یوجنا

یکم تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۷ء



دو روپے

دوریاں ختم ہو گئیں
(برج کشور)

گنگا کو آلودگی سے پاک کرنے کا منصوبہ
(عزیز مرادآبادی)

بیساکھی، قومی یکجہتی کا علامتی تیوہار
(ایم۔ ایل۔ بجاج)

منشی پریم چند اور اردو ناول
(ڈاکٹر شفیق اعظمی)

نظمیں، غزلیں، تبصرہ، ادبی سرگرمیاں

آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے:

بندھوا مزدوری سے متعلق خصوصی مواد

زبان کو مذہب سے جوڑنا ٹھیک نہیں

غالب ایوارڈز کی تقسیم کے موقع پر صدر جمہوریہ ہند کا اظہارِ خیال



(دائیں سے بائیں) سید ابوجعفر زیدی، جناب رضا نقوی واہی، صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ، جناب کشمیری لال ذاکر، جناب احمد سعید ملیح آبادی۔

۲۰ مارچ کو ایوانِ غالب میں اردو کے معزز اور مقتدر ادیبوں، صحافیوں اور دانشوروں کو غالب ایوارڈز پیش کیے گئے۔ یہ مبارک رسم صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔ اس سال جن آٹھ شخصیتوں کو ایوارڈز دیے گئے ہیں، ان کے نام یہ ہیں: ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی (اردو ادب میں تحقیق)، ڈاکٹر اختر [illegible]، جناب کشمیری لال ذاکر (اردو نثر)، جناب رضا نقوی واہی (طنز و مزاح)، جناب احمد سعید ملیح آبادی (صحافت)، سید ابوجعفر زیدی (خطاطی)، بیگم صالحہ عابد حسین (ادبی خدمات)، جناب م۔م۔ راجندر (اردو افسانہ)۔

صدر جمہوریہ ہند نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندی اور اردو دونوں ہی اس ملک کی زبانیں ہیں، زبان کو کسی فرقے یا مذہب سے جوڑنا ٹھیک نہیں۔ زبان، ثقافت کی مظہر ہے، اس کا تعلق پورے ملک سے ہے کسی ایک مذہب کے ماننے والوں سے نہیں۔ انھوں نے ان ادیبوں اور شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں کی خدمات کو سراہا جنھوں نے اپنے قلم سے ملک و وطن کی خدمت کی، اور عمر بھر پیار کے نغمات سنائے، اس زبان نے ملک کی جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، لہٰذا اس کے کاز کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔



تصویر میں اردو کے بزرگ صحافی ادیب جناب حیات اللہ انصاری (بائیں طرف)، ممتاز ادیب و دانشور جناب سید حامد کی کتاب کا اجرا فرماتے ہوئے۔ (فوٹو: سید فدا علی)

(رپورٹ صفحہ ۴۲ پر)

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر: سید ظفر الحسن
ایڈیٹر: جگندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹر: محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر: وسیم حیدر، عبد الحمید

شرح چندہ
سالانہ ۲۰ روپے، دو سالہ ۳۶ روپے
سہ سالہ ۴۸ روپے، فی کاپی دو روپے
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں
کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

جلد ۷ | شمارہ ۱، ۲ | یکم تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۷ء | ۱۱ چیتر تا ۱۰ بیساکھ شک ۱۹۰۸ | قیمت: ۲ روپے، ٹیلیفون: ۶۰۱۸۱۸

اس شمارے میں

اداریہ ۲

اقتصادیات
۸۸-۱۹۸۷ء کے عام بجٹ کی خاص خاص جھلکیاں ۳
۸۷-۱۹۸۶ء کا اقتصادی جائزہ ۵
۸۷-۱۹۸۶ء کیلئے ۳ کھرب ۹۰ ارب روپے کا بجٹ [illegible]
۸۸-۱۹۸۷ء کے ریلوے بجٹ کی نمایاں خصوصیات [illegible]

آزادی کے چالیس سال
نیا بیس نکاتی پروگرام اور تعلیم — کے۔ کے۔ کھلر ۱۰

دیہی ترقی
ساتواں پنجسالہ منصوبہ اور دیہات میں روزگار کی فراہمی — این۔ ایس۔ بالاسبرامنین ۱۳
زمینی اصلاحات کا مسئلہ — کرشن شرما ۱۴
توانائی کے غیر مروجہ مسائل — نریندر جوشی ۱۸

ڈاک اور تار
آدرپال ختم ہو گئیں — برج کشور ۲۱

گنگا
گنگا کو آلودگی سے پاک کرنے کا منصوبہ — عزیز مراد آبادی ۲۴

شخصیات
قومی یک جہتی کے علمبردار مہاتما گاندھی — ریاض احمد خاں ۲۷

طب
ماں کے دودھ پر بچے کی پرورش ۳۰

قومی یک جہتی
بیساکھی قومی یک جہتی کا علامتی تیوہار — ایم۔ ایل۔ بجاج [illegible]

ادب
منشی پریم چند اور اردو ناول — ڈاکٹر شفیق اعظمی [illegible]
اردو کی وسعت (آخری قسط) — پروفیسر سید شبیر علی کاظمی [illegible]
قندیلیں بجھتے فانوس (کہانی) — امر سنگھ [illegible]
میں [illegible] کا بھلا چاہتا ہوں (نظم) — ایم۔ اے۔ شمسی [illegible]
غزلیں — جنید حزیں لاری، جمنا پرشاد راہی، انجم عیانی، عمران عظیم، خلش قادری، ڈاکٹر نریش، سید فضل المتین [illegible]

طلیب کا ستارہ نمبر (تبصرہ) — وسیم حیدر [illegible]
آپ سب کے لیے [illegible]
غالب انعامات — کور
سید حامد صاحب کی کتابوں کا اجراء — کور
غالب کی منظوم سوانح حیات — کور
یوجنا ترقی کے نئے دور میں — کور

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں رہتے۔

[illegible]

اداریہ

عورتوں کی بہبود

یوں تو حصولِ آزادی کے بعد بھارت میں زندگی کے سبھی شعبوں میں ترقی دیکھنے کو ملی ہے لیکن ایک خاص بات جس پر کافی توجہ دی گئی، وہ ہے، بھارتی خواتین کی بہبود ــ بھارت نے نہ صرف خواتین کے مرتبے کو پہچاننے اور اسے اوپر اُٹھانے کے لیے قدم اُٹھائے بلکہ پوری دُنیا کی توجہ اس اہم ضرورت کی طرف مبذول کرائی۔ یہ کوشش ۱۹۷۵ء کے بعد سے اور بھی تیز ہو گئی کیوں کہ یہ وہ سال تھا جب سے اقوامِ متحدہ نے عورتوں کی بہبود کے پروگراموں کو پوری دنیا میں مؤثر بنانے کے لیے زور دیا تھا۔ یہ سلسلہ پورے دس سال رہا اور ۱۹۸۵ء میں نیروبی کانفرنس تک برابر چلا۔ نیروبی کانفرنس میں دُنیا بھر میں خواتین کے مرتبے کو بلند کرنے کے لیے ایک عملی پروگرام کو وضع کیا گیا۔ یہ پروگرام پندرہ برسوں کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر مرتّب کیا جا سکا۔ چنانچہ اس صدی کے آخر تک اس پروگرام کی افادیت بڑی حد تک منظرِ عام پر آ چکی ہوگی۔

عورتیں مختلف مقامات پر مختلف طرح کے امتیازات کا شکار ہیں۔ یہ کمی ترقی یافتہ ملکوں میں بھی ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں "دبلیفیر مدر" زیادہ تر حبشی عورتیں ہی ہوتی ہیں جو مختلف طرح کی محرومیوں کی موجودگی میں گندی بستیوں میں زندگی گزارتی ہیں۔ ہندوستان میں تحریکِ آزادی، جو کہ تقریباً سو سال قبل شروع ہوئی تھی، کے ذریعے شروع ہی سے اس بات پر زور دیا گیا کہ بھارت کی عورتیں مردوں کے دوش بدوش کام کر سکتی ہیں۔ اب تو یہ نظریہ کھل کر سامنے آ چکا ہے کہ عورتیں بچہ پیدا کرنے اور ان کی پرورش کرنے کی ذمّہ داریوں سے بہت آگے آ چکی ہیں۔ آج مُلکی ترقی کے ہر شعبے میں عورتوں کا کردار نمایاں طور پر واضح ہے۔ آج وہ نہ صرف مختلف کاموں، ہنروں اور پیشوں میں اعلیٰ مہارت حاصل کر چکی ہیں بلکہ حمل کو روکنا بھی اب اُن کے دائرۂ اختیار میں ہے۔ اپنی مرضی سے بچے جننے کی اہلیت نے بھی نوعِ انسان کی تاریخ میں انھیں ایک معزز اور ایک ایسا مقام عطا کیا ہے، جو پہلے کبھی حاصل نہ تھا۔

کوئی ملک کتنا مہذب ہے، اس کا اندازہ چار بنیادی باتوں سے لگایا جا سکتا ہے، اتفاق سے یہ چاروں باتیں عورت کی ذات سے متعلق ہیں۔ پہلی بات یہ کہ آبادی میں مرد، عورت کا تناسب کیا ہے، دوسری بات یہ کہ کسی ملک میں عورتوں کی شرحِ خواندگی کیا ہے، تیسری یہ کہ کسی ملک میں زچگی کے دوران کتنی عورتیں مرتی ہیں اور چوتھا یہ کہ کسی ملک میں پیدائش کے سلسلے کی سہولتیں کتنی ہیں اور وہاں پیدائشوں کو ایک مناسب سطح تک رکھنے کے لیے کیا کیا انتظامات ہیں۔ بھارت میں ابھی تک یہ شعور بڑے پیمانے پر پیدا نہیں ہو سکا ہے کہ امورِ خانہ داری میں مصروف ہونا، ایک بڑی ذمہ داری کو دعوت دیتا ہے۔ قدیم زمانے میں عورتیں زراعت سے متعلق بہت سے کاموں میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں، لیکن آج وہ ضمنی حیثیت سے کہیں آگے بڑھ گئی ہیں اور اب وہ ایک بنیادی انسانی وسیلہ بن چکی ہیں۔ چنانچہ عورتوں کی بہبود کی سماجی اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی تعلیم و تربیت کی سہولتوں میں اضافہ ضروری ہو جاتا ہے، ان کی تعلیم بجائے خود ایک قابلِ تعریف نصب العین ہے، اس میں کنبہ کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے اور اسے محدود رکھنے کا عنصر شامل کر کے اسے اور بھی زیادہ مفید اور معتبر بنایا جا سکتا ہے۔ بچّوں کی پیدائش کوئی بُرائی نہیں، آبادی بھی خطرہ نہیں کہی جا سکتی۔ بشرطیکہ کنبہ کی وسعت کو محدود رکھا جائے اور خاندانی منصوبہ بندی کو طرزِ حیات کے طور پر اپنا لیا جائے۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ گزشتہ دس برسوں میں مردوں کے مقابلے عورتوں کے تناسب میں ایک درجہ اضافہ ہوا ہے، اس کی بنیادی وجہ خاندانی منصوبہ بندی اور زچہ بچّہ کی دیکھ بھال ہے، یہ بات بھی امید افزا ہے کہ شرحِ اموات میں تیزی سے کمی آئی ہے اور شرحِ پیدائش بھی گری ہے۔ آیندہ پندرہ برسوں میں اس محاذ پر تیزی سے کامیابی حاصل کیے جانے کا پروگرام ہے، گویا کہ آیندہ پندرہ برسوں میں بھارت میں ایک نئی عورت کو جنم مل سکے گا ـــــ ایک ایسی عورت جو اپنے حقوق کی مکمل طور پر حفاظت کر سکے اور نوعِ انسانی کی بہبود میں بھرپور حصہ لے سکے۔

(ایڈیٹر) ●

۸۸-۱۹۸۷ء کے عام بجٹ کی خاص خاص جھلکیاں

الیکٹرانکس کی صنعت کی ترقی کے لیے پالیسی کے بنیادی ڈھانچے کو مضبوط بنانے کے اقدامات ۸۸-۱۹۸۷ء کی بجٹ تجاویز کی ایک بڑی خصوصیت ہیں۔ جو رعایتیں دی گئی ہیں اور ڈھانچے کو معقول بنانے کے جو اقدامات کیے گئے ہیں ان سے الیکٹرانکس اور کمپیوٹروں کی تیزی سے ترقی کر رہی صنعتوں کی مزید حوصلہ افزائی ہوگی۔

درآمد کردہ کمپیوٹر نظاموں پر محصول ۱۵۰ فیصد سے گھٹا کر ۱۴۰ فیصد کیا جا رہا ہے۔

تحقیق کے لیے درکار کمپیوٹر سے متعلق ساماں پر درآمدی محصول سے چھوٹ مزید تین برس جاری رہے گی۔

تحقیق و ترقی کے لیے درکار ساز و سامان پر محصول ۱۴۰ فیصد سے گھٹا کر ۵۵ فیصد کر دیا گیا ہے۔

کمپیوٹروں کے بعض خاص خاص قسم کے الیکٹرانی حصوں پر درآمدی محصول ۲۵ فیصد سے بڑھا کر ۷۵ فیصد کیا جا رہا ہے تاکہ اس مال کی ملک میں تیاری کے لیے تحفظ دیا جا سکے۔

سیلولوز، سولر سیلز اور فوٹو وولٹکس نظاموں کی درآمد پر بالترتیب ۴۰، ۴۵ اور ۷۵ فیصد محصول مقرر کیا گیا ہے۔

پلاسٹک کی تمام اقسام پر گھریلو صنعت ... کے ایک قدم کے طور پر پیداواری محصول ... کیا جا رہا ہے۔

... کی دلی

ٹیلی ویژن کی بیماری میں ٹیکسوں کی چوری کو روکنے کے لیے ۳۶ سینٹی میٹر سے زیادہ چوڑائی کی اسکرین والے سیاہ و سفید سیٹوں پر ۱۵۰ روپے اور رنگین سیٹوں پر ۶۰۰ روپے کا ٹیکس عائد کیا گیا ہے۔

براہ راست ٹیکسوں سے متعلق تجاویز کا بنیادی زور اس بات کی ترغیب دینے پر ہے کہ بچتوں کو بڑھاوا دے کر سرمایہ کاری اور مکان بنانے کو فروغ دیا جا سکے۔

شخصی ٹیکس اور کمپنیوں پر ٹیکس کی شرحوں کے ڈھانچے میں تبدیلیوں کی کوئی تجویز نہیں ہے یہ طویل المدتی مالی پالیسی کے عین مطابق ہے۔

غیر ملکی زرِ مبادلہ کو محفوظ رکھنے اور مالیہ بڑھانے کے لیے غیر ملکی سفر کے لیے ہندوستان میں دیے جانے والے غیر ملکی زرِ مبادلہ پر ۱۵ فیصد کا معمولی ٹیکس لگانے کی تجویز ہے، اس سلسلے میں باہر ملکوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے یا علاج معالجے کے لیے دی جانے والی رقومات پر ٹیکس نہیں لگے گا۔

تعمیر مکانات میں بچتوں کے استعمال کے لیے مالی ترغیبات دی جا رہی ہیں۔ سال میں دس ہزار روپے تک کے قرضوں کی ایسی رقوم کی واپسی پر جو کہ کسی نئی رہائشی جائداد بنانے پر صرف کی گئی ہوگی، انکم ٹیکس ایکٹ کے سیکشن ۸۰ سی کے تحت اسی طرح رعایتیں ملیں گی جس طرح کہ پراویڈنٹ فنڈ میں رقم ڈالنے یا زندگی بیمہ کے لیے ... دینے پر ملتی ہیں۔ یہ رعایت چالیس ہزار روپے کی حد تک ملے گی۔

یکم اپریل ۱۹۸۰ء سے نئی کمپنیوں کے چند زمروں کے ایکوئٹی حصص میں سرمایہ کاری کے ضمن میں موجودہ رعایتوں کو ہٹائے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا مگر اس رعایت کو مزید تین سال کے لیے جاری رکھنے کی تجویز ہے۔

غیر ملکی کرنسیوں میں کمائی کرنے والے بھارتی شہریوں کو فی الحال ۵۰ فیصد کی چھوٹ ملتی ہے۔ اس میں مزید رعایت دی جا رہی ہے۔

جسمانی طور پر معذور اور پورے نابینا افراد ... کی حد دس ہزار سے بڑھا کر ۱۵ ہزار روپے کی جا رہی ہے۔

ممبران پارلیمنٹ کے لیے حلقہ الاؤنس میں بنا کسی زیادہ سے زیادہ حد کے عام چھوٹ دی جا رہی ہے۔

مرکزی پلان کی خاص خاص باتیں

۱- آبرسانی اور سیلابوں کی روک تھام کے لیے ۱۶۷ کروڑ روپے کے اخراجات رکھے گئے۔ اس میں ۱۶ لاکھ ۷۰ ہزار ہیکٹیر اراضی پر آبرسانی کی چھوٹی اسکیموں کو فروغ دیا جائے گا۔

۲- توانائی کی مد پر ۶۹۰ کروڑ روپے کے اخراجات ہوں گے۔ اس مد میں سے ۱۳۳۰ کروڑ روپے

یکم تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۷

[illegible] کی نیا سی یا دسر [illegible] خرچ کئے [illegible] [illegible] سیر جائے گی [illegible] ... [illegible] کروڑ روپے [illegible]

[illegible] اخراجات آئندہ سال دوگنے [illegible] آئندہ برس تعلیم کی مد پر ۸۰۰ کروڑ روپے کے مصارف عمل میں آئیں گے جب کہ [illegible] ۲۰۰ کروڑ روپے کے بقدر تھے۔ [illegible] بورڈ نامی پروگرام کے تحت ملک [illegible] پرائمری تعلیم کے نظام کو مستحکم بنایا جائیگا۔ [illegible] دور کرنے کے لیے ٹیکنالوجی مشن قائم کیے جائیں گے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۱۵۰" [illegible] سے [illegible] لیے کھولے جائیں گے۔ تکنیکی تعلیم کی مد پر اخراجات کو بڑھا کر ۱۴۳ کروڑ روپے کیا جا رہا ہے۔

صحت اور خاندانی بہبود کی مدات پر ۷۹۰ کروڑ روپے کے اخراجات ہوں گے۔ اس سلسلے میں کوڑھ اور گلہڑ کے امراض کی روک تھام پر خصوصی زور دیا جائے گا۔ ٹیکہ لگانے کے پروگرام کو توسیع دی جائے گی۔

اطلاعات و نشریات کے لیے ۴۳۴ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۶۳ نئے ٹرانسمیٹر نصب کئے جائیں گے۔ مارچ ۱۹۸۸ء تک ملک کی ۷۰ فیصد آبادی ٹی وی پروگراموں سے مستفید ہو رہی ہوگی، اس وقت تک ملک کے ۲۵ فیصد حصے میں یہ پروگرام پھیل چکے ہوں گے۔

درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کی بہبود کے لیے ۲۲۵ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔

۸۸-۱۹۸۷ء میں قبائلی آبادی کی بہبود کے ذیلی منصوبوں کے لیے ۱۲۹ کروڑ روپے خصوصی مرکزی امداد کے طور پر دئے جائیں گے۔

[illegible] اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے ۹۰۹ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ کھادی اور دیہی صنعتوں کے کمیشن کے پروگراموں کو مضبوط بنانے کے لیے ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۱۴۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ اس پروگرام کے تحت ۴۱ لاکھ افراد کو روزگار مل سکے گا۔

سائنس، ٹیکنالوجی اور ماحولیاتی پروگراموں کے لیے ۴۳۴ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں جنگل بانی کے پروگراموں پر خاص زور رہے گا۔

ٹرانسپورٹ کی مد کے لیے ۴۳۷۶ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ سڑکوں کی تعمیر و ترقی کے لیے ۵۵ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ ریلویز کی ترقی کے لیے ۲۳۰ کروڑ روپے کے اخراجات ہوں گے۔

غریبی دور کرنے کے لیے بھاری رقم

۱۔ دیہی ترقیات کے محکمے کے اخراجات ۳ ہزار کروڑ روپے سے بھی تجاوز کریں گے۔

۲۔ قومی دیہی روزگار پروگرام کے لیے ۸۰۴ کروڑ روپے مخصوص کئے گئے ہیں جس سے آئندہ برس ۲۷ کروڑ ۳۰ لاکھ افرادی دنوں کا روزگار مہیا کیا جائے گا۔

۳۔ دیہی بے زمین افراد کے لیے روزگار کے ضمانتی پروگرام۔ اس کے لیے ۶۲۵ کروڑ روپے مخصوص کئے گئے ہیں، جس سے آئندہ برس ۲۵ کروڑ ۶۰ لاکھ افرادی دنوں کا روزگار مل سکے گا۔ اس پروگرام کے تحت ایک سال میں ہر کنبے کے کم سے کم ایک فرد کو سو دنوں تک کا روزگار مل سکیگا۔

گاؤں میں پانی کی فراہمی

اس کام کے لیے آئندہ برس ۳۷۰ کروڑ روپے کے اخراجات مختص کئے گئے ہیں۔ ریاستی سیکٹر میں کم سے کم ضروریات کے پروگرام کے تحت جو اخراجات مختص [illegible] کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ مرکزی سیکٹر میں [illegible] رقم مخصوص کی گئی ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء میں [illegible] گاؤں میں پانی مہیا کیا جائے گا۔

زراعت

زرعی تحقیق اور زراعت کے محکموں کے لیے ۱۵۵ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

۱۔ مشرقی خطے میں چاول کی پیداوار بڑھانے کے خصوصی پروگرام کے لیے ۲۲ کروڑ روپے۔

۲۔ تلہنوں کی پیداوار بڑھانے کے قومی پراجیکٹ کے لیے ۱۷ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

۳۔ نیشنل واٹر شیڈ ڈیولپمنٹ پروگرام کے لیے ۲۸ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

۴۔ آپریشن فلڈ کے لیے ۵۶ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

۵۔ زراعت کی ترقی و فروغ کے قومی بنک کے لیے ۱۵۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

عام بجٹ ۸۸-۱۹۸۷ء

	کروڑ روپے ۸۸-۱۹۸۷ء بجٹ تخمینے
زراعت	۹۱۲
دیہی ترقی	۱۶۵۱
آبپاشی اور سیلاب کی روک تھام	۱۶۷
توانائی	۷۶۹۰
صنعت اور معدنیات	۴۷۱۳
نقل و حمل	۴۳۷۶
مواصلات	۱۲۲۹
سائنس، ٹیکنالوجی اور ماحولیات	۴۳۴
سماجی خدمات	۳۰۱۱
دیگر اخراجات	۲۳۹
کل میزان	۲۴۴۲۲

۸۷-۱۹۸۶ء کا اقتصادی جائزہ

وزیراعظم نے پارلیمنٹ میں پیش کیا

وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے ۸۷-۱۹۸۶ء کا اقتصادی جائزہ پارلیمنٹ میں پیش کرتے ہوئے بتایا کہ ساتویں پنجسالہ منصوبے میں داخل ہوتے وقت ہماری اقتصادی کارکردگی کی مجموعی علامات انتہائی امید افزا ہیں۔ مجموعی اقتصادی ترقی منصوبے میں درج نشانوں کے مطابق آگے بڑھ رہی ہے، صنعتی ترقی کی شرح میں اضافہ ہوا ہے، اور مسلسل تین برس تک خشک سالی کے حالات کے باوجود خوراک کی صورت حال اطمینان بخش ہے، افراط زر قابو میں ہے۔ سال رواں میں تجارتی خسارہ کم ہوا، یہ سب ٹھوس کامیابیاں ہیں جو ایک صحیح اور اثرپذیر اقتصادی پالیسی کی وجہ سے ممکن ہوئیں۔

جائزے کے مطابق سال رواں میں مجموعی قومی پیداوار میں ۵ء۴ اور ۵ فیصد کے درمیان ترقی ہونے کا امکان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پچھلے سات برسوں میں حقیقی اقتصادی ترقی کا اوسط تقریباً ۵ فیصد سالانہ رہا ہے جبکہ شرح ترقی کا پچھلا طویل المدت رجحان ۵ء۳ فیصد تھا۔ اس طرح ظاہر ہے کہ ہماری معاشیات ترقی کے زیادہ بلند راستے پر گامزن ہوگئی ہے۔ جائزے میں کہا گیا ہے کہ ترقیاتی کاموں کے لیے رکھے گئے وسائل کی بتدریج توسیع کے ذریعہ ترقی کی رفتار کو قائم رکھا جا رہا ہے۔ پلان کے پہلے تین برسوں میں پہلی بار پانچ سالہ مرکزی منصوبے کے نشانے کا حقیقی معنوں میں پورا ہونے کا امکان ہے۔

زرعی پیداوار

امید کی جاتی ہے کہ خراب موسم کے باوجود ۸۷-۱۹۸۶ء میں اناج کی پیداوار ۱۵ کروڑ ۵ لاکھ ٹن سے بڑھ جائے گی جو کہ ۸۶-۱۹۸۵ء کی پیداوار سے بھی زیادہ ہے۔ پہلی جنوری ۱۹۸۷ء کو عام تقسیمی نظام میں خوراک کے ذخیرے ۲ کروڑ ۳۶ لاکھ ٹن تھے۔ اس سے اناج کی پیداوار میں طویل المدت ترقی اور اس حلقے کا خود مکتفی ہو جانا ظاہر ہوتا ہے۔

۸۷-۱۹۸۶ء میں حکومت نے زراعت کے حلقے میں کچھ بڑے کامیاب قدم اٹھائے جن کا مقصد گنا اور تلہنوں کی پیداوار بڑھانا اور اس طرح ان کی درآمدات پر انحصار کم کرنا تھا۔ ان پالیسیوں کی وجہ سے چالو سال میں شکر اور خوردنی تیلوں کی درآمدات میں کافی کمی ہوئی۔

پروجیکٹ کے علاقوں اور غذائیت کے پروگراموں کے لیے انتہائی رعایتی شرحوں پر اناج مہیا کرنے کے علاوہ قومی دیہی روزگار پروگرام (NREP) اور دیہی مزدور روزگار ضمانتی پروگرام (RLEGP) کے لیے پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ گیہوں اور چاول دیا گیا۔

صنعتی کارکردگی

صنعتی پیداوار کے نئے اشاریہ (بنیاد ۸۱-۱۹۸۰ء) سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ حالیہ برسوں میں صنعتی ترقی پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہوئی ہے۔

صنعتی پیداوار کے نئے اشاریہ کے مطابق صنعتی پیداوار کی شرح ترقی بڑھ کر ۸۵-۱۹۸۴ء اور ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۹.۵ فیصد سے زیادہ ہوگئی جبکہ اس سے پہلے کے تین برسوں میں اوسط شرح ترقی ۹.۹ فیصد تھی۔ توقع ہے کہ چالو سال میں بھی شرح ترقی اچھی رہے گی۔

جائزے کے مطابق، صنعتی کارکردگی میں اس بہتری کی جزوی طور پر وجہ یہ ہے کہ حالیہ برسوں میں صنعتی توسیع میں ضابطے کی رکاوٹوں میں کمی ہوئی ہے۔ نئی پیداواری صلاحیت پیدا کرنے، ٹیکنالوجی کا معیار بہتر کرنے، مختلف یونٹوں میں تقابل اور بڑے پیمانے پر پیداوار کرنے پر روز افزوں زور دیا گیا ہے۔

اپریل ۱۹۸۶ء سے جنوری ۱۹۸۷ء تک کے عرصے میں نئے اجرائے سرمایہ کی منظوریاں ۷۵ کروڑ روپے کی تھیں جبکہ ۸۵-۱۹۸۴ء اور ۸۶-۱۹۸۵ء کے پورے مالی برسوں میں یہ منظوریاں بالترتیب ۳۰۲ کروڑ روپے اور ۳۲۹۵ کروڑ روپے کی تھیں۔

بنیادی ڈھانچہ

یکم اپریل تا دسمبر ۱۹۸۶ء کے عرصے میں ۱۹۸۵ء کی مماثل مدت کے مقابلے میں بجلی کی پیداوار میں دس فیصد سے زیادہ کا اضافہ ہوا۔ حرارتی بجلی پیدا کرنے والے بجلی گھروں کا اس سال کا پلانٹ لوڈ فیکٹر (PLF) ۵۱.۵ فیصد تھا، جو سات برسوں میں سب سے زیادہ ہے۔ ۸۷-۱۹۸۶ء کے پہلے نو مہینوں میں مال یہ کمانے والے ریلوے کے بھاڑے میں تقریباً ۷ فیصد اضافہ ہوا جبکہ چھٹے منصوبے کی مدت میں اوسط سالانہ شرح اضافہ تقریباً چار فیصد تھا۔ یہ خاص طور پر قابل تعریف ہے کیونکہ ۸۶-۱۹۸۵ء میں شرح اضافہ نو فیصد سے بھی زیادہ تھا۔ دوسری کلیدی صنعت کوئلہ کی صنعت ہے جس نے اس سال اچھی کارکردگی دکھائی۔ اپریل تا دسمبر ۱۹۸۶ء کے عرصے میں کوئلہ کی پیداوار میں اضافہ ۸.۷ فیصد تھا جو کہ پچھلے پانچ برسوں میں سب سے زیادہ ہے۔

قیمتیں

اقتصادی جائزے کے مطابق امکان ہے کہ ۸۷-۱۹۸۶ء کے آخر میں تھوک قیمتوں کے اشاریہ کی بنا پر افراط زر کی شرح ۶.۵ فیصد ہوگی۔ یہ شرح گذشتہ دس برس کے دوران قیمتوں میں قریب آٹھ فیصد سالانہ کی اوسط اضافے کی رفتار سے کافی کم ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ ملک میں قیمتوں کی مجموعی صورت حال توازن میں ہے۔

اناجوں کی قیمتیں ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۸۶-۱۹۸۵ء کی نسبت زیادہ مستحکم تھیں جن میں چار فیصد کی شرح سے اضافہ ہوا ہے جو گزشتہ برس ۶.۵ فیصد تھی۔ دوسری جانب زرعی غیر اناج اجناس کی قیمتوں میں کافی اضافہ ہوا ہے جبکہ گذشتہ برس پٹ سن، کپاس، چائے اور مرچ مسالوں کی قیمتوں میں بھاری کمی ہوئی تھی۔ اس برس خوردنی تیلوں اور دالوں کی قیمتوں میں تیزی سے اضافے کے سبب قیمتوں کے مجموعی اشاریہ میں اضافہ ہوا۔ تاہم سال رواں میں قیمتوں میں اضافے کو گزشتہ دو برسوں میں گری ہوئی قیمتوں کے لحاظ سے دیکھا جانا چاہیئے۔

حکومت کے بڑے بڑے ٹیکسوں سے آمدنی جو ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۲۲ فیصد بڑھی تھی اس میں اپریل تا دسمبر ۱۹۸۶ء میں مزید ۱۷ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ سب سے زیادہ باعث دلچسپی امر براہ راست ٹیکسوں میں اضافہ ہے جو ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۲۳ فیصد تھا۔ آمدنی اور کمپنیوں پر ٹیکسوں سے آمدنی (ماسوائے تیل کے شعبے) کے بارے میں اندازہ ہے کہ وہاں اپریل سے دسمبر ۱۹۸۶ء کے مہینوں میں اضافے کی یہ شرح برقرار رکھی گئی۔ ۸۵-۱۹۸۴ء کے بعد ٹیکسوں سے آمدنی میں تیزی سے جو اضافہ ہوا ہے وہ حکومت کے طریقہ کار کی پختگی کا مظہر ہے۔

درآمدات کے شعبے میں بڑی مقدار میں درآمد کی جانے والی اشیاء کی بجائے ملکی مال جیسے کہ چینی، خوردنی تیلوں اور کیمیاوی کھادوں کی پیداوار بڑھانے کی حوصلہ افزائی کرنے کے اقدام اٹھائے گئے۔ ان اقدامات سے برآمدات میں اپریل سے نومبر ۱۹۸۶ء کی مدت میں ۱۹۸۵ء کی اسی مدت کے مقابلے میں ۱۷.۳ فیصد کا اضافہ ہوا اور درآمدات میں اضافے کو صرف ۱.۴ فیصد تک محدود رکھا گیا۔ خام تیل کو چھوڑ کر باقی اشیاء کی برآمد میں ۱۲.۹ فیصد کا اضافہ ہوا۔ ان اقدامات کی بدولت اپریل سے نومبر ۱۹۸۶ء کے دوران تجارتی خسارہ میں گذشتہ برس کی اسی مدت کے مقابلے میں ۱۸.۳ فیصد یا ۱۰۱ کروڑ روپے کی کمی ہوئی۔ تاہم غیر ملکی زرمبادلہ کے مجموعی ذخیرے میں جنوری ۱۹۸۷ء کے آخر تک ۱۶۰ کروڑ روپے کی کمی ہوئی جب کہ ۸۶-۱۹۸۵ء میں ذخیرے میں ۵۷۷ کروڑ روپے کا اضافہ ہوا تھا۔

مسائل اور امکانات

مستقبل کے بارے میں جائزے میں سرکار کے اخراجات پر قابو رکھنے کی اہمیت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ جائزے میں سرکاری دائرہ کار سے مالی وسیلے پیدا کرنے میں مزید بہتری لانے کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ساتویں منصوبے میں سرمایہ کاری اور ترقی کی رفتار کی بنا پر افراط زر یقینی بنانے کے لیے سرکاری دائرہ کار کے اداروں میں فاضل سرمائے کے حصول اور ان کی اہلیت کار کو بہتر بنانا بہت ضروری ہے۔ مالی وسیلوں پر تقاضوں کے بوجھ سے نمٹنے کے لیے اقتصادی جائزے میں ٹیکسوں سے آمدنی میں اضافے کے رجحان کو انتظامیہ اور قوانین کے نفاذ کے ذریعے برقرار رکھنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ ●

۱۹۸۶-۸۷ء کیلئے ۳ کھرب ۹ ارب روپے کا بجٹ

غریبی دُور کرنے پر زور

۱۹۸۶-۸۷ء کے سالانہ پلان کے لیے ۳ کھرب ۹۰ ارب اور ۵۲ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اس میں مرکزی پلان کے لیے ۲ کھرب ۲۳ ارب روپے (۱۹۸۵-۸۶ء کے لیے نظرثانی شدہ تخمینہ کے ۱۱ فیصد منظور شدہ اخراجات سے ۲۰.۵ فیصد زیادہ) مرکزی منتظم علاقوں کے لیے ۸ ارب ۳۷ کروڑ روپے (گذشتہ برس سے ۳۹ فیصد زیادہ) اور ریاستوں کے لیے ایک کھرب ۵۸ ارب اور ۹۷ کروڑ روپے (۸۵-۸۶ کے نظرثانی شدہ تخمینہ سے ۱۵ فیصد اور منظور شدہ اخراجات سے ۲۱ فی صد زیادہ) کی رقومات شامل ہیں۔ دیہی ترقیات کے سیکٹر کے لیے زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا گیا ہے اور اس کے لیے ۸۵-۸۶ء کے طے شدہ اخراجات سے ۵۱ فیصد زیادہ رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اس کا تذکرہ ۱۹۸۶-۸۷ء کے سالانہ پلان میں کیا گیا ہے جو ۷ نومبر ۱۹۸۶ء کو لوک سبھا کی میز پر رکھا گیا تھا۔ دستاویز میں یہ توقع کی گئی ہے کہ ملکی وسائل سے پلان کے اخراجات کے لیے ۸۰.۰ فیصد سرمایہ فراہم کیا جا سکا جبکہ ۹.۸ فیصد سرمایہ سمندر پار کے وسائل سے جمع کیا جا سکا۔ اور پلان کے اخراجات کا باقیماندہ حصہ خسارے کے بجٹ سے پورا کیا جائیگا۔

سالانہ پلان میں انسداد افلاس پر زور دیا گیا ہے۔ تاکہ سماج کے کمزور طبقوں کے لیے روزگار اور آمدنی کے زائد مواقع پیدا کیے جائیں۔ اس کے علاوہ بہتر صلاحیت سے پیداواری قوت بڑھانے وسائل کے استعمال کو بہتر بنانے، ٹیکنالوجی کو اعلیٰ بنانے اور جن زیر عمل پراجیکٹوں پر کافی کام ہو چکا ہے انھیں وقت پر مکمل کرنے اور دیگر پراجیکٹوں کی فوری تکمیل پر بھی زور دیا گیا ہے تاکہ اُن پر کی گئی سرمایہ کاری سے استفادہ کیا جا سکے۔

برآمدات میں اضافہ

پلان میں ایسے اقدامات کرنے کے لیے کہا گیا ہے جن سے برآمدات سے طویل المدتی نفع بخشی کی اُمید بڑھ جائے۔

ان سے برآمد کنندگان کو اپنی برآمدات بڑھانے کا پلان بنانے کی ترغیب حاصل ہوگی۔ دستاویز میں برآمدات کو دی گئی اعلیٰ اولیت جاری رکھنے اور ایسی مزید مساعی کرنے کو کہا گیا ہے جن سے برآمدات سے متعلقہ بنیادی سہولیات کو وسیع حاصل ہو۔ علاوہ ازیں درآمدات کے نعم البدل تیار کرنے کے ساتھ اس امر پر بھی زور دیا گیا ہے کہ فولاد سازی کیمیاوی کھاد اور دیگر کلیدی صنعتوں کی پیداواری صلاحیت کا بھرپور استعمال کیا جائے۔ سالانہ پلان میں افراط زر پر قابو پانے سے متعلق پالیسیاں اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے جن سے ادائیگیوں کے توازن کی پوزیشن بہتر ہو سکے۔

زراعت پر زور

سالانہ پلان کی دستاویز میں بتایا گیا ہے کہ ناسازگار مون سون کے باوجود ۱۹۸۵-۸۶ء میں ۱۹۸۴-۸۵ء کے مقابلے میں زرعی پیداوار کے بڑھنے کا امکان ہے۔ بنیادی سہولیات میں کافی اضافہ کیا گیا ہے۔ خاص طور پر ریلوے ٹرانسپورٹ میں بڑی بہتری ہوئی ہے۔ صنعتی پیداوار میں ۶.۲ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ حقیقی معانی میں ۱۹۸۵-۸۶ء میں کل ملکی پیداوار کا ۴.۵ فیصد سے زیادہ بڑھنے کا اندازہ ہے جبکہ ۱۹۸۴-۸۵ء میں اس میں ۳.۷ فیصد کا اضافہ ہوا تھا۔

دستاویز میں مزید بتایا گیا ہے کہ ۱۹۸۵-۸۶ء میں کل زرعی پیداوار کا تخمینہ ۱۵ کروڑ ۵ لاکھ ٹن

لگایا گیا ہے جبکہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں یہ ۱۴ کروڑ ۶۲ لاکھ ٹن تھی۔ لیکن نشانے کے مطابق یہ کافی کم تھی۔ جہاں تک تجارتی فصلوں کا تعلق ہے، ۸۶-۱۹۸۵ء میں پٹ سن کی پیداوار کا اندازہ ایک کروڑ ۴۲ لاکھ گانٹھیں لگایا گیا ہے جو کہ ایک ریکارڈ پیداوار ہے اور گزشتہ برس کے مقابلے میں کوئی ۵۵ فیصد زیادہ ہیں۔ روئی اور چینی کی تخمینہ شدہ پیداوار میں بھی گذشتہ برس کے مقابلے میں بھی معمولی اضافہ ہوا ہے لیکن تلہن کی پیداوار میں ۱۴٫۵ فیصد تک کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران زرعی پیداوار اور پیداواری قوت کو بڑھانے کے لیے زور شور سے کوششیں جاری رکھی گئیں۔ اس برس مزید ۲۲ لاکھ ۲۰ ہزار ہیکٹیر زمین میں آبپاشی کا امکان پیدا کیا گیا اور مزید ۱۶ لاکھ ۹۰ ہزار ہیکٹیر زمین میں آبپاشی کی گئی۔ اسی طرح ناسازگار موسم کے باوجود کیمیاوی کھاد کی کھپت ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۹۰ لاکھ ۱ ہزار ٹن تک بڑھ گئی جو ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۸۲ لاکھ ۱۰ ہزار ٹن تھی۔ اس طرح اس کی کھپت میں ۱۰ فیصد کا اضافہ ہوا۔

سالانہ پلان کی دستاویز میں کہا گیا ہے کہ ساتویں پلان کے مقاصد کے مطابق ۸۷-۱۹۸۶ء میں خوراک، روزگار اور پیداواری صلاحیت بڑھانے پر متواتر زور دیا جائے گا۔ چونکہ بنیادی ڈھانچہ اقتصادی ترقی کی اولین شرط ہے اس لیے اس کی ترقی کو اعلیٰ ترجیح دی گئی ہے اور پلان کے کل اخراجات کا تقریباً ۴۴ فیصد حصہ توانائی اور ٹرانسپورٹ کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ انسدادِ افلاس سے متعلق حکومت کے قول و قرار اور خوراک کے وافر ذخائر کی دستیابی کے پیش نظر یہ تجویز کیا گیا ہے کہ انسدادِ افلاس سے متعلق پروگراموں کی جانب زیادہ توجہ دی جائے۔ انسانی وسائل کے فروغ، زراعت اور متعلقہ سرگرمیوں، آبپاشی اور کیمیاوی کھاد کی پیداوار پر بھی زیادہ زور دیا گیا ہے۔

پیداوار اور پیداواری قوت بڑھانے، علاقائی عدم توازن کو کم کرنے اور افلاس و بیروزگاری کا انسداد کرنے کی غرض سے بعض خصوصی زرعی پروگراموں پر زور دیا گیا ہے۔ مشرقی خطے میں ۸۶-۱۹۸۵ء میں چاول کی پیداوار بڑھانے سے متعلق ایک خصوصی پروگرام عمل میں لایا گیا تاکہ اس خطے میں بنیادی ڈھانچے سے متعلق سہولیات کے فروغ پر زور دیا جائے۔ اس پروگرام کے بڑے بڑے اجزا ہیں — ترسیل، کیمیاوی کھاد اور بیجوں کے چھوٹے چھوٹے تھیلوں کی تقسیم، حلقہ جاتی نرسریوں کا قیام، کیڑے مار دوائیوں کی فراہمی اور نالیوں کی سہولیات۔

تلہن خصوصاً خوردنی تلہن کی سپلائی مانگ سے کم ہو گئی ہے جن سے اُن کی درآمد لازمی ہو گئی ہے اور اس سے ملک کے زرِ مبادلہ کے وسائل پر بھاری بوجھ پڑ رہا ہے۔ سالانہ پلان کی دستاویز میں قومی تلہن پراجیکٹ کے ڈھانچے کی از سر نو تشکیل کرنے کو کہا گیا ہے تاکہ ایسے کلیدی اداروں کو تقویت دینے پر زور دیا جائے جو کاشتکاروں کو ضروری چیزیں فراہم کرنے کے لیے ذمہ دار ہیں جیسے کہ کیمیاوی کھاد، بیج اور وغیرہ۔

آبپاشی

سالانہ پلان کے مسودے میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران مزید ۲۴ لاکھ ۲۰ ہزار ہیکٹیر زمین میں آبپاشی کا امکان پیدا کیا جائے اور مزید ۱۸ لاکھ ۴۰ ہزار ہیکٹیر زمین کو آبپاشی کے تحت لایا جائے۔ بڑی اور درمیانہ درجے کی آبپاشی کے معاملے میں زیرِ عمل پراجیکٹوں کو ترجیح دی جائے گی۔ جنہیں فوری طور پر مکمل کیا جا سکتا ہے۔ درمیانے درجے کی آبپاشی کے پراجیکٹ محض اُن علاقوں میں عمل میں لائے جائیں گے جو قبائلی یا پسماندہ ہیں یا جو خشک سالی کا شکار ہوتے ہیں۔

سالانہ پلان کے مسودے میں بتایا گیا ہے کہ توانائی اور ٹرانسپورٹ کے بنیادی سیکٹروں کی ترقی پر خاص زور دیا گیا ہے۔ کوئلے کی روانگی، بجلی کی پیداوار، ریلوے کے ذریعہ مال برداری اور بڑی بڑی بندرگاہوں میں مال لادنے اور اُتارنے کے امور میں تیزی آئی ہے۔

دستاویز کے مطابق ریلوے کی کارکردگی میں قابلِ ذکر بہتری ہوئی ہے۔ ریلوے کے ذریعے ڈھوئے جانے والے مال سے ہونے والی آمدنی میں پچھلے یکساں عرصے کے دوران ہونے والی ۱۰٫۴ میٹرک ٹن آمدنی کے مقابلے میں ۵٫۹ فیصد کا اضافہ ہوا جبکہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں یہ شرح ترقی محض ۲٫۷ فیصد تھی۔

۸۶-۱۹۸۵ء کے لیے صنعتی پیداوار کا عارضی اشاریہ ۶٫۲ فیصد ہے اگرچہ یہ پلان کے ۷ فیصد کے نشانے سے کم ہے تاہم یہ امر بڑا اہم ہے کہ ۸۳-۱۹۸۲ء کے بعد سے صنعتوں کی شرحِ ترقی رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی ہے۔ مینوفیکچرنگ (مصنوعات) کے سیکٹر میں ۸۶-۱۹۸۵ء میں شرح ترقی ۸٫۵ فیصد تھی۔ [illegible] شرح ترقی ۱٫۸ فیصد اور کانکنی کی شرح ۷٫۱ فیصد تھی۔

کئی صنعتیں ایسی ہیں جہاں کارکردگی نشانوں کے مقابلے میں بہت اچھی رہی۔ خام تیل، پیٹرول کی صفائی، [illegible] سازی، جوٹ، بعض قسم کی مشینری، فاسفیٹ فرٹیلائزر، اور بائٹ ٹائروں، [illegible] سازی، متعدد مصنوعی ریشوں کے پارچہ جات، کپڑے کے سوت کا دھاگہ اور کاغذ کی مصنوعات، اخباری کاغذ، اسکوٹروں اور موٹر سائیکلوں، بائیسکلوں (منظم سیکٹر) اور بعض الیکٹرانک اشیاء کے مقابلے میں پیداوار نشانوں سے بڑھ گئی۔ لیکن متعدد اہم اشیاء جیسے کوئلے، سیمنٹ، نائٹروجن فرٹیلائزر، موٹر گاڑیاں، جہاز سازی،

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

۸۸-۱۹۸۷ء کے ریلوے بجٹ کی نمایاں خصوصیات

ریلوے ۔ کل ۲۸ کروڑ ۴۶ لاکھ ٹن مال کی نقل و حمل کی جبکہ گزشتہ برس ۲۶ کروڑ ۴۸ لاکھ ٹن مال ڈھویا گیا تھا۔ حالانکہ مال ڈبوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

سال کا اختتام عمومی مالیات میں ۵۰۷ کروڑ روپے کا پورا ڈیویڈنڈ ادا کرنے کے بعد ۱۷۹ کروڑ روپے کی بچت سے ہوا۔ یہ بجٹ میں متوقع بچت سے ۱۰۵ کروڑ روپے زیادہ تھی۔

رواں مالی سال کے بجٹ کی ایک خصوصیت گھسائی پٹائی کے ریزرو فنڈ میں ۲۳۶ کروڑ روپے کا اضافہ ہے جو ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۹۲۰ کروڑ روپے تھا لیکن ۸۷-۱۹۸۶ء میں بڑھ کر ۱۰۵۰ کروڑ روپے ہو گیا۔

مال و بس سے ۳۰۵۰ کروڑ روپے کی آمدنی کی توقع ہے جب کہ بجٹ کا اندازہ ۶۸۱۹ کروڑ روپے کا تھا۔

عملے کے اخراجات میں بجٹ کے بعد بھاری اضافے کے باوجود ریلوے کو ۵۰۰ کروڑ روپے کے ڈیویڈنڈ کی ادائیگی کے بعد گیارہ کروڑ روپے کا منافع ہوا۔

مسافروں کیلئے خدمات

ریلوے نے متعدد اضافی مسافر خدمات اور مسافروں کے لیے سہولیات مہیا کیں جس میں گاڑیوں کی مسافت میں توسیع اور موجودہ مسافر ٹرینوں کے بہتر استعمال سے گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ شامل ہے۔

یکم اپریل ۱۹۸۷ء سے درج ذیل کئی نئی ریل گاڑیاں چلائی جا رہی ہیں۔

ایک سپر فاسٹ گاڑی (ہفتے میں دو بار) بمبئی وکٹوریہ ٹرمینس اور کوچین کے درمیان۔

ایک ایکسپریس گاڑی (ہفتہ وار) پٹنہ اور مدراس کے درمیان براستہ اٹارسی اور جبلپور۔

ایک سپر فاسٹ گاڑی (ہفتہ وار) حیدرآباد اور کوچین کے درمیان۔

ایک سپر فاسٹ گاڑی (ہفتہ وار) احمدآباد اور کوچین کے درمیان۔

ایک سپر فاسٹ گاڑی (ہفتہ میں تین بار) لکھنؤ اور بمبئی کے درمیان۔

ایک سپر فاسٹ گاڑی (ہفتہ وار) گوہاٹی اور کوچین کے درمیان۔

ایک چھوٹی پٹڑی کی گاڑی سمندری اور رانی واڑہ کے درمیان۔

۳۱ مارچ ۱۹۸۷ء تک دلی کے پورے علاقے میں مسافروں کی نشستوں کی کمپیوٹروں کے ذریعہ تخصیص اور دلی، نئی دلی اور حضرت نظام الدین میں نشستوں کی تخصیص کے لیے کاؤنٹر کھولنا جن کے ساتھ شہر میں چار مزید بیرونی ٹرمینل قائم کیے جائیں گے۔

بمبئی اور کلکتہ میں کمپیوٹر کے ذریعے نشستوں کی تخصیص کا پہلا مرحلہ دسمبر ۱۹۸۷ء سے شروع ہو جائے گا۔

۸۸-۱۹۸۷ء میں کمپیوٹروں کے ذریعے مسافروں کے لیے نشستوں کی تخصیص کے پانچ نئے پراجیکٹ مدراس، بنگلور، سکندرآباد، بھوپال اور لکھنؤ میں شروع کیے جائیں گے۔

۶۷ نئے مثالی اسٹیشن قائم کیے جائیں گے جہاں مسافروں کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی جائیں گی۔

پرانی قسم کے دوسرے درجے کے تمام مسافر ڈبوں میں آئندہ تین برس کے اندر گدے مہیا کر دیے جائیں گے۔

اشیاء خوردنی کی فراہمی کے معیار کی بہتری کے لیے اسٹیشنوں پر قائم باورچی خانوں کی جدید کاری کی جائے گی۔

عوامی شکایات کا ازالہ

عوامی شکایات کے ازالے کو اعلیٰ ترجیح دی جا رہی ہے اور ہر سطح پر عملے کو چوکس کیا جا رہا ہے۔

●

تعلیم کی ترقی کے ۴۰ سال

کے۔ کے۔ کھلر

نیا بیس نکاتی پروگرام اور تعلیم

نیا بیس نکاتی پروگرام ہندوستان میں تعلیم کے معیار کو مضبوط اور مستحکم بنائے گا تاکہ اس معیار کے سب سے اوپر والے لوگ دنیا کے بہترین افراد میں ہوں اور سب سے نیچے والے اوپر چڑھنے میں اس طرح کوشاں ہوں کہ معیار کی بلندی کو چھو سکیں۔ تعلیم ترقی کی سیڑھی ہے۔ تعلیم کے بغیر انسان جانور ہے۔ تعلیم کی ترقی انسانی وسائل کی ترقی ہے۔ انسانی تہذیب کی ترقی ہے۔"

(کے۔ کے۔ کھلر)

۲۰ اگست ۱۹۸۶ء کو پارلیمنٹ میں نیا بیس نکاتی پروگرام پیش کیا گیا۔ پرانے بیس نکات کو نئی شکل دی گئی ہے تاکہ ان کی کارکردگی اور تاثیر کو ہر سطح پر بہتر بنایا جا سکے۔ دیہات سے غریبی ہٹانے کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ دیہات سے غریبی نہ صرف ہٹانا ہے بلکہ مٹانا ہے۔ جتنی دیر تک دیہاتی غریبی مکمل طور پر نیست و نابود نہیں ہو جاتی باقی انیس نکات کی کارکردگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ "دیہاتی دستکاری صنعت" میں بہتری کے لیے گورنمنٹ اور سوسائٹی اور انڈسٹری کو کندھے سے کندھا ملا کر چلنا پڑے گا۔ اس سے لاکھوں انسانوں کو روزی ملے گی عزت کی زندگی ملے گی، ان کے بچے اسکولوں میں جا پائیں گے۔

اسکول جو ترقی کے لیے زینہ ہیں۔

ہمارے کسان آج بھی غریب اور ان پڑھ ہیں۔ ان کو سائنسی ترقی سے کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، ان کو کچھ معلوم نہیں۔ بارش کے پانی کو کیسے بند بنا کے تالابوں میں جمع کیا جا سکتا ہے۔ سوکھے میں ان کو کیا کرنا چاہیئے۔ بہتر فصلیں کیسے ہوتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں اس کو صرف تعلیم سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔ چوں کہ تکنیکی اور زراعتی تعلیم مہنگی ہے اس لیے کسانوں کو لازمی تعلیم مفت دینے کا پروگرام بنانا ہوگا۔

پہلے بیس نکاتی پروگرام میں تعلیم کا نمبر سولہواں تھا نئے بیس نکاتی پروگرام میں اسے دسویں نمبر پر رکھا گیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ پچھلے ۱۵ سالوں کی ترقی کو مد نظر رکھتے ہوئے تعلیم کا درجہ سولہویں نمبر سے دسویں نمبر پر آ پہونچا ہے۔ تعلیم مفت اور لازمی تو پہلے سے ہی ہے۔ نئے پروگرام میں لڑکیوں کی تعلیم پر زور دیا گیا ہے۔ اسکول چھوڑ دینے والے بچے خاص کر بچیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اس مسئلے کے حل کو نئی تعلیمی پالیسی میں بھی اولیت دی گئی ہے۔ غیر رسمی تعلیم کو فروغ دیا جائے گا اس بات کو یقینی بنایا جائے گا کہ ۱۹۹۱ء تک تقریباً گیارہ برس کی عمر کو پہنچنے والے تمام بچے پانچ سالہ اسکولی تعلیم یا غیر رسمی نظام کے ذریعے اس کے مساوی تعلیم حاصل کر چکے ہوں۔ اسی طرح نئی تعلیمی پالیسی میں یہ عزم ہے کہ ۱۹۹۵ء تک تمام بچوں کو ۱۴ سال کی عمر تک مفت اور لازمی تعلیم مہیا کی جائے گی۔ بیس نکاتی پروگرام اور نئی تعلیمی پالیسی کو ساتھ ساتھ پڑھنے اور عمل میں لانے کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی بیس نکاتی پروگرام اور تعلیم کا پروگرام آف ایکشن تقریباً ایک ساتھ ہی پارلیمنٹ میں پیش ہوئے اور تقریباً ایک ساتھ ہی ان کو منظوری ملی۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے

٭ جی-۲/۱۲، راجوری گارڈن، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۷

نئے بیس نکاتی پروگرام میں غیر رسمی تعلیم کو مرکزی اہمیت اس لیے دی گئی ہے کہ آج بھی ہندستان میں ایک لاکھ ۹۰ ہزار گاؤں یا چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں جہاں کوئی اسکول نہیں ہے۔ جو بچے پورے دن کے لیے اسکول نہیں جا سکتے ان کی تعلیم کا انتظام غیر رسمی تعلیمی پروگرام میں شامل ہے۔ غیر رسمی تعلیمی مراکز کے تعلیمی ماحول کو بہتر بنانے کے لیے جدید تکنیکی امدادیں استعمال کی جائیں گی۔ مقامی آبادی کے باصلاحیت اور لگن والے نوجوان مردوں اور عورتوں کو اپنی خدمات پیش کرنے کی درخواست کی جائے گی۔ ان لوگوں کی ٹریننگ کی طرف خاص دھیان دیا جائے گا۔ ان بچوں کو رسمی نظام میں شامل کرنے کے وہ تمام اقدامات اٹھائے جائیں گے جو ضروری ہوں گے۔ وہ اقدامات بھی اٹھائے جائیں گے جو اس بات کو یقینی بنائیں کہ غیر رسمی تعلیم ہر نوعیت سے رسمی نظام کے ہم پلہ ہو۔ لوگوں میں آج یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ غیر رسمی تعلیم دوسرے درجے کی تعلیم ہے اور غریب بچوں کے لیے ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ غیر رسمی تعلیم کا نصاب، ان کے اساتذہ اور ان کے لیے ضروری اشیاء، ان کی سہولتیں کسی لحاظ سے رسمی تعلیم سے کم نہیں ہیں۔ غیر رسمی تعلیم کے مراکز کو چلانے کا بیشتر کام رضاکار ایجنسیوں اور پنچایت راج کے اداروں کے ذریعہ کیا جائے گا۔ ان ایجنسیوں کو بروقت مناسب مالی وسائل فراہم کیے جائیں گے۔ حکومت اس مرکزی سیکٹر کی جو اہم سکیم ہے مکمل اور پوری ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لے گی جیسا کہ نئی تعلیمی پالیسی میں اس کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ بنیادی تعلیم کی نئی پیش رفت پر دو پہلوؤں پر زور دیا جائے گا۔ ہر بچے کو داخلہ ملے اور چودہ سال تک کا ہر بچہ زیر تعلیم ہو۔ اور تعلیم کی نوعیت میں خاطر خواہ بہتری ہو۔ ہر اسکول میں بنیادی سہولتیں مہیا ہوں، بلیک بورڈ ہوں، پڑھنے پڑھانے کے ذرائع فراہم ہوں، کتابیں ہوں، دریاں ہوں، وظیفے ہوں، ایسے کھلونے جن سے چھوٹی عمر کے بچے کھیل سکیں۔ نقشے، چارٹ اور دیگر تعلیمی مواد شامل ہیں۔ ہر اسکول میں کم از کم پہلے ایک استاد بجائے دو استادوں کی سہولت رکھ دی گئی ہے۔ دوسرا استاد لیڈی ٹیچر یعنی استانی ہوگی۔ اس سارے پروگرام کا علامتی نام آپریشن بلیک بورڈ ہوگا۔ جیسا کہ وزیر اعظم نے حال ہی میں فرمایا ہے کہ آپریشن بلیک بورڈ کا نام صرف بلیک بورڈ مہیا کرنا نہیں ہے بلکہ یہ ایک اسکول کے بچوں اور استادوں کے لیے طریق کار ہے کہ ہر کام صحیح وقت پر صحیح طریقے سے کیا جائے۔ ہر اسکول کی اپنی عمارت ہوگی۔ ہر اسکول میں ایک لائبریری ہوگی۔ ایک سائنس کا کمرہ ہوگا۔ ہر اسکول میں بیت الخلاء **Toilet** ہوگا۔ دوسرے محکمہ جات کی اسکیموں سے بھی تعلیم کے لیے اسکول بنانے کا پروگرام ہے۔ این۔ آر۔ ای۔ پی (NREP) اور آر۔ ایل۔ ای۔ جی۔ پی (RLEGP) کے مالی وسائل سے سب سے پہلے اسکولوں کی عمارتیں بنائی جائیں گی۔ نسبتہ یہ کہ اسکول کو ایک مرکزی اہمیت دی گئی ہے۔ کچھ رفتار نو اسکول جن کو پہلے ماڈل اسکول اور اب نو اودے اسکول۔ NAVO DAYA SCHOOL کہا جاتا ہے، بھی ہر ضلع میں کھولے جائیں گے۔ اس سال تقریباً اسّی اسکول کھولنے کا پروگرام ہے۔

نو اودے اسکولوں میں بچوں کو اعلیٰ تعلیم مفت دی جائے گی۔ ۵۰ فیصد بچے ان اسکولوں میں گاؤں کے ہوں گے۔ یہ وہ اسکول ہوں گے جہاں غریبوں کے ذہین بچے تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھیں گے۔ ان اسکولوں کی خاصیت یہ ہوگی کہ دوسرے گرد و نواح کے اسکولوں کے لیے یہ ماڈل ہوں گے۔ لازمی اور مفت تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ اسکول سماجی انصاف اور عدل کے مقاصد کو پورا کرنے میں سنگ میل ہوں گے۔ ان اسکولوں میں دوسرے صوبوں سے بھی بچے داخل کیے جائیں گے تاکہ ساتھ رہ کر ایک ہوسٹل میں زندگی بتا کر قومی یکجہتی کو فروغ ملے۔ ان اسکولوں میں داخلہ صرف خصوصی صلاحیت رکھنے والے بچوں کو ملے گا۔ یہ تمام اسکول جو ملک گیر پیمانے پر کھولے جائیں گے، رہائشی ہوں گے۔ داخلے کے معاملے میں کسی قسم کی رعایت نہیں برتی جائے گی۔ ہریانہ میں جھجر اور مہاراشٹر میں امراوتی کے مقامات پر یہ دو اسکول تو کھل بھی گئے ہیں۔ باقی بہت تیز رفتاری سے کھولنے کا پروگرام ہے۔ اس اسکولوں کے تمام اخراجات مرکزی سرکار دے گی صرف بلڈنگ صوبائی حکومتیں مہیا کریں گی۔

نئے بیس نکاتی پروگرام میں تعلیم بالغاں کو بھی خاص اہمیت دی گئی ہے۔ وہ لوگ جو کسی وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر سکے ان کے لیے تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ ۱۵ سے ۳۵ سال تک کے لوگوں میں ناخواندگی کو دور کرنے کا نئی تعلیمی پالیسی میں بھی عزم ہے۔ تعلیم بالغاں صرف گورنمنٹ کا پروگرام نہیں ہے بلکہ ساری قوم کا ہے۔ جتنی دیر تک یہ ایک مہم کی شکل اختیار نہ کرے گا اتنی دیر تک ناخواندگی کا بھوت اس ملک کے سر پر منڈلاتا رہے گا۔ ایک ایسی مہم چلانے کا پروگرام ہے جس میں طالب علم، اساتذہ اور سوسائٹی کے دیگر افراد کی شمولیت نہایت ضروری ہے۔ عوامی خواندگی کے پروگراموں میں خواندگی کے ساتھ ساتھ عملی معلومات بھی شامل ہوا کریں گی۔

اس وقت ملک میں دو لاکھ سے زیادہ تعلیم بالغاں کے سینٹر چل رہے ہیں۔ نئے بیس نکاتی پروگرام میں یہ مرکز بڑھ چڑھ کر دیہات میں کھولے جائیں گے۔ ان میں مقامی تعلیم کے ساتھ ساتھ دلچسپی سے نیز ضرورت پر مبنی کاروباری

تربیت بھی دی جائے گی۔ یونیسکو (UNESCO) کی ایک رپورٹ کے مطابق اکیسویں صدی کے آغاز میں ۱۵ سے ۳۰ سال کی عمر کے لوگوں میں سب سے زیادہ ان پڑھ ہندوستان میں ہوں گے، اگر تعلیم بالغان کو ایک قومی مہم کی شکل نہ دی گئی۔ یہ ذمہ داری خاص کر پڑھی لکھی عورتوں پر ہے کیونکہ اگر گھر میں عورت پڑھی لکھی ہے تو کم از کم اس گھر سے ناخواندگی ہمیشہ کے لیے ختم سمجھنی چاہیے۔ گاندھی جی کی بنیادی تعلیم اسی اصول پر مبنی تھی۔ حکومت نے عورتوں کی تعلیم سارے ملک میں بارہویں جماعت تک مفت کر دی ہے اس کا سارا خرچہ یعنی تقریباً ۴۳ کروڑ روپے بھی سینٹر کو دے رہی ہے اور ہر سال دیتا رہے گا۔

نئے پروگرام میں پیشہ ورانہ تعلیم بھی شامل ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کے تحت بھی طلبا کو مخصوص پیشوں کے لیے تیار کیا جائے گا۔ عام طور پر ثانوی سطح کے بعد ان کورسوں کا انتظام کیا جائے گا۔

نو تعلیم یافتہ افراد، بنیادی تعلیم سے فارغ شدہ نوجوان دوران تعلیم اسکول یا کالج چھوڑ دینے والے طلبا، بار روزگار، بے روزگار اور جزوی طور سے بار روزگار افراد کے لیے بھی غیر رسمی ضرورت پر مبنی پیشہ ورانہ تعلیمی پروگرام چلائے جائیں گے۔ عورتوں کے لیے علیحدہ پالی ٹیکنک ہوں گے۔ مجموعی طور پر پروگرام یہ ہے کہ ۱۹۹۰ء تک ۱۰ فیصدی اعلیٰ ثانوی جماعت پاس طلبا کو اور ۱۹۹۵ء تک ایسے ۲۵ فیصد طلبا کو پیشہ ورانہ کورسوں کے تحت لایا جائیگا۔ بیس نکاتی پروگرام کا لب لباب یہ ہے کہ تعلیم کو روزگار اور روزگار کو تعلیم کے ساتھ جوڑا جائے۔ کمیونٹی پالی ٹیکنک کی اسکیم دیہات کے کمزور طبقوں کے لیے آگے ہی کافی فائدہ مند ثابت ہوئی ہے۔ اس اسکیم کو تقویت دی جائے گی۔ بیس نکاتی پروگرام کا گیارہواں نکتہ درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کی تعلیم پر ہے۔

درج فہرست ذاتوں کی تعلیمی ترقی کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انھیں تعلیم کے تمام مراحل اور تمام سطحوں پر تمام شعبوں میں غیر درج فہرست ذات والے افراد کے برابر اور ہم پلہ کیا جائے۔ اسی طرح درج فہرست قبائل کو دوسروں کے برابر تعلیمی نقطۂ نظر سے لایا جائے تاکہ ملک کی ترقی میں یہ لوگ ساتھ ساتھ حصہ لے سکیں۔ گورنمنٹ نے جو اس سلسلے میں اقدام اٹھانے کا پروگرام بنایا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے۔

(الف) غریبوں کے بچوں کو ۱۴ سال کی عمر تک مفت اور لازمی پڑھائی کے لیے ضروری سہولتیں مہیا کرنے کا ایک خاص پروگرام۔

(ب) صفائی کے کام کرنے والے جانوروں کی کھال اتارنے والے جیسے پیشوں میں لگے کنبوں کے بچوں کے لیے قبل میٹرک وظائف کی اسکیم کو پہلی کلاس سے ہی لاگو کر دیا جائے۔ ایسے کنبوں کو بلا لحاظ آمدنی کے تحت لایا جائے اور ان کے لیے مقررہ معیار اور پروگرام بنایا جائے۔ پروگرام آف ایکشن میں یہ اسکیم لائی جا چکی ہے اور اس پر جلد از جلد عمل ہونے کی امید ہے۔

(ج) درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کے بچوں کو روزگار کے قابل بنایا جائے۔ ان کے لیے نصابوں کی اصلاح کی جائے۔

انھیں ذاتوں سے اساتذہ کی بھرتی ہو۔ ان کے بچوں کو ہوسٹلوں میں سہولتیں دی جائیں، بالغوں کی تعلیم کے مراکز ان لوگوں کی بستیوں میں کھولے جائیں تاکہ ان کی شرکت باآسانی اور زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔

اسی طرح درج فہرست قبائل کی تعلیمی ترقی کے لیے مندرجہ ذیل اقدام اٹھانے کا گورنمنٹ کا پروگرام ہے۔

(الف) قبائلی علاقہ جات میں پرائمری اسکولوں کو زیادہ سے زیادہ کھولا جائے۔ اسکولوں کی عمارت ایسی ہوں۔ ہر قبائلی گاؤں میں جہاں مناسب آبادی ہے اسکول کھولا جائے۔

(ب) تعلیم جہاں تک ہو سکے قبائلی زبان میں دی جائے۔ ان کے نصاب ان کے سماجی اور ثقافتی پس منظر میں ترتیب دیے جائیں۔ ان کے اساتذہ کو ٹریننگ دی جائے۔ جہاں قبائلی زبان کا اپنا رسم الخط نہیں ہے وہاں علاقائی زبان کو اپنانے کے انتظامات کیے جائیں۔

(ج) آشرم اسکولوں کے ساتھ ساتھ رہائشی اسکولوں کو بڑے پیمانے پر کھولا جائے۔ درج فہرست قبائل کی خصوصی ضروریات اور طرز ہائے معاشرت کے پیش نظر ان کے لیے ترغیبی اسکیمیں مرتب کی جائیں۔ غیر رسمی تعلیمی اداروں کا ان علاقوں میں اضافہ کیا جائے گا۔ تعلیم بالغان کے مراکز بھی زیادہ تعداد میں کھولے جائیں گے۔ تعلیم کے ہر سیکٹر کے لیے ایسے نصاب بنائے جائیں جن سے قبائلی لوگوں میں اپنی قیمتی تہذیبی شناخت کے ساتھ ساتھ اپنے اندر پوشیدہ بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا شعور پیدا ہو۔

ان درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے علاوہ تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ طبقوں کے لیے مناسب ترغیبات دیے جانے کا پروگرام ہے۔ پہاڑی ریگستانی اور دور دراز کے علاقوں اور جزیروں تک تعلیم کی نعمت کو پہنچانے کے لیے حکومت کی طرف سے انتظامات کیے جائیں گے۔ خانہ بدوش لوگوں کے بچوں کے لیے اسکول ان کے گھروں اور گھروندوں تک پہنچے گا۔ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کے لیے بھی حکومت نے مناسب اقدام اٹھائے ہیں۔

(باقی صـ ۴۲ پر)

ایس۔ ایس۔ بالاسبرامینن*

ساتواں پنجسالہ منصوبہ اور دیہات میں روزگار کی فراہمی

مُدّتِ طویل تک بے روزگاری ایک بڑا سماجی جُرم ہے کیونکہ اس کے معنی ہیں وسیع پیمانے پر پیداواری صلاحیت کی تضییع۔ یہ بات اس بیان سے اور واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں ہر سال بے روزگاری اور کم روزگاری کے سبب کُل جتنے نفری گھنٹے بے کار جاتے ہیں، اُتنے گھنٹے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ساری لیبر فورس کام پر صرف کرتی ہے۔ برّصغیر کے عوام کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے، انھیں سماجی انصاف دلانے اور غریبی دور کرنے کے لیے منفعت بخش روزگار کی فراہمی ایک بنیادی ضرورت ہے۔

ملک میں چھٹے پنج سالہ منصوبے کے شروع ہونے کے وقت اندازاً ۱۲،۰۲ ملین افراد بیروزگار تھے۔ یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ ۸۵-۱۹۸۰ء کے دَوران محنت کشوں کی تعداد میں مزید ۳۴،۲۴ ملین کا اضافہ ہوگا۔ اس لیے سب کو روزگار کی فراہمی کے لیے ۴۶،۲۴ ملین نوکریاں پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی لیکن خود منصوبے میں یہ کہا گیا تھا کہ معیشت کی صلاحیت صرف ۳۴،۲۸ ملین نوکریاں پیدا کرنے کی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ساتویں منصوبے کے آغاز کے وقت ۱۱،۹۰ ملین افراد بیروزگار رہ جائیں گے۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ چھٹے منصوبے میں محنت کشوں کی کُل تعداد میں ہونے والے اضافے کا جو اندازہ لگایا گیا تھا اور منفعت بخش روزگار کے مواقع کی فراہمی کا جو نشانہ مقرر کیا گیا تھا وہ زیادہ حقیقت پسندانہ نہیں تھا۔ چھٹے منصوبے کے پہلے دو برسوں میں لگ بھگ صرف ۱۲ ملین ملازمتیں پیدا کی جا سکیں۔ جو مقررہ نشانے کے صرف ۳۴ فیصد کے برابر تھیں۔ تیسرے برس یعنی ۸۳-۱۹۸۲ء میں فصل خراب ہونے کے سبب اور بھی کم روزگار پیدا ہونے کا خدشہ تھا۔ ایک حالیہ اندازے کے مطابق ۱۹۸۵ء میں بے روزگار بچے ہوئے افراد کی تعداد تقریباً ۴۴ ملین ہونے کی توقع تھی، ۱۱،۹۰ ملین نہیں، جیسا کہ ساتویں منصوبے میں فرض کیا گیا ہے۔ یہ صورتِ حال دو بنیادی حقیقتوں کو ظاہر کرتی ہے اور وہ یہ کہ ۸۵-۱۹۸۰ء کے دَوران کُل لیبر فورس میں اندازے سے بہت زیادہ اضافہ ہوا ہوگا یا روزگار کے مواقع اصل نشانے سے کم تعداد میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ اس مضمون کا مقصد دونوں زاویہ ہائے نگاہ سے مسئلہ کا تجزیہ کرنا ہے بالخصوص دیہی ہندوستان کے ضمن میں۔ مضمون میں اُن عناصر کو ملحوظ رکھا گیا ہے جو ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کی مدّت میں دیہی لیبر فورس کی سپلائی اور مانگ کا تعین کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس بات کو بھی مدِّنظر رکھا گیا ہے کہ چھٹے منصوبے کے دَوران ساتویں پنجسالہ منصوبے کے اختتام تک دیہات میں بیروزگاری کو صفر کی سطح پر لانے کے لیے، روزگار پیدا کرنے والی جو اسکیمیں شروع کی گئیں وہ کتنی موثر ثابت ہوئیں۔

دیہی لیبر فورس

لیبر فورس کی جسامت کا انحصار خاص کر آبادی کی جسامت، آبادی کے زمرہ ہائے عمر اور لیبر فورس کی شرکت پر ہے۔ ان تینوں میں سے پہلے اور تیسرے عنصر زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ مختلف وجوہات کے سبب ۱۵ سے ۶۰ تک کے زمرۂ عمر سے نیچے اور اوپر کے لوگ خود برسرِ روزگار ہونے کے بجائے دوسروں پر انحصار رکھتے ہیں، اس لیے

---

* پروفیسر اینڈ ہیڈ آف فیکلٹی آف اکنامکس (شعبۂ معاشیات) ایم۔ ایم۔ ایس۔ ایس۔ وی۔ این کالج، مدورائی۔

۱۵ تا ۶۰ سال کے زمرۂ عمر کی آبادی کی جسامت کے بجائے لیبر فورس کی شرح شرکت قابلِ اعتماد عنصر ہے۔ ہندوستانی معیشت میں آبادی کے زمرہ ہائے عمر کا ڈھانچہ کم و بیش یکساں ہی رہتا ہے جیسا کہ ذیل کے گوشوارہ سے ظاہر ہے۔

ہندوستان کی آبادی کی مختلف زمرہ ہائے عمر میں فیصد تقسیم
۱۹۶۱ء تا ۱۹۷۶ء کے دوران

سال	زمرہ ہائے عمر			کُل
	صفر تا ۱۴	۱۵ تا ۶۰	۶۰ اور اس سے زیادہ	
۱۹۶۱	۴۱٫۰	۵۳٫۳	۵٫۷	۱۰۰٫۰
۱۹۷۱	۴۱٫۴	۵۳٫۴	۵٫۲	۱۰۰٫۰
۱۹۷۶	۳۹٫۶	۵۵٫۰	۵٫۴	۱۰۰٫۰

آبادی

مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان کی آبادی ۱۹۷۱ء میں ۵۴۸ ملین اور ۱۹۸۱ء میں ۶۸۵ ملین تھی۔ ۱۹۷۱ء میں آبادی کی اوسط سالانہ شرح افزائش کا اندازہ ۲٫۴ فیصد لگایا گیا تھا۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری سے واضح ہو گیا کہ افزائشِ آبادی کے بارے میں سابقہ اندازے صحیح نہیں تھے۔ چھٹے پنجسالہ منصوبے کے وسط مدتی جائزے میں بھی یہ بات صاف کر دی گئی کہ شرح پیدائش اور شرح اموات وغیرہ میں تبدیلیوں کے بارے میں ماہرین کی کمیٹی کے اندازے کچھ زیادہ ہی رجائیت پسندانہ تھے۔ اس طرح ہندوستان کی آبادی مارچ ۱۹۸۱ء میں اصل اندازے سے تقریباً ۱۳٫۲ ملین زیادہ تھی۔ یہ بات نہ صرف ۱۹۷۱ء تا ۱۹۸۱ء کی مدت پر صادق آتی ہے بلکہ ۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۰ء کی مدت کے لیے بھی صحیح ہو سکتی ہے جو کہ چھٹے اور ساتویں منصوبے کی مدت ہے۔ ساتویں منصوبے کیلئے اندازہ

سے متعلق دستاویز میں کہا گیا ہے کہ ۱۹۹۰ء تک ہندوستان کی آبادی ۸۰۵ ملین ہو جائے گی اور یہ اندازہ سالانہ اضافہ آبادی کی شرح ۱٫۸ فیصد فرض کرتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن یہ مفروضہ بھی زیادہ ہی رجائیت پسندانہ نظر آتا ہے گو یہ مرغوب یا پسندیدہ ہو سکتا ہے۔ ۱۹۷۱ء تا ۱۹۸۱ء کی مدت میں آبادی کی اوسط سالانہ شرح افزائش کم و بیش یکساں رہی یعنی ۲٫۵ فیصد کے لگ بھگ۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ ۱۹۸۰ء تا ۱۹۹۰ء کے دوران افزائشِ آبادی کی اوسط سالانہ شرح اندازاً دو فیصد رہے گی تو ۱۹۹۰ء میں ہندوستان کی آبادی ۸۱۷٫۴ ملین ہو جائیگی۔ اس طرح ساتویں پنجسالہ منصوبے کے اختتام تک جتنی آبادی کے ہونے کا اندازہ لگایا گیا ہے کُل آبادی اُس سے ۱۲٫۴ ملین زیادہ ہو گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۹۹۰ء تک عام مزدوروں کی تعداد اندازے سے ۹۲٫۴ اور دیہی علاقوں کے مزدوروں کی تعداد ۹۲٫۳ ملین زیادہ ہو گی۔

لیبر فورس کی شرح شرکت

لیبر فورس کی اصطلاح کا مطلب اُن تمام افراد سے ہے جو ایک یا کئی کاموں پر ایک سال میں مخصوص تعداد ایام تک برسرِ روزگار رہتے ہیں، اور وہ لوگ بھی جو کام کرنے کو تیار ہیں لیکن جنہیں مذکورہ نوعیت کا کام نہیں ملتا۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہ شرح ۳۴٫۲ فیصد تھی، لیکن ۱۹۸۱ء کی مردم شماری میں یہ بڑھ کر ۳۶٫۸ فیصد ہو گئی۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کے برسوں میں اس شرح کے اور بڑھنے کا پورا امکان ہے۔

دیہی سیکٹر میں لیبر فورس

نظرثانی شدہ چھٹے پنجسالہ منصوبے کے اندازوں کے مطابق ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۵ء کے دوران لیبر فورس میں ۳۴٫۲۴ ملین کا خالص اضافہ ہوا اور منصوبے کی مدت کے دوران ۳۴٫۲۸ ملین نئی جابس (Jobs) یعنی کام یا ملازمتوں کے پیدا ہونے کی توقع تھی جس کا مطلب یہ ہوا کہ ساتویں پنجسالہ منصوبے کے آغاز کے وقت ۱۱٫۹۸ افراد بے روزگار ہوتے اور چھٹے پنجسالہ منصوبے کے آغاز پر ۱۲٫۲ ملین افراد بے روزگار بچے رہے لیکن اب ان تخمینوں کو بہت ہی زیادہ رجائیت پسندانہ سمجھا جا رہا ہے۔ اگر لیبر فورس اور روزگار کے مواقع میں ہونے والے اضافوں کے بارے میں کچھ مفروضات صحیح ثابت ہوتے ہیں تو بھی ۱۹۸۵ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان لیبر فورس میں خالص اضافہ ۳۸٫۵۳ ملین ہوگا اور ساتویں منصوبے کی مدت کے دوران کُل بے روزگار لیبر فورس ۵٫۱۵ ملین ہوگی۔ اگر دیہی اور شہری لیبر فورس کا تناسب ۷۹ : ۲۱ فرض کر لیا جائے تو معاشرے کو دیہی علاقوں میں مزید ۳۹٫۹ ملین اور شہری علاقوں میں مزید ۱۰٫۶ ملین کے لگ بھگ روزگار کے مواقع پیدا کرنے ہونگے۔

روزگار پیدا کرنے والی اسکیمیں

لیبر کے لیے مانگ کا انحصار معاشی ترقی کی سطح، حکومت کی پالیسی، مجموعی مصارف اور معیشت کے سماجی اداروں کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ ہماری حکومت نے [illegible]

سرمایہ کاری کے حجم کو کافی زیادہ بڑھا کر اور اس اقدام کے نتیجے میں نجی یا پرائیویٹ سیکٹر میں سرمایہ کاری میں ہونے والے مسلسل اضافے کے ذریعے دیہی اور شہری دونوں علاقوں میں لیبر فورس کی مانگ کو بڑھانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ لیکن حکومت کی پالیسیوں اور کوششوں کے باوجود لیبر فورس کے لیے مانگ لیبر فورس کی سپلائی سے کم رہتی ہے جس کا نتیجہ بے روزگاری کی شکل میں نکلتا ہے۔ لیبر فورس کی سپلائی اور مانگ کے درمیان عدم توازن کے مسئلے کو لیبر فورس کی سپلائی کو کم کر کے اور لیبر فورس کی مانگ کو بڑھا کر ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ چوں کہ لیبر فورس کی تعداد کا انحصار آبادی پر ہوتا ہے اس لیے آبادی کی شرح افزائش کو گھٹانے کی فوری اور اشد ضرورت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آبادی کی شرح افزائش پر کنٹرول کے کسی بھی اقدام سے مطلوبہ نتائج ایک مدتِ طویل میں ہی برآمد ہو سکتے ہیں۔ اور یہ بات بھی درست ہے کہ ہندوستان میں سماجی و سیاسی ڈھانچے اور روایات و عقائد کی دشواریوں، بالخصوص دیہی علاقوں میں، کے سبب آبادی پر کنٹرول کے لیے کڑے اقدامات (مثلاً ایک کنبے میں ایک ہی بچے کا اصول سختی سے نافذ کرنے کے امکانات کم نظر آتے ہیں۔ بہرصورت ماہرین اور پیدائش و اموات ماہرین عمرانیات و معاشیات اور سیاستدانوں کے لیے آبادی کی شرح افزائش کو موثر طریقوں سے روکنے پر توجہ مبذول کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ لیبر فورس کی مانگ بڑھانے پر بھی اور زیادہ توجہ دینا بھی لازم ہے۔

دیہی لیبر فورس کے ضمن میں ضروری ہے کہ دیہات کے کھیتوں میں اور کھیتوں سے باہر کام کے مواقع کافی زیادہ مقدار میں پیدا کیے جائیں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتوں پر زور دیا گیا ہے :-

زراعت میں مشینوں کا استعمال اس طرح کرنا کہ [illegible] میں لیبر فورس کی کھپت [illegible]

آبپاشی کے پراجیکٹوں پر روز افزوں توجہ دی جائے کیونکہ کئی کئی فصلیں اور ملی جلی فصلیں اگا کر اس کام میں زیادہ لیبر لگائی جا سکتی ہے۔ ایسی ٹیکنالوجی اختیار کی جائے جس میں زیادہ لیبر استعمال کی جا سکے بشرطیکہ اس قسم کی ٹیکنالوجی اختیار کرنے سے پیداوار پر اثر نہ پڑے۔

ان بنیادی پالیسیوں کے تحت چھٹے پنجسالہ منصوبے کے دوران کئی پروگرام شروع کیے گئے مثلاً مربوط دیہی ترقی کا پروگرام، آپریشن فلڈ، ڈیری فارموں کی ترقی کا پروگرام، دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کا پروگرام، قومی دیہی روزگار پروگرام، خود اپنا روزگار شروع کرنے کے لیے دیہی نوجوانوں کو تربیت دینے کا پروگرام (PRYSEM) کم از کم ضرورتوں کی تکمیل کا پروگرام وغیرہ۔ ساتویں پنج سالہ منصوبے (۹۰ - ۱۹۸۵ء) کے دوران مربوط دیہی ترقی کے پروگرام اور قومی دیہی روزگار پروگرام کو وسیع تر اور تیز رفتار بنانے کی تجویز ہے۔

یہ سب پروگرام اچھی طرح مرتب کیے گئے لیکن پروفیسر نیل کنٹھ راتھ نے، ہر ریاست کے منتخب اضلاع میں زراعت اور دیہی ترقی کے قومی بنک کے زیر اہتمام مرتب کیے گئے جائزوں کی رپورٹوں کا تجزیہ کرنے کے بعد کہا ہے کہ اگرچہ مربوط دیہی ترقی کے پروگرام کا خیال اچھا تھا لیکن اس سے جن افراد کو فائدہ پہنچا اُن میں بیشتر وہ لوگ تھے جو غریب نہیں تھے۔ مسئلے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ امداد کے لیے درخواست دینے والوں کو پراجیکٹ افسران، کمرشیل بنکوں اور دیہی سطح کے مختلف کیڈروں کے افسران کے رُوبرو بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امداد کا ایک بڑا حصہ غائب ہو جاتا ہے اور جو حصہ باقی بچتا ہے وہ دیہات کے غریبوں کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانے کے لیے کافی نہیں [illegible]

اسکیم کو ساتویں منصوبے کے دوران زیادہ موثر طریق پر لاگو کرنے کی ضرورت ہے جس سے کہ یہ غریبی دور کرنے کا موثر ذریعہ بن سکے۔ خاص کر اس لیے بھی کہ مربوط دیہی ترقی کے پروگرام کے لیے ساتویں منصوبے میں تقریباً ۳۰۰۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے جبکہ چھٹے منصوبے میں تقریباً ۱۷۰۰ کروڑ روپے مخصوص کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ۴۰۰۰ کروڑ روپے کے قرضے بنکوں سے بھی حاصل ہو سکیں گے۔

لُبِّ لباب

ہماری معیشت کو فوری طور پر ایک سخت اور دو طرفہ حملے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف تو آبادی کی شرح افزائش کو روکنے کے لیے جنگی پیمانے پر فوری اور سنجیدہ کوششیں کی جانی چاہئیں اور دوسری طرف دیہی علاقوں میں روزگار کے مزید مواقع پیدا کرنے کے لیے موثر اقدامات کیے جانے چاہئیں۔

ساتویں پنجسالہ منصوبے کے دوران پبلک اور پرائیویٹ دونوں سیکٹروں کو جن امور پر اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیئے اُن میں سے کچھ یہ ہیں :-

تیز رفتار صنعت کاری، دیہی علاقوں میں منظم طور پر زراعت پر مبنی صنعتوں کا قیام، دیہی علاقوں میں آلات زراعت کے رکھ رکھاؤ کے لیے خدمات کی سہولیات، دیہات کے غریب لوگوں کے لیے سستے مکانات کی تعمیر، دیہی علاقوں میں بنیادی سہولیات کی فراہمی، آبپاشی کے چھوٹے پراجیکٹوں کو ترجیح جس سے زرعی پیداوار بڑھانے میں تو مدد ملے ہی گی، دیہی افراد کو روزگار کے زیادہ مواقع بھی میسر ہو سکیں گے۔

سریش شرما

زمینی اصلاحات کا مسئلہ

جب سے ہمارا ملک آزاد ہوا ہے دیہات کی تعمیرِ نو کی طرف برابر دھیان دیا جا رہا ہے۔ زمینی سدھار دیہی تعمیرِ نو کا ایک اہم جزو ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ (۱) زمین کی ملکیت کے قدیم جاگیردارانہ اور نیم جاگیردارانہ سماجی و اقتصادی نظام کو ختم کیا جائے۔ (۲) کاشتکاروں اور بٹائی داروں کا استحصال ختم کیا جائے، انھیں پٹے کا تحفظ دیا جائے۔ اور مزارعوں و بٹائی داروں کے لگان کو باقاعدہ بنایا جائے اور سوئم کاشتکاروں اور سرکار کے درمیان براہِ راست تعلق قائم کیا جائے اور زمین کی از سرِ نو تقسیم کے ذریعے بے زمین کسانوں کا سماجی و اقتصادی رتبہ قائم کیا جائے۔

خیال کیا جاتا تھا کہ زراعت کو جدید ڈھنگ کا بنانے اور پیداواری صلاحیت بڑھانے کے لیے یہ کام انجام دینے بہت ضروری ہیں۔ اس سے بے زمین کسانوں کو راحت ملے گی اور وہ زیادہ لگن سے کام کیا کریں گے۔ ان کی اقتصادی حالت سدھرے گی۔ دیہات کے بے زمین کسانوں کو بھی کچھ زمین حصے میں آئے گی۔ وہ اس زمین سے اپنی روزی کمانے لگیں گے اور مزید آمدنی کے لیے محنتی کام سے دریغ نہ کریں گے۔ زمین کا استعمال ہوگا، مزارعوں اور بٹائی داروں کو حقوقِ مالکانہ دیئے جائیں گے اور کھاتے، کھتونیوں اور ریکارڈ وغیرہ کو مکمل کیا جائے گا۔ اس سے چھوٹے کسان بھی سرکاری اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کے لائق ہو جائیں گے اور زمین کو وہ کھاد بھی استعمال کر سکیں گے۔ انھیں قرضہ مل سکے گا اور اس طرح ملک میں اناج کی پیداوار بڑھے گی۔

ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں:۔

ا۔ زمینداریوں کا خاتمہ، کاشتکاروں اور بٹائی داروں کو تحفظ عطا کرنا اور باقاعدہ لگان مقرر کرنا تاکہ بعد ازاں انھیں حقوقِ مالکانہ دے دیے جائیں۔

ب۔ یہ طے کرنا کہ کسی شخص کے پاس زیادہ سے زیادہ کتنی زمین رہ سکتی ہے اور اس طرح جو زمین بچے اُسے بے زمین کسانوں اور چھوٹے کسانوں میں تقسیم کرنا۔

ج۔ استحکام اراضی کرنا۔

د۔ زمین کی جمع بندیوں، کھاتوں اور کھتونیوں کو مکمل کرنا۔

اس سلسلے میں ۱۹۵۰ء کی دہائی کے آغاز سے لے کر اب تک ملک بھر میں بہت سے قانون بنائے گئے ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ ان قوانین اور اقدامات پر کس حد تک کام ہوا ہے اور ہم اپنے مقصد کی طرف کتنا آگے بڑھے ہیں۔ جہاں تک نظامِ زمینداری کے خاتمے کا سوال ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ملک کے بیشتر حصے میں زمینداریوں، جاگیروں اور انعاموں کو ختم کیا جا چکا ہے۔ اب دو کروڑ کاشتکاروں کا سرکار سے براہِ راست رابطہ قائم ہو گیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ملک کی تمام ریاستوں میں یکساں طور پر پیش رفت نہیں ہوئی ہے اور ابھی کچھ کام ہونا باقی ہے، مگر موٹے طور پر اب تک کا کام تسلی بخش رہا ہے۔

جہاں تک پٹے داری کی اصلاحات کا تعلق ہے، اُن تمام ریاستوں میں جہاں مالک و کاشتکار کے تعلق کو تسلیم کیا جاتا ہے، کاشتکاروں اور بٹائی داروں کو پٹے کا تحفظ مہیا کر دیا گیا ہے۔ اس سے

---

۵ ای/۔۶۸، ساکیت، نئی دہلی
یوجنا، نئی دہلی

۷۹ لاکھ سے زیادہ کاشتکاروں کو فائدہ پہونچا ہے اور ۱۷ لاکھ ہیکٹیر سے بھی زیادہ زمین ان کے دائرہ عمل میں آگئی ہے۔ لیکن فی الحال آندھرا پردیش کے آندھرا علاقہ، بہار، ہریانہ، پنجاب، تامل ناڈو اور مغربی بنگال کے کاشتکاروں کو ملکیتی حقوق نہیں ملے ہیں۔ اسی طرح اڑیسہ کو ذیلی رعیتوں اور ذیلی کاشتکاروں کو بھی یہ حقوق نہیں عطا ہوئے۔ آسام میں ابھی اس قانون پر پوری طرح عمل نہیں ہوا۔ بعض ریاستوں میں بٹائی داروں کا نام ابھی تک کھاتوں میں شامل نہیں ہوسکا ہے۔ صرف مغربی بنگال میں ۱۳ لاکھ بٹائی داروں کا نام درج رجسٹر ہوا ہے۔ مزارعوں اور بٹائی داروں کے نام کھاتوں میں چڑھائے بغیر کاشتکاروں کو تحفظ عطا نہیں ہوسکتا۔ مشرقی خطے میں چاول کی فصل کی پوری حد تک نہ بڑھنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ بہت سی فصل ایسے لوگ بٹا کر لے جاتے ہیں جن کا کھاتوں میں نام ونشان تک نہیں ہے۔ ان لوگوں کو کیا غرض ہے کہ زمین میں کھاد ڈالیں یا سینچائی کا بندوبست کریں، مالک بھی اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔

جن ریاستوں میں مزارعہ کا نظام ختم کردیا گیا ہے وہاں یہ نظام ابھی تک چوری چھپے چل رہا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اراضی خود کاشت ہے جب کہ حق بات یہ ہے کہ مزارعے ہی زمین کاشت کررہے ہیں۔ مئی ۱۹۸۵ء میں دورانیے مال کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس نے سفارش کی تھی کہ پنچایتوں، رضاکار جماعتوں اور مقامی لوگوں کی مدد سے مہم چلاکر ایسے تمام کیس ریکارڈ پر لائے جائیں جن میں مزارعوں سے زبانی کہا ہوا ہے کہ وہ زمین کاشت کرتے رہیں اور ان کے تحفظ کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہ بھی سفارش کی گئی تھی کہ شخصی کاشت کی زیادہ سختی سے وضاحت کی جانی چاہیئے اور جہاں کہیں ضروری ہو ایسا قانون بنایا جانا چاہیئے جس کی رو سے بٹائی داروں اور تمام مزارعوں کو حقوق مالکانہ عطا کئے جاسکیں۔ یہ بھی تجویز کیا گیا تھا کہ شخصی کاشت کی تعریف یہ ہونی چاہیئے کہ کاشت کے دنوں میں بیشتر طور پر کاشتکار اپنی زمین سے ۵ کیلومیٹر سے دور رہائش نہ رکھ سکے اور اس کی آمدنی کا بیشتر جزو زراعت سے حاصل ہوتا ہو۔

جہاں تک زمین کی حدِ ملکیت سے متعلق قوانین کا تعلق ہے صورتِ حال یہ ہے کہ ملک کی ۲۲ ریاستوں اور ۹ مرکزی انتظام والے علاقوں میں سے میگھالیہ اور ناگالینڈ کی ریاستوں اور انڈمان ونکوبار، اروناچل پردیش، گوا، دمن اور دیو، لکش دیپ اور میزورم کے مرکزی انتظام والے علاقوں میں زمین کی حد کے متعلق کوئی قانون نافذ نہیں ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ سکم میں اس قانون پر عمل ہی نہیں کیا گیا۔

جب سے زمین کی حد کا پروگرام شروع کیا گیا ہے متعلقہ قوانین کے تحت پونے چوہتر لاکھ ایکڑ زمین فاضل قرار دی جاچکی ہے۔ اس میں سے ۵۷ لاکھ ایکڑ سے زیادہ زمین قبضہ میں لی جاچکی ہے اور ۴۵ لاکھ ایکڑ کے لگ بھگ زمین ۳۴½ لاکھ لوگوں میں تقسیم کردی گئی ہے۔ ۴۶ فیصدی زمین پچھڑے درجے قبیلوں اور ذاتوں کو دی گئی ہے جو اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے والے کل لوگوں کے ۴۷ فیصدی کے برابر ہیں۔ فاضل قرار دی جاچکی زمین کے ۸۰ فیصدی حصہ پر قبضہ کرلیا گیا ہے۔ اب تک جو علاقہ فاضل قرار دیا گیا ہے وہ قابلِ کاشت زمین کے دو فیصدی سے بھی کم حصے کے برابر ہے۔ فاضل قرار دی گئی زمین، قبضہ میں لی گئی زمین اور تقسیم کی گئی زمین میں ابھی بہت فرق پایا جاتا ہے جس ۲۹ لاکھ ایکڑ زمین کو فاضل قرار دیا جاچکا ہے لیکن جسے ابھی تقسیم نہیں کیا گیا اس میں سے ۱۴٫۸۷ لاکھ ایکڑ زمین کے متعلق مقدمے چل رہے ہیں اور ۶٫۰۵ ۱۰٫ لاکھ ایکڑ زمین قابلِ کاشت نہیں ہے یا جنگل لگانے کے لیے ریزرو رکھی گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ فاضل زمین کا جو اندازہ لگایا گیا تھا اور جو فاضل زمین بتائی گئی ہے۔ اس میں بہت فرق ہے وجہ یہ ہے کہ:

(ا) قانون ہے کہ ۵ افراد سے زیادہ والے کنبے زمین کی حد سے دوگنا زمین اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔

(ب) کنبے کے بالغ لڑکوں کے لیے زمین کی حد الگ سے طے کی گئی ہے۔

(ج) چائے، قہوہ، ربڑ، الائچی اور کوکو کے باغات پر اور ان زمینوں پر یہ قانون لاگو نہیں ہوتا جو مذہبی اور خیراتی اداروں کے قبضے میں ہے۔

(د) حد بندی کے قانون کو ناکام بنانے کے لیے بینامی اور فرضی انتقال کروائے گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک استعمال اراضی کا تعلق ہے ہندستان میں ایک اوسط کسان کے پاس زمین نہ صرف بہت تھوڑی ہے بلکہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ملتی ہے۔ اس سے زمین کی کاشت صحیح ڈھنگ سے نہیں ہوسکتی ہے، چنانچہ زمین کا استعمال بہت ضروری تھا۔ پنجاب اور ہریانہ میں تو استعمال مکمل ہوچکا ہے اور اتر پردیش میں بھی مکمل ہونے کے قریب ہے۔ باقی جگہوں پر ابھی زیادہ کام نہیں ہوا ہے۔ اروناچل پردیش، میزورم، میگھالیہ اور ناگالینڈ جیسے علاقوں میں تو استعمال کی گنجائش ہی نہیں رہی ہے۔ پھر بھی اڑیسہ، بہار، گجرات، مہاراشٹر اور ہماچل پردیش جیسی ریاستوں میں بعض چیدہ علاقوں میں خاصا کام ہوا ہے۔

اب آخری بات رہ جاتی ہے زمینی کھاتوں کی۔ زمینی اصلاحات جیسے اقدامات اٹھانے کے لیے پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ زمینی کھاتے، جمع بندیاں اور کھتونیاں مکمل ہوں لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ:

۱۔ ہریانہ، کیرالہ، کرناٹک، مہاراشٹر اور اڑیسہ میں زمینوں کے داخل خارج کا کام ابھی بہت باقی ہے۔

۲۔ جموں وکشمیر میں جمع بندی کا کام نامکمل ہے۔

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

نریندر جوشی

توانائی کے غیر مروّجہ وسائل

بائیو گیس اور بائیو ماس

توانائی کے بحران پر قابو پانے کے لیے سائنسدانوں کی طرف سے توانائی کے غیر مروجہ وسائل کی کھوج کرنے کے لیے زبردست کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس سلسلے میں جہاں دیہات میں بائیوگیس کے پلانٹ لگائے جارہے ہیں، وہاں بائیوماس سے تیل حاصل کرنے کے لیے تجربے کئے جارہے ہیں جو بہت حد تک کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ ان غیر مروجہ وسائل کی بدولت ان ملک کے تیل، لکڑی، اور گوبر پر بہت کم انحصار رکھنا ہوگا اور اس سسٹم سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس سے ماحول میں آلودگی پیدا نہیں ہوگی۔ (ایڈیٹر)

گذشتہ چند برسوں سے بائیوگیس کی اہمیت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جانے لگا ہے۔ کیوں کہ ملک اور خصوصاً دیہات میں توانائی کا بحران بڑھتا جا رہا ہے۔ بجلی اور تیل کی قیمتیں بہت بڑھتی جارہی ہیں۔ درختوں کی اندھا دھند کٹائی سے جہاں ایندھن کی لکڑی نایاب ہونے لگی ہے، وہاں ماحولی آلودگی کا خطرہ بھی شدید ہوتا جا رہا ہے۔ ایسی صورتِ حالات میں توانائی کے غیر مروجہ وسائل کی جانب ماہرین کی توجہ مبذول ہو رہی ہے اور وہ کوشش کر رہے ہیں کہ توانائی کا کوئی ایسا وسیلہ دریافت کیا جائے جو ارزاں تر ہو اور آسانی کے ساتھ دستیاب بھی ہو۔ چنانچہ بائیوگیس کی دریافت ماہرین اور سائنسدانوں کی انھیں کوششوں کا نتیجہ ہے۔

بائیوگیس دیہات میں زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل کرتی جا رہی ہے۔ حال ہی میں غیر مروجہ وسائل کے محکمے (ڈی این ای ایس) نے بائیوگیس کے فروغ سے متعلق قومی پراجیکٹ (این پی ڈی) کے تحت جو نومبر ۱۹۸۱ء میں شروع کیا گیا تھا بائیوگیس پروگرام پر نئے سرے سے زور دیا ہے۔ اس پروگرام کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ جہاں این پی ڈی سے قبل کے آٹھ برسوں (۱۹۷۴ء تا ۱۹۸۱ء) میں صرف ۱۰۱۲۱۳ گنبد جاتی پلانٹ نصب کئے گئے وہاں اس پروگرام کے چار برس کے عرصے (۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۵ء) میں کل ۳،۴۳،۵۰۲ پلانٹ لگائے گئے جس میں سے صرف ۳،۲۷،۷۱ پلانٹ ۸۵-۸۴ء میں ہی لگائے گئے۔ اسے ایک شاندار کامیابی کہا جاسکتا ہے۔ یہ گیس گوبر سے تیار کی جاتی ہے جو دیہات میں بھاری مقدار میں دستیاب ہے۔

فوائد

اس گیس کے متعدد فوائد ہیں۔ اسے کھانا بنانے اور روشنی حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے جو زیادہ صاف اور ارزاں ایندھن کا کام دیتی ہے۔ اس سسٹم سے بھرپور نامیاتی کھاد تیار ہوتی ہے۔ اور ماحولی آلودگی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ گوبر اور لکڑی کی مانند دھواں نہیں چھوڑتی جس سے کھانا بنانے والوں، خصوصاً عورتوں کی آنکھوں کو نقصان پہونچتا ہے۔

حال ہی میں آپریشنز ریسرچ گروپ (او آر جی) نامی ایک تنظیم کی طرف سے بھارت کی دو ریاستوں مہاراشٹر اور کرناٹک میں سروے کیا گیا تھا جس

ہ جی ۱۷/ بی ۸۹، جنک پوری، نئی دہلی
یوجنا، نئی دہلی

تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن کنبوں نے بائیو گیس کے پلانٹ لگا رکھے ہیں وہ اس ایندھن سے کام لیتے ہیں اور دوسرے ایندھنوں پر بہت کم انحصار رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کنبوں کے ہاں اپلوں کا استعمال ۸۳ سے ۸۸ فیصد تک، ایندھن لکڑی کا استعمال ۸۴ سے ۷۵ فیصد تک، پودوں کی ٹہنیوں کا استعمال ۷۲ سے ۴۶ فیصد تک، زرعی فاضلات کا استعمال ۴۲ سے ۱۵ فیصد تک اور مٹی کے تیل کا استعمال ۴۳ سے ۴۴ فیصد تک کم ہو گیا۔

سروے میں پایا گیا کہ جو خواتین رسوئی گھروں میں گوبر گیس کا استعمال نہیں کرتی تھیں اُن کے مقابلے اُن خواتین کی نسبت آنکھوں اور سانس کے امراض زیادہ پائے گئے جو گوبر گیس کا استعمال کرتی تھیں۔ اس تحقیق و مطالعہ سے سروے ٹیم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں گوبر گیس کی بدولت ایندھن جمع کرنے میں خواتین کے وقت میں بھاری بچت ہوئی وہاں اس کام میں مصروف افراد کی تعداد بھی کم ہو گئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جن کنبوں نے اپلوں کا استعمال ترک کر دیا تھا اُن کے لیے دن میں ۲ گھنٹے اور ۴۴ منٹ کا وقت بچ گیا اور جنھوں نے بعض مقاصد کے لیے اپلوں کا استعمال جاری رکھا اُن کے لیے دن میں ایک گھنٹہ ۴۳ منٹ کے وقت کی بچت ہوئی۔ وقت کی اس بچت سے دو ریاستوں میں کنبوں کے رسوئی حصے کی خواتین ایسے کام کرنے لگیں جن سے انھیں نقد آمدنی ہونے لگی۔ ایک تہائی کنبوں کی خواتین نے بچوں کی دیکھ بھال پر زیادہ وقت دیا اور کرناٹک میں ۲۵ فیصد سے کچھ زیادہ کنبے اور مہاراشٹر میں ۲۰ فیصد کنبے گھریلو کاموں کی طرف زیادہ توجہ دینے لگے۔ کرناٹک میں ہر آٹھ میں سے ایک خاتون کو قدرے زیادہ آرام کا موقع ملا۔ (اس فائدے کی اہمیت کو اس نگاہ سے دیکھا جانا چاہیئے کہ دیہات میں خواتین کو دن میں ۱۰ سے ۱۲ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے) اس مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجموعی طور پر گوبر گیس کے پروگرام پر بخوبی عمل ہو رہا ہے گو ایسے علاقے ہیں جہاں اس پروگرام کو تقویت دینے کی ضرورت ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ گوبر گیس سے زیادہ تر خواتین کو فائدہ پہونچ رہا ہے۔

بائیوماس

بائیو گیس کی مانند "بائیوماس" بھی توانائی کا ایک متبادل وسیلہ ہے۔ دراصل دونوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ بائیوماس کی اصطلاح میں تمام نباتاتی زندگی، پیڑ، زرعی پودے، جھاڑیاں اور گھاس وغیرہ آجاتی ہے۔ لہذا اسے جنگلوں سے منصوبہ بند یا غیر منصوبہ بند طریقے یا زرعی باقیات سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس اصطلاح کی توسیع کرنے سے مویشیوں کا گوبر بھی اس میں آجاتا ہے کیوں کہ وہ بھی نباتاتی باقیات سے حاصل کیا جاتا ہے۔ بائیوماس کے تمام تر نامیاتی جز کو توانائی کی دستیاب صورتوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال ایندھن کی لکڑی ہے جو ابھی تک ہمارے ملک میں نہایت وسیع پیمانے پر استعمال ہونے والے ایندھنوں میں سے ہے۔

توانائی کا بے پناہ وسیلہ

بائیوماس توانائی کا ایک بے پناہ وسیلہ بن سکتا ہے اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ آج دنیا میں ہر برس جتنی توانائی کی کھپت ہوتی ہے اُس کا ۱۰ گنا بائیوماس سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تاہم آج دنیا کی کُل توانائی کا ساتواں حصہ بائیوماس کے استعمال سے حاصل کیا جاتا ہے۔ بھارت میں اس وسیلے سے زیادہ تر استفادہ نہیں کیا جاتا حالانکہ یہ ایک قابل تجدید وسیلہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق بھارت میں سال میں محض زرعی فاضلات سے ہی ۳۰ کروڑ ٹن سے زیادہ بائیوماس دستیاب ہو سکتا ہے۔

گیسیفائر یونٹ

بڑودہ کی ایک فرم نے جو توانائی کے قابل تجدید وسائل کے شعبے میں ریسرچ کر رہی ہے حال ہی میں بائیوماس پر مبنی ایک گیسیفائر (Gasifier) انجن تیار کیا ہے۔ جس کا استعمال آبپاشی اور صنعتی مقاصد کے لیے کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت ڈیزل پمپ سیٹوں سے کام لیا جاتا ہے۔ جو ڈیزل جنریٹنگ سیٹوں اور براہ راست حرارتی بجلی سے بھی کام کرتے ہیں۔ ایسے ڈیزل پمپ سیٹوں کی تعداد ۳۵ لاکھ ہے اور ملک میں ڈیزل جنریٹنگ سیٹوں کی نصب شدہ صلاحیت چند سو میگاواٹ ہے۔ لیکن گیسیفائر یونٹ پر ۵ ہزار روپے فی کلوواٹ کی لاگت آتی ہے جس میں یونٹ کی تنصیب اور دیگر اخراجات شامل ہیں۔

گجرات زرعی ڈولپمنٹ ایجنسی کے ڈائریکٹر جے۔ ایس۔ راؤ کا بیان ہے کہ "ایک کاشتکار کو ۱۰۔ ایکڑ زمین میں آبپاشی کے لیے تقریباً ۱۰ ہزار یونٹ (کے ڈبلیو ایچ) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اتنی توانائی ایک گیسیفائر انجن کے ذریعہ تقریباً ۱۵ ٹن لکڑی سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ اگر کسان اپنی ۵ فیصد اراضی (نصف ایکڑ) میں توانائی کے لیے پیڑ پودے لگاتا ہے تو وہ اپنے گیسیفائر انجن کو چلانے کے لیے ضروری لکڑی آسانی سے پیدا کر سکتا ہے۔ چوں کہ زرعی فاضلات بھاری مقدار میں دستیاب ہیں اس لیے زراعتی کاموں کے لیے ایک موزوں گیسیفائر انجن جو ان زرعی فاضلات اور بائیوماس ایندھن سے چل سکتا ہے۔ ترجیحی بنا پر تیار کیا جا سکتا ہے اور کئے جانے کی ضرورت ہے۔

مونگ پھلی کے چھلکوں سے بجلی

اس سلسلے میں ایک ایک میگاواٹ صلاحیت کے دو پلانٹ تیار کرنے کی تجویز کی گئی ہے جن میں سے ایک بھاؤنگر اور دوسرا راجکوٹ میں نصب

کیا جائے گا۔ یہ دونوں شہر سوراشٹر میں ہیں۔ ان پلانٹوں میں گیسیفائر سسٹم سے بجلی تیار کی جائیگی جو گجرات بجلی بورڈ کو ۱۲۵ روپیہ فی یونٹ کے حساب سے فروخت کی جائے گی۔ بھاؤنگر پلانٹ حقیقتاً لکڑی اُٹھانے والوں کے لیے ایک نعمت ثابت ہوگا۔ اس سے انھیں لکڑی کی منافع بخش قیمتیں حاصل ہوں گی کیونکہ اس پلانٹ سے ۳۰ فیصد منافع ہونے کی توقع ہے۔

علاوہ ازیں راجکوٹ کی ایک مونگ پھلی کے مِل سے بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ ایک میگاواٹ کا پلانٹ لگائے جو مونگ پھلی کے چھلکوں سے بجلی تیار کرے گا۔ سردست مِل بھاپ تیار کرنے کے لیے مونگ پھلی کے چھلکے جلاتی ہے جو تیل پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کی طرف سے چھلکے ۱۵ روپے فی ٹن کے حساب سے فروخت کیے جائیں گے اور اس کے عوض میں وہ بھاپ عام قیمت پر حاصل کریگی۔ اس طرح جو بجلی پیدا ہوگی وہ گجرات بجلی بورڈ کو فروخت کر دی جائے گی۔

گیسیفائر سسٹم سے تیار کی جانے والی بجلی مروجہ بجلی کے مقابلے میں ۱۰۰ فیصد مہنگی ہو سکتی ہے لیکن جب یہ زیادہ مقدار میں پیدا کی جائے گی اور سسٹم کے ڈیزائنوں میں تبدیلی کی جائے گی تو لاگت پیداوار میں کمی آ جائے گی اگر اس طرح پیدا کی جانے والی بجلی کامیاب ثابت ہوئی تو ایسے یونٹ پہاڑوں میں بھی نصب کیے جائیں گے جہاں بجلی کے تار بچھانے کا کام مشکل ہے یا جہاں بجلی کی ترسیل میں زیادہ رکاوٹیں آتی ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ مدھیہ پردیش کی بیپا نگر پیپر مل بھی آزمائشی طور پر ۳۰۰ کلوواٹ کا ایک یونٹ نصب کرنے کے بارے میں غور کر رہی ہے۔ اس مل سے ٹنوں کی مقدار میں فاضل لکڑی کا اخراج ہوتا ہے جسے ریاستی جنگلاتی کارپوریشن فروخت کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مدھیہ پردیش اُوجا

وکاس نگم" نے اپنے دفتر میں پانچ کلوواٹ کا گیسیفائر اور جنریٹر لگایا ہے۔ جس سے وہ اپنی بجلی سے متعلقہ ضروریات پوری کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں دو ۲۰ کلوواٹ کے گیسیفائر اور جنریٹر کونڈا گاؤں (بستر) اور پتھلگاؤں (رائے گڑھ) میں لگائے جا رہے ہیں تاکہ آرا ملوں کو چلایا جا سکے۔

غرضیکہ بائیو ماس توانائی حاصل کرنے کا ایک متبادل وسیلہ ہے اور اسے ترقی دینے سے دیہی اور قبائلی علاقوں کا کایا پلٹ ہو سکتا ہے اور وہاں لوگوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں۔ ●

بقیہ: بیساکھی

ان نہتے اور معصوم لوگوں کو راہِ فرار نہیں ملی ہزاروں لوگ گولیوں سے ہلاک اور زخمی ہوئے۔ بھگدڑ میں بھی کئی لوگ مارے گئے بہت سے لوگ تو باغ کے کوئیں میں گر پڑے اور اُن کی لاشوں سے کنواں اَٹ گیا۔ اس طرح بھارتیوں نے سلطنتِ برطانیہ کے ملت آزادی کی دیوی کو اپنے خون کی آہوتی دی۔

جنرل ڈائر کے اس وحشیانہ اقدام کیخلاف جب سارے ملک میں طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تو انگریزی سرکار نے لوگوں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کیلیے تحقیقات کرنے کی غرض سے ہنٹر کمیٹی مقرر کر دی جس کے سامنے اپنے بیان میں اُس جلاد سیرت ڈائر نے اپنی انتہائی بے شرمی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ میرے پاس جو گولیاں تھیں وہ ختم ہو گئی تھیں اگر اور گولیاں ہوتیں تو شورش پسندوں کو سبق سکھانے کے لیے وہ بھی چلا دیتا۔ اور اس کا بدلہ لیا پورے بیس سال کے بعد پنجاب کے غیور نوجوان اُودھم سنگھ کا مبوج نے جس نے لندن میں ظالم ڈائر کے سینے میں پستول کی تین گولیاں داغ کر اُسے وہیں ڈھیر کر دیا۔

کہتے ہیں کہ شہیدوں کا خون رنگ لاتا ہے۔ چنانچہ جلیانوالہ باغ میں ہزاروں بھارتیوں کی شہادت رنگ لائی۔ ملک میں تحریکِ آزادی زور پکڑتی گئی اور آخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو وہ دن آ گیا جب بھارتی عوام نے انگریزی حکومت کا جُوا گلے سے اُتار پھینکا۔ ●

بقیہ: قومی یک جہتی کے علمبردار مہاتما گاندھی

کانگریس کے معتمد خاص مولوی شفیع داؤدی اور دہلی سے میجر جنرل شاہ نواز کو بلوایا سرحدی گاندھی ان کے ساتھ تھے ہی۔ یہ چھوٹا سا قافلہ یارسہ پہونچا اور اپنی آنکھوں سے فساد سے ہونے والی تباہی دیکھی۔ یہاں سرحدی گاندھی اور مہاتما گاندھی نے ہر متاثر شخص کی دلجوئی کی، انھیں آئندہ فساد نہ ہونے کا یقین دلایا اور مکانات کی از سرِ نو تعمیر کے لیے فنڈ اکٹھا کیا۔ اسی مرحلے میں سرحدی گاندھی اور مہاتما گاندھی نے ہندوؤں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے بے قصور مسلمان بھائیوں سے معافی مانگیں اور کھُلے دل سے ایک دوسرے کے قریب آ جائیں۔

گاندھی جی کی تمام عمر اسی جدوجہد میں گذری۔ آزادی ملنے کے بعد افسوس ہے کہ وہ زیادہ دنوں تک ہمارے درمیان نہ رہے، ورنہ آج فرقہ وارانہ فساد کا نام و نشان تک نہ ملتا۔ اب حکومت کی اور وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی کی سب سے پہلی کوشش یہی ہے کہ ملک کے عوام میں ایک دوسرے کے تئیں جذبۂ ہمدردی پیدا ہو۔ قومی یک جہتی کی فضا دیش میں دور دور تک پھیلے تاکہ ملک میں استحکام پیدا ہو۔ ملک ترقی کرے اور غریب سے غریب تر کو پیٹ بھر کھانے اور ایک چھت کے نیچے سونے کا موقع میسر ہو۔ ●

برج کشور ایڈووکیٹ٭

دُوریاں ختم ہو گئیں

ڈاک اور ٹیلی کمیونیکیشن کی خدمات کا کمال

زمانۂ قدیم میں نامہ بر کبوتروں کے ذریعے نامہ و پیام لیا جاتا تھا یا پیغامبروں کے ذریعے پیغامات بھجوائے جاتے تھے۔ یہ پیغامبر پیدل یا گھوڑوں پر سینکڑوں میل کی مسافت طے کرکے ہفتوں یا مہینوں میں منزلِ مقصود پر پہنچتے تھے اور لوگوں کو اپنے اعزا و اقربا کا حال جاننے کے لیے مدتوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن سائنسی ترقی اور نئی نئی ایجادات کی بدولت آج صورتِ حال یکسر بدل گئی ہے۔ پہلے اور آج کے حالات میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

کسی کو کوئی خبر یا پیغام بھیجنا ہے تو بس ایک پوسٹ کارڈ یا لفافہ منگوایئے اور لکھ کر حوالۂ ڈاک کر دیجئے۔ وہ دو تین روز میں ہی اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جائے گا۔ اگر پیغام فوری نوعیت کا ہے تو تار بھیج دیجئے یا پھر ٹیلیفون پر رابطہ قائم کر لیجئے۔ یہ تمام سہولیات عہدِ جدید کی دین ہیں۔ ان میں حصولِ آزادی کے بعد نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ جن کی اہم تفصیلات ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں:-

۱۔ ڈاک کی خدمات

ہندوستان میں ڈاک کی خدمات کا آغاز ۱۸۳۷ء میں ہوا تھا۔ پہلا ڈاک ٹکٹ ۱۸۵۲ء میں کراچی میں جاری کیا گیا جو غیر منقسم ہندوستان کے صوبۂ سندھ میں ہی چلتا تھا۔ محکمۂ ڈاک کا قیام ۱۸۵۴ء میں عمل میں آیا۔ اس وقت ملک میں ۷ ڈاک گھر کام کر رہے تھے۔ منی آرڈر کی سروس ۱۸۸۰ء میں شروع ہوئی۔ ڈاک گھر بچت بینک ۱۸۸۲ء میں اور پوسٹل لائف انشورنس کی سہولت ۱۸۸۴ء میں شروع کی گئی۔ دستیاب اعداد و شمار کے مطابق ۳۱۔ دسمبر ۱۹۸۴ء کو ملک میں ۱۴۴۹۰۴ ڈاک گھر کام کر رہے تھے۔ جن میں سے ۱۵۲۸۹ شہری علاقوں میں اور ۱۲۹۶۱۵ دیہی علاقوں میں تھے۔ یعنی اوسطاً ۴۷۲۸ افراد کے لیے ایک ڈاک گھر تھا جو ۲۲٫۶۸ مربع کلو میٹر علاقے میں کام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ۱۱۶۹۶ دیہات میں "چلتی پھرتی ڈاک سروس" مہیا کی گئی۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۴ء تک ساٹھ فیصد گاؤں میں روزانہ ڈاک تقسیم کی جانے لگی تھی۔

دیہی علاقوں میں ڈاک گھر کھولنے کی ترمیم شدہ پالیسی کے تحت پسماندہ اور آدی باسی علاقوں میں ڈاک گھر قائم کرنے کے اصولوں کو فراخدلانہ بنا دیا گیا ہے۔ اب گرام پنچایت والے کسی بھی گاؤں میں اگر تین کلو میٹر کے دائرے میں کوئی ڈاک گھر نہیں ہے تو وہاں ایک ڈاک گھر کھولا جا سکتا ہے بشرطیکہ ڈاک گھر کھولنے کی لاگت کے ۲۵ فیصد کے بقدر آمدنی ہونے کی توقع ہو اور مقامی آبادی کی تعداد کم از کم دو ہزار ہو۔ آدی باسی اور پسماندہ علاقوں کے گرام پنچایت والے گاؤں میں ڈاک گھر کھولنے کی شرط اور بھی نرم کر دی گئی۔ وہاں اگر کُل لاگت کے دس فیصد کے برابر آمدنی ہونے کی توقع ہو تو ایک ڈاک گھر کھولا جا سکتا ہے اگر تین کلو میٹر کے دائرے میں کوئی اور ڈاک گھر موجود نہ ہو۔ چھٹے منصوبے کے دوران دیہی علاقوں میں ۸۷۰۰ نئے ڈاک گھر کھولے گئے۔ ان میں سے ۴۰ فیصد پسماندہ اور آدی باسی علاقوں میں کھولے گئے۔

اشاعتِ تعلیم اور صنعتی ترقی کے نتیجے میں ڈاک میں بےحد اضافہ ہوا ہے۔ ڈاک، ریل، سڑک،

٭ عیش باغ گیٹ، شنکر دیال روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۴

...پوسٹ آفسوں، اور سائیکل وغیرہ کے ذریعے بھیجی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے شہروں کو ہوائی جہاز سے بھی ڈاک بھیجی جاتی ہے۔ "آل اَپ اسکیم" کے تحت سبھی اِنلینڈ لیٹر، لفافے، پوسٹ کارڈ، رجسٹرڈ چٹھیاں اور منی آرڈر ہوائی جہاز سے پہونچائے جاتے ہیں۔

تیز رفتار ڈاک سروس

۱۹۷۵ء سے شروع کی گئی "کوئیک میل سروس" کے تحت سبھی ریاستوں کی راجدھانیوں، مرکزی نظم و نسق کے علاقوں کے صدر مقاموں اور اہم تجارتی شہروں کو بھیجی جانے والی ڈاک خاص لیٹر بکسوں میں، جن پر ... لکھا ہوتا ہے ڈالی جاتی ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ ان میں پن کوڈ بھی لکھا جائے۔ ایسی ڈاک عام طور پر دوسرے روز ہی پہونچ جاتی ہے۔ اس وقت ملک میں تیز رفتار ڈاک کے ۵۴ قومی مراکز اور ۱۰۴ علاقائی مراکز کام کر رہے ہیں۔

پن کوڈ

بڑھتی ہوئی ڈاک کو جلد پہونچانے کے لیے ۱۹۷۲ء میں "پن کوڈ" کا طریقہ شروع کیا گیا۔ پن کوڈ چھ اعداد پر مشتمل نمبر ہوتا ہے۔ اس کے پہلے عدد سے علاقے، دوسرے عدد سے ذیلی علاقے، تیسرے سے چھنٹائی ضلع کا پتہ چلتا ہے۔ جبکہ آخری تین عددوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاک کی چھنٹائی کے ضلع سے خط کس تقسیم کار ڈاک گھر میں پہونچنی چاہیئے۔ لہٰذا پتے میں پن کوڈ لکھ دینے سے ڈاک چھانٹنے میں آسانی ہو جاتی ہے اور خط جلد اپنی منزل مقصود پر پہونچتا ہے۔

غیر ملکی ڈاک سروس

ہندوستان یونائیٹڈ نیشنز پوسٹل یونین کا ممبر ہے۔ اس یونین کے ممبروں کی تعداد ۱۶۸ ہے۔ یہ اقوام متحدہ کی ایک خصوصی ایجنسی ہے جس کا مقصد ممبر ملکوں کے ڈاک کے نظاموں کے درمیان ڈاک کی خدمات کے سلسلے میں باہمی تعاون کو فروغ دینا ہے۔ ہندوستان ایشیا اور پیسفک پوسٹل یونین کا بھی رکن ہے۔ اس یونین کا مقصد بھی ممبر ملکوں کے درمیان ڈاک کی خدمات کو بہتر بنانا اور باہمی تعاون کو بڑھانا ہے۔ ہندوستان سے غیر ملکوں کو بھیجی جانے والی ڈاک عام طور پر ہوائی اور سمندری جہازوں سے بھیجی جاتی ہے۔

ڈاک گھر بچت بنک

ڈاک گھر بچت بنک ملک کا سب سے بڑا بچت بنک ہے اسکی سہولیات ملک کے ۱۴۴۰۰۰ ڈاک گھروں میں موجود ہیں۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۴ء کو مختلف قومی بچت اسکیموں کے تحت ڈاک گھر بچت بنکوں میں ۱۳۵۱۴ کروڑ روپے کی رقم جمع تھی۔

ڈاک جیون بیمہ

۳۱ مارچ ۱۹۸۴ء کو ڈاک جیون بیمہ (پوسٹل لائف انشورنس) کی رواں پالیسیوں کی تعداد ۱۸۴۱۰۲ اور کل بیمہ شدہ رقم ۸۰۶٫۴۲ کروڑ روپے تھی۔ ۱۹۸۳-۸۴ء میں ۱۴۳٫۲ کروڑ روپے کی لگ بھگ ۳۴۷۱۰۱ نئی پالیسیاں جاری کی گئیں۔ اس طرح ڈاک جیون بیمہ میں گزشتہ سال کے مقابلے میں ۹۵٫۱۸ فیصد کا اضافہ ہوا۔

۲۔ ٹیلی کمیونیکیشنز سروسیں

محکمۂ ڈاک و تار جو ڈاک اور ٹیلی کمیونیکیشنز سروسوں کا اہتمام کرتا ہے۔ ملک میں سب سے زیادہ روزگار مہیا کرنے والے محکموں میں سے ایک ہے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۴ء سے اسے دو الگ الگ محکموں یعنی محکمۂ ڈاک اور محکمۂ ٹیلی کمیونیکیشنز میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

بہتر انتظام کے لیے ملک کو ۱۵ ٹیلی گراف سرکلوں، ۱۲ ڈاک سرکلوں، ۷ ڈاک تار سول سرکلوں، پانچ ڈاک تار برقی سرکلوں اور ۲۱ ٹیلیفون اضلاع میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۴ء کو ملک میں ۳۹۹۸۶ تار گھر تھے۔

۱۷۶ شہروں کے درمیان ٹیلیکس سروس دستیاب تھی۔ ان شہروں میں ۲۹۸۴۴ لائنوں کی سہولیات موجود تھیں جن سے ۲۲۵۵۲ ٹیلیکس کنکشن کام کر رہے تھے۔ ٹیلیکس سروس سے مراد ایسی ٹیلی پرنٹر سروس ہے جس پر دونوں طرف سے مشین پر پیغامات کا تبادلہ کیا جا سکے۔

ٹیلی فون کی سہولیات

گذشتہ چند برسوں میں ٹیلیفون کی خدمات میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ دُنیا میں ٹیلیفون کی ایجاد ہونے کے صرف پانچ برس بعد ۸۲-۱۸۸۱ء میں کلکتہ میں ۵۰ لائنوں والا ایک ٹیلی فون مرکز قائم ہوا تھا۔ اس وقت ملک میں ۸،۹۹ ٹیلیفون ایکسچینج اور تقریباً ۳۰٫۵۳ لاکھ لائنیں کام کر رہی ہیں۔ ٹیلیفون سروسوں میں بیشتر اضافہ حصولِ آزادی کے بعد ہی ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں لگ بھگ ۳۲۱ ٹیلیفون ایکسچینج اور صرف ۸۲ ہزار ٹیلیفون تھے۔ اس وقت آٹھ لاکھ افراد ٹیلیفون کنکشن پانے کے انتظار میں ہیں۔ یہ تعداد موجودہ کنکشنوں کے صرف ۲۵ فیصد کے برابر ہے۔ ذیل کے گوشوارے سے بخوبی ظاہر ہے کہ ۱۹۴۸ء کے مقابلے میں ۱۹۸۴ء میں ٹیلی کمیونیکیشنز کی خدمات میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔

	یکم اپریل ۱۹۴۸ء	یکم اپریل ۱۹۸۷ء
۱۔ سوئچ سسٹم کی صلاحیت	۱٫۰۰ لاکھ لائینیں	۳۰٫۵۴ لاکھ لائینیں
۲۔ ڈائرکٹ ایکسچینج لائینیں	۰٫۸۲ لاکھ کنکشن	۲۶٫۶۷ لاکھ کنکشن
۳۔ ٹیلیفون نظاموں سے منسلک ٹیلیفون	۱٫۶۸ لاکھ	۳۴٫۶۲ لاکھ
۴۔ ٹیلیفون ایکسچینج	۳۲۱	۹۹۷۸
۵۔ ٹرنک آٹومیٹک مراکز	—	۲۸
۶۔ ٹرنک آٹومیٹک لائینیں	—	۸۰٬۶۲۰
۷۔ ایس ٹی ڈی روٹ (خود ڈائل گھما کر دوسرے شہر سے بات کرنے والی لائینیں)	—	۷۰۱
۸۔ تار گھر (بشمول مشترک دفاتر)	۳۸۲۴	۳۴۳۳۴
۹۔ ٹیلیکس ایکسچینج	—	۱۷۶
۱۰۔ ٹیلیکس سروس کے گاہک	—	۲۲٬۵۵۲

ایس۔ ٹی۔ ڈی۔ سروس

خود ڈائل گھما کر دوسرے شہر سے بات کرنے کی سروس (ایس۔ ٹی۔ ڈی) ملک میں سب سے پہلے ۱۹۶۰ء میں کانپور، لکھنؤ کے درمیان شروع کی گئی تھی۔ یہ سروس اب ۲۰۵ شہروں تک رسا ہے۔

بین الاقوامی ٹیلیفون سروس

اب ۴۴ ممالک کے ساتھ ڈائرکٹ ٹیلیفون سروس دستیاب ہے۔ بمبئی، کلکتہ، دہلی اور مدراس کے گاہک انگلینڈ، آسٹریلیا، سنگاپور، ہانگ کانگ، فرانس اور جاپان کے گاہکوں کو براہ راست ٹیلیفون کر سکتے ہیں۔

بمبئی، کلکتہ، جبلپور اور کھیلائی میں چار محکماتی کارخانے ٹیلی کمیونیکیشنز کا اہم ساز و سامان مثلاً مائیکرو ویوٹاور، سکّے اکٹھا کرنے کے ڈبّے، اوپن وائر لائن ہارڈ ویئر، ٹرنک بورڈ، مینوئل بورڈ وغیرہ تیار کر رہے ہیں۔ ۱۹۵۶ء سے ایک ٹیلی کمیونیکیشنز ریسرچ سینٹر بھی کام کر رہا ہے جو پوری طرح محکمۂ ٹیلی کمیونیکیشنز کے لیے وقف ہے۔ یہ سنٹر ٹیلی کمیونیکیشنز کے شعبے میں مستقبل کی ضروریات کا اندازہ لگاتا ہے اور مختلف آلات و ساز و سامان کے سودیسی ڈیزائن تیار کرتا ہے جس سے ہمیں غیر ممالک پر انحصار نہ رکھنا پڑے۔ اس کے علاوہ یہ دیگر اہم کام بھی انجام دیتا ہے۔

انڈین ٹیلیفون انڈسٹریز

انڈین ٹیلیفون انڈسٹریز لمیٹڈ ٹیلی کمیونیکیشنز کے مختلف آلات و ساز و سامان تیار کرنے میں مصروف ہے۔ اس کے رجسٹرڈ دفاتر بنگلور میں ہیں اور اس کی پانچ پیداواری اکائیاں بنگلور، نینی، پالگھاٹ، رائے بریلی اور سری نگر میں کام کر رہی ہیں۔

ٹیلی پرنٹر اور اس سے متعلق آلات بنانے کے لیے پبلک سیکٹر کا مشہور کارخانہ ہندوستان ٹیلی پرنٹرز لمیٹڈ ۱۹۶۰ء میں مدراس میں قائم کیا گیا تھا۔ ۸۵-۱۹۸۴ء میں اس کارخانے نے ۶۸۰، الیکٹرو میکینکل ٹیلی پرنٹر اور دیگر متعلقہ ساز و سامان تیار کیا۔

سمندر پار ٹیلی کمیونیکیشنز سروس

دوسرے ملکوں کے ساتھ ٹیلی کمیونیکیشنز کی خدمات اوورسیز ٹیلی کمیونیکیشنز سروس فراہم کرتی ہے۔ ان خدمات کا اہتمام چار بین الاقوامی روٹ سینٹروں بمبئی، نئی دہلی، کلکتہ اور مدراس سے کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سمندر پار ٹیلیفون، ٹیلیکس، تار، ریڈیو فوٹو اور کرائے پر دی گئی ٹیلی پرنٹر و الیس گریڈ سرکٹ کی سہولیات بھی فراہم کی جاتی ہیں۔ مصنوعی سیارہ کے ذریعے سے بین الاقوامی ریلے ٹیلی ویژن کی سہولت بھی مہیا کی جاتی ہے۔

آخر میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ڈاک اور ٹیلی کمیونیکیشنز کی خدمات میں توسیع و اضافے کے نتیجے میں دوریاں ختم ہو گئی ہیں اور دنیا کے ممالک اور ہمارے ملک کے شہر اور قصبات ایک دوسرے کے نزدیک تر آ گئے ہیں۔ اب ہم اپنے دوستوں اور عزیزوں سے جب چاہیں تب نامہ و پیام کر سکتے ہیں اور جب چاہیں تب ٹیلی فون پر گفتگو کر سکتے ہیں خواہ وہ سات سمندر پار کیوں نہ بیٹھے ہوں۔

●

عزیز مرادآبادی٭

گنگا کو آلودگی سے پاک کرنے کا عظیم ترین منصوبہ

ساتویں منصوبے میں ماحول کے تحفظ اور بیسٹ حیوانات کے لیے ۲۷۴ کروڑ روپے سے بھی زیادہ کی رقم مختص کی جا چکی ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستانی روایات کے احترام میں دریائے گنگا کی آلودگی کی روک تھام خصوصی اہمیت رکھتی ہے، اس کے لیے حال ہی میں کانپور اور پٹنہ کے مقامات پر گنگا کی آلودگی کی روک تھام کے لیے سخت اقدامات کیے گئے ہیں، گنگا کے پانی کو آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے اس کے کنارے آباد شہروں کے کچرے اور گندے پانی کے نکاس کے لیے سب انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ گنگا کے کنارے سلبھ شوچالیہ بنانے کا پروگرام بھی اس سلسلے کی کڑی ہے۔ کانپور میں صفائی کے پروگرام کو مؤثر ڈھنگ سے چلانے کے لیے عالمی بینک سے امداد بھی حاصل کی گئی ہے، چمڑے کی رنگائی اور اس کے کچرے کے مناسب استعمال کے لیے ہالینڈ سرکار کے اشتراک سے ایک پلانٹ لگانے کی تجویز زیر غور ہے۔ (ایڈیٹر)

گاندھی جی نے ۱۹۱۵ء میں کنبھ کی یاترا کے بعد اپنی خودنوشت سوانح حیات میں لکھا تھا:-

"... میں یاترا کی بھاؤنا سے ہری دوار نہیں گیا تھا۔ مجھے پاکیزگی کے لیے تیرتھ استھانوں پر بھٹکنے کا اشتیاق کبھی نہیں رہا۔ لیکن ۱۷ لاکھ افراد پاکھنڈی نہیں ہو سکتے .... ان میں بے شمار لوگ پنیہ (ثواب) کمانے اور شدھی (اصلاح) پراپت کرنے کے لیے آئے تھے۔ اس میں مجھے کوئی شبہ نہیں تھا۔ یہ کہنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے کہ اس طرح کی عقیدت آتما کو کس حد تک اوپر اٹھاتی ہوگی...!"

مہاتما گاندھی کے مندرجہ بالا مختصر بیان سے رام گنگا کا دھارمک نظریہ مترشح ہے، جو صد فیصد حقیقت کا عکاس ہے۔ اس حقیقت کو نہ صرف ہندو بلکہ غیر ہندو بھی تسلیم کرتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا ہے:

"گنگا بھارت کی صدیوں پرانی تہذیب اور تمدن کی علامت ہے۔ جو دن بہ دن بدلتی رہتی ہے، تاہم اصلاً ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔ ہم گنگا کی نرملتا میں اس مہان ایک کا عکس دیکھتے ہیں۔ قدرت کی اس بے مثال دین کو افادیت کا درجہ دے کر ہمارے پُران خالقوں نے انسانی مروت و اخلاق کو احساس نو سے ہمکنار کیا ہے۔"

مذکورہ دونوں قد آور، مستند و مسلّم ہستیوں کے مختصر مگر جامع بیانات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ گنگا ہماری تہذیب اور کلچر کی امرت دھارا تو ہے ہی، ہندوستان جیسے زرعی ملک کے لیے اس کی حیثیت 'ماں' جیسی بھی اس وجہ سے ہے کہ یہ یہاں کے باسیوں کی پرورش کسی بھی مشفق

٭ محلہ قاضیان، بسی کرتپور، بجنور (یو۔پی)

ماں کی طرح ہی کرتی ہے۔ اسی لیے خصوصاً ہندو لوگ اسے "گنگا میّا" بھی کہتے ہیں۔

مذکورہ حقائق کو ذہن میں رکھ کر ہمارے نوجوان وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے گنگا کی قومی افادیت کو محسوس کیا اور اسے آلودگی سے پاک کرنے کا جرأت مندانہ اعلان کر دیا۔

آلودگی کا مفہوم

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ کسی چیز کو آلودہ کر دینا، خراب یا گندہ کرنا۔ یا کسی شئی سے کو انسانی زندگی کے لیے مضر اور نقصان دہ بنا دینا۔ مہلک یا ناخوش اثرات پیدا کرنا۔ اس طرح آلودگی کی بہت سی قسمیں ہیں، اس لیے صرف ان چند قسموں کے نام بتا دینا کافی ہے جس کی طرف ماہرین عالم کی توجہ مبذول ہوئی ہے۔ آلودگی کی مخصوص یا قابلِ ذکر اقسام یہ ہیں۔

۱۔ ہوا کی آلودگی ۲۔ پانی کی آلودگی

۳۔ آواز کی آلودگی ۴۔ ماحول یا سماج کی آلودگی۔ زیر نظر مضمون میں ہمیں پانی کی آلودگی کے مسئلے کو خاص طور پر ذہن میں رکھنا چاہیئے کیونکہ مذکورہ سب اقسام کا تذکرہ اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں ہے، بلکہ اپنی جگہ ہر قسم ایک علیحدہ مضمون کی متقاضی ہے۔

آلودگی کے اہم اسباب

یہاں پر ہم آلودگی کی جملہ اقسام کے اسباب کا برائے نام ذکر کرنے پر ہی اکتفا کر رہے ہیں تاکہ قارئین کرام کے سامنے اسباب کی ایک جھلک آسکے!

۱۔ بڑے پیمانے پر جنگلات کی کٹائی۔

۲۔ بڑے پیمانے پر صنعت کاری کی توسیع اور ترقی سے کارخانوں کے دھوئیں اور بخارات۔

۳۔ شہروں میں گندگی و غلاظت۔

۴۔ آمد و رفت کے ذرائع۔

۵۔ کھیتوں میں استعمال کی جانے والی تیز اثر زہریلی ادویہ۔

۶۔ سائنسی تجربات۔ ۷۔ آبادی میں تیز رفتار اضافہ۔ ۸۔ معاشرہ میں بدعنوانیاں۔ ۹۔ تعلیم اور بیداری کی کمی۔ ۱۰۔ مذہبی کٹرپن اور اندھ وشواس وغیرہ۔ ۱۱۔ موضوع کے اعتبار سے یہ لازمی ہے کہ گنگا کی آلودگی کے اہم اسباب پر الگ سے حسب ضرورت روشنی ڈالی جائے۔

گنگا کی آلودگی کا خاص سبب شہروں اور صنعتی اداروں کا کوڑا کرکٹ ہے، جو ایک لاکھ سے زیادہ کی آبادی والے درجہ اول کے ۲۹ شہروں، پچاس ہزار سے کم آبادی والے تقریباً ۴۸ قصبوں کے ذریعہ پھینکا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق گندگی کا ۷۵ فیصد آلودگی مقامی اداروں (کارپوریشنوں، نگر پالیکاؤں اور گرام سبھاؤں وغیرہ) کے ذریعہ ڈالے گئے کوڑا کرکٹ سے ہوتی ہے، جن میں غلاظت سے بھرپور گندہ پانی شامل ہے۔ اگر گنگا ندی کے ساحل پر بسے ہوئے درجہ اوّل کے شہروں کی غلاظت اور گندہ کوڑا کرکٹ کہیں اور ڈال دیا جائے یا کسی کام میں لایا جائے تو آلودگی کو کافی حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آج آبادی میں برق رفتاری سے اضافہ اور تیزی سے صنعتوں کی توسیع و ترقی وغیرہ سے گنگا کا پانی آلودہ ہوتا جا رہا ہے۔

گنگا جل کی انفرادی خصوصیت

گنگا کا پانی امرت کی طرح دوسرے سارے پانیوں سے زیادہ صحت کے لیے مفید ہے۔ یہ جسم کی جلدی اور اندرونی بہت سی بیماریوں کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے محمد تغلق سے لے کر شہنشاہ اکبر تک تاریخی ہستیاں بھی اس کے پانی کو استعمال کیا کرتی تھیں۔

گنگا کے پانی کی سائنسی جانچ کرنے پر ثابت ہو چکا ہے کہ اس میں ایک خاص طرح کے پروٹیکٹیو کلورائیڈز (Protective Chloride) ہیں جو دوسری ندیوں کے پانی میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ ماہرِ آب ڈاکٹر ہینکن نے گنگا جل کو سب سے عمدہ اور اعلیٰ ترین خواص کا پانی قرار دیا ہے۔

صفائی سے ہونے والے فوائد

جب اتنی لمبی گنگا ندی کے پانی کو صاف کرنے کا کام زور وں پر شروع ہو جائے گا تو شہروں اور قصبوں وغیرہ کی غلاظت اور کوڑا کرکٹ کو کئی قسم کی کارآمد اشیاء میں بدلا جا سکتا ہے۔ مثلاً دیسی کھاد بنانے، توانائی حاصل کرنے اور کاغذ وغیرہ تیار کرنے کے کام میں لایا جا سکتا ہے۔

قومی و سماجی بہبود کا کارنامہ

گنگا ندی دیگر بے شمار ندیوں کی جننی ہے۔ یہ ندی جتنے بڑے رقبے کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہے، کوئی اور ندی اس حیثیت کی حامل نہیں ہے۔ اس کی جو قومی و ملکی اہمیت ہے وہ بھی کسی اور ندی کی نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی صفائی وسیع پیمانے پر قومی و سماجی بہبود کا عظیم کارنامہ کہلائے گا۔ مذہبی، تہذیبی اور زرعی اعتبار سے گنگا ندی کا کم سے کم بھارت میں تو ثانی نہیں ہے۔

مرکزی گنگا اتھارٹی کا قیام

فروری ۱۹۸۵ء میں مرکزی گنگا اتھارٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ جس کے چیئرمین یا صدر خود وزیراعظم شری راجیو گاندھی جی ہیں۔ اس گنگا اتھارٹی نے گنگا کے ان قدرتی اعلیٰ اوصاف کو از سرِ نو نکھارنے کے لیے (جو برسہا برس آلودگی سے پہلے تھے) اور ساحل کو سدھارنے کے لیے ایک طویل المیعاد منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس نے جون ۱۹۸۵ء میں ہوئی اپنی پہلی نشست میں، اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے امور کو مندرجہ ذیل تین مدارج میں تقسیم کیا ہے:۔

۱۔ گندے پانی کو کہیں اور لے جانا۔ اس مقصد کے لیے پمپنگ اسٹیشنوں کا قیام عمل میں لانا۔ اور پہلے سے کام کر رہے اسٹیشنوں کی کارکردگی کو بہتر بنانا۔

۲۔ گندے پانی کو صاف کرنے والے آلات کی تنصیب سے متعلق کام جس سے توانائی اور دیگر اشیاء حاصل کی جا سکیں۔

۳۔ کم خرچ پر صفائی، ساحل کے سدھار کی سہولیات اور زندگی کے تحفظ سے متعلق امور۔

متعدد صوبوں کے لیے ذیلی منصوبے

مرکزی گنگا اتھارٹی نے صوبائی حکومتوں سے مناسب صلاح مشورے کے بعد ۱۳ر۲۹۲ کروڑ روپے لاگت والی ایک بڑی یوجنا منظور کی ہے۔ اس ذیلی منصوبے میں اتر پردیش کو ۳۰ر۱۱۲ کروڑ روپے، بہار کو ۲۴ر۴۶ کروڑ روپے اور مغربی بنگال کو ۵۵ر۱۳۳ کروڑ روپے دئے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔

بہار میں پٹنہ شہر کے لیے ۱۱ر۴۶۲ لاکھ روپے کی لاگت سے بڑی اور سادی پور صفائی آلات کو دوبارہ بہتر بنانے کی یوجنا کو اور ۸ر۲۴۸ لاکھ روپے کی لاگت سے پردرشنی مارگ، اناگھاٹ اور کرشنا گھاٹ پر سمتوں کی تبدیلی اور شمشان گھاٹ پر شو داہ گرہ (لاش پھونکنے کی جگہ) کے قیام کے منصوبوں کو منظوری دی جا چکی ہے۔ اسی طرح مغربی بنگال میں چندر پور، شری رام پور، بھاٹ پاڑہ اور ٹیٹا گڑھ قصبوں میں سیوریج کے رخ تبدیل کرنے اور مزید بہتر بنانے کے منصوبوں کے لیے ۲۲۲ لاکھ روپے کی منظوری دی جا چکی ہے۔ ... اس کے علاوہ ۳۴ر۳۹۲ کروڑ روپے کی متوقع لاگت والی بڑی یوجنائیں زیر غور ہیں۔

اتر پردیش کیلئے منظور شدہ ذیلی یوجنائیں

مرکزی گنگا اتھارٹی نے گنگا کو آلودگی سے پاک کرنے کی غرض سے اتر پردیش کے لیے ابھی تک مندرجہ ذیل منصوبے منظور کئے ہیں:-

۱۔ ہری دوار اور رشی کیش میں سیور کے رخ کی تبدیلی، ان کی صفائی اور پمپنگ اسٹیشن کو بہتر بنانے کے لیے ۴۳ر۹۶ لاکھ روپے۔

۲۔ کانپور میں جوشی مٹھ غلیظ پانی پر پمپنگ اسٹیشن کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ۸۶ر۱۷ لاکھ روپے۔

۳۔ الہ آباد میں گؤ گھاٹ پمپنگ اسٹیشن کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے ۶۰ر۱۱ لاکھ روپے۔

۴۔ وارانسی میں تارکی کھنڈرات کے نظام کے مطالعہ کے لیے ۵۰ر۱۱ لاکھ روپے۔

۵۔ رام نگر میں سیوریج فارم کی توسیع اور سیوریج (وارانسی) پمپنگ کے کام کو پھر سے شروع کرنے کے لیے ۷۰ر۹ لاکھ روپے۔

مذکورہ بالا ذیلی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۸۲ر۱۹۹ کروڑ روپے کی رقم الاٹ کی گئی ہے۔ ہری دوار، رشی کیش اور رام نگر کے منصوبے کی کافی حد تک تکمیل کی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ ۲۲ کروڑ روپے لاگت کی ابتدائی رپورٹ زیر غور ہے جس کا تعلق فرخ آباد، فتح گڑھ اور کانپور شہروں سے ہے۔

وارانسی میں گنگا کی خصوصی اہمیت ہے۔ اس وجہ سے اس پورے منصوبے میں وارانسی کے پروگرام کو فوقیت دی گئی ہے۔ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے اس پورے منصوبے کا آغاز (افتتاح) خود ۱۴ر جون کو وارانسی میں کیا ہے۔ وارانسی شہر کے لیے ۵ر۲۴۲ کروڑ کی متوقع لاگت سے ایک خصوصی عملی پروگرام تیار کیا گیا ہے۔ اس بڑی یوجنا کے ذریعہ ایک ہمہ گیر مقصد حاصل کرنے کا خیال ہے۔ پانی کی نکاسی، غلاظت کا بندوبست اور صفائی کے آلات پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے ندی کے پانی کو صاف کرنے اور ساحل کو توسیع دینے کے کاموں میں تال میل پیدا کرنے کا کام بھی اس ذیلی منصوبے کے تحت کیا جائے گا۔ وارانسی میں سیوریج پمپنگ اسٹیشن اور ٹریٹمنٹ پلانٹ وغیرہ کی کارکردگی بہتر بنانے اور قیام کے لیے ۲۷۵ لاکھ روپے مختص کئے گئے ہیں۔ اس کے تحت ہندو یونیورسٹی سرکل میں سیور صفائی، پرانے ٹریٹمنٹ پلانٹ کو بہتر بنانے اور نئے نصب کرنے ڈیریکا میں سیوریج اور انڈسٹریل ویسٹ ٹریٹمنٹ پلانٹ (Industrial Waste Treatment Plant) دینا پور میں فرانس کے اشتراک سے ٹریٹمنٹ پلانٹ کی تنصیب، کونیا اور دینا پور سیوریج پمپ کی صلاحیت میں اضافہ، نلوں کے رخ میں تبدیلی اور ٹرانس دریا سیوریج منصوبہ وغیرہ شامل ہیں۔ مذکورہ جملہ امور اتر پردیش جل نگم کے ذریعے پورے کئے جائیں گے۔ منصوبے کے دیگر اہم امور مثلاً گھاٹوں کا سدھار اور مرمت (۴۸۰ لاکھ روپے مختص)، کوڑا کرکٹ وغیرہ کو ٹھکانے لگانے، گھریلو سیوروں کو برانچ سیور سے جوڑنے، مویشیوں کے لیے کالونی وغیرہ (۵۰۰ لاکھ روپے کا الاٹمنٹ)، سڑکوں کی مرمت (۱۵۰ لاکھ روپوں کی منظوری) اور کنڈوں، تالابوں کی مرمت، ندی کے کنارے پولیس کی تعیناتی کا بہتر نظم، مردوں کو جلانے کی جگہ وغیرہ (۳۵۰ لاکھ روپوں کا بندوبست) کی تعمیر و توسیع کا کام شامل ہے۔ ان امور کو انجام دینے کی ذمہ داری خصوصاً وارانسی کی کارپوریشن کو سونپی گئی ہے۔

کامیابی کیلئے ضروری شرطیں

ہماری سرکار کی عظیم الشان یوجنا اسی وقت خاطر خواہ طور پر تکمیل کے مراحل کامیابی و کامرانی کے ساتھ طے کر سکتی ہے جبکہ عوام اپنا بیش بہا تعاون پیش کریں۔ اپنی ذہنیت اور شعور میں تبدیلی لائیں، کیونکہ گنگا ندی پاک و صاف ندی ہے۔ اس کی پاکی و صفائی کو برقرار رکھنا ہوگا۔ جیسا کہ عزت مآب وزیر اعظم

(باقی صفحہ ۴۱ پر)

ریاض احمد خاں

قومی یکجہتی کے علمبردار

مہاتما گاندھی

مہاتما گاندھی کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ملک کو اس وقت تک آزادی نصیب نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ یہاں پر بسنے والے دو عظیم فرقے آپس میں شیر و شکر ہو کر رہنا نہ سیکھ سکیں۔ اور اگر آزادی مل بھی گئی تو حقیقی معنوں میں یہ وہ آزادی نہ ہوگی جس کے ہم سب متمنی ہیں۔ گاندھی جی ہندوستان میں ہونے والے فسادات سے دل برداشتہ تھے، اس لیے انھوں نے اپنی تمام تر قوت ملک میں یکجہتی قائم کرنے پر لگا دی۔ فسادات کا سلسلہ ختم تو ضرور ہو گیا مگر اکثر و بیشتر ملک میں فسادات ہوتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے جب سے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ہے اسی وقت سے گاندھی جی کے پیغام امن کو پیش پیش رکھا ہے اور اپنی ہر تقریر میں اس بات پر زور دیا ہے کہ ملک کی سالمیت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جبکہ ہم ہندوستانیوں میں آپسی بھائی چارگی ہو، خلوص اور محبت ہو جس سے ایک ایسی فضا قائم ہو سکے جو قومی یکجہتی کا جیتا جاگتا نمونہ بن کر ابھرے۔ اس نظریے کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑے پیمانے پر قومی یکجہتی کمیٹی کی تشکیل بھی ہوئی ہے اور اس سمت زور و شور سے کام بھی ہو رہا ہے۔

ہمارے ملک میں قومی یکجہتی قائم کرنے کے علمبردار مہاتما گاندھی ہیں جنھوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر ہندوستانیوں میں یکجہتی کی فضا قائم کرنے کے لیے ان کے خون کی بھی ضرورت پڑی تو، نہ تو ان کے قدم لڑکھڑائیں گے اور نہ وہ پس و پیش کریں گے بلکہ خوشی سے اس یکجہتی کی فضا کو اپنے خون سے سینچیں گے۔ انھوں نے اپنی انتھک محنت سے دونوں فرقوں سے یہ منوا لیا کہ وہ نہ صرف ہندوؤں سے بلکہ مسلمانوں سے بھی دلی محبت کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے مذہب کی تعلیم بھی مساوات پر قائم ہے۔ مہاتما گاندھی نے اپنے خطبات میں اکثر اس بات کا تذکرہ کیا کہ بحیثیت ایک ہندوستانی اور ہندو مذہب کے پیروکار ہونے کے اگر میں مسلمان بھائیوں سے محبت نہ کر سکوں تو اس وقت میری تمام عبادت ہیچ ہوگی۔ آپ نے اکثریتی طبقے سے کہا کہ اگر ملک میں قومی یکجہتی کی فضا بنائے رکھنا چاہتے ہو تو اس بات کا یقین رکھو کہ وہ فضا اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ اقلیتی فرقے کے دل جیت نہ لو۔ انھیں اپنی محبت سے سرشار کر دو کیونکہ ہندو مسلم اتحاد کا مول تول نہیں ہو سکتا۔

مہاتما گاندھی نے کھلے الفاظ میں اس بات کا اظہار کیا کہ ملک میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ خواب دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوؤں کا راج ہوگا۔ دراصل یہ خواب و خیال کی باتیں ہیں، کیونکہ ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھی اس سرزمین کے پاسبان ہیں۔ انھوں نے بھی اس سرزمین پر جنم

گئے اور اس سرزمین پر پلے بڑھے اور اسی سرزمین کی خاک میں مل گئے۔ مسلمانوں کی بھی وہی اُمیدیں تھیں جو اُمیدیں ہندو اپنے سینوں میں دبائے ہوئے تھے۔ ان کے بزرگ، عزیز، رشتہ دار سب اسی سرزمین کے باشندے تھے۔ وہ کہیں اور سے نہیں آئے تھے اسی لیے ان کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا اکثریتی فرقے کے لوگوں کا ــــ مہاتما گاندھی کا یہ کہنا تھا کہ آزادی کی خاطر جیل میں جانا یا جیل جانے کی تیاری رکھنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ ملک کے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور پارسی، ان سب فرقوں میں یک جہتی قائم کی جائے۔ یک جہتی قائم کرنے والے سے زیادہ بلند مرتبہ یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ گاندھی جی نے اپنے ایک خطبے میں اس بات کا بھی اعلان کیا کہ کیا وجہ ہے کہ طویل مدت کی کوششوں کے باوجود ملک میں قومی یک جہتی کی فضا قائم نہیں ہو پا رہی ہے نیز اتنی جانفشانی کے بعد بھی اردو اخبارات اس طرح کا الزام عائد کرتے ہیں کہ اگر ملک میں مسلمانوں کا کوئی دشمن ہے تو وہ مہاتما گاندھی ہے گاندھی جی نے اپنا سینہ چاک کرکے دکھانا چاہا کہ ان کے دل میں مسلمانوں کے لیے جو محبت اور عقیدت ہے اس کا بدل مشکل ہے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم نہ ہونے کی وجہ مہاتما گاندھی نے یہ بتلائی کہ درپردہ ایک تیسری طاقت برسرِ پیکار ہے جو اپنے مفاد کی خاطر ہندوستان میں ان دو بھائیوں کو ملنے نہیں دیتی۔ یہ تیسری عظیم طاقت یہ چاہتی ہے کہ اس عظیم عمارت میں رخنہ اندازی کرکے اسے مسمار کر دیا جائے تاکہ ہندوستانیوں کی طاقت بکھر جائے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے باعثِ شرم ہوگا بلکہ پوری قوم کی گردنیں جھک جائیں گی اور ہندوستانیوں کا وہ سرِ افتخار جو بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے نہیں جھک سکا، آپسی جھگڑوں کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جھک جائیگا۔

مہاتما گاندھی نے ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کی ناکامی کی دوسری وجہ جو بتائی ہے وہ ہے "شراب" اپنے ایک خطبے میں انھوں نے کہا کہ بڑی بڑی سلطنتیں شراب کی لعنت سے نیست و نابود ہو چکی ہیں ــــ ہندوستان میں وہ طبقہ جو اعلیٰ ظرفی، بہادری اور جوانمردی کا مظہر تھا جس میں لارڈ کرشنا جیسی عظیم ہستی نے جنم لیا، وہ صرف شراب کی وجہ سے نیست و نابود ہوگیا۔ اتنا کہ آج اس طبقے کا نام لیوا بھی باقی نہیں بچا۔ جب بڑی بڑی سلطنتیں اور بڑے بڑے فرقے اس لعنت سے نابود ہو سکتے ہیں تو ہندوستانیوں کا کیا شمار۔ وہ کس گنتی میں ہیں۔ شراب انھیں کسی بھی لمحے مٹا سکتی ہے۔ یہ شراب کا نشہ ہی ہے جس نے بھائی کو بھائی کا دشمن بنا دیا ہے مہاتما گاندھی نے قطعی طور پر قومی یک جہتی قائم کرنے کے لیے عوام سے شراب ترک کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس ضمن میں آپ نے فرمایا کہ اگر انھیں صرف ایک گھنٹے کے لیے ہندوستان کی بادشاہت مل جائے تو وہ اس ایک گھنٹے میں ملک کی تمام شراب کی دکانوں کو بغیر لیس و پیش بند کرا دیں گے۔ یہی نہیں بلکہ دکان کے مالکان کو کچھ بھی ہرجانہ نہیں دیں گے حالاں کہ ایسا کرنے میں حکومت کو بہت بڑے خسارے کا سامنا کرنا پڑے گا جسے پورا کرنے کے لیے مہاتما جی نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے دفاعی خرچ کم کر دیا جائے گا تاکہ ہندوستان کی نئی نسلیں برباد نہ ہوں اور ان کے جسموں کی نشو و نما قدرتی طور سے ہو، تاکہ وہ نیک ہندوستانی بن سکیں اور ملک میں امن و امان، اتحاد اور یک رنگی کے علمبردار بنیں۔

مہاتما گاندھی نے قومی یک جہتی کے اوّلین علمبردار مہاتما گوتم بدھ کے بارے میں کہا ہے کہ انسانیت کا درد قدرت کی طرف سے ان کے دل میں پیدا کیا گیا تھا۔ گوتم بدھ نے، جہاں جہاں بھی وہ گئے، یہی سبق دیا کہ انسان، انسان سے ہمدردی رکھے، ایک دوسرے سے محبت کرے، ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں ساتھ دے۔ گاندھی جی کی نظروں میں گوتم بدھ سے عظیم اور کوئی شخصیت اس سرزمین پر نہیں گذری جس نے انسانی ہمدردی پر اتنا درس دیا ہو۔ مہاتما گاندھی کا یہ کہنا تھا کہ بدھ ہندوؤں میں اعلیٰ ہندو تھے جنھوں نے ہندوازم کے خیالات میں وسعت پیدا کی۔ مہاتما گاندھی نے گوتم بدھ کی تعلیمات پر تذکرہ کرتے ہوئے اس امر کا بھی اظہار کیا کہ ان کی تعلیمات مقدس کتاب وید کے اوراق میں گم ہوگئیں اور یہی وجہ ہے کہ سیلون، برما، چین اور تبت میں گوتم بدھ کی یک جہتی کی تعلیمات پوری طرح سے نہیں پہنچ پائیں، مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قومی ہم آہنگی کی جو تعلیم مہاتما بدھ نے دی تھی اس میں ایک رُوح تھی، ایک پاکیزگی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ سیکڑوں برس گذر جانے کے بعد مہاتما بدھ کا نام لینے والے اس سرزمین میں کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔

حصولِ آزادی سے پہلے گاندھی جی کی زندگی کا ایک بڑا حصہ ملک میں دُور دُور تک دورہ کرنے میں گزرا۔ ہندوستان کے کسی بھی کونے سے ہندو مسلم فساد کی خبر پاتے ہی گاندھی جی وہاں کا رُخ کرتے اور ہندوؤں اور مسلمانوں سے ملتے۔ دونوں فرقوں کے حالات معلوم کرتے اور انھیں آپس میں نہ لڑنے کا درس دیتے۔ گاندھی جی کے الفاظ پُراثر ہوتے جو دونوں ہی فرقوں پر اثر انداز ہوتے ــــ ہندوستان میں ریاست بہار ایک ایسی ریاست تھی جہاں آزادی سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت کشت و خون ہوا کرتا تھا۔ گاندھی جی کو اپنی سیاسی زندگی میں سوائے مصروفیت کے اور کچھ نہ ملا۔ مگر باوجود اس عدیم الفرصتی کے آزادی

۔ ابوحسن، نئی دہلی

حاصل ہونے سے صرف چھ ماہ پہلے پٹنہ میں ہندو مسلم فساد ہوا جس میں دونوں فرقوں کا جانی اور مالی نقصان ہوا۔ فساد کی آگ کسی طرح بجھنے نہ پاتی تھی۔ اس وقت کے بہار کے وزیر ڈاکٹر سید محمود نے اپنے معتمد خاص جناب مجتبیٰ کو گاندھی جی کے پاس روانہ کیا اور گاندھی جی کے نام ایک خط بھی لکھا۔ خط پاتے ہی گاندھی جی بے چین ہو گئے اور اپنے تمام ضروری امور کو چھوڑ کر پٹنہ کے لیے عازم سفر ہوئے۔ راستے میں فتوا قصبہ میں جب گاندھی جی پہنچے تو پروفیسر عبدالباری نے ان کا پرجوش استقبال کیا۔ مہاتما گاندھی نے ڈاکٹر سید محمود کے ساتھ رہنا پسند کیا۔ یہاں سے گاندھی جی بغرض ملاقات عبدالعزیز صاحب کے پاس گئے جو بہار پروینشل مسلم لیگ کے صدر تھے۔ یہیں پر مہاتما جی نے ایس۔ ایم۔ اسمٰعیل، اپوزیشن لیڈر سے بھی ملاقات کی اور اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ ان دونوں مسلم رہنماؤں نے گاندھی جی کا پوری طرح ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ گاندھی جی نے ڈاکٹر راجندر پرساد، ڈاکٹر اے۔ کے۔ سنہا، سری کرشن سنگھ، بی۔ این۔ سنگھ، جے پرکاش نارائن اور صوبائی مسلم لیگ کے عہدیداروں کو اپنے اعتماد میں لے کر فساد زدہ علاقوں کا دورہ شروع کیا۔ مہاتما گاندھی نے یہ بات محسوس کی کہ حکومت کو انتباہ یا دونوں فرقوں کے لوگوں سے "فساد نہ کرنے" پر دستخطی مہم موثر نہیں ہوگی۔ اسے موثر بنانے کے لیے مہاتما گاندھی جب تک بہار کے دورے پر رہے ہر شام اپنی پرارتھنا سبھا کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کی صدیوں سے چلی آرہی ہم آہنگی پر روشنی ڈالتے رہے۔ انھوں نے ہندوؤں سے اپیل کی کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کو سنیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا ان کا ضمیر اپنے بھائیوں کا خون بہانے کے لیے کہہ رہا ہے یا انھیں گلے لگانے کا مشورہ دے رہا ہے۔ اگر ان کا ضمیر اقلیتی فرقے کے لوگوں کا خون بہانے کے حق میں ہے تو یہ سمجھ لیجیے کہ وہ سچے ہندو نہیں ہیں۔ ان کا ہندو دھرم، ہندو تعلیم، ہندو روایت سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ صرف نام کے ہندو ہیں۔ جو ہندو مذہب پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے باطن کو روشن کریں۔ اپنے خیالات کو صاف ستھرا کریں اور کھلے دل سے میدان عمل میں اتر آئیں اور جو کچھ ہوا ہے اس پر اظہار افسوس کر کے فساد سے متاثرہ لوگوں کی اشک شوئی کریں۔ یہی تعلیم انھوں نے مسلمانوں کو دی۔ گاندھی جی کے ان پیغامات کا خاطر خواہ اثر ہوا اور نہ صرف پٹنہ بلکہ پورا بہار فسادات کے سیلاب سے بچ گیا۔

گاندھی جی نے اپنے اس مشن کی کامیابی کا سہرا بہار کانگریس کمیٹی کے صدر پروفیسر عبدالباری کے سر رکھا اور اعلان کیا کہ جس خلوص اور نیک نیتی سے پروفیسر عبدالباری اور ان کے ساتھی امن قائم کرنے میں ان کے شانہ بشانہ رہے ہیں وہ قابل تقلید امر ہے۔ گاندھی جی کے کامیاب دورے سے ہر خاص و عام متاثر ہوا۔ جناب جعفر امام ایم۔ ایل۔ اے و صدر بہار مسلم پروینشل مسلم لیگ اور مظہر امام ایم۔ ایل۔ اے بھی گاندھی جی سے ملے، اور یک جہتی کی بہتر اور سدھرتی ہوئی فضا کے بارے میں ان سے گفتگو کی۔ اس میٹنگ کے بعد ہی جناب ایم یونس، مسلم لیگ سینٹرل ریلیف کمیٹی نے گاندھی جی سے ملاقات کی اور گاندھی جی سے وعدہ کیا کہ وہ تمام صوبے کی فضا کو خوشگوار بنائے رکھنے میں سرگرم عمل رہیں گے۔ گاندھی جی نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ مختلف سیاسی پارٹیوں کو بھی اس قومی خدمت کے لیے میدان عمل میں کود پڑنا ہے کیوں کہ یک جہتی اور ہم آہنگی کی فضا صرف گاندھی جی یا صرف کانگریس پارٹی یا صرف کسی ایک جماعت سے قائم نہیں کی جاسکتی۔ اس فضا کو قائم کرنے کے لیے مشترکہ کوششوں اور قربانیوں کی ضرورت ہے۔ گاندھی جی نے اس بات کا تحریری طور پر اعلان کیا کہ ہر دو فرقے کے لوگ یہ نہیں چاہتے کہ آپس میں فساد برپا کریں بلکہ مذہبی جذبات کو بھڑکانا اور فساد کرانا ایک معمول بن گیا ہے جس سے پڑھے لکھے اور غیر پڑھے لکھے سب ہی دور رہیں تو زیادہ مناسب ہے۔ اس سلسلے میں گاندھی جی نے مختلف آرا رکھنے والوں سے بھی ملاقات کی اور اپنی تجاویز خاص طور پر قومی یک جہتی کی ان کے سامنے پیش کیں۔ ان ملاقاتیوں میں ڈاکٹر سچدانند سنہا، کرنل محبوب احمد، قاضی احمد حسین، سرحامی، مولوی نوراللہ اور محمد نور جیسے سرکردہ افراد شامل تھے۔

گاندھی جی کے دورۂ بہار میں سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں بھی ان کے ساتھ تھے۔ اکثر اوقات بجائے گاندھی جی کے خان عبدالغفار خاں تقریر کرتے۔ جسے نہ صرف سامعین بلکہ گاندھی جی بھی غور سے سنتے۔ ایک مرتبہ سرحدی گاندھی کی تقریر سننے کے بعد سامعین نے گاندھی جی سے مطالبہ کیا کہ وہ بھی ان سے کچھ کلمات کہیں۔ گاندھی جی نے ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے کہا کہ جو کچھ بھی میرے بڑے بھائی سرحدی گاندھی نے آپ لوگوں کے سامنے کہا وہ میرے دل کی آواز ہے، اس لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ہم لوگوں کو سننے کے بعد آپ میدان عمل میں کود پڑیں۔

خان عبدالغفار خاں نے مہاتما جی کے ساتھ جو پھلواری شریف کا دورہ کیا وہ اپنی نوعیت کا منفرد دورہ تھا۔ پھلواری شریف کے ایک قصبے "پارسا" میں زبردست فساد برپا ہوا اور وہاں کی مسلم آبادی کے مکانات اور دکانیں جلادی گئیں۔ چونکہ گاندھی جی پٹنہ میں تھے اس لیے انھوں نے

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

ماں کے دُودھ پر بچّے کی پرورش

حالیہ اوقات میں "ماں کے دودھ" کے بارے میں بہت دلچسپی لی جانے لگی ہے اور طبّی تحقیق بھی کی جا رہی ہے۔ اس تحقیق و مطالعہ سے صدیوں سے جانے مانے حقائق و عقائد کی تصدیق ہو گئی ہے۔ ماں کا دُودھ بچّے کا نقاہت سے تحفظ کرتا ہے اور اُس کی جسمانی و ذہنی نشو ونما میں بڑی مدد دیتا ہے۔

ہر بچّے کو اپنی پیدائش سے ہی یہ ناگزیر حق حاصل ہے کہ اُسے بہتر طور پر غذا میسّر ہو اور اُس کی اچھی طرح نشوونما کی جائے اُسے ایسی غذا ملے جس سے اُسے زیادہ سے زیادہ صحت اور جسمانی و ذہنی نشو ونما پانے اور برقرار رکھنے میں مدد ملے۔ حالیہ طبّی تحقیق و مطالعہ سے اس امر کی تصدیق ہو گئی ہے کہ اگر بچّے کی پرورش ماں کے دودھ پر کی جائے تو اُس کی نشو ونما بہترین طور پر ہوتی ہے۔ لہٰذا ماں کے دودھ کو غذائے اطفال کی مثالی صورت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ ماہرینِ غذائیت کا بیان ہے کہ جن ماؤں کو اچھی غذا نہیں ملتی اُن کا دُودھ بھی ڈبّہ بند دودھ اور غذاؤں سے زیادہ قوّت بخش ہے کیوں کہ وہ طبّی اور نفسیاتی طور پر اور حفظانِ صحت کے نقطۂ نگاہ سے چھ ماہ تک کی عمر کے بچّوں کے لیے بہترین غذا ہے۔

ماں کے دُودھ سے بچّہ اور ماں کو جو بیشتر فوائد پہونچتے ہیں اُن کے باوجود حالیہ برسوں میں بچّوں کی نشوونما کو بڑھاوا دینے والے طریقوں میں سب سے زیادہ دھکّا لگا ہے ماؤں کی طرف سے بچّوں کو اپنا دُودھ پلانے کے رواج کو۔ اب تو شہروں اور دیہات میں ایسی ماؤں کو عام دیکھا جاتا ہے جن کا پختہ یقین ہے کہ ڈبّہ بند دودھ یا مویشیوں کے دودھ سے بچّے زیادہ صحت مند اور زیادہ پھرتیلے ہوتے ہیں اور اُن کی ہڈّیاں زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔

اس عقیدے کے ساتھ یہ احساس بھی وابستہ ہے کہ اگر عمر کے ابتدائی ہفتوں میں بچّے کو ڈبّہ بند دودھ یا دوسرے دُودھ کا عادی بنایا جائے تو بچّے کو نیم ٹھوس اور خالص دُودھ شروع کرانا مشکل ہو جائے گا۔ بیشتر حالتوں میں لوگ بعض غلط خیالات کا شکار ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ایسا ہی خیال ہے کہ بچّے کو اپنا دُودھ پلانے سے ماں کی خوبصورتی جاتی رہتی ہے یا وہ کمزور ہو سکتی ہے۔ ایسے غلط خیالات کئی اسباب سے پیدا ہوتے ہیں۔ اکثر یہ اُس پبلسٹی اور بکری کی پالیسی کا نتیجہ ہو سکتا ہے جو بچّوں کے لیے خوراکی سامان تیار کرنے والی کمپنیوں کی طرف سے اختیار کی جاتی ہے۔

یہ چال بعض اوقات اس حقیقت کے باوجود کارگر ثابت ہوتی ہے کہ بچّوں کی کوئی ایسی غذا ایجاد نہیں ہوئی جو صحتی، غذائی اور جغرافیائی ضروریات کے لحاظ سے ماں کی محبّت یا اُس کی موزونیت کی جگہ لے سکے۔

حیاتیاتی خصوصیات

فطرت نے دُودھ پلانے والی مخلوق کو ایسے دُودھ خیز غدود عطا کئے ہیں جن کا اہم ترین عمل

ہے ان کے لیے بھی کیونکہ ان کے اپنے ہی دودھ سے نشوونما کرنا فطرت نے دودھ کی کچھ اس طرح تشکیل کی ہے کہ وہ بہت حد تک بچے کی ضروریات سے مطابقت رکھتا ہے۔ حالیہ طبی تحقیق اور مطالعے سے ماں کے دودھ کی کیمیاوی و حیاتیاتی خصوصیات پر بہت زیادہ روشنی پڑتی ہے جس سے بچے کی افزائش، صحت اور نشوونما کو بڑھاوا دینے کے معاملے میں تمام قسم کے ڈبہ بند دودھ پر اس کی برتری ثابت ہو گئی ہے۔

ڈبہ بند دودھ اور اس سے بنی غذائیں تساہل پیدا کرتی ہیں اور اُن کے اجزا مقررہ ہوتے ہیں لیکن ان کے برعکس ماں کا دودھ جیتی پیدا کرتا ہے اور اس کے اجزا اور پیداوار بچے کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ماں کے دودھ میں شروع میں چکنائی کا جزو کم ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ آخر میں بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے پہلے پانچ دنوں کے دوران جو "کولوسٹرم" (چربی) بن کر حوں ہیں جاتی ہے اُس کی تشکیل ڈبہ بند دودھ سے بنے والے "کولوسٹرم" سے مختلف ہوتی ہے۔ اس میں چکنائی کم ہوتی ہے لیکن پروٹین زیادہ ہوتی ہے۔ اور اس میں "اینٹی باڈیز" کا بھی بھاری اجتماع ہوتا ہے جو چھوت کی بیماریوں سے تحفظ کرتا ہے۔ یہ فولاد، وٹامن اور معدنی اجزا کا بھی بڑا وسیلہ ہوتا ہے۔ ڈبہ بند دودھ کے برعکس ماں کے دودھ میں "کیسین" کا نسبتاً کم تناسب ہوتا ہے جس کے نتیجے میں نرم تر دہی بنتی ہے، وہ آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے اور قبض کا بہت کم امکان رہتا ہے۔ چکنائی میں ایسے اعلیٰ سطح کے غیر چکنائی دار تیزاب ہوتے ہیں جو موٹاپا پیدا نہیں کرتے اور وہ چکنائی وٹامن "ای" بھی فراہم کرتی ہے۔ ماں کے دودھ میں موجود کیلشیم اور فولاد ڈبہ بند دودھ کے انہی عناصر کی بہ نسبت زیادہ زود ہضم ہوتے ہیں۔ ماں کے دودھ کے "اینٹی باڈیز" وہی ہوتے ہیں جو اُس چھوت کا مقابلہ کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں جس کا ماں کو اپنے ماحول میں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ڈبہ بند دودھ میں ایسے تحفظاتی "اینٹی باڈیز" نہیں ہوتے اور دُنیا کی تمام دولت سے انھیں خریدا بھی نہیں جا سکتا۔

ماں کے دودھ میں زیادہ کاربوہائیڈریٹ (نشاستہ) ہوتے ہیں اور اعلیٰ قسم کی پروٹین اور لوہے جیسے معدنیات ہوتے ہیں۔ اور اس میں ٹھوس پن کم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دودھ بچوں کو جلد ہضم ہو جاتا ہے۔ خواہ پیدائش کے وقت بچے کا وزن کم یا نارمل ہو اور یا وہ قبل از وقت پیدا ہو گیا ہو۔ اس کے برعکس ہر جانور ایسا دودھ پیدا کرتا ہے جو اس کی اپنی بقا اور افزائش کے لیے نہایت سازگار ہے اور جو انسانی دودھ سے بہت زیادہ مختلف ہوتا ہے۔ بھینسوں جیسے مویشیوں کے دودھ میں چکنائی بہت زیادہ ہوتی ہے اور وہ زیادہ ٹھوس ہوتا ہے اور اس لیے پہلے چند ہفتوں میں بچوں کے لیے موافق نہیں ہوتا۔ اس میں تقریباً ہمیشہ پانی ملا کر اسے پتلا کیا جاتا ہے۔ تجارتی طور پر دستیاب بچوں کی غذا کسی جانور کا خالص دودھ نہیں ہوتی بلکہ گائے کے دودھ میں مکئی، سویابین اور ناریل کا تیل ملا کر تیار کی جاتی ہے اور اس میں وٹامن بھی ملائے جاتے ہیں تاکہ وہ غذائی فراہمی کے لیے موزوں ہو سکے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ماں کا دودھ کم از کم غذائی اجزا کے اعتبار سے بچوں کے لیے دستیاب تمام قسم کے دودھ سے نہایت سازگار دودھ ہے۔ چنانچہ ماں کا دودھ بچے کے لیے مثالی غذا ہے کیوں کہ اس میں "لیکٹو بیکٹیریا" ہوتے ہیں۔ اس میں ڈبہ بند دودھ کے مقابلے میں کم کاربوہائیڈریٹ، چکنائی اور شکر ہوتی ہے لیکن پروٹین، وٹامن، سوڈیم اور پوٹاشیم زیادہ ہوتے ہیں۔ ردِ عمل کے لحاظ سے اس میں شوریت ہوتی ہے۔ اور یہ تحفظاتی اینٹی باڈیز فراہم کرتا ہے۔

ماں کے دودھ کے فوائد بچوں کیلئے

۱۔ یہ درست درجۂ حرارت پر دستیاب ہے۔ یعنی جسم کے درجۂ حرارت سے مطابقت رکھتا ہے۔

۲۔ یہ آسانی سے ہضم ہو سکتا ہے۔

۳۔ اس میں زیادہ صفائی ہوتی ہے اور بیرونی چھوت کے امکانات کم ہوتے ہیں جو غیر صاف دودھ، بوتل، آلودہ پانی یا شکر یا برتنوں کے ذریعہ داخل ہوتی ہے۔

۴۔ یہ پروٹین، وٹامن اور معدنیات جیسے تمام اجزا فراہم کرتا ہے جو اس لحاظ سے دوسری ڈبہ بند غذاؤں سے بچے کی افزائش کے لیے بہتر ہے۔

۵۔ ماں کے دودھ پر پرورش پانے والے بچے بوتلوں سے دودھ پینے والے بچوں کی نسبت زیادہ صحت مند ہوتے ہیں اور ان میں جراثیمی چھوت، خصوصاً پیٹ کی بیماریوں سے لڑنے کی زیادہ طاقت ہوتی ہے۔

۶۔ ماں کا دودھ بچے کو انسانی محبت کی گرمی اور جذباتی سلامتی مُہیا کرتا ہے۔

ماں کے لیے فائدہ

۱۔ اس سے نہ صرف ماں اور بچے کے درمیان پیار کا رشتہ استوار ہوتا ہے بلکہ ماں کو آسودگی بھی ملتی ہے۔

۲۔ دودھ پلانے سے ماں کی چھاتیاں صحیح حالت میں رہتی ہیں اور انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

۳۔ اس سے ماؤں کو چھاتی کا کینسر ہونے کا بہت کم امکان رہتا ہے۔

۴۔ اس سے ماں کے جسم کا وہ وزن کم ہو جاتا

بچے چھاتیوں کے دوران بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے جسم کو پتلا کرنے کے لیے غذا میں کمی کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

۵۔ یہ آسانی سے دستیاب ہے اور اس طرح ماں کے لیے وقت اور توانائی میں بچت کرتا ہے۔

۶۔ یہ ارزاں اور کفایتی ہے اس لیے اس پر فاضل اخراجات کی ضرورت نہیں رہتی۔

۷۔ چھاتیاں چوسے جانے کی وجہ سے اگلے حمل کے لیے تاخیر ہو جاتی ہے۔

ماں کا دودھ کب شروع کیا جائے

ماں کا دودھ پیدائش کے بعد جلد از جلد دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض بچوں کے ڈاکٹروں نے یہ سفارش بھی کی ہے کہ مائیں بچہ جننے کے کمرے میں ہی بچوں کو دودھ پلائیں۔ کولسٹرم۔ پہلا دودھ۔ سیال جو دودھ کی مانند معلوم نہیں ہوتا، نوزائدہ بچے کے لیے مکمل غذا ہے۔ جلد دودھ پلانے سے ماں کی چھاتیوں میں جلد دودھ اُترنا شروع ہو جاتا ہے اور نوزائدہ بچوں میں بار بار ہونے والے امراض کی روک تھام کرتا ہے جیسے کہ یرقان اور اسہال کے خطرناک امراض۔

بچے کو دودھ پلاتے وقت حسب ذیل باتوں کا خیال رکھا جائے۔

دودھ پلانے سے پہلے چھاتیوں کو موزوں طور پر صاف کر لینا چاہیئے۔ چھاتیوں کو بچے کے ناک سے دور رکھا جائے تاکہ وہ آسانی سے سانس لے سکے۔ جب بھی دودھ پلایا جائے بچے کو دونوں چھاتیوں سے پلایا جائے۔ دودھ پلانے کے بعد بچے کو اٹھایئے اور اس کی پیٹھ کو تھپتھپایئے حتیٰ کہ اُسے ڈکار آ جائے۔

ضمنی غذائیں

ماں کی چھاتیوں میں روزانہ تقریباً ۸۰۰ ملی لیٹر تک دودھ تیار ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ جب بچہ ۴-۶ ماہ کا ہو جائے تو اُسے نیم ٹھوس غذائیں اور باہر کا دودھ دیا جائے لیکن ماں کا دودھ تب تک جاری رکھا جانا چاہیئے جب تک وہ کافی دودھ پیدا کرتی ہے اور ضمنی غذائیں بچوں کی خوراک میں رفتہ رفتہ شامل کی جا سکتی ہیں۔ یہ یاد رکھنا انتہائی ضروری ہے کہ جہاں بوتل سے دودھ پلانا آسان معلوم ہوتا ہے وہاں وہ حقیقت میں ایک ٹیڑھا معاملہ ہے اور اس کے لیے علم اور ہنر کی ضرورت ہے۔ چھ مہینے کے بعد بچے کو دودھ پیالے یا کٹوری میں اور ٹھوس غذا چمچے کے ساتھ آسانی سے دی جا سکتی ہے۔ صفائی اور دودھ کی تیاری کے علم کے بغیر بوتلوں سے دودھ پلانا چھوٹے بچوں کے لیے فائدہ مند ہونے کے بجائے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک عام رواج جس کا تذکرہ اور مذمت کرنے کی ضرورت ہے وہ ہے ماں کا دودھ آنے سے پہلے بچے کو شہد یا جنم گھٹی وغیرہ دینا۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا البتہ بچے کے پھیپھڑے میں خرابی آ سکتی ہے اور چھوت پیدا ہو سکتی ہے۔

خلاصہ

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لاڈ پیار کے ساتھ ماں کا دودھ ملنے سے بچے کی صحت بہتر ہوتی ہے۔ یہ الفاظ گو صدیوں پہلے لکھے گئے تھے تاہم آج بھی وہ صادق ہیں اور سائنسی دنیا میں انھیں نہ فوقیت دی گئی ہے اور نہ ہی اُن کی مذمت کی گئی ہے۔ ماں کے دودھ سے متعلق تازہ ترین معلومات سے بھی جو حالیہ اوقات میں ہماری دلچسپی اور طبی تحقیق کا موضوع رہا ہے تقریباً اُن تمام حقائق اور عقائد کی توثیق ہو گئی ہے جو صدیوں سے ماں کے دودھ کے بارے میں مشہور ہیں یعنی کہ بچے کا تحفظ کرتا ہے اور جسمانی و نفسیاتی طور پر اُس کی نشوونما میں مدد کرتا ہے۔ لہٰذا ماؤں کو مشورہ دیا جانا چاہیئے اور اس امر کے لیے اُن کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے کہ وہ بچوں کی پرورش اپنے دودھ پر کریں۔ ●

بقیہ: زمینی اصلاحات کا مسئلہ

(۳) آندھرا پردیش، بہار، ہریانہ، پنجاب، اور تامل ناڈو میں مزارعوں کے نام نہیں لکھے گئے یا پھر مزارعوں کے رجسٹر مکمل نہیں کیے گئے۔ اڑیسہ میں بٹائی داروں کے نام درج نہیں کیے گئے۔

(۴) کیرالہ، میگھالیہ، ناگالینڈ، اڑیسہ، سکم، تریپورہ، مغربی بنگال، اروناچل پردیش، گوا دمن دیو، لکش دیپ اور میزورم میں گرداوری کر کے ریکارڈ مکمل کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہی حال آسام، منی پور، میگھالیہ، ناگالینڈ، اروناچل پردیش اور میزورم کے پہاڑی علاقوں کا ہے۔ مغربی بنگال، گوا، دمن اور دیو اور لکش دیپ میں بھی گرداوری کرنے کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔

ان حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ریاستوں سے کہا گیا ہے کہ کھاتوں، کھتونیوں کو جلد از جلد مکمل کرنے کی بھرپور کوششیں کریں اور ایسا نظام قائم کریں کہ ہر سال کھیتوں کی گرداوری کر کے زمین اور فصل کا صحیح صحیح ریکارڈ رکھا جائے۔ ریاستوں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ زمین کے مالکوں اور مزارعوں کو قانونی حیثیت کی پٹہ پاس بکیں جاری کریں۔ ساتویں پلان کے دوران مرکز کی تجویز کردہ ایک اسکیم پر عمل درآمد کرنے کا خیال ہے تاکہ محکمہ مال کو مضبوط بنایا جائے اور ریاستوں میں زمینی کھاتوں کو مکمل کیا جائے۔ اس نئی اسکیم پر ساتویں پلان کے دوران ۱۲ کروڑ روپے کے لگ بھگ روپیہ مرکز کی طرف سے صرف کرنے کی تجویز ہے۔ ●

ایم ایل۔ بجاج٭

بیساکھی

قومی یکجہتی کا علامتی تیوہار

فصلیں پک کر تیار ہیں
گیہوں کی سنہری بالیاں دیکھ کر کسان کا دل باغ باغ ہو رہا ہے۔

رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس جوان، بوڑھے، بچے اور عورتیں گاؤں کے میلے میں جمع ہو رہی ہیں۔

سرو قد جوانوں نے حلقہ بنا لیا ہے، ڈھول بج رہے ہیں، ڈھول کی تھاپ پر جوانوں کے قدم تھرک رہے ہیں۔ اچانک بھنگڑا ناچ میں تیزی آجاتی ہے اور کسان مستی کے عالم میں جھوم اُٹھتے ہیں۔ قلابازیاں لگاتے ہیں۔ "مگّے" بجاتے ہیں (خوشی سے کلکاریاں لگاتے ہیں) بعد ازاں "ٹپّے" اور "ماہیئے" (لوک گیت) گائے جاتے ہیں۔ عورتیں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتیں۔ وہ "گِدّا" (تالی پیٹ پیٹ کر) گاتی ہیں۔ اور ساری فضا میں مستی چھا جاتی ہے۔ تو یہ ہے بیساکھی کا تیوہار جو ہر برس ہند دکلنڈر کے مطابق بیساکھ ماہ کی پہلی تاریخ اور عیسوی کلنڈر کے مطابق ۱۳ اپریل کو آتا ہے اور فضا میں خوشیاں بکھیر دیتا ہے۔ یہ تیوہار زیادہ تر شمالی بھارت میں، ایسے وقت میں منایا جاتا ہے جب فصلیں پک کر تیار ہو جاتی ہیں۔ یہی تو کسان کا خزانہ ہے جسے دیکھ کر وہ خوشی سے ناچتا ہوا گانے لگتا ہے۔ "جٹا آئی بساکھی تے کدکاں دی مُک گئی راکھی" (مطلب، اے جاٹ بھائی بیساکھی آگئی ہے اور گیہوں کی فصل کی رکھوالی کی ضرورت نہیں رہی) اُس دن سے فصلوں کی کٹائی شروع ہو جاتی ہے اور کسان کے گھر دولت آنی شروع ہو جاتی ہے۔

اگرچہ یہ تیوہار بعض دیگر ریاستوں میں بھی منایا جاتا ہے اور کہیں کہیں نو نیا سمت بھی شروع ہوتا ہے اور سے ہی کھانے تقسیم کئے جاتے ہیں، تاہم یہ زیادہ جوش و خروش کے ساتھ پنجاب میں ہی منایا جاتا ہے۔ جہاں جگہ جگہ میلے لگتے ہیں اور زندہ دلانِ پنجاب ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ کئی شہروں اور قصبوں میں مال مویشی کی منڈیاں لگتی ہیں اور کسان اپنے لیے ڈھور ڈنگر خریدتے ہیں۔

اس تیوہار کو دائمی اور مستقل صورت دینے کے لیے تقدس کا رنگ دیا گیا ہے۔ مقدس ندیوں، دریاؤں اور تالابوں میں اشنان کر کے مذہبی رسوم ادا کی جاتی ہیں اور خوشحالی کے لیے پرارتھنائیں اور دعائیں کی جاتی ہیں۔ اگرچہ اس تیوہار کا تعلق عموماً ہندوؤں اور سکھوں سے ہے تاہم تقسیم وطن سے پہلے متحدہ پنجاب میں مسلمان بھی ان میلوں میں شرکت کرتے تھے بلکہ بعض مقامات پر اُن کی طرف سے ایسے ہی میلوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر پوٹھوہار (راولپنڈی کے علاقے) میں ہندو کٹاس راج کے سرودر (تالاب) میں اشنان کرتے تھے تو مسلمانوں کی طرف سے چیت ماہ کے آخری جمعہ کو جو عموماً یکم بیساکھ سے دو تین دن پہلے آتا تھا چوہا سیدن شاہ پر میلے کا اہتمام کیا جاتا تھا جہاں راگ رنگ کی محفلیں جمتی تھیں۔ ناچنے اور گانے والیاں میلے کی رونق بڑھاتی تھیں۔ ان محفلوں میں ہندو بھی شرکت کرتے تھے اور پھر اسی طرح دو تین دن بعد ہونے والے بیساکھی کے میلے میں مسلمان بھی حصہ لیتے تھے۔

اسی طرح ہیر رانجھے کے وطن جھنگ میں دریائے چناب کے کنارے بیساکھی کا میلہ لگتا تھا جس میں بڑی چہل پہل ہوتی تھی۔ لوگ رنگ برنگے کپڑے پہن کر میلے میں شرکت کرتے تھے۔ ان میں کشتیاں بھی ہوتی تھیں۔ میلے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مسلمان ہندوؤں کی نسبت زیادہ تعداد میں

٭ ۵۸ ملک بلڈنگ، چونا منڈی، پہاڑ گنج۔ نئی دہلی
یوجنا، نئی دہلی

شامل ہوتے تھے اور جھگڑا ڈالنے والے زیادہ تر مسلمان ہوا کرتے تھے جو عموماً نواحی دیہات سے آتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایسا بھائی چارہ تھا کہ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ دن اب تو خواب ہو گئے ہیں۔

سکھوں کے لیے اس تیوہار کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ یہ دن خالصہ کا جنم دن ہے۔ کوئی تین سو برس پہلے ۱۳ اپریل ۱۶۹۹ء کو دسویں گورو گوبند سنگھ جی نے خالصہ پنتھ کی بنیاد رکھی تھی۔ تب سے ہر برس ۱۳ اپریل کو بیساکھی اسی تقریب کے سلسلے میں منائی جاتی ہے۔ پنجاب کے گوردواروں میں سکھوں کے اجتماع ہوتے ہیں اور امرتسر میں تو بالخصوص رونق ہوتی ہے جہاں ہرمندر صاحب کے پوتر سرووَر میں عقیدتمند اشنان کرتے ہیں اور بعد ازاں بیساکھی کے میلے میں شرکت کرتے ہیں۔

جہاں جہاں بھارت واسی اور خصوصاً سکھ لوگ گئے ہیں وہاں بھی یہ تیوہار بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ افغانستان میں منائی جانے والی بیساکھی جہاں سکھوں کی مذہب کے تئیں عقیدتمندی کی مظہر ہے وہاں وہ مسلم ملک افغانستان کی مذہبی رواداری اور وہاں کی مذہبی آزادی کا ثبوت بھی بہم پہونچاتی ہے۔ بیساکھی سے ایک روز قبل کابل میں رہنے والے بھارتی کابل سے جلوس کی صورت میں چشمہ صاحب کی جانب روانہ ہوتے ہیں جہاں بھاری میلہ منعقد ہوتا ہے۔ جلوس کے ہمراہ لوک گیت گانے والوں کی ٹولی بھی چلتی ہے۔ چشمہ صاحب، پنجہ صاحب (حسن ابدال) کی مانند ایک پوتر سرووَر ہے۔ یہ ایک تاریخی مقام ہے جہاں گورو نانک دیو جی نے افغانستان میں سے گذرتے ہوئے آرام کرنے کی غرض سے قیام کیا تھا۔

یوں تو بیساکھی کا تہوار پہلے ہی ثقافتی طور پر "سیکولر" اور مذہبی رنگت رکھنے کے باوجود غیر فرقہ وارانہ تھا تاہم اس کی عظمت کو چار چاند لگائے جلیانوالہ باغ کے سانحہ نے جو ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو عمل میں آیا۔ اس نے قومی یکجہتی کو استوار کرنے اور بھارت کی آزادی کی بنیاد کو مضبوط کرنے میں بے مثل رول ادا کیا ہے۔ اس سانحہ میں ہندو کا خون بہا، مسلمان کا خون بہا اور سکھ کا خون بہا جس سے آزادی کے چمن کی آبیاری ہوئی۔

پہلی جنگِ عظیم میں گاندھی جی نے انگریزی سرکار کی مدد اس شرط پر کی تھی کہ جنگ کے اختتام کے بعد بھارت کو آزادی دی جائے گی لیکن ہندوستان کے بہادر سپاہیوں اور روپے پیسے کی مدد سے جنگ جیتنے کے بعد برطانوی سرکار نے بھارت کے رہنماؤں کو انگوٹھا دکھا دیا۔ اس پر سارا ملک تڑپ اٹھا۔ جگہ جگہ احتجاجی مظاہرے ہونے لگے اور جلوس نکالے جانے لگے۔ انگریزی سرکار نے رولٹ ایکٹ نافذ کر دیا اور جلوسوں جلسوں پر پابندی عائد کر دی۔ گاندھی جی نے ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو تمام ملک میں ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ بس پھر کیا تھا جگہ جگہ لوگوں کی ٹولیاں ہاتھوں میں ترنگے لیکر گلیوں اور بازاروں میں گھومنے لگیں اور انگریزی سرکار کے خلاف نعرے لگا کر رولٹ ایکٹ کی دھجیاں اڑانے لگیں۔

دلی میں سوامی شردھا نند کی قیادت میں زبردست مظاہرہ ہوا۔ ایک موقع پر جب ایک سپاہی نے ایک ٹولی پر گولی چلانے کے لیے بندوق اٹھائی تو ایک مسلمان نے (جس کا نام شاید عبداللہ تھا) لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ دوسرے سپاہی نے اس کی گردن کاٹ دی۔ اس طرح اس مسلم نوجوان نے جامِ شہادت نوش کر لیا۔ ہندو اور مسلمان ان سے جلوسوں اور جلسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ پنجاب میں ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو جو عوام کی رہنمائی کر رہے تھے گرفتار کر کے کسی نامعلوم مقام کو بھیج دیا گیا۔ قوم پرستی کے روح پرور نظارے ہر سو دکھائی دے رہے تھے۔ قومی یکجہتی اپنے عروج پر اس قدر پہونچ چکی تھی کہ اسی دور میں جامع مسجد دلی کے منبر سے جو محض امام کے خطبہ کے لیے ہی مخصوص ہے آریہ سماج کے لیڈر سوامی شردھا نند کو لیکچر کرنے کی سعادت بخشی گئی۔

خیر! لوگوں کے دلوں میں جوش و خروش کا لاوا ابل رہا تھا اور کہیں کہیں وہ خود کو قابو میں نہ رکھ سکے تھے۔ چند مقامات پر توڑ پھوڑ کا ہونا قدرتی امر تھا۔ انگریزی حکومت نے ان حالات سے نپٹنے کے لیے پنجاب میں مارشل لا نافذ کر دیا، اور امرتسر کو فوج کے حوالے کر دیا۔ لوگوں کو رینگ کر چلنے اور برطانوی پرچم یونین جیک کو سلامی دینے پر مجبور کیا جانے لگا۔ حکم عدولی کرنے والوں کو سر بازار کوڑے لگائے جانے لگے۔ غیرتمند بھارتی اس ذلت آمیز سلوک کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ میں احتجاجی جلسہ کرنے کا اعلان کر دیا۔ چونکہ وہ بیساکھی کا روز تھا لوگ گرد و نواح سے بھاری تعداد میں امرتسر آئے ہوئے تھے۔ شام کے چار بجے جلیانوالہ باغ میں جلسہ منعقد ہوا۔ گرفتاری کے باعث ڈاکٹر کچلو کی عدم موجودگی میں لوگوں نے کرسیٔ صدارت پر اُن کا فوٹو رکھ دیا اور پُرجوش تقریریں شروع کر دیں۔ جلسے میں ہندو، مسلمان اور سکھ بھاری تعداد میں موجود تھے کیونکہ انگریزی حکومت نے اُن کی غیرت کو چنوتی دی تھی جسے وہ برداشت نہیں کر سکے۔ کچھ ہی دیر میں انگریز جنرل ڈائر اپنے فوجی دستے کو لے کر جو مشین گنوں سے لیس تھا وہاں آ دھمکا اور اس نے آتے ہی کوئی وارننگ دیے بغیر نہتے اور پُرامن بھارتیوں پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ جلیانوالہ باغ میں داخل ہونے اور نکلنے کا راستہ بہت تنگ تھا۔

(باقی صفحہ ۳ پر)

ڈاکٹر شفیق اعظمی

منشی پریم چند اور اُردو ناول

بقول اکبر رحمانی "منشی پریم چند اُردو افسانوی ادب کا وہ گوہر آبدار ہے جس کی چمک دمک، قدر و قیمت زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہی رہے گی۔" وہ آگے تحریر فرماتے ہیں:

"اس قطرے کو گوہر آبدار بننے تک نہ جانے کیسے طوفان سے گزرنا پڑا، دکھ درد کی موجوں کے کیسے کیسے تھپیڑے سہنے پڑے، صبر آزما ریاضت کی کن کن بھٹیوں سے گزرنا پڑا۔ یہ ایک داستان جد و جہد کشمکش ہے جو ایک ادیب جیسی اور حقیقت پسند سامان رکھتی ہے۔ اس داستان کو جانے بغیر پریم چند کے فکر و فن کی شناخت نہیں ہو سکتی۔"[لہ]

منشی پریم چند کا جنم ۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء میں پانڈے پور کے قریب موضع لمہی میں ہوا تھا، جو سارناتھ سے پانچ چھ کلومیٹر پر واقع ہے۔ ان کے والد منشی عجائب لال ڈاک خانہ میں کلرک تھے۔ آمدنی قلیل تھی۔ گزر بسر تنگی ترشی میں ہوتی تھی۔ پریم چند بچپن میں ہی جبکہ اُن کی عمر محض آٹھ سال کی تھی، ماں کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے تھے۔ ایک آٹھ سال کے بچے کے لیے یہ غم معمولی غم نہ تھا۔ اس پر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ ان کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں سے اُن کی کبھی نہیں بنتی تھی۔ غرضیکہ ماں کی ممتا کے ساتھ ساتھ والد صاحب کی توجہ اور محبت سے بھی محروم ہو گئے۔ غرضیکہ ابتدائی زندگی ہی میں تعدد کی مہر ماتھے پر لگ گئی۔ کسی نہ کسی طرح ٹھوکریں کھا کر اور پھٹے حالوں رہ کر ہائی اسکول پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی بڑی تمنا تھی مگر گھریلو حالات اجازت نہ دیتے تھے۔ اُن کی شادی بھی پندرہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی اور شادی کے ایک سال بعد ان کے والد صاحب کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ ان حالات نے گھریلو ذمہ داریوں کا سارا بوجھ ان پر ڈال دیا۔ آخر انھیں شہر کا رُخ کرنا پڑا۔ وہاں انھیں ایک جگہ پانچ روپے ماہانہ کی ٹیوشن مل گئی اور وہ بچوں کو پڑھانے لگے۔ اور ساتھ ہی انٹرنس کی تیاری بھی کرتے رہے۔ ٹیوشن کے جو پانچ روپے ملتے تھے ان میں سے تین روپے گھر دے دیتے تھے اور دو روپے میں اپنا کام چلاتے تھے۔ کبھی کبھی صرف بھنے ہوئے چنے کھا کر رہ جاتے تھے پھر بھی فاقے کی نوبت آ جاتی تھی۔ تنگ آ کر انھوں نے اپنی کچھ کتابیں جو ان کے پاس تھیں بیچ دیں۔ ایک روز وہ ایک اسٹال پر اپنی کوئی کتاب بیچ رہے تھے کہ وہاں اُن کے ہیڈ ماسٹر صاحب آ گئے۔ جب پریم چند کتاب بیچ کر دکان سے نیچے اُترے تو اُنھوں نے ان سے حال دریافت کیا۔ انھیں منشی پریم چند پر رحم آیا۔ ان دنوں ان کے اسکول میں ایک اسسٹنٹ ٹیچر کی جگہ خالی تھی۔ انھوں نے پریم چند کو اسکول کی نوکری کی پیشکش کی اور پریم چند نے اسے قبول کر لیا۔ تنخواہ اٹھارہ روپے ماہوار مقرر ہوئی اور پریم چند مدرس ہو گئے۔ نوکری مل جانے کے بعد حالات کچھ بہتر ضرور ہوئے مگر آسودگی نصیب نہ ہوئی، یہاں تک کہ انھوں نے نوکری کے دوران ایف اے اور بی اے پاس کیا۔ اسی دوران اسکول ہوتے ہوئے مضامین لکھے، ناول اور افسانے تخلیق کیے۔ اخبار رسالے، غرضیکہ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے بڑی تگ و دو اور بڑی جد و جہد کی لیکن پھر بھی زندگی بھر پریشان ہی رہے۔ انھیں زندگی بھر بھی وہ نہیں ملا جو وہ چاہتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق "ارمانوں کو خاک میں ملانے والی قوتیں، جد و جہد، محنت اور مشقت سے زیادہ طاقتور ہوتی ہیں۔" یہی وجہ ہے کہ انھیں غریبوں، مجبوروں، مظلوموں، کسانوں اور مزدوروں سے بڑی ہمدردی تھی، بقول اکبر رحمانی "دیہاتوں میں پھیلی ہوئی غربت و جہالت، کاشتکاروں اور

ہ معرفت پرنس میڈیکل ہال، سرائے میر، اعظم گڑھ ۔ (یو۔پی)

[illegible] کی تنگ نظری اور پسماندگی، مذہبی ٹھیکیداروں کی ریاکاریوں اور فریب کاریوں کو دیکھ کر ان کا دل [illegible] تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جب ناول لکھنا شروع کیا تو انھیں سب کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ پریم چند ایک حساس دل انسان تھے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا، محسوس کیا اور جو کچھ خود ان کے اوپر بیتی اسے بھی صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا۔ آل احمد سرور تحریر فرماتے ہیں کہ "پریم چند کا میدان اتنا ہی وسیع ہے جتنی کائنات، وہ ایک اچھے قصہ گو اور درجنوں جیتے جاگتے کرداروں کے خالق ہیں۔ وہ ہندوستان میں بیٹھ کر ایران و توران کے افسانے نہیں لکھتے ہیں، وہ یہیں کے مال سے اپنی دوکان سجاتے ہیں۔"[3]

ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے محنت کش عوام کو اپنے افسانوں اور ناولوں میں جگہ دی، انھوں نے اسی دنیا کی تصویر کھینچی جس دنیا میں وہ رہتے تھے۔ اُن کے یہاں بادشاہوں، نوابوں، جنوں اور پریوں، شہزادے اور شہزادیوں کے قصے نہیں ملتے۔ بقول احتشام حسین :

"پریم چند پہلے ادیب ہیں جنھوں نے شعوری طور پر ادب کے ذریعے عوام کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی۔" پریم چند کے یہاں گاندھی جی کا آدرش واد، ٹالسٹائی کی انسان دوستی اور چیخوف کی سماجی حقیقت نگاری سب کچھ ملتی ہے۔ پریم چند افادی ادب کے علم بردار تھے، انھوں نے جتنے بھی ناول تخلیق کئے ہیں سب کسی نہ کسی مقصد کے تحت کئے ہیں۔ پریم چند پہلے ناول نگار ہیں جن کے ناولوں میں پہلی بار زندگی کے مسائل پر سنجیدگی سے بحث کی گئی ہے۔ ان کے لکھنے کا مقصد صرف تفریح طبع یا حسن و عشق کی قصیدہ سرائی نہ تھا بلکہ وہ ادب کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت سرانجام دینا چاہتے تھے اور سماج کی اصلاح بھی، چنانچہ انھوں نے جتنے بھی ناول تخلیق کئے ہیں سب کسی نہ کسی مقصد ہی کے تحت لکھے ہیں۔

جمال آرا نظامی تحریر فرماتی ہیں کہ "پریم چند کے ناولوں کو مسائلی ناول کہا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ہر ناول کے لیے کسی ایک مسئلے کو بنیاد بنایا ہے یا کئی مسائل کے گرد کہانی کا تانا بانا بُنا ہے۔"[4] انھوں نے اپنے پہلے ناول "اسرار معابد" میں پجاریوں اور مہنتوں کی ریاکاریوں کی مذمت کرتے ہوئے ان کے چہروں سے نقاب کشائی کی ہے۔ "ہم خرما و ہم ثواب"۔ "بیوہ" اور "جلوۂ ایثار" میں بے جوڑ شادی کے خوفناک انجام اور بیوہ کے مسائل کو بڑے فنکارانہ اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ "کشنا" اور "غبن" میں زیورات کا کس قدر شوق ہوتا ہے، عورتوں کو اس کے ساتھ ہی ساتھ متوسط طبقے کی جھوٹی شان اور شوکت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ "نرملا" میں جہیز کی لعنت جیسے موضوع کو پیش کیا ہے اور "بازارِ حسن" میں عورتوں کی بے بسی اور مجبوری نیز اس کی بے حرمتی کی سچی تصویر کشی ملتی ہے۔ "گوشۂ عافیت"۔ "چوگان ہستی"۔ "میدانِ عمل" اور "گئو دان" میں ہندوستان کے گاؤں کی زندگی کی تصویر کشی، کسانوں اور مزدوروں کے مسائل، اچھوتوں اور ہریجنوں کی مظلومی اور زمیندارانہ نظام کی لعنتوں کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اور اس ڈھنگ سے پیش کیا ہے کہ بالکل ہو بہو اس کا نقشہ ہمارے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ ہندوستان کے گاؤں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی اور ان کے مسائل کی جامع پیش کش کی ابتدا کا سہرا پریم چند ہی کے سر ہے اور بقول ڈاکٹر یوسف سرمست "پریم چند نے دیہاتی مسائل کو پیش کرتے ہوئے بڑی ہی حقیقت شعارانہ فنکاری سے کام لیا ہے"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے گاؤں کی زندگی کا مطالعہ بہت قریب سے اور گہرائی کے ساتھ کیا تھا۔ اور یہی ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز بھی ہے۔ پریم چند کے ناولوں میں جنگِ آزادی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ سردار جعفری نے بجا فرمایا ہے کہ پریم چند کی عظمت کا اندازہ ہندوستان کی جنگِ آزادی اور انقلابی جدوجہد کے پس منظر سے الگ کرکے کبھی نہیں کیا جا سکتا۔"[5] موضوع کے علاوہ فن کے لحاظ سے بھی پریم چند کے ناول اعلیٰ درجے کے ہیں۔ کردار نگاری عمدہ اور فطری خصوصیات کی حامل ہے۔ منظر نگاری کے نمونے بھی جا بجا ملتے ہیں۔ پریم چند جس منظر کی منظر کشی اپنے ناولوں میں کرتے ہیں، بالکل اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ زبان سیدھی سادی اور سلیس استعمال کرتے ہیں۔ مکالمے بھی بالکل فطری اور جاندار استعمال کرتے ہیں۔ ناول کا پلاٹ گٹھا ہوا اور دلچسپ ہوتا ہے۔ پریم چند کے ابتدائی ناول فنی اعتبار سے ضرور کچھ کمزور ہیں لیکن بعد کے ناول، ناول نگاری کے فن پر پورے اُترتے ہیں غرضیکہ پریم چند اُردو کے عظیم ناول نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اُردو ناول کو زندگی سے قریب تر کر دیا اور اپنے قلم کے ذریعے ہندوستان کے دیہی باشندوں، کسانوں اور مزدوروں کی زبوں حالی کو دور کرنے کی بھرپور سعی کی۔ اُردو ناول نگاری کی تقدیر سنوارنے میں منشی پریم چند نے جو کارنامہ انجام دیا ہے، اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو فکشن کی تاریخ میں ان کا نام سدا سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔

حوالے :۔

[1] "آواز" یکم تا ۱۵ مئی ۸۴ء صفحہ ۲۔ [2] "آواز" یکم تا ۱۵ مئی ۸۴ء صفحہ ۲۔ [3] "تنقیدی اشارے" صفحہ ۱۲۔

[4] "اُردو میں افسانوی ادب" صفحہ ۹۴۔

[5] "بیسویں صدی میں اُردو ناول" صفحہ ۱۸۱۔

[6] "ناول کی تنقیدی تاریخ" صفحہ ۲۔

پروفیسر سید شبیر علی کاظمی

اُردو کی وُسعت

دوسری اور آخری قسط

ھندی محققوں کا خیال ہے کہ کھڑی بولی کے سب سے پہلے شاعر امیر خسرو ہیں اور عام طور پر یہی اُردو کے بھی پہلے شاعر سمجھے جاتے ہیں مگر حالیہ دریافت نے اسے غلط ثابت کر دیا ہے۔ البتہ اس سے انکار نہیں کہ کھڑی بولی اور امیر خسرو کی زبان میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ یعنی کھڑی بولی اور اُردو دونوں ایک ہی ہیں۔ امیر خسرو نے سب سے پہلے فارسی بحور کو ہندی میں داخل کیا اور اُردو شاعری نے آگے چل کر انھیں بحروں کو استعمال کیا۔ لیکن ہندی میں صرف لاونی بحر لکھنے والوں نے ان کا اتباع کیا اور یہ لاونی دراصل ہندی کے ماٹک چھند (بحر) کا دوسرا نام ہے۔ ریختہ کھڑی بولی والے ہمیشہ فارسی بحریں استعمال کرتے، کیوں کہ کھڑی بولی میں ہندی بحر کا نبھانا مشکل ہے۔ پراچین اور نوین کاریہ دھارا کے مصنف سورج بلی سنگھ لکھتے ہیں "برج اور اودھی کے استھان پر کھڑی اپنا پورن ادھیکار جما چکی تھی۔ ادھر پنڈت چندر دھر گلیری کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ "کھڑی بولی یا پکی بولی یا ریختہ عہد حاضر کی ابتدائی نظم و نثر کو دیکھ کر جان پڑتا ہے کہ اُردو رچنا میں فارسی اور عربی تت سموں کو نکال کر سنسکرت تت سموں کو رکھنے سے ہندی بنائی گئی ہے"۔

دلی کی نسبت سے زبان اورنگ آبادی کہلائی۔ دکنی اور اورنگ آبادی زبان میں ہمیشہ فرق رہا ہے۔ قطب شاہی خاندان نے دکنی کو مکمل زبان ہونے کی سند عطا کر دی۔ اس زبان پر مقامی اثرات نمایاں ہیں مغلوں کی آمد سے قبل گجرات اور دکن میں اُردو شاعری شروع ہو چکی تھی۔ شیرانی صاحب کا خیال ہے کہ "تیمور کے زمانے میں ہندو مسلم ربط ضبط اور روزمرہ مراسم نے جنوبی ہند میں بھی ایک زبان کی بنیاد ڈالی جسے آج دکنی کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔"

مصنف "پنجاب میں اُردو" تحریر فرماتے ہیں کہ "آلِ غزنیہ کی حکومت ہندوستان میں کم و بیش ایک سو ستر سال رہی اور اس عرصے میں ہندو مسلم قوم کی یک جائی سے ایک نئی زبان کا پیدا ہو جانا لازمی بات ہے کیونکہ اس حکومت کا پورے پنجاب پر تسلط تھا اور اس لیے لوگوں نے اسے پنجابی بھی کہا۔"

امیر خسرو اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں اُردو کو زبانِ دہلوی کہتے ہیں۔ خوب محمد گجراتی نے ۱۵۷۵ء میں اُردو کو گجراتی بولی لکھا ہے اُس کا مصرع یہ ہے:

سن بولے بولی گجراتی" وجہی نے اس کو سب رس کے دیباچے میں "زبان ہندوستان" کہا ہے۔

کچھ غیر معروف نام بھی ملتے ہیں۔ ہاشمی صاحب تحریر فرماتے ہیں "پہلے شمالی ہند کے بعض آثار پر نظر کیجیے جن کا زمانہ دکن کی شاہیوں سے مقدم ہے۔ سیاسی انقلاب کی تباہی اور تلاش و تحقیق کی کوتاہی کے باوجود ہمیں اس نئی مخلوط زبان کے دور دور تک نشان ملتے ہیں آج بھی اقصلائے مشرق و جنوب اُردو کو "مسلمانی بولی یا ترکوں کی" کہنے والے مل جائیں گے۔ یہ نام دراصل سلاطین مغلیہ سے پہلے کی زبان کی یادگار ہیں۔ جب مسلمان فاتح بنارس تھے اور ممالک ہند کے بعید ترین گوشوں میں لیے جا رہے تھے۔ فرہنگ شرف نامہ میری سے اس چیز پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہ ایک بنگالی فاضل ابراہیم قوام فاروقی نے تالیف کیا اور کئی قدیم ماخذوں کے علاوہ ہم عصر بنگالی ادیبوں سے مدد لی۔ انھیں زبان دانوں میں ملک فضل سنگالی [illegible] ین کا نام شامل ہے۔

اس کو زبان مور بھی کہا گیا ہے۔ کرنل یول کے قول کے مطابق ۱۸۳۰ء میں شاہی فوج کے افسران اور مدراس کے دیگر سرکاری ملازمین اس نام کو استعمال کرتے تھے اور جنار میں تو یہ نام ۱۸۹۲ء تک مستعمل تھا۔ فوجی افسران اس کو سیاہ زبان بھی کہتے تھے۔

روسی اسی زبان کو اردا کہتے ہیں گو یہ لفظ ایشائی

ترجمانوں اور باشندوں کے لیے حقارتاً استعمال کیا جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ لفظ اُردو کے ماخذ اور اس کی وجہ تسمیہ پہ بحث کی جائے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ہندوستانی کا کچھ تذکرہ ہو جائے کیوں کہ لفظ اردو کے بالکل مترادف استعمال ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نام فورٹ ولیم کالج کا عطیہ ہے اور آج تک انگریز اور دوسرے غیر ملکی ہندوستان کی اس مشترکہ زبان کو ہندوستانی ہی کہتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس مخلوط زبان کو مغل بادشاہوں ہی کے زمانے میں ہندوستانی کہا گیا ہے چنانچہ ملا عبدالحمید لاہوری "بادشاہ نامہ" میں لکھتے ہیں "بیشتر بہ فارسی در کمال فصاحت و بلاغت تکلم می فرمایند و بعضے کہ فارسی نہ دانند بہ ہندوستانی" لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پادریوں اور دوسرے یورپین لوگوں کے استعمال سے یہ لفظ عام ہوا۔ میرامّن "باغ و بہار" کے دیباچے میں لکھتے ہیں "اب خداوند نعمت صاحب تحکرست نے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی میں جو اُردو کے لوگ بولتے ہیں ترجمہ کرو" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرامّن کے دور تک ہندوستانی اور اُردو میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور تھا۔ بول چال کی زبان جو عوام میں رائج تھی ہندوستانی تھی اور اُردو سے مراد وہ زبان تھی جو فارسی داں طبقہ تحریری مقاصد کے لیے استعمال کرتا تھا۔

بہرصورت لفظ "ہندوستانی" میرامّن نے اپنے خداوندوں سے سیکھا۔ ڈاکٹر ڈنکن فاربس نے باغ و بہار کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "باغ و بہار ہندوستانی زبان میں تفریح کی ایک کتاب ہے جس کو میرامّن نے تصنیف کیا ہے"۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں صاف تحریر ہے کہ انگریزوں نے ابتدائی آریائی زبان کو

اس زبان کے حق میں جس کے لیے یہ استعمال کیا ہے ناموزوں ہے البتہ اس کو ہندوستانیین (HINDUS-TANIAN) کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی اہلِ ہندوستان کی زبان ہے مگر یہ زبان اپنی حقیقی حدود سے باہر بھی بولی جاتی تھی۔ خصوصاً مسلمان اور سپاہی اس کو تمام جزیرہ نما ہندوستان، ایران، تبت اور آسام میں بھی بولتے تھے۔ پس اس زبان کے لیے لفظ ہندی یا انڈین جو ابتداءً اس کو دیا گیا تھا اور جس نام سے انگریز اب تک اس کو موسوم کرتے ہیں اس نام سے زیادہ موزوں ہے جو اہلِ یورپ نے اختیار کیا ہے۔

لفظ ہندوستانی ہندی اُردو کے جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے اُردو ہفتے کی ایک کارروائی میں اُردو کے بجائے اس زبان کو ہندوستانی تجویز کیا گیا تھا۔ جو کثرت رائے سے منظور ہوا تھا۔ یو۔پی میں ہندوستانی اکیڈمی کا قیام اور اسی قسم کی دوسری اور کوششیں عمل میں آئی تھیں۔

ہندوستان کے بہت سے ایسے اہم زبان علمی ریں سے سب نے نام اختیار کیے ہوئی ہماری زبان دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ میرامّن کا خیال ہے کہ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تو تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئی۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال جواب کرنے سے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔ یہاں تک کہ شاہجہانی روز آ پہونچا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ "اُردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اُردو ہو گیا"۔ سرسید

ایک لفظ اپنی زبان کا دو لفظ اس کی زبان کے تین لفظ دوسروں کی زبان کے ملا کر بولتے اور سودا سلف لیتے، رفتہ رفتہ اس نے ایسی ترکیب پائی کہ یہ خود بخود ایک زبان بن گئی۔ سیماب اکبرآبادی اپنے خطبات شاعری میں لکھتے ہیں "عہد جلال الدین محمد اکبر میں جو مردانہ اور زنانہ بازار قلعۂ آگرہ میں لگتا تھا اسے اُردو کہتے تھے۔ جہانگیر کے عہد میں یہ بازار آباد تھا۔ وہاں لین دین بدستور اس زبان میں ہوتا تھا۔ شاہجہاں نے اسے اور رونق دی۔

لفظ اُردو اگر لغت کے اعتبار سے جانچا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ التائی زبان کا ہے، اور ترکی پراکرت میں مختلف صورتوں میں ملتا ہے مثلاً اردو، اُردو، اور آرت وغیرہ۔ اور یہ خیمہ، قیام گاہ، حویلی، چھاؤنی، فوجی لشکر کی قیام گاہ وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یہ تاتاری خان کی لشکر گاہ کے لیے بھی مستعمل ہوا ہے اور اس سے انگریزی لفظ (HORDE) بھی ماخوذ ہے۔ دالنگا کے کنارے والا گولڈن ہورڈ کوئی تاتاری قبیلہ نہ تھا، بلکہ اس سے مراد شاہی کیمپ کا ایک خاص انداز طرز تھا جس نے بعد کو بالطو کے شاہی محلات کی صورت اختیار کر لی۔ ہندوستان میں مغلوں کی آمد پر بابر کے زمانے سے لفظ اُردو کا استعمال شروع ہوا۔ بابر ۱۵۲۶ء میں ہند کا بادشاہ ہوا۔ بابر نامہ میں دلی و آگرہ کی فتح پر اس نے اپنی فوج کو "اُردو نصرت شعار" لکھا ہے۔ طبقاتِ اکبری اور اقبال نامہ جہانگیری میں بھی لفظ اُردو بہ معنی شاہی فرودگاہ کے مستعمل ہے۔ مغلوں کے سکوں پر بھی ٹکسال کے لیے "اُردوئے ظفر قرین" لکھا ہوا ملتا ہے۔ جہانگیری کے سکے پر یہ عبارت ہے:

برا اُردو سکہ زد در ساو دکن شاہ بحر و بر

شہنشاہ زماں شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

تحریک کا سبب کے زیر اثر اس میں بولی جاتی تھی ہندوستانی ۔ احمد خاں کا خیال ہے کہ جب شاہجہاں بادشاہ ہوا اور ۔ اور کچھ سکوں پر [illegible] اُردو [illegible] دکن" بھی ملتا

کے نام سے ایک بیسے گیارہ سال بعد اس کی لپیٹ میں تیسرے ۔ شاہجہاں آباد، آباد کیا اس وقت شہر میں تمام ملکوں ۔ [illegible] تاریخ جہاں کشا میں رشیداللہ

نصف بات ۵ ستمبر ۱۵۰۲ء میں فرماتے ہیں "لفظ ہندوستانی ۔ کے لوگوں کا مجمع ہوا، ہر ایک سے معاملہ کرنے کا چال ۔ [illegible] خاں اور اسما کو

امر سنگھ

روشن قندیلیں بجھتے فانوس

نیما آج بیحد خوش تھی۔ فرطِ شوق سے اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ آج اس کا جنم دن تھا اور آج ہی اس کے منگیتر کی سالگرہ بھی تھی۔ اس اتفاقیہ مطابقت کا علم اسے ابھی ایک روز پیشتر ہی ہوا تھا۔ اس کے منگیتر نے کانپور سے جہاں وہ آرڈیننس فیکٹری کے ڈیزائن کے شعبہ میں اسسٹنٹ انجینیر تھا، خط لکھا تھا کہ ۱۶ر ستمبر کو اس کا جنم دن ہے۔ اس موقع پر وہ جموں اپنے گھر نہیں جا سکتا کیوں کہ اس کی تقرری حال ہی میں ہوئی ہے اور زیادہ دنوں کی چھٹی اسے نہیں مل سکتی۔ اس کا خیال ہے کہ ایک دن کے لیے دلّی آ جائے اور اگر انھیں کوئی اعتراض نہ ہو تو اپنا جنم دن بھی ان ہی کے ہاں منالے۔ نیما کے والد نے فوراً ٹرنک کال سے اسے دلّی چلے آنے کو کہا تھا اور اسے یہ بھی بتایا تھا کہ اسی روز نیما کی سالگرہ بھی ہے اور دونوں کی سالگرہ اکٹھی منا کر ان سب کو بہت زیادہ خوشی ہوگی۔

اور آج شام وہ آ رہا تھا۔

خوشی اور اشتیاق کے ساتھ نیما اُڑتی پھر رہی تھی۔ بڑے جوش و انہماک کے ساتھ وہ اس تقریب کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ دو اسپیشل برتھ ڈے کیک اس نے بیکر کے ہاں آرڈر کیے تھے اور بیکر نے اقرار کیا تھا کہ وہ کیک تیار کروا کے بروقت ان کے گھر پہنچا دے گا۔

اور اب وہ خریداری میں مصروف تھی۔ رنگ برنگی موم بتیاں، کریپ اور کرنکل پیپر کے رنگین ربن، کاغذی قندیلیں، بیلیں، پھول اور آرائش و تزئین کے دیگر لوازمات۔ اس وقت خریداری تو وہ جنرل اسٹور پر کر رہی تھی مگر اس کا ذہن بھٹک رہا تھا اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں جہاں سالگرہ کی تقریب منعقد کی جانے والی تھی اور وہ خود پہنچ چکی تھی اس لمحے میں جسے ابھی وجود پذیر ہونا تھا اور جس کے وجود کو سجانے اور رنگین بنانے کے لیے وہ یہ سارا اہتمام کر رہی تھی۔ اس موقع پر جہاں بہت سے عزیز و اقارب اور پیارے لوگ جمع ہوں گے اور ان سب سے زیادہ باوقعت، سب سے زیادہ عزیز شخصیت ہوگی، رتن، اس کے منگیتر کی۔۔۔ اور۔۔۔ اور وہ خود ہوگی۔۔۔

۔۔۔ اپنے پورے جمال کے ساتھ۔

ایک بار اس نے کہا تھا "نیما! آپ کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں!" اور وہ بیحد خوش ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار آنکھیں اٹھا کر رتن کی طرف دیکھا تھا۔ رتن کی آنکھیں جیسے نیما کی آنکھوں کے سحر سے سحرزدہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہ سحرزدگی اپنے آپ میں کافی دل خوش کُن تھی۔ مگر اتنا ہی تو کافی نہ تھا۔ اس کی محض آنکھیں ہی تو خوبصورت نہ تھیں اور وہ بھی تو بہت کچھ تھا۔ یہ تو ہوا۔ اور نیما نے اپنی نظریں جھکا لی تھیں کہ وہ اس کی آنکھوں کے سحر سے نکل سکے اور اسے خوب اچھی طرح دیکھ سکے اور کچھ بھی کہہ سکے۔ لیکن وہ اسی طرح مسحور ہو کر اسے خاموشی سے تکتا رہا۔

"سچ نیما جی! بہت خوبصورت ہیں آپ کی آنکھیں۔ بہت ہی۔۔۔" اس نے ایک جادو بھری سرگوشی میں دہرایا تھا اور نیما کا بھی جی چاہا تھا کہ اس کے سینے کے ساتھ لگ جائے اور پوچھے:

لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکی اور "لمس" کی بجائے اس کے ہونٹوں سے یہ الفاظ پھسل پڑے:

"اجی بس جانے دیجئے۔ زیادہ خوشامد نہ کیجئے"۔

لیکن اب کے وہ اپنے پورے جمال کے ساتھ

---

٥ کے۔ ۱۔ اے/۹۹ سی، جنک پوری، نئی دہلی ۱۱۰۰۵۸

اس کے سامنے آئے گی، وہ مجبور ہو جائے گا۔ اس کی آنکھوں کے علاوہ۔۔ اس کے علاوہ وہ واضح طور پر کچھ تصور نہ کر سکی کہ وہ اس کی زبان سے کس قسم کے الفاظ یا جملے سننے کی متمنی تھی۔ ایک خلا اس کے ذہن پر چھا گیا۔ اس خلا کو تو رتن ہی پُر کر سکتا تھا۔ لیکن وہ تو وہاں موجود ہی نہ تھا۔ حقیقت کا یہ احساس اس کے پیشرو خلا سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا اور اس کا ذہن جھٹ اسے پھلانگ گیا۔

اس بار وہ اپنی شخصیت کا جلال بھی اسے دکھلائے گی۔ وہ اس کے ساتھ باتیں کرے گی۔ فن، ادب، موسیقی اور شاعری پر، وہ اسے بتلائے گی کہ کیسی کیسی قابلِ قدر ہستیاں اس کے حلقے میں رہتی ہیں۔ وہ اسے اپنی سہیلی آشما سے ملائے گی جو اسے الیکٹرک گٹار پر مغربی نغمے اور دیسی دھنیں سجا کر محظوظ کرے گی اور نلنی من شکھ، کم از کم ایک آئٹم بھرت ناٹیم کی تو ضرور پیش کرے گی۔۔۔ اور ہاں جے دیو کی نظمیں بھی ہوں گی۔ اسے تو وہ بھول ہی گئی تھی۔ وہ جے دیو کا تعارف رتن سے کرائے گی اور اسے بتائے گی کہ یہ ہونہار شاعر ایک روز شاعری کے آسمان پر ایک تارے کی طرح جگمگائیگا۔

جے دیو ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی اس کے حلقے میں شامل ہوا تھا۔ وہ اکثر ان کی دکان سے کپڑا خریدا کرتی تھی۔ اسے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ کپڑا ناپنے والا یہ بزاز کا چھوکرا شاعر بھی ہو سکتا ہے۔ شاعر تو رہا ایک طرف اسے یہ بھی توقع نہ تھی کہ وہ کسی اچھے ذوق کا مالک بھی ہو سکتا ہے۔

ایک دو بار نیما کے ہاتھوں میں کتابیں دیکھ کر جے دیو نے کتابوں اور اس کے ادبی مذاق کے بارے میں بات چیت کرنا چاہی تھی اور نیما نے محسوس کیا تھا کہ جے دیو اس بہانے اس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا ہے وہ اسے لفٹ دینا نہیں چاہتی تھی۔ تاہم اس نے اپنی فطری خوش اطواری کی بنا پر محض چند ایک رسمی جملوں میں ہی اسے ٹال دیا تھا۔

لیکن ایک بار جب وہ کپڑے کی خریداری سے فارغ ہو کر دکان سے باہر جانے ہی والی تھی کہ جے دیو نے بیحد ملتجانہ انداز میں کہا کہ وہ اسے اپنی ایک نظم سنانا چاہتا ہے۔ اس التجا میں خوشامد کا عنصر کچھ اس طرح شامل تھا کہ وہ انکار نہ کر سکی اور لحاظ داری کے جذبے کے تحت نظم سننے پر رضامند ہو گئی لیکن جب نظم شروع ہوئی تو اس کا اشتیاق بڑھنے لگا۔ نظم ایک مشہور اور بڑے شاعر کے رنگ میں تھی۔ لیکن شروع شروع میں اکثر شعراء کے کلام پر اساتذہ میں سے کسی نہ کسی کے رنگ کی چھاپ تو ہوتی ہی ہے۔ اس کا اپنا انفرادی رنگ اور انداز تو بعد میں جا کر بنتا ہے اور جے دیو میں ایک اچھا شاعر بننے کے آثار موجود تھے۔

اس احساس کے ساتھ ہی نیما کے دل میں ایک بھولی بسری امنگ نے سر اٹھانا شروع کیا۔ یہ امنگ کہ اس کے حلقے میں کوئی شاعر اور ادیب بھی ہو۔ اسکول کے دنوں میں اس نے ہلی رُوڈ کی ہسٹری آف انگلش لٹریچر کی سیریز کا مطالعہ کیا تھا۔ اس میں ایک تصویر تھی۔ تصویر میں آلیور گولڈ اسمتھ اپنی ناول "... OF ..." کا مسودہ دو بیحد پیاری اور حسین لڑکیوں کو پڑھ کر سنا رہا ہے۔ اس تصویر کو دیکھنے کے بعد ایک خوابیدہ تمنا عرصے تک اس کے دل میں مچلتی رہی کہ وہ بھی کسی شاعر کے خوابوں کا مرکز بن سکے۔ اب جے دیو اس کے خواب کی تعبیر بن کر سامنے آیا تھا۔

اور نیما نے جے دیو کو اپنے حلقے میں شامل کر لیا۔ اپنے گھر میں جے دیو کے پاس بیٹھ کر اس کی نظمیں سنتے ہوئے وہ خود کو اس لڑکی کی جگہ بیٹھی محسوس کرنے لگتی جو ان لڑکیوں میں سے (جن کے نام اس ذہن سے محو ہو گئے تھے) زیادہ پیاری لگتی تھی۔ اس طرح کی ہر نشست کے بعد اس کے من میں فخر کے جذبات ابھرتے اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں جے دیو کی عزت بھی بڑھ جاتی۔ اسے امید تھی کہ یہ بلند نفس نوجوان ایک دن بہت بڑا شاعر بنے گا۔

اس طرح تصور ہی تصور میں اس نے جے دیو کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کا تعارف رتن سے کرایا اور پھر اسے فانوس بنا کر وقت اور ماحول کی آرائش کا حصہ بنا دیا اور خود اس کی روشنی میں جگمگاتی ہوئی رتن کی نگاہوں کا مرکز بن گئی کیونکہ خود رتن ہی اس کی تمام تمناؤں کا مرکز تھا۔ سب سے زیادہ جگمگاتا ہوا نقطہ۔۔۔

اسی طور وہ اسٹور سے باہر نکلی۔ بازار میں پاؤں رکھتے ہی وہ کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بمشکل بچی۔

"نمستے جی!" ایک گھبرائی ہوئی اور اکھڑی ہوئی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"آپ؟"

اس نے نظر اٹھا کر عالم تخیل سے عالم حقیقت میں آتے ہوئے کہا۔ اس کے سامنے ایک بوکھلایا ہوا چہرہ تھا۔ جے دیو اپنے ایک دوست کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ خود بھی اس اچانک ملاقات سے، جس نے اسے اس کے بیحد پیارے اور حسین خوابوں کے ماحول سے کھینچ کر یہاں لا ڈالا تھا (جبکہ اس کا دل ابھی تک وہیں اٹکا ہوا تھا) کسی قدر بوکھلا گئی تھی۔

"نمستے۔۔۔" اس کی شائستگی نے اپنی اخلاقی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے جواب دیا۔

"میں۔۔۔ میں کچھ شاپنگ کرنے آئی تھی۔"

"اچھا! نمستے" جے دیو نے جھجکتے

سنبھل چکا تھا۔ نیما کی پریشانی کا احساس کر کے اس کو پریشانی سے نجات دلانے کے لیے جانے کی اجازت مانگی اور قدم آگے بڑھا دیا۔

"نمستے!" نیملا نے اور بھی بوکھلا کر کہا۔

لیکن جے دیو اس دوران میں اپنے دوست کے ساتھ آگے بڑھ چکا تھا۔

اس نے بوکھلاہٹ سے کسی قدر نجات محسوس کی۔

"یہ بھلا میں نے کیا حماقت کی ـــ" جنم درم چل کر اسے ہرس آیا۔ "یونہی موقع ہاتھ سے گنوا دیا۔ سام کی تقریب میں اسے مدعو کرنے کے لیے میں پھر بھاگتی پھروں گی۔"

"وہ واپس لوٹی۔ تیز تیز قدموں سے وہ جے دیو کا پیچھا کرنے لگی۔ اس کے عین پیچھے پہنچ کر وہ اسے آواز دینے ہی لگی تھی کہ جے دیو کے دوست کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"کہو بھئی! یہی ہے وہ کبوتری جس کے ساتھ تمہارے معاشقے کے چرچے زوروں پر ہیں آج کل ـ؟"

چرچے ـ معاشقے کے اسکینڈل ـ! نیما کے دل میں جیسے آگ سلگ اٹھی۔ اسے اپنا چہرہ تمتماتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مگر جھٹ ہی ایک امید نے اسے سہارا دیا۔ اس نے امید کی کہ جے دیو ابھی اپنے ساتھی کو ڈانٹ پلائے گا۔ اس نے اپنے قدم سست کر لیے اور کان جے دیو کا جواب سننے کے لیے۔

"عشق! ابھی کہاں دوست ..... لوگ تو یونہی رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔"

"تو کبوتری ابھی پھنسی نہیں ـ؟"

ایک زوردار دھچکا نیملا کے دل کو لگا۔ ایک ثانیے کے لیے وہ بھونچکی ہی رہ گئی۔ سست رو قدموں کے ساتھ جب وہ واپس جا رہی تھی تو اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کے ذہن میں روشن قندیلیں اور فانوس بجھتے جا رہے ہیں۔ ●

بقیہ، اردو کی وسعت

اولاد کی قیام گاہ اور چھاؤنی کو اردو لکھا ہے اور کبھی کبھی لفظ اردو دارالسلطنت کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔

ترکستان اور تاشقند میں اردو ابھی لشکر شاہی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ بابر کے ہمراہ ہندوستان پہنچا اور دہلی کے شاہی محلات اردو کہلائے۔ پشاور کی سرحد پر ابھی تک فوجی کیمپ کو اردو کہتے ہیں۔ نگارستان وتاسی کا خیال ہے کہ لشکر شاہی اور اردوئے معلیٰ دونوں کی ترکیب سے ایک نئی زبان پیدا ہوگئی اور اس نسبت سے اس کو زبان اردو کہنے لگے۔ کثرت استعمال سے زبان کا لفظ معروف ہو گیا اور اسے صرف اردو کہا جانے لگا۔ پنڈت دتاتریہ کیفی اردو کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔ اردو کے معنی بتائے جاتے ہیں لشکر اور بہت حقارت سے کہا جاتا ہے کہ اردو لشکری بولی ہے اور لشکر جس میں یہ بولی جاتی تھی باہر کے آدمیوں پر مشتمل تھا۔ لہٰذا نہ یہ پہلے ماس کی بولی اور نہ دیسی بولی ہے۔ یہ ایک بدیہی چیز ہے۔ لفظ اردو میں ا، ر، د، و اصل حروف ہیں اور یہی تینوں حروف الف کی مختلف حرکتوں کے ساتھ اور لفظوں میں بھی آتے ہیں جیسے آردن بہشت، آردن، اردبیل، اردسیر وغیرہ۔ لفظ اردو کے معنی ہیں مثل یا مانند۔ واؤ نسبتی بڑھانے سے اردو بنا، معنی ہوئے مماثل اجزا سے بنی ہوئی چیز اور یہ نام اس زبان کے لیے جو فارسی اور پراکرت دو آرین زبانوں کے میل سے بنی، بہت مناسب ہے۔ اردو کا لفظ بطور زبان سب سے پہلے مصحفی نے ۱۸۲۲ء میں استعمال کیا ہے۔ لیکن شیرانی صاحب کا قول ہے کہ خان صاحب یعنی خان آرزو غالباً پہلے شخص ہیں جو اردو کا لفظ بمعنی زبان استعمال میں لائے ہیں۔

مختصر یہ کہ اردو اپنے ابتدائی دور میں مختلف ناموں سے معروف رہی اور بالآخر اب اردو اس زبان کا نام ہے جو پورے برصغیر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ●

بقیہ، گنگا کو آلودگی سے پاک کرنے کا منصوبہ

جناب راجیو گاندھی کی تحریک و تلقین پر ہم نے اپنی تہذیب اور روحانیت کی امین گنگا کو پوری طرح پوتر بنائے رکھنے کا حوصلہ حاصل کیا ہے۔ ہمیں گنگا کی پاکیزگی و صفائی کو برقرار رکھنے کا عہد بھی کرنا چاہیے۔ یہ عہد ہمارے قومی جذبے کا مظہر بھی ہوگا۔ گنگا بغیر کسی امتیاز مذہب و ملت تمام باشندگان ہند کے لیے کسی نہ کسی طرح مفید و کارآمد ہے۔ اس لیے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ گنگا نے ہمارے دستور کو ایک سوتر میں باندھنے کا اہم ترین فریضہ انجام دیا ہے۔ ساحل گنگا پر منعقد ہونے والے میلے، خصوصاً کمبھ، بھارت کی مذہبی رواداری کی علامت ہے... جس گنگا سے اہالیان ہند کی عقیدت کئی پہلوؤں سے انتہائی گہری ہو تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی پاکیزگی اور صفائی کے لیے ملک کا ہر فرد کوشاں نہ ہو؟ لہٰذا یہ لازمی شرط ہے۔ گنگا کے اس منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے کہ ہر ہندوستانی اپنی بساط بھر اپنا تعاون دے۔

یاد رہے کہ گنگا کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کا مطلب ہے اپنے ملک کی تہذیب اور ایکتا کی علامت کو زندۂ جاوید بنانا۔ ●

میں اپنے وطن کا بھلا چاہتا ہوں

ایم اے شمسی
رنگھرا ، دھنگر۔

نہ تھا … ہاں … چاہتا ہوں
کہ ہاں میں ٹھنڈی … ہوا … ہے
… صرف میں … ہے
… بار … سب … چاہتا ہوں
دلوں میں … سے … چاہتا ہوں
میں اپنے وطن کا بھلا چاہتا ہوں

نہ ہندو نہ مسلم نہ سکھ نہ عیسائی
نہ ہندوستاں کے … سب … بھائی
… کی … نفرت میں سب … ملے
اسی … یہاں سب … بھلائی
… آپ … چاہتا …
میں اپنے وطن کا بھلا چاہتا ہوں

… ہاں سب … ہے
… کا … ہے
کہ … کی سانس لے …
… بھارت … ہے
… اپنا …
میں اپنے وطن کا بھلا چاہتا ہوں

… کا شعلہ لپکنے نہ پائے
یہاں کوئی … چمکنے نہ پائے
… کے … دل سے
صدا … کی ابھرنے نہ پائے
میں ہر … چاہتا ہوں
میں اپنے وطن کا بھلا چاہتا ہوں

… ذلت کے جھگڑے ہٹا کر
ہر اک بھارتی کو گلے سے لگا کر
وطن کی محبت ہے ایمان میرا
… وطن تجھ کو دل میں بسا کر
خدا کی قسم یہ بتا چاہتا ہوں
میں اپنے وطن کا بھلا چاہتا ہوں

غزلیں

جلیل حزیں لاری : معرفت جناب سرفراز احمد مہر
مرچنٹ، ۱۰ ال سٹریٹ، وارانسی (یو پی) ۲۲۱۰۰۱

جب … کبھی آ گیا وہ شخص
عادت … سوچ کو … وہ شخص
سینے میں … گئیں
… دل … گیا وہ شخص
… کسی … تھا
… کیوں آ گیا وہ شخص
پوچھا … تیرے … کیوں ہے؟
… بات … گھبرا گیا وہ شخص
… آئینہ … اس کے …
… ایسا … شرما گیا وہ شخص
اپنا رقیب آپ ہی کیوں … گیا …
… عکس سے کیوں کھا گیا وہ شخص

حمنا پرساد راحت · ایڈوکیٹ
رگھو در پوری۔ علی گڑھ۔

… ہر رنگ میں تعبیر خواب کی
… تصویر خواب کی
… اک شام گنہگار کر گئی
ہر رات لے کے آتی ہے زنجیر خواب کی
… آ چکا ہے حسیب … دل
آنکھوں سے کوئی چھین لے جاگیر خواب کی
کیا جانے قتل ہو چکیں کتنی صداقتیں
صدیوں سے بے نیام ہے شمشیر خواب کی
آوارگی روح کی منزل نہ پوچھیے
رسوائی خیال ہے تشہیر خواب کی
احساس کے سفیر خیالوں کے شہر میں
کب سے تلاش کرتے ہیں تعبیر خواب کی
کیا خواب تھا نہ جانے مگر اتنا یاد ہے
راہی سلگتی شام ہے تفسیر خواب کی

غزلیں

انجم صمدانی — محمد امیر احمد صمدانی
محلہ ٹیلہ، ادر کوٹ، علی گڑھ۔

غم [illegible] کا [illegible] ہے
[illegible] دل [illegible] ہے

[illegible] کو
[illegible] ہے

[illegible]
[illegible]

[illegible] کے [illegible]
[illegible] ہے

[illegible]
[illegible] ہے

[illegible]
[illegible] ہے

[illegible] — [illegible] اُردو، جامعہ ملیہ
اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵ ۱۱۰۰

[illegible] کو [illegible] رہا
[illegible] رہا

[illegible] بھی [illegible]
[illegible] کا [illegible] رہا

اگر میہ دوست علی گڑھ کے یاد آتے ہیں
[illegible] تو دلی کا [illegible] گوار رہا

مجھے بھی گھر کی فضا میں سکون ملتا ہے
ہمارا ذات سے کس کو بھلا [illegible] رہا

گلوں کا کھلنا بھی شاخوں کو لوٹ نہ سکا
بہار میں بھی منظم اسے سوگوار رہا

غلیف [illegible]
[illegible] کامٹی، ناگپور، مہاراشٹر ۴۴۱۰۰۱

دل کو ابھی [illegible] اور
[illegible] کے [illegible] اور

[illegible]
[illegible] اور

[illegible] کہاں دل [illegible]
[illegible] اور

[illegible]
[illegible] اور

[illegible]
[illegible] اور

[illegible]
[illegible] اور

[illegible]
[illegible]

سید فضل المتین
گدی نشین، درگاہ شریف، اجمیر (راجستھان)

آ گیا مجھ کو راس سناٹا
بن گیا میری آس سناٹا

میرے حالات کی سہارے ہے
غمزدہ، بیر اُداس سناٹا

[illegible] ہے، [illegible] ہے
[illegible] سناٹا

[illegible]
[illegible] سناٹا

آنکھوں میں اُبھر رہا ہے [illegible]
[illegible] سناٹا

[illegible]
اور [illegible] سناٹا

[illegible]
[illegible] سناٹا

[illegible]
[illegible] سناٹا

[illegible]
[illegible] سناٹا

ڈاکٹر [illegible] — [illegible] کالج [illegible]

جسم [illegible] رکھئے	ہر [illegible] دیکھئے
[illegible] کہاں	[illegible] دیکھئے
[illegible]	[illegible] دیکھئے
[illegible] کیجئے	[illegible] دیکھئے

[illegible] تو کبھی کے [illegible]
کب [illegible] ساتھ [illegible] دیکھئے

تبصرہ

طبیب کا شاہ نمبر

صفحات : ۳۴۴

طبیب رسالہ تقریباً ۷ سال سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے، اس رسالے کی آبیاری جس عظیم شخصیت کے ذمے تھی وہ ایک ایسی نامور ہستی تھی جس نے ۵۰ برس سے بھی زیادہ عرصہ تک اُردو صحافت میں بڑے بڑے اہل قلم سے اپنا لوہا منوا لیا۔ یوں تو ... مولانا سید انور شاہ کشمیری نے جہاں ملک و ملت پر اپنی علمی خدمات سے بہت سے احسانات کیے ہیں، وہیں اس فیض کو جاری رکھنے کے لیے مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر اور سید انظر شاہ مسعودی کی پرورش فرمائی تھی۔ ... رسالہ حسرت ... ازہر شاہ قیصر ہی نکالتے تھے جن کا ۲۰ اپریل ۱۹۸۵ء کو ۶۶ سال کی عمر میں وفات پائی، انہوں نے بھی اپنی اولاد میں سے ایک بیٹے کی ایسی تربیت کی جو ان کے علم کو آگے لے کر بڑھے، یعنی نسیم احمد شاہ۔ نسیم احمد صاحب نے ایک لائق باپ کے لائق بیٹے ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے طبیب کا ازہر شاہ نمبر نکالا جس میں ۲۶ ... مضامین سے بہت سارا مواد اور معلومات جمع کر دیا، حالانکہ زیادہ تر مضامین جو اس میں شامل ہیں، بقول خود اُن کے ناکافی ہیں تاہم ان سے مالک ہی کچھ تاریخی نوعیت کا مواد بھی اس میں پڑھنے کو ملتا ہے، جو اُردو صحافت کی تاریخ کی ترتیب میں ایک ضرورت ہے۔ اس میں مولانا امداد صابری دہلوی، مولانا مفتی ظفیر الدین، مولانا اخلاق حسین قاسمی، مولانا سید انظر شاہ مسعودی، جمیل مہدی، سید احمر الاسلام، وسیم احمد طاؤس، نواز دیوبندی، شاہد بختی اور دیگر بہت سی مقتدر شخصیتیں شامل ہیں، سید ازہر شاہ قیصر نے دیوبند سے ۱۹۴۱ء میں ہفتہ وار اخبار جاری کیا تھا، پھر وہ لاہور چلے گئے جہاں ۱۹۴۵ء تک آپ کا قیام رہا۔ لاہور میں مولانا ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، مرتضیٰ احمد خاں میکش، چراغ حسن حسرت جیسے مشہور و معروف ادیبوں کے ساتھ رہے۔ ۲۳ برس تک دارالعلوم دیوبند کے ایڈیٹر رہے۔ وہ ایک بالغ نظر صحافی اور روشن دماغ عالم دین تھے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے متعدد اخبارات کی ادارت سنبھالی غرضیکہ اُردو صحافت کا وہ ایک روشن باب تھے اور جب کبھی بھی اُردو صحافت کی تاریخ مرتب کی جائے گی، انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ خصوصی نمبر اس سلسلے میں ایک دستاویز رہے گا۔ البتہ یہ چونکہ کسی لحاظ سے ناکافی ہے اور ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو اور ان کی علمی کاوشوں کے بہت سے گوشے تفصیلی بیان چاہتے ہیں، لہذا ضروری ہے کہ ان کی شخصیت کی ہمہ گیریت کو سامنے رکھتے ہوئے کسی موقع پر ایک اور شاندار نمبر شائع کیا جائے۔ امید ہے کہ نسیم احمد شاہ قیصر اس ضرورت سے غافل نہ رہیں گے۔ ●

وسیم حیدر

بقیہ: ۸۷-۱۹۸۶ء کے لیے ۳ کھرب ۹۰ ارب روپے کا بجٹ

بعض قسم کی کھیری، چینی اور ملوں کے کپڑے کی ساری میں کمی رہی۔ پیداوار میں بڑی رکاوٹ بجلی کی کم دستیابی اور بعض حالتوں میں کوئلے کی بھی کمی رہی۔

غریبی دور کرنے کی مہم

۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران انسداد افلاس کے پروگراموں کو تقویت دی گئی اور اُن کی زیادہ مؤثر طور پر تعمیل کی گئی۔

دیہی ترقی کے مربوط پروگرام کے تحت ۸۶-۱۹۸۵ء میں فیضیاب کنبوں کی تعداد ۳۰ لاکھ تک پہنچنے کی توقع کی جاتی ہے۔ نیشنل رورل ایمپلائمنٹ پروگرام اور رورل لینڈلیس ایمپلائمنٹ گارنٹی پروگرام کے تحت ۲۸ کروڑ ۷۰ لاکھ اور ۲۱ کروڑ ۱۹ لاکھ انسانی دنوں کا روزگار بالترتیب پیدا کیا گیا۔

دستاویز میں کہا گیا ہے کہ انسداد افلاس کے پروگرام کو مسلسل خصوصی توجہ ملتی رہے گی۔ دیہی ترقی کے مربوط پروگرام کے سبب جس کا مقصد دیہی مفلسوں کے لیے خود روزگار کے مواقع پیدا کرنا ہے۔ ۸۷-۱۹۸۶ء میں تقریباً ۴۰ لاکھ کنبوں کو مدد دیے جانے کی تجویز ہے۔

نیشنل رورل ایمپلائمنٹ پروگرام کا مقصد ہے ملحقہ اثاثہ جات کی تخلیق کے ساتھ ساتھ دیہی علاقوں میں زائد اجرتی روزگار کے مواقع پیدا کرنا۔ اس پروگرام کے تحت ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران ۲۷ کروڑ انسانی دنوں کا روزگار فراہم کرنے کی تجویز ہے۔ رورل لینڈلیس ایمپلائمنٹ گارنٹی پروگرام انسداد افلاس کی ایک اور اہم مہم ہے جس کا مقصد ہر دیہی گھرانے کے ایک فرد کو سال میں ۱۰۰ دن کے لیے روزگار فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ دیہی بنیادی ڈھانچے کو تقویت دینا ہے۔ یہ توقع ہے کہ اس پروگرام کے تحت ۲۳ کروڑ ۶۰ لاکھ انسانی دنوں کا مزید روزگار پیدا کیا جائے گا۔ ان پروگراموں کے تحت ریاستوں کے لیے فنڈوں کی تخصیص ۲۵ فی صد سے بڑھا کر ۵۰ فیصد کر دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں جنگل بانی کی حوصلہ افزائی کرنے اور ایندھن اور چارے کو اُگانے سے متعلق ایک عظیم پروگرام کو عملی صورت دینے کی ضرورت کے پیش نظر دونوں پروگراموں کے تحت سماجی جنگل بانی کے لیے مخصوص کیے جانے والے فنڈ کو ۲۵ فیصد تک بڑھا دیا گیا ہے۔ ●

یوجنا نے ماضی میں کامیابیوں کا ٹھوس ریکارڈ قائم کیا ہے (ڈاکٹر منموہن سنگھ)

یوجنا عوام تک پہونچنے کا ضروری راستہ (شری اجیت پانجا)

یوجنا ایڈیٹرز کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں اظہار خیال

ڈاکٹر منموہن سنگھ کی تقریر

یوجنا گروپ آف پبلی کیشنز کے ایڈیٹروں کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے منصوبہ بندی کمیشن کے نائب صدر ڈاکٹر منموہن سنگھ نے کہا کہ یوجنا کی اشاعت کا مقصد دراصل منصوبے کے بارے میں عوامی شعور کو جگانا ہے جو کہ نئے بھارت کے بنانے کے لیے بہت اہم ہے۔ ملک کی سماجی اور اقتصادی کایا پلٹ کے لیے منصوبہ بندی ایک ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعے بھارت کو غربت اور استحصال سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ اس رول کو نبھانے میں یوجنا کو بڑی ذمہ داری نبھانی ہے۔ یہ رابطہ بڑھانے کا ذریعہ ہے اور ہمیں عوام تک صرف کسی ایک طریقے سے نہیں بلکہ مختلف طریقوں سے پہونچنا ہے۔ انھوں نے اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ یوجنا ۱۲ زبانوں میں چھپتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یوجنا نے ماضی میں کامیابیوں کا ٹھوس ریکارڈ قائم کیا ہے۔ لیکن ہمیں محض ان کامیابیوں پر ہی مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جانا ہے۔ یوجنا کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت ہے۔ اس میں وہ سبھی لوگ شامل ہیں جو ملکی معاملات میں سوجھ بوجھ کے ساتھ دلچسپی لیتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں بڑی تعداد اسے پڑھتی ہے۔ ہمارے ملک میں عوامی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے وہ حلقے بھی جو کسی نہ کسی صورت میں ملکی معاملات پر نظر رکھتے ہیں، اس کو پڑھتے ہیں اس طرح یوجنا مسلسل عوام کی ایک یقینی تخلیقی خدمت انجام دے رہا ہے۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ ابھی اس سلسلے میں اصلاح و بہتری کی کافی گنجائش ہے۔

چنانچہ آئندہ برسوں میں یہ دیکھنا ہوگا کہ آپ منصوبہ بندی کا پیغام کس طرح زیادہ سے زیادہ عوام تک پہونچا سکتے ہیں۔ یہ کام ماضی کے مقابلے زیادہ بڑے پیمانے پر کرنا ہوگا۔ یوجنا میں منصوبے کی تشکیل، اس کے عمل درآمد کے سلسلے کے مسائل پر بہت سے مضامین شائع ہوئے ہیں لیکن ان مسائل پر ماضی کے مقابلے زیادہ باقاعدگی اور تسلسل کے ساتھ بحث و مباحثے کی ضرورت ہے۔ ہماری منصوبہ بندی مختلف مراحل سے گزری ہے چھوٹے چھوٹے منصوبوں کی تشکیل کے مرحلے سے آگے بڑھ کر اب ایسے بہت سے پروگرام شروع کئے گئے ہیں جن کا تعلق براہِ راست عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے سے ہے، ان کو غریبی دور کرنے کا پروگرام کہا گیا ہے۔ انسان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے پروگرام پر کافی رقم خرچ کی جا رہی ہے۔ ان پروگراموں پر عمل درآمد کس حد تک ہوتا ہے؟ نچلی سطح پر ان کے عمل درآمد میں کیا کیا دشواریاں ہیں، ان تمام مسائل پر یوجنا کے ذریعے اظہارِ خیال ہو سکتا ہے اور یہ عوام اور منصوبہ بنانے والوں کے درمیان رابطہ کا کام کر سکتا ہے۔ یہ وہ گوشہ ہے جہاں مستقبل میں یوجنا موثر کردار ادا کر سکتا ہے۔

آگے چل کر انھوں نے کہا کہ منصوبہ بندی جیسا کہ اندرا جی نے پُر زور طریقے سے کہا تھا قومی یکجہتی کا ایک ذریعہ ہے، منصوبہ بندی ملک میں مختلف سمتوں کے درمیان تعلقات سے عوام کو آگاہ کراتی ہے۔ ملک کی مختلف ریاستوں کے درمیان اس طرح کے رابطے قائم ہیں۔ منصوبہ بندی کے ذریعے تخلیقی صلاحیتوں پر مبنی ایسا نظام وضع کر رہا ہے، جس سے ایک دوسرے کی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔ اس کے ذریعے سے ملک کو مضبوط، جدید، خودکفیل بنانا ہے۔ یوجنا نے ماضی میں اسی تحاذ پر بڑا نام پایا ہے، ایسے تخلیقی صلاحیتوں والے دیگر بہت سے میدان اپنانے ہیں، یوجنا کی اس طرح کی خدمات اس کے جواز کے اصل محرکات ہیں اس طرح کے رسالے کی ضرورت پہلے سے ہی محسوس کی جا رہی تھی۔ امید ہے کہ آپ اس کے بنیادی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے وفاداری کے ساتھ اس کی خدمت کرتے رہیں گے۔

ڈاکٹر منموہن سنگھ نے کہا کہ ہمارے ملک میں رسالوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، اخبارات میں روزانہ کی خبروں کی اشاعت بھی بڑھی ہے چنانچہ مقابلے کی اس دنیا میں یوجنا کو اس لائق بنانا ہے تاکہ وہ خود کو زندہ رکھ سکے۔ اس طرح کے ماحول میں معیار کی گراوٹ بھی چیلنج بن کر سامنے آ سکتی ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ آپ اس طرح کے لالچ میں نہیں آئیں گے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو قارئین کو پڑھنے کے لیے معیاری مواد دینا ہے۔ آپ کو اعلیٰ معیار کی تحلیقات قارئین کو دینی ہیں۔ یہ دونوں چیلنج ایک دوسرے سے جڑے ہیں۔ امید ہے کہ اس کانفرنس میں جملہ دیگر امور کے ان مسائل پر بھی توجہ دی جائے گی۔

شری اجیت پانجا کی تقریر

اطلاعات و نشریات کے وزیر شری اجیت پانجا نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ ہمیں عوام کو ساتھ لے کر چلنا ہے، جب تک عوام یہ نہ جان لیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں، اس وقت تک ہم اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا عوام سے اس سلسلے میں رابطہ بنائے رکھنا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ سوال یہ ہے کہ یہ کام کیسے انجام دیا جائے، یہ بلاشبہ ایک مشکل کام ہے لیکن اس سلسلے میں نشر و اشاعت کے عوامی ذرائع اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ملک کے ۷۰ کروڑ عوام تک پہلے شدہ ۱۵ زبانوں کے ذریعے پہونچا جا سکتا ہے۔ وزیر موصوف نے کہا کہ جب ہمیں عوام سے رابطہ رکھنا ہے اور ان تک اپنی بات پہونچانا ہے تو ہر پراجیکٹ کو نفع، نقصان کے پیمانے سے نہیں ناپا جانا چاہیے۔ ان پراجیکٹوں سے ہمیں دانشوروں کے خیالات جاننے کا موقع ملتا ہے جو کہ اپنی جگہ ایک بڑا فائدہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان رسائل کو عام آدمی

کی ضروریات کو پورا کرنا ہے، لہٰذا ان میں چند صفحات کو ناخواندہ افراد کے لیے مخصوص کر دینا چاہیے اور یوجنا کو ان ناخواندہ افراد کو بھی اپنے حلقے میں شامل کر لینا چاہیے۔ دو صفحات کے ذریعے تصاویری اور دیگر آسان مواد پیش کر کے ان لوگوں تک بات پہونچانی چاہیے جو لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ اس سے بچوں کو بھی فائدہ ہوگا۔ دیہات میں رہنے والی مائیں اور عورتیں اس طرح کے مواد کو بآسانی سمجھ سکتی ہیں۔ ان صفحات کو موٹے حروف میں لکھ کر عوام تک پہونچانا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان رسائل کی عمر روزانہ کے اخبار کی طرح صرف ایک گھنٹہ کی نہیں ہوتی۔ اس خیال کے ذریعہ قارئین کی تعداد بڑھانی چاہیے، کیونکہ اگر اس طرح سے ان رسائل کی مالیات بڑھ سکے تو اس پہلو کو نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے پبلی کیشنز ڈویژن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیام سنگھ ششی اور ان کے رفقائے کار کو مبارکباد پیش کی۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یوجنا تیس سال تک عوام الناس کی خدمت کر چکا ہے اور ابھی اتنے ہی برس بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے تک یہ عوام کی خدمت کرتا رہے گا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ قول دہرایا کہ "یوجنا جیسا کہ میں سمجھتا ہوں عوام میں مانے جانے والا ایک رسالہ ہے۔ اسے نیشنل ایکسٹینشن سروس بلاکوں، کوآپریٹو اداروں، اجتماعی ترقی کے پراجیکٹوں، پنچایتوں اور تمام رضاکار اداروں میں پہونچانا ہے، اور اس طرح سے یہ ایک راستہ دکھانے والا اہم کام انجام دے سکے گا۔ انھوں نے اس کانفرنس کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات پیش کیں۔ ●

بقیہ: نیا بیس نکاتی پروگرام اور تعلیم

ہندوستانی سماج تعلیم کو ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ اپنے تعلیمی ڈھانچے اور تعلیمی پالیسی پر ملک کو ہمیشہ فخر رہا ہے۔ تعلیم کے نظام پر ملک کو پورا اعتماد ہے اور امید بھی۔ ظاہر ہے لوگوں کو ٹھوس نتائج کی توقع بھی ہے۔ یہ توقع تب تک پوری نہیں ہو سکتی جتنی دیر تک تمام ملک اور اس کے افراد تعلیم کے پروگراموں کو کارگر بنانے میں حکومت کی مدد کریں۔ حکمت عملی یوجنا بن چکی ہے۔ اب اس کو عمل میں لانے کے لیے سوسائٹی کے ہر فرد کی شرکت اور تعاون کی ضرورت ہے۔ رضاکارانہ تنظیمیں اور غیر سرکاری اداروں کا اس تعلیمی پروگرام میں بہت بڑا رول ہے۔

بیس نکاتی پروگرام کے دسویں پوائنٹ کا آخری حصہ تعلیم کے ثقافتی پہلو پر ہے۔ تعلیم ایسی ہو جس سے ملک کا وقار بڑھے، ملک میں قومی یک جہتی کو فروغ ملے اور طالب علم اپنے ملک پر ناز کر سکیں۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک کارروائی یوجنا انسانی وسیلوں کی ترقی کی وزارت (محکمہ تعلیم) نے بنائی ہے۔ اس میں اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ملک کی شاندار ثقافتی روایت اور اس کے رسمی تعلیمی نظام میں پیدا ہو گئی ہے۔

بیس نکاتی پروگرام کا آخری تعلیمی نکتہ اقدار کی تعلیم پر ہے۔ اس کے مطابق نصاب تعلیم پر اقداری لحاظ سے نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ تعلیم ایسی ہو جس سے ملک کی اخلاقی قدریں اور پڑھنے والوں کا اخلاق اچھا ہو۔ یہی اخلاقی قدریں آگے چل کر ملک میں اتحاد اور یک جہتی پیدا کریں گی۔ تعلیم ایسی ہونی چاہیے جس سے تشدد و مذہبی تعصب ضعیف الاعتقادی ختم ہو جائے۔ مہاتما گاندھی کے مطابق تعلیم کا مقصد ملک میں ایک ایسی سوسائٹی پیدا کرنا ہے جو اہنسا کے اُصولوں پر مبنی ہو

بقیہ: کور صفحہ ۲

غالب اکیڈمی میں سید حامد صاحب کی کتابوں کا اجراء

۱۴ر مارچ ۱۹۸۷ء کی شام کو غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں ایک پُروقار ادبی تقریب ممتاز ادیب و دانشور جناب سید حامد (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی تین تصانیف لمحات (غزلوں کا مجموعہ)، مہر و ماہ (مراسلاتی ناول) اور کربِ آگہی (مضامین کا مجموعہ) کی رسمِ اجرا کے سلسلے میں غالب اکیڈمی کی طرف سے منعقد ہوئی۔

اُردو کے بزرگ ادیب اور صحافی جناب حیات اللہ انصاری، ایم۔ پی نے صدارت فرمائی۔

اُردو کے معروف ناقد جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے لمحات (غزلوں کا مجموعہ) جناب پروفیسر اسلوب احمد انصاری (علی گڑھ) نے مہر و ماہ (مراسلاتی ناول) اور جناب حیات اللہ انصاری نے کربِ آگہی (مضامین کا مجموعہ) کی رسمِ اجرا انجام دی۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ جناب سید حامد کی تصانیف بصیرت کا سرمایہ ہیں۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے مراسلاتی ناول "مہر و ماہ" پر جامع گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ دراصل انگریزی کے مشہور شاعر رابرٹ براؤننگ اور اُس کے عہد کی ایک داستانِ محبت کو مراسلاتی ناول کی صورت میں ایک جیتا جاگتا نقش ہے جس میں خطوط کے انتخابات کا حسن، تلخیص کی خوبی کے ساتھ ترجمہ کی عبارت توازن، احتیاط اور سنجیدگی کا وقار ملتا ہے۔ ●

شمیم حیدر

یہ آپ سب کے لیے

اس شمارے سے ملک کے نئے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے موٹے حروف میں دو صفحات کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جو پڑھنا لکھنا سیکھ رہے ہیں اور جنھیں پڑھنے میں ابھی پوری طرح مہارت نہیں ہے، وہ ان موٹے حروف میں لکھے ہوئے مواد کے ذریعے سے ملک کی ترقی کی کچھ باتوں کو جان سکیں۔ ہمیں اس بارے میں عوام کی رائے جاننے کا انتظار رہے گا تاکہ ان کے مشوروں سے ہم اس مواد کو اور زیادہ مفید بنا سکیں۔ (ایڈیٹر)

عورتوں اور بچوں کی بھلائی کے پروگرام

کہا جاتا ہے کہ عورتیں دنیا کی کمزور ترین مخلوقات میں سے ایک ہیں اور اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری مردوں پر ڈالی گئی ہے اس لیے انسانی وسائل کے فروغ سے متعلق محکمے نے حاملہ عورتوں اور بچوں کے لیے دو پروگرام کی شروعات کی ہے تاکہ ان کی بھلائی کے لیے کچھ کیا جا سکے۔

جنوری ۱۹۸۶ء سے شروع کیے گئے اس پروگرام میں حاملہ عورتوں اور ۶ سال سے کم عمر کے بچوں کو گیہوں سے تیار کی گئی عمدہ غذا دی جاتی ہے۔ دوسرے پروگرام کے تحت انھیں اناج کے علاوہ ان کی صحت کی دیکھ بھال اور تعلیم کی طرف بھی دھیان دیا جاتا ہے تاکہ یہ بچے بڑے ہو کر ایک اچھے شہری بن سکیں۔

یہ پروگرام نہایت کامیابی سے چل رہے ہیں اور اس میں مہاراشٹر اور مدھیہ پردیش کا نام نمایاں ہے۔ ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران اس کے تحت مدھیہ پردیش میں ۹۴ اور مہاراشٹر میں ۱۱ پروگرام چل رہے ہیں۔ ان کو مزید وسعت دینے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔

ریگستان کے ایئرکنڈیشنڈ جھونپڑے

ہندوستان کے غیر ترقی یافتہ علاقوں میں ابھی بھی ایسی حیرت انگیز چیزیں نظر آجاتی ہیں جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایسے ہی حیرت انگیز جھونپڑے راجستھان میں تھار کے ریگستانی علاقے مارو میں پائے جاتے ہیں۔ دور سے دیکھنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سمندر میں کوئی جہاز لہروں کے بے رحم ہاتھوں میں ڈول رہا ہے لیکن نزدیک جانے پر پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک جھونپڑا ہے جس کی دیواریں تو گارے اور مٹی کی بنی ہوتی ہے لیکن چھت باجرے کے ڈوکو سے بنائی جاتی ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ آپ اس میں بیٹھ کر نہ گرمی سے پریشان ہوں گے نہ سردی سے اور برسات کا تو احساس بھی نہیں ہوگا۔

ان علاقوں میں ہمیشہ طوفانی جھکڑ چلتے رہتے ہیں جن کی رفتار ۱۰۰ کیلومیٹر سے بھی تیز ہوتی ہے۔ یہ طوفانی ہوائیں بھی ان جھونپڑوں کو نقصان پہنچانے میں اپنے آپ کو بے بس پاتی ہیں۔

ان جھونپڑوں میں باورچی خانہ سے لیکر عورتوں کے نہانے کا گھر تک موجود ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس میں مویشی باندھنے کے لیے جگہ بھی بنادی جاتی ہے۔ اس گھر کے دروازے کی اونچائی کم رکھی جاتی ہے تاکہ جب

اس میں داخل ہوں تو اس آرام دہ مکان کے احترام میں لوگوں کے سر جھک سکیں۔

جانوروں کا بیمہ

چھوٹے اور غریب کسانوں کو اچانک ہونیوالے حادثات کے نقصان سے بچانے کےلیے ان کے جانوروں کا بیمہ کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے بیکار نہ ہو جائیں یا اس نقصان سے سنبھلنے تک دھنا سیٹھوں کے چنگل میں نہ پھنس جائیں۔

اس پروگرام کے تحت ان کے گائے، بھینس، بیل، گھوڑا، ٹٹو، گھوڑی، بھیڑ، بطخ، مرغی، بکری، وغیرہ تمام پالتو جانوروں کا بیمہ کیا جاتا ہے۔ بیمہ کروانے کےلیے ان سے نہایت قلیل رقم وصول کی جاتی ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ انھیں ان جانوروں کی خرید کی رسید دکھانی پڑتی ہے تاکہ اتنی ہی رقم واپس کی جاسکے۔

اس کام کو کرنے میں جو چار کمپنیاں نہایت اہم کردار انجام دے رہی ہیں وہ ہیں (۱) نیشنل انشورنس کمپنی (۲) اورینٹل فائر اینڈ جنرل انشورنس کمپنی۔ (۳) یونائیٹڈ انڈیا جنرل انشورنس کمپنی۔ (۴) نیو انڈیا انشورنس کمپنی۔

یہ لوگ گاؤں گاؤں جاکر پہلے جانوروں کی صحت اور عمر وغیرہ دیکھتے ہیں۔ اور اطمینان حاصل کرنے کے بعد ان کا بیمہ کرتے ہیں تاکہ اچانک ہونے والے حادثات کے بعد کوئی پریشانی نہ ہو۔ بیمہ ایک سال سے پانچ سال تک کے لیے کیا جاتا ہے اور ضرورت کے مطابق اس میں ترمیم بھی کی جاتی ہے۔

اگر اچانک جانور مر جائے تو بیمہ کے کلیم کے لیے اسے ڈاکٹر سے جانچ کروانا چاہیئے اور وہ رپورٹ، قیمت خرید کی رسید، موت کی رسید (جو گرام پنچایت سے حاصل کرنی چاہیئے) اور اس کے کان میں لگے ہوئے بیمہ کا نمبر ۲۴ گھنٹوں کے اندر بیمہ کے دفتر پہونچا دینا چاہیئے تاکہ مناسب کارروائی کی جاسکے۔ یہ سب کارروائی کرنے سے بیمہ کی رقم جلد ہی مل جاتی ہے۔ اور کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے۔ لیکن دیہاتوں میں بہت زیادہ پریشانیاں پیش آتی ہیں۔ دیہاتوں میں انسان کے لیے ڈاکٹر نہیں مل پاتے تو جانوروں کو کہاں لے جاکر پوسٹ مارٹم کروایا جائے اور ان انشورنس کمپنیوں کے دفاتر اتنے دور واقع ہوتے ہیں کہ وہاں تک پہونچنے ہی میں کافی وقت گزر جاتا ہے اور کبھی کبھی کلیم کے کاغذات انھیں نہیں دیئے جاتے۔ اس لیے وہ لوگ پیسہ واپس لینے میں ناکام ہوتے ہیں یا خواہ مخواہ دیر کی جاتی ہے۔ اس لیے حکومت کو چاہیئے کہ وہ ہر علاقے میں جانوروں کا ڈاکٹر رکھے جس سے کسان جانوروں کی موت کا سرٹی فیکٹ حاصل کرسکیں اور ہر ضلع میں انشورنس کمپنیوں کی ایک شاخ قائم کرے اور انھیں یہ حق دے کہ وہ جانچ کرنے کے بعد پیسہ واپس دینے کے لیے مناسب کارروائی کرسکے۔ اس سے کسانوں کو فائدہ بھی پہونچے گا اور لوگ بیمہ کروانے کی طرف متوجہ بھی ہوں گے۔

چھوٹے آبپاشی کا فروغ

چھوٹے پیمانے پر آبپاشی کے ذرائع مہیا کرنے کے لیے حکومت نے ساتویں پانچسالہ منصوبے کے دوران ۸۶ لاکھ ہیکٹیر زمین کا نشانہ مقرر کیا ہے جس کے لیے ۴۲۱۸ کروڑ روپیے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ ●

۲۷ فروری کو غالب اکیڈمی میں
مرزا غالب کی ۱۱۸ ویں برسی
کے موقع پر ایک ادبی تقریب کا
اہتمام کیا گیا جس کی صدارت
جناب عزیز قریشی ممبر پارلیمنٹ نے
کی، اقلیتی کمشن کے چیرمین
جسٹس حمید اللہ بیگ نے اس
کا افتتاح کیا اس موقع پر
ابیس العصر جناب مہدی نظمی
کی تصنیف "غالب" (منظوم
سوانح حیات) کی رسم اجراء
جناب حکیم عبدالحمید نے فرمائی۔



تصویر میں دائیں سے بائیں جناب یونس سلیم، صدر جلسہ جناب عزیز قریشی ایم۔پی، جسٹس حمید اللہ بیگ۔

غالب کی منظوم سوانح حیات

(ایک اقتباس)

غالب کہ کہکشانِ تغزل کا ماہتاب
جس کی غزل غزل میں رواں 'جاودانِ خرد'[1]
جس کا کلام دانشِ مشرق کی اک دلیل
دستورِ پیش[2] دادیٔ اقلیم ہند پر
طرزِ بیاں کہ جیسے شگفتِ گلِ بہار
آئینۂ تجلیٔ دانش میں عکسِ سحر
"چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے"
جس کو ملا تلمذِ رحمٰن کا شرف
عقلائے فکر و ذہن کی پرواز کو ملے
طرفِ دل و دماغ میں گنجالشِ علوم
مسندنشینِ محفلِ اربابِ علم و فن
چہرے پہ مہرِ دانشِ ہوشنگ[3] کی کرن
رب نے گری صورتِ دوشیزۂ غزل
یوں خاک دال دہر پہ اس کی نگاہ تھی
جس موڑ پر حیات کے، چاہو پکار لو
ہے خسروِ سخن اسد اللہ بیگ خاں

بیدل کا نقش، حافظِ شیراز کا جواب
دیواں جس کا قدر میں ہوشنگ کی کتاب
جس کا شعور کُہنہ روایت میں انقلاب
اُردو زباں میں اُتری ہے الہام کی کتاب
اندازِ فکر جیسے روانیٔ موجِ آب
جیسے کہ جگمگاتا ہے دریا میں آفتاب
رقصِ عروسِ فکر سرِ ساغرِ شراب
ملا تھا جس کو غیب سے مضمونِ انتخاب
موجِ روانِ خونِ پر و بازوئے عقاب
نارِ نظر میں قوتِ تحصیل و اکتساب
جیسے کہ بزمِ کوکب و انجم میں ماہتاب
عارض پہ رنگِ خونِ فریدوں[4] کی آب و تاب
اُردو نگارِ نثر کی ریاضتِ شتاب
محفوظ حافظے میں ہو جیسے کوئی کتاب
ہر موڑ پر حیات کے، دنیا ہے وہ جواب
اک آئینہ کہ جس میں ہے آفاقیت کی آب



تصویر میں حکیم عبدالحمید صاحب، جناب مہدی نظمی کی کتاب کا اجراء فرماتے ہوئے (فوٹو سید علی)

[1] "جاودانِ خرد" ہوشنگ کی کتاب کے ترجمے کا عنوان ہے۔ ایران ہوشنگ کو انبیاء کی صف میں شمار کرتا ہے [2] دستور: ہی [2] پیش دادی: ایران کا حکمراں خاندان، غالب کے آباؤ اجداد اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جس میں ہوشنگ اور فریدوں جیسے نامور بادشاہ گزرے ہیں۔ [3] و [4] ہوشنگ و فریدوں ایران کے معروف حکمراں جن پر غالب کا سلسلۂ نسب منتہی ہوتا ہے۔

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U(DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

Vol.7 No. 1-2 YOJANA (URDU) 1-30 April, 1987

یوجنا ترقی کے نئے دور میں

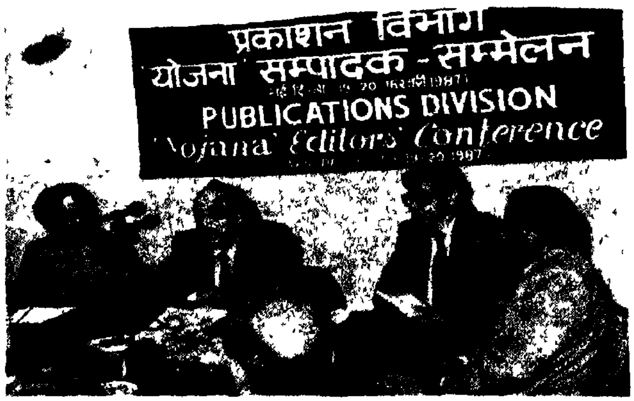


منصوبہ بندی کمیشن کے نائب صدر ڈاکٹر منموہن سنگھ نے ۱۹، ۲۰ فروری ۱۹۸۷ کو نئی دلی میں یوجنا کے ایڈیٹروں کی کانفرنس کا افتتاح کیا۔ زیر نظر تصویر میں اطلاعات و نشریات کے وزیر مملکت شری اجیت پانجا اس افتتاحی اجلاس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے۔ تصویر میں دائیں جانب ڈاکٹر منموہن سنگھ تشریف فرما ہیں۔

یوجنا گروپ آف جرنلز کے ایڈیٹروں کی تیسری کانفرنس ۱۹ اور ۲۰ فروری ۱۹۸۷ کو یہاں نئی دلی میں ہوئی، اس کا افتتاح منصوبہ بندی کمیشن کے نائب صدر ڈاکٹر منموہن سنگھ نے کیا۔ اطلاعات و نشریات کے وزیر ریاست شری اجیت پانجا نے اس کی صدارت کی۔ منصوبہ بندی کمیشن کے تین ارکان اور اس کمیشن کے سکریٹری نیز اطلاعات و نشریات کی وزارت کے سینیئر افسران نے اس دو روزہ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کی۔ پبلی کیشنز ڈویژن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ایس۔ ایس۔ ششی نے خیر مقدمی تقریر کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر منموہن سنگھ نے کہا کہ یوجنا کا اصل مقصد منصوبے کے بارے میں عوام کے شعور کو بیدار کرنا ہے، یوجنا کی خدمات کو سراہتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگرچہ یہ رسالہ مسلسل تخلیقی خدمات انجام دے رہا ہے، تاہم اس میں اصلاح کی بڑی گنجائش ہے تاکہ منصوبہ بندی کا پیغام قارئین کی بڑی تعداد تک پہونچ سکے۔ انھوں نے اس رسالہ کو پیغام دینے والا ایک رسالہ بتلاتے ہوئے کہا کہ یہ عوام اور منصوبہ بندی کے ذمہ داروں کے درمیان دو طرفہ رابطے کا کام کرتا ہے، نائب صدر نے کہا کہ اسے یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہو سکے۔ اور اسے سبسڈی کی ضرورت نہ رہے۔

شری اجیت پانجا نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا کہ یوجنا ملک کے سبھی عوام تک پہونچنا ضروری ہے۔ خاص کر نا خواندہ افراد تک اسے پہونچانا ضروری ہے۔ انھوں نے اس رسالے کو بہتر بنانے کے چند مشورے بھی دیئے تاکہ یہ عام آدمی کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ تعلیم بالغان کے پروگراموں سے فائدہ اٹھانے والے بھی اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے لیے کم سے کم دو صفحات بڑے حروف میں ان کی معلومات کے لیے دیئے جانے چاہئیں۔ پبلی کیشنز ڈویژن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ایس۔ ایس۔ ششی نے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اس ادارے نے کتابوں کی فروخت بڑھانے کے لیے ٹھوس قدم اٹھائے ہیں۔

(ڈاکٹر منموہن سنگھ اور شری اجیت پانجا کی تقریریں ص۲ پر ملاحظہ فرمائیں)



۲۰ فروری کو پٹیالہ ہاؤس میں اطلاعات و نشریات کی وزارت کے سکریٹری شری جی۔ ایس۔ مہرہ نے یوجنا ایڈیٹرز کانفرنس سے خطاب کیا۔ زیر نظر تصویر میں سکریٹری موصوف کے (بائیں طرف) پبلی کیشنز ڈویژن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیام سنگھ ششی، ایمپلائمنٹ نیوز/روزگار سماچار کے چیف ایڈیٹر اور جنرل میجر شری نگیندر سنگھ (دائیں طرف)، یوجنا گروپ آف جرنلز کے چیف ایڈیٹر سید ظہیر الحسن تشریف رکھتے ہیں۔ سکریٹری صاحب کے سامنے پبلی کیشنز ڈویژن کے جائنٹ ڈائرکٹر جناب اے۔ اے۔ سروسی۔

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadurshah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوجنا

بندھوا مزدوری کے نظام سے متعلق خصوصی مواد

جلد: ۷
شمارہ: ۴،۳
قیمت: دو روپے



بندھوا مزدوری نظام کیا ہے؟ یہ دیہات کے غیر منظم محنت کشوں کی انتہائی افسوسناک اور قابلِ رحم حالت کا اظہار ہے۔ اس نظام کو جنم دینے کے لیے جو حالات ذمّہ دار ہوئے، ان کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا ہے تاکہ یہ خرابی دوبارہ جنم نہ لے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے اس نظام نے سر اُبھارا۔ یہ تھے انتہائی غریبی، ہُنرمندی یا اثاثوں کی پوری طرح کمی۔ بے انصافی کی بُنیاد پر چلنے والے سماجی رسم و رواج، زیادہ تر عوام کی بے بسی، بے چارگی اور مجبوری اور ان کا ساہوکاروں پر انحصار، جس سے کہ وہ اُن سے رقم اُدھار لے کر اپنی ضرورتوں کو پورا کریں۔

اس سلسلے میں جو قانون پاس کیا گیا ہے، اس پر عمل درآمد ایک اہم سماجی ذمّہ داری ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو بندھوا مزدور بحال ہوں، انھیں دوبارہ سے بسانا بھی ایک اہم سماجی فریضہ ہے۔

بندھوا مزدوروں کو دوبارہ سے بسانے کے کام کا جائزہ لینے کے لیے جو تنظیم قائم کی گئی اور اس نے اس سلسلے میں جائزہ لینے کے بعد جو رپورٹ دی، اُس میں بہت سے اہم مشورے شامل ہیں مثلاً حفاظتی اقدامات کی ضرورت، مختلف بحالیاتی پروگراموں سے بندھوا مزدوروں کو واقف کرانا، بندھوا مزدوروں کی شناخت کے کام کو بدستور جاری رکھنا اور گروہ کی صورت میں ان کی بحالیات کے پروگرام کے امکانات پر غور و خوض کرنا۔

(ساتویں پنجسالہ منصوبے کی دستاویز سے ماخوذ)

یوجنا
خصوصی شمارہ
نئی دہلی

چیف ایڈیٹر: سید ظفیر الحسن
ایڈیٹر: جگندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹر: محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر: وسیم حیدر
عبد الحمید

شرح چندہ
سالانہ ۲۰ روپے، دو سالہ ۳۶ روپے
سہ سالہ ۴۸ روپے، فی کاپی ۲ روپے
طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت۔

جلد ۷ | شمارہ ۳، ۴ | یکم تا ۱۳ مئی ۱۹۸۰ء | ۱۱ ویساکھ تا ۱۰ جیٹھ، شک ۱۹۰۹ | قیمت: دو روپے، ٹیلیفون: ۶۰۱۸۱۸

اس شمارے میں

اداریہ

بندھوا مزدوری

بندھوا مزدوروں کو آزاد کرانا ایک چیلنج — لکشمی دھر مشرا — ۴
بندھوا مزدوروں کا پتہ چلانا ایک مشکل کام — اے۔ کے۔ سراسنو — ۱۲
بندھوا مزدوری کو ڈائی کنال پہنچ پر — گرنہال سنگھ پیرزادہ — ۱۷
بندھوا مزدوروں کی بحالی تیزی سے ہونی چاہیے — ڈاکٹر ایچ۔ بیس — ۲۱
بندھوا مزدوروں کی بحالی کیا واقعی بحالی ہے؟ — ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ شاہ — ۲۵
بندھوا مزدور خواب یا حقیقت؟ — بھرت ڈوگرہ — ۲۸
بندھوا مزدوروں کی بحالی۔ بیس نکاتی پروگرام کی پیش رفت — ایم۔ یونس صدیقی — ۳۰
بندھوا مزدوروں سے متعلق سپریم کورٹ کا فیصلہ — ۳۲

صنعت بھارتی صنعت کے چالیس برس — ہرش اروڑہ — ۳۹

جنگل کے باسی

جنگلات اور جنگلی جانوروں کا تحفظ — ڈاکٹر احسان اللہ خاں — ۴۲

شہر کاری متوازن شہرکاری۔ اتر پردیش کا مطالعاتی جائزہ — ایس۔ این۔ تیواڑی — ۴۴

طب تیزابیت اور آنتوں کا السر — ڈاکٹر ڈی۔ کے۔ بھارگو — ۴۷

ادب اُردو شاعری کی ہندی اصناف — جمیل اختر — ۵۰
بے آبرو (کہانی) — مدن لال منچندہ — ۵۳
فراق گورکھپوری کا ایک مرثیہ — رفعت سروش — ۵۵
تبرکات (اقسامِ سخن) — حسرت موہانی — ۵۷
غزلیں — مظفر امام، کھنڈوی، سکھدیو شرما رشک، راجندر بہادر موج، اختر شاہجہانپوری، سردار شمیم، نیاز حیدر جیدری، ڈاکٹر اسلم حنیف — ۵۹، ۶۰
اتحاد کی خوشبو (نظم) — شفیع اللہ خاں راز الٰہ آبادی — ۶۰
دلی کی ادبی و فنی سرگرمیاں — ۶۱
تبصرے: سینک سماچار آرمی ڈے نمبر — ایل۔ سی۔ یاس — ۶۲
آسان اُردو شارٹ ہینڈ — سیدہ رقیہ زیدی — ۱۲

شخصیات معین الدین حارث — ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی — ۱۳
کیا آپ جانتے ہیں — زید حسن — ۱۱
آپ سب کے لیے — ادارہ — ۱۹
قارئین کی آراء اور مشورے — اکرام اشرف، ثاقب گنگوہی، قاضی حسن رضا، فردوس گیاوی، اسد رضوی، انور شبابت، معصوم انصاری، کمال انور — ۶۸

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، لیکن اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر یوجنا (اُردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (صین)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منجال

ترسیل زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

نوعِ انسان کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انسان کی شقاوت قلبی اور اس کی بربریت اور حیوانیت کی اکثر داستانیں لرزہ براندام کرنے کے لیے ضرب المثل بن چکی ہیں۔ وہ طبعاً خود غرض واقع ہوا ہے، اسے ذاتی مفادات سے گہری دلچسپی رہی ہے، چنانچہ اس نے اپنے مفادات کی خاطر انتہائی منظم پیمانے پر اور ایک باقاعدہ نظامِ کار کے تحت اپنے ہی بھائیوں کو مسلسل غلامی میں جکڑ رکھا ہے اور یہ کام اس نے بزعم خود بڑے فخر سے کیا ہے، حالانکہ یہ وہ نامراد کام ہے جسے طاقتور سے طاقتور اور چالاک سے چالاک جانور بھی کرتے ہوئے شرماتا ہے اور اسے اپنے لیے باعثِ تحقیر و تذلیل سمجھتا ہے۔ لیکن حضرتِ انسان ہیں کہ اس مذموم رسم اور فعلِ قبیح کو صدیوں سے کرتے چلے آئے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اسے ایک تجارت کی صورت میں کرنے لگے۔ چنانچہ انسان کی خرید و فروخت بالکل اسی طرح سے کی جانے لگی جیسا کہ کسی بھی دوسری شئے کی۔ یہ طریقہ کسی ایک سرزمین یا کسی ایک علاقے تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ یہ ایک عالمی کاروبار بن گیا جو ہزاروں سال تک گویا کہ حضرتِ عیسیٰؑ کے عہد سے لے کر نوآبادیاتی نظام کی توسیع کے زمانے تک چلتا رہا۔ یہ اور بات ہے کہ ہر زمانے اور ہر مقام پر اس کو مختلف ناموں سے پکارا گیا۔ کہیں غلام، کہیں کمیرا، کہیں رعیت، کہیں رعایا، کہیں ہالی موالی کہیں بندھوا مزدور، کہیں کھیت مزدور وغیرہ۔

انسانی تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ انسان جس قدر زیادہ تہذیب سے آشنا ہوتا گیا، اسی قدر اس نے اپنے سے کمزور لوگوں پر اپنا شکنجہ مضبوط کرنے کی نئے نئے حکمتِ عملی اپنائی۔ دنیاوی دولت اور اقتدار کی افزائش سے اس کی سوچ کے دھارے بدل گئے

آدمی کو بھی

وہ دوسروں کو، حقیر سمجھنے لگا، حالانکہ یہی کمزور، حقیر اور بے بس انسان خوشحالی، اور افزائش کا بنیادی ذریعہ بنے اور انھیں کے زور بازو سے وہ دنیاوی دولت حاصل کی گئی، جس پر مالدار لوگوں کی طاقت کا محل تعمیر ہوا۔ اس کلیہ کے کچھ مستثنات ضرور ہیں لیکن برائے نام۔ گویا کہ صرف اس اصول کے جواز کے لیے۔

خود ہمارے اپنے ملک میں اس طرح کا استحصالی نظام مختلف ناموں سے چلتا رہا۔ یہ "بے گار" اور "رعیت" کے نام سے برسوں چلا۔ بندھوا مزدور کی اصطلاح تو ابھی کل کی بات ہے۔ لیکن اس کا مفہوم وہی ہے جو غلام کی ہے۔ حالانکہ زمینداری نظام جو کہ ملک کے لیے ایک کلنک بن چکا تھا، ہٹا دیا گیا، اور اصلاحاتِ اراضی کے پروگرام نیز بھودان تحریک زوروں پر رہی، یہی نہیں بلکہ بندھوا مزدوری نظام کی تنسیخ کا قانون بھی بنا دیا گیا، لیکن ان سب اقدامات کے باوجود ہم اس برائی کو سماج سے دور نہیں کر سکے قانون کے ذریعے اس ملک کے عوام کی اجتماعی قوتِ ارادی کا اظہار ضرور ہوتا ہے، اور یہ بات عوام کے سامنے واضح انداز میں آجاتی ہے کہ ان کے حقوق و فرائض کیا ہیں، لیکن افسوس کہ ایک عام رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ ہم اپنے حقوق کے منوانے پر تو پورا زور لگانے کو تیار ہیں لیکن اس کے دوسرے اہم پہلو یعنی فرائض کی بجاآوری سے غفلت برت رہے ہیں۔ بیشک ہمیں پروان چڑھنے، ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا پورا پورا حق حاصل ہے، ہمیں ہر طرح کی خوشیوں کو سمیٹنے اور خوشحالی کو گلے لگانے کا بھی حق ہے، اس کے ساتھ ہی ہمیں اپنی سرگرمیوں کو متنوع بنانے اور اُن کو نئے نئے رُخ دینے سے بھی کوئی نہیں روک سکتا لیکن یہ کام دوسروں کو نیچا دکھا کر یا دوسروں کے حقوق چھین کر انجام نہیں دیا جا سکتا

میسّر نہیں انساں ہونا

بندھوا مزدوروں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہم سب کے علم میں ہے، ایک مہم جو، مالی طور پر مضبوط اور سماجی تحفظات کے حصار میں رہنے والے طبقے ہے، جو سماج کے دوسرے ایسے کمزور طبقے پر جو کہ مالی طور پر کمزور، پست اور کچلا نیز دبا ہوا ہے، چھایا ہوا ہے اور اسے اپنے انگوٹھے تلے دبا کر، اس کی قیمت پر اپنی خوشحالی کی عمارت تعمیر کر رہا ہے۔ کمزور طبقے کے یہ لوگ سماجی طور پر پسماندہ ہیں، نفسیاتی طور پر دبے ہوئے ہیں جبکہ استحصال کرنے والے طبقے کے لوگ سبھی وسائل کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں، کمزور اور پسماندہ طبقے کے لوگ ہیں کہ انھیں اپنا کہنے کو کچھ بھی نہیں۔

خوش قسمتی سے ہم لوگوں میں چند ایسی انجمنیں ہیں جو سماجی کاموں اور عوام الناس کی خدمت کے کام سے دلچسپی رکھتی ہیں، اسی طرح کچھ ایسے جوشیلے لوگ ہیں جنھوں نے ان بدنصیب لوگوں کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا ہے جو کہ برسوں سے لاپرواہی اور مایوسی کے بوجھ کو چپ چاپ اٹھا رہے ہیں۔ سپریم کورٹ نے متعلقہ افسروں کو ہدایت دی ہے کہ سماجی اداروں کے ارکان کی بندھوا مزدوری کے معاملے کے نپٹارے کے لیے زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان سماجی اداروں اور جوشیلے کارکنوں کی ان تھک کوششوں سے انسانی استحصال کے کچھ ایسے مذموم معاملے روشنی میں آسکے، جن کے بارے میں سپریم کورٹ نے مناسب کارروائی کی اور بڑی تعداد میں ان کو مایوسی کی دلدل سے باہر نکالا گیا۔

بہر صورت اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بندھوا مزدوری کے نظام کی بیخ کنی اور تنسیخ کا مسئلہ چھوٹا موٹا مسئلہ نہیں ہے، ایک یا دو ایسی ریاستوں تک ہی محدود نہیں جو کہ اقتصادی طور پر پسماندہ کہی جاتی ہیں، اس مسئلے سے نپٹنے کے لیے مختلف محاذوں پر کام کرنا ہے، قانونی، سماجی اور نفسیاتی۔ استحصال کرنے والوں کو اس بات کی ترغیب دینی ہوگی کہ سماج وادی جمہوری بھارت میں بندھوا مزدوری کے لیے کوئی مقام نہیں، جن لوگوں کا استحصال ہوا ہے، انھیں یہ سمجھانا ہے کہ وہ خود کو منظم کریں تاکہ دوبارہ ان لوگوں کے دباؤ میں نہ آسکیں۔ انھیں یہ باور کرانا ہے کہ قانون ان کی حفاظت کے لیے موجود ہے اور بروقت ان کی مدد کرنے کے لیے تیار ہے، ہمیں اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ وہ دوبارہ سے مایوسی کے اس غار میں نہ دھکیل دیے جائیں جس سے کہ انھیں قانون کی مدد سے بڑی مشکل سے نکالا جاسکا ہے۔

انسانی وسائل کے استحصال کو روکنے کا پیغام عام کرنے کے لیے روشن خیال اور ہمدرد خلائق شہریوں کو اس کام میں شریک کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ہمیں پابندئ عہد کے طور پر رائے عامہ کو ہموار کرنا ہوگا۔ جن لوگوں کے دلوں میں مظلوموں، بیکسوں، لاچاروں اور مجبوروں کے لیے ہمدردی اور درد ہے اور جن کی آواز عوام میں سنی جاسکتی ہے ان کو دست تعاون دراز کرنے اور اس کام کو مؤثر ڈھنگ سے انجام دینے کے لیے آگے آنے اور اس بدنما داغ کو انسانی سماج کے ماتھے سے دھونے کی ضرورت ہے۔ سرکار قانون ساز اداروں کے بنائے گئے قوانین پر عمل درآمد کراتی ہے، چنانچہ قانون شکنی کا ہر معاملہ سرکار کے علم میں لانے کی ضرورت ہے۔ سرکار ایک لاشخصی نظام ہے جبکہ بندھوا مزدوری کا مسئلہ شخصی توجہ کا محتاج ہے، اس کی بیخ کنی سے برابر دلچسپی لینے کی ضرورت ہے۔ اس کام کو دل و جان سے انجام دینا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

(چیف ایڈیٹر)

لکشمی دھر مشرا

بندھوا مزدوروں کو آزاد کرانا ایک چیلنج

مضمون نگار مرکزی وزارت محنت کے سابق ڈائرکٹر جنرل ہیں اور وہ محنت کشوں کے فلاحی پروگراموں سے متعلق ہیں۔ انھوں نے خود بندھوا مزدوری کے مذموم "سسٹم" کا مطالعہ کرنے کے لیے سپریم کورٹ کے تفتیشی کمشنر کی حیثیت سے گیارہ صوبوں کا دورہ کیا ہے۔ اس مقالے میں مصنف نے "بندھوا مزدوری کے سسٹم" کے سماجی اور اقتصادی پہلوؤں اور اس میں شامل قانونی پیچیدگیوں کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے بندھوا مزدوروں کی شناخت کے لیے بنائے گئے قاعدے اور ان پر عمل درآمد کے بیچ ایک چوڑی خلیج دیکھی اور اس کام میں لگے ہوئے حکام کے لیے لگن سے کام کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے تاکہ آزاد کئے ہوئے ایسے مزدوروں کو جسمانی اور نفسیاتی دونوں طور پر پھر سے بسایا جا سکے۔ مشرا نے اس پروگرام پر عمل آوری کے تعلق سے متعدد خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے، نیز بندھن سے چھوٹے ہوئے مزدوروں کی بحالی کے لیے ایک اجتماعی اندازِ نظر کی پُرزور وکالت کی ہے۔

محنت کی وزارت کے ڈائرکٹر جنرل (مزدوروں کی بھلائی) کی حیثیت سے ۱۹۸۲-۸۳ء تا ۱۹۸۴-۸۵ء کے درمیان مجھے گیارہ صوبوں (آندھرا پردیش، بہار، گجرات، کرناٹک، کیرالہ، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، راجستھان، تامل ناڈو اور اترپردیش) کا دورہ کرنے اور مختلف شکلوں میں بندھوا مزدوری کے ناپسندیدہ سسٹم کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا، یہ ایک ایسی اقتصادی بلا ہے جس کے خلاف کوشش کرنا ضروری ہے۔ مجھے ان لوگوں سے ملنے اور سوال و جواب کرنے کا موقعہ ملا۔ ان لوگوں میں آندھرا پردیش اور کرناٹک کے جیتم، گجرات اور مدھیہ پردیش کے ہالی، سارکے کا میٹے، اڑیسہ کے گوتھی، راجستھان کے سگڑی، تامل ناڈو کے تنڈیال اور کیرالہ کے کوٹنا کمن اور اترپردیش میں جاسر بار کے کولٹاز شامل تھے۔

سپریم کورٹ کے قانون تفتیشی کمشنر کی حیثیت سے مجھے دہرے واٹہ اور فریدآباد میں کانکنی مزدوروں کی حالت زار کا اندازہ ہوا۔ اس دوران مجھے ایسے لوگوں سے بھی بات چیت کا موقع ملا۔ جو کہیں آتے جاتے شرماتے ہیں۔ میں نے اُن سے انھیں کی زبان میں بات چیت کی اور ان کو اپنے اعتماد میں لے کر ان کے حالات جاننے کی کوشش کی۔ ان کوششوں سے حیران کن نتیجے سامنے آئے، ان سب مطالعوں سے یہ اندازہ ہوا کہ یہ لوگ ملک کی متمدن زندگی سے الگ تھلگ رکھے گئے ہیں۔ عرصہ دراز سے یہ بحث چلی آ رہی ہے کہ بندھوا مزدور کسے کہتے ہیں اور کیا ہالی اور جیتم بندھوا مزدوروں کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان کی حالت خرابی کی طرف ہی چل رہی ہے۔ آخر اس بدحالی کے کیا اسباب ہیں۔

قانون کا ارتقاء

ادارہ محنت کی عالمی تنظیم نے بندھوا مزدوری کی تنسیخ سے متعلق ایک کنونشن ۱۹۱۹ء میں مرتب کی، اس کی توثیق ۲۰ نومبر ۱۹۵۴ء کو کی گئی۔ آئین کے آرٹیکل ۲۳ کی روشنی میں یہ قدم اٹھایا گیا۔ اس کے سبب یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کی دفعات کو عملی صورت دی جائے اور اس سلسلے میں ایک قومی قانون وضع کیا جائے۔

اس کنونشن کی روشنی میں اڑیسہ انسداد قرض قانون ۱۹۴۸ء اور سگڑی سسٹم (انسداد) ایکٹ ۱۹۶۱ء وغیرہ جیسے صوبائی سطح

[illegible] لیکن [illegible] ہے
زیادہ [illegible] ہے کہ ان سب کا اثر بہت زیادہ
نہیں ہوا [illegible] وزیر اعظم شریمتی اندرا
گاندھی کی حکومت نے یکم جولائی ۱۹۷۵ء کے پہلے ۲۰ نکاتی
پروگرام کے اعلان کے بعد اس ضمن میں قومی سطح پر
قانون سازی پر زور دیا جا سکا۔ بندھوا مزدوری ختم
کر دی گئی ہے اور جہاں کہیں بھی یہ موجود ہے اسے
غیر قانونی قرار دیا جائے گا یہ ۲۰ نکاتی پروگرام
نمبر ۴ کے تحت درج تھا۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو بندھوا
مزدوری سسٹم (انسداد) آرڈیننس جاری ہوا جس کی
جگہ بعد میں بندھوا مزدوری سسٹم (انسداد) ایکٹ
نے لے لی، جسے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں
نے فروری ۱۹۷۶ء میں پاس کیا، لیکن جس کی
دفعات کا نفاذ اس گزری ہوئی تاریخ سے کیا
گیا، جب کو اس قانون کی اشاعت کی گئی تھی۔
اس بل کو ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء کو ان دنوں کے
وزیر محنت نے پیش کیا اور اس سلسلہ کی دشواریوں
پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی۔

"ایک آزاد کیے ہوئے بندھوا مزدور کے
پاس پیداوار کے لیے نہ تو لاگت وسائل ہوں گے،
نہ ہی اسے کوئی قرض دے گا اور نہ ہی بغیر کسی
مدد کے اپنی روزی روٹی کمانے کے لیے اس کے
پاس کوئی پیشہ ورانہ ہنر ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر
اس کو کسی نفع بخش کام سے لگا بھی دیا جائے گا
تو بھی نتیجے کی مدت کے دوران اس کی کوئی کمائی
نہیں ہوگی۔ ایک بندھوا مزدور جو کہ فرمانروائی
اور تابعداری کی دنیا کا عادی ہوتا ہے، قطعاً
اپنے حقوق سے بے خبر ہوگا۔ بعض اوقات وہ
اقتصادی بحالی کے کٹھن عمل سے گزرنا بھی پسند
نہیں کرے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس غلامی کی
زندگی کی طرف پھر سے لوٹ جانے کو ترجیح دیں۔"

چنانچہ ایک خاص وقت کی ضرورت ہوتی ہے
اور [illegible] کے آخری حصے میں مرتب

[illegible]

معاشرت [illegible] سیاسی خصوصیات اور معاشیاتی
فلسفہ کا آئینہ دار ہوتا ہے لیکن محض ایک
چوکھٹا اور ایک ناقابل رجحان کا اشاریہ ہوتا ہے۔
اس سے سماجی، سیاسی اور اقتصادی [illegible] سسٹم
کی کمزوریوں کو پوری طرح دور کرنے کی توقع نہیں کی
جاتی۔ لہٰذا ان اسباب کا تجزیہ کرنا مناسب ہوگا،
جن کی وجہ سے اس قانون کے مقاصد کے حصول میں
رکاوٹ آئی ہو یا ان کو دھکا پہونچا ہو۔

بندھوا مزدوری کس سے عبارت ہے؟

اول اور اہم ترین بات یہ ہے کہ ایک واضح اور
غیر مبہم قانونی دفعہ کے باوجود جس کی روشنی میں، فروری
۱۹۸۲ء کی رٹ پٹیشن نمبر ۲۱۳۵ کے تعلق سے سپریم کورٹ
کے تاریخی فیصلے (مورخہ دسمبر ۱۶، ۱۹۸۳ء) میں دی گئی ایک
بہت ہی فراخ، فیاض اور پھیلنے والی تاویل بھی پیش کی گئی،
نیز اس قانون کے خاص مضمون میں اس اضافے کے جو ہوئے کہ
ٹھیکے پر کام کرنے والے اور موسمی مزدور بھی، اگر وہ اس
قانون میں مندرج معیارات پر پورا اترتے ہوں،
بندھوا مزدوری سسٹم کے دائرے میں آ سکتے ہیں، ہم
بندھوا مزدوری، بندھوا مزدور اور بندھوا مزدوری
سسٹم کے تصور اور تعریف کے بارے میں غلط
فہمیوں اور شکوک میں مبتلا رہے ہیں۔ اصلی
حقیقت بیان کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ
بندھوا مزدوری سسٹم لازمی طور پر ایک قرض خواہ
اور مقروض کے درمیانی تعلق کی نمائندگی کرتا ہے۔
یہ امر اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ایک مقروض اپنے
روزمرہ کی مالی مجبوریوں کی وجہ سے قرض یا پیشگی
رقم لیتا ہے، اس لیے اسے قرض خواہ کی شرائط کی لازماً
تعمیل کرنی پڑتی ہے۔ اس اقرار نامے کی اہم ترین شرط
کے طور پر مقروض اپنی خدمت یا اپنے کنبے کے کسی
فرد یا سبھی افراد کی خدمات ایک معینہ یا غیر معینہ
مدت کے لیے گروی رکھنا قبول کر لیتا ہے۔ غیر مساوی
شرائط پر تیار کردہ اس اقرار نامے پر تعمیر ہونے والے

ایسے تعلق سے کچھ نتائج پیدا ہوتے ہیں [illegible] محنت
یا خدمت کی لازماً کچھ معقول اجرت ہونی چاہیے
جو مارکیٹ میں اس کی اجرت کے مساوی ہو۔
البتہ بندھوا مزدوری سسٹم کے تحت لی جانے والی
بیگار دئے گئے قرضے یا اس کے سود کے بدلے
میں ہوتی ہے۔ یہ معاوضہ یا تو اس کم سے کم اجرت
سے بھی کم ہوتا ہے جس کا اجرت ایکٹ میں اعلان
کیا گیا ہے یا اس شرح سے کم ہوتا ہے جو بازار میں
عام ہو۔

مزدوری کی ادائیگی نہ کرنا یا مقررشدہ کم
سے کم اجرت سے بھی کم رقم دینا، قرض خواہ اور
مقروض کے مابین نابرابر تعلق کا پہلا مرحلہ ہے۔
اس کے علاوہ دیگر ثمرات بھی ہو سکتے ہیں، مثلاً
(الف) بھارت کے کسی حصے میں آنے جانے کی آزادی
کی رکاوٹ۔ (ب) روزگار کے متبادل مواقع کے
انتخاب کی رکاوٹ (ج) محنت یا ایسی محنت
سے تیارشدہ مصنوعات کی معقول قیمت وصول
کرنے کے حق سے محرومی۔ ایسے نتائج انفرادی یا
اجتماعی انداز میں ہو سکتے ہیں لیکن قرض خواہ —
مقروض رابطے کا وجود اور ایک مقروض کا اپنی یا
اپنے کنبے کے ایک فرد یا سبھی افراد کی خدمات کو،
جس کا ماحصل مذکورہ نتائج میں سے کوئی ایک ہو سکتا
ہو، کسی بھی مدت کے لیے رہن رکھنا، بندھوا مزدوری
سسٹم کے وجود کی تشخیص کے لیے کافی ہے۔ یہ ضروری
نہیں کہ جملہ نتائج ایک ساتھ موجود ہوں۔ دوم
اس سسٹم کی ابتداء، ترقی اور دوام کے لیے ایک نہیں
بلکہ کتنے ہی عوامل ذمہ دار ہیں۔ ذات، فرقہ اور مذہب
کے معنوی پاس و لحاظ پر انحصار رکھنے والا ایک
جہت ہی طبقاتی معاشرتی ڈھانچہ،
غاصبانہ زمینداری نظام کی استبداد
کرنے والے اور اسے ہمیشگی دینے والا انتہائی غیر
مہذب اور غیر اخلاقی زمینداری سسٹم جس کا چلن
۱۸ویں صدی کے دوسرے نصف میں شروع ہوا،

[illegible]

[illegible] ضروریات کی فراہمی [illegible] [illegible] کا فقدان، غربت اور [illegible] تشکیل پیدا کر دینے والا [illegible] کی [illegible] نوعیت، رسومات اور کھلے [illegible] ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قرض [illegible] رقم لینا، مجھلے اور بہت چھوٹے کسانوں کا بے زمین کھیت مزدوروں میں تبدیلی کا عمل، بٹائی پر کھیتی کرنے والوں کا عدم اندراج، نیز زمین اور جملہ اثاثہ جات پر کُلّی اختیار رکھنے والوں کی دھوکہ دھڑی اور جوڑ توڑ سے کی گئی اُن کی بے دخلی کے باعث اُن کا مسلسل مفلس بنایا جانا، ایسی سنگین صورتِ حال کے لیے ذمہ دار عوامل میں سے کچھ وہ ہیں جنہیں آسانی سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔

ایسی مشکل حالات میں، بندھوا مزدوروں کی شناخت کو ویسا نہیں سمجھا جاسکتا جیسا کہ انتخابات کے دوران انمٹ روشنائی لگنے، رائے دہندگان کا ہوتا ہے، نیز یہ عمل اتنا آسان نہیں جتنا کہ مردم شماری کے دوران افراد کی گنتی کا ہوتا ہے۔ صحیح معنوں میں اور قطعی تجزیے کے لیے ان کی شناخت ایک ایسے ناسور کی دریافت کے مترادف ہے، جو ایک انسان ہونے کے باوجود، سالہا سال کے سماجی امتیاز اور اقتصادی استحصال جیسی ایک ناقابلِ بیان سماجی تحریک کی وجہ سے برداشت کیا گیا ہے اور جس کے باعث انسان محض ایک بے حیثیت جاندار ہو کر رہ گیا ہو۔

دریافت کے طریقۂ کار کا فقدان

لہٰذا یہ صاف طور سے عیاں ہے کہ ایک ناسور کو دریافت کرنے کا ایسا عمل ایک ایسے سماجی ماحول میں، جس پر وہ قوتیں چھائی ہوئی ہوں جنہوں نے اس سسٹم کو فروغ دیا ہے اور اُس پر پھل پھول رہی ہیں، سہل نہیں ہے۔ اس تمام عمل کے دو پہلو ہیں۔ ایک [illegible]

[illegible] سرکاری [illegible] مجسٹریٹ اور ضلعی [illegible] کمیٹیاں جو قانون کی دفعات کے نفاذ کے لیے ذمہ دار ہیں لیکن جن کے لیے کوئی واضح طریقۂ کار مقرر نہیں کیا گیا۔ خوشی کی بات ہے کہ شری ایس۔ آر۔ شنکرن نے جو اس وقت آندھرا پردیش سرکار کے سماجی بہبود کے محکمے میں پرنسپل سکریٹری کے عہدے پر فائز تھا، ۱۹۷۶ء میں ایک ایسے طریقِ کار کی تشکیل کی، جس میں خاصی بصیرت، تخیل اور سمجھداری سے کام لیا گیا اور جسے آندھرا پردیش میں تمام کلکٹروں کو، ان کی رہنمائی کے لیے جاری کیا گیا۔ یہ طریقِ کار ایک سوالنامے پر مشتمل ہے، جو کہ تیلیگو زبان میں چھپا ہوا ہے، اور جس میں چند ایسے آسان اور خاص سوالات درج ہیں، جنہیں گاؤں کی ہر بستی والہ میں جا کر، کھیت مزدوروں کے گروہوں سے، جن میں اکثر درجِ فہرست ذاتوں کے طبقے سے تعلق رکھنے والے بے زمین بٹائی پر کھیتی کرنے والے افراد شامل ہوں گے، ایک عہدے دار یا عہدہ داروں کی ایک تفتیشی جماعت کو پوچھنا ہوتا ہے۔ ان سوالات کو نہایت ہی بے تکلف اور سیدھے سادے انداز میں، ان مزدوروں کی سمجھ میں آنے والی زبان میں پوچھنا پڑتا ہے، تاکہ اُن سے ٹھیک ٹھیک جواب پائے جا سکیں، کیونکہ اسی بنا پر کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن ہو سکتا ہے۔

سپریم کورٹ کی طرف سے مقرر کیے گئے ایک تفتیشی کمشنر کی حیثیت سے میرے نجی تجربے سے یہ پتہ چلا کہ بندھوا مزدوروں کی شناخت سے متعلق عمل میں لائی جانے والی قاعدہ بندی میں اور اُس طریقِ کار میں، جسے فی الواقعی برتا جا رہا ہے، کافی فرق واقع ہے، سماج کے سب سے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے بندھوا مزدور شرمیلے اور اپنے

[illegible] آنا نہ تو بیان کرنے کے لیے آگے [illegible] مستعد [illegible] ہوتے ہیں جب [illegible] عہدہ دار یعنی تفتیش کرنے والا عہدہ دار [illegible] کا اعتماد حاصل کر پاتا ہے اور اس کے سوالوں کے جواب بے جھجکے اور خوشی سے دینے کے لیے وہ آگے آتے ہیں۔

حقیقی دستور کے لحاظ سے، چونکہ قانونی طور پر کوئی رسمی قاعدہ مقرر نہیں کیا گیا، بندھوا مزدوروں کی شناخت کا کام، نوکر شاہی پر، اُن کی مصلحتوں کے مطابق چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ لوگ چونکہ دیہی جدید طبقے کا حصہ ہوتے ہیں، اُن سے یہ توقع کرنا بے سود ہوگا کہ وہ اس دشوار اور حساس کام میں کچھ زیادہ انصاف کر پا سکتے ہیں۔ لہٰذا ان ناسوروں کی دریافت کے لیے ہمیں متبادل کارندوں کے بارے میں سوچنا ہوگا، تاکہ انھیں یہ بھروسہ دلایا جائے اور اُن کی ہمت بندھائی جائے کہ وہ ایک آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں، اور اس لیے ہر دوسرے شہریوں کی طرح انسانی حقوق اور ضروریاتِ زندگی کے حقدار ہیں۔ اس سیاق میں یہ امر اہمیت کا حامل ہے کہ ابتدائی سطح پر کام کرنے والی لاتعداد تنظیمیں اس کام میں لگ گئی ہیں۔ اور جو انسانیت کو بانٹنے والی تنگ مصنوعی دیواروں کو توڑنے، اور عزت و وقار کے ساتھ جینے کے لیے اُن میں تمیز پیدا کرنے کے لیے مسلسل طور پر کوشاں ہیں۔

مُکتی رہائی کیلئے طریقۂ کار

غلامی کی زنجیروں سے رہائی کا تصور نیز اس کے حصول کے لیے طریقِ عمل اسی سوال سے جڑے ہوئے ہیں۔ اب تک یہی دیکھا گیا ہے کہ اُن کی رہائی کے ضمن میں، محض رسمی عمل کیا جاتا ہے۔ رہائی کے ہر معاملے میں، ہر کسی [illegible] ہیں، اور

ہر کیس کی باقاعدہ عدالتی تحقیقات کی جا رہی ہے اور عام قاعدے کے مطابق شہادتیں وغیرہ قلمبند کی جا رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بادی النظر میں یا قانون کی نظروں میں اس میں کوئی برائی نہ ہو، لیکن یہ شہادتیں وغیرہ قلمبند کرنے کے ایک ایسے بے سرو پا طویل ضابطے کی جانب لے جاتا ہے، جو بندھوا مزدوروں کے منافی ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنی غربت، جہالت اور پسماندگی کی وجہ سے قانون کی سختیوں اور ایک بے روح قانونی عمل کے تشدد کا مقابلہ کرنے کے لیے بمشکل ہی ہمت کر پاتے ہیں۔

اس وجہ سے بندھوا مزدوروں کی پوری تعداد کی شناخت ممکن نہیں ہو سکی ہے۔ وزارتِ محنت کے پاس دستیاب اطلاعات کے بموجب ۳۰ جون ۱۹۸۶ء تک، ۱۱ صوبوں کے تعلق سے ۲ لاکھ بندھوا مزدوروں کی نشاندہی ہو چکی ہے، لیکن اس بات کا یقین نہیں ہے کہ آیا اُن سبھوں کو بندھن سے آزاد کرایا جا چکا ہے اور یہ کہ اُن کے حق میں باقاعدہ رہائی سندات جاری کی جا چکی ہیں۔

وہ اندازِ نظر جس کی ضرورت ہے

صحیح اور زیادہ قابلِ عمل اندازِ فکر، یہ ہے کہ متعلقہ کارندوں سے رپورٹ ملنے پر، فوری سرسری عدالتی کارروائی کی جائے، تاکہ شناخت اور رہائی ایک ساتھ عمل میں لائی جا سکے۔ ایسی سبھی سرسری عدالتی کارروائیوں میں، بندھوا مزدور اور بندھوا مزدور مالک کو ایک دوسرے سے الگ رکھنا ضروری ہوگا تاکہ اول الذکر کو اعتماد میں لیا جا سکے اور اپنی زندگی کے خاص خاص حقائق کو آزادی اور ہمت سے بیان کرنے پر آمادہ کیا جا سکے، جن کی بنا پر تحقیقات کرنے والا مجسٹریٹ اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ وہ ایک بندھوا مزدور ہے، لہٰذا اسے فی الفور آزاد کرایا جائے۔ اگر مجسٹریٹ کی طرف سے [illegible] بندھوا مزدور کے مالک کی جانب سے کوئی مزاحمت ہو تو بندھوا مزدوری سسٹم (انسداد) ایکٹ کی متعلقہ دفعات کے تحت اُس پر لازماً مقدمہ چلایا جائے۔ ایک ایسے غیر روایاتی اور غیر مروجہ اندازِ فکر کو اختیار کرنے سے زیادہ تر کامیابی کا انحصار تحقیقات کرنے والے مجسٹریٹ کی بصیرت، تخیل اور اس بات پر ہوگا کہ وہ اس سسٹم کی اصل کو کیسے سمجھتا ہے اور اس کے حمائتیوں اور مخالفوں کو کن نظروں سے دیکھتا ہے۔ اگرچہ اس نوعیت کے عدالتی افسروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ (اس ایکٹ کی دفعہ ۲۱ کے تحت چلائے جانے والے سبھی مقدمات کے لیے متعلقہ صوبائی سرکاروں کو ایگزیکیٹو مجسٹریٹوں کا اعلان کرنا ہوتا ہے)، تاہم یہ ضروری ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کی جانب سے واضح رہنما خطوط جاری کیے جائیں تاکہ عدالتی کارروائی سمیت قانونی دفعات کے نفاذ کا عمل مروجہ سماجی اور اقتصادی حقیقت سے ہم آہنگ ہو۔

مطلوبہ لگن

بدقسمتی سے، قانون کی ایک اہم دفعہ ۱۳ کو زیادہ کام میں نہیں لایا گیا۔ اس کے تحت ضلع اور تحصیل کی سطح پر اس کام کو انجام دینے والی کمیٹیوں کا تقرر کیا جانا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ قومی قانون بنائے جانے کے فوراً بعد کچھ صوبوں نے مستعدی سے ان کمیٹیوں کی تشکیل کرنے کی کارروائی کی تھی، ایسی کمیٹیاں (جن کے کام کی مدت ایک سال سے بڑھا کر دو سال کر دی گئی ہے) اب اکثر صوبوں میں برائے نام رہ گئی ہیں۔

کچھ صوبوں نے اس بنا پر کہ وہاں بندھوا مزدوری جیسی کوئی شے نہیں ہے، ایسی کمیٹیوں کی تشکیل ہی نہیں کی۔ ایسے اندازِ فکر کو بہتر سے بہتر حالت میں فرضی اور مغالطے پر مبنی کہا جا سکتا ہے۔ ایسا سوچنا تبھی جائز ہوگا جبکہ ضلعی اور سب ڈویژنل سطحوں پر کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی ہو اور وہ کافی مدت تک کام کر چکی ہوں۔ جبکہ کچھ دوسرے صوبوں میں جہاں ایسی کمیٹیاں بنائی گئی تھیں، انھوں نے اپنا کام بہت ہی سرسری اور بے ڈھنگے پن سے شروع کیا ہے، لہٰذا نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ اس سرسری پن اور بے ضابطگی کو واضح طور پر مناسب سطح پر ہدایات جاری کر کے ٹھیک کیا جا سکتا ہے، ضلعی، سب ڈویژنل اور مزید نچلی سطح پر، انتظامیہ کی قیادت اور سماجی لگن کے ساتھ بھی کافی نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

رہائی پائے ہوئے بندھوا مزدوروں کی بحالی

واقعات کے تسلسل اور ترجیحات کی ترتیب کے بعد جو چیز آتی ہے وہ ہے آزاد کیے گئے بندھوا مزدوروں کی بحالی کا مسئلہ، جس کا ذکر ۱۴ جنوری ۱۹۸۲ء کو اعلان کیے گئے ۲۰ نکاتی پروگرام کی مد نمبر ۶ کے تحت ملتا ہے۔

شناخت اور رہائی کا عام مطلب ایک بندھوا مزدور کے لیے ایک آزاد دنیا سے تھا۔ لیکن اس آزادی کے ساتھ عدم تحفظ کی ایک دنیا بھی جڑی ہوئی ہے، جس کا سامنا ایک آزادی پایا ہوا بندھوا مزدور از خود نہیں کر سکتا۔ چنانچہ آزادی اور عدم تحفظ کی دنیا میں انتخاب کرنا مشکل ہے۔ اس پس منظر میں دیکھتے ہوئے، جب تک ایک آزاد کیے گئے بندھوا مزدور کو کسی سہارے کا یقین نہیں دلایا جائے گا، وہ ہمیشہ پھر سے اپنے مالک کے پاس لوٹ جانا پسند کرے گا۔

مادی اور نفسیاتی ہر دو طرح کی بحالی ضروری ہوتی ہے۔ مادی بحالی لازماً معاشی ہوتی ہے جبکہ نفسیاتی بحالی کو اعتماد اور ہمت افزائی کے عمل کے توسط سے تعمیر کرنا پڑتا ہے ان دونوں کو لازماً ساتھ ساتھ چلنا ہوتا ہے۔ نفسیاتی بحالی کے لیے [illegible]

[illegible] آزاد کردہ بندھوا مزدوروں کو لازماً اُن کی اصلی جگہ سے زبردستی اُکھاڑ کر کسی ایسی جگہ پر پھر سے بسایا جائے جہاں اُن پر اُن کے سابقہ آقاؤں کا مسموم اثر و رسوخ کام نہ کر پائے۔ جب تک اُنھیں نفسیاتی طور پر ایسا یقین اور اعتماد نہیں دلایا جائے گا اس امر کا امکان ہے کہ وہ قرض کے بندھن میں پھر سے لوٹ جانے کو ترجیح دینگے۔

بحالیات کن پر مشتمل ہے ؟

بنیادی طور پر بحالی کے تین مرحلے ہوتے ہیں۔

— آزادی کے بعد فوری مادی بقا / قلیل المدتی اقدامات مثلاً اُنھیں پھر سے نئی زندگی شروع کرنے میں مدد دینے کے لیے، مکان بنانے کے لیے پلاٹ الاٹ کرنا، بیلوں کی جوڑی کے ساتھ زرعی زمین کا ایک قطعہ الاٹ کرنا، روزی روٹی کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کرنا، سرکار کی طرف سے اعلان کردہ اقل ترین اُجرتوں کی باقاعدہ ادائیگی وغیرہ اور آخر میں دیگر طویل المدت اقدامات مثلاً اراضی کو ترقی دینا (آبرسانی کی سہولیات کی فراہمی کے بشمول)، قلیل اور درمیانی مدت کے قرضوں کا اہتمام، بشمول پیداواری اثاثوں کے بیمے کے ذریعے حیوانات کی دیکھ بھال اور اُن کے علاج کے تعلق سے مکمل بچاؤ کی فراہمی، دیہات کے نوجوانوں کی تربیتی اسکیموں کے توسط سے، نئی ہنر مندیوں کے حصول اور پرانی ہنرمندیوں کی ترقی، اُن کی کم درجے کی زرعی اور جنگلاتی پیداوار کی قیمتوں کے تعلق سے نفع بخش امداد، بندھوا مزدوروں کے بالغ افراد کے لیے غیر رسمی خواندگی اور بچوں کے لیے رسمی خواندگی کی یقین دہانی، آزاد ہوئے بندھوا مزدوروں کے کنبوں کے لیے تندرستی، طبی دیکھ بھال، بیماریوں سے تحفظ اور تغذیہ بخش غذا کا تعین، آزاد کیے گئے اُن بندھوا مزدوروں کے شہری حقوق کی حفاظت، جو اپنی پیدائش کی بنا پر سماجی تفریق و امتیازات کا شکار رہے ہیں۔

آزاد کیے گئے بندھوا مزدوروں کی بحالی ضروری ہے۔ انھیں غربت، محرومی اور غلامی کے دلدل سے نکالنا ہے۔ نیز انھیں انسانوں کا درجہ دینا ہے تاکہ وہ ایک مہذب انسانی معاشرے کے خاص دھارے میں شامل ہو سکیں اور انسانی وجود کے وقار، حُسن اور قدر و قیمت کو محسوس کر سکیں، سوال یہ ہے کہ اسے کیسے کیا جا سکتا ہے اور اسے کیسے کیا جا رہا ہے؟ دیگر الفاظ میں اُن کی دائمی بحالی کے مقصد کی حصولیابی کے لیے سرکار نیز دیگر کارندوں کے موجودہ پروگراموں کی موزونیت اور کارگری کیا ہے؟

اسے کارگر ہونا چاہیئے۔

۸۳ – ۱۹۸۲ء، ۸۴ – ۱۹۸۳ء اور ۸۵ – ۱۹۸۴ء میں گیارہ صوبوں میں اپنے اپنے حلقۂ عمل میں۔ اس اہم قومی پروگرام پر عمل آوری کے دوران، مجھے کچھ خوش آئند اور کچھ تکلیف دہ باتیں دیکھنے کو ملیں۔ میں حوصلہ افزا پہلوؤں سے شروع کرتا ہوں۔ پہاڑی علاقوں کی ترقی کے پروگراموں کے تحت اتر پردیش سرکار نے قبائلی آبادی کی بہبود سے متعلق تنظیم کے توسط سے متعدد پراجیکٹ ورکروں کو تعینات کیا ہے۔ ان ورکروں نے آزاد کیے گئے، بندھوا مزدوروں کی ضرورتوں اور اُمنگوں اور ٹرائبل پراجیکٹ اتھارٹی کے مابین ایک پل کا کام کیا ہے، نیز وہ دہرہ دون کے جونسر باور اُتر کاشی اور ٹیہری گڑھوال اضلاع کے کوٹوں میں بیداری پیدا کرنے نیز اُن کے طرزِ حیات میں کچھ نمایاں تبدیلی لانے میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کی مثال دوسری صوبائی سرکاروں کے لیے قابلِ تقلید ہے، کیرالا میں، اگرچہ بندھوا مزدوری سسٹم کا اثر کافی شدید ہے، تاہم اراضی آباد کاری اسکیم کے ذریعے، آزاد بندھوا مزدوروں کو پھر سے بسانے کی ایک سچی کوشش کی گئی ہے، آباد کاری کا یہ اندازِ نظر اڑیسہ میں دیہی غریبوں کی معاشی باز آباد کاری نامی اسکیم کے ذریعے قریب قریب ایک ادارے کے قیام کا سا ہو گیا ہے۔ یہ اسکیم اراضی پر بھی مبنی ہے۔ اس کا حصہ غیر اراضی اور ہنر مندیوں پر بھی مبنی ہے۔ یہ اسکیم ہر طرح سے سب کا ملا جلا نمونہ پیش کرتی ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اُڑیسہ واحد ایسا صوبہ ہے، جہاں بندھوا مزدوروں کا پورے دیہی سماج کی شرکت سے یعنی گرام سبھاؤں کے ذریعے شناخت کیا جانا جاری ہے۔ اڑیسہ میں چل رہے اس پروگرام کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ۸۰ – ۱۹۷۹ء کے آخر تک بمشکل ۳۵۰ بندھوا مزدور شناخت کیے گئے تھے، اس کے بعد بندھوا مزدوروں کی شناخت کا کام تیز ہو گیا چنانچہ ۸۶ – ۱۹۸۵ء کے آخر تک لگ بھگ ۴۲۴۲۱ کو آزاد کیا گیا اور ۳۰۲۵۶ کو پھر سے بسا دیا گیا۔ آندھرا پردیش کی سرکار نے باز آباد کاری کے لیے لازماً ایک مربوط اندازِ نظر اختیار کیا ہے کیونکہ جہاں تک باز آباد کاری کے دشوار کام کرنے کا تعلق ہے، انھوں نے متعدد ذرائع سے وسائل کو یکجا کر کے باز آباد کاری کو سودمند بنایا گیا جسے رنگا ریڈی میں "کیمونٹی پولٹری کمپلکس" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ راجستھان میں یہ پروگرام کم بارش، زمین کی بنجر زرعیت اور سوکھے کی دشواریوں کے باعث بہت ہی مشکل حالات میں چلایا جا رہا ہے، تاہم کچھ صوبے اور ضلع کی سطح کے عہدیداروں نے اس پروگرام سے مستفید ہونے والوں کی آمدنی، روزی روٹی اور زندگی کے معیار کے تعلق سے، اسکے کچھ نمایاں اثرات پیدا کرنے کے لیے لگن کا مظاہرہ کیا ہے۔ مرکزی وزارتِ محنت نے مرکز کی جانب سے کفالت شدہ اسکیم کو ۷۹ – ۱۹۷۸ء (۳۰ مئی ۱۹۷۸ء) میں شروع کی تھی، بعد میں اُسے ترقی دی گئی اور اس اسکیم کو آسان بنا دیا گیا ہے۔ اب ان اسکیموں کی چھان بین اور منظوری صوبائی سرکار ہی اپنی سطح کی ایک چھان بین کمیٹی کے ذریعے

کرتی ہے۔ اس سے قبل یہ کام دلّی سے ہوتا تھا۔ اس امر پر غور کیا جا رہا ہے کہ اس کام کو ضلع کی سطح پر سپرد کر دیا جائے۔ نیز آزاد کئے گئے بندھوا مزدور کے لیے عطیّے کی رقم جلد ہی ۴۰۰۰ روپے سے بڑھا کر ۶۲۵۰ کئے جانے کا امکان ہے۔

خامیاں!

یہ سب مثبت اور اختراع پسندانہ تبدیلیاں ہیں، جن کا مقصد اس پروگرام کے ضابطۂ کار کو سہل بنانا اور اس کے نفاذ میں ایک خاصیتی تبدیلی لانا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس پروگرام کو کسی ایک خاص وزارت / محکمے کے پروگرام کے طور پر دوسروں سے الگ تھلگ کر کے دیکھنے کا انداز نظر رہا ہے۔ اس سلسلے میں قدرے لاپروائی سے کام لیا گیا ہے، نیز اس میں اُس سماجی لگن کا مظاہرہ نہیں کیا گیا، جس کا ایک قومی پروگرام کو حق پہنچتا ہے۔

دوسرے یہ کہ جن حالات میں یہ پروگرام چلائے جا رہے ہیں، وہ بدستور ناسازگار چل رہے ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ عناصر جنھوں نے ماضی میں بندھوا مزدوری سسٹم کو فروغ دیا، آج بھی دیہی زندگی اور معیشت پر چھائے ہوئے ہیں۔ قابلِ فہم طور پر وہ کسی ایسی صورتِ حال سے آسانی سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے، جس میں آزاد کئے ہوئے بندھوا مزدور آزاد معاشی کارندوں کا مرتبہ حاصل کر لیں نیز بندھوا مزدوروں کے مالکوں کے ہم پلّہ ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ اُن علاقوں میں جہاں ایسے لوگ چھائے ہوئے ہیں، بازآباد کاری کا پروگرام ہو سکتا ہے کہ کامیاب نہ ہو یا اس کے ابتدائی اچھے اثرات جلد ہی ختم ہو جائیں۔

تیسرے یہ کہ مال اور ترقیات کے محکموں کے عہدیداران کو پروگراموں کی بہ کثرت سے لاد دیا گیا ہے۔ دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام، روزگار کے قومی پروگرام، روزگار کی ضمانت کا پروگرام اور دیہی افراد کی تربیتی اسکیم۔ زمینوں کی بالائی حد کے قانون کے نفاذ کی مدد سے، بے زمین کسانوں میں زمین کی تقسیم، درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے افراد کی معاشرتی اور معاشی ترقی کے لیے اسکیمیں وغیرہ وغیرہ، قریب قریب یہ سبھی پروگرام مقررہ مدّت میں مکمل کئے جانیوالے ہیں اور ان میں نشانوں کی حصولیابی پر زور دیا گیا ہے۔ مقرّرہ مدّت کے پروگراموں کی بروقت تکمیل کی فکر میں حکام اپنی مُجملہ انسانی مجبوریوں کے ساتھ اور مستفید ہونے والوں کی صلاحیتوں، ترجیحات اور اشد ضرورتوں کا خیال کئے بغیر بڑی عجلت میں بازآبادکاری کی اسکیمیں مرتب کرتے ہیں جس سے یہ لوگ (مستفید ہونیوالے) ان کے لیے بنے پروگراموں کی ایک کثیر تعداد کے تجربوں میں قربانی کے بکرے بن جاتے ہیں۔

زراعت، آبپاشی، جنگل بانی، ماہی گیری اور مویشیوں کے علاج معالجے کے محکموں کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ امانہ جات پر مبنی پروگرام پر کامیاب عمل درآمد کرائیں اور اس کے لیے جملہ ضروری ترقیاتی اور تحفظی اقدامات کریں۔

پانچواں یہ کہ مناسب بنیادی ڈھانچے کی عدم موجودگی اور مدیت دلالوں کی موجودگی میں، جو کہ طفیلیوں کی طرح کام کرتے ہیں اور بازآبادکاری سے دستیاب ہونے والے تھوڑے بہت فائدے کو خود لے بھاگتے ہیں۔ بازآبادکاری کی مساعی کبھی بارآور نہیں ہو سکتی۔

چھٹا یہ کہ آزاد کئے ہوئے بندھوا مزدور جو سماج کے ادنیٰ ترین طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور افلاس اور محرومی کی انتہاؤں کی نمائندگی کرتے ہیں، کسی خاص اسکیم جو اُن کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش ہو سکتی ہو، کے لیے اپنی پسند ظاہر کرنے کے نااہل ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک اسکیم کا انتخاب کرنے میں اپنی مرضی کے استعمال کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس وجہ سے بازآبادکاری کی اسکیمیں مرتب کرنے والی مشینری کو ان کی جگہ پر خود کو رکھ کر ایسے لائحۂ عمل کی منصوبہ بندی کرنا ہوگی جو اُن کو قابلِ قبول ہوگا۔ نیز اُن کے بہترین مفاد میں ہوگا۔

قابلِ رحم حالت

ذیل میں دی گئیں دو مثالیں اُس کٹھن سماجی ماحول کی تصدیق کریں گی جس میں آزاد کئے گئے بندھوا مزدوروں کی معاشرتی اور معاشی بازآبادکاری کا پروگرام چلایا جا رہا ہے۔ ہر دو کا تعلق بندھوا مزدور مالکوں کے اُن کے تئیں عجیب و غریب خیالات، نیز مرکزی قانون کے نفاذ سے ایک دہائی بعد بھی ملک کے کچھ حصوں میں بندھوا مزدوروں کی قابلِ رحم حالت کے بارے میں میرے ذاتی تاثرات سے ہے۔ میں اور وزارتِ محنت میں میرے رفقاءِ کار میں سے ایک، دسمبر ۱۹۸۲ء میں، سمرا گاؤں (ڈالٹن گنج سے ۱۹ کیلومیٹر کی مسافت پر واقع) کا معائنہ کرنے اور کچھ آزاد کئے گئے بندھوا مزدوروں کی حالتِ زار بچشمِ خود دیکھنے کے بعد، ڈالٹن گنج (پلاموں ضلع کا صدر مقام)، لوٹ رہے تھے۔ وہ نظارہ میرے ذہن میں آج بھی تازہ اور واضح طور پر موجود ہے۔ سمرا میں ہم لگ بھگ ایسے مزدوروں کے پچاس کنبوں سے ملے۔ ۱۹۷۵-۷۶ء میں اُن کی رہائی کے بعد انھیں کچھ پیداواری اثاثہ یعنی گائیں اور بکریاں فراہم کی گئیں۔ اس سے قریب قریب ایک دہائی بعد بھی اُن کی مالی حالت یا تو جُوں کی تُوں ہے۔ یا پہلے سے بھی بدتر ہے۔ وہ زرعی زمین جو انھیں الاٹ کی گئی تھی،

تقریباً بنجر ہے۔ مسابقہ سالوں سے اور بہی چلی رہا ہے۔ سابق بندھوا مزدور مالکوں نے ان بدقسمت افراد کے خلاف اس حد تک متحدہ محاذ بنا لیا ہے کہ سماجی اور معاشی طور پر ان لوگوں کا حقہ پانی بند ہے۔ ان کے بچے اُس اسکول میں نہیں جا سکتے جو خاص بستی میں ہے۔ ان کے مویشی پاس کے جنگل میں چرنے کے لیے نہیں جا سکتے کیونکہ اس کے لیے انھیں زمینداروں کے دھان کے کھیتوں سے ہو کر جانا پڑتا ہے۔ کچھ کنبوں سے سوالات جواب کرنے کے دوران ہمیں ایک ایسا آزاد بندھوا مزدور دکھائی دیا جو اپنے سابق مالکوں کی وحشیانہ مارپیٹ کی بدولت مکمل طور پر اپاہج اور معذور بن گیا تھا۔ جب وہ بدنصیب ایک لمبا فاصلہ طے کرکے ڈالٹا گنج میں واقع اسپتال پہونچا تو لگتا ہے کہ چونکہ وہ وہاں کے ڈاکٹر کی دُنیاوی مانگیں پوری نہیں کر سکتا تھا، اُس کی مرہم پٹی سے انکار کر دیا گیا۔ اُس کا دردناک قصہ سُننے کے بعد جب ہم اپنی گاڑی میں ڈالٹا گنج لوٹ رہے تھے تو سماج کے اُونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے زمینداروں کے ایک گروہ نے ہماری گاڑی راستے میں روک لی۔ یہ معلوم کرکے کہ ہم کون ہیں، انھوں نے یہ کہنے کی جسارت کی: "ارے صاحب، آپ لوگ ان بدبختوں کو دیکھنے کے لیے جاڑے کی اس سرد اور غبار آلود صبح کو دلّی جیسی دُور جگہ سے کیوں آئے ہیں؟ یہ لوگ تو اپنے پچھلے جنموں میں بھی ہمارے بندھن میں تھے اور آج بھی ہمارے بندھوا ہیں۔ جہاں تک ان کی حیثیت اور مالی حالت کا تعلق ہے، آپ کے سبھی قوانین اور ادارے اس کو بدل نہیں پائیں گے"

دوسری مثال کا تعلق، پٹنہ کے نزدیک واقع فتوا بلاک میں کئے گئے ہمارے معائنے سے ہے۔ ہم وہاں کے آزاد بندھوا مزدوروں کی جو اتفاق سے کھیت مزدور بھی تھے، اقل ترین مزدوری کی عدم ادائگی کے بارے میں کی گئی چند شکایتوں کی پڑتال کر رہے تھے۔ جاگیردارانہ نظام کے زمینداروں کے ساتھ باہمی اختلاط اُن کے مخصوص رجعت پسندانہ رویے کا غماز تھا: "اقل ترین مزدوری مانگنے کا انھیں کیا حق ہے؟ آج انھیں سرکار سے اتنا کچھ بطور امداد ملا ہے۔ اگر یہ پہلے ہمارا بندھوا نہ ہوتے، تو تم کیا سمجھتے ہو، یہ سب کچھ انھیں مل پاتا؟ محض اسی بنا پر، ہمارا شکرگزار رہتے ہوئے ان کو ہماری بے دام خدمت کرنی چاہیئے، اور کم از کم مزدوری کی کوئی مانگ نہیں کرنی چاہیئے"

اجتماعی اندازِ نظر کی ضرورت

اس بنا پر ہمارے ذہن میں انفرادی طور پر فائدہ پہونچانے کے اندازِ نظر کے مقابلے میں بازآبادکاری کے تعلق سے گروہی اور اجتماعی اندازِ نظر کی موزونیت کا خیال آتا ہے۔ انفرادی طور پر فیض پہونچانے کی اسکیم سنگین قیود کی حامل ہے کیونکہ فیض اٹھانے والا سماج کے ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھتا ہے نیز اپنی پیدائش اور سماج میں اپنے مقام کے باعث زندگی کے متعدد مواقع سے محروم ہوتا ہے۔ سماج کے زیادہ با اثر طبقوں کے، اُس کے اور اُس کے کنبے کے افراد کے خلاف، منظم حملوں کا مقابلہ کرنا اُس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ اُس کے سماجی اور معاشی پس منظر میں بینکوں تک آسانی سے اُس کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ اُس کی جہالت اور ناخواندگی کے باعث وہ اپنے حقوق کے لیے لڑ نہیں سکتا اور نہ ہی ترقی سے حاصل ہونے والے فوائد کو خود میں سمونے کی اہلیت اُس میں ہوتی ہے۔

گروہی اندازِ نظر کے فوائد:۔ اس کے برخلاف ایک گروہی اور اجتماعی ترقیاتی اندازِ نظر متعدد مثبت نکات کا حامل ہے۔ سب سے پہلے مستفید ہونے والے افراد کی ایک تعداد کو شناخت کرنے اور اُنھیں ایک مشترک نقطے پر یکجا کرنے سے سماجی یکجہتی کو فروغ ملتا ہے۔ دوسرے متعدد کارندوں سے وسائل مجتمع کرنے اور پھر اُنھیں ایک مشترک مقصد کے لیے ایک مشترک نقطے پر، ایک خاصیتی اور مستقل بازآبادکاری کی غرض سے، مربوط کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس سے سرمایہ کاری میں بچت اور اُس کی بہتر واپسی، معاوضے کی یقین دہانی ہوتی ہے۔ چوتھے اس سے ایسے گروہی کاموں میں متعدد محکموں اور کارندوں کی شرکت کا کام ممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بینکوں اور مالیاتی ایجنسیوں کا رضاکارانہ تعاون اور شرکت بھی یقینی ہو جاتی ہے۔

اس کے لیے کچھ بنیادی شرائط ہیں، پہلی شرط یہ ہے کہ فیض اٹھانے والے افراد کا نیز اُس مقام کا جہاں اُنھیں پھر سے بسانا مقصود ہو، مناسب انتخاب کیا جائے۔ دوسرے زراعت، آبپاشی، حیوانات کی دیکھ بھال اور اُن کا علاج جنگلات اور ماہی گیری جیسے متعلقہ سرکاری محکموں کا رضامندانہ تعاون، صحیح ڈھنگ پر بازآبادکاری کی کوشش بہت اہم اور ضروری ہے۔ تیسرے کامیابی کے لیے فیض اُٹھانے والے افراد کو اُن کی فلاح و بہبود کے ایک مشترکہ منصوبے کے تحت اُن میں شعور اور بیداری پیدا کرنے کی کوشش، ایک اہم شرط ہے۔ چوتھے مشنری کے لیے لازم ہے کہ وہ خود بھی اس پروگرام کے تئیں اور اُن فیض اٹھانے والے افراد کے لیے، ایک مثبت انسانی اور حساس اندازِ نظر پیدا کرے، جن کے لیے انھیں مرتب کیا گیا اور اگر اس پروگرام کو جائز طور پر کچھ نتائج برآمد کرنے ہوں تو لازمی طور پر وہ مشینری

شود کو اُن کے ساتھ اُن کے مسائل دکھ اور اُن کی کامیابی اور ناکامی کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ کرے۔ یہ دل بڑھانے والی بات ہے کہ آندھرا پردیش، اڑیسہ، کیرالہ اور کرناٹک (ایک محدود پیمانے پر) جیسے صوبوں نے ایسے گروہی اور مربوط اندازِ نظر کو منصفانہ طور پر آزمایا ہے اور یہ اچھا ہوگا اگر اس کی پورے ملک میں تقلید کی جائے۔ نیز اسے ایک ادارے کی شکل دیدی جائے۔

مفادِ عامہ کے تعلق سے مقدمے بازی

آخر میں اُس مقدمے بازی کے تصور کا ذکر کرنا چاہوں گا، جس سے متعدد رضاکارانہ ایجنسیاں اور سرگرم سماجی کارکن، ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ کے روبرو جاکر کام لیتے ہیں اور اُن کا اثر شناخت رہائی اور بازآبادکاری کے عمل پر پڑتا ہے، چوں کہ یہ لوگ قانون کو نافذ کرنے والی ایجنسی کو بےحسی، درد ناآشنا اور غیر مؤثر پاتے ہیں اس لیے وہ ایسی مقدمے بازی کا سہارا لیتے ہیں، اس عمل میں بے انصافی اور ظلم کی متعدد داستانیں سامنے آتی ہیں۔ فاضل کورٹ کے ۱۹۸۱ء کی رِٹ پٹیشن نمبر ۸۱۴۳ (معروف ایشیاڈ مقدمہ) اور ۱۹۸۲ء کی رِٹ پٹیشن نمبر ۲۱۳۵ (معروف فریدآباد پتھر کان کیس) میں دئے گئے فیصلے کامیاب مفادِ عامہ کی مقدمے بازی کی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ کیا یہ شناخت، رہائی اور بازآبادکاری کے مسائل کا حتمی حل ہے؟ ایسی رضاکارانہ ایجنسیاں اور سماجی بہبود کے گروپ بہت ہی کم ہیں جو ہمت، جوش اور مصمم ارادے کے ساتھ اپنے معاملے کو اونچی عدالتوں تک لیجا سکتے ہیں، نیز اُن کی آخر تک پیروی کرسکتے ہیں۔ البتہ یہ مسئلہ کافی وسعت رکھتا ہے اور یہ امید کرنا بے سُود ہے کہ رضاکارانہ ایجنسیاں اور سماجی بہبود کے گروپ ملک بھر میں سماج کے سبھی ایسے طبقوں تک پہونچ پائیں گے اور جوش اور ہمت کے ساتھ اُن کے مقدموں کی پیروی کرسکیں گے — عدالتوں کی جو کہ پہلے ہی روایاتی مقدموں کی ایک بھاری تعداد میں مجتی ہوئی ہیں، اپنی کئی مجبوریاں ہیں۔ لہٰذا اس مسئلے کا حل، بندھوا مزدوروں کی رہائی اور بازآبادکاری کے حصول کے لیے مفادِ عامہ سے متعلق مقدمے بازی کے پھیلاؤ میں نہ ہوکر اس بات میں ہے کہ بصورتِ دیگر قانون نافذ کرنے والی بےحس مشینری کو صحیح عہدے کے لیے صحیح شخص کے انتخاب، معینہ مدتِ کار نیز اُسے ایک معقول اور سچا کار کے لیے ایمانداری سے کام کرنے کے لیے حوصلہ دلاکر فعال بنانے میں ہے۔

موجودہ مشینری کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی ہچکچاہٹوں کو جھٹک پھینکے اور مفادِ عامہ کی مقدمے بازی اور اس کا آسرا لینے والے سماجی کارکنوں کو شک کی نظر سے دیکھنے کے بجائے اُنھیں زندگی کی حقیقتوں کے طور پر دلیری سے تسلیم کرے۔ مفادِ عامہ کی مقدمے بازی تبھی پُرمعنی ہوسکتی ہے جب سماج کے اُن بدنصیب طبقوں کے ساتھ پیش آنے میں رویوں اور شعور میں بنیادی کایا پلٹ ہوسکے اور اس کے تحت مذکورہ مقدمے بازی اور سماجی کارکنوں کی مدد کی جائے۔

●

زیدحسن : قاضی محلہ، حمالہ، دربھنگہ (بہار)

کیا آپ جانتے ہیں

پلاننگ کمیشن کے نائب صدر ڈاکٹر منموہن سنگھ اور سورگیہ جنرل ویدیہ کو پدم وی بھوشن

صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے ۲۳ مارچ ۱۹۸۷ء کو راشٹرپتی بھون کے دربار ہال میں ملک میں مختلف شعبوں میں ممتاز خدمات انجام دینے والے افراد کو ایوارڈ اور اعزازی سرٹیفکیٹ عطا کئے۔ ملک کا اعلیٰ ترین اعزاز "بھارت رتن" اس سال نہیں دیا گیا۔ ۴ پدم وی بھوشن، ۱۲ پدم بھوشن، ۳۲ پدم شری ایوارڈ اور ۱۴ اعزازی سرٹیفکیٹ تقسیم کئے گئے۔ کُل ملاکر ۶۲ ایوارڈ اور سرٹیفکیٹ تقسیم کئے گئے۔

ملک کا دوسرا اعلیٰ اعزاز پدم وی بھوشن پانے والے ہیں، آنجہانی جنرل اے ایس ویدیہ اور پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیرمین ڈاکٹر منموہن سنگھ۔ جنرل ویدیہ کا ایوارڈ اُن کی بیوہ نے لیا۔

ٹریڈ فیر اتھارٹی کے چیرمین جناب محمد یونس خاں اور چند دیگر ہستیوں کو پدم بھوشن

پدم بھوشن کا اعزاز پانے والوں میں پنجاب پولیس کے سربراہ شری جے ایف ریبرو، ٹریڈ فیر اتھارٹی آف انڈیا کے چیرمین جناب محمد یونس شامل ہیں۔

پدم شری کا اعزاز

پدم شری کا اعزاز پانے والوں میں امرتسر کے سینیر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس محمد اظہار عالم، گورداسپور کے سینیر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس شری جوگندر پال برڑی، فلمی دنیا کی مشہور شخصیت اپر سین، مشہور کرکٹ کھلاڑی دلیپ وینگسارکر، شطرنج کی کھلاڑی میں بھاگیشری، مشہور پہلوان کرتار سنگھ (جنھوں نے دسویں ایشیائی کھیل میں سونے کا تمغہ جیتا تھا) اور جموں و کشمیر کی سماجی کارکن بیگم ظفر علی شامل ہیں۔

عربی، فارسی کے اسکالرس کو اعزاز

سنسکرت، عربی اور فارسی کے ۱۴ اسکالرس کو اعزازی سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی، اور ڈاکٹر عبدالستار خاں کو عربی زبان میں نمایاں کارکردگی انجام دینے پر یہ اعزاز دیا گیا۔ فارسی زبان کے لیے اے۔ الف حیدر اور پروفیسر نورالحسن کو یہ اعزاز عطا کیا گیا۔

●

اے ۔ کے بسر لیواستو

بندھوا مزدوروں کا پتہ چلانا ایک مُشکل کام

حالانکہ بندھوا مزدوروں کے سسٹم کو ختم کرنے سے متعلق ایکٹ دس سال پہلے پاس کیا گیا تھا، تاہم بندھوا مزدوروں کا پتہ چلانے کے لیے مناسب طریقہ ابھی تک معلوم نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس سلسلے میں مناسب رہنمائی نہ ہونے سے اس پر عمل درآمد ایک مشکل کام بن رہا ہے۔ یہ بحث بھی چل رہی ہے کہ کیا تھوڑے وقت کے اور عارضی بندھوا مزدوروں کو بھی اس زمرے میں شامل کیا جائے۔ مصنف کا خیال ہے کہ محض سرکاری نظام اس کے لیے ناکافی ہے۔ اس میں رضاکار اداروں کا تعاون ضروری ہے۔ چنانچہ ساتویں منصوبے میں اس پہلو پر زور دیا جا رہا ہے۔ ۱۹۸۶ء میں جو بیس نکاتی پروگرام وضع کیا گیا ہے، اس میں بھی یہ شامل ہے۔

بندھوا مزدوروں کے پتہ چلانے کا کام اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر اس بُرائی کی روک تھام سے متعلق قانون پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا۔ اس کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر اسے بیس نکاتی پروگرام میں شامل کیا گیا ہے۔ بندھوا مزدوری کے نظام کی روک تھام سے متعلق قانون ۱۹۷۶ء میں پاس ہوا تھا، اس میں ضلع مجسٹریٹ پر یہ ذمّہ داری ڈالی گئی تھی یا پھر یہ ذمّہ داری اس کے ماتحت اُن افسروں کی تھی جن کو وہ کام سونپ دے۔ ریاستی سرکاروں سے ملی اطلاعات کی روشنی میں نومبر ۱۹۸۶ء تک ۲۱۳۴۶۵ بندھوا مزدوروں کی نشاندہی کی جا چکی تھی اور یہ کام اب بھی جاری ہے۔ ۱۹۸۵ء میں بیس ہزار بندھوا مزدوروں کا پتہ چلایا گیا اور ۱۹۸۶ء میں نومبر تک ۲۴۵۷ بندھوا مزدوروں کا پتہ چلایا گیا۔

عام طور پر اعتراض یہ ہے کہ ملک میں بندھوا مزدوروں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ریاستی سرکاریں یہ کام بہت آہستہ کر رہی ہیں۔ انکی تعداد کا پتہ لگانے کے لیے خاص خاص ذرائع یہ ہیں:۔

۱۔ گاندھی پیس فاؤنڈیشن۔
۲۔ نیشنل لیبر انسٹی ٹیوٹ۔
۳۔ این۔ ایس۔ ایس۔ او کے سروے۔

گاندھی پیس فاؤنڈیشن نے مئی ۱۹۷۸ء سے دسمبر ۱۹۷۸ء تک اندازہ لگایا ہے کہ بندھوا مزدوروں کی مجموعی تعداد ان ریاستوں میں ۲۶ لاکھ ۱۷ ہزار ہے۔

اس سروے میں کئی تکنیکی خرابیاں ہیں۔ این ایس ایس او سروے میں ۳۲ ویں دور میں جو کہ جولائی ۱۹۷۷ء سے جون ۱۹۷۸ء کے درمیانی عرصہ میں تھا، اندازہ لگایا گیا کہ جن پندرہ ریاستوں کا سروے کیا گیا، ان میں ۳ لاکھ ۴۵ ہزار بندھوا مزدور ہیں۔ اس کے برعکس ۲۱۳۴۶۵ بندھوا مزدوروں کا پتہ چلایا جا چکا، جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے۔

ریاست وار اعداد و شمار اس طرح سے ہیں:۔ سے قرض لیا ہے، بندھوا مزدور کہلائے جا سکتے ہیں اُجرتیں معمولی اور مجوزہ شرحوں سے کم ہوتی ہیں۔ پھر یہ

نمبر	ریاست کا نام	۳۰ نومبر ۱۹۸۶ء کو پتہ چلائے گئے بندھوا مزدور	این۔ایس۔ایس۔او کے اندازے کے مطابق تعداد	گاندھی پیس فاؤنڈیشن کی طرف سے بتائی گئی تعداد
۱۔	آندھرا پردیش	۲۴,۷۸۸	۷,۳۰۰	۳,۲۵,۰۰۰
۲۔	بہار	۱۱,۷۲۹	۱,۰۲,۴۰۰	۱,۱۱,۰۰۰
۳۔	آسام	—	۴,۴۰۰	—
۴۔	گجرات	۶۲	۴,۲۰۰	۱,۷۱,۰۰۰
۵۔	ہریانہ	۲۹۵	۱۲,۹۰۰	—
۶۔	ہماچل پردیش	—	—	—
۷۔	جموں و کشمیر	—	۹۰۰	—
۸۔	کرناٹک	۶۲,۶۸۹	۱۴,۱۰۰	۱,۹۳,۰۰۰
۹۔	کیرالہ	۸۲۳	۴۰۰	—
۱۰۔	مدھیہ پردیش	۵,۶۲۷	۱,۱۲,۲۰۰	۵,۰۰,۰۰۰
۱۱۔	مہاراشٹر	۷۴۰	۴,۳۰۰	۱,۰۰,۰۰۰
۱۲۔	منی پور	—	—	—
۱۳۔	میگھالیہ	—	—	—
۱۴۔	ناگالینڈ	—	—	—
۱۵۔	اُڑیسہ	۴۳,۹۴۷	۵,۴۰۰	۳,۵۰,۰۰۰
۱۶۔	پنجاب	—	۴,۳۰۰	—
۱۷۔	راجستھان	۶,۸۹۰	۲,۴۰۰	۶۷,۰۰۰
۱۸۔	تمل ناڈو	۳۲,۱۸۰	۱۲,۵۰۰	۲,۵۰,۰۰۰
۱۹۔	تری پورہ	—	—	—
۲۰۔	اترپردیش	۲۲,۲۹۵	۳۱,۷۰۰	۵,۵۰,۰۰۰
۲۱۔	مغربی بنگال	—	۲۱,۶۰۰	—
۲۲۔	مرکز کے زیر اہتمام علاقے	—	—	—
	مجموعی میزان	۲,۱۳,۴۶۵	۳,۴۵,۰۰۰	۲۶,۱۷,۰۰۰

بندھوا مزدوروں کی تعداد کا پتہ چلانے میں تاخیر اس لیے بھی ہوئی کہ کچھ ریاستوں میں اس بارے میں شبہ ظاہر کیا گیا کہ کیا وہ وقتی مزدور جنھوں نے آجرین

ہر موسم میں مزدوروں کو کام پر لگانا اور اس کے لیے انھیں کچھ رقم پیشگی دے دینا، جوکہ ان کی اُجرتوں سے وضع کرلی جائے، ایک عام طریقہ بن رہا ہے۔ یہ

بھی معاہدہ ہوتا ہے کہ مزدور اس وقت تک کام چھوڑ کر نہیں جائے گا جب تک کہ وہ پیشگی رقم سب کی سب نہ لوٹا دے۔ اس طرح سے یہ لوگ بھی

بندھوا مزدوروں کے خانے میں آ جاتے ہیں جیسا کہ قانون میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایشیاڈ کے مقدمے ۱۹۸۲ء میں سپریم کورٹ نے بھی ان کی یہی وضاحت کی ہے۔ بندھوا مکتی مورچہ کے مقدمہ (۱۹۸۳ء) میں بھی یہی وضاحت موجود ہے۔ گاندھی پیس فاؤنڈیشن کی طرف سے کئے گئے سروے میں بہت سی کمیاں ہیں۔ اس سے تھوڑے وقت کے بندھوا مزدوروں کے بارے میں چند معلومات ہو سکتی ہیں۔ لمبے عرصے کی بندھوا مزدوری کے مقابلے عارضی وقت کے لیے بندھوا مزدوروں کے بارے میں بہت سی حقیقتیں سامنے آ سکتی ہیں۔ گاندھی پیس فاؤنڈیشن کے اندازے کے مطابق تقریباً ۳۲ فیصد بندھوا مزدور ایک سال کے لیے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرا گروہ وہ ہے جو پانچ سال سے لے کر دس سال کے لیے بندھوا مزدوری کرتا ہے۔ کُل بندھوا مزدوروں کے مقابلے یہ دس فیصد سے کچھ زیادہ ہیں۔ ریاستی سرکاروں میں اب اس کام کے لیے دلچسپی پیدا ہو چلی ہے اور اب وہ یہ بھی سمجھ چکے ہیں کہ تھوڑے وقت کے لیے رکھے گئے مزدوروں کو بھی بندھوا مزدوروں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کا پتہ چلانا بھی ضروری ہے۔ لیکن ابھی اس بیداری کے نتیجے میں بندھوا مزدوروں کے پتہ چلانے اور ان کو کام پر لگانے کی ذمہ داری کو پوری طرح سے نہیں نبھایا جا سکتا ہے۔

اس کام میں دیری کی بہت سی وجوہات ہیں:۔

۱۔ ہر موسم میں عارضی طور پر مزدوروں کو رکھ لینے کا رواج بہت ہے، اس لیے قانون پر عمل درآمد میں دشواری پیش آتی ہے۔

۲۔ قانون پر بڑے پیمانے پر عمل درآمد سے زراعت اور کھیتی کے کاموں پر بُرا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اور عارضی کام مثلاً بھٹوں میں اینٹوں کی پکانے اور تیاری کے کام پر بُرا اثر پڑ سکتا ہے۔

۳۔ بہت سے مزدور بے روزگار ہو جائیں گے۔ چوں کہ بندھوا مزدور آزاد ہو جانے کے بعد دیر سے ہی کام پاتے ہیں۔ اس لیے بھی سبھی بندھوا مزدوروں کی بحالی کا کام آہستہ آہستہ انجام پا سکتا ہے۔

۴۔ مرکز کے زیر اہتمام بہت سی اسکیمیں ایسی ہیں جن کے تحت بندھوا مزدوروں کی بحالی کے لیے امداد ملتی ہے، اس لالچ سے بندھوا مزدوروں کے بہت سے فرضی معاملات بھی سامنے آ سکتے ہیں۔ اس طرح کے چند واقعات علم میں آ چکے ہیں۔

اگر بندھوا مزدوروں کی بڑی تعداد کی شناخت ہو جائے اور ان کو بحالی کے لیے امداد دی جائے تو اس سے دیہی علاقوں میں تناؤ بڑھےگا کیونکہ بندھوا مزدوروں کے مقابلے اور بھی بہت سے ایسے غریب ہوں گے جو یہ امداد نہیں پا سکیں گے۔

۵۔ اگر بندھوا مزدوروں کی تعداد ۲۰ تا ۴۰ لاکھ ہے، تو بحالی سے متعلق کوئی بھی خصوصی اسکیم موزوں اور مناسب نہ ہوگی۔ ان کو غریبی دُور کرنے کے عام پروگراموں کے ذریعے سے ہی بحال کیا جانا مناسب ہوگا۔

بندھوا مزدوری سے نجات

اگر بندھوا مزدوری کسی ایک ہی موسم تک محدود ہے تو بندھوا مزدوری کو ختم کرنے کے قانون کے تحت کارروائی کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی، اس لیے بندھوا مزدوروں کا پتہ چلانے کا کام آہستہ ہو جاتا ہے۔

۱۸۴۳ء میں غلامی سے نجات پانے کا قانون پاس کر لیا گیا تھا۔ اس زمرے میں صرف غلاموں کو شامل کیا گیا اور بندھوا مزدوروں کو شامل نہ کیا گیا۔ ۱۸۴۱ء کی غلامی دُور کرنے سے متعلق رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ سرکار بندھوا مزدوری کے طریقے اور بندھوا مزدوروں کی موجودگی سے باخبر تھی، ۱۸۵۹ء میں کارکنوں کے ساتھ معاہدہ شکنی سے متعلق قانون پاس کیا گیا۔ ۱۸۷۴ء میں اس کے ایک حصے کو منسوخ کر دیا گیا اور پھر ۱۹۲۵ء میں اسے پوری طرح منسوخ کر دیا گیا۔ وزارت امور داخلہ کی طرف سے قبائلی آبادی کی ترقی پر ایک مقالہ تیار کیا گیا جس میں بستر ریاست میں بندھوا مزدوروں کی حالت کا ذکر تھا۔ ان کی حالت کو پورے تاریخی پس منظر میں بیان کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۹۲ء میں بستر میں بیگار سے متعلق قواعد و ضوابط مرتب کر لیے گئے تھے۔ اس میں مالگذاری کے لیے یہ پابندی تھی کہ رعیت کے ہر فرد کو جس سے کہ بیگار لی جائے، کم سے کم ایک خاص اُجرت ضرور ادا کی جائے۔ یہ دس آنے سالانہ کے حساب سے تھی، اس طرح سے مالگذاری کے لیے دوسروں سے بیگار لی جانے کی صورت میں قواعد زیر عمل آئے۔ پچاس سال بعد بستر میں بندھوا مزدوری نظام کو واضح صورت میں تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۱ء کے درمیان ڈبلیو، وی، گریگسن نے جو کہ ریاست کے ایڈمنسٹریٹر تھے، اس نظام کے بارے میں تفصیلی جائزہ لیا۔ بستر میں اس نظام کو کباڑی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ کباڑیوں کی کُل تعداد ۲۵ ہزار یا آبادی کے پانچویں حصے کے برابر تھی۔

گریگسن نے رائے دی کہ یہ اقتصادی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مددگار ہے۔ اس نے وہاں کی ایک رسم کو دُور کئے جانے کی سفارش کی، اس رسم کے مطابق شادی کے خواہشمند فرد کو جسے قبائلی آبادی میں موریا یا ماریا کہا جاتا تھا، لڑکی کے باپ کو دُلہن کی قیمت چکانی پڑتی، یہ ایک طرح کا معاوضہ تھا۔ اس وجہ سے خالی جیب والے کو رقم درکار ہوتی تھی لیکن اس کو دور کرنا نہ تو عملاً ممکن تھا اور نہ ہی پسندیدہ۔ اس طرح اگر عدالت سے کسی ایسے شخص پر جرمانہ کر دیا جاتا جس نے ناجائز شراب کشید کی ہو، تو اسے کہیں نہ کہیں سے رقم لینی پڑتی تھی۔ ان حالات میں رقم حاصل کرنا سوائے اس کے کہ وہ اپنے

آجر سے حاصل کرے، دشوار ہوتی تھی۔

اس مطالعے کی روشنی میں اقتصادی وجوہات کے علاوہ صدیوں پرانی روایت بھی مددگار رہی ہے، اگر کباڑی کے ساتھ اس کے مالک کا سلوک ٹھیک ہے تو ایسی صورت میں کباڑی خود وہاں سے جانا نہیں چاہتا اور اگر اسے زبردستی ہٹایا جائے تو وہ خود کو نقصان میں سمجھتا ہے۔ اس مطالعے میں قانون کی رُو سے اس پر پابندی کی حمایت نہیں کی گئی۔ اس مطالعے میں کہا گیا ہے کہ بستر میں ابھی پرانی روایتیں اور رسم و رواج ہیں، عدالت کی طرف قدم رکھنا ان کے مزاج کے خلاف ہے۔ آجر کا پلڑا بھاری ہے۔ قانون کی رُو سے بندھوا مزدوری ختم کرنے کی کوشش ظلم سمجھی جاتی ہے۔ وہاں کے باشندوں کو شادی بیاہ وغیرہ کے لیے یا جرمانے وغیرہ کی ادائیگی کے لیے آجر سے ہی رقم حاصل کرنی ہوتی ہے۔ وہ اس قرض کے بدلے محنت کرنے کے پابند ہوتے ہیں۔ اگر ان کو وہاں سے ہٹایا جائے تو گویا ان کو اس بات کے لیے ترغیب دی جائے کہ وہ وعدہ شکنی کریں اور اپنے کردار کو غلط سمت میں لے جائیں۔ گرگسن نے اس نظام کی اصلاح و بہتری کے لیے قدم اٹھانے پر زور دیا اور اس کے مکمل خاتمے کی مخالفت کی۔ وہ آجر اور مزدور کے درمیان مناسب شرائط کے حق میں تھے۔ گرگسن نے ایک قانون وضع کیا اور کباڑیوں کے لیے ایک کم سے کم اُجرت کی ادائیگی پر زور دیا۔ انھوں نے پانچ سال کے لیے ۶۰ روپے کا قرض دینے کے لیے کہا تھا، گرگسن نے جن قواعد و ضوابط کو ترتیب دی، انھیں حکام نے منظور نہیں کیا کیوں کہ گرگسن کا تبادلہ ہونے کو تھا، چنانچہ یہی سوچا گیا کہ ان کے بعد جو آئے، اسے ہی اس مسئلے کا حل پر غور کرنا ہوگا۔ اس نظام کو قانونی شکل میں تسلیم کرنے کی بہ نسبت اس کی روک تھام کے لیے عملی اقدامات کو زیادہ ضروری خیال کیا گیا۔

۱۹۳۱ء میں ڈی۔ آر۔ رتنم ایڈمنسٹریٹر بنے۔ انھوں نے کباڑی نظام کا تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش کی، وہ اس نظام کو بُرا خیال کرتے تھے اور اسے ختم کرنے کے حق میں تھے، وہ پانچ سال کے عرصے میں رفتہ رفتہ اسے ختم کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اسے یکم اکتوبر ۱۹۳۸ء تک ختم کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے میں ۱۹۳۳ء میں ایک سرکلر جاری کر دیا گیا۔ اس سرکلر میں کباڑی نظام کو عبوری پانچسالہ دور میں ایک خاص طریق کار کے مطابق چلانے کے لیے کہا گیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ نظام ضروری نہیں کہ خراب ہی ہو لیکن عملی صورت میں اس میں بہت سی برائیاں داخل ہو چکی ہیں۔ کباڑیوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی، حالاں کہ یہ کمی اس سرکلر کے سبب سمجھی گئی۔ اس سرکلر کی وجہ سے بے زمین کھیت مزدوروں کو بسانے کی کوششیں کی گئیں، عمارتی لکڑی کے بیوپار کو بڑھایا جا سکا۔ عمارت بنانے کے کام کو بھی آگے بڑھایا گیا۔ لیکن اکثر و بیشتر روزگار کی ضرورتوں نے انھیں کباڑی بننے پر مجبور کر دیا تھا، اس لیے آجرین اور مزدوروں کے درمیان معاملات کی نوعیت ہر جگہ جدا جدا ہونے کے سبب یہ بات دیکھنے کو ملی کہ کہیں تو یہ معاملہ درست رہا اور کہیں بدمعاملگی ہوئی۔ دور دراز علاقوں میں بسنے والے بندھوا مزدوروں کے حالات خراب تھے، آجرین کا ان کے ساتھ معاملہ بھی ٹھیک نہ تھا، اس سرکلر سے آجرین کو یہ مدد ضرور ملی کہ آجرین نے بندھوا مزدوروں کے ساتھ معاہدے کیے اور ایسے معاہدے کیے جنھیں وہ توڑ سکیں۔ اور اسکے سبب انھیں کوئی نقصان اُٹھانا پڑے۔

مائیکل نے یہ خیال ظاہر کیا کہ بندھوا مزدوری کا نظام نہ تو ختم ہوا ہے، نہ ختم ہو سکتا ہے۔ نفی قانون اقتصادی اسباب کے مقابلے میں موثر نہیں ہو سکتا۔ مثبت قانون سے عدالتی کارروائیوں کا دروازہ کھل جائے گا۔ ایسی صورت میں قانون سے فائدے کے مقابلے نقصان زیادہ ہو سکتے ہیں۔ اس قانون پر عمل درآمد کے نتیجے میں اگر سزاؤں کا دروازہ کھل جاتا ہے تو گویا بندھوا مزدور کے لیے رقم لینے اور قرض حاصل کرنے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ یہاں کے عوام کی حالت کی خرابی دور کرنے کے لیے جو ضابطے بنائے گئے، انھیں یہاں کے عوام کی حالت سُدھارنے کے لیے بے حد اہم سمجھا گیا۔ ایڈمنسٹریٹر سے کہا گیا کہ وہ کباڑی سسٹم کو فوراً ختم کر دے۔ مائیکل نے حقائق کی روشنی میں یہ رائے دی کہ کباڑی سسٹم محض غلامی کے رواج سے ہی متعلق نہیں ہے بلکہ یہ ایک اقتصادی معاہدہ ہے۔ مگر ایک خصوصی نوٹیفکیشن کے ذریعے سے سب بندھوا مزدوروں کو ایک جرم بنا دیا گیا اور اس کے لیے کڑی سزا رکھی گئی۔ یہ معاملہ دوبارہ زیر بحث آیا اور مختلف حقائق کو سامنے رکھا گیا۔ اندازہ لگایا گیا کہ تقریباً ۵ ہزار افراد اس نظام پر انحصار رکھتے ہیں جبکہ اس علاقے کی کُل آبادی ۴ لاکھ تھی۔ یہ بھی بتایا گیا کہ اس سسٹم کو قابلِ سزا جرم بنانے سے، اس پر عمل درآمد کے لیے سرکاری مشینری نہیں ہے۔ پھر ہر علاقے میں کباڑیوں کی تعداد مختلف ہے، اگر دو مسلسل تک برابر خشک سالی کا سامنا کرنا پڑے تو بندھوا مزدوروں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ اور پھر نقلِ مکانی کر کے بندھوا مزدور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سے کباڑی نظام ایک اقتصادی ضرورت ہے۔ اور اکثر موقعوں پر اس کی منسوخی مصیبت پیدا کرے گی۔ جب بھی اس کی منسوخی کا سوال آیا تو جواب یہی تھا کہ یہ بے چارے کباڑی کیا کریں گے؟۔

۱۹۴۳ء میں اس معاملے پر دوبارہ غور ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ زرعی مزدوروں کو ادائیگی کا نظام اصولاً بُرا نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے برتنے میں بہت سی برائیاں داخل ہو گئی ہیں، اس لیے کباڑی نظام کو باضابطہ بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ کھیت مزدور شادی بیاہ اور ہنگامی اخراجات کے لیے یک مشت رقم چاہتے ہیں اور اپنی اُجرتوں سے کچھ بس انداز نہیں کر سکتے۔

اس لیے کباڑی نظام کو سدھارنے کی ضرورت ہے۔ یہ نظام کھیت مزدوروں کے لیے نفع بخش ہے بالکل اسی طرح جیسا کہ کاشتکاروں کے لیے ساہوکار۔

پیچھے کی طرف لوٹنا

یکم اگست ۱۹۳۳ء کو کباڑی نظام اصلاح اور بہتری کے نام پر ختم کر دیا گیا، اس طرح سے غلامی کا ایک دَور ختم ہوا' اور ۱۹۴۳ء میں ایک نیا کباڑی نظام وجود میں آیا۔ اس کی رُو سے ہر مہینے نقد ادائیگی ضروری تھی اور یہ ۳۶ روپے سالانہ رکھی گئی اور جو رقم بطور قرض لی جائے' اس میں سے ۱۸ روپے سالانہ کے حساب سے وضع کئے جائیں۔ اس طرح سے بندھوا مزدوری ایک نئی شکل میں دوبارہ سامنے آئی۔ اس سلسلے میں تفصیل ملک کے دوسرے حصوں کے مقابلے زیادہ ہیں۔ یہاں پر ۱۹۳۳ء میں بندھوا مزدوری ختم کرنے کے لیے ضابطہ لاگو کیا گیا تھا' اور پھر یہیں ۱۹۴۳ء میں نیا قانون بھی لاگو کیا گیا تھا، ملک کے کچھ دوسرے حصوں میں بھی قانون بنا۔ ۱۹۴۸ء تک بندھوا مزدوری کے لیے ضابطے مقرر کئے جا چکے تھے جبکہ ۱۹۶۱ء کے بعد سے اس نظام کو ختم کرنے کے لیے قانون پر عمل ہوا۔

معاہدے:۔

۱۹۲۰ء میں بہار' اڑیسہ کمیوتی معاہدوں سے متعلق ایکٹ پاس ہوا۔ اس سے بندھوا مزدوری کر کے روزی کمانے والوں کے لیے کچھ سہولتیں دینے پر زور دیا گیا اور بندھوا مزدوری اگر وہ ایک سال کے لیے ہو تو جائز قرار دی گئی۔

۱۹۴۰ء میں مدراس میں اس طرح کا ایک قانون نافذ کیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں اڑیسہ میں قرضوں کے عوض بندھوا مزدوری سے نجات دلانے کے لیے قانون پاس کیا گیا۔ یہ دونوں قانون ایک ہی طرح کے تھے، ۱۹۲۰ء کے مذکورہ قانون کے مقابلے یہ بہتر قسم کے قانون تھے لیکن ان سبھی قوانین سے بندھوا مزدوروں کو ممنوع قرار نہیں دیا جا سکا۔

حیدرآباد بھگیلہ معاہدہ سے متعلق قانون مجریہ ۱۹۴۳ء کے ذریعے بھی بندھوا مزدوروں کو منظم بنانے کی کوشش کی گئی۔ بھگیلہ کے استحصال کو روکنے کی کوشش کی گئی، اس سلسلے میں ایک ایسے معاہدے کو ضروری بتایا گیا جو اسٹامپ پر کیا گیا ہو اور اس کی ایک نقل بھگیلہ کے پاس بھی ہونی ضروری بتائی گئی۔ بندھوا مزدوری کی مدت زیادہ سے زیادہ ایک سال رکھی گئی۔ اس کے بعد معاہدے کی تمام شرائط منسوخ سمجھی گئیں' اُجرتوں کی شرحوں کو معقول بنانے پر زور دیا گیا۔

راجستھان ساگری سسٹم کی منسوخی کے قانون ۱۹۶۱ء میں ساگری نظام کو پوری طرح سے ختم کیا گیا۔ اس ایکٹ میں ۱۹۷۵ء میں ترمیم کر کے اس جُرم کو قابلِ دست اندازی پولیس بتایا گیا، اس کی ضمانت بھی نہیں رکھی گئی۔ اس کا فیصلہ مختصر سی مدت میں ہی کیا جانا ضروری سمجھا گیا۔ کیرالہ میں بندھوا مزدوری نظام کی منسوخی کے قانون مجریہ ۱۹۷۵ء میں بندھوا مزدوری نظام کی مکمل منسوخی کی گنجائش رکھی گئی۔ مرکزی سرکار نے ۱۹۷۵ء میں بندھوا مزدوری نظام کی منسوخی کا آرڈیننس جاری کیا جس سے تمام ریاستی قوانین نفاذِ عمل کے لیے کالعدم قرار دے گئے۔

بہار سرکار نے ضلع مجسٹریٹوں کو ہدایت کی کہ بندھوا مزدوری اور ملحقہ مزدوری نظام کے درمیان فرق ہے۔ ملحقہ مزدوری سے مراد یہ تھی کہ وہ کھیت مزدور جو کسی ایک فصل کے اُگانے کے لیے ایک سال کے لیے کھیت وغیرہ پر مزدوری کرتے ہیں۔

لیکن ایک اور سرکلر کے ذریعے اپریل ۱۹۸۱ء میں بہار سرکار نے ان ہدایتوں کو واپس لے لیا۔ اس سرکلر میں یہ بتایا گیا کہ مذکورہ ہر دو قسم کی مزدوری میں ایک ابہام پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ اگر وہ کھیت مزدور ہی سہی تاہم اسے بندھوا مزدوری کی منسوخی کے قانون سے فائدہ پہونچنا چاہیئے۔ سرکار نے یہ بھی کہا کہ بندھوا مزدوری کی تعریف ۱۹۷۶ء کے متعلقہ قانون میں واضح ہے۔ چنانچہ افسروں سے اس سلسلے میں ضروری کارروائی کے لیے کہا گیا۔

ہینڈلوم اور چمڑے کے کام وغیرہ میں بھی قرض کی بنیاد پر بندھے رہنے اور مزدوری کرتے رہنے کا طریقہ رائج ہے۔ چنانچہ ان شعبوں میں اس طریقے کو اقتصادی نظام کا حصہ سمجھ کر ان کی نشاندہی نہیں کی جا سکی۔ بندھوا مزدوری کے نظام کی منسوخی کے ترمیمی قانون ۱۹۸۵ء میں یہ صاف کر دیا گیا کہ معاہدے کے تحت کام کرنے والے اور بین ریاستی نقل مکانی کرنے والے کارکن' اگر بندھوا مزدوری نظام کی تنسیخ سے متعلق قانون ۱۹۷۶ء کی شرائط پوری کرتے ہیں' تو ان کو بندھوا مزدور ہی کہا جائے گا۔ ۱۹۷۶ء کے مذکورہ قانون میں یہ کہا گیا ہے کہ بے گار کی صورت میں کام کرنے والے یا معمولی اُجرتوں پر کام کرنے والے بندھوا مزدور ہی ہیں۔ لیکن محض یہ دفعہ بندھوا مزدور بنانے کے لیے کافی نہیں۔ بلکہ قرض خواہ اور قرضدار کے درمیان تعلق کو واضح کرنا بھی ضروری ہے۔

اس سلسلے میں جو قانون بنا، ان میں بہت سی ایسی باتیں کہنے سے گریز کیا گیا جن کے تحت بندھوا مزدوری کی نشاندہی کا کام بہت بڑھ گیا ہوتا۔ البتہ سپریم کورٹ نے بندھوا مکتی مورچہ کیس میں درج ذیل لفظوں میں واضح کیا ہے:۔

" انسانی معاملات کا عام رویہ یہ بتاتا ہے کہ اس سلسلے میں عدالتی کارروائی کی جا سکتی ہے۔ کسی بھی مزدور کو بے گار کے لیے یا معمولی اُجرت کے عوض کام کرنے [illegible] مجبور ہونا پڑتا ہے

گورنہال سنگھ پیرزادہ

بندھوا مزدوری کوڈائی کنال نہج پر

فاضل مصنف تامل ناڈو کے ضلع کوڈائی کنال میں سب کلکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔ پچھلے سال اخبارات میں اُن کا خوب چرچا رہا ہے، اس ضلع میں سری لنکا سے آئے ہوئے ستر نارتھیوں کو غلامی میں لینے کی جو مذموم کوشش کی گئی، اس کو انھوں نے پوری طرح بے نقاب کیا۔ زیر نظر مقالے میں مصنف نے بتایا ہے کہ یہ لوگ کیونکر چارہ ناچار بندھوا مزدور بنے، نیز کچھ نجی فرموں اور ٹھیکے داروں نے ان کی انتہائی غربت اور بے روزگاری سے فائدہ اُٹھا کر کس طرح ان کا ہر دم استحصال کیا۔ ایک کمیشن نے بھارتی سپریم کورٹ کے ایما پر اس انسانیت سوز مسئلے کی تفتیش کی۔ پھر سپریم کورٹ نے ریاستی سرکار کو یہ ہدایت جاری کی کہ وہ ان تارکینِ وطن کو اُس وقت تک مناسب اور موزوں راحت مہیا کرے جب تک کہ انھیں پھر سے آباد نہیں کیا جاتا، نیز پلانٹیشن لیبر ایکٹ کو سختی سے لاگو کیا جائے۔

۱۹۶۴ء کے سریماوو - شاستری سمجھوتے اور ۱۹۷۵ء کے سریماوو - اندرا گاندھی سمجھوتے کے تحت سری لنکا اور بھارت کی حکومتوں نے اس امر کا اقرار کیا تھا کہ سری لنکا میں بسے ہوئے ۹،۷۵،۰۰۰ ہندوستانی نژاد اشخاص میں سے ۶،۰۰،۰۰۰ کو بھارتی شہریت دے دی جائے گی۔ ۱۹۸۴ء کے وسط تک ۴،۴۵،۵۸۸ افراد پر مشتمل ۱،۱۹،۹۲۷ کنبوں کو بھارت واپس بھیج دیا گیا تھا، ان میں سے ۱،۰۴،۷۷۲ کنبے تامل ناڈو میں بس گئے۔ وطن لوٹنے والے ایسے افراد میں سے اکثر لوگ "تلاشِ معاش میں خانہ بدوش بن گئے۔ چونکہ راتوں رات یہ مزدور فاضل محنت کش طبقے کے زمرے میں آگئے، اس لیے معاشی نقطۂ نگاہ سے یہ معاملہ اور بھی زیادہ سنگین ہو گیا۔

سری لنکا سے بھارت لوٹنے والے افراد

وطن لوٹنے والے ایسے افراد میں سے ۸۲٪ سری لنکا میں چائے باغات میں بطور مزدور کام کرتے تھے اور اس لحاظ سے وہ غیر تربیت یافتہ کارکن تھے۔ ان باغات میں طرزِ تنظیم ایسی تھی جس میں احکامات اوپر سے نیچے جاری ہوتے تھے۔ ان مزدوروں کو سیاسی طور پر غیر منظم، نفسیاتی طور پر دست نگر اور ثقافتی طور پر اپنے حقوق سے بے بہرہ رکھا جاتا تھا۔ ان کا نہ تو کوئی رہنمایانہ کردار تھا اور نہ ان کی پیش قدمی کے لیے کہیں کوئی موقع دستیاب ہوتا تھا۔ اس وجہ سے ان مزدوروں کو دورِ وسیع تر معاشرتی نظام سے انھیں بڑی حد تک الگ تھلگ

کردیا، نیز اپنی انسانی ہستی کو بہتر کرنے کے لیے سماجی زندگی کے مختلف شعبوں میں داخل ہونے سے انھیں کافی حد تک روک دیا۔

ایسے اکثر افراد غیر تربیت یافتہ ہیں

سری لنکا سے بھارت لوٹنے والے ایسے اشخاص کم پڑھے لکھے اور غیر تربیت یافتہ ہونے کے باعث، متعدد بحالیاتی اقدامات کے لیے اپنی نجی ترجیح کا استعمال نہیں کر پائے۔ تکنیکی لحاظ سے یہ کمزور اور تعلیمی طور پر پسماندہ ہونے کی وجہ سے وہ سرکار کی طرف سے دئے گئے قرضوں سے کاروبار شروع نہیں کر پائے، اور خود روزگاری اسکیموں سے فائدہ نہیں اٹھا سکے ان کاموں کے لیے منصوبہ بندی، پہل قدمی، جانکاری اور خطرات مول لینے کی کچھ بنیادی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔ اس کمی کے باعث ان کے بال بچوں کو اپنے بسنے کے لیے بہتر ماحول پانے میں سالہا سال لگ جائیں گے!

سستی محنت کش قوت

کوڈائی کنال میں ان لوگوں کی آبادی (جو دو ہزار کنبوں سے زیادہ ہے) دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اور یہ لوگ کم اجرت پر باغات، سڑکوں اور عمارتوں کی تعمیر، پتھر کی کانوں میں اور بے کھیت زرعی مزدوروں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ دو دیگر روزگاروں کی وجہ سے بھی ہندوستان لوٹنے والے کنبوں کو، ۲۴۰ میٹر اونچی کوڈائی پہاڑیوں کے اندر تک جانا پڑا، جہاں ریاستی محکمۂ جنگلات کے تحت زمین کا بڑا رقبہ ٹھاٹر اور یوکلپٹس کے پیڑوں سے ڈھکا ہوا ہے۔

ان اُگے ہوئے پیڑوں کو دو کمپنیوں کو پٹے پر دے دیا جاتا ہے۔ ان میں سے ٹھاٹر ایک کمپنی کا عرق تیار کرتی ہے، جو چمڑا کمانے میں کام آتا ہے، اور دوسری کمپنی مصنوعی ریشے کی تیاری میں لگی ہوئی ہے۔ یہ کمپنیاں اپنا کام آگے ٹھیکیداروں کی معرفت کراتی ہیں۔

بھارت لوٹنے والوں کی غریبی اور بیروزگاری کی دو خاص وجہیں تھیں جنھوں نے انھیں کوڈائی کنال کے کوپوں (تنگ و تاریک کوٹھریوں) میں کام کرنے پر آمادہ کیا۔ مذکورہ دو کمپنیوں کے ٹھیکیداروں کی طرف سے دی جانے والی ترغیبات کا اس عمل میں بڑا حصہ تھا۔ چوں کہ میدانوں میں بسنے والے تامل مزدور اتنی بلندی پر، دشوار حالات میں اور کم درجہ حرارت میں اکثر کام کرنا نہیں چاہتے، لہٰذا یہ ترغیبات نہایت اہم تھیں۔

یہ لوگ قریب قریب بندھوا مزدور ہیں

بندھوا پن کے ساتھ ساتھ، ماحول کا مسئلہ بھی اتنا ہی اہم ہے۔ پالنی پہاڑیوں میں ٹھاٹر اور یوکلپٹس کے جنگلات کی تاریخ انیسویں صدی کے اول نصف سے شروع ہوتی ہے۔ ان پہاڑیوں کو انسان کے رہنے کے لائق بنانے کے خیال سے یوکلپٹس کے پودے آسٹریلیا سے لائے گئے تھے۔ ان کی بڑے پیمانے پر کاشت نے دلدل کو خشک کرنے اور کیڑے مکوڑوں کو دور رکھنے کا کام سرانجام دیا۔ ٹھاٹر کا پیڑ بھی آسٹریلیا سے لایا ہوا ہے۔ اسے شولوں (سدا بہار جنگلات) جنگل کی آگ سے بچانے کے لیے دور دور تک لگایا جاتا ہے۔ آنے والی دہائیوں میں ٹھاٹر اور یوکلپٹس دونوں نے کاروباری اداروں کو اپنی جانب متوجہ کرنا شروع کر دیا۔ ان پیڑوں سے بنی نوع انسان کی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے افرادی محنت کش قوت کو متعارف کیا گیا۔ اسی کے ساتھ قدرت اور انسانی محنت کشوں کے استحصال کی داستان شروع ہوئی۔

ان کا استحصال بھی کیا گیا ہے

بوٹانیکل سروے آف انڈیا نے ۱۹۶۹ء میں رپورٹ دی کہ بانس کی قسم کے یہ پیڑ جو ٹھاٹر وغیرہ کے نام سے جانے جاتے ہیں، ہریالی کو چوس رہے ہیں۔ اور اس طرح سے یہ خطرہ بن سکتے ہیں۔

"محکمۂ جنگلات کے زیر اہتمام ٹھاٹر اور یوکلپٹس کے جنگلات دھان اگانے والے میدانی علاقوں کے لیے بھی ایک سنگین خطرہ بنے ہوئے ہیں اور یہ صرف بڑے بڑے کارخانوں کے مفادات کو پورا کرتے ہیں۔ بھارت لوٹ کر آنے والے چونکہ کم اجرت پر مزدوری کے لیے مل جاتے ہیں، لہٰذا ان مفادات کو فروغ دینے کے لیے گزشتہ چند برسوں میں منظم کوششیں کی گئی ہیں۔

بھارت لوٹ کر آنے والے اشخاص کی کہانی اُن کی خانہ بدوش زندگی کی نوعیت میں ایک اور باب کا اضافہ کرتی ہے۔

بھارت میں خاص کر کوڈائی کنال کے کوپوں میں ان لوگوں کے جینے اور کام کرنے کا انداز دراصل وہی ہے جو سری لنکا باغات میں۔

ایک طرف یہ انسانی استحصال کو اجاگر کرتا ہے، جو ماضی میں اُن پر ٹوٹا گیا ہے اور دوسری طرف انھیں غلامی کی تمام زنجیروں سے آزاد کرنے اور انسانی وقار کے ساتھ زندگی بسر کر سکنے کی اس تاریخی مطالبہ کی یاد دلاتا ہے جو موجودہ نسل سے کیا جاتا ہے۔ ان دو کمپنیوں میں تقریباً ۶۰۰ کنبے کام کر رہے ہیں، ان میں سے ہر کنبہ میں اوسطاً ۳٫۸۴ افراد ہیں ان کوپوں میں مزدوروں کی تعداد لواحقین کی تعداد سے دُگنی ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ (ا) صحتمند کارکنوں کو ترجیح ملتی ہے خواہ وہ مرد ہوں یا عورت۔ (ب) بال مزدوری کا چلن ہے اور (ج) بوڑھے والدین جیسے نہ کمانے والے افراد کی ان کوپوں میں رہنے کے لیے حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ عمر کی بنا پر افراد کی تقسیم سے بہت جانکاری ملتی ہے۔ محض دو فیصد کے لگ بھگ ہی ایسے لوگ ہیں جو ۱۱ سال یا اس سے زائد عمر کے ہیں، کچھ ایسے معاملوں کا بھی پتہ

چلا ہے، جن میں ایسے کنبوں کو جن کے کچھ افراد لاچار ہوں، کنویں چھوڑ دینے کے لیے کہا گیا ہے۔ کام کے دوران (یا کسی اور وجہ سے) حادثات کے شکار لوگوں کو ان کنوؤں سے فوراً باہر نکال دیا جاتا ہے۔ ان کنوؤں کو کم اجرت پر کام کرنے والے چاہئیں جب کسی مزدور کی پیداواریت ایک خاص حد سے کم پڑ جاتی ہے تو اُسے سرسری انداز میں نوکری سے برخاست کر دیا جاتا ہے۔

غیر انسانی ماحول

کنوؤں کی جگہیں کروڈائی کنال کے جنگلاتی حلقوں میں دُور تک بکھری ہوئی ہیں، جو کہ قصبے سے ۲۵ اور ۴۰ کیلومیٹر کے بیچ کی دوری پر واقع ہیں۔ کنبوں کی ایک ٹولی کے لیے کام کرنے کی ایک جگہ مقرر کی جاتی ہے، کام کی مقدار کے لحاظ سے، مختلف مقامات پر بیس سے لیکر پچاس کنبے ایک جگہ کام کرتے ہیں۔ یہ مزدور ٹین کے شیڈوں والی تنگ کوٹھریوں میں (جو کہ فی کنبہ ۵ فٹ اونچی اور ۸ اور ۱۰ فٹ کے بیچ چوڑی ہوتی ہیں) یا گھاس پھوس کے چھپروں کی طویل قطاروں میں رہتے ہیں۔ یہ رہائشں گاہیں کیا ہیں، مرغی خانے ہیں۔ سماجی کارکن ان کو غلطی سے "کوپ" کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ اقتصادی سرگرمی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم مزدوروں کو مناسب رہائش کی جگہیں فراہم نہیں کی گئیں، مزدوروں کو اشیائے خورد و نوش کوڈائی کنال میں واقع مقررہ دوکانوں سے ہفتہ وار راجناس کی صورت میں مہیا کی جاتی ہیں۔

سپریم کورٹ کی جانب سے بھی توثیق

سپریم کورٹ کی رپورٹ ہے کہ ٹھیکیدار اور یہ کمپنیاں ان لوگوں کی طبی دیکھ بھال سے قطعی غافل ہیں۔ میتری جیسے رضاکارانہ گروہوں کو ابتدائی طبی دیکھ بھال کے لیے وان اہلین اسپتال اور کورسوگ سے تعاون ملتا تھا۔ ٹھیکیداروں کے کارندے ان ٹیموں کو بھی کوریوں میں گھسنے نہیں دیتے تھے۔ سپریم کورٹ کمیشن کے تحت، کرشنا مورتی۔ کاساوائو طبی سائنس ٹیم نے کیڑوں کے ڈسنے کے باعث یہاں جلدی امراض کی رپورٹ پیش کی تھی۔ مزید برآں پانی کی قلت کی وجہ سے "بچے شاذ و نادر ہی نہاتے ہیں اور اُن کے جسم کی کھال اور بال بہت میلے کچیلے رہتے ہیں"۔۔۔۔ نمونیہ، بخار، بدن میں خون کی کمی اور ناقص تغذیہ جیسے عوارض یہاں کی مخصوص بیماریاں ہیں۔ ایک رضاکارانہ گروہ کا کہنا ہے "یہاں کوئی طبی سہولت دستیاب نہیں ہے۔ ہم نے حاملہ عورتوں کو دم توڑتے ہوئے دیکھا، شاید تھکن اور غذا کی کمی کے باعث۔ ہم نے ایسے مرد بھی دیکھے جن کے گھاؤ بغیر کسی مرہم پٹی کے چل رہے تھے۔ کوڈائی کنال قصبے میں ٹھیکیداروں کی جانب سے "منظور شدہ" ڈاکٹر ایسے لوگ ہیں جن کا ڈاکٹر ہونا بھی مشکوک ہے۔ تاہم اُن کی فیس من مانے طور پر مقرر کی گئی ہے اور مزدوروں کی اُجرت سے کاٹ لی جاتی ہے، کام کے دوران حادثات اور اموات کا ان مزدوروں کو کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ زچّہ اور بچّہ کی اموات کی شرح بھی بہت اُونچی ہے۔

کام کرنیکے خطرناک حالات

یہاں مزدور انتہائی خطرناک حالتوں میں کام کرتے ہیں۔ عام طور پر ایک دن میں ۱۰ سے لے کر ۱۲ گھنٹے تک کام لیا جاتا ہے۔ یہ محکمہ جنگلات کے ساتھ کمپنیوں کے معاہدے کی خلاف ورزی ہے جس کے تحت صاف طور پر شام ۶ بجے اور صبح ۶ بجے کے درمیان کام نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ تعطیلات کی بھی اجازت نہیں ہے۔ ایک جائزے کے نتائج کے بموجب مذکورہ دو کمپنیوں میں کام کرنے والوں کی علی الترتیب اوسط کُل ماہانہ آمدنی فی کس ۲۴۰ روپے اور ۲۸۷٫۵۰ روپے ہے۔ کمپنیوں اور ٹھیکیداروں کے مابین معاہدے میں درج ہونے کے باوجود کوئی بونس ادا نہیں کیا جاتا۔ من مانے جُرمانے اور کٹوتیاں عام ہیں۔ یہ امر اہمیت کا حامل ہے کہ جب کہ اول الذکر کمپنی اپنے ٹھیکیداروں کو ٹماٹر کی ہری چھال کے ایک ٹن کے لیے ۵۰۰/ روپے ادا کرتی ہے۔ موخرالذکر کمپنی اپنے ٹھیکیداروں کو اس کے ایک ڈھیر کے ۱۵۰/ روپے ادا کرتی ہے۔ لیکن اول الذکر کے مزدوروں کے حصّے میں جو معمولی رقم آتی ہے، وہ ہے ۱۷۰٫۰۰ روپے سے لے کر ۲۳۰٫۰۰ روپے فی ٹن اور موخرالذکر کے مزدوروں کے حصّے میں فی ڈھیر ۳۵٫۰۰ روپے سے لے کر ۴۵٫۰۰ روپے سے زیادہ کچھ نہیں آتا۔ ان بچولیوں کو خارج کر دینے پر یہ مزدور غیر انسانی استحصال سے یقیناً بچ جائیں گے اور انھیں اپنے کام کی جائز اُجرت پانے میں مدد ملے گی۔

کام کا بندھن کیسے تشکیل پاتا ہے

بندھوا مزدوری کے نتیجے میں مختلف طرح سے استحصال کیا جاتا ہے۔ (ا) ابتدائی سفر خرچ کی پیشگی ادائیگی۔ (ب) محض زندہ رہنے کے لیے ہفتہ وار راشن کی خرید اور روزمرہ کے اخراجات کے لیے وقفہ وار نقدی قرض (ج) ٹھیکیداروں، ذیلی ٹھیکیداروں، دوکانداروں اور ڈاکٹروں کو واجب الادا قرض اور (د) کمبلوں کی فراہمی جنھیں ملازمت ترک کرنے کی صورت میں مزدوروں کو واپس کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹین انڈیا کے مزدوروں کو ایسے کورے کاغذوں پر دستخط کرنے پر مجبور کیے جاتے ہیں جن پر ٹکٹ چسپاں ہوتے ہیں اور جنھیں بعد ازاں ضرورت پڑنے پر اُن کے خلاف کام میں لایا جا سکتا ہے، انھیں گالیاں اور دھمکیاں دینا تو ایک عام بات ہے۔

"غیر ہموار کار" مزدوروں کی، ٹھیکیداروں کے کرائے کے غنڈوں کے ہاتھوں سے پٹائی بھی ہوتی رہتی ہے۔ ایک کنبے کے سبھی افراد کو ایک ساتھ کہیں باہر جانے کی اجازت نہیں ہے تاکہ وہ فرار نہ ہو جائیں۔ یہاں تک کہ اپنے لواحقین کے بجائے ٹھیکیداروں کے کارندے ہی مریضوں کیساتھ جاتے ہیں۔

سپریم کورٹ کی جانب سے کمیشن کا تقرر

آئین کی دفعہ ۳۲ کے تحت سوامی اگنی ویش کے توسط سے بندھوا مکتی مورچہ نے ان مزدوروں کی مصیبتوں کو دور کرنے کے لیے سپریم کورٹ سے درخواست کی۔ سپریم کورٹ نے کوئیوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے حالات کی تحقیقات کے لیے اپنے حکم مورخہ یکم اور ۱۵ اپریل ۱۹۸۲ء کے ذریعے ایک سہ رکنی کمیشن مقرر کیا جو جسٹس سی۔ جے۔ آر پال ریٹائرڈ جج، مدراس ہائی کورٹ، شری ٹی۔ ایس شنکرن۔ آئی۔ اے۔ ایس (ریٹائرڈ) اور مشہور سماجی کارکن شری محبوب پر مشتمل تھا۔ ان کے مسائل کے بارے میں ماہرین عمرانیات نے بھی مطالعہ کیا۔ جسے سپریم کورٹ میں داخل کی گئی کمیشن کی رپورٹ کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ یہ تحقیق تجارتی جنگل بانی اور اس میں انسان کی قیمت کے عنوان سے ہے۔ کوڈائی کنال کی پہاڑیوں میں واقع کوئیوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے حالات کی ایک تحقیق شری آر۔ ودیا ساگر، الوسین ایرودیم اور ایم ویو داسن نے کی۔

کمیشن کی سفارشات کیا تھیں

تین کوئیوں میں کام کرنے والے اُن مزدوروں کو (۱۵۷ کنبے) جنہوں نے میرے رُوبرو اور بعد میں کمیشن کے سامنے اپنی شکایات پیش کرنے کی جرأت کی، کام سے ہٹا دیا گیا۔ کمیشن کی پہلی سفارش یہ تھی، "یہ کہ مزدور اور اُن کے کنبوں کے افراد کو جلوٹ سے بے کار ہیں اور اپنی گذر بسر عوامی خیرات سے کرتے ہیں جن میں خدمت خلق کی تنظیموں وغیرہ کی مدد بھی شامل ہے"۔ اس لیے تامل ناڈو سرکار کو ہدایت کی جائے کہ جب تک کہ بندھوا مزدوری سسٹم (انسداد) ایکٹ کی دفعات کی روشنی میں مرتب کی گئی اسکیموں کے تحت انھیں پھر سے نہیں بسایا جاتا، انھیں مناسب اور کافی راحت بہم پہنچائی جائے۔ اب ان ۱۵۷ کنبوں کو ان کے افراد کی تعداد کی بنا پر ۱۱۰/- روپے سے لے کر ۲۹۰/- روپے فی کنبہ ماہوار رقم دی جا رہی ہے۔ بھارت سرکار اور چند رضاکارانہ تنظیموں کے قریبی تعاون سے تامل ناڈو سرکار ایک طویل المدت بحالیاتی پروگرام بھی بنا رہی ہے۔

متعلقہ قوانین کا نفاذ

سپریم کورٹ کمیشن کی اہم ترین سفارش یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء کے پلانٹیشن لیبر ایکٹ کو اس اقتصادی سرگرمی یعنی تجارتی جنگل بانی پر لاگو کیا جائے۔ اس ایکٹ کا ایک بار اطلاق ہو جانے کے بعد، وہاں کام کرنے والے مزدور، قوانین کی مندرجہ ذیل دفعات کے تحت ملنے والے فوائد کے مستحق ہو جائیں گے۔ میٹرنٹی بینی فٹ ایکٹ ۱۹۶۱ء، دی پے منٹ آف گریجوئٹی ایکٹ ۱۹۷۲ء، دی ورک مینز کمپنسیشن ایکٹ ۱۹۲۳ء وغیرہ وغیرہ۔ کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ مزدوروں کے استحصال کی سبھی بُرائیاں اس ٹھیکیداری نظام سے پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا جتنا جلدی ٹھیکیداری نظام کو ختم کیا جائے گا اُتنے ہی ان مزدوروں کے حالات بہتر ہوں گے۔"

اعتراضات اور مشورے فقط چیف کنزرویٹر آف فارسٹس (جنرل) ہی سے موصول ہوئے تھے۔ دی چیف کنزرویٹر آف فارسٹس (جنرل) نے یہ بیان کیا ہے کہ "اگر اقل ترین اُجرتوں کو قانوناً لاگو کیا جاتا ہے تو جنگلات میں کام کرنے والے مزدوروں کو کم کام کرنے اور ایکٹ کے مطابق اُجرتیں پانے کا ناروا فائدہ مل جائے گا، جس سے کام کرانے کی لاگت میں اضافہ ہو جائیگا۔ اس سے نااہلی کا عنصر رواج پا جائے گا اور کام کی خوبی میں کسی تقابلی سُدھار کے بغیر لاگتوں میں زیادتی آ جائے گی۔ لہٰذا اُس نے یہ مشورہ دیا کہ جنگلات میں ملازمت کی بات کو اُجرتوں کے ایکٹ کے دائرے سے باہر رکھا جائے۔ سرکار نے چیف کنزرویٹر آف فارسٹس (جنرل) کے اعتراضات کا جائزہ لیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ کام کرنے والے مزدور وہ لوگ ہیں جن کا جنگلاتی ٹھیکیداروں کی طرف سے زیادہ سے زیادہ استحصال کیا جاتا ہے، اور اُن کی پسماندگی اور جہالت کی وجہ سے انھیں بہت کم مزدوری دی جاتی ہے، مزید برآں ان میں سے زیادہ تر افراد درج فہرست قبائل اور آدی باسی ہیں، جن کا اب تک بہت زیادہ استحصال کیا گیا ہے۔ لہٰذا سرکار چیف کنزرویٹر آف فارسٹس سے موصولہ اعتراضات اور مشوروں کو مسترد کرتی ہے اور ابتدائی نوٹی فکیشن کی توثیق کرتی ہے۔"

اس پر کمیشن نے "اس عمل پر ٹھیکیداری کے نظام کو جاری رکھنے کے کسی جواز" کو محسوس نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اگر محکمۂ جنگلات اس کام کو خود نہ کر سکتا ہو تو ایسی حالت میں یہ کام پلانٹیشن کارپوریشن جیسی سرکاری دائرہ کار کی کارپوریشنوں کے حوالے کرنے کی بابت سوچنا بھی ممکن ہوگا۔"

۱۹۵۱ء کے پلانٹیشن لیبر ایکٹ کا نفاذ نہ صرف کوڈائی اور اوٹی (تامل ناڈو) میں کام کرنے والے مزدوروں کے لیے فائدہ مند ہوگا، بلکہ ملک کے سبھی حصّوں میں کام کرنے والے ایسے مزدور اس سے مستفید ہوں گے۔ تجارتی جنگل بانی میں بالعموم درج فہرست ذاتوں کے قبائلی مزدوروں کو رکھا جاتا ہے۔ اُن کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ مزدوروں کے شعبہ سے متعلق اس قانون کو لاگو کیا جائے گا۔

ڈاکٹر ایچ۔ پیس

بندھوا مزدوروں کی بحالی تیزی سے ہونی چاہیئے

مصنف نے بندھوا مزدوری کی رہائی کے عمل کی تیزی کے ساتھ ساتھ ہی ان کی بحالی کے عمل میں بھی تیزی لانے کے لیے زور دیا ہے۔ ان دونوں کاموں میں تال میل نہیں ہے اور اس وجہ سے مزدوروں کی بحالی دیر سے ہوتی ہے۔ اس درمیانی عرصے میں ان کو گزارہ بھتہ بھی نہیں ملتا، اس وجہ سے بندھوا مزدور جو کہ رہا کرا لیے جاتے ہیں، دوبارہ سے اس جال میں پھنستے نظر آتے ہیں۔ بندھوا مزدوروں کی بحالیاتی اسکیموں کو تیزی سے آگے بڑھا کر ہی بندھوا مزدوروں کی بے اطمینانی ختم کی جا سکتی ہے۔

آئین کی دفعہ ۲۳ کی رُو سے بندھوا مزدوری غیر قانونی ہے۔ آئین کی رُو سے روک تھام ایک بات ہے لیکن اس پر عمل درآمد دوسری بات ہے، بہت سی ریاستوں سے یہ اطلاع ملی ہے کہ یہ بُرائی بڑے پیمانے پر دیکھنے کو ملتی ہے، اس لیے بندھوا مزدوری کی روک تھام کی غرض سے ایک خاص قانون کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ ۱۹۷۶ء میں اس سسٹم کو ختم کرنے کے لیے ایک قانون بنا جس کا نام ہے Bonded Labour System (Abolition) Act, 1976 اس میں مختلف طرح کی بندھوا مزدوری کو شامل کیا گیا ہے۔ بندھوا مزدوری یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی طرف سے یا اپنے کسی کنبے کے فرد کی طرف سے عہد و پیمان کے ساتھ قرض کی ایک رقم دے دیتا ہے اس آدمی کو جسے کہ قرض دیا جاتا ہے، اس قرض کے بدلے معمولی اُجرت پر کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ اُجرت کبھی نقد اور کبھی جنس کی صورت میں اُسے مل جاتی ہے۔ بندھوا مزدوری کے زمانے میں یہ آدمی کسی اور جگہ کام نہیں کر سکتا، اسے ملک میں کسی بھی جگہ جانے کی آزادی حاصل نہیں ہوتی، وہ اپنی محنت یا محنت کے پھل کو کھلے بازار میں فروخت نہیں کر سکتا، بندھوا مزدوری سماجی اسباب کی بناء پر بھی ہوتی ہے۔ سماجی بندھوا مزدوری یا پرانی قسم کی رواجی بندھوا مزدوری کم ہے، یعنی تقریباً ۲ فیصد۔

مسئلے کی وسعت

بندھوا مزدوری کے مطالعے سے اس مسئلے کی وُسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، مذکورہ قانون پاس ہو جانے کے بعد گاندھی پیس فاؤنڈیشن کو اس کے سروے کے لیے مامور کیا گیا تاکہ بندھوا مزدوروں کی تعداد کا پتہ لگایا جا سکے۔ اس فاؤنڈیشن نے دس ریاستوں میں مطالعہ شروع کیا اور اندازہ لگایا کہ ان ریاستوں میں ۲۶ لاکھ ۱ہزار سے زیادہ بندھوا مزدور ہیں۔ اس فاؤنڈیشن نے اُن اسباب کو بھی بتایا کہ دوسری ریاستوں میں اس طرح کے مطالعے کو کیوں شروع نہیں کیا گیا۔ اس رپورٹ میں مذکور ہے کہ اس کی ابتدائی تحقیقات

سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان علاقوں میں بندھوا مزدوری کا سسٹم بہت کم ہے۔ نیشنل سیمپل سروے آرگنائزیشن نے اپنے ۳۲ راؤنڈ میں یہ بتایا کہ ان ریاستوں میں ۴ لاکھ ۵۰ ہزار بندھوا مزدور ہیں۔ گاندھی پیس فاؤنڈیشن اور نیشنل سیمپل سروے کے اندازوں میں کافی بڑا فرق ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مذکورہ دونوں تنظیموں نے بندھوا مزدوری کی صراحت جُدا جُدا کی ہے۔ گاندھی پیس فاؤنڈیشن نے بندھوا مزدوروں سے متعلق ایکٹ کی تصدیق کی ہے لیکن نیشنل سیمپل آرگنائزیشن نے اس کام کو محدود پیمانے پر کیا ہے۔ نیشنل سیمپل سروے تنظیم دوسروں کے لیے کام کرنے والے افراد کی آزادی چاہتی ہے اور یہ بھی دیکھنا چاہتی ہے کہ کوئی شخص جس قدر کام کر رہا ہے، اس کے تناسب سے اُسے اُجرت ملنی چاہیئے۔ ریاستی سرکاریں تدریجی طور پر اس کام کو آگے بڑھا رہی ہیں اور اس ایکٹ کی رُو سے بندھوا مزدوروں کو آگاہ کرا رہی ہے۔ ریاستی سرکاروں نے بندھوا مزدوروں کی جس تعداد کی نشاندہی کی ہے، اسے واضح طور پر سامنے رکھنا چاہیئے۔ بندھوا مزدوروں کی نشاندہی ایک مسلسل عمل ہے پھر بھی یہ اچھا ہوگا کہ ریاستی سرکاریں، گاندھی پیس فاؤنڈیشن اور نیشنل سیمپل سروے تنظیم کے پیش کئے ہوئے اندازوں کو ایک ساتھ سامنے رکھیں۔

گاندھی پیس فاؤنڈیشن کے اندازے کے مطابق دس ریاستوں میں بندھوا مزدوروں کی تعداد ۲۶ لاکھ ۱۷ ہزار ہے۔ ملک کے کچھ علاقوں کو اس لیے مطالعے میں شامل نہیں کیا گیا چوں کہ وہاں بندھوا مزدوری کم ہے، ان میں جنوبی مہاراشٹر، آندھرا پردیش کے ساحلی علاقے، راجستھان کا ریگستان، گجرات اور چھوٹا ناگپور کے جنوب مغربی ساحلی علاقے وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن ان علاقوں کی

بندھوا مزدوروں کی تعداد کا اندازہ

نمبر شمار	ریاست	ریاستی سرکاروں کی طرف سے نشاندہی کئے ہوئے اور آزاد کرائے گئے	نیشنل سیمپل سروے کی طرف سے شناخت کئے گئے اور آزاد کرائے گئے	گاندھی پیس فاؤنڈیشن کے اندازے کے مطابق
۱۔	آندھرا پردیش	۲۴۷۸۸	۷۳۰۰	۳,۲۵,۰۰۰
۲۔	آسام	—	۴۴۰۰	—
۳۔	بہار	۱۱۰۰۲	۱۰۲۴۰۰	۱۱۱۰۰۰
۴۔	گجرات	۶۲	۴۲۰۰	۱۷۱۰۰۰
۵۔	ہریانہ	۲۹۵	۱۲۹۰۰	—
۶۔	ہماچل پردیش	—	—	—
۷۔	جموں و کشمیر	—	۹۰۰	—
۸۔	کرناٹک	۶۲۶۸۹	۱۴۱۰	۱۹۳۰۰۰
۹۔	کیرالہ	۸۲۳	۴۰۰	—
۱۰۔	مدھیہ پردیش	۴۷۶۱	۱۱۶۲۰۰	۵۰۰۰۰
۱۱۔	مہاراشٹر	۷۸۰	۴۳۰	۱۰۰۰۰۰
۱۲۔	منی پور	—	—	—
۱۳۔	میگھالیہ	—	—	—
۱۴۔	ناگالینڈ	—	—	—
۱۵۔	اُڑیسہ	۴۲۴۲۱	۵۴۰۰	۳۵۰۰۰۰
۱۶۔	پنجاب	—	۴۳۰۰	—
۱۷۔	راجستھان	۶۸۳۶	۲۴۰۰	۶۷۰۰۰
۱۸۔	تامل ناڈو	۳۳۱۳۲	۱۲۵۰۰	۱۵۰۰۰
۱۹۔	تریپورہ	—	—	—
۲۰۔	اتر پردیش	۱۸۳۳۴	۳۱۷۰	۵۵۰۰۰۰
۲۱۔	مغربی بنگال	—	۲۱۶۰۰	—
۲۲۔	مرکز کے زیر انتظام علاقے	—	—	—
		۲۰۵۹۲۳	۳۴۵۰۰۰	۲۶۱۷۰۰۰

رپورٹوں سے بعد میں یہ پتہ چل رہا ہے کہ یہاں بھی کافی تعداد میں بندھوا مزدور ہیں، اس لیے ملک میں بندھوا مزدوروں کی کل تعداد اندازے سے کہیں زیادہ ہے۔

نشاندہی :-

بندھوا مزدوری سے متعلق نظام کی تنسیخ سے متعلق ایکٹ

اس ایکٹ میں اُن طریقوں کا ذکر ہے جن کے مطابق بندھوا مزدوری کی نشاندہی اور شناخت کی جاتی ہے اور انھیں آزاد کرایا جاتا ہے۔ یہ ایک عدالتی کارروائی ہے۔ ایکٹ کی رُو سے مجسٹریٹ اس کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ لیکن شناخت کا یہ عمل جیسا کہ گوشوارے سے ظاہر ہے، بہت آہستہ انجام پا رہا ہے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۶ء تک صرف ۲۰۵۹۲۳ بندھوا مزدوروں کی شناخت ہو سکی ہے۔ اس ایکٹ کے پاس ہو جانے پر دس سال کے عرصے میں بندھوا مزدوروں کی رہائی اور شناخت کا عمل یکساں رفتار سے نہیں چل پایا ہے، اور آزاد کرائے گئے بندھوا مزدور مشکل سے بندھوا مزدوروں کی کُل تعداد کا دس فیصد ہے۔ ۱۹۷۷ء میں گویا کہ ایکٹ پاس ہونے کے پہلے سال ایک لاکھ دو ہزار بندھوا مزدوروں کی شناخت کی جا سکی لیکن بعد میں یہ تعداد گھٹتی ہی رہی۔ ۱۹۸۱ء میں بارہ ہزار، ۱۹۸۲ء میں ۱۹ ہزار بندھوا مزدوروں کی نشاندہی کی گئی۔ ۱۹۸۴ء میں صرف دس ہزار اور ۱۹۸۵ء میں ۱۸ ہزار بندھوا مزدوروں کی شناخت اور رہائی عمل میں آ سکی اگر اسی رفتار سے کام ہوا تو یہ کام آئندہ سو برسوں میں بھی پورا ہونے والا نہیں۔ اس کام کے تئیں شروع میں جو دلچسپی اور تندہی دکھائی گئی، وہ کم ہو گئی، ریاستی سرکاروں نے اس پر توجہ کم کر دی ہے۔ ریاستی سرکار کے مختلف اداروں میں تال میل کی کمی ہے۔ ضلع کی سطح پر دیہات کی مربوط ترقی کی تنظیم دیہی علاقوں کی ترقی کے لیے بنیادی طور پر ذمہ دار ہے۔ اس تنظیم کی ذمہ داریوں میں منجملہ دیگر امور کے ایک یہ بھی ہے کہ انتہائی غریب اور پسماندہ افراد کو فائدہ پہونچایا جائے، اس اندازِ نظر کو اپنانے سے بندھوا مزدوروں کی رہائی میں بڑی حد تک مدد مل سکتی ہے۔ مگر تال میل کی کمی کے سبب یہ پروگرام خاطر خواہ اثرات نہیں دکھا سکا۔ کچھ ریاستوں میں یہ کام سماجی بہبود کے محکموں کو سونپا گیا ہے۔ یہ ادارے ضلع کلکٹر کے ماتحت ہیں۔

بحالی :-

بندھوا مزدوروں کو آزادی مل جانے کے فوراً بعد اپنی بحالی کے لیے کام کرنا پڑتا ہے، یوں تو وہ کھلی منڈی میں آ جاتا ہے تاکہ من پسند کام تلاش کر سکے لیکن عملی صورتِ حال اس سے مختلف ہے، دیہات میں محنت کش طبقہ اپنے لیے نفع بخش کام حاصل نہیں کر پاتا۔ ان حالات میں بندھوا مزدوروں کی بحالی بڑی اہمیت رکھتی ہے، ان کی بحالی سے متعلق اسکیم مرکز کے زیرِ اہتمام چلائی جاتی ہے، بندھوا مزدور جو کہ آزاد ہو گیا ہے، ۴ ہزار روپے تک امداد پانے کا مستحق ہے۔ یکم فروری ۱۹۸۶ء سے یہ رقم بڑھا کر ۶۲۵۰ روپے کر دی گئی ہے۔ ان اخراجات کا نصف حصہ بھارت سرکار برداشت کرتی ہے اور باقی نصف ریاستی سرکار۔ پوری رقم گرانٹ کی صورت میں مل جاتی ہے۔

اس گوشوارے سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کرائے گئے بندھوا مزدور بہت زیادہ ہیں جبکہ بسائے گئے بندھوا مزدور بہت کم ہیں۔ منصوبہ بندی کمیشن کی جس تنظیم نے اس پروگرام کا جائزہ لیا، یہ خیال ظاہر کیا کہ بندھوا مزدور آزاد کرائے جانے کے بعد جب تک پھر سے کام کرنا شروع نہیں کرتے، بڑی پریشانی میں رہتے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ بھوک سے پریشان رہتے ہیں، بندھوا مزدوروں کو گزارہ بھتہ دینے کی گنجائش ضرور ہے لیکن عملاً یہ آدھے بندھوا مزدوروں کو بھی نہیں ملتا۔

مذکورہ تنظیم نے جن ۸۲۷ بندھوا مزدوروں

بندھوا مزدوروں کی رہائی اور بحالی

سال	شناخت کیے گئے اور رہا کرائے گئے بندھوا مزدوروں کی تعداد	پھر سے بسائے گئے بندھوا مزدوروں کی تعداد
۱۹۷۷	۱۰۲۰۶۰	۲۳۷۲۸
۱۹۷۸	۱۱۸۸۴۴	۸۳۲۴۹
۱۹۷۹	—	—
۱۹۸۰	۱۲۰۹۷۱	۱۰۳۷۰۷
۱۹۸۱	۱۳۳۵۵۳	۱۰۹۷۸۱
۱۹۸۲	۱۵۲۳۳۸	۱۱۱۷۶۹
۱۹۸۳	۱۶۳۲۴۵	۱۱۶۹۱۷
۱۹۸۴	۱۷۳۸۱۴	۱۳۱۴۰۷
۱۹۸۵	۱۹۴۲۶۲	۱۴۴۲۸۴

کا جائزہ لیا، ان میں سے ۹۶ء۲ فیصد یعنی ۲۵ء۰ کے لگ بھگ کی یہی شکایت تھی کہ رہا کرا لئے جانے کے بعد انھیں کام بہت دیر سے ملا۔ اکثر و بیشتر نے یہی کہا کہ درمیانی مدت میں ان کو کنبے کے اخراجات چلانے میں بڑی دشواری پیش آئی۔ ان کو ایک وقت کا ہی کھانا ملتا رہا۔ دوسرے وقت بھوکا سونا پڑا۔ رہا کرائے گئے بندھوا مزدوروں کی ۶۰ فیصد تعداد کو دوبارہ سے کام مل سکا۔ اکثر کو رہا ہو جانے کے تقریباً تین چار برس کے بعد ہی کام مل سکا۔ تمل ناڈو کے ہری یار ضلع میں تو یہ تاخیر چار تا پانچ برس کے درمیان رہی، اس علاقے میں رہا کرائے گئے بندھوا مزدوروں کی ۸۵ فیصد تعداد اسی قدر عرصے کے بعد کوئی کام پا سکی۔

بحالیاتی اسکیمیں

زیادہ تر بندھوا مزدوروں کو ایسے کاموں سے لگایا گیا جو زمین سے جڑے ہوئے تھے، ایسا کرنا بدرجۂ مجبوری تھا۔ یہ لوگ وہ تھے جو رہائی سے قبل زمین پر کام کر رہے تھے، بندھوا مزدوروں کو جو اراضی دی گئی، وہ گھٹیا قسم کی تھی، اس پر زیادہ آبپاشی کی سہولتیں بھی نہ تھیں اس پر کھیتی کرنا مشکل تھا۔ اچھی اراضی زیادہ تر اقتصادی طور پر خوشحال کسانوں کے قبضے میں ہے۔ کچھ بندھوا مزدوروں کو گائے، بھینس، بکری، سؤر پالنے اور مرغبانی وغیرہ کے کاموں میں لگایا گیا، بندھوا مزدوروں کو کام ان کی مرضی کے مطابق نہیں مل پاتا۔ عمل درآمد کے ذمہ دار ادارے ان اسکیموں کو بندھوا مزدوروں تک پہونچاتے ہیں۔ چند صورتوں میں صرف تکنیکی امداد دینے پر ہی اکتفا کی جاتی ہے، مویشی دینے کے بعد، بندھوا مزدوروں کے کام پر نظر نہیں رکھی جاتی، اگر ان کے چارے وغیرہ کی مشکلات پیش آتی ہیں تو ایسی اراضی فراہم نہیں کی جاتی جس پر چارہ اگایا جا سکے۔

بندھوا مزدوروں کو جس قدر امداد دی جاتی ہے، وہ بالعموم ناکافی رہتی ہے۔

چند مشورے :-

ریاستی سرکار کی دلچسپی کی کمی کے باعث اس مسئلے پر پوری توجہ نہیں دی جا سکی ہے، ایک اندازے کے مطابق ملک میں تقریباً ۳۰ لاکھ بندھوا مزدور ہیں۔ مارچ ۱۹۸۶ء تک ۲ لاکھ ۵ ہزار بندھوا مزدوروں کی نشاندہی کی جا چکی تھی، چنانچہ اس کام کو تیزی سے آگے بڑھانے کے لیے بندھوا مزدوروں کی نشاندہی بہت ضروری ہے۔ آئندہ سروے میں اس کام کو ترجیح ملنی چاہیئے، دیہات کی مربوط ترقی کے کام سے متعلق تنظیم اس سلسلے میں معاون ہو سکتی ہے، بندھوا مزدوروں کو دیہات کی مربوط ترقی کی مختلف اسکیموں سے فائدہ دینا چاہیئے۔ آندھرا پردیش میں ضلع نظام آباد کے بودھن تعلقہ میں یہی اندازِ نظر اپنایا گیا ہے۔ یہاں کے ضلع انتظامیہ نے بندھوا مزدوروں کی شناخت کے کام کو دیہات کی مربوط ترقی کے پروگراموں سے جوڑ دیا ہے۔ رہا کرائے گئے بندھوا مزدوروں کی مالی امداد کی بالائی حد ۹۶۰۰ روپے کر دینی چاہیئے۔ شیڈولڈ کاسٹ، شیڈولڈ ٹرائب اور پسماندہ طبقات کی بہبود سے متعلق کارپوریشن کو بھی بندھوا مزدوروں کی شناخت اور رہائی کے کام کی ذمہ داریاں سونپ دینی چاہیئے۔ آندھرا پردیش میں ۱۹۸۵ کے آخر تک ۲۵ ہزار بندھوا مزدوروں کی شناخت کی جا چکی تھی۔ اس ریاست میں ۳ لاکھ ۲۵ ہزار بندھوا مزدوروں کے ہونے کا اندازہ ہے۔ بندھوا مزدوروں کی فوری بحالی عمل میں نہ آنے سے انھیں تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسی وجہ سے یہ خطرہ بنا رہتا ہے کہ رہا کرائے گئے بندھوا مزدور دوبارہ سے اسی لعنت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ رہا کرانے اور انھیں کام پر لگانے کا عمل ایک ساتھ آگے بڑھانا ضروری ہے، اچھی اراضی حاصل کرنا آسان نہیں، لہذا جو بھی اراضی دستیاب ہے اسی سے کام چلانا ہے، بندھوا مزدور اپنے دیہی پس منظر کے باعث زمین پر کھیتی اور مختلف کاموں کو ہی پسند کرتے ہیں۔

رضاکار اداروں کا رول

مختلف ریاستوں میں بندھوا مزدوروں کی رہائی کے سلسلے میں بہت سی پٹیشن سپریم کورٹ میں داخل کی گئی ہیں۔ بندھوا مزدوروں کی رہائی میں رضاکار ادارے اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ زیادہ تر مقدمات میں عدالتوں کی طرف سے بندھوا مزدوروں کی رہائی کے احکامات مل چکے ہیں۔ سرکاری اداروں کی کوششوں سے بندھوا مزدوروں کی شناخت کی جا سکی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً ۸۳ء۹ فیصد بندھوا مزدور سرکاری کوششوں سے ہی شناخت میں آ سکے ہیں۔ سماجی کارکنوں کی کوششوں سے صرف اعشاریہ ۳۸ فیصد مزدوروں کی شناخت ہو سکی ہے، تحقیقی کارکنوں کی کوششوں سے کچھ زیادہ یعنی ۳ء۰۰ فیصد بندھوا مزدوروں کی شناخت ہو سکی ہے، اس کام میں رضاکار ادارے اہم خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ اس کام کے لیے ہر ریاست کو مناسب ماحول اور فضا بنانی ہوگی۔ یہ بنیادی طور پر ریاستوں کی ہی ذمہ داری ہے۔ یہ کام ایک وقتِ مقررہ کے اندر انجام دیا جاتا ہے۔

اے کیمیا سازانِ وطن عزم کی لو پر
دینا ہے نئے دور کو اک رنگ ابھی اور

ڈاکٹر ایس ایم شاہ

بندھوا مزدوروں کی بحالی

کیا واقعی بحالی ہے؟

اس مضمون میں راجستھان کے ضلع کوٹہ میں بندھوا مزدوروں کی بحالی کا جائزہ لیا گیا ہے، فاضل مصنف کا خیال ہے کہ وہاں بندھوا مزدور اب بھی مصیبت میں ہیں۔ حالانکہ بندھوا مزدوری کے نظام کی تنسیخ کے لیے ۱۹۷۶ء میں ایکٹ بنایا گیا تھا لیکن یہ لعنت ابھی تک جاری ہے، جو مزدور اس لعنت سے نجات پا چکے ہیں، ان کی حالت بھی پہلے کے مقابلے بہت اچھی نہیں ہے تمام لیت ولعل اور تاخیر مصنف کے خیال میں بیوروکریسی، دفتری تانا شاہی اور گھس گھس کے سبب ہے۔ بندھوا مزدور رہا ہوئے ہیں، ان کی حالت بہتر بنانے پر دفتر شاہی نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ محکمات کو نسوں اور بندھوا مزدوروں کو نفع پہونچانے کی اسکیموں کے درمیان تال میل نہیں ہے۔ اس سے یہ خطرہ بھی سامنے آیا ہے کہ جو مزدور رہا ہوئے ہیں، وہ دوبارہ اس طرح کے شکنجے میں نہ پھنس جائیں۔

اب تک تین سو بندھوا مزدوروں کو رہا کر دیا گیا، یہ وہ لوگ ہیں جن کے جسم پر صرف لنگوٹی ہے، کوئی کرتا، قمیص ان کے جسم پر نہیں، صرف ایک چھوٹا سا رومال سر پر ڈالنے کے لیے ہے، ان کا جسم کالا رنگ لیے ہوئے ہے، قد لمبا ہے، تیزی سے قدم بڑھا کر چلتے ہیں، لیکن ننگے پیر ہیں، تیز آنکھیں، یہ لوگ ضلع کوٹہ کی تحصیل کشن گڑھ میں زندگی گزار رہے ہیں، یہ لوگ گاؤں کی چوپال میں جمع تھے۔ کچھ کھڑے تھے، کچھ بیٹھے تھے، کچھ سیڑھیوں پر تھے، کچھ چھتوں پر۔ اس طرح سے یہ وہ بہترین مقام تھا جہاں بندھوا مزدوروں کی زندگی پر ظلم کی شروعات ہوئی، اُن میں بے زمین مزدور اور غریب ترین افراد بھی شامل تھے۔

میں نے اس سلسلے میں بہت سی عملی تحقیقات کیں، میں نے بہت سے دیہات کا دورہ کیا، ان دیہات کے غریب ترین افراد سے بات چیت کی، ہالی لیبر انکوائری کمیٹی میں کام کرتے ہوئے مجھے بندھوا مزدوروں کے حالات جاننے کا سب سے پہلے موقع ملا۔ ہالیوں کو بعد میں گاندھی جی نے ہل پتی کہہ کر پکارا۔ اس طرح کے لوگ سورت اور بلسر کے اضلاع میں جو کہ گجرات میں واقع ہیں ملتے ہیں، ۱۹۵۳ء میں کام کے دوران میں نے بہت سے ہل پتیوں سے بات چیت کی، لیکن ضلع کوٹہ میں کشن گڑھ تحصیل کے بندھوا مزدوروں کی حالت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اسی طرح کے صحرائی بندھوا مزدوروں کو دیکھ کر مہاتما گاندھی کا دل اُن کے لیے بھر آیا ہوگا، اور شاید ایسے ہی لوگوں کو دیکھ کر انھوں نے کہا کہ "کیا میں اُن کی آنکھوں سے آنسو پونچھ سکتا ہوں"

افسوس کا مقام

ان لوگوں کو تن ڈھانکنے کے لیے دھوتی بھی میسر نہیں، جب میں بندھوا مزدوروں سے ملاقات کے بعد کھیت سے لوٹ رہا تھا، تو کوٹہ کا ایک سینیر ڈسٹرکٹ افسر میرے ساتھ تھا، اس نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ درخت کے نیچے سوتے ہیں، کیونکہ سردی میں ان کے آرام کے لیے اور کوئی محفوظ مقام نہیں ہے، سردی محسوس ہوتی ہے تو

کر دیں بدل بدل کر یہ تصحیح کرتے ہیں، ان کی جیب میں کوئی پیسہ نہیں ہوتا۔ یہاں غربت اتنی ہوتی ہے کہ یہاں کی عورت کو چار آنے حاصل کرنے کے لیے بھی اپنی عصمت تک کی بازی لگانی پڑتی ہے' بندھوا مکتی مہم نے شہروں میں بندھوا مزدوروں کو جو کہ پتھر کی کانوں میں کام کرتے تھے رہا کرایا، ہریانہ میں خاص کر بندھوا مزدوروں کی رہائی کے اقدامات ہوئے۔

میں نے کہا کہ وہ افسران کہاں ہیں جو کہ زیر درد نزاع کے محافظ ہیں، اور جو ان سے ہمدردی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اقتدار کے ڈھانچے کا مطالعہ کیا جانا چاہیے کوآپریٹو اداروں کی صورت میں رضاکارانہ ادارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن یہ صرف شہروں میں۔ دیہی علاقوں میں عام طور پر لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا "کوئی نہیں سنتا"۔

حکومت ہند نے بندھوا مزدوروں کے انسداد سے متعلق ایکٹ ۱۹۷۶ء میں پاس کیا۔ ۷۹-۱۹۷۸ء میں مرکزی سرکار کے زیر اہتمام ایک اسکیم شروع کی گئی جس کی رو سے بندھوا مزدوروں کی بحالی کے پروگرام شروع کیے جانے تھے، ہر ریاست میں اس مد پر آنے والے اخراجات کے نصف حصے کی ادائیگی مرکز کے ذمے رہی۔ ہر مزدور کی بحالی پر ۴ ہزار روپے صرف کیے جانے تھے لیکن بعد میں جائزہ لے کر اس رقم کو اور بڑھایا گیا۔ وزیر اعظم نے نئے بیس نکاتی پروگرام میں اس کام کو اور بھی زیادہ اہم بتایا۔ اس کا تعلق بندھوا مزدوروں کی اقتصادی بحالی سے ہے'۔

جائزہ

منصوبہ بندی کمیشن میں اس سلسلے کے پروگراموں پر عمل درآمد کے جائزے کی تنظیم نے فروری ۱۹۷۹ء میں ایک مطالعہ کیا یہ کام راجستھان میں کوٹہ سے شروع کیا گیا، یہ رپورٹ مارچ ۱۹۸۴ء میں شائع کی گئی، اس کی رپورٹ میں ان کاموں پر عمل درآمد کے لیے زور دیا گیا جو کہ بندھوا مزدوروں کی بحالی کے سلسلے میں ضروری بتائے گئے۔

اس مطالعے کے چند اہم مقاصد یہ تھے:۔

(الف) بندھوا مزدوروں کی شناخت، رہائی اور بحالی کی اسکیم پر مختلف سطحوں پر عمل درآمد کا جائزہ اور انتظامی اقدامات۔

(ب) مختلف اسکیموں کے تفصیلی مشمولات کا مطالعہ اور ان پر عمل درآمد کا جائزہ۔

(ج) بندھوا مزدوروں کی رہائی کے بعد ان کے روزگار اور آمدنی بڑھانے وغیرہ کے سلسلے میں چلائی گئی مختلف اسکیموں کے اثرات۔

(د) بندھوا مزدور دوبارہ اسی لعنت میں گرفتار نہ ہوں، اس سلسلے میں انتظامی امداد اور اس پہلو پر مسلسل نظر رکھنے کے اقدامات۔

(ھ) بندھوا مزدوروں کی اقتصادی حالت سدھارنے کے لیے کیے گئے اقدامات کے اثرات، اس کے نتیجے میں واقع ہونے والی سماجی تبدیلیوں کا اندازہ۔

(و) دیہی سماج کے اصل دھارے میں رہا شدہ بندھوا مزدوروں کا ادغام اور اس سلسلے میں کامیابیوں کا اندازہ منصوبہ بندی کمیشن کے جائزہ تنظیم نے دسمبر ۱۹۸۴ء میں تحقیقات سے متعلق عبوری رپورٹ پیش کی۔ اس نے اس پروگرام پر عمل درآمد میں بہت سی خامیوں کی نشاندہی کی، ۱۹۸۴ء جب اس کی حتمی رپورٹ موصول ہوئی، سرکار نے اس کی روشنی میں اس اسکیم کے رہنمایانہ خطوط میں تبدیلی کی اسے ریاستوں میں گشت کرایا گیا تاکہ اس کی روشنی میں عمل درآمد کو موثر بنایا جا سکے۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ فائدہ پہونچانے کے لیے منتخب ۸۴۷ افراد میں سے تقریباً ۴۰ فیصد نے یعنی کہ ۳۱۰ نے بحالیاتی اسکیموں سے فائدہ اٹھایا۔ امداد کی ادائیگی اور تقسیم طوالت طلب رہی، اور یہ یکساں نہ تھی، بندھوا مزدوروں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسکیم کے پسند کرنے میں ان کی اپنی مرضی کو کوئی دخل حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ اسکیم ان پر تھوپ دی جاتی ہے، بندھوا مزدوروں کی رہائی کے بعد ان کی بحالی تک کافی وقت لگتا ہے، اس بات کی بالعموم سبھی کو شکایت تھی، یہ بھی معلوم ہوا کہ اس طرح کی شکایت کرنے والے ۳۴۱ افراد میں سے، ۴، بندھوا مزدور تو وہ تھے جنھیں اس درمیانی عرصے میں زبردست جدوجہد کے بعد جسم و جان کا تعلق باقی رکھنا پڑا۔

اس تحقیقاتی مطالعے کا ایک حوصلہ افزا پہلو یہ تھا کہ بندھوا مزدوروں کی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے والوں میں ۸۳ فیصد شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب سے تعلق رکھتے تھے، ان اسکیموں سے صرف ۴ فیصد عورتوں نے فائدہ اٹھایا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بندھوا مزدوروں کی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے والوں میں ۲۴ فیصد ایسے نوجوان تھے جو ۱۵ سال سے بھی کم عمری سے بندھوا مزدوری کر رہے تھے، ۳۸ فیصد ایسے افراد ملے جو ۱۵ سال سے لے کر ۲۵ سال تک بندھوا بنائے گئے۔ ۱۹ فیصد ایسے تھے جو ۲۵ تا ۵۵ سال کے درمیان بندھوا مزدور بنے۔ جن لوگوں کو بندھوا مکتی اسکیموں سے فائدہ پہنچانے کے لیے چنا گیا، ان میں ۲۷ فیصد ایسے تھے جو ۵ سال تک یا ۵ سال سے زیادہ بندھوا مزدور رہے، ۲۵ فیصد ۲۰ سال تک بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے تک بندھوا مزدور رہے، بندھوا مزدوری بہار اور اتر پردیش میں بہت زمانے سے چلی آ رہی ہے، یہ دونوں وہ ریاستیں ہیں جہاں زمینداری نظام زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا تھا، ۹۰ فیصد بندھوا مزدور قرض کی ادائیگی نہ کرنے کے سبب اس لعنت میں گرفتار ہوئے۔ مذکورہ ۸۴۷ منتخب بندھوا مزدوروں میں سے ۳۱۰ نے بتایا کہ

ان کی بندھوا مزدوری کے لیے ایک کاغذ پر دستخط کرائے گئے تھے، لیکن اس کی کوئی نقل اُن کو نہیں دی گئی۔ باقی سب کام زبانی تھے۔

اس پروگرام پر عمل درآمد میں وجی لنس کمیٹی کا رول بے حد اہم اور ضروری ہے۔ کچھ اضلاع میں باضابطہ رجسٹر نہیں رکھے گئے، ریکارڈ میں غلط اندراجات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ کمیٹیاں اپنے اجلاس باقاعدہ نہیں کرتیں۔ کچھ ریاستوں میں بندھوا مزدوروں کی شناخت کا کام بہت جلدی میں کیا گیا، اس لیے سبھی مزدوروں کی نشاندہی نہیں کی جا سکی۔ بندھوا مزدوروں کی شناخت کے کام میں کوئی بھی رضاکارانہ تنظیم ساتھ نہ تھی، اس سے اس کام کے تئیں عدم توجہی کا احساس ہوتا ہے۔

۲۸۷ بندھوا مزدور ایسے تھے جنھیں رہا کیا گیا تھا اور اُنھوں نے خود بھی اس بات کی تصدیق کی تھی کہ فی الواقعی اب وہ بندھوا مزدور نہیں رہے، اُن میں سے ۲۳۹ بندھوا مزدوروں کی بحالی عمل میں آئی۔ سات ایسے تھے کہ ان کو جزوی طور پر رہائی مل سکی تھی اور ۳۶ ایسے تھے کہ ان کو مطلق رہائی نہ مل پائی تھی۔ بہار میں ۳۶ بندھوا مزدوروں نے یہ شکایت کی کہ ان کو رہائی کے اس پروگرام سے فائدہ نہیں پہنچا اور ان کو رہائی بالکل نہ مل سکی ہے، اور وہ پہلے ہی کی طرح سے بدستور کام کر رہے ہیں۔

مربوط اندازِ نظر کی کمی

رہا شدہ بندھوا مزدوروں کی بحالی کا عمل بہت سست رہا ہے۔ ۱۸ اضلاع کا مطالعہ کیا گیا۔ ان میں صرف ۹۴۹۳ بندھوا مزدوروں کو مختلف اسکیموں کے تحت فائدہ ملا۔ جبکہ ۲۲۴۵۸ بندھوا مزدوروں کو رہائی ملی تھی۔ اس طرح سے ابھی تقریباً آدھے بندھوا مزدوروں کی بحالی باقی ہے۔ جن بندھوا مزدوروں کو رہائی مل سکی ہے، ان کی حالت بہت خراب ہے۔ راجستھان کے کوٹا ضلع میں ..، بندھوا مزدوروں کو کافی فائدے پہنچائے گئے۔ بندھوا مزدوروں کی صنعتی کوآپریٹو سوسائٹی کے نام پر ہر بندھوا مزدور کو ۴ ہزار روپے فی کس کے حساب سے سینئر سرٹی فیکیٹ دے دیے گئے ہیں۔ اور ساری رقم اس طرح بنک میں جمع کر دی گئی ہے۔ ان کی بحالیاتی اسکیموں کو دیگر طرح کی مختلف اسکیموں سے مربوط کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ بحالیاتی اسکیموں کو کام کے بدلے خوراک یا دیہات کی مربوط ترقی کی اسکیموں سے جوڑنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

جن بندھوا مزدوروں کو بحالیاتی اسکیموں سے فائدہ پہنچانے کے لیے چُنا گیا، ان میں سے ۶۰ فیصد کو بسانے میں دو سال سے لے کر ۴ سال تک کی مدت لگی۔ ۲۸۷ منتخبہ بندھوا مزدوروں میں سے ۴۰ فیصد یعنی تقریباً ۱۳۱ بندھوا مزدوروں نے بحالیاتی اسکیموں سے فائدہ اُٹھایا۔ سرکار نے بسانے کے لیے ۴ ہزار روپے فی بندھوا مزدور کے حساب سے جو رقم دی، وہ کم رہی، مناسب طرح سے بسانے کے لیے فی آدمی دس ہزار روپے سے لے کر پندرہ ہزار روپے تک کی رقم کافی سمجھی گئی۔ جن ۲۸۷ بندھوا مزدوروں نے بسانے کی ان اسکیموں سے فائدہ اٹھایا، ان میں سے ۴۷ افراد ہی مختلف کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ممبر ہیں۔ ان کے علاوہ صرف ۴۶ فیصد افراد نے یہ خبر دی کہ وہ روزانہ کے اخراجات پورا کرنے کے لیے کافی رقم کما رہے ہیں۔ باقی ۵۴ فیصد نے آمدنی کم ہونے کی شکایت کی، یہ لوگ خرچ پورا کرنے کے لیے ساہوکاروں سے قرض لیتے ہیں جس سے یہ خطرہ برابر بنا ہوا ہے کہ یہ لوگ دوبارہ سے بندھوا مزدور نہ بن جائیں۔ اس طرح سے یہ چکر برابر بنا ہوا ہے۔

نتیجہ :-

آبرسانی، ترقیاتی سہولتوں، خواندگی وغیرہ سے بندھوا مزدوروں کے سسٹم کو کم کرنے میں کوئی مدد نہیں ملی، پیداواری وسیلے مثلاً نل کنوئیں اور دیگر اس طرح کے اثاثہ جات کی ملکیت بندھوا مزدوری کے طریقے کو بڑھانے میں برابر مددگار ثابت ہو رہی ہے، آندھرا پردیش جیسی بہت سی ریاستوں میں آبپاشی کے سسٹم کمزور ہیں، اس طرح کی بہت سی سہولتوں کے نہ ہونے سے بھی بندھوا مزدوروں کی تعداد بڑھنے میں مدد ملی ہے۔ یہ مسئلہ فوری توجہ چاہتا ہے تاکہ ملک میں سماجی تانے بانے کے ذریعے ترقی کے عمل کو اور تیزی سے آگے بڑھایا جا سکے۔

●

پبلیکیشنز ڈویژن کیلئے صلاح کار کمیٹی

حکومت نے پبلی کیشنز ڈویژن کو اس کے اشاعتی پروگرام سے متعلق امور میں مشورہ دینے کیلئے ایک سات رکنی کمیٹی تشکیل دی ہے۔

اس کمیٹی کے سربراہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی دلی کے اسکول آف سوشل سائنسز کے پروفیسر بپن چندرا ہوں گے اور پروفیسر وائی۔ ڈی۔ پھڈکے، شریمتی مہاسوتیا دیوی، شری وشنو پربھاکر، شری کرتار سنگھ دُگل، ڈاکٹر دستر تھی اس کمیٹی کے اراکین ہونگے اور ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن اسکے رکن کنوینر ہوں گے۔

پبلی کیشنز ڈویژن کے مقاصد سے ہم آہنگ اشاعتی موضوعات کا انتخاب، کتابوں کی زبان اور ان کے مصنفین و مترجمین کا انتخاب نیز ڈویژن کے رسائل کے معیار میں بہتری وغیرہ پر مشورہ دینا مذکورہ کمیٹی کے دائرہ کار میں شامل ہے۔

بھرت ڈوگرہ

بندھوا مزدور

خواب یا حقیقت!

مصنف کی رائے میں بندھوا مزدوروں کا پتھر کاٹنے کی جگہوں، بلند تعمیر کرنے کی جگہوں اور اینٹ بھٹوں وغیرہ پر پایا جانا عام ہے جہاں کہ شدید غربت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ایسی جگہوں پر کام کرنے کے ماحول میں تبدیلی لانے کی سخت ضرورت ہے۔ جب تک کہ غربت و افلاس دور نہیں کی جاتی، بندھوا مزدوری ختم نہیں ہو سکتی۔ مصنف کی رائے میں بڑے پیمانے پر زمینی اصلاح کا کام اور قحط زدہ علاقوں میں ماحولیاتی تبدیلی لانے کا کام ہی اصلاح کا واحد ذریعہ ہے۔

کچھ دنوں پہلے صوبہ بہار کے پلامو ضلع میں بندھوا مزدوروں سے متعلق ایک کانفرنس، جس کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی گئی تھی، کے منتظمین نے انتہائی ڈرامائی انداز میں متعدد بچوں کو حاضرین کے سامنے پیش کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ یہ بچے پلامو ضلع کے ہی ایک گاؤں سے اغوا کر کے ضلع مرزا پور، اتر پردیش میں قالین بنانے کے کام میں جھونک دیئے گئے تھے۔ دوسرے دن یہ خبر اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی جس کے بعد ہی ان بندھوا مزدوروں کی آباد کاری کے لیے بڑی بڑی اسکیموں کا اعلان ہوا۔

* کچھ ہی دنوں بعد جب راقم الحروف اس ضلع میں پہنچا تو اس نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ آیا بچوں کے اغوا کرنے یا انھیں زبردستی بندھوا مزدور بنا کر دوسری جگہوں پر بھیجنے کی وارداتیں ختم ہوئیں یا نہیں۔ میرے استفسار پر ایک مقامی سوشل ورکر میگھناتھ بھٹاچاریہ، جو کہ اس ضلع کے دبے ہوئے اور کمزور طبقے کے درمیان ایک عرصے سے کام کر رہے ہیں، نے بتایا کہ اخبارات میں اس انکشاف کے فوراً بعد ہی انھوں نے اس علاقے کا دورہ کیا تھا جہاں سے بچوں کو مبینہ طور پر اغوا کیا گیا تھا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے تھے کہ وہ شخص جس پر بچوں کے اغوا کا الزام تھا اطمینان سے اس گاؤں میں اور انھیں اغوا شدہ بچوں کے والدین کے درمیان رہ رہا تھا۔ اگر اغوا کی خبر واقعی صداقت پر مبنی ہوتی تو بچوں کے والدین نے اس شخص کو اتنی آسانی سے نہ بخشا ہوتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر حقیقت کیا ہے؟ مزید استفسار پر میگھناتھ نے بتایا کہ درحقیقت یہ بچے اپنے والدین کی مرضی سے بھیجے گئے تھے بلکہ آس پڑوس کے بچے بھی اسی طرح بھیجے گئے تھے۔ دراصل ان علاقوں میں غربت اور بیروزگاری اتنی شدید ہے کہ والدین کے لیے اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت ممکن نہیں۔

کانفرنس کے منتظمین نے اگر سادہ طور پر یہ کہا ہوتا کہ یہ بچے دور دراز علاقوں میں ملازمت کی غرض سے بھیجے جا رہے ہیں تو اشتہاری نقطۂ نظر سے یہ کوئی بڑی خبر نہیں بن سکتی تھی۔ اس طرح منتظمین ایک ریکیٹ کو ختم کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے اور وہاں صحافی بھی اپنے اپنے اخبار کیلئے سنسنی خیز مواد حاصل نہیں کر سکتے تھے اور ان سب سے بڑھ کر جو ڈھیر ساری رقم آباد کاری کے نام پر حاصل ہوئیں وہ بھی ناممکن ہوتیں۔

کام کے ماحول میں تبدیلی لانے کی ضرورت

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسی جگہوں پر خصوصی

توجہ دینے کی ضرورت ہے جہاں کام کرنے کا ماحول Working Condition انتہائی خراب اور غیر صحتمند ہے نیز جہاں تنخواہ بہت کم اور غیر یقینی ہے۔ چنانچہ اس بات کی ضرورت ہے کہ پتھر کاٹنے کی جگہوں، بند تعمیر کرنے کی جگہوں اور اینٹ بھٹوں پر کام کرنے والے بندھوا مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانے پر خصوصی توجہ دی جائے۔ لیکن بڑھ چڑھ کر کارگزاری دکھانے اور اشتہار بازی کی دھن میں بندھوا مزدوروں کی تشخیص بحیثیت آبادکاری سے متعلق بہت سارے غلط اعداد و شمار پیش کیے جاتے ہیں اور وہ بھی مسئلہ کو وسیع تر تناظر میں پرکھے اور اس استحصالی نظام کی تہہ میں جائے بغیر مذکورہ رویہ اپنا لیا جاتا ہے۔

نامساعد حالات

ذرا ایک ایسے علاقے کا تصور کرکے دیکھئے جہاں جنگلوں کے کٹاؤ، زمین کے کٹاؤ، غیر یقینی بارش اور دیگر وجوہ کی بنا پر انسان کی بقا خطرے میں ہو۔ مزید یہ کہ جہاں زیادہ تر وسائل جیسے زرعی زمینوں اور خاص کر سینچی ہوئی زمینوں پر تھوڑے سے لوگوں کا قبضہ ہو۔ اسی طرح دوسرے چھوٹے چھوٹے کام جیسے لکڑیوں کے کاروبار، جنگلوں کی چھوٹی موٹی پیداوار اور ہلکی پھلکی معدنیات کے کاروبار وغیرہ بھی کچھ اسی انداز میں منظم کیے گئے ہوں کہ ان کے فوائد بھی چند مخصوص افراد کو پہنچتے ہوں پھر مسلسل قحط کے زمانے میں ریلیف کا کام بھی غیر تشفی بخش ہو — ان حالات میں بندھوا مزدوروں کا وجود میں آنا عین فطری ہے۔

دراصل اس علاقے کے غریب لوگ اس کسمپرسی کے عالم میں ہیں کہ انھیں اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بھی مقامی بڑے کسانوں اور ٹھیکیداروں سے قرض لینے پڑتے ہیں — اور یہی ان کے استحصال کی وجہ بنتا ہے۔ قرض کے بوجھ تلے دبے یہ بدنصیب کسانوں اور ٹھیکیداروں کی من مانی شرائط پر کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اسی دباؤ میں دور دراز کے علاقوں میں جانا قبول کر لیتے ہیں۔ ایک بار جب یہ اپنے گھروں سے کہیں دور چلے جاتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے جاتے ہیں کہ اگلے کئی ماہ تک ان کے گھروں پر کھانے کا کوئی انتظام نہیں تو یہ کسی بھی قیمت پر کام کرنے پر رضامند ہو جاتے ہیں اور گوارہ کرتے رہتے ہیں۔

اصلاح احوال

لیکن ایسا ہرگز نہیں کہ صورت حال بالکل خراب ہے اور اس کی اصلاح ممکن ہی نہیں۔ غربت و افلاس کو دور کرنے کے طریقے موجود ہیں جیسے بڑے پیمانے پر زمینی اصلاحات کا کام کیا جا سکتا ہے اور قحط زدہ علاقوں میں ماحولیاتی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اسی طرح ہم مسائل کو حل کر سکتے ہیں اور یقیناً ہمیں ایسا کرنا بھی چاہیئے۔ لیکن جب ہم مسائل کو صحیح تناظر میں پرکھنے اور انہیں حل کرنے کی بجائے چند جگہوں پر چھاپے مار کر بندھوا مزدوروں کا نام دیگر چند لوگوں کے درمیان میل اور بھینس تقسیم کرتے ہیں اور پھر اس کی زبردست پبلسٹی کرتے ہیں تو آبادکاری کی یہ تمام کوششیں محدود طور پر درست ہونے کے باوجود، بندھوا مزدوری جیسی لعنت کا خاتمہ نہیں کہی جا سکتیں۔

آبادکاری کی ضرورت

راقم الحروف کو اتر پردیش کے باندہ ضلع میں بندھوا مزدوروں کی شناخت، آزادی اور آبادکاری کی کارروائی کو قریب سے دیکھنے کا ایک موقع ملا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فارم مزدوروں کے طور پر کام کرنے والے پچھڑی ذات کے تمام لوگوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے چاہے وہ سرکاری اصطلاح میں بندھوا مزدور ہوں یا نہیں۔ ایسے تمام خاندانوں تک فرداً فرداً پہنچنا اور مختلف سوالات پوچھ کر یہ اندازہ لگانا کہ آیا یہ سرکاری اصطلاح میں بندھوا مزدوروں کے زمرے میں آتے ہیں یا نہیں ایک بے نتیجہ عمل ثابت ہوتا ہے۔ اس سے وقت ضائع ہوتا ہے اور یہ طریقہ مہنگا ثابت ہوتا ہے۔

لکھنؤ سے آئے ہوئے ماہرین کے ذریعے ایسی ہی ایک کوشش کے بعد یہ دیکھا گیا کہ مانک پور کے ۳۳۶ خاندانوں میں سے ۲۳۱۶ خاندان بندھوا مزدور تھے۔ لیکن سروے پر کثیر رقم خرچ کرنے کے بعد یہ نتیجہ سیاسی سطح پر ناقابل قبول معلوم ہوا لہٰذا دروازے دروازے جا کر سروے کرنے کا دوسرا عمل شروع کیا گیا۔ اس بار صرف ۲۵۲ بندھوا مزدوروں کا پتہ لگایا جا سکا۔ جب یہ مقدمہ ایس ڈی ایم، کاروی، کو بھیجا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ ان میں سے صرف ۱۷۱ بندھوا مزدور تھے۔ چنانچہ انھیں خاندانوں کو آبادکاری اسکیم کے تحت مدد پہنچانے کیلئے منتخب کیا گیا۔

جب راقم الحروف نے تشفی بخش طور پر بسائے گئے چند مزدوروں سے گفتگو کی تو اسے یہ شکایت سننے میں آئی کہ انھیں جو جانور دیئے گئے وہ کمزور تھے اور جو اس علاقے کی آب و ہوا کے لیے ناموزوں تھے چنانچہ یہ جلد ہی ختم ہو گئے۔

اب تک کئی لاکھ روپے بندھوا مزدوروں کی آبادکاری پر خرچ کیے جا چکے ہیں۔ اس میں اگر وہ خرچ بھی جوڑا جائے جو دو سروے کرنے پر ہوئے اور اس رقم اور وقت کا تخمینہ بھی لگایا جائے جو پروجیکٹ اسٹاف اور عدالتی کارروائی پر صرف ہوئی تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ بہت زیادہ خرچ کرکے بہت کم حاصل کیا جا سکا ہے۔ اگر دوسرے سروے کا نتیجہ پہلے سے مختلف نکلا تھا جس میں بندھوا مزدوروں کی تعداد بہت زیادہ بتائی گئی تھی تو کم سے کم اتنا تو کیا ہی جا سکتا تھا کہ پہلے سروے کے ریسرچ اسٹاف کو بھی پروجیکٹ آفس میں بلایا جاتا اور ان سے بندھوا مزدوروں کی شناخت پر رائے لی جاتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔

ان مثالوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بندھوا مزدوروں کی آبادکاری کے کام کا زیادہ تعلق مختلف کارروائیوں اور نوکر شاہی کے طریقے کے پورا کرنے سے ہے۔ ایسا نہیں کہ بندھوا مزدوروں سے ضروری سوالات پوچھنے کے بعد ان کو استحصالی نظام سے نجات دلانے کی کوشش کی جائے اور اس نظام کی جڑوں کا پتہ چلانے کے لیے سچی لگن سے کام کیا جائے۔ ●

ایم۔ یونس صدیقی

بندھوا مزدوروں کی بحالی

بیس نکاتی پروگرام کی پیش رفت

۱۹۷۶ء میں ملک میں ایک قانون پاس ہوا، اس کا نام ہے: بندھوا مزدوری کے نظام کی منسوخی کا قانون Bonded Labour System (Abolition) Act, 1976

اس قانون کے بن جانے کے بعد سے ۲۱۴۸۴۲ بندھوا مزدوروں کی شناخت کی گئی اور ملک بھر میں ان کا پتہ لگا کر ان کو آزاد کرایا گیا۔ ان میں سے ۱۷۵۶۰۳ بندھوا مزدوروں کو دسمبر ۱۹۸۶ء تک کام پر لگایا جا چکا ہے۔ حکومتِ ہند نے ریاستوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے پوری کوششیں کریں۔ اور اُن بندھوا مزدوروں کو پھر سے بسانے کے لیے کام کریں جنھیں اب تک کسی طرح کا کام نہیں مل سکا ہے۔ ۱۹۸۶ء میں جو نیا بیس نکاتی پروگرام شروع کیا گیا، اس میں اس کام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جن بندھوا مزدوروں کی شناخت کی جا چکی ہے، اُن کی ریاست وار تفصیل کالم ۲، ۳ میں دیکھیے۔

دسمبر ۱۹۸۶ء تک جن بندھوا مزدوروں کو پھر سے بسایا گیا ان کی تعداد جیسا کہ آگے دی گئی ہے ۷۵۶۰۳ ہے۔ ان میں سے آندھرا پردیش میں ۲۱۰۹۵ مزدور، بہار میں ۱۱۴۸۹ مزدور، کرناٹک میں ۴۸۳۳۴ مزدور، مدھیہ پردیش میں ۴۱۰۹ مزدور، مہاراشٹر میں ۲۹۲ مزدور، اڑیسہ میں ۴۳۵۱۹ مزدور، راجستھان میں ۶۶۳۴ مزدور، تمل ناڈو میں ۳۳۱۸۰ مزدور، اترپردیش میں ۱۹۴۴۴ مزدور، ہریانہ میں ۲۹۵ مزدور، گجرات میں ۶۰ مزدور، اور کیرالہ میں ۸۲۳ مزدور بسائے گئے۔

دسمبر ۱۹۸۶ء تک جن مزدوروں کا پتہ لگایا گیا اور پھر انھیں آزاد کرایا گیا

ریاست کا نام	بندھوا مزدوروں کی تعداد	ریاست کا نام	بندھوا مزدوروں کی تعداد
آندھرا پردیش	۲۴۷۸۸	راجستھان	۸۸۹۷
بہار	۱۱۰۲۹	تمل ناڈو	۳۳۱۸۰
کرناٹک	۴۲۶۸۹	اترپردیش	۲۲۹۱۷
مدھیہ پردیش	۵۶۲۷	ہریانہ	۲۹۵
مہاراشٹر	۹۰۴	گجرات	۶۲
اڑیسہ	۴۴۹۳۱	کیرالہ	۸۲۳

۸۷-۱۹۸۶ء کے مرکزی حکومت کے مصارف

مرکز کے زیر اہتمام بندھوا مزدوروں کی بحالی کے لیے جو اسکیمیں چلائی گئیں، ان کے لیے ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۵ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی۔ اس رقم سے بحالی? مختلف بحالیاتی کام کیے جا رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے

۱۹،۲۸ مزدوروں کی بحالی ممکن ہو سکے گی۔ اس کے مقابلے ریاستی سرکاروں نے دسمبر ۱۹۸۶ء تک ۱۵۳۳۴ بندھوا مزدوروں کو پھر سے بسانے کی اطلاع دی ہے۔ اس طرح مقررہ نشانے کا ۸۰ فیصد کام مکمل کیا جا سکا ہے۔

کام کو آگے بڑھانے کا سلسلہ

بندھوا مزدوروں کو آزاد کرانے کے بعد ان کو ایسی اسکیموں سے فائدہ پہونچانے کی کوشش کی جاتی ہے جو غریبی دور کرنے کے لیے ملک میں چل رہی ہیں۔ ۱۹۸۶ء کے نئے بیس نکاتی پروگرام میں نکتہ ۶ بندھوا مزدوروں کی بحالی سے ہی متعلق ہے، اس سلسلے میں حکومت ہند نے اگست ۱۹۸۷ء میں ریاستوں کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل (لیبر ویلفیئر) کو ہدایت جاری کی ہیں کہ وہ اس کام کو آگے بڑھائیں۔ امور محنت کی مرکزی وزارت اس کام کی رفتار ترقی پر نظر رکھے ہوئے ہے، وہ بندھوا مزدوروں کی نشاندہی، ان کی رہائی اور بحالی کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے مسلسل اس کا جائزہ لے رہی ہے، اس وزارت کے اعلیٰ افسران مختلف ریاستوں میں اس پروگرام کی رفتار ترقی پر نظر رکھ رہے ہیں۔ اس طرح کے مطالعے مرکزی وزارت امور محنت کے ڈائرکٹر جنرل (لیبر ویلفیئر) نے کرناٹک اور تمل ناڈو میں ۸۷-۱۹۸۶ء میں کرائے تاکہ ان کی روشنی میں یہ کام مؤثر ڈھنگ سے آگے بڑھ سکے۔

مقاصد:-

نئے بیس نکاتی پروگرام میں نہ صرف بندھوا مزدوروں کی بحالی عمل میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے بلکہ اس سلسلے میں پاس کئے گئے قانون پر مؤثر عمل درآمد کے لیے بھی کام ہو رہا ہے۔ اس قانون پر عمل درآمد کے چند اہم حصے یہ ہیں:-

۱۔ بندھوا مزدوروں کی شناخت، نشاندہی اور ان کا پتہ چلانا۔

۲۔ ان کی رہائی۔

۳ بندھوا مزدوری نظام کو چلانے والوں کے خلاف کارروائی۔

۴۔ وجی لنس کمیٹیوں کی وقتاً فوقتاً میٹنگ جو ضلع اور تحصیل کی سطح پر منعقد کی جائینگی۔

۵۔ ایگزیکٹو مجسٹریٹوں کو ڈسٹرکٹ جوڈیشیل مجسٹریٹوں کے اختیارات سونپنا۔

۶۔ مجوزہ رجسٹروں میں اندراجات مکمل رکھنا۔

۷۔ غریبی دور کرنے کی اسکیموں سے بندھوا مزدوروں کو فائدہ پہونچانا۔ ●

بقیہ، بندھوا مزدوروں کا پتہ چلانا، ایک مشکل کام

کیوں کہ وہ آجر سے کچھ نہ کچھ رقم بطور قرض یا پیشگی لے لیتا ہے، یا کسی اور شکل سے مالی منافع حاصل کر لیتا ہے، اس کی عدم ادائیگی کے سبب وہ مذکورہ حالت میں کام کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے اور آزادی سے اپنی من پسند جگہ کام کرنے کے لیے ادھر سے ادھر جانے کے اپنے حق کو استعمال نہیں کر پاتا۔ لہذا بیگار کی صورت میں عدالت کے سامنے یہ بات مفروضے کے طور پر آتی ہے کہ اپنی رقم چکانے کے لیے یا حاصل کئے فائدوں کے عوض وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ اس مفروضے کو آجر یا ریاستی سرکار باطل قرار دے سکتی ہے۔ اگر وہ ایسا چاہے، لیکن جب تک اس مفروضے کے ابطال کے لیے کافی مواد موجود نہ ہو، اس وقت تک عدالت اس بنیاد پر آگے بڑھ سکتی ہے، یہ مزدور بندھوا مزدور ہے اور اسے بندھوا مزدوری کے انسداد کے قانون کا فائدہ ملنا ضروری ہے۔

اب قانون تو واضح صورت میں سامنے آچکا ہے لیکن پھر بھی اس کے متعلق شبہات ہیں جن کا کھل کر اظہار نہیں کیا جاتا، کچھ کام ایسے ہیں جنکو سرکاری نظام کو پورے طور پر نہیں سونپا جا سکتا۔ چنانچہ ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں ۱۹۸۶ء کے بیس نکاتی پروگرام میں رضا کار اداروں کی شمولیت اور اس کو آگے بڑھانے میں ان کے تعاون کی ضرورت پوری طرح محسوس کی گئی ہے۔ ●

بقیہ، اُردو شاعری کی ہندی اصناف

ان رشتوں کو پھر تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "امیر خسرو کے ہندوی کلام" پر اپنا مربوط مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ خسرو کے یہاں تین طرح کے ہندوی کلام پائے جاتے ہیں اور سبھوں کی اہمیت مسلم ہے البتہ استناد میں فرق ضرور ہے۔ انھوں نے خسرو کی پہیلیوں کے ایک نو دریافت مخطوطے کی اطلاع بھی دی جو حال ہی میں انھوں نے مغربی یوروپ میں دریافت کیا ہے اس میں کئی پہیلیاں وہی ہیں جن کا ذکر اسپرنگر نے کیا ہے۔

سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ڈی، پی، پٹنائک نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے اُردو اور ہندی کے رشتوں کے کئی اہم گوشوں پر روشنی ڈالی۔ صدر جلسہ پروفیسر نامور سنگھ نے اپنی عالمانہ صدارتی تقریر میں گنگا جمنی تہذیب کی ان بنیادوں کی تلاش پر زور دیا جس سے مشترکہ کلچر پھر سے وجود میں آسکے اور قومی اتحاد و سالمیت کی فضا کو مزید سازگار بنایا جا سکے۔ انھوں نے اس سلسلے میں اس سیمنار کو بہت اہم قرار دیا۔ ●

بندھوا مزدوروں سے متعلق

سپریم کورٹ کا فیصلہ

بھارت کے سپریم کورٹ نے بندھوا مزدوروں کے سلسلے میں بھی فیصلہ دیا ہے، اس سلسلے میں انفرادی طور پر اور سماجی تنظیموں کی طرف سے ملک کی اس اعلیٰ ترین عدالت میں رٹ پٹیشنیں داخل کی گئیں۔ اس سلسلے میں غریبوں کے کاز کے لیے کام کرنے والی تنظیموں اور افراد نے اس عدالت کے ذریعے ان کے حق میں آواز اٹھائی۔ سپریم کورٹ نے ہر معاملے کی اچھائی اور برائی کو سامنے رکھ کر ایسے فیصلے دیئے جو ملک کی تاریخ میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان فیصلوں کے ذریعے سے ریاستی سرکاروں کو بندھوا مزدوری کی تنسیخ کے قانون کو نافذ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے سابق چیف جسٹس، شری جسٹس پی۔ این۔ بھگوتی کی اجازت سے اُن کے دئے فیصلوں کے چند اقتباسات دئے جا رہے ہیں۔ جن کا تعلق بندھوا مزدوروں کے مسئلے سے ہے۔

بندھوا مکتی مورچہ کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے اقتباسات

بندھوا مزدوروں کا رواج حصولِ آزادی سے پہلے سے ہی عرصۂ دراز سے ملک کے مختلف حصوں میں چلا آرہا ہے۔ یہ ہماری قومی زندگی کا ایک بھدا اور شرمناک رواج ہے۔ یہ سماج میں چند اقتصادی طور پر مضبوط اور سماجی طور پر برتر افراد کے ہاتھوں استحصال کا طریقہ ہے۔ جس کے ذریعے بڑی تعداد میں لوگ مصیبت اٹھاتے ہیں۔ بندھوا مزدوروں کا طریقہ زمینداری سسٹم کی دین ہے، یہ لوگ دکھاوے کے طور پر پاک باطن اور نیک ہونے کا دم بھرتے ہیں لیکن عوام کی بڑی تعداد کو جن کا تعلق سماج کے نچلے طبقے سے ہے، اور جو سماج میں اقتصادی طور پر کمزور رہے گند اور اشیائے منقولہ سمجھتے ہیں۔ اس نظام کے تحت ایک آدمی کو بیگار دینے کے لیے رکھ لیا جاتا ہے، یہ سلسلہ برسوں چلتا ہے۔ بیشتر طور پر یہ کام اُس قرض کے عوض لیا جاتا ہے، جس کا چکانا ضروری ہوتا ہے۔ مگر جس کی واپسی زندگی میں کبھی بھی پوری نہیں ہوتی۔ یہ طریقہ نئے مبنی بر انصاف سماجی و اقتصادی نظام سے میل نہیں کھاتا، جس کے قیام کے لیے ہم پابند ہیں، یہ انسان کے بنیادی وقار کے منافی ہے اور آئینی اقدار کی صریحاً خلاف ورزی ہے، بندھوا مزدوروں کی زندگی گزارنے کا طریقہ انتہائی گھناؤنا ہے، وہ بطور انسان نہیں بلکہ رعایا کے طور پر زندگی گزارتے ہیں۔ کسی شاعر کے درج ذیل الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ

ہندوستان کی اس آبادی کے بارے میں کہے گئے ہیں، جو کہ توجہ سے محروم ہے اور سماج میں جس کی حالت قابلِ رحم ہے۔

صدیوں کے بوجھ سے جھک گیا ہے
ایسی حالت میں وہ اپنے پھاوڑے
کا سہارا لیتا ہے اور اس پر جھک کر
زمین کو تکتا ہے۔ اس کے چہرے
سے صدیوں کا خلا پن ظاہر ہے اور
اس کی کمر پر دُنیا کا بوجھ ہے۔

ان کا عدم اور وجود برابر ہے۔ وہ تہذیب سے خارج سمجھے جاتے ہیں، جانوروں سے بدتر زندگی گزارتے ہیں، جانور کم سے کم ایک جگہ سے دوسری جگہ تک آنے جانے میں تو آزاد ہیں۔ جب کبھی یہ جانور بھوکے ہوتے ہیں تو جہاں جی چاہے منھ مار سکتے ہیں لیکن بندھوا مزدور تو سماج کے دائرے سے یکسر خارج سمجھے جاتے ہیں، ان کو کسی طرح کی آزادی بھی میسّر نہیں۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے زندگی گزارتے ہیں یا پھر چھپّر یا جھونپڑے میں دن کاٹتے ہیں۔ انھیں جو کچھ بھی کھانا میسّر آتا ہے، اس پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ حالانکہ اس سے ان کے پیٹ کی آگ پوری طرح نہیں بجھتی۔ غریبی اور بھوک کے ہاتھوں پریشان ہو کر وہ بندھوا مزدوروں کی طرف گھسٹ آتے ہیں اور ایک ایسے تاریک اور بے تلی والے گڑھے میں گر جاتے ہیں جہاں سے انھیں نکلنے کی اُمید نہیں ہوتی، خاص کر ایک ظالم استحصالی سماج میں۔ یہ رواج بہت سی ریاستوں میں اُس وقت تھا جبکہ مُلک آزاد ہوا۔ آزادی کے بعد ملک میں عوامی زندگی کو اس طرح سے داغدار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

چنانچہ ملک کے آئین میں آرٹیکل ۲۳ میں انسانوں کی تجارت اور لین دین اور ان کے تبادلے کو نیز بندھوا مزدوری کو خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو ممنوع قرار دیا گیا۔ یہ بات ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو کہی گئی تھی۔ اس کے بعد اتنا کچھ وقت گزر جانے کے بعد بھی اس آرٹیکل کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جا سکی ۱۹۷۶ء میں پارلیمنٹ نے اس سلسلے میں قانون بنایا جس سے سماج کے کمزور طبقوں کا اقتصادی اور جسمانی استحصال نہ ہو سکے۔ بدقسمتی سے بعد کی رپورٹوں سے بندھوا مزدوروں کے استحصال کی خبریں ملتی رہیں۔ اس سلسلے میں دیہی ترقی کے انتظامیہ کے مرکز، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈ منسٹریشن نے (وزارت امورِ محنت) مونگیر میں بندھوا مزدوروں کی حالت کا جائزہ۔ اُتر پردیش میں ٹہری گڑھوال میں بحالیاتی اسکیم، قابلِ مطالعہ ہے، اس کے ساتھ ہی کچھ اور تجزیاتی مطالعے اس شعبے میں بیان کئے جا سکتے ہیں۔

مثلاً محنت کش طبقے کی بہبود کے ڈائرکٹر جنرل شری لکشمن دھر مشرا کی رپورٹ۔ یہ رپورٹ بندھوا مزدوروں کی نشاندہی کے دَوران کئے گئے مطالعوں پر مبنی ہے، یہ محنت کش بندھوا مزدور اتر پردیش، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، کرناٹک، اُڑیسہ، بہار، راجستھان، تمل ناڈو، کیرالہ میں رہا کرائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ۷ فروری سے ۹ فروری ۱۹۸۳ء تک بندھوا مزدوروں کی نشاندہی اور بحالی کے موضوع پر منعقدہ قومی سیمینار کی رپورٹ بھی مذکورہ حقائق کی گواہ ہے، اکثر مقامات پر اس میں کہا گیا ہے کہ بندھوا مزدوری کی یہ نقصان دہ صورت قومی منظر نامے سے یکسر دور نہیں کی جا سکی ہے اور اس سے ملک کے سماجی اور اقتصادی صورتِ حالات کا چہرہ بگڑ رہا ہے۔

ملک کے بہت سے حصوں میں ابھی تک بہت سے بندھوا مزدور ہیں۔ بندھوا مزدوروں سے متعلق مذکورہ سیمینار میں کہا گیا کہ ان میں سے زیادہ تر شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب ہیں یا پھر وہ زرعی مزدور ہیں۔

اس بات کے کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہو سکتی کہ آئینی طور پر یہ ممنوع ہے، بندھوا مزدوروں کی شناخت اور رہائی ضروری ہے تاکہ مہذب انسانی سماج کے اصل دھارے میں خود کو شریک کر سکیں، اور انسانی وجود کے وقار، خوب صورتی اور قیمت کو پہچان سکیں، یہ دراصل ایک ایسا عمل ہے کہ غیر انسان سے انسان بنانے سے تعلق رکھتا ہے، رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی نظم بعنوان 'کڑوی اور کومل' میں اس کا نقشہ کھینچا ہے :-

اِن اُجڑے، دکھی، گونگے لوگوں کے
منھ میں ہمیں دینی ہو گی زباں
اِن کے ویران، سنسان، بنجر سینوں میں
پھر سے اُگانی ہیں، اُمید کی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں
ان سے کہنا پڑے گا ہمیں اونچی آواز میں
اپنے بوجھل خمیدہ سروں کو اُٹھا کر
ذرا ایک پل کے لیے ایک ہو کر تو دیکھو

شناخت، تبدیلی اور کایا پلٹ کے اس عمل کے دَوران خطرات ہیں۔ کیوں کہ جس طرح کے سماجی اور اقتصادی سماجی تانے بانے میں پنپتا ہے، وہ اس کے مخالف ہے اور اس میں پلائے جانے والے عناصر اُس فضا سے ہم آہنگ نہیں ہیں جس میں یہ مسئلہ حل کیا جانا ہے تاکہ غلامی اور پابندی کے ماحول میں زندگی گزارنے والوں کو آزادی سے حاصل ہونے والے پھل سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا جا سکے اور آزادی کی برکتوں سے اُن کو بھی فائدہ پہنچایا جا سکے، یہ مسئلہ مرکزی سرکار اور ریاستی سرکار کی فوری توجہ کا مستحق ہے، ریاستی پالیسی کے رہنمایانہ اصولوں میں مرکز اور ریاستی سرکاروں سے کہا گیا ہے کہ وہ ان محروم اور معذور افراد کے لیے سماجی انصاف کو یقینی بنائیں، اس لیے اس غیر انسانی فعل سے نظریں بچانا صحیح نہ ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ بہت سی ریاستوں میں انتظامیہ ان کے وجود کا انکاری ہے، حالانکہ یہ ان کے علاقے میں رہتے ہیں۔ اور ان کے وجود کے سلسلے میں ناقابلِ تردید

تحت موجودگی۔ انتظامیہ آئین کے وجود کو تسلیم کرنے میں شرم محسوس کرتا ہے، کیونکہ بندھوا مزدوروں کی موجودگی، انتظامیہ کے لیے داغ نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت کہ انتظامیہ اس کو دور کرنے میں ناکام رہا ہے، اس پر ایک دھبہ ہے، انتظامیہ اپنے عزم، تحریک، سماجی ذمہ داری کے احساس سے اس بدنما غیر انسانی رواج کو بند کرا سکتا ہے، اور ان کو رہا کرانے کے بعد ان کی بحالی کے سامان کرا سکتا ہے۔ آندھرا پردیش کے ضلع رنگا ریڈی میں حال ہی میں اس عدالت کی رٹ پٹیشن نمبر ۴۔ ۱۵۷ (۱۹۸۲ء) اور ۵۴ (۱۹۸۳ء) کے نتیجے میں جو کچھ ہوا، اس سے یہ واضح ہے کہ اگر سیاسی اور انتظامی نقشِ آئینی اقدار کے تئیں احساسِ ذمہ داری رکھتا ہے، اور وہ بندھوا مزدوروں کو چھڑانے، اور ان کو پھر سے آباد کرنے کے کام کو ذمہ داری اور سچائی سے انجام دینا چاہتا ہے تو اس سلسلے میں بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔

ضلع رنگا ریڈی کے انتظامیہ نے چھ ماہ سے بھی کم عرصہ میں تین ہزار بندھوا مزدوروں کو رہا کرایا۔ یہ بندھوا مزدور چونے کی کانوں میں کام کرتے تھے اور ٹھیکیداروں کے چنگل میں تھے، ان کو واپسی کے لیے ٹکٹ اور جیب خرچ دیا گیا۔ لہٰذا ریاستوں کو اس سلسلے میں ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اس برائی کو دور کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ عمل جذبۂ انسانی کے تقاضے کے تحت انجام پا سکے گا اور ایک آئینی ذمہ داری کو پورا کیا جا سکے گا اور ملک میں شراکت والی جمہوریت کی بنیادوں کو مضبوط کیا جا سکے گا۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ اگر کوئی شہری عدالت کے سامنے یہ معاملہ لاتا ہے کہ کسی جگہ پر بہت سے بندھوا مزدور ہیں، یا ٹھیکیدار اور پٹہ دار ان کا استحصال کر رہے ہیں اور ان کو سماجی بہبود کے قوانین سے محروم کیا جا رہا ہے، تو ریاستی سرکار کو چاہیئے کہ آئینی طور پر نئے سماجی اور اقتصادی نظام کے قیام کی ذمہ دار ہے، اور جو ایک ایسے نظام کو لاگو کرنے کی پابند ہے جہاں ہر ایک کو سماجی اور اقتصادی انصاف یقینی طور پر ملے، عدالتی جانچ کرانی چاہیئے۔ تاکہ اگر کسی بھی صورت میں استحصال کا امکان ہو تو اس کا سدِباب کیا جا سکے تو بھلے ہی ایسے لوگ بندھوا مزدوری نظام کی تنسیخ سے متعلق ایکٹ ۱۹۷۶ء کے تحت نہ آتے ہوں لیکن ان کا استحصال کسی اور شکل میں ہو جس سے کہ وہ محرومی اور ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں تو اس کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ اگر ریاستی سرکار اپنی تحقیق سے اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ محنت کش طبقہ بندھوا مزدور نہیں ہے، اور ان سے بیگار نہیں لی جاتی، اور وہ جملہ بنیادی سہولتوں کے ساتھ اچھے حالات میں کام کر رہے ہیں، تو بھی ریاستی سرکار کو کسی شہری کی شکایت پر اس سلسلے کی تفتیش میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیئے بلکہ ملک کے عوام کو اس تحقیقات کے ذریعے یہ باور کرانا چاہیئے کہ وہ اپنی آئینی ذمہ داریاں مناسب ڈھنگ سے انجام دے رہا ہے اور محنت کش طبقے کو سماجی اور اقتصادی انصاف مل رہا ہے، ہم نے اس بات کو بار بار کہا ہے کہ عوامی مفاد کے مقدمے مخالفت کی مقدمہ بازی کی صورت میں نہیں ہونے چاہئیں بلکہ یہ سرکار کے لیے ایک چیلنج اور موقع فراہم کرتے ہیں تاکہ اس کے افسران بنیادی انسانی حقوق کو با معنی بنا دیں اور سماج کے محروم اور کمزور طبقوں کے لیے سماجی اور اقتصادی انصاف یقینی بنا دیا جائے جو کہ آئین کا بنیادی مقصد ہے۔ سرکار اور اس کے افسران کو عوامی مفاد کے مقدموں کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ اس کے ذریعے اس بات کو جانچنے کا موقع مل سکتا ہے کہ کیا غریب اور کچلے نیز پسماندہ طبقے اپنے سماجی اور اقتصادی استحقاق سے مستفید ہو رہے ہیں یا نہیں۔ کیا سماج کے مضبوط اور با اثر لوگوں کے ہاتھوں ان کا استحصال تو نہیں ہو رہا ہے۔ کیا یہ سب خواب و خیال تو نہیں ہے۔ اگر اس طرح کی کوئی شکایت صحیح معلوم ہو، تو آئینی ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ اسے دور کیا جائے اور اس استحصال کی بیخ کنی کی جائے۔ اور سماج کے کمزور طبقات کو ان کے حقوق دلائے جائیں۔ عدالت صرف آئینی ذمہ داری اور مقاصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہو رہی ہے۔

" اگر کسی کارکن کی طرف سے یہ شکایت آتی ہے کہ وہ بندھوا مزدوری میں ہے، اس کے کام کرنے کے حالات اور مواقع تکلیف دہ ہیں، اس کو مناسب پناہ نہیں ملتی، اس کے سر پر چھت نہیں ہے، اس کو دھوپ اور بارش سے بچاؤ نہیں ہے، اسے دو وقت پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا، اسے کسی نالے کا گندا پانی پینا پڑتا ہے، تو اس کی درخواست یہ کہہ کر کیسے مسترد کی جا سکتی ہے کہ وہ بنیادی حقوق کے منافی نہیں ہے اور اس سے اس کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی نہیں ہوتی ہے۔ ملک میں ہر شخص کا یہ بنیادی حق ہے، جیسا کہ اس عدالت نے فرانسس ملن کے مقدمے میں آرٹیکل ۲۱ کی وضاحت کی ہے، کہ وہ آرٹیکل ۲۱ میں شامل انسانی وقار کے ساتھ زندگی گزارے، ریاستی پالیسی کے رہنمایانہ اصولوں سے آرٹیکل ۲۱ کی روح کو اور تقویت ملتی ہے، آرٹیکل ۳۹ کے کلاز (ای) اور (ایف) نیز آرٹیکل ۴۱، اور ۴۲ وغیرہ سامنے رکھ کر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کارکنوں کی صحت اور طاقت کا تحفظ ضروری ہے، خواہ وہ مرد ہوں یا عورت اور خواہ بچے ـــــ بچوں کی نشو و نما کے لیے صحت مند ماحول ہونا ضروری ہے تاکہ باوقار طریقے پر آزادی کے ساتھ ان کی نشو و نما ہو سکے اور ان کو مناسب تعلیمی سہولتیں دی جا سکیں۔ زچہ بچہ کے لیے آرام اور مناسب حالات کار ہونے چاہئیں۔ یہ وہ بنیادی اور کم سے کم ضرورتیں

ہیں جن کا ملنا ضروری ہے تاکہ انسان باوقار طریقے پر زندگی گزار سکے۔ مرکز یا ریاستی سرکار کو یہ حق نہیں کہ کوئی ایسا قدم اٹھائے جس سے انسان ان بنیادی سہولتوں سے محروم ہو جائے۔

آرٹیکل ۳۹ کی کلاز (ای) اور (ایف)، آرٹیکل ۴۱ اور ۴۲ کو عدالت کے ذریعے نافذ نہیں کرایا جاسکتا۔ یہ ہدایتی اور رہنمایانہ اصولوں کی صف میں آتے ہیں۔ لیکن جہاں ریاست نے پہلے ہی اس سلسلے میں قانون بنایا ہو اور قانون کی رُو سے محنت کشوں کو یہ بنیادی سہولتیں دی گئی ہوں اور باوقار طریقے پر زندگی گزارنے کے ان کے حق کو تسلیم کیا ہو تو اس کی نگرانی ریاست کرسکتی ہے۔ اس پر عملدرآمد کراسکتی ہے۔ اس پر عمل درآمد کی کوتاہی ان حقوق کو دینے سے انکار سمجھا جائے گا جو انسانی وقار کے لیے ضروری ہیں۔ اور جن کو آرٹیکل ۲۱ میں واضح کیا گیا ہے۔ خاص کر آرٹیکل ۲۵۶ کے حوالے سے جنھیں بیان کیا گیا ہے۔ جس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر ریاست میں انتظامی اختیارات کا استعمال اس طرح سے کیا جائے گا جو پارلیمنٹ کے وضع کردہ قوانین سے ہم آہنگ ہو اور جو اس ریاست کے بنائے ہوئے قانون سے میل کھاتا ہو۔

نیرج چودھری بنام ریاست مدھیہ پردیش

یہ ایک اور مقدمہ ہے جس میں اس امر کو زور دے کر بیان کیا گیا ہے جیسے ہم پہلے بھی کئی موقعوں پر کہہ چکے ہیں کہ بندھوا مزدوروں کی نشاندہی کرنا اور اُنھیں آزادی دلانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ امر شاید مساوی طور پر زیادہ اہم ہے کہ نشاندہی اور آزادی کے بعد اُن کی بحالی ضروری ہے کیونکہ اگر اُنھیں بحال نہیں کیا گیا تو وہ افلاس، بے چارگی اور مایوسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک بار پھر غلامی کے گڑھے میں جا گریں گے۔ اس ملک میں دیہات میں رہنے والے بدقسمت اور بدبخت عوام کی بھاری تعداد کے لیے افلاس اور ناداری زندگی کا تقریباً مستقل جزو بنے ہوئے ہیں اور اسے محض بے رحمی اور سنگدلی ہی تصور کیا جائے گا اگر بندھوا مزدوروں کی نشاندہی کرکے اور آزادی دلاکر اُنھیں موجودہ سماجی اور اقتصادی نظام کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے جس نے اُنھیں روٹی، کپڑا اور مکان جیسی بنیادی ضروریات سے ہی محروم کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ افلاس ایک ایسی لعنت ہے جو ہمارے ناقص سماجی و اقتصادی ڈھانچے نے عوام کی بھاری تعداد پر ڈال رکھی ہے۔ اور اس نے انسانی روح کو کچل دیا ہے اور اُس کے اخلاقی تانے بانے کو تار تار کر دیا ہے۔ اس نے انسان کو تمام تر بنیادی انسانی وقار سے محروم کرتے ہوئے اُس کی اُن اعلیٰ تر قدروں اور لطیف تر جذبات کو پامال کر دیا ہے جن سے اس کرۂ ارض پر خدا کی شاندار مخلوق یعنی انسان تسکین پاتا ہے۔ اس کا مطلب محض یہ نہیں کہ انسان زندگی کی بنیادی ضروریات خریدنے سے قاصر ہو جاتا ہے بلکہ یہ معاملہ اور بھی زیادہ گہرائی میں جاتا ہے۔ یہ (افلاس) انسان کو تعلیم و ترقی کے تمام مواقع سے محروم کرتا ہے۔ اور اس کا اُن سیاہ بختیوں کا شکار بننے کا امکان ہزار گُنا بڑھ جاتا ہے جو اکثر اُسے پیش آتی ہیں۔ اور جن کا سامنا وہ سماجی اور مادی وسائل کی کمی کے باعث نہیں کرسکتا۔ ہم جنھوں نے افلاس و بھوک، محرومی اور ناداری کا سامنا نہیں کیا اکثر بڑھ چڑھ کر آزادی اور آزاد خیالی کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن یہ الفاظ اُس شخص کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے جسے دن میں ایک وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی، جس کے سر پر کوئی چھت نہیں ہے اور جن کے پاس ستر پوشی کے لیے کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ہے۔ بندھوا مزدوروں کے لیے "نشاندہی" اور "آزادی" کا فائدہ کیا ہے اگر ایک آقا سے نام نہاد آزادی پانے کے بعد وہ ایک اور بندھن کی زندگی کا شکار ہو جاتے ہیں یعنی وہ بھوک اور مفلسی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں جہاں اُمید جگانے کے لیے اُن کے پاس کچھ نہیں ہوتا — بلکہ مرنے کے لیے بھی وہ تہی دامن ہوتے ہیں — اور وہ نہیں جانتے کہ کیا اپنے فاقہ کش بچوں کے بھوکے پیٹ بھرنے کے لیے ایک غذائی لقمہ بھی حاصل کرسکیں گے۔ وہ کس چیز کی زیادہ قدر کرتے ہیں — اُس آزادی اور آزاد خیالی کی جن کے ہمراہ بھوک اور ناداری اُنھیں گھورتی ہے یا اپنی بھوک اور اپنے عزیزوں کی بھوک مٹانے کے لیے تھوڑی سی خوراک کی خواہ اس کے لیے اُنھیں اپنی آزادی بھی قربان کرنی پڑے؛ جواب ظاہر ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ نہ ہی حکومت اور نہ ہی عدالت کو محض اس امر سے مطمئن ہونا چاہیے کہ بندھوا مزدوروں کی نشاندہی ہو گئی ہے اور اُنھیں آزادی حاصل ہو گئی ہے بلکہ یہ دیکھنے کے لیے ہر کوشش کی جانی ضروری ہے کہ آزادی پانے والے بندھوا مزدور نشاندہی اور آزادی کے بعد موزوں طور پر بحال کیے جاتے ہیں۔

اس امر پر اصرار کرنا ظلم ہوگا کہ اس سماجی بہبود کے قانون سے فوائد حاصل کرنے کے لیے ایک بندھوا مزدور کو سماعت کے ایسے باضابطہ عمل میں سے گزرنا ہوگا جس کے ساتھ شہادتیں اندراج کرانے کا معمول کا ضابطہ وابستہ ہو۔ یہ کلیتہً ناکارہ عمل ہوگا کیونکہ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ ایک بندھوا مزدور اپنے افلاس، ناخواندگی اور سماجی و اقتصادی پسماندگی کے باعث قانونی عمل کی سختی اور ضابطہ پرستی کے تقاضوں کو کبھی پورا نہیں کرسکتا اور اگر ایسے ضابطے کو پورا کرنا ضروری ہے تو ریاستی حکومت اس قانون کو قانونی کتاب سے حذف کرسکتی ہے۔ اب یہ امر اعداد و شمار سے ثابت ہو گیا ہے کہ زیادہ تر بندھوا مزدور درجِ فہرست ذاتوں اور درجِ فہرست قبیلوں یا دوسرے پسماندہ طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور انسانی امور

کو عام روش سے ظاہر ہو جائے گا اور بلا شبہ اسے انصاف سے دیکھا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی مزدور ایسی حالت کو گوارا نہیں کرے گا جس میں اُس کے لیے اُجرت کے بغیر یا برائے نام اُجرت کے ساتھ بیگار دینا ضروری ہو، اگر اُس نے آجر سے کچھ پیشگی رقم یا کوئی دوسرا اقتصادی فائدہ حاصل نہ کیا ہو اور ایسی پیشگی رقم یا اقتصادی فائدہ واپس نہ کرنے کے عذر کے تحت اُس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ آجر کی خدمت کرے ورنہ اپنی ملازمت کی آزادی یا اپنے نقل و حرکت کی آزادی کے حق سے محروم ہو جائے۔ لہٰذا جب کبھی یہ ظاہر کیا جائے کہ ایک مزدور سے بیگار لی جا رہی ہے تو عدالت یہ فرض کرے گی کہ اُس نے جو پیشگی رقم یا اقتصادی فائدہ لے رکھا ہے، اُس کی وجہ سے اُس کے لیے ایسا کرنا ضروری ہو گیا ہے اور اس لیے وہ بندھوا مزدور ہے۔ اس مفروضہ کی تردید آجر یا ریاستی حکومت کی طرف سے بھی کی جا سکتی ہے اگر وہ ایسا کرنا پسند کرے لیکن جب تک اس مفروضہ کو جھٹلانے کے لیے تسلی بخش ثبوت پیش نہ کیے جائیں۔ عدالت کو اس بنا پر کارروائی جاری رکھنا ضروری ہے کہ مزدور ایک بندھوا مزدور ہے اور وہ اس قانون کی دفعات کے تحت فوائد کا مستحق ہے۔ ریاستی حکومت کو بندھوا مزدوروں کی نشاندہی کرنے، آزادی دلوانے اور بحال کرنے سے متعلق اپنی ذمہ داری سے اس دلیل پر انحراف کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ اگرچہ متعلقہ مزدور بیگار دے رہے ہوں گے۔ تاہم ریاستی حکومت تب تک اُن کے تئیں کوئی ذمہ داری نہیں لے گی، جب تک کہ وہ انصاف کے مخالفانہ سسٹم کے قواعد کے مطابق موزوں قانونی ضابطے سے یہ ثابت نہیں کر پاتے کہ وہ بندھوا مزدور ہیں۔ یہ ایک ایسا معائنہ ہے جس کا اطلاق اس امر کا تعین کرنے کے لیے کرنا ہوگا کہ کیا ایک مزدور بندھوا مزدور ہے یا نہیں اور لہٰذا ہم ریاستی حکومت کو ہدایت دیں گے کہ وہ اس امر کا تعین کرنے کی غرض سے اپنے تمام تر علاقے میں اس معائنے کا اطلاق کرے کہ کیا وہاں کوئی بندھوا مزدور ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو اُن کی تعداد کتنی بڑی ہے۔ جب کبھی یہ پایا جائے گا کہ کسی مزدور کو معاوضے کے بغیر یا برائے نام اُجرت پر کام کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے تو یہ قیاس کیا جائے گا کہ وہ ایک بندھوا مزدور ہے، تا وقتیکہ آجر یا ریاستی حکومت اس قیاس کو جھٹلا کر دیگر صورت کو ثابت نہ کر سکے۔

ریاستی حکومت نے سی آر مہاجن کے حلفیہ بیان میں یہ بھی بتایا ہے کہ تمام کلکٹروں اور کمشنروں کے نام ہدایات جاری کی گئی ہیں کہ وہ بندھوا مزدوری کے سسٹم کی برائیوں کی وسیع ترین ممکن پیمانے پر تشہیر کریں ـــ بندھوا مزدوروں کی نشاندہی، آزادی اور بحالی کے اہم کام میں قانون ساز اسمبلی کے ممبروں کا تعاون بھی طلب کیا گیا ہے اور ریاست کی تمام پنچائتوں سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ اس سلسلے میں ریاستی حکومت سے تعاون کریں۔ ریاستی حکومت کی طرف سے حلفیہ بیان میں کہا گیا ہے کہ اُس کی طرف سے اُن اشخاص کو پچیس پچیس روپے کا انعام دیا جائے گا جو بندھوا مزدوروں کی موجودگی کے بارے میں اطلاع دیں گے۔ یہ خیال کرنا مشکل ہے کہ بندھوا مزدوروں کی موجودگی کا پتہ لگایا جا سکتا ہے اور بندھوا مزدوروں کی بدعت کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے اور اس کے لیے پورے طور پر قانون ساز اسمبلی کے ممبروں یا بیوروکریسی (افسر شاہی) اور حتیٰ کہ پنچایتوں کی طرف سے بھی کیے جانے والے اقدامات پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ گو اُن کی مدد لیا جانا ضروری ہے۔ کمشنروں اور کلکٹروں کو کئی قسم کے فرائض انجام دینے ہوتے ہیں اور اگر وہ بندھوا مزدوری کے سسٹم کی بدعت کا انسداد کرنے کے خواہاں بھی ہوں جس کے لیے وہ ہمارے یقین کے مطابق ہیں تو اُن کے پاس ذاتی طور پر تحقیقات یا تفتیش کرنے کے لیے وقت نہیں ہوگا اور اُنھیں اپنے ماتحت افسروں جیسے تحصیلداروں اور پٹواریوں پر انحصار کرنا ہوگا اور چونکہ بیشتر مقامات پر پٹواری اور تحصیلدار استحصال پسند طبقہ کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں یا وہ سماجی ذمہ داریوں کے احساس سے عاری ہوتے ہیں یا وہ مفلسوں اور پسماندہ لوگوں کے مصائب اور دکھ درد سے بیگانہ ہوتے ہیں اس لیے سرکاری مشینری کے ذریعے بندھوا مزدوروں کی نشاندہی، آزادی اور بحالی کا کام کرنا بہت مشکل ہو جائے گا اسی طرح قانونی اسمبلی کے ممبران بھی اگرچہ وہ نہایت صادق، نیک نیت اور دل سے مفلسوں کے ہمدرد ہیں، شائد چند افراد کے سوائے بندھوا مزدوروں کی نشاندہی اور آزادی کے مقصد کے لیے کوئی تحقیقات یا تفتیش کرنے کے لیے مشکل سے وقت نکال پائیں گے۔ پنچایتیں بھی جن پر بعض اوقات مفاداتِ خصوصی کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور جو اُن کی کارکردگی کے طریقے کا احترام کرتی ہیں، اس کام میں بہت زیادہ موثر ثابت نہیں ہو سکتیں۔ درحقیقت جس بات کی ضرورت ہے وہ ہے بندھوا مزدوروں کی نشاندہی اور آزادی کے کام میں عوامی سطح پر کام کرنے والے سماجی کارکنوں کے گروپوں کو شامل کرنا۔ ہمارا یہ خیال نہیں کہ اس سے کوئی مفید مقصد حاصل ہوگا اگر محکمہ مال کے چھوٹے چھوٹے افسروں سے کہا جائے کہ وہ گھر گھر جا کر پتہ لگائیں کہ وہاں کوئی بندھوا مزدور ہے یا نہیں، کچھ عرصہ ہوا ہمارے سامنے ایک معاملہ تھا جس میں اس عدالت

کی طرف سے جاری کیے گئے ایک حکم کے نتیجے میں کلیکٹر کی طرف سے دی گئی ہدایت کے مطابق تحصیلدار متعلقہ گاؤں میں گیا اور وہاں ڈالس پر زمینداروں کے ساتھ بیٹھ کر اس نے مزدوروں سے پوچھنا شروع کیا کہ کیا وہ بندھوا مزدور ہیں یا نہیں اور جب مزدوروں نے ظاہراً زمینداروں کی موجودگی سے جھجکتے اور ڈرتے ہوئے کہا کہ وہ بندھوا مزدور نہیں ہیں بلکہ آزادی اور رضامندی سے کام کر رہے ہیں تو اس نے کلیکٹر کو رپورٹ دی کہ وہاں کوئی بندھوا مزدور نہیں ہے، ہم محض مفلسوں اور ناداروں کے درمیان کام کرنے والے سماجی کارکنوں کے ذریعہ ہی بندھوا مزدوروں کی موجودگی کا پتہ لگا سکیں گے اور اُن کی نشاندہی کرتے ہوئے اُنھیں آزاد کر سکیں گے خوش قسمتی سے ہمارے ملک میں ایسے عقیدت مند سماجی کارکنوں کی ــــ ایسے نوجوان مردوں اور خواتین کی جو عینیت پسندی سے تحریک پاتے ہیں اور جن کے دلوں میں اپنے ساتھیوں کی مدد کرنے کا داہبار جوش ہے ــــ بڑی تعداد موجود ہے جن کی خدمات بندھوا مزدوروں کی نشاندہی، آزادی اور بحالی کے لیے بروئے کار لائی جا سکتی ہیں۔ ہم ریاستی حکومت کو پُرزور الفاظ میں کہیں گے کہ وہ ایسے سماجی کارکنوں کے گروپوں کو نگراں کمیٹیوں میں شامل کرے اور اُنھیں پوری مدد و تعاون دے۔ یہ سماجی گروپ غیر قدامت پسند اور غیر روایت پسند معلوم ہو سکتے ہیں اور اُن کی سرگرمیوں میں تیزی و تندی ہو سکتی ہے لیکن صرف وہی اس کارِ خیر کو انجام دے سکتے ہیں اور یہ ذہنیت ہے کہ ریاستی حکومت اُن کے بارے میں شک یا بداعتمادی سے کام لینے کے بجائے اُن کی مدد لینا شروع کرے۔ مفاداتِ خصوصی بلاشبہ ایسے سماجی کارکنوں کے گروپوں کے خلاف ہوں گے جو مفلسوں اور دبائے ہوئے لوگوں کو منظم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اپنے تمام وسائل سے ایسے سماجی کارکنوں کے گروپوں پر حملے کرنے اور اُنھیں تباہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس سلسلے میں اُن کے خلاف جھوٹے مقدمے دائر کیے جا سکتے ہیں اور اُن پر حملے بھی کیے جا سکتے ہیں لیکن ریاستی حکومت کو مفاداتِ خصوصی کے غلبے یا اثر کے تحت نہیں آنا چاہیے اور امن و قانون کو برقرار رکھنے کی آڑ میں سماج کے پسماندہ طبقوں کو تنگ یا پریشان نہیں کرنا چاہیے جنھیں سماجی کارکنوں کے گروپ اس مقصد سے منظم کر رہے ہیں کہ وہ مضبوط بن کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں اور قانون کے عمل کے ذریعے اپنے حقوق کے لیے لڑ سکیں۔

ہم ریاستی حکومت سے توقع کرتے ہیں کہ وہ آج سے ایک ماہ کے اندر اس ہدایت کو عمل میں لائے گی۔ ہم ریاستی حکومت کو یہ ہدایت بھی دیں گے کہ یہ سماجی کارکن خواہ وہ نگراں کمیٹیوں میں ہوں یا نہیں، جب کبھی کلیکٹر، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا ڈپٹی کمشنر کو بتائیں کہ کسی خاص مقام پر بندھوا مزدور موجود ہیں اور جب کبھی ضلع ایڈمنسٹریشن کا کوئی افسر سماجی کارکنوں کی طرف سے دی گئی اطلاع کی بنا پر بندھوا مزدوروں کی نشاندہی اور آزادی کے لیے ایسے مقام پر جائے تو وہ اُن کارکنوں کے نمائندے کو اپنے ہمراہ لے جائے اور اپنی تیار کردہ رپورٹ کی نقل فوراً اُس نمائندے کے حوالے کر دے۔ ہم یہاں یہ بھی واضح کر دیں کہ ہماری طرف سے دی گئی ہدایت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف اُنہی سماجی کارکنوں کے گروپوں کو نگراں کمیٹیوں میں لیا جائے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے بلکہ ریاستی حکومت کو اختیار ہوگا کہ وہ کسی بھی ایسے دوسرے سماجی گروپ کے نمائندوں کو نگراں کمیٹی میں شامل کر سکتی ہے جو ریاستی حکومت کے خیال میں اس کام کے لیے موزوں ہوں اور اس کے لیے وہ اُن کی طرف سے عوامی سطح پر ناداروں اور معذوروں میں کیے گئے کام کی نوعیت اور اہمیت کا خیال رکھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بندھوا مزدوروں کی نشاندہی، آزادی اور بحالی کے مقصد سے حکومت کی طرف سے کیے گئے کام پر نظرِ ثانی اپریل ۱۹۸۱ء میں کی گئی تھی اور ستنا، پنا، بستر، رائے گڑھ اور جبل پور کے اضلاع میں مفصل سروے کیا گیا تھا۔ ریاستی حکومت کی طرف سے پیش ہوئے فاضل وکیل نے اس نظرِ ثانی شدہ رپورٹ کے نتائج اور سفارشات کا خلاصہ پیش کیا تھا اور اس خلاصہ میں بندھوا مزدوروں کی نشاندہی، آزادی اور بحالی کے پروگرام کی تعمیل کے بارے میں ریاستی حکومت کی خامیوں کا بے باکی اور دلیری کے ساتھ ذکر کیا گیا تھا، اور موجودہ صورتِ حال کے مداوا کے لیے سفارشات اور تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ ہمیں توقع اور بھروسہ ہے کہ ریاستی حکومت کی طرف سے ان تجاویز اور سفارشات کو فوری طور پر عمل میں لایا جائے گا، اور بندھوا مزدوروں کی نشاندہی، آزادی اور بحالی کے لیے تمام ترمشینری کو ان تجاویز اور سفارشات کی روشنی میں بہتر بنایا جائے گا۔ ہمارے خیال میں ہمارے لیے ان تجاویز اور سفارشات پر بحث کرنا درست نہیں ہوگا کیونکہ ان میں انتظامیہ پالیسی سازی کے امور شامل ہیں لیکن بعض امور کے بارے میں ہم کچھ کہیں گے جو ان تجاویز اور سفارشات سے پیدا ہوئے ہیں۔ سروے ٹیم کی طرف سے جو تجاویز اور سفارشات پیش کی گئی ہیں ان میں سے ایک میں کہا گیا ہے کہ "ضلع اور سب ڈویژن کی نگراں کمیٹیوں کی از سرِ نو تنظیم کی جائے اور اُن کی سرگرمیوں میں تیزی لائی جائے اور اُن کی میٹنگیں اب کے مقابلے میں زیادہ ہونی چاہئیں"۔ اس تجویز یا سفارش سے اس امر کی واضح طور پر توثیق ہوتی ہے جو ہم اس فیصلے کے پہلے پیراگرافوں میں بتا چکے ہیں یعنی

گرانی کمیٹیاں جس صورت میں آج موجود ہیں، وہ مؤثر نہیں ہیں اور انھیں از سر نو منظم اور سرگرم بنانے کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم نے سماجی کارکنوں کے گروپوں کے نمائندوں کی شمولیت کے بارے میں جو ہدایت دی ہے اُس سے نگراں کمیٹیوں کی کارکردگی کو مؤثر اور سرگرم بنانے میں بڑی مدد ملے گی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جن افسروں کو بندھوا مزدوروں کی نشاندہی، آزادی اور بحالی اور دیگر مسئلوں سے نپٹنے کے لیے مختلف سطحوں پر تعینات کیا جائے۔ انھیں مناسب طور پر تربیت دی جائے اور اُن کے ذہنوں کو حساس بنایا جائے تاکہ اُن میں مفلسوں کے مصائب اور دُکھ درد میں شرکت کا احساس پیدا ہو اور وہ افلاس کو دُور کرنے کے کاز کے لیے خود کو کلّی طور پر وقف کر دیں اور اپنا کام ایسے طریقے سے انجام دیں جس سے سماج کے کمزور تر طبقوں اور بندھوا مزدوروں میں اعتماد پیدا ہو۔ ہر افسر کو جس پر بندھوا مزدوروں کی نشاندہی، آزادی اور بحالی کی ذمّہ داری سونپی جاتی ہے، اپنی عظیم ذمہ داری سے بخوبی آگاہ کیا جانا چاہیے۔ اور اُس میں لگن اور مقصد کا احساس پیدا کیا جائے جو اس اہم کام کی کامیاب انجام دہی کے لیے ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جو افسر بندھوا مزدوروں کی نشاندہی، آزادی اور بحالی کے کام کے لیے ذمّہ دار ہیں اُن کی سرگرمیوں کی مسلسل نگرانی اور جانچ پڑتال کی جائے۔ خوش قسمتی سے ہمارے ملک میں سماجی فرائض کے لیے وقف افسران کی ایک بڑی تعداد ہے جو عینیت پسندی سے تحریک پاتے ہیں جن کے جوش میں کوئی کمی نہیں آتی۔ جن کے ذہن آزاد ہیں اور دل تمام قسم کے دباؤ سے غیر آلودہ ہیں اور وہ سماج کے پسماندہ اور کمزور طبقوں کی امداد کے لیے مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کرتے اور بعض اوقات خطرے کا سامنا کرنے کو بھی تیار ہیں۔ ایسے افسروں کی حوصلہ افزائی کی جانی اور اُن کی مساعی کی تعریف کی جانی ضروری ہے تاکہ وہ ایسے مثالی نمونے بن جائیں جن کی دوسرے افسر تقلید کریں۔ پیراگراف ۸ کی سفارشات اور نتائج کے خلاصے میں کہا گیا ہے کہ "جو علاقہ روایتی طور پر قرضے کے بندھن میں بندھا ہوا ہے محکمہ مال کی طرف سے دستیاب فیلڈ ایجنٹوں کی امداد کے ساتھ بندھوا مزدوروں کی نشاندہی کے لیے اُس کا شدید طور پر سروے کیا جائے۔" ہم اس سفارش میں معمولی سی ترمیم کریں گے اور سمجھاؤ دیں گے کہ "جو علاقے روایتی طور پر قرضے کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں اُن کا شدید طور پر سروے بلاشبہ کیا جائے لیکن یہ کام ایسے علاقوں میں سماجی گروپوں کی امداد کے ساتھ کام کرنے والی نگراں کمیٹیوں کی طرف سے کیا جائے اور شاید سروے ٹیم کے دل میں یہی کچھ تھا جب اُس کی طرف سے کہا گیا کہ محکمہ مال کی طرف سے دستیاب فیلڈ ایجنسیوں کی امداد لی جائے۔" ہم نتائج اور سفارشات کے خلاصہ کے پیراگراف ۹ تا ۱۷ میں پیش کی گئی تجاویز اور سفارشات سے کلیتہً اتفاق کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ریاستی حکومت کی طرف سے ان تجاویز اور سفارشات کی صدق دلی اور تیز رفتاری سے تعمیل کی جائے تو اس سے آزادی پانے والے بندھوا مزدوروں کی بحالی میں بڑی مدد ملے گی۔ ہمارے ملک میں کافی اچھی اسکیمیں ہیں لیکن حقیقی مشکل یہ ہے کہ اُن کی موزوں اور مؤثر تعمیل نہیں ہوتی۔ ان اسکیموں کی تعمیل کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھا جانا ضروری ہے کہ اُس سے کتنے نشانے پورے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ اُن پر کتنا خرچ ہوا ہے۔ جو امر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اخراجات کے فوائد عوام تک، خصوصاً مفلسوں میں مفلس ترینوں اور کمزوروں میں کمزور ترینوں تک پہنچنے ضروری ہیں کیونکہ وہ نشانے کے گروپ ہیں جنھیں فائدہ پہنچانا مقصود ہے اور اگر فوائد اُن تک نہیں پہنچتے تو کسی حکومت کے لیے یہ کہنا بے معنی ہے کہ اُس نے اتنی زیادہ رقم خرچ کی ہے۔

لہٰذا ہم ریاستی حکومت سے کہیں گے کہ سروے ٹیم نے اپنی رپورٹ میں جو تجاویز اور سفارشات پیش کی ہیں وہ اُن کی فوراً تعمیل کرے اور ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء کو یا اُس سے قبل ایک ذمّہ دار افسر کے ذریعہ ایک حلفیہ بیان پیش کر کے اس عدالت کو بتایا جائے کہ اُن تجاویز اور سفارشات کی تعمیل کے سلسلے میں کیا ٹھوس قدم اٹھائے گئے ہیں اور کتنے بندھوا مزدوروں کی نشاندہی کر کے انھیں آزاد کیا گیا ہے اور ان میں سے کتنے لوگوں کو بحال کیا گیا ہے اور کس ڈھنگ سے کیا گیا ہے۔ یہ آئین کے آرٹیکل ۲۱ اور ۲۳ کا نہایت معمولی تقاضا ہے کہ بندھوا مزدوروں کی نشاندہی کر کے انھیں آزاد کیا جائے اور آزاد کیے جانے پر انھیں موزوں طور پر بحال کیا جائے۔ بندھوا مزدور سسٹم (تنسیخ) قانون ۱۹۷۶ء اس غرض سے مملکتی پالیسی کے ہدایتی اصولوں کی تعمیل کے سلسلے میں بنایا گیا ہے کہ بندھوا مزدوروں کو بنیادی انسانی وقار کی یقین دہانی کرائی جائے اور اس قانون کی دفعات کی تعمیل میں ریاستی حکومت کے اقدام کی کوئی بھی ناکامی آئین کے آرٹیکل ۲۳ کے علاوہ آرٹیکل ۲۱ کی صریحاً خلاف ورزی ہوگی۔

اس مقدمے کی کارروائی کے سلسلے میں جو رٹ درخواست اور حلفیہ بیانات داخل کیے گئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مارچ ۱۹۸۲ء کے پہلے ہفتے میں اس عدالت کی طرف سے جاری کیے گئے حکم کے نتیجے میں جن ۱۳۵ مزدوروں کو آزاد کیا گیا تھا اُن کی بڑی اکثریت کو ابھی تک

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

ہرش اروڑہ

صنعت کی ترقی کے چالیس سال

بھارتی صنعت کے چالیس برس

قسط: ۱

حصولِ آزادی کے بعد تقریباً ۴۰ برس سے بھارت ترقی کی راہ پر متواتر گامزن ہے۔ معیار اور گوناگونی کے لحاظ سے صنعتوں نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۴ء کے عرصے میں صنعتی پیداوار میں اوسطاً ۵ فیصد کا اضافہ ہوا، تاہم گزشتہ تین برسوں میں صنعت کاری میں ۸ فیصد کا پھیلاؤ ہوا ہے جو گزشتہ دو دہائیوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس ترقی میں تقریباً تمام صنعتی شعبے شریک ہیں لیکن پٹرولیم اشیا، کیمیکلوں اور کیمیکل مصنوعات، دھاتوں کی اشیا، الیکٹرانک اور بجلی کی مشینری، ٹرانسپورٹ اور بجلی کے شعبوں میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے۔

متعدد پانچسالہ منصوبوں کے عرصے میں چالو صنعتوں میں نئے یونٹوں اور نئے اداروں کے قیام سے صنعتی ڈھانچے کی توسیع ہوئی ہے اور اس میں گوناگونی آئی ہے۔ اس کے نتیجے میں صنعتی یونٹوں کی تعداد میں بھاری اضافہ ہوا ہے۔ نئی صنعتوں کے شعبے میں کاشتکاری کے ٹریکٹر، الیکٹرانک اور فرٹیلائزر صنعتوں نے جن کا ۱۹۵۱ء میں کوئی وجود ہی نہیں تھا اتنی ترقی کی ہے کہ اب ان کی درآمد برائے نام رہ گئی ہے۔ ملک کی انجینئری صنعت اب بجلی کی پیداوار، ریل اور سڑک ٹرانسپورٹ اور مواصلات کے تمام آلات اور ساز و سامان فراہم کر سکتی ہے اور بھارت نے بیشتر شعبوں میں خود کفالت حاصل کر لی ہے۔

صنعتی پالیسی

۱۹۴۷ء میں جب بھارت آزاد ہوا تو ملک صنعتی لحاظ سے نہایت پسماندہ ملک تھا۔ انگریزی سامراج نے ملک کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اُس نے اپنے دو صد سالہ عہدِ حکومت میں بھارت کی قدیمی اور روایتی صنعتوں کو تباہ کر دیا تھا، تاکہ برطانوی صنعتوں اور برآمدات کو فروغ دیا جا سکے۔ اس ملک میں صرف اُنہی صنعتوں کو بڑھاوا دیا گیا جو برطانوی پلانٹوں اور ٹیکنالوجی پر انحصار رکھتی تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران بھی برطانوی حکومت کی طرف سے چند ایسی صنعتوں کی اجازت دی گئی اور حوصلہ افزائی کی گئی جن کا مقصد دفاعی سامان اور اشیا تیار کرنا تھا۔ لیکن یہ صنعت کاری، افلاس کے اُس ہمالیائی مسئلہ پر قابو پانے میں نہایت بے اثر تھی جس نے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

چنانچہ ملک میں افلاس کو ختم کرنے اور اُسے خوشحالی کی راہ پر لانے کے لیے ملکی رہنماؤں نے صنعتوں کا جال پھیلانے کا فیصلہ کیا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ۱۹۴۸ء میں آزاد بھارت کی صنعتی پالیسی کا اعلان کیا گیا جس میں ملی جلی معیشت کے اصول کو قبول کیا گیا۔ اس پالیسی کے تحت ملک کے مفاد میں صنعت کی منصوبہ بند ترقی اور قواعد بندی کی پوری ذمہ داری سرکار پر ہے۔ اگرچہ اس میں حکومت کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ کسی بھی صنعتی ادارہ کو عوامی مفاد کی خاطر اپنی تحویل میں لے سکتی ہے تاہم پرائیویٹ سیکٹر کے لیے موزوں شعبے محفوظ رکھے گئے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں پارلیمنٹ نے سماج کے سماج وادی (سوشلسٹ) ڈھانچے کو قومی نصب العین کے طور پر قبول کیا اور بعدازاں ۱۹۵۶ء میں اس پالیسی میں ترمیم کی گئی جس کے تحت ہتھیار، اسلحہ اور دیگر دفاعی ساز و سامان کی تیاری اور جوہری توانائی، فولاد سازی، کان کنی، خام تیل، ریلوے

ٹرانسپورٹ، ہوائی جہازوں اور جہازوں کی تیاری، ٹیلی فون اور ٹیلی فون کے تاروں، ٹیلی گراف اور وائرلیس کے آلات اور بجلی کے پیداوار اور تقسیم کے شعبے حکومت کی ذمہ داری میں آگئے ہیں۔ جبکہ مشینی اوزاروں، آہنی مرکب دھاتوں اور اوزاری فولاد، رنگ کے سامان اور پلاسٹک کی اشیاء، اینٹی بائیوٹک ادویات اور دیگر ضروری ادویات تیار کرنے والی صنعتوں جیسے کیمیکل صنعتوں کے لیے بنیادی مصنوعات فرٹیلائزر، مصنوعی ربڑ، کوئلے کی کاربن کاری، کیمیاوی لگدی، سڑک اور بحری ٹرانسپورٹ کی صنعتیں سرکار کی ملکیت میں دی گئیں۔

فہرست اوّل کی صنعتوں کے لیے حکومت سے لائسنس لینا لازمی ہے۔ حکومت کو یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ وہ کسی بھی ایسے صنعتی ادارے کی کارکردگی کی جانچ پڑتال کر سکتی ہے اور ہدایت دے سکتی ہے جس کے بارے میں وہ ضروری خیال کرے۔ اگر کسی ادارے کی کارکردگی میں بدعنوانیاں پائی جائیں تو حکومت کو یہ بھی اختیار حاصل ہے کہ وہ اس کے انتظام یا کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔ حکومت ان صنعتوں کی طرف سے تیار کی گئی اشیاء کو تقسیم کرانے اور قیمت کو موزوں سطح پر بنائے رکھنے کے لیے بھی کارروائی کر سکتی ہے۔

نئی ترامیم

۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۳ء میں صنعتی لائسنسنگ پالیسی میں ترامیم کی گئیں۔ ان ترامیم میں اس امر کا اعادہ کیا گیا کہ صنعتی شعبے میں حکومت کی پالیسی ۱۹۵۶ء کے صنعتی پالیسی کے مقصد کے مطابق ہوگی۔ بنیادی اور محاذی نوعیت کی صنعتیں اور مفادِ عامہ کی سروسیں پبلک سیکٹر میں رہیں گی۔ ایسی صنعتیں جو بہت ضروری ہیں اور جن کے لیے بہت زیادہ سرمایہ کاری کی ضرورت ہے اور جیسے موجودہ حالات میں مملکت ہی فراہم کر سکتی ہے وہ بھی پبلک سیکٹر میں رہیں گی۔

یہ بھی طے کیا گیا کہ نئی صنعتیں قائم کرنے کے سلسلے میں بڑے صنعتی اداروں اور بدیسی کمپنیوں کے بجائے چھوٹے اور متوسط پیمانے کی صنعتوں کو ترجیح دی جائے گی۔ لائسنسنگ پالیسی کا مقصد یہ ہوگا کہ امدادی ساز و سامان کی تیاری چھوٹے اور متوسط سطح کی صنعتوں میں کی جائے۔ کوآپریٹو سوسائٹیوں اور چھوٹے اور متوسط پیمانے کے صنعتکاروں کو بڑی تعداد میں استعمال کی جانے والی اشیائے صرف کی پیداوار کے معاملے میں بڑھاوا دیا جائے گا۔ دیگر صنعتکاروں کو اسی صورت میں شمولیت کی اجازت دی جائیگی جب بڑے پیمانے پر پیداوار سے پیداواری لاگت میں کمی، تیکنیکی بہتری، زیادہ سرمایہ کاری کی ضرورت ہو اور برآمدات کے زیادہ امکانات یا جدید کاری جیسے اسباب موجود ہوں۔ کوآپریٹو سیکٹر کو بھی ایسی صنعتیں جاری کرنے کے لیے ترجیح دی جائے گی جن میں گنا، پٹ سن اور کپاس جیسے خام مال کو صنعتی استعمال کے لیے تیار کیا جاتا ہے یا فرٹیلائزر جیسی کاشت کے لیے لازمی اشیاء کی پیداوار ہوتی ہے۔

چھوٹی صنعتیں

چھوٹی صنعتوں (جن میں مشینوں اور آلات کے لیے ۳۵ لاکھ روپے تک کی سرمایہ کاری ہو سکتی ہے) اور امدادی صنعتوں (جن میں مشینوں اور آلات کے لیے ۴۵ لاکھ روپے تک کی سرمایہ کاری ہو سکتی ہے) کے لیے تحفظ کی پالیسی جاری تھی۔ حکومت نے اس شعبے میں کام کاج، نتائج اور پیداواری صلاحیت کو دیکھتے ہوئے اس شعبے کے لیے محفوظ صنعتوں کی فہرست کو ۸۷۳ تک بڑھا دیا ہے۔ چھوٹی صنعتوں میں پیداوار کے لیے اشیاء کا تحفظ فروری ۱۹۷۰ء سے صنعت (ترقی اور قواعد بندی) قانون ۱۹۵۱ء کی دفعہ ۲۹۔بی کے تحت کیا جا رہا ہے۔

کارخانوں کے لیے زمین، املاک اور مشینوں کی صورت میں ۵ کروڑ روپے تک کی غیر منقولہ جائداد کے لیے لائسنس سے چھوٹ کی حد بڑھا دی گئی ہے۔ یہ چھوٹ ان پر لاگو نہیں ہوگی۔ بڑے صنعتی ادارے، بڑے ادارے اور بدیسی کمپنیاں، ان کی شاخیں اور امدادی کمپنیاں۔

ملے جلے سیکٹر کے پراجیکٹ کے لیے ہر معاملے پر غور کرتے وقت حکومت کے سماجی و اقتصادی مقاصد کی بنیاد پر اس کی ہنرمندی کا جائزہ لیا جائے گا۔ جو ادارے "ایم آر ٹی پی" (قانون اجارہ داری) کے تحت آتے ہیں انھیں ملے جلے سیکٹر کا استعمال کر کے ایسے کارخانے لگانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جو اُن کے لیے بصورتِ دیگر ممنوع ہیں۔ ملے جلے سیکٹر کی کمپنیوں کی پالیسی کے تعین، انتظام اور تعمیل میں سرکار مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔

صنعتوں کو مراعات

سرمایہ کاری کے عمل کو فراخدلانہ بنانے کے لیے بعض خاص قسم کی درخواستوں کو جلد نپٹانے کے لیے انتظامی وزارتوں کو اختیارات سونپ دیے گئے ہیں۔ ان میں تنوع لانے اور تجارت جاری رکھنے کے لائسنس اور اجازت نامے (LETTER OF INTENT) اور صنعتی لائسنسوں کی جائز میعاد بڑھانے سے متعلق درخواستیں بھی شامل ہیں۔

۱۵ انجنیئری صنعتوں کو ۱۴ اگست ۱۹۸۵ء کو پوری ہونے والی پانچسالہ میعاد میں ایک یا زیادہ بار اپنی لائسنس یافتہ پیداواری صلاحیت ۵ فیصد کی سالانہ شرح سے اور زیادہ سے زیادہ ۲۵ فیصد کی شرح سے بڑھانے کی اجازت دی گئی بشرطیکہ

اُن کی مصنوعات چھوٹی صنعتوں یا پبلک سیکٹر کے لیے محفوظ نہ ہوں اور قانون اجارہ داری کے تحت یہ کارخانہ اُس خاص شئے کو تیار کرنے والا بڑا ادارہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ ایسی ۴۴ صنعتوں کو جنھیں بڑے صنعتی گھرانے اور بدیشی ادارے بھی جاری کر سکتے ہیں اور دیگر متوقع صنعتکاروں کو بھی اُس اضافہ کی اجازت دی گئی ہے۔

سو فیصد پیداوار برآمد کرنے والے کارخانوں کو خاص مراعات دینے کے لیے ایک اسکیم بنائی گئی ہے۔ ان مراعات میں ایسی مشینوں، خام مال اور حصے پرزوں کی درآمدی ڈیوٹی میں چھوٹ شامل ہے جو ملک میں تیار نہیں کئے جاتے۔ غیر ممالک میں رہنے والے بھارتی لوگوں کو غیر ملکی زرِ مبادلہ کی اپنی بچت سے بھارت میں صنعتی پراجیکٹوں کے قیام کے لیے پلانٹ اور مشینیں درآمد کرنے کے لیے خاص مراعات دی گئی ہیں۔ ترجیحی اور برآمدی سیکٹر کی صنعتوں میں سرمایہ کاری کے لیے غیر ممالک سے سرمایہ لانے کے سلسلے میں شرطیں مزید فراخدلانہ بنائی گئی ہیں۔ غیر ممالک میں بسے بھارتیوں کو بھاری مشینوں کی درآمد سے متعلق یہ مراعات بھارت سرکار کی وقتاً فوقتاً ترمیم شدہ درآمدی اور برآمدی پالیسی میں دی گئی ہیں۔ ۸۸-۱۹۸۵ء کے لیے درآمدی پالیسی کے مطابق یہ مراعات غیر ممالک میں بسنے والے صرف اُن بھارتیوں کو دی جائینگی جو مستقل رہائش کے لیے بھارت لوٹ رہے ہیں۔ ان خاص مراعات کے تحت غیر ممالک میں بسنے والے بھارتی بھاری مشینوں کی درآمد کر سکتے ہیں اور مشینوں کی درآمد کے ایک سال کے اندر اپنے صنعتی یونٹوں کا رجسٹریشن کرا سکتے ہیں۔ وہ نئی اور استعمال شدہ مشینوں کی درآمد کر سکتے ہیں لیکن استعمال شدہ مشینیں سات برس سے زیادہ پرانی نہیں ہونی چاہیئیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ ۵۰۰ "کے۔وی۔اے" زیادہ صلاحیت والے ڈیزل جنریٹنگ سیٹوں اور لاگت بیمہ و بھاڑے سمیت ۱۰ لاکھ روپے قیمت کے کمپیوٹروں کی بھی درآمد کر سکتے ہیں بشرطیکہ انھوں نے کم از کم ایک برس تک اُن کا استعمال کیا ہو۔ وہ بھارت میں تفریحی پارک بنانے کے لیے نئے تفریحی کھیلوں کی بھی درآمد کر سکتے ہیں۔ (اس اسکیم میں قسمت کی آزمائش کرنے والے کھیلوں کی درآمد کی اجازت نہیں ہے)۔

آلودگی پھیلانے والی صنعتیں

زیادہ آلودگی پھیلانے والی ۲۰ صنعتوں کی فہرست مرتب کی گئی ہے اور یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان میں سے کسی صنعت میں لگے ہوئے صنعتی اداروں کو آلودگی کنٹرول آلات لگانے سے متعلق بعض خاص شرائط کو پورا کرنا ہوگا۔ ان اداروں کو دیا گیا اجازت نامہ تب تک صنعتی لائسنس میں نہیں بدلا جائے گا جب تک وہ خاص شرائط پوری نہیں کریں گے۔

موجودہ لائسنسنگ پالیسی میں وقتاً فوقتاً ترمیمیں کی گئیں اور ۲۵ بڑی قسموں کی صنعتوں کو لائسنس سے چھوٹ دی گئی ہے لیکن لائسنس سے چھوٹ پانے کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کو پورا کرنا لازمی ہے۔

۱۔ وہ صنعتی ادارہ قانون اجارہ داری یا زرِ مبادلہ ریگولیشن ایکٹ کے تحت نہ آتا ہو۔

۲۔ تیار کی جانے والی شئے چھوٹی صنعت کے سیکٹر کے لیے محفوظ نہ ہو۔

۳۔ وہ صنعتی ادارہ (i) ۱۹۸۱ء کی بھارت کی مردم شماری میں متعین ۵ لاکھ سے زائد آبادی والے شہر کی معیاری شہری حد یا اُس مردم شماری میں متعین ۵ لاکھ یا زائد کی آبادی والے شہر کی میونسپل حد کے اندر نہ آتا ہو۔

چھوٹی صنعتوں کے لیے سرمایہ کاری کی حد ۲۰ لاکھ روپے سے بڑھا کر ۳۵ لاکھ روپے تک اور امدادی صنعتوں کے لیے یہ مَد ۲۵ لاکھ روپے سے بڑھا کر ۴۵ لاکھ روپے تک کر دی گئی ہے۔

دُور مواصلات کے آلات کے معاملے میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ (i) سوئچنگ اور ٹرانسمیشن آلات کی تیاری میں غیر سرکاری اداروں سے اشتراک کیا جا سکتا ہے جس میں مرکزی / ریاستی سرکاروں کے کم از کم ایک فیصد شیئر ہوں اور غیر سرکاری اداروں کے زیادہ سے زیادہ ۴۹ فیصد شیئر ہوں اور (۲) صارفین کے احاطوں میں لگائے جانے کے لیے دُور مواصلات کے آلات، جیسے ٹیلی فون، پی اے بی ایکس، ٹرانسمیٹر، اعداد فراہم کرنے والے آلات کی تیاری کے لیے غیر سرکاری سیکٹر کو اجازت دی جا سکتی ہے۔

سرکار نے صنعتی نقطۂ نگاہ سے پسماندہ علاقوں اور صنعتوں سے مبّرا اضلاع کی از سرِ نو زُمرہ بندی کی ہے۔

زُمرہ (i) اس میں صنعتوں سے مُبّرا اضلاع اور خصوصی علاقہ (۱۳۴۔ اضلاع) شامل ہے۔

زُمرہ (ب) اس میں ۷۵ اضلاع شامل ہیں۔

زُمرہ (ج) اس میں ۱۱۲ اضلاع شامل ہیں۔

ان علاقوں کو سلسلہ وار شرحوں پر مرکزی عطیہ دیا جاتا ہے۔ معیاری قرضہ دینے والے کُل ہند ادارے انھیں رعایتی شرحوں پر قرضے دیتے ہیں مرکز کی طرف سے اعلان شدہ پسماندہ اضلاع کے پہاڑی، دُور اُفتادہ اور دشوار گذار علاقوں کو ٹرانسپورٹ گرانٹ بھی دی جاتی ہے۔ بعض مخصوص ترقیاتی ادارے بھی جو چھوٹے دیہی اور گھریلو صنعتوں کی طرف سے کام کرتے ہیں، ٹرانسپورٹ الاؤنس لے سکتے ہیں۔ حکومت بھی ایک یا دو ترقیاتی مرکزوں میں بنیادی سہولیات کے فروغ کے لیے ریاستی حکومتوں کو کُل لاگت کے ایک تہائی حصّہ تک امداد دیتی ہے لیکن ان کی زیادہ سے زیادہ حد صنعت سے محروم ہر ضلع کے لیے دو کروڑ روپیے ہے۔ ان پسماندہ علاقوں کو صنعتی ترقی کے لیے لائسنس دینے میں ترجیح دینے کے علاوہ دیگر کئی ترغیبات دی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر احسان اللہ خان ٥

جنگلات اور جنگلی جانوروں کا تحفظ

جنگلات ملک کا بہت بڑا سرمایہ ہیں اور کشمیر میں ان کو سبز سونا کہا جاتا ہے۔ اس سرمائے میں اضافے کی غرض سے برٹش حکومت نے ۱۸۹۴ء میں ایک قانون بنایا تھا۔ مگر آزادی کے بعد اس کا احساس ہوا کہ اس قانون کو بہتر بنانا چاہیے لہٰذا ۱۹۵۲ء میں ایک نیا قانون بنایا گیا۔ نئے قانون کے لحاظ سے جنگلات کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا۔ تحفظی جنگلات اور دیہاتی جنگلات اور ان جنگلات سے ملک کا ایک تہائی حصہ ڈھکا ہونا چاہیے تاکہ ان سے ملک میں مکان اور نیز کرسی بنانے کے لیے لکڑی دستیاب ہو سکے علاوہ ازیں دیہاتی علاقوں میں جانوروں کا چارہ، آگ جلانے اور اوزار بنانے کے لیے لکڑی مل سکے اور جانوروں کا گوبر جلایا نہ جائے تاکہ یہ کھاد کے لیے استعمال کیا جائے۔ جنگلات کے تحفظ کا خاص لحاظ رکھا گیا تاکہ بارش کا پانی فوراً بہہ نہ جائے بلکہ اس کا کثیر حصہ زمین کے اندر چلا جائے اور بارش کے بعد دھیرے دھیرے چشموں کی صورت میں ظاہر ہو جو دریاؤں میں جا کر ان کو دائمی بنا سکیں اور جنگلی جانوروں کی حفاظت ہو سکے۔

اس کی بہتری کے لیے ہر سال درخت لگانے کا جشن منایا جاتا ہے اور ۲۱ مارچ کو عالمی جنگلاتی یوم کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ جنگلی جانوروں کی حفاظت کی غرض سے ہر سال اکتوبر کے پہلے ہفتے میں جنگلی جانوروں کا ہفتہ منایا جاتا ہے۔

حکومت نے ۷۵۰ لاکھ ہیکٹیر جنگلات کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ مگر جنگلات کی صحیح طور سے حفاظت نہ ہونے کی بنا پر ۱۹۷۵ء تک جنگلات کا علاقہ ۵۵۵ لاکھ ہیکٹیر رہ گیا اور ۱۹۸۲ء تک اس میں مزید کمی ہوئی، لہٰذا یہ ۴۶۴ لاکھ ہیکٹیر رہ گیا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے حکومت نے جنگلات لگانے کا پروگرام بنایا ہے: لہٰذا ۱۹۸۱ء میں ۴ لاکھ ہیکٹیر اور ۱۹۸۵ء میں ۱۳ لاکھ ہیکٹیر کے علاقے میں درخت لگائے گئے اور تقریباً ۱۲۸ کروڑ درخت کے پودے لوگوں کو لگانے کے لیے دیے گئے۔ علاوہ بریں قومی پارک، جنگلی جانوروں کی جائے پناہ اور تحفظی علاقے وغیرہ کے نام سے بہت بڑا علاقہ محفوظ کر دیا گیا۔

جنگلات کے مزید تحفظ کی غرض سے حکومت نے ۱۹۸۰ء میں جنگلاتی تحفظ ایکٹ پاس کیا اور تاکید کی کہ جنگلاتی علاقوں کو دوسرے مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے، لہٰذا ۱۹۸۵ء تک محض تقریباً ۲۸ ہزار ہیکٹیر جنگلاتی علاقے سڑک، تیل کی تلاش اور آبپاشی وغیرہ کی غرض سے دیا گیا۔ درختوں کی سالانہ کٹائی کی تعداد میں کمی کر دی گئی اور درخت لگانے کے پروگرام میں تیزی پیدا کی گئی۔ جن لوگوں کے پاس زمین نہ تھی ان کو حکومت کی زمین درخت لگانے کے لیے دی گئی اور دوسرے ایسے پرائیویٹ اداروں کی ہمت افزائی کی گئی جو درخت لگانے میں دلچسپی رکھتے تھے۔

جنگلات سے متعلق تعلیم و تربیت کے لیے ۱۸۸۱ء میں اگرچہ کام شروع ہو گیا تھا مگر آزادی کے بعد حکومت نے دہرہ دون کے جنگلاتی تحقیقی ادارے اور کالج کو مزید بہتر بنانے کے لیے کثیر رقم فراہم کی۔ اس ادارے کی ماتحتی میں چار مزید کالج کھولے گئے۔ ۱۔ ہندوستانی جنگلاتی کالج جو جنگلات کی بہتری کے لیے ملکی سطح پر اعلیٰ افسران کی تعلیم دیتا ہے ۲۔ صوبائی جنگلاتی کالج جو صوبے کے اعلیٰ جنگلاتی

٥ سینئر سائینٹسٹ، کرشی بھون، ڈاکٹر راجندر پرشاد روڈ، نئی دہلی

افراد کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتا ہے۔ ایسے صوبائی کالج برنیہٹ (آسام)، کوئمبٹور (تامل ناڈو) اور دہرہ دون (یو۔پی) میں ہیں۔ علاوہ ازیں پانچ رینجر کالج بھی کھولے گئے ہیں جو مغربی بنگال، تامل ناڈو، مدھیہ پردیش، یو۔پی اور مہاراشٹر میں ہیں۔

اب زراعتی کالجوں میں بھی جنگلات کا محکمہ کھولا جا رہا ہے۔

۱۹۸۲ء میں جنگلات کے وسائل کا مناسب اور صحیح استعمال کی غرض سے بھوپال میں ایک جنگلاتی انتظامیہ کالج کھولا گیا ہے۔

جنگلی قبائل کو جنگلات کاٹ کر کھیتی کرنے کی جو عادت پڑ گئی تھی اس کو روکنے کی غرض سے حکومت ان قبائل کو زمین میں درخت لگانے کی ہمت افزائی کرتی ہے اور درخت لگانے کا پورا خرچ برداشت کرتی ہے جب تک درخت کاٹنے کے لائق نہیں ہو جاتے ہیں ان قبائل کے افراد کو ماہانہ مناسب رقم دیتی ہے تاکہ وہ ان درختوں کی نگرانی کریں اور درخت کٹنے کے بعد ان کو ان کی قیمت میں سے مناسب حصہ دیتی ہے۔ دوسرے افراد خاص طور سے ٹھیکیداروں کو ان جنگلات میں داخل ہونے نہیں دیتی ہے، جنگلی قبائل جو جنگلی مال جمع کرتے ہیں حکومت ان کو مناسب قیمت میں خرید لیتی ہے۔

جنگلی جانوروں کا تحفظ

ہندوستان جنگلی جانوروں کے تحفظ کے لیے زمانۂ قدیم سے مشہور ہے کیوں کہ مہاتماؤں کے آشرم کے گرد جنگلی جانور پھرا کرتے تھے اور مہاتما جو ان کے تحفظ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ہندو ازم میں دیوتا سے کوئی نہ کوئی جنگلی جانور منسلک رہا ہے اور خود کوٹلیہ نے اپنے ارتھ شاستر میں جنگلی جانوروں کے تحفظ کے لیے قانون وضع کئے تھے لہٰذا دورِ جدید میں یہاں پر جنگلی جانوروں کے تحفظ کے لیے خاص انتظام کرنا ضروری ہے۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور اس میں ۳۵۰ نوع دودھ پلانے والے جانور پائے جاتے ہیں۔ پرندوں کی نوعی تعداد تقریباً ۲۱۰۰ ہے اور کیڑے مکوڑوں کی تقریباً بیس ہزار نوعی تعداد ہے۔ لہٰذا ان کی دیکھ بھال صحیح طور پر کرنا مشکل کام ہے۔ علاوہ ازیں انسانی آبادی میں اضافے کی بنا پر صنعتی اور زرعی ترقی کے لیے جنگلاتی علاقوں کی حدود کو کم کرنا پڑا جس سے جنگلی جانوروں کے تحفظ میں مزید خلل پیدا ہوا لیکن اس تبدیلی سے چند جانور زیادہ متاثر ہوئے اور یہ خطرہ محسوس کیا جانے لگا کہ اگر ان کے تحفظ کا انتظام نہ کیا گیا تو یہ ختم ہو جائیں گے لہٰذا ۶۶ دودھ پلانے والے جانوروں کی نوع، ۳۸ پرندوں کی نوع اور ۱۸ حل بھوما اور رینگنے والے جانوروں کی نوع کے تحفظ کا خاص انتظام کیا گیا کیونکہ ۱۹۷۲ء کے جنگلی جانوروں کے تحفظ کا ایکٹ میں ان کو جلد ختم ہونے والے جانوروں میں شامل کر لیا گیا۔

ان کے تحفظ کے لیے ۱۹ قومی پارک اور ۲۰۲ جانوروں کے لیے جائے پناہ سانکچوئری جن کا رقبہ ۲۳،۶۳،۵۷ مربع کلومیٹر ہے مگر یہ تمام ایک ہی قسم کے نہیں ہیں بلکہ بعض بعض ایک مخصوص جانور کے ہیں مثلاً گیر جنگل کا قومی پارک اور جائے پناہ ببر شیر کے لیے، قاضی رنگا کی جائے پناہ گینڈا کے لیے، ڈاچی گام کی جائے پناہ کشمیری بارہ سنگھا کے لیے، بھرت پور گھانا کی جائے پناہ پرندوں کے لیے ہے علاوہ ازیں کنہا اور کوربٹ قومی پارک مختلف قسم کے جنگلی جانوروں کے لیے مشہور ہیں۔ ان قومی پارکوں اور جائے پناہوں کے لیے مرکز کافی رقم دیتی ہے اور ان کی نگرانی کے لیے جو عملہ ہوتا ہے ان کا خرچ صوبائی حکومتیں برداشت کرتی ہیں۔

جنگلی جانوروں کے تحفظ کے لیے حکومت نے ۱۹۵۲ء میں ایک بورڈ بنایا تھا اور اسی طرز پر ۱۹۷۲ء میں صوبائی حکومتوں نے بھی بورڈ بنایا۔ یہ بورڈ ان کی بہتری کے لیے حکومت کو رائے دیتا ہے۔ اس بورڈ نے کارکردگی میں بہتری پیدا کرنے کی غرض سے تین مخصوص شعبے بنائے ہیں ایک جانوروں کے لیے مخصوص ہے، دوسرا پودوں کے لیے اور تیسرا پرندوں کے لیے۔

خوراک و زراعت کے ادارے نے مگرمچھ اور گھڑیال کی افزائش کی غرض سے ایک مخصوص تحقیقی ادارہ کھولا ہے جہاں پر مگرمچھ اور گھڑیال کے انڈوں سے بچے نکالے جاتے ہیں اور بچوں کو جھیلوں اور مخصوص جائے پناہوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔

دہرہ دون کے جنگلاتی کالج اور تحقیقی ادارے میں ۱۹۶۹ء سے جنگلی جانوروں کی دیکھ بھال کے لیے چھ ماہ کی تربیت دی جاتی ہے اور ۱۹۷۷ء سے ایک سال کی تعلیم کے بعد ڈپلومہ کی ڈگری ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو جنگلات میں B.Sc کرنے کے بعد داخلہ لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں جو طالب علم جنگلی جانوروں کی دیکھ بھال کے مسائل پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں ان کو PhD حاصل کرنے کے دوران وظیفہ دیا جاتا ہے۔

حکومت کے ان اہم اقدام کے علاوہ چند عوامی ادارے بھی اس نیک کام میں لگے ہوئے ہیں جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

۱۔ بمبئی نیچرل ہسٹری کال سوسائٹی جو ۱۸۸۳ء سے کام کر رہی ہے۔

۲۔ جنگلی جانوروں کے تحفظ کی سوسائٹی جو ۱۹۵۶ء سے دہرہ دون میں کام کر رہی ہے۔

۳۔ عالمی اور قدرتی وسائل کے تحفظ کا ادارہ۔

۴۔ عالمی جنگلی جانوروں کے تحفظ کا مالی ادارہ۔

۵۔ خوراک و زراعت کا ادارہ۔

مجموعی طور سے بیس سال سے یہ ہوتا آیا ہے کہ

(باقی صفحہ ۶۵ پر)

این۔ ایف۔ تیواری

متوازن شہرکاری

اُترپردیش کا مطالعاتی جائزہ

انسٹی ٹیوٹ آف ٹاؤن پلانرز کی طرف سے کیے گئے ایک تحقیقی مطالعہ کی بناپر مصنف نے اُترپردیش کی بڑھتی ہوئی شہر کاری پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے نتیجے میں چھوٹے اور متوسط قصبوں کو ترقی دینے کی ضرورت پر زور دیا ہے تاکہ بڑے شہروں کو بے تحاشہ پُر ہجوم ہونے سے روکا جاسکے۔

چھوٹے اور متوسط قصبوں کی ترقی کو کچھ عرصہ سے تمام ملک میں شہرکاری کے رُجحان کو ایک نئی سمت دینے کے لیے بنیادی طور پر ایک اچھی حکمت عملی تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ حکومتوں کو نہ صرف اس امر کے بارے میں پالیسی کے سوالوں سے تحریک ہوئی ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں سروسوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو کیونکر پورا کیا جائے اور ریاست کے دیگر کم آباد شہری علاقوں کو آئندہ ترقی دے کر شہری ترقی کو کیونکر بڑھاوا دیا جائے بلکہ دیگر سماجی و سیاسی مقاصد سے بھی انھیں تحریک حاصل ہوئی ہے جیسے کہ دیہی اور شہری علاقوں کے درمیان عظیم تر باہمی تعلق، روزگار کے مواقع کی تخلیق اور علاقوں کے درمیان عظیم تر توازن۔

بڑھتی ہوئی شہرکاری

ریاست اُترپردیش میں ۸۱-۱۹۷۱ کے درمیان شہری آبادی کی شرح افزائش بہت اونچی رہی۔ یہ تمام بھارت کی ۸۵ر۳ فیصد شرح افزائش کے مقابلے میں ۹ر۴ فیصد سالانہ تھی۔ ریاست کے شہری علاقوں میں نقل مکانی کی اوسط شرح تقریباً ۷ر۱ فیصد سالانہ تھی۔ افزائش زیادہ تر درجہ چہارم اور درجہ پنجم کے زُمروں کے قصبوں میں ہوئی جن کی تعداد ۵۰۷ ہے جبکہ ریاست کے کُل شہری مرکز ۶۵۹ ہیں۔

۸۱-۱۹۷۱ء کی دہائی کے دوران تقریباً ۲۶۶ نئے شہری مرکزوں کا اضافہ ہوا جو معیشت میں ایک اعلیٰ تعمیری تبدیلی کا مظہر ہے اور جس کے باعث دونوں زرعی طور پر خوشحال اور زرعی طور پر جامد خطوں سے مزید دیہی عوام شہری علاقوں میں چلے گئے۔ ۱۹۷۱ء میں درجہ اوّل کے ۲۲ قصبوں میں ریاست کی کُل آبادی کے تقریباً ۵ر۵ فیصد لوگ بودوباش رکھتے تھے۔ اس کے مقابلے میں ۱۹۸۱ء کے دوران درجہ اوّل کے ۳۰ قصبوں میں کُل شہری آبادی کے تقریباً ۵۱ فیصد لوگ رہتے تھے۔ اس طرح حالیہ مدت میں تمام ریاست میں ایک اہم علاقائی توازنی قوت ظہور میں آئی ہے۔

علاقائی تفاوت

لیکن ریاست کے پانچ خطوں کے درمیان ترقیات کے لحاظ سے کافی فرق ہے۔ مغربی خطہ اقتصادی طور پر نہایت ترقی یافتہ ہے۔ اس کے بعد وسطی خطہ، مشرقی خطہ، پہاڑی خطہ اور بُندیل کھنڈ کا نمبر آتا ہے۔ مغربی خطہ میں ریاست کی کُل آبادی کے اندازاً ۹ر۴۶ فیصد لوگ آباد ہیں۔ بعدازاں مشرقی خطہ میں ۴ر۲۲ فیصد اور وسطی خطہ (جس کا بارہ بنکی حصہ ہے) میں ۸ر۲۰ فیصد لوگ بودوباش رکھتے ہیں۔

چھوٹے قصبوں کی بڑھتی ہوئی اہمیت

یہ امر واضح ہے کہ چھوٹے اور متوسط قصبوں کو مستقبل میں ملک کی شہرکاری پالیسی میں اہم

رول ادا کرنا ہوگا۔ اس رول کو ادا کرنے کے لیے قصبوں کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ ترقیاتی پروگراموں کے لیے اقتصادی طور پر سودمند یونٹ بنیں۔

۸۱ - ۱۹۷۱ء کی گزشتہ دہائی کے دوران جن رجحانات کا اظہار ہوا ہے اُن سے پتہ چلتا ہے کہ شہری آبادی کی تقسیم کے شعبے میں چھوٹے اور متوسط قصبوں کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں درجہ اوّل کے شہروں میں شہری آبادی ۵۷ فیصد تھی اور اس کے مقابلے میں ۱۹۸۱ء میں وہ محض ۵۱ فیصد رہ گئی۔ اس کے علاوہ ۸۱ - ۱۹۷۱ء کے دوران شہری مرکزوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا جو زیادہ تر قصبوں کے درجہ چار سے درجہ چھ کے زمروں میں تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دیہی علاقوں کی تعمیری حیثیت میں بڑی تبدیلی آئی ہے جس سے دیہی عوام نزدیکی شہری مرکزوں میں جا رہے ہیں۔ مندرجہ بالا کی روشنی میں چھوٹے اور متوسط قصبوں کے رول نے ریاست بھر میں شہری آبادی کی منصفانہ تقسیم میں نازک پوزیشن اختیار کرلی ہے۔

اگرچہ درجہ اوّل کے قصبوں کی حالت میں ہر ۱۰۰ مربع کلومیٹر کے لیے ۶۲۵ کلومیٹر پختہ سڑکیں بنی ہوئی ہیں۔ درجہ دوئم کے قصبوں کی حالت میں پختہ سڑکوں کی لمبائی ۳۵۶ کلومیٹر اور درجہ ششم کے قصبوں کی حالت میں وہ ۹۳ کلومیٹر ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے بیشتر قصبوں میں کچی سڑکیں ہی ہوئی ہیں۔ جو یہاں کے باشندوں تک پہونچنے کا کام کرتی ہیں۔ دوسری طرف ان میں سے بیشتر قصبوں میں پانی کی سپلائی کا زیادہ تر دارومدار تالابوں اور کنوؤں پر ہے۔ ۱۹۷۱ء میں کیے گئے ایک تحقیقی مطالعہ میں یہ پایا گیا کہ درجہ دوئم کے قصبوں میں بھی جہاں نل کا پانی سپلائی کیا جاتا ہے۔ ۳۰ میں سے ۴ قصبوں میں پانی کی فی کس سپلائی اُس سے بھی بہت کم تھی جس کی کم از کم ضرورت ہوتی ہے۔

صحتی سروسز کی کمی

صحت و صفائی کی حالت بہت مایوس کُن ہے۔ مجموعی طور پر صرف ۴.۱۷ چھوٹے اور متوسط قصبوں میں بعض قسم کی زمین دوز نالیوں کا اہتمام ہے۔ ۶.۰۶ ایسے قصبے ہیں جہاں نہ تو زمین دوز نالیاں ہیں اور نہ ہی انھیں بنانے کا کام ہو رہا ہے۔ آبی آلودگی کے تدارک اور کنٹرول سے متعلق سنٹرل بورڈ (نئی دلی) کی جانب سے کیے گئے ایک سروے میں (اُتر پردیش کے درجہ دوئم کے) ۲۰ قصبوں میں حسبِ ذیل نکات کو واضح کیا گیا۔

۱۔ زمین دوز اور غیر زمین دوز نالیوں والی آبادی کا تناسب ۲۰/۹۴ فی صد اور ۹۱.۰۶ فیصد بالترتیب ہے۔

۲۔ ۹۴/۲۵ فیصد گندا پانی زمین دوز نالیوں کے ذریعہ اکٹھا کیا جاتا ہے اور

۳۔ گندے پانی کو قابلِ استعمال بنانے کے لیے کوئی عمل نہیں کیا جاتا۔

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست کے ۲۳۴ چھوٹے اور متوسط قصبوں میں ۱۴۹ ایسے شہری علاقے ہیں جہاں کھلے تالاب ہیں جبکہ ۵۳ دیگر قصبوں میں زمین دوز تالاب ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کھلے تالابوں اور کھلی سطح کی نالیوں کو گندا پانی نپٹانے کا نہایت عام طریقہ تسلیم کیا گیا ہے۔ درجہ دوئم کے قصبوں میں جس طریقے سے گندے پانی کو نپٹایا جاتا ہے اُس سے زمین اور پانی کی آلودگی بڑھتی ہے۔

بیشتر قصبوں میں جہاں زمین دوز نالیاں نہیں ہیں وہاں انسانی فضلہ سر پر اُٹھا کر نپٹایا جاتا ہے۔ کھلی سطح کی نالیاں اور کھلے تالاب بہت زیادہ شہری علاقوں میں موجود ہیں۔ کھلی نالیوں میں جراثیم، مکھیاں اور مچھر خوب پنپتے ہیں، جو نہایت غیر صحتمندانہ حالات کا باعث بنتے ہیں۔

چھوٹے اور متوسط قصبوں میں بالعموم صحتی سہولیات بہت کم دستیاب ہیں۔ ہسپتالوں کی اوسط تعداد درجہ دوئم کے فی قصبہ میں ۴.۴ ہسپتالوں سے لےکر درجہ پنجم اور ششم کے قصبوں میں عموماً ۱.۵ ہسپتال ہیں۔ درجہ اوّل کے ہر قصبے کے لیے ڈسپنسریوں کی تعداد سرسری طور پر اوسطاً ۵.۵ فیصد ہے۔ اس کے مقابلے میں درجہ دوئم کے ہر قصبے کے لیے ڈسپنسریوں کی تعداد ۱.۱ ہے جو درجہ پانچ اور درجہ چھ کے قصبوں کی حالت میں کم ہوکر ۱.۴ رہ گئی ہے۔ ۳ ہزار سے کم آبادی والے بیشتر قصبوں میں صرف ابتدائی صحتی مرکز ہیں جو نواحی دیہی علاقوں کی صحتی ضروریات بھی پورا کرتے ہیں۔

اسی طرح درجہ سوئم سے درجہ ششم تک کے ۶۳۲ قصبوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے صرف ۱۰۸ خاندانی منصوبہ بندی کے مرکز ہیں اور ان ۶۳۲ قصبوں کے لیے ۳۵ ٹی بی کلینک ہیں۔ دوسری صحتی سروسوں کی حالت بھی دگرگوں ہے۔

خواندگی کی مایوس کُن حالت

جہاں تک خواندگی کی سطح کا تعلق ہے وہ قصبوں کی جسامت کے درجے میں کمی آنے کے ساتھ عام طور پر زوال پذیر ہو رہی ہے تعلیم نسواں کی سطح تو بالخصوص بہت پست ہے جو ان علاقوں کے لیے بڑی تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ان چھوٹے اور متوسط قصبوں میں بیشتر قصبے نواحی دیہی علاقوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کے مرکزوں کا کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ خود قصبے کی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ نواحی علاقوں کی ضروریات کے باعث ایسے قصبوں میں تعلیمی مرکزوں کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ سرسری طور پر ایک میٹرکیولیشن یا ثانوی معیار کا اسکول ۲۰ ہزار کی آبادی میں کام کر رہا ہے۔ اسی

طرح ایک انٹرمیڈیٹ کالج تقریباً ۳۰ ہزار کی آبادی کی ضروریات پوری کر رہا ہے جس میں نواحی علاقوں کے لوگ بھی شامل ہیں۔

عام طور پر چھوٹے اور متوسط قصبوں کے لوگوں کی آمدنی بہت کم ہے۔ اُن میں درج فہرست ذاتوں اور پسماندہ طبقوں کی بھاری تعداد آباد ہے۔ ان گروپوں اور خود قصبوں میں حسبِ ذیل متعدد مسائل کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

علاقائی مسائل

۱۔ اگرچہ چھوٹے اور متوسط قصبوں میں روایاتی طور پر دستکار طبقے کے لوگ کافی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ تاہم اُنھیں منظم مارکیٹنگ ذرائع تک بہت کم رسائی حاصل ہے جس سے اُن کی پیداواری صلاحیت کم ہوجاتی ہے اور اس کے نتیجے میں اُنھیں موسمی روزگار یا کم روزگار یا بے روزگاری کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔

۲۔ غیر صحتمندانہ ماحول

ان علاقوں میں صفائی کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مثال کے طور پر ان شہری علاقوں میں انسانی بول و براز کو صفائی کے ساتھ نپٹانے کے ذرائع عملاً مفقود ہوتے ہیں۔ ان شہری علاقوں میں تیز رفتار ترقی کے باعث پہلے جن کھلی جگہوں کو لوگ رفع حاجت کے لیے استعمال کرتے تھے وہاں اب بتدریج نئی کالونیاں بن رہی ہیں۔ اس کے نتیجے میں مرد، خواتین اور بچے عموماً سڑکوں کے کنارے، پٹریوں، پارکوں اور ریل کی لائنوں کے ساتھ ساتھ اور کھلی نالیوں میں رفع حاجت کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ برسات میں کھلی نالیوں کی حالت بہت خراب ہو جاتی ہے اور گندگی پھیلنے کے باعث بیماریاں پھیلنے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔

۳۔ ناقص پانی کی بے قاعدہ سپلائی

انتہائی افلاس اور ناخواندگی سے ہونیوالی ناقص صحت و صفائی کے نتیجے میں پانی سے متعلقہ امراض اکثر بچوں کی اموات کا باعث بنے ہوئے ہیں۔

۴۔ خاندانی بہبود کی موزوں سروسوں کی کم دستیابی اور کارکن ماؤں کے بچوں کی بالغوں کی جانب سے ناکافی دیکھ بھال۔

۵۔ واحد والدین کا کنبہ جہاں خواتین روزی کمانے کے لیے گھر کے باہر چلی جاتی ہیں اور اس وجہ سے بچے اکثر بالغوں کی جانب سے دیکھ بھال اور تربیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

۶۔ مائیں چھاتی کا دودھ جلد چھڑا دیتی ہیں جس سے بچے کم غذائیت کا شکار ہو جاتے ہیں اور صحت و ماحول کے خراب حالات سے وہ اسہال میں مُبتلا ہو جاتے ہیں اور نقد آمدنی نہ ہونے سے کم از کم ضروری غذائیت اور علاج معالجہ سے محروم ہو جاتے ہیں۔

۷۔ کم آمدنی والے علاقوں میں امدادی پروگراموں کی تعمیل کے لیے سرمایہ کی کمی اور کمزور اداراتی ڈھانچہ میونسپل نظامتی ڈھانچہ بھی نہایت کمزور ہے، جس سے اُن بنیادی شہری سروسوں میں امداد نہیں دی جاسکتی ہیں جن میں کمیونٹی ترقیاتی کام بہت حد تک شامل ہوتے ہیں۔

۸۔ خواندگی اور اسکولی داخلے کی کم شرح اور ترقیات پر آنے والی بھاری لاگت۔

بڑی خامیاں زیادہ تر تعلیم نسواں کے شعبے میں پائی جاتی ہیں۔

●

بقیہ فراقؔ گورکھپوری کا ایک مرثیہ

اور آخیر میں ایک ایسا شعر ہے جو نہ صرف غم کی شدّت کا اظہار کرتا ہے بلکہ ان سماجی ذمّہ داریوں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جو بھائی کی موت کے بعد فراقؔ کے کاندھوں پر آپڑی ہیں، مگر چوں کہ وہ قیدِ فرنگ میں ہیں اس لیے اپنی ذمّہ داریاں پوری کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ صورتِ حال ان کی ذہنی اور روحانی پریشانی کا باعث ہے اور واضح کرتی ہے کہ آزادی کی جدوجہد کرنے والوں اور سیاسی قیدیوں کو کیسی کیسی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا تھا اور ان کے اہلِ خاندان، بوڑھے ماں باپ، چھوٹے بھائی بہن۔ کن کن مسائل کا شکار نہ ہونے ہوں گے ؎

گھر کو میں کیا مُنہ دکھاؤں گا رہا ہو کر فراقؔ
ہیں اسیر اور اُن کا یہ حالِ پریشاں ہائے ہائے

یہ مرثیہ آج سے چونسٹھ سال پہلے لکھا گیا تھا۔ مگر اس کے استعاروں یا غم کے جو کوندے لپکتے ہیں، وہ آج بھی اتنے ہی شرر انگیز ہیں جیسے پہلے تھے۔ اور یہی لازوال غم کی پہچان ہے۔ اس مرثیے کی بازگشت ان کی مشہور نظم 'ہنڈولا' میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

غم کا سچّا اور کربناک احساس ہی مرثیے کو جنم دیتا ہے اور نوحہ خوانی اور ماتم گساری پر مجبور کرتا ہے، اور اُردو کی ادبی روایت اور تاریخی بصیرت کے طور پر اس کے ڈانڈے غمِ حسینؑ سے جاملتے ہیں۔

●

ڈاکٹر ڈی۔ کے۔ بھارگو

تیزابیت اور آنتوں کا السر

تیزابیت جس سے نظام ہضم بگڑتا ہے عام لوگوں میں کافی
پائی جاتی ہے۔ اس کا سبب معدے کے بعض خلیوں کی طرف
سے تیزاب کا زیادہ اخراج۔ اس سے آنتوں کا السر یا غیر السری بدہضمی
ہو سکتی ہے جس کے لیے الگ الگ علاج درکار ہیں۔ بعض امور
تیزابیت سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں، جیسے اسپرین کا استعمال،
سگریٹ نوشی، شراب نوشی، جذباتی دباؤ، تناؤ اور تولیدی امور۔

تیزابیت سے مراد ہے معدی
ترشے میں اضافہ۔ اسے عام طور پر آنتوں کے السر
والے مریضوں اور ان لوگوں میں دیکھا جاتا ہے جو غیر
السری بدہضمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس ضعف معدہ
کی علامتیں پیٹ کے اوپری حصے میں درد یا بے چینی،
کلیجے میں جلن، قے، پیٹ سے کھٹا پانی منہ میں آنے کی
صورت میں ظاہر ہو سکتی ہیں۔ یہ علامتیں خصوصی نہیں ہیں
کیونکہ یہ دیگر امراض جیسے پتے میں جلن، اور معدے
کے السر وغیرہ میں بھی موجود ہو سکتی ہیں۔ السر ایک
زخم ہے جو جھلی کو گزند پہنچنے سے پیدا ہوتا ہے۔

معدی ترشے کا اخراج

ضعف معدہ کی علامتیں ہمارے ملک کی تقریباً
۱۰ فیصد آبادی میں پائی جاتی ہیں۔ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ
آف میڈیکل سائنسز کے امراض شکم کے بیرونی
شعبے میں یہ ایک بڑا عام مسئلہ ہے۔ ان مریضوں کی
اکثریت السر کے بجائے غیر السری بدہضمی میں مبتلا
ہوتی ہے۔

معدی ترشہ یعنی ہائیڈرو کلورک ایسڈ غذا
ہضم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کا اخراج معدے
کے لعاب میں موجود پیری ٹیل (PARIETAL)
خلیوں سے ہوتا ہے۔ فاقہ کشی کی حالت میں اس
رطوبت کی پیداوار زیادہ سے زیادہ پیداوار کی
۱۰ فیصد ہوتی ہے۔ پیٹ کی خرابیوں سے مذکورہ
بالا خلیوں کے اندر حیاتیاتی کیمیاوی رد عمل ہوتے

ہیں جس کے نتیجے میں زیادہ معدی ترشے کا اخراج
ہوتا ہے۔

کسی کسی مریض میں پیٹ کا السر کئی اسباب سے ہو سکتا ہے

عام طور پر چھوٹی آنتوں کی سالمیت، تیزاب،
پیپسن اور پیٹ میں پیدا ہونے والے انزائمز اور لعابی مدافعت
کے درمیان توازن برقرار رہتا ہے۔ جب یہ توازن بگڑ
جاتا ہے تو السر پیدا ہوتا ہے۔ آنتوں کے السر میں تیزاب
اور پیپسن کا بہت زیادہ اخراج ہوتا ہے۔

خطرے کے امور

(۱) غذا اس امر کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ
غذائی امور آنتوں کا السر پیدا کرتے یا انھیں دوبارہ
سرگرم کرتے ہیں گو بعض غذائیں، مشروبات اور مسالے
ضعف معدہ پیدا کر سکتے ہیں۔ بھارت میں غذا ایک
اہم سبب ہو سکتی ہے کیونکہ جنوبی بھارت کے
چاول خوروں میں شمالی بھارت کے گیہوں خوروں
کے مقابلے میں السر کا مرض زیادہ عام ہوتا ہے۔ ایک
مطالعہ میں یہ پایا گیا ہے کہ گیہوں کی غذا کی نسبت
چاول کی غذا زیادہ السر کا باعث بنتی ہے۔ ایسا اس
لیے ہے کیونکہ گیہوں کی غذا کے مقابلے میں چبانے
کے لیے لعاب کی زیادہ پیداوار درکار ہے۔ اس سے
تیزاب اور صفرا کے اخراج میں کمی ہوتی ہے۔

یکم تا ۳۱ مئی ۱۹۸۷

(ب) ادویات: اسپرین سے معدے اور آنتوں کے لُعاب کو نقصان پہنچتا ہے جس سے وہ چھِل جاتی ہیں اور اوپری آنتوں سے خون بہنے لگتا ہے۔ اسپرین لینے والے تھوڑے سے مریضوں کو السر ہو جاتا ہے گو اُنھیں معدے کے السر کی نسبت آنتوں کے السر کا کم تر خطرہ ہوتا ہے۔ دوسری دوائیوں جیسے انڈومیتھیسین (INDOMETHACIN) وغیرہ سے السر ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔

(ج) سگریٹ نوشی: سگریٹ نوشی کرنے والوں کو السر کا زیادہ خطرہ ہوتا ہے اور اس کا براہِ راست تعلق سگریٹ نوشی کی مقدار سے ہوتا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ سگریٹ نوشی السر کو ٹھیک نہیں ہونے دیتی اور اس سے دوبارہ السر ہو جاتا ہے۔ ایسا اس لیے ممکن ہے کیونکہ بائی کاربونیٹ کا اخراج کم ہو جاتا ہے اور آنتوں میں معدی ترشہ بڑھ جاتا ہے ایسا سگریٹ نوشی کرنے کی حالت میں ہوتا ہے۔

(د) تولیدی امور: ۳۰ سے ۴۰ فیصد مریض جن کے خاندان میں السر ہوتا ہے، تولیدی سبب سے السر کا شکار ہوتے ہیں۔ اسی طرح السر کے مریضوں کے درجۂ اول کے رشتہ داروں میں تین گنا زیادہ السر عام پایا جاتا ہے۔ مزید برآں آنت کا السر اُن اشخاص میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ جن کا خون "او" گروپ کا ہوتا ہے۔

(س) نفسیاتی امور: جذباتی امور معدے کی کارکردگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آنتوں کے السر کے بیشتر مریض تیز موٹر گاڑی چلانے والے اور زیادہ اُمنگیں رکھنے والے منتظم ہوتے ہیں۔ جذباتی دباؤ السر پیدا کر سکتا ہے یا اُسے بڑھا سکتا ہے۔

(ص) رُوحانی امراض: بعض پُرانے امراض جیسے پھیپھڑے کے پُرانے امراض، گردے کی خرابی اور اُس کی جگہ نیا گردہ لگانے، جگر کی خرابی اور جوڑوں کے درد سے بھی پیٹ کا السر ہو سکتا ہے۔

علامتیں

آنتوں کے السر کا درد عموماً اوپری پیٹ کے مرکزی حصے میں ہوتا ہے جو کھانے کے ایک سے تین گھنٹے بعد ہوتا ہے۔ یہ زیادہ تر رات کے وقت ہوتا ہے۔ الکلی اور غذا سے راحت ملتی ہے۔ لیکن دیگر بیماریوں جیسے معدے کے السر اور غیر السری ضعفِ معدہ کے آنتوں کے السر کا امتیاز کرنے کے لیے یہ علامتیں نہ ہی خصوصی ہیں اور نہ ہی حساس ہیں۔ مزید برآں السر ۲۵ فیصد مریضوں میں کسی علامت کے بغیر موجود ہو سکتا ہے بعض مریضوں میں نس پھٹنے اور آنتوں میں رکاوٹ جیسی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ غیر السری ضعفِ معدہ میں زیادہ تر پیٹ کا اوپری حصہ بھرا بھرا سا رہتا ہے، جلن ہوتی ہے یا کھٹا پانی اوپر کو آتا ہے۔ جہاں تک اعداد و شمار کا تعلق ہے، پُرانے پیٹ درد کے ۵۰ فیصد مریضوں کو غیر السری بدہضمی ہوتی ہے۔ اُن میں سے بعض میں پُرانا آنتوں کا السر ہو سکتا ہے اور ۳۰ فیصد مریضوں میں ۷ سے ۲ برس کے اندر آنتوں کا السر ہو سکتا ہے۔ یہ مریض عموماً افسردہ رہتے ہیں اور اِن میں تناؤ بنا رہتا ہے۔ ان کے علاوہ ان میں کئی دوسرے امراض ہو سکتے ہیں جن میں بدہضمی جیسی علامتیں ہو سکتی ہیں جیسے صفراوی امراض اور معدے کا السر وغیرہ۔

تشخیص

جن مریضوں کو بدہضمی ہوتی ہے اُن میں سے ہر ایک کو بیریم ایکسرے یا جدید اینڈوسکوپی (اندرون نما) سے معائنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا انحصار بیماری کی طوالت، مریض کی عمر اور علامتوں کے باعث مریض کی سرگرمیوں میں رکاوٹ پر ہوتا ہے۔ دُہرے معائنوں سے احتراز کیا جانا چاہیئے کیوں کہ ان پر بھاری لاگت آتی ہے۔ علاج معالجے کے اثر کا جائزہ لینے کے لیے خصوصی ضابطوں سے احتراز کیا جانا چاہیئے۔

اگر السر ہو تو اُس کے علاج کا بنیادی مقصد علامتوں کو دُور کرنا، السر کو ٹھیک کرنا اور پیچیدگیوں کی روک تھام کرنا ہے۔

خوراک: دُودھ اور دُودھ سے بنی اشیاء پر مشتمل غذائیں، نرم مسلی ہوئی غذائیں اور موٹے غذائیں السر کے علاج میں کبھی مفید نہیں پائی گئیں۔ دودھ کا بار بار اور زیادہ استعمال بھی تیزاب کا زیادہ اخراج کر سکتا ہے اور ان سے شریانیں سکڑتی ہیں۔ مریضوں کو غذا کے معاملے میں آزادی دی جانی چاہیئے۔ تھوڑی تھوڑی غذا کچھ کچھ وقفے کے بعد دی جا سکتی ہے لیکن اس میں اور تین باقاعدہ غذاؤں کے معاملے میں زیادہ فرق نہیں دیکھا گیا۔ سونے کے وقت کھانا نہ دیا جائے۔ کھانے کو اچھی طرح چبایا جائے تاکہ وہ لُعاب کے ساتھ اچھی طرح مل جائے۔ السر کے ٹھیک ہونے کے بعد کافی یا چائے تھوڑی مقدار میں (دن میں ۳ یا ۴ کپ) چینی اور دودھ کے ساتھ لے جا سکتی ہے۔ زیادہ شراب کے استعمال کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ لیکن تھوڑی سی مقدار نقصان دہ نہیں ہوسکتی۔ سگریٹ نوشی بالکل بند کی جائے کیوں کہ اس سے آرام آنے میں دیر لگتی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ السر کے علاج میں مرچ کی تھوڑی سی مقدار رُکاوٹ نہیں ڈالتی اس لیے خوراک میں مرچ تب تک بند نہیں کرنی چاہیئے جب تک کہ اس سے بدہضمی نہ ہو جائے۔ پھلوں کا رس اور دیگر غیر الکوحلی مشروبات تھوڑی مقدار میں لیے جا سکتے ہیں۔ اگر انفرادی طور پر مریض اپنے معالجوں کو بتائیں کہ بعض غذاؤں یا مشروبات سے بیماری کی علامتیں بڑھتی ہیں تو اُنھیں اُن غذاؤں اور مشروبات کو بند کر دینا چاہیئے۔

ادویات: متعدد قسم کی ترشہ شکن ادویات بازار میں دستیاب ہیں۔ وہ اپنی قوت، ذائقے، مخالفانہ اثرات اور سوڈیم جُزو کے لحاظ سے گوناگوں

ہیں کیلشیم کاربونیٹ اور سوڈیم بائی کاربونیٹ کارآمد ہیں تاہم اُن کا استعمال نہیں کیا جانا چاہیئے۔ کیوں کہ وہ نقصان دہ ہو سکتے ہیں۔

ترشہ شکن ادویات کے علاوہ کئی نئی دوائیاں حالیہ برسوں میں رائج ہوئی ہیں، ان میں سیمیٹی ڈائن (CIMETIDINE) اور رینٹی ٹی ڈائن (RANI-TIDINE) وغیرہ شامل ہیں۔

سرجری : سرجری اُس وقت ضروری ہو جاتی ہے جب پیٹ کی آنتوں میں سوراخ ہو جائیں، رُکاوٹ پیدا ہو جائے، نسوں کے پھٹنے سے خون بہنے لگے اور دوائیاں اثر کرنا بند کر دیں۔ خون کے بہاؤ پر جدید تکنیکوں سے اینڈوسکوپ کے ذریعے اور انجکشنوں سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ ہمارے جیسے ترقی پذیر ملکوں میں اُن لوگوں کے لیے سرجری کے بارے میں بھی سوچا جا سکتا ہے جو لمبے عرصے تک طبی علاج معالجہ کی استطاعت نہیں رکھتے۔

غیر السری ضعفِ معدہ

ان مریضوں کا علاج آنتوں کے السر والے مریضوں کی مانند نہیں کرنا چاہیئے۔ بدہضمی کے مریضوں کو میٹوکلوپرامائیڈ (METOCLOPRAMIDE) کے سوائے کسی دوسری دوائی کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ بیشتر مریض ذیل میں مندرج پرہیز کے اقدامات سے بہتر محسوس کریں گے۔

پرہیز

علاج سے پرہیز بہتر ہے اور یہ زیادہ ارزاں بھی ہے۔ چونکہ ہم نے غیر السری اور السری بدہضمی کے مریضوں کو دیکھا ہے۔ اُن کی حالت میں نفسیات اہم حصّہ ادا کرتی ہے۔ وہ غیر السری بدہضمی والوں کی حالت میں زیادہ حصّہ ادا کرتی ہے۔

۱۔ غذا ۔ صحیح قسم کی خوراک کھانی چاہیئے۔ اور وہ متوازن ہونی چاہیئے۔ اُس میں دودھ، دہی، پھلوں کا رس، سبزیاں، شہد اور ریشے دار اناج شامل ہونا چاہیئے۔ جن غذاؤں میں زیادہ پروٹین اور چکنائی ہو اُن کا اعتدال کے ساتھ استعمال کیا جانا چاہیئے۔ زیادہ مسالے دار چٹپٹی یا کیمیکلوں والی خوراک سے احتراز کیا جائے اور غذا کو خوب چبا کر کھایا جائے۔

۲۔ مشروبات : زیادہ الکوحل، کافی، چائے، کولا اور چاکلیٹ سے احتراز کیا جائے۔

۳۔ ادویات : ایسپرین یا ایسپرین جیسی دوائیوں کے زیادہ استعمال سے احتراز کیا جائے۔

۴۔ سگریٹ نوشی بڑے خطرے کی چیز ہے۔ اسے قطعاً ترک کرنا چاہیئے۔

۵۔ جذبات پر قابو : ہمیں تشویش، مایوسیوں اور دُشوار جذبات پر کنٹرول کرنا چاہیئے۔ پیشے، تعلیم، مالی مسائل یا گھروں میں بیماری کے معاملے میں تناؤ اور دباؤ سے بچنا چاہیئے۔ یہ اعصابی اور نفسیاتی اسباب السری اور غیر السری بدہضمی میں یقیناً خطرناک ہیں۔ دھیان (مراقبے) اور یوگا جیسی تکنیکوں سے دماغ کو ہلکا رکھیئے۔

یہ کچھ طریقے ہیں جن سے کوئی بھی ترشہ سے وابستہ خطرے کے اسباب کو دُور کر سکتا ہے۔ ان اقدامات کے باوجود اگر علامتیں پھر بھی موجود ہوں تو ڈاکٹر سے مشورہ کیا جائے۔

(بشکریہ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز)

بقیہ، بندھوا مزدوروں سے متعلق سپریم کورٹ کا فیصلہ

بحال نہیں کیا گیا گو ۱۸ مہینے سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ ہمیں تعجب ہے کہ نوعِ انسانی کے ٹھکرائے ہوئے اپنے ساتھی انسانوں سے فراموش شدہ اور اپنی حکومت کی طرف سے نظر انداز کیے گئے یہ لوگ کیونکر اپنے وجود کو بنائے ہوئے ہیں وہ کیونکر اپنے بھوکے بچوں کے پیٹ کی آگ بجھا رہے ہیں اور کیونکر اپنی بیویوں کی ستر پوشی کر رہے ہیں؟ ان بدبخت انسانوں کے لیے زندگی شاید ایجیرن بنی ہوئی ہے اور وہ ایک نہ ختم ہونے والا عذاب ہے۔ یہ لوگ جو مدد کے لیے بھی نہیں چلّا سکتے کیونکہ انھیں علم ہے کہ اُن کی چیخ و پکار صدا بصحرا ہوگی اور جو اپنی زندگی کی گاڑی کو اس اُمید کے ساتھ گھسیٹ رہے ہیں کہ ایک روز موت اُنھیں مصائب سے نجات دلا دے گی آج قانون ساز اداروں، انتظامیہ اور عدلیہ سے دریافت کر رہے ہیں کہ "آپ لوگوں نے ہمارے لیے کیا کیا ہے۔ کیا ہمیں انسانی وقار کے ساتھ زندگی بسر کرنے اور آپ کی آزادی و ترقی کی نعمتوں میں شریک ہونے کا حق نہیں ہے یا ہمیں غلامی اور فاقہ کشی کی زندگی کے لیے مجبور کر دیا ہے جس سے ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بچوں کے نحیف جسم دیکھتے ہیں جن کے رُخسار اور آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں اور جو سُوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں اور دَم توڑنے والے ہیں۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اُن ہدایات اور احکام کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں جو میرے فاضل برادر نے اس فیصلے میں سُنائے ہیں۔

(نیرج چودھری بنام ریاست مدھیہ پردیش)

جمیل اختر[۵]

اُردو شاعری کی ہندی اصناف

دلّی میں سہ روزہ کُل ہند سیمنار

۲۸ فروری تا ۲ مارچ ۱۹۸۷ء کو ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار "اردو شاعری کی ہندی اصناف" کے موضوع پر غور و فکر کے لیے ایک سہ روزہ کل ہند سیمنار اُردو اکادمی، دلّی کے زیرِ اہتمام "غالب اکیڈمی" میں منعقد ہوا۔ یہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا سیمنار تھا جس کا مقصد اُردو اور ہندی کے باہمی رشتے اور رشتوں کی ان بنیادوں کی نشاندہی کرنا تھا جس سے یہ دو زبانیں اپنے وجود سے لے کر اب تک ایک دوسرے کی بقاء اور ترقی میں معاون و مددگار رہی ہیں تاکہ ان زبانوں میں جو فاصلہ ہے وہ کم ہو سکے اور ملکی اتحاد و سالمیت کو مزید مستحکم بنایا جا سکے۔

سیمنار کا افتتاحی اجلاس پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں صبح ساڑھے دس بجے شروع ہوا۔ سیمنار کا افتتاح کرتے ہوئے دلّی کے لفٹیننٹ گورنر اور اکیڈمی کے چیرمین جناب ایچ۔ ایل کپور نے کہا کہ ملک کے موجودہ حالات میں جب زبان، ثقافت اور مذہب کے نام پر بھائی کو بھائی سے لڑانے کی مذموم کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ دو مشترکہ تہذیبی اور لسانی قدریں تلاش کی جائیں اور ان کی پہچان عام ہو جائے جو پوری قوم کو یک جہتی کے رشتے میں پروتی ہے۔ تاکہ قومی اتحاد و سالمیت ان سے حرارت اور توانائی حاصل کر سکے۔

سیمنار کمیٹی کے چیرمین پروفیسر گوپی چند نارنگ



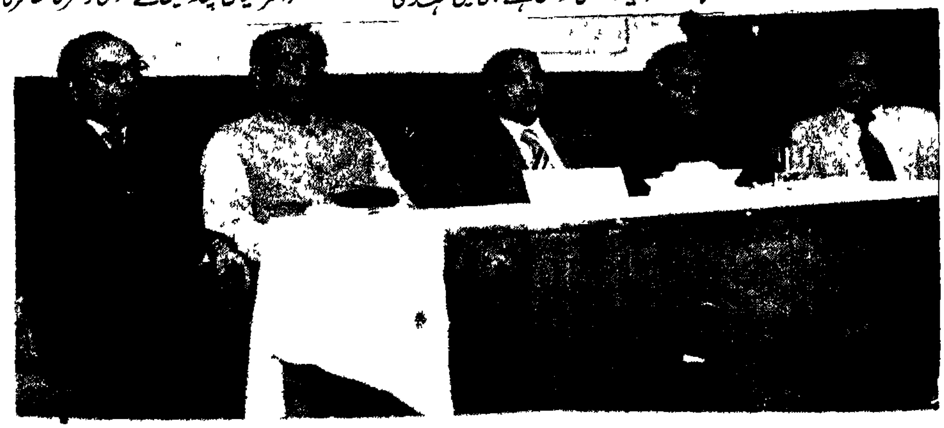
دائیں سے دا
عابد پشاوری،
پروفیسر مسعود حسن
شمس الرحمان،
پروفیسر جعفر

۵ ۱۵۶، کاویری ہوسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔

نے سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس سیمینار کا مقصد صرف دو زبانوں کے لسانی رشتوں کی نشاندہی کرنا ہی نہیں بلکہ تخلیقی رویّوں اور شعری سرچشموں کا بھی جائزہ لینا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ عوامی رواجوں کا فیضان کہاں تک پہنچا ہے۔ انھوں نے علمِ لسانیات کی روشنی میں اُردو اور ہندی کے باہمی رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اُردو کے بیشتر مصادر، افعال، امدادی افعال اور اسماء وہی ہیں جو ہندی میں بھی موجود اور مروّج ہیں۔ نارنگ صاحب نے اُن تخلیقی سرچشموں کی بھی نشاندہی کی جس سے دونوں زبانوں کے فن کاروں نے مشترکہ طور پر فیض اُٹھایا ہے۔

اجلاس کے مہمانِ خصوصی اور دلّی یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے سابق صدر وجیندر سناتک نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اُردو اور ہندی کے باہمی رشتوں کو پھر سے اُجاگر کرنے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ وحدت قائم ہو سکے۔

خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے کہا کہ اُردو ہندوستان کے مشترکہ کلچر کی زبان ہے اُردو کا نقصان ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا نقصان ہے۔ اُردو شاعری ہماری پوری تہذیب کے جلوۂ صد رنگ کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیب میں تین خاص



(بائیں سے دائیں)
ڈاکٹر ظ۔ انصاری، پروفیسر نامور سنگھ، پروفیسر ڈی۔ پی پٹنائک، ڈائرکٹر آف انڈین لینگویجز، جناب رشید حسین خاں اور پروفیسر مغنی تبسم

عناصر آریائی، دراوڑی اور وسط ایشیائی کی نشاندہی کی اور کہا کہ اُردو شاعری آریائی عناصر کے میل جول کو پیش کرتی ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کے شکریے کے ساتھ یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

سیمینار کا پہلا اجلاس پروفیسر نذیر احمد کی صدارت میں ہوا۔ جس میں دو مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں نے "اُردو کے آئینۂ شعر و سخن میں ہندی صد حال کی جلوہ گری" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے قدیم شعراء مثلاً میرؔ، انشاؔء کے شعری سرمائے میں ہندی الفاظ کی جلوہ گری دکھائی اور کہا کہ اُردو ایک ایسی زبان ہے جس میں ہندی کا ایک لفظ لائے بغیر کوئی جملہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

"اُردو میں بارہ ماسے کی روایت" پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کہا کہ بارہ ماسے کی روایت کا آغاز راسو گرنتھوں سے ہوا۔ اُردو بارہ ماسے کی روایت بھی اپنی روایت سے جُڑی ہوئی ہے۔

دوسرا اجلاس پروفیسر مغنی تبسم کی صدارت اور اختر الواسع کی نظامت میں ہوا۔ "اُردو میں گیت اور نعت کی روایت" پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر انصار اللہ نظرؔ نے کہا کہ ہندوستان میں گیت کو مذہبی تقدس حاصل رہا ہے اور یہ اولیاء و صوفیاء کی محفلوں میں گایا جاتا رہا ہے۔ انھوں نے نعت کی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ واضح شکلوں میں نعت گوئی کا سلسلہ سولہویں صدی سے شروع ہوتا ہے اور منقبت بھی اسی دور میں وجود میں آیا۔

پروفیسر شہاب سرمدی نے "اُردو اور ہندی کا اشتراکِ عمل" کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اُردو اور ہندی قومی زبان کی حیثیت سے برابر کا درجہ رکھتی ہے اور آج کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے دونوں کو اشتراکِ عمل کا اپنا وہ تاریخی رول ادا کرنا ہے جو شروع سے ان کا اپنا رہا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے "دکنی و گجری شاعری میں ہندی اصناف" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ دوہا، کبت، جھولنا اور گیت کی روایت ان دونوں زبانوں کی شاعری میں ملتی ہے۔ دکنی و گجری شعراء کے کلام کے حوالے سے ان اصناف کی نشاندہی کی اور اُن شعراء سے بھی متعارف کرایا جنھوں نے ان اصناف کو برتا ہے۔

پروفیسر نذیر احمد نے "مسعود سعد سلمان اور بارہ ماسہ" پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ فارسی ادب میں بارہ ماسہ کا وجود نہیں لیکن مسعود سعد کے یہاں ایسے قطعات اور نظمیں پائی جاتی ہیں جو بارہ ماسہ کے ضمن میں آتی ہیں اور جن میں الگ الگ بارہ مہینوں کا ذکر ملتا ہے

یکم مارچ کو تیسرا اجلاس ظ۔ انصاری کی صدارت میں شروع ہوا۔ ڈاکٹر محمد صابرین نے نظامت کے فرائض انجام دئے۔ یہ اجلاس لوک گیتوں کے لیے مخصوص تھا اس میں پانچ مقالے پڑھے گئے۔ ڈاکٹر ماجدہ اسد نے "آسند کے قدیم لوک گیت" پر اظہار خیال کرتے ہوئے قدیم شعری سرمائے میں لوک گیتوں کی نشاندہی کی اور کہا کہ لوک گیتوں کا رواج قدیم زمانے میں بھی مختلف سماجی، سیاسی اور مذہبی رسومات میں ہوتا تھا۔ اور یہ ہماری زندگی اور ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔

جناب مہیشور دیال نے دلی کے لوک گیت پر اپنا مربوط مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے جو لوک گیت ہم تک پہنچے ہیں ان کا سلسلہ دلی میں مسلم حکمرانوں کے دور سے شروع ہوتا ہے۔ عہدِ مغلیہ میں یہ روایت مضبوط ہوئی اور مسلمان صوفیا نے اسے ترقی دی۔

کاظم علی خاں نے "اتر پردیش کے لوک گیتوں کی روایت" پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں گیت کی روایت کا آغاز امیر خسرو سے ہوتا ہے جو اتر پردیش کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے مختلف مواقع پر گائے جانے والے لوک گیتوں کے ناموں کی نشاندہی کرتے ہوئے امانت، واجد علی شاہ اور حشر کے ڈراموں میں لوک گیتوں کی دریافت کی۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے "جدید اردو شاعری میں گیت" کے موضوع پر اپنا مبسوط مقالہ پیش کرتے ہوئے زبان و بیان، اسلوب اور موضوعات کی سطح پر گیت کی عہد بہ عہد تبدیلی پر روشنی ڈالی اور کہا کہ سماجی و سیاسی اور معاشرتی تبدیلی نے گیت کی زبان اور موضوعات پر اثر ڈالا ہے۔ داخلیت، اظہارِ ذات اور عشق و محبت کی جگہ خارجی واقعات و ارادات اور معاملات و مسائل نے لے لی۔ تحریکِ آزادی نے گیت کو باغیانہ اور انقلابی آہنگ و لہجہ عطا کیا اور آج آزاد شاعری کی طرح آزاد گیت لکھے جا رہے ہیں۔

چوتھا اجلاس پروفیسر مسعود حسین خاں کی صدارت میں ہوا۔ حبیب خاں نے "اردو میں دوہے کی روایت" سے گفتگو کرتے ہوئے دوہے کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ شمس الرحمان فاروقی نے "میر کی ہندی بحریں" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میر نے اپنی غزلوں میں جو بحریں استعمال کی ہیں وہ نہ ہندی ہیں نہ فارسی بلکہ میر کی خاص ایجاد ہیں اور انھیں بحرِ میر کہنا درست ہوگا۔ ممکن ہے کہ ان بحروں کی ایجاد میں میر نے ہندی سے استفادہ کیا ہو۔

پروفیسر عابد پشاوری نے "کلام انشا میں ہندی اصناف" کی نشاندہی کرتے ہوئے رانی کیتکی کی کہانی کو پہلی ہندی صنف قرار دیا اور انشا کے کلام میں چند بولا، چوکھٹے، دوہے اور پہیلیاں وغیرہ اصناف کی بھی نشاندہی کی۔

پروفیسر جعفر رضا نے "نظیر کی شاعری پر برج بھاشا کے اثرات" پر مقالہ پیش کرتے ہوئے نظیر کو کرشن بھگتی یعنی برج بھاشا کا شاعر قرار دیا اور کہا کہ نظیر کے یہاں رتی و رنگ کے ساتھ ساتھ وِرہ ورنن بھی ملتا ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے دوہے کی اقسام، اس کے فنی لوازم اور فکری میلانات پر روشنی ڈالی۔

۲ مارچ ۱۹۸۷ کو سیمنار کا پانچواں اجلاس پروفیسر جعفر رضا کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر صلاح الدین نے "سودا کے کلام میں ہندی پنجابی اصناف کی جھلک" پر اظہار خیال کرتے ہوئے سودا کے مرثیوں میں ہندی اصناف کی نشاندہی کی اور کہا کہ سودا کے یہاں دوہرا بند مرثیہ، چوپائی، دوہا اور پہیلیاں ملتی ہیں۔ مرثیوں میں گیت کا آہنگ ٹیپ کے بند میں ملتا ہے۔

قیصر جہاں کا مقالہ "قدیم اردو شاعری میں گیت کی روایت" پر تھا۔ انھوں نے گیت کو غنائی شاعری کا قدیم روپ قرار دیتے ہوئے امیر خسرو کو اس روایت کا بانی قرار دیا۔ پھر یہ روایت دکن میں پروان پائی اور یہیں سے ہندوستان میں پھیلی اور بہادر شاہ ظفر کے یہاں گیت کی واضح شکل نکھر کر سامنے آئی۔

"اردو عروض پر ہندی پنگل کا اثر" کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی نے کہا کہ متقدمین سے متاخرین تک تمام شعرا نے ہندی پنگل کے اوزان میں شاعری کی ہے۔ اردو کے بہتر اوزان ایسے ہیں جو ہندی پنگل سے مماثل ہیں۔ بحر اور چھند میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے "ایہام گو شعرائے دہلی پر ریتی کال کی ہندی شاعری کا اثر" پر اپنا مربوط مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ برج کے دوہوں سے الفاظ اور معنی کی تہ داریاں اردو میں آئی ہیں۔ شلیش جو ایہام سے ملتی جلتی صنعت ہے، کے واضح اثرات بھی ان شعرا کے یہاں ملتے ہیں۔

چھٹا اور آخری اجلاس ہندی کے نامور ادیب پروفیسر نامور سنگھ کی صدارت میں ہوا۔ پروفیسر مغنی تبسم نے "اردو غزل اور گیت" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ابتدائی دور سے ہی غزلوں پر گیت کا رنگ غالب رہا ہے اور یہ عصری تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے اور آج بھی جذبات نگاری میں گیت کے پیرایوں سے بھرپور استفادہ کیا جا رہا ہے۔

رشید حسن خاں نے "اردو میں کبت کی روایت" سے بحث کرتے ہوئے کہا کہ باغ و بہار اور نو طرز مرصع کے علاوہ اردو کی قدیم کتابوں میں کبت ملتے ہیں۔ انھوں نے کلام سودا میں بھی کبت کی نشاندہی کی۔

ظ انصاری نے "اردو شاعری اور ہندوستانی موسیقی کے رشتوں پر چند خیالات" کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ابتدا ہی سے اردو شاعری اور موسیقی کا اٹوٹ رشتہ رہا ہے جس کو فراموش کر دیا گیا۔ آج

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

مدن لال منچندا ⁵

بے آبرو

شام دھندلکے میں ڈوب رہی تھی، دکانوں پر بجلی کے قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ مارکیٹ کے سامنے پارک میں پانی کے فوارے بجلی کی روشنی میں پھول جھڑیوں کی طرح گل فشاں تھے۔ بچے ہری بھری گھاس پر کھیل رہے تھے۔ قریب میں ایک بنگلے سے طبلے کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی چھن چھناہٹ ہر آنے جانے والے کی توجہ اپنی طرف کھینچ رہی تھی، جہاں بالائی منزل پر ایک کشادہ کمرے میں ایک ڈانس ماسٹر ایک دوشیزہ کو ناچ کی مشق کرانے میں محو تھے۔ باہر سڑک پر موٹر کاروں کی ریل پیل تھی۔ اسکوٹر اور موٹر سائیکل والوں کو چھوڑ کر پیدل چلنے والوں کی بھی ایک بڑی بھیڑ اُمڈ آئی تھی۔ خنکی بڑھ رہی تھی، مردوں نے گرم سوٹ پہن رکھے تھے اور عورتوں نے ریشمی ساڑیوں پر رنگ برنگی اُونی شالیں اوڑھ رکھی تھیں۔ اُونی ملبوسات میں اُن کے ہشاش بشاش چہروں سے لگتا تھا کہ موسمِ سرما اُن کے لیے ایک نئی بہار لے آئی تھی۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے بھی بے حد فرحت بخش تھے۔

اچانک میری نظر ایک نہایت دُبلے پتلے سائیکل سوار پر پڑی جس کی سائیکل سڑک کے نیچے ناہموار راستے پر ہچکولے کھاتی پیپل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سائیکل کو پیپل کے سہارے لگا کر اُس نے کونے والی دکان کا رُخ کیا۔ اُس کو چال ڈھال سے میں نے پہچان لیا کہ وہ رام بھروسے ہی تھا۔ اُس نے نہ ہی ڈھیلا ڈھالا اور بوسیدہ کوٹ پہن رکھا تھا جو کسی بھاری بھرکم جسم کے سائز کا معلوم ہوتا تھا اور کھلی موہری والی سفید سوتی ڈرل کی پینٹ بھی کسی اور ہی کی لگ رہی تھی جس نے اُسے ایک پرانی پیٹی کے سہارے کمر سے لٹکا رکھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑوں میں وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ شاید اُس کا پیٹ بھی خالی تھا۔ اُس کی دھنسی ہوئی آنکھوں اور پچکے ہوئے گالوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ ضرور بدحالی اور تنگ دستی کی زندگی گزار رہا ہے۔ نقاہت کے مارے اُس کے قدم دُکان کی جانب آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔

کونے والی دُکان پر چائے پینے والوں کی اِک بھیڑ لگی تھی۔ اُس کا مالک بھولا ایک میانے قد کا گٹھیلا انسان تھا جو زندگی کی پچاس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ لیکن ابھی بھی وہ اپنے کشادہ سینے اور چاق و چوبند جسم پر ناز کر سکتا تھا، نہ معلوم اُس کی جسمانی کھال کے نیچے چربی کی کتنی موٹی تہ جمی تھی کہ وہ اس منجمد کر دینے والی سردی میں ایک گاڑھے کے کرتے اور پاجامے اور اوپر ایک میلی سی واسکٹ میں نہایت مستعدی سے کام کر رہا تھا۔ چائے تو نوکر بناتا اور بانٹتا تھا۔ بھولا پیسے وصول کرتا تھا۔ اُس کی نظر ہمیشہ چائے پینے والوں پر جمی رہتی تھی، کوئی بھی نظر بچا کر پیسے دیے بغیر پیالی یا گلاس رکھ کر جانے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ تمام کالونی میں اور قریبی مونسپل ہسپتالوں میں ڈبل روٹی اور مکھن کی سپلائی بھولا ہی کے ہاں سے ہوتی تھی۔ سگریٹ اور پان کے علاوہ، چائے کی پتی، بسکٹ اور ٹافیاں، بلیڈ، نہانے اور کپڑے دھونے کے صابن اور سر درد کی گولیاں بھی مل سکتی تھیں۔ خصوصاً ان اشیا کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ وہ ضرورت مند ہی لگا سکتے ہیں جو دوسری دُکانیں بند ہونے کے باوجود بھولا کی دُکان سے انھیں صبح پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک خرید سکتے تھے۔

نام اُس کا ضرور بھولا تھا۔ لیکن بھولا کوئی سادہ لوح یا بھلکڑ آدمی نہ تھا، اُس کی یادداشت غضب کی تھی۔ کسی گاہک نے اُس سے کب اور کیا لیا ہے،

⁵ ڈی ۲۸۲، موتی باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۱

اُس کے کتنے پیسے لگایا ہیں اُس کے ذہن کے پردے پر ہر تفصیلات کے رقوم رہتی تھیں۔ اسی طرح ڈبل روٹی کے کتنے کریٹ سپلائی ہوئے ہیں اور اُس کو انھیں کتنے روپے دینے ہیں اُسے یہ سب کچھ پتہ ہوتا۔ میونسپل ہسپتال کی بڑھتی گھٹتی سپلائی بھی اُسے ازبر ہوتی اور اُس کے روزمرّہ کے گاہکوں سے میں مکھّن کا خریدار کون ہے جسے کم ڈبل روٹی آنے کے باوجود ڈبل روٹی دینی ہے یہ اُسے خوب یاد رہتا تھا۔ ان اوصاف کے باوجود وہ ایک بدمزاج، اکھڑ اور کائیاں قسم کا دکاندار تھا۔

تازہ ڈبل روٹی کے ساتھ باسی بھی چلا دیتا تھا اور سپلائی کم ہونے کی صورت میں مخصوص گاہکوں کو چھوڑ کر سب کو کورا جواب دے دیتا تھا، اور اصرار کرنے والوں کو ہسپتال کی سپلائی کے بہانے سے ٹال دیتا تھا۔

رام بھروسے بھی اُس کے گاہکوں میں ایک تھا جس کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا تھا۔ اِس کمر توڑ مہنگائی کے زمانے میں پانچ بچوں کا چار ساڑھے چار سو روپے ماہانہ کی قلیل آمدنی میں پیٹ پالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ مکان کے کرائے میں ہی ڈیڑھ سو روپے چلے جاتے تھے، بیوی کے بیمار پڑ جانے سے اُس کی حالت اور بھی پتلی ہوگئی تھی۔ پہلا حساب نہ چکنے پر دکانداروں نے مزید اُدھار دینا بند کر دیا تھا وہ اگلے سے اگلے مہینے قرض چکانے کا وعدہ کرتا تھا، ایسا نہ کر پاتا اُس کی معذوری کو چند دکاندار اُس کی بہانہ بازی پر محمول کرتے اور اُس کی نیت پر شک کرتے۔

وہ بے بس ایسے خستہ حالات کا شکار ضرور تھا۔ لیکن اُس کی ایمانداری پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حالانکہ اُس نے بھولا کا منہ بند کرنے کے لیے اس تنگدستی کی حالت میں بڑی مشکل سے بیس روپے چند دن پہلے دئے تھے لیکن بھولا کے تقاضے بڑھتے ہی جاتے تھے۔ آج رام بھروسے کی بیمار بیوی کو تمام دن چائے نہ نصیب ہو سکی تھی۔ کیوں کہ چائے کی پتی اور چینی دونوں ہی ختم ہوگئی تھیں۔ ناچار اُس نے بھولا کی دُکان کا رُخ کیا۔ پیشتر اس کے کہ رام بھروسے اُسے چینی اور چائے کی پتی کے لیے التجا کرتا بھولا کڑک کر بولا۔

"کچھ لائے ہو؟"۔

رام بھروسے بغلیں جھانکنے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ غیر ارادی طور پر اُس نے سَر ہلا دیا۔

"تو پھر اب اور سامان نہیں ملے گا"

"بیس تو دے گیا تھا۔"

"باقی کی بات کر۔"

"میں نے انکار کب کیا ہے، تھوڑا سا انتظار کرلو۔" رام بھروسے نے نہایت انکساری سے کہا۔

"میں پوری رقم جلدی لوٹا دوں گا"

"اے جلدی کے بچے، تین مہینے بعد تو تم نے اُس دن شکل دکھائی۔"

بھولا کے نتھنے غصے سے پھول رہے تھے۔

"ابھی اور اسی وقت پیسے نکال" یہ کہتے ہی اُس نے دُکان سے اُٹھ کر رام بھروسے کے کوٹ کا کالر پکڑ لیا اور اُسے جھنجھوڑ کر بولا۔

"نکال یا ابھی ایک جماتا ہوں۔"

"آپ جتنی چاہیں میری بے عزتی کرسکتے ہیں۔"

بھولا کی آواز سُن کر قریبی دکانوں سے بھی لوگ اُس طرف آگئے۔

"کیا بکواس لگا رکھی ہے، نکالتا ہے یا دوں ایک لپیٹ۔" بھولا آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اُس نے رام بھروسے کو بُری طرح جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ لیکن رام بھروسے نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے نہایت تحمل اور ادب سے کہا۔

"آپ ناحق خفا ہو رہے ہیں۔ میں پائی پائی چکا دوں گا۔"

"نکال، ورنہ ہڈی پسلی برابر کردوں گا"

یہ کہتے ہی اُس نے دونوں ہاتھوں سے کندھوں سے پکڑ کر اُس کا کوٹ اُس کی پیٹھ سے زبردستی اُتار لیا۔

رام بھروسے سے کوئی مزاحمت نہ ہونے پر بھولا کو یقین آگیا تھا کہ کوٹ کی جیب دراصل بالکل خالی تھیں۔ بھولا آگ بگولا ہوگیا اور جھنجھلا کر اُس نے اپنا ہاتھ اُس کی پیٹھ پر ڈالا اور اپنی اُنگلیاں دھنساتے ہوئے دھکا دیا۔

"اُتار یہ پیٹ بھی اُتار، تھیں آج ننگا کرکے گھر بھیجوں گا۔"

"ٹھہرو" مجمع سے ایک جوان للکارا "ایسے ہی کھانا نکالو، اسے حساب بتا دو، یہ پیسے دے جائیگا، اور اپنا کوٹ لے جائے گا۔"

اس کے بعد ایک اور دھیمی آواز بھی اُبھری۔

"بہتر ہوتا اگر آپ اسے اس کی حیثیت دیکھ کر اُدھار دیتے۔"

زبانِ خلق سے بھولا کو مجمع کی موڈ کا صحیح اندازہ ہوچکا تھا، لیکن غصے کے مارے اُس کے تن بدن میں آگ لگی تھی وہ نہایت بے بابی سے ایک مرتبہ پھر بُری طرح بِکا۔ شاید رام بھروسے کو ایک تھپّڑ رسید کرکے اپنا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مجمع کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے گھر کی طرف بڑھتے رام بھروسے کے کندھوں پر اُس کا کوٹ ڈال دیا، شاید اُسے رام بھروسے کی مجبوری کا یقین آچکا تھا — رام بھروسے اپنے خیالوں میں گم، ٹھنڈی ہوا کے خونخوار تھپیڑوں کی پرواہ کیے بغیر اپنے شانوں پر پڑے کوٹ کے ساتھ اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیکن تاریک فضا میں اُس کی بیمار بیوی کا چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے تیر رہا تھا، جو چائے کے ایک گھونٹ کے لیے ترس رہی تھی۔

●

رفعت سروش

فراق گورکھپوری کا ایک مرثیہ

میرے خیال میں مرثیہ نگاری صرف کسی کے غم میں دل سے نکلے ہوئے آنسوؤں اور نالوں کو موثر الفاظ میں ڈھالنے کا ہی نام نہیں ہے۔ بلکہ اس غم کی شدت کو ذاتی سے زیادہ آفاقی بنا دینے کا فن بھی مرثیہ نگاری کے دائرے میں آتا ہے۔

اکثر مرثیے حضرت امام حسین اور شہدائے کربلا کے غم میں کہے گئے اور کہے جاتے ہیں، مگر صرف اتنا ہی سبب ہے۔ ہر مرثیہ نگار واقعاتِ کربلا کو تاریخی تناظر میں دیکھتا ہے اور اس لیے شہدائے کربلا کا ماتم کرتا ہے کہ وہ حق پرست تھے اور ان کے خون کے قطروں نے ان عظیم اقدار کو صفحۂ تاریخ پر رقم کر دیا جو رہتی دنیا تک ظالموں اور جابروں کے خلاف حق کا پرچم بلند کرنے اور ضرورت پڑنے پر تلوار اٹھانے کے لیے ہر ذی حس انسان کو آمادہ کرتی رہیں گی — اور ہر دور اس عظیم واقعۂ شہادت کی نئی تفہیم کرتا رہے گا اور اس سے جرأت اور جذبۂ عمل اخذ کرتا رہے گا — باطل سے مقدس بغاوت کا یہ جذبہ آج بھی جاری و ساری ہے اور اقوامِ عالم کی رگوں میں سرایت کر چکا ہے۔

اُردو میں مرثیہ نگاری نے ایک الگ اور مستقل صنف کی صورت اختیار کر لی اور اس صنفِ سخن میں ہمارے عظیم شاعروں نے اپنی فکر و فن کے جوہر دکھلائے۔ کچھ حلقوں نے ماتم کربلا کی طہارت اور رقت کو اپنے دل میں جذب کر کے اپنی ذاتی زندگی کے غم کو اس صنفِ سخن میں ڈھالا اور اپنے پیاروں کا ماتم کیا — غالب کا شخصی مرثیہ — جو عارف کی موت پر کہا گیا۔ اس ذیل میں آتا ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضہ کوئی دن اور

مرزا غالب کا ذاتی غم تو اس میں ہے ہی، ان کا دور بھی جھلک رہا ہے اور معاشرے کی زبوں حالی آشکارا ہے ؎ تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضہ کوئی دن اور

غالب کی وفات پر حالی کا مرثیہ بھی اسی انداز کا ہے ؎

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات

ہماری جنگِ آزادی کی تحریک نے واقعۂ کربلا اور مرثیہ کی عظیم روایت سے ایک نئی عزت حاصل کی اور ذکرِ حسین کو محض اشکِ انسانی کے لیے نہیں، بلکہ باطل کے خلاف صف آرائی کے لیے بھی استعمال کیا۔ اس کی ایک ہی مثال کافی ہے ؎ مولانا محمد علی کا ایک شعر ؎

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اس شعر میں پوری خلافتِ تحریک جھلک رہی ہے، اور پوری قوم کو حسینی ذوق بننے پر آمادہ کر رہی ہے۔ ذکرِ حسین کی خوبی یہ ہے کہ شعلۂ اشک اظہارِ غم بھی کرتا ہے اور عزم و استقلال کی مشعل بھی روشن کرتا ہے، اسی لیے مرثیہ نگاری بھی اس دور میں نئی کروٹ لیتی ہے جب معاشرہ شکست و ریخت کے ساتھ جد و جہد و تعمیر کے مرحلوں سے گزرتا ہے۔

---

۵ ڈی، ۲/۱ اے، ڈی ڈی فلیٹس، منیرکا۔ نئی دہلی۔

اس صنفِ سخن کو پھولنے پھلنے کے لیے ایسے ہی دل گداز ماحول کی ضرورت ہے۔

ہمارے ملک کی تاریخ میں ایسا ایک موڑ تھا ۱۹۲۰ء کی سول نافرمانی تحریک۔ پریم چند نے اپنی عام افسانوی فضا سے نکل کر اسی دور میں ڈرامہ کربلا لکھا۔ اور آج میں جس شخصی مرثیے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ڈانڈے بھی سول نافرمانی تحریک کے پیدا شدہ اثرات سے جا ملتے ہیں۔

زیرِ تجزیہ فن پارے میں مرثیہ کی روایتی فضا اور لفظیات بھی موجود ہیں اور اپنے دور کی کربناکی بھی۔ فراق گورکھپوری سول نافرمانی کے جرم میں قیدِ فرنگ کاٹ رہے تھے۔ اس عالم میں ۱۹۲۱ء میں انھیں اپنے چھوٹے بھائی کی موت کی خبر ملی جو عرصے سے تپِ دق کا شکار تھا اور جسے فراق زندگی اور موت کی کشمکش میں چھوڑ کر ملک کی آزادی کی خاطر اسیرِ زنداں ہو گئے تھے۔ بھائی کی موت پر فراق کا دل خون کے آنسو رویا اور انھوں نے جن الفاظ میں اس کا ماتم کیا ان سے اردو کے ایک اہم شخصی مرثیہ کی تشکیل ہوئی۔ شخصی بھی اور آفاقی بھی کیونکہ اس میں غلام ہندوستان کی پوری فضا سانس لے رہی ہے اور انگریزی سامراج کی بربریت بھی بے نقاب ہو رہی ہے۔

اکیس اشعار پر مشتمل یہ مرثیہ ان کے پہلے مجموعۂ کلام "روحِ کائنات" (مطبوعہ ایوان اشاعت گورکھپور ۱۹۴۵ء) میں صفحہ ۸۲ سے ۸۶ تک پھیلا ہوا ہے۔ جیل کی تنہا کوٹھری میں فراق بھائی کی موت کو اپنے تصور کی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔ اور آخری رسوم کا منظر ان کی بیتاب نظر کے سامنے ہے۔ وہ اسی لہجے میں غم گسار ہیں جو اردو مرثیے کا مانوس لہجہ ہے ؎

گھاٹ پر جلنے جلانے کے وہ ساماں ہائے ہائے
کس قدر خاموش ہے شہرِ خموشاں ہائے ہائے

ایک ہی شعر میں پورا منظر پیش کر دیا۔ جواں مرگ بھائی کی تصویر نظروں میں پھر رہی ہے۔

کہتے ہیں ؎

نزع میں دیکھا تھا وہ چہرہ اثر نے اہلِ دل
اس شکستِ رنگ کے آئینہ داراں ہائے ہائے
مرنے والے یاد آتی ہے جواں مرگی تری
اُمڈ گیا دل میں ہے تو دل کے ارماں ہائے ہائے
میری قسمت میں تجھے کاندھا بھی دینا جب نہ تھا
دل نے کیوں باندھا تھا تجھ سے عہد و پیماں ہائے ہائے
الوداع اے زودِ بازِ دیار سے بھائی الفراق
اب تو میں ہوں اور ترے داغِ ہجراں ہائے ہائے

ان اشعار میں فراق کی روح بھائی سے ہم آہنگ ہو گئی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ وہ اشعار نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ غم لفظوں تک کھنچ آیا ہے۔ یہ شعوری کوشش نہیں بلکہ غیر شعوری عمل ہے کہ مرثیوں کا مخصوص ماحول ان کے اشعار میں سرایت کر گیا ہے ؎

مٹتی جاتی ہے اُفق سے سُرخیٔ رنگِ شفق
بڑھتا جاتا ہے سوادِ شامِ زنداں ہائے ہائے
اُن بگولوں کا یہ عالم، بادِ صرصر کا یہ جوش
خاک اُڑاتا ہے ترے غم میں بیاباں ہائے ہائے
سونے والے خاک ویرانوں میں اُڑتی ہے تری
بادِ صرصر ہے تری گہوارہ جنباں ہائے ہائے

ان اشعار کی فضا کسی ایک قصبے یا کسی ایک شہر تک محدود نہیں ہے۔

'سُرخیٔ رنگِ شفق'، 'سوادِ شام'، 'بادِ صرصر کا یہ جوش خاک اُڑاتا ہے ترے غم میں بیاباں' — یہ ایسے ٹکڑے جو میدانِ کربلا کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ مرثیہ نگاری کا یہی وہ جادو ہے جو اس صنف کو کسی ایک قوم، کسی ایک مذہب، کسی ایک فرقے یا کسی ایک علاقے تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ اسے سیکولر رنگ عطا کرتا ہے اور اس کی آفاقیت پر دلالت کرتا ہے۔

فراق انگریز کی جیل میں تھے اور اس زمانے میں سیاسی قیدیوں کی وہ حالت نہ تھی جو آج ہے۔ ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا تھا۔ جیل کی کوٹھری میں بھی انھیں کھل کر رونے کی اجازت نہ تھی۔ فراق نے اس مرثیے کے ایک بھی مصرعے میں انگریز یا قیدِ فرنگ کا نام نہیں لیا ہے، کسی جابر انگریز پر ملامت نہیں کی ہے، انگریزی سامراج کی مذمت نہیں کی ہے مگر براہِ راست یہ سب باتیں نہ کہنے کے باوجود فراق نے یہ سب کچھ کہہ دیا ہے اور ایک ایسا نقشہ پیش کر دیا ہے جو ہمیں انگریزی حکومت کی سفاکی اور سیاسی قیدیوں سے اس کے جابرانہ سلوک کا پردہ فاش کرتا ہے اور اس مجبوری اور دستورِ زباں بندی میں شاعر کے غم کی شدت اور بڑھ جاتی ہے ؎ کتنے چبھیلے اشعار ہیں ؎

ایک سناٹے کا عالم ہے در و دیوار پر
شامِ زنداں اب ہوئی ہے شامِ زنداں ہائے ہائے
یاد آئیں گی کسی شوریدہ سر کی وحشتیں
دیکھ کر گلکاریٔ دیوارِ زنداں ہائے ہائے

اور دستورِ زباں بندی کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ یہ اشعار ؎

قید میں جی کھول کر رونا بھی مشکل ہو گیا
اب میں سمجھا معنیٔ تنگیٔ زنداں ہائے ہائے
آہ یہ آدابِ زنداں یہ شعارِ ضبطِ غم
یہ وفورِ درد یہ حالِ پریشاں ہائے ہائے

اور ایک لمحہ وہ آتا ہے جب ان کے ہاتھ سے شعارِ ضبطِ غم کا دامن چھوٹ جاتا ہے اور ایسے عالم میں وہ جیل کے آہنی آداب کو توڑنا اپنا حق تصور کرتے ہیں ؎

اپنے مرنے پر مرا رونا تھا تجھ کو ناگوار
اتنا کب تھا تجھ کو پاسِ اہلِ زنداں ہائے ہائے
قید میں بھی پردہ داریٔ غم کی مشکل ہو گئی
کھل گیا رازِ در و دیوارِ زنداں ہائے ہائے

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

حسرت موہانی

تبرکات

اقسامِ سخن

جو کلام خالص جذباتِ حسن و عشق کا حامل اور اپنی خوبی کے لیے کسی محسوس صنعت گری کا محتاج نہ ہو وہ عاشقانہ کہلائے گا اور جس کلام میں عشقِ مجازی سے برتر درجے پر عشق سے عشق اور حسن سے حسنِ مطلق مراد ہو، وہ عارفانہ ہوگا، اور اس کے برخلاف جن غزلوں میں مجازی عشق سے کمتر درجے کے جذباتِ ہوس کی مصوری اور صحیح مصوری موجود ہو وہ فاسقانہ کہلائے گا۔ مثلاً، عاشقانہ شاعری کی مثالیں زیادہ تر میر و مصحفی، قائم و غالب، شیفتہ و حالی، جلال لکھنوی اور شاد عظیم آبادی کی غزلوں میں ملیں گی اور عارفانہ شاعری کے نمونے درد دہلوی، نیاز بریلوی اور آسی سکندرپوری کی غزلوں میں دستیاب ہوں گے، اور فاسقانہ سخن سنجی کی تصویریں زیادہ جرأت اور کثرت سے مصحفی و انشا یا متاخرین میں کسی قدر مضطر خیرآبادی اور گستاخ رامپوری کے ہاں موجود ہیں۔

فاسقانہ شاعری کو بدمذاقی پر محمول کرنا، سوقیانہ و مبتذل قرار دینا، انصاف کا خون کرنا ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ جب شاعری کا مقصد صحیح جذبات کی مصوری مسلّم ہو تو پھر اس کے دائرے کو صرف پاک جذبۂ عشق تک محدود کر دینے اور عامۃ الخلائق کے ۹۹ فیصدی جذباتِ ہوس کو اس طرح سے خارج کر دینے کی کوشش اور وہ بھی محض اس بنیاد پر کہ ان کا اظہار و اعلان بعض فقیہانہ و ملّایانہ طبائع کی مصنوعی پاکیزگیٔ خیال کے لیے ناگوار ثابت ہوگا، خود مخالفینِ ہوس نگاری کی انتہائی بدمذاقی اور بے شعوری کے سوا اور کسی چیز پر دلالت نہیں کرتا البتہ اس میں جو حدِ اعتدال سے گزر جانا، جیسا کہ رنگین کی بعض ریختیوں اور صاحبقران و جان صاحب کے مبتذل اشعار میں پایا جاتا ہے، یقیناً قابلِ اعتراض ہے، مگر ایسے کلام کو فاسقانہ کے بجائے فاحشانہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

اب اگر عاشقانہ شاعری کی خوبی بسیط ہونے کی بجائے مرکب ہو۔ یعنی صنعت گری کی بھی شرمندۂ احسان ہو اور یکسر بیگانۂ بے ساختگی نہ ہو تو اس کو عاشقانہ کے بجائے شاعرانہ کہنا چاہیے۔ دورِ حاضرہ کے تقریباً کل متغزلین کی اکثر غزلیں اسی رنگِ سخن کی حامل ہیں، اور آمد و آورد کی درمیانی تقسیم کے تحت میں آتی ہیں۔

اس کے بعد بھی اگر شاعرانہ طرزِ سخن خوبیٔ اثر سے محروم ہو تو پھر اس کو شاعرانہ کہنے کے بجائے ماہرانہ یا استادانہ کہنا چاہیے، مثلاً امیر مینائی، منیر شکوہ آبادی سے لے کر بزم اکبرآبادی، ثاقب لکھنوی و صادق کنتوری تک کی غزلیں نہ عاشقانہ ہیں نہ شاعرانہ، بلکہ ماہرانہ ہیں اور آورد کے تحت میں آتی ہیں۔ پھر اگر یہ ماہرانہ شاعری پختگی و متانت کے جوہر سے بھی خالی ہو اور بقول مصحفی، موزونیٔ طبع کا نتیجہ ہو تو اسے ناظمانہ کہنا چاہیے۔

عاشقانہ شاعری کی مانند عارفانہ شاعری کا بھی یہی حال ہے کہ اگر اس میں عشق و حسنِ مطلق کی جگہ رسمی حد تک اصطلاحی تصوف کا جلوہ نظر آتا ہو تو اس کو عارفانہ کے بجائے صوفیانہ کہنا چاہیے جو آورد کے تحت میں آئے گی، یا اگر روحانی تحریکاتِ عشق سے کمتر درجے پر جذباتِ خلوص و عقیدت کے ماتحت نعت، منقبت یا سوز و سلام کے سانچے میں ڈھل کر سامنے آئے ہوں اور ان میں کمالِ اثر بھی ہو تو اس شاعری کو مخلصانہ شاعری کہنا چاہیے مثلاً علامہ امام [illegible] شاہ نیاز بریلوی، محسن کاکوروی، رضوان مرادآبادی، صفا ہرالوی، حمید لکھنوی، انیس و متعلقینِ انیس، تعشق، رشید وغیرہم کا کلام۔ لیکن اگر اس قسم کا کلام محض صنعت گری کا مرہون اور تاثیر سے محروم ہو یا محض حصولِ ثواب و نجات کی غرض سے وجود میں آتا ہو، مثلاً امیر مینائی یا مضطر خیرآبادی کا نعتیہ دیوان یا مرزا دبیر کا تمام ذخیرۂ مرثیات، تو ان کو مخلصانہ کے بجائے ماہرانہ کہنا ہوگا، یا ناصحانہ، اور یہ دونوں قسمیں آورد کے تحت میں آتی ہیں۔

علیٰ ہٰذا القیاس، فاسقانہ شاعری میں اگر خالص جذباتِ ہوس کی مصوری کے بجائے سماج یا مذہب و حکومت کے استخفاف یا انکار کا پہلو نمایاں ہو تو اسے باغیانہ کہنا چاہیے، مثلاً جوش، احسان دانش، ساغر، اختر شیرانی، مجاز ردولوی وغیرہم ترقی پسند ادب کے دعویداروں کی بے باک نگاری . . .

(سنجیدہ) ایک قسم سخن اور وہ گوئی جس کا مقصد محض ظرافت ہوتی ہے، مثلاً ظریف لکھنوی یا احمق پھپھوندوی کا کلام۔ یا ظرافت کے ساتھ طنز و قدامت پرستی کا پہلو نکلتا ہے، مثلاً اکبر الہ آبادی و ظفر علی خاں کا کلام۔ جو عام حکایات کے علاوہ نامناسبت بھی ہو سکتا ہے۔ مگر بہرحال آورد ہی کے تحت میں آ سکتا ہے ...... ہزل یا ہجو کا شمار بھی اس قسم سخن میں ہوتا ہے لیکن اگر یہ چیزیں حد اعتدال سے گذر کر پھکڑ اور یا فحش گوئی کے درجے تک پہونچ جائیں تو ان کو ظرافت کے بجائے سوقیانہ کہنا چاہئے۔

(حسرت نے ایک قطعہ میں اپنے معاصر شعرا کو بیان کیا ہے، اس قطعہ میں ۲۰۸ تخلص درج ہیں، جن میں سے بعض کئی شعرا میں مشترک ہیں۔ اس طرح کل تعداد ۲۰۸ (۰) ق ہے، یہ قطعہ ۱۹۱۷ء میں کہا گیا تھا)

(معاصرین ہیں اسماعیل و جاوید و رشید اکبر
جلیل و نظم، رضوان، انس و بزم و صباحت کا

ریاض و منظر و شوق و صفی، شاد و اثر، مائل
عزیز و ثاقب و بیخود، نظر، اقبال و رفعت کا

شہید و کوثر و اختر، صمیم و سائل و اصغر
وسیم و حمد و سیاک و دلبر و نوح و وحشت کا

حفیظ و رعب و نازش، آرزو، یاس، احسن و ناطق
وفا، صفدر، ظفر، محشر، شفق، چکبست و شوکت کا

جگر، مانی، کلیم و طپش و رسوا، برہم و برتر
ثمر، سیماب، امیر و بے نظیر و باغ و ندرت کا

نسیم، ابرو، ثروت، حشر و شرر، محو و عطا، فانی
غریب و ولی، فقیر و طالب و مہر و وجاہت کا

ماہ مئی ۱۸-۱۹۱۷ء

سیاہ بسمل، دلگیر، نجم و دلگیر، اطہر و کیفی
تمنا، رونق و عرش و حضور و برق و شہرت کا

ذہین و وصل و ضامن، رند و صبر و شاطر و شیدا
فصیح و عیش و مانی، محوی و فیروز و عشرت کا

تپش، نیرنگ و سالک، صدق و راغب، ناسخ و تیغ
ملک، مجروح، احمق، تاجور، توفیق و حسرت کا

جلیس و جوہر و سرشار و ساغر، ناظر و باسط
زلالی، ہادی و عزم و سراج و مہر و فطرت کا

ظریف، آشفتہ و آزاد، عاشق، سیدل و زیبا
سحر، موج و اسد، صابر، فراق، اعجاز و صولت کا

حزیں، نسیم و راسخ، حالی، شبلی، داغ، امیر، آسی
ہلال، اشرف، ذکی، مجروح و عاشق، مست و شوکت کا

نفیس، اکبر، نسیم، اوج و تعشق، مطہر و عارف
حسن، بیخود، سرور و ہجر و گستاخ و لطافت کا

حبیب و ساد و خورشید و صفی، محسن، رسا، ساقی
ظہیر و کامل و مساق و عیس، آزاد و رحمت کا

حکیم و اشہری، شہباز، افق، شوق و سیال، نادر
شگفتہ، شعلہ و شمشاد و احسان، یاس و حسرت کا

بقا، یوسف، تجمل، تائب، انجم، بے خبر، ارشد
جنوں، ناسخ، قضا، انعام، افسر، جاہ و رفعت کا

ماہ مئی ۱۸-۱۹۱۷ء

٭

بقیہ دلی کی ادبی وفنی سرگرمیاں

میں اردو مصنفین، شعرا، اساتذہ کرام اور صحافیوں کے زمروں کے ایوارڈز تقسیم کئے گئے۔ اس جلسہ کی صدارت دلی کے ایگزیکٹو کونسلر شری جگ پرویش چندر نے کی۔ اس موقع پر جن لوگوں کو اعزازات سے نوازا گیا، ان میں جناب غلام ربانی تاباں، ڈاکٹر شارب ردولوی، جناب ودیا پرکاش سرور تونسوی، جناب مشیر جھنجھانوی اور جناب زین العابدین (مرحوم) کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ دلی کے لیفٹیننٹ گورنر شری ایچ۔ ایل۔ کپور نے یہ اعزازات تقسیم کئے۔ جناب غلام ربانی تاباں کو اردو ادب میں بہ سال تک مسلسل تخلیقی خدمات کے صلے کے طور پر آل انڈیا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ دیا گیا۔ اس ایوارڈ کے تحت موصوف کو گیارہ ہزار روپے، ایک شال اور ایک سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ ڈاکٹر شارب ردولوی کو اردو تحقیق و تنقید کی خدمات کے لیے ۵۰۰۱ روپے کا ایوارڈ دیا گیا۔ جناب سرور تونسوی کو اردو صحافت کے لیے، جناب مشیر جھنجھانوی کو اردو شاعری کے لیے اور جناب زین العابدین کو بہترین استاد ہونے کے ناطے (بعد از مرگ) یہ ایوارڈز دیئے گئے۔ اردو میں درس و تدریس کی ہمت افزائی کے لیے دیا جانے والا یہ پہلا ایوارڈ تھا۔

جناب جگ پرویش چندر نے اس موقع پر زبان کو آسان بنانے کے لیے زور دیا گیا اور اس بات پر تشویش ظاہر کی کہ اس میں فارسی کے الفاظ کی آمیزش سے یہ زبان مشکل اور عام آدمی کی سمجھ سے باہر ہوتی جارہی ہے۔ جناب ایچ۔ ایل۔ کپور نے کہا کہ اردو اور ہندی بہنیں ہیں۔ انھوں نے مصنفوں، صحافیوں اور شاعروں سے اپیل کی کہ وہ ملک کی سالمیت اور اتحاد کی خاطر اپنی تخلیقی قوتوں کو کام میں لائیں۔ ●

٭

غزلیں

منظر امام : کتابستان، چندوارہ، مظفرپور۔
(بہار)

دردِ دل پھر بڑھا دیا کس نے
سو گیا تھا جگا دیا کس نے

میرا احساس میرا کربِ ذات
ہائے سب کچھ چرا لیا کس نے

میری قسمت میں تھی یہ تنہائی
دیکھنا ساتھ پھر دیا کس نے

جامدِ احساس کا سمندر تھا
آج پتھر جلا دیا کس نے

حرفِ ماضی بیانِ مستقبل
یک بہ یک مجھ سے لے لیا کس نے

پُرسکوں تھی بہارِ گل منظر
منتشر اس کو کر دیا کس نے ●

اسد کھنڈوی : کھنڈوہ (ایم۔پی)

یوں نظر آتے ہیں اپنے دل کے داغ
جیسے یہ بھی ہوں مہِ کامل کے داغ

کھو گئے راہوں میں کتنے رہ گذر
لے کے دل میں حسرتِ منزل کے داغ

وہ تو اپنے ساتھ سب کچھ لے گیا
حسرتوں کی بے زبانی دل کے داغ

تھا پسِ پردہ کسی سازش کا ہاتھ
مِٹ گئے اب دامنِ قاتل کے داغ

موجیں بڑھ بڑھ کر انھیں دھوتی رہیں
جب نظر آئے انھیں ساحل کے داغ

وائے ناکامی اسد پتھر ہوا ہے ہر قدم
دل میں ہیں اب سعیِ لاحاصل کے داغ ●

سُکھ دیو شرما رشک :
اُردو مجلس، آل انڈیا، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

یہ بھی ہے اک فریضہ دنیا میں آدمی کا
کچھ اہتمام کرنا ظلمت میں روشنی کا

کرتے نہیں ہیں دعویٰ ذی ہوش برتری کا
اچھا نہیں ہے لیکن احساس کمتری کا

ہے قابلِ ستائش یہ قول بھی کسی کا
بے سود ہے تقاضا دشمن سے دوستی کا

یوں تو چمن میں آئی فصلِ بہار لیکن
اب کے کھِلا کھِلا ہے چہرہ کلی کلی کا

ماہر ہے اپنے فن میں اس کا یہی ہنر ہے
دل توڑنا کسی کا دل جوڑنا کسی کا

کہتے ہیں لوگ جس کو ناکامیٔ محبت
یہ دل شکن حقیقت حاصل ہے زندگی کا

آؤ بنائیں ایسی اک انجمن رفیقو!
جس انجمن میں کوئی دشمن نہ ہو کسی کا

افسانۂ محبت اس دل کی داستاں ہے
جو آ گیا کسی پر تو ہو گیا اسی کا

مجھ کو عزیز تر ہے میرا غمِ محبت
کیونکہ دیا ہوا ہے یہ غم بھی آپ ہی کا

ہر روز جس کے در پہ جھکتے ہوں شادیانے
ایسا بھی ہے مقدر لیکن کسی کسی کا

ناداں تھے رشک اُن کو اپنا سمجھ رہے تھے
دُنیا میں درحقیقت کوئی نہیں کسی کا ●

راجندر بہادر موج : فتح گڑھ، یو۔پی۔

ساری عمر پھولوں کی کانٹوں میں گذرتی ہے
ہر چبھن نیا اُن میں رنگ رُوپ بھرتی ہے

اہلِ گلستاں سمجھیں صرف انکی غفلت سے
پھول اور پتّوں کے دل پہ کیا گذرتی ہے

دھرم اور بھاشا کے بنس رہے ہیں ٹھیکیدار
بیگناہوں کے خوں سے لال لال دھرتی ہے

دیکھتی نہیں سیرت دیکھتی نہیں خصلت
یہ عجیب دنیا ہے صورتوں پہ مرتی ہے

چھُو کے جگمگاتی ہے اُس حسین چہرے کو
چاندنی بھی کس درجہ انکو پیار کرتی ہے

ملتی ہے تموّج سے توج تقویت ہم کو
حادثوں کے سائے میں زندگی سنورتی ہے ●

اختر شاہ جہانپوری : رنگیں چوپال
شاہجہاں پور، ۲۴۲۰۰۱ (یو۔پی)

اے مکینِ لامکاں منظر میں آ
ہو سکے تو گنبدِ بے در میں آ

پھر در و دیوار گم ہونے لگے
اے انیسِ شامِ غم تو گھر میں آ

معجزہ جلتے نشیمن سے یہ دکھا
موسمِ گل کے ہر اک منظر میں آ

آسمانوں پہ بسیرا کر سکوں
عظمتِ پروانہ بال و پر میں آ

بھول جاؤں نیک نامی کی طرح
اے غمِ سود و زیاں ساغر میں آ

اہلِ زر کی ملکیت اب ختم ہو
زندگانی کی چمک گھر گھر میں آ

یا تو اختر ہاتھ میں تلوار اُٹھا
اور یا ہارے ہوئے لشکر میں آ ●

غزلیں

مسرور شفیق ، قاسم پورہ،
مئوناتھ بھنجن، ۲۷۵۱۰۱ (یو پی)

جاگتی راتوں کو لطفِ معتبر لکھے گا کون
تم سو جاؤ گے تو دیواروں کو گھر لکھے گا کون

سوچتی ہے دیر سے بیدار بستر کی شکن
روشنی خاموش ہے خوابِ سحر لکھے گا کون

شہر کی تیرہ فضا نے روشنی کو ڈس لیا
اے قلم یہ ماجرائے تازہ تر لکھے گا کون

ایک تم ہی تھے ہمارے عہد میں مصحف مزاج
تم بھی چپ ہو اب حدیثِ خیر و شر لکھے گا کون

طاقِ نسیاں پر سجا دو قصۂ ہجر و وصال
کس کو فرصت ہے یہاں یہ دردِ سر لکھے گا کون

تم نے مجھ کو زندگی کی ساری خوشیاں بخش دیں
میں نہ لکھوں گا تو تم کو خوش نظر لکھے گا کون

حوصلے پتھرا گئے ہیں رہروانِ شوق کے
منزلوں کو اب نشانِ رہگذر لکھے گا کون

زرد رو موسم نے پھولوں کی ردائیں چھین لیں
تیرا غم اے طائرِ بے بال و پر لکھے گا کون

تم سا پارکھ ہی سمجھتا ہے مری قیمت ہے کیا
ورنہ اس بے مایہ قطرے کو گہر لکھے گا کون

زندگی کی راہ میں آنکھیں کھلی رکھو شفیق
تم نے مطلب کی تو رودادِ سفر لکھے گا کون ●

نیاز جیراجپوری : سی، ۱۴۔ آر ایم ہال
اے۔ ایم۔ یو، علی گڑھ، ۲۰۲۰۰۱

واسطہ جب پڑا نکلا عیار سا
میں سمجھتا رہا اس کو دلدار سا

میں گنہگار کس سے رکھوں واسطہ
ہے مرے شہر میں ہر کوئی پارسا

بے سبب خوف سے دل لرزتا نہیں
کچھ تو ہے تیری آنکھوں میں تلوار سا

اب ہمارا ملن ہو بھی تو کس طرح
میں ہوں اس پار سا تو ہے اس پار سا

وہ بھی مجھ سے جدا ہو کے کب خوش رہا
اس کا چہرہ لگے کل کے اخبار سا

اس کی چاہت پہ آئے یقیں کس طرح
اس کا برتاؤ ہے اک اداکار سا

آج تک میں سمجھنے سے قاصر رہا
وہ کبھی پھول سا ہے کبھی خار سا

جھوٹ میرا گواہوں نے سچ کر دیا
تھا پریشان منصف گنہگار سا

اب تو جیراجپوری بھلا دو اسے
اس کا وعدہ ہے خوشبو کی دیوار سا ●

ڈاکٹر اسلم حنیف : گنور، ضلع بدایوں۔ ۲۰۲۵۲۲ (یو۔پی)

برعکس زیست کے امتحاں سب قیامت کے ہیں
جیسے پروردہ ہم، لمحۂ بے بضاعت کے ہیں

آندھیاں، برق، سیلاب، طوفاں، کرن، زلزلے
یہ گراں تا گراں سب بکھیڑے امارت کے ہیں

ہیں عجب چیخیں دیوار و در سے ابھرتی ہوئی
لوگ حیرت زدہ صحن میں اک عمارت کے ہیں

جاگ اٹھا حبس خوردہ فضا کی رگوں میں لہو
شاخ در شاخ قصے یہ کس کی شجاعت کے ہیں

کاٹ موجوں کا، بوئے گل کی، پروازِ شاہین کی
دوستو! سب حوالے یہ میری عبارت کے ہیں

ہم، کڑاک، گڑگڑاہٹ سے ہی چونک جاتے ہیں یوں
جیسے پیرِ فلک کے یہ لہجے بشارت کے ہیں

خود میں گم، گوش بر آسماں، راہرو کے ہوئے
سرگراں یہ جبل، منتظر کس سماعت کے ہیں
●

اتحاد کی خوشبو

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی : ایس این کالج،
کٹرہ پرول خاں، اٹاوہ، ۲۰۶۰۰۱ (یو۔ پی)

پنچھی
حدودِ صحنِ گلستاں سے اڑ گیا
باقی ہے
پھر بھی
اس کے ترانوں کا بانکپن
روشن ہے
فیضِ نور سے
پھولوں کی انجمن
ذروں کو
آفتاب کا ہمسر بنا دیا
گلشن کو
رشکِ مہ و اختر بنا دیا
شاخوں کو
بجلیوں کے غضب سے بچا لیا
امن و اماں کے
اس نے
فروزاں کیے چراغ
دھرتی سے
نفرتوں کے اندھیرے مٹا دیے
ہر ناتواں کو
حوصلۂ زندگی ملا
رگ رگ میں
اتحاد کی خوشبو ہے موجزن
خاکِ چمن کو
خونِ جگر سے سنوار کر
پنچھی
حدودِ صحنِ گلستاں سے اڑ گیا
لیکن
یہ کہہ رہا ہے ترنگا فضاؤں میں
زندہ رہے گا
تا بہ ابد
'اندرا' کا نام

دلّی کی ادبی و فنّی سرگرمیاں

مرکزی وزارتِ تعلیم کے ترقی، اُردو بیورو نے ۱۹ مارچ کو نئی دلّی میں "اُردو کے ذریعے انجینئرنگ ٹکنالوجی کی اشاعت" کے موضوع پر ایک دو روزہ کل ہند سیمنار اور کتابی نمائش کا اہتمام کیا۔

سابق گورنر بہار ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے اپنی افتتاحی تقریر میں اُردو میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی اصطلاحات کے وضع کئے جانے کا ذکر کرتے ہوئے صنعت و حرفت کے تمام شعبوں میں اصطلاحات بنائے جانے کی ضرورت پر روشنی ڈالی لیکن اس بات پر زور دیا کہ اُردو اصطلاح سازوں کو انگریزی، ہندی، اُردو اور دوسری زبانوں میں مروج ایسی اصطلاحوں کو اپنانے میں تامل نہ ہونا چاہیئے۔ جنھیں اُردو قبول کر سکتی ہو۔

مرکزی وزارتِ تعلیم کے ایجوکیشنل ایڈوائزر (ٹکنیکل) پروفیسر اشوک چند نے جنھوں نے اس موقع پر اُردو ترقی بیورو کی شائع کردہ کتابوں کی ایک نمائش کا افتتاح بھی کیا۔ اپنی تقریر میں کہا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ اردو بولتا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی نے ملک میں سائنسی مزاج پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

مرکزی وزارت فلاح و بہبود کے ایڈیشنل سکریٹری شری آر کے سید نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ ملک کی اردو بولنے والی آبادی کے لیے ٹیکنیکل تعلیم مُہیا کرنا ضروری ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ تعلیم انھیں ان کی مادری زبان میں دی جائے۔ لیکن شری سید نے زور دیا کہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اُردو میں ٹیکنیکل تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ روزگار ملنے سے محروم نہ ہو جائیں۔



۹ مارچ ۱۹۸۷ء کو غالب اکیڈمی میں جناب اندر کمار گجرال نے جناب رفعت سروش کی کتاب "بمبئی کی بزم آرائیاں" کا اجرا فرمایا۔ جناب اندر کمار گجرال نے اس موقع پر فرمایا کہ خاکہ نگاری مشکل کام ہے، اس کتاب میں ایسے بہت سے کردار ہیں جو آج بھی زندہ ہیں، اگرچہ ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن یہ اختلافات زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ اس تقریب کی نظامت انجمن ترقی پسند مصنفین کے رکن ڈاکٹر اجمل اجملی نے کی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے ایک مقالہ پڑھا۔ (فوٹو نوید سروش)

اُردو مرثیہ دورِ حاضر میں

۲۸ مارچ کو نئی دلی میں اُردو مرثیہ پر سہ روزہ سیمنار منعقد کیا گیا۔ اُردو اکیڈمی دلّی نے اپنے زیرِ اہتمام سال کے دوران جن پانچ اجلاس منعقد کرانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سلسلے کی آخری کڑی تھی۔ اکیڈمی کی صد سالہ تقاریب سے متعلق کمیٹی کے صدر جناب کرنل بشیر حسین زیدی مہمانِ خصوصی تھے، اس تقریب کی صدارت جناب گوپی چند نارنگ نے کی، کرنل بشیر حسین زیدی نے اُردو ادب میں مرثیہ کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ اگر ہندوستان میں ہندوستانی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو زندہ و پائندہ بنانے کی جملہ کوششیں کی جاتی ہیں تو اس کے لیے مرثیہ کی روایت کو بھی زندہ رکھنا ہوگا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے سانحہ کربلا کی شعری استعارے کے طور پر وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس کے بہت سے پہلو اور بہت سے رُخ ایسے ہیں جن پر ابھی بھی بحث اور تبادلۂ خیال کی ضرورت ہے۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ مرثیہ پر ابھی تک وہ توجہ نہیں دی جا سکی جس کے لیے وہ مستحق ہے اس کی جڑیں ہندوستانی روایت و ادب میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ غزل، قصیدہ اور مثنوی پر زیادہ توجہ دی گئی۔ لیکن اس شعری صنف کو قابلِ افسوس حد تک نظر انداز کیا گیا۔ مرثیہ کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ نامکمل ہے اور اس سلسلے میں انیس اور دبیر کے مراثی کا ذکر ناگزیر ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس سیمنار میں جو مقالے پڑھے جائیں گے، اردو اکیڈمی انھیں کتابی صورت میں شائع کریگی۔ اس سیمنار میں دلّی یونیورسٹی کے پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر جعفر رضا (الہ آباد)، جناب صادق نقوی (عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد)، ڈاکٹر (مسز) رشید موسوی (حیدرآباد)، جناب محمود نقوی، سید محمد سیادت نقوی اور ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی (امروہہ) اور دیگر حضرات نے مقالے پڑھے۔

اُردو اکیڈمی کی طرف سے ایوارڈز

اُردو اکیڈمی دلی کا پانچواں سالانہ جلسہ ۹ اپریل کو دلّی میں منعقد ہوا۔ اس

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

تبصرہ: سینک سماچار آرمی ڈے نمبر ۱۹۸۷ء

رسالہ سینک سماچار وزارت دفاع کے ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز کے زیرِ اہتمام اردو، ہندی، انگریزی، اُڑیا، پنجابی، مراٹھی، تیلگو، تمل، ملیالم، بنگالی اور گورکھالی بارہ زبانوں میں باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے چیف ایڈیٹر شری ببیکا نند رے اور شعبۂ اردو کے اسسٹنٹ ایڈیٹر انچارج شری پریم پال اشک ہیں۔

اس سال اس نے یوم برّی افواج کے موقع پر ۵۲ صفحات پر مشتمل ایک خصوصی آرمی ڈے نمبر شائع کیا ہے۔ کور کے چار صفحات اس کے علاوہ ہیں۔ اتنی ضخامت، آرٹ پیپر کے خوبصورت کور، عمدہ کاغذ پر فوٹو آفسیٹ کی عمدہ طباعت اور فوجی ساز و سامان کی خوش رنگ کمیاب تصاویر سے مزیّن اس خصوصی نمبر کی قیمت صرف ایک روپیہ رکھی گئی ہے جو ہر خاص و عام کی دسترس کے اندر ہے۔

خصوصی نمبر میں اعلیٰ ٹیکنالوجی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سے یقیناً قارئین کو برّی افواج میں ہونے والی ٹیکنالوجیکل تبدیلیوں سے آگاہی حاصل ہوگی اور وہ ملک کی دفاعی قوت پر ناز کر سکیں گے۔

خصوصی نمبر کے مضامین میں سب سے زیادہ اہم چیف آف دی آرمی اسٹاف جنرل کے سندرجی کا انٹرویو ہے جو انھوں نے سینک سماچار کے چیف ایڈیٹر کو دیا اس میں انھوں نے سینا میں اعلیٰ ٹیکنالوجی اختیار کرنے سے متعلق امور پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

دیگر اہم مضامین میں نگرانی اور معلومات کے لیے

خصوصی سیارے، الیکٹرانک جنگ میں مہارت، سینا میں کمپیوٹر سروس کا آغاز، ای ایم ای اسکول بڑودہ میں اعلیٰ ٹیکنالوجی کی تربیت، اور فوج میں شخصی استحکام و انصرام میں خودکاری شامل ہیں۔

نئے ہندوستان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ضرورت کے موقع پر وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی کے انقلاب آفریں خیالات بھی شریکِ اشاعت ہیں۔

تمام مضامین ایسی معلومات فراہم کرتے ہیں جن سے نہ صرف فوجی عملے کو بلکہ ہر خاص و عام کو باخبر ہونا چاہیئے۔

خصوصی نمبر میں قارئین کے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے کہانی اور نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔

اندرونی و بیرونی صفحات پر فوجی ساز و سامان کی خوبصورت تصاویر شائع کی گئی ہیں۔ نمبر قابلِ مطالعہ ہے۔

ایل۔ سی۔ یاسین ●

نام کتاب : آسان اردو شارٹ ہینڈ

مصنف : سید راشد حسین

ناشر : ترقی اردو بیورو، حکومتِ ہند
آر۔ کے۔ پورم۔ نئی دہلی۔

قیمت: ۱۶ روپے

کسی بھی قوم کی سماجی اور اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ زبان کی ترقی و بقا کے لیے ضروری ہے کہ اسے روزمرہ کی زندگی میں، اسکولوں اور کالجوں میں، دفاتر اور کاروباری اداروں میں زیادہ سے زیادہ رائج کیا جائے اور ذخیرۂ علوم اس کی اپنی زبان میں فراہم کیا جائے۔ آزادی کے بعد یوں تو مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں مگر تکنیکی اور فنی کتب کی جانب توجہ نہیں دی گئی۔ جناب سید راشد حسین انسٹرکٹر، اردو شارٹ ہینڈ و ٹائپ، غالب اکیڈمی، نظام الدین، نئی دہلی نے اس فن پر "آسان اردو شارٹ ہینڈ" کے نام سے کتاب تصنیف کرکے اردو کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اس سے پہلے اس فن پر مصنف مذکور نے سہ ماہی رسالہ بعنوان "رہنما اردو مختصر نویسی" شروع کیا جس کے کئی شمارے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ رہنما اردو مختصر نویسی اور آسان اردو شارٹ ہینڈ کے درمیان راشد صاحب کے اس موضوع پر کئی مضامین بھی ہیں جو اردو کے اہم رسائل اور اخبارات میں شمولیت کر چکے ہیں۔ جو اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ راشد صاحب اس فن کو ترقی دینے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں مصنف نے سب سے پہلے ضروری ہدایات دی ہیں اس کے بعد شارٹ ہینڈ حروف کی علامات کو چارٹ کے ذریعہ انھیں لکھنے کا طریقہ بتایا ہے۔ حرکات کا چارٹ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ عام مبتدی بھی اسے آسانی سے سمجھ سکے۔ اِملا اور تلفظ پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ہر سبق کے بعد رموز کا ایک باب شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ ہر سبق کے بعد مبتدیوں کے لیے مشقیں بھی دی گئی ہیں تاکہ طلبا و طالبات مختلف اصول پڑھنے کے فوراً بعد ان کا اطلاق کرتے ہوئے شارٹ ہینڈ لکھ سکیں۔ اس کے علاوہ مصنف مذکور نے مجموعہ نویسی کے اصول بھی تحریر کئے ہیں جنھیں شارٹ ہینڈ میں اہم مقام حاصل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سابقے اور لاحقے بھی ان کی گرفت سے نہیں بچ پائے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں مصنف نے تقریباً ایک ہزار مشکل الفاظ اور ان کی شارٹ ہینڈ کو لغت کے اصولوں کے تحت مرتب کیا ہے۔ امتحانی پرچے بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں۔ راشد صاحب نے ایک مشکل کام کو آسان کرنے کے لیے پورے خلوص سے کوشش کی ہے اور اپنے تجربوں کو ان میں سمویا ہے

اُمید ہے کہ یہ کتاب اردو شارٹ ہینڈ سیکھنے والے طلبا و طالبات کی نہایت ضرورتوں کو پورا کرے گی۔

(سیدہ رقیہ زیدی) ●

ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی

معین الدین حارث

اب یادِ رفتگاں کی بھی فرصت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

غم و اندوہ، حسرت و حرماں اور یاس و مجبوری میں ڈوبا ہوا یہ شعر آج ایک بار پھر مجھے اس لیے یاد آیا کیونکہ میں آپ کے اور اپنے ایک محبوب یعنی عالی جناب معین الدین صاحب حارث مرحوم و مغفور کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ حارث صاحب کی شخصیت اتنی پہلو دار تھی کہ اس کے جلوہ ہائے صد رنگ کو چند الفاظ میں سمیٹ کر محض چند لمحات میں بیان کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ع

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بے کراں کے لیے

بہتر یہ ہوگا کہ حارث صاحب کی زندگی کے کچھ دھندلے اور گہرے نقوش کو ابھارے بغیر ہم محض ان کے جادہ ہائے حیات کے سنگِ میلوں پر روشنی ڈالتے چلے جائیں جو نئی نسل سے تعلق رکھنے والوں کو اپنی اپنی منزل متعین کرنے میں یقیناً مدد دیں گے۔

حارث صاحب کے والد محترم جناب برہان الدین صاحب سرزمین مہاراشٹر کے فرزند تھے۔ وہ نالہ سوپارہ کے رہنے والے تھے جو شہر بمبئی سے چند کلومیٹر کی دوری پر واقع ایک قصبہ ہے — اللہ نے برہان الدین صاحب کو روپیہ پیسہ، اولادِ صالح، شرافت و نجابت اور علم و ایمان سبھی نعمتوں سے نوازا تھا۔ ان میں ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مذہبی اور معاشرتی روایات کے پاسدار ہوتے ہوئے عہدِ جدید کی مفید و صحت مند ترقیات کے قدرداں بھی تھے۔ وہ غریبوں کے ہمدرد، اہلِ علم و فن کے قدرداں، سادہ زندگی کے قائل اور اخلاقِ حسنہ کے دلدادہ تھے۔ ان کے لائق فرزند جناب معین الدین حارث صاحب نے شخصیت کی یہ تمام دلآویز خصوصیات اپنے والد ماجد سے وراثتاً پائی تھیں اور یہ خصوصیات محض دلکش لباس کی طرح نہ تھیں (جسے جب چاہا پہن لیا اور جب چاہا اُتار پھینکا) بلکہ یہ خصوصیات جذب ہو کر خود اُن کی شخصیت کا جوہر بن گئی تھیں۔ حارث صاحب کی تاریخِ ولادت ۱۸؍ اپریل ۱۹۰۵ء تھی۔ ان کی ابتدائی تعلیم پُرانے انداز پر ہوئی یعنی قصبے کے ایک اسلامی مکتب میں عربی، فارسی اور اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس دَور کے ان کے اساتذہ میں جناب مولانا حافظ علیم الدین صاحب ٹونکی اور قاری غلام مصطفیٰ خاں صاحب بنارسی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اسی مکتب میں رہ کر انھوں نے قرآن مجید ختم کیا اور کچھ پارے حفظ بھی کیے۔ ایک مرتبہ ایک نجی ملاقات میں حارث صاحب نے بیان فرمایا کہ بچپن میں جب تک میں کم از کم ایک یا دو آیاتِ قرآنی صبح کو حفظ کر کے اپنے اُستاد کو سُنا نہ دیتا تھا، مجھے ناشتہ نہ ملتا تھا۔

مکتبی تعلیم کے بعد حارث صاحب پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں پڑھنے لگے۔ پرائمری اسکول میں ذریعۂ تعلیم مراٹھی تھا اور حارث صاحب بڑی روانی کے ساتھ مراٹھی بولنے اور لکھنے لگے۔ انھوں نے روایت کی کہ کئی بار انھوں نے مراٹھی مقالہ، خطابت و مضمون نویسی میں انعامات حاصل کیے تھے۔ انھوں نے کئی بار اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں مراٹھی اور اردو زبانوں کی ملی جلی قواعد لکھنا چاہتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حارث صاحب نے ہمیشہ اردو اور مرہٹی سے پُرخلوص محبت کی اور ان دونوں زبانوں میں پوشیدہ تاریخی، تہذیبی اور لسانی مشترکہ اقدار کی تلاش و تحقیق کرتے رہے۔ افسوس کہ سیاسی، سماجی، صحافتی اور قومی کاموں نے انھیں یکسوئی کے ساتھ علمی نہج پر کام کرنے کی مہلت نہ دی ورنہ یقین ہے کہ ان کی کوشش سے یہ ذو لسانی تحریک خوب خوب پھلتی پھولتی۔

اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ حارث صاحب اُردو کے حُسن پر دل و جان سے فریفتہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اُردو ہی بھارت کی واحد سیکولر زبان ہے اور یہی وہ زبان ہے جس میں دنیا کے ہر قسم کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی بے تکان اور بھرپور طریقہ پر کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں حارث صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے وہ اداریے بیحد اہم ہیں جو انھوں نے روزنامہ "اجمل" اور ہفت روزہ "اجمل" بمبئی کے لیے لکھے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادیٔ وطن سے پہلے اور بعد، حارث صاحب نے قومی زبان کے موضوع پر جو باتیں لکھی تھیں، ان کی بنیاد پر ان کے سماجی شعور اور علم اللسان سے ان کی علمی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔

حارث صاحب دیوناگری میں لکھی ہوئی آسان ہندی یا گاندھی جی کی من پسند بھاشا "ہندوستانی" کے بھی حامی تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مرحوم ہندوستانی پرچار سبھا بمبئی سے ہمیشہ وابستہ رہے۔ وہ ایک عالی ظرف اور سمجھدار انسان کی طرح انگریزی زبان کو بین الاقوامی رابطے کی زبان سمجھتے تھے۔ وہ خود انگریزی بہت کم بولتے تھے۔

لیکن جب حارث صاحب [illegible] تو انہیں روانی اور جوش کے ساتھ [illegible] اس زبان میں گفتگو فرماتے تھے جو کو انگریزی [illegible] اور [illegible] میں بھی کمال حاصل تھا۔ وہ ہر روز [illegible] کے ساتھ مختلف اخبارات کا مطالعہ بہت غور و خوض سے کرتے تھے اسی لیے ان کی معلومات گوناگوں اور تازہ ترین ہوا کرتی تھیں۔

معین الدین حارث صاحب ایک سچے قوم پرست مسلمان تھے۔ اگر ایک طرف انہیں اپنے وطن ہندوستان سے محبت تھی تو اسی شدت کے ساتھ دوسری جانب وہ ملتِ اسلامیہ کے سچے بہی خواہ اور پُرجوش وکیل بھی تھے جس زمانے میں انگریزوں نے اپنی اچوک Divide & Rule کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں اور ہندوؤں کو آپس میں لڑانے کی کوشش کی اس زمانے میں حارث صاحب نے ڈنکے کی چوٹ پر انگریزوں کی عیاری اور مکاری کا پردہ فاش کیا اور ہندو مسلمان کو نااتفاقی سے پیدا ہونے والے خوفناک خطروں سے آگاہ کیا۔ وہ اپنے نظریات پر اتنے اٹل تھے کہ تقسیم وطن کے بعد بھوٹ پھوٹ کر روئے اور اعزہ و احباب کی متواتر کوششوں کے باوجود پاکستان جانا گوارا نہ کیا۔

یہاں ایک دلچسپ بات یاد آگئی۔ حارث معین الدین صاحب کا تخلص تھا اور عنفوان شباب میں وہ کبھی کبھی شعر بھی کہا کرتے تھے۔ عربی زبان میں حارث کے معنی "کسان" کے ہیں۔ اس تخلص سے اندازہ ہوتا ہے کہ حارث صاحب کو دیہات کی سیدھی سادی زندگی سے کتنی محبت تھی اور وہ کھیتی باڑی کو کتنا اچھا پیشہ سمجھتے تھے۔ یہ تخلص ان کی حد سے بڑھی ہوئی منکسرالمزاجی کا غماز بھی ہے۔ ایک مرتبہ رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی نے یہ بلیغ جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ معین الدین اپنے کھیتوں کے لیے بےشک حارث ہے لیکن میدان سیاست میں "ابو الحارث" یعنی "شیر" ہے، حارث صاحب نے ہمیشہ اپنے لیے کہے گئے اس جملے پر ناز کیا۔

ابھی حارث صاحب کی مسیں بھیگی تھیں کہ ہندوستان میں علی برادران اور ان کے بہت سے حامیوں نے "تحریکِ خلافت" شروع کردی۔ اسی زمانے میں ایک اسکول مصطفیٰ کمال پاشا سے منسوب کرکے قائم کیا گیا تھا۔ حارث صاحب بھی اس اسکول میں پڑھنے لگے۔ یہ اسکول جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ملحق تھا اور علی گڑھ میں واقع تھا۔ آگے چل کر بعض وجوہ کی بنا پر جب جامعہ ملیہ علی گڑھ سے منتقل کرکے قرول باغ دہلی لے جایا گیا تو حارث صاحب بھی دہلی چلے گئے۔ دہلی میں حارث صاحب کو مولانا اسلم جیراجپوری، ڈاکٹر عبدالحئی فاروقی، مولوی شرف الدین ٹونکی، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین، مولوی شفیع الدین نیر، مولوی عبدالغفار مدھولی اور بہت سے دوسرے اکابر علم و ادب کی صحبتوں میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا اور اسی جامعہ ملیہ سے انھوں نے ۱۹۲۷ء میں بی، اے کی ڈگری حاصل کی۔

ابھی حارث صاحب کا تعلیمی دور جاری تھا اور وہ فارغ التحصیل بھی نہ ہوئے تھے کہ ان کی صحافتی زندگی کی شروعات ہوگئی۔ اس زمانے میں مشہور محب وطن لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک مراٹھی زبان میں دو اخبار نکالتے تھے۔ ایک کا نام تھا "کیسری" اور دوسرے کا "نواکال"۔ چنانچہ حارث صاحب مراٹھی میں ان دونوں اخبارات کے لیے مضامین و مراسلات بھیجا کرتے تھے۔ آگے چل کر جب حارث صاحب بمبئی پہنچے تو وہاں سے شائع ہونے والے اُردو روزنامہ "خلافت" اور انگریزی ہفتہ وار "بمبئی کرانیکل" کے ادارۂ تحریر میں شامل ہوگئے۔ سید عبداللہ بریلوی اور مولانا عبدالباسط صاحبان ایسے منجھے ہوئے اخبار نویسوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے حارث صاحب کے خیالات میں بلندی اور قلم میں بےپناہ تیز رفتاری پیدا ہوگئی۔ اور ابھی تعلیم مکمل کیے ہوئے حارث صاحب کو صرف ایک ہی سال گزرا تھا کہ ۱۹۲۸ء میں جبکہ ان کا سن ۲۳ برس کا تھا وہ روزنامہ "اجمل" بمبئی کے ایڈیٹر بنا دیے گئے۔ وہ محض اُردو اور مراٹھی صحافت ہی کے مرد میدان نہ تھے بلکہ انگریزی روزنامے (ایوننگ نیوز) میں بھی ایک مستقل کالم لکھا کرتے تھے۔ اب مرحوم ملک گیر شہرت کے حامل بن چکے تھے اور سبھی قومی رہنما ان کی قدر کرتے تھے۔

حارث صاحب ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۴ء تک مہاراشٹر لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے اور تیرہ سال تک بمبئی میونسپل کارپوریشن کا ممبر کی۔ اس کے علاوہ حارث صاحب کو جو دیگر اعزازات حاصل ہوئے ان کی مختصر فہرست ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ ہندوستانی پریس کمیشن اوّل دوم کے نامزد ممبر
۲۔ سنٹرل حج کمیٹی بمبئی کے تین سال صدر۔
۳۔ فلم سنسر بورڈ کے ۱۲ سال تک نامزد ممبر۔
۴۔ یونیورسٹی آف بمبئی کے فیلو۔
۵۔ تحریک ستیہ گرہ میں حصہ لینے پر ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء میں جیل یاترا۔
۶۔ گاندھی جی کی ڈانڈی یاترا میں شریک ہوئے۔
۷۔ اسلامی و مغربی ممالک کا دورہ کیا۔
۸۔ یوسف مہرعلی میموریل ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر رہے۔
۹۔ ادارہ انجمن اسلام بمبئی کے صدر تادم آخر۔
۱۰۔ حارث صاحب کی قیادت میں ارکان انجمن اسلام کی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی سے ملاقات فروری ۱۹۸۲ء۔

معین الدین حارث صاحب کے بارے میں، میں نے شروع ہی میں عرض کیا تھا کہ ان کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ وہ ایک ترشے ہوئے نگینے کی طرح تھے کہ جس طرف سے بھی ان پر روشنی ڈالی جائے وہ چمک اُٹھتے تھے۔ مثلاً ان کا ذاتی کتب خانہ منتخب اور نایاب کتابوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس میں صرف بیش قیمت کتابیں ہی نہ تھیں بلکہ ہندوستان کے سبھی مشہور اخبارات کی باقاعدہ فائلیں بھی موجود تھیں۔ جو لوگ صحافی ہیں یا تحقیقی کام کرتے ہیں وہ ان چیزوں کی صحیح قدر و قیمت سے واقف ہوتے ہیں۔ کتنی حیرت انگیز ہے یہ بات کہ حارث صاحب، جن کے مشاغل گوناگوں اور بےشمار تھے سنجیدہ کتابوں کے مطالعے اور انھیں سجانے سنوارنے کے لیے کیسے وقت نکال لیا کرتے تھے۔ ہمارے نوجوانوں کو حارث صاحب ایسے باذوق بزرگوں کی مثالی زندگی سے ایسی قابل تعریف اور لائق تقلید باتوں کو سیکھ لینا چاہیئے۔ غور کیجئے تو ہمارے بزرگوں کا مقصدِ حیات ہم سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ تھا۔ ان کی نظر زیادہ تر ہم سے

زیادہ علم اندوزی پر رہا کرتی تھی اور وہ زندگی کے اسٹیج پر اداکاری سے زیادہ فن کاری کے قائل تھے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ حارث صاحب کے بھائی جناب رضوان حارث صاحب نے معین الدین حارث مرحوم کے بیش بہا ذخیرۂ کتب کو بطور عطیہ انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کو دے دیا ہے جو اب LATE MOIN-UDDIN HARIS COLLECTION کے نام سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔

حارث صاحب نے اپنا خاندانی نام ہی حارث رکھ لیا تھا لیکن کبھی کبھی اسے بطور تخلص بھی استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے زندگی میں شعر کم ہی کہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شاعر بھی تھے۔ مشاعروں میں شاذ ہی شریک ہوتے تھے لیکن انتہائی عالی مذاق سخن ور و سخن فہم تھے۔ ان کی ایک چھوٹی سی نظم مجھے اب تک یاد ہے جو انھوں نے چند بے تکلف احباب کی محفل میں سنائی تھی۔ غالباً یہ نظم ابھی تک کہیں بھی شائع نہیں ہوئی لیکن مرحوم فرماتے تھے کہ جناب ماہر القادری صاحب مرحوم نے اپنے رسالہ فردوس (بمبئی) کے لیے ان سے یہ نظم بہ اصرار لی تھی۔ لیجیے آپ بھی یہ نظم سنیئے اور لطف اُٹھایئے۔ نظم کا عنوان ہے — "نوید آزادی"۔

پھر چمن میں موسموں کا تاجدار آنے کو ہے
جھوم کر کہتے ہیں گل بوٹے، بہار آنے کو ہے

لو درِ مے خانہ پھر وا ہو رہا ہے مے کشو
مدتوں کے بعد پھر دورِ خمار آنے کو ہے

ساقیٔ گلگوں قبا سامانِ مے نوشی لیے
دیکھنے کو آج ظرفِ بادہ خوار آنے کو ہے

بابِ زنداں توڑ کر ہر اک سپاہی دیش کا
سینہ تانے، سر اُٹھائے، باوقار آنے کو ہے

گیت آزادی کے گاتا چھیڑتا سازِ خوشی
ہند کا ہر نوجواں، دیوانہ وار آنے کو ہے

شمعِ آزادی کے پروانوں کی جرأت دیکھ کر
سامراجی قوتوں کو اب بخار آنے کو ہے

جو کبھی ڈوبا نہ تھا، سورج وہ ڈوبا جائے ہے
تاجداروں کے لیے پیغامِ دار آنے کو ہے

گاندھی و آزاد اور جوہر، جواہر کے طفیل
کشتیٔ اہلِ وطن طوفاں کے پار آنے کو ہے

بنتا جاتا ہے مقدر، جاگتی جاتی ہے قوم
اب خدا رکھے زمانہ شاندار آنے کو ہے

کیوں نہ ہم ہوں سُرخرو ہے خالق اکبر معین
مژدہ باد اے بے قراروں کو قرار آنے کو ہے

معین الدین حارث صاحب مرحوم کی یہ نظم جہاں، ایک طرف ان کی قادرالکلامی اور فصاحت و بلاغت زبان پر دلالت کرتی ہے وہیں دوسری طرف اُن کے پُرخلوص جذبۂ حب الوطنی اور احساس قومیت کی آئینہ دار بھی ہے۔ اس نظم کی اٹھان اور اس کے لب و لہجہ کو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ اگر حارث صاحب سنجیدگی کے ساتھ اس طرف توجہ کرتے تو ایک دن یقیناً وہ ایک مشہور و معروف شاعر بن سکتے تھے اور انہیں جوش، حفیظ، مجاز اور مولانا ظفر علی خاں کی صف میں جگہ مل سکتی تھی مگر وہ شعر کی دیوی کو دور سے سلام کر کے پیچھے ہٹ گئے اور اس طرح اُردو شاعری کا بڑا نقصان ہو گیا۔

شاعری سے قطع نظر جب ہم حارث صاحب کی نثر نگاری پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ نثر کے میدان میں ان کا قلم نظم سے کہیں زیادہ برق رفتار تھا۔ انھوں نے سیاسی، ادبی، سماجی اور مذہبی ہزاروں موضوعات پر مضامین لکھے لیکن ان کے ہر مضمون میں جو خصوصیت تھی وہ یہ تھی کہ وہ موضوع کا حق ادا کر دیا کرتے تھے یعنی موضوع زیرِ بحث کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو تشنہ رہ جائے۔

عموماً وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے لیکن جب کسی رسالے یا کسی مذاکرے کے لیے مضمون نگاری کرتے تھے تو پوری طرح لیس ہو کر۔

کاش کہ ان کے مضامین کا کوئی مجموعہ شائع ہو جائے تو لوگوں کو اندازہ ہو کہ معین الدین حارث صاحب قلم کے کتنے بڑے دھنی تھے۔

افسوس کہ بیک وقت اتنے بہت سے انسانی اوصاف کا مجموعہ اور صحافتی و ادبی صلاحیتوں کا گلدستہ ہمارے درمیان نہ رہا — ۳۱ جولائی ۱۹۸۳ء کو قوم و ملک کا یہ بے باک خدمت گزار اور شعر و ادب و صحافت کا محسن اس دنیائے آب و گل کو چھوڑ کر اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا۔ جاتے جاتے ہیں خدائے سخن میر تقی میر کا ایک شعر سنا گیا —

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سُنیے گا
کہتے کسی کو سُنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا

بقیہ: جنگلات اور جنگلی جانوروں کا تحفظ

حالات بدلنے سے پرانی نوع ختم ہو رہی ہیں۔ اور نئی نوع وجود میں آ رہی ہیں۔ اس صنعتی دور میں نئی نئی فیکٹریوں کے کھلنے سے اور انسانی آبادی میں اضافے کی بنا پر حالات کافی تیزی سے بدلے ہیں لہذا فطری طور سے پُرانی نوع کا ختم ہونا اور نئی نوع کا وجود میں آنا ہے مگر انسانی لالچ اس میں مزید اضافہ کر رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گینڈے کے سینگ اور آہوئے نافہ کا مُشک دوائیوں میں استعمال کرنے کی غرض سے گینڈے اور آہوئے نافہ کا شکار بے دردی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ہاتھی کا دانت، بحری شیر کا پستم اور وہیل مچھلی کا تیل کافی قیمتی ہوتے ہیں اس بنا پر ان جانوروں کا شکار حد سے بڑھ گیا ہے۔ علاوہ ازیں خوشحال لوگوں کے شکار کے شوق نے جنگلی جانوروں کو سخت مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے اور ان کی تعداد مسلسل کم ہوتی جا رہی ہے۔ انھیں حالات کو سامنے رکھ کر جنگلی جانوروں کے تحفظ کا پروگرام کافی اہم ہو گیا ہے۔

آپ سب کے لیے

سورج کیا ہے ؟

سورج دراصل ایک ستارا ہے جو قریب ہونے کی وجہ سے دیگر ستاروں کے مقابلے بڑا نظر آتا ہے اور ستارے بھی بڑے بڑے سورج ہیں لیکن دُور ہونے کی وجہ سے چھوٹے نظر آتے ہیں۔

سورج کا زمین سے اوسط فاصلہ ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ اس کی روشنی کو زمین تک پہنچنے میں تقریباً ۸ منٹ لگتے ہیں جبکہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ سورج کے بعد جو ستارا ہم سے سب سے قریب ہے اس کی روشنی کو زمین سے تک پہنچنے میں تقریباً چار سال لگتے ہیں۔

سورج جو ہمیں تھالی کی طرح گول نظر آتا ہے۔ دراصل گیند کی طرح گول ہے۔ اس کا قطر یعنی آر پار کا ناپ ۸ لاکھ ۶۵ ہزار میل ہے دوسرے ستاروں کی طرح سورج بھی گیسوں کا بنا ہوا ایک گولہ ہے۔

گرمی کی طرح گیسوں کا دباؤ بھی گہرائی کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے سطح سمندر پر ہوا کا دباؤ جتنا ہے اس کا ایک ارب گنا دباؤ سورج کے درمیانی حصہ میں پایا جاتا ہے۔

مادّے کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ ٹھوس جیسے برف، سیّال جیسے پانی، گیس جیسے بھاپ سورج کے مرکزی حصہ میں مادّے کی ایک چوتھی صورت پائی جاتی ہے، جسے پلازما کہتے ہیں۔ پلازما بنتا ہے جب گیسوں کی بےحد گرمی اور دباؤ سے انکے ایٹم ٹوٹ جاتے ہیں اور دھماکے ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں ایٹم کے بارے میں چند بنیادی باتیں جاننا ضروری ہیں۔ کیونکہ بغیر ایٹم کی بناوٹ کو سمجھے ہوئے یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ سورج اور ستارے روشنی کیسے پیدا کرتے ہیں ؟

پرانے زمانے کے لوگ سمجھتے تھے کہ دُنیا کی سب چیزیں چار چیزوں سے مل کر بنی ہیں یعنی مٹّی، پانی، آگ اور ہوا۔ انھیں وہ عناصر کہتے تھے۔ لیکن بعد میں سائنس دانوں نے معلوم کیا کہ عناصر چار نہیں ہیں بلکہ سَو ہیں اور خود ہر عنصر بے شمار لیکن ایک ہی طرح کے ایٹموں کے ملنے سے بنا ہے۔ ایٹم باریک سے باریک ذرّے سے چھوٹا ہوتا ہے، اتنا چھوٹا کہ اسے انتہائی طاقتور خوردبین سے بھی دیکھا نہیں جا سکتا ہے۔ ایٹم دنیا کی سب سے چھوٹی چیز ہے اور ستارا سب سے بڑی لیکن ایٹم کے بھی حصّے ہوتے ہیں۔

ایٹم کی بناوٹ نظامِ شمسی سے ملتی جلتی ہے جس طرح سورج کے گرد ستارے گردش کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر ایٹم کے بیچ میں سورج کی جگہ مثبت بجلی کے ایک یا کئی ذرّے ہوتے ہیں جنھیں پروٹان کہتے ہیں۔ الیکٹران ہلکے ہوتے ہیں اور پروٹان بھاری۔ الیکٹران پروٹان کے گرد نہایت تیزی سے برابر گھومتے رہتے ہیں۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ ہمارے سورج میں ہر سکنڈ ۵۶ کروڑ چالیس لاکھ ٹن ہائیڈروجن کے ایٹم ٹوٹ کر ۵۶ کروڑ ٹن ہیلیم میں بدل جاتے ہیں۔ باقی ۴۰ لاکھ ٹن مادہ روشنی اور گرمی میں بدل جاتا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ سورج کے وزن میں ہر سکنڈ ۴۰ لاکھ ٹن کمی ہو جاتی ہے۔ اس حساب سے ہمارا سورج

تقریباً ۵ ہزار سال سے اپنی روشنی اور گرمی لٹا رہا ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ موجودہ رفتار سے وہ تقریباً اتنی ہی مدت تک اور روشنی اور گرمی دیتا رہے گا پھر ایک زمانہ ایسا آئے گا جب اس کی ساری روشنی اور گرمی ختم ہو جائے گی اور تب وہ ایک ٹھوس اور ٹھنڈے گولے کی شکل میں خلا میں چکر کاٹتا رہے گا۔

ریلوے ٹکٹ اور کمپیوٹر

جب ہمیں ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے کا خیال آتا تھا تو سب سے پہلے ہمیں سفر کی تکلیفیں نظر آنے لگتی تھیں، جو ابتدا میں اتنا پریشان کرتی تھیں کہ پروگرام منسوخ کر دینے میں ہی خیریت نظر آتی تھی۔ اس کی شروعات اسوقت ہو جاتی تھی جبکہ ہم ٹکٹ خریدنے جاتے تھے۔ اور اپنی سیٹ ریزرو کرانا چاہتے تھے۔ ہم ریزرویشن کھڑکی پر ایک جم غفیر پاتے تھے۔ اگر صبح ۱۰ بجے لائن میں کھڑے ہوئے تو کم از کم ۲ بجے تک کی چھٹی لیکن ہمیں سائنس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ جس نے کمپیوٹر جیسی چیز ایجاد کر کے بہت سی پریشانیوں سے بچا لیا ہے۔ اب دہلی اور آس پاس کے ریلوے بکنگ کاؤنٹر پر کمپیوٹر لگا دیئے گئے ہیں جن کی وجہ سے ہم ریزرویشن کی پریشانیوں سے بچ گئے ہیں۔

اس کمپیوٹر کی مدد سے اب ہمیں ریزرویشن ٹکٹ صرف ۲ منٹ میں مل جاتا ہے۔ اب نہ بکنگ کلرک سے جھگڑنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی دلال کے چنگل میں پھنسنے کی۔ کمپیوٹر کو تمام ضروری معلومات بہم پہنچائی گئیں اور اس نے یہ معلومات دیدیں کہ کتنی نشستیں خالی ہیں اور اس کے بعد ایک اور بٹن دبایا گیا، آپ کا ٹکٹ تیار ہے، صرف پیسہ دیجیے اور سفر کی تیاری میں لگ جائیے۔ دیکھ لیا آپ نے کمپیوٹر کا کمال یعنی وقت کم اور کام زیادہ۔

بینائی سے محروم افراد کو روزگار مہیا کیا جائیگا

بینائی سے محروم لوگوں کو روزگار فراہم کرنے پر بھی حکومت غور کر رہی ہے تاکہ ان کو سماج میں رہنے کا اور ایک اچھی زندگی گزارنے کا حق مل سکے۔ حکومت کا خیال ہے کہ انھیں گروپ "اے" اور "بی" میں مختلف کاموں پر لگایا جا سکتا ہے اور اس کے لیے یونین پبلک سروس کمیشن نے منظوری دیدی ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اس سلسلے میں اور بھی ضروری احکامات دیدیے جائیں گے۔ انھیں ایسی جگہوں پر رکھا جائے گا جہاں چلنے پھرنے کی کم سے کم ضرورت ہو گی۔

اس سے پہلے صرف ایک فیصد کی بنیاد پر انھیں چوکیداری، چپراسی وغیرہ جیسے کاموں پر لگایا جاتا تھا۔ ان افراد کو روزگار دلانے کے لیے ملک میں ایسے ۲۲ دفاتر کام کر رہے ہیں اور جلد ہی ۴۲ دفاتر قائم کیے جائیں گے۔ بینائی سے محروم لوگوں کو روزگار دلانے کے لیے نجی ادارے بھی کام کر رہے ہیں اور حکومت ان کی ہمت بڑھانے کے لیے وقتاً فوقتاً انعامات کا بھی اعلان کرتی ہے۔ ایسی ہی خدمات کے لیے مدھیہ پردیش اور تامل ناڈو کے دو افراد کو صدر جمہوریہ کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

بینائی سے محروم لوگوں کی امداد کے لیے حکومت نے ۸۷-۱۹۸۶ء کے بجٹ میں ۲ کروڑ ۵ لاکھ روپے مخصوص کیے تھے۔ دسمبر ۱۹۸۶ء تک ایک کروڑ ۲۷ لاکھ روپیہ بطور امداد بینائی سے محروم بارہ ہزار افراد کو دیا گیا۔

قارئین کے آراء اور مشورے

• یومِ جمہوریہ کے موقع پر یوجنا نے "قومی یکجہتی" کے عنوان سے خصوصی شمارہ شائع کر کے قارئین یوجنا پر احسان کیا ہے۔ قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے آج کے دور میں بہت کام کیا جا رہا ہے لیکن یوجنا نے ملک کے مشہور و معروف دانشوروں اور مفکروں کے مضامین ایک ساتھ شائع کر کے یقیناً ایک بڑا کام کیا ہے۔

تمام مضامین معیاری ہیں۔ ڈاکٹر گوپال سنگھ، سید مظفر حسین برنی اور ایس سی بھٹ کے مضامین قابلِ تعریف ہیں۔ یہ وقت کی اہم ضرورت ہے کہ آپس میں تفریق مٹا کر ایک دوسرے کے قریب آئیں اور ملک کی ترقی کے لیے کام کریں۔

اس شمارے کا کور بھی دیدہ زیب ہے۔

اکرام اشرف

گاندھی چوک، جالہ، دربھنگہ (بہار)

• یوجنا کے نئے رنگ و روپ اور اس کی روز افزوں ترقی کی بابت صرف میرا اظہارِ خیال ہی زیادہ اہمیت کا حامل رہے گا۔ صرف عام قاری بلکہ شاعروں اور ادیبوں کا تمام حلقہ یوجنا کے نئے رنگ و روپ کا مدح خواں ہے۔ آپ لوگوں نے یوجنا کو ہر ادب دوست کا محبوب بنا دیا ہے۔

ثاقب گنگوہی

قریشیان، گنگوہ، ضلع سہارنپور

• مجھ ناچیز کے دو مشوروں میں سے ایک مشورے پر عمل کر کے فنکاروں کے پتے شائع فرمائیے، شکریہ۔ زیرِ نظر شمارہ صوری اور معنوی اعتبار سے ایک معیاری رسالہ ہے۔

یوجنا صحتمند ادب کا ترجمان ہے اس نے مختلف عنوانات قومی یکجہتی، اقتصادیات، ترقیات، صنعت، تعلیم، طب اور ادب کے تحت جامع مواد فراہم کیا ہے۔

قاضی حسن رضا

قاضی پورہ، کھنڈوہ، (ایم۔پی)

• یوجنا کا تازہ شمارہ دیکھا، پسند آیا۔ ادھر کافی تبدیلی آئی ہے۔ مضامین کا حصہ کافی جاندار ہے۔ افسانے بھی اچھے لگے۔ شعری نگارشات بھی پسند آئیں۔

فردوس گیاوی

بھٹے خاں کی گلی، پنچایتی اکھاڑا، گیا (بہار)

• چند ہی دنوں میں اس رسالہ نے کافی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے تحت اس رسالے نے عوام کو بہت سے مناسب معلومات سے آگاہ کیا ہے۔ ادبی حصہ بھی خوب ہے۔

اسد رضوی

محمد پور مبارک، مظفر پور (بہار)

• یوجنا کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اقتصادیات صنعت و زراعت کے ساتھ ساتھ ادبی حصہ بھی پڑھنے کو ملے، ادبی حصے میں اگر کچھ اضافہ کر سکیں تو ادب نوازوں پر کرم ہوگا۔ تخلیق کے ساتھ تخلیق کاروں کی تصویریں اگر دے سکیں تو رسالہ کی جاذبیت میں اضافہ ہوگا۔

انور ثبات

۳۷/اے، اقبال پور لین، کلکتہ ۲۳۔

• یوجنا کا شمارہ جنوری ۸۷ نظر نواز ہوا۔ یوجنا کا نیا رنگ و روپ پسند آیا۔ امید کہ آپ کی مساعیٔ جمیلہ اسے معیاری جریدہ بنانے میں قابلِ قدر ثابت ہوں گی

ممتاز ٹونکی

کالی پلٹن روڈ، پل محمد خاں، ٹونک (راجستھان)

• یوجنا میں جو تبدیلیاں آپ نے کی ہیں یقیناً بڑی خوش آئند ہیں۔ لیکن حصہ نظم کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ کیا اس کے لیے ایک صفحے کا اور اضافہ نہیں ہو سکتا۔

معصوم انصاری

اسٹار گارمنٹ، نظام پورہ، بھیونڈی (مہاراشٹر)

• اپریل کا شمارہ نظر نواز ہوا، پرچہ کی ترتیب اور عمدہ کتابت و طباعت دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ رسالہ کا نام 'یوجنا' یہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ پلاننگ کے بارے میں معلومات بہم پہونچانے کا ذریعہ ہے۔ لیکن اس میں ادب کی چاشنی بھی بھرپور موجود ہے۔ ادبی حصے میں اُردو کی وُسعت، بہت ہی معلوماتی مضمون ہے اور اسے پروفیسر سید شبیر علی کاظمی صاحب نے محنت سے قلمبند کیا ہے۔ اس کے علاوہ کہانی، نظم اور غزلیں بھی اچھی ہیں۔ تخلیق کے ساتھ تخلیق کاروں کی تصاویر بھی شائع کی جائیں تو بہتر رہے گا۔

محمد کمال انور

۲۰ رحیات خاں لین، کلکتہ، ۹

بندھوا مزدوری نظام کی تنسیخ سے متعلق ایکٹ مجریہ ۱۹۷۶ء کے عمل درآمد کے سلسلے میں سب سے پہلے جو سوال سامنے آتا ہے وہ ہے بندھوا مزدوروں کی شناخت کا مسئلہ ۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ انتظامیہ ان مقامات پر بھی، جہاں کہ بندھوا مزدوری نظام موجود ہے۔ بندھوا مزدوروں کی موجودگی کو تسلیم کرنے میں پس وپیش کرتا ہے۔ چنانچہ انتظامیہ پر یہ واضح کردیا ضروری ہے کہ اگر شتر مرغ اپنا سر ریت میں چھپالے، تو اس سے اصل صورت حال میں کوئی فرق نہیں پڑتا، لہذا بندھوا مزدوری کے رواج سے نظریں چرانا بے سود ہوگا۔ دراصل بندھوا مزدوروں کی موجودگی انتظامیہ پر اتنا بڑا داغ نہیں ہے جتنا کہ اس سے بھی زیادہ بدنما داغ یہ ہے کہ انتظامیہ اس برائی کو دور کرنے میں ناکام رہا ہے اور وہ ریاست کی نیک نامی کی خاطر اس داغ کو دھونے کے لیے ضروری اقدامات کرنے سے قاصر رہا جس کا مطلب یہ ہے کہ انتظامیہ نے اپنی آئینی ذمہ داری کو نبھانے میں کوتاہی کی ہے۔

(ہندوستان کے سابق چیف جسٹس،
جسٹس پی۔ این۔ بھگوتی)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi

Special Issue 1-31 May, 1987

YOJANA (URDU)

Vol. 7 No. 3-4

ان اُجڑے، دُکھی، گونگے لوگوں کے
مُنھ میں ہمیں دینی ہوگی زباں
اِن کے ویران، سنسان، تھرے سینوں میں
پھر سے اُگانی ہیں، اُمید کی لہلہاتی ہوئی کھیتیاں
ان سے کہنا پڑے گا ہمیں اونچی آواز میں
اپنے بوجھل خمیدہ سروں کو اُٹھا کر
ذرا ایک پل کے لیے ایک ہو کر تو دیکھو
کہ وہ ظالم، جس سے ہراساں ہو، خائف ہو
خود کتنا بُزدل ہے، کمزور ہے، اُس میں کچھ دَم نہیں،
تم جو بیدار اک بار ہو جاؤ گے، اُس میں ہمت کہاں
تاب لائے تمھاری نگاہِ شرربار کی،
وہ سگِ راہ بھاگے گا فراری
ڈرا، سہما، اُلجھتا ہوا اپنے مذموم کردار کی دوڑ میں
سفارش کرے گا، اُس کی کوئی ہیبتِ یزداں
نہ اُس کی سُنی جائے گی آہ و زاری
وہ خود اپنی ذلت کے احساس کی قبر میں
لمحہ لمحہ اُترتا چلا جائے گا۔"

(رابندر ناتھ ٹیگور کی بنگلہ نظم سے ماخوذ)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadurshah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوجنا

دو روپے

الہ آباد کا ایک تاریخی
طرحی مشاعرہ

غزلیں نظمیں

بھارتیندو ہریش چندر ایوارڈز ۱۹۸۵ء

۲۰ اپریل ۱۹۸۷ء کو پبلی کیشنز ڈویژن کی طرف سے بھارتیندو ہریش چندر ایوارڈز کی تقسیم کے لیے تیسری بار سالانہ تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس کی صدارت وزیر اطلاعات و نشریات شری اجیت کمار پانجہ نے کی۔ اس موقع پر سکریٹری وزارت اطلاعات و نشریات شری جی۔ ایس مہرہ بھی موجود تھے۔ اس سال دس ہزار روپے کا پہلا ایوارڈ شری جگدیش پرساد چترویدی کو، سات ہزار روپے کا دوسرا ایوارڈ شری الکھشیم چندر سُمن کو اور پانچ ہزار روپے کا تیسرا ایوارڈ شری مدن گوپال کو دیا گیا۔ اس سال ان تینوں ایوارڈز کی رقم بڑھا کر دی گئی ہے۔ اس سے قبل یہ بالترتیب پانچ ہزار روپے، چار ہزار روپے اور تین ہزار روپے ہوا کرتی تھی۔ انعامات کے فیصلے کے لیے وزارت اطلاعات و نشریات کی سفارش پر ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی، جس کے صدر نو بھارت ٹائمز کے سابق ایڈیٹر شری اکچھے کمار جین تھے۔ اس کے دیگر ارکان میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن کے سابق ڈائرکٹر شری اندر پرتاپ تیواری، وزارت اطلاعات و نشریات کی ہندی صلاح کار کمیٹی کے رکن اور سابق ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل شری گریش کمار ماتھر، سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات کے کمیشن کے صدر پروفیسر ملک محمد اور پبلی کیشنز ڈویژن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیام سنگھ ششی شامل تھے۔ اس سال ۱۲۸ کتابیں یا مسودات موصول ہوئے اور مندرجہ بالا ایوارڈز ۲۴ فروری ۱۹۸۷ء کو منعقدہ میٹنگ میں بالاتفاق منظور کیے گئے۔

بھارتیندو ہریش چندر ایوارڈ ۱۹۸۳ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے ذریعے آل انڈیا ریڈیو، دور درشن، صحافت اور پرنٹ میڈیا وغیرہ میں ہندی میں طبع زاد کتابیں لکھنے کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ یہ ایک قومی اعزاز ہے۔ اس سلسلے کی کتابیں منگوانے کے لیے ہر سال اخبارات، جرائد، آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن کے ذریعے اطلاع دی جاتی ہے۔



زیر نظر تصویر میں انعام یافتگان اور اس انعامی مقابلے کا فیصلہ کرنے والی کمیٹی کے ارکان، وزیر اطلاعات و نشریات شری اجیت کمار پانجہ کے ساتھ۔

(دائیں سے بائیں) سکریٹری اطلاعات و نشریات شری جی۔ ایس۔ مہرہ، پبلی کیشنز ڈویژن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیام سنگھ ششی، شری جگدیش پرساد چترویدی۔ (جنھیں پہلا انعام ملا)، شری مدن گوپال (جن کو تیسرا انعام ملا)، وزیر اطلاعات و نشریات شری اجیت کمار پانجہ، شری الکھشیم چندر سُمن (جنھیں دوسرا انعام ملا)، شری اکچھے کمار جین، شری گریش کمار ماتھر، پروفیسر ملک محمد، شری آئی۔ پی۔ تیواری۔

یوجنا
نئی دہلی

چیف ایڈیٹر: سیّد ظفیر الحسن
ایڈیٹر: جگندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹر: محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر: وسیم حیدر، عبدالحمید

شرح چندہ
سالانہ ۲۰ روپے، دو سالہ ۳۶ روپے
سہ سالہ ۴۸ روپے، فی کاپی دو روپے
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں
کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

جلد: ۷ | شمارہ: ۵، ۶ | یکم تا ۳۰ جون ۱۹۸۷ء | جلسٹھ تا آساڑھ شک ۱۹۰۹ | قیمت: دو روپے۔ ٹیلیفون ۶۰۱۸۱۸

اس شمارے میں

اداریے ۲

جموں و کشمیر: عظیم عزائم — ڈاکٹر فاروق عبداللہ ۳

زراعت: زرعی سیکٹر کا مستقبل ذخیرہ — سید اطہر رضا بلگرامی ۵

آزادی کے چالیس سال

سماجی برائیوں کا خاتمہ — جگدیش لال ۱۱

بھارتی صنعت کے چالیس برس — ہرش اروڑہ ۱۵

ترقی کے سنگ میل

باغبانی کو ترقی دینے کا پروگرام — شیام سُندر چاؤلہ ۱۸

بایوگیس کے بڑھتے ہوئے قدم — ایم کے خاں اور ایس کے گھوش دستی دار ۲۲

ادب: تحریکِ آزادی اور اُردو ادب — محمد عامر علوی ۲۴

لمحہ لمحہ کرب (افسانہ) — محمد طارق ۳۰

الہ آباد کا ایک تاریخی طرحی مشاعرہ — ذکی طارق ۳۲

بے جُرمِ ضعیفی کی سزا (انشائیہ) — روشن لال روشن بنارسی ۳۵

غزلیں: واحد سحری، محمد حنیف نشاہد، انوار رضوی ۳۷

کلیم صبا، ریاض احمد عباسی ساحر ۳۸

ہری اونکار پرساد سنہا تمنا

نظمیں: ایک سوال — سید محمود نقوی ۳۸

اسی دن کے لیے — اوم تنہائت ۳۸

طب: ہم بوڑھے کیوں ہوتے ہیں؟ — ڈاکٹر ونود کمار ۳۹

فلم: اللہ تیرو نام ایشور تیرو نام — سرور یوسف ۴۲

شخصیت: ڈاکٹر ایس بیدٹ — فاطمہ ایس ۴۳

آپ سب کے لیے — ادارہ ۴۴

تبصرے۔ شریر بلی — محمد معیز الدین ۴۶

مذہب اور سائنس —— دورِ جدید اور روح — یونس صدیقی ۴۶

کھیل: کیل دیو کی بیٹنگ اور بالنگ کا جائزہ — شاہین پروین حالوی ۴۷

قارئین کی آرا اور مشورے — جمیل ارشد، کے این بھٹناگر (خورشید) ۴۸

کلیم صبا، جیند حزیں لاری، سرفراز احمد

نشاط جبیں خاں، محمد نعیم احمد

بھارتیند وہریش چندر ایوارڈ — کور ۲

پینے کے پانی کے لیے نئی تکنیکیں — پریم پال اشک — کور ۳

صفر کی بنیاد پر بجٹ — سید علی — کور ۴

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): آر۔ ایس۔ منجال

ترسیلِ زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

منصوبہ بندی

سماجی ترقّی کا اہم ذریعہ

اب ہمارے ملک میں اس بات پر سبھی کا اتفاق ہے کہ یہاں کی سماجی اور اقتصادی ترقی اور تبدیلی کے لیے قومی سطح پر منصوبہ بندی کا نظام لازمی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان جس قدر وسیع وعریض ملک ہے اور جس قدر تنوع اور رنگا رنگی یہاں پائی جاتی ہے، اس کو دیکھتے ہوئے یہاں کی معیشت کو محض منڈی یا بازار کی قوتوں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس منصوبہ بندی کا سہرا سورگیہ پنڈت جواہرلال نہرو کے سر ہے جنھوں نے ملک کو منصوبہ بندی کے نظام سے روشناس کرایا ہے اور جمہوری آئین پر حق رائے دہندگی بالغان پر ایک سے زیادہ پارٹی والے سیاسی نظام کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے اس کو پروان چڑھایا۔ ریاست کو ترقیاتی عمل کو تیزی سے آگے بڑھانے کی اہم ذمہ داری سونپی گئی۔ اس کے ساتھ ہی قومی سطح پر مشاورت رہبرانہ خطوط اور ترجیحات کے دائرہ عمل میں رہتے ہوئے انفرادی پیش قدمیوں اور کوششوں کی بھی ہمت افزائی کی گئی، ہندوستان نے اگرچہ بین الاقوامی تعاون کو ترقی کے لیے ضروری سمجھا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ملک کی ترقیاتی حکمت عملی میں خودکفیلی کو اہم ترین مقام دیا ہے اور غیرملکی امداد پر غیرضروری اور ضرورت سے زیادہ بھروسہ کو کبھی بھی جائز نہیں سمجھا کیونکہ اس سے ہندوستانی عوام کی آرزوؤں اور امنگوں نیز ان کی اپنی ضرورتوں سے ہم آہنگ رہنے والے خودمختار راستہ میں رکاوٹ پڑ سکتی تھی۔

منصوبہ بندی کے عمل کے ذریعے سے ملک کے اقتصادی ڈھانچہ کو وسعت دی جا سکی ہے۔ اس کے ذریعے ملک میں تکنیکی اور انتظامی صلاحیتوں پر مبنی قابلِ قدر عملہ بڑی تعداد میں تیار کیا جا سکا ہے، سائنس اور ٹکنالوجی سے معیشت کے سبھی شعبوں خاص کر زراعت میں نمایاں ترقی دیکھنے کو ملی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس قدر فروغ کے باوجود ترقی کی بحیثیت مجموعی رفتار ابتدائی توقعات سے کم رہی۔ چنانچہ ملک میں غریبی دور کرنے کے لیے بہت کچھ کیا جانا باقی ہے، خوش قسمتی سے ساتویں دہائی کے وسط سے ترقی کی رفتار تیزی سے بڑھی، اور غریبی کی روک تھام کے لیے مؤثر قدم اٹھائے جا سکے۔ اس عرصے میں ترقی کی گراوٹ ہوئی جو فضا بہت سے ترقی پذیر ملکوں میں دیکھنے کو ملی، اس کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے ملک کی ترقی اور بھی قابلِ قدر معلوم ہوتی ہے۔

درحقیقت ملک میں جدید کاری، خودکفیلی اور سماجی انصاف لانے کے لیے ایک ایسے اقداری نظام کے فروغ کی ضرورت ہے جس کی جڑیں ہندوستان کے شاندار ماضی کے ورثے میں پیوست ہوں۔ خوش قسمتی سے ہماری جدوجہد آزادی کے ترکے اور ہمارے آئین کے ذریعے اقداری نظام کے پھلنے پھولنے کے لیے ایک ٹھوس بنیاد موجود ہے، مگر اب وہ نسل ختم ہوتی جا رہی ہے جس نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں حصہ لیا تھا، لہٰذا اقداری نظام میں عوام کے اعتماد کو باقی رکھنے کے لیے مؤثر اقدامات کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے، ترقی کے عمل کو ٹھوس بنیادوں پر آگے بڑھانے اور اس کے لیے فضا ہموار کرنے کے لیے ایسے اقدامات ضروری ہو گئے ہیں۔ جن سے مذہبی جنون، فرقہ واریت، ذات پات پر مبنی امتیازی نظام، علاقہ پرستی اور تشدد کے واقعات کا سدّباب ہو سکے۔ صحیح اقداری نظام کے رائج کرنے میں تعلیم کلیدی رول ادا کرتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ذرائع ابلاغ اور نشر واشاعت کے ادارے فرقہ وارانہ ہم آہنگی لانے میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

۱۹۵۴ء میں پہلے پریس کمیشن کی رپورٹ میں ایسے اخبارات کی مذمت کی گئی تھی جو کہ قسمت کا حال بتایا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ ضعف الاعتقادی سائنسی مزاج کی پرورش میں مانع ثابت ہوتی ہے، دوسرے پریس کمیشن نے بھی اسی طرح کے خیالات کا اعادہ کیا تھا۔

ساتویں منصوبے میں غریبی دور کرنے کے پروگراموں پر بہت زور دیا گیا ہے، دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام کے ذریعے پانچ سال میں دو کروڑ افراد کی مدد کی جانی ہے، روزگار کے مواقع پیدا کرنے اور عوام کی آمدنی بڑھانے کے لیے متعدد پروگراموں اور اسکیموں کو اس میں شامل کیا گیا ہے، دیہی علاقوں میں صحت، خاندانی بہبود اور تعلیم کے فروغ کے لیے خصوصی اقدامات پر زور دیا گیا ہے، بچوں کے فروغ اور ان کی نشوونما کے لیے مربوط خدمات کے پروگرام اس وقت ۱۵۰۰ سے زیادہ، ترقیاتی بلاکوں میں چل رہے ہیں۔ ان میں ٹیکہ لگانے کا پروگرام، صحت کی جانچ، تغذیہ بخش خوراک کی فراہمی،

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

ڈاکٹر فاروق عبداللہ
وزیر اعلیٰ، جموں و کشمیر، سری نگر



عظیم عزائم

جموں و کشمیر میں ترقی اور سیاسی استحکام کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ ترقی اور استحکام کا یہ باب ۷ نومبر ۱۹۸۶ء کو شروع ہوا، جب جمہوری اور سیکولر قوتیں ریاست کی تعمیر کے لیے یکجا ہو گئیں۔ نیشنل کانفرنس اور کانگریس آئی کے درمیان ہوئے ایکارڈ کے نتیجے میں نہ صرف ایک عوامی حکومت قائم ہوئی بلکہ ریاست کی خوشحالی اور تیز تر ترقی کے لیے نئی راہیں کھل گئیں۔ اس ایکارڈ سے دونوں جماعتوں کو یہ موقع حاصل ہوا کہ وہ متحد ہو کر بنیاد پرست اور منفی رجحانات رکھنے والی قوتوں کا مقابلہ کریں۔ وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی نے بجا طور پر کہا ہے کہ ایکارڈ کا بنیادی مقصد ریاست میں جمہوریت پسند سوشلسٹ اور سیکولر قوتوں کو مضبوط کرنے کے علاوہ نہ صرف ریاست بلکہ سارے ہندوستان میں سیاسی استحکام اور اقتصادی خوشحالی کے ایک نئے دور کا آغاز کرنا ہے

وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالنے پر میں نے عوام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ریاست میں جمہوریت کی بحالی میرا اولین مقصد ہوگا۔ نیشنل کانفرنس اور کانگریس آئی نے یہ عہد کیا ہے کہ ہم ماضی کی تلخیوں کو فراموش کر کے ریاست میں تعمیر و ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز کریں گے۔ وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی نے گذشتہ سال موسم سرما میں زبردست سردی اور ناسازگار موسم کے باوجود ریاست کے تینوں خطوں کا تفصیلی دورہ کیا۔ ان کے اس دورہ کا مقصد لوگوں کو درپیش مسائل سے جانکاری حاصل کرنا اور ان کے حل کے لیے امداد فراہم کرنا تھا۔ وزیر اعظم نے مرکزی اور ریاستی انتظامیہ کے ساتھ ایک میٹنگ کی جس میں ریاست کو درپیش مسائل کا جائزہ لیا گیا اس میٹنگ کے نتیجے میں دس ارب روپے کے مختلف پروجیکٹوں اور دیگر اسکیموں کے بارے میں فیصلے لیے گئے جس میں ڈول ہستی پاور پروجیکٹ پر کام شروع کرنا، ریاست میں سیاحت کو وسعت دینا، گلمرگ میں کیبل کار پروجیکٹ کے علاوہ ریاست میں سڑکوں اور پلوں کی تعمیر و تجدید پر کام شروع کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ جموں سے ادھمپور تک ریلوے لائن بچھانے کے کام کے لیے معقول رقومات فراہم کی گئی ہیں۔ ایچ، ایم، ٹی واچ فیکٹری کو تقریباً چار کروڑ روپے کی لاگت سے وسعت دینے کا فیصلہ کیا گیا ہیلی کاپٹر کارپوریشن آف انڈیا سے ریاست کو دو ہیلی کاپٹر فراہم کرنے کی استدعا کی گئی تاکہ ریاست کے دور دراز علاقوں، جو کہ عام طور پر موسم سرما میں ریاست کے باقی حصوں سے کٹ جاتے ہیں، کے ساتھ رابطہ قائم رکھا جا سکے۔ ریاست میں سیاحت کے شعبے کو بڑھاوا دینے کے لیے ایک ہیلی کاپٹر حاصل کیا گیا ہے علاوہ ازیں شیر کشمیر یونیورسٹی آف ایگری کلچرل سائنس و ٹیکنالوجی کو ۹ کروڑ روپے کی لاگت سے وسعت دیے جانے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔

ریاست کی تیز تر ترقی کو یقینی بنانے کے لیے ۸۸-۱۹۸۷ء کے سالانہ منصوبے کے لیے پہلے منظور کی گئی ۳۵۲ کروڑ روپے کی رقم بڑھا کر ۳۷۵ کروڑ روپے کر دی گئی۔ اس کے علاوہ میں نے ریاست کی ہمہ گیر ترقی کے لیے پندرہ نکات پر مشتمل ایک جامع پروگرام بھی مرتب کیا ہے۔

گذشتہ برس وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد میں نے اسمبلی کو توڑنے کی سفارش کی اور درخواست کی کہ ریاست میں نئے اسمبلی انتخابات کرائے جائیں اور

اس طرح ۲۳ مارچ ۱۹۸۷ء کو ریاست بھر میں انتخابات عمل میں لائے گئے۔ اسمبلی چناؤ کی خاص بات یہ تھی کہ کانگریس آئی اور نیشنل کانفرنس نے مشترکہ طور پر انتخابات میں حصہ لیا، تاکہ قومی یکجہتی اور سیکولر طاقتوں کو مضبوط بنایا جائے۔ اسمبلی چناؤ میں دونوں پارٹیوں کے محاذ کو بھاری اکثریت حاصل ہوئی اور اس طرح ریاست میں ایک بار پھر نیشنل کانفرنس اور کانگریس کی ملی جلی سرکار قائم ہوئی۔

چناؤ نتائج سے یہ بات عیاں ہوئی کہ ریاستی عوام نے علیحدگی پسند، فساد پرست اور فرقہ پرست عناصر کو ٹھکرا کر سیکولرازم، سوشلزم اور جمہوریت پسند پارٹیوں کے حق میں ووٹ دے کر انھیں موقع فراہم کیا کہ وہ ملک اور ریاست کی تیز تر ترقی کے لیے کام کریں۔ چناؤ نتائج سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وزیر اعظم اور میرے درمیان ہوئے ایکارڈ کو ریاستی عوام کی بھرپور تائید حاصل ہے۔

ریاست کو بہت سارے مسائل درپیش ہیں۔ جنھیں حل کرنے کے لیے میری حکومت تمام تر کوششیں بروئے کار لائے گی تاکہ لوگوں کی ان امنگوں اور امیدوں کو پورا کیا جا سکے جو انھوں نے ہمارے ساتھ وابستہ کی ہیں۔ ریاست کے دور دراز اور پسماندہ علاقوں کی تیز تر ترقی، بے روزگاری کا خاتمہ، بہتر طبی سہولیات اور پینے کے پانی کی فراہمی، زرعی پیداوار میں خود کفالت اور بجلی کی پیداوار بڑھانے کے علاوہ تعلیمی نظام کو نئی سمت دینا اور رشوت ستانی کا قلع قمع کرنا میری حکومت کی ترجیحات ہیں۔ مجھے امید ہے کہ لوگوں کے تعاون سے میری حکومت اس مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگی۔

ہمارا ملک آجکل ایک مشکل دور سے گذر رہا ہے۔ ایک طرف جہاں بیرونی طاقتیں ہمارے ملک کو کمزور کرنا چاہتی ہیں۔ وہاں اندرونی ملک میں بھی، ملک دشمن اور انتہا پسند قوتیں ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ بن گئی ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت یہ اہم مقصد ہے کہ ان عناصر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے جو ہماری سیکولر روایات کو زک پہنچانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک نے آزادی حاصل کرنے کے بعد زندگی کے ہر شعبے میں جو نمایاں ترقی کی ہے۔ اس میں رخنہ ڈالنے کے لیے کچھ بیرونی طاقتیں انتہا پسند اور فساد پرست عناصر کی حوصلہ افزائی کر رہی ہیں، ہمیں ملک کی سلامتی اور خوشحالی کے لیے ان عناصر کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے جو ہمارے ملک کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان کو ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا کرنے کے لیے ہمیں، وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی کے ہاتھ مضبوط کرنا ہوں گے۔ ہندوستان ایک پرامن ملک ہے اور وہ تمام ممالک کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی پالیسی پر گامزن ہے۔

اگر ہم ایک خوشحال اور ترقی یافتہ ہندوستان دیکھنا چاہتے ہیں، تو ملک کے ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی کی ان کوششوں میں ان کا ہاتھ بٹائیں، جو وہ ملک کی تعمیر و ترقی اور امن و آشتی کے لیے کر رہے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ ملک کے تمام لوگ اس کام میں وزیر اعظم کا بھرپور ساتھ دیں گے۔ ●

بقیہ: اللہ تیرو نام ایشور تیرو نام کا موسیقار نہ رہا

جے دیو کو مقبول عام بنا دیا۔

نیشنل ایوارڈز

جے دیو نے تقریباً ۲۶ فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔ ادھر کچھ برسوں سے وہ فلموں سے دور ہو چلے تھے۔ انتقال سے کچھ دن پہلے ایک انٹرویو میں یہ پوچھے جانے پر "آپ کمرشیل [illegible] موسیقاروں میں شامل کیوں نہیں دکھائی دیتے" انھوں نے کہا تھا "کبھی کبھی میں بھی یہی بات سوچتا ہوں۔ تجزیہ بھی کرتا ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میری موسیقی کو لوگوں نے خوب پسند کیا۔ میرے بہت سے گانے ہٹ ہوئے جو آج بھی ریڈیو پر بجتے ہیں۔ ٹی وی پر دکھلائے جاتے ہیں مگر میری فلمیں ہٹ نہیں ہوئیں۔ اس فلم نگری کا عجیب رواج ہے۔ موسیقار کے گانے ہٹ ہوتے ہیں تو اسے کامیابی نہیں ملتی لیکن اگر فلم کامیاب ہو جاتی ہے تو وہ بھی کامیاب شمار کیا جاتا ہے۔ ورنہ عمدہ سے عمدہ آرٹسٹ ٹیکنیشین پیچھے رہ جاتا ہے، گنی سے گنی موسیقار کے گن دھرے رہ جاتے ہیں۔"

جے دیو کو ابھی کچھ دن پہلے ہی ۸۷-۱۹۸۶ء کا لتا منگیشکر ایوارڈ حاصل ہوا تھا۔ لتا منگیشکر ایوارڈ پروفیشنل ایوارڈ نہیں ہے۔ یہ وہ فلمی ایوارڈ بھی نہیں ہے جو شہرت کی بنا پر "کمرشیل" انڈسٹری دباؤ میں حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی ایسا ایوارڈ بھی نہیں جسے خرید لیا جائے۔ یہ ایوارڈ مدھیہ پردیش سرکار کا ایسا اعزاز ہے جو صرف اسے ہی حاصل ہوتا ہے جس نے اپنے میدان میں کوئی کارہائے نمایاں انجام دیا ہو۔

موصوف کو تین بار نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جے دیو پہلے بھارتی تھے جنھیں رائل کمیشن آف نیپال نے اپنی فلم 'میتری گھر' میں موسیقی کے لیے مدعو کیا۔ اس فلم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے گیت خود شاہ نیپال نے قلمبند کیے ہیں۔

آج جے دیو ہمارے درمیان نہیں ہیں ہم بھی ایک دن نہیں رہیں گے۔ ہم سب خزاں رسیدہ درخت کے ان پتوں کی مانند ہیں جنھیں ایک دن ٹوٹ ٹوٹ کر شاخ سے ویسے ہی الگ ہو جانا ہے جیسے روح جسم کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جاتی ہے۔ ●

سید اطہر رضا بلگرامی٥

زرعی سیکٹر کا مشینی دور

ہندوستان کا زرعی سیکٹر آہستہ آہستہ مشینی دور میں داخل ہو رہا ہے۔ پنجاب، ہریانہ اور یو۔پی کے کچھ اضلاع میں بیشتر کاشتکاری مشینوں کی مدد سے ہی کی جا رہی ہے اور جیسے جیسے زمین سدھار پروگراموں کے تحت بڑے رقبوں کی کاشت کا انتظام ہو رہا ہے، وہاں آبپاشی، بجلی اور کھاد کی سہولتوں کو دیکھتے ہوئے مشینوں کا استعمال تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یہ ترقی کا مثبت رجحان بھی ہے اور زرعی استحکام کا ثبوت بھی۔ اس رجحان کی حمایت و مخالفت میں اکثر و بیشتر آوازیں اٹھائی جاتی رہی ہیں۔ اس کے فوائد و نقصانات پر نظریاتی بحثیں ہوتی ہیں، اس کے نفع و نقصان کا تخمینہ لگایا گیا ہے اور ماہرین نے حکومت کو گاہے گاہے اپنے مطالعوں کے نتائج سے آگاہ بھی کیا ہے۔ اس مضمون میں مشینوں کی حمایت و مخالفت میں اٹھنے والی آوازوں، نفع و نقصان کے تخمینوں اور مختلف مطالعوں کے نتائج کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

زرعی سیکٹر میں مشینوں کی آمد۔

__تعریف و توسیع__ : زرعی سیکٹر میں پیداوار کے لیے دو توانائیوں (Energy) کی ضرورت پڑتی ہے۔ اوّل بشری و حیوانی توانائی اور دوم مشینی یا میکینکی توانائی۔ قدرتی توانائی کا ذکر یوں نہیں کیا گیا کیونکہ یہ توانائی بطور عطیہ قدرت کی طرف سے مفت ملتی ہے اور اس کی کوئی قیمت ادا نہیں کی جاتی — دھوپ، حرارت، اوس، بارش سب کچھ قدرت عطا کرتی ہے اور سب کو مساوی طور پر دیتی ہے۔ اس لیے ضروری ہوتے ہوئے بھی چونکہ مفت ہے اس لیے اس کے استعمال میں قیمت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بشری، حیوانی اور مشینی توانائی ایسی ہیں جو قدرت کی طرف سے بطور عطیہ نہیں سمجھی جا سکتیں کیوں کہ ان کے استعمال کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔ قیمت اس لیے ادا کی جاتی ہے کیوں کہ یہ توانائیاں ہماری ضرورتوں کے بالمقابل کم ہیں۔

بشری و حیوانی توانائی کو حیاتیاتی توانائی (Biological Energy) اور مشینی توانائی کو میکینکی توانائی (Mechanical Energy) کہا جاتا ہے۔ جب زرعی پیداوار میں حیاتیاتی توانائی کے بدلے میکینکی توانائی کا استعمال شروع ہوتا ہے تو اس تبدیلی کے دور کو زراعت کا مشینی دور (Mechanisation in Agriculture) کہا جاتا ہے۔ اس تبدیلی کے بہت سے مدارج ہیں جہاں ہر ایک کو الگ نام سے پکارا جاتا ہے۔ اگر کسی ملک میں حیاتیاتی توانائی کو مکمل طور سے ہٹا کر میکینکی توانائی کو اپنا لیا گیا ہے، یعنی جہاں انسانوں اور حیوانوں کو کم سے کم استعمال میں لایا جاتا ہو، اس کو مکمل یا کامل مشینی دور (Total/Complete Mechanisation) کہا جاتا ہے۔ روس اور امریکہ اس کی مثالیں ہیں۔ جہاں حیاتیاتی اور میکینکی دونوں توانائیاں استعمال ہو رہی ہوں ان کو غیر مکمل یا نیم مشینی دور (Semi Mechanisation) کے دائرہ میں رکھا جاتا ہے۔ ہندوستان اس کی ایک مثال ہے۔ بہت سے ایشیائی ممالک اسی دائرہ میں آتے ہیں۔ اس کے برعکس جب کوئی بھی مشین استعمال نہیں کی جاتی تو اس کو روایتی، پچھڑی ہوئی اور فرسودہ نظام والی کاشت کہا جاتا ہے۔ افریقہ اس کی بہترین مثال ہے اور آزادی سے

٥ ریڈر، شعبۂ معاشیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی - ١١٠٠٢٥
یوجنا، نئی دہلی

قبل ہندوستان بھی اسی دائرہ میں آتا تھا۔ مشینی دور کے بہت سے مدارج ہیں۔ ایک مکمل مشینی دور کو حاصل کرنے میں بہت سے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ابتدا میں صرف مروّجہ طریقوں میں کچھ ایسی تبدیلی کر لی جاتی ہے جس سے محنت کی بچت اور پیداوار کے ذریعے میں نتائج بہتر نکلتے ہیں۔ مثلاً اگر مروجہ لکڑی کے ہل کے بجائے فولاد کے بنے ہل استعمال کریں تو اوزار کی عمر اور کارکردگی میں یقیناً اضافہ ہوگا۔ یہ مشینی دور کی ابتدا ہے۔ پھر دوسرا دور وہ آتا ہے جہاں کچھ ایسے میکانکی طریق کار اپنائے جائیں جس سے وقت میں بچت کا احساس ہو، کام زیادہ ہو اور انسانی محنت کی کم ضرورت پڑے۔ یہاں کاموں میں خود کاریت (Automation) کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ آبپاشی کے طریق کار، اناج بونے، اناج نکالنے کے طریق کار میں ایسی تبدیلیاں لائی جاتی ہیں۔ تیسرا دور وہ آتا ہے جہاں انسانی و حیوانی طاقتوں کا استعمال کم سے کم ہوتا ہے اور زیادہ تر کام مشینوں کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ یہاں وقت کی بچت کے ساتھ بہتر کام کیا جاتا ہے۔ زمین جوتنے کے لیے ٹریکٹر، بیج بونے، کھاد ڈالنے اور دوائیں چھڑکنے کی مشینیں، فصل کاٹنے، اناج نکالنے کی مشینیں، منڈیوں تک پہونچانے کے ذریعہ یہ سب کے سب کام مشینوں سے پورے کیے جاتے ہیں جہاں جانوروں اور انسانوں کی محنت کا استعمال کم سے کم کیا جاتا ہے۔ ایک کسان صرف بٹن دبا کر ٹیوب ویل کے ذریعے پوری کاشت میں آبپاشی کر سکتا ہے اور باقی وقت دوسرے کارآمد کاموں میں لگا سکتا ہے۔ اب اس کسان کو پورے وقت کھیتوں میں پانی دینے کے لیے مصروف نہیں ہونا پڑے گا۔ ایک چوتھا دور وہ آتا ہے جب خودکاریت (Automation,) اپنے معراج پر پہنچ جاتی ہے۔ یہاں ٹیکنالوجی اس بلندی پر ہوتی ہے جہاں بڑی بڑی مشینوں کی جگہ چھوٹی سے چھوٹی مشینیں بڑے سے بڑا کام انجام دیتی ہیں۔ کمپیوٹرس کا استعمال عام ہو جاتا ہے، حیوانی طاقت مطلق استعمال میں نہیں لائی جاتی اور بشری طاقت کا استعمال کم سے کم رہ جاتا ہے۔

ہندوستان کا زرعی نظام اپنے روایتی اور فرسودہ نظام سے نکل کر مشینی دور کے پہلے مرحلہ میں داخل ہو چکا ہے اور کئی کئی صوبوں میں تو وہ پہلے دور سے نکل کر دوسرے دور میں داخل ہے۔ پنجاب، ہریانہ اور یو۔پی کے مغربی اضلاع اس کی روشن مثالیں ہیں جہاں بیشتر کاشت کا کام مشینیں انجام دیتی ہیں۔ یہ صوبے نیم مشینی دور (Semi Mechanisation) سے گزر رہے ہیں جہاں بشری قوت کے ساتھ ساتھ مشینوں کا بھرپور استعمال کیا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں پہلے دو منصوبوں کے دوران زراعت میں مشینوں کا استعمال بہت سست رہا۔ سبز انقلاب (Green Revolution) کے بعد مشینوں کے استعمال میں تیزی آئی۔ ۱۹۵۶ء تا ۱۹۷۱ء میں ہندوستان میں لکڑی کے ہلوں کی تعداد نہیں بڑھی لیکن فولاد کے ہلوں کی تعداد میں نمایاں تبدیلی آئی۔ ۱۹۵۶ء میں لوہے کے ہلوں کی کل تعداد ۲۷،۶۰،۰۰۰ تھی جو ۱۹۷۱ء میں ۵۳،۵۹،۰۰۰ ہو گئی۔ ۱۹۶۱ء ۔ ۷۱ کے درمیان لوہے کے ہلوں کا استعمال دو گنا ہو گیا۔ ۱۹۵۰ ۔ ۵۱ء تک ہندوستان میں مجموعی کاشت کے رقبے میں فی لاکھ ہیکٹیر صرف ۷ ٹریکٹر مہیا تھے۔ یہ تعداد ۱۹۷۸ ۔ ۷۹ء تک ۲۴۳ ہو گئی جو میکینائزیشن کی طرف انتہائی حوصلہ افزا قدم ہے۔ اسی طرح ۱۹۵۰ ۔ ۵۱ء تک فی لاکھ ہیکٹیر پر تیل کے ذریعہ چلنے والے انجنوں کی تعداد صرف ۶۲ تھی جو ۱۹۷۸ء تک ۱۰۰۷۴ ہو گئی۔ بجلی کے ذریعے آبپاشی کے لیے چلائے جانے والے انجنوں اور ٹیوب ویلوں کی فی لاکھ ہیکٹیر تعداد ۱۶ تھی جو ۱۹۷۸ ۔ ۷۹ء تک ۲،۳۰۸ ہو گئی۔ ۱۹۵۰ ۔ ۵۱ء تک فی ہزار ہیکٹیر زمین پر بجلی کی کھپت صرف ۱۵ کلوواٹ گھنٹہ تھی جو ۱۹۷۸ ۔ ۷۹ء تک ۹،۶۷ کلوواٹ گھنٹہ بڑھ گئی۔ ان تخمینوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان اپنے زراعتی میدان میں تیزی کے ساتھ میکینائزیشن کی طرف بڑھ رہا ہے۔ تفصیلات کے لیے گوشوارہ نمبر ۱ دیکھئے۔

زراعت کے مشینی دور کی خوبیاں اور فوائد کا تنقیدی جائزہ

میکینائزیشن کی حمایت میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں وقت کی بچت، کم سے کم مدت میں کام کی تیزی سے انجام دہی، زمین و محنت کشوں کی پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ، پیداوار کے اخراجات یعنی لاگت میں کمی اور پیداواری اضافوں کا بڑھنا خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تمام فوائد کا مجموعی نتیجہ یہ ہوگا کہ زراعت فرسودہ نظام سے نکل کر جدید تجارتی نظام کو اپنا لے گی جہاں فی کس آمدنی کسی دوسرے سیکٹر کے مقابلہ کم نہ رہے گی۔ یہی چیز سماج کے ذہنی، اخلاقی و سماجی قدروں کو بدلنے کا ذریعہ ہوگا۔ اب ان فوائد کا جائزہ لینے پر یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ کس حد تک اس میں میکینائزیشن کا ہاتھ ہے اور کس حد تک دوسرے عوامل کا۔

۱: فارم میکینائزیشن اور پیداوار میں فروغ

کاشت میں مشینوں کے استعمال کا سب سے اہم فائدہ پیداوار میں فروغ کی شکل میں دیکھا گیا۔ یہ کہا گیا کہ مشینیں کام کی رفتار بڑھاتی ہیں اور اس طرح کم مدت میں کام بخوبی انجام پا جاتا ہے۔ رفتار اور

محنت کی بچت، وسائل کو دوسرے کاموں کو انجام دینے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس طرح پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن مشینوں کے استعمال سے اگر پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے تو دوسری طرف حیوانی و بشری قوت کو بے روزگاری کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے بڑھی ہوئی پیداوار میں حیوانی و بشری قوت کی بے روزگاری و بیکاری کے ذریعے ہوئے نقصان کو نکال کر دیکھنا ہوگا کہ صحیح معنی میں کتنا اضافہ ہوا۔ پھر پیداوار میں جو اضافہ ہوا ہے، اُس کو محض مشینوں کے استعمال کا انعام کیوں سمجھا جائے؟ سوال یہ ہے کہ پیداوار میں فروغ محض مشینوں کی وجہ سے ہوا یا زراعت میں مجموعی طور پر سرمایہ لگانے اور اس کو بڑھانے کی وجہ سے ہوا۔ زرعی اقتصادیات کے ماہر راج کرشنا نے ایک مطالعہ میں کہا کہ اگر مشینوں کے ذریعے زرعی پیداوار کے فروغ سے آبپاشی، کھاد اور عمدہ کاشت کے طریق کار کے اثرات کو نکال دیا جائے تو میکنائزیشن کا حصہ بہت کم رہ جائے گا۔ لیکن پھر بھی یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ مشینوں کے ذریعے رفتار اور وقت کی بچت پیداوار پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔ راجستھان کے ریتیلے علاقوں میں جہاں بارش کی شدید کمی رہتی ہے وہاں بارش کے فوراً بعد ٹریکٹر کا استعمال جتائی کی مدت کو کم کرنے میں اور پیداواری صلاحیت کو بڑھانے میں بہت مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

۲۔ محنت کشوں کی پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ

مشینوں کی حمایت میں دوسری اہم بات یہ کہی جاتی ہے کہ مشینیں محنت کشوں کی پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ کا باعث ہوتی ہیں اور وہ اس طرح کہ مشینوں کے استعمال سے کم محنت کش وہی یا اُس سے کہیں زیادہ پیداوار کرتے ہیں جتنی مشینوں سے قبل بہت زیادہ محنت کش مل کر کرتے تھے۔ اس طرح مشینوں کی آمد نے فی محنت کش کی پیداوار میں بہت اضافہ کر دیا۔ مشینوں نے انسانی محنت کو بچایا اور اب تعداد میں کہیں کم انسان پہلے سے کہیں زیادہ یا کم سے کم پہلے جیسی پیداوار کر سکتے ہیں۔ امریکہ کے ایک تخمینہ کے بموجب ۱۸۳۰ میں ۱۰۰ بُشل (Bushels) گیہوں کی پیدائش کے لیے ۳۲۰ گھنٹہ انسانی محنت درکار تھی۔ ۱۹۰۰ میں اُسی قدر گیہوں کی پیداوار کے لیے صرف ۱۰۸ گھنٹہ انسانی محنت اور ۱۹۴۷ء میں صرف ۷۴ گھنٹہ انسانی محنت کی ضرورت باقی رہ گئی۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ مشینوں کی آمد نے کس طرح محنت کشوں کی پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ کیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ کاشت میں مصروف کسانوں کی پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہو بلکہ مشینوں کی آمد نے کام کرنے والوں کے وقت کو بھی بچایا ہے۔ اور افراد کی مطلوبہ تعداد میں بھی تخفیف کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ محنت کشوں کو آرام کرنے اور دیگر غیر زرعی کارآمد کاموں میں مصروف رہنے کا موقع ملا ہے۔ اب وہ گاؤں یا گاؤں سے باہر شہروں یا دیگر صنعتی مرکزوں پر تعمیری یا دوسرے پیداآور کاموں میں مصروف ہو سکتے ہیں۔

چونکہ تمام ترقی پذیر ممالک میں کاشتکاری ایک موسمی سرگرمی ہے جہاں فصل کے بوتے یا کاٹنے تک شدید مصروفیت رہتی ہے اور اس کے بعد بیروزگاری اور فرصت۔ اس لیے مشینوں کا استعمال ان دونوں صورت حال کا مقابلہ کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ وہ شدید مصروفیت کے زمانہ میں جبکہ مزدوروں کی کمی کا احساس بڑھ جاتا ہے اور بڑھی ہوئی مزدوری پر محنت کشوں کی تلاش شدید ہو جاتی ہے اُس وقت یہ مشینیں زائد مزدوروں کی طلب کا بدل ثابت ہوتی ہیں اور مزدوروں کی کمی کا احساس نہیں دلاتیں۔ فرصت کے اوقات میں کاشت سے ہٹ کر دیگر پیداآور کاموں میں مصروف رہنے کا موقع دے کر محنت کشوں کی پیداواری صلاحیتوں کو بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

۳۔ مشینیں اور کاشت کی لاگت

میکنائزیشن کی حوصلہ افزائی کرنے والوں کا ایک مضبوط دعویٰ یہ بھی ہے کہ مشینوں کے استعمال سے کاشت کی مجموعی لاگت میں گراوٹ آتی ہے۔ مشینوں کی موافقت کا یہ پہلو بحث طلب ہے۔ مغربی ممالک کی مثالیں دے کر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کس طرح ان ممالک نے پیداوار کی لاگتوں کو کنٹرول میں رکھا ہے اور کم کیا ہے لیکن اس یقین کے ساتھ ساتھ یہ بھی خیال رکھنا ہوگا کہ ان ممالک میں بشری و حیوانی قوت کی بہت کمی ہے اور یہی کمی ان توانائیوں کو بہت بیش قیمت ثابت ہوئے ہیں اس لیے وہاں مشینوں کا استعمال ارزاں ہے اور پیداواری لاگت کم رہتی ہے یعنی بشری و حیوانی توانائی کی کمی نے ان ممالک کو بڑے پیمانے پر مشینوں کے استعمال کے لیے مجبور کیا ہے۔ ترقی پذیر ممالک تصویر کا دوسرا رُخ پیش کرتے ہیں۔ یہاں انسانی و حیوانی آبادی اتنی زیادہ ہے کہ مشینوں کے مقابلہ میں اُن کی لاگت کم آتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہر ملک میں میکنائزیشن پیداوار کی لاگتوں کو کم کرے گی۔

لیکن سی ایچ ہنومنتھا راؤ کے مطالعے نے دوسرے ہی نتائج برآمد کیے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ

ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی ایسا تاثر دیتی ہے جیسے یہاں محنت کش انتہائی سستا ہے۔ لیکن پنجاب و ہریانہ میں مشینوں کے استعمال کے در پردہ جو عنصر پوشیدہ ہے وہ یہ کہ محنت کشوں یا انسانی مشقت سے زیادہ مشینیں سستی نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی نے اجناس کی قیمتوں کو بڑھا دیا ہے اور اس کے نتیجہ میں مزدوری کی اُجرت بھی بہت بڑھ گئی، نقد و جنس دونوں ہی شکلوں میں۔ سہنو منقارا راؤ نے ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۸ء کے درمیان محنت کشوں کی نقد اُجرت، اجناس کی قیمت، بیلوں کی قیمت اور ٹریکٹر کی قیمت میں ہونے والی تبدیلیوں کا موازنہ کیا اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس مدت میں جن علاقوں میں میکینائزیشن تیزی سے ہوا ہے وہاں جبکہ زرعی اشیاء کی قیمتوں کے بالمقابل مزدوروں کی نقد اُجرت کہیں زیادہ تیزی سے بڑھیں، ٹریکٹر اور اُس کے ایندھن کی قیمتوں میں صرف ۵۰ فیصد کا ہی اضافہ ہوا۔ اُن کے تخمینہ کے بموجب زرعی اشیاء کی قیمتوں میں، اس مدت کے درمیان ۱۰ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مشینیں، انسانی و حیوانی قیمتوں کے مقابلہ میں سستی پڑتی ہیں۔ پھر انھوں نے ایک اہم بات یہ بھی بتائی کہ مشینوں و انسانوں اور حیوانوں کو سرگرم عمل بنائے رکھنے کی لاگت الگ الگ ہے یہ لاگت مشینوں کے مقابلہ میں انسانوں اور جانوروں کے لیے کہیں زیادہ ہے۔ ایک مشین کو ایندھن کی ضرورت اُس وقت پڑتی ہے جب وہ کھیت پر کام کرے۔ لیکن ایک جانور اور انسان کو اپنی تندرستی و صحت کے لیے مقررہ وقت پر تا حیات غذا درکار رہتی ہے، چاہے وہ کھیت پر کام کرے یا نہ کرے۔ اس طرح سرگرم عمل رہنے کی لاگت انسانوں و حیوانوں کی زیادہ ہے اور مشینوں کی کم۔ مشینوں کے استعمال سے لاگتیں کس طرح کم ہوتی ہیں اس کو نقشہ نمبر ۲ میں سمجھایا گیا ہے

۴۔ دیگر فوائد

ان اہم فوائد کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مشینوں کی آمد کسانوں کے روایتی و فرسودہ اندازِ فکر کو بدل کر جدید فکر عطا کرتی ہے جہاں پیدا کرنے والا قیمتوں اور لاگتوں کو بہتر طور پر سمجھ کر زیادہ تجارتی، منافع بخش اور صنعتی انداز اختیار کرلیتا ہے۔ یہ رجحان زیادہ پیداوار، زیادہ آمدنی، بہتر صرف، بلند معیارِ زندگی اور مجموعی طور پر معاشی خوشحالی کا باعث بنتا ہے۔ یہیں سے معاشی اضافوں (Economic Surpluses) کی تخلیق ہوتی ہے جو پوری معیشت کے استحکام کا باعث بنتی ہے۔

چند اہم اعتراضات اور اُن کا تجزیہ

ایک ایسی معیشت جو ہر سال زیادہ سے زیادہ آبادی سے دب رہی ہو وہاں مشینوں کی آمد یقیناً بیروزگاری پھیلانے کا سب سے اہم اور مؤثر ذریعہ بنے گی۔ ایسی معیشتیں جو سرمایہ کے ذخائر سے مالامال ہوں اور جہاں سرمایہ کاری کی رفتار بہت تیز ہو اور آبادی نہ صرف کم ہو بلکہ اُس کے بڑھنے کی رفتار بھی سست ہو، میکینائزیشن نہ صرف فائدہ بخش ہے بلکہ انتہائی ضروری بھی۔ لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں سرمایہ عنقا ہو، سرمایہ کاری کی رفتار سست اور آبادی کی رفتار بہت تیز ہو میکینائزیشن سوائے معاشی عیش و عشرت کے اور کچھ نہیں ہے سی ایچ ۔ سہنو منقارا راؤ کے ایک تخمینہ کے بموجب فیروز پور (پنجاب) میں ٹریکٹروں کی آمد نے فی ایکڑ کاشت کے رقبہ پر ۲۰ تا ۳۰ فیصد فی دن انسانی محنت میں تخفیف کردی۔ اسی طرح اناج کاٹنے اور گہنے (Threshers and Harvesters) کی مشینوں نے بھی بیروزگاری پھیلائی۔ ۱۵ فیصد مزدور میکینکل تھریشر کی بدولت بیکار ہوئے اور ۲۵ فیصد مزدور ریپر و سٹر کے ہمراہ تھریشر استعمال ہونے کی بدولت بے کار ہوئے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہندوستانی زراعت میں جہاں کل آبادی کا ۷۰ فیصد رہتا ہے، اس طرح کی مشینوں کا استعمال کس قدر بیروزگاری پھیلا سکتا ہے۔ اس بیروزگاری کا احساس شدید نہ ہوتا اگر ہمارے صنعتی سیکٹر میں اتنا پھیلاؤ ہوتا کہ اس طرح کے تمام بیروزگاروں کو کھپا لیتا۔ لیکن چونکہ ابھی صنعتی سیکٹر میں اتنی استعداد پیدا نہیں ہوپائی ہے اس لیے میکینائزیشن کے ذریعے پھیلی ہوئی بیروزگاری نمایاں نظر آنے لگتی ہے۔

جس شدت سے بیروزگاری کے مسئلہ کو لے کر میکینائزیشن کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے اسی طرح کاشت کے رقبوں کو سامنے رکھ کر مشینوں کی شدید مخالفت کی گئی۔ مشینوں کا استعمال وہاں فائدہ بخش، کفایتی اور پیداآور ثابت ہوتا ہے جہاں کاشت کا رقبہ بڑا ہو اور ساتھ ہی ساتھ دیگر اہم سہولتیں جیسے آبپاشی، اچھی کھاد، معتمد بیج، مشینوں کی مرمت کے لیے ورکشاپ وغیرہ مہیا ہوں۔ روس اور امریکہ کی مثالیں سامنے ہیں۔ یقیناً ان ممالک میں مشینوں کا استعمال انتہائی سود مند ثابت ہوا ہے۔ لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں ۵۴ء۶ فیصد کاشت کا رقبہ ایک ہیکٹر سے بھی کم کا ہو اور ۱۸ فیصد رقبہ ایک اور دو ہیکٹر کے درمیان ہو وہاں مشینوں کا استعمال یقیناً نہ صرف غیر کفایتی ہوگا بلکہ لاگتوں کے نقطۂ نظر سے گراں بھی ہوگا۔ یہاں مشینوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے بجائے برباد کیا جائے گا۔ پھر ابھی

آبپاشی کی سہولتیں، مشینوں کی مسلسل دیکھ ریکھ اور مرمت کے مسائل، ٹریننگ، یہ ایسی کمیاں اور کمزوریاں بڑے پیمانے پر موجود ہیں جو میکینائزیشن کی کسی طرح سفارش نہیں کرسکتیں لیکن ان تمام کمیوں یا کمزوریوں کو میکینائزیشن کی راہ میں مشکلات تو کہا جاسکتا ہے لیکن یہ کہنا زیادتی ہے کہ اُن کی وجہ سے میکینائزیشن نامناسب یا غیر موافق ہے۔

ایک اور شدید خدشہ کی طرف متوجہ کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ میکینائزیشن کی وجہ سے بین العلاقائی اور ذاتی سطح پر عدم مساوات کی خلیج اور بڑھ جائے گی۔ یوں بھی زرعی سیکٹر میں غریب، چھوٹے اور بڑے امیر کسانوں کے درمیان خلیج کیا کم ہے۔ میکینائزیشن صرف بڑے و امیر کسانوں کے لیے ہے وہی اُس کو برداشت کرسکتے ہیں، اپنا سکتے ہیں اور مزید امیر بن سکتے ہیں۔ میکینائزیشن کو غریب کسان نہ برداشت کرسکتا ہے، نہ اپنا سکتا ہے اور نہ چلا سکتا ہے۔ وہ مسائل کے اعتبار سے، تعلیم و تجزیہ کے اعتبار سے، اپنی گھریلو و سماجی مشکلات کے اعتبار سے اور پھر سماجی و معاشی معیار کے اعتبار سے کمزور ہے۔ اگر میکینائزیشن پر زور دیا گیا تو اس سے پورا فائدہ اٹھانے والے متمول، بڑے کسان ہونگے جو موجودہ امیری و غریبی کی خلیج کو اور وسیع کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے۔

پھر ایک نفسیاتی و سماجی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دیہی سماج میں جانوروں کو خاندان کے فرد کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی پرورش میں جو ایک قلبی اور ذہنی تعلق پایا جاتا ہے وہ کسی خاندان کے فرد کی پرورش سے کم نہیں ہوتا۔ مشینیں نہ تو اس کا بدل ہوسکتی ہیں اور نہ ہزاروں، لاکھوں برسوں سے انسانوں و حیوانوں کے درمیان جڑے اس رشتہ کو ختم کرسکتی ہیں۔ اس لیے اگر مشینوں کو حکومت کی سرپرستی میں دیہی سماج پر تھوپنے کی کوشش کی گئی تو یقیناً سماج اُس کو قبول نہیں کرے گا۔ اس کو مقبولِ عام کرنے کے لیے سرمایہ داری و تجارتی رجحانوں کو تقویت دینا ضروری ہے جو اس طرح کے قلبی و ذہنی رشتوں کو بے معنی سمجھتے ہیں اور نفع و نقصان کے پیمانوں پر فیصلے کرتے ہیں۔ اس طرح موجودہ صورت

نقشہ نمبر ۱ ہندوستان میں میکینائزیشن کے رُجحانات
فی لاکھ ہیکٹر قابلِ کاشت زمین پر

سال	ٹریکٹر	تیل سے چلنے والے انجن	بجلی سے چلنے والے پمپ	فی ہیکٹر قابلِ کاشت زمین پر بجلی کا مصرف
۱۹۵۱	۷	۶۲	۲۰	۱٫۵
۱۹۵۶	۱۴	۸۴	۳۲	۲٫۱
۱۹۶۱	۲۰	۱۵۱	۱۰۵	۵٫۵
۱۹۶۶	۳۴	۳۰۳	۲۶۰	۱۲٫۲
۱۹۷۰	۷۲	—	۸۲۹	۲۳٫۰
۱۹۷۱	۸۱	—	۹۷۶	۲۷٫۱
۱۹۷۴	۱۲۳	۱۰۳۱	۱۴۱۲	۴۵٫۸
۱۹۷۵	۱۴۷	—	۱۵۵۵	۵۰٫۰
۱۹۷۸	۲۱۳	—	—	—

حوالہ: سائنس سالنامہ ۱۹۷۹، صفحہ ۲۷۴۔

نقشہ نمبر ۲۔ یوپی میں استعمال ہونے والے مختلف آلات کی تقابلی لاگت و پیداوار

آلات	پیداوار (فی ایکڑ فی دن)	استعمال کی لاگت (فی ایکڑ روپیہ میں)
۱۔ بیلوں کے ذریعے استعمال ہونے والے لکڑی کے ہل	۵ر	۴۵۰ — ۴۰۰
۲۔ ڈسک ہیرو (Disc Harrow)	۲	۲۷۰ — ۲۴۰
۳۔ بیلوں کے ذریعے استعمال ہونے والا کھرا وغیرہ	۶ر - ۵ر	۳۵ — ۳۰
۴۔ بیلوں کے ذریعے بیج و کھاد ڈالنے والی مشینیں	۲ - ۱ر۵	۲۰ — ۱۵

حال میں میکینائزیشن کو زراعت میں عام کرنے کا مطلب ایک سرمایہ دارانہ نظامِ کاشت کو فروغ دینا ہوگا جو کسی طور پر مناسب نہیں ہے۔

میکینائزیشن کی موافقت و مخالفت میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا اُس سے ایک انتہا پسند اندازِ فکر کا احساس ہوتا ہے۔ حکومت نے ان دونوں اندازِ فکر کو غلط بتایا ہے۔ آج کے دور میں زراعت کی پسماندگی اور غربت و افلاس کو دور کرنے میں میکینائزیشن نہ صرف مددگار بلکہ ضروری بن گیا ہے۔ لیکن ہندوستان میں زرعی طبقہ میں میکینائزیشن کی وہ نوعیت مناسب نہیں ہے جو مغربی ممالک میں مروج ہے، یعنی مکمل میکینائزیشن، مکمل میکینائزیشن نہ تو مناسب ہے اور نہ ہمارا سماج ابھی اس قابل ہے کہ اس کو بخوشی قبول کرے۔ اس لیے ہمارے یہاں میکینائزیشن کی سب سے مناسب و بہتر سطح "منتخب میکینائزیشن (Selective Mechanisation)" کو سمجھنا چاہیئے اور اسی کی سفارش چھٹے پانچسالہ منصوبے میں بھی کی گئی ہے۔ یہاں کچھ صوبے، کچھ اضلاع یا علاقے منتخب کر لیے جاتے ہیں جہاں وسائل، ریسرچ اور تکنیک کو دیکھتے ہوئے مشینیں مناسب طور پر استعمال کی جا سکتی ہیں۔ جہاں وسائل اجازت نہیں دیتے وہاں ضروری نہیں ہے کہ میکینائزیشن تھوپا جائے۔ ہندوستان میں ... ار کے ہم طریق کار مروج ہیں۔ اول روایتی طریقِ کار جہاں کاشت لکڑی و لوہے کے ہل اور بیلوں کی مدد سے کی جاتی ہے۔ یہاں نئی کھاد یا H.Y.V. کے تحت بہتر بیج بھی استعمال میں نہیں لایا جاتا، دوم کاشت کے رقبہ کو بڑھا کر کاشت کرنا جس میں اس کی گنجائش رہتی ہے کہ اچھی کھاد و بہتر بیج کا استعمال ہو سکے۔ سوم انسانوں و جانوروں کو ہٹا کر مشینوں کا استعمال اور چہارم ایک ملا جلا طریق کار جس میں کاشت کا رقبہ بھی بڑھایا جاتا ہے اور انسانوں و جانوروں کو ہٹا کر مشینیں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ پنجاب، ہریانہ، یوپی کے چند اضلاع، تامل ناڈو اور آندھرا پردیش اس کی مثالیں ہیں۔ اس طرح ہندوستان میں حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ چاروں معیار مروج ہیں۔ ہندوستان کے پانچویں پانچسالہ منصوبے نے بھی منتخب میکینائزیشن (Selective Mechanisation) کی سفارش کی ہے اور مکمل میکینائزیشن کی سفارش نہیں کی ہے۔ ہندوستانی زراعت کے لیے حکومت کی یہ پالیسی، حالات اور وسائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سب سے بہتر اور موثر نظر آتی ہے۔ ●

بقیہ، بائیو گیس کے بڑھتے ہوئے قدم

پڑا انحصار کرنا پڑا ... دونوں ریاستوں میں بائیو گیس رکھنے کے ا... اُپلے استعمال کرنے والے کنبوں کا تناسب ۸۳ سے ۸۸ فیصد کم ہو گیا، ایندھن استعمال کرنے والے کنبوں میں ۴۸ سے ۸۷ فیصد کمی ہوئی۔ ٹہنیاں اور ڈنٹھل استعمال کرنے والے کنبوں میں ۳۷ سے ۴۴ فیصد کمی ہوئی، زرعی فاضلات استعمال کرنے والے کنبوں میں ۷۲ سے ۵۱ فیصد اور مٹی کا تیل استعمال کرنے والے کنبوں میں ۳۳ سے ۴۴ فیصد کی کمی ہوئی۔ اس کا مطلب ہے کھانا پکانے والے دیگر ایندھنوں کا تحفظ اور اس کے ساتھ ہی خواتین کا دھوئیں اور ان ایندھنوں سے وابستہ دیگر خطروں سے کم دوچار ہونا۔ اس امر کا مشاہدہ کیا گیا کہ مہاراشٹر میں جو خواتین رسوئی گھر میں کام کرتی تھیں اور اس طرح آنکھوں اور سانس کے امراض میں مبتلا تھیں اُن کی تعداد بائیو گیس استعمال کرنے والوں میں استعمال کنندگان کے معاملے میں دوچند تھی۔ یہ بھی مشاہدہ کیا گیا کہ بائیو گیس کے باعث نہ صرف ایندھن جمع کرنے پر صرف ہونے والے وقت میں بچت ہوئی بلکہ اس سے ایندھن جمع کرنے والے افراد کی تعداد بھی کم ہو گئی۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ جن کنبوں نے اُپلوں کا استعمال بند کر دیا تھا اُن کے لیے دن میں ۲ گھنٹے اور ۴۴ منٹ کے وقت کی بچت ہوئی اور جنھوں نے بعض مقاصد کے لیے ان کا استعمال جاری رکھا اُن کے لیے دن میں ایک گھنٹہ ۴۳ منٹ کی بچت ہوئی۔ وقت کی اس بچت سے دونوں ریاستوں میں تقریباً ۱۰ فیصد کنبوں کی خواتین ایسی محنت مزدوری میں لگ گئیں جن میں اُنھیں نقد اُجرت ملتی ہے، ایک بہائی کنبوں میں خواتین نے بچوں کی دیکھ بھال پر زیادہ وقت دیا۔ اور ایک چوتھائی سے زیادہ کنبوں نے گھریلو کاموں کی جانب زیادہ توجہ دی۔ کرناٹک میں ہر آٹھ خواتین میں سے ایک کو قدرے زیادہ آرام کرنے کا موقع ملا (اس فائدہ کی اہمیت کو کم نہ خیال کیا جائے کیونکہ دیہی علاقوں میں خواتین کو عام طور پر دن میں ۱۰ سے ۱۲ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے) مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پلانٹ خریدنے کا فیصلہ زیادہ تر مردوں نے کیا گو بائیو گیس زیادہ تر خواتین کی طرف سے استعمال کی جاتی ہے۔

اس جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ بائیو گیس کا پروگرام روبہ ترقی ہے گو کچھ ایسی باتیں ہیں جن میں سدھار کرنے کی ضرورت ہے۔ بائیو گیس کے بالواسطہ فوائد سے زیادہ خواتین فیضیاب ہو رہی ہیں اور اس ترقیاتی پروگرام پر آنے والی لاگت کا خیال کرتے ہوئے اس کی اہمیت کو کم نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ●

جگدیش لال

سماجی بُرائیوں کا خاتمہ

گذشتہ چالیس برسوں کا جائزہ

حصولِ آزادی کے بعد بھارت نے سماجی، اقتصادی اور سیاسی شعبوں میں جو ترقی کی ہے اُسے قابلِ تعریف کہا جا سکتا ہے خواہ بعض شعبوں میں ترقی کی رفتار سُست رہی ہے۔ ملک کی مجموعی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ سماجی بدعتوں کا انسداد کیا جائے کیونکہ ایک صحتمند سماج ہی ترقیاتی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے سکتا ہے۔ جب تک سماج کے تمام طبقوں کو انصاف نہیں ملیگا وہ جوش اور اُمنگ کے ساتھ تعمیری اور ترقیاتی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ چنانچہ یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ گزشتہ چالیس برس میں نہ صرف چھُوا چھوت، جہیز اور جسم فروشی جیسی سماجی بدعتوں کا انسداد کرنے بلکہ مظلوم درجِ فہرست ذاتوں، قبیلوں اور بے سہارا خواتین کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔

چھُوا چھُوت کا انسداد

چھُوا چھُوت ایک ایسی لعنت ہے جس کی جانب ملکی رہنماؤں کی نگاہ حصولِ آزادی سے قبل ہی چلی گئی تھی۔ مہاتما گاندھی نے سب سے پہلے اس کے خلاف ملک گیر پیمانے پر تحریک چلائی تھی اور ملک کے قدامت پسندانہ ماحول میں اس کے انسداد کے لیے اپنی جان کی بازی تک لگا دی تھی۔ حصولِ آزادی کے بعد چھوا چھوت کے انسداد سے متعلق عزم کی توثیق کی گئی اور جو آئین مرتب کیا گیا اُس میں جہاں چھوا چھوت کے خاتمے کا اعلان کیا گیا وہاں درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کی حالت بہتر بنانے اور انھیں تحفظات دینے کا بھی اہتمام کیا گیا۔ آئین کے آرٹیکل ۳۴۱ اور ۳۴۲ کی دفعات کے تحت راشٹرپتی کی طرف سے جاری کیے گئے ۱۵ آرڈیننسوں کے ذریعے درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کی نشاندہی کی گئی۔ چنانچہ ۱۹۸۱ کی مردم شماری کے مطابق ملک کی کل آبادی میں درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کا تناسب ۱۵ اور ۲۳ فیصد تھا۔

آئینی تحفظات

آئین میں درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں اور دیگر کمزور طبقوں کی تعلیمی و اقتصادی حالت بہتر بنانے اور اُن کی سماجی محرومیوں کو دُور کرنے کی غرض سے انھیں سلامتی و تحفظات دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ بعض تحفظات درجِ ذیل ہیں۔

۱۔ چھوا چھوت کا انسداد اور کسی بھی صورت میں اسے عمل میں لانے کی ممانعت (آرٹیکل ۱۷)۔

۲۔ ان ذاتوں کے تعلیمی اور اقتصادی مفادات کا تحفظ اور تمام قسم کی استحصال پسندی اور سماجی ناانصافی سے حفاظت۔ (آرٹیکل ۴۶)۔

۳۔ ہندوؤں کے پبلک اور مذہبی اداروں کے دروازے تمام ہندوؤں پر کھولنا۔ (آرٹیکل ۲۵ بی)

۴۔ دکانوں، عوامی طعام خانوں، ہوٹلوں اور عوامی تفریح گاہوں میں داخلہ اور مکمل و جزوی طور پر سرکاری مالی امداد سے بنائے گئے یا عوام کے استعمال کے لیے وقف کیے گئے کنوؤں، تالابوں،

غسل خانوں، گھاٹوں، سڑکوں اور عوامی اجتماع کے مقاموں کے استعمال کے بارے میں کسی بھی نااہلیت، ذمہ داری، پابندی یا شرط کو ہٹانا۔ (آرٹیکل ۱۵ (۲))۔

۵۔ حکومت کی طرف سے چلائے جانے والے یا سرکاری امداد پانے والے کسی تعلیمی ادارے میں داخلے پر کسی بھی طرح کی پابندی کی ممانعت (آرٹیکل ۲۹۔ بی)

۶۔ ریاستوں کو پسماندہ طبقات کے لیے اُن سرکاری ملازمتوں میں جہاں اُن کی نمائندگی کم ہے، تحفظ دینے کا اختیار دینا اور ریاستوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ سرکاری ملازمتوں میں تقرریاں کرنے کے معاملے میں درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کے دعووں کو پیشِ نظر رکھیں گے۔ (آرٹیکل ۱۶، اور ۳۳۵)۔

۷۔ درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کو ۲۵ جنوری ۱۹۹۰ء تک لوک سبھا اور ریاستی ودھان سبھاؤں میں خصوصی نمائندگی دینا (آرٹیکل ۳۳۰، ۳۳۲ اور ۳۳۴)۔

۸۔ جسم انسانی کی تجارت اور بیگار پر پابندی (آرٹیکل ۲۳)۔

چھوا چھوت خلاف قانون

۱۹۵۵ء میں چھوا چھوت (جرم) قانون منظور کیا گیا اور ۱۹۷۶ء میں اسے زیادہ جامع اور تعزیری دفعات کو زیادہ سخت بنایا گیا اور یہ ترمیمی قانون ۱۹ نومبر ۱۹۷۶ء کو نافذ کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا نام بدل کر تحفظ شہری حقوق قانون رکھ دیا گیا۔

تحفظ شہری حقوق قانون ۱۹۵۵ء کی دفعہ ۱۵ (۱) کے تحت ریاستی حکومتوں اور مرکزی منتظمہ علاقوں کو مرکز سے امداد دی جاتی ہے۔ ۲۰ ریاستوں نے شہری حقوق کے تحفظ سے متعلق امور میں درج فہرست ذاتوں سے مظلوم لوگوں کو قانونی امداد دینے کا اہتمام کیا ہے۔

آئین کے آرٹیکل ۳۳۰ اور ۳۳۲ کے تحت درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کی آبادی کے تناسب سے اُن کے لیے لوک سبھا اور ریاستی ودھان سبھاؤں میں نشستیں مخصوص کی جاتی ہیں۔ شروع میں یہ رعایت آئین کے نفاذ سے ۱۰ برس کے عرصے کے لیے تھی لیکن آئین میں ترمیم کرکے اسے ۲۵ جنوری ۱۹۹۰ء تک بڑھا دیا گیا ہے تاہم راجیہ سبھاؤں اور ریاستی ودھان پریشدوں کونسلوں میں نشستیں محفوظ نہیں کی جاتیں۔

پنچایتی راج لاگو ہونے پر درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کے لیے پنچایتوں اور دیگر لوکل باڈیوں میں نشستیں مخصوص کرنے کا اہتمام ہے تاکہ ان میں انھیں مناسب نمائندگی ملتی رہے۔

اس طرح ان لوگوں کے لیے سرکاری ملازمتوں میں بھی ریزرویشن کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ان ذاتوں کی مدد کے لیے کہ وہ ملازمتوں کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرسکیں، ملک میں ۸۰ کوچنگ سینٹر قائم کیے گئے ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں ۸۲-۱۹۸۵ء میں ان کی تعداد ۶۰ تھی۔

درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کی بہبود کے نئے خطوط پر شروع کرنے کے لیے سنٹرل ریسرچ ایڈوائزری کونسل (مرکزی تحقیقی مشاورتی کونسل) اور سنٹرل ٹرائبل ریسرچ ایڈوائزری کونسل (مرکزی قبائلی تحقیقی مشاورتی کونسل) کا قیام کیا گیا ہے اور ان دونوں کے چیئرمین ڈپٹی منسٹر تھے۔ درج فہرست ذاتوں کی بہبود سے متعلق تحقیق شروع کرنے کے لیے ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران ۱۵ لاکھ روپے کا عطیہ دیا گیا جس کے تحت ۳۰ اداروں کو مختلف تحقیق و مطالعات کے لیے مالی امداد دی گئی اسی طرح جو ۱۲ قبائلی تحقیق اور تربیتی ادارے آندھرا پردیش، آسام، بہار، گجرات، کیرل، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، راجستھان، تامل ناڈو، اُتر پردیش اور مغربی بنگال میں قائم کیے گئے تھے۔ انھوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

گذشتہ برس جموں و کشمیر اور پانڈیچری میں دو نئے شیڈولڈ کاسٹس ڈویلپمنٹ کارپوریشن قائم کیے گئے جس سے ایسے کارپوریشنوں کی کل تعداد ۲۱ تک پہونچ گئی جن میں سے ۱۸ ریاستوں اور ۳ مرکزی منتظمہ علاقوں میں ہیں۔

گشتی عدالتیں

درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کی خواتین اور بچوں کی ترقی کو یقینی بنانے کے لیے بہبود کے وزیرِ مملکت کی زیرِ سرکردگی ایک مشاورتی بورڈ قائم کیا گیا ہے۔

ایک اور قابلِ ذکر کارنامہ جو انجام دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ صفائی کے ذلت آمیز کام کو ختم کرنے کے لیے ایک پراجیکٹ عمل میں لایا جا رہا ہے۔ ۸۱-۱۹۸۰ء کے بعد سے ۱۲ ریاستوں کے ۹۱ قصبوں میں صفائی کارکنوں کو نجات دلائی گئی ہے۔ اب تک ۸ ریاستوں کے ۱۸ قصبوں میں خشک بیت الخلاؤں کو آبدار بیت الخلاؤں میں بدل دیا گیا ہے۔ چھوا چھوت کے جرائم کو تیزی سے نپٹانے کے لیے راجستھان میں ۸، آندھرا پردیش میں ۱۱، اور مدھیہ پردیش، تامل ناڈو اور بہار میں چار چار گشتی عدالتوں کا قیام کیا گیا ہے۔ ۱۹ ریاستوں میں خصوصی سیلوں اور تنظیموں کے لیے افسروں کی تقرری عمل میں لائی گئی ہے تاکہ تحفظ شہری حقوق قانون کے مقدموں کی کارروائی کی نگرانی کی جاسکے۔ اس اسکیم کے لیے ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران ۸.۵۷ کروڑ روپے کی

رقم مخصوص کی گئی ہے۔ ۲۰ نکاتی پروگرام کے نکتہ ۷ کے تحت نگراں سیل نے درج فہرست ذاتوں کی ترقی سے متعلق بڑھائے گئے پروگرام کی ترقی کی نگرانی کو جاری رکھا۔

حکومت درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کی بہبود میں کس قدر دلچسپی لے رہی ہے اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں ان کی بہبود کے لیے ۸۹۷۷ء۳۲ کروڑ روپے کی رقم مہیا کی گئی ہے جو کہ چھٹے پانچ سالہ منصوبے سے بہت زیادہ ہے جس کے دوران ۵۰ء۴۶۴۳ کروڑ روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔

یہ اعداد اور امور اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ گزشتہ ۴۰ برسوں میں نہ صرف چھوا چھوت کا انسداد کرنے بلکہ درج فہرست ذاتوں کی سماجی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے سلسلے میں بڑی پیش رفت ہوئی ہے گو یہ بھی صحیح ہے کہ یہ مسئلہ بہت عظیم ہے اور اسے حل کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

جہیز کا انسداد

جہیز کی بدعت کے انسداد کا ذکر کرتے وقت ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ رواج خصوصاً ایسا رواج جسے مذہبی تقدس حاصل ہو قانون کی نسبت زیادہ اطاعت گذاری کا تقاضا کرتا ہے۔ قانون سے بچنے کے لیے راہ نکالی جا سکتی ہے لیکن رواج سے احتراز کرنا بہت مشکل ہے۔ ہندو سماج میں شروع سے یہ رواج چلا آرہا ہے کہ عورت کو قانونی طور پر باپ کی جائداد سے حصہ نہیں دیا جاتا البتہ جائداد یا نقدی جو کچھ دیا جائے وہ رضا کارانہ طور پر شادی کے وقت جہیز کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ یہ "استری دھن" کہلاتا ہے جس میں سسرال والوں کی طرف سے اگر وہ چاہیں تو اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ماضی میں یہ سارا انتظام خوش اسلوبی سے چل رہا تھا۔ لوگوں میں طمع و حرص نہیں تھی لیکن گذشتہ نصف صدی سے اس بدعت میں اضافہ ہو رہا ہے اور ہم آئے دن اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں کہ جہیز کے لالچ میں عورتوں پر ظلم کیا جا رہا ہے، بلکہ کئی درندہ صفت تو انھیں جلانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

کچھ عرصہ پہلے دلی میں قائم شدہ ایک مشاورتی یونٹ نے ۲۰۰ ایسے کنبوں کا سروے کیا جو میاں بیوی پر مشتمل تھے اور جن کی عورتیں طلاق یافتہ تھیں یا وہ اپنے شوہروں سے الگ رہتی تھیں۔ اس یونٹ نے سروے کے بعد اپنی رپورٹ میں بتایا کہ ۵۰ فیصد شادیاں محض اس لیے ٹوٹ گئیں کہ بیویوں کو ان کے شوہر بار بار مزید جہیز یا بھاری بھرکم رقم لانے کے لیے تنگ کرتے تھے یا گھر سے نکال دیتے تھے۔ یا ان پر تشدد کرتے تھے اور انھوں نے روز روز اپنی ہڈیاں تڑوانے سے تنگ آکر ازدواجی رشتے توڑ دیئے۔ سروے سے ظاہر ہے کہ محض جہیز کے لالچ نے ہی ان عورتوں کو ان کے شوہروں سے الگ ہو جانے پر مجبور نہیں کیا بلکہ بعد میں سائیکل، اسکوٹر، فرج، ٹیلی ویژن اور نقد رقوم کے تقاضوں نے بھی ان کا دل توڑ دیا اور وہ ازدواجی زندگی سے مایوس ہو گئیں۔

حصول آزادی کے بعد ۱۹۶۰ء کی ابتدائی دہائیوں میں انسداد جہیز کا قانون بنایا گیا تھا جس کے تحت ۲ ہزار روپے سے زیادہ جہیز دینے پر پابندی لگا دی گئی تھی لیکن اس قانون پر سختی سے عمل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ کوئی بھی لڑکی کا باپ اپنے سمدھیوں کے خلاف شکایت کر کے دشمنی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ جب سماج کے بڑے بڑے لوگوں کی طرف سے شادی اور منگنی پر بھاری رقوم اور زیورات دے کر اور شان و شوکت اور رنگ دار روشنیوں پر لاکھوں روپے لٹا کر اس قانون کی دھجیاں اڑا دی گئیں اور محافظین قانون خاموش تماشائی بنے رہے تو اس قانون کا بظاہر "اپنی موت آپ مرنا" قدرتی تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی عوام نے بھی پر تولنے شروع کئے اور دیکھتے دیکھتے اس مرض نے وبائی صورت اختیار کر لی۔

جہیز کے لیے عورتوں پر ظلم و تشدد کے اسباب جہاں اقتصادی ہیں وہاں سماجی و اخلاقی نوعیت کے بھی ہیں۔ پرانی اخلاقی قدریں ٹوٹ رہی ہیں۔ تقسیم ملک اور صنعتی انقلاب نے جہاں مشترکہ خاندان کو زبردست دھکا لگایا ہے وہاں انھوں نے قدیم برادری نظام اور پنچایتی ڈھانچے کو بھی توڑ کر رکھ دیا ہے۔ جو تمام سماجی برائیوں کے خلاف ایک قلعہ کا کام دیتے تھے۔ چنانچہ اب حکومت جہاں اس بدعت کو روکنے کے لیے تعزیری اقدامات کر رہی ہے وہاں اس کی طرف سے ان سماجی برائیوں کے خلاف رائے عامہ بھی بیدار کی جا رہی ہے کیونکہ بالآخر عوام کے تعاون سے ہی ان برائیوں کا خاتمہ کیا جا رہا ہے۔

اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے قانون کو مزید سخت بنا دیا گیا ہے اور اب جہیز دینے اور لینے والے دونوں کے خلاف کارروائی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اب کسی لڑکی کے یہ شکایت کرنے پر کہ اسے جہیز نہ لانے یا کم لانے پر تنگ کیا جا رہا ہے، قانونی مشینری فوراً حرکت میں آجاتی ہے۔ جہیز کے معاملے میں عورتوں کو پریشان کرنے یا جلانے پر فوراً کارروائی شروع کر دی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی مرکزی سرکار کے ملازموں کے لیے جہیز لینا یا دینا سرکاری ملازموں کے ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی قرار دے دیا گیا ہے اور ریاستی سرکاروں کو بھی ایسی ہی کارروائی کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

مرکزی سماجی بہبود بورڈ نے مرکزی سطح پر

اور ۱۴ ریاستوں اور مرکزی منتظمہ علاقوں میں رضا کارانہ ادارے قائم کئے ہیں جن کا مقصد عورتوں اور بچوں پر ہونے والے مظالم اور ان کی استحصال پسندی کو روکنے اور مظالم کا شکار ہونے والوں کے لیے تدارک اور بحالی سہولیات فراہم کرنا ہے۔ کئی رضا کار ادارے صغر سنی کی شادی اور جہیز کے رواج کے خلاف رائے عامہ بیدار کرنے کے سلسلے میں سرگرمی سے کام کر رہے ہیں۔

انسداد جسم فروشی

جسم فروشی دنیا کا اولین پیشہ ہے۔ یہ سماجی بدعت تمام ملکوں اور قوموں میں شروع سے موجود رہی ہے۔ اس پر قابو پانا بہت مشکل ہے۔ یہ بدعت اب مہذب سماج میں بھی کئی صورتوں میں پھیل گئی ہے جن کی نشاندہی کرنا آسان نہیں ہے۔ کیونکہ جب دو فریقوں میں "جسم" کا سودا ہو جاتا ہے تو وہ شارع عام میں اس شہوانی فعل کا ارتکاب نہیں کرتے۔ پولیس کو عموماً کوئی فرضی گاہک بھیج کر گرفتاری عمل میں لانی پڑتی ہے لہٰذا جب ہم جسم فروشی کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد اُن چکلوں سے ہے جہاں نابالغ اور بالغ لڑکیاں اقتصادی حالات یا دیگر مجبوریوں سے تنگ آ کر جسم کی تجارت کرتی ہیں۔ چکلوں کے مالک ان لڑکیوں کو جو عموماً پسماندہ طبقوں یا پہاڑی اور قبائلی علاقوں سے تعلق رکھتی ہیں اُن کی غریبی سے فائدہ اُٹھا کر انھیں لاتے ہیں، یا بے سہارا عورتوں کو پھسلا کر اغوا کر کے لے آتے ہیں اور پھر انھیں ڈرا دھمکا کر پیشہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کئی قحبہ خانوں کے مالک تو بیسیوں لڑکیوں کو خرید لاتے یا اغوا کر کے لے آتے ہیں اور اُن کی کمائی کھاتے ہیں۔ یہ کسی بھی سماج کے لیے باعث شرم ہے کہ اس کی بیٹیاں محض پیٹ میں دو روٹیاں ڈالنے کے لیے اس طرح اپنی آبرو کا سودا کریں۔

چنانچہ مئی ۱۹۵۰ء میں نیو یارک میں "افراد کی غیر اخلاقی تجارت کے سدِ باب" سے متعلق ایک بین الاقوامی معاہدہ منظور ہوا جس پر بھارت نے بھی دستخط کیے۔ جس کی تعمیل کرتے ہوئے بھارت کی طرف سے "عورتوں اور لڑکیوں کی غیر اخلاقی تجارت کے سدِ باب" سے متعلق قانون پاس کیا گیا اور ۱۹۵۶ء میں اس کا نفاذ کر دیا گیا۔ اس قانون کی رُو سے "دلالے اور قحبہ خانے کا مالک جو کسی لڑکی کو قحبہ خانے میں رکھتے ہیں اور احاطے کے مالک کے ساتھ، اگر اُسے علم ہو کہ اُس کا احاطہ جسم فروشی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ لڑکی کی کمائی کھاتے ہیں تو وہ سزائے قید کے مستوجب ہیں جو جرمانہ کے ساتھ یا اُس کے بغیر ایک سے تین برس تک ہو سکتی ہے۔ اس قانون کے تحت اگر قحبہ خانہ کسی مذہبی مقام یا پبلک جگہ سے دو سو گز کے اندر ہو تو قحبہ خانے کے مالک اور جسم فروش عورت کو سزا دی جاتی ہے۔

اس قانون کی تعمیل کرتے ہوئے ملک کے اکثر شہروں میں قحبہ خانے بند کر دیئے گئے لیکن ابھی ممبئی، کلکتہ، اور دیگر کچھ شہر اور قصبے ہیں جہاں یہ انسانیت سوز دھندہ جاری ہے۔ کہیں کہیں تو سنگیت اور رقص کی آڑ میں جسم فروشی ہوتی ہے۔ اس کی زیادہ تر وجہ بعض قانونی سقم ہیں۔ مثلاً جب بھی قحبہ خانے پر پولیس چھاپہ مارتی ہے تو وہ قحبہ خانے کے مالک اور جسم فروش پر ہاتھ ڈالتی ہے لیکن جسم کا خریدار صاف بچ جاتا ہے کیونکہ قانون میں اُس کی گرفتاری کا کوئی اہتمام نہیں ہے۔ حالانکہ اس جرم میں دونوں مساوی طور پر ملوث ہوتے ہیں۔ صرف عورت کو ہی سزائے قید یا جرمانہ ہوتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عورت کم تر جرم کی مرتکب ہے جو اقتصادی مجبوریوں، سماج سے اخراج، اور مکار مجرموں کے ناپاک ہتھکنڈوں کے باعث یہ ناپاک پیشہ اختیار کرتی ہے ..... لیکن اگر یہی جرم قحبہ خانے کے باہر سرزد ہو تو اس صورت میں عورت کے ساتھ ساتھ مرد بھی ضابطہ فوجداری کے تحت قانونی گرفت میں آ جاتا ہے۔

ایک خامی یہ ہے کہ جب کسی طوائف کو عدالت میں پیش کیا جاتا ہے تو اس کی پیروی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ جس سے دلال اور قحبہ خانوں کے مالک طوائفوں کی ضمانت داخل کر کے یا خود کو رشتہ دار بتا کر انھیں اپنی تحویل میں لیتے ہیں اور وہ پھر قحبہ خانے میں پہنچ جاتی ہے۔

اس قانون میں سماجی کارکنوں کی تقرری کرنے کے لیے کہا گیا ہے تاکہ وہ خصوصی پولیس اور مقدموں کا فیصلہ کرنے والی عدالتوں کو مشورہ دے سکیں، لیکن کبھی کسی سماجی کارکن کی تقرری نہیں کی گئی۔ اس سے بھی دلالوں اور قحبہ خانوں کے مالکوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ جسم فروشی کے کاروبار پر پابندی لگا دی گئی ہے اور اکثر شہروں اور قصبوں میں قحبہ خانے بند کر دیئے گئے ہیں لیکن جو عورتیں اس "دھندے" کو ترک کرتی ہیں اُن کی بحالی کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔ جس سے وہ مجبور ہو کر دوبارہ اس دھندے میں لوٹ آتی ہیں اور چوری چھپے دھندہ کرتی ہیں۔

توقع کرنی چاہیئے کہ گزشتہ برسوں میں جہاں ان بیشتر اڈوں کو ختم کر دیا گیا ہے وہاں ان قانونی خامیوں کو بھی دور کر دیا جائے گا تاکہ اس بدعت کا خاتمہ بالخیر کرنے میں مدد مل سکے۔ ●

ہرش اروڑہ

صنعت کی ترقی کے چالیس سال

بھارتی صنعت کے چالیس برس

قسط: ۲

کہا جا سکتا ہے کہ بھارت میں منظم جدید صنعت کاری ۱۸۵۴ء سے شروع ہوئی، جبکہ زیادہ تر بھارتی سرمایہ اور محنت سے بمبئی میں کپڑا مِل صنعت کا حقیقی آغاز ہوا۔ پٹ سن صنعت کا آغاز زیادہ تر بدیسی سرمایہ اور اشتراک سے ۱۸۵۵ء میں کلکتہ کے نزدیک ہوا۔ تقریباً اسی وقت سے کوئلہ کانکنی صنعت نے پیش رفت شروع کر دی۔ پہلی عالمی جنگ کے قبل بھی بڑی صنعتیں تھیں جنھوں نے ملک میں ترقی کی تھی۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ کے دوران اور اس کے بعد حکام نے قدرے فراخدلانہ پالیسی اختیار کی جیسے کہ صنعتوں کو تحفظ دینے کی پالیسی جس سے صنعتی ترقی کو بڑھاوا ملا۔ متعدد صنعتوں نے تیزی سے فروغ پایا اور کئی نئی صنعتوں کا قیام ہوا جیسے فولاد سازی، چینی، سیمنٹ، کانچ، صنعتی کیمیکل، صابن، بناسپتی اور چند انجینئری اشیاء۔ لیکن ان کی پیداوار نہ تو اس قدر کافی تھی کہ اس سے ملکی مانگ پوری ہوتی جو اس وقت بہت کم تھی اور نہ ہی ان میں گوناگونی تھی۔ مزید برآں ان میں سے کچھ صنعتیں جنگ کے دنوں میں دفاعی سامان کی تیاری کے لیے قائم کی گئیں یا پہلے سے موجود صنعتوں کو اس لیے ترقی دی گئی کہ وہ دفاعی سامان تیار کر سکیں۔

پہلے دو پلان

پہلے اور دوسرے پانچ سالہ منصوبوں کے عرصے کے دوران صنعتوں کی ترقی و تنوع میں قابلِ ذکر پیش رفت ہوئی۔ یہ پیش رفت دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے دوران بالخصوص قابلِ ذکر رہی۔ سرکاری سیکٹر میں ۱۰۔۱۰ لاکھ ٹن فولاد سازی کی صلاحیت کے تین نئے اسٹیل پلانٹ لگائے گئے اور غیر سرکاری سیکٹر میں کام کر رہے دو اسٹیل کارخانوں کی پیداواری صلاحیت بڑھا کر دُگنی کر دی گئی۔ بجلی کے بھاری سامان اور بھاری مشینوں، اوزار صنعتوں اور مشینوں کی تیاری اور بھاری انجینئری صنعتوں کی دیگر شاخوں میں صنعتوں کا قیام کیا گیا۔ سیمنٹ اور کاغذ صنعتوں کے لیے مشین سازی پہلی بار شروع کی گئی۔ کیمیکلوں کے شعبے میں بھی بڑی ترقی ہوئی۔ اس کے نتیجے میں نہ صرف نائٹروجن فرٹیلائزر، کاسٹک سوڈا، سوڈا ایش، اور گندھک کے تیزاب جیسے بنیادی کیمیکلوں کے بڑے بڑے کارخانے قائم کیے گئے بلکہ یوریا، امونیم فاسفیٹ، پینسلین، مصنوعی ریشوں، صنعتی آتش گیر مادے، پالی تھین اور رنگ کے سامان جیسی نئی نئی اشیاء کی پیداوار بھی شروع ہوئی۔ کئی دیگر صنعتوں کی پیداوار میں بھی بھاری اضافہ ہوا۔ جن میں سائیکل، سلائی مشین، ٹیلی فون اور بجلی کے سامان کی صنعتیں شامل ہیں۔ عملے نے نئے ہنر سیکھے اور صنعتی منتظموں کا ایک نیا طبقہ ظہور میں آیا۔ منظم صنعتوں میں پیداوار ان دس برسوں میں دُگنی ہو گئی۔ صنعتی پیداوار کا اشاریہ جو ۵۱۔۱۹۵۰ء میں ۱۰۰ تھا وہ ۶۱۔۱۹۶۰ء میں بڑھ کر ۱۹۴ ہو گیا۔ ملک کے بڑے شہروں کے آس پاس نئی صنعتی بستیاں آباد ہو گئیں اور نئے کارخانوں کا قیام ہوا۔

تیسرا پلان

تیسرے پانچ سالہ منصوبے اور بعد کے منصوبوں کے آٹھ برسوں میں صنعتی رفتار میں بہت کمی بیشی ہوتی رہی۔ پہلے چار برسوں میں صنعتی سرمایہ کاری اور ترقی کے لیے حالات مقابلتہً سازگار رہے اور قابلِ ذکر ترقی ہوئی۔ اس کے بعد لگ بھگ تین برس

یوجنا، نئی دہلی

تک ملک کے معاشی نظام پر بھاری بوجھ اور دباؤ پڑا۔ جس سے صنعتی پیداوار کی شرح افزائش کم ہونے لگی ہے۔ پہلے تو یہ رفتہ رفتہ کم ہوئی اور بعد میں تیزی سے گھٹی اور آخر میں تو وہ قریب قریب جامد ہو گئی۔ لیکن اس مدت کے آخری برس ۶۹-۱۹۶۸ء میں اس میں بہتری کی چند علامات کا ظہور ہوا۔

۶۵-۱۹۶۴ء کے بعد صنعتی ترقی میں گراوٹ آنے کے کئی اسباب تھے جن میں سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۶۵ء کی لڑائی اور ۶۶-۱۹۶۵ء اور ۶۷-۱۹۶۶ء کے دو برسوں میں سوکھا پڑنے کے باعث صنعتوں پر بُرا اثر پڑتا رہا۔ ۱۹۶۵ء میں کچھ عرصے تک بیرونی امداد بند ہونے کے باعث خام مال اور پرزہ جات کی کمی سے کئی صنعتوں کو نقصان پہونچا۔

جن صنعتوں نے تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے اپنے پیداواری نشانے ۶۶-۱۹۶۵ء تک پوری طرح یا قریب قریب حاصل کر لیے تھے۔ وہ ہیں، المونیم، موٹر گاڑیاں، الیکٹرک ٹرانسفارمر، سوتی کپڑا ملوں کی مشینری، مشینی اوزار، چینی، بیٹ سن کا سامان، برقی پمپ، ڈیزل انجن اور پٹرولیم مصنوعات۔ اس کے برعکس فولاد اور فرٹیلائزر جیسی اہم صنعتوں کی پیداوار میں بھاری گراوٹ آئی۔ بعد کے برسوں میں فرٹیلائزر، بھاری کیمیکل، سیمنٹ اور پٹرولیم مصنوعات جیسی بعض صنعتوں کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔

اہم کامیابیاں

پیداوار میں کمی بیشی کے باوجود اس عرصے کے دوران چند اہم کامیابیاں حاصل ہوئیں جن کے نتیجے میں صنعتی ڈھانچہ متنوع ہوا۔ کئی نئے شعبوں میں بھاری پیداواری صلاحیت نے فروغ پایا۔ کئی بڑے پراجیکٹ جو تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے آغاز میں شروع کیے گئے تھے مکمل کر لیے گئے اور ان میں پیداوار شروع ہو گئی۔ بالخصوص بھاری انجینئری سامان اور مشینوں کے شعبے میں بھاری انجینئرنگ کارپوریشن اور مائننگ اور الائیڈ مشینری کارپوریشن کے متعدد کارخانوں اور بجلی کے بھاری سامان کے پراجیکٹوں میں پیداوار شروع ہو جانے سے لوہا اور فولاد، کانکنی اور بجلی کی پیداوار جیسے اہم شعبوں میں زیادہ تر ملکی مساعی سے ہی پیداواری صلاحیت کا مزید اضافہ کرنا ممکن ہوا۔ ریلوے اور سڑک ٹرانسپورٹ اور مواصلات کے شعبے میں آلات اور مشینری اور ریلوے انجنوں اور ڈبوں کی سپلائی کے بارے میں ملک درحقیقت خود کفیل ہو چکا تھا۔ کپڑا، سیمنٹ اور چینی جیسی روایتی صنعتوں کے لیے مشین سازی کی صلاحیت نے فروغ پا لیا اور ان کے ڈیزائن تیار کرنے اور انجینئرنگ کے شعبے میں صلاحیت کی توسیع کی گئی۔ کئی صنعتوں کی تکنیکی جانکاری حاصل کر لی گئی یا اس نے فروغ پا لیا۔ جس سے کہ فرٹیلائزر، ریفائنری اور مطلوب گُدری جیسی صنعتوں کے پراجیکٹوں کے ڈیزائن تیار کرنے سے کارخانے لگنے تک کا کام زیادہ تر ملکی مساعی سے ہی پورا کیا جانے لگا۔ فولاد اور غیر آہنی دھاتوں کی پیداواری صلاحیت میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا۔ پٹرولیم، فرٹیلائزر اور پٹروکیمیکل صنعتوں میں بھی پیداواری صلاحیت بڑھانے میں مدد ملی۔

چوتھا پلان

چوتھے پانچ سالہ منصوبے میں صنعتی شعبے کا کام پیداوار اور سرمایہ کاری کے لحاظ سے زیادہ اچھا نہیں تھا۔ سرکاری سیکٹر میں صنعتی ترقی پر ۳۰۵۰ کروڑ روپے کے اہتمام کے مقابلے میں سرمایہ کاری اندازاً ۲۷۰۰ کروڑ روپے رہی۔ خام لوہے، پٹرولیم اور پٹرولیم مصنوعات جیسے بعض شعبوں میں سرمایہ کاری کی رفتار بالعموم اطمینان بخش تھی۔ لیکن لوہے اور فولاد، غیر آہنی دھاتوں، فرٹیلائزر اور کچے کوئلے جیسے شعبوں میں ایسا نہیں تھا۔ پراجیکٹ لاگتوں میں ہوئی توسیع کا حساب لگایا جائے تو تمام تر سرمایہ کاری میں گراوٹ کہیں زیادہ نظر آئے گی۔

صنعتی پیداوار میں غیر اطمینان بخش اضافے کے کئی اسباب تھے۔ فولاد اور فرٹیلائزر جیسے بعض نازک شعبوں میں چند یونٹوں میں خرابی کے باعث پیداوار قائم شدہ صلاحیت سے بہت کم رہی۔ زراعت پر انحصار رکھنے والی چینی، اور کپڑے جیسی صنعتوں میں بھی غیر معمولی حالات بنے رہے۔ سرمایہ کاری کی کمی کے باعث صنعتی مشینری کی مانگ کم ہو گئی جس کا بھاری مشینری بنانے والی صنعتوں پر بُرا اثر پڑا۔ فولاد اور غیر آہنی دھاتوں کی کمی سے دیگر انجینئری صنعتوں کی پیداوار پر بھی بُرا اثر پڑا۔

دوسری طرف مرکب دھاتوں اور بالخصوص فولاد، المونیم، موٹر گاڑیوں کے ٹائر، پٹرولیم مصنوعات، الیکٹرانکس، مشینی اوزار، ٹریکٹر اور بھاری بجلی کی صنعتوں جیسی بیشتر صنعتوں کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا۔ چوتھے منصوبے کے آخری برسوں میں سرکاری سیکٹر کے اداروں کی پیداوار میں بھی حوصلہ افزا پیش رفت ہوئی۔ اس کے علاوہ صنعتی بنیاد کی مزید توسیع ہوئی اور کوالٹی کی بہتری اور خود کفالت کی سمت میں کافی پیشقدمی ہوئی۔

پانچواں پلان

پانچویں منصوبے میں اہم صنعتوں کی تیز رفتار ترقی اور برآمد پر مبنی مال اور بڑے پیمانے پر استعمال ہونے والی اشیاء کی پیداوار بڑھانے پر زور دیا گیا۔ ترمیم شدہ منصوبے میں صنعتی سیکٹر کی ترقی کی اوسط شرح کا حساب ۷ فی صد سالانہ لگایا گیا

ہے۔ خوراک، فرٹیلائزر اور تیل کی قیمتوں میں خلاف توقع اضافے سے تمام تخمینے غلط ثابت ہوئے جن کی بنا پر پانچویں پانچ سالہ منصوبے کا مسودہ مرتب کیا گیا تھا۔ ان نئے حالات کے باعث خوراک اور توانائی کے معاملوں میں قدرے خود کفالت حاصل کرنے کے لیے ایسا پروگرام بنانا بھی ضروری ہو گیا جسے وقت کے اندر پورا کیا جا سکے۔ آئندہ سالانہ منصوبے انہی امور کو پیشِ نظر رکھ کر مرتب کرنے پڑے۔

پانچویں منصوبے کے مسودے میں کُل ۱۱۴۳۵ کروڑ روپے کے اخراجات کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں سے ۳۷۲۵۰ کروڑ روپے پبلک سیکٹر کے لیے اور ۱۶۱۶۱ کروڑ روپے پرائیویٹ سیکٹر کے لیے مخصوص تھے۔ لیکن ۱۹۷۳ء میں تیل کی قیمتوں میں انتہائی اضافے کے باعث غیر معمولی افراطِ زر کی حالت پیدا ہو جانے سے ۱۹۷۴ء میں منصوبے میں کافی کاٹ چھانٹ کرنی پڑی۔ ترمیم شدہ منصوبے میں کُل ۶۹۳۵۱ کروڑ روپے کے اخراجات رکھے گئے — ۴۲۲۰۳ کروڑ روپے پبلک سیکٹر کے لیے اور ۲۷۴۸ کروڑ روپے پرائیویٹ سیکٹر کے لیے۔

پانچویں منصوبے میں پبلک سیکٹر کے لیے ۳۹۳۰۳ کروڑ روپے کی جو ترمیم شدہ رقم رکھی گئی تھی اُس میں سے ۱۰۳۰۱ کروڑ روپے یعنی ۲۵ء۹ فیصد صنعتی اور معدنیاتی سیکٹر کے لیے تھے۔ بڑی اور متوسط صنعتوں کے لیے ۹۶۹۱ کروڑ روپے اور دیہی اور چھوٹی صنعتوں کے لیے ۵۱۰ کروڑ روپے رکھے گئے تھے۔

چھٹا پلان

چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں پبلک سیکٹر کے لیے منصوبہ جاتی رقم ۹۷۵۰۰ کروڑ روپے رکھی گئی۔ بڑی صنعتوں اور معدنیاتی سیکٹر کے لیے کوئلے اور پٹرولیم سمیت کُل ملا کر ۲۰۴۰۷ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی۔ جس کا کافی بڑا حصہ یعنی ۱۹۰۱۸ کروڑ روپے مرکزی سیکٹر اور ۱۳۸۹ کروڑ روپے ریاستی سیکٹر کے لیے تھا۔ اس کے علاوہ ۸۵-۱۹۸۰ء کے دوران پرائیویٹ سیکٹر کے لیے ۳۰۳۲۳ کروڑ روپے کی رقم وقف کی گئی۔ دیہی اور چھوٹی صنعتوں کے لیے ۱۷۸۰ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی۔

چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے دوران صنعتی پالیسی کا مقصد دستیاب پیداواری صلاحیتوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا، بھاری مشینری اور متوسط درجے کی اشیاء اور اشیائے صرف کی پیداوار میں کافی اضافہ کرنا اور پیداواری صلاحیت کو بڑھانا تھا۔ پانچ برس کے عرصے میں صنعتی پیداوار کی سالانہ شرح افزائش ۸ فیصد تک بڑھانا تھا۔ لیکن چھٹے منصوبے کے پہلے تین برسوں میں اوسط سالانہ شرح ترقی ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۴ فیصد، ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۸ء۶ فیصد اور ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۳ء۹ فیصد (عبوری) حاصل ہوئی۔ اس طرح منصوبے کے پہلے تین برسوں میں اوسط شرح ترقی ۵ فیصد سالانہ تھی۔

چھٹے پانچ سالہ منصوبے کی صنعتوں کی کارکردگی کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ المونیم، جست، سیسہ، تھرموپلاسٹک، پٹرو کیمیکل کی میانہ مصنوعات، بجلی کی مشینری اور آلات، موٹر گاڑیوں اور پائیدار اشیائے صرف جیسی صنعتوں کے لیے پیداواری صلاحیت بڑھانے کے نشانے حاصل کر لیے گئے ہیں۔ پٹرولیم، مشینی اوزاروں، مسافر کاروں، موٹر سائیکلوں، اسکوٹروں اور ٹیلی ویژن جیسی صنعتوں میں پیداواری نشانوں کا حصول ہو گیا ہے۔ لیکن کوئلے، فولاد، غیر آہنی دھاتوں، سیمنٹ، دوائیوں، کپڑے، پٹ سن کی اشیاء، تجارتی گاڑیوں، ریل ویگنوں اور چینی جیسی صنعتوں کی پیداوار میں کمی بتائی گئی ہے۔

چھٹے منصوبے میں ٹیکنالوجی میں جو شاندار کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں اُن میں ۵۰۰ میگاواٹ کے بجلی جنریٹنگ یونٹ کا چالو کیا جانا، ۵ میگاواٹ کے ٹربو جنریٹر اور بوائلر کی تیاری شروع کرنا اور بین الاقوامی ٹیکنالوجی کی بین الاقوامی معیار کی جدید ٹیکنالوجی والی ۸۰۰ سی سی کی کم تیل کھپت کرنے والی موٹر گاڑیوں کی تیاری شامل ہے۔ فرٹیلائزر کے شعبے میں ۱۳۵۰ ٹن روزانہ صلاحیت والے فرٹیلائزر پلانٹوں کی تعمیر شروع ہو گئی ہے۔ فولاد سازی کے شعبے میں پوری طرح سودیشی ۳۲۰۰ مکعب میٹر کی دھمن بھٹی اور، میٹالرجی "کوک اوون" بیٹری اور آلات اس ملک میں ہی بنائے جا رہے ہیں۔ اس طرح اس کانکنی کے لیے بڑی جسامت کی بھاری مشینوں جیسے لمبی دیوار کی کھدائی کی مشینیں، ، مکعب میٹر کی ہائیڈرولک مشینوں وغیرہ کی تیاری شروع ہو گئی ہے۔

الیکٹرانک صنعت میں جسے ساتویں منصوبے میں "چڑھتے سورج کی صنعت" کا نام دیا گیا ہے۔ چھٹے منصوبے کے نشانے سے زیادہ پیداوار شروع ہو گئی ہے۔ ایل ایم آئی زی ایل ایس آئی، سرکٹوں جیسے شعبے میں ۸ اور ۱۶ مائکرو کمپیوٹر چپ، کمپیوٹر اور مائکرو پروسیسر، مواصلاتی آلات، نشریاتی اور ٹی وی ٹرانسمیشن مشینیں، مائکرو الیکٹرانک آلات، الیکٹرانک سازوسامان اور پرزوں وغیرہ کی تیاری میں اعلیٰ معیار کی ٹیکنالوجی حاصل کر لی گئی ہے۔

●

مضمون نگار حضرات توجہ دیں

یوجنا کے لیے معیاری ادبی مضامین جو بہت زیادہ طویل نہ ہوں مگر اپنی افادیت کے لحاظ سے بھرپور ہوں، ارسال فرمائیں۔ اس میں کتابوں پر تبصرہ بھی ہوتا ہے، تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں ارسال کریں۔

شیام سندر چاولہ

قسط: ۸

ترقی کے سنگ میل

باغبانی کو ترقی دینے کا پروگرام

ساتویں منصوبے میں باغبانی کو ترقی دینے کے لیے زیادہ فنڈ مخصوص کئے گئے ہیں۔ ضروریات کی فراہمی کے سلسلے میں باغبانی کو ترقی دینے پر خاص زور دیا جا رہا ہے۔ حکومت کی طرف سے بڑے پیمانے پر پروگرام میں پھلوں اور سبزیوں کی کاشت بہتر بنانے اور جلد تلف ہونے والی زرعی اشیاء کا مناسب طریقے پر ذخیرہ اور "پراسیس" کرنے اور ان کی فروخت کی سہولیات کو بڑھاوا دینے کے امور کو شامل کیا گیا ہے۔

باغبانی کی صنعت کی تیز رفتار ترقی اور اسے مضبوط لائنوں پر کھڑا کرنے کے لئے ساتویں پلان میں "نیشنل ہارٹی کلچر بورڈ" کے لئے ۵ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۳۰ کروڑ روپے مختص کئے ہیں۔ وزارت زراعت کے شعبہ باغبانی کے لیے فنڈ بھی ۲۵ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۸۰ کروڑ روپے کر دئے گئے ہیں تاکہ باغبانی سے متعلق پروگراموں کو ترقی دی جا سکے۔

نیشنل ہارٹی کلچر بورڈ جلد تلف ہونے والی زرعی اجناس سے متعلق گروپ کی سفارشات پر ڈاکٹر ایم۔ ایس۔ سوامی ناتھن کی زیر سرکردگی قائم کیا گیا تھا۔ اس گروپ نے گزشتہ ایک برس میں متعدد پروگرام شروع کرکے مؤثر کردار ادا کیا ہے۔

بورڈ کی طرف سے ایک رہنما پراجکٹ کی منظوری بھی دی گئی ہے جو "یو پی کے پہاڑوں میں باغبانی کی ترقی" سے تعلق رکھتا ہے۔ دیہی علاقوں میں کم لاگت کے کم توانائی کھپت کرنے والے کولڈ اسٹوریج قائم کرنے سے متعلق ایک اسکیم بھی منظور کی گئی ہے تاکہ بھرپور موسم کے دوران کٹائی کے بعد ہونے والے نقصانات کو کم کیا جا سکے۔

بورڈ نے پیداواریت بڑھانے سے متعلق پروگراموں کو عمل میں لانے کا قصد کیا ہے اور اس کے لیے وہ غیر منافع بخش فارموں اور باغات کی حالت بہتر بنانے میں امداد دیگا۔ پیداوار کی مارکیٹنگ پر زور دینے کے علاوہ بورڈ پیداوار بڑھانے کے لیے ٹیکنالوجی کی منتقلی کا اہتمام کرے گا۔ وہ کاشتکاروں کو ملک کے سرکردہ تحقیقی اداروں میں بھیجنے کا بندوبست کرے گا تاکہ وہ ان اداروں کی ریسرچ سے فیضیاب ہو سکیں۔

کپڑا مزدوروں کیلئے بحالیاتی فنڈ کا قیام

حکومت نے کپڑا مزدوروں کے لیے بحالیاتی فنڈ کی اسکیم شروع کی ہے جو ۱۵ ستمبر ۱۹۸۶ء سے عمل میں آئی ہے۔ فنڈ کا مقصد ان مزدوروں کو عارضی امداد فراہم کرنا ہے جو کپڑا ملوں کے مستقل بند ہو جانے کے نتیجے میں بیروزگار ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ کپڑا سیکٹر میں متبادل روزگار اور خود روزگار کے لیے مراعاتی سرمایہ یا روزگار کے ذریعہ ان میں سے بعض کو امداد دی جا سکتی ہے تاہم اس کے باوجود مزدوروں کی ایسی بھاری تعداد رہ جاتی ہے جو ان اقدامات سے امداد حاصل نہیں کر سکتے انہیں عبوری عرصہ کے لیے امداد کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ کوئی اور روزگار حاصل کر سکیں۔

اس اسکیم کے تحت کوئی بھی ایسا ورکر جس نے ایک مل کے بند ہونے پر متواتر پانچ برس یا زائد عرصے ملازمت کی ہو اور ۱۶۰۰ روپے ماہوار یا کم کے برابر اجرت حاصل کی ہو اور متعلقہ ریاست

کے پراویڈنٹ فنڈ کمیشنر کے ریکارڈ پر اُس کا نام ہو وہ اس امداد کا مستحق ہوگا۔

* اس اسکیم* کے تحت امداد تین برس کے عرصے کے لیے عارضی بنیاد پر دستیاب ہے لیکن وہ کسی ورکر کی سبکدوشی کی تاریخ کے بعد میسر نہیں ہوگی۔ ورکر اس طرح امداد کا مستحق ہوگا۔

ا۔ مل کے بند ہونے پر پہلے برس میں اُجرت کے ۷۵ فیصد کے برابر تک۔

ب۔ دوسرے برس اُجرت کے ۵۰ فیصد کے برابر اور

ج۔ تیسرے برس اُجرت کے ۲۵ فیصد کے برابر۔ اس فنڈ کا انتظام ٹیکسٹائل کمشنر اپنے علاقائی دفاتر کے ذریعہ کرتا ہے۔

جون ۱۹۸۵ء کی ٹیکسٹائل پالیسی میں واضح کردیا گیا ہے کہ کمزور ملوں کے مستقل طور پر بند ہونے کی صورت میں مزدوروں کے مفادات کا مکمل طور پر تحفظ کیا جائے گا۔ بحالیاتی فنڈ ایسے مزدوروں کی امداد کے لیے ۱۰ کروڑ روپے کے سرمایہ سے شروع کیا گیا ہے۔

۱۹۸۶ء کا بیس نکاتی پروگرام ۸۸-۱۹۸۷ء سے عمل میں لایا جائیگا

تعمیل پروگرام کی وزارت ۱۹۸۶ء کے بیس نکاتی پروگرام کی تعمیل اور نگرانی کی تفاصیل مرتب کرنے میں مصروف ہے جس کے لیے وہ متعلقہ وزارتوں اور کابینہ کے سیکریٹریٹ کے ساتھ صلاح مشورے کر رہی ہے۔ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ اس پروگرام پر آئندہ مالی برس سے عمل درآمد کیا جائے۔ یہ اطلاع تعمیل پروگرام کے وزیر شری اے بی اے غنی خاں چودھری کی طرف سے ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو نئی دلی میں اس پارلیمانی مشاورتی کمیٹی کو دی گئی تھی جو ان کی وزارت سے وابستہ تھی۔ انھوں نے بتایا کہ ریاستی حکومتوں سے بھی کہا گیا ہے کہ اپنے اسکیموں کے لیے مقدار اور کوالٹی کے نشانے مقرر کیے جائیں۔ فنڈوں کا بندوبست کیا جائے اور پروگرام کی نگرانی کی جائے۔

ممبروں کو بتایا گیا کہ پلاننگ کمیشن نے ۱۹۸۷ء کے پلان کی اسکیموں کے بارے میں بات چیت شروع کردی ہے۔ ریاستی حکومتوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ۱۹۸۶ء کے لیے ۲۰ نکاتی پروگرام کے بارے میں اپنی تجاویز پیش کریں۔ ان اسکیموں کے سالوں اور فنڈوں کو ریاستی حکومتوں اور پلاننگ کمیشن کے مشورے کے ساتھ قطعی صورت دی جائے گی۔

مسٹر چودھری نے بتایا کہ ۲۰ نکاتی پروگرام غریبوں کی بہتری کا پلان ہے۔ اس پروگرام کو ساتویں پلان کے مقاصد اور ہمارے تجربوں اور کامیابیوں کی روشنی میں از سر نو ترتیب دیا گیا ہے اس کے تشکیل شدہ پروگرام سے افلاس، پیداوارت کو بڑھانے، آمدنیوں میں نابرابری کو کم کرنے اور سماجی و اقتصادی عدم مساوات کو دور کرنے اور معیار زندگی کو بہتر بنانے سے متعلق ہمارے قول و قرار کی تجدید ہوتی ہے۔ وزیر موصوف نے کہا کہ افلاس کے خلاف جنگ، ہماری پہلی اولیت ہے۔ گزشتہ پانچ برسوں میں ۱ کروڑ سے زیادہ افراد افلاس کی سطح کے اوپر لائے گئے ہیں۔ ہمارا ہمیشہ یہ مقصد رہا ہے کہ افلاس کو ختم کیا جائے اور روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کیے جائیں۔

سڑکوں اور ریلوں کی تعمیری ٹیکنالوجی میں بھارت کی شاندار ترقی

بھارت میں سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر اور اُن کے رکھ رکھاؤ پر ہر برس ۱۴ ارب روپے خرچ کرنے کا پلان بنایا گیا ہے۔ ۱۹۸۱ء سے ۲۰۰۲ء تک جو پلان بنایا گیا ہے اُس کے مطابق ۲۷ لاکھ کلومیٹر سڑکوں کا جال پھیلایا جائے گا جس میں قومی شاہراہیں، ریاستی شاہراہیں، بڑی اضلاعی سڑکیں اور دیہی سڑکیں شامل ہوں گی۔ یہ بھی تجویز ہے کہ بعض نہایت گنجان علاقوں کے راستوں میں تیز ٹریفک کا کنٹرولوں کے تحت اہتمام کیا جائے۔ بھارت میں سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر کے سلسلے میں جو ٹیکنالوجیکل ترقی ہوئی ہے وہ نہایت شاندار ہے۔ سڑکیں اونچے پہاڑوں، گہری وادیوں اور ریگستانی علاقوں میں بھی بنائی گئی ہیں۔ ایسے علاقوں میں بھی سڑکوں کا جال پھیلایا گیا ہے جو بنجر اور دشوار گذار ہیں اور جہاں تعمیری سامان آسانی سے دستیاب نہیں ہے۔ گنگا اور برہم پتر جیسے عظیم دریاؤں پر کئی مقامات پر پل بنائے گئے ہیں اور کئی مقامات پر ان پلوں کی لمبائی ۵ کلومیٹر تک ہے۔ شہروں کے گنجان آباد قصبوں میں "فلائی اوور" بنائے گئے ہیں ان میں سے بعض لمبے پل اور "مہرنا" ... اور ... اور ... پیدا ہوا۔ ... کر کے ریکارڈ قائم کیا گیا ہے۔ بعض شاہراہوں کے اہم حصوں پر تیز رفتار ٹریفک کا اس طرح اہتمام کیا گیا ہے کہ سست رفتار گاڑیوں اور ٹریفک سے موٹر گاڑیوں کی تیز رفتاری میں رکاوٹ نہیں پڑے گی۔

عالمی بینک کے ایک مطالعہ کے تحت جو تجربے کیے گئے ہیں اُن سے پتہ چلا ہے کہ سیدھے خطوط، مثلثوں اور دائروں سے متعلق تکنیک میں بہتری لا کر اور سڑکوں پر کنکریٹ کا جال پھیلا کر اخراجات میں بھاری بچت کی جا سکتی ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس طرح جو سڑکیں تیار ہوں گی اُن پر چلنے والی موٹر گاڑیوں کے

اینڈیمک میں ۲۰ فیصد کی کمی ہوگی۔ اس سلسلے میں ٹرانسپورٹ وزارت کے تحت "پانی دستے" محنتوں کی تربیت سے متعلق جو قومی ادارہ قائم کیا گیا ہے وہ اس حصے میں [illegible] پورا کرنے سے متعلق اپنی قسم کا تنہا ادارہ ہے۔

۲۰۰۰ء تک سب کے لیے صحت کا پروگرام

ہمارے [illegible] ۱۹۷۱ء [illegible] سب کے لیے صحت کے حصول کا [illegible] [illegible]

[illegible] ۱۹۷۱ء میں ۱۰۰ برس تھی وہ ۸۲-۱۹۸۱ء میں بڑھ کر ۵۴ برس ہوگئی۔ [illegible] ۱۹۸۱ء [illegible] [illegible] ہے [illegible] ۸۳ [illegible] مرکز، [illegible] اور امدادی صحتی مرکز اور ۲۵۰ [illegible] صحتی مرکز ہیں۔

حکومت کی طرف سے صحت پر کیا جانے والا [illegible] ۱۹۵۵ء میں ۱.۵ روپیہ تھا وہ

۸۲-۱۹۸۱ء میں بڑھ کر ۲۷،۸۹ روپے ہوگیا۔ طاعون اور چیچک کا انسداد کر دیا گیا ہے۔ چھٹے پانچسالہ پلان کے دوران ایک اہم ترین اقدام یہ کیا گیا ہے کہ پارلیمنٹ نے قومی صحت پالیسی کی منظوری دی ہے۔

ساتویں پلان کے دوران ابتدائی صحتی دیکھ بھال کو مزید تقویت دی جائے گی۔ صحتی ترقی کے قومی پروگرام میں [illegible]

توانائی کے بار بار استعمال کیے جانیوالے وسائل کا فروغ

چھٹے پلان کے دوران توانائی کے بار بار استعمال کیے جانے والے وسائل کو [illegible] دینے کے لیے [illegible] کارروائیاں کی گئیں۔ اس میں شمسی سمیت حیاتیاتی توانائی (بایوگیس اور بایوماس)، شمسی اور حرارتی توانائی، ہوائی توانائی اور شمسی فوٹو وولٹکس PHOTO-VOLTAICS

ساتویں پلان کے مقاصد یہ ہیں:

۱۔ توانائی کے بار بار استعمال ہونے والے وسائل کو جہاں کہیں تکنیکی اور اقتصادی طور پر موزوں ہو ترقی دینا اور ان کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا۔

۲۔ بار بار استعمال ہونے والے توانائی کے غیر مرکوز وسائل خصوصی طور پر دیہی آبادی میں [illegible] اور دستیاب کرانا۔

۳۔ پسماندہ اور دیہی علاقوں کی ترقی اور شہری و دیہی علاقوں کی متوازن ترقی میں مدد دینا اور اس کے لیے مقامی طور پر دستیاب بار بار استعمال کیے جانے والے غیر مرکوز وسائل کو بروئے کار لانا اور جنگلوں کی کٹائی کے نتیجے میں ہونے والی ماحولی آلودگی کو کم کرنا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے [illegible]

[illegible] بھی تجویز کیا گیا ہے کہ توانائی کے تمام جدید سلسلوں کی تیاری، [illegible] وغیرہ سے متعلق موثر [illegible] تیار کیا جائے۔

پٹ سن صنعت کی صنعتکاری کیلئے فنڈ

حکومت کی طرف سے پٹ سن صنعت کی

جدید کاری سے متعلق اسکیم کی تفصیل کو قطعی صورت دی گئی ہے۔ اس اسکیم میں ٹیکسٹائل جدید کاری فنڈ کے قیام کی تجویز ہے۔ جسا کہ وزیر اعظم نے حال میں اعلان کیا تھا۔ یہ ٹیکسٹائل جدید کاری فنڈ کی طرح پر کام کرے گا۔

حکومت گزشتہ چند برسوں سے مل صنعت کے زوال پذیر رجحان کے پیش نظر اس صنعت کو نئے سرے سے تقویت دینے کے سلسلے میں [illegible] اقدامات پر غور کر رہی ہے۔ اس صنعت میں زوال آنے کی [illegible] ہے کہ [illegible] سازو سامان [illegible] ہو گیا ہے [illegible]

اس [illegible] فیصلہ کیا گیا ہے [illegible] جدید کاری [illegible]

[illegible]

بھارت [illegible] کی [illegible] جدید کاری فنڈ کو سرمایہ [illegible] ایک ارب [illegible] کروڑ روپے مخصوص کئے ہیں۔

اس فنڈ میں سے ایک ارب ۲۰ کروڑ روپے ایسی کمزور ملوں کو دئے جائیں گے جو مالی امداد سے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہیں۔ انھیں جدید مشینوں کے رعایتی [illegible] فراہم کیا جائے گا۔ اس رعایت سے ہونے والی کمی کیلئے مالی امداد مرکزی حکومت کی طرف سے بجٹ میں جدید کاری فنڈ کو دی جائے گی۔

جدید کاری کے سلسلے میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ جدید کاری کیلئے درکار مشینری اور ساز و سامان جو ملک میں تیار نہیں ہوتا وہ تین برس کے عرصے تک ڈیوٹی کے بغیر درآمد کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد پوزیشن پر نظر ثانی کی جائے گی۔

ہینڈلوم سیکٹر میں ارزاں پولیسٹر کپڑے کی تیاری

یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ نیشنل ٹیکسٹائل کارپوریشن کی ملوں کی طرف سے ارزاں قیمت کا جو پولیسٹر اور سوت کا ملا جلا کپڑا تیار کیا جا رہا ہے اور جو سستا کپڑا اسکیم کے نام سے موسوم ہے اس کی تیاری کا کام ہینڈلوم سیکٹر کو سونپ دیا جائے اور اس کے لئے ڈیوٹی [illegible] پولیسٹر [illegible] فراہم کیا جائے۔

[illegible] ہینڈلوم [illegible] تیاری کی حوصلہ افزائی کی جائے [illegible]

[illegible] پولیسٹر کے استعمال سے ایسے کپڑے کی تیاری [illegible] بڑھانے کی [illegible] ان ملوں کو [illegible] جو نیشنل ٹیکسٹائل کارپوریشن یا اسٹیٹ ٹیکسٹائل کارپوریشن یا کوآپریٹو اسپننگ ملوں سے متعلق [illegible]۔ اس اسکیم پر تمام [illegible] ہینڈلوم کے ڈویلپمنٹ کمشنر کے ہاتھ میں رہے گا۔

"فضائی" صنعتوں کیلئے صنعتی مہارت

پالیسی بیان کے مسودے کے مطابق پبلک سیکٹر میں ایسی مہارت مجتمع کی گئی ہے جس سے بڑی بڑی صنعتوں کو چلانے کے لئے ان کے ڈیزائن وغیرہ تیار کئے جا سکیں اور انھیں چالو کیا جا سکے۔ دستاویز میں کہا گیا ہے کہ صنعت کو یہ امر یقینی بنانا چاہیئے کہ پبلک سیکٹر میں اس مہارت سے فائدہ اٹھایا جائے اور پرائیویٹ سیکٹر کی بھی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ "فضائی" صنعتوں جیسے ٹیلی مواصلات، کمپیوٹروں، مائکرو الیکٹرانک اور بائیو ٹیکنالوجی کی ترقی میں حصہ لے۔ پیداوار اور کوالٹی کو بڑھانے کے سلسلے میں ماسٹر آئیکٹس، پرزوں اور راسٹوں جیسی ٹیکنالوجیوں کو اختیار کرنے کے لئے نجی صنعت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ دستاویز میں کہا گیا ہے کہ پالیسی کے لحاظ سے نجی پبلک سیکٹر کو میونیفیکچرنگ (مال کی تیاری) کی ٹیکنالوجی کی جدید کاری میں بھی زیادہ سے زیادہ اہم [illegible] ہوگا۔ لیکن اس امر کی بھی ضرورت [illegible] کے لئے زیادہ دستور کار [illegible] کام لیا جائے۔

●

بقیہ تبصرہ

تصور ختم ہو جاتا ہے۔ لہذا عذاب اور ثواب کی بنیاد مشکوک ہو جاتی ہے مگر مذہب کے دامن سے وابستگی کی بنا پر مصنف نے عذاب اور ثواب کا سائنٹفک حل پیش کیا ہے جو ڈاکٹر خان کی اپنی ذاتی رائے ہے جو ان کے اپنے مطالعے پر مبنی ہے، ضروری نہیں کہ انکی اس رائے سے سبھی اتفاق کریں، اس میں اختلاف رائے کی بڑی گنجائش ہے مگر یہ ضرور ہے کہ ایک اہم موضوع پر یہ طرز استدلال دعوتِ فکر دیتا ہے۔

دونوں کتابوں کی زبان سادہ اور طرز تحریر سلیس ہے جس سے اتنے مشکل مسئلہ کا سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔ میرے خیال سے تعلیم یافتہ حضرات ان کتابوں کو ضرور پڑھیں تاکہ ان کو جدید سائنس اور مذہب کے مقام کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

●

یونس صدیقی

یوجنا، نئی دہلی

ایم۔ کے۔ خان اور ایس۔ کے گھوش دستی دار

بائیو گیس کے بڑھتے ہوئے قدم!

ذیل کے مضمون میں مہاراشٹر اور کرناٹک میں بائیو گیس پروگرام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ۲۰۰ سے زیادہ پلانٹوں کا مطالعہ کی غرض سے انتخاب کیا گیا۔ اس کے انکشافات قطعی دلچسپ ہیں۔ مثال کے طور پر بائیو گیس کے دو اہم ترین فوائد ہیں — وقت کی بچت اور مٹی کے تیل، ایندھن، اپلوں اور لکڑی جیسے مروجہ ایندھنوں پر کم انحصار۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خواتین میں اب آنکھوں اور سانس کے امراض کم ہوتے ہیں۔

بائیو گیس کو گزشتہ چند برسوں سے غیر مروجہ توانائی کے وسائل کے فروغ اور استعمال سے متعلق پروگرام کے سلسلے میں کافی توجہ دی جانے لگی ہے تاکہ خصوصاً دیہی علاقوں میں توانائی کے بڑھتے ہوئے بحران کا مقابلہ کیا جا سکے۔ یہ ٹیکنالوجی چند دیگر امور کے ساتھ ساتھ ان باتوں کو یقینی بناتی ہے۔

(ا) کھانا پکانے اور روشنی کے لیے صاف تر اور ارزاں تر ایندھن۔

(ب) بھرپور نامیاتی کھاد، (ج) خصوصاً ایسی خواتین کی صحت کا تحفظ جو باورچی خانے میں دھوئیں میں کام کرتی ہیں۔ اور (د) بہتر ماحولیاتی صفائی۔

اس امر کا بھی مظاہرہ ہوا ہے کہ اس سسٹم سے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو برقی قوت فراہم کی جا سکتی ہے۔

حال ہی میں غیر مروجہ توانائی کے وسیلوں کے محکمے (ڈی۔ این۔ ای۔ ایس) نے بائیو گیس کے فروغ سے متعلق قومی پراجیکٹ (این پی بی ڈی) کے تحت جو نومبر ۱۹۸۱ء میں شروع کیا گیا تھا۔ بائیو گیس پروگرام پر نئے سرے سے زور دیا ہے۔ "این پی بی ڈی" کے عرصے کے دوران اس پروگرام کو جو کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جب کہ "این پی بی ڈی" سے قبل کے آٹھ برسوں (۱۹۷۴ء تا ۱۹۸۱ء) کے دوران صرف ۱۰۱۲۱۳ کنبہ جاتی پلانٹ لگائے گئے۔ "این پی بی ڈی" کے چار برس کے عرصے (۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۵ء) میں کل ۲،۵۷،۳۴۳ پلانٹ لگائے گئے، جن میں سے صرف ۱،۲۷،۲۷۳، ۸۵-۱۹۸۴ء میں ہی لگائے گئے۔ یہ ایک شاندار کامیابی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "ڈی این ای ایس" کی مساعی سے بائیو گیس ٹیکنالوجی کو دیہی علاقوں میں زیادہ سے زیادہ قبول کیا جانے لگا ہے۔ بھارت کے دیہات میں جس بھاری مقدار میں گوبر دستیاب ہے اور کھانا پکانے کے ایندھن، خصوصاً لکڑی کی جو بہت کمی ہو رہی ہے، اس پر غور کرتے ہوئے تمام متعلقین کو چاہیے کہ وہ بائیو گیس کی مقبولیت بڑھانے کے لیے اپنی مساعی کو مجتمع اور تیز کر دیں لیکن یہ بات کس قدر تعجب خیز ہے کہ بعض لوگ توانائی کے اس غیر مرکوز وسیلے کی افادیت پر شبہ کر رہے ہیں جو دیہی علاقوں میں پہلے ہی مقبولِ عام ہو گیا ہے۔

پلانٹوں کا جائزہ

مہاراشٹر اور کرناٹک میں آپریشنز ریسرچ گروپ (او آر جی) کی طرف سے پلانٹوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان دونوں ریاستوں میں کل ۲۰۶۶ پلانٹوں کا جنہیں بلا سوچے سمجھے منتخب کیا گیا تھا جائزہ لیا گیا اور ان کے بارے میں تحقیق و مطالعہ کیا گیا۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا کہ دونوں ریاستوں میں ۱۹۸۵ء تک جو پلانٹ نصب کئے گئے تھے، وہ

اسی عرصے میں ملک بھر میں نصب کیے جانے والے کُل پلانٹوں کا تقریباً ۲۸ فیصد تھے۔ لہٰذا ملک کے تقریباً ایک تہائی پلانٹوں کے بارے میں کیے گئے مشاہدات صحیح ہیں۔ او آر جی کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دونوں ریاستوں میں جن ۲۰۶۶ پلانٹوں کا سروے کیا گیا ہے اُن کے نصف سے زیادہ (۵۵ فیصد) بائیو گیس کے فروغ سے متعلق قومی پراجیکٹ کے نفاذ سے پہلے نصب کیے گئے تھے اور پلانٹ عموماً ۴-۲ برس سے کام کر رہے تھے۔ اس تحقیق و مطالعہ سے معلوم ہوا کہ مہاراشٹرا اور کرناٹک میں کام کرنے والے پلانٹوں کا تناسب (۱۰ فیصد) ۱۵ فیصد کے قومی تناسب سے پھر بھی کم تھا۔ کام نہ کرنے والے پلانٹوں میں بڑا نقص یہ تھا کہ اُن میں زنگ لگ گیا تھا اور رساؤ ہو رہا تھا۔ پائپ لائین میں شگاف ہو گئے تھے۔

کرناٹک میں کام کرنے والے پلانٹوں میں ناکافی گیس کی تیاری کی شکایت ۲۱ فیصد کنبوں اور مہاراشٹر میں ۱۲ فیصد کنبوں کی طرف سے کی گئی —— دونوں ریاستوں میں پلانٹ مالکان کو پلانٹ کی دیکھ بھال کا علم نہیں تھا جس سے گیس کی پیداوار میں اضافہ ہوتا۔ اُن میں سے تو بیشتر کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ Slurry کی تیاری کے لیے گوبر اور پانی کا دُرست تناسب کیا ہے۔ اس پروگرام کے طویل المدتی فائدے کے لیے یہ ضروری ہے کہ لوگوں کو پلانٹ کی دیکھ بھال کے بارے میں سمجھایا جائے کہ وہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔

اس تحقیق و مطالعہ سے پتہ چلا کہ پلانٹ خریدنے سے پہلے یہ کتنے ایک یا دو کام کرنے والے پلانٹ دیکھنے گئے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کام کرنے والا پلانٹ از خود بائیو گیس کو فروغ دینے کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔

او آر جی کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلا کہ بائیو گیس کی ملکیت کے باعث کنبوں کو دیگر ایندھنوں

(باقی صفحہ [illegible] پر)

یوجنا، نئی دہلی

بقیہ لمحہ لمحہ کرب

نہیں دیتا۔ کانوں میں مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ ہوتی ہے۔ کبھی کوئی بات سُنائی دیتی ہے تو میں اُس کا مختصر سا جواب دے دیتا ہوں۔ میرا مختصر سا جواب سُن کر کبھی چڑھ سی جاتی ہے۔ مگر میں اُسے منا لیتا ہوں۔

عورت کی محبت، مرد کی محبت سے زیادہ گہری ہوتی ہے۔ وہ پیار میں شدت چاہتی ہے۔ سمندر کی طوفانی لہروں کی سی شدت، آبشاروں کی روانی کا سا زور۔ لیکن وقت نے میرے جذبات سے بہت کچھ نچوڑ لیا ہے۔ وہ میری اس مجبوری کو سمجھتے ہوئے اکثر مان جاتی ہے اور کبھی اس کے جذبات کی شدت نہیں میرے جذبات کا زور نہیں ہم دونوں مل کر اس فعل کا اعادہ کرتے ہیں .... پھر وہ میرے بالوں میں اپنے اُنگلیوں سے ہولے ہولے کنگھی کرنے لگتی ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ اُس کی اُنگلیوں میں وہ پہلا سا تناؤ نہیں۔ پہلا سا اثر نہیں اور میرے دل کی دھڑکنوں کا طرز بھی معمول پر آ گیا ہے۔

میں اپنے اندر ایک جمود سا محسوس کرتا ہوں ایک سنّاٹا — ٹھہراؤ — سوچتا ہوں، ہماری محبت، ہمارے پیار میں جو شدت ہے جو ایمائیت ہے، جو زور ہے، جو روانی ہے وہ صرف ایک ہی جذبے کے زیر اثر تو نہیں ؟!۔

وہ نجانے کیا سوچتے ہوئے میرے بالوں میں اپنی اُنگلیوں سے ہولے ہولے کنگھی کرتی رہتی ہے نیند سے میری پلکیں بوجھل ہونے لگتی ہیں۔ لیکن میں اپنے مُنّے کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں جسے نیند نے اپنی پُرسکون آغوش میں سمیٹ لیا ہے۔

میری بیوی بارہا مجھے کہتی ہے "راجا! ہمیشہ آپ کو یاد کرتے کرتے سو جاتا ہے۔ "ابو کب آئیں گے، مجھے کہانی کب سنائیں گے، کیا صرف ایک ہی روز آتے ہیں ابو؟"۔

اُس کا سوال کتنا درست ہے۔ اس کی حد تک بالکل سچا۔ ہفتہ میں وہ ایک بار مجھے دیکھتا ہے، میں اُسے کہانیاں سُناتا ہوں۔ اُس سے باتیں کرتا ہوں۔ خوب پیار کرتا ہوں اُس کا وہ دن چھٹی کا دن ہوتا ہے۔

چھٹی کے دن میں اُس سے وعدہ ضرور کرتا ہوں —" بیٹا —! میں کل تمھیں کہانی سناؤں گا بہت ساری باتیں کروں گا تم سے، بہت ساری باتیں — حالاں کہ میں خوب جانتا ہوں کہ وہ کل ابھی نہیں آنے والا، وہ کل آئے گا ضرور آئے گا۔

وہ کل ہے :-

میں اپنے اُس کل کو پُرسکون بنانے کے لیے۔ اُس کل میں خوشحال رہنے کے لیے دوڑتا رہا — اپنی اور اپنے بیوی بچّے کی جائز ضرورتوں فرمائشوں، خواہشوں کے لیے بھاگتا رہا۔

اس دوڑ دھوپ میں وقت گزرتا رہا .... گزرتا رہا، کبھی جیٹ کے پر لگا کر، کبھی کچھوے کی چال سے۔ بہرحال دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے۔ عمر کا خزانہ رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔

برسوں بعد میری زندگی کی دہلیز پر دبے پاؤں وہ "کل" آیا۔ میرے چہرے پر جھرّیوں کا جال پھیل گیا تھا۔ ہڈیوں کا گودا پگھل پگھل کر زندگی کی موریوں میں بہہ چکا تھا — میرا بدن نحیف و کمزور ہو گیا تھا۔ اور زمانے نے مجھے "دودھ کی مکھی" کی طرح نکال کر پھینک دیا تھا۔

آج میرے پاس بہت سارا وقت ہے۔ فضول سا وقت ... اپنے بیٹے سے باتیں ہی باتیں کرنے کے لیے۔ اپنی زندگی سے جو کچھ سیکھا ہے وہ اُسے بتانے کے لیے

لیکن اب میرے بیٹے کی زندگی گھڑی کے ایک سے بارہ تک اعداد میں منقسم ہو چکی ہے۔●

محمد عامر علوی٥

تحریکِ آزادی اور اُردو ادب

اُردو ہندوستان کی پیدا شدہ تمام زبانوں میں کم سن ترین زبان ہے لیکن نشو و نما کے تمام مدارج حسن و خوبی اسلوبی کے ساتھ اس نے طے کیے۔ وہ صرف اور صرف اسی کا خاصہ ہے جو زبان اس کا لمس پاگئی، شیریں ہو گئی، جن کانوں سے اس کا گزر ہو گیا، ذہن و دل کو معطر و شاداب کر گئی۔

حسبِ شعر میں کسی زبان نے ایسی سحر انگیزی اور اثر آفرینی بہت ہی کم پیدا کی ہے جیسی اُردو نے کی۔ یہی سبب ہے کہ ایسے بے شمار اُردو داں ہوئے ہیں اور آج بھی ہیں جنھیں اردو شعر کے متعدد اقتباسات ازبر ہیں جبکہ یہ کام کوئی زبان صرف شاعری کے وسیلے سے ہی انجام دے سکتی ہے اس لیے جس زبان کو شعر میں ہی یہ امتیاز حاصل ہو تو اس کی شاعری بقول شخصے "یکتائے روزگار" کیوں نہ ہو؟ اس کا ثبوت وہ اہلِ زباں ہیں جنھیں کلیاتِ اقبال حفظ ہے، میرؔ کے اشعار زبان سے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے ادا کرتے ہیں اور غالبؔ کی آفاقی شاعری کا کوئی شعر برمحل یوں پڑھتے ہیں گویا بالخصوص اسی موقع کے لیے ہی یہ شعر موزوں ہوا تھا یا۔ موقع خود اس لیے نازل ہوا ہے کہ کوئی اس پر غالبؔ کا شعر چسپاں کرکے اس کا "سر" "سرپُرغرور" سا دے۔ جب کوئی زبان اس قدر جذبات میں تلاطم پیدا کر سکتی ہے، جوش و ولولہ کا دریا بہا سکتی ہے تو وطن کے شیدائیوں اور مجاہدینِ آزادی کے سینے آتش فشاں کیسے نہیں بنا سکتی؟ کیسے کوئی چندر شیکھر آزاد یہ نہ کہہ اٹھے ۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

خواہ کوئی مولانا ابو الکلام آزاد ہو یا چندر شیکھر آزاد، سردار بھگت سنگھ ہو یا راجہ رام موہن رائے۔ ہر وطن پرست کی زبان کو اُردو کے ایک ہی فقرے "انقلاب زندہ باد" نے شیر کا سا غضبناک لہجہ عطا کیا تھا جسے سُن سُن کر فرنگیوں کے دل دہلتے تھے اور جس کی ادائیگی سے مُردہ جسموں میں روح، مایوس دلوں میں حوصلہ اور کمزور بازوؤں میں صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی۔ تمام مروجہ زبانوں میں وہ اُردو ہی تھی جس نے مغلوب و محکوم، لاچار و بے زار ہندوستانیوں کے آگے آئینہ رکھا اور ان کے اُلجھے ہوئے بالوں میں کنگھی کا کام کیا۔ انھیں متحرک و متحد کیا۔ انھیں اپنی جان سے زیادہ اپنی اس خاکِ وطن کو عزیز رکھنے کا درس دیا، جس میں وہ پلے بڑھے ہیں، انھیں "کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو" کا نعرہ دیا، انھیں "گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے" کی ہدایت دی، اور سائل دہلوی اعلان کیا

سُلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اس طرح کا پیغام ظفر علی خاں کی شاعری سے بھی ملتا ہے، وہ بھی قوم کو نئے تقاضوں سے روشناس کرتے ہیں اور سرمایہ داری نظام کے خلاف اعلان کرتے ہیں بلاشبہ اُردو نے آزادی کی راہ ہموار کرنے میں غیر معمولی اور ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا ہے۔ اسی بنا پر رشید احمد صدیقی نے کہا تھا۔ "اُردو کے آئینے میں ہندوستان نے پہلی بار جمہوریت کی تصویر دیکھی۔" شبنم سبحانی "ہندوستانی تہذیب اور اُردو" میں ایک مقام پر لکھتے ہیں۔ "ظلم کے خلاف عوام میں آواز اٹھانے کی جرأت اور ان کے اندر اپنی قدر و قیمت اور اہمیت کا احساس پیدا کرنے کا سہرا اُردو ہی کے سر ہے۔"

اُردو نے کس طرح جنگِ آزادی میں حصہ لیا اور کس طرح جنگِ آزادی سے اثر پذیر بھی ہوئی

---

٥ ۱۴۱۔ شبلی ہوسٹل، ایم ایم ہال، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اور اس پہ اثر انداز بھی ہے۔ جب ہم اس جانب غور کرتے ہیں تو ہمیں بہت دور نہیں جانا پڑتا کیونکہ جذبۂ وطن پروری کی کونپلیں اٹھارویں صدی کی آخری دہائیوں میں زمینِ اُردو پہ پھوٹیں اور پھر ان کے جسم و قامت کی درازی و توانائی میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ آغاز کا یہ دَور طوائف الملوکی اور معاشی بدحالی کا دَور تھا کیونکہ اب مغلوں کا جاہ و جلال زوال کی گہرائیوں کو ناپنے میں لگا ہوا تھا۔ دلّی کے شہنشاہ شہنشاہیت کا مذاق بن گئے۔ کیا افغانی، کیا انگریز اور کیا فرانسیسی، سب ہی بھوکوں کی طرح دلّی پر جھپٹ رہے تھے ؎

نہ جانے بیٹھے حال کس جہاں سے آئے تھے

اور پھر "دلّی جو اک شہر تھا عالم میں انتخاب ۔۔ اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا۔"

لیکن اس ہنگامۂ رستخیز میں ایسی آوازیں بھی اٹھیں جنھوں نے حُبّ الوطنی کا راگ گایا اور صورِ حُبّ قومی سے اہلِ وطن کو جگایا۔ ان میں سے وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے اپنے زہد و تقویٰ سے عوام الناس کے دلوں کو جیتا اور وہ بھی تھے جو قلم کے ذریعے جہاد بنے۔

شاہ عبدالقادر، سید احمد بریلوی، اسماعیل شہید اور شاہ ولی اللہ ایسے ہی کرداروں کی تجسیم تھے۔ انھوں نے مذہب کے سہارے وہ اصلاحی تحریک کی بنیاد رکھی جس نے "آزادیِ جرأت اور بے باکی پیدا کی۔" "انھوں نے اپنی ان خدمات کے لیے اُردو کا سہارا لیا اور اُردو نثر کو ان کی اس جد و جہد سے سیدھی و فنی اعتبار سے خاصی تقویت ملی۔" انھیں خدا کے نیک بندوں نے جدید اُردو نثر کا سنگِ بنیاد بھی رکھا اور اس کی اس حد تک تعمیر بھی کی کہ جہاں سے وہ بآسانی وسیع سے وسیع تر ہونے کے قابل ہو گئی۔ اگرچہ ان کی تحریریں "مذہبی" حیثیت رکھتی ہیں لیکن چونکہ وہ عوام کے فائدے کے لیے صاف اور سلیس زبان میں لکھی گئی تھیں اس لیے ان سے اُردو کو تقویت پہونچی۔

اس طرح جدید نثر کے لیے زمین ہموار ہو گئی، اور اس نثر کو فروغ دینے اور آراستہ پیراستہ کرنے کا باقی کام سرسید اور ان کے رفقاء نے بے حد خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔

بلاشبہ یہ شاہ ولی اللہ اور ان کے رفقاء اور اعزہ ہی تھے جنھوں نے مذہب کے سائے سائے تصورِ آزادی عطا کیا۔ بقول خواجہ احمد فاروقی ــ "آزادی کا یہ تخیل مذہب کے سرچشمے سے پھوٹا۔" "نتیجہ بغاوت سنہ ۱۸۵۷ء کی شکل میں ظاہر ہوا۔" "جس میں مسلمان علماء اور اہلِ اللہ نے بھی پوری سرفروشی کا مظاہرہ کیا۔"

اگرچہ اُردو نثر کی اشاعت اور مقبولیت میں فورٹ ولیم کالج نے بھی کلیدی رول ادا کیا لیکن اس کی نوعیت جداگانہ تھی۔ وہاں سلیس اور عام فہم زبان میں دیگر زبانوں سے ترجمے کئے جاتے تھے تاکہ لورارڈ انگریز بآسانی انھیں پڑھ کر سمجھ سکیں۔ اس طرح وہاں اُردو کی جدید نثر نے آنکھ تو کھولی لیکن انگڑائیاں لیتے ہوئے اُٹھ کر کھڑی نہ ہو سکی۔ وہ وہاں بھی داستانوں اور افسانوں کے نرم و گداز بستر پہ محوِ خواب رہی۔ یہ تو صرف علماء اور اہلِ اللہ تھے جنھوں نے اُردو نثر کو سلیس و عام فہم بھی بنانے کی کوشش کی اور اس سے تعمیری کام بھی لیا۔ بعد میں ایک اور درمیانی راہ نکالی گئی جو عالمی، مذہبی جذبات برانگیختہ کر کے قوم کو درسِ عمل دیتے، قوم کے ماضیٔ پُر شکوہ کو پھر آئینے میں اُتار کر اسکی بازیافت کی ترغیب دلانے، حالات سے سمجھوتہ کر کے آگے بڑھنے اور مناسب وقت کا انتظار کرنے جیسے مقامات سے گزرتی تھی اور یہ اعلان کرتی تھی کہ :-

عقیدوں کی مِٹ جائے گی سب رقابت
مذاہب کو ہوگی تعصب سے نفرت
محبت کی بڑھ جائے گی اور طاقت
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

اس طرح سے وہ کارواں جس کی قیادت سرسید نے کی ان کے ہمراہی حالی، شبلی، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی اور نذیر احمد وغیرہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان برگزیدہ شخصیتوں نے بیک وقت ملی رجحان، حُبّ الوطنی کے جذبے اور اُردو ادب کے فروغ میں جو کارنامہ انجام دیا، اس کی نظیر مستقبل قریب میں تو ممکن نظر نہیں آتی مستقبل بعید میں بھی اس کی توقع کم ہی ہے۔

سرسید قوم کے مسیحا ثابت ہوئے۔ انھوں نے قوم کے زخموں کو مندمل کرنے کی ہی سعی نہ کی بلکہ پھولوں کی طرح مسکرانے کی ادا بھی دی۔ اسی طرح اُردو کے ضمن میں "انھوں نے نہ صرف اُردو زبان کی حفاظت کی بلکہ اس کو غیر معمولی ترقی دی، اُردو ادب کے نشو و نما و ارتقاء میں بھی نمایاں حصہ لیا۔"

اُردو کو عوام سے قریب کرنے اور اس میں سلاستِ بیان پیدا کرنے کی جد و جہد سرسید نے ہی کی۔ اس راہ دشوار طلب میں ان کے رفقاء نے اعتقاد کامل اور اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ ان کی معاونت کی۔ سرسید ہی بانیٔ جدید اُردو نثر کہے جانے کے مستحق ہیں کیونکہ انھوں نے ہی اُردو کو اجتماعی مقاصد سے روشناس کیا اور اس کو سہل اور سلیس بنا کر عام اجتماعی زندگی کا ترجمان اور علمی مطالب کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کے زمانے تک نثر میں عموماً نفس مضمون اور معنی کو ثانوی اور طرزِ بیان کو اولیں اہمیت دی جاتی تھی مگر انھوں نے مضمون کو اوّلیت دی۔ اسی طرح تکلف اور تصنع جو پُرانی نثر کا

اشتیاق خاص تھا، ترک کر دیا اور نثری عبارت آرائی کے خلاف آواز بلند کی۔"

بغاوتِ ہند ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد قوم کے بے قصور انسانوں کو انگریزوں کے انتقامی غیظ و غضب سے بچانے کی خاطر "اسبابِ بغاوتِ ہند" سرسید نے ہی تصنیف کی جو ایک طرف جرأت مندانہ اقدام تھا تو دوسری طرف جذبۂ حب الوطنی کا مثالی ثبوت بھی۔ اس کتاب سے بالخصوص مسلمانوں کے سر سے انگریزوں کی قہر انگیز بلائیں فرو ہو گئیں۔ اس کے علاوہ" یہ کتاب اس دور کے تہذیبی، تاریخی، معاشی اور سیاسی حالات کا مرقع ہے۔"

انھوں نے "تہذیب پر مذہب کے اثر کو کم کر کے دنیوی ضروریات کی طرف زور دیا یعنی مذہب کے اعلیٰ اخلاقی معیاروں کی بجائے اس کے رسمی و رواجی تصورات نے ترقی اور آزادی کی ساری راہیں مسدود کر دی تھیں۔ انھوں نے مشکل کا حل یہ نکالا کہ عقل کو راہنما بنایا اور نیچر کی اطاعت پر زور دیا۔" انھیں نظریات کی اشاعت کے لیے انھوں نے مشہور زمانہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ بقول شبنم سبحانی ــ "انھوں نے جریدۂ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ تہذیب و ادب کی بڑی خدمات انجام دیں۔ انگلستان گئے وہاں سے آکر ملک کو وہاں کی تمدنی و تعلیمی سرگرمیوں سے روشناس کرایا۔ انگریزوں اور انگریزی تمدن کی خوبیوں سے ہندوستانیوں کو قریب تر کیا۔ اس سے انکی اچھائیوں کا عام چرچا ہوا اور خاص طور سے مسلمانوں کے دل میں ان سے جو خدا واسطے کا بیر تھا وہ ختم ہونے لگا۔"

سرسید کا عظیم ترین کارنامہ علی گڑھ تحریک کی بنیاد ہے۔ اس کا مقصد ہمہ گیری رکھتا ہے سیاست اور علم و ادب کے امتزاج کا گہرا شعور اس تحریک کے تحت آزمائش پا سکا۔ اس تحریک میں شمولیت حاصل کر کے تمام ہی خواص قوم نے اپنی اپنی بساط کے مطابق ملک و قوم کی نمایاں خدمات انجام دیے۔ یہ کبھی ایک فرد کی تحریک نہیں تھی بلکہ اجتماعی سعی و عمل کا نتیجہ تھی۔ اس میں تو ــ

لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اگرچہ علمی قیادت کی یہ بساط سرسید نے ہی بچھائی تھی اور فرضِ رہبری بھی انھوں نے ہی ادا کیا تھا لیکن حق یہ ہے کہ ان کے پیچھے چلنے والے اراکین کے بے لوث تعاون کے بغیر کامیابی کی منزل اسکے قدم نہیں چوم سکتی تھی۔ ایسے اراکین کی صفِ اول میں سرسید کی نامور رفقاء ہیں ــ نواب محسن الملک، نواب عماد الملک، نواب وقار الملک، مولوی نذیر احمد، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، مولانا شبلی، مولانا وحید الدین سلیم، مولانا حالی اور عبد الحلیم شرر۔

اول الذکر نوابین نے سیاسی طور سے سرگرم رہنے اور علم و ادب کو بہتر سے بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ علی گڑھ تحریک کو فروغ دینے، اسے ملک کے طول و عرض میں پھیلانے اور اس کے حصولِ مقصد کی خاطر بہر طور امداد کرنے کا بارِ گراں تا حیات انھوں نے اپنے شانوں پر اٹھائے رکھا۔

مذکورہ بالا شخصیتوں نے سرسید کے نظریات اور علی گڑھ تحریک کے اغراض و مقاصد کی گستردہ اشاعت کی اور اصلاحی ادب کی تخلیق کی۔

مولانا شبلی باغیانہ تیور رکھتے تھے۔ ان کے اپنے نظریات تھے۔ جب تک سرسید اور ان کے نظریات میں مطابقت رہی، وہ علی گڑھ تحریک سے وابستہ رہے لیکن پھر نظریاتی اختلاف کی بنا پر قطع تعلق کر گئے اور دار المصنفین کی تحریک کے روحِ رواں بن گئے، "چونکہ علی گڑھ کے اثرات کی رہینِ منت تھی۔

مولانا وحید الدین سلیم فوراً علی گڑھ تحریک میں شامل نہیں ہوئے تھے بلکہ بعد میں اس کے رکن بنے۔ مولانا حالی کے منہ میں تو بقول شخصے سرسید کی زبان تھی لیکن سرسید کی زبان نثر تک محدود تھی۔ حالی نے سرسید کی یہ خواہش تکمیل کو پہنچائی کہ ان کے نظریات خواہ سیاسی مسلک کے ہوں یا علمی و ادبی عوام تک بذریعہ شاعری پہنچائے جائیں۔ چنانچہ دیگر کارناموں کے علاوہ حالی کا معرکہ آرا کارنامہ مسدس "مدو جزر اسلام" معرضِ وجود میں آیا جو سرسید کی ایما سے ۱۸۷۹ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں حالی نے رخِ قوم کو شاندار ماضی کے چھینٹے دے دے کر یاس و پست ہمتی کے خواب سے بیدار کرنے کی کامیاب سعی کی۔ اس مسدس کی بہترین تعریف یہ ہے کہ سرسید اسے اپنی مغفرت کا سامان سمجھتے تھے۔

علی گڑھ تحریک کے اراکین کی صفِ دوم میں سر ضیاء الدین، نواب صدر یار جنگ، مولانا ظفر علی خاں، سجاد حیدر، مولوی عبد الحق، آفتاب احمد خاں اور مولانا حسرت موہانی قابلِ ذکر ہیں، صفِ سوم میں رشید احمد صدیقی، عبد الماجد دریا بادی، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور خواجہ غلام السیدین اہم ترین سرگرم کارکن تھے۔ ان سبھی نے علی گڑھ تحریک کی بساط بھر آبیاری کی اور اسے توانائی بخشی۔

مجموعی اعتبار سے قوم میں جذبۂ حب الوطنی بیدار کرنے، اپنی زبوں حالی کے اسباب تلاش کرنے، سمجھنے اور ان کے ازالے کی تدبیر کرنے، احساسِ کمتری دور کرنے اور پُرشکوہ ماضی کی بازیافت کے لیے مصروفِ عمل ہونے کا اسی علی گڑھ تحریک نے درس دیا۔

اس تحریک کے سوا کتنے ہی شعراء ایسی شاعری کی تخلیق میں مشغول تھے جو وطن پروری اور قوم دوستی کے جذبات سے مملو تھی۔ ان میں ایک نام اسماعیل میرٹھی کا ہے۔ انھوں نے "قوم کے نونہالوں کی ذہنی

تربیت کے لیے بڑی دلکش نظمیں لکھیں۔ ان کے دلوں میں وطن کی عظمت کا بیج بونے کے لیے یہ بڑی کارآمد ثابت ہوئیں، وطن کی محبت، قوم کی محبت، ملک کی ہر چیز سے محبت اور کردار کا ایک اعلیٰ تصور ان کے یہاں کارفرما ہے۔" وہ ایسی "خشک روٹی" کو "خوف و ذلت کے حلوے" سے بہتر سمجھتے تھے جو آزاد رہ کر نصیب ہو۔ انھیں ہر محب وطن کی طرح اس کا ملال تھا کہ ہمارے ملک میں اگر باہمی اختلافات و تعصبات نہ ہوتے تو آج ایک اجنبی قوم کے ہم مفتوح بھی نہ ہوتے۔ لیکن وہ اس ملال کو درگزر کر کے ملک میں پھر اتحاد و اتفاق دیکھنے کی تمنا رکھتے تھے کیونکہ ع

لگے ہاتھ سب کا تو اٹھ جائے چھپّر

اور انھیں یقین بھی تھا کہ ؎

تنے گا مسرت کا اب شامیانہ
بجے گا محبت کا نقار خانہ
حمایت کا گائیں گے مل کر ترانہ
کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

سرور جہاں آبادی کی شاعری میں بھی حب الوطنی اور آزادی کے لیے تحریک دینے والے عناصر کارفرما ہیں۔ وہ "پرانی تہذیبی قدروں اور جدید ابھرتی ہوئی قدروں کے شناسا ہیں۔" انھوں نے "خاک وطن"، "حب وطن"، "عروس وطن" اور "حسرت وطن" کے علاوہ ایک بہت دلکش نظم "گلزار وطن" موزوں کی۔ وہ اس ملک میں اتحاد کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ وہ "ایک ایک گل میں" "روح تنظیم وحدت" پھونکنا چاہتے تھے اور "اِک اِک کلی کو دل کے دامن سے" ہوا تیں دینا چاہتے تھے تاکہ ؎

مل مل کر ہم ترانے حب وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں

پھر ایک شاعر طنز و مزاح کے انداز میں قوم کو جگانے کے لیے آواز دی تاکہ جامد و ساکت انسانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا جاسکے، یہ آواز تھی اکبر الہ آبادی کی۔

بادۂ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم پہ خم
ایشیا کے شیشۂ تقویٰ کو کردو پاش پاش

یہ وہ زمانہ تھا جب دو گروہ تھے اور دونوں انتہا پسند۔ ایک انگریزوں اور انگریزیت کا اندھا مقلد تو دوسرا اس کا عین برعکس۔ اکبر نے ان دونوں میں مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی اور انھیں اعتدال کی روش اختیار کرنے کی تلقین اپنے منفرد انداز بیان میں کی۔ انھوں نے انگریزوں کی اعلیٰ تہذیبی اقدار کو اپنانے اور اپنی فرسودہ و بے جا رسومات و روایات کو ترک کرنے پر اپنی رضا کا اظہار تو کیا لیکن ایک حد تک یعنی عقل و شعور کے ساتھ۔ مثلاً انگریزوں کے مقلد لڑکیوں کی تعلیم کے حامی تھے جبکہ دوسرا گروہ سخت مخالف۔ اکبر دونوں کے خلاف تھے۔ انھوں نے دونوں کو سمجھایا ؎

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہو وہ سبھا کی پری نہ ہو

آزادی کی خواہش اکبر کے بعض اشعار سے بہت شدت کے ساتھ نمایاں ہوئی ہے۔ وہ بھی سرور جہاں آبادی کی طرح غلامی کے حلوے سے بہتر آزادی کی خشک روٹی سمجھتے تھے لیکن ان کا طرز بیان اور تھا ؎

دُھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دیہاتی
لسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

مولوی محمد حسین آزاد نے اردو ادب کی جو خدمات انجام دیں وہ اس کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کے پاؤں زمین پر جمانے کی کوشش کی، اسے فضائے تخیل سے زندگی کی حقیقتوں کے ماحول میں لانے کی سعی کی۔ انھوں نے ادب برائے زندگی کے عناصر سے اردو ادب کو بالعموم اور اردو شاعری کو بالخصوص تہی داماں پایا جبکہ ان نامساعد حالات میں ان کی اشد ضرورت تھی۔

چنانچہ اپنے مقصد کی حصولیابی کے لیے انجمن کی بنیاد ڈالی جو "انجمن پنجاب" کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہاں "مشاعرہ" کی جگہ "مناظمہ" کی تجدید عمل میں آئی، کیونکہ شعراء اپنا کلام صرف نظم کی شکل میں پڑھ سکتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظم بالمقابل غزل وسیع موضوعات آسانی ادا کر سکتی ہے اور جو مقاصد مولوی آزاد کے پیش نظر تھے، ان کی پیش کش کے لیے یہ زیادہ موزوں تھی۔ چنانچہ ان مناظموں میں جو نظمیں پڑھی گئیں وہ ملک و قوم سے متعلق تھیں۔ خود آزاد نے بھی کچھ نظمیں کہیں۔ "حب وطن" نظم میں ان کی حب الوطنی کی جھلک ملتی ہے مثلاً ؎

حب وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں
حیراں ہوں آج کل ہے پڑا اس کا کال کیوں

اور پھر کہتے ہیں ؎

لبریز جوش حب وطن سب کے جام ہوں
سرشار ذوق و شوق دل خاص و عام ہوں

غدر کے بعد جو نمایاں ترین انتہائی ولولہ انگیز عملو معانی اور جذبۂ حب الوطنی سے سرچشمے اٹھتی آواز گونجی وہ اقبال کی تھی۔ "وہ اقبال بذات خود ایک بحر علوم تھے۔" ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا دنیا کے تہذیبی عروج و زوال پر ان کی نظر تھی۔ تمدنی ارتقاء کا حقیقی مفہوم ان پر منکشف تھا ساتھ ہی ساتھ وہ مغربیت شناس اور مشرقی مزاج شناس تھے۔ انھوں نے ملک و قوم کو ایک ایسا نظریۂ حیات دینے کی کوشش کی جو ان کی بے جان سی رگوں میں "خون کو گرما دے" اور اس نظریۂ حیات کی کاوش یہ "اقبال نے دنیا کے تمام نظریۂ حیات کو چھان ڈالا جس سے کلچر و تمدن کا خمیر بنتا ہے۔ وہ ان تمام مسائل کی تہہ میں اتر پڑے جو تہذیب کو جلا بخشتے ہیں۔" یہ نظریۂ حیات انسانیت پر مبنی

تھا۔ وہ قوم، فرقے، ملک، روایات، رنگ و نسل اور ذات پات کے قائل نہیں تھے۔" ان کے یہاں وطن پرستی کے بجائے وطن دوستی اور قوم پرستی کے بجائے قوم دوستی کا ایک انسانی جذبہ ہے" ان کا ذہن ہر انسان کے لیے ہے، ہر قوم اور ہر ملک کے لیے ہے۔ ان کی نظر میں نوعِ انسان کو "مومن نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے"۔ اس لیے وہ انسان کو "اخوت کا بیاں" اور "محبت کی زباں" کا حامل ہونے کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان کی ابتدائی شاعری پر قومیت و وطنیت کے جذبات کی گہری چھاپ رکھتے ہیں۔ انھیں سرحدِ وطن کی طرح وطن کے عوام ہونے کا تو شدید احساس تھا ہی لیکن اس سے کہیں زیادہ غم یہ تھا کہ اہلِ وطن غلامی کی زنجیر توڑنے کی عملی تدبیر کرنے کے بجائے لاچار و مایوس ہو کر حالاتِ زمانہ سے مصالحت کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے اس غم کا اظہار یوں بھی ہوا ہے؎

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

در غلامی پہ رضامند بندوں کو تحریک دیتے اور حالات سے مقابلہ کرنے کی جرأت پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ انہیں "شوکتِ جم و کے" بے معرکہ ہاتھ نہیں آتا اور کبھی "بے معرکہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں"

اقبال کے عہد میں وطن پروری کے جذبات سے مملو شاعری عام تھی لیکن محدود سطح پر نمایاں تر یہ شاعری عالمانہ حیثیت کی تھی۔ حکمت سے وطن پرستی یا حبِ وطنی کا کوئی مستقل نظریہ تو پیش نہیں کیا، اور نہ ہی آزادی کا تصور ان کے یہاں "سوراج" سے زیادہ معنی رکھتا ہے لیکن جذبۂ حب الوطنی اہلِ وطن کے دلوں میں پیدا کرنے کے لیے انھوں نے بہت پرجوش اور موثر اشعار موزوں کئے۔ ان کی نظر میں غلامی حب الوطنی کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ وہ ہند کے شاندار ماضی سے باخبر تھا اور ماضی کے ہندوستان کو ایک انجمن سے تعبیر کرتے ہیں مگر افسوس یہ کرتے ہیں کہ "انجمن وہی ہے" لیکن شمعِ انجمن گل ہو چکی ہے، یعنی "حبِ وطن نہیں ہے۔ خاکِ وطن وہی ہے"۔

حسرت موہانی سیاسی طور سے بہت سرگرمِ عمل رہے اور ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں مصروف رہے۔ اسی سبب جیل کا انھیں بھی منہ دیکھنا پڑا۔ "نجاتِ ہند" نظم میں انھوں نے اپنے ہم وطنوں کو غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے طریقۂ کار بھی سمجھائے ہیں؎

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھکو آرزو
ہمتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر

حفیظ جالندھری نے "شاہنامۂ اسلام" کی تخلیق کی جو تاریخِ اسلام پر مبنی ہے۔ اس سے ان کا مقصد اسلام کے ماضی روشن سے اہلِ اسلام کو آگاہ کرنا اور اس کی بازیابی کے لیے کوشاں ہونے کی ترغیب دینا تھا۔ حفیظ نے قوم و وطن کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر کئی نظمیں اور گیت بھی لکھے۔ ان کی ایک نظم "سیرِ کشمیر" کافی طویل ہے جس میں انھوں نے کشمیری عوام کی قابلِ رحم حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ ان کی ایک اور نظم بعنوان "آزادی" ہے جس میں انھوں نے علامتی انداز اختیار کیا ہے۔ فاتح کو شیر اور مفتوح کو بھیڑوں سے تعبیر کیا ہے۔ وہ ان بھیڑوں کو شیر سے برانگیختہ کراتے ہیں کیونکہ بصورتِ دیگر آزادی کی حصولیابی ممکن نہیں ہے؎

بھیڑیں جب تک شیر بن لیں نام نہ لیں آزادی کا

انھوں نے انگریزوں کی بد دیانتی، بدنیتی اور انسان دشمنی کا بھی بھرپور بیان کیا ہے مثلاً؎

سرمائے کا ذکر کرو مزدور کی ان کو فکر نہیں
مختاری پر مرتے ہیں مجبور کی انکو فکر نہیں

۱۹۳۰ء کے بعد ہندوستانی سیاست اپنے عروج پر تھی۔ گوناگوں سیاسی نظریات و تصورات ابھر کر سامنے آ رہے تھے۔ اردو ادب نے ان کی بھی اشاعت و تبلیغ میں بحسن و خوبی اپنا کردار ادا کیا اتحاد و اتفاق کا نعرہ گلی گلی، کوچہ کوچہ پہنچانے میں اردو شاعری نے اپنا نمایاں تعاون دیا۔ انڈین نیشنل کانگریس اس وقت سب سے بڑی پارٹی تھی اور وہی پورے ملک کو متحد کرنے میں سب سے زیادہ پیش پیش تھی۔ گاندھی جی سماجی اصلاح میں مصروف تھے۔ مذہبوں کے درمیان تفریق مٹانے اور وطنیت کا جذبہ پیدا کرنے میں گاندھی جی نے اہم تاریخی رول ادا کیا۔ اردو ادب نے گاندھی جی کے انھیں اصلاحی اور ترقی پسند نظریات و خیالات کی ترجمانی اور نشر و اشاعت میں کسی دوسرے ادب سے کہیں زیادہ حصہ لیا۔ اسی بنا پر تبسم سجانی بھی کہتے ہیں — "اردو میں جتنا صالح، غیر فرقہ دارانہ، اور ترقی پسند ادب موجود ہے اتنا ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں۔ سامراج کی مخالفت، جمہوریت نوازی اور جذبۂ اتحاد سے اس کا ادب بھرا پڑا ہے"۔

انھیں نظریات کے پہلو بہ پہلو روسی اشتراکیت زور پکڑتی گئی جس کی ایک شاخ ادب میں اشتراکی ادب کے نام سے موسوم ہوئی۔ پھر ترقی پسند مصنفوں پر مشتمل ۱۹۳۵ء میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" وجود پذیر ہوئی۔ ان ترقی پسند ادباء و شعراء میں سب سے پہلی زوردار انقلابی آواز جوش ملیح آبادی کی تھی۔

وہ ملک کے اس ماضی کو آواز دیتے ہیں جو "شاہانہ وقار" رکھتا تھا لیکن اب "خوابیدہ" تہہِ خاک ہے۔ وطن کے اس شاہانہ وقار کی بازیافت کے لیے وہ "بستگانِ زلفِ گیتی" سے کمر کس کر آزادی کی راہ میں نکل جانے کے خواستگار ہیں اور جیسا وہ کہتے ہیں کہ آسمان سے بھی یہی ندا آ رہی ہے۔ کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

ترقی پسند شعراء میں ایک نام فیض کا ہے جو بیسویں صدی کے ممتاز شعراء میں سے تھے۔ تحریکِ آزادی کے زمانے کی ان کی شاعری جوشِ حب وطن سے لبریز ہے۔ انھیں غلامی کا شدید احساس اور آزادی کی شدید خواہش بیک وقت مایوس بھی کرتے ہیں اور اُمید بھی بندھاتے ہیں۔ انھوں نے وطن کی حالتِ زار کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا۔ ان کو بہر حال یہ "تسلی" بھی تھی کہ ایک دور جو کہ بہت نزدیک آچکا ہے ہماری آزادی کا پیامبر ہوگا۔ اس لیے وہ اپنے وطن سے "چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز" انتظار کرنے کو کہتے ہیں۔ آزادی کے تئیں خود ان کی بے تابی کا یہ عالم ہے کہ جب تحریکِ آزادی زور پکڑتی ہے، وہ اسے ایک آہٹ سے تعبیر کرتے ہیں اور چونک چونک کر دیکھتے اور اُمید کرتے ہیں کہ شاید اب آزادی اس جانب آرہی ہے لیکن دفعتاً وہ مایوس ہو جاتے ہیں کہ "راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا"۔ جب بار بار یہی صورتِ حال پیش آتی ہے تو مایوسی ان پر غالب ہو جاتی ہے اور وہ جھنجھلاہٹ میں کہہ اُٹھتے ہیں ـــ

اپنے خوابیدہ کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

لیکن ان کی تمنا بر آئی۔ ملک کو آزادی نصیب ہوئی مگر آزاد ملک بجائے مسرت کے اور بھی غم و اندوہ کی تصویر بن گیا۔ فیض کو اس کا بڑا صدمہ پہونچا کہ ملک میں انتشار سا ہے، جمہوریت برائے نام ہے اور اہلِ وطن شدید قسم کے باہمی اختلافات میں اُلجھے ہوئے ہیں اور پھر وہ آزادی کا منتظر جو ملک و قوم کو تسلی کے ساتھ آزادی کی راہ دیکھنے کا درس دیتا تھا، رو پڑا ـــ "کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں"۔ دوسرے اہم شعراء میں احسان دانش نے بھی "فقدانِ معاش"، "امیر ملک کے فقیر باشندے"، "اُمید آزادی" اور "غلامی کی خصوصیات" وغیرہ نظمیں ملک کے حالات سے متاثر ہو کر لکھیں جو بہت مقبول بھی ہوئیں۔ جمیل مظہری کی شاعری میں بھی وطنیت کے جذبات کا نمایاں طور پر اظہار ہوا ہے۔ ان کا گیت "نالۂ جرس" وطن کے نوجوانوں سے خطاب ہے

برادرانِ نوجواں! غرورِ کارواں ہو تم
جہانِ پیر کے لیے شبابِ جاوداں ہو تم
بہ لغزشِ ریائے رفتگاں
بڑھے چلو، بڑھے چلو

اسی طرح رضی عظیم آبادی نے بھی نوجوانوں کے نام ایک نظم بعنوان "نوجوانوں کی دنیا" لکھی۔ وہ نوجوانوں سے کہتے ہیں ـــ

مجھے لے نوجواں ایسا جہاں تیار کرنا ہے
اسی کوشش میں جینا ہے اسی کوشش میں مرنا ہے

مخدوم بھی وہ ترقی پسند شاعر ہیں کہ جن کے لہجے سے ہی وطنیت کے جذبات کا جوش ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں یہ جذبات رگ کی طرح رواں دواں ہیں۔ "دعوتِ جنگ" ان کی ایک طویل نظم ہے جو ایسے جذبات سے مملو ہے۔ ان کے لب و لہجے اور جوشِ جذبات کا یہ بہترین نمونہ ہے ـــ

جھومتا چل اور جوتا زرد کے سینے چیر ڈال
اک قدم بڑھ اور غداروں کے سینے چیر ڈال
ظلمتِ شب میں سیہ کاروں کے سینے چیر ڈال
اے سپاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ

مخدوم محی الدین نے وطن، دوستی اور انسان دوستی کے رنگوں کے حسین امتزاج سے اپنی نظموں کی آرائش و زیبائش کی۔ "سپاہی"، "سنپتی"، "موت کا گیت" اور "آزادیٔ وطن" ان کی ایسی ہی مشہور نظمیں ہیں۔ وہ وطن ہی نہیں بلکہ تمام انسانیت کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر نظمیں کہہ رہے تھے۔ وہ مستقبل سے بہت پُراُمید تھے ـــ "اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا"

آزادی کے ترانے گانے والی آوازیں، وطن پروری کے گہر لٹانے والے قلم اور درسِ عمل دینے والی زبانیں اُردو ادب کے ذریعے تک آزادی کا محاذ تیار کرنے اور قوم و وطن کو غلامی سے نجات دلانے میں بالآخر کامیاب ہوئیں ●

بقیہ اداریہ

صحت سے متعلق معلومات، زچہ بچہ کی نگہداشت خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ شہر کی گندی بستیوں قبائلی آبادی والے علاقوں اور پچھڑے ہوئے دیہی علاقوں میں ان خدمات کی توسیع پر خاص زور ہے۔ اس منصوبے میں ۳ سال سے کم عمر کے سبھی بچوں کے لیے ٹیکے کے پروگرام شامل کیے گئے ہیں تاکہ کمسن بچوں کی اموات میں کمی آسکے، اس سے بحیثیت مجموعی قوم کی صحت کا معیار بڑھے گا۔ لیکن یہ پروگرام اُسی وقت اپنا خاطر خواہ اثر دکھا سکیں گے جب عوام کو ان کے بارے میں معلومات ہوں، ریڈیو ٹی وی اور دیگر ذرائع ابلاغ اس پیغام کو گھر گھر پہونچا سکتے ہیں۔ نچلی سطح کے لوگوں کے ترقیاتی مسائل کی جانب اس سلسلے کی ایک مفید صورت ہے۔ دیہی علاقوں میں اصلاحات، زمین کے پروگرام پر عمل درآمد کا بالکل ہو کم سے کم اجرتوں کی ادائیگی کا معاملہ ہو، غرضیکہ یہ وہ باتیں ہیں جن سے سماج کے کمزور طبقات کا بھلا ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں چونکہ ناخواندگی بڑے پیمانے پر ہے، لہذا ریڈیو اور ٹی وی کی ترسیلی عمل میں بڑی اہمیت ہے۔ ساتویں منصوبے میں اطلاعات و نشریات کے لیے اخراجات کو بہت بڑھا دیا گیا ہے۔ اس منصوبے میں ان مدات پر ۱۵۶ کروڑ روپے کے اخراجات ہوں گے جبکہ چھٹے منصوبے میں صرف ۲۷۲ کروڑ روپے ہی تھے۔ لہذا ملک میں ترقیاتی عمل سے عوام کی کایا پلٹ کے امکانات بہت زیادہ روشن ہو گئے ہیں۔

(ایڈیٹر)

محمد طارق ٥

لمحہ لمحہ کرب

دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کے ایک سے بارہ تک اعداد میں میری زندگی منقسم ہو چکی ہے۔ گھڑی کی سوئیاں میری زندگی کو حسبِ معمول بانٹتی رہتی ہیں۔

علی الصبح چھ بجے ٹن ٹن کی آواز میرے کانوں میں پہنچتے ہی میری آنکھوں کے پٹ کھل جاتے ہیں۔ اور کبھی میری آنکھ نہیں کھلتی تو میری بیوی مجھے جگا دیتی ہے۔ لیکن ایسا موقعہ شاذ ہی آیا ہو اور یہ موقعہ بھی کبھی کبھی ہی آتا ہے کہ مجھے اپنی بیوی کو جگانا پڑا ہو — وہ بھی میری طرح صبح چھ بجے اٹھنے کی عادی ہو گئی ہے۔ ہاں، جب وہ نئی نویلی تھی تب کچھ دنوں تک مجھے جگانا پڑا تھا۔ رفتہ رفتہ ماحول نے اُسے صبح چھ بجے اُٹھنے کا عادی بنا دیا ہے۔

کڑاکے کی سردی ہو یا موسم گرما میں میٹھی میٹھی تھپکیاں دے کر سلانے والی علی الصبح کی ہوائیں، یا برسات کی خوشگوار صبحیں، کبھی اُس نے جاگنے پر ناراضگی کا اظہار نہیں کیا اور کرے بھی کیوں! وہ تعلیم یافتہ ہے، پڑھی لکھی سمجھدار ہے، وہ جانتی ہے کہ میرے دیر سے جاگنے پر کیا کچھ ہو سکتا ہے۔

دفتر دیر سے پہنچوں گا۔ ڈیوٹی پر لیٹ پہنچنے کے جرم میں میری ملازمت پر آنچ آ سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دن کی تنخواہ کٹ جائے اور ایک دن کی تنخواہ کم ملنے پر کفایت شعاری سے بنائے ہوئے ماہانہ بجٹ میں یقیناً گڑبڑ ہو جائے گی۔

ہمیشہ کا یہ معمول رہا تو ملازمت بھی جا سکتی ہے اور وہ یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ ملازمت ہے تو تنخواہ ہے۔ تنخواہ ہے تو گھر ہے (جس کا ماہوار کرایہ ڈیڑھ سو روپے ہے)۔ گھر کے چولھے میں آگ ہے، بدن پر صاف ستھرا، اوسط درجے کا لباس ہے، کچھ ضرورتوں کی تکمیل ہے اور سینے کے کہتانوں میں کچھ سر اُٹھاتی ہوئی آرزوؤں کو سلانے کے لیے میٹھی میٹھی تھپکیاں — "سو جاؤ! ابھی تنخواہ کم ہے اور مہنگائی زیادہ، ابھی سو جاؤ آنے والے ماہ تک میری پیاری کومل آرزو!!"

پہلے پہل جب میری بیوی نے اپنی آرزوؤں کی فہرست میرے سامنے پیش کی تھی تب میں نے اُسے ایسا ہی سمجھایا تھا جس طرح میں برسوں سے اپنے دل کو سمجھاتا آ رہا ہوں اور میری بیوی سمجھ گئی، کیوں کہ وہ بھی ایک معمولی کلرک کی ہی بیٹی ہے۔

صبح اُٹھتے ہی وہ میرے لیے چائے بناتی ہے اور میں "شیو" کرنے بیٹھ جاتا ہوں۔

— میں "شیو" روز کرتا ہوں اس لیے کہ "شیو" نہ کرنے سے مجھے اپنا چہرہ اچھا نہیں لگتا، صاف ستھرا، اُجلا اُجلا۔

میں خود، خود کو دکھانے کے لیے شیو کرتا ہوں — نہیں یہ فریب ہے جو میں خود کو دے رہا ہوں، کہیں یہ بھی سچ ہے کہ آدمی خود اپنے لیے بنے سنورے۔

اچھا لباس پہننا، شیو کرنا، بال سلیقے سے سنوارنا، اپٹوڈیٹ رہنا، عورتوں کا بناؤ سنگھار کرنا یہ سب خود کے لیے نہیں ہوتا۔ یہ انسانی فطرت ہے، اُس کا جذبۂ خودنمائی۔ اس طرح وہ اپنے اس جذبہ کی تسکین کر لیتا ہے۔ پھر میں خود کس لیے روز شیو کرتا ہوں۔

مجھے ایک سچ چھپانے کے لیے کتنی پیچ در پیچ باتیں کرنی پڑ رہی ہیں۔

درحقیقت بات یہ ہے کہ میرے دفتر میں

---

٥ کھولاپور، ضلع امراوتی ۴۴۴۸۰۲ (مہاراشٹر)

ایک لیڈی کلرک ہے۔

"انیتا"۔

میں انیتا کو جنت کی حور نہیں کہوں گا کیونکہ وہ حور نہیں ہے۔ میں اُسے پری پیکر بھی نہیں کہوں گا کیوں کہ میں نے پری نہیں دیکھی نہ ہی وہ میرے خوابوں کی ملکہ ہے کیوں کہ وہ کبھی میرے خوابوں میں نہیں آئی۔ میرے خوابوں میں تو کبھی میری بیوی بھی نہیں آئی۔ کیوں کہ خوابوں میں وہی چیز آتی ہے جس کا حاصل کرنا حقیقت میں زیادہ محال ہوتا ہے۔ میرے لیے سب سے مشکل ہے پیسہ کمانا۔ اس لیے میرے خوابوں میں صرف نوٹ آتے ہیں۔ پیسہ آیا ہے جو خوشحال زندگی گزارنے کے لیے بیحد لازمی اور ضروری ہے۔

انیتا ایک عام شکل و صورت کی گوری چمڑی والی لڑکی ہے۔ میرے ٹیبل کے سامنے ہی اس کا ٹیبل ہے۔ ایک بار میں پندرہ منٹ لیٹ جا گا تھا اس لیے میں نے "شیو" نہیں کیا تھا۔ بال بھی سلیقے سے نہیں سنوارے تھے اور آفس چلا آیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر حسب معمول مسکرائی تھی اور پھر میرے قریب آکر کہنے لگی تھی: "کیوں، آج آئینہ نہیں دیکھا!"

"نہیں — آج آئینے نے مجھے دیکھ لیا ہے"۔

وہ میری بات سمجھی تھی یا نہیں، میں نہیں جانتا۔ ہاں اس کے لبوں سے صرف یہ جملہ پھسلا تھا، "واہ! خوب کہتے ہیں آپ بھی!"

تب سے میں بلاناغہ "شیو" بنا کر آفس جانے لگا ہوں۔ لیکن میں یہ یقین سے کہتا ہوں کہ انیتا سے میرا کوئی سمبندھ نہیں، کوئی ایسا رشتہ نہیں جس سے میرا کردار داغدار ہو۔

شیو کرنے کے بعد میری بیوی مجھے چائے پیش کرتی ہے۔ چائے پی کر میں غسل کرتا ہوں۔ . . تب تک وہ ناشتہ تیار کر لیتی ہے۔ اور ساتھ کے لیے ٹفن بھی۔

میں غسل کر کے آتا ہوں اور جلدی جلدی ناشتہ کرتا ہوں، دفتر جانے کے لیے جو کپڑے استری کیے ہوئے ہوتے ہیں جسے میری بیوی کھونٹی سے نکال کر مجھے دیتی ہے پہنتا ہوں تب تک پورے سات بج جاتے ہیں میرے پاس پھر اتنا وقت نہیں رہتا کہ اپنے سوئے ہوئے منے کو جگاؤں اور اس سے کہوں، اچھا بیٹا! اب ہم آفس جا رہے ہیں۔ نو بسل بجے رات تک آئیں گے، تم جاگتے رہنا!! اس لیے میں اس کا ایک خموش بوسہ لیتا ہوں اور آفس کے لیے بیگ لے کر نکل پڑتا ہوں۔

فٹ پاتھ پر دوڑتے، بھاگتے، ہانپتے بے قرار، مشینوں کی طرح مصروف انسانوں کے بے پناہ ہجوم میں مل جاتا ہوں۔ تیز تیز چلتا ہوں۔ سر جھکائے اپنی ہی فکر میں ملوّث۔

کون پاس سے گزر رہا ہے، کون کس کو دھکا دے رہا ہے۔ کون کس کو مار رہا ہے، کون گالیاں بک رہا ہے کس کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا گیا۔ کون مدد کے لیے پکار رہا ہے، کون کار سے کچل گیا۔ کس نے بس کے جھٹکوں میں دم توڑ دیا۔ ٹرین سے کس کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، کوئی خبر نہیں۔ کوئی فکر نہیں، کوئی ہمدردی نہیں۔ دیکھنے تک کے لیے کوئی تیار نہیں، کسی کے پاس اتنا فضول وقت نہیں۔ سب اپنی ہی فکر میں سرگرداں چلے جا رہے ہیں۔ سر جھکائے، سر اٹھائے۔ . . . بھاگتے ہوئے — ہانپتے ہوئے . .

دفتر دس بجے پہونچنا ہے۔ پلیٹ فارم دور ہے اور ٹرین کے آنے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ .

میں ہمیشہ تقریباً بھاگتے ہوئے پلیٹ فارم پر پہونچتا ہوں۔ گھڑی دیکھتا ہوں — کبھی ساڑھے سات بجتے ہیں۔ کبھی سات چالیس۔

ٹرین کے آنے کا وقت آٹھ بجے ہے لیکن اکثر ٹرین آٹھ بجے نہیں آتی۔ آدھا پون گھنٹہ لیٹ آتی ہے۔ •

ٹرین کبھی بھی آئے مگر ہمیں تو وقت سے پہلے ہی ٹرین کا انتظار کرنا ضروری ہے نا، کیونکہ ہم ٹرین کے غلام ہو چکے ہیں۔ ٹرین ابھی تک ہماری غلام نہیں بنی۔

حسب معمول دھڑ دھڑاتی ہوئی بجلی کی دیو قامت ٹرین پٹڑیوں پر پھیل جاتی ہے۔ مسافروں کا اژدہام بے تحاشا ٹرین کی طرف بڑھتا ہے۔ میں بھی افتاں و خیزاں ٹرین میں ایک منٹ کے اندر اندر سوار ہو جاتا ہوں۔ کیونکہ ٹرین ایک منٹ کے لیے ہی رکتی ہے۔

ٹھیک ساڑھے دس بجے دفتر شروع ہوتا ہے اور میں قبل از وقت دفتر پہونچ جاتا ہوں آٹھ گھنٹے فائلوں میں سر کھپانے کے بعد واپس اپنے گھر روانہ ہو جاتا ہوں۔ دوڑتے، بھاگتے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر —

گھر پہونچنے میں میری حالت اس مریل بیل کی طرح ہو جاتی ہے جسے قصائی مذبح خانے میں ڈھکیل ڈھکیل کر لے جاتا ہے۔

میرا منا ہمیشہ سو چکا ہوتا ہے۔ بیوی بغیر کھائے پیئے میرے انتظار میں جاگتی رہتی ہے۔ میں کپڑے بدلتا ہوں، منہ ہاتھ دھوتا ہوں تب تک وہ کھانا گرم کر لیتی ہے۔ پھر ہم دونوں مل کر کھانا کھاتے ہیں اور بستروں پر دراز ہو جاتے ہیں۔

کبھی میری بیوی میرے پیر دباتی ہے، کبھی میرے الجھے ہوئے تیز رفتار زندگی کی گرد میں اٹے ہوئے بالوں کو اپنی لانبی لانبی مخروطی انگلیوں سے سنوارتی ہے۔ تکان سے میری پلکیں بند ہونے لگتی ہیں — وہ کبھی کبھی کچھ پیار و محبت کی باتیں بھی کرتی ہے۔ لیکن مجھے صاف سنائی

(باقی ص۲۳ پر)

ذکی طارق[1]

تبرکات

الہ آباد کا ایک تاریخی طرحی مشاعرہ

مشاعرے [illegible] [illegible] آج کل [illegible] [illegible] [illegible] اثرات [illegible] ثقافتی [illegible] رسالوں، شاعروں کا [illegible] شاعروں کو [illegible] اور شاعروں [illegible] ایک بات [illegible] مشاعروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعروں کے انعقاد نے اُردو کی اشاعت [illegible] میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اردو [illegible] اور ہندی کی تحریک سے دو قوموں [illegible] اسلام والی ہندو کے اتحاد کا مضبوط رشتہ [illegible] کی [illegible] رہا ہے۔ اس کی آبیاری میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی غرضیکہ سبھی مذاہب اور فرقوں کے لوگوں نے دل کھول کر حصہ لیا۔ مشاعروں میں شرکت کرنے والوں میں ہر مکتبۂ فکر اور ہر مذہب کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس طرح مشاعرے ملکی اتحاد اور [illegible] ہیں اسی طرح [illegible] مشاعرے [illegible] تاریخی اہمیت کے حامل [illegible] مرزا احسان اللہ بیگ دہلوی نے ۱۹۲۶ء میں ایک یادگار مشاعرے کا ذکر اور [illegible] اس سے تعلق [illegible] علوم ہوتے ہیں۔ قدیم [illegible] مشاعرے اور [illegible] سامنے آتی ہے۔ اس طرح ۱۲ [illegible] ۱۱ [illegible] ۱۹۲۴ء کو الہ آباد [illegible] [illegible] کے ہاتھوں [illegible] تعلق [illegible] ہوا [illegible] سے ایک [illegible] تھا۔ اس کی صدارت [illegible] حسنین سرشاہ محمد سلیمان [illegible] دونوں تھے، اس لیے پہلی نشست سے دوسری نشست کے آخر تک مسلسل مسند صدارت پر جلوہ افروز رہے۔ پہلی نشست ۱۲ بجے دن سے شروع ہوئی اور ساڑھے چار بجے شام تک چلی، دوسری نشست ۸ بجے رات سے شروع ہو کر طلوع آفتاب تک چلی۔ یہ مشاعرہ طرحی تھا، مصرع طرح تھا ع [illegible] اس میں تقریباً سو شاعروں نے شرکت کی تھی۔ سننے والوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب [illegible] تھی۔ اس میں [illegible] دہلی، لکھنؤ، آگرہ، [illegible] سیتاپور [illegible] [illegible] کے [illegible] اور الہ آباد کے [illegible] شاعر شریک تھے۔

اس میں شرکت کرنے والوں میں پنڈت [illegible] موہن دتاتریہ کیفی، نواب سراج الدین احمد خاں سائل، منشی مہاراج بہادر برق، پنڈت امرناتھ مدن ساحر، پنڈت دینا ناتھ مدن [illegible] پنڈت [illegible] ناتھ زتشی زار، پنڈت برج کشور [illegible] پنڈت کیلاش نرائن کول بیدل، پنڈت رتن نرائن [illegible] لیاقت علی تاباں، قمر، ارشد [illegible] بدایونی، پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق، سید نصیرالدین نصیر، طاہر جونپوری، قدسی جائسی، سیماب اکبرآبادی، اثر اکبرآبادی، مولانا حسرت موہانی، منشی [illegible] وحشی کانپوری، حکیم ضمیر حسن خاں دل، منشی علی حسین خاں ترق [illegible] پنڈت آنند نرائن مُلا، صفی، ظریف، ناتک، آرزو، آشفتہ

[1] سیکریٹری اردو سنگم چودھری [illegible] حیدرآباد۔
[illegible] دہلی

سراج، منظر، قدیر، اثر، بیخود موہانی وغیرہ نے
شرکت کی، الہ آباد سے فراق صاحب، ضامن صاحب،
ماجد صاحب، حامد صاحب، اصغر گونڈوی، شفق
عماد پوری، نوح ناروی، شاطر صاحب، محشر صاحب
اور بہت سے دیگر شاعروں نے طرحی غزلیں سنائیں،
بخوف طوالت ان سب شاعروں کی پوری پوری غزلیں
یہاں نہیں دی جا سکتیں، صرف چند شاعروں کے
منتخبہ اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔ (اگر کوئی صاحب
کسی شاعر کی پوری غزل کے طالب ہوں تو وہ ایڈیٹر
پوجنا سے رابطہ قائم کریں۔)

جناب وصل الدین اکبر آبادی، اثر

جلوہ عریاں، برق پیدا، طور پنہاں دیکھئے
غور کر کے دل کے اجزائے پریشاں دیکھئے

گل بداماں ہے سحر، راتیں ہیں انجم در کنار
میری دنیائے محبت کا چراغاں دیکھئے

یہ فسانہ حیر نظریں، یہ جنوں انگیز چالے
کھل نہ جائے بخیۂ چاکِ گریباں دیکھئے

..

جناب اثر صاحب

اس نظر سے مصحفِ رخسارِ جاناں دیکھئے
شرع میں حکم شریعت ہے کہ قرآں دیکھئے

کیجئے آباد اب دل کو خیالِ دوست سے
تا کجا اس آئینہ خانہ کو ویراں دیکھئے

یا مرے داغِ جگر ان کی نگاہِ ناز میں
برقِ تاباں کو اشرابِ گل بداماں دیکھئے

..

جناب سید انور حسین آرزو، لکھنوی

کھینچ کر تابِ نظر کو روئے جاناں دیکھئے
کچھ سکئے کو مدتِ تجلی تو ہاں ہاں دیکھئے

شوق کی دیوانگی کو ہوش ہی اس کا کہاں
کیجئے اتنا ارادہ، جتنا امکاں دیکھئے

تو نکلا دہر سے روشن لیے دل کا چراغ
نہیں کافر یہ بد باطن مسلماں دیکھئے

حکیم آشفتہ، لکھنوی

بزم ہستی دیکھئے، گورِ غریباں دیکھئے
ایک آئینہ ہے جس کے دونوں عنواں دیکھئے

پھونکتا ہوں دل کے داغوں کو چراغاں دیکھئے
اس بیاباں کو بناتا ہوں گلستاں دیکھئے

جناب اصغر حسین، اصغر گونڈوی

تا بہ کے آخر ملالِ شامِ ہجراں دیکھئے
نالۂ نے کی طرح اڑ کر نیستاں دیکھئے

غرق ہیں سب علم و حکمت دین و ایماں دیکھئے
کس طرح اٹھتا ہے اک ساغر سے طوفاں دیکھئے

اک تبسم، یا ترنم اک نظر یا نیشتر
کچھ نہ کچھ ہوگا، پھڑکتی ہے رگِ جاں دیکھئے

میں نہ کہتا تھا کہ آفت ہے شرابِ شعلہ رنگ
سوخت آخر ہو گئے سب کفر و ایماں دیکھئے

∴

سید اعجاز حسین، اعجاز

اور بسمل پر بڑھے گا بارِ احساں دیکھئے
آپ کیوں اس کو باندازِ پشیماں دیکھئے

حسن ہر آسان کو مشکل بناتا ہے مگر
عشق کہتا ہے کہ ہر مشکل کو آساں دیکھئے

بس اسی کے دم سے ہے اعجاز شمعِ زندگی
ہاتھ سے جانے نہ پائے سوزِ پنہاں دیکھئے

∴

منشی مہاراج بہادر دہلوی برق

ہر طرف ہے حسنِ نظارہ بداماں دیکھئے
دیکھتی آنکھوں بہارِ باغِ امکاں دیکھئے

نامرادِ عشق کی کیا شکل پہچانیں گے آپ
شمع لے کر صورتِ بیمارِ ہجراں دیکھئے

فصلِ گل ہے، ابر تر ہے، برق توبہ توڑیئے
پھر بہم ہوتے ہیں کب یہ ساز و ساماں دیکھئے

∴

جناب محمد علی حسین خاں رئیس، شاہجہانپوری برق

عشق پروانہ نہ حسن شمعِ سوزاں دیکھئے
اک نگاہِ لطف کی دو پردوں میں پنہاں دیکھئے

دستِ وحشت بڑھ چلا ہے اور ہو جیبِ قریب
ایک وقت اب چاک ہوں گے دو گریباں دیکھئے

∴

جناب الہ یار خاں بریاں الہ آبادی

کھینچ کر لائی عدم سے مجھ کو دنیا کی طرف
اب کہاں لے جائے یہ عمرِ گریزاں دیکھئے

مل گئے سب خاک میں اس روز ہم بھی ہوں گے خاک
اس نظر سے جانبِ شہرِ خموشاں دیکھئے

∴

جناب مرزا عاشق حسین بزم اکبر آبادی۔

ابتدا ہوتی ہے دل سے میرا عنواں دیکھئے
عشق کی بدنامیوں کا ساز و ساماں دیکھئے

کارگاہِ عشق میں معراجِ امکاں دیکھئے
دستِ سائل دیکھئے اور دیدۂ درباں دیکھئے

باد ناخواستہ دہر مری میت کے سامنے
حسن کی آزادیوں کو پابجولاں دیکھئے

∴

منشی سکھ دیو پرشاد بسمل الہ آبادی۔

پتی پتی پر لکھی ہے داستانِ رنگ و بو
کیوں نہ اس عنواں سے حسنِ گلستاں دیکھئے

نیستی لے گی ہستی کا کسی دن جائزہ
مطمئن اس پر سمجھی ہے دنیا ہیولا ساں دیکھئے

∴

جناب پنڈت کیلاش نرائن کول بیدی منظر نگری۔

فیضِ ساقی دیکھئے آدابِ رنداں دیکھئے
خطِ ساغر میں مفید نورِ ایماں دیکھئے

ایک جانب پرسشِ محشر کا ساماں دیکھئے
اک طرف مجبوریٔ تقدیرِ انساں دیکھئے

لامکاں کی وسعتوں میں کیا ہے دنیا کا وجود
اک فضلِ پاک میں تعمیرِ عصیاں دیکھئے

جناب سید محمد رضا الہ آبادی بیدل

آپ کے ناوک کے صدقے زور پیکاں دیکھئے
رقص کرتے دل کے اوراق پریشاں دیکھئے
محو حیرت ہو رہا ہوں جلوہ گاہ حسن میں
کیا دکھاتی ہے تماشا چشم حیراں دیکھئے

٭

جناب بیخود موہانی لکھنوی بیخود

اشک سے ہے جو سلوک چشم گریاں دیکھئے
پائے مہماں چومئے پھر سوئے مہماں دیکھئے
ضعف میں کیونکر ہو شرح درد پنہاں دیکھئے
کس طرح آتے ہیں آنسو تا بمژگاں دیکھئے

٭

جناب مولوی لیاقت علی خاں بدایونی تاباں۔

پُر اثر ہے شور مرغان خوش الحاں دیکھئے
پھول ہے ہر زخم بلبل کو نمکداں دیکھئے
ہے تجلی ریز داغ سوز پنہاں دیکھئے
آفتاب مطلع چاک گریباں دیکھئے
طے ہو کس راہ جنون فتنہ ساماں دیکھئے
کیا دکھاتے کوچۂ چاک گریباں دیکھئے

٭

جناب حافظ وکیل احمد حافظ، غازی پوری۔

حسن کو ہر آئینہ میں فتنہ ساماں دیکھئے
فاش ہو جائے نہ کیں راز پنہاں دیکھئے
شعلۂ ایمں کا ہر رنگ نمایاں دیکھئے
جب کلی ہنستی ہوئی یا گل کو خنداں دیکھئے

٭

جناب مولانا حسرت موہانی حسرت

دیدۂ دل سے بہار حسن خوباں دیکھئے
صورت انساں میں بھی اک عالم جاں دیکھئے
ندرت حسن بشر کو قدرت حق جانئے
شعلۂ عشق بتاں میں نور ایماں دیکھئے

٭

جناب منشی حسن عسکری حشق الہ آبادی۔

خانۂ دل میں نکالی ہے داغوں نے اک آگ
آیئے اور شوق سے سیر چراغاں دیکھئے
حشر کے دن بھی رہا اُس مہروش کا انتظار
بن گئی صبح قیامت شام ہجراں دیکھئے

٭

جناب مولوی ابوالحسن حیدری، غازی پوری۔

ہے زلیخائے خطا یا ماہ کنعاں دیکھئے
کس کے ہوتا ہے موافق چاک داماں دیکھئے
دربدر پھیرے گا یوں کب تک تلاش یار میں
جانیئے کیوں دور اسے نزدیک رگ جاں دیکھئے

٭

جناب پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار، دہلوی

ہو حرم شان خدا ایک دیر ویراں دیکھئے
بتکدے سے ہو شیوع نور ایماں دیکھئے
لغزش مستانۂ خود رفتہ رنداں دیکھئے
شیوۂ رندانہ سر بریدہ مستاں دیکھئے
ہو انا الحق قول جوش جذب مستاں دیکھئے
اس خدائی کی خودی کی حد امکاں دیکھئے

٭

جناب ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں
سائل دہلوی۔

فصل گل اب آ گئی وحشت کا ساماں دیکھئے
سنگ طفلاں دیکھئے خار بیاباں دیکھئے
جانیئے آسیب ہستی سے اسی کو مطمئن
ذرہ ذرہ خاک کا جس کی پریشاں دیکھئے

٭

جناب عاشق حسین سیماب اکبر آبادی۔

آیئے بزم وفا کے ساز و ساماں دیکھئے
شمع کی لو پر پتنگوں کو غزل خواں دیکھئے
کس قدر معصوم تھا ہستی کا عنواں دیکھئے
سب سے پہلا صفحۂ تاریخ انساں دیکھئے

ہے یہ انجام شکست عہد و پیماں دیکھئے
اپنا دامن دیکھ کر میرا گریباں دیکھئے
اضطراب سانس ہے نغموں کی اُلجھن کا سبب
کھینچئے اک نالۂ جب دل کو پریشاں دیکھئے

٭

جناب مولوی صغیر احمد صغیر دہلوی

آئینے میں کیوں بہار [illegible] تاباں دیکھئے
سب نظر آئے گا [illegible] چشم حیراں دیکھئے
روئے تاباں [illegible] زلف پریشاں دیکھئے
اب یہ [illegible] کفر و ایماں دیکھئے

سید محمد ضامن علی صاحب صدر شعبہ اردو
الہ آباد یونیورسٹی۔

کب میسر ہو ہمیں دیدار جاناں دیکھئے
شوق نظارہ ہو کب تک گل بداماں دیکھئے
جذب کی تاثیر قابل دیکھنے کے ہے حضور
دل ہے یا ہے آپ کے ناوک کا پیکاں دیکھئے

٭

جناب پنڈت رتن ناتھ در عرش لکھنوی۔

اب کدھر جائیں ہمارے دل کے ارماں دیکھئے
کشمکش میں ڈالتے ہیں کفر و ایماں دیکھئے
چھپ نہیں سکتا چھپانے سے کبھی لائیگا رنگ
آستیں کا سانپ ہے خون شہیداں دیکھئے

٭

جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، لیکچرار
یونیورسٹی، الہ آباد۔

تاکہ شان فریب عہد و پیماں دیکھئے
وصل و فرقت سے گزر کر حسن جاناں دیکھئے
جلوۂ صحرا میں نیرنگ گلستاں دیکھئے
چاک جیب گل میں دامان بیاباں دیکھئے
حسن میں شان جمال برق جولاں دیکھئے
موج لے کر چھلکے پیمانے میں فرزاں دیکھئے

(باقی صـ۱۴۱ پر)

روشن لال روشن بنارسی ٥

انشائیہ

طنز و مزاح

ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا

بیشک ضعیفی ایک جُرم ہے۔ اور آپ حضرات جانتے ہیں کہ ہر جُرم کی ایک سزا بھی ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ زیادہ تر جرائم میں مجرم بے قصور ہوتا ہے لیکن آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ مجرم کو سزا ہو کر ہی رہتی ہے (خواہ وہ بے قصور ہی کیوں نہ ہو)۔

یوں تو بے قصور مجرم ہر شعبۂ جرم میں ہوتے ہیں لیکن ضعیفی ایک ایسا جرم ہے جس کے مجرم ہمیشہ بے قصور ہی ہوتے ہیں۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ مجرم کو سزا ہو کر ہی رہتی ہے خواہ وہ بے قصور ہی کیوں نہ ہو!

بارایٹ لاء علامہ اقبالؔ بھی ضعیفی کو ایک جُرم سمجھتے تھے۔ اور انھوں نے بھی جُرم ضعیفی کے سلسلہ میں فیصلہ کُن لہجے میں ارشاد فرمایا ہے ؎

ہے جُرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

بارایٹ لاء علامہ اقبالؔ کے اس فیصلہ پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ فیصلہ ہماری دُنیا کی عدالتوں کا فیصلہ نہیں ہے اور یہ سچ بھی ہے۔ اُن کا فیصلہ عدالت عالمِ بالا کا ہے۔

عدالت عالم بالا کا یہ فیصلہ جُرم ضعیفی کے مجرموں کے لیے سخت سے سخت سزا کیوں نہ ہو ہماری سطر حاضی نرم اور رعایتی و روایتی ہے۔

ہم جرم ضعیفی کے مجرموں کو ملنے والی ان سزاؤں کی طرف آپ حضرات کی توجہ دلانا چاہتے ہیں جو "مرگِ مفاجات" سے بھی زیادہ اذیت ناک اور تکلیف دہ ہے۔

جُرم ضعیفی کی ابتدا کے ساتھ ہی گھر محلہ، معاشرہ تینوں عدالتوں سے ضعیفوں کے لیے ایک قرار داد پاس ہوتی ہے جس کے مطابق ہی ان بے قصور و مجبور مجرموں کو اپنی آگے کی زندگی گزارنا پڑتی ہے۔

اُس قرار داد میں جو کچھ ہوتا ہے اُس کا ایک ایک جملہ، ایک ایک تازیانہ لگنے کی سی چوٹ دیتا ہے۔ اس چوٹ کا احساس محسوس کر کے میرے جیسا نوجوان بھی بارگاہِ الٰہی میں دُعا کے لیے ہاتھ اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یا اللہ! مجھے ہر گناہ کر لینے دے مگر اس جرم ضعیفی سے باز رکھ۔

بہرحال قرار داد کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔ اُمید ہے اسے پڑھ، سُن و سمجھ کر آپ حضرات بھی میری طرح اُس خالقِ کائنات سے دعا مانگنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

قرار داد تقریباً ایک درجن شرائط پر مبنی ہوتی ہے مگر یہ ایک درجن شرائط ۱۲ درجن شرائط پر بھاری ہیں۔

۱۔ آپ چونکہ جُرم ضعیفی کر چکے ہیں، اس لیے دین و مذہب کے علاوہ اور کسی موضوع پر اظہارِ خیال نہیں کر سکتے۔

۲۔ لیلیٰ مجنوں جیسی فلمیں دیکھنا آپ پر حرام ہیں۔ ٹی۔ وی۔ ویڈیو اور ریڈیو پر بھی غیر شرعی پروگرامس اور فلمیں دیکھنا، سُننا آپ کے لیے ایک ادب ناک جُرم ہے۔

۳۔ اپنی جوانی کے قصّوں کو بار بار اور جا بجا سُنانا آگ پر تیل چھڑکنے اور باسی کڑھی میں اُبال لانے کے مصداق ہوگا۔

۴۔ آپ کو دوسروں کی کوئی بات ایک ہی بار میں سُننا سمجھنا ہوگی۔ اپنی کوئی بات بار بار دُہرانا نہیں ہوگی۔ بس ایک بار کہہ کر خاموش ہو جانا ہوگا، چاہے آپ کی بات کوئی سُنے یا نہ سُنے اور آپ کے لیے بہتر تو یہی ہوگا کہ آپ کچھ کہنے اور سُننے کی نوبت ہی نہ آنے دیں

---

٥ ڈی ۴۷/۱۱۰ اے، راما پورا، وارانسی، ۲۲۱۰۰۱۔
بوجہ انتقال دہلی

۵۔ اپنے سے چھوٹوں کو ڈانٹنا ڈپٹنا آپ کے سٹھیا جانے کی دلیل ہوگی۔

۶۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو نصیحت کرنا (خواہ وہ کچھ بھی کرتے ہوں کیسی بھی حالت میں ہی ہوں)، آپ کا پاگل پن سمجھا جائے گا اور آپ مانتے ہیں کہ پاگلوں کی جگہ پاگل خانہ ہوتی ہے۔ گھر محلہ اور معاشرے میں ایسے لوگوں کا گزر ممکن نہیں۔

۷۔ گھر کے سارے افراد اگر پکنک پر کہیں گھومنے جائیں یا پھر سینما دیکھنے جائیں، آپ گھر کی مکمل دیکھ بھال پوری ذمہ داری کے ساتھ کریں گے۔ ساتھ چلنے کی خواہش آپ کے لیے بچوں کی ضد اور سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے جیسی بات سمجھی جائے گی۔

۸۔ کبھی کھٹولے سے بھی اپنی چہارپائی کا پدنا (کسی اپنے ناعیر کے آگے) آپ کو نہ روا ہو گا۔

۹۔ گھر میں جو کھانا پکے گا، جیسا بھی پکے گا کھانا ہوگا۔ آپ کے دانتوں و مسوڑوں کی تکالیف وغیرہ کے بارے میں ہم کچھ سننا نہیں چاہیں گے۔

۱۰۔ ہمیشہ گھر آپ کا بیمار رہنا ہم میں سے کسی کو گوارا نہ ہوگا۔

۱۱۔ آپ کو ہر وقت خود کو خوش و خرم رکھنا پڑے گا کسی بھی طرح کی ناراضگی، بدلی، ناخوشی کے اظہار کا حق آپ کو نہیں ہوگا۔ اگر ایسا کریں گے تو اسے بڑھاپے کی سنک کہہ کر آپ کو بدنام کیا جائے گا۔ جس کا خمیازہ آپ ہی کو بھگتنا ہوگا۔

۱۲۔ آپ کی کسی بھی طرح کی شکایت سے ہمیں شکایت ہوگی۔ ہمارے محلہ میں بھی ایک صاحب ہیں (ظاہر ہے کہ آپ کے گھروں میں تو ایسے لوگ ہوں گے ہی) جو پچھلے پانچ سالوں سے جرم ضعیفی میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ گھر محلہ و معاشرہ کی مندرجہ بالا قرارداد کے پیش نظر خود کو ضعیفی کا مجرم تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ خود کو جوان ثابت کرتے ہیں جو دلائل وہ دیتے ہیں اس سے دنیا کے تمام ضعیفوں کو فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ دلائل کے علاوہ وہ خود کو جوان تسلیم کرانے کے لیے جو ترکیبیں استعمال میں لاتے ہیں وہ دنیا کے تمام ماہر نفسیات کے لیے غور و فکر کے نئے گوشے وا کرتے ہیں۔

گھر محلہ و معاشرہ کے لوگوں کو ان کی ذات سے ایک محاورہ ایسا ازبر ہو گیا ہے کہ جہاں کسی نے ان کو دیکھا فوراً زبان پر آیا۔ "رسی تو جل گئی ہے مگر بل نہیں گئے۔"

اگر یہ محاورہ ان کے گوش گزار ہوا تو فوراً پلٹ کر کہیں گے۔

"آپ احمق ہیں اور اگر آپ احمق ہیں تو کیا میں بھی احمق بن جاؤں؟ اگر دنیا ساٹھ کے بجائے تیس سال کے شخص کو ضعیف قرار دیتی تو کوئی دنیا کا کیا کر لیتا۔

آپ کو شاید معلوم نہیں کہ "ضعیفی دل و دماغ، خیالات و احساسات کی کمزوری کا نام ہے۔"

"دانتوں کا گر جانا، بالوں کا سفید ہو جانا، جسم میں جھریوں کا پڑ جانا، بینائی کا کم ہو جانا، قطعی ضعیفی کی علامتیں نہیں ہیں۔"

ہمارے بال سفید ہو چکے ہیں تو کیا ہم خود کو ضعیف مان لیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر قدرت نے ہمارے بال قبل از وقت سفید کر دیے ہیں تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ ہم اگر خضاب لگاتے ہیں تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ کسی غلط اور ناجائز بات کا احتجاج کوئی دل لگی تو نہیں ہے۔ جناب من! "ضعیفی کا تعلق جتنا بالوں سے نہیں اس سے کہیں زیادہ خون سے ہوتا ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ ضعیفی کا تعلق فقط خون ہی سے ہوتا ہے۔"

"میں ایسے کتنے ہی نوجوانوں کو جانتا ہوں جن کا خون تک سفید ہے، اسے کیا کہیں گے آپ؟"

میرے دانت گر گئے ہیں تو کیا اس میں دانتوں کی کمزوری کو کوئی دخل نہیں۔

اسی طرح بدن کی جھریوں اور آنکھوں میں بینائی کی کمی محض ایک قدرتی بات ہے۔ جھریوں والے بدن کے باوجود ہم نوجوانوں سے زیادہ چست ہیں۔ آنکھوں میں بینائی کی کمی کے باوجود ہم چہروں کو بہت اچھی طرح اور درست نگاہ یا زاویہ سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے نوجوان آپ چپ کیوں ہو گئے؟

ظاہر ہے ان دلائل کے آگے کون ہے جو لب کشائی کرے۔

ظاہر ہے ایسے جیالے ضعیف اگر ہیں بھی تو بہت کم۔ مگر زیادہ تر بیچارے سزا یاب ہی ہوتے ہیں اور ان دلائل کے پس پردہ اگر ہم دیکھیں تو ہمیں جرم ضعیفی کی سزاؤں کا خوف ہی جلوہ گر نظر آئے گا۔

تو آئیے آج ہم اللہ سے دعا مانگیں کہ یا اللہ ہمیں ہر گناہ کر لینے دے مگر اس جرم ضعیفی سے بہر حال باز رکھ۔ آمین۔ ●

غزلیں

واجد سحری، ۲۸- بی طبیہ کالج،
قرول باغ، نئی دہلی ۰۰۵ ۱۱۰۔

بن کے وہ خوشبو گھر میں ہمارے
بکھرے تو دیکھیں گے کیسے

بچے بھی حساس بنیں کتنے
ہم نے دیئے توڑے پیسے

اُجلے تن کے میلے من کے
تیری طرح ہیں دوست ہمارے

یاد تمھاری ساتھ ہے میرے
میں ہوں تنہا بات غلط ہے

اور جگا دیں زخم کی ٹیسیں
حال ہمارا پوچھنے والے

رُوٹھ گئی ہے قسمت لیکن
ماں کی دعائیں ساتھ ہیں میرے

جو گرجے ہیں کب برسے ہیں
قتل مجھے اور آپ کریں گے

کون مخالف ہوتا میرا
زہر، تمھیں ہو گھولنے والے

ہو چکی بارش گھر مرا لیکن
برسے گا اب بادل جیسے

اے واجدؔ محتاط رہو تم!
تجربے پھر بھی ہوتے رہیں گے

●

محمد حنیف ساجدؔ
۱۱- مسجد تھنی بی، سرسید روڈ، بھوپال ۱۸۔

اُن کے جلوؤں کا تصور عام ہے
کس قدر رنگین اپنی شام ہے

تم نہ آئے تھے تو دھڑکن تیز تھی
آ گئے تم دل کو اب آرام ہے

درحقیقت آپ ہی کے حسن سے
رونقِ بزمِ دو عالم عام ہے

اس کی ہی رنگینیاں ہیں ہر طرف
اس کا ہی جلوہ جہاں میں عام ہے

طُور پر کیوں جا رہے ہو اے کلیم
کچھ خبر ہے اُن کا جلوہ عام ہے

دل دھڑکتا رہتا ہے ہر دم مرا
اس کا ہی شاید محبت نام ہے

اُن کے رُخ پر زلف ہے بکھری ہوئی
کچھ سحر کا وقت ہے کچھ شام ہے

کر رہا ہے دل خطائیں عشق میں
اور ساجدؔ مُفت میں بدنام ہے

●

کلیم ضیاء: ۵- کیو/۲۲، شیواجی نگر، گوونڈی
بمبئی، ۰۰۰۴۳ ۴

بات کرتے ہی سوالات نے دَم توڑ دیا
لہلہاتے ہوئے باغات نے دَم توڑ دیا

دھوپ صحراؤں کی بستی سے نکل کے بھاگے
رات آئی تو خیالات نے دَم توڑ دیا

آگ برسائی درختوں نے پھلوں کے بدلے
صاف گوئی کی کرامات نے دَم توڑ دیا

اُن کے ہونٹوں کی خموشی کے تمر پھیکے تھے
آج پھر تلخیٔ حالات نے دَم توڑ دیا

سبز پتوں کی زبانوں پہ پڑے ہیں تالے
دل کو لگتی ہوئی ہر بات نے دَم توڑ دیا

فاصلے عشق کی معراج کے ضامن تھے مگر
ایسی فرسودہ روایات نے دَم توڑ دیا

چوٹ پتھر کو بھی آ جائے اگر دیکھ لے تو
میں تو انسان تھا جذبات نے دَم توڑ دیا

یوں تو ہر روز قیامت کا رہا ہے خدشہ
روزِ محشر کے حسابات نے دَم توڑ دیا

اے ضیاؔ ذکرِ بہاراں سے یہ دل کیا بہلے
جب خزاں آئی تو صدمات نے دم توڑ دیا ●

انوار رضوی: ۲۸ سی، پاکٹ اے، کالکا جی ایکس ٹینشن، نئی دہلی ۱۹ ۱۱

لرزاں لرزاں، دھندلی دھندلی، کچھ تصویریں ذہن میں ہیں
دل کا سیہ خانہ روشن سا کچھ تنویریں ذہن میں ہیں

سیلِ حوادث توبہ توبہ اک اک کر کے نقش مٹے
مٹی مٹی سی مبہم مبہم کچھ تحریریں ذہن میں ہیں

خالی خالی ذہن میں اب بھی ایک آواز کھٹکتی ہے
عہدِ جنوں کو بیت چلا ہے کچھ زنجیریں ذہن میں ہیں

مہر و وفا کو وہ کب جانے ہم ہی کچھ دلواتے تھے
ہائے جنوں میں کتنے سہارا کچھ تدبیریں ذہن میں ہیں

غزلیں

ریاض احمد عباسی ساغر: محلہ مولانا
پوسٹ آفس: مئو ایما، ڈسٹرکٹ الہ آباد (یوپی) ۲۱۲۵۰۱

دردِ جو لا دوا نہیں ہوتا
اس میں کوئی مزہ نہیں ہوتا
لوگ منزل کو بھول جاتے ہیں
راستہ بے وفا نہیں ہوتا
جب وہ میرے قریب ہوتے ہیں
پھر کوئی حادثہ نہیں ہوتا
موت بہتر ہے ایسے جینے سے
در جو دل کا کھلا نہیں ہوتا
دیکھئے دل کا زخم اے ساغر
اچھا ہوتا ہے یا نہیں ہوتا

●

ہوی ادنکار پرشاد سنہا تمنا۔ سیتا پوری
۲۷۷، نورنگ آباد، لکھیم پور کھیری

رہِ حیات میں طوفان اگر نہیں آتے
ہم اس جہاں میں کبھی راہ پر نہیں آتے
ہم اس خیال سے کشتی کو لائے طوفاں میں
کہ روز روز یہ منظر نظر نہیں آتے
شبِ فراق کی ہو جائے تو سحر لیکن
"نسیمِ صبح کے جھونکے ادھر نہیں آتے"
میں زندگی میں انھیں حادثوں سے ڈرتا ہوں
وہ حادثے جو بظاہر نظر نہیں آتے
یہ آگ ایسی محبت کی اے تمنا ہے
بھڑکتی رہتی ہے شعلے نظر نہیں آتے

●

ایک سوال

سید محمود نقوی: اسسٹنٹ ڈائرکٹر،
۵، شام ناتھ مارگ دہلی ایڈمنسٹریشن،
دہلی ۱۱۰۰۵۴

اے خدا!
تجھ سے فرشتوں نے کہا تھا اک بار
مشتِ خاکی کو کیا مالک و مختارِ زمیں
جس کی رگ رگ میں لہو بن کے رواں
خون و فساد
تجربہ ہو چکا ایسا ہی ہمیں پہلے بھی
پھر بھی ممتاز کیا نوعِ بشر کو تو نے
مصلحت اس میں ہے کیا؟

اے خدا!
جس کی تقدیر میں خود اپنے قلم سے تو نے
بے نیازی سے لکھی کون و مکاں کی تسخیر
تیری مرضی کے مطابق وہ ہواؤں میں اڑا
چاند تاروں پر کمند اس نے پھینکی
کر سکا ذات کو اپنی نہ مسخر لیکن
پیکرِ خون و فساد
مصلحت اس میں ہے کیا؟

اے خدا!
تیرے فرشتوں کا کہا سچ ہی ہوا
آگ سے جس کو کیا تھا تخلیق
اس نے سجدہ نہ کیا
خاک کے اس پتلے کو
پھر بھی اس پیکرِ خاکی میں ہوئی شعلہ مزاجی پیدا
ہر طرف گرمیٔ انفاس سے ہے ایک قیامت برپا
ہر طرف معرکۂ خون و فساد
مصلحت اس میں ہے کیا؟

اے خدا!
خالقِ روز و شب
اپنے فرشتوں کو ذرا
اتنا بتا دے اک بار
کب تلک سلسلۂ خون و فساد
کرۂ ارض کی وسعت پہ رہے گا موجود
تاکہ بے چین زمانہ ہوں کو قرار آ جائے
مطمئن ہو سکیں ہم جیسے گنہگار بھی کچھ
قلبِ پیمبر کی طرح

●

اِسی دن کے لیے

انور ثبات۔
۳۷/اے اقبال پور لین، کلکتہ ۷۰۰۰۲۳

اب بھی
ماں کا سنا سا چہرہ
جب
پلکوں کے جھروکوں میں دکھائی دیتا ہے
تو آنکھوں سے سارے منظر غائب ہو جاتے ہیں
اور صرف ایک ہی صورت
کئی پردوں میں لپٹی دکھائی دیتی ہے
جسے پہچاننے کی کوشش میں
آنکھوں سے تارے ٹوٹ پڑتے ہیں
اور پھر
دادا کی پرانی بات یاد آتی ہے
جو انھوں نے پاپا کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہی تھی
"بیٹے!
جو تم نے کھویا ہے، وہ تم پا سکتے ہو"
جو میں نے کھویا ہے، وہ میں پا سکتا ہوں
لیکن جو ان بچوں نے کھویا ہے
کبھی نہیں پا سکتے
شاید انھوں نے یہ بات اسی دن کے لیے کہی تھی!

ڈاکٹر ونود کمار

ہم بوڑھے کیوں ہوتے ہیں؟

بڑھاپا ابھی تک سائنسدانوں کے لیے ایک پیچیدہ مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ہارمون بڑھاپے کے عمل میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان میں عدم توازن آ جانے سے بالغوں، بالخصوص معمر لوگوں میں متعدد امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس مضمون میں مصنف نے بڑھاپے کے عمل اور بڑھاپے کی بیماریوں میں ہارمونوں کے رول پر روشنی ڈالی ہے۔

بیشتر ترقی یافتہ ممالک میں معمروں کی دیکھ بھال کے لیے بڑی دلچسپی پائی جاتی ہے اور صحتی، نفسیاتی، سماجی اور اقتصادی شعبوں میں اُن کے متعدد رُخی مسائل کو حل کرنے کے لیے کئی پروگرام زیر عمل ہیں۔ طبی شعبے میں متعلقہ علم جو "طب برائے معمراں" کے نام سے موسوم ہے بیشتر طبی اداروں میں تعلیمی نصاب کا حصہ ہے جہاں ڈاکٹروں کو ضروری تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی محققوں نے اپنی لیباریٹریوں میں بڑھاپے اور اُس کے عمل کے بارے میں تحقیق کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں صحتی بجٹ کا بڑا حصہ معمروں کی بہبود کے لیے بروئے کار لایا جا رہا ہے۔

ہر جگہ ۶۰ برس سے زیادہ عمر والوں کی آبادی کا تناسب بڑھ رہا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں یہ تناسب اس وقت ۱۰ فیصد ہے جو ۲۰۲۵ تک بڑھ کر ۲۲ فیصد ہو جائے گا۔ ہمارے ملک میں سر دست ۴ کروڑ افراد (آبادی کا ۶ فیصد) ۶۰ برس سے زیادہ عمر کے ہیں اور یہ تعداد ۲۰۲۵ تک بڑھ کر ۱۳ فیصد ہو جائے گی۔ کل تعداد کے لحاظ سے بھارت آئندہ ۴۰ برس میں چار گنا ہو جائے گا اور بھارت متواتر معمروں کی آبادی کا دوسرا بڑا ملک بنا رہے گا۔

بڑھاپے کے عمل نے قدیم زمانے سے جو انسانی یادداشت سے بعید ہے انسان کی توجہ کو اپنی جانب کھینچ رکھا ہے۔ ٹیکنالوجیکل ترقیوں سے سائنسدانوں کو بڑھاپے کے عمل کے مطالعہ میں مدد ملی ہے اور اس کی معلومات پر مبنی ایسی مساعی کی جا رہی ہے جس سے صحتی عمل کو فروغ دے کر بڑھاپے کو ٹالا جا سکتا ہے۔

ہم بوڑھے کیوں ہوتے ہیں اس کی وضاحت کرنے کے لیے کئی تھیوریاں پیش کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر بڑھاپے کی حیاتیاتی تھیوری طویل عرصے سے چلی آ رہی ہے جو تولیدی یا ماحولی اسباب کو بڑھاپے کے لیے ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔ میں اس مضمون میں بڑھاپے سے متعلق ہارمونوں کی سائنس اور معمروں میں اُن کی خرابیوں سے بحث کروں گا۔

ہارمونوں کا کردار

ہارمون اہم مادے ہیں جو انسانی جسم کے بعض حصوں سے تشکیل پاتے ہیں جو اینڈوکرین غدود کے نام سے موسوم ہیں۔ وہ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے لازمی ہیں کیونکہ اُن سے ہماری نشوونما، افزائش، نظام ہضم، تولید و تناسل اور عمل کو فروغ ملتا ہے اور وہ جسم میں متعدد اعضاء کی سرگرمیوں میں تال میل بنائے رکھنے کے لیے

ضروری ہیں۔

دماغ اہم عضو ہے جو متعدد غدودوں کی جانب سے ہارمونوں کی تخلیق پر کنٹرول کرتا ہے۔ زیادہ صحیح طور پر دماغ میں ایک پُرزہ "ہائی پوتھلا موس" (HYPOTHALAMUS) ہے، جو کیمیاوی مادہ "ریلیزر ہارمونز" بناتا اور اُسے اپنے معاون کو بھیجتا ہے جو "پچوری (بلغم ریا) غدود" کے نام سے موسوم ہے، اور دماغ میں قدرے پست تر سطح پر موجود ہے۔ یہ غدود دعوے سا میں "ٹروفک ہارمونز" (TROPHIC HARMONES) گروپ کے تحت متعدد ہارمونز پیدا کرتا ہے۔ جن میں سے ہر ہارمون ایک خصوصی ہارمون کو کنٹرول کرتا ہے جو ہمارے جسم کی جلد کے ساتھ ساتھ ایڈرینل کریں غدود پیدا کرتا ہے۔ یہ غیر اعصابی غدود عملاً اپنے آقا "ہائپو تھلاموس اور اس کے معاون "پچوری غدود کے غلاموں کے طور پر کام کرتے ہیں اور ان کی ہدایات کے تحت ہارمون پیدا کرتے ہیں۔ یہ غدود ہیں "تھائی رائڈ"، "ایڈرینل"، "ٹیسٹس" اور اووری" وہ اپنے متعلقہ ہارمون پیدا کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں [illegible] اور [illegible] کی افزائش، چھاتی سے دودھ کا اخراج اور ہمارے پینکریاس (عنق الطحال) میں انسولین کی تیاری اور اخراج بھی جزوی طور پر اس نظام پر انحصار رکھتے ہیں۔ یہ ہارمون مختلف فرائض انجام دینے کے لیے ایسی خصوصی کارروائیوں پر زور دینے کی اہلیت رکھتے ہیں جیسے کہ رفتہ رفتہ نشوونما کو فروغ دینا یا جسم کے اندر سے یا بیرونی ماحول سے پیدا ہونے والی دفعتہً مانگوں کے جواب میں عمل کرنا۔ یہ نظام اس ڈھنگ سے بنا ہوا ہے کہ کسی غیر اعصابی غدود کا معمول زائد ہارمون بھی کوئی نقصان نہیں پہونچاتا۔ چنانچہ صحتی شعبہ میں غیر اعصابی غدود ایک دانشور "غلام" کے طور پر کام کرتا ہے اور جانتا ہے کہ کب آقا کی فرماں برداری کی جائے اور کب اپنے آقا کی بھی رہنمائی کی جائے۔ لہٰذا ہارمون کی تخلیق ایک منضبط عمل ہے جو کنٹرول کے تحت رہتا ہے۔

بڑھاپے کا نظریہ

بڑھاپے کا نظریہ جس کے لیے ہارمونوں کا عمل ذمہ دار ہے واضح کرتا ہے کہ ہارمونوں کی تخلیق کی ہدایت کرنے کے لیے ہائپو تھلاموس کی عملی صلاحیت زندگی کی ایک گھڑی کی مانند ہے جو اس طرح بنی ہوئی ہے کہ وہ حمل کے وقت سے لے کر مراحل ترقی و نما کے تمام تر سلسلے کا تعین کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ہارمونی صلاحیت منضبط اقدام میں ایک رفتار ساز کے طور پر کام کرتی ہے اور بچپن سے بلوغت تک اور ادھیڑ عمر سے انجام کار بڑھاپے تک ہماری پیش رفت کا تعین کرتی ہے۔ ہماری تمام تر زندگی کے ہارمونی اعصا ما کی ایک خاص بات تولید و تناسل کا زوال ہے۔ یہ عورتوں میں ۴۵ برس کی عمر کے آس پاس ہوتا ہے جب اُنھیں حیض آنا بند ہو جاتا ہے اور ایسا ہی زوال معمروں میں آتا ہے (لیکن عورتوں کی نسبت [illegible] رفتہ رفتہ اور کم شدید) کم از کم عورتوں میں جنسی ہارمونوں کی کمی جو عمر کے اس حصے میں پیدا ہوتی ہے وہ اس لحاظ سے بڑھاپے کے لیے سازگار ہے کہ اُنھیں قلبی امراض اور کینسر کا خطرہ کم تر ہوتا ہے۔

بڑھاپے میں ہارمونی تبدیلیوں کی وجہ دماغ کے اعصابی مرکزوں کا ٹوٹنا ہے جو عموماً ہارمونی تخلیق کو کنٹرول کرتے ہیں۔ ایک اور توضیح ہے دماغ کے "نیورو ٹرانسمیٹروں" اور ہائپو تھلامک ریلیزر "ہارمونوں کی بڑھتی ہوئی کمی جس کے نتیجے میں پچوری ہارمون کم ہو جاتے ہیں جو بڑھاپے کی ثانوی تبدیلیوں کا باعث ہیں۔ ہارمونوں کے بارے میں خواہ کوئی بھی توضیح پیش کی جائے، حقیقت یہ ہے کہ بڑھاپا "تھائی رائڈ" "ایڈرینل" "کارٹیکس"، "ٹیسٹس"، "اووری" اور نشوونما کرنے والے ہارمونوں کی محفوظ رطوبت میں بتدریج کمی لیکن بھاری کمی سے عمل میں آتا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہارمونوں سے متعلقہ امراض پر مختصر بحث کی جائے جو معمر لوگوں میں پیدا ہوتے ہیں، میرے لیے یہ ضروری ہوگا کہ ایسا تاثر نہ پیدا ہونے دیا جائے کہ بڑھاپا محض ہارمونوں کی کمی سے ہوتا ہے۔ اس کے کچھ دیگر اسباب بھی ہیں۔ عرصۂ حیات کے دوران جو معذوریاں اور بیماریاں جمع ہوتی ہیں وہ بھی بڑھاپے کے عمل میں اپنا رول ادا کرتی ہیں۔ مزید برآں انسانی جسم کے دیگر سسٹم بھی بڑھاپے کے عمل میں سے گزرتے ہیں۔

ہارمونوں سے متعلقہ امراض

ہارمونوں کے بارے میں جانکاری دینے کے بعد آؤ اب ہم ہارمونوں سے متعلقہ عام بیماریوں کی جانب توجہ دیں جن میں سے بعض بالغوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں لیکن جو معمروں میں غیر معمولی کیفیتیں پیدا کرتی ہیں۔ مزید برآں بعض بیماریاں تو محض بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہیں۔

۱۔ معمر افراد میں مردانہ جنسی حراساں عموماً رفتہ رفتہ پیدا ہوتی ہیں اور وہ جنسی کارکردگی میں کمی اور تولید و تناسل کے امکان میں بتدریج کمی کی صورت میں رونما ہو سکتی ہیں۔ ایسی مثالیں بہت ہی کم ملتی ہیں کہ جب ۶۵ سے ۷۰ برس سے زیادہ عمر کے مرد بچے پیدا کرتے ہیں۔ تاہم معمر مردوں میں جنسی کارکردگی میں کمی کے اسباب کلیتہً ہارمونی نہیں ہو سکتے گو ان کے جنسی ہارمونوں کے بنیادی اجتماع کی سطح معمول کے مطابق ہو سکتی ہے۔ نفسیاتی دباؤ، متعلق نسوں کی کمزوری اور عام عادات بھی مساوی طور پر اہم وجوہات معلوم ہوتی ہیں اور اس سلسلے میں موزوں دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔

۲۔ عورتوں میں تولید و تناسل کی کمی ۴۵ برس

کی عمر کے قریب ہوتی ہے اور وہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی کے ساتھ ایسے مقام پر پہونچ جاتی ہے جہاں تولید و تناسل عملاً بند ہو جاتے ہیں۔ ایسا ادھیڑ عمر میں حیض بند ہونے پر ہوتا ہے جس کے ساتھ بعض عورتوں کا جسم گرم رہتا ہے انھیں پسینہ آنے لگتا ہے اور بے دلی شروع ہو جاتی ہے۔ انھیں غلطی سے نفسیاتی امراض تصور کیا جاتا ہے۔ تب عورتوں کے کم ہونے والے جنسی ہارمونوں کی تلافی کرنا درست معلوم ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر عموماً سنگین ضمنی اثرات اور پیچیدگیوں کے خوف سے ایسا نہیں کرتے۔ اس کے علاج کے بعض دیگر مخصوص طریقے ہیں۔ عورتوں میں ان ہارمونوں کی کمی کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی ہڈیوں کو رفتہ رفتہ نقصان پہونچنے لگتا ہے جیسے خود بڑھاپے کا عمل اور کم غذائیت بڑھا دیتی ہے۔ صرف ان بیماریوں کے بڑھنے کی حالت میں ہی مریضوں کو ہڈیوں میں درد محسوس ہونے لگتا ہے اور دباؤ سے وہ چٹخ جاتی ہیں۔

۳۔ تھائی رائڈ غدود کا غیر معمولی عمل خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ تھائی رائڈ کی کمی سے بھی بڑھاپے کی کئی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں جیسے سستی، جلد کا خشک ہو جانا، قوت برداشت کا نہ رہنا اور رگوں کی نسوں میں چربی کا جمع ہو جانا۔ بڑھاپے سے متعلق لیباریٹری کے تجربوں سے تھائی رائڈ ہارمونوں کے جمع ہونے سے جلدی بدلیوں کا اظہار نہیں ہوا۔ اس غدود کے زیادہ سرگرمی کے ساتھ کام کرنے سے بھی بڑھاپے کے عمل میں تیزی آتی ہے۔

۴۔ ایڈرینل غدود کی خرابیاں معمّروں میں مخصوص طور پر عام نہیں ہیں۔ لیکن بظاہر یہ مان لیا جاتا ہے کہ چونکہ ہمارے بزرگ لوگ نوجوانوں کی مانند دباؤ اور تناؤ پر قابو پانے کی سکت نہیں رکھتے اس لیے ممکن ہے کہ اُن میں ایڈرینل ہارمونوں کی کمی ہو جو تناؤ کا مقابلہ کرنے میں خصوصی رول ادا کرتے ہیں۔ ہائپوتھلامو - پچوری - ایڈرینل زندگی کو سہارا دینے والا محور ہے۔ ان غدودوں کے ہارمونوں میں معمولی تبدیلیاں بھی بڑھاپے کے عمل سے تعلق رکھتی ہیں۔

۵۔ عمل، نیند اور بیداری کی خرابیاں ریسرچ کے نئے طریقوں سے پتہ چلتا ہے کہ معمّروں میں غیر معمولی نیند اور بیداری کے طور طریقوں میں ہارمون بنیادی رول ادا کرتے ہیں۔ رات کے وقت "نارایپی نفرین" (NOREPINE PHRIN) ہارمون کے زیادہ بڑھ جانے سے اکثر نیند میں خلل واقع ہوتا ہے۔

۶۔ گلوکوز کی عدم قبولیت اور ذیابیطس بڑھاپے کی ایک علامت یہ ہے کہ اس میں جسم گلوکوز کی بڑی مقدار کو قبول نہیں کرتا۔ پہلی غیر معمولی بات ذیابیطس کے مریضوں میں عام پائی جاتی ہے۔ اس اور دیگر اسباب کے لیے ذیابیطس اگر ابتدائی عمر میں ہو جائے تو بعض اوقات بڑھاپے کے عمل کا پیش خیمہ تصور کیا جاتا ہے۔

مشورہ

بڑھاپے کے اسباب اور بڑھاپے کی بعض بیماریوں میں ہارمونوں کے رول کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ شاید ان کے مداوا کے لیے طویل عرصے سے چلی آرہی اقدار کی اہمیت پر زور دیا جا سکتا ہے جیسے متوازن خوراک کھائی جائے۔ طویل پستی کی عادات، سگریٹ نوشی اور شراب نوشی سے احتراز کیا جائے۔ یہ کم از کم بعض مسلّمہ باتیں ہیں جن سے کسی کو لمبے عرصے تک صحت مند اور توانا رہنے میں مدد ملتی ہے جو تمام نوع انسانی کا حتمی مقصد ہے۔ اس سلسلے میں سائنسدانوں کو عوامی کارکنوں کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ ہم اب صرف اُن نسبتاً زیادہ لیکن قابلِ قدر عادات کے بارے میں سائنسی وضاحت پیش کر سکتے ہیں جو صدیوں سے زیرِ عمل ہیں۔ اس کے باوجود سائنسداں ایسے ذرائع کی نشاندہی کرنے کے لیے زیادہ بنیادی سطح پر سرگرم کار ہیں جن سے بڑھاپے کے عمل میں تاخیر کی جا سکتی ہے یعنی عمر کی گھڑی کی مرمّت کی جا سکتی ہے۔

●

بقیہ، الٰہ آباد کا ایک تاریخی طرحی مشاعرہ

مبتدائے بے حرص ہے ہر غم صبر آزما
تا بہ کے ہر درد میں تاثیرِ درماں دیکھئے

:.

جناب اودھ کستور پرشاد کستر، گیاوی۔

گُل کو حیراں دیکھئے شبنم کو گریاں دیکھئے
باغِ عالم میں طلسم رنگِ امکاں دیکھئے

دل ہمارا اور اپنی زُلفِ پیچاں دیکھئے
کس پریشاں نے کیا کس کو پریشاں دیکھئے

:.

جناب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی۔

ورطۂ بیرنگی میں یک رنگی کا ساماں دیکھئے
چشمِ وحدت بیں سے رنگِ کفر و ایماں دیکھئے

رازِ ہستی کو سمجھنا رازؔ ہے افشائے راز
دیدۂ بینا ہے تو پیدا میں پنہاں دیکھئے

کیجئے دیر و حرم کا ختم قصہ بھی کہیں
دل میں اپنے انعکاسِ نورِ سبحاں دیکھئے

:.

جناب محمد نوح ناروی۔

شوق کہتا ہے کہ برقِ حسنِ جاناں دیکھئے
دیکھنا مشکل ہو لیکن تا بہ امکاں دیکھئے

بحرِ عالم میں ہے اُن کا اک یہ زندہ معجزہ
نوح کو دیکھا نہ ہو تو جوشِ طوفاں دیکھئے

●

سرور یوسف٭

اللہ تیرو نام ایشور تیرو نام کا موسیقار نہ رہا!

ہماری فلمی صنعت کو آغاز سے ہی جہاں عام قسم کے موسیقار ملتے رہے ہیں وہیں ہر دور میں ایسے موسیقار بھی ملے ہیں جن کا کوئی ثانی نہیں ہوتا ان کا کسی سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا، ان پر کسی کی چھاپ نہیں ہوتی۔ انھیں مکمل طور پر منفرد اور اصل موسیقار کہا جا سکتا ہے انھیں میں سے ایک موسیقار جے دیو تھے۔

۶ جنوری کو اچانک جے دیو کی طبیعت خراب ہوگئی، اور منہ سے خون آنے لگا انھیں اسپتال میں بھرتی کیا گیا جہاں صبح ۲ بج کر ۲۰ منٹ پر وہ اپنے لاتعداد مداحوں کو سوگوار چھوڑ کر چلے گئے۔

جے دیو کی پیدائش ۳ اگست ۱۹۱۸ء کو نیروبی میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے کنبے کے ساتھ لدھیانہ آگئے تھے۔ یہیں ان کی ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ عام طور پر لوگ فلمی دنیا میں ہیرو بننے کا خواب لیکر آتے ہیں پردے پر اپنے آپ کو دیکھنے کی خواہش دل میں لئے آتے ہیں، حالانکہ جے دیو نے موسیقی کی تربیت حاصل کی تھی پھر بھی اداکاری کی آرزو موسیقار پر غالب آگئی تھی اور انھوں نے فلموں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے آٹھ نو فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھلائے مگر بعد میں طبیعت اچاٹ ہو جانے کی وجہ سے واپس موسیقی کے میدان میں اتر پڑے۔

موسیقی کی خوشبو

جے دیو نے برکت رائے موہن سنگھ جادوکر بنارسی جیسے معروف موسیقاروں سے موسیقی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ آواز کا جادو جے دیو کو انھیں کلاسیکی گائکوں اور موسیقاروں سے حاصل ہوا۔ لکھنؤ کے استاد علی اکبر خاں نے جے دیو کی مہارت اور ان کے اندر پوشیدہ جوہر کو دیکھتے ہوئے انھیں اپنا شاگرد بنا لیا۔ دن گزرے جے دیو کی فنکارانہ صلاحیتوں نے استاد علی اکبر خاں کو متاثر کیا۔ ایک دن آیا جب جے دیو ان کے اسسٹنٹ ہوئے۔ استاد علی اکبر خاں کی فلم "آندھیاں" اور "ہم سفر" میں وہ اسسٹنٹ میوزک ڈائرکٹر رہے۔

ہلکی اور میٹھی موسیقی جے دیو کی ہمیشہ سے کمزوری رہی۔ اپنی اس کمزوری کی بنا پر استاد علی اکبر کے استقال کے بعد وہ ایس ڈی۔ برمن کے قریب آگئے اور ان کے ساتھ بطور اسسٹنٹ میوزک ڈائرکٹر کام کرنے لگے۔ برمن کے ساتھ ان کی پہلی فلم "ٹیکسی ڈرائیور" تھی۔

کہتے ہیں کہ کسی کی صلاحیت کسی کے گن چھپے نہیں رہتے۔ کہیں نہ کہیں ضرور عیاں ہو جاتے ہیں، لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔ جے دیو کی موسیقی کی مٹھاس نے اداکار و ہدایت کار چیتن آنند کو ان کا گرویدہ بنا دیا۔ اس طرح پہلی بار جے دیو نے آزادانہ طور پر موسیقی دینے کی ذمہ داری سنبھالی اور اسے بخوبی نبھایا بھی۔ "جورو کا بھائی" (۱۹۵۵) بطور موسیقار ان کی پہلی فلم تھی۔ موسیقی ہٹ ہوئی تو انھیں اور بھی موقع ملا۔ 'انجلی' اور 'کنارے کنارے' کے گانے بھی مقبول ہوئے۔ چیتن کے بھائی دیو آنند نے انھیں اپنے بینر کی پہلی فلم 'ہم دونوں' کی موسیقی کے لیے سائن کیا۔ 'ہم دونوں' کے گیتوں نے دھوم مچا دی۔ 'اللہ تیرو نام، ایشور تیرو نام'، 'ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر' جیسے گیتوں نے انھیں صف اول کے موسیقاروں میں لا کھڑا کیا۔

رفتہ رفتہ جے دیو کی موسیقی کی خوشبو پھیلنے لگی۔ اجنتا آرٹس کے بانی اداکار و ہدایت کار نیز ممبر پارلیمنٹ جناب سنیل دت صاحب نے انھیں 'مجھے جینے دو' میں موقع دیا۔ 'اب کوئی گلشن نہ اجڑے اب وطن آزاد ہے' جیسے گیتوں کی موسیقی

(باقی ص۴ پر)

٭ ۹۱۴، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۱۰۰۲۵۔

فاطمہ انیس

ڈاکٹر اینی بیسنٹ

انسانی تاریخ کے ہر دور میں کسی ایک عورت نے اہم کردار ادا کیا ہے کہیں رضیہ سلطانہ کے روپ میں، کبھی نورجہاں کے روپ میں کبھی رابعہ بصری کے روپ میں تو کبھی میرا بائی اور جون آف آرک کے روپ میں سماجی، تہذیبی، تمدنی و ثقافتی رشتوں برابر استوار ہوتی رہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں کئی خواتین نے تاریخ ساز کارنامے انجام دیے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں ہمیں ایک خاتون اینی بیسنٹ کا نام ملتا ہے جس نے اپنے عہد کے اصولوں اور مروجہ قوانین سے انحراف کیا، بغاوت کی جو اس کی اپنی راست میں ایسے ایسے نظریات اور خیالات سے میل رکھتے تھے۔ انیسویں صدی کا عہد جب قدامت پرستی کا غلبہ شدید تر تھا، مروجہ خیالات اور تصورات سے انکار فرد تو کیا افراد کے لیے بھی ایک مشکل ترین مرحلہ بن سکتا تھا۔ وہاں ایک غریب کمزور عورت نے جو سماج میں مساوی درجہ تک حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی، بڑی جسارت کے ساتھ اپنے نظریات کی تبلیغ کی۔ مذہبی، سماجی اور سیاسی نظریات و عقائد میں تبدیلی لانے کی جدوجہد کی۔

اینی بیسنٹ کا کام عوامی فلاح و بہبود سے زیادہ فلسفیانہ نظریات سے متعلق تھا اسی لیے اینی بیسنٹ کا نام دانشور طبقہ تک محدود رہا۔ تاریخ میں جہاں کہیں ان کا نام ملتا ہے تو وہ اینی بیسنٹ کی آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ابتدائی دور سے وابستگی اور ہوم رول لیگ کے قیام کے سلسلے میں ملتا ہے۔

اینی بیسنٹ ۱۸۴۷ء میں انگلستان میں پیدا ہوئیں بچپن غریبی اور محرومی میں گزرا لیکن وہ بہت ذہین اور سوچ بچار کرنے والی خاتون تھیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہوتی گئی اور وہ اپنے آبائی مذہب عیسائیت سے دور ہوتی گئیں۔ اینی بیسنٹ سچائی کے مقابلہ میں کسی کی پروا نہ کرتی تھیں۔ وہ سچائی کی پرستار تھیں ایک حد ایسی بھی آئی جب ان کو ۱۸۷۳ء میں اپنے شوہر پادری فرانک بیسنٹ سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ عدالت نے اینی بیسنٹ کو ان کے مذہب اور اس عہد کے مروجہ خیالات سے انحراف کی سزا کے طور پر اپنے بچوں سے بھی محروم کر دیا اس طرح اپنے آزادانہ خیالات اور غیر مذہبی نظریات کے اختیار کرنے کی قیمت انھیں چکانی پڑی۔ نیشنل سوسائٹی کے ممبر کی حیثیت سے وہ آزادانہ خیالات اور تفکر کی مبلغ بنی رہیں۔ اور FABIAN سوسائٹی کے ذریعہ اشتراکیت کی پرچارک بن گئیں۔ ۱۸۷۷ء میں چارلس بارڈلاؤ کے ساتھ مل کر "نیشنل ریفارمر" نامی ایک رسالہ جاری کیا اور اس رسالہ میں برتھ کنٹرول یا خاندانی منصوبہ بندی پر ایک مضمون لکھا جو بعد میں ایک پمفلٹ کی صورت میں بھی چھپا سوچیے کتنی دور اندیش اور روشن خیال تھیں وہ جنھوں نے آج سے سو سال قبل خاندانی منصوبہ بندی کی ضرورت اور اہمیت کو پیش کیا تھا۔ اس پمفلٹ کی اشاعت کے بعد ان پر ان کے ساتھی ایڈیٹر کے ساتھ غیر اخلاقی حرکت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ لیکن وہ بری کر دی گئیں۔ ان کی بڑی زبردست اخلاقی جیت تھی۔

۱۸۸۹ء میں وہ مادام بال ولسکی کی متلاشی یا بالفاظ دیگر مرید بن گئیں اور تھیوسوفیکل سوسائٹی کی ممبر بن کر ۱۸۹۳ء میں ہندوستان آئیں تاکہ تھیوسوفی نظریات کی تبلیغ کی جائے۔

ہندوستان آنے کے بعد انھوں نے ہندو مذہب کا بغور مطالعہ کیا، وہ ہندوازم سے کافی متاثر ہوئیں اور ہندو مذہب کی طرف ان کا رجحان بڑھا۔ انھوں نے ہندوستان کو اپنا ملک بنا لیا اور بنارس میں سکونت اختیار کر لی۔ پھر ہندو مذہب کی اصلاح اور احیاء کی خاطر انھوں نے ۱۸۹۸ء میں بنارس میں سنٹرل ہندو کالج قائم کیا، جو بعد میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے لیے بنیاد ثابت ہوا۔ انھوں نے ہندوستانی عورتوں کی تعلیم کے لیے بہت کوشش کی اور ۱۹۰۴ء میں بنارس ہی میں لڑکیوں کے لیے ایک "سنٹرل ہندو گرلز اسکول" بھی قائم کیا ۱۹۱۴ء میں ڈاکٹر اینی بیسنٹ نے تمام ہندوستانیوں سے اپیل کی تھی کہ اگر وہ اپنی اور اپنے ملک کی ترقی چاہتے ہیں تو انھیں تمام عورتوں کی حالت کی اصلاح کرنی چاہیے۔

پہلی عالمی جنگ کے دوران میں اینی بیسنٹ ہندوستان کی آزادی کے کاموں میں جٹ گئیں اور قومی آزادی کی جدوجہد کا ایک جزو بن گئیں۔ ۱۹۱۶ء میں "ہوم رول لیگ" نامی انجمن قائم کی اور اس کی صدر بن گئیں۔ ۱۹۱۷ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کی صدر منتخب ہوئیں۔ پھر اختلافات کی وجہ سے کانگریس سے علیحدہ ہو گئیں لیکن دیش بھگتی میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

ڈاکٹر اینی بیسنٹ نے کئی کتابیں لکھیں اور پمفلٹ شائع کیے ان میں سے قابل ذکر ایک تو ان کی اپنی خود نوشت سوانح عمری ہے جو ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی۔ دوسری "چار بڑے مذاہب" نامی کتاب ہے جو ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔ تیسری Ancient Wisdom (قدیم عقل و دانش) نامی کتاب ہے اور ۱۹۰۵ء میں بھگوت گیتا کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔

ڈاکٹر اینی بیسنٹ تھیوسوفیکل سوسائٹی کی صدر ۱۹۰۷ء میں بنیں ۱۹۲۶ء تا ۱۹۲۸ء تک تھیوسوفیکل سوسائٹی کے مبلغ کی حیثیت سے امریکہ، یورپ اور مشرق کا دورہ کیا۔ ہندوستان سے بے پناہ پیار و دلی لگاؤ کی وجوہات میں اہم ترین وجہ تھیوسوفی نظریات تھے جو ویدانتی نظریات مثلاً روح، مکتی، آواگون وغیرہ کے تعلق سے مماثلت رکھتے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ اینی بیسنٹ کے نظریات سے اختلاف کیا جائے لیکن اینی بیسنٹ کی انقلابی اور اپنے نظریات پر یقین کامل رکھنے والی ہستی کی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ عظیم ہستی کی شناخت یہی ہے کہ وہ اپنے مقصد زیست کا خود تعین کرے اور اس مقصد پر اٹوٹ یقین رکھے چاہے کتنی ہی مشکلات و موانعات راہ میں حائل ہوں اینی بیسنٹ نے اپنے عہد سے بغاوت کی۔ مروجہ اصولوں کی خامیوں کی نشاندہی کی۔ خود کو سماجی استبداد سے آزاد کیا۔ ساری زندگی وہی کیا جس کو ان کے دل و دماغ نے قبول کیا اور ضمیر نے ان کی رہنمائی کی

۸۶ سال کی عمر میں ۱۹۳۳ء میں وہ انتقال کر گئیں، ۴۰ سال تک لگاتار ہندوستان میں انھوں نے جو خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ ان کے کارناموں کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی۔ ●

یہ حسانہ، نئی دہلی

آپ سب کے لیے

تمباکو یا صحت :-

ہم یہ جانتے ہیں کہ سگریٹ صحت کے لیے نقصان دہ ہے، لیکن کیا آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تمباکو اور تمباکو سے بنی ہوئی چیزوں کے استعمال سے آپ موت کے مُنہ میں بھی پہونچ سکتے ہیں۔ خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو، بیڑی پینا، تمباکو چبانا، حقّہ پینا، سگار پینا، تمباکو والا پان کھانا اور تمباکو ملے ہوئے منجنوں کا استعمال۔ سب کے سب نقصان دہ ہیں۔ مئی ۱۹۸۶ء میں جنیوا میں صحت کی حفاظت کا ۳۹ واں عالمی جلسہ منعقد ہوا تھا" تمباکو اور صحت" کے نام سے۔ اس میں یہ تجویز رکھی گئی تھی کہ لوگوں کو اپنی صحت کی حفاظت کے لیے تمباکو جیسی زہریلی اشیاء کا استعمال ترک کر دینا چاہیئے۔

ہندوستانی میڈیکل ریسرچ کونسل نے بھی ایک سروے کے ذریعے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ ہندوستانی مردوں کا نصف حصہ اور عورتوں کا ایک چوتھائی حصہ تمباکو کے استعمال کی وجہ سے کینسر کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس لیے محکمہ اس بات کی کوشش کر رہا ہے کہ تمباکو کی خرابیاں لوگوں تک پہنچائے اور انھیں بربادی سے روکے۔ ہمیں چاہیئے کہ حکومت یا محکمہ صحت کی کوشش کے علاوہ نجی طور پر بھی جس حد تک ممکن ہو اس بُرائی سے بچنے کی کوشش کریں اور اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہو تو ہمیں نہایت حلیمی سے اسے تمباکو کے نقصان بتانے چاہئیں اور ہمیں یہ بھی کوشش کرنی چاہیئے کہ دفتروں، ریلوے اسٹیشنوں، ہوائی اڈّوں، سرکاری دفتروں، تعلیمی اداروں، ہسپتالوں اور عام جلسے جیسے مقامات پر ان برائیوں سے لوگوں کو روکیں۔ کیا اب بھی آپ سگریٹ اور تمباکو کا استعمال جاری رکھیں گے؟ اُمید ہے کہ جواب نفی میں ہوگا کیونکہ "تمباکو اور صحت" میں سے آپ کو صحت کو ہی ترجیح دینی ہوگی۔

روایات کا ترجمان "ترشنا"

ایک چھوٹا سا جہاز جس پر ۱۰ جوان سوار ہوں اور اس کے پیچھے ۲۰-۲۰ فیٹ لمبی دو وہیل مچھلیاں تیر رہی ہوں اور اس کوشش میں ہوں کہ اس جہاز کو اُلٹ کر انسانی جسم سے اپنی خوراک کا انتظام کریں۔ ایسے ماحول میں آپ جوانوں کے حالات کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں اور یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ "ترشنا" کے ساتھ، جی ہاں جو اپنے سفر پہ ۲۸ ستمبر ۱۹۸۵ء کو بمبئی سے روانہ ہوا تھا اور تقریباً ۳۰ ہزار بحری میل جو ۵۰ ہزار بری میل کے برابر ہے سفر طے کر کے بخیریت بمبئی کی بندرگاہ پہ ۱۰ جنوری ۱۹۸۷ء کو لنگر انداز ہوا یعنی پورے ساڑھے چودہ مہینے بعد۔

اس سفر میں ترشنا تین بار خطِ استوا سے اور چھ سمندروں کے بیشتر حصّے سے گزرا۔ اس سفر میں بحری افواج کے ۱۰ انجینئروں نے حصّہ لیا۔ اس میں میجر ل سنگھ کا صرف ایک پیر تھا۔ ان کا دوسرا پیر لکڑی کا تھا اور دورانِ سفر دو بار ان ٹانگوں کو بدلنا بھی پڑا تھا۔

ترشنا اپنے سفر کے دوران کئی بار سمندری طوفان میں بھی گھر گیا تھا۔ فجی اور آکلینڈ کے درمیان ایک ایسے ہی طوفان کا سامنا کرنا پڑا جہاں طوفانی جھکڑ ۱۲۰ سے ۱۳۰ کیلو میٹر فی گھنٹہ کے حساب سے چل رہے تھے اور موجیں ۴۵ سے ۵۰ فٹ تک اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ اس سفر کے دوران ایک بار ترشنا کا انجن بھی خراب ہو گیا اور اس نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ لیکن بعد میں طوفان کا زور ٹوٹنے کے بعد اسے کنارے لایا جا سکا۔ اس دوران اس جہاز کے ارکان نے اپنی پیٹ کی آگ صرف بسکٹ اور چاکلیٹ کھا کر بجھائی تھی۔

ترشنا کا یہ سفر صرف مہم کی کامیابی کے لیے ہی قابلِ ذکر نہیں ہے بلکہ اس سے ہندوستان کی پرانی روایات کو زندہ کیا جا سکا ہے۔ دورِ قدیم سے ہی ہندوستانی عوام اپنی مہم جوئی کے لیے مشہور رہے ہیں اور انھوں نے اس دوران عظیم مہمات
سر کر کے ہندوستانی تہذیب کو جنوبی مشرقی ایشیا کے بڑے علاقوں تک پہونچا دیا تھا۔ ۸

بچوں کے بہبود کے پروگرام :-

بھارت میں اس وقت بچوں کی بھرپور طور پر راحت اور بہبودی خدمات انجام دینے والے ۱۶۱۱ پروگرام چل رہے ہیں۔ ان میں سے ۱۴۸۰ پروگرام مرکز کے زیرِ اہتمام اور باقی پروگرام ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں کے اہتمام میں چلائے جا رہے ہیں دسمبر ۱۹۸۶ء میں ملک میں ۱۱۶۱۹۶ آنگن واڑیوں میں بچوں کی پرورش ہو رہی تھی۔ ان میں سے ۱۱۰۵۰۹ آنگن واڑیوں میں بچوں کی صحت بنانے کے لیے تغذیہ بخش خوراک بھی فراہم کی جا رہی تھی۔

ریاستی سیکٹر میں ۱۰۸۵۵ آنگن واڑیاں تھیں۔ ان میں سے ۱۰۶۵۳ آنگن واڑیاں بچوں کو تغذیہ بخش خوراک دے رہی تھیں۔

اس پروگرام سے بلحاظ عمر جو بچے فائدہ اٹھا رہے ہیں، اُن کی تعداد اس طرح سے ہے :-

تین سال سے کم عمر کے بچے ۳۴۱۶۷۰ — تین سال سے چھ سال تک ۳۷۵۸۹۰ بچے

اس کے علاوہ اس پروگرام سے جن خواتین کو فائدہ پہنچایا جا رہا ہے، اُن کی تعداد ۱۲۵۵۷۰ ہے جن میں حاملہ عورتیں اور دودھ پلانے والی مائیں دونوں شامل ہیں۔

۱۲۵۳۸ آنگن واڑیاں ۴۳۲۷۴۱۰ بچوں کو پری۔ اسکول تعلیم دے رہی ہیں۔ یہ تعلیم ۳ سال سے لے کر چھ سال تک کے بچوں کو دی جا رہی ہے۔

بچوں کی غور و پرداخت کے کام سے متعلق عملہ اس طرح سے ہے :-

۱۲۳۰ پراجیکٹ افسر، جو ۱۳۹۸۱۰ آنگن واڑیوں سے وابستہ ہیں۔ اس کام میں ۲۰۲ مکھیہ سیوکائیں بھی شریک ہیں۔

ریاستی سطح کی آنگن واڑیوں میں ۲۴۹۲۱ کارکن کام کر رہے ہیں۔

ایک پراجیکٹ کی تکمیل کے لیے ۱۲ سے لے کر ۱۸ ماہ تک درکار ہوتے ہیں۔ اس کام کو ساتویں منصوبے میں خاص توجہ کے ساتھ آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

تبصرے

شریر بلی

سید محمود نقوی کی بچوں کے لیے لکھی گئی دس کہانیوں کا مجموعہ ہے جو اردو اکادمی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ ان میں کچھ کہانیاں طبع زاد ہیں اور کچھ دوسرے ملکوں کی مشہور کہانیوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ ایسی کہانیوں میں بھی ہندوستانی بچوں کے ذہن و مزاج کے اعتبار سے ضروری تبدیلیاں کی گئی ہیں جن سے کہانیوں کی اپیل میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس طرح کی کہانیوں میں روس کی کہانی "گم شدہ بھائی"۔ برما کی کہانی "انصاف کا ترازو"۔ اور "قصہ گوئی کا مقابلہ" اور انگلستان کی کہانی "ملیوں کا راجا" بہت دلچسپ ہیں مصنف کی اپنی لکھی ہوئی کہانیوں میں "شریر بلی"، "پڑوسی" اور "سیار کا فیصلہ" انتہائی دلچسپ ہونے کے علاوہ معنی خیز اور سبق آموز بھی ہیں۔ ان سے سبھی عمر کے بچے اور بوڑھے یکساں طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ غلط نہ ہوگا اگر "شریر بلی" کو شریر بھرے لڑکوں کی علامت سمجھا جائے جو خواہ مخواہ ذرا سی بات پر اپنے چاہنے والے بزرگوں سے ناراض ہو کر گھر سے فرار ہو جاتے ہیں اور در در کی ٹھوکریں کھا کر اور طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہو کر پچھتاتے ہیں۔ اسی طرح "سیار کا فیصلہ" میں سیار ایک شاطر سیاستداں کی علامت ہے جو (DIVIDE AND RULE) کی پالیسی اپنا کر سادہ لوح عوام پر حکومت کرتا ہے۔ کہانی "پڑوسی" کے کرداروں میں قومی یکجہتی اور باہمی اتحاد کی زیریں لہر موجود ہے جس کا واضح احساس قاری کو نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا ذہن و دل متاثر ضرور ہوتا ہے۔ سبھی کہانیوں کی زبان بھی سادہ و سلیس ہے۔ کہیں کہیں کچھ لفظ کھٹکتے ہیں مگر مجموعی طور پر انداز بیان عام فہم ہے۔ اس طرح "شریر بلی" کو اردو میں بچوں کے ادب میں ایک خوشگوار اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ ہر کہانی کے شروع و آخر میں موضوع سے متعلق تصاویر بھی ہیں جن سے دلکشی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ دو رنگوں میں چھپا ہوا سرورق بھی دیدہ زیب ہے۔ آفسیٹ پر چھپی ہوئی ۴۴ صفحات پر مشتمل کہانیوں کے اس مجموعے کی قیمت ساڑھے سات روپے ہے جو نشاط پبلی کیشنز کمرا سورج پوری دہلی نمبر ۵ سے حسب ضرورت طلب کیا جا سکتا ہے۔ ●

محمد معیز الدین

کتابوں کے نام (۱) "مذہب اور سائنس"

PROMOTION OF SCIENTIFIC TEMPER

(۲) "دورِ جدید اور رُوح"

SOUL AND ENERGY

مصنف کا نام: ڈاکٹر احسان اللہ خان

قیمت: ہر دو کتابوں کی قیمت ۴۰ روپے فی کتاب

ناشر: بیت الحکمتہ، نئی دہلی۔

ڈاکٹر احسان اللہ خاں انڈین کونسل آف ایگریکلچر ریسرچ میں سینیئر سائنٹسٹ ہیں موصوف عوام میں سائنٹفک مزاج پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس وقت جبکہ تمام دنیا میں بھارتی، ملکی اور مذہبی تنگ نظری جنون کی حد تک پہونچ رہی ہے مصنف نے اپنی کتابوں میں سائنٹفک معیاروں پر مذہبی سماج بنانے کی دعوت دی ہے۔ جس میں جفاکشی، ایمانداری، انصاف پسندی اور انسانی برادری کو بنیادی ستون کا مقام دیا ہے جو مذاہب عالم میں اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کھلے ذہن سے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ان میں دین کے عناصر۔ خدا، آخرت اور رسالت موجود ہیں مگر بعض علاقائی ماحول اور زمانے کی احتیاج کی بنا پر ان کا ظاہری صورتوں میں اختلاف ہے مگر ہر مذہب میں رواداری خاص مقام رکھتی ہے جس کا برتنا از حد ضروری ہے۔ خاص طور سے ہندوستان میں جہاں پر مختلف مذاہب کے افراد رہتے ہیں۔

مصنف نے مختلف دلائل ... ثابت کیا ہے ... ایک واضح سماج بنانے کے لیے ہوتی ہیں اور سائنسی تعلیم کے لیے نہیں ہوتی ہیں۔ لہذا جدید سائنس اور مذہبی کتابوں میں مذکور سائنٹفک بیانات میں کافی تضاد ہے اور ان کو کھینچ تان کر جدید سائنس کے موافق کرنا نادانی ہے۔

مصنف کا کہنا ہے کہ خالص سائنسی مزاج اور سیکولر ذہنی سماج جدید انسانی مسائل کا منصفانہ حل پیش کرنے سے قاصر ہے لہذا دنیا میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے اس لیے مصنف نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ سائنٹفک معیاروں پر مذہبی سماج تیار کیا جائے جو موجودہ پریشانیوں کے حل کا موجب ہو سکے۔

اپنی کتاب "دورِ جدید اور روح" میں یہ ثابت کیا ہے کہ ارتقاء مذہب کے خلاف نہیں ہے۔ روح کا تذکرہ ہر مذہب میں آیا ہے جو جسم کو زندہ اور متحرک رکھتی ہے۔ انھوں نے سائنٹفک تجربے اور مشاہدے سے یہ ثابت کیا ہے کہ زندگی کی ابتدا پانی میں ہوئی، جیسا کہ ہر مذہب میں موجود ہے۔

مصنف نے سائنٹفک طریقہ تحقیق سے یہ بتایا ہے کہ ابتدا میں ہماری زمین ایک گیس کا گولہ تھی جو دھیرے دھیرے موجودہ شکل میں آئی پھر بعد میں ہماری زمین پر غیر نامیاتی مرکب نامیاتی مرکب میں تبدیل ہوا، بعد میں ابتدائی خلیہ میں بدل گئی اور مناسب ماحول میں مکمل خلیہ کی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح غیر جاندار شئے جاندار کی صورت میں آ گئی۔ لہذا موت اور روح ہم معنی الفاظ ہوئے ایسی صورت میں روح کا مروجہ

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

شاہین پروین جالوی[٥]

ایک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میچ میں کپل دیو کی بیٹنگ اور بالنگ کا جائزہ

۲۰ مارچ ۱۹۸۷ء کو حیدر آباد میں پاکستان کے خلاف ۹۹ ایک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میچ کھیلتے ہوئے کپل دیو نے اپنا ۲۰۰۰واں رن پورا کیا۔ کپل دیو ہندوستان کے چوتھے کھلاڑی ہیں۔ جنھوں نے ایک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میچوں میں ۲۰۰۰ سے زیادہ رنز بنائے۔

مندرجہ ذیل تین ہندوستانی کرکٹ کھلاڑیوں نے ۲۰۰۰ سے زیادہ رنز بنائے ہیں۔ سنیل گواسکر نے ۹۸ میچوں میں ۲۱۴۳ رنز، دلیپ وینگسارکر نے ۸۸ میچوں میں ۲۵۰۰ رنز اور کرشنما چاری سری کانت نے ۷۵ میچوں میں ۲۱۴۹ رنز بنائے۔

کپل دیو دنیا کے پہلے آل راؤنڈر کھلاڑی ہیں جنھوں نے ایک روزہ کرکٹ میچوں میں ۲۰۰۰ رنز بنائے اور ۱۰۰ وکٹ لیے۔

کپل دیو نے سب سے اچھی اننگس زمبابوے کے خلاف ۱۹۸۳ء میں Prudential World Cup میں کھیلی، جبکہ انھوں نے ۱۸۱ منٹوں میں ۱۷۵ رنز بنائے جس میں چھ چھکے اور ۱۶ چوکے شامل تھے، یہ میچ ہندوستان نے ۳۱ رنز سے جیت لیا۔

۱۹۸۳ء کے Prudential World Cup میں ہی آسٹریلیا کے خلاف کھیلتے ہوئے کپل دیو نے ۱۲ اوور میں ۴۳ رنز دیکر ۵ وکٹیں لیں جو ان کے ایک روزہ کرکٹ میچ کا ریکارڈ ہے۔

یکم اپریل ۱۹۸۷ء تک ایک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میچوں میں کپل دیو کی بیٹنگ کا جائزہ

مدمقابل	میچ	اننگ	ناٹ آؤٹ	رنز	سب سے زیادہ رنز	اوسط	۱۰۰ رنز	۵۰ رنز
نیوزی لینڈ	۱۹	۱۵	۳	۲۷۱	۷۵	۳ر۹۱	–	۴
ویسٹ انڈیز	۱۴	۱۳	۳	۲۹۷	۷۲	۲۹٫۷۰	–	۱
سری لنکا	۱۴	۱۳	۵	۱۹۴	۴۹	۲۴٫۲۵	–	–
زمبابوے	۲	۲	۲	۱۰۷	۱۷۵	–	۱	–
آسٹریلیا	۲۶	۲۳	۲	۴۳۹	۵۸	۲۰٫۹۰	–	۱
انگلینڈ	۱۱	۱	۱	۲۷۳	۶۰	۳۰٫۳۳	–	۳
پاکستان	۲۰	۱۷	۱	۲۷۴	۵۹	۱۷٫۱۲	–	۱
	۱۰۲	۹۳	۱۷	۲۲۵	۱۷۵۰	۲۶٫۶۴	۱	۱

بالنگ

مدمقابل	گیند	خالی اوور جس میں کوئی رن نہیں دیا گیا	رنز	وکٹ	اوسط	سب سے اچھا وکٹ – رن
نیوزی لینڈ	۸۷۵	۲۴	۴۶۳	۲۲	۲۱٫۰۴	۳ – ۲۶
ویسٹ انڈیز	۶۹۰	۱۴	۴۱۹	۱۵	۲۷٫۹۳	۳ – ۴۴
سری لنکا	۷۰۲	۱۹	۴۰۷	۱۷	۲۸٫۵	۲ – ۱۰
زمبابوے	۱۲۰	۴	۵۰	۲	۲۵	۱ – ۱۸
آسٹریلیا	۱۳۱۲	۳۵	۷۹۰	۲۰	۲۶٫۵۶	۵ – ۴۳
انگلینڈ	۵۸۸	۱	۲۳۵	۱۱	۳۰٫۴۵	۳ – ۳۵
پاکستان	۱۰۳۶	۱۴	۷۶۱	۳۰	۲۵٫۳۶	۳ – ۱۷
	۵۳۵	۱۲	۳۳۰۲	۱۲۷	۲۶٫۰	۵ – ۴۳

[٥] قاضی محلہ، جالہ، دربھنگہ (بہار)۔
یوجنا، نئی دہلی

قارئین کی آراء اور مشورے

● پرچہ بہت خوب ہے۔ پھر بھی کچھ تشنگی کا احساس رہتا ہے۔ اس کی ضخامت بڑھائی جائے تو بہتر رہے گا۔ افسانوں کی تعداد بڑھائی جائے، قومی یکجہتی پر مشتمل کہانیوں اور مضامین کو ترجیح دیں۔ تعلیم، اسپورٹس اور بچوں کا ادب بھی شامل کریں تو میرے خیال میں حوصلہ مند قدم ہوگا۔ اور کچھ ایسا انتظام کیا جائے کہ پرچہ آسانی سے ہر جگہ دستیاب ہو۔ کبھی کبھی اردو ادب کی مشہور شخصیتوں پر نمبر نکالیں تو پرچہ بہت مقبول ہو جائے گا۔ جگہ جگہ تصویروں کا ہونا ضروری ہے۔ ترجموں کا سلسلہ شروع کر دیں تو چار چاند لگ جائیں گے۔

جمیل اسد دلیتانی کلینک، ۸ ٹریٹی
بازار اسٹریٹ، کلکتہ، ۷۳، ۷۰۰۔

● اب آپ نے یوجنا کو سجا سنوار دیا ہے۔ ڈیزائن بھی خوب ہے۔ اور سائز بڑا۔ نئے رنگ، روپ کا یہ رسالہ اچھا لگا۔ بدھائی ہے۔ یہ رسالہ ضرور ترقی پذیر ہوگا۔

کے۔ ایس بھٹناگر (خورشید) بی۔ ایس۔ ایم
(کمپاؤنڈر) رڑکی، ۲۴۷۶۶۷ (یو۔پی)

● جنوری ۱۹۸۷ء کا شمارہ موصول ہوا۔ بعد شکریہ! رسالہ معقول طور پر پڑھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ واقعی آپ نے اس میں زندگی کے تمام شعبہ جات سمیٹ لیے ہیں۔ ہر کالم اپنی جگہ نہ صرف منفرد ہے بلکہ اپنے اندر بھرپور معلومات جذب کیے ہوئے ہے۔ خصوصاً "ادب" میں آلِ احمد سرور صاحب کا مضمون، خواجہ صاحب کا اثاثہ اور غیاث الدین صاحب کا امراؤ جان اور اس کے دو کردار' ادبی خبریں اور تبصرے بھی اپنی جگہ عمدہ اور اہم ہیں۔ مبارکباد قبول فرمائیے، اتنے عمدہ اور دیدہ زیب رسالے کے لیے۔ دعا ہے کہ 'یوجنا' اپنی کُل آب و تاب کے ساتھ دنیائے ادب پر چھایا رہے۔

کلیم ضیاء، شعبہ اُردو، اسمٰعیل یوسف کالج
جوگیشوری (ایسٹ)، بمبئی ۶۰۔

● یوجنا کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ کرم فرمائی کے لیے شکریہ۔ بلاشبہ "یوجنا" اس اعتبار سے ایک مکمل اور معیاری رسالہ ہونے کا شرف حاصل کر چکا ہے۔ بعض خوشگوار تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ایک مستحکم مقصدیت کو لیے جلو میں لیے ہوئے ہے۔ مضامین و موضوعات کا تنوع دامنِ کشِ دل ہے۔ ادبی حصہ بھی خاصا جاندار و وسیع ہے۔ مجموعی طور پر آپ لوگوں کی کاوشیں لائقِ تحسین و ستائش ہیں۔ پُرخلوص مبارکباد و نیک خواہشات قبول فرمائیں۔

جُنید حزیں لاری: معرفت جناب
سرفراز احمد، پیپر مرچینٹ، دال منڈی
دارالسنی، ۲۲۱۰۰۱ (یو۔پی)

● یوجنا اپریل ۱۹۸۷ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ بہت خوشی کی بات ہے کہ یوجنا بھی اب دوسرے سرکاری پرچوں کی طرح علمی و ادبی شکل اختیار کر رہا ہے۔ رفتہ رفتہ یقین ہو رہا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب اس پرچے کی بھی علمی و ادبی لحاظ سے اپنی ایک انفرادیت ہوگی۔ "مالک کے دودھ پر بچے کی پرورش" معلوماتی مضمون ہے جو بہت محنت سے لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر شفیق اعظمی کا علمی و ادبی مضمون "منشی پریم چند اور اردو ناول" پسند آیا۔ ریاض احمد خاں کا مضمون "قومی یکجہتی کے علمبردار مہاتما گاندھی" بھی کسی حد تک مناسب ہے۔ یوجنا میں علمی و ادبی اور تنقیدی مضامین کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ جمنا پرشاد راہی اور عمران عظیم کی غزلوں نے متاثر کیا۔

درخواست ہے کہ آپ شاعری کے حصے پر بھی خاص توجہ فرمائیں۔

نشاط حسین خاں ۳/۱۶۸ ذاکر نگر
گلی نمبر ۱، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

● بندھوا مزدوری کے نظام سے متعلق یوجنا کا خصوصی شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس شمارے میں بندھوا مزدوروں کی بحالی کے لیے جو حکومتِ ہند نے اقدام اٹھائے ہیں اس کے بارے میں تفصیلی مضامین شائع کیے گئے ہیں جو بیحد معلوماتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں شامل مواد مستند ہے۔ کور کی تبدیلی پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ کور مضامین کی مناسبت سے ہی بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر ڈی۔ کے۔ بھارگو کا مضمون "تیراکیت اور آنتوں کا اثر" معلوماتی مضمون ہے۔ طب پر ہر شمارے میں دو تین مضامین شائع کریں تاکہ قارئین اس سے مستفید ہو سکیں۔ حسرت موہانی کا مضمون "تبرکات (اقسامِ سخن)" یوجنا کے قارئین کے لیے تبرکات میں سے ہی ہے۔ دلی کی ادبی و فنی سرگرمیاں شائقین اُردو کے لیے دلچسپ بھی ہیں اور معلومات افزا بھی۔ ایسی سرگرمیوں کی خبریں بالعموم یہاں کے اخباروں میں شائع نہیں ہوتی ہیں۔

محمد فہیم احمد۔ سیکٹر ۱۹، کوارٹر نمبر
اے/۴۴، راور کیلا (اڑیسہ)۔

●

پریم پال اشک[5]

پینے کے پانی کے لیے نئی تکنیکیں

زندہ رہنے کے لیے جہاں انسان کو ہوا چاہیئے، وہاں حیات جاودانی کے لیے پانی کی اہمیت اور افادیت کسی درجہ کم نہیں ہے اگر انسان کے جسم میں پانی ضرورت سے زیادہ چلا جائے تو بھی خطرناک ہوتا ہے اور اگر پانی معمول اور اعتدال سے کم ہو تو بھی اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

صاف شفاف پانی کی عدم فراہمی سے انسان لاتعداد امراض کا شکار ہو جاتا ہے غالباً اس پہلو کے پیش نظر حکومت نے دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کے مسئلے سے گھرے ہوئے عوام کو مقامی ذرائع سے پانی کی فراہمی کی نئی تکنیکوں کو فروغ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ پانی کے مسئلے کے شکار پچاس اضلاع کے لیے نیشنل ٹکنالوجی مشن کے تحت بھی مشن قائم کئے گئے ہیں۔ تاکہ ہر اس دیہی علاقے میں کہ جہاں پینے کے پانی کی کمی ہے، وہاں اس کی فراہمی کے ذرائع کے لیے منصوبے وضع کئے جائیں۔

پہلے دیہات میں لمبے لمبے پائپوں کے ذریعہ دور دراز علاقوں سے پانی بہم پہنچایا جاتا تھا، اور اس پر لاگت بھی کافی اٹھتی تھی اور اس کے ساتھ ہی پریشانی بھی اٹھانی پڑتی تھی۔ مگر اس تجربے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کئی علاقوں میں دستیاب صاف پانی کی فراہمی پر دور دراز علاقوں سے حاصل کئے گئے پانی کی نسبت لاگت کم آسکتی ہے۔

اگرچہ چھٹے منصوبے کے اختتام تک پینے کے پانی کے مسئلے کے شکار دیہات کی تعداد کہنے کو صرف ۳۸ ہزار تھی لیکن ازسرِنو تجزیے سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ ان کی حقیقی تعداد دو لاکھ ۲۰ ہزار ہے ان میں سے ایک لاکھ ۵۴ ہزار تین سو دیہات (یعنی اس کل تعداد کا ۶۸ فیصد) پینے کے پانی کے بڑے مسئلے کا شکار ہیں۔ جبکہ باقی دیہات میں فراہم کیا جانے والا پانی پینے کے ناقابل ہوتا ہے۔ اب منی مشینوں کے ذریعے پانی کو کیمیائی طریقے سے صاف کرکے پینے کے قابل بنایا جائے گا۔ اس کے علاوہ جن دیہات میں پینے کے پانی کی کمی ہے، وہاں جدید تکنیک کی حامل ان مشینوں کے ذریعے پانی کے وسائل تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔

پینے کے پانی کی کوالٹی کو برقرار رکھنے کے ٹکنالوجی مشن بھی چالو کئے جانے کے قدم اٹھائے گئے ہیں۔ دیہی اور قصباتی علاقوں کے سکینڈری اسکولوں اور کالجوں کی لیبارٹریوں کو پانی ٹیسٹ کرنے کے کِٹ بھی فراہم کئے جا رہے ہیں۔ اور انھیں اس کام کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ مٹی اور پانی کے تحفظ کی تکنیکیں اپنا کر زمین سے پانی نکالنے کے اقدامات بھی کئے جا رہے ہیں۔ ان تمام اقدامات کے لیے کم لاگت کے طریقے استعمال کرنے نہایت ضروری ہیں۔ کیوں کہ ساتویں منصوبے میں تمام ذرائع سے دیہی علاقوں میں پانی کی فراہمی کی اسکیموں کے لیے صرف چار ہزار کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

ٹکنالوجی مشن سے یہ احساس ہوا ہے کہ اس پروگرام کے طے شدہ نشانوں کے حصول کے لیے نئی پالیسی کے تحت چند اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ آبی نظام کو موثر کرنے اور اس کے استحصال کو روکنے کے لیے چند قوانین وضع کرنے بھی ضروری ہیں۔ ملک کی چند ریاستوں میں تو ایسے قوانین موجود ہیں، لیکن انھیں مؤثر ڈھنگ سے لاگو نہیں کیا گیا۔ ماہرین نے آبپاشی کے تمام پراجیکٹوں میں پینے کے پانی کا کوٹہ مخصوص کرنے کی بھی سفارش کی ہے۔ ان کے مطابق کسی علاقے کے طبعی و جغرافیائی سروے کی تفصیلات جانے بغیر ٹیوب ویل کھودنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیئے اور اس کے ساتھ ہی پانی کی کمی والے علاقوں میں ایسی فصلوں کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیئے کہ جنھیں پانی کی بہ افراط ضرورت ہوتی ہے، یہی نہیں بلکہ پینے کے پانی کا ایک قومی بورڈ قائم کیا جانا بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ سرکاری محکمے کی نسبت ایسا بورڈ زیادہ مؤثر انداز سے کام کر سکتا ہے۔

---

[5] ۶۳، ایم، بنگلہ صاحب روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

Vol. 7 No. 5-6 YOJANA (URDU) 1-30 June, 1987

سید علی*

صفر کی بنیاد کا بجٹ

صفر کی بنیاد کے بجٹ کا تصور ۱۹۷۰ میں **Prof. Peter A Phyrr** نے پیش کیا ہے۔ امریکہ کے سابقہ صدر جمی کارٹر نے سب سے پہلی بار صفر کی بنیاد پر بجٹ کے تصور پر عمل کیا تھا جبکہ وہ ۱۹۷۰ میں جارجیا (**Georgia**) علاقہ کے گورنر تھے۔ اس تصور پر عمل کرنے سے حکومت کے انتظامی اخراجات میں پچاس فیصد سے زیادہ کمی ہوئی تھی اور ٹیکس میں اضافہ کے بغیر کئی ترقیاتی پروگراموں پر عمل کیا گیا تھا۔ کئی کمپنیاں اور ریسرچ کی تنظیمیں بھی صفر کی بنیاد کے بجٹ کا تجربہ کر چکی ہیں اور اس تصور پر عمل کر رہی ہیں۔

بجٹ کی تیاری کے موجودہ روایتی طریقہ میں گذشتہ سال کی بنیاد پر بجٹ تیار کیا جاتا ہے فرض کیجئے کہ ۱۹۸۴ء میں کسی ڈپارٹمنٹ پر ۵ کروڑ روپے صرف کئے گئے ہیں۔ آئندہ سال ڈپارٹمنٹ کے عمل کو سالانہ **Increments** ادا کرنا پڑتا ہے اور قیمتوں میں اضافہ ہونے سے گرانی الاؤنس میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ۱۹۸۵ء میں اس ڈپارٹمنٹ کے اخراجات میں اضافہ ہونے کی وجہ سے اس کو گذشتہ سال کی بہ نسبت زیادہ رقم یعنی ۵۵ کروڑ روپے مختص کئے جاتے ہیں اس طریقہ میں کسی ڈپارٹمنٹ کی کسی اسکیم کی افادیت کا جائزہ نہیں لیا جاتا کسی اسکیم کی افادیت میں کمی ہونے کے باوجود اس اسکیم پر مصارف میں کمی یا اس اسکیم کو ختم نہیں کیا جاتا۔ بجٹ کی تیاری کے اس طریقہ میں مالی وسائل کا صحیح استعمال ممکن نہیں ہے۔

اس کے برخلاف صفر کی بنیاد کے بجٹ میں ماضی کا تذکرہ نہیں ہوتا بلکہ ہر اسکیم کو اس کے مقصد، طریقہ کار اور محصلہ وسائل کی بنیاد پر قطعیت دی جاتی ہے۔ اس طریقہ میں کسی بھی ڈپارٹمنٹ کو یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ کسی اسکیم پر کس حد تک عمل کیا گیا ہے۔ اور جس اسکیم پر عمل آوری ہو رہی ہے اُس کے مصارف کو نئے بجٹ میں شامل کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے جواز کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔ صفر کی بنیاد کے بجٹ میں جس اسکیم پر عمل آوری ہو رہی ہے اس کی افادیت پر بار بار غور کیا جاتا ہے۔ اگر کسی اسکیم کی افادیت میں کمی ہو رہی ہے تو اس اسکیم پر اخراجات میں کمی کی جاتی ہے یا اس اسکیم کو ختم کیا جاتا ہے اور ایسی ہی اسکیم شروع کی جاتی ہے جس سے عوام کو زیادہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس نئے طریقے میں نہ صرف مصارف میں کمی کی جاتی ہے بلکہ جو مصارف کئے جا رہے ہیں اُن کا صحیح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ صفر کی بنیاد کے بجٹ کا اصل مقصد یہ ہے کہ مالی وسائل بہتر طور پر استعمال کر کے عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جائے۔

ہندوستان میں ساتویں منصوبے کے دستاویز میں صفر کی بنیاد کے بجٹ کی سفارش کی گئی ہے جس کے مطابق سب سے پہلی دفعہ یکم اپریل ۱۹۸۷ء سے اس نئے طریقہ پر کام شروع ہوا ہے۔ صفر کی بنیاد کے بجٹ پر عمل کرنے کی وجہ سے حکومت کے انتظامی اخراجات میں کمی ہوگی اور ترقیاتی اسکیموں کی [illegible] پر زیادہ مالیہ صرف کیا جا سکتا [illegible] منصوبے کے اہم مقاصد مثلاً [illegible] اور بے روزگاری کا خاتمہ کرنے میں "صفر کی بنیاد پر بجٹ" کا نیا طریقہ معاون ثابت ہوگا۔

* لیکچرر گورنمنٹ کالج (لڑکیاں) نلگونڈہ ۵۰۸۰۰۱۔

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadurshah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوجنا

دو روپے

ہمارے منصوبے (نظم)

(احمد عثمان عارف نقشبندی)

ستیہ مورتی — بھارت میں پارلیمانی جمہوریت کا معمار

(ایم پلاد سنگھ)

غزلیں / نظم

سلام پرویز، ایم۔ آر۔ قاسمی

اسد رضوی

یعقوب یاور کوٹی

محمد عبداللہ

دربھنگہ ضلع میں بیس نکاتی پروگرام کا جائزہ

دربھنگہ ضلع بہار کا سیاسی لحاظ سے بہت ہی اہم مگر صنعتی اعتبار سے بہت ہی پچھڑا ہوا علاقہ ہے جہاں کی اکثریت مفلس لوگوں کی ہے۔ بہار کے اتر میں واقع ہے۔ ضلع شمال میں مدھوبنی اور جنوب میں سمستی پور سے ملا ہوا ہے۔ اس کے پورب میں سہرسا اور پچھم میں مظفر پور ہے اس کی کل آبادی ۲۰،۸۱۹۳ ہے۔ جس میں ۹،۲،۷،۵۲ مرد اور بقیہ عورتیں ہیں۔ شہر میں رہنے والوں کی تعداد ۱،۶۳،۷۰۱ ہے جبکہ دیہاتی علاقے میں ۱۸،۳۱،۸۹۲ اشخاص بستے ہیں۔

اس ضلع میں ۱۲ بلاک اور ۳ گرام پنچایت ہے۔ اس کے گاؤں کی تعداد ۱۳۱۵ ہے لیکن اس کے صرف ۶۴۶ گاؤں میں بجلی کی سہولت میسر ہے۔ پورے ضلع میں سٹیڈولڈ کاسٹ کی تعداد ۲،۹۳،۲۱۵ ہے جو آبادی کے لحاظ سے یہاں کی آبادی کا صرف ۲ر۸۴ فیصد ہے کیونکہ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق بہار کی آبادی ۶،۹۹،۱۴،۷۳۴ ہے۔

یہاں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب ۹ر۲۳ فیصد ہے۔ جس میں خواندہ مردوں کی تعداد ۳،۰۵،۲۷۸ ہے اور خواندہ عورتیں ۱،۲۵،۴۸۶ ہیں۔ ایگریکلچر سے منسلک جو لوگ ہیں ان کی تعداد ۲،۵۰،۳۲۷ ہے جو کہ کل آبادی کا ۳ر۲۴ فیصد ہے جبکہ ایگریکلچر مزدوروں کی تعداد ۲،۹۳،۹۵۳ یعنی ۴۴،۳۵ فیصد ہے۔ گھریلو انڈسٹری میں صرف ۲ر۴ فیصد لوگ لگے ہوئے ہیں۔ یہاں تین بڑے کارخانے ہیں اور چھوٹے کل کارخانوں کی تعداد ۱۴ ہے۔ تو کل کارخانوں کی بات تھی اب ایک نظر (Animal Hus bandry) پر ڈالیں۔ دودھ دینے والے جانوروں کی تعداد مندرجہ ذیل ہے۔

دودھاری گائے	۲۱،۹۶
بیکار گائیں	۲۵،۰۷۶
بیل	۱،۴۸،۹۸۱
دودھاری بھینسیں	۲۹،۰۴۸
بیکار بھینسیں	۳،۸۵۲
بکریاں	۱،۷۲،۶۳۳
مرغیاں	۱،۶۵،۸۵۲
بھیڑیں	۲،۳۰۶

دربھنگہ ضلع میں پوکھروں کی بہتات ہے۔ مچھلی پالن ایک اچھا آمدنی کا ذریعہ ہے ایک اچھی خاصی تعداد اس کام میں لگی ہوئی ہے۔

ایک جائزے کے مطابق ۶،۹۱۵ر۲ ہیکٹیئر کا رقبہ جو کہ سرکاری دیکھ ریکھ میں مچھلی پالن کر رہا ہے جبکہ پرائیویٹ تالاب کا رقبہ ۱،۱۴،۴۰۰ ہیکٹیئر ہے۔ مختلف کام کے لیے کام کی نوعیت کے اعتبار سے مندرجہ ذیل رقم ایسے افراد کو فراہم کی جا رہی ہے جو کہ بے روزگار ہیں اور کام کرنے کی صلاحیت اور دلچسپی بھی رکھتے ہیں۔ یہاں کچھ خاص چیزوں کے لیے دی جانے والی رقمیں دی جا رہی ہیں۔

ITEMS	UNIT COST
۱۔ کھیتی کے لیے	۲، ۰۰
۲۔ ڈیزل پمپ سیٹ (S.H.P)	۶، ۰
۳۔ ٹریکٹر	۱،۲۵،۰۰۰
۴۔ ہل بیل	۳،۲۰۰
۵۔ گائے بھینس ایک جوڑا اس میں ایک ماہ کا چارا انشورنس اور ضروری دوا بھی شامل ہے	۶،۵۸۵
۶۔ مچھلی پالن	۱۶، ۰۰

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

۵ یونین سک آف انڈیا، پوسٹ کٹرا، ضلع مظفر پور (بہار)

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر: سیّد ظفیر الحسن
ایڈیٹر: جگندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹر: محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر: وسیم حیدر
عبدالحمید

شرح چندہ
سالانہ ۲۰ روپے، دو سالہ ۳۶ روپے
سہ سالہ ۴۸ روپے، فی کاپی دو روپے
طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں
کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت۔

جلد ۷ | شمارہ ۷، ۸ | یکم تا ۳۱ جولائی ۱۹۸۷ء | ۱۰ اساڑھ تا ۹ شراون شک ۱۹۰۹ | قیمت: دو روپے، فون: ۶۰۱۸۱۸

اِس شمارے میں

اداریہ		۲
قومی یکجہتی: محبِّ وطن اقبال کا ایک باب	سیّد مظفر حسین برنی	۴
ہمارے منصوبے (نظم)	محمد عثمان عارف نقشبندی	۸
آزادی کے چالیس برس:		
ترقیاتی پروگراموں میں اقلیتوں کی شرکت	ایم۔ ایل۔ بجاج	۹
ناکردہ گناہ	م۔ ک۔ مہتاب	۱۲
بہار: بہار کا سماجی و اقتصادی منظر	نریندر جوشی	۱۶
دربھنگہ ضلع میں ۲۰ نکاتی پروگرام کا جائزہ	محمد عبداللہ	کور ۲
زراعت: اندرا گاندھی نہر	کسُم چوپڑہ	۱۹
پپیتا، اس کی قسمیں اور باغبانی	ڈاکٹر مسعود حسین	۲۲
فصلوں کے دشمن اور ان سے حفاظت	عبیدالرحمٰن	۲۵
درخت	حمید آرموری	کور ۴
سماجیات: تمباکو نوشی یا زہر نوشی	تشنہ بلگرامی	۲۹
شخصیات: ستیہ مورتی۔ بھارت میں پارلیمانی جمہوریت کا معمار	پرہلاد سنگھ	۳۲
ادب: سیامتُور راستہ (افسانہ)	م۔ م۔ راجندر	۳۷
دشمنِ جاں (انشائیہ)	صبا حسنی	۳۹
غزلیں	سلام پردیز، ایم۔ آر قاسمی، ...حیدر رضوی	۴۱
آج کی شکنتلا (نظم)	...یعقوب یاور کوٹی	۴۱
طب: قد بڑھانے والے ہارمون	محمد برہان حسین	۴۲
آپ سب کے لیے	ادارہ	۴۵
قارئین کی آراء اور مشورے	تسنیم فاطمہ ایم اے، سید بشیر رضوی، محمد ایوب، اطہر منیر دربھنگوی، روشن لال روشن بنارسی، مس نیر سلطانہ، شیخ محمد علی، محمد جہانگیر ذاکر حسین	۴۷
چترنجن لوکوموٹیو		کور ۳

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:۔
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن)۔ **آر۔ ایس۔ منجال**

ترسیلِ زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی

اقتصادی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہے۔ ہندوستان ایک ترقی پذیر ملک ہے، اس کے عوام کو اقتصادی ترقیوں اور کامیابیوں سے ہمکنار کرانا بے حد ضروری ہے۔ ملک کی ترقی اور خوشحالی کا اندازہ بڑی بڑی صنعتوں کی ترقی کی بنیاد پر ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ ہندوستان کی اقتصادی پالیسی کو ایک ایسے وسیع ڈھانچے پر اٹھایا گیا ہے جس میں چھوٹے صنعت کار اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعے دیہات میں صنعت کاری کے عمل کو فروغ مل سکتا ہے، روزگار کے مواقع بڑھائے جا سکتے ہیں، دیہات میں چھوٹی بچتوں کو فروغ دے کر سرمایہ کاری میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کے متعدد فائدوں کے پیش نظر حکومت ہند نے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی سماجی اور اقتصادی اہمیت تسلیم کی ہے، چنانچہ ملک کی منصوبہ بند ترقی کے تحت ہر پنجسالہ منصوبے میں پہلے کے مقابلے اس مد کے لیے زیادہ رقم مختص کی جا سکی ہے، تجارتی بنکوں کو قومیانے، مختلف مالیاتی اور ادارہ جاتی منصوبوں کی تشکیل وغیرہ سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو آگے بڑھانے کے لیے کوشاں ہے۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے ۱۲۶ آئٹم مخصوص کئے گئے تھے مگر ۸۵-۱۹۸۴ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۸۷۲ تک پہونچ چکی تھی۔ حصول آزادی کے بعد حالانکہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو بڑی صنعتوں سے کافی مقابلہ کرنا پڑا، لیکن اس کے باوجود چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی شرح ترقی میں اضافہ ہوا۔ ۷۹-۱۹۷۸ میں ۷ لاکھ ۳۴ ہزار چھوٹے پیمانے کے صنعتی کارخانے تھے۔ مگر ۸۵-۱۹۸۴ء کے آخر تک ان کی تعداد بڑھ کر ۱۲ لاکھ ۸۰ ہزار تک پہونچ گئی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ چھوٹے پیمانے کے صنعتی اداروں سے ملک میں بے روزگاری کم کرنے میں مدد ملی ہے۔



خواجہ احمد عباس کی وفات

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اردو کے مشہور و معروف ادیب اور صحافت کے میر قلم ساری کے میدان کے شہسوار جناب خواجہ احمد عباس یکم جون کو بمبئی میں دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے۔ آپ کو بمبئی کے شمال مغرب میں جوہو قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ پانی پت میں پیدا ہوئے، آپ کی تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی کی تھی، آپ نے ۱۹۳۳ء میں بی۔ اے کا امتحان اور ۱۹۳۵ء میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا۔ آپ بمبئی کرانیکلز سے وابستہ رہے، جس میں آپ کے فلمی تبصرے بیحد پسند کئے جاتے تھے۔ بلٹز کا آخری صفحہ بھی آپ کے قلم کا مرہون منت رہا۔ ۱۹۳۹ء میں کرانیکلز سے الگ ہو گئے اور فری لانس صحافی کی حیثیت سے لکھنے لگے۔

صدر جمہوریہ ہند نے خواجہ احمد عباس کو بے پناہ ذہین انسان بتلاتے ہوئے کہا کہ خواجہ احمد عباس کی تخلیقی صلاحیتوں نے ہندوستان کی ثقافتی زندگی کو مالا مال کیا ہے۔

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے خواجہ صاحب کی موت پر اپنے تعزیتی پیغام میں کہا ہے کہ انھیں خواجہ احمد عباس کی وفات کی خبر سن کر بے حد افسوس اور دکھ ہوا، وہ قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے علمبردار تھے، وہ حیرتناک حد تک تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے انصاف اور عوام کی آواز کے اظہار نیز انسانی بھائی چارہ کے پیغام کو عام کرنے کے لیے اپنی تحریروں اور فلموں کو وقف کر دیا تھا۔ وزیر اعظم نے کہا کہ عباس نے اپنا آخری صفحہ لکھ لیا،

لیکن ان کی مثال ہمیں سیکولر، جمہوری اور انسان دوست بھارت کی تعمیر کے لیے کام کرنے کا متواتر حوصلہ دیتی رہے گی ۔

وزیر امور خارجہ شری نرائن دت تیواری نے کہا کہ آپ کی فلموں اور کتابوں کی بڑی تعداد نے دیش واسیوں کے دلوں میں آپکی یاد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی ہے

اطلاعات ونشریات کے وزیر مملکت شری اجیت پانجہ نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ خواجہ احمد عباس اُردو کے ایک ممتاز ادیب تھے ۔ انھوں نے صحافت اور فلمی دنیا میں ایک امتیازی مقام حاصل کیا ۔ انھوں نے ۲۵ فلمیں تیار کیں ۔ ان کی فلم "شہر اور سپنا" کو صدر کا طلائی تمغہ حاصل ہوا ۔

شری عباس نے ہندی، انگریزی اور اُردو میں ۰۰ کتابیں لکھیں ۔ انکی موت سے فن، ادب اور صحافت کے میدان میں جو خلاء پیدا ہوگیا، اُسے پُر کرنا دشوار ہے ۔ اُتر پردیش کے گورنر جناب محمد عثمان عارف نے کہا کہ آپ کی وفات سے ادب، علم اور صحافت کی دُنیا کو جو نقصان پہونچا ہے، وہ ناقابلِ تلافی ہے ۔

خواجہ احمد عباس کو ۱۹۵۱ء میں بھارتی وفد کے رکن کی حیثیت سے چین بلایا گیا ۔ آپ نے رُوس، چیکوسلواکیہ، پولینڈ، برطانیہ اور بہت سے دیگر یوروپی ممالک کا دورہ کیا ۔ خواجہ احمد عباس نے جن فلموں کی کہانی لکھی ان میں سنا سنسار، نئی دنیا، میںا، آدھی رات، آوارہ، شری چار سو بیس، ایکٹرس، جاگتے رہو، میرا نام جوکر، زندگی زندگی، بابی اور اچانک وغیرہ شامل ہیں ۔

خواجہ احمد عباس نے ۱۹۴۶ء میں دھرتی کے لال کی ہدایت کاری بڑی کامیابی سے انجام دی، اس میں قحط بنگال کے دردناک مناظر دکھلائے گئے ۔ آپ کی بہت سی کتابوں کے روسی زبان میں تراجم ہوئے ہیں ۔ آپ کو بہت سے ہندوستانی اور بین الاقوامی اعزازات حاصل ہوئے ۔ ۱۹۶۹ء میں آپ کو پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا ۔

آپ کے پسماندگان میں ایک صاحبزادی ہیں ۔ ادارہ یوجنا کے ارکان آپ کی وفات پر بیحد مغموم ہیں، آپ کی مہربانیاں اور شفقتیں ہمیشہ ہی یوجنا کو حوصلہ دیتی رہیں، آپ نے اس رسالے میں خصوصی شماروں کے لیے بہت سے فکر انگیز مقالے عطا کیے، جنھیں عوام نے بیحد پسند کیا ۔

آپ کی وفات بلاشبہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے لیکن موت ایک تلخ حقیقت ہے اور اس سے رستگاری ممکن نہیں ۔ آپ کی وفات پر اظہار افسوس کرنے والوں میں ہریانہ کے گورنر جناب مظفر حسین برنی، اتر پردیش کے وزیر اعلےٰ جناب ویر بہادر سنگھ اور ہزارہا دیگر افراد شامل ہیں ۔

ادارہ آپ کی وفات کو اُردو دنیا کا زبردست نقصان تصور کرتا ہے ۔

مہدی نظمی کی رحلت



ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

اُردو دنیا میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سُنی گئی کہ ۳۰ مئی ۱۹۸۷ء کو اُردو کے مقبول وممتاز شاعر، صحافی، ادیب جناب مہدی نظمی اس دُنیا سے رخصت ہو گئے ۔ آپ نے مختلف روزناموں، ماہناموں، ہفتہ وار اخبارات کی ادارت کی جن میں روزنامہ ناظم رامپور، روزنامہ نئی دنیا دہلی، روزنامہ پیام وطن، روزنامہ عوام دہلی، ہفتہ وار شیر پنجاب دہلی، ہفتہ وار ایشیا دہلی، پرچم ہند دہلی، ہفتہ وار کاروانِ وطن دہلی، پندرہ روزہ حسینی آواز، ماہنامہ حجابِ ستان اور ماہنامہ آستانہ دہلی قابلِ ذکر ہیں ۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں ہندوستان، بھارت درشن، ہندوستان ارمِ بے نظیر، نذر نانک، صحیفۂ عقیدت، نذر اہلِ بیت، مظلوم کربلا، نقشِ فریاد، سازو آواز، حرفِ دانش، رنگِ سرخ، نہج البلاغہ کے ہزار سال، غزل غزل، منظر پس منظر اور شمع فروزاں وغیرہ شامل ہیں ۔

تاریخ وسیاست کے موضوعات پر خالد بن ولید، دوست گورو، اندرا گاندھی اور اقدام ونظریہ وغیرہ کتابیں خاصی اہمیت رکھتی ہیں ۔ انھوں نے ناول بھی لکھے جن میں دھوپ چاندنی، گرم خون، امیر عامرا اور زلف و زنجیر وغیرہ شامل ہیں ۔

مرحوم اس سال اگست میں مہاتما گوتم بدھ کے موضوع پر ایک بڑا سیمنار نئی دہلی میں نارتھ انڈیا ہسٹری کانگریس کے زیرِ اہتمام کرنا چاہتے تھے اور دن رات اس کی تیاریوں میں مصروف تھے ۔ مرحوم نے ۱۹۸۴ء میں ابوطالب اکیڈمی قائم کی جو اس کے پیغام کو عوام الناس میں موثر بنانے کے لیے سرگرم عمل رہی ۔

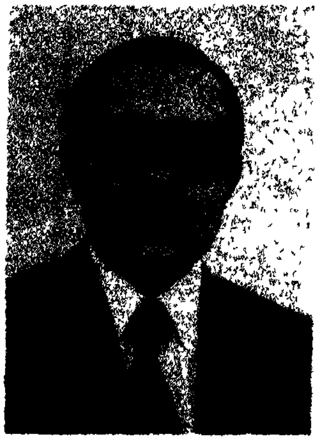
آپ نے ۲۳ اپریل ۱۹۲۳ء کو لکھنؤ کے ایک علمی خانوادے میں آنکھیں کھولیں ۔ غالب اکیڈمی میں ان کی یاد میں ۵ جون کو جو تعزیتی جلسہ ہوا اس میں مرحوم کی عالمانہ صحافیانہ خدمات کا اعتراف کیا گیا ۔ اور ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر اکمل اجملی، جناب گلزار دہلوی، جناب ذہین نقوی، جناب ابرار کرتپوری اور دیگر بہت سے حضرات نے ان کی بھاری بھرکم شخصیت پر روشنی ڈالتے

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ

"محبِ وطن اقبال" کا ایک باب

قومی یکجہتی زندگی کے آئینے میں



سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ

اقبال کی شخصی زندگی بھی قومی یکجہتی کی ایک درخشاں مثال ہے۔ ان کے احباب اور مداحوں کا ایک وسیع حلقہ تھا جس میں ملک کے مختلف حصوں کے اور ہر فرقہ و مذہب کے لوگ شامل تھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس وقت کے لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر شادی لال نے بینچ میں ان کی شمولیت کی مخالفت کی اور اس تکلیف دہ تجربہ کے باوجود جس میں فرقہ پرست عناصر کی سازش سے ان کے بڑے بھائی کو ایک جھوٹے مقدمے میں پھانسا گیا تھا، ہندوؤں اور سکھوں میں مقتدر حضرات سے اقبال کے بہترین دوستانہ تعلقات تھے۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد

مہاراجہ سرکشن پرشاد سے ان کے تعلقات بے ریا دوستی، پُرخلوص محبت اور ایک دوسرے کی گہری عزت و احترام کا نمونہ ہیں۔ جیسا کہ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ اقبال نے ان کی ایک بیٹی کے لیے پنجاب میں کوئی مناسب رشتہ تلاش کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

سر جوگندر سنگھ: سر جوگندر سنگھ نے ذوالفقار علی خاں کے موٹر کے بارے میں جو اتفاقیہ طور پر ایک حملہ کہا تھا، اسے نظم کرکے تو اقبال نے انھیں ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے اس سے انھوں نے خاموش اور مسلسل عمل کے فلسفہ کی وضاحت ان لفظوں میں کی ہے ؎

کسی سے کی بات جگندر نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش
بیٹرے کہا جب یہ موٹر پہ منحصر
ہے جادۂ حیات کا ہر ہیز پا خموش

سردار امراؤ سنگھ

اقبال کے ایک اور قریبی دوست سردار امراؤ سنگھ تھے۔ ۱۹۳۲ء میں گول میز کانفرنس سے واپس آتے ہوئے اقبال نے پیرس میں ان کے پاس ہی قیام کیا تھا۔ سردار امراؤ سنگھ نے اقبال پر انگریزی میں لکھی ہوئی پہلی کتاب (A voice from the east) (مشرق کی ایک آواز) کا پیش لفظ بھی لکھا تھا جو نواب ذوالفقار علی خاں نے تصنیف کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب میں اقبال کی جتنی نظمیں بھی شامل ہیں، ان کا انگریزی ترجمہ سردار امراؤ سنگھ ہی کا کیا ہوا ہے۔

سردار موصوف کو ایک اور سبب سے بھی یاد رکھا جائے گا کہ وہ مشہور فن کار امرتا شیرگل کے باپ تھے جو ہمارے زمانے کی سب سے بڑی آرٹسٹ ہوئی ہیں۔

شہزادی بمبا دلیپ سنگھ

اقبال کے مخلصانہ تعلقات شہزادی بمبا سے بھی تھے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پر پوتی ہوتی تھیں۔ شہزادی بمبا دلیپ سنگھ سے علامہ اقبال کی ملاقات ۱۹۱۱ء میں سردار جوگندر سنگھ نے کروائی تھی۔ کیونکہ شہزادی بمبا علامہ سے ملاقات کی بیحد خواہشمند تھیں۔ یہ ملاقات شہزادی بمبا کی کوٹھی پر ہی ہوئی تھی۔ اس موقع پر شہزادی کی فرمائش پر علامہ نے ایک نظم بھی سنائی۔ مرزا جلال الدین اور سر جوگندر سنگھ بھی اقبال کے ساتھ تھے۔

یہاں شہزادی بمبا سے علامہ اقبال کی ایک اور ملاقات کا ذکر غالباً بے جا نہ ہوگا۔ ان دنوں سر جوگندر سنگھ کہیں گئے ہوئے تھے۔ علامہ اقبال مرزا جلال الدین ہی کے ہمراہ شہزادی کی دعوت

ف ذکرِ اقبال: عبدالمجید سالک، ص ۸۰۔

پھر اس سے ملنے گئے۔ اس بار شہزادی بمبا کی ایک آسٹرین سہیلی علامہ سے ملنے کی مشتاق تھی۔ اس دعوت میں ایک اور یورپین خاتون بھی موجود تھی۔ ان دو خواتین میں سے ایک نے علامہ کی خدمت میں ایک پھول پیش کیا، دوسری اپنی گود میں ایک خوبصورت بلی لیے ہوئے بیٹھی تھی۔ علامہ کی نظمیں 'پھول کا تحفہ عطا ہونے پر' اور '۔۔۔ کی گود میں بلی دیکھ کر' اسی موقع کی یاد میں لکھی گئی تھیں۔ مذکورہ بالا دونوں نظمیں ذیل میں درج ہیں ؎

۔۔۔۔ کی گود میں بلی دیکھ کر

تجھ کو دزدیدہ نگاہی یہ سکھا دی کس نے؟
رمزِ آغازِ محبت کی بتا دی کس نے؟
ہر ادا سے تری پیدا ہے محبت کیسی
نیلی آنکھوں سے ٹپکتی ہے ذکاوت کیسی
دیکھتی ہے کبھی ان کو، کبھی شرماتی ہے
کبھی اٹھتی ہے، کبھی لیٹ کے سو جاتی ہے
آنکھ تیری صفتِ آئینہ حیران ہے کیا؟
نورِ آگاہی سے روشن تری پہچان ہے کیا؟
مارتی ہے انھیں پونچھوں سے، عجب ناز ہے یہ
چھیڑ ہے، غصہ ہے یا پیار کا انداز ہے یہ؟
شوخ تو ہو گی تو گودی سے اتاریں گے تجھے
گر گیا پھول جو سینے کا تو ماریں گے تجھے
کیا تجسس ہے تجھے؟ کس کی تمنائی ہے؟
آہ! کیا تو بھی اسی چیز کی سودائی ہے؟
خاص انسان سے کچھ حسن کا احساس نہیں
صورتِ دل ہے یہ ہر چیز کے باطن میں مکیں
شیشۂ دہر میں مانندِ مےِ ناب ہے عشق
روحِ خورشید ہے، خونِ رگِ مہتاب ہے عشق

دلِ ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی
نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی
کہیں سامانِ مسرت، کہیں سازِ غم ہے
کہیں گوہر ہے، کہیں اشک، کہیں شبنم ہے

٭

پھول کا تحفہ عطا ہونے پر

وہ مستِ ناز جو گلشن میں جا نکلتی ہے
کلی کلی کی زباں سے دعا نکلتی ہے
"الٰہی پھولوں میں وہ انتخاب مجھ کو کرے
کلی سے رشکِ گلِ آفتاب مجھ کو کرے"
تجھے وہ شاخ سے توڑیں؟ زہے نصیب ترے
تڑپتے رہ گئے گلزار میں رقیب ترے
اٹھا کے صدمۂ فرقت وصال تک پہنچا
تری حیات کا جوہر کمال تک پہنچا
مرا کنول کہ تصدق ہیں جس پہ اہلِ نظر
مرے شباب کے گلشن کو ناز ہے جس پر
کبھی یہ پھول ہم آغوشِ مدعا نہ ہوا
کسی کے دامنِ رنگیں سے آشنا نہ ہوا
شگفتہ کر نہ سکے گی کبھی بہار اسے
فسردہ رکھتا ہے گلچیں کا انتظار اسے

٭

عبدالمجید سالک کے مطابق اقبال کی ملاقات شہزادی بمبا سے ۱۹۱۱ء میں ہوئی جبکہ "بانگِ درا" میں نظم "پھول کا تحفہ عطا ہونے پر" حصہ دوم (۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک) کے کلام میں شامل ہے۔ سنہ میں کچھ شمار اختلاف ہو سکتا ہے مگر واقعات صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ نظم غلطی سے حصہ دوم میں شامل ہو گئی ہو۔ دوسری نظم "۔۔۔ کی گود میں بلی دیکھ کر" حصہ سوم میں ہے، وہیں اس کو بھی شامل ہونا چاہیے تھا۔

سروجنی نائیڈو : سروجنی نائیڈو کو اقبال

سے بڑی گہری عقیدت تھی۔ ایک زمانہ میں تو وہ اس حد تک متاثر تھیں کہ اپنے ایک نجی انگریزی خط میں، جو انھوں نے ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو بمبئی سے پنڈت جواہر لال نہرو کے نام لکھا تھا، بے ساختہ اقبال کے ایک مصرعہ کا ایک حسین ٹکڑا لکھتی چلی جاتی ہیں[۲]:

"مجھے ڈر ہے کہ آپ میری عجلت میں لکھی ہوئی تحریر پڑھ بھی سکیں گے یا نہیں۔ میری کلائی میں سخت درد ہے، جیسے اقبال کے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ "میں سراپا درد ہوں"۔

ملک راج آنند

انگریزی کے مشہور ناول نگار ڈاکٹر ملک راج آنند نے ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کیا ہے۔ مگر اس سے اقبال کے کردار کے ایک ایسے پہلو پر روشنی پڑتی ہے جو عام طور پر معلوم نہیں ہے۔ ۱۹۲۲ء میں ملک راج آنند نے جو اس وقت ایک نوجوان طالب علم تھے اور شاعر بننے کی تمنا رکھتے تھے، اقبال سے ملاقات کی۔ انھوں نے اقبال سے کہا کہ میری ایک دوست اور میری بھابی باہر انتظار کر رہی ہیں۔ یہ سن کر اقبال خود اٹھے اور انھیں اندر لے آئے۔ اس اخلاق سے حوصلہ پا کر ملک راج آنند نے عرض

"I wonder if you can read my scrawl. My wrist is stiff with pain. Main sara-pa dard hun" to quote Iqbal literally.
A Bunch of old letters: Jawahar Lal Nehru p.49.

یہ "بانگِ درا" کی نظم "صقلیہ (جزیرۂ سسلی)" کے اس شعر سے ماخوذ ہے ؎

درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں

---

[۱] ذکرِ اقبال۔ عبدالمجید سالک۔ ص ۸۱۔

کیا "میں کچھ نظمیں اور طفلانہ محبت کے اشعار (Calf-Love Poems) لایا ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنی دوست یاسمین کی طرف دیکھا۔ اقبال نے کہا "اگر وہ طفل (Calf) یہ حسین لڑکی ہے تو تم دونوں کو مبارک ہو۔" ملک راج آنند نے کہا "میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہوں اور یہ لڑکی مسلمان ہے۔" اس پر اقبال نے کہا: "اس طرح کا ملاپ تو میں چاہتا ہوں۔" جب یاسمین ایک ریلوے گارڈ کی بیسری بیوی کے طور پر بیاہ دی گئی (جس نے آخر کار یاسمین کو قتل کر دیا) تو اقبال نے ملک راج آنند کو سفر خرچ کے لیے کچھ روپے بھی دیئے تاکہ وہ لندن جا کر فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔

اس واقعہ سے ظاہر ہوگا کہ وہ کیسا محبت بھرا دل رکھتے تھے اور ہر ایک سے ان کے تعلقات کیسے مخلصانہ تھے، خواہ وہ کسی بھی ذات، عقیدے یا مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔

ان کے دوستوں اور مداحوں کے بیان کئے ہوئے ایسے بہت سے قصے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ایک سادہ ذہن، انسان دوستی نیز باہمی ہمدردی کا سچا جذبہ رکھنے تھے۔ اس سلسلہ میں دو واقعات اور درج کرنا چاہتا ہوں۔

دو یتیم ہندو بچّوں کی دستگیری

پہلا[1] واقعہ عبدالرشید طارق بیان کرتے ہیں۔ علامہ کی قیام گاہ کے نزدیک ہی ایک سینما تھا۔ ایک بار انھوں نے سینما کے شور و غوغا کی طرف علامہ کی توجہ دلاتے ہوئے دریافت کیا کہ آپ جیسے فلسفی اور شاعر کے آرام میں اس سے خلل نہیں پڑتا؟ علامہ فرمانے لگے مجھے تو اس کی عادت پڑ گئی ہے

انھوں نے جب ان کو کوٹھی بدل لینے کی صلاح دی تو علامہ نے یہ کہہ کر ٹال دیا "اصل بات یہ ہے کہ اس کوٹھی کے وارث دو یتیم ہندو بچے ہیں، جنھیں میں ۱۳۰ روپے کرایہ دیتا ہوں۔ میں نے اگر یہ کوٹھی چھوڑ دی تو اس کا اتنا کرایہ ان یتیموں کو شاید نہ مل سکے۔"

ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑا

دوسرے[2] واقعہ کے راوی جلال الدین اکبر ہیں۔ یہ اسٹیٹ اسکالرشپ کا معاملہ تھا جس کے تحت ایم، اے فارسی میں اوّل آنے والا طالب علم اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے برطانیہ جانے کا مستحق قرار پاتا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں اقبال ایم، اے فارسی کے صدر ممتحن اور پیپر سیٹر (Paper Setter) تھے۔ اکبر صاحب نے ایم، اے کے امتحان میں شرکت کی لیکن ان کے پرچے حسب توقع اچھے نہ ہوئے۔ چنانچہ ان کی سفارش کرنے کے لیے حافظ محمود شیرانی اور سر عبدالقادر علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ اگر اکبر فیل ہو گئے تو اسٹیٹ اسکالرشپ کوئی ہندو لے جائے گا۔ اقبال نے جواب دیا کہ "میں جانتا تھا کہ اُمیدوار کو فارسی بہت اچھی آتی ہے۔ وہ ایک اچھا شاعر بھی ہے اور ہونہار طالب علم بھی لیکن جو مستحق ہے اسے یہ اسکالرشپ ملنا چاہیئے۔" چنانچہ اس سال اسٹیٹ اسکالرشپ صرف دو نمبروں کے فرق سے ایک ہندو طالب علم کو مل گیا اور وہ طالب علم فارسی کے مشہور اسکالر اور ادیب ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑا تھے۔ جو کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے صدر رہے۔ انھوں نے مجھ سے خود اس واقعہ کی تصدیق کی۔

فتوئے کفر

مختلف فرقوں کے افراد سے قریبی تعلق رکھنے کی بنا پر کبھی کبھی اقبال کو سمجھنے میں بھی لوگوں سے غلطی ہوئی۔ آفتاب[3] جیسی نظم لکھنے اور خصوصاً اپنی نظم "رام" میں ان کو "امام" اور "چراغِ ہدایت" کہنے پر اقبال کو اپنے بعض کٹر ہم مذہبوں کی نظر میں معتوب ہونا پڑا۔ چنانچہ یہ ترکِ موالات کے بعد کے زمانے کا ذکر ہے۔ جب "شدھی" "سنگھٹن" اور "تبلیغ" کا غلغلہ زوروں پر تھا۔ ایک خوش طبع مسلمان نے دل لگی کی غرض سے "پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری" کے نام سے مسجد وزیر خاں لاہور کے خطیب مولانا ابو محمد سید دلدار علی شاہ کو، جو اپنے شوقِ تکفیر کے لیے مشہور تھے، یہ استفتا لکھا:

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور حامیانِ شرعِ متین اس مسئلے میں کہ ایک شخص اشعار میں آفتاب کو خدائی صفات کے ساتھ متصف کرے اور اس سے مرادیں طلب کرے، آخرت پر یقین نہ رکھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر سے استہزا کرے، علمائے کرام اور پیرانِ عظام پر آوازے کسے اور انھیں بُرے خطابات سے یاد کرے، ہندوؤں کے ایک بزرگ کو جسے وہ خدا کا اوتار مانتے ہیں "امام" اور "چراغِ ہدایت" کے الفاظ سے یاد کرے اور اسکی تعریف میں رطب اللسان ہو۔ کیا ایسا آدمی اسلام پر ہے یا کفر پر؟ اس کے ساتھ لین دین، نشست و برخاست اور ہر طرح کا مقاطعہ کرنا جائز ہے یا ناجائز اور نہ کرنے والوں

---

[1] مئے شبانہ: عبدالرشید طارق۔ بحوالہ ملفوظات۔ مرتبہ محمود نظامی۔ ص ۲۰۸۔

[2] اقبال بحیثیت ممتحن: محمد حسین شاہد، رسالہ نقوش، اقبال نمبر (۱)، شمارہ (۲)، ستمبر ۱۹۷۷ء ص ۷۵۵۔

[3] ایضاً، ص ۱۲۹، بحوالہ "زمیندار" ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء

کے متعلق کیا حکم ہے ؟ ۔ ۔ ۔"

اس کے جواب میں مولانا نے فوراً فتویٰ صادر کیا کہ ایسا شخص ہرگز مسلمان نہیں رہ سکتا۔ "اسمِ پروردگار اور یزداں عرفاً مخصوص ذاتِ جناب باری ہے اور اوتار ہنود کے نزدیک خدا کے جنم لینے کو کہتے ہیں، اندریں صورت یزداں اور پروردگار آفتاب کو کہنا صریح کفر ہے۔ علیٰ ہذا خدا کے جنم لینے کا عقیدہ بھی کفر اور توہینِ موسیٰ علیہ السلام بھی کفر اور توہینِ بزرگانِ دین فسق۔ لہٰذا جب تک ان کفریات سے قائل شاعر مذکور توبہ نہ کرے، اس سے ملنا جُلنا تمام مسلمان ترک کردیں ورنہ سخت گنہگار ہوں گے۔"

یہ الگ بات ہے کہ اس جاہلانہ فتویٰ کی سار پر مولانا سید سلیمان ندوی جیسے جید عالمِ دین اور دیگر علمائے اسلام نے مولوی صاحب پر بہت لعن طعن کیا اور یہاں تک کہا گیا کہ اگر علامہ اقبال جیسا عاشقِ رسولؐ اور نہایت مخلص مسلمان بھی کافر ہے تو پھر مسلمان کون ہے؟

اپنے بارے میں ایک شاہکار تجزیاتی نظم، زہد اور رندی، میں وہ اپنے ایک پڑوسی مولوی کا ذکر کرتے ہیں جو اقبال کے بارے میں ایسی ہی رائے کا اظہار کرتا ہے ؎

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی

شاید ان ہی واقعات کی بنا پر ان کو کہنا پڑا ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

برہمن نژاد ہونے پر ناز

اس موقع پر میں یہ وضاحت بھی کرنا چاہوں گا کہ اقبال اپنے برہمن نژاد ہونے پر نازاں تھے اور انھوں نے خاصی تحقیق کرکے یہ پتہ لگایا کہ وہ سپرو گوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے بیٹے جاوید اقبال نے اپنے والد کی سوانح عمری "زندہ رود" میں اس نکتے کی خاص وضاحت کی ہے اور لکھا ہے کہ ایک قول کے مطابق برہمنوں کی یہ شاخ "سپرو" مصر سے ہندوستان آئی تھی میں اس کتاب کا اقتباس درج کرتا ہوں جو خاصا دلچسپ ہے۔[1]

"خواجہ حسن نظامی نے اپنے ایک مضمون "اقبال سے میرے تعلقات" میں جو "ادبی دنیا" کے شمارہ مئی ۱۹۶۵ء میں چھپا تھا، یومِ اقبال کے موقع پر نئی دہلی میں سفیرِ مصر سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ اپنی تقریر میں سفیرِ مصر نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کشمیری برہمن مصر سے آئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مصر میں سورج دیوتا کا بڑا پجاری "ہری ہر" کہلاتا تھا۔ قدیم مصری زبان میں 'را' کے معنی سورج کے ہیں۔ قرآن شریف میں سورۂ یوسف کا آغاز بھی 'الف لام را' سے ہوا ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن شریف میں بھی اللہ تعالیٰ نے 'را' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اسی طرح ہندو مذہب میں راما کی شخصیت کا بہت احترام کیا جاتا ہے سفیرِ مصر نے آگے چل کر کہا کہ اس بڑے پجاری 'ہری ہر' نے قبطی فرعون کی بیٹی سے شادی کی۔ جب فرعون لاولد مرگیا، تو 'ہری ہر' کو اس کی جگہ تخت نشین کیا گیا۔ اس کی اولاد نے چار سو سال تک مصر پر حکومت کی۔ اس کے بعد ایک انقلاب کے نتیجے میں ایک دوسرا خاندان برسرِ اقتدار آگیا۔ اور 'ہری ہر' کے اخلاف حضرت موسیٰؑ اور ان کے یہودی پیروکاروں کے ساتھ مصر سے ہجرت کرگئے۔ موسیٰؑ تو اپنے پیروؤں کے ساتھ فلسطین چلے گئے، 'ہری ہر' کی اولاد نے افغانستان کا رُخ کیا۔ جہاں انھوں نے 'ہری' نام کا ایک شہر بسایا۔ جو بعد کو 'ہرات' کے نام سے مشہور ہوا۔ کچھ زمانے کے بعد یہ لوگ کشمیر کی طرف ہجرت کرگئے۔ آخر میں یہ لوگ ہندوستان کے میدانوں کی طرف آئے اور انھوں نے اپنے مورثِ اعلیٰ کے نام پر ایک نئی عبادت گاہ "ہری دوار" کے نام سے قائم کی۔ اس تحقیق کے مطابق اس برصغیر کے کشمیری برہمن نسلی اعتبار سے مصری ہیں۔ چوں کہ اقبال بھی ایک کشمیری برہمن تھے۔ اس لیے وہ بھی مصری اصل کے ہوئے اور اسی طرح جواہر لال نہرو بھی۔"

اس نئے نظریہ کی تائید میں کسی قابلِ استناد تاریخی مواد کے موجود نہ ہونے کے باعث اس پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ اقبال اپنے کشمیری برہمن ہونے پر نازاں تھے۔ اس سلسلے میں ان کے یہ اشعار مشہور ہیں ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

(مجھے دیکھو، کیونکہ ہندوستاں میں دوسرا کوئی ایسا نہیں ملے گا جو برہمن زادہ ہوتے ہوئے بھی روم و تبریز کا محرمِ اسرار ہو۔)

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برہمن پسرے محرمِ اسرار کجا است

(میر و مرزا تو سیاست کے جوئے میں اپنا دل و دین گنوا بیٹھے ہیں۔ اب ایک برہمن زادے کے سوا کوئی محرمِ اسرار ہے کہاں!)

---

[1] زندہ رود (حصّہ اوّل) حیاتِ اقبال کا تشکیلی دور : جاوید اقبال، ص ۷۔



ہمارے منصوبے

محمد عثمان عارف نقشبندی گورنر یو۔پی

(۱)

پھر ہم اُٹھے ہیں ہمّتِ مرداں لیے ہوئے
جوشِ عمل کا سینہ میں طوفاں لیے ہوئے
تعمیرِ نو ۔ نو کے ہیں ارماں لیے ہوئے
ہاتھوں میں زندگی کے چراغاں لیے ہوئے
سب چاک ہوں گے پردۂ تاریک رات کے
جلوے نظر میں آئیں گے صبحِ حیات کے

(۲)

چونکا دیا ہے ولولۂ کامگار نے
گرما دیا ہے ہمّتِ مردانہ کار نے
آگے بڑھے جو ہم رُخِ گیتی سنوارنے
باہیں گلے میں ڈال دیں ہنس کر بہار نے
در تے ہیں آفتاب زمیں آسمان ہے
پربت کی چوٹیوں پہ ہمارا نشان ہے

(۳)

بجلی ہے مٹھیوں میں اشارے پہ ہے ہَوا
جس سمت چاہا موڑ کے دریا کا رُخ کیا
یہ گرمیٔ عمل کا کرشمہ تو دیکھنا
پانی کو آگ، آگ کو پانی بنا دیا
سیلاب ہم نے روکے ہیں عزمِ بلند سے
پوچھو ہمارے حوصلے ریہانہ بند سے

(۴)

چنبل کی موج موج سے اُبھری ہے زندگی
نانگل کی لہر لہر میں جیون کی ہے خوشی
چہروں پہ بھاکرہ سے نئی آب آگئی
راوڑ کیلا بھیلائی نے قوت وہ بخش دی
بنیادِ زندگانی کو فولاد کر دیا
جسمِ وطن میں ہم نے نیا خون بھر دیا

(۵)

تصویرِ زندگی میں عجب رنگ بھر گئے
آنکھوں میں نقش کھُب گئے دل میں اتر گئے
لیلائے علم و فن کے جو گیسو سنور گئے
اہلِ دل و نگاہ اداؤں پہ مر گئے
کیا صنعتوں نے ہند کی صورت نکھار دی
گویا زمیں پہ اک نئی جنت اُتار دی

(۶)

کالج میں مست ماہ لقائیں ہیں رقص میں
گاؤں کی گوریوں کی ادائیں ہیں رقص میں
چلتی ہیں آج کل جو ہوائیں ہیں رقص میں
وہ رقص کا ہے حال فضائیں ہیں رقص میں
سنگیت کے ترانے دلوں میں اُتر گئے
سوئے پڑے تھے ساز جو نغموں سے بھر گئے

(۷)

دیہات کو سکھائی ہے تہذیب شہر کی
تاریکیوں کو علم کی دے دی ہے روشنی
کانٹوں کو ہم نے بخشی ہے پھولوں کی زندگی
ہے بٹ بحر گاؤں کے پنگھٹ کی کامنی
تھے جھونپڑے جہاں وہاں محلات ہو گئے
تبدیل بستیوں میں خرابات ہو گئے

(۸)

جنگل ہرے بھرے ہیں چمن ہیں بہار پر
بکھرے پڑے ہیں پھول ہر اک کوہسار پر
ہیں کھیت سامنے کہ نظر لالہ زار پر
رحمت خدا کی بندۂ محنت شعار پر
پانی نے کوہساروں سے چشمے اُچھالے ہیں
ہم نے زمینِ شور سے کس بل نکالے ہیں

(۹)

کل تک تو ایک پرندہ بنانا محال تھا
آج انجنوں کا دیش میں طوفان آ گیا
ہاتھوں میں فن جو آیا ہوائی جہاز کا
اُڑنا ہوا میں ہو گیا بچوں کا کھیل سا
کتنی بلندیوں پہ ہماری چڑھائی ہے
کہتے ہیں آسمانوں میں تھگلی لگائی ہے

(۱۰)

دیکھا ہماری جوہری طاقت کا تجربہ
صحرائے پوکرن میں کھلا پھول امن کا
کیسا خلا میں آریہ بھٹ کو اُڑا دیا
ٹیلی وژن کا گاؤں نے نظارہ کر لیا
دنیا میں بھی ملک ہمارا یہ کم نہیں
رہ جائیں پیچھے راہِ ترقی میں ہم نہیں

(۱۱)

ہاں یوں ہی حوصلوں کے سہارے چلے چلو
طوفاں ہو، موج ہو کہ کنارے چلے چلو
رُکنے کا نام ہی نہ لو پیارے چلے چلو
بہتے ہیں جیسے گنگ کے دھارے چلے چلو
راہِ عمل میں صورتِ سیل رواں رہیں
مقصد ہو کامیاب ارادے جواں رہیں

(۱۲)

ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا بنیں گے ہم
انسانیت کے درد کا چارا بنیں گے ہم
طوفانِ زندگی میں کنارا بنیں گے ہم
عالم میں روشنی کا منارا بنیں گے ہم
بھٹکے ہوؤں کو راہ پہ منزل پہ لائیں گے
ہم ڈوبتوں کو کھینچ کے ساحل پہ لائیں گے

(۱۳)

تعمیر کرتے جائیں گے اک زندگی نئی
لائیں گے انقلاب نیا، روشنی نئی
حُبِّ وطن کا نشہ نیا بے خودی نئی
جذبے نئے نئے ہیں اُمنگیں نئی نئی
امن و اماں سے جنگ کے حربوں کو توڑ دیں
سارے جہاں کو پیار کے رشتے میں جوڑ دیں

٭ ● ٭

ایم۔ ایل۔ بجاج*

ترقیاتی پروگراموں میں اقلیتوں کی شرکت

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے اقلیتوں کے معاملات دیکھنے کے لیے کابینہ کی ایک سات رکنی کمیٹی قائم کی ہے، شری گاندھی اس کمیٹی کے سربراہ ہیں۔

کسی بھی ملک کے لیے جس کا سیاسی ڈھانچہ جمہوریت اور سیکولرازم پر مبنی ہو اور جس کا مقصد سوشلسٹ سماج کا قائم کرنا ہو اُس کے لیے اس امر کی نگرانی کرنا نہایت ضروری ہے کہ اُس کی مملکت کے اندر تمام طبقوں، فرقوں اور اقلیتوں سے خواہ وہ مذہبی ہوں یا لسانی، منصفانہ سلوک کیا جاتا ہے اور ذات پات، رنگ و نسل یا مذہب و زبان کی بنا پر اُن سے کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ ایک مطمئن اقلیت ہی امن و سلامتی اور خوشحالی کی ضامن ہے۔ ملک کے اندر غیر مطمئن، پسماندہ، افلاس زدہ اور ناخواندہ اقلیتیں ایسے ہی ہیں جیسے کسی خوبصورت لباس میں کثیف ٹکڑوں کے پیوند لگے ہوں۔ لہٰذا جہاں اقلیتوں کا مفاد اس امر میں ہے کہ وہ قومی دھارے سے وابستہ رہیں وہاں قومی رہنماؤں کا بھی فرض یہ دیکھنا ہے کہ کسی جائز وجہ کی بنا پر اقلیتوں کو شکایت کرنے کا موقعہ نہ ملے۔

یوں تو حصولِ آزادی کے بعد سے ہی قومی حکومت کی طرف سے اقلیتوں کی بہبود و ترقی کی جانب توجہ دی جا رہی تھی اور تحریروں میں خواہ وہ اعلیٰ سطح پر یا ادنیٰ سطح پر تھیں کبھی امتیاز نہیں برتا گیا اور اقلیتوں کے جذبات و احساسات کا بالخصوص احترام کیا جاتا ہے تاہم اقلیتوں سے متعلق حکومت کی پالیسیوں کو قانونی صورت دینے اور اُن کی شکایات کو جو سرکاری پالیسیوں کی تعمیل کے سلسلے میں کبھی کبھی پیدا ہو جاتی تھیں دُور کرنے اور اُن کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے بھارت سرکار کی طرف سے جنوری ۱۹۷۸ء میں اقلیتی کمیشن (Minorities Commission) کا قیام کیا گیا تاکہ سیکولر روایات اور قومی یکجہتی کا تحفظ کیا جا سکے۔ کمیشن ایک چیئرمین اور چار دیگر ممبروں پر مشتمل ہے جو اقلیتی فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کمیشن کو جو امور سونپے گئے وہ درج ذیل ہیں۔

(الف) اقلیتوں کی حفاظت کے لیے آئین میں اور مرکزی و ریاستی حکومتوں کی طرف سے منظور شدہ قوانین میں جن متعدد تحفظات کا اہتمام کیا گیا ہے اُن کی کارکردگی کا جائزہ لینا۔

(ب) تمام تحفظات اور قوانین کی مؤثر تعمیل اور نفاذ کو یقینی بنانے کی غرض سے سفارشات کرنا۔

(ج) اقلیتوں کے بارے میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی طرف سے عمل میں لائے جانے والی پالیسیوں کا جائزہ لینا۔

(د) اقلیتوں کے حقوق اور تحفظات کو یقینی بنانے کے بارے میں واضح سفارشات پر غور کرنا۔

(س) اقلیتوں کے خلاف امتیاز سے احتراز کے سوال کے بارے میں تحقیق و مطالعہ اور تجزیہ کرنا۔

(ص) کسی بھی اقلیت کے بارے میں ایسے موزوں قانونی اور فلاحی اقدامات کی تجویز کرنا جنھیں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی طرف سے عمل میں لایا جائے۔

(ض) اقلیتوں کے حالات سے متعلق معلومات کی فراہمی و تشہیر کے لیے ایک قومی ادارے کے طور پر کام کرنا۔

(ط) متعین مدت پر حکومت کو وقتاً فوقتاً رپورٹیں پیش کرنا۔

واضح رہے کہ اقلیتی کمیشن کی طرف سے اب تک چھ سالانہ رپورٹیں پیش کی جا چکی ہیں اور پہلی چار رپورٹیں پہلے ہی پارلیمنٹ میں رکھی جا چکی

* ۲۰، ملک بلڈنگ، چونا منڈی، پہاڑ گنج، نئی دہلی۔

ہیں۔ ۸۵-۱۹۸۴ء کے لیے کمیشن کی ساتویں سالانہ رپورٹ کمیشن کی طرف سے مرتب کی جارہی ہے۔

لسانی اقلیتوں کے لیے کمشنر

بھارت کو نہ صرف مذہبی بلکہ لسانی اقلیتوں کی بہبود میں بھی دلچسپی ہے۔ لسانی اقلیتوں کے وسیع تر معانی میں ایسی تمام اقلیتیں آجاتی ہیں جن کی مادری زبان الگ ہے۔ چنانچہ لسانی اقلیتوں سے متعلق ایک خصوصی افسر جو لسانی اقلیتوں کے کمشنر کے نام سے موسوم ہے، کا دفتر جولائی ۱۹۵۷ء میں آئین کے آرٹیکل ۳۵۰-بی کے تحت قائم کیا گیا تھا جسے ریاستوں کی تنظیم نو کے کمیشن کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آئین میں شامل کیا گیا تھا۔ سردست مذکورہ بالا کمشنر کے چار دفاتر ہیں اس کا ہیڈ کوارٹر الہ آباد میں ہے اور تین علاقائی دفاتر کلکتہ، مدراس اور بیلگام میں ہیں۔ اس کمشنر کا ادارہ آئین کے تحت لسانی اقلیتوں کو دیے گئے تحفظات سے متعلق تمام معاملات کی جانچ کرتا ہے اور اُن معاملات کی بھی جانچ کرتا ہے جنھیں ملکی سطح پر دیا جانا منظور کیا جاتا ہے اور وہ جانچ کے بعد مجوزہ وقفوں پر راشٹرپتی کو اپنی رپورٹیں بھیجتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ادارہ لسانی اقلیتوں سے متعلق مختلف تنظیموں اور افراد کی جانب سے موصول ہونے والی شکایات اور عرضداشتوں کی بھی پڑتال کرتا ہے تاکہ اُن کی شکایات کا ازالہ کیا جاسکے۔ اب تک اس ادارہ کی طرف سے ۲۳ رپورٹیں پیش کی گئی ہیں۔ جنھیں پارلیمنٹ میں رکھا گیا ہے۔ ۲۴ ویں اور ۲۵ ویں رپورٹوں کو حکومت کی طرف سے ترتیب دیا جارہا ہے تاکہ وہ پارلیمنٹ میں پیش کی جاسکیں۔

۱۵ نکاتی پروگرام

اقلیتوں کی بہبود و ترقی کے پروگراموں کی تعمیل میں وزیر اعظم ذاتی دلچسپی لے رہے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں ایک ۱۵ نکاتی پروگرام پیش کیا ہے جس کا مقصد قومی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اقلیتوں کی مکمل شرکت کو فروغ دینا ہے۔ اس پروگرام کے بعض اہم نکات درج ذیل ہیں:-

(ا) فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کرنے اور اُن پر قابو پانے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے سے متعلق اقدامات کرنا۔

(ب) مرکزی اور ریاستی پولیس تنظیموں، قومی ملکیت کے بینکوں، پبلک سیکٹر کے اداروں اور ریلوے وغیرہ کی ملازمتوں کی بھرتی کے معاملے میں اقلیتوں کا خاص خیال رکھنا اور انتخابی کمیٹی کو مذکورہ مقصد کے لیے نمائندہ جماعت بنانا۔

(ج) تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتی گروپوں کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے لیے اقدامات کرنا۔

(د) اقلیتوں کے لیے ۲۰ نکاتی پروگرام سمیت ترقیاتی پروگراموں کے فوائد کے منصفانہ اور موزوں حصے کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کرنا۔

(س) اقلیتوں کی شکایات کے ازالے کے لیے فوری کارروائی کرنا اور اس کام کو برابر جاری رکھنا نیز اقلیتوں کے مسائل کو نپٹانے کے لیے اداراتی انتظامات کرنا۔

۱۵ نکاتی پروگرام اور ریاستیں

بیشتر ریاستوں نے اپنے ریاستی سیکریٹریٹ میں اقلیتی سیل (محکمے) قائم کیے ہیں اور باقیماندہ ریاستوں سے ایسا ہی کرنے کو کہا گیا ہے۔ جن ریاستوں میں "ریاستی اقلیتی کمیشن" اور "ریاستی اقلیتی مالی کارپوریشنیں" نہیں ہیں انھیں مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی ریاستوں میں ایسے اداروں کی ضرورت کا جائزہ لیں۔ ریاستوں کو یہ مشور بھیج دیا گیا ہے کہ وہ کام کا جائزہ لینے کے وزیر اعلیٰ یا چیف سیکریٹری کی سطح پر سہ ما اور ڈویژنل کمشنر یا ڈسٹرکٹ کلیکٹر کی سطح ماہانہ میٹنگوں کا انعقاد کریں۔ ریاستوں سے بھی استدعا کی گئی ہے کہ وہ ۱۵ نکاتی پروگرام تعمیل کا جائزہ لینے کے کام میں موجودہ ریاس اقلیتی کمیشنوں یا بورڈوں کو شامل کریں۔

مرکزی وزارت بہبود کا "اقلیتی سیل ۱۵ نکاتی پروگرام کی تعمیل میں ہونے والی پیش رف کے بارے میں سہ ماہی رپورٹیں ریاستی حکومتو اور متعلقہ مرکزی وزارتوں سے موصول کر رہا ہے اور انھیں ایک جامع رپورٹ کی صورت میں وز اعظم کے دفتر کو ارسال کر رہا ہے۔ اقلیتی سیل کے حکام فوری کارروائی کے لیے ریاستوں کا دور بھی کر رہے ہیں۔ پروگرام کی تعمیل میں جو خامیاں پائی جاتی ہیں وہ ریاستی حکومتوں اور مرکزی وزارتوں کے علم میں لائی جاتی ہیں تاکہ انکا موزوں طور پر مداوا کیا جاسکے۔

پروگرام کی تعمیل کا جائزہ

۱۵ نکاتی پروگرام کی تعمیل کا جائزہ اقلیتی بہبود سے متعلق ریاستی حکام کی کانفرنس میں لیا گیا جس کا انعقاد جون ۱۹۸۶ء میں ہوا۔ بعد ازاں پروگرام کی تعمیل پر "قومی یکجہتی کونسل" کی اسٹینڈنگ کمیٹی کی میٹنگ میں از سرِ نو غور کیا گیا۔ جس کی میٹنگ اگست ۱۹۸۶ء اور پھر ستمبر ۱۹۸۶ء میں منعقد ہوئی۔ اس پروگرام کے متعدد نکات کے بارے میں جو پوزیشن تھی وہ ذیل میں درج ہے

فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہونے والوں کے لیے امداد

فسادات کا میلان رکھنے والی ریاستوں میں وہاں کی حکومتوں نے فرقہ وارانہ تشدد کو روکنے اور

اُمید پر قابو پانے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ سے متعلق اقدامات کے تئیں ٹھوس ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ بیشتر ریاستوں نے فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہونے والوں کی امداد کے بارے میں مرکز کے رہبرانہ خطوط کو قبول کیا ہے۔ باقیماندہ چند ریاستوں سے مرکز کے رہبرانہ خطوط کو قبول کرنے کی استدعا کی گئی ہے۔

ریاستی پولیس میں بھرتی

بعض ریاستوں کی طرف سے بتایا گیا ہے کہ انھوں نے ریاستی پولیس میں بھرتی کے لیے انتخابی کمیٹیوں کو نمائندہ بنانے کے سلسلے میں کارروائی کی ہے۔ لیکن بعض ریاستوں کو ابھی ایسا کرنا ہے۔ کسی بھی ریاست نے موزوں اقلیتی افسروں کی عدم دستیابی کی صورت میں غیر سرکاری ممبروں کی نامزدگی کا اہتمام نہیں کیا ہے۔ بیشتر ریاستوں نے ابھی کوئی موزوں نگران سسٹم مرتب نہیں کیا جس سے وقتاً فوقتاً بھرتی کا خاکہ تیار کر کے پولیس میں اقلیتوں کی موزوں بھرتی کو یقینی بنانے کے سلسلے میں پیش رفت کا جائزہ لیا جا سکے۔

مرکزی پولیس میں بھرتی

گروپ "سی" اور "ڈی" کے زمروں میں بھرتی کے لیے انتخابی کمیٹیوں کو ۵ مرکزی پولیس تنظیموں میں نمائندہ بنایا گیا ہے یہ تنظیمیں ہیں —— سینٹرل ریزرو پولیس فورس، بارڈر سکیورٹی فورس، سنٹرل انڈسٹریل سکیورٹی فورس، آسام رائفلز اور انڈو تبتین بارڈر پولیس۔ بھرتی کے خاکے کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان تنظیموں میں مسلمانوں کی بھرتی متواتر کم ہے۔ صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں۔

بینکوں ریلوے اور سرکاری اداروں میں بھرتی

قومی ملکیت کے بینکوں، پبلک سیکٹر کے اداروں اور ریلوے وغیرہ میں "سی" اور "ڈی" زمروں میں بھرتی کے لیے انتخابی کمیٹیوں کو نمائندہ بنانے کے لیے ہدایات جاری کی گئی ہیں۔ بھرتی کے خاکے کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان تنظیموں میں مسلمانوں کی بھرتی متواتر نہایت کم چلی آ رہی ہے۔ بینکنگ کے محکمے کی جانب سے ایسے ۴۰ چیدہ اضلاع میں جہاں تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتوں کے افراد بہت بھاری تعداد میں رہتے ہیں۔ کلرکی کے لیے بھرتی سے قبل کے تربیتی مرکزوں کے قیام اور ریاستی راجدھانیوں میں افسروں کی بھرتی کے لیے قبل از بھرتی کے تربیتی مرکزوں کے قیام کے لیے کارروائی کی گئی ہے۔ پبلک سیکٹر کے اداروں اور ریلوے وغیرہ میں بھی صورت حالات کو بہتر بنانے کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں۔

ایمپلائمنٹ ایکسچینجوں کو ہدایات

ڈائرکٹر جنرل ایمپلائمنٹ اینڈ ٹریننگ، نئی دلی کی جانب سے اس امر کو یقینی بنانے کے لیے ریاستی حکومتوں کو مفصل ہدایات جاری کی گئی ہیں کہ ناموں کا اندراج کرنے اور بھرتی اداروں کو ناموں کی تجویز کرنے کے سلسلے میں ایمپلائمنٹ ایکسچینجوں کی طرف سے اقلیتوں کے خلاف امتیاز نہیں برتا جانا چاہیے اور جن علاقوں میں اقلیتی افراد بھاری تعداد میں آباد ہیں وہاں اور اقلیتی تعلیمی اداروں میں ناموں کے اندراج کی خصوصی مہم بھی چلائی جانی چاہیے۔ ریاستی حکومتوں سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ ان ہدایات کی مؤثر تعمیل کی نگرانی سے متعلق انتظامات کا جائزہ لیں۔ چار ریاستوں میں ریاستی سطح پر نگراں "سیل" قائم ہو چکے ہیں۔

کوچنگ اسکیم

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ۲۰ یونیورسٹیوں اور ۸۰ ڈگری کالجوں میں اقلیتی فرقوں سے تعلق رکھنے والے کمزور طبقوں کے لیے ایک کوچنگ اسکیم شروع کی ہے۔ موصولہ رپورٹوں کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اسکیم مؤثر طور پر عمل میں نہیں آ رہی اور اقلیتی فرقہ کے بہت کم اُمیدوار کامیاب ہوتے ہیں۔ اس اسکیم سے متعلق یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی مشاورتی کمیٹی نے جو مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) ایم۔ ایچ بیگ کی صدارت میں کام کرتی ہے تمام تر اسکیم پر نظر ثانی کے لیے ایک سب کمیٹی کی تشکیل کی ہے جو مداوا کے لیے ضروری اقدامات کرے گی۔

قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء

قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء میں تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتی گروپوں کی جانب خصوصی توجہ دینے کے لیے کہا گیا ہے اور مذکورہ پالیسی کے تحت مرتب کیے گئے لائحہ عمل میں اس مقصد کے لیے ٹھوس اقدامات شامل کیے گئے ہیں۔ مذکورہ پروگرام کے تحت تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتی منتظمہ اداروں کے ٹیچروں کے لیے سائنس، ریاضی، انگریزی اور کیریئر گائیڈنس (Career Guidance) میں سروس ٹریننگ دی جاتی ہے اور یہ ٹریننگ نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، اسٹیٹ ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ اور دوسرے وسائلی مرکزوں کی وساطت سے دی جاتی ہے۔ اس میں کمیونٹی لیڈرشپ اسکیم میں اقلیتی تعلیمی اداروں کے لیے موزوں نمائندگی، اقلیتی منتظمہ اداروں میں اعلیٰ تر ثانوی سطح پر پیشہ ورانہ تعلیم، تعلیم بالغان پر کماحقہ زور دینے اور بھاری تعداد میں اقلیتی افراد والے علاقوں میں بچوں کو شروع سے تعلیم دینے اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے دستیاب سہولیات کے سروے کے لیے کارروائی اور بھاری تعداد میں اقلیتی افراد والے علاقوں میں جہاں کہیں ضرورت ہو لڑکیوں کے اداروں اور ہوسٹلوں کا قیام کرنے

(باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

م۔ک۔ مہتاب

آزادی کے چالیس سال
سماج کے کمزور طبقات کی بہبود

ناکردہ گناہ

سماجی و اقتصادی کمزوری کوئی خود کردہ گناہ نہیں ہے جس کی سزا ملک کی آبادی کا ایک بہت بڑا طبقہ سینکڑوں برس سے بھگتتا آرہا ہے بلکہ یہ محرومی اور کمزوری مذہبی اور اقتصادی استحصال کا نتیجہ ہے۔ اس تاریخی عمل نے ان طبقوں کو کبھی اُبھرنے نہیں دیا۔ یہاں تک کہ کئی ایک طبقوں نے جہنم کی سی اس زندگی کو اپنا مقدر سمجھ لیا تھا اور وہ اس پر قانع ہوگئے تھے کہ وہ غلاظت میں پیدا ہوں اور زندگی کا مختصر دور غلاظت میں ہی ختم کر کے چل بسیں۔

ملک کی قریب ۲۲ فیصد آبادی میں اس بے حسی کے سبب نہ صرف ملک جاگیردارانہ اور نو آبادیاتی نظام میں جکڑا رہا ہے بلکہ اقتصادی ترقی کے عمل میں بھی فرسودہ ڈھنگ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ کچھ لوگ اور کچھ طبقے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر ترقی کرتے رہے ہیں جس کے نتیجے کے طور پر حاکم و محکوم، متموّل اور محروم طبقوں کے درمیان فاصلہ اور بھی طویل ہوتا چلا گیا ہے۔

چنانچہ جب ملک آزاد ہوا اور قومی رہنماؤں نے اُسے ترقی کی راہ پر آگے لے جانے کی کوشش کی تو سماج کے کمزور طبقوں کو ساتھ لے کر چلنے کا سوال ایک سنگین مسئلہ بن کر ملک کے معماروں اور منصوبہ کاروں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ سماج کے کمزور طبقوں میں عام طور پر درج فہرست ذاتیں، درج فہرست قبیلوں کے افراد، پسماندہ ذاتیاں، بعض اقلیتیں، خواتین اور معذور افراد شامل ہیں۔

ان طبقوں کی حالت میں تبدیلی لانے کے لیے تین سطحوں پر کارروائی ہوتی رہی ہے۔ سماجی اصلاحات کی تحریک، حکومتی کارروائی اور سیاسی عمل۔

سماجی اصلاحات

ہندو سماج میں ورن سسٹم کے تحت درج فہرست ذاتوں کو سب سے نچلا یعنی پانچواں مقام دیا گیا تھا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا کام بالائی طبقوں کی خدمت کرنا تھا۔ وہ نہ باقی سماج کے ساتھ رہ سکتے تھے نہ اُن کی زندگی کے کسی عمل میں شریک ہو سکتے تھے۔ اُن کو چھونا بلکہ دیکھنا بھی گناہ شمار ہوتا تھا۔ وہ شہروں اور دیہات کے باہری حصے میں کچے جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ گندی غذائیں بلکہ مُردار تک کھاتے تھے، کچی شراب پیتے تھے۔ مرد اور عورتیں بہت کم کپڑے پہنتی تھیں، اُنھیں کسی عبادت گاہ میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اور وہ توہم پرستی کا شکار تھے۔ جنھیں اعلیٰ طبقے محض دو لقموں کے لیے زندگی بھر بندھوا مزدور کی صورت میں اپنے کھیتوں اور کارگاہوں میں کام پر لگائے رکھتے تھے۔

درجِ فہرست قبائل وہ ہیں جو دار و گیر کے تاریخی عمل میں خوشحال زندگی کے دائرہ عمل سے بھگا دئے گئے۔ اُنھیں اچھوت سمجھا گیا اور وہ ملک بھر میں دور افتادہ دیہات، پہاڑی علاقوں اور تاریک گوشوں میں زندگی بسر کرتے آئے ہیں جہاں نہ تعلیم کی روشنی پہنچتی ہے اور نہ ترقی کے وسیلوں کی رسائی حاصل ہوتی ہے۔ ملک کے شمال مشرقی، ہمالیائی، مشرقی اور وسطی، جنوبی اور مغربی خطوں میں ۴۲۷ قبائل آباد ہیں۔ یہ قبیلے انڈومان اور نکوبار کے جزائر تک میں پائے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ جہالت اور عسرت کے اندھیروں میں جنگلی حیوانات کی سی زندگی بسر کرتے آئے ہیں اس لیے ہر حاکم اور نوآمد نے اُن کا استحصال کیا ہے۔

درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل میں سماجی اصلاحات رائج کرنے کا عمل آزادی سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا مہاتما گاندھی [illegible]

تشکل دی اور ان طبقوں میں بیداری لانے اور ان طبقوں کے لیے دیگر طبقوں میں ہمدردی پیدا کرنے کو ملک کی آزادی کی تحریک کا ایک اہم آلۂ کار بنایا۔ انھوں نے چھوت چھات کو ختم کرنے، سماج میں برابری کا درجہ دلانے اور انھیں بہتر زندگی بسر کرنے کی سہولیات مُہیا کرنے کے کام کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔ علاقائی بنیادوں پر بھی کئی ایک رہنماؤں نے اصلاح کا یہ کام جاری رکھا۔ جیسے مہاراشٹر میں مہاتما پھولے اور گجرات میں اے وی ٹھکر، یہ کام انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر بی۔آر امبیدکر نے بھی ملک بھر کی درج فہرست ذاتوں کی اصلاح کے لیے اہم کام کیا۔ درج فہرست ذاتوں کی اصلاح کی تحریکیں علاقائی اور قومی پیمانے پر چلتی رہیں لیکن قبائل کی اصلاح کی تحریکوں کی نوعیت زیادہ تر مقامی رہی۔ اس کے نتیجے کے طور پر کچھ ذاتوں اور کچھ قبیلوں نے ترقی کی۔ وہ سماجی زندگی میں آگے بھی بڑھے ــــ عیسائیت، اسلام، بُدھ اور سکھ دھرم نے ان قبائل یا ذاتوں کے افراد کا سماجی مرتبہ بلند کرنے کے عمل میں حصہ لیا جس سے بہت سے لوگ ان مذاہب کے دائرے میں آگئے لیکن سماجی طور پر کمزور ان طبقوں کے بیشتر افراد کی حالت میں کوئی زیادہ سُدھار نہیں ہوا۔

حکومت کا عمل

سماج کے کمزور طبقوں کی حالت میں تبدیلی لانے کی دوسری بڑی کارروائی حکومت کے ذریعے کی گئی ہے اور اس مضمون میں ہمارا مطمحِ نظر یہی ظاہر کرنا ہے کہ ان طبقوں نے ملک کے آئین میں مُہیا کردہ تحفظات اور اہتمام کے مطابق کہاں تک ترقی کی ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کی کارروائی میں وہ قانونی اور انتظامیہ اقدام شامل ہیں جو آبادی کے ان زمروں کی فلاح و بہبود کے لیے اُٹھائے گئے ہیں۔ ملک کے آئین میں درج فہرست ذاتوں اور قبائل کی فلاح کے لیے جو ملک کی کُل آبادی کا ۲۲ فیصد حصہ ہیں کئی ایک حفاظتی اقدامات شامل کیے گئے ہیں۔ پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں نمائندگی، مرکزی اور ریاستی ملازمتوں میں موزوں حصہ۔ سماجی، تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے لیے خصوصی انتظامات، جبری مزدوری پر پابندی، چھوت چھات پر پابندی، درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے علاقوں کی ترقی، آئینی تحفظات پر عمل کا جائزہ لینے کے لیے خصوصی افسروں کا تقرر وغیرہ کچھ اہتمام ان اقدامات میں شامل ہیں۔

ملک میں منصوبہ بند معاشی ترقی کا عمل ۱۹۵۱ء سے شروع ہوا۔ آئین کے آرٹیکل ۴۶ میں مندرج ہدایتی اصولوں کے مطابق سماجی و اقتصادی طور پر دبے ہوئے یا پسماندہ طبقوں کا سماجی و اقتصادی مرتبہ بلند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلے دو پانچسالہ منصوبوں میں درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبیلوں اور دیگر کمزور طبقوں کا اقتصادی اور تعلیمی مرتبہ بلند کرنے کی غرض سے فلاحی پروگرام مرتب کیے گئے۔ اس کے علاوہ قبائلی اور شیڈولڈ علاقوں میں خصوصی ترقی کے نظریے کو اپنایا گیا۔ لیکن چوتھے پانچسالہ منصوبے کے آخر میں محسوس کیا گیا کہ محرومی کے شکار ان طبقوں کی ترقی کی حکمتِ عملی، اقتصادی اور انسانی وسیلوں کی جامع ترقی کی کوششوں پر مرتب کرنی ہوگی تاکہ آبادی کے یہ طبقے ترقی کے عام پروگراموں سے حاصل ہونے والے مواقع کا فائدہ اُٹھا سکیں۔ چنانچہ پانچویں منصوبے میں قبائل کے لیے الگ ضمنی منصوبے اور چھٹے منصوبے میں درج فہرست ذاتوں کے لیے مخصوص پروگراموں پر مشتمل منصوبے شامل کیے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی اور ریاستی سرکاروں کے ترقی کے عام منصوبوں سے پیدا ہونے والی سہولیات اور سرگرمی کے علاوہ قبائل کی ترقی کے ضمنی منصوبوں اور درج فہرست ذاتوں کی سماجی و اقتصادی ترقی کے لیے الگ رقوم وقف کی گئیں۔ چھٹے منصوبے میں زیادہ توجہ فلاح سے ہٹ کر کنبوں اور فائدہ اٹھانے والے طبقوں کی ترقی کے مخصوص کاموں کی جانب مبذول ہوئی جس کا مقصد ایسی اسکیمیں مرتب کرنا تھا جن سے سماج کے ان کمزور طبقوں کو خصوصی فائدہ پہنچایا جا سکے۔ چنانچہ چھٹے منصوبے میں پہلی بار درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کی ۵۰ فیصد آبادی کو غریبی کی سطح سے اوپر اُٹھانے کا نشانہ مقرر کیا گیا۔

ان منصوبوں اور پروگراموں پر عمل درآمد کے نتیجے کے طور پر اگرچہ درج فہرست ذاتوں اور درجِ فہرست قبائل کی تعلیمی اور معاشی سطح میں اُتنی ترقی تو نہیں ہوئی جتنی سماج کے دیگر طبقوں میں ہوئی ہے لیکن جو کچھ بھی دیکھنے میں آیا ہے وہ یقینی طور پر حوصلہ افزا ہے۔ رُجحان تبدیل ہو گیا ہے جمود ٹوٹ گیا ہے۔ قسمت پر قانع لوگ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگے ہیں۔ جب کوئی طبقہ اپنے بارے میں خود سوچنے لگے تو ترقی کے عمل میں اُسے انقلابی تبدیلی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ آبادی کے دیگر طبقوں میں تعلیم کا تناسب ۱۹۷۱ء میں ۴۸ر۳۳ فیصد تھا جو ۱۹۸۱ء میں ۲۲ر۴۱ فیصد ہو گیا جب کہ درج فہرست ذاتوں میں یہ تناسب ۶۷ر۱۴ فی صد سے بڑھ کر ۳۸ر۲۱ فیصد اور درج فہرست قبیلوں میں ۳۰ر۱۱ فیصد سے بڑھ کر ۳۵ر۱۶ فیصد ہو گیا۔

جہاں تک پیشہ ورانہ کاموں کا تعلق ہے اگرچہ کاشت اور کھیتوں میں مزدوری میں ان کے

حصے میں ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۱ء کی دہائی میں زیادہ اضافہ نہیں ہوا لیکن غیر زراعتی کاموں سے ان کے حصے میں زیادہ اضافہ ہوا ہے۔

مرکزی ملازمتیں

جہاں تک مرکزی ملازمتوں میں درجِ فہرست ذاتوں اور قبائل کے ملازموں کا تعلق ہے۔ ۱۹۶۵ء میں پہلے چار زمروں کے ملازموں کی کل تعداد ۲۲،۶۴،۷۹۵ تھی جس میں درجِ فہرست ذاتوں کے ملازموں کی تعداد ۲،۹۸،۳۲۹ یعنی ۱۳٫۱۷ فیصد اور درجِ فہرست قبائل کے ملازموں کی تعداد ۵۰،۹۸۳ یعنی ۲٫۲۵ فیصد تھی۔ ۱۹۸۳ء کے اعداد و شمار کے مطابق کل یعنی ۳۲،۴۶،۳۵۲ مرکزی ملازموں میں درجِ فہرست ملازموں کا تناسب بڑھ کر ۱۲٫۴۴ اور درجِ فہرست قبائل کا تناسب ۴٫۵۶ فیصد ہو گیا ہے۔ تعداد کے لحاظ سے ان دونوں طبقوں کے ملازموں کا تناسب ۹۳ فیصد اور ۲۱۷ فیصد بڑھ گیا۔

چھٹے منصوبے میں مذکورہ طبقوں کی ترقی کے لیے ایک حکمتِ عملی مرتب کی گئی جس کا مقصد مخصوص عناصر یا اجزا کے پروگراموں کے ذریعے سماجی و اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کے لیے اور زیادہ رقوم مہیا کرنا ہے جو صرف ان لوگوں کی حالت بہتر بنانے پر ہی خرچ کی جائیں تاکہ کم از کم پچاس فیصد آبادی کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھایا جا سکے۔ ان مخصوص پروگراموں کے لیے چھٹے منصوبے میں درجِ فہرست ذاتوں کے لیے ریاستوں، مرکزی امداد اور ادارہ جاتی مالی امداد کے وسیلوں سے ۴۸۰٫۴ کروڑ روپے وقف کیا گیا تھا لیکن اس کے مقابلے میں ۴۲۳۸ کروڑ روپے خرچ کیا گیا۔ درجِ فہرست قبائل کے لیے چھٹے منصوبے میں ۴۰۰٫۶ کروڑ روپیہ مخصوص کیا گیا لیکن کارکردگی نشانے سے بڑھ گئی اور ۴۶۹٫۴ کروڑ روپیہ اُن کے لیے خرچ کیا گیا۔ دیگر پسماندہ جماعتوں اور طبقوں کے لیے ۴۹۲ کروڑ روپے کی مخصوص رقم کے مقابلے میں چار سو کروڑ روپیہ خرچ کیا گیا۔ درجِ فہرست ذاتوں کے لیے مخصوص اجزا کے پروگرام ملک کی بیس ریاستوں اور چار مرکزی علاقوں میں زیرِ عمل ہیں جب کہ درجِ فہرست قبائل کے لیے ذیلی منصوبے قبائل کی زیادہ آبادی والے ۲۴۵ مخصوص علاقوں میں زیرِ عمل ہیں جن سے قبائل کی زائد از ۶۵ فیصد آبادی مستفید ہو رہی ہے۔

چھٹے منصوبے کے دوران سماج کے ان کمزور طبقوں کے ۱۱۵ لاکھ بچوں کو تعلیمی وظائف دیے گئے اور مزید ۱۱۳ لاکھ بچوں کو مفت کپڑوں، کتابوں، لکھنے پڑھنے کے سامان وغیرہ جیسی سہولیات دی گئیں۔ ۹ لاکھ بچوں کو بعد از میٹرک کی تعلیم کے لیے یہ وظائف دیے گئے۔ تین ہزار ہوسٹل اور ۹ ہزار آشرم اسکول کھولے گئے۔ پانچ سالہ منصوبوں میں معاشی طور پر کمزور طبقوں کی تعلیمی سہولیات پر اس لیے زیادہ زور دیا جا رہا ہے کیوں کہ معاشی و سماجی ترقی کے عمل میں تعلیم کو سب سے بڑا آلۂ کار سمجھا جاتا ہے۔

اقتصادی شعبے میں ان طبقوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے جو اسکیمیں رائج کی گئی ہیں اُن کا مقصد فائدہ اٹھانے والے کنبوں کو اپنی آمدنی میں مستقل اضافہ کرنے کے قابل بنانا ہے۔ چنانچہ چھٹے منصوبے کے دوران درجِ فہرست ذاتوں اور قبائل کے ۳ لاکھ کنبوں کو زراعت، مویشی پالنے اور گھریلو صنعتوں جیسے پیداواری شعبوں میں آلات اور دیگر سہولیات فراہم کی گئیں۔

۲۶ ریاستوں اور ۷۲ شہروں میں خشک ٹٹیوں کو پانی سے گندگی بہا دینے والی ٹٹیوں میں تبدیل کرنے کے ایک بہت بڑے منصوبے پر مرکزی امداد سے کام شروع کیا گیا۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہے جس کا مقصد خاک روبوں کو ایک گندے پیشے سے نجات دلانا ہے جس میں وہ سالہا سال سے پلتے اور دکھ جھیلتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کام سے خارج ہو جانے والے لوگوں کو متبادل کام فراہم کرنے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

حکومت نے معاشی طور پر کمزور طبقوں کو ترقیاتی اور بیس نکاتی پروگراموں کے تحت غریبی کی سطح سے بلند کرنے کے جو نشانے مقرر کیے ہیں، اُس میں اُسے توقع سے بڑھ کر کامیابی ہوئی ہے۔

ریاستوں میں درجِ فہرست ذاتوں اور قبائل کی ترقی کے لیے الگ سے ترقیاتی کارپوریشنیں قائم کی گئی ہیں۔ جو انھیں آمدنی و روزگار پیدا کرنے والے کاموں کے لیے سرمایہ مہیا کرتی ہیں۔ اس وقت ملک میں ایسی ۲۰ کارپوریشنیں ہیں جن کا سرمایہ ۱۰۳ کروڑ روپے ہے۔ ان کارپوریشنوں نے چھٹے منصوبے کے دوران ۲۷ لاکھ کنبوں کو کام دھندوں کے لیے سرمایہ مہیا کیا، جو قریب ۳۵ کروڑ روپے تھا۔

سماجی طور پر کمزور طبقوں کے لیے ایک اور اہم کام زمین کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کرنے کے نتیجے میں حاصل ہوئی فاضل زمین کی ان لوگوں میں تقسیم ہے۔ چھٹے منصوبے کے دوران ۶،۸۸،۱۷۵ درجِ فہرست ذاتوں کے کنبوں کو ۸،۰۶،۱۴۳ ایکڑ زمین تقسیم کی گئی۔

بنیادی سہولیات کے زمرے میں ہر ترقیاتی منصوبے میں درجِ فہرست ذاتوں اور قبائل کے خطوں میں زمین کے کٹاؤ کو روکا جا رہا ہے۔ زمین کی صلاحیت بہتر بنائی جا رہی ہے۔ دیہات کو بجلی مہیا کی جا رہی ہے۔ پینے کا صاف پانی مہیا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ چھٹے منصوبے کے دوران دو لاکھ ہیکٹیئر زمین میں کٹاؤ زمین کو روکا گیا۔ ۹ ہزار قبائلی دیہات کو بجلی مہیا کی گئی اور ۸۰ ہزار دیہات کو پینے کا پانی مہیا کیا گیا۔

ساتویں منصوبے میں بھی ان اسکیموں پر عمل جاری ہے اور کم و بیش ہر پروگرام کے لیے تخصیص

زر میں بھاری اضافہ کر دیا گیا ہے۔ گندگی صاف کرنے اور کوڑا اٹھانے کا سلسلہ کلیتاً ختم کر دینا ساتویں منصوبے کا ایک بڑا نصب العین ہے۔

قبائل کی ترقی کے سلسلے میں مختلف ریاستوں اور مرکزی علاقوں میں قبائل کی اکثریتی آبادی والے علاقوں میں مربوط ترقی کے پروگراموں کے ذریعہ ان طبقوں کی معاشی ترقی پر بھرپور توجہ دی جا رہی ہے۔ وہاں اب کثیر المقاصد زراعتی انجمنیں قائم کی جا رہی ہیں۔ ایک سے دوسری جگہ منتقل ہو جانے والی زراعتی قبائلی آبادی کو سکونتی آبادی میں تبدیل کرنے کے پروگرام بنائے گئے ہیں۔ ملک کے جنگلات کے قریب ۵ ہزار دیہات میں دو لاکھ قبائلی کنبے ہیں جن کے پاس زمین کے حقوق نہیں ہیں۔ ان کی آبادکاری کے لیے خصوصی اہتمام کئے گئے ہیں۔ قبائل کی خواتین کی پسماندگی دور کرنے پر بالخصوص زور دیا جا رہا ہے۔

ساتویں منصوبے میں درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبیلوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کی فلاح و ترقی کے ان پروگراموں کے لیے ۴۳ء۱۵۲۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے جس میں سے ۲۱ء۱۲۳۹ کروڑ روپیہ ریاستی منصوبوں اور ۲۲ء۲۸۱ کروڑ روپیہ مرکزی شعبے میں خرچ کیا جائے گا۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۸۷-۱۹۸۶ء میں درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے ۱۱ لاکھ طلباء کو بعد از میٹرک کی تعلیم کے لیے وظائف دیئے گئے۔ ان طبقوں کے جو طلبا مرکزی یا ریاستی سروس کے امتحانوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں ان کی تربیت کے لیے الگ سے ۸۰ مراکز ملک کے مختلف حصوں میں کھولے گئے ہیں۔

نومبر ۱۹۸۶ء تک ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت درج فہرست ذاتوں کی تیز تر ترقی کے پروگرام سے ۱۱ لاکھ کنبوں کو اقتصادی مدد دی گئی۔

۸۷-۱۹۸۶ء میں اس پروگرام کے تحت درج فہرست قبائل کے ۸ء۳۵ لاکھ کنبوں کی امداد کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ دسمبر ۱۹۸۶ء تک ان میں سے ۵ء۷۹ لاکھ کنبوں کو مستفید کیا جا چکا تھا۔

درج فہرست قبائل کی لڑکیوں کے لیے الگ ہوسٹل تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں ایسے ۱۰۷ ہوسٹلوں پر ایک کروڑ ۳۵ لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا۔ ۸۷-۱۹۸۶ء میں ان ہوسٹلوں کے لیے ایک کروڑ ۴۰ لاکھ روپیہ مخصوص تھا۔

آٹھویں مالیاتی کمیشن کی سفارسات کے مطابق خاص خاص قبائلی دیہات میں بنیادی سہولیات مہیا کرنے کے لیے ۱۹۸۵ء سے چار برسوں کے لیے ۸۸ کروڑ ۷ لاکھ روپیہ آندھرا پردیش، آسام، بہار، ہماچل پردیش، کیرل، مدھیہ پردیش، منی پور، اڑیسہ، راجستھان، سکم، تری پورہ، اتر پردیش اور مغربی بنگال کے لیے وقف کیا گیا ہے۔

درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کی عورتوں اور بچوں کی ترقی کے لیے مرکزی وزیر فلاح کی زیر صدارت الگ سے ایک مشاورتی بورڈ قائم کیا گیا ہے۔

چوں کہ درج فہرست ذاتیں، قبائل اور پسماندہ طبقے کمزور ہیں اور ایسی حالت میں نہیں کہ زوردار اور اقتصادی طور پر جابر طبقوں کے ظلم کا مقابلہ کر سکیں۔ اس لیے حکومت ہند ہمیشہ اس مسئلے پر غور کرتی آئی ہے اور حالات کے مطابق قوانین اور اقدامات وضع کرتی رہی ہے۔ اس قسم کے ظلم کو روکنے اور کمزور طبقوں کا تحفظ کرنے کے لیے مرکزی سرکار نے واضح اور جامع ہدایات مرتب کی ہیں جن کی سفارش ریاستی سرکاروں سے عملدرآمد کے لیے کی گئی ہے۔ شہری حقوق کے تحفظ کے قانون ۱۹۵۵ء کی دفعہ ۱۵ (الف) کے تحت مرکزی سرکار ریاستی سرکاروں کے اس قانون کو موثر ڈھنگ سے نافذ کرنے کے لیے عملے کے اخراجات اور خاکروبوں کو ان کے پیشہ سے نجات دینے کے پروگرام کے لیے برابر کی مالی مدد دیتی ہے۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۱۸ ریاستی سرکاروں کو اس مقصد کے لیے ساڑھے پانچ کروڑ روپے کی مالی مدد دی گئی۔

آئین کے تحت درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کو جو تحفظات دیئے گئے ہیں ان کو ٹھیک ڈھنگ سے لاگو کرنے اور ان پر نگاہ رکھنے کے لیے ۱۹۷۸ء میں شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ قبائل کا ایک کمیشن بھی قائم کیا گیا ہے۔ یہ کمیشن اب تک ۲۷ رپورٹیں تیار کر کے پارلیمنٹ کو پیش کر چکا ہے۔

اقلیتوں کی بہبود

اگرچہ سب اقلیتی طبقے سماجی طور پر کمزور نہیں ہیں پھر بھی ان کو بعض محرومیوں کا سامنا ہو سکتا ہے۔ قومی زندگی کے دھارے میں اقلیتوں کے پورے پورے اشتراک عمل کی سہولیات مہیا کرنے کے لیے وزیر اعظم نے ایک ۱۵ نکاتی پروگرام بنایا ہے۔ اس پروگرام کے تحت وزارت فلاح میں ایک اقلیتی شعبہ قائم کیا گیا جو متعلقہ شکایات پر غور کر کے تدارک کے اقدامات کرتا ہے۔ ملک میں اوقاف کے انتظام کے قانون کے تحت ایک مرکزی وقف کونسل قائم کی گئی ہے۔

جسمانی طور پر معذور افراد اور طلبا کو وظائف دیئے جاتے ہیں۔ ۸۷-۱۹۸۶ء میں ایسے ۱۸ ہزار طلبا کو وظائف دیئے گئے۔ ملک میں معذور افراد اور اپاہج لوگوں کی امداد کے لیے ۱۸۰ رضاکار ادارے کام کر رہے ہیں جنھیں گذشتہ برس دو کروڑ ۶۵ لاکھ روپے امداد کے طور پر دیئے گئے۔ مرکزی ملازمتوں کا تین فیصد حصہ ان افراد کے لیے مخصوص رکھا گیا ہے۔

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

نریندر جوشی

بہار کا سماجی و اقتصادی منظر

مایوسی اور تاریکی کے بادل چھٹنے لگے!

بہار ایک تاریخی ریاست ہے، یہ ریاست عہد مہابھارت سے عہد موریہ تک مگدھ کہلاتی تھی۔ اس کا نام بہار اس لیے پڑا کیونکہ وہاں بودھ وہاروں کی کثرت تھی، اس ریاست نے موریہ خاندانوں کے حکمرانوں کا جاہ و جلال دیکھا۔ جیساکہ چندر گپت، اشوک اور ہرش وردھن۔ یہ نہ صرف بہادری اور علم دوستی کے لیے مشہور تھے، بلکہ ان کی قدردانی پوری دنیا میں مشہور ہوگئی تھی، ان کے نام سے بھارت کے نام کو چار چاند لگے۔ یہاں چانکیہ جیسے عظیم سیاست داں ہوئے جنھوں نے کوٹلیہ ارتھ شاستر تصنیف کرکے بھارت کو علم و سیاسیات کے قیمتی خزانوں سے مالا مال کیا، یہاں کی نالندہ یونیورسٹی نے علم کی تشہیر کرکے نہ صرف بھارت بلکہ غیر ممالک کے متلاشیان علم کی پیاس بجھائی، یہاں کے لوگ عالیشان مکانوں میں رہتے تھے۔ ریشمی کپڑے پہنتے تھے اور رقص و موسیقی کی محفلوں سے مسرور ہوتے تھے مگر یہی بہار آج غربت، اور افلاس کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔

آج بہار کا سماجی، اقتصادی اور سیاسی منظر نہایت مایوس کُن ہے۔ اس کی موجودہ آبادی کوئی آٹھ کروڑ ہے (۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ۷ کروڑ ۹۹ لاکھ تھی)۔ اس لحاظ سے یہ اتر پردیش کے بعد بھارت کی دوسری بڑی ریاست ہے اس کا رقبہ ۱۷۳۸۷۷ مربع کلومیٹر ہے۔ جہاں بھارت کی کل معدنی دولت کا ۴۰ فیصد پایا جاتا ہے لیکن اس سے پورے طور پر استفادہ نہیں کیا گیا۔ یہاں عوام کی فی کس آمدنی بھارت میں سب سے کم ہے۔ خوراک کے معاملے میں یہاں کے عوام سب سے کم غذائیت کا شکار ہیں۔ یہاں بے زمین کسانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور بھارت میں سب سے زیادہ افلاس یہیں پایا جاتا ہے۔ بچے بھکمری کا شکار ہیں۔ جرائم حد سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔

زرعی پیداوار میں جمود چھایا ہوا ہے۔ آبپاشی کی سہولیات کم ہیں، یہاں کی بھاری صنعت میں پبلک سیکٹر کی سب سے زیادہ سرمایہ کاری ہوئی ہے لیکن اس سے ہونے والے منافع کی شرح نہایت کم ہے۔ بہار اسٹیٹ بجلی بورڈ کو کل جتنا نقصان ہوا ہے وہ "بین الاقوامی مالی فنڈ" سے موصولہ قرضہ کے برابر پہونچ گیا ہے اور یہاں تک بتایا جاتا ہے کہ بہار اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی کوئی بھی بس، جب گیراج سے باہر آتی ہے تو وہ کارپوریشن کے لیے نقصان کا باعث بنتی ہے۔ جو ریاست میں بڑھتے ہوئے بھرشٹاچار (بدعنوانیوں) کی منہ بولتی تصویر ہے۔

افلاس کی چکی نے پیس ڈالا

افلاس نے عوام کو جس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا ہے اُسے انسانیت کی سطح سے پست زندگی ہی کہا جا سکتا ہے۔ لاکھوں مزدور روزی کی تلاش میں بنگال کی دم گھونٹو پٹ سن ملوں میں کام کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں یا وہ کلکتہ کی سڑکوں پر ہاتھ سے کھینچی جانے والی رکشائیں چلا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ بارہ مولا (کشمیر) سے لے کر اگرتلہ (تری پورہ) تک غلاموں کے گروہوں کی مانند سڑکوں، پلوں، باندھوں اور مکانات وغیرہ کی تعمیر میں مصروف دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ بھارت کے شمال مغربی حصے میں فارموں اور کھیتوں میں بندھوا مزدوروں کی مانند بھی کام کر رہے ہیں۔

ریاست کے نعامی توازن کو بھی درہم برہم کیا جا رہا ہے۔ اس کے کھیتوں اور جنگلات کی دولت بھی لوٹ لی گئی ہے اور لاکھ اور سال کے بیجوں جیسی جنگلاتی پیداوار کو جن پر آدی باسیوں کی زندگی کا دارومدار ہے کوڑیوں کے داموں پر

جا رہا ہے اور جھارکھنڈ کے عوام تو جسم و روح کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے برائے نام اُجرت پر مزدوری کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ قحط سیلاب، خشک سالی، جنگلات کی بربادی اور فطری توازن کی درہمی برہمی نے تباہی مچا رکھی ہے۔ "اُونٹ رے اُونٹ تیری کونسی کل سیدھی" کے مصداق یہاں زندگی کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں جسے اچھا کہا جا سکے حتیٰ کہ تعلیمی اداروں کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔ لوگ محض افلاس کے باعث ہی نہیں بلکہ تعلیم اور روزگار کے مواقع کی تلاش میں بھی اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہہ رہے ہیں۔ دلی کی یونیورسٹیوں میں ہزاروں بہاری طلبا کی شمولیت اس حقیقت کی مظہر ہے کہ متوسط طبقوں کے ہزاروں لوگوں کے ساتھ ساتھ لاکھوں مزدور بھی بہار سے نقل مکانی کر رہے ہیں۔

لیکن اب حالات نے کروٹ لینا شروع کی ہے۔ لاقانونی اور بڑھتے ہوئے جرائم کی زیادتی وجہ یہ تھی کہ اس کا سیاسی ڈھانچہ غیر مستحکم تھا۔ آئے دن وزارتیں ٹوٹتی اور بنتی تھیں۔ مگر اب دو سال سے زائد عرصے سے سیاسی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۸۵ء کو جب موجودہ وزیر اعلیٰ نے اپنے عہدے کا چارج لیا تھا تو سیاسی مشاہدین نے پیشن گوئی کی تھی کہ شری بندیشوری دوبے چھ ماہ سے زیادہ عرصے تک وزارت عظمیٰ کے عہدے پر متمکن نہیں رہ سکیں گے۔ لیکن وہ جس مضبوطی اور تدبر سے صورتِ حال پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں اس سے ایک بار پھر اُمید کی شمع روشن ہوئی ہے۔

انسدادِ افلاس کے پروگرام

عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد اگلے روز یعنی ۱۳ مارچ ۱۹۸۵ء کو وزیر اعلیٰ نے اعلان کیا کہ اُن کی حکومت کے روبرو جو اہم ترین مقاصد ہیں اُن میں سب سے زیادہ ترجیحی مقام امن و قانون کو حاصل ہے جسے ہر قیمت پر برقرار رکھا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ ترقیاتی منصوبوں کو تیزی سے عمل میں لایا جائے گا اور تمام محکموں کی کارکردگی کو بہتر بنایا جائے گا۔ انھیں علم تھا کہ ریاست خصوصاً دیہات اور قبائلی علاقوں میں امن و قانون کی بحالی کے بغیر ترقی ممکن نہیں ہے۔

لیکن دیہات اور قبائلی علاقوں میں افلاس اور بے روزگاری کے مسائل اس قدر عظیم ہیں کہ اس وقت ترقی کی جو رفتار ہے اگر اُس سے بھی بہت زیادہ تیز رفتاری سے کام لیا جائے تو بھی ان علاقوں میں ان مسائل پر قابو پانے کے لیے کئی دہائیاں درکار ہیں۔ چنانچہ اسی ضمن میں چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے تحت انسدادِ افلاس کے متعدد پروگراموں جیسے "آئی آر ڈی پی" (مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام)، "این آر ای پی" (قومی دیہی ترقیاتی پروگرام) اور "آر ایل ای جی پی" (دیہی بے زمین مزدوروں سے روزگار کی گارنٹی کا پروگرام) کے ذریعہ افلاس پر زبردست حملہ کر دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی بے گھروں کو مکانات اور مکانوں کے قطعات دینے کا پروگرام بھی شروع کیا گیا ہے۔

ملک میں افلاس کے معاملے کے بارے میں "نیشنل سیمپل سروے" (قومی نمونہ جاتی سروے) اور دیگر جائزوں سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ بہار میں سطح افلاس سے نیچے رہنے والے لوگوں کا فیصد ملکی اوسط سے زیادہ ہے تاہم اس میں بتدریج کمی ہو رہی ہے۔

نیشنل سیمپل سروے کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہار میں گذشتہ پانچ برس کے عرصے میں دیہی افلاس کی سطح میں ۶ فیصد کی کمی ہوئی ہے۔ بہار جیسی ایک ریاست میں یہ کامیابی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنا بے محل نہیں ہوگا کہ ۷۸-۱۹۷۷ء میں بہار میں سطح افلاس کے نیچے رہنے والے لوگوں کی تعداد کُل آبادی کا ۵۷ء۴ فیصد تھی۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق بہار میں مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کی بدولت ۵۰ فیصد عوام سطح افلاس سے اوپر آگئے ہیں۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ گو سطح افلاس کے نیچے رہنے والے لوگوں کا فیصد کم ہو گیا ہے۔ تاہم یہ کامیابی بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث کالعدم ہو گئی ہے جس کے نتیجے میں سطح افلاس کے نیچے رہنے والے عوام کی کُل تعداد میں تقریباً جمود آگیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی بھارت سرکار کی طرف سے ۸۶-۱۹۸۵ء میں لیے گئے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام سے مستفید ہونے والے جو لوگ سطح افلاس (۳۵۰۰ روپے سالانہ) سے اوپر آئے ہیں۔ بھارت میں اُن کا تناسب ۴۲ فیصد تھا جبکہ اُن کے مقابلے میں بہار میں اُن کا تناسب ۵۳ فیصد تھا۔

اسی طرح مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام سے مستفید ہونے والے جو لوگ سطح افلاس سے (۶۴۰۰ روپے سالانہ) سے اوپر آئے بھارت میں اُن کا تناسب جہاں ۱۱ فیصد تھا وہاں بہار میں اُن کا تناسب ۱۳ فیصد تھا۔ توقع کی جاتی ہے کہ ساتویں پانچ سالانہ منصوبے کے آخیر تک سطح افلاس کے نیچے رہنے والے دیہی آبادی کا فیصد کم ہو کر ملک میں ۲۸ فیصد اور بہار میں ۴۰ فیصد تک رہ جائے گا۔

آٹھویں پانچ سالا منصوبے کے آخیر تک موجودہ رجحانات کے مطابق ملک میں سطح افلاس کے نیچے رہنے والے عوام کا فی صد ۱۰ فیصد ہوگا اور بہار میں ۲۰ فیصد رہے گا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام امور کو مدنظر رکھ کر مرکزی اور ریاستی سطحوں پر انسدادِ افلاس

کے متعدد پروگرام شروع کئے گئے ہیں تاکہ افلاس کے مسئلہ پر قابو پایا جا سکے۔

ان پروگراموں کے تحت دیہی علاقوں کی تمام ترقیاتی سرگرمیاں آتی ہیں جن میں زراعت، آبپاشی، ترقیات، ڈیری، ماہی گیری، دیہی اور چھوٹی صنعتیں، دیہی توانائی اور امداد باہمی اور اصلاحات اراضی سے لے کر متعدد دیہی ترقیاتی پروگرام جیسے پینے کے پانی کی رسائی، دیہی سڑکوں، صحت عامہ اور خاندانی بہبود کے پروگرام اور سماجی جنگلبانی شامل ہیں۔ یہ پروگرام "آئی آر ڈی پی"، "آر ایل ای جی پی" اور درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل اور مفلسوں کے لیے بحالوں سے متعلق پروگراموں کے علاوہ ہیں۔

مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام ایک پرجوش پروگرام ہے۔ اسے ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں اہم مقام حاصل ہے جس کا مقصد سطح افلاس کے نیچے رہنے والے عوام کے فیصد کو جو ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۳۶٫۹ فیصد تھا ۹۰-۱۹۸۹ء میں ۲۵٫۸ فیصد تک کم کرنا ہے۔

اس پروگرام کو عمل میں لا کر ان مفلس کنبوں کی آمدنی بڑھائی جائے گی جن کی آمدنی کی سطح ۶۴ روپئے کی سطح تک یا اس سے کم ہے۔ اس زمرے میں عام طور پر چھوٹے کاشتکاروں کے کنبے، بے زمین کھیت مزدور، دیہی دستکار اور دیگر کمزور طبقے آتے ہیں لہذا اس پروگرام کے تحت درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کو قدرتی طور پر اولیت حاصل ہے

امید کی جھلک

بہار نے گذشتہ دو برسوں میں یعنی ۱۲ مارچ ۱۹۸۵ء سے ۱۲ مارچ ۱۹۸۷ء تک ترقیاتی سرگرمیوں میں جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ مختصراً درج ذیل ہیں۔

مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے تحت ۹۴۹۸۰ افراد کو سطح افلاس سے اوپر لایا گیا ہے۔

قومی دیہی روزگار پروگرام کے تحت ۶ کروڑ ۳۰ لاکھ ۵۶ ہزار انسانی دنوں کا روزگار پیدا کیا گیا ہے۔

دیہی بے زمینوں کے لیے روزگار کی گارنٹی کے پروگرام کے تحت ۴ کروڑ ۸۸ لاکھ ایک ہزار انسانی دنوں کا روزگار مہیا کیا گیا ہے۔ ۲۵۸۸۶ ایکڑ فاضل زمین کی تقسیم کی گئی۔

درج فہرست ذاتوں کے ۴۸۶، ۶۰، ۴ افراد اور درج فہرست قبائل کے ۲۲۲۷۴ افراد نے مالی طور پر استفادہ کیا۔

۳۴۷۸ دیہات میں جہاں پانی کی کمی تھی پانی کی سہولیات مہیا کی گئیں

۵۱۵۱۵ چھوٹے چھوٹے پلاٹ بے گھر لوگوں میں تقسیم کئے گئے۔

۲۶۷۲۷ کنبوں کو ان کے گرد و پیش کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے مدد دی گئی۔

۴۷۲۰۴ مکانات دیہی علاقوں میں کمزور طبقوں کے لیے تعمیر کئے گئے۔

۴۵۲۷ دیہات میں بجلی پہونچائی گئی۔

۲۰۷۴۳ بجلی سے چلنے والے پمپ نصب کئے گئے۔

۲۴ کروڑ ۴۳ لاکھ درخت لگائے گئے

۱۳۳۸ بائیو گیس پلانٹ نصب کئے گئے۔

۵۲۱۴۵۵ افراد کی خاندانی بہبود کی اسکیم کے تحت نس بندی کی گئی۔

۳۴۲ گشتی دکانیں، پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم کے تحت شروع کی گئیں۔

۱۵۵۱۷ نئی چھوٹی صنعتیں اور دستکاری کے یونٹ قائم کئے گئے۔

سچ تو یہ ہے کہ بہار نے کچھ عرصے سے ترقی کی راہ پر تیزی سے قدم بڑھانے شروع کر دئے ہیں، لیکن ابھی منزل بہت دور ہے۔ حکومت کی طرف سے کوشش کی جا رہی ہے کہ ترقی کے فوائد سے ریاست کے تمام طبقے، خصوصاً کمزور طبقے اور اقلیتی طبقے فیضیاب ہوں اور یہ تمام طبقے ان ترقیاتی سرگرمیوں میں حصہ لے کر بہار کو آگے لے جائیں۔ اگر اقلیتوں سمیت تمام طبقوں کو ترقیاتی سرگرمیوں سے فائدہ نہ پہنچے تو یہ ترقی ادھوری اور بے معنی ہو کر رہ جائیگی۔

مسلمانوں کے مسائل

اگرچہ بہار سرکار اقلیتوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے خلوص اور فراخدلی سے کام لے رہی ہے تاہم مسلمانوں کے بعض مسائل ایسے ہیں جو فوری توجہ کے مستحق ہیں۔

بہار میں مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا ۱۴ فیصد ہے۔ تاہم وہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں آل انڈیا سروسز، پولیس اور فوج اور پبلک اور پرائیویٹ سیکٹروں کی ملازمتوں میں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اگر وہ مقابلے کے امتحانات میں اچھی پوزیشن حاصل نہیں کر رہے تو حکومت کو ان کی تعلیمی حالت بہتر بنانے کے لیے سازگار حالات پیدا کرنے چاہئیں اور دیکھنا چاہیئے کہ بھرتی کے معاملے میں انصاف سے کام لیا جا رہا ہے۔

مسلمان نوجوانوں کو اس امر کی بھی شکایت ہے کہ بہار کے مختلف اضلاع میں ان کی اقتصادی بہبود یا بحالی کے سلسلے میں چھوٹی صنعتیں یا تجارتی ادارے قائم کرنے کے لیے بہار اسٹیٹ اقلیتی مالی کارپوریشن کی طرف سے جو قرضے دئے جاتے ہیں ان کی تقسیم ٹھیک طور پر نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں بتایا جاتا ہے کہ بہار یونیورسٹی سروس کمیشن، بہار کالجز سروس کمیشن اور بہار اسکول سروس کمیشن میں مسلمانوں کی نمائندگی صحیح ڈھنگ سے نہیں ہو رہی ہے۔ بعض ایسے مسائل بھی ہیں جو ہندوؤں سے

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

کسم چوپڑا

اندرا گاندھی نہر
جو صحرا کی کایا پلٹ کرے گی

اندرا گاندھی نہر کا پلان ۱۹۴۸ء میں بنایا گیا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں بھارت سرکار نے اس کی منظوری دی تھی اور ۱۹۵۸ء میں اس پر کام شروع ہوا تھا۔ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۶۱ء کو اس کا پانی پہلی بار ایک نہری نظام میں چھوڑا گیا تھا، جو مکمل ہونے پر دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام ہوگا اور جس کی لمبائی ۹۴۲۵ کلومیٹر ہوگی۔

بعض اعداد تو دماغ کو چکرانے والے ہیں، جیسے اندرا گاندھی نہر بھارت کے طول و عرض کے دگنے کے برابر ہوگی۔ زمین کی کھدائی ۳۹ کروڑ مکعب میٹر ہوگی۔ اس کی مٹی سے ریلوے ویگن اتنی تعداد میں بھر جائیں گے کہ وہ دنیا کے اردگرد پانچ بار گھیرا لگا سکیں گے۔ اس پر اندازاً ۹۳ ارب ۴۰ کروڑ روپے کی لاگت آئے گی (اس میں تازہ ترین نظرثانی شدہ رقومات شامل نہیں ہیں)۔ اس پراجیکٹ سے اس کی اراضیات کی قیمت میں ۵۰ ارب روپے کا اضافہ ہوگا اور سال میں ۳۷ لاکھ ٹن اناج کی پیداوار ہوگی۔ ۲۵ ہزار کنبوں کو کھیتوں میں کام کرنے کے لیے روزگار ملے گا۔ پینے لائق پانی کی سپلائی ۱۲۰۰ گاؤں تک بڑھ جائے گی اور ۱۰ ہزار کلومیٹر نہروں کی پٹریوں کے ساتھ ساتھ پیڑ پودے لگائے جائیں گے۔

جب انجام کار اندرا گاندھی نہر مکمل ہو جائے گی تو یہ دنیا کے عجوبوں میں شمار ہوگی۔ جس سے راجستھان کی تمام تر صحرائی ریاست لہلہانے لگے گی۔ اس سے ریاست کے سماجی و اقتصادی منظر میں اعلیٰ درجے کی تبدیلی ہوگی۔ ماحولیات میں سدھار ہوگا اور مغربی بھارت میں تھار صحرا کی پیشقدمی رک جائے گی۔

برلا سائنس اینڈ ٹیکنالوجی سینٹر نئی دلی نے دور افتادہ حساس سراغرساں آلوں سے جو معلومات فراہم کی ہیں ان کے مطابق تھر نہ صرف اراولی کے سلسلۂ کوہ کے مشرق میں بڑھ رہا ہے جو راجستھان کے بیچ میں سے گزر رہا ہے بلکہ وہ شمال مشرق میں بھی دلی، پنجاب اور ہریانہ کی جانب بڑھ رہا ہے جہاں صحرا کی پیشقدمی ہو رہی ہے۔ پلاننگ کمیشن نے جو اعداد فراہم کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ گذشتہ ۵۰ برس سے صحرا کا پھیلاؤ ہر برس نصف میل بڑھ رہا ہے اور وہ ہر برس ۵۰ مربع میل زرخیز زمین کو ہڑپ کر رہا ہے۔ لیکن اب انسان کے بنائے اوسط درجے کے دریا یعنی اندرا گاندھی نہر نے الٹا چکر چلا دیا ہے جو لق و دق صحرا کے عقبی حصے کو زرخیز زمین میں منتقل کر رہی ہے۔

پراجیکٹ کی ۶۴۹ کلومیٹر لمبی بڑی نہر کی تکمیل ہونا باقی ہے۔ نہر کے پانی سے سیراب ہونے والی زمین سے پہلے ہی سال میں ۳ ارب روپے کی فصل حاصل ہوئی ہے۔ اس کے مقابلے میں صرف پراجیکٹ کے پہلے مرحلے میں جس میں ۲۳ ارب ۳۰ کروڑ روپیے کی سرمایہ کاری ہوئی ہے، دستیاب کل ۱۵۳۱۰۰ ہیکٹر زمین میں سے صرف ۰ ۴۵ ہیکٹر زمین کو زیر کاشت لایا گیا ہے۔ یہ زمین بڑی نہر کے پہلے مرحلے کے ۱۸۹ کلومیٹر پھیلاؤ کے ساتھ دستیاب کرائی گئی ہے۔ راجستھان جو طویل عرصے سے اناج کی کمی والی ریاست رہا ہے اب خوراک کی سپلائی میں خود کفیل ہو گیا ہے۔ اور جلد ہی اناج کی برآمد کرنے کی پوزیشن میں پہونچ جائے گا۔ اب ایسا منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے جس میں پراجیکٹ کے پہلے مرحلے کے لیے مجوزہ شدید آبپاشی کو توسیعی آبپاشی میں منتقل کیا جائے گا۔ توسیعی آبپاشی (جس سے

سال میں ایک چراگاہ کے ساتھ ایک فصل ہوتی ہے اور اس کے مقابلے میں بھرپور آبپاشی کے تحت تین فصلیں حاصل ہوتی ہیں) اور لیشو پلان (جس کے لیے پلاننگ کمیشن سے باضابطہ منظوری کا ابھی تک انتظار ہے) کی جانب یہ تبدیلی اُن تبدیلیوں کے سلسلے کی تازہ ترین کڑی ہے جس سے اندرا گاندھی نہر ایک بے مثل پراجیکٹ بن گئی ہے جو بدلتے ہوئے اوقات کے ساتھ علاقے کا نقشہ ہی بدل رہا ہے اور جس کے تحت بڑے وسیلے یعنی پانی کا احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جا رہا ہے۔

۱۹۵۷ء میں جب پراجیکٹ پر کام شروع ہوا تھا (اس کا خیال حصولِ آزادی سے بہت پہلے سابقہ ریاست بیکانیر کے ایک انجینئر مسٹر کنور سین کو سُوجھا تھا) تو ۶۶ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کے اس پراجیکٹ کے تحت پنجاب کے "ہریکے باندھ" سے راجستھان کی سرحدوں تک پانی لانے کے لیے ایک ۲۰۴ کلومیٹر معاون نہر بنانے اور ۴۴۵ کلو میٹر لمبی بڑی نہر کو بیکانیر کے مسلسل سوکھا زدہ ضلع کے وسطی حصے تک لانے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اس صحرائی علاقے کو سرسبز بنانے کے لیے اس نہر کے ساتھ ساتھ تمام علاقے میں بھرپور آبپاشی کا پلان بنایا گیا تھا۔

جب اس پراجیکٹ پر کام بڑھتا گیا تو پانی کے بھاری رساؤ سے ہونے والے نقصان کے باعث اس پراجیکٹ پر از سرِ نو غور کیا گیا۔ پہلے فیصلہ کیا گیا کہ معاون اور بڑی نہروں اور بعد میں تمام تر ۹۴۲۵ کلومیٹر نہری نظام کی استرکاری کی جائے جس سے یہ دُنیا کا سب سے بڑا نہری نظام بن جائے جس کی مٹی کی کھدائی اتنی بڑی ہے کہ اس سے ماؤنٹ ایورسٹ کے برابر ایک ایسا اونچا مینار بن سکتا ہے جس کی بنیاد ۳۵۰ میٹر لمبی اور ۳۵۰ میٹر چوڑی ہو۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ جن اینٹوں اور ٹائلوں سے استرکاری کی جائے گی۔ اس سے خطِ استوا کے گرد آٹھ میٹر چوڑی پٹی بن سکتی ہے یا کلکتہ سے قاہرہ تک ایک شاہراہ تیار ہو سکتی ہے۔

استرکاری سے ہونے والی پانی کی بچت سے اس پراجیکٹ کی کافی توسیع ہوئی ہے۔ لیکن انجام کار استعمال میں آنے والی پانی کی مقدار ۷۲ لاکھ ایکڑ فٹ ہے جو راجستھان کے لیے الاٹ کیا گیا ہے۔

صحرا کو سرسبز بنانے کی مساعی میں یہ جانکاری حاصل ہوئی کہ اگر راجستھان کے مقامی کاشتکاروں کو اندرا گاندھی نہر سے مستفید ہونا ہے تو اب پلان کے خد و خال میں تبدیلیاں کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ ۱۹۸۴-۸۵ء میں ان نظرثانیوں کے بارے میں غور کیا گیا۔

بڑی نہر کے آخری حصے پر نہر کا ۱۲۵ کلومیٹر کی توسیع کرنا تھا، صحرا کے دور دراز حصوں میں پینے لائق پانی دستیاب کرنا، مشرقی کنارے پر پانچ لفٹ آبپاشی اسکیمیں جس سے اُن عقبی حصے کی شادابی کا امکان بڑھ جائے جہاں مقامی آبادی کے فائدے کے لیے چراگاہوں کی افزائش ہو۔ یہاں زیادہ تر ایسے مویشی پالنے والے رہتے ہیں جو دنیا کے مشہور قالینوں میں استعمال ہونے والی دو تہائی اُون پیدا کرتے ہیں اور دُنیا کے بعض اعلیٰ ترین گھوڑے بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔

اس سے اس علاقے کی ثقافت اور عمرانیات کی بقا کی یقین دہانی ہوگی، فطری توازن میں ایسی تبدیلیاں کم ہوں گی جن سے صحرا کی جنگلی زندگی کو نقصان پہونچ سکتا ہے اور انجام کار ایسی فصلوں کی فراوانی سے تحفظ ہو سکتا ہے جن کی کثرت ترقی یافتہ ملکوں کی زرعی معاشیات کو پہلے ہی نقصان پہونچا رہی ہے۔

شائد جس امر سے تحریک ہوئی وہ تھی "سیوان گھاس" جو نہایت مقوی ہے اور تھار کے بعض حصوں میں خوب پیدا ہوتی ہے جس سے وہاں مویشیوں کی افزائش میں بڑی مدد ملتی ہے۔ نہر کے کناروں کے لیے جس ایک کلومیٹر جنگلاتی تہہ کا پلان بنایا گیا ہے اُس سے اور سیراب ہونے والی زمینوں کی کُل کاشت سے جیسا کہ شمال میں گنگانگر میں کیا جا رہا ہے۔ اعلیٰ چراگاہوں پر ضرب کاری لگے گی جو کہ نامعلوم ادوار سے راجستھان کے طرزِ زندگی کی بنیاد رہی ہے۔ لہٰذا سماجی اتار چڑھاؤ کو کم از کم کرنے کے لیے پراجیکٹ پر از سرِ نو نظرثانی کی گئی ہے۔

پھلوں، بیلوں اور تلہن کی واحد فصل کے ساتھ ساتھ ایسی متعدد زرعی صنعتوں کی طرف پہلے ہی بغور توجہ دی جا رہی ہے۔ جس کے ساتھ ہی آبادی کی بھاری تعداد کے لیے سروسوں، کام دھندوں اور اُن کی قوتِ خرید میں اضافہ ہوگا اور اس کے ساتھ ہی آلودگی سے پاک صحرائی ماحول برقرار رہے گا۔ یہ پہلے ہی فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس علاقے میں آلودگی پھیلانے والی کسی بھی صنعت کی اجازت نہیں دی جائے گی اور کہ نہر میں کسی بھی نالہ یا نالی کے پانی کو گرنے نہیں دیا جائے گا۔ اس میں سے صرف نالے یا نالیاں ہی نکالی جا سکیں گی تاکہ پانی صاف اور نیلگوں بنا رہے۔

اس شاندار نہر کی تعمیر از خود ایک چھوٹے سے معجزے سے کم نہیں ہے۔ مثلاً ایک مسلسل دباؤ ثابت ہو رہے ہیں کیوں کہ ریاستی حکومت زیادہ سے زیادہ کوشش کرنے پر بھی اس پراجیکٹ کے تئیں اپنے کُل بجٹ کا محض کچھ فیصد دے سکی ہے۔ ٹیکس پہلے ہی زیادہ بڑھے ہوئے ہیں جس سے کسی خصوصی محاصل کا نفاذ خارج از امکان ہے۔

گو ایسے پراجیکٹ سے عوام کو ہونے والے فوائد اس امر سے خود آشکارا ہیں کہ تمام تر پراجیکٹ پر آج تک ۷،۵ ارب روپے کی کُل لاگت آئی ہے

اوراس کے کچھ حصے پر کاشتکاری ہونے سے ہر برس ۲ ارب روپے کی فصلیں پیدا ہوں گی۔

حالیہ اوقات میں یہ مالی دباؤ قدرے کم ہوگئے ہیں۔ جب کہ مرکزی حکومت کی طرف سے ۸۳-۱۹۸۲ء کے بعد پلان کی زیادہ سے زیادہ مالی حد سے زائد مزید چالیس کروڑ روپے دیئے جا رہے ہیں۔ اس سے ہونے والے فوائد کا اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس سے سال میں ۳۵ لاکھ خوراکی فصلیں، ۳ لاکھ ٹن منافع بخش فصلیں اور ۴۰ لاکھ ٹن چارہ پیدا ہوگا۔ سب ملا کر دیکھا جائے تو یہ نہر کی تعمیر پر ہونے والی سرمایہ کاری سے بہت زیادہ ہوگا اور اس کے ساتھ ہی دو کپڑا ملیں، دو چینی کے یونٹ، اور بناسپتی تیل، چینی، گوند، صابن، نشاستہ اور گلیسرین اور پھلوں اور سبزیوں کے تحفظ کے کارخانے بھی لگائے جائیں گے۔ اور ان کے علاوہ کپاس بیلنے اور پراسیسنگ کا کام بھی ہوگا۔۔۔ اور اگر اندرا گاندھی نہر کے چیئرمین سری بھٹناگر کے خواب سچے ثابت ہوئے تو کئی طرح کی شرابیں بھی تیار کی جائیں گی۔ وہ جوش و اُمنگ کے ساتھ امریکہ کے ایریزونا اور کیلی فورنیا صحراؤں کی جانب اشارہ کرتے ہیں جہاں بادام اور انگوروں کی فصلوں سے لہر بہر ہوگئی ہے اور جہاں کے حالات تھار کے صحرا سے ملتے جلتے ہیں۔

یقینی طور پر مزدور ریاست کے اندر ہی سے لیے جاتے ہیں۔ بھلا راجستھان کے مزدوروں کے سوائے دوسرا کون تھار صحرا کے موسم کی سختیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوگا جس کی تیز گرم ہواؤں سے نہر کے پانی میں لہریں اُچھلتی ہیں۔ جو کھڑی فصلوں پر ریت کی چادر بچھا دیتی ہیں۔ اور نہر کے کناروں پر درختوں کو جھکا کر دُہرا کر دیتی ہیں۔

نہری حکام کا بیان ہے کہ اگر نہر کے ارد گرد کی زمینوں کو جو کُل ملا کر اس وقت ۱۶ لاکھ ہیکٹر ہیں۔ موجودہ مارکیٹ قیمتوں پر نیلام کیا جائے تو اس سے بہت زیادہ فنڈ اکٹھے ہو جائیں گے اور زمین کے استعمال میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہوگا۔

حکومت راجستھان قطعاتِ اراضی الاٹ کرنے کے معاملے میں جن میں سے ہر ایک ۱۵ء۵ مربع ایکڑ ہے۔ بڑی احتیاط سے کام لے رہی ہے۔ اور اس سلسلے میں روایاتی طور پر بے زمین کاشتکاروں اور درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کو ترجیح دے رہی ہے۔ زمین کی قیمتیں بڑی رعائتی ہیں۔ ہر قطعہ ۳۰ ہزار روپے میں دیا جاتا ہے۔ اور قیمت کئی برسوں میں قسطوں میں وصول کی جاتی ہے۔

اس سے بھی بیشتر ابتدائی الاٹیوں کی ہمت ٹوٹ گئی اور انھوں نے زمینیں امیر لوگوں کو فروخت کر دیں۔ انجام کار کمانڈ ایریا ڈولپمنٹ اتھارٹی قائم کی گئی جس نے ایک نیا طرزِ زندگی وضع کرنے میں مدد دی۔

جب انجام کار نہر مکمل ہو جائے گی تو اس کی وسعت بڑھ جائے گی اور وہ اعلیٰ کاریگری کا نمونہ ہوگی۔ ۹۰۰ کلومیٹر لمبی بڑی نہر کو جو تہہ میں ۳۸ میٹر چوڑی اور ۴ر۶ میٹر گہری ہوگی تراشنا اور اس کے ساتھ ہی پانی تقسیم کرنے والی ۸۸۰۰ کلومیٹر لمبی نہریں اور کُل ۶۵ ہزار لمبی معاون نہریں بنانا ایک بہت بڑا کام ہے۔ طوالت کے علاوہ ریت کو ہٹانا بھی مشکل ہے۔ اس کام کو جولائی سے مارچ تک ۵۰ ہزار مزدور ۲۳ ہزار گدھوں اور ۶ ہزار اونٹ گاڑیوں کی مدد سے انجام دیں گے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ نہر کے کناروں پر لائیننگ لگانے میں ۱۵ لاکھ ٹن کوئلہ اور ۲۰ لاکھ ٹن سیمنٹ استعمال کیا جائے گا۔ نہر کے کناروں کے ساتھ ساتھ گھنے جنگل اُگ رہے ہیں۔ اگرچہ جنوبی حصے کو ابھی زیر کاشت لایا جا رہا ہے تاہم شمالی حصے پر پھلوں کی نئی اقسام خصوصاً لیموں نسل کے پیوندی پھل، سنگترے، مالٹا اور نئی قسم کے "کینو" بڑی مقدار میں ۱۰ ہزار ہیکٹر زمین میں اُگائے جا رہے ہیں جو زیادہ تر برآمد کئے جا رہے ہیں۔

●

بقیہ اِداریہ

ہوئے انھیں صفِ اوّل کا ممتاز ادیب اور شاعر بنایا۔

ادارہ ان کے پسماندگاں سے دلی عقیدت و تعلقِ خاطر کے ساتھ اظہارِ تعزیت کرتا ہے اور ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

قمر مرادآبادی

اُردو کے مشہور شاعر قمر مراد آبادی ۸۰ سال کی عمر میں ۳ مئی کو مراد آباد میں شدید علالت کے بعد انتقال فرماگئے، موصوف ۷۰ سال سے بھی زیادہ عرصے سے اُردو ادب کی خدمت بڑے خلوص اور لگن کے ساتھ کر رہے تھے، ان کی شعری خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں فخرِ غزل کے خطاب سے نوازا گیا۔

تغزل کی جو خصوصیات اور روایات ذوق سے چل کر حسرت، جگر اور فانی وغیرہ کے توسط سے دورِ حاضر کے شاعروں تک پہونچیں، قمر مرادآبادی ان کے امانت دار تھے، انھوں نے غزل کو کچھ نئے امکانات سے بھی آشنا کیا، مشاعروں میں انھیں بڑے احترام اور ذوق و شوق سے سُنا جاتا تھا۔ ان کے ۵ شعری مجموعے اور تین نثری تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ادارہ ان کی وفات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ (ایڈیٹر)

●

ڈاکٹر سید مسعود حسین جعفری۵

پپیتا اس کی قسمیں اور باغبانی

آم کے بعد پپیتا ہی ایسا پھل ہے جس میں وٹامن اے، نشاستہ اور کیلشیم کافی مقدار میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک قسم کا دودھ جس میں ایک قسم کا خمیر ENZYME بھی شامل ہے، قابل لحاظ مقدار میں ہوتا ہے۔ اس کے ذائقے اور افادیت کی وجہ سے ملک میں اس کی مانگ بہت ہے۔ حالانکہ ہندوستان میں اس کی پیداوار فی ایکڑ بہتر ہے لیکن بازار کی مانگ اس قدر ہے کہ یہ شرح پیداوار ناکافی ہے۔ ملک کی زرعی کونسل (آئی۔ سی۔ اے۔ آر) کے ماتحت مرکزی اداروں میں باغبانی سے متعلق تحقیقی کام کافی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ مختلف پھل دار پودوں کی افزائش کے علاوہ شرح پیداوار میں اضافہ اور انواع و اقسام کی بیماریوں سے ان کا تحفظ کیسے کیا جائے ان اداروں کا نصب العین ہے۔

پپیتے Papaya کی باغبانی سے ابھی تک ملک کی ضرورت کو پوری طرح سے تسکین نہیں ہوئی ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ اس کی باغبانی پرانے طریقوں سے کرتے ہیں دوسرے کم پیداوار والی قسموں کو بویا جاتا ہے۔ پپیتے کی عام قسمیں: کو۔۱، کو۔۲، "گرگ ہنی"، "واشنگٹن سیلون" اور "مدھو بندو" ہیں، ان میں زیادہ تر قسمیں خالص نہیں ہیں۔ کو۔۱، کو۔۲ اور "گرگ ہنی" جنوبی ہندوستان کی خالص قسموں میں شمار کی جاتی ہیں لیکن شمالی ہندوستان میں ان کی پیداوار تسلی بخش نہیں ہے، اس کے باوجود "رانچی" قسم ان سب میں اعلیٰ خیال کی جاتی ہے۔ تحقیقی اداروں میں افزائش نسل پر تحقیق جاری ہے تاکہ جدید قسموں کو دریافت کیا جا سکے۔

انڈین ایگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ IARI دہلی نے پپیتے کی چار قسموں کو دریافت کیا ہے۔ ان کا ذکر باغبانی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اور کسانوں کو مفید ثابت ہوگا۔

۱۔ پوسا ذائقہ دار، پوسا ڈیلیشیس (Pusa 1-15) پیداوار اور خوبیوں کے لحاظ سے یہ سب سے اعلیٰ قسم ہے۔ اس کا پودا تقریباً ۸۰ سینٹی میٹر کی قامت پر پھل دینا شروع کر دیتا ہے۔ ایک بار پھل دینے کے بعد پودوں کی قامت ۱۹۶ سے ۲۱۶ سینٹی میٹر تک ہو جاتی ہے۔ تقریباً ۲۴۹ سے ۲۵۶ دنوں میں پودوں میں پھل آجاتے ہیں جو نہایت شیریں اور خوشبودار ہوتے ہیں۔ گودے کا رنگ گہرا نارنجی اور تقریباً ۴ سینٹی میٹر دبیز ہوتا ہے۔ پھلوں کی لمبائی تقریباً ۱۸ سینٹی میٹر اور چوڑائی ۸ سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ ایک پھل کا وزن قریب قریب ۲ کلوگرام اور پیداوار فی پودا ۳۵ سے ۴ کلوگرام تک ہوتی ہے۔ پھلوں میں نشاستہ (شکر) کی فیصد مقدار ۱۳ ہے۔ اس قسم کی دوسری خصوصیت جس کی وجہ سے یہ دیگر قسموں سے مختلف ہے، اس کا نسلی امتیاز ہے۔ اس میں نر پودے بالکل نہیں ہوتے اور تقریباً دس فیصد پودے پھل دار ہوتے ہیں اور تین سال تک پھلوں کی پیداوار مل سکتی ہے۔

۲۔ پوسا میجسٹک Pusa Majestic اسم با مسمّیٰ ہے حالانکہ یہ دوسرے درجہ کی قسم شمار کی جاتی ہے۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ اس کے پھل پکنے پر جلد نہیں سڑتے لہٰذا زیادہ دنوں تک رکھ سکتے ہیں یا دور کے بازاروں میں آسانی سے بھیج سکتے ہیں۔ اس کے پودے ۸۴ سینٹی میٹر کی قامت پر پھل دینے لگتے ہیں۔ ایک

۵ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف شوگر کین ریسرچ، لکھنؤ۔

پھل دینے کے بعد پودوں کی اونچائی ۱۶۲ سے ۱۹۶ سینٹی میٹر تک پہنچ جاتی ہے۔ اول الذکر قسم کی طرح اس میں بھی نر پودے نہیں ہوتے۔ البتہ اس کے پھل ذائقہ میں پہلی قسم کو نہیں پا سکتے (یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ پپیتے میں صرف مادہ پودے ہی پھل دیتے ہیں)۔ اس کی شرح پیداوار ۳۵ سے ۳۸ کلوگرام فی پودا ہے۔ ایک پھل کی اندرونی لمبائی و چوڑائی ۱۷ ر اور ۹ ر سینٹی میٹر علی الترتیب ہوتی ہے۔ گودے کی موٹائی تقریباً ۳ ر ۵ سینٹی میٹر، ٹھوس اور پیلے رنگ کا ہوتا ہے، اس میں شکر کی مقدار ۹ سے ۱۰ فیصد تک ہوتی ہے۔ ایک پھل کا وزن ۲ ر ۵ کلوگرام تک ہوتا ہے۔ پیداوار کے لحاظ سے اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ دوسرے سال تین گنی ہو جاتی ہے

۳۔ پوسا جینٹ (Pusa 1-45 V)

یا Pusa giant اس کے پھل بڑے اور گولائی کے ساتھ لمبے ہوتے ہیں۔ پھل کا آخری سرا نوکیلا ہوتا ہے۔ پھل کی لمبائی و چوڑائی ۱۸ ر اور ۱۰ ر سینٹی میٹر علی الترتیب ہوتی ہے۔ گودے کی موٹائی ۵ ر سینٹی میٹر اور ایک پھل کا وزن ۵ ر ۱ سے ۵ ر ۳ کلوگرام تک ہوتا ہے۔ اس میں شکر کی مقدار ۷ ر سے ۵ ر ۸ فیصد ہوتی ہے۔ اس کے پودے ۸۱ سے ۹۲ سینٹی میٹر کی قامت پر پھل دینے لگتے ہیں۔ ایک سال گزر جانے پر پودوں کی قامت ۲۲۰ سینٹی میٹر تک ہو جاتی ہے۔ پیداوار کی شرح ۳۵۲ کلوگرام فی پودا ریکارڈ کیا گیا ہے۔ چونکہ اس کے پودے موٹے اور قامت میں مضبوط ہوتے ہیں لہذا اس کی باغبانی ملک کے ان علاقوں میں مناسب ہے جہاں تند ہوائیں چلتی ہیں۔

۴۔ پوسا کی پست قامت قسم

(Pusa 1-45 V

اس کے پودے دیگر قسموں کے بہ نسبت پست قامت ہوتے ہیں۔ ۹۰ سینٹی میٹر کی اونچائی پر بھی پودے پھل دینے لگتے ہیں۔ ایک سال بعد پودوں کی اونچائی ۱۳۰ سینٹی میٹر ہو جاتی ہے۔ تقریباً ۲۳۵ سے ۲۳۹ دنوں میں پودوں میں پھل آ جاتے ہیں۔ پھل سیفادی، ان کی لمبائی و چوڑائی ۱۲ ر اور ۸ ر سینٹی میٹر علی الترتیب ہوتی ہے۔ اندر کے گودے کی موٹائی ۲ ر ۵ سینٹی میٹر، رنگ زرد سرخ پھل کا وزن ۵ ر ۰ سے ۵ ر ۱ کلوگرام تک، اور شکر کی مقدار ۸ سے ۹ فیصد تک ہوتی ہے۔ اس کے پودے دو تین سال تک پھل دیتے ہیں۔ لہذا اس کی باغبانی ملک میں زیادہ مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔

باغبانی کا طریقہ

نرسری کی تیاری، مٹی کے گملوں، لکڑی کے بکس یا پالی تھین کے تھیلیوں میں بھی کر سکتے ہیں۔ اس طریقہ سے تیار کی ہوئی نرسری کے پودے آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جا سکتے ہیں۔ ان تھیلوں، گملوں یا لکڑی کے بکسوں میں ½ حصہ مٹی، ½ حصہ بالو (ریت) اور ½ حصہ پتوں سے تیار کی ہوئی کھاد (کمپوسٹ) بھر لیں۔ ان میں ایک سینٹی میٹر کی گہرائی پر بیج کو بو دیں یہ نرسری اپنے گھروں میں کچن گارڈن کے لیے آسانی سے تیار کر سکتے ہیں۔ بیج کو بونے سے پیشتر الیسان نامی دوا سے دھو لیں تاکہ پھپھوندی کی بیماری گلکا نہ لگے

بڑے پیمانے پر نرسری تیار کرنا

اس کے لیے ۳ میٹر لمبی، ایک میٹر چوڑی کئی کیاریاں بنائیں جو سطح زمین سے ۱۰ سینٹی میٹر کی اونچائی پر ہوں۔ کیاریوں کی مٹی خوب باریک ہو اور بیجوں کو قطاروں میں بونا چاہیئے۔ دو بیج کے درمیان ایک سینٹی میٹر کا فاصلہ اور دو قطاروں کے درمیان ۱۰ سینٹی میٹر کا فاصلہ رکھنا چاہیئے۔ بونے کے بعد سڑے ہوئے پتوں کی باریک کھاد Compost سے بیجوں کو ڈھک دیں۔ بارش اور دھوپ سے محفوظ رکھنے کے لیے دھان کے پوال یا پالی تھین کی چادر سے کیاریوں کو ڈھک دیں۔ اکثر و بیشتر بورڈ مکسچر کا ۱ فیصد محلول کیاریوں میں چھڑک دیجیے، ایک ہیکٹر زمین پر پپیا لگانے کے لیے ۲۵ گرام بیج کافی ہوتا ہے۔ نرسری کے پودوں کو باغ کی زمین پر آسانی سے منتقل کیا جا سکتا ہے

باغ کے لیے ایسی زمین کا انتخاب کیا جائے جو اونچی ہو اور وہاں پانی جمع نہ ہوتا ہو۔ گرمی کے موسم میں ۲ × ۲ مربع میٹر کی دوری پر ۶۰ مکعب سینٹی میٹر کے گڑھے بنائے جائیں اور ان میں کمپوسٹ ۲۰ کلوگرام دیمک کی کھاد یا کھلی ایک کلو گرام اور ریلیز میل (Rallismeal) یا ہڈی کا چورا ایک کلوگرام بھر دیا جائے۔ دو مہینے تک یہ کھاد ان میں سڑتی رہے۔ اس کے بعد نرسری میں تیار کئے ہوئے پودے لگائیں۔ ایک گڑھے میں تین پودے مثلث نما قطار میں اور ۱۵ سینٹی میٹر کے فاصلہ پر ایک دوسرے کو رکھیں۔ اس کے بعد مشاہدہ کرتے رہیں تاکہ نر پودوں کو خارج کیا جا سکے۔ البتہ ۱۰ فیصد نر پودے ایک باغ کے لیے کافی ہیں۔ پودوں کی خوراک کے لیے نائٹروجن ۲۰۰ سے ۲۵۰ گرام، فاسفورس بھی اسی مقدار میں اور پوٹاش ۲۵۰ سے ۵۰۰ گرام۔ نصف برسات کے شروع میں اور باقی نصف برسات کے آخر میں دینا چاہیئے۔ پوسا ڈیلیشس اور پوسا میجسٹک قسموں کے لیے فی گڑھا ایک پودا کافی ہے۔

بیماریاں اور ان سے تحفظ

پپیتے پر کچھ مخصوص بیماریاں لگتی ہیں جو

پھلوں کی مٹھاس کو کم کر دیتی ہیں۔ ان میں موزیک Mosaic پتوں کو موڑنے والی، زنگ یا گول دھبے والی، اور مٹھاس کو کم کرنے والی موزیک قابلِ ذکر ہیں۔ موزیک کی بیماری عموماً سارے ملک میں پھل کو متاثر کرتی ہے۔ اس کے علاوہ پتوں، تنوں اور شاخوں کو بھی برباد کر دیتی ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ پہلے یہ پتوں، تنوں یا پھلوں پر چکنے دھبوں کی شکل میں اُبھرتی ہے۔ بیماری کے آغاز پر یہ دھبے چھوٹے ہوتے ہیں پھر بڑے ہو کر پھیل جاتے ہیں۔ پتے بد رنگ، پھل چھوٹے اور پکنے سے پیشتر ہی پودوں سے گر جاتے ہیں۔ اگر ان پھلوں کو چکھا جائے تو مزہ پھیکا ہوگا۔ کبھی کبھی اس بیماری کی وجہ سے پھل دوہرا ہو جاتا ہے۔ پتوں کی تعداد کم اور بناوٹ چھوٹی رہ جاتی ہے جس کا براہِ راست، اثر پھلوں کی پیداوار پر پڑتا ہے۔

دوسری مہلک بیماری پتوں کو موڑنے والی ہے جو دہلی، یو۔پی اور بہار کے باغات میں دیکھی گئی ہے۔ اس کی وجہ سے پتے مڑ جاتے ہیں۔ انھیں پودوں پر آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ مُڑے ہوئے پتے پودے سے جلد ہی گر جاتے ہیں اور بالآخر پودے کے سرے پر پتوں کا صرف ایک گچھا تاج کی شکل میں رہ جاتا ہے۔ مڑے ہوئے پتے موٹے۔ زرد اوراق کی نسیں اُبھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اس بیماری کا اثر براہِ راست پھلوں کی پیداوار پر پڑتا ہے۔ کئی بار تو دیکھا گیا ہے کہ ایسے پودوں پر پھل قطعی نہیں لگتے یا چھوٹے اور بدشکل ہو جاتے ہیں۔ یہ بیماری سفید مکھی کے ذریعہ پھیلتی ہے۔

ان بیماریوں سے پودوں کی حفاظت ضروری ہے۔ لہٰذا بیمار پودوں کو شروع سے ہی علیحدہ کر دیا جائے، پودوں کے قریب لگی ہوئی گھاس اور دیگر فاضل گھاس کے پودوں کو صاف کر دیا جائے۔ روگور، میلاتھیان، میٹا سسٹاک نامی دواؤں کا ایک فیصد محلول ۱۵ سے ۲۵ دن کے وقفے سے پودوں پر چھڑکیں۔

ایک دوسری قسم کی بیماری جو پھپھوند زہر سے تعلق رکھتی ہے جڑوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے، اس کی وجہ سے پودوں کی جڑیں سڑ جاتی ہیں اور پودا کمزور ہو کر گر جاتا ہے۔ یہ بیماری اتر پردیش، بہار، آسام اور دیگر پڑوسی ریاستوں میں عام ہے۔ عموماً یہ بیماری پانی کی ناقص نکاسی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے پتے زرد اور پودے پست قامت رہ جاتے ہیں۔ جڑوں کی کمزوری کی وجہ سے پودے ہوا کے ہلکے جھونکے سے بھی گر جاتے ہیں۔ اس بیماری سے پودوں کو محفوظ رکھنے کا پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ باغ میں پانی کی نکاسی کا صحیح بندوبست ہو، تاکہ پودوں کے ارد گرد پانی جمع نہ ہو۔ دوسرے پودوں کے ارد گرد زمین کو کھرپتوار سے صاف رکھیں۔ علاج کے لیے بیمار پودوں کی جڑوں کو کھود کر کاٹ دیا جائے (صرف انھیں جڑوں کو جو متاثر ہیں) اور کٹے ہوئے حصہ پر بورڈو مکسچر (چونا ایک حصہ۔ نیلا تھوتھا ایک حصہ اور السی کا تیل ۱/۲ حصہ) ملا کر لگا دیں۔ نرسری سے پودوں کو لیتے وقت یہ دھیان رکھیں کہ پودوں کی جڑیں کم ٹوٹیں اور انھیں دوسری جگہ لگانے سے پیشتر نیلے تھوتھے Copper Sulphate کے ۳۰ فیصد محلول میں کم از کم ۲۰ منٹ تک (صرف جڑ تک) تر کر دیں اور بعد میں سایہ میں سُکھا لیں۔

اگر ان باتوں کا خیال رکھا جائے تو پپیتے کی باغبانی بہت کامیاب ثابت ہو سکتی ہے۔ ●

بقیہ: بہار کا سماجی و اقتصادی منظر

کے ساتھ مشترک ہیں۔ مثال کے طور پر بہار کی ۸ کروڑ آبادی کا کم از کم ۶۰ فیصد حصہ دیہات میں آباد ہے۔ بہار میں جہاں افلاس کا دور دورہ ہے۔ ۸،۸۷،۰۰۰ دیہات میں مسلمانوں کے وہی وسائل ہیں جو ہندوؤں کے ہیں۔ دیہات میں مسلمان بُنکروں کو متعدد معاملوں میں شدید مالی مشکلات کا سامنا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہار میں تیار ہونے والی ہینڈلوم اشیاء کا معیار وہ نہیں ہے جو یو۔پی، تامل ناڈو، گجرات یا جموں و کشمیر میں تیار ہونے والی اشیاء کا ہے۔ یہ سچ ہے کہ موجودہ ریاستی حکومت اپنے ہینڈلوم وزیر ڈاکٹر خالد رشید میاں کی وساطت سے بہار کے غریب مسلم بُنکروں کی حالت بہتر بنانے کے لیے کوشش کر رہی ہے اور یہ کام مرکزی حکومت کے بیس نکاتی پروگرام کے نکتہ اوّل کے منشا کے مطابق کیا جا رہا ہے۔ تاہم مسلمان بُنکر، ہندو بُنکروں کے ہمراہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے ہاتھوں بہتر سلوک کے مستحق ہیں۔ ●

بقیہ: ناکردہ گناہ

سماجی اور اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کی حالت میں تبدیلی لانے کا تیسرا طریقہ سیاسی عمل ہے۔ چنانچہ ان طبقوں میں ایسی سیاسی جماعتیں بھی کام کر رہی ہیں جنھیں اُبھرنے کے پورے پورے مواقع حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ انھوں نے ان طبقوں کی ترقی کے تحفظ کے لیے ضروری اور اہم تحریکیں چلائی ہیں۔ اور حکومت نے اُن کے مطالبے تسلیم کیے ہیں۔ ان طبقوں کو اب سیاسی طور پر خوابیدہ یا لاعلم نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں اور پنچایتوں میں پوری پوری نمائندگی حاصل ہے۔ ●

عبیدالرحمٰن٭

فصلوں کے دشمن

اور اُن سے حفاظت

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان کی تقریباً ۸۰ فیصد آبادی گاؤں میں رہ کر زراعت پر منحصر کرتی ہے۔ حالانکہ ہمارے ملک میں زراعت کی کافی سہولتیں موجود ہیں اور بڑے پیمانے پر کھیتی کی جاتی ہے مگر اس کے باوجود اس تناسب سے جتنی پیداوار ہونی چاہیئے اتنی ہو نہیں پاتی ہے۔ اس کمی کی جہاں اور بہت سی دیگر وجوہات ہیں وہیں ایک سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فصلوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑے مکوڑے اور دیگر چرند و پرند انھیں بڑی مقدار میں برباد کرتے ہیں۔ نتیجتہً پیداوار میں خاطر خواہ کمی ہو جاتی ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ ان تمام دشمن عناصر سے فصلوں کی حفاظت کی جائے تاکہ پیداوار میں اضافہ ہو سکے۔ اس عنوان کے تحت یہاں ہم ایسے ہی چند ضرر رساں جانداروں کے متعلق باتیں کریں گے۔

۱۔ گھونگھا

یہ عموماً نم اور دلدلی جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ یہ مختلف طرح کے ہوتے ہیں ان میں Giant African Snail زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ زیادہ تر رات کے وقت باہر نکلتے ہیں اور خاص کر چھوٹے چھوٹے پودوں اور سبزیوں کو کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کیلے کی فصل کو بھی برباد کرتے ہیں۔ بڑھتے ہوئے چھوٹے پودوں کو زمین کے پاس جڑ سے کاٹ دیتے ہیں جس سے پودے سوکھ کر ختم ہو جاتے ہیں۔

ترکیبِ حفاظت (Control)

اس سے بچاؤ کے مندرجہ ذیل طریقے ہیں۔

(الف) Mechanical Control

۱۔ گھونگھا کا جسم باہر سے ایک خول (Shell) کے ذریعہ گھرا ہوتا ہے۔ لہذا گھونگھوں کو ہاتھ سے جمع کر کے انھیں زور سے زمین پر پٹخنے سے ان کا باہری خول ٹوٹ جاتا ہے جس سے اندر کا جانور بھی مر جاتا ہے۔

۲۔ جہاں گھونگھا ہو وہاں اس کے انڈے تلاش کرنے چاہیئے۔ ان تمام انڈوں کو ضائع کر دینا چاہیئے تاکہ ان کی پیدائش نہ ہو سکے۔

(ب) Chemical Control

گھونگھا کو جمع کر کے دس فیصد نمک کے محلول میں ڈالنا چاہیئے یا پھر نمک کے محلول کا چھڑکاؤ بھی کھیتوں میں کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ پانچ فیصد میتھلڈ یہائڈ (Metha-ldehyde) کو گیہوں کی چوکر اور شیرے کے ساتھ ملا کر ۳۵ کیلوگرام فی ہیکٹیر کے حساب سے کھیتوں میں چھڑکاؤ کرنا چاہیئے۔

۲۔ ٹڈی

فصلوں کو نقصان پہنچانے والے ضرر رساں کیڑوں میں ٹڈی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کھیتوں، باغوں اور جنگلوں میں پائے جانے والے سارے پودوں کو برباد کر دیتی ہیں ان کی روک تھام کے لیے (Indian Council of Agricultural Research) نے ۱۹۳۰ء میں ایک اسکیم کو منظوری دی، اور ۱۹۳۹ء میں بھارت سرکار نے بھی اس کی روک تھام کے لیے ایک کمیٹی ICAR کے زیر نگرانی بنائی۔ اس کمیٹی کے قیام میں آنے کے ایک سال بعد ہی ٹڈیوں کا ایک زبردست غیر ملکی ہجوم ہندوستان میں گھس آیا لہذا تشکیل شدہ کمیٹی نے اپنا کام شروع کیا مگر اس کی روک تھام میں زیادہ کامیابی نہیں مل سکی۔ لہذا اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں سرکار نے ہر ریاست کے دو حلقوں

٭ جمیل روڈ، مظفر پور (بہار)

میں ٹڈیوں کی روک تھام کے لیے کمیٹی بنانے کی اجازت دے دی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ٹڈیوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جائے اور اس کی روک تھام کے لیے صحیح اقدامات کیے جائیں۔

ہندوستان میں پائی جانے والی ٹڈیوں میں ریگستانی ٹڈیوں کو خاص مقام حاصل ہے۔ یہ دو حالتوں میں پائی جاتی ہیں۔ تنہا یا پھر غول کی شکل میں۔ جو ٹڈی تنہا پائی جاتی ہے اس کا رنگ ہرا ہوتا ہے اور غول میں پائی جانے والی ٹڈیوں کا رنگ شروع میں گلابی اور پھر دھیرے دھیرے پیلا ہو جاتا ہے۔

ان کا عمل کسی خاص طرح کی فصل پر نہیں بلکہ سبھی طرح کی فصلوں پر ہوتا ہے۔ یہ مختلف اقسام کے فصلوں کے علاوہ باغوں اور جنگلوں میں لگے پودوں کو بھی کثیر تعداد میں برباد کرتے ہیں۔ ان کا غول گھروں میں بھی گھس آتا ہے۔ یہ کنوؤں اور تالابوں میں گر کر پانی کو استعمال کے لائق نہیں رہنے دیتے۔

ترکیب حفاظت

ان سے حفاظت کے لیے ان کی زندگی کی سبھی Stages کو ضائع کرنا ضروری ہے۔ ان کی روک تھام کسی ایک خاص جگہ یا خاص کھیت تک منحصر نہیں ہونی چاہیئے کیوں کہ باہر سے بھی ان کا غول دوسری جگہوں کے کھیتوں پر حملہ کر سکتا ہے؟ اور اسی لیے سرکار نے ہر جگہ اس کی روک تھام کے لیے کوشش کیں۔ لہٰذا ایک بڑے پیمانے پر ان کی روک تھام ضروری ہے۔ ان کی روک تھام کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اپنائے جاسکتے ہیں۔

۱۔ انھیں کانٹے دار لکڑیوں سے پیٹ کر مار دینا چاہیئے۔

۲۔ انھیں جمع کر کے آگ میں ڈال دینا چاہیئے اور اگر یہ ایسی جھاڑیوں پر بیٹھی ہوں جن کا کوئی مصرف نہیں ہو تو ان جھاڑیوں میں آگ لگا دینی چاہیئے۔

۳۔ کھیتوں میں نقارہ بجا کر ان کے غول کو کھیتوں میں گھسنے سے روکا جاسکتا ہے۔

۴۔ ان کے انڈوں کو جمع کر کے ضائع کر دینا چاہیئے۔

۵۔ دس فیصد ڈی۔ ایچ۔ سی کا فصلوں، پیڑوں اور زمین پر چھڑکاؤ کرنا چاہیئے۔

۶۔ ان کی روک تھام میں ہیلی کاپٹر اور گلائڈر کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اُڑتے ہوئے ٹڈیوں کے غول پر ۲ فیصد الڈرن (Aldrin) کو پانی میں گھول کر چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔

ضرر رساں پرندے

پرندوں میں کئی ذات ایسی ہوتی ہیں جو فصلوں کی دشمن کہی جاسکتی ہیں۔ یہ فصلوں کو بوائی کے وقت سے لے کر ان کے پک کر تیار ہونے تک نقصان پہنچاتی رہتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ کٹائی کے بعد بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور جمع کیے گئے دانوں کو بھی یہ کھا جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ پھلوں کو بھی کثیر تعداد میں برباد کرتے ہیں۔

ان کی روک تھام کے لیے ان کی پوری جانکاری مثلاً ان کے عادات و اطوار، کھانے پینے کے طریقے اور ان کی پیدائش کا وقت وغیرہ کی پوری معلومات بہت ضروری ہے۔ اور ساتھ ہی ان کی معاشی حالت کا بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے۔

ان کی کچھ نقصان دہ ذاتیں مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ کوّا

یہ ہندوستان میں تقریباً سبھی جگہ بکثرت ملتے ہیں۔ یہ اپنی شاطر مزاجی کے لیے مشہور ہیں۔ یہ زیادہ تر غول میں پائے جاتے ہیں۔ اگر اکیلا کوّا کسی خاص جگہ پر کوئی کھانے کی چیز دیکھتا ہے تو وہ ایک خاص آواز سے اور کوّوں کو وہاں بُلا لیتا ہے۔ کھیتوں میں بیج بوئے جانے کے فوراً بعد یہ بیجوں کو کھا جاتے ہیں جس سے پیداوار کافی حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ خاص کر مکئی، مونگ پھلی اور سورج مکھی کے فصلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق کوّے ۲۰ فیصد دھان اور ۱۶ فیصد گیہوں کے Seedlings کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ مرغی پالنے والی جگہوں Poultry میں گھس کر چوزوں کو بھی کھا جاتے ہیں۔

۲۔ گوریا

یہ ہندوستان میں لگ بھگ ہر جگہ دیکھے کو ملتی ہیں۔ ان کی پیدائش کا مہینہ مارچ سے جولائی اور ستمبر سے اکتوبر کا ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ان کے گھونسلے تقریباً پورے سال دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہ خاص کر گنّے کی فصل کی دشمن ہیں۔ یہ گنّے کو کٹائی ہونے سے پہلے کافی حد تک برباد کر چکی ہوتی ہیں۔ یہ فصلوں کو تو برباد کرتی ہی ہیں ساتھ ہی ساتھ لگ بھگ ۴۰ فیصد ایسے کیڑوں کو کھا جاتی ہیں جو فائدہ مند ہیں۔

ایک اندازہ کے مطابق یہ ۳٫۸ فیصد گیہوں، ۱۱٫۱ فیصد چاول اور ۲۰٫۰ فیصد باجرا کی فصلوں کو برباد کرتی ہیں۔

۳۔ طوطا

یہ بھی ہندوستان میں ہر جگہ دیکھا جاتا ہے ان کی پیدائش جنوری سے اپریل ماہ میں ہوتی ہے مگر صرف مشرقی ہندوستان میں مارچ سے مئی

ماہ میں ہوتی ہے۔ یہ فصلوں سے زیادہ پھلوں کو نقصان پہونچاتے ہیں۔ اپنی چونچ کے ذریعے یہ آم، انجیر، امرود اور مونگ پھلی کو بکثرت برباد کرتے ہیں۔ فصلوں میں دھان، باجرا، گیہوں، مٹر اور دال کے دشمن ہیں۔

۴۔ کبوتر

یہ بھی ہر جگہ بکثرت دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ لگ بھگ بیس سے تیس کے جھنڈ میں اڑتے ہیں۔ یہ زیادہ تر گیہوں، چاول، باجرا اور دال کی فصلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

۵۔ مینا

یہ صرف پہاڑی جگہوں کے علاوہ سبھی جگہ ملتے ہیں یہ عام طور پر جوڑا بنا کر رہتے ہیں۔ یہ کھانے کے معاملے میں بہت بے تکلف ہیں اور کسی خاص چیز پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ فصلوں کی بہتری قسموں کے علاوہ پھلوں کے بھی خاص رسیا ہیں۔

روک تھام کے طریقے

ان کی روک تھام کے کئی طریقے ہیں مگر کسی ایک طریقہ کے ذریعہ ان کی روک تھام مشکل ہے لہذا روک تھام کے مختلف طریقوں کو ایک ساتھ استعمال میں لانا چاہیئے۔

(الف) Mechanical Control

۱۔ پرندوں کو کھیتوں اور باغوں سے بھگانے کے لیے کھیتوں میں آدمی کے پتلے لگانا، ٹین کے پیپے کو بجانا یا پھر غلیل کے ذریعے انھیں بھگایا جاسکتا ہے۔ رات کے وقت کھیتوں میں آگ جلا کر بھی پرندوں کو کھیتوں سے دور رکھا جاسکتا ہے۔ انھیں جال کے ذریعے بھی پکڑا جاسکتا ہے۔

۲۔ پرندوں کا ایک اچھی روک تھام کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے گھونسلے تلاش کر کے انھیں ضائع کیا جائے۔ ضرررساں پرندوں کے گھونسلے اور انڈوں کو ختم کر دینا چاہیئے۔ تاکہ ان کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوسکے۔

۳۔ پھلوں اور فصلوں کو کپڑوں یا پلاسٹک کے تھیلوں سے باندھ کر بھی انھیں پرندوں سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔

(ب) Chemical Control

۱۔ زہریلی دوائیوں کا استعمال۔

کھیتوں میں ان زہریلی دوائیوں کے استعمال سے پرندوں کا غول کھیتوں سے دور رہتا ہے۔ ان میں خاص کر مندرجہ ذیل دوائیں کارآمد ہیں۔

(i) ٹیٹرا میتھائل تھائرم ڈائی سلفائیڈ (T.M.T.D)
(ii) انتھراکیونون (Anthraquinon)
(iii) ۲ فیصد لنڈین (2% Lindain)
(iv) ۵ فیصد مالاتھین (5% Malathion)
(v) آلڈرین (Aldrin)
(vi) نیپتھلین پاوڈر (Nephthalene Powder)

۲۔ لسا کا استعمال

کھیتوں میں کھڑی فصلوں کو خاص کر کوّے اور طوطے سے بچاؤ کے لیے اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے کٹھل کے دودھ اور کول تار سے تیار شدہ لسا بہت کارآمد ہے۔

۳۔ زہریلی غذا

ایسی غذا مندرجہ ذیل Chemicals سے تیار کی جاسکتی ہیں:

(i) میتھائل پیراتھین (Methyl Parathion)
(ii) ایتھائل پیراتھین (Ethyl Parathion)
(iii) کاربوفیورن (Carbofeurin)
(iv) انڈرن (Endrin)
(v) فیوراڈان (Feuradan)

اب غذا تیار کرنے کے لیے چاولوں کو مندرجہ بالا Chemicals میں بھگو کر انھیں سایہ میں سکھا کر کھیتوں میں ڈال دینا چاہیئے۔ اس کے کھانے سے پرندے فوراً مر جائیں گے اس عمل میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ایسی غذا بچوں اور گھریلو پالتو جانوروں کی پہونچ سے باہر رہیں۔

اس طرح کی زہریلی غذا کا استعمال خاص کر کوّا، گوریا، کبوتر اور مینا کے لیے کیا جاتا ہے۔

۴ دھواں دینا۔

پرندوں کے گھونسلوں کو اس طریقے سے بھی ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ہائڈروجن سائنائڈ یا ایچ۔سی۔این (HCN) کا استعمال ہوتا ہے جو کہ سلنڈر میں بھرا ہوتا ہے۔

(ج) Biological Control

پرندوں کو ان کے اپنے دشمنوں کے ذریعہ بھی ہلاک کیا جاسکتا ہے مثلاً چیل، منگوس، سانپ اور گرگٹ ایسے جانور ہیں جو پرندوں کو کھا جاتے ہیں۔

ضرر رساں جانور

بہت سارے جانور ایسے ہیں جو کھیتوں میں لگی فصلوں کو بہت نقصان پہونچاتے ہیں۔ ان میں خاص کر بندر، گیدڑ، لومڑی، نیل گائے، گلہری، خرگوش، ہرن، سیہی، سانبھر، چیتل اور چمگادڑ وغیرہ فصلوں کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔

۱۔ بندر

یہ سبھی جگہوں پر ملتے ہیں۔ پھلوں اور سبزیوں کے شوقین ہیں اور کھاتے کم ہیں برباد زیادہ کرتے ہیں۔ یہ کچے پھلوں کو ادھر ادھر سے کتر کر پھینک دیتے ہیں۔ یہ زیادہ تر امرود،

آم، کیلا، جامن، سیب، پپیتا، مونگ پھلی، باجرہ، مکئی، سیب، مٹر، گنا، کھیرا اور ککڑی کو بکثرت نقصان کرتے ہیں۔ لاہ کے کیڑوں کو کھا کر لاہ کی پیداوار گھٹاتے ہیں۔

ترکیبِ حفاظت

انھیں شور کر کے کھیتوں سے بھگا دینا چاہیئے۔ کھیتوں میں جا بجا لوہے کے پنجرے رکھے جا سکتے ہیں۔ جن سے انھیں بہ آسانی پکڑا جا سکتا ہے۔

۲۔ نیل گائے

یہ اکثر غول بنا کر رہتی ہیں۔ جس کھیت میں ایک بار گھس آئیں اسے الگ بھگ تباہ کر کے ہی نکلتی ہیں۔ ان کا حملہ جوار، باجرا، مکئی، دھان، گیہوں اور چنا پر زیادہ ہوتا ہے۔

ترکیبِ حفاظت

انھیں اکثر گولی مار کر ہلاک کیا جاتا ہے۔ رات کو کھیت کی اچھی رکھوالی بھی ضروری ہے۔

۳۔ ہرن

یہ بھی جھنڈ میں رہنے والے جانور ہیں۔ دھان، گیہوں، مکئی اور جوار وغیرہ کی فصلوں کو نقصان پہونچاتے ہیں۔ یہ فصلوں کو ان کی چھوٹی عمر سے ہی چرنا شروع کر دیتے ہیں جس سے پودوں کی نشو و نما رک جاتی ہے۔

ترکیبِ حفاظت

کانٹے دار جھاڑیوں کو کھیت کے چاروں طرف گھیر دینا چاہیئے۔

۴۔ خرگوش

یہ عموماً رات کے وقت خصوصاً سبزیوں کی فصلوں پر حملہ کرتے ہیں۔ دن میں جھاڑیوں وغیرہ میں چھپ کر رہتے ہیں اور دوسری فصلوں میں جوار، مکئی وغیرہ کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔

ترکیبِ حفاظت: انھیں مارا جا سکتا ہے، یا جال کے ذریعے پکڑا جا سکتا ہے۔

۵۔ گلہری

یہ خصوصاً پھلوں کو مثلاً امرود، انار وغیرہ کو نقصان پہونچاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ فصلوں جیسے جوار، باجرا، مکئی، دھان، مونگ پھلی، مٹر اور چنا وغیرہ کو بھی ضائع کرتی ہیں۔

ترکیبِ حفاظت

انھیں بندوق سے، جال میں پھنسا کر یا زنک فاسفائڈ (Zinc Phosphide) کی زہریلی غذا دے کر مارا جا سکتا ہے۔

۶۔ سیار

یہ خاص کر رات کے وقت فصلوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ یہ مختلف فصلوں جیسے گیہوں، خربوزہ، گنا، تربوز اور آلو وغیرہ کو برباد کرتے ہیں۔

ترکیبِ حفاظت

۱۔ لوہے کے جال سے پکڑا جا سکتا ہے۔

۲۔ زنک فاسفائڈ (Zinc Phosphide) کا چارہ دیا جا سکتا ہے۔

۷۔ سیہی

یہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے پاس یا جنگلوں میں گڈھے بنا کر رہتی ہیں۔ یہ عموماً جھنڈ میں رہتی ہیں۔ زیادہ تر سبزیوں کی دشمن ہیں مگر جوار، آلو، مونگ پھلی اور باجرہ وغیرہ کو بھی برباد کرتی ہیں۔

ترکیبِ حفاظت

۱۔ ان کے بلوں کو بند کر دینا چاہیئے۔

۲۔ آلو کے ٹکڑوں میں زنک فاسفائڈ یا آرسینک (Arsenic) زہر ملا کر رکھنے سے اس کو مارا جا سکتا ہے۔

۳۔ بلوں میں زہریلی گیس چھوڑی جا سکتی ہے۔

۸۔ چمگادڑ

یہ پھلوں کو زیادہ نقصان کرتے ہیں۔ خاص طور پر لیچی، امرود اور جامن وغیرہ کو زیادہ برباد کرتے ہیں۔

ترکیبِ حفاظت

۱۔ جال کے ذریعہ پکڑ کر ہلاک کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ رات کے وقت پیڑوں پر بجلی کے بلب جلانے سے چمگادڑ اُن پیڑوں پر نہیں آتے ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات بہت واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے گرد و پیش کے چھوٹے چھوٹے کیڑوں مکوڑوں سے لے کر بڑے جانوروں تک کس قدر ہماری پیداوار میں پستی کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ اوپر بتلائے گئے طریقے اور دوسری حفاظت کی ترکیبیں اختیار کی جائیں تاکہ ہم کھیتوں میں جتنی محنت کرتے ہیں اس کا صحیح نتیجہ ہمارے سامنے آئے اور پیداوار بڑھ سکے۔ ●

بقیہ: نیا منوّر راستہ

لوگوں پر خرچ کریں اور اس کام کی ذمے داری آج سے میں سنبھال لوں گی۔ اس سال ہم بیس غریب طالب علموں کو وظیفے اور دس بیواؤں کو مدد دیں گے۔ اور ایک بات یاد رکھئے۔"

"کیا" ستیکھر بولا۔

"نیکی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ یعنی اس پروگرام کو آپ جتنا چاہیں شوق سے بڑھا سکتے ہیں اور میں پورے طور پر آپ کے ساتھ ہوں گی۔" ستیکھر کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا اور اُس نے بڑے سکون کا احساس کیا وہ اوما کی طرف مسکرا کر دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن کا غبار دُھل گیا تھا اور اسے ایک نیا منوّر راستہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ اٹھا اور اوما سے بولا۔

"چلو میں کار نکالتا ہوں۔ بچو تم تیار ہونا، بازار سے ہوتے ہوئے نو بجے ہوٹل پہونچ جائیں گے۔"

تشنہ بلگرامی ۵

تمباکو نوشی یا زہر نوشی

تمباکو ایک خاص قسم کے درخت کے پتّوں کو سکھا کر بنایا جاتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ سب سے پہلے تمباکو کب اور کہاں پیدا ہوا اور تمباکو نوشی کی ابتدا کہاں سے ہوئی، کہتے ہیں کہ کولمبس امریکہ سے تمباکو اپنے وطن پرتگال لایا اور وہاں سے یہ مشرقِ وسطیٰ پہونچا۔ کسی زمانے میں ترکی تمباکو کی پیداوار کے لیے مشہور تھا لیکن ایک زمانہ ایسا آیا کہ ترکی کے سلطان مُراد چہارم نے تمباکو نوشی کو اپنی سلطنت میں مکمّل طور پر ممنوع قرار دے دیا اور اس کا ارتکاب کرنے والے کے لیے موت کی سزا مقرر کردی۔ اس بادشاہ کو تمباکو نوشی سے اس قدر نفرت تھی کہ وہ اکثر راتوں میں صرف یہ جاننے کے لیے اپنے دارالسلطنت کی تنگ و تاریک گلیوں کا دَورہ کیا کرتا کہ کہیں کوئی اس کے نافذ کردہ قانون کی خلاف ورزی تو نہیں کر رہا ہے۔

مغل شہنشاہ اکبر اعظم کا طبیبِ خاص فتح اللہ جیلانی کہتا ہے کہ تمباکو نوشی سے نبض کی رفتار سُست اور خون کا دَوران تیز ہو جاتا ہے اس سے حلق اور پھیپھڑے کا کینسر، دانت اور مسوڑھوں کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں لیکن اتنے مُضر اثرات کے باوجود یہ سمجھنا مشکل ہے کہ لوگ پھر بھی تمباکو کیوں استعمال کرتے ہیں۔

چونکہ بُرائی خودرَو پودے کی طرح فروغ پاتی ہے اس لیے تمام تنبیہہ و تلقین کے باوجود یہ زہر پھیلتا گیا اور اس کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا گیا یہاں تک کہ سولہویں صدی کے آغاز میں ہی تمباکو سارے یورپ میں پیدا ہونے لگا۔ یوں تو زمانۂ قدیم میں بھی تمباکو استعمال ہوتا تھا لیکن مہذب دُنیا کے لوگوں نے تمباکو نوشی کے لیے طرح طرح کے طریقے اپنائے۔ مُغلوں نے حُقّہ، انگریزوں نے پائپ، فرانس نے نسوار، اسپین نے سگار اور آخر میں برازیل نے سگریٹ ایجاد کیا جو سب سے زیادہ مقبولِ عام ہوا۔ اور آج یہ عالم ہے کہ دُنیا کے گوشہ گوشہ میں تمباکو نوشی جاری و ساری ہے۔

برِّصغیر ہند میں ایک قسم کے سوکھے پتّے کے خول میں تمباکو بھر کر اور جلا کر پینے کی ایک نئی صورت پیدا کی گئی اس نئی ایجاد کا نام بیڑی رکھا گیا جو سگریٹ کے مشابہ اور نسبتاً سستی ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں تقریباً نوّے فیصد تمباکو نوشی کی ابتدا غیر شعوری کے عالم سے ہوتی ہے۔ بچّے اکثر ایک دوسرے کی تقلید میں اس کا شکار بنتے ہیں۔ اور آگے چل کر وہ اس کے عادی بن جاتے ہیں۔ تمباکو نوشی کا ابتدائی زمانہ مختلف مغالطوں اور غلط فہمیوں کا زمانہ ہوتا ہے اس دَور میں انسان طرح طرح کی خام خیالی میں مُبتلا رہتا ہے۔ کچھ کو یہ گمان ہوتا ہے کہ تمباکو نوشی سے غور و فکر کی طاقت اور یادداشت بڑھ جاتی ہے۔ بہتیرے احساسِ کمتری کے باعث اپنی شخصیت کا رعب اور وقار جمانے کے لیے اس کا استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ دوسروں میں منفرد اور ممتاز نظر آئیں۔ ایک طبقہ تمباکو نوشی کو سکون و اطمینان کا وسیلہ اور تنہائی میں یکسوئی کا ذریعہ تصوّر کرتا ہے۔ نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ تمباکو نوشی کا انداز بھی بہتیری خصوصیات کا

---

۵ ۷/۱۳۲، جعفرآباد۔ دہلی ۱۱۰۰۵۳
یوجنا، نئی دہلی

حاصل ہوتا ہے۔ اکثر نوجوان تمباکو نوشی کرتے وقت دھوئیں کے چھلّے بنا کر فضا میں اُچھالتے ہیں اور اسے تحلیل ہوتے دیکھ کر راحت محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ بادی النظر میں وہ خود کو تحلیل کرتے رہتے ہیں۔ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ آگ کا کام جلانا ہے اور جب کوئی شخص آگ سے قربت کا خواہش مند ہو تو یقیناً اس کو احمق ہی کہا جائے گا۔ بلاشبہ تمباکو نوشی کے تمام ذرائع آگ سے قربت حاصل کرنے کے وسیلے ہیں تمباکو نوشی سے انسان خود فراموشی کا شکار ہو جاتا ہے وہ ایک عارضی سرور و انبساط کی خاطر تمباکو نوشی میں محو ہو کر وقتی طور پر تمام افکار سے نجات حاصل کر لیتا ہے لیکن درحقیقت وہ خود اپنی ہلاکت کا اہتمام کرتا ہے جس کے نتیجے میں وہ نہ صرف خود کو بلکہ اپنے خاندان کے دیگر افراد کو بھی ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔ تمباکو نوشی سے نظامِ توالد و تناسل اور تنفس اور بصارت بھی متاثر ہوتا ہے اس سے سینہ میں درد اور دِق کی شکایات بھی پیدا ہوتی ہے۔ خواتین کے لئے تمباکو نوشی خصوصاً دورانِ حمل سخت مُضر ثابت ہوتی ہے اس سے اسقاطِ حمل کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔ ماں کی تمباکو نوشی نومولود بچے کیلئے انتہائی نقصان دہ ہوتی ہے اور مختلف بیماریوں کا سبب بنتی ہے۔

یہ حیرت انگیز بات ہے کہ تمباکو نوشی کے عادی اس کے مُہلک اثرات سے پوری واقفیت کے باوجود خود کو اس سے محفوظ نہیں رکھتے۔ جیسے جیسے نئے نئے طریقے ایجاد ہوتے گئے۔ تمباکو نوشی کے نقصانات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ان تمام قسموں میں سگریٹ سب سے زیادہ مُضرت رساں ہے جو تمباکو نوشی کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل ہے۔ سگریٹ نوشی سے نکوٹین نام کا ایک زہریلا مادّہ پیدا ہوتا ہے، جو ہمارے خون کے سُرخ خلیات میں شامل ہو جاتا ہے اس طرح نکوٹین کی ایک مقررہ مقدار کے جسم میں پہنچتے ہی انسان سگریٹ نوشی کا عادی بلکہ اس کا غلام بن جاتا ہے اس کے نہ ملنے کی صورت میں وہ بے چینی محسوس کرتا ہے اور اسے ترک کرنا اس کے قبضۂ قدرت میں نہیں رہتا کیوں کہ وہ اپنے اندر نکوٹین کی متعیّن مقدار میں کمی کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ نکوٹین مُہلک ترین زہروں میں شمار ہوتی ہے اور اس کا اثر انسانی صحت پر بتدریج ہوتا ہے جس کا احساس سگریٹ نوشوں کو ابتدا میں بالکل نہیں ہوتا۔ درحقیقت نکوٹین بذاتِ خود ایک نشہ ہے۔ جدید تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ تیز تمباکو والے سگریٹ نوشوں کو ہلکے تمباکو والی سگریٹ سے تشفی نہیں ہوتی کیوں کہ اس طرح ان کے خون میں مقررہ مقدار میں نکوٹین نہیں پہونچ پاتی۔

سگریٹ نوشی شروع کرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کے مُضر اثرات رونما ہونے لگتے ہیں۔ جسم تھکن محسوس کرتا ہے۔ دل کی رفتار تیز ہو جاتی ہے خون کا دباؤ کم ہو جاتا ہے اور ذہن اپنی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے کیونکہ تمباکو نوشی کے نتیجے میں پیدا ہونے والا زہر دماغ کی شریانوں پر اثر انداز ہونے لگتا ہے جس سے دل اور دماغ کے درمیان رابطہ تقریباً مفلوج ہو جاتا ہے۔ دل کی بیماری کا ایک خاص سبب یہ تمباکو نوشی ہی ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ حرکت قلب بند ہونے کے سبب ہونے والی اموات میں اکثریت تمباکو نوشوں کی پائی گئی ہے۔

سگریٹ اور بیڑی کے دھوئیں سے کاربن مونو آکسائیڈ نکلتی ہے جو خون پہنچانے والی باریک شریانوں کو بند کر دیتی ہے جس سے دورانِ خون میں خلل واقع ہوتا ہے اور آخر کار دل کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے گویا نکوٹین اور کاربن مونو آکسائیڈ دونوں ہی دل کی بیماری کا سبب بنتے ہیں۔ تمباکو نوشی سے پھیپھڑے کی نازک نلکیوں میں زہر آلود دھوئیں بھر جاتے ہیں جس سے ہوا کی آمد و رفت میں دشواری پیدا ہو جاتی ہے اس سے دل حلق اور پھیپھڑوں میں کینسر ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کینسر ایک لا علاج مرض ہے اس وقت عملِ جراحی کے ذریعے کینسر کے پھیلتے ہوئے ریشوں کو کاٹ کر الگ کر دیا جاتا ہے لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ ریشے دوبارہ بڑھ جاتے ہیں۔ گذشتہ نصف صدی کی مسلسل کوششوں، کاوشوں اور تحقیق و تفتیش کے باوجود ماہرین اب تک اس موذی مرض پر مکمل قابو نہیں حاصل کر سکے ہیں۔

امریکہ کے دو مشہور محقق ڈاکٹر رابرٹ بائک اور ڈاکٹر کریگ وان ڈائک کا کہنا ہے کہ تمباکو نوشی سے ذاتی صلاحیت اور تخلیقی اوصاف تقریباً ختم ہو جاتے ہیں اس سے بے خوابی، بھوک کا نہ لگنا، ہزیان اور دماغی بُخار کی شکایت پیدا ہو سکتی ہے۔

۱۹۸۲ء کی سالانہ رپورٹ میں امریکہ کے عالمی شہرت یافتہ سرجن جنرل ڈاکٹر ایوریٹ کوپ نے لکھا ہے کہ سگریٹ نہ پینے والوں

کے مقابلہ میں سگریٹ پینے والوں کی شرح اموات تقریباً دوگنی ہوتی ہے۔ ان کے بقول اگر امریکی باشندے تمباکو نوشی ترک کر دیں تو صرف کینسر سے مرنے والوں کی تعداد میں ۵۰ فیصد کی کمی واقع ہو سکتی ہے۔ واضح ہو کہ اس وقت امریکہ میں ہر سال تقریباً ساڑھے چار لاکھ اموات صرف کینسر کے باعث ہوتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کینسر سے ہونے والی اموات کی شرح اور روزانہ پی جانے والی سگریٹوں کی تعداد کے مابین بھی ایک تعلق ہے۔ ان اعداد و شمار سے سگریٹ نوشی کے تباہ کن اثرات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس حقیقت سے ابھی تک بہت کم لوگ واقف ہیں کہ تمباکو کے دھوئیں سے جتنا خطرہ تمباکو نوش کی زندگی کو رہتا ہے، اتنا ہی خطرہ اس کے اہلِ خاندان اور احباب و اعزّا کو بھی رہتا ہے کیوں کہ تمباکو کے دھوئیں میں پایا جانے والا کاربن مونو آکسائڈ اپنے ماحول میں رہنے والے ہر متنفّس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف اور کیسی ستم ظریفی ہے کہ وہ معصوم لوگ جن کو تمباکو نوشی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں اس کے ضرر رساں اثرات کا نشانہ بن جائیں۔ ایسے لوگوں میں زیادہ تر خواتین ہوتی ہیں جن کی اکثریت تمباکو نوشی تو نہیں کرتی لیکن اس کا نشانہ ضرور بنتی ہیں کیوں کہ وہ اپنے شوہروں اور دیگر عزیزوں کی تمباکو نوشی کے خطرناک نتائج سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔ بلا شبہ تمباکو نوشوں کی غیر ذمہ دارانہ غیر ہمدردانہ اور غیر انسانی حرکتیں ہی اس کا باعث ہیں۔ یہ بات تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ ایک تمباکو نوش جو ہمہ وقت زہر آلود ماحول میں اپنی زندگی گذارتا ہے وہ دوسروں کے لیے بھی خطرناک ثابت ہوتا ہے کیوں کہ اس کی تمباکو نوشی کے نتیجے میں ہر وقت کاربن مونو آکسائڈ اس کے گرد و پیش کے ماحول میں بکھرتا رہتا ہے، جس میں سانس لینے والا کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ ایسی فضا میں رہنے والی خواتین کے بچے بھی عموماً کم وزن اور لاغر پیدا ہوتے ہیں اور ان کی بڑھوتری کی رفتار بھی نسبتاً سست ہوتی ہے۔

برطانیہ میں ایک سروے کے دوران تحقیق کچھ ایسے لوگوں کے خون میں نکوٹین اور کاربن مونو آکسائڈ پائے گئے جو خود تو تمباکو نوشی نہیں کرتے تھے لیکن وہ جس سوسائٹی کے فرد تھے اس کی اکثریت تمباکو نوشی کی عادی تھی۔ اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ تمباکو نوشی اپنے ماحول کو بھی لازمی طور پر متاثر کرتا ہے۔

منشیات کا جائزہ لینے والے جاپان کے ایک قومی تحقیقاتی ادارے کے محقق ڈاکٹر فاکشی ہرایامہ نے تقریباً پچیس ۲۵ لاکھ انسانوں کا سروے کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہزاروں خواتین کی موت کا سبب ان کے شوہروں کی تمباکو نوشی ہے۔

بلا شبہ یہ تمباکو نوشی ایک گھر کی پُر سکون اور پُر امن فضا کو مکدر اور زہر آلود بنا دیتی ہے جس میں انسانی صحت کا محفوظ رہنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ جدید طبّی تحقیق کے بعد ایسی شہادتیں ملی ہیں کہ تمباکو نوشی کرنے والوں میں کوئی فرد سرطان کی ابتدائی علامات سے پاک نہیں ہے۔

آج مغربی ممالک میں تمباکو نوشی کے خلاف تحریکیں چل رہی ہیں اور مشرقی ممالک میں روز افزوں اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق صرف برطانیہ میں بیس لاکھ افراد تمباکو نوشی ترک کر چکے ہیں۔ مشرق میں منشیات کے فروغ کا باعث مغربی ممالک کی درپردہ سازشیں ہیں جن کا مقصد یہاں کے باشندوں کو زیادہ سے زیادہ منشیات کا عادی بنا کر اس خطّہ میں افراتفری، لاقانونیت پھیلانا ہے۔ مغرب کی یہ دیرینہ حکمتِ عملی ہے کہ وہ اپنے مفاد کی خاطر مشرق کو کمزور رکھنا چاہتا ہے۔ اس حکمتِ عملی کی روشنی میں سگریٹ کے مغربی صنعت کار مشرقی ممالک میں اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے سگریٹ نوشی کی زیادہ سے زیادہ ترغیب دے رہے ہیں کیوں کہ اب مغرب کا بازار ان کے لیے رفتہ رفتہ بند ہوتا جا رہا ہے۔

ایک جائزہ کے مطابق ہندوستان میں ہر سال صرف کینسر سے پندرہ لاکھ افراد متاثر ہوتے ہیں اور ان میں پانچ لاکھ افراد ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ان اموات میں اکثریت تمباکو نوشوں کی ہوتی ہے۔ یہ عجیب مضحکہ خیز حقیقت ہے کہ اس قدر مضرِ صحت چیز کی تشہیر اور حوصلہ افزائی کے لیے کھلے عام اشتہارات دینا ممنوع نہیں ہے۔ البتہ یہ خوش کن خبر آئی ہے کہ سگریٹ کے اشتہارات پر مکمل پابندی کے لیے پارلیمنٹ میں مطالبہ کیا گیا ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ پہلے اقدام کے طور پر تمباکو نوشی کو عوامی جگہوں میں بالکل ممنوع قرار دے اور اشتہارات کی حوصلہ افزائی نہ کرے۔ ان اقدام سے یقیناً تمباکو کی تجارت متاثر ہوگی جس کے مثبت نتائج ظاہر ہوں گے۔

●

پرہلاد سنگھ*

ستیہ مورتی — بھارت میں پارلیمانی جمہوریت کے معمار

ستیہ مورتی کی رنگا رنگ وسیع اور گوناگوں سرگرمیوں کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ وہ بلا کے ذہین، دانشور، مقرر اور پارلیمنٹرین تھے۔ وہ طنز و مزاح کے بادشاہ تھے اور ہمیشہ اپنی زبردست تقریروں اور دلائل سے برطانوی سرکار کے بلوں اور پالیسیوں کے پرخچے اُڑا دیتے تھے۔ مہاتما گاندھی نے تو ایک موقع پر اُن کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر ہمارے لیجسلیچروں میں دس ستیہ مورتی ہوتے تو انگریز کب کے بھارت چھوڑ گئے ہوتے۔ ذیل کا مضمون اُن کی صد سالہ سالگرہ (۱۹ اگست ۱۹۸۷) پر دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا جس میں بھارت کے اس عظیم سپوت کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ (ایڈیٹر)

ستیہ مورتی کا شمار جدید بھارت کے معماروں میں ہوتا ہے۔ اُن کے بارے میں بخوبی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھارت میں پارلیمانی جمہوریت کے جنم داتا تھے۔ دیگر عظیم — یا عظیم تر لیڈروں نے کئی طریقوں سے ملک کی ترقی میں حصّہ لیا ہے۔ بیشتر دیگر لیڈروں نے اُن سے پہلے اور بعد میں لیجسلیچروں میں شاندار کام کیا ہے۔ لیکن اگر کوئی واحد شخصیت ہے جس نے بھارت میں پارلیمانی جمہوریت کی تشکیل میں نمایاں ترین حصّہ لیا ہے تو وہ بلاشبہ ستیہ مورتی تھے۔ انھوں نے پوری لگن کے ساتھ لیجسلیچروں پر قبضہ کرنے کے لیے جدوجہد کی اور اندر سے لڑائی کی اور پھر قوم کی بہتری کے لیے اقتدار پر قبضہ کے لیے زبردست کوشش کی۔ جو لوگ شروع میں اُن پر پھبتیاں کستے تھے۔ آخرکار وہ اُن کے مدّاح بن گئے۔ آج بھارت اپنی پارلیمانی زندگی کے لیے زیادہ تر ستیہ مورتی کی انتھک مساعی کا مرہونِ منت ہے۔

ایک چمکدار ستارہ: بھارت کے سیاسی منظر پر ستیہ مورتی کا ظہور اُس وقت ہوا جب بھارت میں انگریزی حکومت کے خلاف بے چینی پھیل رہی تھی اور عوام کی اُمنگوں کو کچلنے کے لیے سامراج کی طرف سے ظلم و ستم توڑے جا رہے تھے۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں حکومت نے جسٹس سڈنی رولٹ کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی جو "بغاوت کمیٹی" کے نام سے موسوم ہوئی۔ اِس کمیٹی کا مقصد "بغاوت کی تحریک کے بارے میں تحقیقات کرنا اور اُس سے نپٹنے کے لیے سفارشات پیش کرنا تھا۔ عوام کے غم و غصّہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حکومت کی طرف سے فروری ۱۹۱۹ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں رولٹ کمیٹی کی اُن سفارشات پر مبنی دو بِل پیش کئے گئے جن میں تحریکات اور اجتماع کی ابتدائی آزادی کو کچلنے کے لیے بھی حکومت کو وسیع اختیارات دیئے گئے تھے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ، سریندر ناتھ بنرجی، کے۔ وی۔ رنگا سوامی آئنگر، راجہ آف محمود آباد اور ایم۔ اے۔ جناح (بعد میں پاکستان کے بانی) اور دیگر لیڈروں نے اِن بِلوں کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ انجامِ کار جب یہ بِل مارچ ۱۹۱۹ء میں

* ۵ / ۹ ، ۱ ، گپتا کالونی ۔ نئی دہلی ۔

زبردست مخالفت کے باوجود منظور کیے گئے تو جناح کو اس قدر صدمہ پہونچا کہ انھوں نے لیجسلیٹو کونسل سے استعفیٰ دے دیا اور وائسرائے کے نام ایک احتجاجی مراسلے میں لکھا کہ " ایک ایسی حکومت جو زمانۂ امن میں بھی ایسا قانون پاس کرتی ہے اُسے ایک مہذّب حکومت کہلانے کا حق نہیں ہے۔

مہاتما گاندھی نے جو پہلے ہی تحریکِ آزادی کے ہراول مورچے پر تھے ستیہ گرہ شروع کرنے سے متعلق اپنے ارادے کا اعلان کیا اور عوام سے کہا کہ وہ سختگیرانہ قوانین کی پُرامن مزاحمت کرنے کا حلف لیں۔

رولٹ ایکٹ کے پاس ہوتے ہی سختی کا دور دَورہ شروع ہوگیا اور پنجاب میں مارشل لا لاگو کر دیا گیا۔ اس ضمن میں جلیانوالہ باغ کا سانحہ ظہور میں آیا۔ جس میں جنرل ڈائر نے ہزاروں کی تعداد میں پُرامن اور نہتّے بھارتیوں پر بے تحاشہ گولیاں چلاکر اُنھیں ہلاک و مجروح کر دیا۔

ستیہ مورتی جو مہاتما گاندھی کی مقناطیسی شخصیت سے مسحور ہو کر کانگرس میں شامل ہو چکے تھے اُس وقت انگلینڈ میں تھے جہاں وہ پنڈت مدن موہن مالویہ کی زیرِ قیادت ایک وفد کے ممبر کے طور پر کانگرس کے حق میں پروپیگنڈہ کرنے اور کانگرس کے موقف کے بارے میں برطانوی عوام کو آگاہ کرنے کے لیے گئے تھے۔ واضح رہے کہ وہ نمایاں پوزیشن کے ساتھ وکالت کا امتحان پاس کر چکے تھے اور ایک جادو اثر مقرّر اور ایک اعلیٰ پایہ کے مناظر کے طور پر اپنی دھاک پہلے ہی جما چکے تھے۔ یہ اُن کا سمندر پار کا پہلا دَورہ تھا۔ وہ چند ہفتوں کے بعد بھارت آنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن وہ جس ڈھنگ اور زبردست گویائی سے اپنا کیس پیش کرتے تھے

اُس سے متاثر ہو کر اُنھیں وہاں رُکنے کو کہا گیا جبکہ باقیماندہ لیڈر واپس آگئے، ستیہ مورتی نے چھ ماہ تک انگلینڈ میں قیام کیا اور اس عرصے کے دَوران انھوں نے تمام انگلینڈ کا دورہ کیا اور ۶۰ سے زیادہ پبلک جلسوں سے خطاب کیا۔ کوئی ۶۰،۰۰۰ ہزار لوگوں نے اُنھیں سُنا۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اُنھیں برطانیہ میں بھارت اور بھارتیوں کے خلاف پھیلے ہوئے خدشات اور غلط فہمیوں کو دُور کرنے میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ دراصل ستیہ مورتی نے اپنی تقریروں سے ہی اُس روز سے اپنی دھاک جما دی تھی جس روز وہ سیاسی اکھاڑے میں اُترے تھے۔ یہ کمال بہت کم لوگوں کے حصّے میں آیا ہے۔ وہ ایک پیدائشی مقرّر تھے اور اپنے پُرزور دلائل اور فصاحت و بلاغت سے سامعین کو گھنٹوں اُن کی نشستوں پر بٹھلائے رکھتے تھے۔ ایک معاصر نے ان کے بارے میں شروع میں ہی لکھ دیا تھا "ستیہ مورتی پیدائشی مقرّر ہیں۔ وہ بخوبی بولتے ہیں اور بلندی کے ساتھ بولتے ہیں اُن کی زبان زبردست ہے۔ وہ "روزویلٹ کی سی گرج کے ساتھ بولتے ہیں اور چرچل کی سی تیز طرّار زبان رکھتے ہیں"۔ انگلینڈ میں کرنل ویجووڈ نے جنھیں ستیہ مورتی نے اپنی تقریروں سے موہ لیا تھا کہا تھا کہ انھوں نے غالباً لائڈ جارج کے سوائے ایسے اعلیٰ ترین مقرر کو اپنی زندگی میں سُنا ہی نہیں"۔

جب ستیہ مورتی بھارت واپس آئے تو یہاں ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ پر طوفان مچا ہوا تھا جس میں اس تحقیقاتی کمیٹی نے جنرل ڈائر کے انسانیت سوز جرائم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے اپنی زبردست تقریروں میں اس رپورٹ کی دھجّیاں اُڑا دیں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی طرف سے بٹھائے گئے پنجاب تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کو ہر لحاظ سے قابلِ اعتبار اور برتر بیان کیا۔

پیشہ وکالت ترک

انگلینڈ کے کامیاب دورے سے واپسی پر ستیہ مورتی کا سرگرم اور پرجوش خیر مقدم کیا گیا جس سے متاثر ہو کر انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے پیشہ وکالت کو واپس نہیں جائیں گے بلکہ کانگریس کا پروپیگنڈہ کریں گے اور اُس کے لیے کام کرینگے۔

چنانچہ انھوں نے ۱۹۲۰ء کے تمام تر سال میں مدراس پریزیڈنسی (جو اُس وقت تامل علاقوں کے علاوہ آندھرا، مالابار اور مغربی ساحل کے چند اضلاع پر مشتمل تھی) میں رات دن ایک کرکے کانگریس کا پرچار کیا۔ کوئی ایسا ضلع نہیں تھا جہاں وہ گئے نہیں۔ تامل اضلاع کا کوئی ایسا اہم گاؤں نہیں تھا جہاں انھوں نے کانگریس کا پیغام دیا نہ ہو۔ انھوں نے کوئی چھ سو میٹنگوں سے خطاب کیا حالانکہ اُن دنوں میں کوئی لاؤڈ سپیکر اور مائکروفون بھی نہیں تھے اور جلسے کھُلے میدانوں میں ہوتے تھے اُن کی اس دوڑ دھوپ اور زبردست کوششوں سے مدراس پریزیڈنسی میں کانگریس کی تنظیم زور پکڑ گئی۔

اگر ستیہ مورتی اپنے پیشہ وکالت کو لَوٹ جاتے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک چوٹی کے کامیاب وکیل بن جاتے۔ اور خوب پیسہ کماتے مگر اُس صورت میں ملک ایک عظیم سیاستداں سے محروم ہو جاتا۔

عدم تعاون کی تحریک

جب گاندھی جی نے اپنی عدم تعاون کی تحریک شروع کی تو ستیہ مورتی نے اُس کے خلاف اپنی آواز اُٹھائی۔ انھوں نے عدم تعاون کی تحریک میں شرکت نہیں کی لیکن انھیں ڈسپلن کا بڑا احساس تھا اور وہ کانگریس کے وفادار سپاہی سے رہے۔ اُس میں رہے اور اُس کے لیے کام کرتے رہے۔ گو وہ عدم تشدّد اور عدم تعاون کی تحریک کے

بابسے میں گاندھی جی سے متفق نہیں تھے۔ تاہم جب گاندھی جی اور مولانا محمد علی نے اُن سے درخواست کی کہ وہ اس عظیم قومی جدوجہد میں شامل ہو جائیں تو اُن کا ذہن دو باتوں میں بٹا ہوا تھا۔ کئی راتوں کی نیند حرام کرنے اور اپنی پوزیشن پر غور و فکر کرنے کے بعد تاکہ وہ اپنے تن من کو اس کام کے لیے لگا دیں، وہ فیصلے پر پہنچ پائے انھوں نے گاندھی جی کو لکھا کہ انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنا پیشہ وکالت ترک کر کے خود کو کانگریس کے کام میں لگا دیں گے۔ ... لیکن وہ اس امر پر زور دیتے رہے کہ "ہمیں عدم تعاون کا راستہ اختیار کرتے ہوئے لیجسلیچروں میں جانا چاہیئے اور وہاں ملک کی آزادی کے لیے لڑنا چاہیئے اس کے باوجود وہ کانگریس کے ڈسپلن کے پابند رہے۔ جب ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کے بعد گاندھی جی نے کانگریسیوں سے ستیہ گرہ کے لیے کہا تو ستیہ گرہ کے حلف نامہ پر دستخط کرنے والے اوّلین نوعمر کانگریسی لیڈروں میں ستیہ مورتی ہی تھے۔

کانگریس کے متعدد اجلاس میں اس امر پر بحث ہوتی رہی کہ کونسلوں کا بائیکاٹ جاری رکھا جائے یا اُن میں داخل ہو کر آزادی کی لڑائی کو آگے لے جایا جائے۔ انجام کار ستمبر ۱۹۲۳ء میں دلّی میں کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس مولانا محمد علی' جو جیل سے رہا ہو کر آئے تھے کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں انجام کار کونسل کے داخلے پر سے پابندی اٹھائی گئی (اُن دنوں گاندھی جی جیل میں تھے)۔

کونسل میں

ستیہ مورتی ووٹوں کی بھاری تعداد حاصل کر کے یونیورسٹی حلقے سے مدراس لیجسلیٹو کونسل میں پہونچ گئے۔ اُس کے بعد سے اُنھوں نے تقریباً تن تنہا ہی لڑائی جاری رکھی۔ سوراج پارٹی کے ممبر اقلیت میں تھے۔ انھوں نے اپنی نہایت بلند و فصیح زبان میں اپوزیشن کے پرچم کو بلند رکھا اور کانگریس کے نام کو تاباں کیا۔ وہ پہلی بار لیجسلیٹو کونسل میں داخل ہونے والے سب سے کم عمر سیاستداں تھے، لیکن اُنھوں نے اپنی تقریروں، سوالوں اور کام سے بیشتر سیاستدانوں کو ماند کر دیا۔

کانگریس کا "نقارہ" کونسل ہال میں گونجا اور اُس نے سرکاری بینچوں کو ہلا دیا۔ اور سرکار انگلشیہ کے وفاداروں اور رجعت پسندوں کے قدم اُکھاڑ دیے۔

پہلے روز سے ہی اُن کی آواز کونسل میں دوسروں پر چھا گئی۔ اُنھوں نے گاندھی جی کے الفاظ کو کافی حد تک حق بجانب ثابت کر دیا۔ جو انھوں نے اس سے پہلے سوراج پارٹی کی تشکیل کے موقعہ پر کہے تھے۔ تب گاندھی جی نے کہا تھا کہ لیجسلیچر میں اکیلے ستیہ مورتی کو بھیجا جانا ہی کافی ہے۔ ستیہ مورتی نے صوبائی لیجسلیٹو کونسل اور بعد میں سینٹرل اسمبلی میں اپنی جس قابلیت کا مظاہرہ کیا اُس میں گاندھی جی کے اعتماد کو انھوں نے پھر حق بجانب ثابت کر دیا۔ چنانچہ ایک موقعہ پر تو گاندھی جی نے یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر ہمارے لیجسلیچروں میں دس ستیہ مورتی ہوتے تو انگریز کب کے بھارت چھوڑ گئے ہوتے۔

ستیہ گرہ میں گرفتاری

ایسا نہیں تھا کہ ستیہ مورتی کو سول نافرمانی کی تحریک سے کوئی چڑ تھی۔ اگرچہ وہ اس کے خلاف تھے تاہم جب بھی کانگریس کی طرف سے تحریک شروع کی جاتی تھی ستیہ مورتی ایک وفادار سپاہی کی مانند ہراول مورچوں پر پائے جاتے تھے۔

کانگریس نے مکمل آزادی کے حصول کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ ۲۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو کانگریس کے مطالبات کے جواب میں لارڈ ارون نے ۲۵ر جنوری اور بعد میں ۲۹ر جنوری کو سینٹرل اسمبلی میں جو رُخ اختیار کیا، اُس سے قومی رہنماؤں کو مایوسی ہوئی۔ فروری کے وسط میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس سابرمتی میں ہوا اور ایک قرارداد کے ذریعہ مہاتما گاندھی کو اختیار دیا گیا کہ وہ جب چاہیں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دیں۔ چنانچہ گاندھی جی نے نمک تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ تاریخ آزادی میں یہ تحریک "ڈانڈی مارچ" کے نام سے مشہور ہے۔ وہ سابرمتی سے اپنے ہزاروں ستیہ گرہیوں کے ہمراہ روانہ ہوئے اور ۲۴ روز تک چلتے ہوئے ۵ر اپریل ۱۹۳۰ء کو ڈانڈی پہونچے۔ وہاں صبح کو پوجا ارچنا کرنے کے بعد انھوں نے سمندر کے کنارے پر سے نمک اٹھایا اور اس طرح قانون کی خلاف ورزی کی۔ بعد ازاں گاندھی جی نے نمک کے "ڈپوؤں" پر دھرنا دینے کی تجویز کی۔ اس پر انھیں ۵ر مئی کو صبح کے ایک بجے گرفتار کر لیا۔

گاندھی جی کے ڈانڈی مارچ سے پہلے سردار ولبھ بھائی پٹیل کو گرفتار کر لیا گیا۔ اب عباس طیب جی نے نمک ستیہ گرہ میں گاندھی جی کی جگہ لی۔ لہٰذا انھیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔

تمام ملک میں "ایکشن کونسلوں" کا قیام ہو گیا۔ تحریک چلانے والے ڈکٹیٹر آگے آتے گئے اور گرفتار ہوتے گئے۔ 'سرحدی گاندھی' خان عبدالغفار خاں، پنڈت جواہر لال نہرو اور متعدد دیگر لیڈر گرفتار کر لیے گئے اور انھیں جیل میں ڈال دیا گیا۔

مدراس میں بھی کونسل آف ایکشن بن گئی۔ ٹی پرکاشم اور راجگوپال آچاری کی گرفتاری کے بعد ستیہ مورتی "کونسل آف ایکشن" کے صدر بن گئے۔ انھوں نے ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو اپنے مکان کے گرد تریلی کیشو مندر کے سامنے کانگریس کا جھنڈا لہرانے کا اعلان کیا۔ انھیں ڈپٹی کمشنر آف پولیس نے تو می جھنڈا لہرانے کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ مجسٹریٹ نے ۱۰ روپے جرمانہ کر کے چھوڑ دیا۔ ستیہ مورتی نے جرمانہ

دینے سے انکار کر دیا۔ بعد میں پولیس نے اُن کی رہائش گاہ سے ایک میز، دو کرسیاں اور ایک آرام کرسی قرق کر کے ان چیزوں کو نیلام کر دیا۔ اس کے بعد ستیہ مورتی نے مدراس کے جارج ٹاؤن میں ایک بدیسی کپڑے کی دُکان پر پکٹنگ کرنے کا اعلان کیا۔ اس کوشش میں انھیں گرفتار کر لیا گیا اور چھ ماہ کے لیے ویلور سنیٹرل جیل میں ڈال دیا گیا۔ اور بعد ازاں ۱۲ر مارچ ۱۹۳۱ء کو ویلور جیل سے رہا کر دیا گیا۔

لارڈ اروِن کے بعد لارڈ ولنگٹن نے آتے ہی سختگیری شروع کر دی۔ ۴ر جنوری ۱۹۳۲ء کو صبح ساڑھے تین بجے گاندھی جی کو بمبئی میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ملک بھر میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ستیہ مورتی نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ بدیسی کپڑے، برطانوی مال اور برطانوی جہازی ایجنسیوں کا بائیکاٹ کر دیں۔ ۹ر جنوری ۱۹۳۲ء کو انھوں نے راجگوپال آچاری کے ساتھ بدیسی مال کی دکانوں پر جا کر پکٹنگ شروع کر دی۔ دونوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ستیہ مورتی کو ۱۸ ماہ کی قید کی سزا سُنائی گئی جبکہ راجہ جی کو چھ ماہ کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

سینٹرل اسمبلی میں

۱۹۳۴ء کے آخر میں مونٹ فورڈ اصلاحات (۱۹۱۹ء) کے تحت پانچویں سنیٹرل اسمبلی کے انتخابات ہوئے جس کے بعد ۲۱ر جنوری ۱۹۳۵ء کو اسمبلی کا پہلا اجلاس نئی دلّی میں منعقد ہوا۔ ۱۴۰ ممبروں میں سے ۴۴ کانگریس اور ۱۱ کانگریس نیشنلسٹ پارٹی کے تھے۔ اسمبلی میں کانگریس سب سے بڑی پارٹی تھی۔ یہ اسمبلی اس لحاظ سے بے نظیر تھی کہ اس میں ملک کی ممتاز ترین ہستیاں سرکاری اور اپوزیشن بنچوں پر جلوہ گر تھیں۔ سر نرپیندر ناتھ سرکار (لاء ممبر) سر محمد ظفراللہ (بعد میں ہیگ بین الاقوامی عدالت کے جج) سر گرجا شنکر باجپائی، اور سر ہنری کریک (ہوم ممبر) سرکار کے نمائندے تھے اور بھولا بھائی ڈیسائی بمبئی کے (ایڈوکیٹ جنرل) گووند ولبھ پنت، آصف علی، بابو بھگوان داس (جو فلسفی کے عالم) اُن کے فرزند ارجمند شری پرکاش (بیرسٹر) این جی رنگا، دی وی گری، محمد علی جناح، (انڈی پینڈنس کے لیڈر) اور کاؤس جی جہانگیر اسمبلی کی عظمت میں اضافہ کر رہے تھے۔ ستیہ مورتی اگرچہ نووارد اور اس کُل ہند میدان کے چھوٹے کھلاڑی تھے، تاہم وہ ایک اعلیٰ مقرر کے طور پر اسمبلی کو ضو فشاں کر رہے تھے۔ بھولا بھائی ڈیسائی کانگریس کے لیڈر اور گووند ولبھ پنت ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے۔ نو عمر ستیہ مورتی ایک جنرل سکریٹری کے طور پر چُنے گئے۔

ستیہ مورتی سامراج کی راجدھانی میں ایک مجاہد کے طور پر داخل ہوئے اور اُنھوں نے حکومت کے قلعہ — لیجسلیٹو اسمبلی میں تہلکہ مچا دیا۔ یہ اسمبلی اب تک حکومت برطانیہ کی ایک کٹھ پتلی کا ناچ کر رہی تھی لیکن اب ان ممتاز ہستیوں کے آنے کے باعث اس میں جان پڑ گئی۔ ان میں سب سے زیادہ تیز طرار ستیہ مورتی تھے جو اپنے زورِ بیان اور طنزیہ انداز سے حکومت کے بِلوں اور بیانوں کی دھجیاں اُڑا رہے تھے۔

سُنہری برس

۱۹۳۵ء ستیہ مورتی کی زندگی کا سُنہری برس تھا اور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک کے برس اُن کی پبلک اور پارلیمنٹری زندگی کے بہترین برس تھے جبکہ اُن کی شخصیت کا مکمل ارتقا ہو چکا تھا اور اُن کی شہرت ملک کے تمام حصّوں میں پھیل گئی تھی۔ اُن کا ایک شاندار کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے ۱۷ر ستمبر ۱۹۳۷ء کو اسمبلی میں آئین ساز اسمبلی بُلانے کے بارے میں ایک قرارداد پیش کی — اور بڑی قابلیت سے وکالت کی۔ اس میں گورنر جنرل سے کہا گیا کہ وہ حکومتِ برطانیہ پر واضح کر دیں کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء بھارتی قوم کی اُمنگوں کی نمائندگی نہیں کرتا اور کہ اس کی جگہ ایک آئین ساز اسمبلی بلائی جائے جو بالغوں کے رائے دہندگی کی بنا پر منتخب کی جائے۔ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بعد میں حکومتِ برطانیہ نے یہی کچھ کیا۔

سفرِ آخرت

جب کانگریس نے ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو "بھارت چھوڑو" کی قرارداد پاس کی تو حکومت نے کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ اس سے ملک میں ہلچل مچ گئی۔ ستیہ مورتی کانگریس کے اجلاس میں شرکت کرنے کے بعد بمبئی سے مدراس جا رہے تھے کہ ۱۱ر اگست کو "ارکونام" میں انھیں گرفتار کر لیا گیا اور انھیں ویلور جیل لے جایا گیا۔ وہاں انھیں ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ عمر بھر سرگرمی سے کام کرنے سے اور جیلوں میں بند رہنے سے اُن کی صحت بگڑ گئی تھی۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۴۳ء کو انھیں جنرل ہسپتال میں علاج کے لیے داخل کرایا گیا۔ وہ ابھی نظر بند ہی تھے کہ اُن کی گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر انھیں ۲ر فروری ۱۹۴۳ء کو رہا کر دیا گیا۔ بعد ازاں علاج معالجے سے اُن کی حالت میں کچھ سُدھار ہوا لیکن چند ہفتوں کے بعد طبیعت پھر بگڑ گئی اور — آخر ۲۸ر مارچ ۱۹۴۳ء کو صبح آٹھ بجے اُنھوں نے آخری سانس لی۔

ستیہ مورتی کی زندگی وسیع اور گوناگوں سرگرمیوں کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اُن کا جنم ۱۹ر اگست ۱۸۸۷ء کو جنوبی ہند کے ایک برہمن کنبے میں ہوا تھا۔ وہ اپنے والد سُندر شاستریار کے ۹ بچوں میں تیسرے تھے۔ انھیں بچپن میں سنسکرت اور تامل میں ابتدائی تعلیم دی گئی۔ بعد میں انھوں نے انگریزی میں تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے تینوں زبانوں پر عبور

حاصل کیا۔ انھوں نے سیاست کے علاوہ تعلیم، آرٹ، سنگیت اور سماجی و تعمیری سرگرمیوں میں گہری دلچسپی لی اور اُن کے لیے اپنا قیمتی وقت بھی صرف کیا۔

تعلیم کے شعبے میں انھوں نے نمایاں رول ادا کیا۔ وہ کئی برس تک مدراس یونیورسٹی کی سینیٹ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوتے رہے اور آخر میں یونیورسٹی کے انتظام اور تعلیمی کام سے وابستہ ہو گئے۔

انا ملائی یونیورسٹی کے قیام میں بھی اُن کا اہم حصہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک اقامتی یونیورسٹی سے متعلق اُن کا خواب جزوی طور پر انا ملائی یونیورسٹی کے قیام سے پورا ہو گیا۔ وہ سنسکرت یونیورسٹی کے بھی ایک بڑے ستون تھے۔ اُن کا کوئی بھی لیکچر سنسکرت کے ایک دو شلوکوں کے بغیر ختم نہیں ہوتا تھا اور وہ کبھی کبھی لیکچروں کو فارسی کے اشعار کی چاشنی بھی لگا دیتے تھے۔

جہاں تک تعلیم نسواں کا تعلق ہے وہ چاہتے تھے کہ عورتیں تعلیم حاصل کریں لیکن وہ اس بات کے خلاف تھے کہ انھیں اعلیٰ تعلیم دی جائے۔ انھیں شہری اور میونسپل امور میں بھی بڑی دلچسپی تھی۔ وہ برسوں تک مدراس میونسپل کارپوریشن کے رکن رہے اور آخر میں اُس کے میئر بھی منتخب ہوئے۔ انھوں نے مدراس شہر میں بہت سدھار کئے۔

وہ فنونِ لطیفہ کے دلدادہ تھے اور ان کے لیے کچھ نہ کچھ وقت نکال لیتے تھے۔ وہ میوزک اکیڈمی، مدراس کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۱ء میں بمبئی میں منعقدہ آل انڈیا میوزک کانفرنس کی بھی صدارت کی۔ وہ جنوبی ہند کے چیمبر آف کامرس کے اولین صدر تھے۔ کھادی کی ترقی بھی اُن کی تعمیری سرگرمیوں کا ایک حصہ تھی۔ انھوں نے کانگریس کے جوبلی برس میں کل ہند سودیشی وکھادی نمائش کی تجویز رکھی، اور اسی برس اور بعد کے دو برسوں میں اس نمائش کا انعقاد کیا۔

مظلوموں کے مسیحا

وہ مظلوموں اور ناانصافی کا شکار ہونے والوں کا ساتھ دینے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے کسانوں کی حالت زار ہو یا کمزور لوگوں کا معاملہ ہو، نان گزیٹیڈ افسروں کے مسائل ہوں یا مزدوروں کی شکایات یا طلبا کے مطالبات، وہ ہمیشہ اُن کے حق میں لڑنے کے لیے پیش پیش رہتے تھے۔

قدامت پسند ہندو ہونے پر بھی وہ دقیانوسی نہیں تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے چھوا چھوت کے خاتمے کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مدراس لیجسلیٹو کونسل اور بعد میں سینٹرل اسمبلی میں ہریجنوں کے کاز کے لیے لڑے

انھوں نے کھادی، دیہی صنعتوں اور دستکاریوں کی ترقی کی جانب بھی بڑی توجہ دی کیونکہ اُن کی رائے میں اس سے دیہات میں بیروزگاری کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔

وہ مدراس کونسل میں شراب بندی کے حق میں بھی خوب لڑے۔

ستیہ مورتی اچھی اور مسرور زندگی بسر کرنے میں یقین رکھتے تھے۔ وہ اچھی پوشاک، اچھی خوراک اور اچھی معاشرت کے گرویدہ تھے۔

اور ان سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ وہ ایک مذہبی آدمی تھے اور اُن کا مذہب دوسرے مذہب کے لوگوں کے ساتھ میل جول بڑھانے میں حارج نہیں تھا، وہ ایشور میں گہرا اعتقاد رکھتے تھے اور اپنی روزمرہ کی زندگی کا آغاز پوجا پاٹ سے کرتے تھے۔

بقیہ، دشمنِ جاں

اپنی بہتری کے لیے تماکو کے استعمال کو آج ہی سے چھوڑ دیجئے۔ آپ کے اس عمل سے زندگی میں نکھار آجائے گا۔ اگر آپ کی ایسی کیفیت ہے ؂

دل یہ اک ہاتھ، اک ہاتھ میں ساغر ٹوٹا

تو آپ اپنے شغل کو جاری رکھئے شوق سگریٹ کے کش لگاتے رہئے اور معطر تمباکو کے پانی کو پھیلا کر فضا کو زعفران زار بناتے رہئے اور آپ کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ آئینے کے روبرو کھڑے ہو کر اپنے رُخِ زیبا کو دیکھ کر مسرت بکسار بھی ہوا کیجئے لیکن اپنی بھلائی کے لیے ہر سال اپنے سینے کا چیک اپ ضرور کراتے رہئے۔ اور اپنے معالج سے علیک سلیک ضرور جاری رکھئے اور درج ذیل مشوروں کو بھی سنتے چلئے۔

صبح سویرے تماکو نہ استعمال کریں دوڑ دھوپ اور محنت و مشقت کے بعد تماکو استعمال نہ کریں۔ بند مکان یا کمرہ میں بیٹھ کر (جن کی کھڑکیاں اور روشن دان بند ہوں وہاں تماکو ہرگز استعمال نہ کریں) کیوں کہ ایسی بند جگہ پر دھواں زہریلا بن جاتا ہے۔ حقہ، سگریٹ، سگار، پائپ اور بیڑی کے مقابلے میں کم نقصان دہ ہے لیکن اس کے پانی کو برابر بدلنا چاہیئے۔ جب سگریٹ جلتے جلتے ایک انچ کی رہ جائے تو اُسے پھینک دیں۔ آنکھوں کو سگریٹ کے دھوئیں سے بچائیے۔

تماکو استعمال کرنے والوں کو شب میں سوتے وقت حلق صاف کر کے محوِ خواب ہونا چاہیئے۔

م۔م۔ راجندر

نیا منوّر راستہ

کچھ عرصے سے شیکھر کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ رات کو گیارہ بارہ بجے جب وہ بستر پر لیٹتا تو تھکاوٹ کے باوجود بہت دیر تک سو نہ پاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جسمانی تھکاوٹ کے باوجود اس کا ذہن بدستور کام کرتا رہتا ہے اور وہ اپنے جسم کو ایک ذہنی تکان اور کھنچاؤ کے بوجھ تلے دبائے پڑا رہتا، حتیٰ کہ ایک اُکھڑی اُکھڑی سی نیند دو تین گھنٹوں کے لیے اُسے اپنی آغوش میں لے لیتی۔ وہ صبح چھ بجے بستر سے اُٹھ جایا کرتا تھا اور پھر وہی مشینی اور میکانکی زندگی کا نہ رُکنے والا چکر شروع ہو جاتا۔

شیکھر کی عمر اس وقت باون سال کی ہو گی۔ مجموعی طور پر اس کی صحت اچھی تھی۔ اس کی بیوی اُوما ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خوبصورت عورت تھی۔ شیکھر کے دونوں لڑکے پردیپ اور سندیپ کالج میں پڑھ رہے تھے۔ شیکھر نے کامیابی کے میدان میں تقریباً چھلانگیں لگائی تھیں اور بیس بائیس سال کی بزنس کی زندگی میں وہ اب دو بڑے کارخانوں کا مالک تھا جن میں انجینئرنگ کا سامان تیار ہوتا تھا۔ اس کی فیکٹریوں میں بنا ہوا سامان نہ صرف ہندوستان میں بکتا تھا بلکہ باہر کے ملکوں میں بھی جاتا تھا۔ شیکھر کا شمار اس کے صوبے کے چوٹی کے بزنس مینوں میں ہوتا تھا۔ اسے زندگی کی ساری آسائشیں نصیب تھیں اور اس کی دولت دن بدن بڑھ رہی تھی لیکن کچھ عرصے سے وہ اچانک یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ ضرورت سے زیادہ دولت انسانی ذہن اور جسم کو زنگ آلود بنانے کا سب سے یقینی ذریعہ ہے۔

شاید شیکھر کی اس اچانک ذہنی تبدیلی کے لیے اس کا ماضی اور اس کا پس منظر ذمہ دار تھا۔ شیکھر غریب والدین کا بیٹا تھا اور بڑی مشکل سے پڑھ پایا تھا۔ اس کا بچپن اور نوجوانی بڑی مالی دشواریوں اور پریشانیوں میں گزری تھی۔ اس نے انجینئرنگ کی تعلیم سرکاری وظیفے اور ایک ٹرسٹ کی مالی امداد سے پائی تھی۔ اُس کے بعد سرکاری مدد اور بنک کے قرضے سے اس نے صرف دو مشینوں اور چار کاریگروں سے ایک چھوٹی سی فیکٹری لگائی تھی۔ وہ محنتی تو تھا ہی مگر قسمت نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا اور کامیابی اس کے قدم چومتی گئی۔ اس نے اٹھائیس سال کی عمر میں ایسی بے حد کامیابی کے باوجود اوما سے شادی کر لی تھی جو ایک غریب گھر کی لیکن پڑھی لکھی خوبصورت لڑکی تھی۔

شادی کے بعد اس نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی تھی اور آہستہ آہستہ اس کی اپنی غربت کا پس منظر ایک بھولی بسری بات بن گئی۔

ان دنوں جو بات سب سے زیادہ شیکھر کو محسوس ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ وہ ایک مشین سا ہو گیا ہے جو صبح آٹھ بجے سے رات کے دس گیارہ بجے تک کام میں جُٹا رہتا ہے۔ اگرچہ اس کے دونوں کارخانوں میں اس کی مدد کے لیے ایک بڑا عملہ کام کرتا تھا لیکن وہ تمام اہم فیصلے اپنی ہی سطح پر کرتا تھا اور اس کی شروع سے یہ عادت تھی کہ وہ ہر معاملے میں دلچسپی لے اور یہ دونوں باتیں کارخانوں کی کامیابی کے لیے بے حد ضروری تھیں۔ اس کے علاوہ اسے بزنس کے سلسلے میں بہت دورہ کرنا پڑتا تھا۔ اور وہ تقریباً ایک مہینے میں دس دن باہر ہی گزارتا تھا۔ اور یہ سب کچھ اسے بالکل بے مقصد نظر آ رہا تھا۔

ایک روز شیکھر کے پاس رات کو دس بجے اس کا دوست سریندر پہنچا۔ اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ تھی۔ سریندر اس کی ہی عمر کا ایک بڑا بزنس مین تھا۔ کوئی دو سال سے وہ ایک بڑے سادھو کا چیلا بن گیا تھا۔ اس سادھو کا ایک بڑا مٹھ میرٹھ کے پاس تھا۔ لیکن سریندر نے اپنا بزنس نہیں چھوڑا تھا۔ اگر

۵ ۶۸، چترا وہار، دہلی
یوحستا، نئی دہلی

اس کا کچھ چھوٹا سا تھا تو وہ اس کا لباس تھا۔ وہ اب عمدہ سلک کے گیروے رنگ کے کپڑے پہنتا تھا، اور اس کے گلے میں اُس کے گورو کی دی ہوئی ایک مالا لٹکی رہتی تھی۔ بلاشبہ سریندر نے کوئی پچاس ہزار روپے سادھو کو اپنی طرف سے دان دیئے تھے۔ سریندر اس سادھو کے مقامی مرکز کا انچارج بھی تھا۔ اب تک وہ اس معاملے میں شیکھر کو اپنا ہم خیال اس لیے نہیں بنا سکا تھا کیوں کہ شیکھر کی بیوی اوما کو ان ڈھکوسلوں میں یقین نہیں تھا اور وہ ہمیشہ اس کی مخالفت کرتی آئی تھی۔ آج شیکھر نے سریندر کے آنے پر جب اس سے اپنی دلی بے چینی اور اضطراب کا ذکر کیا تو سریندر نے پھر اپنے گورو کا ذکر کر دیا اور ایک طویل لیکچر کے بعد شیکھر کو یہ رائے دی

"شیکھر جب سے میں گورو جی کی شرن میں آیا ہوں مجھے ایک نئی شانتی مل گئی ہے۔

ان کی شرن میں آتے ہی تمہاری بے چینی بھی مٹ جائے گی۔ گورو جی سوموار کو یہاں آ رہے ہیں۔ ان کے مٹھ کے لیے ایک آدھ لاکھ روپے دان بھی دے دو اور ان کی شرن میں آکر ایک نئی زندگی پالو۔"

شیکھر کو سریندر کی بات جچ گئی۔ وہ خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ جب سے سریندر گورو جی کا چیلا سا ہے اس کے چہرے پر ایک عجیب اطمینان سا آگیا ہے آج اوما نے بھی سریندر کے خیالات کی مخالفت نہیں کی۔ کیونکہ وہ شیکھر کو ہر قیمت پر خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ کئی دنوں سے شیکھر کی بڑھتی ہوئی بے چینی کو دیکھ کر خود پریشان ہونے لگی تھی۔ اگر گورو جی کی شرن میں آکر شیکھر کے دل کو شانتی مل سکتی ہے تو اوما کے لیے اس سے بڑھ کر اور خوشی کیا ہو سکتی تھی وہ اسی وقت اٹھی اور شیکھر کی چیک بک اٹھا لائی اور شیکھر کے سامنے رکھ کر بولی۔

"گورو جی کے مٹھ کے لیے پچاس ہزار روپے کا چیک کاٹ کر سریندر بھیا کو ابھی دے دو۔ یہ گورو جی کو دے دیں گے۔ گورو جی سوموار کو تو آ ہی رہے ہیں۔ ان سے مل کر گورو منتر بھی لے لینا۔"

شیکھر نے اوما کے کہنے پر چیک اسی وقت کاٹ کر دے دیا۔ گورو جی کے آنے پر شیکھر ان کا چیلہ بھی بن گیا۔ گورو جی نے اسے اپنی لکھی ہوئی کئی کتابیں بھی دیں اور اسے اپنے یہاں کے مرکز کا سکریٹری بھی بنا دیا۔ شیکھر نے سریندر کی طرح گیروے کپڑے تو نہیں پہنے لیکن اس نے مٹھ کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ وہ رات کو بستر پر گورو جی کی دی ہوئی کتابیں بلاناغہ پڑھتا اور دل ہی دل میں ان کا دیا ہوا منتر بھی دُہراتا۔ اس طرح سے کئی ماہ بیت گئے مگر اس کے دل کی بے چینی اور اضطراب کم نہیں ہوا۔ ایک دفعہ وہ اوما کو لے کر میرٹھ بھی گیا اور وہاں اس نے ایک ہفتہ گورو جی کے مٹھ میں گزارا لیکن اس کی بے چینی کم نہیں ہوئی بلکہ جو کچھ اس نے وہاں دیکھا اور محسوس کیا اس سے اس کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک گہری اور اندھی سُرنگ میں گھس کر بھٹک گیا ہے۔ اور اب اس سے نکل کر ہی وہ کھلی ہواؤں میں سانس لے سکے گا۔ زندگی میں کتنا دھوکا، کتنی بے مقصدیت اور بے راہ روی ہے، اسے محسوس کر کے وہ بہت اُداس ہو گیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اس تاریک سُرنگ میں سے سریندر کی ناراضگی کے باوجود نکل آیا۔

مٹھ سے تعلق توڑ کر شیکھر نے کئی دنوں تک اپنے آپ کو زیادہ آزاد محسوس کیا لیکن چند دنوں کے بعد ہی اس کی وہی کیفیت لوٹ آئی۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید کوئی بھی روحانی رشتہ اس کی گھٹن کا مداوا ہو سکتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے شدت سے احساس کیا کہ وہ ایک انجینیر تھا اور اس اعتبار سے قدرے آزاد خیال بھی، اگرچہ بلاشبہ وہ دنیا کے تمام مذاہب کا احترام کیا کرتا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ ہر مذہب کی منزل ایک ہے اور کوئی مذہب نفرت نہیں سکھاتا۔ اس لیے وہ ایک آفاقیت، ایک انسانیت میں یقین رکھتا تھا۔ لیکن اگرچہ وہ ایک بزنس مین تھا مگر اندھا دھند کمائی بذات خود اس جیسے حساس آدمی کی منزل تو نہیں بن سکتی۔ وہ بزنس میں بھی کوئی بے ایمانی نہیں کرتا تھا، اور تمام ٹیکسوں کو ایمانداری سے ادا کرتا تھا مگر پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھا۔ کوئی کمی تھی جو وہ محسوس کر رہا تھا، وہ کچھ دھیرے دھیرے کھو رہا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر شیکھر زیادہ اُداس ہو گیا اور ایک دو دن فیکٹری بھی نہیں گیا

اوما قدرتی طور پر پریشان تھی۔ اس نے ایک روز شیکھر سے کھل کر بات کی اور شیکھر نے اوما سے بات کر کے اپنے آپ کو بہتر محسوس کیا۔ اوما نے اسے بتایا کہ مسلسل کام کرنے اور محنت کرنے میں ہی سچی مسرت اور راحت ہے اور دولت کمانے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ انسان اس کا صحیح استعمال کرے۔ اوما کی بات سُن کر شیکھر بولا

"یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ صرف کمانا اور بے تحاشہ خرچ کرنا یقیناً زندگی کا مقصد نہیں ہے۔"

" اگر تم یہ مانتے ہو" اوما بولی" تو ہمیں ایک جینے کی راہ ڈھونڈنی چاہیئے۔"

شیکھر کے چہرے پر مسرت کی سُرخی پھیل گئی اور وہ خوش ہو کر بولا۔

" اوما تم نے میرے دل کی بات پکڑ لی ہے۔ میں سچ مچ سکون کی تلاش میں ہوں، جو اچھے عمل سے ملتا ہے۔"

" اچھا دیکھئے" اوما بولی"۔ کل ہماری شادی کی سالگرہ ہے اور ہم دونوں ایک اُمنگوں بھرا پُر مقصد سال شروع کریں گے۔ میں کل آپ کو ایک پروگرام بھی دوں گی جس پر عمل کر کے ہم دونوں کو شاید بہت خوشی ملے۔ آپ پہلا کام تو یہ کیجئے کہ راج ہوٹل میں شام کے کھانے کے لیے چار سیٹیں بُک کریں۔ شادی کی سالگرہ ہے نا بچوں کے ساتھ ہی باہر کھانا کھائیں گے۔"

اگلے دن فیکٹری سے شیکھر شام کو جلدی چلا آیا۔ ڈرائنگ روم میں اوما پہلے ہی سے بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں بچے پردیپ اور سندیپ بھی اپنی ماں سے کچھ بات کر رہے تھے۔ شیکھر آج بڑا خوش تھا۔ اور اس کے بیٹھتے ہی نوکر چائے لے آیا۔ شیکھر مسکرا کر بولا۔

"ہاں اوما، بتاؤ تم نے کیا پروگرام بنایا ہے؟ کل تم نے کہا تھا کہ کچھ بتاؤ گی۔ ہوٹل کی سیٹیں تو بُک ہو گئی ہیں۔"

" تو سُن لیجئے۔ میں نے بچوں سے بھی صلاح کر لی ہے۔ میری نظر میں آپ کا یہ فرض ہے کہ محنت اور دیانتداری سے خوب کمائیں۔ اپنی فالتو کمائی آپ غریب

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

ضیاء حسنی*

(انشائیہ)

دشمنِ جاں

اچانک ایک دن تم سے دل لگ گیا تھا۔

تم اس طرح ملتفت ہوئیں کہ مَیں نے فوراً ہی تمھارا دامنِ رنگیں پکڑ لیا اور مَیں ایسا خوش ہوا کہ جیسے میں شب و روز ڈھونڈھ رہا تھا وہ اچانک مل گیا ہو لیکن اب کفِ افسوس ملتا ہوں اور سوچتا ہوں۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

بس مَیں دلوانہ وار تمھاری طرف بڑھنے لگا۔ حیران و پریشان اپنے آپ کو بھلائے ہوئے تمھاری چاہت میں سرگرداں پھرا کرتا تھا اور جو اپنا حالِ زار دیکھتا تو ترس آتا اور زیرِ لب گنگنانے لگتا۔

میرؔ جب سے گیا ہے دل تب سے
مَیں تو کچھ ہو گیا ہوں سودائی

ابتدا میں جب تم سے ملتا تو عجب سا تیکھا پن اور کڑواہٹ محسوس کرتا اور یہی جی چاہتا کہ اب تمھارے پاس نہ جاؤں پھر بھی نہ جانے وہ کون سی کشش تھی جو مجھے کشاں کشاں تمھارے قریب لے جاتی اور جیسے ہی تم مِل جاتیں تو میرے دل کو قرار آجاتا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور تم دھیرے دھیرے ہولے ہولے میرے دل میں اُترتی چلی گئیں اور اب تو یہ عالم ہے کہ تازہ ہوا سے زیادہ یہ کڑوا کسیلا پن میرے چہرے کو تازگی بخشتا ہے اور میرے جسم میں زندگی کی لہر دَوڑا کر کارزارِ حیات میں مجھے گامزن کر دیتا ہے۔

آج میں پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے وہ کرب انگیز لمحات بے اختیار یاد آتے ہیں کہ جنھیں مَیں نے تمھاری جُدائی میں گزارے تھے ایسے میں میری زندگی سُنسان ریگستان بن جاتی میرا اُجڑا چہرہ، میرے تشنہ لب، میری ڈوبی ڈوبی آنکھیں، میرے ڈگمگاتے قدم سبھی تمھاری کربناک جُدائی کی ترجمانی کرتے تھے۔ یقین جانو! مَیں تمھاری رفاقت کو کیسے بھول سکتا ہوں کیوں کہ صبح سے شام تک تم ہی سہارا دے کر کاموں کے لیے اُکساتی ہو اور میرے بدن میں چستی اور مستعدی کی ایک لہر دوڑا کر زندگی گزارنے کا سلیقہ بھی دیتی ہو۔

تمھارے اس وصف نے ان گنت لوگوں کو تمھارا گرویدہ بنا لیا ہے۔ کھیتوں کھلیانوں میں کام کرنے والے کسان، کارخانوں اور ملوں میں دوڑ بھاگ کرتے ہوئے مزدور، دفتروں میں مصروف افسر اور بابو، کچہریوں میں رواں دواں وکیل اور کتنے ادیب شاعر اور دانشور سبھی تمھیں دل کی گہرائی سے چاہتے اور تمھاری رفاقت کے سہارے دوڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ٹھیک ہے ان گنت افراد تمھیں دل کی گہرائی سے چاہتے ہیں اور تم کسی روپ میں اُن کے سامنے آؤ وہ بڑھ کر تمھیں پیار کرتے ہیں اور سینے سے لگا لیتے ہیں۔ یہ سبھی لوگ تمھاری چند گھنٹوں کی جدائی برداشت نہیں کر پاتے اور بس وہ یہی چاہتے ہیں کہ تم اُن کے ہونٹوں سے لگی اور سینے میں بسی رہو لیکن بُرا نہ مانو تو یہ بھی بتاتا چلوں کہ تم جفا پیشہ ہو اور اس بے وفا دنیا کی طرح اپنے ہر عاشق کو دل کی گہرائی سے محبت کرنے کا یقین دلاتی ہو۔ ٹھیک ہے تم اُسے وقتی طور پر راحت بھی دیتی ہو لیکن مہلک زہر بن کر اُس کے رگ و ریشے میں سما بھی جاتی ہو۔ اس کے بعد اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک کر یکسوئی حاصل کر لیتی ہو۔ مَیں نے

* ۳۵، چھوٹی بازار، فتح پور (یو-پی)

تمھارے ہزاروں عاشقوں کو سسک سسک کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑتے دیکھا ہے۔ یہ بھی سُن لو کہ تمھارا وجود سم قاتل ہے اور تمھاری قربت کسی افعی جاں گداز سے آنکھ مچولی کرنے سے کم مہلک نہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم وہ زہر ہو جو آہستہ آہستہ میرے بدن کو گھلا رہا ہے اور ایک دن مجھے موت کے گھاٹ اتار کر دم لے گا۔ میرا چہرہ، اندر کی تپن اور جلن کی چغلی کھاتا ہے۔ دل دھڑکتا ہے سر چکراتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ دو قدم چلنے میں دَم پھولنے لگتا ہے

چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے
اک آگ سی رہے ہے کیا جانیے کیا ہے

میں کافی روانی سے بول رہا تھا کہ وہ تیکھے تیوروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ہ

چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

میں نے کبھی کسی کو دعوت نہیں دی۔ لوگ خود ہی کھچے چلے آتے ہیں، مجھ سے راہ و رسم بڑھاتے ہیں میری دوستی کا دَم بھرتے ہیں اور پھر چند دنوں کے بعد میرے اندر کیڑے نکالنے لگتے ہیں عشق اور محبت بچوں کا کھیل نہیں کسی کونے میں بیٹھے رہو بدن پر ذرا سی خراش نہ آئے گی۔ آگ تاپوگے تو جل بھی سکتے ہو۔

یہ کہتے ہوئے وہ دامن جھٹک کر چلی گئی اور میں منھ دیکھتا رہ گیا۔

کافی دیر سے یہ مسلسل اور پُراسرار گفتگو چل رہی تھی اور آپ دل لگا کر اسے سُن رہے تھے۔ دیکھیے! اب ہم دونوں بے نقاب ہو کر آپ کے سامنے موجود ہیں۔ میں تمباکو کا رسیا ہوں اور ہزاروں اپنے ہم جنسوں کی طرح سوتے سوتے دس بارہ سگریٹوں کو پھونک ڈالتا ہوں، اور پان میں کئی طرح کی معطر تمباکو اور مسالہ ڈال کر اس کے کڑوے کسیلے گھونٹ نگلا کرتا ہوں۔ پینے اور کھانے کی دونوں تمباکو مجھے اچھی لگتی ہیں لہٰذا ان دونوں کھاؤ سے میرا جو حال ہوا اس کی تفصیل سُنا چکا ہوں۔ دانت گر رہے ہیں، آنتوں کی بھی خیر نہیں۔ تقریباً بیس برسوں سے تمباکو سوتے جاگتے ساتھ دے رہی ہے کبھی نیند اسی آنکھوں سے دیکھ کر یا ٹٹول کر سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس اُٹھاتا ہوں سگریٹ جلاتا ہوں اور جب کئی کش لے لیتا ہوں تو بدن میں چستی آتی ہے اسی طرح سگریٹ کے کش لگا کر نیند کی آغوش میں جھولنے لگتا ہوں۔ ممکن ہے آپ تمباکو سے پوری طرح متعارف نہ ہوں اس لیے میں اس کی روداد بھی سنا دینا چاہتا ہوں۔

ہمارے یہاں تمبول (پان) کھانے کا رواج صدیوں پہلے سے چلا آرہا ہے۔ حضرت امیر خسروؒ نے بھی اس رواج کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن تمباکو کھانے کا واضح طور پر تذکرہ نہیں کیا البتہ ایسا کہا جاتا ہے کہ پرتگالی تمباکو کو یہاں لائے۔ عجیب بات ہے کہ جہاں جہاں اس مضرت رساں شے نے اپنے کڑوے کسیلے پن کے باوجود مقبولیت حاصل کی۔ وہاں اس نقصان دہ چیز کو برباد کرنے کے منصوبے بھی بنائے گئے لیکن شدید مخالفتوں کے باوجود یہ سخت جان محبوبہ اپنے عاشقوں کے ہونٹوں میں لگی اور سینوں میں بسی رہی۔ یورپ میں ملکۂ ایلزبتھ، شاہ جیمز اور شاہ چارلز نے اس کے وجود کو ختم کرنے کی کوششیں کیں اور ہندوستان میں شہنشاہ جہانگیر نے تمباکو نوشی کے خلاف ایسے سخت احکام نافذ کیے کہ اگر کسی شخص کو تمباکو پیتے دیکھ لیا جائے تو اُس کے ہونٹ کاٹ لیے جائیں لیکن چوری چھپے یہ رواج بڑھتا ہی گیا۔ انگریزوں کے تسلّط کے بعد حقے کے علاوہ سگریٹ، سگار اور پائپ کا بھی چلن ہو گیا۔ کم یافت افراد بیڑی پینے لگے لہٰذا عوام اور خواص دونوں تمباکو کے رسیا ہو گئے۔

تمباکو میں تھوڑی سی مقدار میں ایک جوہر پایا جاتا ہے جسے نکوٹین کہتے ہیں یہ ایک طرح کا روغن ہوتا ہے جو ایک دم انسان کو نہیں مارتا لیکن یہ ایسا زہر ہے کہ جو انسان کو مبتلائے آزار کر دیتا ہے۔ چین اسموکنگ اور تمباکو کے مسلسل استعمال سے خون پتلا پڑ جاتا ہے جس سے دماغ اور اعصاب کی بخوبی پرورش نہیں ہوسکتی اور بیسیوں شکایتیں جیسے بے خوابی، سر چکرانا، دماغ کی کمزوری وغیرہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ تمباکو کے برابر استعمال سے ہاضمہ کی خرابی اور قبض کی شکایت قدم جما لیتی ہے۔ بظاہر تمباکو قبض کو توڑنے میں معاون لگتی ہے لیکن وہ جسم میں اور پیچیدگی پیدا کر دیتی ہے۔ یہ پیچیدگی مُہلک بھی بن جاتی ہے۔

جدید طبّی تحقیقات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ پھیپھڑے کا سرطان تمباکو پینے والوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ امریکن کینسر سوسائٹی نے ایک لاکھ اٹھاسی ہزار اُن مریضوں کا مطالعہ کیا کہ جن کی عمر ۵۰ سے ۷۰ سال کے درمیان تھی۔ اُن میں سگریٹ پینے والوں کی سرطان کے سبب اموات ہوئیں۔ عورتوں کی بہ نسبت مرد سرطان میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ مرد نسبتاً زیادہ تمباکو نوشی کرتے ہیں۔ عموماً عورتیں پان میں تمباکو کھاتی ہیں اور چند تمباکو اور چونے کو ملا کر کھاتی ہیں۔ کم تعداد ہی عورتیں سگریٹ نوشی کی بھی عادی ہو رہی ہیں۔ مشرقی تہذیب میں ایسی آزادی کو پسند نہیں کیا جاتا بغرض تمباکو سرطان کو پروان چڑھانے میں معاون بنتی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس مہلک عادت کو چھوڑ دینے ہی میں عافیت ہے۔ موت اٹل حقیقت ہے جس نے ماں کی گود دیکھی ہے وہ قبر کا گوشہ بھی دیکھے گا لیکن کیا اچھا ہو کہ آدمی پُرسکون موت مرے۔ اگر آپ کی قوتِ ارادی مضبوط ہے جو ارادہ کر لیتے ہیں اُسے پایۂ تکمیل کو پہنچا کر دم لیتے ہیں تو

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

غزلیں

اسلام پرویز
مقام و ڈاکخانہ، بہسولے، سیتا مڑھی۔ (بہار)

شبِ وصال کا باقی حساب رہنے دے
کچھ اور دیر مجھے محوِ خواب رہنے دے

تکلّفات میں کچھ پیچ و تاب رہنے دے
دلِ حزیں میں غم و اضطراب رہنے دے

ہے تیرے چہرے سے روشن ضیائے حسن و جمال
کچھ اور دیر اسے بے نقاب رہنے دے

وہ اپنے دور کی ظلمت میں ہو گیا ہے اسیر
نئی سحر کا مجھے آفتاب رہنے دے

تمام باغ پہ قبضہ جما لے تو لیکن
مرے لیے کوئی تازہ گلاب رہنے دے

سجا سنوار کے رکھ تو غزل کو اے پرویز
اگر خراب ہوئے ہم خراب رہنے دے

●

ایم۔ آر۔ قاسمی: ۳/۱۸۲، آٹھ کوارٹرز، کھجور والی مسجد، جعفر آباد۔ دہلی ۱۱۰۰۵۳۔

بجھا چکی ہے ہوا جس کو وہ دیا بھی میں
مگر یہ دیکھ بہت دیر تک جلا بھی میں

ملے قیام کے احکام بھی مجھی کو یہاں!
مسافتوں کا پرستار ایک تھا بھی میں

طویل دھوپ کی شدت ہواؤں کی یورش
سہی بھی میں نے سرِ دشتِ غم کھلا بھی میں

مرے نصیب میں ٹھہرے کے راستوں کے سفر
"سدا بہار" دیاروں سے آشنا بھی میں

مجھی سے آئی تھی ملنے اداس چاندنی رات
اگر یہ جانتا ہوتا تو جاگتا بھی میں!

مری طرف تھیں کبھی بارشیں بھی پھولوں کی
حصارِ سنگ و صدا میں گھرا ہوا بھی میں

یہ سوچتا ہوں کہوں خود کو قاسمی میں کیا
بہت سکوت بھی اندر مرے، صدا بھی میں

●

اسد رضوی: محمد پور مبارک، مظفر پور۔ ۸۴۲۰۰۱ (بہار)

عجیب وقت تھا صحرا میں بے وطن کے لیے
برہنہ لاش پڑی رہ گئی کفن کے لیے

بہار آئی مگر اس قدر ہے خوفِ خزاں
کہ ایک پھول بھی کھلتا نہیں چمن کے لیے

غریب بھائی تھا اک آہ بھر کے بیٹھ گیا
طلب جہیز کی قاتل سی بہن کے لیے

کفن کے واسطے کپڑوں کا انتخاب ہوا
لباس جب کہ میسر نہ تھا بدن کے لیے

ہم اپنے آپ میں تنہا نہیں اسد رضوی
ہماری ذات ہی کافی ہے انجمن کے لیے!

●

آج کی شکنتلا

یعقوب یاور کوٹے: نگار فوٹو اسٹوڈیو، چرچ روڈ، جہانگیر آباد، بھوپال ۴۶۲۰۰۸۔

مجھے لگا
جیسے میرے چاروں طرف کھڑے ہوں
ہزاروں ترکش بدوش کیوپڈ
نظر اٹھائی تو میں نے دیکھا
سنہری رنگت کا اک ہرن میرے سامنے سے گذر
رہا تھا

پھر اس کے پیچھے میں چل پڑا تھا
نہ راستوں کی نہ اپنی منزل کی کچھ خبر تھی
مگر یہ سپنا تھا
آنکھ کھولی تو سامنے ایک بھولی بھالی اداس لڑکی

بدن دریدہ
لباس کے تار گن رہی تھی

جو میں نے پوچھا کہ کون ہو تم
تو آنسوؤں نے زباں کھولی

میں بھولی بسری شکنتلا
کالیداس کی بات جو ہتی ہوں
نہ جانے کس نے
مری کتابِ حیات کے ہر ورق کو تاریک کر دیا ہے

میں اک گلی ہوں
اور ایک رتنیت ابھی ابھی اس گلی سے گذرا ہے
تم بھی آؤ ... ؟

●

زندگی بھر ہم فریبِ دوستی کھاتے رہے
زندگی بھر ہم وفاؤں کا صلہ پاتے رہے

جگن ناتھ آزاد

محمد برہان حسین٭

قد بڑھانے والے ہارمونز

یوں اس بات سے کہ درست ہے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ لمبے قد اور چھوٹے قد کے اپنی اپنی جگہ برابر کے فائدے ہیں جیسے کم قد آدمی زیادہ پھرتیلا ہوتا ہے۔ تنگ سے تنگ جگہ سے گزر سکتا ہے۔ کم کپڑے میں کام چلا لیتا ہے۔ تنگ اور کم جگہ والی جگہوں پر کام کر سکتا ہے۔ لیکن اس کی شخصیت متاثر کن نہیں ہوتی۔ خوبصورت چہرے اور ذہانت کے باوجود کم قد عورتیں اور مرد، لمبے قد والوں کے سامنے عجیب احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس احساسِ کمتری کو کم کرنے کی خاطر عام طور پر کم قد لوگ سخت محنت و ذہانت سے کام کر کے خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ احساسِ کمتری کا شکار ہی رہتے ہیں۔

نپولین کم قد انسان تھے۔ ایک دفعہ وہ لائبریری میں اونچے ریک سے کتاب نکالنے کی کوشش کر رہے تھے، ان کے ایک خادم نے بڑھ کر کتاب نکال کر ان کو پیش کر دی چونکہ وہ لمبا آدمی تھا۔ نپولین نے کتاب لے کر اس کے طویل قد کو دیکھا اور کہا "تم مجھ سے قد میں بڑے ضرور ہو لیکن مجھ سے بڑے آدمی نہیں ہو"۔ نپولین کا یہ جملہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا تھے کہ ان کا قد چھوٹا تھا۔

آپ کسی لمبے آدمی سے کہیئے کہ آپ کے پاس قد کو کم کرنے والی دوا ہے تو وہ اس دوا سے کوئی دلچسپی ظاہر نہ کرے گا بجائے اس کے اگر آپ کسی کم قد سے کہیئے کہ آپ اس کا قد لمبا کر سکتے ہیں تو وہ اس دوا کو حاصل کرنے کی زبردست کوشش کرے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانہ میں ہوشیار لوگوں نے اس قسم کی دوائیں ضرورتمند کم قد لوگوں کو فروخت کر کے دولت کمائی ہے۔

ذہین لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ کالے رنگ کو گورا کرے، کم قد کو لمبا کرے، گنجے سر پر بال اگانے اور سفید بالوں کو مستقلاً کالا کرنے کی کوئی دوا نہ کبھی تھی اور نہ اب ہے لیکن ایسی دواؤں کا اس وقت بھی زبردست مارکیٹ موجود ہے اور ایسے لوگ موجود ہیں جو اب بھی کالے کو گورا کرنے، بال کالے کرنے اور قد لمبا کرنے کے سپنے بیچتے ہیں اور لوگ جان بوجھ کر دھوکہ کھاتے ہیں۔

جارج برنارڈ شا نے اپنے شہرۂ آفاق ڈرامہ "کلو پیٹرا" میں بالوں کو کالا کرنے کا وہ نسخہ نقل کیا ہے جو "کلو پیٹرا" استعمال کیا کرتی تھی۔ سائنسداں بھی اس انسانی خواہش سے ہر زمانہ میں متاثر ہوئے ہیں کہ ایسی دوا ایجاد ہو جائے جو کم قد کو لمبا، سفید بالوں کو کالا کر سکے۔ چونکہ انھیں معلوم ہے کہ ایسی دوائیں سونے سے بھی بڑی قیمت پر فروخت ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ آج بھی دواؤں کی بڑی بڑی کمپنیاں نہ صرف اس قسم کی ریسرچ پر روپیہ خرچ کرتی ہیں بلکہ تحقیق کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ قدرت کے ان رازوں پر سے پردہ اٹھانے کے لیے چل رہا ہے۔

۱۔ انسان بوڑھا کیوں ہوتا ہے۔

۲۔ لمبا یا ٹھنگنا کیوں ہوتا ہے۔

۳۔ گورا اور کالا کیوں ہوتا ہے۔

اگر یہ راز معلوم ہو جائیں تو ان کی دوائیں بنانا بھی آسان ہو جائے گا اور پھر وہ نہ صرف دولت کما سکیں گے بلکہ انسانی ذہنی تکلیف اور احساسِ کمتری کو دور کر سکیں گے۔

آج سے نصف صدی قبل کم قد کی عورتوں

٭ سائنٹسٹ، ریجنل ریسرچ لیباریٹری، حیدرآباد – ۹

کو پسند کیا جاتا تھا چنانچہ اُس دَور میں لکھے گئے ناولوں اور افسانوں میں دوشیزہ کا حسن بیان کرتے وقت اُس کے 'بوٹے قد' کو ضرور سراہا جاتا تھا لیکن آج شادی کے لیے اشتہاروں میں لمبے قد اور گورے رنگ کا ذکر اوّل ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے لڑکا اور لڑکی نہ صرف خود لمبے قد کے ہونا چاہتے ہیں بلکہ اپنی بیوی یا شوہر کو بھی طویل القد ہی چاہتے ہیں۔ لوگ ڈاکٹروں کے پاس آتے ہیں اور ایسی دوائیں طلب کرتے ہیں جن کے استعمال سے قد بڑھے۔ لوگ اس مقصد کے لیے یوگا کرتے ہیں اور سڑک چھاپ چٹکلے باز حکیموں اور ویدوں کی دوائیں استعمال کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ حالانکہ آئے دن سُنتے ہیں کہ اس قسم کی دواؤں کے استعمال سے لوگوں کو نقصان ہوتا آیا ہے۔

سائنس نے بتایا ہے کہ انسان کے رنگ، قد اور عادتوں کا راز اُس کے نُطفہ میں ہوتا ہے، اور یہ والدین سے اُسے ورثہ میں ملتے ہیں۔ پھر جدید تحقیقات سے معلوم ہوا کہ جسم کی بناوٹ قد کی طوالت اور صحت و توانائی ہارمونز پر منحصر ہوتی ہے۔

ہارمونز کیا ہوتے ہیں؟ یہ ایک خاص قسم کے مرکبات ہوتے ہیں جو مختلف غدودِ جسم کے اندر پیدا کرتے ہیں اور خارج کرتے ہیں اور دورانِ خون کے ساتھ یہ جسم کے دیگر حصوں تک پہنچتے ہیں اور اعصاب کے افعال کو کنٹرول کرتے ہیں۔ ہارمونز کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر ہی دوائیں بنانے والی کمپنیاں ساری دنیا میں ہارمونز کی تحقیقات اور تیاری پر غیر معمولی توجہ کر رہی ہیں۔

قد بڑھانے والے ہارمونز جنھیں گروتھ ہارمونز بھی کہتے ہیں کی دریافت کے بعد اِن کے استعمال کے بارے میں بحث چھڑی ہوئی ہے۔ لیکن ان ہارمونز کی مارکیٹ میں طلب یقینی ہے، چوں کہ ہر ماں باپ اپنے بچوں کی شخصیت کے نکھار کے لیے انھیں ضرور استعمال کریں گے۔ اس کے علاوہ موٹے لوگ دُبلے ہونے کے لیے جو جتن کرتے ہیں، ان ہارمونز کے استعمال سے اس کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ چوں کہ یہ ہارمونز اُن کے جسم سے صرف چربی کو نکال دیں گے اور پٹھوں یا Tissues پر کوئی اثر نہیں کریں گے۔ خصوصیت سے معمر لوگوں کو اس سے فائدہ ہوگا۔ چوں کہ ہارمونز کے استعمال سے چربی چھٹنے سے اُن کے اعصاب اور چہرے پر جُھرّیاں نہیں پڑیں گی۔ Atheletics نے ایسے ہارمونز کا استعمال شروع کر دیا ہے جو اُن کے جسم کو پھُرتیلا، زیادہ طاقتور اور توانا بنائے رکھتے ہیں۔ اگرچہ ایسی ادویات یا ہارمونز پر قانوناً پابندی لگائی گئی ہے۔

قد بڑھانے والے ہارمونز دماغ میں واقع ایک غدود پچوٹری Pituitary سے خارج ہوتے ہیں۔ یہ ہارمونز جگر کو اُکساتے ہیں کہ وہ ایک اور قسم کے ہارمونز سوماٹو ڈینز Somatedins پیدا کرے۔ یہ ہارمونز انسولین کے مشابہ ہوتے ہیں اور ہڈیوں کو بڑھنے پر اُکساتے ہیں۔ بچوں اور نوجوانوں میں یہ ہارمونز بڑی مقدار میں پیدا ہوتے ہیں جبکہ معمر لوگوں میں ان کی پیداوار رُک جاتی ہے۔ بعض سائنس دان سمجھتے ہیں کہ یہ ہارمونز صرف قد بڑھانے کا کام ہی نہیں کرتے، بلکہ ان کا کوئی اور مقصد بھی ہونا چاہیئے۔ چوں کہ غیر متوازن غذا کھانے والے بچے قدآور نہیں ہو پاتے جبکہ اُن میں ان ہارمونز کی بہتات ہوتی ہے۔ بڑی عمر والے لوگ یہ ہارمونز پیدا نہیں کرتے لیکن جب وہ روزہ رکھتے ہیں یا تھک جاتے ہیں تو بڑی مقدار میں ہارمونز پیدا ہونے لگتے ہیں۔ محققین کا نظریہ ہے کہ اِن ہارمونز کا کام دراصل تھکن کے وقت چربی سے توانائی حاصل کرکے پٹھوں کو پہنچانا ہے۔

امریکہ کی ریاست ورجینیا کے Robert Blizzard کا کہنا ہے "گروتھ ہارمونز فاقہ یا روزہ کا ہارمونز ہے جیسا کہ انسولین پیٹ بھروں کا ہارمونز ہے"۔ یعنی پیٹ بھرے کے بعد جو شکر خون میں آجاتی ہے اس کو نکالنے کے لیے جسم انسولین بناتا ہے، جو شکر کو جسم سے خارج کرتی ہے۔ اسی طرح جب تھکن یا روزہ کی وجہ سے خون میں شکر ختم ہو جاتی ہے تو گروتھ ہارمونز چربی سے شکر حاصل کرکے خون میں پہنچاتا ہے۔ اسی نظریہ کے تحت اُمید ہے کہ ان ہارمونز سے موٹاپے کا علاج ممکن ہو سکے گا۔

گروتھ ہارمونز انسان کو بوڑھا کرنے میں بھی حصہ لیتے ہیں بوڑھے لوگ کم عمر لوگوں کے مقابلہ میں گروتھ ہارمونز کم پیدا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ جن بچوں میں کسی خرابی کی وجہ سے گروتھ ہارمونز کم خارج ہوتے ہیں وہ جلد بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ایک تیس سالہ شخص ان ہارمونز کی کمی کا شکار ہو کر ۷۰ سالہ نظر آتا ہے۔ چہرے پہ وقت سے پہلے جُھرّیاں پڑ جاتی ہیں اور جسم کے مختلف جگہوں پر چربی جمع ہونے لگتی ہے جو بوڑھے لوگوں کی پہچان بن گئی ہے۔ ان مشاہدات اور تحقیقات سے اس نتیجہ پر پہونچا گیا ہے کہ ان ہارمونز کا عمر سے جسم میں ہونے والی تبدیلیوں سے ضرور کچھ تعلق ہے۔

ہارمونز کے بارے میں ان نظریات کو اب تک صرف اس لیے آزمایا نہ جا سکا کہ ان ہارمونز کی پیداوار بہت کم ہے اور مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ان ہارمونز کو لاشوں کے پچوٹری غدود سے حاصل کیا جاتا رہا ہے۔ اور صرف ایسے

بچوں کو ہر ہفتہ تین انجکشن کی شرح سے دیا جاتا رہا ہے۔

اب ان ہارمونز کو "جین" Gene ، ٹکنالوجی کی مدد سے بیکٹیریا کے ذریعے بنایا جا رہا ہے اگرچہ اب بھی ان کی قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے اور سال بھر کے ڈیڑھ سو انجکشن کے کورس کی قیمت دس ہزار ڈالرس ہے۔ اسی لیے ان کا استعمال صرف امریکہ میں رائج ہے، جہاں انشورنس کمپنیاں ان اخراجات کو پورا کرتی ہیں۔ امریکہ میں ان ہارمونز کی افادیت کے پیش نظر، بعض کمپنیاں ان کی بڑی مقدار میں پیداوار کے لیے کوشش جاری رکھی ہوئی ہیں۔ اور ایسے بیکٹیریا کے دریافت کی کوشش جاری ہے جو کم خرچ پر ہارمونز تیار کریں تاکہ عام آدمی ان کو حاصل کر سکے۔

اگر ان کی پیداوار مستقبل قریب میں سستی اور زیادہ ہو بھی جاتی ہے تو ایک اور سوال باقی رہ جاتا ہے کہ یہ تشخیص کیسے کی جائے کہ کن بچوں کو ان کی ضرورت ہے چوں کہ ایسے بچوں کو جن کی نشو و نما نارمل کے لگ بھگ ہے انھیں ان ہارمونز کا استعمال کرانے سے قد میں غیر معمولی اور غیر ضروری اضافہ ہو سکتا ہے۔

مگر ایک بات ضرور مانی جا چکی ہے کہ مستقبل کے ماں باپ یقیناً اپنے بچوں کو ان ہارمونز کا استعمال کروانا پسند کریں گے تاکہ بچوں کی شخصیت میں خوبصورتی آئے۔ اور گروتھ ہارمونز ایسے ہی عام ہو جائیں گے جیسے آج وٹامن کی ٹکیاں ہیں۔ یا ٹرپل ویکسین ہیں۔ ساری دنیا میں والدین میں بچوں کو صحت مند اور توانا رکھنے کا شعور پیدا ہو رہا ہے جو بہت جلد بچوں کو قد آور دیکھنے کی خواہش کو جنم دے گا۔ چوں کہ یہ دنیا اور یہ زمانہ مقابلہ کا زمانہ ہے۔ گویا صرف اس بات کو منوانے کی ضرورت ہے کہ ان ہارمونز سے قد بڑھتا ہے اور ان سے کسی قسم کا کوئی نقصان یعنی ذیلی اثرات جسم یا دماغ پر مرتب نہیں ہوتے۔

اس کے بعد دوسرا اہم ٹیکنیکل سوال خوراک کی مقدار کا ہوگا۔ انگلستان، امریکہ، جاپان اور سوئٹزرلینڈ میں گروتھ ہارمونز کے استعمال کی آزمائش جاری ہے۔ اس میں کم قد کے بچوں کے دو گروپس بنائے جاتے ہیں۔ ایک گروپ کے بچوں کو چھ ماہ تک گروتھ ہارمونز دئے جاتے ہیں اور پھر موقوف کرکے دوسرے گروپ کے بچوں کو چھ ماہ تک دئے جاتے ہیں۔ اس طرح آن اینڈ آف ٹرائلس کے بعد دونوں گروپس کے بچوں کے قدوں میں بہتری کو جانچا جاتا ہے۔ اس طرح ہارمونز کی مقدار، استعمال کے عرصہ اور قد کے بڑھنے کی شرح میں تعلق کو باقاعدہ کیا جا سکے گا جو علاج میں بطور معیاد کے استعمال کیا جا سکے گا۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ برائے صحت اطفال و انسانی ترقی کے گورڈن کٹلر اس قسم کی تحقیقات میں Placebo کے استعمال پر زور دیتے ہیں۔ Placebo ایسی کیپسول یا ٹکیوں کا نام ہے جو صرف چاک سے بنی ہوئی ہیں اور جو اگرچہ دوا بھری کیپسول یا ٹکیوں سے مشابہ ہوتی ہیں۔ ان کو آزمائشی مریض یا والنٹیئر کو اصلی دوا والی ٹکیوں کے ساتھ ملاکر استعمال کروایا جاتا ہے تاکہ مریض یا والنٹیئر میں صرف دوا سے ہونے والے اثرات کا مشاہدہ کیا جا سکے۔

ایک پرانی حکایت ہے کہ ایک قیدی کے سامنے ایک پیالہ میں سے قاتل زہر گرایا گیا جس کو چاٹ کر ایک بلی مرگئی پھر چالاکی سے ویسے ہی پیالہ میں اُس قیدی کو غیر زہریلا شربت دیا گیا تو وہ پی کر مرگیا۔ اسی لیے Placebo کا استعمال کیا جاتا ہے کہ نفسیاتی اثرات کو زائل کیا جائے اور حقیقی اثرات سامنے آسکیں۔

کٹلر کہتے ہیں کہ بچوں کے دو گروپس میں سے ایک کو ہارمونز کے انجکشن دینے چاہئیں اور دوسرے گروپ کو صرف Placebo اور پھر قد بڑھنے کا مشاہدہ کرنا چاہیئے۔

کٹلر کہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں بچوڑی دینے بچوں کی مثال دینا غلطی ہے اس سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ یہ وہ بچے ہیں جن میں ہارمونز کی بڑی مقدار خارج ہوتی رہتی ہے اور یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ عمر کے کس حصہ میں ان ہارمونز کے اثر سے اُن کا قد بڑھتا ہے۔

موجودہ سہولتوں کی مدد سے بچہ کو دو سال کے ہونے تک یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں کہ وہ آئندہ کم قد ہوگا بلکہ اکثر صورتوں میں دس سال کی عمر تک بھی ایسا اندازہ کرنا ممکن نہیں ہے

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ہارمونز حاصل کرنے والے بچے جلدی جوان ہو جاتے ہیں اور اُن کی نشو و نما بھی وہیں رُک جاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہارمونز حاصل کرنے والے بچوں کی نشو و نما جلد ختم ہو جاتی ہے۔

کٹلر کہتے ہیں کہ ہفتہ میں تین انجکشن لینے والے بچوں کی نفسیات ان بچوں سے الگ ہوگی جو انجکشن نہیں لیتے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ دوسرے گروپ کو خالی انجکشن لگانے چاہئیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قد کے بڑھنے کو دماغ کنٹرول کرتا ہے۔ اصل میں دماغ کو پیام لے جانے والے یا وہاں سے لانے والے مرکب جنھیں Neuretransmitter کہتے ہیں۔ گروتھ ہارمونز کے اخراج پر کچھ نہ کچھ اثر کرتے ہیں۔ چنانچہ مصیبتوں میں رہنے والے بچے قد آور نہیں ہوتے پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ نفسیات کا اثر قد پر نہیں ہوتا یہ افسوسناک امر ہے کہ گروتھ ہارمونز پر

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

آپ سب کے لیے

عورتوں کے لیئے تعلیم

حکومت غیر تعلیم یافتہ عورتوں کو تعلیم دینے کے لیے ان علاقوں میں جہاں کہ عورتوں کا تعلیمی تناسب بہت کم ہے۔ نئے مراکز کھولنے پر غور کر رہی ہے تاکہ عورتوں کو خواندہ بنایا جاسکے۔ حکومت نے ریاستوں سے بھی کہا ہے کہ وہ تعلیم بالغان کا پروگرام تیزی سے چلائیں۔ تعلیم دینے کے پروگراموں میں شیڈولڈ کاسٹ اور سماج کے کمزور طبقے کی عورتوں پر خاص توجہ دی جا رہی ہے۔

عورتوں میں تعلیم پھیلانے کے لیے نجی اداروں کا تعاون حاصل کیا جا رہا ہے۔

چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے دوران یہ دیکھا گیا ہے کہ تعلیم بالغان کے پروگراموں سے فائدہ اُٹھانے والے ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ افراد میں ۹۸ لاکھ ۷۴ ہزار عورتیں تھیں۔ ۱۹۸۵ء میں ۷۰ لاکھ ۳۶ ہزار عورتوں نے تعلیم حاصل کی جو تعلیم حاصل کرنیوالوں کا تقریباً ۵۵ فیصد ہے۔

ساتویں منصوبے کے دوران اس پروگرام کے لیے ۱۳۰ کروڑ روپے منظور کیئے گئے۔ اُمید کی جارہی ہے کہ اس منصوبے کے دوران عورتوں کی ایک بڑی تعداد کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جاسکے گا۔

زینے دار کنویں: گجرات میں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں کے لوگوں کو پانی حاصل کرنے میں سخت دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اس دشواری سے بچنے کے لیے انھیں کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کرنا ضروری تھا۔ کنواں، جو پانی حاصل کرنے کا ایک آسان ذریعہ ہوتا ہے۔ یہاں بھی کھُدوایا گیا لیکن یہ کنواں عام کنوؤں سے مختلف تھا اور اس کا نام "زینہ دار کنواں" یا مقامی زبان میں "واو" رکھا گیا۔ یہ اپنے نام سے ہی ظاہر کرتا ہے کہ اس میں کنواں اور سیڑھی کا ہونا لازمی ہے۔ جی ہاں۔ پانی کی سطح تک پہونچنے کے لیے ان کنوؤں میں زینہ بھی بنوایا جاتا ہے۔

گرمی کے دِنوں میں گجرات میں تالاب اور جھیلیں سُوکھ جایا کرتی ہیں اور اس علاقے سے کوئی بڑی ندی بھی نہیں گزرتی ہے اور چھوٹی ندیاں برسات کے کچھ دنوں بعد ہی سُوکھ جایا کرتی ہیں۔ اس لیے صرف کنواں ہی پانی کا ایک واحد ذریعہ بچ رہتا ہے۔ لیکن پانی کی سطح اتنی نیچی ہوتی ہے کہ اسے باہر نکالنا بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے اور اس کام کے لیے بہت محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان مشکلوں پر قابو پانے کے لیے کنویں میں زینہ بنا دیا جاتا ہے۔ ایسے کنویں گجرات کے ہر علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی ترقی میں جین اور بودھ مذہب کا بھی اثر ہے۔ راستوں کے کنارے ایسے کنویں بنوانے میں بادشاہوں نے بھی

خاص دلچسپی لی تھی چونکہ گجرات میں پانی کی سطح بہت نیچی ہے اس لیے ایسے کنوئیں کی تعمیر، ترقی میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

گجرات میں ایسے زینہ دار کنوئیں بنوانے میں بادشاہوں کے ساتھ ہی ساتھ امیر و کبیر لوگوں نے بھی خاص حصہ لیا ہے۔ ان کنوؤں سے ہم نہ صرف صاف ستھرا اور ٹھنڈا پانی پاتے ہیں بلکہ جنگ کے زمانے میں اس میں چھپ بھی سکتے ہیں اور محفوظ بھی رہ سکتے ہیں۔ یہ کنوئیں جالی کی شکل میں ہوتے ہیں۔ ایسے کنوئیں کی تعمیر سطح زمین سے نیچے کی جاتی ہے۔ اس کے زینے عام زینے سے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ یہ بہت چوڑے ہوتے ہیں اور اونچائی بھی کم ہوا کرتی ہے۔ ہر چار یا پانچ زینے کے بعد ایک چوڑا زینہ بنایا جاتا ہے۔ تاکہ جانور اور انسان آسانی سے اوپر نیچے آجا سکے۔ لیکن کچھ ایسے بھی کنوئیں ہوتے ہیں جن کے زینے کی چوڑائی کم ہوتی ہے لیکن اونچائی بہت زیادہ ہوا کرتی ہے۔ ایسے کنوئیں گاؤں اور قصبوں میں بنائے جاتے ہیں۔ اس کے چاروں طرف جانوروں اور انسانوں کے آرام کے لیے درخت لگائے جاتے ہیں

خاص شاہراہوں پر ایسے زینہ دار کنوؤں کی تعمیر کروائی جاتی تھی جس میں سال بھر پانی رکھا جا سکے اور کنوئیں کے آس پاس زیر زمین کمرے بھی بنوائے جاتے تھے۔ آسانی سے اوپر نیچے جانے کے لیے کنوئیں کے دونوں طرف چکردار زینے بنوائے جاتے تھے اور اس کو کسی بادشاہ، رانی یا مشہور شخصیت کے نام سے منسوب کر دیا جاتا تھا۔ ان کنوؤں کی دیواریں، ستون سنگ تراشی اور نقاشی کے بہترین نمونے ہیں۔

ایسے کنوئیں گجرات میں چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور کچھ کا استعمال اب بھی کیا جاتا ہے۔ اس کی بناوٹ و نقش نگاری اب بھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

گجرات کے کنوئیں یہ ثابت کرتے ہیں کہ عام استعمال چیزوں سے بھی حسن کو ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ یہ کنوئیں اپنی سادگی ا حسن سے ہمیں اپنی طرف راغب کرتے ہیں۔

ٹرانسپورٹ کی ترقی

سڑکوں کے ذریعے نقل و حمل میں اضافہ ہوا ہے، اب موٹریں، ٹرک اور کاریں سڑکوں پر ہر طرف دوڑتی نظ آتی ہیں، ٹرکوں کے ذریعے سامان کی ڈھلائی میں م ملی ہے۔ سڑکوں کے ذریعے ٹرانسپورٹ کا نظام ا ریلوے نظام کا مقابلہ کرتا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں سڑکوں کے ذر نقل و حمل کا حصہ صرف گیارہ فیصد تھا اور مسافروں کو ادھر سے اُدھر لانے، لیجانے میں اس کا تناسب صرف ۳۶ فیصد تھا مگ اب یہ بڑھ گیا ہے۔ ۷۱-۱۹۷۰ء میں یہ بالترتیب ۳۴ فیصد اور ۶۰ فیصد ہو گیا۔ ٹرکوں کی تعداد میں ۶٫۸ فیصد اور بسوا کی تعداد میں ۴٫۵ فیصد اضافہ ہوا ہے، ساتویں منصوب میں یہ اضافہ ۸ فی صد سالانہ کے حساب سے ہوگا۔ ملک می ۵۷ ریاستی ٹرانسپورٹ کارپوریشنیں ہیں۔ جن میں سرکا زمرے کی کارپوریشنیں بھی شامل ہیں۔ یہ ہر روز ۴ کروڑ ۴ لاکھ مسافروں کو ادھر سے اُدھر لے جاتی ہیں۔

ہریانہ میں مرتھل کے مقام پر اور پنجاب میں جالندھ کے پاس کوٹ کلاں میں ٹرک پارکنگ کمپلکس تعمیر کئے گئے ہیں بس کے مسافروں کے لیے سہولتیں فراہم کرنے کے ل ضروری قدم اٹھائے جا رہے ہیں، سو سو کلو میٹر کے فاصلے ریستوراں، ٹائلٹ، ٹیلی فون اور مرمت وغیرہ کی سہولتیں دی جائیں گی۔

قارئین کی آراء اور مشورے

● یوجنا کا رنگ روپ برابر نکھرتا جارہا ہے، نئی تبدیلیوں اور آپکی کوششوں سے اُردو کا ایک معیاری رسالہ بن گیا ہے جس سے نہ صرف شائقین ادب اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں بلکہ طلبا اور نوجوان اپنی معلومات میں اضافہ کر سکتے ہیں، خدا کرے کہ یہ رسالہ برابر ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے۔

تسنیم فاطمہ، ایم۔ اے
محلہ ہرناتھ پورہ، سہارنپور۔

● بندھوا مزدوری سے متعلق خصوصی شمارہ دیکھا، آپ کی کوششیں لائقِ تحسین ہیں، یوجنا نے سماجی ومعاشرتی معلومات فراہم کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، وہ برابر آگے بڑھنا چاہیئے، اس سے قوم و وطن کے نوجوانوں کی تعمیر میں مدد ملے گی، ادبی حصہ بھی خوب ہے، اس میں نظموں کا حصہ مزید توجہ کا محتاج ہے۔

سید مشیر رضوی
اورینٹ بک ڈپو، پلٹن بازار، دہرہ دون۔

● یوجنا کا پرچہ اکثر زیر مطالعہ رہتا ہے، اس کے کور میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے، اگرچہ رنگ بدل دیے جاتے ہیں لیکن اچھا یہی ہے کہ اس کا کور دیدہ زیب بنایا جائے۔ مشمولات کے اعتبار سے یہ کافی جاندار رسالہ ہے، اس میں صحت، طب، ادب، شخصیات، نظمیں، غزلیں، سبھی کچھ سمونے کی کوشش کی گئی ہے، بحیثیت مجموعی یہ رسالہ ترقی کی طرف گامزن ہے، خدا کرے کہ یہ اور ترقی کرتا رہے

محمد ایوب
بیکری روڈ، کلکتہ، ۷۰۰۰۲۲۔

● یوجنا (اردو) کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا، سرورق دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔ مضامین اور دیگر مندرجات بھی کافی معلومات آفریں اور بصیرت افروز ہیں۔ مستند قلمکاروں کے ساتھ آپ نئی نسل کی بھی ہمت افزائی کرتے ہیں، آپ کی فراخدلی اور وسعت نظری قابلِ صد ستائش ہے!

اظہر منیر دربھنگوی
ایس/ایک۔ اسٹریٹ۔ ۲۴، سیکٹر۔ ۶
بھلائی نگر۔ (ایم۔ پی) ۴۹۰۰۰۶۔

● یوجنا ملک ومعاشرے کی فلاح وبہبود کی قابلِ قدر معلومات فراہم کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے، خدا کرے کہ یہ اسی طرح اپنے مقصد میں کامیاب وکامراں رہے!

روشن لال روشن بنارسی
ڈی۔ ۲۱/۴۷ اے، راجا پورہ، وارانسی،
(یو پی) ۲۲۱۰۰۱

● حکومت کی جانب سے نکلنے والے اردو رسالوں میں اگر معلوماتی رسالہ کسی کو کہہ سکتے ہیں تو وہ یوجنا ہی ہے۔ اس کے مطالعے سے نہ ہمیں صرف حکومت کے پروگراموں کے بارے میں جانکاری ملتی ہے بلکہ ادب کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ خواہ وہ آٹے میں نمک کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے مضامین مختلف النوع ہیں جس سے ملک کے بہت سے لوگ اپنے اپنے ذوق کے مطابق فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مس سیر سلطانہ
کیو ۲۸۰، مدیالی روڈ۔ کلکتہ ۲۴۔

● رسالہ نظر نواز ہوا۔ غیر ادبی رسالوں میں ایک بہترین رسالہ ہے۔ ادبی حصہ اگر بڑھایا جائے تو بہتر ہوگا۔ اُمید ہے اس طرف آپ لوگ توجہ مبذول کریں گے۔ آمین۔

شیخ محمد علی
ٹاؤن سول بوکارو تھرمل، گریہڈیہ ۸۲۹۱۰۷۔

● یوجنا (اُردو) کا تازہ شمارہ نظر سے گزرا حسب معمول بہتر ہی ہے۔ اس میں ایک نیا سلسلہ کھیل کود پر دیکھنے کو ملا۔ کیا حکومت کھیل کود کے لیے منصوبے نہیں بناتی۔ اگر بناتی ہے تو اس کی روداد یوجنا میں ضرور شامل ہونی چاہیئے۔

محمد جہانگیر
عمر منزل۔ سورت

● یوجنا کا بندھوا مزدور نمبر دیکھا۔ اس میں بندھوا مزدوروں کی حالتِ زار کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے، وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ آپ کی محنت اور حق گوئی کے لیے آپ کے ادارے کو داد دیتا ہوں۔ اور اس رسالے کی کامیابی کے لیے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

ذاکر حسین
محلہ رضواں۔ آرہ (بہار)۔

●

بقیہ، دربھنگہ ضلع میں بیس نکاتی پروگرام کا جائزہ

۷۔ ٹرک ۱,۵۰,۰۰۰
۸۔ چھوٹی دوکان کے لیے ۵,۰۰۰
۹۔ لاؤنڈری ۱,۵۰۰
۱۰۔ بُنائی مشین ۳,۰۰۰

I.R.D.P. کے ذریعے دیے جانے والے اعداد و شمار

Sector,	No. of unit	Total Outly	Subsidy	Credit Campenent
ایگریکلچر اور اس سے منسلک کام	۸,۰۰۲	۳۰,۸۷۳	۱,۲۱۸۳	۱۸۶۹۰
انڈسٹریز	۵۵۴۲	۱۲۳۶۲	۴۹۷۶	۷۳۸۶
دوسرے کام کے لیے	۶۰۰۹	۲۰۹۴۴	۸۰۶۱	۱۲۸۸۳
	۱۹۵۵۳	۶۴۱۷۹	۲۵۲۲۰	۳۸۹۵۹

جیسا کہ اوپر کی ٹیبل سے ظاہر ہوتا ہے ۳۸۹,۵۹ لاکھ روپے ۱۹۵۵۳ یونٹ پر خرچ کیا جائے گا جس سے کہ ۱۰۵۷۲ آئی۔آر۔ڈی۔پی فیملی کو فائدہ پہونچے گا۔ دوسرے مرحلہ میں ۶۶۱ فیملی کو دوبارہ مدد کی جائے گی۔ ساتھ ہی ساتھ ۲۲۰ نئی فیملی کو بھی مدد کی جائیگی ایک محتاط تخمینہ کے مطابق اس طرح آئی۔آر۔ڈی۔پی فیملی کی پونجی ...۶ تک ۱۹۸۶ء کے آخر تک ہو جائے گی۔

یہ تمام کام تیزی سے ہو رہا ہے مگر ضرورت اس میں اور بھی تیزی لانے کی ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب لوگ خود بیدار رہیں اور

(بقیہ دوسرے کالم میں)

اُن کی معلومات میں اضافہ ہو۔ اُن کی معلومات بڑھانے اور بیداری پیدا کرنے کے لیے۔ ہم لوگ ریڈیو، ٹی۔وی اور دوسرے ذرائع کو کام میں لا سکتے ہیں۔ ●

بقیہ، ترقیاتی پروگراموں میں اقلیتوں کی شرکت

کا اہتمام کیا گیا ہے۔ پروگرام میں اقلیتی تعلیمی اداروں کو تسلیم کرنے کے لیے واضح رہنما خطوط مرتب کرنے اور زیر غور درخواستوں کو وقت پر نپٹانے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

ترقیاتی پروگراموں میں اقلیتوں کا حصہ

ریاستی حکومتوں اور مرکزی وزارتوں سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتی گروپوں میں سے ٹیچروں، ڈاکٹروں اور وکیلوں وغیرہ کے لیے قلیل مدتی معلوماتی پروگراموں کا اہتمام کریں تاکہ اُن میں ترقیاتی پروگراموں کے بارے میں جانکاری پیدا ہو خصوصاً ایسے پروگراموں کے بارے میں جن میں حلقے کے لوگ تعلیم، بچوں اور عورتوں کی بہبود اور صحت وغیرہ کے شعبوں میں شرکت کرتے ہیں۔ بالخصوص قومی ملکیت کے بینکوں کی جانب سے نجی روزگار کے لیے مالی امداد کی اسکیموں، خواتین اور بچوں کی بہبود کی اسکیموں، ہینڈلوم اور دستکاریوں کی ترقی کی اسکیموں، ہاؤسنگ اسکیموں، خوراک کو محفوظ رکھنے، صحت صفائی اور صفائیت، تعلیم بالغان اور بچپن کی ابتدائی تعلیم مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام "این آر ای پی" اور "ٹرائسم" وغیرہ کے لیے معلوماتی پروگراموں کا سمجھاؤ دیا گیا ہے۔

الیکٹرانکس، اسٹیٹسٹکس (Statis-tics) (کمپیوٹر کے بارے میں)، توانائی کے غیر مروجہ وسائل، ماحولیاتی کنٹرول، بحری ترقیات، اور خلائی تحقیق کے مرکزی محکموں سے بھی استدعا کی گئی ہے کہ وہ ان شعبوں میں ٹیکنالوجی کی تازہ ترین ترقیوں سے پسماندہ اقلیتی گروپوں کو روشناس کرائیں۔

ریسرچ یونٹ

تمام ریاستی حکومتوں سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً جانچ پڑتال کرنے کے لیے ریسرچ یونٹ قائم کریں۔ وہ چھان بین کریں کہ اقلیتوں تک ترقیاتی پروگراموں کے فوائد منصفانہ اور کافی حد تک پہونچتے ہیں اور وہ اقلیتوں کے دیگر اہم مسائل کی تحقیق کریں۔ چند ریاستوں میں ایسے ریسرچ یونٹ قائم ہو چکے ہیں۔ راجستھان اور کرناٹک نے موجودہ پلان کا جائزہ لینے والی اپنی مشینری کے ذریعہ یہ دیکھنے کے لیے فیصلہ کیا ہے کہ ترقیاتی پروگراموں کے فوائد اقلیتوں تک پہونچ رہے ہیں۔ دیگر ریاستوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ایسے ریسرچ یونٹ قائم کرنے کے لیے تیزی سے کام کریں۔ ●

بقیہ، قد بڑھانے والے ہارمونز

تحقیقات مختلف لائسنسوں اور اجازت ناموں کی وجہ سے رُکی ہوئی ہے اور اس بات کا امکان ہے کہ ان کا استعمال اس کے بغیر ہی شروع ہو جائیگا اور لوگ ان کے نقصانات کے بارے میں سوچے بغیر ان کو استعمال کر رہے ہیں اور مستقبل میں بہت زیادہ استعمال کریں گے۔ ●

چترنجن لوکوموٹیو

چترنجن لوکوموٹیو کا کارخانہ ۱۹۵۰ء میں بھاپ سے چلنے والے انجن تیار کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا لیکن اب وہاں بجلی سے چلنے والے انجن تیار کیے جا رہے ہیں۔ دیش بندھو چترنجن داس جی کے نام سے یہ کارخانہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کارخانہ کو ملک کی ترقیاتی سرگرمیوں میں تعاون دینے کے لیے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔

آج کل اس کارخانے میں ہر سال ۵۴ ڈیزل کے اور ۵۰ بجلی کے انجن تیار کیے جا رہے ہیں۔

چترنجن لوکوموٹیو نے جنوری ۱۹۵۰ء میں بھاپ سے چلنے والے انجن تیار کرنے شروع کیے تھے حالاں کہ ان میں سے پہلا انجن یکم نومبر ۱۹۵۰ء کو تیار ہو گیا تھا۔ اسی روز اس کارخانے کا نام دیش بندھو چترنجن داس کے نام سے رکھا گیا۔ کارخانے میں بھاپ سے چلنے والا آخری انجن ۱۹۷۲ء میں تیار ہوا۔ یہ کارخانہ بھاپ سے چلنے والے ۲۳۵۱ انجن تیار کر چکا ہے۔

ڈیزل سے چلنے والے شنٹنگ انجن کی ساخت ۱۹۶۸ء میں شروع ہوئی۔

چترنجن کے کارخانے میں بجلی سے چلنے والے انجن تیار کرنے کی صلاحیت ۱۹۶۱ء میں نصب کر دی گئی تھی۔

کارخانے میں ڈیزل اور بجلی سے چلنے والے انجنوں کی ساخت کے لیے درکار مختلف اقسام کا سازوسامان اور حصے پرزے تیار کرنے کی تمام سہولیات موجود ہیں۔ بجلی کے انجن تیار کرنے کی کارگاہ آدھا کلومیٹر لمبی ہے۔ اس کارگاہ میں ہر ماہ ۴۰ سے ۵۰ موٹریں تیار ہوتی ہیں۔ مئی ۱۹۸۶ء میں اس کارگاہ نے ۵۹ موٹریں تیار کر کے سابقہ ریکارڈ مات کر دیے۔ اس کارخانے میں فولاد کی ڈھلائی، لوہے کی ڈھلائی کے بھٹیاں، ڈیزل انجن تیار کرنے کی کارگاہ، کھینچائی کرنے والی موٹروں کی ورکشاپ، سامان سازو سامان کی تیاری کی ورکشاپ، بجلی اور ڈیزل کا انجن جوڑنے کی ورکشاپ شامل ہیں۔ یہ تمام تر پیداواری صلاحیت ۲۴ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری سے قائم کی گئی ہے جس میں رہائشی بستی اور ذیلی خدمتیں بھی شامل ہیں۔ کارخانے کی منقولہ جائداد کی مالیت ۳۶ کروڑ روپے ہے۔

کارخانے میں تیار ہونے والے بجلی کے انجنوں کی تعداد ۵۰ سے بڑھا کر ۸۹-۱۹۸۸ء میں ۱۰۰ کر دینے کی تجویز ہے جبکہ ڈیزل انجنوں کی پیداوار ۴۵ فی سال برقرار رکھی جائے گی۔

ریلوے بورڈ ساتویں پنجسالہ منصوبے کے دوران بجلی سے چلنے والے ۵۰۰ انجن تیار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ریلوے لائنوں میں بجلی لگانے کے بتدریج عمل کے ساتھ ساتھ اس کارخانے میں ایک اور اسکیم پر بھی عمل کیا جا رہا ہے جس کے تحت ۵ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے کے مصارف سے کارخانے میں انجنوں کی تیاری کی سالانہ صلاحیت بڑھا کر ۸۰ کر دی جائے گی۔

کارخانے میں گاڑیاں کھینچنے والی ٹی۔ اے۔ او ۶۵۹ قسم کی موٹریں تیار کرنے کا کام مرحلہ وار ختم کر دینے کی تجویز ہے۔ ان کی جگہ جاپان کی فرم ہٹاچی کے تعاون سے آئندہ ۱۸ ماہ کے اندر اندر زیادہ صلاحیت والی موٹروں کی تیاری شروع کر دی جائے گی۔ شروع میں ہر سال ایسی ۵۰ موٹریں تیار کی جائیں گی۔

چترنجن لوکوموٹیو کارخانے کی جدید کاری کے لیے ۱۷ کروڑ روپے کے ایک منصوبے کے لیے عالمی بینک سرمایہ دے رہا ہے جس میں سے ۹،۷ کروڑ روپیہ مارچ ۱۹۸۶ء تک خرچ کیا جا چکا ہے۔

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

Vol. 7 No. 7-8 YOJANA (URDU) 1-31 July, 1987

حمید آرموری ∆

درخت
ملک کی قدرتی دولت

درخت انسان کے لیے کس قدر اہمیت رکھتے ہیں اس کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ انسان درختوں کے بغیر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ درخت فضا میں آکسیجن چھوڑتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ انسان کی کئی طرح خدمت کرتے اور اس کے کام آتے ہیں مثال کے طور پر درختوں کی بدولت ہی بارش زیادہ ہوتی ہے۔ درخت آلودگی کو کم کرتے ہیں۔ پاک صاف آب وہوا کا دارومدار بھی درختوں پر ہی ہے۔ درختوں کی کمی و بیشی سے موسموں میں تغیرات رونما ہوتے ہیں ماحول کے توازن کی برقراری و استحکام میں بھی درخت مددگار و معاون ہوتے ہیں۔ زمین کی زرخیزی کے لیے بھی درختوں کا وجود لازمی ہے۔ ان کی وجہ سے کھیت تروتازہ رہتے ہیں یہ ندی، نالے، دریاؤں اور جھرنوں کو پانی مہیا کرتے ہیں۔ زرعی فصلوں کو پالے سے بچانے کے لیے چھتری کا کام کرتے ہیں۔ تند بارش میں درختوں کی جڑیں مٹی کے بہاؤ (EROSION) کو روکتی ہیں۔ درخت سیلاب کے زور کو توڑتے اور زمین کے کٹاؤ کو روکتے ہیں۔ یہ تعمیرات، دفاع و مواصلات اور دیگر صنعتوں کے لیے خام مال فراہم کرتے ہیں۔ ان سے جلانے کی لکڑی بھی حاصل ہوتی ہے۔ ایندھن کے علاوہ گوند کی کانیں بھی درختوں کی دین ہے۔ درخت پھل، پھول تو دیتے ہی ہیں مگر اہم جڑی بوٹیوں کا وجود بھی ان ہی کے دم سے قائم ہے

درخت نہ صرف انسان کے کام آتے ہیں بلکہ جانوروں اور پرندوں کی زندگی کا انحصار بھی ان ہی پر ہے۔ کیوں کہ جنگلی جانور اور پرندے اپنی بود و باش کے لیے جنگلوں اور درختوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ مویشیوں کے لیے چارہ اور خوراک بھی درختوں سے حاصل ہوتا ہے۔ درختوں کے سائے میں جنگلی جانور آرام کرتے ہیں۔ بہرحال درخت قدرت کا ایک انمول عطیہ ہے۔ اور سچ پوچھئے تو اس کے ایک ایک پتّے پر ایک ایک صحیفہ لکھا ہوا ہے ؎

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

بقول شخصے درخت واعظ، شاعر، خدمت گار اور محسن بھی ہیں۔ مگر اس راز کو سمجھنے کے لیے بصیرت اور چشمِ بینا چاہیئے۔ ہمارے بزرگوں کو درختوں کی افادیت اور ان کی اہمیت کا بخوبی اندازہ تھا تب ہی تو انھوں نے جنگلات کو "دریاؤں کی ماں" کا لقب دیا ہے۔ ایک سنت نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "ایک درخت دس لڑکوں کے برابر ہے۔" (A TREE IS EQUAL TO TEN SONS)

سائنس والوں نے بھی درختوں کی اہمیت کو جتانے کے لیے انھیں "سبز سونا" (GREEN GOLD) کہا ہے اور ہمارا ملک اس قدرتی دولت سے مالا مال ہے۔ یہاں ہمہ اقسام کے درخت پائے جاتے ہیں۔ ان میں آرائشی اشجار بھی ہیں اور میوہ دار درخت بھی۔ بعض درختوں کو تقدس کا درجہ بھی حاصل ہے۔ مثلاً آم، پیپل، برگد (بڑ) اور تلسی وغیرہ۔ غرض درخت ملک کی قدرتی دولت ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم عوام پر اس بات کی وضاحت کریں کہ درخت انسان کی بقا کے لیے کس قدر ضروری ہے۔ اور جنگلات جو ہماری قومی دولت ہے۔ اس کی حفاظت ہمارا فرض ہی نہیں بلکہ ہماری ضرورت اور وقت کا اہم تقاضہ ہے۔ ●

∆ اسپیشل گریڈ سکریٹری، اگری کلچرل مارکیٹ کمیٹی، کھمم (اے۔پی)

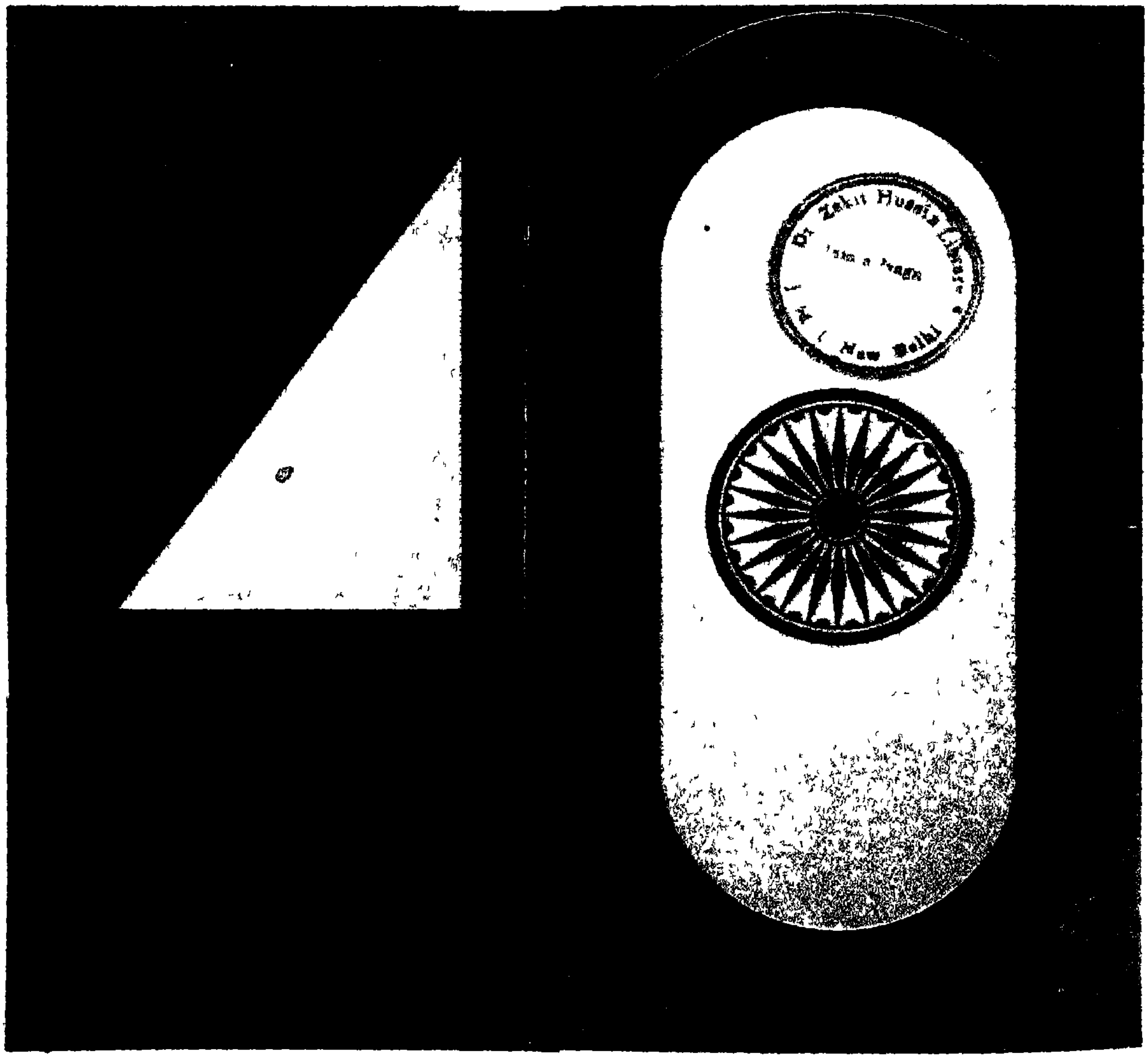
Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadurshah Zafar Marg, New Delhi-110002.

خصوصی شمارہ ۱۵ اگست ۱۹۸۷ء

یوجنا

جلد، ۷
شمارہ، ۹، ۱۰
قیمت، ۲ روپے

ترقی کے چالیس سال



ہمیں منصوبہ بند اقتصادی ترقی کے راستے پر قدم رکھے ہوئے تقریباً ۴۰ برس ہو چکے ہیں، اس عرصے میں منصوبہ بندی کا عمل جڑیں پکڑ چکا ہے اور اس نے جدید دھارے کے رخ پر آگے بڑھنا شروع کر دیا ہے، چنانچہ اب یہ ہمارے قومی نظام کا ایک جزو لازم بنتا چلا ہے۔ اس نے غربت دور کرنے اور معیشت کو ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر آگے بڑھانے کے بنیادی مقاصد کے تعین، پالیسیوں کو مرتب کرنے کے لیے قومی سطح پر اتفاق رائے کے ارتقاء میں مدد دی ہے، اس کی مدد سے ایسا سماجی نظام قائم ہو سکا جو انصاف اور مساوات کے اصولوں پر قائم ہے۔ منصوبے میں آئندہ پانچ برسوں میں ہمارے اُن اغراض و مقاصد اور ترجیحات کی وضاحت کی گئی ہے جو اقتصادی اور سماجی ترقی کے طویل المدتی پیش منظر میں قائم کی گئی ہیں، یہ ہمارے عوام کی اجتماعی آرزوؤں اور اُمنگوں کا مظہر ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس سے سرکار کے عزم کی عکاسی ہوتی ہے جس کے مطابق مرادت شدہ مقاصد اور نشانے پورے کئے جاتے ہیں۔

(وزیراعظم کے پیش لفظ کا ایک اقتباس جو ساتویں منصوبے
کی دستاویز میں درج ہے)

خصوصی شمارہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر۔ سیّد ظفر الحسن
ایڈیٹر۔ جگندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹر محمّد عادل صدّیقی
سب ایڈیٹرز وسیم حیدر
[illegible] الحمید

جلد ۷ | شمارہ ۹، ۱۰ | یکم تا ۳۱ اگست ۱۹۸۷ء | [illegible] درشک ۹ - ۱۹ | قیمت: دو روپے۔ ٹیلیفون ۶۰۱۸۱۸

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، دوسالہ ۳۶ روپے
سہ سالہ ۴۸ روپے، فی کاپی دو روپے
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں
کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت۔

اس شمارے میں

اداریہ (باقی ہے ابھی کوسوں کا سفر) سیّد ظفر الحسن ۲
اس شمارے میں اظہارِ خیال کرنے والی شخصیتیں اور ان کا مختصر تعارف ۴
معاشیات: نشو و نما، ترقی اور پیش رفت ڈاکٹر بھابا توش دتا ۵
بھارتی معیشت کے ۴۰ سال ڈاکٹر مالکم ایس ادی سیشیہ ۱۱
آزاد ہندوستان میں صنعتی ترقی عابد حسین ۱۶
چھٹا معجزہ ڈی ایچ پائی پانڈیکر ۲۵
سائنس اور ٹیکنالوجی:
بحری سائنس اور ٹیکنالوجی ڈاکٹر ایس زیڈ قاسم ۳۱
کیا ہم اور بھی اچھا کام کر سکتے تھے؟ پی جے لوکرے ۳۹
ٹیلی کمیونی کیشن — ملک کی ہمہ گیر ترقی میں معاون ٹی ایم کھنہ ۴۵
تعلیم: آزادی کے بعد تعلیمی ترقی ڈاکٹر پریم کرپال ۴۹
تعلیم، ترقی کے لیے اہم سرمایہ کاری کے کے کھلر ۵۵
زراعت: ہندوستانی زراعت ڈاکٹر این ایس رندھاوا ۶۷
زراعت کی متوازن ترقی ڈاکٹر ٹی بی بھٹاچاریہ ۷۳
سیلاب پر کنٹرول کی پالیسیاں کامیابیاں اور چنوتیاں ڈاکٹر کامتا پرساد ۷۸
میڈیا:
میڈیا کو آزاد کرانے کی ضرورت رومیش تھاپر ۸۲
حصولِ آزادی کے بعد میڈیا کے بڑھتے قدم این وی کے مورتی ۸۹
میڈیا — ملے جلے منظر کی عکاسی ایس سی بھٹ ۹۶
ہم ایک رہیں گے (نظم) محبوب راہی ۱۰۲
نظم رزاق دل گھولاپوری ۱۰۳

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر یوجنا (اردو)، پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر کے پورم (مین)
نئی دہلی

● اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر. ایس منجال

ترسیلِ زر کا پتہ بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

● یوجنا منصوبہ بندی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے — مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں رہتے۔

اداریہ

باقی ہے ابھی کوسوں کا سفر

ترقی تبدیلِ مسلسل کا نام ہے، یہ ایک ایسا عمل ہے جو مسلسل جاری رہنے والا ہے، اور اس کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ مختلف عناصر سے جڑا ہوا ہے، اس لحاظ سے یہ غیر جانبدار نہیں بلکہ ایک اضافی عمل ہے۔ اس کی ایسی کوئی منزل نہیں جہاں یہ اعلان کردیا جائے کہ مطلوبہ نشانہ مکمل کرلیا گیا ہے اور اب اس سے آگے جانے کی نہ کوئی گنجائش باقی ہے اور نہ ضرورت۔ اس طرح ترقی عمل اور ردِ عمل کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ زندگی کے ہر مرحلے میں ترقی اور پیش رفت سے نئے نئے افق روشن ہوتے ہیں اور ایسے بہت سے دیگر امکانات معرضِ وجود میں آنے لگتے ہیں جن کی تعداد گنوائی نہیں جا سکتی۔ زندگی اپنے خلوص میں مختلف النوع پہلو رکھتی ہے، انسان کی پہلو دار شخصیت کی ترقی بھی کثیر الجہت ہے۔ چنانچہ ترقی کی سمتیں بھی انسانی شخصیت کی طرح سے ہی پہلو دار ہیں۔ اسے چند منتخبہ شعبوں اور چند محدود گوشوں تک ہی محصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تعلق سماج کے چند منتخبہ طبقات تک ہی محدود نہیں رہ جاتا، بلاشبہ ترقی کا عمل سماجی کایا پلٹ کا انتہائی موثر ذریعہ ہے، لہذا اس کے نتیجے میں ہونے والے فائدوں سے سماج کے سبھی طبقوں کا بھلا ہونا چاہیئے۔ یہ ایک ایسا سایہ دار درخت ہے، جس کا پھیلاؤ کسی ایک حصّے تک ہی محدود نہیں ہوگا بلکہ یہ سماج کے سبھی طبقوں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لے گا۔

اس سال ۱۵ اگست کو ہم اپنی آزادی کے چالیس برس مکمل کر رہے ہیں، گویا کہ غیر ملکی اقتدار سے نجات پائے ہوئے ہمیں [illegible] بیت چکے ہیں، اس عرصہ میں اگرچہ آہستہ آہستہ تاہم مستعدی کے ساتھ ہم نے منصوبہ بندی کی راہوں پر قدم بڑھائے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے اور اس حقیقت سے وہ لوگ بھی منکر نہیں ہو سکتے جو ہمیشہ سخت سے سخت تنقید کرنے کے عادی ہیں۔ کوئی بھی گوشہ لے لیجئے، زراعت سے لے کر صنعتی پیداوار تک سبھی جگہ جدید طریقوں کی روشنی میں اور سائنسی انداز نظر سے کام لیتے ہوئے ترقی نمایاں ہے، اعداد و شمار کی روشنی میں اس کے واضح ثبوت ملتے ہیں، اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کی جانی چاہیئے کہ ترقی کی یہ سطح سخت قسم کے اندرونی خلفشار اور ٹھوس قسم کے بیرونی دباؤ کی موجودگی میں حاصل کی جا سکی، جن سے ملک کو گاہے گاہے سابقہ پڑتا رہا۔ اس عرصہ میں آبادی کا فرد استاریہ بھی بھیانک روپ سے بڑھتا رہا جس نے ہماری ترقیاتی کوششوں کو بے اثر اور اس کی تیزی کو کُند بنا دیا۔ انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اس سمندر کو ساتھ لے کر ترقی کے راستے پر آگے بڑھنا اور خاص کر جمہوری طریقوں سے کام لے کر اس عمل کو آگے بڑھانا، ایک مشکل ترین کام ہے۔ ہندوستان کی کامیابیوں پر نظر دوڑاتے ہوئے ہم اکثر ایسے دوسرے چھوٹے ترقی پذیر ملکوں کی طرف جھک جاتے ہیں اور ان کی دلفریبیوں پر ریجھ جاتے ہیں جن کی معیشت بلاشبہ بہتر طور پر مستحکم ہو سکی ہے، لیکن اس مطالعے کے دوران یہ بنیادی حقیقت نظر انداز کردی جاتی ہے کہ ان ملکوں کے سامنے ایسے چیلنج،

اور خطرناک نیز پیچیدہ مسائل نہیں رہے ہیں جیسے کہ ہمارے ملک میں ہیں۔ ہمارے ملک میں ابھی تک بھی یہ سنگین مسائل اور رکاوٹیں موجود ہیں، ہمارے ملک کی گوناگونی، بوقلمونی، یہاں کی بے پناہ آبادی، یہاں کی وسعت اور ایسے ہی دیگر مسائل کی موجودگی میں یہ ترقی عمل میں آسکی ہے جو اپنی جگہ ایک عظیم کارنامہ ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ ان ترقی یافتہ ملکوں کو مصائب اور آلام سے سابقہ نہیں پڑا لیکن ہمارا معاملہ تو ان سے قطعی جدا ہے اس لیے اس طرح کے تقابلی مطالعے کا جواز ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہندوستان ایسے وسیع و عریض ملک کے ضمن میں ۴۰ سال کا عرصہ کوئی بڑا عرصہ نہیں ہے لیکن اس مختصر سے عرصے میں سائنس اور ٹیکنالوجی میں زبردست ترقیات دیکھنے کو ملیں، عالمی سیاست کے چہرے مہرے میں زبردست تبدیلی آئی، نئی عالمی تحریکوں نے جنم لیا، اس لحاظ سے یہ ۴۰ برس ہمارے لیے بڑا اہم ہیں۔ جس وقت ہمارے ملک پر یونین جیک کے بدلے ترنگا لہرایا، اس وقت ہمارا ملک منقسم ہو چکا تھا، ملک تقسیم کی شکست و ریخت سے دوچار تھا، چنانچہ اس کے بعد کے حالات مظہر ہیں کہ ہمیں غیر ملکی حکمرانوں کی طرف سے تقریباً دو صدی تک نفاق کے بوئے گئے بیجوں سے اُگنے والی فصل کو کاٹنا پڑا۔ حصولِ آزادی کے وقت ملکی حالات ایسے نہ تھے کہ ہم ان سے مطمئن ہو جاتے یا جو ہماری جوت میں اضافہ کرتے، اس دور کی تلخ یادیں ابھی تک بھی ہمارے ایسے لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہوں گی، ان حالات سے گزر کر ہم نے عالمی اقوام میں اپنا سر بلند رکھا تو اس کا سہرا ہمارے مدبروں اور منصوبہ بندی کے ماہروں کی بصیرت اور دور اندیشی کے سر جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ ہمارے عوام کا جمہوری اقدار میں غیر متزلزل یقین، ہمارے کسانوں کی انتھک محنتیں اور کوششیں، ہمارے محنت کش طبقے اور ہمارے قوم کی پُرعزم زندگی تھی جس نے ہمیں اقوامِ عالم میں سربلند رکھا، ممکن ہے کہ ہم خود کو اپنے لفظوں میں قابلِ رشک نہ گردانیں، لیکن بہت سے دوسرے ہیں جن میں ہمارے پڑوسی بھی شامل ہیں، جو ہماری ترقی پر رشک کرتے ہیں۔

یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کو اس میں کیوں مزہ آتا ہے کہ وہ ہماری ناکامیوں کو اچھالیں اور ہماری کامیابیوں پر پردہ ڈالیں یا ان کی اہمیت گھٹائیں، حالانکہ وہ تعلیم یافتہ ہیں، پوری طرح باخبر ہیں اور معقولیت پسند بھی ہیں لیکن ان کے اس جذبے کے درپردہ محرکات ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ کامیابی پر مطمئن ہونا اور کوششوں میں ڈھیل دینا یا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا تعطل اور جمود کی نشانی ہے۔ آج دنیا میں ہر طرف مقابلہ ہے، مسابقت کا جذبہ ہے، ترقی ہر طرف تیزی سے اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ ایسی صورت میں ایک منٹ کی یا ایک لمحہ کی غفلت بھی نہیں برتی جا سکتی اور ہم کسی بھی طرح اپنی کامیابیوں پر مطمئن ہو کر آگے بڑھنے کی اپنی کوششوں میں ڈھیل نہیں دے سکتے، بلاشبہ اس سلسلے میں بہت کچھ ہوا ہے لیکن بہت کچھ کرنا باقی ہے اور جو کچھ کرنا ہے، اس کی اہمیت اور ضرورت کو ایک لمحہ کے لیے بھی نظرانداز نہیں کرنا ہے۔ تبدیلی کی ہوائیں برق رفتاری سے چل رہی ہیں اور ہمیں پورے وثوق اور عزم و ارادے کے ساتھ آگے بڑھنا ہے، ہمارے ملک میں شہری اور دیہی علاقوں میں جوانوں کی شرح بڑھ رہی ہے اور مواصلاتی نظام تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔ اسی لیے آج ہمارے عوام اپنے حقوق سے پہلے کے مقابلے کہیں زیادہ باخبر ہیں، اب جو صورتِ حال ہے، وہ ۲۵ سال پہلے کی صورتِ حال سے قطعی مختلف ہے۔ عوام کی آرزوؤں اور امنگوں کا دامن آج پہلے کے مقابلے کہیں زیادہ وسیع ہے، ہم نے ان سے جو وعدے کئے ہیں، انہیں عملی شکل میں لانا ہے۔

ایسا تبھی ہو سکتا ہے جبکہ ہم حقیقی ترقی کے کار کے لیے مخلص ہوں اور تندہی اور لگن کے ساتھ کام کریں۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی ہے کہ خلوص زندگی میں اپنا اثر دکھاتا ہے، لیکن ہمیں اس کی قیمت کی ادائیگی بینک کرنی ہے ہر سال ۱۵ راگست کو ہم بہت سے عہد و پیمان کرتے ہیں لیکن ان کی مثال کیلنڈر کے ان ماہوں کی طرح سے ہونی چاہئے جن میں صرف تاریخ اور رقم بدلتی ہوتی ہے۔ اور باقی مواد جوں کا توں رہتا ہے، گزشتہ ۴۰ برسوں میں ہم نے زندگی کے سبھی شعبوں میں تعمیری اعتبار سے نمایاں ترقی کی ہے۔ غالباً ہماری کامیابیوں کا پلڑا اور بھی بھاری ہوتا اگر انتشار پسندانہ اور سماجی استحکام کو کمزور کرنے والی قوتوں نے ترقی کے راستے میں اڑچنیں نہ ڈالی ہوتیں، ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہم نے کافی فاصلہ طے کر لیا ہے لیکن ابھی ہماری منزل دور ہے اور ہمیں کوسوں کا سفر طے کرنا ہے۔

(چیف ایڈیٹر)

اس شمارے میں اظہارِ خیال کرنیوالی شخصیتیں اور ان کا مختصر تعارف

ڈاکٹر بھابھاتوش دتا	معاشیات کے سابق پروفیسر پریزیڈنسی کالج، کلکتہ۔
ڈاکٹر مالکم ایس ادی سیشیہ	چیئرمین، مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اسٹڈیز، مدراس۔
عابد حسین	رکن، پلاننگ کمیشن، نئی دہلی۔
ڈی۔ ایچ پائی۔ پاسندیکر	سکریٹری جنرل، فیڈریشن آف انڈیا چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹریز، نئی دہلی۔
ڈاکٹر ایس۔ زیڈ۔ قاسم	سکریٹری، بحری سائنس کی ترقی کا شعبہ، نئی دہلی۔
ڈاکٹر پی۔ جے۔ لوکرے :	ایڈوائزر، شعبہ سائنس و ٹیکنالوجی، نئی دہلی۔
جے۔ ایم۔ کھنہ	جنرل منیجر، مہانگر ٹیلیفون نگم لمیٹڈ، نئی دہلی۔
ڈاکٹر پریم کرپال ۰	صدر، انٹرنیشنل ایجوکیشنل کنسورشیم، نئی دہلی۔
کے۔ کے۔ کھاتر ۰	ڈائرکٹر (پلاننگ)، شعبہ تعلیم، نئی دہلی۔
ڈاکٹر این۔ ایس۔ رندھاوا	ڈائرکٹر جنرل، انڈین کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ، نئی دہلی۔
ڈاکٹر پی۔ بی۔ بھٹاچاریہ :	معاشیات کے پروفیسر، انسٹی ٹیوٹ آف اکونومکس گروتھ، دہلی۔
ڈاکٹر کاملا پرساد ۰	معاشیات اور دیہی ترقی کے پروفیسر، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن، نئی دہلی۔
رومیش تھاپر ۰	ایڈیٹر، سیمینار، نئی دہلی۔
این۔ وی۔ کے۔ مورتی ۰	چیف ایگزیکٹو، نہرو سنٹر، بمبئی۔
ایس۔ سی۔ بھٹ۔	نامور صحافی، نئی دہلی۔

ڈاکٹر بھابا توش دتّا

نشوونما، ترقی اور پیش رفت

پروفیسر دتّا نے جو ایک چوٹی کے ماہر اقتصادیات ہیں اس مضمون میں نہ صرف ہماری ترقیاتی سرگرمیوں کے مثبت نتائج بلکہ خامیوں کا بھی بیان کیا ہے جو مصدقہ اعداد اور توثیق شدہ معلومات پر مبنی ہے۔ اُن کی تنقید کا مقصد محض ہمارے ترقیاتی منصوبوں کے نقائص تلاش کرنا نہیں بلکہ ایک منصفانہ سماج کی جانب ہمارے سفر میں ممکنہ رکاوٹوں سے احتراز کرنے میں مدد دینا ہے۔ (ایڈیٹر)

"نشوونما"، ترقی، اور پیش رفت، کے الفاظ اکثر بدل بدل کر ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال کئے جاتے ہیں لیکن ایسے تجزیہ کار ہیں جنھوں نے بغور مطالعہ طے کیا ہے کہ اُن کے معانی یکساں نہیں ہیں۔ ڈڈلے سیئرز نے کوئی بیس برس قبل زیادہ تر بعض لاطینی (جنوبی) امریکی ممالک کے حوالے سے "نشوونما کے بغیر ترقی" کا ذکر کیا تھا۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی "کل قومی پیداوار" (جی این پی) کا جائزہ لیتے ہوئے جبلی مشکلات کو نظر انداز کرتا ہے تو کیسے ملک کی اقتصادی نشوونما کا اظہار جس ایک آسانی سے ہو جائے گا، وہ ہے اس کی "کل قومی پیداوار" کی شرح تبدیلی۔ بین الاقوامی موازنے اکثر غلطیوں سے بھرپور ہوں گے لیکن کسی واحد ملک میں کوئی بھی شخص قیاس کر سکتا ہے کہ جائزے میں غلطیاں اور خامیاں وقت پاکر اُسی کے تناسب سے بڑی یا چھوٹی ہو جائیں گی۔ اس قیاس پر کوئی بھی شخص بامعنی طور پر "کل قومی پیداوار" کی وقت وقت پر ہونے والی نشوونما کے بارے میں بتا سکتا ہے ترقی میں "کل قومی پیداوار" کی نشوونما شامل ہے لیکن وہ تصوراتی طور پر تبدیلیوں کے وسیع تر سلسلے پر مبنی ہے۔ پیش رفت اس سے بھی وسیع تر اصلاح ہے جس میں اُس کے اندر ترقیاتی امور کے ساتھ ساتھ دیگر سماجی اجزا بھی شامل ہیں۔ نشوونما سے مراد اقتصادی سطح میں اُن تبدیلیوں میں اضافہ سے ہے جس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ترقی کا مطلب ہے اقتصادی کایا پلٹ اور پیش رفت کا مطلب ہے سماجی کایا پلٹ۔

نشوونما میں اُتار چڑھاؤ

پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ اگر "کل قومی پیداوار" (حقیقی معانی میں) کو ایک واحد مظہر کے طور پر استعمال کیا جائے اور اس طرح اقتصادی نشوونما کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ اس کام میں متعدد ناقابلِ حل مسائل پائے جاتے ہیں۔ بھارت میں منصوبہ بند ترقی کے آغاز سے "کل قومی پیداوار" کی نشوونما کا اوسط تقریباً ۵ فیصد سالانہ رہا ہے لیکن چھٹے منصوبے کی کامیابی کے باوجود جو اُسے تقریباً ۴ء۵ فیصد کی سالانہ شرح افزائش تک پہنچنے میں حاصل ہوئی ہے حقیقی نشوونما تقریباً ۳ء۶ فیصد سالانہ رہی ہے۔ کچھ ایسے بھی برس رہے ہیں جن میں شرح افزائش بہت زیادہ رہی ہے جیسے

۸۱-۱۹۸۰ء میں ۴ء۳ فیصد اور ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۸ء۰ فیصد لیکن ان میں سے ہر برس سے پہلے ایک کم تر منفی افزائش کا برس رہا تھا (جیسے ۸۰-۱۹۷۹ء میں منفی ۴ء۷ فیصد اور ۸۳-۱۹۸۲ء میں محض ۲ء۶ فیصد)۔ لیکن چھ پلانوں کے بعد بھی بھارت جو بارانی زراعت پر زیادہ تر انحصار رکھتا ہے بہت زیادہ اُتار چڑھاؤ پر قابو پانے میں ناکام رہا ہے۔

زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ اگر معیشت کے تین بڑے سیکٹروں ـــ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ـــ کو دیکھا جائے تو بھارتی تجربہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نشوونما کی مجموعی شرح زیادہ تر اُس آمدنی میں اضافے کی مرہونِ منت ہے جو اعلیٰ سیکٹر یعنی سروس سیکٹر سے حاصل ہوئی ہے۔ سروس سیکٹر ایک ایسا چھاتہ ہے جو تمام قسم کی غیر مادّی آمدنیوں کو پناہ دیتا ہے۔ ان میں سے بعض مادّی پیداوار سے قریبی طور پر منسلک ہیں، بعض نسبتاً امیروں کے اخراجات صرف میں اضافے سے منسلک ہیں۔ بعض روزگار کی توسیع اور سرکاری سروسوں کی آمدنی پر انحصار رکھتی ہیں اور یا قیمانده افلاس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مخفی بے روزگاری کی توسیع پر دار و مدار رکھتی ہیں۔ بنکنگ یا ٹرانسپورٹ سروسوں کی آمدنی میں اضافہ زراعتی اور صنعتی نشوونما کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلمی آرٹسٹوں کی آمدنی میں اضافہ نسبتاً امیروں کے اخراجات صرف میں اضافہ کے باعث ہوا ہے۔ اگر حکومت ڈیفنس ملازموں کی تعداد بڑھاتی ہے یا اُن لوگوں کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے جو براہِ راست انتظامیہ میں ملازم ہیں تو اس سے "کُل قومی پیداوار" میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اگر افلاس سے مراد ہے موکلوں کے بغیر وکیلوں کی تعداد اور شخصی سروسیں مُہیا کرنے والے گاہکوں کی کمی میں اضافہ، تو اس کا بھی کُل قومی پیداوار یا قومی آمدنی کا حساب لگانے پر کچھ ٹھوس اثر پڑ سکتا ہے کیوں کہ ہر ایسے نیم روزگار کے بارے میں جو سروسیں مُہیا کرتا ہے خیال کیا جاتا ہے کہ اُس کی کچھ آمدنی ہوتی ہے۔

حتیٰ کہ مادّی پیداوار کے معاملے میں بھی بھارتی معلومات نامکمل ہیں۔ مثال کے طور پر چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی پیداوار کا حساب معیاری تخمینوں کے ذریعہ لگایا جاتا ہے اور زراعت میں معلومات کی فراہمی کا طریقہ ابھی مکمل طور پر قابلِ انحصار نہیں ہوا۔

جہاں تک بڑے صنعتی سیکٹر کا تعلق ہے اُس پر تو اکثر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ اپنی پیداوار کا کم اندراج کرتا ہے۔ تاکہ وہ ٹیکس مراعات اور انتظامیہ کی سہولیات حاصل کر سکے۔ سماجی نقطۂ نگاہ سے اس سے بھی زیادہ اہم حقیقت یہ ہے کہ "کُل قومی پیداوار" کے لیے اقتصادی نشوونما کے اقدام کے طور پر ہر چیز کی قیمت سماجی ترجیحات کا کوئی لحاظ کئے بغیر قیمتوں (بالواسطہ ٹیکسوں سے مطابقت پیدا کر کے) کے مطابق طے کی جاتی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں عالیشان مکانوں اور فلیٹوں پر ۵ ارب روپے کا جو خرچ کیا جاتا ہے وہ کم آمدنی والوں کے مکانوں پر خرچ کئے جانے والے ایک ارب روپے کی نسبت کل قومی پیداوار کے اعداد میں زیادہ وقعت رکھتا ہے۔ کُل قومی پیداوار کے اعداد میں پولیسٹر کپڑے کی پیداوار میں ایک ارب روپے کے اضافے کو وہی اہمیت دی جاتی ہے جو عام آدمی کے سوتی کپڑے کی پیداوار میں ایک ارب روپے کے اضافے کو دی جاتی ہے۔

کم اضافہ

لہٰذا کسی کو بھی "کُل قومی پیداوار" کو بڑی محدودیت کے ساتھ نشوونما کے مظہر کے طور پر دیکھنا ہوگا۔ اور پھر اس کُل پیداوار کی تقسیم کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ عام طور پر اسے فی کس آمدنی میں تبدیلیوں کے ذریعے ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بھارت کے معاملے میں ۳۷ برس کی منصوبہ بندی کے عرصے میں فی کس آمدنی کا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن یہ افزائش آبادی میں غیر متوقع اضافے کے باعث کم رہی ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء اور ۸۶-۱۹۸۵ء کے درمیان مستقل قیمتوں پر فی کس خالص قومی پیداوار میں ۷۱ء۲ فیصد تک اضافہ ہوا ہے یعنی یہ اضافہ محض تقریباً ۶ء۱ فیصد کی اوسط سالانہ شرح سے ہوا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر حساب لگایا جائے تو اس سے آمدنی کی تقسیم کے اصل ڈھانچے کی دُرست تصویر نہیں ملتی۔ یہ بالکل آسان طور پر ممکن ہے کہ فی کس آمدنی میں اس اضافے نے آمدنی کی تقسیم کو بدتر کیا ہو۔

بدقسمتی سے بھارت میں گروپ وار آمدنی کی تقسیم سے متعلق قابلِ بھروسہ تازہ ترین اعداد دستیاب نہیں ہیں۔ دس برس قبل لگائے گئے بعض اندازوں سے پتہ چلا تھا کہ ۲۰ فیصد امیر ترین گھرانے کُل گھرانوں کی ۴ء۴۹ فیصد آمدنی سے فیضیاب ہو رہے

> **چھ پلانوں کے بعد بھی بھارت جو بارانی زراعت پر زیادہ تر انحصار رکھتا ہے بہت زیادہ تغیرات پر قابو پانے میں ناکام رہا ہے۔**

تھے اور اُس میں سے بھی چوٹی کے ۱۰ فیصد
گھرانے کُل گھرانوں کی ۲ء۳۲ فیصد آمدنی
کے مالک تھے۔ اِسی بنیاد پر بنائے گئے
ایک لورینز گراف سے صرف ایک خاص برس
کی پوزیشن کا پتہ چلتا ہے جبکہ کسی کو ان تمام
برسوں کے لیے تقابلی خاکوں اور گوشواروں کی

کارکردگی، جیسا کہ غیر جانبدارانہ تحقیقات سے
منکشف ہوا ہے، اُس کارکردگی کی نسبت زیادہ
ہلکی ہے جو تعمیل کنندگان حکام نے اپنے ریکارڈ
میں دکھائی ہے۔

صنعت کا ظہور

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بھارتی معیشت
نے گزشتہ ۳۰ برس میں نمایاں ترقی کی ہے حصول

سامنے ایک مایوس کن تصویر آتی ہے۔ ہم نے بہت
کچھ کیا ہے لیکن اتنا زیادہ نہیں کیا جتنا ہم کرنا
چاہتے تھے اور حتیٰ کہ اتنا زیادہ بھی نہیں کیا جتنا
کرنے کی ہم امکانی صلاحیت رکھتے تھے۔
آنکھیں کھولنے والی حقیقت ہے کہ کُل گھریلو
پیداوار میں "مینوفیکچرنگ" کا حصہ ۱۹۸۴ء
میں وہی ۱۵ فیصد رہا جو ۱۹۶۵ء میں تھا۔ اور
سماجی انصاف کے شعبے میں ہم یقینی طور پر

بڑے بڑے شہروں میں عالیشان مکانوں اور فلیٹوں پر ۵ ارب
روپے کا جو خرچ کیا جاتا ہے وہ کم آمدنی والوں کے مکانوں پر خرچ کئے جانے
والے ایک ارب روپے کی نسبت کُل قومی پیداوار کے اعداد میں زیادہ وقعت
رکھتا ہے۔ کُل قومی پیداوار کے اعداد میں پولیسٹر کپڑے کی پیداوار میں ایک
ارب روپے کے اضافے کو وہی اہمیت دی جاتی ہے جو عام آدمی کے سُوتی
کپڑے کی پیداوار میں ایک ارب روپے کے اضافے کو دی جاتی ہے۔

ضرورت ہے۔ جو کچھ بھی سب کچھ
دستیاب ہوا ہے وہ ہے سطحِ افلاس کے نیچے
رہنے والے بھارتی عوام کے فیصد کے وقتاً
فوقتاً تیار کئے گئے تخمینے (جس کی تشریح اب
بدل دی گئی ہے)، ان تخمینوں کے مطابق گزشتہ
دہائی میں فی صد ۴۸ سے کم ہو کر تقریباً ۳۷
رہ گیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہے کہ کوئی ۲۸
کروڑ افراد (۱۹۸۷ء کی تقریباً ۷۰ کروڑ آبادی میں سے)
ابھی تک سطحِ افلاس کے نیچے زندگی بسر کر رہے
ہیں۔ سطحِ افلاس کے نیچے ایک گروپ سے کسی دوسرے
پست تر گروپ میں جانے والے لوگوں کے بارے
میں کوئی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ دیہی افلاس
کے انسدادی پروگراموں کی بنا پر تیار کئے گئے تخمینوں
سے اکثر معلوم ہوا ہے کہ ان پروگراموں کی اصل

آزادی کے بعد منصوبہ بندی
کے قبل کے تیس برس ظاہرا اسباب سے اچھوتے
رہ گئے۔ انفرادی صنعتوں کی پیداوار میں بہت
بھاری اضافہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ بیشتر نئی صنعتیں
ظہور میں آئی ہیں اور اب بھارت کا صنعتی سیکٹر
دنیا کا ایک عظیم ترین صنعتی کمپلیکس بن گیا ہے۔
اور یہ حقیقت ہے کہ اگر بھارت کی ۱۰ فیصد آبادی
بھی صنعت پر انحصار رکھتی ہے تو یہ ۱۰ فی صد
صنعتی طور پر نہایت ترقی یافتہ بیشتر مغربی ممالک کی کُل
آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن یہ تصویر کا ایک
رُخ ہے۔ اگر ماضی کا حال سے موازنہ کرنے کے بجائے
حال میں جو کچھ حاصل ہوا ہے اُس کا مقابلہ ہم حال
کے نتائج یا امکانی صلاحیتوں سے کریں تو ہمارے

نہیں جانتے کہ کیا ہوا ہے لیکن
ہم اپنی آنکھوں کے سامنے بے پناہ دولت اور
انتہائی افلاس کو ایک ساتھ دیکھتے ہیں۔
آمدنی کی تقسیم ایک ایسا امر ہے جسے ہمیں
"ترقی" کے کسی بھی جائزے میں اس لحاظ سے
دیکھنا ہوگا کہ وہ "نشوونما" سے وسیع تر ہے۔ دراصل
ترقی ایک تصور کے طور پر کُل قومی پیداوار (کُل یا
اوسط) کی محض شرح افزائش کی نسبت زیادہ بامعنی
طور پر بین الاقوامی موازنوں سے تعلق رکھتی ہے۔ جن
دنوں میں نام نہاد "ترقیاتی مطالعات" شروع ہوئے
تھے تب بعض ممالک (جن میں بھارت شامل تھا)
"ناکافی طور پر ترقی یافتہ" کہلاتے تھے— یہ ایک

یکم تا ۳۱ اگست ۱۹۸۷

لقب تھا جو واضح طور پر موازنے کے لیے ایک معیار کے وجود کا اظہار کرتا تھا۔ اُس اصطلاح کی جگہ ایک بے ضرر اصطلاح "ترقی پذیر" آگئی ہے لیکن کوئی بھی ملک، امیر یا غریب ایسا نہیں ہے جسے اس زُمرے کے تحت نہیں لایا جاسکتا۔ اب ہم 'کم ترقی یافتہ' کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ایک بار پھر یہ سوال اُٹھا رہے ہیں کہ اس سے بھی "کم کیا" ہوگا اس کا جواب ناطق ہونا ضروری ہے۔ عالمی بینک اپنی سالانہ "ورلڈ ڈویلپمنٹ رپورٹ" میں محض دو گروپوں کی تقسیم نہیں کرتا بلکہ عالمی معاشیات کو چھ زمروں میں بانٹتا ہے۔ جو زیادہ تر فی کس "کُل قومی پیداوار" اور بڑی بڑی اقتصادی خصوصیات پر مبنی ہیں — ۱۹۸۶ء کی رپورٹ میں جن ۱۲۸ ملکوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں سے ۳۶ کم آمدنی کی معاشیات والے ممالک ہیں۔ (جن میں بھارت، چین اور ذیلی صحرائی ممالک ہیں)۔ ۳۹ کم تر متوسط آمدنی کے ممالک ہیں، ۲۰ "بالائی متوسط آمدنی کے ممالک" ہیں، ۵ زیادہ آمدنی والے تیل کے برآمد کنندگان" ہیں۔ اور ان کے علاوہ ۸۰ ممالک کا "مشرقی یورپ کی غیر بازاری معاشیات والے ممالک کے طور پر اندراج کیا گیا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں بھارت نچلی سطح سے ۱۵واں ملک تھا جس کی فی کس "کُل قومی پیداوار" ۲۶۰ امریکی ڈالر تھی۔ یہ ۱۹۸۰ء کے مقابلے پر بہتر پوزیشن تھی۔ جب بھارت ۱۹ویں پوزیشن میں تھا اور اُس کی فی کس آمدنی ۲۴۰ امریکی ڈالر تھی۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ بھارت کے پڑوسیوں میں سری لنکا اور پاکستان بھارت سے اونچی پوزیشن پر تھے۔ جبکہ بنگلہ دیش بالکل نچلی سطح کے بہت قریب تھا۔

ی کس کُل قومی پیداوار" کی بنا پر موازنہ میں نہ صرف اندرونِ ملک کے جائزے کی مشکلات بلکہ موزوں شرح استعمال پر تمام مقامی کرنسی کو یکساں تعداد میں منتقل کرنے کی مشکلات شامل ہیں۔ لیکن بعض نسبتاً تُلے فرق کے لحاظ سے چند حقیقی موازنے کرنا ممکن ہے۔ اب کوئی محض تین تبدیلیوں کی بنا پر نہایت محدود "زندگی کی طبیعاتی نوعیت کے اشاریہ" کے بارے میں نہیں سنتا۔ یہ تین ہیں — بچوں (صفر سے ایک برس کا گروپ) کی شرحِ اموات، پیدائش پر اوسط متوقع عمر اور خواندگی کی شرح۔ یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ یہ تین تبدیلیاں خود اپنے اندر آمدنی کی نشو ونما اور حتّیٰ کہ آمدنی کی تقسیم کے اثرات سموئے ہوئے ہیں اور لہٰذا ان موخرالذکر عناصر کا الگ آزادانہ تبدیلیوں کے طور پر استعمال غیر ضروری ہے۔

تقابلی مطالعہ

بھارت میں بچوں کی شرح اموات ۱۹۶۵ء میں ہر ۱۰۰۰ زندہ پیدائشوں میں ۱۵۱ تھی جو ۱۹۸۴ء میں کم ہوکر ۹۰ رہ گئی۔ یہ ایک واضح بہتری تھی۔ لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ ۱۹۸۴ء میں یہ شرح چین میں ۳۶ اور سری لنکا میں ۳۷ تھی۔ (یہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں ۶ اور ۱۲ کے درمیان اور مشرقی یورپ کے سوشلسٹ ملکوں میں تقریباً ۱۸ تھی)۔ ۱۹۸۴ء میں بھارت میں پیدائش پر متوقع عمر مردوں کے لیے ۵۶ اور عورتوں کے لیے ۵۵ برس تھی۔ جو ۱۹۶۵ء کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ جبکہ اُس وقت مردوں کے لیے یہ عمر ۴۶ برس اور عورتوں کے لیے ۴۴ برس تھی۔ لیکن اس معاملے میں بھی چین کے لیے ۱۹۸۴ء کے اعداد یہ تھے۔

مردوں کے لیے ۶۸ برس اور عورتوں کے لیے ۷۰ برس۔ جبکہ سری لنکا میں مردوں کی متوقع عمر ۶۰ برس اور عورتوں کی ۷۲ برس تھی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش دونوں اس معاملے میں بھارت سے پیچھے تھے۔ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں اور مشرقی یورپ کے ملکوں میں بھی ۱۹۸۴ء میں زندگی کی اوسط عمر ۷۰ برس اور ۸۰ برس کے

> دیہی افلاس کے انسدادی پروگراموں کی بنا پر تیار کئے گئے تخمینوں سے اکثر معلوم ہوا ہے کہ ان پروگراموں کی اصل کارکردگی، جیسا کہ غیر جانبدارانہ تحقیقات سے منکشف ہوا ہے، اُس کارکردگی کی نسبت زیادہ ہلکی ہے جو تعمیل کنندہ حکام نے اپنے ریکارڈ میں دکھائی ہے۔

درمیاں تھی۔

تمام ملکوں کے تعلیم بالغان سے متعلق تازہ ترین اعداد دستیاب نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات نوٹ کی جاسکتی ہے کہ ۱۹۸۰ء میں خواندگی کا فیصد بھارت میں ۳۶ تھا (جو ۱۹۶۰ء میں ۲۸ تھا) جبکہ سری لنکا میں یہ فیصد ۸۵ اور چین میں ۶۹ فیصد تھا۔ ان تبدیلیوں میں سے ہر ایک کے لحاظ سے ملکوں کا درجہ طے کرکے "زندگی کی طبیعاتی نوعیت کا اشاریہ" تیار کرنا ممکن ہے۔ لیکن مشترکہ گوشوارے میں عام طور پر تمام تبدیلیوں کو مساوی اہمیت دی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں کوئی بھی شخص مزید کوشش کرکے سرمایہ کی تشکیل، بجلی کی کھپت، صنعت میں مزدوروں کی تعداد، سڑک اور ریل کے میلوں میں پھیلاؤ (فی دس لاکھ ایکڑ یا فی دس لاکھ آبادی کے حساب سے) بینک برانچوں، اسکولوں اور اسکولوں میں طلباء کی تعداد، دستیاب صحتی سہولیات وغیرہ میں ترقی کے بارے میں جانکاری حاصل کرسکتا ہے۔ تب مشترکہ گوشوارے تیار کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہو جائے گا لیکن تمام معلومات کو الگ الگ دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ بھارت کو اُس مقام پر پہونچنے میں بہت زیادہ وقت لگیگا جسے ہم "ترقی کا مرحلہ" کہتے ہیں۔ اب مسئلہ محض پھیلاؤ کا نہیں بلکہ بڑھتی ہوئی پیداوار کے امکان کا ہے۔

"پیش رفت" کے معانی ترقی یا نشو و نما سے زیادہ وسیع ہیں۔ کیونکہ اس کی بجا طور پر تاویل کی جانی چاہیئے کہ اس سے مراد مطلوبہ سماجی کایا پلیٹ یا کم از کم اُس مقصد کی جانب ایک مستحکم قدم ہے۔ ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزرا کہ ہنری جارج نے ۱۸۷۹ء میں اپنی مشہور کتاب "پیش رفت اور افلاس" لکھی تھی جس میں انھوں نے ثابت کیا تھا کہ صنعت کی تدریجی توسیع سے افلاس کا مسئلہ کیونکر بدتر ہوتا جا رہا ہے اُس سے بھی ایک صدی قبل ۱۷۷۶ء میں ایڈم سمیتھ نے مختلف ملکوں کی دولتمندی کی پیش رفت" کے بارے میں لکھا تھا۔ اس نام میں پیش رفت سے مراد اُس تصور کا اظہار کرنا تھا جو آج ہم نشو و نما کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ یہ مارشل تھے جنھوں نے ۱۸۹۰ء میں اپنی کتاب "اصولے" (PRINCIPLES) میں "قیمتوں پر پیش رفت کا عام اثر" اور معیار زندگی کے تعلق میں پیش رفت" پر دو ضمنی باب لکھے تھے۔ انھوں نے پیش رفت کی تشریح نہیں کی تھی لیکن معیارِ زندگی کے لحاظ سے وسیع نظریہ اختیار کیا تھا اور اقتصادیات سے آگے بڑھ کر "مکمل مستعدی" کے لیے لازمی شرائط کے طور پر اُس کے "امنڈ آزادی اور تبدیلی کے رول پر زور دیا تھا۔ انھوں نے آجروں اور مزدور یونینوں کے درمیان

بڑھتے ہوئے تفاعل کی جانب زیادہ توجہ دی تھی وہ کسی بھی زبردست تبدیلی کے خلاف تھے۔ اور یقین رکھتے تھے کہ "پیش رفت" آہستہ آہستہ ہو ناضروری ہے۔ انھوں نے وارننگ دی تھی کہ "فطرت چھلانگیں لگا کر اپنا کام نہیں کرتی"۔ یہ ایک ایسا محاورہ ہے جو کسی بھی مارکسٹ کے نزدیک رد کئے جانے کے قابل ہے۔

یہ عجب بات ہے کہ پیش رفت کے تصور کو حالیہ مصنفوں کی طرف سے بھی مکمل طور پر واضح نہیں کیا گیا۔ جب کولن کلارک نے ۱۹۴۰ء میں اپنی کتاب "اقتصادی پیش رفت کے حالات" لکھی تو انھوں نے اس لفظ کا استعمال قومی پیداوار میں اضافے کے معانی میں کیا اور اپنے اس مفروضہ کی امداد سے توثیق کرنے کی کوشش کی کہ ایسے اضافے کا انحصار ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ شعبوں کی سرگرمیوں کے نسبتی تناسب پر ہوتا ہے۔ لفظ پیش رفت کے وسیع معانی اُن کی سوجھ بوجھ سے باہر رہے، لیکن یہ وسیع معنی ہے جو حقیقتاً اہم ہے۔ اور جو ماہر اقتصادیات صرف ایسی جانکاری حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اُس کی قلمرو سے باہر آتی ہے اُسے اس امر کو دیکھنا ہوگا کہ ہر سماجی تبدیلی کا اقتصادیات پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔

اگر کوئی سوال دریافت کرے کہ حصول آزادی

> ہم نے بہت کچھ کیا ہے لیکن اتنا زیادہ نہیں کیا جتنا ہم کرنا چاہتے تھے اور حتیٰ کہ اتنا زیادہ بھی نہیں کیا جتنا کرنے کی ہم امکانی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہ آنکھیں کھولنے والی حقیقت ہے کہ کُل گھریلو پیداوار میں "مینوفیکچرنگ" کا حصہ ۱۹۸۴ء میں وہی ۱۵ فیصد رہا جو ۱۹۶۵ء میں تھا۔

> اتنا ضروری ہے اقتصادی کایا پلٹ کی رفتار بہت سست ہے، سماجی کایا پلٹ سے جو اس سے بھی زیادہ ضروری ہے دیہی بھارت سے انتہائی اندرونی علاقوں، پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے والے عوام کی بھاری تعداد ابھی تک ناآشنا ہے۔ قدیم بھارت زیادہ مشتہر شدہ جدید بھارت پر ابھی تک حاوی ہے۔

کے بعد بھارت میں اقتصادی نشوونما ہوئی ہے تو اس کا جواب یقیناً اثبات میں ہے کوئی بھی شخص مزید بڑھ کر کہہ سکتا ہے کہ بھارت کی قلمبند تاریخ میں چار دہائیوں کا ایسا کوئی بھی دور نہیں آیا جس میں معیشت کی اس قدر نشوونما ہوئی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر یہ سوال دریافت کیا جائے کہ کیا بھارتی معیشت نے حسب منشا یا ممکنہ تیزی سے یا ساتھ ساتھ مطابقت رکھنے والی رفتار سے نشوونما کی ہے تو جواب مشروط ہوگا جس میں اس امر پر زور دیا جائے گا کہ شرح افزائش — خواہ وہ مجموعی ہو یا فی کس — اس سے بہت کم رہی ہے جو ہونی چاہیئے تھی یا ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد اگر آمدنی کی تقسیم کے بارے میں سوال کیا جائے تو جواب مشکوک ہوگا۔ اس کو دیکھتے ہوئے اگر کوئی یہ دریافت کرے کہ کیا بھارت نے گزشتہ ۴۰ یا ۳۷ برس میں "ترقی" کی ہے تو اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ بھارت ابھی تک ترقی کی سیڑھی کے نچلے ڈنڈے پر ہے اور عالمی بنک کی رپورٹ کے مطابق ۱۲۸ ملکوں میں کم از کم ۱۵ فیصد کے اندر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھارت ایک کم ترقی یافتہ ملک ہے اور وہ لمبے عرصے تک ایسا ہی رہے گا۔

درآمد ٹیکنالوجی کا استعمال بے قدری

صنعتی نشوونما اور خصوصاً تازہ ترین ٹیکنالوجی کا استعمال کرنے والے جدید پیداواری یونٹوں کی نشوونما کے باوجود بیچ ہے۔ صنعتی پیداوار کی آن لائنوں میں درآمدہ ٹیکنالوجی کے استعمال کو حق بجانب ٹھہرایا جاتا ہے جہاں اعلیٰ ترین کوالٹی اور خصوصیات کا مال تیار کیا ہوتا ہے لیکن خارجہ ٹیکنالوجی کا بے تحاشہ استعمال نہ صرف کاروں، موپیڈوں اور اسکوٹروں، ٹیلی ویژن سیٹوں اور گھڑیوں وغیرہ کی تیاری میں کیا جاتا ہے جنھیں یہاں پلاسٹوں میں صرف جوڑا جاتا ہے بلکہ چاکلیٹ، بام ہاؤسحت بخش مشروبات اور دیگر بیمو بیڈ قسم کے مستر وبات کاسمیٹکس اور ٹائلٹ مصنوعات کی تیاری میں بھی کیا جاتا ہے۔ اس تمام سے صنعتی پیش رفت کا اظہار ہوتا ہے لیکن ترقی کا مطلب ہونا چاہیئے اندرونی وسائل سے ہونے والی نشوونما کی بنیادوں کو تقویت دینا یہاں کامیابی کے بارے میں سوال پریشان کن ہوجاتا ہے۔

سماجی برائیوں کا تدارک

کیا بھارت نے گذشتہ چار دہائیوں میں نہایت ضروری سماجی کایا کلپ کی سمت میں "پیش رفت" کی ہے؟ درست سمتوں مثال کے طور پر تعلیم کے پھیلاؤ کے سلسلے میں قدرے "پیش رفت" کا ذکر کیا جاسکتا ہے لیکن کارکردگی میں ناکامیوں کی ایک طویل فہرست پیش کی جاسکتی ہے۔ بیروزگاری بڑے پیمانے پر ہے اور بڑھ رہی ہے۔ چھوا چھوت کا قانونی طور پر انسداد کیا گیا ہے لیکن "چھوٹی ذاتوں" والے لوگ معذوریوں کا شکار ہیں اور حتیٰ کہ انھیں جسمانی اذیتیں بھی دی جاتی ہیں جن کا ہمیشہ اخبارات وغیرہ میں چرچا نہیں ہوتا۔ ہم نے ۱۹۵۰ء میں بندھوا مزدوری کا انسداد کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن یہ برائی ابھی تک موجود ہے۔ خاتون کارکنوں کو بیشتر شعبوں میں نہایت ناسازگار حالات درپیش ہیں اور اُن کی بستری آزادیاں ابھی تک غیر محفوظ ہیں۔ نوعمر بیویوں کو انسدادِ جہیز کے قوانین کی ناکامی کے باعث مرنا پڑ رہا ہے۔ متعدد قسم کے بنیاد پرستوں میں احیاء کے معاملے میں مقابلہ ہو رہا ہے اور بعض اوقات قوانین ایسے احیاء میں مدد دیتے ہیں ذات اور مذہب سیاسی ہتھکنڈے بن گئے ہیں۔

اقتصادی نشوونما سے بعض لوگ دوسرے لوگوں سے بہت زیادہ فیض یاب ہوئے ہیں۔ اقتصادی ترقی بھارت کو بین الاقوامی ترقی کی سیڑھی کے نچلے ڈنڈے سے اوپر نہیں لے جاسکتی ہے اور پیش رفت لفظ کے وسیع ترین معانی میں عوام

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

ڈاکٹر مالکم ایس۔ ادی سیشیہ

بھارتی معیشت کے چالیس سال

اس مضمون کے مصنف ایک مشہور و معروف اسکالر ہیں۔ ملک کی معیشت پر ان کی نظر گہری ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں ہماری کامیابیوں اور ناکامیوں نیز خامیوں کا جائزہ پیش کیا ہے، یہ باتیں انھوں نے حقائق اور دلائل کی روشنی میں کہی ہیں۔ انھوں نے اس مضمون کے آخر میں جو نتیجہ اخذ کیا ہے، اس پر سنجیدگی سے غور کئے جانے کی ضرورت ہے۔ منصوبہ بند ترقی کے عمل میں یقین رکھنے والوں کو ان کے دلائل اور حقائق پر ٹھنڈے دل سے سوچنا ہے۔

ہماری ترقی کی رفتار دھیمی کیوں ہے؟ اس بارے میں اسباب و علل کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ادی سیشیہ نے کہا کہ ملک میں آبادی میں اس قدر تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے کہ اس کی موجودگی میں ملکی معیشت صرف رینگ کر آگے جا سکتی ہے، اس کی سریع نشو و نما یا ترقی ممکن نہیں۔ انھوں نے تنبیہ کی کہ ملک کے کثیر لوگ وہ ہیں جو محرومی کا شکار ہیں اور اس لیے مستقبل میں ملک میں ان کا وجود خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ مصنف نے ملک میں پائے جانے والی بدعنوانیوں پر افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ یہ ایک ایسا مرض ہے جو ہماری معیشت کی تمام سطحوں اور سبھی مراحل پر نفوذ کر گیا ہے۔

گذشتہ ۴۰ برسوں میں معیشت کی ترقی اور اُس کے فروغ کے جائزہ کی کوشش ایک پیچیدہ اور مشکل کام ہے۔ یہ اس لیے پیچیدہ ہے کہ ان ۴۰ برسوں کو ملک کی بحیثیت مجموعی ۴ ہزار سال کی تاریخ کے پس منظر میں سمیٹنا ہے۔ پھر یہ کہ ۴۰ برس کا یہ عرصہ اُن تضادات، ناہمواریوں اور عدم توازن کا شکار رہا ہے جو کہ گزشتہ دو سو برس کے عرصے میں پیدا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۴۰ سال کی کامیابیوں کا جائزہ لینا محض ملک کی معیشت کو آئینہ دکھانا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس مرحلے میں اس کی رفتار ترقی کی صورت حال کیا رہی۔

انحصاری سے خود انحصاری کی طرف

پچھلے ۴۰ برس میں ملک کی معیشت میں سب سے زیادہ نمایاں ترقی جو دیکھنے کو ملی، وہ یہ کہ ملک دوسروں پر انحصار کرنے کی بجائے

کے بعد بھارت میں اقتصادی نشوونما ہوئی ہے تو اس کا جواب یقیناً اثبات میں ہے کوئی بھی شخص مزید بڑھ کر کہہ سکتا ہے کہ بھارت کی تمام تر تاریخ میں چار دہائیوں کا ایسا کوئی بھی دور نہیں آیا جس میں معیشت کی اس قدر نشوونما ہوئی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اگر یہ سوال دریافت کیا جائے کہ کیا بھارتی معیشت نے حسب منشا یا ممکنہ تیزی سے یا لوگوں کی توقعات سے مطابقت رکھنے والی رفتار

صنعتی نشوونما اور خصوصاً تازہ ترین ٹیکنالوجی کا استعمال کرنے والے جدید پیداواری یونٹوں کی نشوونما کے باوجود سچ ہے۔ صنعتی پیداوار کی اُن لائنوں میں درآمدہ ٹیکنالوجی کے استعمال کو حق بجانب ٹھہرانا آسان ہے جہاں اعلیٰ ترین کوالٹی اور خصوصیات کا مال تیار کرنا ہوتا ہے لیکن خارجہ ٹیکنالوجی کا بے تحاشہ استعمال نہ صرف کاروں، موپیڈوں اور اسکوٹروں، ٹیلی ویژن سیٹوں اور گھڑیوں وغیرہ کی تیاری میں کیا جاتا ہے جنھیں یہاں پلانٹوں میں

کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن کارکردگی میں ناکامیوں کی ایک طویل فہرست پیش کی جا سکتی ہے۔ بیروزگاری بڑے پیمانے پر ہے اور بڑھ رہی ہے۔ چھوا چھوت کا قانونی طور پر انسداد کیا گیا ہے لیکن "چھوٹی ذاتوں" والے لوگ معذوریوں کا شکار ہیں۔ اور حتّٰی کہ انھیں جسمانی اذیتیں بھی دی جاتی ہیں جن کا ہمیشہ اخبارات وغیرہ میں چرچا نہیں ہوتا۔

ہم نے ۱۹۵۰ء میں بندھوا مزدوری کا انسداد کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن یہ برائی ابھی تک موجود ہے۔ خاتون کارکنوں کو بیشتر شعبوں میں

> انتہائی ضروری ۔ اقتصادی کایا پلٹ کی رفتار بہت سست ہے، سماجی کایا پلٹ سے جو اس سے بھی زیادہ ضروری ہے دیہی بھارت ۔ انتہائی اندرونی علاقوں، پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے والے عوام کی بھاری تعداد ابھی تک ناآشنا ہے۔ قدیمی بھارت زیادہ مشتہر شدہ جدید بھارت پر ابھی تک حاوی ہے۔

سے نشوونما کی ہے۔ تو جواب یقیناً ہوگا جس میں اس امر پر زور دیا جائے گا کہ شرح افزائش۔ خواہ وہ مجموعی ہو یا فی کس۔ اس سے بہت کم رہی ہے جو ہونی چاہئے تھی یا ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد اگر آمدنی کی تقسیم کے بارے میں سوال کیا جائے تو جواب مشکوک ہوگا۔ اس کو دیکھتے ہوئے اگر کوئی یہ دریافت کرے کہ کیا بھارت نے گزشتہ ۴۰ یا ۳۷ برس میں "ترقی" کی ہے تو اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ بھارت ابھی تک ترقی کی سیڑھی کے نچلے ڈنڈے پر ہے اور عالمی بنک کی رپورٹ کے مطابق ۱۲۸ ملکوں میں کم از کم ۱۵ فیصد کے اندر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھارت ایک "کم ترقی یافتہ ملک" ہے اور وہ لمبے عرصے تک ایسا ہی رہے گا۔

درآمد ٹیکنالوجی کا استعمال بے دریغ

صرف جوڑا جاتا ہے بلکہ جاکولیٹ، نام نہاد صحت بخش مشروبات اور دیگر بیہودہ قسم کے مشروبات کاسمیٹکس اور ٹائلٹ مصنوعات کی تیاری میں بھی کیا جاتا ہے۔ اس تمام سے صنعتی پیش رفت کا اظہار ہوتا ہے لیکن ترقی کا مطلب ہونا چاہیئے اندرونی وسائل سے ہونے والی نشوونما کی بنیادوں کو تقویت دینا۔ یہاں کامیابی کے بارے میں سوال پریشان کن ہو جاتا ہے۔

سماجی برائیوں کا تدارک

کیا بھارت نے گزشتہ چار دہائیوں میں نہایت ضروری سماجی کایا کلپ کی سمت میں "پیش رفت" کی ہے؟ درست سمتوں میں۔ مثال کے طور پر تعلیم کے پھیلاؤ کے سلسلے میں قدرے "پیش رفت"

نہایت ناسازگار حالات درپیش ہیں اور اُن کی بستری آزادیاں ابھی تک غیر محفوظ ہیں۔ کم عمر بیویوں کو انسداد جہیز کے قوانین کی ناکامی کے باعث مرنا پڑ رہا ہے۔ متعدد قسم کے بنیاد پرستوں میں احیاء کے معاملے میں مقابلہ ہو رہا ہے اور بعض اوقات قوانین ایسے احیاء میں مدد دیتے ہیں ذات اور مذہب سیاسی ہتھکنڈے بن گئے ہیں۔

اقتصادی نشوونما سے بعض لوگ دوسرے لوگوں سے بہت زیادہ فیض یاب ہوئے ہیں۔ اقتصادی ترقی بھارت کو بین الاقوامی ترقی کی سیڑھی کے نچلے ڈنڈے سے اوپر نہیں لے جا سکتی ہے اور پیش رفت لفظ کے وسیع ترین معانی میں عوام

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

ڈاکٹر مالکم ایس. ادی سیشیہ

بھارتی معیشت کے چالیس سال

اس مضمون کے مصنف ایک مشہور و معروف اسکالر ہیں۔ ملک کی معیشت پر ان کی نظر گہری ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں ہماری کامیابیوں اور ناکامیوں نیز خامیوں کا جائزہ پیش کیا ہے، یہ باتیں انھوں نے حقائق اور دلائل کی روشنی میں کہی ہیں۔ انھوں نے اس مضمون کے آخر میں جو نتیجہ اخذ کیا ہے، اس پر سنجیدگی سے غور کئے جانے کی ضرورت ہے۔ منصوبہ بند ترقی کے عمل میں یقین رکھنے والوں کو ان کے دلائل اور حقائق پر ٹھنڈے دل سے سوچنا ہے۔

ہماری ترقی کی رفتار دھیمی کیوں ہے؟ اس بارے میں اسباب و علل کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ادی سیشیہ نے کہا کہ ملک میں آبادی میں اس قدر تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے کہ اس کی موجودگی میں ملکی معیشت صرف رینگ کر آگے جا سکتی ہے، اس کی سریع نشوونما یا ترقی ممکن نہیں۔ انھوں نے تنبیہ کی کہ ملک کے کثیر لوگ وہ ہیں جو محرومی کا شکار ہیں اور اس لیے مستقبل میں ملک میں ان کا وجود خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ مصنف نے ملک میں پائی جانے والی بدعنوانیوں پر افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ یہ ایک ایسا مرض ہے جو ہماری معیشت کی تمام سطحوں اور سبھی مراحل پر نفوذ کر گیا ہے۔

گذشتہ ۴۰ برسوں میں معیشت کی ترقی اور اُس کے فروغ کے جائزہ کی کوشش ایک پیچیدہ اور مشکل کام ہے۔ یہ اس لیے پیچیدہ ہے کہ ان ۴۰ برسوں کو ملک کی بحیثیت مجموعی ۴ ہزار سال کی تاریخ کے پس منظر میں سمیٹنا ہے۔ پھر یہ کہ ۴۰ برس کا یہ عرصہ اُن تضادات، ناہمواریوں اور عدم توازن کا شکار رہا ہے جو کہ گزشتہ دو ہزار برس کے عرصے میں پیدا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۴۰ سال کی کامیابیوں کا جائزہ لینا محض ملک کی معیشت کو آئینہ دکھانا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس عرصے میں اس کی رفتار ترقی کی صورتِ حال کیا رہی۔

انحصاری سے خود انحصاری کی طرف

پچھلے ۴۰ برس میں ملک کی معیشت میں سب سے زیادہ نمایاں ترقی جو دیکھنے کو ملی، وہ یہ کہ ملک دوسروں پر انحصار کرنے کی بجائے

اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہو سکا اور نہ دوسروں کا دست نگر نہ رہ کر خود کفیلی کی جانب گامزن ہو سکا ہے۔

زراعت کے شعبے میں ۴۰ برس پہلے بھارت کو چاول برما سے منگانا پڑتا تھا۔ گیہوں یورپ کے ملکوں سے آتا تھا اور کپاس مصر سے آتی تھی۔ اس عرصے میں خوراکی اجناس تین گنا ہو گئی اور ۵ کروڑ ٹن سے بڑھ کر ۱۵ کروڑ ٹن تک پہونچ گئی۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ملک میں قحط پڑا کرتا تھا، لیکن اب اس مصیبت سے بالکل نجات مل گئی۔ تقسیم وطن کے نتیجے میں ملک کے وہ حصے جو سوت اور کپاس کی کاشت کے لیے مشہور تھے، مغربی پاکستان چلے گئے۔ ہندوستان میں اس عرصے میں سوت اور کپاس کی پیداوار اس قدر بڑھی کہ ملک اس معاملے میں خود کفیل ہو گیا بلکہ لمبے ریشے والی کپاس کی مختلف اقسام دوسرے ملکوں کو بھیجی جانے لگیں۔ پٹ سن کی کاشت کے لیے مشہور سرزمین مشرقی پاکستان میں چلی گئی تھی، مگر مغربی بنگال کے کسانوں کی کوششوں سے اب پٹ سن کی فصل وہاں اس قدر اچھی ہونے لگی کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اس کو مصنوعی دھاگے سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اسی وجہ سے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک میں پٹ سن کی مانگ گھٹ رہی ہے جبکہ پٹ سن کی پیداوار بڑھ رہی ہے۔ یہی صورت حال ایکھ یعنی گنے کے ساتھ پیش آئی۔ ملک میں صاف شدہ چینی اور کھانڈ وغیرہ کی ضرورتیں ہر سال بڑھ رہی ہیں مگر انھیں ملکی پیداوار سے ہی پورا کیا جا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں زراعت کے شعبے میں معیشت خود کفیل ہے بلکہ بہت سی زرعی اشیاء دوسرے ملکوں کو برآمد کی جا رہی ہیں۔

کان کنی اور مینوفیکچرنگ کے شعبوں میں دیکھا جائے، یہاں بھی ملکی معیشت کو زبردست ترقی حاصل ہو سکی۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ملک میں کوئلے اور سونے کی صرف چند کانیں تھیں لیکن آج خام لوہا، آہن آمیز دھاتوں کی کان کنی اور اس کے ساتھ ہی کوئلے اور لگنائٹ کی کان کنی نے خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔ صنعتی پیداوار کے معاملے میں ملک نے بہت ترقی کی۔ ۱۹۴۷ء سے قبل سیفٹی پن، صابن، ٹوتھ پیسٹ، وغیرہ تک باہر ملکوں سے منگانا پڑتا تھا۔ متوسط اشیاء اور مشینی سامان بھی باہر ملکوں سے آتا تھا، اب ہمارے ملک میں صنعتی ڈھانچہ کافی مضبوط ہو گیا ہے، اب اشیائے صارفین متوسط اشیاء، بنیادی سامان اور بھاری سامان، ان سبھی شعبوں میں ہم خود کفیل ہیں۔ ملک میں گزشتہ ۴۰ برس میں صنعتی اشیاء کی تیاری کی شرح ترقی ۵ فیصد رہی ہے۔

بنیادی ڈھانچے کے شعبے میں بجلی کی تیاری دس فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھی، بجلی نے اس عرصے میں تجارتی ایندھن کے ایک بڑے وسیلے کی صورت میں خاص اہمیت حاصل کر لی۔ خام تیل کی کھوج میں بمبئی ہائی نے نمایاں مقام حاصل کیا، چنانچہ ملک میں پیٹرولیم کی آدھی ضرورتیں اندرونِ ملک تیل حاصل کر کے پوری کی جانے لگیں۔

ٹرانسپورٹ، کمیونی کیشن اور ٹیلی کمیونیکیشن کے شعبوں میں معیشت نے ہمہ جہت ترقی کی اور ان شعبوں میں ملک نے خود کفیلی اور خود انحصاری کی طرف قدم بڑھایا۔

گزشتہ ۴۰ برسوں میں معیشت کی شرح ترقی مسلسل ۳٫۵ فیصد رہی اور یہ صورتِ حال ۱۹۸۰ء تک برقرار رہی۔ اس کے بعد اس میں اور زیادہ اضافہ دیکھنے کو ملا۔

منصوبہ بندی

ہندوستانی معیشت کی ایک خاص بات

اب ہمارے ملک میں صنعتی ڈھانچہ کافی مضبوط ہوگیا ہے، اب اشیائے صارفین، متوسط اشیاء، بنیادی سامان اور بھاری سامان، ان سبھی شعبوں میں ہم خود کفیل ہیں۔ ملک میں گزشتہ ۴۰ برس میں صنعتی اشیاء کی تیاری کی شرح ترقی ۵ فیصد رہی ہے۔

گزشتہ ۴۰ برسوں میں یہ رہی کہ چالیس ۴۰
برسوں میں سے ۳۵ برسوں میں اس نے منصوبہ
بند طریقے پر ترقی کی، پنجسالہ منصوبوں کے تحت
چند مقاصد پیش نظر رہے، پیداوار اور کھپت
کے نشانوں کے ساتھ ساتھ مطلوبہ مقاصد کی
تکمیل کی بھی کوشش کی گئی۔ ہندوستانی معیشت
کی منصوبہ بندی کے دو اہم پہلو ہیں، ایک یہ کہ
اس میں لامرکزی نظام کو سامنے رکھا گیا ہے اور

ہے کہ جو قومیں ۵ فیصد بچتیں کرتی ہیں، اگر دس ۱۰
فیصد بچانے لگیں، تو ان کی معیشت خود کفیلی کی
طرف بڑھے گی۔ بھارتی معیشت میں یہاں کے
عوام اور اداروں نے بچتوں کے محاذ پر اچھی کار
گزاری دکھائی اور ان کی بچتوں میں دوگنا اضافہ
ہوا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۹ء تک بچتوں کی
شرح دس فیصد رہی۔ یعنی مجموعی گھریلو پیداوار
کی دس فیصد۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۹ء تک یہ تناسب
۱۵ فیصد اور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۹ء تک ۲۰ فیصد

صرف چند یونیورسٹیاں تھیں، اور خصوصی تحقیقی
اداروں کی تعداد محدود تھی، خاص کر زراعت
وغیرہ کی تعلیم کے ادارے معدودے چند تھے،
اس وقت ملک میں اعلیٰ تعلیم کے ۱۵۰ ادارے
ہیں اور طبیعاتی، قدرتی، زمینی، انجینئرنگ،
میڈیکل، سماجی اور عمرانی سائنس کے سو سے
زیادہ مراکز پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ ایک زمانہ
تھا کہ یہاں کے اداروں میں برطانوی افراد پر
مشتمل سائنسی عملہ تھا، مگر اب ہر سال دس
ہزار سائنس داں باہر ملکوں میں جاکر خدمات

**ہندوستانی معیشت کی ایک خاص بات گزشتہ ۴۰ برسوں میں یہ
رہی کہ چالیس ۴۰ برسوں میں سے ۳۵ برسوں میں اس نے
منصوبہ بند طریقے پر ترقی کی، پنجسالہ منصوبوں کے تحت چند مقاصد
پیش نظر رہے، پیداوار اور کھپت کے نشانوں کے ساتھ ساتھ مطلوبہ
مقاصد کی تکمیل کی بھی کوشش کی گئی۔**

اس میں لچک ہے۔ اس میں پرائیویٹ سیکٹر اور
پبلک سیکٹر دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش
کی گئی ہے، پبلک سیکٹر کا حصہ ملکی معیشت میں
۸۰ فیصد ہے۔ اس طرح سے یہ معیشت اہم
خصوصیات کی حامل ہے۔ دوسری خاص بات یہ
کہ یہ منصوبہ بند ترقی تدریجی طور پر انتہائی
جدید لائنوں پر ملک کو لے آئی ہے، اور اس کے
دائرہ کار میں سبھی شعبے آتے ہیں یعنی معاشیات،
سماجی اور ثقافتی شعبے سبھی اس کے دائرہ عمل میں
شامل ہیں۔ منصوبہ بندی نے معیشت کی ترقی کے
لیے نئے نئے گوشے نکالے اور نئے نئے افق روشن
کیے ہیں۔

بچتیں: ماہرین اقتصادیات کا خیال

سے بھی زیادہ رہا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد سے یہ ۲۳
فیصد ہو گیا۔ یہ شرح دنیا کے بہت سے ترقی یافتہ
ملکوں کی شرحوں کے مقابلے میں زیادہ ہے، گزشتہ
دہے میں یہ بچتیں بینک ڈپازٹ کی شکل میں لئے، اور
اسٹاک شیئرز کی شکل میں دس فیصد سے لے کر ۳۰ فیصد
تک بڑھیں، بچتوں کا دیگر ۲۵ فیصد وسیلہ سرکاری
اور پبلک اداروں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے —
پرائیویٹ کارپوریٹ سیکٹر بھی اس میں شامل ہے
گزشتہ ۴۰ برسوں میں بچتوں اور سرمایہ بندی میں
مساوات بڑھی، غیر ملکی بچتوں پر انحصار مجموعی قومی
پیداوار کے ایک تا ۲ فیصد کے برابر ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی: ۴۰ برس پہلے ملک میں

انجام دے رہے ہیں، یہاں کے سائنسدان،
انجینئر اور ڈاکٹر امریکہ، برطانیہ اور یوروپی
ممالک میں خدمات انجام دے رہے ہیں،
اُن لوگوں کی معیاری خدمات کے سبب وہ متعلقہ
ملکوں کی معیشت کا جزو لازم بن چکے ہیں۔
ہندوستان میں گزشتہ ۴۰ برسوں میں سائنسدانوں
اور ماہرین ٹکنالوجی کی تعداد بڑھی ہے، ہندوستان
وہ تیسرا بڑا ملک ہے جہاں دنیا کے دیگر ترقی یافتہ
ملکوں کے سائنسدانوں کی طرح سے سائنسدانوں کا
گروہ موجود ہے۔ ملک کی معیشت میں ان کا مفید
اور ضروری حصہ ہے۔

خامیاں :

گزشتہ ۴۰ برسوں میں ملک کی معیشت پر اثر انداز ہونے والی چند اہم خامیاں بھی پیشِ نظر رہنی ضروری ہیں:۔

آبادی :

ملک میں اس عرصے میں آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے، اس سے فی کس اوسط شرح ترقی پر اثر پڑا۔ برصغیر یعنی بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش اور نیپال میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء کے درمیان

۳۵ کروڑ لوگ آباد تھے لیکن آج ان ملکوں کی آبادی ایک بلین کے لگ بھگ ہے، ہندوستان کی آبادی میں اضافے کی شرح ۲ تا ۵ر۲ فیصد رہی۔ اس وجہ سے یہاں فی کس اوسط شرح ایک تا ڈیڑھ فیصدی ہو سکی۔ ملک میں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے سبب خوراکی اشیاء کی فراہمی، کپڑے کی فراہمی، تعمیرِ مکانات، اسکولی آراضی سہولتوں اور دیگر ضروری اشیاء کی فراہمی پر کافی اثر پڑا۔ ایسی صورت میں معیشت رینگ کر ہی آگے

بڑھ سکتی تھی، اس کی بڑے پیمانے پر نشوونما کے امکانات روشن نہیں ہو سکتے تھے۔

کالا دھن اور بدعنوانی

ہماری معیشت کا ایک اور تاریک پہلو یہ ہے کہ جس قدر معیشت ترقی کی راہ پر آگے بڑھی، اس قدر ٹیکس کی چوری اور اسمگلنگ وغیرہ غیر ناجائز کاروبار کے سبب آمدنی میں تیزی سے اضافہ ہوا اور ملک ایک روپوش معیشت کے ساتھ آگے بڑھا، ملک میں کالے دھن کے حجم کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مجموعی گھریلو پیداوار کی تہائی پیداوار اسی کالے دھن کی صورت میں ہے۔

میرے اپنے نزدیک یہ ۴۰ فیصد کے لگ بھگ ہے۔ کالا دھن منصوبے کے مقاصد کو بگاڑ کے رکھ دیتا ہے اور معاشی نشانے بگڑ جاتے ہیں۔ اسی کالے دھن کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ سماج میں بدعنوانیاں بڑھ جاتی ہیں۔ ہر چھوٹا اور بڑا کاروبار کالے دھن کی مدد سے چلتا ہے۔ یہ بیماری اتنے بڑے پیمانے پر ہے کہ اس سے کوئی بھی بچا ہوا نظر نہیں آتا، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کی رپورٹ اس

سلسلے میں ثبوت پیش کرتی ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ ۱۸۰۰ کروڑ روپے سالانہ ناجائز طور پر سوئٹزرلینڈ میں بھارتی باشندوں کے خفیہ کھاتوں میں رہتے ہیں۔

ماحول کی گراوٹ

معیشت کا ایک اور تاریک پہلو یہ کہ گزشتہ ۴۰ برسوں میں معیشت کی ترقی کی ضرورتوں کو متوازن بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی جا سکی، یہ بات اراضی، کان کنی، جنگل بانی آبرسانی نظاموں اور سڑکوں غرضیکہ تقریباً سبھی معاشی شعبوں میں دیکھنے کو ملتی ہے، اس کے ساتھ ہی کرۂ ارض کو صاف ستھرا رکھنے کی ضرورت

سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ اس وجہ سے انسانی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مطلوبہ خوراک اور عوام کو صاف ستھرا ماحول دلانے کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جا سکا۔ چنانچہ آج وہ جس ہوا میں سانس لیتے ہیں، وہ صنعتی ترقی کے زیرِ اثر آلودہ ہے اور وہ جو پانی پیتے ہیں، وہ صاف ستھرا نہیں، کھیتی باڑی کرنے میں بے کار سمجھ کر پھینک دی جانے والی اشیاء اور

ایک زمانہ تھا کہ یہاں کے اداروں میں برطانوی افراد پر مشتمل سائنسی عملہ تھا، مگر اب ہر سال دس ہزار سائنس داں باہر ملکوں میں جا کر خدمات انجام دے رہے ہیں، یہاں کے سائنس داں، انجینئر اور ڈاکٹر امریکہ، برطانیہ اور یوروپی ممالک میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان لوگوں کی مفید خدمات کے سبب وہ متعلقہ ملکوں کی معیشت کا جزو لازم بن چکے ہیں۔

زرعی اشیاء پر مبنی صنعتوں کے فضلے ہوا اور پانی دونوں کو مسموم کر رہے ہیں، ایک اطلاع کے مطابق ہر سال معاشی اہمیت کی حامل چھ بلین ٹن مٹی بہہ کر سمندر میں چلی جاتی ہے۔ ملک میں

ہیں۔ ۱۳ بڑے دریا آلودگی کے مسئلے سے دوچار ہیں، دریائے گنگا کی آلودگی ان میں سب سے زیادہ ہے، ان کے کناروں پر واقع ۱۳۲ صنعتوں کا کچرا ان دریاؤں کے پانی میں گرا دیا جاتا ہے، دو پہیوں والی گاڑیوں اور دیگر آٹوموبیل دریاؤں

پچھلے ۲۰ برسوں میں مسلسل گھٹ رہا ہے جو کہ پریشان کن مسئلہ ہے۔ اس مضمون کے شروع میں کھیتوں میں اضافے کی بات کہی گئی تھی، لیکن ان کھیتوں سے مجموعی گھریلو پیداوار میں ترقی اضافہ نہیں ہو سکا ہے۔ اس متضاد کیفیت کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ کان کنی، مینوفیکچرنگ، جو رائی

یہ بیماری اتنے بڑے پیمانے پر ہے کہ اس سے کوئی بھی بچا ہوا نظر نہیں آتا، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کی رپورٹ اس سلسلے میں ثبوت پیش کرتی ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ ۱۸۰۰ کروڑ روپے سالانہ ناجائز طور پر سوئٹزرلینڈ میں بھارتی باشندوں کے خفیہ کھاتوں میں رہتے ہیں۔

حالانکہ بحساب فی کس نئے دن روزگار کے مواقع بڑھتے نظر آتے ہیں لیکن کام مانگنے والے مزدوروں کی تعداد ان کے مقابلے کہیں زیادہ ہے، لہٰذا مواقع میں اضافہ بے سود ہو کر رہ جاتا ہے، اکثریت اُن لوگوں کی ہے جن کی آمدنی غیر نفع بخش ہے، اس لیے وہ منڈی کی دسترس سے باہر رہتے ہیں۔ ان کے لیے منڈی تنگ ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ترقی نہیں کر پاتے۔ غریبی کا دوسرا بڑا سبب اثاثہ جات سے محرومی ہے۔

---

۶ کروڑ اراضی سیلابوں کی زد میں آتی ہے، کیونکہ دریائی طاس کم گہرے ہیں۔ خشک سالی کی زد میں آنے والے علاقے ۸ کروڑ ہیکٹیئر اراضی پر مشتمل

کے پانی کو گدلا بناتے ہیں۔

پیداواری صلاحیت میں کمی

معیشت کی پیداواری صلاحیت کا ریکارڈ

احساس اور تجارتی فصلوں کی پیداوار میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کے نتیجے میں اہلیت کا رسے

(باقی صفحہ ۱۰۱ پر)

عابد حسین

آزاد ہندوستان میں صنعتی ترقی

اقتصادی صورت حال کا تحقیقی جائزہ پیش کرتے وقت معقول بات تو یہ ہے کہ صرف کامیابیوں ہی کا نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ملک کی ناکامیوں اور خامیوں پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ منصوبہ بندی کمیشن کے رکن جناب عابد حسین نے زیر نظر مضمون میں ایسا ہی کیا ہے۔ ایسا کرنے سے ان کا یہ جائزہ صحت مند ہو گیا ہے اور انہوں نے جن کوششوں کے ذریعے بھارت کی صنعتی و ٹیکنیکی پیش رفتوں کا تجزیہ کیا گیا ہے زیادہ معتبر ہو گیا ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ خود انحصاری اور خود کفالت حاصل کرنے کی دھن میں ہم پالیسی میں ہوئی ان ترتیبوں اور خاص کر ٹیکنالوجی کے میدان میں ہوئی پیش رفت کے تبادلہ خیال سے ہم کچھ پیچھے ہیں نہیں پرانے طریقوں پر چلتے رہتے اور دوسروں کا مقابلہ نہ کر پاتے کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن مصنف کو صدق دل سے یہ اُمید ہے کہ اگر حال ہی میں نافذ کی گئی اعتدال پسندانہ مالی و اقتصادی پالیسیوں سے صرف نظر نہ کیا جائے تو زیادہ تیز رفتار صنعتی ترقی کا حصول یقینی امر ہے۔ مضمون میں گذشتہ چالیس سالوں میں ملک کے بہت سے شعبوں میں صنعتی ترقی کے اتار چڑھاؤ کی تصویر مستند تفاصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

صدیوں کی غلامی کے بعد ہندوستان میں آزادی کا سورج ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو طلوع ہوا۔ تقریباً دو صد سالہ برطانوی راج سے ہمیں وراثت میں کسی قسم کی کوئی چیز نہیں ملی۔ استحصال پسندانہ دولتمندی کے چند نخلستانوں کے سوا ہر چہار سو غریبی اور جہالت کا دور دورہ تھا۔ ملک کے قدرتی وسائل کا ایک بڑا حصہ اَن چھوا پڑا تھا اور اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ معاشی یا ٹیکنالوجیکل ترقی کے ڈھانچے کے نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ بہت مشکل کاموں کی ذمہ داری ہم پر آن پڑی تھی اور ہمارے عوام کو بہت سی چنوتیاں درپیش تھیں، جبکہ ہماری معاشی بنیاد کمزور تھی اور قوت و توانائی کا کوئی ذریعہ دستیاب نہ تھا سوائے اس کے کہ ہم اپنی قسمت کے مالک آپ تھے۔

آزاد ہندوستان نے منصوبہ بند معاشی ترقی کا راستہ چنا۔ ترقی جس کا نصب العین مساوات اور جس کی روح جمہوری سوشلزم ہے۔ خود انحصاری و خود امدادی کے اصولوں کی بنیاد پر ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک کی ترقی آسان بڑا کام تھا جس کی کوئی نظیر موجود نہیں تھی

اس کے لیے انگریزوں سے ورثے میں ملے ہوئے سماجی و معاشی ڈھانچے میں ایک عظیم تبدیلی لانے کی ضرورت تھی۔ نئی تبدیلی کا اہم آلۂ کار اسٹیٹ یا ریاست تھی۔ ریاست جسے نوآبادیاتی طرز حکومت کا آلۂ کار بنے رہنے کے بجائے جمہوریت اور سوشلزم پر مبنی نظام کو وجود میں لانا تھا۔

منصوبوں کے ذریعے انقلاب

ہندوستان میں پنجسالہ منصوبوں کے ذریعے ایک روایتی معیشت کو ایک صنعتی معیشت

ہمیں منصوبہ بندی کے ۳۵ سالوں میں نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئی ہے۔ ہندوستان میں ۵۱-۱۹۵۰ء سے ۷۹-۱۹۷۸ء تک کی مدت میں ۵ر۳ فیصد سالانہ کی اجتماعی مرکب شرح ترقی حاصل کی جا چکی ہے۔ حالیہ برسوں میں مجموعی قومی پیداوار (GNP) میں سالانہ شرح ترقی پانچ فیصد رہی ہے۔ زرعی پیداوار کی شرح ترقی ۵۱-۱۹۵۰ء سے ۷۹-۱۹۷۸ء تک کی مدت میں ۲ر۸ فیصد سالانہ اور ۸۰-۱۹۷۹ء سے ۸۵-۱۹۸۴ء کی مدت میں غلہ کے ضمن میں ۸ر۳ فیصد سالانہ

جمود کا خاتمہ

منصوبہ بندی کے گذشتہ ۳۵ برسوں میں ہندوستانی معیشت کی کارکردگی کافی اہم اور نمایاں رہی ہے۔ ہماری منصوبہ بندی کی ایک بڑی کامیابی یہ ہے کہ ملکی معیشت پر ایک طویل عرصے تک جو جمود طاری تھا، وہ ختم ہو چکا ہے۔ اگر ہم ان عظیم مسائل اور کمزوریوں کو جو ہم نے حصول آزادی کے وقت ورثے میں پائی تھیں۔ دھیان میں رکھیں تو ایک ملک کے لیے تیس سال کا عرصہ ایک مختصر عرصہ نظر آتا ہے۔

ترقی کی صنعتی وسعتیں ۔ آزادی کے وقت ہمیں جو صنعتی ڈھانچہ وراثت میں ملا، وہ

منصوبہ بندی کا مقصد ترقی کا ایک ایسا سلسلہ شروع کرنا ہے جس سے دیہی و شہری علاقوں کے کروڑوں عوام کا معیار زندگی بہتر بنایا جا سکے اور سماجی و معاشی ترقی کی نئی راہیں کھولی جا سکیں۔

میں بدلنے کی پُرزور کوشش کی گئی ہیں۔ اس تبدیلی کی نوعیت ہمارے پنجسالہ منصوبوں میں واضح طور پر بیان کی گئی ہے۔ ہندوستان تیس سال سے زیادہ عرصے سے منصوبہ بند ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔ ہمارا اس لحاظ سے ایک انوکھا تجربہ ہے کہ ہمارے یہاں منصوبہ بند ترقی ایک مخلوط معیشت کے دائرے میں ہوئی ہے، جبکہ پبلک سیکٹر کو تیز رفتار ترقی کے لیے ایک محوری کردار عطا کیا گیا ہے، پرائیویٹ سیکٹر کو دوسرے شعبوں میں اسی قدر اہم رول دیا گیا ہے۔ منصوبہ بندی کا مقصد ترقی کا ایک ایسا سلسلہ شروع کرنا ہے جس سے دیہی و شہری علاقوں کے کروڑوں عوام کا معیار زندگی بہتر بنایا جا سکے اور سماجی و معاشی ترقی کی نئی راہیں کھولی جا سکیں۔

تھی۔ ۵۱-۱۹۵۰ء سے ۷۹-۱۹۷۸ء تک کے دوران صنعتی پیداوار کی شرح ترقی ۶ر۱ فیصد سالانہ تھی اس کے بعد کے پانچ برسوں میں یہ ۵ر۵ فیصد ہو گئی۔ مجموعی اندرون ملک پیداوار (GDP) کے حصے کے طور پر مجموعی گھریلو بچتیں ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۲ر۱۰ فیصد سے بڑھ کر ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۹ر۲۳ فیصد ہو گئیں۔ اس مدت میں مجموعی سرمایہ سازی کی شرح ۱۰ فیصد سے بڑھ کر ۷ر۲۳ فیصد تک پہونچ گئی۔

ہماری ترقی کے دیگر اہم اشارئے اگلے صفحہ کے گوشوارے میں درج کیے جا رہے ہیں:-

کپڑے، چینی، سیمنٹ، مشینری، ریلوے ویگن وغیرہ صرف چند صنعتوں تک ہی محدود تھا۔ فولاد کے دو کارخانے نصب ہو چکے تھے اور ریلوے ورکشاپوں اور حصے پُرزے جوڑنے کے پلانٹوں میں انجینئرنگ کے ضمن میں محدود ترقی ہوئی تھی۔

منصوبہ بند ترقی کے پروگرام میں ایک روائتی معیشت کو ایک صنعتی معیشت میں بدلنے کے کام کو نمایاں اہمیت دی جاتی رہی ہے اس کا آغاز ۱۹۵۲ء کے انڈسٹریل ڈیولپمنٹ اینڈ ریگولیشن ایکٹ اور ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی کی قرارداد سے ہوا تھا جو ملک میں صنعتی پالیسی

گوشوارہ نمبر ۱: اہم معاشی اشاریے (۱۹۵۰ء تا ۸۶-۱۹۸۵ء کی مدت میں)

صنعت	اکائی	۵۱-۱۹۵۰ء	۸۶-۱۹۸۵ء
قومی آمدنی (۷۱-۱۹۷۰ء کی قیمتوں کی بنیاد پر)	کروڑ روپیوں میں	۱۶۷۳۱	۵۹۲۹۵
فی کس آمدنی (〃 〃 〃)	روپیوں میں	۴۶۶	۷۸۲
غلّہ کی پیداوار	میٹرک ٹن	۵۵	۱۴۸٫۵
نائٹروجن والی کیمیاوی کھاد کی کھپت	〃	۰٫۰۵۶	۶٫۰۰
فاسفیٹ والی کیمیاوی کھاد کی کھپت	〃	۰٫۰۰۷	۲٫۰۰
بجلی کی پیداوار	بلین کلوواٹ گھنٹے	۵٫۲	۱۷۰
گاؤں کی تعداد جن میں بجلی پہونچائی گئی	—	۳۰۰۰	۳۸۲۰۰۰
منظم سیکٹر میں روزگار	ملین افراد	۱۲٫۱	۲۴٫۶
		(۶۱-۱۹۶۰ء)	(۸۵-۱۹۸۴ء)
فولاد کے ڈلوں کی پیداوار	میٹرک ٹن	۱٫۵	۱۱٫۸
پختہ سڑکیں	...، کلومیٹر	۱۵۷	۸۳۳ (۸۵-۸۴ء)
ریل لدان	میٹرک ٹن	۹۳	۲۶۵ (۸۵-۸۴ء)
آبادی	ملین افراد	۳۵۹	۷۴۰

کی اساس ہیں۔ پالیسی میں وہ خطوط متعین کئے گئے تھے جن پر ترقی اور سماجی انصاف کے اصولوں کی روشنی میں صنعتی ترقی لائی جاتی

پہلے پنجسالہ منصوبے میں زراعت کو مستحکم بنانے پر زور دیا گیا کیونکہ کروڑوں عوام کے لیے خوراک کا انتظام کرنا اولیں ترجیح کا مستحق

(دوسرا پنجسالہ منصوبہ بھی اسی سال شروع ہوا تھا) صنعتی و معدنیاتی شعبے میں عظیم سرمایہ کاری کی گئی جس کے نتیجے میں صنعتی منظر میں نمایاں

اگر ہم ان عظیم مسائل اور کمزوریوں کو جو ہم نے حصول آزادی کے وقت ورثے میں پائی تھیں دھیان میں رکھیں تو ایک ملک کے لیے تیس سال کا عرصہ ایک مختصر عرصہ نظر آتا ہے۔

تھی۔ پنجسالہ منصوبوں میں اس صنعتی ڈھانچے کو، جو ہمیں آزادی کے وقت ورثے میں ملا تھا، وسیع تر اور متنوع بنانے کی حکمت عملی کو مدنظر رکھا گیا۔

تھا۔ اس محاذ پر معقول ترقی حاصل کرنے کے بعد دوسرے اور بعد کے پنجسالہ منصوبوں میں صنعت کاری پر توجہ مبذول کی گئی۔ ۱۹۵۶ء میں صنعتی پالیسی کی قرارداد کے منظور کئے جانے کے بعد

تبدیلیاں آئیں۔ گوشوارہ نمبر ۲ اس کا شاہد ہے۔ گوشوارہ آگے درج کیا جا رہا ہے۔

گوشوارہ نمب

منظم صنعتوں اور م

میں سرما

پہلا منصوبہ
دوسرا منصوبہ
تیسرا منصوبہ
تیسرا سالانہ منصوبے
چوتھا منصوبہ
پانچواں منصوبہ

۳
۵
۷
۲

چھٹا منصوبہ
ساتواں منصو

* اندازاً

تعبیر پذ

منصو

میں صنعتی پیدا
لگاتار ترقی
سالوں (۱
پیداوار کی
پانچ برس

خصوصی

گوشوارہ نمبر ۴

صنعتی پیداوار کی رفتار ترقی

(کچھ منتخب صنعتوں کے لیے)

صنعت	اکائی	۵۱-۱۹۵۰ء	۶۱-۱۹۶۰ء	۷۱-۱۹۷۰ء	۸۱-۱۹۸۰ء	۸۵-۱۹۸۴ء
کوئلہ (بشمول لگنائٹ)	لاکھ ٹن	۳۲۸	۵۵۷	۷۶۳	۱۱۸۸	۱۵۵۲٫۴
قابلِ فروخت فولاد¹	"	۱۹٫۴	۲۳٫۹	۴۴٫۸	۶۲٫۸	۸۷٫۷
المونیم	ٹن	۴	۱۸٫۳	۱۶۸٫۳	۱۹۹٫۰	۲۷۶٫۵
تانبہ	"	۷٫۱	۸٫۵	۹٫۳	۲۵٫۳	۴۱٫۰
مشینی آلات	کروڑ روپے	۰٫۳	۷٫۰	۴۳٫۰	۱۹۶٫۲	۳۰۳٫۰
ریلوے ویگنیں²	ٹن	۲٫۹	۱۱٫۹	۱۱٫۱	۱۳٫۶	۱۲٫۵
نائٹروجن والی کیمیاوی کھاد	"	۹	۹۸	۸۳۰	۲۱۶۴	۳۹۱۷
فاسفیٹ والی کیمیاوی کھاد	"	۹	۵۲	۲۲۹	۸۴۲	۱۲۶۴
سیمنٹ	لاکھ ٹن	۲۷٫۳	۷۹٫۷	۱۴۳	۱۸۶	۳۰۰٫۱
پیٹرولیم مصنوعات (صاف شدہ)	"	۲	۵۸	۱۷۱	۲۴۱	۳۵۵٫۶
سوتی کپڑا³	کروڑ میٹر	۴۲۱٫۵	۶۳۸٫۸	۷۷۷٫۲	۹۶۳٫۸	۱۱۹۵٫۰
چینی (اکتوبر تا ستمبر)	لاکھ ٹن	۱۱٫۳	۳۰٫۳	۳۷٫۴	۵۱٫۴۸	۶۰٫۲۰
بجلی کی پیداوار	کروڑ کلوواٹ گھنٹے	۵۳۰	۱۶۹۰	۵۵۸۰	۱۱۰۸۰	۱۷۰۰۴

* لگاتار
** ۸۶-۱۹۸۵ء کے لیے

۱۔ پالش شدہ فولاد ۷۱-۱۹۷۰ء تک
۲۔ ریلوے ورکشاپوں کی Excluded output
۳۔ بشمول Blended اور ملے جلے سوت کے کپڑے کے ۷۱-۱۹۷۰ء سے آگے کے لیے

معیشت کی تیز رفتار ترقی میں معاون سہولتیں میں علی، ٹرانسپورٹ، بھاری انجینیرنگ سامان بنانے والی صنعتیں، فولاد، کیمیاوی کھاد، اہم صنعتی کیمیکلز، بنیادی مقرر ادویہ، مصنوعی ریشے بنانے والی صنعتیں شامل تھیں۔ اس مدت میں سیمنٹ اور کاغذ بنانے کے کارخانے کے لیے مشینری بنانے کے کارخانے بھی لگائے گئے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء سے ۶۱-۱۹۶۰ء تک کے دس برسوں میں منظم سیکٹر کی صنعتی پیداوار قریب قریب دوگنی ہو گئی۔

تیسرے منصوبے اور مابعد سالانہ منصوبوں کے دوران صنعتی ترقی کی رفتار قدرے غیر یکساں رہی۔ تیسرے منصوبے کے آخری سال سے تقریباً تین چار برس تک معیشت کو کافی دباؤ اور مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجے میں صنعتی پیداوار کی شرح ترقی میں شروع میں آہستگی اور ازاں بعد تیزی سے گراوٹ آئی۔ اس کی کئی وجوہات تھیں جن میں سے سب سے اہم وجوہ پاکستان کے ساتھ ۱۹۶۵ء کی جنگ اور ۶۶-۱۹۶۵ء اور ۶۷-۱۹۶۶ء کی خشک سالیاں تھیں۔ خام مال اور اجزا کی کمی سے بہت سی صنعتیں متاثر ہوئیں۔ ۱۹۶۵ء کے بعد غیر ملکی امداد میں بھی کمی آئی۔ تیسرے منصوبے کی مدت کی ایک اہم بات یہ تھی کہ چند صنعتوں میں پیداواری نشانے ۶۶-۱۹۶۵ء میں پورے کر لیے گئے۔ لیکن کچھ

دوسری اہم صنعتوں، مثال کے طور پہ فولاد اور کیمیادی کھاد کی صنعتوں میں نشانوں سے کافی کم پیداوار حاصل ہوئی۔ اس مدت میں صنعتی ڈھانچوں کو متنوع بنانے میں بھی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ کان کنی، بجلی کی پیداوار اور لوہے اور فولاد جیسے اہم شعبوں میں خود اپنی کوششوں سے نصب شدہ صلاحیت میں مزید توسیع بھی ممکن ہوگئی۔ ریل، روڈ ٹرانسپورٹ اور مواصلات

مدت میں صنعتی ڈھانچہ میں خود انحصاری حاصل کرلی گئی۔

پانچویں منصوبے میں مرکزی اہمیت کے صنعتوں کی پیداوار میں تیز رفتار ترقی نیز برآمدی مال اور عوامی کھپت کی اشیاء کی پیداوار میں اضافے پر توجہ مرکوز کی گئی۔ لیکن ۶ فیصد کی شرح ترقی کا نشانہ حاصل نہیں کیا جاسکا کیوں کہ جن مفروضات کی بنا پر منصوبہ تیار کیا گیا تھا وہ غلہ کیمیاوی کھاد اور تیل کی قیمتوں میں کافی زیادہ اضافے کے سبب الٹ پلٹ گئے۔ نومبر ۱۹۷۳ء

تو یہ ہے کہ بجلی کی کمی ہی صنعتی پیداوار میں رکاوٹ کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ کپڑا ملوں میں محنت کشوں میں ایک طویل مدت تک بے چینی اور مانگ کی کمی، پٹ سن کی مصنوعات میں خام مال کی کمی، فولاد کی صنعت میں کوکنگ کوئلے کی قلت اور فولاد استعمال کرنے والی بیشتر صنعتوں میں موزوں کوالٹی کے فولاد کی ناکافی دستیابی کچھ دوسری وجہیں تھیں جن کا اثر پیداوار پر پڑا۔

چھٹے منصوبے میں صنعتی پیداوار میں ترقی کا نشانہ سات فیصد سالانہ تھا۔ لیکن صرف ۵ء۵ فیصد کے لگ بھگ شرح ترقی ہی حاصل کی

صنعت کاری کی پالیسی پر عمل پیرائی کا آخری مقصد روزگار کے کافی زیادہ مواقع پیدا کرنا اور قیمتی زرمبادلہ کمانا ہے جو صنعتی ترقی کی تیز رفتار کو برقرار رکھنے کے لیے اشد ضروری ہے۔

کے شعبوں کے لیے ریلوے انجن اور ڈبوں نیز ساز و سامان کی بہم رسانی میں خود کفالت حاصل کرلی گئی۔ بہت سی روایتی صنعتوں کے لیے مشینری بنانے کے لیے ڈیزائن اور انجینئرنگ کی صلاحیتوں میں توسیع، پیٹرولیم، کیمیاوی کھاد، پیٹرو کیمیکلز، فولاد اور غیر آہن آمیز دھاتوں کی صنعتوں کی صلاحیت پیداوار میں قابلِ ذکر ترقی ہوئی۔ معیشت کی حالت پھر سے بہتر ہونے کا سلسلہ ۱۹۶۹ء میں شروع ہوا۔

چوتھے منصوبے کے دوران صنعتی شعبے میں پیداوار اور سرمایہ کاری دونوں لحاظ سے کارکردگی توقعات سے کم رہی۔ لیکن ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ مرکب فولاد، المونیم، آٹوموبائل، ٹائروں، پیٹرولیم ریفائنری مصنوعات، الیکٹرانکس، مشینی آلات، ٹریکٹروں اور بجلی کے بھاری ساز و سامان کی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا۔ اس

کے تیل کے بحران نے افراطِ زر کی ایسی صورت حال پیدا کردی جیسی پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ ان وجوہات کے سبب خوراک اور توانائی میں ایک حد تک خود مکتفی ہونے پر زور دینا ضروری ہوگیا۔

چھٹے منصوبے میں پہلے سے پیدا شدہ صلاحیتوں کا بہترین استعمال کرنے پر زور دیا گیا۔ جو نئی صلاحیتیں پیدا کی گئیں وہ بہت سی صنعتوں کے مقررہ نشانوں کے مطابق ہی کی گئیں۔ فولاد، سیمنٹ، غیر آہن آمیز دھاتوں، کیمیاوی کھاد وغیرہ کی قسم کی کچھ اہم صنعتوں میں پیداوار کے نشانے پورے نہیں کئے جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ صنعتی پیداوار کی ترقی کا نشانہ حاصل نہیں کیا جاسکا۔ بہت سی صنعتوں کی پیداوار بجلی کی ناکافی اور غیر مسلسل سپلائی کی وجہ سے متاثر ہوئی حقیقت

جاسکی جو گذشتہ تین دہائیوں کی چھ فیصد کی رجحانی شرح ترقی سے بھی کم تھی۔ منصوبے کی مدت میں شعبۂ انجینئرنگ کی بعض صنعتوں میں ٹیکنالوجیکل ترقی کی اہمیت پر کافی زیادہ زور دیا گیا۔ برقی سیکٹر کے لیے مطلوبہ ساز و سامان کے واسطے پیداواری ٹیکنالوجی کو باقاعدہ طور پر بہتر بنایا گیا۔ اس منصوبے کی ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اب ۱۳۵۰ ٹی پی ڈی فرٹیلائزر یونٹوں اور فولاد کے کارخانوں کے لیے ۳۲۰۰ مکعب میٹر کی صلاحیت والی انجن بھٹیوں کے لیے ساز و سامان اندرون ملک ہی تیار کیا جارہا ہے۔ مشینی آلات، کنزیومر الیکٹرانکس اور مواصلاتی ساز و سامان سے متعلق

متعدد صنعتوں میں پیداوار کے نشانے حاصل کر لیے گئے۔ اس منصوبے کی مدت میں غیر ملکی زرِ مبادلہ کی سخت مشکل نے بھی ہمارے مسائل میں اضافہ کردیا۔ ۱۹۷۹ء کے تیل سے متعلق بحران اور اس عرصے میں مختلف ریاستوں میں سوکھا پڑجانے سے منصوبے کے آغاز میں ہی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

ساتویں منصوبے میں نہ صرف صنعتی ترقی کی رفتار تیز کرنے کی ضرورت کو بلکہ ایسی اہم نوعی تبدیلیاں لانے کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا گیا ہے جن صنعتوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے قول سے انحراف نہیں ہے۔ نہ ہی اس کی غلط تشریح کرکے یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم برگزیدہ طبقے کی اشیائے کھپت پر توجہ دے رہے ہیں۔ کیونکہ جہاں ہم مستقبل میں المونیم، کیمیاوی کھاد، پلاسٹک کی مصنوعات، الیکٹرانکس، ٹیلی کمیونی کیشنز کے سازوسامان وغیرہ کی صنعتوں میں اہم تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ وہاں عوامی کھپت کی اشیاء کی پیداوار کی رفتار ترقی بھی تیز تر کرنا چاہتے ہیں۔ صنعت کاری کی پالیسی پر عمل پیرائی کا آخری مقصد

اگر ترقی کے عمل کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ پیداوار کی شعبہ وار ترکیب کو بدلا نہ جاتا تو صنعتی ترقی کے عمل کو شروع کرنا ممکن نہ ہوتا۔ ہماری صنعتی ترقی کے اس تیکنیکی جزو میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ مجموعی اندرون ملک پیداوار (GDP) میں زراعت اور ملحقہ شعبوں کا حصہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۵۸٫۹ فیصد سے دھیرے دھیرے گھٹتا ہوا ۱۹۸۴-۸۵ء میں ۳۶٫۹ فیصد ہوگیا ہے اور موجودہ صدی کے آخر تک اس کے مزید گھٹ کر ۲۵٫۱ فیصد ہو جانے کی امید ہے۔ صنعتی شعبے بشمول خدمات، بجلی، ٹرانسپورٹ وغیرہ کا حصہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۴۱٫۱ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۸۴-۸۵ء (یعنی چھٹے

حکومت لگاتار اس بات پر زور دیتی رہی ہے کہ خود انحصاری اور خود کفالت حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہے۔

منصوبے کے اختتام پر) میں ۶۳٫۱ فیصد ہوگیا ہے۔ اور اس کے ۱۹۸۹-۹۰ء تک ۶۳٫۷۱ فیصد سے بھی بڑھ جانے کی توقع ہے۔ موجودہ صدی کے اختتام تک یہ غالباً ۷۴٫۵ فیصد ہو جائیگا۔

ہمارے پنجسالہ منصوبوں کی صنعتی حکمت عملی کی اہم ترین بات یہ رہی ہے کہ آزادی کے وقت ہم نے جو صنعتی ڈھانچہ ورثے میں پایا تھا اسے وسیع تر اور متنوع بنایا جائے۔ صنعتی پیداوار میں خوراک اور کپڑے جیسے روایتی پیداواری شعبوں کا حصہ کم ہوگیا اور کیمیکلز اور انجنیئرنگ جیسے نئے شعبوں کا حصہ قابلِ لحاظ حد تک بڑھ

روزگار کے کافی زیادہ مواقع پیدا کرنا اور کافی زرِ مبادلہ کمانا ہے جو صنعتی ترقی کی تیز رفتاری کو برقرار رکھنے کے لیے اشد ضروری ہے۔

ترقی کی تکنیکی وسعتیں

اقتصادی ترقی کا عمل اقتصادی ترقی کے ڈھانچے میں شعبہ جاتی و ادارہ جاتی تبدیلیوں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے جڑا ہوا ہے۔ پیداوار کی شعبہ وار ترکیب میں تبدیلی اور مینوفیکچرنگ سرگرمیوں کا متنوع بنایا جانا نیز ٹیکنالوجی کی پیش رفت ہماری معیشت کی جدید کاری کے عمل کا ہی ایک حصہ ہیں۔

سے اہلیت میں اضافہ ہو اور ایک لچکدار صنعتی ڈھانچہ تشکیل دیا جاسکے جو دنیا بھر میں چلنے والی تبدیلی کی ہواؤں کے مطابق اپنے بادبانوں کو درست کرسکے۔ رواں صنعتی پالیسی ماضی کے تجربات پر مبنی ہے۔ اور ایسے صنعتی بنیاد کو مضبوط بنانے کے طویل المدت تناظر، قومی ترجیحات اور عالمی معیشت کی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی چنوتیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وضع کیا گیا ہے۔

صنعتی پالیسی کے تناظر میں ٹیکنالوجی اور بندوبست کا درجہ بلند تر بنانا، کفایت شعاری لانا، زیادہ اہم مصنوعات کی تیاری اور برآمدات میں اضافے کی سرگرم کوششیں شامل ہیں۔ جو راستہ متعین کیا گیا ہے اس کا مطلب پبلک سیکٹر کو محرکِ اصلی کا رول دینے اور چھوٹے پیمانے کی

گیا۔ ترقی کی رفتار تیز ہونے کے ساتھ ساتھ معیشت کی جدید کاری کا عمل بھی شروع ہوا۔ اس کے نتیجے میں صنعتی مصنوعات اور خدمات کی کوالٹی بہتر ہو گئی اور ان کی مانگ میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا۔ اس ترقی کے نتیجے میں صنعتی ڈھانچے کی دھیرے دھیرے از سر نو تشکیل کی گئی جس میں زور روایتی صنعتوں سے ہٹ کر بنیادی دھاتوں، کیمیاوی کھادوں اور صنعتی مینوفیکچرروں پر ہو گیا اور ٹیکنالوجی پر مبنی نئی نئی صنعتوں کا حصہ رفتہ رفتہ زیادہ ہو گیا۔ جیسا کہ گوشوارہ نمبر ۵ سے ظاہر ہے۔

ملک میں صرف پانچ پبلک کارخانے تھے جن پر کل ۲۹ کروڑ روپے کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ مارچ ۱۹۸۶ء میں پبلک کارخانوں کی تعداد ۵۰۳۴۱ کروڑ روپے کے سرمائے کے ساتھ ۲۲۵ تک پہونچ گئی تھی۔ لیکن پبلک سیکٹر کے کارخانوں کو کچھ خاص مسائل درپیش رہے ہیں جن کی وجہ سے ان میں سے بہت سے کارخانوں کی کارکردگی خراب رہی ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں کئے گئے مختلف اقدامات کے نتیجے میں پبلک سیکٹر کی کارکردگی میں نمایاں بہتری نظر آرہی ہے۔

معیشت کی ٹیکنالوجی سے متعلق ضروریات

گوشوارہ نمبر ۵

۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۰ء کے دوران صنعتی ڈھانچے میں ہونے والی تبدیلیاں

صنعتی پیداوار کے اشاریے *

سیکٹر (یا شعبہ)	۱۹۵۱ء	۱۹۶۰ء	۱۹۷۰ء
خوراک	۱۵٫۷	۱۴٫۲	۱۳٫۱۲
کپڑا	۴۷٫۰	۳۱٫۹	۲۱٫۵
ربڑ، کیمیکل اور پٹرولیم	۱۱٫۷	۱۲٫۹	۱۸٫۱۸
غیر فلزاتی معدنیات	۲٫۸	۴٫۵	۴٫۱۱
بنیادی دھاتیں	۱۰٫۴	۸٫۷	۱۰٫۹
انجینئرنگ	۸٫۳	۱۹٫۷	۲۵٫۹۱
دیگر تمام	۴٫۱	۸٫۱	۶٫۲۸
کل	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۰۰

* کان کنی، پتھر کی کانوں کی کھدائی اور بجلی کو چھوڑ کر

ملک کی معاشی ترقی میں پبلک سیکٹر نے ایک بڑے عنصر کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ پہلے منصوبے کے شروع ہونے کے وقت

کو پورا کرنے اور جدید کاری کی رفتار تیز کرنے کے لیے دیسی ساز و سامان استعمال کرنے کی جانب کچھ ترقی ہوئی ہے۔ ۱۹۵۸ء کے سائنٹی فک

پالیسی کے ریزولیوشن میں اس سمت میں کی جانے والی قومی کوششوں کے لیے رہنمایانہ خطوط متعین کئے گئے ہیں۔ حکومت لگاتار اس بات پر زور دیتی رہی ہے کہ خود انحصاری اور خود کفالت حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہے۔ تکنیکی، بنیادی اور تنظیمی تعلیم، ڈیزائن سازی اور ڈیزائنوں کی بنیادی اور اطلاقی تحقیق و ترقی کے لیے ایک ٹھوس ادارہ جاتی بنیاد قائم کی گئی ہے۔

مجموعی قومی پیداوار (GNP) کی نسبت سے ۸۵-۱۹۸۴ء میں سائنس اور ٹیکنالوجی پر اخراجات ایک فیصد تھے جبکہ ۵۹-۱۹۵۸ء میں یہ صرف ۰٫۲۳ فیصد تھے۔ یہ عالمی اوسط تناسب جو تین فیصد سے زائد ہے، کافی کم ہے۔ ہندوستان میں ریسرچ اور ڈیولپمنٹ کا خرچ ایک ہزار کی آبادی پر صرف ۲٫۶ امریکی ڈالر کے بقدر ہے جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں یہ ایک ہزار کی آبادی پر ۱۱۰ امریکی ڈالر سے بھی زیادہ ہے۔ ۱۹۸۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں ایک ہزار کی آبادی پر ۲٫۹ سائنسداں، انجینئر اور ٹیکنیشین ہیں۔ ان میں سے فی ہزار آبادی یہ صرف ۰٫۲ ریسرچ اور ڈیولپمنٹ یا اس سے متعلق کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ کچھ ترقی یافتہ ممالک بلکہ کچھ دوسرے ترقی پذیر ملکوں کے مقابلے میں یہ تعداد بہت کم ہے۔ لہذا اس تعداد میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔

ریسرچ کے لیے بنیاد

چونکہ معاشی ترقی کی ضرورتیں مختلف قسموں اور مختلف نوعیتوں کی ہیں اس لیے مختلف شعبوں مثلاً معاشیات، اعداد و شمار، انسانیات، بائیو ٹیکنالوجی، خلائی سائنس، ایٹمی توانائی، دفاعی ٹیکنالوجی وغیرہ میں مطالعہ و تحقیق کے لیے

ایک ٹھوس بنیاد قائم کی گئی ہے۔ جنوری ۱۹۸۳ء میں ٹیکنالوجی سے متعلق جس پالیسی کا اعلان کیا گیا تھا وہ کثیرالنواع اور پیچیدہ معاملوں پر رہنمائی فراہم کرنے کی غرض سے مرتب کی گئی تھی اور اس کی تشکیل میں اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ ہندوستان سرمائے کا قلت والا ملک ہے۔ دوسری باتوں کے علاوہ اس پالیسی کا ایک اہم مقصد ملک کے قدرتی وسائل، خصوصاً انسانی وسائل کے بہترین استعمال کو یقینی بنانا ہے۔ اپنی ترقی کے اس مثبت پہلو کے باوجود ہم اپنی ٹیکنالوجی سے متعلق ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ابھی تک غیر ملکی ذرائع پر انحصار رکھتے ہیں۔ غیر ملکی مالیات کے معاملے میں بھی ہمارا نصب العین خود انحصاری حاصل کرنا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ غیر ملکی امداد پر انحصار میں کمی کی جانی چاہیئے،

برآمدات کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔ ہماری ضرورت کا طرح طرح کا سامان ملک میں ہی تیار کیا جانا چاہیئے اور درآمدات میں کمی کی جانی چاہیئے۔ گذشتہ تیس برسوں میں ملک نے اس سمت میں نمایاں پیش رفت کی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ صنعتوں کے لیے درکار سازوسامان اب بڑی حد تک ملک کے اندر ہی تیار کیا جاتا ہے۔ پراجیکٹوں سے متعلق مشاورت، ڈیزائن اور انجینئرنگ اور پراجیکٹوں پر عمل درآمد کرانے کی صلاحیت ایک ایسی حد تک پیدا کر لی گئی ہے کہ اب ہم یہ خدمات دوسرے ضرورت مند ملکوں کو بھی مہیا کر سکتے ہیں۔ حال ہی میں تیل کی قیمتوں میں کچھ گراوٹ آئی ہے لیکن پھر بھی یہ کافی زیادہ ہیں۔ برآمدات کے لیے بین الاقوامی منڈیوں میں حالات زیادہ مشکل صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ایک طرف بین الاقوامی مندہ ہماری برآمداتی منڈیوں کی حوصلہ شکنی کر رہا ہے اور دوسری طرف بعض ملکوں کی اپنی دیسی صنعتوں کو تحفظ عطا کرنے کی پالیسی بھی ہمیں ان کی منڈیوں تک نہیں پہنچنے دیتی۔

اس صورتِ حال کا علاج ہم نے یہ نکالا ہے کہ ہم درآمد کی جانے والی اشیاء خود اپنے ملک میں بنانے اور اپنی برآمدات کو بڑھانے کے لیے موثر اقدامات کر رہے ہیں۔

لبِ لباب

ہماری صنعتی کوششوں میں اب تک کئی محاذوں پر جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں وہ یقیناً قابلِ تعریف ہیں۔ ہم ایک چھوٹی سی صنعتی بنیاد سے کام شروع کر کے اپنے صنعتی ڈھانچے میں اہم تبدیلیاں لائے ہیں اور ہماری صنعتی پیداوار بھی تیزی سے بڑھی ہے۔ صنعتی ڈھانچے کو ہم نے اس قدر متنوع بنایا ہے کہ ملک میں سبھی بنیادی، درمیانی اور کنزیومر انڈسٹریاں قائم ہو گئی ہیں۔

دوسرے اور تیسرے منصوبوں میں صنعتی ترقی کو پبلک سرمایہ کاری میں سریع اضافے اور باہر سے درآمد کیا جانے والا سامان خود اپنے ملک میں تیار کرنے کے انتظامات سے تقویت و تحریک حاصل ہوئی۔ لیکن تیسرے منصوبے کے بعد کے عرصے میں یہ دونوں محرکات کافی سست پڑ گئے۔ وسائل کی مشکلات پبلک سرمایہ کاری پر اثر انداز ہوئیں۔ وسائل کی مشکلات سے پیدا ہونے والی مجبوریوں کا مقابلہ مانگ کے متبادل مواقع سے استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے ایک متحرک اور اہلِ صنعتی سیکٹر کے ذریعے کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اتنا اہل صنعتی سیکٹر موجودہ نہ تھا۔ فی کس آمدنی کی سست شرح اضافہ کی وجہ سے یہ مشکلات اور بڑھ گئیں۔ مختلف وجوہ کی بنا پر غیر ملکی مقابلے کے خلاف تحفظ مہیا کرنا اور معیشت کے اندر مقابلے کو کم کرنا ضروری ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی صنعت کو جدید کاری، پیداواریت میں اضافے، اور غیر استعمال شدہ صلاحیت کے تقاضوں کو ملتوی کرنا پڑا اور اس طرح تحفظ کی اونچی قیمت دینی پڑی۔ ہماری ترقی کی صنعتی وسعتوں میں یہ سب سے بڑا منفی نکتہ ہے۔

خود انحصاری اور خود کفالت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ہم بیرونِ ملک ہونے والی ترقیوں، بالخصوص ٹیکنالوجی کے میدان میں ہونے والی بیش رفتوں کے ساتھ نہ چل سکے۔ اس کے نتیجے میں ہماری صنعتوں اور مصنوعات میں کافی فرسودگی پیدا ہو گئی اور ان کے اندر غیر ملکی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ رہی۔ صنعتی ڈھانچے کو نمایاں طور پر متنوع اور ہمہ جہت بنایا گیا ہے۔ ہندوستان دنیا کی بڑی صنعتی اقوام میں شمار کیا جانے لگا ہے۔ ملک میں لگاتار معاشی ترقی کی بنیاد ڈال دی گئی ہے۔ معیشت کی جدید کاری کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ صنعتی پیداوار میں کافی ترقی ہوئی اگرچہ یہ اور بات ہے کہ یہ مقررہ نشانوں کے مطابق نہیں ہے۔ صنعتی ڈھانچے کی بتدریج تشکیل نو کے ساتھ روایتی صنعتوں سے توجہ ہٹا کر بنیادی اور بھاری صنعتوں اور ابھرتے ہوئے اعلیٰ ٹیکنیکی علاقوں پر مبذول کی جا رہی ہے۔ نہ صرف روایتی صنعتوں میں بلکہ نہایت پیچیدہ شعبوں میں بھی کسی حد تک خود کفالت حاصل کی جا چکی ہے۔ لیکن پھر بھی ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اب جبکہ آئی ڈی آر ایکٹ ۱۹۵۱ء کو نرم اور معاشی و مالی پالیسیوں کو اعتدال پسندانہ بنا دیا گیا ہے، نیز پالیسی کی حالیہ تبدیلیوں کے ساتھ جدید ٹیکنالوجی پر زور دیا جا رہا ہے، مستقبل میں صنعتی ترقی کی رفتار تیز تر ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ●

ڈی۔ ایچ۔ پائی۔ پانڈیکر

چھٹا معجزہ

ہمارے اس خصوصی شمارے میں ہر ایک مصنف نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا ہماری کارگزاری بہتر ہو سکتی تھی۔ مصنف سری پانڈیکر نے بھی جو فیڈریشن آف انڈین چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے سیکریٹری جنرل ہیں۔ ذیل کے مضمون میں یہ معاملہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ معیشت جتنی زیادہ 'پبلک' (سرکاری) ہوگی اُس کی اتنی ہی کم ترقی ہونے کا امکان ہے۔ حکومت نے برآمدی و درآمدی سرگرمیوں کو منضبط کرنے کے لیے جو بعض اقدامات کئے ہیں وہ اُن پر خوش نہیں ہیں۔ انھوں نے جن اقدامات کا سجھاؤ دیا ہے اُن سے ایک معجزہ رونما ہونے کی اُمید پیدا ہوئی ہے، جس سے بھارت، جاپان اور ایشیا کے اُن دیگر چھوٹے ممالک کی صف میں آجائے گا جنھوں نے برآمدی و درآمدی منڈیوں پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ (ایڈیٹر)

یقیناً ہم بہت آگے ہیں۔ "جی۔ این۔ پی" (کل ملکی پیداوار) جیسے مختصر اعداد و شمار کے پیمانوں سے دیکھا جائے تو چالیس برس پہلے ہم جتنا مال اور سروسیں تیار کرتے تھے اُن کے مقابلے میں آج ہماری پیداوار کم از کم چار گنا ہو گئی ہے۔ ان اعداد و شمار کے حق میں اس سے بھی زیادہ کئی نمایاں باتیں دیکھنے میں آرہی ہیں۔ دیہات پر نگاہ دوڑائیے وہاں آپ عام طور پر ہرے بھرے کھیت دیکھیں گے ایک خوش پوش کسان دکھائی دے گا جس کے کندھے پر ایک ٹرانزسٹر لٹک رہا ہوگا اور کوئی تو شاید ایک ٹریکٹر میں بیٹھ کر گھر لوٹ رہا ہوگا۔ شہروں پر نظر ڈالئے۔ عمارتوں کے نقشے ہی بدل گئے ہیں۔ سڑکیں زیادہ کشادہ ہو گئی ہیں اور موٹر گاڑیاں اور بسیں وغیرہ اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ اکثر آمد و رفت کا سلسلہ رُک جاتا ہے نئی خوشحالی ہر جگہ دیکھنے میں آرہی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملک میں ترقی ہوئی ہے۔

اس پر بھی سوالات دریافت کئے جاتے ہیں کہ کیا ہم اس سے زیادہ ترقی نہیں کر سکتے تھے؟ بیروزگاروں کی تعداد کافی ہے اور اس سے بھی زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جو نیم روزگار ہیں۔ ہمارے ہاں اُجرتیں امریکہ کے مقابلے میں غالباً ۵۰ گنا کم ہیں۔ کینیڈا میں جتنی توانائی کی کھپت ہوتی ہے اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں ۲ فیصد توانائی کی کھپت ہوتی ہے اور سنگاپور کے مقابلے میں فولاد کی کھپت ۳ فیصد ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ہر ۷۰۰ اشخاص کے لیے ایک موٹر کار ہے جب کہ امریکہ میں ہر دوسرے شخص کے لیے ایک کار ہے۔

نظریاتی اُمور کا دباؤ

۱۹۶۰ء کی ابتدائی دہائی میں کوریا اور بھارت

کی فی کس آمدنی تقریباً یکساں تھی۔ آج اس کی فی کس آمدنی کم از کم ۱۰ اگنا ہو گئی ہے۔ اُنہی برسوں میں صنعتی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ملکوں میں ہمارا مقام کم از کم دسواں تھا جو آج کم ہو کر ۲۵ واں رہ گیا ہے۔ عالمی تجارت میں ہمارا حصہ ۹ر۱ فیصد سے کم ہو کر ۵ر۰ فی صد رہ گیا ہے۔ ہم اعلیٰ ترقی پذیر ملکوں کے ساتھ قدم ملا کر کیوں نہیں چل سکے؟

زیادہ توجہ نہیں دی گئی تھی۔ بین الاقوامی تنظیموں کی جانب سے خبردار کرنے کے باوجود ترقی کی شناخت صنعتکاری کے ساتھ کی گئی۔ درحقیقت ایک اعلیٰ افسر نے اس حد تک بڑ ہانکی تھی کہ "ہم اناج کی درآمد کریں گے اور فولاد کی برآمد کریں گے۔" ہم نے اناج درآمد کیا۔ جو سال میں تقریباً دس لاکھ ٹن تھا — اور ہم نے فولاد بھی درآمد کیا۔

زراعت پر ہمارا بہت زیادہ دارومدار ہے اور ہم زیادہ اناج پیدا کرنے

منتقل کیا جائے یا بعض بنجر اور ویران زمینوں پر تجارتی طور پر کاشت کی جاسکتی ہے بشرطیکہ تلہنوں کو صنعت کا رتبہ دیا جائے۔

برآمد کے لیے پیداوار

خوردنی تلہنوں اور دالوں میں ناکامی کا حساب کروڑوں ڈالروں میں لگایا جاسکتا ہے۔ کچھ ایسے شعبے ہیں جن میں نقصان اس قدر نمایاں نہیں ہے۔ ہم ملکی کھپت اور برآمدات کے لیے زیادہ سبزیاں اور پھل پیدا کرسکتے ہیں۔ بلاشبہ برآمد سہل نہیں ہے۔ برآمد کا مطلب ہے اعلیٰ کوالٹی، برآمد کا مطلب ہے دل کش

ہماری ترقی کی پالیسی درُست تھی۔ لیکن پالیسی اور اُس کی تعمیل کے درمیان سیاست گھس آئی۔ اب زور نتائج کے بجائے طریقوں پر دیا جانے لگا۔ سوشلزم پالیسی کی حتمی کسوٹی بن گیا۔

ہماری ترقی کی پالیسی درُست تھی۔ لیکن پالیسی اور اُس کی تعمیل کے درمیان سیاست گھس آئی۔ اب زور نتائج کے بجائے طریقوں پر دیا جانے لگا۔ سوشلزم پالیسی کی حتمی کسوٹی بن گیا۔ اور یہ پالیسی زیادہ سوشلسٹ ہوتی اگر محض اس سے زیادہ سرکاری کنٹرول عمل میں آتے، اگر محض اس سے پبلک سیکٹر کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جاتا، اگر محض اس سے بڑے بڑے یونٹوں کا قیام رُک جاتا اور اگر محض اس سے کمپنیوں یا افراد پر بھاری ٹیکس عائد کئے جاتے۔ اس میں کوئی تعجب نہیں کہ ہم ایک ایسے نظام میں دھنس گئے ہیں جس میں زراعت، صنعت اور بنیادی ڈھانچے پر بہت زیادہ لاگت آتی ہے۔ معیشت ابھی تک ان نظریاتی امور کے دباؤ کے تحت ہے۔

۶۰ کی دہائی کے وسط تک زراعت کی جانب

اور زیادہ اناج برآمد کرنے کی امکانی قوت رکھتے ہیں۔ خوش قسمتی سے سبز انقلاب نے ۶ کی دہائی کے وسط سے پلڑا پلٹ دیا ہے گو ملک ۸ کی دہائی میں ہی واقعی خود کفیل ہوا ہے۔ زرعی ترقی میں یہی زبردست تعاون دیکھنے کو ملتا ہے مثلاً ہمارے ہاں کافی اناج ہوتا ہے لیکن کافی خوردنی تیل اور دالیں نہیں ہوتیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سال میں تقریباً ۸ ارب روپے کی مالیت کا زرمبادلہ باہر چلا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں تکنیکی دریافت ضروری ہے لیکن وہ ابھی عمل میں نہیں آئی۔ اس اثنا میں چونکہ اناج کی پیداوار فاضل ہے اور تلہنوں کی پیداوار کم ہے۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ ۲۰ لاکھ ہیکٹیئر زمین کو ایک سیکٹر سے دوسرے سیکٹر میں

پیکنگ، برآمد کا مطلب ہے وقت پر مال پہنچانا اور برآمد کا مطلب ہے واجبی قیمت گرم سیر خطے میں واقع ہونے سے ہمیں ایک خاص فائدہ بھی ہے۔ جب امریکہ اور یورپ موسم سرما میں منجمد ہو جاتے ہیں ہمارے ہاں موسم بہار ہوتا ہے۔ ہم پھول، پھل، سبزیاں اور گوشت برآمد کرسکتے ہیں۔ یہ صرف اُس صورت میں ممکن ہے جب ہم برآمدات کے لیے یہ اشیاء پیدا کریں اور اس کے لیے ٹرانسپورٹ اور "پراسس" کرنے کی ضمنی سہولیات مہیا کی جائیں۔ بہت سے لوگوں کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ اگر سہولیات فراہم کی جائیں تو ہماری زرعی اجناس کی برآمد ۳ کھرب ۵۰ ارب روپے سے بڑھ سکتی ہے۔

یعنی رواں سال میں وہ ہماری کل برآمد کا تقریباً تین گنا ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ برآمدی فارموں کو تجارتی کمپنیوں کی لائنوں پر چلایا جائے۔ موجودہ تنظیم میں جس بڑے عنصر کا اضافہ کیا جائے وہ ہے حسنِ انتظام — یہی سبب فرق کا باعث ہے۔

خامیوں کے باوجود یہ سچ ہے کہ ہم خود کفیل ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں فاضل اناج کا اس قدر ذخیرہ ہے کہ دو مسلسل خشک سالیوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم اس امر کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ سبز انقلاب پہلے ہی نحیف ہو کر دم توڑ رہا ہے۔ گذشتہ تین برسوں میں اناج کی پیداوار ۱۵ کروڑ ٹن کے آس پاس آکر رک گئی ہے۔ ہماری فی ہیکٹیئر پیداوار کم ہے۔ چاول کی پیداوار جاپان کے مقابلے میں نصف سے کم ہے۔ گیہوں کی پیداوار فرانس کے مقابلے میں ایک تہائی ہے اور روئی کی پیداوار چین کے مقابلے میں ایک چوتھائی ہے۔ جس نئی فارم ٹیکنالوجی نے ہمیں ۶۰ کی دہائی میں ایک یقینی تباہی سے بچایا تھا وہ پہلے ہی زائد المیعاد ہو چکی ہے۔ اگر ہمیں دوسرے ملکوں کے مقابلے پر آنا ہے تو ہمیں حیاتیاتی ٹیکنالوجی (بائیو ٹیکنالوجی) کو

خامیوں کے باوجود یہ سچ ہے کہ ہم خود کفیل ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں فاضل اناج کا اس قدر ذخیرہ ہے کہ ہم دو مسلسل خشک سالیوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم اس امر کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ سبز انقلاب پہلے ہی نحیف ہو کر دم توڑ رہا ہے۔

اختیار کرنا ہوگا۔ لیکن ہمیں اس کی آگاہی بھی نہیں ہے۔

دو رکاوٹیں

صنعت میں ہمارا آغاز بہت اچھا تھا۔ درآمدی نعم البدل ایک پالیسی کے طور پر تقریباً ایک بھارتی جدت معلوم ہوتا تھا اور اس پر بخوبی کام ہوا۔ ۶۰ کی دہائی کے وسط تک صنعتی پیداوار میں بتدریج ۷ فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا۔ یہ شرح افزائش اس امر پر غور کرتے ہوئے قطعاً کم نہیں تھی کہ جب ملک آزاد ہوا ہمارے ہاں کارخانوں کی بڑی تعداد تھی جن میں ۲ لاکھ سے زیادہ مزدور کام کرتے تھے۔ درآمدی نعم البدل سے زیادہ تیزی سے کام ہونے لگا اور کئی قسم کی صنعتیں وجود میں آئیں۔ اب بھارت کپڑے سے لے کر ہوائی جہاز تک تقریباً ہر شئے تیار کرتا ہے۔ بہت کم ملک ایسا کر رہے ہیں۔ یہ ایک اطمینان بخش خیال ہے۔ لیکن اس سے دو زبردست رکاوٹیں بھی پیدا ہوئی ہیں۔ اول، درآمدی نعم البدل کی پالیسی پر اندھادھند عمل کیا گیا اور اس کے نتیجے میں بہت سے مال کی پیداواری لاگت میں بھاری اضافہ ہوا۔ صنعت کو بقا حاصل ہوئی۔ دراصل اس نے

بھاری منافع کمایا۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ اُسے درآمدات سے تحفظ مل گیا۔ لیکن اس میں نقصان اُٹھایا صارفین نے۔ کیوں کہ اُنھیں اُن بیشتر اشیاء کے لیے اُس سے دُگنی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے جو وہ دوسرے ملکوں میں اُنھیں خریدنے کے لیے دیتے ہیں۔ قدرتاً ان اشیاء کو کبھی برآمد نہیں کیا جا سکتا۔ درآمدی نعم البدل برآمدات کی حالت میں اُن کی برآمد کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

دوئم، جس صنعتی پالیسی پر عمل ہوا اُس سے ملکی منڈیوں میں بھی صنعت کی مقابلے کی سکت کمزور پڑ گئی۔ ہماری صنعتی لائسنسنگ پالیسی نے مختلف کارخانہ داروں کے مابین منڈی کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جس سے ہر ایک کو ایک ایسا یقینی حصہ مل گیا جو دوسرا نہیں لے سکا۔ ہر مال تیار کرنے والا عملاً ایک اجارہ دار بن گیا، حتیٰ کہ مال تیار کرنے والوں کی تعداد بھی بہت کم نہیں تھی۔ بدتر بات یہ تھی کہ لائسنس یافتگان کو جو پیداواری صلاحیتیں عطا کی گئیں وہ اس قدر کم تھیں کہ اُن کے یونٹ پیداواری لاگت کو کم نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ایک مستقل رکاوٹ تھی جس سے صنعت کی لاگت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ بعد میں اس پالیسی کو فراخدلانہ بنانے کے باوجود

یہ کمی بمشکل دور ہو سکی۔

یہی حقیقی مسئلہ ہے گو یہ تحفظ تھا جس پر نکتہ چینی کی گئی اور اُس سے نپٹنے کی کوشش کی گئی۔ جب ملکی طور پر مقابلہ اتنا سخت ہو تو کسی کے لیے بھی باہر سے مقابلہ کرنا آسان ہو جائیگا یہیں پر جاپان آگے بڑھ گیا اور ہم نے مات کھائی۔ حکومت لازماً اس امر کا بہتر فیصلہ نہیں کر سکی کہ سرمایہ کاری کہاں کی جائے اور پیداوار کا پیمانہ کیا ہو۔ صنعتی لائسنسنگ پالیسی کے بغیر ہم بیشتر غلط سرمایہ کاریوں سے احتراز کر سکتے تھے اور زیادہ باصلاحیت صنعت کا قیام کر سکتے تھے۔

یہی بات "ایم آر ٹی پی" قانون کے باب سوئم کی حالت میں سچ ہے جو غالباً بڑے بڑے کارپوریشنوں کی اقتصادی طاقت کے خوف سے وجود میں آیا۔ لیکن یہ خوف بے بنیاد تھا۔ کوئی بھی حکومت کسی بھی کارپوریشن سے کم طاقتور نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح بڑے بڑے کارپوریشنوں یا تجارتی گھرانوں کے لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ چھوٹے اور متوسط یونٹوں کی راہ میں حائل ہوں۔ کیوں کہ بڑے گھرانوں کو صرف اُن صنعتوں میں سرمایہ کاری کی اجازت دی جاتی ہے۔ جن کے لیے بھاری سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے "ایم۔ آر ٹی پی" قانون کے باب سوئم کی رُو سے حکومت کو محض یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایک بڑے گھرانے کا دوسرے بڑے گھرانے سے انتخاب کرے کوئی تعجب نہیں کہ "ایم آر ٹی پی" کے تحت جو درخواستیں دی گئی تھیں اُن کے معاملوں میں ۹۷ فیصد سے زیادہ کو منظوری دیدی گئی۔

"ایم آر ٹی پی" نے جو کچھ کیا ہے وہ یہ ہے کہ سرکاری افسروں کو روزگار دیا گیا ہے اور پراجیکٹوں کی تعمیل میں کم از کم چھ ماہ کی تاخیر کی جاتی ہے۔ کیا باقی تین فیصد معاملوں کی نامنظوری سے بڑے گھرانوں کی اقتصادی طاقت میں بہت زیادہ کمی آجائیگی۔

مقابلے کا آغاز

یہ اقتصادی پالیسی کا سیاسی تقاضا تھا جسے حکومت نے پورا کیا۔ اس سے ہم نے ملک کے اندر ہی دیکھنا شروع کیا اور ہم نے رفتہ رفتہ عالمی منڈی میں اپنا مقام کھودیا۔ اگر ہم نے عالمی تجارت میں اپنا حصہ برقرار رکھا ہوتا تو آج ہماری تجارت برآمد اُس سے تگنی ہوتی جتنی کہ وہ اب ہے۔ ہم نے بیرونی منڈی اس لیے کھوئی کیونکہ ہم اُس معیار کا مال تیار نہیں کر سکے جس معیار کا بیرونی صارفین مانگتے تھے۔ ہم ایسی لاگت پر مال تیار نہیں کر سکے جو کافی حد تک مقابلے پر اُتر سکتی۔ ہمارا سسٹم اس امر کی ضمانت نہیں دے سکا کہ مال کم از کم وقت کے اندر پہونچ جائے گا۔ کوئی تعجب نہیں کہ گذشتہ ۴۰ برسوں میں تجارتی توازن صرف دو برسوں میں فاضل رہا ہے۔ آج تجارتی خسارہ ۷۵ ارب روپے سے بڑھ گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بیرونی قرضے کے سُود اور ادائگیوں کے مسئلے حقیقتاً شدید صورت اختیار کرلی ہے۔

بلاشبہ گذشتہ دو برسوں سے ہم کمر شیلوں سے مقابلے کی جانب بڑھ رہے ہیں اور حالت کچھ بدلی ہے۔ صنعت بے اطمینانی سے خود کو خریدار کی منڈی میں پاتی ہے۔ یہ مقابلے کا آغاز ہے، یہ غالباً برآمدات کا آغاز ہے۔ اور اگر ایک بار صنعت نے برآمدات کرنا سیکھ لیا تو ان کی ترقی کی کوئی حد نہیں رہے گی جو ۶۰ کی دہائی کے وسط سے نصف رہ گئی ہیں۔ کیونکہ صنعت جو کچھ پیدا کرتی ہے انجام کار وہ اُس پر دارومدار رکھتی ہے جو کچھ وہ فروخت کرتی ہے۔ یہ ملک کے اندر اپنا مال فروخت کر سکتی ہے۔ جسے لوگ اپنی آمدنی میں سے

> جب ملکی طور پر مقابلہ اتنا سخت ہو تو کسی کے لیے بھی باہر سے مقابلہ کرنا آسان ہو جائے گا۔ یہیں پر جاپان آگے بڑھ گیا اور ہم نے مات کھائی۔ حکومت لازماً اس امر کا بہتر فیصلہ نہیں کر سکی کہ سرمایہ کاری کہاں کی جائے اور پیداوار کا پیمانہ کیا ہو۔

خریدنے کو تیار ہوں گے ۔ یہ سمندر پار ملک میں اپنا مال فروخت کرسکتی ہے جسے وہ کفایتی طور پر تیار کرسکتی ہے ۔ عام طور پر صنعت کی شرح افزائش "جی این پی" کی شرح افزائش کا ۲ر۱ گنا ہوگی جس میں صنعتی پیداوار کے لیے تیار مال کی برآمد کا فیصد جمع کرنا ہوگا ۔ ۱٫۲ گنا آمدنی بڑھنے سے مانگ بڑھ سکتی ہے جس میں قیمتوں میں کمی ہونے سے مزید اضافہ ہوسکتا ہے

ہیں ۔ ۱۰۰ چوٹی کی کمپنیوں پر نگاہ ڈالیے ۔ ان میں سے ۲۱ تو ایسی ہیں جنھوں نے قطعاً کوئی برآمد نہیں کی ۔ باقیماندہ نے اپنی ۹٫۵ فیصد مصنوعات کو برآمد کیا ۔ ۱۳ کمپنیوں نے ۱۰ فیصد سے زیادہ مال برآمد کیا اور صرف ۳ کمپنیوں نے اپنی ۲۰ فیصد پیداوار برآمد کی ۔ ان تمام چوٹی کی ۱۰۰ کمپنیوں نے کل ملا کر صرف ۵ر۱ فیصد پیداوار برآمد کی ۔ اگر بڑے گھرانے ۹۰-۱۹۸۹ء تک اپنی ۱۰ فیصد مصنوعات برآمد کریں تو وہ ملک کے

دراصل بہت گہرا ہے ۔ اول ، سہولیات ناکافی ہیں جس کی وجہ سے دوسرے سیکٹروں کی ترقی رکی ہوئی ہے ۔ بجلی کی کمی تو تقریباً ایک روائت بن چکی ہے ۔ یہ کمی ۷۰ کی دہائی میں پیدا ہوئی تھی ، اور بلاشبہ ۹۰ کی دہائی تک جاری رہے گی ۔ کوئلے کی سپلائی میں تسلسل نہیں ہے ۔ تیل مہنگا ہے ۔ قدرتاً توانائی پر مبنی تمام صنعتیں بے دم ہوگئی ہیں ۔ دیگر بنیادی ڈھانچے میں کارکردگی مثالی بھی نہیں ہے ۔ ریلوے کی سہولیات میں حال میں اضافہ ہوا ہے لیکن وہ ضروریات سے بہت کم ہیں ۔

حکومت نے وہ ذمہ داری اٹھائی جسے وہ پورا نہیں کر سکتی تھی ۔
اس نے وسائل کی شیرازہ بندی کی جو غالباً پرائیویٹ سیکٹر نہیں
کرسکتا تھا اور ان وسائل کی شیرازہ بندی کرکے حکومت نے بجلی
کے پلانٹ نصب کئے ، کوئلے کی کانیں حاصل کیں اور سازوسامان اور
آلات تیار کرنے کے لیے کارخانے قائم کئے اور یہ تمام کام اس یقین کے
ساتھ کیا کہ جو مالک ہوتا ہے وہ ایک اچھا منتظم بھی ہوتا ہے لیکن دونوں
باتیں ہمیشہ ساتھ ساتھ نہیں چلتیں ۔

بشرطیکہ صنعت قیمتیں کم کرسکے ۔ اس شعبے میں امکان محدود ہے ۔ بہترین طریقہ برآمد کو بڑھانا ہے ۔ کوریا جیسے ملکوں نے مال برآمد کیا اور وہ صنعتی ترقی کو ۲۰ فیصد سے زیادہ بڑھا سکے ۔ ہم یقیناً اب ایسا کرسکتے ہیں ۔

برآمدات کے لیے ذمہ داری چھوٹے صنعتی یونٹوں پر نہیں ڈالی جاسکتی ۔ گو برآمدات میں ان کا حصہ بہت زیادہ ہے ۔ یہ ذمہ داری بڑے تجارتی گھرانوں کی ہونی چاہیئے جو درآمدی نعم البدل تیار کرنے میں بہت زیادہ مصروف

ہیں ۔ مزید ۴ ارب روپے کی مالیت کا زرِ مبادلہ کما سکتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ ۱۰ فیصد برآمد اپنے طور پر نہ ہوسکے ۔ اس کے لیے حکومت کو صنعت کے مسائل کو سمجھنا اور انھیں حل کرنا ہوگا اور ان کی مدد کرنی ہوگی تاکہ وہ سمندر پار ممالک میں اپنے حریفوں سے مقابلہ کرسکیں ۔ یہ اس صورت میں ممکن ہے جب حکومت اور صنعت کے درمیان گہرا اشتراک ہو ۔

جہاں تک بنیادی ڈھانچے کا تعلق ہے مسئلہ

اس سے پہلے کہ جہازوں پر سے مال اتارا جائے انھیں کئی دنوں تک انتظار میں کھڑا رہنا پڑتا ہے ۔ کوئی تعجب نہیں کہ "کانفرنس لائنر" (جہاز کمپنی) یہاں آنے سے جھجکتے ہیں ۔ ٹیلی فونوں کی حالت تو بہت خراب ہے ۔ کوئی بھی ایسی بنیادی سہولت نہیں ہے جو مانگنے پر مل جائے ۔ کیوں ؟

وسائل کی شیرازہ بندی

حکومت نے وہ ذمہ داری اٹھائی جسے وہ

پورا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے وسائل کی شیرازہ
بندی کی جو غالباً پرائیویٹ سیکٹر نہیں کر سکتا
تھا اور ان وسائل کی شیرازہ بندی کر کے
حکومت نے بجلی کے پلانٹ نصب کئے، کوئلے
کی کانیں حاصل کیں اور سازوسامان اور آلات
تیار کرنے کے لیے کارخانے قائم کئے اور یہ تمام
کام اس یقین کے ساتھ کیا کہ جو مالک ہوتا

خارجی امداد اور قرضوں کو ملایا جائے تو ہماری
سرمایہ کاری کی شرح تقریباً ۲۵ فیصد ہو سکتی
ہے۔ ہم اس سرمایہ کاری سے کیا حاصل کر رہے ہیں؟
محض پانچ فیصد شرح افزائش، سرمایہ اور
پیداوار کا تناسب بہت زیادہ ہے۔ اس کی
وجہ کسی حد تک یہ ہے کہ ہم اپنے وسائل کا
بے دریغ استعمال کر رہے ہیں۔ مختلف سیکٹروں

یہ سوچنا قابلِ قدر ہوگا کہ کیا پبلک اداروں
کی ملکیت میں واقعی تبدیلی کئے بغیر اُن کے انتظام
کو بہتر نہیں بنایا جا سکتا۔ ایک متبادل یہ ہے کہ
ان پبلک اداروں کے شیئروں کا ایک حصہ عام
پبلک کو فروخت کر دیا جائے اور منتظمین کو الگ
تھلگ خود مختار بنا دیا جائے۔ بیشتر مالکوں کو
اس متبادل کی آزمائش میں بھاری کامیابی
حاصل ہوئی ہے۔ دوسرا متبادل یہ ہے کہ انتظام

ہماری ناکامیوں کو ترقی کی پالیسی سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہماری معیشت کو سیاست کاری کے اثر کے تحت لانے سے پیدا ہوتی ہیں جن سے ہمارے منصوبوں اور اُن کی کارکردگی کے درمیان ایک بڑا شگاف بن گیا ہے۔ پانچویں منصوبے تک تقریباً ہر منصوبے کے لیے شرح افزائش کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا جو موزوں طور پر حقیقت پسندانہ تھا لیکن اُس سے بہت کم نتیجہ برآمد ہوا۔

ہے وہ ایک اچھا منتظم بھی ہوتا ہے۔ لیکن
دونوں باتیں ہمیشہ ساتھ ساتھ نہیں چلتیں۔
حکومت ایک منتظم کے طور پر ناکام ہوئی۔
پبلک سیکٹر کے اداروں میں بہت بھاری سرمایہ
کاری کی گئی جو چند ایک کے سوائے بھاری خسارے
میں چل رہے ہیں۔ سوال محض منافع کا نہیں بلکہ
افزائش کا ہے۔ اگر ان کارخانوں کا انتظام
ناقص ہے تو ہم سرمایہ کاری کے فی یونٹ پر
پیداوار بھی کم حاصل کریں گے۔
کوئی بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر
سکتا کہ ہماری قومی بچت کی شرح اچھی ہے۔
ایک ترقی پذیر ملک کے لیے ۲۳ فیصد کی
شرح کوئی مذاق نہیں ہے۔ اس کے ساتھ

میں فی یونٹ سرمایہ کاری کی پیداوار کا موازنہ
کیجئے۔ یہ پرائیویٹ سیکٹر میں بہت زیادہ ہے۔
مشترکہ سیکٹر میں کچھ کم ہے اور پبلک سیکٹر میں کم
ترین ہے۔ جو معیشت جتنی زیادہ "پبلک" ہوگی
اُس کی اتنی ہی کم ترقی ہونے کا امکان ہے۔
یہ نظریاتی امور نہیں ہیں۔ عوام کو صنعتی
اداروں کی ملکیت سے کوئی غرض نہیں ہے۔
اُنھیں نتائج میں دلچسپی ہے۔ کیا اُنھیں زیادہ
ملازمتیں حاصل ہوں گی؟ کیا اُن کی اُجرتوں میں
اضافہ ہوگا؟ کیا وہ کم تر قیمتوں پر مال اور
سروسیں خرید سکتے ہیں؟ یہ ہیں وہ سوالات جن
سے اُنھیں زیادہ دلچسپی ہے۔

کا ٹھیکہ پرائیویٹ سیکٹر کو دے دیا جائے۔
یہ مثال کے طور پر بجلی کے سیکٹر میں ممکن ہے۔
ہماری ناکامیوں کو ترقی کی پالیسی سے منسوب
نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہماری معیشت کو سیاست
کاری کے اثر کے تحت لانے سے پیدا ہوتی
ہیں۔ جن سے ہمارے منصوبوں اور اُن کی کارکردگی
کے درمیان ایک بڑا شگاف بن گیا ہے پانچویں
منصوبے تک تقریباً ہر منصوبے کے لیے شرح
افزائش کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا جو موزوں طور
پر حقیقت پسندانہ تھا لیکن اُس سے بہت کم
نتیجہ برآمد ہوا۔ اگر نشانے مکمل طور پر پورے

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

ڈاکٹر ایس۔ زیڈ قاسم

بحری سائنس اور ٹیکنالوجی

سمندر آج سے بے پایاں وسائل کی کلید ہے جن کو ہمیں مستقبل میں برّی ذخائر کے ختم ہو جانے پر بروئے کار لانا ہوگا۔ خوش قسمتی سے ہندوستان کا ساحل بہت لمبا ہے اور سمندر کی تہ میں محفوظ معدنی و مادی دولت کے وسیع ذخائر کو بروئے کار لانے کی سرگرم کوششیں کی جا رہی ہیں۔ زیر نظر مضمون میں مصنف نے، جو علم بحریات کے ایک نامور اور مسلمہ ماہر ہیں، بتایا ہے کہ ہندوستان نے گزشتہ چالیس برسوں میں بحری سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں کیا پیش رفت کی ہے۔ محکمۂ بحری ترقی کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے ان کا کہنا ہے کہ بحری ترقی کے لیے بھاری اخراجات اور بھاری جوکھوں والے جو نئے پروگرام مرتب کیے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ملک نے بحری سائنس میں کافی پختگی حاصل کر لی ہے۔ ان پروگراموں میں ایسی گوناگوں سرگرمیوں کو شامل کیا گیا ہے جن سے نہ صرف ہماری معاشی بنیاد مضبوط ہوگی بلکہ سمندر کی صحت کی مناسب دیکھ بھال بھی کی جا سکے گی، جو بتدریج آلودہ ہوتا جا رہا ہے۔ مصنف نے جو ہندوستان کی انٹارکٹیکا مہم کے نقیب بھی ہیں، اس امر پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ یہ منجمد براعظم ہمارے لیے کیا امکانات رکھتا ہے۔

ہندوستان کا ساحل چھ ہزار کلو میٹر سے بھی زیادہ لمبا ہے اور بحر ہند، جو اس نیم براعظم کے چرن دھوتا ہے، بحرِ انٹارکٹک تک پھیلا ہوا ہے۔ ساحلی علاقوں میں رہنے والی انسانی آبادی ماہی گیری اور جہازرانی کے لیے سمندر کا استعمال کرتی رہی ہے۔ آج ہم سمندر کے اندر چھپی ہوئی دولت کا اندازہ لگانے کے لیے اعلیٰ ٹیکنالوجی کا استعمال کر رہے ہیں تاکہ ہم سمندر کے اندرونی ماحول کو خطرے میں ڈالے بغیر اس دولت کا پتہ لگا سکیں اور اسے بروئے کار لا سکیں۔

گزشتہ چالیس برسوں میں بھارت نے سمندری شعبوں میں چنوتیوں سے بھرے ہوئے کام کرنے کے لیے تنظیمی ڈھانچہ بنانے نیز سہولیات اور افرادی قوت فراہم کرنے میں کافی پیش رفت کی ہے۔ اس وقت ملک میں ۳۰ تنظیمیں سمندری تحقیق و ترقی کا کام کر رہی ہیں۔ ان میں کچھ عمدہ ترین اور ترقی یافتہ تنظیمیں بھی شامل ہیں جو جدید ترین خطوط پر پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے

ہمارے پاس کچھ
کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ہمارے
اعلیٰ ترین تحقیقی جہاز بھی ہیں اور ایک ہزار
تربیت یافتہ سائنسداں، انجینئر اور تکنیکی افراد
دستیاب ہیں۔ وزیر اعظم کے ماتحت سمندری
ترقی کے نئے محکمے کا قیام اس امر کی نشاندہی
کرتا ہے کہ بھارت سرکار سمندری تحقیق و ترقی کو
اعلیٰ ترجیح دے رہی ہے۔ ہمارے بھاری
اخراجات اور بھاری جوکھم والے نئے پروگراموں

اہم رول ادا کرنا ہوگا۔
بھارت میں بحریات کی سائنس ایک کم
سن سائنس ہے۔ مختلف ڈسپلنوں سے تعلق
رکھنے کی وجہ سے یہ تمام سائنسوں پر محیط ہے۔
ان سائنسوں کے باہمی تعلق کو سمجھنے کے لیے
ایک مربوط انداز فکر کی ضرورت ہے۔ بحریات
کی سائنس کے مستقبل میں متعدد چنوتیوں کا
سامنا کرنا ہوگا۔ اس کے لیے بحریات میں عمدہ
تربیت یافتہ ایک نئی نسل درکار ہوگی۔ بحر ہند

سرکار نے جولائی ۱۹۸۱ء میں سمندری ترقی کا ایک
محکمہ قائم کیا۔ نومبر ۱۹۸۲ء میں پارلیمنٹ کے دونوں
ایوانوں میں "سمندری پالیسی کا بیان" کے عنوان
سے ایک دستاویز پیش کی گئی جس میں سمندری
ترقی کے اہم مقاصد بیان کئے گئے تھے۔
سمندری ترقی کے مختصر المدت مقاصد میں
سمندری سائنس کی تحقیق و ترقی، سروے نقشہ
کشی، مخصوص معاشی خطے اور براعظمی حصے کے
جاندار اور غیر جاندار وسائل کے جائزے لینا،
معاون تنظیمی ڈھانچے کی نشوونما، موزوں ٹیکنالوجی

ہمارے بھاری اخراجات اور بھاری جوکھم والے نئے پروگراموں سے ظاہر ہے کہ ہمارے ملک نے سمندری سائنس میں کافی پختگی حاصل کرلی ہے اور وہ ایسی مُہمیں شروع کرسکتا ہے جو پہلے مالدار اور ترقی یافتہ ملکوں کا اجارہ سمجھی جاتی تھیں۔

سمندری
سے ظاہر ہے کہ ہمارے ملک نے
سائنس میں کافی پختگی حاصل کرلی ہے اور وہ
ایسی مہمیں شروع کرسکتا ہے جو پہلے مالدار اور
ترقی یافتہ ملکوں کا اجارہ سمجھی جاتی تھیں۔
سمندروں کے تعلق سے ایک نیا نظام
دسمبر ۱۹۸۲ء میں وجود میں آیا جب کہ دنیا کی
۱۱۹ اقوام نے خلیج مونٹیگو (جمائیکا) میں سمندر
کے قانون اور سمندری وسائل کے استعمال کے
بارے میں ایک نئے معاہدے پر دستخط کئے۔
یہ نظام سمندری تحقیق و ترقی کے لیے وسیع امکانات
فراہم کرے گا، بالخصوص ترقی پذیر ممالک کو۔
بحر ہند کے خطے کا ایک سرکردہ ملک ہونے کے
ناطے بھارت کو بحر ہند کے عظیم وسائل کی تلاش
اور استعمال کی ذمہ داری سنبھالنے میں ایک نہایت

کی بین الاقوامی مہم کے اختتام پر ۱۹۶۶ء میں
گوآ میں بحریات کے قومی انسٹی ٹیوٹ اور کوچین،
بمبئی اور والٹیر میں اس کے تین علاقائی مراکز
کے قیام سے ملک میں بحری سائنسوں کو ایک
نئی تقویت حاصل ہوئی۔ پھر بھی، اگر ان یونیورسٹیوں
اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کو جہاں
سمندری سائنس اور ٹیکنالوجی کی تربیت دی
جاتی ہے، شمار نہ کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ
ملک میں سمندری تحقیق و ترقی سے متعلق کلیدی
اداروں کی تعداد بہت کم ہے۔
سمندری ترقی اور سمندری وسائل کو
ملک کے سماجی و معاشی فائدے کے لیے
استعمال کرنے کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے بھارت

کا حصول و ترقی، افرادی قوت کی تربیت و تیاری
اور سمندر کی آلودگی کی روک تھام شامل ہیں۔
طویل المقاصد یہ ہیں :-
سمندروں کے جاندار اور غیر جاندار وسائل
کا فائدہ مند استعمال، سمندری معدنیات کی
کھوج اور استعمال، توانائی کے قابل تجدید وسائل
کو کام میں لانا اور بحر انٹارکٹک میں تحقیق کی
حوصلہ افزائی اور تحقیق کے نتائج کا فائدہ مند
استعمال۔
۱۹۶۲ء سے ۱۹۸۶ء تک ۲۴ برسوں کے دوران
سمندری تحقیق و ترقی کے کچھ اہم سنگ میل
درج ذیل ہیں :-

اہم سنگ میل :۔

۱۹۶۲ء بحرِ ہند کی بین الاقوامی مہم۔

۱۹۶۶ء گوآ میں بحریات کے قومی انسٹی ٹیوٹ اور اس کے علاقائی مراکز کا قیام۔

۱۹۷۶ء پہلے بھارتی تحقیقی جہاز 'گویشنی' کا حصول۔

۱۹۸۱ء محکمۂ سمندری ترقی کا قیام۔ انٹارکٹیکا کے لیے پہلی مہم۔

۱۹۸۲ء بھارت کو اولین سرمایہ کار کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔
انٹارکٹیکا کے لیے دوسری مہم۔
سمندری پالیسی سے متعلق بیان۔

۱۹۸۳ء سمندری تحقیق کے لیے "ساگر کنیا" نامی جہاز کا حصول۔ انٹارکٹک معاہدہ کی مشاورتی حیثیت۔
انٹارکٹیکا کے لیے تیسری مہم۔

۱۹۸۴ء انٹارکٹیکا میں مستقل اسٹیشن کا قیام۔
سمندری تحقیق کے واسطے "ساگر سمپدا" نامی جہاز کا حصول۔
انٹارکٹیکا کے لیے چوتھی مہم۔

۱۹۸۵ء انٹارکٹک کے بارے میں تحقیق کی سائنٹفک کمیٹی کی رکنیت۔
انٹارکٹیکا کے لیے پانچویں مہم۔

۱۹۸۶ء بحر انٹارکٹک کے جاندار وسائل کے استعمال سے متعلق کنونشن کی رکنیت۔ انٹارکٹیکا کے لیے چھٹی مہم کا آغاز۔

محکمۂ سمندری ترقی کے اہم پروگرام

محکمۂ سمندری ترقی مندرجہ ذیل پروگراموں پر تسلسل کے ساتھ عمل پیرا ہے :۔

۱۔ جاندار اور بے جان وسائل کے جائزے۔
۲۔ پانی کا کھارا پن دور کرنے کا پروگرام۔
۳۔ سمندر کی تہ میں گہرائی تک کھوج
۴۔ افرادی قوت کی تربیت۔
۵۔ انٹارکٹک پروگرام۔
۶۔ سمندری ماحول ــــ آلودگی کی روک تھام۔
۷۔ زیرِ آب ٹیکنالوجی کی ترقی۔
۸۔ امواج سے پیدا ہونے والی توانائی کا حصول و استعمال۔
۹۔ سمندر کی حرارتی توانائی کا مبادلہ۔

۱۔ جاندار و بے جان وسائل کے جائزے

بھارت مدتِ دراز سے سمندر کے جاندار وسائل کا فائدہ مند استعمال کرتا رہا ہے۔ یہاں ہر سال سمندر سے جتنی مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں ان کے حساب سے یہ دُنیا کے ملکوں میں آٹھویں نمبر پر ہے۔ اندازہ ہے کہ ۲۰۰۰ عیسوی تک بھارت کی آبادی کے لیے ۴ء۱۱ ملین ٹن مچھلی کی ضرورت پڑے گی۔ اس وقت بھارت میں ہر سال ۲ء۳ ملین ٹن مچھلی پکڑی جاتی ہے۔ اس میں سے ساٹھ فیصد حصّہ سمندر سے اور باقی تازہ پانی کے وسائل سے حاصل کیا جاتا ہے۔

سمندری مچھلی کی زیادہ تر مقدار ساحل کے نزدیک کے تنگ علاقوں سے حاصل ہوتی ہے۔ گزشتہ چالیس برسوں میں ان وسائل کے استعمال میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کے لیے ابھی تک غیر مشینی کشتیاں استعمال کی جاتی ہیں لیکن حال ہی میں پیداوار میں جو نمایاں اضافہ ہوا ہے وہ بڑی حد تک مشینی کشتیوں کے استعمال کا مرہونِ منّت ہے۔

میری کلچر (Mariculture) ایک اور اہم پیداواری سیکٹر ہے لیکن ابھی بھارت میں یہ بخوبی منظم نہیں ہے۔ یہ طریقہ ایک چھوٹے پیمانے پر کیرالا، کرناٹک اور مغربی بنگال کے بند عقبی پانیوں اور دہانے کے علاقوں میں رائج ہے۔ مچھلیوں کی افزائش زیادہ تر روایتی ڈھنگ سے ہی کی جاتی ہے۔ سمندر کی پُر زور لہروں کے ذریعے

آج ملک میں تیس علمی اور تربیتی درس گاہیں بحری سائنسوں کی تعلیم دے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ۲۰ سے زائد تنظیمیں ایسی ہیں جن میں سمندری سیکٹر کے تربیت یافتہ افرادی قوت کو ملازمت دی جا سکتی ہے۔

تجربہ کر رہے ہیں۔ ٹیکنالوجی کو مکمل اور بہتر بنانا اس نظام کی معاشی اعتبار سے اہل کارکردگی کی کلید ہے۔

(د) نقل وحمل اور مارکیٹنگ

کان کنی کی جگہ سے نکالے ہوئے مختلف دھاتوں کے ذرات وغیرہ کو دھاتیں صاف اور الگ الگ کرنے کے مراکز تک بھیجنے کے معاشی پہلو کا بھی مطالعہ کرنا ہوگا۔ یہ طے کرنے کے لیے کہ سمندر سے معدنیات نکالنے کا سلسلہ کہاں تک فائدہ مند ہے یہ دیکھنا پڑے گا کہ عالمی مارکیٹ میں خشکی پر واقع

تنصیبات لگانے، آبدوز پائپ لائنیں بچھانے، جمع کردہ معلومات کی پروسیسنگ اور ماہی گیری اور دیگر سمندری صنعتوں کے بندوبست وغیرہ کے لیے۔ اس وقت سمندری سیکٹر میں افرادی قوت کی تربیت کا کوئی قومی سینٹر نہیں ہے۔ کچھ یونیورسٹیاں سمندری سائنس کی محض کچھ برانچوں میں ہی تربیت دے رہی ہیں۔ بمبئی اور مدراس کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں بحری انجینیرنگ اور ٹیکنالوجی کے نصابات شروع کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوسیانوگرافی، سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف فشریز ایجوکیشن،

دہائیوں سے سائنٹفک تجسس کا موضوع رہا ہے۔ اس کی وسعت، محل وقوع، علیحدگی اور اس کی آب وہوا کا انوکھاپن سائنسی مطالعہ کا ایک نادر موقع فراہم کرتا ہے۔ ۱۹۵۹ء کے انٹارکٹک معاہدہ کے زیر سایہ انٹارکٹک کا خطہ ایک پُرامن خطہ رہا ہے جو نیوکلیائی اور دوسرے ہتھیاروں سے مُبرا ہے۔ اقوام متحدہ کا کوئی بھی ممبر ملک، یا کوئی اور ملک جسے معاہدے کے ارکان دعوت دیں، انٹارکٹک معاہدے کو قبول کر کے اس میں باقاعدہ طور پر شامل ہو سکتا ہے۔ اس وقت تک ۳۵ ممالک اس معاہدے کو تسلیم کر چکے ہیں جن میں سے صرف

آج ہم زیادہ گہرے سمندر میں آب دوز میں بھیج سکتے ہیں جن میں انسان کو بھی بھیجا جا سکتا ہے۔ لیکن سمندر کی تہ میں بہت سے کاموں اور تحقیق وغیرہ کے لیے بغیر انسان کے آب دوز میں بھیجنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ ان پر کم خرچ آتا ہے بمقابلہ ایسی آب دوزوں کے جن میں انسان کو بھیجا جاتا ہے۔

کانوں سے نکالی گئی دھاتوں کے مقابلے میں سمندر سے حاصل کی گئی دھاتوں کی دستیابی کی کیا پوزیشن ہے

۳۔ افرادی قوت کی تربیت

ساتویں پنجسالہ منصوبے کے مشمولات اور سمندری سیکٹر کی موجودہ و آئندہ ضرورتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگلے پندرہ برسوں میں سمندری سائنسوں کے مختلف شعبوں میں تقریباً ۳۵۰۰ تربیت یافتہ افراد کی ضرورت پڑے گی۔ آنے والے سالوں میں تکنیکی عملے کی ضرورت بڑھے گی خاص کر ساحل کے نزدیکی علاقوں اور گہرے سمندر میں کان کنی، ساحل کے نزدیکی علاقوں میں

سینٹرل میرین فشریز ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، تیل اور قدرتی گیس کمیشن، جیالوجیکل سروے آف انڈیا اور ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے بھی بحری سیکٹر میں افرادی قوت کی تربیت کے پروگرام مرتب کئے ہیں۔ آج ملک میں تیس علمی اور تربیتی درس گاہیں بحری سائنسوں کی تعلیم دے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ۳۰ سے زائد تنظیمیں ایسی ہیں جن میں سمندری سیکٹر کے تربیت یافتہ افرادی قوت کو ملازمت دی جا سکتی ہے۔

۴۔ انٹارکٹک ریسرچ پروگرام: انٹارکٹیکا کئی

۱۸ ملک اور وہ جو انٹارکٹک میں تحقیق میں مصروف ہیں، "معاہدے کی مشاورتی پارٹیوں" کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور انھیں انٹارکٹک کے بارے میں فیصلے کرنے کا اختیار ہے۔

لیکن انٹارکٹیکا میں سائنسی تحقیق کی اہمیت و امکانات صرف بنیادی سائنسوں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ اس براعظم اور اس کے اردگرد کے سمندروں میں معاشی قدروقیمت کے وسائل موجود ہیں۔ اگرچہ ابھی تک یہاں

معدنیاتی دریافتوں کا کوئی حوصلہ افزا اعلان نہیں ہوا ہے (کیونکہ ان کے لیے تحقیق ابھی شروع نہیں ہو پائی ہے)؟ اس سوال پر زور دیا جا رہا ہے کہ برف کے نیچے کے ممکنہ وسائل کو کیسے کام میں لایا جا سکے گا۔ اور کون ان کا فائدہ اٹھائے گا۔

بھارت کے انٹارکٹک پروگرام کا مقصد سائنسی مطالعات و تحقیقی سرگرمیوں کو فروغ دینا ہے۔ اس مقصد کے لیے ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۶ء تک کی مدت میں چھ مہمیں بھیجی گئیں جنھیں کافی کامیابی حاصل ہوئی۔ چھٹی مہم نومبر ۱۹۸۶ء میں شروع کی گئی تھی۔ پہلی پانچ مہموں کے دوران انٹارکٹیکا میں سائنسی تحقیقات جاری رکھنے کے لیے ضروری تنصیبات لگائی گئیں۔ تیسری مہم کے دوران وہاں پر ایک مستقل اسٹیشن دکشن گنگوتری کے نام سے قائم کیا گیا اور بھارت کے ساتھ مصنوعی سیارے کے ذریعے ضروری مواصلاتی رابطوں کا اہتمام کیا گیا۔ پانچویں مہم کے دوران موسمیاتی رابطہ بھی قائم کیا گیا۔

بھارت ایشیا کا واحد ترقی پذیر ملک ہے جس نے انٹارکٹیکا میں ایک مستقل اسٹیشن قائم کیا ہے۔ چین نے اپنا پہلا اسٹیشن ۸۵-۱۹۸۴ء میں قائم کیا اور اکتوبر ۱۹۸۵ء میں یوروگوئے کے ساتھ مشاورتی حیثیت حاصل کی۔

محکمۂ سمندری تحقیق انٹارکٹک ریسرچ پروگرام کے لیے اپنے ملک کی ایجنسیوں کے وسائل اور افرادی قوت ہی استعمال کرتا رہا ہے۔ مہم کی انٹارکٹیکا میں قیام اور نقل و حرکت کے معاملے میں تینوں دفاعی افواج اس کی مدد و رہنمائی کر رہی ہیں۔ سائنسی عملہ اور سامان ملک بھر کی ریسرچ انسٹی ٹیوشنوں اور سرکاری محکموں سے حاصل کیا جاتا ہے۔

انٹارکٹیکا کے لیے بھارت کی چھٹی مہم، جو ۹۰ ارکان پر مشتمل تھی، ۲۶ نومبر ۱۹۸۶ء کو گوآ سے روانہ ہو کر ۲۱ دسمبر ۱۹۸۶ء کو انٹارکٹیکا پہونچی تھی۔ اس میں ملک کے ۱۴ سائنسی اداروں سے لیا گیا ۲۵ نفری سائنسی عملہ شامل تھا اور قیام اور نقل و حرکت سے متعلق امور میں رہنمائی کے لیے بھارتی برّی فوج، فضائیہ، بحریہ اور ڈیفنس ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے ۶۵ ارکان لیے گئے تھے۔ اس مہم کی قیادت نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوسنوگرافی کے ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ پرولیکر نے کی۔ ڈیپارٹمنٹ آف اوسن ڈیولپمنٹ کے پرسنل سائنٹفک افسر شری ایچ۔ پی۔ راجن بھی ٹیم میں ڈیپارٹمنٹ کے نمائندے کی حیثیت سے بطور رکن شامل تھے۔ مہم کی گرمائی پارٹی ۲۰ مارچ ۱۹۸۷ء کو واپس آ گئی تھی۔

چھٹی مہم میں ۱۷ افراد چوتھی سرمائی پارٹی کی حیثیت سے شامل تھے۔ یہ انٹارکٹیکا میں یہیں رہ گئے۔ بھارتی فوج کے کرنل وی ایس آبیر کو سرمائی ٹیم کا قائد مقرر کیا گیا۔ اس ٹیم میں چار سائنسی اداروں (جیالوجیکل سروے آف انڈیا، بھارتی محکمۂ موسمیات، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف جیومیگنیٹزم اور ڈیفنس انسٹی ٹیوٹ آف فزیالوجی اینڈ ایپلائڈ سائنس) کے چھ سائنسداں اور دفاعی افواج کے ۱۱ ارکان شامل تھے۔

۵۔ سمندری ماحول — آلودگی کی روک تھام

سمندر کا ساحل کے قریب کا حصہ خوراکی اور معدنی وسائل کے اعتبار سے مالا مال ہے۔ اس لیے ماحول کا تحفظ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ سمندر کے ساحلی پانیوں کی آلودگی کی کئی وجوہات ہیں جن میں بڑے شہروں سے گندگی اور سیوریج، کارخانوں کے گندہ اور بیکار مواد، کوڑا کرکٹ، پیٹرولیم اور گندے اور بے مصرف زراعتی مواد وغیرہ کا سمندر میں چھوڑا جانا شامل ہیں۔ سمندری ماحول میں تیل کی آلودگی بھی برابر بڑھتی جا رہی ہے خاص کر ساحلی پانیوں میں۔ تیل کی آلودگی تیل بردار جہازوں کے حادثوں، ان جہازوں کی دھلائی، تیل صاف کرنے کے کارخانوں سے نکلنے والے بیکار مواد، پائپ لائنوں سے ہونے والے رساؤ، ساحل کے قریب پیداواری پلیٹ فارموں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ سمندری ماحول میں پیٹرولیم اور پیٹرولیم کی مصنوعات کی وجہ سے پیدا ہونے والی آلودگی کا حصہ کافی زیادہ ہے۔ اس لیے بہت سے زہریلے مادّوں کے اثرات کو بخوبی سمجھنے کے لیے سمندروں کی صحت کا مطالعہ ضروری ہے۔

بھارت میں اس شعبے میں ریسرچ اور مانیٹرنگ میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ملک کے مختلف ادارے ۱۹۷۵ء سے سمندری ماحول کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ آلودگی پیدا کرنے والے تمام مادّوں کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کرنے کے لیے سروے کیے جا رہے ہیں۔ پگھلی ہوئی شکل میں بھاری دھاتوں کے اجتماع اور بحرہ عرب اور خلیج بنگال سے اکٹھی کی گئی مچھلیوں کے بارے میں معلومات جمع کی جا رہی ہیں۔

سمندری آلودگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے کی ذمہ داری محکمۂ سمندری تحقیق کے سپرد کی گئی ہے۔ وہ جلد ہی بھارتی ساحل سے متصل علاقوں میں آلودگی کا مطالعہ کرنے کے لیے کئی اسٹیشن قائم کرے گا۔

۶۔ زیرِ آب ٹیکنالوجی کا فروغ

کئی صدیوں سے انسان سمندر کی گہرائیوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے کیونکہ ان میں بے شمار دولت چھپی ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں تحقیق کا آغاز غوطہ خوری سے ہوا تھا۔ آج زیادہ گہرے سمندر میں آب دوزیں بھیجی جا سکتی ہیں جن میں انسان کو بھی بھیجا جا سکتا ہے۔ لیکن سمندر کی تہ میں بہت سے کاموں اور تحقیق وغیرہ کے لیے بغیر انسان کے آب دوزیں بھیجنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ ان پر کم خرچ آتا ہے بمقابلہ ایسی آبدوزوں کے جن میں انسان کو بھیجا جاتا ہے۔

۷۔ سمندر کی لہروں سے توانائی

آئی۔آئی۔ٹی مدراس سمندر کی لہروں سے توانائی حاصل کرنے کے پروجیکٹ پر گزشتہ پانچ برسوں سے کام کر رہا ہے کیونکہ اس کے پاس ٹیسٹنگ وغیرہ کی بہت اچھی سہولیات موجود ہیں۔ مدراس کے ساحل کے قریب پہلی بار گزشتہ دو برسوں میں لہروں کے بارے میں، ایک خاص ویو رائڈ بوائے، (Wave Ride Buoy) کے استعمال کے ذریعے سائنٹفک معلومات جمع کی گئی ہیں۔ اس کے اشارات کو وائرلیس کے آلات سے مانیٹر کیا گیا اور اس کے نتائج کا تجزیہ کیا گیا تا کہ سال کے تمام مہینوں میں لہروں کا زور معلوم ہو سکے۔ سینٹر میں ہی مطلوبہ کمپیوٹر آلات تیار کیے گئے ہیں۔ سینٹر کو اپنے کام میں مدراس پورٹ ٹرسٹ اور ماہی گیری کے اداروں سے "ویو رائڈ بوائے" استعمال کرنے اور اسے بحفاظت رکھنے میں تعاون ملا۔

پروجیکٹ کے ابتدائی مراحل میں لہروں سے توانائی پیدا کرنے کے مختلف طریقوں اور آلوں کے بارے میں تحقیقات کی گئی اور ان میں سے کچھ کو تجربے کے طور پر آزمایا گیا اور آخر میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہمارے ساحل کے لیے ایک اوسی لیٹنگ واٹر کالم (او۔ڈبلیو۔سی) موزوں ترین رہے گا۔ او۔ڈبلیو۔سی سے نکلنے والی ہوا کی قوت کو توانائی میں بدلنے کے لیے ایک خاص ٹربائن پر بہت سے تجربات کیے گئے۔ سمندروں کی لہروں سے توانائی حاصل کرنے کے ضمن میں مطالعات ہنوز جاری ہیں۔

۸۔ اوسن تھرمل انرجی کنورژن (OTEC)

یہ حقیقت سب پر آشکار ہے کہ سمندر میں توانائی کے بے پناہ وسائل موجود ہیں۔ سمندری توانائی کا اظہار لہروں، موجوں اور مد و جزر سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سمندری توانائی کے ایسے وسائل بھی ہیں جو اتنے ظاہرہ نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک حرارتی توانائی یا تھرمل انرجی ہے۔ یعنی وہ توانائی جو سطح سمندر کے درجۂ حرارت اور سمندر کی گہرائی کے درجۂ حرارت میں مضمر ہوتی ہے۔ امریکہ، جاپان، فرانس، نیدرلینڈ اور اسکینڈے نیویا کے ممالک اس توانائی کو استعمال میں لانے کے امکانات کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے اس کے اردگرد اور لکش دیپ اور جزائر انڈمان و نکوبار کے اطراف میں سمندری حرارتی توانائی کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔

بھارت کے سمندری تحقیق کے آئندہ پروگرام ملک کی اہم اور فوری ضرورتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے بڑی احتیاط کے ساتھ مرتب کیے جا رہے ہیں۔ ہم نے اپنی آزادی کے بعد سے ایک بہت اہم چالیس سالہ دور مکمل کر لیا ہے۔ آئندہ تیرہ برسوں میں، جن کے بعد ہم اکیسویں صدی میں داخل ہوں گے ہمیں اپنے مذکورہ بالا پلانوں میں سے ہر ایک کو پورا کرنے کے لیے زیادہ سرگرم کوششیں کرنی ہوں گی تا کہ ہمارے وسیع سمندری وسائل کی دریافت و استعمال کے ایک نئے دور کا آغاز ہو سکے جو ہماری معاشی و سماجی ترقی میں ممد و معاون ہو۔

●

بقیہ، سیلاب پر کنٹرول کی پالیسیاں کامیابیاں اور چنوتیاں

برعکس کسی ریاست سے پانی کے بہاؤ پر قابو پانے اور سیلاب پر کنٹرول سے متعلق تالابوں جیسے زیادہ پسندیدہ اقدامات پر خرچ کرنے میں کم دلچسپی ہوتی ہے جو اس کے اندر واقع ہو سکتے ہیں یا جن سے دوسری ریاستوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ لہذا سیلاب پر کنٹرول کی بین الریاستی اسکیموں میں مرکزی سرمایہ کاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ سیلاب پر کنٹرول سے متعلق جامع دستورکار کا جزو لاینفک ہو۔ یہ بات بلاوجہ نہیں ہے کہ ایسا دنیا کے اُن ملکوں میں ہوتا ہے جہاں زیادہ تر سیلاب آتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ امریکہ میں بھی جہاں خصوصی طور پر ندار کی یا ترقیاتی اسکیموں کے شعبے میں مقامی اور ریاستی خود مختاری کی قومی روائت پائی جاتی ہے۔ یہ مناسب خیال کیا گیا ہے کہ وفاقی حکومت سیلاب پر کنٹرول کے لیے سرمایہ فراہم کرے۔ جتنی جلدی ہم اس قومی دستورکار کو اختیار کریں گے اس سے پتہ چلے گا، اس بار بار پیدا ہونے والے مسئلہ کو حل کرنے میں ہم کس قدر سنجیدہ ہیں۔ یہ ہمیں ایک بڑا چیلنج پیش کرتا ہے۔

●

پی۔ جے۔ نوکرے

کیا ہم اور بھی اچھا کام کر سکتے تھے؟

ہمارے ملک کی ترقی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا زبردست کردار رہا ہے۔ حکومت ہند کے مشیر جناب پی۔ جے۔ نوکرے کی اس موضوع پر کافی گرفت ہے۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ اگر سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے ملک کی سماجی اور اقتصادی ترقی کی حکمتِ عملی تیار کرنی ہے، تو اس سلسلے کی کامیابیوں اور ناکامیوں کو مبالغے کے ساتھ بیان نہیں کیا جانا چاہیئے۔ انھوں نے کہا کہ اس کے لیے کافی غور و خوض کی ضرورت ہے۔ وہ خود کفیلی اور خود انحصاری کے درمیان حدِ فاصل رکھنا چاہتے ہیں اور انھوں نے ان دونوں کا فرق بتلانے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ہم نے خود کفیل ملک کی حیثیت سے پیش رفت کی ہے تاہم ابھی خود انحصاری کی منزل باقی ہے۔ ہمارے یہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کے اثرات زراعت اور صحت کے شعبے میں واضح طور پر نمایاں ہیں اور ان سے قومی زندگی کا معیار بلند کرنے میں مدد مل سکی ہے تاہم دیگر ترقیاتی شعبوں میں ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا ہے۔ انھوں نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ آج سائنس دانوں نے جو تصورات پیش کئے ہیں، انھیں جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے عملی صورت دی جا سکے گی اور اس کے لیے اندرونِ ملک ٹیکنالوجی کو عصری تقاضوں اور ملکی حالات سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔

بھارت ایک روایت پسند اور وسیع اور عریض ملک ہے، چنانچہ ۴۰ سال کا عرصہ ایک بڑے اور روایت کے حامل ملک کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن اس مختصر سے عرصے میں اس ملک نے بہت تیزی سے ترقی کی ہے، خاص کر سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں اس کے بہت سے اہم اور وسیع کارنامے ہیں۔ دوسرے اس عرصے میں جو کچھ دریافت کیا جا سکا، اور سائنسی تجربہ گاہوں میں جو تجربے کئے گئے، انھیں عوام الناس تک پہنچانے کے لیے زبردست کام ہوا ہے، اس نقطۂ نظر سے اس ملک کی ترقی، خصوصاً جب کہ وہ تھوڑے سے زمانے کو سامنے رکھ کر جانچی جا رہی ہو، خاص اہمیت رکھتی ہے، بلاشبہ دنیا کے دیگر ملکوں کی طرح سے بھارت نے بھی اس عرصے میں نمایاں ترقی کی ہے لیکن ایک سوال پھر بھی باقی

رہتا ہے اور مدعا یہ کہ یہ ترقی اس سے بھی زیادہ ہو سکتی تھی، زیر نظر مضمون میں اس پہلو کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی منصوبہ بندی کے عمل کا جائزہ لے کر اس پر غور کیا جائے گا کہ ہمارے مقاصد اور نشانے کیا تھے اور ہم نے ان کو پانے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی اور دستیاب وسیلوں کی بنیاد پر ہم اپنے مقاصد میں کہاں تک آگے بڑھے اور ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے ٹھوس ڈھانچہ فراہم کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے سماجی اور اقتصادی ترقی کی بنیاد بنانے اور اس سلسلے میں حکمت عملی وضع کرنے کے معاملے میں کامیابیوں اور ناکامیوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ضروری ہوگا۔ ۱۹۵۰-۵۱ء سے ۱۹۸۴-۸۵ء تک سماجی اور اقتصادی ترقی کے کچھ گوشے ذیل میں دیے جا رہے ہیں جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے ابھر کر سامنے آئے ہیں:-

سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے سماجی اور اقتصادی ترقی کی بنیاد بنانے اور اس سلسلے میں حکمت عملی وضع کرنے کے معاملے میں کامیابیوں اور ناکامیوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ضروری ہوگا۔

گوشوارہ نمبر ۱
سماجی اور اقتصادی ترقی کی نشاندہی کرنے والے امور

نمبر شمار	نشاندہی کرنیوالے امور	اکائی	۱۹۵۰-۵۱	۱۹۷۷-۷۸	۱۹۸۴-۸۵	سنہ ۲۰۰۰ء متوقع
۱۔	آبادی	ملین	۳۵۸	۶۲۳	۷۶۱	۹۸۶
۲۔	شرح پیدائش	فی ہزار	۳۹٫۹	۳۴٫۵	۳۲٫۶	۲۳٫۱
۳۔	اوسط عمر	سال	۳۲٫۰	(۱۹۷۴) ۵۲٫۲	۵۶٫۵	۶۴٫۰
۴۔	خواندگی کی شرح	فیصد آبادی	۱۶٫۷	۲۹٫۵	۳۷٫۰ (مرد ۴۸٪ عورت ۲۵٪)	(۱۹۹۰) ۱۰۰٫۰
۵۔	مجموعی ملکی پیداوار	ملین روپے	۹۵۰۳۰ مجموعی قومی پیداوار	۸۰۰۰۰ مجموعی قومی پیداوار	۱۹۳۴۲۸۰	۴۰۲۱۴۳۵
۶۔	خوراکی اجناس کی پیداوار	ملین ٹن	۵۰٫۸	۱۳۲	۱۵۰	۲۳۵
۷۔	صنعتی پیداوار	۱۹۷۰-۱۰۰	۲۷٫۰	۱۴۸٫۰	۱۸۲٫۳	—
۸۔	بجلی	ملین کلوواٹ	۵۱۰۷	۹۸۵۰۰	۱۶۷۰۰۰	۵۷۵۰۰۰
۹۔	دیہات اور قصبات جنکو بجلی دی گئی	تعداد	۲۳۹۸۰	۲۰۷۴۴۲	۳۶۸۸۴۰	(۱۹۹۰) ۴۸۶۹۴۱
۱۰۔	سائنس اور ٹیکنالوجی کا عملہ	فی ہزار	۱۸۸	۲۳۲۸	۲۸۵۸	۴۰۰۰
۱۱۔	یونیورسٹیاں	تعداد	۲۷	۱۰۵	۱۴۵	—
۱۲۔	سائنس اور ٹیکنالوجی کے اخراجات	ملین روپے	۴۷	۵۵۸۷ (۱۹۷۸-۷۹)	۱۸۹۰۶	—

نمبر شمار	نشاندہی کرنیوالے امور	اکائی	۱۹۵۰–۵۱	۱۹۷۷–۷۸	۱۹۸۴–۸۵	سنہ ۲۰۰۰ء متوقع
۱۳۔	مواصلات					
	الف، ٹیلیفون	لاکھ	۱ر۶۸	۲۲ر۴۷	۳۴ر۶۲	—
	ب، ٹیلکس ایکسچینج	تعداد	—	۱۰۱	۱۷۶	—
	ج، ٹیلکس کے خریدار	تعداد	—	۱۴۶۴۱	۲۲۵۵۲	—
۱۴۔	برآمدات	کروڑ روپے	۶۰۰ر۲۴	۴۰۳۶ر۲۶	۱۱۴۶۵ر۹۵	—
۱۵۔	فی کس اوسط آمدن (۱۹۷۰–۷۱ کی قیمتوں کے مطابق)		۵۵۸ر۸	۶۶۳ر۵	۷۴۸ر۶	—
۱۶۔	سائنس کے جرنل	تعداد	—	۷۰۸	۲۰۰۰	—
۱۷۔	پیٹنٹس	تعداد	—	۳۰۰۵	۳۰۰۸	—

اس مضمون میں چند مخصوص کامیابیوں کی عام ترقی کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ناکامیوں کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس عرصے میں سائنسداں نے مینیجر کا رول ادا کیا ہے، اس کے مجموعی اثرات جانچنے کے لیے سماج کے مختلف طبقات کی حالت کو سامنے رکھنا ہوگا۔ دیہی علاقوں میں عوام کی حالت کا جائزہ لے کر ہی سائنس اور ٹیکنالوجی کے حقیقی فائدہ کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی منصوبہ بندی

حصولِ آزادی کے فوراً بعد سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے وسائل کی تخصیص کی ضرورت محسوس کرلی گئی تھی، ترقی پذیر ملک کی حیثیت سے بھارت میں یہ کام سرکاری سطح پر رقومات کی تخصیص کے ذریعے انجام دیا جاسکا۔ البتہ گذشتہ چند برسوں میں نجی سیکٹر نے بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

ذیل کے گوشوارے میں ۱۹۵۱ء سے گویا کہ جب سے ملک میں منصوبہ بندی شروع ہوئی، ساتویں منصوبے تک سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے مخصوص کردہ رقومات اور ان سرگرمیوں کے لیے دی گئی مالی امداد کی تفاصیل درج ہیں:-

گوشوارہ نمبر۲

(کروڑ روپیوں میں)

		منصوبہ جاتی اخراجات	غیر منصوبہ جاتی اخراجات	میزان
پہلا منصوبہ	(۱۹۵۱ — ۵۶)	۱۴	۶	۲۰
دوسرا منصوبہ	(۱۹۵۶ — ۶۱)	۳۳	۳۴	۶۷
تیسرا منصوبہ	(۱۹۶۱ — ۶۶)	۷۱	۷۳	۱۴۴
چوتھا منصوبہ	(۱۹۶۹ — ۷۴)	۱۴۲	۲۳۱	۳۷۳
پانچواں منصوبہ	(۱۹۷۴ — ۸۱)	۵۰۲	۵۱۵	۱۰۱۷
چھٹا منصوبہ	(۱۹۷۸ — ۸۳)	۱۳۷۶	۱۰۶۹	۲۴۴۵
چھٹا منصوبہ	(۱۹۸۰ — ۸۵)	۱۱۵۸	۹۸۴	۲۱۲۴
ساتواں منصوبہ	(۱۹۸۵ — ۹۰) متوقع	۲۴۶۶	۲۳۴۷	۴۸۱۳

اس گوشوارے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہر اگلے منصوبے میں پہلے کی بہ نسبت سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے زیادہ رقومات رکھی گئی ہیں۔ نہ صرف حقیقی وسائل میں اضافہ ہوا ہے، بلکہ تحقیق و ترقی کی سرگرمیوں کے لیے مجموعی قومی پیداوار کا تناسب بھی بڑھا ہے اور وہ ۵۹-۱۹۵۸ء کے ۰٫۲۳ فیصد سے بڑھ کر ۸۵-۱۹۸۴ء میں ایک فیصد تک پہونچ گیا ہے۔

استفادے کی ضرورت واضح کی گئی، اسی طرح ۱۹۵۸ء میں سائنسی پالیسی کی قرارداد منظور کی گئی اور ۱۹۸۳ء میں ٹیکنالوجی پالیسی مرتب کی گئی، ان تمام کوششوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت برابر حکومت کے پیش نظر رہی ہے، لیکن ان کامیابیوں کے ساتھ کچھ ایسی خامیاں بھی ہیں جن کا وقتاً فوقتاً ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق زراعت اور میڈیسن وغیرہ پر زیادہ توجہ کی ضرورت محسوس کی گئی ہے،

میں ایک کمی یہ رہی کہ اقتصادی سیکٹروں سے متعلق سائنس اور ٹیکنالوجی کی سرگرمیوں کے لیے وسائل کو خاطر خواہ طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ مثلاً فولاد سازی، کیمیاوی کھادوں کی تیاری، بجلی، نقل و حمل وغیرہ۔ پنجسالہ منصوبوں کی دستاویزوں میں جہاں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے الگ سے باب کا اضافہ کیا گیا ہے، یہ بات برابر کہی گئی ہے کہ پیداواری صلاحیت بڑھانے میں اقتصادی اور سروس سیکٹروں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے ضروری سامان فراہم کرنا بہت اہم ہے، بدقسمتی سے متعلقہ اقتصادی سیکٹروں نے اس پر ضروری توجہ

گزشتہ پانچ برسوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ریاستی کونسلوں کے تشکیل پا جانے کے بعد ریاستی سطح پر سائنس اور ٹیکنالوجی کی پیش رفتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے مطلوبہ نظام مستحکم کیا جا سکا ہے۔ امید ہے کہ اس سے سماجی اور اقتصادی ترقی کے لیے بنیادوں کو استوار کیا جا سکے گا۔

اس سے سرکار کا یہ عزم واضح ہوتا ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو ترقی دینے کی پوری کوشش کر رہی ہے، ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم، شری جواہر لال نہرو نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی سرگرمیوں پر خصوصیت سے زور دیا تھا، انھوں نے سائنسی مزاج کی پرورش کے لیے پورا زور دیا تھا، اس مقصد کے لیے ملک میں لیباریٹریوں کا جال بچھایا گیا اور ایٹمی توانائی اور خلائی سائنس کے ابھرتے ہوئے شعبوں میں نئے اور بڑے پروگرام شروع کئے جا سکے۔ اس سلسلے میں رہنمایانہ خطوط مرتب کئے گئے اور پالیسی مرتب کی گئی۔ ۱۹۵۶ء میں جو صنعتی پالیسی تشکیل دی گئی، اس سے سائنس اور ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے استعمال اور

اور ان کے مقابلے ایٹمی توانائی اور خلائی سائنس پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔

زرعی تحقیق اور توسیعی خدمات کے سبب ہندوستان خوراک کے محاذ پر خود کفیل ہو چکا ہے، اور اب زراعت کے نئے گوشے اجاگر کرنے کی بات سوچی جا رہی ہے، روایتی اسبار کی کوششیں مثلاً زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کی کاشت اور آبرسانی کی سہولتوں میں اضافہ ایک حد تک ہی اپنا اثر دکھا سکتی ہیں۔ چنانچہ اب بایوٹیکنالوجی کی مدد سے زراعت کو ترقی دینے کی بات کہی جا رہی ہے لیکن اس کے لیے آنے والے برسوں میں مسلسل کوششیں کرنی ہوں گی، ان تمام کوششوں

نہیں کی۔ اس لیے اقتصادی اور صنعتی محاذوں پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے اثرات اتنے اچھے ظاہر نہیں ہو سکے، جتنے کہ وہ ہو سکتے تھے، اس سے قبل گوشوارہ نمبر ا میں یہ واضح ہے کہ بھارت میں پیٹنٹوں کے داخلے میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ گزشتہ چند برسوں کے مطالعے سے یہ واضح ہوا ہے کہ تحقیق و ترقی کی مد کے جملہ اخراجات کا ایک چوتھائی صنعتی سیکٹر میں لگا ہے، حالانکہ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ تناسب ۵۰ فیصد تک پہونچتا ہے، جہاں کہ صنعت کاری کا عمل بڑی حد تک سائنس اور

ٹیکنالوجی کی ترقی پر انحصار رکھتا ہے، چنانچہ ہمارے ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی اقتصادی اور پیداواری سیکٹروں میں کافی تال میل بٹھانے سے قاصر رہا ہے، ایک طرف صنعتوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو بڑھانے کی مانگ کمزور ہے، دوسری طرف سائنسی برادری نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے نتائج کو حتمی پیداوار کے لیے خاص کر ایسے شعبوں کے لیے جو اقتصادی ترقی میں معاون ہیں، متعارف نہیں کرایا ہے، عام تاثر یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے عام آدمی کے مطالبات اور اس کے تقاضے پورے کیے جا سکتے تھے، جو کہ نہیں کیا گیا۔ ایسا نہیں کہ سائنسی برادری کے خیالات و تصورات نیز ٹیکنالوجیوں کو عوام الناس کے فائدے کے لیے نہیں دے سکتی، البتہ اس سلسلے میں انتظامی ڈھانچہ بہت کمزور ہے، زرعی سیکٹر سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو خوراکی پیداوار بڑھانے کے لیے موثر ڈھنگ سے استعمال کیا گیا ہے۔

مرکزی علاقوں اور ریاستوں میں بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کو اقتصادی شعبوں اور سرگرمیوں کی پیش رفت کے لیے اُس ڈھنگ سے استعمال نہیں کیا گیا، جس ڈھنگ سے کہ استعمال کیا جانا تھا۔ البتہ گزشتہ پانچ برسوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ریاستی کونسلوں کے تشکیل پا جانے کے بعد ریاستی سطح پر سائنس اور ٹیکنالوجی کی پیش رفتوں سے فائدہ اُٹھانے کے لیے مطلوبہ نظام مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ اُمید ہے کہ اس سے سماجی اور اقتصادی ترقی کے لیے بنیادوں کو استوار کیا جا سکے گا۔ اس سلسلے کی کوششوں کو بڑھاوا ملنے لگا ہے، البتہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی پیش رفتوں اور کامیابیوں کو مصنوعات سازی سے عملاً جوڑنا باقی ہے اس کے بغیر اس سے حقیقی معنوں میں فائدہ نہیں اٹھایا جا سکے گا۔

پچھلے چند برسوں میں ٹیکنالوجی مشن تشکیل دیے گئے، ان کا کام یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے مقامی نوعیت کے مخصوص مسائل کو حل کرنے پر زور دیا جائے، اس کے لیے منصوبہ بندی میں لچک اور تنظیمی ڈھانچہ میں ضروری تبدیلیاں درکار ہوں گی۔ اس سے ایک ایسا نظام کار درکار ہوگا، جو سائنس اور ٹیکنالوجی سے استفادہ کرنے والوں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے نئے نتائج سامنے لانے والوں کے درمیان رابطہ قائم کر سکے، یہ کام وقت مقررہ کے اندر انجام دینا ہوگا۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے ادارے

ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے ایک ٹھوس ڈھانچہ فراہم کیا گیا، یہ کام قومی سطح پر نئے ادارے اور تنظیمی ڈھانچے قائم کر کے انجام دیا گیا۔ انڈین انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اور انجینئرنگ کالجوں کا ایک جال بچھایا گیا، نئی ترقی یافتہ یونیورسٹیوں میں نئے تربیتی نصابات شروع کیے گئے۔ ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے ایسے نئے نئے گوشے شروع کیے گئے جو ملک

ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے ایک ٹھوس ڈھانچہ فراہم کیا گیا، یہ کام قومی سطح پر نئے ادارے اور تنظیمی ڈھانچے قائم کر کے انجام دیا گیا۔ انڈین انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اور انجینئرنگ کالجوں کا ایک جال بچھایا گیا، نئی ترقی یافتہ یونیورسٹیوں میں نئے تربیتی نصابات شروع کیے گئے۔ ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے ایسے نئے نئے گوشے شروع کیے گئے، جو ملک کے لیے ہر طرح سے نئے تھے۔ مثلاً ایٹمی توانائی کا محکمہ، سرکار، دفتر شاہی والا انداز نظر بدل دیا گیا۔

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہندوستان میں آزادی کے حصول کے وقت صرف ۸۶ ہزار ٹیلی فون کنکشن تھے، جو ۳۲۰ ٹیلی فون ایکسچینجوں پر مشتمل تھے۔ طویل فاصلے کے ٹرنک چینل صرف ۳۲۶ تھے، ملک میں ۵ لاکھ ۵۰ ہزار گاؤں میں سے صرف ۳۳۸ دیہات میں ۱۹۴۷ء میں ٹیلی کمیونی کیشن کی سہولتیں تھیں، بلاشبہ یہ صورت حالات بہت ہی تاریک تھی، بین الاقوامی سطح پر دو سرکٹ تھے۔ ایک دلی سے برطانیہ کے لیے دوسرا بمبئی سے جاپان کے لیے تھا، یہ سروس بھی چند گھنٹوں کے لیے ہوتی تھی۔ مختصر یہ کہ ہمارے ٹیلی کمیونی کیشن نظام حصول آزادی کے وقت برائے نام تھا۔

س: حصولِ آزادی کے بعد سے ہندوستان کی ٹیلی فون انڈسٹری کی خاص خاص باتیں کیا ہیں

ج: ۱۹۴۸ء میں انڈین ٹیلی فون انڈسٹریز کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا گیا، یہ پبلک سیکٹر میں قائم کیا جانے والا پہلا محکمہ تھا، آج یہ ٹیلی کمیونی کیشن سامان تیار کرنے والا واحد سب سے بڑا شعبہ ہے، یہ نہ صرف ٹیلی کمیونی کیشن کے محکمے کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے بلکہ ریلوے، دفاع اور ریاستی بجلی بورڈوں وغیرہ کی بھی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ انڈین ٹیلی فون انڈسٹریز نے بہت زیادہ ترقی کی ہے، اور بدلتی ہوئی ٹیکنالوجیوں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش کی ہے، آج یہ الیکٹرو میکانیکل سوئچ سے لے کر جدید ترین ڈجیٹل الیکٹرانک ایکسچینج تک بنا رہا ہے اور اس سے مقامی پر طویل فاصلے پر رابطہ قائم کرنے کی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں۔ ٹرانسمیشن کے سلسلے میں یہ ادارہ ہم محوری نظام، مائکرو ویو، یو ایچ ایف اور ملٹی ایکسس ریڈیو ریلے نظام تیار کر رہا ہے، ملک میں ڈجیٹل ٹرانسمیشن سامان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے یہ اشتراکِ عمل سے بہت سا سامان تیار کر رہا ہے، ڈجیٹل الیکٹرانک سوئچنگ ایکسچینج کے لیے ایک ایسی فیکٹری ہے جس میں ہر سال ڈیڑھ لاکھ لائنیں تیار ہو رہی ہیں، رواں منصوبے کے آخر تک پانچ لاکھ لائنیں ہر سال تیار کئے جانے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ اس شعبے میں ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے، سرکار نے ٹیلی فون کی تیاری اور اس کے بنانے کا کام پرائیویٹ انڈسٹری کو بھی دینا شروع کر دیا ہے، ٹیلی فون رکھنے والوں کے لیے جو مختلف طرح کا سامان درکار ہوتا ہے، مثلاً الیکٹرانک پی اے بی ایکس پُش بٹن، ٹیلی فون انسٹرومنٹ، فیکس مشینیں اور متعدد دیگر سامان پرائیویٹ سیکٹر میں تیار ہو سکتا ہے، پبلک سیکٹر میں بھی اس سامان کی تیاری کے لیے بہت سی فیکٹریوں کو یہ ذمہ داری سونپی جا رہی ہے۔ ڈجیٹل الیکٹرانک ایکسچینج کی تیاری کے لیے اندرونِ ملک ٹیکنالوجی کی دریافت کے سلسلے میں کوششیں جاری ہیں۔

ٹیلی میٹکس کے فروغ اور تیاری کے لیے ایک مرکز قائم کیا گیا ہے، اس کا نام ہے سی ڈی او ٹی (CDOT) اس نے اس پی اے بی ایکس / ڈجیٹل الیکٹرانک ایکسچینج کے ڈیزائن تیار کئے ہیں جو کہ دیہات میں کارآمد ہوں گے۔ اب بڑی صلاحیت والے ڈجیٹل الیکٹرانک ایکسچینج کی تیاری کے لیے کام ہو رہا ہے، لیکن اندرونِ ملک ضرورت کے مطابق کام نہیں ہو پاتا، یہاں کی ضرورتیں زیادہ ہیں جبکہ سامان حسب ضرورت تیار نہیں ہو پاتا، کوشش یہ ہے کہ ۱۹۹۳ء تک اندرونِ ملک ہی ہماری ضرورتیں پوری ہونے لگیں، ریڈیو میڈیا اور آپٹیکل فائبر کیبل پر کام کرنے والے ڈجیٹل ٹرانسمیشن ایکویپمنٹ جلد ہی تیار ہونے لگیں گے۔

آج کے دور میں اس کی بڑی اہمیت ہے، اس سلسلے میں سرکار دور اندیشی سے کام لے کر ٹیلی کمیونی کیشن کے جدید نظاموں کو رائج کر رہی ہے جس سے فائبرز کے ایک جوڑے پر ۸۰۰/۲۰۰۰ ٹیلی فون چینل ٹرانسمٹ ہو سکیں۔ ایچ سی ایل اور آئی ٹی آئی میں اس کے لیے ضروری اقدامات کئے گئے ہیں۔ ایچ سی ایل آپٹیکل فائبر کیبل تیار کرے گا۔ اور آئی ٹی آئی اس سے متعلق الیکٹرانکس ٹرانسمیشن ایکویپمنٹ تیار کرے گا۔ بھوپال میں ریاستی الیکٹرانکس ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے نام سے اس کا ایک اور یونٹ کام کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ مقامی اور طویل فاصلے کی ٹرانسمیشن کے لیے اندرونِ ملک سامان تیار کر لیا جائے گا۔ اس کے لیے مینوفیکچرنگ صلاحیت بڑھانی ہوگی، ایک اندازے کے مطابق اصل الیکٹرانک ایکسچینج کے لیے ہر سال ۲ لاکھ لائنوں کا اضافہ کرنا ہوگا اور دیہی ایکسچینجوں کے لیے ۵ لاکھ لائنوں کا ہر سال اضافہ کرنا ہوگا۔ محکمہ کا انتخاب، مشینری کے حصول اور تنصیب کے کام کو پورے زور و شور سے آگے بڑھانے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے تاکہ ۱۹۹۳ء تک مینوفیکچرنگ صلاحیت مطلوبہ نشانے پورے کر سکے۔

س: بھارت میں طویل فاصلے کے پبلک کال سسٹم نے کب جنم لیا۔

ج: ۱۹۲۳ء میں لاہور اور لائلپور کے درمیان پہلی طویل فاصلے والی ڈائلنگ سروس شروع ہوئی، یہ ۱۲۰ کلو میٹر فاصلے کو طے کرتی تھی اور دور شہر میں مطلوبہ نمبر آپریٹر کے ذریعے براہ راست ڈائل کر دئے جاتے تھے، جہاں تک ٹیلی فون رکھنے والے کی طرف سے براہِ راست ڈائل گھما کر بات کرنے کا تعلق ہے، جسے اب ہم ایس ٹی ڈی کہتے ہیں، یہ ۱۹۶۰ء میں لکھنؤ اور کانپور کے درمیان شروع ہوئی، اس کے بعد اس ضمن میں بہت زیادہ ترقی دیکھنے کو ملی، راجدھانی سے تمام ریاستی راجدھانیوں کو ایس ٹی ڈی کے ذریعے جوڑا گیا ہے۔

اور تقریباً ۵۰ فیصد ضلعی ہیڈ کوارٹرز پر ایس ٹی ڈی کی سہولت موجود ہے۔ گویا ۶۰ فیصد ٹیلی فون رکھنے والے طویل فاصلوں پر ملک گیر پھیلنے پر براہِ راست ٹیلی فون سے از خود نمبر گھما کر بات کر سکتے ہیں۔ انٹرنیشنل سبسکرائبر ٹرنک ڈائلنگ سروس کو آئی ایس ڈی کہتے ہیں۔ یہ فی الحال ہندوستان نے ۲۴ ملکوں کے ساتھ قائم کر رکھی ہے۔ گویا عملاً سبھی ملک جن سے کہ ہمارے تجارتی اور کاروباری تعلقات ہیں، براہِ راست ٹیلی فون سروس سے جڑے ہوئے ہیں!

س: اَوْن یور ٹیلی فون سروس جسے مختصراً او، وائی، ٹی سروس کہتے ہیں، کیا ہے؟ اس طرح سے ٹیلکس سروس اور ڈیمانڈ ٹرنک سروس کیا ہے، ذرا وضاحت فرمایئے تاکہ قارئین یہ جان سکیں کہ وہ ان سہولتوں سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ج: اَوْن یور ٹیلی فون، اسکیم کے تحت دلی میں ایک شخص کو ۸ ہزار روپے دینے پڑتے ہیں تاکہ اس اسکیم کے تحت اس کا نام رجسٹرڈ کر لیا جائے، اس اسکیم کے تحت اس شخص کو آسانی سے اور ترجیحی زمرے میں ٹیلی فون مل سکتا ہے، او، وائی، ٹی اور نان او، وائی، ٹی میں ٹیلیفون رکھنے والے کا حصہ ۴۰ فیصد ہے، جبکہ مخصوص زمروں میں یہ ۲۰ فیصد ہے۔

ٹیلی فون آج کے دَور کی ایک اہم ضرورت ہے، اس پر دو آدمی خواہ وہ کتنی ہی دور ہوں، براہِ راست بات چیت کر سکتے ہیں، کاروبار، تجارت اور صنعت میں تحریری خط و کتابت بھی درکار ہوتی ہے، زبانی بات چیت میں کوئی نہ کوئی خامی رہ جاتی ہے۔ تحریری خط و کتابت سے جملہ باتیں سند کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں، یہ پبلک ٹیلی گراف اور ٹیلکس سروس کی صورت میں ہوتی ہے۔ ٹیلکس سروس بھی ایس ٹی ڈی کی طرح سے خود حرکی ہے، یہ سروس روز بروز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ جدید الیکٹرانک سوئچنگ سسٹم جو کہ دلی، کلکتہ، بمبئی، مدراس جیسے بڑے شہروں میں میسر ہے، دو شہروں کے درمیان پیغام رسانی کی رفتار میں موجودہ رائج الوقت رفتار سے ۵۰ گنا اضافہ ہوا ہے، ان سے اقتصادی سرگرمیوں کو تیزی سے بڑھاوا ملا ہے۔

اَن ڈیمانڈ ٹرنک سروس، میں آپریٹر سے کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے ہی دوسرے شہر میں جہاں کہ یہ سروس ہے، آپ کو فلاں نمبر دے دے۔ وہ آپ کو مطلوبہ نمبر ملا دے گا۔ فی الحال یہ سہولت اہم شہروں میں ہے اور رفتہ رفتہ اس کی توسیع عمل میں آ رہی ہے۔

س: آج کے دَور میں ٹیلی کمیونی کیشنز کی اہمیت کیا ہے؟

ج: ٹیلی کمیونی کیشن ملک کی اقتصادی ترقی کا استعارہ ہے، یہ محض ٹیلی فون، ٹیلی گراف یا ٹیلکس سروس ہی نہیں ہے بلکہ اس نظام کے تحت مکمل اطلاعاتی نظام ہے جس میں فیک سی ملی، پکچر ٹرانسمیشن اور کمیونی کیشن بذریعہ کمپیوٹر وغیرہ سبھی کچھ شامل ہے، یہ سب کام اُن عام نوعیت کی ٹیلی فون لائنوں سے ہو رہا ہے جو شروع میں ایک لائن پر صرف ایک ہی گفتگو کی حامل ہوتی تھیں، ٹیلی کمیونی کیشن نظام میں بنیادی تبدیلیاں آئی ہیں، شروع میں پیغامات کی ترسیل کی رفتار دھیمی تھی جو ٹیلی کمیونی کیشن کوڈ کی رُو سے زیادہ سے زیادہ ۶،۹ کے۔ بی تھی لیکن جدید کاری کے نتیجے میں یہ ۳۰ گنا بڑھ گئی ہے، اس طرح سے عام نوعیت کی ٹیلی فون لائن انفارمیشن پائپ لائن کی شکل اختیار کر چکی ہے، کمپیوٹری نظام کی مدد سے اس نظام کو بہت ترقی مل سکی ہے، ہمارے ملک کی ۸۰ فیصد آبادی دیہات میں ہے، ان تک ٹیلی کمیونی کیشن کے نظام کو پہونچانا ہے، اس سے ملک ایک دوسرے سے مربوط ہو جائیگا اور سماج آپس میں جُڑ سکے گا۔ اس کے ذریعے سے طویل فاصلے پر تعلیمی پروگراموں کی ترسیل آسان ہو سکے گی دیہی آبادی کے لیے تصاویر کی ترسیل اور تعلیمی پروگراموں کی بڑی اہمیت ہے، طویل فاصلے والے تعلیمی پروگرام ناخواندگی دُور کرنے میں معاون ہوں گے۔ ان کے ذریعے سے کسانوں کو جدید دریافتوں سے باخبر رکھا جا سکے گا اور وہ اپنی پیداواری صلاحیت بڑھائیں گے اور سماج میں صحتی تعلیم کو عام کر سکیں گے۔ ایک بات یاد رکھنے کی ہے، ٹی۔ وی تعلیمی پروگراموں کی یک طرفہ ترسیل میں معاون ہے لیکن ٹیلی کمیونی کیشن دو طرفہ ترسیل میں مددگار ہے جس سے عمل اور ردِ عمل دونوں کا بیک وقت ظہور ممکن ہے، اس کو دیہی ترقی کا اہم ذریعہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ ٹیلی فون اور اطلاعاتی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، شہروں کی توسیع ہو رہی ہے لیکن کوشش یہ کرنی ہے کہ دیہات سے شہروں کی طرف کم لوگ جائیں، اس سے نہ صرف یہ کہ دیہی عوام اپنی شناخت کرتے ہیں بلکہ سماجی دباؤ بھی بڑھتا ہے، ہمیں صنعت اور تجارت کو دیہات میں پھیلانا ہے اور ٹیلی کمیونی کیشن کے ذریعے اس سلسلے کی معلومات کو عام کرنا ہے اور دیہی عوام کو ترقیاتی پروگراموں میں جوڑنا ہے۔

ٹیلی کمیونی کیشن کے فروغ کے لیے سیاسی شعور میں بیداری آئی ہے، ہمارے وزیرِ اعظم نے قوم کو پانچ گوشوں کی اہمیت سے واقف کرایا ہے۔ ان میں سے ایک ہے بہتر مواصلاتی نظام، اس کے علاوہ انھوں نے پینے کے پانی کی فراہمی، ناخواندگی دُور کرنا وغیرہ پر بھی زور دیا ہے۔ ٹیلی کمیونی کیشن سماجی اور اقتصادی ترقی کا ذریعہ

ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن نے ساتویں منصوبے میں صاف صاف ٹیلی کمیونی کیشن کے رول کی اہمیت کو واضح کیا ہے، چنانچہ سنہ ۲۰۰۰ تک ۲۰۰ لاکھ اصلی ٹیلی فون لائنوں کی فراہمی کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ فی الحال ہمارے ملک میں ۳۵ لاکھ اصلی ٹیلی فون لائنیں ہیں گویا کہ ۱۳ سال میں دس گنا اضافہ ہونا ہے، اس سے ۲ کروڑ سبسکرائبروں کی ضرورتیں پوری ہو سکیں گی، اس نظام سے بڑے پیمانے پر فائدہ اٹھانے کے لیے ڈیجیٹل موڈ یعنی مربوط ڈجیٹ والے نظام کو بڑھایا جا رہا ہے، اس کا مختصر نام آئی ڈی این ہے۔

س: کیا مستقبل میں ایسی امید کی جا سکتی ہے کہ مانگنے والے کو ٹیلی فون مل سکے گا۔

ج: اس کا جواب اثبات میں بھی ہے اور نفی میں بھی۔ ٹیلی فون جس قدر تیزی سے دیے جاتے ہیں، اسی تیزی سے اس کی مانگ بھی بڑھتی ہے البتہ اس صدی کے آخر تک ۲۰۰ لاکھ اصلی ٹیلی فون لائنوں کے حصول کے لیے کوشش کی جا رہی ہے، اس کی بنیاد پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ہم ٹیلی فون مطلوبہ تعداد میں دے سکیں گے۔

س: جہاں تک ریونیو کا سوال ہے، اس سلسلے میں آپ کے محکمے کی کامیابیاں کیا ہیں؟

ج: اس سلسلے میں محکمے کو نمایاں کامیابیاں ملی ہیں، پچھلے دس برسوں میں مرکزی خزانے کو ملنے والا ریونیو بڑھا ہے۔ ۷۶-۱۹۷۵ء میں یہ صرف ۲۵ کروڑ روپے تھا، جو بڑھ کر ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۱۷۰ کروڑ روپے ہو گیا لیکن یہ اندازِ نظر تنگ نظری پر مبنی ہوگا۔ اس سے بالواسطہ ہونے والے اقتصادی فائدے بہت زیادہ ہیں، ٹیلی فون کنکشن کی عدم موجودگی میں سڑک کے ذریعے رابطہ کا قیام نہ صرف یہ کہ وقت ضائع کراتا ہے بلکہ مہنگا بھی پڑتا ہے، ٹیلی کمیونی کیشن نظام سے خود محکمے کے وارے نیارے نہ ہوئے ہوں لیکن اس نے معیشت کو زبردست فائدہ پہنچائے ہیں۔ یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے کہ کسی بھی ملک کی مجموعی اندرونِ ملک پیداوار کا تناسب اس بات سے جانچا جاتا ہے کہ اس کے ٹیلی فونی نظام پر کس قدر دباؤ ہے۔ یہ تناسب ہمارے ملک میں ایک ہزار کی آبادی پر ۴ ہے۔ بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں یہ تناسب ایک ہزار کی آبادی پر ۸۰۰ ہے، ہمیں اس لحاظ سے کافی آگے جانا ہے، اس لیے ٹیلی کمیونی کیشن کی ریونیو کی کارکردگی کی بنیاد پر اس نظام کو محدود اندازِ نظر سے نہیں دیکھنا ہے، اس کے بے شمار بالواسطہ اقتصادی فائدے ہیں۔

س: کیا یہ بات سچ ہے کہ سبسکرائبر سے جو کچھ رقم لی جاتی ہے، ٹیلی فون ان سے کہیں زیادہ مہنگے ہیں۔

ج: جی ہاں! ایک ٹیلی فون کنکشن دینے پر تقریباً ۲۵ ہزار روپے کے اخراجات آتے ہیں۔ اور ہم صرف سو روپے مہینہ لیتے ہیں، کوئی چاہے تو جس قدر کالیں مفت وہ کر سکتا ہے، انھیں میں وہ اپنا کام چلا لے، لیکن میری اس سے دلچسپی نہیں ہے میں تو یہ سوچتا ہوں کہ ہر ہندوستانی کو ٹیلی فون سے حاصل کرنے کا حق ہے اور وہ بھی اتنے خرچے پر جسے وہ ادا کر سکے۔ ہمیں واضح سیاسی ہدایت درکار ہے تاکہ اس صدی کے آخر تک ۲ کروڑ ٹیلی فون رکھنے والوں کی جدید ٹیلی کمیونی کیشن نظام کی مدد سے خدمت کی جا سکے، اس طرح آیندہ ۱۳ برسوں میں ۵۰ ہزار کروڑ روپے کے اخراجات کی ضرورت ہے، اس کی راہ میں وسائل کی دشواری نہیں آنی چاہیئے۔ ایک بار سیاسی عزم کا اظہار ہو جانے پر نئے طریقوں سے وسائل جٹائے جا سکتے ہیں اور یہ کام مرکزی خزانہ پر غیر ضروری توجہ کے بغیر انجام پا سکتا ہے، فرانس میں یہی ہوا ہے، ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں، صدر جسکارڈ نے ٹیلی کمیونی کیشن نظام کو قومی سطح پر ترجیح دی اور یہ کام ۸۱-۱۹۷۶ء کے ساتویں منصوبے میں انجام دیا، اس کے لیے انھوں نے مرکزی خزانے سے رقم حاصل نہیں کی اور رقم حاصل کرنے اور وسائل فراہم کرنے کے لیے نئے طریقے نکالے گئے، انھوں نے پٹہ داری کے نظام پر مبنی کمپنیاں قائم کیں، فرنچ ٹیلی کمیونی کیشن بنک قائم کیے۔

ہم فرانس کے تجربے سے سبق لے سکتے ہیں اور صحیح سمت میں تیزی سے قدم بڑھا سکتے ہیں۔

●

بقیہ: زراعت کی متوازن ترقی

غیر متوازن رہی ہے۔ اس غیر ہموار ترقی کے نتیجے کے طور پر ایک طرف غربت اور ناقص تغذیہ برقرار رہے تو دوسری جانب سرکار کے پاس خوراک کا فاضل اسٹاک جمع ہو گیا ہے۔ اس اٹ پٹی زرعی ترقی سے علاقائی عدم توازن بھی پیدا ہو گیا ہے، مثبت پہلو پر، زرعی ترقی بڑے پیمانے پر قحط اور اتلافِ جان کو روک پائی ہے۔ بھارت کے ماضی کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ کم کارنامہ نہیں ہے، خوراک کے معاملے میں خود اکتفائی بھارتی زراعت کا دوسرا اہم کارنامہ ہے۔ البتہ یہ خود اکتفائی غربت اور ناقص تغذیہ کے ساتھ ساتھ حاصل ہوئی ہے۔

●

مضمون نگار حضرات توجہ دیں

یوجنا کے لیے معیاری ادبی مضامین ارسال فرمائیں اس میں کتابوں پر تبصرہ بھی ہوتا ہے۔ تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں ارسال کریں۔

ڈاکٹر پریم کرپال

آزادی کے بعد تعلیمی ترقی

دستاویزی حوالوں سے مزین اس مضمون میں ہمارے سابق سکریٹری تعلیم اور مشہور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر پریم کرپال نے تعلیم کے میدان میں اُن حیرت کُن کامیابیوں کا مختصر مگر ٹھوس بیان کیا جو ملک نے گذشتہ چالیس برس میں سخت دقتوں کے باوجود حاصل کی ہیں۔ ہندوستان برِصغیر کی حیثیت کا ملک ہے جس کی کثیر آبادی میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے لہذا یہاں کا کوئی بھی مسئلہ جلد مہیب شکل اختیار کرلیتا ہے۔ مضمون نگار جن کا ملک کے متعدد تعلیمی منصوبوں سے قریبی تعلق رہا ہے، ان مسائل کے ممکن حل تجویز کئے ہیں۔ نئی تعلیمی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ اس پالیسی کا مقصد بہت اہم ہے تاکہ آئندہ صدی کے بڑی تیزی سے بدلتے ہوئے دُنیا کے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ معلّم کو اُن کی کوششوں کا انعام ملنا چاہیئے اور سماج کو چاہیئے کہ اُس میں تخلیقی صلاحیتیں پیدا کرے۔ ثقافت اور تہذیب کی ڈھیر سارے نقدم خیال کی جانی چاہیئے اور اسے فروغ دینے کے لیے مادّی و روحانی وسیلے مُہیا کئے جانے چاہئیں۔

ہندوستان کی آزادی جدید تاریخ کے ایک اہم دور میں آئی۔ ہمیں اپنے اندر اور دوسری اقوام کے ساتھ علم، آبادی، انسانی توقعات اور تکنیکی ترقی میں بھاری اضافے سے پیدا انسانی مشکلات کے بحران میں شریک ہونا پڑا۔ اس صدی کا درمیانی دور ایک ایسی حد فاصل تھا جس نے ماضی کی صنعتی تہذیب کو بھیانک خطرات اور بے مثال مواقع سے پُر مستقبل سے الگ کر دیا تھا۔ جنگِ عظیم کے بعد کے بڑھتے ہوئے چیلنجوں اور نئی حقیقتوں نے ایسی تخلیقی صلاحیتوں اور ہم آہنگی پر مبنی انسانی تعلقات کی ضرورت کو سامنے لا کھڑا کیا جو صرف صحیح قسم کی تعلیم سے ہی پوری ہوسکتی تھی۔ ذہن اور روح کی ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ تعلیم کے عمل سے مانگ کی گئی کہ وہ بین الاقوامی تعاون اور موزوں قومی نظاموں اور سرکاری پالیسیوں کے ذریعہ امن اور بہتات کی ایک نئی دنیا پیدا کرے۔ چنانچہ تعلیم تمام قومی معاشروں اور اُبھر رہے بین الاقوامی نظام کی مانگ بن گئی۔ ۱۹۴۷ء میں جواہر لال نہرو کی جدوجہد کا مقصد ایک نئے انسان اور ایک نئے سماج کی تشکیل تھی جس میں سب سے زیادہ حصّہ تعلیم کو ادا کرنا تھا۔ دوسری اقوام کو بھی یہی چیلنج درپیش تھا

چنانچہ موجودہ صدی کے دوسرے نصف حصے میں تعلیمی فکر و عمل کا ایک ایسا ارتقاء دیکھنے میں آیا جو ماضی میں کبھی نہیں دیکھا گیا تھا کیونکہ ماضی میں تعلیم کا کردار بیشتر ملکی ثقافت کا مقابلتاً مستحکم سماجی اور ثقافتی زندگی میں نئی نسلوں تک منتقل کرنے تک محدود تھا۔ چنانچہ تعلیم

اضافہ ہوا ہے جن سے شہروں اور دیہات میں تعلیم کے پھیلاؤ میں مدد مل سکتی ہے۔ بالغ آزادی پر مبنی سیاسی زندگی اور اقتصادی ترقی میں شرکت نے لوگوں کے حقوق کے استعمال، فرائض کی ادائیگی کے بارے میں جاننے اور پیداواریت میں اضافے کے لیے موزوں ہنروں کے بارے میں زیادہ بیداری

اعتبار سے ترقی یافتہ ملکوں کے علمی اداروں کا مقابلہ کرتے ہیں، دوسری طرف انتہائی غریبی کے مظاہر اور محرومی کی عکاسی کرنے والے ادارے ہیں جہاں عوام تعلیم پاتے ہیں، خاص کر دیہی علاقوں میں اس غریبی کے بھیانک مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس طرح ہندوستان میں تعلیمی منظر نامہ، امید اور مایوسی نیز کامیابی اور ناکامیوں کا مظہر ہے۔

مجموعی توازن یقینی طور پر ترقی اور کامیابیوں کے حق میں ہے حالانکہ عوام اور

مجموعی توازن یقینی طور پر ترقی اور کامیابیوں کے حق میں ہے حالانکہ عوام اور باخبر و بے خبر لوگوں کی طرف سے اکثر تعلیم پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ سیاہ اور روشن پہلوؤں کی اس ملی جلی صورت حال میں تعلیم حکومتی پالیسیوں کی دانستہ تخلیق کی بجائے سماج کا ایک عکس نظر آتی ہے۔

کی نوعیت اور امکان میں ایک اہم تبدیلی آئی جس کی پیچیدگیوں کا ابھی پتہ لگایا جا رہا ہے۔ انہیں سمجھنا اور ان پر عمل کرنا ہے جیسا کہ تمام قوموں کو بہت سے مسائل اور مواقع کے لحاظ سے ایک نئے چیلنج کا سامنا ہے۔

تعلیم کی نوعیت

ہندوستان کی آزادی نے اقتصادی ترقی، سماجی تبدیلی اور جمہوریت کے نئے شعبوں کے باب وا کئے ہیں جن کے لیے ہنرمند اور ماہر افراد کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ان لوگوں کو تحصیل علم کے مواقع بھی مہیا کئے ہیں جو ترقیات کے عمل میں شریک ہو سکتے تھے۔ اسکولوں اور کالجوں میں رسمی تعلیم کی وسیع سہولیات کے ساتھ ساتھ کام اور ثقافت کی دنیا میں غیر رسمی تعلیم کے مواقع میں تیزی سے

حاصل کرنے کا موقع دیا۔

لوگوں کو اپنی صلاحیتوں، کارکردگی، ابداع اور بطور انسان، بطور کارکن اور بطور شہری، رسمی، غیر رسمی اور روایتی تعلیمی طریقوں سے آگے بڑھنے دینا تعلیم کا خاصہ ہے۔ تدریس اور تحصیل علم رسمی اور غیر رسمی دونوں صورتوں میں ہوتی ہے جس سے انفرادی بہبود اور سماجی ترقی دونوں کے لیے قوم کے انسانی وسیلوں میں بہتری آئی ہے۔

یہ ہندوستان کا تعلیمی منظر نامہ وسیع ہے، یہ متنوع بھی ہے اور پھیلا ہوا ہے، یہ کامیابیوں کی داستان بھی ہے اور ترقیاتی مسائل کی وضاحت بھی۔ اس میں مختلف خیالات اور اداروں میں مختلف علمی سطحوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ ہندوستان میں ایک طرف تعلیم و تحقیق کے اعلیٰ ادارے ہیں جو اپنی صلاحیت اور معیار کے

باخبر و بے خبر لوگوں کی طرف سے اکثر تعلیم پر نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ سیاہ اور روشن پہلوؤں کی اس ملی جلی صورت حال میں تعلیم حکومتی پالیسیوں کی دانستہ تخلیق کی بجائے سماج کا ایک عکس نظر آتی ہے۔ تعلیم عوام کی شرکت، زندگی کے تمام شعبوں میں تبدیلیوں کے اثرات اور نئی توقعات، ٹکنالوجی کی تبدیلیوں اور زندگی کے اسلوبوں کو حاصل کرنے کی خواہش کے مطابق تشکیل پاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک قابل ذکر کامیابی یہ ہے کہ تعلیم کے ایک نئے تصور کو وسیع پیمانے پر تسلیم کیا جا رہا ہے جس میں ماضی کے تنگ نظریات کی بیڑیوں سے دور ایک متحرک مستقبل کی جانب دیکھنا ہے۔

تعلیم کا ایک نیا تصور: تحریک آزادی، آزادی

سے حاصل شدہ مواقع نئے خیالات اور بعد از جنگ
کی دنیا میں تعلیم کے چلن کے اصولوں نے تعلیم کے
ایک نئے تصور کو جنم دیا ہے۔ جدید ہندوستان اب
برطانیہ کے تعلیمی طریقے کا پابند نہیں رہا اور نہ ہی
وہ نوآبادیاتی دور کی زنجیروں سے جکڑا ہوا جو آزاد
اختراع پسند اور خود کفیل ماتحتوں کو، ماضی کی روایات
اور صحت مندانہ بنیادوں اور ہر جگہ سے آنیوالی

ایک عمل ہے کہ تحصیل علم، علم حاصل کرنے والے کی
مرضی اور رفتار کے مطابق ہونی چاہیئے اور
تبدیل ہو رہے سماج میں دستیاب تمام مناسب
طریقوں کے ذریعہ عمر بھر جاری رہنی چاہیئے۔ تعلیم
سماج کی جڑوں سے ابھرنی چاہیئے یہ حالات زندگی
اور مسائل کے مطابق ہونی چاہیئے اور اس میں
زندگی کے نصب العین اور خواہشات کی تکمیل
کی کوشش شامل ہونی چاہیئے کہ صرف اس طریقے

اضافہ کرے گی، ہماری آگاہی میں اضافہ کرنے عمل کی خدمت
کی کوشش کرے گی۔
شخصیت کے پورے پورے
اظہار میں مدد دے گی اور معمولی باتوں سے اوپر
اُٹھنے کے جذبے کو تحریک دے گی جو ہندوستان
کی ثقافت کی انتہائی بیش قیمت وراثت ہے۔
اور ہمارے وقت کی بڑھتی ہوئی ضرورت
ہے۔ تعلیم کے اس جامع تصور کا ہر ممکن طریقوں
سے انسان کی بطور ایک شہری، ایک کارکن اور
ایک شخص کے ضروریات پر اطلاق ہونا چاہیئے

مستقبل کی تعلیم، تحصیل علم کی صورتوں اور تکنیک کو مدِ نظر رکھے گی،
فورس اور اکثر تبدیلیوں کے لیے لچک کو بڑھائے گی، راستوں اور
انتخاب کے مواقع میں اضافہ کرے گی، ہماری آگاہی میں اضافہ کرنے
کے عمل کی خدمت کی کوشش کرے گی، شخصیت کے پورے پورے
اظہار میں مدد دے گی اور معمولی باتوں سے اوپر اُٹھنے کے جذبے کو تحریک
دے گی جو ہندوستان کی ثقافت کی انتہائی بیش قیمت وراثت ہے اور
ہمارے وقت کی بڑھتی ہوئی ضرورت ہے۔

سے حاصل نئے نظریات کی بنا پر ایک
تارہ ہواؤں سے حاصل نئے نظریات کی بنا پر ایک
آزاد قوم کو قسمت کی تعمیر سے باز رکھتی تھیں۔ یونیسکو
میں ہندوستان کی شرکت دوسروں کے ساتھ مسائل
کو حل کرنے میں مدد لینے اور تعلیم کے تصور کو ظاہر
کرنے کی ایک مثال ہے۔ اس عالمی تحریک میں
ہندوستان نے نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اس نے
اقوام کے عالمی تعاون سے اپنی قومی ترقی کے لیے
کئی فوائد اور نظریات بھی حاصل کئے ہیں۔
جدید تعلیم حقیقی زندگی اور ہمارے گرد و پیش کے
سماج میں ہو رہی تبدیلیوں سے علم حاصل کرنے کا

سے تعلیم زندگی سے منسلک رہ سکتی ہے اور ایک فرد
سماج کی بہبود کے لیے اپنا حصہ ادا کر سکتا ہے۔
تمام خارجی ذرائع اور داخلی تجربات سے عمر بھر
کی بہترین تعلیم کا مقصد اور طریقہ کار ہے ایک
شخص جس طرح تعلیم حاصل کرتا ہے یا اُسے استعمال
کرتا ہے وہ اس کی زندگی کے تجربے کی خوبی اور حدود کو
متعین کرتا ہے۔ مستقبل کی تعلیم، تحصیل علم کی صورتوں اور
تکنیک کو مدنظر رکھے گی، فورس اور اکثر تبدیلیوں کے
لیے لچک کو بڑھائے گی، راستوں اور انتخاب کے مواقع میں

جس سے دوسرے انسانوں سے اُس کا رابطہ بڑھے۔
اُس کی تخلیقی قوتیں اور ہنرمندی بڑھے اور سب
سے بڑھ کر یہ کہ اُس کے تخلیقی ہنر کو ترقی کرے
کے پورے مواقع ملیں جس کا اظہار نیکی،
سچائی اور خوبصورتی کی تلاش میں ہوتا ہے
جو آزادی اور سکون میں پھلتا پھولتا ہے
اور کسی شخص کی انفرادی زندگی اور تحصیل
کو بامعنی بناتا ہے۔ یہ ایک وسیع اور پیچیدہ
کام ہے۔ لیکن مستقبل کی تعلیم کے بارے

یکم تا ۳۱ اگست ۱۹۸۷

میں سوچنے کے لیے ہمارے پاس یہی واحد راستہ ہے۔ یہ کام پورا کرنا ناممکن نظر آسکتا ہے لیکن اس کے لیے کوشش دلچسپیوں سے بھرپور ہے۔ یہ ایک طرح کی مہم جوئی ہے۔

ہے۔ اس نئی تعلیمی پالیسی کو تشکیل دینے سے قبل تعلیمی ماہرین اور متعلقہ متعدد افراد سے پوچھ تاچھ کا سلسلہ قائم کیا گیا اور تعلیم کے سبھی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر تبادلۂ خیال بڑے پیمانے پر کیا گیا۔ جو لوگ اس نئی تعلیمی پالیسی کی تشکیل سے وابستہ تھے، ان کو اس طرح کی گفتگو اور بحثوں سے مثلے

کمیشن نے اعلیٰ تعلیم میں اصلاحات کے لیے ایک قابلِ ذکر خاکہ تیار کیا۔ اس کے بعد تعلیمی ترقی اور پرائمری تعلیم کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کے ذرائع طریقے اور وسائل تجویز کرنے کے لیے ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں دو کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن (۵۳-۱۹۵۲ء) ایک اور سنگِ میل تھا جس کے بعد بنیادی تعلیم کا جائزہ (۵۶-۱۹۵۵ء)

آزادی کے بعد تعلیمی ترقی کا سب سے نمایاں پہلو طلباء کے داخلے میں تعداد کے لحاظ سے قابلِ ذکر توسیع اور اداروں، معلموں کی تعداد اور مالی تخصیص میں اضافہ ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء سے ۸۳-۱۹۸۲ء تک تعلیمی ترقی کے تیس برسوں سے جن کے بارے میں قابلِ اعتبار اعداد و شمار حاصل ہیں ہر سطح میں غیر معمولی ترقی کا اظہار ہوتا ہے۔

تعلیم کا ترقی اور معیارِ زندگی سے نہایت اہم تعلق ہے لیکن تعلیم اور معیشت و سماجی نظام کے دیگر شعبوں کے درمیان با معنی رابطے قائم کرنا آسان نہیں ہے۔

جس کے لیے انتھک محنت درکار ہے۔ لہٰذا جو لوگ دلیری سے کام کریں گے کامیابی اُن کا انتظار کرے گی۔

نئی تعلیم کے لیے منصوبہ بندی

حصولِ آزادی کو چالیس برس ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں رسمی تعلیم اور غیر رسمی تعلیم کو حقیقت پسندانہ بنانے کے لیے برابر غور و خوض کیا جاتا رہا اور اس کے لیے بہت سے کمیشن بٹھائے گئے، کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی اور کانفرنسوں کا انعقاد ہوا۔ اس کے لیے تعلیمی منظرنامے سے بہت سے حقیقت پسندانہ مواد بھی اکٹھا کیا گیا، ان تمام کوششوں اور محنتوں کا نتیجہ آج نئی تعلیمی پالیسی کی شکل میں ہمارے سامنے

کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی، اس کے ذریعے اصولوں نے تحریکِ عمل بھی لی، قومی سطح پر اس سلسلے کی کوششوں پر اگر صرف سرسری نظر بھی دوڑا لی جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ کام کتنے وسیع پیمانے پر ہوا۔

اگرچہ آزادی سے قبل تعلیمی منصوبہ بندی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، چنانچہ ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ۱۹۴۴ء میں بعد از جنگ کا ترقیاتی منصوبہ تشکیل دیا گیا، جسے سارجنٹ رپورٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے، آزادی کے بعد مرکزی حکومت نے تعلیم کے میدان میں قومی منصوبہ بندی کا عمل شروع کیا۔ سروپلی رادھا کرشنن کی قیادت میں ۴۹-۱۹۴۸ء کے یونیورسٹی تعلیم کے

اور بعد از بیسک اور کثیر المقاصد اسکولوں کو یکجا کرنے کا (۱۹۵۷ء) کا فیصلہ ہوا۔ تعلیم میں جامع جانچ پڑتال اور منصوبہ بندی کا جو عمل ہوا اُس کا اظہار صرف سنسکرت کمیشن (۵۷-۱۹۵۶ء)، خواتین کی تعلیم کی کمیٹی (۵۹-۱۹۵۷ء) مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی کمیٹی (۱۹۵۹ء) طلبا میں ڈسپلن کی کمی کی رپورٹ (۱۹۵۹ء) ہائر سیکنڈری اسکولوں کی عمارتوں کے بارے میں کمیٹی (۱۹۶۰ء) جذباتی یکجہتی کی کمیٹی (۱۹۶۱ء) بچوں کی دیکھ بھال کی کمیٹی (۶۲-۱۹۶۱ء) جسمانی تعلیم کی کمیٹی اور نیشنل سروس اسکیم (۱۹۶۴ء) سیکنڈری اسکولوں میں سائنس

کی تعلیم کے بارے میں رپورٹ (۱۹۶۴ء)
لڑکیوں کی تعلیم اور عوامی تعاون کی رپورٹ
(۶۵ — ۱۹۶۳ء) غرضیکہ ان تمام اور دیگر رپورٹوں کا مجموعی اثر ہندوستانی تعلیم کے بارے میں ایک جامع کمیشن کے (۶۶-۱۹۶۴) قیام کی شکل میں نظر آیا۔ اس کمیشن نے ڈاکٹر ڈی ایس کوٹھاری کی قیادت میں تعلیم کے تمام شعبوں اور پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ کمیشن نے وزیر تعلیم ایم سی چھاگلا کو جو رپورٹ دی وہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جس کے اثرات ملکی حدود کو پار کر گئے۔ اس کی بنا پر ہی یونیسکو کا تعلیم کے بارے میں بین الاقوامی کمیشن (۱۹۷۰ء) قائم ہوا اور اس کی مشہور رپورٹ "تعلیم کیا ہو" مرتب کی گئی قومی سطح پر تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کی بنا پر ۱۹۶۶ء میں تعلیم کے بارے میں قومی پالیسی کا اعلان کیا گیا اور فصابی کتابوں کے بارے میں متعدد کمیٹیاں قائم کی گئیں اور منصوبہ بندی کی کوششیں کی گئیں۔ جن میں سے کچھ یہ ہیں (۱۹۶۶) ایجوکیشن پلاننگ، نظم و نسق اور جائزہ (۱۹۶۸) اسکولوں کی نگرانی اور جانچ (۱۹۶۹) دیہات کے اعلیٰ تعلیم (۶۹-۱۹۶۷) آبادی کے بارے میں تعلیم (۱۹۶۹) تعلیم میں گاندھیائی قدریں (۱۹۷۰) اور کھلی یونیورسٹیوں کے بارے میں ایک بین الاقوامی سیمینار (۱۹۷۰) ان جائزوں اور مطالعات نے ۵۲-۱۹۵۱ء کے بعد قوم کے پانچسالہ منصوبوں کی تشکیل، مختلف سطحوں پر متعدد تعلیمی اصلاحات اور تعلیم کے بارے میں ایک قومی پالیسی کی تلاش میں رہنمائی کی۔

آزادی کے بعد تعلیمی ترقی کا سب سے نمایاں پہلو طلبا کے داخلے میں تعداد کے لحاظ سے قابلِ ذکر توسیع اور اداروں، معلموں کی تعداد و مالی تخصیص میں اضافہ ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء سے ۸۳-۱۹۸۲ء تک تعلیمی ترقی کے تیس برسوں سے جن کے بارے میں قابلِ اعتبار اعداد و شمار حاصل ہیں ہر سطح میں غیر معمولی ترقی کا اظہار ہوتا ہے۔ خواندگی کا تناسب ۱۶٫۶۷ فیصد سے بڑھ کر ۳۶٫۲۳ فیصد ہو گیا ہے جب کہ تعلیم بالغان کا تناسب ۱۹٫۱۳ سے بڑھ کر ۴۰٫۷۶ فیصد ہو گیا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ملک میں تعلیم یافتہ افراد کی تعداد ۶ کروڑ تھی جو ۱۹۸۳ء میں ۲۴ کروڑ ۸۰ لاکھ ہو گئی یعنی چار گنا اضافہ ہوا۔ اسی مدت میں پرائمری اسکولوں کی تعداد ۲۰۹۶۷۱ سے بڑھ کر ۴۹۰۰۰۰ اور پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کی تعداد ۵۳۷۹۱۸ سے بڑھ کر ۱۳۶۵۴۳۱ ہو گئی۔ ۶ سے گیارہ برس کے بچوں کے اسکولوں میں داخلے کا تناسب ۴۲٫۶ فیصد سے بڑھ کر ۸۳٫۱ فیصد ہو گیا۔ مڈل اسکولوں کی تعداد ۱۳۵۹۶ سے بڑھ کر ۱۲۳۳۰۰ ہو گئی اور ان اسکولوں میں اساتذہ کی تعداد ۸۵۴۹۶ سے بڑھ کر ۲۷۲۸۴۲ ہو گئی۔ ۱۱ سے ۱۴ برس کی عمر کے مڈل اسکولوں میں داخل ہونے کے قابل بچوں کے داخلے کا تناسب ۱۲٫۹ فیصد سے بڑھ کر ۴۰ فیصد ہو گیا۔ سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری درجے کے اداروں کی تعداد ۷۳۰۰ سے بڑھ کر ۵۲۲۶۹ ہو گئی جبکہ کالجوں کی تعداد ۷۹۸ سے بڑھ کر ۵۲۴۶ ہو گئی۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ملک میں ۲۷ یونیورسٹیاں تھیں ۸۳-۱۹۸۲ میں یہ تعداد ۱۶۰ ہو گئی۔ یونیورسٹیوں میں طلبا کی تعداد ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ سے بڑھ کر ۱۱ کروڑ ۶۰ لاکھ ہو گئی جبکہ اساتذہ کی تعداد ۷ لاکھ ۵۰ ہزار سے بڑھ کر ۳۲ لاکھ ہو گئی۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں تعلیم پر کل مصارف ۱۱۴۳ کروڑ روپے تھے جن میں چار گنا اضافہ ہوا اور ۸۳-۱۹۸۲ء میں تعلیم کے لیے کل تخصیص زر ۵۱۸۵۹ کروڑ روپے ہو گئی۔

حیران کن کامیابیاں

عوام میں تحصیلِ علم کی لہر اور اس کے تئیں حکومتی اور غیر حکومتی سطح پر حوصلہ افزا جواب کے نتیجے کے طور پر اتنی تیزی سے جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں وہ واقعی حیران کن ہیں۔ لیکن تعلیمی ترقی مختلف خطوں اور ریاستوں میں ایک جیسی نہیں تھی۔ اسی طرح خاص طور پر دیہی علاقوں میں بچوں کے اسکولوں کے ابتدائی درجوں میں ہی بڑی تعداد میں اسکول چھوڑ دینے کے سبب مصارف کا بھاری نقصان جاری رہا۔ دیہات میں اسکولوں کی حالت بھی اکثر افسوسناک تھی۔ ان خامیوں کے باوجود تعلیمی اداروں، اساتذہ اور داخل ہونے والے طلبا کی تعداد میں جو غیر معمولی اضافہ ہوا ترقی پذیر دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس توسیع کے لیے ہندوستان کے کسی بھی دوسرے ملک کے مقابلے میں کم رقوم خرچ کیں اور تمام سطحوں پر تعلیم کے فی کس معمولی خرچ پر معیار اور مقدار کے لحاظ سے جو نتائج حاصل کئے گئے وہ حیران کن ہیں۔

آزادی کے بعد تعلیم کی ترقی کے عمل کی خصوصیات کے بارے میں اس مختصر جائزے کو تعلیم کے معیار اور چالیس بھرپور برسوں کے تجربے سے ابھرتے امکانات کے ذکر سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اگر حقائق کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ یہ عام خیال غلط ہے کہ تعلیم کا معیار گر گیا ہے۔ طلباء کے داخلے میں تیزی سے اضافے سے پہلی بار تعلیم حاصل کرنے والی نسل اس میدان میں آئی ہے جن کے لیے ماضی میں اسکولی تعلیم کے لیے کایتاً کوئی انتظام نہ ہونے کی نسبت اسکول کی ابتدائی سہولیات مہیا کیا جانا ہی بہتر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ دیہات کے بہت سے پرائمری اسکولوں میں ضروری سہولیات بھی میسر نہیں اور وہاں ایسا تعلیمی ماحول بھی نہیں ہے جس سے ان بچوں کے لیے وہاں موجود رہنے کی دلکشی فراہم کی جا سکے جو گھر کام کے لیے یا دیہی معیشت کے لیے مطلوب ہیں۔ اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ عدم مساوات بھی موجود ہے اور خواتین کو آبادی کے پسماندہ طبقے کے لیے دوسرے طبقوں کی برابری کرنا آسان نہیں ہے۔ ثانوی تعلیم کی سطح پر

پیشہ ورانہ ہنر اور ٹیکنالوجی حاصل کرنے کی بجائے ایسے طلباء کالجوں میں داخلہ لیتے ہیں جو وہاں کی تعلیم کے قابل نہیں ہوتے۔ یہ خامیاں طلباء کی تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد سے پیدا ہوئی ہیں جو کہ بجائے خود تعلیم حاصل کرنے والے سماج کی ایک کامیابی ہے۔

تعلیم کا ترقی اور معیارِ زندگی سے نہایت اہم تعلق ہے لیکن تعلیم اور معیشت و سماجی نظام کے دیگر شعبوں کے درمیان بامعنی رابطے قائم کرنا آسان نہیں ہے۔ مربوط ترقی کا عمل جس میں انسانی وسائل کی ترقی کے لیے تعلیم کو کلیدی مقام حاصل ہے اور ہماری جدوجہد کے چالیس برسوں میں تبدیلی و ترقی کے نئے امکانات ظاہر ہوئے ہیں جس کا اظہار نئی تعلیمی پالیسی میں کیا گیا ہے جس سے قومی پیمانے پر بحث ہوئی ہے اور ۲۱ ویں صدی کے شہریوں کے لیے تعلیم کے رہنما خطوط کے بارے میں اتفاق رائے پیدا ہوا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی کی خاص خاص باتوں کا سب کو علم ہو چکا ہے جنہیں رسالہ یوجنا نے اپنے گذشتہ شماروں میں اچھی طرح بیان کیا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا کافی ہے کہ یہ پالیسی ہر لحاظ سے ماضی کے جائزوں اور تجربوں کا نچوڑ ہے جس سے ہمیں کچھ سیکھنا چاہیئے چھان بین کرنی چاہیئے، پھر نئے مقصد سے بندی کرنی چاہیئے اور تب آگے بڑھنا چاہیئے۔ یہ سبق واضح ہیں اور ان پر ہی مستقبل میں کامیابی کا انحصار ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ تعلیم کے اجزا کیا ہوں۔ آئندہ صدی کے شہریوں کی تعلیمی ضروریات کیا ہیں؟ وہ لوگ کس قسم کی دنیا میں رہیں گے اور اپنے آپ کو تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کے تقاضوں کے بارے میں کس طرح ڈھال سکیں گے؟

چنانچہ علم اور ہنرمندی کے بنیادی اجزا کیا ہوں جو سب کو مہیا کئے جا سکیں ان کا انتخاب عقلمندی سے کیا جائے اور ان پر پوری طرح عمل درآمد کیا جائے۔ تعلیم کا اس قسم کا متن خود کفالت اور عمر بھر کی تعلیم کی بنیاد ہے۔ دوسرے یہ کہ معلم کا کردار اور اس کی قابلیت اور لگن کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ چنانچہ سوال یہ ہے کہ ایک معلم کو کام کے لیے کس طرح تربیت دی جائے۔ علم میں اضافوں کے بارے میں اسے کیسے آگاہ کیا جائے۔ وہ جو کام کرے اسے اس کا موزوں معاوضہ کیسے دیا جائے اور تخلیقی کام کے لیے اسے کیسے تیار کیا جائے؟ تیسرے یہ کہ ہمارے سماج کو کافی مادی اور روحانی وسیلے مہیا کرنے چاہئیں جن سے ہمارے جیسے لوگوں کو جن میں تحصیل علم کی صلاحیت کسی سے کم نہیں ہے۔ ثقافت اور تہذیب کے علم کے حصول کی تلاش میں اعلیٰ ترین معیار کی تعلیم دی جا سکے۔ ان بنیادی مصلحتوں اور ضرورتوں کا اظہار موزوں طور پر نئی تعلیمی پالیسی میں کیا گیا ہے۔ اب ہمارے سامنے جنوبی عمل کرنے، نئے سرے سے سیکھنے اصلاح کرنے اور اس طرح معلومات کے حصول میں لا انتہا پسماندگی کو ختم کرنے کی ہے۔ ●

بقیہ "نشو و نما، ترقی اور پیش رفت"

کی بھاری تعداد تک نہیں پہنچی ہے۔ اسے ضروری اقتصادی کایا پلٹ کی رفتار بہت سست ہے۔ سماجی کایا پلٹ ہے جو اس سے بھی زیادہ دور ہے۔ دیہی بھارت سے انتہائی اندرون علاقوں، پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے والے عوام کی بھاری تعداد ابھی تک ناآشنا ہے۔ قدیم بھارت زیادہ متاثر شدہ جدید بھارت پر ابھی تک حاوی ہے۔ بھرشٹاچار اور کالا دھن جو اقتصادی ترقی کی راہ میں عظیم خطرے ہیں بڑے پیمانے پر پھیل گئے ہیں اور سماجی و سیاسی طور پر قبول کر لئے گئے ہیں۔

ایک ایسی ایٹمی جنگ کا امکان ہمارے لیے ایک بیرونی خطرہ بنا ہوا ہے جو ہمیں زمانہ قبل از تاریخ کے دور میں واپس لے جائے گی۔ ہمارے لیے اندرونی خطرہ سماجی انحطاط پیدا کئے ہوئے ہے جو اقتصادی کایا پلٹ سمیت ہر شے پر سست لیکن خطرناک اثر ڈالے ہوئے ہے۔ اگر چالیس برسوں نے ہمیں کچھ سکھایا ہے تو وہ یہ ہے کہ محض پختہ دانش نگرانی ہی واحد ذریعہ ہے جس سے ہم ہر شعبے میں جس میں اقتصادی شعبہ بھی شامل ہے حقیقی ترقی حاصل کر سکتے ہیں۔ ●

بقیہ "میڈیا کو آزاد کرانے کی ضرورت"

اور تسلسل سے جاری ہوتے ہیں۔ ایسا کئے جانے سے میڈیا کو ایک نئے اور دلیرانہ انداز سے استعمال کرنے کی کوششوں کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ آکاش وانی اور دوردرشن میں جو ہر تخلیق کی موت یقینی ہے اور اس کے نتیجے میں کافی زیادہ صلاحیتیں ہونے کے باوجود تمام تر مواصلاتی کوششوں کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔

اس بات پر بہت زیادہ زور دیا جا رہا ہے کہ میڈیا، جس میں اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا (یعنی ریڈیو اور ٹیلی ویژن) دونوں شامل ہیں، ذمہ دار نگہبانوں کا رول ادا کریں۔ وہ وقت گیا جب حکومت چلانا ایک چھوٹے سے برگزیدہ طبقے کا موروثی حق سمجھا جاتا تھا۔ اب تو ہر شخص کو امور حکومت سے دلچسپی ہے کیونکہ ان کا اثر تمام طبقات کے مستقبل پر پڑتا ہے۔ میڈیا — بالخصوص الیکٹرانک میڈیا کو اس کی عکاسی کرنی چاہیئے۔ ہماری ناکامی عامیانہ پن اور سستی کو دعوت دینے کے مترادف ہوگی۔ اور یہ اس بات کو ظاہر کرے گی کہ میڈیا کے ذمہ دار انسان کی بنیادی سرشت اور اس کی نیکی کے منکر ہیں۔ ●

کے۔ کے۔ کھلّر

تعلیم
ترقّی کے لیے اہم سرمایہ کاری

شاید اس بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ تعلیم تیز رفتار اور لگاتار سماجی و اقتصادی ترقی کی کلید ہے۔ مصنف نے اپنے اس جامع مقالے میں تعلیمی پالیسی اور اس کے موقع سائج پر بالتفصیل بحث کی ہے۔ اس میں جو مستند حقائق و اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں ان سے قارئین یہ اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہم نے تعلیم کے میدان میں نمایاں ترقی کی ہے۔ ہاں ہمیں ابھی ایک طویل مسافت طے کرنی ہے لیکن ہماری منزل مقرر ہے اور ہمیں اس کی جانب تیزی سے آگے بڑھنا ہوگا کیونکہ ہمیں اپنے وسیع انسانی وسائل کو جو ہمیں میسر ہیں بہت تیزی سے ترقی کے انجن کی شکل میں بدلنا ہے۔ ہماری تمام آبادی تعلیم سے لیس ہو کر ملک میں سماجی و معاشی انقلاب لانے کی کوششوں میں زیادہ اچھی طرح سے اپنا حصہ ادا کر سکے گی۔

ہندوستان میں انگریزی راج کی تمام "برکتوں" کے باوجود ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو حصولِ آزادی کے وقت ہم نے جو کچھ ورثے میں پایا وہ یقیناً بہت کم تھا۔ ہماری میراث ۱۷۲۶۶۱ پرائمری اسکولوں، ۱۲۸۴۳ مڈل اسکولوں، ۵۲۴۷ سیکنڈری / ہائی اسکولوں، ۱۷ یونیورسٹیوں، ۶۳۶ ڈگری کالجوں، ۱۷ زراعتی اداروں اور ۱۵ میڈیکل کالجوں پر مشتمل تھی۔ آزادی کا سورج طلوع ہونے سے قبل چھ تا ۱۱ سال کی زمرۂ عمر کے ہر تین بچوں میں سے ایک پرائمری اسکول میں، گیارہ تا ۱۴ سال کے زمرۂ عمر کے ہر گیارہ بچوں میں سے ایک مڈل اسکول میں اور ۱۴ تا ۱۷ سال کے زمرۂ عمر کے ہر بیس بچوں میں سے ایک ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم قریب قریب ناپید تھی۔ روایتی تعلیم گرو کلوں، پاٹھ شالاؤں، مدرسوں اور مکتبوں میں دی جاتی تھی لیکن وہاں سے پڑھ کر نکلنے والے سرکاری ملازمت کے اہل نہیں سمجھے جاتے تھے شہری اور دیہی عوام کے درمیان، مردوں اور عورتوں کے درمیان، امیروں اور غریبوں کے درمیان نیز اونچی ذاتوں کے لوگوں اور درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے درمیان تعلیم میں نابرابری اور عدم توازن تھا۔ پچھڑے اور کمزور ترین اسکولوں کے

درمیان بڑا تفاوت تھا۔ انگریزی زبان کو غیر ضروری طور پر بہت اہمیت دی جاتی تھی اور ہندوستانی زبانوں، سائنس اور علم ریاضی پر زور نہیں دیا جاتا تھا۔ تعلیم میں ثقافت کا عنصر صفر تھا۔ شرح خواندگی صرف ۱۴ فیصد اور مجموعی تعلیمی اخراجات محض ۵۰ کروڑ تھے یعنی قومی آمدنی کے نصف فیصد سے بھی کم۔ تعلیم بالغان، تسلسل تعلیم اور غیر رسمی تعلیم کا نام و نشان

ہندوستان کے قومی رہنماؤں کو اس کا پورا احساس تھا کہ انگریزوں نے اپنی نام نہاد "تعلیم" سے ہمارے ملک اور اس کی ثقافت کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ گاندھی جی نے ذہنی اور جسمانی کام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے بنیادی تعلیم کی ایک اسکیم "نئی تعلیم" کے نام سے وضع کی۔ اس میں کام دھندوں کی تربیت اور بالغوں کی تعلیم شامل تھی اور اس کا محور گاندھی جی کا "عدم تشدد پر مبنی، ذات پات و طبقاتی امتیازات سے بالاتر سماج" کا تصور تھا۔

وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح اسکول اور سماج کو ایک دوسرے کے قریب تر لایا جاسکتا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو ایسی تعلیم کی ضرورت پر اکثر زور دیا کرتے تھے جو فنون کی انسانیت نوازی اور سائنس کی معقولیت پسندی دونوں کا مرکب ہو قانون ساز اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے گوپال کرشن گوکھلے نے ایک مسودۂ قانون ابتدائی تعلیم کو عام بنانے کے لیے پیش کیا تھا۔

آزادی کے بعد کے زمانے میں حکومت ہند اور ریاستوں کا نظریہ یہ رہا ہے کہ قوم کی ترقی اور استحکام کے لیے تعلیم ایک بنیادی عنصر کی حیثیت

دو سو سالہ برطانوی حکومت کے دور میں ہندوستان کو صنعتی اور زراعتی انقلابات کے فوائد سے محروم رکھا گیا جبکہ یوروپ نے عالمی نوعیت کے ان انقلابات سے بے انتہا فائدہ اٹھایا۔ دوسرے الفاظ میں آزادی کی صبح جب ہم خواب سے بیدار ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ ہمارا ملک تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ہے۔

موجود نہ تھا جبکہ برطانیہ عظمیٰ میں لوگ اسی قسم کی تعلیم پبلک اسکولوں میں حاصل کرتے تھے۔ دو سو سالہ برطانوی حکومت کے دور میں ہندوستان کو صنعتی اور زراعتی انقلابات کے فوائد سے محروم رکھا گیا جب کہ یوروپ نے عالمی نوعیت کے ان انقلابات سے بے انتہا فائدہ اٹھایا۔ دوسرے الفاظ میں آزادی کی صبح جب ہم خواب سے بیدار ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ ہمارا ملک تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ہے۔ تعلیمی نظام یا مشترکہ تعلیمی ڈھانچے کے نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی درحقیقت برطانوی ہندوستان اور رجواڑوں کے ہندوستان میں کوئی شے مشترک نہ تھی۔

یہ عوام کی زندگی سے تعلیم کا براہ راست تعلق پیدا کرنے کی جانب ایک بڑا قدم تھا۔ یہ تجربہ گجرات، مہاراشٹر اور راجستھان کے کچھ حصوں میں بہت کامیاب ہوا۔ گاندھی جی کا "تعلیم سے متعلق عملی انداز نظر" کا نظریہ اس یقین پر مبنی تھا کہ انسان زندہ رہنے کے لیے جو کچھ کرتا ہے اس کا اس کی فکر، طرز عمل اور نقطۂ نگاہ پر منہ سے بول کر سکھائی جانے والی باتوں سے کہیں زیادہ اثر پڑتا ہے۔ ان کا مسلک اسکول سماج کے ساتھ مل کر رہنے کا تجربہ تھا جس کی اہم خصوصیات تھیں، چرخہ کاتنا، کپڑا بننا، کھیتی باڑی کرنا وغیرہ

رکھتی ہے چنانچہ انھوں نے اس پر روز افزوں توجہ مبذول کی۔ تعلیم کی تشکیل نو کے مسائل پر غور کرنے کے لیے کئی کمیشن اور کمیٹیاں مقرر کی گئیں جن میں سے یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن، جو ۱۹۴۸-۴۹ء میں ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن کی سربراہی میں مقرر کیا گیا، اور ثانوی تعلیم کمیشن، جس کا تقرر ۱۹۵۲-۵۳ء میں ڈاکٹر اے لکشمن سوامی مدالیار کی صدارت میں عمل میں آیا، قابل ذکر ہیں۔ ان کمیشنوں کی سفارشات پر عمل کے لیے کچھ اقدامات کیے گئے اور پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں

سائنٹفک پالیسی کی قرارداد کی منظوری کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور سائنٹفک ریسرچ پر خاص طور سے زور دیا گیا تیسرے پنجسالہ منصوبے کے اختتام کے قریب نظام تعلیم پر مفصل غور و خوض کی ضرورت محسوس کی گئی تاکہ تعلیم کی تشکیل نو کے لیے ایک نئی اور زیادہ مصمم کوشش شروع کی جا سکے۔ چنانچہ "تعلیم کے قومی ڈھانچے اور تمام مدارج پر تعلیم کے عام اصولوں اور پالیسیوں پر" حکومت کو مشورہ دینے کے واسطے ڈاکٹر ڈ ۔ ۔ ایس۔ کوٹھاری کی صدارت میں ایجوکیشن کمیشن (۶۶ ۔ ۱۹۶۴ء) مقرر کیا گیا۔ اس کمیشن کی رپورٹ پر ہی ۱۹۶۸ء میں تعلیم کی قومی پالیسی مرتب کی گئی۔

۱۹۶۸ء اور ۱۹۸۶ء کے درمیان

۱۹۶۸ء کی قومی پالیسی آزاد ہندوستان میں تعلیم کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل تھی۔ اس کا مقصد قومی ترقی کو فروغ دینا، عوام کو مشترکہ تہذیب اور ثقافت کا احساس کرانا اور قومی اتحاد و یکجہتی کو مستحکم بنانا تھا۔ اس میں تمام مرحلوں پر تعلیم کی کوالٹی کو بہتر بنانے کے لیے تعلیمی نظام کی انقلابی تشکیل نو پر زور دیا گیا تھا، سائنس اور ٹیکنالوجی پر زیادہ توجہ مبذول کی گئی تھی اور تعلیم اور زندگی کے درمیان ایک زیادہ نزدیکی تعلق اور اخلاقی اقدار پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

۱۹۶۸ء کی پالیسی قرارداد کی منظوری کے بعد سے ملک بھر میں تمام سطحوں پر تعلیمی سہولیات میں ہمہ جہت توسیع ہوئی ہے۔ اب ملک کی نوے فیصد سے زائد دیہی بستیوں میں ایک کلومیٹر کے اندر اندر اسکول کی سہولت موجود ہے۔ دوسرے مدارج پر بھی تعلیم کی سہولیات میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے۔ جہاں تک خرچ کا سوال ہے تعلیمی اخراجات، منصوبہ جاتی و غیر منصوبہ جاتی دونوں مل کر دفاع کے بعد دوسرے نمبر پر آتے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں ملک میں ۵,۲۰,۰۰۰ پرائمری اسکول، ۱,۳۰,۰۰۰ مڈل اسکول، ۵۹,۰۰۰ سیکنڈری اسکول، ۶,۰۰۰ ڈگری کالج اور ۱۳۵ یونیورسٹیاں تھیں جن میں ۱۷ زرعی کالج اور ۱۱۷ میڈیکل کالج بھی شامل تھے۔ تعلیمی اخراجات بڑھ کر ۶,۶۲,۸۵ کروڑ روپے یعنی غیر منقسم ہندوستان کے کل اخراجات کا ۵۰ گنا ہو گئے تھے۔

غالباً سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ سارے ملک کے لیے ایک مشترک تعلیمی ڈھانچہ منظور کیا گیا ہے اور دس جمع دو جمع تین کا سسٹم زیادہ تر ریاستوں میں لاگو ہو چکا ہے۔ اسکولی نصاب میں، لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ایک مشترک اسکیم منظور کرنے کے علاوہ سائنس اور ریاضی کو بطور لازمی مضامین کے شامل کیا گیا اور "ورک ایکس پیرینس" (Work experience) کو ایک اہم مقام دیا گیا۔ ایک مشترکہ اسکول سسٹم حقیقتاً ۱۹۶۸ء کی پالیسی کی اہم ترین خصوصیت تھا لیکن یہ معرض وجود میں نہیں آیا۔

انڈر گریجویٹ سطح پر بھی نصابات کی از سر نو ترتیب کی کوشش شروع کی گئی۔ پوسٹ گریجویٹ تعلیم اور ریسرچ کے لیے اعلیٰ تعلیم کے مراکز قائم کیے گئے اور ہم اپنی تعلیم یافتہ افرادی قوت کی ضرورت پوری کرنے کے قابل بن گئے۔

اگرچہ یہ کامیابیاں اپنے آپ میں متاثر کرنے والی ہیں تاہم ۱۹۶۸ء کی پالیسی میں متعین خطوط کو مفصل لائحہ عمل میں نہیں بدلا گیا۔ نہ ہی ذمہ داریاں متعین کی گئیں، نہ مالی و تنظیمی انتظامات کیے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رسائی، کوالٹی، تعداد، افادیت اور مالی اخراجات سے متعلق مسائل سال بہ سال جمع ہوتے گئے اور چند سالوں میں مسائل کا اتنا انبار لگ گیا کہ انھیں حل کرنے کے لیے اشد ترین فوری اقدامات کی ضرورت پیدا ہو گئی۔ تعلیم مخصوص طبقوں اور محض کلاس روم تک محدود تھی۔ نہ اسے ضرورت وقت کے مطابق بنایا گیا نہ کام دھندوں کی مہارت پیدا کرنے پر توجہ دی گئی۔ تعلیم میں جو توسیع و اضافہ ہوا وہ آبادی میں تیز رفتار اضافے سے بے اثر ہو گیا۔ لہٰذا ایک نئی تعلیمی پالیسی مرتب کرنی پڑی۔

نئی تعلیمی پالیسی

قومی تعلیمی پالیسی (۱۹۸۶) جسے عام طور پر نئی تعلیمی پالیسی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، آنے والے ایام میں تعلیم کا منشور اعظم ہے۔ یہ دستاویز ۲۹ صفحات اور دس ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس کے بارہ باب اور ۱۵۷ آرٹیکل ہیں۔ ہر آرٹیکل اکیسویں صدی کی ضرورتوں کے مطابق انسانی وسائل کی ترقی کے مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے مرتب کیا گیا ہے۔

پارلیمنٹ کی منظوری سے قبل اس پالیسی کی ضرورت اور اس کے مشمولات پر ملک بھر میں وسیع پیمانے پر مفصل بحث ہوئی جس میں ہزاروں طلبا، اساتذہ، والدین، طلبا و اساتذہ کی انجمنوں، رضاکار تنظیموں، تعلیمی اداروں، یونیورسٹیوں، ریاستی حکومتوں، مرکزی وزارتوں، پنچایت سمیتیوں اور ضلع پریشدوں نے حصہ لیا۔ پالیسی کے مسودے پر تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ اور قومی ترقیاتی کونسل میں غور و خوض کیا گیا۔ تعلیم کی تاریخ میں دنیا کے کسی بھی ملک میں کسی

تعلیمی پالیسی پر اتنی مفصل بحث نہیں ہوئی۔ اس لحاظ سے یہ پالیسی ہر شخص کی پالیسی ہے کیونکہ اس کی تشکیل میں ہر اس شخص نے جس کا تعلیم سے کوئی تعلق ہے حصہ لیا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی تیار کرنے کی ضرورت کا اظہار سب سے پہلے وزیراعظم نے ۵ جنوری ۱۹۸۵ء کو قوم سے اپنے اولین خطاب میں کیا تھا۔ اس نئی پالیسی کی ضرورت اس لیے پڑی کہ ۱۹۶۸ء کی پالیسی پر مکمل اور یکساں طور پر عملدرآمد نہیں کیا گیا تھا۔ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے

اس بحث مباحثے کے نتیجے میں یہ محسوس کیا گیا کہ اِدھر اُدھر چھوٹی موٹی اصلاحات کرنے سے فرسودہ نظام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ضرورت ایک انقلابی تبدیلی کی ہے۔ یہ تبدیلی ایسی ہونی چاہیئے جو طلباء اور نوجوانوں میں ایک نیا اعتماد پیدا کرے، لوگوں میں تعلیم کے ذریعے بھائی چارے اور قومی اتحاد کا جذبہ پیدا کرے اور ملک کے لیے ایک درخشاں مستقبل کی راہ ہموار کرے۔ اس احساس کے تحت قومی تعلیمی پالیسی لوک سبھا میں ۸ مئی اور راجیہ سبھا میں ۱۳ مئی ۱۹۸۶ء کو منظور کی

آزادی کی تاریخ، ہماری آئینی ذمہ داریاں، ہماری ثقافتی اقدار، قومی وراثت، سائنسی مزاج پیدا کرنے والا مواد، چھوٹے کنبے کا اصول، جمہوریت، سیکولرازم اور سوشلزم شامل ہیں۔ ان عناصر کو مضامین کے اندر سمویا جائیگا مقصد ان ثقافتی و آئینی اقدار کو فروغ دینا ہے جن کا ہم نے عہد کیا ہوا ہے۔ وزیراعظم کے الفاظ میں "نیا تعلیمی نظام ملک کی پرانی قدروں کو مستحکم کرے گا اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ یہ مادہ پرستی کی یورش کے خلاف ہماری ہندوستانیت کو برقرار رکھے گا۔" اس طرح نئی تعلیمی پالیسی بنیادی اقدار کی شکست و ریخت پر ہماری بڑھتی ہوئی تشویش کی مظہر

گاندھی جی کا "تعلیم سے متعلق عملی انداز نظر" کا نظریہ اس یقین پر مبنی تھا کہ انسان زندہ رہنے کے لیے جو کچھ کرتا ہے اس کا اس کی فکر، طرز عمل اور نقطۂ نگاہ پر منہ سے بول کر سکھائی جانے والی باتوں سے کہیں زیادہ اثر پڑتا ہے۔

کوئی لائحۂ عمل مرتب نہیں کیا گیا اور نہ اس مقصد کے لیے رقوم فراہم کی گئیں۔ دریں اثنا ناخواندہ افراد کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا اور دوسری طرف تعلیم کا معیار بھی گر گیا۔ ہر جگہ نئی ٹیکنالوجیاں اُبھر کر سامنے آئیں۔ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ وزیراعظم نے کہا تھا کہ "کوئی نظام ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہ سکتا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اصلاحات لانے کی ضرورت ہوتی ہے"۔ وزارتِ تعلیم نے اگست ۱۹۸۵ء میں "تعلیم کی چنوتی" کے عنوان سے ۱۱۹ صفحات پر مشتمل جو دستاویز جاری کی تھی اس پر اخبارات اور پارلیمنٹ میں مفصل بحث ہوئے۔

گئی۔ پارلیمنٹ نے اگست ۱۹۸۶ء میں نئی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لائحۂ عمل (۱۹۸۶ء) منظور کیا۔

قومی نظامِ تعلیم

نئی تعلیمی پالیسی کا مقصد تعلیم کا ایک قومی نظام قائم کرنا اور تعلیم کے تمام شعبوں میں ہر قسم کی نابرابری اور عدم توازن کو ختم کرنا ہے۔ قومی نظام ایک قومی نصابی ڈھانچے پر مبنی ہے جس میں ایک لازمی کور (CORE) نصاب کے علاوہ دوسرے لچکدار حصّے شامل ہیں۔ مشترکہ کور نصاب میں ہندوستان کی جدوجہد

ہے۔ اور تعلیمی نصاب میں ایسی تبدیلیاں کرنے کی ضرورت پر توجہ مرکوز کرتی ہے جس سے تعلیم کو سماجی و اخلاقی قدریں پیدا کرنے کا ایک طاقتور ذریعہ بنایا جا سکے امید ہے کہ اس قسم کی تعلیم سے مذہبی جنون، کٹرپن توہم پرستی، تقدیر پرستی اور تشدد کو دُور کرنے میں مدد ملے گی۔ قومی نظام تعلیم کا مقصد ملک میں دس جمع دو جمع تین کا ایک مشترکہ تعلیمی سسٹم قائم کرنا ہے۔ جسے ملک کے تمام حصّوں میں تسلیم کیا جا چکا ہے۔ جہاں تک پہلے دس

برسوں کی مزید تقطیع کا سوال ہے اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ پہلے پانچ سال پرائمری تعلیم کے ہوں۔ اس کے بعد کے تین سال اپر پرائمری تعلیم کے اور پھر دو سال ہائی اسکول کے۔

قومی خواندگی مشن

مساوات کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ سب کو نہ صرف رسائی بلکہ کامیابی تعلیم کے لیے برابر کے موقع فراہم کرنا ہے۔

ناخواندگی کا قلع قمع کرنے کے لیے مرکزی حکومت نے ایک قومی خواندگی مشن شروع کیا ہے، جس کے تحت ۱۵ تا ۳۵ سال کے زمرۂ عمر کے اسّی ملین افراد کو کام چلانے کے لائق پڑھنا لکھنا سکھایا جائے گا۔ ان میں سے ۳۰ ملین افراد کو ۱۹۹۰ء تک اور باقی ۵۰ ملین افراد کو ۱۹۹۵ء تک خواندہ بنا دیا جائے گا۔ یہ مشن تعلیم بالغان کے میدان میں گزشتہ تجربات کے سال کی اسکولی تعلیم یا اس کے ہم پلّہ غیر رسمی تعلیم حاصل کر چکے ہوں۔ اسی طرح ۱۹۹۵ء تک تمام بچوں کو ۱۴ سال کی عمر تک مفت اور لازمی تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے گا۔ عام طور پر غیر رسمی تعلیم کو گھٹیا تعلیم خیال کیا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ سماج کے محروم طبقوں کے لیے ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ غیر رسمی تعلیم کسی طرح اسکول کی باقاعدہ تعلیم سے کمتر یا گھٹیا نہیں ہے۔ اسکول سے باہر کے بچوں کے لیے جن میں وہ بچے بھی شامل ہیں جو سرے سے اسکول نہیں

آپریشن بلیک بورڈ کے معنی اسکولوں کو صرف تختۂ سیاہ فراہم کرنا ہی نہیں ہے۔ یہ تو ایک طرزِ فکر اور ایک طرزِ عمل کا مظہر ہے۔ یہ ایک علامت ہے صحیح کام کو صحیح وقت پر، صحیح جذبے کے ساتھ، صحیح ڈھنگ سے صحیح لوگوں سے کروانے کی۔

کہ شرائط کے تعلق سے برابر کے موقعے فراہم کیئے جائیں۔ اس کے علاوہ "کور نصاب" کے ذریعے سب کے اندر برابری کا احساس پیدا کیا جائے گا۔ مقصد اُن تعصبات اور احساسات کو دور کرنا ہے جو سماج کے ماحول اور اونچی یا نیچی ذات یا خاندان میں پیدا ہونے کے سبب پیدا ہو گئے ہیں۔ چنانچہ پالیسی میں درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبائل، اقلیتوں، جسمانی طور پر معذور افراد اور دیگر پسماندہ طبقات کی تعلیم کے لیے وافر گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ انھیں باقی آبادی کے برابر لایا جا سکے اور پھر وہ قومی ترقی کے کاموں میں شانے سے شانہ ملا کر حصہ لے سکیں۔ اصل میں نئی تعلیمی پالیسی کا لبّ لباب سماج کے کمزور طبقوں کو

تجربے کی بنیاد پر شروع کیا گیا ہے۔

اعلیٰ ترین ترجیح

نئی تعلیمی پالیسی میں اعلیٰ ترین ترجیح ان بچوں کے مسئلے کو دی گئی ہے جو تعلیم مکمل کیئے بغیر، بیچ میں اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ مائکرو پلاننگ کی بنیاد پر پورے غور و فکر کے بعد ایسی حکمتِ عملی تیار کی گئی ہے جسے سماج کی سب سے نیچے کی سطح سے شروع کیا جائیگا تاکہ بچے اسکول نہ چھوڑیں اور برابر تعلیم حاصل کرتے رہیں۔ اس کوشش کو غیر رسمی تعلیم کے سلسلے کے ساتھ بخوبی مربوط کیا جائے گا۔ اس بات کا اہتمام کیا جائے گا کہ ۱۹۹۰ء تک گیارہ سال کی عمر کو پہونچنے والے تمام بچے پانچ گئے اور وہ بھی جنھوں نے بیچ میں اسکول چھوڑ دیا، ابتدائی تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے یہ نصب العین سامنے رکھا گیا ہے کہ "۶ تا ۱۴ سال کے زمرۂ عمر کا ہر بچہ اگر ممکن ہو تو کل وقتی بنیاد پر اور اگر ضروری ہو تو جز وقتی بنیاد پر تعلیم حاصل کرے گا۔" اس کے لیے خصوصی تعلیمی سامان کے ساتھ خصوصی نصابات مرتب کیئے گئے ہیں۔ ۹ سے ۱۱ سال تک کی لڑکیوں کو پرائمری کی سطح کے مرکزوں میں اور ۱۱ سے ۱۴ سال تک کی لڑکیوں کو مڈل کی سطح کے مرکزوں میں داخل کیا جاتا ہے۔ اس وقت تعلیمی لحاظ سے پسماندہ نو ریاستوں میں اس قسم کے ...۱۶ مراکز کام

کر رہے ہیں (جن میں سے ۲۱ ہزار مراکز صرف لڑکیوں کے لیے ہیں) گھر پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرنے کے اصول پر نئی تعلیمی پالیسی میں ایک "اوپن اسکول" کا اہتمام کیا گیا ہے۔ سینٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن نے ایسا ایک اسکول ۱۹۷۹ء میں قائم کیا تھا۔ اس میں خط و کتابت کے ذریعے اسباق بھیج کر تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو اپنی ملازمت یا اپنا دھندہ

ایک طرز فکر اور ایک طرز عمل کا مظہر ہے۔ یہ ایک علامت ہے صحیح کام کو صحیح وقت پر، صحیح جذبے کے ساتھ، صحیح ڈھنگ سے صحیح لوگوں سے کروانے کی۔ یہ ملک کے تمام پرائمری اسکولوں کو کم از کم ضروری سہولیات کی فراہمی کا پروگرام ہے۔ اجتماعی ترقی کے بیس فیصد بلاکوں کو، سالِ رواں میں اور مزید بیس فیصد کو آئندہ سال اس پروگرام کے تحت لانے کا فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ منصوبے کے

جس میں جنس قوی اور جنس نازک کے درمیان مساوات کی قدر کی جائے، نصابی کتابوں سے عورتوں کے خلاف جنس کی بنا پر امتیاز ختم کر دیا جائے اور لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم کو عام بنایا جائے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کی غرض سے انھیں نئی ترغیبات فراہم کرنی ہوں گی مثلاً مفت نصابی کتب اور حاضری کا وظیفہ۔ گاندھی جی کہا کرتے تھے کہ اگر آپ ایک لڑکے کو تعلیم دیتے ہیں تو یہ سمجھئے کہ صرف ایک فرد کو تعلیم دیتے ہیں لیکن

> گاندھی جی کہا کرتے تھے کہ اگر آپ ایک لڑکے کو تعلیم دیتے ہیں تو یہ سمجھئے کہ صرف ایک فرد کو تعلیم دیتے ہیں لیکن اگر آپ ایک لڑکی کو تعلیم دیتے ہیں تو آپ سارے خاندان کو تعلیم دیتے ہیں کیونکہ ایک پڑھی لکھی ماں اپنے گھر میں ناخواندگی برداشت نہیں کر سکتی۔

چھوڑے بغیر، گھر بیٹھے تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

آپریشن بلیک بورڈ

نئی تعلیمی پالیسی میں پرائمری اسکولوں کو واجب ضروری سہولیات مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی دو بڑے کمرے جنھیں ہر موسم میں استعمال کیا جا سکے۔ ضروری کھیل کھلونے، چارٹ، نقشہ جات اور دوسرا تعلیمی سامان جس میں ایک بلیک بورڈ یا تختۂ سیاہ بھی شامل ہے۔ اسکولوں کی اصلاح و بہتری کے پروگرام کے تحت ملک بھر میں ایک "آپریشن بلیک بورڈ" جاری ہے۔ آپریشن بلیک بورڈ کے معنی اسکولوں کو صرف تختۂ سیاہ فراہم کرنا ہی نہیں ہیں۔ یہ تو

اختتام تک یہ پروگرام پورے ملک میں لاگو ہو جائے۔

وزیر اعظم نے کچھ عرصہ قبل کہا تھا کہ نئی تعلیمی پالیسی سے سب سے زیادہ فائدہ نوجوانوں اور عورتوں کو پہونچنا چاہیئے۔ لہذا نئی پالیسی کو عورتوں کے درجے میں بنیادی تبدیلی لانے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ یہ تسلیم کیا جانا چاہیئے کہ بہت سی کوششوں کے باوجود مردوں اور عورتوں کے درمیان نابرابری اور عدم مساوات ابھی تک موجود ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں کہا گیا ہے کہ تعلیم کے ذریعے ایک ایسا سماج بنانے کی کوشش کی جائے گی

اگر آپ ایک لڑکی کو تعلیم دیتے ہیں تو آپ سارے خاندان کو تعلیم دیتے ہیں کیونکہ ایک پڑھی لکھی ماں اپنے گھر میں ناخواندگی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس طرح دیہی علاقوں میں لڑکیوں کی تعلیم ایک خاص توجہ حاصل کر چکی ہے۔ تعلیم مکمل کئے بغیر، بیچ میں اسکول چھوڑ دینے والی لڑکیوں کے لیے پہلے ہی ایک خاص مہم شروع کی جا چکی ہے۔

عورتوں کی تعلیم

تعلیم کو عورتوں کے درجے میں بنیادی تبدیلی لانے اور عورتوں کو طاقتور بنانے کے

لیے استعمال کیا جائے گا۔ محکمے کے تمام جاری پروگراموں میں عورتوں کی ترقی کے عناصر کا اضافہ کیا جا رہا ہے، مثلاً:۔

۱۔ آپریشن بلیک بورڈ کے تحت اُستانیاں اور ایک فاضل اُستانی فراہم کرنے پر زور دیا جائے گا۔

۲۔ غیر رسمی تعلیم کو عورتوں کی ترقی کا پروگرام سمجھا جائے گا۔ اور اسے مختصر

لیے تعلیم کے ضابطہ ہائے عمل اور مشمولات میں اصلاح کی جا رہی ہے۔ این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی یعنی تعلیمی تحقیق و تربیت کی قومی کونسل نصابات میں شامل کرنے کے لیے عورتوں کی برابری سے متعلق مواد تیار کر چکی ہے۔ اساتذہ کی تربیت کے عظیم پروگرام میں عورتوں کی برابری کا اندازہ لگانے کے لیے خاص پیمانے مقرر کیے گئے ہیں۔ موجودہ نصابی کتب کی چھان بین کی جا رہی ہے تاکہ اگر ان سے جنس کی بنیاد پر تعصب کا

کے مراکز کی حیثیت سے خواندگی سینٹروں کا قیام تاکہ عورتیں ان میں سرگرم حصہ لے سکیں۔ فراہمی وسائل کے ریاستی مراکز سے تعلیم بالغان کے ان سینٹروں کے لیے خصوصی تعلیمی مواد تیار کرنے کو کہا جائے گا۔

۳۔ لڑکیوں کے تمام سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری اسکولوں کو کام دھندوں کی تربیت کے پروگرام اور اس تربیت سے پہلے کی تربیت کے پروگرام مہیا کیے جائیں گے۔ جو متعلقہ خطے میں کام کے مواقع سے علاقہ رکھتے ہوں گے۔

کھلی یا اوپن یونیورسٹی کے نظام کو تعلیم کو جمہوری بنانے کے آلۂ کار کے طور پر پوری تقویت دی گئی ہے۔ ایک اوپن یونیورسٹی گھر پر بیٹھ کر تعلیم دینے کے اُصول پر کام کرتی ہے۔ اس میں تعلیم خط و کتابت اور جدید ذرائع مواصلات کے ذریعے دُور سے دی جاتی ہے۔

نصابات اور خاتون انسٹرکٹروں کی خصوصی تربیت سے جوڑا جائے گا۔

۳۔ قومی خواندگی مشن عورتوں کی مساوات اور عورتوں کے مراکز چلانے پر خاص توجہ دے گا۔

۴۔ پیشہ ورانہ تربیت میں عورتوں کو کام دھندے سکھلانے کے پروگراموں پر خاص زور دیا جائے گا۔

۵۔ تیکنکی تعلیم کے میدان میں عورتوں کے لیے پالی ٹیکنک قائم کرنے کا ایک بڑا پروگرام شروع کیا جا رہا ہے۔

۶۔ اعلیٰ تعلیم میں عورتوں کی تعلیم پر بدستور توجہ دی جاتی رہے گی۔

باقاعدہ اور غیر رسمی تعلیم کے تمام مراحل پر عورتوں کی برابری کا اصول لاگو کرنے کے

کوئی عنصر موجود ہو تو اسے خارج کیا جا سکے۔

"عورتوں کی برابری کے لیے تعلیم" کے نام سے ایک پراجیکٹ تشکیل دیا گیا ہے۔ جسے منتخب اضلاع میں زیرِ عمل لایا جائے گا۔ اس پراجیکٹ کی تفصیلات متعلقہ ریاستی حکومتوں، عورتوں کی ترقی میں دلچسپی رکھنے والے عالموں اور عورتوں کی ترقی کا کام کرنے والے کارکنوں کے مشورے سے مرتب کی جائیں گی۔ پراجیکٹ کے خاص اغراض و مقاصد حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ تعلیم کے ابتدائی مرحلے میں لڑکیوں کی شرکت کو امدادی خدمات اور مقامی اُستانیوں کی فراہمی اور غیر رسمی تعلیم کے پروگراموں کے ذریعے بڑھانا۔

۲۔ تعلیم، تعریج اور ترقی کے عمل کو سمجھنے

اُمید ہے کہ ہر اسکول میں چار پیشہ ورانہ نصابات شروع کیے جائیں گے اور اس قسم کے نصابات پچاس سیکنڈری / ہائر سیکنڈری اسکولوں میں شروع کیے جائیں گے۔

۴۔ سماجی سائنس کی تحقیق اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں کی حوصلہ افزائی کی جائے گی کہ وہ عورتوں کے لیے تعلیم، تحقیق، تربیت اور توسیعی خدمات کے پروگرام شروع کریں۔ یہ ادارے اپنے طلبا کو اس پراجیکٹ کے تحت شروع کیے جانے والے پروگراموں کی افادیت کے تحقیقی جائزے مرتب کرنے کے کام میں لگائیں گے۔

۵۔ تعلیم کے ضلعی انسٹی ٹیوٹوں سے کہا

جائے گا کہ وہ پراجیکٹ کے ذریعے عورتوں کو طاقتور بنانے کے مقصد کی تکمیل کے لیے کام کریں۔

۹۔ پراجیکٹ کے ضلعوں میں عورتوں کی تعلیم کا ایک مضبوط شعبہ ہوگا۔ اس میں عورتوں کی ترقی چاہنے والے عالموں اور خاتون کارکنوں کا اہم رول ہوگا۔ عورتوں کی ترقی کے پروگراموں کا باریکی سے جائزہ لیا جائے گا اور ضرورت اصلاحات کرنے کا انتظام کیا جائے گا۔ پراجیکٹ کی مدت چار برس ہوگی لیکن جائزہ افادیت کے بعد اس میں مزید چار سال کی توسیع کی جاسکے گی۔

نوودے اسکول

نئی تعلیمی پالیسی میں عوام کو عمدہ قسم کی تعلیم کے کھلے مواقع فراہم کرنے کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ ملک کے ہر ضلع میں ماڈل اسکول، جنھیں اب نوودے اسکول کہا جاتا ہے، قائم کرنے کی تجویز کے پیچھے یہی نظریہ کارفرما تھا۔ یہ اسکول دیہی، قبائلی اور پہاڑی علاقوں کے غریب عوام کے ذہین بچوں کے لیے ہوں گے۔ ان نوودے اسکولوں کا خاص مقصد قومی اتحاد و یکجہتی کو فروغ دینا ہے۔ ملک کے ایک حصے کے بچوں کو دوسرے حصے میں لے جایا جائے گا اور انھیں وہاں کے بچوں کے ساتھ رکھا جائے گا تاکہ وہ سماجی، معاشی اور علاقائی بندھنوں کو توڑتے ہوئے ایک ساتھ ہندوستانیوں کی حیثیت سے بڑے ہوں۔ یہ خیال کہ یہ اسکول برگزیدہ طبقے کے بچوں کے لیے ہیں قطعی بے بنیاد ہے۔ اس کے برعکس ان اسکولوں کے بچوں میں دیہات کے غریب افراد کے بچوں کی تعداد ۷۵ فیصد ہوگی۔ اور ان کی تخلیقی قابلیتوں کے اظہار کے لیے جدت طرازی و تجربہ کاری کی پوری گنجائش ہوگی۔ ملک میں سب کو برابر کے مواقع فراہم کرنے کی راہ میں یہ ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس وقت تک دیش میں ۸۳ نوودے اسکول قائم کیے جاچکے ہیں۔ ایک اور اسکول اگلے سال کھولا جائے گا۔

پیشہ ورانہ نصابات

نئی پالیسی میں پیشہ ورانہ تربیت کو بہت اعلیٰ ترجیح دی گئی ہے۔ ۱۹۹۰ء تک ہائر سیکنڈری اسکولوں کے ۱۰ فیصد طلباء کے لیے اور ۱۹۹۵ء تک ۲۵ فیصد طلباء کے لیے پیشہ ورانہ نصابات کا اہتمام کیا جائے گا۔ اس وقت صرف ۲٫۵ فیصد طلباء کے لیے ان نصابات کا اہتمام ہے جو ناکافی ہے۔ اس بات کا انتظام کیا جائے گا کہ یہ نصابات مکمل کرنے والے طلباء ملازمت سے لگ جائیں یا اپنا روزگار خود شروع کریں۔ ان نصابات پر باقاعدگی سے نظر ثانی کی جائے گی۔ پیشہ ورانہ تربیت میں مرکزی حکومت کے ایک فیصلہ کن کردار کی اہمیت اب سبھی جگہ تسلیم کی جانے لگی ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء سے ایک نئی اسکیم شروع کرنے کا ارادہ ہے جس کے تحت ساتویں منصوبے کی مدت میں پانچ ہزار اسکولوں کو پیشہ ورانہ تربیت کی سہولیات مہیا کی جائیں گی۔ پیشہ ورانہ تعلیم کی مشترکہ کونسل کو، انسانی وسائل کی ترقی کی وزارت کے تحت ایک اہم ادارہ بنانے کی تجویز ہے۔ اس میں پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت کی موجودہ تمام اتھارٹیوں اور ریاستی حکومتوں کے نمائندوں کو شامل کیا جائے گا۔

سائنس کی تعلیم اور ریسرچ کو اعلیٰ ترجیح دی گئی ہے۔ تکنیکی تعلیم اس وقت تک صرف شہری علاقوں کے شعبہ انجینئرنگ کی افرادی قوت کی ضروریات ہی پوری کرتی رہی ہے۔ اب تکنیکی تعلیم دیتے وقت دیہی علاقوں کی اور بالخصوص غیر منظم سیکٹر کی ضروریات کو مدنظر رکھا جائے گا۔

نئی تعلیمی پالیسی نے تعلیمی اداروں کو زیادہ خود مختاری عطا کی ہے جس سے دفتر شاہی کی طوالتیں کم ہوگئی ہیں۔ یونیورسٹی سسٹم میں نرمی لائی جائے گی اور حکومت، صنعت، تحقیقی اداروں اور یونیورسٹیوں کے ساتھ موزوں رابطے قائم کیے جائیں گے۔

ملازمتوں کے لیے ڈگری کی شرط کا خاتمہ

جن ملازمتوں کے لیے ڈگری ضروری نہیں ہے، ان کے لیے ڈگری کی شرط ختم کردی جائے گی۔ اس اقدام کے نتیجے میں الگ الگ پیشوں اور کام دھندوں کے نصابات مرتب کیے جائیں گے جن سے اُن اُمیدواروں کے ساتھ انصاف ہوسکے گا جو کسی خاص کام یا دھندے کی اہلیت رکھنے کے باوجود ملازمت نہیں پاسکتے کیونکہ اس کے لیے بھی گریجویٹ اُمیدواروں کو غیر ضروری ترجیح دی جاتی ہے۔ ملازمتوں سے ڈگری کی شرط کو الگ کرنے کے ساتھ ساتھ نیشنل ٹیسٹنگ سروس کی قسم کی ایک موزوں مشینری قائم کی جائے گی جو مخصوص ملازمتوں کے لیے اُمیدواروں کی موزونیت کی رضاکارانہ طور پر جانچ کرے گی تاکہ ملک بھر میں اس کے برابر کی اہلیت کے لیے اُصول وضع کیے جاسکیں۔ اس قسم کی جانچ کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ لوگوں کو، خواہ ان کے پاس باقاعدہ ڈگری ہو یا نہ ہو، مختلف قسم کی ایسی ملازمتوں کے لیے اپنی قابلیت کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملے گا جو گریجویٹوں تک ہی محدود رہی ہیں۔ اس قسم کی جانچ یا آزمائش سے برسر ملازمت لوگوں کو ترقی پانے میں بھی مدد ملے گی۔

کھلی (اوپن) یونیورسٹی

نئی تعلیمی پالیسی میں کھلی یا اوپن یونیورسٹی قائم کرنے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ اس کی نشوونما تعلیم کے ذریعے دیہی علاقوں کی کایا پلٹ کے بارے میں مہاتما گاندھی کے انقلابی نظریات کی بنا پر کی جائے گی۔ گاندھی جی کے بیسک تعلیم کے پروگرام اور اداروں کی مدد و حمایت کی جائیگی۔ کھلی یا اوپن یونیورسٹی کے نظام کو تعلیم کو جمہوری بنانے کے آلۂ کار کے طور پر پوری تقویت دی گئی ہے۔ ایک اوپن یونیورسٹی گھر پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرنے کے اصول پر کام کرتی ہے۔ اس میں تعلیم خط و کتابت اور جدید ذرائع مواصلات کے ذریعے دُور سے دی جاتی ہے۔ درس گاہ کے احاطے میں بالمشافہ تعلیم کے مقابلے میں اس کے کئی فائدے ہیں۔

کھلی یا اوپن یونیورسٹی اس بات کا براہِ راست نتیجہ ہے کہ باقاعدہ تعلیم کا نظام تعلیمی توسیع کی مانگوں اور چنوتیوں کو پوری نہیں کر سکتا تھا۔ باقاعدہ تعلیم کے نظام کے تحت اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلوں کی تعداد اب بڑھ کر ۲۵٫۵ لاکھ تک پہونچ گئی ہے اور آئندہ بیس سالوں میں اس کے ۱۳۰ لاکھ تک پہونچ جانے کی توقع ہے۔ ساتویں منصوبے کے دوران داخلوں میں ۵۰ فیصد کا اضافہ ہوگا۔ طلبا کی بڑھتی ہوئی تعداد کو داخلہ نہ دے پانے کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ باقاعدہ تعلیم کا نظام آبادی کے صرف ایک چھوٹے سے غیر کام کاجی طبقے کا ہی احاطہ کرتا ہے۔ یہ اُن لوگوں کی کوئی مدد نہیں کرتا جو بیچ میں اسکول یا کالج چھوڑ دیتے ہیں۔ یا سرے سے داخل ہی نہیں ہوتے یا ہو پاتے۔ علاوہ ازیں یہ ایک خرچیلا نظام ہے جسے کوئی غریب ملک بمشکل برداشت کر سکتا ہے۔ تعلیم کو ترقی سے مربوط کرنے کی اس کی صلاحیت بھی محدود ہے۔ لہٰذا غیر رسمی تعلیم ہی واحد حل ہے۔ غیر رسمی تعلیم کا نظام ایک تکمیلی یا اضافی یا متوازی نظام ہو سکتا ہے۔ لیکن ہے یہ عمدہ ترین متبادل نظام۔ صرف یہی تعلیم کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں اور سماجی و اقتصادی ترقی کے لیے درکار افرادی قوت کی مانگوں کو پورا کر سکتا ہے۔

ملک میں پہلی کھلی یونیورسٹی ۲۰ اگست ۱۹۸۲ء کو حیدرآباد میں قائم کی گئی تھی اور اس کا افتتاح راشٹرپتی کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اس نے حیدرآباد کی سنیٹرل جیل میں ایک مطالعاتی مرکز قائم کیا ہے تاکہ قیدیوں کو ڈگری اور پیشہ ورانہ مہارت حاصل کرنے میں مدد دی جا سکے۔ اس مرکز میں کپڑا بُننے، چھپائی، بڑھئی اور پاپوش سازی کے کاموں کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ قیدی جیل سے رہا ہونے پر ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکیں۔

۱۹ نومبر ۱۹۸۵ء کو اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ کیرالہ، بہار اور مہاراشٹر کی حکومتوں نے بھی جلد ہی اپنے یہاں اوپن یونیورسٹیاں قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

طریقہ امتحانات میں اصلاحات

نئی تعلیمی پالیسی میں قابلیت کی جانچ اور امتحانات میں اصلاحات پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ قابلیت کی جانچ درس و تدریس کے کسی بھی سلسلے کا جزو لازم ہے۔ مثبت تعلیمی حکمت عملی کے ایک حصے کے طور پر امتحانات سے تعلیم کی کوالٹی کو بہتر بنانے کے لیے استعمال کیا جانا چاہیئے۔ مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ امتحانوں کے نظام میں اس طرح کی اصلاحات کی جانی چاہئیں جن سے طلبا کی حاصل کردہ قابلیت کی واجب اور صحیح جانچ ہو سکے اور امتحان درس و تدریس کو بہتر بنانے کا ذریعہ بن سکیں۔ اس کے علاوہ درج ذیل اقدامات کرنے ہوں گے :۔

۱۔ امتحان سے اتفاق اور داخلیت کے عنصر کو، جو بہت بڑھ گیا ہے ختم کیا جائے۔

۲۔ زبانی یاد کرنے پر زور کو ختم کیا جائے۔

۳۔ تعلیم کے کُل مدت کے دَوران حاصل کی گئی قابلیت کی لگاتار اور جامع انداز سے جانچ کی جانی چاہیئے اور اس میں تعلیم کے علمی اور غیر علمی دونوں پہلوؤں کی جانچ شامل ہونی چاہیئے۔

۴۔ اساتذہ، طلبا اور والدین کو قابلیت جانچ کے عمل کا موثر استعمال کرنا چاہیئے۔

۵۔ امتحانوں کے اہتمام و انصرام میں بہتری لانی چاہیئے۔

۶۔ تعلیمی مواد، سازوسامان اور تعلیم کے طریقوں میں بیک وقت تبدیلیاں لائی جانی چاہئیں۔

۷۔ سیکنڈری کے مرحلے سے، مرحلہ وار طریقے سے سمیسٹر Semester سسٹم شروع کرنا چاہیئے۔

۸۔ نمبروں کے بجائے گریڈ دیئے جانے چاہئیں۔

مذکورہ بالا اقدامات خارجی امتحانات اور تعلیمی اداروں کے اندر قابلیت کی جانچ دونوں کے لیے موزوں ہیں۔ تعلیمی اداروں کی سطح پر قابلیت کی جانچ کو رواں بنایا جائے گا اور خارجی امتحانات پر حد سے زیادہ انحصار کو کم کیا جائے گا۔

مختصر الفاظ میں نئی تعلیمی پالیسی کا مطمح نظر یہ ہے کہ طلبا، کی قابلیت کی جانچ پڑتال کے عمل کو پڑھنے اور پڑھانے کے عمل میں مدغم رکھا جائے اور طلبا کی قابلیت

جانچ کے عمل کو تعلیم کو ملحوظ کوالٹی بہتر بنانے کے لیے استعمال کیا جائے۔

سسٹم کو کیسے قابل عمل بنایا جائے

پالیسی کی دستاویز میں واضح کیا گیا ہے کہ تعلیم کی نئی ذمہ داریاں بدنظمی کی حالت میں پوری نہیں کی جا سکتیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح کسی ملک میں جمہوری اداروں کی کارکردگی اور بنیادی حقوق سے استفادہ کا انحصار وہاں کے شہریوں کے ذریعے شہری ذمہ داریوں کی ادائیگی اور نظم و ضبط کی برقراری پر ہے۔ اسی طرح تعلیمی نظام میں آزادی کے ماحول، امتزاجیت اور تخلیقیت کا انحصار ذہنی مستقت، تمام متعلقہ افراد کے درمیان لحاظ و مروت اور کام کے ایک نئے ضابطۂ اخلاق کی تشکیل پر ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تعلیمی نظام ملک کے تمام حصوں میں تعلیم کے تمام مرحلوں پر خوش اسلوبی سے کام نہیں کرتا قومی تعلیمی پالیسی میں بیان کردہ تعلیمی اصلاحات بارآور ثابت نہیں ہو سکتیں۔ قومی تعلیمی پالیسی میں کہا گیا ہے کہ اگر اساتذہ اور طلبا میں سچی لگن موجود ہو اور وہ سب مل کر کوشش کریں تو تعلیمی نظام میں یقیناً ایک نئی زندگی ایک نئی تخلیقیت پیدا کی جا سکتی ہے۔

لہٰذا سب سے پہلا کام سسٹم کو زیر عمل لانا اور ایک ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جس میں تمام اساتذہ دل لگا کر پڑھائیں اور تمام طلبا دل لگا کر پڑھیں۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔

۱۔ اساتذہ کے ساتھ بہتر سلوک اور ان کے ذریعے فرائض کی بہتر انجام دہی۔

۲۔ طلبا کے لیے بہتر خدمات کا اہتمام اور طرز عمل کے مسلمہ اصولوں کی پابندی پر اصرار۔

۳۔ تعلیمی اداروں کے لیے بہتر سہولیات کی فراہمی اور

۴۔ ایسا انتظام کرنا جس سے اس بات کا جائزہ لیا جا سکے کہ تعلیمی ادارے قومی یا ریاستی سطح پر طے کیے گئے معیاروں کے مطابق کام کر رہے ہیں یا نہیں۔

ان سب باتوں کے لیے باہمی لین دین اور شرکت باہم کا جذبہ اور جمہوری طرز فکر اختیار کرنا ہوگا۔ مجوزہ لائحہ عمل میں اساتذہ اور طلبا دونوں کی شکایات کے ازالہ کی مشینری قائم کرنا بھی شامل ہے۔

ثقافت

نئی تعلیمی پالیسی میں یہ سفارش بھی کی گئی ہے کہ تعلیم میں ثقافتی جزو کو اس کی جتنی شکلوں میں ہو سکے ترقی دینے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ بچوں میں یہ صلاحیت پیدا کی جائے گی کہ وہ خوبصورتی، نفاست اور ہم آہنگی کو سمجھ سکیں اور ان کی قدر کر سکیں۔ ثقافتی امور کے ماہرین کو، خواہ ان کی باقاعدہ تعلیمی قابلیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، دعوت دی جائے گی کہ وہ تعلیم کے ثقافتی پہلو میں اضافہ کریں۔ اس کے لیے تحریری اور زبانی دونوں روایات کا استعمال کیا جائے گا۔ ثقافتی روایت کو برقرار رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے پرانے ماہرین فن کو، جو اپنے شاگردوں کو روایتی طریقوں سے تربیت دیتے ہیں، تسلیم کیا جائے گا اور ان کی مدد کی جائے گی۔ اسی طرح یونیورسٹی سسٹم اور آرٹ، فن تعمیر اور مشرقی علوم کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے مابین رابطہ قائم کرنے کی بھی تجویز ہے۔ فنون لطیفہ، فن ترتیب، آثار قدیمہ، قدیم عمارات، قدیم اعتقادات و روایات وغیرہ مخصوص شعبوں پر مناسب توجہ دی جائے گی، ان کے مطالعہ، تربیت اور تحقیق کی حوصلہ افزائی کی جائے گی تاکہ ان مضامین میں خصوصی مہارت رکھنے والے لوگوں کی تعداد کو بڑھایا جا سکے۔

پالیسی کی دستاویز میں اقدار پر مبنی تعلیم کو ایک اہم مقام دیا گیا ہے۔ این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی اور ایس۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کے مشورے سے اسکولی نصاب میں سچائی، ایمانداری و دیانت داری اور جذبۂ صادق جیسی قدروں پر زور دیا جائے گا اور بتایا جائے گا کہ ہماری قومی وراثت میں ان قدروں کا کیا حصہ ہے۔ اس کا مقصد بچوں میں ان قدروں کا احترام پیدا کرنا اور ان کی شخصیت کو بنانا ہے۔

پرائمری سے پہلے کے مرحلے پر ثقافت کو تعلیم میں شامل کرنے کی تجویز ہے۔ مقصد یہ ہے کہ

۱۔ بچے میں ماحول کے بارے میں بعض ابتدائی احساسات پیدا کیے جائیں۔

۲۔ مٹی، ریت اور پھول پتیوں جیسی قدرتی چیزوں کے ساتھ کھیلنے اور اس سے سیکھنے میں ان کی مدد کی جائے۔

۳۔ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ مل کر گانے اور ناچنے کے ذریعے حرکت اور آواز کے بارے میں سیکھیں اور ان کے اندر ترنم سے محظوظ ہونے کی قابلیت اور رنگوں اور شکلوں وغیرہ کی پہچان پیدا کی جائے۔

اس کے لیے ایک کلچرل پیرا میٹر تیار کیا جائے گا جو پرائمری سے پہلے کی سطح پر بچوں کی تربیت اور دیکھ بھال کرنے والے اساتذہ اور کارکنان

کی رہنمائی کرے گی۔ سماج کو ترغیب دی جائے گی کہ وہ کھُلی جگہ، دیگر سامان اور سہولیات فراہم کرے جس سے کہ بچّوں میں کھلونوں، تصویروں، پوسٹروں، ماڈلوں وغیرہ کا شوق پیدا کیا سکے۔ ارادہ یہ ہے کہ ہر گاؤں میں بچّوں کا ایک پارک اور ہر اسکول میں بچّوں کا ایک عجائب گھر ہو۔ پرائمری کی سطح پر ہر بچّے کو ہندوستان کے ثقافتی ورثے کے بارے میں ایک بنیادی نصاب پڑھایا جائیگا۔

قدیم ہندوستان میں "گرو ششیہ پرمپرا" (یعنی شاگرد، اُستاد روایت) نے ہمارے بہترین عالم، فنکار اور سائنسداں مُہیا کئے ہیں۔ گرو کل، مدرسے اور مکتب کی تعلیم کو جدید شکل دی جائے گی۔ پالی، پراکرت، اُپ بھرنش، اردھ ماگدھی، قدیم تمل، قدیم تیلگو، سنسکرت، عربی اور فارسی وغیرہ کلاسیکی زبانوں کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ ایک بین الاقوامی انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کرنے کی تجویز ہے تاکہ اسکالر ایک مشترک عالمی کلچر کی جڑیں ہندوستانی اور غیر ملکی کلاسیکی ادب میں تلاش کرسکیں نئی تعلیمی پالیسی میں پرائمری کی سطح پر مادری زبان میں تعلیم دینے، یونیورسٹیوں کی سطح پر علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے اور سہ لسانی فارمولے پر سرگرم عملدرآمد پر زور دیا گیا ہے۔

آنے والے سالوں کے لائحۂ عمل میں یہ باتیں شامل ہیں:۔

۱۔ غیر ہندی ریاستوں میں ہندی ٹیچروں کے تقرر میں امداد دینا جاری رکھا جائے۔

۲۔ یہ امداد پھر ۱۰۰ فیصد تک کردی جانی چاہیئے، جیسا کہ ۷۹۔۱۹۷۸ء میں تھا۔

۳۔ غیر ہندی ریاستوں میں ہندی ٹیچروں کے تقرر کی اسکیم کی طرح ہندی بولنے والی ریاستوں میں بھی جدید ہندوستانی زبانوں کے ٹیچروں کے تقرر کے لیے سو فیصد امداد دی جانی چاہیئے جیسا کہ سہ لسانی فارمولے میں تجویز کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اسکیم مرتب بھی کی جاچکی ہے۔

۴۔ ریاستوں میں ہندی اور جدید ہندوستانی زبانوں کے اساتذہ کے لیے ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کے علاوہ زبانوں کے ٹیچروں کی تربیت کی سہولیات فراہم کرے اور جن ٹیچر ٹریننگ کالجوں میں یہ سہولیات موجود ہیں ان میں انھیں بڑھانے کی ضرورت ہے۔

۵۔ زبانوں سے متعلق انسٹی ٹیوشنوں کو مستحکم بنایا جانا چاہیئے تاکہ وہ ایسے پروگرام شروع کرسکیں جن سے زبانوں کی تعلیم کے لیے سہولیات بہم پہنچائی جاسکیں، زبانیں پڑھانے کے طریقوں کے بارے میں ریسرچ اور کمپیوٹرز اور نئی کمیونیکیشن ٹیکنالوجیوں کے تجربات کیے جاسکیں۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستان میں ۱۶۵۲ مادری زبانیں ہیں۔ گروپ میں شامل کی گئی زبانوں اور بولیوں کی تعداد ۸۲۶ ہے، جن میں سے تقریباً ۴۰ کافی اچھے پیمانے پر استعمال ہوتی ہیں۔ اسکول کی سطح پر ۶۷ تعلیمی زبانیں پڑھائی یا بطور ذریعۂ تعلیم کے استعمال کی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے آئین کے آٹھویں شیڈول میں ۱۵ ہندوستانی زبانیں شامل کی گئی ہیں۔ جبکہ ساہتیہ اکاڈمی نے ہر سال ادبی انعامات دینے کے لیے ۲۲ زبانوں کو تسلیم کیا ہے۔ ہندوستان میں ۵۵۱ درج فہرست قبیلے اور تقریباً ۴۰۰ قبائلی بولیاں ہیں۔ میسور میں واقع ہندوستانی زبانوں کے مرکزی انسٹی ٹیوٹ نے، جو انسانی وسائل کی ترقی کی مرکزی وزارت کے محکمۂ تعلیم کا ایک ذیلی دفتر ہے، ۴۶ قبائلی، اقلیتی اور سرحدی زبانوں کے لیے صوتی ریڈریں، تجزیاتی گرامریں، دو لسانی گائیڈیں تیار کی ہیں اس انسٹی ٹیوٹ نے ایک گرامر اور ایک کثیر لسانی ڈکشنری تیار کرنے کے لیے ۳۵ قبائلی زبانوں کو چُنا ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ پرائمری سطح کے لیے بھی پرائمر تیار کرتا ہے۔ اس نے دو لسانی تعلیم کے ڈھانچے کے اندر ۱۰ پرائمریں شائع کی ہیں۔ یہ پرائمریں نئی تعلیمی پالیسی کی تعمیل کریں گی، جس میں کہا گیا ہے کہ درج فہرست قبائل کا سماجی و ثقافتی تانہ بانہ اپنی اپنی امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔ ان میں بہت سے قبائل کی اپنی اپنی بولیاں بھی شامل ہیں۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ ابتدائی سطحوں کے لیے نصابات اور تعلیمی مواد قبائلی زبانوں میں تیار کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ انتظام بھی ہونا چاہیئے کہ بعد کی تعلیم کے لیے علاقائی زبان کو استعمال کیا جائے۔

عمل درآمد کا جائزہ

ہر پانچ سال بعد پالیسی پر عمل درآمد کا جائزہ لیا جائے گا۔ عمل درآمد کی رفتار ترقی اور اس دوران اُبھر کر سامنے آنے والے نئے رجحانات کا پتہ لگانے کے لیے تھوڑے تھوڑے عرصے بعد بھی اس قسم کے جائزے لیے جاسکتے ہیں۔ تعلیمی پالیسی کی دستاویز تعلیم کی تاریخ میں اپنی قسم کی پہلی دستاویز ہے۔ اس کی کامیابی کا انحصار لائحۂ عمل کو مناسب طور پر عملی جامہ پہنانے پر ہے۔ یہ دستاویز ۲۰۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں تعلیم کے ۲۴ سیکٹروں کا احاطہ کیا گیا ہے اور نہ صرف ۱۹۸۶ء کا لائحۂ عمل بلکہ ساتویں منصوبے کے باقی تین سالوں اور آٹھویں منصوبے کے ایکشن پلان بھی اس میں شامل

کیے گئے ہیں۔

نئی تعلیمی پالیسی میں تعلیم کو ایک خدمت کے بجائے قومی ترقی و بقا کے لیے سرمایہ کاری کا ایک اہم شعبہ قرار دیا گیا ہے۔ ۱۹۶۸ء کی پالیسی میں مندرج ہے کہ تعلیم پر سرمایہ کاری کو رفتہ رفتہ اتنا بڑھانا چاہیئے کہ یہ جلد سے جلد قومی آمدنی کے چھ فیصد کے برابر ہو جائے۔ اگلے تین چار برسوں میں تعلیم پر اخراجات قومی آمدنی کے چھ فیصد سے زیادہ ہوں گے۔

مربوط دیہی ترقی کے پروگرام (IRDP) دیہی روزگار کے قومی پروگرام (NREP) اور دیہات میں روزگار کی گارنٹی کے پروگرام (RLEGP) کے فنڈز میں سے پہلا حصہ پرائمری اسکول کی عمارت پر ہوگا۔ تعلیم ایک سماجی ذمہ داری ہے جس میں سبھی کو اپنا حصہ ادا کرنا ہے۔ صنعت کو بھی اپنا حصہ ادا کرنا ہوگا اور ساری قوم کو تعلیم کو عام بنانے اور ناخواندگی کو ختم کرنے کا عہد کرنا ہوگا۔ تبھی ملک میں ایک غیر متشددانہ غیر استحصال پسندانہ سماجی و اقتصادی نظام قائم کرنے کا مہاتما گاندھی کا خواب پورا ہو سکے گا۔ تبھی ہمارا ملک قوموں کی برادری میں اپنی عظیم ثقافتی وراثت اور اپنی عظیم صلاحیتوں کے مطابق اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے گا۔

انسانی وسائل کی ترقی و نشوونما

انسانی وسائل کی ترقی و نشوونما اپنے آپ میں ایک اہم قومی نصب العین بھی ہے اور ملک کی تیز رفتار سماجی و اقتصادی ترقی کا ایک اہم ذریعہ بھی۔ ساتویں پنجسالہ منصوبے کا ایک بڑا کام ملک کے کثیر انسانی وسائل کو کام میں لانا اور انصاف و مساوات کے ساتھ ترقی کے لیے ان کی صلاحیتوں کو بہتر بنانا ہے۔" غریبی کے خاتمہ، اقتصادی و سماجی نابرابری میں کمی، پیداوارِیت میں اضافہ، افرادی قوت کی منصوبہ بندی اور تعلیمی خدمت کے لیے تربیت کے پروگرام انسانی وسائل کی ترقی کے لازمی پروگرام ہیں۔ ساتویں پنجسالہ منصوبے میں واضح کیا گیا ہے کہ صرف شعبۂ مالیات میں وسائل کو حرکت میں لانے سے ترقی کے عمل کے پیچیدہ مسائل کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ انسانی عنصر ترقی کے عمل میں اہم ترین پارٹ ادا کرتا ہے۔ اس لیے انسانی وسائل کی خاطر خواہ ترقی اور نشوونما کے بغیر ہم ترقی کے عمل میں پسپائی سے نہیں بچ سکتے۔ تعلیم تیز رفتار اور مسلسل سماجی و اقتصادی ترقی کی کلید ہے۔

انسانی وسائل کی ترقی کو جمہوری معاشروں میں کسی ملک کی سماجی و اقتصادی ترقی اور اس کے عوام کے طرزِ زندگی کا اشاریہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے آبادی میں جسمانی و ذہنی قوت، ہنرمندی، صحیح نظریات و صحیح اقدار پیدا ہوتی ہیں جن کی بدولت انسان انفرادی زندگی میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں اور قومی ترقی کے کاموں میں سرگرم حصہ لے سکتے ہیں۔ انسانی وسائل کی ترقی و نشوونما کی تشریح یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ نوعِ انسانی کی صلاحیتوں کو جلا دینے اور انھیں اقتصادی و سماجی ترقی کے لیے پوری طرح بروئے کار لانے کا عمل ہے۔

انسانی وسائل کی ترقی میں تعلیم کا رول اُس کیمیاوی شے کی طرح ہے جو خود متاثر ہوئے بغیر دوسری چیزوں میں تغیر پیدا کرتی ہے۔ یہ نہ صرف فرد کو مستفید کرتی ہے بلکہ سماجی انقلاب اور ترقی کا ذریعہ ہے جو ملک پر اس کی آبادی کے بارِ گراں کو ملک کی ترقی کے انجن میں بدل سکتی۔ قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء میں کہا گیا ہے کہ انسان ایک مثبت سرمایہ اور ایک قیمتی قومی وسیلہ ہے جس کی ترقی اور نشوونما اشد ضروری ہے۔ اس کے لیے تعلیم کا منصوبہ سوچ سمجھ کر بنایا جانا چاہیئے۔ اور اس پر سمجھداری اور صدقِ دل سے عمل کیا جانا چاہیئے۔ انسانی وسائل کی ترقی کا انحصار مناسب سیاسی و سماجی ماحول پر ہے۔

ایک ایسا سسٹم بنانا بہت ضروری ہوگا جس میں تمام تعلیمی کوششوں کو سماجی و ثقافتی ترقی کے ساتھ مربوط کر دیا جائے تاکہ فرد کی پوری صلاحیت کو نکھارا جا سکے۔ انسانی وسائل کی مربوط ترقی کے مقصد کی تکمیل کے لیے پہلا قدم تعلیم سے متعلق تمام سرگرمیوں، آرٹ، ثقافت، نوجوانوں کے لیے خدمات اور کھیل کود اور بچوں اور عورتوں کی ترقی کے پروگراموں کو باہم مربوط کرنا ہونا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ قومی ترقی کی ترجیحات کو مدِنظر رکھتے ہوئے تمام تعلیمی پروگراموں کو زراعت، تعلیم، طبی تعلیم، نیم طبی عملے اور صنعتی کارکنان کی تعلیم کے اُن پروگراموں کے ساتھ بھی مربوط کرنا چاہیئے جو دوسری وزارتوں کے زیرِ سرپرستی چلائے جاتے ہیں۔

نئی تعلیمی پالیسی کی دستاویز کے مطابق خاص کام ایک ایسے ملک کے مینارِ ترقی کی بنیاد کو مضبوط کرنا ہے جس کی آبادی اس صدی کے اختتام تک ایک ارب کے قریب ہو جائے گی۔ اس بات کی کوشش کرنا بھی اتنا ہی اہم ہے کہ جو لوگ اس مینار کی چوٹی پر ہوں وہ دنیا کے بہترین افراد میں سے ہوں۔ ماضی میں ہمارے ثقافتی سرچشمے ان دونوں باتوں کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن اس سلسلے میں رکاوٹ غیر ملکی تسلط کے دوران پیدا ہوئی۔ لیکن اب انسانی وسائل کی ترقی و نشوونما کی ملک گیر کوششوں کو تیز تر کیا جانا چاہیئے اور اس میں تعلیم کو کثیر پہلو رول ادا کرنا چاہیئے۔ ●

ڈاکٹر ایم. ایس. رندھاوا

ہندوستانی زراعت

مصنف وزارتِ زراعت میں ایک اعلیٰ انتظامیہ افسر ہیں اور اُن کا زراعت کے شعبے میں منصوبہ بندی، تحقیق اور ترقی سے قریبی تعلق رہا ہے۔ درج ذیل مضمون میں انھوں نے ہندوستان کے کاسۂ گدائی پکڑے رہنے کی حالت سے دنیا میں غلّے کی افراط والے ایک ملک کے طور پر اُبھرنے کی داستان بیان کی ہے۔ سبز انقلاب کے آغاز سے لے کر زراعت میں استعمال کی جانے والی نئی اشیا بشمول نئی تکنیک تک ہمارے ملک نے بڑے پیمانے پر اناج پیدا کرنے میں حیران کن ترقی کی ہے۔ تاہم برآمدی مقاصد سے قطع نظر کرتے ہوئے زراعت کا رُخ معین کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ جس کے لیے بین الاقوامی مقابلے کی قیمتوں پر اناج پیدا کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس مضمون میں کئی پہلوؤں سے کی جا رہی اُن کوششوں کا ذکر ہے جو بارانی کھیتی، کیڑوں مکوڑوں کی روک تھام اور فصل کٹنے کے بعد اُسے کم لاگت سے سنبھالنے کی ٹیکنالوجی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نئے مسائل کا مقابلہ کرنے کے لیے معیشت، حیوانات اور اقتصادیات میں ایک نئے امتزاج کی ضرورت ہے جس سے معیشت حیوانات میں توازن کو برقرار رکھتے ہوئے معیارِ زندگی میں مسلسل اضافہ کیا جاسکے۔

آزادی کے بعد ہندوستان کی زراعتی ترقی کی قومی اور بین الاقوامی سطح پر تعریف کی گئی ہے۔ چھٹی دہائی کے وسط تک جس ملک کو کہا جاتا تھا کہ وہ کاسۂ گدائی ہاتھ میں لیے ہوئے ہے آج اُسے دنیا کے غلّے کی افراط والے ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی ہم آہنگ کوششوں کا ثمرہ ہے جن کے لیے منتظموں اور منصوبہ سازوں، تحقیقی سائنس دانوں، توسیعی کارکنوں، زراعت کے لیے درکار ضروریات جن میں قرضے بھی شامل ہیں فراہم کرنے والے اداروں، ذرائع ابلاغ اور بہت سی دیگر تنظیموں نے مل کر کام کیا ہے۔

آزادی کے بعد زراعت کی ترقی ایک مسلسل عمل ہے جس نے ملک کو خوراک کے معاملے میں خود کفیل بنانے میں مدد دی۔ اس لحاظ سے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۶ء کے بعد کے ادوار امتیازی قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۶ء کے دوران زراعت میں ترقی زیادہ تر سماجی ترقی کے لیے کیے گئے اقدامات

سے حاصل ہوئی جن میں مساوات کے لیے
اصلاحاتِ اراضی اور بیجوں و کھاد کی فراہمی
کے لیے امداد شامل ہے۔ ان اقدامات کے
سبب رقبہ زیرِ کاشت ۵۰-۱۹۴۹ء میں ۹
کروڑ ۷۲ لاکھ ۰۰ ہزار ہیکٹیر سے بڑھ کر
۷۶-۱۹۷۵ء میں ۱۱ کروڑ ۱۵ لاکھ ہیکٹیر اور
اناج کی پیداوار ۵ کروڑ ٹن سے بڑھ کر ۷ کروڑ
۲۳ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن تک پہونچ گئی۔ اس ترقی
کے باوجود ملک کو بڑھتی ہوئی آبادی کی غذائی

۷۶-۱۹۷۵ء میں ۱۲ کروڑ ۱۰ لاکھ ۳۰ ہزار ٹن پہونچ
گئی۔ اُس کے بعد اب تک کے برسوں کو اس
سبز انقلاب کو جاری رکھنے کے برس کہا جاسکتا ہے
جو اس بات سے ظاہر ہے کہ ۸۶-۱۹۸۵ء میں
اناج کی پیداوار ۱۵ کروڑ چار لاکھ ۷۰ ہزار ٹن رہی
ہے۔

پیداوار میں اضافے کے علاوہ سب سے
بڑی کامیابی ابھرنے کی وہ قوت ہے جو ہندوستانی
زراعت نے ماضی قریب میں حاصل کی ہے۔
بدترین خشک سالی کے باوجود جس میں آٹھویں

نئے مسائل اور نئے چیلنج ہیں؟

نئے نشانے

ہماری اناج کی پیداوار موجودہ صدی کے
آخر تک ۲۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن سے ۲۴ کروڑ ۵۰
لاکھ ٹن کی حد تک پہونچنی چاہیے جس سے ہم تخمیناً
ایک ارب نفوس کی آبادی کی ضروریات پوری
کرسکیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اناج کی پیداوار
جو اس وقت ۱۵ کروڑ چار لاکھ ۷۰ ہزار ٹن ہے
پندرہ برس میں ساڑھے سات کروڑ ٹن سے
ساڑھے نو کروڑ ٹن تک بڑھنی چاہیے۔ یہ
ایک بہت بڑا اور مشکل کام ہے۔ ہمیں اپنے

ہم اناج کی پیداوار میں خود کفیل ہو گئے ہیں اور اناج کا دو کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن کا ذخیرہ بھی کرلیا ہے۔ تاہم اب بھی ہندوستان کی زراعت کے سامنے نئے نشانے نئے مسائل اور نئے چیلنج ہیں۔

ضروریات پوری کرنے کے لیے قریب ایک کروڑ
ٹن اناج درآمد کرنا پڑتا تھا۔
لیکن زراعت میں حیران کن ترقی کا دور
۶۷-۱۹۶۶ء میں شروع ہوا جب میکسیکو کی کم
لمبائی والی گندم کی اقسام مثلاً کلیاں سونا، سونا
لیکا، چھوٹی لرما اور شربتی سونورا نے سبز انقلاب
کا آغاز کیا۔ جن اسباب نے اس انقلاب
کی رفتار تیز کی ہیں وہ ہیں۔ (۱) پانی، توانائی،
بیج، کھادوں اور قرضے کی مجموعی فراہمی اور
(۲) پیداوار کی قیمت کو بڑھانے اور برقرار
رکھنے والی سرکاری حکمت عملیاں۔ چھٹی دہائی کے
آخری اور ساتویں دہائی کے ابتدائی برسوں سبز
انقلاب کا وہ دور تھا جب پیداوار کی مقدار
میں بڑی چھلانگ لگائی گئی اور پیداوار ۶۶-۱۹۶۵
میں ۷ کروڑ ۲۳ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن سے بڑھ کر

دہائی کے دوران زیادہ از ۷۰ فیصد رقبہ زیر
کاشت متاثر ہوا اناج کی پیداوار میں کمی ہم
سے ۷۰ لاکھ ٹن تک محدود رکھی گئی جب کہ ساتویں
دہائی کے دوران ایسی ہی خشک سالی میں پیداوار
میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن سے دو کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن
کی کمی ہوئی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان
کی زراعت میں ایک قسم کا استحکام پیدا ہوگیا ہے
اور زراعت اب مون سون پر انحصار رکھنے والا
جوا نہیں رہا۔ یہ قابل تعریف کارنامہ تحقیق اور
زراعت کی ترقی کی ایک اچھی منصوبہ بند حکمتِ
عملی کے سبب ممکن ہوسکا ہے۔ ہم اناج کی
پیداوار میں خود کفیل ہوگئے ہیں اور اناج کا دو
کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن کا ذخیرہ بھی کرلیا ہے۔ تاہم اب
بھی ہندوستان کی زراعت کے سامنے نئے نشانے

خوردنی تیلوں، دودھ اور گوشت کی ضروریات
بھی پوری کرنی ہیں۔ صرف خوردنی تیلوں کی درآمد
پر ۱۳۰۰ کروڑ روپے خرچ کیا جارہا ہے۔ اس
کے علاوہ ہماری ریشوں، چارے، ایندھن اور
عمارتی لکڑی جیسی دیگر زراعتی اشیاء کی مانگ
بھی بہت بڑھی ہے۔
دیہی خوشحالی کا تعلق بہت حد تک
زراعت سے ہے کیونکہ ۷۶ فیصد آبادی زراعت
کرتی ہے اور قومی آمدنی کا قریب ۴۰ فیصد حصہ
زراعت سے حاصل ہوتا ہے۔ دیہات میں خوشحالی
کا دور شروع کرنے کے لیے کھیتی سے آمدنی
میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنا ہوگا جس کے لیے
ملی جلی فصلوں، مویشی پالنے، ماہی پروری اور

باغبانی کے کاموں کے ذریعہ زراعت میں نئے کام شروع کرنے ہوں گے۔ اس لیے ضروری ہوگا کہ بین الاقوامی سطح پر مقابلے کی قیمتوں پر مال پیدا کر کے زراعت کو برآمدات کے مقصد سے آگے بڑھایا جائے۔

زراعت کے شعبے میں حکمتِ عملی میں ایک شعوری تبدیلی کی ضرورت ہے جس میں عام ترقی کی بجائے دیہی غریبی پر براہِ راست حملہ کیا جائے کیوں کہ زراعت کے بغیر دیہات کی غریبی دور نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں زراعت کو صرف زیادہ اناج پیدا کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ زیادہ روزگار کے مواقع اور زیادہ دیہی آمدنی حاصل کرنے کے ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنا ہوگا۔

> دیہی غریبی پر براہِ راست حملہ کیا جائے کیوں کہ زراعت کے بغیر دیہات کی غریبی دور نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں زراعت کو صرف زیادہ اناج پیدا کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ زیادہ روزگار کے مواقع اور زیادہ دیہی آمدنی حاصل کرنے کے ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنا ہوگا۔

مسائل: اراضی کی پیداواریت کے خطرات

ہندوستانی زراعت کو انسانی آبادی میں لگاتار اضافے سے سخت مشکلات کا سامنا ہے جس سے فی کس رقبہ زیرِ کاشت جو ۱۹۵۰ء میں ۰.۳۳ ہیکٹر تھا کم ہو کر ۱۹۸۰ء میں ۰.۲۰ ہیکٹر رہ گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ ۲۰۰۰ء تک یہ رقبہ ۰.۱۵ ایکڑ رہ جائے گا۔ اس کے علاوہ زمین کی زرخیزی کم ہو رہی ہے، صنعتوں سے خارج کئے جانے والے کثیف مادّوں کی زمین میں مقدار بڑھ رہی ہے، زراعتی کیمیات کے استعمال میں بھی اضافہ ہو رہا ہے قریب ۱۷ کروڑ ۵۰ لاکھ ہیکٹیئر اراضی کو مختلف قسم کے خطرات درپیش ہیں۔ ۴ کروڑ ہیکٹیئر زمین سیلابوں کی زد میں اور ۲۶ کروڑ ہیکٹیئر رقبہ خشک سالی سے متاثر ہو سکتا ہے۔ ہمارے کُل جغرافیائی رقبے کا ۱۲ فیصد حصہ بنجر ہے جو زیادہ تر راجستھان اور گجرات میں ہے، جہاں زمین بہت ناقص ہے، بارش بہت کم اور غیر یقینی ہے۔ زمین پر حیاتیاتی دباؤ زیادہ ہے زمین پر اور زیرِ زمین پانی کم ہے اور توانائی کے وسائل ناکافی ہیں۔ ان خصوصیات کے سبب صحرا پھیلتا ہے۔ ہمالیائی اور دیگر پہاڑی خطوں کی معیشت حیوانات کا نظام بہت کمزور ہے۔

زمین کے وسائل ہماری مقدس وراثت ہیں۔ ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم اس وراثت کو نہ صرف اسی شکل میں بلکہ بہتر بنا کر آنے والی نسلوں کے حوالے کریں اس لیے زرعی ترقی کے عمل کو زمینی وسائل کی صلاحیت اور ماحولیاتی تحفظ کے پہلوؤں کا لازمی طور پر خیال رکھنا چاہیئے۔ ہمیں ایسے پروگرام بنانے چاہئیں جن سے زمین اور پانی کے باہمی تعلق کو برقرار رکھا جا سکے۔ دستیاب زمین کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہو، گھٹیا زمینوں کو بحال کیا جائے اور ترقی دی جائے، روزگار پیدا کیا جائے اور دیہات میں معیارِ زندگی کو بہتر بنایا جائے، زمینی وسائل کے زیادہ سے زیادہ استعمال اور تحفظ کی ضروریات کو سماجی و اقتصادی نصب العین سے ملا کر زراعت اور اس سے متعلقہ پیشے دیہات کی آبادی میں خوشحالی لا سکتے ہیں۔

فصلوں اور خطّوں کی پیداوار میں نابرابری

ملک کی اناج کی پیداوار میں تین گنا اضافہ ہوا ہے جس کا ۴۳ فیصد حصہ بہتر قسم کی پیداوار کی ٹیکنالوجی اور صرف ۲ فیصد حصہ رقبہ زیرِ کاشت میں توسیع کے سبب حاصل ہوا ہے۔ پیداوار میں بڑا اضافہ گندم میں ہوا ہے جو ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۶۵ لاکھ ۶۰ ہزار ٹن سے بڑھ کر ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۴ کروڑ ۹۰ لاکھ ٹن ہو گئی۔ اسی طرح چاول کی پیداوار جو ان برسوں میں دو کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۶ کروڑ ٹن ہو گئی ہے۔ اسی عرصے میں موٹے اناجوں کی پیداوار دوگنی ہو گئی ہے۔ تاہم دالوں اور تلہن کی پیداوار بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکی حالانکہ دالوں کی پیداوار ۸۴ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ایک کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن اور تلہن کی پیداوار ۵۲ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ایک کروڑ ۲۵ لاکھ ٹن ہو گئی ہے۔ مختلف فصلوں کی

مطالعہ کو اولین مقام دیا جانا چاہیے مستقبل میں شروع
کیے جانے والے پراجیکٹوں میں آبپاشی اور پانی
کے نکاس اور ذخیرہ آب کے علاقے کے تحفظ کو
الگ الگ کاموں کے بجائے مجموعی طور پر ایک ہی
کام سمجھنا چاہیے۔ کوئی ایسا آبپاشی پراجیکٹ شروع
کرنے سے قبل جہاں سے کھیتوں تک پانی نہ پہنچایا
میں دس سے پندرہ برس لگ جائیں گے عبوری مدت

پانی کے بہتر استعمال کے طریقے بھی معلوم ہو جائیں
گے۔ ان تحقیقوں کو کسانوں کو آبپاشی کے پانی
کے بہتر استعمال سے آگاہ کرنے کے لیے بھی استعمال
کیا جا سکتا ہے۔

کیمیائی کھادوں کے استعمال کے لیے ۱۹۸۷ء
میں ۹۲ لاکھ ٹن کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ ٹیکنیک
۲۰۰۰ء تک یہ استعمال بڑھا کر دو کروڑ ٹن کرنا ہوگا۔
کیمیائی کھاد بہت مہنگی چیز ہے جو کھیتی میں استعمال

ہو گیا ہے۔ آلودگی سے پاک ماحول کی مانگ کو مدنظر
رکھتے ہوئے اور پودوں کو بیماریوں سے بچانے کے
لیے جو حکمتِ عملی اب بنائی گئی ہے، اُس میں پودوں
کے تحفظ کے لیے نسلی، پیدائشی اجزا اور حیاتیاتی
طریقوں پر زور دیا گیا ہے۔

فصل کٹنے کے بعد کی ٹیکنالوجی

ملک نے زراعتی آلات و مشینوں کی تیاری،
ساخت، استعمال اور دیکھ بھال میں نمایاں ترقی
کی ہے۔ جس نے سبز انقلاب کو جاری رکھنے میں

ملک نے زراعتی آلات و مشینوں کی تیاری، ساخت، استعمال اور دیکھ بھال میں نمایاں ترقی کی ہے جس نے سبز انقلاب کو جاری رکھنے میں بہت حصہ ادا کیا ہے۔ اگر کسانوں کو فصل کٹنے کے بعد اُسے سنبھالنے کے طریقے اُس کے گھر جا کر مہیا کیے جائیں جنھیں وہ اختیار کرے تو اُس سے فصل کٹنے کے بعد اناج کے نقصانات اور اُس کی غذائی قدر و قیمت میں گراوٹ کو کم از کم کیا جا سکتا ہے۔ وہ بازار میں فروخت کے قابل مال کو بازار میں کام کرنے والی قوتوں سے سودا بازی کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

کو زمین تیار کرنے اور کمان علاقے کے کسانوں کو
آبپاشی کے پانی کو اچھی طرح استعمال کرنے کے لیے
آگاہ کرنے کے واسطے استعمال کیا جانا چاہیے۔
آبپاشی کے بہت سے کمان علاقوں میں فصلوں کے
منصوبے بنا کسی صحیح جانچ پڑتال کے تھوپ دیے
جاتے ہیں۔ یہ جانچ پرکھ آبپاشی کی صلاحیت
پیدا ہونے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ بہتر یہ
ہوگا کہ ۲۵ سے ۵۰ ہیکٹیئر کے چھوٹے تجرباتی پلاٹ
بنائے جائیں۔ ان کے لیے زیر زمین پانی استعمال
کیا جائے۔ اس سے وہاں کونسی فصلیں اگائی جا سکتی
ہیں اُن کا بھی پتہ لگ جائے گا اور آبپاشی کے

ہوتی ہے۔ ہمارے دو تہائی کسان چھوٹے اور
مجبور کسان ہیں۔ اُن میں سے بہت سے لوگوں
کے پاس کیمیائی کھاد خریدنے کے لیے پیسہ یا قرضہ
نہیں ہے۔ حیاتیاتی کھادیں زمین کو نائٹروجن مہیا
کرنے کا کم خرچ وسیلہ بن سکتی ہیں۔ یہ کھادیں کیمیائی
کھادوں کے استعمال میں مدد بھی دے سکتی ہیں اور
پیداوار بڑھانے کے لیے بھاری اہمیت بھی
رکھتی ہیں۔

کیڑے مار دوائیوں کا استعمال جو ۵۱-۱۹۵۰ء
میں ۲۳۵۰ ٹن تھا ۸۷-۱۹۸۶ء میں بڑھ کر ۶۰ ہزار ٹن

بہت حصہ ادا کیا ہے۔ اگر کسانوں کو فصل کٹنے کے
بعد اُسے سنبھالنے کے طریقے اُس کے گھر جا کر مہیا
کیے جائیں جنھیں وہ اختیار کرے تو اُس سے فصل
کٹنے کے بعد اناج کے نقصان اور اُس کی غذائی
قدر و قیمت میں گراوٹ کو کم از کم کیا جا سکتا ہے۔
وہ بازار میں فروخت کے قابل مال کو بازار میں کام
کرنے والی قوتوں سے سودا بازی کے لیے استعمال
کر سکتے ہیں۔ حقیقت سبز انقلاب کے آغاز
سے ہی ۶ ، ہوئی تھی۔ اگر اناج کو سائنسی ڈھ...

(باقی صفحہ ۹۵ پر)

ڈاکٹر بی۔ بی۔ بھٹا چاریہ

زراعت کی متوازن ترقی

زیرِ نظر مضمون میں، پروفیسر بھٹا چاریہ نے، جو کہ بھارت میں ہونے والی زرعی اور دیہی ترقی کے ایک ذہین اور سنجیدہ مبصر و مشاہد ہیں، گذشتہ چار دہوں میں ہماری زرعی منصوبہ بندی کی خوبیوں اور خامیوں کا ایک متوازن تجزیہ پیش کیا ہے۔ اُن گوناگوں زرعی مسائل کے تئیں جن کا ہمارے ملک کو آج سامنا ہے، پروفیسر بھٹا چاریہ کا مثبت اندازِ نظر، اس مضمون میں اُن کی جا بجا تنقید سے پیدا ہونے والی سخت اذیت کا ازالہ کرتا ہے۔ راقم نے کچھ ٹھوس حل تجویز کئے ہیں جن پر اگر عمل کیا جائے تو اُس سے یقیناً غیر متوازن زرعی ترقی کا انسداد ہو سکتا ہے نیز اس شعبے میں توازن پھر سے بحال کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بڑی کامیابی سے، ہمارے ملک میں اُگائی جانے والی متعدد فصلوں کے عروج و زوال کا خاکہ کھینچا ہے، جس میں دیہی حالات کو منعکس کیا گیا ہے۔

آزادی کے وقت، بھارتی معیشت نہ صرف دُنیا کی کمزور ترین معیشتوں میں سے تھی بلکہ یہ ساکت و جامد بھی تھی۔ لگ بھگ نصف صدی (۱۹۴۶ـ ۱۹۰۰ء) تک ۱ء۱ فیصد سالانہ کے حساب سے، اس کی آبادی میں اضافے کی طویل مدتی شرح کم و بیش ۲ء۱ فیصد کے حساب سے، اصل قومی آمدنی کی طویل مدتی شرحِ نمو کے برابر تھی۔ محض ۳ء۰ فیصد طویل مدتی شرحِ نمو کے ساتھ زرعی پیداوار فی الواقعی جامد تھی۔

خوراک کی پیداوار کی بہ نسبت آبادی میں تیز تر اضافے کے باعث، افلاس کا دائرۂ اثر، جو کہ بیسویں صدی کے آغاز میں پہلے ہی سے کافی وسیع تھا، آزادی کے وقت مزید پھیل کر تقریباً ۵۰ فیصد ہو گیا۔ بیسویں صدی کے اول نصف کے دوران معیشت کا مجموعی انداز غریبی، کم آمدنی، کم بچت، کم سرمایہ کاری، کم یافت کے مذموم چکر میں مبتلا تھا۔

اس کے مقابلے میں، آزادی کے بعد کے دور میں بھارتی معیشت کی مجموعی کارکردگی سراسر بہتر ہے۔ قومی آمدنی کی پیداواری شرح بڑھ کر ۶ء۳ فیصد ہو گئی ہے اور یہ اب آج کے صنعتی ممالک کے ابتدائی ترقیاتی مرحلے کی طویل مدتی پیداواری شرح کے مقابلے میں خاصی اچھی ہے۔ صنعتی پیداواری شرح بھی آزادی سے پہلے کے دور کے ۲ فیصد سے بڑھ کر آزادی کے بعد ۶ فیصد ہو گئی۔ ۷ء۲ فیصد پر زرعی پیداوار کی شرح آزادی سے پہلے کی مدت کے دوران کی

شرح جتنی ہی ہے۔ خوراک کی پیداوار ۹-۱۹۴۸ء میں ۵۰ ملین ٹن سے کم تھی مگر یہ بڑھتا ہوا ۸۳-۱۹۸۲ میں ۱۵۰ ملین ٹن سے زائد ہو گئی۔ دیہی اور شہری علاقوں میں غریبی کا دائرہ اثر کم ہو گیا ہے، نیز اس کے دہے کے وسط تک غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والی آبادی کا فیصد ۵۰ فیصد سے کم ہو گیا ہے۔

خود کفیلی: متعدد صنعتی مصنوعات کے

ہو گئی ہے لیکن سرِدست ایسا بہت آہستہ ہو رہا ہے۔ فی کس اصل آمدنی کی ترقی بھی بہت دھیمی ہے۔ یعنی محض ۳/۱ فیصد فی سال۔ یہ متعدد نو آبادیاتی دور کے ترقی پذیر ممالک کی مذکورہ شرح نمو سے خاصی کم ہے۔ چنانچہ آزادی کے بعد ایک بہتر پیداواری شرح کے باوجود بھارت آج بھی بین الاقوامی معیار پر غریب ترین ممالک میں سے ایک ہے حالانکہ منصوبہ بندی دور کے دوران خوراکی پیداوار

کیا جاتا تھا، جو کہ چند سالوں کے دوران ملکی پیداوار کے ۵ فیصد کے بقدر بھاری تھی۔ پچاس اور ساٹھ کے دہوں میں عوامی تقسیم اور راشن بندی کا نظام صحیح معنوں میں درآمد شدہ خوراک، بالخصوص پی۔ ایل۔ ۴۸۰ عطیے پر منحصر تھا۔ درآمدی غلے پر انحصار اس قدر شدید تھا کہ ۶۶-۱۹۶۵ء اور ۶۷-۱۹۶۶ء کے مسلسل دو سالوں میں مون سون کے شدید نقصان کے نتیجے میں خوراک درآمد کرنے کی ضرورت اس قدر زیادہ ہو گئی، جو کہ ملک کے بیرونی زرِ مبادلہ

آزادی کے بعد ایک بہتر پیداواری شرح کے باوجود، بھارت آج بھی بین الاقوامی معیار پر غریب ترین ممالک میں سے ایک ہے۔

تعلق سے ہماری معیشت خود کفیل بن گئی ہے۔ اور ساتویں پنج سالہ منصوبے کے اختتام تک مزید کئی مصنوعات میں ایسا ہونے جا رہا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ساڑھے تین دہوں کی منصوبہ بندی نے بھارتی معیشت کو یکسر بدل دیا ہے۔ ایک ایسی معیشت میں جو کہ پہلے غیر متحرک تھی حرکت لائی گئی ہے اور آج ایک جمود کے بجائے یہ ایک معیارِ زندگی میں عام بہتری لانے والی، یکساں اور باقاعدہ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے لیے پر تول رہی ہے۔

البتہ معیارِ زندگی میں بہتری اتنی پُر اثر نہیں رہی جتنی کہ پیداوار میں بڑھوتری، آزادی کے بعد کے دور میں، قومی آمدنی کے ساتھ ساتھ آبادی کی شرح اضافہ بھی بڑھی ہے۔ آبادی کی شرح میں بھاری اضافے کا خاص باعث شرحِ اموات میں بھاری کمی ہے۔ خشک سالی اور وبائی امراض پر اب قابو پایا جا چکا ہے۔ شرحِ پیدائش میں بھی کمی آنی شروع

میں قابلِ لحاظ اضافہ ہوا ہے، آبادی کی شرح میں تیز تر اضافے کی بدولت خوراک کی فی کس دستیابی میں نمایاں اضافہ نہیں ہو پایا۔ دراصل ۶۵-۱۹۶۴ء میں ۴۸۰ گرام، جو کہ منصوبہ بندی دور میں حاصل کردہ ایک انتہائی نقطہ تھا، سے گھٹ کر بعد کے سالوں میں خوراکی اجناس کی فی کس یومیہ خالص دستیابی ۴۵۰ تا ۴۷۰ گرام رہ گئی۔ زرعی پیداوار میں مندے کے سالوں میں یہ مزید گھٹ کر ۴۱۰ گرام رہ جاتی ہے۔

خوراک کا فاضل ذخیرہ

مثبت پہلو پر، زرعی ترقی کا بڑا کارنامہ خوراک کے معاملے میں خود کفیل بن جانا ہے۔ منصوبہ بندی دور کے اوائل میں شہری علاقوں میں خوراک کی مانگ، منڈیوں میں اس کی فراہمی کے مقابلے میں بسرعت بڑھتی تھی۔ ان دونوں کے مابین کمی کو درآمدات کے ذریعے پورا

کے ذخیرے کی قوت خرید سے بھی باہر تھی۔ (خوراک کی پیداوار جب کہ ۶۵-۱۹۶۴ء کے مقابلے میں ۲۰ فیصد کے بقدر زیادہ تھی)۔ اس کے عقب میں ظاہر ہونے والے قحط نے، جسے اب قحطِ بہار کہا جاتا ہے، بھارتی زراعت کے خود کفیل ہونے کے بارے میں شدید شبہات پیدا کر دیے اور یہ ڈر لگنے لگا کہ شاید بھارت کو اپنے کروڑہا عوام کا پیٹ بھرنے کے لیے مستقلاً دوسروں کے رحم و کرم پر رہنا ہوگا۔ ۷۵-۱۹۷۴ء میں فصلوں کی بڑے پیمانے پر تباہی کے بعد بھی ایسے ہی شبہات کا اظہار کیا گیا تھا۔ غلہ درآمد کرنے کی ضرورت تدریجاً کم ہوتی گئی ہے اور اس ضمن میں اب ہمارا ملک نہ صرف خود کفیل بن چکا ہے بلکہ عوامی تقسیم کے نظام کے ساتھ یہاں بڑے پیمانے پر اناج کا فاضل ذخیرہ بھی اکٹھا کر لیا گیا ہے۔ فی الحقیقت سرکار

کے پاس خوراک کا فاضل ذخیرہ ایسے ذخیرے کی عام ضرورت سے نہ صرف کہیں زیادہ ہے، بلکہ ملک کے مالی خزانے پر ایک بڑا بوجھ بھی ہے۔ اس تعلق سے یہ مسئلہ خوراک کی زائد مانگ سے اس کی قلیل مانگ میں تبدیل ہو گیا ہے۔

منصوبہ بندی کے دور میں زرعی ترقی کے دو نمایاں مراحل ہیں۔ پہلے مرحلے میں یعنی ساٹھ کے دہے کے وسط تک، پیداوار خاص طور پر زیرِ سرمایہ بھی زیادہ لگتا ہے، البتہ زیادہ پیداوار کے ذریعے اس سے بلا واسطہ طور پر روزگار میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ سبز انقلاب اور نئی ٹکنالوجی کا مجموعی نتیجہ تیز تر خوراکی پیداوار اور ہر سطح پر خود کفیل پا لینے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اس سے گرانقدر زرِمبادلہ کی بچت بھی ممکن ہو گئی، کیونکہ اس سے قبل اس کی بڑی مقدار خوراک کو درآمد کرنے پر ہی صرف ہو جایا کرتی تھی۔

میں اضافے کے ۵۰ فیصد کے لیے محض زیرِ کاشت رقبے کا ۱۵ فیصد ہی کام میں لایا گیا ہے، چنانچہ ۸۰ فیصد غلّے کی سرکاری وصولی کے لیے پنجاب، ہریانہ اور مغربی اتر پردیش ہی اب ذمہ دار ہیں۔ کھادوں، جراثیم کش دواؤں نیز رعائتی دروں پر دی جانے والی دیگر زرعی لاگتوں کا استعمال بھی انہی علاقوں میں ایک بہت ہی اونچے تناسب سے ہوتا ہے۔ لہٰذا زرعی ترقی کے فوائد بھی انہی حصوں میں مرکوز ہو کر رہ گئے ہیں اور وہ بھی چھوٹے کسانوں سے زیادہ متموّل

> فی الحقیقت سرکار کے پاس خوراک کا فاضل ذخیرہ ایسے ذخیرے کی عام ضرورت سے نہ صرف کہیں زیادہ ہے، بلکہ ملک کے مالی خزانے پر ایک بڑا بوجھ بھی ہے۔ اس تعلق سے یہ مسئلہ خوراک کی زائد مانگ سے اس کی قلیل مانگ میں تبدیل ہو گیا ہے۔

کاشت رقبہ میں توسیع کے باعث بڑھی۔ اس مرحلے کے بیچ اصلاحاتِ آراضی نافذ کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ البتہ اس ضمن میں اصل حصولیابی سراسر مایوس کن ہے۔ ساٹھ کے دہے کے وسط تک زیرِ کاشت زمین میں توسیع کرنا دھیما پڑ گیا اور اس کے ساتھ دوسرے مرحلے میں سبز انقلاب کا آغاز کرنے کی حکمتِ عملی کا زیادہ انحصار پیداواریت میں اضافے پر تھا۔ اگرچہ اصلاحاتِ آراضی کے مقصد کو ترک نہیں کیا گیا تاہم اس مرحلے میں تقسیم کے مقابلے میں پیداواریت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ نئی ٹکنالوجی جسامت کے بارے میں بے تعلق نہیں ہے۔ زیادہ وسیع فارم جو کہ زیادہ وسائل رکھتے ہیں، چھوٹے فارموں کے مقابلے میں نئی ٹکنالوجی کو بہتر انداز میں اختیار کرنے کے قابل ہیں۔ نئی ٹکنالوجی اختیار کرنے میں

غیر متوازن زرعی ترقی

البتہ سبز انقلاب اور نئی ٹکنالوجی کا نتیجہ غیر متوازن زرعی ترقی میں ظاہر ہوا ہے۔ خطوں، فصلوں اور کھیتوں میں پیداواریت میں یکساں ترقی نہیں ہوئی۔ پنجاب، ہریانہ، مغربی اتر پردیش، نیز آندھر پردیش اور گجرات کے کچھ اضلاع نے اپنی آبپاشی کی بہتر سہولیات کے باعث، جو کہ نئی ٹکنالوجی کو اپنانے کی پہلی شرط ہیں، باقیماندہ ملک کے مقابلے میں زیادہ سرعت کے ساتھ ترقی کی ہے۔ زرعی ترقی میں علاقائی تفاوت کچھ اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ سبز انقلاب کے بعد کے دور میں، خوراکی اجناس

کسانوں کے تئیں۔

فصلوں میں، گیہوں کو، جو کہ خاص طور پر شمال مغربی خطے میں اُگایا جاتا ہے۔ دوسری فصلوں کے مقابلے میں، نئی ٹکنالوجی سے زیادہ فائدہ پہونچا ہے۔ دھان کی پیداوار میں جو کہ آبادی کے ایک وسیع حصّے کی خوراک کا اہم جُز ہے، خاص کر مشرقی، وسطی اور جنوبی غریب تر خطوں میں بڑی دھیمی ترقی ہوئی ہے۔ دالوں کی پیداوار تو صحیح معنوں میں جامد ہو گئی ہے اور باجرہ اور راگی جیسے ادنیٰ اناجوں کی پیداوار گھٹ گئی ہے۔ چنانچہ جب خوراک کی کُل پیداوار میں اضافہ ہوا ہے، ان کی ترتیب پُر معنی طور پر

بدل گئی ہے۔ اس عرصے میں ایک بات یہ
دیکھنے کو ملی ہے امیر لوگوں میں اجناس کی
کھپت بڑھی جب کہ غریب افراد کے
یہاں اس کی کھپت میں کمی آئی
یہ ایک طرف تو غریبی اور ناقص تقسیم کے یکجا
ہونے کی ایک دلیل ہو سکتی ہے اور دوسری
طرف سرکار کے پاس بچے ہوئے غلے کا اسٹاک
کی۔ زرعی ترقی میں علاقائی تفاوت سے مانگ
اور رسد کا عدم توازن مزید بڑھ جاتا ہے۔
امیر ترین ریاستوں میں زرعی ترقی کی رفتار
زیادہ تیز ہے اور غریب ترین ریاستوں
میں زیادہ دھیمی۔ مانگ اور رسد کے عدم

پر فراہم کیا جاتا ہے، خاص کر خوشحال زرعی خطوں
میں استعمال کی جاتی ہیں۔ زرعی لاگتی اشیاء اور
پیداوار دونوں پر دی جانے والی مالی امداد کا بار
اب سرکاری خرچے کی ایک بڑی مد بن گیا ہے،
یہ خسارے کی سرمایہ کاری کی ایک بڑی وجہ
بھی ہے۔ سبسڈی کے اس بوجھ کو محض شہری ٹیکس
دہندگان ہی نہیں اٹھاتے بلکہ یہ غریب کسانوں اور
زرعی مزدوروں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ایسی
مالی امداد عوامی سرمایہ کاری کے وسیلے کی بنیاد کو بھی سکیڑ
رہی ہے۔ دیا جو خوشحال زرعی خطوں میں سرکاری
خرچے کا بار صرف متمول ریاستیں برداشت
کرتی ہیں، ناکہ غریب ریاستیں بھی ایسا کرتی ہیں
زرعی ترقی کی کفالت میں یہ نابرابری ٹیکس

حکمت عملی بہت پس رو ہے۔
اب تک کے خوشحال زرعی خطے میں مزید
ترقی کے امکانات اب محدود ہو گئے ہیں۔ ان
خطوں میں زراعت میں سرمایہ کاری سے قلیل
منافع اب اور بھی کم ہونے لگا ہے، علاوہ ازیں
زرعی ترقی کو مزید بڑھانے میں ماحولیاتی نیز
انسان اور چوپایوں وغیرہ میں توازن سے متعلق
خطرات بھی مضمر ہیں۔ لہٰذا اب ضروری ہے کہ
زرعی ترقی اُن خطوں میں ہو، جو اب تک پسماندہ
رہے ہیں۔

ٹکنالوجیکل مجبوریاں

ساتویں منصوبے میں مشرقی خطے میں زرعی
ترقی، خاص کر دھان کی پیداوار بڑھانے پر دیا
گیا زور ایک خوش آئند اقدام ہے۔ مشرقی

**سبز انقلاب اور نئی ٹکنالوجی کا مجموعی نتیجہ تیز تر خوراک کی پیداوار اور
ہر سطح پر خود کفیلی پا لینے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اس سے
گرانقدر زرِ مبادلہ کی بچت بھی ممکن ہو گئی، کیونکہ اس سے قبل اس
کے بڑی مقدار خوراک کو درآمد کرنے پر ہی صرف ہو جایا کرتی تھی۔**

توازن کا ایک اور پہلو ہے شہری سیکٹر میں
روزگار کی دھیمی ترقی

زرعی ترقی کی مالی کفالت

اگرچہ خطوں اور فصلوں کے مابین غیر یکساں
زرعی ترقی کے لیے زیادہ تر ٹکنالوجیکل عوامل
ذمہ دار رہے ہیں، زراعت کے بارے میں
سرکاری اقتصادی پالیسی بھی اس شعبے میں اُٹ
پٹی ترقی کے لیے ذمہ دار رہی ہے۔ عصری زرعی
لاگتی اشیاء مثلاً کھادیں، جراثیم کش دوائیں،
ڈیزل سے چلنے والے پمپ سیٹ، آبپاشی کے
لیے پانی و بجلی وغیرہ، جنھیں بہت ہی رعایتی دروں

عائد کرنے کی پالیسیوں سے مزید بڑھ جاتی ہے۔
زرعی شعبہ سرکاری راست ٹیکسوں سے حاصل
ہونے والی آمدنی میں اب بہت ہی کم حصہ ادا کر
رہا ہے۔ آراضی سے متعلق لگان میں بڑے پیمانے
پر دی جانے والی چھوٹ بلکہ اس سے مکمل استثنیات
کی وجہ سے یہ حصہ اور بھی گھٹتا جا رہا ہے۔ لہٰذا
جبکہ سرمایہ دار کسان زرعی مالی امداد نیز
زراعت میں عوامی سرمایہ کاری سے مستفید ہو رہے ہیں،
وہ ٹیکس ریونیو میں ایک بہت ہی معمولی حصہ ادا
کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے سرکار کی اقتصادی

خطے میں پیداواریت بہت کم ہے۔ لہٰذا زراعت
میں سرمایہ کاری کا حال بھی ایسا ہی ہے، اس
خطے میں زراعت میں کم سرمایہ کاری کی بنیادی
وجہیں ہیں چھوٹے چھوٹے کھیت، ادارہ جاتی
پابندیاں، بارش پر منحصر کاشت کاری
نیز عوامی آبپاشی اور دیگر بنیادی ڈھانچے کی سہولیات
کا فقدان۔ یہ بھی دلیل دی جاتی ہے کہ اس خطے
کی خاص فصل دھان ہے جو ٹکنالوجیکل مجبوریوں کا شکار
ہے۔ متعدد ایشیائی ممالک میں حالیہ تجربات

بنیادی ڈھانچہ
نے یہ دکھایا ہے کہ اگر مناسب
کھیتی کے جدید طریقوں
میسر ہو تو بہتر بیجوں اور
سے دھان کی پیداوار کو قابلِ لحاظ حد تک بڑھایا
گزشتہ چند سالوں میں مشرقی خطے
جاسکتا ہے۔
میں دھان کی پیداوار میں بھی بے حد اضافہ
پیداوار میں اس گرانقدر اضافے کے
ہوا ہے۔
باوجود مشرقی ریاستوں میں چاول کی فی ایکڑ
پیداوار امکانات سے بہت ہی کم ہے۔ لہذا

کی ضرورت ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یا تو
اب تک کے خوشحال زرعی خطوں میں عوامی
سرمایہ کاری گھٹا دی جائے یا اُن زرعی امدادی
رقوم میں تخفیف کر دی جائے جن سے سرمایہ دار
کسانوں ہی کو فائدہ پہونچتا ہے یا زراعت پر
زیادہ ٹیکس عائد کر دیا جائے۔ انصاف کے
نقطۂ نظر سے حکمتِ عملی کی دوسری اور تیسری
پسند پہلی سے بہتر ہے۔ البتہ اس کے لیے زرعی
پالیسی میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی۔

اکثر غریب یا تو بہت چھوٹے
سے بہت زیادہ ہے۔
کسان ہیں یا بے زمین مزدور ہیں نیز اُن کی اہم
خوراک چاول ہے، لہذا وقت کی اشد ضرورت
یہ ہے کہ کم لاگت پر دھان کی پیداوار میں اضافہ
ہو، یہ مقصد فقط عوامی سرمایہ کاری اور قیمتیں
مقرر کرنے کی حکمتِ عملی میں تبدیلی لانے ہی سے
پورا ہو سکتا ہے۔
منصوبہ بندی دور میں بھارتی زراعت
میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں آئی ہیں ادارہ جاتی اور
تکنالوجیکل مجبوریوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے

زرعی شعبہ سرکاری راست ٹیکسوں سے حاصل ہونے والی آمدنی میں اب بہت ہی کم حصّہ ادا کر رہا ہے، آراضی سے متعلق لگان میں بڑے پیمانے پر دی جانے والی چھوٹ، بلکہ اس سے مکمل استثنیات کے حصہ سے یہ حصہ اور بھی گھٹتا جا رہا ہے۔ لہذا جبکہ سرمایہ دار کسان زرعی مالی امداد نیز زراعت میں عوامی سرمایہ کاری سے مستفید ہو رہے ہیں، وہ ٹیکس ریونیو میں ایک بہت ہی معمولی حصہ ادا کر رہے ہیں۔

مثبت پہلو پر، زرعی ترقی بڑے پیمانے پر قحط اور اتلافِ جان کو روک پائی ہے۔ بھارت کے ماضی کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ کم کارنامہ نہیں ہے، خوراک کے معاملے میں خود کفیلی بھارتی زراعت کا دوسرا اہم کارنامہ ہے۔

اس خطے میں چاول کی پیداوار کی ترقی کی کافی
گنجائش ہے۔
مشرقی خطے میں تیز تر زرعی ترقی کے لیے
زراعت میں بڑے پیمانے کی عوامی سرمایہ کاری

بھارت میں غریب لوگوں کی بھاری تعداد
گنگا وسندھ کے میدان میں بستی ہے، اس خطے
میں غریبی کا دائرہ اثر بہت وسیع ہے قومی اوسط

زراعت کا فروغ نہایت پُراثر رہا ہے، البتہ
علاقائی اور فصل دونوں اعتبار سے زرعی ترقی
(باقی صفحہ ۴۸ پر)

یکم تا ۳۱ اگست ۱۹۸۷

خصوصی شمارہ یوجنا، نئی دہلی

ڈاکٹر کامتا پرساد

سیلاب پر کنٹرول کی پالیسیاں

کامیابیاں اور چنوتیاں!

سیلاب تباہی مچاتے ہیں اور سال بہ سال ہمارے دیہی زندگی کا تانا بانا تارتار کر رہے ہیں۔ کروڑوں روپے کی مالیت کی کھڑی فصلیں برباد ہو جاتی ہیں۔ بیشتر انسانی زندگیوں کا اتلاف ہو جاتا ہے اور مویشی بہت بھاری تعداد میں متلاطم ندیوں کے غصے کا شکار ہو جاتے ہیں اور ہزاروں اشخاص بے گھر ہو جاتے ہیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ حصول آزادی کے بعد سیلاب پر کنٹرول سے متعلق ایک قومی پالیسی مرتب کی گئی ہے اور سیلاب کی تباہ کاریوں کو کم کرنے کے لیے متعدد اقدامات کئے گئے ہیں۔ تاہم ابھی بیشتر چنوتیوں کا سامنا کیا جانا ہے۔ فاضل مصنف نے جو معاشیات اور دیہی ترقی کے پروفیسر اور ماہر مشاہد ہیں سیلاب کے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے بعض ٹھوس تجاویز پیش کی ہیں۔ (ایڈیٹر)

اگست جس میں ہم اپنی آزادی کی سالگرہ مناتے ہیں ایک ایسا مہینہ ہے جس میں سیلاب کے مسئلہ کی جانب عموماً زیادہ توجہ منتقل ہو جاتی ہے۔ کئی دریاؤں میں طغیانی آتے ہی اخبارات اکثر ایسی خبریں اور رپورٹیں شائع کرتے ہیں جن میں فصلوں اور املاک کو ہونے والے نقصان گھرے ہوئے علاقوں اور انسانی زندگیوں کے اتلاف کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جلدی جلدی مرکزی ٹیموں کی تشکیل کرکے انھیں ریاستی راجدھانیوں میں بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ اس امر کا تعین کریں کہ مرکز کو کتنی امداد دینی چاہیئے۔ مقامی سیاستداں بھی امداد کا زیادہ حصہ حاصل کرنے کے لیے سرگرم کار ہو جاتے ہیں۔ انسانی زندگیوں اور املاک کو سیلاب سے تقریباً آئے سال نقصان پہنچتا رہتا ہے۔ سیلاب سے بہت بڑے علاقے کو نقصان پہنچتا ہے جو کہ اس امر سے دیکھا جا سکتا ہے کہ سیلاب کی زد میں آنے والے علاقے کا اندازہ تقریباً ۴ کروڑ ہیکٹیئر کہا جاتا ہے جو کہ ملک کے کل جغرافیائی علاقے کا کوئی آٹھواں حصہ ہے۔ یہ تناسب بہار، یو۔پی اور مغربی بنگال جیسی ریاستوں میں بہت زیادہ ہے جو سیلاب کا شدید طور پر شکار ہوتی ہیں۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۸ء کے درمیان سیلاب سے متاثر ہونے والا سالانہ اوسط علاقہ اندازاً ۸۲ لاکھ ہیکٹیئر تھا جس میں سے ۳۵ لاکھ ہیکٹیئر یا ۴۳ فیصد میں فصلوں کی کاشت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۸ء کے درمیان

۹ لاکھ ۲۵ ہزار مکانوں کو نقصان پہونچا جب کہ انسانی زندگیوں کا اتلاف ۱۲۴۰ اور مویشیوں کا ۷۷ ہزار تھا۔ ۱۹۷۶ء کے واحد سال میں نو سب سے زیادہ علاقے یعنی ایک کروڑ ۷۰ لاکھ ہیکٹیر کو نقصان پہونچا۔ ۱۹۸۶ء کے دوران ۲۵۲ اضلاع کو نقصان پہنچا جہاں تقریباً ۲۶۲۴۳ دیہات اور ۸۲ لاکھ ہیکٹیر علاقہ سیلاب کی لپیٹ میں آگیا جن میں ۵ کروڑ ۲۲ لاکھ افراد آباد تھے اور ۴۳ لاکھ ہیکٹیر رقبے میں فصلیں برباد ہو جاتی تھیں۔ ۲۰ لاکھ مکانوں کو نقصان پہونچنے کے علاوہ ۱۸۸۰ انسانی زندگیوں اور ۵۸ ہزار مویشیوں کا اتلاف ہوا۔

سیلاب سے متعلق قومی پالیسی

سیلابوں کے لیے وسیع پیمانے پر بچاؤ اور امدادی کارروائیوں کی ضرورت ہے —

۱۹۸۵-۸۶ء کے دوران سیلابوں کے لیے ۵ ارب ۱۲ کروڑ ۸ لاکھ روپے اور ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران ۳ ارب ۷۴ کروڑ ۴۸ لاکھ روپے کی امداد دی گئی۔ چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں امداد پر کل ۱۲ ارب روپے خرچ کئے گئے جب کہ اس کے مقابلے میں اسی منصوبے کے عرصے کے دوران حفاظتی پروگراموں پر ۷ ارب ۸۰ کروڑ روپے کا سرمایہ لگایا گیا۔ اس کے باوجود ۱۹۵۳ء سے قبل اس امر کا بخوبی احساس نہیں کیا گیا کہ سیلاب کا مسئلہ کس قدر سنگین ہے۔ حصول آزادی سے قبل سیلاب پر قابو پانے سے متعلق دستور کار زیادہ تر مقامی نوعیت کا تھا۔ زمیندار یا مقامی برادریاں اپنی زمینوں کی حفاظت کے لیے عارضی طور پر پشتوں کی تعمیر کرتی تھیں۔ حکومت اس کام میں بہت کم ہاتھ بٹاتی تھی۔ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۴ء میں ملک کے بعض حصوں میں جو تباہ کن سیلاب آئے ان سے حکومت کی توجہ اس مسئلہ کی جانب گئی اور بھارت سرکار کی طرف سے ۳ ستمبر ۱۹۵۴ء کو سیلاب سے متعلق قومی پالیسی کا اعلان کیا گیا۔ اس میں سیلاب سے حفاظت کا کام باقاعدہ اور منصوبہ بند ڈھنگ سے ہاتھ میں لینے کی ضرورت پر زور دیا گیا اور اس میں فوری مرحلے (دو سال کی اندر) سے لے کر قلیل المدتی مرحلے (۳ سے ۷ برس) اور طویل المدتی مرحلے (۸ سے ۱۲ برس) کے وقت کے اندر پورا کئے جانے والا ایک منصوبہ عمل شروع کرنے کو کہا گیا۔ اس کے بعد سے حکومت کی طرف سے اس کام میں متواتر دلچسپی لی گئی ہے اور سیلاب پر کنٹرول سے متعلق متعدد اسکیمیں عمل میں لائی گئی ہیں۔ مندرجہ ذیل گوشوارے سے ان اخراجات کا پتہ چلتا ہے جو حکومت کی طرف سے سیلاب سے حفاظت کے کام پر اٹھائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سیلاب پر کنٹرول کے اخراجات مجموعی طور پر پلان کے اخراجات کی مانند ان تمام برسوں میں بڑھتے جا رہے ہیں۔

حصولِ آزادی سے قبل سیلاب پر قابو پانے سے متعلق دستور کار زیادہ تر مقامی نوعیت کا تھا زمیندار یا مقامی برادریاں اپنی زمینوں کی حفاظت کے لیے عارضی طور پر پشتوں کی تعمیر کرتی تھیں۔ حکومت اس کام میں بہت کم ہاتھ بٹاتی تھی۔

پلان	عرصہ	سیلابوں سے حفاظت پر اخراجات (کروڑوں روپے میں)
پہلا منصوبہ	۱۹۵۱-۵۶	۱۳٫۸
دوسرا 〃	۱۹۵۶-۶۱	۴۹٫۲
تیسرا منصوبہ	۱۹۶۱-۶۶	۸۶٫۰
سالانہ 〃	۱۹۶۶-۶۹	۴۲٫۶
چوتھا 〃	۱۹۶۹-۷۴	۱۷۱٫۸
پانچواں 〃	۱۹۷۴-۸۰ (بشمولیت ۱۹۷۹-۸۰)	۶۰۴٫۹
چھٹا منصوبہ	۱۹۸۰-۸۵	۷۷۸٫۲
ساتواں 〃 (مجوزہ)	۱۹۸۵-۹۰	۹۴۷٫۴

گمبھیر تشویش کا معاملہ

لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ سیلاب پر کنٹرول کے مسئلہ کو وہ اولیت نہیں دی گئی جس کا یہ مستحق ہے

سیلاب پر کنٹرول کے اخراجات کُل منصوبہ جاتی اخراجات کا ۵ر۰ سے ۸ر۱ فیصد ہیں۔ سیلاب کی حالت کی نزاکت کے پیش نظر اس رقم کو بہت زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ فیصد ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں بہت کم (۵ر۰ فیصد) ہے جو گہری تشویش کا باعث ہے۔ ساتویں منصوبے کے دوران محض دس لاکھ ہیکٹیئر کی حفاظت کا مادی نشانہ چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے ۴۰ لاکھ ہیکٹیئر اور ۲۰ لاکھ ہیکٹیئر کے عملی حصول سے بہت کم ہے۔ یہ ساتویں پانچ سالہ منصوبے کے اعلانیہ عزم کے حق میں اچھا نہیں جس میں مشرقی خطّے کی تیز رفتار ترقی کے لیے کہا گیا ہے جو سیلابوں سے نہایت شدید طور پر متاثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ سیلابوں سے متعلق قومی کمیشن کی طرف سے بجا طور پر بتایا گیا ہے سیلاب کسی بھی علاقے کی زرعی ترقی کے عمل میں نہاں آنے والے سیلابوں کی کثرت کے حساب سے رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ سیلابوں کے بار بار آنے سے کسانوں میں جو عدم سلامتی کا احساس پیدا ہوتا ہے اس کے باعث انھیں زراعت میں طویل المدتی سرمایہ کاری کی ترغیب نہیں ملتی۔ حتیٰ کہ بنیادی ڈھانچے کی سرمایہ کاری بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے اور اس طرح پسماندگی برقرار رہتی ہے۔

> سیلابوں کے بار بار آنے سے کسانوں میں جو عدم سلامتی کا احساس پیدا ہوتا ہے اُس کے باعث اُنھیں زراعت میں طویل المدّتی سرمایہ کاری کی ترغیب نہیں ملتی۔ حتّٰی کہ بنیادی ڈھانچے کی سرمایہ کاری بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے اور اس طرح پسماندگی برقرار رہتی ہے۔

ایک ساتھ متعدد اقدامات

اب ہم مادی لحاظ سے کامیابیوں کا مختصر طور پر جائزہ لیتے ہیں۔ ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۸ء تک کے عرصے کی کامیابیوں میں ۱۰۸۲۱ کلومیٹر کے پشتے، ۱۹۲۶۰ کلومیٹر کی نالیاں اور نالیوں میں سدھار، ۲۶۴ قصبوں کا تحفظ، ۴۶۹۷ دیہات کی حفاظت اور بیشتر کٹاؤ شکن اقدامات شامل ہیں۔ ان کی بدولت ایک کروڑ ہیکٹیئر علاقے کی حفاظت ہوئی۔ اس عرصے کے دوران تحفظ مہیا کرنے میں شرح اضافہ سال میں اوسطاً ۲ر۴ لاکھ ہیکٹیئر اور پشتوں کی تعمیر کی رفتار ۴۵۱ کلومیٹر تھی۔ اس کے بعد سے مزید ۳۰ لاکھ ہیکٹیئر علاقے کا تحفظ کیا گیا ہے۔ لہٰذا اب محفوظ علاقہ تقریباً ایک کروڑ ۳۰ لاکھ ہیکٹیئر ہے جو اس قابلِ تحفظ علاقے کا ۴۰ فیصد ہے جس کا اندازہ ۳ کروڑ ۲۰ لاکھ ہیکٹیئر لگایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سیلابوں کی پیشنگوئی کرنے اور وارننگ دینے والے مرکزوں کا ایک نظام قائم کیا گیا ہے۔ اس سے عوام کے انخلاء کے لیے وقت پر سیلاب کی وارننگ دینے میں مدد ملی ہے اور اس سے بیشتر زندگیوں کے اتلاف کو روکا جا سکا ہے اور املاک کو بہت کم نقصان پہونچا ہے۔

۱۹۵۴ء کی پالیسی میں سیلاب پر قابو پانے میں ایسے کثیر المقصدی تالابوں کی اہمیت واضح کی گئی ہے جس کے ساتھ پشتوں، پانی کے زمینی ذخیروں اور نالیوں کی تعمیر اور اُن کی بہتری پر زور دیا گیا ہے۔ بعد کے عرصے میں کثیر المقصدی تالابوں پر واجب زور دینے کے ساتھ ساتھ متعدد اقدامات ایک ساتھ کرنے کا دستور کار پسندیدہ طریق کار بنا رہا جیسا کہ سیلابوں سے متعلق اعلیٰ سطحی کمیٹی (۱۹۵۷ء) سیلاب پر کنٹرول سے متعلق وزرا کی کمیٹی (۱۹۶۴ء) اور سیلاب اور سیلاب سے متعلق امداد کی وزرا کی کمیٹی (۱۹۷۲ء) کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے لیکن عملی طور پر جو بڑے بڑے طریقے اختیار کیے گئے ہیں وہ ہیں پشتوں اور نالیوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ سیلابوں کی پیشنگوئی کرنے اور وارننگ دینے والے مرکز۔ دامودر ویلی کارپوریشن اور ہیرا کُنڈ جو ۵۰ کی دہائی میں مکمل کیے گئے تھے اور رینگالی ڈیم کی تعمیر کے سوائے جو زیر تعمیر ہے بمشکل سیلاب پر قابو پانے والے کسی تالاب کی تعمیر کی گئی ہے۔ سیلاب پر قابو پانے کا دستور کار مجموعی طور پر مقامی بنا رہا ہے جب کہ یہ مسئلہ لازمی طور پر بین الریاستی اور اس طرح قومی ہے۔ جو اقدامات کیے گئے ہیں وہ مؤثر

ثابت نہیں ہوئے۔ جیسا کہ سیلاب پر کنٹرول کرنے والی اسکیموں میں بڑھتی ہوئی سرمایہ کاری کے باوجود حقیقی معنوں میں سیلاب سے نقصانات کے بڑھتے ہوئے رجحان سے دیکھا جا سکتا ہے۔

اس موضوع پر اس وقت پایا جانے والا عام خیال جو کہ سیلاب پر کنٹرول سے متعلق قومی کمیشن (۱۹۸۰) کی رپورٹ اور دیگر دستاویزات سے منظہر ہے محض پشتوں پر انحصار کے خلاف زیادہ زور دیا جائے۔ جن مہینوں میں سیلاب نہیں آتے اُن میں تھوڑی مدت میں تیار ہونے والی فصلوں کی اقسام بونے پر زور دیا جائے اور جہاں کہیں ضروری ہو اُن کے لیے آبپاشی اور دیگر سہولیات فراہم کی جائیں۔

ریاستی حد بندیاں ختم کرنا

سیلاب کے مسئلہ کی غالب بین الریاستی نوعیت اور بین الریاستی تنازعات کو دور کرنے واضح کیا جا سکتا ہے کہ اس مقصد کے لیے آئین میں کسی ترمیم کی ضرورت نہیں۔ مرکزی حکومت اُن خصوصی اختیارات کا استعمال کرکے بین الریاستی طاس اتھارٹی کا قیام کر سکتی ہے جو آئین کی "اینٹری ۵٦ لسٹ" اول (یونین لسٹ) نے اُسے عطا کر رکھے ہیں تاکہ "بین الریاستی دریاؤں اور دریائی وادیوں کو اُس حد تک فروغ دیا جا سکے اور منضبط کیا جا سکے جس حد تک پارلیمنٹ کی طرف سے قانوناً ایسے انضباط اور فروغ کا مفاد عامہ میں

سیلاب پر قابو پانے کا دستور کار مجموعی طور پر مقامی نوعیت کا رہا ہے جب کہ یہ مسئلہ لازمی طور پر بین الریاستی اور اسی طرح قومی ہے۔

لہٰذا سیلاب پر کنٹرول کی بین الریاستی اسکیموں میں مرکزی سرمایہ کاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ سیلاب پر کنٹرول سے متعلق جامع دستور کار کا جزو لاینفک ہو۔

ہے۔ اور ایک جامع دستور کار کے حق میں ہے جو مختلف قسم کے اقدامات کے درست امتزاج پر مشتمل ہے جیسے کہ اراضی کا تحفظ اور جنگل کاری، تالاب، پشتے، نالیاں، دریاؤں کو طویل اور گہرا کرنا، سیلاب پر قابو پانے کے قواعد، سیلاب کی پیشگوئی کرنا، ہنگامی اقدامات اور سیلاب کا بیمہ وغیرہ۔ پانی کے تحفظ سے متعلق اقدامات جیسے جنگل کاری، پھیلے ہوئے پانی پر قابو، چھوٹے درمیانے اور بڑے تالاب، پانی جمع رکھنے والے قدرتی طاس اور زمینی آبی ذخائر ایسے امور ہیں جن پر پہلے غور کیا جانا چاہیئے۔ سیلاب پر کنٹرول کے ایک ذریعے کے طور پر تالابوں پر میں تاخیر اور ماضی کے غیر مستحکم فیصلوں کے پیش نظر" بین الریاستی دریائی طاس اتھارٹی" قائم کرنے کی ضرورت ہوگی جو ریاستوں کے کنٹرول سے آزاد ہو اور جسے اپنے فیصلوں کی تعمیل کرانے کے لیے کافی اختیارات حاصل ہوں۔ صرف اُس صورت میں سیلاب کے مسئلہ کے بارے میں مربوط نظریہ اختیار کیا جا سکتا ہے اور ایسے ملے جلے اقدامات کے سلسلے کی منصوبہ بندی کرکے تعمیل کی جا سکتی ہے جو تکنیکی و اقتصادی لحاظ سے بہترین پائے جائیں اور جو ریاستی حد بندیوں کو توڑ سکیں۔ یہاں اہم مرکز کے کنٹرول کے تحت اعلان کیا جائے۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت کی طرف سے ایک گرانقدر مالی حصہ دینے کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت سیلاب پر کنٹرول کی اسکیموں کے لیے ریاستی فنڈوں میں سے روپیہ دیا جاتا ہے اور یہ پشتے وغیرہ بنانے جیسے اقدامات کے لیے دیا جاتا ہے جن کی منصوبہ بندی اور تعمیل کسی ریاست کے مکمل کنٹرول کے اندر ہوتی ہے۔ اس سے ہونے والے فوائد بھی اُسی ریاست کو ملتے ہیں۔ اس کے

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

رومیش تھاپر

میڈیا کو آزاد کرنے کی ضرورت

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ یہ افسوس کی بات ہے کہ آکاش وانی اور دور درشن کے پروگراموں سے ایسی دل چیز ابھر کر سامنے نہیں آتی جس سے بولے ہوئے الفاظ کی اثر پذیری اور مہذب تعریر کی لطافتیں اور باریکیاں منعکس ہوتی ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پروگراموں کی ترسیل ٹکنکل بے ہنجر دماغی کی جھلک ملتی ہے اور بولنا چیخنے میں بدل جاتا ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ گذشتہ چالیس برسوں میں ان دونوں ذرائع ابلاغ کو جو مواقع میسر آئے ہیں ان کا فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔ سرکاری سلیبسٹی کے پروگراموں کے دوران ہندوستان کی مستند آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بیوروکریٹک انداز میں مرتب کئے گئے پروگراموں کا عوام پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام کے جذبات و احساسات کو محسوس کرنے اور ان کے شکوک و شبہات کا جواب دینے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس لیے مصنف کی رائے میں پروگراموں کی تشکیل اسٹوڈیو سے باہر نکل کر اس طرح کی جانی چاہیئے کہ سماج کے سامنے اس کی حقیقی تصویر پیش کی جا سکے۔

ایوان ایلیچ نے، جو ایک پرجوش دانشور ہیں اور جنھوں نے ہمیں اپنے بہت سے نظریات اور تناظروں کا ازسر نو جائزہ لینے پر مجبور کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے، جب اندرا گاندھی کی دعوت پر ہندوستان کا دورہ کیا تو انھوں نے شریمتی اندرا گاندھی سے کہا کہ وہ اپنے عوام کو ناخواندہ افراد کے زمرے میں رکھنا چھوڑ دیں کیوں کہ وہ ایک زبانی روایت کے حامل ہیں اور پیچیدہ غور و فکر اور بحث و مباحثے میں مغرب کے خواندہ افراد سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہاں انھیں خواندہ ضرور ہونا چاہیئے کیونکہ جدید کاری اس بات کی مقتضی ہے پھر دیکھیے افکار و نظریات کا ایک دھماکا سا ہوگا۔

خواندگی اور مذہب

لیکن ایسا ہوا نہیں خواندگی کے لیے جو مہم چلائی گئی اسے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کبھی ایسا مطالعاتی مواد دستیاب نہ ہوا جو پڑھنے والوں میں وسیع النظری اور کشادہ ذہنی پیدا کر سکے۔ خواندگی کا دھماکہ درحقیقت مذہب پرستی اور قدامت پسندی کا دھماکہ بن گیا کیونکہ زیادہ تر دستیاب مطالعاتی مواد ایسے مذہبی اقتباسات پر مبنی تھا جو پہلے زمانوں میں ازبر کئے جاتے تھے۔

زبانی روایت کے تانے بانے کے اندر ناولوں اور قصے کہانیوں کو چھوڑ کر کچھ اور پڑھنے کی عادت نہ صرف کم بلکہ قریب قریب مفقود ہو گئی ہے

اس عادت کو بڑی ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ذہن کی نشوونما کے اس پہلو کے بارے میں ہم بہت بے حس رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ترجمے کو وہ ترجیحات نہیں دی گئی ہیں جن کا وہ مستحق ہے۔ بالخصوص ایک پیشہ ورانہ سرگرمی کی حیثیت سے۔ بُک ٹرسٹوں کا وجود محض نمائشی ہے کیونکہ ان کے ذمّہ داران نے ترجمے کی صنعت کے لیے کبھی ایک حقیقی بنیاد تیار کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

ذرائع ابلاغ کی ناکامی

اگر یہ ذمّہ داریاں ہمارے حکمرانوں کی نگاہوں سے اوجھل رہیں تو اس کا کیا ذکر کہ آکاش وانی اور دُور درشن خلاء کو کچھ حد تک پُر کرنے میں بھی ناکام رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ "زبانی" وسائل ہیں۔ ان کے پروگراموں سے ایسی کوئی بات اُبھر کر سامنے نہیں آتی جس سے بولے ہوئے الفاظ کی اثر پذیری اور مہذب تقریر کی باریکیاں اور لطافتیں منعکس ہوتی ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پروگراموں کی تشکیل میں بنجر دماغی کی جھلک ملتی ہے اور بولنا چیخنے میں بدل جاتا ہے۔

جب غیر ملکی مہمان اُن آزادیوں اور حقوق کا، جو ہمیں حاصل ہے، بمقابلہ دیگر بہت سے ملکوں کے عوام کو میسر آزادیوں اور حقوق سے کرتے ہیں تو ہم اُن کے سامنے اپنی ایک خوشنما تصویر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم ایسے غیر سرکاری ملکیت کے اخباروں، رسالوں اور جرائد کا ذکر اظہارِ بیان کی اُس آزادی کی مثال کے طور پر کرتے ہیں جو ہمیں حاصل ہے۔ ہم تباہ کن مذہب پرستی اور متوسط طبقے کے دعاوی کو نہیں دیکھتے ہم اس بات سے بھی نظر چراتے ہیں کہ نچلی سطح کے لوگوں کی محتاج توجہ زندگی کو سمجھنے کی قریب قریب کوئی کوشش نہیں کی جا رہی ہے۔

اگر ہم پچھلے گذشتہ دعدوں کو یاد کریں تو یہ محسوس ہوگا کہ ہم نے اپنی عدم توجہی سے کتنی بڑی خلیجیں پیدا کر دی ہیں۔ جہاں روایتی اور بنیادی طور پر ایک قوم تھی وہاں دھیرے دھیرے اب دو قومیں بنتی جا رہی ہیں۔ تقریباً ایک کروڑ افراد پر مشتمل، ایک چھوٹا سا مالدار اور برگزیدہ طبقہ شہری علاقوں میں پھیلے ہوئے کوئی بیس کروڑ افراد کی محنت پر عیش و آرام سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس طبقے کا، اطراف کی کثیر آبادی سے، جو اب لگ بھگ اسی کروڑ ہونے جا رہی ہے، براہِ راست کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اس عجیب و غریب صورتِ حال میں میڈیا کا کیا رول ہونا چاہیئے، اس بارے میں ریسرچ اور تحقیق کی ضرورت ہے۔

انگریزی کا غلبہ : میڈیا کا انگریزی کا شعبہ امورِ حکومت میں بدستور بے پناہ اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ لیکن یہ ان کروڑہا افراد کے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا جو ہمارے سماج کی بنیاد ہیں۔ ہندوستانی زبانوں کے اخبارات بھی انگریزی اخبارات کے افکار و آراء کی ہی عکاسی کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں مطبوعہ میڈیا اس چھوٹے سے برگزیدہ طبقے کے مفاد کی ہی حفاظت کرتا ہے۔ جو حکومت چلاتا ہے۔

اب اس پر خواہ کتنا ہی برہم ہوا جائے اور کتنی ہی پُرزور تردیدیں کی جائیں اس خیال کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اخبارات کے کالموں میں اصل حقیقت اپنی خام شکل میں جگہ نہیں پاتی۔ نہ ہی اخبارات و رسائل کا نفاست پسند حصہ تبدیلیٔ آراء، مثلاً انتخابات وغیرہ کو صحیح طور پر سمجھ یا بیان کر پاتا ہے۔ اسی لیے اکثر اوقات ان کی پیشنگوئیاں نہ صرف سادہ لوحی پر مبنی ہوتی ہیں بلکہ اکثر بالکل غلط ثابت ہوتی ہیں۔ خلیج اتنی بڑی ہے کہ اخبارات کے لیے اسے پُر کرنا دشوار ہے۔

الیکٹرانک میڈیا کا استعمال کیجیئے :

ان چالیس برسوں میں ریڈیو کو اور (بعد میں) ٹیلی ویژن کو جو مواقع حاصل ہوئے ہیں ان کا بھرپور فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ الیکٹرانک میڈیا دیہات میں جاتا اور عوام سے باہمی گفتگو اور برموقع مشاہدات و معلومات کے ذریعے سچائی کا پتہ لگا کر اسے عوام کے سامنے پیش کرتا، اس

> ریڈیو اور دُور درشن کے پروگراموں سے ایسی کوئی بات اُبھر کر سامنے نہیں آتی جس سے بولے ہوئے الفاظ کی اثر پذیری اور مہذب تقریر کی باریکیاں اور لطافتیں منعکس ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ پروگراموں کی تشکیل میں بنجر دماغی کی جھلک ملتی ہے اور بولنا چیخنے میں بدل جاتا ہے۔

کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ دفتر یا اسٹوڈیو میں بیٹھ کر پروگراموں کی تشکیل کرے۔ سرکاری پالیسی کے پروگراموں کے دوران ہندوستان کی مستند و معتبر آوازیں شاذ ہی سنی گئیں۔

ہندوستان جیسے وسیع و عریض اور پیچیدہ جمہوری ملک میں تبدیلی کا ایک بڑا ذریعہ میڈیا ہے جس میں اخبارات و جرائد اور الیکٹرانک میڈیا دونوں شامل ہیں۔ ہندوستان کی زبان

اور دوردرشن دونوں کے پروگراموں میں وہ سماجی عنصر عنقا ہے جو ہمارے سماج میں انقلاب کی چنگاری روشن کرسکتا ہے۔ نازک معاملات کے بارے میں ہمارے دماغوں پر جو جالے پڑ گئے ہیں انھیں پروگراموں کے مشمولات پر عائد ان سنسی یا پابندیوں کی وجہ سے دور کرنا ممکن نہیں ہے۔ "مثبت رپورٹنگ" کا نعرہ سچائی کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ وہ عوام کے اندر تحریک عمل پیدا کرنے میں مانع ہے اور عوام میں تفرقہ و انتشار

بیوروکریٹک انداز نظر

سرکاری کنٹرول کے تحت الیکٹرانک میڈیا میں دو تصورات کارفرما ہیں۔ ایک تو یہ کہ الیکٹرانک میڈیا کو بازار میں حکومت کے پبلک ریلیشنز کا کام کرنے کا ذریعہ بنا دیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ ملک میں عدم استحکام پیدا کرنے کی اندرونی و بیرونی کوششوں کے باوجود ایک پیچیدہ اور مختلف النوع معاشرے کی ایک واحد قوم ہونے کی طرف پیشقدمی کے تھیسس کو عوام کے سامنے نہایت سادگی سے پیش کیا جائے۔ اس بیوروکریٹک پروگرام کا اثر صرف

> اگر ہم اپنے گذشتہ وعدوں کو یاد کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ہم نے اپنی عدم توجہی سے کتنی بڑی خلیجیں پیدا کردی ہیں۔ جہاں روایتی اور بنیادی طور پر ایک قوم تھی وہاں دھیرے دھیرے اب دو قومیں بنتی جارہی ہیں — تقریباً ایک کروڑ افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا مالدار اور برگزیدہ طبقہ شہری علاقوں میں پھیلے ہوئے کوئی بیس کروڑ افراد کی محنت پر عیش و آرام سے زندگی بسر کررہا ہے۔ اس طبقے کا اطراف کی کثیر آبادی سے، جو اب لگ بھگ اسی کروڑ ہونے جارہی ہے براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اس عجیب و غریب صورت حال میں میڈیا کا کیا رول ہونا چاہیئے، اس بارے میں ریسرچ اور تحقیق کی ضرورت ہے۔

روایات اور ان کی بہت سی غلط کاریوں کے سبب الیکٹرانک میڈیا کو اس ملک میں وسیع رول ادا کرنا ہے لیکن حکومت ہند کا ایک محکمہ بن کر رہ جانے کے باعث یہ کچھ نہیں کر پاتا۔ اس کے ذریعے جو ڈھیلے ڈھالے پروگرام پیش کئے جاتے ہیں ان کی وجہ سے ہم ہندوستانیوں کے ذہن میں تحریک عمل پیدا کرکے سماجی امتیازات پر حملہ کروانے کا موقع کھو دیتے ہیں۔

سماجی عنصر کی کمی

بات اہمیت رکھتی ہے کہ آکاش وانی

پیدا کرتا ہے

ہاں ہم وادی کشمیر میں اسلامی قدامت پسندی، ہندوستانی نوجوں کے داخلے سے قبل گولڈن ٹیمپل کی متعدد بار بے حرمتی، ہندوؤں اور سکھوں کی عصبیات اور دیگر بہت سے گروہوں کی عصبیات، شمالی و جنوب کی تقسیم، شمال مشرقی علاقے کے قبائلیوں کے شکوک و شبہات، برنس مافیاؤں اور ہمارے انتہائی غیر محفوظ معاشرے کی دماغی و ذہنی کمزوریوں پر بحث نہیں کرتے

ہے کیونکہ عوام کے خیالات و احساسات کو محسوس کرنے اور ان کے شکوک و شبہات کا جواب دینے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی اصلیت تو یہ ہے کہ حقیقت کو بلحاظ زبان اور بلحاظ جزئیات مسخ کیا جاتا ہے۔

ہم آکاش وانی اور دوردرشن پر ان کے پروگراموں کے تعلق سے بہت نکتہ چینی کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کا بنیادی ڈھانچہ اور

ان کے بندوبست پر کنٹرول کچھ اسی نوعیت
کا ہے کہ اس میں ایک سخت اور کمزور بنا دینے
والی سنسر شپ خود بخود آجاتی ہے۔ آپ
اختلاف رائے اور تخلیقی اظہار کا راستہ کھولنے
کی خواہ کتنی ہی کوشش کریں صورت حال بدل
نہیں سکتی۔ الیکٹرانک میڈیا کے انچارج مجبور

زیادہ بہتر نمائندگی کرنے والی [illegible] کی کوشش
کرنے کی کوششیں کی جاتی [illegible] ایک نا گزیر
پارٹی کے الگ الگ [illegible] ہٹ جانے کا وقت
ہے اور ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی نافذ کئے جانے کے بعد
سے ان اعتدال پسندانہ [illegible] کی جن سے
ایسا لگنے لگتا تھا کہ الیکٹرانک میڈیا وقت کی
ضرورتوں کو محسوس کر رہا ہے۔ حوصلہ شکنی ہوئی ہے

کسی بھی یا مناسبت کا خیال نہیں رکھا جاتا۔
ان رجحانات کو ۱۹۷۰ء کے بعد کے برسوں
میں نمایاں تقویت ملی جبکہ حکمراں پارٹی نے خود
کو خطروں سے گھرا ہوا پایا۔ جنتا پارٹی کے
مختصر عہد حکومت میں بھی اس سلسلے میں کوئی
قابل لحاظ پیش رفت نہیں ہوئی۔ دراصل ہماری
سیاسی جماعتیں الیکٹرانک میڈیا کو خود مختار
ہاتھوں میں سونپنے کے سوال پر بہت خائف و

میڈیا کا انگریزی کا شعبہ امور حکومت میں بدستور بے پناہ اثر و رسوخ رکھتا ہے لیکن یہ ان کروڑہا افراد کے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا جو ہمارے سماج کی بنیاد ہیں۔ ہندوستانی زبانوں کے اخبارات بھی انگریزی اخبارات کے افکار و آرا کی ہی عکاسی کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں مطبوعہ میڈیا اس چھوٹے سے برگزیدہ طبقے کے مفاد کی ہی حفاظت کرتا ہے جو حکومت چلاتا ہے۔

اخبارات کے کالموں میں اصل حقیقت اپنی تمام تر شکل میں جگہ نہیں پاتی۔ نہ ہی اخبارات و رسائل کا نفاست پسند حصہ نمائندہ آرا (مثلاً انتخابات وغیرہ) کو صحیح طور پر سمجھ یا بیان کر پاتا ہے۔ اسی لیے اکثر اوقات ان کی پیشین گوئیاں نہ صرف سادہ لوحی پر مبنی ہوتی ہیں بلکہ اکثر بالکل غلط ثابت ہوتی ہیں۔ خلیج اتنی بڑی ہے کہ اخبارات کے لیے اسے پُر کرنا دشوار ہے۔

کریٹ خواہ کتنے ہی روشن دماغ ہوں ان سے
یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ وزارتی جانچ پڑتال
اور پارلیمنٹ میں سوالات اٹھانے کی جوکھم مول
لیں گے۔
چوں کہ سیاسی زندگی مقابلتاً شائستہ ہو گئی
ہے اس لیے گاہ بگاہ ملک کی دلچسپی و مفاد کی

غلط استعمال

الیکٹرانک میڈیا کا صرف حکمراں پارٹی کے
مفاد کے لیے ہی استعمال کیا جا رہا ہے اس کی ایک
واضح مثال خبروں کے [illegible] کا غلط استعمال ہے۔
واقعات و حقائق کو صرف کم کر کے بلکہ مسخ کر کے
پیش کیا جاتا ہے اور واقعات کو پیش کرنے میں

محتاط رہی ہیں۔

پبلک کنٹرول

عوام کی ناراضگی کا پیمانہ اگرچہ کافی وسیع
تھا لیکن وہ کبھی واضح اور باضابطہ انداز میں
ظاہر نہیں کی گئی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے غیر حساس

یکم تا ۳۱ اگست ۱۹۸۷ء

خصوصی شمارہ یوجنا، نئی دہلی

بند و بست پر عام نکتہ چینی کے علاوہ یہ شبہ
ظاہر کیا گیا کہ پروگراموں میں متعلق خطّے کی خاطر
خواہ عکاسی نہیں کی جائے گی۔ بڑھتی ہوئی نکتہ
چینی کی وجہ سے حکومت نے گزشتہ برسوں
میں یکے بعد دیگرے تین کمیشن 'چندا' ورگیز اور

عام طور پر ایک کمیشن کی حوصلہ افزائی کی جاتی
ہے کہ وہ اپنی رپورٹ پیش کرنے سے پہلے
بھارت درشن کے دورے پر نکلے اور ایک
ایک روز کے لیے ہر جگہ جائے، قبائلی علاقوں
میں بھی، تاکہ وہ اصل صورت حال سے آگاہ ہو
سکے۔ کہیں بھی ماہر نے یہ تجویز نہیں کیا کہ خود مختاری

ریڈیو اور ٹیلی ویژن نظاموں کے تجربات کا مطالعہ
کرنے میں ناکام رہے ہیں جنھوں نے اپنی اپنی جمہوریتوں
کے اندر اپنا خود مختارانہ وجود قائم کیا ہے بشمول
یہی وجہ ہے کہ ہمیں کمیشنوں سے عقیدت ہے۔
لیکن یہ کمیشن اس بارے میں جامع رپورٹیں
پیش کر کے کہ خود مختاری کیسے کام کرے گی، صرف
حالات کو جوں کا توں بنائے رکھنے میں ہی کامیاب

بجائے اس کے کہ الیکٹرانک میڈیا دیہات میں جاتا اور عوام سے باہمی گفتگو اور
بر موقع مشاہدات و معلومات کے ذریعے سچائی کا پتہ لگا کر اسے عوام کے سامنے پیش
کرتا، اس کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ دفتر یا اسٹوڈیو میں بیٹھ کر پروگراموں
کی تشکیل کرے۔ سرکاری بلیٹن کے پروگراموں کے دوران ہندوستان
کی مستند و معتبر آوازیں شاذ ہی سُنی گئیں۔

گزشتہ چالیس برسوں میں ہمارے اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا دونوں میں سچائی
کو اس کی تمام تر ناخوشگواری اور اَن گھڑپن کے ساتھ ریکارڈ کرنے کی خواہش
کی کمی رہی ہے۔ سچائی کڑوی اور پریشان کر دینے والی ہوتی ہے۔ پھر بھی
انفارمیشن سوسائٹی کی جدید ٹکنالوجی ہمیں سچائی تک پہونچنے کے وسیلے فراہم
کرتی ہے۔

جوشی کی سربراہی میں قائم کیے۔ ماہرین پر
مشتمل ان کمیشنوں نے اپنے طور پر حکومت
کا تسلط ختم کرنے کی کوشش کی۔ ریڈیو اور
ٹیلی ویژن پر کنٹرول کے نئے نظاموں کی ضرورت
پر تمام تر ترغیبی دلائل کے ساتھ زور دیا گیا
لیکن بے سود۔

کی نشوونما اور تحفظ کا کام سنبھالنے کی غرض
سے ایک خود مختار اتھارٹی کا خاکہ تیار کرنے میں
صرف چند ہفتے لگیں گے۔

خود مختاری

اور خود مختاری کے صحیح معنی سمجھنے اور اُن
ہم

اس بات کی گنجائش
ہوتے ہیں۔ ہمیشہ
رکھی جاتی ہے کہ مختلف سطحوں کے بیورو کریٹ
سے اِن رپورٹوں کو "پروسیس" کرایا جائے۔
اگر بامعنی خود مختاری قائم کرنے کا کوئی

یکم تا ۳۱ اگست ۱۹۸۷

سنجیدہ ارادہ ہو تو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے
متعلق تمام مواد
لیے اس قسم کی خود مختاری سے
وزارت اطلاعات و نشریات کی چند نالوں
اور متعلقہ نظاموں کو
سے جمع کیا جا سکتا ہے۔
چند صفحات
آزادیاں دینے کے بارے میں

تبادلۂ خیالات اور ایسے ہی دیگر پروگراموں کے
ذریعے لاکھوں افراد میں تحریک عمل پیدا کرکے
انھیں متحد ہو کر اس سماجی تبدیلی کا مطالبہ کرنے
کی ترغیب دی جا سکتی ہے جس کا گلا خاموشی کے
ساتھ سازش کے ذریعے گھونٹ دینے کی کوشش کی جاتی
ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارے پروگرام اسٹوڈیو

نہیں کرسکتا. کیونکہ وہ نچلی سطح کے عوام کے ساتھ
گفتگو اور تبادلۂ خیالات کو ان کی اپنی زبان
میں ان کے اپنے محاوروں کے ساتھ ٹیپ کرلیتا
ہے۔ ٹیلی ویژن کے لیے یہی کام ویڈیو کیسٹ
ریکارڈ کرتا ہے۔

الیکٹرانک میڈیا تک رسائی

الیکٹرانک میڈیا تک رسائی جمہوریت کی

> الیکٹرانک میڈیا میں شہریوں کی وسیع پیمانے پر رسائی اور شمولیت سے، جو صرف حقیقی خود مختاری کی صورت میں ہی ممکن ہو سکتی ہے، الیکٹرانک میڈیا اور اس کے استعمال میں ایک غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔ ہماری زبانی روایت کے سیاق و سباق میں، اس سے قابلیتوں اور صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا۔ لیکن ہم تجربہ شروع کرنے سے ڈرتے ہیں۔

وزارت قانون
ایک مختصر بیان تیار کرکے اسے
کو بھیجا جا سکتا ہے تاکہ وہ پارلیمنٹ میں پیش
کئے جانے کے لیے ایک مسودۂ قانون تیار کرے۔
ایک پانچ رکنی اتھارٹی میں ہندوستان کے
مختلف خطوں کے بے داغ کردار والے مردوں
اور عورتوں کو شامل کیا جانا چاہئے۔ یہ اتھارٹی
اپنا نظام کنٹرول خود وضع کرے گی۔ بجائے اس
کے کہ کوئی چیز ان پر اوپر سے لادی جائے یہ
انداز نظر اس سے یکسر مختلف ہے جو عام طور پر
اختیار کیا جاتا رہا ہے۔

ذرائع ابلاغ بطور مجاہد

مختلف سطحوں اور مختلف طبقات پر
مشتمل ہمارے معاشرے میں حرکت پذیر سماجی
اصلاح کے لیے ایک بڑے پیمانے پر عوام کو حرکت
میں لانا الیکٹرانک میڈیا کی مدد کے بغیر ممکن نہیں
ہے۔ کوئی بھی مسئلہ ہو، بحث مباحثوں، مذاکروں

سماج کے سامنے
سے باہر نکل کر جائے جائیں۔
سماج کی صحیح تصویر پیش کی جائے۔ تبھی ہم یہ محسوس
کرسکیں گے کہ ہم کتنے بے حس ہو گئے ہیں، ہم کیسی
لعنتوں کو برداشت کرتے ہیں اور ان سب کا ہماری
زندگی اور ہمارے احساس پر کتنا خراب اثر پڑتا ہے

اور سچائی کیسے پیش کی جائے؟

گذشتہ چالیس برسوں میں ہمارے اخبارات
اور الیکٹرانک میڈیا دونوں میں سچائی کو اس کی
تمام تر ناخوشگواری اور ان گھڑپن کے ساتھ ریکارڈ
کرنے کی خواہش کی کمی رہی ہے۔ سچائی کڑوی اور
پریشان کردینے والی ہوتی ہے۔ پھر بھی الفارمیشن
سوسائٹی کی جدید ٹکنالوجی ہمیں سچائی تک پہنچنے
کے وسیلے فراہم کرتی ہے۔ ایک سادہ سا ٹیپ
ریکارڈر خواہ وہ کسی کے ہاتھ میں ہو، ایسے نتائج
پیش کرسکتا ہے جو اسٹوڈیو میں تیار کردہ کوئی پروگرام

ایک عمدہ مثال بن سکتی ہے۔ لیکن
نیٹ ورکوں کو ویڈیو کی اس جاندار، بے
تصنع، حقیقت پسندانہ اور مناظرانہ انداز کی
ریکارڈنگ کو قبول کرنے کے لیے رضامند
ہونا چاہیئے اور اس کی اتنی قیمت دی جانی
چاہیئے جس کی وہ مستحق ہو۔ لیکن میڈیا میں
بہت سے بیورو کریٹوں کی موجودگی باہر کے
اجنبی اشخاص سے اس قسم کا مواد قبول کئے
جانے میں مزاحمت کا باعث بنتی ہے۔ وہ اس
مواد کے بارے میں اس لیے پس و پیش کرتے
ہیں کہ یہ دھاردار ہوتا ہے اور اسے عام ٹیم ٹام
اور تصنع سے تیار نہیں کیا جاتا۔
الیکٹرانک میڈیا میں شہریوں کی وسیع
پیمانے پر رسائی اور شمولیت سے، جو صرف حقیقی

خود مختاری کی صورت میں ہی ممکن ہو سکتی ہے
الیکٹرانک میڈیا اور اس کے استعمال میں ایک
غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو جائے گی ... زبانی
روایت کے سیاق و سباق میں ...
اور صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا ... گا۔
لیکن ہم تحریر شروع کرنے سے ...
سوچتے ہیں کہ یہ ہاتھ سے نکل جائے گا ...
قابو سے باہر ہو جائے گا۔ اس لیے ہم حالات

اپنے زمانے کے مطابق طرز ہائے عمل وضع کرنے
ہیں اور انھیں آزمانا ہے۔

سخت ترین چیلنج

آج ہمیں ایک سخت ترین چیلنج درپیش
ہے۔ یہ ہے تقریباً ایک سو کروڑ افراد کے لیے
ایک سادہ اور باعزت طرزِ زندگی وضع کرنا۔
یہ اتنا بڑا چیلنج ہے جتنا کسی معاشرے کو
درپیش نہیں رہا۔ بہرحال اس چیلنج کے جواب
ہمیں دستیاب نہیں ہیں اور اگر کچھ تجاویز کو وضاحت

ہی ہونی چاہیئے۔ یہ سلسلہ ہمارے لیے تباہ کن
ہے۔ اسے روکنا ہوگا۔
قدروں کے نظاموں اور طرز ہائے زندگی
کی تیزی سے کایا پلٹ کرنے کے لیے — اتنی
تیزی سے کہ امکانی دھماکے کو روکا جا سکے ہمیں
الیکٹرانک میڈیا کو ہی کام میں لانا ہوگا۔ کیوں کہ
صرف وہی اپنی وسیع پیمانے کی ترغیباتی مہموں
وغیرہ کے ذریعے اتنا کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔
جتنا ہم چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں الیکٹرانک میڈیا
بلکہ بحیثیت کل سارے میڈیا کی ترقی کو اپنی

> میڈیا کی خود مختاری، آزادی اور بالا دستی سے خوفزدگی وسیع پیمانے پر اُن لوگوں میں پائی جاتی ہے جنھوں نے گزشتہ چالیس برسوں میں سیاسی اور اقتصادی طاقت پر اجارہ داری حاصل کرلی ہے۔ عوامی شمولیت کی جانب بڑھنے والے ہر قدم کو غیر منضبط عناصر کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔

کرحقوں کا توں رہنے دیں گے ... کا وقت
اگرچہ اس میں کسی وقت بھی ایک دھماکا ہونے
کے امکانات موجود ہیں۔
میڈیا کی خود مختاری، آزادی اور بالا
دستی سے خوفزدگی وسیع پیمانے پر اُن لوگوں
میں پائی جاتی ہے جنھوں نے گزشتہ چالیس برسوں
میں سیاسی اور اقتصادی طاقت پر اجارہ داری
حاصل کرلی ہے۔ عوامی شمولیت کی جانب بڑھنے
والے ہر قدم کو غیر منضبط عناصر کے سامنے ہتھیار
ڈالنے کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ برگزیدہ طبقے
کے ہاتھوں میں کنٹرول کے پس منظر میں صرف عوامی
شمولیت ہی قابلِ برداشت ہے۔ یہ نہیں سمجھا
جاتا کہ کل کے نظریات آج لاگو نہیں ہو سکتے ہیں

کے ساتھ پیش کیا گیا ہے تو انھیں خیالی قرار
دے کر ٹھکرا دیا گیا ہے۔ ہمیں انجام کار پُرا سرار
تصنیع آسودگی اور انقلابِ صارفین
Consumer Revolution سے جو
مغربی ممالک میں رونما ہوا ہے، مُنہ پھیرنا ہوگا۔
اسے مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے اور
ہمارے ملک میں اسے ایک پانچ ستارہ ثقافت
کہا جاتا ہے لیکن یہ صرف ایک چھوٹے سے
برگزیدہ طبقے کو ہی چھوتی ہے۔ بہرحال اس وقت
تک ہم اس چیلنج کا سامنا کرنے سے انکار کرتے
رہے ہیں اور ایک ایسا سسٹم بنانے پر قانع
ہیں جو دو قومیں پیدا کرتا ہے جبکہ صرف ایک قوم

حالیہ انداز ہمارے سماجی تناظروں میں دیکھنا ہوگا —
اس کے بعد ہی ہم اس بات کا زیادہ درست اور
بامعنی جائزہ لے سکیں گے کہ ان چالیس برسوں
میں کیا ہوا ہے۔
بہت سے دوسرے معاملوں کی طرح
ان معاملوں میں بھی ہم ڈانواڈول ہیں۔ دوسرے
معاشروں کی بھونڈی نقل کر رہے ہیں اور بہترین
اور بدترین میں امتیاز نہیں کر پا رہے ہیں اچھی
طرح سوچ سمجھ کر چیدہ موضوعات پر تیار کیے گئے
پروگراموں کی کمی کی وجہ سے مختلف غیر ملکی زبانوں
کے پروگرام ٹیلی کاسٹ کرنے پڑتے ہیں جو اقدار

(راتے صفحہ ۵۴ پر) یکم تا ۳۱ اگست ۱۹۸۷

ایس۔ وی۔ کے مورتی

حصولِ آزادی کے بعد میڈیا کے بڑھتے قدم

معنف جو فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا پونے کے سابق ڈائریکٹر اور مامور دستاویزی فلم ساز ہیں ہمارے ملک میں پریس، ریڈیو، فلم اور ٹیلی ویژن کے بتدریج عروج اور اثر کے بارے میں جانکاری دیتے ہیں۔ اس مضمون میں وہ "پریس کی آزادی" اور "ریڈیو اور ٹی وی پر مرکزی حکومت کی" اجارہ داری" سے متعلق سوالات اٹھاتے ہیں جن کے بارے میں بڑا چرچا کیا جا رہا ہے، انھوں نے "ویڈیو چوری" کا بھی ذکر کیا ہے جس سے فلم صنعت کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ چونکہ وہ گذشتہ چار دہائیوں سے میڈیا سے قریبی طور پر وابستہ رہے ہیں۔ اس لیے میڈیا کی نشو و نما اور محاسن سے متعلق اُن کے تجزیہ پر سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہیئے۔ (ایڈیٹر)

اگر کسی کو بھارت میں حصولِ آزادی کے بعد میڈیا کا جِھٹّا تیار کرنا ہے تو اُسے کم از کم اس امر کا تھوڑا سا خیال ہونا چاہیئے کہ آزادی سے قبل اُس کی حالت کیا تھی۔

آج بھارت میں چار میڈیا۔ پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن (ویڈیو) اور سنیما ہیں جن میں سے ٹیلی ویژن ایک ایسا میڈیم ہے جس سے بھارت آزادی سے قبل ناآشنا تھا۔ آیئے ہم باقیماندہ میڈیا پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں۔

پریس: ہمارے ملک میں انگریزی کا ایک زبردست قوم پرست پریس اور علاقائی بھارتی زبانوں کے بیشتر اخبارات تھے انھوں نے آزادی کی جدوجہد میں قابلِ ذکر حصہ لیا تھا سیاسی واقعات قدرتاً تمام تر دلچسپی کو سموئے ہوئے تھے اور خبروں اور ادارتی کالموں میں اُن کا سب سے زیادہ چرچا ہوتا تھا۔ پریس بدیسی حکومت کے حملے اور دار سہہ کر بھی زندہ رہا۔ پریس کو قابو میں لانے کے لیے سخت قوانین بنائے گئے۔ ان قوانین کی بہادرانہ خلاف ورزی کرنے اور ہوشیاری سے بچنے کی بیشتر داستانیں مشہور ہیں گھوش برادران جو بنگالی اخبار "امرت بازار پتریکا" نکالتے تھے انھوں نے جس طرح حکام کو مات دی اس کی کہانی بھارت میں پریس کی قابلِ فخر تاریخ کا ہی حصہ بن گئی ہے جب حکومت نے بھارت میں بھارتی زبانوں کے پریس پر ورنیکلر پریس ایکٹ نافذ کر دیا تو گھوش برادران نے راتوں رات اپنے اخبار کو انگریزی، بنگالی کا دولسانی اخبار بنا دیا اور اس طرح اسے اس خطرناک قانون کی حدود سے باہر نکال دیا۔ جب اشاعت سے قبل ادارتی کالموں پر سنسر لگا دیا گیا اور سنسر

[illegible] کیا جانے لگا تو [illegible]
[illegible] کے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] اخبارات شائع ہوتے تھے ان کی تعداد
[illegible] زیادہ نہیں تھی [illegible]
بڑے [illegible] اور [illegible]
اہم ڈسٹرکٹ [illegible]
تھے [illegible]
یعنی [illegible] تھی [illegible]
طرح [illegible] کی تعداد [illegible] بہت زیادہ
[illegible]
[illegible] متوسط طبقے [illegible]
[illegible] لوگ [illegible]
خبروں پر [illegible] تھے [illegible] سماجی طور
[illegible]
اخبارات کی کل تعداد [illegible] تھی [illegible]
ان تمام کی کُل [illegible] بہت کم یعنی ۵ ہزار
سے کم تھی۔

ریڈیو

[illegible] بڑے بڑے شہروں
اور [illegible] چند بھارتی ریاستوں کی راجدھانیوں
میں قدم رکھا ہی تھا۔ ان میں سے بعض تو تب
اد [illegible] تھے جنھیں [illegible]
دیا اور انھیں چلایا تھا اور [illegible] میں حکومت نے
اُنھیں اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ ریڈیو زیادہ تر
سرکاری [illegible] کیا کرتا تھا لیکن وہ قوم
[illegible]وں کی سرگرمیوں کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا تھا۔

سنیما

سنیما نے ۱۹ویں صدی کے آخری برسوں میں بھارت میں قدم رکھے لیکن اُسے قدم جمانے میں کچھ وقت لگ گیا۔ پہلی بھارتی فلم دادا صاحب پھالکے نے ۱۹۱۳ء میں بنائی تھی۔ یہ فلمیں خاموش ہوتی تھیں اور مناظر کے درمیان مکالمات ہوتے تھے اور فلم کی روانی کو برقرار رکھنے کے لیے گانے کا پروگرام بھی ہوتا تھا۔

> **بھارت کی تمام تر سرگرمیاں جدوجہد آزادی پر مرکوز تھیں اور اس کا پریس میں انعکاس ہونا قدرتی امر تھا۔**

میڈیم ابتدائی ناٹکوں، لوک تھیٹروں اور لوک ناچوں وغیرہ پر زیادہ دارومدار رکھتا تھا اور اُن سے بہت کچھ مستعار لیتا تھا۔ دلوملا تمام لوک ناٹکوں اور سوانگوں کا اہم حصہ ہوتی تھی، اس لیے ابتدائی فلمیں بھی ان وسائل پر زیادہ انحصار رکھتی تھیں۔ لیکن ملک کے مزاج کو یکسر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تاہم سیاست سے براہ راست کسی بھی طرح کے تعلق کا مطلب حکومت کا عتاب مول لینا تھا اور اس کے نتیجے میں فلم قطعاً دکھائی نہیں جا سکتی تھی۔ ایسے وقت میں ایک اعلیٰ ترین شخصیت کا بھارت کے سیاسی اُفق پر ظہور ہوا۔ اُس کا نام تھا، موہن داس کرم چند گاندھی۔ انھوں نے عوام میں بیداری پیدا کی یہ ایک ایسا کام تھا جو کوئی دوسرا نہیں کر سکا۔ اُن کا دستور کار محض سیاسی نہیں تھا۔ اُنھوں نے ایک ایسے نئے سماج کی تعمیر کا بیڑا اُٹھایا جہاں کسی بھی قسم کی بے انصافی نہ ہو۔ انھوں نے ذات پات، خصوصاً چھوا چھوت جیسی سماجی برائیوں کے خلاف عملاً جنگ چھیڑ دی۔ فلم سازوں نے عصر حاضر کی اہمیت سے متعلق کہانیوں کو فلمانے کی جسارت کی انھوں نے سماجی اصلاح کے لیے اس تحریک کی آڑ لی۔ ایسی سینکڑوں اہم فلمیں بنائی گئیں جن میں ذات پات اور شراب نوشی پر حملے کئے گئے۔ خواتین کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی گئی اور سود خوروں کے خلاف غریب کاشتکاروں کی مدد جدوجہد کو دکھایا گیا لیکن ان کی تہہ میں دیا جانے والا سیاسی پیغام واضح تھا۔

دوسری عالمی جنگ کے برسوں کے دوران بعض دُور رس تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔ اگرچہ یہ کام بادلِ ناخواستہ کیا گیا تاہم بھارت میں قدرے صنعت کاری عمل میں لائی گئی تاکہ کم از کم جنگ کی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکتا۔ اُس وقت کی سب سے بڑی صنعت خوراک اور کپڑے سے لے کر ہتھیاروں اور اسلحہ تک بے شمار ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تھی ایک نئی قسم کا کاروباری، فوجی ٹھیکیدار پیدا ہوا وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے ضروری آدمیوں اور سروسوں کی تنظیم کی۔ اس کاروبار میں بڑے منافعے تھے اور یہ معمولی محنت سے یا اُس کے بغیر ہی پیدا کئے گئے اور وہ بھی تھوڑے سے عرصے میں۔ جنگ کے بعد اس دولت کے لیے سرمایہ کاری کے نکاس تلاش کئے جانے لگے۔ اتفاق سے سنیما ان حالات میں آڑے آیا۔ لیکن اس کے اثرات ۱۹۴۷ء میں

بھارت کی طرف سے حصولِ آزادی کے بعد ہی دیکھے جا سکے۔ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو ایک قومی حکومت کو اقتدار منتقل کئے جانے سے ایک نیا دور شروع ہوا۔ اب بھارتی اپنی تقدیر کے آپ مالک بن گئے تھے۔ لیڈروں کے لیے اب ایجی ٹیشن اور عوامی تحریکیں چلانے کے دن گذر چکے تھے۔ اب انھیں ایک بہت بڑے ملک کا نظم و نسق چلانے کا سنجیدہ اور مشکل کام سنبھالنا پڑا۔ لیکن پرانی عادات آسانی سے نہیں جاتیں۔ پریس کے مجاہدوں کی تربیت ایک ایسے ادارے کی فضا میں ہوئی تھی جو اپنے وقت کی طاقتوں کے ساتھ خوفناک لڑائی لڑے تھے، راتوں رات سیاسی واقعات کو فراموش نہیں کر سکے اور انھوں نے بھارتی زندگی کے دیگر پہلوؤں پر زور دیا۔ چنانچہ سیاست خبروں اور اداراتی کالموں پر چھائی رہی۔ لیکن جلد ہی زندگی کے دوسرے پہلو منظر پر آئے جن کا بتدریج لیکن یقینی طور پر حل کیا جانا تھا۔ چنانچہ جرنلسٹوں نے بعض شعبوں، جیسے سائنس، اقتصادی امور اور تجارت وغیرہ میں مہارت حاصل کرلی اور ان شعبوں کی سرگرمیوں کا ذکر نہ صرف خبروں کے کالموں میں ہونے لگا بلکہ اداراتی صفحوں پر ان پر تبصرے بھی کئے جانے لگے۔

بھارتی زبانوں کے اخبار

آزادی کی جدوجہد کے دوران گاندھی جی نے ایک قومی زبان اور علاقائی زبانوں کے فروغ پر زور دیا تھا۔ انھوں نے اس بحث رائے کا اظہار کیا تھا کہ حکومت اور عوام کے درمیان زبان کی کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ انھوں نے کہا تھا کہ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے، جب حکومت کا کام کاج عوام کی زبان میں کیا جائے۔ چنانچہ یہ قدرتی تھا کہ علاقائی زبانوں اور ثقافتوں نے فروغ پانا شروع کیا۔ ان میں سے بعض کی تاریخی میراث شاندار تھی۔ اب پریس کے ذریعہ اس تمام ثروت کو عوام کے نزدیک لایا گیا۔ تازہ ترین

> دیومالا، لوک ناٹکوں اور سوانگوں کا اہم حصہ ہوتی تھی اس لیے ابتدائی فلمیں بھی ان وسائل پر زیادہ تر انحصار رکھتی تھیں لیکن ملک کے مزاج کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یعنی ۱۹۸۵ء کے دستیاب اعداد و شمار کے مطابق اخبارات کی تعداد ۲۰۷۵۸ ہے۔ ان میں انگریزی کے اخبار ۴۳۸۰، ہندی کے ۵۹۳۶ اور دیگر زبانوں کے ۱۰۹۸۲ ہیں۔ ان تمام اخبارات کی کُل اشاعت ۵۵۳۹۱ ہے۔ اگر ان اعداد کا ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کے اعداد کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پریس نے بہت زیادہ ترقی کی ہے۔ تاہم اگر کوئی ملک کی آبادی اور علاقائی تنوع کے مقابلے میں ان اعداد کا مطالعہ کرے تو وہ یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ صورت حال کسی بھی طرح مثالی نہیں ہے۔

پریس کی آزادی: آیئے اب ہم پریس کی آزادی پر ایک نگاہ ڈالیں۔ پریس کا بیشتر حصہ پرائیویٹ سیکٹر میں ہے۔ ہمارے آئین میں ایسی کوئی خاص دفعہ نہیں ہے جس کا تعلق پریس کی آزادی سے ہے۔ آرٹیکل ۱۹(۱)، جو آزادیٔ تقریر سے تعلق رکھتا ہے، تحریر یا الفاظ کی آزادی پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ لیکن اخبارات شائع کرنے کی اقتصادیات کچھ ایسی ہیں جو کافی مالی اخراجات کے بغیر اخبار کا چلایا جانا ناممکن بنا دیتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں فیصلہ سازی کا کام قدرتی طور پر اُن لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے جو مالیات کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ بات بھارت کی حالت میں ہی عجیب نہیں ہے بلکہ اسے دیگر ملکوں کے معاملوں میں بھی دیکھا گیا ہے۔ کوئی تیس دہائیاں پہلے امریکہ میں پریس کا تحقیق و مطالعہ کرنے والے ایک کمیشن نے اشارہ کیا تھا کہ وہ دن آئے گا جب تمام حلقے اور برادریاں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ایک ہی آواز سنیں گی اور اخبارات میں ایک ہی رائے کا مطالعہ کریں گی۔ بھارت میں بھی پہلا پریس کمیشن کوئی تیس دہائیاں پہلے ۱۹۵۱ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے چیئرمین جسٹس راجیہ ادھیکش تھے۔ بڑے اخبارات کی اقتصادی طاقت کو چھوٹے اخبارات کو کچلنے سے روکنے کے لیے انھوں نے ایک "پرائس پیج شیڈول" کا قانون بنانے کا مشورہ دیا تھا جس میں دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ صفحات کی مخصوص تعداد کے لیے کم از کم قیمت مقرر کرنے کو کہا گیا تھا۔ بعض اخبارات کی طرف سے شدت سے اس کے خلاف قانونی لڑائی گئی

اور پٹنے کے ایک اخبار نے تو سپریم کورٹ
میں مقدمہ جیت لیا جب کہ اُس کی طرف کے
"پرائس پیج شیڈول" کو رد کر دیا گیا۔ تب سے
دو مکاتبِ خیال کے درمیان پُرجوش بحث جاری
ہے۔ ایک گروپ ایسے شیڈول کو قابلِ عمل بنانے
کے لیے ضروری تبدیلیاں کرنے کے حق میں ہے اور
دوسرا زور و شور سے اس کی مخالفت کر رہا ہے
کیونکہ اس کے خیال میں یہ پریس کی آزادی کے

پریس کی کارکردگی پر نگرانی کرنے کا محدود کام
انجام دے سکتی ہے اور وہ اس کے تنظیمی پہلوؤں
کے بارے میں بے بس ہے۔

ذمہ داری کا احساس

اس بارے میں بھی بہت کچھ کہا گیا ہے
کہ حتمی تحفظ ہے انفرادی جرنلسٹ کا احساسِ
ذمہ داری۔ دراصل جب سے امریکی پریس
کمیشن کی رپورٹ کو "ایک آزاد اور ذمہ دار
پریس" کا لقب دیا گیا ہے اس محاورے کا

مقابلے میں اُن کے اظہارِ خیال کی آزادی کا بھی
تحفظ ہے۔ صرف اُس وقت اُمید کی جا سکتی ہے
کہ پریس خود کو موقعہ کے اہل ثابت کرے گا
اور چنوتیوں کا سامنا کرے گا۔

ریڈیو

ریڈیو کا ذکر کرتے ہوئے کہا جا سکتا
ہے کہ یہ یقیناً ۱۹۲۷ء سے بہت دُور آ گیا ہے
جب اس کا دو ٹرانسمیٹروں کی صورت میں
آغاز ہوا تھا جو پرائیویٹ ملکیت کے تھے اور
بمبئی اور کلکتہ میں قائم کیے گئے تھے۔ بعد

پریس کے مجاہد جن کی تربیت ایک ایسے ادارے کی فضا میں ہوئی تھی جو اپنے وقت کی طاقتوں کے ساتھ خوفناک لڑائی لڑے تھے راتوں رات سیاسی واقعات کو فراموش نہیں کر سکے اور انھوں نے بھارتی زندگی کے دیگر پہلوؤں پر زور دیا۔ چنانچہ سیاست خبروں اور اداریتی کالموں پر چھائے رہے۔

تصور کی جڑوں پر وار کر رہا ہے۔
اس خاص پہلو کو نمایاں کرنے کے بارے
میں میرا مقصد محض ایک جمہوری سماج کے
برقراری میں پریس کی آزادی پر زور دینا ہے۔
کیونکہ اظہارِ آزادی کے بغیر کوئی بھی سماج
زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ آزادی
محض سرکاری کنٹرول کے بارے میں نہیں بلکہ
دوسرے گروپوں کے کنٹرول کے بارے میں ہے
جن کا ایسے کنٹرول میں مفاد خصوصی ہو سکتا ہے۔
اس سلسلے میں پریس کونسل کی امکانی قوت
کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اس میں
کوئی شبہ نہیں کہ اس کا کچھ اچھا اثر نہیں ہوا
ہے۔ لیکن یہ کونسل اپنے آئین کے باعث ہی

بڑا طین ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابلِ
ذکر ہے کہ انڈین فیڈریشن آف ورکنگ جرنلسٹس
جیسی ایک جماعت نے ۱۹۷۱ء میں احمد آباد
میں منعقدہ اپنی سالانہ کانفرنس میں پریس کی
سماجی ذمہ داری کے بارے میں ایک قرارداد منظور
کی تھی۔ یہ بلاشبہ بھارت میں پریس کی تاریخ میں
ایک سنگِ میل تھی۔ ایسے عصرِ حاضر کے بھارت
میں عظیم تر اہمیت حاصل ہو جاتی ہے جب ملک
میں ہر شعبے میں چنوتیوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔
اس کا حل آسان نہیں ہے۔ ہمیں ایسے قواعد
بنانے ہوں گے جو نہ صرف جرنلسٹوں کی کم از کم
اُجرتوں پر لاگو ہوں بلکہ جن سے اُجرتوں کے

میں حکومت نے انھیں اپنی تحویل میں لے لیا۔
دستیاب تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق
آل انڈیا ریڈیو کا نظام اب علاقے اور آبادی
کے لحاظ سے تقریباً تمام ملک میں پھیلا ہوا
ہے۔ جس بات سے واقعی حالات میں ڈرامائی
تبدیلی آئی ہے وہ ہے ٹرانزسٹر انقلاب۔
ارزاں ٹرانزسٹر ریڈیو سیٹوں کی دستیابی
سے آل انڈیا ریڈیو اب ہر جگہ موجود نظر آتا
ہے۔ ریڈیو محض خبروں کا ایک ذریعہ نہیں بلکہ
یہ ثقافتی رابطے کا ذریعہ بھی بن گیا ہے۔ ریڈیو
یقیناً کلاسیکی کلچر کو عام لوگوں کی پہنچ کے اندر

لے آیا ہے۔ لیکن اس شعبے ما
ہے۔ر
ریڈیو پر مرکزی حکومت کی کلیتہً اجارہ
داری ہونے سے ایک مکتبِ خیال کے لوگ
شدّت سے محسوس کرتے ہیں کہ اس سے آج دنیا
میں عوامی رابطے کے ایک اہم ترین ذریعے کے
سلسلے میں آئین کے منشاء کی نفی ہوتی ہے۔
دوسرا سینما: جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ

مالی نہیں

رہا۔ اس سے سینمائی فلموں میں ایک انقلاب آ
گیا۔ ان مناظر کے لیے بھاری مالی اخراجات
کی ضرورت تھی۔ ابتدائی برسوں میں فلمیں زیادہ تر
"پربھات"، "بمبئی ٹاکیز" اور "نیو تھیٹر" وغیرہ میں
کم بجٹ پر تیار کی جاتی تھیں۔ اب فلموں کے
لیے جن بھاری مالی اخراجات کی ضرورت تھی وہ
ان عام قسم کے اسٹوڈیو کے دائرے سے باہر تھے۔
مزید برآں وہ اداکار جو پہلے ان اسٹوڈیوز میں
تنخواہوں پر ملازم تھے انھوں نے آزادانہ طور پہ

مایوس کُن حالت نہیں
رتبہ حاصل کرنا ہے تاہم یہ
ہے کہ زیادہ تعداد میں فلمیں بننے سے معیاری
فلمیں بالکل نہیں بن رہیں۔ ۵۰ء کی دہائی میں
بے اطمینانی کی ایک آواز بنگال سے اٹھی ستیہ
جیت رائے نے معمولی بجٹ پر باتھیر پنچالی
فلم بنائی جس کی سمندر پار اور ملک کے اندر
بڑی سراہنا ہوئی۔ یہ فلم دیہی بنگال کی حقیقت
پسندانہ زندگی کے بارے میں تھی۔ جیسے شاعر
نے اپنی نازک خیالی اور حساسیت سے نکھارا تھا۔
جلد ہی چند دوسرے لوگ منظر پہ آئے جن کی

لیکن اخبارات شائع کرنے کی اقتصادیات کچھ ایسی ہیں جو کافی مالی اخراجات کے بغیر اخبار کا چلایا جانا ناممکن بنا دیتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں فیصلہ سازی کا کام قدرتی طور پر اُن لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے جو مالیات کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ بات بھارت کی حالت میں ہی عجیب نہیں ہے بلکہ اسے دیگر ملکوں کے معاملوں میں بھی دیکھا گیا ہے۔

حصولِ آزادی کے بعد کے دور میں بھارتی سینما
زبردست تبدیلیوں سے گزرا ہے۔
۱۹۴۸ء میں جنوبی بھارت میں مرحوم مسٹر ایس ایس
واسن نے "چندر لیکھا" کے نام سے ایک فلم بنائی
جس میں دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ ڈھول
ناچ کے مناظر کا ایک سلسلہ تھا جس پر بہت بھاری
لاگت آئی تھی۔ یہ "ڈرامز ہارس" کی ایک صورت
تھی۔ سپاہیوں کی ایک جماعت ان ڈھولوں کو
پھاڑ کر اُس راجہ کو قبضہ میں لینے کے لیے باہر نکل
آئی جس کے دربار میں یہ ناچ ہو رہا تھا۔ اس فلم
کی اہمیت یہ ہے کہ یہ باکس آفس پر بہت کامیاب

کام کرنا زیادہ پسند کیا اور انھوں نے ہر فلم کے
لیے اپنی شرائط کو منوانا شروع کر دیا۔ اس
سے اسٹوڈیو سسٹم کا خاتمہ پڑھا گیا۔ اس کے بعد
فلم کے ڈائریکٹر کو دوسرا مقام نصیب ہوا اور پہلا
مقام سرمایہ کار کو حاصل ہوا جو سب سے زیادہ طاقتور
ثابت ہوا۔ اُس روز سے فلم صنعت کی جسامت
میں بہت بھاری اضافہ ہوا ہے۔ اب ہر سال
تقریباً ۷۰۰-۸۰۰ فلمیں تیار ہوتی ہیں جو دنیا میں
سب سے زیادہ ہیں۔ لیکن جہاں تک ان کی قسم کا
تعلق ہے بھارتی سنیما کو مجموعی طور پر ابھی عالمی

فلموں نے لوگوں کی توجہ اپنی جانب کھینچی۔ ان کے
نام تھے رتوک گھٹک اور مرنال سین۔ اس کے
جلد بعد جن باصلاحیت لوگوں کو ۱۹۶۰ء میں قائم شدہ
پُونے کے فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ میں
تربیت دی گئی تھی انھوں نے بھی جوہر دکھانے
شروع کر دیے۔ ادور گوپال کرشن کی فلم
"سوئمبرم" نے جو کیرل میں بنائی گئی تھی راشٹریہ
کا اعزاز حاصل کیا۔ بعد کے برسوں میں اس
قسم کی فلموں نے جن کا ذکر "دوسرے سنیما"

یکم تا ۱۵ اگست ۱۹۸۷

کے طور پر لیا جاتا ہے اپنا مقام بنا لیا ہے اس قسم کی فلموں کی بڑی خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ یہ عصر حاضر کے مسائل سے متعلق ہیں، سادہ ہیں اور اسلوباتی طور پر پیش کیا جائے۔

۲۔ ان میں سے چند ہندی کے سوائے دیگر زبانوں میں ساتھ ساتھ ہیں اور یہ اعلیٰ علاقائی ثقافتوں کا اظہار کرتی ہیں جب زبان ہندی ہو تو بھی موضوع علاقائی ہوتا ہے اور اسے علاقائی ثقافتی ماحول میں بڑی توجہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

۳۔ ان میں باکس آفس سینما کی عام چالوں جیسے تشدد، جنسیات اور سستی تیر اندازیوں سے احتراز کیا جاتا ہے۔

ان فلموں نے بھارتی سینما میں جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل ذکر ہے۔ اس سینما کو آئندہ کی توجہ دینے کے لئے عدد تمہید کر رہے ہیں ان انجام کار یہ تماشائیوں کی اثر قبول کرنے کی طاقت ہو گی جو یہ فیصلہ کرے گی کہ اس امر کے زیادہ امکانات ہیں کہ دوسری قسم کے سینما کی کوالٹی سے لطف اندوز ہونے کے بعد تماشائی باکس آفس سینما کی فراری کی جانب بہت کم لوٹے گا۔

ٹیلی ویژن

ٹیلی ویژن جدید ٹیکنالوجی میں جدید ترین ہے اور یہ اپنے ساتھی ویڈیو کے ہمراہ ابتدائی میڈیم سینما کا تقریباً صفایا کر دے گا۔ اس کے اسباب جمالیاتی کے بجائے اقتصادی زیادہ ہیں۔ تقریباً ہر متوسط طبقہ کے گھر میں چھوٹے ٹیلی ویژن سے سینما گھروں میں حاضری پر بُرا اثر پڑنے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اسکے علاوہ ویڈیو چوری جس سے ہر گھر میں تازہ ترین فلموں کے ویڈیو کیسٹ پہونچ جاتے ہیں۔ ایک ایسا خطرہ ہے جو فلمی حلقوں میں بہت زیادہ تشویش پھیلا رہا ہے۔

لیکن آیئے! ہم بعض دوسرے پہلوؤں پر ایک نظر ڈالیں۔ ۱۹۵۹ء میں دلّی میں ایک تجرباتی اسٹیشن کے طور پر ٹیلی ویژن کا معمولی سطح پر آغاز ہوا تھا۔ اس کا مقصد حلقہ جاتی

> ریڈیو پر مرکزی حکومت کی کلیتہً اجارہ داری ہونے سے ایک مکتبِ خیال کے لوگ شدّت سے محسوس کرتے ہیں کہ اس سے آج دُنیا میں عوامی رابطے کے ایک اہم ترین ذریعے کے سِلسلے میں آئین کے منشا کی نفی ہوتی ہے۔

ترقی اور دیہی بہتری کے لیے ٹیلی ویژن کا ایک ذریعے کے طور پر استعمال کرنا تھا۔ اس وقت بھی بھارتی پارلیمنٹ میں اس امر کے بارے میں نکتہ چینی کی گئی کہ ٹیلی ویژن ایک بہت زیادہ قیمتی میڈیم ہے جس کی استطاعت بھارت نہیں رکھتا۔ اس وقت کے پردھان منتری مرحوم پنڈت جواہر لال نہرو نے ایوان کو یقین دلایا تھا کہ ٹیلی ویژن کو کبھی بھی تفریح کا ذریعہ نہیں بننے دیا جائے گا بلکہ اُسے تقریباً خصوصی طور پر سماجی تبدیلی لانے کے لیے استعمال کیا جائیگا جس کا زیادہ چرچا کیا جاتا ہے۔ بد قسمتی سے بعض لوگ آج اس قول و قرار کو فراموش کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ تاہم دلّی سے ٹیلی ویژن کی ایک باقاعدہ سروس شروع کرنے میں چھ برس لگے۔ اور ۱۹۷۲ء میں دلّی سے باہر پہلا ٹیلی ویژن اسٹیشن بمبئی میں قائم کرنے میں مزید سات برس لگ گئے۔ بعد ازاں چند مزید اسٹیشن سرینگر اور امرتسر میں بھی قائم کئے گئے۔

بھارت میں ٹیلی ویژن کی تاریخ میں اہم ترین واقعہ تھا ۱۹۷۵ء میں سائٹ (SITE) تجربہ۔ امریکی مصنوعی سیارہ ایک برس کے لیے بھارت کو مستعار دیا گیا تاکہ وہ سیٹلائٹ ٹیلی ویژن کا تجربہ کر سکے۔ اس تجربے سے تقریباً ۲۴۰۰ دیہات مستفید ہوئے جو راجستھان، مدھیہ پردیش، بہار، اڑیسہ، کرناٹک اور آندھرا پردیش میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان علاقوں کی علاقائی زبانوں میں پروگرام مصنوعی سیارے کو بھیجے جاتے تھے اور وہ ان علاقوں میں قائم شدہ موصول کنندہ اسٹیشنوں کو واپس بھیج دیتے تھے صبح کو اسکولوں کے لیے باقاعدہ کلاس روم اور شام کو عام ٹیلی کاسٹ ہوتے تھے۔ اس سے ان علاقوں کے لوگوں کو بڑا فائدہ پہنچا اور انھیں معلوم ہوا کہ کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے۔

سٹیلائٹ ٹیلی کاسٹ

بھارت میں ٹیلی نشریات میں اگلا سنگ میل

اس وقت قائم ہوا جب بھارت نے اپنا مصنوعی سیارہ "انسیٹ ۔ ٹی" داغا۔ اس کے موصول کنندہ اسٹیشنوں کے جال کے ذریعے سارے ملک کو تکنیکی طور پر محیط کرنا ممکن ہو گیا۔ بدقسمتی سے یہ ایک غیر محدود نعمت ثابت نہیں ہوا۔ یہ سچ ہے کہ تمام ملک میں تقریباً ۲ ایسے اسٹیشن قائم ہو گئے ہیں جن میں بعض نہایت دُور افتادہ علاقوں میں واقع ہیں۔ لیکن زیادہ نکتہ چینی اس امر پر ہو رہی ہے کہ ٹکنیکیا لوجی میں اس لمبی چھلانگ سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے ساف ٹ ویر کو فروغ نہیں دیا گیا۔ یہاں کوئی بھی محسوس کرتا ہے کہ سائٹ تجربے سے جو بعض نکات پیدا ہوئے تھے انھیں فراموش کر دیا گیا ہے۔ ایک اہم نکتہ ہے تماشائیوں کے لیے علاقائی ثقافت کی علاقوں سے بے پناہ یگانگت کا احساس۔ چونکہ ان بیشتر مقامات پر دلی سے پروگرام بھیجے ہیں اس لیے علاقائی ثقافتوں کو نظرانداز کرنے کے بارے میں شدید ردّعمل ہو رہا ہے۔ شاید ریلے اسٹیشنوں کی توسیع کے ساتھ ساتھ کم از کم چند اہم علاقائی پروڈکشن سینٹر قائم ہونے چاہیئے تھے۔ صورت حال کا نہایت افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ زیادہ تر توسیع اُس وقت عمل میں آئی جب ماہر عمرانیات ترمایی سی جوشی کی صدارت میں ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی اپنی سفارشات پیش کر چکی تھی جو ایسی توسیع کے خیال کے خلاف تھی۔ لیکن بیتی بات پر رونے دھونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ابھی اب کم از کم غلطیوں کو دُرست کرنا چاہیئے جن سے بھارت میں ٹیلی ویژن کا نظام واقعی عوامی رابطے کا ایک بامعنی میڈیم بن جائے۔

ملک میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن براڈ کاسٹنگ کی تنظیم سے متعلق بڑی نکتہ چینی مرکزی حکومت کی اجارہ داری پر کی جارہی ہے جہاں تک ذرائع [illegible] مسئلہ ما پر کنٹرول کا تعلق ہے [illegible] اگر کوئی اُسے اگر تسلیم بھی کرلے [illegible] جانے تو اُسے پرائیویٹ [illegible] کے بعض متبادل کے طور پر قبول [illegible] حالات محتاط رہنا چاہیے۔ جیسا [illegible] کے سلسلے میں بتایا گیا ہے۔ ان نئی ٹیلی [illegible] پر آنے [illegible] لاگت سے یہ [illegible] کیا ہے [illegible] میڈیا کو کھا [illegible] مالی اخراجات [illegible] لایا جائے۔ یہ [illegible] کمائیوں [illegible] [illegible] [illegible] میں ہیں [illegible] جمہوری سماج میں [illegible] متبادل [illegible] کی ملکیت کو اس [illegible] کیا جائے کہ وہ وقت کی حکومت اور [illegible] خصوصی سے آزاد ہوں۔ [illegible] [illegible] آئندہ ایک [illegible] پوری توجہ کا سوال بن جائے۔ ●

بقیہ ہندوستانی زراعت

[illegible] ذخیرہ [illegible] اور غذائی مصنوعات تیار کرنے والی صنعتوں کی ترقی کی اہمیت کو مدنظر رکھا جائے تو فصل کے بعد کی کم خرچ ٹیکنالوجی تیار کرنے پر اور زیادہ زور دینا ہوگا۔

توانائی میں سرمایہ کاری میں کفایت

موجودہ زراعت انتہائی پیداوار ہے لیکن اس کے ساتھ ہی [illegible] توانائی اور زراعت کے کام آنے والی اشیاء کی بھی بہت ضرورت رہتی ہے۔ اس لیے زراعت میں بالواسطہ یا بلاواسطہ روایتی یا غیر روایتی توانائی کے استعمال [illegible] [illegible] کی کوشش کی جانی چاہیئے۔

[illegible] اور اقتصادیات میں ایک نیا امتزاج پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ معیار زندگی میں [illegible] اور [illegible] کے توازن کو برقرار رکھا جا سکے۔

چنانچہ فصلوں کی ایسی نئی اقسام کی ضرورت ہے جو [illegible] اور [illegible] مکوڑوں کا مقابلہ [illegible] کر سکیں اور ان کی تیار ہونے کی [illegible] کم ہو اور [illegible] غیر رسمی حالات والے علاقوں میں ایک سے زیادہ فصل اگانے کے نظام میں مدغم کیا جا سکے۔ [illegible] میں [illegible] کی مقدار والے جینس شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی [illegible] فصلوں میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ایک [illegible] اور [illegible] علم میں جو دلچسپ تحقیق ہو رہی ہے اُس سے مذکورہ بالا مقاصد حاصل [illegible] پیدا ہوئی [illegible] علاقوں میں کچھ برسوں کی [illegible] کے باوجود مسلسل ترقی کر رہی ہے۔

اس میں آگے چھلانگ اسی صورت میں لگائی جا سکتی ہے، اگر افرادی مادی اور وسیلوں کو وسیع پیمانے پر متحرک کیا جائے۔ تحقیق کے عمل کی تنظیم کو توسیع اور اشیائے ضروریہ کی فراہمی کے [illegible] عوام [illegible] کرنی ضروری ہے کہ وہ اپنی پیداوار میں اضافہ کو برقرار رکھیں [illegible] اس طرح [illegible] کی [illegible] [illegible] کو ملت کا [illegible] ●

ایس سی بھٹ

میڈیا — ملے جلے منظر کی عکاسی

مصنف نے جو میڈیا میں اعلیٰ پوزیشن پر رہ چکے ہیں پریس کے کردار، فلموں کی کامیابیوں اور آل انڈیا ریڈیو اور دُور درشن کی تیز تر ترقیوں کے بارے میں ذیل کا مضمون سپردِ قلم کیا ہے جس میں زیادہ تر عرصہ مابعد آزادی کی سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ انھوں نے تحقیقی صحافت کی بعض خامیوں کے خلاف انتباہ کیا ہے لیکن اس پختہ رائے کا اظہار کیا ہے کہ آزاد پریس کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے تنقید کے حق کا استعمال کرے۔ اُن کے خیال میں گزشتہ چالیس برس میں میڈیا کے محاذ پر بڑی ترقی ہوئی ہے تاہم اُن کی رائے ہے کہ فلمسازوں کے لیے رہبرانہ خطوط وضع کرنے سے تخلیقی پسندی کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ سماج جس صورت میں ہے میڈیا محض اس کی عکاسی ہی کر سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں کیوں ملے جُلے منظر کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ (ایڈیٹر)

اُس تاریخی نصف شب سے جب آزادی کی دیوی نے بھارت میں قدم رکھا تھا اور تقدیر سے ہمکنار ہونے کا خواب "بہت حد تک" پورا ہو گیا تھا میڈیا (اخبارات، فلمیں اور ریڈیو وغیرہ) ہمیشہ ایک وفا شعار بیوی کی مانند حکومت کے ساتھ رہا ہے۔ درحقیقت تحریکِ آزادی کے رہنما ترسیلِ روابط وسائل کے اُستاد تھے اور عوام کو آزادی کی منزل تک لے جانے میں میڈیا کے اہم رول کو بخوبی سمجھتے تھے۔ ریڈیو کا دائرہ کار بہت محدود تھا اور وہ تحریکِ آزادی کی پہنچ کے باہر تھا اور جہاں تک فلموں کا تعلق تھا اُس پر بہت سخت سنسر لگا ہوا تھا صرف پریس دستیاب تھا، وہ بھی اُس کا ایک حصہ لیکن ان رہنماؤں نے اُس کے ساتھ ساتھ پبلک پلیٹ فارم اور دیگر بیشتر فورموں کا جن سے تحریکِ آزادی کا کام لیا جاتا تھا بخوبی استعمال کر کے بھارت کے کونے کونے میں قومی بیداری، اتحاد و دوستی اور قومی خود داری کا پیغام پہنچایا۔ بلاشبہ اس سلسلے میں دیواروں اور گلی محلوں کے بورڈوں پر تحریروں سے بھی کام لیا گیا۔

برسیاں اور سالگرہیں ایک معمول اور رسمی تقریب ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ ہمیں اُن تبدیلیوں کا جائزہ لینے میں مدد دے سکتی ہیں (اگر ہم ایمانداری سے کوشش کریں)، جو قصداً پیدا کی گئی ہیں، جن میں سے بعض آہستہ آہستہ اور بتدریج سماج میں داخل ہو گئی ہیں اور بعض ایسی ہیں جو ہم پر جبراً لاد دی گئی ہیں۔ ان چالیس برسوں میں ٹیکنالوجی میں بہت بڑی تبدیلی آئی ہے اور بعض میڈیا، مثال کے طور پر ٹیلی ویژن تو جو اُن دنوں موجود نہیں تھا دھماکے کے ساتھ منظر پر آگیا ہے اور اُس نے ہمیں تقریباً دم بخود کر دیا ہے۔ میڈیا زیادہ تر اُس کی عکاسی کرتا ہے جو کچھ ہو رہا ہے اور وہ واقعات کی روش پر اثر انداز ہونے کا ذریعہ نہیں بنتا جیسا کہ بعض میڈیا والے اور دیگر لوگ خواہ مخواہ اُمید کرتے ہیں۔ اب ہم ایک لیڈر کی شبیہ بنانے کی بات کرتے ہیں اور عوام کو یہ بتانے اور سمجھانے کی کوشش نہیں کرتے کہ وہ کون سے خیالوں اور آدرشوں کی نمائندگی کرتا ہے اور انھیں عمل میں لانے کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے اور کیونکر کوشاں ہے۔

ملے جلے منظر کا ظہور

ملک کے باہر تبدیلی کی ہوائیں آرہی ہیں۔
بعض تو دور افتادہ ممالک سے آرہی ہیں اور
لوگوں کو زیادہ چٹپٹی، سنسنی خیز، اور رنگین خبروں
کی بھوک رہتی ہے۔ میڈیا بدلتے ہوئے ذوق
سے مطابقت پیدا کرنے اور اُسے پورا کرنے کے
لیے سخت کوشش کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی
رجعت پسندی اور بنیاد پرستی کی وہ قوتیں بھی سرگرم
کار ہیں جو ہمیں کئی دہائیاں پیچھے لے جانا چاہتی
ہیں۔ گاندھی ازم کی جڑیں بھی بیشتر ذہنوں پر اپنا

آج کا منظر ملا جلا ہے۔ ہمارے لیے یہ قلمبند کرنا
بھی ضروری ہے کہ میڈیا نے کئی لحاظ سے قابل ذکر
کامیابیاں حاصل کی ہیں اور وہ نئی بلندیوں پر پہنچا
ہے۔ آج اخبارات کئی گنا بڑھ گئے ہیں اور اُن کی
اشاعت میں بھاری اضافہ ہوا ہے۔ بھارتی زبانوں
کی صحافت میں پختگی آچکی ہے۔ اب پریس اس
امر پر مطمئن نہیں ہوتا کہ جو اُسے سرکاری طور پر دیا
جائے وہ اُسے ناظرین تک پہنچا دے بلکہ وہ
حقائق کی جانچ کرنے، تحقیقات کرنے اور صداقت
کی اس کی گوناگوں صورتوں میں کھوج کرنے کا آرزو
مند ہے۔

ریڈیو کا رول اب ٹی۔ وی نے لے لیا ہے جو اس
وسیع اور گوناگوں سرزمین کے دور افتادہ اور ناقابل
رسائی حصوں میں پہونچ رہا ہے۔ فیچر فلموں کے
ساتھ دونوں الیکٹرانک میڈیا نے ملک کے مختلف
حصوں اور علاقوں کو جوڑنے اور بھارتییا
(ہندوستانیت) کی تصویر پیش کرنے میں کوئی ادنیٰ
رول ادا نہیں کیا۔ شہروں کی خوشحالی اور دیہات کی
قناعت پسندی کی غیر حقیقی اور غیر وجودی متعدد
تصویروں کے ساتھ ساتھ فلموں نے خاص طور پر
ہماری ایک ایسی نمائندہ تصویر پیش کرنے
کی کوشش کی ہے جن سے بیشتر بھارتیوں نے خواہ
وہ کہیں بھی ہوں یگانگت پیدا کر لی ہے۔ انھوں نے

میڈیا زیادہ تر اُس کی عکاسی کرتا ہے جو کچھ ہو رہا ہے اور وہ واقعات کی
روش پر اثر انداز ہونے کا ذریعہ نہیں بنتا جیسا کہ بعض میڈیا والے اور دیگر لوگ
خواہ مخواہ اُمید کرتے ہیں۔ اب ہم ایک لیڈر کی "شبیہ بنانے" کی بات کرتے ہیں
اور عوام کو یہ بتانے اور سمجھانے کی کوشش نہیں کرتے کہ وہ کون سے خیالوں اور
آدرشوں کی نمائندگی کرتا ہے اور انھیں عمل میں لانے کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے
اور کیونکر کوشاں ہے۔

دباؤ جما رہی ہیں اور ہم قدرے عینیت پسندی
(آدرش واد) اور زیادہ تر مادہ پرستی کے اس
ملے جلے منظر کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور متعدد انتشار
پسند قوتیں ہماری توجہ کھینچنے کے لیے نبرد آزما ہیں۔
اگر ۱۹۴۷ء میں یہ مسئلہ حل شدہ اور مقاصد واضح
اور قابل حصول نظر آتے تھے تو آج تصویر قدرے
دھندلی دکھائی دیتی ہے اور وہ عناصر نظر نہیں آتے
جو اتحاد و ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔
ہم جو کچھ ہیں میڈیا اُس کی محض عکاسی
ہی کر سکتا ہے اور چنانچہ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ

اسی طرح ریڈیو ملک کے دور ترین کونوں
میں پہنچ چکا ہے۔ اور وہ نہ صرف قومی ترقی کا پیغام
عوام تک پہنچانے میں مدد دے رہا ہے۔ بلکہ
ہماری ثقافتی زندگی، خصوصاً سنگیت کی شاندار
روایات کو بھی مالا مال کر رہا ہے اور اُس نے
بحران اور دکھ کی گھڑیوں میں ہمیں تھام رکھا ہے،
جیسا کہ راشٹر پتا کی شہادت کے موقعہ پر اُس
نے میلول ڈی میلو کی طرف سے آنکھوں دیکھا حال
نشر کر کے ڈھارس دی تھی۔

جس آسان فہم زبان کا استعمال اور پرچار کیا ہے
اُس نے نہ صرف مختلف زبانوں کی قوم کو متحد
رکھنے میں ایک رابطہ کی زبان کو فروغ دینے بلکہ قومی
اتحاد کی جڑوں کو مضبوط بنانے میں بھی مدد دی ہے۔
اس قدر بوسیدہ اور "باکس آفس" والی ہلکی
معیاری فلموں کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل پیش کرنے والی غیر فنی خوبیاں
اور حقیقت نگاری کی سوالی بھی کئی فلمیں تیار کی گئی ہیں۔
بھارتی سینما دیگر بیشتر باتوں کی مانند ایک ملا جلا

سطر پیش کرتا ہے۔

اشاعت میں غیر معمولی اضافہ

قطعی ماڈل ... سے ... ترقی ... اچھی
ہے کہ ہمارا ملک ... ہے ... کافی
ہے ۔ ۱۹۶۳ء میں اخبارات کی تعداد ...
تا ... ان اعداد ... ۵۱ - ۲ تھی جس
سے ظاہر ہوتا تھا کہ چند برسوں کو چھوڑ کر تمام
برسوں میں تدریجی اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اسی طرح

تقریباً ۱۶ ر افراد کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ پھر بھارتی
زبانوں کے اخبارات نے قابلِ ذکر ترقی کی ہے۔
انگریزی اور ۱۵ بھارتی زبانوں کے علاوہ
اخبارات ۵۷ دیگر زبانوں میں شائع ہو رہے ہیں۔
(ان میں چند غیر ملکی زبانیں بھی ہیں) ان سے ان
زبانوں کی کل تعداد ۹۱ تک پہونچ جاتی ہے۔ یہ تسلیم
کیا جاتا ہے کہ چھوٹی زبانوں اور بولیوں کے اخبارات
میں ترقی کم ہوئی ہے لیکن یہ بات قدرے قابلِ
غور ہے کہ اس دور افتادہ قبائلی زبانوں میں بھی

انڈیا ریڈیو کو صاف صاف سن سکتے تھے۔ اب آل
انڈیا ریڈیو کو فخر ہے کہ اس کے ۹۳ اسٹیشن
ہیں۔ ۱۲۳ ایم ڈبلیو ٹرانسمیٹر ہیں جن کی کل بجلی کی قوت
۵۴۴ کے ڈبلیو کی ہے۔ ۳۵ ایس ڈبلیو ٹرانسمیٹر
ہیں جن میں سے ۲ کی کل بجلی کی قوت ۷۲۰ کے ڈبلیو ہے اور چار
ایف ایم ٹرانسمیٹر ہیں جن کی کل بجلی کی قوت ۶۰ کے ڈبلیو
کی ہے۔ اب ۸۶ فیصد علاقے تک ان کی نشریات
ہوتی ہیں اور ان میں اچھی آواز میں سننے والوں کی
تعداد اب ۹۵ فیصد ہو گئی ہے۔
دور درشن کو ایک لمبے عرصے تک صوتی

شہروں کی خوش حالی اور دیہات کی قناعت پسندی کی غیر حقیقی اور غیر موجود منفرد تصویروں کے ساتھ ساتھ فلموں نے خاص طور پر ہماری ایک ایسی قسم کی نمائندہ تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے بیشتر بھارتیوں نے خواہ وہ کہیں بھی ہوں یگانگت پیدا کر لی ہے۔

ان کی اشاعت میں بھی چند برسوں کے سوا ...
اضافہ ہوتا رہا ہے اور ۵۵ ... لاکھ تک پہنچ
گئی تھی۔ ان میں روزنامے جو عوام تک قوم اور دنیا
کی تازہ ترین خبریں پہونچاتے ہیں ان کی اشاعت
ایک کروڑ ۷۶ لاکھ تھی اور شائع ہونے والے روزناموں
کی تعداد ۱۳۲۳ تھی۔ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۸۳ء کے درمیان
تمام زبانوں میں روزناموں کی اشاعت میں ۲ فیصد
تک کا اضافہ ہوا۔
اور تاہم اس وسیع اشاعت کو ملحوظِ خاطر رکھا
جائے تو اس کا مطلب ہے کہ ایک روزنامہ ۴۰
اشخاص کے لئے ہے اور تمام اخبارات کو ملحوظِ خاطر رکھا
جائے تو ایک اخبار ... سے ... ہر
۱۴ افراد کے لیے ہے۔ اگر ان افراد کو چھوڑ بھی دیا
جائے جو لکھ اور پڑھ نہیں سکتے تو ہمارا ایک اخبار

اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ اشاعت کے لحاظ
سے پہلے تین مقام ہندی، انگریزی اور ملیالم کو حاصل تھے۔
جب بھارت آزاد ہوا تو آل انڈیا ریڈیو
کے محض چھ اسٹیشن تھے جو دلی، بمبئی، کلکتہ،
مدراس، لکھنؤ اور ترچنا پلی میں واقع تھے۔
میں دیگر اسٹیشن لاہور، پشاور اور ڈھاکہ میں
تھے جو پاکستان کو مل گئے تھے۔ تب آل انڈیا
ریڈیو کے پاس صرف چھ میڈیم ویو اور ۱۲
شارٹ ویو ٹرانسمیٹر تھے جن کے ساتھ ہی بجلی
کی کل پیداوار میڈیم ویو کے لیے ۲۵ ر ۲۳
کے ڈبلیو اور شارٹ ویو کے لیے ۱۳ کے ڈبلیو
تھی صرف ۱۱ فیصد بھارتی ہی ایسے علاقوں
میں جو ملک کے کل علاقے کا ۵ ر ۲ تھا آل

نشریات کی ایک کمزور کڑی کے طور پر دیکھا جاتا
تھا جبکہ جولائی ۱۹۸۳ء میں ایک بڑا توسیعی
پروگرام سُرعت کے ساتھ شروع کیا گیا جو نومبر
۱۹۸۴ء تک مکمل ہو گیا۔ دنیا میں کہیں بھی ٹی۔ وی
کی اتنی کم مدت میں اتنی بڑی توسیع نہیں ہوئی کہ
اس کے اسٹیشنوں کی تعداد ۴۵ سے ۱۸۰ تک
پہونچ گئی۔ اب دوردرشن کے ۱۹۲ مرکز ہیں جن میں
ریوات بھاٹا (راجستھان) میں ایک شمسی دور افتادہ
مرکز ہے جو کسی انسان کے بغیر کام کر رہا ہے۔ یہ
بھارتی ٹی۔ وی کے لیے ایک بے مثل امتیازی پوزیشن
ہے۔ یہ میڈیم قدرے تاخیر کے ساتھ ستمبر ۱۹۵۹ء
میں بھارتی منظر پہ آیا۔ اور آل انڈیا ریڈیو کے

حصے کے طور پر اس کی نشوونما ہوئی اور پھر ۱۹۷۶ء میں وہ اس سے کٹ گیا۔ چنانچہ ان تین برسوں میں دوردرشن نے بڑی ترقی کی ہے۔ اب تقریباً ۷۰ فیصد عوام تک اس کے پروگرام پہونچ رہے ہیں۔

علاقائی فلموں کی مقبولیت

فیچر فلموں کے معاملے میں بھارت کا ریکارڈ قابلِ فخر ہوچکا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں یہاں بنائی گئی فلموں کی کُل تعداد ۲۱۹ تھی۔ یہ سال بہ سال بڑھتی گئی حتیٰ کہ ۱۹۸۵ء میں بھارت میں ۹۱۲ فلمیں تیار کی جارہی تھیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ جبکہ ۱۹۵۱ء میں ہندی فلمیں جن کی تعداد ۱۰۰ تھی منظر پر چھائی ہوئی تھیں ۱۹۸۵ء میں ان کی تعداد ۱۸۷ تک پہونچ گئی لیکن ان کے مقابلے میں تیلگو میں ۱۹۸، اور تامل میں ۱۹۰ فلمیں بنائی گئیں۔ جس امر کو غلطی سے علاقائی سنیما کا نام دیا جاتا ہے اُس کی شاندار ترقی بھارتی فلم صنعت کے فروغ کا ایک غالب پہلو تھا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۹۸۵ء میں ملیالم میں ۱۳۷، کنڑ میں ۶۹، بنگالی میں ۴۸، گجراتی میں ۳۲، اُڑیہ میں ۱۷، مراٹھی میں ۱۶، اور آسامی میں ۱۰ فلمیں تیار کی گئیں۔ عمدگی کے لحاظ سے "علاقائی" فلموں کا ریکارڈ اس سے بھی زیادہ شاندار تھا جبکہ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۸۵ء کے درمیان راشٹرپتی کا گولڈ میڈل حاصل کرنے والی کُل ۴۲ فلموں میں سے ۲۳ ہندی کے سوائے دیگر زبانوں کی فلمیں تھیں۔

بھارت کو اس امر کا امتیاز حاصل ہے کہ وہ ناٹکوں، گیتوں، بھگتی سنگیت، رقص، داستانوں اور عوامی تھیٹر کی مختلف صورتوں اور کٹ پتلیوں کے وسیع امکانات سے فائدہ اٹھا کر انھیں ملک کی جدید کاری، قومی اتحاد اور سماجی و اقتصادی ترقی کے پیغام کے ذریعہ کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ اطلاعاتی فلموں کو دیہی اور قبائلی علاقوں میں عوام تک پہونچنے کے ذریعہ کے طور پر بروئے کار لایا گیا ہے اور اس طرح تعلیمی موضوعات اور سماجی و اقتصادی ترقی کے موضوعات سے متعلق نمائشوں کا انعقاد کیا گیا ہے۔ درحقیقت میڈیا کے تجربات کی کوئی کمی نہیں ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کو خصوصاً چھپائی کے میڈیم میں بھی سمویا گیا ہے جہاں اخباری صنعت اور کتابوں اور "جاب" کے چھپائی یونٹ اس شعبے میں تیز رفتار ترقی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہے ہیں۔ عمدگی کو پروان چڑھایا گیا ہے اور اگرچہ قسم اور مقدار کے لحاظ سے اخباری کاغذ کی قلت ایک دیرینہ مسئلہ بن گئی ہے تاہم روزنامہ اخبارات اور رسائل نے وقت کے چیلنج کا بخوبی جواب دیا ہے۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ٹیکنالوجی اور ذہنی رسائی اور سماجی و اقتصادی نظریے میں جو اس اہم میڈیا کے عمل پر اثرانداز ہوتے ہیں آزادیِ عمل کی گنجائش کی بڑی ضرورت ہے۔ تاہم پریس عام طور پر ذمہ دار اور قابلِ تعریف حد تک آزاد بھی رہا ہے لیکن بعض اوقات اُس کی آزادی کو چنوتیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن میں سے کچھ تو خود پریس کے اندر ہی سے پیدا ہوتی ہیں جیسے اُن لیکچروں کے سلسلے کا تو کوئی اختتام ہی نہیں جو برسرِاقتدار اور اقتدار سے معزول سیاستدانوں کی طرف سے اخبارات اور صحافیوں کو اُن کی ذمہ داری کے بارے میں رات دن گھوٹ گھوٹ کر پلائے جاتے ہیں۔ اخبارات کو تنقید کرنے اور حتیٰ کہ مخالفانہ پوزیشن اختیار کرنے کا جو حق ہے اور بلاشبہ اُس کا یہ جو فرض ہے اُس کے تئیں اُن میں رواداری نہیں پائی جاتی اور بہت زیادہ زودحسی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

پریس کا رول

خود پریس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی بعض خصوصی باتوں پر ایک قریبی نظر ڈالے۔ سنسنی خیز باتیں اور عارضی طور پر چونکا دینے والے مواد شائع کرنے کے اکثر واقعات کی اہمیت کا جائزہ لینے میں غلطی ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے ہی کہ کسی سیاست داں نے کوئی اہم کام کیا ہو اُس کے بارے میں لکھا جاتا ہے انٹرویو لیا جاتا ہے اور اُسے ایک شخصیت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جیسے کہ اُس

تحقیقی صحافت کے نام پر بعض اوقات ایسے ذرائع کا حوالہ دیا جاتا ہے جو گمنام رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں لیکن نہایت اشتعال انگیز خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ خطرہ اس بات میں ہے کہ سطحی بات کو گہری اور ممکنہ رائے کے طور پر پیش کرنے کی غلطی کی جاتی ہے۔

سیاستدان کے بارے میں جیسے ۱۹۸۶ء میں
روزنامہ اور ہفتہ وار اخبارات میں زیادہ سے زیادہ
پبلسٹی دی گئی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ جب
اُسے پہلے انتخابی مقابلے کا سامنا کرنا پڑا تو اس
کی نئی نئی پارٹی ایک بھی نشست حاصل نہ کر سکی۔
تحقیقی صحافت کے نام پر بعض اوقات ایسے
ذرائع کا حوالہ دیا جاتا ہے جو گمنام رہنا زیادہ

تنقید کرنے اور بعض اوقات غلطیاں کرنے کا
حق حاصل ہے۔ بعض لیجسلیچروں کی طرف سے پریس
کے لیے قوانین بنانے کا رجحان اس میڈیم اور ملک
کے لیے حقیقی خطرے کا مظہر ہے۔ بڑے بڑے
تجارتی گھرانوں کی طرف سے جن کے تجارت و صنعت
میں وسیع مفادات ہیں اس پر کنٹرول ایک اور
سنگین خامی ہے۔
جہاں تک الیکٹرانک میڈیا کا تعلق ہے گزشتہ

آئے گا۔ لیکن الیکٹرانک میڈیا میں رکاوٹوں کا
ایک پورا سلسلہ پایا جاتا ہے اور کلیدی شعبوں
رشتاں کے طور پر خبروں اور حالاتِ حاضرہ) میں انھیں
روزانہ جس قدر مداخلتوں کو برداشت کرنا پڑتا
ہے وہ دیکھتے ہی بنتا ہے۔
اس کے نتیجے میں انھیں اپنی ملازمت یا عزت
سے ہاتھ دھونے کا ڈر رہتا ہے جس سے کام کاج
کا معیار پست ہو جاتا ہے اور اصولوں میں گراوٹ
آجاتی ہے جس سے ہر کوئی ناخوش رہتا ہے۔ ستم

جب تک ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں کام کرنے والے مرد اور عورتوں کو اپنے دائرہ کار اور پالیسی کے واضح رہبرانہ خطوط کے اندر آزادی نہیں ہوگی اُن کی کارگردگی میں رکاوٹ آئے گی اور اُن کے تخلیقی کام میں نکھار نہیں آئے گا۔

نام نہاد تعلیمی پروگرام، چند اچھے پروگراموں کے سوائے، ناخوشگوار حد تک پھیکے اور غیر دلچسپ ہوتے ہیں۔ ایسے پروگراموں کو وضع کرنے میں ایک طے شدہ فارمولا اختیار کیا جاتا ہے اور اس مقولے کو نظر انداز کیا جاتا ہے کہ کسی بھی بات کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

اشتعال انگیز خیالات
پسند کرتے ہیں لیکن سیاست
کا اظہار کرتے ہیں۔ خطرہ اس بات میں ہے کہ سطحی
بات کو گہری اور ممکنہ رائے کے طور پر پیش کرنے کی
غلطی کی جاتی ہے۔
لیکن پریس اپنی بعض غلطیوں کو درست
کرنے کی امکانی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ سیاستدان
ہیں جن میں سے بعض قوت برداشت اور صبر و تحمل
سے عاری ہوتے ہیں۔ جنھیں یہ احساس کرنا ہوگا
کہ ایک آزاد پریس کو اپنی نشو و نما کے لیے

کے مسئلہ کو حل کرنے
چالیس برس میں اُس آزادی
میں اندر نہیں ملی جو انھیں نہ صرف اپنی روز مرہ کی
سرگرمیوں کو انجام دینے بلکہ تخلیقی سرگرمیوں کے لیے
بھی ہونی چاہیئے۔ یہ بات غلط نہیں ہے کہ جب تک
ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں کام کرنے والے مرد اور عورتوں
کو اپنے دائرہ کار اور پالیسی کے واضح رہبرانہ
خطوط کے اندر آزادی نہیں ہوگی اُن کی کارکردگی میں
رکاوٹ آئے گی اور اُن کے تخلیقی کام میں نکھار نہیں

ظریفی یہ ہے کہ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کا
رکاوٹوں کی تجویز کرنے میں پہلا مقام ہوتا ہے۔

تفریح پر زور
ٹیلی ویژن کے تیز رفتار وسعت پذیر اور غالب میڈیا" جس میں
کمرشیلائزیشن بڑھ رہی ہے اور تفریح پر زور دیا
جا رہا ہے۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ

ٹیلی ویژن ہماری پردہ داری پر زیادہ سے زیادہ حملہ کرے گا اور ہماری سماجی عادات اور حتیٰ کہ طرزِ زندگی کو بھی نئے سانچے میں ڈھال دے گا۔

اُن حدود کے اندر جن میں عوامی رابطے کا کوئی ذریعہ (رجحانات کو بدلنے اور اُن پر اثر انداز ہونے کے معاملے میں) رہتا ہے "ٹی۔ وی" میڈیا کے حلقے اور بھارتی عوام کی زندگی میں بڑا رول ادا کرے گا۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ بہت زیادہ تاخیر ہو جائے ہمیں اس امر پر متفق ہونا چاہیے کہ یہ سماعی و بصری میڈیم کس حد تک تفریحی پروگرام پیش کرے اور وہ عوامی پیغام رسانی کے کسی بھی میڈیم کے دو اجزا ___ تعلیم اور اطلاعات پر حاوی ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو چھپانا نہیں چاہیئے اور اس صداقت کا سامنا کیا جانا ضروری ہے کہ ٹیلی ویژن دیکھنے والے خواہ اُن کا تعلق شہری یا دیہی علاقوں سے ہو بہت بھاری تعداد میں تفریحی پروگراموں کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ نام نہاد تعلیمی پروگرام، چند اچھے پروگراموں کے سوائے، ناخوشگوار حد تک پھیکے اور غیر دلچسپ ہوتے ہیں! ایسے پروگراموں کو وضع کرنے میں ایک طے شدہ فارمولا اختیار کیا جاتا ہے۔ اور اس مقولے کو نظر انداز کیا جاتا ہے کہ کسی بھی بات کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ جس متوازن دستورِ کار کی ضرورت ہے وہ ہے ترجیحات' مختلف پروگراموں کے تقابلی جُزو اور ان کی پیش کش کا تعین کرنا۔

اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ گزشتہ چالیس برس میں قوم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھی رہی اور میڈیا کے محاذ پر کافی ترقی ہوئی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ کامیابیاں حاصل ہو سکتی تھیں اور ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ ہم نے قابلِ احتراز اختلافات اور تنازعات میں کافی وقت کھویا ہے اور بیشتر توانائی ضائع کی ہے اور حل تلاشوں کے لیے راہِ عمل وضع کرنے سے متعلق ہمارا رجحان ہمارے لیے بہت مہنگا ثابت ہوا ہے۔ ●

بقیہ: بھارتی معیشت کے چالیس سال

کام نہیں لیا جا سکا اور کارگزاری بہت کم رہی۔

غریبی:

ملک میں غریبی مسلسل سماج کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے، معیشت کی شرحِ ترقی پر یہ بوجھ بن گئی ہے۔ اس وقت ۲۷ کروڑ افراد خطِ افلاس سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں، ہم یہ جانتے ہیں کہ غریب کون ہیں' وہ کہاں رہتے ہیں اور وہ کیا کرتے ہیں، لیکن غریبی کے مسئلے کے حقائق کو سمجھنے کے لیے ہم نے محض اعداد و شمار کا سہارا لیا ہے' اس کا ایک بڑا سبب بے روزگاری ہے' یا یہ کہ کام کرنے والوں کی اُجرتیں بہت کم ہیں۔ حالانکہ بحساب فی کس فی دن روزگار کے مواقع بڑھتے نظر آتے ہیں لیکن کام مانگنے والے مزدوروں کی تعداد ان کے مقابلے کہیں زیادہ ہے' لہٰذا مواقع میں اضافہ بے سود ہو کر رہ جاتا ہے' اکثریت اُن لوگوں کی ہے جن کی آمدنی غیر لچکدار ہے' اس لیے وہ منڈی کی دسترس سے باہر رہتے ہیں۔ ان کے لیے منڈی تنگ ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ترقی نہیں کر پاتے۔ غریبی کا دوسرا بڑا سبب اثاثہ جات سے محرومی ہے۔

نابرابری:

سماج دو حصوں میں بٹا ہے' سماج کے چند مُٹھی بھر لوگ وہ ہیں' جو اراضی کے مالک ہیں جن کے پاس مینوفیکچرنگ کی صنعتیں ہیں۔ تجارت پر وہ قابض ہیں، شہروں میں بڑے بڑے مکانات اُن کے ہیں' ان کے پاس بڑے اثاثہ جات ہیں، جبکہ سماج کا ایک بڑا طبقہ ان تمام اثاثہ جات سے محروم ہے یا اس کے پاس برائے نام اثاثہ جات ہیں' ریزرو بنک آف انڈیا کے سروے میں کہا گیا ہے کہ دیہی علاقوں میں کم ترین ۳۰ فیصد لوگ وہ ہیں' جن کے پاس ۱۹۶۱ء میں تمام دیہی اثاثہ جات کے ۲.۵ فیصد کی ملکیت تھی جو گھٹ کر ۱۹۷۱ء میں دو فیصد رہ گئی' جبکہ اسی عرصے میں اعلیٰ ترین ۳۰ فیصد وہ لوگ ہیں جن کی ملکیت کا تناسب اس عرصے میں ۷۹ فیصد سے بڑھ کر ۸۱.۹ فیصد ہو گیا۔ شہری اور صنعتی اثاثہ جات میں بھی اسی طرح کی نابرابری دیکھنے کو ملتی ہے' اس کا مطلب یہ ہوا کہ اکیسویں صدی میں قدم رکھتے وقت بھلے ہی غریبی دُور کرنے کی بات کہدی جائے' (جو کہ منصوبہ بندی کے مقاصد میں سے ایک ہے) تاہم ہمارا سماجی ڈھانچہ پھر بھی اقتصادی نابرابریوں سے بھرا ہوا ملے گا۔ ملک کے بڑے طبقے کی اثاثہ جات سے محرومی ایک ایسا اہم مسئلہ ہے جس کا حل کرنا بہت ضروری ہے اس کے بغیر معیشت ترقی کی راہ پر آگے نہیں بڑھ سکتی، آئندہ ۴۰ برسوں میں معیشت کو ترقی پذیر اور مستحکم بنانے کے لیے اس پہلو پر غور کرنا بیحد ضروری ہے۔ ●

ہم ایک رہیں گے

محبوب راہی : بارسی ٹاکلی، آکولہ - ۴۴۴۴۰۱

سکھ مل کے اٹھائیں گے تو دُکھ مِل کے سہیں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

ہر تفرقۂ مذہب و ملّت کو مِٹا کر   یکجہتی کا ہر شخص کو پیغام سُنا کر
پیار اور اخوت کے حسیں پھول کھلا کر   چاہت کی مہکتی ہوئی خوشبو سے بسا کر
بھارت کی فضائیں یونہی مہکاتے رہیں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

قطرات جو یکجا ہوں تو بنتا ہے سمندر   بن جاتی ہے دیوار جو مِل جاتے ہیں پتھر
افراد اکٹھا ہوں تو بن جاتا ہے لشکر   یکجہتی سے قوموں کا سنورنا ہے مقدّر
ہم راہِ ترقی پہ سب اک ساتھ بڑھیں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

شعلوں سے مسائل کے گزرنا ہے ہمیں کو   اس آگ میں تپ تپ کے نکھرنا ہے ہمیں کو
اک قوتِ نو بن کے اُبھرنا ہے ہمیں کو   کرنا ہے جو کچھ کام تو کرنا ہے ہمیں کو
ہم ہر رہِ پُرخار پہ ہنس ہنس کے چلیں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

ہم اپنے پرائے کے سبھی فرق مٹائیں   اخلاص و محبت سے گلے سب کو لگائیں
بھارت سے اب افلاس و جہالت کو بھگائیں   خود آگے بڑھیں دیس کی توقیر بڑھائیں
دنیا سے کسی بات میں پیچھے نہ رہیں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

پیغام یہی دیتی ہے بہتے ہوئے گنگا   لہراتا ہوا درس یہ دیتا ہے ترنگا
آپس میں نہ ہو اہلِ وطن کے کوئی دنگا   بھوکا رہے بھارت میں نہ کوئی رہے ننگا
پیغامِ مساوات کو اب عام کریں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

شہروں کے یہ باشندے یہ ملبوس سجیلے   دیہاتوں کے باسی یہ بدن ان کے گٹھیلے
یہ دھرم یہ ذاتیں یہ مذاہب یہ قبیلے   گلدستۂ بھارت کے یہ سب پھول رنگیلے
ان پھولوں کو ہم یونہی تر و تازہ رکھیں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

ہے پھوٹ کا بس ایک ہی انجام تباہی   تاریخ بھی اس بات کی دیتی ہے گواہی
ہر راہ میں ہر موڑ پہ ہر اک گام پہ راہی   ہم دیش کے باہمت و جانباز سپاہی
مل جُل کے جہالت سے غریبی سے لڑیں گے
ہم ایک تھے ہم ایک ہیں ہم ایک رہیں گے

رزّاق دلے کھولا اورنگے [illegible] مڈل اسکول کھولاپور
مقام پوسٹ کھولاپور ۴۴۴۶۰۲ ضلع امراؤتی (مہاراشٹر)

اخوت سے آراستہ سلسلے ہوں
ہمالہ کے مانند بلند حوصلے ہوں
محبت کے گلشن کھلے ہی کھلے ہوں
چمن در چمن پیار کے گل کھلے ہوں

اٹھو جوشِ الفت دلوں میں ابھارو
بڑھو ایکتا سے وطن کو سنوارو

یہ مندر یہ مسجد یہ گرجا یہ دوارا
یہ گنگا کی موجیں یہ جمنا کا دھارا
ہمیں جاں سے پیارا ہے سب کچھ ہمارا
لہو دے کے سب نے وطن کو سنوارا

اٹھو جوشِ الفت دلوں میں ابھارو
بڑھو ایکتا سے وطن کو سنوارو

تھا سولی پہ چڑھنا بھی منظور ان کو
نہ بھایا غلامی کا دستور ان کو
اجل بھی نہ کر پائی مجبور ان کو
یہی شوق رکھتا تھا مسرور ان کو

اٹھو جوشِ الفت دلوں میں ابھارو
بڑھو ایکتا سے وطن کو سنوارو

یہ گوتم کا تلسی کا میرا کا آنگن
یہ ٹیگور کا روپ غالب کا درپن
یہیں سے ملا ہے ہمیں گیان کا دھن
اسی کے لیے وقف کرنا ہے جیون

اٹھو جوشِ الفت دلوں میں ابھارو
بڑھو ایکتا سے وطن کو سنوارو

فقط آج اتنی ہی خواہش ہے سب کی
یہی ایک تخلیق و سدرش ہے سب کی
اسی واسطے مل کے کاوش ہے سب کی
یہ اہلِ وطن سے گزارش ہے سب کی

اٹھو جوشِ الفت دلوں میں ابھارو
بڑھو ایکتا سے وطن کو سنوارو

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81
Vol. 7 No. 9-10

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

Special issue 1-31 August, 1987

ساتویں منصوبے کی تشکیل ماضی سے ورثے میں پائی ہوئی قوت پر ہی ہونی چاہیئے — یہ قوت عبارت ہے صنعتوں کی اعلیٰ شرح سے، سائنسی تکنیکی اور انتظامی افرادی قوت سے، خشک سالی اور بین الاقوامی انتشار سے نپٹنے کی صلاحیت سے، نیز غریب لوگوں کے مفاد کی خاطر کی جانے والی نئی نئی کوششوں سے۔

اب یہ ممکن ہے کہ سماجی انصاف کو ساتھ لے کر اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہونے والی ترقی اور نشو و نما حاصل کرنے کے مقصد کی جانب تیزی سے بڑھا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے پالیسیوں اور کارگزاریوں میں اہم تبدیلیاں درکار ہوں گی۔ پبلک سیکٹر کے لیے وسائل کو متحرک بنانے کے طریقوں میں اہم تبدیلیاں اور اصلاحات ضروری ہیں۔ اس کے ساتھ ہی صنعت، زراعت اور ٹیکنالوجی کے میدان میں درکار پالیسی سے متعلق تبدیلیاں ضروری ہیں جس سے کہ کارگزاری بہتر ہو سکے اور پیداواری صلاحیت بڑھ سکے ملکی برآمدات میں اضافہ کے لیے بھی انتظامیہ کے بنیادی ڈھانچے میں اصلاحات ضروری ہیں۔ اب زیادہ زور معیار کو اوپر اٹھانے پر دیا جاتا ہے، تعلیم کے نظام کو زیادہ موثر بنانا ہے، صحت پروگراموں کو موثر بنانا ہے اور خاندانی بہبود کے پروگراموں کو تیزی سے آگے لے جانا ہے۔

(ساتویں منصوبے کی دستاویز کا
ایک اقتباس)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadurshah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوجنا

یکم تا ۳۰ ستمبر ۱۹۸۷ء

دو روپے

بیرونی ملکی قرضے و معاشی ترقی

(فرقان قمر / ڈاکٹر عالم فاروقی)

مسلم اوقاف اور ان کا انتظام

(پرہلاد سنگھ)

غزلیں، کہانی، تبصرہ، انشائیہ اور
بہت سا دلچسپ مواد

پرمود ایس بھٹناگر

ہندوستان کاپر لمیٹڈ

آج ہندوستان کاپر لمیٹڈ ملک میں تانبہ تیار کرنے والا واحد ادارہ ہے۔ مذکورہ ادارے نے ۱۹۷۲ء میں انڈین کاپر کارپوریشن کا انتظام سنبھالا اور اس طرح ملک میں تانبے کی کان کنی کی پوری صنعت کو اپنے اختیار میں لے لیا۔ ہندوستان کاپر لمیٹڈ کے کاموں میں اب مشرقی سیکٹر میں انڈین کاپر کامپلیکس (آئی سی سی) اور راکھا کاپر کامپلیکس (آر سی سی)، مغربی سیکٹر میں کھیتری کاپر کامپلیکس (کے سی سی) چاند ماری کاپر پراجیکٹ (سی سی پی) اور دھریبا کاپر پراجیکٹ (ڈی سی پی) نیز مرکزی سیکٹر میں ملنج کھنڈ کاپر پراجیکٹ (ایم سی پی) شامل ہیں

کھیتری کاپر کامپلیکس (کے سی سی)

سب سے بڑا ہیر کان کنی اور دھات صاف کرنے کا سب سے جدید کامپلیکس ہے۔ مذکورہ کامپلیکس میں سالانہ ۲۷ لاکھ ٹن کی صلاحیت کا ایک پلانٹ ہے۔ یہ دھات پگھلانے کی ایک بھٹی اور دھات صاف کرنے کا ایک کارخانہ بھی ہے جس کی سالانہ صلاحیت ر۳۱ ٹن ہے۔ مزید برآں مذکورہ کامپلیکس میں گندھک کے تیزاب کا ایک پلانٹ، جس کی صلاحیت ۱۸۲ ٹن سالانہ ہے اور کیمیاوی کھاد تیار کرنے کا ایک پلانٹ بھی ہے جس کی صلاحیت ر۹ ٹن ہے ۵ فروری ۱۹۷۵ء کو وزیر اعظم نے کھیتری کاپر کامپلیکس میں دھات پگھلانے کی ایک تیز بھٹی کا افتتاح کیا۔ ستمبر ۱۹۸۵ء میں ۱ میگا واٹ کے دو گیس ٹربائن سٹ کی تنصیب کر کے مذکورہ پراجیکٹ کی بجلی تیار کرنے کی صلاحیت میں کافی اضافہ کیا گیا۔

چوتھے دہے کے دوران خام تانبے کی پیداوار ۵۵ ٹن ماہانہ سے بڑھا کر ۸۸ ٹن ماہانہ کرنے کی غرض سے انڈین کاپر کامپلیکس کی متعدد کانوں کی توسیع کی گئی ہے اور چاندی کی تیاری کے سلسلے میں جون ۱۹۷۵ء میں انڈین کاپر کارپوریشن میں قیمتی دھاتوں کی بازیابی کا پلانٹ چالو کیا گیا۔ اس کے علاوہ ضمنی مصنوعات مثلاً ایلیریم کی بازیابی کا کام شروع کیا گیا۔

مدھیہ پردیش کے بالا گھاٹ ضلع میں ملنج کھنڈ کاپر پراجیکٹ (ایم سی پی) ۱۲ نومبر ۱۹۸۲ء کو شروع کیا گیا تھا۔ مذکورہ پراجیکٹ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ملک میں سخت چٹان کی سب سے بڑی کھلی کان ہے۔ مذکورہ کان سے ایک سال میں ۲۰ لاکھ ٹن خام تانبہ حاصل ہوتا ہے جو ۲۳۰۰ ٹن تانبے کے برابر ہے۔ اس دھات کا ایک حصہ پگھلانے اور صاف کرنے کی غرض سے کھیتری بھیجا جاتا ہے۔ پراجیکٹ کا دوسرا مرحلہ دسمبر ۱۹۸۳ء میں مکمل ہوا تھا۔ راجستھان میں چاند ماری کاپر پراجیکٹ (سی سی پی) دسمبر ۱۹۷۵ء میں چالو کیا گیا تھا۔

تیسرے دہے کے اختتام تک ہندوستان کاپر لمیٹڈ میں تانبے کی پیداوار ۲۴۳۱۴ ٹن تک پہنچ گئی۔ ہندوستان کاپر لمیٹڈ کی بھٹیوں میں صاف کئے گئے تانبے کی پیداوار ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران ۳۳۶۲۱ ٹن رہی ہے۔

مذکورہ دہے کے دوران ہندوستان کاپر لمیٹڈ میں تحقیق اور ترقی کی ایک ٹھوس بنیاد بھی قائم کی گئی جس کی وجہ سے کیمیاوی کان کنی، دھات پگھلانے وغیرہ کے شعبوں میں تحقیق و ترقی کے متعدد اندرونی پروگرام شروع کئے گئے۔

ان تمام کوششوں کے باوجود تانبے کی بہت بڑی مقدار میں ضرورت ہے۔ ۲۰۰۰ء کے بعد تانبے کی مانگ میں مسلسل تین فیصد کا اضافہ ہونے کی وجہ سے اگلے تیس برسوں میں ملک میں تانبے کی کل ضرورت ۱۱۰ لاکھ ٹن ہو جائے گی۔ ملک میں خام تانبے کے ذخائر کے بارے میں ہماری موجودہ جانکاری کے مطابق تانبے کی زیادہ پیداوار ملنج کھنڈ اور سنگھم کاپر بیلٹ سے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ تانبے کے ذخائر کے بارے میں ہمارے تجزیے کے مطابق ان ذخائر سے تانبے کی صرف ۳۴ فیصد سے ۴۴ فیصد مانگ پوری کی جا سکتی ہے۔ جب تک کہ ملنج کھنڈ اور سنگھم جیسے نئے اور وسیع ذخائر نہیں تلاش کئے جاتے اس وقت تک تانبے کی مانگ کا آدھا حصہ پورا کرنا بھی بہت دور کی بات ہے۔

کان کنی، دھات پگھلانے اور دھات کے لیے قابل عمل رپورٹوں کے ساتھ ساتھ مذکورہ علاقوں میں تانبے کی تفصیلی کھوج کی ضرورت ہے۔ اس اثنا میں تانبے کی درآمد اور اس کی کترنوں اور چھیلنوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کر کے مانگ میں کمی کو پورا کر رہا ہے۔

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر: سیّد ظفیر الحسن
ایڈیٹر: جگندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹر: محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر: وسیم حیدر، عبدالحمید

شرح چندہ
سالانہ ۲۰ روپے، دو سالہ ۳۶ روپے
سہ سالہ ۴۸ روپے، فی کاپی دو روپے
طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت۔

جلد ۷، شمارہ ۱۱، ۱۲ | یکم تا ۳۰ ستمبر ۱۹۸۷ء | ۱۰ بھادوں تا ۸ آسون، شک ۱۹۰۹ | قیمت دو روپے۔ ٹیلیفون ۶۰۱۸۱۸

اس شمارے میں

اداریہ ۲
زراعت: ہمارے لگان اراضی کا انتظام — ڈاکٹر کرشن موہن پرساد ۳
مربوط دیہی ترقی کا لائحہ عمل ۷
صنعت: بھارتی صنعت کے چالیس برس — ہرش اروڑہ ۹
کیا کچھ پایا اور کیا کچھ پانا باقی ہے — پروفیسر بپن چندر ۱۲
معاشیات: بیرونی ملکی قرض و معاشی ترقی — فرقان قمر/توقیر عالم فاروقی ۱۴
مسلم اوقاف اور ان کا انتظام — پرہلاد سنگھ ۱۹
قومی یک جہتی: صوفی سنت اور قومی یکجہتی — کمال جعفری ۲۲
تاریخ ہند کے چند سنہری اوراق — ایم۔ ایل۔ بجاج ۲۵
ادب: قاضی عبدالودود کا طریقہ تحقیق — منظر اعجاز ۲۸
فراق کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی — ڈاکٹر انجنی کمار سریواستو ۳۲
غزلیں — فضا ابن فیضی، قمر سنبھلی ۳۴
ڈاکٹر نرلیش، انیس احمد خاں
اسعد بدایونی، خالد ندیم ۳۵
ڈاکٹر سجاد حیدر، اسلم ملک، آغا زبرنی ۳۵
نغمۂ امن (نظم) — سیدہ عارفہ لقاش ۳۵
اندھیرا (کہانی) — لکشمی چندر پاس ۳۶
ہوشیار اے عشق (انشائیہ) — ضیاء حسنی ۳۹
ماہنامہ العلش کا جگن ناتھ آزاد نمبر (تبصرہ) — عادل صدیقی ۴۱
طب: بچوں کے چھ دشمنوں سے جنگ — عبدالعزیز قادری ۴۲
دل کا دورہ یا ہارٹ اٹیک — کے ایس بھٹناگر ۴۴
آپ سب کے لیے ۴۶
قارئین کی آراء اور مشورے — عزیز مراد آبادی، مسز پروین ۴۸
مشتری بیگم، فہیم نادر
روشن لال روشن بنارسی ۴۸
منظر اعجاز، جلیل الرحمٰن ۴۸
ہندوستان کاپر لمیٹڈ — پرمود ایس بھٹناگر کور ۲
پٹرولیم کی کھوج کور ۳
حکومت ہند اور حج — خواجہ محمد شاہد کور ۴

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر یوجنا (اردو)، پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (سیکٹر)، نئی دہلی
اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): آر۔ ایس۔ منچال
ترسیل زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

زراعت کی ترقی

بھارت نے جب آزادی کے بعد اپنی زندگی شروع کی تو اُس وقت اُس کی ایک بڑی آبادی کو ایک وقت کا کھانا بھی میسر نہیں تھا۔ ایک زمانہ میں یہ مشہور تھا کہ بھارت میں دودھ اور شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ اس سرزمین کا انگریزوں نے تجارتی مقاصد کے اتنی بے دردی سے استعمال کیا کہ وہ اپنے تمام وسائل سے محروم ہو گئی کھیتی باڑی ایک کمزور پیشہ بن گیا تھا جس کے نتیجے میں ہزارہا لوگ ا زمینوں کو ترک کرکے اپنی گذر بسر کے لیے شہروں میں جا بسے۔

ایسی خطرناک اور مایوس کن صورتِ حال کو مکمل طور پر سمجھتے ہوئے ہمارے منصوبہ سازوں نے زراعت اور متعلقہ شعبے آبپا کو پہلے منصوبے کا سب سے خاص اور اہم مرکز بنایا۔ پہلا منصوبہ بہت ہی زیادہ کامیاب رہا اور اناج کی کُل پیداوار ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۵۰۸ ٹن سے بڑھ کر ۱۹۶۰-۶۱ء میں ۸۲۰ لاکھ ٹن ہو گئی۔

اس کے باوجود بھارت کو ایک ایسے دَور کا سامنا کرنا پڑا جب اُسے چاول اور گیہوں جیسی لازمی اشیاء بھی درآمد کرنی پڑیں لیکن ۱۹۶۷-۶۸ء کے انقلاب کے زمانے میں چاول کی تحقیق کے بین الاقوامی ادارے کی تیار کردہ چھوٹے چاول کی اعلیٰ قسموں اور میکسیکی گیہوں کی زیادہ پیداوار والی قسموں کی شر ہوئی۔ چنانچہ اس سبز انقلاب کی وجہ سے اناج کی کمی اس حد تک دُور ہو گئی کہ آج بھارت ایشیا اور افریقہ کے قحط سے متاثرہ عوام کی مدد کر سکتا پہلا سبز انقلاب خاص طور پر پنجاب، ہریانہ اور مغربی اُتر پردیش تک محدود تھا لیکن ۱۹۸۳-۸۴ء کے دوسرے سبز انقلاب کے فوائد مغربی بنگال، ب اڑیسہ، مدھیہ پردیش اور اُتر پردیش کو بھی حاصل ہوئے جو اس معاملے میں کافی پیچھے چل رہے تھے۔ ۱۹۸۵-۸۶ء میں ۶۱۰ لاکھ ٹن چاول اور ۴۶۰ لاکھ ٹن گیہوں ریکارڈ پیداوار ہونے کی وجہ سے بھارت میں کھیتی باڑی کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔

حکومت نے اسی طرح کے نتائج حاصل کرنے کے لیے متعدد کوششیں کی ہیں۔ بھارتی زراعت کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ کنبوں کے ممبران اور کر اپنی چھوٹی چھوٹی زمینوں کی شکل میں ایک بڑے علاقے پر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ کسان اپنے کھیتوں کی آبپاشی کے لیے مکمل طور سے بارشوں پر انحصار کرتے ہیں۔ بیج کی غرض سے روپے پیسے کے لیے وہ اکثر قرض دینے والوں کے رحم و کرم پر رہتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے کسان اپنی زمینوں سے حاصل ہونے والی پیداوار پر بڑی تنگی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ۱۹۸۳-۸۴ء میں حکومت نے زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کی غرض سے چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں کے لیے امداد کی ایک اسکیم شروع کی۔ اس اسکیم میں مرلوط اور دیہی ترقیات کے فی بلاک کے حساب سے پانچ لاکھ روپے کے سالانہ اخراجات شامل ہیں جو چھوٹی آبپاشی، تلہنوں، دالوں موٹے اناج کے لیے بیجوں کی تھیلیوں کی تقسیم نیز زمین کو بہتر بنانے کے سلسلے میں صرف کئے جاتے ہیں۔

مذکورہ اسکیم کے آغاز سے لے کر اب تک دالوں اور تلہنوں کے لیے بیجوں کی تقریباً ۱۲۲ لاکھ چھوٹی تھیلیاں چھوٹے اور بہت چھوٹے کسانوں کو کی جا چکی ہیں اس پروگرام کی وجہ سے مہاراشٹر میں سورج مکھی، مدھیہ پردیش، اتر پردیش، راجستھان اور ہماچل پردیش میں سویابین نیز اتر پردیش، راجستھا مدھیہ پردیش میں مونگ جیسی فصلوں کو شروع کرنے اور انھیں مقبول بنانے میں کافی مدد ملی ہے۔

مذکورہ اسکیم کی وجہ سے دالوں اور تلہنوں کی پیداوار میں عدم توازن کو کچھ حد تک درست کرنے میں بھی مدد ملی ہے جس کی پیداوار چاول اور کے مقابلے میں کافی پیچھے ہے۔ سبز انقلاب نے چاول اور گیہوں کی پیداوار کو بہت زیادہ فروغ دیا تھا جس کی وجہ سے تلہنوں اور دالوں کی پیداوار متاثر

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

ڈاکٹر کرشن موہن پرساد

ہمارے لگان اراضی کا نظام

ماضی اور حال میں

اس دلچسپ مضمون میں مصنف نے اُس لگان اراضی کے نظام کا جائزہ لیا ہے جو نامعلوم یُگوں سے اب تک بھارت میں رائج ہے۔ وہ آخر میں اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ لگان اراضی اور زرعی انکم ٹیکس کی پوزیشن سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ریاستی منصوبوں کی سرمایہ کاری میں اراضی ٹیکسوں کا حصّہ بہت کم رہا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ غیر زرعی شعبے کے مقابلے میں زرعی شعبے پر بہت کم ٹیکس لگائے گئے ہیں۔

اراضی پر لگان نامعلوم یُگوں سے لگایا جا رہا ہے۔ یہ تہذیب انسانی کے آغاز سے ہی مختلف صورتوں میں چلا آ رہا ہے۔ زمانۂ قدیم میں لگان اراضی کو اراضی ٹیکس تصور کیا جاتا تھا جس کے ساتھ بعض اوقات دیگر محصولات وابستہ ہوتے تھے۔ لگان اراضی عموماً مملکت یا اُس کے گماشتے کے ذریعہ اراضی کی ملکیت یا اُس کے استعمال پر لگایا جاتا تھا۔ قدیم سلطنت روما اور انگلینڈ کے جاگیردارانہ دَور میں زمین کے تناسب یا پیداوار کے لحاظ سے ٹیکس لگائے جاتے تھے، جبکہ قدیم بھارت میں زرعی پیداوار کا چوتھائی حصہ ٹیکس کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا۔

ماضی میں لگان

منوسمرتی میں راجہ کو کُل زرعی پیداوار کا چھٹے حصّے سے بارہواں حصّہ بطور ٹیکس وصول کرنے کو کہا گیا ہے۔ زمانہ جنگ یا دیگر ہنگامی حالات میں یہ ٹیکس ایک چوتھائی تک بڑھایا جاسکتا تھا۔ ویدک دَور میں زمین انفرادی ملکیت تھی اور راجہ یا سردار کی طرف سے کاشتکاروں یا مالکوں سے جبری ٹیکس جو "بلی" کے نام سے موسوم تھا وصول کیا جاتا تھا۔ "بلی" کُل زرعی پیداوار کے حصّے کے طور پر جنس (اناج یا مویشی) کی صورت میں ادا کیا جاسکتا تھا۔

عہدِ قدیم میں لگان اراضی کے سسٹم کا نہایت جامع اور مفصّل احوال کوٹلیہ کے ارتھ شاستر میں ملتا ہے۔ جو ۳۲۳ قبل مسیح میں چندر گپت موریہ کے عہدِ حکومت میں لکھا گیا تھا۔ لگان اراضی کُل زرعی پیداوار کا چھٹا حصہ مقرر کیا گیا تھا۔ چندر گپت موریہ کے دربار میں یونان کے سفیر میگستھنیز نے اس کی توثیق کی ہے۔ جو کچھ کوٹلیہ نے اُس عہد کے لیے لکھا تھا رودر دمن کے کتبے (۱۵۰ء) میں ایسی روایاتی تکنیکی الفاظ کا ذکر ملتا ہے جیسے "بلی" "بھاگ" "کر" "شلک" "وِشٹی" اور "پرینہ"۔

باقاعدہ مساعی

عہدِ تیموری میں پہلی بار اس امر کی باقاعدہ کوشش کی گئی کہ پیداوار کا حساب لگا کر ٹیکس روپیہ کی صورت میں وصول کیا جائے۔ اس کے بعد شیر شاہ سوری (۱۵۴۰-۴۵ء) کی طرف سے ایسی ہی کوشش کی گئی لیکن وہ اس پیڑے سرے نہیں چڑھ سکی کیوں کہ اُس کا دورِ حکومت بہت مختصر رہا۔ اس ضمن میں تیسرا اور مشہور ترین بندوبست مغل اعظم اکبر کے دورِ حکومت میں اُس کے قابل وزیرِ خزانہ ٹوڈر مل کی طرف سے کیا گیا اور اسے چار زمروں میں بانٹا

دیا گیا۔ کل پیداوار میں حکومت کا حصہ ایک تہائی مقرر کیا گیا۔ مغلوں نے ہندوؤں کے قدیم لگان سسٹم میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی۔ البتہ بندوبستِ انتظام و انصرام کے غیر تحریری مروجہ طور طریقوں کو ایک مربوط نظام میں بدل دیا۔ انھوں نے مملکت کے مالی وسائل سے متعلق واضح علم حاصل کرنے کی غرض سے لگان کے باقاعدہ ریکارڈ رائج کئے۔ اکبر کے دورِ حکومت سے قبل مغلوں کے لگان اراضی کے نظام کے بارے میں کوئی اہم بات نہیں ہوئی۔ لیکن شیر شاہ سوری (۱۵۴۰ ـ ۴۵) کے عہد میں لگان اراضی کی تشخیص کے طریقوں میں قابلِ ذکر اصلاحات کی گئیں۔ اناج کی ہر فصل کی معیاری پیداوار کا حساب الگ الگ طور پر زمین کے تین زمروں — اچھی، درمیانہ اور گھٹیا — سے لگایا گیا۔ بعد ازاں ان اعداد کا اوسط نکالا گیا اور اوسط کا تیسرا حصہ علاقے کے ہر یونٹ سے لگان کے طور پر وصول کیا گیا جسے کاشتکاروں نے جنس کی صورت میں ادا کیا۔ پیمائش کے معیاری یونٹ بھی مرتب کئے گئے۔ "الٰہی گز" پیمائش کا یونٹ بنایا گیا جو ۳۲ انگلیوں پر مشتمل تھا۔ یہ موجودہ عہد کے ۲۹ سے ۳۲ انچوں کے برابر ہے۔ لگان اراضی مختلف اراضیات کی پیداواری صلاحیت کے مطابق مقرر کیا گیا۔ اراضی کی چار اقسام مقرر کی گئیں جیسے پولیج، پرتی، چیچر اور بنجر۔ پولیج بہترین قسم کی اراضی تھی اور اس پر سارا سال کاشت ہوتی تھی۔ پرتی کو کچھ وقت کے لیے غیر مزروعہ حالت میں چھوڑا جاتا تھا تاکہ اس کی زرخیزی بحال ہو جائے۔ چیچر کو تین سے چار برس تک ویران چھوڑا جاتا تھا اور بنجر بدترین قسم کی اراضی تھی جس پر پانچ برس کے بعد کاشت کی جاتی تھی۔

مغل دور میں تبدیلیاں

بعد کے مغل عہد میں اکبر اعظم کے لگان اراضی کے نظام سے احتراز کیا گیا۔ "لکاشند" بتاتے ہیں کہ "بعد کے مغلوں کے دور میں اکبر کے لگان اراضی کی پالیسی کے مقصد سے کلیتہً احتراز کیا گیا۔ گو اکبر کے جانشینوں نے جدتیں رائج کیں جو بدتر ثابت ہوئیں تاہم وہ نظام کسی حد تک برقرار رہا۔ لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد نظام کلیتہً ٹوٹ گیا۔ گو آگے بھارت کے ابتدائی برطانوی گورنر جنرل کے نظم و نسق کے تحت اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے پچاس برس لگے۔ اکبر کے بعد کا مغل دور بھارت میں لگان اراضی کا نہایت برا دور تھا۔ تشخیص کی سطح کل پیداوار کے ایک تہائی سے بڑھا کر نصف یا اس سے بھی زیادہ کر دی گئی۔ شاہجہاں نے لگان اراضی بڑھا کر ایک تہائی سے نصف کر دیا اور اورنگ زیب کے عہد میں پیداوار کا نصف حصہ بطور لگان معیاری ہو گیا۔

برطانوی عہد

اٹھارہویں صدی میں بھارت میں برطانوی فتوحات سے نئے حکمرانوں کو یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ وہ اس اراضی ٹیکس سسٹم کو نئے سرے سے مؤثر طور پر مرتب کریں جو کہ سرکاری آمدنی اور طاقت کی اہم بنیاد تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۷۶۵ء میں بنگال، بہار، اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کرنے کے بعد کلیکٹروں کی تقرری کی تاکہ وہ زمینداروں کی زمین کی مقدار اور اس لگان کا تعین کریں جو کاشتکاروں کو انھیں دینا چاہیئے۔ لیکن یہ سسٹم ناکام ہو گیا اور صوبائی کمیٹی کی نگرانی میں یہ کام مقامی کلیکٹروں کو سونپا گیا۔ مگر وارن ہیسٹنگز نے اس کمیٹی کو ختم کر دیا اور اس کی جگہ پر ریونیو کی ایک میٹرو پالیٹن کمیٹی مقرر کر دی۔ لارڈ کارنوالس نے ۱۷۹۳ء میں "مستقل بندوبست اراضی" رائج کیا جس کے تحت تین قسم کے لگان سسٹم رائج کئے گئے یعنی (۱) مستقل بندوبست (۲) رعیت واڑی اور (۳) مہالواڑی۔

مستقل بندوبست کا سسٹم

مستقل بندوبست اراضی کا سسٹم اٹھارہویں صدی کے اواخر میں یہاں بنگال اور اڑیسہ میں رائج کیا گیا۔ اس سسٹم میں نہ صرف کھیتی باڑی پر ٹیکس لگانے کے موجودہ اصول کو تسلیم کیا گیا بلکہ زمینداریوں کا قیام بھی کیا گیا۔ زمینداروں پر کاشتکاروں سے لگان وصول کرنے کی ذمہ داری ڈالی گئی۔ اراضی ٹیکس کی تشخیص کی سطح ہمیشہ کے لیے مقرر کی گئی جو مثال کے طور پر ۱۷۹۳ء میں بنگال میں زمینداروں کی طرف سے کل فراہم شدہ لگان کا ۱۱ ـ ۱۰ فیصد تھی۔

دوسرا رعیت واڑی سسٹم تھا۔ اس سسٹم میں ٹیکس کی تشخیص عارضی تھی جو مفروضہ طور پر خالص پیداوار پر مبنی تھی اور اس کا بندوبست مملکت اور خود کاشتکار کے درمیان کیا گیا تھا۔ جس عرصہ کے دوران تشخیص کی جاتی تھی وہ ۱۵ سے ۴۰ برس تک مقرر کیا گیا تھا۔

تیسرا مہالواڑی سسٹم تھا جس میں تشخیص کل پیداوار پر کی جاتی تھی۔ مہالواڑی سسٹم میں تشخیص انفرادی کاشتکار کے بجائے مجموعی طور پر گاؤں پر کی جاتی تھی۔

۱۷۹۳ ـ ۹۴ء میں جو لگان اراضی وصول کیا گیا وہ کل مرکزی اور صوبائی ریونیو کا ۶۹ فیصد تھا، ۱۸۹۱ ـ ۹۲ء میں ۴۳ فیصد اور ۳۹ ـ ۱۹۳۸ء میں ۱۶ فیصد تھا۔

اصلاحاتِ اراضی

حصولِ آزادی کے بعد بھارت سرکار نے زمینداری سسٹم منسوخ کر دیا جس سے حکومت اور مزارعوں کے درمیان بچولیوں کا سسٹم خود بخود ختم

ہو گیا۔ زمینداری سسٹم کی تنسیخ سے حکومت اور کاشتکاروں کے درمیان براہِ راست رابطہ قائم ہو گیا۔ اصلاحاتِ اراضی کے دیگر اقدامات کے ساتھ حکومت کے اس اقدام سے لگان اراضی کی وصولی پر اچھا اثر پڑا اور اس کے نتیجے میں حصولِ آزادی کے بعد وصولی بڑھ گئی جو گوشوارہ نمبر ۲ء ۲ سے ظاہر ہے۔

گوشوارہ نمبر ۲ء۲

ریاستی حکومتوں کی لگان اراضی کی وصولی اور ٹیکسوں کی کل آمدنی اور ریاستی حکومتوں کی ٹیکسوں کی کل آمدنی کے مقابلے میں اس کا فیصد۔

کروڑوں روپے میں

سال	لگان اراضی کی وصولی	ریاستوں کی ٹیکسوں کی کل آمدنی کے مقابلے میں لگان اراضی کا فیصد	مملکت کی ٹیکسوں کی کل آمدنی کے مقابلے میں لگان اراضی کا فیصد
۱۹۵۱–۵۳	۴۸٫۰	۱۷٫۰۸	۱۶٫۱۲
۱۹۵۵–۵۶	۷۸٫۰	۲۱٫۹۱	۱۴٫۷
۱۹۶۰–۶۱	۹۷٫۲	۱۵٫۵۱	۹٫۵۸
۱۹۶۵–۶۶	۱۱۱٫۹	۱۰٫۰۱	۶٫۰۵
۱۹۷۰–۷۱	۱۱۲٫۶	۴٫۹۳	۳٫۲۰
۱۹۷۴–۷۵	۱۲۴٫۳	۳٫۹۳	۲٫۶۱
۱۹۸۰–۸۱	۱۴۵٫۵	۱٫۳۹	۰٫۸۸
۱۹۸۱–۸۲	۱۸۱٫۱	۱٫۴۲	۰٫۹۸
۱۹۸۲–۸۳	۱۸۲٫۱	۱٫۲۸	۰٫۸۸

گوشوارہ نمبر ۲ء۲ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۵۱–۵۲ء میں لگان اراضی کی وصولی ۴۸ کروڑ روپے تھی جو ۱۹۵۵–۵۶ء میں بڑھ کر ۷۸ کروڑ روپے، ۱۹۶۵–۶۶ء میں ۱۱۱٫۹ کروڑ روپے اور ۱۹۷۴–۷۵ء میں ۱۲۴٫۳ کروڑ روپے ہو گئی۔ بلحاظ سال ۱۹۸۱–۸۲ء میں ۱۸۱٫۱ کروڑ روپے اور ۱۹۸۲–۸۳ء میں ۱۸۲٫۱ کروڑ روپے ہو گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آمدنی کے لحاظ سے وصولی زمانہ مابعد آزادی میں بڑھتی گئی ہے لیکن لگان اراضی کی حقیقی پوزیشن کی صرف اس وقت تشخیص کی جا سکتی ہے، [illegible] کی کل ریاستی ٹیکس آمدنی کے مقابلے میں دیکھیں اُسے بھی گوشوارہ نمبر ۲ء۲ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

لگان میں کمی

گوشوارہ نمبر ۲ء۲ سے مزید ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۵۰–۵۱ء سے ۱۹۸۲–۸۳ء تک بھارت میں ٹیکسوں کی کل آمدنی اور ریاستی حکومتوں کی کل آمدنی کے مقابلے میں لگان اراضی کی وصولی کس قدر ہے۔ گوشوارے سے واضح ہے کہ بھارت میں لگان اراضی ٹیکسوں سے ہونے والی کل آمدنی اور کل آمدنی کے تناسب سے تیزی کے ساتھ کم ہو رہا ہے۔ ۱۹۵۱–۵۲ء میں لگان اراضی ٹیکسوں سے ہونے والی کل آمدنی کا ۱۷٫۰۸ فیصد اور کل آمدنی کا ۲٫۱۳ فیصد تھا۔ ۱۹۵۵–۵۶ء میں اس کا تناسب ٹیکسوں کی کل آمدنی کے ۲۱٫۹۱ فیصد اور کل آمدنی کے ۱۴٫۷۰ فیصد تک بڑھ گیا۔ لیکن لگان اراضی ۱۹۵۵–۵۶ء سے کم ہونا شروع ہوا اور ۱۹۸۲–۸۳ء میں ٹیکسوں کی کل وصولی کا محض ۱٫۲۸ فیصد اور کل آمدنی کا ۰٫۸۸ فیصد ہو گیا۔ لگان اراضی میں تیزی سے ہونے والی کمی مرکز میں ٹیکسوں کی نئی صورتوں جیسے انکم ٹیکس، کسٹم ڈیوٹی اور پیداواری ٹیکس میں اور ریاستوں میں سیلز ٹیکس اور متعدد دیگر ٹیکسوں میں تیزی سے ہونے والے اضافے کا نتیجہ تھا۔ لگان اراضی میں کمی کا ایک اور سبب بعض ریاستی حکومتوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً چھوٹے چھوٹے کھیتوں کو لگان سے چھوٹ دینا تھا۔

(گوشوارہ نمبر ۲ء۳ اگلے صفحہ پر دیکھئے۔)

گوشوارہ نمبر ۲ء۳ سے ۱۹۵۱ء سے مملکت کی آمدنی میں دو بڑے براہِ راست اراضی ٹیکسوں، لگان اراضی اور زرعی انکم ٹیکس کی پوزیشن کا پتہ چلتا ہے۔ مملکت کے ٹیکسوں کے تناسب کے طور پر دونوں لگان اراضی اور زرعی انکم ٹیکس میں تیزی سے کمی ہوئی ہے۔ گو پہلے پلان کے دوران میں لگان اراضی کی اوسط ۲۵٫۹ فیصد تھی تاہم پانچویں پلان میں وہ کم ہو کر ۵٫۱۰ فیصد ہو گئی اور ۱۹۸۲–۸۳ء کے بجٹوں کے لیے وہ ۱٫۸۰ فیصد رہ گئی۔ اسی طرح زرعی انکم ٹیکس جو پہلے پلان میں ۲٫۰۰ فیصد تھا وہ پانچویں پلان کے دوران میں مزید کم ہوا اور ۱۹۸۲–۸۳ء کے بجٹ میں محض ۰٫۴ فیصد رہ گیا۔ ان براہِ راست اراضی ٹیکسوں کا تناسب ایک ریاست سے دوسری ریاست میں مختلف ہے۔

گوشوارہ نمبر ۳ و ۲

بھارت میں پلان کے عرصے کے دوران مملکت کے ٹیکسوں میں لگان اراضی اور زرعی انکم ٹیکس

کروڑ روپے میں

عرصہ		لگان اراضی	زرعی انکم ٹیکس	مملکت کے ٹیکسوں سے کل آمدنی	مملکت کو ٹیکسوں سے ہونیوالی کل آمدنی کا فیصد لگان	مملکت کو ٹیکسوں سے ہونیوالی کل آمدنی کا فیصد زرعی انکم ٹیکس
پہلا پلان	سالانہ اوسط	۶۵٫۳۴	۴٫۸۲	۲۵۱٫۴۲	۲۵٫۹	۲٫۰
دوسرا پلان	،،	۹۱٫۰۰	۸٫۵۰	۳۷۹٫۵۸	۲۴٫۰۰	۲٫۰
تیسرا پلان	،،	۱۱۴٫۰۶	۹٫۷۸	۶۶۷٫۹۸	۱۷٫۰	۱٫۴
سالانہ پلان	،،	۱۰۲٫۳۶	۱۰٫۹۷	۱۰۷۴٫۴۴	۹٫۶	۱٫۱
چوتھا پلان	،،	۱۱۰٫۲۸	۱۲٫۲۸	۱۷۴۰٫۸۰	۶٫۳	۰٫۷
پانچواں پلان	،،	۱۸۲٫۸۸	۲۸٫۸۶	۳۶۹۰٫۳۷	۵٫۰	۰٫۸
۱۹۷۸-۷۹		۱۸۸٫۳۰	۸۰٫۳۰	۴۹۷۰٫۰۳	۳٫۶	۱٫۴
۱۹۷۹-۸۰		۱۵۱٫۹۰	۵۸٫۳۰	۵۶۶۹٫۱۰	۲٫۷	۱٫۰
۱۹۸۰-۸۱		۱۴۵٫۵	۴۶٫۴۰	۶۶۱۶٫۰۰	۳٫۲	٫۷
۱۹۸۱-۸۲		۱۸۱٫۱۰	۴۱٫۱۰	۸۰۷۰٫۰۰	۲٫۲	۰٫۵
۱۹۸۲-۸۳		۱۸۲٫۱۰	۴۲٫۱۰	۹۴۳۵٫۰۰	۱٫۸	۰٫۴

لگان اراضی اور زرعی انکم ٹیکس کی پوزیشن سے اس امر کی توثیق ہوتی ہے کہ ریاستی پلانوں کی سرمایہ کاری میں اراضی ٹیکسوں کا حصہ بہت کم رہا ہے اور ان میں متواتر کمی ہوتی جارہی ہے۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ بھارت جیسے ملک میں جہاں ۷۰ فیصد سے زیادہ آبادی زراعت پر انحصار رکھتی ہے اور کوئی ۵۰ فیصد قومی آمدنی اس شعبے سے حاصل کی جاتی ہے۔ اس ٹیکس سے ہونے والی ٹیکس آمدنی ریاستوں کی کل ٹیکس آمدنی کا محض ۲ فیصد ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر زرعی شعبے کے مقابلے میں زرعی شعبے پر بہت کم ٹیکس لگائے جارہے ہیں۔

بقیہ، بھارتی صنعت کے چالیس سال

کیمیکل انڈسٹریز

بھارت کی معیشت میں کیمیکلز صنعت کا اہم کردار ہے لوہے و فولاد انجینئرنگ اور کپڑا صنعت کے بعد اسے چوتھا مقام حاصل ہے کیمیکلز صنعت کی ترقی پورے صنعتی شعبے میں ہوئی ترقی سے مطابقت رکھتی ہے۔ اپریل دسمبر ۸۴ء کے دوران منظم صنعتوں کے شعبوں میں گزشتہ برس کے اس عرصے کے مقابلے میں ۷ء۸ فیصد کا اضافہ ہوا جبکہ کیمیکلوں اور کیمیاوی اشیاء کی پیداوار میں ۱۰ء۱ فیصد کا اضافہ ہوا۔ یہ صنعت دوائیوں اور رنگائی کے سامان، کیڑے مار دوائیوں، پلاسٹک اور رنگ و روغن کی پیداوار کے لیے بنیادی سہولیں فراہم کرتی ہے۔

کیمیکلوں کے شعبے میں پبلک سیکٹر کا سب سے بڑا کارخانہ ہندوستان آرگینک کیمیکلز لمیٹڈ دوائیوں، رنگوں اور ربڑ کیمیکلوں کے لیے کیمیاوی اشیاء تیار کرنے کے لیے ۱۲ دسمبر ۱۹۶۰ء کو قائم کیا گیا تھا۔

کیڑے مار دوائیوں کی صنعت نے بھی گزشتہ ۳ دہائیوں میں بڑی ترقی کی ہے۔ ان دوائیوں کا پہلا کارخانہ ۱۹۵۲ء میں کلکتہ میں رسٹرا میں لگایا گیا تھا۔ آج ملک میں اعلیٰ تکنیک سے ۵۰ قسم کی کیڑے مار دوائیاں تیار کی جارہی ہیں۔

مربوط دیہی ترقی کا لائحہ عمل برائے ۸۷-۱۹۸۶ء

رکز سے بجٹ میں سال ۸۷-۱۹۸۶ء
۲۸۷ کروڑ روپیے کی رقم مخصوص کی گئی
الی ۳۲ لاکھ کنبوں کی امداد کا نشانہ
رکیا گیا ہے۔ ان میں بیس لاکھ پرانے
گے اور ۱۲ لاکھ نئے۔ رقوم کی تخصیص اور
امداد و شمار ذیل کے گوشوارے میں
ہے ہیں۔ سہ ماہی نشانوں کے تعین کا
۱۹۸۶ء میں بھی جاری رکھا جائے گا۔
نشانہ یوں ہے :-

سہ ماہی میں ۱۵ فیصد، دوسری سہ ماہی میں
(یعنی کل ۳۵ فیصد بشمول پہلی سہ ماہی
سہ ماہی میں ۳۵ فیصد (پہلی اور دوسری
شامل کرتے ہوئے کل ۷۰ فیصد) اور
ماہی میں ۳۰ فیصد (جو پہلی، دوسری
اور تیسری سہ ماہیوں کو شامل کرنے کے بعد ۱۰۰ فیصد ہو جائے گی)

۸۷-۱۹۸۶ء کے لیے مختلف اقدامات کے لیے مندرجہ ذیل تاریخیں مقرر کی گئی ہیں :-

نمبر شمار	اقدامات	تاریخ تکمیل
۱	اخراجات اور نشانوں کی اطلاع دہی	یکم اپریل ۱۹۸۶ء
۲۔	سالانہ لائحہ عمل برائے ۸۷-۱۹۸۶ء کی منظوری	۳ جون ۱۹۸۶ء
۳۔	حکومت ہند اور ریاستی حکومت کی طرف سے پہلی قسط کا اجراء۔	۳۰ جون ۱۹۸۶ء
۴۔	حکومت ہند اور ریاستی حکومت کی طرف سے دوسری قسط کا اجراء۔	۳۱ جنوری ۱۹۸۷ء
۵۔	ریاستی سکریٹریوں کے ساتھ مربوط دیہی ترقی کے پروگرام پر عمل درآمد کا جائزہ۔	جون ۱۹۸۷ء
۶۔	مرکزی کمیٹی کی میٹنگ	ستمبر ۱۹۸۶ء، دسمبر ۱۹۸۶ء اور فروری ۱۹۸۷ء
۷۔	سالانہ لائحہ عمل (ایکشن پلان) کی منظوری۔	۲۸ فروری ۱۹۸۷ء

۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران مربوط دیہی ترقی کے تحت رقوم کی تخصیص اور نشانوں کی ریاست وار تفصیل

...ا مرکزی نظم و نسق ...تے کا نام	کل مخصوص شدہ رقم (لاکھوں میں)	مرکز کی طرف سے مخصوص کی گئی رقم (لاکھ روپوں میں)	مستفید ہونے والے پرانے کنبوں کی تعداد (لاکھ میں)	مستفید ہونے والے نئے کنبوں کی تعداد (لاکھ میں)	مستفید ہونے والے کنبوں کی تعداد (لاکھ میں)
۱	۲	۳	۴	۵	۶
...دیش	۳۷۳۹٫۷۷	۱۸۶۹٫۸۹	۱٫۵۵	۰٫۷۳۵	۲٫۲۸۵
...ام	۱۲۵۶٫۵۹	۶۲۸٫۳۰	۰٫۴۰	۰٫۳۰۵	۰٫۷۰۵

۱	۲	۳	۴	۵	۶
۳۔ بہار	۷۰۹۷ر۷۲	۳۵۴۸ر۸۶	۲ر۶۴	۱ر۵۱	۴ر۲۵
۴۔ گجرات	۱۹۷۹ر۶۷	۹۸۹ر۸۴	۰ر۸۶	۰ر۳۶۵	۱ر۲۲۵
۵۔ ہریانہ	۶۹۱ر۱۸	۳۴۵ر۵۹	۰ر۳۹	۰ر۱۰۰	۰ر۴۲
۶۔ ہماچل پردیش	۴۳۷ر۷۶	۲۱۸ر۸۸	۰ر۲۳	۰ر۰۸۱	۰ر۳۱۱
۷۔ جموں وکشمیر	۷۰۲ر۰۳	۳۵۱ر۰۲	۰ر۱۸	۰ر۲۰۵	۰ر۳۸۵
۸۔ کرناٹک	۲۱۷۳ر۸۲	۱۰۸۶ر۹۱	۰ر۸۷	۰ر۴۳۵	۱ر۳۰۵
۹۔ کیرل	۱۴۷۷ر۹۷	۷۳۸ر۹۸	۰ر۵۳	۰ر۳۲۵	۰ر۸۵۵
۱۰۔ مدھیہ پردیش	۵۰۷۳ر۶۱	۲۵۳۶ر۸۰	۲ر۰۸	۰ر۰۲۰	۳ر۱۰
۱۱۔ مہاراشٹر	۳۶۹۹ر۴۷	۱۸۴۹ر۷۳	۱ر۲۰	۰ر۹۰۰	۲ر۱۰
۱۲۔ منی پور	۱۵۴ر۸۳	۷۷ر۴۱	۰ر۰۴	۰ر۰۴۸	۰ر۰۸۸
۱۳۔ میگھالیہ	۲۰۸ر۱۷	۱۰۴ر۰۸	۰ر۰۲	۰ر۰۶۸	۰ر۰۸۸
۱۴۔ ناگالینڈ	۲۶۳ر۲۷	۱۳۱ر۶۴	۰ر۰۷	۰ر۰۶۵	۰ر۱۳۵
۱۵۔ اڑیسہ	۲۹۷۲ر۰۴	۱۴۸۶ر۰۲	۱ر۲۴	۰ر۵۸۰	۱ر۸۲
۱۶۔ پنجاب	۷۹۵ر۳۶	۳۹۷ر۶۸	۰ر۴۷	۰ر۰۸۵	۰ر۵۵۵
۱۷۔ راجستھان	۲۵۳۳ر۵۴	۱۲۶۱ر۷۷	۰ر۸۷	۰ر۶۱۵	۱ر۴۸۵
۱۸۔ سکم	۸۶ر۱۳	۴۳ر۶	۰ر۰۳	۰ر۰۱۷	۰ر۰۳۷
۱۹۔ تمل ناڈو	۳۷۹۳ر۵۳	۱۸۹۶ر۷۶	۱ر۵۱	۰ر۷۹۵	۲ر۳۰۵
۲۰۔ تریپورہ	۱۴۶ر۷۵	۷۳ر۳۸	۰ر۰۶	۰ر۰۳۵	۰ر۰۹۵
۲۱۔ اترپردیش	۱۰۰۲۹ر۶۶	۵۰۱۴ر۸۳	۳ر۹۹	۲ر۰۳۰	۶ر۰۲
۲۲۔ مغربی بنگال	۴۰۰۱ر۰۱	۲۰۰۰ر۵۱	۰ر۵۸	۱ر۳۱۵	۱ر۸۹۵
۲۳۔ جزائر انڈمان ونکوبار	۴۵ر۱۵	۴۵ر۱۵	۰ر۰۰۱	۰ر۰۱۷	۰ر۰۱۸
۲۴۔ اروناچل پردیش	۳۶۷ر۱۵	۳۶۷ر۱۵	۰ر۰۳۹	۰ر۱۲۷	۰ر۱۶۶
۲۵۔ چنڈی گڑھ	۶۰ر۷۳	۶۰ر۷۳	۰ر۰۰۱	۰ر۰۲۴	۰ر۰۲۵
۲۶۔ دادرا اور نگرحویلی	۲۳ر۷۹	۲۳ر۷۹	۰ر۰۰۱	۰ر۰۰۹	۰ر۰۱
۲۷۔ دہلی	۱۰۰ر۵۸	۱۰۰ر۵۸	۰ر۰۲۲	۰ر۰۲۹	۰ر۰۵۱
۲۸۔ گوآ، دمن اور دیو	۱۹۳ر۳۶	۱۹۳ر۳۶	۰ر۰۳۱	۰ر۰۹۳	۰ر۰۹۳
۲۹۔ لکش دویپ	۳۰ر۴۹	۳۰ر۴۹	۰ر۰۰۱	۰ر۰۱۲	۰ر۰۱۳
۳۰۔ میزورم	۱۸۰ر۶۸	۱۸۰ر۶۸	۰ر۰۱۵	۰ر۰۶۵	۰ر۰۸
۳۱۔ پانڈیچری	۷۶ر۷۵	۷۶ر۷۵	۰ر۰۱۹	۰ر۰۲۱	۰ر۰۴
کل ہند	۵۴۳۸۲ر۵۶	۲۷۷۳۰ر۶۲	۲۰ر۰۰۰	۱۲ر۰۰	۳۲ر۰۰

نوٹ :- مذکورہ بالا گوشوارہ میں ریاستوں اور مرکزی نظم ونسق کے علاقوں کے ناموں کی ترتیب انگریزی حروف تہجی کے اعتبار سے ہے۔

ہرش اروڑہ

بھارتی صنعت کے چالیس برس

تیسری اور آخری قسط

حصول آزادی کے بعد بھارت ۴۰ برس سے جہاں بڑی بڑی مشینوں اور انجینئرنگ کی صنعتوں میں ترقی کر رہا ہے۔ وہاں وہ عام مصنوعات کے شعبوں میں نہ صرف خود کفالت حاصل کر رہا ہے بلکہ وہ ان کی برآمد سے غیر ملکی زر مبادلہ بھی کما رہا ہے۔ بعض مصنوعات کے شعبوں میں اس کی ترقی تو قابل تعریف ہے۔ ان میں کپڑا، پٹ سن، چینی کاغذ اور سیمنٹ وغیرہ شامل ہے۔

سوتی کپڑا

سوتی کپڑا صنعت اکیلے ہی صنعتوں کے زمرے میں بھارت کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ ہمارے ملک میں سوتی کپڑا صنعت کا جدید طرز پر آغاز ۱۸۱۸ء میں ہوا تھا جب کلکتہ کے پاس فورٹ گلاسٹر میں پہلی سوتی مل کا قیام عمل میں آیا تھا تحفظات ملنے اور سودیشی تحریک کے باعث سوتی کپڑا صنعت نے تیزی سے ترقی کی۔ ۱۹۴۷ء میں سوتی کپڑا ملوں کی تعداد بڑھ کر ۳۸۹ ہو گئی تھی جن میں ۲۶۴ ۲۵۲ کرگھے (لوم) تھے مارچ ۱۹۸۴ء کے اخیر میں ان ملوں کی تعداد بڑھ کر ۹۲۵ ہو گئی (۹۳۹ میں کتائی اور ۲۸۱ میں کتائی اور بننا دونوں کا کام ہوتا تھا۔ ان کی نصب شدہ صلاحیت ۲۴ کروڑ ۲۸ لاکھ تکلوں اور ۲ لاکھ ۱۰ ہزار کرگھوں کی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں سوتی دھاگے کی پیداوار ۵۹ کروڑ ۷۰ لاکھ کیلوگرام اور کپڑے کی پیداوار ۴ ارب ۵۰ کروڑ ۹۰ لاکھ میٹر تک پہنچ گئی تھی ۸۴-۱۹۸۳ء میں ملوں میں سوتی دھاگے کی پیداوار ۱ ارب ۱۱ کروڑ ۳۰ لاکھ کیلوگرام اور سوتی کپڑے کی پیداوار ۱۰ ارب ۷۰ کروڑ ۳۰ لاکھ میٹر ہو گئی۔

جب کہ غیر مرکوز شعبوں میں ۵ ارب ۹۹ کروڑ ۸۰ لاکھ میٹر کی پیداوار ہوئی۔

پٹ سن

پٹ سن صنعت ملک کی قدیم ترین صنعتوں میں سے ہے یہ ملک کے لیے زر مبادلہ کمانے کا ایک بڑا وسیلہ ہے اور اس لیے ملک کی معیشت میں اسے اہم مقام حاصل ہے۔ بھارت میں سب سے پہلے برقی قوت سے چلنے والی پٹ سن مل ۱۸۵۹ء میں کلکتہ کے نزدیک رسرا میں قائم ہوئی تھی اور تب سے یہ صنعت تیزی سے ترقی کر رہی ہے ۱۹۴۷ء میں ملک کے بٹوارے کے باعث اس صنعت کو اہم خام مال سے محروم ہونا پڑا۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں خام پٹ سن کی پیداوار محض ساڑھے ۱۶ لاکھ گانٹھیں رہ گئیں جب کہ بٹوارے سے پہلے پیداوار ۶۵ لاکھ ۷۰ ہزار گانٹھیں تھیں۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں خام پٹ سن کی پیداوار ۸۰ لاکھ گانٹھوں کی ریکارڈ سطح پر پہنچ گئی لیکن جون جولائی ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران پٹ سن کی پیداوار ۷۳ لاکھ گانٹھیں ہونے کا اندازہ کیا گیا۔ پیداوار میں یہ کمی زیادہ تر خراب موسم کے باعث ہوئی۔ ۸۵-۱۹۸۴ء (اپریل - مارچ) کے دوران پٹ سن سے بنی اشیاء کی پیداوار ۱۳ ر ۸۴۸ لاکھ ٹن تھی۔ جب کہ گذشتہ برس پیداوار ۱۰۶۸۹ لاکھ ٹن ہوئی۔ ۸۵-۱۹۸۴ء (اپریل دسمبر) کے دوران ایک ارب ۹۷ کروڑ ۸۰ لاکھ روپئے کی مالیت کی پٹ سن مصنوعات کی برآمد ہوئی جب کہ ۸۴-۱۹۸۳ء کے پورے سال اپریل مارچ کے دوران پیداوار میں کمی کی زیادہ تر وجہ

پٹ سن ملوں میں ۱۶ جنوری ۱۹۸۴ء سے ۸۴ روز کی ہڑتال تھی اس کا اثر اس دوران پٹ سن کی مصنوعات کی برآمد پر بھی پڑا۔ حال ہی میں ملک کی تجارت برآمد میں پٹ سن کا حصہ کم ہوا ہے۔ جس کے متعدد اسباب ہیں۔ ملک میں پٹ سن کی ۶۹ ملیں ہیں۔ ان میں تین ملیں شامل نہیں جو مستقل طور پر بند ہو گئی ہیں، جن کی کل نصب شدہ صلاحیت ۴۴۳۷۶ کرگھوں کی ہے ان میں ۶ ملیں قومی ملکیت میں چلی گئی تھیں جن میں کل پیداواری صلاحیت کا لگ بھگ ۱۳ فیصد ہوتا ہے۔ پٹ سن صنعت تقریباً ۴۰ لاکھ کسان کنبوں اور لگ بھگ ڈھائی لاکھ صنعتی مزدوروں کو روزگار فراہم کرتی ہے اس کے علاوہ لوگوں کی بڑی تعداد ملک میں خام پٹ سن اور پٹ سن مصنوعات کی تجارت سے وابستہ ہے۔

چینی

چینی صنعت کا ملک کی ان صنعتوں میں دوسرا مقام ہے جو زیادہ تر زراعت پر انحصار رکھتی ہیں۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں چینی ملوں کی تعداد ۱۳۸ تھی جو ۸۴-۱۹۸۳ء میں بڑھ کر ۳۲۶ ہو گئی۔ چینی کی پیداوار ۵۲-۱۹۵۱ء میں ۱۱ لاکھ ۳۴ ہزار ٹن تھی جو ۷۸-۱۹۷۷ء میں بڑھ کر ۶۴ لاکھ ۴۲ ہزار ٹن ہو گئی تھی لیکن اس کے بعد اس کی پیداوار میں کمی ہو گئی جس کی زیادہ تر وجہ گنے کے زیر کاشت رقبہ میں کمی ہونا ہے۔ ۷۹-۱۹۷۸ء میں چینی کی پیداوار کم ہو کر ۵۸ لاکھ ۴۴ ہزار ٹن رہ گئی اور ۸۰-۱۹۷۹ء میں اس میں مزید کمی ہوئی۔ اور وہ ۳۸ لاکھ ۵۹ ہزار ٹن رہ گئی اس کے بعد متعدد ترقیاتی

اقدامات کے نتیجے میں چینی کی پیداوار میں پھر اضافہ ہونے لگا ۱۹۸۰-۸۱ء میں چینی کی پیداوار ۵۱ لاکھ ۴۸ ہزار ٹن تک بڑھی اور ۱۹۸۱-۸۲ء میں ۸۴ لاکھ ۳۸ ہزار ٹن تک کی بلند سطح پر پہنچ گئی ۱۹۸۲-۸۳ء میں چینی کی پیداوار ریکارڈ سطح کے قریب ۸۲ لاکھ ۳۲ ہزار ٹن تھی۔ ۱۹۸۳-۸۴ء میں بعض قدرتی حالات کے باعث چینی کی پیداوار کم ہو کر ۵۹ لاکھ ۸ ہزار ٹن رہ گئی۔ ۱۹۸۳-۸۴ء کے دوران ۷ لاکھ ۴ ہزار ٹن چینی کی برآمد کی گئی جب کہ ۱۹۸۲-۸۳ء میں ۳ لاکھ ۲۲ ہزار ٹن چینی برآمد کی گئی تھی۔ حصول آزادی کے بعد چینی صنعت کے بارے میں ایک قابل ذکر بات یہ ہوئی ہے کہ کوآپریٹو سیکٹر میں اس صنعت کی کافی ترقی ہوئی ہے۔ سر دست ۳۵۵ چینی ملوں میں سے ۱۸۳ ملیں کوآپریٹو سیکٹر میں ہیں۔

۱۶ اگست ۱۹۷۸ء سے ۱۶ اگست ۱۹۷۹ء تک کے مختصر عرصے کے لیے چینی پر سے مکمل کنٹرول ہٹا لینے کے بعد سرکار نے ۱۷ دسمبر ۱۹۷۹ء سے پھر چینی پر جزوی کنٹرول نافذ کر دیا اور دوہری قیمت کی پالیسی اختیار کر لی اس پالیسی کے تحت چینی ملوں کی کل پیداوار کا ۶۵ فیصد سرکار کنٹرول قیمت پر لیوی کی صورت میں خرید لیتی تھی اور باقی ماندہ ۳۵ فیصد پیداوار کو کسی قسم کی کنٹرول قیمت کے بغیر کھلے بازار میں فروخت کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ ۱۹۸۳-۸۴ء میں بھی یہ پالیسی جاری رہی۔

سیمنٹ

سیمنٹ کی پیداوار سب سے پہلے ۱۹۰۴ء میں مدراس میں ہوئی تھی اس وقت سیمنٹ کے ۱۰۳ کارخانے ہیں جن کی کل نصب شدہ صلاحیت ۳۱ مارچ ۱۹۸۵ء کو تقریباً ۴ کروڑ ۲۸ لاکھ ٹن سالانہ تھی۔ ۱۹۸۴-۸۵ء میں سیمنٹ کی کل پیداوار (تمام اقسام کو ملا کر) ۳ کروڑ ٹن ہوئی جب کہ ۱۹۸۰-۸۱ء میں یہ ایک کروڑ ۸۶ لاکھ ٹن تھی اس کے مقابلے میں ۱۹۵۰-۵۱ء میں سیمنٹ کی پیداوار محض ۲۹ لاکھ ٹن تھی۔ سیمنٹ کی تقسیم اور قیمتوں کو موزوں سطح پر رکھنے کے لیے حکومت نے ۲۸ فروری ۱۹۸۲ء سے سیمنٹ پر جزوی طور پر کنٹرول ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ اس اسکیم کے تحت موجودہ سیمنٹ کارخانے اپنی نصب شدہ صلاحیت کا ۶۵ فی فیصد سیمنٹ لیوی سیمنٹ کے طور پر کنٹرول قیمت پر دیں گے لیکن جن کارخانوں نے ۱۹۸۲ء کے بعد تجارتی سطح پر کام شروع کیا ہے اور جن کارخانوں کو "بیمار" قرار دیا گیا ہے وہ اپنی نصب شدہ صلاحیت کا ۵۰ فی صد سیمنٹ لیوی سیمنٹ کی صورت میں دیں گے لیوی سیمنٹ سے مرکزی اور ریاستی سرکار کے محکموں، مرکزی اور ریاستی کارپوریشنوں، بڑی درمیانہ اور چھوٹی صنعتوں کی تعمیر سے متعلق ضروریات پوری ہونگی۔ اور چھوٹے صارفین کو مقررہ حد تک تعمیرات، مکان بنانے اور رہائشی مکانوں کی چھوٹی موٹی مرمت کے لیے سیمنٹ فراہم ہو سکے گا۔

کاغذ اور گتہ

کاغذ صنعت جس میں لگدی، کاغذ، گتا اور اخباری کاغذ شامل ہیں ملک کی بنیادی اہمیت کی صنعتوں میں سے ایک ہے ۱۹۵۰-۵۱ء میں کاغذ اور گتا تیار کرنے والی ۱۷ ملوں کی نصب شدہ صلاحیت [illegible] ٹن تھی اس صنعت نے اس کے بعد تیزی سے ترقی کی ہے چنانچہ یکم جنوری ۱۹۸۵ء کو ملک میں ۳۳ لاکھ ۹۴ ہزار ٹن سالانہ نصب شدہ صلاحیت کے ۲۵۱ یونٹ کام کر رہے تھے۔ ۱۹۵۱ء کی ایک لاکھ ۹ ہزار ٹن پیداوار کے مقابلے میں ۱۹۸۴ء میں پیداوار ۱۴ لاکھ ٹن رہی۔

ملک میں لگدی اور کاغذ پراجیکٹوں کے قیام کے لیے ۱۹۷۰ء میں پبلک سیکٹر کا ادارہ ہندوستان پیپر کارپوریشن لمیٹڈ (کلکتہ) شروع کیا گیا۔ کارپوریشن نے ناگالینڈ میں کاغذ اور لگدی کی ۳۳ ہزار ٹن صلاحیت کا پراجیکٹ شروع کیا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں اس پراجیکٹ نے تجارتی پیداوار شروع کی۔ علاوہ ازیں کارپوریشن نے ۱۹۸۲ء کے دوران کیرل میں ۸۰ ہزار ٹن سالانہ صلاحیت کا اخباری کاغذ کا پراجیکٹ بھی شروع کیا ہے۔

اخباری کاغذ

کچھ عرصہ پہلے نیشنل نیوز پرنٹ اینڈ پیپر ملز لمیٹڈ نیپانگر ملک میں اخباری کاغذ تیار کرنے والا واحد یونٹ تھا اس مل نے جو اب پبلک سیکٹر میں ہے ۱۹۵۵ء میں کام شروع کیا تھا ۷۵ ہزار ٹن سالانہ مقررہ صلاحیت والی اس مل نے ۱۹۸۴ء کے دوران ۳۸۷۴۴ ٹن کاغذ تیار کیا تھا۔ کرناٹک کا میسور لگدی پیپر مل ریاستی سرکار کا ایک ادارہ ہے۔ اس کی ۷۵ ہزار ٹن کی سالانہ صلاحیت کے اخباری کاغذ کے پراجیکٹ نے ۱۹۸۱ء میں پیداوار شروع کی پبلک سیکٹر کے پراجیکٹ ہندوستان پیپر کارپوریشن (اب ہندوستان نیوز پرنٹ لمیٹڈ) کے ۸۰ ہزار ٹن کے سالانہ صلاحیت والے یونٹ کیرل نیوز پراجیکٹ نے ۱۹۸۲ء میں پیداوار شروع کی اس اخباری کاغذ کی گھریلو پیداوار ۱۹۸۱-۸۲ء میں ۵۵۰۲۱ ٹن سے بڑھ کر ۱۹۸۴ء میں ایک لاکھ ۹۹ ہزار ٹن ہو گئی۔

فولاد سازی

بھارت میں لوہے اور فولاد سازی کی صنعت کا آغاز ۱۸۷۴ء میں ہوا جب بنگال آئرن ورکس کمپنی نے کلٹی (مغربی بنگال) میں ایک پلانٹ نصب کیا لیکن فولاد سازی کی پیداوار بڑے پیمانے پر ۱۹۰۷ء میں جمشید پور میں ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کے قیام کے ساتھ شروع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۱۹ء میں برن پور میں انڈین آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کا قیام ہوا ۱۹۲۳ء میں بھدراوتی میں وشویشوریا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کے قیام کے ساتھ پبلک سیکٹر کے پہلے آئرن اینڈ اسٹیل نے کام شروع کیا ہے۔

حصول آزادی کے بعد فولاد سازی کی صنعت کے فروغ کے بارے میں پہلے پانچ سالہ منصوبے میں غور کیا گیا لیکن اس پر کام دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں ہو سکا جس میں ۱۰-۱۰ لاکھ ٹن فولادی گولوں کی صلاحیت کے تین پراجیکٹ بھلائی، درگاپور اور رورکیلا میں قائم کیے گئے۔ پرائیویٹ سیکٹر کے فولاد سازی کے دو کارخانے ٹسکو اور اسکو کی پیداواری صلاحیت بالترتیب ۲۰ لاکھ اور ۱۰ لاکھ ٹن بڑھانے کا کام ہاتھ میں لیا گیا پبلک سیکٹر کے تین کارخانوں میں پیداوار ۱۹۶۵ اور ۱۹۶۲ء کے دوران شروع ہوئی۔ پرائیویٹ سیکٹر کے کارخانوں کی توسیع ۱۹۵۹ء میں ہوئی تیسرے پانچ سالہ منصوبے میں پبلک سیکٹر کے تینوں فولاد سازی کے کارخانوں کی توسیع اور بوکارو میں ایک فولاد سازی کے کارخانے کے قیام پر زور دیا گیا چونکہ پانچ سالہ منصوبے کی بنیاد یہ تھی کہ موجودہ فولاد سازی کے کارخانوں کی صلاحیت

کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاتے اور سیلم تامل ناڈو، وجے نگر (کرناٹک) اور وشاکھاپٹنم (آندھرا پردیش) میں فولاد سازی کے نئے کارخانے قائم کرکے فولاد سازی کی صلاحیت اس قدر بڑھائی جائے کہ وہ پانچویں منصوبے کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

لیکن پانچویں منصوبے کے اخیر میں ہی جو ایک برس پہلے ۳۱ مارچ ۱۹۷۵ء کو ختم ہو گیا تھا یہ ممکن ہو سکا کہ ۲۶ فروری ۱۹۷۸ء کو بوکارو پلانٹ کے چالو ہو جانے پر فولاد سازی کی پیداواری صلاحیت میں لگ بھگ ۱۷ لاکھ ٹن کا اضافہ ہوا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۷۴ء تک فولادی گولوں کی پیداوار جو ۸۹ لاکھ ٹن تھی وہ ۳۱ مارچ ۱۹۸۴ء تک بڑھ کر ۱۱۶ لاکھ ٹن ہو گئی۔

سٹیل اتھارٹی آف انڈیا

سٹیل اتھارٹی آف انڈیا لمیٹڈ پورے طور پر بھارت سرکار کا ملکیتی ادارہ ہے یہ پانچ سٹیل پلانٹوں یعنی بھلائی، راؤرکیلا، درگاپور، بوکارو، برن پور اور اس کے ساتھ ہی سیلم اور الائے اسٹیل پلانٹوں کے انتظام کے لیے ذمہ دار ہے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۸۵ء کو کمپنی کا منظور شدہ سرمایہ ۴۰ ارب روپے اور ادا شدہ سرمایہ ۳۷ ارب ۳۱ کروڑ ۴۵ ہزار روپے تھا اس میں ایک ارب ۳ کروڑ ۳ لاکھ روپے کے تبرعوں کا سرمایہ بھی شامل ہے۔ ۸۴-۱۹۸۵ء کے دوران کمپنی کی کل پیداوار ۳۷ ارب ۱۱ کروڑ ۲۴ لاکھ روپے (انترم) کی تھی۔

چھوٹے فولادی پلانٹ

بجلی کی فولادی بھٹیاں جنھیں عام طور پر فولادی پلانٹ کہا جاتا ہے ردی (اسکریپ) دھاتوں اور سپنج لوہے سے فولاد تیار کرتی ہیں۔ یہ پلانٹ ہمارے ملک کی فولاد سازی کی صنعت کا اہم حصہ ہیں۔

اس وقت ملک میں ۱۸۹ چھوٹے فولادی پلانٹ ہیں جن کی کل لائسنس شدہ سالانہ پیداواری صلاحیت ۵۳ لاکھ ٹن سالانہ سے زیادہ ہے۔ ان میں سے ۱۵۰ پلانٹوں میں کام ہو رہا ہے اور انھوں نے تجارتی سطح پر پیداوار شروع کر دی ہے باقی ماندہ تکمیل کے مختلف مرحلوں میں ہیں۔ ۱۹۸۴ء کے دوران یونٹوں کی پیداوار ۲۳ لاکھ ۳۰ ہزار ٹن رہی۔

ٹرانسپورٹ

۱۹۸۴ء میں ٹرانسپورٹ کے شعبے میں ۹۳۲۵۸ تجارتی گاڑیاں تیار کی گئیں جن میں کاریں ۶۴۱۰۲، جیپیں ۲۴۴۹۸ اور ریلوے ویگنیں ۱۵۴۴ تھے۔ زرعی ٹریکٹروں کی پیداوار ۸۲۵۰۰ تھی

ماروتی انڈسٹریز لمیٹڈ نے جو جاپان کی سوزوکی موٹر کمپنی کے مالی و تکنیکی اشتراک سے اس شعبے میں آئی ہے دسمبر ۱۹۸۳ء میں کمپنی کی طرف سے بنائی ہوئی پہلی کار کی تقسیم کی ۸۴-۸۵ کے دوران ۲۵۵۳ مسافر کاریں اور ۱۰۳ دیگر کاریں تیار کی گئیں

مشینی اوزار

مشینی اوزاروں کی پیداوار کے منظم شعبوں (پبلک اور پرائیویٹ سیکٹروں) میں ۱۹۶۱ء میں ۶ کروڑ روپئے سے ۱۹۸۳ء میں ۲ ارب ۸۶ کروڑ روپئے تک بڑھ گئی ہے ۱۹۸۴ء میں مشینی اوزاروں کی پیداوار ۲ ارب ۱۹ لاکھ روپئے کی ہوئی۔ ملک میں مشینی اوزاروں کی کل پیداوار کا تقریباً ۱۵ فیصد برآمد کیا گیا۔

ہندوستان مشین ٹولز لمیٹڈ مشینی اوزاروں کو تیار کرنے والا ایک بڑا ادارہ ہے۔ ایچ ایم ٹی کے متعدد کارخانوں میں ۱۹۸۴-۸۵ء کے دوران میں ایک ارب ۲۹ کروڑ روپیے کے اوزار بنائے گئے

بھاری برقی ساز و سامان کی صنعت

بجلی کے ساز و سامان کی صنعت ملک کی اندرونی ضروریات کو پورا کرنے میں تقریباً خودکفیل ہو گئی ہے۔ پبلک سیکٹر کا ادارہ بھارت ہیوی الیکٹریکلز لمیٹڈ ملک میں بجلی کی پیداوار میں کام آنے والا ساز و سامان تیار کرتا ہے۔ ساز و سامان تیار کرنے والے کارخانے بھوپال، ترچی، حیدرآباد، ہردوار، رانی پیٹ، جگدیش پور اور بنگلور میں ہیں۔ سال ۱۹۸۵ء میں پیداوار ۱۵ ارب ۴۲ کروڑ روپئے کی ہوئی تھی جو برس ۸۴-۱۹۸۳ء کے مقابلے میں جو ۱۳ ارب ۲۵ کروڑ روپئے تھی ۱۶ فیصد زیادہ تھی

کیمیاوی کھاد

فرٹیلائزر یعنی کیمیاوی کھاد صنعت کی پچھلے برسوں کی منصوبہ بندی اور ترقی سے بھارت دنیا کے سرکردہ فرٹیلائزر پیدا کرنے والے ممالک میں سے ایک ہو گیا ہے۔ زراعت کی ترقی میں فرٹیلائزر اہم حصہ ادا کرتا ہے اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ملک میں فرٹیلائزر کے ۳۸ بڑے کارخانے ہیں جن میں عام نائٹروجن آمیز فاسفیٹ فرٹیلائزر تیار کیے جاتے ہیں اس کے علاوہ تقریباً ۴ چھوٹے کارخانے ہیں جن میں صرف سپر فاسفیٹ فرٹیلائزر تیار کیے جاتے ہیں اور چھ کارخانوں میں ضمنی پیداوار کی صورت میں امونیم سلفیٹ تیار ہوتا ہے۔ ۸۵-۸۶ء کے دوران پانچ نئے فرٹیلائزر پلانٹوں کے ذریعہ تجارتی پیمانے پر پیداوار شروع ہونے کی امید ہے ان کے علاوہ ۸ فرٹیلائزر پراجیکٹ تکمیل کے مختلف مرحلوں میں ہیں۔

نائٹروجن کی پیداواری صلاحیت ۵۲-۱۹۵۱ء میں ۸۵ ہزار ٹن سے بڑھ کر ۸۴-۸۵ء میں ۵۱ لاکھ ۹۵ ہزار ٹن ہو گئی۔ فاسفیٹ فرٹیلائزر کی پیداواری صلاحیت ۵۲-۱۹۵۱ء میں ۶۳ ہزار ٹن سے بڑھ کر ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۱۴ لاکھ ۸۸ ہزار ٹن ہو گئی۔ حکومت کی کوشش ہے کہ کسانوں کو واجب قیمت پر فرٹیلائزر دستیاب ہو تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ فرٹیلائزر کا استعمال کریں جس سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہو۔ اس مقصد کے لیے حکومت نے ۲۹ جون ۱۹۸۳ء سے فرٹیلائزر کی قیمتوں میں ۷.۵ فیصد کی کٹوتی کی ہے۔ اب تک وہی قیمتیں لاگو ہیں۔

(باقی صفحہ ۶ پر)

پروفیسر بپن چندر

کیا کچھ پایا اور کیا کچھ پانا باقی ہے

ہر ملک کو کامیابیاں اور ناکامیاں پیش آتی ہیں۔ اسی طرح ہمیں بھی پیش آئی ہیں۔ اس مضمون میں مصنف نے گذشتہ ۴۰ برسوں میں مختلف شعبوں جیسے معیشت، تعلیم، سماج اور قومی یکجہتی میں ہماری کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ آغاز اچھا ہے اور ہمیں جو ناکامیاں پیش آئی ہیں ان پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

بھارت کو آزاد ہوئے ۳۹ برس سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے۔ لہٰذا اب وقت ہے کہ قومی حالات کا جائزہ لیا جائے۔ اس عرصے میں جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں ان پر اظہار مسرت کیا جائے اور جو ناکامیاں یا ادھورے کام رہ گئے ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک نوآبادیاتی طاقت سے سیاسی اقتدار حاصل کرنا ہی از خود ایک بڑی کامیابی ہے۔ لیکن اقتصادی اور ثقافتی آزادی اور ترقیات کا حصول اور ان کے لیے مساعی ایک طویل عمل ہے۔

۱۹۵۰ء کی ابتدائی دہائی میں پانچسالہ منصوبوں کے آغاز کے ساتھ اقتصادی ترقی اور خود کفالت کی جانب بڑے بڑے اقدامات کئے گئے۔ آج بھارت خوراک میں خود کفیل ہے۔ ایک بڑے مشینی سیکٹر کی تعمیر کی گئی ہے۔ بھارت کی معیشت دنیا میں نہایت پیچیدہ اور گوناگوں معاشیات میں سے ایک ہے۔ بھارت میں سائنسدانوں اور ٹیکنیشینوں کی بہت بھاری تعداد ہے۔ گو وہ کافی تربیت یافتہ نہیں ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ معیشت کے تقریباً تمام بنیادی صنعتی، ٹرانسپورٹ، برقی، تجارتی اور مالی سیکٹروں پر بھارت کا کنٹرول ہے اور اس کے لیے دونوں پبلک اور پرائیویٹ سیکٹروں کو بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ سوشلسٹ ممالک کے باہر بمشکل کوئی واحد ملک ہوگا جہاں کثیر القومی کارپوریشن معیشت میں اس قدر چھوٹا اور غیر کنٹرولی کردار ادا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر غیر ملکی سرمایہ بھارت کی قومی آمدنی کے ۳ فیصد سے بھی کم ہے۔ غیر ملکی قرضے پر بھارت کا انحصار کم ہے گو وہ پیداوار کے عالمگیر مقابلے کے لحاظ سے معمولی نہیں ہے۔ بھارت دفاع میں بہت حد تک خود کفیل ہے گو وہ ابھی تک بعض نہایت اعلیٰ قسم کا دفاعی ساز و سامان بیرونی ممالک سے خریدتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں بھارت ابھی تک ایک غریب اور ترقی پذیر ملک ہے تاہم اس نے نوآبادیاتی نظام کے شکنجے اور ریشہ دوانیوں سے خود کو بچا رکھا ہے۔

. . اور ناکامیاں

اقتصادی شعبے میں ہماری ناکامیاں بنیادی طور پر آمدنی کی تقسیم یا قومی پیداوار میں حصہ داری کے معاملے میں ہیں۔ ہم نے ایک سوشلسٹ سماج کی تعمیر کا قصد کیا تھا۔ لیکن ایک منصفانہ سرمایہ دارانہ نظام قائم کرنے میں بھی ناکام رہے ہیں۔ ہمارا سماج اپنی سماجی اور طبقاتی بناوٹ کے لحاظ سے قطعاً غیر مساوی اور غیر منصفانہ ہے۔ ہماری ۳۰ فیصد آبادی انتہائی افلاس میں زندگی گذار رہی ہے یہ ہر حساس بھارتی کے لیے باعث شرم ہے۔ ہمارے شہروں میں جھگی جھونپڑیاں اس انسانیت سوز حالت کی شاہد ہیں جو ہم اپنے

اردگرد برداشت کر رہے ہیں۔ ہمارے بڑے شہروں کی مادی، سماجی اور ثقافتی زندگی کا معیار دن بہ دن گرتا جا رہا ہے۔ اُن میں سے تقریباً تمام کسی ایک یا دوسرے مرحلے میں دم توڑنے کے عمل میں ہیں۔ ہماری ماحولی زندگی روزانہ دیہات میں بھی بگڑ رہی ہے۔ ہم ایک ایسا بنیادی ڈھانچہ بنانے میں ناکام رہے ہیں جو ایک جدید صنعتی اور زراعتی معیشت کو تھام سکے۔ حتیٰ کہ کام کاج، باہمی تعاون اور سماجی ذمہ داری سے متعلق ہماری اخلاقی قدریں بھی تیزی سے زوال پذیر ہو رہی ہیں۔

ایک جمہوری اور شہری آزادی پر مبنی سرکاری تنظیم کا قیام اور برقراری آزاد بھارت کی ایک بڑی کامیابی ہے۔ ہم نے اس سرکاری تنظیم کو ۳۹ برس سے برقرار رکھا ہے۔ یہ ایک ایسی کامیابی ہے جس کا مقابلہ چند جدید قومی مملکتیں ہی کر سکتی ہیں ــ جواہر لال نہرو بڑے شوق سے کہتے تھے کہ بھارت ایک ایسا کارِ عظیم انجام دے رہا ہے جس کے لیے کوئی دوسرا ملک کوشش بھی نہیں کر رہا، یعنی جیسا کہ بعض ماہرینِ اقتصادیات کہیں گے ہمارا ملک جمہوری نظام میں شہری آزادیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اقتصادی طور پر ترقی کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ تقریباً تمام ترقی یافتہ ممالک کسی قدر مطلق العنانیت کے تحت اور یقیناً مزدور تنظیموں کے حقوق سے دوچار ہوئے بغیر ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے ہیں لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت نے جمہوریت اور شہری آزادیوں کے اُن بلند آدرشوں کی تکمیل کی ہے جو حریت پسندوں کی نسلوں سے ہمیں میراث میں ملے ہیں خواہ اس کام میں الخرافات اور کمزوریاں بھی پیش آئی ہیں۔

سماجی منظر

سماجی شعبے میں بھی ہمیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ جدوجہد آزادی کے مقاصد کی تکمیل کے لیے ہمارے آئین نے ذات پات، جنس اور مذہب کی بنا پر امتیاز کو ختم کر دیا۔ گو تمام لوگوں تک کم از کم تعلیم کی سہولیات پہونچانے میں یقیناً ہمیں بہت کم کامیابی حاصل ہوئی ہے تاہم خواتین اور پسماندہ ذاتوں نے ان محدود تعلیمی مواقع سے بڑا فائدہ اُٹھایا ہے۔ سیاسیات اور کام دھندوں میں خواتین کی شرکت کم ہے لیکن بیشتر دوسرے ممالک سے موافقانہ طور پر اُن کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ سماجی آزادی یا اُس کے شعور کا بھی بڑا حصہ ابھی تک متوسط طبقہ کی خواتین تک محدود ہے۔

اسی طرح دلِت یعنی دبی ہوئی ذاتوں کے لوگ زیادہ تر بیدار ہو رہے ہیں۔ وہ اب اپنی سماجی حالت کو قبول کرنے کو تیار نہیں اور وہ اپنے پیدائشی حقوق کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ بدتر بات یہ ہے کہ ذات پات کے نظام اور خواتین کے غیر منصفانہ حالات کے خلاف ہم کوئی مؤثر تحریک نہیں چلا پائے۔ خواتین، پسماندہ ذاتوں اور قبائلی عوام کے خلاف وسیع پیمانے پر کیے جانیوالے جرائم اس امر کا ثبوت ہیں کہ اُن کی سماجی حالت متواتر خراب ہے اور کہ وہ اس سماجی حالت کو برداشت کرنے سے سراسر انکار کر رہے ہیں۔

تعلیم کا رُتبہ

اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے ایک بڑے نظام نے گذشتہ ۳۹ برس میں فروغ پایا ہے مثال کے طور پر ۱۸۸۰ء میں تمام ملک میں جتنے گریجویٹ تیار ہوئے تھے اب دلی، کانپور یا دیہ واڑہ کا ایک واحد کالج اُن سے زیادہ گریجویٹ تیار کر رہا ہے۔ اسی طرح ۹۰ فیصد بچے اب ایک ایسے اسکول میں جا رہے ہیں جہاں وہ چاہیں تو پیدل پہونچ سکتے ہیں۔ تاہم ہمارے نظامِ تعلیم میں بعض بڑی کمزوریاں موجود ہیں۔ اول ہمارے لوگوں کی اکثریت جن میں ۱۹۴۷ء کے بعد پیدا ہونے والے شامل ہیں ناخواندہ ہے۔ بچوں کی بھاری تعداد ۵ سالہ پرائمری نصاب پاس نہیں کرتی۔ ہماری سماجی سائنس اور شاید فزیکل سائنس بھی نوآبادیاتی ڈھنگ سے سامراجی ممالک پر انحصار رکھتی ہیں گو یہ کام اکثر بین الاقوامی سائنس کے نام پر کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جہاں غیر ملک کی کشش ابھی تک بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ یہ بات ہماری ثقافت کے بیشتر دوسرے بڑے شعبوں کے بارے میں بھی سچ ہے۔

۔۔ اور قومی یک جہتی

ہماری سامراج دُشمن تحریک نے بھارتی عوام کو ایک قوم میں جوڑنے کا مشکل اور پیچیدہ عمل شروع کیا تھا۔ جدوجہد آزادی کے دوران بھی اس عمل کو بڑی اور متواتر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بات ۴۷ء کے بعد کے عرصے کے بارے میں بھی سچ ہے۔ اس امر کے باوجود کہ ہمارا ملک بہت بڑا ہے اور یہاں وسیع پیمانے پر لسانی، ثقافتی، مذہبی اور نسلی گوناگونی پائی جاتی ہے ہم ایک رہے ہیں اور ایک عوام، ایک قوم ہونے کے احساس کو تقویت حاصل ہوئی ہے۔ لیکن یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہی ایک جاری رہنے والا عمل ہے جو پایۂ تکمیل کے قریب نہیں پہنچا۔ بدقسمتی سے حصولِ آزادی کے بعد اس سلسلے میں کوششیں ڈھیلی پڑ گئی ہیں۔ یہ عوامی سطح پر بالخصوص سچ ہے جہاں قومی یک جہتی کی مصلحتوں کو قلیل المدتی سیاسی فوائد کی خاطر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آج ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بھارت فرقہ پرستی، ذات پات اور علاقہ پرستی کے نرغے میں آ گیا ہے۔ پنجاب، دلی، احمد آباد، حیدر آباد، بہار اور یو۔پی کے دیہات کے واقعات نے بڑے بڑے رجائیت پسندوں کو بھی مایوس بنا دیا ہے۔ محض بھارتی

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

فرقان قمر - توقیر عالم فاروقی*

بیرون ملکی قرض و معاشی ترقی ایک جائزہ

اقتصادی ترقی سے مراد کسی ملک مخصوص میں زرکی فراوانی یا بہتات سے نہیں ہے بلکہ اقتصادی ترقی کا معیار یہ ہوتا ہے کہ وہ ملک ممکن حد تک نفع بخش طور پر اپنے قدرتی و معاشی وسائل کے استعمال کی صلاحیت رکھتا ہو۔ کسی ملک کی اقتصادی ترقی اور وہاں کے عوام کی خوشحالی میں گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ اقتصادی طور پر ترقی یافتہ ممالک بین الاقوامی سطح پر اپنا منفرد و مخصوص مقام تو رکھتے ہی ہیں ساتھ ہی اندرون ملک حالات مستحکم ہوتے ہیں اور وہاں کے عوام خوشحال۔ انھیں وہ تمام آسائشیں و سہولیات بہ آسانی دستیاب ہوتی ہیں جو دنیاوی اعتبار سے آرام دہ، باعزت اور پر وقار زندگی گذارنے کے لئے ضروری ہو سکتی ہیں علاوہ ازیں اقتصادی ترقی کا اثر اس ملک کی دیگر سماجی و معاشرتی سرگرمیوں پر بھی پڑتا ہے۔ معاشی طور پر ترقی یافتہ ممالک علم و سائنس کے میدان میں پیش پیش ہوتے ہیں اور منفرد تہذیب و ثقافت کے حامل بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام ممالک جو پائیدار مستقبل کے خواہاں ہیں غیر ترقی یافتہ سے ترقی پذیر، ترقی پذیر سے ترقی یافتہ و ترقی یافتہ سے مزید ترقی یافتہ بننے کی جستجو میں لگے ہوتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد غیر ترقی یافتہ ممالک کو شدت سے احساس ہوا کہ ان کی اپنی بقا کے لیے ترقی نہایت ضروری ہے۔ لہٰذا معاشی ترقیاتی سرگرمیوں میں قدرے تیزی آئی۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دنیا کا ہر ملک اپنی موجودہ ترقی پر قناعت نہیں کر سکتا اس لئے دنیا کا ہر ملک ہر قیمت پر مزید معاشی ترقی کے حصول کے لیے ہر دم کوشاں رہتا ہے مگر ترقی پذیر و غیر ترقی یافتہ ممالک کے ترقیاتی مسائل ترقی یافتہ ممالک کے ترقیاتی مسائل سے قدرے مختلف و کہیں زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے پاس مالی و اقتصادی وسائل کی بہتات تو نہیں ہوتی لیکن اتنی قلت بھی نہیں ہوتی جتنی کہ ترقی پذیر ممالک میں محسوس کی جاتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کا مسئلہ ترقیاتی ترجیحات طے کرنا ہوتا ہے۔ جب کہ غیر ترقی یافتہ ممالک کی ترجیحات طے شدہ ہوتی ہیں اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اقتصادی و مالی وسائل فراہم کرنا بنیادی مسئلہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ترجیحات کا طے کرنا اتنا بڑا مسئلہ نہیں جتنا کہ ذرائع کی فراہمی۔ اس سے قطع نظر اس بات سے ہم سب واقف ہیں کہ امارت بہت سے مسائل خود بخود حل کر دیتی ہے جب کہ غربت نت نئے مسائل جنم دیتی ہے، روپیہ روپئے کو کھینچتا ہے جب کہ منہگائی میں آٹا اکثر گیلا ہوتا ہے۔

ایک مشہور ماہر معاشیات راگنر نرکسے (ROGNER NURKSEY) نے اقتصادی افلاس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ایک ملک کی غربت کا بنیادی سبب اس کی اپنی غربت ہے"۔ راگنر نے ثابت کر دیا ہے کہ غریب ممالک غربت کے گھناؤنے گورکھ دھندے میں پھنسے ہوتے ہیں ایک ملک اس لیے مفلس و غریب ہوتا ہے کہ وہاں کے عوام مفلس ہیں، ان کی آمدنی قلیل حد تک محدود ہے اور وہ بمشکل اپنی زندگی کی تمام بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کر پاتے ہیں۔ ان کے پاس اتنی آمدنی نہیں کہ وہ اپنی ضرورتوں کے بعد کچھ پس انداز کر سکیں لہٰذا ملک میں بچت کا فقدان ہوتا ہے بچت پر ہی سرمایہ کاری کا انحصار ہوتا ہے اور قلیل بچت سے محدود سرمایہ کاری ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ نتیجتاً ملک میں خاطر خواہ صنعتی و تجارتی ترقی ممکن نہیں ہو پاتی جس سے ملک میں بے روزگاری بڑھتی ہے، مزدوری کی شرح گر جاتی ہے اور آمدنی کے ذرائع مزید کم ہو جاتے ہیں، اس طرح غربت و افلاس کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ اس کے برعکس ترقی یافتہ ممالک میں عوام بحیثیت مجموعی عام طور پر خوشحال ہوتے ہیں کیونکہ آمدنی وافر ہوتی ہے۔ ایسے ممالک میں بچت و سرمایہ کاری زیادہ ہونے کے باعث معیشت پائیدار و ملک اقتصادی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے۔

عوام الناس کی قوت خرید بھی تجارتی و صنعتی سرگرمیوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ غیر ترقی یافتہ ممالک میں عوام کی قوت خرید کم ہونے کے باعث بازار میں بیشتر اشیا کی مانگ کا فقدان ہوتا ہے لہٰذا وہ عناصر جن کے پاس سرمایہ لگانے کی استطاعت و صلاحیت ہوتی ہے وہ بھی غیر تسلی بخش تجارت و منافع کی وجہ سے صنعتیں و تجارتی ادارے قائم کرنے میں پہلو تہی سے کام لیتے ہیں۔

مندرجہ بالا بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ پسماندگی و افلاس ایک مسلسل عذاب ہے۔ جس سے نجات

* شعبہ کامرس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

آسان نہیں - پھر سوال اٹھتا ہے کہ پسماندہ ممالک کی اقتصادی ترقی کیونکر ممکن ہو؟ پریٹو (PARETO) اور اس کے حامیوں کا خیال ہے کہ پسماندگی سے نجات از خود ممکن ہے کیونکہ ملک مخصوص کی بازاری سرگرمیاں بذات خود افلاس و امارت کی حدود متعین کرتی ہیں - ان کا خیال ہے کہ کھلے بازار کی پالیسی (LAISEZZ FAIRE) ملکی معیشت کو مانگ و سپلائی کے قاعدے و قانون کے مطابق خود ایڈجسٹ کرتی رہتی ہے اس لیے حکومتوں کو ترقیاتی امور میں کم سے کم دخل دینا چاہیے - گو فلسفہ کے اعتبار سے پریٹو اور اس کے حامیوں کی تھیوری درست ہے لیکن ماہرین معاشیات کے ایک بڑے طبقے کا خیال ہے کہ آج کے تیز رفتار زمانے میں کسی ملک کے پاس اتنا حوصلہ و سکت نہیں کہ وہ اس وقت کا انتظار کر سکے - جب بازاری سرگرمیاں ہموار ہو جائیں اور وہ اقتصادی طور پر ترقی یافتہ ملک بن جاتے "کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک" کے مصداق، ہر ملک ہر ممکن کوشش سے جلد از جلد ترقی کے منازل طے کر کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہونا چاہتا ہے اس کے علاوہ جدید دور میں جب کہ بیشتر ممالک جمہوری طرز حکومت پر چلائے جا رہے ہیں - حکومت کی یہ ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ کم سے کم مدت میں اپنے عوام کو خوشحالی کا راستہ دکھائے تاکہ انھیں اپنی ضرورت کی تمام آسائشیں و سہولتیں بہ آسانی دستیاب ہو سکیں اسے ہم ویلفیر اسٹیٹ کی پالیسی کا نام دے سکتے ہیں

اقتصادیات کے پنڈتوں نے چند ایسے اصول و ضوابط وضع کر دیئے ہیں جن سے قدرے کم وقت میں اقتصادی ترقی نہ صرف ممکن ہے بلکہ بہت سے ممالک ان سے استفادہ کرتے ہوئے ترقی کی منازل طے بھی کر رہے ہیں - بیشتر ماہرین اقتصادیات کا خیال ہے کہ عوامی بچتیں اور ان سے حاصل کیا جانے والا سرمایہ ترقیاتی پروگراموں کی کامیابی میں اہم مقام رکھتا ہے چونکہ غریب ممالک میں عوامی بچتیں قدرے کم ہوتی ہیں اس لیے غیر ممالک سے وسائل فراہم کیے جا سکتے ہیں اور ان سے ایسے ترقیاتی پروگراموں کی ابتدا کی جا سکتی ہے جو کم مدت میں ملک کی اقتصادی حالت کو پائیداری بخش سکتے ہیں - غیر ملکی قرض و امداد کے ذریعہ اقتصادی ترقی کے اس فارمولے کو ترقی یافتہ ممالک نے اپنا پورا تعاون دیا - دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کے بیشتر ممالک کی اقتصادی حالت قدرے خراب ہو گئی تھی اور تمام ممالک کی یہ مشترکہ ذمہ داری سمجھی گئی کہ ان ملکوں کی معاشی صورت حال بہتر بنائی جائے - دوسری طرف ترقی یافتہ ممالک کو بھی یہ احساس ہوا کہ وہ ترقی کی جس منزل پر پہنچ چکے ہیں اس پر ان کا قیام و مزید ترقی، دنیا کے دیگر ممالک کی اقتصادی ترقی پر منحصر ہے - لہذا انھوں نے بھی بڑھ چڑھ کر پسماندہ ممالک کی اقتصادی ترقی کے لیے مالی و دیگر تعاون دینے کا سلسلہ شروع کر دیا -

دور جدید میں غیر ملکی وسائل مختلف طریقوں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں جن میں غیر ملکی قرض و امداد کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر کچھ ایسے مالیاتی ادارے و ایجنسیاں قائم ہو گئی ہیں جو کم ترقی یافتہ ممالک کے معاشی، صنعتی، زرعی، تجارتی، تعلیمی و سماجی ترقیاتی پروگراموں کے لیے رعایتی قرض و امداد فراہم کرتی ہیں ترقی پذیر ممالک میں غیر ملکی وسائل کی آمد کا سلسلہ ۱۹۵۰ء سے شروع ہوا اور اب تک اس میں گرانقدر اضافہ ہوا ہے ذیل میں دیئے گئے گوشوارہ نمبر ۱ سے ظاہر ہے کہ ۱۹۵۵ء میں ترقی پذیر ممالک پر بین الاقوامی قرض کا بوجھ آٹھ ہزار ملین ڈالر تھا جب کہ بین الاقوامی بینک کے جدید ترین تخمینہ کے مطابق ۱۹۸۴ء میں ترقی پذیر ممالک ۹ لاکھ ملین ڈالر کے مقروض ہیں -

بیرون ملکی قرضہ جات میں اس اضافے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں -

(۱) لامحدود اقتصادی ترقیاتی ضرورتوں کے پیش نظر ترقی پذیر ممالک کو بے پناہ معاشی و مالی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ غیر ملکی حکومتوں و بین الاقوامی ترقیاتی اداروں و ایجنسیوں سے بطور امداد مختصر رقم ہی مل سکتی ہے اس لیے ترقی پذیر ممالک کو قرض پر انحصار کرنا پڑتا ہے -

(۲) بیرون ملکی امداد (خواہ وہ غیر ملکی حکومتوں سے ملی ہو یا بین الاقوامی ترقیاتی اداروں سے) اکثر مشروط ہوتی ہیں جس کے کچھ سیاسی اثرات بھی ہوتے ہیں جن سے مقروض ممالک کی یکجہتی، سالمیت، خودمختاری و وقار کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے گو بین الاقوامی ترقیاتی اداروں کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا مگر ان اداروں سے نہایت قلیل رقم ہی حاصل کی جا سکتی ہے دوسرے کچھ ایسے اشارات بھی ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بین الاقوامی ترقیاتی ادارے بھی ترقی یافتہ ممالک کے زیر اثر کام کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر ان کی پالیسی ایسی ہوتی ہے جس سے ترقی یافتہ ممالک کو ہی فائدہ پہنچے ایسی صورت میں ترقی پذیر ممالک امداد

گوشوارہ نمبر ۱

(ترقی پذیر ممالک پر مجموعی قرض کا بار)

سال		بیرون ملک قرضہ جات (ہزار ملین ڈالر میں)
۱۹۵۵		۸
۱۹۶		۱۶
۱۹۶۵		۳۴
۱۹۷۳		۷۳
۱۹۷۷		۲۸۵
۱۹۸۲		۷۰۰
۱۹۸۴		۹۰۰

گوشوارہ نمبر ۲
نوعیت کے اعتبار سے بین الاقوامی وسائل

تفصیلات / نوعیت		غیر ملکی وسائل (فیصد)	
	۱۹۷۰	۱۹۷۵	۱۹۸۹
رعایتی قرض و امداد غیر رعایتی قرض	۴۳ ۳۸	۳۸ ۴۲	۳۵ ۴۹
براہ راست سرمایہ کاری	۱۹	۲۰	۱۷
میزان	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰

بحوالہ - OECD 1980 REVIEW [1] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو
PRIME ESHAG "FISCAL AND MONETARY POLICIES AND PROBLEMS IN DEVELOPING COUNTRIES' MODERN CAMBRIDGE ECONOMIC SERIES (CAMBRIDGE) UNIVERSITY PRESS-1983

کے مقابلے قرض کو بہتر تصور کرتے ہیں۔

(۳) گذشتہ دہائیوں میں ترقی پذیر ممالک بیرون ملکی قرضہ جات کا استعمال اقتصادی ترقیاتی پروگراموں تک محدود نہیں رکھ سکے۔ نتیجتاً اول تو ملک میں اس قدر اقتصادی ترقی ممکن نہ ہو سکی جتنی ہونی چاہیے تھی دوئم قرض کی ادائیگی دشوار ہو گئی۔ بعض ممالک کو اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے مزید قرض بھی حاصل کرنا پڑا ہے۔

(۴) گذشتہ چند سالوں سے ترقی پذیر ممالک دفاعی امور پر بے پناہ سرمایہ لگانے لگے ہیں۔ احساس عدم تحفظ و جنگی ٹکنالوجی میں دن دونی رات چوگنی ترقی کے باعث یہ ممالک جدید ترین اسلحہ جات و جنگی ساز و سامان و ٹکنالوجی حاصل کرنے کی دوڑ میں کافی بڑے پیمانے پر زرمبادلہ ترقی یافتہ ممالک کو برآمد کرنے لگے ہیں نتیجتاً اپنی ترقیاتی و بنیادی ضرورتوں کے واسطے ملک میں زرمبادلہ کی کمی محسوس کی جاتی ہے اور غیر ملکی قرض کا سہارا لینا پڑتا ہے

(۵) پٹرولیم کی بڑھتی ہوئی قیمتوں نے ترقی پذیر ممالک کے زرمبادلہ پر کافی بار ڈالا ہے اور اندرون ملک پٹرولیم اور اس سے بننے والی دیگر اشیاء کی درآمدات چونکہ ضروری ہیں، بیرون ملکی قرضہ جات میں قدرے اضافہ ہوا ہے

پیش نظر گوشوارہ نمبر ۲ سے صاف ظاہر ہے کہ بیرون ملکی قرض میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے جبکہ بیرون ملکی امداد میں بتدریج کمی واقع ہو رہی ہے، اسی کے ساتھ دوسری طرف ترقی پذیر ممالک کا بیرون ملکی وسائل کا انحصار بڑھتا جا رہا ہے۔

گو بیرون ملکی قرض و امداد کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن کسی بھی چیز کی کثرت نقصان دہ ہوتی ہے، اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بیرون ملکی قرضہ جات کی کوئی حتمی حد ہے؟ اگر ہاں تو اس حتمی حد کا تعین کن عناصر پر مبنی ہے؟ ساتھ ہی ساتھ یہ سوال پیدا ہونا بھی لازمی ہے کہ کیا ترقی پذیر ممالک قرضہ جات کا منافع بخش و پیداواریت بخش استعمال کرنے میں خاطر خواہ حد تک کامیاب رہے ہیں یا نہیں۔ ذیل میں ہم حقائق کی روشنی میں انھیں سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے

بیرون ملکی قرض کے سلسلے میں ایک بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے وہ یہ کہ قرض ایک معینہ مدت کے اندر واجب الادا ہوں گے، ادائیگی کی رقم سود کی وجہ سے اصل قرضے کی رقم سے زیادہ ہوگی اور قرض کی ادائیگی بین الاقوامی کرنسی یعنی زرمبادلہ کی شکل میں ہوگی ان بنیادی حقائق کی بنا پر بیشتر ماہرین اقتصادیات متفق ہیں کہ بیرون ملکی قرض کا بہترین استعمال ان ترقیاتی پروگراموں میں مانا جاتا ہے گا جو مقروض ملک کی بین الاقوامی تجارت خصوصاً برآمدات کو فروغ دے سکیں تاکہ برآمدات سے حاصل ہونے والے زرمبادلہ سے بیرون ملکی قرضہ جات کی ادائیگی بہ آسانی کی جا سکے۔ حال ہی میں شائع بین الاقوامی ترقیاتی رپورٹ (۱۹۸۶ء) میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ ترقی پذیر ممالک تقریباً ۹ لاکھ ملین ڈالر کے مقروض ہیں جن پر اوسطاً پندرہ فیصد کی شرح سے سود واجب الادا ہوتا ہے۔

ایک دوسرے تخمینہ کے مطابق ترقی پذیر ممالک کا ہر فرد پانچ سو ڈالر کا مقروض ہے جسے ادا کرنے کے لیے اسے تین سالوں کی اپنی تمام آمدنی صرف

کم پہنچ جائے گی۔ بین الاقوامی ترقیاتی رپورٹ کا ایک خاکہ گوشوارہ نمبر ۳ میں پیش کیا جا رہا ہے جو ناظرین کو ایک نظر میں غیر ملکی / بیرون ملکی قرض وان کی ادائیگی سے متعلق چند بنیادی حقائق سے روشناس کرانے کیلئے کافی ہے۔

گوشوارہ نمبر ۳: ترقی پذیر ممالک میں بیرون ملکی قرض وادائیگی سے متعلق چند ضروری معلومات: ۱۹۸۴ء

ملک کا نام	بیرون ملکی قرض (ہزار ملین ڈالر)	بیرون ملکی قرض بہ نسبت فیصد قومی پیداوار	برآمدات سے ہونے والی آمدنی (ہزار ملین ڈالر میں)	بیرون ملکی قرض کے سود کی ادائیگی میں صرف آمدنی برآمدات سے ہونے والی آمدنی کا فیصد
۱ میکسیکو	۸۷٫۵۰	۵۴	۲۲٫۲۰	۴۷
۲ برازیل	۸۷٫۰۰	۴۴	۱۷٫۵۰	۶۴
۳ ارجنٹائنا	۳۸٫۲۰	۴۷	۹٫۲۰	۵۰
۴ جنوبی کوریا	۳۰٫۰۰	۳۷	۱۹٫۴۰	۲۵
۵ پولینڈ	۲۷٫۰۰	۵۲	۱۰٫۲۰	۳۱
۶ انڈونیشیا	۲۶٫۷۰	۳۵	۱۴٫۸۰	۲۱
۷ وینزویلا	۲۳٫۸۰	۵۳	۱۲٫۹۰	۲۹
۸ اسرائیل	۱۹٫۹۰	۱۰۰	۵٫۸۰	۴۱
۹ چلی	۱۷٫۳۰	۱۰۰	۴٫۱۰	۵۴
۱۰ یوگوسلاویہ	۱۷٫۱۰	۴۲	۱۰٫۳۰	۲۳
۱۱ مصر	۱۶٫۴۰	۵۱	۵٫۳۰	۴۵
۱۲ ترکی	۱۶٫۲۰	۳۲	۵٫۲۰	۵۴
۱۳ فلپائن	۱۳٫۱۰	۴۴	۵٫۷۰	۴۷
۱۴ نائجیریا	۱۲٫۷۰	۱۷	۱۳٫۳۰	۳۷
۱۵ پیرو	۱۱٫۳۰	۹۸	۳٫۷۰	۴۱
۱۶ ہندوستان	۲۵٫۰	۱۳	۹٫۴۰	۱۰

(۱) گوشوارہ میں شامل سولہ میں سے آٹھ ممالک کی برآمدات سے ہونے والی آمدنی کا پچاس فیصد سے زائد بیرون ملکی قرضہ جات کے سود کی ادائیگی میں صرف ہو جاتا ہے چونکہ سود کی شرح میں تدریجی اضافہ ہوتا چلا آرہا ہے اس لیے اس میں مزید اضافہ کا امکان ہے۔

(۲) لاطینی امریکہ کے بیشتر ممالک میں واجب الادا قرض کی رقم ان کی برآمدات کا دوگنے تک پہنچ گئی ہے ایسی صورت میں امکان غالب ہے کہ یہ ممالک پچھلے قرضہ جات کی ادائیگی کے لیے اونچی شرح پر نئے قرضوں کے حصول کے لیے مجبور رہیں گے۔ ایک تخمینے کے مطابق ۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۴ء کے درمیان ان ممالک کے واجب الادا قرض کی رقم ۶۰۳۰۷ ملین ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔

(۳) ان اعداد و شمار سے صاف ظاہر ہے کہ ترقی پذیر ممالک کی زر مبادلہ کا کثیر حصہ سود و قرض کی ادائیگی کے طور پر ترقی یافتہ ممالک کی جھولی میں جا گرتا ہے جس کے بیشتر خطرناک نتائج سامنے آتے ہیں۔ اول تو زرمبادلہ کی عدم موجودگی سے ملک کی بین الاقوامی حیثیت میں تنزل پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے نہایت ضروری اشیاء مثلاً غذا، خوراک، تیل، ٹکنالوجی کی درآمدات کے لیے زرمبادلہ بطور قرض حاصل کرنی پڑتی ہے۔ نتیجتاً ترقی پذیر ممالک بجائے ترقی کے روبزوال ہو جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا دلائل و حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ ترقی پذیر ممالک غربت کے گھناونے دلدل سے نکلنے کی کوشش میں ایک دوسری دلدل یعنی قرض کی لعنت میں گرفتار ہو گئے ہیں نتیجتاً ترقی پذیر ممالک بجائے ترقی کے روبہ زوال پاتے جاتے ہیں۔ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ ترقی پذیر ممالک نے قرض کے بنیادی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر قرض کو ایسے مصارف میں استعمال کرنا شروع کر دیا جن سے نہ تو پیداوار بڑھی اور نہ ہی مستقبل میں مزید وسائل کے ذرائع پیدا ہو سکے۔ دوم درمیانی حد کے بہت سے بیرون ملک قرضہ جات کا ترقی پذیر ممالک نے ایسے مصارف میں استعمال کیا جن سے مزید وسائل کی فراہمی ایک طویل مدت کے بعد ہی ممکن تھی۔ لہٰذا جب وہ قرض واجب الادا ہوتے تو ملک مخصوص کو ادائیگی میں دشواریاں پیدا ہوتیں اور انھوں نے دوسرے قرض حاصل کر کے پچھلے قرضہ جات چکائے۔

تیسری بات جو زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ بہت سے ترقی یافتہ ممالک نے جلد از جلد اقتصادی ترقی حاصل کرنے کے لیے بہت سے ایسے پروجکٹ قرض کے ذریعے شروع کر دیے جنھیں بعد میں وہ برقرار نہیں رکھ سکے، شاید اسی لیے کہ ان پروجکٹوں کو شروع کرتے

ہوتے ان کا بغور مطالعہ نہیں کیا تھا اور ان کے فوائد و نقصانات کے بارے میں غور و خوض کا فقدان تھا۔

مندرجہ بالا دلائل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرض کے ذریعہ معیشت کی ترقی ممکن تو ہے مگر اس کے لیے قرض کا حصول و صرف اس انداز میں کرنا چاہیے جس سے ملک میں پیداواریت و بین الاقوامی تجارت فروغ حاصل کرے۔ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ دور جدید میں قرض کا نقصان سامنے آ رہا ہے جس کے لیے ترقی پذیر ممالک کی حکومتوں کی نااہلی کو زیادہ دخل ہے۔ گو کچھ دوسرے عناصر بھی ان حالات کے ذمہ دار گردانے جا سکتے ہیں۔ مثلاً بین الاقوامی اداروں میں ترقی پذیر ممالک کی برامدات کی قدرے کم قیمت، ناہموار تجارتی شرائط، ان تمام باتوں کے علاوہ ترقی پذیر ممالک سے برآمد ہونے والی اشیاء کی قیمتوں میں گراوٹ و درآمدات کی اشیاء کی قیمتوں مثلاً پٹرول کی قیمتوں میں بے حساب اضافہ ہوا بھی قرض کے مسئلہ کو مزید پیچیدہ کر رہا ہے۔ بہت سے ممالک میں حکومت کی نااہلی و بدنظمی نے بھی اس مسئلہ کو پیچیدہ بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ لاطینی امریکہ و افریقہ کے کئی ممالک اس زمرے میں نمونے کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

بیرون ملک قرض کے اعتبار سے ہندوستان ان چند ترقی پذیر ممالک میں سے جو اپنی معیشت پر قرض کا خاصا بار لادے ہوتے ہیں۔ جدید ترین تخمینہ کے مطابق ہندستانی معیشت پر تقریباً ۲۶ ہزار ملین ڈالر کا قرض ہے مگر قرض کی ادائیگی کے اعتبار سے ہماری صورتحال دیگر ممالک سے قدرے بہتر ہے۔

ہندوستان نے زیادہ قرضے رعایتی شرح پر حاصل کیے ہیں جن پر اوسطاً ۲ سے ۵ فیصد سالانہ سود واجب الادا ہوتا ہے جو دوسرے ممالک کے سود کی شرح سے کہیں کم ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے تمام قرضے طویل مدتی نوعیت کے ہیں یعنی وہ ۱۵ سال سے ۳۵ سال کے عرصے میں واجب الادا ہیں۔

اس کے علاوہ تجارتی قرض حاصل کرنے اور اس کا بہترین و منفعت بخش استعمال کرنے کے لیے مالی ادارے قائم کیے گئے ہیں جو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ تجارتی طور پر حاصل کیے گئے قرض کا استعمال ترقیاتی کاموں میں صرف کیا جائے تاکہ مزید وسائل کا حصول ممکن ہو۔ ۴۹۰۰ ملین ڈالر کا قرض جو بین الاقوامی مالی فنڈ سے حاصل کیا گیا تھا۔ اس کا استعمال معیشت کو راہ راست پر لانے کے لیے خرچ کیا گیا اس کے علاوہ تمام قرضے پیداوار بڑھانے والے مقاصد میں صرف ہوتے۔ ہندوستان ان چند ممالک میں سے ایک ہے جو وقت معینہ پر اپنے قرض و سود کی قسطیں مسلسل ادا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان تمام مثبت پہلوؤں کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرض پر انحصار کم سے کم ہونا چاہیے اور جس قدر جلد ممکن ہو اس عذاب سے نجات حاصل کر لینا چاہیے۔ یہاں ایک امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ۹۰-۱۹۸۹ء میں بین الاقوامی مالی فنڈ کا ایک ہزار ایک سو ملین ڈالر کا قرض واجب الادا ہوگا۔ جس کے معنی یہ ہوں گے کہ حکومت کو برامدات کی تمام آمدنی کا ۲۶ فیصد قرض کی ادائیگی میں صرف کرنا پڑے گا۔ ہمارے خیال میں یہ غیر ملکی قرض کی حد ہوگی اور حکومت کو مزید قرض سے گریز کرنا چاہیے۔ ●

بقیہ ہوشیار اے عشق

رخصت لیے سامان کا جائزہ بھی نہیں لینے دیا ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ مخاطب ہوتے ہیں تو دوسری طرف توجہ دینے کا موقع نہیں دیتے چنانچہ ہم دفتر سے روانہ ہو کر سڑک تک آ گئے انہیں خدا حافظ کہا اسی اثنا میں بس آ گئی اور ہم بس کے اندر داخل ہو گئے لیکن کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ ابھی ہم سانس کا اتار چڑھاؤ ٹھیک نہ کر پائے تھے کہ کنڈکٹر آ گیا اور ٹکٹ کے پیسے مانگے۔ اسی وقت پتہ چلا کہ پرس تو الماری میں چھوڑ آئے ایسا خیال آتے ہی ہمارے چہرے کا رنگ بدلنے لگا معاملہ فہم کنڈکٹر بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے نرمی سے بولا: کوئی بات نہیں کل پیسے دے دیجیے گا۔

اب اگلے دن کی روداد سنیئے: صبح سویرے ہم شیو کر رہے تھے اور بیگم ہمارے سامنے بیٹھی چھالیہ کترنے کے ساتھ ساتھ گرہستی کے سلسلہ میں اپنے کارہائے نمایاں بھی بیان کرتی جا رہی تھیں۔ ہم ان کی شیریں گفتاری میں گم ہے گا ہے الجھ تو جاتے تھے لیکن دفتر والی عینک کے محل وقوع پر نظر رکھے ہوتے تھے اب ہم شیو کر چکے تھے اسی وقت اخبار آ گیا ہم نے احتیاطاً عینک کو اسی جگہ رہنے دیا اور گھر والی عینک کو بھی زحمت نہیں دی کہ کہیں وہ بھی دفتر نہ جا پہنچے اور اخبار کی شہ سرخیوں کو بغیر عینک کے پڑھتے رہے اسی دوران پوسٹ مین آ گیا اور ایک رسالہ دے گیا جس میں ہماری کہانی شامل تھی۔ اب ہم نے بے اختیار ہو کر جلدی سے بیگ سے عینک نکالی اور اپنی کہانی کو انہماک سے پڑھنے لگے اسی دوران چھوٹی بچی آئی اور اس نے پلاسٹک کا ناشتہ دان چمڑے کی بیگ میں رکھ دیا ہم نے اسے بچاس پیسے دیئے۔ پھر ہم نے عینک کو میز پر رکھا اور اس پر اخبار رکھ دیا کپڑے پہنے مال سوار بیگ کو لے کر سڑک پر آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد بس آ گئی جس نے بخیر و عافیت دفتر پہنچا دیا۔ وہاں بیگ کا جائزہ ملا تو دھیان آیا کہ عینک تو غریب خانہ پر نو کلو میٹر دور تعطیل منا رہی ہوگی۔ زندگی میں غلطیاں ہوتی ہیں ان کا سدباب بھی ہو جاتا ہے وقت ضرورت ایک ساتھی اپنی عینک دے دیتے ہیں اس طرح کام چلتا رہا لیکن اپنی عینک بار بار یاد آتی رہی۔

اب بھول چوک کے ان واقعات نے ہمیں کافی مستعد کر دیا ہے اور ہم ہر لمحہ احتیاط سے گرد و پیش کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں پھر بھی کئی دنوں کے وقفہ کے بعد کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہو کر ہمیں چونکا دیتا ہے اس لیے ہم شاعر کے اس خیال سے متفق ہو گئے ہیں کہ:

ہوشیار اے عشق وہ نازک مقام آ ہی گیا۔ ●

پرہلاد سنگھ

مسلم اوقاف اور ان کا انتظام

اوقاف ایسی منقولہ اور غیر منقولہ املاک ہیں جو ان امور کے لیے مستقل طور پر وقف کی جاتی ہیں جو شریعت کے تحت مذہبی، مقدس یا فلاحی نوعیت کے قرار دیئے گئے ہیں۔ مذہبی امور کے علاوہ اوقاف معاشرتی، اقتصادی، ثقافتی، تعلیمی اور دیگر شعبوں میں ضرورتمندوں کو امداد فراہم کرتے ہیں۔

۱۴ جنوری ۱۹۸۶ء سے قبل وزارت قانون و انصاف اوقاف کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ لیکن اس کے بعد سے یہ کام مرکزی وزارت بہبود کو منتقل ہو گیا ہے۔ اس سے اب وقف قانون ۱۹۵۴ء اور درگاہ خواجہ صاحب قانون ۱۹۵۵ء کا نظم و نسق وزارت بہبود کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ اور اس کے علاوہ وہ اب نکاسی جائداد قانون ۱۹۵۰ء کے نظم و نسق کے تحت وقف جائدادوں سے متعلقہ کام کی دیکھ بھال کرتی ہے۔

وقف قانون وقف قانون ۱۹۵۴ء میں ملک میں اوقاف کے نظم و نسق کے لیے ایک غیر مرکوز ڈھانچے کے قیام کی تجویز کی گئی ہے۔ اس کی دفعہ ۸ کے تحت مرکزی سطح پر ایک مشاورتی جماعت کا قیام کیا گیا ہے جو مرکزی کونسل کے نام سے موسوم ہے اور جس کا مقصد ملک میں اوقاف کے نظم و نسق اور بورڈوں کی کارکردگی سے متعلقہ امور کے بارے میں بھارت سرکار کو مشورہ دینا ہے۔ قانون کی دفعہ ۴۲ کے تحت مرکزی حکومت کو پالیسی سے متعلقہ سوالات کے بارے میں بورڈوں کو ہدایات جاری کرنے کے لیے اختیارات دیئے گئے ہیں۔ اگرچہ قانونی لحاظ سے حکومت کا کردار بہت محدود ہے تاہم عملی طور پر شروع سے ہی حکومت عام دلچسپی کے متعدد امور سے خود کو وابستہ کیے ہوئے ہے تاکہ ملک میں اوقاف کے مفادات کو فروغ دیا جا سکے ان میں سے بعض امور یہ ہیں۔ وقف قانون ۱۹۵۴ء کو زیادہ موثر بنانے کے لیے قوانین بنانا، ریاستی حکومت کی جانب سے اوقاف کی املاک کے سروے کی بلا تاخیر تکمیل کو یقینی بنانا، اوقاف کی املاک کا ناجائز قبضوں سے تحفظ کرنے کے لیے اقدامات، وقف بورڈوں اور وقف اداروں وغیرہ کے مالی وسائل کو تقویت دینے کی تدابیر، وقف نظم و نسق کے اہم معاملوں اور درگاہ خواجہ صاحب قانون کی تعمیل سے متعلق وزارت ہذا کی سرگرمیاں درج ذیل ہیں۔

وقف (ترمیمی) قانون ۱۹۸۴ء ملک میں اوقاف کے نظم کو مزید مضبوط بنانے کی غرض سے ایک ترمیمی بل جو وقف (ترمیم) قانون ۱۹۸۴ء کے نام سے موسوم ہے منظور کیا گیا ہے لیکن مسلم فرقہ کے ممبروں کی طرف سے اس کی بعض دفعات میں اعتراضات کئے جانے کے باعث اس قانون کو عمل میں نہیں لایا جا سکا۔ لہٰذا حکومت نے وزیر بہبود کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل کرنے کا فیصلہ کیا جو ابتدائی طور پر پارلیمنٹ کے ممبروں پر مشتمل تھی تاکہ ان اعتراضات پر غور کیا جا سکے اور سفارشات پیش کی جا سکیں۔ کمیٹی کی پہلی میٹنگ ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء اور دوسری میٹنگ ۱۸ اور ۲۱ دسمبر ۱۹۸۶ء کو ہوئی اور اس نے ۲۲ جنوری ۱۹۸۷ء کو اپنی پوری رپورٹ مکمل کی۔

اس اثنا میں دفعہ ۶۶ (اوقاف املاک کی بازیابی کے سلسلے میں استغاثہ دائر کرنے کی مدت کو محدود کرنے کے بارے میں) اور ۶۶-ایچ (وقف بورڈوں کی طرف سے نکاسی وقف املاک کے انتقال کے بارے میں) ۲۳ جون ۱۹۸۴ء سے نافذ کردی گئی ہیں۔

وقف املاک کا سروے وقف قانون کے تحت کسی ریاست میں موجود وقف املاک کا سروے ان ریاست کی ذمہ داری ہے بتایا جاتا ہے کہ یہ کام مختلف ریاستوں میں مختلف اوقات میں پورا کیا جا سکا ہے۔ آندھرا پردیش میں ۱۹۶۲ء میں آندھرا علاقے میں اور ۱۹۷۶ء میں تلنگانہ علاقے میں پورا کیا گیا، اسی طرح آسام میں ۱۹۵۴ء میں، گجرات (کچھ) اور ہریانہ میں ۱۹۶۹ء میں، کرناٹک میں ۱۹۶۴ء میں، مدھیہ پردیش میں ۱۹۶۸ء میں، مہاراشٹر میں ۱۹۶۸ء میں، پنجاب میں ۱۹۶۹ء میں، راجستھان میں ۱۹۶۲ء میں، تمل ناڈو میں ۱۹۸۵ء میں اور اڑیسہ میں ۱۹۸۲ء میں مکمل کیا گیا۔ وقف املاک کا سروے دہلی اور مدھیہ پردیش میں جاری ہے اور توقع ہے کہ وہ جلدی مکمل ہو جائے گا۔ مرکزی حکومت کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ سروے کا کچھ کام، کیرلا، پانڈیچری، تریپورہ، بہار اور میگھالیہ میں مکمل ہونا باقی ہے۔ انڈمان اور نکوبار جزائر میں سروے کا کام حال ہی میں شروع کیا گیا ہے۔

وقف املاک پر ناجائز قبضوں کو ہٹانا وقف املاک پر ناجائز قبضہ ایک عام بات بن گئی ہے لیکن یہ مسئلہ ان ریاستوں میں شدید صورت اختیار کر چکا ہے جو ملک کے بٹوارے سے متاثر ہوئی تھیں اس مسئلہ کو دو وسیع زمروں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ (۱) وقف املاک اور اراضیات جن پر پرائیویٹ افراد نے قبضہ کیا ہوا ہے اور (۲) وقف عمارات و اراضیات جن پر متعدد سرکاری محکموں اور لوکل باڈیز کا قبضہ بحال ہے۔ جہاں تک پہلے زمرے کا تعلق ہے جن میں پرائیویٹ افراد ملوث ہیں وقف بورڈوں اور وقف اداروں کے سامنے جو واحد کھلا راستہ ہے وہ یہ ہے کہ عدالت میں بے دخلی کے لیے استغاثہ دائر کیا جائے لیکن جہاں تک

۵ ۹۰ ،۱۰ گپتا کالونی - نئی دہلی
یوجنا، نئی دہلی

ان پر سرکاری اداروں کے قبضے کا تعلق ہے تو شریمتی اندرا گاندھی نے یہ معاملہ ان ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ اور مرکزی منتظمہ علاقوں کی حکومتوں کے ساتھ اٹھایا تھا۔ جہاں یہ معاملہ شدید ہے۔ جہاں تجویز کیا تھا کہ یہ معاملہ انتظامیہ سطح پر حل کیا جائے۔ یہ معاملہ سرکاری اور وقف وزراء کی سطحوں پر متعلقہ ریاستی حکومتوں کے ساتھ متواتر زیر بحث ہے لیکن چونکہ اس معاملے میں حوصلہ افزا پیش رفت نہیں ہوئی اس لیے یہ معاملہ ایک بار پھر مرکزی وزیر بہبود کی سطح پر تمام ریاستی وزرائے اعلیٰ کے ساتھ اٹھایا گیا ہے۔ وزیر بہبود نے اپنے فروری ۱۹۸۶ کے مراسلے میں ایسے تمام معاملوں کو جلد نپٹانے کی خواہش پر زور دیتے ہوئے اُن درج ذیل رہنمایانہ خطوط کا اعادہ کیا ہے جو مرحوم وزیر اعظم کی طرف سے پہلے تجویز کیے گئے تھے۔

(۱) جہاں ممکن ہو وقف املاک کو خالی کرایا جائے اور ان کا قبضہ متعلقہ وقف بورڈ کو دیا جائے۔

(۲) جہاں زمین پر بیش قیمت عمارتیں کھڑی کی گئی ہیں اور انھیں خالی کرانا ممکن نہیں وہاں ریاستی حکومتیں وقف بورڈوں کے ساتھ مستقل پٹے کے معاہدے کر سکتی ہیں لیکن اس کے لیے انھیں پہلے بورڈوں کو بھاری بھر کم بازاری قیمت پریمیم کے طور پر ادا کرنا ہوگی یا

(۳) اس کے بدلے میں ریاستی حکومتیں بورڈوں کو زمینوں کی مصفا بازاری قیمت دلانے کا انتظام کریں جو ان پر اپنے حقوق ترک کر دیں گے۔ اگر وہ ان کے براہ راست انتظام میں ہوں گی ورنہ وہ متعلقہ متولیوں سے ان کی رضامندی کے ساتھ ترک حقوق کی ضروری دستاویز حاصل کریں۔ اس معاملے پر متعلقہ حکومتوں سے باقاعدہ بات چیت جاری ہے۔ اب تک جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ متعدد حکومتوں نے اس معاملوں کے تصفیہ کے سلسلے میں کارروائی میں پہل کی ہے تو پیش رفت ہوئی ہے۔ اس پر متواتر نگاہ رکھی جا رہی ہے۔

قبرستانوں پر ناجائز قبضے ہٹانا

یہ معاملہ سابق وزیر اعظم کے ۱۵ نکاتی پروگرام کے سیکشن ۲ سے تعلق رکھتا ہے جسے سابق وزیر اعظم نے اقلیتوں کی بہبود کے لیے کیا ہے تاکہ قومی زندگی کے تمام پہلوؤں میں ان کی مکمل ترقی کو یقینی بنایا جا سکے۔ اس معاملے کی اہمیت کے پیش نظر وزیر بہبود نے تمام ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ سے اس بارے میں بات چیت کی ہے اور انھیں قبرستانوں کا تحفظ کرنے کے طریقوں اور ذریعوں کا مشورہ دیا ہے جن میں ان کے چاروں طرف دیواریں بنانا بھی شامل ہے۔ اب تک جو عبوری جوابات موصول ہوئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس معاملہ کی جانب ریاستی حکومتوں کے متعلقہ محکمے توجہ دے رہے ہیں۔ پیش رفت کا معائنہ کیا جا رہا ہے۔

وقف املاک کا تحفظ

ایک تجویز زیر غور ہے کہ کیا وقف املاک کو سرکاری املاک کے زمرے میں لایا جا سکتا ہے تاکہ سرسری سماعت سے ناجائز قبضہ کرنے والوں کو آسانی سے بے دخل کیا جا سکے۔ ایسا اہتمام سنٹرل قانون یعنی پبلک املاک (ناجائز قابضوں کی بے دخلی) قانون ۱۹۷۱ء کے تحت ممکن نہیں ہے جو مرکزی حکومت کی املاک سے تعلق رکھتا ہے لیکن ریاستی حکومتیں بھی اس معاملے پر قوانین بنانے کے لیے قانونی اختیارات رکھتی ہیں۔ درحقیقت راجستھان اور کرناٹک کی حکومتیں پہلے ہی اپنے متعلقہ سرکاری املاک (ناجائز قابضوں کی بے دخلی) قوانین میں ترمیم کر چکی ہے۔ تاکہ پبلک وقف املاک کے لیے امداد دی جا سکے۔ لہٰذا مرکزی حکومت دیگر ریاستی حکومتوں کے ساتھ رابطہ برقرار رکھے ہوئے ہے تاکہ وہ متعلقہ ریاستی قوانین کے ساتھ پبلک اوقاف کو اپنی اپنی امداد دینے کے بارے میں غور کریں۔ اس معاملے پر ریاستی حکومتیں متواتر توجہ دے رہی ہیں۔

کرایہ کنٹرول قوانین سے استثنیٰ

وقف بورڈ کو آمدنی قانونی طور پر اس حصے سے ہوتی ہے جو اسے اوقاف کی خالص سالانہ آمدنی میں سے ملتا ہے۔ وقف جائدادوں میں سے بیشتر ایسی ہیں جو تھوڑے سے کرایہ پر دی گئی تھیں اور جنھیں اب کرایہ کنٹرول قوانین کے تحت نافذ پابندیوں کے باعث بڑھایا نہیں جا سکتا اس کے نتیجے میں اوقاف کی آمدنی اور اخراجات میں فرق بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اور ان میں سے اکثر لازمی انتظامیہ یا نگراں مشنری رکھنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جس سے وہ اوقاف کے مقاصد کو موثر طور پر پورا کر سکیں۔ کرایہ کنٹرول چونکہ ایک ریاستی معاملہ ہے اس لیے مرکزی حکومت متعدد ریاستی حکومتوں سے درخواست کر رہی ہے کہ وہ وقف املاک کو امداد دینے کے بارے میں غور کریں۔ لہٰذا اس کے نتیجے میں آندھرا پردیش، بہار، ہریانہ، کیرالہ، پنجاب، راجستھان، تامل ناڈو، کرناٹک اور مہاراشٹر کی ریاستوں نے اپنے متعلقہ کرایہ کنٹرول قوانین کے تحت وقف املاک کو مطلوبہ امداد دی ہے جہاں تک اڑیسہ اور تریپورہ کا تعلق ہے ان کے کرایہ کنٹرول قوانین کی دفعات وقف املاک کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتی ہیں کیونکہ ان میں کرایوں میں وقتاً فوقتاً اضافے یا ان میں نظر ثانی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اگرچہ اروناچل پردیش، دادرا اور ناگر حویلی، لکش دیپ اور ناگالینڈ میں کوئی کرایہ کنٹرول قانون نہیں ہے تاہم میزورم، گوا، دمن، دیو اور سکم نے اطلاع دی ہے کہ ان کے علاقوں میں برائے نام وقف املاک ہیں۔ گذشتہ سال کے دوران آسام، ہماچل پردیش، گجرات، مدھیہ پردیش، میگھالیہ، اتر پردیش اور مغربی بنگال کے وزرائے اعلیٰ کے ساتھ ساتھ پانڈیچری مرکزی منتظمہ علاقے کے وزیر اعلیٰ اور انڈمان و نکوبار جزائر کے لیفٹیننٹ گورنر کے ساتھ وزیر بہبود کی سطح پر معاملہ اٹھایا گیا ہے۔ جہاں تک دلی کا تعلق ہے معاملہ شہری ترقیات کی وزارت کے مشورہ کے ساتھ زیر غور ہے جو انتظامیہ طور پر دلی کرایہ قانون ۱۹۵۸ء کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

شہری وقف املاک کی ترقی

اوقاف اور وقف بورڈ کے مالیات کو بہتر بنانے اور انھیں اس قابل بنانے کے لیے کہ وہ اپنی فلاحی سرگرمیوں کو وسعت دے سکیں مرکزی حکومت نے ۱۹۷۴-۷۵ء سے سنٹرل وقف کونسل کو جہاں کی جانب سے قانونی طور پر

مقررہ ادارہ ہے۔ سالانہ عطیات دے رہی ہے جن کا خاص مقصد ملک کے وقف بورڈوں اور وقف اداروں کو مالی امداد دینا ہے تاکہ وہ اپنی شہری وقف املاک کو ترقی دے سکیں یہ عطیات ایک غیر مصدوم بہائی اسکیم کے تحت دیئے جاتے ہیں اس اسکیم کے تحت وہ سنٹرل وقف بورڈوں اور وقف اداروں کو ان خاص پراجکٹوں کے لیے قرضے دیتی ہے۔ جنھیں کونسل ہذا اور مرکزی حکومت کی منظوری حاصل ہے۔ یہ پراجکٹ وقف اراضیات پر بنی عمارتوں کی تعمیر اور تعمیر نو سے تعلق رکھتے ہیں جو تجارتی طور پر سود مند ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ جو اضافی رقومات لوٹاتے ہیں ان سے اوقاف اور وقف بورڈوں کی مالی حالت مضبوط ہوتی ہے اور ان کی فلاحی و خیراتی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ اس تمام تر عمل کا مقصد معاشرے کی مجموعی ترقی میں حصہ ادا کرنا ہے۔ سنٹرل وقف کونسل کے لیے ۸۷-۱۹۸۶ء کے برس کے بجٹ میں ۵۰ لاکھ روپیے کی امداد کا اہتمام کیا گیا ہے جس میں سے کونسل کو ۳۱ دسمبر ۱۹۸۶ء تک ۱۲ لاکھ روپئے پہلے ہی دیئے جاچکے ہیں۔

وزراء اوقاف کی میٹنگ وزیر بہبود نے ۲۴ جون ۱۹۸۶ء کو ریاستی وزراء اوقاف اور ریاستی وقف بورڈوں کے صدروں کی میٹنگ بلائی جس میں اوقاف کے انتظام و کارکردگی کو بہتر بنانے کی غرض سے کئی مسائل پر غور کیا گیا اور معلومات کا تبادلہ کیا گیا اس میٹنگ میں متعدد تجاویز پیش کی گئیں اور وہ ریاستی حکومتوں اور وقف بورڈوں کو بھجوائی گئیں تاکہ ان پر غور کیا جائے اور موزوں کارروائی کی جائے۔ وقف بورڈوں سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی سرگرمیوں کے بارے میں ہر دو برس بعد ایک رپورٹ شائع کریں۔ چنانچہ اب تک تریپورہ اور پنجاب وقف بورڈوں کی طرف سے سالانہ رپورٹیں شائع کی گئی ہیں جب کہ دہلی کے وقف بورڈ کی رپورٹ زیر اشاعت ہے۔

پنجاب وقف بورڈ مرکزی حکومت کی جانب سے پنجاب وقف بورڈ کی کئی ماہ از سر نو تشکیل کی گئی ہے اور اس میں پنجاب، ہریانہ، ہماچل پردیش اور مرکزی منطقہ چنڈی گڑھ سے ممبران لیے گئے ہیں۔ گذشتہ بورڈ کی طرف سے کی گئی بے قاعدگیوں کے پیش نظر مرکزی حکومت نے نومبر ۱۹۸۱ء میں بورڈ کو توڑ دیا اور ایک ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ چنانچہ اب بورڈ کی سرگرمیوں میں بہتری اور اضافہ ہوا ہے

آمدنی پنجاب وقف بورڈ اپنے عمل دخل کے تحت اوقاف میں سے ۹ فیصد کا انتظام براہ راست کرتا ہے۔ سابقہ برس ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۹۹ لاکھ روپئے کی آمدنی ہوئی تھی اور اب نئے برس ۸۷-۱۹۸۶ء کے لیے نشانہ ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپیے مقرر کیا گیا ہے۔ بورڈ نے اب تک کرایہ اور پٹے سے جو روپیہ حاصل کیا ہے اس سے اس نشانہ کے پورا ہونے کی امید پیدا ہو گئی ہے۔

غربا کو امداد آمدنی میں بتدریج اضافہ ہونے سے بورڈ کی فلاحی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ سال رواں کے دوران اماموں اور مؤذنوں وغیرہ کی تنخواہیں بڑھائی گئی ہیں اور مسجدوں اور درگاہوں کی وقتاً فوقتاً مرمت کی گئی جن کی تعداد کوئی ۳۰۰ تھی۔

تعلیمی سرگرمیاں پنجاب وقف بورڈ اسلامیہ ہائی اسکول مالیر کوٹلہ (پنجاب) اور اس کی چھ امدادی درسگاہوں کا انتظام کرتا ہے۔ مسلم طلبا کو تعلیمی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے بورڈ کی ایک بڑی سرگرمی ہے بورڈ اسکولوں، کالجوں اور دینی مکاتب کو ماہانہ امداد دینے کے علاوہ مستحق طلبا کو وظائف بھی عطا کرتا ہے۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۲۵۳ طلبا کو ایک لاکھ ۶۱ ہزار روپئے کے وظائف دیئے گئے

مرکزی وقف کونسل مرکزی وقف کونسل ایک قانونی طور پر بنی جماعت ہے۔ جس کا قیام وقف قانون ۱۹۵۴ء کی دفعہ ۸ کے تحت مرکزی حکومت کی طرف سے کیا گیا ہے تاکہ ملک میں وقف بورڈوں کی کارکردگی اور اوقاف کے انتظام سے متعلقہ معاملات پر مشورہ دیا جا سکے۔ کونسل کا صدر مرکزی وزیر اوقاف کا انچارج ہوتا ہے اور اس کے ۲۰ ممبر ہوتے ہیں جو مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر کیے جاتے ہیں

کونسل کی ۲۴ ویں اور ۲۵ ویں میٹنگ ۱۶ جون اور ۷ اکتوبر کو نئی دہلی میں منعقد ہوئیں جن کی صدارت بہبود اور اوقاف کی وزیر ڈاکٹر راجندر کماری باجپائی نے کی۔ کونسل کی تجویز کے مطابق مرکزی حکومت نے ۱۵ ترقیاتی پراجکٹوں کی منظوری دی جس کے لیے کونسل مرکزی حکومت سے موصول ہونے والے عطیات میں سے مالی امداد دے گی۔ چونکہ کونسل کو ہر برس ۳۰ جون تک عطیات دینے کا اختیار ہے اس لیے اپریل سے جون ۱۹۸۶ء تک کے عرصہ کے لیے ۲۹ لاکھ ۲۵ ہزار روپئے کی امداد دی گئی۔

کونسل نے اپنے Revolving Fund میں سے چھوٹے چھوٹے ترقیاتی پراجکٹوں کے لیے ۴ لاکھ ۸۳ ہزار روپئے کا قرض بھی دیا۔ کونسل کی طرف سے طلبا کو وظائف ٹیکنکل اداروں اور مقابلے کے امتحانات میں بیٹھنے والے امیدواروں کو مالی امداد بھی متواتر دی جا رہی ہے۔

وقف قانون ۱۹۵۴ء کے تحت کونسل کو ان رقومات سے آمدنی ہوتی ہے۔ جو وہ مختلف ریاستی وقف بورڈوں سے وصول کرتی ہے۔ اسے انفرادی اوقاف کی خالص سالانہ آمدنی کی ایک فیصد شرح کے حساب سے ملتی ہے۔

درگاہ خواجہ صاحب قانون ۱۹۵۵ء بین الاقوامی طور پر مشہور وقف یعنی درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی (اجمیر) کا نظم و نسق درگاہ خواجہ صاحب قانون ۱۹۵۵ء کے تحت انجام دیا جاتا ہے۔ اس وقف کا انتظام مرکزی طور پر مقررہ ایک کمیٹی کی جانب سے کیا جاتا ہے۔ جو درگاہ کمیٹی کے نام سے موسوم ہے۔ سردست اس کے نو ممبر ہیں۔ کمیٹی کے کام کاج میں ایک افسر مدد دیتا ہے جسے ناظم کہا جاتا ہے۔ اسے بھی مرکزی حکومت مقرر کرتی ہے ناظم اپنے عہدے کے لحاظ سے کمیٹی کا سکریٹری ہے جسے وقف پر کنٹرول، نگرانی اور انتظام کرنے کے اختیارات حاصل ہیں۔ موجودہ ناظم کے عہدہ کی میعاد یکم فروری ۱۹۸۸ء تک ہے

فلاحی سرگرمیاں درگاہ کمیٹی کی طرف سے طلبا کو وظائف، بیواؤں اور دیگر حاجتمندوں کو متواتر امداد دی جا رہی ہے اس کی طرف سے لنگر لگانے اور مفت یونانی اور ہومیوپیتھک شفاخانے چلانے کے

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

کمال جعفری

صوفی، سنت اور قومی یک جہتی

تصوف اسلام کے اصولوں پر مبنی روحانی زندگی کا ایک وسیلہ ہے۔ ایک صوفی عام انسانوں کی طرح مذہب کے ظاہری تقاضوں یعنی شریعت پر عمل کرتا ہے، پھر طریقت کے بلند مدارج طے کر کے مذہب کی اصل روح کے ساتھ انسانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک ظاہری عالم شریعت کے اصولوں پر عمل تو کرتا ہے لیکن تزکیۂ نفس اور قلب کی پاکیزگی میں اتنی پختگی حاصل نہیں کر پاتا جتنی صفائی ایک صوفی حاصل کرتا ہے بقول سعدی شیرازیؒ

صوفی نشود صافی تا درنکشد جامی
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

(وصول اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک اس راہ میں خود کو نہیں کھویا۔ لہٰذا منزلِ مقصود پانے کے لیے شرط ہے کہ تصوف کی راہ پر ایک مدتِ دراز تک سفر جاری رکھیں تاکہ اس کی کمزوریاں دُور ہو جائیں)۔

صوفی کی طرح سنت بھی اپنے مذہب کی پیروی اس طرح کرتا ہے گویا اس کا پالنہار ہر وقت اُسے دیکھ رہا ہے۔ اگر صوفی اور سنت کا مفہوم ایک مقدس اور پرہیزگار یا اپنے مرشد یا گرو کی تعلیمات پر عمل کرنے والا ایک سچا پرہیزگار تسلیم کیا جائے تو دونوں کا مفہوم تقریباً یکساں ہے لیکن ایک ذرا سا فرق قائم کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ایک مخلص مسلمان جو لباس، عبادات اور خصائل کے نقطۂ نظر سے تصوف کی جلوہ گاہ میں روحانی سفر کر رہا ہے وہ صوفی ہے۔ بالکل اس کے برعکس ہندو، سکھ یا کسی بھی مذہب کا ماننے والا انسان جو اپنے گرو کی رہنمائی میں کچھ خاص اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے آتما یعنی روح کی پاکیزگی کے لیے بھکتی کی راہ پر گامزن ہو اُسے سنت کہتے ہیں۔

فی الحال میں صوفی اور سنت کے موضوع پر تفصیلی بحث سے قطع نظر کر کے صوفی، سنت اور قومی یک جہتی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اختصار کے ساتھ کر رہا ہوں جس کی روشنی میں قومی یک جہتی کے پہلوؤں پر ایک عام انسان سوچ سکتا ہے۔

یہ ایک تاریخی امر ہے کہ ہمارا مُلک ہندوستان زمانۂ قدیم سے صوفیوں اور سنتوں کا مسکن رہا ہے۔ اسلام کی آمد سے قبل ہندوستان میں سنت اور گرو پیدا ہو چکے تھے جن کے آثار یہاں کی تاریخی دستاویزات میں پائے جاتے ہیں اس کی ایک مثال خود مہاتما گوتم بدھ کی شخصیت ہے۔

ہندوستان کے صوبہ سندھ میں جب محمد بن قاسم آئے تو مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی تعداد نے ہندوستان میں بود و باش اختیار کی۔ اس کے بعد محمود غزنوی اور محمد غوری آئے۔ لیکن تاریخ کے مطالعے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مسلم صوفیائے کرام مسلم حکمرانوں سے قبل ہندوستان تشریف لا چکے تھے لیکن داتا گنج بخشؒ لاہوری، مصنف کشف المحجوب (متوفی ۱۰۷۲ء) سے صوفیوں کا سلسلہ پھیلا۔ پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (متوفی ۱۲۳۶ء) نے اجمیر میں پہلی چشتی خانقاہ کی بنیاد ڈالی اور ان کے فیوض و برکات سے ہندوستان کے متعدد علاقوں میں چشتیہ سلسلے کو بے پناہ فروغ حاصل ہوا۔ ان کے بعد ان کے مشہور خلیفہ حضرت بختیار کاکیؒ نے دہلی میں سلسلۂ چشت کو متعارف کرایا۔ حضرت بختیار کاکیؒ کے خلیفہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ اور حضرت مخدوم صابرؒ کلیری نے اس سلسلہ کو مزید تقویت پہنچائی۔ بعد ازاں حضرت نظام الدین اولیاؒ نے دہلی اور ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اپنے خلفاء کو بھیج کر سلسلۂ چشت کو وسیع تر بنانے میں نمایاں

۸۱/۲ ذاکر نگر، اوکھلا۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

یوجنا، نئی دہلی

کامیابی حاصل کی۔ بالکل ان ہی صوفیائے کرام کی طرح سنتوں نے بھی اپنے سلسلوں کو ہندوستان میں پھیلایا جن میں سنت کبیرداس، ملک محمد جائسی، ملاں، تلسی داس، میرابائی، دادو اور گرو نانک کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان تمام صوفیوں اور سنتوں نے انسانوں کے درمیان یک جہتی اور بھائی چارگی کی فضا صرف انسانی بنیاد پر قائم کی تھی۔ صوفی سنت اور قومی یک جہتی سے متعلق کچھ ایسے ضروری نکات کو بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن کی مدد سے ہندوستان میں قومی یک جہتی کو فروغ ہوا۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد سے لیکر آج تک کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صوفیوں نے انسانوں کے درمیان ہمیشہ محبت، یگانگت اور خوفِ خدا کی تعلیمات کو ملحوظِ خاطر رکھا، یہی سبب ہے کہ ہر دور میں خدا کے بندوں نے صوفیوں اور سنتوں کی خانقاہوں میں اپنی روحانی پیاس بلا تفریق مذہب اور ملت بجھائی۔ جب حضرت خواجہ غریب نوازؒ اجمیر میں قیام فرما تھے تو آپ کے چاہنے والوں میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے، اور آج بھی صدیاں گذر جانے کے باوجود آپ کے عقیدت مندوں میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل ہیں۔ خواجہ صاحبؒ کی طرح سنت کبیر اپنی زندگی میں بیحد مقبول ہوئے۔ وہ کسی خاص مذہب کے قائل نہیں تھے لیکن ان کی بھکتی اور انسان دوستی نے ہر قوم کے لوگوں کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ راقم الحروف کو کبیرداس کے مزارِ مبارک اور پوجا استھان پر حاضری کی سعادت نصیب ہو چکی ہے۔ کبیر کا مزار ضلع دیوریا بمقام مگہر ہے۔ وہاں میں نے بچشم خود دیکھا کہ ایک جانب کبیر کے مزار پر مسلم زائرین فاتحہ خوانی میں مصروف ہیں تو عمارت کی دوسری جانب ہندو پجاری پوجا کی تقریب میں منہمک ہیں۔ اس طرح آج بھی صوبہ یوپی میں کبیر کی عبادت گاہ قومی یک جہتی کا جیتا جاگتا نمونہ پیش کر رہا ہے۔ کبیر نے بجا کہا تھا ؎

پوتھی پوتھی پڑھے جگ مُوا پنڈت نہ ہوئے کوئے
ڈھائی اکچھر پریم کا پڑھے سو پنڈت ہوئے

-

بھکتی تحریک کے ایک دوسرے شاعر جیون داس نے یہ کہا ؎

ہردے ماہیں پریم ہو، نیوں جھلکائے
سو ہی جیما ہری رس لیگا وا کی پرسوں دھائے

ترجمہ: "جس کے من میں پریم اور آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں وہ شخص اگر مجھے کہیں مل جائے تو اس کے قدموں میں اپنا سر رکھ دوں"۔

ایسے جذبات کا اظہار جن میں عقیدت، محبت اور سچائی کے عناصر پائے جائیں ہر دور میں صوفی اور سنت شعراء کے اہم فلسفے رہے ہیں۔ حضرت بوعلی قلندرؒ، حضرت امیر خسروؒ، ملک الشعراء بہاری لال، سور داس، عبدالرحیم، سید غلام نبی رس لین اور مہارانی میرابائی نے اپنے عقیدت بھرے نغموں سے انسانوں کو محبت و آشتی کا پیغام دیا ہے۔ ان کے نغموں میں انسان دوستی اور قومی یک جہتی کا پیغام ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں ان بزرگوں نے نظم و نثر کے پیرائے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سرزمینِ ہند کی عظمت میں صوفیوں اور سنتوں نے اضافے کئے اور سچے محبِ وطن کی حیثیت سے اس کے حسن میں چار چاند لگائے۔ اس موقع پر شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کے خیالات ملاحظہ ہوں:

چشتی نے جس زمیں پر پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

☙

حضرت شیخ المشائخ نظام الدین اولیاؒ قومی یک جہتی کی زندہ مثال ہیں۔ آپ سے قبل آپ کے پیر و مرشد حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ (پاک پٹن شریف پاکستان) نے اپنے فیض سے اہلِ ہند کو بیحد متاثر کیا تھا۔ حضرت بابا فریدؒ کے ماننے والے ہندو، مسلم اور سکھ آج بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کے دوہے بیجا سکھ لوگ گیتوں میں الاپے جاتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ (متوفی ۱۳۲۶ء) نے دہلی اور اطرافِ دہلی میں تصوف کی روحانی تعلیمات کے ذریعے ہندوستان کی قوموں کو مستفیض کیا اور قومی یک جہتی کا وہ درس دیا کہ الگ الگ مذاہب کے ماننے کے باوجود لوگ شیر و شکر کی طرح ساتھ رہتے اور ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ آج جو لوگ مختلف قوموں کے درمیان قومی یک جہتی تلاش کرتے ہیں انھیں قومی یک جہتی حضرت نظام الدین اولیاؒ کی تعلیمات کے تناظر میں تلاش کرنی چاہیئے یہاں صرف ایک واقعہ نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جس سے بخوبی یہ اندازہ لگ سکتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کی تبلیغ کا طریقۂ کار کیا تھا۔ وہ زبردستی کسی پر اپنا مذہب مسلط نہیں کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا ایک مرید راجکمار ہردیو تھا۔ اس نے بیان کیا ہے کہ بسنت پنچمی کو میلا لگا تھا جہاں ہندو عقیدت سے سرسوں کے پھول اپنے ہاتھوں میں لیے مندر کی طرف جا رہے تھے۔ اتنے میں ہردیو کی ملاقات حضرت امیر خسروؒ سے ہوئی، دیکھا کہ حضرت امیر خسروؒ بھی اپنے ہاتھوں میں سرسوں کے پھول لیے

جارہے ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت نظام الدینؒ نے دریافت کیا کہ کیا ہے؟ حضرت امیر خسروؒ نے کہا کہ ہندو بُت پر پھول چڑھانے جا رہے ہیں۔ میرے بُت آپ ہیں میں بھی سرسوں کے پھول چڑھانے آیا ہوں اور بے ساختہ درجِ ذیل شعر پڑھا ؎

خلق می گوید کہ خسرو بُت پرستی میکند
آرے آرے می کُنم با خلق و عالم کار نیست

(اگر لوگ یہ کہتے ہیں کہ خسرو بُت پرستی کر رہا ہے تو میں ایسا کروں گا اس پر دُنیا کے عام لوگوں کو اعتراض نہیں کرنا چاہیئے کیوں کہ اس مسئلہ کا حل اہلِ تصوّف ہی جانتے ہیں)۔

حضرت شیخ المشائخ شعر سُنتے جاتے اور رقص کرتے جاتے۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد بسنت کا یہ موسمی تہوار جسے ہندو مناتے تھے مسلمان بھی منانے لگے اور آج بھی بسنت پنچمی کے دن حضرت کی درگاہ کے قریب پیرزادے آتے ہیں اور پھول چڑھاتے ہیں۔ نیز محفلِ سماع بھی منعقد کراتے ہیں۔ قومی یک جہتی کی اس سے اچھی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

صوفیائے کرام کی زندگی سیاست سے خالی اور محبت سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امیر خسروؒ نے اپنی مثنویوں، قصیدوں اور غزلوں میں ہندوستان کی عظمت یہاں کے باغات، پھولوں اور تہواروں کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ حضرت امیر خسروؒ کا درجِ ذیل شعر قومی یک جہتی کی عمدہ مثال پیش کر رہا ہے ؎

کافرِ عشقم مسلمانی مُرا درکار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنّار نیست

(میں عشق کا متوالا ہوں مجھے (ظاہری) مسلمان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری رگوں میں (تصوّف) تار پیوست ہے۔ مجھے جنیو یا زُنّار کی ضرورت بھی نہیں ہے۔)

آج کے اس دورِ کم سواد میں جو لوگ قومی یک جہتی کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں، سیمینار اور اسٹیج سجاتے ہیں انھیں خلوصِ دل سے ان صوفیوں اور سنتوں کی پاکیزہ تعلیمات کا جائزہ لینا چاہیئے جن کی تعلیمات آج بھی بنی نوع انسان کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہیں۔ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات فوائد الفواد اور افضل الفوائد اور امیر خسروؒ کی مثنویاں ہمارے لیے آئینہ حیات ہیں۔

قومی یک جہتی کی روشنی میں بھکتی تحریک کا ذکر بھی ضروری خیال کرتا ہوں۔ بھکتی تحریک تصوّف سے متاثر تحریک ہے۔ اس تحریک کے ماننے والوں نے صوفیائے کرام کی طرح اپنی تعلیمات کو عوام تک پہنچانے کی بھرپور سعی کی۔ اس تحریک کے سب سے بڑے علمبردار چیتنیہ دیو (۱۴۸۴ء—۱۵۲۳) ایک سچے سنت تھے۔ اس نے بنگال کے معروف چشتی بزرگ حضرت نور قطب العالمؒ کی روحانی تعلیمات سے استفادہ کیا۔ چیتنیہ دیو کے ماننے والے ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ اس نے ذات پات، رنگ و نسل اور آپسی اختلافات کو دُور کر کے بنگال کے لوگوں میں بیداری کی نئی لہر دوڑا دی۔ جس طرح صوفیائے کرام ذکر و فکر کے ذریعہ قربتِ الٰہی حاصل کرتے ہیں، اُسی طرح چیتنیہ نے عوام کو بھکتی اور کیرتن کے ذریعے روحانی وسیلہ فراہم کیا۔ وہ سماجی ناانصافیوں کو ختم کر کے لوگوں کو متحد کرتے تھے، لہٰذا اُن کی تعلیمات بھی قومی یک جہتی کا نمونہ ہیں۔

دہلی میں چشتیہ سلسلے کے دورِ آخر کے مشہور صوفی حضرت شیخ کلیم اللہ دہلویؒ بلا تفریق مذہب و ملّت اپنا فیض عوام کو پہنچانے میں شب و روز منہمک تھے۔ ان کے خطوط میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ تہذیب کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ انھوں نے قومی یک جہتی کے فروغ میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ بہار میں تیرہویں صدی عیسوی کے مشہور فردوسی بزرگ حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے براہِ راست ہر قوم کے افراد کو اپنی تعلیمات سے مستفیض فرمایا۔ انھوں نے نہایت سادگی اور خاموشی سے ہر مذہب و ملّت کے غرباء اور مساکین کی مدد کی ان کی خانقاہ میں ہر طبقے کے لوگ جمع ہوتے اور تصوّف کی روحانی تعلیمات سے فائدہ اُٹھاتے۔ مکتوبات صدی اور دیگر علمی تصانیف ان کی یادگار ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ بھارت میں ان بزرگوں نے اخلاقی تعلیمات کو اس جامعیت کے ساتھ پیش کیا اور خود ذاتی طور پر عمل کر کے دکھایا کہ ہر قوم کے افراد ان کے گرویدہ ہو گئے۔

آج ہندوستان ہی نہیں دُنیا کی بھلائی اسی میں ہے کہ لوگ کھلے ذہن سے صوفیائے کرام کی تعلیمات کو اپنائیں۔

ہندوستان میں بیشمار قومیں بستی ہیں، جن کی مادری زبانیں الگ الگ ہیں۔ مذاہب الگ ہیں۔ لیکن سبھی ایک پرچم کے نیچے اور ایک قومی دھارے میں جیتے ہیں۔ ہندوستان کی ترقی اور تعمیر میں ہر شخص کو کھُل کر حصّہ لینا چاہیئے۔ مادرِ وطن سے محبّت کرنا ایک عبادت ہے۔ مولانا حالی نے مادرِ ہند سے خطاب کرتے ہوئے کیا خوب کہا تھا ؎

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے
لُوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

صوفیوں کی وسیع النظری اور محبّت قومی یک جہتی کی شعاعیں ہیں۔ کاش کہ ہم ان سے استفادہ کریں۔ اقبالؔ نے کس شان سے فرمایا ہے ؎

جلا سکتی ہے شمعِ کُشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں
تمنّا دردِ دل کی ہے تو خدمت کر فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں ●

ایم۔ایس۔ سجاج

تاریخ ھند کے چند سنہری اوراق

ھندوستان کی تاریخ میں بیشمار ایسے واقعات موجود ہیں جن سے قومی یکجہتی کی مہک آتی ہے۔ اگر وقت اور تعصب کی گرد کو جھاڑ دیا جائے تو یہ پھول آج بھی ترو تازہ دکھائی دینگے۔ ایک ایسے ہی واقعہ کا ذکر ایک عربی سیاح محمد عوفی نے اپنی ایک کتاب میں کیا ہے جو تقریبًا آٹھ سو برس قبل ہندوستان میں آیا تھا جب یہاں ملک کے بیشتر حصے پر خاندان غلاماں کی حکومت تھی۔ دلی کے تخت پر سلطان التمش قابض ہو چکا تھا۔ لیکن ملک کے منفرد حصوں میں خودمختار صوبے اور ریاستیں موجود تھیں۔

محمد عوفی نے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام تھا "جامع الحکایات ولامع الروایات" اس میں اُس نے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیا ہے جسے قومی یکجہتی یا سیکولرزم" کی مُنہ بولتی تصویر کہا جا سکتا ہے۔ اس واقعہ کا تعلق گجرات کے ہندو راجہ جنک سے ہے۔

محمد عوفی لکھتا ہے کہ ایک بار اُسے کھمبات جانے کا اتفاق ہوا جو گجرات کے ہندو راجہ کے قلمرو میں تھا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ یہ علاقہ سمندر کے کنارے پر ہے اور وہاں مسلمان تھوڑی تعداد میں آباد ہیں۔ یہاں مسلمانوں نے ایک مسجد بنا رکھی ہے جہاں وہ نماز ادا کرتے ہیں۔ مسجد کے مینارہ پر چڑھ کر بانگ دی جاتی ہے۔ گو وہاں پارسی بھی تھوڑی تعداد میں موجود ہیں۔ تاہم اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ پارسیوں اور مسلمانوں کا کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور پارسیوں نے چند ہندوؤں کو اُکسا کر انھیں مسلمانوں سے لڑا دیا۔ طیش میں آکر بعض شرپسندوں نے مسجد کا میبارہ شہید کر دیا اور چند مسلمانوں کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ مسجد کا امام جس کا نام علی تھا بھاگ گیا اور اُس نے قریبی شہر میں جا کر راجہ کے اہلکاروں سے مل کر فریاد کی مگر کوئی دادرسی نہیں ہوئی لیکن امام مایوس نہیں ہوا، اُسے ایک نئی تدبیر سُوجھی اُس نے سارے واقعہ کو منظوم کیا اور خبر رکھی کہ راجہ شکار کو کب جاتا ہے۔

ایک روز جب راجہ شکار کو نکلا تو امام اپنی منظوم فریاد لے کر راستہ میں ایک جھاڑی میں چھُپ کر بیٹھ گیا۔ جس وقت راجہ اُدھر سے گذرا امام فریاد لے کر سامنے آگیا اور دُہائی دی کہ اُس کی فریاد سُن لی جائے۔ راجہ وہاں رُک گیا اور اُس کی منظوم فریاد سُنی۔ اُس کے دل پر اُس کا گہرا اثر ہوا اور اُس نے کاغذ اُس کے ہاتھ سے لے کر ایک اہلکار کو دے دیا۔ اور حکم دیا کہ یہ فرصت کے وقت اُسے پھر دکھایا جائے۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے دامن پر بے انصافی کا داغ لگ جائے۔ راجہ اُسی وقت شکار سے واپس آگیا اور وزیر کو بُلا بھیجا وزیر کی آمد پر راجہ نے کہا کہ وہ تین روز تک محل میں آرام کرے گا اور ان تین دنوں میں کسی کو محل میں آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اُس نے یہ بھی حکم دیا کہ اُس کی غیر حاضری میں سلطنت کے امور کی دیکھ بھال وزیر کرے۔

راجہ محل میں چلا گیا لیکن رات کو ایک تیز رفتار سانڈنی پر بیٹھ کر اکیلے ہی کھمبات کی جانب روانہ ہو گیا۔ راجہ کو ۴۰ فرسنگ کا فاصلہ طے کرنے میں ایک دن اور ایک رات لگی۔ وہاں پہونچ کر اُس نے ایک سوداگر کا بھیس بنایا اور گلی کوچے میں جا کر اس واقعہ کی تحقیق کی اور راہ گیروں کی باتیں سُنیں۔ بہت سے لوگوں کی طرف سے بتایا گیا

۵۲۰۔ ملک بلڈنگ، چونا منڈی، پہاڑ گنج، نئی دہلی۔
یوجنا، نئی دہلی

کرشنر پسندوں نے چند بے گناہ مسلمانوں کو ہلاک کیا ہے۔ اور اُن پر بڑا ظلم کیا گیا ہے۔ راجہ نے اس واقعہ کی پورے طور پر تحقیق کرکے ایک لوٹے میں سمندر کا پانی بھرا اور اُس کا مُنہ بند کرکے اپنے ساتھ لے لیا اور پھر اسی طرح ایک دن اور رات سانڈنی پر سوار ہو کر راجدھانی کو واپس آ گیا۔ اگلے روز راجہ نے دربار منعقد کیا۔ مقدمے کی سماعت کی اور اس سلسلے میں مسجد کے امام کو بھی طلب کر لیا گیا۔ جب وہ دربار میں پیش ہوا تو اُسے اپنی عرضداشت پڑھ کر سنانے کو کہا گیا۔ امام جب اس عرضداشت کو پڑھ چکا تو بعض ہندو اہلکاروں کی طرف سے کہا گیا کہ مقدمہ جھوٹا ہے اور دعویٰ سراسر غلط ہے۔ راجہ نے آبدار سے وہ لوٹا منگوایا اور سب کو تھوڑا تھوڑا پانی پینے کو کہا۔ جس نے بھی پینے کی کوشش کی وہ پی نہ سکا کیونکہ سمندر کا پانی کھاری تھا۔ اس پر راجہ نے کہا کہ چونکہ یہ مذہبی معاملہ تھا اور اس میں مجھے پورا پورا انصاف کرنا تھا۔ اس لیے مَیں نے کسی پر بھروسہ نہ کرکے خود جا کر اس واقعہ کی تفتیش کی اور مجھ پر ثابت ہوا کہ مسلمان مظلوم ہیں اور ان پر ظلم ہوا ہے۔ میرے راج میں کسی کو کسی دوسرے پر ایسا ظلم کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس کے بعد اُس نے اُن شر پسندوں اور پارسیوں کو سزا کا حکم سنایا جنھوں نے اس جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اور مسلمانوں کو ایک لاکھ بالوتڑا (جو ایک گجراتی سکّہ تھا) کا تاوان دلوایا تاکہ وہ اس سے مسجد اور مینارہ کو دوبارہ تعمیر کر سکیں اور امام کو خلعت اور انعام دے کر رخصت کیا۔ چنانچہ اس روپیہ سے مسجد کی از سرِ نو تعمیر ہوئی اور یہ انعامات اس میں یادگار کے طور پر رکھے گئے۔ محمد عوفی لکھتا ہے کہ ہر سال عید کے موقع پر ان اشیاء کو نکال کر اُن کی نمائش کی جاتی ہے۔

* * *

اسی طرح ایک اور واقعہ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں پیش آیا جو اورنگ زیب، اُس کے پوتے پوتی اور راجپوت سردار دُرگا داس راٹھور سے تعلق رکھتا ہے اور جسے قومی یکجہتی کی ایک شاندار مثال کہا جا سکتا ہے۔

مورخ بتاتے ہیں کہ اورنگ زیب نے ۱۶۷۹ء میں راجپوت راجاؤں کے خلاف جنگ چھیڑ دی تاکہ اُن سب کو اطاعت کے لیے مجبور کیا جائے شیواجی نے اس اقدام کی مذمت کی تھی لیکن ۱۶۸۰ء میں اُن کا انتقال ہو گیا تھا۔ ۱۰ جنوری ۱۶۸۱ء کو اُس کے بیٹے سمبھاجی کی رائے گڑھ میں تاجپوشی ہوئی۔ اورنگ زیب نے اپنے بیٹے اکبر کو جو اُسے سب سے زیادہ عزیز تھا، راٹھور راجپوتوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا اور مغل فوج کی کمان اُس کے سپرد کر دی۔ یہ جنگ اس قدر تباہ کُن ثابت ہوئی کہ اُس نے راجپوت راجاؤں کو متحدہ محاذ بنانے پر مجبور کر دیا۔ اکبر ایک برس تک راجپوتوں کے ساتھ لڑتا رہا لیکن سوائے مایوسی اور بھاری نقصان اُٹھانے کے اُس کے پلّے کچھ نہیں پڑا۔ اُس نے تنگ آکر راٹھور سردار دُرگا داس سے صلح کی بات چیت شروع کر دی اور اپنے والد شہنشاہ اورنگ زیب کو تجویز کیا کہ جنگ باعزّت طور پر بند کر دی جائے۔ اس سلسلے میں اُس نے دُرگا داس سے پرائیویٹ طور پر مشورہ کیا جس میں دُرگا داس نے کہا کہ "ہم نہیں سمجھتے کہ شہنشاہ ہم سے ناراض کیوں ہے؟ اگر اورنگ زیب اکبرِ اعظم کی مانند صلح کُل پالیسی اختیار کرے اور ہمیں امن و امان سے رہنے دے تو ہم اُس کے وفادار خادم بن جائیں گے" لیکن اورنگ زیب صلح کی باتیں سننے کو تیار نہیں تھا۔ اُس نے اکبر کو بُری طرح کوسا اور لعنت ملامت کی۔ اکبر اس ذلت کو برداشت نہیں کر سکا۔ اُس نے دُرگا داس کے ساتھ مل کر اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کر دی اور شہنشاہ ہونے کا اعلان ایسے وقت پر کر دیا جب رائے گڑھ میں سمبھاجی کی تاجپوشی ہو رہی تھی۔ اس سے اورنگ زیب کے سامنے مشکل صورتِ حال پیدا ہو گئی، وہ اجمیر میں تمام کارروائیوں کی نگرانی کر رہا تھا۔

جب اکبر راجپوت سپاہ کے ساتھ اُس کی طرف بڑھا تو وہ ہکّا بکّا رہ گیا اور اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اُس مصیبت سے کیونکر نجات پائے۔ جو اُس نے خود اپنے والد (شاہجہاں) پر لاد دی تھی۔ لیکن قسمت نے ایک بار پھر اورنگ زیب کا ساتھ دیا۔ اور وہ اپنے بیٹے کے ہاتھوں گرفتار ہونے اور قیدی بننے سے بچ گیا۔ اُس نے اپنے دشمنوں کو زبردست شکست دی جس کے نتیجے میں اکبر اور دُرگا داس کو اپنی جان بچانے کے لیے فرار ہونا پڑا۔ اور انھوں نے دکن جا کر سمبھاجی کے ہاں پناہ لی۔

اکبر اور سمبھاجی چھ برس تک جون ۱۶۸۱ء سے فروری ۱۶۸۷ء تک مل کر اورنگ زیب کے خلاف لڑتے رہے لیکن قسمت نے یاوری نہیں کی۔ گو اس عرصے کے دوران انھیں قدرے کامیابیاں بھی ہوئیں لیکن انجام کار میدان اورنگ زیب کے ہاتھ رہا۔ اورنگ زیب ان کے تعاقب میں ۱۳ نومبر ۱۶۸۱ء کو بُرہان پور پہنچا اور مارچ ۱۶۸۲ء میں اُس نے اورنگ آباد میں ڈیرے ڈال دیئے۔

مرہٹہ سرداروں کی رائے میں جنھوں نے اکبر اور دُرگا داس سے ملاقات کی سمبھاجی کے لیے یہ شاندار موقع تھا کہ وہ اپنے والد کا ادھورا کام پورا کرتا لیکن انھیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اس پہاڑ جیسے عظیم کام کی انجام دہی کے لیے جو کردار اور صلاحیت درکار تھی سمبھاجی غضب کا بہادر ہوتے ہوئے بھی

اُس میں کورا تھا۔ شیواجی کو اس قدر کمال حاصل تھا کہ اُس کی راہ میں جو موقع آتا تھا وہ بلا تاخیر اُس سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ لیکن سمبھاجی میں یہ خوبیاں نہیں تھیں جسے اپنے شکی مزاج ہونے کے باعث ہر جگہ سازشیں نظر آتی تھیں۔ تاہم وہ بڑی بہادری سے لڑا۔ ایک بار تو اورنگ زیب نے ۱۶۸۲ء میں رام سیج قلعہ پر مرہٹہ فوجوں کے حوالی حملے سے جس میں اُس کا جرنیل شہاب الدین بھاری نقصان اُٹھانے کے بعد بھاگ کھڑا ہوا تھا اپنی پگڑی اُتار لی تھی اور قسم کھائی تھی کہ وہ جب تک اپنے دشمن پر قابو نہ پائے گا پگڑی نہیں پہنے گا۔

چھ سال کی سخت جدوجہد کے بعد اکبر دل برداشتہ ہو گیا۔ اُدھر راجپوتانہ کے راجے اُسے بار بار لکھ رہے تھے کہ وہ اُن کی پناہ میں آجائے تاکہ وہ مل کر شہنشاہ کے خلاف یورش کریں اور دلّی پر قبضہ کریں لیکن اکبر کے وسائل بہت محدود تھے۔ سمبھاجی بھی اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ اُس کی زیادہ مدد کر سکتا۔ اکبر کی بہن زینت النساء نے باپ اور بیٹے میں سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی لیکن اکبر اس کے لیے تیار نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر ایک بار وہ اورنگ زیب کے ہاتھ آگیا تو شہنشاہ اُس کا بھی وہی حال کرے گا جو اُس نے اپنے باپ اور بھائیوں کا کیا تھا۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر فروری ۱۶۸۷ء میں راجاپور میں ایک برطانوی مال بردار جہاز میں سوار ہو کر ایران روانہ ہو گیا، جہاں وہ کئی جگہ ٹھوکریں کھاتا ہوا جنوری ۱۶۸۸ء میں اصفہان پہونچا۔ وہیں وطن سے دور عالم بیچارگی میں اُس نے ۱۷۰۴ء میں دم توڑ دیا۔

ویر دُرگا داس

بہادر درگا داس جس کی شجاعت کے بارے میں راجستھان میں لوک گیت مشہور ہے کہ "اے ماں! بیٹا جننا ہے تو ایسا جن جیسا درگا داس ہے۔ ورنہ تو بانجھ ہی بھلی ہے۔ وہ فروری ۱۶۸۷ء میں راجاپور میں اکبر کو الوداع کہہ کر اُس کے بیٹے بلند اختر اور بیٹی صفیۃ النساء کو اپنی تحویل میں لے کر جودھپور واپس پہونچ گیا اور وہاں اُس نے مارواڑ کو واپس لینے کے لیے راجپوت سرداروں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ دُرگا داس نے ایک ماہر دینیات کو اُس کی تعلیم و تربیت کے لیے مامور کیا جب اورنگ زیب کو اکبر کے ایران فرار ہونے کی اطلاع ملی تو اُس نے اپنے ایک معتبر اہلکار ایشور داس ناگر کو دُرگا داس کے پاس صلح صفائی کی گفت و شنید کے لیے بھیجا۔ دُرگا داس اکبر کی ۱۶ سالہ بیٹی کو لیکر شہنشاہ سے ملاقات کرنے کے لیے ۱۶۹۶ء میں برہم پوری پہونچا۔ اُس وقت دادا اور پوتی میں جو یادگاری بات چیت ہوئی وہ سیکولرازم کی مُنہ بولتی تصویر ہے اور وہ تاریخ کے اوراق پر آج بھی درخشاں ہے۔

اورنگ زیب۔ چونکہ تم نے اب تک اپنی تمام زندگی غیر مسلمانوں میں بسر کی ہے تم ہمارے مذہب سے قطعی بے بہرہ ہو گئیں۔ لہٰذا تمھیں مقدس قرآن کا فی الفور مطالعہ شروع کر دینا چاہیئے۔

صفیۃ النساء: دادا حضور! آپ غلطی پر ہیں عزت مآب دُرگا داس نے نہ صرف مجھے زندگی کی تمام آسائشیں بہم پہونچائی ہیں بلکہ انھوں نے ایک مسلم خاتون کو بھی مجھے مذہبی تعلیم دینے کے لیے مامور کر دیا تھا۔ میں حافظِ قرآن ہوں۔

اورنگ زیب: صد آفریں، دُرگا داس۔ تم کس قدر نیک ہو۔ تمھارے خیال میں مجھے تمھاری خدمات کا کیونکر صلہ دینا چاہیئے۔

صفیۃ النساء: آپ ایشور داس سے دریافت کیجئے۔ وہ آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔

اس کا اورنگ زیب پر اس قدر اثر ہوا کہ اُس نے جودھپور کے راجپوتوں کا مقبوضہ علاقہ انھیں لوٹا دیا اور دُرگا داس نے بلند اختر کو جسے اُس نے بطور یرغمال ساکر رکھا ہوا تھا اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔

بقیہ، مسلم اوقاف اور انکا انتظام

اخراجات بھی دیئے جاتے ہیں دسمبر ۱۹۸۶ء تک ان تمام پر ایک لاکھ ۷۷ ہزار روپے خرچ ہوئے کمیٹی کی طرف سے زائرین کو رعایتی شرح پر آرام دہ قیام گاہیں مہیا کرنے کا کام بھی جاری ہے۔ اس سلسلے میں غریب نواز گیسٹ ہاؤس کامپلیکس کی چھٹی عمارت کی تعمیر گذشتہ برس مکمل ہو گئی۔ جو مہمانوں کے لیے ۳۰ کمروں، آفس بلاک اور ناظم کی رہائش گاہ پر مشتمل ہے۔

سالانہ عرس خواجہ صاحب کا سالانہ عرس مارچ ۱۹۸۶ء کو منعقد ہوا اور حسب معمول صفائی، سلامتی اور طبی امداد کے تمام انتظامات درگاہ ایڈمنسٹریٹس کی طرف سے ریاستی حکومت کے حکام کے تعاون کے ساتھ کئے گئے۔ سالانہ عرس کے موقعوں پر انتظامات کی جانب خاص توجہ دیکائی ہے

نکاسی جائداد کے نظم و نسق کا قانون ۱۹۵۰ء وزارت بالا صرف مذکورہ بالا قانون کی دفعہ ۱۱ کے مطابق نکاسی وقف املاک اور ٹرسٹیوں کی تقرری سے متعلقہ معاملوں سے دلچسپی رکھتی ہے۔

جہاں اس قانون کی دفعہ ۱۱ کے تحت کسٹوڈین نے باضابطہ طور پر ٹرسٹیوں کی تقرری نہیں کی وہاں نکاسی وقف املاک کے انتظام میں بعض تکنیکی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔ جیسا کہ وقف ترمیمی، قانون ۱۹۸۴ء میں دفعہ ۶۶-ایچ شامل کر کے وقف بورڈوں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ سارے معاملے پر نظرثانی کریں اور متنازعہ معاملوں میں متعلقہ ریاستی بحالیاتی محکموں سے بات چیت کریں اس کے ساتھ ہی اس وزارت کی درخواست پر مرکزی وزارت داخلہ کے بحالیات محکمے نے بھی تمام ریاستی سرکاروں کے محکموں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ تازہ ترین قانونی اہتمام کے پیش نظر متنازعہ معاملے کو فوراً نپٹائیں۔

منظر اعجاز*

قاضی عبدالودود کا طریق تحقیق

(مثنویات راسخ تبصرہ کے تناظر میں)

لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

یہ بیان مرزا اسد اللہ خاں غالب اردو غزل میں جن کی اہمیت اور عظمت نہ صرف یہ کہ مسلّم ہے بلکہ ناقابل تردید بھی اگر غالب کے ساعرانہ مرتبے سے انکار کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ غزل کی آبرو سے کھیلنے کی جسارت کہلائے گی غالب اپنے مذکورہ شعر میں کتنا دل جلا معلوم ہوتا ہے۔ یہ محسوس کرنے کی چیز ہے۔ پتہ نہیں غالب کے سینے میں انسان کا دل تھا یا جہنم کی آگ کہ آج تک یہ آگ بجھ نہیں سکی ہے۔ اس کے شعلے کی لپٹ اور بھی کچھ تیز ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود "حرف پہ انگشت" رکھنے کی بات اپنی معنویت کھو چکی ہے آج کے انسانی اذہان نے اس آگ کو کرید لے کی صلاحیت اپنی انگلیوں میں پیدا کر لی ہے، غالب شکنی کے معاملے میں یاس یگانہ چنگیزی نے "غالب شکن" کا کارنامہ ہی انجام نہ دیا بلکہ "آذر شکنی" بھی کی لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے غالب کی اہمیت و حیثیت و عظمت کا اعتراف ہی نہیں کیا بلکہ اس اعتراف کا اظہار بھی کیا ہے

صلح کر لو یگانہ غالب سے
تم بھی استاد وہ بھی اک استاد

اردو تحقیق کے معاملے میں قاضی عبدالودود کی حیثیت بھی نابغہ کی ہے۔ حیرت تو تب ہوتی ہے جب ان کی وسعت مطالعہ پر نظر ڈالی جائے اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ان کا حافظہ ہے۔ مختلف زبانوں کی ادبیات اور علوم کے مطالعے نے انہیں وہ حوصلہ عطا کیا جس کے بل بوتے پر انہوں نے کتنے ہی معتبر اور بزرگ محققوں کے بخیے ادھیڑ دیے۔ یہ معاملہ نظریاتی اختلافات کا نہ تھا بلکہ دانش دارانہ دیانت داری کا عمل تھا جو میدانِ تحقیق میں اصولِ تحقیق کے تقاضوں کے پیشِ نظر ایک مقدس فریضے کا جواز ثابت ہوا، اور جہاں تحقیق کا اقتدار قاضی صاحب کے نام منسوب ہو گیا لیکن بخیہ ادھیڑ جانے کے باوجود بھی ان بزرگوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جنھوں نے نہ صرف یہ کہ تحقیقی سرمائے میں گرانمایہ اضافے کئے بلکہ اس صحرا کے خار زار میں راہ ہموار کرنے کے کارنامے بھی انجام دئے بلکہ قریب میں، جبکہ تحقیق کا مشغلہ موروثی لیے سے زیادہ علم و ادب کے میدان میں معاشی ضروریات کی کفالت کے لیے ناگزیر سمجھا جانے لگا، قاضی صاحب کی حیثیت قاضیٔ شہر کی ہو گئی ان کے فتوؤں کا احترام ہی لازم نہیں ہوا بلکہ دورانِ تحقیق قاضی صاحب کی شخصیت اور ان کے اصولِ تحقیق کو پیشِ نظر رکھے جانے کی ضرورت، اہمیت اختیار کر گئی۔ قاضی صاحب کا دفترِ تحقیق تقریباً تمام محققوں کے لئے میدانِ حشر سا اور ان کی نظر پل صراط بن گئی۔ معاملہ ایسا ہی تھا کہ اگر کوئی فنِ تحقیق کا ماہر ہے تو اس مرحلے کو طے کر کے دکھائے! یہ ہے قاضی صاحب کی شخصیت اور حیثیت۔

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ انہوں نے پڑھا تو بہت لیکن لکھا بہت کم ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھ دیا بحیثیت مجموعی دنیائے تحقیق میں ایک وسیع و قیمتی سرمائے کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اعداد و شمار اور مدت کار کے اعتبار سے واقعی ان کے مضامین کی تعداد زیادہ نہیں لیکن اپنی وسعت، وقعت اور حجم و ضخامت کے اعتبار سے ان کا کارنامہ بے حد اہم اور بے انتہا تشفی بخش ہے۔

قاضی صاحب کا بعض بعض مضمون کتابی ضخامت کا حامل ہے۔ انہوں نے زیادہ تر تذکروں پر خامہ فرسائی کی ہے اور بعض اوقات تحقیقی مقالوں کو بھی کنگھالا ہے میرے پیشِ نظر ڈاکٹر ممتاز احمد کے تحقیقی مقالے "مثنویات راسخ" پر ان کا تبصرہ ہے۔ یہ تبصرہ اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے تو بے حد مفید اور خصوصی اہمیتوں کا حامل ہے ہی، ساتھ ہی اپنی مجموعی ضخامت کے اعتبار سے الگ ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ مبصر نے تبصرے کے اول مرحلے میں ہی یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ اس مقالے پر دانشگاہ پٹنہ نے ڈاکٹر ممتاز احمد کو پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔ اس کے بعد ہی سے وہ اپنے عمل تحقیق میں اپنے مخصوص انداز سے سرگرم کار ہو گئے ہیں۔

قاضی صاحب کی محققانہ خوبیاں اتنی ہیں کہ انہیں شمار کرنا مشکل ہے لہٰذا اعتراف کے طور پر اجمالاً ایک دو جملے میں ان خوبیوں کا احاطہ کیسے ممکن ہے۔ اس کے برعکس اگر خامیاں ہیں تو اتنی کم کہ انگلیوں پر گنوائی جا سکیں لہٰذا ان کے طریق تحقیق کا جائزہ لیتے وقت طوالت سے گریز کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ دو چار اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کروں گا۔

SHORTER OXFORD DICTIONARY کے مطابق RESEARCH کی تعریفیں یوں کی گئی ہے

1. THE ACT OF SEARCHING (CLOSELY OR CAREFULLY) FOR OR AFTER A SPECIFIED THING OR PERSON.
2. AN INVESTIGATION DIRECTED TO THE DISCOVERY OF A SOME FACT

---

* حاجی لاج، شکلا روڈ۔ مظفر پور ۸۴۲۰۰۱ (بہار)
یونیورسٹی، دہلی

CAREFUL STUDY OF A SUBJECT,
A. COURSE OF CRITICAL OR SCIEN-
TIFIC INQUIRY (PAGE NO 1712)
یہ دو لفظوں کا مجموعہ ہے RE + SEARCH لاطینی میں اس کے معنی "شئے"
یا معاملے کے ہیں ۔ فرانسیسی میں اس لفظ کا استعمال LATEN RES کیا گیا
تھا یعنی "WITH REFERENCE TO" یا "IN
THE MATTER OF" PREFIX کے طور پر
لاطینی میں اس کا استعمال بار دیگر و اپسی یعنی BACK OR AGAIN
کے مفہوم میں ہوا (PAGE NO-1663)۔
EXAMINE THOROUGHLY OR SEARCH
TO EXPLORE اس طرح
دونوں لفظ مل کر جو معنی مرتب کرتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں
"کسی شئی یا معاملے کا پھر سے دقتِ نظر کے ساتھ تفصیلی جائزہ یا کسی شئی کی حکیمانہ
اور دقیق بنیادوں پر تلاش۔ اسی سے لفظ محقق بنا ہے جو ایسا کرے"
اب اس تعریف کے تناظر میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ
قاضی صاحب کیسے محقق ہیں؟ جہاں تک نئی دریافت یا کھوج
کا سوال ہے ادب میں یوں بھی مشکل ہے کیوں کہ ادب در
اصل قدیم فکری اور ترسیلی روایات کے داخلی لاشعوری
سرمایے کی تلاش سے مرتب ہوتا ہے۔ اس طرح وہ بہر حال
تحقیق بار دیگر رہ جاتا ہے۔ دریافت کا معاملہ جہاں تک ہے
حکمتوں میں عام ہے۔ اب چونکہ قاضی صاحب ادبی محقق ہیں اس
لئے ان کے یہاں نئی دریافت تو نہیں لیکن تلاش بار دیگر ملتی
ہے۔

دوسرے لفظوں میں تحقیق دو طرح کی ہوتی ہے
(۱) تخلیقی (CREATIVE) تحقیق (۲) اصولی (NON-CREATIVE)
تحقیق تخلیقی (CREATIVE) تحقیق وہ
ہے جس میں ایجاد، انکشاف اور دریافت ہو۔ اور اصولی
(NORMATIVE) تحقیق وہ ہے جس میں ایجاد، انکشاف
اور روایات کو اصول پر جانچ کر واقعیت کی سند دی جاتی
ہے اسی طرح سائنس بھی دو طرح کی ہوتی ہیں (۱) POSI-
TIVE SCIENCE (اثباتی حکمت) (۲) NORMATI-
VE SCIENCE (اصولی حکمت) POSITIVE
SCIENCE اشیاء کو جیسی کہ وہ ہیں، دیکھتا ہے اور
NORMATIVE SCIENCE اصول کی بنا پر
سند یا ان کی حیثیت متعین کرتا ہے
اس طرح حکمت یا سائنس میں تلاش بار دیگر نہیں
فرق یہ ہے کہ تلاش کرنے والے نئے زاویے نکالتے ہیں
اور تلاش بار دیگر کرنے والے ان نئے زاویوں کی تحلیل
کرکے ان میں پائے جانے والے نقائص یا امکانات کی نشان
دہی کرتے ہیں۔ اس طرح حکمت میں تلاش کا ڈانڈا اسرارِ وجدان
وجدان سے اور تلاش بار دیگر کا ڈانڈا تحلیل سے ملتا ہے۔
یہی فرق ادیب اور محقق میں ہے ادیب
بر بنائے وجدان ایک پارۂ فن تخلیق کرتا ہے اور محقق بر بنائے
تحلیل اس تخلیق کے حسن و حال کی نشاندہی کرتا ہے۔ بیسک
یہ نشاندہی بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تعبیری اور دوسری
تنقیدی جن تربیت یافتہ ذہنوں میں تخلیقی عنصر کی کمی ہوتی
ہے، وہ تلاش بار دیگر میں نقائص کو دور کرنے کا کارنامہ
کام دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک بڑا کام ہے اور خاص دقتِ
نظر، منطقی شعور اور وسعتِ مطالعہ کا متقاضی ہے۔
کبھی کبھی تخلیقی صلاحیت رکھنے والے ادیب بھی رسمی
تحلیل کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور ایسا تبھی ہوتا ہے جب
حیات کی تازہ کاری سے ان کا یقین اٹھ جاتا ہے عام طور سے
اس کا سبب جسمانی علالتوں سے آتا ہے۔
قاضی صاحب کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرنے
سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی تخلیقی صلاحیت کو طلوع ہی
ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں ان کا یقین، حیات اور اس کے
امکانات، اس کی تازہ کاری، شکستوں میں فتح اور بنیادی
رجائیت سے اٹھ گیا تھا تخلیق کی تازہ کاری رجائیت، امید
عقیدہ اور اعتماد چاہتی ہے۔ قاضی صاحب کے یہاں اس
کی جگہ نا امیدی، مایوسی اور محرومی جسمانی علالت کی وجہ سے
ایک ذہنی ساخت مرتب کرتی ہے۔ لیکن داخلی اور خلقی توانائی
اپنے عمل کے لیے راستہ ڈھونڈتی ہے جو ایک طرف انہیں
درازئ عمر اور دوسری طرف اپنی ذات کے اظہار کے لیے
تحلیلی تحقیق کا میدان دیتی ہے۔
قانون اور معاشیات کے مطالعے نے ان میں غیر
معمولی منطقی گرفت اور فکری ربط و تنظیم کا شعور پیدا کیا
چونکہ قانون مخالف کی دلیل کی تردید اور تنقیص سے اپنے
لیے راہ ہموار کرنے کا فن سکھاتا ہے اس لیے بر بنائے
اکتساب قاضی صاحب نے رد و تردید کے فن میں مہارت
حاصل کی جس کی بنیاد تنقیص ہے اور یہ اکتسابی عنصر غیر سے
ان کے اجتماعی لاشعور میں بھی اپنی جڑیں رکھتا تھا یعنی
نسلی پشت کے دارالقضا کی امارت نے ذہن کی تحلیلی
ساخت مرتب کرنے میں تعاون بھی کیا۔ نتیجتاً جہاں منطق
ایک طرف اور نظم و ضبط (صوری) (FORMAL) دوسری
طرف ان کے ذہن کا طرۂ امتیاز بن گئے۔ ساتھ ہی اپنے
دعوے اور دلیلوں پر مضبوطی کے ساتھ ڈٹے رہنا بھی انہوں نے
قانون اور معاشیات کی تعلیم سے سیکھا۔ اگر قاضی صاحب
بیرسٹری کی پریکٹس (PRACTICE) میں چلے جاتے
تو منطقی استدلال اور صوری موشگافیوں کی تسکین عدالت
میں ہو جاتی اور کتب خانے میں ان کی شخصیت کا تخلیقی عنصری
عنصر ابھر آتا لیکن صحت کی خرابی نے شخصیت کے اس پہلو
کی تسکین صحیح مقام پر نہ ہونے دی۔ نتیجتاً عدالت کتب خانے
میں گھس گیا۔ اور پھر اس کا نتیجہ یوں نکلا کہ وہ
"رگی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی" علاوہ قاضی صاحب
سے جیسی فکری توانائی حالات کے ہاتھوں مظلوم ہوگئی یعنی
MISPLACED PERSONALITY
کا مرقع بن گئی۔ تخلیق غیر محتاط ہوتی ہے محتاط ہونے پر
تخلیقی عمل معلوج نہیں تو کمزور ضرور ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے
کہ لاکھ روپے کا پروجیکٹ ناتمام رہ جاتا ہے۔[۱۵]
چھلانگ لگانے کی تخلیقی قوت بال کی کھال کھینچنے میں
صرف ہو گئی اور یہی قاضی صاحب کی شخصیت کا MISPLA-
CEMENT تھا۔ لالہ کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آئے تھے
جہاں نسلی لاشعوری منطقی تلاش نے گلرساں دنیا سے
کی دھجی اڑائی تھی اگر صحت وفا کرتی اور یہ شخصیت زندگی
سے یاس کا شکار نہ ہوتی اور فکری طور پر شگفتگی کا موقع
پاتی تو اقدار کے ساتھ اس کی وابستگی اس کو صلاحیت کی صحیح
سمت میں لے جاتی نفاست پسندی اور ربط و تنظیم جو ہیئت

[۱۴] مقالاتِ قاضی عبدالودود (جلد اول) صفحہ ۲۹
[۱۵] مقالات عبدالودود (جلد اول) صفحہ ۳۴، ۳۵

کے تناسب و توازن سے وابستہ ہو کر قاضی صاحب کی شخصیت میں جو FORMALISM دے گئی ہے اور یقین بھی دے جاتی اسی ایک کمی نے تحقیقی چھلانگ کی تحریک سے انہیں محروم کر دیا۔ اور وہ صرف صوری چھان پھٹک کے ماہر بن کر رہ گئے۔ اس کا اندازہ ان کے مقالات سے علی العموم لگایا جا سکتا ہے اور علی الخصوص مثنویات راسخ کی تحلیل سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔

قاضی صاحب کے اندر FORMALISM کا جو بےسود میلان ان کے اپنے بیان سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"میں ایسے ادب کا جو لکھنے والے کے سوا
کسی کی سمجھ میں نہ آئے، قائل نہیں
کہ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ لکھنے والے
کا مافی الضمیر وہ غلط ہو یا صحیح، بالکل واضح
طور پر ظاہر ہو جائے" ۱۶؎

لیکن خود قاضی صاحب کی تحریروں میں بھی بعض اوقات یہ سقم پایا جاتا ہے ان کا مافی الضمیر ان کے جملے سے واضح طور پر ادا نہیں ہو پاتا۔ وہ لکھتے ہیں

"ان (دادا) کی موت کے بعد انہوں (والد) نے
سود کے ہزاروں روپئے معاف کر دئے۔" ۱۷؎

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "سود کے ہزاروں روپئے جزوی تھے یا کلی؟ اگر کلی تھے تو یہ کہنا ہی کافی تھا کہ سود کے روپئے معاف کر دئے۔ اس طرح "ہزاروں" کے زائد استعمال سے بھی وہ بچ جاتے اور والد صاحب کا متشرع ہونا بھی مشکوک نہ ہونا پایا۔ اگر "ہزاروں" سے رقم کی اہمیت ہی ظاہر کرنا مقصود تھا تو لفظوں کے استعمال میں ذرا فراخدلی سے کام لینا تھا۔ یوں لکھنا تھا کہ "انہوں نے سود کے کل روپے معاف کر دئے جو ہزاروں پر مشتمل تھے"۔

قاضی صاحب ارسطو کی DEDUCTIVE LOGIC کے پیرو ہیں یعنی رام ایک آدمی کا بیٹا ہے، میں ایک آدمی ہوں اس لیے رام میرا بیٹا ہے۔ وہ حساب کے نتائج کی قطعیت کو درست مانتے ہیں اس لیے اس کے اصولوں پر مرتب ہونے والے نتائج کو وہ صحیح تسلیم کرتے ہیں مثال ایسی ہے جیسے ۱۔ ایک مزدور ایک گھنٹہ میں ایک پایا بناتا ہے اس لیے ۴۰۰، ۳ مزدور وہ پایا ایک سکنڈ میں بنائیں گے۔ آپ ہزار کہتے رہیں یہ ناممکن ہے لیکن وہ کہیں گے کہ یہ درست ہے۔ اب بات کی غلطی یا صحت کا تعلق اصولوں کے برتاؤ پر آکر رک گیا اور اصول قطعی نہیں ہیں، وہ بدل سکتے ہیں مگر قاضی صاحب نہیں بدل سکتے۔ اس لیے نتیجہ خواہ کچھ ہو اصولوں کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ یہی چیز ان کے مزاج کو سائنٹیفک بنا دیتی ہے۔ ان کے اندر موجود تعمیری توانائی کو ضعف پہنچا دیتی ہے مثال کے طور پر۔

مثنویات راسخ کے موضوع پر ڈاکٹر ممتاز احمد کا مقالہ اور اس پر قاضی صاحب کا تبصرہ ملاشبہ راسخ کے اکثر اہم گوشوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے لیکن اس میں غیر متعلق امور کی بھی اتنی پکڑ کی گئی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن مبادیات ہی میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ جیسے۔

"(۱) ۔ پہلی مرتبہ پیش کیا جا رہا ہے" مثلے پیش کئے جانے پر اعتراض یا "دردمند کا نام محمد فقیہہ صاحب کی جگہ محمد فقیہہ بتایا ہے" شگفتہ حکم صاحب، مالوجی وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو جزو اسم نہیں ہوتے اور حفظ مراتب کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن قاضی صاحب کا منطقی شعور ایسے لفظوں کو بھی جزو اسم تسلیم کرتا ہے۔ ان کے یہاں منطقی شعور کا شدید غلبہ ذیل کے جملے سے واضح طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔

"گذارش میں ۶ غیر مطبوعہ مثنویاں پیش
کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے ۶ کو ۳ سے تقسیم
دیا جائے تو غیر مطبوعہ مثنویوں کی صحیح تعداد
معلوم ہو سکتی ہے" ۱۹؎

یہاں یہ کہتے ہیں قاضی صاحب کو پریشانی لاحق ہوئی ہے اور حساب کے نتائج کی قطعیت پر جو انہوں نے رسد دیا ہے اسی بنا پر ارسطو کی DEDUCTIVE LOGIC اور مزدور کی مثال بھی دینی پڑی تاکہ وضاحت کے ساتھ ان کے تحقیقی میلانات کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔

"ان (ڈاکٹر ممتاز احمد) کا یہ دعویٰ کہ راسخ
کے رسالۂ عروض کا "انکشاف" ان (ڈاکٹر
ممتاز احمد) کی بدولت ہوا، ناقابل قبول ہے
معارف میں کئی سال قبل کسی نے اس کا تعارف
کرایا تھا۔" ۲۱؎

جب یہ بات کہی جا رہی ہے کہ ڈاکٹر ممتاز احمد سے پہلے بھی اس پر لکھا جا چکا ہے تو یہ بھی بتایا جانا تھا کہ معارف کے کس شمارے میں کس نے اس کا تعارف کرایا؟ اور صرف یہ کہہ دینا کہ "معارف میں کئی سال قبل کسی نے اس کا تعارف کرایا تھا" خود اپنے اصول تحقیق کی صریح خلاف ورزی ہے قاضی صاحب کو نہ صرف مصنف کا نام اور صفحہ نمبر کا حوالہ دینا تھا بلکہ اس کا عدد کی قسم بھی لکھی جانی چاہئے تھی جس کا تذکرہ رسالۂ معارف کا وہ شمارہ شائع ہوا۔

"مقدمہ نگار نے بعض اوقات مطالب میں
اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے اور ایک دو جگہ
ایسی بات لکھی ہے جو مدعائے راسخ کے
خلاف ہے" ۲۲؎

اس میں شک نہیں کہ شاعر کے مطالب اور بعد کے شارحین کے مطالب میں فرق ہو سکتا ہے اس لیے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ شاعر کا مدعا کیا تھا اگر ممتاز احمد صاحب نے کہیں تشریح میں اپنی طرف سے مطالب کا اضافہ کیا بھی ہے۔ تو ان اضافوں کو یہ کہہ کر کہ "(وہ) مدعائے راسخ کے خلاف ہیں۔" رد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہی سوال قاضی صاحب سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ راسخ کا مدعا دوسرے طور پر مترشح ہوتا ہے۔ تو سیاق و سباق کی تیسری تاویل بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ اس لیے تشریحات میں شارح کو اتنی چھوٹ دینی ہی چاہئے اگر تشریح سے کچھ مفید حال نتائج برآمد ہو سکیں۔ لیکن جدید تاویلیں اپنی افادیت رکھتی ہو تو ایسی صورت میں معترض ہونا فعل عبث ہے۔

۱۶؎ مقالات قاضی عبدالودود (جلد اول) صفحہ ۷۵
۱۷؎ " " " ۱۹۱
یو جی سی، نئی دہلی

۱۸؎ ۱۹؎ مقالات قاضی عبدالودود (جلد اول) صفحہ ۲۲۳
۲۰؎ " " " ۵

۲۱؎ مقالات قاضی عبدالودود (جلد اول) ص ۱۹۹
۲۲؎ " " " ص ۲۰۰

اب جہاں تک ادبی زبان کا صحت کا تعلق ہے قاضی صاحب کی گرفت یقیناً حق بہ جانب ہے اور وہ کرے حالی چاہئے ورنہ جنہیں قلم پکڑنے کی بھی تمیز نہیں، ادیب بن جائیں گے۔ اپنے تبصرے کے پانچویں نکتے میں ممتاز صاحب نے "سیف اور سلطنت" کو حن صاحبان کے ساتھ وابستہ کیا ہے" نہ تو ان کی سیف زنی نہ ان کے تدبر پر کوئی واقعہ درج مقالہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تحقیقی مقالے میں ایسے دعوے حن کی تصدیق واقعات سے نہ کرائی گئی ہو اوتحض SSERTION کی حیثیت رکھتے ہوں، تحقیق کی قدر و قیمت کو گھٹا دیتے ہیں۔ پھر صوبے کی دیوانی اور حکومت کا مسئلہ بھی اہم ہے کیونکہ دیوانی کو حکومت قرار دینے سے نفسِ واقعہ پر اثر پڑتا ہے۔ دیوانی حکومت کے تابع ہوتی ہے۔

قاضی صاحب کی گرفت کو محض ہنسی گرفت کہہ کر اس کی قدر و قیمت کم نہیں کی جا سکتی۔ یہ درست ہے کہ ہیئتی انتہاپسندی کے تقاضا مات اپنی جگہ ہیں لیکن متوازن صورت میں وہ اگر یہ ہے اور قاضی صاحب کی گرفت کا اپنا ایک CORRECTIVE VALUE مسلم اور قابل تردید ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ خود قاضی صاحب تحقیق میں روایتوں اور زبانی بیانات کو وہ درجہ دیتے ہیں جو خود ان کے اصولِ تحقیق کے منافی ہے مثلاً

"شہریار کے بارے میں خود تحقیق نہیں کی۔ سید حسن عسکری صاحب کے زبانی بیان پر اکتفا کیا ہے" [1]

یا

"..... لیکن جیسا کہ سید حسن عسکری صاحب نے مجھ سے زبانی کہا ہے" [2] "پھر شہر آشوب" کی تاریخی اہمیت کے سلسلے میں قاضی صاحب کی گرفت لفظاً آج [..] بربالے کی کھال کھینچنے کے مترادف ہے یہ اور ایسی بہت ساری مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ جن سے یہ ثابت کرنا مشکل نہیں کہ قاضی صاحب نے خود اپنے ہی اصولِ تحقیق کی خلاف ورزیاں کی ہیں۔

اس سے ایک ہی بات ثابت ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تحقیق یا تنقید کے اصول ہر عہد میں انسانی ضرورتوں کے تحت افادیت کی روشنی میں بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اصولِ تحقیق میں قطعیت پسندی کسی طور قابلِ قبول نہیں۔ اور یہ قطعیت پسندی قاضی صاحب کا طرۂ امتیاز ہے۔

اس قطعیت پسندی کا سبب یہ ہوا کہ یورپ میں ان کا عہدِ اکتساب وہ تھا جب وہاں ان کے اساتذہ کے ذہن پر اٹھارویں صدی کی میکانکی طبیعات کی قطعیت پسندی کا غلبہ تھا۔ اور یہی مزاج ان کا بھی سائنس پر بدلتے ہوئے علمی ساطرنے کوئی تعاون نہ کیا اور وہ اس عہد کے ذہنی میلان کے شکنجے میں جکڑے رہ گئے۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

قاضی صاحب نے بدلتے ہوئے موسموں کا ساتھ نہ دیا بلکہ پرانی کھاد پر پرورش پائے ہوئے تناور درخت کی طرح بدلتے ہوئے موسم سے مقاومت کی مگر اس سے پیپے والی کسی نئی کونپل کو شاخ نہیں بنے دیا۔

بقیہ: کیا کچھ پایا اور کیا کچھ پانا باقی ہے

سیاستدانوں کی باشعور مسلسل اور جرأت مندانہ مساعی سے ہی طوفاں کا رُخ بدل سکتا ہے۔ ہمارا گذشتہ ۴۰ برس کا ریکارڈ اُمید کی بنیاد بن سکتا ہے۔

اب میں ایک آخری شعبے کا ذکر کروں گا جس میں ہمارا گذشتہ ۳۹ برس کا ریکارڈ کم و بیش مثبت رہا ہے یہ خارجہ پالیسی کا شعبہ ہے۔ اس کا خواب ہماری جد وجہد آزادی کے رہنماؤں نے دیکھا تھا اور ۱۹۴۷ء کے بعد جواہرلال نہرو نے اسے عملی صورت دی تھی۔ چنانچہ بھارتی عوام نے رفتہ رفتہ امن، غیر وابستگی اور سامراج دشمنی کی بنیاد پر ایک آزاد خارجہ پالیسی کا ارتقا کیا ہے جو وقت پر کھری اتری ہے۔

جس نے سیاسی اور اقتصادی شعبوں میں ہمارے قومی مفاد کو پورا کیا ہے اور بہت حد تک استحکام، ٹھوس پن اور ایک مستقل کردار بھی حاصل کر لیا ہے۔

ہماری جد و جہد آزادی عوام کے اس اعتماد پر مبنی تھی کہ وہ اُن دِنوں کی عظیم ترین سامراجی طاقت سے لوہا لینے کی سکت رکھتے تھے ہمارے آئین سازوں کو یقین تھا کہ ہمارے عوام ہماری صدیوں پرانی پسماندگی پر قابو پانے کے لیے توانائی بھی پیدا کر سکتے ہیں ہمیں آج جو مسائل درپیش ہیں اور قوم کے روبرو جو ظاہرا یا حقیقی بحرانی حالات موجود ہیں اُن سب کے باوجود یہ ضروری ہے کہ اس یقین کو برقرار رکھا جائے۔ ہم نے اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اس امر کا نتیجہ ہے کہ ہمارے عوام تیزی سے ضروری قیادت قائم کرنے کی توانائی و صلاحیت رکھتے ہیں

آخر میں ہماری ناکامیوں کی زیادہ تر وجہ یہ رہی ہے کہ ہم میں ایسے ادارے تعمیر کرنے کی صلاحیت نہیں جن کے ذریعے ہمارے عوام اپنی توانائیوں سے کام لے سکیں اور ترقیات اور آزادی، جمہوریت، سوشلزم، سیکولرزم اور سماجی مساوات کے دوائع میں انھیں بروئے کار لایا جا سکے۔ یہ وہ اقدار ہیں جو ہمیں اپنی جدوجہد آزادی سے میراث میں ملی ہیں اور ہمارے آئین میں مندرج ہیں۔

---

[1] مقالات قاضی عبدالودود (جلد اول) صفحہ ۲۰۲

[2] " " " " ۲۹

ڈاکٹر انجنی کمار سریواستو[۵]

فراق کی حاضر جوابی و بذلہ سنجی

ایک عظیم شاعر، مفکر اور ماہر علم و ادب کی حیثیت سے مشہور زمانہ انجہانی پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی شخصیت خداداد ذہانت اور گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی۔ گو ان کی کچھ خصوصیات اختلاف رائے کا موضوع بنیں لیکن وہ غلط سمجھے جانے کی جوکھم اٹھا کر بھی اپنی ڈگر پر چلتے رہے اور دنیائے شعر و ادب میں روشنی پھیلاتے رہے۔ انگریزی ادب پر انھیں کچھ ایسی دسترس حاصل تھی کہ پریاگ یونیورسٹی میں انگریزی ادب پڑھنے والی مختلف نسلیں آج بھی ان کے پڑھانے کے انداز کو یاد کرتی ہیں۔ کھل کر کھری اور صاف صاف بات کہنے کی ان کی عادت کچھ ایسی تھی کہ بہت سی بحثیں مناظروں کا درجہ اختیار کر کے یادگار بن گئیں۔ وہ اتنے بے باک اور بے خوف تھے کہ کسی سے بھی الجھ جانے سے نہیں کتراتے تھے خواہ وہ کسی بھی حیثیت اور مرتبہ کا آدمی ہو۔

چہل بھری جملہ بازی میں تو ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ مرتے دم تک ان کی زندہ دلی اور تیز کلامی جوں کی توں برقرار رہی نوک جھونک اور چھیڑ چھاڑ ان کی عادت میں شامل تھی۔ نجی زندگی ہو یا محفلِ علم و ادب وہ اکثر طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے تھے اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کے طنز کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کا وصف ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھا جہاں وہ طنز و مزاح سے بھرپور جملوں سے دوسروں کو ہنساتے تھے وہاں اپنے اوپر کئے گئے طنز کو برداشت کر کے اور کبھی کبھی خود ہی اپنا مذاق اڑا کر بھی سب کو محظوظ کرتے تھے

ان کی صاف گوئی حاضر جوابی و بذلہ سنجی اور ہر بار کوئی نئی بات کہنے کی خوبی اب شاید ہی کسی اور میں نظر آئے۔

آج ان کے بارے میں کچھ سوچتے ہوئے ان کی جادو بیانی خوش مزاجی اور لطیفہ گوئی کی بہت سی مثالیں یاد آرہی ہیں۔ بہت سی باتیں ذہن میں کروٹ لے رہی ہیں۔ جنھیں دوسروں تک پہنچانے کو جی چاہتا ہے۔ ان کی زندگی، شخصیت، تخلیقات اور فن کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن پریاگ یونیورسٹی میں اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران ان کی محبت و شفقت کی ڈور سے برسوں تک بندھے رہنے کے طفیل میں جو کچھ بتانے جا رہا ہوں وہ باتیں آپ تک نہ پہنچی ہوں گی۔ تو ملاحظہ فرمایئے چند مثالیں جو فراق صاحب کی زندہ دلی، بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور صاف گوئی کا بین ثبوت ہیں۔

دہلی میں لال قلعہ کا سالانہ مشاعرہ۔ کئی شعرا اپنا اپنا کلام پیش کر چکے تو شاعرِ اعظم فراق کی باری آئی۔ فراق صاحب اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے ہی شعر پڑھ رہے تھے۔ تبھی سامعین کی صفوں سے ایک آواز ابھری۔ "جناب فراق صاحب! براہ کرم کھڑے ہو کر اپنے اشعار سنائیں کیوں کہ ہمیں آپ کی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔"

فراق صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ "افسوس میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ میرے پائجامے کا ازار بند ٹوٹ گیا ہے۔"

دوستوں کی محفل میں ایک بار ایک بزرگ ادیب پرانے زمانے کے ہندوستان اور اس کی تہذیب کا ذکر کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے فرمایا۔ "آپ سے کئی سال پہلے میں اپنا مکان بنوا رہا تھا تو بنیاد کی مضبوطی کے خیال سے زمین میں نے کافی گہری کھدوائی جس میں سے کچھ تار برآمد ہوئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں تار (وائر) کا استعمال رہا ہوگا۔

وہاں موجود لوگوں میں فراق ہی ایسے تھے جنھوں نے ان حضرت کی بات کے جواب میں کچھ کہنا ضروری سمجھا۔ انھوں نے کہا۔ "جناب! تقریباً اسی زمانے میں میرا مکان بھی بن رہا تھا اور میں نے بھی کافی گہرائی تک زمین کھدوائی تھی۔ مگر اس کے اندر سے کچھ نہیں نکلا۔ ظاہر ہے قدیم ہندوستان میں وائرلیس (بے تار کا تار) کا رواج رہا ہوگا۔

وگیان بھون نئی دہلی میں بھارتیہ گیان پیٹھ ایوارڈ کی تقریب، جس میں فراق صاحب کو ایوارڈ ملا تھا۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے شب کا وقت رہا ہوگا۔ گیان پیٹھ کی صدر شریمتی رماجین سلیکشن کمیٹی کے صدر ڈاکٹر بی گوپالا کی لکھی ہوئی تقریر کے پڑھے جانے کے بعد اب ایوارڈ پانے والے کے بولنے کی باری تھی اپنی لکھی اور چھپی تقریر کے پڑھنے میں فراق صاحب نے اپنی پریشانی یوں بیان کی۔ "مجھ سے پہلے جن لوگوں نے تقریریں کی ہیں انھیں رات میں دکھائی دیتا ہے میری دقت یہ ہے کہ مجھے صرف دن میں دکھائی دیتا ہے۔"

فراق صاحب کی یہ بات سن کر اس وقت کی وزیر اعظم اور تقریب کی مہمان خصوصی شریمتی اندرا گاندھی بھی اپنی

---

۵ ڈی ۲/ ۳۷ بھیج نتھا، وارانسی (یو۔پی)۔
بوجیتا، نئی دہلی

ہنسی نہ روک سکیں اور ان پر بھی کچھ ایسا اثر ہوا کہ انھوں نے بھی اپنی لکھی ہوئی تقریر کو میز پر چھوڑ کر فی البدیہہ بولنا شروع کیا۔

فلم ڈویژن فراق صاحب کی زندگی اور شاعری پر ایک ڈاکیومنٹری فلم بنا رہا تھا۔ الہ آباد میں ایک روڈ پر واقع ان کی رہائش گاہ کے کچھ مناظر بھی فلمائے جا رہے تھے۔

"دیکھئے فراق صاحب! پلنگ سے اتر کر آہستہ چل کر کمرے کے اس گوشے تک آئیے۔ پھر قد آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھیے اور سامنے ٹنگے ہوئے تولیے سے اپنا منھ پونچھیے" کہتے ہوئے سرین صاحب نے اس تولیے سے اپنا منھ پونچھ کر انھیں سمجھایا کہ وہ بھی ایسا ہی کریں۔ اس کے بعد ڈائرکٹر سرین نے کیمرہ مین کو تیار رہنے کی ہدایت کی فراق صاحب نے بیچ ہی میں اپنی مشکل یوں بیان کی۔

"مگر میں اس تولیے سے اپنا منھ کیسے پونچھوں گا۔ آپ نے جو اس کا استعمال کر لیا"

ایک دفعہ کی بات ہے کہ فراق صاحب کے پاس انٹرویو کے لیے آئے ہوئے ایک موقر جریدہ کے نمائندے نے ان سے سوال کیا "آپ اپنا نام پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق لکھوانا پسند کرتے ہیں یا صرف فراق؟"

فراق صاحب نے جواب دیا "آپ جو چاہیں لکھیں مگر میں آپ کو بتا دوں کہ میرے نام میں رگھوپتی سہائے" اتنا ہی غیر ضروری ہے جتنا کہ سیکسپیئر کے نام میں ولیم"

بنارس ہندو یونیورسٹی میں کل ہند مشاعرہ۔ فراق یونیورسٹی کے احاطے میں ہی وی آئی پی گیسٹ ہاؤس میں قیام فرما تھے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے قبل یونیورسٹی کے اس وقت کے چیف پراکٹر ڈاکٹر اوماشنکر سنگھ اور سکریٹری میجر ایس۔ ایل۔ درگیسٹ ہاؤس پہنچے اور فراق صاحب سے گذارش کی وہ حضور کپڑے بدل لیں مشاعرے میں چلنے کا وقت ہو رہا ہے۔ فراق صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے صاحب میں کپڑے بدلتا نہیں کپڑے پہنتا ہوں"

کئی سال پہلے کی بات ہے فراق صاحب الہ آباد کے سروپ رانی اسپتال میں بھرتی تھے ان کا ایک معمولی سا آپریشن ہونے والا تھا۔ فراق صاحب کے مزاج سے ڈاکٹر بخوبی واقف تھے اس لیے انھوں نے فراق صاحب کو بیہوش کر کے آپریشن کرنا مناسب سمجھا۔ فراق تاڑ گئے اور اس پر اعتراض کیا۔ انھوں نے کہا "مجھے بیہوش کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اول تو یہ کہ فراق جلدی بیہوش نہ ہوگا دوسرے اگر ہو گیا تو جلدی ہوش میں نہیں آئے گا۔

ایک بار کہیں سے فراق کے نام ایک خط آیا کہ فلاں اکیڈمی یا انجمن ایک انعام دے کر انھیں عزت دینا چاہتی ہے خوددار فراق نے خط کے جواب میں لکھوایا "مجھ سے زیادہ تو وہ انعام ہی عزت پائے گا میرے نام سے وابستہ ہو کر"

اردو ادب کے نامور نقاد پروفیسر احتشام حسین کی پہلی برسی پر دارالشفا نگر نگم کے ہال میں مصنفین کے ایک اجتماع اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اتر پردیش کے اس وقت کے گورنر جناب اکبر علی خاں بھی آئے تھے۔ شام کو ہوٹل کلارک میں دعوت تھی ان سطور کا راقم بھی معہ اپنی اہلیہ کے موجود تھا دعوت کے بعد فراق صاحب جب باہر نکل کر اپنی کار میں بیٹھنے والے تھے تو روزنامہ "آج" کے چیف ایڈیٹر ستیندر کمار گپتا نے شریمتی ممتا شری واستو کی طرف دیکھتے ہوئے (اور یہ نہ جانتے ہوئے کہ فراق صاحب انھیں اچھی طرح جانتے ہیں) فراق صاحب سے کہا۔ "یہ میری بیٹی ہے"۔

یہ سنتے ہی فراق صاحب نے ازراہ تمسخر ایک قصہ بیان کر ڈالا۔ ایک ماسٹر صاحب تھے۔ ریٹائرڈ۔ ہر شام اپنی بیوی کے ساتھ ٹہلنے نکلتے تھے راستے میں جو بھی نوجوان دکھائی دیتا اسے اپنا طالب علم بتلاتے اور پھر اپنی بیوی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا کرتے

"ان سے ملو یہ تمہاری ماں ہیں"

ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے ہم لوگ اور گپتا جی بھی۔

فراق صاحب نے ایک دفعہ بتایا کہ کبھی ریل کے طویل سفر میں ان کا اور ان کے ہم مرتبہ شاعر جوش ملیح آبادی کا ساتھ ہو گیا۔ آدھی رات کا وقت فراق کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ جوش جھپکی لے رہے تھے۔ فراق شعر کہنے کے موڈ میں ہوتے۔ پہلا مصرعہ کہہ ڈالا ؎

آج آنکھوں میں کاٹ لے شب ہجر

دوسرا مصرعہ کوشش کے باوجود نہیں ہو پا رہا تھا انھوں نے جوش صاحب کو بتایا جوش صاحب جو عمر میں کچھ بڑے تھے اپنے بزرگانہ انداز میں کہا "جب تک دوسرا مصرعہ نہ ہو جائے منھ نہ دکھانا"

دوسرا مصرعہ تھوڑی ہی دیر میں ہو گیا۔ مکمل شعر یوں ہے ؎

آج آنکھوں میں کاٹ لے شب ہجر
زندگانی پڑی ہے سو لینا

فراق صاحب نے ایک بار انگریزی ادب کے ایک پروفیسر کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔ "صاحب ان کے پاس جب کوئی سوال لے کر کوئی طالب آتا ہے تو کہہ دیتے ہیں آج کل نہ جانے کیوں یورپ سے کتابیں آنا بند ہو گئی ہیں اس لیے تھنکنگ رک گئی ہے"۔ ذرا سوچیے چالیس سال پڑھنے کے بعد بھی آپ بغیر کتاب کے تھنکنگ نہیں کر سکتے۔ کبھی کچھ اپنے دماغ سے بھی سوچنے کی عادت ڈالو۔

●

بقیہ، بچوں کے چھ دشمنوں سے جنگ

بیماریوں کے ٹیکے لگوانے کا رجحان اور پختہ ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کے ہر شہری کو صحت اور علاج کی سہولت فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے اور اسی کا فرض ہے۔ اس لیے بچوں کے ان چھ دشمنوں سے جنگ کرنا بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔ لیکن درحقیقت دیکھا جائے تو بچوں کو بچانے کی پہلی ذمہ داری ماں باپ پر آتی ہے۔ جب تک وہ اپنے بچوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے اور انھیں ٹیکے لگوانے میں دلچسپی نہیں لیں گے تب تک حکومت کا کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہوگا۔

●

غزلیں



فضا ابن فیضی : مئو ناتھ بھنجن۔

آج کس کام آئے گی، اتنی ذرا سی آگہی
ایک حرف اپنا ہنر، اک نقطہ اپنی آگہی

بحث یہ ہے، کون کس کو آئینہ دکھلائے گا
سب کا سرمایہ یہاں بس تھوڑی سی آگہی

کاروبارِ لذت کام و دہن پھر بھی ہے گرم
پھیکی، بے موسم کے پھل کی طرح سب کی آگہی

ہم نے کس آئینہ خانے میں سجایا ہے اسے
یہ خود اپنے آپ سے آنکھیں چرا تی آگہی

روشنائی اڑ گئی، اوراق سادہ رہ گئے
ٹھہری اک حرفِ غلط، سب سوچی سمجھی آگہی

کس بلا کی تھی تپش تم میں، بدلتے موسمو!
راکھ ہو کر رہ گئی شبنم میں بھیگی آگہی

انجمن میں ہم ہی تنہا تھے چراغِ رہگزر
سب کے ہاتھوں پر فروزاں تھی سنہری آگہی

کھاد وہ بازی گر پرانا، سادہ لوحی دیکھنا
داؤ پر ہم نے لگا دی اپنی پوری آگہی

پُر تو کر لے اپنے اندر کا خلا وہ شخص بھی
ڈال دو کاسے میں اس کے یہ ادھوری آگہی

خون کی گردش میں شامل ہے قلم کا زہر بھی
قطرہ قطرہ یہ بدن میں جذب ہوتی آگہی

بات ہی کچھ اور تھی اقبالؔ و غالبؔ کی فضاؔ
پھر زمیں پر آسمانوں سے نہ اتری آگہی

انیس احمد خان، ایڈوکیٹ سپریم کورٹ، نئی دہلی۔

دریا ہوں اپنی راہ میں ریت چھوڑ جاؤں گا
میں سوکھ بھی گیا تو گہر چھوڑ جاؤں گا

اڑنے کا قید سے میں ہنر چھوڑ جاؤں گا
صیاد تیرے ہاتھوں میں پر چھوڑ جاؤں گا

سیراب مجھ سے ہوگا یہ صحرائے زندگی
ہر خار کی زبان کو تر چھوڑ جاؤں گا

پتھر میرے بغیر نہ اتنا اداس ہو
مطلب اگر ہے سر سے تو سر چھوڑ جاؤں گا

اشعار میرے رخ پہ ترے ہوں گے رونما
دل میں ترے میں ایسا اثر چھوڑ جاؤں گا

مجھکو ملائیں خاک میں وہ شوق سے انیسؔ
میں تخم ہوں مٹا تو شجر چھوڑ جاؤں گا



قمر سنبھلی
۱۵۳۸ نئی سڑک
دہلی ۱۱۰۰۰۶

غم کیا جو زخم زخم ہوا ہے بدن تمام!
منسوب اُن سے ہے مرا دیوانہ پن تمام

جذبوں پہ برف جمنے لگی ماہ و سال کی
رخصت ہوئی وہ شعلگی جان و تن تمام

برسی گئی ہے رات کے بستر کی طرح ریت
مسکا ہوا حیات کا ہے پیرہن تمام

بے چہرگی کا پھیلا ہے آسیب ہر طرف
ہے آئینوں سے خوف زدہ انجمن تمام

جیب و قبا ہیں چاک، نہ دامن ہی تار تار
روٹھی ہوئی ہے مجھ سے بہارِ چمن تمام

نفرت کی آندھیوں سے دیا کب تلک لڑے؟
تاریکیوں میں ڈوب نہ جائے چمن تمام

حسرتؔ کی اس زمین میں کیسے غزل کہوں؟
بے دست و پا ہوتے ہیں فکر و فن تمام

●

ڈاکٹر نریش، پنجاب یونیورسٹی ایوننگ کالج چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۴

گھر ہی جلنے دو کچھ روشنی تو ملے
اور دو چار دن زندگی تو ملے

جامِ مے جو نہیں زہرِ غم ہی سہی
خشک ہونٹوں کو تھوڑی نمی تو ملے

اس بیابان کو شہر کیسے کہوں
سائے ہی سائے ہیں آدمی تو ملے

بھیڑ کو شکل دیں کارواں کی مگر
کارواں کو کوئی راہ بھی تو ملے

اے نریشؔ عشق کا کچھ بھی دستور ہو
خود بھی آکر وہ ہم سے کبھی تو ملے

●

غزلیں

اسعد بدایونی : آفتاب ہوسٹل مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔

نفیِ ہزارت کے منظر اتارنے والا
وہ کشتیوں میں سمندر اتارنے والا
ہوا کی لہر کو نفرت کا زہر بھی دے گا
کبھی چراغ مرے گھر اتارنے والا
شکستہ تیغ سے پوچھا زمینِ مقتل نے
کہاں گیا وہ جنر، سر اتارنے والا
ابھی ابھی کوئی جھونکا ادھر سے گزریگا
شجر کے جسم سے زیور اتارنے والا
میں بجھ گیا تو میری راکھ سے طلوع ہوا
فصیلِ خواب کے پتھر اتارنے والا

●

اُسامہ مَلِک : مدینہ منزل، نزد لال مسجد،
دیوبند، یو۔پی

تم سے تم کرتے رہے اور تو سے تو کرتے رہے
جیسا تھا ماحول ویسی گفتگو کرتے رہے
جانے کیسے لوگ تھے وہ پتھروں کے شہر میں
عمر بھر جو آئینوں کی جستجو کرتے رہے
اپنے دامن کی طرف ہم نے کبھی دیکھا نہیں
مستقل لوگوں کے دامن کو رفو کرتے رہے
سرحدوں پر یہ اگر بہتا تو کہلاتے شہید
رائیگاں سڑکوں پہ ہم اپنا لہو کرتے رہے
دوسرے خوش ہیں تو ہم جی لینگے انکو دیکھ کر
دل میں ہر لمحہ یہی اک آرزو کرتے رہے
دوستی کی انتہا شاید عداوت ہو ملکؔ
پھر بھی ذکرِ دوستی تم کو بہ کو کرتے رہے

●

خالد ندیم : بجنور ہاؤس، یونائیٹڈ کالونی، امیر نشان، علی گڑھ۔

تنہائیوں کے دشت سے مجھ کو نکال دے
آخر کبھی تو مژدۂ شامِ وصال دے
یہ کیا کہ تیرا کرب ہی مجھ میں چھپا رہے
اک دن تو میرے ہاتھ میں دستِ سوال دے
ایسا کہاں سے لاؤں جو میری طلب کے ساتھ
ساگر سے موج، موج سے گوہر اچھال دے
خود آگہی کے واسطے تو بھی تو ایک دن
اپنی گرہ سے مجھ کو رنج و ملال دے
اب کون حرف و صوت کی بخیہ گری کرے
جتنے سوال ہیں مری جھولی میں ڈال دے

●

آغاز سبزنی، خالد مارکیٹ لاہور۔ ۸

وہ جس نے آئینہ دیکھا نہیں تھا
حصارِ ذات سے نکلا نہیں تھا
رگ و پے میں رواں تھا وہ مسلسل
اسے میں نے کبھی سوچا نہیں تھا
وہ خوشبو تھا مگر اس کے بدن پر
گلوں کا رنگ بھی رچتا نہیں تھا
سراپا صبر تھا وہ جانِ محفل
بچھڑتے وقت بھی رویا نہیں تھا
محبت سوچنی ہے دیکھنی ہے
اسے میں نے یہ سمجھایا نہیں تھا
میں اتنا جانتا ہوں میری خاطر
وہ دیواروں سے ٹکرایا نہیں تھا
کبھی آغاز پوچھو فصلِ گل سے
اسے میں یاد کیوں آیا نہیں تھا

●

ڈاکٹر سجاد سبد : سی ۲، گلمہر ایونیو، جامعہ نگر، اوکھلا۔ نئی دہلی۔

آئینے سے خون امڈا جائے ہے
پتھروں کا دل لرزتا جائے ہے
زیست کی چکی کا یہ چرخ ملا
آرزو کا دل کچلتا جائے ہے
کیا یہ دیوانوں کی بستی ہے یہاں
ہر حسیں سے خوں رستا جائے ہے
خونِ ناحق رنگ لائے گا میاں
ایک دیوانہ یہ بکتا جائے ہے
ہم شبِ فاقہ زدہ جیسے چراغ
دل مرا کچھ ایسے گھٹتا جائے ہے
ذہن میں ہے چند یادوں کی چتا
اور دھواں سا دل سے اٹھتا جائے ہے
آدمیت کی خمیدہ پیٹھ میں
بغض کا خنجر اترتا جائے ہے

●

نعرۂ امن

سیدہ عارفہ نقاش، خندہ بھون، سرینگر (کشمیر)

لڑو نہیں
زیادہ سے زیادہ تم لے لو
کم سے کم مجھے دے دو
تمہارا زیادہ تمہاری سلطنت ہی
میرا کم، میرا ایٹم بم ہے۔
مگر ڈرو نہیں
میں تمہاری غلطی نہیں دہراؤں گی
نہ تمہارے ملک کے کسی شہر کو
"ناگاساکی" اور "ہیروشیما" بننے دوں گی
کیونکہ
میرا ایٹم بم میرا نعرۂ امن ہے
صداقت کا اجالا ہے
جو تمہاری ظلمتوں کی حکومت کو
تہس نہس کر دے گا

لکشمی چندر پاس

اندھیرا

دھندلاہٹوں کے سائے میں اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ تصورات و تفکرات کی لامحدود گہرائیوں میں ڈوب جاتی گھنٹوں ماضی کی خوشگوار و ناخوشگوار یادوں میں گم رہتی اور جب ہوش میں آتی تو اپنے گرد پھیلی تاریکیوں کو دیکھتی ان ہی تاریکیوں میں اسے کمار کی شکل نظر آتی۔ کمار جسے اس سے سچا پیار تھا۔ اچانک نگاہ جب اوپر اٹھاتی تو نیلگوں آسماں پر چمکتے تاروں کو دیکھتی اور سوچتی اس کے دل میں بھی تو ان تاروں کی طرح بے شمار داغ ہیں اس کی زندگی بھی سیاہ رات کی طرح تاریکیوں سے بھرپور ہے۔ اس کا جی چاہتا کہ خوب روئے پھوٹ پھوٹ کر روئے اتنا روئے کہ آنسو بن کر بہہ جائے یا آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب جائے اور محرومی و ناکامی سے نجات پالے اپنے اس گناہ کا کفارہ کرلے جو اس نے جذبات کی رو میں بہہ کر کر ڈالا تھا۔

دن کی مصروفیات میں بھی وہ اسی کی تصور میں کھوئی رہتی وہ اس کو بھولنے کی ازحد کوشش کرتی مگر کامیاب نہ ہوتی دراصل زندگی میں کچھ واقعات ایسے بھی رونما ہوتے ہیں جو لوح دل پر نقش ہوجاتے ہیں اور تادم واپسی محو نہیں ہوتے اور پھر کمار؟ اس کی یاد تو جیسے اس کے دل کی دھڑکن تھی۔ جس کا تعلق اس کی زندگی کے ہر سانس سے تھا۔

وہ جب پہلے پہل اس مکان میں آیا تھا تو اچانک نیلا سے آنکھیں چار ہوگئی تھیں اور تبھی وہ ایک دوسرے کے دل میں سما گئے تھے۔ بات دراصل یوں ہوئی کہ مکان کا جائزہ لیتا ہوا کمار اس کھڑکی تک آپہونچا جو نیلا[1] کے کمرے والی کھڑکی کے سامنے کھلتی تھی۔ جب اس نے اپنے کمرے والی کھڑکی کھولی تھی تو وہ کوئی فلمی گیت گنگنا رہا تھا سامنے نیلا تکیے کے غلاف پر کشیدہ کاری کر رہی تھی گنگنانے کی آواز سن کر وہ سمجھ گئی کہ ضرور کوئی سامنے والے مکان میں آگیا ہے۔ کون ہے، کیسا ہے، شاید یہی جاننے کے لئے وہ غلاف پر پھول کاڑھتے کاڑھتے اپنی کھڑکی میں آکر کھڑی ہوگئی تھی۔

کمار نے کھڑکی کھولی تو آنکھیں نیلا کی آنکھوں سے لڑ گئیں دل کے تار جھنجھنا اٹھے۔ بعد لبوں پر مسکراہٹ لئے کھڑکی بند کردی۔ اس کا دل نہ جانے کیوں زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

یہ تھی ان کی پہلی پہچان، کتنی مختصر لیکن کتنی اہم جس نے کمار کو وارفتہ بنادیا تھا نیلا کے ہوش و حواس چھین لئے تھے۔ کنول سی پیشانی پر شبنم کے موتی جگمگا اٹھے تھے اس کو سب سے زیادہ یہی فکر لاحق تھی کہ کم بخت ساری کا پلو بھی تو سر سے ڈھلک کر دوش پر آرہا تھا۔ وہ تو سدھ بدھ ہی کھو بیٹھی تھی اور وہ بھی برابر تاکے جارہا تھا جیسے کوئی الوکھی چیز دیکھی ہو۔

کمار نے سوچا یہ لڑکی کتنی خوبصورت ہے۔ گلاب کو شرماتی ہے۔ دلآویز کتابی چہرہ، بڑی بڑی نرگسی آنکھیں قندھاری انار سے سرخ ہونٹ اور شرمگیں پیکر وہ تو جیسے لٹ سا گیا تھا۔

وقت ہوا کے پر لگا کر اڑتا گیا۔ دونوں گھرانوں میں واقفیت بڑھتی گئی۔ وکیل صاحب اور ڈاکٹر صاحب دوست بن گئے اور کمار اور نیلا بھی ایک دوسرے کے نزدیک آتے گئے اور وہی بات ہوئی کہ رفتہ رفتہ وہ میری ہستی کا ساماں ہوگئے

نیلا سوچتی کتنے اچھے ہیں کمار بابو! کتنے میٹھے ہیں ان کے بول! جیسے مصری کی ڈلیاں۔ اور ان کے دل میں نہ جانے کیوں کوئی خیال آکر بار بار گدگدانے لگتا اس کی دراز اور گھنی پلکیں نرگس کے پھولوں پر جھک جاتیں اور ایک عجیب نشہ سا اس پر چھا جاتا۔

کبھی کبھی جب وہ کمار کے گھر جاتی تو وہ بھی پھولا نہ سماتا جیسے کوئی نعمت مل گئی ہو ویسے وہ اپنی کھڑکیوں سے روز ہی ایک دوسرے کو دیکھ لیتے تھے۔ مگر دیدار کی یہ تمنا ایسی تھی کہ کبھی ختم نہ ہوتی تھی۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ ہر وقت ایک دوسرے کو دیکھتے رہا کریں، کبھی جدا نہ ہوں، کبھی نگاہ سے اوجھل نہ ہوں، مگر کیا یہ ممکن تھا؟

اتوار کی شام جب وہ آئی تو ڈاکٹر صاحب باہر گئے ہوئے تھے۔ کمار اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا ہارڈی کا کوئی ناول پڑھ رہا تھا۔ ماں باورچی خانے میں تھیں وہ بہن نیلا کی انگلی پکڑ کر سیدھا اسے کھینچ لایا کمار کے کمرے میں۔

"اوہ آپ؟" کمار نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا

مسکراہٹ لبوں پر پھیل گئی۔ پلکیں نیچے جھک گئیں اور رخسار گلابی ہوگئے۔

"جی تشریف رکھیئے!"

وہ کرسی پر بیٹھ تو گئی مگر یہی سوچتی رہی کہ کیا کہے۔ علاحدگی میں ہزاروں قسم کے خیالات دل میں آتے تھے مگر سامنا ہونے پر جیسے کوئی منہ پر قفل ڈال دیتا

"مزاج تو اچھا ہے آپ کا؟"

---

[1] اپنجنیٹہ بھوانی شنکر، فتح پوری، دہلی ۱۱۰۰۰۶

[illegible]، نئی دہلی

"جی مہربانی ہے" الفاظ کسی طرح نکل ہی گئے منہ سے۔ اب کمار کیا کہے۔

"موہن کہاں گیا تھا تو ابھی؟" اس نے موہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے بیٹھ کر پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ کیوں؟"

موہن نے اس کی طرف دیکھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ کچھ کہے، دوسرا سوال ہوا، دوسری طرف سے۔

"تو ہمارے یہاں کیوں نہیں آتا موہن؟"

موہن بڑے بھائی کے عتاب سے بچ گیا۔ جواب دہی کی مصیبت ٹل گئی

"کبھی کوئی بلائے تبھی تو آؤں"، کمار نے موہن کو صلاح دی۔

"کیوں کیا ویسے آنا برا ہے؟" نیلا نے پوچھا۔

"اور کیا سالی نہ مان تیرا مہمان"

"آیا کرو موہن،" نیلا نے موہن کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا مگر الفاظ کسی اور کے دل میں اتر گئے۔

"وہ کوئی دوسرا گھر تھوڑے ہی ہے۔ ہم کیا پرائے ہیں جو تمہیں بن بلائے آنا پسند نہیں؟" نیلا نے اپنی بات پوری کی۔

"ہوں، اور نہیں تو کیا؟" موہن بول پڑا۔

"بڑے ویسے ہو تم" ہلکی سی چپت موہن کے گال پر پڑی۔ اور کمار کو اچانک نیلا کی نرم و نازک انگلیوں کے لمس کا احساس ہوا جیسے نیلا نے پھولوں کی نازک چھڑی سے اسی کے دل کو گدگدایا ہو۔

"آیا کرو موہن۔ وہ کوئی دوسرا گھر نہیں ہے سمجھے؟"

اس مختصر سے جملے میں شراب کا نشہ تھا۔ پھولوں کی لطافت تھی شہد کی مٹھاس تھی۔ جس نے کمار کو مدہوش کر دیا۔ اسے گھر کی فضا بڑی پرکیف نظر آئی کسی خوبصورت وادی سے بھی زیادہ دلکش اور سہانی۔

نیلا دوسرے تیسرے دن فرصت ملنے پر اپنی ماں کے ہمراہ اس کے یہاں چلی جاتی۔ اس کی ماں سے باتیں کرتی موہن کو چھیڑتی اور کبھی کبھی اس کے ساتھ کمار کے کمرے میں بھی چلی جاتی۔ اس کی کتابیں دیکھتی، اس کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھ دیتی۔ شاید اسی لئے وہ اکثر گھر پر رہتا اس کے ساتھی طلبا کناٹ پلیس، انڈیا گیٹ یا کافی ہاؤس میں اپنی شامیں گزارتے مگر وہ نیلا کا استقبال کرنے کے لیے گھر پر ہی رہتا جب وہ آتی تو اس کے دل کی کلی کھل جاتی اور جب وہ نہ آتی تو انتظار کی گھڑیاں گنتے گنتے اکتا جاتا اور نہ جانے کیسی اداسی اس پر مسلط ہو جاتی۔ اس کی آنکھیں گرم ہو جاتیں اور ان میں آنسو مچلنے لگتے۔

نیلا اس کے گھر آ جاتے۔ براہ راست اس سے باتیں نہ کرے کچھ پرواہ نہیں۔ ہاں وہ اس کو دیکھ لے اور وہ اس کی آواز سن لے۔ بس یہی تمنا تھی۔

ہوتا بھی ایسا ہی تھا۔ وہ اکثر موہن کو مخاطب کر کے باتیں کرتی تھی، ایسی باتیں جو موہن سے متعلق ہوتی تھیں اور ایسی بھی جو موہن کے لیے نہیں، کمار کے لیے کہی جاتی تھیں اور سب ایسے ہی چل رہا تھا۔

ایک عالم ہے عالم حقیقی۔ ایک دنیا ہے دنیائے تخیل، جہاں ہماری آرزوئیں بستی ہیں۔ جہاں ہمارا فکر پرواز کرتا ہے عالم حقیقی میں سماج کی قیود ہیں، مذہب کی بندشیں ہیں بے بسی ہے لاچاری ہے، بدنامی ہے، رسوائی ہے۔ دنیائے تخیل میں رنگین سپنے ہیں۔ آشائیں ہیں ارماں ہیں۔ مگر دونوں دنیاؤں میں کتنا فرق ہے ایک حقیقتوں کی دنیا ہے دوسری سپنوں کی ایک میں تلخی ہے دوسری میں شیرینی۔

کمار اور نیلا دونوں دنیائے تخیل میں پرواز کرتے تھے۔ عالم حقیقی کی حدود و قیود سے بے نیاز مذہب اور سماج کی بندشوں سے بے خبر کہ اچانک فصل گل تمام ہو گئی خزاں کا موسم آ گیا۔ ان کو کیا خبر تھی کہ خزاں اتنی جلد آ موجود ہو گی۔ مگر یہ تو قانون قدرت ہے بہار کے بعد خزاں اور خزاں کے بعد بہار۔

نیلا نے کمار کی سگائی کا بلاوا سنا تو اس نے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے کلیجے پر گھونسا مار دیا ہو۔ ایک گہری بے چینی اس کے دل میں اتر گئی۔ مایوسیاں ایک خوفناک اندھیرے کے ساتھ پھیل گئیں۔ اس نے آہ میں لپٹا ہوا ایک سانس ہوا میں چھوڑا اور تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

کمار خود نہ سوچ سکا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ ایک طرف فرض تھا دوسری طرف محبت، دونوں کے مابین جنگ ہو رہی تھی اور وہ عجیب کشمکش میں گرفتار تھا۔

دل نے کہا تو نے اس سے محبت کی ہے کیا وفا نہ کرے گا؟ عقل بولی محبت زندگی کا بہترین تحفہ ہے مگر ایک شے ہے جو اس سے بھی بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ وہ ہے فرض۔ محبت نے کچھ نہ کہا بس سسک اٹھی۔

آج کل کا زمانہ تو تھا نہیں کہ محبت فرض اور لوک لاج کو لات مارتی اور من مانی کرتی۔ فرض اور محبت دونوں ہی کمار کو عزیز تھے۔ مگر اس کو دونوں میں سے کسی ایک کو چننا تھا فرض یا محبت۔ کتنا مشکل انتخاب تھا جس پر دو زندگیوں کا انحصار تھا جو خوشیوں اور مسرتوں کا دارومدار تھا۔

والدین کا اصرار تھا کہ وہ اپنی ہی ذات کی، ان کی منتخب کردہ لڑکی سے شادی رچائے کمار نے لاکھ بہانے بنائے کہ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا، ابھی وہ آگے پڑھنا چاہتا ہے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر والدین نے اس کی ایک نہ مانی۔ اور بے چارہ کمار اپنی فرماں برداری اور والدین کے دل کو ٹھیس نہ پہنچے، اس خیال سے حرف مطلب زبان پر نہ لا سکا۔ فرض فتحیاب ہوئی اور محبت خاموش رہی۔ اس نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ شادی محبت کا لازمی انجام تو نہیں یہ تو دو انسانوں کے درمیان ایک پاک جذبہ ہے جو شادی کے بغیر بھی برقرار رہ سکتا ہے بس وہ خاموش رہا نہ رضامندی کا اظہار کیا نہ انکار پر اصرار کیا اس کی اس خاموشی کو اس کے گھر والوں نے رضامندی پر محمول کیا اور سگائی کی رسم ادا ہو گئی۔

اور تبھی سے نیلا کے نزدیک کمار پرایا ہو گیا جیسے کبھی اس سے کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔ اس کی دنیا تاریک ہو گئی۔ اس کے ارمانوں کا دم گھٹ گیا اس کی آرزوئیں مرجھا گئیں۔ کیسے کٹے گی یہ طویل زندگی اب تو دکھ درد کے گڑھوں میں دب جانا ہو گا یا پھر گھٹ گھٹ کے مر جانا۔ شاید یہی قسمت میں لکھا ہے اور کچھ ہو تو اس کا پتہ کاتب تقدیر کو ہی ہو گا۔

شادی کے دن!

ڈاکٹر صاحب کا مکان بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ پاس پڑوس، ناطے رشتے کے سبھی افراد موجود تھے۔ کہیں مردوں کا مجمع تھا تو کہیں عورتوں کا جمگھٹ کہیں بوڑھی عورتیں محوِ گفتگو تھیں تو کہیں جوان دوشیزائیں خورش گپیوں میں مصروف تھیں کہیں ڈھولک بج رہی تھی تو کہیں فلمی دھنوں پر لڑکے متحرک رہے تھے۔

کاشف کے کمرے میں اداسی برس رہی تھی وہ رنجور دسمور پلنگ پر لیٹا ہوا اپنے ٹوٹتے ہوئے خوابوں کا عکس دیکھ رہا تھا چہرے پر بے بسی نمایاں تھی۔ مگر سارے گھر میں ہنسی گونج رہی تھی ہر طرف ایک عجیب شور و غل بپا تھا۔

فضا میں لاؤڈاسپیکر سے گیت بکھیر رہا تھا۔

برات کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

وہ سوچ رہا تھا۔ نیلا نظر نہیں آتی۔ گرد و نواح کے سبھی آدمی اور عورتیں تو موجود ہیں لیکن وہ کیوں نہیں آئی کیا وہ اس سے ناراض ہے ہاں جبھی تو سگائی والے دن کے بعد آج تک نظر نہیں آئی۔ اگر وہ آتی تو وہ اپنی مجبوری و لاچاری کی داستان اسے سنا کر اپنا جی تو ہلکا کر لیتا اس کی ڈانٹ تو لیتا۔ لیکن کیا وہ اس کی بے بسی کی داستان نہیں سننا چاہتی ہے۔ اس نے چاہا کہ سہرا بندھوانے سے پہلے اڑ کر نیلا کے پاس پہونچ جائے اور اپنا دل چیر کر اس کے سامنے رکھ دے۔

اچانک کھڑکی میں سے ہو کر آتا ہوا کاغذ میں ملفوف ایک کنکر اس کے قدموں میں آگرا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے والی کھڑکی سونی پڑی تھی۔ وہ اٹھا اور پرزہ کھول کر پڑھنے لگا۔

"بے وفا!

سچ تھی مرد بے وفا ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو کیوں آئے تھے میری زندگی میں کیوں قدم آگے بڑھایا تھا۔ کیوں موہ لیا مجھ کو۔

بے مروت کہو گے ماں باپ نے مجبور کر دیا تھا مگر مجھے سب معلوم ہے تمہاری رضامندی ہی سے سب کچھ ہوا ہے۔ تمہیں اگر مجھ سے ذرا بھی محبت تھی تو تم نے زبان کیوں نہ ہلائی ماں باپ کے سر کیوں نہ ہوئے۔ انہیں کیوں نہ بتایا کہ تم ۔۔۔۔ لیکن تمہیں مجھ سے محبت تھی ہی کب۔ وہ تو ایک کھیل تھا۔ شکاری شکار کر کے اپنا دل بہلاتے ہیں تم نے محبت کا کھیل کھیل کر اپنا دل بہلایا۔ میں ہی بھولی تھی۔ لیکن کیا جانتی تھی کہ ایسے نکلو گے۔ سن لو۔ عورت اپنی زندگی میں صرف ایک بار ہی محبت کرتی ہے اور اسی میں اپنا سب کچھ ہار دیتی ہے اور مرد؟ فریبی ہے، مکار ہے، دھوکہ باز ہے بھنورا ہے کلی کلی کا لوبھی ۔۔۔۔

وہ آگے نہ پڑھ سکا۔ پرزے کو مسل دیا اور کھڑا ہو گیا آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ نیلا کے دل میں اس کی یہی عزت ہے وہ اس کو اتنا نیچ سمجھتی ہے" اتنا بے مروت اتنا بے وفا۔ اوہ!

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کتنا پیار کرتا ہے۔ نیلا کو اور نیلا اسے بے وفا، بے مروت سمجھتی ہے وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ نیلا اسے غلط سمجھے اگرچہ اب کچھ نہیں ہو سکتا لیکن وہ نیلا کو دکھا دیگا کہ اس کی محبت سچی تھی۔

اس کے جسم میں ایک ساتھ ہزار بچھو ڈنک مار رہے تھے وہ انہی خیالات میں گم ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ نیچے باجے بج رہے تھے۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس کے دل میں دعائیں دعائیں کر کے توپیں گرج رہی تھیں۔ وہ نیلا کو اپنی محبت کا ثبوت دے گا۔ وہ اسے دکھا دے گا کہ یہ شادی اس کی مرضی کے خلاف ہے یہ اور بات ہے کہ والدین سے سرکشی نہ کر سکا۔ گھما پھرا کر مختلف عذر پیش کر کے شادی کے ٹالنے کی کوشش اس نے ضرور کی۔ اس کے بعد اس کی عقل گویا شل ہو گئی اور سب کچھ کس قدر جلد ہو گیا۔

موت کی آغوش میں جاتے جاتے جینے کی آرزو اس میں جاگ اٹھی وہ پچھتانے لگا کہ اس نے زہر کیوں کھا لیا ہے کیا اس سے نیلا کی محبت اسے واپس مل جائے گی۔ گو وہ اپنی جان دے کر یہ ضرور ثابت کر دیگا کہ اس کی محبت سچی تھی لیکن پھر نہ صرف نیلا کی بلکہ اس کے والدین کی دنیا اندھیری ہو جائے گی۔ ماں اسے کتنا پیار کرتی ہے کیا وہ اس صدمے کو برداشت کر سکے گی۔

وہ آگے نہ سوچ سکا۔ اس کے قویٰ سلب ہوتے جا رہے تھے' بدن نیلا پڑتا جا رہا تھا۔ جلدی میں جذبات کی رو میں بہہ کر اس نے جو کچھ کر ڈالا تھا اس کا ازالہ کرنے کے لیے وہ اٹھا اور دو قدم چلا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے گھنا اندھیرا چھاتا جا رہا تھا۔ اس نے پہلے نیلا کو پھر ماں کو پکارنا چاہا لیکن اس کی نحیف و نزار آواز کمرے کی اداس فضا میں تحلیل ہو گئی۔ یکایک اس نے محسوس کیا کہ اس کے اعضا شل ہوتے جا رہے ہیں جسم ڈھیلا پڑ گیا ہے اور کسی نے اس کی قوتِ گویائی کو سلب کر لیا ہے۔

اس کے ہونٹ پھڑپھڑاتے مگر بے سود

دوسرے لمحے کسی نامعلوم طاقت نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کی روح کو قبض کر لیا۔

نیلا کی زندگی میں' والدین کی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اندھیرا چھا گیا۔ ●

اقوالِ زرّیں

- انسان کو صرف اسی قدر عقائد کو ساتھ لے کر چلنا چاہیئے جس قدر کہ وہ ہضم کر سکے۔
  (ہیولاک ایلس)
- کچھ کتابیں چکھنے کے لیے ہوتی ہیں' کچھ ہڑپ کرنے کے لیے' صرف چند کتابیں ہیں جنھیں ہضم کیا جا سکتا ہے۔ (بیکن)
- سرمایہ بذاتِ خود برائی نہیں ہے البتہ اس کا غلط استعمال برائی کی طرف لے جاتا ہے۔ (مہاتما گاندھی)
- روزانہ کی معمولی محنت بشرطیکہ یہ روزانہ پابندی سے ہو' سخت جان سے سخت جان بہادر کی محنتوں کو گھٹا سکتی ہے۔
  (انتھونی ٹرولوپ)

●

ضیا حسنی

ہوشیار اے عشق....

اب ہم چونکہ اپنی عمر کی گولڈن جوبلی منا کر فارغ ہو چکے ہیں اس لیے یہ وسوسہ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا"؟ اکثر سانپ بن کر پھنکارنے لگتا ہے اور ہم سہم کر بیٹھ جاتے ہیں اس وقت مستقبل کتنی بھیانک روپ دکھا دیتا ہے ویسے ہم آپ کی اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ خدا کے فضل سے ابھی تک ہم بہ وجوہ خیر و عافیت ہیں۔ ماشاء اللہ خوب دور کی سوجھتی ہے۔ رسیلے نغموں اور کھنک دار قہقہوں پر کان کھڑے ہوتے ہیں اور خوب رویوں کو اچٹتی نظر سے دیکھنے سے بھی نہیں جھجکتے سر دست ہاتھ پیر بغاوت نہیں کرتے ورنہ آجکل کے لڑکوں کی طرح یہ بھی من مانی کرنے لگیں تو ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ بہرحال اچھی گزر رہی ہے البتہ گاہے گاہے یادداشت جھل دے جاتی ہے۔ کبھی ہم اپنی یادداشت پر کافی بھروسہ کرتے تھے۔ بچپن میں ہم نے جو کچھ پڑھا اور سنا تھا وہ ہمارے ذہن میں بیٹھ گیا تھا۔ اساتذہ کے اشعار نوکِ زباں پر رہتے تھے۔ اس وقت کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی بات چلی ہو اور ہم نے برمحل کوئی شعر نہ سنایا ہو اب یہ عالم ہے کہ وضع داری کے طور پر موقع پر شعر تو سناتے جا رہے ہیں لیکن مجبوری یہ ہے کہ ادھر کوئی صحت مند شعر سنا نہیں پاتے جو شعر ہماری نوکِ زبان پر آتا ہے وہ لنگڑاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

غرض جب ہماری یادداشت نے دھوکا دیا تو فوراً ہی خیال آیا کہ یہ ڈھلتی عمر کا کرشمہ تو نہیں ہے پھر ہمیں یہ مشہور بات یاد آگئی "پیری صد عیب" چلیے ایک عیب سے تو تعارف ہو گیا جب باقی ساڑھے عیب سامنے آئیں گے اور ان کے بارے میں تفصیل سے سوچنے کے قابل رہے تو ان کے بارے میں بھی غور کریں گے سر دست جو ہر دن بھول چوک ہو جاتی ہے اسے سنتے چلیے!

ایک دن ہمارے ایک باذوق نوجوان ساتھی آئے اور اپنی بھری نوجوانی کی کچھ رنگین جھلکیاں دکھانے لگے ہم نے گزارش کی۔

• "پھول مسکراتے ہیں دل پہ چوٹ پڑتی ہے"۔

انھوں نے یہ مصرع جیسے سنا ہی نہیں اور وہ اسی طرح رنگیں بیانی برتتے رہے۔ ہم سر جھکائے خاموش رہے اور ان کی باتیں سنتے رہے۔ بھلا وہ کب چین سے بیٹھنے والے تھے انہوں نے ہمیں جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"بزرگوار! آپکے پہلو میں دل ہے یا پتھر کا ٹکڑا
باتوں باتوں میں میں نے دل نکال کر رکھ دیا اور
آپ گم صم بیٹھے ہیں"!

"میاں! اب ہمیں پیچھے مڑ کر دیکھنے کے لئے مجبور نہ کرو"۔

صاحب زادے پھر بھی خاموش نہ ہوتے اور کڑی سے کڑی ملاتے رہے تنگ آکر ہم نے دھیرے سے کہا۔

"یہ مے پرستی ہے تو تابِ مے پرستی کیا ہے
بہک نہ جائے جو پی کر وہ رند ہی کیا ہے

انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"بجا ارشاد لیکن شعر پٹری سے اتر گیا ہے شعر اس طرح ہے محترم!"

پیے کشتی ہے تو شانِ مے کشی کیا ہے
بہک نہ جائے جو پی کر وہ رند ہی کیا ہے

"اس شعر کو برسوں پہلے سنا تھا۔ یہاں! اب ہمیں کل کی بات یاد نہیں رہتی لیکن معاملہ یہ ہے کہ جب کوئی جوانی کی باتیں کرنے لگتا ہے تو ہم دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بقول شاعر۔

جب کسی نے تمہارا نام لیا
بے چین دل کو اپنے تھام لیا

"قبلہ! اس شعر کا بھی حلیہ بگاڑ دیا آپ نے۔ میں عرض کرتا ہوں۔

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو اپنے تھام تھام لیا

یہ تو اشعار کی بات ہوئی اس کے آگے سنیے!

مسعود کو محمود، دردا کو سرما، شانہ کو عزانہ کہہ دینا تو روزانہ کا معمول ہو گیا ہے۔ لیکن ادھر اپنے بچوں کے ناموں کے سلسلے میں جو الٹ پھیر ہوئی تو بیگم نے نہ صرف کان کھڑے کئے بلکہ لگے ہاتھوں یہ طنزیہ حملہ بھی چپکا دیا۔

"اللہ خیر کرے اب کچھ یاد ہی نہیں رہتا
بچوں کے نام بھی یاد نہیں رہے۔ میرا نام تو
یاد ہے کہ اسے بھی بھلا بیٹھے"!

"آپ کا نام کیسے بھول سکتا ہوں؟"

کیجئے گا تو یہ بات کہد دی لیکن ذہن پر کافی زور دینے کے بعد بھی بیگم کا نام کسی طرح یاد نہیں آیا البتہ وہ پیارے پیارے القاب یاد آتے رہے جن سے ہم انہیں مخاطب کرتے ہیں۔ غرض جب ہم چیزیں کھونے لگے اپنے پرائے لوگوں کے نام بھولنے لگے جانی پہچانی گلیوں کے نام فراموش کرنے لگے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ کسی شناسا کے مکان پر دستک دینے کے بجائے کسی انجان شخص کے دروازے جا پہنچے اور کال بیل کو چھوتے ہی اندر سے ایک رسیلی آواز ابھری۔

"بڑے میاں دوسرا دروازہ دیکھیے"

تو صرف نہ ہم شرمندہ ہوئے بلکہ یہ یقین بھی ہو گیا استغفار کی منزل سے گزر رہے ہیں۔ کیا عرض کریں کس کس چیز کو چھوڑ کر آگے بڑھ جانا روز آنہ کا معمول ہو گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ استعمال کرنے سے پہلے ہم کافی چوکنا رہتے ہیں کہ فلاں فلاں ضروری چیزوں کو لے جانا ہے پھر انہیں چیزوں کے چھوڑنے میں ذرا سی تساہلی بھی نہیں برتتے ادھر ہم کھونے اور گنوانے کی مہم کو کافی تیزی سے چلا رہے ہیں اور ادھر اہل خانہ ہماری اس طرح نگرانی کرتے ہیں جیسے پولیس کسی عادی مجرم پر نگاہ رکھتی ہے۔ عالم یہ ہے کہ ادھر ہم سو کر بیدار ہوتے کہ بچے ہمارا محاصرہ کر لیتے ہیں، بستر کو اچھی طرح دیکھتے ہیں، ہم گھر سے جیسے ہی باہر قدم نکالتے ہیں گھر کے کونے کونے کو کھنگال ڈالتے ہیں جہاں ذہن کے اس طویل تجربہ کے بعد ایسی بات سامنے آئی ہے کہ ہم جہاں جہاں قدم رنجہ فرماتے ہیں وہاں کوئی نہ کوئی نشان ضرور چھوڑ جاتے ہیں کچھ نہ سہی تو کچھ سگریٹیں اور چند سکے ہی چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں چنانچہ بیگم وقت رخصت ہمیں اس دعا کے ساتھ الوداع کہتی ہیں۔

"خداوندا! آپ کو مع ضروری سامان کے واپس آنے کی توفیق دے آمین ثم آمین۔"

لیکن ہم افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ بیگم کی یہ دعا کبھی قبول نہیں ہوئی اور جب ہم گھر پہنچے ہیں تو کوئی نہ کوئی چیز گنوا کر ہی اندر داخل ہوتے ہیں۔ ہم سستی اور ضروری چیزیں ہر دن کھوتے رہتے ہیں اور پھر کف افسوس ملتے ہیں۔ ان چیزوں کی تعداد اب اتنی بڑھ چکی ہے کہ جتنے ہمارے سر کے بال یا آسمان پر تارے۔ آج تک ہم دو چند بیش قیمت چیزوں کو بھی گنوا چکے ہیں۔ داغ مفارقت دینے والی ان اشیاء میں ایک خوبصورت بال پین بھی ہے جسے ہم آج تک بھول نہیں سکے۔ وہ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے ہمیں بار بار اور بے اختیار یاد آجاتا ہے۔ وہ نہ صرف ہمیں لکھنے کے لیے اکساتا تھا بلکہ موقع پر ہمیں وقت اور تاریخ سے بھی آگاہ کرتا تھا۔ یقین کیجئے! ہم اپنے گھریلو معاملات میں لاپرواہی کرتے لیکن اس قلم کی نگرانی کافی مستعدی سے کرتے تھے بالکل اس طرح جیسے کوئی شکی مزاج شوہر اپنی خوب رو شوخ اور چنچل بیوی پر نگاہ رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اپنے پرائے سبھی اس قلم کے حسن و جمال پر ریجھے ہوئے تھے اور جان چھڑکتے تھے اور جب تک اسے ہاتھ میں نہ لے لیتے انہیں کسی کل چین نہ آتا تھا اس لیے ہم چوکنا رہتے تھے کہ کسی طرح اس کا اغوا عمل میں نہ آنے پائے۔ غرض اس قلم نے مہینوں رفاقت کی اس کے بعد پھر کیا ہوا؟ اسے بھی سنتے چلئے!

ایک دن اچانک وہی قلم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے کر چل بسا اور ہمیں سوگوار اور اشکبار بنا گیا۔ اس کی وفاداری بشرط استواری کا نشان بن کر ہمارے ذہن میں کھٹکا کرتی ہے۔ یہ جانکاہ حادثہ اس دن رونما ہوا جب ہم صبح سویرے اسے کوٹ کی اوپری جیب میں اسے نمایاں طور پر لگائے ہوئے تھے۔ بیگم نے اسے دیکھتے ہی کافی خلوص سے مشورہ دیا تھا۔

"قیمتی قلم ہے اسے اندر کی جیب میں رکھئے"

ہمیں اتنا یاد ہے کہ گھر سے رخصت ہوتے ہوئے ہم نے اسے پینٹ کی اگلی جیب میں محفوظ کر لیا تھا یہی وہ جیب ہے جس میں ہم نوٹ بھی رکھ لیتے ہیں اور ہمارے ہاتھوں کے اس سے قریبی روابط ہیں لمحہ بہ لمحہ اپنے آپ ہاتھ اس کی طرف بڑھ جاتے ہیں غرض ہمیں اس قلم کو اس جیب میں رکھنا تو یاد ہے لیکن وہ کب اور کس طرح ہم سے جدا ہو گیا یہ بالکل یاد نہیں ہم اس قلم کی جدائی میں سینہ چاک اور دل فگار گھر پہنچے۔ بیگم ہمیں دیکھتے ہی بولیں۔

خیریت تو ہے۔ چہرہ پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں!
بیگم کو ہم نے شریک غم کرتے ہوئے اس حادثے کی خبر سنا دی لیکن وہ تیکھے انداز میں بولیں۔

صبر کیجئے۔ یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا ویسے اس قلم نے حق رفاقت خوب ادا کیا۔ مجبوری یہ ہے کہ آپ کے ہاتھ میں کوئی چیز ٹکتی ہی نہیں۔ وہ تو کہیئے کہ میں آپ کا ذہن مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہوں ورنہ آپ مجھے بھی سر راہ کہیں گم کر دیتے۔"

ادھر عینک کے کھونے کے پے در پے واقعات پیش آتے تو ہمیں ایک سن رسیدہ باس بے اختیار یاد آئے۔ جنھوں نے دوران گفتگو ایک ضروری فائیل میں اپنی عینک باندھ کر کمشنر کے پاس بھیج دی تھی عینک کے سلسلے میں دفتر میں تفتیش ہو رہی تھی۔ کئی بے گناہ زد میں آرہے تھے عین اسی وقت کمشنر نے اس عینک کو واپس کر کے ان بے گناہوں کی گلو خلاصی کروائی۔ اس وقت ہمیں اس واقعہ پر تعجب ہوا تھا لیکن آج جو ہم پر بیت رہی ہے اور تین عینکوں کو ہم نے دو ماہ کے وقفہ میں جن جن نا دیدہ مقامات میں کھو یا تو ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ عمر کی اس منزل میں یہی ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں اب ہمارے تجربات بھی سنتے چلیئے!
جب ہم نے یکے بعد دیگرے تین عینکیں گنوا دیں تو ہم نے دو عینکیں بنوائیں ایک کو دفتر میں رکھتے ہیں اور دوسری گھر میں۔ ایک دن ہم دفتر میں بیٹھے ہوئے ایک فائیل دیکھ رہے تھے اور ہمیں اس میں وہ ضروری کاغذ نہیں مل رہا تھا جس سے معاملے کو آگے بڑھایا جاتا۔ موقع پر ریکارڈ کیپر بھی نہیں تھے۔ عین اس وقت ہمارے ایک دوست آگئے اور انہوں نے اپنی باتوں میں اس طرح الجھایا کہ ہمیں وقت

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

تبصرہ

ماہنامہ العطش جموں کا جگن ناتھ آزاد نمبر

ماہنامہ العطش جموں نے کچھ عرصہ پہلے جگن ناتھ آزاد نمبر شائع کیا، جس میں موصوف کی شخصیت، شاعری، نثر نگاری وغیرہ پر بیش قیمت مضامین شامل ہیں۔ اس میں جگن ناتھ آزاد کی تصنیفات و تالیفات نیز انعامات و اعزازات کی تفصیل بھی شامل کی گئی ہے۔ لکھنے والوں میں جناب انتظار حسین، ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، خواجہ احمد عباس، جناب راج بہادر گوڑ اور جناب عبداللطیف اعظمی جیسی بہت سی عظیم شخصیتیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں جناب فراق گورکھپوری، جناب سجاد ظہیر، ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب جاوید اقبال، جناب جاں نثار اختر، جناب احتشام حسین، جناب مجروح سلطانپوری، جناب محمد حسن، جناب وزیر آغا، جناب خلیل الرحمٰن اور دیگر بہت سی عظیم ہستیوں کے ایسے خطوط شامل کئے گئے ہیں جن میں دلی لطائف کے علاوہ بہت سے علمی گوشوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اس کے حرف اوّل میں مذکور ہے کہ بطور شاعر پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی مقبولیت کا اندازہ تو اس بات سے ہی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے وقت پہلا ترانۂ پاکستان جو ریڈیو پر سنایا گیا، وہ انھیں کا لکھا ہوا تھا، اس میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ اتنی مقبولیت حاصل ہونے، اتنے اعزازات و انعامات حاصل کرنے، نامور ادبی شخصیتوں کی داد و تحسین حاصل ہونے کے باوجود ان میں تکبر نام کی چیز نہیں ہے۔ رسالے کے مدیر راج کمار چندن نے پروفیسر

یوجستا، نئی دہلی

جگن ناتھ آزاد سے ایک ادبی ملاقات کی، اس ملاقات میں آزاد صاحب نے بہت سی پتے کی باتیں کہی ہیں۔ اپنے شعر و ادب کی تعمیر و تشکیل کے بارے میں فرماتے ہیں۔۔

"میں سمجھتا ہوں کہ میں جو کچھ بھی اس وقت ہوں، انھیں (اپنے والد محترم) کی وجہ سے ہوں انھوں نے میرے شعر و ادب اور وجدان کی پرورش میرے بچپن ہی میں شروع کی تھی اور اگر میں ۱۹۳۷ء میں اس قابل ہو چکا تھا کہ مولانا تاجور نے مجھے بخوشی اپنے حلقۂ تلامذہ میں شریک کیا تو اس کا سبب صرف یہی ہے کہ میرے والد کی تربیت نے مجھے ۱۸ برس کی عمر میں اس قابل بنا دیا تھا کہ علامہ تاجور نے بغیر کسی تامل بلکہ اظہارِ مسرت کے ساتھ مجھے اپنی شاگردی میں قبول کیا۔ اس وقت اختر شیرانی، احسان دانش، فاخر ہریانوی اور کرپال سنگھ بیدار ایسے مشاہیر شعرا ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔" آزاد صاحب اس ملاقات میں آگے چل کر فرماتے ہیں کہ "راج کمار جی! ہمارے ملک میں انعامات Merit یا قابلیت کی بنا پر بھی ملتے ہیں اور جوڑ توڑ کی بنا پر بھی ۔۔ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ ساہتیہ اکیڈمی کا انعام پانے والے اکثر لوگ کس طرح Wire pulling کرتے ہیں۔ اس میں چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں۔ میں کس کس کا نام لوں، کس کس طرح سفارشیں آتی ہیں۔ انعام پانے والوں میں فراق گورکھپوری اور جگر مرادآبادی ایسے شاعر اور امتیاز علی خاں عرشی ایسے مسلّمہ حیثیت کے نثر نگار حضرات شامل ہیں لیکن ان حضرات کو بھی جس طرح ساہتیہ اکیڈمی کا انعام ملا، اس کی تفصیل میں بخوبی جانتا ہوں ۔۔۔"

اس گفتگو میں آگے چل کر کہتے ہیں کہ اب رہی بات میرے ماہر اقبالیات کہلانے کی تو بڑی صفائی اور بغیر کسی تصنع کے یہ عرض کر رہا ہوں کہ میں اپنے آپ کو اس اعزاز کا ہرگز مستحق نہیں سمجھتا۔ ماہر اقبالیات کے لیے پہلے اتنا علم تو کسی شاعر کے پاس ہو، جو اقبال کے پاس تھا۔"

اس بات چیت میں آپ نے یہ بھی خوش خبری دی کہ دنیا کے اکثر ملکوں میں اور یونیورسٹیوں میں اُردو پر کام ہو رہا ہے۔ روس، امریکہ، کینیڈا، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور اکثر ایشیائی ممالک کی یونیورسٹیوں میں اُردو ایک مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ امریکہ میں مختلف سطحوں پر ۲۲ یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جارہی ہے۔

بلاشبہ جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی زندگی کے بہت سے مخفی گوشوں کو بے نقاب کیا ہے اور اقبالیات کے مطالعے سے دلچسپی رکھنے والوں کو بہت سے ایسے گوشوں سے واقف کرایا ہے جس سے ہندوستان کی تہذیبی رنگارنگی اور گوناگوں منظرِ عام پر آتی ہے۔ انھوں نے بتلایا کہ کئی پشتوں پہلے کسی منزل پر اقبال اور تیج بہادر سپرو کے جدِ اعلیٰ ایک ہی تھے اور یہی وہ باہمت خاندان ہے جس کے وہ چشم و چراغ تھے اور جس پر انھیں فخر تھا۔

اس طرح جگن ناتھ آزاد نمبر ایک وقیع دستاویز ہے اور اس کے بیش قیمت مشمولات اردو ادب کے ہر طالب علم کے مطالعے کے لیے ضروری ہیں۔ جو طلبا جگن ناتھ آزاد پر تحقیقی کام کرنا چاہیں گے، ان کے لیے یہ ضروری مواد فراہم کرتا ہے۔ البتہ اس کی چھپائی ناقص ہے اور کاغذ ہلکا ہے، کاش اس قدر بیش قیمت مواد ایک بار پھر عمدہ کاغذ اور طباعت کے ساتھ منظرِ عام پر آسکے، اس میں جگن ناتھ آزاد کی صحافتی زندگی اور چند اہم تصاویر کا اضافہ کر دیا جائے تو اس کی جامعیت اور افادیت بڑھ جائے گی۔

عادل صدیقی

یکم تا ۳۰ ستمبر ۱۹۸۷

عبدالعزیز قادری۵

بچوں کے چھ دشمنوں سے جنگ

بچے بالخصوص نومولود بچے بڑی آسانی سے بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کے جسم میں قدرتی مدافعتی نظام پوری طرح مضبوط و مستحکم نہیں ہو پاتا۔ اس لیے بہت سی خطرناک بیماریوں کا زیادہ خطرہ بھی بچوں کو ہی رہتا ہے ان میں پولیو (POLIOMEYLITIS) تپ دق یا ٹی بی (TUBERCULOSIS) خسرہ یا چھوٹی چیچک (MEASLES) گلسوئے یا گلگھونٹو (DIPHTHERIA) کالی کھانسی، (WHOOPING COUGH) اور ٹیٹنس (TETANUS) خاص بیماریاں ہیں جو بچوں کو مدافعتی نظام کی تشکیل سے پہلے لاحق ہو جاتی ہیں۔

بعض صورتوں میں ان امراض کا نتائج بڑے سنگین اور دائمی نکلتے ہیں مثلاً دماغی خلیے (CELLS) تباہ ہو سکتے ہیں جن کے نتیجے میں بچہ ذہنی مریض بن جاتا ہے، ان کے کسی عضو یا جسم کے نصف حصے پر فالج پڑ سکتا ہے۔ ہاتھ پیر مڑ سکتے ہیں۔ مریض دائمی طور پر بہرا اور اندھا ہو سکتا ہے اور کئی صورتوں میں تو موت بھی ہو جاتی ہے۔

ہمارے ملک میں سبز انقلاب آیا، اناج کی پیداوار دوگنی تین گنی ہو گئی۔ صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوا اور خلاء میں بھی ہم نے قدم رکھنا شروع کر دیا۔ مگر کتنے افسوس کی بات ہے کہ صحت عامہ کے شعبے میں ہم اتنی ترقی نہیں کر سکے جتنی کرنی چاہیے تھی۔ ملک میں ہر روز ۵۰۰ بچے پولیو کی وجہ سے زندگی بھر کے لیے معذور ہو جاتے ہیں۔ ہر سال ڈھائی لاکھ بچے ٹیٹنس کی وجہ سے پیدا ہوتے ہی یا پیدا ہونے کے کچھ دیر بعد مر جاتے ہیں۔ ۴ لاکھ بچے ہر سال تپ دق کی وجہ سے مرتے ہیں، اور ایک لاکھ سے زائد کالی کھانسی میں جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے بچے خسرہ سے بھی یا تو مر جاتے ہیں یا بیحد کمزور ہو جاتے ہیں۔ یہ اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ صحت کے شعبے میں ہم کس قدر پچھڑے ہوئے ہیں۔

اس پچھڑے پن کی کئی سماجی و اقتصادی وجوہ ہیں جن میں غریبی، ناخواندگی، زیادہ آبادی اور غیر صحت مند ماحول اہم ہیں۔ ملک کی آبادی مسلسل بڑھ رہی ہے اور اندازہ ہے کہ ۲۰۰۰ء تک ملک کی آبادی ایک ارب سے زائد ہو جائے گی۔ اس وقت آبادی ایک کروڑ ۳۰ لاکھ کی سالانہ شرح سے بڑھ رہی ہے۔ روزگار کی تلاش میں زیادہ سے زیادہ لوگ دیہات سے شہروں کا رُخ کر رہے ہیں۔ جس کے نتیجے میں شہروں کی آبادی بڑھ رہی ہے اور جھگی جھونپڑیوں والی نئی نئی گندی بستیاں جنم لے رہی ہیں۔ دیکھا جائے تو شہروں میں گندی بستیوں کے پھیلاؤ کی وجہ سے ہی زیادہ تر بیماریاں پنپ رہی ہیں۔ اور اوپر جو اعداد و شمار ہم نے دیئے ہیں ان میں سے بیشتر صرف ان گندی بستیوں کے غیر صحت مند ماحول کی وجہ سے اتنے بڑے ہو گئے ہیں

آٹھ سال پہلے ۱۹۷۸ء میں حکومت نے عالمی صحت تنظیم کے تعاون سے بچوں کے جسمانی مدافعتی نظام کو مضبوط کرنے کے لیے ٹیکے لگانے کا ایک توسیعی پروگرام شروع کیا تھا جسے ای پی آئی (EXPANDED IMMUNIZATION PROGRAMME) کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑا پروگرام ہے جس کا خاص مقصد بچوں میں بیماریوں کو کم سے کم کرنا ہے۔ اس کے تحت ۱۹۹۰-۹۱ء تک ملک کے ۸۵ فیصد بچوں کو ٹیکے لگا کر مذکورہ چھ خطرناک بیماریوں سے محفوظ کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ تب سے اب تک یہ پروگرام عالمی صحت تنظیم یا ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO) کے زیر اہتمام ایک بہت بڑا پروگرام بن گیا ہے۔ تنظیم نے سب سے پہلے اس پروگرام کا خاکہ ۱۹۷۴ء میں تیار

۵ چوک ہاشم خاں، گھجو تلہ، سہارنپور (یو۔ پی)

کیا تھا۔ جس کا مقصد ۱۹۹۰ء تک دنیا کے تمام بچوں کو مہلک بیماریوں کے ٹیکے لگانا تھا، خاص زور انھیں چھ مہلک بیماریوں پر دیا جا رہا ہے جن میں مبتلا ہو کر ۱۹۸۳ء کے جائزے کے مطابق ہر سال ۵۰ لاکھ بچے مر جاتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ترقی پذیر دنیا میں ہر ایک منٹ میں ۱۰ بچے ان بیماریوں کے شکار بن جاتے ہیں اور اتنے ہی معذور ہو جاتے ہیں۔

اس عرصہ میں اگرچہ کئی ترقی پذیر ملکوں نے ٹیکے لگانے کی اس زبردست مہم میں کافی ترقی کی ہے مگر ۱۹۹۰ء تک تمام بچوں کو چھ مہلک بیماریوں کے ٹیکے لگانا اب بھی ایک خواب بنا ہوا ہے۔ ۱۹۹۰ء کا سال تیزی سے قریب آ رہا ہے اور اگرچہ ٹیکوں کے ذریعے بیماریوں سے محفوظ ہونے والے بچوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ مگر اس کی رفتار اب بھی کم ہے۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا میں صرف ۴۰ فیصد چھوٹے بچوں کو ڈی پی ٹی (DPT) کا تیسرا ٹیکہ لگ سکا ہے اور ۳۰ فیصد کو پولیو کا تیسرا ٹیکہ لگا ہے۔ نومولود بچوں کی شرح اموات اب بھی بہت زیادہ ہے اور ہر ایک ہزار بچوں میں سے ۱۱۴ پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں۔ قومی صحت پالیسی میں اس شرح کو ۲۰۰۰ء تک ۶۰ فی ہزار یا ۶ فیصد کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

اس وقت ہندوستان میں صرف ۳۰ فیصد بچوں کو تمام پانچ ٹیکے لگ پاتے ہیں۔ ان پانچ ٹیکوں میں خسرہ کا ٹیکہ بھی شامل ہے۔ اسے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ۹۱-۱۹۹۰ء تک ۸۵ فیصد بچوں کو ٹیکے لگانے کا نشانہ حاصل کرنا بھی مشکل ثابت ہو سکتا ہے۔

عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ چھ بیماریاں بچوں پر اسکول جانے سے پہلے کے عمر کے حصے میں حملہ کرتی ہیں۔ پولیو میں بیشتر بچے دو سال سے کم عمر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ (پانچ برس سے زیادہ عمر کے بچوں میں یہ مرض بہت کم پایا جاتا ہے) کالی کھانسی کا شدید اور خطرناک حملہ عموماً نومولود بچوں پر ہوتا ہے۔ جب کہ کنٹھی یا ڈپتھیریا اور تپ دق اسکول جانے کی عمر میں دیکھے گئے ہیں۔ ٹیٹنس کے مہلک کیس عموماً نومولود بچوں میں دیکھنے میں آتے ہیں اور ہمارے ملک میں نومولود بچوں کی اموات میں بڑا ہاتھ اسی ٹیٹنس کا ہے۔ اس کی علامتیں پیدائش کے تین یا چار دن بعد ظاہر ہوتی ہیں اور موت بہت جلد واقع ہو جاتی ہے۔ عموماً بچہ ہسپتال یا ڈاکٹر تک لے جائے جانے سے پہلے ہی چل بستا ہے۔ اکثر صورتوں میں وہ ہسپتال میں بھی نہیں بچ پاتا۔ ہمارے ہسپتالوں میں ٹیٹنس میں مبتلا ہونے والے جو نومولود بچے علاج کے لیے داخل کیے جاتے ہیں ان میں چار میں سے تین ساری کوششوں کے باوجود نہیں بچ پاتے۔

جہاں تک پولیو کا تعلق ہے تو اس کے کیس پچھلے برسوں میں گھٹنے کی بجائے اور بڑھ گئے ہیں۔ ملک میں ۱۲ لاکھ بچے پولیو میں مبتلا ہیں اور ان میں ہر سال دو لاکھ کا اضافہ ہو رہا ہے۔

یہ سب اس کے باوجود ہو رہا ہے کہ ان چھ مہلک بیماریوں کے نہایت مؤثر ٹیکے دستیاب ہیں اور حکومت ان پر کافی سرمایہ خرچ کر رہی ہے۔ پھر یہ ٹیکے نہ صرف بہ آسانی دستیاب ہیں بلکہ انھیں لگوانے پر کچھ خرچ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ بڑے شہروں کی تمام سرکاری ڈسپنسریوں اور ہسپتالوں میں یہ ٹیکے بہ آسانی لگوائے جا سکتے ہیں۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی یہ ٹیکے مہیا کر دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اخبارات و رسائل، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے بھی حکومت کا محکمۂ صحت ان امراض کے خلاف پرچار کر رہا ہے۔ عالمی صحت تنظیم اور یونی سیف کے تعاون سے شہروں کے گندی بستی والے علاقوں میں ٹیکے لگانے والوں کی ٹیمیں بھیجی گئی ہیں۔

ان سب تدبیروں کے نتیجے میں بہت سے علاقوں میں ان بیماریوں کے بڑھنے کی شرح کو روکا گیا ہے لیکن یہ رفتار ابھی تسلی بخش نہیں ہے۔

انھیں حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے حکومت صحت سے متعلق منصوبوں پر اپنے اخراجات میں مسلسل اضافہ کر رہی ہے اور ساتویں منصوبے میں اس کے لیے ۳۳ ارب ۹۲ کروڑ ۸۹ لاکھ روپے مخصوص کیے جا چکے ہیں۔ سالانہ اخراجات میں بھی بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ جہاں ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۴ ارب ۸۴ کروڑ روپے مخصوص کیے تھے، وہاں ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۵ ارب ۳۷ کروڑ روپے مخصوص کیے گئے اور ۸۷-۱۹۸۶ء کے مالی سال میں تو ۶ ارب روپے سے بھی زیادہ خرچ ہونے کا امکان ہے۔

صحت سے متعلق منصوبوں پر اخراجات میں اس اضافے کے پیش نظر چھ مہلک بیماریوں کے خلاف ٹیکوں سے لڑی جانے والی اس جنگ میں بھی شدت آنے کی توقع ہے۔ اب حکومت ٹیکوں کی سلسلے کی مہم کو اور تیز کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور گھر گھر جا کر ٹیکے لگانے والے عملے میں بھی اضافے کا منصوبہ ہے۔

ایک اور جنگ تعلیم کے مورچے پر لڑی جا رہی ہے اور ناخواندگی کو کم کرنے کے کئی پروگراموں پر عمل ہو رہا ہے۔ تعلیم اور خواندگی کا صحت پر بھی اثر پڑتا ہے اور امید کی جانی چاہیے کہ جیسے جیسے تعلیم بڑھتی جائے گی۔ لوگوں میں بچوں کو مہلک

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

کے این بھٹناگر

دل کا دورہ یا ہارٹ اٹیک

ایک مُہلک مرض ـــــ اِس سے بچئے!

یہ مرض بڑا مُہلک اور جان لیوا ہے۔ اور اچانک ہی دھر دبا تا ہے جس سے مریض کی جان پر آ بنتی ہے اور علاج میں ذرا سی بھی غفلت ہو جائے تو مریض کا جانبر ہونا مشکل ہو جاتا ہے، اور اس کے پسماندگان پر بھی مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے کیوں کہ اس مرض کے شکار عام طور پر مرد ہی ہوتے ہیں۔ روزی روٹی کمانے والے۔ عورتیں نہیں ہوتیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ یہ مرض سگریٹ یا تمباکو نوشی اور دیگر مست آور چیزوں کے استعمال سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ عورتیں عام طور پر ان چیزوں سے پرہیز کرتی ہیں اور ان کے استعمال کو ایک عیب سمجھتی ہیں۔ اس لیے وہ اس بیماری سے محفوظ رہتی ہیں۔

پچھلے زمانے میں تو صرف بوڑھے لوگ ہی اس بیماری کا شکار ہوتے تھے، اور وہ بھی بہت کم، لیکن اب تو یہ بیماری عام ہو گئی ہے۔ اور اس کے جال میں نوجوان طبقہ بھی بکثرت پھنسنے لگا ہے۔ اور جب کسی نوجوان پر اس کا حملہ ہوتا ہے تو وہ بڑا تیز اور تیکھا ہوتا ہے جسے وہ برداشت نہیں

[illegible]

کر پاتا۔ اور لقمۂ اجل بن جاتا ہے۔

اگرچہ اب پہلے کے مقابلے میں اس روگ کے مریضوں کے لیے زیادہ سہولتیں میسر ہیں اور ملک کے کئی بڑے ہسپتالوں میں خاص وارڈ بھی بنا دیے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی مریضوں کی تعداد دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اگر یہی عالم رہا، اور یہ روگ وبا بن کر پھیل گیا تو اس سے نپٹنا مشکل ہو جائیگا۔

ڈین آف کے۔ ای۔ ایم (KEM) ہسپتال بمبئی کا کہنا ہے کہ کچھ سال پہلے تو چالیس سال سے کم عمر کا دل کا مریض شاذو نادر ہی ہسپتال میں بھرتی ہونے کے لیے آتا تھا لیکن اب تو روزانہ ہارٹ کے مریضوں کا ایک تانتا سا لگا رہتا ہے اور اتنا رش ہوتا ہے کہ اُسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہی نہیں مدراس میڈیکل کالج ہسپتال والوں کی بھی یہی شکایت ہے۔ پہلے اُن کے پاس دل کے مریضوں کے لیے ۲۰۰ بیڈ ریزرو تھے۔ اب سو بیڈ اور بڑھا دیے گئے ہیں۔ لیکن اب وہ بھی کھچا کھچ بھرے رہتے ہیں۔ اور کتنے ہی سے مریضوں کو پلنگ نہیں ملتے۔ اور انہیں بعض اوقات کئی کئی دن انتظار کرنا پڑتا ہے۔

یہی حال آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز دہلی کا ہے۔ اب بھی اوپن ہارٹ سرجری (Open Heart Surgery) کے کئی مریض اُن کے ویٹنگ لسٹ میں ہیں۔ جو آپریشن تھیٹر میں جانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔

دل کا یہ روگ یعنی ہارٹ اٹیک آخر ہوتا کیوں ہے۔ ڈاکٹری چھان بین سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کثرت سے سگریٹ نوشی، شراب خوری اور منشیات کا استعمال۔ مرغن غذائیں وغیرہ یا طبیعت میں انتشار، اشتعال، کھچاؤ، بے چینی اور گھبراہٹ ہی اس روگ کے بانی مبانی ہیں۔ سب سے زیادہ نقصان تو سگریٹ نوشی اور تمباکو کے استعمال سے ہوتا ہے۔ کیوں کہ تمباکو میں ایک زہر نکوٹین (Nicotine) پایا جاتا ہے جو ہر کش کے ساتھ اندر جاتا ہے۔ اور دل کی شریانوں پر اثر کرتا ہے۔ وہ سکڑنے لگتی ہیں۔ اور خون کا دورہ رُکنے لگ جاتا ہے جس سے ایک طرف تو دل کے کام میں رُکاوٹ پیدا ہونے لگتی ہے اور وہ خون

بخوبی پمپ نہیں کر سکتا۔ دوسرے نکوٹین کا زہر منہ، گلے اور لیور پر بھی اثر کرتا رہتا ہے۔ اور بعض اوقات کینسر بھی پیدا کر دیتا ہے۔ ادھر ہارٹ اٹیک بھی ہونے لگتے ہیں اور اگر اٹیک زبردست ہوا تو مریض ڈاکٹر کی راہ تکتے ہوئے ہی دم توڑ دیتا ہے۔ اور گھر والے منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

سگریٹ نوشی کا شوق نوجوانوں میں دن بدن ترقی پذیر ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم اسے برملا پینے لگے ہیں۔ اور دن میں کئی کئی سگریٹیں پھونک دیتے ہیں۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ یہ راہ انھیں موت کی نیند بھی سُلا سکتی ہے۔ کالا ناگ انہی کی تاک میں بیٹھا ہے۔ اور موقعہ پاتے ہی انھیں ڈس لے گا۔

اِدھر سگریٹ بنانے اور بیچنے والی کمپنیاں اپنی چیز کی مشہوری کے لیے نئے نئے ہتھکنڈے استعمال کرتی ہیں۔ اور اخباروں اور رسالوں میں بڑھ چڑھ کر دلکش اشتہار دیتی ہیں۔ لیکن قانون کی زد سے بچنے کے لیے ایک کونے میں یہ عبارت ضرور لکھ دیتی ہیں (Cigarette Smoking is injurious to health) یہ کیسا بھونڈا مذاق ہے پبلک کے ساتھ۔ اگر یہ چیز نقصان دہ اور جان لیوا ہے تو اس کا اشتہار ہی کیوں دیا جائے۔ اور پھر گورنمنٹ اُس کی اس بے دھڑک اشتہار بازی پر پابندی کیوں عائد نہیں کرتی۔ اگر ان نقصان دہ چیزوں کی اشتہار بازی بند ہو جائے اور یہ آسانی سے میسر نہ ہو سکیں تو ہزاروں اور لاکھوں قیمتی زندگیاں تباہ ہونے سے بچائی جا سکتی ہیں۔

کہتے ہیں سنجیو کمار فلم کا مشہور ایکٹر یعنی فلم اسٹار جو لاکھوں دلوں کا چہیتا تھا، سگریٹ اور شراب نوشی کا بڑا عادی تھا۔ دن میں سگریٹ کی کئی کئی ڈبیا پھونک دیتا تھا۔ ابھی اُسکی شادی تک نہیں ہوئی تھی۔ اُسے بھی دل کا عارضہ تھا اور ڈاکٹروں نے اُسے وارننگ بھی دے رکھی تھی۔ لیکن اُس نے کسی کی بات نہ سُنی۔ اور پھر اوپن ہارٹ سرجری کے لیے امریکہ بھی گیا اور وہاں سے آپریشن کرا کے واپس آیا۔ لیکن پھر بھی جانبر نہ ہو سکا۔ اور جھٹ پٹ موت کی آغوش میں جا بیٹھا۔ ایک دن اچھا بھلا سنیو کرنے کے بہانے کے لیے غسل خانے جا رہا تھا کہ ایک دم ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ اور چھاتی پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے منٹوں میں چت ہو گیا۔ اُس کی موت سے ساری فلم انڈسٹری میں کہرام سا مچ گیا۔ کئی پروڈیوسروں کو کافی مالی نقصان بھی پہونچا۔ جن کی فلموں میں وہ کام کر رہا تھا اور وہ فلمیں ادھوری رہ گئیں۔

جب یہ خبر گجرات میں اُس کے بھائی اور بھاوج کو ملی تو وہ دھک سے رہ گئے۔ اور بدحواس ہو کر دوڑے ہوئے بمبئی آ پہونچے۔ لیکن اب وہاں کیا رکھا تھا۔ سنجیو کمار کی زندگی تو ختم ہو چکی تھی۔ مثل مشہور ہے کہ اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

سچ تو یہ ہے کہ دل کا دورہ یعنی ہارٹ اٹیک ایک بڑا خطرناک مرض ہے۔ ڈاکٹر مریض کی جان بچانے کے لیے اکثر اوپن ہارٹ سرجری کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن ہر جگہ اس کے لیے پوری سہولتیں بھی میسر نہیں ہیں دوسرے یہ کافی مہنگا علاج ہے ہر شخص کے بس کا روگ نہیں۔ کہ اس کا بوجھ اٹھا سکے۔ تیسرے دل کے مریض کی کوئی گارنٹی نہیں کہ شفا ہو گی بھی یا نہیں اور وہ کب تک زندہ رہیگا۔ اس کی تازہ مثال سنجیو کمار کا کیس ہمارے سامنے ہے۔ جو ہزاروں روپے خرچ کر کے اوپن ہارٹ سرجری کے لیے امریکہ گیا لیکن پھر بھی زندہ نہ رہا۔

ہمارے خیال میں تو اس موذی مرض سے بچنے کا ایک موثر طریقہ یہی ہے کہ سگریٹ، بیڑی تمباکو اور دیگر منشیات کو منہ نہ لگایا جائے اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو ہارٹ اٹیک کا خطرہ ٹل جائے گا۔ دوسرے منہ اور لیور کے کینسر جیسی نامراد بیماری سے بھی بچاؤ رہے گا۔ اسی کو کہتے ہیں ایک تیر سے دو شکار، ذرا آزما کر تو دیکھئے اس میں بھلائی ہی بھلائی ہے۔ شاید اسی لیے کچھ مذاہب نے بھی ان چیزوں کے استعمال پر کڑی پابندی لگا رکھی ہے۔ ●

بقیہ، اداریہ

۵۱ - ۱۹۵۰ء میں دالوں کی کاشت ۱۹ لاکھ ہیکٹیئر رقبہ پر کی جا رہی تھی۔

۸۵ - ۱۹۸۶ء میں دالوں کی کاشت کا رقبہ ۲۳۸.۲ لاکھ ہیکٹیئر تھا اور پیداوار ۱۲۹.۶ لاکھ ٹن تھی۔ ۵۱ - ۱۹۵۰ء میں تلہنوں کی کاشت ۱۰۷ لاکھ ہیکٹیئر رقبے پر کی جا رہی تھی اور جن کی پیداوار ۵۱.۵۸ لاکھ ٹن تھی۔

۸۶ - ۱۹۸۵ء میں تلہنوں کی کاشت کا رقبہ ۱۸۸.۷ لاکھ ہیکٹیئر تھا اور پیداوار ۱۱۵ لاکھ ٹن تھی۔ ایندھن اور پھلوں کے درخت لگانے کی اسکیم کے تحت ۳۶۸.۵ لاکھ پودے ۸۴-۱۹۸۳ء کے دوران تقسیم کئے گئے اور ۲۷۰.۷۸ لاکھ پودے ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران تقسیم کئے گئے۔ اس سال خشک سالی نے ہمارے سامنے ایک زبردست مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں آبرسانی کے چھوٹے وسیلوں سے کام لیا جا رہا ہے، یہ اچھی بات ہے کہ چھوٹی آبپاشی کی اسکیم کے تحت ۸۴-۱۹۸۳ء سے دسمبر ۱۹۸۶ء تک تقریباً چار لاکھ کنوئیں اور ٹیوب ویل تعمیر کئے جا چکے ہیں اور ۴ لاکھ پمپ سیٹ ڈیزل انجن اور بجلی کے موٹر لگائے جا چکے ہیں۔ ●

(ایڈیٹر)

آپ سب کے لئے

آئی آر ڈی پی کیا ہے؟

ہندوستان گاؤں کا ملک ہے ۱۰۰ میں سے تقریبا ۷۶ لوگ گاؤں میں رہتے ہیں وہاں غریبی ایک خاص مسئلہ ہے گاؤں میں غریبی دور کرنے کے لئے ایک یوجنا بنائی گئی ہے اسکو "دیہی ترقیاتی پروگرام" یا آئی آر ڈی پی کہتے ہیں۔

اس پروگرام کا مقصد کیا ہے؟

اس پروگرام کے تحت گاؤں میں رہنے والے غریب خاندانوں کو مدد دی جاتی ہے تاکہ وہ خود روزگار شروع کرکے اپنی آمدنی میں کسی حد تک اضافہ کر سکیں۔

بہت غریب کون ہے؟

جن خاندانوں کی سالانہ آمدنی ۶۴۰۰ روپیہ یا اس سے کم ہے، انہیں بہت غریب مانا جاتا ہے۔ لیکن اس پروگرام کے تحت صرف ان غریب خاندانوں کو مدد دی جاتی ہے جن کی سالانہ آمدنی ۴۸۰۰ روپے تک ہوتی ہے۔ اس پروگرام کا مقصد سب سے غریب خاندانوں کی مدد کرنا ہے۔ اس لئے جن خاندانوں کی آمدنی ۳۵۰۰ روپیہ سالانہ سے بھی کم ہوتی ہے، انہیں پہلے مدد دی جاتی ہے

یوجنا، نئی دہلی

مدد کیوں دی جاتی ہے؟

سب سے غریب خاندانوں کو اس لیے مدد دی جاتی ہے تاکہ ان خاندانوں کی آمدنی بڑھ کر ۶۴۰۰ روپے سالانہ ہو جائے۔

مدد کن لوگوں کو دی جاتی ہے؟

چار قسم کے لوگوں کو مدد دی جاتی ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ چھوٹے کسان۔ وہ کسان جن کے پاس پانچ ایکڑ یا اس سے کم زمین ہو۔

۲۔ مارجنل کسان۔ وہ کسان جس کے پاس ڈھائی ایکڑ یا اس سے کم زمین ہو۔

۳۔ کھیت میں کام کرنے والے مزدور۔ ایسے لوگ جن کے پاس اپنے گھر کو چھوڑ کر دوسری کوئی زمین نہ ہو اور جن کی آمدنی کا آدھا حصہ دوسروں کے کھیتوں میں مزدوری کرنے سے آتا ہو۔

۴۔ دیہی دستکار۔ دیہی دستکاروں کو بھی مدد دی جاتی ہے، اس کے تحت لوہار، موچی کمہار، درزی، بڑھئی وغیرہ آتے ہیں۔

ایک ضروری بات

اگر کسی گاؤں میں ۱۰۰ لوگوں کو مدد دی جاتی ہے تو یہ ضروری ہے کہ اس میں ۳۰ عورتیں ہوں اور ۳۰ درج فہرست ذاتوں یا قبیلوں کے لوگ ہوں۔

مدد پانے والوں کا انتخاب کیسے کیا جاتا ہے؟

مدد دینے کے لئے غریب خاندانوں کا سال میں ایک بار بڑے پیمانے پر سروے کیا جاتا ہے۔

سروے کرنے کے بعد خاندانوں کو آمدنی کے حساب سے تین درجوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔

۱۔ جن کی سالانہ آمدنی ۲۲۵۰ روپے تک ہو۔

۲۔ جن کی سالانہ آمدنی ۲۲۵۱ روپیہ سے ۳۵۰۰ روپے تک ہو۔

۳۔ جن کی سالانہ آمدنی ۳۵۰۱ روپیہ سے ۴۸۰۰ روپے تک ہو۔

اس سروے کے بنیاد پر سب سے غریب خاندانوں کی لسٹ بلاک اسٹاف تیار کرتا ہے۔

یہ لسٹ کہاں جاتی ہے؟

لسٹ تیار کرنے کے بعد بلاک ڈیولپمنٹ افسر (B.D.O) گرام سبھا کی میٹنگ بلاتا ہے۔ اس سبھا میں یہ لسٹ

پیش کی جاتی ہے، اس میٹنگ میں، مدد پانے والوں کا پکا چناؤ کیا جاتا ہے۔

اس سبھا میں کون کون سے لوگ شامل ہوتے ہیں

اس میں گاؤں کے لوگ، بلاک کے افسر، بینک کے افسر اور وہاں کے مقامی لوگ بھی ہوتے ہیں۔

چناؤ کے بعد کیا ہوتا ہے؟

چنے ہوئے لوگوں کے نام کی لسٹ بلاک آفس اور گاؤں پنچایت کے نوٹس بورڈ پر لگا دی جاتی ہے۔

اگر لسٹ میں لکھے کسی نام پر کوئی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو ڈسٹرکٹ رورل ڈیولپمنٹ ایجنسی DistrictRuralDevelopment Agency کے پروجیکٹ ڈائریکٹر، بی ڈی او (B.D.O) کی صلاح سے اس کا فیصلہ کرتا ہے

کن لوگوں کو پہلے مدد دی جاتی ہے؟

چنے ہوئے لوگوں کی حالت تقریباً ایک ہی قسم کی ہوتی ہے پھر بھی دو طرح کے لوگوں کو مدد پہلے دی جاتی ہے۔

۱۔ جنہیں گاؤں کی بیکار پڑی ہوئی زمین ملی ہو۔

۲۔ وہ بندھوا مزدور جو آزاد کئے گئے ہوں۔

لیکن یہ دھیان رکھا جاتا ہے کہ مدد پانے والی عورتوں اور شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کا حق نہ مارا جائے۔

یہ مدد چھوٹے موٹے روزگار چلانے کے لئے دی جاتی ہے۔

روزگار کا انتخاب کیسے ہوتا ہے؟

خاندانوں کے لیے روزگار کا کرتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا دھیان رکھا جاتا ہے۔

۱۔ لوگوں کو وہی کام دیئے جائیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔

۲۔ یا لوگوں کو ایسے کام دیئے جائیں جو انہیں آتے ہوں یا ان میں ان کی دلچسپی ہو۔

۳۔ یا ایسے پروگرام بنائے جائیں جن کے لئے خام مال آسانی سے مل سکے اور بنے ہوئے سامان کی آسانی سے کھپت ہو جائے۔

کچھ ایسے روزگاروں کی لسٹ جنکے لئے مدد دی جاتی ہے

- نجی سینچائی، کنواں، پمپ لگانے کے لئے۔
- سینچائی کے لئے نل کوپ، چڑے کھودے ہوئے کنوؤں میں پمپ لگانے کے لئے۔
- کھیتی کے لائق اوزار خریدنے کے لئے۔
- کھیتی کے لائق زمین بنانے کے لئے بیل
- بیل گاڑی، اونٹ گاڑی، گھوڑا گاڑی بھینسا گاڑی کے لئے۔
- پھل کے باغات لگانے کے لئے۔
- نرسری لگانے کے لئے۔
- مویشی پالنے کے لئے دودھ دینے والی گائے اور بھینس، مرغی، بھیڑ اور سور پالنے کے لئے۔
- مچھلی پالنے کے لئے بیج، جال، ناؤ خریدنے کے لئے۔
- ریشم پالنے، لاکھ پالنے اور شہد کی مکھیاں پالنے کے لئے۔
- چمڑے کا کام، بڑھئی کا کام، لوہاری، بیت کی ٹوکری وغیرہ بنانے کے لیے۔
- اس کے علاوہ ایسے کسی بھی کام کے لئے مدد مل سکتی ہے جو قانوناً مناسب ہو اور جس سے مدآمدنی ہو سکتی ہے۔

بینک سے قرض کے لئے درخواست

بینک سے قرض لینے کے لئے درخواست ایک کیمپ میں تیار کی جانی چاہئے۔ اس کیمپ میں مدد پانے والے، بلاک کے افسر، بینک کے افسر اس سے منسلک دوسرے محکمے کے لوگوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک ہی جگہ پر سبھی لوگوں کے اکھٹے ہونے سے ایک تو وقت کی بچت ہوتی ہے۔ دوسرے مدد پانے والوں کو کاغذات کے لئے ایک دفتر سے دوسرے دفتر کا چکر نہیں لگانا پڑتا

بینک سے قرض کی منظوری

یہ بینک کی پہلی ذمہ داری ہے کہ وہ بی ڈی او کے ذریعے دی گئی درخواستوں کو فوراً نپٹائے۔ یہ کام پندرہ دنوں میں ہونا ضروری ہے۔

املاک پر مہر یا نشان کیوں لگایا جاتا ہے؟

بینک سے ملنے والی چیزوں کے اوپر نشان لگا دیا جاتا ہے تاکہ ان کا غلط استعمال نہ ہو اور نہ ہی انہیں بدلا جا سکے۔

قرض کی وصولی کیسے ہوتی ہے؟

بینک سے منظوری ملنے پر مدد پانے والوں کو متعلقہ چیز دے دی جاتی ہے۔ اس کا دھیان رکھا جاتا ہے کہ اشیاء اچھے قسم کی اور واجب دام کی ہوں اور مدد پانے والے اس سے مطمئن ہوں۔ اشیاء کی خریداری علاقائی ترقیاتی افسر (بی ڈی او) علاقائی مویشی پالنے والے افسر، بینک منیجر اور مدد پانے والے شخص مل کر کرتے ہیں۔

قارئین کی آراء اور مشورے

● تازہ شمارہ ملا پڑھ کر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہا آپ کی لگن اور کاوشیں یقیناً رنگ لا رہی ہیں تقریباً ہر موضوع پر آپ بہترین تخلیقات پیش کر رہے ہیں، لیکن ادبی حصے کے سلسلے میں ناقص تجویز یہ ہے کہ اس میں طنز و مزاح کو بھی مناسب جگہ ملنی چاہیئے۔ کہانیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہونا چاہیئے ہاں اچھا مقالہ ایک بھی کافی ہے، بہر کیف مجموعی طور پر یہ شمارہ بھی لائق صد ستائش ہے۔ آپ نے اپنے قارئین کی تشنگی بجھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔

عزیز مرادآبادی

قاضیان، بستی کرت پور

ضلع بجنور (یو۔پی)

● "یوجنا" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ مواد کے اعتبار سے دلچسپ اور بہت معلوماتی ہے۔ میں "یوجنا" کی مستقل خریدار ہوں۔ مجھے اس کے ہر شمارے کا انتظار بڑی شدت کے ساتھ رہتا ہے۔ ادبی گوشہ بھی خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ م۔م راجندر کی کہانی "نیا منور راستہ" اور ضیا حسنی کا انشائیہ پسند آیا۔ غزلیں بھی پسند آئیں۔

مسرت پروین چالوی

قاضی محلہ، چالہ دربھنگہ (بہار)

● آپ کا رسالہ "یوجنا" واقعی قابل ستائش ہے کاغذ نہایت عمدہ اور سرورق بھی دیدہ زیب ہے صحت کے متعلق جو مضمون "ماں کے دودھ اور بچے کی پرورش" تھا وہ نہایت معلوماتی اور دلچسپ تھا۔ میرے خیال میں اگر اس میں ہم طلبا کے لئے کچھ نامور ادیبوں کے مقالے جو ہمارے کورس کے مطابق ہوں اور ہمارے مطالعے کے دوران کافی مدد بہم پہنچا سکیں شائع کئے جائیں تاکہ ہم جیسے طالب علموں کے لئے اس کا ہر شمارہ رکھنا ضروری ہو جائے اس کے علاوہ ہر شمارے میں کوئی مزاحیہ یا انشائیہ مضمون بھی شامل ہو تو کیا بات ہے۔ جس طرح رسالہ "شاعر" میں ہوا کرتا ہے۔

ویسے "یوجنا" ہر طرح سے قابل قبول ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا اسے شہرت کے بام پر پہنچا دے۔ آمین!

مشتری بیگم۔ معرفت نور محمد

زیڈ۔۳/۵۴ اے ڈاکٹرائے سے روڈ

کلکتہ ۲۴۰۰۰۰

دربھنگہ میں "یوجنا" نہیں آتا ہے۔ مدھوبنی گیا تو وہاں "یوجنا" دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی بہت دنوں کے بعد پڑھنے کا موقع ملا۔ آپ نے تو اسے مرکب بنا دیا ہے۔ ہاں! ایسا مرکب جو سب کے لئے مفید ہو۔ کہانی، غزلیں، نظمیں، طب، فلم، سائنس شخصیات کے ساتھ ملا یہ سب ایک ساتھ کہاں پڑھنے کو ملتا ہے۔ آپ کا موسیٰ الفطر یعنی "یوجنا" کی انفرادیت قائم رکھی ہے مبارکباد!

نسیم ناہد

سکریٹری مسلم یوتھ سوسائٹی

پوسٹ بھوسنے و صوفی

ضلع دربھنگہ (بہار)

● "یوجنا" ملک و معاشرہ کے فلاح و بہبود کے قابل قدر معلومات فراہم کرنے میں پوری طرح کامیاب نظر آتا ہے۔ خدا کرے یہ اپنے مقصد میں اسی طرح کامیابی و کامرانی حاصل کرتا رہے۔

روشن لال روشن بنارسی

ڈی ۱۱/۴۷ اے، راساپورہ

وارانسی (یو۔پی)

● اس طرف دیکھ رہا ہوں کہ یوجنا کے شمارے میں زبردست تغیر رونما ہوا ہے اگر ایسا ادبی معیار رہا جیسا کہ حالیہ شمارے میں دیکھنے کو ملا تو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اور اس کے سرکولیشن میں بھی اضافہ ہوگا۔ خاص کر ادب کے طلبا اس میں خاص دلچسپی لیں گے۔

منظر اعجاز، حاجی لاج، شکلا روڈ

مظفرپور (بہار)

● جولائی ۱۹۸۷ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ یوں تو یوجنا کا ہر شمارہ معیاری ہوتا ہے۔ لیکن تازہ شمارہ پچھلے شماروں سے مختلف ہے۔ اس کے سبھی مضامین معلوماتی ہیں۔ جیسے عبیدالرحمٰن صاحب کا مضمون "فصلوں کے دشمن اور ان سے حفاظت"، ڈاکٹر مسعود حسین جعفری کا مضمون "پپیتا اس کی قسمیں اور باغبانی"، ایم ایل باجاج کا مضمون "ترقیاتی پروگراموں میں اقلیتوں کی شرکت" تقریباً سبھی مضامین معلوماتی ہیں۔

"آپ سب کے لئے" عنوان کے تحت جو مضامین شائع ہوتے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ اس سلسلے کو جاری رکھیں۔

جلیل الرحمٰن معرفت ڈاکٹر قاسم صدیقی جیل روڈ، مظفرپور

پیٹرولیم کی کھوج

بھارت کی درآمدات میں پیٹرولیم کا ایک بڑا حصہ ہے جو ہمارے پہلے کے جمع شدہ غیر ملکی زرمبادلہ کو ختم کرتا ہے۔ زرعی شعبے میں تیزی سے بڑھتی ہوئی اس کی کھپت، بڑھتی ہوئی صنعت کاری، دشوار گزار علاقوں میں تیزی سے بڑھتا ہوا مواصلاتی سلسلہ غرضیکہ معیشت کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جو پیٹرولیم سے تیار ہونے والی اشیاء کا استعمال نہ کر رہا ہو۔

تیل اس وقت بھی حرارتی یا برقی پیداوار میں گراوٹ آتی ہے، فوری طور پر زرعی و صنعتی شعبے کی ضروریات کی تکمیل میں زبردست رول ادا کرتا ہے۔ تیل کی کھوج کے لیے تیل اور قدرتی گیس کمیشن اور آئل انڈیا لمیٹیڈ ایسے ادارے قائم کیے گئے۔ تیل صاف کرنے کے کارخانے بھی تعمیر کیے گئے۔ ۱۹۸۰-۸۱ء سے اب تک ۵۹ گیس اور تیل کی کھوج کی مہمات مکمل ہو چکی ہیں اور ۱۵ ان گزشتہ تین برسوں میں ابتدائی پیداوار بھی شروع کر دی ہے۔ کرشنا، گوداوری، اور کاویری کے طاسوں اور بمبئی کے دور دراز ساحل، کیمبے طاس اور آسام کے بالائی علاقوں میں کھوج تیز کر دی گئی ہے ہمالیہ کے ترائی کے پہاڑوں، مغربی بنگال کے دور دراز ساحلی علاقوں، کیرالہ کے ساحلی علاقوں اور مغربی بنگال کے ساحل کے گہرے علاقوں میں کھوج کی تیز کوششیں جاری ہیں۔

تیل اور قدرتی گیس کمیشن اور آئل انڈیا لمیٹیڈ، دونوں اداروں کے عملی نشانوں پر عمل شروع ہو گیا ہے۔ کھوج کرنے والی ساحلی و دور دراز ساحل کی برمائی میں بھی ۱۰ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ ساتویں منصوبے کے لیے ۸۱۸ میٹر کی ساحلی برمائی کے مقابلے میں ۲۴۹۰۰ میٹر برمائی کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

ساتویں منصوبے میں کھوج کے لیے منصوبہ بندی کمیشن سے منظور شدہ کمپنیوں کی پیداوار چھٹے منصوبے کے ۶۵۲ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۲۰۷۹ کروڑ روپے کر دی گئی ہے۔ مذکورہ منظور شدہ پیداوار حقیقی ضرورتوں پر منحصر ہوگی اور سال بہ سال اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

کیمبے اور کاویری کے طاسوں کے مخصوص علاقوں میں روسی امداد سے کھوج کا پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ مذکورہ پروگرام کی توسیع مغربی بنگال میں بھی متعلقہ علاقوں میں کی جائے گی۔

ساتویں منصوبے میں تیل کے طبقات الارضی ذخائر میں تقریباً ۹۶ لاکھ ٹن اور ممکن الحصول ذخائر میں ۲۳۵٫۰ لاکھ ٹن اضافہ کی تجویز ہے۔ ۱۹۸۵-۸۷ء کے دو مالی برسوں کے دوران جنوری ۱۹۸۵ء تک ۵۰۰ لاکھ ٹن کے قائم کردہ ذخیرے میں ۳۰٫۴۱ لاکھ ٹن ممکن الحصول ذخیرے سے اضافہ ہوا ہے۔

۱۹۶۰-۶۱ء میں ۵ لاکھ ٹن کی معمولی خام پیداوار کے ساتھ شروع ہونے والی پیداوار چھٹے پنج سالہ منصوبے کے پہلے برس میں ۱۲/۱۱۰ لاکھ ٹن اور منصوبے کے آخری برسوں میں ۲۹ لاکھ ٹن تک پہونچ گئی۔ ساتویں منصوبے کے دوران خام تیل کی کل پیداوار چھٹے منصوبے کے ۱۰۳ لاکھ ٹن کے مقابلے میں ۱۵۹٫۰ لاکھ ٹن ہو جانے کی توقع ہے جو ۵۴ فیصد اضافے کی مظہر ہے۔

قومی تیل کمپنیوں اور غیر ملکی اداروں کی کوششوں اور تیل کھوج نکالنے کی تکنیکوں پر پیداوار کے نئے نظام سے چلائے جا رہے کھوج کے تیز تر اقدامات کے تحت خام تیل کی پیداوار آٹھویں منصوبے کے اختتام تک ۳۴ لاکھ ٹن سالانہ تک پہونچ جانے کی توقع ہے۔

اپریل ۱۹۸۷ء میں ملک میں تیل صاف کرنے کی صلاحیت ۴۷٫۰ لاکھ ٹن سالانہ تھی جس میں بمبئی کے تیل صاف کرنے کے کارخانے ہندوستان پیٹرولیم کارپوریشن کی ۲۰ لاکھ ٹن سالانہ کی تیل صاف کرنے کی صلاحیت شامل نہیں ہے۔

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

YOJANA (URDU)

Vol. 7 No. 11-12

1-30 September 1987

خواجہ محمد شاہد

حکومتِ ہند اور حجاج

حکومتِ ہند ہندوستانی حاجیوں کے آرام و دیکھ بھال کے لیے خاص انتظامات کرتی ہے۔ اس سال تقریباً تیئیس ہزار حاجی ہندوستان سے گئے تھے۔ ہندوستان سے سعودی عرب کا سفر ہوائی جہاز اور پانی کے جہاز کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ گزشتہ سالوں میں ہوائی جہاز صرف بمبئی سے روانہ ہوا کرتے تھے لیکن حاجیوں کے آرام و سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کرایہ میں ہوائی جہاز کی پروازیں دہلی، مدراس اور سری نگر سے بھی شروع کر دی گئی ہیں۔ پانی کا جہاز ایم وی اکبر بمبئی اور جدہ کے بیچ میں کئی پھیرے لگاتا ہے جس سے حاجیوں کو کم کرایہ پر سفر کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ پانی کے جہاز کے مسافروں کے سفر خرچ کا کچھ حصہ حکومت برداشت کرتی ہے۔ پچھلے سالوں میں حکومتِ ہند نے پانی کے جہاز کے مسافروں کے کرایہ کو پورا کرنے کے لیے تقریباً ۸۰ لاکھ روپیہ فی سال اپنی طرف سے ادا کئے۔ حکومتِ ہند ہر سال حاجیوں کو ہندوستانی روپیہ کے بدلے میں زرِ مبادلہ بھی دیتی ہے۔ اس سال تقریباً ۳۶ لاکھ روپیہ کا زرِ مبادلہ حاجیوں کو دیا گیا۔

حج کمیٹی

ہندوستان سے جانے والے حاجیوں کی مدد کرنے کے لیے حکومتِ ہند نے ایک حج کمیٹی قائم کی ہوئی ہے۔ حج کمیٹی ایک آزاد اور خودمختار ادارہ ہے۔ اس کا مرکزی دفتر بمبئی میں ہے۔ اس میں بندرگاہ، کسٹم، میونسپلٹی اور پولیس کے افسران کے علاوہ پارلیمنٹ کے ممبر اور حکومتِ مہاراشٹر کے نمائندہ اور قانون ساز بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ ممبران ایک چیئرمین اور وائس چیئرمین چنتے ہیں۔ حج کمیٹی میں ایک مستقل ایگزیکٹیو آفیسر ہوتا ہے جو کمیٹی کے کام کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ حکومتِ ہند (وزارتِ خارجہ) اس کمیٹی کو تمام ممکن امداد دیتی ہے۔ حج کمیٹی کی ذمہ داری یہ ہے کہ حج کے سلسلہ میں تمام ضروری اطلاعات حاجیوں کو فراہم کرے اور حج کے سفر پر آتے اور جاتے وقت جو بھی مدد درکار ہو وہ حاجیوں کو فراہم کرے۔ حج کمیٹی عرصۂ دراز سے حاجیوں کی خدمت کا اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

حج کمیٹی پانی اور ہوائی جہازوں کو کرایہ پر لے لیتی ہے۔ اس طرح جہاز چارٹر کرنے سے فی کس کرایہ عام جہازوں کے مقابلہ میں بہت کم پڑتا ہے۔ ہر جہاز پر ایک امیر الحج مامور کر دیا جاتا ہے جو سفر کے دوران حاجیوں کی تکالیف کو دور کرنے میں جہاز کے عملہ کی مدد کرتا ہے۔ امیر الحج کی ذمہ داری پانی کے جہاز میں زیادہ ضروری اور اہم ہو جاتی ہے کیونکہ یہ سفر تقریباً ۱۰ دن کا ہوتا ہے۔ حج کمیٹی اس بات کا انتظام کرتی ہے کہ حاجیوں کو ضروری ٹیکے اور دوسری ضروری معلومات فراہم کی جائیں۔ حج کمیٹی کی طرف سے حج گائیڈ چھپوا کر مفت تقسیم کئے جاتے ہیں۔ حج کمیٹی مسافروں کے ٹھہرنے کا بھی مفت انتظام کرتی ہے۔ بمبئی میں تو ایک بہت بڑا اور خوبصورت حج ہاؤس تعمیر ہو گیا ہے۔ سارے متعلقہ دفاتر اور بینک وغیرہ اب ایک چھت کے نیچے آ گئے ہیں۔ اب حجاج غیر ضروری بھاگ دوڑ سے بچ جاتے ہیں۔ دہلی میں بھی حج ہاؤس قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔

بہت سی رضاکار تنظیمیں بھی حاجیوں کی مدد میں پیش پیش رہتی ہیں۔ اسی طرح ایئر انڈیا، بینک اور دوسرے ادارے بھی حاجیوں کی خدمت کرنے میں پیچھے نہیں رہتے ہیں۔ کوئی ایئر بیگ دے رہا ہے تو کوئی چائے بسکٹ تو کوئی آبِ زم زم کے لیے ڈبہ۔ کوئی تنظیم حاجیوں کے لیے سواری کا انتظام کر رہی ہے تو کوئی کھانا پیش کر رہا ہے۔ غرضیکہ ہر شخص ان حاجیوں کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر کے ثواب میں شامل ہونے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔

ایک میڈیکل مشن بھی بھیجا جاتا ہے۔ اس میں چالیس ڈاکٹر بشمول لیڈی ڈاکٹر، کمپاؤنڈر اور نرس شامل ہوتے ہیں۔ یہ میڈیکل مشن میڈیکل آفیسر، مکہ کے زیرِ نگرانی کام کرتا ہے۔ مکہ مکرمہ کے تین چار ایسے محلوں میں جہاں ہندوستانی حاجی صاحبان کا قیام ہوتا ہے مزید دواخانے کھولے جاتے ہیں۔ وہیں پر حج آفس، مکہ کی برانچیں بھی قائم کی جاتی ہیں تاکہ حاجیوں کو گھر کے پاس ہی ساری ضروری سہولتیں مہیا کر دی جائیں۔ ڈاکٹروں کی خدمات چوبیس گھنٹے حاصل رہتی ہے۔ مریض کو مفت دوائیاں دی جاتی ہیں

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadurshah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوجنا

دو روپے

سرسیّد اور سیکولرازم

(محمد انور صالح)

اقبال کا تصوّرِ خودی

(عمران عظیم)

غزلیں، کہانی، تبصرہ اور
بہت سا دلچسپ مواد

شری آر۔ وینکٹ رمن

ہندوستان کے نئے راشٹرپتی

شری آر۔ وینکٹ رمن جمہوریۂ ہند کے آٹھویں راشٹرپتی ہیں۔ آپ نے ۲۵ جولائی ۱۹۸۷ء کو حاضر ووٹوں کا ۷۲ء۲۹ فیصد حاصل کرکے اس عہدے کا چارج سنبھالا۔ مشہور ماہر پارلیمان، قانون داں اور ٹریڈ یونین کے سرگرم کارکن رہے ہیں۔ آپ کی پیدائش ۴ دسمبر ۱۹۱۰ء کو تمل ناڈو کے ضلع تھنجاور کے گاؤں راجہ مدام میں ہوئی تھی۔ آپ کی تعلیم مدراس شہر میں ہوئی، آپ نے اکنامکس میں ماسٹر ڈگری حاصل کی اور پھر لا کالج مدراس میں قانون کا مطالعہ کیا۔ شری وینکٹ رمن اپنی نوجوانی کے دنوں سے ہی جدوجہد آزادی سے سرشار رہے ہیں۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ آپ برطانوی سرکار کی ملازمت نہیں کریں گے۔ آپ نے پریکٹس شروع کی۔ ۱۹۳۵ء میں ہائی کورٹ مدراس میں آپ نے اپنے نام کا اندراج کرلیا۔ آپ ۱۹۴۲ء میں مہاتما گاندھی کی بھارت چھوڑو تحریک میں شامل ہوگئے، آپ نے پریکٹس چھوڑ کر اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا، برطانوی سرکار نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت آپ کو دو سال تک نظر بند رکھا۔ ۱۹۴۴ء میں رہائی کے بعد آپ نے تمل ناڈو کانگریس کمیٹی کے لیبر سیکشن کو سنبھالا۔ شری وینکٹ رمن نے ۱۹۴۹ء میں لیبر لا جرنل نکالا۔ آپ نے اپنے آبائی وطن میں کسانوں کی بہبود کے کام سے گہری دلچسپی لی۔ ۱۹۵۰ء میں آزاد ہندوستان کی عارضی پارلیمنٹ (۱۹۵۰ء — ۱۹۵۲ء) کے لیے آپ کو چن لیا گیا۔ نیوزی لینڈ میں کامن ویلتھ پارلیمنٹری کانفرنس میں ہندوستان کے پارلیمانی وفد میں آپ شریک ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں آپ کو پارلیمنٹ کے لیے دوبارہ چن لیا گیا، شری وینکٹ رمن مرکز سے استعفیٰ دے کر مدراس سرکار میں وزیر کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں شری وینکٹ رمن کو یونین پلاننگ کمیشن کا ممبر مقرر کیا گیا۔ آپ کو صنعت اور محنت، بجلی، نقل و حمل، مواصلات اور ریلوے کے شعبے سونپے گئے، ۱۹۷۱ء تک آپ اسی عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۷۷ء میں شری وینکٹ رمن کو مدراس (جنوبی حلقہ انتخاب) سے لوک سبھا کے لیے چنا گیا، آپ نے پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۸۰ء میں آپ لوک سبھا کے لیے دوبارہ منتخب ہوئے۔ شریمتی اندرا گاندھی نے آپ کو مرکز میں وزیر خزانہ بنایا۔ ۱۹۸۲ء میں آپ مرکزی وزیر دفاع بنائے گئے، ۲۲ اگست ۱۹۸۴ء کو آپ کو ہندوستان کے نائب صدر جمہوریہ کی



شری آر۔ وینکٹ رمن

حیثیت سے چنا گیا۔ آپ نے ۳۱ اگست ۱۹۸۴ء کو یہ عہدہ سنبھالا۔ اس کے ساتھ ہی آپ راجیہ سبھا کے چیرمین تھے۔ اس کے علاوہ آپ بہت سے دیگر اہم ذمہ داریاں سنبھالتے رہے۔ آپ نے ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۵ء، ۱۹۵۶ء، ۱۹۵۸ء، ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۰ء، ۱۹۶۱ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ہندوستانی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی، اس کے علاوہ آپ نے مغربی اور مشرقی یورپ، روس، امریکہ، کینیڈا، جاپان، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، یوگوسلاویہ وغیرہ کا بھی دورہ کیا ہے۔

آپ کو بہت سے علمی اعزازات اور خصوصی ایوارڈز ملے ہیں، آپ کی دھرم پتنی شریمتی جانکی وینکٹ رمن ہیں، آپ کے تین بیٹیاں ہیں۔

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر : سید ظفر الحسن
ایڈیٹر : جگندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹر : محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر : وسیم حیدر، عبدالحمید

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، دو سالہ ۳۶ روپے
سہ سالہ ۴۸ روپے، فی کاپی دو روپے
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں
کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

جلد ۷ شمارہ ۱۳،۱۴ یکم تا ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۷ء | ۹ اشون تا ۹ کارتک شک ۱۹۰۹ | قیمت، دو روپے۔ ٹیلیفون ۶۰۱۸۱۸

اس شمارے میں

اداریہ		۲
شخصیات : پسماندہ طبقوں کے مسیحا، گاندھی جی	جگدیش لال	۳
سرسید اور سیکولرازم	محمد ابو صالح	۶
زراعت : ہندوستان میں کیمیاوی کھاد کی صنعت	ابو سعد خاں	۱۱
دلہن کی پیداوار میں ترقی	ڈاکٹر محمد اسلم پرویز	۱۶
انڈین فارمنگ فرٹیلائزر کو آپریٹو کا عملی پروگرام	پریم پالی اتسک	۱۸
زعفران اور اس کی کاشت	موتی لال ساقی	۱۹
ماحولیات : قدرتی معیشت اور ماحولیات	عظیم الرحمٰن عظیم	۲۰
سماجیات : تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا خطرہ	بپن کمار گپتا	۲۳
اضافہ آبادی کی روک تھام	سید اظہر حسین ہاشمی	۲۶
ملاوٹ ۔ ایک بھیانک جرم	عزیز اندوری	۲۸
بڑھتی ہوئی آبادی اور اس کے اثرات	شگفتہ فرحت جبیں	۳۰
ریاستیں : گجرات ۔ خوش حالی کی جانب بڑھتے قدم	گوپال اروڑہ	۳۲
ادب : اقبال کا تصورِ خودی	عمران عظیم	۳۵
اردو ادب اور عصری آگہی	مدن لعل منچندہ	۳۸
غزلیں	رفعت سروش، شہپر رسول، حسینی کرہانی، عطا عابدی، اختر شاہجہانپوری، منظر امام	۴۰، ۴۱
وطن کے نوجوانوں کے نام (نظم)	ایم۔ اے۔ رشمی	۴۱
فرض (کہانی)	سلمیٰ جبیں	۴۲
تبصرہ	شمس الاسلام فاروقی / علی احمد نگھروی	۴۳
طب : علم کیمیا، جابر بن حیان کی خدمات	منظر اسلام جاوی	۴۴
آپ سب کے لیے		۴۶
قارئین کی آراء اور مشورے	عمران عظیم، محمد عالمگیر، محمد ذاکر حسین، علی احمد نگھروی، قمر الدین	۴۸
شری آر۔ وینکٹ رمن، ہندوستان کے نئے راشٹرپتی		کور ۲
جمہوریہ ہند کے آٹھویں نائب صدر "ڈاکٹر شنکر دیال شرما"		کور ۳

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ۔

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (منزل)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) ۔۔۔۔۔ آر۔ ایس۔ منچال

ترسیلِ زر کا پتہ :۔ بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

عورتوں کی بہبود وقت کی ضرورت

ہمارا آئین عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق عطا کرتا ہے، اور ان کے تحفظ کی یقین دہانی کراتا ہے۔ بجا طور پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ مساوی مرتبے اور تحفظ کے اس دعوے کو کس حد تک قانونی اور انتظامی شکل میں تبدیل کیا گیا ہے۔ ساتویں منصوبے کی دستاویز میں عورتوں کے طویل المدتی ترقیاتی پروگراموں کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے ذریعے عورتوں کی اقتصادی اور سماجی حالت بہتر بنائی جائے گی اور ان کو قومی ترقی کے اصل دھارے میں شامل کیا جائے گا، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ملک کے مختلف سماجی، اقتصادی اور سیاسی نیز ثقافتی پروگراموں میں عورتوں کی اہمیت کو بخوبی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اقتصادی اور سماجی پروگراموں کے ذریعے عورتوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور ان کو اس حقیقت سے آشنا کرایا جا رہا ہے کہ وہ ملک کی ترقی میں برابر کی ساجھے داری رکھتی ہیں، اس سلسلے میں ذرائع نشر و اشاعت کے ذریعے بہت سے پروگراموں کو شروع کیا جا چکا ہے، انسدادِ جہیز کے قانون کا نفاذ بہت سختی سے عمل میں آ چکا ہے، عورتوں پر ظلم و ستم اور ان کو ڈرانے دھمکانے کے واقعات کی روک تھام کی جا رہی ہے۔ رضاکارانہ اور تعلیمی اداروں کو بھی اس کام میں شریک کیا گیا ہے عورتوں کو روزگار دلانے، انھیں تعلیم یافتہ بنانے، صحت کے پروگراموں سے فائدہ پہنچانے، تغذیہ بخش خوراک کی تعلیم اور سائنسی و تکنیکی پروگراموں سے مستفید کرنے کے سلسلے میں مربوط اندازِ نظر اپنایا گیا ہے، عورتوں کی آمدنی بڑھانے اور انھیں اپنے پیروں پر آپ کھڑے کرنے کے لائق بنانے پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے تحت تعلیمی پروگراموں پر نظرِ ثانی کی جا رہی ہے اور اسکولی نصابات میں ضروری رد و بدل کی جا رہی ہے۔ ہائر سیکنڈری اور اعلیٰ تعلیمی نصابات پر نظرِ ثانی کی جا رہی ہے ہائر سیکنڈری اور اعلیٰ تعلیمی نصابات میں لڑکیوں کے داخلے کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔

ہندوستانی سماج میں عورتوں کو ایک عام شکایت یہ ہے کہ ان کو عدالتوں میں دیر سے انصاف ملتا ہے، اس لیے ایسی کوششیں کی جا رہی ہیں کہ عورتوں کو جلد سے جلد انصاف دلایا جائے۔ اس مقصد کے لیے سماجی قوانین پر عمل درآمد کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عوامی شعور کو بیدار کرنا اور احتیاطی تدابیر پر توجہ دینا بھی ضروری ہے۔ انسداد جہیز کے قانون پر موثر عمل درآمد کے لیے متعلقہ افسروں کی تقرری کے کام کو اولیت دی جانی ضروری ہو گئی ہے۔ وزیر اعظم نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ ہمیں سماج میں برابر کی ساجھے داری کے تصور کو عام کرنا ہے، ہم قوانین پاس کرتے ہیں، ہم کانفرنسوں کا انعقاد کرتے ہیں لیکن ہمیں عوام کے دلوں میں اس کی اہمیت بٹھانی ہے، اس کے بغیر عورتوں کی بہبود اور بھلائی کے پروگرام خاطر خواہ اپنے اثرات نہیں دکھا سکتے۔



مہادیوی ورما

ہندی کی مشہور شاعرہ مہادیوی ورما ۱۱ ستمبر کو الہ آباد میں اپنی رہائش گاہ پر طویل علالت اور بیہوشی کے بعد سورگباش ہو گئیں۔ ۸۰ سالہ اس شاعرہ نے ہندی ادب میں ایک خاص مقام پیدا کیا۔ آپ کی پیدائش فرخ آباد میں ۱۹۰۷ء میں ہولی کے دن ہوئی تھی۔ پنت، نرالا اور سوریہ کانت ترپاٹھی اور مہادیوی ورما تینوں کو کھڑی بولی کے سنہری دور کا اصل معمار سمجھا جاتا ہے۔ موصوفہ کو بھارتیہ گیان پیٹھ ایوارڈ ملا ہے، یہ اعزاز ان کے شعری مجموعے "یاما" پر دیا گیا ہے۔ صدر جمہوریہ ہند شری آر۔ وینکٹ رمن، نائب صدر ڈاکٹر ایس۔ ڈی شرما اور وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ممتاز ہندی شاعرہ کی موت پر تعزیت کا اظہار کیا ہے اور ان کی موت کو ملک، ادب اور قوم کا عظیم نقصان بتایا ہے۔ ادارہ، اس غم میں مہادیوی ورما کے سوگواروں کے ساتھ برابر کا شریک ہے۔



فکر تونسوی کی وفات

اُردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار فکر تونسوی دماغ کی رگ پھٹ جانے سے ۱۲ ستمبر کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے، لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے اُردو صحافت کا آغاز کیا

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

جگدیش لال



پسماندہ طبقوں کے مسیحا گاندھی جی

جب گاندھی جی عالمِ نوجوانی میں تحصیلِ علم کے لیے انگلینڈ کو روانہ ہونے لگے۔ جہاں بعد میں انھوں نے لندن یونیورسٹی سے میٹریکولیشن اور وکالت پاس کی تو اُن کی والدہ انھیں ایک جین سادھو کے پاس لے گئیں جہاں انھوں نے قسم کھائی کہ وہ سمندر پار جا کر شراب نوشی کریں گے، نہ گوشت کھائیں گے اور نہ ہی کسی پرائی عورت کو چھوئیں گے۔ انھوں نے اس حلف کو کمال ضبط کے ساتھ نبھایا، گو وہ ترغیبات اور تحریصات کے متعدد مواقع سے دوچار ہوئے۔

جب وہ تحصیلِ علم کے بعد واپس ہندوستان آئے تو اُن کی ذات کے لوگوں نے انھیں اس لیے برادری سے خارج کر دیا کہ انھوں نے سمندر پار جا کر ایک غیر ملک کا دورہ کیا ہے جو اُن دنوں قدامت پسندوں کے نزدیک معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ گاندھی جی نے کفارہ کے لیے کچھ رسوم بھی ادا کیں تاہم انھیں برادری میں واپس لینے سے انکار کیا گیا۔ اس ایک واقعہ نے گاندھی جی کے دماغ پر یہ بات نقش کر دی کہ ذات پات محض تنگ نظری پیدا کرتی ہے اور اس کے بندھن مصنوعی ہیں۔

۵۵۱۷/۵، شورا کوٹھی، پہاڑ گنج، نئی دہلی۔ ۵۵
یوجنا، نئی دہلی

اس سے انھوں نے جو تاثر قبول کیا تھا وہی مستقبل میں جا کر چھوا چھوت کے انسداد کا باعث بنا۔

اسی طرح ایک دوسرے واقعہ نے اُن کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ گاندھی جی قانون کی تعلیم لیکر بھارت آئے تھے۔ جب گجرات کے چند مسلم تاجر جو جنوبی افریقہ میں کاروبار کرتے تھے اپنے ایک مقدمے کے سلسلے میں انھیں اپنے ساتھ جنوبی افریقہ لے گئے جہاں انھوں نے کامیابی کے ساتھ اُن کے مقدمے کی پیروی کی (حالانکہ وہ شروع میں جب بمبئی کی ایک عدالت میں ایک مقدمے کی پیروی کے لیے پیش ہوئے تو پبلک طور پر بولنے کی عادت نہ ہونے سے گھبرا گئے تھے اور مقدمہ چھوڑ کر ہی چلے گئے تھے)، وہاں جنوبی افریقہ میں سیاہ فام لوگوں اور ہندوستانیوں کے ساتھ جو ذلت آمیز سلوک کیا جاتا تھا اُسے دیکھ کر جہاں اُن کے دل میں ہندوستان کو آزاد کرانے کے عزم نے زور پکڑا وہاں نسل پرستی سے انھیں سخت نفرت ہو گئی۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان واقعات نے نہ صرف اُن کے نظریے کو وسعت دی بلکہ اُن کی قوم پرستی کو بھی آفاقیت بخشی۔ اب وہ ہندوستان کے باشندے ہی نہیں بلکہ ایک عالمی شہری بن گئے تھے۔ اُن کے نزدیک ہندو، مسلمان، عیسائی اور پارسی میں کوئی امتیاز نہیں تھا۔ انگریزوں کی جابر حکومت میں رہتے ہوئے بھی انگریزوں سے انھیں نفرت نہیں تھی وہ انسانیت کی اعلیٰ سطح پر پہونچ گئے تھے جہاں وہ بُرے آدمیوں سے نہیں بلکہ اُن کی برائیوں سے نفرت کرتے تھے۔

اُن کے دل و دماغ کے دروازے کھُلے تھے۔ وہ جہاں بھگوت گیتا، "سرمن آف دی ماؤنٹ" (عیسائیوں کی مذہبی کتاب) تھورو، ایمرسن اور ٹالسٹائی سے متاثر ہوئے تھے وہاں انھوں نے سادگی کے لیے خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کو آدرش کے طور پر منتخب کیا تھا۔ وہ خود بھی سادگی کی تصویر تھے۔ اسی سادگی کی وجہ سے وہ عوام کے نزدیک آ گئے تھے اور عوام انھیں اپنا ہی "آدمی" سمجھتے تھے۔ جب انھوں نے بھارت کے کروڑوں عوام اور خصوصاً دیہاتیوں کو بدحالی میں دیکھا تو انھوں نے کوٹ پتلون ترک کر کے دھوتی کُرتہ پہن لیا اور جب انھوں نے مدراس، تامل ناڈو میں دیکھا کہ لوگوں کے تن پر کپڑا بھی نہیں ہے تو انھوں نے دھوتی کرتہ بھی چھوڑ کر لنگوٹی باندھ لی۔ حتیٰ کہ جب وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے بھارتی وفد کے ساتھ لندن

گئے تو وہاں بھی انھوں نے دھوتی لنگوٹی اور چادر اوڑھ رکھی تھی اور وہاں انھوں نے مزدوروں کی بستی میں رہنے پر اصرار کیا تھا۔

گاندھی جی ہندو مسلم اتحاد کے زبردست علمبردار تھے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد آزادی دینے کے بجائے عوام کی تحریکِ آزادی کو کچلنے کے لیے رولٹ ایکٹ منظور کیا گیا تو انگریزی حکومت کے مظالم کے خلاف تمام ملک اُٹھ کھڑا ہوا۔ گاندھی جی کی طرف سے ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو ملک گیر ہڑتال کا اعلان کیا گیا۔ ترکی میں خلافت کے خاتمے اور اُس ملک کے تئیں انگریزوں کے لاپرواہانہ رویّہ سے ہندوستان کے مسلمان بپھر گئے اور یہاں علی برادران کی رہنمائی میں خلافت کی تحریک شروع ہوئی جس میں گاندھی جی نے پورا تعاون کیا۔ ۱۹۲۰ء میں ستمبر میں لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں کانگریس کا خصوصی اجلاس ہوا جس میں گاندھی جی نے کہا کہ وہ ایک عوامی تحریک شروع کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے یکم اگست ۱۹۲۰ء کو عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کی تحریک کا افتتاح کیا اور اعلان کیا کہ یہ تحریک تب تک جاری رہے گی جب تک پنجاب (جلیانوالہ باغ) میں ہوئے مظالم اور خلافت کے مسائل کا خاطر خواہ حل نہیں پیش کیا جاتا اور سوراج کا قیام عمل میں نہیں آتا۔ لیکن شاطر انگریز ہندو مسلم اتحاد کو کیونکر برداشت کر سکتا تھا۔ چنانچہ اُس کی طرف سے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفاق کے بیج بوئے گئے بلکہ ہندوؤں کو بھی آپس میں بانٹنے کے لیے منصوبے بنائے جانے لگے۔

جب گاندھی جی اور دیگر قومی رہنما جیل میں بند تھے تو برطانوی وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے ۱۶ اگست ۱۹۳۲ء کو ناپاک کمیونل ایوارڈ کا اعلان کر دیا۔ اس ایوارڈ کے تحت تجویز کیا گیا کہ مسلمانوں کی مانند ہندوؤں کے ’پسماندہ طبقوں‘ کو بھی الگ حق رائے دہندگی دی جائے۔ گول میز کانفرنس میں بھی الگ فرقہ وارانہ حق رائے دہندگی کا معاملہ زیر بحث آیا تھا اور گاندھی جی نے اس کے خلاف پُرزور احتجاج کیا تھا۔ لیکن برطانیہ اپنی شاطرانہ چالیں چلتا رہا۔ اب گاندھی جی نے حلف لیا کہ وہ اس تباہی کو روکنے کے لیے اگر ضروری ہوا تو اپنی جان بھی قربان کر دیں گے۔ پہلے مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ کیا اور اب ہندوؤں کو ایک دوسرے سے الگ کیا جانے لگا ہے۔

جب برطانوی حکومت نے اس ناپاک ایوارڈ کو واپس لینے سے انکار کیا تو گاندھی جی نے جو پونہ کے نزدیک یرودا جیل میں نظر بند تھے گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کے آشیرباد کے ساتھ ۲۰ ستمبر کو "آمرن برت" شروع کر دیا، اس سے تمام ملک کانپ اُٹھا اور تمام دُنیا میں اس "دُبلے فقیر" کے لیے تشویش اور خوف کی لہر چھا گئی۔ جس نے نام نہاد اچھوتوں کی پسماندہ اقلیت کو بچانے کے لیے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ، سرتیج بہادر سپرو اور دیگر لیڈر فوری طور پر حرکت میں آ گئے اور انھوں نے ایک طرف گاندھی جی اور دوسری طرف ڈاکٹر بی آر امبیدکر کے درمیان مصالحت کی کوششیں شروع کر دیں۔ ڈاکٹر امبیدکر بھی دوسرے لیڈروں کی مانند گاندھی جی کی زندگی بچانے کے لیے بیتاب تھے گو وہ چھوا چھوت کے سوال پر ہندوؤں سے بدظن تھے۔ خیر! ان لیڈروں کی کوششیں رنگ لائیں اور ڈاکٹر امبیدکر اور پسماندہ طبقوں کے دیگر لیڈروں کے مصالحانہ رویہ سے ایک سمجھوتہ ہو گیا جس میں گاندھی جی کی منظوری کے ساتھ قرار پایا کہ پسماندہ طبقوں کی ہندو اقلیت الگ حق رائے دہندگی کا دعویٰ ترک کر دے گی اور مشترکہ رائے دہندگی کو منظور کرے گی لیکن اس کے لیے قانون ساز اداروں میں منصفانہ طور پر ان کے لیے نشستیں مخصوص کی جائیں گی۔ اس معاہدہ پر جو پونہ پیکٹ کے نام سے موسوم ہے۔ گاندھی جی کے برت کے چھٹے روز دستخط ہوئے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر برطانوی وزیر اعظم نے الگ حق رائے دہندگی کی تجویز واپس لے لی۔ گاندھی جی نے ساتویں روز ۲۶ ستمبر ۱۹۳۲ء کو اپنا برت کھول دیا۔ گاندھی جی کی زندگی بچ گئی۔ جس پر تمام ملک اور دنیا نے اطمینان کا سانس لیا۔

اب گاندھی جی نے بھارت ماتا کے ماتھے سے چھوا چھوت کے بدنما داغ کو مٹانے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے لفظ اچھوت کو مٹانے اور نام نہاد اچھوتوں کے تئیں نفرت کا جذبہ ختم کرنے کے لیے سب سے پہلے انھیں ہریجن یعنی "خدا کے پیارے بندے" کا نیا نام دیا اور ہندوؤں سے کہا کہ وہ اُن پر مندروں کے دروازے کھول دیں۔ گاندھی جی نے ہریجنوں کا رُتبہ بڑھانے کے لیے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" کا نام بدل کر بھی "ہریجن" رکھ دیا۔

۳۰ اگست کو گاندھی جی کو جیل سے رہا کر دیا گیا اور اُنھوں نے باہر آتے ہی ہریجنوں کی بہبود کے لیے کام شروع کر دیا کیونکہ انھوں نے پونہ میں وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی تمام تر توجہ ہریجن کاز پر مرکوز کر دیں گے۔ انھوں نے نومبر ۱۹۳۳ء میں اپنا مشہور عالم ہریجن دورہ شروع کیا۔ انھوں نے تمام ملک کا دورہ کیا اور عوام کو تلقین کی کہ وہ چھوا چھوت کو ختم کریں اور مندروں کے دروازے ہریجنوں پر کھول دیں۔ انھوں نے ہریجن فنڈ کے لیے روپیہ جمع کرنے کی تحریک بھی شروع کی۔ اس تحریک، خصوصاً فنڈ کے تئیں عوام کا ردّعمل بڑا حوصلہ افزا تھا۔ لوگوں نے دل کھول کر چندہ دیا۔ عورتوں

اور لڑکیوں نے اپنے سونے کے زیور بھی اتار کر گاندھی جی کو دے دیے اور کئی مقامات پر گاندھی جی نے خود زیور مانگے ان زیوروں کو پبلک میٹنگوں میں گاندھی جی نے نیلام کیا جس سے فنڈ میں بھاری رقم جمع ہو گئی۔ اس طرح گاندھی جی نے اپنے ہریجن دورہ میں ۸ لاکھ روپیہ جمع کر لیا۔ (واضح رہے کہ اُن دنوں یہ بہت بھاری رقم تھی)۔

ہریجنوں کی بہبود گاندھی جی کے نزدیک کوئی پالیسی نہیں بلکہ ایک عقیدہ تھا۔ وہ بھارت میں جہاں کہیں بھی جاتے تھے ہریجن بستیوں میں رہنا ہی پسند کرتے تھے۔ انسانیت کو مختلف خانوں میں نہیں بانٹتے تھے۔ اُن کے لیے تمام انسان مساوی حیثیت کے مالک تھے۔ اُن دنوں عام گھروں کی صفائی کے سلسلے میں ہریجنوں کو سر پر فضلہ اٹھانا ہوتا تھا اس لیے ان کے تئیں منافرت کو ختم کرنے کے لیے گاندھی جی نے اپنے سیوا گرام آشرم کے تمام مکینوں کے لیے لازمی کر دیا تھا کہ وہ اپنا فضلہ خود اٹھا کر باہر پھینکیں۔

یہ سچ ہے کہ صنعتی انقلاب نے ذات پات کے نظام اور چھوا چھوت کو ختم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے اور آج اسکولوں، بینکوں، کارخانوں اور دیگر سرکاری دفتروں میں ہریجن دیگر طبقوں کے دوش بدوش کام کر رہے ہیں۔ ریلوے، بسوں، سینما گھروں اور ہوٹلوں میں وہ ایک ساتھ دیکھے جاتے ہیں تاہم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ چھوا چھوت کے انسداد کے لیے گاندھی جی نے ہی سب سے پہلے جہاد کیا۔ اگرچہ دیگر سماج سدھارکوں جیسے راجہ رام موہن رائے اور سوامی دیانند سرسوتی نے بھی چھوا چھوت کے خلاف آواز بلند کی تاہم اُن کا دائرہ کار محدود تھا۔ وہ گاندھی جی کی طرح اسے ایک عوامی تحریک نہیں بنا سکے۔ گاندھی جی کو تو اپنی اس تحریک کے سلسلے میں قدامت پسندوں کے مخالفانہ مظاہروں اور طعنوں کو بھی برداشت کرنا پڑا۔ حتیٰ کہ انھوں نے ہریجنوں کے کاز کے لیے اپنی جان کی بازی بھی لگا دی تھی۔

ہریجنوں کا مسئلہ بنیادی طور پر افلاس کا مسئلہ ہے اُن کے استحصال کا مسئلہ ہے۔ اُن کی غریبی اور استحصال کو ختم کرنے سے اُنھیں سماج میں اعلیٰ رتبہ مل سکتا ہے۔ چنانچہ حصولِ آزادی کے بعد گاندھی جی کے دکھائے ہوئے راستے پر چل کر حکومت کی طرف سے ہریجنوں کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لیے متعدد اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ انھیں جہاں تعلیمی سہولیات دی جا رہی ہیں وہاں ملازمتوں اور قانون ساز اداروں میں بھی اُن کے لیے نشستیں محفوظ کی گئی ہیں۔ انھیں چھوٹے چھوٹے کام دھندوں کے لیے قرضے دیے جا رہے ہیں اور مکانوں کی تعمیر کے لیے مالی امداد بھی دی جا رہی ہے۔ گاندھی جی نے جو چھوٹا سا پودا لگایا تھا آج اُسے تناور درخت بنانے کے لیے بہت کچھ کیا جا رہا ہے۔

●

بقیہ، بڑھتی ہوئی آبادی اور اس کے اثرات

ہوئی ہوتی ہے۔ اور اموات کی شرح حیثیت کی اونچ نیچ کے مطابق کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ اموات کی شرح میں کمی کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً پابندی سے غذا کا ملنا، معاشی ترقی اور سرکاری انتظام کی درستی کے ساتھ ملک میں نظم و نسق کا بہتر ہونا وغیرہ، لیکن کمی کا زیادہ اہم سبب یہ ہو سکتا ہے کہ معاشی ترقی کے براہِ راست نتیجے کے طور پر صحت و صفائی کے بارے میں لوگوں کو معلومات زیادہ ہوتی ہیں۔ اموات کی شرح میں کمی کے مقابلے میں پیدائش کی شرح کم ہونے میں وقت لگتا ہے۔ پہلے اور دوسرے منصوبوں کے دوران ہمارے ساتھ بالکل یہی ہوا، یعنی پیدائش کی شرح تقریباً قائم رہی اور اموات کی شرح کمی کی طرف مائل رہی۔

ایک ساکت اور نیم جامد ماحول میں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی واقعی خطرناک ہے۔ برطانوی عہد میں تو یہ اور بھی زیادہ خطرناک نظر آتی تھی کیونکہ اُس عہد میں نہ تو چھوٹے سے سرمایہ دار سیکٹر کو بڑھانے کی کوشش کی گئی اور نہ گذر بسر کرنے والوں سیکٹر کو متحرک کرنے کی کوشش کی گئی۔ جس میں ہندوستان کے کروڑوں لوگوں کی معاشی ترقی کو تیز کرنے کے لیے کام میں لایا جاتا۔ چنانچہ نئی صنعتی تنظیم اور صنعتی ترقی سے یہ مسئلہ پورے طور پر حل نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زراعتی اور صنعتی ترقی کے اقدام کے ساتھ ساتھ فیملی پلاننگ کے پروگرام کی مؤثر تعمیل کی کوشش ملک گیر پیمانے پر کی جائے۔

معاشی ترقی کے دوران آبادی کی منصوبہ بندی کو سب سے اہم رول ادا کرنا ہے۔ یہ اس لیے کہ معاشی ترقی کا مقصد ملک کے عوام کی خوشحالی سے ہے۔ اگر ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ معاشی ترقی منصوبے کے تحت عمل میں آئے تو عام ترقی سے پہلے ہمیں آبادی کی منصوبہ بندی کی طرف توجہ دینی ہو گی ہمیں صرف یہی نہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ موجودہ آبادی کتنی ہے بلکہ یہ بھی کہ موجودہ آبادی میں کس شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔ معاشی ترقی کی شرح اور منصوبوں کے دوران وسائل کے استعمال کی رفتار ان دونوں کو آبادی کے اضافے کی شرح کے ساتھ متوازن ہونا چاہیئے۔ ترقیاتی منصوبہ بندی کے ایک اچھے نظام کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ موجودہ آبادی کا مؤثر استعمال ہو اور اس کو پیداآور روزگار سے لگایا جائے بلکہ منصوبہ بندی کو نئے آنے والوں کے اُمنڈتے ہوئے طوفان کا مسئلہ بھی حل کرنا ہے۔ ●

محمد ابوصالح[٥]



سرسیّد اور سیکولرازم

تاریخی شخصیتیں دو طرح کی واقع ہوئی ہیں پہلی قسم تو اُن شخصیتوں سے عبارت ہے جو اپنی جملہ صلاحیتوں کی سیادت پر پوری تابناکی کے ساتھ مطلع ہستی پر نمودار ہوتی ہیں اور تاریخ کے اوراق انھیں محفوظ کر لیتے ہیں۔ دوسری قسم اُن کی ہے جو نہ صرف تاریخ کے دھارے کو بدل دیتی ہیں بلکہ تاریخ خود اُن سے عبارت ہو جاتی ہے۔ سرسید کی شخصیت کا تعلق دوسری قسم سے ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا سہرا بلاشبہ سرسید کے سر جاتا ہے لیکن ان کی وفاداریاں صرف مسلمانوں سے مشروط نہیں تھیں۔ وہ جدید ہندوستان کے اوّلین معماروں میں سے تھے۔ اُنیسویں صدی کی عام تہذیبی و تمدنی بیداری کے باب میں سرسید احمد خاں کی قربانیاں روزِ روشن کی طرح زندہ و تابندہ رہیں گی۔

سرسید کی شخصیت نہایت جامع اور متنوع تھی ان کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ ان کے دماغ میں بیک وقت کئی بڑے دماغوں کی صلاحیتیں اکٹھی ہو گئی تھیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی زندگی جد و جہد کی زندگی تھی اور قول و فعل کے تضادات سے ان کا دامنِ زیست ہمیشہ ہی پاک اور بے داغ رہا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ سرسید کی شخصیت کا سب سے بڑا وصف کیا ہے تو اس کا جواب ہوگا خلوص اور سچائی' اور سرسید کی عظمت کا راز انھیں دو لفظوں میں مضمر ملے گا۔

سرسید نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو زندگی کے ہر شعبے پر توجہ کی اور اپنے کردار و عمل' افکار و خیالات سے گم کردۂ راہ قوم کی بھرپور قیادت فرمائی۔ تعلیم و معاشرت' معیشت و مذہب کے علاوہ سیاست کے میدان میں بھی بے نظیر کارنامے انجام دیے۔ سرسید کے سیاسی منشور میں سیکولرازم کا تصور کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سیکولر جذبات و خیالات ان کے یہاں کوئی عارضی یا اختیاری شے نہیں بلکہ خون میں شامل ہو کر سیرت کا ناگزیر حصہ بن گئے تھے۔

اُردو میں سیکولرازم کی اصطلاح کا ترجمہ "لادینیت" یا "غیر مذہبیت" کے طور پر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ امر قابلِ تصریح ہے کہ "لادینیت" یا "غیر مذہبیت" سے مراد مذہب کی ضد یا اس سے انکار نہیں ہے۔ بلکہ لادینیت کی اصطلاح (سیاسی تناظر میں) ایسے نظامِ فکر یا نظریے کی طرف اشارہ ہے جس میں مذہب کو اساسی اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ لہذا ملک کے آئین یا دستور میں کسی خاص مذہب کو اساس یا بنیاد کے طور پر تسلیم نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ سیکولر آئین یا سیکولر اسٹیٹ میں مذہبی آزادی کو ملحوظ نہیں رکھا جائے گا۔ سیکولر آئین سارے مذاہب کے تحفظ اور آزادی کی ضمانت دیتا ہے اس طرح سیکولرازم کے تحت مذاہب کے باہمی تضاد اور اس سے پیدا ہونے والے مضر اثرات سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ سیکولرازم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس دنیا میں بسنے والی مختلف اقوام' خواہ وہ رنگ و نسل کے اعتبار سے کچھ بھی کیوں نہ ہوں' مادی ترقیوں سے ہمکنار ہوں' ان کو بلاتفریق زندگی کی آسائشیں اور ترقی کے مواقع دستیاب ہوں' مذہب یا نسلی امتیاز کسی بھی طرح ان کی ترقی کی راہ میں حائل نہ ہو۔

ہندوستان صدیوں سے ایک کثیر المذاہب

---

٥ ریسرچ اسکالر، شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ملک رہا ہے۔ یہاں ہر زمانے میں مختلف عقائد و مذاہب کے ماننے والے، مختلف رنگ و نسل، مختلف قبائل و جغرافیائی خطے کے لوگ متوطن رہے ہیں جن کے مذاہب الگ الگ، رسم و رواج جداگانہ اور اصول معاشرت مختلف تھے۔ لیکن ان تمام تر تمدنی و معاشی تنوع کے باوجود ہندوستان ایک پُرامن اجتماعی زندگی کے لیے ہر دور میں ممتاز رہا ہے۔ لہٰذا کثرت میں وحدت کے حسین روپ کو بیرونِ ہند سے آئے ہوئے سیاحوں نے حیرت و استعجاب سے دیکھا اور تمدنِ ہند پر قلم اٹھانے والے اسے سراہے بغیر نہیں رہ سکے۔

آزادی کے بعد جب ہندوستان کا آئین مرتب کیا جانے لگا اور جب یہاں کے باشندوں کی اجتماعی ترقی و بہبودی کے لیے اور ان کی سماجی، سیاسی، مذہبی، اقتصادی اور معاشی آزادی کے لیے ایک سیاسی دستور العمل کی تشکیل زیرِ بحث آئی تو جمہوریت کے سیکولر پہلو پر بہت زیادہ زور دیا گیا اور آزاد ہندوستان کے آئین کو سیکولرازم کا مزاج عطا کیا گیا۔ قومی سطح کے سیاسی مدبروں کی اتفاق رائے سے جو طرزِ حکومت تجویز ہوئی اُسے سیکولر ڈیموکریٹک ری پبلک کے نام سے موسوم کیا گیا۔ آزاد ہندوستان کے آئین میں سیکولرازم کی خصوصیت اس بنا پر پیدا کی گئی کیونکہ ہندوستانی قوم بنیادی طور پر روحانیت پسند واقع ہوئی ہے۔ اگر سارے ملک میں ایک ہی مذہب یا دھرم کے ماننے والے ہوتے تو مضائقہ نہ تھا لیکن اس کے برخلاف یہاں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور بدھشٹ اور جینی مذاہب کے لوگ ایک مشترکہ سماجی زندگی گزار رہے تھے۔ ایسے حالات میں سیکولر آئین کا نفاذ ناگزیر سمجھا گیا۔

سیکولرازم ہندوستانی آئین و سیاست کی سب سے بڑی خصوصیت اور سب سے اہم تقاضہ رہا ہے۔ یہ ایک ایسا آئیڈیل ہے جس پر عمل درآمد کے بغیر ہندوستان کی اجتماعی ترقی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ آج بھی ہندوستانی سیاست میں سب سے زیادہ اسی نظریے اور اسی آئیڈیل کا بول بالا ہے۔ سیکولرازم جو ہندوستانی سیاست کا سب سے اہم اور نازک پہلو ہی نہیں بلکہ سیاسی منشور کے جسم میں شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے، اسے قابلِ افسوس حد تک اربابِ حکومت اور سیاست کے ذریعے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ملک کی سالمیت و اجتماعیت ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے اور حکومتِ ہند کو نت نئے مسائل اور طرح طرح کے سیاسی چیلنج کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اسی کے عدم نفاذ سے آج ہر طرف مذہبی، لسانی، جغرافیائی تنازعے اور فرقہ وارانہ فسادات نے سر اٹھانا شروع کر دیا ہے۔

۱۸۵۷ء سے جدید ہندوستان کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ غدر کے آزمائشی دور میں اور غدر فرو ہونے کے بعد بھی سرسید انگریزوں کے وفادار رہے، اس کے زمانے میں سرسید نے انگریزی حکومت کی تائید کی اور اسے ہندوستانی اقوام کے حق میں باعثِ خیر و برکت قرار دیا۔ لیکن اگر بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ان کی انگریز نواز پالیسی کے پیچھے نہ تو انگریز پرستی نظر آئے گی اور نہ کسی ذاتی یا ملّی تعصب کا سراغ ملے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ جس جذبے نے انھیں انگریزی عمل داری کو قبول کرنے پر مجبور کیا وہ یہ تھا کہ انگریزوں کی سرپرستی میں سرزمینِ ہند پر سیکولر اقدار کا جس حد تک تحفظ متصور تھا، اس کی توقع دیسی حکومتوں سے اس دور کی فضا میں تقریباً بے معنی تھی۔ انگریز حکام نسلی تعصب اور دوسری خرابیوں کے باوصف ایک حد تک سیکولرازم پسند واقع ہوئے تھے۔ انیسویں صدی کے نصفِ آخر کا زمانہ ہندوستانی قومیت کے آغاز کا زمانہ تھا۔ ہندوستان کے چند سیاسی رہنماؤں کے ذہن میں قومیت اور قومی مسائل سے متعلق سوالات اُبھرنے شروع ہوئے۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں جب ہندوستانی قومیت کا رجحان سارے ملک میں عام ہونے لگا اور ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کو قانونی حیثیت دے دی گئی تو اس کے ساتھ کچھ فرقہ دارانہ اور علیحدگی پسند ذہن بھی سرگرم و متحرک ہو چلی تھیں جن کے طرزِ عمل سے متحدہ قومیت کا تصور مشکوک ہوتا جا رہا تھا۔ سرسید نے بروقت اس حادثۂ عظیم کا اندازہ کر لیا تھا جو ابھی پردۂ افلاک سے نازل نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا وہ کچھ سالوں تک خاموشی اختیار کیے رہے۔ بالآخر اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ انھیں کامل یقین تھا کہ آزادی ملنے کے بعد مذہبی، لسانی، تمدنی، اور جغرافیائی بنیاد پر جھگڑے فسادات شروع ہو جائیں گے اور جو طبقہ برسرِ اقتدار ہوگا یا ہندوستانی سیاست پر حاوی ہوگا محکوم اور اقلیتی طبقے سے انصاف نہیں کر سکے گا۔ نظریۂ قومیت کی مخالفت سرسید نے اس لیے نہیں کی تھی کہ وہ دیسی حکومت کے حق میں نہ تھے بلکہ وہ اس خواہش کو قبل از وقت سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں ہندوستانی سیاست دانوں میں ابھی اتنی سیاسی بصیرت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ اتنی بڑی سلطنت کی باگ ڈور سنبھال سکیں اور اتنے بڑے خطے پر کامیابی کے ساتھ حکومت کر سکیں۔ ابھی اہلِ ہند کو اگر ایک طرف اعلیٰ تعلیم کی اشد ضرورت تھی تو دوسری طرف علوم و فنون کی روشنی گھر گھر پہونچا کر شہر دیہات ہر جگہ سے جہالت اور توہمات کی تاریکی مٹانی تھی۔ یہی سبب تھا کہ سرسید اہلِ وطن کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو سردست سیاست سے دور رہنے اور تعلیم و تربیت میں سعی کرنے اور "پہلے لائق

ینو پھر خواہش کرو" کے مقولے پر عمل کرنے کی تلقین کرتے رہے۔

چنانچہ ہندوستانی قومیت کے تشکیلی دور میں جب کہ ہندوستان کے سیاسی رہنما سیاسی لاسمتیت کے شکار تھے۔ ان کے ذہنوں میں وسیع تر قومیت کے خط وخال پوری طرح واضح نہیں تھے۔ سرسید نے ایک جامع وسیع اور نہایت ہی منظم سیاسی تصور پیش کیا تھا۔ سرسید کا سیاسی تصور ہر قسم کے تعصبات سے بلند تر ہونے کے علاوہ ہندوستانی اقوام کے مزاج اور ماحول سے گہری مطابقت بھی رکھتا تھا۔

ہندوستان کے سیاسی دھارے کو کارآمد جہت عطا کرنے اور مشترکہ قومیت کے رجحان عام کرنے کی غرض سے سرسید کو مذہب اور سیاست کے درمیان مطابقت کی راہ تلاش کرنی پڑی اور مذہب کی رکاوٹوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ انھوں نے قوم کے ہندو اور مسلمان بھائیوں کو ان کے مذاہب کے حوالے سے سمجھایا کہ مشترکہ ومتحدہ زندگی گزارنا بنی آدم کا فطری تقاضا ہے اور اس امر میں مذہب کہیں بھی مانع نہیں آتا۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ ہندوستان کے صحیح اور اصلی باشندے کون ہیں؟ سرسید نے فرمایا:۔

" اے عزیزو! جس طرح ہندوؤں کے شریف قومیں اس ملک میں آئیں اسی طرح ہم بھی اس ملک میں آئے۔ ہندو اپنا ملک بھول گئے۔ اپنے دیس سے پردیس کا زمانہ ان کو یاد نہیں رہا اور ہندوستان ہی کو انھوں نے اپنا وطن سمجھا اور یہ جانا کہ ہمالیہ اور بندھیاچل کے درمیان ہمارا ہی وطن ہے۔ ہم کو اپنا وطن چھوڑے سیکڑوں برس ہو گئے نہ وہاں کی آب و ہوا ہم کو یاد ہے نہ اس ملک کی فضا کی خوبصورتی ..... پس اب ہندوستان ہم دونوں کا وطن ہے ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں، مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم پیتے ہیں۔ ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں مرنے جینے میں دونوں کا ساتھ ہے ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا۔ دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک سی ہو گئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں اختیار کر لیں ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں۔ یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر نئی زبان اُردو پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی نہ ان کی ... ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبود ممکن ہے اور آپس کے نفاق اور ضد و عداوت نیز ایک دوسرے کی بدخواہی سے ہم دونوں برباد ہونے والے ہیں"۔

(لکچر بمقام پٹنہ، ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء)

یہاں ایک طرف سرسید اگر اہلِ وطن کو مشترکہ ومتحدہ زندگی کی نعمتوں کی بشارت دیتے ہیں تو دوسری طرف فرقہ پرستی، آپسی تعصب اور بھید بھاؤ سے ہونے والے نقصانات سے آگاہ بھی کرتے ہیں۔ جب ملک جسم ہوا اور باشندگان ملک اس کے مختلف اعضا تو ملک کی صحت یا ترقی اسی وقت ممکن ہے جب ملک کے سارے باشندوں کی ترقی ہوگی۔

سرسید مذہب کو انسان کا ذاتی اور پرائیویٹ مسئلہ قرار دیتے ہیں۔ جہاں لوگوں کے بہت سے ذاتی اور شخصی مسائل ہیں وہیں ایک مسئلہ مذہب کا بھی ہے۔ مذہب کا تعلق روح اور دل کی اندرونی کیفیت سے ہے جس سے خدا کے سوا کوئی بھی آگاہ نہیں اس لیے کسی کے مذہب میں دخیل ہونا نہایت ہی غلط اور بری بات ہے۔ جس طرح لوگوں کے بہت سے شخصی اور ذاتی مسائل اجتماعی مسائل میں دخیل نہیں ہوتے اور نہ کسی کے نجی مسئلے میں دوسروں کو مداخلت کا حق ہے۔ سرسید کے نزدیک یہی حال مذہب کا بھی ہے۔ جہاں تک قومیت کے تصور کا سوال ہے سرسید اسلامی قومیت اور جغرافیائی قومیت میں بھی مطابقت کی صورت پیدا کر لیتے ہیں۔ جس طرح اسلام نے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی بنیاد پر گورے اور کالے امیر اور غریب، عربی و عجمی کے باہمی فرق کو ختم کر دیا اسی طرح مشترکہ اور متحدہ قومیت کی تشکیل کے لیے علاقائی، مذہبی، نسلی اور دیگر امتیازات کو ختم کر دینا سرسید کے نزدیک نوع بشر کا ایک قدرتی اور فطری تقاضا ہی نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات رکھتا ہے، انڈین ایسوسی ایشن لاہور کی جانب سے پیش کیے گئے ایڈریس کے جواب میں سرسید نے صاف لفظوں میں کہا تھا۔

" لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ نیشن (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ سے لائق نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے کیونکہ اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں۔ ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں۔ ہم سب قحط کی مصیبت برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر ان دونوں کو جو ہندوستان میں آباد ہیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں " ہندو" یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم"۔

لاہور میں جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے سرسید نے جو قومیت کا تصور پیش کیا ہے اس میں ملک کے ادی باسی اور وہ لوگ بھی شریک ہو جاتے ہیں جو ابھی جنگل کی تہذیب سے باہر نہیں آئے اور متمدن دنیا کی روشنی ان کے دماغ تک

نہیں پہونچ سکی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

" میری رائے اگر سچ ہے تو میں کالے سے کالے انسان کو اور گورے سے گورے رنگ کے انسان کو وہ جو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کی تہذیب میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں اور وہ جو ابھی نیچر کے جوش میں ہیں اور جنگلوں میں اپنے دن کاٹ رہے ہیں سب کو اپنا بھائی اور ایک قوم تصور کرتا ہوں۔ میری تمام آرزو یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم و مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں۔ مذہب بے شک علیحدہ علیحدہ ہے مگر اس کے لحاظ سے کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے۔"

(تقریر بمقام لاہور، ۳۰ دسمبر ۱۸۷۳ء)

سرسید نے ہندو اور مسلمانوں کو ایک خوبصورت دلہن کی دو حسین آنکھوں سے تشبیہ دی ہے۔ اگر دونوں آنکھیں آپس میں نا برابر ہوئیں تو دلہن بھینگی کہلائے گی۔ اگر ان میں سے ایک جاتی رہی تو دلہن کانی ہو جائے گی۔ غرضکہ اس دلہن (قوم) کی خوبصورتی اس بات میں مضمر ہے کہ دونوں آنکھیں سلامت و برقرار رہیں۔

سرسید کے کردار و عمل اور تحریر و تقریر سے ان کے سیکولر خیالات کی سیکڑوں شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ گفتار کا غازی ہونا اور بات ہے۔ کردار کے غازی ہزاروں میں ایک ہوتے ہیں اور صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ سرسید محض گفتار کے غازی نہیں تھے ۔ وہ زندگی کے ہر موڑ پر اور عام شعبہ ہائے زندگی میں سیکولر کردار کا مظاہرہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک کرتے رہے۔ مسلمانوں کو جدید علوم و فنون سے آشنا کرنے اور ان کی تعلیمی ضرورت کی تکمیل کے لیے برسوں کی جد و جہد کے بعد مدرستہ العلوم یا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا اور حکومت سے اردو یونیورسٹی کی بھی مانگ کی۔ اس موقع پر غیر مسلم عوام اور لیڈروں نے سرسید کو شک کی نگاہوں سے دیکھا حالانکہ اس کے لیے کوئی معقول جواز ان کے پاس نہ تھا۔ ہندو یا غیر مسلم طبقے کے لیے تعلیمی اداروں کی کوئی کمی نہیں تھی جہاں چاہتے تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ مسلمان سرکاری اداروں میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے یہ ان کی مجبوری تھی۔ سرسید نے کالج قائم کیا۔ حق بہ حقدار رسید۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس ادارے میں صرف مسلمانوں کے داخلے پر ہی زور دیا جاتا۔ لیکن سرسید نے کالج کا دروازہ سبھی اقلیتوں کے لیے ہمیشہ کھلا رکھا۔ کالج کی اقامتی زندگی میں ہندو طلبا سے مساویانہ سلوک کے علاوہ کالج میں عربی کے ساتھ سنسکرت کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا۔ کالج میں تعلیم پانے والے ہندو اور مسلمان طلباء کے باہمی تناسب میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہا۔ امرتسر کے مسلمانوں نے جب مدرستہ العلوم کے بی اے کی کلاس میں فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے والے کے لیے سونے کے تمغے جاری کئے تو سرسید نے اپنے کالج کے اس ہندو طلبا کے لیے اپنی جیب خاص سے طلائی تمغے کا اعلان کیا جو درجہ مذکور میں فرسٹ ڈویژن حاصل کرے گا۔ باہمی یگانگت اور قومی یک جہتی کے رجحان کو فروغ دینے کے لیے اپنے پوتے راس مسعود کو ان کی تقریب بسم اللہ کے موقعے پر اپنے دلی دوست راجہ جے کشن داس کے سپرد کیا جن کی گود میں بیٹھ کر نونہال راس مسعود نے قرآن کی آیتوں کے ساتھ تعلیم و تربیت کی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔ محبت اور وسیع القلبی کا یہ منظر دیکھ کر بیشتر لوگ حیران تھے۔ چند ایسے بھی تھے کہ کعبہ و صنم خانے کے اتحاد سے دل ہی دل میں مسرور ہو رہے تھے — پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے۔ سرسید اپنی قوم کے نا عاقبت اندیش اور جذباتی مسلمانوں کو غیر مذاہب کے پیشواؤں کے احترام کی ہدایت بھی کرتے ہیں اور انھیں قرآن پاک کے الفاظ یاد دلاتے ہیں کہ "مت برا کہو ان کو جو خدا کے سوا کسی اور کی عبادت کرتے ہیں۔ پھر وہ بڑھ کر ناد انستگی سے خدا کو برا کہیں گے۔"

(سورۃ انعام آیت ۱۰۸)

لندن کے سفر کے دوران سرسید کی ملاقات انگریز حکام اور مشہور و معروف شخصیتوں سے ہوئی ان میں میجر ڈاڈ ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ناگپور اور ڈی نیٹیز پیرک سابق ڈپٹی کمشنر دہلی بھی شامل تھے۔ میجر ڈاڈ سرسید سے بہت خلوص اور اپنائیت سے ملتے تھے اور پہروں باتیں کیا کرتے تھے۔ بظاہر تو میجر ڈاڈ بہت با اخلاق نرم سخن اور آہستہ گو آدمی تھے۔ لیکن ان صفات ظاہری کے باوصف ان کی ذہنیت مذہبی تعصبات سے بری طرح آلودہ تھی پبلک انسٹرکشن سے متعلق کسی ڈائریکٹر کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی: میجر موصوف کہتے ہیں :-

وہ شخص باوصف اپنی بڑی لیاقتوں کے ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن اس لیے نہیں ہوا کہ شاید وہ لا مذہب تھا اور کسی مذہب کے سچے ہونے کے بارے میں یقین نہیں رکھتا تھا۔" سرسید کو میجر ڈاڈ کا یہ نقطۂ نظر بہت نامناسب معلوم ہوا۔ چنانچہ میجر صاحب سے کہتے ہیں :-

" میری رائے میں ضرور ہے کہ ہندوستان میں ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ایسے ہوں جو لا مذہب ہوں۔" اس لیے کہ ہندوستان میں مختلف قوم اور مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں لہٰذا کسی مذہبی آدمی کا افسر تعلیم مقرر ہونا سرسید کے خیال میں بے تعصب اور عام تعلیم کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر سکتا ہے۔ سرسید کا مندرجہ ذیل قول اس قابل ہے کہ اسے آب زر سے لکھا جائے۔

" دراصل میری رائے میں جیسا کہ خدا

بے تعصب ہے، مشرک بُت پرست اور خدا پرست سب کو برابر پرورش کرتا ہے اسی طرح گورنمنٹ اور افسر تعلیم کو بے تعصب ہونا چاہیے۔ جبھی تو گورنمنٹ ظل اللہ اور افسر تعلیم معلم میں صفات اللہ ہو سکتا ہے۔"

سرسید حاکم و محکوم کے درمیان جس اسلامی رشتے کے قائل تھے اس کے مطابق گورنمنٹ سے وفاداری، رعایا پر مذہباً فرض سمجھتے تھے۔ بادشاہ کا اپنی رعایا کے سامنے خود کو نائب خدا یا خلیفۂ خدا تصور کرنا اور رعایا کا بادشاہ کو ظلِّ الٰہی سے تعبیر کرنا اسی تصور کی وجہ سے تھا۔ سرسید نے اس تصور کو مزید وسعت دی اور غیر مذاہب کے حکام کو بھی انھیں شرعی حدود میں شامل کر لیا جو برسول خلفاء اسلامی اور شاہانِ اسلام کے لیے مختص تھیں۔

لندن جاتے ہوئے فیلٹز پیرلک سالق ڈپٹی کمشنر دہلی سے گفتگو کے دوران جب پنجاب کی گورنمنٹ کا ذکر آیا تو سرسید نے نہایت صاف گوئی سے کہا کہ :-

یہ ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ ہے اور بلا شبہ سکھوں کی (سابقہ) عملداری سے ہزاروں درجے بہتر ہے، شاید پنجاب کے لوگ خوش ہوں کہ انھیں آگ سے نکال کر دھوپ میں بٹھا دیا گیا ہے۔ مگر ہم لوگ انھیں پسند نہیں کر سکتے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ دلی اور متعلقہ اضلاع کے لوگ پنجاب گورنمنٹ کے موجودہ انتظام کو غدر کی جملہ سزاؤں میں سے ایک سزا تصور کرتے ہیں۔ سرسید کے نزدیک غیر آئینی یا شخصی طرز حکومت کے لیے موجودہ عہد میں نہ کوئی جواز ہے اور نہ اس کی کوئی معنویت۔ کہتے ہیں :-

"اب وہ زمانہ نہیں رہا جس میں ڈسپاٹک گورنمنٹ کو لوگ پسند کرتے تھے اور نہ اب وہ بھلائیاں ہیں جو ہزاروں برائیوں کے ساتھ اگلے زمانے کی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ملی ہوئی تھیں اور جن سے ان برائیوں کا علاج ہوتا تھا..... اب ان کا ہونا کسی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ممکن نہیں ہے۔ وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان میں بجائے کانسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ کے ڈسپاٹک گورنمنٹ جیسی کہ قدیم سے تھی زیادہ مفید ہوگی، وہ نہایت غلطی پر ہیں۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے کسی باغ کو موسم خزاں میں دیکھ کر اس کی بھلائی کی نسبت رائے قائم کرے اور موسم بہار کا کچھ بھی خیال نہ کرے۔"

جس سیاسی رہنما کے کردار و عمل میں، اقوال و افکار میں اس درجہ سیکولر جذبات اور جمہوری خیالات کی Democrative Ideas کارفرمائی موجود ہو، اس پر فرقہ پرستی، تعصب اور تنگ نظری وغیرہ کا الزام رکھنا تاریخی حقائق سے مجرمانہ تجاہل کے مصداق ہوگا۔ سرسید کے ناقدین کو قدم اٹھانے سے پہلے ان کی خدمات اور ان کے خیالات و افکار کا بڑی تفصیل سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی اُس دور اور اُن خیالات کو بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے جن سے سرسید اور ان کی قوم کا سابقہ پڑا تھا۔ انیسویں صدی کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے کامل شعور کے بغیر سرسید کی شخصیت سے متعلق کوئی رائے قائم کرنا نہایت ہی دشوار کام ہے۔ آزادیِ ہند کے بعد سرسید کی مخلصانہ کاوشوں کو بھی ان کے کچھ نقادوں نے غلط تاثر دینے کی شعوری کوشش کی۔ نظریاتی، سیاسی مصلحتوں اور اکثر عدم واقفیت کی بنیاد پر حقائق کو مسخ کرکے پیش کرنے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ حالانکہ خیالات و زمانے کی بدلتی کروٹوں نے اور وقت کے پیہم انقلابات نے ثابت کر دیا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اس مخلص قوم نے جسے دنیا سرسید احمد خاں کے نام سے پکارتی ہے۔ اپنی قوم کو جن خطرات سے متنبہ کیا تھا اُن میں کتنی صداقت تھی۔

جواہر لال نہرو جو نہ صرف جنگِ آزادی کے ممتاز ترین سپاہی تھے بلکہ ایک مشہور و معروف دانشور بھی تھے، سرسید کی تحریک اور قومیت کی طویل کشمکش کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ :-

" سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دی جائیں یقیناً درست اور صحیح تھا۔ بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی مؤثر حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے۔ یہ تعلیم میں بھی اُن سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی اُن سے زیادہ مضبوط۔"

(میری کہانی حصہ دوم ص ۱۵)۔

یہ الفاظ اس ذمہ دار سیاسی قائد کے ہیں جس نے اپنے دامن حُبّ الوطنی کو تمام تر تعصبات سے پاک رکھا تھا (اس کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ لامذہب تھے) قدرت کا عجیب کرشمہ ہے کہ سرسید نے پون صدی پہلے جن خطرات سے اہلِ ہند کو متنبہ کیا تھا وہ ایک ایک کرکے صحیح ثابت ہوتے گئے۔ آزادی کے موقع پر جب ہندو مسلم فساد برپا ہوا تو گاندھی جی نے بڑے دکھ سے اقرار کیا تھا کہ "ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کو قبل از وقت آزادی مل گئی ہے"۔

سرسید آج ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن ان کے پیغامات، ان کی نشانیاں من و عن محفوظ ہیں۔ بظاہر تو ان کے افکار و خیالات انیسویں صدی کی سیاسی و سماجی حالات کی پیداوار تھے لیکن بڑی حد تک ان کی معنویت آج بھی برقرار ہے اور آئندہ کے لیے مشعلِ راہ بھی۔ ●

ابوسعد خان٭

ہندوستان میں کیمیاوی کھاد کی صنعت

ہندوستان ایک زرعی ملک ہے یہاں کی آبادی کی اکثریت دیہی علاقوں میں رہتی ہے اور زراعت کے پیشے سے وابستہ ہے۔ لہٰذا زراعت کو ملک کی معیشت میں اہم اہمیت حاصل ہے۔ زرعی اشیاء کی برآمد کے ذریعہ ملک کو قیمتی زرمبادلہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ کل برآمدی تجارت میں زراعت کا براہ راست یا بالواسطہ طور پر ۷۰ فیصد حصہ ہے۔ اس کے علاوہ زراعت ایک ایسا شعبہ ہے جس میں ملک کی تقریباً ۶۰ فیصد افرادی قوت وابستہ ہے جس پر ملک کی ۷۰ فیصد سے زائد آبادی کا دارومدار ہے اور ملک کی قومی پیداوار کا تقریباً ۴۲ فیصد حصہ اسی شعبہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد ہماری حکومت نے غذائی اجناس کی پیداوار میں خودکفیل ہونے کے مقصد سے زراعت کو سب سے زیادہ ترجیح دی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہی ہندوستان کی زرعی پیداوار میں اضافہ کی رفتار برابر جاری ہے۔ ہماری سابق وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی کے بیس نکاتی پروگرام میں بھی زرعی شعبہ کو بہت اہمیت دی گئی تھی اور زرعی ترقی کے لیے کافی وسائل مختص کیے گئے۔ ہمارے ملک کا شمار ان مخصوص ترقی پذیر ملکوں میں ہوتا ہے جو زراعت کو کافی ترقی دینے اور ترقی کی رفتار کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ملک میں جو زرعی ترقی ہوئی ہے اور خوراک کے معاملے میں خودکفالت کا جو خواب شرمندۂ تعبیر ہوا ہے اور "سبز انقلاب" رونما ہوا ہے اُس میں کیمیاوی کھادوں کا نصف حصہ ہے۔ کیمیاوی کھادوں کے استعمال سے فی ہیکٹیر پیداوار میں اضافہ ممکن ہو سکا ہے۔ آزادی کے بعد کیمیاوی کھاد کی صنعت، ہمارے ملک میں ایک اہم ترین صنعت کے طور پر اُبھری ہے۔

ملک میں بڑھتی ہوئی آبادی کی غذائی ضرورتوں کی تکمیل بہت ہی ترقی یافتہ زراعت سے ممکن ہے جو خاص طور سے کیمیاوی کھادوں کے استعمالات پر منحصر ہے۔ ہندوستان میں کیمیاوی کھادوں کی صنعت کا فروغ دوسری عالمی جنگ کے بعد ہی شروع ہوا۔ ملک میں کیمیاوی کھاد کا سب سے پہلا کارخانہ میسور کیمیکلس اینڈ فرٹیلائزرس، بیلگام (کرناٹک) میں ۱۹۳۹ء میں قائم ہوا۔ یہاں سے سالانہ ۶ ہزار ٹن امونیم سلفیٹ کھاد تیار کی جاتی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں کیمیاوی کھاد کا دوسرا کارخانہ فرٹیلائزرس اینڈ کیمیکلس لمیٹڈ، الوائے (کیرل) میں قائم ہوا۔ اس کارخانہ کی پیداواری صلاحیت ۵۰ ہزار ٹن امونیم سلفیٹ اور ۳۶ ہزار ٹن سوپر فاسفیٹ تیار کرنے کی تھی۔ چونکہ کیرل میں کوئلہ نہیں پایا جاتا تھا، اس لیے اس کارخانہ میں امونیم گیس بنانے کے لیے "گیس جنریٹر" کی بھٹیوں میں لکڑی کا کوئلہ استعمال کیا جاتا تھا۔

آزادی کے بعد کیمیاوی کھاد کی صنعت کا فروغ تیزی سے شروع ہوا۔ کیمیاوی کھاد کی کمرشیل پیداوار اس وقت شروع ہوئی جب پبلک سیکٹر کے تحت سندری (بہار) میں ۲۸ کروڑ روپے کی لاگت سے کیمیاوی کھاد کا ایک جدید کارخانہ ۱۹۵۱ء میں قائم کیا گیا۔ اس کارخانہ کا شمار ایشیا کے بڑے کھاد کے

٭ لیکچرر شعبۂ جغرافیہ، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، کوٹ دوار، پوری گڑھوال، یو پی۔

کارخانوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ کارخانہ پانچ حصوں میں منقسم ہے :-

۱۔ پاور پلانٹ۔ ۲۔ گیس پلانٹ۔
۳۔ امونیا پلانٹ۔ ۴۔ سلفیٹ پلانٹ۔
۵۔ کوک، اوین پلانٹ۔

اس کارخانہ سے امونیم سلفیٹ کے علاوہ کئی ذیلی پیداوار بھی مثلاً کوک، کولتار، موٹر بنزول، بنزین، نیفتھا، ٹولون وغیرہ حاصل ہوتی ہیں۔ فرٹیلائزر پروجیکٹ کمیٹی کی سفارشوں کے مطابق حکومت نے "سنگل پروجیکٹ" قائم کیا۔ اس کارخانہ کی پیداواری صلاحیت سالانہ ۸۰ ہزار امونیم نائٹریٹ تیار کرنے کی ہے۔ اس وقت ملک میں پبلک، پرائیویٹ اور کوآپریٹو سیکٹر کے تحت کیمیاوی کھاد کے کئی کارخانے قائم ہو چکے ہیں یہاں کیمیاوی کھاد کی ۴۲ بڑی یونٹ قائم ہیں جن سے کافی مقدار میں نائٹروجن (Nitrogenous) اور فاسفیٹک (Phosphatic) کھادیں تیار ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ۵۰ چھوٹی یونٹوں سے سوپر فاسفیٹ (Super Phosphate) اور چھ یونٹوں سے ذیلی پیداوار کے طور پر امونیم سلفیٹ حاصل ہوتی ہے۔ اس صنعت میں کوئی چار ہزار کروڑ روپے کا سرمایہ لگا ہوا ہے اور ساتویں پنج سالہ منصوبہ کے اختتام تک یہ سرمایہ کاری ۷۵۰۰ کروڑ روپے تک پہونچ جانے کا اندازہ ہے۔

کھاد کی صنعت کے ارتکاز کے عوامل میں خام مال کی فراہمی، قوت محرکہ کی رسد، حمل و نقل کی بہتر سہولتیں، وسیع مقامی کھپت، سستی محنت کا حصول اور سرمایہ کی افراط وغیرہ شامل ہیں۔ ہمارے ملک میں کیمیاوی کھاد کی صنعت میں نیفتھا، کوئلہ اور قدرتی گیس کا استعمال فیڈ اسٹاک (Feed Stock) کے طور پر ہوتا ہے۔ ملک کے اندرونی حصوں میں واقع زیادہ تر کارخانوں میں نیفتھا کا استعمال ہوتا ہے۔ نامروپ (آسام)، گورکھپور، ٹرامبے، بڑودہ، بردلی، منگلور، دوگاپور، کوچین، گوا اور ٹیوٹی کورن وغیرہ فیکٹریوں میں نیفتھا کا ہی استعمال ہوتا ہے۔ ان کارخانوں سے امونیا کھاد کے مرکبات، یوریا اور امونیم سلفیٹ تیار کئے جاتے ہیں۔ زیادہ تر کیمیاوی کھاد کے کارخانوں میں نیفتھا کو فیڈ اسٹاک کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے لیکن مستقبل میں قائم ہونے والے کھادوں کے کارخانوں میں قدرتی گیس اور کوئلہ کو ہی استعمال کیا جائے گا جس کے ملک میں وسیع ذخائر موجود ہیں۔ بمبئی ہائی گیس کی دریافت کے بعد حکومت کیمیاوی کھاد کے ایسے کارخانوں کو قائم کرنے کے حق میں ہے جن میں قدرتی گیس کا استعمال ہو سکے۔ ملک میں صرف دو کارخانے ایسے ہیں جہاں فیڈ اسٹاک کے طور پر کوئلے کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ کارخانے راما گنڈم اور تالچیر میں قائم کئے گئے ہیں۔ ان دونوں کارخانوں کی کارکردگی اطمینان بخش نہیں ہے پھر بھی ان کارخانوں کی کارکردگی بہتر بنانے کی کافی گنجائش موجود ہے۔ کوئلے کے ذخائر والے علاقوں میں ایسے کئی کارخانے کامیابی کے ساتھ قائم کئے جا سکتے ہیں۔

حکومت نے کیمیاوی کھاد کی پندرہ نئی یونٹوں کو قائم کرنے کے لیے منظوری دی ہے۔ ان میں سے چھ یونٹوں کو ہزیرہ، بیجے پور اور جگدیش پور۔ (H.B.J.) گیس پائپ لائن کے ذریعہ بمبئی ہائی کی گیس مہیا کی جائے گی۔ ایچ۔ بی۔ جے گیس پائپ لائن ایک ہزار سات سو ۸۰ کلومیٹر لمبی ہوگی۔ یہ گیس پائپ لائن ہزیرہ آن شور ٹرمنل (Onshore Terminal) سے شروع ہو کر ببرالا (یو پی) میں ختم ہوگی۔ اس پائپ لائن سے روزانہ ۱۸٫۳ ملین کیوبک میٹر گیس کی سپلائی کی جائے گی اور بعد میں ۲۲٫۴ ملین کیوبک میٹر گیس کی سپلائی ممکن ہو سکے گی۔ "بمبئی ہائی" کی گیس پر انحصار کرنے والے کیمیاوی کھاد کے کارخانے بیجے پور، آنولہ، جگدیش پور، سوائی مادھوپور، ببرالا اور شاہجہانپور میں قائم کئے جائیں گے۔ بیجے پور (گونا۔ مدھیہ پردیش) میں کھاد کا کارخانہ نیشنل فرٹیلائزر کمپنی لمیٹڈ کے ذریعہ پبلک سیکٹر میں قائم کیا جائے گا۔ جب کہ آنولہ (یو۔ پی) میں اِفکو (IFFCO) کے ذریعے کوآپریٹو سیکٹر کے تحت قائم ہوگا، چار کارخانے پرائیویٹ سیکٹر اور جوائنٹ سیکٹر میں قائم کئے جائیں گے۔ سوائی مادھوپور، پروجیکٹ، آراولی فرٹیلائزر لمیٹڈ کے ذریعے، جگدیش پور میں انڈو گلف فرٹیلائزر کے ذریعے، ببرالا میں ٹاٹا فرٹیلائزر لمیٹڈ اور شاہجہانپور میں اپچے فرٹیلائزر لمیٹڈ کے ذریعہ قائم کئے جائیں گے۔ ان کارخانوں کو قائم کرنے کے لیے ہر ایک کارخانہ پر تقریباً ۵۰۰ کروڑ روپے کا خرچ آئے گا۔

"بمبئی ہائی گیس" پر انحصار کرنے والے ۸ کیمیاوی کھاد کے کارخانوں میں سے ۲ کارخانوں میں کمرشیل پیداوار شروع ہو چکی ہے۔ یہ کارخانے تھال ویشٹ (Thal-Vaishet) اور ہزیرہ میں قائم ہیں۔ بیجے پور، آنولہ اور جگدیش پور کے کارخانے جلد ہی مکمل ہونے والے ہیں۔ سوائی مادھوپور پروجیکٹ، کو بھی حکومت نے منظوری دے دی ہے۔ اس پروجیکٹ پر جلد ہی کام شروع ہو جائے گا۔ ببرالا اور شاہجہانپور کے کارخانے ابھی ابتدائی اسٹیج میں ہیں۔ یہ سبھی کارخانے بین الاقوامی کمپنیوں کے اشتراک و تعاون سے قائم کئے جا رہے ہیں۔ ان تمام کے مابین مقابلے سے ملک کی کھاد کی صنعت کی کارکردگی بہتر ہوگی۔

"بمبئی ہائی گیس" پر انحصار کرنے والے کیمیاوی کھاد کے کارخانوں کی تفصیل اگلے صفحہ پر درج جدول سے واضح ہے :-

"بمبئی ہائی گیس" پر انحصار کرنے والے کارخانے :۔

نمبر شمار	پروجیکٹ	مقام	پیداواری صلاحیت (ٹن یومیہ)	کمپنیوں سے تعاون و اشتراک
۱۔	راشٹریہ کیمیکلس اینڈ فرٹیلائزرس	تھال (مہاراشٹر)	امونیا (۲ × ۱۳۵۰) یوریا (۳ × ۱۵۰۰)	ہلدور ٹوپسول (Helder Tepsol) ڈنمارک۔ اسنام پروگیٹی (اٹلی) اور پی ڈی آئی ایل۔ بھارت۔
۲۔	کرشک بھارتی کوآپریٹو (KRIBHCO)	ہزیرہ (گجرات)	امونیا (۲ × ۱۳۵۰) یوریا (۴ × ۱۱۰۰)	کیلوگ (Kellogg) یو۔ ایس اے۔ اسنام پروگیٹی (Snamprogetti) اٹلی اور پی۔ ڈی۔ آئی۔ ایل (P.D.I.L.) بھارت۔
۳۔	نیشنل فرٹیلائزرس (N.F.L.)	بیجے پور (ایم پی)	امونیا (۱۳۵۰) یوریا (۲۲۰۰)	ہلدور ٹوپسول (ڈنمارک)، اسنام پروگیٹی (اٹلی)، اور پی۔ ڈی۔ آئی۔ ایل۔ (بھارت)
۴۔	انڈین فارمرس فرٹیلائزرس کوآپریٹو (IFFCO)	آنولہ (یو۔ پی)	امونیا (۱۳۵۰) یوریا (۲۲۰۰)	اسنام پروگیٹی اور پی۔ ڈی۔ آئی۔ ایل۔
۵۔	انڈو گلف فرٹیلائزرس اینڈ کیمیکلس کارپوریشن	جگدیش پور (یو۔ پی)	امونیا (۱۳۵۰) یوریا (۲۲۰۰)	اسنام پروگیٹی اور پی۔ ڈی۔ آئی۔ ایل۔
۶۔	اراوالی فرٹیلائزرس لمیٹڈ	سوائی مادھوپور (راجستھان)	امونیا (۱۳۵۰) یوریا (۲۲۰۰)	اسنام پروگیٹی اور پی۔ ڈی۔ آئی۔ ایل۔
۷۔	ٹاٹا کیمیکلس	ببرالا (یو۔ پی)	امونیا (۱۳۵۰) یوریا (۲۲۰۰)	ابھی فائنل ہونا باقی ہے۔
۸۔	اے۔ پی۔ جے لمیٹڈ (A Pee Jay)	شاہجہاں پور	امونیا (۱۳۵۰) یوریا (۲۲۰۰)	" " "

ماخذ : سروے آف انڈین انڈسٹری ۱۹۸۵ء (دی ہندو) صفحہ ۱۲۳۔

آزادی کے بعد ملک میں کیمیاوی کھاد کی پیداوار میں بہت تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں یہاں صرف ۲۷ ہزار ٹن کھاد تیار ہوئی تھی جبکہ ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۱،۵ لاکھ ٹن، ۷۱-۱۹۷۰ء میں ۱۰،۵۹ لاکھ ٹن اور ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۳۰ لاکھ ٹن کھاد کی پیداوار ہوئی۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں کیمیاوی کھاد کی پیداوار ۵۷،۶۰ لاکھ ٹن تک پہونچ گئی تھی۔ کیمیاوی کھاد کے کارخانوں کی پیداواری صلاحیت ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۱،۴۸ لاکھ ٹن، ۷۱-۱۹۷۰ء میں ۴، ۳۰ ملین ٹن اور ۸۶-۱۹۸۵ء میں ۳، ۸ ملین ٹن تھی۔ اس طرح ملک کے موجودہ فرٹیلائزر کارخانوں میں پیداواری صلاحیت کا صرف ۷۰ فیصد ہی پیداوار ہو پا رہی ہے۔ اس کی وجہ بجلی کی سپلائی میں کمی اور مشینوں کا جدید نہ ہونا ہے۔ موجودہ پلانٹوں میں تھوڑا سرمایہ لگا کر انھیں جدید بنایا جا سکتا ہے اور ان کی موجودہ نصب شدہ صلاحیتوں سے ہی پیداوار میں قابلِ ذکر اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ملک میں کیمیاوی کھاد کی پیداوار میں مندرجہ ذیل جدول سے واضح ہے۔

نمبر شمار	سال	نائٹروجن (ہزار ٹن)	فاسفیٹ (ہزار ٹن)	کل پیداوار (ہزار ٹن)
۱۔	۱۹۵۰-۵۱	—	—	۲۰
۲۔	۱۹۶۰-۶۱	۹۸	۵۲	۱۵۰
۳	۱۹۷۰-۷۱	۸۳۰	۲۲۹	۱۰۵۹
۴۔	۱۹۸۰-۸۱	۲۱۴۴	۹۴۹	۳۰۹۳
۵۔	۱۹۸۴-۸۵	۳۹۱۷	۱۳۱۷	۵۲۳۵
۶۔	۱۹۸۹-۹۰	۶۹۳۰	۲۱۹۵	۹۱۲۵ (تخمینہ)

نائٹروجن کھادوں (Nitrogenous Fertilisers) کی پیداوار میں ہمارے ملک کو عالمی طور پر دوسرا اور فاسفیٹک (Phos-phatic) کھادوں کی پیداوار میں آٹھواں مقام حاصل ہے لیکن پوٹاش کی پیداوار بہت ہی کم ہے اور ملک میں زرعی ترقی کے لیے اس قسم کی کھاد کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے ملک میں کیمیاوی کھاد کی مصارف پیدائش دوسرے ملکوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے۔ اس کی وجہ کارخانوں کو قائم کرنے کے لیے غلط جگہوں کا انتخاب، پروجیکٹوں کی تکمیل میں تاخیر، خام مالوں کی کمی، سستی ذریعۂ قوتِ محرکہ کی رسد میں کمی، آسان ذرائع نقل و حمل کی سہولیات میں کمی اور کھاد کی صنعت میں کارکردگی کا فقدان وغیرہ عوامل اہم ہیں۔ ملک میں کیمیاوی کھاد کی صنعت کی کارکردگی بہتر کرنے اور اس کو خسارے سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ کارخانوں کی مشینوں کو جدید ڈھنگ سے آراستہ کیا جائے۔ کھاد کی پیداوار میں اضافہ اور کم لاگت کے لیے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کیا جائے اور مستقبل میں قائم کیے جانے والے نئے پلانٹوں کو صحیح مقامات پر قائم کیا جائے۔

کھادوں کی پیداوار میں اضافے کے ساتھ اس کی قیمت فروخت میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے مثلاً سفیتھا کی کھاد کی قیمت ۱۹۷۹ء میں ۷۵۲ روپے فی ٹن تھی۔ جو اب ۲۳ سو روپیہ فی ٹن ہو گئی ہے۔ قیمت فروخت میں اضافے کا سبب اس صنعت میں استعمال ہونے والے خام مالوں کی قیمتوں میں بھاری اضافہ ہے۔ پچھلے کچھ سالوں میں بجلی کی دروں میں بھی بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے اس کے علاوہ ریل بھاڑہ بھی اس دوران سو فیصد بڑھا ہے اور گیس کے دام میں بھی اضافہ ہوا ہے یورپی ممالک کے مقابلے میں یہاں گیس کی قیمت تقریباً ۴ فیصد زیادہ ہے۔ انھیں وجوہات کی بنا پر کھادوں کی قیمتوں میں اضافہ ہوا ہے۔

ملک میں کھاد کی کئی کمپنیوں کی کارکردگی بہت اچھی ہے۔ مثلاً انڈین فارمرس فرٹیلائزرس کوآپریٹو لمیٹڈ (IFFCO) نے ۱۹۸۴-۸۵ء کے دوران کھاد کی پیداوار اور فروخت میں نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اِفکو کے تحت تین کارخانوں میں ۱۸٫۳ لاکھ ٹن کھاد تیار کی گئی۔ اِفکو ملک کی تنہا تنظیم ہے جو ۳۴ ہزار سہکاری مراکز کے توسط سے کنزیومرس (Consumers) تک کھاد اور دوسرے سامانوں کو پہنچاتی ہے۔ نیشنل فرٹیلائزرس لمیٹڈ (N.F.L.) نے ۱۹۸۲ء کے دوران ۹ لاکھ ۲ ہزار ۲ سو ٹن مختلف قسم کی کھادوں کی ریکارڈ پیداوار کی جبکہ اس سال پیداوار کا مقرر کردہ نشانہ ۹ لاکھ ۲۳۰ ٹن ہی تھا۔ اس کے دونوں کارخانے پانی پت اور بھٹنڈہ میں یوریا کی پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ گیس کی مدد سے چلنے والے ہزیرہ پروجیکٹ (سورت۔ گجرات) کی کارکردگی بہت ہی اچھی ہے۔ پچھلے مارچ سے پیداوار شروع ہونے کے بعد اس کارخانے سے اس کی پیداواری صلاحیت کی تقریباً ۹۲ فیصد پیداوار حاصل ہوئی ہے جو کسی بھی نئے کارخانے کے لیے فخر کی بات ہے۔

گو کہ کیمیاوی کھاد کی پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ پھر بھی ملکی ضروریات کی تکمیل نہیں ہو پا رہی ہے۔ ہماری زراعت کا انحصار درآمدی کھادوں پر ہے۔ ہمارے ملک میں ہر سال تین ملین ٹن سے زیادہ یعنی کل مانگ کی تقریباً ۲۷ فیصد کھاد درآمد کی جاتی ہے۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں کھاد کی کل ملکی مانگ صرف ۷۱ ہزار ٹن تھی جو بڑھ کر ۱۹۸۵-۸۲ء میں ۹ ملین ٹن ہو چکی تھی۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ساتویں منصوبے کے اختتام تک ملک میں کیمیاوی کھاد کی کل مانگ ۱۴ ملین ٹن تک پہنچ جائے گی اور کھاد کی پیداوار صرف ۹٫۲ ملین ٹن تک ہوگی اس طرح ملک میں کیمیاوی کھاد کی مانگ اور پیداوار میں تقریباً ۵ ملین ٹن کا فرق جاری رہیگا اور ملک کو درآمدی کھادوں پر انحصار کرنا پڑے گا۔ کھادوں کی یہ درآمدات ہمارے محدود وسائل پر بھاری بوجھ بنی ہوئی ہے۔ ملک میں کھاد کی درآمدات کی تفصیل مندرجہ ذیل جدول سے ظاہر ہے:-

سال	درآمدات (ملین ٹن)	درآمد شدہ کھاد کی قیمت (کروڑ روپے)
۱۹۵۱-۵۲	۰٫۰۵۲	۵٫۰
۱۹۶۱-۶۲	۰٫۹۹	۹۰٫۰
۱۹۸۱-۸۲	۲٫۰۴	۷۱۷

۱۹۸۴-۸۵	۳،۲۴۲	۱۴۳۵
۱۹۸۵-۸۶	۳،۳۱	۱۴۷۵
۱۹۸۹-۹۰	۶،۰ (تخمینہ)	۳۰۰۰ (تخمینہ)

پچھلے ۲۰ سالوں میں کھادوں کے استعمال میں نمایاں اضافہ ہوا ہے آج ہندوستان دُنیا کے اُن چار ملکوں میں شامل ہے جہاں کھادوں کا کل استعمال بہت زیادہ ہے۔ مستقبل میں کھادوں کے استعمال میں بہت زیادہ اضافہ کی اُمید ہے۔ ہمارے ملک میں کھادوں کی فی ہیکٹر کھپت دوسرے ملکوں کے مقابلے نسبتاً کم ہے۔ آزادی کے بعد کیمیاوی کھادوں کے فی ہیکٹر استعمال میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں کیمیاوی کھاد کی کھپت صرف ایک کلوگرام فی ہیکٹر تھی جو ۸۶-۱۹۸۵ء میں بڑھ کر ۵۲ کلوگرام فی ہیکٹر تک پہونچ گئی تھی۔ لیکن یہ فی ہیکٹر کھپت ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں بہت کم ہے — ۱۹۸۳ء میں نیوزی لینڈ میں فی ہیکٹر کھادوں کی کھپت ۸۹، کلوگرام، بلجیم میں ۵۷۴ کلوگرام، جاپان میں ۴۲۷ کلوگرام، جرمنی میں ۴۲۱ کلوگرام، کوریا میں ۴۱۱ کلوگرام، چین میں ۱۷۶ کلوگرام اور ہندوستان میں صرف ۴۴ کلوگرام فی ہیکٹر تھی۔ حکومت کی سطح پر کوششیں کی جارہی ہیں کہ ملک میں فی ہیکٹر کھادوں کے استعمال میں اضافہ ہو جس سے کہ زرعی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ممکن ہو سکے۔ کیمیاوی کھادوں کی قیمت اور اس کی تقسیم پر حکومت کا کنٹرول ہے تاکہ پورے ملک میں کسانوں کو کھاد آسانی سے حاصل ہو سکے۔ حکومت نے کیمیاوی کھادوں پر جو سبسڈی دی ہے اس کا فائدہ بھی کسانوں کو مل رہا ہے۔

ملک میں کسانوں کو کھاد واجب قیمت پر دلانے کے لیے حکومت نے رٹینشن قیمت سسٹم (Retention Price System) نافذ کیا ہے۔ اس سسٹم کے تحت حکومت کو کافی گرانٹس خرچ کرنی پڑتی ہے۔ ۸۱-۱۹۸۰ء میں یہ گرانٹس (Grants) ۲۵۰ کروڑ روپے تھی جو اس سال تقریباً ۲ ہزار کروڑ تک پہونچ گئی تھی۔ اس اسکیم سے کسانوں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا ہوا ہے۔ لیکن زیادہ بڑے کسان اٹھا رہے ہیں۔ جو اس لائق ہوتے ہیں کہ اپنے روپئے سے ہی کھاد خرید سکتے ہیں۔ ایسی کوششیں کی جانی چاہئیں کہ چھوٹے اور مارجنل کسانوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔ کھادوں کی صحیح تقسیم کے لئے پیور باراری اور دوسرہ امدوری پر قابو پایا جانا بھی بہت ضروری ہے۔ زرعی ترقی کو قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کیمیاوی کھاد کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے اور درآمدات پر انحصار کم کیا جائے۔

بقیہ فرض

انھیں کی کمپنی میں ان کی جگہ سنبھال لے، کم از کم آٹھ سو روپے تو ضرور مل جائیں گے لیکن اس میں انوار کا اپنا خواب بکھرتا نظر آیا اور اس نے گھر سے بغاوت کردی۔

"مجھے ابھی نوکری نہیں کرنی ہے۔ مجھے انجنیئر بننا ہے۔"

لیکن گھروالوں کی دلیل تھی۔ اتنے روپے آئیں گے کہاں سے۔ انجنیئر بننے کے لیے تو کافی روپیوں کی ضرورت ہوگی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جو روپیے ملے ہیں اسے ہم لوگوں نے لڑکیوں کی شادی کے لیے رکھا ہے۔ گھریلو اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے۔ اس کی فکر لگی ہوئی ہے۔

گھروالوں کا یہ فیصلہ سُن کر انوار نے اپنا سر پکڑ لیا اور فیصلہ کُن لہجہ میں کہا۔

"ٹھیک ہے، میں ٹیوشن کرکے پڑھ لونگا"

اور پھر والدین نے ہتھیار ڈال دیے۔

آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے گھر کی پریشانیاں بڑھنے لگیں۔ بڑے لڑکے کے انکار کے بعد لڑکیاں حالات کی چکی میں پسنے لگیں مگر انوار نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا اور اپنے آپ کو کبھی ایک اور کبھی دوسری دلیل سے مطمئن کرنے لگا۔

"یہ ذمہ داری میری نہیں ہے۔ والدین نے وقت کی آواز کو کیوں نہیں سُنا، لڑکیوں کی شادی کرنا ان کا فرض ہے میرا نہیں۔ میں خود کچھ بن جاؤں پھر سارا بوجھ سنبھال لوں گا۔"

اب انوار انجنیئر بن کر مشرق وسطیٰ پہنچ چکا ہے۔ سارا گھر خوش ہے۔ بہنیں بھی خوش ہیں۔ روپیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ مگر انوار کی اپنی زندگی کیا ہے؟ بہنوں کا مستقبل کیا ہے۔

شاید ابا اپنی کھوکھلی ہنسی میں احساس پشیمانی چھپائے جی رہے ہیں اور بہنوں کا مستقبل ان کی راتوں کی نیند چھینے ہوئے ہے۔

لڑکیاں خاموش ہیں کسے الزام دیں والدین کو یا اپنی قسمت کو۔

اب ہر چہرہ انوار کے لیے ایک کھلی کتاب بن گئی ہے وہ خیالوں کی دُنیا میں غرق کبھی اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا ہے، کبھی بہنوں کے چہروں کو پڑھتا ہے کہ گھڑی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اوہ ڈیوٹی کا وقت ہو گیا اور وہ کپڑے بدل کر اور فلیٹ کا دروازہ بند کرکے چپ چاپ کارخانے کی طرف بڑھنے لگا

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز٭

دلہن کی پیداوار میں ترقی

گزشتہ ڈھائی دہوں سے دلہن کی پیداوار جامد رہی۔ یہ امر بھی اتنا ہی تکلیف دہ ہے کہ عوام کے لیے پروٹین کے اس اہم وسیلے کی فی کس دستیابی برابر کم ہوتی جارہی ہے۔ یہ دوسرے پلان کی مدت میں ۵ء۶۸ گرام فی کس یومیہ سے گھٹ کر چھٹے پلان میں فی کس یومیہ ۵ء۶۸ گرام کے لگ بھگ رہ گئی۔ فی الوقت تو یہ ۴۰ گرام سے بھی کم ہے۔ یہ گراوٹ تشویش کی اصل وجہ ہے کیوں کہ بھارتی کونسل برائے طبی تحقیق کے بموجب جسمانی وزن کے ہر کیلو گرام کے لیے ایک گرام پروٹین کے خوراکی اصول کی تکمیل کے لیے یومیہ فی کس دستیابی لگ بھگ ۸۰ ـ ۵ء۷ گرام ہونی چاہیئے۔ اس خطرناک صورت حال کی وجوہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ دلہن کے ماہرین کے بموجب کاشتکاروں کی عدم دلچسپی ان فصلوں کی تباہی کا اصل سبب ہے۔ دالیں ناقص اراضی میں، مناسب آبپاشی، کھادوں اور پودوں کی محافظت کے بغیر اُگائی جاتی ہیں۔ آبپاشی کے سریع پھیلاؤ کے ساتھ اچھی اراضی کا زیادہ سے زیادہ استعمال گیہوں، دھان اور دیگر ترجیحی فصلیں اُگانے کے لیے کیا جارہا ہے، نتیجتاً دالوں کی کاشت زیادہ سے زیادہ معمولی اراضی کی طرف دھکیلی جارہی ہے۔ دلہن کی پیداوار میں آخر اس جمود کی وجہ کیا ہوسکتی ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دھان اور گندم کی فصلوں پر ہماری توجہ مقابلتاً زیادہ رہی ہے اور دلہن کی پیداوار پر وہ توجہ نہ دی جاسکی جس کی وہ حقدار تھی۔ یہ دیکھ کر حوصلہ بڑھتا ہے کہ پودوں کی افزائش کرنے والوں کی مساعی کے نتیجے میں کچھ ایسی کم مدتی اقسام کا ارتقاء ہوا ہے جن سے اس شکایت کو دور کرنے میں مدد ملی ہے۔ مونگ کی ایسی اقسام کا ارتقاء کیا گیا ہے جو بہ مشکل ۶۰، ۷۰ دنوں میں پک جاتی ہیں اور جس کی کاشت اتر پردیش، پنجاب، راجستھان، ہریانہ اور بہار کے نہری علاقوں میں ربیع کی کٹائی اور خریف کی بوائی کے بیچ ایک گرمائی فصل کے طور پر بیش از بیش کی جارہی ہے۔ روایتی ارہر لگ بھگ دس ماہ تک کھیت میں کھڑی رہتی تھی۔ لیکن اس کی نئی قسمیں پانچ مہینوں میں پک کر تیار ہوجاتی ہیں۔ جس سے گیہوں کے ساتھ ان کی دو فصلیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ روایتی اقسام کے مقابلے میں، جن کی فی ہیکٹر فقط آٹھ کوئنٹل پیداوار ہوتی تھی، ارہر کی نئی اقسام فی ہیکٹر تیس کوئنٹل سے بھی زیادہ پیداوار دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اگر نئی اقسام کے امکانات کو پوری طرح کام میں لایا جائے تو دلہن کی پیداوار بڑھائی جاسکتی ہے، یہ کام تبھی ممکن ہوسکتا ہے جب اُن علاقوں کے کسانوں میں جہاں آبپاشی کی سہولیات میسر ہیں، ان نئی اقسام کو متعارف کرایا جائے، نیز انھیں فروغ دیا جائے۔ مزید یہ کہ ان کسانوں کو خاص طور پر فاسفیٹی کھادوں جیسی ضروری لاگتی اشیاء نیز مشینوں کی موزوں محافظت بہم پہونچائی جائیں۔ چونکہ دالوں کی فصلوں کے لیے آبپاشی کی ضرورت کم ہوتی ہے۔ لہٰذا فصل کی پیداوار کے اہم مراحل پر ایک یا دو بار محافظتی آبپاشی سے پیداوار میں نمایاں فرق پڑ جاتا ہے، ان فصلوں کو زیادہ نائٹروجن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ فاسفورس کی تھوڑی سی ملاوٹ کرنا بہتر رہتا ہے۔ ریزوبیم نامی ایک خاص قسم کے نباتی جراثیم کے ساتھ بیجوں میں ایک خاص کیمیائی اجزاء کی ملاوٹ سے پودے اس قابل ہوجاتے

٭ شعبہ نباتیات، ذاکر حسین کالج، اجمیری گیٹ، دہلی۔

ہیں کہ وہ فضائی نائٹروجن کا اسی طرح تعین کریں جو نہ صرف خود اُن کی ضروریات کے لیے کافی ہوتا ہے بلکہ زمین کو بھی زرخیز بناتا ہے۔ یہ رحبزو بیم کلچر اب بازار میں آسانی سے دستیاب ہے اور کسانوں میں مقبول ہوتا جا رہا ہے۔

کسانوں میں نئی اقسام کو مقبول بنانے کے لیے اوّلین شرط یہ ہے کہ ان کے بیج کافی مقدار میں نیز بروقت دستیاب ہوں۔ پہلی بات یہ کہ بیجوں کی تخلیق کو ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ چنے اور ارہر کی ترقی یافتہ قسمیں جو فی ایکڑ ۲۵۰۰-۳۰۰۰ کیلوگرام پیداوار دیتی ہیں۔ نیز فی ایکڑ ۲۰۰۰-۲۵۰۰ کیلوگرام پیداوار دینے والی مٹر کی قسموں کی نشوونما کی گئی ہے نیز لیبارٹریوں اور کھیتوں میں اُن کی جانچ کی جا چکی ہے۔ اگر ان اقسام کی کاشت دال اُگانے والے موجودہ روایتی خطّوں میں سبھی کی جا سکے تو بھی ۱۹ ملین ٹن کی بیش از بیش تخلیقی سطح آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس معاملے میں خاص رُکاوٹ کافی مقدار میں بیجوں کا مل پانا ہے اور دلہن کی پیداوار میں بڑھوتری کے لیے اس مشکل پر قابو پانا ضروری ہے۔

قیمتوں میں استحکام کے لیے ایک زیادہ کارگر نظام کی بھی ضرورت ہے۔ یہ دُرست ہے کہ سرکار دالوں کی کچھ اقسام کے لیے امدادی قیمتوں کا اعلان کرتی ہے، مگر یہ قریب قریب ہمیشہ ہی تیار فصل کی تقابلی قیمت سے بہت کم ہوتی ہے امدادی قیمت جس کا مقصد مجموعی آمدنی میں قدرے استحکام لانا ہوتا ہے، کچھ اس طرح مقرر کی جانی چاہئے کہ اُس سے بازار کے رُجحانات کی عکاسی ہو۔ اگرچہ دالوں کی خوردہ قیمتیں تیزی سے بڑھی ہیں تاہم اس سے کاشتکاروں کے پلے کچھ نہیں پڑا۔ ایک ایسے عمل کی ضرورت ہے جس سے دالوں کی فروخت خوردہ منڈی میں کی جا سکے۔ چونکہ قریب قریب سبھی کسانوں کے پاس انھیں اسٹور کرنے نیز کیمیائی عمل سے انھیں تیار کرنے کی ضروری سہولیات کا فقدان ہے لہٰذا انھیں مجبوراً ان کو اُن داموں پر فروخت کرنا پڑتا ہے جو اس کے لیے متعین کر دی جاتی ہیں۔ سرکاری ایجنسیوں کے ذریعے خرید سے کسان ایسی مجبوری کی حالت میں فروخت سے بچ جائیں گے۔

ایک بہتر امدادی قیمت والے نظام کے ساتھ ساتھ زیادہ پیداوار دینے والی کم مدتی اقسام کی دستیابی، نیم آبپاشی کی صورت میں بھی کسانوں کو دلہن کی کاشت پر یقیناً آمادہ کرے گی نیز زیادہ فائدہ بخش فصلیں کاشت کرنے کے ساتھ ساتھ دلہن کی کاشت پر بھی توجہ مبذول کرا سکے گی۔

دلہن کی کاشت کو ناقص، معمولی اور آبپاشی کی سہولت سے محروم آراضیات تک محدود نہیں کرنا چاہیے۔ دالوں کے لیے نئے نئے خطّے اور رقبے شناخت اور تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ مونگ پھلی، کپاس یا نیشکر کے ساتھ ارہر، گیہوں، مکّی یا جَو کے ساتھ اُڑد اور مکّی یا جوار کے ساتھ مونگ جیسے ملی جلی کھیتی کے نئے طریقوں کی ہمت افزائی کی جانی چاہیے۔

میکسیکو نوع کی گندم اور ہرے انقلاب جیسی عظیم کامیابیوں کی اصطلاح میں ہمارا سوچنا ستم کرنا مراد ہوگا۔ بیش از بیش بدیہی حکمتِ عملی یہ ہوگی کہ مختلف محاذوں پر کام شروع کیا جائے کیوں کہ یہ مسئلہ بہت سے پہلو دار اور دائمی ہے۔ ●

بقیہ، انڈین فارمنگ فرٹیلائزرس کوآپریٹو کا عملی پروگرام

علاوہ غریب دیہاتی خواتین کو سلائی مشینیں بھی دی جاتی ہیں تاکہ وہ فالتو اوقات میں اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکیں، بلکہ کئی دیہات میں تو کیمیائی کھاد صحیح استعمال کرنے کا مظاہرہ بھی کیا جاتا ہے اور جہاں زراعت کا سلسلہ کمزور ہے وہاں کے ہر کسان کو نصف ایکڑ پر دو سو روپے بطور مالی امداد بھی دیے جاتے ہیں۔ اور اب تو انکو نے کسانوں کے لیے کمیونٹی سنٹر کھولنے کا منصوبہ بھی بنایا ہے۔ اب حکومت نے انکو کو اڑھائی ہزار کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ تاکہ ترقیاتی سرگرمیاں تیز کی جا سکیں اور دیہی عوام کو جدید ترین زرعی ٹیکنالوجی کی معلومات مہیا کی جا سکیں، طبّی سہولیات اور مویشیوں کی بیماری کی روک تھام کی خدمات فراہم کی جا سکیں اور تعلیم بالغان کے پروگرام کو فروغ دیا جا سکے۔

علاوہ ازیں انکو کی طرف سے کسانوں کے باہمی یک جہتی پروگرام پر بھی زور دیا جاتا ہے تاکہ کسان اپنے ملک کے ایک خطّے سے دوسرے خطّے میں جا کر اپنے دوسرے کسان بھائیوں کے یہاں اپنائے جانے والے ترقی پذیر زرعی اقدامات سے روشناس ہو سکیں، وہاں کے تمدنی ورثے سے متعارف ہوں اور ملک کے دیگر حصّوں میں رہنے والے کسانوں کی سماجی رسوم اور طرزِ حیات کو سمجھنے کی کوشش کر سکیں اور اپنے یہاں کے زرعی ترقیاتی اقدامات، سماجی رسوم اور تہذیبی اور تمدنی زندگی سے اپنے دوسرے کسان بھائیوں کو روشناس کرا سکیں۔

ایسے پروگرام سے جہاں کسان ایک دوسرے کو انفرادی اور سماجی طور پر سمجھنے کی کوشش کریں گے، وہاں صحیح معنی میں قومی یک جہتی کا جذبہ بیدار ہوگا۔ اور قوم سماجی طور پر زیادہ بیدار مغز ہوگی۔ اور ثقافتی طور پر مستحکم۔ ●

پریم پال اشک*

انڈین فارمنگ فرٹیلائزرس کوآپریٹیو کا عملی پروگرام



جیسے غریب اور مفلوک الحال بچوں کی پرورش اور نگہداشت کے لیے آجکل کئی فعال ادارے اور خوش حال گھرانوں کے افراد انھیں گود لے لیتے ہیں اور اُن کی تعلیم و تربیت کے انتظام کی پوری ذمے داری اپنے کندھوں پر لے کر اُس غریب اور بدقسمت بچوں کی تقدیر بدل کر انھیں باعزت اور مہذب شہری بناتے ہیں ٹھیک اُسی طرح ہندوستانی کسانوں اور کیمیائی کھاد کے کوآپریٹو ادارے اِفکو (IFFCO) نے اوڈیشہ میں کالاکورائے (KALLAKOFAI) نامی ایک گاؤں کو ہر اعتبار سے ترقی یافتہ اور خود کفیل بنانے کے لیے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا ہے۔ یہ کیمیائی کھاد کی ملک گیر صنعت میں وسیع ترین عملی پروگراموں میں سے ایک ہے۔

اِفکو نے اب تک تقریباً ساڑھے چھ سو دیہات کو مثالی گاؤں کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے امداد فراہم کی ہے۔ تاکہ وہ زرعی میدان میں جدید ترین اقدامات کر سکیں۔ اور کم سے کم قابلِ قبول زندگی گزارنے کے لیے ان دیہات کے افراد کو موزوں تعلیمی، طبی اور دیگر سماجی سہولیات فراہم کی جا سکیں، دیہات کی قبولیت کا پروگرام ۱۹۷۲ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اور اب تک ایک ہزار سے زائد دیہات کو قبولیت کا شرف حاصل ہو چکا ہے اور انھیں زرعی، طبی، تعلیمی اور دیگر سماجی سہولیات کی فراہمی کے سلسلے میں، امداد بہم پہنچائی جا چکی ہے۔

حال ہی میں اِفکو کے کنبے میں جس نئے گاؤں کا اضافہ ہوا ہے، اُس کا نام کالاکورائے ہے، یہ ۴۰۰ برس پُرانا گاؤں اوڈیشہ ہے۔ ۱۲ کلو میٹر کے فاصلے پر نیل گری کی سرسبز وادی میں واقع ہے۔ یہاں ۱۲۰ کنبے آباد ہیں اور اُن کے ۷۰ فیصد افراد بڈاگا نامی پسماندہ قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ غربت کی سطح سے بھی کافی نیچے ہیں۔ ان کی قابل کاشت زمین انتہائی مختصر یعنی ایک ہیکٹیر سے بھی کم ہے۔

لیکن یہ امر باعثِ توجہ ہے کہ معاشی پریشانی کے باوجود وہ لوگ نہایت صاف ستھرے ماحول میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ایک کمرے میں رہتے ہیں مگر اُن کے گھر پختہ ہیں۔ انھیں علم کی اہمیت اور افادیت کا بھی احساس ہو گیا ہے اسی لیے انھوں نے اپنے گاؤں میں ایک اسکول بھی کھول لیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے تقریباً ۴۰ سال قبل ایک ٹینک تعمیر کرا کے نل کا پانی حاصل کرنے کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ لیکن اب بڑھتی ہوئی آبادی کے پیشِ نظر پانی کا ایک ٹینک ناکافی نظر آتا ہے۔

دراصل اِفکو کی طرف سے اس گاؤں کی قبولیت کی خاص وجہ وہاں کے عوام کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانا اور کیمیائی کھاد کے سائنٹفک استعمال سے اُن کے چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں خوشحالی کی بارش کرنا اور وہاں کے کسانوں کو آلو، گاجر، لہسن اور دیگر سبزیوں کی زیادہ سے زیادہ پیداوار کے لیے موزوں کیمیائی کھاد کے صحیح استعمال کا طریقہ بتانا اور زراعت کے جدید ترین طریقے اپنانے کی تحریک دینا ہے تاکہ وہ عمدہ بیج، بہتر زرعی آلات کے استعمال اور پودوں کے تحفظ کے موزوں اقدامات کے ذریعہ اپنی پیداوار بڑھا سکیں۔ جن دیہات کو قبولا جاتا ہے وہاں کے کسانوں کو مزدوری، زرعی مشینری، کیمیائی کھاد اور دیگر زرعی اشیاء فراہم کی جاتی ہیں۔ اس کے

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

* ایم ۶۳، بنگلہ صاحب روڈ، نئی دہلی۔

موتی لال ساقی

زعفران اور اس کی کاشت

زعفران زمانۂ قدیم سے استعمال میں لایا جاتا رہا ہے۔ کشمیر میں اس کا استعمال ہندو لوگ ٹیکا بنانے اور پوجا کے لیے زمانہ قدیم سے کرتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ زعفران سے خاص قسم کا مرہم اور دوائی بھی تیار کی جاتی تھی۔ چٹنیاں تیار کرنے میں زعفران خوشبودار مسالے کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔ چائے کے رسیا کشمیری قہوے کو خوشبودار بنانے کے لیے زعفران کا استعمال کرتے ہیں۔ مرغوب اور قیمتی شے ہونے کے ناطے زعفران کا لفظ مختلف جہتوں میں ہمارے لوک ادب میں بار بار آرہا ہے۔

ہم نے تمھارے لیے زعفران کی خاص
ترکاری تیار کی ہے محنت سے اس
ترکاری کو سبھی لوگ قبول کیجئے۔

ایک خاص قسم کا پلاؤ تیار کرنے میں بھی زعفران کا استعمال ہوتا ہے۔ اس پلاؤ کو زعفران پلاؤ کہا جاتا ہے۔ کشمیر کے علاوہ زعفرانی پلاؤ ایران اور اسپین میں بھی کافی مقبول ہے۔ مغربی دنیا میں جنوبی امریکہ کے علاوہ اسپین میں بھی زعفران کی کاشت ہوتی ہے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ زعفران کا اصلی وطن اناطولیہ کو چک ہے جہاں اس کی کاشت کور گور زمین میں ہوتی تھی اور وہیں سے اس کی گٹھلیاں مشرق اور مغرب کے ممالک میں پہنچ گئیں (یہ بات قابل ذکر ہے کہ زعفران کے پھول سے کسی قسم کا بیج نہیں نکلتا۔ البتہ زمین میں لگائی گئی گٹھلیوں کی تعداد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے)۔

اگرچہ کچھ لوگوں نے کشمیر کو زعفران کا آبائی وطن مانا ہے مگر بودھ ارہٹ مدھیانتک کے حوالے سے جو بات زعفران کی کاشت کے بارے میں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ زعفران کی گٹھلی کشمیر میں باہر سے لائی گئی تھی۔ اگرچہ یہ کام آج سے دو ڈھائی ہزار سال پہلے انجام دیا گیا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں وادی کے علاوہ زعفران کی کاشت کشتواڑ میں بھی ہوتی ہے وہاں پر جو زعفران پیدا ہوتا ہے۔ رنگ کے اعتبار سے وہ زیادہ شوخ ہے مگر اس کی خوشبو کشمیری زعفران کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

زعفران کا مخملی رنگ پھول کیسو سے ملتا جلتا ہے۔ جب زعفران زار کھل اٹھتا ہے اس وقت ہر طرف خوشبو کی لہریں دوڑ جاتی ہیں۔ اور کیف و سرور کا سماں بندھ جاتا ہے۔ حالانکہ زعفران کی اس خوشبو کا اثر ان لوگوں پر نہیں ہوتا ہے جو زعفران چننے کے عادی ہوتے ہیں مگر یہ بات ہر ایک کے لیے صحیح ثابت نہیں ہو سکتی۔ جہانگیر نے یہاں تک لکھا ہے کہ "جب اہل کاروں سمیت زعفران زار کا نظارہ دیکھنے کے لیے گئے تو سبھی لوگ سر درد کا شکار ہو کر رہ گئے۔" زعفران چننے کا عمل بھی خاصا دلچسپ اور صبر آزما ہے۔ چننے کے بعد پھولوں کو دھوپ میں سکھایا جاتا ہے۔ دوسرے مرحلے پر پھول کے بیچ میں موجودہ ڈنڈیوں کو چن لیا جاتا ہے۔ یہ ڈنڈیاں کیسری رنگ کی ہوتی ہیں مگر اس کا کچھ حصہ سفید ہوتا ہے۔ زعفران کی ان ڈنڈیوں کو کشمیری میں "تھیج" کہا جاتا ہے۔ ڈنڈیوں کا سرخ حصہ شاہی زعفران کہلاتا ہے۔ اس کا سفید حصہ بھی زعفران ہی ہوتا ہے۔ مگر شاہی زعفران سے کمتر درجے کا۔ شاہی زعفران کا شمار اعلیٰ درجے میں ہوتا ہے جبکہ سفید حصے والا دوسرے درجے کا زعفران ہوتا ہے۔ ڈنڈیاں الگ کرنے کے بعد پھولوں کو پھر دھوپ میں سکھایا جاتا ہے۔ پھر ان پھولوں کو چھڑی سے ہلکے ہلکے کوٹا جاتا ہے۔ اس عمل کے بعد پھولوں کو پانی میں ڈالا جاتا ہے۔ پھول پانی پر تیرتے رہتے ہیں اور بچا کھچا زعفران جس میں زرگل بھی شامل ہوتا ہے تہ میں جمع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پانی کو نتھار کر تہہ میں جمع زعفران کو سکھایا جاتا ہے۔ یہ طریقہ تین بار دہرایا جاتا ہے۔ شاہی زعفران کو کشمیری میں "مہنگر" اور دوسرے درجے کے زعفران کو "پٹ" کہتے ہیں۔ زعفران کی کیاریوں سے جو پیداوار حاصل ہوتی ہے اس کے بارے میں جانکاری دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ زعفران کاشت کرنے والوں کی زبان میں ۵۰ کیاریوں پر محیط رقبے کو پیٹھ کہتے ہیں۔ اس ایک پیٹھ سے پہلے سال میں ڈھائی سیر پھول حاصل ہوتے ہیں۔ دوسرے سال یہ پیداوار ساڑھے چار سیر اور تیسرے سال ۹ سیر تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر کیاریوں کی نگہداشت اچھی طرح نہ کی جائے اور چوہوں کا سدِ باب نہ ہو تو پیداوار کافی گھٹ جاتی ہے۔ سال میں زمین کی چار بار گڑائی کرنا ضروری ہے۔ زمین میں نمی کا قائم رہنا اچھی فصل نہ ہونے کی ضمانت ہے۔ اگر اپریل اور مئی کے دوران بارشیں اچھی ہوں تو زعفران کی بھرپور کھیتی کی امید کی جا سکتی ہے۔ ورنہ اس میں کمی ہونے کا احتمال رہتا ہے۔ ابھی تک زعفران بیماریوں سے بچا رہا ہے مستقبل کیا گل کھلائے گا معلوم نہیں۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ شہد کے جو چھتے زعفران کے کھیتوں کے آس پاس لگے ہوتے ہیں ان کا شہد کافی لذیذ اور خوشبودار ہوتا ہے۔ زعفران کی دھرتی کشمیر رنگوں اور نظاروں کی سرزمین ہے۔ اس سرزمین کو کبھی سارد اپیٹھ تو کبھی ایران صغیر اور کبھی زعفران کی نسبت سے کیسر کی دھرتی کا نام دیا گیا ہے۔

زعفران کے جو کھیت آج ہمارے کسانوں کے لیے خوشحالی اور فارغ البالی کے ضامن ہیں۔ البتہ شاہمیری سلاطین کے زمانے میں پھول

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

یوجنا، نئی دہلی

عظیم الرحمٰن عظیم

قدرتی معیشت اور ماحولیات

ہندوستان صدیوں سے قدرتی دولت سے مالا مال ہے۔ عہد ساز جنت نشاں دھرتی رہا ہے۔ رِشیوں، مُنیوں اور سادھو، صوفی سنتوں نے اس دیش کو خدا کی پاک سرزمین کا نام دیا۔ یہاں قدرت کی فیاضی عام رہی، دھرتی ہری بھری، کھیت کھلیان، سرسبز اور شاداب، یہاں کے لوگ اپنی گنگا جمنی تہذیب اور رواداری کی روایات کے دامن میں پلے بڑھے، جنگلی جانوروں نے بھی اس دھرتی کے تقدس کو بنائے رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ رامائن اور مہابھارت کی کہانیوں کے اوراق اُلٹیے۔ کئی صفحات اس کی شہادت دیں گے، مور، شیر ببر، ہاتھی، گھوڑے بھارت کے لینے والوں کے لیے ہمیشہ سکون، راحت اور ترقی نیز بہادری کی علامت رہے ہیں۔

ہندوستان کے جنگلات اور جنگلوں میں اُگنے والی سبھی نباتات سے عام جنتا نے ہمیشہ فائدہ حاصل کیا ہے۔ یونانی، آیورویدک اور انگریزی ادویات میں ان نباتات کا استعمال اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ انسان اپنے دُکھ درد سے راحت پانے کے لیے جڑی بوٹیوں کا ممنونِ احسان رہا ہے۔

جنگل جہاں موسموں کے توازن کو برقرار رکھتے ہیں، وہیں ان جنگلوں میں پرورش پانے والے جنگلی جانور بھی انسانیت کی بقا اور صحت کے لیے انمول دولت رہے ہیں جنگلوں میں شیر، چیتا، ہرن اور کئی خطرناک جنگلی جانور صدیوں سے اپنی زندگی بسر کرتے آ رہے ہیں۔ یہ جانور ہم انسانوں اور آج کی سائنسی تجربات کے بعد کی مشینی زندگی میں بھی ہم انسانوں کے لیے مفید اور فائدہ بخش رہے ہیں اور ان کے تحفظ نیز پرورش کی ذمہ داری کو قومی فریضہ کے طور پر حکومتِ ہند اور تمام ریاستی حکومتوں نے تسلیم کیا ہے۔ شیر کو ہندوستان کا قومی جانور قرار دیا گیا ہے اور اس کے شکار پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اس طرح مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے جنگلوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ جنگلی جانوروں کے تحفظ پر زور دیا ہے۔ جنگلی جانوروں سے کھیتوں اور انسانی زندگی کے چند در چند نقصانات کو اگر ہم فراموش نہ کر سکیں تو ان کے بارے میں غور و فکر سے کام لے سکتے ہیں۔ ذرا سی عقل و دانش کو کام میں لایا جائے تو یہ عقدہ کھُلے گا کہ کوئی بھی جاندار کسی دوسرے جاندار پر بلا وجہ حملہ آور کبھی نہیں ہوتا اگر ہم اُن کی نفسیات کو سمجھیں اور انھیں نہ چھیڑیں تو وہ بھی ہمیں نہ چھیڑیں، قانونِ قدرت یہی ہے کہ جیئو اور جینے دو۔

جب شکاری جنگلوں میں شیر، چیتا اور ہرن کا شکار کرتے ہیں تو یہ جانور بھی اپنا بدلہ لینے کی خاطر ان پر حملہ کرتے ہیں۔ اس طرح یہ بات تسلیم کر لینا چاہیئے کہ جنگلوں میں جس جگہ جو جانور رہتے ہیں انھیں اپنی نسل کو بڑھانے کے پورے مواقع مُہیا ہوں، ہمارا ملک ہندوستان جنگلوں پہاڑوں اور دریاؤں کا وہ عظیم ملک ہے جہاں قدرت کی عنائتیں اور فطرت کا حُسن سب کے لیے عام ہے اگر ہم جنگلوں سے جانور ختم کر دئے جائیں گے تو جنگل ویران ہو جائیں گے، اگر ندیاں سے پانی خالی کیا جائے تو وہ خشک ہو جائیں گے، اگر پہاڑوں پر دست اندازی کی جائے تو ان کی افادیت اور طوفان سے بچاؤ کے اسباب ختم ہو جائیں گے۔ موسموں میں کوئی اعتدال اور

۵ مکان نمبر ۵۸۵-۳-۲۳، سلطان شاہی، حیدر آباد، ۵۰۰۲۶۵۔

توازن نہ رہے گا۔

جنگلی جانوروں کی قدرتی ماحول میں پرورش اور اُن کی نسل کی تربیت کے لیے مرکزی اور علاقائی حکومتوں نے طویل مدتی پروگراموں کو منصوبہ بند طریقے پر عملی جامہ پہنانے کے مؤثر اقدامات کئے ہیں۔ انسانی ضروریات میں جنگلوں، ہرے بھرے سبزہ زاروں اور پیڑ پودوں کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے، ان کے ساتھ جنگلی جانوروں اور پرندوں کے کردار کو بھی نمایاں دخل رہا ہے۔ ان میں کسی ایک حصے کو اگر ہم نظر انداز کر دیں تو ماحول پر اُس کے مُضر اور بُرے اثرات کا رونما ہونا لازمی ہے۔ حکومت ہمارے ماحول کے تحفظ کو وقت کی پُکار اور مُلک کی اہم ضرورت تصور کرتے ہوئے قومی پنجسالہ منصوبوں میں ماحولیات سے متعلق اُمور کا مکمل جائزہ لینے اور منصوبہ سازی نیز ترقیاتی عمل میں ماحولیات کے وسائل کو بھی شامل کیا ہے۔

ماحولیات کے محکمہ سے وابستہ کئی اہم مرکزی اور علاقائی تنظیموں اور اداروں کے ذریعہ جنگلی جانوروں، قومی پرندوں اور جنگلات کے تحفظ کے بارے میں کئی پروگراموں کو رُوبہ عمل لایا جا رہا ہے۔ پیڑ پودوں کے کاٹے جانے اور جنگلات کو ختم کرنے کے رُجحان کو سختی سے روکنے کے بارے میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے بہتر قوانین وضع کئے ہیں تاکہ ان کے تحفظ کا بہتر انتظام ہو سکے اور تیزی سے بڑھنے والے پیڑ پودے لگا کر اور زیادہ پیداوار دینے والے پودوں کی کاشت کر کے جنگلات کی پیداوار میں اضافہ کو ممکن بنایا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ماحول کے بارے میں عوامی بیداری پیدا کرنے کی غرض سے کئی اقدامات کئے گئے ہیں۔ ریاستوں کے محکمہ ہائے جنگلات نے اپنے پروگراموں کے ذریعہ مختلف مقامات پر جلسوں، سیمیناروں اور درخت اُگاؤ مہم، جنگلی جانوروں کو بچاؤ مُہم جیسے پروگراموں کو اس قدر مؤثر انداز میں شروع کر رکھا ہے جس سے عوام میں ماحول کے تحفّظ کا احساس اپنے اچھے اثرات دکھا رہا ہے۔

بھارت میں تقریبًا ساڑھے سات کروڑ ہیکٹیر زمین میں جنگلات پھیلے ہوئے ہیں، تاہم ملک میں جنگلاتی علاقہ کا رقبہ کم از کم ۱۱ گیارہ کروڑ ہیکٹیر ہونا چاہیئے۔ زمین پر موجودہ دباؤ کا یہ نتیجہ ہے کہ زمین کا اندھا دُھند استعمال ہو رہا ہے۔ کارخانوں کا تیزی سے قیام اور ان سے نکلنے والا دُھواں اور ان کارخانوں سے نکلنے والا زہریلا پانی پیداواری خطّوں کو متاثر کر رہا ہے جس کے سبب جنگلات کی موجودہ حدُود کے باہر شجر کاری یا درخت اُگاؤ مہم پوری طرح کارآمد ثابت نہیں ہو رہی ہے۔ ریاستوں اور حکومتوں نے اپنے اپنے وسائل و اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے سڑکوں اور ریلوے لائنوں سے متصل نیز نہروں کے کناروں پر پیڑ پودے لگانے کی اسکیم کا آغاز کیا۔ اس طرح پیڑ پودے لگانے سے جنگلاتی رقبہ میں ۱۰ لاکھ ہیکٹیر کا اضافہ ہو جائے گا۔ یہی نہیں اجتماعی ملکیت والی بیکار پڑی ہوئی زمین پر بھی شجر کاری کی کافی گنجائش موجود ہے۔ یہ بیکار زمین فی الحال جانوروں کی چراگاہ کا کام دیتی ہے۔ ایسی زمین پر مُفید اور کام آنے والے درخت لگائے جائیں تو جانوروں کے لیے چارے کی پیداوار فراہم ہو سکتی ہے۔

مرکزی اور علاقائی حکومتوں کی طرف سے ہر سال سیمیناروں، جلسوں اور نمائشوں، مختلف زبانوں میں کتابچوں کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ بنی نوع انسان کا مستقبل غیر معمولی طور پر ماحول کے تحفّظ سے مربوط ہے۔ جنگل نہ کاٹے جائیں، جنگلی جانوروں، پرندوں، درندوں اور مویشیوں کی بہتر نگہداشت کی جائے۔ اگر جنگل کاٹے جائیں تو طغیانیوں اور سیلابوں کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ جنگلی درخت اور پیڑ پودے پانی کی تیز رفتار تباہی سے پھیلنے والے خطرات کو روکنے میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں، جب جنگل ہی نہ رہیں اور پیڑ پودے بھی نہ رہیں تو سیلاب کا پانی نہ صرف آبادیوں بلکہ ہرے بھرے کھیتوں کو بھی بہا لے جاتا ہے اور بڑے پیمانے پر تباہی کا منظر بنی نوع انسان کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ اس لیے انسان کے عام فائدے کے لیے جنگلات کے تحفّظ کو اہمیت دی گئی ہے۔ شہری علاقوں میں فضائی آلودگی اور کثافت پھیلانے والی صنعتوں کا جائزہ لینے کے بعد ان کی آبی کثافت کو کم کرنے کے لیے مختلف تدابیر ملک گیر پیمانے پر شروع کی گئی ہیں۔ شہروں میں پٹرول سے چلنے والی موٹر گاڑیوں اور لوہے کے کارخانوں اور دیگر صنعتی اداروں سے نکلنے والے دھوئیں اور گرد و غبار سے ماحولیاتی نظام میں جن خرابیوں کا پیدا ہونا لازمی ہو جاتا ہے انھیں دُور کرنے کے لیے درختوں، پیڑ پودوں اور جنگلات کے تحفّظ کا احساس ضروری ہو جاتا ہے۔ اس پس منظر میں قومی سطح پر ایک ایسی قومی پالیسی تشکیل دی گئی ہے جس کی سفارشات میں سے ایک سفارش یہ ہے کہ جنگلات وغیرہ کے شعبہ میں دیہاتوں میں رہنے والوں اور قبائلی عوام کے لیے روزگار کے زیادہ بہتر مواقع پیدا کئے جائیں تاکہ وہ لوگ اپنے آس پاس کے ماحول میں خلل ڈالے بغیر قدرتی ماحول میں گذر بسر کر سکیں۔

ہماری سابق وزیرِاعظم محترمہ اندرا گاندھی نے اپنے مقبولِ عوام نئے بیس نکاتی پروگرام میں درخت اُگاؤ مُہم کو شامل کر کے ماحول کے تحفّظ کو

اہمیت دی گئی۔ ملک کے نئے منصوبہ کے اہم خدوخال میں وسیع اراضی پر پودے لگانے کا منصوبہ بھی شامل ہے۔ ۸۴-۱۹۸۳ء میں ڈیڑھ ارب ۲۰ کروڑ پودے لگائے گئے اور ۸۷-۱۹۸۶ء میں ڈیڑھ ارب پچاس کروڑ پودے لگائے گئے۔ ملک کے ۱۵۷ اضلاع پر جہاں جلانے والی لکڑی کی سخت قلت ہے، خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ ان اضلاع میں ایک خاص اسکیم کو عمل جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ یہی نہیں ہمالیائی خطے کے خصوصی مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے زمین کے کٹاؤ کا مسئلہ بھی حل کیا جا رہا ہے۔ گنگا کی صفائی اور ملک کے تمام بڑی ندیوں کی صفائی کے نام پر مرکزی حکومت نے ایک مفید اور اہم اسکیم کا آغاز کیا ہے۔ جس کی شروعات وزیراعظم مسٹر راجیو گاندھی کے ہاتھوں ہوئی۔ گنگا کی صفائی سے منسوب اس اسکیم کے تحت ملک کی مقدس اور قدیم ندیوں میں گندگی نہ ڈالنے اور انھیں فضلے سے پاک رکھنے کے بارے میں لوگوں کو احساس دلایا جا رہا ہے تاکہ ہماری یہ ندیاں گندی نالیوں کی صورت اختیار نہ کر جائیں، پھر آلودگی آمیز پانی سے متعدد بیماریوں کے پھیلنے کا اندیشہ بھی ختم ہو۔ جنگلات کے وسیع ذخیروں کو پاک اور محفوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ دریاؤں کے کٹاؤ اور کوڑا کرکٹ، غلاظت سے ان کے بچاؤ کی طرف مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے منصوبہ بند طریقوں پر اپنی توجہات کو مرکوز کر رکھا ہے تاکہ آلودگی کے انسداد کے بارے میں اقدامات کئے جائیں۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ ماحولیاتی تحفظ کے لیے دو باتیں اہم ہیں یعنی آلودگی کی روک تھام اور قدرتی ماحول کا بچاؤ۔ ہم ہندوستانی قدرتی وسائل توانائی سے سرفراز ہیں اور ہمارے پاس لکڑی، کوئلہ، تیل، بجلی، بائیو گیس، شمسی اور فضائی توانائی بھی عصری سائنسی ترقی کی بدولت حاصل ہے۔

ماحولیاتی آلودگی کی وجوہات اور آئے دن آلودگی میں اضافے کی جانب مسٹر ایس سی کمار نے ایک مقالہ میں وضاحت سے روشنی ڈالی ہے اور بتایا کہ فضائی آلودگی محض انسانوں کو ہی نقصان نہیں پہنچاتی جو کہ اس کے زہر میں دن رات سانس لیتے ہیں، اور کئی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حیوانات اور نباتات پر بھی اس آلودگی کے نمایاں اثرات دیکھے گئے۔ جب کوئی چیز جلائی جاتی ہے تو اس میں سے حرارت، دھواں، گیس اور بدمزہ فضولیات پیدا ہوتی ہیں جو کہ ہوا کو آلودہ کر دیتی ہیں۔ جن علاقوں میں دھند ملتی ہے، وہاں صنعتی کارخانوں اور گھریلو چمنیوں کا دھواں اور موٹر گاڑیوں سے خارج ہونے والی آلودگی صحت عامہ پر مضر اثرات کا سبب بنتی ہے۔ بڑھتی ہوئی صنعت کاری اور نیوکلیائی طاقت کے فروغ کی وجہ سے گرمی کے اخراج میں معتدبہ اضافہ کے زندگیوں پر مضر اثرات مرتب ہونے لگے ہیں۔

انسانی ترقی اور تہذیب کو دریاؤں نے ہمیشہ زندگی بخشی ہے لیکن انسان انہی دریاؤں کو غلیظ کر دیتا ہے، جو اس کی زندگی کا سہارا ہیں اور کھیتوں، باغوں کی سرسبزی اور شادابی کا ذریعہ بھی، دریاؤں کی آلودگی کا بیشتر حصہ شہری غلاظت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، جسے عام طور پر صحیح کیمیائی ڈھنگ سے ٹھکانے نہیں لگایا جاتا۔ عمومی طور پر ملک کی بڑی ندیوں کے بہاؤں کی جانب جانوروں کا نہلانا، کوڑے کرکٹ اور کارخانوں کی غلاظت بہایا جانا اور جانوروں اور انسانی لاشوں کا دریا میں ٹھکانے لگانا، دریاؤں کی آلودگی میں اضافے کا سبب ہیں اور اسی فیصد بیماریاں اس پانی کے استعمال سے پھیلتی ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی دیگر زہریلی ادویات اور دھاتیں بھی ہیں جو ماحول اور زندہ چیزوں میں آلودگی پیدا کرتی رہتی ہیں۔ شہروں میں شور کا ارتعاش بھی ماحول کو آلودہ کر دیتا ہے۔ شور سے انسانی صحت پر مضر اثرات پڑتے ہیں۔ موٹر گاڑیوں، مشینوں، کارخانوں کے سائرن کی آوازوں سے شور کے زیر اثر رہنے کے سبب بہرے پن کا مرض لاحق ہو سکتا ہے۔

بلاشبہ آلودگی کے باعث انسانی زندگی تباہ کن ہو گئی ہے اور پیڑ پودے اور حیوانات تیزی سے ختم ہوتے چلے جا رہے ہیں، ہرے بھرے باغات خزاں آلود ہو رہے ہیں، پانی کے ذخیرے آلودہ اور زہریلے اجزا سے پُر ہو رہے ہیں، نیلگوں آسمان زہریلی گیسوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ اگر آلودگی مسلسل بڑھتی رہی اور حیوانات، پیڑ پودے ختم ہوتے رہے تو انسان کا سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔ یہ کتنا غلط نہ ہوگا کہ آلودگی تنہا ایک انسان یا کسی ایک ملک کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک عالمی مسئلہ ہے اس لیے آلودگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے کرۂ ارض پر رہنے بسنے والے تمام شریف انسانوں کو مل جل کر کوشش کرنی چاہیئے۔

مختصر یہ کہ ماحول کا تحفظ ہر شہری کی قومی ذمہ داری قرار پاتی ہے۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی طرف سے ہر سال ماحولیات کے عالمی دن کے نام سے نباتات اور حیوانات کے تحفظ، جنگلات کی سرسبزی و شادابی اور شہری زندگی میں ماحول کی کثافت کے تدارک کے بارے میں توجہ دلائی جاتی ہے اور بنی نوع انسان کے فائدے کے بارے میں معلوماتی اور رنگا رنگ تقاریب، سیمیناروں اور نمائشوں نیز کتابچوں کے ذریعہ تشہیر کی جاتی ہے۔

ماحولیات اور آلودگی کی منصوبہ سازی سے متعلق قومی کمیٹی نے ایک مضبوط قومی پالیسی تشکیل دی ہے، جس کی سفارشات میں جنگلات کا تحفظ جنگلی جانوروں اور نباتات و حیوانات کے تحفظ اور افزائش کے ساتھ ساتھ فضائی اور آبی آلودگی کی روک تھام شامل ہے۔ ●

پون کمار گپتا

تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا خطرہ

بھارت میں ہر برس آسٹریلیا کے برابر آبادی کا اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ ناقابلِ یقین دکھائی دینے پر بھی حقیقت ہے۔ آبادی میں یہ خطرناک اضافہ حکومت کی جانب سے روک تھام کی کوششوں کے باوجود جاری ہے۔ آبادی کے اس دھماکے کی زیادہ تر وجوہات سماجی اور مذہبی ہیں۔ لہٰذا مصنف کے مطابق ہمارے پاس اس کا علاج ہے بہتر صحتی دیکھ بھال کا اہتمام، تعلیم نسواں اور عورتوں کے لیے زیادہ روزگار کے مواقع کی فراہمی اور مذہبی رہنماؤں کی خدمات سے استفادہ کرنا وغیرہ۔

آج دنیا بھر کے ماہرینِ امورِ آبادی اور مفکروں کو بڑھتی ہوئی انسانی آبادی پر گہری تشویش ہے۔ سرِ دست (۱۹۸۷ء میں) عالمی آبادی ۵ر ارب سے زیادہ ہے اور توقع ہے کہ وہ ۲۰۰۱ء میں ساڑھے ۱۰ ارب تک پہونچ جائیگی۔ ہر برس عالمی آبادی میں ۵ر۲ فیصد کا اضافہ ہوتا ہے اور اندیشہ ہے کہ اس صدی کے آخر تک یہ شرح تقریباً ۴ء۴ فیصد تک پہونچ جائے گی۔ اگر ہم بھارت کے ضمن میں اس مسئلہ پر غور کریں تو صورتِ حال اس سے بھی زیادہ بدتر اور مایوس کن دکھائی دیتی ہے۔

بھارت دنیا میں آبادی کے لحاظ سے دوسرا اور زمینی رقبے کے لحاظ سے پانچواں بڑا ملک ہے۔ بھارت کی آبادی اپریل ۱۹۸۶ء میں ۷۸ کروڑ ۵۰ لاکھ ریکارڈ کی گئی تھی اور توقع ہے کہ وہ ۲۰۰۱ء تک ایک ارب ۶۳ کروڑ تک پہونچ جائے گی (یہ اعداد پی ایس جی واشنگٹن کے صدر تھامس میرک نے فراہم کئے ہیں)، اس کے علاوہ ۲ر۴ فیصد زمینی رقبے کے ساتھ عالمی آبادی کا ۱۵ فیصد حصہ یہاں بود و باش رکھتا ہے۔ اور ہر برس آسٹریلیا کے برابر آبادی کا اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مزید برآں اگر جلد ہی ایک منٹ میں ۴۴ پیدائشوں کا موجودہ رجحان کافی حد تک کم نہ کیا گیا تو بھارت ۲۰۰۱ء تک چین سے بھی آگے نکل جائے گا اور اس کے علاوہ اُسے متعدد اقتصادی، سماجی، صحتی اور ماحولیاتی مسائل کا سامنا کرنا ہوگا جس کے نتیجے میں بھارت کی ترقی میں رکاوٹ پڑے گی اور وہ مسائل بدتر ہو جائیں گے۔

خاندانی بہبود ایک ایسا عمل ہے جس سے ایک جوڑا کامیابی کے ساتھ اپنے کنبے کو کامیابی سے محدود رکھ سکتا ہے اور اُس کی خوشی بڑھا سکتا ہے، اور اس طرح ملک کی ہمہ جہت ترقی کی رفتار تیز کرنے کے لیے قومی وسائل کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ دراصل خاندانی بہبود یا آبادی پر کنٹرول ایک ترقیاتی پروگرام تصور کیا جاتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے حکومت اس پروگرام کو عوامی تحریک بنانے کے لیے زیادہ اہمیت دے رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس پروگرام کو عوامی تحریک بنایا جا سکے تو اس سے زیادہ مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

کنبہ محدود کیوں؟

اقتصادی اسباب کے نتیجے میں ایک جوڑے کو اپنے کنبے کو محدود رکھنا یا پیدائشوں میں وقفہ بڑھانا ضروری ہے۔ اس سے ایک شخص کو اپنے کنبے کی بہتر دیکھ بھال کا موقع ملتا ہے۔ ضبطِ تولید کی ایک اور اہم وجہ یہ ہے کہ اس سے ماں اور بچے کی صحت کا تحفظ ہوتا ہے اور بچے کو بہتر تعلیم فراہم ہو سکتی ہے۔ آجکل اعلیٰ تر تعلیم پر بھاری خرچ آتا ہے۔ ایک چھوٹے کنبے میں ہر بچے کی تعلیم کا کسی مالی دباؤ کے بغیر اہتمام کیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا خاندانی بہبود نہ صرف ملک کی مدد کرنے کا ایک ایسا طریقہ ہے جس سے وہ تعداد محدود کرنے سے متعلق قومی مقصد کو پورا کر سکے بلکہ اس سے آبادی کے پھیلاؤ، عوامی افلاس اور بھکمری کو روکنے اور معیارِ زندگی کو بلند کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ بلاشبہ نئی اقسام کے بیجوں اور کاشتکاری کی نئی تکنیکوں سے خوراک کی سپلائی میں اضافہ ہوتا ہے لیکن پیداوار میں ہر اضافے پر اُسے نگلنے کے لیے بہت زیادہ مُنہ ظہور میں آجاتے ہیں۔ موزوں روزگار مہیا کرنے اور بے روزگاری کے مسئلے کا سامنا کرنے کے لیے ہر کنبے کو چھوٹا کرنے کی ضرورت ہے۔ ضبطِ تولید کنبہ کو محدود کرنے کا اہم طریقہ ہے۔

بھارت میں خاندانی بہبود کے پروگرام سے متعلق ایک ورکنگ گروپ کے مطالعہ سے انکشاف ہوا ہے کہ اس نے خواتین کا حمل کی صعوبتوں سے تحفظ کرنے اور پیدائشوں کو روکنے میں بتدریج مفید کردار ادا کیا ہے۔ محض اس پروگرام کی بدولت جوڑوں کے تحفظ کی شرح ۱۹۸۰ء میں ۲۲/۲ فیصد سے بڑھ کر مارچ ۱۹۸۵ء میں ۳۲ فیصد ہو گئی اور توقع ہے کہ وہ ساتویں منصوبے کے آخر تک ۴۲ فیصد تک پہونچ جائے گی۔ اس پروگرام کی بدولت ۱۹۸۰ء سے مارچ ۱۹۸۴ء تک تقریباً ۶ کروڑ ۹ لاکھ پیدائشوں کو روکا گیا (انڈیا ۱۹۸۵ء صفحہ ۱۳۴) اس طرح اس مؤثر پروگرام کے ذریعے پہلی بار (مانعِ حمل) گولیوں کا استعمال کرنے والی خواتین کی تعداد بھی ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۵۵ لاکھ سے بڑھ کر ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۹۳ لاکھ ہو گئی۔ (انڈیا ٹوڈے ۳۱ جولائی، ۱۹۸۵ صفحہ ۱۳۹)۔

شرحِ پیدائش میں کمی

بھارت میں خاندانی بہبود پروگرام (تب خاندانی منصوبہ بندی) نے درحقیقت ۶۷-۱۹۶۶ء میں زور پکڑا جب اسے فنڈوں میں بھاری اضافہ کے ساتھ میعاد اور نشانے کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ لیکن چوتھے اور پانچویں پانچسالہ منصوبوں کے عرصے کے دوران اس سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکے۔ چوتھے پانچسالہ منصوبے کا مقصد شرحِ پیدائش کو ۳۹ فی ہزار سے کم کر کے ۳۲ فی ہزار کرنا تھا۔ لیکن منصوبے کے عرصے کے آخر تک وہ صرف ۳۵ فی ہزار تک کم ہو سکی۔

ماضی میں اضافہ آبادی کے رُجحانات کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بھارت سردست آبادی کے دھماکے کے مرحلے میں ہے۔ حصولِ آزادی سے قبل بہت طویل عرصے تک آبادی کا بحران یقیناً قطعی طور پر سنگین تھا۔ لیکن ۲۱-۱۹۰۱ء کے عرصے کے دوران یہ تیزی سے نہیں بڑھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امر کا کوئی علم نہیں تھا کہ ۱۹۵۰ء کے برس سے قبل بھارت کی آبادی بڑی سست رفتار سے بڑھ رہی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں بھارت کی آبادی تقریباً ۲۴ کروڑ تھی جو ۱۹۴۷ء میں ۳۴ کروڑ ۷۰ لاکھ اور ۱۹۶۰ء میں ۳۶ کروڑ ہو گئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے ۵۰ برسوں میں آبادی میں صرف ۱۲ کروڑ تک کا اضافہ ہوا جبکہ آئندہ ۳۰ برسوں میں یعنی ۱۹۸۱ء تک اس میں ۳۲ کروڑ کا اضافہ ہوا یا وہ ۱۹۴۷ء کے مقابلے میں تقریباً دگنی ہو گئی چنانچہ مذکورہ بالا سے ظاہر ہے کہ ایک دہائی (۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۱ء تک) میں بھارت کی آبادی میں کوئی ۱۴ کروڑ کا اضافہ ہوا لیکن بعد کے ۳۵-۳۰ برسوں (۱۹۵۱ء سے ۸۵-۱۹۸۱ء تک) اس میں کوئی ۹۰ فیصد کا اضافہ ہوا۔ لہٰذا اگر اس دھماکہ خیز رُجحان کو جلد روکا نہ گیا تو سماجی اقتصادی ترقیات کے مکمل فوائد عوام تک نہیں پہنچ پائیں گے۔

اموات میں کمی

زمانہ مابعد آزادی کے دوران حکومت نے طبی اور صحتی سہولیات بڑھانے کے لیے متعدد اقدامات کئے جن سے شرح اموات ۱۹۵۱ء میں ۲۷٫۴ فی ہزار سے کم ہو کر ۱۹۸۱ء میں ۱۲٫۵ فی ہزار اور ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۱۱٫۹ فی ہزار رہ گئی۔ توقع ہے کہ ساتویں پلان کے آخر تک یہ شرح اموات مزید کم ہو کر ۸٫۳ فی ہزار رہ جائے گی۔

پیدائش کے وقت متوقع عمر جو ۱۹۵۱ء میں ۳۲ برس تھی۔ وہ ۱۹۸۱ء میں بڑھ کر ۵۴ برس اور ۸۵-۱۹۸۴ء میں بڑھ کر ۵۶ برس ہو گئی۔ توقع ہے کہ وہ ساتویں پلان کے آخر تک ۶۰ برس تک پہونچ جائے گی۔

بچوں کی اموات کی شرح ۱۹۸۱ء میں ۱۰۶ فی ہزار تک گر گئی اور وہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں پھر ۱۱۲ تک پہونچ گئی جب کہ ان کے مقابلے میں وہ ۶۱-۱۹۵۱ء کے عرصے میں ۱۴۶ فی ہزار تھی اور اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ ساتویں پانچسالہ پلان کے آخر تک ۶۰ فی ہزار تک آجائے گی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ گذشتہ ساڑھے تین دہائیوں میں صحت عامہ کے شعبے میں بڑی ترقی ہوئی ہے۔ اس کے برعکس شرحِ پیدائش گذشتہ دو دہائیوں سے تقریباً مستحکم چلی

آرہی ہے۔ یعنی کمی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ یہ ۱۹۵۱ء میں ۴ء۱۴ فی ہزار سے کم ہوکر ۱۹۸۱ء میں صرف ۳۳ فی ہزار اور ۸۵-۱۹۸۴ء میں کم ہوکر ۶ء۳۲ فی ہزار رہ گئی۔ اس کے نتیجے میں پیدائش اور اموات کی شرح میں فرق ۱۹۵۱ء میں ۳ء۱۴ فی ہزار سے بڑھ کر ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۷ء۲۰ فی ہزار ہوگیا۔ مزید برآں شرح پیدائش میں اتنی ہی کمی کے بغیر شرح اموات میں کمی اس عرصے کے دوران بھارت میں "آبادی کا دھماکہ" بن گئی

رکاوٹیں

خاندانی بہبود کے پروگرام کے لیے سماجی شرکت یا عوامی تحریک نے اگر زور نہیں پکڑا تو اس کی وجوہات اقتصادی نہیں ہیں بلکہ سماجی، مذہبی قدامت پسندی ہے۔ بچے کی موت کا خوف، خواتین کی ناخواندگی، خاندانی بہبود کے پروگرام کے تئیں طبی عملہ کی لاپروائی اور نا اہلیت، خواتین کے لیے نا کافی طبی سہولیات اور کام میں شرکت کی کمی اور روایات و توہمات بھارت میں شرح پیدائش میں بھاری اضافے (۵۲ فی ہزار) کے لیے ذمہ دار ہیں۔ **تجربات و مشاہدات پر مبنی موجودہ مطالعوں سے ظاہر ہوا ہے کہ ان اسباب اور اعلیٰ تر شرح پیدائش میں گہرا تعلق ہے۔** لہٰذا جب تک ان اسباب کی نشاندہی نہیں کی جائے گی اور چھوٹے کنبے کے اصول کے حق میں رویہ تبدیل نہیں کیا جائے گا تب تک ضبط تولید کے اقدامات "آبادی کے دھماکہ" کو روکنے میں مؤثر ثابت نہیں ہوسکتے۔ ہمارے ملک میں تقریباً ۶۰ فیصد مرد اور ۷۵ فیصد خواتین ابھی تک ناخواندہ ہیں۔

خاندانی بہبود کے پروگرام کی ناکامی ملک کی سماجی، اقتصادی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ آبادی میں اضافے کا بھارت کی اقتصادی ترقی پر برا اثر پڑتا ہے۔ جب کارکن اور اُس پر انحصار رکھنے والوں کے درمیان توازن بگڑ جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں عوام کے معیار زندگی میں گراوٹ آتی ہے۔

آبادی کا براہ راست طور پر خوراک کی کمی یا بھوک اور اُن لوگوں کے کم فیصد سے بھی تعلق ہے جو مقوی غذا کی استطاعت رکھتے ہیں۔ چونکہ زراعت بھارت کے عوام کا بڑا پیشہ ہے اس لیے آبادی میں اضافے سے زمین پر بوجھ پڑتا ہے جس کے نتیجے میں کم زرعی پیداوار ہوتی ہے جو بدلے میں خوراک کی کمی اور ناقص غذائیت کی ذمہ دار ہے۔ ماہرین کی رائے ہے کہ اگر آبادی پر وقت کے اندر سختی سے قابو نہ پایا گیا تو خوراک کی کھیت میں اضافہ ہوگا، فی کس خوراک کی دستیابی میں کمی آجائے گی اور ۲۰۲۵ء تک ہمیں مجموعی طور پر بھوک کے سنگین مسئلے کا سامنا کرنا ہوگا۔

اسکولی اور طبی سہولیات میں بھی کمی آئے گی اور مکانوں کی بڑھتی ہوئی ضرورت نازک صورت اختیار کرے گی۔ اس کے علاوہ صنعتی پیداوار کی فی کس دستیابی بھی کم ہوجائے گی۔ لہٰذا اگر ہم سماج میں تیز رفتاری سے اقتصادی ترقی اور بہبود کے خواہاں ہیں تو ہمیں آبادی پر کنٹرول کرنا ہوگا۔ چنانچہ ضبط تولید ایک پیچیدہ صورت حالات ہے جسے اکیلے حیاتیاتی انداز فکر سے نہیں بلکہ سماجی، اقتصادی، مذہبی اور دیگر مسائل کو سختی سے حل کرکے بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

لہٰذا حکومت نے ساتویں پلان میں پیدائش، موت اور بچوں کی اموات کی شرح میں کمی کرنے کے نشانے مقرر کئے ہیں جن کے تحت اُن میں (۸۵-۱۹۸۴) ۶ء۳۲ فی ہزار سے ۲۹ فی ہزار، ۹ء۱۱ فی ہزار سے ۴ء۱۰ فی ہزار اور ۱۰۶ سے ۶۰ فی ہزار تک بالترتیب کمی کی جائے گی۔ مزید برآں ساتویں پلان میں ضبط تولید کے ۳ کروڑ ۱۰ لاکھ آلات تقسیم کرنے کا نشانہ مقرر کیا ہے تاکہ جوڑوں کے تحفظ کی شرح ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۳۲ فیصد سے بڑھا کر ۴۲ فی صد کردی جائے۔ لہٰذا زچہ و بچہ کی صحت کی دیکھ بھال کو خاندانی بہبود کے پروگرام کا جزو لاینفک بنایا گیا ہے جس سے جوڑوں کے تحفظ کی شرح مزید بڑھ کر ۲۰۰۱ء میں ۶۰ فیصد ہوجائے گی۔

تاہم اگر ہم آبادی میں اضافے کو روکنے کے لیے خاندانی بہبود کے پروگرام کو زیادہ مؤثر بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں چھوٹے کنبے کے اصول کو درج ذیل پالیسیوں اور تحریروں کو مقبول عام بنانا ہوگا۔

سماجی، مذہبی رجحانات کے باعث پیداواری قوت کو ختم کرنے اور ضبط تولید کے طریقوں پر زور رہٹانا ہوگا اور ان امور کو اپنانا ہوگا۔ زچہ و بچہ کی صحت کی بہتر دیکھ بھال، تعلیم نسواں میں بہتری، عمر کے گروپ کے درکنار اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں جنس و آبادی سے متعلق تعلیم کی شمولیت، خواتین کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنا، سماجی سلامتی کے اقدامات کا اہتمام، دیہی علاقوں میں معاشرتی حالات کو بہتر بنانے پر زور اور صحت کے لیے موزوں بنیادی سہولیات کی فراہمی۔ بچوں کی مزدوری کو کم کرنے سے متعلق کافی تعلیمی سہولیات اور مستعدی بڑھانے کے لیے انتظامیہ مشینری کی تعمیر اور محرکات و عدم محرکات کے سسٹم کا اجرا رکھی جسے مضبوط سیاسی عزم اور مقصد کی ضمانت حاصل ہو ہماری پالیسی کا حصہ ہونا چاہیئے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس پیغام اور سروسوں کو خصوصاً دیہی علاقوں اور گندی بستیوں میں ہر گھر تک پہنچایا جائے جہاں ۸۰ فیصد آبادی بود و باش رکھتی ہے۔

ان اقدامات اور پالیسیوں کے علاوہ بالخصوص بھارت جیسے ملک میں اگر پروہتوں اور مذہبی رہنماؤں کی خدمات اور خصوصی محرکات یا دیگر ذرائع سے فائدہ اٹھایا جائے تو وہ اضافہ آبادی کو روکنے میں نہایت مؤثر اور کامیاب کردار ادا کرسکتے ہیں۔ تب کوئی وجہ نہیں ہوگی کہ آبادی کے دھماکے" کا رُخ کیوں نہ بدلا جاسکے۔ ●

سید اظہر حسین ہاشمی ۵

اضافہ آبادی کی روک تھام

ہندوستان میں اضافہ آبادی کا مسئلہ تشویشناک حد تک پہونچ گیا ہے۔ اگر نی الوقت اس پر توجہ دے کر روکا نہ گیا تو مستقبل قریب میں کثرتِ آبادی جانکاہ اور رُوح فرسا مسئلہ بن جائے گی ہم آزاد جمہوری ملک کے باشندے ہیں۔ حکومت میں اپنے نمائندے منتخب کرکے بھیجتے ہیں۔ جو ہمارے ترجماں کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ ہماری مشکلات کا حل ڈھونڈتے ہیں، امن قائم کرتے اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ گویا یہ سب وہ کام ہیں جن کی ذمہ داری ہمارے شانوں پہ ہے۔ ہم نے اپنے شانوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے یہ کام ان کے سپرد کردیے ہیں۔ پس اس کے بعد ہم پر واجب ہے کہ ہم حکومت کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں۔ خود اپنی بالغ نظری سے نمائندہ بنانے کے بعد انھیں کی مخالفت بھلے لوگوں کا کام نہیں۔ حکومت اگر اضافہ آبادی پر روک لگاتی ہے تو ہمیں اس کام سے اتفاق کرکے حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے، کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ گرانی کا سبب کیا ہے؟ بد انتظامی کیوں ہے؟۔ رشوت ستانی کیوں نہیں رُکتی اور آمیزش، نفع خوری اور ذخیرہ اندوزی آپ کے بس سے کیوں باہر ہوتی جارہی ہے؟ دراصل اس کی تہہ میں بجز اضافہ آبادی کے کوئی دوسری وجہ نہیں ہے۔

اب سے پچاس ساٹھ سال قبل ہندوستان کی آبادی صرف ۳۵ کروڑ تھی۔ آج اس سے دوگنی ہے۔ اگر اضافہ کی یہی صورت حال ہے تو دس پندرہ سال اور بیت جانے دیکھئے تو ہوشربا گرانی، رہائش اور دوسرے مسائل خود آپ کے ہوش ٹھکانے کردیں گے۔ ابھی زندگی دشوار تر ہے پھر دشوار ترین ہو جائے گی۔ بعض ہمارے اہلِ وطن گھبرا کر انگریزی دورِ حکومت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہاں پینتیس کروڑ کی آبادی اور کہاں ستر کروڑ۔ اس اگلے دور میں ایک روپیہ کا بیس سیر گیہوں بکتا تھا۔ ایک من چنا، سوا من مٹر، سوا سیر گھی۔ دو آنہ سیر دودھ، چار آنہ بکری کا بہترین گوشت، ایک پیسے کے دو انڈے (آجکل کے پانچ پیسے پرانے دو پیسوں کے برابر ہیں)۔ بارہ آنہ من لکڑی۔ دو پیسے سیر تخمی آم۔ اسی نسبت سے دوسری اشیاء کی قیمتیں تھیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ آبادی کم تھی۔ کم پیسوں میں بھی ضروریاتِ زندگی پوری ہو جاتی تھیں۔ دس پندرہ روپے مہینہ کافی ہو جاتے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ آبادی کیوں کر بڑھی۔ یہ یوں بڑھی کہ پہلے ایک شخص وہ خود تھا۔ اس کے پانچ بچے ہوئے۔ بیاہ شادیاں ہوئیں تو بچوں کے بچے پیدا ہوئے۔ پچاس سال کے اندر اندر اس ایک شخص کی اولاد پچیس ۲۵ کی تعداد کا ایک کنبہ بن گیا۔ پس جو غذا پہلے ایک شخص کی کفیل تھی۔ اُن پچیس ۲۵ آدمیوں کی کفالت کیوں کر کرے؟ زمین، غلّہ، مکان، تعلیم، اسپتال، ملازمت، ان ستر کروڑ آبادی کے لیے مشکل مسئلہ بن گیا۔ زمینیں ٹریکٹروں کے ذریعہ جوتی گئیں۔ پمپنگ مشینوں کے ذریعہ پانی فراہم کیا گیا۔ مصنوعی کھاد نے دیکھتے ہی دیکھتے لہلہاتی کھیتی میں مزروعہ زمینوں کو تبدیل کردیا۔ پہلے یہی کھیت ۳۵ کروڑ آبادی کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ اب اسی کھیت کی زمین ستر کروڑ آبادی کا بوجھ ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ زمین کی قوتِ نمو مضمحل ہوگئی۔ اس کی روئیدگی کی قوت میں فرق آگیا۔ پہلے جانور اور انسان کا فضلہ تمین

۵ نعمت اللہ روڈ، امین آباد، لکھنؤ (یو۔پی)۔

سال کام آتا تھا۔ لیکن مصنوعی کھاد ہر فصل پر تین بار نہ چھڑکی جائے تو کھیت اوسر اور بنجر زمین نظر آئیں۔ غلہ دس گنا بڑھا۔ مگر آبادی کا تناسب کیا ہے؟ لامحالہ جو گیہوں ایک روپیہ میں بیس سیر بکتا تھا اب اس کی قیمت دو ڈھائی روپے فی کلو ہے۔ دوسری اشیا کی قیمتیں بھی آسمان تک پہونچ گئیں۔ پھر بھی کمیاں پوری نہ ہوسکیں تو ملاوٹ کا کاروبار شروع ہوگیا۔ گیہوں کے آٹے میں آم کی گٹھلی کا سفوف ملایا گیا اور طرح طرح کی آمیزش اور ملاوٹ کے طریقے نکالے گئے۔ گھی کی کمی کو بناسپتی گھی نے پورا کیا۔ پسی ہوئی سرخ مرچ میں رنگ ملاکر ضرورت پوری کی گئی۔ دھنئے میں برادہ، ہلدی میں گرد، چائے میں ہوٹلوں کی پی ہوئی چائے پی جانے لگی۔ خوردنی تیلوں میں بھی طرح طرح کی ملاوٹ کی جانے لگی۔

پھر آمیزش کا سلسلہ آگے بڑھا تو دواؤں میں بھی آمیزش کی جانے لگی۔ انجیکشن اور گلوکوز سیار ہونے لگے۔ یورپ میں دو عظیم جنگوں نے وہاں یہ مسئلہ پیدا ہی نہیں ہونے دیا۔ پہلی جنگِ عظیم ۱۸-۱۹۱۴ء تک جاری رہی، دوسری ۴۶-۱۹۳۹ء تک۔ بے شمار آدمی کھیت رہے۔ وہاں یتیموں اور بیواؤں کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ انسانی آبادی کا مسئلہ صرف ہندوستان تک محدود نہیں ہے۔ دوسرے ممالک بھی آبادی کم کرنے پر غور کر رہے ہیں۔

پہلے پہل جب انگریزی دورِ حکومت میں یہ مسئلہ اٹھا تو خوب لے دے کی گئی۔ اسی لے دے کے اثرات کبھی کبھی ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ ضبطِ تولید سے جنسی مسائل نیا جنم لے لیں گے۔ کسی نے اولاد کی ہلاکت سے تعبیر کیا۔ یہ دونوں باتیں بے معنی اور لچر ہیں۔ جنسی مسائل اور بے راہ روی کے اسباب میں ہمارا فحش لٹریچر ہے۔ عریاں تصویریں، سنیما، جاسوسی ناول اور فلمی رسالوں کی بہتات ہے۔ قدیم زمانہ میں ان باتوں کو مذہب روکے ہوئے تھا۔

آجکل مذہب کے نام پر لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ نئی تعلیم نے بچوں کے ذہن اور فہم کو چوپٹ کرکے رکھ دیا۔ اب رہا ہلاکتِ اولاد کا مسئلہ تو اس کی حیثیت وہم سے زیادہ نہیں۔ ہلاکت اس کو کہتے ہیں کہ جس میں روح اور جان ہو مگر جو شے اس سے عاری ہے یا جس کا وجود ہی نہیں اس کو ہلاکت سے تعبیر کرنا۔ اپنی فہم کے ساتھ دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہو کہ پہلے جس شد و مد سے مخالفت کی جا رہی تھی اس کی وجہ ان حکام کی بازی گری تھی جن کے سپرد یہ کام کیا گیا۔ حکومت کا اس بارے میں کوئی جُرم نہ تھا۔

ہندوستان کی دیکھئے یہ کہاوت کب ختم ہو۔ کسی نے کہا۔ حضرت وہ دیکھئے آپ کی ناک کوّا لیے جا رہا ہے۔ یہ سنتے ہی پہلے یہ دیکھئے کہ ناک برقرار ہے یا نہیں۔ لیکن اس کے بجائے کوّے کے پیچھے دوڑے جا رہے ہیں۔ یہی بات نس بندی میں ہلاکتِ اولاد تصور کرنے پر صادق آرہی ہے۔

اضافہ آبادی کے سلسلہ میں ہم آپ کو لطیفہ بھی سنانا چاہتے ہیں۔ کئی روز کی بات ہے۔ ہمارے ایک دوست باہر سے تشریف لائے۔ منصوبہ بندی پر بات جاری تھی۔ وہ بولے۔ ہم ایک دلچسپ قصہ سنانا چاہتے ہیں۔ ہم نے کہا ضرور سنائیے۔ میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔ انھوں نے کہا۔ میرے وہاں ایک جوڑا کبوتر اور دو مرغیاں پلی ہوئی ہیں۔ کبوتر کے صرف دو بچے نکلتے ہیں جب کہ ان دونوں مرغیوں کے ہر سال بارہ بارہ، پندرہ پندرہ بچے عالمِ وجود میں آجاتے ہیں۔ دونوں اپنے اپنے بچوں کا لشکر لیے دن بھر گھر میں گندگی اور غلاظت پھیلاتے پھرتے ہیں البتہ ان کی وجہ سے گھر کیڑے مکوڑوں سے صاف رہتا ہے اور پھر انڈوں کا لالچ بھی ہے۔

انھوں نے کہا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مرغی کے بچوں نے کبوتر کا دانہ چُگ لیا۔ یہ بات کبوتر کو ناگوارِ خاطر گذری اور بات بھی ناگواری کی تھی۔ دونوں کبوتروں نے سبق سکھانے کے لیے ان بچوں کی جی کھول کر مرمّت کر ڈالی۔ مرغی کی نظر پڑ گئی۔ وہ بچوں کی توہین کیوں برداشت کرے۔ کبوتروں پر جھپٹ پڑی۔ تھوڑی دیر دونوں میں جھپٹ کا تماشہ جاری رہا۔

کبوتر نے مرغی سے کہا۔ تم کو شرم نہیں آتی کہ بھیک منگوں کی طرح تمھارے بچے مارے مارے پھرتے ہیں۔ یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ بے شرمی کی زندگی سے مرجانا بہتر ہے۔

مرغی نے جواب دیا۔ تم میرے بچوں سے کیوں حسد کرتے ہو۔ تم اپنے بچوں کی خیر مناؤ۔ کاہل سُست لوتھڑے نظر آتے ہیں۔ جب تک بڑے نہ ہوجائیں تم دونوں اپنے پیٹ کا دانہ کھلا کھلا کر پرورش کرتے ہو۔ میرے بچوں سے سبق سیکھو۔ پیدا ہوتے ہی خدا کے خود کفیل ہوجاتے ہیں۔ مجھ پر ایک تنکے کا بار نہیں۔

کبوتر نے جواب دیا۔ یہ تو خدا کی رحمت کی نشانی ہے کہ اس نے بچوں کی غذا کا کفیل بنایا۔ ورنہ وہ بھی تمھارے بچوں کی طرح مارے مارے پھرتے۔

مرغی نے کہا۔ واہ اچھی رحمت ہے۔ زحمت کو رحمت کا نام دے دیا۔ رحمت تو یہ ہے کہ میرے ایک ایک جھول میں بارہ بارہ پندرہ پندرہ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ تم ہو کہ دو بچے مدتوں لیے بیٹھے رہتے ہو۔

کبوتر بولا۔ تم کو بھی میری طرح پیٹ کا دانہ کھلانا پڑتا پھر میں دیکھتا کہ تم کتنے بچے پیدا کرتی ہو۔ مرغی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ لاجواب ہوکر مرغی دوسری طرف چلی گئی۔ ممکن ہے یہ سوچتی

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

عزیز اندوری ۵

ملاوٹ — ایک بھیانک جرم

ایک زمانہ تھا جب غذا کی اصلیت اور تازگی پر شک کرنا تو دُور اس میں کسی بھی قسم کی ملاوٹ کا خیال بھی ذہن میں نہیں آتا تھا۔ تجار ایمان فروشی اور ضمیر کی مُردنی پر کسی طرح بھی آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ مگر اب مختلف اجناس کے علاوہ ادویات اور پھلوں وغیرہ میں ملاوٹ کرنے کے جدید طریقے ایجاد کر لیے گئے ہیں۔ آج کی کثیر آبادی ایسے ہی لالچی اور ضمیر فروش تجار کی بے ایمانیوں کا شکار ہو کر نہ صرف اپنی صحت کو ضائع کر رہی ہے بلکہ اپنی رقم کا بڑا حصہ برباد کر رہی ہے۔

دودھ، گھی، تیل، مٹھائی، گرم مصالحہ، مٹی کا تیل، پیٹرول، ڈیزل، ایل پی جی، دال، لال مرچ، آٹا، سیمنٹ، رنگ وغیرہ میں آمیزش کے ساتھ ہی ایسی مثالیں بھی ملی ہیں کہ پھل (مثلاً تربوز، خربوزہ اور آم) کی شیرینی میں اضافہ کرنے کی غرض سے سیکرین کو بھی انجکشن کے ذریعہ ان میں داخل کر کے زیادہ نرخ میں فروخت کیا جاتا ہے۔

ادویات میں ملاوٹ کرنے یا نقلی اور بوگس ادویات کی فروخت تو عام بات ہو گئی ہے۔ اس قسم کے اخلاق سوز جرائم کے مرتکب تجار دولت کمانے کی ہوس میں تمام انسانی اور اخلاقی روایات اور اقدار کو فراموش کر دیتے ہیں ان کے مردہ ضمیر اس احساس سے عاری ہو گئے ہیں کہ اس قسم کے ارتکابِ جرم کی وجہ سے ہزاروں بھولے بھالے افراد نہ صرف اپنی صحت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں بلکہ بیشتر تو اپنی جان بھی گنوا دیتے ہیں۔

ایسے ہی ضمیر فروش تاجروں کو غیر اخلاقی جرائم سے روکنے کے لیے حکومت ہند نے ۱۹۵۴ء میں ملاوٹ کے انسداد کا ایکٹ بنایا تھا اور جسے یکم جون ۱۹۵۵ء سے عمل میں لایا گیا۔ اس ایکٹ کا مقصد ملاوٹ کرنے والوں کے خلاف مؤثر اور عملی اقدام اٹھانا ہے۔ اسے مزید پُراثر بنانے کے لیے ۱۹۶۴ء اور پھر ۱۹۷۶ء میں ترمیم کی گئی اور اس کے تحت ملاوٹ ثابت ہو جانے پر اس جرم کے مرتکب کو چھ ماہ کی قید اور ایک ہزار روپے جرمانہ کی سزا مقرر کی گئی۔ اگر غذائی اجناس پر ملاوٹ کرنے پر کسی شخص کی موت واقع ہو جائے تو اس ایکٹ کے تحت ملاوٹ کرنے والے کو عمر قید اور پانچ ہزار روپے جرمانہ کی سزا دی جا سکتی ہے۔

مرکزی حکومت نے ملاوٹ کو روکنے کے لیے ایک سنٹرل کمیٹی برائے غذائی معیار (Central Committce for Food Standard) کی تشکیل کی ہے۔ اس کمیٹی میں کئی تیکنیکی سب کمیٹیاں بھی ہیں۔ لیکن خاص طور سے غذا میں ملاوٹ روکنے کے ایکٹ (PFAA) کو نافذ کرنے اور موثر بنانے کی جواب داری مقامی انتظامیہ داری حکام کی زیادہ ہے اس لیے مرکزی حکومت نے صوبائی حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ وہ لائق اور تجربہ کار حکام کا غذائی اجناس میں آمیزش کی روک تھام کے تقرر کریں۔

ویسے مرکزی سرکار نے غازی آباد، میسور، پونا اور کلکتہ میں سینٹرل فوڈ لیباریٹری قائم کی ہیں۔ ان تجربہ گاہوں میں عدالت کے ذریعہ مشکوک مختلف اجناس کے نمونے بھیجے جاتے ہیں اور ان تجربہ گاہوں سے حاصل ہونے والی رپورٹ کو مکمل طور پر مسلّم مانا جاتا ہے۔ اور اسی کی بنیاد پر عدالت کے ذریعے قانونی کارروائی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ صوبائی سرکاروں اور مقامی اداروں کے تحت ستر تجربہ گاہیں بھی قائم کی گئی ہیں۔ فوڈ انسپکٹروں کے

---

۵ ۷۷K، آشیانہ، جونا رسالہ، اسٹریٹ نمبر-۱، اندور، ۴۵۲۰۰۶

ذریعے لیے گئے نمونے ان تجزیہ گاہوں کو روانہ کئے جاتے ہیں اور ان کی رپورٹ پر قانونی اور عدالتی کارروائی کی جاتی ہے۔

اس ایکٹ کے علاوہ بھارت سرکار نے ۱۹۴۰ء میں ادویات اور آرائش و زیبائش کی اشیاء میں ملاوٹ کو روکنے کے لیے "دی ڈرگ اینڈ کاسمیٹکس ایکٹ (The Drug & Cosmetic Act)" بھی بنایا تھا اس میں بھی کئی بار مناسب ترمیم کر کے اسے زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ایکٹ کے تحت ادویات اور آرائشی اشیاء کی تقسیم سے متعلق طریقوں پر نظر رکھی جاتی ہے اور ایکٹ کے ذریعے بناوٹی، نقلی یا ملاوٹی ادویات بنانے یا فروخت کرنے کو سخت جرم تصور کیا جاتا ہے۔ حکومت کو یہ اختیار ہے کہ درآمد کی جانے والی ادویات کی جانچ کرنے کے بعد اسے فروخت کرنے کی اجازت دے۔ صوبائی سرکار ادویات بنانے، فروخت کرنے اور تقسیم کرنے کے طریقوں پر کڑی نظر رکھتی ہے۔

ادویات میں ملاوٹ کرنے یا نقلی ادویات کے نقصانات تو ظاہر ہیں۔ لیکن آرائش و زیبائش سے متعلق اشیاء میں ملاوٹ کرنے کے بڑے بھیانک نتائج سامنے آتے ہیں۔ ایسی اشیاء کے استعمال سے عام طور پر چمڑی سے متعلق بیماریاں تو ہوتی ہی ہیں بعض مرتبہ نقلی یا ملاوٹی لپ اسٹک وغیرہ کے استعمال کی وجہ سے کینسر جیسا مہلک مرض بھی ہو جاتا ہے۔

مرکزی اور صوبائی سرکاروں نے ان جرائم کے انسداد کے لیے قانون بنا دئے ہیں مگر اس کے باوجود آج بھی ملاوٹ کرنے والوں کی تعداد میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ سرکاری حکام اور ادارے تو اس سلسلے میں قانونی کارروائیاں کرتے ہیں۔ عوام کا بھی فرض ہے کہ وہ ایسے جرائم یا بد اعمالی کے خلاف سخت قدم اٹھائیں اور جہاں بھی ان جرائم کے نشانات دیکھیں متعلقہ حکام کو اس سے باخبر رکھیں اور یہ بھی دیکھیں کہ ان کے خلاف کیا قانونی کارروائی کی جا رہی ہے۔

بقیہ گجرات ۔ خوشحالی کی جانب بڑھتے قدم

منتظمہ بنیادی ڈھانچہ ہے۔

گجرات میں نہ صرف صنعتوں کو فروغ دیے بلکہ اُن کا تحفظ کرنے کے لیے بھی متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔ صنعتی سیکٹر میں مجرمانہ سرگرمیوں کو کچلنے اور بینکوں کی ڈکیتیوں پر قابو پانے کے لیے ریاستی حکومت نے ایک سلامتی کا ریزرو فورس قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ریٹائرڈ فوجیوں کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ یہ ملک میں پہلا خود مختار ادارہ ہوگا۔

خشک سالی

لیکن یہ گجرات کی بدقسمتی ہے کہ اُسے متواتر تین برس سے خشک سالی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جس سے اُس کی معیشت کو زبردست نقصان کا بوجھ اٹھانا پڑ رہا ہے۔ تاہم حکومت نے اس عظیم چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے پوری تیاری کر لی ہے۔ اُس نے ریاست کے ۱۶، اضلاع کے ۱۴۴ تعلقوں میں کُل ۱۱۶۱۲ دیہات کو خشک سالی سے متاثرہ قرار دیا ہے اور خشک سالی پر قابو پانے کے لیے ۴ ارب ۹۳ کروڑ ۲۳ لاکھ روپے کا ماسٹر پلان مرتب کیا ہے۔ اس سلسلے میں پینے لائق پانی کے لیے ۹۴ کروڑ ۲۳ لاکھ روپے، امدادی سرگرمیوں کے لیے ۴۵ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے، معمروں اور کمزور لوگوں کو نقد وظائف دینے کے لیے ۹ ارب ۱۲ کروڑ روپے اور مویشیوں کے تحفظ کے لیے ۲۰ کروڑ ۲۳ لاکھ روپے کی رقومات مخصوص کی ہیں۔ ۶۲۰۱۰ امدادی کاموں میں ۱۳ لاکھ ۲۱ ہزار اشخاص کو روزگار دیا گیا ہے اور غیر پیداواری اور غیر منصوبہ جاتی اخراجات کو کم کرنے کے لیے متعدد اقدامات کئے ہیں۔

اقلیتی بورڈ کا قیام

شاید گجرات سرکار کی سب سے زیادہ تعریف اس امر کے لیے کی جائے گی کہ وہ امن و قانون برقرار رکھنے کی جانب خاص طور پر توجہ دے رہی ہے۔ اُس نے لاقانونی اور بار بار ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات پر قابو پانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ ان فسادات سے احمد آباد اور دیگر بڑے شہروں، وڈودرا (بڑودہ) اور بھڑوچ اور نواحی دیہات کا امن درہم برہم ہو جاتا ہے اور بے گناہوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ ان فسادات کا سب سے زیادہ اثر ترقیاتی سرگرمیوں پر پڑتا ہے اور ان سے تجارت، روزگار اور تعلیم سے متعلق سرگرمیاں ٹھپ ہو جاتی ہیں۔ فسادات پر قابو پانے کے لیے حکومت کی طرف سے ایک چار نکاتی منصوبہ عمل تیار کیا گیا ہے۔ جس کے تحت پولیس کی مشینری کو زیادہ مؤثر بنایا جائیگا۔

حکومت جہاں فرقہ وارانہ فسادات کو سختی سے کچلنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے وہاں اُس کی طرف سے اقلیتوں کی جائز شکایات کو رفع کرنے کے لیے بھی اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اُس کی طرف سے ایک اقلیتی بورڈ کی تشکیل کی جا رہی ہے اور اس بورڈ کو ایک قانونی کارپوریشن کا درجہ دینے کے بارے میں سرگرمی سے غور کیا جا رہا ہے تاکہ وہ اقلیتوں کی فلاح و بہبود میں مؤثر حصہ لے سکے۔

شگفتہ فرحت جبیں[۵]

بڑھتی ہوئی آبادی اور اس کے اثرات

ہندوستان کی یہ صورتِ حال بوکھلا دینے والی ہے کہ ایک طرف آبادی کا بہت بڑا حصہ بہت ہی پست معیارِ زندگی گزار رہا ہے اور دوسری طرف آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ روز بروز یہ خدشہ بڑھتا جا رہا ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کہیں وہ دن نہ دکھائے کہ روئے زمین پر رہنے کے لیے جگہ نصیب نہ ہو۔ جس تیزی کے ساتھ آج آبادی بڑھ رہی ہے۔ یہ صرف ہندوستان کا مسئلہ نہیں بلکہ تمام عالم کا مسئلہ ہے۔ اس اعتبار سے حکومت کی ذمہ داری بھی بڑھتی جاتی ہے۔ شاید یہ بات ہر شخص اپنے گھر اور معاشرے کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتا ہے کہ جس طرح اولاد کی کثرت ماں باپ پر ایک بھاری بوجھ بن جاتی ہے اسی طرح ملک میں بڑھتی ہوئی آبادی حکومت پر بوجھ بنتی چلی جاتی ہے۔

اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ ایک چھوٹا خاندان کم پیسوں میں بھی اچھی طرح گذر کر سکتا ہے۔ جب کہ ان کے مقابل ایک بڑا خاندان اتنے پیسوں میں اپنی گذر مشکل ہی سے کر پاتا ہے۔ اس صورتِ حال کے اثرات خاندان کے تمام افراد پر پڑتے ہیں۔ اپنی مجبوری کی وجہ سے انھیں ضروریات کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے۔ ایک بچہ جس کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ ایک اچھا اور ترقی یافتہ انسان بنے اس کے بڑے خاندان کی پیدا کردہ مشکلات قدم قدم پر اس کا راستہ روکتی ہیں۔ نہ بہتر صحت کے لیے اسے غذا میسر آتی ہے اور نہ اچھی تعلیم کے وسائل اسے نصیب ہوتے ہیں۔ تعلیم سے محرومی یا مفید مطلب تعلیم نہ حاصل کر سکنے کے باعث اگر وہ کوئی ایسا کام کرنا چاہے جس سے خاندان کے معاشی حالات سدھر سکیں تو اکثر و بیشتر یہ بھی ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے گھریلو حالات کچھ اس قدر پیچیدہ ہوتے ہیں اور پیسوں کی اتنی تنگی ہوتی ہے کہ وہ خود ماں باپ پر ایک بوجھ بن جاتا ہے اس کا وجود خود اس کی نظر میں ایک سنگِ گراں ہو جاتا ہے۔

اپنے گرد و پیش روزانہ نظر آنے والی اس صورتِ حال سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ معمولی مجبوری جب اتنے چھوٹے گھر میں اتنی بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے تو ایک ملک کو جو تمام خاندانوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ آبادی کی کثرت سے کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا جن کی بنا پر وہ چاہتے ہوئے بھی ترقی نہیں کر پائے گا۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر آبادی اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو ہماری معاشی ترقی پر کتنا برا اثر پڑے گا۔ کچھ لوگ شاید آج بھی اس طرف دھیان نہیں دے رہے ہیں۔ لیکن یہ کسی مذہب نے نہیں کہا ہے کہ بھوکے پیٹ اپنے گھر کے افراد کو بڑھاتے رہو اور خود وقت گذرنے کے بعد پشیمان ہو۔

ایک نظر ذرا اپنے ملک کے حالات پہ ڈالنے سے عیاں ہے کہ کن مشکلات کے بعد ہم نے آزادی پائی ہے اور اتنے برسوں کی جد و جہد کے بعد ملک اتنی ترقی کر سکا۔ اب ہم سب کو یہ سوچنا چاہیے کہ جس طرح ایک خاندان کا بوجھ افراد کے بڑھنے سے بڑھتا ہے اسی طرح ایک ملک کا بوجھ آبادی کے بڑھنے سے بڑھتا ہے اور اس کی معاشی ترقیات میں بہت بڑی رکاوٹ ہو جاتی ہے۔

آبادی کے لحاظ سے دنیا میں ہندوستان

---

۵ ۹۶۴، گلی پتنہ والی، بلیماران، دہلی ۶ -
یوجنا، نئی دہلی

کا دوسرا مقام ہے۔ دُنیا کی کُل آبادی کا ۱۵ فیصد حصّہ بھارت میں مقیم ہے۔ لیکن بھارت کا کُل رقبہ دنیا کے رقبہ کا صرف ۲٫۴ فیصد ہی ہے۔ ۱۹۲۱ء تک آبادی بڑھنے کی رفتار دھیمی اور سُست گام تھی۔ لیکن ۱۹۲۱ء کے بعد اضافے کی شرح مسلسل بڑھتی رہی۔ ہندوستان کی پیدائش اور اموات کی پچھلی شرح کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۵۱ء تک کے تیس برسوں میں اموات کی شرح ۱۹۲۱ء کے مقابلے میں بہت کم رہی ہے۔ لیکن پیدائش کی شرح وہی رہی ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری سے یہ ظاہر ہے کہ ۱۹۵۱ء کے مقابلے میں ہندوستان کی آبادی ۲۱٫۶۴ فیصد بڑھی اور اضافے کے اوسط کی شرح ۱۶ فیصد زیادہ تھی۔ ان دس برسوں میں طبّی امداد، صفائی اور صحتِ عامہ کے پروگراموں کی وجہ سے اموات کی شرح بہت گھٹ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے پہلے کے دس برسوں کے مقابلے میں آبادی کے اضافے کی شرح بڑھ گئی۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کی آبادی ۵۴٫۸ کروڑ تھی اور سالانہ بڑھوتری کی شرح ۲۵ فیصد تھی۔ ہندوستان کے لیے یہ تیز رفتاری سے بڑھتی ہوئی آبادی خاص فکر کا موضوع ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے تحت بھارت کی آبادی ۶۸٫۴ کروڑ تھی اور سالانہ بڑھوتری کی ۲٫۴۷ فیصد تھی۔

پانچ سالہ یوجنا ہماری آبادی کے مسئلے کو دو رُخ سے حل کر رہی ہے۔ منصوبہ بندی کے ذریعے ہم بہ یک وقت آبادی بڑھنے کی شرح کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور معاشی ترقی کی وہ شرح حاصل کر رہے ہیں جس سے آبادی اور وسائل کا بہتر تناسب قائم ہو۔

ہندوستانی معیشت کی کم ترقی یافتہ ماہیئت کی وجہ سے معاشی ترقی میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی سب سے زبردست مسئلہ ہے۔ آبادی کی منصوبہ بندی کا عمل بہت سُست ہوتا ہے اور ہندوستان جیسے کم ترقی یافتہ ملک میں جہاں کی بیشتر آبادی پر قابو پانے اور خاندانی منصوبہ بندی کی کوشش کے باوجود مسئلہ جوں کا توں ہے۔ اس کے حل کے لیے زیادہ کوشش اور اجتماعی عمل کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کے لیے آبادی کی محتاط منصوبہ بندی اشد ضروری ہے ورنہ آبادی کا اضافہ معاشی ترقی کو ہڑپ کر جائے گا۔

ہندوستان کی اوسط آمدنی مشکل سے اتنی ہے کہ آبادی کے دو تہائی حصّے کا پیٹ بھرا جا سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خصوصاً دیہات میں لوگوں میں غربت بے پناہ ہے۔ بڑھتی ہوئی پیدائش اور گھٹتی ہوئی اموات کی شرح کے دور سے گذرتا ہوا ہندوستان دُنیا میں آبادی کے شدید ترین دباؤ کا علاقہ ہے۔ ظاہر ہے کہ آبادی بڑھ رہی ہے اور ۶۴ فیصد آبادی کو اس کے سدِّباب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آبادی کے رجحانات میں تبدیلی کا اثر دو تین پُشتوں کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ اور اُتنی ہی مدّت اولاد پیدا کرنے کے رویئے کو بدلنے میں لگتی ہے۔ ڈاکٹر چندر شیکھر نے تخمینہ لگایا تھا کہ اضافے کی موجودہ شرح کے مطابق ۱۹۹۹ء تک آبادی ۱۰۰ کروڑ کی تشویش ناک تعداد کو چھُو سکتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان نئے پیدا ہونے والوں کا پیٹ کیسے بھرا جائے۔ یہ دُرست ہے کہ ہر شخص ایک مُنہ کے ساتھ دو ہاتھ بھی لے کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی مُنہ اپنا کام شروع کر دیتا ہے، جب کہ ہاتھوں کو کسی مفید کام کرنے کے قابل ہونے میں پندرہ سولہ برس لگ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ تیز صنعتی توسیع کے لیے ترقیاتی منصوبہ بندی کے زیرِ اثر دیہاتوں سے شہروں کی طرف انتقالِ آبادی کی رفتار بڑھتی رہتی ہے۔ چنانچہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان کی ترقیاتی منصوبہ بندی میں کھانے کی رسد اور آبادی کے اضافے میں توازن کیسے قائم کیا جائے۔

پانچ سالہ منصوبوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ ترقیاتی منصوبہ بندی کے ارتقاء کے ساتھ ہندوستان اپنے قدرتی وسائل اور ماحول کو مؤثر طریقے سے استعمال کرتا رہے گا۔ سوال یہ ہے کہ آبادی کے اضافے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اوّلاً تو صحتِ عامہ کے بہتر اقدام کے ساتھ اموات کی شرح غالباً گھٹے گی۔ دوسرے یہ کہ ترقی کے دوران آمدنی بڑھنے کے ساتھ ممکن ہے کہ آبادی بھی بڑھے۔ ایسا نہ بھی ہو تو کافی عرصہ تک پیدائش کی شرح قائم رہے گی۔ کیونکہ دستور اور پُرانے رسم و رواج کو بدلنا اور جو عوام روایات میں جکڑی ہوئی ہے ان میں خاندانی منصوبہ بندی کا پیغام مؤثر طریقے سے پھیلانا بڑا مشکل ہے۔ چنانچہ غالباً یا تو پیدائش کی شرح بڑھے گی یا قائم رہے گی اور اموات کی شرح گھٹے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ترقیاتی منصوبہ بندی کے دوران مستقبل قریب میں بھی آبادی بڑھتی رہے گی۔

اب ہم عبوری دور میں آبادی کے اُتار چڑھاؤ کے اُصولوں کا سرسری خاکہ خلاصے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس سے معاشی ترقی کی منزل میں آنے سے قبل ایک کم آمدنی والے زراعتی سماج کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ پیدائش اور اموات دونوں کی شرح اونچی ہوتی ہے۔ پیدائش کی شرح نسبتاً تھی

(باقی صفحہ ۵ پر)

گوپال اروڑہ٭

گجرات ـ خوشحالی کی جانب بڑھتے قدم

بھارت نے گذشتہ چالیس برس میں صنعتی ترقی اور خود کفالت کے حصول میں جو کامیابی حاصل کی ہے گجرات نے اس میں اہم حصّہ لیا ہے۔ پہلے گجرات کا علاقہ صوبہ بمبئی میں شامل تھا۔ لیکن جب بھارت میں حصولِ آزادی کے بعد لسانی ریاستوں کا قیام عمل میں آنے لگا تو ۱۹۶۰ء میں اس کا ایک ریاست کے طور پر ظہور ہوا۔ اُس وقت اس کا شمار آٹھویں درجے کے طور پر ہوا تھا لیکن منصوبہ بند اور باقاعدہ ترقی، مضبوط صنعتی بنیادی ڈھانچے، بجلی کی بھروسہ مند سپلائی، پُرامن اور پیداواری افرادی قوت اور نہایت اثر پذیر اور پُرجوش صنعتی نظم و نسق کی بدولت یہ ریاست ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہوئی اور اس میں جو صنعتی انقلاب آیا اُس سے بھارت کے صنعتی نقشے پر اس نے دوسرا مقام حاصل کر لیا۔

گجرات کا رقبہ ۱۹۶۰۲۴ مربع کلومیٹر اور آبادی ساڑھے تین کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ راجدھانی گاندھی نگر اور ریاستی زبان گجراتی ہے۔ زمین نہایت زرخیز ہے۔ کپاس اور مونگ پھلی کی پیداوار بہت زیادہ ہوتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس ریاست کو کپاس اور مونگ پھلی کی پیداوار میں اوّل اور تمباکو کی پیداوار میں دوسرا مقام حاصل ہے۔ ان زرعی اشیاء کی بھاری پیداوار کی بدولت یہاں کپڑے، تیل اور صابن جیسی صنعتوں کو بڑا فروغ حاصل ہوا ہے۔ دیگر منافع بخش فصلیں ہیں ـ اسبغول، سفید زیرہ، گنّا، آم اور کیلا۔ ریاست کی بڑی زرعی فصلیں ہیں دھان، گیہوں اور باجرا۔

صنعتیں

گجرات میں بڑی صنعت کپڑے کی ہے دیگر جن صنعتوں کا یہاں قیام ہو رہا ہے وہ ہیں :ـ کیمیکل، کیمیاوی کھاد، دوائیاں، رنگ کا سامان، متعدد اقسام کے انجینئرنگ یونٹ ـ علاوہ ازیں یہاں ملک کا سب سے بڑا پیٹرو کیمیکلز کامپلیکس ہے۔

گجرات کی تیز رفتار صنعتی ترقی کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۶ء کے درمیان یہاں ۱۲۵۲۸ چھوٹے صنعتی یونٹوں کا اندراج کیا گیا جب کہ اس کے مقابلے میں گذشتہ دہائی میں سال میں اوسطاً ۲۰۴۴ چھوٹے یونٹوں کا اندراج ہوتا تھا۔ ملک میں ۱۹۸۶ء کے دوران جتنے صنعتی لائسنس جاری کئے گئے اُن میں گجرات کا حصّہ بڑھ کر ۱۲٫۱ فیصد ہو گیا جو ۱۹۸۵ء میں محض سات فیصد تھا۔

اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ نہ صرف بھارت بلکہ بیرونِ ملک کے صنعت کار بھی صنعتوں کے قیام کے لیے گجرات کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اس کا ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ گذشتہ ۸ برس سے غیر سکونتی سرمایہ کاروں کی طرف سے اوسطاً ہر ہفتہ ایک یونٹ لگایا جا رہا ہے۔

ریاست میں زراعت اور صنعت کی تیز رفتار ترقی کے لیے جو اقدامات کئے گئے ہیں اُن کا مقصد عوام اور خصوصاً دیہات، قبائلی علاقوں اور شہروں کی گندی بستیوں میں رہنے والوں کی سماجی و اقتصادی حالت کو بہتر بنانا اور افلاس کا انسداد کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت کی طرف سے جو اسکیمیں عمل میں لائی جا رہی ہیں اُن میں ایک ہے نرمدا پراجیکٹ۔

نرمدا پراجیکٹ : مرکزی حکومت نے سردار

٭ بی ۲/۲۵۱، پچھم وہار، نئی دہلی

سرودر (نرمدا) پراجیکٹ کی منظوری دیدی ہے جسے طویل عرصے تک اس حقیقت کے باوجود عمل میں نہیں لایا جاسکا کہ وہ ریاست کی ہمہ جہت ترقی کا اہم پہلو ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء اس کے لیے ابتدائی برس مقرر کیا گیا ہے اور اس پراجیکٹ پر آنے والی کُل لاگت ایک کھرب ۲۰ ارب روپے کے لگ بھگ ہے۔ پردھان منتری نے گذشتہ ۳ جون ۱۹۸۷ء کو اس پراجیکٹ کے سلسلے میں ماحولیات کے تحفظ سے متعلق سماجی جنگل بانی کے پروگرام کا افتتاح کیا۔

اس پراجیکٹ کے مکمّل ہونے پر ریاست کی مزید ۱۷ لاکھ ۹۲ ہزار ہیکٹیئر اراضی میں آبپاشی ہونے لگے گی۔ جس سے ریاست کے ۱۲ اضلاع کے تعلقے فیضیاب ہوں گے۔ اس سے زرعی پیداوار میں ۵۴ فیصد اضافہ ہوگا۔ ریاست کی سالانہ آمدنی بھی بڑھ جائے گی اور اس میں ۱۲ ارب روپے سالانہ کا اضافہ ہوگا۔ اس پراجیکٹ کے باعث بجلی کی پیداوار اندازاً ۱۴۵۰ ایم ڈبلیو ہو جائے گی۔ میونسپلٹیوں اور صنعتوں کے استعمال کے لیے ۱۰ لاکھ ۶ ہزار ایکڑ (فٹ) پانی دستیاب ہوگا۔ اس سے درحقیقت سوراشٹر اور شمالی گجرات کے اُن علاقوں پر خوشحالی کے دروازے کھُل جائیں گے جو اکثر شدید خشک سالی کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔

شاندار کارکردگی

حکومت کی طرف سے اب تک جو ترقیاتی اقدامات کیے گئے ہیں اُن کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں جن سے عوام کی سماجی و اقتصادی حالت کو بہتر بنانے اور افلاس کے انسداد میں بڑی مدد مل رہی ہے۔

درج فہرست ذاتوں، قبیلوں اور سماجی طور پر تعلیمی لحاظ سے پسماندہ طبقوں کو اعلیٰ معیاری تعلیم دینے کی غرض سے آدرش اقامتی اسکول کھولنے کی اسکیم کے تحت ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران کُل ۱۰ اقامتی اسکول قائم کیے گئے ہیں۔

درجِ فہرست قبائل کے بچوّں کو تعلیمی سہولیات فراہم کرنے کے لیے ۵ لاکھ ۹۴ ہزار روپے کی لاگت سے ۶ کیمٹر کوارٹرس اور ۱۵ لاکھ ۶۰ ہزار روپے کی لاگت سے ۳۰ بورڈنگ شروع کرنے کی اسکیم زیرِ غور ہے۔

ریاستی حکومت نے بُنکروں کی منافع بخش اُجرت بڑھانے کی غرض سے سُوتی دھاگے کی بُنائی پر ۱۰ پیسے فی مربع میٹر زائد دینے سے متعلق جو فیصلہ کیا تھا اُس پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہے۔

بھروچ کے نزدیک پالس (دھاگے) کی ایک فیکٹری ۴۷ کروڑ روپے کی لاگت سے لگائی جا رہی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں ۱۲۱۷۴ فیکٹریاں تھیں جن میں ۷ کروڑ ۱۳ لاکھ کارکنوں کو روزگار دیا گیا۔ جبکہ ۱۹۸۶ء میں ۱۵۶۲۹ فیکٹریاں کام کر رہی تھیں۔ جن میں ۷ کروڑ ۹۴ لاکھ افراد کو روزگار ملا۔

کھیت مزدوروں کی یومیہ اُجرت ۹ روپے سے بڑھا کر ۱۱ روپے کر دی گئی۔

بندھوا مزدوروں کی آبادکاری کی اسکیم کے تحت ۶۳ مزدوروں کا پتہ لگایا گیا اور اُن کی روزی کو یقینی بنانے کی کوشش کی گئی۔

مفصل علاقوں کے بے زمین مزدوروں اور غیر ہُنرمند کارکنوں کو ۸ لاکھ ۹۴ ہزار پلاٹ دیے گئے جن میں سے ۲ لاکھ ایک ہزار پلاٹ درج فہرست ذاتوں اور ایک لاکھ ۷۰ ہزار پلاٹ درج فہرست قبیلوں کو الاٹ کیے گئے تاکہ وہ اپنے مکانات کی تعمیر کر سکیں۔

ہلپتی ہاؤسنگ ترقیاتی اسکیم کے تحت اب تک ۱۵۸۹ مکانات کی تعمیر کی گئی ہے۔

۱۹۸۵ء میں ۳۳۴۸۴ اور ۱۹۸۶ء میں ۳۳۹۹۴ کُنبوں کو اپنے مکانات بنانے کے لیے امداد دی گئی اور اسی طرح ۱۹۸۵ء میں درجِ فہرست ذاتوں کے ۵۱۵۰ کُنبوں اور ۱۹۸۶ء میں ۴۴۸۴۴ کُنبوں کو اقتصادی امداد بہم پہونچائی گئی۔

دیہات کے بے زمین لوگوں کو روزگار بیمہ اسکیم کے تحت دو برس میں ۸۵ لاکھ ۳۳ ہزار انسانی دنوں کا روزگار پیدا کیا گیا۔ تیل و قدرتی گیس کمیشن نے مہسانہ میں ایک رہنمایانہ پراجیکٹ شروع کیا ہے جو ۶ کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن کوئلے کو گیس میں منتقل کرے گا۔

گجرات صفِ اوّل کی اُن ریاستوں میں ہے جو دیہات میں توانائی کے متبادل ذریعے کے طور پر گوبر گیس پلانٹ نصب کر رہی ہیں۔ چنانچہ اس ریاست کی طرف سے گذشتہ دو برس میں مختلف دیہات میں گوبر گیس کے ۴۲ ہزار پلانٹ نصب کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں درجِ فہرست ذاتوں اور قبیلوں اور چھوٹے اور حاشیائی کاشت کاروں کو ۷۵ فیصد امداد فراہم کی جا رہی ہے۔

سماجی جنگل بانی اسکیم کے تحت ۲۲۴۰۰ ہیکٹیئر زمین پر جنگل لگانے کا پروگرام عمل میں لایا گیا ہے اور ایک ارب ۶ کروڑ ۲۴ لاکھ پودے لگائے گئے ہیں۔

دو برسوں میں بالترتیب ۱۰۱۲ اور ۱۰۰۲ ایسے دیہات میں پانی کی سپلائی کا پروگرام عمل میں لایا گیا جہاں پینے لائق پانی کی کمی تھی اور قبائلی اور پسماندہ علاقوں کے ۹۱۸ اور ۶۹۴ دیہات میں بجلی مہیا کی گئی۔

سلم کلیرنس اسکیم کے تحت میونسپل کارپوریشنوں اور میونسپلٹیوں کو مالی امداد دے کر گندی بستیوں کی حالت کو سُدھارا گیا اور وہاں پانی، گٹر، سڑکیں

بجلی اور غسل خانے فراہم کئے گئے۔

جن کنبوں کی سالانہ آمدنی ۵ ہزار روپے تک ہے انھیں نرخی راشن کارڈ دئے گئے اور انھیں ہر ماہ ۵ء۲ کلوگرام گیہوں، ایک روپیہ بیس پیسے فی کلوگرام اور ۵۰۰ گرام چاول ایک روپیہ چالیس پیسے فی کلوگرام کی شرح سے فی فرد کے حساب سے دئے گئے۔

طلباء کے لیے دوپہر کا کھانا

ریاست میں خواندگی کی شرح بڑھانے کے لیے ۱۹ نومبر ۱۹۸۵ء سے دوپہر کے کھانے کی اسکیم شروع کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے تحت اسکولوں میں بچوں کو مقوی خوراک دی جاتی ہے

یہ اندازہ کیا گیا تھا کہ اس اسکیم کے تحت ۵۰ لاکھ بچوں کو فائدہ پہنچے گا جبکہ اس وقت اوسطاً ۴۷ لاکھ بچے اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ ساتویں منصوبے میں اس اسکیم کے تحت ۵ ارب ۵۰ کروڑ روپے خرچ کئے جانے کا اندازہ ہے جبکہ ۱۹۸۶ء میں ۳۴ کروڑ ۱۹ لاکھ خرچ کئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں اس اسکیم کے سلسلے میں ۸۵۷۷ اشخاص کو روزگار بھی ملا ہے۔

مفت درسی کتابیں

رواں اسکول سال سے غیر قبائلی علاقوں کے اسکولوں میں پہلی سے چوتھی جماعت تک ۲۶ لاکھ ۸۱ ہزار طلباء کو اور قبائلی علاقوں کے اسکولوں میں پہلی سے ساتویں جماعت تک ۱۰ لاکھ ۲۶ ہزار طلباء کو مفت درسی کتابوں کی تقسیم کی گئی — آئندہ تعلیمی سال سے کُل ۶۱ لاکھ ۲۳ ہزار طلبا کو اس اسکیم کے تحت لایا جائے گا جب کہ قبائلی علاقوں کے اسکولوں میں پہلی سے بارہویں جماعت تک تمام طلباء کو مفت درسی کتابیں دی جائیں گی۔ گجرات ریاست نئے نصاب کی درسی کتابوں کی اشاعت اور تقسیم کی کُل تعداد میں پیش پیش ہے۔

آئندہ تعلیمی برس سے قبائلی علاقوں کے اسکولوں میں پہلی سے ساتویں جماعت تک کے طلباء میں وردیوں کی مفت تقسیم کی جائے گی۔ تعلیمی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے گذشتہ برس نئی تعلیمی پالیسی کے سلسلے میں ۲۵ ہزار ٹیچروں کو تربیت دی گئی۔ امسال مزید ۲۵ ہزار ٹیچروں کو تربیت دی جائیگی۔ ٹیچروں کو تربیت دینے کے لیے دو کالج شروع کئے جائیں گے۔ ایک کالج راجکوٹ میں قائم کیا جائے گا۔

کھیل تعلیمی سرگرمیوں کا اہم حصہ ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہر ضلع میں ایک اسپورٹس ہوسٹل کی تعمیر کی جائے گی۔ علاوہ ازیں ایک یوتھ ہوسٹل ہر ضلع میں ۱۹۹۰ء تک بنا دیا جائے گا۔ ۱۹۹۰ء میں نہرو یوتھ مرکز ہر ضلع میں قائم کئے جائیں گے۔ سردست ایسے مرکز ریاست کے چھ اضلاع میں کام کر رہے ہیں۔

نظر ثانی شدہ ۲۰ نکاتی پروگرام

پردھان منتری کی طرف سے پارلیمنٹ میں جس نظر ثانی شدہ ۲۰ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا گیا تھا اُسے اپریل ۱۹۸۷ء سے عمل میں لایا جارہا ہے۔ اس پروگرام کے تحت جو نشانے مقرر کئے گئے ہیں اُن میں سے بعض درج ذیل ہیں۔

۱۔ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے تحت ۱۴۷۹۲۱ افراد کو فائدہ پہنچایا جائے گا۔

۲۔ قومی دیہی روزگار پروگرام کے تحت ۶۸ لاکھ انسانی دنوں کا روزگار اور دیہات کے بے زمینوں کے لیے روزگار کی گارنٹی پروگرام کے تحت ۶۳ لاکھ ۷۵ ہزار انسانی دنوں کا روزگار پیدا کیا جائے گا۔

۳۔ ۸۰۰ مزید دیہات میں پینے لائق پانی کا اہتمام کیا جائے گا۔

۴۔ ۲۵ مزید کمیونٹی سینٹر، ۱۵۰ مزید ابتدائی صحتی مرکز اور ۳۰۰ مزید ضمنی صحتی مرکز قائم کئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ۸ لاکھ ۳۱ ہزار بچوں کو بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے لگائے جائیں گے۔

۵۔ ۱۲ لاکھ سے زائد افراد کو خاندانی بہبود کی سرگرمیوں میں شامل کیا جائے گا۔ بچوں کے مربوط ترقیاتی سروس کے پراجیکٹ یونٹوں کی تعداد بڑھا کر ۶۲ کردی جائے گی اور اسی طرح آنگن واڑیوں کا نیا نشانہ ۱۱۰۵۸ مقرر کیا گیا ہے۔

نئی صنعتی پالیسی

یکم اپریل ۱۹۸۶ء سے نئی صنعتی پالیسی کو عمل میں لایا گیا ہے جس کا مقصد ریاست میں صنعتوں کو فروغ دینا ہے۔ امداد اور فروخت ٹیکس کی شرحیں پسماندگی اور علاقوں کی حالت کے مطابق مقرر کی گئی ہیں۔

پنا ندھرو لگنائٹ پراجیکٹ کو ۱۰۰ کروڑ روپے کی لاگت سے جدید کاری کی سطح پر لایا جائے گا اور اس کے لیے جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک سے اشتراک کار کیا جائے گا۔

سوراشٹر کے خطے کی صنعتی ترقی کے لیے ۱۵۰۰ کروڑ روپے کا ایک ماسٹر پلان بنایا گیا ہے۔ آئندہ دو برسوں کے دوران صنعتوں میں ۵۰ کروڑ روپے کا سرمایہ لگا کر تقریباً ۵۰ ہزار لوگوں کو روزگار مہیا کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔

ریاست کی صنعتی ترقی کے لیے ایک قابلِ تعریف اقدام کیا گیا ہے وہ ہے "اوپن ہاؤس" کی اسکیم جسے صنعتی ترقی سے متعلق مسائل کو تیزی سے نبٹانے کے لیے ہر ضلع میں عمل میں لایا جائے گا صنعتی ترقی سے متعلقہ کوئی بھی شخص اس اسکیم سے فائدہ اُٹھا سکے گا۔ شاید گجرات ملک میں واحد ریاست ہے جہاں صنعت کاروں کو بیک وقت امداد و قرضے دینے سے متعلق مختلف ضوابط کا ایک مجموعہ

(باقی صفحہ ۲۹ پر)



عمران عظیم ۵

اقبال کا تصوّرِ خودی

خودی کا تصورِ اقبال کی شاعری میں کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ خودی انسان کی مرکزی قوّت اور عرفانِ ذات کا نام ہے۔ اقبال کے کلام میں خودی سے مراد معرفتِ نفس سے ہے۔ ان کے کلام کو سمجھنے کے لیے قرآنِ کریم پر گہری نظر ہونی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے خودی کے تصور میں مثنوی سے بڑی حد تک فیض اُٹھایا ہے۔

اقبال سے پہلے اردو شاعری میں خودی کا لفظ غرور، خودستائی وغیرہ کے معانی میں مستعمل تھا اور مذموم سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اقبال نے اسے اپنا کر نئے معنی عطا کیے اور اب یہ لفظ محترم ہو گیا ہے۔

مغرب میں بھی خودی کے تصور کو پیش کیا جا چکا تھا اور مشرق میں بھی اس کی گونج موجود تھی لہٰذا اقبال کو تصورِ خودی کا بانی نہ کہہ کر مدوّن کہنا چاہیے۔ لیکن سطحی مماثلت کے ساتھ اقبال کا تصورِ خودی ان سے خاصا مختلف بھی ہے۔

مغربی مفکرین کے آئیڈیل خدا کے وجود کے سامنے گستاخانہ آتے ہیں اور خدا کے حضور میں نیازمندانہ سرِ تسلیم خم نہیں کرتے۔ یہیں سے اقبال کا مثالی انسان مغربی مفکرین کے مثالی انسان سے مختلف ہو جاتا ہے۔ وہ خودی کے فلسفے کو مذہبِ اسلام کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ خودی کے فلسفے سے متعلق اقبال کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس سے پیشتر جو معلومات فراہم کی جا چکی تھیں، اُن کا مطالعہ اُنھوں نے بغور فرمایا۔ یہ بات الگ ہے کہ خودی کا فلسفہ پہلے سے موجود تھا لیکن اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے طور پر خودی کے فلسفے کی تحقیق و تدوین کی۔ لیکن اقبال کے یہاں خودی کا تصور اپنی مستقل بالذات حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہ مردِ مومن یا انسانِ کامل کے بنیادی وصف کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ خودی دراصل ایک صفت ہے، جس سے متّصف ہوئے بغیر مردِ مومن یا انسانِ کامل کی شخصیت مکمل نہیں ہو سکتی۔

اقبال سے پہلے خودی منفی ([illegible]) معنوں میں مستعمل تھی۔ اقبال نے اسے مثبت جہت عطا کی۔ اس طرح خودی جو ایک مذموم لفظ تھا محترم ہو گیا۔

اقبال اس راز سے واقف ہو گئے تھے کہ جن اقوام میں احساسِ خودی نہیں وہ قومیں مُردہ ہیں۔ بہت سی قومیں اس لیے نیست و نابود ہو گئیں کہ ان میں احساسِ خودی ختم ہو گیا تھا۔ اقبال پروفیسر نکلسن کے نام خط میں خودی کا ترجمہ شخصیت کرتے ہیں۔ خط پڑھ کر خودی کا مطلب اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ انسان بے پناہ صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اگر اپنے اندر مضمر صلاحیتوں کا پتہ انسان پا لیتا ہے تو یہی راز خودی کہلاتا ہے۔ اسی رازِ خودی کو اثباتِ خودی کہا جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک جہان کے عدم وجود کی بحث فضول ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق خودی میں دنیا کا وجود اور عدم وجود شامل ہے۔ خودی سمندر کی مانند ہے۔ خودی کے فلسفے میں بہت وُسعت اور گہرائی ہے ؎

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

خودی وہ جوہر ہے جو ظاہری ذرائع اور مادّی وسائل سے پیدا نہیں ہوتا۔ خودی ازلی طور پر انسان میں ہوتی ہے، لیکن کہیں زندہ، کہیں خوابیدہ اور کہیں مُردہ۔ اقبال نے خودی کے فلسفے

---

۵ شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ۱۱۰۰۲۵
بوجب [illegible]

کو بہت سلیقے سے پیش کیا۔ اقبال کے نزدیک خود شناسی خدا شناسی ہے۔ اقبال نے خودی اور عشق مردِ مومن کی زندگی کا اہم حصہ قرار دیا ہے۔ اسرارِ خودی میں اقبال نے بتایا ہے کہ خودی عشق سے استوار اور مستحکم ہوتی ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی کے اندر لامتناہی امکانات پوشیدہ ہیں۔ وہ اصل عشق خودی کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے اور خودی آخری۔

کچھ عجب نہیں کہ اقبال نے مغربی مفکرین کے خیالات سے بھی فلسفۂ خودی کی تدوین میں مدد لی ہو۔ لیکن خودی کا تصور ان سے مستعار ہرگز نہیں ٹھہر سکتا۔ اس لیے کہ نہ تو سو فیصد مغربی مآخذوں سے اقبال کے یہاں مطابقت پائی جاتی ہے اور نہ سنسکرت ماخذوں سے۔ خودی کا تصور اقبال کی شاعری کا اہم جزو ہے۔ اقبال خودی کے پیغام کے ذریعہ اپنی قوم میں وہ جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے قوم کا ہر فرد خودی پر ناز کر سکے۔

اقبال خودی کے فلسفے کے راز کو بخوبی سمجھ چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال نے اپنی قوم میں یہ صلاحیت پیدا کرنا چاہی کہ وہ اپنی عظمت کا اعتراف کر سکے۔ خودی ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی فرد، جماعت اور قوم کی کامرانی کا راز پنہاں ہے۔ خودی ہی ایک ایسا جذبہ ہے جو منزلِ مقصود پر پہونچاتا ہے۔ ذیل کے سطور میں اشعار بطور حوالہ پیش کئے جاتے ہیں تاکہ خودی سے متعلق اقبال کے خیالات کا صحیح ادراک ہو سکے۔ یہ جوہر خودی کا ہے کہ ؎

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی
ہر ذرّہ شہیدِ کبریائی
بے ذوقِ نمود زندگی موت
تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

انسان کی کامرانی یہی ہے کہ وہ پورے وثوق کے ساتھ اپنے وجود کو دنیا کی تمام تر قوتوں سے برتر سمجھے۔ اپنے وجود اور اپنی شخصیت کو ہر مقام اور ہر موقع پر بلند کرے۔ خودی ایک ایسا جذبہ ہے جس کو سمجھنے کے بعد انسان منزلِ مقصود پر پہونچ جاتا ہے۔

خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مملکتِ صبح و شام سے آگاہ

اقبال کے مطابق اگر روزے، نمازیں اور زہد و تقویٰ خودی کی نگہبانی نہیں کر پاتے تو ان کی کوئی معنویت ہے اور نہ اہمیت۔

یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں

خودی کے بغیر انسان کی ذات کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔ خودی لائقِ قدر ہے۔ انسان کی کامیابی کا راز خودی میں پوشیدہ ہے۔ جس شخص نے خودی کو پہچان لیا، اس نے کائنات کی تمام تر چیزوں پر قابو پا لیا۔ وجودِ انسانی میں خودی کا اہم مرتبہ ہے

اسرارِ خودی مثنوی میں اقبال نے ایک حکایت منظوم کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک پیاسے پرندے نے ریزۂ الماس کو پانی کی بوند سمجھ کر پینے کی کوشش کی۔ پرندے کی چونچ مجروح ہوگئی اور ریزۂ الماس کا کچھ نہ بگڑا۔ ریزۂ الماس نے پیاسے پرندے کا مذاق اُڑایا۔ بالآخر وہیں کسی پتّی پر اوس کی بوند دکھائی دی۔ جس سے پیاسے پرندے نے اپنی پیاس بجھائی۔ اقبال نے اس حکایت کے ذریعے خودی کی حقیقت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ریزۂ الماس اور شبنم کے استعاروں سے خودی کے مختلف درجے (Degree) اور مختلف حیثیتیں سمجھانے کی سعی کی ہے۔ ریزۂ الماس کی چمک اور مضبوطی ظاہری یا معنوی یا سطحی نہیں ہے۔ وہ تو اندر سے مستحکم اور مضبوط ہے۔ انسان بھی جب اپنی ممکنہ مضمر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے تو ایسا ہی توانا اور مستحکم ہو جاتا ہے۔

اسرارِ خودی میں اقبال نے ایک نوجوان کا واقعہ منظوم کیا ہے۔ جس کا خلاصہ ہے۔ سید علی ہجویری کی خدمت میں کوئی نوجوان حاضر ہوا۔ کہنے لگا۔ حضرت، میں دشمنوں کے نرغے میں پھنس گیا ہوں۔ میری مدد فرمایئے۔ سید علی ہجویری نے فرمایا۔ خود کو حقیر و کمتر مت سمجھو اور دشمن کا خوف اپنے دل سے نکال دو۔ سپرد آزمائی کی جو قوتیں تمہارے دل میں ہیں انھیں بیدار کرو۔ اس واقعہ سے یہ بات ظاہر ہے کہ جب انسان خود کو ناتواں محسوس کرتا ہے تو اس کی تمام تر صلاحیتیں بیکار ہو جاتی ہیں۔

اقبال ایک جگہ فرماتے ہیں کہ جس قوم نے اپنے اندر سیرتِ فولاد پیدا کر لی اسے کسی فولاد سے کوئی ڈر نہیں ہو سکتا۔

اس قوم کو فولاد کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے غلاموں کی خودی سیرتِ فولاد

اسرارِ خودی میں شیر اور بکری کی حکایت بھی منظوم ہے۔ جس کا خلاصہ ہے کہ ایک زمانہ شناس بکری نے شیر پر فتح حاصل کرنے کے لیے اسے تہذیب اور اخلاق کے دائرہ میں ناتوانی اور عاجزی کا سبق پڑھا دیا۔ جب گوشت خور شیر گھاس پر گذارا کرنے پر آمادہ ہو گیا تو اس میں شیروں کی سی کوئی بات ہی نہ رہ گئی۔ وہ شیر کی کھال میں بکری ہو گیا۔ اب اس میں نہ وہ پہلی سی ہمت رہی اور نہ طاقت۔

اقبال مردِ کامل کو اس کی صلاحیتوں سے باخبر کرنا چاہتے ہیں۔ اقبال اپنی زبوں حال قوم کے ہر فرد میں احساسِ خودی کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ قوم کے ہر فرد کو مردِ کامل دیکھنا چاہتے ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ مردِ کامل یا مردِ مومن کی شناخت یہی ہے کہ وہ دنیا کی کسی چیز یا طاقت

کا تابع نہیں بلکہ تمام زمانہ اس کا تابع ہے۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

انسان کو اپنی عظمت کا اعتراف کرنا چاہیئے۔ خدا تعالیٰ نے بھی انسان کو اشرف المخلوق کہا ہے۔ اللہ رب العزت کے حکم پر ابلیس نے آدم کو سجدہ نہیں کیا تھا۔ اس گستاخی کو اللہ تعالیٰ نے معاف نہیں کیا اور ابلیس کو اس گستاخی کی سزا دی۔ اسی لیے اقبال نے مردِ کامل کو مردِ قلندر بھی کہا ہے۔ اقبال کے نظام فکر میں حرکت و عمل کا بہت دخل ہے۔ مردِ کامل وہ ہے جس کی خودی مستحکم ہے۔ ساری کائنات مردِ کامل کے زیرِ فرماں ہوتی ہے۔ انسان مجبور و لاچار نہیں ہے۔ اگر وہ چاہے تو استحکام خودی سے ساری کائنات کو زیرِ نگیں کر سکتا ہے۔ مردِ کامل کے قبضۂ قدرت میں نہ صرف زمین و آسمان ہوتے ہیں بلکہ وہ چاہے تو قضا و قدر کو بھی اپنی مرضی کے تابع کر سکتا ہے۔ نظام زمانہ بدل سکتا ہے اور آئینِ قدرت میں ترمیم کر سکتا ہے۔

علامہ کے نزدیک مردِ کامل سرورِ کائنات کی ذاتِ گرامی تھی۔ جس طرح آپؐ کی شخصیت مثالی تھی اسی طرح آپ کی خودی بھی عدیم المثال تھی اور اقبال کے اس شعر سے مطابقت رکھتی تھی ؎

تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود
حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و سوز و حیات

خودی کوئی اوڑھا ہوا احساس یا طاری کیا ہوا جذبہ نہیں۔ یہ ایمان و عمل کی مستقل قوت ہے جو ارتقائی مراحل سے گذر کر اپنی معراج کو پہنچتی ہے۔ خودی کے ارتقائی سفر کو آسان کرنے کے لیے اقبال نے خودی کی تربیت کے بھی اصول بتائے ہیں۔

تربیتِ خودی : تربیت خودی کے تین مراحل ہیں۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابت الٰہی۔

اطاعت، تکمیل خودی کی پہلی کڑی ہے۔ خدا کے احکام کی تعمیل اطاعت ہے۔ جو شخص اپنے نفس کو مار دیتا ہے۔ اس کی خودی مستحکم ہو جاتی ہے۔ جو اپنے نفس کو نہیں مار سکتا۔ اس کی خودی ناتواں اور کمزور ہوتی ہے۔ ضبط نفس، تکمیل خودی کی دوسری کڑی ہے۔ نفس امارہ کسی بھی شخص کو اطاعت سے منع کرتا ہے۔ دراصل شہوت، غضب، حرص، تکبر اور خود غرضی جیسی چیزیں بدی کی طرف مائل کرتی ہیں۔ جب انسان ان سب چیزوں سے پرہیز کرتا ہے۔ جن سے خدا تعالیٰ نے روکا ہے۔ وہ خواہشوں کے حصار سے باہر ہو جاتا ہے اور ضبط نفس کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

نیابت الٰہی، تکمیل خودی کی آخری کڑی ہے۔ جب انسان اللہ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے صفات الٰہی سے متصف ہو جاتا ہے۔ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے عین مطابق کر لیتا ہے تو وہ نیابت الٰہی کی سند حاصل کر لیتا ہے۔ اللہ کی سرزمین پر اس کے احکامات کو زندہ کرتا ہے۔

قرآن شریف کی اس آیت میں بھی اس امر کی وضاحت موجود ہے۔

وما خَلَقْتُ الجِنَّ وَالانسَ اِلَّا لِیَعبُدُون
(بیشک میں نے جن اور انسان کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے)۔

مندرجہ بالا باطنی صفات سے خودی روح اور ایمان کے اس شرف کی حامل ہو جاتی ہے جس کے بغیر ہٹلر اور مسولینی کی خودی گمراہ اور نامکمل تھی۔ یہی وہ شرف ہے جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں موجود تھا۔

اقبال کے زمانۂ شاعری میں مسلمان تمام دنیاوی وسائل اور طاقتوں سے اسلام کے دورِ آغاز کے مقابلے میں زیادہ بہرہ مند تھے لیکن ان کی خودی سو رہی تھی۔ لہٰذا وقت کا تقاضہ یہی تھا کہ ہندوستانی عوام کو عظمتِ رفتہ کا آئینہ دکھا کر ان میں ثابت قدم اور سرخرو ہونے کی ترغیب و تحریک پیدا کریں۔ غرضیکہ اقبال کا فلسفۂ خودی کوئی رومانی تصور نہیں، عصری معنویت سے پُر اور ایک عملی پیغام تھا۔ جس نے بجا طور پر جمود و تعطل کو ختم کر کے قوم کی شیرازہ بندی کی تھی جسے ہم دیکھ اس لیے نہیں سکتے کہ شعر و ادب کے اثرات غیر محسوس ہوتے ہیں۔

●

بقیہ، اداریہ

اور اخباروں میں باقاعدہ کالم نویس کی حیثیت سے طنزیہ مضامین لکھتے رہے، آپ کا اصلی نام رام لال بھاٹیہ تھا مگر آپ اپنے قلمی نام فکر تونسوی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ آپ کا تعلق چونکہ متحدہ پنجاب کے ڈیرہ غازی خاں میں تونسہ شریف سے تھا، اس لیے آپ کو تونسوی کہا جاتا تھا۔ آپ نے اُردو کے مشہور روزنامہ "ملاپ" میں پیاز کے چھلکے کے عنوان سے تقریباً ۲۵ برس تک مسلسل لکھا، پنجاب کیسری میں آپ پیاز کے چھلکے کے عنوان کے تحت "مردوں کے نام خط" لکھا جو آخری تحریر کہی جا سکتی ہے۔ آپ کو ۱۹۸۰ء میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ملا۔ اس کے علاوہ آپ کو غالب ایوارڈ ملا۔ پنجاب نیز اُترپردیش کی سرکاروں نے بھی آپ کو اعزازات سے نوازا۔

آپ کی وفات اردو دنیا کا ایک نقصانِ عظیم ہے جس کی تلافی آسان نہیں۔ آپ کے پسماندگان میں آپ کی بیوہ، دو صاحبزادیاں اور ایک بیٹا ہے۔ ادارہ مرحوم کے پسماندگان سے اظہار تعزیت کرتا ہے اور ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ ●

مدن لعل منچندا[۵]

اُردو ادب اور عصری آگہی

آگہی سوچ کی وہ پہلی کرن ہے جو ادراک کے پردے پر جھلملاتی ہے۔ اس کی تمام تر روشنی ایک ہی نقطے پر مرکوز ہوتی ہے۔ جس سے معانی اور ماہیئت سمجھنے یا جوہر کے تشخص میں مدد ملتی ہے۔ اس کا دوسرا رُخ منطقی سوچ ہے جس کی روشنی کا دائرہ بتدریج بڑھتا رہتا ہے اور آگہی کی حدود تجریدی تصورات تک پھیل جاتی ہیں۔ ایک نظریے کے مطابق اس سلسلے کی پہلی کڑی ماحول یا ارد گرد کا شعور ہے جو سراسر بنیادی اور فطری ہے۔ اس سلسلے کی دوسری کڑی معانی کا شعور ہے جسے دریافت کرنا بلاشبہ انسانی سعی یا کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے کی تیسری اور آخری کڑی تعلقات قائم کرنے کی روش ہے جو در حقیقت معنی دریافت کرنے کے عمل ہی کا ایک ثمر ہے۔

عصری آگہی سے اُردو ادب ایک خاص حد تک اثر انداز ہوا ہے۔ اس لیے اُن تصورات کا جس سے عصری فضا گرانبار تھی ایک سرسری جائزہ ضروری ہے۔ ملک ایک سیاسی ہیجان، سماجی ابتری اور معاشی بحران سے گذر رہا تھا۔ مہاتما گاندھی نے اپنے لاثانی سیاسی فلسفے کی ایک ایسی طاقتور قندیل روشن کی تھی۔ جس سے راہیں جگمگا اٹھی تھیں۔ انھوں نے اپنی جدوجہد سے ملک کے کونے کونے میں انقلاب کی ایک لہر پیدا کر دی تھی اور حُب الوطنی اور انسان دوستی کے ایک نئے جذبے کو بیدار کیا تھا۔ بیرونی ممالک میں بھی علم کے کچھ نئے سرچشمے پھوٹے تھے۔ مارکس کی اشتراکیت کا فلسفہ اور جمہوریت کے خاتمے پر ایک نیا سویرا نمودار ہوا تھا۔ جس سے صدیوں کا گھٹا ٹوپ اندھیرا کافور ہو گیا تھا۔ اسی طرح فرائیڈ کی داخلیت کی تھیوری، برگسن کی وقت کی اور آئین اسٹائن کی خلائی فضا اور توانائی کی تھیوری نے ا‍ک تہلکہ مچا دیا تھا۔ جن سے بساطِ دہر ہی بدل گئی۔

ان نئے سیاسی نظریات، فلسفۂ حیات، علمی اور سائنسی انکشافات نے جس سے عصری آگہی عبارت ہے زندگی کے سارے لوازمات اور ساری قدروں کو بدل دیا تھا۔ ان شدید ذہنی زلزلوں کے مسلسل جھٹکوں سے پرانے عقائد کے حصار کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ مذہب کی فسوں کاری جاتی رہی اور نیکی اور ثواب، ریاکاری اور فریب نظر آنے لگے۔ ردّ عالمی جنگوں کی ہولناک تباہی اور بربریت کے متعدد سانحات نے یہ ثابت کر دیا کہ ہم محض وحشی ہیں۔ قوم کے ذہنی کرب اور اضطراب نیز اقتصادی بدحالی، معاشرتی ناانصافی اور فکری انتشار نے اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کو جنم دیا جو ایک جہانِ نو کی تعمیر اور ایک نئے سماج کی تشکیل کی ایک منظم کوشش تھی۔

چنانچہ اُردو شاعری میں عصری آگہی کے زیر اثر سماجی اصلاح اور وطن پرستی کی جن صحتمند روایات کی مولانا حالی اور ڈاکٹر محمد اقبال نے داغ بیل ڈالی تھی انھیں روایات کو جوشؔ، فراقؔ، ساغر نظامی، فیض، مجاز، مخدوم محی الدین، اختر الایمان، جاں نثار اختر، احسان بن دانش، علی سردار جعفری، نریش کمار شاد، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی نے آگے بڑھایا ہے۔ بلاشبہ ان شعرا کے کلام میں مارکس کے اشتراکی فلسفہ کی شعوری یا غیر شعوری کارفرمائی ہے۔

اسی طرح پریم چند اُردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے عصری آگہی کے تقاضوں اور وطنیت کے جذبے کو پوری طرح افسانوں میں سمو دیا ہے۔ اُن

۵ ڈی، ۳۸۲، موتی باغ، نئی دہلی۔

کے افسانے اُس دَور کے فلاکت زدہ کسانوں، عوام کے دُکھ درد کی مُنہ بولتی تصویریں ہیں۔ اعظم کریوی، علی عباس حُسینی، سدرشن اور سلطان حیدر کے افسانے بھی اسی حقیقت نگاری کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ انگارے کے افسانوں میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہے۔ دوسرے دَور کے افسانہ نگاروں میں جنھوں نے سیاسی زندگی کے لیے آئے ہوئے معاشی اور معاشرتی نتائج کی بڑی واضح اور مکمل تصویریں اپنے افسانوں میں پیش کی ہیں۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، اختر انصاری، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جدید دَور کے افسانہ نگاروں میں انور عظیم، جیلانی بانو، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، م م راجندر کے افسانے بھی عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔

اس دَور کا دوسرا بڑا رجحان بھی عصری آگہی کا مرہونِ منّت ہے اور فرائیڈ کے داخلیت کے فلسفے سے فیضیاب شعراء کا وہ گروہ ہے جنھوں نے شاعری میں جدیدیت کے نام پر گوناگوں ہیئتی تجربات کئے ہیں۔ آزاد نظم کی بنیاد ڈالی ہے، اور جدید شاعری کو پھیلایا ہے اور نئے امکانات سے آشنا کیا ہے۔ اشاریت اور ابہام ان کا خاصہ ہیں۔ ان میں ن م راشد، میراجی، قیوم نظر، سلام مچھلی شہری، کرشن موہن اور بلراج کومل۔ اس روش کے علمبردار رہیں۔ ان کی شاعری میں انفرادیت، بے یقینی، مایوسی کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں اور وہ سماجی تصورات سے گریز اور اجتماعی ناآسودگی کی مظہر ہیں۔

افسانے میں داخلیت اور تحلیل نفسی کے تجربات نے اُردو ادب کو مالامال کیا ہے اور خارجی حقائق کے ساتھ ساتھ اور انسانی جذبات اور احساسات کے ردّ عمل سے سماجی اصلاح کا آلۂ کار بنایا ہے۔ اُس میں راجندر سنگھ بیدی، منٹو، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، محمد حسن عسکری، پریم ناتھ در خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ خصوصاً منٹو اور عصمت چغتائی نے سماج کے گھناؤنے چہرے پر سے جس بے باکی سے پردہ اٹھایا ہے اور جس طرح معاشرے کے قابلِ نفرین پھوڑوں کی نشتر زنی کی ہے، اُنھیں عریانیت کا لیبل لگا کر اُن کی قدر و قیمت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ عصری آگہی کے تقاضے زندگی کی حقیقتوں کو آشکار کرنے پر مصر ہیں جن میں حقیقی اصلاح کا راز مضمر ہے۔ لیکن ایک دوسرے نظریے کے مطابق منٹو اور عصمت کے چند افسانے معتدل اور متوازن زندگی سے کہیں دُور ہیں۔ جن کا شمار صالح ادب میں نہیں کیا جا سکتا۔

بحیثیت مجموعی اردو افسانے نے عصری آگہی کے زیرِ اثر دس برس کے قلیل عرصے میں اُن بلندیوں کو چھُو لیا ہے کہ بلا تامل اُردو کے مختصر افسانے کا عالمی معیاری افسانوں میں شمار ہو سکتا ہے۔ لمبے مختصر افسانے یا ناولٹ بھی اُردو ادب میں چند حسین مثالیں موجود ہیں جن میں سجاد ظہیر، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر اور م م راجندر ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ناول بھی افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ عصری آگہی کے زیرِ اثر، پریم چند نے، وطن پرستی کے جذبے سے سرشار ہو کر جو سماجی ناول لکھے ہیں ایک ناقد کی رائے میں اُن میں بلاشبہ ہندوستان کا دل دھڑکتا نظر آتا ہے۔ اور وہ ہندوستان کی تہذیب تمدن اور اخلاقی قدروں کے عظیم شاہکار ہیں۔ جن میں عام لوگوں کی سادہ زندگی اور اس سادہ زندگی کی پیچیدگیوں کو نہایت خوش اسلوبی سے اُجاگر کیا ہے۔ اُردو ادب پریم چند کے ناولوں پر بجا فخر کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی اور ناول نگار ان شاندار روایات کو آگے نہیں بڑھا سکا ورنہ ہی اُن کے ناول عالمی ناول کی سطح کو چھُو سکے ہیں۔ کم و بیش یہی حال اُردو ڈرامے کا بھی ہے۔ اُردو میں ڈراموں کی بیحد کمی ہے، اور جو ڈرامے لکھے گئے ہیں اُن میں سے کسی کو ممتاز ادبی حیثیت نہ حاصل ہو سکی۔

نثری ادب میں ہلکے پھلکے انشائیے ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ مولانا آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ غلام السیدین اور پروفیسر مجیب کے انشائیے علمی اور فلسفیانہ تحریر کی خوبصورت مثال ہیں جو سنجیدگی، زورِ بیان اور عصری آگہی کے نادر نمونے ہیں۔ تنقید بھی تخلیقی ادب کا ایک اہم حصّہ ہے۔ اس میں چند نقادوں نے غیر معمولی ذہانت اور عصری آگہی کا ثبوت دیا ہے۔ اُن میں فراق گورکھپوری، مجنوں، آل احمد سرور، ڈاکٹر اعجاز حسین، وقار عظیم، ... ت بریلوی، سید احتشام حسین، اور ڈاکٹر ... لوبی ... نارنگ ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

ظاہر ہے جدید اُردو ادب عصری آگہی سے ایک بڑی حد تک بہرہ ور ہے اور عصری تقاضوں سے مکمل طور سے ہم آہنگ ہے۔ ●

بقیہ' اضافہ آبادی کی روک تھام

ہو کہ اگر مجھے بھی اپنے بچوں کو پیٹ کا دانہ کھلانا پڑتا تو میری جان جوکھوں میں پڑ جاتی۔

اس زمانے میں ہندوستان کے معاشی حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہم صرف دو بچوں کی پرورش اچھے ڈھنگ سے کر سکیں، اگر ہم نے دو بچوں کی صحت اور تعلیم پر بھی پوری توجہ دی تو ہماری آئندہ نسل صحت مند اور خوشگوار زندگی گزار سکے گی۔

●

رفعت سروش : ڈی، ۲/اے۔ ڈی ڈی
اے فلیٹ، منیر کا۔ نئی دہلی۔

اب مرے پاس ترے خط، نہ تری تحریریں
اجنبی لگتی ہیں ماضی کی سبھی تحریریں
ذہن میں اب کوئی چہرہ نہ کسی زلف کے خم
ٹوٹتی جاتی ہیں یادوں کی سبھی زنجیریں
ظلمتِ شب کے سمندر سے نکل آئے ہم
ساحلِ نور پہ رقصاں ہیں نئی تنویریں
خواب تو خواب ہیں آنکھوں میں بسے ہیں اب تک
لے گیا وقت مگر ساتھ حسیں تعبیریں
ان غلاموں کو نہ دو رقص کی مہلت رفعت
توڑ ڈالیں نہ کہیں پاؤں کی سب زنجیریں

عطا عابدی : ماہنامہ مسافر، مدرسہ چشمۂ فیض
ململ، ضلع مدھوبنی ۲۲۹، ۸۴۷ (بہار)۔

دنیائے بے ثبات میں عیش و طرب نہ ڈھونڈ
حسنِ عمل سے کام لے نام و نسب نہ ڈھونڈ
ہوگا تجھے ملال بہت جان کر سبب
اپنے ہنسی اڑائیں تو ہرگز سبب نہ ڈھونڈ
کر خواب سے گریز، حقیقت کی سمت دیکھ
موجودگیٔ شمس میں آثارِ شب نہ ڈھونڈ
اے شیخ یہ حرم ہے کوئی میکدہ نہیں
آبِ وضو تلاش کر آبِ عنب نہ ڈھونڈ
وہ دن گئے کہ گھر کے جھمیلوں سے دور تھا
مجھ میں عطا وہ پہلا سا ذوقِ ادب نہ ڈھونڈ



شہپر رسول

شہپر رسول : ۳۹۔ احمد نگر، دودھپور
علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱۔

پناہ گاہوں میں جو سائبان والے تھے
امیرِ شہر تھے، پختہ مکان والے تھے
نہ کوئی غم تھا کسی کو نہ آپسی شکوہ
یہ واقعے تو بڑے امتحان والے تھے
بڑے میاں! جنھیں تمغہ ملا ہے پس از مرگ
سنا ہے وہ، کوئی اردو زبان والے تھے
تھی جن کے بیچ میں دیوارِ خندۂ آہو
وہ تیر والے تھے اور وہ کمان والے تھے
زمیں قبول نہیں کرتی نقشِ پا ان کے
وہی تو لوگ ہیں جو آسمان والے تھے
یقین والے تو سب لوٹ آئے تھے لیکن
رواں دواں تھے جو، سارے گمان والے تھے
کہاں تلک نہ بہک پاتی خواہشِ منزل
تمام میل کے پتھر تھکان والے تھے
زمیں کی سیر ہی سے مطمئن تھا وہ شہپر
پر اس کے بازو تو اونچی اڑان والے تھے

حسین کرہانی : او۔ ایس۔ ڈی
بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بنک، دریا گنج، نئی دہلی ۲۔

مجھے جستجو ہے نہ موت کی، نہ تو زندگی کی تلاش ہے
جو تری خوشی کا ہو سلسلہ، مجھے اُس خوشی کی تلاش ہے

مجھے عیش کا یہ صلہ ملا، تجھے دل سے جس نے بھلا دیا
تری یاد دل سے نہ مٹ سکے، مجھے بے بسی کی تلاش ہے

جو یہ فیضِ وحشتِ دل کبھی، درِ یار پہ میں پہنچ گیا
مجھے دیکھتے ہی وہ کہہ اٹھا، تجھے کیا کسی کی تلاش ہے

مری زندگی ہے اداس یوں کہ جنوں بھی کام نہ آسکا
جسے کہہ سکیں غمِ معتبر، اسی آگہی کی تلاش ہے

ہے شعور جوہرِ ذات کیا، ہے حیات و عیش کی بات کیا
ہو عطا یہ جس کی عطا سدا، مجھے اس سخی کی تلاش ہے

تیرے میکدہ میں ہے کچھ خبر، کسے ڈھونڈھتی ہے تری نظر
مرے جام میں کرے رقص جو، مجھے اُس پری کی تلاش ہے

میں تجلیوں میں جو کھو گیا، تو نہاں بھی راز ہوئے عیاں
مری اک جہاں کو تلاش ہے مجھے کس کسی کی تلاش ہے

یہی آرزو ہے اب آخری کبھی ڈوب کر نہ ابھر سکوں
تجھے کیا بتاؤں اے ہمنشیں، یہ مِ بیخودی کی تلاش ہے

جو ہوں بادہ خوار ہزار ہا نہ مقام پائیں گے یہ مرا
ترے میکدے کے شباب کو، مری تشنگی کی تلاش ہے

جو نگاہِ اہلِ زمانہ میں، کہیں شرک ہو کہیں کفر ہو
اے حسینی عشقِ حسینؑ میں، اُسی خودسری کی تلاش ہے

وطن کے نوجوانوں کے نام

ایم، اے شمسی
دودگھرا، جالہ، دربھنگہ (بہار)

اے جوانانِ وطن اے عظمتِ ہندوستاں
ہے تمھاری کاوشات سے قائم وجودِ گلستاں
برق لہرائے نہ اس رنگین و زرّیں باغ پر
خون سے سینچا ہے باپوں نے یہ پیارا آشیاں

کل کے گاندھی اور جواہر ہو تمھیں اے مہرباں
اے جوانانِ وطن تم ہو وطن کے پاسباں

تم اگر بدلو گے تو بدلے گا یہ اپنا وطن
نفرتوں کو بھول کر سیکھو محبت کا چلن
ہے یہی اب وقت آؤ متحد ہو جائیں ہم
آؤ ہر اک دل میں بھر دیں ہم محبت کی لگن

ہو نہیں سکتیں ہماری کوششیں اب رائیگاں
اے جوانانِ وطن تم ہو وطن کے پاسباں

ہاں حدِ پرواز سے اونچی ہر اک پرواز ہو
دیس کی عظمت پہ مٹنے کا سدا انداز ہو
تم چراغِ ملک ہو تم ہو وطن کی روشنی
کیوں نہ پھر ہندوستاں کو آج تم پر ناز ہو

دیکھ لو جھکنے نہ پائے پرچمِ ہندوستاں
اے جوانانِ وطن تم ہو وطن کے پاسباں

اپنے پیارے ملک سے غربت مٹا سکتے ہو تم
ظلمتوں میں پیار کی شمعیں جلا سکتے ہو تم
گر وطن کو ہو ضرورت پھر تمھارے خون کی
وقت آنے پر یقیناً سر کٹا سکتے ہو تم

اب تمھارے ہاتھ میں ہے گردشِ کون و مکاں
اے جوانانِ وطن تم ہو وطن کے پاسباں

دیس کی عزّت تمھیں پیاری ہو اپنی جان سے
ہر قدم پہ لڑتے جاؤ اٹھتے طوفان سے
خوں سے لت پت ہوں بازو زخم سے چھلنی بدن
پھر بھی آگے بڑھتے جاؤ فاتحانہ شان سے

خون سے لکھے گی دنیا یہ تمھاری داستاں
اے جوانانِ وطن تم ہو وطن کے پاسباں

اختر شاہجہانپوری: رنگین چوپالے
شاہجہانپور، ۲۴۲۰۰۱۔ (یو.پی)

دعائے نیم شب بیکار کر دی
تری یادوں کی خوشبو ایسی مہکی
انھیں یہ ضد کہ بیگانے بھی آئیں
کہ محفل میں ذرا ہلچل تو ہوگی
حسیں چہرے بھی کمہلائے ہیں اب تو
قیامت ہے نسیمِ صبح گاہی
زمانے میں ہمارے تذکرے ہیں
تری قربت نے وہ شہرت عطا کی
درِ زنداں پہ ہنگامے ہیں برپا
یہ کس نے آگ گلشن میں لگا دی
مجھے چھوڑا تھا طوفانوں میں جس نے
کنارے پر اسی کی لاش نکلی
گلے مل کر ہوئے سیراب دونوں
انھیں بھی پیاس تھی پیاسے تھے ہم بھی
تمھیں بھی ناز ہے اختر کسی پہ
مگر یہ بات تم کھل کر کہو بھی

●

منظر امام: کتابستان، چندوارہ، مظفرپور (بہار)

لمحہ لمحہ بھولتا جاتا ہے خوابِ زندگی
قطرہ قطرہ سوکھتا جاتا ہے آبِ زندگی
رفتہ رفتہ سرد پڑ جاتے ہیں کارِ جستجو
چہرہ چہرہ ماند پڑ جاتی ہے تابِ زندگی
قصہ قصہ جو پڑھا تھا گاؤں کے چوپال میں
قریہ قریہ آج بھی ہے وہ کتابِ زندگی
شیشہ شیشہ گرد تصویریں بھی دھندلائی ہوئی
ریزہ ریزہ توڑ دے دم جیسے تابِ زندگی
سایہ سایہ دھوپ ہے منظر ہر اک جھلسا ہوا
صحرا صحرا کیوں ہے بھٹکاتا سرابِ زندگی

●

سلمیٰ حبیب ٥



فرض

مہندی اور نیم کی ڈالیوں سے جھک جھک کر نکلتے سورج کو سلام کیا اور وہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اپنے بستر سے اُٹھ بیٹھا۔ ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد سفر کے لیے تیاری کرنے لگا اور تھوڑی ہی دیر میں اس کی گاڑی تیزی سے ایرپورٹ کی جانب بڑھنے لگی۔ کیوں کہ آج اسے پھر اپنے آبائی وطن سے دُور ماں، باپ، بھائی بہن سے دُور ریت کی وادی میں چلے جانا تھا۔ آٹھ دِنوں کی چھٹیاں دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوگئی تھیں۔

ہوائی جہاز رفتہ رفتہ اوپر کی طرف پرواز کرنے لگا۔ وہ رقت انگیز نظروں سے اپنے وطن اور اپنے گھر والوں کے دُھندلے چہروں کی طرف دیکھتا رہا جو رفتہ رفتہ اوجھل ہو رہے تھے۔ ذمّہ داریوں اور فرض نے انوار کو پھر ریت کی وادی میں لا پٹخا تھا۔

دوبئی کے ایرپورٹ سے باہر نکلنے کے بعد تھکے قدموں سے چلتا ہوا اپنے فلیٹ تک پہونچا اور دھول سے بھرے بستر پر اپنے آپ کو گرا دیا۔ یہاں نہ کوئی اس کا پُرسانِ حال تھا اور نہ ہی کوئی ہمدرد۔ نہ ماں تھی جو کھانے کو پوچھتی اور نہ بہنیں تھیں جو دل کو بہلاتیں سوچتے ہی سوچتے وہ نیند کی آغوش میں پہونچ گیا۔

آنکھیں کھُلیں تو دن چڑھ آیا تھا۔ بھوک شدّت سے محسوس ہو رہی تھی اس نے سوچا ابھی ایک میل دور چل کر کینٹین کھانے کے لیے جانا ہوگا۔ کوئی تو ہے نہیں جو ایک پیالی چائے کو بھی پُوچھے۔

کیسی بے بسی اور مجبوری ہے کہ وہ اپنی منزل پانے کے بعد بھی حالات اور فرض کے ہاتھوں مجبور و بے بس ہے۔ ساتھی انجنیئر کہتے ہیں اب شادی کر لو کب تک ایسے ہی تکلیف اُٹھاتے رہو گے۔ مگر ابھی شادی کیسے کر سکتا ہوں۔ گھر پر تین جوان کنواری بہنیں ہیں۔ چھوٹے بھائیوں کا مستقبل ہے ضعیف اور بیمار باپ ہیں اور ان سبھوں کی اُلجھنوں اور ذمہ داریوں میں پھنسی ہوئی ماں ہے۔

بچپن کی یادیں انوار کے ذہن کو بوجھل کرنے لگیں۔ والدین کی ناسمجھی نے اس پر اچھا خاصہ بوجھ لاد دیا ہے۔ لیٹے ہی لیٹے اس کا ذہن خلاؤں میں اُڑنے لگا اور زندگی کی کتاب کے اوراق ہواؤں کے دوش پر بکھرنے لگے۔

زندگی کا پہلا دور ــــ اس کا بچپن ــــ خوشحال زندگی ــــ والدین کا خواب، ڈگری کورس کی طالبہ جوان بہنیں ــــ چاروں طرف سے رشتوں کی بوچھار ہونے لگی مگر والدین کی سادہ لوحی زمانے کے اُتار چڑھاؤ سے بے خبر سارے رشتوں کو ٹھکراتی رہی۔

"نہیں ہماری لڑکیاں ابھی پڑھ رہی ہیں۔"

"ایسے ماحول میں ہمیں لڑکی نہیں دینی ہے۔"

"لڑکا معمولی اسکول میں ٹیچر ہے۔ بات بنتی نظر نہیں آ رہی ہے۔ ٹھیک ہے اپنے رشتہ داروں سے مشورہ کر کے جواب دوں گی۔"

اور پھر اونچے خواب دیکھنے والے والدین کی لڑکیوں کے لیے کوئی محلوں کا شہزادہ نہ آسکا اور یہ سلسلہ بالکل معدوم ہوگیا۔

زندگی کا دوسرا دور ــــ انوار کی جوانی ــــ والد کا ریٹائرمنٹ جس سے گھر کے نظام میں ہلچل مچ گئی۔ والدین چاہتے تھے کہ انوار

(باقی ص ۱۵ پر)

٥ معرفت فصیح الرحمٰن، ۱۳۔ سرسید احمد روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۱۴۔

تبصرے

نام کتاب : سائنس کی باتیں
مصنف وناشر: ڈاکٹر محمد اسلم پرویز
قیمت : ۲۰ روپے

"سائنس کی باتیں" ایک بامقصد کتاب ہے جس کے لیے مصنف مبارکباد اور ستائش کا مستحق ہے۔ جس مصنف کی پہلی کتاب اتنی اچھی ہو اُس سے مستقبل میں یقیناً بے شمار توقعات وابستہ کی جائیں گی۔ جو موضوعات اس کتاب میں زیر بحث آئے ہیں، ان کی نوعیت ہمہ گیر ہے۔ آج کی دنیا کا ہر فرد بالواسطہ یا بلا واسطہ ان سے منسلک ہے۔ اُردو قارئین پر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز کا زبردست احسان ہے کہ انھوں نے سائنسی موضوعات پر طبع آزمائی کی اور انھیں پہلے اخبار کے کالموں کے ذریعے اور اب اس کتاب کی شکل میں عوام تک پہونچایا۔ کتاب کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ مصنف نے مختلف مسائل، ان سے متعلقہ معلومات اور ساتھ ہی ان کے مجوزہ حل بہت دلکش انداز سے بیان کیے ہیں۔ مضمون "آزادی کے بعد زرعی ترقی" پڑھنے کے بعد قاری خود بخود قائل ہو جاتا ہے کہ ہم نے اس میدان میں ترقی تو ضرور کی ہے لیکن بڑھتی ہوئی آبادی اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہ بات بھی پوری طرح واضح ہو کر ابھرتی ہے کہ جنگلات کا استعمال ایک بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ اس کے علاوہ ہماری فضا اور پانی کی لگاتار بڑھتی کثافت، جانوروں اور نباتات کی اقسام کا تیزی سے ناپید ہونا، زہریلی جراثیم کش دواؤں کے بے قاعدہ اور بے تحاشہ استعمال اور پانی کی بڑھتی ہوئی قلت موجودہ دور کے وہ سنجیدہ مسائل ہیں جو ہم نے خود اپنے ہاتھوں پیدا کئے ہیں اور اب صرف ہماری کوششوں ہی سے انھیں قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ مصنف کا اوّلین مقصد عوام میں ان مسائل پر غور و فکر کی فضا پیدا کرنا اور ساتھ ہی وہ سائنسی شعور بیدار کرنا ہے جو انھیں اجتماعی طور پر ان مسائل کا تدارک کرنے پر آمادہ کر سکے اور میں سمجھتا ہوں وہ اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہے۔

ایک سائنس کے طالب علم سے زبان کا سہو کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے اور بقول سید حامد صاحب مصنف نے زباں داں ہونے کا دعویٰ بھی کب کیا ہے۔ لیکن زبان چونکہ سادہ ہے اور موضوعات براہِ راست خود عوام سے متعلق، اس لیے قاری کی مکمل دلچسپی قائم رہتی ہے اور زبان کا سہو جہاں کہیں بھی ہے ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اعداد وشمار تمام مضامین کی جان ہیں، لیکن اگر انھیں گرافس اور ہسٹوگرافس کے ذریعے بھی پیش کر دیا جاتا اور ساتھ ہی حوالے بھی درج کر دیے جاتے تو کتاب کا معیار اور اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا۔ موضوعات میں ربط کے اعتبار سے مضامین کی ترتیب اور پھر ایڈیٹنگ انھیں اور بھی دلکش بنا سکتی تھی۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب بے حد مفید ہے۔ عام لوگوں کے علاوہ میں اسے سیکنڈری اسکول کے طالب علموں کے لیے امدادی کتاب کی حیثیت سے بھی پڑھائے جانے کی سفارش کرتا ہوں۔ توقع ہے کہ یہ نوجوان مصنف مستقبل میں اسی طرح اپنی گراں قدر خدمات جاری رکھے گا۔

(شمس الاسلام فاروقی)

نام کتاب : آفتاب عروض
مصنف وناشر: آفتاب احمد خاں حسن پوری
محلہ کمالستھان تحصیل حسن پور، ضلع مراد آباد، یو.پی
قیمت : ۴۰ روپے

فنِ عروض حقیقت میں ایک بہت مشکل فن ہے۔ اس کو سیکھنے میں عمریں گزر جاتی ہیں، مگر درجۂ کمال چند خوش نصیب لوگوں کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ انہی خوش نصیب لوگوں میں ایک آفتاب حسن پوری بھی ہیں ان کی اس صلاحیت کے معترف حضرت عروج زیدی بدایونی بھی ہیں۔ موصوف نے عروض پر یہ کتاب لکھ کر اردو دنیا پر ایک احسان کیا ہے، نیز ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ نئے سیکھنے والوں کے لیے راہ ہموار ہوئی ہے۔ نیز یہ کتاب مبتدیوں کے لیے ایک بڑا سہارا ہے۔ اگر اس کتاب کو تھوڑا سا غور وفکر کے ساتھ پڑھا جائے تو اکثر صورتوں میں یہ کتاب موٹی موٹی ضخیم کتابوں سے بے نیاز کر دیگی۔ آفتاب صاحب کا اندازِ بیان سادہ، دلکش اور عام فہم ہے اور یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یقین ہے آفتاب صاحب کی یہ کاوش ضرور مقبولِ خاص و عام ہوگی۔ قافیہ کو جس انداز سے معہ مثالوں کے سمجھایا گیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ معائب و محاسن شعر پر جو گفتگو کی گئی ہے وہ بھی دلنشیں ہے شعر کے لیے فنِ عروض ایک اساسی چیز ہے۔ بقول ڈاکٹر عنوان چشتی "عروض شعریات میں شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے"۔

ارکانِ عروض کو تبدیل کرنے کی پہلے بھی کئی بار کوششیں ہو چکی ہیں۔ آفتاب صاحب نے بھی اس طائفہ میں شریک ہونا ضروری سمجھا۔ یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ آخر نئے ارکان وضع کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی کیا اس کو بدلے بغیر فنِ عروض سیکھا ہی نہیں جا سکتا، آخر آپ نے بھی تو سیکھا ہے۔ ہمارے خیال میں اس خیال سے توبہ ہی کرلی جائے تو بہتر ہوگا۔ ویسے آفتاب صاحب کے پیش کردہ ارکان تمام اوزان پر حاوی ہیں۔

کتاب کی قیمت کچھ زیادہ ہی ہے۔

(علی احمد بھگروی)

مظفر الاسلام جالوی ۵

علم کیمیا میں جابر بن حیان کی خدمات

علم کیمیا اس ترقی پذیر دور میں اب تعارف کا محتاج نہیں ہے ہر خاص و عام اس علم اور اس فن سے آشنا ہے مگر اس کے باوجود کیمیا کی وجہ تسمیہ اور کیمسٹری تک پہونچنے کے مراحل سے اکثر لوگ ناآشنا ہیں۔

یونان کی سرزمین میں کالے رنگ کو کیمی کہا جاتا ہے اور وادیٔ نیل کی مٹی سیاہ رنگ کی ہے اس لیے اہلِ یونان نے اس کا نام کیمیا رکھا پھر جب مسلمان عرب دانشور نے اسے ترقی اور شہرت دی تو اہلِ یورپ اس علم یعنی الکیمیا سے متعارف ہوئے جس کو یورپی زبان میں الکیمی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اور پھر ترقی کے مراحل سے گزرتے ہوئے سترہویں صدی عیسوی میں یہ علم کیمسٹری (. . . . .) کہلانے لگا۔

علم کیمیا کی وجہ تسمیہ کے ساتھ ساتھ بانیٔ علم کیمیا سے بہت کم لوگ متعارف ہیں اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ علم کیمیا کی ایجادات و اختراعات یورپ والوں کی اپنی ہے مگر جب اس پر سے حقیقت کا پردہ چاک کرتے ہیں تو اہلِ یورپ کے شیرازے بکھرتے نظر آتے ہیں۔

ابو موسیٰ جابر بن حیان الاسعدی شاگرد مولانا جعفر الصادقؒ علم کیمیا کا پہلا بانی کہا جاتا ہے۔ کیمسٹری کے شعبے میں انھیں مندرجہ بالا مقام حاصل ہے۔

آپ ۷۲۱ء میں پیدا ہوئے اور ۹۴ برس کی عمر میں آپ نے دیگر علوم نجوم اور علمِ تصوف کے علاوہ علم کیمیا کی بہت خدمت کی اور تلاش و جستجو سے معلومات کے نئے نئے دروازے کھولے اور آئندہ آنے والے محققین کے لیے راستہ کو سہل اور ہموار بنا دیا۔ افسوس کہ علمائے مغرب نے علمائے مشرق کی ایجادات و اختراعات کے ضمن میں بہت کوتاہی اور خاص طور پر مسلمانوں کی اختراعات و ایجادات کو مٹانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے واضح ہے۔

"حتیٰ کہ صلیبی جنگوں ۱۰۹۶ء — ۱۲۷۰ء میں عیسائیوں نے مسلمانوں کے نام و نشان مٹانے کا بیڑا اٹھایا اور برطانوی پادری راجر بیکن نے اسلامی شہروں کو سائنسی طاقت سے جلا ڈالنے کے لیے منصوبہ بنانے لگے۔"

اس سلسلے میں یہ تحریر بھی توجہ طلب ہے کہ۔

راجر بیکن (۱۲۱۴ء — ۱۲۹۲ء) کو مسلمان سائنسدان اور بابائے بصیرت ابن الہیثم کی ایک کتاب ہاتھ لگی جس کا موضوع تھا "شیشۂ سوزاں" یعنی "آتشی شیشہ" اس کی پہلی جلد میں ابن الہیثم نے جومیٹری کے اصولوں سے یہ ثابت کیا تھا کہ سورج کی شعاعیں شیشے میں اس طرح اُتاری جا سکتی ہیں کہ جلانے والا ہتھیار بن سکے۔ راجر نے پوپ کلیمینٹ چہارم کو لکھا کہ وہ ابن الہیثم کی کتاب کو پڑھنے کے بعد "شیشۂ سوزاں" تیار کر رہا ہے جس سے عربوں کے تمام شہر جلائے جا سکتے ہیں۔ اور صلیبی جنگوں میں کسی بھی سپاہی کو تلوار اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اسے اس کتاب کی دوسری جلد نہیں مل سکی۔ اور وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔"

(بحوالہ تہذیب الاخلاق، ج ۵ ص ۲۹) اگست ۸۶ء۔ مصنف نذیر احمد خان پاکستان۔

اور بقول علامہ شبلی کے کہ :-

اہلِ یورپ نے مسلمانوں کے عجیب و غریب

---

۵ قاضی محلہ، یوسٹ جالے، ضلع دربھنگہ (بہار)۔

یوجنا، نئی دہلی

کارناموں کو گمنامی کی خاک میں دفن کر دیا۔"
(بحوالہ: مقالات شبلی ج ۶ ص ۱۴۶)

تاہم بعض ایسے بھی مغربی محققین ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے خدمات کا اعتراف کیا ہے چنانچہ پروفیسر سر ولیم اسکر (Sir William Osker) رقم طراز ہیں کہ:۔

"علم الادویہ (Pharmacopia) جابر بن حیان کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ نئی نئی زود اثر ادویہ کا انکشاف انھوں نے ہی کیا ۔ یورپ کے بازاروں میں یہ ادویات اب تک ان ہی ناموں سے چلی آئی ہیں جیسے الکلی اور الکیمی وغیرہ

(بحوالہ علم تخدیر و علم تبخیر)

جابر بن حیان علم کیمیا کے نایاب و نادر ایجادات اور اختراعات کی وجہ سے اس میدان میں صف اوّل میں شمار کئے جاتے ہیں۔ Alkohal, Sulphuric, Alkami, Alkali, Distillation, Nitric Acid, Acid اور Anaesthesia کے علاوہ دیگر کیمیاوی عملیات کی ایجادات بھی جابر بن حیان کی ہے۔ جابر حیان ہی نے سب سے پہلی سائنسی لائبریری قائم کی، مختلف طرح کے کیمیائی آلات بنائے اور اونٹ کے گوبر کو جلا کر امونیا گیس تیار کی اور مشرق و مغرب میں ایک ہلچل پیدا کر دی ۔ دیگر ایجادات کے علاوہ علم کیمیا کے موضوع پر جابر بن حیان کی پانچ سو سے زائد تصانیف ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر کتابیں بارہویں صدی میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئیں آپ کی ایک مشہور کتاب کا ترجمہ ۱۶۷۴ء میں فرانسیسی زبان میں ہوا اور اس کو یورپ کی درسی کتابوں میں شامل کیا گیا۔

Jober has written quite number of books but with decusier names, for example Kitabul Mamlikat, Kitab-ul-Meezan-us-Sagher, Kitabul Rajam, Kitabul Jamee, Concentration Kitabul Zibugus Sharqi etc.

Most of his books were translated.

Some were translated into French.

کلورائیڈ آف سوڈیم، پارہ، اور پارہ نکالنے کی ترکیب، الکحل، مخدر ادویہ، سونے کا پانی (Aqua Ragia) چاندی کا پانی (Silver Water) وغیرہ موضوعات کی تفصیلات اب بھی آپ کی ان کتابوں میں موجود ہے۔

Anaesthesia جس کو خاص یورپ والوں کی دین تصور کیا جاتا ہے۔ درحقیقت اس کی بھی ایجاد کا سہرا جابر بن حیان کے سر ہے۔ عمل جراحی سے قبل درد و تکلیف کے پیش نظر بے ہوش کرنے کا پہلا خیال (Original and root idea) جابر بن حیان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ Sonorofic Spongue کو مخدر اور سنوم ادویہ میں تر کر کے خشک کر لیا جاتا تھا اور استعمال کے وقت اسکو تر کر کے مریض کے منھ پر رکھ دیا جاتا تھا اس کے تقریباً ۵ سال کے بعد اس نسخہ میں خفیف تبدیلی کے بعد ۱۲۶۰ء میں ریڈرک آف لولون نے اسے ظاہر کیا۔

مشہور مغربی محقق اسکاٹ لکھتے ہیں کہ:۔
"گیسوں (Gases) کے علم سے جابر واقف تھے۔ آکسیجن (Oxygen) کے وجود سے باخبر تھے Oxidation پیدا کرنے کی ترکیب سب سے پہلے جابر ہی نے بیان کی۔"
(بحوالہ:۔ علم تخدیر و علم تبخیر ص ۔)

Anaesthesia کے علاوہ جابر بن حیان کا دوسرا عظیم کارنامہ Distillation اور Condensation کا ہے چنانچہ رکن کے مشہور سرجن ڈاکٹر خورشید حسین احمد نے اس سلسلے میں جابر کی تین کتابوں کے نام گنوائے ہیں، جن کے نام یہ ہیں۔

1. Distillation by water bath.
2. Direct Distillation.
3. Dislillation Sand bath

ڈاکٹر خورشید حسین نے لکھا کہ فارمیسی کے شعبے میں ان کی زبردست خدمات ہیں۔

اس قدر بیش قیمت اختراعات و ایجادات کے باوجود جابر بن حیان کی خدمات کو فراموش کرنا تنگ نظری کی دلیل ہے اور اگر جابر بن حیان اور ان کے خدمات سے ہٹ کر کوئی تاریخ لکھی جائے گی تو وہ تشنہ اور نامکمل ہوگی۔

●

بقیہ: زعفران کی کاشت

چُننا اور زعفران کو پھولوں سے الگ کرنا' یہ کام لوگوں سے زبردستی کروایا جاتا تھا۔ اس بیگار کے عوض ان کو تھوڑا سا نمک دیا جاتا تھا (یاد رہے کہ پرانے زمانے میں نمک کشمیر میں کافی مہنگا اور نایاب تھا) دو پل زعفران چننے کے بدلے ایک پل نمک زعفران چننے والے کو دیا جاتا تھا۔ غازی خاں چک کے زمانے میں زعفران چننے کے لازمی بیگار کو ختم کر دیا گیا۔ اس نے ۵۵ سیر زعفران کے پھول چُننے کی عوض پانچ سیر چُنے ہوئے پھول مزدوروں کے لیے اُجرت کے طور پر مقرر کئے۔

ہماری دھرتی نام کی ہی نہیں، بلکہ سونا اُگلنے والی دھرتی ہے جس کے چمن زاروں میں زعفران پیدا ہوتا ہے جو سونے سے کسی طرح کم نہیں۔ ہمارے یہاں زعفران زار سونے کی ایک ایسی کان ہے جو کبھی بھی خالی نہیں ہو سکتی۔ ●

قارئین کی آراء اور مشورے

● یوجنا (جون ۱۹۸۷ء) کا شمارہ زیرِ مطالعہ رہا۔ رسالہ صوری و معنوی ہر اعتبار سے اچھا ہے۔ گزشتہ کئی ماہ سے رسالے کے مزاج و معیار میں تبدیلیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔ جو رسالے کی صحت و توانائی کی ضامن ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ادبی گوشہ خاصا اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ ابھی تنقیدی، علمی و ادبی مضامین کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے جس کے لیے خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ مختلف تبدیلیاں یقین دلا رہی ہیں کہ دوسرے اہم ادبی رسائل کی طرح یوجنا کا بھی ایسا مقام ہوگا۔ شعری حصہ بہت وسیع اور جاندار ہو گیا ہے۔

زیرِ نظر شمارہ میں نثر کے حصے میں محمد عامر علوی کا مضمون "تحریکِ آزادی اور اردو ادب" ذکی طارق کا "الہ آباد کا ایک تاریخی طرحی مشاعرہ" خاصے کی چیزیں ہیں۔ ہرش اروڑہ کا "بھارتی صنعت کے چالیس برس" سید اطہر رضا بلگرامی کا "زرعی سیکٹر کا مشینی دور" معلوماتی مضامین ہیں۔ اس شمارہ میں غزلیں مناسب کہی جا سکتی ہیں۔ سید محمود نقوی اور انور ثبات کی نظمیں دامنِ دل کھینچتی ہیں۔ مجموعی طور پر رسالہ بہت خوب ہے۔ کتابت، طباعت اور ترتیب کا سلیقہ بہت اچھا ہے۔ جس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یوجنا تمام شہروں میں دستیاب نہیں ہو پاتا۔ آپ سے مشورہ ہے کہ یوجنا کو تمام شہروں کے اہم بک اسٹال پر ضرور بھجوایئے۔

عمران عظیم، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

● پچھلے کچھ ماہ سے میں برابر یوجنا کا مطالعہ کر رہا ہوں اس کے اسٹینڈرڈ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، نہ جانے ڈو رنگا کور اس کے ساتھ کیوں بری طرح چپک کر رہ گیا ہے اور کبھی کبھی یہ رنگ تو مضحکہ خیز ہوا کرتا ہے۔

رسالہ میں معاشیات، صنعت، زراعت، قومی یکجہتی، طب کی جانکاری سے متعلق تو ہمیں بتایا جاتا ہے، لیکن نہیں بتایا جاتا تو کھیل کود کی جانکاری کے بارے میں۔ ورلڈ کپ کرکٹ اگلے ماہ سے ہندوستان میں ہو رہا ہے لیکن اس کے بارے میں آپ کا رسالہ بالکل خاموش ہے۔ کیا کھلاڑیوں کو گھر سے بلا کر میدان میں بھیج دیا جائے گا۔ اگر ورلڈ کپ کرکٹ کے بارے میں ایک تفصیلی رپورٹ کو بھی جگہ دیتے تو بہتر ہوتا۔ مبارکباد کے ساتھ وداع ہو رہا ہوں۔

محمد عالمگیر، معرفت واحد خاں پان شاپ
جی پی روڈ۔ پوسٹ جگسلائی، جمشید پور، ۶۔

● ستمبر کا رسالہ نظر نواز ہوا، کور دیکھ کر مایوسی ہوئی لیکن جب ترتیب پر نظر پڑی تو دل باغ باغ ہو گیا۔ ویسے تو تمام مضامین اچھے تھے، لیکن مجھے خاص طور پر قومی یکجہتی پر کمال جعفری کا "صوفی سنت اور قومی یکجہتی" ایم ایل بجاج کا "تاریخ ہند کے چند سنہری اوراق" طب پر "بچوں کے چھ دشمنوں سے جنگ" اور غزل میں اسامہ ملک کی غزل بہت پسند آئی۔ اور اُمید یہی کرتا ہوں کہ مستقبل میں ایسے ہی مضامین دیکھنے کو ملا کریں گے۔ لیکن مجھے فراق کی حاضر جوابی اور

بزم سنجی" پسند نہیں آیا۔ مضمون پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کسی چیز کی تشنگی ہے اس کا جواب آپ بہتر طور پر دے سکتے ہیں۔

محمد ذاکر حسین: معرفت کریم سردار
۱۴، میور بھنج روڈ، کلکتہ ۲۳ ..۰۷۔

● یوجنا کو آپ نے پندرہ روزہ سے ماہنامہ کر دیا۔ ضخامت بھی بڑھا دی۔ تبدیلیاں خوش آئند ہیں یوجنا جیسے خالص معلوماتی اور خشک پرچے کو بھی آپ نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور مسلسل کاوشوں کے بل پر اتنا جاندار حسین اور دلچسپ پرچہ بنا رہا ہے کہ آپ پر رشک آنے لگا ہے۔ اللہ آپ کو عمر کی اس منزل میں بھی نظرِ بد سے بچائے (آمین) آپ کی کوشش و کاوش قابلِ تحسین ہے اور آپ کی محنت کی داد نہ دینا یقیناً بخل ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش آپ یقیناً جاری رکھیں گے۔

اس مرتبہ حصہ نظم کی وسعت دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی پر باعثِ مسرت امر یہ ہے کہ اس بار تمام تخلیقات معیاری اور جاندار ہیں۔ محمد ظفر علوی کا مضمون "تحریکِ آزادی اور اردو" اور افسانہ "لمحہ لمحہ کرب" پسند آئے۔ موضوع اگرچہ نیا نہیں ہے لیکن اندازِ تحریر دلکش ہے۔ "جرمِ ضعیفی کی سزا" بھی خوب ہے۔ ذہن کو سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ دیگر مضامین بھی معیاری ہیں۔ غزلیں اس بار سبھی اچھی ہیں۔

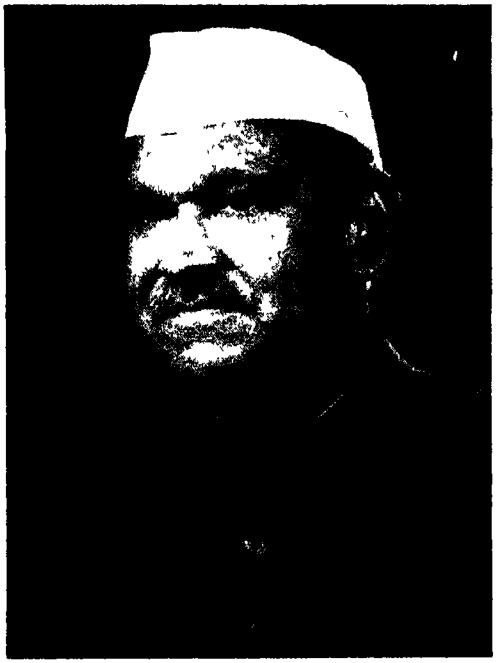
علی احمد بگھروی، شفیق میموریل سینئر سکنڈری اسکول، باڑہ ہندو راؤ، دہلی ۶۔

● آپ کا پرچہ اردو کی نہایت قابلِ قدر خدمات انجام دے رہا ہے اور اس کے لیے یقیناً آپ اور پرچہ سے متعلق دیگر تمام حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں۔

قمر الدین
این سی ای آر ٹی۔ نئی دہلی۔ ۱۶۔

جمہوریہ ہند کے آٹھویں نائب صدر

ڈاکٹر شنکر دیال شرما



ڈاکٹر شنکر دیال شرما اتفاقِ رائے سے ہندوستان کے آٹھویں نائب صدر جمہوریہ بنے ہیں۔ آپ شری آر۔ وینکٹ رمن کی جگہ منتخب ہوئے۔ جو کہ صدر جمہوریہ ہند کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہو چکے ہیں۔ آپ تیسرے نائب صدر جمہوریہ ہیں جنھیں بلا مقابلہ انتخاب کر لیا گیا۔ اس سے قبل ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن بھی ۱۹۵۲ء اور پھر ۱۹۵۷ء میں دو بار بلا مقابلہ اس عہدے کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں جسٹس ایم ہدایت اللہ کو بھی بلا مقابلہ منتخب کیا گیا تھا۔



اردو ٹرسٹ انڈیا کے ایگزیکیٹو ڈائرکٹر ابوالفیض سحر کی رہنمائی میں اردو والوں کا ایک وفد ۱۷ ستمبر ۱۹۸۷ء کو نائب صدر جمہوریہ شنکر دیال شرما کو مبارکباد دینے ان کی کوٹھی مولانا آزاد روڈ نئی دہلی میں گیا۔ تصویر میں (دائیں سے) جناب ہمدرد شمس الرب صدیقی، ڈاکٹر ایم۔ آر۔ خاں، جناب ابرار کرتپوری، نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما، جناب واجد سحری، جناب ذہین نقوی، حاجی انیس دہلوی، اور جناب ابوالفیض سحر۔

(تصویر سید فدا علی)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) to post without pre-payment at RMS, New Delhi.

Vol. 7 No. 13-14 YOJANA (URDU) 1 October 1987



۲۹ اگست ۱۹۸۷ء کو انڈیا انٹرنیشنل سینٹر نئی دہلی میں پریس ایشیا انٹرنیشنل فورم کی جانب سے یروشلم پر اُردو مضامین کے مجموعے "یروشلم ۔ شہر مقدس سے شہر مصلوب تک" کتاب کی رسم اجراء سفیر تنظیم آزادیٔ فلسطین خالد الشیخ نے کی۔ تصویر میں (بائیں سے) جناب اختر الواسع، ویلڈ ان ریسرچ ایڈیٹر ماہنامہ (طغر یسامی)، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے وائس چانسلر جناب علی اشرف کتاب کی پہلی جلد سفیر تنظیم آزادیٔ فلسطین خالد الشیخ کو پیش کرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ (تصویر سید فدا علی)



۲۲ اگست ۱۹۸۷ء کو غالب اکیڈمی نئی دہلی میں غالب میموریل ویلفیئر سوسائٹی و دیگر ادبی انجمنوں کی جانب سے "کیف غزل" بصدارت جناب خلیق انجم منعقد ہوئی۔ اس موقع پر جناب حرّار چھولسی کی غزلوں کی کتاب "عکس حیات" کی رسم اجراء جناب حیات اللہ انصاری ایم پی نے کی۔ تصویر میں (دائیں) جناب صاحب مراد آبادی، جناب حرّار چھولسی "عکس حیات" کی پہلی جلد حیات اللہ انصاری ایم۔ پی سے لیتے ہوئے اور (آخر میں) ڈاکٹر خلیق انجم کو دیکھا جا سکتا ہے۔ (تصویر: سید فدا علی)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadurshah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوجنا

دو رُوپے

امیر خسروؔ کی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں
اور بول انمل، دوسخنے وغیرہ
(کے کے کھلر)

کرکٹ کی دنیا کی عہد آفریں
شخصیت ۔ سنیل گواسکر
(شاہین پرویز حاوی)

غزلیں، کہانی، تبصرے اور بہت سا
دلچسپ مواد



غالب اکیڈمی نئی دہلی میں اُردو کے نامور ادیب، اور طنز و مزاح کی دنیا کی معروف شخصیت جناب فکر تونسوی کا ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت جناب اندر کمار گجرال منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں مشہور ادیبوں صحافیوں نے شرکت کی۔ تصویر میں (دائیں سے) پروفیسر گوپی چند نارنگ، جناب بلونت راگی، جناب اندر کمار گجرال، جناب جوگیندر پال، جناب دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی اور جناب تحسین حسین نظر آرہے ہیں۔ (تصویر سید فدا علی)



غالب اکیڈمی نئی دہلی میں نیویارک سے آئے ادیب شاعر ڈرامہ نگار جناب جاوید دانش کا سفرنامہ "آوارگی" کی رسم اجراء پروفیسر قمر رئیس نے انجام دی۔ جلسہ کی صدارت جناب حیات اللہ انصاری ایم۔پی نے کی۔ تصویر میں (دائیں سے) پروفیسر قمر رئیس کتاب کی پہلی جلد جناب جاوید دانش کو پیش کرتے ہوئے (درمیان میں) جناب شمس الزماں (بائیں) جناب ابرار کرتپوری کو دیکھا جاسکتا ہے۔

(تصویر: سید فدا علی)

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : سیّد ظفر الحسن
ایڈیٹر : جگندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹر: محمّد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر: وسیم حیدر
عبد الحمید

شرح چندہ
سالانہ ۲۰ روپے، دو سالہ ۳۶ روپے
سہ سالہ ۴۸ روپے، فی کاپی دو روپے
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں
کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت۔

جلد ۷ | شمارہ ۱۵، ۱۶ | یکم تا ۱۵ نومبر ۱۹۸۷ء | ۱۰ کارتک تا ۱۹ اگرہائن شک ۱۹۰۹ | قیمت: دو روپے، ٹیلیفون ۶۰۱۸۱۸

اس شمارے میں

اداریہ		۲
منصوبہ بندی : منصوبوں کی کہانی خود ان کی زبانی	سید اطہر رضا بلگرامی	۳
زراعت ، زراعتی طریقوں میں نیا رخ کیوں ؟	ڈاکٹر سید مسعود حسین جعفری	۸
ریشم کی صنعت	ترییندر جوشی	۱۰
سماجی جنگل بانی کے پروگراموں کے لیے عورتوں کے تعاون کی ضرورت	اُرملا دیوی	۱۲
بینک کاری ، غریبی دور کرنے میں بینکوں کا رول	جے۔ آر۔ سیدیوا	۱۴
سائنس اور ٹیکنالوجی ، مزدور عورتوں پر نئی ٹیکنالوجی کے اثرات	دھرمیندر کمار	۱۷
شخصیات : انسانی محبت اور اخوت کے نقیب ۔ گورو نانک	ایم۔ ایل۔ سجاج	۲۰
پنڈت نہرو اور طنز و مزاح	جگدیش پرشاد کوشک	۲۲
پنڈت گوبند بلبھ پنت	تسنیم فاطمہ	۲۳
فلم ، بھارت کا ۳۲ واں فلمی میلہ	کانتا کپور	۲۶
ادب : نئی غزل ۔ ایک جائزہ	سیّد احمد شمیم	۳۰
امیر خسرو کی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں اور ڈھکوسلے، انمل دو سخنے وغیرہ	کے۔ کے۔ کھلر	۳۳
غزلیں	علی احمد نگھروی، عزیز نگھروی حسرت رسالپوری	۳۵
	قمر عثمانی، شہاب الدین ثاقب نثار اختر انصاری	۳۶
نظمیں		
گمراہ مسافر (افسانہ)	محمد طارق	۳۷
تبصرے	عمران عظیم، عبد الحمید	۳۹
کرکٹ کی دنیا کی عہد آفریں شخصیت ۔ سیسل گو اسکر	شاہین پروین جالوی	۴۰
آپ سب کے لیے		۴۶
قارئین کی آراء اور مشورے	شہریار احمد قدسی، موہن رستوگی، برج کشور، عزیز نگھروی، شمشیر خاں	۴۸
ادبی خبریں، تصویروں کی زبانی	کور	۲، ۳
بھیکاجی رستم کاما پر کتاب کا اجراء	کور	۴

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (میں)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶
اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) ـــــــ آر۔ ایس۔ منجال
ترسیل زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ہماری بندرگاہیں

جس وقت ہمارا ملک آزاد ہوا، اس وقت ملک میں چار بندرگاہیں تھیں یعنی بمبئی، کوچین، مدراس اور کلکتہ۔ مگر اب یہ تعداد دس تک پہونچ گئی ہے۔ جلد ہی اس میں ایک اور بندرگاہ نیوا شیوا کا اضافہ ہوگا۔ یہ اپنی سہولتوں اور بنیادی ڈھانچوں کی مناسبت سے دنیا کی ایک بہترین بندرگاہ ہوگی۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ ان بندرگاہوں کی کارکردگی کا ریکارڈ بہت تسلی بخش رہا ہے۔ ۸۷-۱۹۸۶ء میں مذکورہ بندرگاہوں سے ۱۲۴۲۰۲ لاکھ ٹن مال کا لدان ہوا جبکہ ۴۸-۱۹۴۷ء میں صرف ۱۹۳۰۶ لاکھ ٹن مال کا لدان ہو سکا تھا، ان بندرگاہوں کے ذریعے غیر ملکی تجارت کو بڑھانے پر حکومت نے خاص زور دیا۔ ۸۵-۱۹۸۴ء تک ان بندرگاہوں کی ترقی اور جدید کاری پر ۱۵۶۰ کروڑ روپے خرچ کئے جا چکے ہیں۔ ساتویں منصوبے میں بندرگاہوں پر تجارتی سہولتوں کو بڑھانے کے لیے ۱۱۰۰ کروڑ روپے خرچ کئے جانے ہیں۔ کلکتہ، بمبئی، مدراس اور کوچین کی بندرگاہوں پر یہ سہولت پہلے ہی دی جا چکی ہے اور یہ سہولتیں اپنے معیار کے اعتبار سے کسی بھی صنعتی ملک کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ ہلدیہ کی بندرگاہ پر بھی اسی قسم کی سہولت جلد دے دی جائے گی۔ ملک کی چار اہم بندرگاہوں یعنی مورما گاؤ، پرادیپ، وشاکھاپٹنم اور مدراس کے توسط سے ہر روز تقریباً ۴۰ ہزار ٹن خام لوہے کا لدان ہوتا ہے۔ یہاں سب کام مشینوں کی مدد سے ہوتا ہے۔ ہندوستان سے کھاد، خام مال، اناج، کیمیاوی اشیاء اور دیگر بہت سا سامان باہر ملکوں کو بھیجا جاتا ہے اور اسی طرح بہت سامان باہر ملکوں سے منگایا جاتا ہے۔ یہ سب کام بندرگاہوں پر جدید مشینوں اور قدیم طریقوں دونوں کی مدد سے انجام پاتا ہے۔ حال میں اس سلسلے کی بہت سی دشواریوں کو دور کرنے اور انتظامیہ کو بہتر بنانے کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں، ان سے ان بندرگاہوں کی کارکردگی مزید بڑھے گی۔ اس سلسلے میں حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ ایک اعلیٰ سطح کی کمیٹی مستقبل کی ضرورتوں کا پتہ لگا رہی ہے۔ ہندوستان کی تجارت مستقبل میں بڑھے گی، اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے یہ کام اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ ہماری بندرگاہیں، ہماری اقتصادی ترقی اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح اہل ثابت ہو رہی ہیں۔

اقلیتوں کی بہبود

اقلیتیں اس ملک کی تعمیر و ترقی میں برابر کی شریک ہیں۔ چنانچہ ریاستی حکومتوں کو ایسی ہدایات دی گئی ہیں کہ وہ اقلیتوں کی بہبود کے لیے وضع کردہ ۱۵ نکاتی پروگرام پر موثر عمل درآمد کرائیں اور ان کی پیش رفت پر نگاہ رکھیں، اسی طرح سے اقلیتوں میں اعتماد کی بحالی کے ذریعے ان کو ملک کے ترقیاتی پروگراموں سے فائدہ پہونچانے کی کوشش برابر جاری ہے۔ اس سلسلہ میں فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام، اقلیتی طبقوں کی تعلیم، ملازمت، اقتصادی ترقی کے مواقع وغیرہ بہم پہنچانے کے لیے متعدد اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں فلاح و بہبود کی ذمہ داریاں سنبھالنے والے افسروں کی نامزدگی عمل میں آ چکی ہے۔ اس سلسلے کے مختلف پروگراموں میں تال میل کے لیے کام ہو رہا ہے۔ اتر پردیش، بہار، آندھرا پردیش اور کرناٹک کی ریاستوں میں اقلیتی طبقوں کے لیے مالیاتی کارپوریشنیں قائم کی گئی ہیں تاکہ ان کی اقتصادی ترقی عمل میں آ سکے۔ گجرات اور آسام میں اقلیتی طبقوں کی بہبود سے متعلق بورڈ قائم ہیں۔ اتر پردیش، بہار، آندھرا پردیش اور مدھیہ پردیش میں Minority Commission بھی کام کر رہے ہیں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس بات کا جائزہ لیا جا رہا ہے کہ اقلیتوں کے لیے وضع کردہ بہبودی اقدامات اُن کے لیے کس حد تک موثر ثابت ہو رہے ہیں۔ اقلیتوں کے پسماندہ طبقوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینے کے لیے خصوصی اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ وزیر اعظم کی صدارت میں ایک کابینہ کمیٹی اس طرح کے پروگراموں پر عمل درآمد کی رفتار ترقی کا جائزہ لے رہی ہے۔ اُمید ہے کہ ان مختلف اقدامات کے ذریعے ملک کے سماجی طبقوں، خاص کر ملک کی اقلیتوں میں اعتماد کی ایک فضا بن سکے گی اور وہ ملک کی تعمیر و ترقی میں پہلے کے مقابلے زیادہ جوش و خروش سے شریک ہو سکیں گے۔

سید اطہر رضا بلگرامی

منصوبوں کی کہانی، خود ان کی زبانی

میرا نام "پانچ سالہ منصوبہ" ہے۔ "منصوبہ" میرا خاندانی نام ہے اور یہی میری عرفیت بھی۔ میری عمر پانچ سال ہوتی ہے یعنی ایک بھائی اپنے پانچ سال پورے کرکے دوسرے کو جانشین بنا دیتا ہے۔ ہم سب بھائیوں کا نصب العین عوام کو خوش و خرم و بلند معیارِ زندگی عطا کرنا ہے۔ ہم اسی مقصد کی تکمیل میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔ آپ نے مجھے ۱۹۵۱ء میں بُلایا اور یہی نصب العین سامنے رکھا۔ آج چھتیس سال کے عرصہ میں ہر بھائی نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس مقصد کی تکمیل کی انتہائی کوشش کی ہے۔ آج میرا ساتواں بھائی سرگرمِ عمل ہے اور مجھے اُمید ہے کہ وہ اپنے جانشین کو بہت کچھ دیکر جائے گا۔ ہم سب کس طرح اور کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کی تفصیلات بیان کرنے سے قبل اپنا مختصر تعارف کرا دینا ضروری سمجھتا ہوں "تاکہ پھر میری اس رام کہانی میں آپ کو اجنبیت کا احساس نہ ہو۔

میرا خاندان عالمی ہے۔ میں ہر مُلک میں، ہر فرد میں، ہر ذی روح میں اور یہاں تک کہ پورے کائناتی نظام میں تعمیری و تخریبی دونوں طور پر موجود ہوں۔ انگلینڈ، امریکہ، روس، جرمنی و جاپان جو آج ترقی و خوشحالی کے ایک بلند مقام پر فائز ہیں اور جنھوں نے قلم کی نب سے لےکر کار اور جیٹ ہوائی جہاز تک تمام ضروریاتِ زندگی کی اشیاء پیدا کرکے نہ صرف اپنے ملک بلکہ تمام ممالک کے عوام کی ضرورت و خواہشات کی تسکین کا خیال رکھا، بلند مذاق کا احساس دلایا میرے ہی مرہونِ منت رہے ہیں اور تو اور یہ میری ہی حوصلہ افزائی ہے کہ انسان چاند پر قدم رکھنے میں کامیاب ہوا اور یہ میری ہی کرشمہ سازی ہے کہ ایک ملک کی چاند گاڑی بغیر کسی انسانی وجود کے چاند پر پہنچ کر وہ تمام کام بخوبی انجام دے رہی ہے جو انسان کا طرۂ امتیاز ہے۔

الغرض یہ میں ہوں جس کی بدولت آج انسان خواب کو حقیقت میں بدلنے کے قابل بنتا جا رہا ہے اور اپنی آرزوؤں کو پورا ہوتے دیکھ کر "دشتِ امکاں" کو بھی "نقشِ پا" سے زیادہ نہیں سمجھتا ہے۔ لیکن میرا دوسرا رُخ بھی دیکھ لیجئے — ۱۹۳۰ء کی امریکہ کی معاشی بدحالی مجھ سے غفلت برتنے کا ہی نتیجہ تھی۔ آج آپ کے مُلک میں بھی قصباتی طبقہ جس معاشی بدحالی کا شکار نظر آتا ہے اور ایک بے چین و مایوس زندگی گزار رہا ہے وہ درحقیقت مجھے ہی نظرانداز کرنے کا نتیجہ ہے، مجھ سے الگ الگ رہنے کا انجام ہے۔

آپ مجھے اور قریب سے پہچانئے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ کے شعور میں رچا بسا ہوں تو آپ کو ضرور تعجب ہوگا۔ لیکن ٹھہریے میں آپ کو احساس دلاتا ہوں۔ آپ نے اکثر و بیشتر لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہوگا کہ وہ شخص کتنا سلیقے شعار ہے، کیسا منظم دماغ پایا ہے۔ کیسی ہوشمندی اور سوجھ بوجھ سے کام کرتا ہے۔ اپنے مستقبل کا کتنا خیال ہے، حال پر کیسی نگاہ ہے اور تمام افراد کس طرح خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی تمام ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کرتے ہیں، ہر فرد میں کس قدر وقت کی پابندی کا احساس ہے، اپنے کاموں اور ذمہ داریوں کو کیسا بانٹ رکھا ہے، ذمہ داریوں کے احساس نے محنت، جفاکشی اور مسلسل جدوجہد کے جذبے کو کس قدر بیدار کردیا ہے۔ ہر فرد اپنی پیداوار و آمدنی کو بڑھانے میں منہمک نظر آتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ ضروریات

٭ شعبۂ معاشیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

[illegible] کے قابل

بنتا رہے۔

اس کے برعکس آپ یہ بھی دیکھتے ہونگے کہ ایک گھر میں کیسی بدحالی پھیلی ہوئی ہے۔ ہر فرد کا مزاج الگ، کسی کو کسی کے کام یا ذمہ داری سے کوئی سروکار نہیں۔ اس گھر میں آمدنی و خرچ کا کوئی اندازہ نظر نہیں آتا۔ اگر پیسے آگئے تو وقتی طور پر شاہ بن گئے ورنہ پھر دستِ دعا ہر کس و ناکس کے سامنے ہے۔ اس گھر میں ہر شخص کی نگاہ حال پر ہے، کسی کو اپنے مستقبل کی فکر نہیں۔ اپنی ضروریات کا احساس ہے لیکن ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جن وسائل کی ضرورت پڑتی ہے، جس طریقہ کار کو اپنانا پڑتا ہے، جس ہوشمندی اور سلیقے کی ضرورت پڑتی ہے وہ نہیں ہے۔

تو جناب یہ سب کس کا پرتو ہے۔ افراد میں خیالات و نظریات کی ہم آہنگی، تعمیری رجحانات کے ساتھ احساسِ ذمہ داری، بلند نصب العین کے ساتھ جد و جہد، وقت کے تقاضوں کا بھرپور احساس، موجودہ وسائل پر نگاہ، وسائل کے بھرپور استعمال اور مسلسل توسیع و تبدیلی پر نگاہ وغیرہ وغیرہ نہ جانے ایسے کتنے آلہ کار کی مجموعی سرگرمیوں کا نتیجہ ہی تو ہے جن کے مناسب و غیر مناسب استعمال کو دیکھ کر آپ کسی گھر کو خوشحال یا بدحال بتلانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسے تمام آلۂ کار مجھ سے الگ کسی تنظیم کے تحت کام کرتے ہیں؟ جی نہیں یہ میں ہوں جس کا سہارا لے کر ایک انسان، ایک سماج، ایک ملک پرسکون اور قابلِ قدر زندگی گزارنے کے قابل بنتا ہے اور مجھے نہ اپنانے پر، نظر انداز کرنے پر اور مجھ سے کنارہ کشی اختیار کرنے پر پریشان حال اور پست ترین زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

[illegible] ہیں

موجود ہوں۔ میں آپ کو آپ کے مشاہدے ہی سے سمجھاؤں گا کہ کس طرح میں ہر ذی روح کی طبیعت میں بسا ہوا ہوں۔ آپ نے مکڑی کو جالا بنتے تو دیکھا ہی ہوگا، چیونٹیوں کی لمبی قطار پر نظر پڑی ہی ہوگی۔ اور یہ بھی دیکھا ہوگا کہ کس طرح وہ اپنے رزق کا ایک ایک دانہ منہ میں احتیاط سے رکھتے دیوار پر چڑھتی اور گرتی رہتی ہیں اور بالآخر اپنی منزلِ مقصود تک پہونچنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ آپ نے شہد کی مکھیوں کے چھتے کی تعمیری خصوصیات، شہد کی مکھیوں کی تنظیم اور اُن کی انتھک و مسلسل جد و جہد اور تقسیم کار کو بھی دیکھا ہوگا، جنگلوں میں جنگلی جانوروں کے نظامِ زندگی کا بھی مشاہدہ کیا ہوگا اور پرندوں کے باہوش طرزِ عمل کو بھی دیکھا ہوگا کہ وہ کس طرح ایک ایک تنکا جمع کرتے ہیں اور غذا کا مناسب ذخیرہ جمع کرکے پرسکون برسات گزارتے ہیں۔ آپ نے غور کیا مکڑی کی اس نفیس صنعت کاری، چیونٹیوں کی اس فوجی تنظیم، چڑیوں کی دور اندیشی و مستقل مزاجی اور درندوں کی جابرانہ شورہ پشتی کے پس پشت کون کارفرما ہے۔ جناب اگر غور کریں تو یہاں بھی میری ہی روح کارفرما ہے۔ میں انسان تو انسان ہر ذی روح کے مزاج و شعور میں رچا بسا ملوں گا۔

اب آیئے میں اپنی کارگزاریوں، کامیابیوں ناکامیوں کی رام کہانی سناؤں میری یہ رام کہانی دراصل آپ کی ہی سرگرمیوں کی داستان ہے۔ آپ کی ہی کہانی ہے اور آپ کو ہی سنا رہا ہوں۔ میں ۱۹۵۰ـ۵۱ء میں آپ کے یہاں بلایا گیا اور آج ۳۶ برس ہو رہے ہیں آپ کی خدمت میں دن رات مصروف رہتے ہوئے۔ آجکل میرا ساتواں بھائی سرگرم عمل ہے کیا آپ نے غور کیا کہ اس عرصۂ دراز میں میں نے کیا کچھ تبدیل کر دیا۔ میں جب آیا تھا تو

[illegible]

[illegible] کا عالم تھا [illegible] اور نا چاریوں کا ماحول تھا۔ ہر چیز کے لیے دوسروں کا منہ دیکھنا پڑتا تھا، یہاں تک کہ دو وقت کی روٹیوں میں بھی باہری دوستوں کا حصہ شامل تھا اور ۳۶ برس کے قلیل عرصہ کے بعد آپ کہاں کھڑے ہیں؟ ذرا غور کیجئے، اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیجئے۔ آپ نہ صرف دو وقت کی روٹیاں سکون سے اپنی پیداوار کی کھاتے ہیں بلکہ دوسرے غریب ممالک کا پیٹ بھرنے اور کسی ہنگامی صورتِ حال کا بخوبی مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ میں نے تو ۳۶ برسوں میں زراعت جیسے مفلس و غریب و انتہائی پسماندہ سیکٹر کی کایا پلٹ کر دی۔ آج آپ اجناس کی پیداوار میں نہ صرف خود کفیل ہیں بلکہ زراعت کو مکمل صنعت کا درجہ دینے کی تیاری کر رہے ہیں۔ آپ صنعت پر نگاہ ڈالیے۔ وہ کون سی شئے ہے جو دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں تیار کی جاتی ہو اور آپ تیار نہ کرتے ہوں۔ کیا آپ لوہا و اسپات تیار نہیں کرتے، کیا آپ دیوہیکل مشینیں، بھٹیاں، برقی قوت تیار کرنے کے جنریٹر تیار نہیں کرتے، کیا آپ نفیس سے نفیس عالی معیار کے کپڑے و ملبوسات نہیں بناتے، کیا زندگی کے عیش و آرام کی اشیاء مثلاً کاریں، اسکوٹر، بسیں، ہوائی جہاز، ریفریجریٹر، ایر کنڈیشنرز، بجلی کے ساز و سامان، رہائشی مکان، ٹی۔وی، ٹیلی فون نہیں بناتے؟ کیا آپ ہر طرح کے ڈیفنس کا ساز و سامان تیار نہیں کرتے۔ آپ تو کچھ بھی سوچئے اور پوچھئے، میرا جواب تو یہی ہوگا۔ جی ہاں میں تیار کرتا ہوں۔ رسل و رسائل کے میدان میں تو آپ نے ایسی نمایاں کامیابی حاصل کر لی ہے کہ اس کی مثال مشکل سے نظر آتی ہے۔ ریلوں میں آج آپ کا دنیا میں دوسرا مقام ہے۔ ہوائی جہازوں میں آپ کسی ترقی یافتہ ملک

ہے پیچھے نہیں۔ آرام دہ بسوں سے تو آپ کشمیر تا کنیا کماری تک کی سیر کر سکتے ہیں۔ بین الاقوامی تجارت میں بھی آپ نے اپنا لوہا منوا لیا۔ یہاں کے ملبوسات ہشتیں، بجلی کا ساز و سامان، سائیکلیں، بجلی کے پنکھے، ریلوے ویگن وغیرہ کی مانگ مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ آپ تو بین الاقوامی چنوتیوں کو بھی قبول کرنے لگے ہیں۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا آپ پیٹرول و ڈیزل تیل کے سلسلے میں دوسروں کے محتاج تھے۔ آپ کا بین الاقوامی تجارت میں کمایا ہوا قیمتی زرِ مبادلہ اجناس اور پیٹرول و ڈیزل تیل کی خریداری پر صرف ہو جاتا تھا۔ یقیناً پیٹرول کی بڑھتی ہوئی قیمتیں نہ تو میری ضرورتوں کو پورا کر سکتی تھیں اور نہ میرے دیگر ترقی کے پروگراموں کو بخوبی چلا سکتی تھیں۔ میں نے اس محتاجی کو دور کرنا چاہا اور چنوتی کو قبول کیا۔ اپنی سرزمین پر، سمندر کی تہوں میں، وادیوں میں تیل کی جستجو میں لگ گئے۔ دن رات کی انتھک محنت و لگن سے کامیابی سے ہمکنار ہوئے اور آپ کو معلوم ہے کہ آج تقریباً ۷۰ فیصد ضرورت کی تکمیل آپ اپنے تیل سے کرتے ہیں، قیمتی زرِ مبادلہ بچاتے ہیں۔ اور سر بلندی سے دنیا کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ آپ اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائیے آپ کو ہماری کرشمہ سازی نظر آئے گی۔

مجھے یہ ساری کامیابیاں ایک وقت میں اور ایک ساتھ نہیں مل گئیں۔ اس منزل تک پہونچنے کے لیے ہم نے آہستہ آہستہ، قدم بہ قدم اور درجہ بدرجہ کامیابی حاصل کی ہے۔ کسی طرح اس کو بھی مختصراً واضح کرتا چلوں۔ سب سے پہلے ہم نے اپنا ایک نصب العین متعین کیا پھر اس نصب العین کے حصول کے لیے واضح مقاصد سامنے رکھے، پھر ان مقاصد کے حصول کے لیے عملی پروگراموں کو تشکیل دیا۔ اب اپنے موجودہ وسائل پر نگاہ کی جن کو ان مقاصد کے حصول میں استعمال ہونا ہیں۔ اس کا اندازہ لگایا کہ کس حد تک ہم آپ کو زیر بار کرتے ہوئے وسائل میں توسیع کر سکتے ہیں، یعنی اُس حد تک آپ کو زیر بار کرنا ضروری تھا جو آپ کے برداشت کے اندر ہو۔ باقی کمی کو پورا کرنے کے لیے ہم نے باہری ممالک سے مدد مانگی، قرضے لیے اور صلاح و مشورے حاصل کئے۔ لیکن یہاں بھی اپنی آزادی اور پالیسی کو بھینٹ نہ چڑھنے دیا۔ ہم نے معیشت کے تمام اہم سیکٹرس میں تال میل بنائے رکھا تاکہ کوئی ایک سیکٹر دوسروں سے بہت زیادہ آگے نہ نکلنے پائے۔ اس طرح ترقیاتی سرگرمیوں میں علاقائی اور سیکٹر کے باہمی ربط کو کبھی نہ ٹوٹنے دیا اور آپ نے دیکھ ہی لیا کہ اس جدّوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج کوئی بھی سیکٹر خواہ وہ زراعت ہو یا صنعت، رسل و رسائل ہو یا تجارت کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ ہم سب بھائیوں کا نصب العین یہ رہا کہ ہم عوام کو بہتر سے بہتر معیارِ زندگی عطا کریں، ایک ایسے سماج کی تشکیل کریں جہاں غریبی و امیری کا فرق مٹ جائے اور ہر فرد کو ترقی کے بھرپور مواقع فراہم ہوں۔ بظاہر بڑا بلند خیال ہے اور انتہائی خوش کن بھی، لیکن اس کا حصول انتہائی مشکل۔ اس کے لیے آپ کو نظامِ پیداوار، نظامِ تقسیم، نظامِ زر، اندرونی اور بیرونی تجارت، درآمدات و برآمدات، تعلیم و تربیت، رجحانات، طرزِ فکر سبھی کچھ کو ایک ایسے ڈھانچے میں ڈھالنا پڑیگا۔ جو کشاں کشاں سماج کے ہر فرد کو ایک ذمہ دار پیدا آور رکن، ایک ذمہ دار صارف، اور مجموعی حیثیت سے ذمہ دار شہری بنا دے۔ ہم سب اسی کوشش میں لگے ہیں اور بہت حد تک ہم نے عوام کا اندازِ فکر، اندازِ صرف، اندازِ پیداوار بدل دیا ہے۔

دیکھئے جس وقت ہم معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر فرد کو بہتر سے بہتر زندگی کی سہولتیں مہیا ہوں تاکہ وہ پرسکون و خوشحال زندگی گزارے۔ جب آپ زندگی کی سہولتوں کی طرف نظر کرتے ہیں تو ان کا نو لامتناہی سلسلہ ملتا ہے جس کو کسی مخصوص دائرہ میں محدود کر کے نہیں بتلایا جا سکتا۔ ہم تو بس اتنا بتلا سکتے ہیں کہ زندگی کی سہولتوں کا تعلق کبھی نہ رکنے والی پیداوار سے ہے جو ممالک اشیاء اور خدمات پیدا کرنے اور مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہاں کے عوام بھی بہتر معیارِ زندگی گزارتے ہیں۔ اس طرح بہتر معیارِ زندگی کا تعلق سیدھے اور گہرے طور پر پیداوار و سہولتوں اور خدمات کی سطح سے ہے۔ اب بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ اس سطح کو کس طرح بڑھایا جائے اور اتنا بڑھایا جائے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کوئی مضر و منفی اثرات نہ چھوڑنے پائے۔ یہ میرے سامنے چیلنج تھا جس کو ہم سب نے قبول کیا۔ ایک بار پیداوار و خدمات میں متواتر توسیع ہوتے رہنے کا یقین ہو جائے تو پھر منظم، مساوی و انصاف پسند نظامِ تقسیم کو رائج کر کے ہر خاص و عام کو بہتر معیارِ زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ آج سے ۳۶ برس قبل کے ایک اوسط انسان کی زندگی پر نگاہ ڈالئے اور آج کے اوسط انسان پر زندگی کی سہولتوں کے استعمال کے نقطۂ نظر سے نمایاں فرق نظر آ جائے گا اور بس یہی فرق میری کامیابی کی دلیل ہے۔ میں نے اس کامیابی کو درجہ بدرجہ حاصل کیا ہے، دشوار راہوں، رکاوٹوں اور وقتی ناکامیوں کے باوجود کامیابی ملی ہے۔ اس کی بھی طویل داستان ہے جس کو انتہائی اختصار سے بیان کر رہا ہوں۔ میں نے سب سے پہلے بنیادی ڈھانچہ مضبوط کرنے پر دھیان دیا۔ اس بنیادی

ڈھانچہ کا کام میرے دوسرے بھائی نے شروع کیا۔ ہر طرح کی پیداوار و خدمات کو اچانک اور ایک ساتھ تو نہیں بڑھایا جا سکتا اس کے لیے تو ایک طویل مدتی پروگرام بنانا ہوگا۔ میرے دوسرے بھائی نے یہ کام شروع کیا۔ سب سے پہلے بنیادی صنعتیں جیسے لوہا اسپات بنانے کے عظیم کارخانے، بڑی بڑی مشینوں و کل پرزوں کو ڈھالنے کے کارخانے، فولادی بھٹیاں، برقی قوت (بجلی) پیدا کرنے کے عظیم کارخانے، سڑکوں، ریلوں، ٹیلی فون کا جال، مختلف اقسام کی تعلیم و تربیت کے ادارے، ریسرچ کے مراکز وغیرہ قائم کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ اس بنیادی ڈھانچہ کی تیاری کے بعد دوسری بنیادی اشیائے صرف اور عیش و آرام کی اشیا بنانے والے کارخانوں کا قیام بہت آسان ہوگیا۔ ہم سب بھائیوں نے شدید جدوجہد کے بعد یہ ڈھانچہ تیار کر لیا ہے اور اب تیزی سے عوام کی دیگر اشیائے صرف کی پیداوار کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہم نے نظامِ تقسیم کو مؤثر اور انصاف پسند بنانے کے لیے پچھڑے ہوئے غریب طبقہ و کمزور طبقہ و علاقے پر خصوصی دھیان دینا شروع کر دیا تاکہ ہماری جدوجہد کے انعامات صرف امیر و آسودہ طبقہ تک محدود ہو کر نہ رہ جائیں۔ بلکہ اُن کا پورا فائدہ غریب سے غریب تر تک پہونچے۔ آپ نے بیس نکاتی پروگرام سنا ہوگا، بینکوں کو قومیانے کی بات سنی ہوگی اور گاؤں گاؤں بینکوں کی شاخوں کو کھلتے دیکھا ہوگا، پھر ہر جگہ مناسب قیمتوں والی غلّہ کی دوکانیں شکر، گیہوں، چاول، کپڑا، کھانے کا تیل تقسیم کرتی دیکھی ہوں گی، سپر بازاروں، چلتی پھرتی بازاروں، جنتا کپڑے وغیرہ کا نام تو ہر خاص و عام کی زبان پر ملتا ہے۔ یہ سب اسی انصاف پسند نظامِ تقسیم کے حصے ہیں۔

اس کے علاوہ جگہ جگہ ہسپتال، اسکول، معذوروں کے تربیتی مرکز، مزدوروں کے تربیتی مرکز، صاف ستھرے کھلے پارک وہ سہولتیں ہیں جو صرف غریب طبقہ کے لیے مخصوص ہیں تاکہ وہ ہم سے دور نہ ہونے پائیں۔ اور جن کی مدد سے بہتر زندگی گزارنے کا حوصلہ پیدا کر سکیں۔

اس منزل تک پہونچنے میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اس کا ذکر ضروری ہے تاکہ آپ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ سب کچھ آسانی سے ہوتا گیا۔ میرے دوسرے بھائی نے دراصل اس منزل تک پہونچنے کا سنگِ بنیاد رکھا تھا بنیادی ڈھانچہ کو مرتب کرنے میں کثیر سرمایہ کی ضرورت تھی، صرف ملکی نہیں بلکہ بیشتر غیر ملکی۔ عوام کی پسماندگی اجازت نہ دیتی تھی کہ اس سرمایہ کو ان سے وصول کیا جائے ان کو مزید زیر بار کیا جائے اس لیے ابتدا میں دوست ممالک سے مدد لی، قرضے فراہم کیے، عطیے قبول کیے اور تجربہ حاصل کیا۔ اس سرمایہ کو جب مختلف پروگراموں پر لگایا گیا تو روزگار اور آمدنی بڑھی۔ یعنی طلب میں اضافے کا باعث بنا۔ بس یہیں سے مشکلات نے آگھیرا۔ ہوا یہ کہ بڑے پیمانہ پر لگائے گئے سرمایہ نے فوری طور پر روزگار و آمدنی و طلب کو تو بڑھا دیا لیکن پیداوار میں فوری طور پر کوئی توسیع نہ ہو سکی۔ یہ طویل مدتی پروگرام تھے اور وہ بھی سرمایہ والے جہاں لوہا، اسپات، مشینیں، کل پرزے، بجلی کی قوت، پیدا ہونی تھی، سڑکیں، ہسپتال، ریل، ہوائی جہاز تیار ہونا تھے۔ ان سے بڑھتی ہوئی طلب کی تسکین کیسے ہوتی۔ وہاں تو فوری طور پر ضرورت تھی۔ اناج، کپڑا، مکان و دیگر اشیائے صرف کی جس کی پیداوار میں فوری اضافہ ناممکن تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام اشیاء کی قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہو گیا جس کی لپیٹ میں میری تمام ترقیاتی اسکیمیں آگئیں اور ان کی تکمیل لاگت میں بھی تیزی سے اضافہ شروع ہو گیا۔

ترقی کی جو راہ ہم نے اختیار کی تھی اس کا فطری نتیجہ تھی اور مجھے اس نازک صورتحال کا انتہائی سوجھ بوجھ سے مقابلہ کرنا تھا۔ مسئلہ کا حل تو پیداوار کی وسعت میں مضمر تھا لیکن یہ پیداوار فوری طور پر کیسے بڑھائی جائے جب تک ایک مضبوط ڈھانچہ نہ تیار ہو جائے ہر طرح کی بنیادی صنعتیں نہ قائم ہو جائیں تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام نہ ہو جائے۔ اس کے لیے تو وقت چاہیئے اور وہ بھی ہندوستان جیسے بڑے ملک کے لیے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ہم اپنی آزادی اور خود مختاری کو باہری ممالک کے ہاتھوں فروخت کر کے سب کچھ بطور امداد کے حاصل کرتے رہتے، آپ کی وقتی دشواریوں کو حل کرتے رہتے اور خود کفیل، خود مختار و آزاد معیشت کا خواب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ رہتے۔ میں نے عوام کو سمجھایا کہ اس صورتِ حال کا میرے ساتھ رہ کر مقابلہ کیجیئے۔ یہ بس وقتی دور ہے جو ہم جلد سے جلد گزار لیں گے۔ ہم نے انتہائی مناسب شرائط کے ساتھ باہری امداد بھی قبول کی اور بہرحال ۱۹۷۱ء تک ہم نے اس صورتِ حال پر قابو پا لیا اور آج آپ اس سنگین دور سے نکل آئے ہیں۔ آج آپ اتنا اناج، کپڑا و دیگر اشیائے صرف پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے باوجود سب کی ضرورت پوری کر رہے ہیں، پڑوسی ممالک کی ضرورتوں کو پورا کر رہے ہیں اور ضرورت پڑنے پر باہری ممالک سے تجارت کر کے زرِ مبادلہ بھی کما رہے ہیں۔

میرا پہلا بھائی صرف ۹۰۰ کروڑ ر

[illegible] ۱۱ فیصد زراعت پر ۲۰ فیصد رسل ورسائل پر، ۲۳ فیصد سماجی خدمات پر، صرف ۴ فیصد صنعت پر اور ۴ فیصد دیہی صنعتوں پر خرچ کیا گیا۔ پہلا بھائی تو ہنگامی صورت میں آیا۔ ملک کے سامنے ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ مسائل، اناج و دیگر خام مال کی کمی اور ایک اُجڑی ہوئی معیشت تھی۔ اس لیے مستقبل کے ہندوستان کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ بھائی صرف وقتی مسائل کے حل کرنے پر ہی زور دے سکا۔

دوسرے بھائی نے ایک ٹھوس، طویل مدتی اور خودکفیل معیشت کا خواب دیکھا اور اس کی ابتدا کی۔ اس کا کہنا تھا کہ جب تک تیزی سے صنعتیں نہیں پھیلیں گی کوئی معیشت مضبوط و مستحکم نہیں بن سکتی۔ اسی لیے یہ بھائی صنعت کی طرف بڑھا۔ ۴۶۰۰ کروڑ روپیہ کی رقم خرچ کی گئی جس میں بجلی کی قوت بھاری صنعتوں اور رسل ورسائل پر ۵۸ فیصد، سماجی خدمات پر ۱۸ فیصد، زراعت پر ۱۹ فیصد اور دیہی صنعتوں پر ۴ فیصد خرچ کیا گیا۔ لیکن یہاں زراعت نے ساتھ نہ دیا۔ سیلاب و خشک سالی نے فصلیں تباہ کیں اور نتیجہ یہ نکلا کہ معیشت ایک بار پھر سنگین صورتِ حال سے دوچار ہوگئی۔ تیسرے بھائی نے اس کمزوری کو سمجھ لیا اور زراعت و صنعت دونوں کو متوازی اہمیت دی۔ اس نے کہا کہ دونوں کی ترقی کے بغیر مجموعی ترقی ممکن نہیں۔ اس لیے اس نے اپنے دوسرے بھائی کے صنعتی پروگرام کو آگے بڑھایا، جلد سے جلد تکمیل کی طرف لے گیا اور ساتھ ہی ساتھ زراعت پر بھی زور دیا۔ اس نے ۸۵۰۰ کروڑ روپیہ خرچ کیے جس میں ۲۱ فیصد زراعت اور ۲۰ فیصد صنعتوں کے لیے مخصوص تھے میرے تیسرے بھائی نے ۲ بڑے شدید جھٹکے سہے۔ اوّل دو جنگوں (چین سے ۱۹۶۲ء میں اور پاکستان سے ۱۹۶۵ء میں) کا سامنا کیا۔ اور دوم زراعتی محاذ پر ناکامیابی ہوئی۔ اس کے باوجود اس بھائی نے زراعت و صنعت دونوں کو متوازی اہمیت دے کر یہ بتلا دیا کہ ترقی کی صحیح سمت یہی ہے۔ پھر چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں بھائیوں نے اسی سمت کی پیروی کی، پانچویں بھائی نے اپنا کام ختم کرکے ایک مضبوط، خودکفالت کی طرف بڑھتی ہوئی زرعی معیشت سپرد کی۔ صنعتی ترقی کے لیے ڈھانچہ کا کام مکمل ہو گیا اور آج ہم ہر سمت میں ہر طرح کی اشیاء تیار کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ چوتھے بھائی کے زمانہ سے پسماندہ، غریب اور بے توجہی کے شکار طبقہ کی طرف دھیان دیا جانے لگا اور آج آپ دیکھ رہے ہیں، کہ ہم نے غریبوں کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔

میں نے اپنے نصب العین کا آئینہ آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ میری تمام سرگرمیوں کا مقصد بس یہی ہے کہ آپ سب اپنی زیادہ سے زیادہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل بن جائیں۔ آپ جو چاہیں پیدا کریں، جتنا چاہیں پیدا کریں اور جب چاہیں پیدا کریں۔ آپ میری پیدا کی ہوئی سہولتوں کا فائدہ اٹھائیے اور مجھ پر بھروسا کیجئے۔ یہ ساری سہولتیں، آپ کی خواہشات کی تسکین کے لیے ہیں اور ہر ناممکن کو ممکن بنا کر خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے ہیں۔ ●

بقیہ، بھارت میں ۳۴واں قومی فلمی میلہ

اور ان میں بھائی چارے اور امن کا پیغام ہونا چاہیئے۔ صدر جمہوریہ ہند نے مزید فرمایا کہ تفریح ہماری اعلیٰ اور ارفع قدروں کی قیمت پر نہیں ہونی چاہیئے۔ باکس آفس کی کامیابی کے لیے تخریبی جذبات کو ابھارنا نہیں چاہیئے انھوں نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ بھارت کی جنگِ آزادی میں فلموں نے عمدہ کردار ادا کیا ہے۔ اور آج بھی یہ وقت کی ضرورت ہے کہ قومی آدرشوں کی عکاسی کی جائے۔ فلم سازوں کو اپنے آپ پر مردہ سنسر کے بجائے رضاکارانہ سنسر کو لاگو کرنا چاہیئے۔ انھوں نے جنسی اشتعال اور تشدد کے عام فارمولے کو ختم کرنے کی اپیل کی کیونکہ فلموں کی مار دھاڑ سے سماج میں مار دھاڑ کو تقویت ملتی ہے۔ کم تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اکثر و بیشتر فلموں میں جرائم کی بھرمار نظر آتی ہے۔ راشٹرپتی نے کہا کہ یادگار فلمیں وہ ہیں جو ہماری سوچ کو بدل دیں اور تھوڑی دیر ٹھہر کر ہمیں کچھ سوچنے پر مجبور کر دیں۔ وزارت اطلاعات و نشریات کے مرکزی وزیر شری اجیت پانجہ نے اپنی تقریر میں قومی یک جہتی اور اتحاد کے موضوع پر فلمیں بنانے پر زور دیا۔

اس مرتبہ ملیالم زبان کی فلموں کو مختلف زمروں میں سب سے زیادہ یعنی سات اعزازات ملے۔ البتہ بنگالی فلم "پھیرا" اور ہندی فلم "مرچ مصالحہ" کو تین تین اعزازات عطا کیے گئے اور اپنی اپنی زبان کی فلموں میں انھوں نے علاقائی زبانوں کے اعزازات حاصل کیے۔

اس بار عطا کیے گئے اعزازات کا ایک خصوصی اور قابل توجہ پہلو یہ رہا کہ اس بار نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن (NATIONAL FILM DEVELOPMENT CORPORATION) کی طرف سے تیار کیے گئے یا اس کے ذریعہ مالی امداد حاصل کرنے والی فلموں کو ۹ اعزازات عطا کیے گئے۔ یہ ایک ریکارڈ رہا۔ ●

ڈاکٹر سید مسعود حسن جعفری



زراعتی طریقوں میں نیا رُخ کیوں؟

مُلک میں غذائی مسئلہ کے پیشِ نظر زراعتی طریقوں میں تنوع لاکر نہ صرف اجناس کی زیادہ پیداوار ممکن ہے بلکہ مٹی کی زرخیزی کو بھی زیادہ مدت تک قائم رکھ سکتے ہیں۔ شمالی ہندوستان کی ان ریاستوں میں جہاں دھان اور گیہوں کی مسلسل کاشت یکے بعد دیگرے کی جاتی ہے۔ جدید کاری سے کسانوں کو زیادہ منافع مل سکتا ہے۔ کچھ سال پہلے مروجہ طریقوں میں تجدید کا رجحان کم تھا لیکن جیسے جیسے تجزیہ کے نتائج سامنے آئے ہیں جدید طریقوں کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اوّل ان جدید طریقوں سے آبپاشی میں کفایت ہوتی ہے، دوئم پودوں کے خوراکی اجزاء جیسے نائٹروجن، فاسفورس اور پوٹاشش جو مٹی میں قدرتی طور پر شامل ہیں زیادہ عرصہ تک پودوں کو خوراک فراہم کر سکتے ہیں اور اس زرخیزی سے کیمیاوی کھاد میں کفایت ہوتی ہے۔

ملک میں اس وقت مختلف اجناس، تلہن، دالیں، ریشے والی فصلیں جیسے جوٹ اور کپاس۔ مویشیوں کے چارے۔ موٹے اناج اور نیشکر کی پیداوار میں اضافہ کی ضرورت ہے، ملک میں ان کی ضرورت برابر بڑھ رہی ہے، لہٰذا اس کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ یہ طریقے معاشی اعتبار سے سود مند اور تیکنیکی لحاظ سے کاشتکاروں کو قابلِ قبول بھی ہوں۔ علاوہ اس کے فصلوں کی پیداوار میں کمی نہ آئے۔ پیداوار کی قیمتیں معقول اور علاقائی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ گیہوں اور دھان کی جدید قسموں کی مقبولیت سے ملک میں زراعتی انقلاب آیا۔ تقریباً سولہ سال (۸۲ — ۱۹۸۱ء تک) کی مدت میں ملک کے وسیع علاقے میں یہ فصلیں بوئے جانے لگیں اور یہاں زراعت کے زیرِ تحت رقبہ بڑھ گیا۔ تخمینہ کے مطابق یہ اضافہ علی الترتیب ۴۷ اور ۱۲ فیصد گیہوں اور دھان کے لیے ہوا ہے۔ شمالی ہندوستان میں پنجاب کی ریاست گیہوں کی کاشت کے لیے ساری دنیا میں ہے۔ یہاں تقریباً ۸۵ فیصد علاقہ میں آبپاشی کی سہولتیں حاصل ہیں لہٰذا گیہوں کے زیرِ کاشت رقبہ میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ دوسری فصل دھان کی پیداوار بیس سال کی مدت میں تقریباً ۷ گنا بڑھ چکی ہے۔ موجودہ اعداد کے مطابق پنجاب میں گیہوں کا زیرِ کاشت رقبہ کل زراعتی رقبہ کا ۸۴ فیصد (پنجاب کا کل زراعتی رقبہ ۴۲۱۰۰۰۰ ہیکٹیر ہے) اور دھان کا زیرِ کاشت رقبہ ۱۵ فیصد ہے۔ اس ریاست میں زراعتی آمدنی کا تقریباً ¾ حصہ انھیں دو فصلوں سے حاصل ہوتا ہے۔ صوبہ کی نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ پنجاب ہی ایسا صوبہ ہے جہاں سے گیہوں کی کُل ملکی پیداوار کا تقریباً ۶۰ سے ۷۰ فیصد اور دھان کی کُل ملکی پیداوار کا ۴۰ سے ۴۵ فیصد حصہ حاصل ہوتا ہے۔

اس صوبہ کے ان علاقوں میں جہاں دیگر اجناس جیسے جَو، چنا، سرسوں کی کاشت کی جاتی ہے۔ وہاں بھی گیہوں نے جگہ لے لی ہے۔ اسی طرح دھان کا علاقہ بڑھتے بڑھتے مکئی اور خریف کی مختلف پھل دار فصلوں (جیسے مسور، اُرد، مونگ، مونگ پھلی، کپاس، اور مویشیوں کے چارہ والی فصلیں) کے علاقہ میں داخل ہو چکا ہے۔ یہی کیفیت پڑوس کے صوبہ ہریانہ اور اُتر پردیش کے مغربی علاقہ میں بھی ہے۔ اگرچہ دھان، گیہوں کا طریقۂ کاشت آسان ہے لیکن مقامی ضرورت کے پیشِ نظر اس طریقہ میں تنوع کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی ہے۔ اگر مطالعہ کیا جائے تو پنجاب میں ان دو فصلوں کے ذریعہ پیداوار کا اوسط ۶٫۳۶ ٹن فی

٭ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف شوگر کین ریسرچ، لکھنؤ
یوجنا، نئی دہلی

ہیکٹیر ہے جبکہ پیداوار کی صلاحیت کا اندازہ تقریباً ۱۲۰ ٹن فی ہیکٹیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا پنجاب کے کسانوں کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ متبادل زراعتی طریقہ اختیار کریں۔ تبدیلی کا رجحان ۱۹۸۵ء میں زیادہ ہوا جب پنجاب کے کسانوں کو اپنی خریف پیداوار کو فروخت کرنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ۱۹۸۵ء میں ملکی اجناس کا ذخیرہ ۱۹۸۱ء کے مقابلہ میں ۱۳٫۶ ملین ٹن (۱۳۶۰۰۰۰۰ ٹن) سے بڑھ کر ۲۹ ملین ٹن (۲۹۰۰۰۰۰۰ ٹن) ہو گیا۔ اس ذخیرہ میں وہ مقدار بھی شامل ہے جو برآمد کی گئی۔ یہ اضافہ یو۔ پی۔ مدھیہ پردیش اور بہار کے صوبوں کے ذریعہ ہوا حالانکہ اس سے قبل یہ صوبے اجناس کے معاملہ میں خود کفیل نہ تھے۔ آئندہ سالوں میں بھی انھیں صوبوں سے زیادہ توقع کی جاتی ہے، لہٰذا پنجاب کا کسان زراعتی طریقوں میں نیا رُخ دینا چاہتا ہے۔

منڈی کے مسائل کے علاوہ کچھ دیگر وجوہات بھی ہیں جن کی بنا پر نیا رُخ ناگزیر ہے۔ مثلاً زیر زمین آبی ذخائر میں کمی، ۲۔ مٹی کی زرخیزی میں کمی۔ ۳۔ نباتاتی بیماریوں، کیڑے مکوڑوں اور کھیتوں میں فاضل گھاس پھوس کی بہتات۔ ۴۔ توانائی کا بکثرت استعمال۔ ۵۔ تلہن اور دالوں کی پیداوار میں کمی، ۶۔ دھان اور گیہوں کی مسلسل کاشت سے ماحول میں زراعتی فصلوں کا بگڑتا ہوا توازن۔

زیر زمین آبی سطح میں کمی کا سبب دھان اور گیہوں کے لیے پانی کی کثیر ضرورت ہے۔ مثلاً پنجاب کے وسطی اضلاع میں زیر زمین آبی سطح ۳۰ سے ۴۵ سینٹی میٹر سالانہ گھٹ رہی ہے جو خطرہ کی گھنٹی ہے۔ اس کے علاوہ اسی صوبہ کے ۵۱ فیصد بلاکوں میں اور زیادہ ٹیوب ویلوں کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس صوبہ کے مغربی اضلاع میں جہاں اُوسر زمین ہے میٹھے پانی کی کمی ہے۔ یہاں دھان کی آبپاری ناقص پانی سے ہو رہی ہے۔

مٹی کی بگڑتی ہوئی زرخیزی بھی ایک اہم مسئلہ ہے جس کی طرف کاشت کاروں کو پوری توجہ دینی ہے۔ دھان، گیہوں فصلوں کی مسلسل پیداوار سے کثیر المقدار خوراکی اجزاء جیسے نائٹروجن فاسفورس اور پوٹاش تقریباً ۵۰۰ سے ۷۰۰ کلوگرام فی ہیکٹیر سالانہ مٹی سے خارج ہوتے ہیں۔ یہ مقدار فصلوں کے لیے سفارشی مقدار سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ دھان کی کاشت کاری میں نائٹروجن کا نقصان لیچنگ (مٹی کی گہری پرت میں انجذاب) کے ذریعہ عام بات ہے۔ فاسفورس کی بڑھتی مانگ اور دھان کی فصل کے لیے پوٹاش کی ضرورت (خصوصاً سُرخ اور ریتیلی مٹی میں) برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ پودوں کی قلیل المقدار خوراکی اجزاء جیسے جستہ، لوہا، میگنیز اور تانبے کی کمیابی بھی محسوس کی جا رہی ہے۔ گندھک یا سلفر کی کمی ان علاقوں میں زیادہ ہے جہاں فاسفورس ڈائی ایمونیم فاسفیٹ فرٹیلائزر کی شکل میں فصلوں کو دیا جاتا ہے۔ کیمیاوی تجزیہ کے علاوہ مٹی کی طبعی ساخت یا ہیئت کا بھی مطالعہ کیا گیا ہے۔ دھان کی کاشت کاری سے مٹی کی طبعی ہیئت آئندہ فصلوں کے لیے ناموافق بن جاتی ہے اس میں انجذابی صلاحیت کم ہو جاتی ہے اور سینچائی کا پانی زیادہ گہرائی تک نہیں پہونچتا۔ دھان کی فصل کے بعد کھیتوں کی مٹی سخت ہو جاتی ہے۔ گیہوں کے لیے ایسی مٹی ناموافق ہوتی ہے کیوں کہ پودوں کی جڑیں گہرائی میں نہیں جا سکتیں۔ مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ دھان کے کھیتوں میں ۱۵ سے ۲۰ سینٹی میٹر کی گہرائی تک مٹی سخت ہو جاتی ہے۔ مٹی کی یہ سخت پرت انجذاب کو روک دیتی ہے۔ اس طرح گیہوں کے کھیتوں میں پانی کا کچھ عرصہ تک جمع رہنا بھی مٹی کی طبعی ہیئت کو بگاڑ دیتا ہے۔

ذیل کے جدول میں جدید طریقہ کاشت کو دکھایا گیا ہے۔ پنجاب کے علاقہ میں خزاں میں لگایا ہوا گنا بہار کے موسم میں لگائے ہوئے گنّے سے تقریباً ۲۳ سے ۳۰ فیصد زیادہ پیداوار دیتا ہے۔ پیداوار میں اضافہ اور بھی زیادہ ممکن ہے اگر گنّے کے ساتھ دیگر فصلوں کو بھی بویا جائے۔

مخلوط فصلیں	پیداوار (ٹن فی ہیکٹیر)		خرچ (روپیوں میں)		کُل خرچ	منافع (روپیوں میں)
	گنّا	دیگر فصل	گنّا	دیگر فصل		
گنّا + آلو	۹۶٫۴	۳٫۱	۵۸۰۰	۳۵۰۰	۹۳۰۰	۴۲۳۱
گنّا + پیاز	۹۹٫۱	۱۳٫۴	〃	۱۱۴۴	۶۹۴۴	۸۸۰۰
گنّا + گیہوں	۶۳٫۹	۲٫۵	〃	۱۱۶۱	۶۹۶۱	۴۱۶۳
گنا + دھنیہ	۷۸٫۶	۰٫۷	〃	۶۳۳۶	۵۳۶	۶۸۴۰

بہ شکریہ انڈین جرنل آف شوگر کین ٹیکنالوجی ۳۔ نمبر ۱ ۱۹۸۶ء۔

نریندر جوشی

بھارت میں ریشم کی صنعت

ریشم صدیوں سے بھارت کا روایتی پہناوا چلا آرہا ہے۔ اس کا ذکر چانکیہ کے "کوٹلیہ ارتھ شاستر" اور کالی داس کے ناٹکوں میں بھی ملتا ہے جو تقریباً دو ہزار سال قبل لکھے گئے تھے۔ مورخ بتاتے ہیں کہ عہد موریہ میں لوگ ریشم کے کپڑے پہنتے تھے۔ آجکل ریشم کی مانگ اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اسے پورا کرنے کے لیے اب مصنوعی ریشم بھی بھاری مقدار میں تیار کیا جارہا ہے۔ ریشم خاص کیڑوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ جن کی کاشت کرناٹک، آسام، اور کشمیر میں کی جاتی ہے جو ریشم کی پیداوار میں پیش پیش ہیں۔ دراصل ریشم کی پیداوار ملک میں ایک گھریلو صنعت کے طور پر رہی ہے جس میں شہری اور دیہی علاقوں کے بہت بھاری تعداد مصروف ہے۔ بلکہ اب تو ملک کے دیگر حصوں میں گذشتہ دو دہائیوں میں اس کی پیداوار میں بھاری اضافہ ہونے لگا ہے اور اُتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان میں بھی اس گھریلو صنعت نے بڑی ترقی کی ہے۔ اس صنعت کے فروغ میں بھارت سرکار کی طرف سے جو امداد دی جارہی ہے اس کی بدولت اب بھارت ریشم کی پیداوار میں چین اور جاپان کے بعد تیسرے نمبر پر آگیا ہے۔ اگر ترقی کی یہی رفتار برقرار رہی تو بھارت جلد چین کے بعد دوسرے نمبر پر آجائیگا۔

اس صنعت میں چین دُنیا میں سب سے آگے ہے بلکہ بعض مورخوں کا بیان ہے کہ ریشم چین سے بھارت پہنچا ہے اور اس کے بعد بھارت نے اس کی صنعت کو فروغ دیا تھا۔ چین میں ایک کروڑ سے زیادہ لوگ دیہی علاقوں میں اس صنعت کو اپنا ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں جب کہ بھارت میں ۵۵ لاکھ سے زیادہ افراد اس کی بدولت اپنی روزی کما رہے ہیں۔ بھارت میں ریشم کی سالانہ پیداوار اب تقریباً ۹ ہزار ٹن ہے۔ اور ۱۴ ریاستوں میں اس کی کاشت کی جارہی ہے۔ یہاں چار قسم کا ریشم پیدا کیا جارہا ہے۔ ملبری، ٹسر، ایری، اور موگا۔ اوران میں سب سے زیادہ "ملبری" ریشم تیار کیا جاتا ہے۔ جس کے کیڑوں کی کاشت شہتوت کے درختوں پر کی جاتی ہے۔ ٹسر بہار اور مغربی بنگال میں پیدا کیا جاتا ہے جبکہ موگا کی کاشت آسام میں ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آسام کی ریشمی ساڑیاں اسکارف اور دیگر لباس اور بھاگلپور کے ریشمی کوٹنگ اور شرٹنگ بہت مشہور ہیں۔ ریشم پیدا کرنے والے کاشتکاروں کا بیان ہے کہ انھیں ریشم کی کاشت سے مقابلتہً زیادہ فائدہ پہنچ رہا ہے کیونکہ اس سے تمام سال آمدنی ہوتی ہے۔ اگرچہ بھارت کی طرف سے ریشم کی برآمد بھی کی جارہی ہے اور ۱۹۸۵ء میں تقریباً ایک کھرب روپے کی کُل برآمدات میں اس کا حصّہ ۱۲ فیصد سے بھی زیادہ ہوگیا ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ ریشم کی جس قدر پیداوار ہوتی ہے اُس سے گھریلو مانگ بھی پوری نہیں ہوتی (اور اسی لیے مصنوعی ریشم کی تیاری میں تیزی لائی جارہی ہے)۔ ماہرین کی رائے ہے کہ پیداواری صلاحیت کو بڑھا کر نہ صرف ملکی مانگ پوری کی جاسکتی ہے بلکہ برآمد میں بھی اضافہ کرکے مزید زرِ مبادلہ کمایا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے یہ سجھاؤ دیا ہے کہ ضرر رساں کیڑوں سے ہونے والے ۴۰ فیصد نقصان پر قابو پاکر اس کی پیداوار میں کافی اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ ماہرین کی یہ رائے بھی ہے کہ ملک کی کُل ۳۶ کروڑ ہیکٹر زمین کے صرف ۶ فیصد حصے (۲۱۱۱۷۴ ہیکٹر زمین) میں ریشم کے کیڑوں کی کاشت ہوتی ہے۔ اگر مزید کچھ زمین

کو اس مقصد کے لیے استعمال میں لایا جائے تو اس سے جہاں ریشم کی پیداوار میں اضافہ ہوگا وہاں دوسری فصلوں پر اس کا کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا۔ اتنا ہی نہیں۔ اگر ہم پیداوار جاپان کے برابر بھی کرلیں تو زمین کا رقبہ بڑھائے بغیر ہی ہماری پیداوار دوگنی ہوسکتی ہے۔ بیکار پڑی بنجر زمین کا استعمال "ٹسر" ریشم کی پیداوار کے لیے کیا جاسکتا ہے۔ بھارت کی زراعت میں لاگت اور منافع کا تناسب ۳:۲ ہے جب کہ ریشم میں ۳:۱ ہے۔ اسی طرح دیگر کئی سماجی و اقتصادی فوائد اس صنعت سے حاصل ہوسکتے ہیں جن سے اس صنعت کے تئیں رجحان بڑھتا جارہا ہے۔ موجودہ پانچسالہ منصوبے میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ برآمد کے لیے ساڑھے ۴ لاکھ ہتھ کرگھوں اور ۳۶ ہزار برقی کرگھوں پر جو ۱۰ لاکھ بُنکر کام کر رہے ہیں ان کی تعداد بڑھا کر ۱۵ لاکھ کردی جائے گی۔ تقریباً ۲۰ ہزار سائنس داں، منتظم اور اعلیٰ افسران ریشم کی پیداوار بڑھانے میں لگے ہوئے ہیں جو اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ بھارت میں ریشم بڑھانے کا شعبہ کافی وسیع ہے۔ بھارت کی ایسی صلاحیت پر ہی بھروسہ کرتے ہوئے بین الاقوامی سلک تنظیم نے اس اُمید کا اظہار کیا ہے کہ دُنیا میں بھارت اور برازیل ہی دو ایسے ملک ہیں جو ریشم کی عالمی تجارت میں اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔ کرناٹک میں ریشم کی پیداوار بڑھانے میں مرکزی سلک بورڈ بڑا حصہ لے رہا ہے۔ اُس کی طرف سے کاشتکاروں کو ضروری تکنیکی جانکاری اور کیڑوں کے بیماری سے مبرّا انڈے مُہیا کیے جارہے ہیں۔ اس سے ریشم کے کوالٹی اور پیداوار میں بہتری ہو رہی ہے ریشم کے کویوں کی فروخت کا انتظام بھی کچھ ایسے ڈھنگ سے کیا گیا ہے جس سے کسانوں کا استحصال نہ ہو اور انھیں اپنے مال کے موزوں دام ملیں۔ ریاست میں کویا کی فروخت کے ۴۴ مرکز ہیں جو قانون کے تحت کام کرتے ہیں۔ ۸۷-۱۹۸۶ء کے انہیں میں خشک سالی کے باوجود تقریباً ۴۱ ہزار ٹن کویا کی پیداوار ہوئی ہے جبکہ گذشتہ برس اسی عرصے میں ۳۸ ہزار ٹن کی پیداوار ہوئی۔

رواں مالی سال کے دوران ۴۶ ہزار ٹن کویوں کی پیداوار کی اُمید ہے جس سے ۸۴ سو ٹن ریشم کی پیداوار ممکن ہوگی۔ مرکزی سلک بورڈ کے اہتمام میں میسور میں ریشم تحقیقی مرکز کا قیام کیا گیا ہے۔ اُدھر اُتر پردیش میں ڈیرادون اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں اعلیٰ قسم کے سفید کویوں کی پیداوار کے تجربے کافی حد تک کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور اُن کی پیداوار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی قسم کے ریشم کے تحقیقی ادارہ کا قیام مغربی بنگال میں بھی کیا گیا ہے۔ رانچی میں واقع ادارہ میں ٹسر قسم کے ریشم کے بارے میں تحقیق و مطالعہ کیا جارہا ہے۔ یہاں تحقیق و مطالعے کے علاوہ ملک اور غیر ممالک کے ماہرین ریشم تربیت بھی دیتے ہیں۔ مرکزی سلک بورڈ ریشم کے پیداوار کو فروغ دینے میں تیزی سے کام کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں چاروں اقسام کے ریشم کی کوالٹی کو بہتر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں ۳۰ کروڑ روپے کی لاگت سے متعدد پراجیکٹوں پر مغربی بنگال، اڑیسہ، اُتر پردیش، آسام، بہار، مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر میں کام ہو رہا ہے۔

مرکزی سلک بورڈ ریشم کے برآمد کنندگان کی رجسٹریشن کرتا ہے اور برآمد کیے جانے والے مال کی کوالٹی پر نگرانی اور کنٹرول کرتا ہے۔ ریشمی ساڑیوں اور کپڑوں کی برآمد لگ بھگ ۸۰ ملکوں کو کی جاتی ہے جس میں سے ۵۰ فیصد مال مغربی ممالک کو جاتا ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء میں تقریباً ایک ارب ۳۰ کروڑ روپے کی مالیت کے ریشمی کپڑوں کی برآمد ہوئی جس کے آئندہ برسوں میں مزید بڑھنے کا امکان ہے۔

حکومت کی طرف سے ریشم کی پیداوار بڑھانے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔ ریاستوں میں سلک ایکسچینج اداروں کا قیام کیا گیا ہے جہاں تیار کچے دھاگے کی نیلامی کی جاتی ہے۔ بنگلور میں جو ایکسچینج کھولا گیا ہے وہ ایشیا میں اپنی قسم کا واحد اکلوتا مرکز ہے۔ یہاں ہر برس دو ارب روپے کی مالیت کے کچے ریشم کے دھاگوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ نیلامی میں بدعنوانیوں کو روکنے اور قیمتوں میں استحکام بنائے رکھنے کے لیے ریاستی مارکیٹ بورڈ قائم کیا گیا ہے۔ اس طرح ریشم کی پیداوار، ترقی اور برآمد کو بڑھاوا دینے کے لیے زبردست مساعی کی جارہی ہے۔ توقع ہے کہ وہ دن جلد آئے گا جب بھارت ریشم کے شعبے میں دُنیا میں سب سے آگے نکل جائے گا۔

●

تصحیح

یوجنا، اکتوبر ۱۹۸۷ء میں "بڑھتی ہوئی آبادی اور اس کے اثرات" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے، اس کی مصنفہ شگفتہ فرحت حبیب ہیں۔ قارئین نام کی تصحیح فرمالیں۔

ایڈیٹر

اُرملا دیوی

سماجی جنگل بانی کے پروگراموں کے لیے

عورتوں کے تعاون کی ضرورت

درخت ہماری زندگی کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ ہمیں آکسیجن مہیا کرتے ہیں جو زندہ رہنے کے لیے بے حد ضروری ہے، چلچلاتی دھوپ میں سایہ دیتے ہیں جو ہمیں سورج کی تیز کرنوں سے بچاتا ہے۔ خاص کر اس وقت جب سورج سوا نیزے پر ہوتا ہے۔ ان کی ہریالی آنکھوں کو طراوت بخشتی ہے۔ اور ماحول کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے۔ درخت اگر پھل دار ہوں تو ان کے کھٹے میٹھے پھل ہمارے لیے لذتِ زبان اور صحت کی بہتری کا ساماں فراہم کرتے ہیں۔ بہت سے پیڑ پودے دوا کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور ان کی پتیاں یا پھل یونانی و آیورویدک دوائیاں بنانے کے کام آتے ہیں۔ جب بارش ہوتی ہے تو اس کا پانی ہماری زرخیز زمینوں کے اوپر کی مٹی بہا کر لے جاتا ہے۔ اگر درخت، پیڑ پودے اور جنگلات ہوں تو وہ زمین کے کٹاؤ کو روکتے اور زمین کو بنجر ہونے سے بچاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں میں تو عورتیں پیپل اور برگد کے پیڑوں اور تلسی کے پودے کی پوجا کرتی ہیں اور ان پر جل چڑھا کر انھیں سیراب کرتی ہیں۔ یہ درختوں کے احترام کی بیّن مثال ہے۔ اسے مذہبی رنگ شاید اس لیے دیا گیا کہ درختوں پر لازمی طور پر توجہ دی جائے۔

ہندوستانی معیشت کے لیے، جو زیادہ تر زراعت پر مبنی ہے، درختوں کی افادیت اور اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت نے ہر سال "ون مہوتسو" منانے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس مہوتسو کے دوران ملک بھر میں بہت بڑی تعداد میں پودے لگائے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کتنے تناور درخت بنتے ہیں یہ بات تحقیق طلب ہے کیونکہ بیشتر پودے مسلسل آبیاری و دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب مرجھا جاتے ہیں۔

خودرو درختوں کے انبوہ کو جنگل کہتے ہیں۔ لیکن اضافہ آبادی کے سبب کالونیاں یا مکانات بنانے یا صنعتی استعمال کے لیے عمارتی لکڑی کی مانگ پوری کرنے کے لیے بہت سے جنگل بے دریغ کاٹ دیے جاتے ہیں۔ ایندھن کے لیے لکڑی بھی جنگل سے کاٹ کر لائی جاتی ہے۔ لیکن اگر جنگلات کو بلا سوچے سمجھے کاٹنے کا سلسلہ جاری رہا تو ہماری زرخیز زمینیں چٹیل میدانوں اور ریگ زاروں میں بدل جائیں گی۔ اس سے جہاں زراعت بُری طرح متاثر ہوگی وہاں قدرتی ماحول بھی تباہ ہو جائے گا۔

سماجی جنگل بانی

چنانچہ حکومت نے تحفظِ جنگلات اور ہوا اور پانی کو آلودگی سے بچانے کے لیے متعدد پروگرام شروع کیے ہیں اور کئی قوانین پاس کیے ہیں۔ انھیں موثر ڈھنگ سے زیرِ عمل لانے کے لیے عوام کا مکمل تعاون حاصل کرنا ضروری ہے۔ سماجی جنگل بانی کا تصور بھی ترقیاتی مسائل میں مرکزی اہمیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ سماجی جنگل بانی کا مقصد جنگل بانی کے پروگرام کو مقامی عوام کی شرکت و تعاون اور کنٹرول کے ساتھ زیرِ عمل لانا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ اعلیٰ سطح پر تیار کیے گئے پروگراموں کو عوام کے اشتراکِ عمل کے بغیر ہمکنار، پوری کامیابی کے ساتھ لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ اب جنگلات کے پراجیکٹ صرف درختوں کے وسیع اور گھنے جھنڈوں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ اب ان کا تعلق کسی بھی درخت یا درختوں اور جھاڑیوں سے ہو سکتا ہے اور ان کی حفاظت و دیکھ بھال کو زرعی ترقی کے دوسرے

۵ منتج پوری دہلی۔
یوجنا، نئی دہلی

پروگراموں سے مربوط کیا جاسکتا ہے۔ جنگلات کے تحفظ کے لیے کیے گئے اقدامات کے نتیجے میں اس متعلقہ کارکنوں کا زیادہ تر وقت اب بندوبست، کنٹرول اور قوانین کے نفاذ پر صرف نہیں ہوگا کیونکہ یہ فرائض جہاں جہاں ممکن ہوگا وہاں مقامی سماج کو منتقل کردئے جائیں گے اور یہ کارکن ایک ٹیکنیکل رول ادا کریں گے اور اس کا کام امدادی اور مشاورتی ہوگا۔ مرکزی اہمیت مقامی باشندوں کو حاصل ہوگی۔ البتہ انھیں مقامی مسائل کو حل کرنے میں امداد و رہنمائی فراہم کی جائے گی۔ یہ نیا طریق کار مشکل اور دقت طلب ضرور ہے لیکن اس سے یقیناً بہتر نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ مقامی لوگوں کو مقامی مسائل اور انھیں حل کرنے کے مختلف طریقوں سے آگاہ کرنا ہوگا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی کہ وہ خود یہ فیصلہ کریں کہ کون سا طریقہ موزوں اور ممکن العمل ہوگا۔

عورتوں کا تعاون اشد ضروری

اکثر دیکھا گیا ہے کہ دیہات میں مکانوں کے قریب سایہ یا پھلوں یا سبزیوں کے لیے جو درخت یا پودے لگائے جاتے ہیں وہ سب کے سب زندہ اور ہرے بھرے رہتے ہیں کیوں کہ اس گھروں کی عورتیں ان کی مسلسل دیکھ بھال کرتی رہتی ہیں اور انھیں باقاعدگی سے پانی وغیرہ دیتی رہتی ہیں لیکن ہمارے پروگرام بنانے والے کارپرداز مقامی حالات و مسائل کا پتہ لگانے کے لیے جب گاؤوں کے دورے پر جاتے ہیں تو وہ مرد مکھیاؤں یا پنچایت لیڈروں سے ہی بات کرتے ہیں۔ اس طرح عورتیں پروگرام تیار کرنے کے کام میں شریک نہیں ہو پاتیں۔ ہمارے کئی پروگراموں کے ناکام ہونے کی وجہ یہی ہے کہ ان کی تشکیل اور عمل آوری میں عورتوں کو شریک نہیں کیا جاتا۔ شجرکاری وغیرہ کے کام میں عورتوں کا تعاون بے حد ضروری ہے۔ مثال کے طور پر اگر مرد کچھ پیڑ پودے لگاتے ہیں اور ان کے گھروں کی عورتیں ان کی آبیاری نہیں کرتیں تو وہ پیڑ پودے جلد ہی مرجھا جائیں گے۔ لیکن اگر عورتوں کا تعاون حاصل ہو اور وہ باقاعدگی سے پیڑ پودوں کی آبیاری و دیکھ بھال کرتی رہیں تو وہ تیزی سے بڑھیں گے، سرسبز و شاداب رہیں گے اور ماحول کو خوبصورتی عطا کریں گے۔ اگر وہ پھل دار درخت ہیں تو ان میں وقت پر پھل آئیں گے اور اگر وہ سبزیاں ہیں تو جلد ہی شکم پروری کے کام آئیں گی۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ عورتوں کا پورا تعاون اسی صورت میں حاصل کیا جاسکتا ہے جب انھیں شجرکاری و جنگل بانی کے پروگراموں کی تشکیل و عملدرآمد کے تمام مراحل میں شریک کیا جائے۔ آج جب عورتیں پارلیمنٹ، مجالس قانون ساز میں، انتظامیہ و عدلیہ میں، دفاتر اور کارخانوں میں، اسکولوں کالجوں میں، علم و ادب اور سائنس و ٹیکنالوجی میں، کھیتوں اور کھلیانوں میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ انھیں سماجی جنگل بانی کے پروگراموں کی تشکیل و عمل درآمد میں شریک نہ کیا جائے۔ انھیں کچھ مقامی حالات کا مردوں سے زیادہ علم رہتا ہے۔

ایندھن — ایک بنیادی مسئلہ

جبکہ دیہات میں مرد کھیتی باڑی کے کام میں مصروف رہتے ہیں، عورتیں کھانا بناتی اور گھر اور کھیت کے دوسرے کام کرتی ہیں، کھانا بنانے کے لیے ایندھن انھیں جنگلوں سے لانا پڑتا ہے، کبھی قریب کے جنگلوں سے کبھی دور کے جنگلوں سے۔ اور جب وہ کسی وجہ سے ایسا نہیں کر پاتیں تو انھیں گوبر کے اپلوں کا سہارا لینا پڑتا ہے اور جب اس سے بھی ضرورت پوری نہیں ہوتی تو انھیں لکڑی ٹھیلے والوں یا دوسرے ذرائع سے خریدنی پڑتی ہے، جو مرد چلاتے ہیں۔ اس سے ان کا خرچ بڑھ جاتا ہے۔ بہرحال، ایندھن کے ضمن میں الگ الگ علاقوں میں الگ الگ صورت حال ہے جس سے وہاں کی عورتیں ہی زیادہ باخبر ہوتی ہیں۔ اگر ہمارے پروگرام ساز ان سے ملیں۔ ان پر جنگلات کے تحفظ کی ضرورت واضح کریں اور پھر مقامی مسئلے کا حل ان کی رائے سے نکالیں تو کوئی بہتر حل نکل سکتا ہے مثلاً یہی کہ انھیں سمجھایا جاسکتا ہے کہ صرف سوکھی لکڑی ہی جنگل سے لائیں، مثلاً درختوں کے ٹھونٹھ کی لکڑی یا دوسری سوکھی اور بے مصرف لکڑی ٹوٹی اور خشک شاخیں وغیرہ درخت نہ کاٹیں نہ ان کی شاخیں تراشیں۔ اگر اس سے اور گوبر کے اپلوں سے بھی ضرورت پوری نہ ہو تو وہ کوئی اور طریقہ سوچ سکتی ہیں مثلاً ایک وقت پکائیں، دو وقت کھائیں اور اس طرح ایندھن بچائیں اور پھر آج کل تو کافی جگہوں پر گوبر گیس پلانٹ بھی لگائے جارہے ہیں۔ ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ جنگل تک جانے، لمبی مسافتیں طے کرنے اور عرق ریزی سے بچا جاسکتا ہے اور جنگلوں کو بچایا جاسکتا ہے۔ جہاں تک مویشیوں کے چارے کا تعلق ہے یہ کھیتوں کے گھاس پھوس سے اور گھر کے اردگرد گھاس اور جھاڑیاں وغیرہ اگا کر پورا کیا جاسکتا ہے اس میں بھی عورتیں بڑی مدد کرسکتی ہیں۔ اگرچہ انھیں باقاعدہ تربیت تو حاصل نہیں ہوتی لیکن وہ اپنے تجربے کی روشنی میں مسئلے کا حل تلاش کرنے میں مدد دے سکتی ہیں۔ ضرورت صرف راستہ دکھانے والے کی ہے اور یہ کام جنگل کا ناظم یا ایجنٹ یا سماجی جنگل بانی کے پروگرام ساز بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ اس طرح مقامی عوام اور بالخصوص مقامی عورتوں کو پروگرام میں پوری طرح شریک کیا جاسکتا ہے۔ اس سے وہ اپنی ذمہ داری بھی سمجھیں گے اور یہ محسوس نہیں کریں گے کہ اوپر سے لادے ہوئے کسی پروگرام پر عمل کے لیے انھیں مجبور کیا جارہا ہے۔

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

جے۔ ار۔ سپدیوا٭

غریبی دُور کرنے میں بینکوں کا رول

بینکوں کا قومیایا جانا اُن تمام اقدامات، سرگرمیوں، تجویزوں اور پروگراموں کا منطقی نتیجہ تھا جو ملک کی اقتصادی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے عمل میں لائے جا رہے تھے اور لائے جا رہے ہیں۔

بھارت کی منصوبہ بندی کا ایک بڑا مقصد نہ صرف ملک کے مختلف خطّوں کو متوازن ترقی سے ہمکنار کرنا ہے بلکہ سماج کے مختلف طبقوں کے مابین بڑھتی ہوئی نابرابری کو بھی کم کرنا ہے۔ منصوبہ بندی کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ روزگار کے مواقع بڑھاکر افلاس کا انسداد کیا جائے۔ دیہی علاقوں میں زراعت سے روزگار کے زیادہ مواقع پیدا کرنا ممکن نہیں ہے چنانچہ اس سلسلے میں اب دیہی ترقی پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے جس سے دیہی عوام اور خصوصاً دیہی مفلسوں کی اقتصادی و سماجی حالت کو بہتر بنایا جا سکے کسی بھی ترقیاتی پروگرام کے لیے قرضہ ایک لازمی شرط ہے۔ یہ خاص طور پر دیہی ترقی کے لیے سچ ہے جس کا مقصد دیہی عوام کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانا اور زرعی پیداوار کو بڑھانا ہے۔

عام طور پر ترقی پذیر معیشت میں تین قرضہ جاتی ایجنسیاں ہوتی ہیں۔ وہ ہیں (۱) ادارہ جاتی قرضہ (۲) غیر ادارہ جاتی قرضہ اور (۳) سرکاری۔ ان تینوں ایجنسیوں میں ادارہ جاتی قرضہ دیہی ترقی میں بہت زیادہ حصہ ادا کر سکتا ہے۔ ادارہ جاتی ایجنسی میں شیڈولڈ کمرشل بینک بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۹۶۷ء سے قبل کمرشل بینک دیہی قرضہ کے شعبے میں بہت کم حصہ ادا کرتے تھے۔ قومی ملکیت میں لیے جانے سے قبل بھارت کے بیشتر بینک زیادہ تر صنعتوں کو قرضے دیتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں قومیائے جانے کے بعد بینکنگ سیکٹر میں نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں جو زیادہ تر چار شعبوں میں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ یہ شعبے ہیں: (۱) شاخوں کی توسیع (۲) ترجیحی سیکٹروں کے لیے قرضے۔ (۳) لیڈ بینک اسکیم اور (۴) کمزور طبقوں کے لیے خاص اسکیمیں اور علاقائی دیہی بینکوں کا قیام۔

شاخوں کی توسیع

بینکوں کی شاخوں کی تعداد جو جون ۱۹۶۹ء میں ۸۲۶۲ تھی وہ مارچ ۱۹۸۵ء میں بڑھ کر ۵۰۹۸۰ ہو گئی۔ اس ضمن میں یہ دیکھنا باعثِ دلچسپی ہوگا کہ ۱۹۶۹ء تا ۱۹۸۵ء کے عرصے کے دوران کمرشل بینکوں کی دیہی شاخیں ۱۸۳۲ سے بڑھ کر تقریباً ۲۹۸۳۷ ہو گئیں۔ دیہی شاخوں کا تناسب جو ۱۹۶۹ء میں ۲۲٫۲ فیصد تھا وہ ۱۹۸۵ء میں بڑھ کر ۵۸٫۵۳ فیصد ہو گیا۔ لہٰذا شاخوں کے توسیعی پروگرام کا بنیادی مقصد اُن علاقوں پر جہاں بینک نہیں یا بہت کم تھے بینک کی شاخوں کے افتتاح کی رفتار میں تیزی لانا اور خصوصاً دیہات کے کمزور طبقوں کو ادارہ جاتی قرضہ دے کر بینکنگ سہولیات کے پھیلاؤ میں عدم توازن کو کم کرنا تھا۔

ترجیحی سیکٹروں کو قرضہ

بینکوں کے قومی ملکیت میں جانے سے پہلے ایک یہ خامی دیکھی گئی کہ بینکوں کے زیادہ تر قرضے بڑی اور اوسط پیمانے کی صنعتوں اور بڑے بڑے تجارتی گھرانوں کو دیے جاتے تھے اور ترجیحی سیکٹر (زراعت، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور برآمدات) کی جانب بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ مارچ ۱۹۸۵ء تک کل قرضے کا ۴۰ فیصد ترجیحی سیکٹر کو دیا گیا۔ اس ۴۰ فیصد میں سے ۲۵ فیصد قرضہ کمزور طبقوں اور باقیماندہ ۱۵ فیصد براہِ راست چھوٹے

٭ ۵/۴۴۰۵ شوراکوٹھی، پہاڑ گنج، نئی دہلی
یوجنا، نئی دہلی

کاشتکاروں کو دیا گیا۔

لیڈ بینک اسکیم

لیڈ بینک اسکیم کو بھارتی کمرشل بینکوں کا ایک اور سنگ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔ نیشنل کریڈٹ کونسل کے اسٹڈی گروپ (گیڈگل اسٹڈی گروپ) کی سفارشات پر بھارتی ریزرو بینک کی طرف سے دسمبر ۱۹۶۹ء میں لیڈ بینک اسکیم رائج کی گئی۔ اس اسکیم کے تحت بینکوں کو افزائشی مرکز کا پتہ لگا کر ڈیپازٹوں کے امکان کا جائزہ لے کر اور قرضوں میں تفاوت کی جانچ کر کے اقتصادی ترقی کا اہم ذریعہ بننا ہے۔ لیڈ بینک نے ضلع کلیکٹر کی صدارت کے تحت ہر ضلع کے لیے ایک مشاورتی کمیٹی بنائی ہے۔

خاص اسکیم

بھارتی بینکنگ کی ایک اور اسکیم جسے سنگ میل کہا جا سکتا ہے وہ ہے سود کی مختلف شرحوں (ڈی آئی آر) کی اسکیم اور علاقائی دیہی بینکوں کا قیام سود کی مختلف شرحوں کی اسکیم ڈاکٹر آر کے ہزاری کی صدارت کے تحت بھارتی ریزرو بینک کی کمیٹی کی سفارشات پر ۱۹۷۲ء میں رائج کی گئی تھی۔ اس کا مقصد دیہی علاقوں میں کمزور طبقوں کو فائدہ پہنچانا تھا۔ ڈی آئی آر اسکیم کے تحت بینکوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ قرضہ دیئے جانے والی کل رقم کا ایک فیصد خصوصاً پسماندہ طبقوں کو ۴ فیصد شرح سود پر دے۔ ڈی آئی آر اسکیم کے تحت جو زمرے قرضہ پانے کے مستحق ہیں اُن میں بے زمین مزدور، چھوٹے زمیندار، دیہی دستکار، جسمانی طور پر معذور اور درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں وغیرہ کے لوگ آتے ہیں۔ ہر واحد قرضہ پانے والے کے لیے کاروباری سرمایہ کی زیادہ سے زیادہ حد ۱۵۰۰ روپے ہے اور میعادی قرضہ کی زیادہ سے زیادہ حد ۵ ہزار روپے ہے۔

بھارتی بینکنگ کا ایک اور سنگ میل ہے۔ علاقائی دیہی بینکوں کی اسکیم علاقائی دیہی بینکوں کا قیام ۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو ایک ورکنگ گروپ کی طرف سے کیا گیا تھا جو بھارت سرکار نے قائم کیا تھا۔ ان بینکوں کو دیہی شاخیں کھولنے کے معاملے میں ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ علاقائی دیہی بینک بھارت سرکار، متعلقہ ریاستی حکومت اور اہتمام کنندہ بینک کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں۔ اس میں بھارت سرکار، متعلقہ حکومت اور اہتمام کنندہ بینک اداشدہ سرمائے کا تناسب بالترتیب ۵۰، ۱۵، ۳۵ فیصد ہوتا ہے۔ علاقائی دیہی بینکوں کا بڑا مقصد دیہی معیشت کو فروغ دینا ہے اور اس کے حصول کے لیے خصوصاً چھوٹے اور حاشیائی کاشتکاروں، کھیت مزدوروں اور دیہی دستکاروں کو پیداواری اور ترقیاتی قرضہ فراہم کیا جاتا ہے۔

دسمبر ۱۹۸۴ء کے آخیر تک ملک میں ۱۷۳ علاقائی دیہی بینک تھے جن کی ۱،۲۴۵ شاخیں ۴۰۰ اضلاع میں سے ۳۰۷ میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سلسلے میں بینکوں نے مختلف ترقیاتی اسکیموں اور ایجنسیوں کی تعمیل میں بڑا رول ادا کیا ہے۔

کام کاج میں آنے والے مسائل

عام طور پر کمرشل بینکوں کو مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام (آئی آر ڈی پی) کی تعمیل کے مختلف مرحلوں میں متعدد مسئلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہ ہیں: (۱) بنیادی ڈھانچے کی سہولیات کی کمی (۲) تربیت اور بھرتی کی کمی (۳) قرضہ و امداد سے مستفید ہونے والوں کی صحیح شناخت نہ کرنا اور فنڈوں کے استعمال کی صحیح دیکھ بھال نہ ہونا۔ (۴) ضلع دیہی ترقیاتی ایجنسی (ڈی آر ڈی اے) بینکروں اور بلاک سطح کے عملے کے مابین تال میل نہ ہونا اور (۵) قرضوں کی وصولی وغیرہ۔

قرضے کی وصولی قرضے کے پروگرام کا ایک کٹھن جزو ہے۔ قرضوں کی عدم ادائیگی سے نہ صرف فنڈز کی گردش محدود ہو جاتی ہے بلکہ اس سے بینکوں کے منافعوں اور اُن کے کام کرنے کی طاقت پر بھی بُرا اثر پڑتا ہے۔ مسٹر کمیٹی نے یہ پتہ لگایا تھا کہ فصلوں کی ناکامی، بامقصد نادہندگی، قرضوں کا نامناسب استعمال اور نگرانی میں سُستی قرضوں کی عدم وصولی کے بعض اسباب ہیں۔

قرضوں کی عدم وصولی کے سلسلے میں متعدد دلچسپ اسباب بیان کیے گئے ہیں جن میں سے بعض ایک قرضخواہ ایجنسی کے طور پر علاقائی دیہی بینک کے رول سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔ قرضوں کی عدم وصولی سے متعلق اسباب دلچسپ گوشوارے میں دیئے گئے ہیں۔

گوشوارہ

قرضوں کی عدم ادائیگی سے متعلق قرضہ لینے والوں کا رویّہ

اسباب	فیصد
فصلوں کی پیداوار میں کمی	۴۲،۵۰
اسکیم سے ہونے والی آمدنی میں تاخیر	۲۰،۰۰
مستقبل میں قرضہ نہ لینے کی خواہش	۳۸،۷۵
اسکیم سے ہونے والی ناکافی آمدنی	۶۰،۰۰
بینک افسران کی طرف سے ترغیب کا نہ دیا جانا	۴۳،۷۵

جان بوجھ کر عدم ادائیگی	۹۵ ، ۰۰
مارکیٹنگ سہولیات کا ناکافی ہونا	۲۱ ، ۳۵
دیگر قرضوں کی موجودگی	۳۰ ، ۰۰
کنبے میں بڑھی ہوئی کھپت	۱۰ ، ۰۰
اثاثہ جات کی موزوں دیکھ بھال کا نہ ہونا	۶۶ ، ۳۵

اگر غور سے دیکھا جائے تو قرضہ واپس کرنے والوں میں اُن لوگوں کی تعداد سب سے زیادہ (۳۵ ، ۶۶) ہے جو اثاثہ جات کی موزوں دیکھ بھال نہیں کرتے اس کی وجہ ہے کہ جن اسکیموں کے تحت اثاثہ جات دئے جاتے ہیں اُن میں اُن کی دیکھ بھال کا اہتمام نہیں ہے۔ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام سے وابستہ لوگوں کی اکثریت اس خیال میں رہتی ہے کہ پروگرام قرضے بانٹنے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ قرضوں کی واپسی نہ کرنے کی دوسری بڑی وجہ جان بوجھ کر عدم ادائیگی ہے۔ بیشتر قرضہ حاصل کرنے والے یہ خیال کرتے ہیں کہ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے تحت جو قرضے منظور کئے جاتے ہیں وہ لوٹانے کے لیے قطعی نہیں دئے جاتے اور کہ اگر وہ انھیں نہیں لوٹائیں گے تو آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا۔

کیا کرنا ضروری ہے؟ اس سلسلے میں کلیدی کامیابی کا انحصار "ڈی۔آر۔ڈی" ، بینک اسٹاف اور بلاک منڈل سطح کے عملے کے تعاون پر ہوگا کہ وہ قرضہ جاتی رقم کے انتخاب اور منظوری میں احتیاط سے کام لیں۔ مذکورہ بالا مشکلات پر قابو پانے کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز کو عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ (۱) ریاستی حکومت کو دیہی اور نیم شہری علاقوں کے لیے بنیادی ڈھانچے کی سہولیات کو فروغ دے کر بینکوں کی مدد کرنی چاہیئے۔ (۲) قرضہ پانے والوں کی نشان دہی کرنے میں خصوصی احتیاط کو یقینی بنایا جائے۔ (۳) اہتمام کنندہ ایجنسیوں کو قرضوں کی وصولی کی مہم میں مساوی ذمہ داری لینی چاہیئے۔ (۴) نشاندہی کرنے والی ایجنسیوں اور سرمایہ دینے والے بینکوں کے درمیان تال میل ہونا چاہیئے۔ (۵) مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کی کامیاب تکمیل کے لیے دور دراز کے علاقوں میں بینکوں کو مزید شاخیں کھولنی چاہئیں اور اس سلسلے میں بینک اسٹاف کو دیہی بھتہ جیسی بعض دلکش ترغیبات فراہم کرنی چاہئیں اور (۶) موزوں تکنیکی امداد بھی فراہم کی جا سکتی ہے۔

شہری افلاس

مرکزی حکومت نے اس امر کا احساس کرتے ہوئے کہ شہروں میں افلاس بڑے پیمانے پر موجود ہے جہاں ۸۴-۱۹۸۳ء کے قومی اعداد و شمار کے مطابق ۲۸ فیصد آبادی سطح افلاس کے نیچے رہتی ہے (جبکہ اس کے مقابلے میں دیہات میں ۴۰ ، ۴ فیصد آبادی سطح افلاس کے نیچے رہتی ہے)۔ بر وقت قدم اٹھاتے ہوئے شہری مفلسوں کے لیے ایک ملک گیر خود روزگار اسکیم مرتب کی ہے حکومت کی کوشش ہے کہ ساتویں پانچسالہ منصوبے کے آخر تک شہری مفلسوں کی تعداد میں ۸۳ لاکھ کی کمی کی جائے۔

اس اسکیم کے تحت رواں مالی سال کے دوران تین سے پانچ لاکھ اشخاص کی مدد کی جائے گی حکومت نے ریزرو بینک کے مشورے کے ساتھ یہ اسکیم مرتب کی ہے، اس کے اہم ترین پہلو ہیں۔ (۱) امداد پانے والے کنبے کی آمدنی ۶۰۰ روپے ماہوار سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔ (۲) قرضہ پانے والا شہر یا قصبہ میں متواتر تین سال سے رہ رہا ہو، اُس کے پاس راشن کارڈ ہونا چاہیئے اور وہ جو صنعت یا کاروبار شروع کرنا چاہے اُس کا اُسے سابقہ تجربہ ہونا چاہیئے۔ (۳) زیادہ سے زیادہ قرضہ ۵ ہزار روپے کا دیا جائے اور اُس پر ۱۰ فیصد سود وصول کیا جائے۔ (۴) قرضہ تین ماہ کے عرصے کو چھوڑ کر ۳۳ مساوی اقساط میں لوٹایا جائے۔ مرکزی حکومت قرضہ کی رقم کا ۲۵ فیصد امداد کے طور پر فراہم کرے گی جسے متعلقہ بینک میں جمع کیا جائے گا توقع ہے کہ اسی مناسبت سے قرضہ پانے والے کا واپسی کا بوجھ صرف ۹۷ فیصد تک کم ہو جائے گا۔ شہروں اور قصبوں میں تعمیلی کارروائی اور نگرانی کریں گے اُن کے اثاثہ جات کی تصدیق کریں گے اور قرضوں کی وصولی وغیرہ کریں گے۔ اب بینک بد عنوانیوں، غلط نشاندہی درخواستوں کو سٹانے اور امداد وغیرہ دینے میں تاخیر کے لیے کسی دوسرے کو قصور وار نہیں ٹھہرائیں گے، اب قرضہ پانے والوں کے انتخاب سے لے کر قرضہ کی وصولی تک تمام ضابطے بینکوں کو ہی مکمل کرنے ہوں گے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بینک نہ صرف دیہات بلکہ شہروں میں بھی اپنی سماجی ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں اور انسداد افلاس کے پروگراموں میں اپنا کردار بخوبی ادا کر رہے ہیں۔

●

دھرمیندر کمار*

مزدور عورتوں پر نئی ٹیکنالوجی کے اثرات

آج ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور سے گذر رہے ہیں۔ ہر شعبے میں نئی نئی ٹیکنالوجیاں دریافت اور استعمال کی جارہی ہیں اور اس سے خاطر خواہ فائدے بھی حاصل ہو رہے ہیں۔ لیکن ایک بات جس پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے، دیہات و قصبات میں مزدور عورتوں کی حالتِ زار ہے جو نئی ٹیکنالوجی کے استعمال سے متاثر ہوئی ہے۔

اقوام متحدہ کی طرف سے ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۵ء کی دہائی دنیا میں عورتوں کی دہائی کے طور پر منائی گئی اور اس دوران مختلف ممالک میں عورتوں کی فلاح و بہبود کے اقدامات کیے گئے۔ لیکن یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ اس سال سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں منعقدہ اقوام متحدہ کی کانفرنس میں عورتوں کے رول کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ترقی یافتہ ممالک میں غیر ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں عورتوں کی حالت بہت اچھی ہے اور وہ مختلف شعبوں میں مساویانہ بنیاد پر مردوں کے شانہ بشانہ خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ہمارے ملک کے بڑے شہروں میں بھی تعلیم یافتہ کارکن عورتیں مختلف شعبوں میں مردوں کے شانہ بشانہ مساویانہ بنیاد پر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ لیکن غیر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے دیہی علاقوں میں عورتوں کی حالت مزید اصلاحی اقدامات کی متقاضی ہے۔ ہندوستان کے دیہات و قصبات میں بھی صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے۔ یہاں کے دیہات میں زیادہ تر عورتیں بوجہ غربت کھیت کھلیانوں اور کارخانوں وغیرہ میں محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہیں۔ محنت مزدوری کے ساتھ ساتھ انھیں اپنے گھروں کی صفائی ستھرائی، کھانا پکانے، کپڑے دھونے نیز بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے ہیں یعنی کام کے بوجھ تلے دبی رہتی ہیں۔ جس سے ان کی اور ان کے بچوں کی صحت پر اثر پڑتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ نئی ٹیکنالوجی کے استعمال سے ان کے روزگار پر بھی اثر پڑا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نئی ٹیکنالوجی استعمال نہ کی جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام صورتِ حال کا جائزہ لے کر ان کی مشکلات و ضروریات کا پتہ لگایا جائے اور انھیں پورا کرنے کے اقدامات کیے جائیں۔

ذیل میں کچھ ایسے شعبوں کا، جن میں مزدور عورتیں بہت بڑی تعداد میں کام کرتی ہیں، ان مسائل کے ساتھ ذکر کیا جارہا ہے جن کا انھیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

زراعت

تجارتی فصلوں کی کاشت اور کھیتی باڑی میں ٹیکنالوجی کی اصلاحات کے نتیجے میں عورتوں پر کام کا بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ نئی ٹیکنالوجیاں مرد ہی دریافت اور بروئے کار لاتے ہیں۔ اس لیے تربیت اور نئے کام مردوں کے لیے ہی مخصوص رہتے ہیں۔ دیہی علاقوں کی عورتیں بندھوا مزدوروں کی طرح کھیتوں میں جسمانی محنت کے کام کرتی ہیں۔ زیادہ گھنٹوں تک کام کرتی ہیں اور انھیں ابتدائی آلات اور سہولیات تک میسر نہیں ہوتیں۔ ہمارے منصوبہ سازوں کی توجہ اس بات پر نہیں گئی ہے کہ ہندوستانی عورتوں میں تقریباً ایک تہائی زرعی مزدوروں کی حیثیت سے کام کرتی ہیں نیز زرعی مزدوروں کا ۴۴ فیصد حصہ عورتوں پر مشتمل ہے۔

* [illegible] مارگ، دہلی۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۱ء تک کے بیس سالوں میں کاشتکار عورتوں کی تعداد پچاس فیصد گھٹ گئی ہے جبکہ کھیتوں پہ مزدوری کرنے والی عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ جبکہ مردوں کو سال میں ۲۰۸ روز کام میسر ہوتا ہے عورتوں کو صرف ۱۳۸ روز کام ملتا ہے۔ جن گاؤوں میں جدید طریقوں سے کھیتی باڑی کی جا رہی ہے ان میں روایتی طریقوں سے کاشت کرنے والے گاؤوں کے مقابلے میں عورتوں کی معاشی سرگرمیوں میں کمی دیکھنے میں آئی ہے۔

ڈیری فارمنگ

ہندوستان میں ڈیری فارمنگ میں ایک اہم پیش رفت ۱۹۴۰ء کی دہائی میں ریاست گجرات کے کیرا ضلع میں ہوئی جہاں اس وقت ۱۸۴۰ کوآپریٹو ڈیریاں کام کر رہی ہیں۔ وہاں کی سب سے بڑی ڈیری آنند ملک یونین لمیٹڈ ہے۔

دودھ نکالنے اور فروخت کرنے کا کام روایتی طور پر عورتیں ہی کیا کرتی تھیں۔ آج کی ڈیری انڈسٹری میں یہ کام اور اس کے فوائد عورتوں کے ہاتھوں سے نکلتے جا رہے ہیں۔ آنند ملک یونین کی مثال ہی لیجئے۔ ایک مطالعے کے مطابق وہاں دو ہزار افراد کام کر رہے ہیں۔ جن میں صرف ایک خاتون ماہر مویشیاں ہے اس کے علاوہ چند خاتون ٹیلی فون آپریٹر اور سکریٹری ہیں۔ وہاں مکھن اور پنیر بنانے کے روایتی طریقوں کی جگہ جو نئی ٹیکنالوجی شروع کی گئی ہے۔ اس کی تربیت مردوں کو ہی دی گئی ہے۔ کسی بھی عورت کو نہیں۔

نئی نسلوں کے مویشیوں کی دیکھ بھال کے نصابات میں ایک بھی عورت شامل نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جوں جوں ڈیری کی صنعت ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے مزید وسعت اختیار کر رہی ہے عورتوں کو اس سے باہر کیا جا رہا ہے۔

کیرا ضلع کی ۱۸۴۰ کوآپریٹو سوسائٹیوں کے اراکین میں بھی عورتوں کی تعداد صرف دو سے پندرہ فیصد تک ہے۔ ان میں بھی بیشتر وہ ہیں جنھوں نے اپنے شوہروں کی موت کے بعد ان کی جگہ سنبھالی ہے۔ تمام سوسائٹیاں صرف مرد ہی چلا رہے ہیں۔ ہاں ایک سوسائٹی ضرور ایسی ہے جو صرف عورتوں کے ہاتھوں میں ہے۔

ماہی گیری

جہاں تک ماہی گیری کا تعلق ہے یہاں بھی سمندر میں جا کر مچھلیاں پکڑنے کا کام مرد کرتے ہیں جبکہ عورتیں مچھلیوں کے رکھ رکھاؤ اور فروخت کا کام سنبھالتی ہیں۔ بھارت کے ساحلوں پر عورتوں کو اپنے سروں پہ مچھلیوں کے ٹوکرے لادے قریبی بازار یا گاہکوں کے پاس لے جاتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ بہت سی جگہوں پر ماہی گیری کے پرانے طریقے ہی رائج ہیں تاہم اب ان کی جگہ مچھلیاں پکڑنے، مچھلیوں کی درجہ بندی، رکھ رکھاؤ اور فروخت کے لیے رفتہ رفتہ جدید طریقے اختیار کئے جا رہے ہیں۔

کیرالہ کے قلون ضلع میں ۲۵ سال پہلے ناروے کی ایک ایجنسی کی سرپرستی میں ماہی گیری کا ایک مربوط پراجیکٹ شروع کیا گیا تھا۔ اس میں عورتوں کو ماہی گیری کے ہر شعبے میں نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ لیکن اب حال ہی میں عورتوں کی زندگی اور کام پر اس نئی ٹیکنالوجی کے اثرات پر کچھ توجہ دی گئی ہے۔

اب بیشتر عورتوں کو نیا ذریعۂ معاش ڈھونڈنا پڑ رہا ہے کیونکہ مچھلیوں کو منڈیوں تک پہنچانے کے لیے تیز رفتار لاریوں اور بائیسکلوں کا استعمال کیا جانے لگا ہے۔ یہ کام مرد ہی کرتے ہیں۔ مچھلیوں اور جھینگوں کی پروسیسنگ اور رکھ رکھاؤ کے لیے فیکٹریاں بن گئی ہیں۔ اگرچہ ان فیکٹریوں میں کچھ عورتوں کو عارضی بنیاد پر کام مل جاتا ہے لیکن مردوں سے کم اجرت پہ۔ فیکٹریوں میں نئی ٹیکنالوجیوں میں عورتوں کی شمولیت کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔

گھریلو کام کاج

زمانۂ قدیم سے ہی مردوں اور عورتوں کے درمیان تقسیم کار کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ گھر کے کام کاج کی بھاری ذمہ داریاں عورتوں کے حصے میں آئی ہیں۔ خوراک کی پیداوار، رکھ رکھاؤ اور مقامی کھپت کے شعبے میں بھی صورت حال ایسی ہی ہے۔ زرعی موسموں میں خوراک کی پیداوار میں بھی عورتوں کو جتنا کام کرنا پڑتا ہے وہ مردوں سے کم نہیں۔ عورتوں کو درانتی وغیرہ سے فصلوں کی کٹائی اور اس کے بعد کٹی ہوئی فصل کو لکڑیوں سے پیٹنے اور پھر ہوا میں چھاج کی مدد سے بھوسے سے دانوں کو الگ کرنے کا کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ اناج صاف کرنے، چھاننے، بینے اور کنکر مٹی وغیرہ الگ کرنے کا کام بھی کرتی ہیں۔ کٹی ہوئی فصلیں جب سوکھنے کے لیے دھوپ میں پڑی رہتی ہیں تو انھیں پرندوں اور کیڑے مکوڑوں سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ بھی رہتا ہے اس لیے مسلسل دیکھ بھال رکھنی پڑتی ہے۔ جب بھوسے یا چھلکے سے دانے الگ کرنے کی مشینیں آ جاتی ہیں تو انھیں مرد چلاتے ہیں اور وہ عورتیں جو کوٹ کر دانے الگ کرتی تھیں اپنی روزی سے محروم ہو جاتی ہیں۔

کھیت کے کاموں کے علاوہ دیہی عورتوں کو جنگل سے لکڑی اور پنگھٹ سے پانی لانے، گھر صاف رکھنے، کھانے پکانے اور کپڑے دھونے کے کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔ کئی مطالعات سے معلوم ہوا ہے کہ اس طرح عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں زیادہ وقت کام کرنا پڑتا ہے۔

نئی ٹیکنالوجی کے کچھ نتائج

جہاں جہاں جدید ٹیکنالوجی کا استعمال شروع

کیا گیا ہے وہاں وہاں عورتوں کے لیے روزگار کے مواقع کم ہو گئے ہیں۔ جو کام عورتیں ہاتھ سے کرتی ہیں جب انھیں کرنے کے لیے مشین یا ہل لگ جاتی ہے تو اسے مرد ہی چلاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سی عورتوں کا کام چھن جاتا ہے۔ کھیتوں میں ہل یا ٹریکٹر مرد ہی چلاتے ہیں۔ عورتوں کے لیے صرف پھاوڑا رہ جاتا ہے جس سے وہ زمین کو گھاس پھوس اور سرکنڈوں وغیرہ سے صاف کرتی ہیں۔ اس طرح سے ذرائع پیداوار اور معاشی وسائل پر عورتوں کا کنٹرول کم ہو جاتا ہے اور اکثر انھیں کم اُجرت پر زیادہ مشکل کام کرنا پڑتا ہے۔ آمدنی کم ہو جانے کی وجہ سے وہ اپنے خاندان کے لیے اچھی خوراک بہم نہیں پہنچا پاتیں نہ ہی بچوں کی اچھی طرح پرورش کر پاتی ہیں۔

ہندوستان کے مختلف حصوں میں عورتوں کی زندگی اور مسائل کے بارے میں کیے گئے تحقیقی جائزوں سے یہی بات سامنے اُبھر کر آتی ہے کہ مزدور عورتوں کے لیے حالات مشکل سے مشکل تر ہوتے جا رہے ہیں۔

انڈین کونسل آف سوشل سائنس ریسرچ نے اپنے مطالعات سے درج ذیل نتائج اخذ کیے ہیں۔

(۱) عورتوں اور چھوٹی بچیوں میں اونچی شرح اموات۔
(۲) آبادی میں عورتوں کے تناسب میں مسلسل کمی۔
(۳) خواندگی، تعلیم اور تربیت کے معاملے میں مردوں اور عورتوں کے درمیان بڑھتا ہوا فرق (۴) ۱۹۵۱ء کے بعد عورتوں کے روزگار میں تیزی سے کمی (۵) آبادی کے غریب تر طبقات میں مردوں اور عورتوں کے درمیان، صحتی و طبی دیکھ بھال اور طبی خدمات تک رسائی کے معاملے میں، نابرابری۔

شیر خوار اور چھوٹے بچوں کے لیے صحت بخش خوراک کی کمی اور ان کی بڑھتی ہوئی شرح اموات واقعی ایک سنگین مسئلہ ہے۔ یہ ماں کی ذمہ داری ہے کہ وہ انھیں اپنے دودھ کے ساتھ ساتھ آسانی سے ہضم ہونے والی صحت بخش خوراک مہیا کرے لیکن کیا مزدور عورتیں اپنی محدود ترین آمدنی اور غربت کی موجودگی میں ایسا کر سکتی ہیں۔ اس لیے محض عدم توجہی یا لاپرواہی کو اس مسئلے کی وجہ نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اس کی اصل وجہ پر دھیان دے کر کارگر اقدامات کرنے چاہئیں۔

چند تجاویز

(۱) مذکورہ بالا امور کی روشنی میں یہ بہت ضروری ہے کہ ہر ترقیاتی حکمت عملی میں عورتوں کی دستیاب قوت کو بہتر طریقے سے استعمال کرنے پر دھیان دیا جائے۔

(۲) شیر خوار اور چھوٹے بچوں کے لیے صرف اپنے طور پر صحت بخش خوراک مہیا کرنا غریب عورتوں کے بس کی بات نہیں ہے اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ گاؤں کی سطح پر ہی سماج کی مشترکہ اور منظم کوششوں سے بچوں کے لیے اضافی و صحت بخش خوراک تیار کرنے اور اسے ایسی قیمتوں پر جو غریب طبقے ادا کر سکتے ہوں، فراہم کرنے کا انتظام کیا جائے۔ جن عورتوں کو دہاڑی کے لیے گاؤں سے باہر جانا پڑتا ہے انھیں گاؤں کے اندر ہی اس قسم کی خوراک تیار کرنے کی صنعت میں کام فراہم کیا جا سکتا ہے۔

(۳) گھریلو کاموں کو اس طرح منظم کیا جائے عورتیں دوسرے منفعت بخش کاموں کے لیے زیادہ وقت بچا سکیں۔

(۴) پانی کی بہم رسانی، توانائی کے کفایت شعارانہ استعمال، کٹی ہوئی فصلوں کو سکھانے، شمسی توانائی کے ذریعے گرم کیے ہوئے پانی کی بہم رسانی کے ذریعے کھانا پکانے کے وقت میں کمی کرنے، اور اناج چھلنے بننے کا کام کم وقت میں کرنے کے لیے نئی ٹیکنالوجیاں دریافت کی جانی چاہئیں۔ اس سے عورتیں کا وقت بچے گا جسے وہ تعلیم یا تربیت پائے ہنر سیکھنے یا کوئی نفع بخش کام کرنے میں صرف کر سکتی ہیں۔

(۵) پبلک سیکٹر میں عورتوں کو ترقیاتی پراجیکٹوں یا نئی ٹیکنالوجیوں میں ابتدائی مراحل سے ہی شریک کیا جانا چاہیئے تاکہ انھیں روزگار کے معاملے میں مردوں کے مساوی مواقع میسّر ہو سکیں اور ان کی ضرورتوں اور دلچسپیوں کا بھی خیال رکھا جا سکے۔

(۶) وقتاً فوقتاً تحقیقی جائزے لیے جانے چاہئیں تاکہ ان کی روشنی میں اصلاحی اقدامات کیے جا سکیں۔ تحقیقی عملہ عام طور پر مردوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ مردوں کے لیے دیہات کی عورتوں تک پہونچنا اور ان سے سوالات پوچھنا مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ٹیکنالوجیاں جو ماؤں سے بیٹیوں اور پوتیوں تک پہونچتی ہیں روشنی میں نہیں آ پاتیں۔ اس سے ان پُرانی ٹیکنالوجیوں کو جاری رکھنا مقصود نہیں ہے۔ ان کی افادیت کا پتہ لگا کر ان میں ضروری تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں۔ بہرحال یہ ضروری ہے تحقیقی عملے میں خاتون محققین کو بھی خاصی تعداد میں شامل کیا جانا چاہیئے تاکہ وہ مکمل تحقیقی جائزوں کے لیے عورتوں کا تعاون حاصل کر سکیں۔ تحقیقی جائزے صحیح حالات کا پتہ لگانے اور ان کا موثر حل تلاش کرنے میں بہت معاون ہوتے ہیں۔ ●

ایم۔ ایس۔ بجاج

انسانی محبّت، اخوّت کے نقیب

گورونانک

گورو نانک دیو نے تاریکی میں بھٹکتی نوعِ انسانی کو جو راہ دکھائی تھی اُس پر چلنے کی آج بھی اُتنی ہی ضرورت ہے جتنی پندرہویں صدی میں تھی، جبکہ اس عظیم ہستی کا ظہور ہوا تھا اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ اُن کا محبت و اخوت کا پیغام آنے والے ادوار میں بھی نوعِ انسانی کے لیے بدستور مشعلِ راہ کا کام دیتا رہیگا۔

گورو نانک نوعِ انسانی کو مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک تمام انسان برابر تھے۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ ساری کائنات کا ظہور ایک ذاتِ مطلق سے ہوا ہے اور کوئی بھی انسان پیدائش سے چھوٹا یا بڑا نہیں ہے۔ وہ نوعِ انسانی سے اپنی اتھاہ محبت اور ایشور بھگتی سے زمان و مکاں کی حدود کے باہر چلے گئے تھے۔ ایک خاص دور میں جنم لے کر بھی تمام ادوار کے لیے لافانی ہو گئے اور ایک خاص ملک میں پیدا ہو کر بھی اُن نورانی بلند و بالا ہستیوں میں شامل ہو گئے جنھیں بجا طور پر عالمی رہنما کہا جا سکتا ہے۔

گورو نانک کی تعلیمات آج کے دور میں بھی کس قدر با معنی ہیں اُس کا اظہار اس خراجِ عقیدت سے عیاں ہوتا ہے جو سورگیہ شریمتی اندرا گاندھی نے اس درخشاں ہستی کو دیا تھا۔ مرحومہ نے کہا تھا:

"گورو نانک دیو جی کا ظہور ایسے دور میں ہوا جب ہمارے عوام باہمی مخالف گروپوں میں بٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس امر کے لیے بے پناہ محنت اور دوڑ دھوپ کی کہ تمام لوگ ایشور بھگتی اور عوام الناس کی خدمت میں محبت کے ساتھ لگے رہیں اور باہمی خیر سگالی اور یکجہتی کا قیام ہو۔ اپنی تحریک نیز تعلیم اور "شبدوں" کے ذریعے انھوں نے عوام کو سکھایا کہ تمام مذاہب یکساں ہیں، نہ کوئی ہندو ہے نہ کوئی مسلماں۔ مرد اور عورتیں، طاقتور اور کمزور اور مختلف ذاتیں اور فرقے برابر ہیں۔ انھوں نے توہمات اور مکاری کے خلاف جہاد کیا۔ ملک میں دور دور تک لمبی یاترائیں کر کے انھوں نے حسنِ اخلاق اور اخوت کا پیغام دیا۔۔۔ گورو نانک ہم سب کے ہیں اور اُن کی تعلیمات ہمارا انمول خزانہ ہیں۔"

گورو نانک محض انسانی اخوت اور ہندو مسلم ہم آہنگی کی تعلیم ہی نہیں دیتے تھے بلکہ خود بھی اُس پر عمل پیرا تھے۔ اُن کے دو مریدوں میں جو اکثر اُن کے ہمراہ رہتے تھے ایک ہندو بھائی بالا اور دوسرا مسلمان ربابی بھائی مردانہ تھا۔ اُن کے نام کے ساتھ تین القاب وابستہ کیے جاتے ہیں۔ "گورو، بابا اور شاہ"۔ ان میں پہلا لفظ سنسکرت کا ہے جس کا مطلب ہے گیان (روحانی تعلیم) دینے والا، دوسرا ہندوستانی ہے جس کا مطلب ہے باپ یا مالک اور تیسرا فارسی کا ہے جس سے مراد ہے بادشاہ یعنی صوفی سنتوں میں اعلیٰ ترین شاہی شان والا الست فقیر۔ اسی طرح اُن کی بانی "گورو گرنتھ صاحب" کے نام کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان میں پہلا لفظ سنسکرت اور دوسرا عربی کا ہے۔

انھوں نے ملک میں اپنی یاتراؤں کے دوران خصوصاً جب وہ ہردوار سے کاشی، گیا، کامروپ اور جگناتھ پوری گئے تو مسلمان قلندروں اور فقیروں کی سی کپڑے کی ٹوپی پہن رکھی تھی اور وہ ہندو سادھو سنتوں کی طرح پیشانی پر چندن لگاتے تھے اور گلے میں مالا پہنتے تھے۔ اُن کا یہ ملا جلا پہناوا اور بھیس ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو قبول تھا۔ مشرقی پردیشوں کی یاترا سے پنجاب لوٹنے کے بعد گورو نانک نے

۵۔ ۲۰، ملک بلڈنگ، چونا منڈی، پہاڑ گنج، نئی دہلی۔

مسلم صوفی شیخ فریدؒ سے ملنے کے لیے اجودھن (اب پاک پٹن) گئے۔ شیخ فریدؒ کا اصلی نام شیخ ابراہیم تھا لیکن وہ فرید یا فریدا کے نام سے ہی مشہور تھے۔ دونوں میں روحانی مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ اس ملاقات کے بعد دونوں میں اس قدر محبت ہوگئی کہ چند روز کے بعد گورو صاحب اُن سے دوبارہ ملنے کے لیے گئے۔ ان دونوں بلند ہستیوں کے خیالات میں کیسی یکسانیت تھی اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ گورو گرنتھ صاحب میں دیگر ہندو سنتوں کے ساتھ ساتھ شیخ فریدؒ کے کلام کو بھی شامل کر لیا گیا۔

گورو نانک نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی تمیز نہیں کرتے تھے بلکہ وہ ذات پات کے امتیاز کو بھی ختم کرنے کے حق میں تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ امیروں کے مقابلے میں غریبوں کی زیادہ قدر افزائی کرتے تھے اور انھیں گلے لگاتے تھے تو یہ سچائی سے بعید نہیں ہوگا۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک بار اپنے مسلم مرید مردانہ کے ہمراہ سید پور گاؤں گئے جہاں اُنھوں نے لالو نامی ایک بڑھئی کے ہاں قیام کیا۔ انھیں ایک چھوٹی ذات کے آدمی کے گھر کھانا کھاتے دیکھ کر گاؤں کے برہمنوں اور کھتریوں میں ہلچل مچ گئی۔ انھوں نے گورو صاحب سے کہا کہ آپ یہاں سے اُٹھ کر بھاگو کے گھر چلیں جو کہ گاؤں کا زمیندار ہے وہاں انھیں اچھے سے اچھا کھانا ملے گا لیکن گورو نانک نے اس استدعا کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ" لالو اگرچہ غریب ہے مگر اُس کی روٹی میں دودھ ہی دودھ ہے کیوں کہ وہ خون پسینے کی کمائی ہے۔ تمھارے زمیندار بھاگو کی روٹی میں یہ مزہ اور یہ پاکیزگی کہاں؟ وہ تو ظلم کی کمائی کی روٹی ہے جو خون میں ڈوبی ہوئی ہے۔

دراصل گورو نانک نہ صرف ایک روحانی پیشوا تھے بلکہ وہ ایک ایسے سماج کی تعمیر بھی کرنا چاہتے تھے جو اعلیٰ اخلاقی قدروں، برابری، ایمانداری، محنت کی عظمت اور انسانیت نوازی پر مبنی ہو اور جہاں اُونچ نیچ نہ ہو اور کوئی کسی دوسرے کا استحصال نہ کرے۔ گورو نانک نمرتا (حلیمی) کی مورت تھے۔ اُن میں گھمنڈ یا اہنکار قطعی نہیں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ دُنیا میں انسان سب کے ساتھ محبت سے رہے اور اپنی زندگی میں حلیمی لائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اصولوں پر مضبوطی سے ڈٹا رہے۔ اس سلسلے میں اُن کی ایک بانی ہے جسے سورگیہ لال بہادر شاستری اکثر دہراتے تھے۔ اس بانی کا مطلب درج ذیل ہے۔

" نانک کہتے ہیں کہ دُنیا میں اس طرح نمر رہو جس طرح چھوٹی چھوٹی گھاس رہتی ہے۔

تیز ہوا آنے پر بڑے بڑے درخت اُڑ جاتے ہیں لیکن نمر گھاس اپنی جگہ پر ڈٹی رہتی ہے"

گورو نانک کا جنم نومبر ۱۴۶۹ء کی پورنیما کو ایک ہندو کھتری کے گھر تلونڈی رائے بھوئی میں ہوا تھا جسے اب ننکانہ صاحب کہتے ہیں اور جو اب پاکستان میں چلا گیا ہے۔ ان کے والد کا نام کالو مہتہ اور ماتا کا نام ترپتا تھا۔ دادا کا نام شورام تھا۔ اور یہ گھرانہ بیدی کھتری تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ گورو نانک کا نام اُن کی بہن نانکی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ کُنبے کے جیوتشی پنڈت گوپال نے ننھے نانک کی جنم پتری بنائی اور پیشنگوئی کی کہ یہ بچہ بڑی عظمت حاصل کرے گا اور نام پیدا کرے گا۔ گورو نانک کو پڑھنے کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن وہ تھوڑے عرصے تک ہی وہاں ٹکے۔ بعد ازاں انھیں ایک مولوی کے پاس فارسی پڑھنے کے لیے بھیجا گیا لیکن وہ وہاں بھی چل نہیں سکے۔ کیوں کہ اُن کا دل تو عرفان سے سرشار تھا۔ اُن کے دل میں ایشور کی لو لگی تھی اور انھیں دُنیاداری میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے پاس جو بھی روپیہ پیسہ آتا تھا وہ سادھو سنتوں میں بانٹ دیتے تھے۔

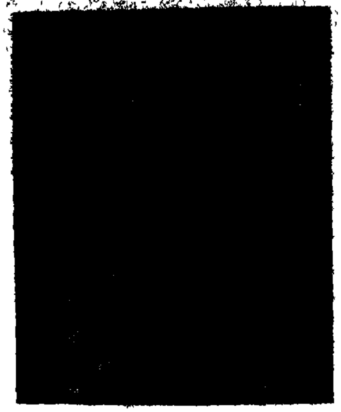
دنیاداری میں اُن کا دل لگانے کے لیے اُن کے والد نے انھیں بیوپار کرنے کے لیے کچھ روپیہ دیا۔ اور کھرا سودا خرید لانے کے لیے کہا چوہڑکانہ میں انھیں کچھ سادھو ملے۔ گورو جی سارا روپیہ ان بھوکے سادھوؤں کو دے دیا۔ ایک سچے ایشور بھگت کی نگاہ میں اس سے زیادہ کھرا سودا اور کیا ہو سکتا تھا۔ جس جگہ سادھوؤں کو روپیہ دیا تھا اُس جگہ پر اب گوردوارہ "سچا سودا" موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایک بار گاؤں کے تالاب میں اشنان کر کے جاتے ہوئے انھوں نے ایک سونے کی انگوٹھی اور پیتل کا لوٹا ... کر دیا۔ مہتہ کالو کے لیے یہ سب ناقابل برداشت ہو گیا۔ انھوں نے انھیں اُن کی بہن کے پاس سلطان پور لودھی بھیج دیا۔ جہاں انھوں نے دس برس گزارے۔ ازاں بعد بٹالہ کے لالہ مول چند کی لڑکی سُلکھنی کے ساتھ اُن کی شادی کر دی گئی۔ اُس وقت سے ہی رباعی مردانہ اُن کے ساتھ رہنے لگا۔ اُن کے گھر دو لڑکے سری چند اور لکھمی چند پیدا ہوئے۔ جس کے کچھ عرصے کے بعد وہ دھرم پرچار کے لیے یاترا پر روانہ ہو گئے۔

اُن کی یاترا کو ' اُداسی ' کہا جاتا ہے اور پہلی اُداسی ۱۵۰۵ء میں شروع ہوئی۔ وہ کورو کشیتر، کرنال، پانی پت، ہردوار، دلّی، متھرا، نانک متہ (پیلی بھیت)، ایودھیا سے ہوتے ہوئے چٹاگانگ اور جگنا تھ پوری گئے اور بندھیاچل اور راجستھان کی راہ سے واپس آئے۔ دوسری اُداسی دکن کے لیے کی گئی جس کا آغاز ۱۵۰۶ء میں ہوا۔ وہ کئی شہروں سے ہوتے ہوئے مدراس، ناگا پٹم اور سری لنکا گئے۔ واپسی پر رامیشورم، دوارکا، سندھ سے ہوتے ہوئے لاہور واپس پہنچے۔ تیسری اُداسی ۱۵۱۴ء کے آس پاس شروع ہوئی اس کے دوران

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

جگدیش پرشاد کوشک

پنڈت نہرو اور طنز و مزاح



عالمی شہرت کے مالک آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کی ساری زندگی مصروفیت کی زندگی رہی۔ آزادی ملنے سے پہلے وہ اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ مل کر ملک کی آزادی کے لیے جدّوجہد کرتے رہے اور آزادی ملنے کے بعد پسماندہ دیش کو ایک خوشحال ولیش بنانے کے لیے کام کرتے رہے۔ انھیں لگاتار بیس بیس گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ اتنی سخت محنت اور اُلجھنوں میں گھرے رہنے کے باوجود پنڈت جی ہمیشہ خوش رہتے تھے اور موقعہ ملتے پر طنز و مزاح سے اپنی زندہ دلی کا ثبوت پیش کرنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ پیش ہیں اُن کے طنز و مزاح کی کچھ جھلکیاں۔

قصہ اجمیر کا ہے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ایک خاص اجلاس ہو رہا تھا۔ جلسہ گاہ میں مردوں اور عورتوں کے بیٹھنے کے لیے الگ الگ جگہ مقرر کی گئی تھی۔ لیکن کچھ لوگ عورتوں کے لیے مخصوص جگہ پر رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ والنٹیرسوں نے انھیں وہاں سے اُٹھنے کے لیے کہا۔ لیکن وہ نہیں اُٹھے۔.... وہ بیچارے مایوس ہو کر رہ گئے۔ اُن کی ایسی حالت دیکھ کر پنڈت جی مائک پر آئے اور کہنے لگے۔ جو مرد اپنے آپ کو مرد نہیں سمجھتے وہ بیشک عورتوں والی سیٹوں پر بیٹھے رہیں، لیکن جو واقعی اپنے آپ کو مرد سمجھتے ہیں۔ وہ مردوں والی جگہ پر آجائیں جلسہ گاہ میں ہنسی کا فوارہ تو چھوٹا ہی لیکن ساتھ ہی ساتھ عورتوں والی جگہ پر بیٹھے سب مرد وہاں سے اُٹھ کر مردوں کے لیے مخصوص جگہ پر آ بیٹھے۔

نہرو جی وقت کے بڑے پابند تھے۔ پھر بھی اگر کسی وجہ سے کسی کو ملنے کے لیے دیئے گئے وقت پر نہ مل پاتے تو خوشی خوشی اپنی مجبوری کا اظہار کر کے معافی بھی مانگ لیتے تھے۔ ایک بار انھوں نے ہندی کے مشہور شاعر شری رام دہاری دنکر، کو صبح نو بجے ملنے کا وقت دیا۔ دنکر جی اُن کے یہاں مقررہ وقت پر پہونچ گئے۔ لیکن نہرو جی پندرہ منٹ بعد ملاقات والے کمرے میں پہونچے۔ اور پیشتر اس کے کہ دنکر جی کچھ بولتے۔ نہرو جی ہنس کر آپ ہی کہنے لگے۔ معاف کرنا صاحب! میں بھی لال قلعہ اور قطب مینار کی طرح دیکھنے کی چیز بن کر رہ گیا ہوں۔ لوگ ہر روز تانتا باندھ کر آجاتے ہیں۔ آج کچھ زیادہ ہی لوگ آگئے تھے۔ کسی کو کیا کہتا۔ اس لیے پندرہ منٹ لیٹ ہو گیا ہوں۔ اُن کے اس طنز کو سُن کر دنکر جی کھل کر ہنس پڑے۔

پنڈت جی ہنی جیل میں قید تھے۔ وہاں جو روٹی ملتی تھی۔ اُس میں ریت ملا ہوتا تھا۔ پنڈت جی نے جیلر سے اُس کی شکایت کی، جیلر نے کہا۔ پنڈت جی آپ ماتر بھومی کی خدمت کے لیے آئے ہیں، شکایت کیوں کرتے ہیں۔ پنڈت جی نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ ہم ماتر بھومی کی خدمت کے لیے آئے ہیں۔ اسے کھانے نہیں آئے۔ ہمیں بنا مٹی کے آٹے کی روٹی ملنی چاہیئے۔ جیلر اُن کا چُست جواب سُن کر شرمندہ ہو گیا۔ ●

۱۱۰۵، بابری تھانیسر، ضلع کوروکشیتر، (ہریانہ)

بقیہ، تبصرہ

روشنائی سے لہو کی میں نے لکھا تھا جسے
نامہ بر کے ہاتھ وہ میری کہانی بھیجنا
(سریندر پنڈت سوز)

بہیں گی کب تلک ندیاں لہو کی نام مذہب پر
کہاں تک ہم کو یہ دیر و حرم جینے نہیں دینگے
(شہاب ملت)

رات کا در د قضا صبح سے کہنے کے لیے
ہم سمندر سے پہاڑوں کی طرح ابھریں گے
(صبا صدیقی)

کیا خبر تجھ کو کہ کس کرب سے گزرا ہوگا
دل کی تختی سے ترا نام مٹانے والا
(کرشن کمار طور)

دنیا چڑھا رہی ہے مزاروں پہ چادریں
لیکن کسے خبر ہے کوئی بے کفن بھی ہے
(مسعودہ حیات)

آگ ہے پانی ہے مٹی ہے ہوا ہے تجھ میں
اور پھر ماننا پڑتا ہے، خدا ہے مجھ میں
(کرشن بہاری نور)

(عبدالحمید)

تسنیم فاطمہ ۵



معمارِ قوم

پنڈت گووند بلبھ پنت

پنڈت گووند بلبھ پنت نہ صرف ایک پارلی مینٹرین، ایک کونسلر، ایک ودیر ہی تھے، بلکہ وہ روئے زمین پر بحیثیت ایک انسان اور ایک دردمند دل رکھنے والے فرد کے روپ میں ابھر کر سامنے آئے وہ ایک روشن ستارہ تھے جن کی تابانی سے دنیائے انسانیت منور ہو سکی وہ ایک دلیش بھگت، استطامیہ کے ماہر اور ملک کے پسماندہ اور پچھڑے ہوئے لوگوں کے غم کے شریک کی حیثیت سے تاریخِ انسانی میں ایک ابدی مقام پا سکے۔ ان کا شمار ان چند عظیم ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہندوستان کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس لحاظ سے وہ صحیح معنی میں معمارِ قوم تھے،

پنڈت گووند بلبھ پنت کا جنم ۱۸۸۷ء میں ہوا۔ آپ کا جنم چونکہ انت چتردشی کے دن ہوا تھا اور ۱۹۴۶ء میں جب کہ آپ کا جنم دن سرکاری سطح پر منایا گیا، وہ دس ستمبر کی تاریخ تھی (اس سال چتردشی ۱۰ ستمبر کو ہی پڑی تھی) لہذا آپ کی تاریخ پیدائش ۱۰ ستمبر ہی مان لی گئی۔ آپ کے والد پنڈت منورتھ پنت گڑھوال میں ریونیو کے محکمے میں ملازم تھے۔ آپ کی والدہ شریمتی گووندی رائے بہادر پنڈت بدری دت جوشی کی صاحبزادی تھیں۔

پنڈت گووند بلبھ پنت الموڑہ کے پاس سیاہی دیوی کے دامن میں واقع ایک گاؤں کھوٹ میں پیدا ہوئے تھے، چار سال کی عمر میں آپ کے نانا آپ کو الموڑہ لے گئے۔ آپ نے ابتدا میں پرائیویٹ تعلیم پائی، بعد میں آپ نے رمزے انٹرمیڈیٹ کالج میں تعلیم پائی۔ آپ نے انٹر کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اس وجہ سے آپ کو بیس روپے ماہانہ کا وظیفہ ملنے لگا۔ الہ آباد میں تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے یہ رقم اُس دور میں کافی سمجھی جاتی تھی۔ آپ کو شروع ہی سے گھوڑ سواری کا شوق تھا، قدرتی مناظر اور جنگلات سے آپ کو بیحد عشق تھا، الموڑہ قدرتی مناظر کے لیے خاص طور پر مشہور ہے۔ شمال میں باروں سے ڈھکی پہاڑی چوٹیاں بے حد حسین اور دلکش نظر آتی ہیں۔ بقول شاعر ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست

غروبِ آفتاب کے وقت قوسِ قزح کا رنگ آمیز جلوہ انتہائی مسحور کن ہوتا ہے۔ اپنے ملک کے یہ حسین مناظر اتنے دلکش نظر آتے ہیں کہ انتہائی خشک انسان بھی ان رعنائیوں سے اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پنڈت گووند بلبھ پنت کی حساس دل اور عقابی نگاہیں ان جلووں سے اثر لے کر آپکو ایک ایسی دنیا کی طرف لے جا رہی تھیں۔ جہاں نوعِ انسانی کی خدمت ہی سب سے بڑا دھرم سمجھا جاتا ہے۔ فلاحِ عامہ کے کاموں کی اہمیت آپ نے بچپن ہی سے سمجھ لی تھی۔ یہ روایت آپ کو ورثہ میں ملی تھی کیونکہ آپ کے باپ، دادا نوعِ انسانی کی خدمت کو متاعِ عزیز سمجھتے آئے تھے۔

۱۹۰۵ء میں آپ نے الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۰۹ء میں آپ نے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ اس جگہ بھی آپ کی فرسٹ پوزیشن رہی اور آپ کو طلائی تمغہ ملا۔

الہ آباد میں جس وقت آپ زیرِ تعلیم تھے، اُس وقت ملک ایک عجیب بحران سے گزر رہا تھا، ملک کے عوام میں بیداری آ رہی تھی اور لال، بال اور پال طلبا کے ہیرو بنے ہوئے تھے۔

۱۹۰۵ء میں بنارس میں کانگریس کا اجلاس ہوا، جس میں پنت جی نے شرکت کی، یہ وہ مقام اور موقع تھا جب کہ پنت جی نے اپنے سیاسی گرو "گوکھلے" کے درشن کئے۔ پنت جی نے گوکھلے اور مالویہ جی کی تعلیمات

۵۔ محلہ ہرنانتھ پورہ، سہارنپور (یوپی)

سے بے حد متاثر ہوا کرتے [illegible]
سے وہ بے حد متاثر ہوا کرتے تھے۔ ملک کے عظیم ناول نگار منشی پریم چند چار جی کے لیے بھی آپ ہمیشہ رطب اللسان رہے۔ آپ نے زمانۂ طالب علمی میں سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، چنانچہ آپ کو بی۔ اے کے امتحان میں شرکت سے روک دیا گیا۔ البتہ آپ کو ریاضی پڑھانے والے ایک استاد پروفیسر کوکس کی مداخلت پر امتحان میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔

الہ آباد میں آپ نے کلاسیکی ہندوستانی موسیقی سے دلچسپی لی، آپ کی رہائش گاہ پر سنگیت کی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔

قانون کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ نے الموڑہ میں پریکٹس شروع کی، آپ جلد ہی رانی کھیت چلے گئے۔ اور بالآخر نینی تال میں آپ نے رہائش اختیار کرلی۔ کمایوں میں آپ کی پریکٹس بے حد کامیاب رہی، یہاں رہ کر آپ نے نام بھی کمایا اور دولت بھی۔ مشہور کاکوری کیس میں آپ کی وکالت نقطۂ عروج پر تھی۔ آپ کی دھرم پتنی شریمتی کلا دیوی کے تین بچے ہوئے۔ دو لڑکیاں یعنی لکشمی اور پشپا اور ایک بیٹا کرشن چندرا جو آج مرکزی کابینہ کے وزیر ہیں۔

سماجی مصلح :۔

آپ نے قانونی سرگرمیوں کے علاوہ سماجی سرگرمیوں سے بھی دلچسپی لی، آپ نے ۱۹۱۶ء میں کمایوں پریشد نامی تنظیم قائم کی۔ اس کا کام پہاڑی آبادی کی بہبود کے اقدامات کرنا تھا، پنڈت پنت نے کمایوں کے جنگلات کے مسائل پر ایک کتاب لکھی جو ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔ آج ملک میں جنگل کی ضرورتوں اور اس کی اہمیت پر شدومد سے زور دیا جارہا ہے لیکن پنڈت پنت نے اس اہم مسئلے کی طرف اب سے تقریباً ۷۰ برس پہلے توجہ دلائی تھی، اس پریشد نے قلی بیگار کی رسم ختم کرادی۔ آج بندھوا مزدوروں کو ختم کرنے پر بہت زور ہے مگر یہ کام پنڈت پنت کی رہنمائی میں بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔

پنڈت گووند بلبھ پنت میں حب الوطنی کا جذبہ بہت شدومد سے سرایت کیے ہوئے تھے۔ آپ کی بے چین روح محض قانونی سرگرمیوں اور مشوروں تک ہی محدود نہیں رہ سکتی تھی، چنانچہ جب مہاتما گاندھی کی آواز پر وہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں شریک ہوگئے۔ ۱۹۲۳ء میں آپ کو اترپردیش کی لیجسلیٹو کونسل کے لیے چن لیا گیا۔ وہ جلد ہی سوراج پارٹی کے سربراہ بن گئے۔ وہاں پریشد میں آپ نے جو تقریریں کیں، ان سے آپ کا زورِ خطابت ٹپکتا ہے۔ ۱۹۲۷ء میں آپ کو اترپردیش کانگریس کمیٹی کا صدر چن لیا گیا۔ علی گڑھ کے اجلاس میں آپ نے فرقہ وارانہ مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو جی کے ساتھ مل کر آپ نے سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرہ کیا۔ اس موقع پر پولیس کی لاٹھیوں کا شکار ہوئے اور چوٹیں کھائیں۔ اس سے وہ عمر بھر قدرے معذور رہے، نمک ستیہ گرہ کے سلسلے میں آپ کو ۱۹۳۰ء میں چھ ماہ کے لیے گرفتار کرلیا گیا۔ ۱۹۳۲ء میں آپ دوبارہ بریلی اور دہرہ دون کی جیلوں میں بند رہے۔ پنڈت جواہرلال نہرو بھی آپ کے ہمراہ تھے، اس زمانے میں پنڈت نہرو خودنوشت سوانح حیات لکھ رہے تھے اور پنڈت پنت اس کے مسودے پڑھا کرتے تھے

۱۹۳۴ء میں پنت جی کو مرکزی قانون ساز اسمبلی کا رکن چن لیا گیا۔ اس موقع پر آپ نے پارلیمانی امور اور مالیات کے ایک ماہر ہونے کا ثبوت دیا۔ ۱۹۳۷ء میں آپ نے استعفیٰ دے دیا کیوں کہ آپ کو اترپردیش اسمبلی کا الیکشن لڑنا تھا، آپ نے الیکشن میں کامیابی حاصل کی۔ آپ کو کانگریس پارٹی کا لیڈر چن لیا گیا۔ آپ ۱۹۳۹ء تک اترپردیش کے وزیراعلیٰ رہے۔ جنگ کے شروع ہو جانے پر کانگریس نے احتجاجاً علیحدگی اختیار کرلی، کانگریس کو شکایت تھی کہ برطانوی سرکار نے ہندوستان کو ہندوستانی عوام کی مرضی کے بغیر جنگ میں ملوث کرلیا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں انفرادی ستیہ گرہ کے باعث آپ کو جیل کیا ڈال دیا گیا۔ ۱۹۴۲ء میں جب مہاتما گاندھی نے بھارت چھوڑو تحریک چلائی، اس وقت بھی آپ جیل میں تھے، آپ کو پنڈت نہرو کے ساتھ قلعہ احمدنگر میں قید رکھا گیا۔ سردار پٹیل اور دیگر رہنما بھی وہیں مقید تھے۔ رہائی کے بعد آپ کو اترپردیش اسمبلی کے لیے ۱۹۴۶ میں چن لیا گیا۔ آپ آٹھ برس تک اترپردیش کے وزیراعلیٰ رہے۔ اس مدت میں آزادی کا خواب پورا ہو گیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ میں قومی جھنڈے کو سلامی دیتے ہوئے، آپ کا دل جذبات سے بھر گیا اور آپ نے ببانگِ دہل کہا کہ میری زندگی کا خواب پورا ہو گیا، اب مجھے یہ پروا نہیں کہ میں اس دنیا سے چلا جاؤں، بھلے ہی میں آج ہی اس دنیا کو خیرباد کہہ دوں، میری زندگی کی ملک کو آزاد دیکھنے کی تمنا اب پوری ہو گئی ہے، تقسیم وطن کے نتیجے میں ملک میں فرقہ وارانہ فسادات پھیلے، لیکن پنڈت گووند بلبھ پنت کے عزم و ارادے نیز کوششوں سے اترپردیش میں صورتِ حالات پر قابو پایا جاسکا۔ دسمبر ۱۹۵۴ء میں آپ نے مرکزی کابینہ میں شمولیت کی، فروری ۱۹۵۵ء میں آپ کو وزیر داخلہ بنایا گیا۔ اس دوران میں ریاستوں کی تنظیم نو کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں ہندوستان کی ریاستوں کا نیا نقشہ کھینچا گیا۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک ملک کے سبھی اہم سیاسی امور پر آپ کی گہری چھاپ رہے۔ پنڈت نہرو آپ سے ہر معاملے میں مشورہ کرتے تھے۔ قوم کے لیے اپنی بیش قیمت خدمات کے صلے میں آپ کو ۱۹۵۷ء میں بھارت رتن کا اعزاز دیا گیا۔

۲۰ فروری ۱۹۶۱ء کو پنڈت گووند بلبھ پنت سرکاری فائلوں کا مطالعہ کر رہے تھے، آپ نے وزیر قانون جناب اشوک سین کو کسی مشورے کے

لیے اچانک بُلا بھیجا۔ آپ نے اگلے روز راجیہ سبھا کی بحث کا جواب دینے کے لیے انھیں ضروری نکات سمجھائے۔ اسی دَوران آپ کو بیہوشی کا دَورہ پڑا جس سے وہ کبھی جانبر نہ ہوسکے، ۷ مارچ ۱۹۶۱ء کو آپ سورگباشں ہوگئے۔

نوعِ انسانی کے مسائل سے دلچسپی

آپ ملک کے نوجوانوں کی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں تعلیم کی اہمیت بخوبی سمجھتے تھے، ۱۵ فروری ۱۹۶۰ء کو یونیورسٹی کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے ناگپور یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں فرمایا کہ یونیورسٹی کی چار اہم ذمہ داریاں ہیں۔ اوّل علم کا حصول، دوم طالب علم کی ذہنی، سماجی اور اخلاقی قوتوں کی پرورش جس سے وہ سماج میں قیادت کے فرائض انجام دے سکے، تیسرے ثقافتی ورثے کی پرورش، چوتھے طالب علم کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی تکمیل ذریعہ تعلیم مادری زبان ہونا چاہیئے، اس سلسلے میں آپ نے کہا کہ اگر تعلیم غیر ملکی زبان میں حاصل کی جائیگی تو زیادہ زور زبان کے حصول پر رہے گا نہ کہ اس موضوع پر جسے حاصل کیا جا رہا ہے۔ آپ کی زندگی کسانوں کی بھلائی اور بہبود کی خاطر خاص طور پر مشہور رہی ہے۔ آگرہ لگان داری ایکٹ ۱۹۲۶ء میں آپ کا رول بیحد اہم تھا۔ آپ نے ۸ جولائی ۱۹۲۶ء کو اتر پردیش کی لیجسلیٹو کونسل میں اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارے کروڑوں دیش واسی صرف ایک وقت روٹی کھاتے ہیں۔ کیا یہ انصاف ہے یا یہ انسانیت ہے؟ کیا ہم ان کو مزید نچوڑنے کا حق رکھتے ہیں؟ آپ نے حصولِ آزادی کے بعد زمینداری نظام کی تنسیخ کے سلسلے میں موثر رول ادا کیا۔ آپ نے اسمبلی میں بل پیش کیا اور پھر اس پر موثر عمل درآمد کے لیے کام کیا، آپ کو کسانوں کے استحصال پر بیحد غم تھا، فرقہ وارانہ فسادات کو آپ غیر ملکی دین سمجھتے تھے، ۲ فروری ۱۹۴۰ء کو سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک تقریر میں آپ نے کہا کہ فرقہ وارانہ فسادات ہمیں پریشان کرنے اور پھنسانے کے لیے کرائے گئے ہیں۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو بنگال کے وزیر اعلیٰ مسٹر فضل الحق کے غیر ذمہ دارانہ بیان پر پٹنہ میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا اگر دیگر صوبوں میں مسلمان ہندوؤں پر ظلم و ستم بھی کریں گے تو میں اپنے صوبے میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کروں گا۔" مختصر یہ کہ پنڈت گووند بلبھ پنت نے نوعِ انسانی کی بے لوث خدمت کرکے حُبّ الوطنی کی اعلیٰ ترین مثال پیش کی، آج کے دَور میں اس طرح کی مخلصانہ اور بے لوث خدمات کیلیے بیناہ ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔

بقیہ، نئی غزل
ایک جائزہ

اتنی نشینی ہو چکی ہے کہ پڑوسی سے پڑوسی کا رشتہ تو خیر الگ بات ہے، بھائی سے بھائی کا رشتہ، بیٹے سے باپ کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ آج کا ہر انسان اپنے مسائل اور اپنی دنیا میں اس طرح کھو گیا ہے کہ اسے دوسروں کی تو کیا خود اپنی خبر نہیں ہے۔ ایک چہرے کے اندر کتنے چہرے ملتے ہیں اور خود اپنا چہرہ کھو گیا ہے۔ لوگ ملتے ہیں، بیٹھتے ہیں لیکن وہ مکمل نہیں ہوتے۔ ان کی زبان کچھ اور بولتی ہے ذہن کہیں اور ہوتا ہے، دل کچھ اور محسوس کرتا ہے اس بے چہرگی اور تنہائی کے احساس کو آج کا شاعر شدت سے محسوس کرتا ہے۔

مل کے بیٹھیں گے وہی لوگ ادھورے آدھے
پھر وہی میز، وہی سرد پیالی ہوگی
(پرکاش فکری)

⁂

وہ لوگ اب کہاں، وہ چہرے کدھر گئے
اے شہرِ حسن کس کی تجھے بد دعا لگی
(خلیل الرحمان اعظمی)

⁂

آئینے کے ہاتھ میں رونے لگے شمیم
ملنے کو اپنے آپ سے اب جی ترس گیا
(سید احمد شمیم)

اس بے چہرگی کے احساس نے آج کے شاعروں کو تلاشِ ذات کا شعور بخشا ہے۔ تلاشِ ذات کا یہ عمل مختلف صورتوں میں آج کی غزل میں دکھائی دیتا ہے۔ کبھی خود کو شناخت کی دنیا تو ٹھکرا کر اور کبھی اپنی انتہائی انا کا اظہار کرکے آج کا شاعر اپنے وجود کے اثبات کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔

مجھ کو خود مجھ سے ہی ملنے نہیں دیتی دُنیا
چھُپ کے ملتا ہوں کبھی جب نہیں ہوتا کوئی
(سلیمان ادیب)

دراصل نئی غزل کا حسن اس کے Diction (اسلوب) میں ہے۔ الفاظ یہاں نئے روپ اور نئی معنویت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ یقیناً نئے غزل گو شعرا نے پرانے لفظوں کو بھی نئی روح عطا کردی ہے ان کے یہاں ایمائیت، علامت، پیکر تراشی اور نئے لفظیات کا حسن ملتا ہے اور وہ انگریزی لفظوں کو بھی تخلیقی صورت میں استعمال کرتا ہے۔

کانتا کپور

بھارت کا ۳۴ واں قومی فلمی میلہ

بھارت کے ۳۴ ویں قومی فلمی میلے کی شاندار تقریب سری فورٹ آڈی ٹوریم نئی دلی میں ۱۸ ستمبر کو منعقد ہوئی اس پُر وقار تقریب میں صدر جمہوریۂ ہند عالی جناب آر وینکٹ رامن نے اپنے دستِ مبارک سے ۳۴ ویں قومی فلمی اعزازات عطا فرمائے اس مرتبہ دادا صاحب پھالکے کا ذی وقار اعزاز جنوبی بھارت کے ممتاز فلم ساز ہدایت کار بی۔ ناگی ریڈی (B. NAGI REDDY) کو عطا کیا گیا۔

بی ناگی ریڈی اس دشت نوردی میں اپنی تمام عمر گزار چکے ہیں۔ بی ناگی ریڈی ہندوستان کے واحد فلم ساز ہیں جنھوں نے پانچ ہندوستانی زبانوں میں فلمیں تیار کی ہیں۔ اُن کی فلمیں تیلگو فلم شائقین میں تو مقبول ہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہندی سینما کے شائقین بھی اُن سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ اُن کی ہندی فلموں میں رام اور شیام، شریمان شریمتی، جولی۔ یہی ہے زندگی اور گھر گھر کی کہانی بیحد مقبول رہیں۔ تیلگو اور ہندی فلموں کے علاوہ انھوں نے تامل، ملیالم اور کنڑ فلمیں بھی بنائیں۔ ناگی ریڈی کا وجے واہنی اسٹوڈیو ایشیا کا بہترین فلم اسٹوڈیو تصور کیا جاتا ہے، علاوہ ازیں وہ وجے ہسپتال کے نام سے مدراس میں ایک خیراتی ہسپتال بھی چلا رہے ہیں، جہاں غربا کا مفت علاج ہوتا ہے، یہی نہیں بلکہ "چندا ماما پبلی کیشنز بی۔ این کے پریس پرائیویٹ لمیٹیڈ اور ڈالٹن پبلی کیشنز جیسے موقر اشاعتی ادارے انھیں کے مرہونِ منت ہیں۔ یہ امر بھی باعثِ دلچسپی ہوگا کہ ہماری فلمی دنیا میں بی ناگی ریڈی واحد فلمساز ہدایت کار ہیں جن کے ایک ہی خاندان کے دو افراد کو دادا صاحب پھالکے کے پروقار اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ اس سے قبل ۱۹۷۵ء میں اُن کے بھائی بی۔ این۔ ریڈی مرحوم کو یہ اعزاز عطا کیا گیا تھا۔ دادا صاحب پھالکے اعزاز ایک لاکھ روپے نقد ایک سورن کمل اور ایک شال پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ اعزاز کسی فلمی شخصیت کو اُس کی مجموعی خدمات پر دیا جاتا ہے، بی ناگی ریڈی نے اعزاز قبول کرنے کے بعد صدر جمہوریۂ ہند اور حکومت کا شکریہ ادا کیا اور انعام کی ایک لاکھ روپے کی پوری رقم سوکھا راحت کے لیے وزیر اعظم کے قومی امدادی فنڈ کو عطا کر دی، اس طرح انھوں نے فلمی کلاکاروں کی ایک اور مثال قائم کردی کہ وہ قوم اور ملک پر کوئی بھی ناگہانی یا قدرتی آفت ٹوٹ پڑنے پر کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔ اس مرتبہ کنڑ فلم تبرانا کاتھے (TABARAN KATHE) کو ۱۹۸۶ء کی بہترین فلم قرار دیا گیا اس میلے میں فلم کے پروڈیوسر کو ۵۰ ہزار روپے اور سورن کمل اور اس کے ہدایت کار گریش کسراولی (GRISH KASARAVALLI) کو ۲۵ ہزار روپیہ دئے گئے۔

اس فلم کے ایکٹر چارو ہاسن (CHARUHASAN) کو بہترین اداکاری پر دس ہزار روپے نقد اور ایک نقرئی کنول عطا کیا گیا۔ اس فلم کی کہانی افسر شاہی نظام کا احاطہ کرتی ہے کہ کس طرح انسان اس چکرویوہ میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ اندرا گاندھی اعزاز کسی نئے ہدایت کار کی پہلی فلم پر دیا جاتا ہے، لہٰذا اس مرتبہ یہ اعزاز نئے نوجوان ہدایت کار سدھیر مشرا (SUDHIR MISHRA) کو اُن کی پہلی فلم "یہ وہ منزل تو نہیں" پر دیا گیا، جب کہ

۱۵ ایم/۲۳، بنگلہ صاحب روڈ، ...
یوسف...؟ نئی دہلی

جی اروندن (G. ARVINDAN) کو ۱۹۸۶ء
کا بہترین ہدایت کار قرار دیا گیا۔ یہ اعزاز انھیں
ان کی فلم اوری دتھ (ORI DATH)
پر دیا گیا۔ علاوہ ازیں ۱۶ سالہ ملیالی ایکٹرس
مونیشا (MONISHA) کو بہترین ایکٹریس
قرار دیتے ہوئے انھیں اُن کی فلم ناکھا کشتھنگل
(NAKHA KASHATHANGAL) پر

کو مرچ مصالحہ (MIRCH MASALA)
پر بہترین معاون اداکار کا اعزاز دیا گیا۔ جبکہ
منجولا کنوار (MANJULA KANWAR)
کو اُس کی فلم بھانگا سلاتا (BHANGA
SILATA) پر بہترین معاون اداکارہ
کا اعزاز عطا کیا گیا۔ ان کا یہ پہلا اعزاز ہے
سماجی موضوعات پر مشتمل فلموں میں ملیالم فلم

اعزاز دس سالہ لڑکے اینتیک سین گپتا،
(ANTEK SEN GUPTA) کو دیا گیا۔ اس نے
بنگالی فلم پھیرا میں ایک پُر اعتماد کردار ادا کیا
تھا۔ اس فلم کے ہدایت کار بدھ دیب داس
گپتا (BUDH DEB DAS GUPTA)
ہیں اور ہیمنت کمار مکرجی (HEMANT
KUMAR MUKHERJI) کو ۱۹۸۶ء



۱

۱۸ ستمبر ۱۹۸۷ء کو نئی دہلی میں منعقدہ ایک تقریب میں صدر جمہوریہ ہند شری آر وینکٹ رامن نے قومی فلمی میلے کے ایوارڈز عطا کئے۔
اس موقعہ پر اطلاعات و نشریات کے وزیر مملکت شری اجیت کمار پانجہ بھی موجود تھے۔
زیر نظر تصویر میں صدر جمہوریہ ہند بنگالی فلم "پھیرا" میں ماسٹر اینکیت سین گپتا کو بہترین اداکاری پر ایوارڈ
عطا کرتے ہوئے۔

ایوارڈ دیا گیا۔ اس کے ہدایت کار ہری ہرن (HARI
HARAN) ہیں اور سمسا رام آدھو منسا رام
(SAMSARAM ADHU MANSARAM)
فلم کو مجموعی طور پر ایک مکمل بہترین تفریحی فلم قرار
دیتے ہوئے اس کے ہدایت کار ایم سرونن (M.
SARAVANAN) کو اس اعزاز سے سرفراز
کیا گیا۔ ادھر ہندی فلموں کے نامور اداکار سریش
اوبرائے (SURESH OBRAI)

دُوری دُوری اور و کوڈو کوٹم (DOORI DOORI
ORU KO DDUKOOTTAM) کو بہترین
فلم قرار دیا گیا۔ اس سلسلے میں اس فلم کو اعزاز
عطا کیا گیا۔ اور کنڑا فلم مادھو آچاریہ (MADHO
ACHARYA) کو بہترین میوزیکل فلم قرار دیا
گیا۔ اور اس سلسلے میں اس کے موسیقار بالامرلی
کرشنن (BALAMURLI KRISHNAN)
کو اعزاز دیا گیا۔ اس مرتبہ بہترین بال کلاکار کا

کا بہترین گلوکار قرار دیا گیا۔ انھیں یہ اعزاز
اُن کی فلم لالن فقیر (LALAN FAQIR)
پر عطا کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی گلوکارہ چترا
کو بہترین گلوکارہ قرار دیا گیا۔ چند ٹیکنیکل
اعزاز یافتگان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔
الف بہترین آڈیوگرافی پتھ بھولا (PATH
BHOLA) بنگالی ۔ اعزاز یافتہ
درگا مترا (DURGA MITR

بہترین ایڈیٹنگ، مرچ مصالحہ (MIRCH MASALA) ہندی
اعزاز یافتہ سنجو شاہ (SANJU SHAH)

۳۔ بہترین آرٹ ڈائریکشن مادھو آچاریہ کو ملا (MADHAVACHARYA)

علاوہ چند علاقائی زبانوں کے اعزاز یافتگان مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ آسامی فلم، بان (BAAN) اعزاز یافتہ چارو کمل ہزاریکا (CHARO KAMAL HAZARIKA)

۲۔ ہندی فلم، مرچ مصالحہ (MIRCH MASALA) اعزاز یافتہ کیتن مہتہ۔

PAVITRAN)

۲۔ اڑیہ فلم، ماجھی پا چا (MAJHI PAHACHA)
اعزاز یافتہ من موہن مہاپاترا۔ (MAN MOHAN MAHAPATRA)

۷۔ تامل فلم، موناراگم (MONARAGAM)
اعزاز یافتہ منی رتنم۔



۱۸ ستمبر ۱۹۸۷ کو نئی دہلی میں منعقدہ ایک تقریب میں صدر جمہوریہ ہند شری آر وینکٹ رامن نے قومی فلمی میلے کے ایوارڈز عطا کئے۔ اس موقعہ پر اطلاعات و نشریات کے وزیر مملکت شری اجیت کمار پانجہ بھی موجود تھے۔
زیر نظر تصویر میں صدر جمہوریہ ہند ملیالم فلم " ماکھا کاشا تھنگل" میں مونیشا کو بہترین اداکارہ کا ایوارڈ عطا کرتے ہوئے۔

اعزاز یافتہ پی کرشنا مورتی (P. KRISHNA MOORTI)

۴۔ بہترین کاسٹیوم پری نیتی (PARINITI) ہندی۔
اعزاز یافتہ۔ پربھات جھا۔ (PRABHAT JHA)

۵۔ بہترین فوٹو گرافی، نموکو پرکنی منتری تھوادل ملیالم اعزاز یافتہ وینو (VEENO)

(KETANMEHTA)

۳۔ بنگالی فلم پھیرا (PHERA) اعزاز یافتہ بدھ دیب داس گپتا۔ (BUDH DEB DASS GUPTA)

۴۔ کنڑ فلم تبشنکھا ناڈ (SHAN KHANAD) اعزاز یافتہ امیش کلکارنی۔

۵۔ ملیالم فلم، اپو (APPU) اعزاز یافتہ وی۔کے۔ پوترن (V.K.

اس کے علاوہ انگریزی فلم واچ مین (WATCHMAN) کو اُن زبانوں کی بہترین فلم کے لیے اعزاز دیا گیا کہ جن کا ذکر آئین کے آٹھویں شیڈول میں نہیں کیا گیا۔ اس کی کہانی آر۔کے۔ نارائن (R.K. NARAYAN کے ٹی وی سیریل مال گڈاس ڈیز (MULLGADDI DAYS) سے لی گئی ہے۔
اس موقعہ پر ملیالم فلم اما آرین (AMMA

(ARIYAN) کے ہدایت کار جان ابراہیم
(JOHN ABRAHIM) کو جیوری
کا خصوصی اعزاز عطا کیا گیا۔ انھیں ڈوکومنٹ کی
خاموشی اختیار کرکے خراج عقیدت پیش کیا گیا۔
واضح رہے کہ جان ابراہیم اُسی سال ماہ جنوری
میں اچانک وفات پاگئے تھے۔

اس کے ساتھ ہی عالمی شہرت یافتہ ہدایت
کار ستیہ جیت رے (SATYAJIT RAY)
کے صاحبزادے سن دیپ رے
(SANDEEP RAY) کی فلم ہم گھر
(HIMGHAR) کی خاص طور پر تعریف
کی گئی اور انھیں بھی جیوری کے خصوصی اعزاز سے
نوازا گیا۔

علاوہ ازیں حسن شارٹ فلموں کو اعزازات
عطا کئے گئے ان میں سے چند کی تفصیل مندرجہ
ذیل ہے۔

دی لینڈ ویڈی وڈ بلوز فری کو بہترین
شارٹ فلم قرار دیا گیا۔ اس کے ہدایت کار چندر
نارائن بروا (CHANDRA NARAIN BARUA) کو طلائی کنول اور ۵ ہزار روپے
سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل
شارٹ فلموں کو اعزازات عطا کئے گئے۔

دی لینڈ آف سینڈ ڈیونس (THE LAND OF SAND DUNES)
ہدایت کار گوتم گھوش
(GAUTAM GHOSH)
کملا نہرو (KAMLANEHRU)
ہدایت کار اشیش مکرجی (ASHISH MUKHERJI)
آور اسلامک ہیریٹیز (OUR ISLAMIC HERITAGE) ہدایت کار
کے کے گرگ (K.K. GARG)

کلاسیکی ڈانسز آف انڈیا (CLASSICAL DANCES OF INDIA) ہدایت کار
پرکاش جھا۔ (PRAKASH JHA)
بہترین سائنٹیفک فلم کام دھینو ریڈیمیڈ۔ (KAAM DHENU REDEEMED)
ہدایت کار محی الدین مرزا۔ (MOHI-UD-DIN MIRZA)
بہترین انڈسٹریل فلم۔ دی اسٹوری آف گلاس۔ (THE STORY OF GLASS) ہدایت کار
بدھ دیب داس گپتا، (BUDHDEB DASS GUPTA)
بہترین ایگری کلچرل فلم، ٹری اسپائسز سینامن (TREE SPICES CINNAMAN) ہدایت کار
گوتمن (GAUTAMAN)
بہترین ایجوکیشنل فلم، اے۔بی۔سی۔ڈی (A.B.C.D) ہدایت کار ارون
گونگڈے (ARUN GONGDE)

اس مرتبہ کسی فلم کو قومی یک جہتی کے
لیے نرگس دت اعزاز کے مستحق قرار نہیں پایا
گیا۔ اور نہ ہی کسی فلم کو بچوں کی بہترین
فلم بطور گیت کار کا اعزاز دیا گیا۔ مراٹھی
زبان کی کوئی فلم بہترین تصور نہیں کی گئی۔ اس کے
علاوہ گجراتی، کشمیری، پنجابی، سنسکرت، سندھی
اور اُردو کے زمروں میں مقابلے کے لیے کوئی
فلم نہیں آئی۔

اس کے علاوہ انگریزی کے ممتاز فلم
جرنلسٹ چدانند داس گپتا (CHIDANAND DASS GUPTA) کو ۱۹۸۶ء
کا بہترین فلم جرنلسٹ قرار دیا گیا۔ اس کے
ساتھ ہی ارون کمار رے (ARUN KUMAR RAY) کی تحریر کردہ بنگالی
زبان کی کتاب رابندر ناتھ و چل چتر
(RABINDRA NATH-O-CHALCHITRA)
کو سینما پر لکھی گئی ۱۹۸۶ء کی بہترین تصنیف
قرار دیا گیا اور ان دونوں کو پانچ پانچ ہزار
روپے نقد اور نقرئی مور عطا کیا گیا۔

اعزازات عطا کئے جانے سے قبل فیچر
فلموں کی دس اراکان کی جیوری کے چیرمین جناب
بھیشم ساہنی (BHISHAM SAHNI)
نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ نوجوان فلم ساز عوام
کی زندگی اور جذبات کی عکاسی کرنے میں پیش
پیش ہیں۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ قومی اعزاز
کے لیے پیش کی جانے والی فیچر فلم کی کم سے کم مدت
۷۰ منٹ ہونی چاہیئے۔ ٹی۔وی سیریل مقابلے
میں شامل نہیں ہونے چاہئیں اور سرٹیفکیٹ آف میرٹ
عطا کئے جانے کا سلسلہ پھر سے شروع کیا جانا چاہیئے۔

اس کے علاوہ ممتاز فلم ساز اور ہدایت کار
گوپال کرشن آدور (GOPAL KRISHN ADOOR) نے شارٹ فلموں کی جیوری
کے چیرمین کی حیثیت سے شارٹ فلموں کی رپورٹ
پیش کی اور سینما پر تحریرات کی رپورٹ وجے تنڈولکر
(VIJAY TANDOOLKAR) کی عدم موجودگی
میں ڈائرکٹوریٹ آف فلم فیسٹول کے ڈپٹی ڈائرکٹر
جناب سنیل ٹنڈن (SUNEEL TANDON)
نے پیش کی۔ تقریب کا آغاز وزارت اطلاعات و
نشریات کے سکریٹری جناب جی۔این۔ مہرہ،
(G.N. MEHRA) کی استقبالیہ تقریر
کے ساتھ ہوا۔

راشٹرپتی شری آر۔ وینکٹا رمن نے اس
موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے ملک کے فلم سازوں
پر زور دیا کہ وہ بھارتی آدرشوں کے لیے مشعل
راہ کا کام کریں اور اہم سماجی موضوعات پر
فلمیں بنائیں۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ بھارتی فلمیں عوام
کی ذہنی صحت میں اضافے کا ذریعہ ہونی چاہئیں

(باقی صفحے پر)

سید احمد شمیم

نئی غزل ــــ ایک جائزہ

غزل اُردو میں فارسی شاعری کی دین ہے۔ غزل کے معنی ہیں عورتوں سے باتیں کرنے کے اور اسی لیے ایسی فکری اور اسالیبی تبدیلیوں کے باوجود غزل کی داخلی ہیئت اور اس کی ظاہری صورت میں اب تک کوئی بہت بڑی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ یہ صنف اپنے مخصوص رکھ رکھاؤ، لہجے کی نرمی اور شیرینی اور معنی کی تہہ داری اور بیان کے اختصار و ایجاز سے پہچانی جاتی رہی ہے۔ غزل کسی دور میں بھی محض حسن و عشق کے اظہار تک محدود نہیں رہی۔

اصناف شاعری میں غزل واحد صنف شاعری ہے جس کی توانائی اور سخت جانی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

ایلیٹ نے کہا ہے کہ ہمارے عہد میں شاعری کی نسلیں کوئی بیس سال کی مدت پر بدل جاتی ہیں۔ لیکن غزل کے ساتھ اتنی تیز رفتار ترقی بلکہ تبدیلی آسان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک اس کی ساخت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ مطلع اور مقطع کا چوکھٹا، قافیے اور ردیف کی پابندی آج بھی ویسے ہی برقرار ہے جیسے پہلے تھی۔ البتہ اقبال نے "بال جبریل" کی چند غزلوں میں ہیئتی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً ایک غزل ایسی ہے جس کا آخری شعر بہ شکل مطلع ہے اور یہ مطلع دوسرے قافیے اور ردیف میں ہے۔

ہمارے عہد میں مظہر امام نے آزاد غزل کا تجربہ کیا۔ مظہر امام کے بعد کرامت علی کرامت، ناہید تابانی[1]، اور دوسروں نے بھی آزاد غزلیں لکھیں۔ احمد عظیم آبادی نے بھی غزل کی ساخت میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش اپنی معریٰ غزلوں کے ذریعہ کی یعنی انھوں نے چند ایسی غزلیں کہیں جس کے مصرعوں میں ارکان تو برابر ہیں اور تمام اشعار کی بحر بھی ایک ہی ہے، لیکن قافیے بدل گئے ہیں۔ جیسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی بحر و وزن میں لکھے ہوئے چند مختلف اشعار کو غزل کا نام دے دیا گیا ہے۔ جن کے قافیے بھی الگ الگ ہیں۔

چوں کہ غزل اپنے اسالیبی اور فکری تبدیلیوں کے باوجود ایک مخصوص رکھ رکھاؤ کی حامل رہی ہے اس لیے ان ہیئتی تجربوں کا حشر وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ یعنی چند بھونڈے تجربوں کے بعد یہ کوشش دم توڑ گئی۔

نئے شاعروں کے انقلابی اور تجرباتی اذہان میں چند ایسے بھی ذہن سامنے آئے جنھوں نے روایت سے بغاوت کے زعم میں غزل کے مخصوص مزاج سے انحراف کیا اور اس انحراف کا نام رکھا گیا "اینٹی غزل" (Anti-ghazal)۔ اینٹی غزل میں علامتی اظہار کو کلیدی حیثیت دی گئی۔ لسانی توڑ پھوڑ کی بالقصد کوشش کی گئی۔ فارم Form کی گرفت کو ہلکا کرنے کے لیے مروجہ زبان کے خلاف تمسخرانہ لہجہ اختیار کیا گیا یہ کوشش اگر ایک حد تک رہتی تو شاید بات نہیں بگڑتی لیکن اینٹی غزل والے اتنے انقلابی ثابت ہوئے کہ غزل اور ہزل کا فرق ہی اُٹھ گیا۔ ظفر اقبال، عادل منصوری، محمد علوی اس میں پیش پیش رہے اور غزل کے نام پر ایسے ہی اشعار بھی کہے گئے۔

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کا پردہ کھینچ لیا۔ رات ہو گئی
(ندا فاضلی)

تو کسی کے کمرے میں تھی
میں کسی کے کمرے میں تھا (عادل منصوری)

---

[1] مناظر عاشق ہرگانوی کے قول کے مطابق ناہید تابانی نے نہیں بلکہ سدینہ تابانی نے آزاد غزلیں کہی ہیں۔

پڑوسی کی چھت پر جو بندر گرا
دھڑا دھڑ میری نیند کا گھر گرا

(محمد علوی)

⁂

وہ تو غرّا کے چل رہی تھی مگر
سہما سہما تھا شیر کا خالو

(ظفر اقبال)

غزل کا عام مزاج عشقیہ رہا ہے اور عشق کو سیکس (Sex) سے بالکل الگ کیا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن اِدھر فرائڈ اور دوسرے ماہرینِ نفسیات کے مطالعے نے سیکس (Sex) کو شاعری، کہانی، یہاں تک کہ عام گفتگو کا موضوع بھی بنا دیا ہے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ جو سیکس پر گفتگو کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ جدید شاعروں میں کچھ لوگوں کے یہاں غزل میں بھی سیکس کا تذکرہ بڑے جارحانہ انداز میں کیا گیا ہے۔

بتی جلا کے دیکھ لے سب کچھ یہیں پہ ہے
بنیائن میرے نیچے ہے، شلوار اس طرف

(ظفر اقبال)

⁂

تیرگی چھٹ گئی، ہر طرف روشنی بٹ گئی
رات اس نے جو کپڑے اتارے تو دیپک جاگ گئی

(کرشن موہن)

⁂

ہونٹوں کی نرم گرم دوا پی کے دیکھ لے
بجھتے ہوئے بدن میں حرارت بھی آئے گی

(مظہر امام)

ظاہر ہے ان اشعار کو غزل کی نفاست، شائستگی اور تہذیب سے کوئی علاقہ نہیں ہے اور جدید غزل کا المیہ یہی ہے کہ مخالفین ایسے ہی اشعار کے حوالے سے نئی غزل کی تقدیر کا فیصلہ کر دیتے ہیں، جب کہ یہ نئی غزل کا منفی رجحان ہے جسے غزل کے سنجیدہ شاعروں نے پسند نہیں کیا۔ بعض ایک تو ایسے بھی ہیں جنھوں نے ایسے اشعار کہہ کر بھی اس رجحان کی صحت کی وکالت نہیں کی ہے بلکہ غلط ہی کیا ہے۔ لیکن نئی غزل کے مخالف ایسے اشعار کو بنیاد بنا کر جب تمام تر نئی غزل کو معتوب کرتے ہیں تو خود اپنے ساتھ بھی انصاف نہیں کرتے۔ وہ شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ کلاسیکی شعرا کے یہاں بھی بد مذاقی کے نمونے ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں، مثلاً ــ

ہے تیرا گال مال بوسے کا
کیوں نہ کیجئے سوال بوسے کا (انشا)

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا پاؤں میرے داب تو دے

(غالب)

پرس تو نے جو پہنی ہے سنہری انگیا
آج آتی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھ کو (ناسخ)

کھولیے شوق سے بند انگیا کے
لپٹ کر ساتھ نہ شرمائیے آپ (رند)

میر صاحب عجب ساده ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

(میر)

ہم میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو میرؔ، غالبؔ، ناسخؔ اور رندؔ کے ان اشعار کے حوالے سے ساری کلاسیکی غزل کو قابلِ ملامت ٹھہرانے کی جرأت کرے۔ بات یہ ہے کہ شعرا کبھی کبھی اپنی مخصوص ذہنی ترنگ کا اظہار یوں بھی کر جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ہم اسے صرف سطحی، ذہنی ترنگ کا نام نہیں دیں گے ان اشعار کی بنیاد پر میرؔ اور غالبؔ جیسے عظیم ترین شعرا کو فحش نگار کہنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ لہٰذا جدید غزل کے برے اشعار کو سامنے رکھ کر پوری جدید غزل کے خلاف فیصلہ صادر کرنا بھی ایمان اور تنقیدی منصب کے خلاف ہے۔

جدیدیت محض ایک اضافی اصطلاح ہے، اس لیے جدیدیت کی کوئی جامع اور مانع تعریف ممکن نہیں ہے۔ ہر چیز جو آج جدید ہے کل قدیم ہو جائے گی اور ہر وہ چیز جسے آج ہم قدیم کہتے ہیں کبھی اپنے وقت میں جدید تھی اس لیے جدیدیت کی اصطلاح اپنے اندر خود ہی ایک الجھاؤ رکھتی ہے۔ آج کی غزل Modern Sensibility کے اظہار سے معنون ہے اور عصری مزاج پر جب ہم گفتگو کریں گے تو نئی حسیت کے اظہار کو کسی طور پر نظر انداز نہیں کر سکیں گے۔

نئی شاعری کی ابتدا عام طور پر ۱۹۵۵ء کے بعد مانی جاتی ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ ترقی پسند تحریک کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی اور شعرا اپنے آپ کو کچھ زیادہ کشادہ اور نئی فضا میں محسوس کرنے لگے تھے۔ یہاں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ترقی پسند تحریک بھی اپنے عہد کی نہایت ہی جان دار اور جدید تحریک تھی۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ جدیدیت کو نئی ترقی پسندی بھی کہتے ہیں اور ترقی پسند تحریک کی توسیعی شکل بھی۔ لیکن عصری شاعری اور ترقی پسند شاعری کا واضح فرق (Commitment) اور (Non-Commitment) میں موجود ہے، ترقی پسندی ایک تحریک تھی۔ ایک خاص مقصد اور نظریے کی تابع۔ جب کہ جدیدیت یا عصریت کوئی تحریک نہیں مختلف رجحانات، مختلف رویے اور غیر متعین راستے سے عبارت ہے۔ جیسے اس کے مخالف بے سمتی بھی کہتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے دور میں اس کے Parallel ایک اور رجحان بھی موجود تھا جو حلقۂ اربابِ ذوق سے تعلق رکھنے والے شعراء اور ادباء سے منسوب ہے۔ یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ ایک زمانے میں خود حلقۂ اربابِ ذوق کے اہم

متعدد ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ مثلاً ن۔م۔ راشد، میراجی، قیوم نظر وغیرہ لیکن ترقی پسند تحریک جیسے جیسے اشتراکی نظامِ حیات کا علمبردار ہوتی گئی۔ اور مارکسزم اور لینن ازم (Marxism and Leninism) کے فروغ کو اپنا مقصد بناتی گئی Dogomatic ہوتی چلی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جو ذہنی آزادی کو زندگی کی سب سے بڑی دولت سمجھتے ہیں الگ ہوتے گئے اور اس طرح حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں شک نہیں کہ میراجی اور ایک آدھ دوسرے لوگوں کے یہاں ترقی پسند تحریک سے الگ ہونے کے بعد جنسی کج روی کے آثار بھی نمایاں ہوئے لیکن ترقی پسندوں نے میراجی اور ن۔م۔ راشد کے ساتھ جس جارحانہ رویّے کا اظہار کیا وہ بھی ادبی ستم ظریفی اور آمریت کا نہ بھلانے والا واقعہ ہے۔

نئی غزل در اصل تازہ ہواؤں اور کشادہ فضاؤں کی تلاش کا نام ہے۔ اگر ناصر کاظمی، ابن انشاؔ، منیر نیازی وغیرہ نہ بھی سامنے آتے تو بھی غزل ایک نئی فضا تلاش کر لیتی۔ جس کی پہلی تھرتھری فراقؔ اور فیضؔ کی غزلوں میں ملتی ہے۔ فیض کے یہاں کم اور فراقؔ کے یہاں زیادہ۔ فراق غزل میں نئی فضا آفرینی، پیکر تراشی اور نازک Images اور تہہ دار معنویت کا پہلا شاعر ہے۔ نئے شاعروں سے بہت پہلے فراقؔ نے ایسے اشعار کہہ لیے تھے۔

کچھ چونک سی اٹھی ہیں فضا کی اُداسیاں
اس دشتِ بے کسی میں سرِ شام تم کہاں

٭

ہری بھری رگوں میں وہ چہکتا بولتا لہو
وہ سوچتا ہوا بدن، خود ایک جہانِ معنی ہے

نئی غزل پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ نئے شعراء جس مشینی کرب، تنہائی، خوف اور صنعتی عہد کی لعنتوں کا ذکر کرتے ہیں وہ حقیقی نہیں، مغرب سے مستعار ہیں۔ مغرب میں جدید صنعتی عہد اپنی انتہا پر پہنچ چکا ہے دنیا کی تمام مادی آسائشیں مغرب والوں کو حاصل ہیں، لیکن روح کی آسودگی غائب ہو چکی ہے اور آج کا مغرب بجا طور پر یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ اس نے سب کچھ حاصل کر کے جو چیز کھو دی ہے وہ اتنی اہم ہے کہ اس کے بغیر ہر ترقی بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ نئے سائنسی انکشافات نے زمین پر رینگنے والے انسان کو آسمان کی بلندی تک پہنچا دیا ہے وہ سیاروں کو فتح کر رہا ہے اور سمندر کے سینے اس نے کھنگال دئے ہیں اس کے باوجود وہ بے یقینی کا شکار ہو چکا ہے۔ دو عظیم جنگوں نے انسان کا مستقبل سخت خطرے کے قریب کر دیا ہے۔ انسان نے خود اپنے ہاتھوں ایسے ہتھیار بنا لیے ہیں کہ بڑے ملکوں کا کوئی بھی دیوانہ سیاست داں اور صاحبِ اقتدار شخص کسی بھی لمحہ پوری زمین کو آگ و خون کے سمندر میں جھونک سکتا ہے۔ یقیناً جنگیں پہلے بھی ہوا کرتی تھیں اور بڑی تعداد میں لوگ مارے جاتے تھے۔ بستیاں ویران کر دی جاتی تھیں۔ اس کے باوجود تباہی کا دائرہ بہرحال محدود رہتا تھا۔ دُور دراز کے علاقوں میں لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ حکومت کس کے ہاتھ سے کس کے ہاتھ میں چلی گئی۔ مگر بیسویں صدی کے انسان نے یہ دیکھا کہ چھوٹے سے ایٹم بم نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے بے شمار بوڑھوں، عورتوں اور معصوم بچّوں کو بھی آگ کے جہنّم میں جھونک دیا۔ جدید فلسفوں اور سائنسی ترقیوں نے مجبور انسانوں کا آخری سہارا بھی چھین لیا ہے۔ وہ خدا کے سائے سے بھی محروم ہو چکا ہے اور انھیں ترقیِ معکوس نے مغرب کے نوجوانوں میں ردِ عمل کے ایسے جذبات پیدا کر دئے ہیں جس کے نتیجے میں بوہیمین اور ہپّی امریکہ، فرانس اور برطانیہ کے شہروں میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، لیکن مشرق میں خاص طور پر ہندوستان میں ابھی تک کوئی صورتِ حال پیدا نہیں ہوئی ہے۔

اور انہوں نے جدید غزل میں جو بے حسی، بے یقینی، صنعتی عہد سے بیزاری، جنگل کی طرف واپس لوٹ جانے کے رجحانات پائے جاتے ہیں، وہ نہ سچے ہیں اور نہ فطری۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ہے یقیناً مشرق، مغرب کے مقابلے میں بہت پیچھے ہے لیکن ہمارے عہد کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ وقت اور فاصلے کی حدیں ٹوٹ چکی ہیں۔ اس لیے ہمارے یہاں بھی جو صنعتی کرب جدید غزل میں پایا جاتا ہے اس کو مستعار کہنا حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے ؎

صنعتی شہر ہے احباب بنتے رہیے
دل ملے یا نہ ملے، ہاتھ ملاتے رہیے

(ندا فاضلی)

نئی اُردو غزل میں شہر سے گاؤں کی طرف لوٹ جانے کی جو تمنّا ملتی ہے اس کی سچائی اور اثر انگیزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے ؎

جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں شہروں کے فقیر
کیا درختوں سے بھی چھِن جائے گا عالم وجد کا

(وہاب دانش)

٭

اب کے بسنت آئی تو آنکھیں اُجڑ گئیں
سرسوں کے کھیت میں کوئی پتّہ ہرا نہ تھا

(ابھل کرشن اشک)

عشق کائنات کی تخلیق کا سبب ہے اور ازل سے یہ انسان کے اندر موجود ہے۔ رشتے اور تعلقات بدلتے رہتے ہیں اور یہ عمل آج غیر فطری بھی نہیں لگتا۔ جدید عشقیہ غزل اس Modern Sensibility کی عکاسی کرتا ہے ؎

ایک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم، اپنا پیغام لاتی تھی موجِ رواں
آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح، ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

(بشیر بدر)

اب وہاں کیلئے نئے چالیس پیسوں کے سوا
برسوں میں منہ دیکھ لیتا ہوں تیری تصویر کا

(مظفر حنفی)

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

کے۔ کے۔ کھلر*

امیر خسروؒ کی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں اور بول انمل دو سخنے وغیرہ

خسرو کی فارسی شاعری نے اہلِ ایران کو سرنگوں کیا لیکن امیر کی جو شاعری ہندوستان کے عوام و خواص کے دلوں کی دھڑکن ہی وہ ان کی ہندی شاعری ہے۔ ہندی خسرو کی مادری زبان تھی اور انھیں اس پر ناز تھا۔ وہ ہندی کو فارسی پر ہمیشہ ترجیح دیتے تھے فارسی میں اگر ان کی ساٹھ کتابیں ہیں تو ہندی میں انھوں نے چار لاکھ اشعار لکھے۔ حالاں کہ آج ان چار لاکھ میں صرف چار سو اشعار باقی رہ گئے ہیں۔ ان کی پہیلیاں، دوہے کہہ مکرنیاں بول انمول، دو سخنے انھیں چار سو میں شامل ہیں۔ ان چار سو میں "خالق باری" بھی ہے جو خسرو کی سب سے بڑی تصنیف ہے۔ دنیا میں ادبی لحاظ سے شاید ہی کوئی دوسری مثال ملتی ہو جہاں سات سو سال بعد بھی شاعر کا کلام بغیر کسی رد و بدل کے گھر گھر میں اسی انداز میں گایا جاتا ہو، جیسا کہ خسرو کے اپنے زمانے میں

مور کو پہلی بار قومی پرندہ خسرو نے اپنی انھیں پہیلیوں میں کہا تھا۔ سیتا پھل کو شریفہ کا نام بھی خسرو نے اپنے بولوں میں عطا کیا تھا۔ بنگلے کو بھگت کا درجہ بھی خسرو کے امثلوں میں ملا۔ ہندوستان کے پھولوں کے بارے میں خسرو لکھتے ہیں کہ اگر ایسے پھول شام اور روم میں پائے جاتے تو وہاں کے لوگ خوشی اور خوشبو سے پاگل ہو جاتے۔ لوگ پیار سے انھیں طوطیٔ ہند کہتے ہیں۔ ان کے نغمے سن اور پڑھ کے انسان آسمان کی بلندیوں کو چھونے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ وہ بول ہیں جنھیں سن کر انسان پرندوں کی زبان سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ جن کے گیت ایک دلفریب ناچ کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ جہاں موسیقی بے ساختہ بجنے لگتی ہے۔ جہاں رومان تہذیب کے بوجھ سے بالکل آزاد ہو جاتا ہے۔ جہاں جذبات بچوں کی مانند کھیلتے ہیں۔ جہاں کا عشق ایسا سونا ہے جس میں مادرِ وطن کی مٹی ملی ہوئی ہے۔ خسرو کے گیت پڑھنے کے بعد انسان عشق کے صحیح مفہوم سے آگاہ ہو جاتا ہے خسرو نے ایک ایسے ادب کو جنم دیا جہاں پرندوں کی اڑان بنجاروں کی موسیقی اور درویشوں کا رقص ہے۔ یہ ایک ایسا نغمہ تھا جس نے سارے تمدن کو ہلا دیا سسرال میں لڑکی ساون کی رُت میں جھولتی ہوئی گاتی ہوئی ماں کو یاد کرتی ہے

"اماں میرے باوا کو بھیجو ری کہ ساون آیا"

یعنی مجھے آکر لے جائے

بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری کہ ساون آیا

یعنی وہ کیونکر آسکتا ہے۔

اماں میرے بھائی کو بھیجو ری کہ ساون آیا

بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری کہ ساون آیا

یعنی بچہ اکیلا اتنی دور کیونکر آئے۔

اماں میرے ماموں کو بھیجو ری کہ ساون آیا

یعنی اس کے لیے تو وہ دراں عذر نہیں۔

بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری کہ ساون آیا

بھلا وہ میری کب سننے لگا۔

خسرو ہندوستان کی مشترکہ کلچر کی ایک موہنی تصویر ہیں۔ بقول محمد حسین آزاد" وہ ایک ایسی سوئی تھی جو بن بجائے بڑی بجتی تھی۔ بولوں کے ساتھ درجنوں راگ ایجاد کئے جو آج تک ہندوستان کے مرد و زن کی زبان پر ہیں۔ بہار راگ اور بسنت کے میلے نے انھیں کی طبیعت سے رنگ پکڑا۔ بین کو مختصر کر کے ستار بھی انھوں نے ہی نکالا۔

خسرو کہا کرتے تھے کہ ہر زبان کا ایک "نمک" ہوتا ہے جس سے ادبی ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔

---

* ڈائرکٹر (پلاننگ)، شعبۂ تعلیم، شاستری بھون، نئی دہلی

یوجنا، نئی دہلی

کسی تعصب کے ماتحت اس نقل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کی بولیاں جتنی نمکین ہیں اتنی میٹھی بھی ہیں۔ نمک اور شکر کی آمیزش ہی ان بولیوں کی شان ہے۔ جس لطافت کے ساتھ خسرو نے پہیلیاں ادا کی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے نمک نے ہندی کے ذائقہ میں کیا لطف پیدا کیا۔ مکرنی، انمل، دو سخنے خاص ان کی شاعری کا جوہر ہے۔

بنولی کی پہیلی مطالعہ ہو :۔

تر ور سے ایک تریا اُتری اس نے بہت رجھایا
باپ کا اس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا
آدھا نام پتا پر پیارا بوجھ پہیلی موری
امیر خسرو یوں کہیں اپنے نام بنولی

آئینہ کی پہیلی سنئے :۔

فارسی بولی آئینہ
ترکی سوچی پائینہ
ہندی بولوں آرسی آدے
منہ دیکھو جو اسے بتادے

ناخن کی پہیلی ملاحظہ ہو :۔

بیسوں کا سر کاٹ لیا
نہ مارا نہ خون کیا

لال کی پہیلی :۔

اندھا گونگا بہرا بولے گونگا آپ کہائے
دیکھ سفیدی ہوت انگارا گونگے سے بھڑ جائے
بانس کا مندر داں کا باشا باشے کا وہ کھاجا
سنگ ملے تو سر پر رکھیں واہ کورا درا ا
سی سی کرکے نام بتایا تامیں بیٹھا ایک
اُلٹا سیدھا ہر پھر دیکھو وہی ایک کا ایک
بھید پہیلی میں کہی تو سن لے میرے لال
عربی ہندی فارسی تینوں کرو خیال

بھٹے کی پہیلی :۔

ہری تھی من بھری تھی لال موتیاں جڑی تھی
راجہ جی کے باغ میں دوشالہ اوڑھے کھڑی تھی

ساون کے بول تو امیر کے خاص بولوں میں ہیں۔

جو پیا آون کہہ گئے اجہ سو نہ آئے سوامی ہو
آون آون کہہ گئے۔ آئے نہ بارہ ماس

بروا راگ میں اس گیت کی لے بھی خسرو نے رکھی تھی۔ محمد حسین آزاد کہتے ہیں :۔

" واہ کیا زبانیں تھیں جو کچھ ان سے نکل گیا عالم کو بھایا۔ گویا زمانے کے دل پر نقش ہو گیا۔ بنانے والوں نے ہزاروں گیت بنائے۔ اور گانے والوں نے گائے۔ آج ہوئے کل بھول ہو گئے۔ چھ سو برس گذرے۔ یہ آج تک ہیں۔ اور ہر برسات میں ویسا ہی رنگ دیئے جاتے ہیں۔ اس حسن قبول کو خداداد نہ کہئے تو کیا کہئے۔

مکرنیوں کے تو وہ موجد تھے۔

سگری رین موہے سنگ جاگا
بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑتے پھاٹت ہیا
اے سکھی ساجن نہ سکھی دیا

ایک اور شوق فرمائیے :۔

سرب سلونا سب گن نیکا
وا بن سب جگ لاگے پھیکا
واکے سر پر ہووے کون
اے سکھی ساجن نہ سکھی لون

اور وہ جو سب سے مشہور ہے :۔

وہ آوے تب شادی ہووے
اس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگے واکے بول
اے سکھی ساجن نا سکھی ڈھول

اور یہ کہاوت تو آپ نے ضرور سنی ہوگی۔

ایک کنوئیں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھیں۔ امیر خسرو جو اس رستے سے گذر رہے تھے۔ چلتے چلتے انھیں پیاس لگی۔ کنوئیں پر جاکر ایک سے پانی مانگا۔ ان میں سے ایک انھیں پہچانتی تھی۔ اس نے اوروں سے کہا۔ دیکھو یہی خسرو ہے۔ ایک بولی۔ کیا تو وہی خسرو ہے جس کے سب گیت گاتے ہیں اور پہیلیاں، مکرنیاں اور انمل سنتے ہیں۔ خسرو نے کہا، ہاں۔ بولی ہمیں انمل سناؤ۔

خسرو نے چاروں لڑکیوں سے ایک ایک لفظ بولنے کو کہا۔

ایک نے کہا۔ کھیر، دوسری نے کہا چرخہ، تیسری نے کہا ڈھول، چوتھی نے کہا کتا

خسرو بولے۔ مارے پیاس کے دم نکل رہا ہے۔ پہلے پانی تو پلا دو۔

وہ بولیں — جب تک ہمیں انمل نہیں سناؤ گے ہم پانی نہیں پلائیں گی۔

بولے :۔

کھیر پکائی جتن سے
چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا
تو بیٹھی ڈھول بجا ... لا پانی پلا۔

ڈھکوسلا بھی امیر کی ہی ایجاد ہے، اور دو سخنے بھی

گوشت کیوں نہ کھایا۔ ڈوم کیوں نہ گایا۔

گلا نہ تھا۔

جوتا کیوں نہ پہنا۔ سموسہ کیوں نہ کھایا۔

تلا نہ تھا۔

انار کیوں نہ چکھا، وزیر کیوں نہ رکھا۔

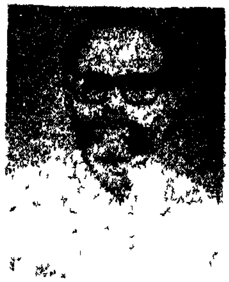
دانا نہ تھا۔

امیر خسرو کے گیتوں کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ ان کو سنگیت میں بہ آسانی اتارا جا سکتا ہے۔ موسیقی میں امیر نائک کہلائے۔ درجنوں راگ راگنیاں ایجاد کیں۔ ہندوستانی اور کرناٹک موسیقی کے فاصلے کم ہو گئے۔

خسرو اپنی سب سے نازک تصنیف "عشقیہ" میں پھول گل کوزہ کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ گل کوزہ وہ پھول ہے کہ آسمان نے جگر کاٹ کر ہندوستان کی خاکِ پاک کو اس کی پیداوار کے لیے چنا ہے

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

غزلیں



علی احمد بگھروی : شفیق میموریل
سینیئر سیکنڈری اسکول، باڑہ ہندو راؤ، دہلی ۶ ۔

سفینۂ غمِ ہستی کو ناخدا نہ ملا
خرد کے زعمِ تجسّس کو آئینا نہ ملا

نظر نواز تبسّم سے آشنا نہ ملا
عجیب دَور ہے کوئی بھی خوش ادا نہ ملا

برہنہ سر ہوئی لیلیٰ تلاشِ مجنوں میں
تمام شہر میں ڈھونڈا کہیں پتا نہ ملا

ہوئی ہے بیعتِ رنداں تو دستِ ساقی پر
بلا سے ساغرِ صہبا ملا، ملا نہ ملا

چلی ہوا تو بکھرتے چلے گئے گیسو
اٹھا جو ابر تو کرنوں کو راستا نہ ملا

شگفتِ لالہ و گل کیا، کلی کی شوخی کیا
کسی کے ذوقِ تبسّم کو اک بہانا ملا

نہ "آہ" سے کوئی نسبت نہ "واہ" کا محرم
دلِ غریب تجھے کوئی مشغلا نہ ملا

امینِ دردِ بشر ہے تو چشمِ نم اپنی
غلط ہے بزم کو اک درد آشنا نہ ملا

تمہارے شہر میں قحط الرّجال ہے احمدؔ
خدا شناس تو دیکھے خود آشنا نہ ملا



عزیز بگھروی : ۲۵۰۳، بارہ دری،
شیر افگن، بلیماران، دہلی ۱۱۰۰۰۶ ۔

بات اپنی کرے یا پرائی کرے
آدمی سوچ کر لب کشائی کرے

مُنہ پہ تعریف پیچھے بُرائی کرے
ہمنوا بھی لگائی بجھائی کرے

حق سے اُلفت بھی ہے آدمی کو بہت
بات حق کی کہو تو لڑائی کرے

بند آنکھیں نہ کھولے زمانہ اگر
خضر بھی اُس کی کیا رہنمائی کرے

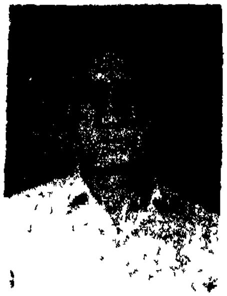
نیک و بد میں نہیں فرق باقی کوئی
وہ بھی مخلص ہے جو بیوفائی کرے

اوج پر ہے ستارہ ترا ان دنوں
ہر مخالف تری ہمنوائی کرے

مل کے رہنے کا ہم فیصلہ تو کریں
کس میں ہمت ہے ہم میں جدائی کرے

سرفرازی سے محروم اک حکمراں
اک فقیری میں فرمانروائی کرے

دل ہے کیسا نرالا ہمارا عزیزؔ
چوٹ کھائے تو نغمہ سرائی کرے



حسرت رسالپوری : کے جی ۱/۴۹،
وکاس پوری، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۸

ب کہاں جاؤ گے رہ جاؤ یہیں رات کی رات
بھیگی بھیگی ہے فضا اور یہ برسات کی رات

جام و مینا کو ذرا وَجد میں آجانے دو
خود لپک جائے گی رندانِ خرابات کی رات

یہ حسیں چاند یہ تاروں کا سہانا جُھرمٹ
تری آمد سے بنی آج طلسمات کی رات

پی کے زاہد نے کئے سینکڑوں سجدے شب بھر
ہم نے میخانہ میں دیکھی ہے مُناجات کی رات

چاند اک چرخ پہ اک میرے تصوّر میں مکیں
کتنی پُر لطف سہانی ہے یہ جذبات کی رات

ہاں کبھی آپ نے پیمانِ وفا باندھے تھے
عمر بھر یاد رہے گی وہ ملاقات کی رات

ساقیا رقص میں پھر جامِ شراب آنے دے
خود ہی ہو جائے گی یہ رات کرامات کی رات

ہم نے رو دھو کے گزاری ہے بمشکل حسرتؔ
راس آئی نہ ہمیں صورتِ حالات کی رات

نغمۂ کامرانی



قمر عثمانی : محلہ ابوالبرکات۔ نزد سعید مسجد، دیوبند۔

آزادی کے خواب کی اپنی پائی ہے تعبیر نئی
اپنے وطن کی نکھری نکھری ابھری ہے تصویر نئی

غم کے اندھیرے جانے لگے ہیں اپنے وطن کی سرحد سے
صبح مسرت رفتہ رفتہ لائے گی تنویر نئی

محرومی کا دور ہمیں اب اور نہ ڈسنے پائے گا
عزم جواں ہے اپنے وطن کی ہوگی اب تعمیر نئی

محنت ہمت ساتھ ہمارے آگے بڑھتے آئے ہیں
خوشحالی کا مژدہ لیکر جاگی ہے تقدیر نئی

دور نیا ہے بات نئی ہے طور نئے انداز نئے
جہد مسلسل کرنے والے پائیں گے توقیر نئی

محنت جاگی سونا بکھرا کھیتوں میں کھلیانوں میں
اور بہت آگے جانا ہے کرنی ہے تدبیر نئی

محنت کا ہتھیار ہمیں اب لینا ہے مضبوطی سے
غربت سے لڑ جانا ہے تو لینی ہے شمشیر نئی

امیدوں کی جوت جگائے سعی مسلسل کرنی ہے
سارے دکھوں کے سارے غموں کے حق میں ہے اکسیر نئی

جینا اس انداز سے جینا دنیا بھی تسلیم کرے
جینے کے انداز کی ہم کو کرنی ہے تفسیر نئی

راہ ترقی ساتھ لیے آگے بڑھتے جائیں گے
پختہ عزم کیا ہے ہم نے پاؤں نہ رکنے پائیں گے

خون پسینہ ایک کریں گے کام کے ہر اک میداں میں
آپہونچے ہیں جس منزل تک اور بھی آگے جائیں گے

کوئی نہ بھوکا رہنے پائے کوئی نہ خالی ہاتھ رہے
سب کا حق ہے روٹی روزی یہ احساس دلائیں گے

ظلمت پاس نہ آنے پائے اندھیاروں کا دم ٹوٹے
روشنی جس کی دور تلک ہو ایسی شمع جلائیں گے

صنعت خانوں سے ابھرے گا چاند وطن کی رفعت کا
جب بھی ذرے چاند بنیں گے تابانی پھیلائیں گے

منصوبوں کے ساتھ وطن کی شان ابھرتی جائے گی
محنت سے جو کام کریں گے شان وطن کہلائیں گے

اپنے عمل سے اپنی جنت آپ بنانی ہے ہم کو
اپنا جذبہ اپنی محبت دنیا کو دکھلائیں گے

کمزوری کی بات نہ ہوگی محرومی کا شکوہ کیا
جن راہوں پر چل نکلے ہیں پاؤں نہ رکنے پائیں گے

سنورے گا مستقبل اپنا اس کی ہے امید ہمیں
آئے گی وہ صبح یقیناً جس کی ہے امید ہمیں

جواہر لال نہرو

نثار اختر انصاری : ایڈیٹر اردو ہمہ گیر،
چوک، ناگپور، ۴۴۰۰۱۸

دیش جس کا مرہونِ منت ہے
جس نے امن کے باغ کو سینچا
فرقہ پرستی کی جڑیں کھودیں۔
جس نے عالمی اتحاد کا نعرہ دیا
جس نے غریبوں کو سہارا دیا
پیامبر امن وہ جواہر لال
ہمیشہ دیش کے لیے محوِ خیال
ترقی کے یہ جال بچھائے کس نے
جدید ساز و ساماں لائے کس نے
وہ سائنس کا محسن
وہ ٹیکنالوجی کا مونس
گلاب کی طرح۔
ہر دم تر و تازہ
جواہر لال نہرو
ایک بار پھر آجا

غزل



شہاب الدین ثاقب : شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کسی بھی طاق میں کوئی دیا نہیں ہوگا
سکون پھر بھی تجھے اے ہوا نہیں ہوگا

تمام آنکھیں یہاں خواب ہی کی عادی ہیں
ہمارے شہر میں اب رتجگا نہیں ہوگا

میں تیرے گھر کی طرف سوچ کر یہ نکلا تھا
یہاں پہ اور کوئی دوسرا نہیں ہوگا

ملا تھا مجھ سے وہ جب تو یہی خیال آیا
کہ اب وہ مجھ سے کبھی بھی جدا نہیں ہوگا

یہ برف ہم کو بھی اپنی طرح جما دے گی
رگوں میں خون کا پھر دوڑنا نہیں ہوگا

محمد طارق



گمراہ مسافر

میرے اطراف اَن گنت راستے بکھرے پڑے ہیں۔ اُن راستوں پر انسانوں کا بے ہنگم شور شرابا نجانے کب سے مچا ہوا ہے۔ . .

میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ انسانوں کے اس شور شرابے نے میری سُکھ چین کی ردا کو جسے میں سر سے پیر تک اوڑھے میٹھی نیند سو جایا کرتا تھا، تار تار کر دیا ہے۔ میری زندگی کے سکون و اطمینان پر ڈاکہ زنی کی ہے۔ اسی لیے میں اُن راستوں کے درمیان تنہا کھڑا رہ گیا ہوں۔ . .

میں مضطرب، متحیرانہ نگاہوں سے راستوں کو گھور رہا ہوں جس پر اَن گنت راہ گیر بھیڑوں کی طرح سر جھکائے چلے جا رہے ہیں۔ بھیڑیں جو یہ نہیں سوچتیں کہ انھیں کہاں لے جایا جا رہا ہے، چراگاہ میں یا مذبحہ خانے میں بس سر لٹکائے "میں میں" کرتی چلی جاتی ہیں۔ ریوڑ ہانکنے والے کے اشاروں پر۔ . .

میں اپنے مضطرب وجود کو سنبھالے نہ چاہتے ہوئے بھی سوچتا ہوں، یہ راہ گیر بھیڑوں کی طرح کیوں چل رہے ہیں۔ گردنیں لٹکائے۔ آگے دیکھتے ہیں نہ پیچھے . . . دائیں طرف نہ بائیں طرف . . بس راستوں کی گرد و غبار میں آنے قدم بڑھائے جا رہے ہیں . . . وہ کہاں جا رہے ہیں۔ کیوں جا رہے ہیں ؟؟ جیسے اُن کے سامنے کوئی سوال نہیں۔ بس راستوں کی دشواریوں، صعوبتوں سے بے پروا سر بیکار چلے جا رہے ہیں . . . اُفتاں و خیزاں . . .

بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ کاش ۔۔۔! میری باہیں اتنی بڑی ہوتیں کہ تمام انسانوں کو اپنی باہوں میں سمیٹ کر پوچھتا "کہاں جا رہے ہو، تمھارے سفر کا انت کہاں ہے، تمھاری منزل کس سمت میں ہے، کہاں ہے ؟؟ کیا تم ان مختلف راستوں سے منزل تک پہونچ جاؤ گے !؟" سوال میرے ذہن میں ایک نہ حل شدہ پہیلی بن گیا ہے۔ میں کیسے سُلجھاؤں اس پہیلی کو ۔۔ کیسے۔ کس طرح ؟!

۔ میں کس سے دریافت کروں . . . مجھے تو سارے چہرے اجنبی دکھائی دے رہے ہیں، میری جیسی ناک، آنکھوں والے، میرے جیسے لبوں اور کانوں والے، میرے جیسے انسانوں کے سارے چہروں پر یہ کیسی اجنبیت کی پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ کس قدر فکر انگیز اجنبیت ۔۔!

جی چاہ رہا ہے کہ میں ان کے چہرے سے اجنبیت کی صدیوں پُرانی پپڑیاں کھرچ ڈالوں اور سب کو ایک دوسرے کا شناسا بنا دوں، مگر کیسے ؟ کس طرح ؟؟ کوئی ایک لمحہ کے لیے بھی میری طرف دیکھ نہیں رہا ہے۔ سارے کے سارے اپنے اپنے راستوں میں اُلجھے ہوئے دوڑے چلے جا رہے ہیں . . .

۔۔ میں بھی اُن کے پیچھے دوڑ جاؤں جس طرح بھیڑ بھیڑ کے پیچھے دوڑتی ہے، کُتے کے پیچھے کُتا بھاگتا ہے۔ یا میں اُن کے پیچھے پیچھے ایسا چلوں جس طرح کُتا اپنے مالک کے پیچھے دُم ہلاتا ہوا خموشش چلتا ہے۔ .

میں خود سے پوچھتا ہوں ۔۔

میرا خود ! میرا ازل تا ابد تک کا ساتھی مجھے مشورہ دیتا ہے۔

"تم بھیڑوں اور کُتوں کی طرح دوڑو، نہ دُم ہلاتے ہوئے چلو" تاوقتیکہ وہ سوال جو ذہن میں نہ حل شدہ بنا ہوا ہے حل ہو جائے۔

کون میرا پیچیدہ سوال حل کرے گا ۔۔ کون ؟ ؟!۔

---

۵ کھولاپور، ضلع امراؤتی ، ۴۴۴۸۰۲

[illegible] دیکھتا ہوں [illegible] چہرے [illegible] ہیں۔ جستجو کرتے کرتے میری نظریں ایک ایسے شخص پر رُک جاتی ہیں جو تمام انسانوں میں جداگانہ تھا۔ اُس کا چہرہ نورانی، حلیہ: پاکیزگی و طہارت کا شاہد تھا۔

میں اُس کے قریب جاکر اُس سے پوچھتا ہوں" مجھے اپنی منزل پر پہونچنا ہے۔ میں کس راستے پر چلوں!"۔

"کسی بھی ایک راستہ کا انتخاب کرکے اُس پر چلنا شروع کردو تمھیں اپنی منزل مل جائیگی کیونکہ سارے راستے ایک ہی منزل کو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ تم راستے پر ٹھیک ڈھنگ سے چلو اُس کے قواعد و ضوابط پر عمل کرتے ہوئے۔۔۔

اِس شخص کی بات پر مَیں نے عمل کیا۔ ایک راستہ کا تعین کرکے اس پر چل پڑا۔۔۔

کچھ دُور چلنے کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ مَیں جس راستے کو منزل کا راستہ سمجھ کر چل رہا تھا وہ بہت سارے راستوں میں تقسیم ہوگیا ہے۔۔۔

مَیں حیران ہوکر کھڑا ہوجاتا ہوں، سوچتا ہوں۔ یہ کیسی سازش ہے، راستوں کی ۔ !کس نے اس راستے کی سالمیت کو بہت سارے راستوں میں تقسیم کرکے ختم کردیا ہے۔ ۔ اب میں کس راستے پر چلوں۔۔۔ منزل کا دُور دُور تک پتا نہیں ہے۔ حدِ نظر تک انسانوں کی بوئی ہوئی کانٹے دار فصلوں کا گھنا پُر آشوب جنگل اپنے اندر دُنیا بھر کی تاریکی سمیٹے آباد ہے۔۔۔

جنگل کی آغوش میں ان گنت راستے گُم ہوگئے ہیں ۔ اُن راستوں پر انسانوں کے تقسیم شُدہ قافلے پالتو جانوروں کے ریوڑ کی طرح چلے جارہے ہیں ـــ تاریک جنگل میں بھٹکنے کے لیے۔ ۔

راہ گیر اندھے تو نہیں ہوگئے۔ کیا اُن کی عقل پر پتھر تو نہیں پڑگئے۔۔۔

اسی اثنا میں ایک شخص میرے پاس آتا ہے۔ اُس کا حلیہ ہو بہو اُس متبرک شخص کی طرح تھا جس نے مجھے منزل کے راستے کے بارے میں بتایا تھا وہ پُرخلوص انداز میں مجھ سے پوچھتا ہے"ایسے کیوں کھڑے ہو ـــ ؟"۔

"منزل کی تلاش میں بھٹک گیا ہوں"۔

"آؤ! میں تمھیں راستہ بتاتا ہوں، جو تمھیں منزل تک پہونچا دے گا۔ مَیں تمھارا رہبر بن جاتا ہوں، آؤ ـــ میرے پیچھے !!"۔

اُسی وقت ایک اور شخص نجانے کہاں سے میرے قریب آجاتا ہے اور کہتا ہے" نہیں یہ تمھیں صحیح راستہ نہیں بتائے گا۔ اس کے جھانسے میں مت آنا ـــ، مَیں بتاتا ہوں تمھیں منزل کا راستہ، مجھے تم اپنا رہبر بنالو"!

"نہیں ـــ، یہ تمھارا رہبر نہیں بن سکتا!" پہلا شخص دوسرے شخص کی طرف دیکھ کر کُتّے کی طرح غرّاتا ہے اور مجھ سے کہتا ہے" میں تمھارا رہبر ہوں، آؤ میرے پیچھے۔۔۔ یہ رہزن ہے"۔

"نہیں ـــ میں رہزن نہیں ہوں، رہزن تو ہے، بھولے بھالے مسافروں کو غلط راستہ بتا کر انھیں لُوٹنے والا لٹیرا۔۔۔" دوسرا شخص جواباً پہلے شخص کی طرف خونخوار نگاہوں سے دیکھ کر دہاڑتا ہے، پھر مجھ سے مخاطب ہوتا ہے، میرے پیچھے چلو۔۔ ۔ آؤ۔۔ چلے آؤ !"۔

"نہیں ـــ، میرے پیچھے !"

"نہیں ـــ، میرے پیچھے ۔

دونوں میری بانہیں پکڑ کر مجھے اپنی اپنی طرف کھینچنے لگتے ہیں۔ میں اُن کے درمیان صلیب کی طرح لٹک جاتا ہوں۔

اُن کی کشمکش سے میرے کانوں کے پردے لرزنے لگتے ہیں۔ میرے سارے بدن میں عجیب قسم کا درد انگیز تشنج پیدا ہوجاتا ہے۔

اُن کی گرفت میری بانہوں پر اور مضبوط ہوجاتی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے بازو کندھوں سے اب اُکھڑ ہی جائینگے۔

میں درد کی شدّت سے سراپا تڑپ جاتا ہوں۔۔۔

"چھوڑ دو مجھے ـــ، خدا کے لیے چھوڑ دو۔ ۔۔۔ تم دونوں رہبر نہیں ہو۔۔ رہزن ہو۔ راستوں کے متفنی۔۔۔ اپنے مفاد کی خاطر تم نے بھی ایک راستے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔۔ ۔۔۔ تم راستوں کے فسادی ہو۔۔۔ چھوڑ دو مجھے ـــ چھوڑ دو ـــ !!"

میں اپنے بدن کی ساری قوّت یکجا کرکے اُن سے اپنے بازو کسی طرح چھڑا لیتا ہوں۔ ۔۔ اور نامعلوم سمت بے تحاشا دوڑ پڑتا ہوں۔ ـــ کچھ دُور دوڑنے کے بعد مجھے احساس ہوتا ہے جیسے میرے بازو نہیں ہیں۔

میں گھبرا کر اپنے بازوؤں کو دیکھتا ہوں۔ ۔۔۔ یہ کیا ؟۔

میرے بازو مُردہ سانپوں کی طرح میری دونوں طرف لٹکے ہوئے ہیں۔۔۔ میں اب کسی کو سہارا دینے کے لائق بھی نہ رہا۔۔۔۔ کتنا بڑا المیہ ہے یہ میرے وجود کا ۔ـــ میں خود کا ماتم کروں یا اُن لوگوں سے شدید نفرت جنھوں نے مجھ سے میرے بازوؤں کی قوّت چھین لی۔۔"

میں دوڑتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کیوں کہ میرے پیر اب ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں رُک رہے ہیں۔ نجانے کیوں ـــ؟! خود کار مشین کی طرح مجھے لے جارہے ہیں نجانے کس سمت میں۔۔"!

مَیں اپنے آپ کو روکنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے اندر کہیں بریک فیل ہوچکے ہیں۔۔۔!

تبصرے

نام کتاب : داغ کے اہم تلامذہ
مصنف : اسعد بدایونی
قیمت : ۲۰ روپے، ضخامت ۱۵۵ صفحات
رابطہ : مکتبہ جامعہ دلی، علیگڑھ اور بمبئی

نواب مرزا داغ کا اُردو شاعری میں خاص مقام ہے۔ ان کی زندہ دلی، درخوش مذاق، ان کی معاملہ بندی زبان کے لب و لہجے کے ساتھ مزا دے جاتی ہے۔ جو داغ کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسی سبب داغ نے اپنی زندگی میں خاصی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ داغ کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ موصوف کی شاعری کا مزاج رندانہ ہے۔ نشاطیہ کیفیت ان کی شاعری کی خوبی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب اُردو کے معزز و معتبر شاعر اسعد بدایونی کی نثری کتاب ہے۔ موصوف مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے شعبۂ اُردو کے ریسرچ اسکالر ہیں اور ڈاکٹر نورالحسن نقوی صاحب کی نگرانی میں تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ "داغ کے اہم تلامذہ" تحقیقی سلسلے کی پہلی کڑی ہے جو موصوف کا ایم فل کا مقالہ ہے۔ یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اُتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

داغ کے شاگردوں کی اصل تعداد کا پتہ لگانا بڑا مشکل ہے۔ سید محمد علی نے اپنی کتاب "مطالعہ داغ" میں داغ کے شاگردوں کی تعداد ۱۴۰ بتائی ہے۔ اسعد بدایونی نے رسائل و کتب کی مدد سے تحقیق و جستجو کے بعد داغ کے شاگردوں کی تعداد میں ۹، ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ اس طرح سے مصنف نے اس کتاب میں تلامذۂ داغ کی ایک فہرست شامل کی ہے جو ۲۱۹ ناموں پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا باب اُردو شاعری میں تلمذ کی روایت ہے۔ اس باب میں اصلاحِ سخن کی روایت پر زور دیا گیا ہے۔ اس زمانے میں اصلاحِ شعر کے دو طریقے رائج تھے۔ جن کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

دوسرے باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ داغ کا طریقۂ اصلاح ہے اور دوسرا حصہ داغ کی اصلاحیں ہیں پہلے حصے میں مصنف نے داغ کا اپنے شاگردوں کو اصلاح دینے کا طریقہ واضح کیا ہے اور دوسرے حصے میں داغ کے اصلاح کردہ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کئے ہیں۔

تیسرے باب میں داغ کے ۱۱ اہم شاگردوں کا مفصل تعارف کرایا ہے جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں :۔

بیخود بدایونی، بیخود دہلوی، حسن بریلوی، میر محبوب علی خاں آصف، سراج الدین احمد خاں سائل، حیات بخش رسا، احسن مارہروی، علامہ اقبال، نوح ناروی، سیماب اکبرآبادی اور جوش ملسیانی۔

چوتھا باب "داغ کے تلامذہ کی فہرست" ہے۔ جسے مصنف نے اضافے کے ساتھ بیان کی ہے۔

۱۵۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب بتصویر شائع کی گئی ہے۔ مجھے امید ہے یہ کتاب ادبی حلقے میں بہت پسند کی جائے گی اور اردو ادب میں بیش بہا سرمایہ ثابت ہوگی۔

عمران عظیم •

نام کتاب : دھوپ چھاؤں
مرتب : دھرم پال عاقل
قیمت : ۱۶ روپے
ناشر : ڈائرکٹر، بھاشا سنسکرتی وبھاگ، ہماچل پردیش، شملہ

دھوپ چھاؤں، بھاشا سنسکرتی وبھاگ، ہماچل پردیش، شملہ کا دوسرا شعری مجموعہ ہے ہماچل پردیش کی اُردو دوستی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ ہر سال ایک کل ہند مشاعرہ منعقد کرتا ہے اور پھر اس کے معیاری اشعار کو کتابی شکل میں شائع کرتا ہے چنانچہ یہ کتاب اس روایات کو زندہ رکھتے ہوئے شائع کی گئی ہے۔

دھوپ چھاؤں میں ۴۰ شاعروں اور شاعرات کا کلام موجود ہے۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ اس میں کہنہ مشق شاعروں کے ساتھ ہی نئی نسل کے نمائندہ شاعر بھی شامل ہیں۔

اس شعری مجموعہ میں کچھ نظمیں ایسی ہیں جو قاری کے ذہن کو بہت زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ خاص طور پر ضیا صدیقی کی نظمیں "بچے نہیں جانتے" اور "کرفیو ہٹنے کے انتظار میں" اور طلعت عرفانی کی ایک نظم "ایگزاسٹ فین" شاعرات کا کلام بھی اس کتاب کی زینت ہے۔ شاعرات میں نرجس زیدی اور مسعودہ حیات نے اچھے اشعار کہے ہیں۔

مشاعرہ کے اسٹیج پر وہی شاعر کامیاب ہوتا ہے جو سامعین کے مزاج کو سمجھ کر شعر سنائے اور دادِ تحسین وصول کرے۔ اس شعری مجموعہ کے مطالعہ سے اس دعویٰ کی تصدیق ہو جاتی ہے جس کے بارے میں ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ اچھی شاعری کرتے ہیں اور اُردو کے ادبی رسائل ان کی غزلوں کو اپنے رسالے میں فخر سے شائع کرتے ہیں۔ انھوں نے بھی اس مشاعرے میں صرف روایتی انداز کے اشعار سنانے پر اکتفا کی۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عاقل صاحب نے اس شعری مجموعہ کی ترتیب میں بہت محنت کی ہے اور اپنے پچھلے شعری مجموعہ "آبشار" کے شایان شان نکالا ہے۔

سرورق دیدہ زیب ہے، کتابت اور طباعت بھی عمدہ ہے۔ عمدہ کاغذ استعمال کیا گیا ہے، اور یہ شعری مجموعہ بھی قابلِ مطالعہ ہے کیوں کہ یہاں ایک جگہ پر بہت سے نمائندہ شاعروں کو یکجا کیا گیا ہے۔ قارئین کو بہت سے شعرا کو بیک وقت سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ نمونے کے طور پر چند اشعار قارئین کی نذر ہیں :۔

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

شاہین پروین جالوی

کرکٹ کی دُنیا کی عہد آفریں شخصیت

سُنیل گواسکر

لارڈس (انگلینڈ) کو "کرکٹ کی جنت" کہا جاتا ہے۔ یہاں سنیل گواسکر نے کبھی سنچری نہیں بنائی تھی۔ ۲۰ اگست سے ۲۵ اگست ۱۹۸۷ء تک ایم۔سی۔سی اور ریسٹ آف دی ورلڈ کے بیچ کھیلے گئے میچ میں گواسکر نے ۱۸۸ رن بنائے اور ان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ ویسے یہ سنچری ٹسٹ میچ کے زمرے میں نہیں آتی۔ گواسکر اس میچ کو اپنی کرکٹ زندگی کا آخری پانچ روزہ میچ قرار دے چکے ہیں۔ اس میچ کے بعد وہ ٹسٹ کرکٹ میچوں سے ریٹائر ہونے کا اعلان کر چکے ہیں۔

اس میچ کی دوسری اننگ میں گواسکر صفر پر آؤٹ ہوئے۔ اس طرح انھوں نے عالمی ریکارڈ میں ایک اور اضافہ کیا۔ اس سے قبل سرڈان بریڈ مین نے جب اپنی کرکٹ زندگی کی آخری اننگ کھیلی تو اس میں بریڈ مین بھی صفر پر آؤٹ ہوئے تھے۔

سنیل گواسکر نے پہلی بار ہندوستانی کپتان اجیت واڈیکر کی ٹیم میں شامل ہو کر اپنے کرکٹ ٹیسٹ میچوں کی شروعات کی، سب سے پہلے وہ ۱۹۷۱ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف پہلا ٹیسٹ میچ کھیلا۔ واڈیکر نے اپنی کتاب "مائی کرکٹنگ ایرس (My Cricketing Years)" میں لکھا ہے کہ "ویسٹ انڈیز میں سنیل گواسکر نے بہترین بلے بازی کی۔ گواسکر نے ویسٹ انڈیز میں جس طرح ریکارڈ قائم کئے وہ ہم لوگوں کی توقعات سے کہیں زیادہ تھے"! سنیل گواسکر نے اپنے دوسرے ٹیسٹ میچ میں ویسٹ انڈیز کے خلاف جارج ٹاؤن میں ۱۱۶ رن بنا کر اپنی سنچری بنانے کا کھاتہ کھولا۔ اسی سیریز کے دوران پورٹ آف اسپین میں سنیل گواسکر نے اپنی پہلی دوہری سنچری ۲۲۰ رن کی بنائی۔ گواسکر نے ویسٹ انڈیز کے خلاف چار ٹیسٹ میچ کھیل کر ۷۷۴ رن بنا کر ایک ریکارڈ قائم کیا۔

سنیل گواسکر نے بریڈ مین کے بہت سے ریکارڈ توڑ دئے اور کرکٹ میچوں میں روز بروز عالمی ریکارڈ کا اضافہ کرتے رہے۔ ویسٹ انڈیز کے شہرہ آفاق تیز گیند باز "ویزلی ہال" نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر سنیل گواسکر ہندوستان کے بجائے کسی دوسرے ملک میں پیدا ہوتے تو وہ تیس سنچریاں اکیلے ہی ہندوستان کے خلاف بنا ڈالتے۔ انگلستان کے افتتاحی بلے باز سرلین ہٹن نے سنیل گواسکر کی ۱۹۷۹ء میں اوول ٹیسٹ میچ میں ۲۲۱ رن کی اننگس کو دیکھ کر "دی آبزرور" میں لکھا تھا کہ "میں نے ٹیسٹ میچوں میں کئی دوہری سنچریاں دیکھی ہیں لیکن گواسکر کی اس دوہری سنچری کو بہترین مانتا ہوں۔"

ٹیسٹ میچوں سے گواسکر کے ریٹائر ہونے سے ہندوستان کی بیٹنگ میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے، دیکھنا ہے آنے والے وقت میں گواسکر کی جگہ کون لے پاتا ہے۔ گواسکر نے ٹیسٹ میچوں میں کل ۱۰۱۲۲ رن بنائے۔ جس کا اوسط ۵۱٫۱۲ ہے۔

اس سال اکتوبر، نومبر میں ہونے والے ریلائنس کپ میں سنیل گواسکر اپنی بیٹنگ کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ سنیل گواسکر کے عالمی ریکارڈ کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ دنیا کے پہلے بلے باز جنھوں نے ۱۰۱۲۲ رن بنائے۔

۲۔ ۱۲۵ ٹیسٹ میچ کھیلے۔

۳۔ ۲۱۴ اننگس کھیلیں۔

۴۔ لگاتار ۱۰۶ ٹیسٹ میچ کھیلے۔ اس سے قبل یہ ریکارڈ ہندوستان کے جی آر وشوناتھ کے ۸۷

٭ قاضی محلہ، جالہ، دربھنگہ (بہار)

یوجنا، نئی دہلی

جیسوں کا تھا۔

۵۔ ۳۴ سنچریاں بنائیں۔

۶۔ ۴۵ نصف سنچریاں بنائیں۔

۷۔ ۳ ٹیسٹ میچوں کی دونوں اننگس میں سنچری بنائی۔

۱۲۴/۲۴۰، پورٹ آف اسپین ۱۹۷۰-۷۱، ۱۱۱/۱۳۷ کراچی ۱۹۷۸-۷۹، اور ۱۰۷/۱۸۲ ناٹ آؤٹ ۱۹۷۸-۷۹ بہ مقابلہ ویسٹ انڈیز۔

۸۔ پہلے کھلاڑی جنھوں نے ایک سال میں چار بار ۱۰۰۰ رن سے زیادہ بنائے۔

سال	رن	ٹیسٹ
۱۹۷۶	۱۰۲۴	۱۱
۱۹۷۸	۱۰۴۴	۹
۱۹۷۹	۱۵۵۵	۱۸
۱۹۸۳	۱۳۱۰	۱۸

۹۔ دنیا کے پہلے کھلاڑی ہیں جنھوں نے اپنے پہلے ٹیسٹ سیریز (۴ ٹیسٹ میچوں) میں ۷۷۴ رن بنائے۔ یہ رن انھوں نے ۱۹۷۱ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف بنائے، گواسکر سے قبل کسی بھی بلے باز نے اپنی پہلی ٹیسٹ سیریز میں اتنے رن نہیں بنائے تھے۔ ویسٹ انڈیز کے جارج ہیڈلی نے ۱۹۲۸-۲۹ء میں انگلینڈ کے خلاف ۷۰۳ رن بنائے تھے۔

انگلینڈ کے سرلن ہٹن (Sir Len Hutton) بھی سنیل گواسکر کی طرح افتتاحی بلے باز تھے، انھوں نے ۱۹۵۳-۵۴ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف ۶۷۷ رن بنائے تھے۔

۱۰۔ وہ واحد کھلاڑی ہیں جنھوں نے غیر ملکوں میں ۵۵۰۵ رن ۷۰ ٹیسٹ میچوں میں ۱۸ سنچری کے ساتھ بنائے۔

۱۱۔ وہ واحد کپتان ہیں جو ۹ بار ٹاس (Toss) ہارے۔

۱۲۔ میچ کی پہلی بال پر ۳ بار آؤٹ ہوئے یہ بھی ایک ریکارڈ ہے۔

کیچ کرگئے	بولڈ	رن	مقام	سال
ناٹ	آرلاٹ	.	برمنگھم	۱۹۷۴
ڈوجوں	مارشل	.	کلکتہ	۱۹۸۳
میاں داد	عمران خان	.	جے پور	۱۹۸۷



سنیل گواسکر

رن	سیریز	بمقابلہ	مقام
۹۷	۱۹۷۸-۷۹	پاکستان	لاہور
۹۰	۱۹۸۳-۸۴	ویسٹ انڈیز	احمد آباد
۹۰	۱۹۸۶-۸۷	آسٹریلیا	مدراس
۹۱	۱۹۸۶-۸۷	پاکستان	״
۹۶	۱۹۸۶-۸۷	پاکستان	بنگلور

کامیابیاں

رنز	ٹیسٹ	اننگس	رنز پورا کرنے کی تاریخ	بمقابلہ	مقام	سیریز
۱۰۰۰	۱۱	۲۱	۱۹۷۳-۱-۲۵	انگلینڈ	کانپور	۱۹۷۲-۷۳
۲۰۰۰	۲۳	۴۴	۱۹۷۶-۴-۱۱	ویسٹ انڈیز	پورٹ آف اسپین	۱۹۷۵-۷۶
۳۰۰۰	۳۴	۶۶	۱۹۷۷-۱۲-۲۰	آسٹریلیا	پرتھ	۱۹۷۷-۷۸
۴۰۰۰	۴۳	۸۱	۱۹۷۸-۱۲-۲۹	ویسٹ انڈیز	کلکتہ	۱۹۷۸-۷۹
۵۰۰۰	۵۲	۹۵	۱۹۷۹-۹-۲۰	آسٹریلیا	بنگلور	۱۹۷۹-۸۰
۶۰۰۰	۶۵	۱۱۷	۱۹۸۱-۱-۲۴	آسٹریلیا	ایڈیلیڈ	۱۹۸۰-۸۱
۷۰۰۰	۸۰	۱۴۰	۱۹۸۲-۱۲-۱۴	پاکستان	لاہور	۱۹۸۲-۸۳
۸۰۰۰	۹۵	۱۶۶	۱۹۸۳-۱۰-۲۹	ویسٹ انڈیز	دہلی	۱۹۸۳-۸۴
۹۰۰۰	۱۱۰	۱۹۲	۱۹۸۵-۱۲-۱۷	آسٹریلیا	ایڈیلیڈ	۱۹۸۵-۸۶
۱۰۰۰۰	۱۲۴	۲۱۲	۱۹۸۷-۳-۷	پاکستان	احمد آباد	۱۹۸۶-۸۷

مختلف ملکوں کے خلاف بنائے گئے رنز

بمقابلہ	ٹیسٹ	اننگس	ناٹ آؤٹ	رنز	سب سے زیادہ رنز	سنچریاں	نصف سنچریاں
آسٹریلیا	۲۰	۳۱	۱	۱۵۵۰	۱۷۲	۸	۴
انگلینڈ	۳۸	۶۷	۲	۲۴۸۳	۲۲۱	۴	۱۶
نیوزی لینڈ	۹	۱۶	۱	۶۵۱	۱۱۹	۲	۳
پاکستان	۲۳	۳۹	۴	۱۹۷۳	۱۶۶	۵	۱۱
سری لنکا	۷	۱۱	۲	۶	۱۷۶	۲	۳
ویسٹ انڈیز	۲۷	۴۸	۶	۲۷۴۹	۲۳۶	۱۳	۷
کل میزان	۱۲۴	۲۱۲	۱۶	۱۰۰۰۵	۲۳۶	۳۴	۴۴

سُنیل گواسکر ٹیسٹ میچوں میں کِس طرح آؤٹ ہوئے

کِس طرح آؤٹ ہوئے	تعداد
کیچ	۱۴۱
گیند پھینک کر آؤٹ کرنا (Bowled)	۳۲
ایل۔ بی۔ ڈبلیو (Lbw)	۱۷
رن آؤٹ	۴
اسٹمپ (Stump)	۲

سنیل گواسکر نے ۱۲۵ ٹیسٹ میچوں میں ۳۴ سینچریز بنائیں جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

نمبر شمار	ٹیسٹ نمبر	رنز	بمقابلہ	مقام	سیریز	کتنے منٹوں میں	چوکا	چھکا
۱۔	۲	۱۱۶	ویسٹ انڈیز	جارج ٹاؤن	۱۹۷۰ - ۷۱	۲۷۰	۱۱	۰
۲۔	۳	۱۱۷	" "	برج ٹاؤن	۱۹۷۰ - ۷۱	۳۴۰	۱۰	
۳۔	۴	۱۲۴	" "	پورٹ آف اسپین	۱۹۷۰ - ۷۱	۳۹۰	۱۱	
۴۔	۴	۲۲۰	" "	" "	۱۹۷۰ - ۷۱	۵۱۰	۲۴	
۵۔	۱۳	۱۰۱	انگلینڈ	مانچسٹر	۱۹۷۴	۳۰۰	۸	
۶۔	۱۸	۱۱۶	نیوزی لینڈ	آکلینڈ	۱۹۷۵ - ۷۶	۲۶۵	۱۵	
۷۔	۲۲	۱۵۶	ویسٹ انڈیز	پورٹ آف اسپین	۱۹۷۵ - ۷۶	۴۸۰	۱۴	
۸۔	۲۳	۱۰۲	" "	پورٹ آف اسپین	۱۹۷۵ - ۷۶	۲۴۴	۱۳	
۹۔	۲۵	۱۱۹	نیوزی لینڈ	بمبئی	۱۹۷۶ - ۷۷	۲۹۱	۲۰	

[illegible]	۳۴	۱۰۸	انگلینڈ	بمبئی	۱۹۷۶ – ۷۸	۳۴۱	۱۳	×
۱۱	۳۳	۱۱۳	آسٹریلیا	برسبین	۱۹۷۷ – ۷۸	۳۲۰	۱۲	×
۱۲	۳۴	۱۲۷	آسٹریلیا	پرتھ	۱۹۷۷ – ۷۸	۲۷۰	۲۰	×
۱۳	۳۵	۱۱۸	آسٹریلیا	ملبورن	۱۹۷۷ – ۷۸	۳۴۵	۱۴	×
۱۴	۴۰	۱۱۱	پاکستان	کراچی	۱۹۷۸ – ۷۹	۳۵۷	۱۵	×
۱۵	۴۰	۱۳۷	پاکستان	کراچی	۱۹۷۸ – ۷۹	۳۱۵	۱۲	×
۱۶	۴۱	۲۰۵	ویسٹ انڈیز	بمبئی	۱۹۷۸ – ۷۹	۳۹۸	۲۹	۲
۱۷	۴۳	۱۰۷	ویسٹ انڈیز	کلکتہ	۱۹۷۸ – ۷۹	۳۱۵	۱۸	×
۱۸	۴۳	۱۸۲	ویسٹ انڈیز	کلکتہ	۱۹۷۸ – ۷۹	۳۹۹	۱۹	×
۱۹	۴۵	۱۲	ویسٹ انڈیز	دہلی	۱۹۷۸ – ۷۹	۳۴۴	۱۸	×
۲۰	۵	۲۲۱	انگلینڈ	اوول	۱۹۷۹	۴۹۰	۲۱	×
۲۱	۵۴	۱۱۵	آسٹریلیا	دہلی	۱۹۷۹ – ۸۰	۳۲۹	۱۷	۱
۲۲	۵۶	۱۲۳	آسٹریلیا	بمبئی	۱۹۷۹ – ۸۰	۳۰۰	۱۷	×
۲۳	۶۱	۱۶۶	پاکستان	مدراس	۱۹۷۹ – ۸۰	۵۹۳	۱۵	۱
۲۴	۷۱	۱۷۲	انگلینڈ	بنگلور	۱۹۸۱ – ۸۲	۷۰۸	۲۱	×
۲۵	۷۹	۱۵۵	لنکا	مدراس	۱۹۸۱ – ۸۲	۳۹۹	۲۴	۱
۲۶	۸۲	۱۲۷	پاکستان	فیصل آباد	۱۹۸۲ – ۸۳	۴۳۷	۱۹	×
۲۷	۸۸	۱۴۷	ویسٹ انڈیز	جارج ٹاؤن	۱۹۸۲ – ۸۳	۳۲۰	۱۷	۱
۲۸	۹۱	۱۰۳	پاکستان	بنگلور	۱۹۸۳ – ۸۴	۲۳۹	۱۰	×
۲۹	۹۵	۱۲۱	ویسٹ انڈیز	دہلی	۱۹۸۳ – ۸۴	۲۲۴	۱۵	۲
۳۰	۹۵	۲۳۶	ویسٹ انڈیز	مدراس	۱۹۸۳ – ۸۴	۶۴۴	۲۳	×
۳۱	۱۱۰	۱۶۶	آسٹریلیا	ایڈیلیڈ	۱۹۸۵ – ۸۶	۵۵۱	۱۶	×
۳۲	۱۱۲	۱۷۲	آسٹریلیا	سڈنی	۱۹۸۵ – ۸۶	۵۱۳	۱۹	×
۳۳	۱۱۸	۱۰۳	آسٹریلیا	بمبئی	۱۹۸۶ – ۸۷	۳۰۲	۱۱	×
۳۴	۱۱۹	۱۷۶	لنکا	کانپور	۱۹۸۶ – ۸۷	۵۰۶	۲۲	×

نصف سینچری کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

نمبر شمار	ٹیسٹ نمبر	رنز	بہ مقابلہ	مقام	سیریز
۱	۱	۶۵	ویسٹ انڈیز	پورٹ آف اسپین	۱۹۷۰ – ۷۱
۲	۱	۶۷	ویسٹ انڈیز	پورٹ آف اسپین	۱۹۷۰ – ۷۱

۳	۲	۲۳	ویسٹ انڈیز	جارج ٹاؤن	۱۹۷۰-۷۱
۴	۵	۵۳	انگلینڈ	لارڈس	۱۹۷۱
۵	۶	۵۷	انگلینڈ	مانچسٹر	۱۹۷۱
۶	۱۱	۶۹	انگلینڈ	کانپور	۱۹۷۲-۷۳
۷	۱۲	۶۷	انگلینڈ	بمبئی	۱۹۷۲-۷۳
۸	۱۳	۵۸	انگلینڈ	مانچسٹر	۱۹۷۴
۹	۱۷	۸۶	ویسٹ انڈیز	بمبئی	۱۹۷۴-۷۵
۱۰	۱۹	۷۱	نیوزی لینڈ	کرسٹ چرچ	۱۹۷۵-۷۶
۱۱	۲۴	۶۶	ویسٹ انڈیز	کنگسٹن	۱۹۷۵-۷۶
۱۲	۲۶	۶۲	نیوزی لینڈ	کانپور	۱۹۷۶-۷۷
۱۳	۲۸	۷۱	انگلینڈ	دہلی	۱۹۷۶-۷۷
۱۴	۳۱	۵۰	انگلینڈ	بنگلور	۱۹۷۶-۷۷
۱۵	۳۸	۸۹	پاکستان	فیصل آباد	۱۹۷۸-۷۹
۱۶	۳۹	۹۷	پاکستان	لاہور	۱۹۷۸-۷۹
۱۷	۴۱	۷۳	ویسٹ انڈیز	بمبئی	۱۹۷۸-۷۹
۱۸	۴۷	۶۱	انگلینڈ	برمنگھم	۱۹۷۹
۱۹	۴۷	۷۸	انگلینڈ	برمنگھم	۱۹۷۹
۲۰	۴۸	۵۹	انگلینڈ	لارڈس	۱۹۷۹
۲۱	۴۹	۷۸	انگلینڈ	لیڈس	۱۹۷۹
۲۲	۵۱	۵۰	آسٹریلیا	مدراس	۱۹۷۹-۸۰
۲۳	۵۳	۷۶	آسٹریلیا	کانپور	۱۹۷۹-۸۰
۲۴	۵۷	۸۸	پاکستان	بنگلور	۱۹۷۹-۸۰
۲۵	۶	۸۱	پاکستان	کانپور	۱۹۷۹-۸۰
۲۶	۶۶	۷۰	آسٹریلیا	ملبورن	۱۹۸۰-۸۱
۲۷	۶۸	۵۳	نیوزی لینڈ	کرسٹ چرچ	۱۹۸۰-۸۱
۲۸	۷۰	۵۵	انگلینڈ	بمبئی	۱۹۸۱-۸۲
۲۹	۷۳	۸۳	انگلینڈ	کلکتہ	۱۹۸۱-۸۲
۳۰	۷۵	۵۲	انگلینڈ	کانپور	۱۹۸۱-۸۲
۳۱	۸۰	۸۳	پاکستان	لاہور	۱۹۸۲-۸۳
۳۲	۸۳	۶۰	پاکستان	حیدرآباد	۱۹۸۲-۸۳
۳۳	۸۵	۲۷	پاکستان	کراچی	۱۹۸۲-۸۳
۳۴	۹۳	۵۰	پاکستان	ناگپور	۱۹۸۳-۸۴
۳۵	۹۳	۶۴	پاکستان	ناگپور	۱۹۸۳-۸۴

[illegible]	۹۶	۹۰	ویسٹ انڈیز	احمدآباد	۱۹۸۳-۸۴
۳۷	۱۰۳	۶۵	انگلینڈ	دہلی	۱۹۸۴-۸۵
۳۸	۱۰۷	۵۱	لنکا	کولمبو	۱۹۸۵-۸۶
۳۹	۱۰۸	۵۲	لنکا	کولمبو	۱۹۸۵-۸۶
۴۰	۱۱۵	۵۴	انگلینڈ	برمنگھم	۱۹۸۶
۴۱	۱۱۶	۹۰	آسٹریلیا	مدراس	۱۹۸۶-۸۷
۴۲	۱۲۰	۷۴	لنکا	ناگپور	۱۹۸۶-۸۷
۴۳	۱۲۲	۹۱	پاکستان	مدراس	۱۹۸۶-۸۷
۴۴	۱۲۴	۶۳	پاکستان	احمدآباد	۱۹۸۶-۸۷
۴۵	۱۲۵	۹۶	پاکستان	بنگلور	۱۹۸۶-۸۷

بقیہ، سماجی جنگل بانی کے پروگراموں کے لیے عورتوں کے تعاون کی ضرورت

مقامی لوگوں کی مدد سے پروگراموں کی تشکیل

سماجی جنگل بانی کے تحفظ و فروغ میں ملک کے مختلف علاقوں، مختلف نسلوں، حتیٰ کہ مختلف گاؤں میں ایک دوسرے سے مختلف حالات کے سبب عورتوں کا رول بھی مختلف ہوگا چونکہ باہر کے لوگوں کے لیے کسی علاقے یا گاؤں کے صحیح حالات یا ضروریات کا پتہ لگانا قدرے مشکل ہو سکتا ہے۔ اس لیے مقامی افراد کی مدد لینا بہت ضروری ہے۔ ان کے مشورے سے پروگرام بنائے اور زیرِ عمل لائے جانے چاہئیں لیکن سماجی جنگل بانی کا تعہد بھی مشکلات سے خالی نہیں ہے اور ان مسائل کو حل کرنا ہوگا۔

مشکلات

ایک مشکل سوال تو یہی ہے کہ کاشتکاروں کو اپنی کھیتی باڑی کی مصروفیات کے دوران کیسے درخت لگانے اور ایک طویل مدت تک ان کی دیکھ بھال کرنے پر رضامند کیا جا سکتا ہے۔ خرکار کو کوئی معاشی فائدہ پہونچائے بغیر کیسے ماحول میں بہتری لائی جا سکتی ہے۔ کیسے کسانوں کو جنگل بانی کو اپنے مسائل کا حل سمجھنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے یا جنگلاتی امور کے تیکنیک کاروں کو کس طرح صرف ایک امدادی اور مشاورتی رول ادا کرنے پر رضامند کیا جا سکتا ہے۔

چند دیگر مسائل یہ ہیں: عورتوں کو زمین تک رسائی یا درختوں کی پیداوار کے استعمال کی راہ میں کیا دشواریاں پیش آتی ہیں، عورتوں کو پروگرام میں شریک ہونے کے لیے وقت، مالیات یا دوسری کئی رکاوٹوں کو دور کرنا ضروری ہے۔ عورتوں کو ان پراجیکٹوں سے فائدہ ہوگا اس کے لیے یقین دہانیوں کی ضرورت ہے، مختلف سماجی رسم و رواج عورتوں کو بحیثیت ایک فرد یا گروپ کے، پروگرام میں شریک ہونے کی کتنی اجازت دیتے ہیں۔

یہ مشکل اور پیچیدہ سوالات ہیں اور ان کا کوئی آسان یا جامع حل دستیاب نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر سوال یا مسئلے کو اس کے مخصوص مقامی پس منظر میں دیکھا جائے اور پھر مقامی حالات و ضروریات کے مطابق کوئی حل وضع کیا جائے۔ اس کے لیے وقت اور محنت درکار ہوگا۔ وقتاً فوقتاً پروگراموں کی افادیت کا جائزہ لینا بھی ضروری ہوگا تاکہ اس کی روشنی میں ضروری اصلاحات کی جا سکیں۔ ●

بقیہ، امیر خسرو کی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں اور لول انمول، دوسخنے وغیرہ

دراصل امیر خسرو خود ایک ایسا گل کوزہ پھول ہیں جس کی پیداوار کے لیے ایک نہیں کئی آسمانوں نے چکر کاٹ کر ہندوستان کی سرزمین کو چنا۔ ویسے تو یہاں کا ہر پھول باغ بہشت کا نمونہ ہے یہ گل کوزہ جس کا دوسرا نام امیر خسرو ہے۔ ہندوستانی باغ بہشت کا بہترین نمونہ ہے جو اپنی خوشبو سے سارے باغ کو بہشت بنائے ہوئے ہے۔ ●

بقیہ، انسانی محبت و اخوت کے نقیب ــــ گورونانک

گورونانک نے کیلاش پربت کے پار تبت اور لداخ کی راہ سے کشمیر، ریاسی اور جموں کے یاترا کی۔ چوتھی اُداسی ۱۵۱۸ء سے ۱۵۲۲ء تک ہوئی جس کے دوران گورونانک مکہ، مدینہ، یروشلم، دمشق اور بغداد گئے اور ایران، ترکستان، کابل اور پشاور ہوتے ہوئے واپس آئے۔ ان یاتراؤں کے دوران انھوں نے لوگوں کو انسانی محبت، بھائی چارے اور ایشور بھگتی کے اپدیش دیئے۔

گورونانک نے جو بھگتی تحریک شروع کی تھی اس کے نتیجے میں عوام کی زندگی کی روش ہی بدل گئی اور اُن کے اندازِ فکر میں خوشگوار تبدیلی آئی۔ آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ اُن کی راہ پہلے بھی سچی تھی اور سچی ہے۔ چنانچہ اسی سے متاثر ہو کر علامہ اقبال کو اُن کے بارے میں کہنا پڑا۔

"پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے!" ●

آپ سب کے لیے

سمندر کے راستے مال کا لدان بڑھا

آزادی ملنے کے بعد سمندری راستوں سے سامان کا لدان بڑھا۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں سمندری راہوں سے ۱۹۲ لاکھ ٹن مال کا لدان ہوا تھا، بڑھتے بڑھتے یہ لدان ۸۷-۱۹۸۶ء میں ۱۲۴۲ لاکھ ٹن تک پہونچ گیا۔ بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بڑی بندرگاہیں بنوائی گئیں۔ آزادی کے بعد کانڈلا، مورماگاؤ، پردیپ، ٹیوٹی کورن اور نیو منگلور کی بندرگاہیں بنوائی گئیں۔ پرانی بندرگاہوں میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی بندرگاہیں ہیں، کوچین اور وشاکھاپٹنم کی بندرگاہیں جنگ کے زمانے میں بنائی گئی تھیں۔

کھیلوں کی ترقی

تعلیم کی نئی پالیسی میں کھیلوں اور کسرت پر بہت زور ہے، اسکولوں اور کالجوں میں کم سے کم ایک گھنٹہ روزانہ کھیلوں اور جسمانی تعلیم کے لیے رکھا جائے گا۔ اس لیے یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ہر اسکول میں کھیل کی سہولتیں موجود ہوں۔ اس کے لیے کھیلوں کا سامان اور کھیلوں کا میدان فراہم کرنے کا پلان ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہندوستان میں دس ہزار سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری اسکول ایسے ہیں جہاں کھیل کے میدان نہیں ہیں۔ مرکزی سرکار نے ایک اسکیم بنائی ہے جس کے مطابق میدانوں کی سہولت دینے کے لیے جو رقم خرچ کی جائے گی اس کا آدھا حصہ مرکزی سرکار دیگی۔ یہ رقم زیادہ سے زیادہ ۵۰ ہزار روپے ہوسکتی ہے۔ گاؤوں میں کھیلوں کو بڑھاوا دینے کے لیے الگ سے خاص خاص اسکیمیں شروع کی جائیں گی۔ اس کے لیے گاؤوں کے اسکولوں کو امداد دی جائے گی۔ اس رقم سے کھیل کے میدانوں کو ٹھیک ٹھاک کرنے کے علاوہ مختلف طرح کے کھیل کا سامان بھی خریدا جائے گا۔ جن کھیلوں کے لیے سامان خریدا جاسکتا ہے ان میں والی بال، باسکٹ بال، کرکٹ، ٹیبل ٹینس، جسمانی کسرتوں کا سامان، فٹ بال، ہاکی وغیرہ شامل ہے۔

ہندوستان اور آسٹریلیا کے بیچ ڈاک

ہندوستان اور آسٹریلیا کے درمیان ڈاک سیوا شروع کردی گئی ہے۔ یہ ڈاک بہت تیزی سے آ، جارہی ہے۔ اب تک اس طرح کی تیز رفتار ڈاک جن ملکوں تک آ، جاسکتی ہے ان کے نام یہ ہیں:- برطانیہ، جرمنی، ہانگ کانگ، جاپان، امریکہ، بحرین، بیلجیم، مصر، فرانس، پاکستان، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ٹیونیشیا، ترکی اور متحدہ عرب امارات۔

چوتھا عالمی کرکٹ کپ

چوتھا عالمی کرکٹ کپ ۸ اکتوبر سے ہندو پاک میں مشترکہ طور پر منعقد ہوا۔ پہلے اس کا نام روتھمنس کپ تھا لیکن اس بار نام بدل کر ریلائنس کپ کر دیا گیا ہے۔
گذشتہ ٹورنامنٹ کی طرح اس بار بھی اس میں ۸ ٹیمیں حصہ لے رہی ہیں انھیں چار چار کے حساب سے دو گروپوں میں بانٹا گیا ہے۔ پہلے گروپ میں رنرزاپ ویسٹ انڈیز، پاکستان، انگلینڈ، اور سری لنکا کی ٹیمیں ہیں جب کہ دوسرے گروپ میں فاتح ہندوستان، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور زمبابوے کی ٹیمیں ہیں۔
یہ ٹورنامنٹ ہر چار سال کے بعد ہوتا ہے۔ گذشتہ تین ٹورنامنٹ انگلینڈ ہی میں منعقد ہوئے تھے جس میں پہلے دو ٹورنامنٹوں میں ویسٹ انڈیز کی جیت ہوئی۔ تیسری بار ہندوستان شاندار طریقے پر ویسٹ انڈیز کو شکست دے کر روتھمنس کپ کا مالک بن بیٹھا تھا۔ اس سلسلے کا پانچواں ٹورنامنٹ ۱۹۹۱ء میں آسٹریلیا میں منعقد کیا جائے گا۔
ریلائنس کپ کا فیصلہ ٹورنامنٹ کے آخری دن ۸ ر نومبر کو ہوگا۔ پاکستان کے کپتان عمران خان، ہندوستان کے کپتان کپل دیو، ویسٹ انڈیز کے کپتان ویورچرڈس، انگلینڈ کے کپتان مائیک گیٹنگ اور آسٹریلیا کے کپتان ایلن بورڈر اپنے ساتھیوں سے مطمئن ہیں۔
اس ٹورنامنٹ کے افتتاح پر برصغیر کے عظیم کھلاڑی سنیل گواسکر کو ان کی خدمات کے عوض کار پیش کی گئی۔ یہ عظیم کھلاڑی اس ٹورنامنٹ کے بعد کرکٹ کی دنیا سے سنیاس لے رہے ہیں۔

دُرگا پوجا اور دسہرہ

دُرگا پوجا ہندوستان کا ایک بڑا تیوہار ہے۔ یہ تیوہار بنگال میں بڑے پیمانے پر منایا جاتا ہے۔ اس تیوہار پر یہاں کے لوگ نئے کپڑے ضرور بنواتے ہیں اور ملنے جلنے والوں کو مٹھائی وغیرہ پیش کرتے ہیں۔ یہ تیوہار ہر سال ۸ ر آشون سے لے کر ۱۰ ر آشون تک منایا جاتا ہے۔ اس موقعہ پر بڑے بڑے شامیانے لگائے جاتے ہیں اور ان میں مٹی کی مورتیاں بٹھائی جاتی ہیں۔ جو تعداد میں پانچ ہوتی ہیں۔ ایک درگا، دوسری گنیش، تیسری سرسوتی، چوتھی لکشمی اور پانچویں مورتی کارتیکا کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف کلچرل پروگرام بھی کرائے جاتے ہیں جو لوگوں کا دل موہ لیا کرتے ہیں۔
یہ تیوہار شکتی کی علامت ہے۔ اس کا دسہرے سے خاص تعلق ہے، اس موقع پر رام چندر جی نے سری لنکا کے راجہ راون پر فتح پائی تھی، راون برائی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

پنڈت نہرو پر فلم : اطلاعات ونشریات کے وزیر شری اجیت پانجہ نے بتایا کہ دہلی دور درشن پنڈت نہرو پر ایک فلم بنا رہا ہے۔ یہ فلم مسٹر ایلن برکن شا کی ہدایت میں مشہور برطانوی پروڈیوسر مسٹر کینتھ گرنتھ بنا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں کسی کمپنی سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ فلم ۱۹۸۸ء کے شروع میں مکمل ہو جائے گی۔

قارئین کی آراء اور مشورے

● ماہ ستمبر ۱۹۸۷ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس شمارے کے تمام مضامین معلوماتی ہیں، خاص طور سے جناب منظر اعجاز صاحب کا مضمون "قاضی عبدالودود کا طریقِ تحقیق" اور ڈاکٹر انجنی کمار کا "فراق کی حاضر جوابی و بذلہ سنجی" قابلِ تعریف ہے۔ اس طرح کے مضامین "یوجنا" کے معیار میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ آپ نے تخلیق و تحقیق کے متناسب امتزاج سے "یوجنا" کو ہر ادب دوست کا محبوب بنا دیا ہے۔ اس طرح کے معلوماتی مضامین پیش کرنے میں آپ کے ارادے صاف ظاہر ہیں۔ خدا کرے آپ ہمیشہ اور ہر ارادے میں کامیاب رہیں۔

شہریار احمد قدسی : تین کوٹھیا، جیل روڈ
مظفر پور (بہار)

● یوجنا کا ۱۵ اگست کا خصوصی شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس میں معاشیات، سائنس اور ٹیکنالوجی، تعلیم، زراعت اور ذرائع ابلاغ کے بارے میں نامور اہلِ قلم کے مضامین شامل ہیں وہ واقعی نہایت مستند اور معلومات افزا ہیں۔ ان کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ملک نے گذشتہ چالیس برسوں میں مختلف شعبوں میں کتنی پیش رفت کی ہے۔

اس کا ادبی سیکشن خلافِ دستور کمزور ہے۔ اگر آپ اس میں ایک افسانہ اور چند غزلیں بھی شامل کر لیتے تو سونے پہ سہاگہ ہو جاتا۔ تاہم اپنی موجودہ شکل میں بھی پرچہ ریکارڈ میں رکھنے لائق ہے اور یہ صرف اسی شمارہ پر موقوف نہیں، یوجنا کا ہر شمارہ اتنا معلوماتی ہوتا ہے کہ اسے ریکارڈ میں محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ معاشیات کے طالب علموں کے لیے آپ کے پرچے کی افادیت دوچند ہے۔

منوج رستوگی : ۱۴/۲۵۴ چوپٹیاں، لکھنؤ ۳۔

● یوجنا کا ستمبر کا شمارہ دیکھنے کو ملا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ آپ کا رسالہ روز بروز خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ ستمبر کے شمارہ میں معلومات افزا اقتصادی مضامین کے ساتھ ساتھ آپ نے جو ادبی مضامین شائع کئے ہیں وہ واقعی قابلِ تعریف ہیں۔ قاضی عبدالودود کا طریقِ تحقیق "تاریخِ ہند کے چند سنہری اوراق"۔ "فراق کی حاضر جوابی و بذلہ سنجی" اور افسانہ "اندھیرا" بہت پسند آئے۔ لکشمی چندر یاس نے اپنے افسانے میں ایک ایسے نوجواں کا کردار پیش کیا ہے جو محبوبہ کو اپنی محبت کا ثبوت دینے کے لیے اپنی جان تو قربان کر دیتا ہے مگر اپنی محبت کو پروان چڑھانے کے لیے والدین سے بغاوت نہیں کرتا۔ محبت کی مجبوریوں پر آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں اور پھر افسانے کی زبان اتنی شیریں و دلآویز ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اُسامہ ملک کی غزل کا یہ شعر ابھی تک ذہن میں گونج رہا ہے۔

سرحدوں پہ یہ اگر بہتا تو کہلاتے شہید
رائیگاں سڑکوں پہ ہم اپنا لہو کرتے رہے

برج کشور ایڈوکیٹ : ۲۵۶/۱۰۰ شنکر دیال روڈ، عیش باغ کیمپ، لکھنؤ۔

● وزارتِ اطلاعات و نشریات تو شکریہ کی مستحق ہے کہ وہ اردو میں "یوجنا" کی اشاعت نہایت پابندی سے کر رہی ہے لیکن اسی ضمن میں آپ کی مساعیٔ جمیلہ بھی لائقِ تحسین و تبریک ہیں کہ آپ اسے متنوع اور

[illegible] یوجنا میں ادبی حصے کی شروعات ایک بہترین اور مستحسن اقدام ہے۔ میں اپنے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کراتا ہوں۔

مختار ٹونکی : کالی پلٹن روڈ، پل محمد خان، ٹونک۔

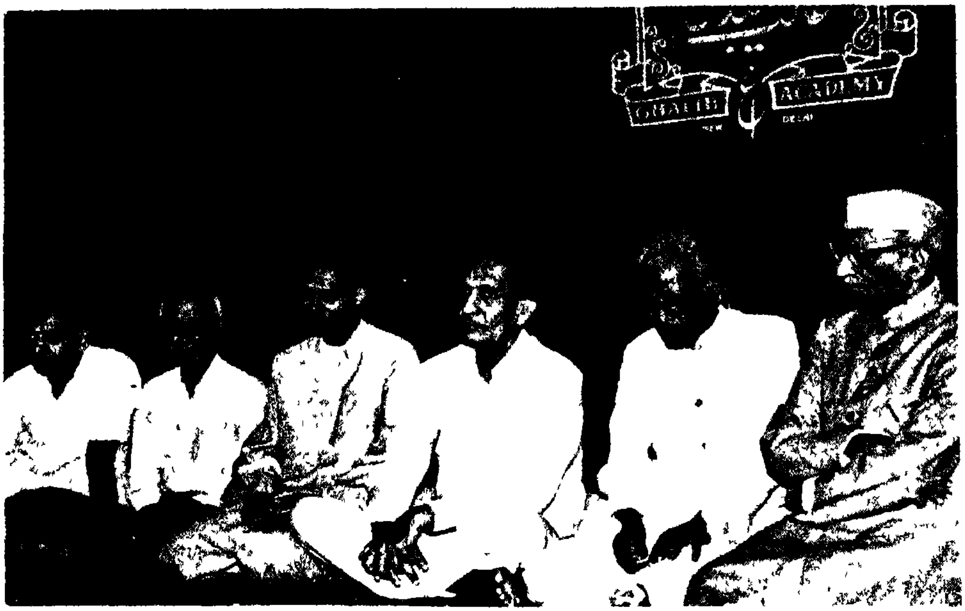
● سرورق سادہ مگر دیدہ زیب، سائز و ضخامت نہایت موزوں اور مناسب، کتابت صاف ستھری، وقت کے اہم موضوعات کا انتخاب اور ادبی، اخلاقی، سماجی رنگا رنگ مضامین اور پاکیزہ حصۂ نظم نے رسالہ کی افادیت میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ جس رفتار سے اب تک "یوجنا" نے آپ کی سرپرستی میں اپنا سفر طے کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مناسب ہی ہے کہ رسالہ بہت جلد ملک کے ممتاز و معروف جرائد کی صف میں شمار کیا جائیگا۔

عزیز نگھروی : ۲۵۰۳، بارہ دری، شیر افگن بیماران، دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

● یوجنا اب پہلے کی نسبت زیادہ دلچسپ ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی اشاعت میں جو تبدیلی لائی گئی ہے اور جو اوراق کا اضافہ کیا گیا ہے وہ ضروری بھی تھا۔ اس کا معیار دن بدن بڑھتا اور مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ قیمت کے لحاظ سے اردو رسالوں میں بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔ ادبی، تحقیقی مضامین کے ساتھ ساتھ نظموں اور غزلوں کی اشاعت سے یہ رسالہ مزید مقبولیت حاصل کرتا جائے گا۔

میری رائے میں اگر تعلیم و تربیت کے حصول سے متعلق معلوماتی مضامین یا معلومات شائع کریں تو یہ تعلیم کے فروغ میں ضرور ایک کامیاب قدم ثابت ہوگا۔ جس سے ضرورتمند افراد طلباء استفادہ حاصل کریں گے۔ اور یہی یوجنا کا مقصد عین بھی ہے۔

شمشیر خان : پوسٹ سواحی سدوبا، تحصیل گھاٹن جی، ضلع یوت مال (مہاراشٹر)



۲۷ ستمبر کو ادارہ ایک سعیتہ البدایہ ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام غالب اکیڈمی نئی دہلی میں حضرت سید الشہداء علیہ السلام کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک بزم مسالمہ زیرِ صدارت جناب شریف الحسن نقوی سکریٹری اُردو اکیڈمی منعقد ہوا۔ اس موقعہ پر پاکستان سے آئے ہوئے مشہور نقاد ادیب پروفیسر جناب اقبال عظیم مہمانِ خصوصی تھے۔ تصویر میں (دائیں سے) جناب کرنل بشیر حسین زیدی، جناب پروفیسر اقبال عظیم، جناب شریف الحسن نقوی، جناب مولانا ذلیستاں ہدایتی، جناب رگھوناتھ سہائے اُمید اور جناب محمود نقوی نظر آ رہے ہیں۔

(تصویر: سید فدا علی)



۱۹ اگست ۱۹۸۹ء کو جشن مالک رام کمیٹی کے زیرِ اہتمام اُردو کے مشہور و ممتاز محقق جناب مالک رام پر ایک کل ہند سیمینار غالب اکیڈمی نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر کرنل بشیر حسین زیدی کی مرتب کردہ کتاب "مالک نامہ" کی رسمِ اجراء پروفیسر سروپ سنگھ نے انجام دی۔ تصویر میں (دائیں سے) پروفیسر سروپ سنگھ، جناب مالک رام، کرنل بشیر حسین زیدی اور جناب سید حامد کو دیکھا جا سکتا ہے۔

(تصویر: سید فدا علی)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) ... to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

Vol. 7 No. 15-16 YOJANA (URDU) 1-30 November 1987

میڈم کاما کی سوانح حیات

شری اجیت کمار پانجہ نے اجراء فرمایا



زیر نظر تصویر میں (دائیں سے) اطلاعات ونشریات کے مرکزی وزیر شری اجیت کمار پانجہ، پبلیکیشنز ڈویژن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیام سنگھ ششی اور کتاب کی مصنفہ محترمہ خورشید ادی سیٹھنا

عظیم دیش بھگت اور انقلابی میڈم بھیکا جی رستم کاما کے ۱۲۶ ویں جنم دن کے موقع پر اطلاعات ونشریات کے مرکزی وزیر شری اجیت کمار پانجہ نے ان کی زندگی پر لکھی گئی کتاب کا اجراء کیا۔

محترمہ خورشید ادی سیٹھنا نے یہ کتاب انگریزی میں لکھی ہے اور اسے شعبہ اطلاعات ونشریات کے پبلیکیشنز ڈویژن نے شائع کیا ہے۔ یہ تقریب پبلیکیشنز ڈویژن کے مرکزی دفتر پٹیالہ ہاؤس میں منعقد کی گئی۔

اس موقع پر میڈم کاما کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے شری اجیت کمار پانجہ نے انیسویں اور بیسویں صدی کی اس عظیم انقلابی خاتون کی خدمات ... انھوں نے کہا کہ میڈم کاما نے غیر ممالک میں رہ کر ہندوستان کی آزادی کے لیے چلنے والی انقلابی تحریکوں کی سرپرستی کی اور غیر ملکی زمین پر پہلی ... کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

... نے کہا کہ آج جب کہ ہم آزادی کی ۴۰ ویں سالگرہ منا رہے ہیں، یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی انقلابی تحریکوں کی تاریخ کو اجاگر کریں تاکہ ... سے ... واقف ہو سکیں، بلکہ اس سے تحریک عمل لے کر ملک کو مضبوط و مستحکم بنا سکیں۔

... تعارفی تقریر میں پبلیکیشنز ڈویژن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیام سنگھ ششی نے کہا کہ پبلیکیشنز ڈویژن نے کتابوں کی فروخت کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس ادارے نے حال ہی میں کچھ مصنفوں کو ۵۰ سے ۶۴ ہزار روپے تک کی رقم بطور رائلٹی دی ہے۔

پبلیکیشنز ڈویژن کے جائنٹ ڈائرکٹر شری اے اے ترمذی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس ادارے نے حال ہی میں بیتاجی سبھاش چندر بوس کی تمام تقریروں کا ہندی ترجمہ شائع کیا ہے۔

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadurshah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوجنا

دو روپے

اردو ناول کے ارتقاء میں خواتین کا حصہ

(ڈاکٹر عتیق اعظمی)

سماج اور اقبال

(محمد حامد علی خاں)

غزلیں، کہانی، تبصرے اور
بہت سا دلچسپ مواد



گذشتہ دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سے "یوم سرسید" کے موقع پر ایک عشائیہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر صدر جمہوریہ ہند جناب آر۔ وینکٹ رمن نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے، دلی میں مقیم اولڈ بوائز کے نام پتے اور دیگر کوائف پر مشتمل ایک ڈائرکٹری کا اجرا دائ انٹرنیشنل سینٹر میں کیا، تصویر میں (دائیں سے) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی، صدر جمہوریہ ہند، پروفیسر اشتیاق عابدی اور جناب اے آر قدوائی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ (فوٹو، سید فدا علی)



گذشتہ دنوں وزیراعظم جناب راجیو گاندھی نے اردو کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں سے ملاقات کی۔ اس موقع پر اردو کے معروف دلی کے شاعر جناب واجد سحری نے وزیراعظم کو اپنا تازہ شعری مجموعہ "سنہری آنچ" پیش کیا، اس ملاقات میں انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم، ممبر پارلیمنٹ جناب حیات اللہ انصاری اور دیگر حضرات کو بھی وزیراعظم کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

(فوٹو، سید فدا علی)

یوجنا
نئی دہلی

چیف ایڈیٹر: سید ظفر الحسن
ایڈیٹر: جگندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹر: محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر: وسیم حیدر، عبدالحمید

شرح چندہ
سالانہ ۲۰ روپے، دو سالہ ۳۶ روپے
سہ سالہ ۴۸ روپے، فی کاپی دو روپے
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت۔

جلد ۷ شمارہ ۱۷،۱۸ | یکم تا ۳۱ دسمبر ۱۹۸۷ء | ۱۰ اگرہائن تا ۱۰ پوس، شک ۱۹۰۹ | قیمت دو روپے ٹیلیفون ۶۰۱۸۱۸

اس شمارے میں

اداریہ		۲
شخصیات: شریمتی اندرا گاندھی	پرہلاد سنگھ	۳
صنعت: بیمار صنعتوں کی تشخیص اور علاج	ال پرتاپ سنگھ	۷
پبلک سیکٹر: بھارت کے اقتصادی اور معاشی نظام میں پبلک سیکٹر کا کردار	عزیز مراد آبادی	۱۱
سماجیات: پانچسالہ منصوبے اور سماجی تبدیلی	ڈاکٹر قمرالدین	۱۶
ہندوستان میں ٹریڈ یونین تحریک	ڈاکٹر بی۔ ایس۔ سنگھ	۱۹
ایک نئے طرز فکر کی ضرورت	شہباز حسین	۲۲
جوہری جنگ کے اثرات	خلیل اکمل	۲۴
تعلیم: نیا تعلیمی رجحان اور اس کا ڈھانچہ	سید اسحاق حسین عابدی	۲۶
طب: سروائیکل اسپانڈی لوسز اور کمر کا درد	پروفیسر بی کے دوبے	۲۹
ایڈس ایک مہلک مرض	ڈاکٹر ایس' او' رحمٰن	۶
ادب: اردو ناول کے ارتقاء میں خواتین کا حصہ	ڈاکٹر شمیم اعظمی	۳۱
سماج اور اقبال	محمد حامد علی خاں	۳۴
گرم خون (کہانی)	شگفتہ عارف	۳۷
ملازمت سے سبکدوشی (انشائیہ)	عبدالستار انصاری	۳۹
ایک دن کی زندگی (مختصر افسانہ)	عادل اشرف	۴۱
غزل	وقار طاہری	۴۳
نظمیں	سیدہ نسرین نقاش	"
	فردوس گیاوی	"
غزلیں	دھرم پال عاقل، برجے اصیلاتی، میر قریشی	۴۴
تبصرے (خوشبو کا سفر، تعارف)	جمیل اختر	۴۵
آپ سب کے لیے		۴۶
قارئین کی آراء اور مشورے	احمد علی برقی اعظمی، شمیم حیدر، محمد رضی الدین معظم، منظر امام، شاہد حسین، روشن لال روشن بناری	۴۸
ادبی خبریں، تصویروں کی زبانی		کور ۲، ۳، ۴

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر یوجنا (اردو)، پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر. کے. پورم (مین)، نئی دہلی

● اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): آر. ایس. منچال

ترسیل زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

نوادے اسکول

۱۹۸۶ء میں نئی قومی تعلیمی پالیسی کا آغاز ہوا، اس کی رُو سے منجملہ دیگر اہم اصلاحات کے ہر ضلع میں ساتویں منصوبے میں ایک نوادے اسکول کے قیام کا نشانہ مقرر کیا گیا۔ یہ نوادے اسکول اعلیٰ تعلیمی خدمات انجام دینے کی غرض سے قائم کئے جا رہے ہیں تاکہ سماج کے سبھی طبقوں کے ذہین طلباء کو صحیح قسم کی تعلیم دے کر افرادی قوت کو مستحکم بنایا جا سکے۔ ان اسکولوں کے قیام کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ ملک میں سماجی اور قومی یکجہتی کے لیے زمین ہموار کی جا سکے اور آنے والی نسلیں باہم شیر و شکر ہو کر ملک کی ترقی میں حصہ لے سکیں ان اسکولوں کے نظم و نسق کے لیے نوادے ودیالیہ سمیتی قائم کی گئی ہے۔ انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت میں یہ ایک خود مختار تنظیم ہے۔ اس کا الحاق ثانوی تعلیم کے مرکزی بورڈ سے ہے۔ ان کے لیے ایک اعلیٰ سطح کی کمیٹی قائم کی گئی ہے جس کے صدر مذکورہ وزارت کے سکریٹری ہیں، ان کے علاوہ ماہرینِ تعلیم پر مشتمل کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں جو تعلیمی پروگراموں کی ترتیب و تشکیل میں معاون ہوں گی، ان اسکولوں میں چھٹی جماعت سے لے کر بارہویں جماعت تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اس طرح کے چند اسکول پہلے ہی قائم کئے جا چکے ہیں۔

بلاشبہ جس قوم کے افراد ذہین اور محنتی ہوتے ہیں، وہ قوم ترقی کی راہ پر شاندار طریقے سے آگے بڑھتی ہے یہ لوگ قوم کا اثاثہ کہلاتے ہیں، ان کی ترقی اور تعلیم سے کوئی قوم بھی غفلت نہیں برت سکتی۔ یہ طریقہ یوروپی ملکوں میں بھی پہلے ہی سے رائج ہے۔ برطانیہ کے گرامر اسکول، جرمنی کے جیمنا اسکول نیز روس کے فزیکو۔ میتھمیٹکس اسکول اس سلسلے کی چند مثالیں ہیں، ہمارے ملک میں حصولِ آزادی کے بعد سے ہی تعلیم کو ایک اہم موضوع سمجھا گیا ہے لیکن اب تک ہم نے تعلیم کے میدان میں تعلیم یافتہ افراد کی تعداد بڑھانے پر زور دیا ہے، آزادی کے فوراً بعد ایسا ہونا ایک لازمی امر تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ہمارے ملک میں خواندگی کی شرح صرف ۱۲٫۲ فیصد تھی، ملک میں آئین کی دفعات کی کوشش کی گئی کہ آئین کے اس رہنمایانہ اصول کو عملی جامہ پہنایا جائے کہ دس سال میں ۶ سال سے ۱۴ سال تک کی عمر کے سبھی بچوں کو اسکول میں ہونا چاہیئے۔ اگرچہ یہ بات تو ابھی تک میسّر نہیں آسکی تاہم اس عرصے میں یہ بات ضرور سامنے آئی کہ تعلیم یافتہ افراد کی نہ صرف تعداد بڑھنی چاہیئے بلکہ ان کا معیارِ تعلیم بھی اُوپر اٹھنا چاہیئے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے بدلتے ہوئے نظام نے اس ضرورت کو اور بھی تیزی سے ملک کے سامنے لا کھڑا کیا۔

آج بھارت میں سبھی شعبوں میں سریع ترقی عمل میں آرہی ہے اس عمل کو تیزی سے آگے بڑھانے کے لیے ذہین اور تربیت یافتہ افراد درکار ہیں، کچھ پبلک اسکولوں میں اعلیٰ معیار کی تعلیم ضرور مل رہی ہے مگر وہ ناکافی ہے، حصولِ آزادی کے بعد ۱۹۵۳ء میں ثانوی تعلیم کا کمیشن اور ۱۹۶۶ء میں ایجوکیشن کمیشن قائم کیا گیا انھوں نے اسکولی نظام تعلیم کا جائزہ لیا، اور یہ محسوس کیا کہ لئے جمہوری اور سماج وادی نظام میں اس نظام تعلیم سے ہمیں ایسے افراد نہیں مل سکیں گے جن کی ملک کو ضرورت ہے، ان کمیشنوں نے عوام کی تعلیم کے لیے مشترکہ اسکولی نظام کی حمایت کی اور ایسے اسکولوں کے قیام کی ضرورت بتائی جہاں ذات پات، نسل و فرقہ، مذہب یا اقتصادی حالات سے قطع نظر تعلیم سب کے لیے عام ہو، گویا کہ تعلیم کے حصول کے لیے دولتمند ہونا ضروری نہ رہے بلکہ طالب علم کا ذہین ہونا ضروری ہو، لہٰذا نوادے اسکولوں میں داخلہ کی بنیاد طالب علم کا علم کے حصول کے لیے ذوق و شوق ہے یہ قدم سماجی انصاف لانے اور تعلیمی مواقع سے کم استحقاق یافتہ طبقات کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے اٹھایا گیا ہے، شیڈولڈ ذاتوں اور شیڈولڈ قبائل کے بچوں کے لیے ان کی آبادی کے تناسب سے نشستوں کا تحفظ کیا گیا ہے۔ شہری علاقوں کے بچوں کے داخلے کو ۲۵ فیصد تک محدود کر دیا ہے، تقریباً ایک تہائی لڑکیوں کے داخلے کی کوشش کی جائے گی، اس کے علاوہ طلباء کے تبادلہ کے ذریعے قومی یکجہتی کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے گی اور ہندی والے علاقوں کے طلبا کو غیر ہندی علاقوں میں اور اسی طرح وہاں کے طلباء کو ہندی علاقوں میں منتقل کیا جائے گا۔ استادوں کی بھرتی کُل ہند بنیاد پر ہوگی، ان کے تبادلے ایک ودیالہ سے دوسرے ودیالہ میں ہو سکیں گے۔ ان اسکیموں میں جو نصاب پڑھایا جائے گا، وہ اعلیٰ سطح کا ہوگا۔ نوادے اسکولوں میں اعلیٰ معیار کی برقراری کے لیے بھرپور کوشش کی جائے گی، نوادے اسکولوں میں ساتویں یا آٹھویں جماعت تک مادری زبان میں تعلیم دی جائے گی،

امید ہے کہ اس طرح سے جو نوجوان ڈھل کر نکلیں گے، وہ ملک کی تعمیر و ترقی کے عمل کو زیادہ خلوص، تن دہی، ایمانداری اور صلاحیت سے انجام دے سکیں گے۔

(ایڈیٹر)

پرہلاد سنگھ٭

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

شریمتی اندرا گاندھی



اندرا پریہ درشنی نہرو کا جنم ۱۹ نومبر ۱۹۱۷ء کو ہوا۔ آپ ملک کی ایک عظیم ہستی پنڈت جواہر لال نہرو کی ہونہار بیٹی تھیں، آپ کی والدہ کا نام شریمتی کملا نہرو تھا۔ آپ موتی لال نہرو کی پوتی تھیں۔ وہی موتی لال نہرو جو اپنے دور میں ایک مشہور وکیل اور شاہانہ انداز کے مالک رہے۔ موتی لال نہرو ایک شاندار مکان میں رہتے تھے جسے آنند بھون کہا جاتا ہے۔ اندرا پریہ درشنی کو بچپن میں محبت اور پیار سے اندو کہا جاتا تھا، اندو کو بچپن میں انگریزی کی تعلیم کے لیے بہترین اتالیق ملے۔ اندو کو اپنے والد سے وراثت ملی۔ اندو کو بھی اپنے باپ کی طرح سے قدرتی مناظر سے خاص لگاؤ تھا، موتی لال چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا جواہر لال ایک کامیاب بیرسٹر بنے لیکن یہ دور سیاسی بے چینی کا تھا، قومی جذبات کو بری طرح سے کچلا جا رہا تھا۔ مہاتما گاندھی سیاسی اُفق پر چمک رہے تھے۔ ہر طرف ہڑتالیں اور مظاہرے ہوا کرتے تھے۔ سرکار انگلشیہ کی طرف سے لاٹھی چارج اور فائرنگ ہوا کرتی تھی۔ امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا المیہ انھیں دنوں میں پیش آیا۔ یہاں جو لوگ جمع ہوئے تھے، انھیں بغیر کسی وارننگ کے بندوقوں کی گولیوں سے بھون ڈالا گیا، جواہر لال کے حساس دل نے ان واقعات سے متاثر ہو کر حب الوطنی کی راہ اپنائی، وہ پکے قوم پرست بن گئے اور اپنی پوری زندگی جدوجہد آزادی میں لگانے کی ٹھان لی، انھوں نے سارے شاہی ٹھاٹ باٹ ترک کر دیے اور خاکسارانہ طور پر سادہ زندگی گزاری، جواہر لال نہرو کسانوں میں گھومے پھرے اور ان کی عمر کا زیادہ حصہ آنند بھون سے زیادہ جیل خانے میں گزرا۔ اُن دنوں آنند بھون میں آنے والوں میں مہاتما گاندھی بھی تھے، اندرا گاندھی کے سیاسی افکار گاندھی جی کے فلسفے سے بے حد متاثر ہونے شروع ہو گئے۔ شریمتی گاندھی نے خود لکھا ہے کہ "مہاتما گاندھی میری بچپن کی یادوں کا حصہ ہیں، میں بچپن میں انھیں نہ صرف ایک عظیم رہنما سمجھتی تھی بلکہ اپنے کنبے کا ایک بزرگ مانتی تھی اور اپنے مسائل اور مشکلات کے حل اُن سے پوچھتی تھی۔

اندرا گاندھی ابھی چار برس کی ہی تھیں کہ موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو کے خلاف مقدمہ چلا اور چھ ماہ قید بہ ۵۰۰ روپیہ جرمانہ ہوا۔ مگر انھوں نے جرمانہ ادا کرنے سے انکار کیا تو پولیس نے آنند بھون کی قیمتی اشیا کو نیلام کر کے یہ رقم وصول کی، اندرا گاندھی چیختی چلاتی رہیں، لیکن کسی نے نہ سنی۔ انھوں نے خود لکھا کہ "یہ صورتِ حال بہت زیادہ برہم کرنے والی اور جھنجھلانے والی تھی اور مضبوط ارادے کے مالک بچے کے لیے اسے خاموش تماشائی اور بزدلی کے ساتھ دیکھنا بس سے باہر تھا۔"

اندرا گاندھی نے سماج سیوا کو اپنا دھرم سمجھا، دس برس کی عمر میں وہ اتوار کے روز بارہ میل دور سیی مام کی جگہ بائیسکل پر جاتی تھیں اور وہاں کوڑھیوں کے ایک مرکز میں اُن کی خدمت کیا کرتی تھیں۔ بارہ سال کی عمر میں وہ کانگریس پارٹی کا رکن بننے کی خواہشمند تھیں لیکن ان کی عمر ناکافی ہونے کے سبب، ان کو رکنیت نہیں دی گئی۔ ان کو اس بات پر اتنا غصہ آیا کہ وہ کہنے لگیں کہ میں اپنی تنظیم الگ سے بنا لوں گی، چنانچہ انھوں نے بچوں کی ایک تنظیم وانر سینا کے نام سے بنائی۔ شروع میں چھ ہزار بچے اس کے رکن بنے، یہ سینا نوٹس لکھنے، جھنڈے

٭ ۹۰/۱۲ گنگیا کالونی، نئی دہلی ۱۱۰۰۳۱۔

[illegible] تھا تا جھٹکے اور پیغام ادھر سے ادھر پہنچانے کا کام کرتی تھی، یہ سیاسی جاسوسی کے فرائض بھی انجام دیتی، کہ اس بات کی ٹوہ میں رہتی کہ پولیس سٹیشن کے سامنے بیٹھے ہوئے سپاہی کیا بات کیا کہتے ہیں، کس کس کی گرفتاری کی بات کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اندرا گاندھی کی تعلیم باقاعدہ نہ ہوسکی، ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے پر تعلیم ترک کرنی پڑتی تھی۔ وہ کہتی ہیں کہ "میں نے اسکول بدلے اور یہ تبدیلی اتنی بار ہوئی کہ تعلیم کا سلسلہ قائم رکھنا دشوار ہوگیا"۔ باپ کے بار بار جیل جانے سے بھی اُن کی تعلیم متاثر ہوئی، پھر ماں کی بیماری اور خود اُن کی علالت سے بھی تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ ۱۹۲۳ء میں انھوں نے الہ آباد کے سینٹ سی سی لیا اسکول میں داخلہ لیا۔ ۱۹۲۶ء میں وہ سوئٹزرلینڈ گئیں، جنیوا اور برن کے اسکولوں میں داخلے لیے، اس کے بعد سینٹ میری کنونٹ الہ آباد میں داخلہ لیا، موتی لال نہرو کی وفات کے بعد، جواہر لال نہرو نے انھیں پونا کے ایک اسکول میں بھیجا، سولہ سال کی عمر میں انھوں نے میٹرک کولیشن کا امتحان پاس کیا، لیکن سب سے بڑی تعلیم تو وہ تھی جو انھوں نے جواہر لال نہرو کے سایۂ عاطفت میں پائی۔ جواہر لال نہرو نے اندرا پریہ درشنی کے نام جیل سے ۳۰ خطوط لکھے جو چھپ چکے ہیں، اس کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "یہ ذاتی خطوط ہیں جو ایک باپ نے اپنی دس سالہ بیٹی کے نام لکھے ہیں"۔

اندرا گاندھی نے بچپن سے ہی شجاعت، بہادری، دلیری کا سبق پڑھا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں جواہر لال نہرو نے لکھا "کوئی کام چھپا کر مت کرو، یا کوئی ایسا کام نہ کرو جسے تم چھپانا چاہتی ہو۔ کیونکہ کسی بات کو چھپانے کا مطلب ہے کہ تم خوفزدہ ہو، خوف بُری چیز ہے جو تمھیں زیب نہیں دے گا۔ بہادر ہو، سب حالات کا سامنا کرو گے"۔

ٹیگور نے ایک بار شری نہرو کو اندرا گاندھی کے بارے میں لکھا کہ "وہ ہمارے لیے ایک اثاثہ ہیں۔ میں نے ان کو قریب سے دیکھا ہے اور جس طرح سے آپ نے ان کی پرورش کی، وہ قابلِ تحسین و قابلِ داد ہے"۔

۲۶ مارچ ۱۹۴۲ء کو شریمتی گاندھی کی شادی ایک پارسی فیروز گاندھی سے ہوئی۔ شری فیروز گاندھی نے اندرا گاندھی کے بچپن میں سوئٹزرلینڈ میں اُن کی بیمار ماں کی بڑی خدمت کی تھی۔ اتفاق سے شریمتی اندرا گاندھی اور شری فیروز گاندھی کے سیاسی افکار میں بڑی حد تک مماثلت تھی، شریمتی اندرا گاندھی نے ایک سیاسی خاندان میں جنم لیا اور ایک سیاسی خاوند سے ہی شادی کی، شادی کے کچھ دنوں بعد ہی شریمتی گاندھی اور شری فیروز گاندھی کو "بھارت چھوڑو" آندولن کے سلسلے میں گرفتار کرلیا گیا، تیرہ مہینے کے بعد ان کو رہا کیا گیا۔ ۱۹۴۴ء میں ان کے ایک بیٹا ہوا، جن کا نام شری راجیو گاندھی ہے، دو سال بعد ایک اور بیٹا ہوا جن کا نام سنجے تھا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو بھارت آزاد ہوا اور تقسیم وطن کے نتیجے میں پاکستان سے شرنارتھیوں کا ایک ریلا ہندوستان آنا شروع ہوا، اس سے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکی، مہاتما گاندھی نے فرقہ وارانہ فسادات سے متاثرہ علاقوں میں کام کرنے کے لیے شریمتی اندرا گاندھی کو ذمہ داری سونپی۔ شریمتی اندرا گاندھی نے لکھا "دلّی میرے لیے ایک نئی جگہ تھی، میرے پاس ایک چھوٹا بچہ تھا، جو اچھا نہیں رہتا تھا لیکن مہاتما جی نے مجھ سے کہا کہ میں ان مسلم علاقوں میں کام کروں جہاں لوگ خوف و ہراس میں مبتلا ہیں۔ یہ ایک خطرناک کام تھا، اور اس کا مطلب عوام میں اپنے آپ کو غیر مقبول کرنا تھا۔۔۔ چنانچہ مجھے ان علاقوں میں روزانہ بارہ بارہ گھنٹے کام کرنا پڑا۔ میں باپو جی کو جب بھی وقت ملتا، یہاں کی رپورٹ دیتی، مجھے باپو جی سے مل کر بڑا حوصلہ ملتا۔ لیکن اکثر دنوں میں مجھے ملاقات کا وقت نہ مل سکا۔

بالآخر لوگوں نے امن اور چین کا سانس لینا شروع کیا۔ گاندھی جی نے شریمتی اندرا گاندھی کی تعریف کرتے ہوئے کہا:۔

"اب مجھے معلوم ہوا کہ غیر ملکوں میں تمھارا قیام اور تعلیم بیکار نہیں گئی"۔

آزادی ملنے کے بعد شری جواہر لال نہرو وزیر اعظم بنے۔ کام کا بوجھ بڑھ گیا، اسے نبٹانے میں شریمتی اندرا گاندھی نے بھی میزبانی کے عظیم فرائض انجام دیے۔ اس زمانے میں بھی آپ نے بچوں کی بہبود سے بڑی دلچسپی لی۔ آپ یونیسکو کے ایگزیکیٹو بورڈ کی رکن بنیں، اور اس ناطے بین الاقوامی سطح پر بہت سی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۰ء میں آپ کے شوہر شری فیروز گاندھی کی وفات ہوئی، اب وہ اپنا تمام وقت اپنے والد محترم کی مدد کرنے میں گزارتیں۔

ایک بار شریمتی اندرا گاندھی نے خواجہ احمد عباس سے اپنی زندگی کی خواہش بیان کرتے ہوئے کہا کہ:۔

میں ایک مصنّف ہونا پسند کرتی، مجھے تاریخ میں تحقیقی امور سے دلچسپی ہے، مجھے علم الانسان سے دلچسپی ہے، زندگی کو سہل اور پرلطف بنانے کے لیے میں گھر کی سجاوٹ کی ذمہ داری ہی سنبھال لیتی، مجھے اس سے یقیناً دلچسپی ہے۔۔۔۔ میں رقص کرنا سیکھ لیتی، میں نے شانتی نکیتن میں منی پوری رقص سیکھا بھی تھا"۔

لیکن شریمتی اندرا گاندھی تو دیش کی خدمت کے لیے اس دنیا میں آئی تھیں، لہٰذا سیاست ان

کا چھ عرصہ میں پڑھا تھا۔ آپ کو سیاست میں ہی اپنا زیادہ وقت گزارنا پڑا۔ لیکن یہ سب سیاست عہدے یا منافع کے لیے نہ تھی، ۱۹۵۹ء میں جب یو۔این۔ ڈھیبر نے کانگریس پارٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا، تو شریمتی اندرا گاندھی کو یہ ذمہ داری سنبھالنے کے لیے کہا گیا، مجبوراً ان کو بادل ناخواستہ یہ ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔ گیارہ ماہ کی صدارت کے عرصے میں آپ نے نظریے کی آزادی اور قیادت، کی صلاحیت کا بھرپور ثبوت دیا، آپ نے زبان کی بنیاد پر بمبئی کی ریاست کو بانٹ دینے کی سفارش کی، تاکہ مہاراشٹرا اور گجرات کے عوام کے جذبات کی تسکین ہو جائے۔ وقت نے یہ ثابت کیا ہے کہ اُن حالات میں یہ بہترین حل تھا۔

شریمتی اندرا گاندھی سے درخواست کی گئی کہ وہ دوبارہ بھی اس ذمہ داری کو سنبھالیں، لیکن اپنی مدت عہدہ ختم ہونے پر آپ نے اس کو سنبھالنے سے انکار کر دیا۔

۱۹۶۴ء میں جب شری نہرو کو دل کا دورہ پڑا تو بارہ ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ نے شری نہرو سے درخواست کی کہ شریمتی گاندھی کو کابینہ میں شامل کیا جائے، لیکن شریمتی گاندھی نے انکار کر دیا۔ ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو شری جواہر لال نہرو کی وفات کے فوراً بعد وہ اگر چاہتیں تو وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داری سنبھال سکتی تھیں، مگر آپ نے ایسا نہیں سوچا

شری لال بہادر شاستری کو جب وزیر اعظم بنایا گیا، تو انھوں نے شریمتی گاندھی کو کابینہ میں بطور وزیر خارجہ آنے کی دعوت دی۔ مگر شریمتی گاندھی نے اُن کے بڑے اصرار پر صرف وزیر اطلاعات ونشریات بننے پر اکتفا کیا۔ بطور وزیر اطلاعات ونشریات بھی آپ نے اپنی چھاپ چھوڑی، آپ نے دفتر شاہی نظام پر تنقید کی اور ذرائع ابلاغ میں بہت سے اصلاحی اقدامات کئے، آپ نے ٹیلی ویژن کے فروغ پر زور دیا اور فلموں کی سنسر کے قواعد وضوابط کو نرم کیا۔

تاشقند میں شری شاستری کی وفات کے بعد ۱۹ جنوری ۱۹۶۶ء شریمتی اندرا گاندھی کو کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کا سربراہ چُنا گیا۔ ۲۴ جنوری ۱۹۶۶ء کو آپ نے وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف لیا، جب آپ نے ملک کی وزارتِ عظمیٰ کی عظیم ذمہ داری سنبھالی، اسوقت ملک شدید بحران میں مبتلا تھا، غیر ملکی امداد کم ہو گئی تھی، صنعتی پیداوار گھٹ رہی تھی، بارشیں نہیں ہوئی تھیں، ملک کے بہت سے حصّوں میں سوکھا پڑا تھا، زرعی پیداوار گھٹ گئی تھی، اس لیے ملک میں خوراک کے بحران پر قابو پانے کے لیے باہر سے اناج منگایا گیا۔ زرعی طریقوں کی کھوج اور پیداوار بڑھانے کے طریقوں پر زور دیا گیا اور زرعی سائنسدانوں کی ہمت افزائی کی گئی۔ اس سے ملک میں سبز انقلاب آیا، اور آج ملک خوراک کے معاملے میں خود کفیل ہے، حالانکہ آج پھر ملک کو خشک سالی کا سامنا ہے تاہم، خوراک کے محاذ پر بھارت کو تشویش نہیں ہے۔ شریمتی اندرا گاندھی نے غیر ملکی دَورے کئے اور بھارت کی خارجہ پالیسی کی وضاحت کی۔ آپ پیرس، لندن، ماسکو اور واشنگٹن تشریف لے گئیں۔

۱۲ مارچ ۱۹۶۷ء کو شریمتی اندرا گاندھی کو دوبارہ اتفاق رائے سے کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کا لیڈر چُن لیا گیا۔ اس بار وزیر اعظم بننے کے بعد آپ نے گولڈ کنٹرول کے قواعد وضوابط نرم کئے۔ اور چینی حملے کے وقت جو ایمرجنسی لگادی گئی تھی۔ اُسے ہٹایا۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن کی بحیثیت صدر جمہوریہ ہند مدت عہدہ ختم ہو رہی تھی اور نئے صدر کے انتخاب کا سوال تھا، جب ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام صدارت کے لیے آیا تو ان کے نام کی مخالفت کی گئی، لیکن شریمتی اندرا گاندھی نے ذاکر صاحب کے نام کی حمایت کی کیوں کہ وہ ثابت کرنا چاہتی تھیں کہ ہندوستان صحیح معنی میں سیکولر ملک ہے چنانچہ ذاکر صاحب نئے صدر جمہوریۂ ہند بنے۔

شریمتی اندرا گاندھی نے بنکوں کو قومی ملکیت میں لیا تاکہ چھوٹے کسانوں اور چھوٹے پیمانے کے صنعت کاروں کو قرض وغیرہ کی سہولتیں بآسانی دستیاب ہوں اور ملک سے غریبی دور کرنے میں بنک موثر کردار ادا کر سکیں، ان کو امیر اور غریب کے درمیان فرق دُور کرنے کے کام سے بیحد دلچسپی تھی، وہ ملک کی سابق ریاستوں کے نوابوں اور رجواڑوں کی مراعات اور استحقاق کو ختم کرنے کے حق میں تھیں اور ان کو جمہوریت کی راہ میں حائل سمجھتی تھیں۔ چنانچہ لوک سبھا میں رجواڑوں کے حقوق و مراعات کو ختم کرنے کے لیے ایک بل پیش کیا گیا، لوک سبھا نے تو اسے پاس کر دیا مگر راجیہ سبھا میں ایک ووٹ سے یہ پاس نہ ہو سکا۔ شریمتی گاندھی کے کہنے پر اُس وقت کے صدر جمہوریہ صدر وی۔ وی گری نے ایک اعلان کے ذریعے رجواڑوں کے صرف خاص کا خاتمہ کیا، یہ رجواڑے سپریم کورٹ میں پہونچ گئے اور سپریم کورٹ نے اس اعلان کی تائید نہ کی، شریمتی گاندھی نے عوام کی رائے کو ہر لحاظ سے برتر سمجھتے ہوئے صدر جمہوریہ سے پارلیمنٹ توڑ دینے کو کہا، اور یہ وقت سے پہلے ہی توڑ دی گئی تاکہ نئے انتخابات کرائے جا سکیں، شریمتی گاندھی نے کہا کہ :۔

"ہمارا کام صرف کرسی سے چپٹے رہنا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ہم کو عوام نے جو اختیار سونپا ہے اس کو کام میں لاتے ہوئے ملک کے لوگوں کا معیار زندگی بلند کریں اور اُن کو بہتر زندگی دے سکیں اور نیز مبنی بر انصاف سماجی نظام کے لیے کوشش

کرتی تھا وہ عوام کی خواہشات اور اُمنگوں سے ہم آہنگ رہے۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء کے الیکشن میں کانگریس کو بھاری اکثریت حاصل رہی۔

شریمتی گاندھی نے پُرامن بقائے باہم اور ناوابستگی کو اپنی خارجہ پالیسی کے اہم اجزا بنائے۔ شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت میں ملک نے زبردست ترقی کی، سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں نمایاں پیش رفت دکھائی۔ مئی ۱۹۷۴ء میں راجستھان میں پوکھرن میں زیر زمین نیوکلیر دھماکہ ایٹمی توانائی کمیشن کی طویل عرصے کی تحقیق اور کوششوں کا ثمرہ تھا، اس سے تیل کی کھوج میں مدد ملی اور دیگر پُرامن مقاصد کو تقویت ملی۔

اپریل ۱۹۷۵ء میں خلائی سیارہ آریہ بھٹ مدار میں چھوڑا گیا، یہ ہندوستانی سائنسدانوں کا عظیم شاہکار تھا، بمبئی ہائی میں تیل کی کھوج کے کام کو بڑھایا گیا۔ دنیا میں خام تیل کی قیمتیں برابر بڑھ رہی ہیں، اور پیٹرولیم کی مصنوعات کی مانگ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، لہٰذا ایسے حالات میں اندرون ملک تیل کی دریافت ایک عظیم کارنامہ ہے۔

یکم جولائی ۱۹۷۵ء کو شریمتی اندرا گاندھی نے بیس نکاتی اقتصادی پروگرام کا اعلان کیا، اس کے تحت اشیائے ضروری کی قیمتوں کو کم کرنے کی کوشش کی گئی، بے گھر لوگوں کو مکانات دینے کا بندوبست کیا گیا، بندھوا مزدوروں کا خاتمہ کیا گیا۔ دیہات کے لوگوں کو قرض سے نجات دلانے کی مہم چلائی گئی، زرعی مزدوروں کی کم سے کم اُجرت کو ٹھیک سے لاگو کرنے پر زور دیا گیا۔ متوسط آمدنی والوں کو آمدن ٹیکس سے نجات دلانے کے لیے انکم ٹیکس سے مستثنیٰ آمدنی کی حد بڑھا دی گئی۔ طلبا کو درسی کتابیں اور کاپیاں مناسب داموں پر فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے بسنے والوں کو قومی تعلیم کے کاموں میں عملاً مصروف کیا جائے، ان پروگراموں پر عمل درآمد سے اشیا کی قلت دور ہو سکی اور اشیائے ضروری کی تقسیم کے نظام کو مستحکم کیا جا سکا۔ اشیا کی ناجائز جمع خوری کرنے والوں کو میسا (MISA) کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ ان تمام کوششوں سے پیداوار بڑھی۔ اس پروگرام سے ملک و عوام میں خود اعتمادی بڑھی۔

شریمتی اندرا گاندھی کی شاندار زندگی کا چراغ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو یکایک اس وقت گل ہو گیا جبکہ ان کے حفاظتی دستے کے دو غداروں نے ان پر گولیاں چلائیں۔ شریمتی گاندھی اپنے دیش کے لیے زندہ رہیں اور دیش کے لیے انھوں نے جان دی۔ ان کی جان کی قربانی اس دیش کے اتحاد کی ضمانت ہے۔

ہمارے موجودہ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے بجا طور پر فرمایا کہ "اندرا گاندھی اب ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی روح اور اُن کی آتما ضرور ہمارے درمیان ہے، بھارت زندہ ہے، بھارت لافانی ہے، بھارت کی روح لافانی ہے۔"

●

یوجنا، نئی دہلی

ڈاکٹر ایس اے رحمٰن*

ایڈس ایک مہلک مرض

ایڈس ایک نئی اور انتہائی خطرناک بیماری ہے۔ اس بیماری کی واقفیت بہت کم لوگوں کو ہے۔ ساری دنیا کے ڈاکٹر اس نئے مرض سے بیحد پریشان ہیں، اور اس سلسلے میں سنجیدگی سے غور و فکر کر رہے ہیں۔ اب تک اس مرض کا کوئی معقول علاج معلوم نہیں کیا جا سکا۔ ایک بار جس شخص کو اس مرض نے آ دبوچا وہ جاں بحق ہو جاتا ہے۔ اس مرض کے بارے میں واقفیت کی کمی کے سبب مناسب طبی امداد بھی نہیں پہنچائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس مرض کے پھیلنے کی رفتار بھی تیز ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ مرض کافی دنوں سے پھیل رہا ہے لیکن حال ہی میں اس کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے اور عوام کو اس کے بارے میں آگاہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

پہلی بار امریکہ کے ڈاکٹر نے اس کے بارے میں رپورٹ دی اور کچھ مریضوں کو Isolate بھی کیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد دیگر ممالک سے بھی یہ رپورٹ ملی کہ ایڈس کے مریض وہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور یہ مرض تیزی سے پھیل رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی ایک کیس اس مرض کا پتہ لگا ہے۔ سرکار نے عوام کو اس سلسلے میں واقف کرانے کی کوشش تمام ترسیل و ابلاغ کے ذرائع سے کی ہے تاکہ عام آدمی تک اس ہلاکت خیز اور مہلک بیماری کے دور رس نتائج کا علم فراہم ہو سکے۔

اس مرض کا نام ایڈس ہے۔ جو انگریزی کے چار حروف پر مشتمل ہے AIDS یعنی

Auto Immune Deficiency Syndrome

کہلاتا ہے۔ یہ بیماری دراصل ایک خاص طرح کے وائرس کے ذریعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جس آدمی کے خون میں وائرس داخل ہو جاتا ہے اس میں ایک خاص طرح کی پروٹین کی کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ پروٹین انسان کے جسم میں طرح طرح کی بیماری سے نبرد آزما ہونے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یہ انسانی جسم کو قوت مدافعت عطا کرتا ہے۔ اسے ڈاکٹر انگریزی میں اس طرح سے واضح طور پر بیان کرتے ہیں۔ "This type of protien is responsible to provide immunity against any disease". یعنی یہ اس طرح کا پروٹین ہوتا ہے جو تمام امراض سے بچاؤ کی قوت عطا کرتا ہے۔ جو انسان اس مرض کا شکار ہوتا ہے۔ اس کے خون کی Serological جانچ کی جاتی ہے۔ اور یہ پتہ لگایا جاتا ہے کہ اس کے خون میں اس قسم کا وائرس

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

---

* کریم گنج، گیا۔

۱۹۸[illegible]

انل پرتاپ سنگھ*

بیمار صنعتوں کی تشخیص اور علاج

صنعتوں کی بیماری حالیہ برسوں میں عام ہوگئی ہے اور اب یہ مسئلہ نہ صرف صنعتی اکائیوں کے مینیجروں اور مالیاتی اداروں بلکہ حکومت کے لیے بھی سخت تشویش کا باعث بن گیا ہے چھوٹے پیمانے کی صنعتی اکائیاں زیادہ تعداد میں بیماری کا شکار ہو رہی ہیں اس بیماری کے حوصلہ شکن اثرات اور مادی، مالی اور انسانی وسائل کی وسیع پیمانے پر تضییع فوری توجہ کی متقاضی ہے۔

میں اس مضمون میں چھوٹے پیمانے کی صنعتی اکائیوں کی بیماری کی وجوہات اور اس کے علاج کے طریقوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

پہلے تو یہ بتانا ٹھیک رہے گا کہ

ا۔ چھوٹے پیمانے کی صنعت سے کیا مراد ہے؟

ب۔ بیمار صنعت کسے کہتے ہیں؟

چھوٹے پیمانے کی صنعتیں وہ اکائیاں کہلاتی ہیں جن کا پلانٹ اور مشینری کی صورت میں نصب شدہ اصل سرمایہ ۳۵ لاکھ روپیے سے زائد نہ ہو۔ (قطع نظر اس سے کہ وہ ملکیتی بنیاد پر ہے یا ہائر پرچیز کی بنیاد پر یا پٹے پر) مددگار یونٹوں کے لیے جو اپنی پیداوار کا کم از کم پانچ فیصد دوسرے یونٹوں کو سپلائی کرتے ہیں، یہ حد ۴۵ لاکھ روپیے ہے۔

بیماری کے معنی

ریزرو بنک آف انڈیا نے ایک بیمار صنعتی اکائی کی تشریح یوں کی ہے۔

ایک ایسی صنعتی اکائی جسے بنک کی نگاہ میں ایک سال میں نقد آمدنی کا نقصان ہوا ہے اور رواں سال اور اس سے اگلے سال بھی نقصان ہونے کا امکان ہے۔ نیز جس کے مالی ڈھانچے میں عدم توازن آچکا ہے اور موجودہ تناسب ۱:۱ سے کم ہو گیا ہے۔"

اقتصادی نقطۂ نگاہ سے کوئی صنعتی ادارہ اس وقت فیل سمجھا جاتا ہے جب اپنے سرمایہ پر معقول منافع نہیں کما سکتا۔ قرض دینے والے ادارے کسی فیکٹری یا کارخانہ کو اس وقت بیمار سمجھتے ہیں جب وہ (۱) لگاتار چار سہ ماہیوں سے صنعتی قرضے کا سود یا اصل زر نہ ادا کر پا رہا ہو۔ (۲) لگاتار دو برس سے نقصان اٹھا رہا ہو اور اس کی کل قیمت ۵۰ فیصد تک گھٹ گئی ہو۔ (۳) ایک یا دو برس سے اپنی آئینی اور دیگر دینداریوں کے بقایا جات ادا نہ کر پا رہا ہو۔

بیماری کی صحیح تشخیص کے لیے مندرجہ ذیل باتیں دیکھنی چاہئیں۔

۱۔ اگر کوئی کارخانہ ویسے تو ٹھیک چل رہا ہو لیکن بدنیتی کی وجہ سے قرضوں کی قسطیں ادا نہ کر رہا ہو تو اسے بیمار یونٹ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۲۔ جو کارخانے بند کیے جا چکے ہوں انھیں بیمار کارخانوں کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

۳۔ اگر کسی کمپنی کے ایک سے زیادہ یونٹ ہوں تو بحیثیت مجموعی پوری کمپنی کی کارکردگی کو دیکھنا چاہئیے۔

۴۔ جن یونٹوں کو بحالیاتی امداد دی جا چکی ہے انھیں اس وقت تک بیمار سمجھنا چاہیئے جب تک کہ وہ حسب معمول کام نہ کرنے لگیں۔

۵۔ بیماری کے آغاز سے پہلے کی حالت اور بیماری کے بعد کی حالت کے بارے میں ابہام یا غلط فہمی سے بچنا چاہیئے۔

بیماری کی علامات

اگرچہ بیمار ہونے والے یونٹ کی صحیح شناخت ضروری ہے۔ لیکن بیماری کے ابتدائی

* لیکچرار، ہریش چندر پوسٹ گریجویٹ کالج، وارانسی۔

سکھنے کے بارے میں جاننا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ مندرجہ ذیل علامات سے بیماری کا پتہ لگانے میں مدد مل سکتی ہے۔

۱۔ کاروبار میں جمود جس کا اظہار کم یا معمولی آمدنی سے ہوتا ہے

۲۔ مقررہ مدت کے قرض کی اقساط ادا نہ کر پانا۔

۳۔ نقد اور ادھار کھاتوں کی غیر تسلی بخش کارکردگی۔

۴۔ استحقاق سے زیادہ رقم کے حصول کے لیے بار بار درخواست دینا یا پیشگی اور موزوں انتظام کیے بغیر چیک جاری کرنا۔

۵۔ جاری کیے گئے چیکوں کا بنا ادائیگی واپس آجانا۔

۶۔ خریدی ہوئی ہنڈیوں کا ادائیگی کے بغیر لوٹا دیا جانا۔

۷۔ اسٹاک کی بڑی مقدار میں موجودگی اور ایک سال سے دوسرے سال میں برقراری۔

۸۔ اسٹاک کے رجسٹر اور بک ڈیبٹ کے بیانات کے پیش کیے جانے میں تاخیر اور اسٹاک کا بیمہ نہ کروانا یا کم مالیت کا بیمہ کروانا۔

۹۔ طے شدہ اضافی سیکورٹی کے لیے دستاویزات کی تکمیل میں مسلسل تاخیر۔

۱۰۔ ایک ہی کمپنی کے دوسرے یونٹوں کو رقوم کی منتقلی، مستقل آثاثوں کا حصول، غیر مجاز سرمایہ کاری یا بڑی بڑی رقوم ذاتی مقاصد کے لیے نکالا جانا۔

۱۱۔ پراجیکٹ کے شیڈولوں کی، بغیر کسی معقول وجہ کے، پابندی نہ کرنا۔

۱۲۔ مزدوروں کو ان کی اجرتیں اور قانونی واجبات دیر سے ادا کرنا یا بالکل ادا نہ کرنا۔

۱۳۔ اسٹاک کی مالیت بڑھا کر دکھانا یا

اسٹاک اور بک ڈیبٹ کی وصولیوں کو دیگر ذمہ داریوں کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا۔

اپنے "ترسنگ پروگراموں" کے تحت رکھا جنھیں انھیں قرضے دئے ہوئے تھے۔

بیمار یونٹوں کی تعداد

سال	یونٹوں کی تعداد	بنک کریڈٹ کی واجب الادا رقوم (کروڑ روپیوں میں)
۱۹۸۰ء	۲۳۱۴۹	۳۰۵،۷۷
۱۹۸۱ء	۲۵۲۴۲	۳۵۹،۰۷
۱۹۸۲ء	۵۸۵۵۱	۵۶۸،۹۷
۱۹۸۳ء	۷۸۳۶۳	۷۲۸،۹۹
۱۹۸۴ء	۹۱۴۵۰	۸۷۹،۶۹
۱۹۸۵ء	۱۱۷۷۸۳	۱۰۷۰،۶۷

(بذریعہ معلومات: انڈیا ۱۹۸۵ اور اکنامک ٹائمز مورخہ ۲۵ فروری ۱۹۸۷ء)

بیمار یونٹوں کی تعداد ۱۹۸۰ء میں ۲۳۱۴۹ سے بڑھ کر ۱۹۸۵ء میں ۱۱۷۷۸۳ ہو گئی۔ اگرچہ کل صنعتی یونٹوں میں بیمار یونٹوں کا تناسب صرف ۷ فیصد ہے تاہم "صنعتی یونٹوں کی بیماری کا رجحان تشویشناک ہے۔"

ان کا تناسب

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے سیکٹر میں ۱۴۱۶۴۷۸ یونٹوں کو دسمبر ۱۹۸۵ء کے آخر تک کل ۲۲،۸۳۲۷ کروڑ روپے کے بنک قرضے فراہم کئے گئے۔ ان میں سے ۱۱۷۸۹۳ یونٹ (یعنی ۷،۲ فیصد) بیمار پائے گئے ہیں۔ ان کے ذمے بنکوں کا ۶۷،۱۰۷۰ کروڑ روپے (۱۳،۷ فیصد) قرضہ واجب الادا تھا۔ کل بیمار یونٹوں میں سے ۸۳۹۷ یونٹ (۷،۶ فیصد) جن کے ذمے ۴۴،۹۸ کروڑ (۹،۲۲ فیصد) کا قرضہ واجب الادا تھا بنکوں کی نگاہ میں چلنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ دسمبر ۱۹۸۵ء کے اختتام تک ۲۱۸۹ یونٹوں کو جنھیں ۳۳،۹۷ کروڑ روپے کے قرضے واپس ادا کرنے تھے ان بنکوں نے

وجوہات

بیمار ہونے والے صنعتی یونٹوں کی ایک بڑی تعداد کے حالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ ان کی بیماری کے لیے داخلی وخارجی دونوں عناصر ذمہ دار تھے۔

۱۔ داخلی عناصر

(الف) پیداواری عنصر

- یونٹ کے لیے غلط جگہ کا انتخاب
- پلانٹ اور مشینری میں موزوں توازن کی کمی۔
- رکھ رکھاؤ کے ناکافی انتظامات۔
- مناسب مادی کنٹرول اور کوالٹی بہتر رکھنے کے جذبے کی کمی۔
- بجلی کی قلت۔
- ٹھیکیداروں کے پاس سے مال دیر میں آنا۔
- خراب صنعتی تعلقات۔
- پیداوار میں کمی۔

(ب) مال کے لیے آرڈروں کی کمی۔

- مقابلہ۔
- گھٹیا قسم (کوالٹی)۔

- مال کی باقاعدہ اور بروقت ڈلیوری نہ دینا۔
- بازار یا منڈی تک مال پہونچانے کے لیے بھرپور کوشش نہ کرنا۔
- مال کی فرسودہ اقسام۔
- سرکاری پالیسیاں۔
- فروخت بڑھانے کی کوششوں کی کمی۔
- چند منتخب خریداروں پر ضرورت سے زیادہ انحصار۔

(ج) خام مال کی کمی۔

- اونچے دام۔
- گھٹیا کوالٹی۔
- غیر یقینی سپلائی۔
- قومی یا علاقائی قلت۔
- مال دینے والوں کو وقت پر ادائیگی نہ کرنا۔
- منصوبہ بندی کی کمی۔

(د) مالی عنصر

- اثاثہ کا خراب استعمال۔
- چالو سرمایہ کا نااہل بندوبست۔
- لاگتوں اور قیمتوں کے تعین کے عمل کی کمی
- مالی منصوبہ بندی اور بجٹ سازی کی ناموجودگی۔
- رقوم کو دانستہ طور پر کسی دوسری سمت میں منتقل کرنا۔
- قرض داروں کو بے قاعدہ ادائیگیاں۔

(ر) پیداوار کی بڑھی ہوئی لاگت

(۱) بڑھا ہوا اوپری خرچ جس میں شامل ہیں۔

- نااہل پیداوار۔
- غیر استعمال شدہ صلاحیت۔
- زیادہ اونچی شرح سود پر بھاری قرضے لینا۔
- فروخت کے انتظامات اور انتظامیہ اخراجات پر بڑھا ہوا خرچ۔
- غیر منصوبہ بند سرمایہ جاتی اخراجات۔

(۲) خام مال کی بڑھی ہوئی قیمتیں

- بڑھی ہوئی لاگت جو غلط قیمتیں مقرر کرنے کی وجہ سے قیمت فروخت سے پوری نہیں ہوتی۔
- افراطِ زر سے متاثرہ مارکیٹ میں مقررہ قیمتوں پر مال کی سپلائی کے لیے بہت بڑے آرڈروں کا بُک کیا جانا۔
- زیادہ مال مصالحے کی تضیع۔

(۲) خارجی عناصر

۱۔ قیمتوں اور تقسیم کے بارے میں حکومت کی پالیسیاں۔

۲۔ خام مال، بجلی اور ٹرانسپورٹ کی قلت۔

۳۔ ہنرمند کاریگروں کی عدم دستیابی۔

۴۔ مناسب وقت پر قرضے کا میسر نہ ہونا۔

۵۔ غیر حقیقت پسندانہ پرائس کنٹرول۔

۶۔ پبلک سیکٹر انوسٹمنٹ کی کمی۔

آئیے اب صنعتی بیماری کی وجوہات پر ایک نظر ڈالیں۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں عام طور پر کچھ بنیادی خامیاں ہوتی ہیں مثلاً :۔

(ا) محدود وسائل جو غلطی کی گنجائش نہیں چھوڑتے۔

(ب) سرمایہ حصص کی کمی۔

(ج) ایک اچھے اور مضبوط بندوبست کی ضرورت کو پوری طرح نہ سمجھنا۔

(د) منصوبہ بند اور منظم اندازِ نظر کی کمی۔

تیس فیصد صنعتوں کی بیماری نااہل چالو سرمایہ کی وجہ سے ہے۔ ۲۲ فیصد کی ناکافی اور گھٹیا خام مال کی وجہ سے، ۱۳ فیصد کی پیداوار کی مانگ میں کمی کی وجہ سے، ۱۰ فیصد کی نااہل بندوبست کی وجہ سے اور باقی ماندہ صنعتوں کی بیماری دیگر وجوہات کی وجہ سے ہے۔

بیمار صنعتی یونٹوں کا علاج کیا جا سکتا ہے ؟

بیماری کی وجوہات بیان کرنے کے بعد آئیے دیکھیں کہ یہ کیسے طے کیا جائے کہ بیمار یونٹوں کا علاج اور دیکھ بھال کرکے انھیں صحت مند بنانے کی کوشش کی جانی چاہیئے یا انھیں ختم کر دینا چاہیئے۔

اس سلسلے میں کوئی فیصلہ ہمیں مندرجہ ذیل تجاویز کی روشنی میں کرنا چاہیئے :۔

۱۔ اگر بیمار صنعت کو اس کے حالات میں بہتری لاکر چلایا جا سکتا ہو تو اس کا علاج کیجئے۔ بیماری کی تشخیص کے بعد اگر یہ دیکھا جائے کہ اندرونی مسائل کو بیرونی امداد کے ذریعے حل کرنا ممکن ہے تو اس کا علاج کرکے اسے معمول کے مطابق چلنے کے قابل بنایا جانا چاہیئے۔

۲۔ بیمار کارخانے کے حالات میں تبدیلی لانے کے بعد بھی اگر مفصل جائزے کے بعد یہ ظاہر ہو کہ کارخانے کو پہلے کی طرح، منفعت بخش طریقے سے چلانا ممکن نہیں ہے تو اُسے بند کر دینا چاہیئے۔

۳۔ اگر بیمار کارخانے کے حالات میں، اس کے نرسنگ پروگرام کے تحت لائے جانے کے بعد بھی بہتری نہیں آتی تو اسے بند کر دینا ہی مناسب ہوگا۔

سرکاری اقدامات

حکومت بیمار یونٹوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر کافی زور دے رہی ہے۔ اس سلسلے میں وہ مختلف اقدامات کر چکی ہے۔ بیمار صنعتوں کی دیکھ بھال کے لیے ریاستی سطح کی ایک رابطہ کمیٹی قائم کی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ ریجنل رابطہ کمیٹیاں بھی تشکیل دی گئی ہیں۔ یہ کمیٹیاں مارکیٹنگ، مالیات، خام مال اور بجلی کی بہم رسانی وغیرہ مقامی مسائل کو حل کرنے کے

سلسلے میں رابطہ اور تال میل قائم رکھتی ہیں۔

صنعتی بیماری کے مسئلے کے حل کے لیے کچھ اور اقدامات بھی کئے گئے ہیں۔ ریزرو بنک آف انڈیا نے ابتدائی مرحلے پر ہی بیماری کا پتہ لگانے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ بیمار صنعتوں کے لیے بحالیاتی پیکیج پروگراموں کی تشکیل و عملدرآمد کے کام میں کمرشل بنکوں اور مقررہ مدت کے لیے قرض دینے والے دوسرے اداروں کے درمیان رابطہ برقرار رکھنا ضروری ہے۔ ریزرو بنک نے مختلف اُدھار کھاتوں کی زمرہ بندی کے لیے ایک ہیلتھ کوڈ (ضابطۂ صحت) بھی تیار کیا ہے تاکہ کھاتوں کی بہتر نگرانی کی جا سکے۔ واجب ضروری ہو تدارکی احتیاطی اقدامات کئے جا سکیں۔

انڈسٹریل ری کنسٹرکشن بنک آف انڈیا نے بھی صنعتی بیماری کو بڑھنے سے روکنے اور بیمار یونٹوں کو دوبارہ زندگی دینے کے لیے کئی اقدامات کئے ہیں اس بنک نے جون ۱۹۸۶ء کے اختتام تک ۳۹۳ یونٹوں کو امداد مہیا کی۔ ان میں سے ۱۳۶ یونٹوں کو دوبارہ زندہ کیا جا چکا ہے۔ ان میں ایسے یونٹ شامل ہیں جو اپنا پورا قرضہ ادا کر چکے ہیں، جو ضم کئے جا چکے ہیں یا جنھوں نے منافع کمانا شروع کر دیا ہے۔ جو یونٹ نرسنگ پروگرام کے تحت تھے ان کی تعداد ۱۳۱ تھی۔ ان دونوں اقسام کے یونٹوں کی کل تعداد ۲۶۷ ہے جو، بیمار یونٹوں کے اسّی فیصد سے زائد ہے۔ انڈسٹریل ری کنسٹرکشن بنک درمیانہ اور بڑے پیمانے کے سیکٹر کے بیمار یونٹوں کے بارے میں دیگر مالیاتی اداروں کی مشاورت سے بین ادارہ جاتی بحالیاتی میٹنگیں بھی مقرر کرتا رہا۔ ۲۰ مئی ۱۹۸۶ء کو انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بنک آف انڈیا میں چھوٹی صنعتوں کا ایک ترقیاتی فنڈ بھی قائم کیا گیا۔ یہ فنڈ نہ صرف ترقی، توسیع اور جدید کاری کے لیے بلکہ چھوٹے پیمانے کے بیمار یونٹوں کی بحالی کے لیے بھی مالی امداد فراہم کرے گا۔ اُمید ہے کہ آئندہ پانچ سالوں میں اس فنڈ سے چھوٹی بیمار صنعتوں کو دی جانے والی امداد ۱۰۵۰ کروڑ روپے تک پہونچ جائے گی جب کہ گذشتہ پانچ برسوں میں ۴۷.۵ کروڑ روپے کی امداد فراہم کی گئی تھی۔

نرسنگ پروگرام

ایک نرسنگ پروگرام کا مقصد بیمار یونٹوں کی صلاحیت کو اس حد تک بحال کرنا ہے کہ وہ اندرونی بچت دکھا سکیں۔ اس طرح پیدا ہونے والی بچت کو کارکردگی میں بے قاعدگی کم کرنے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

نرسنگ پروگراموں کے اہم پہلو درج ذیل ہیں :-

۱۔ بنک یا قرض لینے والے کی طرف سے فیصلے لینے میں غلطی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

۲۔ ایک بیمار یونٹ پر قرض کا بڑا بوجھ ہوتا ہے۔ نرسنگ پروگراموں کی معاونت کے لیے مزید مالیات کے حصول کے نتیجے میں یہ بوجھ اور بڑھ جاتا ہے جس سے بیمار یونٹ کے ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے بچت حاصل کرنے کے لیے پہلے سے اعلیٰ تر سطح اور بہتر صلاحیت کے ساتھ کام کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔

۳۔ کھاتے میں بے قاعدگی، پیدا ہونے والی بچت سے رفتہ رفتہ ہی ختم کی جا سکتی ہے۔

۴۔ نرسنگ پروگرام میں کہیں بھی تاخیر برداشت کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

فیصلہ کرنے میں جتنی دیر لگے گی مسئلہ اتنی ہی زیادہ شدت اختیار کر جائے گا۔

احتیاطیں :۔ اوپر بیان کی گئی باتوں کی روشنی میں کسی بیمار یونٹ کی بحالی کی کوششوں میں درج ذیل احتیاطیں برتنی چاہئیں :۔

۱۔ کوئی نرسنگ پروگرام شروع کرنے سے پہلے، تمام تر امکانات کے بارے میں مکمل رپورٹ تیار کی جانی چاہیئے۔

۲۔ نرسنگ کے دوران یونٹ کی کارکردگی پر گہری نگاہ رکھنی چاہیئے۔

۳۔ نرسنگ پروگرام کے لیے بنک سے کافی اضافی مالیات فراہم کی جانی چاہئیں۔

۴۔ بنکروں کو اس بارے میں کڑی نگاہ رکھنی چاہیئے کہ مالیات کا مناسب استعمال ہو۔

۵۔ بیمار یونٹ کی کمزوری کو دُور کرنے اور اس کی قوت کو بڑھانے کے لیے مینجمنٹ کے سرگرم تعاون کے ساتھ، مشاورت کی ضرورت ہے۔

۶۔ اگر مالی امداد اقدامات، کلیدی عناصر پر کڑی نگرانی اور بحالی کی کوششوں کے سرگرم اشتراک و تعاون کے باوجود بیمار یونٹ میں کوئی بہتری رونما نہیں ہوتی تو نرسنگ پروگرام کو ختم کر دینا چاہیئے اور اس کے کھاتے کو بند کرنے کے لیے ضروری اقدامات کئے جانے چاہئیں۔ ●

عزیز مرادآبادی٭



بھارت کے اقتصادی و معاشی نظام میں پبلک سیکٹر کا کردار

تسلّی بخش یا مایوس کُن؟

بھارت کے اقتصادی یا معاشی نظام کی زبوں حالی کی اہم ترین وجہ انگریزوں کی غلامی تھی۔ برٹش حکمراں ہمیشہ یہی چاہتے تھے کہ وہ ہماری زبوں حالی کا ناجائز فائدہ اُٹھائیں۔ اپنے ملک کی ملوں اور کارخانوں کو توسیع و ترقی دیں۔ مختلف قسم کا خام مال (RAW MATERIAL) ہندوستان سے انگلینڈ لے جایا جاتا تھا اور وہاں سے تیار مال (اشیاء کی شکل میں) بھارت میں لاکر فروخت کیا جاتا تھا۔ انگریزی سرکار نے ہمیں سائنس کے میدان میں ترقی کرنے کا مناسب موقع نہیں دیا جس کے باعث صنعتی ترقی کی رفتار کو زیادہ تیز نہیں کیا جا سکا۔۔۔۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک میں ذیلی یا معاون یا بنیادی صنعتوں کا تقریباً فقدان تھا۔ برقی قوّت پیدا کرنے کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا اور صنعتی تحقیقی مراکز کی بھی بہت کمی تھی جس کی وجہ سے اس سمت میں خاطر خواہ ترقی نہ ہو سکی تھی۔ کچھ مخصوص صنعتیں غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھیں۔ مشینوں کے لیے غیر ملکوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ غیر ملکی اشیاء کے مقابلے میں ہمارے ملک کی چیزیں سستی اور عمدہ نہیں ہو پاتی تھیں۔ سرکار کی جانب سے سودیشی اشیاء کو نہ تحفظ دیا جاتا تھا اور نہ ہی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اقتصادیات کے کھوکھلے ہو جانے کے باعث بھارت میں پونجی کا اضافہ ممکن نہیں تھا۔۔۔ ایسی صورتِ حال میں حوصلہ مند صنعت کاروں کی بھی فطری طور پر کمی ہو گئی تھی ۔۔۔ اسی طرح کی چند اور ایسی ہی باتیں تھیں جن کے باعث برٹش دور میں صنعتیں وسعت و فروغ کے لیے ہمیشہ محتاجِ اغیار رہتی تھیں۔

۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی: ۳۰ جون

۱۹۵۶ء کو حکومتِ ہند نے صنعتی پالیسی کا دوبارہ اعلان کیا۔ سماج وادی نظام قائم کرنے کا مقصد طے کر لینے کی وجہ سے بڑے پیمانے پر صنعتی ترقی و فروغ کی ذمہ داری سرکار نے اپنے اوپر لے لی۔ سترہ اہم صنعتیں پبلک سیکٹر کے لیے محفوظ کی گئیں اور بارہ صنعتوں کا رفتہ رفتہ نیشنلائزیشن کرنے (قومیانے) کا اعلان کیا گیا۔ کانیں اور فولاد تیار کرنے کی مشینیں، ٹربائن، برقی پلانٹ، کوئلہ، لگنائٹ، معدنی ذخائر کو کانوں سے نکالنا، جہاز سازی وغیرہ بھاری صنعتوں کے قیام اور فروغ کا کام سرکار نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس طرح پبلک سیکٹر کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کو حکومت نے اپنی اقتصادی و معاشی پالیسی کا ایک اہم ترین جزو تسلیم کیا۔

آزادی کے بعد صنعتوں کا فروغ:

پبلک سیکٹر کے اُدیوگ اور کاروبار کا فروغ حصول آزادی کے بعد ہی ہوا ہے۔ لیکن اس کی بنیاد برطانوی دورِ حکومت میں ہی پڑ چکی تھی۔ تحفظ اور دیگر وجوہ سے کچھ پبلک مفاد یا عوامی بہبود کی صنعتوں اور ذرائع نشر و اشاعت وغیرہ کے انتظامات کو سرکار نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔

٭ قاضیان، نیسچ کیرت پور، ضلع بجنور (یو۔پی)

ت ۱۹۴۷ تک ریلوے نظام کی بسم اللہ پرائیویٹ سیکٹر تھا۔ ریلوے نظام کی بسم اللہ پرائیویٹ بیرونی کمپنی نے کیا، لیکن بالآخر اس کو قومیا لیا۔ ۱۹۵۱ء سے بھارت ریلوے بورڈ ریلوے کا انتظام بندوبست دیکھتا رہا ہے۔ اسلحہ سازی کارخانے ابتدا سرکاری کنٹرول اور انتظام میں رہے ہیں۔ مغربی ملک میں یہ کارخانے نجی سیکٹر میں ہیں لیکن برطانوی دست نے غالباً اپنے غیر ملکی اقتدار کی جڑیں جمانے کے لیے اس ملک کی نجی صنعتوں پر بھروسہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن بیرونی سرکار کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اس کا مقصد صرف بھارت کو محکوم بنائے رکھنا تھا۔ اس لیے آزادی حاصل کرنے کے بعد ہی پبلک سیکٹر کے اُدیوگوں (صنعتوں) کو تیزی سے پنپنے کا موقع ملا۔ خاص طور پر منصوبہ بند ترقی کا عمل شروع ہونے سے اس سیکٹر کی بڑے پیمانے پر توسیع ہوئی ہے۔

پبلک سیکٹر کا پھیلاؤ

پبلک سیکٹر کی توسیع دو طرح سے کی گئی ہے:
۱۔ نجی سیکٹر میں کام کر رہی صنعتوں یا خدمات کا نیشنلائزیشن کر کے۔ ۲۔ نئی صنعتوں کو قائم اور خدمات میں اضافہ کر کے۔

صنعتوں کا نیشنلائزیشن

( )

نیشنلائزیشن کے عمل میں بینکوں کا نیشنلائزیشن ایک اہم واقعہ ہے۔ سب سے پہلے ۱۹۵۵ء میں امپیریل بینک کو قومیایا گیا جو اب اسٹیٹ بینک آف انڈیا ( ) کے نام سے مصروفِ عمل ہے۔ ۱۹۶۹ء میں ۱۴ بڑے بینکوں کو قومیایا گیا جس کے نتیجہ میں بینکنگ سروسز ( ) کا تیزی سے پھیلاؤ ہوا ہے اور جمع شدہ رقم میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ جون ۱۹۶۹ء میں بینکوں کی صرف ۸۲۶۲ شاخیں تھیں جو دسمبر ۱۹۸۴ء میں بڑھ کر ۴۴۷۸۸ ہو گئیں۔ نیشنلائزیشن کے وقت ان بینکوں میں جمع رقم تقریباً ۴۶۶۲ کروڑ روپے تھی جو سترہ سال بعد اب ۹۰ ہزار کروڑ روپے ہو گئی ہے۔ نیشنلائزیشن سے پہلے دیہی علاقوں میں بینکوں کی شاخیں برائے نام ہی تھیں۔ لیکن نیشنلائزیشن کے بعد جو نئی شاخیں کھولی گئیں ان میں دیہی علاقوں میں کھلی شاخوں کا تناسب ۸۴ فیصد رہا ہے۔ دیہی علاقوں میں شاخیں کھلنے سے اس علاقے کی بچت کو اکٹھا کرنے میں کامیابی ملی ہے۔

بینکوں نے پچھڑے ہوئے علاقوں میں کاشتکاری، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور نجی کاروباروں کو بھی قرض کی سہولیات مہیا کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ بینکوں کی طرح بیمہ کمپنیوں کو بھی قومیا لیا گیا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں جیون بیمہ کمپنیوں کا نیشنلائزیشن کیا گیا اور لائف انشورنس کارپوریشن کا قیام عمل میں آیا۔ نیشنلائزیشن کے بعد کارپوریشن نے اپنے کاروبار کو بہت توسیع دی اور اس وقت لاکھوں لوگ بیمہ کے فائدوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ گروپ انشورنس، سیرے نو ایشن اسکیم، بیمہ بچت پروگرام اور ماں میڈیکل جنرل اور اسپیشل اسکیم وغیرہ کے ذریعے مختلف طبقوں کے لوگوں کو اجتماعی طور سے بیمہ کا فائدہ بہم پہنچانے کی کوشش جیون بیمہ نگم کئی برسوں سے کر رہا ہے۔ جنرل بیمہ کمپنیوں کا بندوبست سرکار نے مئی ۱۹۷۱ء میں اپنے ہاتھ میں لیا اور جنوری ۱۹۷۳ء سے اس کا پوری طرح نیشنلائزیشن ہو گیا۔ ان کمپنیوں کو از سرِ نو منظم کر کے جنرل انشورنس کارپوریشن کی چار معاون کمپنیاں بنائی گئی ہیں۔ سرکار نے جنرل انشورنس کے دائرے کو بڑھایا ہے اور کاشتکاری، مویشیوں، پمپ سیٹ بیمہ جیسے غیر روایتی بیمے ہونے لگے ہیں۔ مالی اداروں کے علاوہ کئی صنعتوں کا بھی نیشنلائزیشن ہوا ہے۔ کوئلے کی کانوں کو قومیا کر کول انڈیا لمیٹیڈ ( ) قائم کی گئی ہے۔ اس کی کل پونجی بیس ارب روپے ہے۔ بدانتظامی اور روپے کی کمی کا شکار کئی کپڑا ملوں کو پھر سے منظم کر کے چلانے کے لیے سرکاری کنٹرول میں لے لیا گیا۔ پرائیویٹ سیکٹر کی تیل کمپنیوں میں امریکی کمپنی ایسّو ( ) کا کام ہندوستان پٹرولیم کارپوریشن کو اور دو برما شیل کمپنیوں کا کام بھارت پٹرولیم کارپوریشن کو سونپ دیا گیا ہے، جو پبلک سیکٹر میں ہے۔ اسی طرح دیگر صنعتیں بھی اب سرکاری انتظام میں آ گئی ہیں۔

صنعتوں کے قیام، توسیع، فروغ اور ترقی کے لیے اقدامات

پبلک سیکٹر میں صنعتوں کے قیام کی غرض سے بہت زیادہ رقم مختص کی جا چکی ہے۔ مرکز و صوبائی سرکاروں کے ذریعے قائم شدہ اُدیوگ فولاد، مشینی اوزار، ہوائی جہاز، بحری جہاز، برقی آلات، ریلوے انجن، کھاد، ادویات، کاغذ اور سیمنٹ وغیرہ کی پیداوار بڑے پیمانے پر کر رہی ہے۔ گذشتہ ۳۵ برسوں میں بجلی کی پیداوار کی صلاحیت ۱۷۰۰ میگاواٹ سے ۴۸۰۰۰ میگاواٹ ہو گئی ہے۔ پہلے پنجسالہ منصوبے کے وقت تین ہزار دیہاتوں کو بجلی پہونچائی جا چکی تھی۔ سرکار کی کوشش سے اب تین لاکھ پچاس ہزار گاؤں کو بجلی سے روشن کیا جا چکا ہے۔ نیشنلائزیشن کے بعد تنہا کوئلہ کے شعبے میں ہی سرکار نے ۶ ہزار کروڑ روپے مخصوص کئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ پبلک سیکٹر کی صنعتوں کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ قومی معیشت پر ان کے حوالے سے سرکار کا تسلط قائم ہو گیا ہے۔ انھوں نے ملک کے وقار میں اضافہ کیا ہے اور ہمارے حفاظتی نظام کو مضبوط بنایا ہے۔ سرکاری شعبہ میں اسلحہ ساز کارخانوں کی پیداوار روز بروز بڑھ رہی ہے۔ نئے نئے ہتھیاروں کا ڈیزائن تیار کر کے پیچیدہ سے پیچیدہ ہتھیاروں کی تیاری ہمارے دیش میں ہی ہونے لگی ہے۔ جس

ے فوج کی قوتِ مدافعت اور قوتِ مزاحمت بہت بڑھ گئی ہے۔ فوج کے لیے خودکار رائفلیں، راکٹ لانچر، طیارہ شکن توپیں، وجینت ٹینک، بلڈوزر، ڈمپر، یلی کاپٹر، مگ جہاز، جگوار جہاز، فریگیٹ وغیرہ حفاظتی داروں کے ذریعہ بنائے جا رہے ہیں۔ بنیادی صنعتوں ی توسیع و ترقی سے عوامی مفادات کے سلسلے میں مہیا دمات کی توسیع میں بہت مدد ملی ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر بھی پبلک سیکٹر کے طفیل ہی بہت زیادہ ترقی کر سکا ہے۔ اگر سرکار نے بجلی، فولاد، معدنیات یل اور کوئلے کی پیداوار کی جانب خصوصی توجہ نہ ی ہوتی تو پرائیویٹ سیکٹر کی صنعتیں خود کو تنی تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن نہیں کر سکتی تھیں۔ بینکوں کے نیشنلائزیشن کے بعد سے تو دارتی ساکھ INSTITUTIONAL CREDIT کے لیے بھی پرائیویٹ سیکٹر پبلک سیکٹر پر منحصر ہو گیا ہے۔

۳۱ مارچ ۱۹۸۴ء کو مرکزی سرکار کے ۲۱۴ پبلک سیکٹر کے ENTERPRISES تھے۔ ان میں سے ۱۴۶، انٹرپرائزز اشیاء کی پیداوار بڑھانے اور فروخت کرنے کا کام" اور مصروف کار ۵۵ انٹرپرائزز خدمات پیش کرنے کا کام نجام دے رہے تھے۔ پہلی یوجنا کے آغاز سے لیکر یسے انٹرپرائزز کی تعداد اور ان میں پونجی کی لاگت کا اضافہ مندرجہ ذیل رہا ہے:۔

مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ پبلک سیکٹر میں پونجی کا انوسٹمنٹ INVESTMENT دوسرے منصوبے کے بعد تیزی سے بڑھا ہے۔ اس سیکٹر کے صنعتی یونٹوں کے ذریعے حاصل شدہ منافع کو عموماً انکی صلاحیت کو بڑھانے کی غرض سے سرکار نے دوبارہ اسی میں لگا دیا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان مشین ٹولز نے اپنے منافع کو دوبارہ انوسٹمنٹ کرکے اپنے یونٹوں میں اضافہ کر لیا ہے۔ پیداوار PRODUCTION کو مزید بڑھا کر نقصان کی صورتِ حال ختم کرنے کی کوشش بھی پبلک سیکٹر کے اداروں نے کی ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر کی فطرت مالی بحران کے وقت کم پیداوار کرکے زیادہ منافع حاصل کرنے کی رہتی ہے۔ لیکن سرکار کے زیرِ انتظام صنعتوں میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ نجی سیکٹر کی توجہ زیادہ منافع حاصل کرنے پر مرکوز رہتی ہے۔ اس لیے معمولی منافع صنعتوں میں صنعت کار سرمایہ بقول انہی کے پھنسانا نہیں چاہتے۔ سرکار نے پسماندہ علاقوں اور لمبی مدت میں منافع فراہم کرنے والی صنعتوں میں پونجی لگا کر علاقائی نابرابری کو کافی حد تک دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ آمد و رفت اور نشر و اشاعت کے ذرائع اور بجلی کی پیداوار کی جانب فوری دھیان دے کر سرکار نے صنعتی فروغ کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کر دی ہے۔ بیرونِ ملک سے درآمد کی جانے والی کئی چیزوں کی ملک میں ہی تیاری شروع ہو جانے سے بھارت اقتصادی طور پر خود کفالت حاصل کرنے کی طرف گامزن ہوا ہے۔ تیل اور قدرتی گیس کمیشن بڑے پیمانے پر معدنی تیل حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ سرکار کے ذریعے قائم شدہ سائنسی تجربہ گاہوں اور صفائی مراکز نے صنعتی تکنیک کی ترقی میں کافی مدد ملی ہے۔ جوہری توانائی کمیشن نے جوہری دھماکہ کرکے اور خلاء میں سیارچہ چھوڑ کر بھارت کی سائنسی کامیابیوں پر مہرِ ثبت کر دی ہے۔ ایسا کرنے سے نہ صرف ہندوستانی عوام کو مستفید ہونے کا موقع مل رہا ہے بلکہ دیگر ممالک میں بھارت کا وقار بھی بڑھا ہے اور ترقی پذیر ممالک کی صف میں بھارت نمایاں مقام حاصل کرنے لگا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بغیر سرکاری تگ و دو اور مساعی کے بھارت کی برآمدات میں زیادہ اضافہ نہ ہوا ہوتا۔ صوبائی ٹریڈ کارپوریشن، STATE TRADE CORPORATION اور منرل و میٹل ٹریڈ کارپوریشن MINERAL ANI METAL TRALE CORPORATION جیسے سرکاری اداروں کی محنت اور کوشش سے ہی نئے بازاروں کو تلاش کیا جا سکا ہے جس کی وجہ سے بھارت میں تیار شدہ مال دنیا کے ہر گوشے میں پہنچنے اور زرِ مبادلہ کمانے لگا ہے۔ پبلک سیکٹر کی صنعتوں کی ایک اور نظریے سے بھی بہت اہمیت ہے۔ اس کے ذریعے اقتصادی نابرابری دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔ معاشی بحران کو کم کرنے کا موقع میسّر آتا ہے۔ اس طرح صرف چند گنے چنے لوگوں کے ہاتھوں میں صنعت و حرفت، تجارت و منافع کٹھ پتلیاں بن کر نہیں رہ پاتے۔ مرکزیت کا رجحان پنپنے نہیں پاتا۔ اس سیکٹر کا مقصد منافع کمانا نہ ہو کر عوام کی بھلائی ہوتا ہے۔ اس طرح اس سیکٹر کے ذریعہ پیدا شدہ اشیاء کم قیمت پر بھی جنتا کو مہیا کرائی جا سکتی ہیں۔ سماج وادی سماج کے قیام کا مقصد بھی سرکار پبلک سیکٹر کو توسیع دے کر ہی پورا کر سکتی ہے۔

منصوبہ جات (پنجسالہ)	لگی ہوئی کل پونجی کروڑ روپوں میں	انٹرپرائزز کی تعداد
پہلی یوجنا کے شروع میں	۲۹	۵
دوسری یوجنا کے آغاز پر	۸۱	۲۱
تیسری یوجنا کی ابتدا میں	۹۵۳	۴۸
چوتھی یوجنا کے شروع میں	۳۹۰۲	۸۵
پانچویں یوجنا کے آغاز پر	۶،۲۳۷	۱۲۲
چھٹی یوجنا کے شروع میں	۱۸،۲۲۵	۱۸۶
۳۱ مارچ ۱۹۸۴ء کو	۳۵،۴۱۱	۲۱۴

یہ بھی ظاہر ہے کہ موجودہ دور میں بے روزگاری اور بے کاری کا مسئلہ بھی کافی حد تک پبلک سیکٹر حل کر سکتا ہے کیوں کہ پبلک سیکٹر میں بھاری صنعتوں کے تحت چھوٹی چھوٹی صنعتیں بھی سرگرم رہتی ہیں، جن میں سے کچھ پرائیویٹ ہاتھوں میں بھی ہوتی ہیں۔ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کو روزگار فراہم کرانے کے لیے چھوٹی چھوٹی صنعتیں (کم لاگت والی) اہم کردار ادا کر سکتی ہیں اور کسی حد تک ادا کر بھی رہی ہیں۔ ملک کے روشن مستقبل اور عوام کی خوشحالی کا انحصار پبلک سیکٹر پر کافی حد تک ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری مربوط مساعی اور متحدہ کوششیں ہی کسی بھی ملک کو باوقار، عظیم تر اور بڑا بناتی ہیں۔

پبلک سیکٹر کی غیر تسلی بخش کارکردگی

کثیر رقوم انوسٹ کرنے کے باوجود پبلک سیکٹر کی زیادہ تر صنعتوں میں مناسب طور پر پیداوار میں اضافہ نہیں ہوا ہے۔ اس لیے کم قیمت پر اپنا مال عوام کو مہیا کرانے اور ترقی کے لیے پونجی فراہم کرانے میں وہ کامیاب نہیں رہی ہیں۔ مثلاً نیشنلائزیشن کے بعد تیرہ سالوں میں کول انڈسٹری میں تقریباً چھ ہزار کروڑ روپے کی قومی دولت کھپائی گئی ہے حالانکہ پونجی کی کھپت میں سو گنا سے زیادہ اضافہ ہوا ہے لیکن پیداوار ۷۰ کروڑ ٹن سے ۱۵۴ کروڑ ٹن یعنی صرف دوگنی ہی ہوئی ہے۔ اس مدت میں یومیہ مزدوری سولہ روپے سے بڑھ کر ۹۸ روپے یومیہ ہو گئی ہے۔ لیکن کوئلے کی فی کس پیداوار ۵۴ء سے ۵۲ء ٹن (انڈر گراؤنڈ کانوں کے لیے) رہ گیا ہے۔ چین میں یہ زر اوسطاً دو ٹن فی کس ہے۔ نیشنلائزیشن سے قبل صرف ۵۰ کروڑ روپے کے انوسٹمنٹ سے ۷۷ کروڑ ٹن کوئلہ پیدا ہوتا تھا اور ۵،۵۰،۰۰۰ ملازمین اس صنعت میں لگے تھے۔ اب ۶ ہزار کروڑ روپے کے انوسٹمنٹ سے صرف ۱۵۴ کروڑ ٹن کوئلے کی پیداوار اور ۷ لاکھ لوگوں کو روزگار، پبلک ENTERPRISES کی نااہلیت اور بہترین صلاحیت کے فقدان کا جیتا جاگتا ثبوت پیش کرتا ہے۔ صرف کول انڈسٹری ہی سرکار کو گذشتہ بارہ سالوں میں ۱۲۸۰ کروڑ روپے کا خسارہ دے چکا ہے۔ یہ حال تب ہے جب سرکار نے کوئلے کی قیمت میں اندھا دھند اضافہ بھی کیا ہے۔ اس باعث برقی پیداوار پر بھی بہت زیادہ لاگت آنے لگی ہے، کیونکہ بجلی کا انحصار بھی کوئلے پر ہے اور بجلی پر منحصر مل کارخانے بھی اخراجات کے بوجھ سے دبے چلے جا رہے ہیں۔ عام آدمی کی کمر اصولاً مہنگائی کے بوجھ سے دوہری ہوئی جا رہی ہے۔

پبلک سیکٹر کی زیادہ وسعت آج سرکار کے لیے مصیبت کا باعث بنا ہوا ہے۔ فی الواقع سماج واد کے نام پر بجی سیکٹر کی صنعتوں کا اندھا دھند نیشنلائزیشن کر لیا گیا۔ سماج وادی ممالک نے منصوبہ بند اور منظم طریقوں سے کافی ترقی کر لی تھی۔ اسے بنیاد مانتے ہوئے اس ملک میں بھی پنج سالہ منصوبے شروع کیے گئے۔ بھارت میں صنعتی بنیاد قائم کرنے کے لیے ابتدائی صنعتوں کا قیام ضروری تھا۔ اس لیے بجلی اور فولاد جیسے ادیوگوں میں سرکار بڑے پیمانے پر پونجی لگانا بالکل صحیح قدم تھا۔ لیکن جن صنعتوں میں پرائیویٹ سیکٹر صحیح کام کر رہا تھا ان صنعتوں کا بھی نیشنلائزیشن کر کے سرکار نے عقلمندی کا کام نہیں کیا۔ مزدوروں کو بے روزگار ہونے سے بچانے کے لیے بجی سیکٹر کے بیمار یونٹوں کو اپنے ہاتھ میں لینے کی پالیسی بھی دیش کے مفاد میں نہیں ہے۔ اس سلسلے میں موجودہ سرکار کی سوچ میں صحیح سمت میں تبدیلی آئی ہے — ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو قومی پیداوار کونسل NATIONAL PRODUCTION COUNCIL کی قومی کانفرنس میں وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے کہا ہے کہ سرکار مستقبل میں کسی بیمار صنعت کو اپنے کنٹرول میں نہیں لے گی اور خراب مال تیار کرنے والوں سے سختی سے نمٹے گی۔ انھوں مزید کہا کہ صنعت کاروں کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ساری پونجی نکالنے کے بعد بیمار صنعت کو سرکار کے حوالے کر کے گلو خلاصی نہیں کرا سکتے! واقعی کچھ مزدوروں کی نوکری برقرار رکھنے کے لیے کروڑوں روپے کی لاگت سے بیمار ادارہ (EN TERPRISES) چلائے رکھنا قطعی نامناسب ہے۔ جبکہ اتنی ہی رقم سے اس سے کہیں زیادہ لوگوں کو "پیداواری" روزگار دیا جا سکتا ہے۔ صلے پیسے سے اپاہج صنعت کو بیساکھی فراہم کرنا سماج واد SOCIALISM نہیں ہے۔ "سوشلزم" لفظ کا اب تک کافی غلط استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس طرح کے سماج واد کی قیمت عام آدمی کو ہی زیادہ ٹیکس یا مہنگائی کے روپ میں ادا کرنا پڑتی ہے۔!!

ماہرین اقتصادیات کے خیالات میں اختلاف اور تضاد ہونے کے باوجود کسی نہ کسی نکتے پر اتفاق بھی ضرور ہو سکتا ہے۔ وہ نکتہ پبلک سیکٹر کی اچھائیوں، خوبیوں اور کامیابیوں کا محور بھی ہو سکتا ہے اور اس کی خامیوں، ناکامیوں اور برائیوں کا مظہر بھی! تاہم مذکورہ بالا عبارت سے تو یہی مترشح ہے کہ ماہرین کی رائے میں پبلک سیکٹر کی کارکردگی مایوس کن نہیں تو غیر تسلی بخش ضرور ہے — مندرجہ ذیل سطور میں ہم ان نکات اور اقدامات کا سرسری تذکرہ کریں گے، جو اقتصادیات کے ماہرین نے متفق الرائے ہو کر تجویز کیے ہیں، جنھیں عام عقل بھی بہ آسانی تسلیم کرے گی۔

پبلک سیکٹر کی کارکردگی کو مزید بہتر بنانے کیلیے ضروری اقدامات اور تدابیر و تجاویز :-

اس وقت پبلک سیکٹر کو از سر نو منظم

کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ سرکار پر جن بیمار صنعتوں کی ذمہ داری ہے یا جن سے جزوی طور پر خصوصی تعلق ہے، ان کے بارے میں پھر سے غور کیا جانا چاہیئے کہ انھیں چالو رکھنا ضروری بھی ہے یا نہیں؟ جہاں سرکار کا تعلق ہلکا سا ہے وہاں کوشش کی جانی چاہیئے کہ انٹر پرائزز سے سرکاری تعلق ختم ہو! سرکار جن صنعتوں کو پبلک سیکٹر میں رکھنا ضروری سمجھتی ہے ان میں بھی نجی سیکٹر یا دیگر ممالک کے پیمانوں کے مطابق کام لیا جانا چاہیئے! مزدوروں کی پیداواری صلاحیت اور تکنیکی مہارت کو بڑھانے کے لیے خصوصی اقدامات کئے جانے چاہئیں۔ متعلقہ کام کے لیے اہلیت وصلاحیت کی کسوٹی پر جو کھرا اُترے، اُسے ہی اس نوکری میں رکھا چاہیئے۔ ضرورت سے زیادہ کرمچاریوں کو نہیں رکھا جانا چاہیئے۔ فالتو لوگ نہ تو خود کام کرتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو کام کرنے دیتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ فالتو لوگوں کو کان پکڑ کر باہر کر دینا چاہیئے بلکہ انھیں کسی دوسرے ایسے یونٹ میں ایڈجسٹ کر دیا چاہیئے جہاں ملازمین کی کمی ہو! اس طرح کے ایڈجسٹمنٹ سے ملازمین کی کارکردگی بھی بہتر ہوگی اور یونٹ کی پیداواری صلاحیت میں بھی اضافہ ہوگا۔

پبلک سیکٹر میں ماہر اور محنتی منتظمین کی کمی کو فوراً دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے، سرکار کو یہ بھی سوچنا ہوگا کہ حکومت چلانا اور کل کارخانوں کا انتظام سنبھالنا دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس لیے صنعت کو سیاست سے الگ رکھنا پڑیگا مکمل طور پر پبلک سیکٹر کو سیاسی ہتھکنڈوں سے نہ بچائے رکھا گیا تو گھاٹے یا نقصان کے نظام کو ہی کامیابی کا راستہ تسلیم کرنا پڑے گا۔

انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس کے عہدیداروں کو جو پیشہ ورانہ کامیابی کے راز سے اکثر ناواقف ہوتے ہیں پبلک انٹرپرائزز کا چیئرمین یا صدر نہیں بنانا چاہیئے۔ سرکار کو ایک بھارتی انتظامیہ سروس کا قیام عمل میں لانا چاہیئے اور صنعتوں کی نیچر کے مطابق ہی اس سروس کے عہدیداروں کو کئی گروپس میں بانٹ دینا چاہیئے۔ عمر کی حد کو مناسب طور پر بڑھا کر مقرر کرنا چاہیئے اور نجی سیکٹر کے منتظمین (، ۱۹۸۸) کو بھی شروع میں اس سروس میں لیا جانا چاہیئے۔ منتظموں کو حالات کے مطابق فیصلے لینے کی مکمل آزادی حاصل ہونی چاہیئے اور ان کے کام کا محاسبہ آخری نتیجے کی بنیاد پر کرنا چاہیئے۔

اگر کرمچاریوں میں اپنے فرائض کے تئیں ذمہ داری کا احساس بھر دیا جائے، ان میں سماجی شعور بیدار کر دیا جائے، انھیں سماج کے ذریعے محاسبے کا خوف دلایا جائے، ان کے اپنے ضمیر کے تئیں جوابدہی کا احساس بھی دلایا جائے، انھیں اخلاقی تعلیم کے ذریعے ایمانداری اور دیانتداری کا جذبہ بیدار کیا جائے، جو ملازمین کو جوابدہی کے احساس سے بھی روشناس کرائے۔ اس طور سے اگر سارے ملازمین کو ڈسپلن میں رہ کر اپنے فریضہ سے سبکدوش ہونے کا سلیقہ سکھا دیا جائے، انھیں عوامی خدمت اور فلاح وبہبود کے لیے تیار کیا جائے اور ایماندار، محنتی، ہمدرد، فرض شناس اور بے غرض لوگوں کو انتظامیہ کے لیے منتخب کیا جائے، تو یقیناً پبلک سیکٹر کے ذریعہ ایک ایسا خوشگوار انقلاب آجائے گا، جو ملک وقوم کی سدا بہار خوشحالی، دائم ترقی اور امن وسکون کا ضامن ثابت ہوگا!!

بقیہ: سماج اور اقبال

بنالینا اس صورت میں بالکل بے سود ہے جب دل مذہبی جذبہ سے خالی ہو۔ دیکھو حضرت محمدؐ کے عہدِ مبارک میں کعبے کی معمولی دیواریں تھیں۔ کھجور کے پتّے کی چھت اور کھجور کے تنے ہی جابجا ستونوں کا کام انجام دے رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے تک مسجد نبوی بھی اسی حالت میں رہی۔ بنو اُمیّہ کے زمانہ میں کعبہ اور مسجد نبویؐ کی عالیشان عمارتیں بنیں پھر تکلفات بڑھتے گئے اور مذہبی رُوح گھٹتے گھٹتے آخری حد پر پہنچ گئی۔ مقصودِ حقیقی معنویت ہے نہ کہ ظاہرداری سے

مجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی

یہ جو نئی تہذیب ہے یہ شیشہ بنانے والوں کی کارگاہ ہے اسے تباہ کر دینا ہی ضروری ہے اور تباہ کر دینے کی کیا صورت ہے؟ یہ کہ مشرق کے شاعر کو دیوانگی کے طریقے سکھا دو یعنی وہ ایسا پیغام دے کہ لوگوں میں جنوں کی ایک خاص کیفیت پیدا کر دے اور وہ اس بے جان کارگاہ کو ریزہ ریزہ کر ڈالے۔ اس لیے کہ جب تک یہ تہذیب نہیں مٹے گی اس وقت تک یہ مصیبتیں دُور نہ ہوں گی جو اس تہذیب کے باطل اقتصادی نظام نے عوام میں پیدا کر دی ہیں۔ مختصر یہ کہ اگر تینوں نظموں کو غور سے دیکھا جائے تو یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا کہ لینن کی زبان میں سرشاری، لغاست، جذباتیت شکائیت، طنز اور شوخی کے عناصر شامل ہیں۔ فرشتوں کا گیت سراپا پیام ہے

ڈاکٹر قمر الدین*



پانچسالہ منصوبے اور سماجی تبدیلی

ایشیا اور افریقہ کے نئے آزاد شدہ ممالک کے حالات پر نظر ڈالیے ہندستان سیاسی و معاشی ترقی اور سماجی بیداری کے لحاظ سے بالکل نمایاں حیثیت کا حامل ملک نظر آئے گا۔ یہ نمایاں حیثیت ان سربراہوں کی دین ہے جنھوں نے انتہائی دانشمندی اور دور اندیشی کا ثبوت دے کر ملک کی ہمہ جہت ترقی کے لیے پانچ پانچ سالہ منصوبے تیار کیے اور انتہائی استقلال کے ساتھ اپنی منزل پر گامزن رہ کر زندگی کے ہر میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

ملک جس وقت آزاد ہوا تھا سینکڑوں مسائل انتہائی بھیانک اور بظاہر ناقابل حل محسوس ہو رہے تھے لیکن واہ رے ہمارے سربراہوں کی دُور اندیشی۔ قوتِ ارادی استقلال اور خود اعتمادی کر ساری خامیوں، روپیہ، ماہرین، کچے مال اور مشینوں کی کمی کے باوجود

"ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم" کے مصداق قوتِ فکر و عمل کو بروئے کار لاکر کام شروع کر دیا اور بقول شاعر ؎

اراد ے کوہ شکن فولاد جیسے دست و بازو ہیں
میں لنگر کھولنے والا ہوں طوفاں کو بتا دینا

یہ وہ نازک دَور تھا جب پوری قوم سینکڑوں سال کی غلامی کی گہری نیند سے بیدار ہوئی تھی ہزاروں مسائل تھے عام انسان آزادی کی اس فضا اور ملک کی تعمیرِ و ترقی میں اپنے رول کی اہمیت سے ناواقف اور غیر مانوس تھا لیکن پھر بھی کام شروع کیا راہ میں رکاوٹیں آئیں لیکن عزم کا عالم یہ تھا کہ:-

وہ عزم رکھتا ہوں جو حادثوں میں پلتا ہے
ہوائے تند میں میرا چراغ جلتا ہے

پانچ سالہ منصوبوں کے ذریعہ جس قدر بھی مقصد کی تکمیل ہوتی رہی اسی پر اکتفا کر کے صبر و شکر کے ساتھ آگے کے لیے گامزن ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک نے ہر میدان میں نمایاں ترقی کی۔ اگر ہم ۱۹۴۷ء اور آج کے حالات کا تقابلی مطالعہ کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ معاشی میدان میں ہم نے حیرت انگیز ترقی کی ہے عوام کی حالت پہلے کے مقابلے میں ہر لحاظ سے بہت بہتر ہے۔ صنعتی ترقی میں ہم دنیا کے نئے آزاد شدہ ممالک میں سب سے آگے ہیں اور فخر کی بات یہ ہے کہ بڑی سے بڑی ضرورت کی تکمیل کے لیے خود کفیل ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اس قدر بڑی آبادی کے باوجود خوراک میں خود کفیل ہوئے ہیں۔ ملک کا سیاسی ڈھانچہ انتہائی مستحکم ہے۔ سیاسی معاملات میں عوام میں غیر معمولی بیداری اور شعور پیدا ہوا ہے اور ہمارا سیاسی ڈھانچہ بھی بلاشبہ دنیا کے نئے آزاد شدہ ممالک کے مقابلے میں شاید سب سے زیادہ مضبوط ہے۔ سماجی نابرابری جو ۱۹۴۷ء میں ناقابل یقین حد تک تھی، اب کم ہوتے ہوتے اس حد تک کم ہو گئی ہے کہ بقول شخصے "شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پی رہے ہیں"۔ اس کی نمایاں مثالیں ہمیں دیہات میں خصوصاً ملیں گی جہاں سماجی تبدیلی ناقابل یقین حد تک رونما ہو چکی ہے۔ سماج کے کمزور طبقات اور بالخصوص صفائی کے کاموں سے وابستہ افراد کے ساتھ جو سلوک سماج میں ہوتا تھا وہ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ لیکن آج وہ حالات بڑی حد تک تبدیل ہو چکے ہیں۔ ان پیشوں سے متعلق لوگوں کے بچے تعلیم سے فیض یاب ہوتے ہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں حیثیت سے اہم رول ادا کر رہے ہیں ان کے معیار زندگی میں زمین آسمان کا فرق آ چکا ہے جسے ہر گاؤں اور شہر میں نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہمارے سماج کے پیشہ ور لوگوں کی معاشی اور سماجی حالت بھی کچھ بہت اچھی نہ تھی، اب حکومت کی منصوبہ بند اسکیموں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سماجی نقطۂ نظر سے یہ طبقات

---

* ریڈر، ڈی ایم ای، ایس ڈی پی، این سی ای آر ٹی، سری اربندو مارگ، نئی دہلی۔

[illegible] آگے بڑھ چکے ہیں۔ غریب طبقات کے افراد کا امراء اور زمینداروں کے ساتھ جس طرح کا تعلق تھا اس میں نہایت خوشگوار تبدیلی آئی ہے جو لوگ پہلے زمیندار کے سامنے زمین پر بیٹھتے تھے وہ اب برابر کے حقدار ہیں۔

کمزور طبقوں کا استحصال بڑی حد تک کم ہو چکا ہے سماجی مرتبہ کا تصور بالکل بدل چکا ہے۔ چھوا چھوت کا تصور تقریبًا ختم ہو چکا ہے اور ذات پات کی بنا پر سماجی تقسیم کا تصور بھی قریب قریب آخری سانسیں لے رہا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر تعلیمی بیداری عام ہوئی ہے۔ معاشی حالات بہتر ہوئے ہیں۔ معیارِ زندگی بلند ہوا ہے بیشتر دیہات سڑکوں اور ریلوں کے ذریعہ شہروں سے جڑ گئے ہیں اور عام نقطۂ نظر سے زندگی میں ہر لحاظ سے بہتر تبدیلی رونما ہوئی ہے۔

ہم عام طور پر مسلمانوں کی تعلیمی بدحالی کا رونا روتے ہیں۔ دیہات میں جاکر دیکھئے خصوصًا شمالی ہند میں آج شاید ہی دیہات میں رہنے والے کسی مسلمان کا بچہ غیر تعلیم یافتہ ہو۔ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ساتھ وہ بھی دیہات کے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ ہاں بلاشبہ وہ اُردو سے ناواقف اور دینی تعلیم سے محروم ہیں۔ بلاشبہ لڑکیوں کی تعلیم کے معاملے میں ابھی دیہات بہت پیچھے ہیں لیکن پہلے کے مقابلے میں اس سلسلہ میں بھی صورتِ حال کچھ بہت مایوس کُن نہیں ہے۔ اس لیے کہ لازمی تعلیم کی پالیسی کے نتیجے میں اسکولی تعلیم کی اکثریت یعنی تقریبًا ۹۰ فیصد آبادی کو اپنے رہائش کے ایک کلومیٹر کے دائرے میں تعلیمی سہولت حاصل ہے، اسی طرح اعلیٰ تعلیم کے اداروں کی تعداد میں بھی معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔

مسلمانوں کے بارے میں عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں ہندوؤں کی طرح ذاتیں نہیں ہیں۔ اور ان میں سماجی برابری کا تصور کارفرما ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مسلمان بھی اعلیٰ اور ادنیٰ دو طبقات میں تقسیم ہیں اور یہ تقسیم نتیجہ ہے عرب سے چلنے کے بعد ایران اور افغانستان کے قبائلی نظام اور ہندوستان کے ذات پات کے نظام کے اثرات کا۔ بقول پروفیسر محمد حبیب "مسلمانوں نے ہندوستان کو سیاسی حیثیت سے تو فتح کر لیا تھا لیکن وہ خود ہندوستانی سماج کے ہاتھوں شکست کھا گئے" اور یہ شکست تھی ہندوستانی سماج میں رائج اونچ نیچ اور ذاتوں میں تقسیم کے نظام کو مکمل طور پر قبول کرنا۔ اس لیے کہ آج مسلمان قطعی ہندوؤں کی طرح ذاتوں میں تقسیم ہیں جو پیشوں پر مشتمل ہیں۔ شادی بیاہ اور دیگر سماجی تعلقات ذاتوں کی بنیاد پر ہی قائم ہیں۔ پچھلے زمانے میں شیخ سید مغل اور پٹھان اونچی ذات کے اور جملہ دیگر پیشہ ور لوگ نیچی ذات کے لوگ کہلاتے تھے۔ کسی زمانے میں ان طبقات میں نابرابری انتہائی عروج پر تھی جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے لیکن تقسیم ملک کے بعد یہ حالات تقریبًا مکمل طور پر تبدیل ہو چکے ہیں اور مزید تبدیلی کی طرف گامزن ہیں۔ ذاتوں کے تصور میں معیارِ زندگی میں بہتری کی بنیاد پر جو تبدیلی آئی ہے اسے مزاحًا ایک شعر کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ شعر ہے ؎

اولاً ندّاف بودم بعد ازان گشتیم شیخ
غلّہ چوں ارزاں شود امسال سیّد می شویم

ایک طرف یہ شعر مسلم سماج کی تقسیم کی عکاسی کرتا ہے تو دوسری طرف معیارِ زندگی کے بہتر ہونے کے ساتھ ساتھ تبدیلیِ ذات کے تصور کی طرف۔ بہرحال یہ تبدیلی خوشگوار رہی ہے اور دھیرے دھیرے سماجی نابرابری کا یہ تصور ختم ہو رہا ہے طبقاتی تقسیم اپنی موت آپ مر رہی ہے اور ذاتوں کے تصور میں بھی تبدیلی رونما ہو رہی ہے

قابلِ فخر بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں ہم جن حالات سے دوچار تھے ان پر ہم نے بڑی حد تک قابو پا لیا ہے۔ ملک کے ہر فرد بشر کو معاشی اور صنعتی ترقی اور سماجی تبدیلی کے عمل میں شریک کیا ہے۔ ۴۰ سال سے بھی کم مرحلہ میں ملک کے ہر فرد کو ایک ذمہ دار شہری کی حیثیت سے ملک کے مسائل اور ان کے حل میں اور ملک کی ہمہ جہتی ترقی میں احساسِ ذمہ داری کے ساتھ شریک کیا ہے۔ ہمارے رہنماؤں نے اس ترقی اور تبدیلی کے عمل کو عوام کی اس کثیر تعداد پر لادا نہیں بلکہ ہر شہری کو سیاسی، سماجی اور معاشی حیثیت سے بیداری عطا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اسے ایک ذمہ دار رول عطا کیا ہے۔ اس طرح جمہوری نظام کے ساتھ معاشی اور صنعتی ترقی اور سماجی تبدیلی کا یہ تجربہ اس حد تک کامیاب رہا ہے کہ آج ہندوستان کو اپنے اندرونی اور بیرونی مسائل کے باوجود دنیا کی کامیاب ترین اور عظیم ترین جمہوریت کہلانے پر فخر ہے اسی کے ساتھ ساتھ سماج کے کمزور ترین طبقات کی معاشی ترقی، تعلیمی بہتری، سیاسی بیداری اور سماجی تبدیلی پر حکومت نے خصوصی توجہ دی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آبادی کی اس عظیم قوت کے اندر بیداری پیدا کر کے اسے احساسِ ذمہ داری سے روشناس کرایا ہے۔ کھیتی کی ترقی اس حد تک ہوئی ہے کہ عظیم آبادی والا یہ ملک نہ صرف اناج کے معاملے میں خودکفیل ہو گیا ہے بلکہ شاید مستقبل قریب میں وہ اناج برآمد کرنے کی پوزیشن میں آجائے۔ اسی طرح صنعتی میدان میں ہم خودکفیل ہوئے ہیں اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے جسے دوست اور دشمن سبھی سراہتے ہیں اور اس کامیابی کا سہرا یقینًا ایک طرف ہمارے رہنماؤں

[illegible] ملک کے ہر
[illegible] عوام کی شرکت کے احساس نے بہت
[illegible] دار رول ادا کیا ہے۔

ملک کے عوام کے دلوں میں سماجی تبدیلی کے اس احساس کو بیدار کرنا اور اس تبدیلی اور ترقی میں انھیں شریک کرنا اتنی بڑی کامیابی ہے جس کی مثال ہمیں دنیا کے نئے آزاد شدہ ممالک میں کہیں نہیں ملتی۔

ہم نے ان سب میدانوں میں بلاشبہ ترقی پذیر ممالک کے لیے تو ایک مثال قائم کی ہی ہے۔ لیکن بعض معاملات میں ہم کسی طرح بھی ترقی یافتہ ممالک کے پیچھے نہیں ہیں۔ سماجی بیداری معاشی ترقی اور سیاسی شعور کسی خاص طبقہ تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ بلا لحاظ مذہب ملت اور بلا امتیاز سماجی مرتبہ مرد عورت، بوڑھا جوان غریب امیر غرض ہر فرد اس عمل میں شریک رہا ہے اور اس سے مستفید ہو رہا ہے اور بلاشبہ آج کا مورخ فخر کے ساتھ سر اٹھا کر یہ کہہ سکتا ہے کہ گذشتہ تقریباً ۵۰ سال میں ہندوستان ایک سماجی جمود، روایتی غریبی اور جہالت اور زمینداری نظام کے شکنجے سے نکل کر ایک جمہوری دور میں داخل ہوا ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

کسی بھی سماج میں سماجی تبدیلی قدیم روایات، رسوم و رجحانات کو ختم کر کے نئے رجحانات کو جنم دیتی ہے۔ ہندوستان میں سماجی تبدیلی کے اس عمل کے حیرت انگیز نتائج بر آمد ہوئے ہیں۔ قدیم زمینداری اثرات اور ذات پات کے بندھن خود دھیرے دھیرے ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ ۵۰ سال پہلے ہم جن باتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے وہ آج وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔ جو لوگ سماجی تقسیم کے سخت ترین [illegible] حالات کے [illegible] ہوئے وقت اور حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے۔

ایسے لوگوں نے شروع شروع میں اس تبدیلی کو بڑے کڑوے گھونٹ کی طرح پیا تھا اور بیب قیامت اور کل یگ کے حوالے دیئے تھے، لیکن دھیرے دھیرے وہ لوگ بھی اس تبدیلی کو نہ صرف بخوشی قبول کر رہے ہیں بلکہ اس کے عمل میں شامل ہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے منصوبوں کے جملہ مقاصد حاصل کر چکے ہیں اور اب مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس کامیابی نے ہمارے نوجوانوں اور خواتین میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ ہمارے پاس بے پناہ ذہنی، جسمانی اور مادی صلاحیتیں اور ذخائر ہیں۔ ہم اپنے عظیم انسانی وسائل کی دولت سے مالا مال ہیں۔ قدرت نے ہمیں معدنی ذخائر سے فراخدلی کے ساتھ نوازا ہے۔ اتحاد و اتفاق کی قوت عطا کی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم کسی بھی قومی مسئلے کے حل کے لیے ہمیشہ اپنے سارے اختلافات کو ختم کر کے ملک کی حفاظت بڑی قربانیوں کے بعد حاصل شدہ آزادی اور ترقی کے لیے سب کچھ بھول کر اتحاد و اتفاق کے ساتھ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں بنہایت دور افتادہ مقامات پر رہنے والے افراد بھی آج ملک کے مسائل سے بے خبر نہیں ہیں اور انھیں ملکی مسائل کے حل میں اپنے رول کی اہمیت کا احساس ہے۔

وہ دن دور نہیں جب ہندوستان اپنے جملہ وسائل کو استعمال کر کے سماجی، معاشی اور صنعتی لحاظ سے دنیا کے صف اوّل کے ملکوں میں کھڑا ہوگا اور اپنی طاقت کو محض اپنے ملک کی فلاح کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے [illegible] کے صرف کرے گا [illegible] دور میں بھی کہ ہمارے اپنے مسائل کم نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اپنے وسائل کا [illegible] حصہ دوسرے ملکوں کی دکھی انسانیت کو سکون پہنچانے میں صرف کر رہے ہیں۔

بقیہ: نیا تعلیمی رجحان اور اسکا ڈھانچہ

(۳) تعلیم کے دوران طالب علم کے ذوق کا خیال رکھتے ہوئے اسے تعلیم دی جائے۔

(۴) تعلیم کے میدان میں زیادہ سے زیادہ آسانیاں فراہم کی جائیں۔

(۵) طالب علموں پر نصاب کا بوجھ ہلکا کیا جائے۔

(۶) تعلیم کو سیاست سے دور رکھا جائے۔

(۷) اگر ممکن ہو تو یونیورسٹیوں میں داخلے سے قبل لیاقت کے امتحان لیے جائیں۔

(۸) ابتدائی درجات میں کہانیوں اور تصویروں کی مدد سے تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔

(۹) ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر بنایا جائے۔

(۱۱) نصاب کو مذہبی تعصب سے پاک و صاف رکھا جائے۔

(۱۲) اساتذہ کو پابند کیا جائے کہ وہ ٹیوشن کی لعنت سے دور رہیں۔

(۱۳) طالب علموں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھتے ہوئے نئے اسکول کھولے جائیں۔

(۱۴) ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ اساتذہ اپنے فرائض بخوبی انجام دے سکیں۔

(۱۵) درجہ ۵ درجہ ۸ اور درجہ ۱۰ کے بعد طالب علموں کو ہلکے پھلکے روزگار مہیا کئے جائیں۔

(۱۶) اُن اساتذہ کے لیے جن کے تبادلے ہوتے رہتے ہیں سرکاری مکانات فراہم کئے جائیں۔

ڈاکٹر بی۔ این۔ سنگھ*

ہندوستان میں ٹریڈ یونین تحریک

ہندوستان کی مشترکہ معیشت میں ٹریڈ یونین ازم نہ تو خالص "بزنس ازم" کی عکاسی کرتا ہے، جو ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ٹریڈ یونین ازم کرتا ہے نہ انتہا پسندانہ یونین ازم" کی جو غیر سرمایہ دارانہ ممالک میں پایا جاتا ہے۔ ہندوستانی ٹریڈ یونین ازم تو ان دونوں کے بیچ کی چیز ہے۔

ٹریڈ یونینوں کی فیڈریشنیں

ہندوستان میں لیبر تحریک کی معراج ٹریڈ یونینوں کی قومی فیڈریشنیں ہیں مثلاً اے آئی ٹی یو سی (آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس)، آئی این ٹی یو سی (انٹک یا انڈین نیشنل ٹریڈ یونین کانگریس) ایچ ایم ایس (ہند مزدور سبھا)، وغیرہ۔ اے آئی ٹی یو سی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے زیرِ سایہ کام کرتی ہے۔ چونکہ خود کمیونسٹ پارٹی میں سن چالیس کے بعد سے نظریاتی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اس لیے اے آئی ٹی یو سی پر بھی اس کی چھاپ ہے۔ دراصل اے آئی ٹی یو سی کمیونسٹ پارٹی کی پالیسیوں کی بھی عکاسی کرتی آئی ہے اور اس کے اندرونی اختلافات کی بھی۔ لیکن جہاں اس کی اپنی پارٹی کی حکومت ہے وہاں اے آئی ٹی یو سی نے اشتراک و تعاون کا راستہ اختیار کیا ہے اس لیے اس کا طریق کار پُر زور مخالفت اور مکمل تعاون کے درمیان بدلتا رہتا ہے۔ انٹک (آئی این ٹی یو سی) کا آدرش صنعتی تعلقات میں گاندھیائی روایت کی پیروی کرتے ہوئے سچائی اور عدم تشدّد پر زور دینا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ انٹک کے بنیادی مقاصد "سروودئے" کے فلسفے سے روشنی حاصل کی ہے۔ لیکن اس کا ایک طبقہ، جو کانگریس سیوں اور کانگریسی سوشلسٹوں پر مشتمل ہے، ہڑتال کا سہارا لینے کی اجازت دیتا ہے انٹک اور دیگر فیڈریشنوں میں بڑا فرق یہی ہے کہ انٹک اختلافات کو گاندھی جی کے نظریئے کے مطابق دوستانہ بات چیت کے ذریعے حل کرنے پر زور دیتی ہے۔ اس نظریئے کا ایک جزو یہ ہے کہ جب کوئی اور راستہ نہ رہ جائے تبھی ہڑتال کا سہارا لیا جائے۔ آئینی طور پر انٹک نے ہڑتال کرانے سے قبل گفت و شنید، مصالحت اور ثالثی فیصلے کو آزمانے کا عہد کیا ہے۔ ہند مزدور سبھا کانگریسی سوشلسٹوں اور فارورڈ بلاک پر مشتمل ہے۔ نظریئے کے اعتبار سے یہ سوشلزم کی حمایت کرتی ہے لیکن کس برانڈ کے سوشلزم کی، اس بارے میں اس کے اراکین میں اختلاف ہے۔ تنازعات کو حل کرنے میں یہ سمجھوتے کی راہ اختیار کرتی ہے۔ درست ہی کہا گیا ہے کہ "ٹریڈ یونین حکمت عملی کے اعتبار سے ہند مزدور سبھا حکمراں پارٹی سے بندھی ہوئی انٹک کی نرم روی اور کمیونسٹوں کے سخت طرزِ عمل کے بین بین ہے۔"

دوسری مقابلتاً چھوٹی ٹریڈ یونین فیڈریشنوں میں سے ایک قدیم ترین فیڈریشن یو ٹی یو سی ہے۔ اس کی ایک بڑی خصوصیت اس کا انتہا پسندانہ رویہ ہے۔ اس کی طرح سی آئی ٹی یو (سیٹو) بھی انتہا پسندانہ روش پر چل رہی ہے۔ اس کے برعکس بھارتیہ مزدور سبھا کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس پر دائیں بازو کی پارٹی کی چھاپ ہے۔ اراکین یا ملحقہ یونینوں کی تعداد کے اعتبار سے حال ہی میں اس کی پوزیشن ٹھوس ہو گئی ہے۔ بہر حال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج ہم ہندوستان میں بطور ایک سنگ میل کے جس قسم کا ٹریڈ یونین ازم

* ریڈر، شعبہ معاشیات، مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا (بہار)۔

[illegible] اور اپنا [illegible] کا اثر ہے۔ ٹریڈ یونین تحریک کی ان دو مخالف سمتوں میں سے کسی ایک طرف کس حد تک پیش رفت ہوگی، اس کا انحصار بڑی فیڈریشنوں کی نسبتی طاقت اور لیبر تحریک کے بنیادی بلاکوں پر ان کی گرفت پر ہوگا۔

فیڈریشنوں کی نسبتی طاقت

تمام مرکزی فیڈریشنوں میں ملحقہ یونینوں اور ان کے اراکین کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے خاص کر ہند مزدور سبھا اور یو ٹی یو سی میں۔ چار قومی فیڈریشنوں میں انٹک بدستور سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ جیسا کہ گوشوارہ نمبر ایک میں دکھایا گیا ہے اس کے اراکین کی مصدقہ تعداد ۲۲۳۶۱۲۸ (محکمۂ ڈاک و تار میں اس کی ایک یونین کو شمار نہ کرتے ہوئے) تھی۔ ویسے تو اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کے اراکین کی تعداد ۳۵۰۹۳۲۶ ہے۔

[illegible]

* اس تعداد میں محکمۂ ڈاک و تار میں انٹک کی ایک یونین کے اراکین کی تعداد اور بی ایم ایس کی تیرہ یونینوں کی تعداد شامل نہیں ہے کیونکہ اس کے بارے میں اعتراضات اٹھائے گئے ہیں۔

** اے آئی ٹی یو سی اور سی آئی ٹی یو کے اراکین کی تعداد بمطابق دعویٰ رجسٹرار آف ٹریڈ یونینز کے ریکارڈ سے لی گئی ہے۔ کیونکہ ان یونینوں نے اعداد مہیا نہیں کیے۔

۱۹۸۱ء میں انٹک سے ملحقہ یونینوں کی تصدیق شدہ تعداد ۱۶۰۴ تھی اور اس نے دعویٰ ۳۴۵۷ یونینوں کا کیا تھا۔ مرکزی فیڈریشن سے ملحقہ یونینوں کی تصدیق شدہ تعداد کے لحاظ سے سی آئی ٹی یو دوسرے نمبر پر ہے۔ اگرچہ بی ایم ایس کی یونینوں کی دعویٰ شدہ تعداد سی آئی ٹی یو سے کسی قدر مشابہ ہے تاہم بی ایم ایس کے اراکین کی دعویٰ شدہ اور تصدیق شدہ تعداد سی آئی ٹی یو [illegible] زیادہ ہے۔ بی ایم ایس نے دعویٰ کیا کہ اس کے اراکین کی کل تعداد ۱۸۷۹۷۲۸ تھی جب کہ سی آئی ٹی یو کا دعویٰ تھا کہ اس کے اراکین کی تعداد ۱۰۳۳۴۳۲ ہے۔ اس کے اراکین کی تصدیق شدہ تعداد ۱۲۱۱۳۴۵ تھی جبکہ سی آئی ٹی یو کی ۳۳۱۰۳۱ تھی۔ اے آئی ٹی یو سی چوتھی پوزیشن پر ہے اور اس سے ملحقہ یونینوں کی تعداد ۱۰۸۰ ہے۔ ایچ ایم ایس سے ملحقہ یونینوں کی تعداد ۴۰۹ ہے اور یہ پانچویں نمبر پر ہے۔ دوسری اہم فیڈریشنوں میں، این ایل او، یو ٹی یو سی، یو ٹی یو سی (ایل ایس)، این ایف آئی ٹی یو اور ٹی یو سی سی میں بالترتیب ۱۷۲، ۱۵۸، ۱۳۴، ۸۰ اور ۶۳ یونینیں شامل ہیں۔

مرکزی فیڈریشنوں کے رکن یونینوں کی تعداد سے ظاہر ہے کہ ہندوستان ٹریڈ یونین ازم کمیونزم اور جمہوریت کے بیچ کھڑا ہے۔ بہت عرصہ پہلے، رالف جیمز نے کہا تھا کہ ہندوستان کی لیبر فیڈریشنیں ان سیاسی پارٹیوں کا آلہ کار ہیں جن کے ساتھ وہ وابستہ ہیں۔ ایک اور مفکر وی۔ ڈی۔ کینیڈی کی رائے ہے کہ بڑی بڑی فیڈریشنیں بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں سے بندھی ہوئی ہیں اور لیبر رہنماؤں کی غالب اکثریت ایک طرف تو سیاسی ملحوظات کے مطابق عمل پیرا ہے اور دوسری طرف ایک کمزور اور دوسروں پر انحصار رکھنے والے یونین ازم نے موجودہ لیجسلیٹو اور انتظامیہ ڈھانچے کے ان پہلوؤں میں ایک مثبت پوزیشن حاصل کرلی ہے جو اجتماعی سودے بازی کے لیے نہایت حوصلہ شکن ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یونینیں سیاسی پارٹیوں کی توسیع محض ہیں۔ اگر اے آئی ٹی یو سی میں کمیونسٹ پارٹی کا اثر نمایاں ہے تو دوسرے گروپ ڈیموکریٹک ونگارڈ، مارکسسٹ، فارورڈ، انقلابی کمیونسٹ پارٹی وغیرہ بھی اس میں کام کر رہے ہیں۔ اس لیے اگرچہ ہندوستانی ٹریڈ یونینیں ایک بڑی

گوشوارہ نمبر ۱

ہندوستان میں ٹریڈ یونینوں کی مرکزی فیڈریشنوں کے اراکین کی تعداد (۱۹۸۱ء میں)

نمبر شمار	مرکزی فیڈریشنوں کا نام	دعوے کے مطابق		تصدیق شدہ	
		یونٹوں کی تعداد	اراکین کی تعداد	یونٹوں کی تعداد	اراکین کی تعداد
۱۔	انٹک (آئی۔ این۔ ٹی۔ یو سی)	۳۴۵۷	۳۵۰۹۳۲۶	۱۶۰۴*	۲۲۳۶۱۲۸
۲۔	سیٹو (سی آئی ٹی یو)	۱۷۳۷**	۱۰۳۳۴۳۲	۱۴۷۴	۳۳۱۰۳۱
۳۔	بھارتیہ مزدور سبھا (بی ایم ایس)	۱۷۲۵	۱۸۷۹۷۲۸	۱۳۳۳	۱۲۱۱۳۴۵
۴۔	اے آئی ٹی یو سی	۱۳۶۶	۱۰۶۴۳۳۰**	۱۰۸۰	۳۴۴۷۴۶
۵۔	ایچ ایم ایس	۱۱۲۲	۱۸۴۸۱۴۷	۴۰۹	۷۳۵۶۷۷
۶۔	این ایل او	۲۴۹	۴۰۵۱۸۹	۱۷۲	۲۴۶۵۴۰
۷۔	یو ٹی یو سی	۶۱۸	۶۰۸۰۵۲	۱۵۸	۳۵۲۸۴
۸۔	یو ٹی یو سی (ایل۔ ایس)	۱۵۴	۱۲۳۸۸۹۱	۱۳۴	۶۳۱۳۵۹
۹۔	این ایف آئی ٹی یو	۱۹۶	۵۲۷۳۷۵	۸۰	۴۸۱۲۳
۱۰۔	ٹی یو سی سی	۱۸۲	۲۷۲۲۲۹	۶۳	۱۴۱۷۰

پروفیسر جے۔ کے۔ دوبے

سروائیکل اسپانڈی لوسز اور کمر کا درد

سروائیکل اسپانڈی لوسز اور کمر درد ہڈیوں کے عام امراض میں جو شہروں میں دیکھنے میں آتے ہیں' ان دونوں کا تعلق ریڑھ کی ہڈی سے ہے جو انسان کو ایک سیدھی حالت میں ایستادہ رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ یہ مرض عموماً ایسے لوگوں کو ہوتا ہے جو جسمانی مشقت نہیں کرتے اور بیٹھے بیٹھے کام کرتے ہیں۔

سروائیکل سپانڈی لوسز (ریڑھ کی ہڈی کا درد) اور کمر درد ایسے عام ترین مسائل میں سے ہیں جو ہڈیوں اور جوڑوں کے امراض میں دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور جو ان مریضوں میں سے تقریباً ۵ فیصد کو ہوتے ہیں جو آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کے ہڈیوں کے علاج کے شعبہ (او۔ پی۔ ڈی۔) میں آتے ہیں کمر درد اور ریڑھ کی ہڈی کے درد کے کامیاب علاج کا دارومدار انفرادی مریض کی صحیح تشخیص اور اس کی کیفیت کے سمجھنے پر ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ چونکہ یہ مسائل طویل مدتی نوعیت کے ہوتے ہیں اس لیے مریض ایک معالج کو چھوڑ کر دوسرے معالج کے پاس جاتے رہتے ہیں۔ متعدد طبی نظاموں کی آزمائش کرتے ہیں۔ اور آخر میں مایوس ہو کر اپنے علاموں کو دور کرنے کے لیے اپنے اپنے طریقے ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگرچہ یہ سچ ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کے درد اور کمر درد کی علامتوں کا تسلی بخش علاج کیا جا سکتا ہے تاہم ہماری کوشش ہوگی کہ اس مرض کے تدارکی پہلو پر توجہ مرکوز کی جاسکے تاکہ صحت اور جسم کو صحیح حالت میں رکھنے کے بارے میں شعور پیدا کیا جاسکے۔

انسان ایک دو پایہ حیوان ہے جس نے ہزاروں لاکھوں برس سیدھا رہنے کی عادت اختیار کی ہے۔ سیدھا رہنے کی پوزیشن اس کے حق میں نقصان دہ بھی ثابت ہوئی ہے اور اس سے ناقص پوزیشن کے بیشتر مسائل پیدا ہوتے ہیں جو بیتجہ ریڑھ کی ہڈی میں خرابیوں اور درد کا باعث بنتے ہیں۔

انسانی ریڑھ کی ہڈی

انسان کی ریڑھ کی ہڈی میں دو ابتدائی اور دو ثانوی خم ہوتے ہیں۔ پشت کے اوپری اور نچلے حصے کی تکونی ہڈیاں ابتدائی خم کہلاتی ہیں جب کہ گردن اور نیچے کے حصے کی ہڈیاں ثانوی خم کہلاتی ہیں۔ موخرالذکر کی ہڈیاں اول الذکر ہڈیوں کی نسبت زیادہ حرکت پذیر ہوتی ہیں۔ انسان کی ریڑھ کی ہڈی بیشتر حلقوں جیسی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں پر مشتمل ہوتی ہے جو ریڑھ (ہڈیوں کے جوڑ) کہلاتی ہیں۔

یہ ہڈیاں ریشوں سے ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں اور انھیں ریڑھ کی ہڈی کو متاثر کرنے والے عضلات سے مزید تقویت ملتی ہے۔ ان ریشوں اور عضلات میں لطیف نسیں ہوتی ہیں۔ جو پھیلاؤ' استحکام اور درد کے احساس کو ہمارے دماغ تک پہنچاتی ہیں۔

سروائیکل سپانڈی لوسز ایک ایسی حالت ہے جسے پہلی بار ۱۸۹۹ء میں بیان کیا گیا تھا لیکن جس کی صاف طور پر وضاحت بریں مل اور ریاٹش نے ۱۹۴۸ء میں کی تھی۔ بعض اوقات ہڈیوں میں جو تبدیلیاں پیدا کرتا ہے جو گھساؤ یا عمری کا نتیجہ ہوتی ہیں وہ ان سے زیادہ نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے۔

سروائیکل سپانڈیلوسز کے اسباب غیر واضح ہیں لیکن ہڈیوں کے جوڑ میں خرابی اتفاقیہ یا پیشوں سے ہونے والے زخموں' جسم کو ناقص حالات میں رکھنے' پیدائشی نقائص اور نفسیاتی دباؤ سے عضلات میں اینٹھن آجاتی ہے جس سے یہ مرض پیدا ہوتا ہے۔ زخموں سے نہ صرف سروائیکل سپانڈیلوسز ہوتا ہے بلکہ اس مرض سے سنگین علامتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ پیدائشی نقائص جو ریڑھ کی ہڈی میں موجود ہوتے ہیں وہ اس کی حرکت پذیری میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور اس طرح ریڑھ کے باقی ماندہ حصے پر زیادہ دباؤ پڑتا ہے جس سے یہ سوزش ہوتی ہے۔

یہ مرض عام طور پر درمیانی عمر اور اواخر زندگی میں ہوتا ہے اور زیادہ تر ان لوگوں میں دیکھنے میں آتا ہے جو جسمانی مشقت نہیں کرتے اور جو جدید طرز زندگی کے دباؤ اور تناؤ سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور عموماً بیٹھ کر ہی کام کرتے ہیں یہ مرض جسمانی مشقت کرنے والے کارکنوں اور مزدوروں میں دیکھنے میں نہیں آتے۔

علامتیں

۱ مقامی درد۔ بے چین کرنے والا اور شدید درد۔

ب سر کے اوپری حصے یا نسوں میں درد۔

چھاتی میں درد۔ گلے میں درد۔

۲ اکڑاہٹ۔

شدید اور ہیجانی۔

نقل و حرکت مکمل یا جزوی طور پر مسدود ہو سکتی ہے۔

فقدان حس

۳۔ بے حسی ہونا

سُن ہونا

۴۔ حرکتی علامتیں۔

عضلات کی کمزوری۔

مرکزی اعصابی نظام میں نسوں کی ریشوں میں خرابی۔

۵۔ گردن کی ہڈی میں مغز کے جمع ہونے سے اکڑاہٹ

۶۔ چکرانا اور بینائی اور گویائی میں نقص۔

[illegible]

[illegible] دل کی دھڑکن، چھاتی میں درد
[illegible] سر [illegible] ہونا

[illegible] لوسز میں ریڑھ کی ہڈی میں تبدیلیاں [illegible] عمر کے بعد عام طور پر لوگوں میں دیکھی جاتی ہیں۔ [illegible] علامتوں کی مظہر نہیں ہوتیں۔

سروائیکل سپانڈیلوسز کا علاج مختلف دیگر حالات کا [illegible] کرنے کے بعد کیا جانا چاہئے یعنی جب اس میں علامتوں کو پیدا کرنے والی کیفیت کو مسترد قرار دے دیا جائے۔

علاج کے درج ذیل طریقے اختیار کیے جانے چاہئیں۔

ا۔ مریض کو از سر نو یقین دلایا جائے کہ یہ خود بخود دور ہونے والا مرض ہے۔

ب۔ فزیکل

ریڑھ کی ہڈی کی ورزشیں [illegible]

ج۔ سروائیکل کالر

یہ صرف مرض کے شدید مرحلے میں داخل ہونے پر باندھا جاتا ہے۔

اس کے عام استعمال کو علاج میں کوئی مقام حاصل نہیں۔

د۔ سروائیکل دباؤ۔

وقفوں میں۔

متواتر۔

ر۔ یوگا۔

س۔ سرجری۔

اگر نسوں کی جڑوں پر دباؤ ہو تو اسے دور کرنے کے لیے سرجری کی جاتی ہے۔

دباؤ دور کرنے کے بعد استحکام کے لیے ریڑھ کی ہڈیوں کو جوڑنے کے لیے سرجری کی جاتی ہے۔

کمر درد

کمر درد کا علاج اکثر تجربوں اور مشاہدات سے کیا [illegible] علاج [illegible] سکتا ہے کمر درد کی تشخیص اور علاج سے کہیں زیادہ دشوار ہوتا ہے۔

ریڑھ کی ہڈی میں بگاڑ کے عمل کو ناقص عمل کے مرحلے اور عدم استحکام اور استحکام کے مرحلوں میں بانٹا جاتا ہے۔ ایک حصہ کی کارکردگی میں نقص پیدا ہونے سے دوسرے حصوں میں بھی بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے جو متعدد سطحی سپانڈیلوسز کا باعث بنتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کی خرابی کا علاج لازماً تحفظاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اور سرجری کو اس میں بہت کم دخل ہوتا ہے اگرچہ آرام اور مسکن ادویات علاج کے لیے ضروری نہیں تاہم علاج کے لیے فزیوتھیراپی کی ورزشیں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

ورزش سے کئی لحاظ سے بڑا فائدہ پہنچتا ہے اس سے درد کم ہوتا ہے اور عضلات کو تقویت ملتی ہے جس سے ریڑھ کی ہڈی کے ڈھانچے پر بوجھ کم ہوتا ہے ورزش سے جسم کے پوزیشن بھی ٹھیک رہتی ہے اور حرکت پذیر حصہ مضبوط ہوتا ہے۔

ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ جدید طرز زندگی کے دباؤ سے عضلاتی اینٹھن اور درد بڑھتا ہے۔ اور بیٹھے رہنے کی عادت اور ورزش بالکل نہ کرنے سے کمزور عضلاتی نظام سے اس میں مزید خرابی پیدا ہوتی ہے اس مشاہدے کو اس امر سے تقویت ملی ہے کہ تمام مریض غیر جسمانی مشقت کرنے والوں کے گروپ سے تعلق رکھتے ہیں جن پر جدید طرز زندگی کا زیادہ اثر ہوتا ہے حالانکہ جسمانی مشقت کرنے والوں میں سے کوئی بھی اس مرض میں مبتلا نہیں ہوتا تاہم یہ دیکھا ہے کہ ایسے مریضوں کے لیے یوگا نہایت مفید ہے کیونکہ اس سے تناؤ میں کمی آتی ہے، دماغ کو راحت ملتی ہے اور عضلاتی نظام بہتر ہوتا ہے۔

بقیہ: ایڈس ایک مہلک مرض

کس حد تک موجود ہے۔

اس مرض کے ہو جانے کے بعد انسانوں کے اندر خاص [illegible] علامتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انسان میں مرض کی موجودگی سے انتہائی کمزور اور لاغر ہو جاتا ہے۔ مریض مزاجاً کافی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ اس کا وزن تیزی سے کم ہونے لگتا ہے۔ بخار بھی رہتا ہے اور بھوک بھی نہیں لگتی اور دیگر علامتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر یہ مرض چونکہ ابھی تحقیقات کے مراحل سے ہی گزر رہا ہے اس لیے کوئی بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی۔

اب تک جو کیس دریافت ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مرض جنسی اختلاط کے ذریعہ پھیلتا ہے۔ تحقیقات اور دریافت سے یہ معلوم ہوا ہے کہ امرد پرستی سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اور ہم جنس کے شکار افراد اس مرض کے شکار رہتے ہیں۔ یہ بیماری Bleed Transfu-sion کے ذریعے بھی پھیل سکتی ہے۔ اگر کسی صحت مند شخص میں ایڈس کے مریض کا خون داخل کر دیا جائے تو اس شخص کے یہاں بھی یہ ساری علامتیں نمایاں طور پر ابھر جائیں گی۔ اس کے علاوہ اگر ایڈس کے مریض کے لیے استعمال کئے گئے سرنج کو اسٹرلائز نہیں کیا جائے تو یہ مرض دوسرے شخص کو انجکشن کے ذریعہ منتقل ہو سکتا ہے۔ غرض کہ جنسی اختلاط کے علاوہ خون کے ذریعہ بھی یہ مرض ایک شخص سے دوسرے شخص میں منتقل ہو سکتا ہے۔

اس مرض کی روک تھام کے لیے ڈاکٹروں کی ٹیم کو ایک مہم چلانے اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے اور ملک کے جتنے میڈیکل سینٹرس ہیں وہاں ان ڈاکٹروں کو چاہیئے کہ عوام کو اس مرض کے بارے میں معلومات دیں اور عوام کے اندر جو باشعور طبقہ ہے اس کو چاہیئے کہ وہ ڈاکٹروں کو اس سلسلے میں تعاون دیں اور زیادہ سے زیادہ اس طرح کے مریضوں کو علیحدہ کریں اور ان مریضوں کو باقی تمام آبادی کے ساتھ ملنے نہیں دیا جائے۔ اگر یہ مریض غیر شادی شدہ ہو تو اس کو اختلاط کرنے کی اجازت قطعی نہیں دی جائے اور اگر شادی شدہ ہو تو اسے روکا جائے لیکن یہ ممکن اسی وقت ہے جب عوام اور ڈاکٹر دونوں اس جانب سنجیدگی سے توجہ دیں۔

ڈاکٹر شفیق اعظمی*



اُردو ناول کے ارتقاء میں خواتین کا حصّہ!

ناول ادب کی ایک انتہائی اہم صنف ہے جو بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی "ہماری زندگی کی مختلف گتھیوں کو سلجھانے میں مدد دیتی ہے۔"[1] ناول انگریزی لفظ ہے۔ انگریزی ادب کے ساتھ ہمارے یہاں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ادب پر چھا گیا۔[2] ناول میں پُرانے قصّوں، فسانوں اور داستانوں کے برعکس انسانی زندگی کا قصّہ ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے موجودہ عہد کا ر رمیہ بھی کہا جاتا ہے۔[3] انگریزی زبان میں تو ناول کا آغاز اٹھارہویں صدی میں ہی ہو چکا تھا مگر اُردو میں اس کا وجود اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں ہی ممکن ہو سکا۔ "جدید تحقیق کے مطابق اُردو کا پہلا ناول "خطِ تقدیر" مانا جاتا ہے۔ اسے ڈاکٹر محمود الٰہی نے دریافت کیا ہے ورنہ مارچ ۱۹۶۵ء سے قبل لوگ اس سے قریب قریب ناواقف ہو چکے تھے۔[4] "خطِ تقدیر" کی دریافت سے پہلے مولوی نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس" کو اُردو کا پہلا ناول قرار دیا جاتا تھا جسے نذیر احمد نے ۱۸۶۹ء میں تصنیف کیا تھا۔ ناول نگاری کا فن آج اپنے بامِ عروج پر پہونچ چکا ہے۔ اُردو میں کئی ایسے ناول عالمِ وجود میں آچکے ہیں جنھیں یقیناً دوام حاصل ہو چکا ہے، اور انھیں دنیا کے بہترین ناولوں کی صف میں فخر کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے۔ اُردو ناول نگاری کے فن کو جہاں مرد ناول نگاروں نے پروان چڑھایا ہے وہیں خواتین ناول نگاروں نے بھی اس کی آبیاری میں اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ گو کہ خواتین ناول نگاروں نے مردوں کے مقابلے میں بہت بعد میں اس میدان میں قدم رکھا ہے پھر بھی ناول کے ارتقا میں ان کا تعاون کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا یہ یوگ دان نہ صرف قابلِ ستائش ہے بلکہ بڑی اہمیت کا حامل بھی ہے۔

خواتین ناول نگاروں نے بیسویں صدی کے آغاز میں ناول کی تخلیق شروع کی اور تب سے آج تک یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ کئی خواتین ناول نگار تو آج بین الاقوامی شہرت کی مالک ہیں۔ انھوں نے فن اور موضوع دونوں اعتبار سے اسے وسعتیں بخشی ہیں۔ ابتدائی خواتین ناول نگاروں کے یہاں فنّی دسترس کی کمی کا احساس ضرور پایا جاتا ہے مگر ان کی مقصدیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں عورتوں کے بنیادی مسائل کو جگہ دی ہے اور ناول کے ذریعے عورتوں کی تعلیم و تربیت پر سماجی اور اخلاقی و معاشرتی خامیوں کو دور کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ ان کے خیال میں عورتوں کا جاہل ہونا ہی تمام خامیوں اور برائیوں کی جڑ ہے۔ اگر عورت تعلیم یافتہ ہوگی تو وہ کامیاب زندگی گزار سکے گی۔ اس کے علاوہ سماج کی کہنہ اور فرسودہ رسوم و رواج کی طرف بھی لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے کہ اکثر اس کا انجام پریشان کن اور جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ اس ضمن میں محمدی بیگم کے ناول "آجکل"، "سگھڑ بیٹی" اور "شریف بیٹی" اور طیبہ بیگم کا ناول "انوری بیگم" قابلِ ذکر ہیں۔ طیبہ بیگم نے اپنے ناول "انوری بیگم" میں عورتوں کے اندر خانگی ذمہ داریوں کے احساس کو خصوصیت کے ساتھ جگانے کی کوشش کی ہے۔ نذر سجاد بھی اس دور کی ممتاز ناول نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک ناول "آہِ مظلوماں" میں بے میل شادی کے خطرناک نتائج کو پیش کیا ہے۔ نذر سجاد نے اپنے دوسرے ناول "اختر النساء" میں عورتوں کی تعلیم و تربیت پر کافی زور دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اگر لڑکی پڑھی لکھی ہوگی تو اپنی عقل اور اپنے شعور سے زندگی کو جنت کا نمونہ بنا سکتی ہے۔ ان ابتدائی

---

* پرنسپل میڈیکل۔ سرائے میر۔ اعظم گڑھ (یو-پی)

[illegible] یہاں [illegible] زمانے اور
[illegible] سکتا ہے لیکن صحیح
[illegible] حقیقت پسندی اور فنکارانہ روش کا
[illegible] ناول نگاروں کے دوسرے دور سے
[illegible] حجاب امتیاز علی، صالحہ
عابد حسین، سلمیٰ احمد علی، عصمت چغتائی، اے۔ آر۔
خاتون اور قرۃ العین حیدر وغیرہ کے سر ہے۔

مذکورہ خواتین ناول نگاروں کے یہاں مسائل کا صحیح مشاہدہ اور اس مشاہدے کا منطقی تجزیہ اور تطہیر دونوں کے ساتھ غور و فکر کی عناصری پائی جاتی ہے۔ انھوں نے گھریلو زندگی اور اس کے مسائل کے ساتھ ساتھ گھر کی چہار دیواری سے باہر گلی کوچوں، بازاروں اور شاہراہوں میں گونجنے والے نعروں کو بھی اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ ان کے یہاں خالی خولی جذبات نگاری نہیں ملتی بلکہ ان کے خیالات فکر کے تابع نظر آتے ہیں۔ اپنے موضوعات کے ساتھ انھیں محض دلچسپی ہی نہیں بلکہ ان سے پوری طرح واقفیت بھی ہے۔ اس طرح انھوں نے اپنے ناولوں کو اپنے شخصی رجحانات، میلانات، مقصدات اور فلسفۂ حیات کا عکس بنا کر پیش کیا ہے۔

صالحہ عابد حسین کے ناول عذرا، آتشِ خاموش، قطرے سے گہر ہونے تک اور حجاب امتیاز علی کے ناول ظالم محبت، اندھیرا خواب اس کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ ان ناولوں میں پُراسرار تخلیقی رموز اور شاعرانہ ماحول کے ساتھ ساتھ انسانی حرکات و سکنات کی گہری نفسیاتی تاویل نظر آتی ہے اور یہی فنکارانہ خلوص عصمت چغتائی کے یہاں بہت تیز اور گہرا رنگ لیے ہوئے ہے۔ جس کی مثال دوسری خواتین ناول نگاروں کے یہاں مشکل سے ملے گی۔ عصمت چغتائی کے کرداروں میں جو نفسیاتی اور تجزیاتی جھلک

[illegible]
فرد کی زندگی پر کیسے پڑتے ہیں۔ انھوں نے اپنے شہرۂ آفاق ناول "ٹیڑھی لکیر" میں بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ "ٹیڑھی لکیر" نہ صرف عصمت کا شاہکار ہے بلکہ اسے اردو کا شاہکار کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی "عصمت چغتائی اس دور کی نمایاں ناول نگار ہیں"۔ آگے لکھتے ہیں "ٹیڑھی لکیر میں عصمت نے ایک متوسط گھرانے میں پروان چڑھنے والی لڑکی کی جنسیاتی اور نفسیاتی زندگی اور وہ ماحول جس میں کہ وہ پرورش پاتی ہے، اس قدر تکمیل کے ساتھ اور اس درجہ فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے کہ ٹیڑھی لکیر اُردو ناول نگاری کی تاریخ میں سنگِ میل بن گئی ہے[۳]"۔

ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں "اُردو ناول نگاری میں اس کا (ٹیڑھی لکیر کا) جواب نہیں ملتا"[۴]۔ عصمت کے فن پر مغربی رچاؤ کا عکس بہت نمایاں ہے۔ اور اُردو ناول نگاری کے فن پر یہ مغربی رچاؤ وقت اور زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ اور تیز اور گہرا ہوتا چلا گیا ہے۔ جس کی زبردست مثال قرۃ العین حیدر کے یہاں ملتی ہے۔ ان کے ناول "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینۂ غمِ دل" پر یہ رنگ پوری طرح غالب ہے۔ ان ناولوں کا پس منظر مغرب زدہ امیروں کی دُنیا ہے۔ بقول ڈاکٹر احسن فاروقی:

"قرۃ العین حیدر نے ورجینا وولف کا بہت اچھا مطالعہ کیا ہے[۵]۔" ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں: "قرۃ العین حیدر پر ورجینا وولف کا اثر بہت صاف اور نمایاں ہے[۶]۔" قرۃ العین حیدر نے مغربی تیکنیک اور مغربی اندازِ فکر کو بڑے سلیقے کے ساتھ مشرقی روایت کے حسن میں سمویا ہے۔ انھوں نے فرد کی زندگی اور اس کی ذہنی اور جذباتی

[illegible] کینوس کو وسیع بنایا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور پھر یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہی رہا ہے۔ ان کے بعد اس میدان میں قدم رکھنے والی دوسری خواتین ناول نگاروں نے بھی ان کی روایت کو آگے بڑھایا ہے اور فن اور موضوع کی رنگا رنگی کے ساتھ ساتھ انسان کے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مسائل کو تجزیاتی طور پر پیش کیا ہے۔ مثلاً عائشہ جمال کے ناول "گردِ سفر" اور الفت منہاس کے ناول "بے چارہ" اور "یہ کیا" میں اس کا عکس نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی اور بھی بہت ساری خواتین نگاروں نے اُردو ناول نگاری کے کینوس کو وسیع سے وسیع تر کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں بڑا نام کمایا ہے۔ ان مقبول ناول نگاروں میں سرِفہرست جو نام نظر آتا ہے وہ ہے واجدہ تبسم کا۔ واجدہ تبسم اُردو ناول کی دُنیا میں ایک بے باک اور باغی ناول نگار کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔ ان کے بیشتر ناول سماجی روایت سے بغاوت کے حامل ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ حیدرآباد کے روایتی ماحول اور نوابین کے معاشرے میں عورت کے استحصال پر انھوں نے کھُل کر نشترزنی کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ واجدہ تبسم کی بے باکی کبھی کبھی اعتدال کی حد کو پار کر جاتی ہے لیکن اکثر و بیشتر وہ حقیقت پسندی اور حق بیانی سے ہی کام لیتی ہیں۔ ان کے ناولوں میں زیادہ تر جنس کا پہلو نمایاں ہوتا ہے لیکن بقول خود انھیں کے "کیا عورت اور مرد کے درمیان جنسی جذبہ نہیں ہوتا؟ روٹی کپڑا اور مکان کے بعد انسان شادی کرتا ہے یہ انسان کی چوتھی ضرورت ہے۔ پھر اتنے اہم موضوع کو کیوں نظر انداز کریں[۷]۔" "پھول کھلنے دو"، "جیسے دریا"، "شہرِ ممنوع" اور "روزی کا سوال" وغیرہ اُن کے بہترین ناول

ہیں۔ عطیہ پروین اور بشریٰ رحمٰن بھی اس دور کی مقبول ترین ناول نگار ہیں انھوں نے اُردو ادب کو درجنوں ناول دیئے ہیں۔ بشریٰ رحمٰن نے موجودہ سماج کے بیشتر مسائل پر بڑی خوبی اور چابکدستی سے قلم اُٹھایا ہے۔ ان کے ناولوں میں موضوع اور فن دونوں کا تنوع ملتا ہے۔ انھیں کردار نگاری کا بھی بڑا اچھا سلیقہ ہے۔ عطیہ پروین نے یوں تو متعدد ناول تخلیق کئے ہیں جو مقبول عام ہو چکے ہیں مگر ان کے ناول "جس کو سمجھے تھے مسیحا" اور "یہ میرا ظرف دیکھ" خاص طور سے اہمیت کے حامل ہیں۔ جن میں انھوں نے انسان کے نازک احساسات و جذبات کو پیچیدگی اور اُلجھاؤ سے پاک رکھ کر ناول کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ موجودہ دور میں خواتین ناول نگاری کے اور بھی بہت سارے نام ہیں۔ جو اُردو ناول نگاری کے اُفق پر ستاروں کی مانند اپنی بھرپور چمک اور دمک کے ساتھ موجود ہیں۔ غرضیکہ خواتین ناول نگاروں اور اُن کے ناولوں کا ایک کارواں سا نظر آتا ہے جو اپنی منزل کی جانب بڑی تیزی کے ساتھ رواں دواں ہے۔

مثلاً مسرور جہاں کے ناول اُجالے، اچانک، رنگ ہزار، درد کا ساحل، ایک میٹھی بوجھ، پیکر، خزاں سے دور، رشتہ پیار کا، راہوں میں، اپنا خون وغیرہ۔ عفت موہانی کے ناول بھنور، درد درماں، آگ میں پھول، پندار، داغِ دل، ہمسر اور ہیجاں وغیرہ۔ مینا ناز کے ناول بدنام، انجانی منزل، پُکار، پاگل نیتا، درد آشنا، پہاڑی چاند، بہاریں آنے تک، اور بند آنکھوں میں سپنے وغیرہ۔ دیبا خانم کے پتھر کے صنم، پھول کی زنجیر، پتھر کا گلاب، رازِ دل، پیاسے کو شبنم، دھوپ اور چاندنی، اور خوشبو تیرے نام کی وغیرہ۔ رضیہ بٹ کے ناول روپ، سنگ ریزے اور گل بانو، اور زلیخا حسین کے ناول پتھر کی لکیر، ایک ہی ڈگر، اپنے اور پرائے، تاریکیوں کے بعد اور آسمان کے تلے، وغیرہ۔ شکیلہ اختر کا ناول، تنکے کا سہارا" حمیلہ ہاشمی کا ناول "داغ فراق" آمنہ ابوالحسن کا ناول "واپسی" اور جیلانی بانو کا ناول "نغمے کا سفر" اور صغرا مہدی کے ناول دھند، پُروائی اور راہم جولاں وغیرہ بیحد مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ہاجرہ مسرور کا ناول "آنگن" اور خدیجہ منور کا ناول "گھروندے" تو غیر فانی نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عورتوں کے ان تمام ناولوں میں عہد حاضر کی منتشر اور مضطرب زندگی کے احوال کے ساتھ ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا خواب بھی پنہاں ہے۔ ان میں حُسنِ اخلاق اور حسنِ عمل پر بھی زور دیا گیا ہے اور بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ہم آہنگی کا سبق بھی ملتا ہے جو ان خواتین ناول نگاروں کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔ ان ناول نگاروں نے موضوعات کی وسعت اور رنگا رنگی کے ساتھ ہی ساتھ اُردو ناول کو دلچسپی اور دل نشینی سے بھی ہمکنار کیا ہے۔ بقول وقار عظیم "جہاں تک کہانی کہنے اور اسے کہانی کی طرح کہنے کا تعلق ہے عورتوں کے قصّے اور ناول آپ اپنی مثال ہیں اور یہ مثال قدیم اور جدید کے فرق کے بغیر عورتوں کے سب ناولوں میں موجود ہے"[10] غرضیکہ فن اور مواد، موضوع اور اسلوب ہر اعتبار سے خواتین نگاروں کی ناول نگاری نہ صرف قابلِ ستائش ہے بلکہ ناقابلِ فراموش ہے۔ جسے ہمیشہ سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔

حواشی :- ۱۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی۔
۲۔ تنقیدی اشارے ــ آل احمد سرور۔
۳۔ "آجکل" نئی دہلی ــ اکتوبر ۱۹۸۴ء
۴۔ نذیر احمد ــ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی۔

بقیہ' جوہری جنگ کے اثرات

ممالک کی بھی یہ کوشش ہے کہ وہ کسی بھی طرح جوہری طاقت بن جائیں۔ حالانکہ یہ اقدام ان کی معیشت کو بُری طرح متاثر کرتا ہے اور ساری انسانیت کے لیے مستقبل میں نہایت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ جوہری جنگ کی ہولناکیوں کا اندازہ کرتے ہوئے ستمبر ۱۹۸۶ء واشنگٹن میں نیشنل اکیڈمی آف میڈیکل سائنس اور سائنسی کمیٹی برائے مسائل ماحولیاتی آلودگی کے ادارہ کے سائنس دانوں نے ایک مباحثہ منعقد کیا جس میں مختلف ممالک کے کوئی دو سو سائنس دانوں نے حصہ لیا۔ اس مباحثہ میں جوہری جنگ سے انسانی صحت پر مرتب ہونے والے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ اور آخر کار یہی نتیجہ اخذ کیا گیا کہ جوہری جنگ سے کروڑوں انسانوں کی موت ناگزیر ہے۔

جب تک جوہری ہتھیاروں کی یہ دوڑ چلتی رہے گی جنگ کا خطرہ ہم پر ہمیشہ مسلط رہے گا۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ بڑے ممالک جوہری اسلحہ کی تیاری اور ان کے استعمال پر پابندی عائد کرنے کے لیے آپس میں کوئی ٹھوس معاہدہ کر لیں۔ ورنہ اس دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کے نتیجہ میں ساری انسانیت کا روئے زمین پر خاتمہ ہو جائے گا ●

۵۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی۔
۶۔ بیسویں صدی میں اُردو ناول۔ ڈاکٹر یوسف سرمست
۷۔ "نقوش" لاہور۔ فروری مارچ ۱۹۵۳ء
۸۔ بیسویں صدی میں اُردو ناول۔ ڈاکٹر یوسف سرمست۔
۹۔ "فلمی کہکشاں" گستاخ کہانی نمبر۔ اپریل ۱۹۸۷ء
۱۰۔ "داستان سے افسانے تک" وقار عظیم۔ ●

محمد حامد علی خان

سماج اور اقبال



ڈاکٹر علامہ سر محمد اقبال ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۸ء میں وفات پائی۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے قنوطیت کی جگہ رجائیت، بے حسی کی جگہ ذکی الحسی غفلت کی جگہ ہشیاری، غلامی کی جگہ آزادی، بے عملی کی جگہ حرکت و عمل اور تقلید بے جا کی جگہ فکر و عمل کے اجتہاد کو قبول عام کرنے کی دعوت دی ان کے شعری اسلوب میں ماضی کی عظمت، حال کی بصیرت اور مستقبل کی بشارت موجود ہے اقبال کی نگاہ اتنی تیز ہے کہ ذرے کا دل چیر کر خورشید کا لہو دیکھ لیتی ہے۔

حقیقت ایک ہے ہر شئے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

علامہ اقبال کے اردو و فارسی نظموں کے متعدد مجموعے منظر عام پر آئے جس میں اردو نظموں کا پہلا مجموعہ "بانگ درا" ہے۔ اس میں ۱۹۲۲ء تک کا وہ سارا اردو کلام شامل ہے جو افادۂ عام کے اعتبار سے اقبال کے معیار انتخاب پر پورا اترتا ہے اور جس کی اشاعت و حفاظت ان کے نقطۂ نگاہ سے لازمی تھی۔ اس میں قومی نظمیں، قدرتی مناظر پر نظمیں، اخلاقی نظمیں، مرثیے، غزلیات، ظریفانہ کلام وغیرہ ہیں۔ "بانگ درا" کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ان کی توجہ فارسی کی طرف مبذول ہو چکی تھی اور "اسرار خودی" "رموز بے خودی"۔ "پیام مشرق"۔ "زبور عجم" اور جاوید نامہ شائع ہوئے۔ اس کے بعد پھر جب اقبال اردو کی جانب متوجہ ہوئے تو اس دور کا پہلا مجموعہ "بال جبریل" ہے جس میں "زبور عجم" کے انداز کی اردو غزلیں، پیام مشرق کے انداز کی رباعیات اور ان کے علاوہ متعدد ایسی نظمیں ہیں جن کی مثال شاید کسی زبان کے شعر و ادب میں مل سکے۔ مثلاً مسجد قرطبہ، ذوق و شوق ابلیس خدا کے حضور میں، فرشتوں کا گیت، فرمان خدا اور دیگر قطعات بھی ہیں جن کی بنا پر "بال جبریل" کے آخری حصہ کو ضرب کلیم کی تمہید سمجھنا چاہیئے۔

"بانگ درا" کاروان ملت ہی نہیں، کاروان انسانیت کے لیے جادۂ پیمائی کی پہلی دعوت تھی اور "بال جبریل" میں بتلایا گیا ہے کہ جادۂ پیمائی کے بعد اس قافلہ یعنی ہمارے معاشرہ کو منزل مقصود پر پہونچنے کے لیے کیا کرنا چاہیئے۔

اقبال "شمع و شاعر" میں فرماتے ہیں

کر گئے ہیں شاعری جز و لیست ا پیغمبری
ہاں سنا دے محفل ملت کو پیغام سروش

اور اس شعر کی مناسبت سے ہی اقبال نے اپنے ایک مجموعۂ کلام کا نام "بال جبریل" رکھا، گویا جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے یہ اسلام کی الہامی تعلیمات سے ماخوذ ہے اور انھیں تعلیمات پر عمل پیرائی حاصل حیات ہے۔

بلاشبہ "بال جبریل" میں مضمونوں اور عنوانوں کا وہ تنوع نہیں ملے گا جس سے بانگ درا مزین ہے۔ لیکن اس کتاب میں علامہ اقبال کی تعلیم زیادہ معین، زیادہ واضح اور زیادہ روشن نظر آتی ہے اور یہ بھی ان کے فطری کمالات کی دلآویزی اور معجز نمائی سے لبریز ہے۔ حقائق حیات کو شعر کے لباس میں پیش کرنا سہل نہیں۔ اسی نقطۂ نگاہ سے بال جبریل اور ضرب کلیم کو اگر غور سے دیکھا جائے تو اہل دانش کو اندازہ ہو سکے گا کہ اقبال عظمت کے کس بلند مقام پر فائز ہیں ایسی مثالیں دنیائے شعر و ادب میں شاید کہیں اور نہ مل سکیں۔

"بال جبریل" کی تعلیم کا خلاصہ اس کے

---

* معرفت ڈاکٹر اے رحمٰن، جیل روڈ۔ چندواڑہ، مظفر پور۔

سرورق والے شعر سے ہی واضح ہو جاتا ہے ؎

اُٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

اس شعر میں اقبال زندگی کے نئے آفتاب کی نمود کا پیغام دے رہے ہیں تاکہ دنیا کی شام و سحر کی بے کیفی ختم ہو اور اس میں تازگی و شادابی کی نئی شان جلوہ گر ہو جائے۔

بہر کیف مجموعۂ کلام "بالِ جبریل" کی جن نظموں نے مجھے موجودہ حالات کے پیشِ نظر زیادہ متاثر کیا ان میں "لینن خدا کے حضور میں"، "فرشتوں کا گیت" اور "فرمانِ خدا" ہیں۔ کیوں کہ یہ تینوں ہی نظمیں موجودہ مسلم معاشرہ سے متعلق پیشین گوئی کی نوعیت رکھتی ہے۔ اتفاقاً یہ تینوں نظمیں تمام تر ساخت کے اعتبار سے ایک ہی سلسلہ کی نظمیں کہی جانے کی مستحق ہیں۔ گرچہ اقبال نے کچھ اس طرح کا بیان کہیں بھی قلمبند نہیں کیا ہے کہ یہ تینوں نظمیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں لیکن لہجہ و موضوع کے اعتبار سے یہ تینوں نظمیں کم و بیش مشترک مضامین پر مشتمل ہیں۔ اس لیے یہ ممکن ہے کہ ان نظموں کو تسلسل کے ساتھ یکجا کر کے شعوری طور پر یہ نظمیں ایک ہی موضوع پر کہی گئی ہوں ویسے اس پہلو پر زور دینا موزوں نہیں کیوں کہ ؎

مانگنا جرم ہے فنکار سے ترتیبِ خیال
گیسوئے وقت جب آشفتہ سیاہی مانگے

لیکن اقبال کے اندازِ بیان کی روشنی میں اس بات پر قدم جمانے کو جی تڑپ ہی اٹھا ہے کہ یہ نظمیں ایک ہی سلسلہ کی ہیں اسے مان لیا جائے۔ کیوں کہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کے دو اہم پہلوؤں میں ایک پہلو تو یہ ہے کہ انھوں نے شاعری میں نت نئے موضوعات کا ایک اہم ذخیرہ پیش کیا۔ فکر و فن اور احساس و مشاہدہ کی ایک ایک خوبصورت ہم آہنگی دریافت کی

دوسرا پہلو یہ ہے کہ نظمی اسلوب میں انھوں نے رنگا رنگی پیدا کی نظموں کی ساخت اور ہیئت کے کامیاب اور دلکش تجربے کئے اپنے افکار و نظریات کی پیش کش کے لیے ایک طرف شاہین مردِ مومن، جبریل، ابلیس، زاغ جیسی علامتیں اور استعارے استعمال کئے اور دوسری طرف بلبل و طاؤس سے کنارہ کشی اختیار کر لی کیوں کہ ؎

بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

ان سب کے ذریعہ مسلم معاشرے کے معیارِ حیات کو بلند کرنے کی آرزو مندی کا اظہار کیا۔ انکی شاعری ارضی زندگی کے اعلیٰ نصب العین کی آئینہ دار بن گئی۔ انھوں نے فرد اور معاشرے، مسلمان اور ملّت کے رشتوں کی نئی معنویت دریافت کی اور شعروں کو نظموں اور غزلوں کو صالح اور تعمیری تصوّرات کا نقیب بنا دیا۔ انسانی زندگی کی بیداری قدروں کے حفظ و بقا کے لیے اقبال نے اپنی شاعری کو وقف کر دیا۔ انساں کی عظمت کے ترانے گائے اور انسانی حیات کو ہر طرح کی سطحیت اور آلودگی سے بچائے رکھنے کی تلقین کی۔ ان کے شعری لب و لہجہ میں اتنا زور اور جوش ہے کہ کبھی کبھی ان کی شاعری خطیبانہ بن جاتی ہے۔ مثلاً "لینن خدا کے حضور میں" ۲۲، اشعار پر مشتمل نظم اقبال کے زورِ تخیل کا بہترین نمونہ ہے جس کا ہیرو لینن ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوا اور طالب علمی کے زمانے میں انقلابی سکر بالشویک جماعت بنائی۔ ۱۹۱۷ء میں زارِ روس کا تختہ اُلٹ کر اپنی حکومت قائم کر لی اور صدر بن بیٹھا۔ ۱۹۲۴ء میں وفات پائی۔ لینن کمیونزم کا سب سے بڑا داعی مانا جاتا ہے انھوں نے کارل مارکس کے فلسفے کو عملی جامہ پہنایا۔ غرض کہ اقبال کا لینن جیسے مادّہ پرست کو خدا کے حضور میں پیش کر کے پہلے تو خدا کی عظمت کا اعتراف کروانا اور پھر اشتراکی

تصورِ حیات کے اہم ترین (مسائل) یعنی ناداروں اور سرمایہ داروں کی کشمکش کو خدا کے سامنے رکھنا اقبال کے اس یقین کا نتیجہ ہے کہ اسلام ہی سب سے مکمل نظامِ حیات ہے اور دیگر تمام نظریات کے اچھے پہلو اس نظریہ حیات میں شامل ہیں۔ لینن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات

لینن وفات کے بعد خدا کے حضور میں حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا تیری نشانیاں عالمِ ارواح اور عالمِ اجسام دونوں جگہ روشن ہیں سچ یہ ہے کہ تیری ذات ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والی ہے۔

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات

لیکن اے خدا میں کیسے مانتا کہ تو موجود بھی ہے کہ نہیں میری مصیبت یہ تھی کہ عقل نے جو نظریے قائم کئے تھے وہ ہر لحظہ بدلتے رہتے تھے۔ مگر ان میں سے ایک نظریہ بھی اپنی جگہ قائم و دائم رہ جاتا تو مجھے یہ یقین ہو جاتا کہ وہ سچا ہے گو اگر مجھے تیری ہستی کا یقین نہ آیا اور میں تجھ پر یقین نہ لا سکا تو اس کی وجہ فلسفیوں کے وہ نظریات ہیں جن کے بدلتے رہنے سے میں بدظن ہو گیا تھا۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

آخر میں لینن خدا سے کہتا ہے کہ اے خدا مجھے بتا کہ سرمایہ پرستی کی کشتی کب غرقِ آب ہو گی؟ اے خدا تیری دنیا بدلے کا انتظار کر رہی ہے یعنی جب تو نے قاعدہ مقرّر کر رکھا ہے کہ برائی کا بدلہ برائی کے سوا کچھ نہیں ہو گا تو پھر آخر کون سی وجہ ہے کہ سرمایہ پرستی کی برائیوں کا بدلہ

[illegible] پامال ہے۔

اب جبکہ لینن نے دنیا کی حالت بارگاہِ باری تعالیٰ میں پیش کی تو فرشتوں نے بھی اپنے دیکھی ہوئی کیفیت پانچ اشعار میں گیت کی شکل میں پیش کی۔

"فرشتوں کا گیت" کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل تیرا نقش ہے ناتمام ابھی

فرشتے اس شعر میں خداوندِ قدوس کی بارگاہِ عالیہ میں حاضر ہوکر کہتے ہیں کہ اے خدا تو نے انسان کو جو عقل عطا کی تھی وہ ابھی تک بے لگام ہے یعنی ہر شخص تدابیر اور چالاکی سے کام لے کر اپنا مطلب نکال لینے کے درپے ہے۔ خلقِ خدا کی عام بہبود کا خیال رکھنے کے لیے کوئی تیار نہیں اور جہاں تک عشق و محبت کا دخل ہے تو اس نے بھی کوئی ٹھکانہ پیدا نہیں کیا۔ یعنی وہ بھی ایسی صورت اختیار نہیں کر سکا ہے کہ عوام کو نفع حاصل ہو یا ان کی بہتری کے لیے کام آ سکے۔ کہیں کہیں اس کی جھلک ضرور نظر آتی ہے لیکن یہ جذبہ بہت ہی کم ہے۔ اے ازل کے نقاش اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تو نے انسان کی شکل میں عقل و عشق کا جو نقش بنایا تھا وہ اب تک ادھورا ہے۔ غرض کہ اپنے اصل مقصد تک نہیں پہونچ سکا۔

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

پھر فرشتے خدا سے کہہ رہے ہیں کہ تیرے سبھی بندے خواہ وہ مے خوار و اوباش ہوں یا کہ عالم اور دیندار، امیر لوگ ہوں یا کہ پیر و مرشد، غرض کہ جو بھی ہوں سب کے سب تیری گھات میں بیٹھے ہیں اور اسے اپنے اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ یعنی تیری دنیا کا عالم بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ شروع میں تھا اس میں کوئی فرق دیکھنے کو نہیں مل پا رہا ہے۔

جوہرِ زندگی ہے عشق جوہرِ عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیِ نیام ابھی

یہاں فرشتے اللہ سے کہہ رہے ہیں کہ زندگی کا جوہر یہی محبت، یہی عشق اور یہی تڑپ ہے اور اس محبت کا جوہر خودی ہے افسوس کہ خودی کی تیز تلوار ابھی تک میان میں ہے یعنی نہ خودی بروئے کار آئی نہ عشق اور نہ زندگی کے جوہر آشکارا ہوئے۔

اقبال کے یہاں خودی سے مراد عرفانِ نفس ہے دنیا و آخرت میں انسان کی فلاح و کامرانی کا سارا انحصار خود شناسی اور خدا شناسی پر ہے اور خدا شناسی بھی خود شناسی کے بغیر ممکن نہیں، اس کے برعکس خود فراموشی ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے اور خدا فراموشی میں بھی انسان خود فراموشی کی وجہ سے مبتلا ہوتا ہے۔ اقبال نے خودی کو دو حصوں میں بانٹا ہے۔ ایک خودی صالح اور دوسری غیر صالح۔ اقبال خود اپنے خط میں لکھتے ہیں۔ —

"خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی قانونِ الٰہی کا پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتا ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لیے پامال کیا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں دوسری صورت میں قانونِ الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے۔ بہر حال خودی کے تعین کا نام شریعت ہے۔"

بہر کیف ہم دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ لینن نے بارگاہِ باری تعالیٰ میں دنیا کی حالت پیش کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ سرمایہ پرستی کی کشتی کب ڈوبیگی؟ پھر فرشتوں نے بھی عرض کیا کہ دنیا کی حالت بہت خراب ہے اس پر فرشتوں کو خدا کی بارگاہ سے حکم صادر ہوا جو "فرمانِ خدا" کے عنوان سے آٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

اس شعر میں لینن کی شوخ کلامی اور فرشتوں کے بیانات کے بعد خداوند قدوس کی بارگاہ سے حکم ملتا ہے کہ فرشتو، قدرت کے کارخانہ کو چلانے والو اٹھو اور میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو اور امیروں نے جو اونچے محلات تعمیر کر رکھے ہیں ان کے در و دیوار میں زلزلہ پیدا کر دو۔

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

غرض کہ جو لوگ محکوم اور دست نگر بیٹھے ہیں ان میں یقینِ کامل کی ایسی حرارت پیدا کر دو کہ ان کا خون جوش میں آ جائے جو آج عام چڑیوں کی طرح نادار و ناچیز نظر آتے ہیں اور دولت مند اور سرمایہ دار جو اپنی دولت کی بدولت شاہین کی حیثیت رکھتے ہیں تو ایسا سامانِ سفر پیدا کر دو کہ یہ نادار چڑیا شاہین سے لڑ جائے۔

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

کعبے میں سنگِ مرمر کی سلیں لگا دینے سے کیا حاصل، عالیشان مسجدیں تعمیر کر دینے سے کیا فائدہ اصل مقصد تو یہ ہے کہ دینی جذبے کے ماتحت خلقِ خدا کی خدمت بہتر سے بہتر طریق پر انجام پائے۔ مجھے یہ سنگِ مرمر کی عالیشان عمارتیں درکار نہیں بلکہ میں ان سے ناراض و بیزار ہوں۔ مجھے تو ایسا کعبہ چاہیے جو عوام میں سچا دینی جذبہ پیدا کر دے اگرچہ وہ کعبہ مٹی کا ہی بنا ہوا ہو۔ مراد یہ کہ مذہب کی روح اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے عبادت کے لیے عالیشان عمارتیں

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

گھونت فارغ*



گرم خون

درانتی بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ اُس کے تیز تیکھے دانت بچھو کے ڈنک کی مانند ہری ہری نرم گھاس کو کاٹ رہے تھے۔ درانتی کی رفتار میں بجلی کی سی تیزی تھی۔ اُس کے ہاتھ بھی اتنی ہی تیزی سے چل رہے تھے۔ ہری ہری نرم نرم گھاس سے راجی کی جھولی بھرتی جا رہی تھی۔ بھرتی جا رہی تھی۔

اچانک درانتی ہل گئی۔ درانتی کے تیز تیکھے دانت راجی کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی میں چُبھ گئے۔ درد کی ایک ٹیس سے اُس کے مُنہ سے بے اختیار ہی "ہائے ... اوئی" کی آواز نکلی اور گرم ریت پر گرے شبنم کے قطرے کی مانند غائب ہو گئی۔ چند منٹوں تک راجی اُنگلی کو مُنہ میں لیے دانتوں کے نیچے دبائے بیٹھی رہی۔ پھر اچانک آہستہ سے اٹھی اور جھولی کو کندھوں سے اُتار کر زمین پر رکھ دیا۔ جھولی کی چادر کے پھٹے ہوئے کنارے سے ایک چھوٹی سی پٹی بنا کر اُس نے اپنی اُنگلی پر باندھ لی۔ یونہی پٹی کو گانٹھ دینے کے لیے اُس نے پٹی کے ایک سرے کو ایک ہاتھ کی اُنگلیوں اور دوسرے سرے کو دانتوں کے نیچے دبا کر کھینچا۔ کہ درد کی ایک زوردار ٹیس پھر اُبھری لیکن چند ہی لمحوں میں وہ اُنگلی میں اُبھری ٹیسوں کو بھول سی گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ آہستہ سے اُس نے جھولی پھر سے اپنے کندھوں پر رکھ لی۔ اور بڑی احتیاط سے دوبارہ گھاس کاٹنے لگی۔ ایک جگہ سے گھاس کاٹ کر وہ بیٹھی بیٹھی ہی، دوسری طرف آگے بڑھ جاتی اور دیکھتے ہی دیکھتے کافی ساری زمین صاف کر دیتی۔

مغربی اُفق میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ شفق کی لالی آہستہ آہستہ سیاہی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ چاروں سمت درختوں، کھیتوں، فصلوں غرضیکہ ساری کائنات پر سیاہی چھا گئی تھی۔ دور مشرق کی جانب آموں کے درختوں کے جھنڈ میں سے اُسے گاؤں کے کچے، آدھے کچے اور آدھے پکے مکان رات کی سیاہی میں گھلتے ملتے سے جان پڑ رہے تھے۔ اُن پر بھی گہرا اندھیرا چھا رہا تھا۔ راجی نے جلدی جلدی درانتی چلائی۔ آدھی جھولی بھر گئی تو اس نے گھاس کو چادر میں ڈال کر گٹھا سا باندھ لیا اور پھر کچھ پل سستانے کے بعد گٹھے کے دونوں سروں کو پکڑ کر اُسے ایک زور کا جھٹکا دے کر اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ وہ گھاس کاٹتی کاٹتی تھک سی گئی تھی۔ اور گٹھا کافی بھاری تھا۔ اُس نے گٹھے کو پیروں سے سیدھا کیا اور ایک بار پھر اُسے اُٹھانے کے لیے اپنی پوری طاقت لگا دی۔ اب کے گٹھا کندھوں تک پہونچ کر سر پر ٹکنے سے پہلے ہی دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

گٹھا اٹھانے کی بار بار کوشش کرتے کرتے راجی کی پرانی بوسیدہ شلوار گھٹنوں کے پاس سے پھٹ گئی۔ پھٹی ہوئی جگہ سے اُس کے گورے گورے رنگ کے بھرے بھرے گھٹنے نظر آنے لگے۔ جیسے پاس ہی کھلے تلی کے پھولوں کو شرمسار کر رہے ہوں۔ راجی جیسے مارے شرم کے اپنے آپ ہی لاجونتی کی طرح سمٹ کر رہ گئی۔ شلوار کے پھٹے ہوئے حصوں کو چھپانے کے لیے اور گورے گورے گھٹنوں کو ڈھانپنے کے لیے اس نے پانچوں کو ذرا اوپر اٹھا لیا۔ گٹھے کو اٹھانے کی جدوجہد کرنے سے اس کی کٹی ہوئی اُنگلی میں دوبارہ درد شروع ہو گیا۔ گھر جلدی پہنچنے کے خیال سے اُس کی سانس تیز تیز چلنے لگی جیسے لوہار کی دھونکنی

* ۵۲۱، سیکٹر ۳، آر کے پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲۔

[illegible] کے [illegible] اُس
کی چھاتیوں کا اُبھرنا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گورے گورے مکھڑے پر پسینے کے قطرے چمکتے دکھائی دے رہے تھے جیسے گلاب کے پھول پر اوس پڑی ہو۔

پسینے کی ایک موٹی سی بوند اُس کے دائیں گال پر ڈھلک آئی تھی۔ جو بیحد دلکش اور خوبصورت لگ رہی تھی۔

کچھ دیر تک راجی پھر گٹھے کو اٹھانے کی کوشش کرتی رہی۔ اچانک اُس کے دل میں آیا کہ وہ گٹھے کو وہیں چھوڑ کر گاؤں کو بھاگ جائے۔ لیکن وہ خالی ہاتھ کیسے جاسکتی تھی؟ اُس کی ظالم چاچی تو اُسے کچا ہی چبا جائے گی۔ اُسے سوسو باتیں سنائے گی۔ آخر ناامید ہوکر اداس و مغموم وہ گٹھے کے پاس ہی بیٹھ گئی اور پگڈنڈی کی جانب دیکھنے لگی۔ شاید کوئی مسافر اُدھر سے گذر رہا ہو۔ وہ اُسے کہہ کر گٹھا سر پر رکھوا لے گی۔

" راجی۔ ارے او راجی "

وہ اپنا نام سُن کر حیران رہ گئی۔ بجلی کی سی تیزی سے وہ اٹھی اور اِدھر اُدھر تکنے لگی۔ لیکن دُور دور تک کوئی دکھائی نہ دیا۔ اُسے کسی نے آواز نہیں دی تھی۔ اُسے کسی نے نہیں پکارا تھا۔ یہ تو شاید اُس کے اپنے ہی دل کا وہم تھا۔ من کا بھرم "مجھے ہر حالت میں اب تک اپنے گھر پہونچ جانا چاہیئے تھا" وہ سوچ رہی تھی۔

مغرب کے دھندلے آسمان پر چاند چمک اُٹھا آسمان کی جھیل میں چھوٹے چھوٹے ننھے ننھے ان گنت تارے تیرنے لگے۔ راجی بیحد فکر مند دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کسی راہ گیر کا انتظار کررہی تھی۔ کوئی آئے اُدھر سے گذرے اور وہ اُسے کہہ کر گٹھا اُٹھوا لے۔ لیکن اچانک کھیتوں میں سے جاتا ہوا کوئی آدمی اُسے دکھائی دیا۔ وہ سیدھا راجی کی جانب ہی آرہا تھا۔ راجی کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اب وہ اپنا گٹھا آسانی سے اٹھوا لے گی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اجنبی کو پہچاننے میں اُسے دیر نہ لگی۔ وہ گاؤں کے بڑے زمیندار کا منجھلا لڑکا اجیت تھا۔ جیتا بچا بچا کر پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی چور نقب لگانے جارہا ہو۔ راجی کے دل میں ڈر کے بے شمار سائے سے رینگنے لگے۔ جیتا اُس کے نزدیک پہونچ کر آہستہ سے کہتا ہوا سُنائی دیا۔

" راجی۔ کی گل اے " ؟

راجی کچھ نہ بولی۔ بُت کی بُت بنی کھڑی رہی۔ وہ پتھر کی طرح خاموش تھی۔ پھر وہ ہلکا سا مُسکرا دی۔

راجی کی وہ معصوم مُسکان جیسے جیتے کے دل کو گھائل کرگئی۔ وہ اندر تک لرز اُٹھا۔ کانپ سا گیا۔ جیتے کے اندر کا شیطان جاگ اُٹھا۔ جس نے اُس کے دل میں ایک ہلچل سی مچا دی۔ راجی نے گٹھا اٹھانے کے لیے بانہیں اوپر اٹھائیں۔ اِس اُمید سے کہ جیتا، گٹھے کو اُس کے سر پر رکھوا دے گا۔ لیکن ہوا اُس کی اُمید کے بالکل برعکس۔ کیا ہوا کیا جیتا ...؟

یہ سوچ کر راجی جیسے کسی خوفناک خواب سے ہڑبڑا کر جاگ اٹھی ہو۔ اُس نے اپنے جسم کو زور کا ایک جھٹکا دیا۔ اور بجلی کی سی تیزی سے جیتے کی شیطانی گرفت سے باہر نکل گئی۔ اُسکے روئیں روئیں میں جیتے کے لیے جیسے نفرت کی جوالا بھڑک اُٹھی۔ اُس کے دل میں آیا کہ وہ جیتے کو کچا ہی چبا جائے۔

جیتا ایک لمحے کے لیے رُک گیا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر اُس نے قدم آگے بڑھایا راجی زور سے شیرنی کی طرح گرجی۔

" خبردار میری طرف نہ دھیاناں تیری خیر نہیں۔" یہ کہہ کر درانتی اُس نے ہوا میں لہرائی۔ [illegible] آگے دھیاناں بنتی وڈھکے رکھ دیانگی۔ (آگے بڑھا۔ تو گردن کاٹ کر رکھ دوں گی)۔

اُس کا عزم دیکھ کر جیتے کا دل دہل گیا اُس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکنے لگی۔ اور وہ شرم سے پانی پانی ہوکر گاؤں کی جانب کھسک گیا۔

راجی کو پہلی بار اپنی ہمت اور طاقت کا احساس ہوا تھا۔ جیسے کہ [illegible] طاقت اُس کے جسم کے انگ انگ میں سمائی ہو۔ اُس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ گٹھا اٹھانے کے لیے کسی کا انتظار نہیں کریگی۔

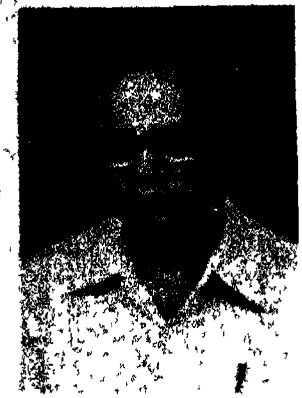
اس عزم کے ساتھ اس نے دوبارہ گٹھے کو ہاتھ لگایا تو وہ اُسے زیادہ بھاری معلوم نہ ہوا۔ اُس نے تھوڑا سا زور لگا کر گٹھا اٹھایا اور سر پر رکھ لیا۔

اب وہ گاؤں کی جانب تیز تیز چلتی جارہی تھی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ اُس کے سر پر گھاس کا بھاری گٹھا نہیں بلکہ پھولوں کی ہلکی پھلکی ٹوکری ہو۔

آج کے واقعے نے اُس کے اندر ایک نیا جوش ایک نیا ولولہ پیدا کردیا تھا اُس کے رگوں میں جیسے گرم گرم خون دوڑ رہا تھا۔

●

عبدالستار انصاری٭



ملازمت سے سُبکدوشی

ملازمت سے سُبکدوشی دو طرح سے ہوتی ہے۔ ایک ملازمت کی متعین مدّت پوری کر لینے کے بعد اور دوسری اس سے قبل یعنی دورانِ ملازمت۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ لمبی بیماری، خانگی مسائل اور فرائض منصبی کی انجام دہی میں کوتاہی۔

اس مضمون میں جس سبکدوشی کا ذکر ہے وہ مدّت ملازمت کی معینہ میعاد پوری کر لینے کی بات ہے جس کو عرفِ عام میں ریٹائرمنٹ کہتے ہیں۔ تو جناب یہ واقعہ پنڈت بھولاناتھ کے ریٹائرمنٹ کا ہے جو اپنی عمرِ عزیز کے چھتّیس سال گذارنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

وہ ایک دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھے اور ان کا کام حساب کتاب کا لیکھا جوکھا رکھنا تھا۔ ان کو اپنے فرائضِ منصبی کا اس قدر شدید احساس تھا کہ وہ نہ صرف دن میں دفتر کے اوقات میں ہی بلکہ رات کو بھی اپنے آرام کے اوقات میں بھی اس سے غافل نہ رہتے تھے۔ اور سوتے میں بھی جمع تفریق کرتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی نیند سے چونک کر اٹھ جاتے تھے۔ جب ان کے جوڑ گھٹانے میں سوچتے سوچتے کوئی کمی یا بیشی ہو جاتی تھی تو وہ اٹھ کر بڑبڑانے لگتے تھے۔ ان کی دھرم پتنی چونکہ ان کی اس عادت سے واقف تھیں وہ ان کو ایک گلاس پانی پلا کر سُلا دیا کرتی تھیں۔

پنڈت بھولاناتھ نے اپنی چھتیس سالہ ملازمت میں کبھی کوئی لمبی چھٹی نہیں لی تھی۔ گھر کا تمام انتظام، بچّوں کی تعلیم، ان کے علاج معالجہ کی تمام تر ذمّہ داری ان کی بیوی پر تھی۔ جس میں وہ کبھی کوئی دخل نہ دیتے تھے اور حق تو یہ ہے کہ ان کے پاس اتنا وقت ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ امورِ خانہ داری کی طرف توجہ دے سکیں۔ انھوں نے دورانِ ملازمت اپنا کوئی ذاتی مکان بھی تعمیر نہیں کرایا تھا جب ان کے ساتھی ان سے اس کا تذکرہ چھیڑ جاتے تو وہ ان کو یہ کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے کہ ابھی جلدی کیا ہے ریٹائرمنٹ کے بعد بنوالیں گے۔

بالآخر چھتیس سال کی ملازمت پوری کرنے کے بعد ان کی سبکدوشی کا دن آگیا۔ جس دن ان کے افسران بالا اور دفتر کے ساتھیوں نے ایک الوداعی پارٹی دی جس میں ان کی کارکردگی، لگن اور ایمانداری کی تعریف کی اور دفتر کی طرف سے بطور یادگار ایک دیوار گھڑی دیکر ان کو رُخصت کر دیا۔ دفتر سے جب وہ گھر پہونچے تو اس شام ان کی بیوی، بیٹے اور بیٹی نے ان کا ایسا استقبال کیا جیسے قیدی لمبی سزا بھگتنے کے بعد جیل سے رہا ہوا ہو۔

سبکدوشی کے پہلے ہفتے پنڈت بھولاناتھ کچھ کھوئے کھوئے سے رہے نہ انھیں غم کا کوئی احساس تھا نہ خوشی کا۔ ان کو البتّہ یہ ضرور احساس ہوتا تھا کہ جو چھتّیس سال کے بعد ایسے جیل خانے سے رہا ہوئے ہیں جس سے انھیں محبت ہو چکی تھی۔ ان کو خود کو یہ یقین دلانا مشکل ہو رہا تھا کہ اب وہ آزاد ہیں اور ان کے پاس اب وقت ہی وقت اور فرصت ہی فرصت ہے۔ انھیں اس بیکراں فرصت کی دولت مل گئی تھی جسے وہ سمیٹنے سے قاصر تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس دولت کو کس طرح خرچ کریں۔ وہ ان فرصت کے ایام میں جس سکون کے متلاشی تھے وہ مفقود تھا۔

٭ [illegible] مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ (یو۔پی)

[illegible] زندگی بھر [illegible] رہے تھے اس سے
[illegible] تھی۔ وہ پھر انھیں پرانی زنجیروں
[illegible] جن میں وہ پچھلے چھتیس سال
تک جکڑے رہے تھے۔ پھر وہ دفتر جس کی مدھم
روشنی میں وہ کام کرنے کے عادی ہو چکے تھے، وہی
ٹوٹی الماری جس میں وہ اپنے کاغذات بڑی حفاظت
سے رکھتے تھے۔ وہی بنا پالش کی کھردری میز جس
پر کبھی کبھی وہ کام سے تھک کر دونوں کہنیاں ٹیک
کر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ان سب کی یادیں
انھیں چین نہیں لینے دیتی تھیں۔

وہ زندگی بھر کبھی اس طرح فرصت سے گھر نہیں بیٹھے تھے اس لیے انھیں یہ فرصت بڑی گراں گزر رہی تھی۔ انھیں وقت گزاری کا پروگرام بنانے میں بڑی دقت محسوس ہو رہی تھی پھر انھیں ایک دن ایک کتاب میں مشہور فرانسیسی مفکر روشو (Roussu) کا وہ مایۂ ناز جملہ ملا۔

Man is born free but
every where, he is in chains

کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر وہ ہر جگہ زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے"۔ اس جملے نے ان کے ذہن میں ایک زبردست تبدیلی پیدا کی۔ انھوں نے سوچا کہ وہ زندگی بھر دوسروں ہی کی خدمت کرتے رہے اور دوسروں ہی کے لیے زندہ رہے۔ اگر ان کے ملازمت کے زمانہ کو ان کی عمر سے منہا کر لیا جائے تو وہ پھر ایک نوجوان بن جائیں گے۔ یہی تو فرصت کا وقت ہے جس کو وہ اپنا کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت کی دولت کے وہ بلا شرکت غیرے مالک ہیں۔ وہ اس کو جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ مگر پھر انھیں یہ احساس مسلسل رہ رہ کر ستاتا تھا کہ ان کا دفتر اور ان کے رفقائے کار کیا یک ان سے چھین لیے۔ جن کے بغیر ان کو زندگی میں ایک بڑا بھاری خلا معلوم ہونے لگا۔ دفتر اور ساتھیوں کے بغیر زندگی، زندگی نہیں رہ گئی۔

وہ کبھی کبھی اپنے پرانے دفتر جانے لگے۔ وہاں ان کے پرانے ساتھی گرمجوشی سے پیش آتے، ہنسی مذاق ہوتا اور قہقہے لگتے مگر اس کے باوجود انھیں دفتر میں ایک اندرونی کسک سی محسوس ہوتی جب وہ دیکھتے کہ جس کرسی پر وہ بیٹھتے تھے اس پر کوئی دوسرا شخص بیٹھا ہے۔ جس میز پر وہ اپنے مخصوص انداز میں کاغذات اور فائلیں رکھتے تھے وہ ترتیب بدل گئی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ پرانے ساتھیوں کی گرمجوشی سرد مہری میں بدلنے لگی ان کی توجہ میں بھی کمی آگئی اور اب ان کا دفتر آنا ان کے ساتھیوں کو گراں گزرنے لگا۔ اس لیے انھوں نے دفتر جانا ترک کر دیا۔

دفتر میں تعطیلات کے دنوں کے وہ منتظر رہتے تھے اب وہ انتظار کے دن ختم ہو گئے۔ اب ہر دن ان کے لیے تعطیل کا دن تھا۔ ان کے لیے وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ انھیں موسموں کی تبدیلی کا کوئی احساس نہیں رہ گیا تھا۔ دن، ہفتوں اور مہینوں کی گنتی وہ بھول گئے تھے۔

دن شروع ہوتے ہی انھیں نامعلوم سا خوف ستانے لگتا کہ اب یہ کیسے گزر گیا۔ جس طرح کسی شے کی افراط بھی انسان کے لیے پریشانی کا باعث ہو جاتی ہے اسی طرح وقت کی افراط بھی پنڈت بھولا ناتھ کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی جب ملنے والے ان سے یہ پوچھتے تھے کہ "کہیے پنڈت جی اب آپ کیا کر رہے ہیں"۔ تو وہ یہ سن کر چونک پڑتے تھے اور ان کو احساس ہونے لگتا تھا کہ وہ بیکار محض ہو کر رہ گئے ہیں۔ دوستوں اور شناساؤں کا یہ جملہ سن کر کہ "پنڈت جی اب تو چین ہی چین اور آرام ہی آرام ہوگا"۔ وہ سٹپٹا جاتے اور وہ اس آرام و چین کے تصور ہی سے گھبرانے لگتے۔ یہ جملہ ان کے لیے روح فرسا ہوتا اور انھیں یہ سن کر اختلاج ہونے لگتا اگر کوئی کہتا کہ "پنڈت جی اب رام رام کرو، ایشور بھجن کیا کرو"۔ تو وہ چراغ پا ہو جاتے اور کہتے کہ کیوں بھئی کیا پچھلے چھتیس سالوں میں رام کو یاد کرنے اور ایشور کی پرارتھنا کرنے کی کیا کوئی پابندی تھی۔ بھگوان کو تو ہمیشہ ہی یاد کرنا چاہیے"۔

پھر تلاش کرتے کرتے انھوں نے اپنے فرصت کے ایام کی مشغولیت کا حل ڈھونڈھ لیا۔ ایک رات کسی نے ان کے کان میں کہا "پنڈت جی سماجی خدمت کیوں نہیں کرتے، خدمت کے ہزار طریقے ہیں۔ جس میں وقت بھی گذر جائے اور دل بھی لگا رہے۔ دنیا بھی سنور جائے اور عاقبت بھی بن جائے۔

اور دوسرے دن صبح اٹھ کر انھوں نے خدمت خلق کرنے کی ٹھان لی۔ اور اسی دن سے اس پر کاربند ہو گئے۔ یہ خدمت کا سلسلہ ان کا ابھی تک جاری ہے جس سے وہ بہت مطمئن ہیں۔ ان کی عمر اب اسّی کے قریب ہو چکی ہے مگر وہ اب بھی تندرست نظر آتے ہیں۔

اس نسخۂ کیمیا کے اجزا جس نے ان کی زندگی بدل دی ــــ وہ صبح سویرے اٹھ کر ایشور کی پرارتھنا کرتے پھر محلے / اور پڑوس کے پسماندہ طبقوں کے غریب بچوں کو پڑھاتے، دن میں کچھ لکھتے پڑھتے۔ مذہبی، سماجی، سیاسی کتابوں اور رسائل کا مطالعہ کرتے اور شام کو تعلیم بالغان کی اسکیم کے تحت ناخواندہ بالغوں کو تعلیم دیتے۔ اس طرح ان کا وقت بھی گذرتا رہا۔ ان کو ذہنی اور قلبی تسکین بھی ملتی رہی اور سماج میں بھی ان کی عزت بڑھ گئی۔



عادل اشرف

ایک دن کی زندگی

سارے دفتر میں مکھی کے چھتے جیسی بھنبھناہٹ تھی۔ ہر کوئی ایک دوسرے کے کانوں میں کچھ نہ کچھ کہتا ہوا نظر آرہا تھا۔ صدر دروازے سے اندر داخل ہوکر میں نے سوچا "۔ کیا معاملہ ہے ۔" چپراسی کے چہرے پر بھی تازگی تھی اور اُس نے بڑی جوشیلی آواز میں سلام کیا تھا۔ پہلی بار آفس میں زندگی سی نظر آرہی تھی۔ اس سے پہلے تو آفس آورز میں کسی کو آفس کے معاملہ سے ہٹ کر بات کرنے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ میں دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا اپنی میز تک جا پہنچا۔ حسبِ معمول فائل نکالا اور کاموں میں مشغول ہوگیا۔ بغل کے ٹیبل پر پی اے۔ سریواستو سگریٹ کا لمبا لمبا کش لے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میرے قریب آئے اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"۔ آج ایک حادثہ ہوگیا ۔" انھوں نے رازدارانہ لہجے میں کہا ۔" کیا ہوا ۔ ؟" میں نے فائل کے کاغذات اُلٹتے ہوئے کہا ۔" یہ پوچھو کیا نہیں ہوا ۔" "آج باس (BOSS) مُسکراتے ہوئے آفس میں داخل ہوئے اور چپراسی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے ۔" کہو دینو کیسے ہو۔ ؟ گھر پر تو سب ٹھیک ہے نا ۔ ؟" خلافِ توقع باس کی زبان سے ایسے الفاظ سُن کر وہ حیرت میں پڑ گیا اور بمشکل کہہ سکا۔

"۔ بس آپ لوگوں کی دعا ہے ۔"

اس کے بعد وہ یکے بعد دیگرے سبھوں کے قریب گئے اور خیریت دریافت کی۔ پھر ہنستے ہوئے اپنے چیمبر میں چلے گئے۔ اب تم ہی بتاؤ اتنی بڑی تبدیلی کیا ایک حادثہ سے کم ہے۔

میں بھی اتنی ساری باتیں سُن کر چونک سا گیا۔ واقعی یہ چونکا دینے والی بات تھی۔ باس سے ایسی باتوں کی توقع کرنا گویا رات میں سورج کی تمنا کرنے کے برابر تھی۔ میرے دل میں ایسی اچانک تبدیلی کی وجہ جاننے کی خواہش ہوئی۔ باس آفس کے سارے لوگوں میں مجھے سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ میں ہمت کرکے ان کے چیمبر میں گیا۔ کچھ کاغذات پر دستخط بھی کروانے تھے۔ مَیں جیسے ہی اندر داخل ہوا وہ تپاک سے اُٹھے اور مصافحہ کرنے کے بعد مجھے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد ان کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی ۔" شوکت ! آج میں بے انتہا خوش ہوں، ایسی اچانک تبدیلی پر تم سب ضرور پریشان ہوگے کہ آخر اتنا بڑا چینج کیسے آگیا ؟ انھوں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

" یس سر ۔" مختصر سے جواب کے ساتھ میں خاموش ہوگیا۔ وہ چشمے کا شیشہ صاف کرتے ہوئے کہنے لگے۔

۔" زندگی کے اس تپتے صحرا میں مَیں ایک سُوکھے کیکٹس کی طرح ہوں جس کی قسمت میں سیراب ہونا لکھا ہی نہیں۔ میری کہانی سُنو۔

بچپن ہی میں مَیں باپ کے سائے سے محروم ہوگیا اور یتیم خانے میں ڈال دیا گیا۔ چونکہ خاموش رہنا میری فطرت میں داخل ہے اس لیے بچپن کی شرارتیں جو عام بچوں کی فطرت ہے، میرے قریب نہ آسکیں! اور میں کتابوں کی دُنیا میں اُلجھا رہا۔ امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل ہونے کی وجہ سے آگے بھی پڑھنے کی سہولتیں ملتی رہیں۔ پڑھائی کا سلسلہ ختم ہوتے ہی مجھے نوکری مل گئی! اُسی زمانے میں شانتی میری زندگی میں آئی۔ اس کی سادگی اور معصومیت میرے دل کی گہرائیوں میں اُترتی چلی گئی اور پھر کچھ دنوں کے بعد وہ میری شریکِ حیات

■ قاسمی لین۔ محلہ مرزا روڈ۔ مظفر پور ۔ ۸۴۲۰۰۱۔

... جانے سے میں ناامیدی اور مایوسی کی تاریک گپھاؤں سے نکل کر سہانے سپنوں کی وادیوں میں داخل ہو گیا۔ مگر قسمت نے میرے ساتھ ایک اور مذاق کیا شادی کے ٹھیک ایک سال بعد شانتی میرے مردہ بچے کو جنم دے کر مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔"

"میری زندگی ایک بار پھر ویران ہو گئی اور میں دوبارہ ناامیدی اور مایوسیوں کی تاریک گپھاؤں میں تنہا لوٹ گیا۔ اسی طرح سالوں گزر گئے مگر مجھے کبھی شانتی نہ ملی۔ ایک جھلاہٹ سی ہمیشہ میرے دل و دماغ پر چھائی رہتی۔ کل رات شانتی مجھ سے خواب میں ملی اور امید کی کرن دکھا کر لوٹ گئی۔ اُس نے کہا۔ "تم اس قدر اُداس کیوں رہتے ہو ذرا اپنے چاروں طرف نظر اٹھا کر دیکھو تمھاری شانتی تم سے دور نہیں۔" اور جب میں نے اپنے چاروں طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے تم سب مجھے اپنے پاس بلا رہے ہو اور کہہ رہے ہو۔" میرے پاس آؤ۔ تمھاری شانتی میرے پیار میں ہے۔

سچ بھی تو ہے شوکت کہ میں تم سبھوں کے اتنے قریب رہ کر بھی بے آپ کو الگ رکھا۔ اکیلے پن کی لیبل خود پر چپکا لوں تو کیا یہ ناانصافی نہیں ہے۔؟ اور پھر زندگی کب اور کس وقت اپنا دامن چھڑا لے کوئی نہیں جانتا۔ گئے رات تک سوچتے سوچتے میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ زندگی کے حصے پل بھی ہمارے حصے میں ہیں اُسے مسکرا کر ... اور زندگی کو آزاد کر دیں ان اصولوں اور قاعدوں سے جو انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب مل بیٹھ کر جینے سے روکتے ہیں۔"

میں خاموشی سے ان کی باتیں سنے جا رہا تھا۔ فرط جذبات سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بھی کافی جذباتی ہو گئے تھے۔ ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے ایک ہی دن میں وہ سالوں کی زندگی گزار گئے ہیں۔ شام کی چائے انھوں نے ہم سبھوں کے ساتھ ہی کینٹین میں لی۔ اور پھر ہم سبھوں سے رخصت ہو کر اندھیرا ہونے کے قبل ہی اپنے بنگلے کی جانب چلے گئے۔ ہم سبھوں کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی حسین خواب دیکھا ہے۔

دوسرے روز جب میں آفس پہونچا تو سارے لوگ اُداسی کا مجسمہ بنے بیٹھے تھے ان کی آنکھوں میں اُداسی کے قطرے لرز رہے تھے۔ چپراسی سے پوچھنے پر کہ کیا بات ہے۔؟ وہ بے اختیار رونے لگا اور بہ مشکل کہہ سکا۔" کل شام باس ہم سب سے رخصت ہو کر گئے تو راستے میں ان کا ایک کار سے ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ اسپتال پہنچتے ہی ہم سبھوں کو چھوڑ گئے۔"

میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

آفس کے بزرگ کلرک چشمے کا شیشہ صاف کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"باس کی ابھی عمر ہی کیا تھی۔ انھوں نے ٹھیک طور پر زندگی گزاری ہی کہاں تھی۔" مگر میرا دل بار بار کہہ رہا تھا وہ سوکھا کیکٹس زیراب ہو چکا تھا۔ باس نے ایک ہی دن صحیح زندگی تو گزار لی تھی۔

●

بقیہ، ایک نئے طرز فکر کی ضرورت

بہت سے ادارے کام کر رہے ہیں۔ کرناٹک میں الامین سوسائٹی، کیرالا میں ایجوکیشن ٹرسٹ، بمبئی میں انجمن اسلام وغیرہ۔ ہر ریاست میں ان گنت ادارے ہیں۔ لیکن ان میں کوئی تال میل نہیں ہے۔ اُردو اخباروں کے ذریعے ان اداروں کی سرگرمیوں کی اطلاع بھی کی جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان اداروں کے عہدیدار پہلے علاقائی طور پر اور پھر کل ہند طور پر جمع ہوں اپنے کام اور طریقۂ کار سے ایک دوسرے کو واقف کرائیں۔ آپسی میل جول سے بہت سے ایسی شکلیں نکل سکتی ہیں جو کل ہند طور پر رائج ہو سکتی ہیں۔

مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کے بہت سے ایسے محکمے ہیں جو فلاحی اور سماجی کاموں کے لیے امداد دیتے ہیں۔ مگر ان کے امداد دینے کا ایک مخصوص ضابطہ ہے۔ بہت کم مسلم ادارے ان ضابطوں کی پیروی کرتے ہیں۔ لہٰذا لاکھوں روپیوں کی امداد سے محروم رہتے ہیں۔ یہ ضابطے ایسے مشکل بھی نہیں، مگر سفر بہ شرط والی بات ہے۔

مسلم لڑکیاں تعلیم میں بہت بچھڑی ہوئی ہیں۔ اب نان فارمل یا خط و کتابت کے ذریعے تعلیم کی بڑی آسانیاں پیدا ہوئی ہیں۔ یہ تعلیم گھر بیٹھے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسکول جانے کی ضرورت بھی نہیں۔ اگر گاؤں یا محلّے میں بااثر افراد مکان کا ایک کمرہ کچھ دیر کے لیے دے دیں اور چند پڑھی لکھی خواتین رضاکارانہ طور پر یا واجبی معاوضے پر ایسی لڑکیوں کو ہفتے میں دو تین بار پڑھا دیں تو سینکڑوں لڑکیاں گھر بیٹھے ہائی اسکول کا امتحان پاس کر سکتی ہیں۔ غریب لڑکیوں کی مدد بھی کی جا سکتی ہے۔ ایسے لوگوں کی کمی بھی نہیں جو ایسے کاموں میں ہر طرح کی مدد کریں۔ لیکن ضرورت یہ ہے کہ چند لوگ پیش قدمی کریں۔ جب تک مسلمان لڑکیوں میں تعلیم عام نہیں ہو گی اس وقت تک مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی ترقی ادھوری رہے گی۔

●

امن کا پرچم



وقار طاہری : ۹۹/۴۲۲ اے، نالا روڈ، چمن گنج
کانپور، ۲۰۸۰۰۱

غزل

میری نظر میں تیرا گنہ گار کون تھا
میں گھر میں تھا اگر تو سرِ دار کون تھا

اونچی فصیل کس پہ گری تیرے خواب کی
جو دب کے مر گیا تہہِ دیوار کون تھا

شب خون مارتی رہی رہ رہ کے اک صدا
غفلت گزیدہ شہر میں ہشیار کون تھا

سمٹا ہوا سا اپنے ہی زندانِ ذات میں
تقلیدیوں کی بھیڑ میں فن کار کون تھا

یہ میری فکر تھی کہ نوشتوں کو پڑھ لیا
سادہ سپاٹ چہروں میں اخبار کون تھا

لہرایا کس کا پرچم آواز لے وقار
اس پار تو اگر تھا تو اُس پار کون تھا

سیدہ نسرین نقاش : خندہ کھون،
نواکدل، سرینگر ۱۹۰۰۰۲ (کشمیر)

ہمارا نقشہ
خانوں میں بٹا ہوا ہے
خانوں کی یہ زنجیر دسیا ہی نہیں
ہمارا اپنا وجود ہے
ایک خانے سے آخری خانے تک
ہم ایک ہیں
پھر ہمارے ہاتھوں میں ایٹم بم کیوں ہے
ہم کونسے خانے پر بم پھینکیں گے
کس خانے میں ہم نہیں ہیں
کیا ہم ایسے ہی دانشور ہیں
کہ ایک ہاتھ سے
دوسرا ہاتھ کاٹ لیں
اور مفلوج ہو جائیں
ہمارے پرچم بلند سہی
لیکن ان سے بھی بلند
ایک اور پرچم ہے
امنِ عالم کا پرچم
جی ہاں ! یہی ہمارا نجات دہندہ ہے ۔



فردوس گیاوی : سخے خاں کی گلی، پنچائتی
اکھاڑا، گیا ۸۲۳۰۰۱ (بہار)

حوصلہ رکھو

کیا ہوا جو سمتیں کھو گئیں
منزل لاپتہ ہے
کھرچ ڈالو ذہن سے نا اُمیدی کے تمام حروف
اور روشن کر لو
اک شمع اُمید و یقین کا
کیا ہوا جو پڑ گئے پاؤں میں چھالے
کٹھن سے کٹھن راہ میں بھی حوصلہ رکھو
دیکھو !
چھوٹنے نہ پائے اُمید و یقین کا دامن
چلو رُک کیوں گئے ؟
دیکھو وہ دُور پگڈنڈی پہ اک چراغ جلتا ہے
منزل اب دُور نہیں !
حوصلہ رکھو
کہ حوصلہ ہی سے ہوا ہے ہر شخص سُرخرو
حوصلہ پست مت کرو
منزل ملے گی ضرور
چلتے رہو، چلتے رہو، چلتے رہو !!!

غزلیں



دھرم پال عاقل :

پن ۸ ـ گورنمنٹ کوارٹرز، شملہ ۱۷۱۰۰۲ (ایچ.پی)

جوانی کی بڑی رنگیں کہانی یاد آتی ہے
جو بیتی پیار میں وہ زندگانی یاد آتی ہے
دلِ مضطر کی بیتابی، وہ بڑھتا بے قراری کا
وہ تنہائی میں اشکوں کی روانی یاد آتی ہے

کوئی جب پھول مرجھایا ہوا سا دیکھ لیتا ہوں
تو خونِ حسرتِ دل کی کہانی یاد آتی ہے
مٹاتا جا رہا ہے وقت دل سے اور سب باتیں
مگر وہ جس کو کہتے ہیں جوانی یاد آتی ہے

پھوار میں سی پڑا کرتی ہیں جب بادل کے پھولوں کی
مجھے رہ رہ کے ان کی گل فشانی یاد آتی ہے
کوئی تو بات ہے تغافل جواب تک اہلِ دنیا کو
جنابِ داغؔ کی رنگیں بیانی یاد آتی ہے

برج ابھیلاشی : دلی گیٹ،

غازی آباد

دیکھ رہے ہو کیوں تم مجھ کو شرمائی آنکھوں سے
کیا ہوگا گر دل میں اُتری یہ پرچھائی آنکھوں سے

بکھری زلفیں، مہکی سانسیں، انگڑائی پہ انگڑائی
جو کہنا ہے جلدی کہہ دو ان ہرجائی آنکھوں سے

ڈوب گئے تو کون نکالے گا تم کو ان جھیلوں سے
بچے ہو جو ناپ رہے ہو تم گہرائی آنکھوں سے

آؤ دیکھیں رنگِ بہاراں، حسن جوانی اور شباب
کس کو خبر ہے کب ہو جائے گم بینائی آنکھوں سے

رات گئے میخانے جب تھے اور دیوانے اسی ضد
ساقی نے پھر جیسے تیسے پیاس بجھائی آنکھوں سے

ممکن ہے پتھر ہو جائے سارا عالم پل دو پل سے
روکیں گے جب میری راہیں وہ سنگرائی آنکھوں سے

وہ بھی رو دیں گے "ابھیلاشی" جب وہ تم کو دیکھیں گے
شوخی شوخی، سہمی سہمی سی مرجھائی آنکھوں سے



نیرّ قریشی :

نیرّ ولا، گنگوہ، (سہارنپور)

آرام کی اک سانس بھی دشوار بہت ہے
اس دور کا ہر شخص دل آزار بہت ہے

فطرت کے تقاضوں کا طلب گار بہت ہے
حیرت ہے کہ دیوانہ بھی ہشیار بہت ہے

شاعر کی زباں وقت کی آواز کہو تم
دنیا مرے شعروں کی پرستار بہت ہے

تنقید یہ تنقید کھلاتی ہے نئے گل
با ذوق نظر آج بھی فن کار بہت ہے

اللہ رے دیکھا تہ گیا ذوقِ نظارہ
دل درد کے ماروں کا طرفدار بہت ہے

فن کار ہوں فن کا مرے سودا نہ کرو تم
پرکھو نہ مجھے دل مرا خود دار بہت ہے

رخ موڑ کے، شیشے کی طرح توڑ گیا دل
اندازِ تغافل تو جفا کار بہت ہے

ہر گام پہ خیراتِ سکوں مانگنے والو
خود دار ہیں ہم، جذبۂ ایثار بہت ہے

احباب کی نظروں میں ہے تنقید سے برتر
نیرّ کا بلند آج بھی کردار بہت ہے

تبصرے

نام کتاب	:	خوشبو کا سفر
مصنف	:	صلاح الدین نیر
صفحات	:	۱۳۴
قیمت	:	۱۲ روپے
ناشر	:	مکتبۂ شعر و حکمت حیدرآباد

"خوشبو کا سفر" صلاح الدین نیر کا [...]نچواں مجموعہ کلام ہے اس سے قبل چار مجموعے [...]ل تازہ، زخموں کے گلاب، صنم تراش، شکس در [...]لکس شائع ہوکر داد و تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ [...]ل تازہ" کی منتخب غزلوں کا تلگو میں "نیر گیتالو" [...]ے نام سے منظوم ترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے۔ خوشبو کا سفر" کا انگریزی ترجمہ زیر طباعت ہے۔

صلاح الدین نیر جدید شعرا میں اپنی انفرادیت [...]ی۰ھ سے ایسا خاص مقام بنا چکے ہیں۔ ان کی شاعری [...] ایسا ایک مزاج ہے۔ غزل میں بھی روایتی [...]ضامین اور اسالیب اظہار سے دامن بچاتے [...]ئے ایک مخصوص اور منفرد طرز ایجاد کیا ہے۔ [...]جی اور سیاسی شعور کو غزل کے پیمانے میں ڈھال [...]غزل کو عصری آگہی کا ترجمان بنادیا ہے۔ سماجی [...]سیاسی مسائل اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ [...]یں خاص طرح کی متانت، نرمی اور دل پذیری [...]یت محسوس ہوتی ہے جو انسان دوستی [...]لوص و وفا سے عبارت ہے۔ نیر صاحب کے [...]عشق کے اظہار میں والہانہ سپردگی کے ساتھ [...]تقدس و طہارت بھی ہے۔ لمحی جسم سے وصال کی خواہش کا اظہار کہیں بھی نہیں ہے۔ غم فراق ہو کہ نشاط وصل ہر طرح کی کیفیات کو انھوں نے شائستگی اور وقار کے ساتھ پیش کیا ہے طہارت اور تقدس کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تمھارے قرب کی تسکین راس کیوں آئی
یہاں سے دور اگر تم کو جاکے بسنا تھا

رواج و رسم کی زنجیریں توڑ کر ساری
تمھارے بعد یہاں کون ملنے آئے گا

ہمارے بیچ جو خوشبو کا ایک رشتہ ہے
اس ایک رشتے کو نیر ترا سجائے گا

"ایک حساس شاعر" کے نام سے ایک مختصر سا تعارف عابد علی خاں کا شامل ہے۔ پیش لفظ ڈاکٹر مغنی تبسم نے لکھا ہے جس میں نیر کی شاعری کا ناقدانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ "خوشبو کا سفر" کے عنوان سے خود نیر صاحب نے اپنا، اپنی شاعری اور اپنے فکر و فن کا تعارف کروایا ہے جو خاصا اہم ہے اور ان کی شاعری کو سمجھنے میں معاون بھی۔ نیر نے زندگی اور اس کے گرد و پیش کو جیسا پایا اور محسوس کیا ویسا ہی پیش کردیا ہے۔ انھوں نے داخلی احساسات اور قلبی واردات کو شعری پیکر دیا اور خارجی ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے عصری زندگی کے مسائل کو اپنے ذہنی رد عمل کا اظہار بنایا۔ کتابت و طباعت عمدہ اور ٹائٹل بھی دیدہ زیب ہے۔ (جمیل اختر) ●

نام کتاب	:	تعارف
مصنف	:	شفیعہ قادری
صفحات	:	۱۱۸
قیمت	:	۱۲ روپے
ناشر	:	مکتبۂ شعر و حکمت حیدرآباد۔

زیرِ تبصرہ کتاب شفیعہ قادری کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ ان کی پہلی کتاب "حیدرآباد کے علمی و ادبی ادارے" جو مصنفہ کے ایم فل کا مقالہ ہے، ۱۹۸۳ء میں شائع ہوکر قبولیت عام حاصل کرچکی ہے اور دانشورانِ ادب نے اس پر اظہار پسندیدگی کے جو کلمات کہے ہیں وہ زیر تبصرہ کتاب میں پہچان کے عنوان سے عام قاری کی معلومات کے لیے شامل ہیں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ پسندیدگی کا اظہار کرنے والے تمام لوگ کسی نہ کسی طور پر حیدرآباد سے جڑے ہوئے ہیں۔ حیدرآباد سے باہر اس کتاب پر کسی کے کان تک کھڑے نہیں ہوئے اور جوں تک نہ رینگی۔ خوشی بس اس بات کی ہے کہ پھول اپنے ہی چمن میں سر چڑھا اور قدر کی گئی۔ خدا کرے کہ تعارف بھی اسی گرم جوشانہ انداز سے متعارف ہو۔

"تعارف" میں دس مضامین اور ایک تبصرہ شامل ہے۔ تمام مضامین تاثراتی قسم کے زیادہ اور تنقیدی کم ہیں۔ مومن، داغ، مجاز، ساحر اور جاں نثار اختر پر جو مضامین شامل کتاب ہیں اس سے ان کی شخصی اہمیت کا اندازہ تو بخوبی لگایا جا سکتا ہے لیکن ادبی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ان کے فکر و فن کا صرف ایک سرسری تعارف پیش کرتے ہیں جس سے ان کی زندگی کے بعض اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اور بعض اہم معلومات بھی فراہم ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں تنقیدی بصیرت کی کمی ہے۔ چونکہ یہ تمام مضامین ریڈیو کے لیے لکھے گئے ہیں اس لیے ان میں وقت کی کمی بھی مانع رہی۔ ریڈیو کے لحاظ سے یہ تمام مضامین بہت معلوماتی ہیں اور ان میں بہت سی بکھری معلومات کو یکجا کردیا گیا ہے جو ایک طرح سے طلبا کی معلومات میں اضافے کا سبب تو بن سکتی ہیں لیکن ناقدوں کے لیے کوئی مسالہ فراہم نہیں کرتیں۔ (جمیل اختر)

آپ سب کے لیے

بائیو گیس پلانٹ

گاؤں ہو یا شہر، ہر جگہ ایندھن کی کمی ایک بڑا مسئلہ بنتی جا رہی ہے۔ لکڑی، کوئلہ اور مٹی کے تیل کا ذخیرہ دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے ان کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ گاؤں کے زیادہ تر لوگ گائے، بیل، بھینس وغیرہ جانوروں کو پالتے ہیں۔ جن کے گوبر کو وہ عموماً کنڈے بنا کر ایندھن کے روپ میں استعمال کرتے ہیں۔ دراصل اس گوبر کو بائیو گیس اور کھاد میں بدل کر اس سے اور بھی اچھا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ بائیو گیس ایندھن اور توانائی دونوں طرح سے کام میں لائی جا سکتی ہے۔

یہ ایک جلنے والی گیس ہے جس میں لگ بھگ دو تہائی میتھین (ILETHANL) اور ایک تہائی کاربن ڈائی آکسائیڈ ہوتی ہے ان کے علاوہ بہت تھوڑی مقدار میں اور گیسیں موجود رہتی ہیں۔ مثلاً ہائیڈروجن سلفائیڈ وغیرہ۔ بائیو گیس مویشیوں کے گوبر انسان کے پیشاب پاخانہ اور نباتات کے سڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسے کھانا پکانے کے ایندھن کے روپ میں بھی کام میں لایا جا سکتا ہے اور روشنی کرنے والی لالٹین جلانے اور کھیت مشینری چلانے کے کام میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ اس پر کھانا جلدی پک کر تیار ہو جاتا ہے۔ اس سے برتن سیاہ نہیں ہوتے اور آنکھوں میں دھواں بھی نہیں لگتا۔ یہ گیس کافی سستی پڑتی ہے۔ یہ صحت کے لیے بھی نقصان دہ نہیں ہے

دھوپ چولہا

ہزاروں سال پہلے سے آگ ذائقہ دار اور ہضم ہونے والا کھانا پکانے کے لیے استعمال ہوتی رہی ہے۔ پرانے زمانے میں جنگلات کی کمی نہ تھی اس لیے کھانا پکانے کے لیے ایندھن کی کمی نہیں تھی۔

اکثر کھلی ہوئی آگ کو کھانا پکانے میں استعمال کیا جاتا تھا اور اس طرح توانائی کا بہت بڑا حصہ بیکار چلا جاتا تھا۔ اس طرح سے کھانا بناتے وقت جو بھاپ بنتی تھی وہ بھی بیکار چلی جاتی تھی۔

اسی گرمی کو کارآمد بنانے کے لیے دھوپ چولہا یا سولر کوکر بنایا گیا ہے۔ یہ ایک باکس ٹائپ کا ہوتا ہے جس میں ایک خاص قسم کا آئینہ لگا ہوتا ہے اس کے ساتھ تانبے کا چھلا بھی لگا ہوتا ہے جس پر کھانے کا سامان رکھا جاتا ہے۔ اس طرح سے شمسی باکس کے اندر اکٹھا کی ہوئی شمسی توانائی کو بیکار نہیں ہونے دیا جاتا ہے۔ یہ باکس کے اندر موجود ہوا کا درجہ حرارت قریب ۱۰۰ ڈگری سینٹی گریڈ تک اٹھا دیتا ہے جو بند جگہ میں کھانا پکانے یا اُبالنے کے لیے کافی گرمی دے سکتا ہے۔

ساتویں منصوبے میں پچھڑی ذاتوں کی بھلائی

یوجنا آیوگ نے ساتویں پانچ سالہ یوجنا میں سماج کے

پچھڑے لوگوں کے لیے ۵۶، کروڑ روپے کی منظوری دی ہے۔ یہ چھٹی پانچ سالہ یوجنا میں منظور کی گئی رقم سے ۷۰۰۵۵ فیصد زیادہ ہے۔

اس پروگرام میں بہتری لانے کے لیے ریاستی حکومتوں کو بھی معاشی ترقی، سینچائی اور تعلیمی میدان پر دھیان دینے کو کہا گیا ہے۔

ساتویں یوجنا میں غریبی دور کرنے کے مختلف پروگراموں کے تحت پچھڑی ذاتوں کے ۴۰ لاکھ خاندانوں کو مالی امداد دی جائے گی، ۸۶ - ۱۹۸۵ء میں ۸ لاکھ ۴۳ ہزار خاندانوں کو یہ امداد دی گئی۔ جبکہ صرف ۸ لاکھ ۵۴ ہزار لوگوں کو مدد دینے کا نشانہ رکھا گیا۔ ۸۷ - ۱۹۸۶ء میں بھی ۸ لاکھ ۳۵ ہزار کی جگہ ۹ لاکھ ۸۳ ہزار خاندانوں کو امداد دی گئی۔

سوویت یونین میں بھارت مہانسو

سوویت یونین میں بھارت مہانسو ۳ جولائی ۱۹۸۷ء کو شروع ہوا۔ اس مہانسو کا مقصد ہندوستانی تہذیب کی ایک جھلک سوویت عوام کو دکھانا تھا۔ اس مہانسو میں جہاں ایک طرف ہندوستانی دست کاری اور صنعت و حرفت کی نمائش کی گئی، تو دوسری طرف تفریحی پروگراموں پر بھی کافی دھیان دیا گیا۔ یہ مہانسو سوویت یونین کے ۱۳۲ شہروں میں ایک ساتھ منایا گیا۔ اس میں لاکھوں سوویت فلم پریمیوں کو لگ بھگ ۰۰ا فیچر فلمیں، ۶۰ ڈاکومنیٹری فلمیں اور بے شمار کارٹون فلمیں دکھائی گئی ہیں۔ سوویت یونین کے لوگ ہندوستانی فلموں کو بہت پسند کرتے ہیں اور ابھی بھی پرانی نسل کے لوگ راج کپور اور ان کی فلم "آوارہ" اور اس کا یہ گیت "آوارہ ہوں" نہیں بھول پائے ہیں۔

ماسکو گورکی سنٹرل پارک میں، کھلے منچ پر ایک ہی وقت میں ۱۲ ڈرامہ کمپنیوں نے اپنا پروگرام پیش کیا جو بہت پسند کیا گیا۔

اس مہانسو سے جہاں ایک طرف سوویت یونین کے لوگوں نے ہندوستانی تہذیب و تمدن کو دیکھا تو دوسری طرف یہاں کے لوگوں کے بارے میں عام خیالات بھی بدلے۔ انھیں یہ پتہ چل سکا کہ ہندوستانی صرف انسان دوست ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر تہذیب و کلا کاری بھی موجود ہے۔

کھیل کود کے پروگرام۔ جرمنی کے ساتھ معاہدہ

بھارت اور ڈیموکریٹک جمہوریہ جرمنی کے درمیان ۸۹ - ۱۹۸۸ء کے لیے کھیل کود کے شعبے میں تعاون کے ایک نئے معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کے تحت کھیل کود کے بھارتی کوچ اور سائنسدانوں کو جرمنی میں فیلوشپ اور وظیفے دیے جائیں گے۔ جرمنی سے کھیل کود کے ماہرین بھارت آئیں گے اور تیراکی، جوڈو اور جمناسٹک وغیرہ میں تربیت دیں گے۔ بھارت سے کھیل کود کی ٹیموں کو جرمنی بھیجے جانے کا پروگرام بھی اس میں شامل ہے۔ یہ ٹیمیں ہاکی اور اتھیلٹک کی ہوں گی۔

میگھ دوت انعام

محکمۂ ڈاک ہر سال اپنے کارکنوں کو اچھی کارگزاری پر میگھ دوت انعام دیا کرتی ہے۔ ہر انعام میں ایک میڈل، ایک توصیفی سند اور ۰۰۰ا روپے دیے جاتے ہیں۔ یہ انعام ۱۹۸۴ء میں شروع کئے گئے تھے۔ اس سال یہ انعام چھ کارکنوں کو دیا گیا ہے۔ ●

قارئین کی آراء اور مشورے

مناظر، عروسِ صحافت ہے یوجنا
آئینہ دارِ حُسنِ ادارت ہے یوجنا
ہے ملک شاہراہِ ترقی پہ گامزن
مشہور بند اس کی شہادت ہے یوجنا
تعلیم، اقتصاد، ادب، طب، معاشیات
ہر ایک علم و فن کی اشاعت ہے یوجنا
کیا پایا ہم نے صنعت و حرفت میں آج تک
اس امر کی صریح وضاحت ہے یوجنا
اکیسویں صدی کی طرف بڑھ رہے ہیں ہم
اہلِ وطن کو اس کی بشارت ہے یوجنا

احمد علی برقی اعظمی : پرشین یونٹ،
آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱ ۔

● یوجنا پابندی سے پڑھنا اپنا اوّلیں فرض سمجھتا ہوں اگر کسی وجہ سے یوجنا وقت پر نہیں مل پاتا تو عجیب سی کسک محسوس ہوتی ہے۔ آپ نے ہر قسم کے قاری کو اس میں سمو دیا ہے، اسے کسی نہ کسی طرح سے اپنی ذہنی جلا کے لیے خوراک مل جاتی ہے۔ یہ اپنے آپ میں ایک بڑا کارنامہ ہے جس کے لیے آپ اور سب متعلقہ اسٹاف مبارکباد کا مستحق ہے۔ خدا کرے کہ آپ کی ادارت میں یہ دن دُونی رات چوگنی ترقی کی منزل پر گامزن رہے۔ آمین۔

اس شمارے میں سب ہی مضامین، غزلیں، نظمیں معیاری ہیں۔ سونے پر سہاگہ کہ اُردو دُنیا کی ادبی خبریں فوٹوؤں کے ذریعے جو اُجاگر کرتے ہیں وہ نہایت ہی دل پذیر اور دل کش جدت ہے اس سے اُردو دنیا کو ایک قوت ملتی ہے اور روشن مستقبل کی جھلک بھی۔ میری جانب سے متعلقہ افراد کو مبارکباد دے دیں۔

شمیم حیدر، لائبریرین
غالب اکیڈمی، حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۳۔ ۱۱

● الحمدللہ کہ یوجنا کے شمارے پابندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ یوجنا کی خریداری پر بندۂ عاجز کو ناز ہے۔ ہر شمارہ خوب ہے بلکہ خوب تر ہے۔ خصوصاً خاص نمبرس۔ قومی تعلیمی پالیسی نمبر، آزادی کی چالیسویں سالگرہ نمبر، یہ یہودگی آخر کب تک، تو قارئین کے لیے عموماً اور طلبا کے لیے خصوصاً نعمتِ عظمیٰ سے کم نہیں۔ ہر شمارہ کے مندرجات کا انتخاب اور تنوع قابلِ تحسین و تسکین ہے۔ آپ چند دردمند حضرات نے یوجنا کو اتنی بلندی پر پہنچا دیا ہے کہ آپ تمام کی بے لوث خدمات تاریخ ادب اُردو میں زرّیں حروف سے لکھی جائیں گی۔

محمد رضی الدّین معظم ۲۰-۳-۸۶۲، رحیم منزل، شاہ گنج، حیدرآباد-۲۔ (آندھرا پردیش)

● یوجنا اُردو کی شہرت بڑھ رہی ہے۔ چونکہ مظفر پور میں یہ میگزین نہیں آتی تھی۔ اب جبکہ آنے لگی ہے اور اس کا ادبی معیار بھی اچھا ہو گیا ہے، اس لیے اردو ادب سے متعلق لوگ اسے کافی پسند کرنے لگے ہیں۔

منظر امام : کتابستان، چندوارہ،
مظفر پور (بہار)

● یوجنا (اکتوبر ۱۹۸۷ء) کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ پچھلے کئی ماہ سے رسالے کے معیار میں اطمینان بخش اضافہ ہوا ہے جو کہ رسالے کی ہر دل عزیزی کا سبب ہوگا۔

تنقیدی مضامین کی طرف توجہ کریں کمی کا احساس ہوتا ہے۔ علمی و ادبی مضامین کی تشنگی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ویسے سبھی مضامین اچھے ہیں خاص کر عمران عظیم صاحب کا "اقبال کا تصورِ خودی" محمد ابو صالح کا "سرسید اور سیکولرزم" ان کی اس کاوش پر داد دینا بخل ہوگا۔ عمران عظیم صاحب سے اُمید ہے کہ وہ مستقبل قریب میں بھی نئی کاوشوں کے ساتھ آتے رہیں گے۔

نثری حصے کے علاوہ غزل کا حصہ بھی خوب تھا۔ جس میں شہیر رسول کی غزل بہت پسند آئی۔ ستمبر کے رسالے میں بھی نثری نگارشات کے علاوہ غزل کا حصہ کافی ضخیم تھا جس میں ڈاکٹر سجاد سیتا صاحب اور اسعد بدایونی کی غزل بہت پسند آئی۔ مجموعی طور پر رسالہ صحت مند ہے اور جس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

شاہد حسین۔ بی ۲/۲۷، شاپنگ سینٹر، صفدر جنگ انکلیو، نئی دہلی۔

● ستمبر کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ ہر اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ ادبی صفحات کی توسیع ضروری معلوم دیتی ہے۔ جناب منظر اعجاز صاحب کا مضمون "قاضی عبدالودود کا طریقِ تحقیق" طویل ہونے کے باوجود بہت مختصر لگا، یہ مضمون اس شمارے کے ادبی حصہ کا حاصل رہا۔ غزلیات کا حصہ بھی قابلِ مطالعہ ہے۔

روشن لال روشن بنارسی :
ڈی اے-۱۱/۷۴ راما پورہ،
وارانسی (یو۔پی) ۲۲۱۰۰۱۔

●



۴ نومبر کو بہار بھون، نئی دہلی میں عبدالحق لائبریری کی ایک میٹنگ "سالانہ عبدالحق ایوارڈ" کو دیے جانے کے سلسلے میں زیرِ صدارت جناب جی۔ ایس۔ پانڈے، گورنر اڑیسہ، منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں ہر سال ایک ایوارڈ عربی، فارسی اور اُردو کے دانشوروں کو دیے جانے کے لیے طے کیا گیا جس میں پچاس ہزار روپے اور سند بھی ہوگی۔ تصویر میں (دائیں سے) بہار کے سابق گورنر جناب اے۔ آر۔ قدوائی، "آزاد ہند" کلکتہ کے مدیر جناب احمد سعید ملیح آبادی، محترمہ نجمہ ہبت اللہ ایم پی اور مرکزی وزیر جناب ضیاء الرحمٰن انصاری نظر آرہے ہیں۔ اس موقع پر مولانا آزاد کمیٹی کی جانب سے مولانا کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ (فوٹو سید فدا علی)



غالب اکیڈمی، حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں ممتاز ادیبہ، افسانہ نگار اور ناقد محترمہ صالحہ عابد حسین کے اعزاز میں ایک خصوصی ادبی استقبالیہ اُردو اکیڈمی، دہلی کے اہتمام میں جسٹس حمید اللہ بیگ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر ادیبوں اور ناقدوں نے صالحہ آپا کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ تصویر میں (دائیں سے بائیں) کرنل بشیر حسین زیدی، محترمہ صالحہ عابد حسین، صدر جلسہ جسٹس حمید اللہ بیگ، جناب عزیز قریشی، ایم۔ پی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ۔

(فوٹو سید فدا علی)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

Vol. 7 No. 17-18 YOJANA (URDU) 1-31 December 1987



۳ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو راشٹریہ ایکتا سمیتی، دہلی کی صدر محترمہ آرتی بھارگو کے زیر اہتمام آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی تیسری برسی کے موقع پر قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے لیے ایک کل ہند مشاعرہ بصدارت جناب غلام نبی آزاد، ماؤلنکر ہال نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر ملک کے نامور شعراء نے شرکت کی۔ تصویر میں (بائیں سے) جناب کیفی اعظمی (مائک پر) جسٹس ایم ایس [illegible] علی سردار جعفری، جناب سردار دربارہ سنگھ جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ جناب فاروق عبداللہ، جناب غلام نبی آزاد اور جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو دیکھا [illegible] (فوٹو سید فدا علی)



پچھلے دنوں شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں ترقی اردو بیورو، نئی دہلی کے زیر اہتمام (شعبۂ اردو کے تعاون و اشتراک سے) "دکنی ادب" پر سہ روزہ علمی مذاکرہ منعقد ہوا۔ جس کا افتتاح یونیورسٹی آف دہلی کے وائس چانسلر پروفیسر مونس رضا نے فرمایا۔ اس مذاکرہ میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ نے مقالے پیش کئے۔ تصویر میں پروفیسر مونس رضا، علمی مذاکرہ کا افتتاح کرتے ہوئے۔ (تصویر، سید فدا علی)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadurshah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوجنا

قیمت : ۲ روپے

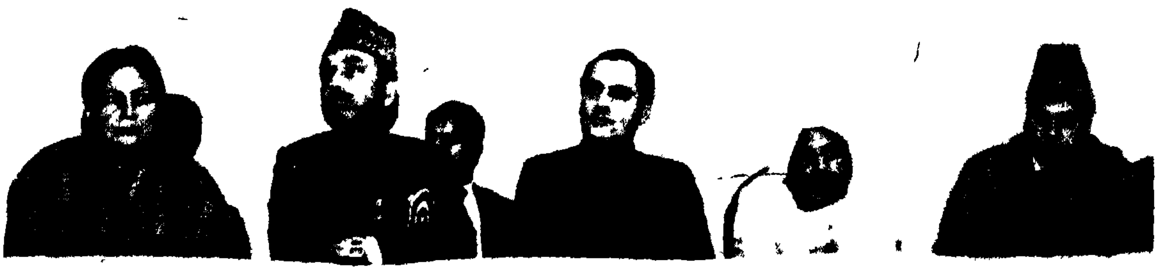


غریبی کا تجزیہ





پچھلے دنوں نائب صدر جمہوریہ ہند نے ممتاز ادیب جناب ظ۔ انصاری کی کتاب "خسرو کا ذہنی سفر" کی رسم اجراء انجام دی۔
تصویر میں (بائیں سے دائیں) نائب صدر جمہوریہ ہند جناب شنکر دیال شرما، جناب ظ۔ انصاری اور جناب خلیق انجم۔ (تصویر سید فدا علی)



گذشتہ دنوں دلی میں جلسہ سیرت النبیؐ میں وزیر اعظم ہند جناب راجیو گاندھی نے شرکت فرمائی۔ اس کی صدارت جناب غلام نبی آزاد نے کی۔ زیر نظر تصویر میں درمیان میں وزیر اعظم تشریف فرما ہیں۔ موصوف کے (دائیں جانب) جناب غلام نبی آزاد اور محترمہ محسنہ قدوائی تشریف رکھتی ہیں، وزیر اعظم کے بائیں طرف مولانا عبدالکریم پاریکھ (ناگپور) اور جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ تشریف رکھتے ہیں۔ (تصویر سید فدا علی)

یوجنا

خصوصی شمارہ ۲۶ جنوری ۱۹۸۸ء
(غریبی کا تجزیہ)

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر : سید ظفر الحسن
ایڈیٹر : جگتندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹرز : محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹرز : وسیم حیدر
عبدالحمید

شرح چندہ
سالانہ ۲۰ روپے، دو سالہ ۳۶ روپے
سہ سالہ ۴۸ روپے، فی کاپی دو روپے
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت۔

جلد ۷	شمارہ ۱۹، ۲۰	یکم تا ۳۱ جنوری ۱۹۸۸ء	۱۱ پوس تا ۱۱ ماگھ شک ۱۹۰۹	قیمت دو روپے ٹیلیفون ۳۰۱۸۱۸

اس شمارے میں

.... تو اب کیا کریں؟ (اداریہ)	چیف ایڈیٹر	۲
اس شمارے میں اظہارِ خیال کرنیوالی شخصیتیں		۴
حقائق کا سامنا نہ کرنا۔ ایک بزدلانہ فعل	وسنت ساٹھے	۵
غریبی ۔ کیا، کیوں، کیسے ؟	ڈاکٹر مالکم ایس ادی سیشیہ	۱۵
محرومی کی تشخیص	پروفیسر بھابا توش دتہ	۲۰
پیداوار میں اضافہ اور انصاف ۔ اپنی غریبی کو سمجھنے کی ایک کوشش	ہیتن بھایا	۲۶
تعلیم، غریبی دور کرنے کا موثر ذریعہ	پروفیسر پی۔ این۔ سریواستو	۳۲
معیارِ زندگی بہتر بنانے کی مساعی میں پورے سماج کی شمولیت ضروری ہے۔	ایس۔ ایم۔ ایچ۔ برنی	۳۷
غریب آدمی، عام آدمی	ایک نامور ماہر معاشیات کے قلم سے	۴۳
ٹیکنالوجی ملک کی ترقی کا راستہ	ڈاکٹر جی این بسیتارام	۴۹
بھرشٹاچار، کیوں اور کیسے ؟	پروفیسر سی جے۔ داسوانی	۵۳
جشنِ جمہوریہ (نظم)	دل کھولا پوری	۶۲
عوام، عظیم ترین سرمایہ	پروفیسر آر۔ ھیسوال	۶۳
غربت کے سماجی اور ثقافتی پہلو	کامیشور چودھری	۶۷
غریبی کے چیلنج اور اس کے حل کچھ سوالات	بھرت ڈوگرہ	۷۲
انسدادِ افلاس ۔ مسائل اور مختلف حل	پروفیسر کامتا پرشاد	۵۸
غزلیں	بلقیس ظفر الحسن	۷۶
	منظر نیاز صدیقی منظر آئمی	"
	خلیل انجم	"
	ریاض احمد عباسی ساغر آئمی	"
	ڈاکٹر ہلال فرید	"
دوہے	بھگوان داس اعجاز	"

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (میں) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منجال

ترسیل زر کا پتہ :- بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

....تو اب کیا کریں ؟

ھندوستان ایک عظیم ملک ہے، جس کے خزانے میں تاریخ کی قدامت، روایات کی رفعت، اور ورثے کے گراں بہا گوہروں کا سرمایہ ہے۔ ہندوستان ایک ایسی سرزمین ہے جہاں صدیوں پرانی یادگاریں، وقت کے تیز و تند طوفانوں اور حادثاتِ زمانہ کے پے بہ پے بے رحم حملوں کی زد میں آنے کے باوجود، آج بھی اپنا سر فخر سے اونچا کئے کھڑی ہیں۔ ہندوستان، فن اور فنکاروں، دستکاریوں اور دست کاروں کا گہوارہ رہا ہے۔ مختلف تمدن اس کی آغوش میں پلے ہیں۔ ہندوستان معدنی وسائل، آبادی، ساتات اور فطرت کی گوناگوں عنایتوں سے مالا مال ہے۔ ہمارے ملک کے اہم شہروں کی فلک بوس عمارتیں، لاتعداد پُرشکوہ ہوٹل، بارونق کاروباری مرکز، شاندار محل اور کشادہ بنگلے، جدید ترین طرز کے ہوائی مستقر، سب کے سب ہماری کامرانی اور کمال کے آئینہ دار ہیں۔ ہمارے بڑے شہروں کی شفاف سڑکوں پر رواں دواں مہنگی موٹر کاروں کی قطاریں، اور ہمارے صنعتی حلقوں میں دھوئیں کے مرغولے بکھیرتی ہوئی بلند و بالا چمنیاں، ہماری اقتصادی خوش حالی، مالی استحکام اور منصوبہ بند ترقی کی نمایاں طور پر نشاندہی کرتی ہیں۔

لیکن، اپنی خوش بختی کی ان تمام بیّن شہادتوں کے باوجود، ہم اس تلخ حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہمارا ملک اگر غریب ترین نہیں، تو دنیا کے غریب ملکوں میں ضرور شمار کیا جاتا ہے۔ ہم ایک متضاد صورت حال سے دوچار ہیں، افراط و بہتات کی سرزمین میں غربت کا وجود، ایک جمہوری نظام میں افلاس کا بول بالا! اپنے تمام مصائب و آلام، دشواریوں اور دقتوں کے الزام کا پشتارہ، حکومت کے دروازے پر دھر دینا بہت آسان ہے، کیوں کہ سیدھی سی بات یہ ہے کہ حکومت کسی فرد کا نہیں، ایک مشینری کا نام ہے، مگر سماج کے افراد کی حیثیت سے کیا ہمارے اندر اتنی ہمت ہے کہ غریبی کے وجود کو برقرار رکھنے میں، ہم خود اپنی کارگزاریوں اور نکو کاریوں کا محاسبہ کریں۔ ہماری اپنی ایک ریاست میں جہاں کہ بیشتر عوام مفلوک الحال ہیں، کسی شخص کی حیثیت، وقار اور مقام کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ شادی کی تقریب کے اختتام کے بعد اس کے یہاں کھانے کی کتنی دیگیں کوڑے دان کی نذر کردی گئیں۔ ابھی حال کی بات ہے کہ ہم میں سے ہی کچھ لوگوں نے ایک دریا کی آلائشوں کو صاف کرنے کی نیت سے سیکڑوں لیٹر دودھ اس کے پانی میں انڈیل دیا، جبکہ ہم جانتے ہیں کہ ہزاروں غریب بچے اس کار آمد چیز سے ہر روز محروم رہتے ہیں۔ ایسی غیر معقول اور بے سود حرکتوں کی فہرست بڑی لمبی اور دردناک ہے اور ہم اس بات کا یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس طرح کی حرکتوں میں کسی حکومت کا، کسی طرح کا بھی دخل نہیں۔ کیا ہمارا یہ اقدام ہمارے ذہنی افلاس کی غمازی نہیں کرتا؟ جذبات کی رَو میں بہہ کر ہمارے اس طرح سوچنے اور عمل کرنے کا مجموعی اثر، غربت کے مسئلے پر براہِ راست کتنا شدید پڑتا ہے۔ ہمیں یہ جاننے کے لیے اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکنا چاہیئے۔

ایک بات تو بالکل صاف ہے، اور وہ یہ کہ افلاس کا مسئلہ کوئی نیا نہیں۔ یہ مسئلہ صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ ہماری دنیا ہمیشہ سے ہی زرداروں اور ناداروں میں منقسم رہی ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ امیر اور غریب اضافی الفاظ ہیں۔ ایسا نہیں کہ امیر ملکوں میں غریب نہیں ہوتے۔ اس وقت ہماری گفتگو کا تعلق اس اقتصادی بدحالی اور غربت

ہے جس میں ہمارے ملک کے لاکھوں لوگ مبتلا ہیں۔ اس زبوں حالی کے خلاف ایک کامیاب تجربہ آزمائش یقینی ممکن ہے۔ ہم لوگ، مختلف پروگراموں کو عملی روپ دیکر، اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لاکر، اسی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ پھر بھی کہا جاتا ہے کہ ان رفاہی اقدامات کے خاطر خواہ نتائج نہیں برآمد ہوئے۔ حالانکہ برسوں سے انکی تعمیل ہو رہی ہے۔ ایسا کیوں ہے، یہ جاننے کے لیے ذہن پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ چند لوگوں میں خلوص کے فقدان، یا دیانت کی کمی کے باعث وہ تمام رعایتیں اور سہولتیں ضائع ہو جاتی ہیں جو بے شمار ضرورتمندوں کے لیے نہایت مفید ثابت ہو سکتی تھیں۔

طاقت، مرتبہ، شہرت اور دولت کی خواہش کسے نہیں ہوتی۔ یہ خواہش شاید ہمارے خمیر کا ایک جزو ہے۔ ایسے افراد جو اس خواہش سے بلند ہوں، انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ عام طور سے یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ جن کے پاس بہت ہے، وہ بہت زیادہ کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے کافی ہمیشہ ناکافی ہوتا ہے۔ قانون، اسی لیے بنائے جاتے ہیں کہ اس خواہش پر گرفت رکھی جائے، اسے معقول حدود میں محصور رکھا جائے۔ قانون کے ذمے یہ کام سونپا گیا ہے کہ وہ ایک عقاب نگاہ ہونے سے یہ دیکھتا رہے کہ کہیں کوئی فرد دوسروں کی حق تلفی کر کے خوا اپنی جھولی تو نہیں بھرتا جا رہا ہے۔ لیکن قانون تو ہم لوگوں کے ہی بنائے ہوئے ہیں۔ ان میں جھول کا ہونا اچنبھے کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تفہیم بھی بڑی تہہ دار ہوتی ہے۔ یہ تو ہمارے آپ کے آئے دن کا تجربہ ہے کہ وہ قاعدے اور ضابطے، جن کی موجودگی کا مقصد ہی عوام کی مدد کرنا اور سہولت بہم پہنچانا ہے، اکثر عوام کو ہراساں کرنے اور ایک سیدھی صورت حال کو پیچیدہ بنانے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اندر کا قانون، ہمارے ضمیر کی آواز، صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی ہماری فطری صلاحیت ہی ہمیں یہ توفیق عطا کرتی ہے کہ ہم انسان کے بنائے ہوئے قانون پر صحیح طور سے عمل کریں اور اسے پورے سماج کی فلاح کو نظر میں رکھ کر استعمال میں لائیں۔

امارت اور افلاس کی ان دو متوازی لکیروں کا ہمارے ملک میں اس قدر نمایاں طور پر ابھرنا، وجود ہمارے آئین آدرشوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتا، جن پر چلنے کا ہم نے فیصلہ کیا ہے۔

اگر ہمیں سماج میں صحت مند تبدیلی لانی ہے تو ہم کو خود اپنے انداز فکر اور طرز عمل کو بدلنا ہوگا۔ اقتصادی غربت کی بیخ کنی کے مقصد کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر اس بات پر ہے کہ ہم نفسیاتی اور اخلاقی محاذوں پر کس حد تک کامیاب ہیں۔ اس عمل میں ہر صاحب فکر اور دانشور کو سنجیدگی سے شریک کرنا ہے اور اسے ساتھ لے کر چلنا ہے۔ کیا یہ ایسا سوچنا صحیح نہ ہوگا کہ ملک کے مالدار اور وسائل کو اپنی گرفت میں رکھنے والے لوگ اگر ملک کے غریبوں کے بارے میں تھوڑا سا بھی خیال کر لیں تو اس کے نتائج حیران کن ثابت ہو سکتے ہیں، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم وسیع تر مقاصد کے تئیں خلوص سے کام لیں اور تنگ نظری سے گریز کریں، ہمیں اس عہد کو نبھانا ہے کہ غریب عوام کے پراجیکٹوں پر صحیح سمت میں عمل درآمد ہو۔ اور ہم اپنے کثیر وسائل سے دور اندیشی اور دوررس اثرات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کام لیں جس سے سماج کے سبھی طبقوں کا بھلا ہو۔

آیئے! ہم اپنے ایک قدیم دانشور کے اس قول سے استفادہ کریں۔

اَمنترم اَکشرم ناستی
ناستی مولم اَنوشدھم
اَیوگیہ پرشو ناستی
یوجکہ: تتر درلبھہ

(مہاسبھاشت سنگرہ)

ترجمہ:-
الفاظ کے گھونگھٹ میں ہے معنی کا جمال
ممکن ہے بنے زہر بھی تریاق خصال
نااہل کوئی شخص نہیں ہوتا ہے
جو کام میں لائے انہیں، ان کا ہے اکال

(چیف ایڈیٹر)

اس شمارے میں اظہار خیال کرنیوالی شخصیتیں اور ان کا مختصر تعارف

- وسنت ساٹھے ——— مرکزی وزیر برائے انرجی
- ڈاکٹر مالکم ایس ادی سیشیدھ ——— چیئرمین مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اسٹڈیز، مدراس۔
- پروفیسر بھا با توش دتّہ ——— معاشیات کے سابق پروفیسر کلکتہ۔
- ھتیرتے بھایا ——— رکن، پلاننگ کمیشن، نئی دہلی۔
- پروفیسر پی۔ ایت۔ سری واستو ——— رکن پلاننگ کمیشن، نئی دہلی۔
- ایس۔ ایم۔ ایچ۔ برنی ——— گورنر ہریانہ، چنڈی گڑھ۔
- جی۔ بے ——— نامور ماہر معاشیات، نئی دہلی
- ڈاکٹر جے۔ این سیتا رام ——— معاشیات کے پروفیسر، مینجمنٹ ڈیولپمنٹ انسٹی ٹیوٹ، گوڑ گاؤں (ہریانہ)
- پروفیسر سی۔ جے۔ داسوانی ——— پروفیسر اور صدر شعبہ ومینز اسٹڈیز یونٹ، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی۔
- پروفیسر کامتا پرشاد ——— معاشیات اور دیہی ترقی کے پروفیسر، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن، نئی دہلی۔
- پروفیسر آر۔ جیسوال ——— عمرانیات اور علم بشریات کے پروفیسر، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف فاریسٹ مینجمنٹ، بھوپال۔
- کامیشور چودھری ——— ریسرچ اسکالر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔
- بھرت ڈوگرہ ——— ایڈیٹر، این۔ ایف۔ ایس انڈیا، نئی دہلی۔



وسنت سالٹھے

حقائق کا سامنا نہ کرنا ایک بزدلانہ فعل

اس تحقیقی مضمون میں فاضل مصنف شری وسنت سالٹھے نے جو مرکزی وزیر اور سیاسی مفکر ہیں نہایت دلیری سے طویل عرصے سے پریشان کن پیمانے پر چلے آنے والے افلاس کے اسباب کا تجزیہ کیا ہے جو ملک میں ایسی ہی قابلِ تعریف منصوبہ بند ترقی کے باوجود موجود ہے۔ وہ کسی لاگ لپیٹ کے بغیر کہتے ہیں کہ بیشتر سیاستداں اور سول ملازم گو انتہائی دانشور، تجربہ کار اور ایماندار ہیں۔ تاہم وہ آسان راہوں کا انتخاب کرنے اور اس طرح ایک آسان زندگی کے عادی ہو گئے ہیں۔ وہ مایوسی کا شکار نہیں ہیں اور یہ سجھاؤ دیتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کے خواب اور جواہرلال نہرو کے نظریہ کے امتزاج سے ملک سے افلاس کا انسداد کیا جا سکتا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم اہم ترین انسانی مسئلہ یعنی اپنے ملک میں افلاس کے مسئلہ پر غور کریں ہمارے لیے شروع میں ایک ایسے درست تناظر کو اختیار کرنا ضروری ہے جس سے ہم اس مسئلہ کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کا حل بھی تلاش کر سکیں۔ افلاس کا مطلب ہی ہے ضروریاتِ زندگی کا فقدان۔ بنیادی طور پر یہ کمی اُن اشیاء کی صورت میں ہے جو بقاء کے لیے درکار ہیں۔ اس کے بعد اگر ہم انسان کو ایک مہذب معاشرے کا رکن تصور کریں تو کم از کم تعلیم اور ثقافتی سہولیات کا فقدان بھی افلاس کا ایک لازمی جزو ہوگا۔ اسی طرح ایک صحتمندانہ زندگی بسر کرنے اور زندہ رہنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ معاشرے کے ہر فرد کو کم از کم طبی سہولیات میسر ہوں۔ اس کا فقدان افلاس کا تیسرا اہم جزو ہے۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ انسان جن مصائب کا شکار ہوتا ہے اُن میں سے زیادہ تر کی وجہ ان کم از کم ضروریاتِ زندگی کی کمی ہے۔

مہاتما گاندھی جیسی ایک عظیم شخصیت کی طرف سے یہ بجا طور پر کہا گیا ہے کہ "اس دنیا میں ہر واحد فرد کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی کچھ ہے لیکن ایک واحد فرد کی بھی طمع پوری کرنے کے لیے کبھی کافی کچھ نہیں ہو سکتا۔" لہٰذا افلاس بنیادی طور پر انسان کا پیدا کردہ ہے کیونکہ کسی بھی معاشرے میں مناسب اور منصفانہ پیداواری اور تقسیمی نظام سے کوئی بھی آسانی سے معاشرے کے ہر فرد کی کم از کم ضروریاتِ زندگی کی دستیابی کو یقینی بنا سکتا ہے۔ لیکن دولت یعنی اشیاء اور سروسوں کی پیداوار کے عمل میں چونکہ معاشرے کے چند افراد معاشرے کے افراد کی اکثریت کی محنت کے ثمرہ کو اپنی نجی کھپت اور لطف اندوزی کے لیے ہتھیا کر جمع کر لیتے ہیں اس لیے اس سے دولت کی غیر متناسب

تقسیم ہوتی ہے اور چند افراد کی طرف سے معاشرہ
کے اکثریتی افراد کا استحصال ہوتا ہے۔ یہی امر
افلاس کی بدعت کا ذمہ دار ہے۔

انسانی زندگی کا ادراک

انسان اس کرۂ ارض کی واحد معلومہ
دانشور نوع زندگی ہے جو اپنی دانشوری کو بروئے
کار لاکر اپنی زندگی کے حالات میں تبدیلی لا
سکتا ہے۔ اُس کی اِس دانشوری اور کامیابیوں

اپنے والدین کے ساتھ جوڑتا ہے۔ پھر رشیوں
منیوں، پیغمبروں اور سیاناؤں کے توسط سے اُس
نے ایک ضابطۂ اخلاق بھی مرتب کیا ہے تاکہ وہ
دیگر ساتھی انسانوں کے ساتھ تنظیم و ضبط کی زندگی
بسر کر سکے۔ اُس کی سب سے بڑی آرزو یہ رہی
ہے کہ وہ اس جسم اور عرصۂ حیات کو بروئے کار
لاکر زیادہ سے زیادہ خوشیاں اور مسرتیں حاصل
کر سکے جس کے بارے میں اُسے بخوبی علم ہے کہ
اس کی مدتِ قیام غیر یقینی ہے اور اس کے باوجود وہ

دولت کی طلب نہیں کرنی چاہیے جو کسی ایک شخص
کی ملکیت نہیں ہے۔ اگر ہمارے رشیوں کے
اس تناظر کو اختیار کر لیا جائے تو افلاس کا مسئلہ
پیدا ہی نہیں ہوگا۔ اس روحانی انداز فکر کو
اختیار کرنا ضروری ہے تاکہ اس کرۂ ارض پر انسانی
زندگی کو جس میں آج کا افلاس کا اہم ترین مسئلہ
شامل ہے سمجھا جا سکے۔

ہم جانتے ہیں کہ افلاس آمدنیوں کی غلط
تقسیم کا نتیجہ ہے جو چند افراد کی طرف سے اکثریت
کے استحصال سے پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ ایک

دولت یعنی اشیاء اور سروس کی پیداوار کے عمل میں چونکہ معاشرے کے چند افراد محنت کے ثمرہ کو اپنے نجی کھپت اور لطف اندوزی کے لیے مہیا کر جمع کر لیتے ہیں اس لیے اس سے دولت کی غیر متناسب تقسیم ہوتی ہے اور چند افراد کی طرف سے معاشرے کے اکثریتی افراد کا استحصال ہوتا ہے۔ یہی امر افلاس کی بدعت کا ذمہ دار ہے۔

کا ہزاروں برس میں ارتقاء ہوا ہے اور وہ غار
میں رہنے والے انسان کے نیم حیوانی مرحلے سے
ترقی کرتے کرتے خلائی انسان کے موجودہ مرحلے تک
پہونچ گیا ہے۔ اس تمام تر ارتقائی عمل کے دوران
وہ ہمیشہ اس امر کے بارے میں سوالات دریافت
کرتا رہا ہے کہ وہ کیا ہے اور اس کا اس کائناتی
طاقت سے کیا رشتہ ہے جو اس وسیع کائنات کا
منبع ہے۔ وہ یہ سوالات دریافت کر رہا ہے
اور اُس نے سہولت کی خاطر اور ان بیشتر ناقابلِ
عمل گتھیوں کو سلجھانے کے لیے اس برتر طاقت
کو "خدا" یا دیگر ایسے متعدد نام دیئے ہیں اور اُس
سے ساتھ اپنا رشتہ ایسے جوڑا ہے جیسا کہ ایک بچہ

اُسے طوالت دینے کے لیے متواتر کوشاں ہے۔
انسان کا نہ صرف برتر قوت بلکہ اپنے ساتھی انسانوں
اور تمام تر فطرت کے ساتھ اُس کے رفاقتی رشتے
کے قیام کے لیے انسانی ذہن کا دانشمندی کے ساتھ
تعلق کے بارے میں بنیادی استفسار اہم ہے۔ اسے
ویدک رشیوں نے خوبصورتی کے ساتھ مختصراً بیان
کیا ہے جنھوں نے کہا ہے کہ:
"اس کائنات کی ہر شئے میں خواہ وہ بڑی
ہو یا چھوٹی، ایک کائناتی قوت سمائی ہوئی ہے
اس حقیقت کے علم کے ساتھ ہر ایک کو اس دنیا
کی آسائشوں سے لطف اندوز ہونا چاہیئے اور

مخصوص مملکت میں انسانی معاشرے کے تمام افراد
کے لیے سماجی و اقتصادی انصاف کے حصول اور
اُسے یقینی بنانے کے ذمہ دار ہیں اُن کا ابتدائی
فرض ہے کہ پیداواری اور تقسیمی قسم کے دونوں
اقتصادی اداروں کی اس طرح تشکیل کی جائے کہ
معاشرہ انسان کی طرف سے انسان کی استحصال
پسندی سے آزاد ہو جائے اور اقتصادی و سماجی
انصاف کا بول بالا ہو جائے۔ یہ ذمہ داری ایک ایسے
معاشرے میں تو اور بھی عظیم تر ہے جو جمہوری ہونے
کا دعوی کرتا ہے، جہاں وقت پر عوام کی طرف سے

حکمراں نمائندے منتخب کیے جاتے ہیں اور وہ اپنی کارکردگی کے لیے جوابدہ ہوتے ہیں۔

افلاس کا تجزیہ

درحقیقت افلاس جو زندگی کی کم از کم ضروریات کے فقدان کا نام ہے اور جو مصائب کا باعث ہے اپنا وجود رکھتا ہے جسے کوئی بھی ایماندار شخص اپنی ننگی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ آپ اسے سب طرف دیکھ سکتے ہیں، حتیٰ کہ انتہائی خوشحال اور آسودہ حال علاقوں میں بھی دیکھ سکتے ہیں جن کے درمیان آپ کو گندی بستیاں نظر آئیں گی، جہاں انسان گندی نالیوں میں رہتے ہیں اور جہاں اُن کے بچے گندگی کے ڈھیروں میں سے چیزیں چُننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر آپ دیہی علاقوں میں جائیں تو وہاں آپ خصوصاً اُن لوگوں کو افلاس کی ناگفتہ بہ حالت میں پائیں گے جن کے پاس بالکل چھوٹی چھوٹی زمینیں ہیں اور جو قطعاً بے زمین ہیں۔ آخر کار اناج، خوردنی تیل اور ایندھن جیسی لازمی اشیاء روپے پیسے کے لحاظ سے اجناس یا ادائیگی کی صورت میں اُجرت کے طور پر حاصل کی جاتی ہیں اور دیہی علاقوں میں زیادہ تر آمدنی زمین کی پیداوار پر مبنی ہوتی ہے یا اُس کا تعلق کھیتوں میں کی جانے والی محنت سے ہوتا ہے۔ یہ بات عام طور پر مانی جاتی ہے کہ بھارتی گاؤں جو صدیوں تک عام ضروریات کے لحاظ سے تقریباً خود کفیل رہا ہے جدید صنعت کاری کے زیر اثر کافی حد تک بدل گیا ہے اور متعدد زرعی صنعتیں دیہی علاقوں سے شہروں کی بڑی بڑی صنعتوں میں مرکوز ہو گئی ہیں۔ زرعی صنعتوں میں اہم ترین کپڑے کی تیاری، چمڑے کے سامان، خوردنی تیل اور مٹی کے برتنوں کی صنعتیں تھیں۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی سے جو حصول آزادی کے بعد سے دگنی ہو گئی ہے دیہی علاقوں میں روزگار کے نئے ذرائع پیدا نہیں ہوئے اور لوگ بڑے بڑے شہروں میں منتقل ہونے پر مجبور ہو رہے ہیں خواہ انھیں وہاں گندی بستیوں اور جھگیوں میں انسانیت سوز حالات میں رہنا پڑے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ کروڑوں نوجوانوں کو جن میں سے بیشتر عام مُفت تعلیم سے مستفید ہو چکے ہیں دیہی علاقوں اور شہری مرکزوں میں کوئی پیداواری روزگار نہیں مل رہا ہے اگر کسی کے پاس دیکھنے کو آنکھیں ہوں تو وہ ان نوجوانوں کے دلوں میں بڑھتے ہوئے اضطراب کو دیکھ سکتا ہے جو کسی مناسب رہنمائی کے نہ ہونے سے فوری بازاری تحریکوں کی صورت میں بھڑک اٹھتا ہے خواہ وہ فرقہ دارانہ، علاقائی، لسانی، ذاتی ہوں یا وہ ایسے ہی دوسرے رنگ لیے ہوں۔ یہ لازماً تنگدلانہ اور انتشار پسندانہ رجحانات ہیں لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ ایک شیرازہ بند قومی کاز کے نہ ہونے سے وہ دل برداشتہ نوجوانوں کو اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

> **حقیقتِ حال یہ ہے کہ کروڑوں نوجوانوں کو جن میں سے بیشتر مفت عام تعلیم سے مستفید ہو چکے ہیں دیہی علاقوں اور شہری مرکزوں میں کوئی پیداواری روزگار نہیں مل رہا ہے۔**

یہ امر حیرت انگیز اور افسوسناک ہے کہ ان ظاہرا حقائق کے لیے کوئی اعداد و شمار اور تحلیلی رپورٹیں تلاش کرنا چاہے اور اسکا کمپیوٹر سے حل جاننے کی ضرورت محسوس کرے۔ گویا منصوبہ بندی کمیشن کی طرف سے قائم کیے گئے متعدد اداروں گروپوں اور کارکنوں کی انجمنوں کے جمع کیے ہوئے اعداد و شمار کافی نہیں تھے کہ اب تجویز کیا جا رہا ہے کہ بھارت میں افلاس کے مسئلہ کا مطالعہ کرنے کے لیے عالمی بنک کے زیر اہتمام ماہرین کا ایک مطالعاتی گروپ قائم کیا جائے۔ اس سے زیادہ صداقت کی خلاف ورزی اور ذلت بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم میں سے بعض نے تہیہ کیا ہوا ہے کہ وہ ہمیں دھوکہ دینے کے لیے ایسا خطِ افلاس کھینچیں گے اور اسے اوپر نیچے لے جائیں گے جس سے ہمیں جھوٹی تسلی و تشفی ہو کہ ہم افلاس کو بہت حد تک دور کر سکے ہیں اور عوام کی بھاری تعداد کو خطِ افلاس کے اوپر لے آئے ہیں۔ لہٰذا آیئے! ہم بعض معلومہ حقائق پر غور کریں۔

اعداد و شمار کا گوشوارہ

پہلا اور اول ترین (گوشوارہ) ہوگا ملک میں پیدا ہونے والی دولت کا فی کس حصہ اس کی ظاہرا ہیئت پر بھی غور کرتے ہوئے جو بات اہم ہے وہ ہے کسی مضبوط بنیاد کے ساتھ مستحکم قیمتوں پر آمدنی پر غور کرنا کیونکہ اس سے حقیقی قوتِ خرید کا اظہار ہوگا اور وہ مروجہ قیمتوں پر نہیں ہوگا جبکہ روپے کی قیمت گر کر ۱۴ پیسے سے بھی کم ہو گئی ہے۔ لہٰذا اعداد و شمار کا پہلا گوشوارہ موجودہ قیمتوں کے لحاظ سے اور ۷۱-۱۹۷۰ء کے بنیادی

برسوں کے ساتھ مستحکم قیمتوں کے مطابق کُل ملکی پیداوار (جی این پی) [illegible]

قومی آمدنی اور فی کس آمدنی

سال	کُل ملکی پیداوار (جی۔ این۔ پی)	قومی آمدنی	فی کس جی این پی	فی کس قومی آمدنی
موجودہ قیمتوں پر	کروڑوں روپے میں		روپے	
۵۱-۱۹۵۰	۹۱۳۶	۸۸۱۲	۲۵۵	۲۴۶
۶۱-۱۹۶۰	۱۳۹۹۹	۱۳۲۶۳	۳۲۳	۳۰۶
۷۱-۱۹۷۰	۳۶۴۵۲	۳۴۲۳۵	۶۷۴	۶۳۳
۷۶-۱۹۷۵	۶۶۳۷۵	۶۲۳۰۲	۱۰۹۴	۱۰۲۶
۸۱-۱۹۸۰	۱۱۳۸۴۶	۱۰۵۷۴۳	۱۶۷۷	۱۵۵۷
۸۲-۱۹۸۱	۱۳۰۷۶۳	۱۲۰۹۶۶	۱۸۸۴	۱۷۴۳
۸۳-۱۹۸۲	۱۴۵۲۸۰	۱۳۳۸۰۷	۲۰۴۹	۱۸۸۷
۸۴-۱۹۸۳	۱۷۱۷۱۳	۱۵۸۲۶۵	۲۳۷۲	۲۱۸۶
۸۵-۱۹۸۴	۱۸۹۴۱۷	۱۷[illegible]۸	۲۵۶۳	۲۳۵۵
۸۶-۱۹۸۵	۲۱۳۵۵۳	۱۹۵۷۰۷	۲۸۳۲	۲۵۹۶
۸۷-۱۹۸۶	۲۳۵۴۴۰	۲۱۵۷۷۰	۳۰۶۰	۲۸۰۰
۷۱-۱۹۷۰ کی قیمتوں پر				
۵۱-۱۹۵۰	۱۷۴۶۹	۱۶۷۳۱	۴۸۷	۴۴۶
۶۱-۱۹۶۰	۲۵۴۲۴	۲۴۲۵۰	۵۸۶	۵۵۹
۷۱-۱۹۷۰	۳۶۴۵۲	۳۴۲۳۵	۶۷۴	۶۳۳
۷۶-۱۹۷۵	۴۲۷۹۹	۴۰۲۷۴	۷۰۵	۶۶۴
۸۱-۱۹۸۰	۵۰۷۱۱	۴۷۴۱۴	۷۴۷	۶۹۸
۸۲-۱۹۸۱	۵۳۴۶۸	۴۹۹۳۴	۷۷۰	۷۲۰
۸۳-۱۹۸۲	۵۴۸۷۲	۵۱۱۵۴	۷۷۴	۷۲۲
۸۴-۱۹۸۳	۵۹۲۶۰	۵۵۳۰۰	۸۱۹	۷۶۴
۸۵-۱۹۸۴	۶۱۴۲۷	۵۷۲۴۳	۸۳۱	۷۷۵
۸۶-۱۹۸۵	۶۴۵۸۳	۶۰۱۴۳	۸۵۷	۷۹۸
۸۷-۱۹۸۶	۶۷۸۱۰	۶۳۱۵۰	۸۸۰	۸۲۰

نوٹ:- ۸۱-۱۹۸۰ء کے آگے کے اعداد و شمار عبوری ہیں۔
اسی طرح روپے کی قیمت میں تبدیلی بھی الگ کالم کے گوشوارے سے دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۹۶۰ء کی قیمتوں کے مقابلے میں روپے کی قوتِ خرید

سال	روپے کی قوتِ خرید (پیسوں میں)
۱۹۶۱	۹۶٫۲
۱۹۶۵	۷۳٫۰
۱۹۷۰	۵۴٫۳
۱۹۷۵	۳۱٫۲
۱۹۸۰	۲۵٫۶
۱۹۸۱	۲۲٫۷
۱۹۸۲	۲۱٫۱
۱۹۸۳	۱۸٫۸
۱۹۸۴	۱۷٫۴
۱۹۸۵	۱۶٫۴
۱۹۸۶	۱۵٫۱
۱۹۸۷ (جون تک)	۱۴٫۰

چنانچہ ۱۹۶۰ء میں ۱۰۰ روپے سے جو کچھ خریدا جا سکتا تھا ۱۹۸۷ء میں اُسے خریدنے کے لیے ۷۱۵ روپے کی ضرورت تھی۔ یہاں پھر اکثر ہم اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں کیونکہ دیگر متعدد ترقی یافتہ ملکوں کے برعکس شہری علاقوں اور صنعتی شہری بستیوں میں رہنے والے اشخاص کی کُل آمدنی میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ تمام ملکی آمدنی کو جمع کر کے اور اُسے تمام آبادی میں تقسیم کر کے فی کس آمدنی نکالنا ایک غلط بات ہے۔ یہ آمدنی کے بعض دلچسپ اعداد سے واضح ہو جائے گا جن کا پتہ ۸۵-۱۹۸۴ء کے کُل ہند انکم ٹیکس کے اعداد سے چلتا ہے کیوں کہ یہی تازہ ترین اعداد دستیاب ہیں۔

آمدنی کے گوشواروں کی تعداد، گوشواروں میں دکھائی گئی آمدنی اور افراد کی جانب سے قابلِ ادائیگی ٹیکس

(تخصیص کا برس ۸۵-۱۹۸۴ء)

دکھائی گئی آمدنی کا سلسلہ (روپے، ۰۰۰)	گوشواروں کی تعداد	دکھائی گئی آمدنی (روپے، ۰۰۰)	قابلِ ادائیگی ٹیکس (روپے، ۰۰۰)
ٹی ایل - ۲۰	۱۲۸۶۰۱۰	۲۲۷۹۸۳۸۰	۱۰۴۰۱۶۶
۲۰ - ۲۵	۷۶۵۰۷۲	۱۷۴۷۳۴۰۷	۱۸۲۹۱۸۸
۲۵ - ۳۰	۱۷۷۳۸۴	۴۹۳۸۸۹۸	۷۳۷۸۳۵
۳۰ - ۵۰	۲۴۶۰۱۲	۹۳۱۶۷۶۲	۲۰۷۳۸۲۷
۵۰ - ۱۰۰	۱۵۳۹۳۰	۱۰۴۰۶۸۶۷	۳۲۳۵۴۷۵
۱۰۰ - ۲۰۰	۱۶۸۶۵	۲۲۴۸۷۳۹	۱۱۰۱۳۶۵
۲۰۰ - ۳۰۰	۲۹۷۵	۷۱۵۰۹۵	۳۹۹۱۱۴
۳۰۰ - ۴۰۰	۱۰۶۵	۳۶۳۶۲۵	۲۰۹۱۶۶
۴۰۰ - ۵۰۰	۴۸۵	۲۱۲۴۷۴	۱۲۹۳۶۴
۵۰۰ - ۱۰۰۰	۴۷۱	۳۲۵۸۷۳	۱۹۸۷۸۰
۱۰۰۰ -	۱۲۷	۲۴۷۷۴۶	۱۵۵۰۶۰
میزان	۲۶۵۰۳۹۶	۶۹۰۴۷۸۶۶	۱۱۵۰۹۳۴۰

> لیکن ہم میں سے بعض نے تہیّہ کیا ہوا ہے کہ وہ ہمیں دھوکہ دینے کے لیے ایسا خطِ افلاس کھینچیں گے اور اُسے اوپر نیچے لے جائیں گے جس سے ہمیں جھوٹی تسلّی و تشفی ہو کہ ہم افلاس کو بہت حد تک دُور کر سکے ہیں اور عوام کی بھاری تعداد کو خطِ افلاس کے اوپر لے آئے ہیں۔

تشخیص شدگان کی کل تعداد ۳۴ لاکھ ۱۶۳ ہزار ہے جن میں سے انفرادی تشخیص شدگان ۲۶ لاکھ ۵۰ ہزار ہیں۔ اس برس گوشواروں میں دکھائی گئی کل آمدنی ۶۳ ۱۴۴ کروڑ روپے ہے اور قابلِ ادائیگی ٹیکس ۱۱۵۰ کروڑ روپے ہے۔ لیکن یہ امر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ اس تمام تشخیص شدگان میں سے انفرادی زمرے کے تحت زیادہ آمدنی یعنی ایک لاکھ روپے سے زائد کے گوشوارے ۲۱۹۷۸ یعنی ایک فیصد سے کم تھے اور وہ کل قابلِ ادائیگی ٹیکس کے ۱۰ فیصد کے ذمہ دار تھے۔ اس سے اول یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً ۱۰ کروڑ کی آبادی میں سے قابلِ ٹیکس حد کے اندر آنے والوں کی تعداد ۲۷ لاکھ سے کم ہے اور حتّٰی کہ اُن میں سے بھی جو زیادہ آمدنی (ایک لاکھ روپے سے زائد) کے گروپ میں آتے ہیں اُن کی تعداد ۲۲ ہزار سے کم ہے۔ اس چھوٹے سے گروپ میں بھی ۱۰ لاکھ روپے سے زیادہ آمدنی دکھانے والوں کی تعداد محض ۱۲۷ ہے۔

یہ ایک عام جانی ہوئی بات ہے کہ جس آمدنی پر ٹیکس نہیں دیا جاتا وہ اندازاً ۴۰ ہزار کروڑ روپے سالانہ ہے جو دکھائی جانے والی آمدنی سے تقریباً ۳ گنا ہے۔ اگر ہم اس تناسب سے اُن اشخاص کا حساب لگائیں جن کے پاس یہ کالا دھن ہوگا ان کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہوگی جو اس ملک کے زیادہ تر کالا دھن کے مالک ہیں یا اُس پر کنٹرول کرتے ہیں۔ کوئی بھی شخص زیادہ آزاد خیالی سے کام لیتے ہوئے کہہ سکتا ہے کہ متوازی معیشت کے اس تمام کالا دھن اور سرکاری سرگرمیوں کے ذریعہ خرچ کئے جانے والے روپے (جن کا حساب رکھا جاتا ہے) کا تھوڑا سا حصہ باہر آتا ہے اور تنخواہ یافتہ ملازموں، صنعتی مزدوروں اور ٹرانسپورٹ اور تجارت جیسی دیگر سرگرمیوں میں کام کرنے والے ملازموں کی جو آمدنی ہے وہ موجودہ قیمتوں کے

حساب سے اوسطاً ایک ہزار روپیہ ماہوار سے زیادہ ہے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد کو خواہ کتنا بڑھایا جائے وہ تقریباً ایک کروڑ سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ یہ امر یاد رکھا جانا ضروری ہے کہ اس کالے دھن کا چلن اور انجیکشن بدعنوانیوں (یعنی بھرشٹاچار) کا زہر پھیلا رہا ہے جو ہمارے معاشرہ کے اُن تمام گروہوں کو متاثر کر رہا ہے جن کے ہاتھ میں اقتدار ہے۔ آخرکار واضح فی کس اعداد کے سوائے ہمارے پاس عوام کی آمدنی کے بارے میں درست اعداد نہیں ہیں لیکن ہمیں اس امر کا بھی کچھ اندازہ ضرور ہے کہ لوگ کیا خرچ کرتے ہیں۔ اسے صارفین کے اخراجات سے متعلق نیشنل سیمپل سروے (۱۹۸۳) کی طرف سے فراہم کیا گیا ہے۔

ان اعداد سے یہ دیکھا جائے گا کہ جو اشخاص ۱۵۰ روپے ماہوار سے زیادہ خرچ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں دیہی علاقوں میں وہ اندازاً ۱۹ فیصد ہیں۔ شہری علاقوں میں وہ آبادی کا ۳۵ فیصد ہیں۔ اب ہمارے جیسے عقلِ سلیم اور زندگی کا تجربہ رکھنے والے لوگوں کا کام یہ دیکھنا ہے کہ ۱۵۰ روپے ماہوار یا روزانہ ۵ روپے کمانے والا کوئی شخص کتنی ضروری اشیاء خرید سکتا ہے۔ اگر وہ کسی پرچون فروش کی دکان یا مناسب داموں کی دکان پر جائے اور اتنی رقم سے اناج، دالیں، خوردنی تیل، آلو، پیاز اور ایندھن خریدنے کی کوشش کرے — کپڑے، مکان اور دیگر اشیائے ضروریہ کی بات تو جانے دیجئے۔ چنانچہ

دیہی علاقوں کی ۸۰ر۱۰۱ روپے ماہوار کی فی کس آمدنی اور شہری علاقوں کی ۱۵ر۱۱۷ روپے ماہوار فی کس آمدنی پر خط کھینچنا کسی بھی اعتبار سے یک طرفہ فیصلہ ہے۔ اس طرح ہم اس خط کو مزید کم کر سکتے ہیں اور خود کو تسلی دے سکتے ہیں کہ آبادی میں لوگوں کی بھاری تعداد خط افلاس کے اوپر آ گئی ہے۔

ذیل کے گوشوارے میں ایسی متعدد اشیاء دکھائی گئی ہیں جو ۸۴-۱۹۸۳ء کے برس میں خطِ افلاس کے نزدیک رہنے والے اشخاص کی فہرست خریداری میں شامل ہیں۔

ماہوار فی کس اخراجات صارفین کے لحاظ سے اشخاص کی تقسیم

۸۴ — ۱۹۸۳ء

اخراجاتی طبقہ روپیہ فی کس ماہوار	اشخاص کا فیصد: دیہی علاقے	اشخاص کا فیصد: شہری علاقے
— ۳۰	ر۹۲	ر۲۱
۳ — ۴۰	۲ر۴۷	ر۵۱
۴ — ۵۰	۵ر۱۱	۱ر۴۰
۵ — ۶۰	۷ر۹۰	۲ر۹۳
۶ — ۷۰	۹ر۶۹	۴ر۹۲
۷ — ۸۵	۱۵ر۲۴	۹ر۵۲
۸۵ — ۱۰۰	۱۳ر۶۴	۱۰ر۶۴
۱۰۰ — ۱۲۵	۱۶ر۹۹	۱۷ر۱۷
۱۲۵ — ۱۵۰	۱۰ر۰۰	۱۳ر۱۳
۱۵ — ۲۰۰	۹ر۷۸	۱۶ر۳۱
۲ — ۲۵۰	۳ر۹۶	۸ر۷۵
۲۵ — ۳۰۰	۱ر۸۱	۵ر۱۹
۳ — اور اوپر	۲ر۴۹	۹ر۳۲

خطِ افلاس کے نزدیک رہنے والے اشخاص کی فہرستِ خریداری

اشیاء کا حصہ ۸۴-۱۹۸۳ء

اشیاء	دیہی	شہری
۱۔ کُل اناج	۳۷ر۵۵	۲۷ر۷۲
۲۔ چنے	ر۲۴	ر۱۹
۳۔ اناج کا نعم البدل	ر۱۹	۰ر۰۹
۴۔ دالیں	۳ر۸۳	۴ر۰۴
۵۔ دودھ اور دودھ کی اشیاء	۷ر۰۲	۸ر۶۶
۶۔ خوردنی تیل	۴ر۲۳	۵ر۷۴
۷۔ گوشت، انڈے اور مچھلی	۳ر۰۸	۳ر۷۱
۸۔ سبزیاں	۵ر۲۲	۵ر۸۴
۹۔ پھل اور سوکھے میوے	۱ر۱۹	۱ر۵۲
۱۰۔ چینی	۲ر۸۱	۳ر۰۸
۱۱۔ نمک	۰ر۱۸	۰ر۱۴
۱۲۔ مسالے	۲ر۵۳	۲ر۶۲
۱۳۔ مشروبات وغیرہ	۳ر۱۳	۵ر۳۰

۱۴۔ خوراکی میزان	۷۱٫۲۱	۶۸٫۶۶
۱۵۔ پان، تمباکو، نشہ آور اشیاء	۳٫۱۲	۲٫۸
۱۶۔ ایندھن اور روشنی	۷٫۶۷	۸٫۴۳
۱۷۔ کپڑا	۵٫۵۵	۳٫۱۹
۱۸۔ جوتے	٫۷۴	٫۷
۱۹۔ متفرق اشیاء اور سروس	۱۰٫۹۸	٫۷۰
۲۰۔ پائدار سامان	٫۷۳	٫۵۳
غیر خوراکی میزان	۲۸٫۷۷	۳۱٫۳۴
میزان	۱۰۰٫۰۰	۱۰۰٫۱۰

کوئی بھی ان اعداد کو ترتیب دینے والے شخص کو چیلنج دے سکتا ہے کہ وہ اپنی جیب میں ۵ روپے لے کر ان اشیاء کو خریدنے کے لیے مارکیٹ میں جائے اور گوشوارے میں مندرج فیصد کے حساب سے انھیں خرید کر دکھلائے۔ بدقسمتی سے اعداد خود کو دھوکہ دینے کے لیے اکثر استعمال کئے جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بہتری کے لیے اولین شرط ہے حقائق کو اُن کی اصلی صورت میں دیکھنے کا عزم اور صداقت کا سامنا کرنے کا مصمم ارادہ اگر ہم قصداً حقائق سے کنی کاٹنے کا رویہ اختیار کریں گے اور خود فریبی میں مبتلا ہو جائیں گے تو ہم سچائی سے کبھی بھی دو دو ہاتھ نہیں کر سکیں گے اور نہ ہی ان مسائل کا حل تلاش کر سکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیہی علاقوں میں ۸۵ فیصد سے زیادہ ہمارے عوام اور شہری علاقوں میں ۶۰ فیصد سے زیادہ ہمارے عوام کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ادنےٰ ترین درجے کے افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر اس افلاس کا یہ مطلب لیا جائے کہ وہ عزت اور صحتمندانہ زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم ہیں۔ ہمارے عوام کا نہایت چھوٹا طبقہ، حتیٰ کہ خطِ افلاس کے اوپر رہنے والوں میں ۲۰ فیصد سے بھی کم خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور وہ ہمارے معاشرے کا زیادہ کھپت کرنے والا اعلیٰ طبقہ بن گیا ہے۔ وہ ایک مصنوعی "پانچ ستارہ" ثقافت لانے کے ذمہ دار ہیں جو کالے دھن کی فضول خرچی سے پنپتی ہے اور یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہم ایک ایسے نظام کو فروغ نہیں دے سکتے جو اس قطعاً بگڑی حالت کو درست کر سکے۔ اور ہماری معیشت کا رُخ ایک منصفانہ اور مساویانہ سماجی، اقتصادی زندگی کی جانب موڑ سکے۔

خواب اور آدرش کا امتزاج

جب ہم نے منصوبہ بندی کا آغاز کیا تو پنڈت جواہر لال نہرو نے منصوبہ بندی کا ایسا عمل شروع کرنا چاہا جو ایسے بنیادی ڈھانچے کی نشو و نما کر سکے جو بدلے میں دیہی علاقوں میں گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی افزائش کر سکے اور اس طرح دیہات میں ہمارے عوام کے حالات زندگی کو بہتر بنایا جا سکے۔ صاف بیانی سے کہا جائے تو مجھے جواہر لال نہرو کے مقاصد اور مہاتما گاندھی کے مقاصد میں کوئی تضاد دکھائی نہیں دیتا۔ جیسا کہ اُن مراسلات میں حال ہی میں بیان کیا گیا ہے۔ جو سری سدھیر چند کے ایک مضمون میں نقل کئے گئے ہیں جو ۸ رنومبر ۱۹۸۷ء کے "ٹائمز آف انڈیا" کے "سنڈے ریویو" میں شائع ہوا ہے۔ آؤ ہم ایک بار پھر اُس مراسلے کا مطالعہ کریں جو مہاتما گاندھی نے ۵ ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو لکھا تھا:-

" جدید علم کی سراہنا کرتے ہوئے قدیم (علم) کو اُس کے تناظر سے دیکھتے ہوئے میں قدیم کو اُس کے نئے لباس میں بہت خوبصورت پاتا ہوں آپ

> حقیقت یہ ہے کہ دیہی علاقوں میں ۸۵ فیصد سے زیادہ اور شہری علاقوں میں ۶۰ فیصد سے زیادہ ہمارے عوام کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ادنےٰ ترین درجے کے افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بشرطیکہ اس افلاس کا یہ مطلب لیا جائے کہ وہ عزت اور صحتمندانہ زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم ہیں۔

مجھے کچھ نہیں پائیں گے اگر آپ خیال کریں کہ میں
آج کے دیہات کی بات کر رہا ہوں۔ میرے آج
کے دیہات میرے تصور میں موجود ہیں۔ آخر کار ہر
شخص اپنے ہی تصور کی دنیا میں رہتا ہے۔ اس
تصوراتی گاؤں کے دیہاتی کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔
وہ خالص شعور کا مجسمہ ہوگا۔ وہ اپنی زندگی
ایک حیوان کی مانند ایک گندے تاریک کمرے
میں بسر نہیں کرے گا۔ مرد اور خواتین آزادی سے
رہیں گے اور وہ تمام دنیا کا سامنا کرنے کے لیے تیار
رہیں گے۔ گاؤں ہیضہ، طاعون یا چیچک سے
ناآشنا ہوگا۔ کوئی بھی شخص کاہلی یا عیش و عشرت
کی زندگی بسر نہیں کرے گا۔ اس سب کے بعد میں
ایسی بہت سی چیزوں کا خیال
کر سکتا ہوں جو بہت بڑے
پیمانے پر تیار کرنا ہوں گی۔
ممکن ہے کہ اس میں
ریلوے ہو اور
اسی طرح

• تب ہمیں پھر بعض مقاصد کا ذکر کرنا ہوگا
جیسے کہ کافی خوراک، کپڑا، مکان، تعلیم اور
صحت وصفائی وغیرہ جو ملک اور ہر فرد کی کم از کم
ضرورت ہونا چاہیئے۔ ان مقاصد کو پیش نظر رکھ
کر ہمارے لیے واضح طور پر یہ جاننا ضروری ہے
کہ انھیں تیز رفتاری سے کیونکر حاصل کیا جائے۔
مجھے یہ بات پھر ناگزیر معلوم ہوتی ہے کہ آمد و
رفت کے جدید ذرائع اور متعدد دیگر ترقیوں
کا جاری رہنا اور انھیں فروغ دینا ضروری ہے۔
انھیں رکھنے کے سوائے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر یہ
ایسا ہے تو ہماری صنعت کا بہت حد تک ہونا
ضروری ہے۔ یہ بات ایک خالصتاً دیہی معاشرے
سے کیونکر مطابقت رکھے گی و ذاتی طور پر میں

جیسا جو اس سلسلے میں لکھا گیا تھا۔ انھوں نے
دونوں نظریوں کے درمیان ظاہرا تفاوت کو دور
کرنے کی کوشش کی اور مندرجہ ذیل نکات میں
ان کا خلاصہ بیان کیا۔
۱۔ آپ کے خیال میں حقیقی سوال یہ ہے کہ
ہر انسان کی دانشورانہ، اقتصادی، سیاسی اور
اخلاقی قوت کو کیونکر بڑھایا جائے۔ مجھ میں بھی
۲۔ اور اس میں ہر شخص کو اوپر اٹھنے کے لیے
یکساں حق اور موقعہ حاصل ہونا چاہیئے۔
۳۔ اس کے مطابق ملک اور شہر کی حالت
ایسی ہی ہونی چاہیئے۔ خوراک، پانی، مکان، کپڑے
اور تفریح کے سلسلے میں ان میں یکسانیت ہونی چاہیئے
ایسی صورت حال پیدا کرنے کے لیے آج ہر ایک
کو اپنے لیے کپڑا تیار کرنا چاہیئے اور اپنے لیے مکان
بنانا چاہیئے اور حتیٰ
کہ ہر ایک کے لیے
پانی اور روشنی بھی
اسی طرح تیار
کی جانی چاہیئے

آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے
عقیدے کے لیے جرأت اور مشکل پسندیوں کو
قبول کرنے کا عزم اگر ہم محض اپنے سیاسی، انتظامی
اور اقتصادی نظام کو نتیجہ خیز اور جواب دہ بنا لیں تو ہم بھارت
میں ایک ایسا پُر امن انقلاب لا سکتے ہیں جو اگر گاندھی اور نہرو کے فلسفہ کے
امتزاج سے کامیاب ہو جائے تو وہ باقیماندہ دُنیا کے لیے ایک آدرش بن سکتا ہے۔

ڈاک اور تار کا نظام بھی ہو۔ اس میں کیا ہوگا
اور کیا نہیں ہوگا میں اس کے بارے میں کچھ نہیں
جانتا اور نہ ہی میں اس کی پروا کرتا ہوں۔ اگر میں
جوہر کو برقرار رکھ سکوں تو باقیماندہ کا مطلب ہوگا
اس میں آنے اور رہنے کی آزادانہ سہولت اور
اگر میں جوہر کو چھوڑ دوں تو مجھے سب کچھ
چھوڑنا ہوگا۔"
پنڈت جی نے اپنے ۹ اکتوبر کے جواب
میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا۔

خیال کرتا ہوں کہ بھاری یا ہلکی صنعت کو
جہاں تک ممکن ہو غیر مرکوز کیا جانا چاہیئے اور
برقی قوت کے فروغ کے باعث ایسا کرنا اب
ممکن ہو گیا ہے۔ اگر ملک میں معیشت کی دو
طرزیں موجود ہوں تو ان دونوں کے درمیان
ٹکراؤ ہوگا یا ایک دوسری پر غالب آجائیگی۔"
پھر ۱۲ نومبر کو دونوں لیڈروں میں ملاقات
کے بعد گاندھی جی نے اگلے روز ایک مراسلہ

۴۔ انسان جنگل میں رہنے کے لیے نہیں بلکہ
معاشرے میں رہنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اس امر
کو یقینی بنانے کے لیے کہ کوئی شخص کسی دوسرے
شخص کا حق نہ دبائے، بنیادی یونٹ کو ایک ایسا
آدرش گاؤں یا گروپ ہونا لازمی ہے جو خود کفیل رہ
سکے اور گروپ کے اندر باہمی انحصار ہونا ضروری

ہے۔ اس امدادِ باہمی سے تمام دنیا میں رہنے والے انسانوں کے مابین تعلق کی تصویر کشی ہوتی ہے۔

اگر ان نکات کو ایک ساتھ دیکھا جائے تو ان دونوں عظیم لیڈروں کے مقاصد میں کوئی بنیادی تضاد نہیں ملے گا۔ درحقیقت اُن کے نظریوں میں امتزاج کی تلاش کرنے سے آج کے بھارت میں بھی افلاس کے مسئلہ کا حل کیا جاسکتا ہے۔ یہ میری اُمید واثق ہے کہ ایسا امتزاج نو عمر گاندھی کی طرف سے عمل میں لایا جاسکتا ہے جو نہرو کا جانشین بھی ہے۔

بھی ہم بڑا نیچے آمد و رفت اور مواصلات کا ایک بنیادی ڈھانچہ قائم کرسکتے ہیں اور اُسے بھی کفائتی بنا پر مؤثر طور پر منظم کیا جاسکتا ہے۔ اس سے ہماری صنعتی پالیسی کو آسانی سے وضع کرنا ممکن ہو جائے گا۔ جس سے اشیائے صارفین کی صنعتوں کو جنھیں اُن کی نوعیت سے ہی مزدور غلبہ والی صنعتیں بنایا جاسکتا ہے۔ غیر مرکوز کیا جاسکتا ہے اور اُن کا مقام دیہی علاقوں میں کیا جاسکتا ہے تاکہ ایک گاؤں یا دیہات کے ایک گروپ کو کم و بیش زندگی کی بنیادی ضروریات

ٹیلی ویژن، وی سی آر، کمپیوٹر، کمپیوٹری ٹیلی فون سسٹم اور مواصلات جیسی جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کو استعمال کرکے دیہات اور شہری مرکزوں کے درمیان فاصلے کو کم کیا جاسکتا ہے۔ اور درحقیقت جن شہری سہولیات کے لیے دیہات کے لوگ شہروں میں آگئے ہیں۔ اُن میں سے بیشتر کو دیہات میں لے جایا جاسکتا ہے۔ اور اس طرح جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ سے دیہات کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مستفید کیا جاسکتا ہے۔ اس سے دیہی علاقوں سے شہری مرکزوں میں فالتو نکاس کو روکا جاسکے گا۔ ہم سب کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ اس سے نہ صرف

یہ افسوسناک امر ہے کہ ہمارا اندازِ فکر ایسا ہوگیا ہے کہ وہ فلمیں اور کہانیاں مقبول ترین بن گئی ہیں جن میں اربابِ حکومت کی، جن میں جج بھی شامل ہیں مسخ شدہ تصویر پیش کرکے انھیں قطعاً بد عنوان اور بد اخلاق دکھایا جاتا ہے۔ یہ بڑے خطرناک رجحانات ہیں جو دیگر انتشار پسندانہ اور رجعت پسندانہ قوتوں کے ساتھ مل کر قوم کو لاقانونیت کی جانب لے جاسکتے ہیں۔

یہ مسئلہ نہایت موثر، کفائتی اور اقتصادی ڈھنگ سے قدرتی اور انسانی وسائل کا بہتر طور پر استعمال کرکے، بنیادی ڈھانچے کی لازمی اشیاء کی دستیابی کو بڑھا کر حل کیا جاسکتا ہے جس سے ہم کوئلے، فولاد، المونیم اور دیگر دھاتوں اور معدنیات جیسی بنیادی اشیاء اور برقی قوت اور توانائی کے دیگر قدرتی اور مسلسل جاری رہنے والے دیگر وسائل بھی پیدا کرسکتے ہیں۔ بنیادی ڈھانچے کی ان لازمی اشیاء کو کفائتی طور پر اور بڑے پیمانے پر لازماً بڑے پیمانے کے سیکٹر میں تیار کرنا ہوگا جس کے لیے بھاری سرمایہ درکار ہوگا اور اس کے ساتھ

میں خود کفیل بنایا جاسکے۔ یہ بنیادی ضروریات ہیں خوراک، مکان، کپڑا، خوردنی تیل، سبزیاں اور انڈوں، دودھ، گوشت، چمڑے کے سامان، برتنوں اور فرنیچر وغیرہ کی زرعی صنعتیں۔ اس طرح اپنی معیشت کی از سرِ نو تعمیر کرکے ہم ایک ایسے معاشرے کے قیام کے لیے ایک نئی سمت متعین کرسکتے ہیں جو استحصال پسندی سے آزاد ہوگا۔ اور جہاں ہر فرد کی کم از کم ضروریاتِ زندگی کو زیادہ تر اُس کی اپنی ہی بستی میں پورا کیا جاسکے گا۔

گندی بستیوں میں انسانی آبادیوں کے مصنوعی مسائل پیدا ہو رہے ہیں بلکہ ہوائی اڈوں اور زمین دوز ٹرانسپورٹ سسٹم وغیرہ کی صورت میں مواصلات کی عارضی ضرورت بھی اُبھر رہی ہے۔ لیکن ان سب سے زیادہ خطرناک ترین رجحان اُس سماجی اور ذاتی زندگی کی قطعی گراوٹ کے لیے ذمہ دار ہے جس سے شہری معاشرے کے ایسے مصنوعی حالاتِ زندگی جیسی امراض، نشہ کی لت اور تشدد و جرائم کی بڑھتی ہوئی لہر جیسے غیر صحتمندانہ حالاتِ زندگی کی صورت میں پیدا

افراد چند لوگوں کے پاس دولت کے مرکوز ہو جانے سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ بہت سے لوگوں کے حق اس لیے مارے جاتے ہیں کہ کچھ کے پاس ان کے استحقاق سے زیادہ ہے۔

ہم جب غریبی کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ روٹی، کپڑا اور مکان کے حق سے محرومی کا نام ہے، تو اس کا ایک المناک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم بہت حد تک یہ ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا لیتے ہیں کہ محروم

سکے اور اسے متحرک رکھ سکے۔ اس بارے میں کوئی ایک رائے ایسی نہیں جس پہ سب کا اتفاق ہو۔ موٹے طور پہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک کنبہ جس میں ۵ یا ۶ افراد ہوں، موجودہ قیمتوں کے حساب سے کم سے کم سال میں ۶۴۰۰ روپے ضرور کمائے تاکہ کم سے کم ضرورتوں کو تو پورا کر سکے اگر وہ یہ نہیں کما پاتا تو وہ کنبہ غریب ہے۔ جن کنبوں کی سالانہ آمدنی ۴۸۰۰ روپے سے کم ہے، وہ بہت غریب کنبوں کی فہرست میں آتے ہیں۔ جن کنبوں کی

لے کر ۱۵ کروڑ ۵۰ لاکھ کنبوں میں سے جو کہ ۷۵ کروڑ سے زیادہ افراد پر مشتمل تھے، کتنے کنبے غریب ہیں۔ اس بارے میں سرکار کے اندازے اور علمی طبقے اور برادری کے اندازے میں بڑا تفاوت ہے۔ سرکار کے اندازے کے مطابق غریب کنبوں کی تعداد ۳۰ کروڑ سے کم ہے جو کہ چھ تا ساڑھے چھ کروڑ پر مشتمل ہیں۔ جبکہ علمی برادری کا اندازہ ہے کہ یہ کنبے ۴۰ کروڑ افراد پر مشتمل آٹھ تا ساڑھے آٹھ کروڑ کے لگ بھگ ہیں۔ چنانچہ زیادہ وقت غریبی دور کرنے کی تدابیر کو مرتب کرنے اور انھیں عملی جامہ پہنانے پر صرف نہیں کیا جاتا بلکہ کوشش یہ ہوتی ہے

چنانچہ زیادہ وقت غریبی دور کرنے کی تدابیر کو مرتب کرنے اور انھیں عملی جامہ پہنانے پر صرف نہیں کیا جاتا بلکہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ غریب کنبوں کی گنتی کی جائے اور اس گنتی کے لیے کوئی طریقہ نکالا جائے اور اس طرح سے حاصل شدہ مختلف اعداد و شمار اور ان کی صحت کے بارے میں تکرار کی جائے۔

بے روزگاری، کم روزگاری اور غیر اطمینان بخش روزگاری کے مسائل بہت زیادہ ہیں اور یہ ہماری غریبی کی دوسری بڑی وجہ ہے۔ اصل ٹریجڈی یہ ہے کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ کتنے لوگوں کے پاس روزگار نہیں ہے اور ان سے بھی زیادہ کتنے لوگ ہیں جو کم روزگاری کا شکار ہیں اور وہ کس حد تک ملک میں غریبی پھیلانے کا ایک حصہ ہیں۔

افراد کتنے ہیں؟ اس کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ انسان کے لیے بنیادی طور پر کم سے کم کتنی خوراک ضروری ہے اسے کتنا کپڑا درکار ہے اور کتنا بڑا مکان درکار ہے جس سے کہ وہ کنبہ کی پرورش کر

آمدنی ۳۵۰۰ روپے سالانہ تک رہ جاتی ہے، وہ غریب کنبوں میں سب سے زیادہ غریب ہیں۔ اس بنیاد پر یکم نومبر ۱۹۸۶ء کو ۱۴ کروڑ سے

کہ غریب کنبوں کی گنتی کی جائے اور اس گنتی کے لیے کوئی طریقہ نکالا جائے اور اس طرح سے حاصل شدہ مختلف اعداد و شمار اور ان کی صحت کے بارے میں

تکرار کی جائے۔

ہمیں ملک میں غریب افراد کی تعداد ۳۰ اور ۴۰ کروڑ کے درمیان مان کر چلنا چاہیئے۔ یعنی سرکار ان کی تعداد ۳۰ کروڑ بتاتی ہے جبکہ علمی برادری ۴۰ کروڑ بتاتی ہے۔ اب اہم سوال جس پر ہمیں توجہ کرنی ہے، وہ یہ کہ ہمارے ملک میں ۴۰ تا ۵۰ فیصد کنبے غریبی کی زندگی کیوں گزار رہے ہیں۔

غریبی کیوں؟

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ملک میں مختصر سے لوگوں کے پاس زمین، جائداد بھی ہے، مکانات بھی ہیں، املاک ور شیئرز بھی ہیں اور بینکوں میں رقم بھی جمع ہے جو کالے اور سفید دونوں کی صورتوں میں ہے۔ جبکہ اکثریت اس طرح کے اثاثہ جات سے محروم ہے۔ خوراک، کپڑا، مکان اور تفریحی اشیاء وغیرہ خریدنے کے لیے با اجرت روزگار کیا جانا ضروری ہے یا از خود روزگار سے اس کے لیے رقم حاصل کرنی ہوتی ہے یا پھر مملوکہ جائدادوں کے کرایہ، سود، نفع وغیرہ سے یہ اشیا حاصل کی جاتی ہیں۔ قومی آمدنی پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ملک میں ۴۰ کروڑ محنت کشوں میں سے ۳۷ کروڑ محنت کشوں کی محنت سے جو رقم حاصل ہوتی ہے، وہ صرف ۳ کروڑ افراد کی کمائی ہوئی جائداد اور کچھ از خود روزگار کرنے والوں کی آمدنی کے مساوی ہوتی ہے۔ آمدنیوں اور اثاثہ جات کی تقسیم میں یہ نابرابری گویا کہ امیر اقلیت اور غریب اکثریت کے درمیان پایا جانے والا فرق مختلف اداروں نے مختلف طرح سے واضح کیا ہے۔ ۱۹۶۱ء، ۱۹۷۱ء اور ۱۹۸۱ء میں ریزرو بینک آف انڈیا نے دیہی کنبوں کی جائدادوں کے سروے کیے، اس سے پتہ چلا کہ دیہی کنبوں میں ادنیٰ سطح کے ۳۰ فیصد کنبوں کے پاس اس عرصے میں جملہ دیہی املاک کا صرف ۴ تا ۵ فیصد رہا، جبکہ اعلیٰ سطح کے ۳ فیصد کنبوں کے پاس جملہ دیہی املاک کا ۸۰ فیصد رہا۔ ادنیٰ سطح کے لوگوں کے اثاثہ جات اس عرصے میں اور بھی کم ہوتے گئے، جبکہ اعلیٰ سطح کے کنبوں کے اثاثہ جات بڑھتے گئے، اس عرصے میں بے زمین زرعی مزدوروں کی تعداد ۱۹۶۱ء میں محنت کشوں کی تعداد کی ۱۷.۲ فیصد تھی جو بڑھ کر ۱۹۷۱ء میں ۲۶.۹ فیصد ہوگئی اور ۱۹۸۱ء میں یہ اور بڑھ کر ۲۹ فیصد ہوگئی۔ این ایس ایس (نیشنل سیمپل سروے) نے ۱۹۸۲ء میں ۳۷ ویں دور میں یہ واضح کیا کہ ۵۵ فیصد کسان ایک ہیکٹیر سے بھی کم زمین کے مالک ہیں جبکہ ۵ فیصد کسانوں کے پاس ۲۰ ہیکٹیر فی کسان سے زیادہ زمین ہے۔ پھر ہم کو اس بات پر فخر ہے کہ ہم اپنی قومی آمدنی کا ۲۲ تا ۲۳ فیصد بچا رہے ہیں گویا کہ تقریباً ۶۵ ہزار کروڑ روپے سالانہ کی بچت کر رہے ہیں لیکن یہ بات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ بچت کس کے حصے میں آ رہی ہے۔ بچتوں کے منبع کے بارے میں بھی زبردست نابرابری ہے۔ سماج کی بالائی طبقے کے ۵ فیصد لوگ کل بچتوں کا ۵۰ فیصد بچاتے ہیں اور بالائی طبقے کے دس فیصد لوگ ۷۰ فیصد بچتیں کرتے ہیں۔ تاہم سماج میں اکثریت یعنی ۷۰ فیصد لوگ کچھ بھی نہیں بچا پاتے۔

ہماری جائداد اور املاک کا چند ہاتھوں میں مرکوز ہونا غریبی کی جڑ ہے، اکثریت اُن کی ہے جن کو جائداد کی کوئی آمدنی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غریبی دُور کرنے کے لیے چلائے جا رہے مختلف پروگراموں مثلاً این آر ای پی، آئی آر ڈی پی، آر ایل ای جی پی (دیہات میں بے زمین لوگوں کے لیے روزگار کی ضمانت کا پروگرام) کی مدد سے اگر ہم غریبی دور کرنے یا اسے کم کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں، جیسا کہ سرکار کا منصوبہ ہے، جو کہ غریبوں کے تناسب صدی کے آخر تک گھٹا کر کُل آبادی کا صرف ۵ فیصد کر دینا چاہتی ہے، تو بھی سماج میں املاک اور جائداد و اثاثہ جات کی نابرابریاں تو بڑھتی رہیں گی۔ اصلاحات اراضی کے پروگرام کے ریکارڈ سے یہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ ہم نے چھٹے منصوبے میں یہ واضح طور پر کہا کہ

> ہمارا نظام قدیمی نظام نہیں ہے۔ یہ صرف دولت مند اقلیتی طبقے اور صاحب اقتدار طبقات کی خدمت کرتا ہے۔ ہمارا معاشی نظام تدریجی طور پر ترقی کی طرف نہیں بڑھ رہا ہے، البتہ یہ نظام ایسے طبقات کو بڑھاوا دے رہا ہے اور ان کے مقاصد حل کر رہا ہے جن کی قوت خرید مستحکم ہے۔ اعلیٰ ٹیکنالوجی اور جدید کاری اس خلط ملط ترقی کے لیے آلہ کار بن رہی ہے جس سے نابرابری کو مزید ہوا ملے گی۔

یکم تا ۱۳ر جنوری 1988

... ۸۱ ـ ۱۹۸۰ء تک
تسلیم کر لیے جائیں گے۔ تاہم یہ چھ بڑی ریاستوں میں نہیں ہوا جو کہ پنجاب سے لے کر تمل ناڈو تک ہیں۔ ہم نے کہا کہ بچولیوں کے توسط سے انعام پانے والا لگان داری نظام ۱۹۶۰ء تک ختم ہو جائے گا لیکن یہ تین ریاستوں میں آج بھی ہے بلکہ حقیقت میں ۱۳ دیگر ریاستوں میں بھی ہے۔ ہم نے کہا کہ فاضل زمین کو ۸۳ ـ ۱۹۸۲ء تک حاصل کر کے

بھی زیادہ کتنے لوگ ہیں جو کم روزگاری کا شکار ہیں۔ اور وہ کس حد تک ملک میں غریبی پھیلانے کا ایک حصہ ہیں۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ فیکٹری اور سرکاری سیکٹر میں کس حد تک بے روزگاری ہے لیکن منظم سیکٹر کا روزگار محنت کشوں کے صرف ۱۰ فیصد حصے کو میسر ہے گویا کہ ۴۰ کروڑ میں سے صرف ۲؍۳ کروڑ کو۔ ہمیں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ کتنے لوگ دیہات میں بے روزگار ہیں اور ان سے کتنے

سے انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ کے عملہ کا مطالعہ بھی اتفاق کرتا ہے۔ موجودہ قیمتوں کے حساب سے یہ ایک لاکھ کروڑ سے لے کر ایک لاکھ ۲۰ ہزار کروڑ روپے تک ہے۔ اس میں سے ۵ ہزار کروڑ روپے کی وہ رقم ہے جو ناجائز اور غیر قانونی طریقے سے سوئٹزرلینڈ کے بینکوں میں ہے۔ یہ سب امیر اقلیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکثریت کے پاس نہ تو کالا دھن ہے اور نہ آمدنی۔ زیادہ تعداد انھیں لوگوں کی ہے جو منڈی میں سامان خریدنے کی سکت نہیں رکھتے ہیں۔ منڈی سامان تعیش اور بالائی متوسط طبقے کے استعمال کی اشیاء سے بھری پڑی ہے۔ اور ان اشیاء کی مانگ ہے اس سے منڈی سکڑ رہی ہے۔ اور منڈی کی طرف سے رائج کئے جانے والا پیداواری نظام اور کار کی کمی کا سبب بنتا ہے، جیسا یہ کاریں، پانچ ستارے والے ہوٹل، کپڑا

> **اعلیٰ سطح پر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے سکہ بدل کر، کالے دھن رکھنے والوں کو عمر بھر قید کر کے، اس سلسلے کے قوانین کو مزید سخت بنا کر، غیر ملکی زر مبادلہ کی خلاف ورزی کرنے والوں کو عبرت ناک سزائیں دے کر، غریبی پھیلانے والے اسباب کی روک تھام کی جاسکتی ہے۔**

اس کی تقسیم عمل میں آجائے گی لیکن فاضل اراضی کے نام پر بہت کچھ دھوکہ بازی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کی روشنی میں فاضل زمین ۶۷ لاکھ ایکڑ ہے جبکہ زرعی شماریات کی روشنی میں یہ ۲۱۶ لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ تین ریاستوں میں تو زمین کی بالائی حد کے قوانین بھی نہیں ہے۔

اصلی ٹریجڈی

زیادہ تر لوگوں کو جائداد کی آمدنی نہیں ہوتی۔ انھیں کام کر کے روپیہ کمانا پڑتا ہے تاکہ اپنے کنبے اور اپنا گزارہ کر سکیں، بے روزگاری، کم روزگاری اور غیر اطمینان بخش روزگاری کے مسائل اسی وجہ سے زیادہ ہیں۔ اور یہ ہماری غریبی کی دوسری بڑی وجہ ہے۔ اصلی ٹریجڈی یہ ہے کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ کتنے لوگوں کے پاس روزگار نہیں ہے اور ان سے

زیادہ کتنے وہ لوگ ہیں جو کم روزگاری میں مبتلا ہیں۔ گاؤں میں محنت کش طبقے کا ۸۰ فیصد آباد ہے مگر ہم گاؤں کے بارے میں مذکورہ معلومات نہیں رکھتے۔ نیشنل سمپل سروے اور دیگر اسی طرح کے مطالعوں سے ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ کم روزگاری کا مسئلہ بہت سنگین ہے اور دیہی محنت کشوں کا بڑا حصہ اس کا شکار ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اتنا نہیں کما پاتے جس سے کہ وہ اپنا اور اپنے کنبے کے ارکان کا گزارہ کر سکیں۔

غریبی کے ضمن میں ان برائیوں سے پیدا ہونے والے کچھ اور اسباب بھی ہیں۔ ایک ہے کالا دھن، جو کہ قومی آمدنی کا ۳۰ فیصد ہے۔ میرے مطالعے کے مطابق یہ ۴۰ فیصد سے بھی زیادہ ہیں۔ اس خیال

دھونے کی مشینیں، ریفریجریٹر، عمدہ کپڑے، اعلیٰ داموں والی دوائیں بکثرت تیار ہو رہی ہیں جن کو سماج کے چند امیر لوگ ہی خرید پاتے ہیں۔ اجرتوں والے طبقے کے استعمال کے سامان کی کمی ہے یعنی خوراک اور خوراکی اشیاء، مکان، کپڑا، بنیادی دوائیں وغیرہ، یہ بنیادی سامان عوام کو مناسب داموں پر ملتا ہے۔

غریبی کیسے دور ہو؟

اس دلدل سے کیسے نکلا جائے۔ یہ ایک ایسی دلدل ہے جہاں نابرابری کے نتیجے میں غریبی ہے۔ اور غریبی نابرابری کو بڑھاوا دے رہی ہے۔

جی ہاں۔ اس سے نکلنے کا ایک طریقہ ہے لیکن

یہ سخت اور تقریباً ناممکن ہے۔ اس غیر مساوی اور غیر منصفانہ نظام سے استفادہ کرنے والوں کو یہ ماننا چاہیئے کہ ہمارا نظام غیر مساوی اور غیر منصفانہ ہے اور اسے قومی نظام کا نام دے کر اس کی برائیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے ہمیں یہ نہ کہنا چاہیئے کہ ہم تدریجی ترقی کے عمل پر کاربند ہیں۔ یہ عمل اعلیٰ ٹیکنالوجی اور جدید کاری کی مدد سے انجام پا رہا ہے، اس کے نتیجے میں غریبی کم ہو جائے گی اور پھر دور ہو سکے گی۔ اس طرح کے بیانات میں غریبی کے بنیادی سبب کو کہیں نہیں بتایا گیا یا سماج میں نابرابری کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

ہمارا نظام قومی نظام نہیں ہے یہ صرف دولت مند اقلیتی طبقے اور صاحبِ اقتدار طبقات کی خدمت کرتا ہے۔ ہمارا معاشی نظام تدریجی طور پر ترقی کی طرف نہیں بڑھ رہا ہے، البتہ یہ نظام ایسے طبقات کو بڑھاوا دے رہا ہے اور ان کے مقاصد حل کر رہا ہے جن کی قوتِ خرید مستحکم ہے۔ اعلیٰ ٹیکنالوجی اور جدید کاری اس خلط ملط ترقی کے لیے آلۂ کار بن رہی ہے جس سے نابرابری کو مزید ہوا ملے گی۔

کیا ہم ان واضح حقائق سے ناواقف ہیں، ان کو جانے بغیر ہم سماج کو غریبی سے نجات نہیں دلا سکتے۔

اگر ہم اس حقیقت سے باخبر ہیں اور اس کا علاج بھی چاہتے ہیں تو ہمیں ایسا سماجی نظام بروئے کار لانا ہوگا جس سے تمام کنبوں کو اثاثہ جات دستیاب ہو سکیں اور سماج میں اثاثہ جات سے محرومی کی شکایت نہ رہے۔ ابتداءیں اصلاحاتِ اراضی کے پروگرام، دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام، رعایتی شرح سود پر قرض دینے کے پروگرام، کوآپریٹو پروگراموں وغیرہ کا مقصد یہی تھا۔ اثاثہ جات اور املاک کی بڑے پیمانے پر تقسیم اسی وقت ممکن ہے جبکہ اصلاحاتِ اراضی کے پروگرام میں جوڑ توڑ، ساز باز اور ناجائز اثرات کے زیرِ اثر زمین کی تقسیم کی برائیوں کو روک سکیں۔ ہمیں اس نظام کی خامیوں اور برائیوں پر قابو پانا ہے۔ موجودہ صورت میں اس سے چند بڑے لوگ ہی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اگر ہم اس طرح کے پروگراموں کی برائیوں کو روک سکے، جو کہ پہلے سے موجود اثاثہ جات میں صرف اضافہ کا باعث ہیں۔ اور ان سے اُن لوگوں کو فائدہ پہونچا سکے، جو اس سے فائدہ اٹھانے کے صحیح معنی میں مستحق ہیں یعنی چھوٹے دستکار اور چھوٹے تاجر۔ اور اگر ہم کوآپریٹو نظام کو اس کے اصلی اور ابتدائی مقاصد کی طرف لا سکے، اور اگر ہم غیر مؤثر قوانین پاس کرنے اور ان پر گفتگو کرنے کا دروازہ بند کر سکے، تبھی صحیح معنی میں غریبی دور کرنے میں مدد مل سکے گی۔ اعلیٰ سطح پر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے سکہ بدل کر، کالے دھن رکھنے والوں کو عمر بھر قید کر کے، اس سلسلے کے قوانین کو مزید سخت بنا کر، غیر ملکی زرِ مبادلہ کی خلاف ورزی کرنے والوں کو عبرت ناک سزائیں دے کر، غریبی پھیلانے والے اسباب کی روک تھام کی جا سکتی ہے۔ حالانکہ ہم ان امیر ترین لوگوں کے بارے میں جو کہ باہر کے ملکوں میں اپنا سکہ رکھتے ہیں، بے پروا ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟ اس کو میں تقریباً ناممکن سمجھتا ہوں۔ اس سے حقیقی قومی بیداری پیدا ہو سکے گی۔ امیر اور صاحبِ اقتدار لوگوں کو اپنی امارت، دولت اور اقتدار کے ایک حصے سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ غریبوں کو خود کو منظم کرنے کی مکمل آزادی دینی ہوگی تاکہ وہ استحصال کے خلاف جدوجہد کر سکیں، ایسا کئے بغیر موجودہ جال سے نکلنا دشوار ہے۔ اس وقت تو صرف یہ جھگڑا ہے کہ غریبوں کی تعداد کتنی ہے، کتنے لوگ غریبی کے خط سے اوپر اُٹھے، غریبوں کے استفادے کے لیے کون کون سے پروگرام شروع کئے جا سکے۔ جبکہ یہ پروگرام کسی نہ کسی طرح اُن کو فائدہ پہنچاتے ہیں جو کہ غریب نہیں ہے۔

اگر یہ نشاۃ ثانیہ عمل میں آتی ہے تو سماج تدریجی طور پر اقتصادی ترقی کر سکے گا۔ غریبی دور کرنے کے لیے یہ بنیادی شرط ہے۔ اصلاحاتِ اراضی کے پروگراموں سے فی الواقعی مستحق لوگوں کو فائدہ پہونچانا ضروری ہے، حقیقی روزگار پیدا کرنا ہوگا اور دیہات کی حقیقی ترقی کو عملی شکل دینی ہوگی۔ کالے دھن کو سفید دھن میں تبدیل کر کے نابرابری کو کم کرنا ہوگا۔ ●

بقیہ، غربت کے سماجی اور ثقافتی پہلو

پارٹیاں اپنے موجودہ پروگرام کے مطابق ہی کامیابی چاہتی ہیں تو انھیں کافی سست رفتاری سے کام کرنا ہوگا۔ لیکن روایتی معاشرے کے بکھراؤ کے بعد غریب طبقے کے لوگوں کو زیادہ عرصہ تک تابع نہیں رکھا جا سکے گا۔ اب غریب لوگوں کے بارے میں عام بیداری کا احساس پیدا ہونے لگا ہے اور اس کے لیے احتجاجوں اور مظاہروں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ غریب طبقے کے لوگ جتنی آزادانہ سے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے جائیں گے۔ یہ بات اتنی ہی اُن کے حق میں جائے گی۔ اگر ملک کا چیدہ اور مخصوص طبقہ وقت کی آواز کو سمجھنے میں ناکام رہا تو بھی سماج کی انقلابی تشکیلِ نو کا عمل عوام کی قیادت میں ہی تکمیل پائے گا۔ ●

پروفیسر بھابا توش دتہ

محرومی کی تشخیص

نامور ماہر اقتصادیات پروفیسر بھابا توش دتہ کی رائے میں ہمارے یہاں افلاس۔ درحقیقت تاریکی کی ایک آماجگاہ ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ہمارے ملک میں آمدنی کی ناقص تقسیم کی بیماری کی باریک بینی سے تشخیص کی ہے جس میں کروڑوں افراد طویل عرصے سے مبتلا ہیں۔ اس تسلیم شدہ استدلال کے باوجود کہ انسداد افلاس کے لیے مرتب کیے گئے نئے پروگراموں پر بجٹ میں بہت زیادہ رقومات مخصوص کی گئی ہیں افلاس ایک بڑے مسئلہ کے طور پر برقرار ہے۔ فاضل مصنف نے مستند اعداد کی بنا پر "خط افلاس" کے تصور پر سیر حاصل بحث کی ہے جو ان کے مطابق نہ صرف کم حیثیت کا ہے بلکہ اسے پالیسی کے آلے میں بھی بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگرچہ ہم ان اشخاص یا کنبوں کی تعداد کے تخمینے تیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جنھیں خط افلاس کے اوپر لایا جا رہا ہے تاہم ہمارے پاس ان کے بارے میں کوئی صحیح اعداد نہیں ہیں جو اسی متعلقہ عرصے میں اصلیا اس خط کے نیچے چلے گئے ہوں۔ ہمارے معلومات میں خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے آمدنی کے مختلف زمروں کے لوگوں کے مابین بچت کی شرح، اموات، پیدائش کے وقت متوقع عمر اور خواندگی کے بارے میں سوالات اٹھائے ہیں۔ (ایڈیٹر)

بھارت کا آئین جس کا نفاذ ۲۶۔ جنوری ۱۹۵۰ء کو ہوا اس کی تمہید میں بھارت کو ایک با اقتدار جمہوری ریپبلک بنانے کے مقاصد میں "سماجی، اقتصادی اور سیاسی انصاف" کو اولین مقام دیا گیا۔ ہدایتی اصولوں میں ہر ایک سے روزی کے ایک موزوں وسیلے کے حق، "گذارے لائق اجرت" اور "ایک اعلیٰ معیار زندگی" کا وعدہ کیا گیا اور اس کے علاوہ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ اقتصادی نظام اس طرح کام نہیں کرے گا "جس کے نتیجے میں دولت اور پیداواری وسائل کا عوامی مفاد کے خلاف اجتماع ہو جائے۔" ان دفعات میں عوام کو قابل نفاذ حقوق نہیں دیے گئے اور بعض قنوطیت پسندوں کو یہ کہنا پڑا کہ دولت کے اجتماع کی اجازت دی جائے گی اگر پالیسی سازوں نے دولت کے ایسے اجتماع کو عوامی فائدے کے لیے ضروری خیال کیا۔ یہ دیکھنا باعث دلچسپی ہوگا کہ آزادی کے بعد کی چار دہائیوں میں یہ امیدیں کس حد تک پوری ہوئی ہیں۔

آئین کی ہدایتی اصولوں کی دستاویزات نے بھی خوش فہمی اور اُمیدیں جگائیں۔ پہلا پانچ سالہ منصوبہ (۵۵-۱۹۵۱ء) اس واضح دعوے کے ساتھ شروع کیا گیا کہ "بھارت میں منصوبہ بندی کا مرکزی مقصد عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ہے" تقریباً تیس برس بعد اُس وقت کے پردھان منتری نے چھٹے منصوبے کے دیباچے میں ٹیگور کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ "دل نکلے گا، اپنی پختہ اعتمادی برقرار رکھو"

تشریح کی تھی۔ اس خط کی تشریح زیادہ تر افراطِ زر کے اشاریہ کی تیاری کے لیے وقتاً فوقتاً بدلی گئی ہے اور اب اسے ۶۰۰۰ روپے سالانہ کی کنبہ جاتی آمدنی پر رکھا گیا ہے۔ ۶۸-۱۹۶۷ء میں بھارت کی آبادی تقریباً ۵۰ کروڑ تھی اور ڈنڈیکر رتھ کے خط (افلاس) کے نیچے رہنے والے لوگوں کی تعداد لگ بھگ ۲۰ کروڑ تھی۔ ایک سرکاری ترجمان کے بیان کے مطابق اس خط کے نیچے جس کی از سرِ نو تشریح کی گئی ہے، رہنے والے لوگوں کی تعداد ۲۷ کروڑ ہے۔ تشریح اور مقابلے

صلاحیت کو برقرار رکھنے کے لیے کم از کم ضروری خیال کیا جاتا تھا لیکن اُس سے دیگر تشریحات کے مزید سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ خطِ افلاس کی تشریح کرنے میں کسی یک طرفہ فیصلے سے کام لینا ہوگا اور مفروضات کو حتمی مرحلے سے ذیلی مرحلوں کو منتقل کرکے مسئلے میں کوئی بہتری نہیں ہوئی۔ کسی کو اب جو کچھ جاننے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ ایک کنبے (۴ یا ۵ افراد کا) کی ۶۴۰۰ روپے کی سالانہ آمدنی یعنی تقریباً ۵۳۳ روپے ماہوار بہت کم آمدنی ہے اور یہ فی کنبہ مجموعی خالص قومی پیداوار کا تقریباً نصف ہے تازک مسائل تو کچھ

تشریح اور مقابلے کی تمام پیچیدگیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے کوئی بھی شخص کہہ سکتا ہے کہ اگرچہ خطِ افلاس کے نیچے آبادی کا ۴۰ فیصد سے کم ہو کر تقریباً ۳۵ فیصد رہ گیا ہے۔ تاہم یہ حقیقت نمایاں ہے کہ تقریباً ۲۰ برس میں کُل تعداد میں ۷ کروڑ کا اضافہ ہوا ہے۔

جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی تاریکی ہے جسے دور کیا جانا ہے۔ مزید پانچ برس گزر جانے کے بعد پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین نے بھارت میں منصوبہ بندی کے بنیادی مقاصد بیان کرتے ہوئے "افلاس کے تدارک" کو اوّل مقام دیا۔ اس اثنا میں "غریبی ہٹاؤ" کو منصوبہ بندی کی تمام سرگرمیوں کے لیے بنیادی خیال کے طور پر اختیار کیا گیا۔ افلاس کے انسداد کے لیے پروگرام وضع کیے گئے اور ان کے لیے بجٹ کی جو رقومات مخصوص کی گئیں وہ قطعی غیر مؤثر نہیں تھیں۔

لیکن اس سب کے باوجود افلاس ایک بڑے مسئلے کے طور پر برقرار ہے۔ جب ۱۹۷۱ء میں پروفیسر ڈنڈیکر اور پروفیسر رتھ نے بھارتی مباحثے میں "خطِ افلاس" کے "راؤن ٹری" بیورج تصور کا اجراء کیا اُن کا اندازہ تھا کہ ۶۸-۱۹۶۷ء میں بھارت کی ۴۰ فیصد آبادی خطِ افلاس کے نیچے ہے جیسی کہ انھوں نے

کی تمام پیچیدگیوں کو نظرانداز کرتے ہوئے کوئی بھی شخص کہہ سکتا ہے کہ اگرچہ خطِ افلاس کے نیچے آبادی کا ۴۰ فیصد سے کم ہو کر تقریباً ۳۵ فیصد رہ گیا ہے تاہم یہ حقیقت نمایاں ہے کہ تقریباً ۲۰ برس میں کُل تعداد میں ۷ کروڑ کا اضافہ ہوا ہے۔

یہاں "عدمِ افلاس" کے اجزاء یا حد بندی کے خط پر لامتناہی بحث و مباحثہ میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سادہ ہی کافی ہے کہ اگر تمام آمدنیوں میں قطعاً مساوات نہیں آتی تو کسی بھی معیشت میں خواہ اُس میں کتنی امارت کیوں نہ ہو خطِ افلاس پیدا ہو سکتا ہے۔ ابتدائی بیسویں صدی کا بیورج تصور اس امر پر مبنی تھا جسے پیداواری

اور ہی ہیں اوّل، خطِ افلاس کا اگر کوئی تصور تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ یہ اصول ایک پالیسی کی شکل اختیار کر لے اور اُسے ہی معیار بنا لیا جائے۔ اگر خطِ افلاس کے اوپر لوگوں کی تعداد بڑھ جائے اور خط کے نیچے کم ہو جائے تو پالیسی ساز یہ سوچے بغیر خوش ہو جاتے ہیں کہ "منتقل کیے جانے والوں" کو تبدیلی سے پہلے کہاں رکھا گیا تھا۔ ۶۲۸ روپے سے ۶۳۹۰ روپے تک کنبے کی آمدنی میں دس روپے کا اضافہ کسی بھی طرح معیشت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اسی طرح ۶۳۹۵ روپے سے لے کر ۶۴۰۵ روپے تک اضافہ ہے، یہ بھی اگرچہ بے معنی ہے لیکن پالیسی پروپیگنڈہ کے طور پر بہتر ڈھنگ سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے اگرچہ اُن اشخاص یا کنبوں

کی تعداد کے بارے میں تخمینے تیار کئے جاتے ہیں جنھیں خطِ افلاس کے اوپر لایا گیا ہے اسی متعلق عرصہ میں خط سے نیچے کی جانب امکانی نقل و حرکت کے بارے میں کوئی تخمینے تیار نہیں کئے جاتے

دراصل "افلاس" ہمارے لیے حقیقتاً تاریکی کی آماجگاہ ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ ہمیں خصوصاً اس بارے میں جاننے کی کیا ضرورت ہے کہ خطِ افلاس کے نیچے مختلف گروپوں ۔ محض محرومی سے لے کر ٹھیک خطِ افلاس کے نیچے رہنے والوں کے مابین آمدنی کی تقسیم کیوں کر ہو رہی ہے۔ یہ غیر اغلب نہیں ہے کہ اگرچہ بعض کنبے خطِ افلاس کو پار کرکے اوپر آرہے ہیں، تاہم دیگر کنبے انتہائی غریبی کے مرحلے سے "محرومی کے مرحلے" میں جا رہے ہیں۔ یہ قیاس کرتے ہوئے کہ ہم خطِ افلاس کی بے ضرر تشریح کر سکتے ہیں، محض اشخاص کی گنتی کرنا (عموماً نہایت غیر مکمل) کافی نہیں ہے۔ محرومی کی بہتر تصویر کو حقیقی آمدنیوں اور خطِ افلاس کی معیاری آمدنی کے درمیان فرق کا اندازہ لگا کر بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر ایک کنبے کی سالانہ آمدنی ۲۴۰۰ روپے (یعنی ۲۰۰ روپے ماہوار) ہے اس کی آمدنی خطِ افلاس سے ۴ ہزار روپے پیچھے ہے۔ اس فرق کو خطِ افلاس کی ۶۴۰۰ روپے کی آمدنی

کے تناسب کے طور پر ظاہر کیا جائے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ انحراف یا محرومی کا تناسب ۶۲٫۵۰ فیصد ہے اور اس امر پر زور دیا جانا چاہیئے کہ اس سے قومی اوسط آمدنی کے پیچھے محرومی کا پتہ نہیں چلتا۔ اب سرکاری رپورٹوں میں "غریبوں" یعنی خطِ افلاس کے پیچھے رہنے والوں، کی ضمنی تقسیم کرتے ہوئے انھیں چار چھوٹے گروپوں میں بانٹا جاتا ہے۔ "محرومیں" (غریبوں میں غریب ترین) جن کی سالانہ کنبہ جاتی آمدنی ایک روپے اور ۲۲۶۵ روپے کے درمیان ہے۔ "نہایت نہایت غریب" جن کی کنبہ جاتی آمدنی ۳۵۰۱ روپے اور ۴۸۰۰ روپے کے درمیان ہے اور "غریبوں کے درمیان امیر ترین" جن کی آمدنی ۴۸۰۱ روپے اور ۶۴۰۰ روپے کے درمیان ہے۔ چار گروپوں کے مابین انسدادِ افلاس کے پروگراموں (خصوصاً مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام) سے فوائد کی تقسیم کے بارے میں جانکاری دستیاب ہے لیکن اس سے کوئی بھی بامعنی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں مختلف گروپوں کی کل تعداد کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ہے

غریبوں میں غریب ترین کو دیکھا جائے جن کی سالانہ آمدنی ایک روپے اور ۲۲۶۵ روپے کے درمیان ہے اور جن کی اوسط آمدنی ۱۱۳۲ روپے ہے۔ (اس چھوٹے گروپ کے اندر آمدنی کی مزید تقسیم کا قیاس کرتے ہوئے) تو کوئی بھی مشاہدہ کرے گا کہ یہ حقیر آمدنی ۶۴۰۰ روپے کی خطِ افلاس کی آمدنی کا محض ۱۷٫۶۹ فیصد ہے جو ۸۲ فیصد کے انحرافی تناسب کا مظہر ہے۔ اسی طریقے سے حساب کیا جائے تو تین دوسرے گروپوں کے لیے انحرافی تناسب ۵۵ فیصد، ۳۵ فیصد اور ۱۴ فیصد پایا جائے گا۔ اگر کوئی قیاس کر سکے کہ ان میں سے ہر ایک گروپ میں کنبوں کی یکساں تعداد ہے تو خطِ افلاس کے نیچے کل جتنی آبادی ہے اس میں سے خطِ افلاس کے نیچے اوسط محرومی ۴۶٫۵۰ فیصد پائی جاتی ہے لیکن یہ قیاس غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ جبکہ تقسیم کی صحیح صورت کا پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ بہ خوبی کہا جا سکتا ہے کہ اوسط محرومی کا اندازہ ۴۶٫۵۰ فیصد سے کافی زیادہ ہے۔

بھارت سرکار کے دیہی ترقی کے محکمے کی طرف سے اکتوبر ۱۹۸۵ء سے ستمبر ۱۹۸۶ء تک بارہ ماہ کے لیے مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کا جو جائزہ

اگر خطِ افلاس کے اوپر کے لوگوں کی تعداد بڑھ جائے اور خط کے نیچے کم ہو جائے تو پالیسی ساز یہ سوچے بغیر خوش ہو جاتے ہیں کہ "منتقل کیے جانے والوں" کو تبدیلی سے پہلے کہاں رکھا گیا تھا۔ ۶۳۸۰ روپے سے ۶۳۹۰ روپے تک کنبے کی آمدنی میں دس روپے کا اضافہ تفریقی فیصدوں پر اثر انداز نہیں ہوتا البتہ ۶۳۹۵ روپے سے ۶۴۰۴ روپے تک اتنے ہی اضافے سے بہتر اعداد مرتب ہوتے ہیں جنھیں پروپیگنڈہ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

لیا گیا ہے وہ کئی لحاظ سے موزوں نہیں ہے۔ البتہ اس سے کچھ باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ تمام تر چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے عرصے (۸۵-۱۹۸۰ء) کے دوران فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد ایک کروڑ ۶۴ لاکھ ۲۰ ہزار تھی۔ سالانہ تعداد ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۲۷ لاکھ ۳۰ ہزار سے بڑھ کر ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۳۸ لاکھ ۴۰ ہزار ہو گئی۔ لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ کیا تمام تر سالانہ اعداد برس کے دوران فائدہ اُٹھانے والے افراد سے تعلق رکھتی ہے یا انہی افراد کو ایک سے زیادہ بار شامل کیا گیا ہے۔ یہ بھی واضح نہیں ہے کہ کیا ایک مستفید ہونے والے کی آمدنی میں اضافہ ایک برس کے لیے ہوا یا اضافہ کچھ عرصے تک رہا یا یہ اضافہ طویل عرصہ تک سالانہ سطح پر جاری رہا۔ یہ امر کہ فی کس سرمایہ کاری اوسطاً ۲۷۹۵ روپے سالانہ تھی۔ آمدنیوں میں کسی ٹھوس اضافے کا مظہر نہیں۔ اور کسی بھی صورت میں فائدہ اٹھانے والوں کی کل ایک کروڑ ۶ لاکھ تعداد خطِ افلاس کے نیچے رہنے والے ۲۷ کروڑ افراد کا نہایت حقیر حصہ تھی۔

عداد کے پُشت پر حقائق

رپورٹوں میں بتایا گیا ہے کہ منتخبہ بلاکوں میں فائدہ اٹھانے والوں کا تعلق غریبوں میں غریب ترین "محروموں" کے گروپ سے تھا۔ یہ وہی تھا جو ہونا چاہیے تھا لیکن یہ جان کر مایوسی ہوتی ہے کہ تعمیل کنندہ حکام نے جو اعداد فراہم کیے ہیں اُن کی تصدیق اس الگ "جائزہ" سے نہیں ہوتی جو دیہی ترقی کے محکمے کی طرف سے بطور نمونہ ۱۶۱۰۱ مستفید ہونے والے کنبوں کے بارے میں لیا گیا تھا۔ یہ منتخبہ نمونے ریاستوں میں متناسب طور پر تقسیم نہیں کیے گئے۔ نہ ہی آبادی کے مطابق اور نہ ہی افلاس کی حد کے مطابق۔ مغربی بنگال میں جہاں بھارت کی ۸ فیصد آبادی ہے صرف ۵۹۲ گھرانوں یعنی کُل ۱۶۱۰۱ گھرانوں کے ۶۸ر۳ فیصد کو لیا گیا۔ مدھیہ

> ان کی رپورٹوں میں "غریبوں" یعنی خطِ افلاس کے نیچے رہنے والوں کی تقسیم کرتے ہوئے انھیں چار چھوٹے گروپوں میں بانٹا جاتا ہے "انتہائی غریب ترین" جن کی سالانہ کنبہ جاتی آمدنی ایک اور ۲۲۶۵ روپے کے درمیان ہے۔ "نہایت نہایت غریب" جن کی کنبہ جاتی آمدنی ۳۵۰۱ روپے اور ۴۸۰۰ روپے کے درمیان ہے۔ اور "غریبوں کے درمیانے امیر ترین" جن کی آمدنی ۴۸۰۱ روپے اور ۶۴۰۰ روپے کے درمیان ہے۔

پردیش کی ۱۹،۷۵ ر کی زیادہ تعداد غالباً افلاس کی زیادہ وُسعت کے باعث حق بجانب تھی لیکن مرکزی منتظمہ علاقوں کی ۹۲۷ کی تعداد جو کُل آبادی کا محض ۴۳ر۱ فیصد تھی۔ تعجب خیز حد تک زیادہ تھی۔

یہ جاننا باعثِ حوصلہ افزائی تھا کہ فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد ۸۰ فیصد نے امداد اور قرضہ کو مطلوبہ اثاثہ جات خریدنے کے لیے کافی پایا اور کہ ۷۱ فیصد معاملوں میں تحقیقات کے بعد پائے گئے، اثاثہ جات جوں کے توں تھے۔ امداد اور قرضے میں تناسب عموماً ۱ اور ۲ تھا۔ مثال کے طور پر ۸۵-۱۹۸۴ء میں فی کس سرمایہ کاری ۲۷۹۵ روپے تھی جس میں امداد کا حصہ ۹۲۰ روپے اور قرضے کا حصہ ۱۸۷۵ روپے تھا۔ ۲۹ فیصد معاملوں میں اثاثہ جات پورے نہیں پائے گئے اس کی بڑی وجوہات مستفید ہونے والے کی موت یا بیماری، ناکافی آمدنی اور رکھ رکھاؤ کی بڑھی ہوئی لاگت وغیرہ تھیں۔ بیجوں اور فرٹیلائزر وغیرہ کے حصول اور مارکیٹنگ کی سہولیات ۸۵ فیصد معاملوں میں دستیاب تھیں لیکن یہ مستفیدگان کی سوجھ بوجھ پر مبنی ہے اور اس لیے اس کی احتیاط سے تاویل کرنا ہوگی۔"

سوالات اُس وقت اُٹھتے ہیں جب کوئی پیدا ہونے والی زائد آمدنی سے متعلق رپورٹ کو دیکھتا ہے۔ جس کی بنا پر زائد آمدنی ۲۶ فیصد معاملوں میں ۲۰۰۰ روپے سے زیادہ تھی۔ ۴۴ فیصد معاملوں میں ۱۰۰۱ روپے سے ۲۰۰۰ روپے تک تھی۔ ۱۵ فیصد معاملوں میں ۵۰۱ روپے سے ۱۰۰۰ روپے تک تھی اور ۱۱ فیصد معاملوں میں ۵۰۰ روپے سے کم تھی۔ ان فیصدوں سے ۷۰ تک اضافہ ہوتا ہے اس کے بعد رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ باقیماندہ ۲۴ فیصد معاملوں میں اثاثہ جات سے کوئی زائد آمدنی نہیں ہوئی۔ مغربی بنگال، تریپورہ اور گجرات میں (ایک سے ۷ فیصد معاملوں میں) اثاثہ جات سے کم فائدہ اٹھایا گیا اور بیشتر دوسری ریاستوں میں بہت ہی کم فائدہ اٹھایا گیا۔ یہ امر قابلِ فہم ہے کہ سکّم میں کوئی زائد آمدنی نہیں ہوئی لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ کیرل، پنجاب، راجستھان، ہریانہ اور مرکزی منتظمہ علاقوں میں ۳۰ سے ۴۰ فیصد تک

معاملے ایسے تھے جن میں اثاثہ جات سے مطلق فائدہ نہیں اُٹھایا گیا ـــــ یہ معلوم کرکے بھی مایوسی ہوئی کہ تامل ناڈو، مہاراشٹر اور کرناٹک

ساتھ تشویش کے معاملے" بتائے گئے ہیں ۹ فیصد معاملوں میں "غیر مستحق کنبوں" کو امداد دی گئی۔ اس مقصد کے لیے حد بندی کا خط ۴۸۰۰ روپے پر اس ہدایت کے ساتھ کھینچا گیا کہ جن کنبوں کی

تھا۔ ریکارڈ شدہ قیمت کے بارے میں فرق کا فیصد بیان نہیں کیا گیا لیکن کوئی بھی دیکھ سکتا ہے کہ سرمایہ کاری فی کنبہ ۳ ہزار روپے کے قریب تھی۔ یہاں بھی مختلف ریاستوں میں بڑے انحرافات پائے گئے۔ رپورٹ میں محض بتایا گیا ہے کہ یہ انحرافات

> مغربی بنگال، تریپورہ اور گجرات میں (ایک سے ۷ فیصد معاملوں میں) اثاثہ جات سے کم فائدہ اٹھایا گیا اور بیشتر دوسری ریاستوں میں تو بہت ہی کم فائدہ اٹھایا گیا۔ یہ امر قابلِ فہم ہے کہ سسٹم میں کوئی زائد آمدنی نہیں ہوئی لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ کیرل، راجستھان، ہریانہ اور مرکزی منتظمہ علاقوں میں ۳۰ سے ۴۰ فیصد تک معاملے ایسے تھے جن میں اثاثہ جات سے مطلق فائدہ نہیں اٹھایا گیا

ایسی ریاستوں میں شامل ہیں جہاں اثاثہ جات سے ۲۰ سے ۳۰ فیصد تک فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔

امداد کے نتیجے میں فیصد اضافہ تقریباً ۲۴ فیصد معاملوں میں ۲۵ فیصد سے کم تھا اور ۱۵ فیصد معاملوں میں ۱ فیصد سے زیادہ تھا۔ امداد کے بعد کی آمدنی امداد سے قبل کی آمدنی سے ۲۳ فیصد معاملوں میں ۲۵ اور ۵۰ فیصد کے درمیان بڑھی اور اتنے ہی فیصد معاملوں میں ۵۰ اور ۱۰ فیصد کے درمیان بڑھی۔ ۱۶ فیصد معاملوں میں کُل آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

یہاں بھی مختلف ریاستوں کے درمیان کھلا فرق پایا گیا۔ بدترین معاملے اڑیسہ، راجستھان، بہار، مرکزی منتظمہ علاقوں، مغربی بنگال اور مدھیہ پردیش میں پائے گئے۔ پیداواریت کی سرمایہ کاری سے متعلق اعداد اور امداد کے بعد کی آمدنی میں فیصد اضافہ سے متعلق اعداد میں کچھ فرق ہے غالباً اس لیے کہ اثاثہ جات کی آمدنی اور کُل آمدنی یکساں نہیں تھی

تقسیم کا معاملہ .. رپورٹ میں ایمانداری کے

آمدنی ۳۵ روپے تک ہے اُنھیں امداد پہلے دی جائے اور اس کے بعد اُن کنبوں کو دی جائے جن کی آمدنی ۲۵۰۱ روپے سے ۴۸۰۰ روپے کے درمیان ہے اس "جائزے" سے پتہ چلا کہ ۴۸۰۱ روپے اور ۶۴۰۰ روپے کے درمیان آمدنی والے جن غیر مستحق کنبوں کو امداد دی گئی اُن کا فیصد راجستھان، کیرل، میگھالیہ، ہریانہ اور پنجاب میں ۱۰ اور ۱۳ فیصد کے درمیان تھا۔ بہت سے معاملوں میں (جس کا سلسلہ ۷ فیصد تک ہے) جن کنبوں کو امداد دی گئی اُن میں بڑی تعداد اُن کی تھی جن کی آمدنی ۶۴ روپے سے زائد تھی۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ ایسا ناقص انتظام، ہدایات اور نگرانی یا مقامی دباؤ کے باعث ہوا۔

تشویش کا دوسرا معاملہ اثاثہ جات کے "ریکارڈ شدہ" اور "تشخیص شدہ" قیمتوں کے درمیان فرق تھا۔ یہ فرق ۳۳ فیصد معاملوں میں پایا گیا بعض معاملوں میں تو یہ فرق ایک ہزار روپے سے زائد کا

"بدعنوانیوں" اور غبن کے مظہر ہیں اور متعلق حکام کی طرف سے تحقیقات کی ضرورت ہے۔ چوں کہ اس کا ذکر محض خلاصہ میں کیا گیا ہے اور گوشواروں کے ساتھ ساتھ زیادہ مفصل بڑے متن میں نہیں کیا گیا اس لیے ممکن ہے کہ "متعلق حکام" کی طرف سے اسے نظرانداز کر دیا جائے گا۔ ۳۲ فیصد مستفید گان کے لیے کاروباری سرمایہ بینکوں کی طرف سے دستیاب نہیں کیا گیا جنھیں ایسے فنڈوں کی ضرورت تھی یہاں بھی رپورٹ میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ یہ ایک ایسا پہلو ہے جس پر بینکوں کو غور کرنا ہوگا۔"

مختلف ریاستوں میں بڑے پیمانے پر پائے جانے والے انحرافات سے اس امر کی ضرورت پر زور پڑتا ہے کہ ریاستی حکومتوں کو اس بارے میں مؤثر کارروائی کرنا چاہیے کہ پبلک سیکٹر کے کمرشل بینکوں، علاقائی دیہی بینکوں (جن میں ریاستی حکومتوں کی کچھ آواز ہوتی ہے) اور کوآپریٹو اداروں کی پیش کاری کس حد تک ہوتی چاہیے۔

تشویش کے دوسرے معاملے تھے۔ قائم شدہ اثاثہ جات کے بیمہ میں تساہل، ترسیلی سہولیات میں ناکامی، سرکاری اداروں کی طرف سے دیکھ بھال، رکھ رکھاؤ اور مرمت کی سہولیات کی فراہمی میں بڑے پیمانے پر

ناکامی۔ اثاثہ جات کے صحیح حالت میں نہ پائے جانے کی ایک بڑی وجہ رکھ رکھاؤ پر آنے والی بھاری لاگت بیان کی گئی ہے۔ لیکن ایک زیادہ پریشان کن سبب یہ بھی پایا گیا ہے کہ مرمت اور رکھ رکھاؤ کی سہولیات قطعاً دستیاب نہیں تھیں۔

دیہی ترقی کے محکمہ کی سالانہ رپورٹ (۸۷-۱۹۸۶ء) میں بعض معاملوں میں جنوری ۱۹۸۷ء تک اعداد مہیا کئے گئے ہیں لیکن اس میں جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ ماضی کے رجحانات سے کسی خاص قطع تعلق کا اظہار نہیں کرتی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پروگراموں کے معائنے اور ساتھ ساتھ جائزہ لینے سے متعلق ایک کافی جامع اسکیم مرتب کی گئی ہے۔ لیکن کوئی بھی شخص جو کچھ جاننا چاہتا ہے وہ ہے تمام تر مسئلہ کے مقابلے میں انسداد افلاس کے پروگرام کی کارکردگی۔ جن رپورٹوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں شہری علاقوں میں انسداد افلاس کے پروگرام کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں دی گئی۔

ہماری معلومات میں نہایت تشویشناک کمی یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ خطِ افلاس کے نیچے جو ضمنی گروپ ہیں اُن میں سے ہر ایک

> ہماری معلومات میں نہایت تشویشناک کمی یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ خطِ افلاس کے نیچے جو ضمنی گروپ ہیں اُن میں سے ہر ایک میں کنبوں یا افراد کی کُل کتنی تعداد ہے۔ یہ کمی۔ حد یا گروپ کے لحاظ سے بھی۔ ملک میں آمدنی اور دولت کی تقسیم سے متعلق ہماری معلومات میں واضح کمی ہے.

میں کنبوں یا افراد کی کل کتنی تعداد ہے۔ یہ کمی۔ حد یا گروپ کے لحاظ سے بھی۔ ملک میں آمدنی اور دولت کی تقسیم سے متعلق ہماری معلومات میں واضح کمی ہے حتیٰ کہ آج عالمی بینک کو اپنی "عالمی ترقیاتی رپورٹ" میں ۷۶-۱۹۷۵ء کے لیے تیار کئے گئے نامکمل تخمینوں کا سہارا لینا پڑا۔ جب کہ بھارتی گھرانوں میں سب سے نچلی سطح کے ۲۰ فیصد کی آمدنی کُل گھرانوں کی آمدنی کا ۷ فیصد تھی، دوسرے گروپ کی ۹٫۲ فیصد، تیسرے گروپ کی ۱۳٫۹ فیصد اور چوتھے گروپ کی ۲۰٫۵ فیصد تھی اور سب سے اوپر کے گروپ کی ۴۹٫۵ فیصد تھی۔ اعلیٰ ترین گروپ کا دولت کا حصہ ۳۳٫۶ فیصد تھا۔

بلاشبہ بیشتر ملکوں کے پاس سابقہ برسوں کے تخمینے ہیں لیکن سری لنکا ۸۱-۱۹۸۰ء کے اعداد فراہم کرسکتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگرچہ ہم نے بچوں کی شرح اموات، پیدائش کے وقت متوقع عمر اور ناخواندگی کے بارے میں اعداد کے اندازے مرتب کئے ہیں تاہم ہم آمدنی کے مختلف زمروں کے بارے میں ان شرحوں کو نہیں جانتے۔ اگر ۱۹۸۵ء میں بھارت میں بچوں کی شرح اموات ۸۹ فی ہزار تھی تو کسی بھی شخص کو یہ جاننے کی خواہش ہوگی کہ آمدنی کے ادنیٰ ترین گروپوں کی آمدنی کی شرحیں کیا تھیں؟ بھارت کی متوقع زندگی (جو ۱۹۸۵ء میں پیدائش کے وقت ۵۷ برس تھی)، سب سے نچلے گروپوں میں کتنی بڑھی ہے؟ یہ کچھ ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات ٹھوس معانی میں بھارتی افلاس کی نوعیت اور اُس کی خرابیوں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن جب ہمارے پاس تازہ ترین اندازوں کی رپورٹ بھی نہیں ہے، بیماری کی ایک ایک تہہ کے کمپیوٹری ایکسرے کا مطالعہ کرنا شاید بہت بڑی بات ہوگی۔ اور جب تک ہمارے پاس معلومات نہیں ہوں گی تب تک ملک میں افلاس کی حقیقی تشخیص نہیں ہو سکے گی۔



ہیتین بھایا

پیداواری اضافہ اور انصاف

اپنی غریبی کو سمجھنے کی ایک کوشش

اس مضمون کے مصنف جناب ہیتین بھایا پلاننگ کمیشن کے ممبر ہیں، ماہر اقتصادیات اور مفکر ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ غریبی کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ ہمارے ملک میں ترقی کی جہت میں جو کوششیں کی جا رہی ہیں وہ ان کی خوبیوں اور کمیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ متعدد ماہرین اقتصادیات نے "خط غریبی" کے تصور کو رد کیا ہے مگر ہیتین بھایا صاحب کا خیال ہے کہ یہ تصور منطقی اعتبار سے درست ہے کیونکہ اس کے ذریعہ ہم غریبی کے مسئلہ کے حجم کا اندازہ لگاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کہیں نہ کہیں سے اس مسئلہ کے بارے میں ہم کو آغاز کار کرنا ہوگا۔ انھوں نے غریبی کی جڑیں ہمارے صدیوں پرانے سماجی، اقتصادی ڈھانچے میں تلاش کی ہیں۔ یہ ڈھانچہ طاقت اور محنت کی تقسیم پر مبنی ہے۔ وہ صاف لفظوں میں بتلاتے ہیں کہ غیر غریب طبقہ میں غریب طبقہ کے لیے تعلق خاطر تو پایا جاتا ہے مگر بس مجرم ضمیری اور پریشانی خاطر کی حد تک۔ ان کا دعویٰ ہے کہ قدرتی وسائل کے منصوبہ بند استعمال و انتظام اور انسانی وسائل کی باقاعدہ ترقی کے ذریعہ بدترین غریبی کو دور کیا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ عالمی امن بیحد ضروری ہے کیونکہ غریبی ختم کرنے کے پروگرام اور نیوکلیائی میزائل بنانے کے پروگرام ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔

پچھلی دو صدیوں کے نوآبادیاتی دورِ حکومت میں ہمارے ملک میں ترقی کی جانب سے جو روگردانی کی گئی ہے غریبی اسی کا شاخسانہ ہے۔ غریبی آزاد ہندوستان پر ایک بدنما داغ ہے۔ یہ ایک ایسا چیلنج ہے جس کا سامنا محض مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو ہی نہیں کرنا ہے بلکہ ہر ہندوستانی کو کرنا ہے۔ غریبی کی پیمائش کے بہت سے پیمانے ہیں مثلاً آبادی کے لحاظ سے قومی آمدنی، یا فی فرد کلوری کی کھپت یا فی فرد توانائی یا فولاد کا استعمال۔ بہرحال ان تمام بنیادوں پر ہندوستان غریب ہے۔ مادی طور پر ہم یقیناً غریب ہیں۔ اول تو جہاں تک بنیادی ضروریات کا سوال ہے علاوہ اناج کے باقی ہر چیز ہماری کثیر آبادی کے لیے ناکافی ہے دوم یہ کہ جو کچھ موجود بھی ہے وہ کروڑوں لوگوں کی پہنچ سے باہر ہے۔ خاص طور پر دیہات کے لوگوں کی پہنچ سے۔

اول کا تعلق قدرتی وسائل کا بھرپور استعمال نہ ہونے اور کم پیداوار سے ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد دُنیا کے بعض علاقوں میں اتنی تیز رفتار ترقی ہوئی کہ زبردست عدم توازن پیدا ہوا۔ پچھلے چند دہوں میں یہاں جو منصوبہ بند ترقی کی کوششیں کی گئی ہیں

وہ اس کمی کو دور کرنے کی سمت میں ہوئی ہیں۔
دوسرے کا تعلق غیر مساوی تقسیم کے ڈھانچے
سے ہے کہ جس کے ذیل میں آمدنی، سامانِ سہولیات
اور معاش کے مواقع آتے ہیں۔
اوّل کے چند پلان پورے کرنے کے بعد
جو تجربہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اتنی
بڑی مقدار میں ترقی
نہیں ہو پائی کہ
اس کے

قیام کتنا ہے۔

سیاست میں کینسر

جو سوال ہر شخص کو پریشان کر رہا ہے وہ
یہ ہے کہ آیا بیماری نوعیت کی غریبی دور کرنے کے
لیے کیا ایسی منصوبہ بند کوششیں بارآور ہو سکتی
ہیں۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے
لیے ہمارے لیے یہ ضروری ہوگا
کہ غریبی سے آگے سیاست
کے بدن میں پرورش
پاتے کینسر میں

ڈھانچہ اور سیاسی نظام پر ہے۔ عمومی طور پر ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ پیداواری اضافہ ایک مقابلہ بازی
اور منڈی سے جڑے ہوئے نظام میں زیادہ تیزی
سے ہوتا ہے مگر وہاں عدم مساوات میں بھی اضافہ ہوتا
رہتا ہے۔ دوسری جانب مکمل سرکاری کنٹرول سے
ایک نسبتاً مساویانہ تقسیم تو عمل میں آجاتی ہے لیکن
پیداواری اضافہ پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔
ذاتی طمع عوامی مفاد سے بڑی محرک ثابت ہوتی
اب ان دو طریقوں میں سے کون سا طریقہ اپنایا جائے
یا کیا دونوں کو ملا جُلا کر اپنانا ممکن ہے؟ ہمارے
سامنے طرح طرح کی مثالیں اور تجربے تو ہیں لیکن اس
گومگو کا صاف جواب نہیں ہے۔
بہرحال جدید ترقی کا اگر ہم تاریخی جائزہ لیں
تو دیکھتے ہیں کہ ایک ملک کی ترقی میں دوسرا
ملک قربانی کا بکرا بن گیا ہے
اور آبادی کے بعض حصوں
کی قربانی لے کر بعض حصوں نے ترقی حاصل کی ہے۔
یورپ اور مغرب کی قومی ریاستوں نے آزادی،

غریبی عدم مساوات کا پیدا کردہ ایک مظہر ہے۔ کیا عدم مساوات ترقی کا لازمی نتیجہ ہے؟ کیا پیداواری اضافہ اور منصفانہ تقسیم ایک دوسرے کی ضد ہیں؟ شاید یہ دونوں الگ الگ عمل ہیں جن کا دار و مدار مروّجہ سماجی، اقتصادی طاقت کے ڈھانچہ اور سیاسی نظام پر ہے۔

یورپ اور مغرب کی قومی ریاستوں نے آزادی، مساوات اور بھائی چارہ کے جھنڈے اپنے اپنے ملک میں گاڑ دیے۔ گو ان میں سے بیشتر ممالک نے دُنیا کے باقی تمام ایسے ممالک کو جو زیادہ مستعد نہ تھے۔ غلامی، عدم مساوات اور غریبی میں جکڑ دیا۔

فوائد از خود نیچے کی سطح کے
کروڑوں لوگوں تک پہنچ جاتے اس لیے چھٹے
پلان سے غریبی دور کرنے کی براہِ راست کوششوں
اور ان پر مبنی پروگراموں کا آغاز ہوا ہے۔ یہ
پروگرام کسی نہ کسی شکل میں حالیہ پلان میں بھی
جاری ہیں۔ ان پروگراموں کا وقتاً فوقتاً جائزہ
لیا جاتا ہے۔ اس پر تقریباً اتفاق رائے ہے کہ
بعض کوتاہیوں کے باوجود ان پروگراموں سے
غرباء کو کافی فائدہ پہونچا ہے۔ بحث اس بات
پر ہے کہ جو بہتری غرباء کو حاصل ہوتی ہے اس کو

اس کے اسباب تلاش کریں، جس
طرح بدن کے ایک حصّہ کی بیماری کے اثرات دوسرے
حصّوں کو متاثر کرتے ہیں اسی طرح اقتصادی مسئلہ
کا حل سیاست کی درستی میں تلاش کرنا ہوگا۔
غریبی عدم مساوات کا پیدا کردہ ایک مظہر
ہے۔ کیا عدم مساوات ترقی کا لازمی نتیجہ ہے؟ کیا
پیداواری اضافہ اور منصفانہ تقسیم ایک دوسرے
کی ضد ہیں؟ شاید یہ دونوں الگ الگ عمل ہیں۔
جن کا دار و مدار مروجہ سماجی، اقتصادی طاقت کے

مساوات اور بھائی چارہ کے جھنڈے اپنے اپنے
ملک میں گاڑ دیے۔ گو ان میں سے بیشتر ممالک نے
دنیا کے باقی تمام ایسے ممالک کو جو کہ زیادہ مستعد
نہ تھے۔ غلامی، عدم مساوات اور غریبی میں جکڑ دیا۔
اور اب ہماری دنیا بالکل واضح طور پر تین خانوں میں
بٹ چکی ہے یعنی ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور غیر ترقی یافتہ۔
دو سو سالہ نوآبادیاتی محکومی کے بعد جمہوریہ ہندوستان
خانے میں اپنے آپ کو پاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

یکم تا ۱۵ ... [illegible]

خصوصی شمارہ یوجنا، نئی دہلی

ترقی کرنے کے لیے ضروری عناصر یعنی خام مواد، ٹیکنالوجی، سرمایہ اور منڈی میں داخلہ اور ان چیزوں کے حصول کے لیے ان پر اختیار چاہیئے اور اختیار کے لیے طاقت۔

اب چاہے یہ ریاست کی طاقت ہو یا منڈی پر قبضہ کی طاقت ہو۔ ترقی کے پھل وہیں پہنچیں گے جہاں یہ طاقت ہوگی۔ یہ بین الاقوامی طور پر بھی اتنا ہی صحیح ہے جتنا گھریلو معیشت کے لیے۔ یہ کوئی آسان جدوجہد نہیں ہے کیونکہ جب ایک بار یہ طاقت کہیں پہنچ جاتی ہے تو وہیں جم جاتی ہے اور اگر اس کو اکھاڑنے کی کوشش کی جائے تو زبردست مزاحمت کرتی ہے۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جس پر اس وقت بھی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے کہ جب محض ملک گیر سطح پر ترقی کے پھل از سرِ نو تقسیم کرنے کی بات کی جا رہی ہو۔

جسامت کی نشاندہی

غریبی دور کرنے کے لیے کسی بھی منصوبہ بند حملہ سے پہلے ایک ضروری قدم یہ اٹھانا ہوگا کہ آپ اس غریبی کے پھیلاؤ اور شدت کا نقشہ تیار کریں یعنی نقطۂ آغاز یہ پیمائش ہونی چاہیئے کہ غریب کتنا غریب ہے۔ خطِ غریبی کا تصور نشان کی سوئی کا سا ہے جس سے حجم اور جسامت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے ابعاد اور رجحانات کا نشان ملتا ہے۔ اس سے موٹے طور پر ہی سہی مگر فوراً مطلوبہ وسائل کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ ماہرینِ اقتصادیات بھلے ہی اس تصور کے جواز اور اس کے معلوم کرنے کے طریقہ کار پر حجت کریں دوسرے لوگوں کو چاہیئے کہ نشان کی سوئی کے طور پر اس کا استعمال کرتے رہیں۔ بہرحال یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ کسی بھی طریقہ سے طے کئے گئے ایک خطِ غریبی سے نیچے جو تعداد ہے وہ کروڑوں میں ہے اور ہمارے سماجی، اقتصادی مسئلہ کی جڑ بنیاد ہے اور شاید سیاسی مسائل کی بھی۔

(اقتباس: ہم بیحد غریب سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے ہیں ان کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ان پر توجہ ماہر شماریات کرے گا یا شاعر۔ ہاورڈس اینڈ ای۔ ایم۔ فورسٹر)۔

خطِ غریبی کے اندر پستی کے مختلف درجات اور گہرائیاں ہیں۔ IRDP کے کارکنان نے خطِ غریبی کے نیچے اپنے آپ ہی مزید تقسیمیں بنا رکھی ہیں۔ مثال کے طور پر خستہ حال (۱ تا ۲۲۶۵ روپے)، بیحد غریب (۲۲۶۶ تا ۳۵۰۰ روپے) بہت غریب (۳۵۰۱ تا ۴۸۰۰ روپے) اور غریب (۴۸۰۱ تا ۶۴۰۰ روپے)، یہ سالانہ آمدنی کے اندازاً حساب سے ہیں۔

اگر خطِ غریبی کو مطلق بھی مان لیا جائے یعنی جہاں محض جسم اور روح کا رشتہ برقرار ہو تب بھی اس خط کے اوپر دور تک اضافی غریبیاں رہیں گی۔ مثال کے طور پر بہت سے ایسے لوگ بھی غریب کہے جائیں گے جو مکمل کلوریز والی متوازن غذا کا خرچ نہیں اٹھا سکتے، وہ لوگ جو کہ مکان نہیں بنا سکتے یا کرایہ پر رہائش نہیں حاصل کر سکتے، وہ لوگ جو کہ غریبی کے باعث دوائیں نہیں خرید سکتے یا ڈاکٹر کا علاج نہیں کر سکتے۔ جو اتنے غریب ہیں کہ بنک سے قرض نہیں حاصل کر سکتے، اتنے غریب ہیں کہ اسکول یا کالج کی تعلیم کا خرچ نہیں اٹھا سکتے، اتنے غریب ہیں کہ عدالت کے ذریعہ انصاف نہیں حاصل کر سکتے۔ اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ خطِ غریبی کے اوپر اور نیچے غریبی کے کئی ابعاد ہیں، کیا قومی دولت کی ازسرِنو تقسیم ممکن ہے؟

ایک جائز سوال یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر ہندوستان کی کل قومی آمدنی کو کیوبا اور چین کے مانند اس کی آبادی میں مساوی تقسیم کر دیا جائے تو کیا اس سے غریبی کم ہو جائے گی۔ لیکن ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ان ممالک میں مساویانہ تقسیم اسی وقت ممکن ہوئی ہے کہ جب پہلے ان کے سماجی اور سیاسی طاقت کے ڈھانچہ میں انقلابی تبدیلی آئی۔ مگر جب آزادی کے بعد ہندوستانی عوام نے پارلیمانی جمہوریت اور مخلوط معیشت کا راستہ لینے

> خطِ غریبی کا تصور نشان کی سوئی کے مانند ہے جس سے حجم اور جسامت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے ابعاد اور رجحانات کا نشان ملتا ہے۔ اس سے موٹے طور پر ہی سہی مگر فوراً مطلوبہ وسائل کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ ماہرینِ اقتصادیات بھلے ہی اس تصور کے جواز اور اس کے معلوم کرنے کے طریقہ کار پر حجت کریں، دوسرے لوگوں کو چاہیئے کہ نشان کی سوئی کے طور پر اس کا استعمال کرتے رہیں۔

لیے منتخب کر لیا تو مساویانہ تقسیم کا دروازہ از خود بند ہو گیا۔ اب سوال محض یہ رہ جاتا ہے کہ آیا موجودہ سیاسی نظام میں کہ جو ہمارا اپنا منتخب کیا ہوا ہے، اس کی حدود کے اندر قومی دولت کی از سرِ نو تقسیم زیادہ موثر ڈھنگ سے ممکن ہے یا نہیں۔

آیئے محض ایک مثال لیتے ہیں یعنی دیہی اثاثوں کی از سرِ نو تقسیم، ہماری آبادی کا ۳۰ فی صد حصہ کُل ملا کر محض ۴ تا ۵ فی صد دیہی اثاثہ کا مالک ہے محض ۸۰ لاکھ ایکڑ زمین کو فاضل قرار دیا گیا ہے اس میں سے ۶۰ لاکھ ایکڑ کو قبضہ میں لے لیا گیا ہے اور ۴۷ لاکھ کی از سرِ نو تقسیم کر دی گئی ہے۔ لیکن نو تقسیم شدہ اثاثوں کے استعمال کا دار و مدار زمین کی حالت پر ہے (بعض بآسانی قابلِ کاشت نہیں ہیں) پھر بیج، کھاد اور قرض کی فراہمی پر بھی انحصار ہے۔ محض از سرِ نو تقسیم سے ہی مسئلہ حل نہیں ہو جاتا اگر تمام قابلِ کاشت زمین دیہی خاندانوں میں مساوی تقسیم کر دی جائے تو کوئی بھی خاندان انفرادی طور پر خود کفیل نہیں ہو گا۔ حالانکہ زمین کی پیداوار بڑھی ہے مگر اوسط ملکیت فی خاندان گھٹی ہے جس سے چھوٹا کاشتکار حاشیائی بنا ہے اور کھیت مزدور میں مدغم ہوا ہے۔ ایسا خاص طور پر مشرقی علاقوں میں ہوا ہے۔ جن علاقوں میں سبز انقلاب سے پہلے چک بندی ہو گئی تھی وہاں ایسا نہیں ہوا۔ کم سے کم اُجرت کا نفاذ بھی تمام علاقوں اور پیشوں میں نہیں ہو سکا ہے اور یہ عملی طور پر ممکن بھی نہیں ہے کیوں کہ کھیت مزدور ابھی تک ایک غیر منظم طبقہ ہے۔ اسی طرح پانی اور بجلی کی حصہ بانٹ کا مسئلہ محض صوبوں

> حالانکہ زمین کی پیداوار بڑھی ہے مگر اوسط ملکیت فی خاندان گھٹی ہے جس سے چھوٹا کاشتکار حاشیائی بنا ہے اور کھیت مزدور میں مدغم ہوا ہے۔ ایسا خاص طور پر مشرقی علاقوں میں ہوا ہے۔ جن علاقوں میں سبز انقلاب سے پہلے چک بندی ہو گئی تھی وہاں ایسا نہیں ہوا۔

کے درمیان ہی فساد کا سبب نہیں ہے، بلکہ انفرادی کاشتکاروں کی سطح پر بھی ایسا ہی ہے۔ ان معاملوں سے نپٹنا گویا اپنے سماجی، اقتصادی ڈھانچہ کی جڑ پر ہی وار کرنا ہے۔ یہ حقیقت سے بعید ہے کہ وہ حکومتیں کہ جن کو بار بار الیکشن لڑنا پڑتا ہے وہ اس طرح کا کوئی خطرہ مول لیں گی۔

آمدنی کی تقسیم کا ایسا طریقہ کہ جس کو قیام ہو یہ بھی ہے کہ ملازمت کے زیادہ مواقع پیدا کیے جائیں۔ کسی بھی نوعیت کی ملازمت کی براہِ راست منصوبہ بندی بظاہر نا قابلِ عمل ہی دکھائی دیتی ہے کیونکہ تمام زراعت اور بیشتر صنعت پرائیویٹ ہاتھوں میں ہے۔ ہماری معیشت میں اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ماکاروں کو مخصوص سیکٹروں یا حکموں پر بھیجا جا سکے۔ یہاں تک کہ (HLEGP) جیسے پروگراموں پر بھی حدود میں رہ کر ہی عمل کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے کہ سرکاری سیکٹر کی ملازمتوں میں زبردست اژدہام ہے لیکن بحث کا موضوع یہ ہے کہ آیا ان کثیر ملازمتوں سے کیا واقعی قابلِ لحاظ پیداوار کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اقتصادی لحاظ سے مردم شماریوں کے ذریعہ سب سے نیچے کی سطح پر ملازمت کی اصل تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ جب تک مرکزیت کو ختم کر کے منصوبہ بندی بلاک اور گاؤں کی سطح پر نہیں آ جاتی تب تک عملی امکانات کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ اس ضمن میں بنیادی اعداد و شمار پر منحصر تحقیق کم و بیش نہ ہونے کے برابر ہے۔

حقیقت کا سامنا کیا جائے

وسائل پر اختیار رکھنے والوں اور ترقی کے پھل تقسیم کرنے والوں میں آپس کی ملی بھگت ہے اور غریبی کے تئیں جو امیروں کا رویّہ ہے یہ سب بین الاقوامی سطح پر بالکل عیاں ہے۔ لیکن بڑی مشکل اور شرمناک بات یہ ہے کہ ملکی سطح پر بھی بنیادی معاملہ یہی ہے بہرحال حقیقت کا تو سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ ہمارے سماجی، اقتصادی ڈھانچہ کی جڑیں ذات پات کے نظام میں بہت گہرائی تک پیوست ہیں اور یہ نظام طاقت اور محنت کی تقسیم پر دار و مدار رکھتا ہے۔ علم اور تعلیم پر پورا قبضہ سماج کے اعلیٰ ترین طبقہ کا تھا، دوسرے نمبر پر جو طبقہ آتا تھا وہ اسلحہ اور انتظامیہ کی طاقت پر اختیارِ کلی رکھتا تھا، تجارت کے ذریعہ روپیہ کی طاقت کو اپنے قابو میں رکھنے والا طبقہ تیسرے درجہ پر آتا تھا اور باقی تمام تھے لکڑی کاٹنے اور پانی کھینچنے والے غریب غربا، لیکن اپنی حالت پر مطمئن۔ ایک بڑی گٹھی ہوئی مضبوط بنیاد جس پر پوری عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ اس عمارت پر مذہبی اور سماجی ارشادات کا بڑا موٹا سمنٹ چڑھایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کرم، آواگون اور مقدر پر انحصار کے بظاہر فلسفیانہ نظریات نے اس

[illegible] ل سے محفوظ رکھا۔ [illegible] توہم پرستی اور [illegible] ہندوستان اور [illegible] پر چلتی ہوئی تبدیلی کی آندھیاں [illegible] صدیوں تک [illegible] تھیں۔ اس کے بعد سے جاگیردارانہ نظام دنیا کے دوسرے علاقوں میں بدل گئے۔ مگر یہ جوں کا توں ہی رہا۔ یہاں تک کہ بعد میں اسلام اور عیسائیت اختیار کرنے پر بھی قدیم ہندوستانی سماجی، اقتصادی ڈھانچہ میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ سمرسٹ ماہم گو اس برہمن عیسائی کی اصطلاح سن کر بھلے ہی اچنبھے میں پڑ گیا ہو مگر کسی ہندوستانی کے لیے یہ ہرگز تعجب کی بات نہیں ہے۔

یہ بات اہمیت سے خالی نہیں ہے کہ ہمارے سماج میں غریب طبقہ اور ذات پات کے نظام کا سب سے نچلی سطح کا طبقہ ایک ہی ہیں۔ آپ ان کی درجہ بندی جیسے دل چاہے کر لیجئے۔ مثلاً درج فہرست یا پسماندہ فرقے، سماج کے اقتصادی طور پر کمزور حصے، غریب، بہت غریب، بیحد غریب یا قطعی خستہ حال۔ ان الگ الگ ناموں سے مراد جو لوگ ہیں وہ ایک ہیں۔

پالیسی کے بنانے میں اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ اپنے چاروں طرف کی غریبی کو خوشحال کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خوشحال غریبی کو پہچانتے تو ہیں اس کو سمجھتے بھی ہیں اور اس سے تعلق خاطر بھی رکھتے ہیں لیکن موثر عمل کے نام پر ٹائیں ٹائیں

یعنی اس مجرم ضمیری اور انھیں محسوس کرکے [illegible] غریبوں کو بہت [illegible] کے خطرہ کہا جاتا ہے [illegible] پہلے ارسطو نے کہا تھا "جب درمیانہ طبقہ نہ ہو اور غریبوں کی تعداد بہت بڑھ جائے تب مصیبتیں کھڑی ہوتی ہیں اور حکومت ختم ہو جاتی ہے۔"

> یہاں تک کہ بعد میں اسلام اور عیسائیت اختیار کرنے پر بھی قدیم ہندوستانی سماجی، اقتصادی ڈھانچہ میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ سمرسٹ ماہم گو اس برہمن عیسائی کی اصطلاح سن کر بھلے ہی اچنبھے میں پڑ گیا ہو مگر کسی ہندوستانی کے لیے یہ ہرگز تعجب کی بات نہیں ہے۔

آج ہمارے سماج میں درمیانہ طبقہ کافی لمبا چوڑا ہے اور وہ اصلاحوں کے حق میں ہیں تبدیلی کے نہیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں از سرِ نو تقسیم ان کی موجودہ مراعات کو کم نہ کر دے۔ اور اکثریت جس غریبی کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے کہیں ان کو بھی اس کا ذائقہ نہ چکھنا پڑ جائے۔ یہ تمام اس لیے ممکن ہو سکا ہے چونکہ خوشحال گو کہ ایک چھوٹی سی اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں، مگر گنتی کے لحاظ سے ان کی تعداد کافی ہے اور یہ لوگ شہری علاقوں میں جمع ہیں۔ ان علاقوں میں ہی رسل و رسائل، صحت کی پرداخت، حصولِ تعلیم، سینما، تھیٹر اور ملازمت کے مواقع کی سہولیات مہیا ہیں۔

اس دو ساختہ کو ہی بعض نے "دو ہندوستان" کا نام دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شہری ہندوستان کے بہت سے نیک نہاد لوگ اور تنظیمیں

[illegible] ہندوستان [illegible] وہ [illegible] اور الگ [illegible] محض چند [illegible]۔ ٹالسٹائی نے ایک جگہ لکھا تھا "میں پیر تسمہ پا کے مانند ایک آدمی کے کاندھے پر چڑھا بیٹھا ہوں، اس کو کوچتا ہوں کہ مجھ کو اٹھائے پھرے پھر بھی اس آدمی کے لیے رنجیدہ ہوتا ہوں اور اس کا بوجھ ہر طریقہ سے ہلکا کرنے کی سوچتا ہوں سوائے اس کے کہ کاندھے سے اتر آؤں"۔ کئی دہائیوں کے بعد آلڈس ہکسلے نے اس بات کو لاگ لپیٹ کے بغیر اس طرح کہا "عسکری کے ساتھ آزادی قول محال ہے، بھوکی ننگی اکثریت پر ہمیشہ پیٹ بھری اقلیت کی ہی حکومت رہے گی۔"

عدم مساواتوں کا پس منظر

موجودہ ہندوستان میں تمام علاقے مساوی ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ کوئی علاقہ بیحد ترقی یافتہ ہے کوئی بالکل پسماندہ۔ یہی وہ صورتِ حال ہے جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہاں جڑیں پکڑی تھیں۔ اور پورے ہندوستان پر قابض ہوئی تھی۔ مشرقی علاقہ آج پھر ویسی ہی پسماندگی کا شکار ہے جس میں کارنوالس کی نوآبادی کو قیام مل گیا تھا۔ اگر اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو عدم مساوات کم ہونے کی بجائے بڑھتی جائے گی۔

خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمارا آئین بنانے والوں کو اس حقیقت کا شعور تھا اس لیے انھوں نے سوشلزم اور مساوات سے ہمکنار جمہوریہ کو اپنی منزل بنایا تھا۔ منزلِ مقصود بالکل واضح تھی مگر

[illegible] بنیادی حقوق میں شامل ہے مگر [illegible] کا حق وہاں نہیں ہے۔ اس [illegible] سمجھ میں آتی ہے۔ جہاں مخصوص مقاصد کی نشاندہی کی گئی تھی وہاں ریاست کے لیے رہنما اصول مقرر کیے گئے۔ بہرحال ان باریکیوں کا تعلق تو دانشوروں، قانون سازوں، عدلیہ اور حکومت سے ہے کہ وہ بال کی کھال نکالتے رہیں مگر غربا جو بہت بڑی اکثریت میں ہیں۔ وہ پیداوار اور اس کی تقسیم کے نظاموں سے لاتعلق رہ گئے چونکہ جو بیروزگار ہیں یا لیاقت اور ضرورت سے بہت کم روزگار کے حامل ہیں ان کی قوت خرید صفر ہے یا بہت کم۔ نوبت یہ ہے کہ قانون کی بندوق بھی ان کے خلاف تنی ہوئی ہے۔ غریب کے پاس لے دے کے بس ووٹ کی طاقت ہے

ہے کچھ مانع نہیں ہوگا۔ عام معیار زندگی بلند کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ قومی دولت میں لگاتار اضافہ ہو، ٹیکنالوجی بہتر سے بہتر ہونی چاہیئے اور پیداوار برابر بڑھے۔ محض ان عوامل سے ہی ترقی پذیر ممالک یا صنعتی دوڑ میں بعد کے شریک ممالک کی نجات ہے۔ ان ممالک کی بات علیحدہ ہے کہ جنھوں نے کئی صدی حکومت کر کے یا نوآبادیاں بنا کر بڑی مقدار میں سرمایہ جمع کیا ہے ہماری کوششیں ہمارے قومی وسائل پر کافی بار ڈال سکتی

جنگ عظیم [illegible] ختم ہو گیا [illegible] اس کے لیے شروعات کرنے کی ضرورت ہے یہ ایک طویل جدوجہد کا پیش خیمہ ہوگا۔ کون جانے عالمی اُفق پر کوئی نیا اقتصادی نظام نمودار ہو جائے۔ فی الحال شمال و جنوب میں مکالمہ تو چل رہا ہے مگر یہ بے نتیجہ زیادہ ہے۔ یہ تو ظاہر بات ہے کہ جب ترقی یافتہ ممالک کی اپنی منڈیوں میں مزید کھپت کی گنجائش نہیں رہے گی تو پیداواری اضافہ کی شرح ترقی پذیر ممالک کی منڈیوں کے بل پر ہی قائم رکھی جا سکتی ہے۔

> صاف بات یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک کی غریبی ختم کرنے کے لیے عالمی امن اور تخفیف اسلحہ ضروری شرائط ہیں مگر محض ان سے بھی پورا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ مگر یہ طے ہے کہ نیوکلیائی میزائل بنتے رہیں گے تو غریبی کے خاتمہ کی کوئی صورت نہ نکلے گی۔

اپنی غریبی کے خدوخال دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کم سے کم بدترین غریبی دور کرنے کے چند مگر واضح طریقے ہمارے پاس ہیں۔

اپنے قدرتی وسائل زمین، پانی، جنگلات اور معدنیات کا منصوبہ بند استعمال اور انسانی وسائل کی نشوونما سو فیصد خواندگی، تربیت، صحت کی پرداخت اور ملازمت کے مواقع مہیا کر کے کی جائے۔ رسل و رسائل، نقل و حمل اور توانائی کے ذرائع کی تجدید کاری اور توسیع کر کے بنیادی ڈھانچہ کو توانا اور وسیع بنایا جائے۔ مراد یہ ہے کہ غریبی سے اگر چھٹکارا پانا ہے تو محولہ بالا کام آنے والے کئی دہوں تک ترقی کے تمام منصوبوں کا دل بنے رہیں۔ غریبی کو واقعی دور کرنا ہے تو اس شرط کی پابندی ضروری ہے۔ فی کس آمدنی کا حساب لگاتے رہنے

ہیں لیکن اس سے ہمارا قومی ارادہ کمزور نہیں پڑنا چاہیئے۔ ہماری معیشت اب ایسی مضبوط بن چکی ہے کہ بہت سے بار اٹھا سکتی ہے۔

مساویانہ تقسیم کے سوچ بچار میں ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ آبادی میں اس طور اضافہ ہو رہا ہے کہ زمین اور دوسرے قدرتی وسائل پر تو بوجھ بڑھ ہی رہا ہے مگر ملازمتوں پر بھی دباؤ بڑھتا جاتا ہے۔ بہتری کے موثر اقدامات کی تلاش جاری ہے مگر غریبی اور بے خبری کو کم کرنے کے لیے آبادی کو قابو میں رکھنا ضروری ہے چاہے جدید طب کی مدد لینا پڑے۔

غریبی دُور کرنے کے مسئلہ پر آخر میں ہم آتے ہیں عالمی معیشت پر ضروریاتِ زندگی کی کمیاب اشیاء، ٹیکنالوجی اور پیداوار کی اضافے کے لیے مشینری ہم کو باہر سے درآمد کرنی پڑتی ہیں۔ دوسری

مگر مسئلہ یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک کی منڈیوں میں مال کی کھپت قرضہ دئے بغیر ہو نہیں سکتی۔ اس لیے اب قرض، امداد، گرانٹ اور شرائط میں بندھے لین دین کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ اب قرضدار ملک میں ترقی تو ہو مگر اس طور کہ درآمدات میں کمی نہ آئے اور جہاں سرمایہ لگانے میں فائدہ ہے وہاں سرمایہ بھی لگتا رہے۔ اس لیے ان کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ درآمد کے مہنگے بدل تیار کرنے میں نہ الجھیں، تجارت کے لیے اپنے دروازے دوسرے ممالک پر آزادانہ کھول دیں۔ اپنی برآمدات ہر قیمت پر بڑھائیں اگر ضرورت پڑے تو اپنے سکہ کی قیمت گھٹا کر بھی۔ حالانکہ اس تمام کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ملک ہمیشہ قرض کے بوجھ میں دبا رہیگا۔ وسائل بڑی مقدار میں سال در سال ترقی پذیر ممالک سے ترقی یافتہ ممالک میں جاتے رہیں گے۔

غریبی دُور کرنے کے لیے امن :۔ اب آپ ترقی یافتہ

(باقی صفحہ پر)

پروفیسر پی. این سری واستو

تعلیم
غریبی دور کرنے کا موثر ذریعہ

دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں اقتصادی غربت دور کرنے اور عوام کو خوشحال بنانے میں تعلیم سب سے زیادہ موثر ذریعہ ثابت ہوئی ہے، اس مضمون کے مصنف رکن منصوبہ بندی کمیشن پروفیسر سری واستو ہے جو کہ ماضی میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ہیں، عوام کو خوشحالی سے ہمکنار کرانے میں تعلیم کی اہمیت واضح کی اور اس بات کا بڑی دردمندی کے ساتھ تذکرہ کیا کہ ہمارے ترقیاتی پروگراموں میں اس کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دی گئی۔ انھوں نے جاپان کی مثال دی ہے، جہاں تقریباً سو برس پہلے تعلیم پر زور دیا گیا جا چکا ہے آج جاپان تعلیم سے فائدے اٹھا رہا ہے اس سلسلے میں انھوں نے عوامی اشتراک عمل کی اہمیت واضح کی کیونکہ ان کے خیال میں محض سرکاری کوششیں تعلیم کے پھیلانے میں ناکافی ہوں گی۔ آزادی ملنے سے پہلے آمدنی کا تقریباً ۲۵ فیصد حصہ عطیہ کے طور پر تعلیم کے لیے دینے کا رواج اور طریقہ تھا، لیکن آج صرف ۲ فیصد کے لگ بھگ ہی اس مد کے لیے دیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اگر ہمارے ترقیاتی پروگراموں میں سماج کا صرف تہائی بالائی طبقہ شریک رہتا ہے تو اس سے ہمیں آسودگی نہیں مل سکتی۔ یہ فائدے محض چند اوپری سطح کے لوگوں کو حاصل کرانے سے مقصد حل نہیں ہوگا۔

مجھے اس بات پر فی الحقیقت خوشی ہے کہ آزادی کی چالیسویں سالگرہ منانے کے موقع پر یوجنا غریبی کے اسباب وعوامل اور اس کے تجزیے کے لیے ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کر رہا ہے۔ اگرچہ ۴۰ سال کا عرصہ کسی بھی آزاد ملک کی تاریخ میں کوئی لمبا عرصہ نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ مدت اتنی قلیل بھی نہیں جس میں کہ غریبی کی سطح اور زیادہ کم نہ کی جا سکی ہوتی۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ آزادی ملنے کے ۴۰ سال بعد بھی ہماری آبادی کا تقریباً ۴۰ فیصد حصہ غریبی کے خط سے نیچے ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اگر ہمارے سماج میں تقریباً ایک تہائی اوپر کے لوگ ترقیاتی پروگراموں میں شریک رہیں اور ترقیاتی فائدے صرف انھیں کے لیے مخصوص ہو کر رہ جائیں تو یہ صورت حال تسلی بخش اور اطمینان بخش نہیں ہو سکتی اور اس سے سکون و راحت نہیں مل سکتی۔

روشن پہلو

ہم کو بہت زیادہ دل شکستہ ہونے کی بھی

ترقی میں ... ہم برسوں میں ہمارے
یہاں مختلف محاذوں پر زبردست کامیابیاں
دیکھنے کو ملی ہیں۔ خوراک کی پیداوار اس عرصے
میں ۴ کروڑ ٹن سے بڑھ کر ۱۵ کروڑ ٹن تک پہنچ
گئی ہے۔ اور یہ اضافہ سخت قسم کی خشک سالیوں
کی موجودگی میں ہوا ہے جو کہ شاید اس صدی کا
سب سے بھیانک سوکھا ہے۔ ہمیں خوراک باہر
سے منگانی نہیں پڑتی۔ اس عرصے میں اوسط عمر ۳۵

ہو رہا ہے۔ نیوکلیر ٹیکنالوجی، خلائی ٹیکنالوجی
بشمول راکٹ اور سٹے لائٹ گویا کہ
انتہائی جدید شعبوں میں بھی ہندوستان کی ترقی
انتہائی متاثر کن اور نمایاں ہے۔
ان تمام کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ہماری
آبادی بھی ۳۵ کروڑ سے بڑھ کر ۷۷ کروڑ تک
پہنچ چکی ہے گویا کہ دوگنی سے بھی زیادہ ہو چکی
ہے۔ ۴۰ سال قبل ہماری شرح ترقی ۲۵ء۱ تھی۔
جبکہ آج یہ ۲ء۲ فیصد ہے۔ چین کے بعد آبادی
میں ہندوستان کا ہی نمبر ہے۔ لیکن

غریب لوگوں کی بڑی تعداد کی آرزوئیں اور
اُمنگیں سمٹ کر رہ گئی ہیں، ان کو صرف بنیادی
سامان کی فراہمی کا مسئلہ ہے تاکہ وہ یہ سامان مناسب
قیمتوں پر حاصل کر سکیں اور اپنی گزر بسر کے لیے
حالات کو یقینی بنا سکیں۔ ساتویں منصوبے کی
دستاویز اور بیس نکاتی پروگرام میں زیادہ تر وہی کچھ
ہے جس کا مقصد غریب عوام کی ضرورتوں کو پورا
کرنا ہے۔ بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کا پروگرام ابتدائی
تعلیم جیسی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل پر زور دیتا ہے۔
اس میں صحت کے لیے بنیادی سہولتوں، پانی کی فراہمی
صفائی اور حفظان صحت کے اصولوں، سڑکوں،

مختصر یہ کہ حصولِ آزادی کے وقت تقریباً سبھی اشیاء باہر سے منگانی پڑتی تھیں لیکن آج ہندوستان میں ایک پن سے لے کر ہر طرح کی پیچیدہ اور جدید ترین مشینری اور سامان سبھی کچھ تیار ہو رہا ہے۔

سال سے بڑھ کر ۵۷ سال ہو گئی
ہماری شرح خواندگی ۱۶ فیصد سے بڑھ کر ۳۷
فیصد ہو گئی۔ بجلی تیار کرنے کی صلاحیت ۲ ہزار میگاواٹ
سے بڑھ کر ۵۲۰۰۰ میگاواٹ تک پہنچ گئی۔ قابل
فروخت فولاد کی پیداوار دس لاکھ ٹن فولاد سے بڑھ
کر ۸۰ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی۔ سمنٹ کی پیداوار
۳۰ لاکھ ٹن کی معمولی مقدار سے بڑھ کر ۴ کروڑ
۲۰ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی، خام تیل کی پیداوار
تقریباً نہ کے برابر تھی لیکن اب یہ ۳ کروڑ ٹن
تک پہنچ گئی، کوئلہ کی پیداوار ۳ کروڑ ٹن سے
بڑھ کر ۱۵ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی، خام
لوہے کی پیداوار ۳۰ لاکھ ٹن سے بھی کم تھی مگر اب
یہ بڑھ کر ۹ کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن تک پہنچ گئی۔
مختصر یہ کہ حصولِ آزادی کے وقت تقریباً
سبھی اشیاء باہر سے منگانی پڑتی تھیں لیکن آج
ہندوستان میں ایک پن سے لے کر ہر طرح کی پیچیدہ
اور جدید ترین مشینری اور سامان سبھی کچھ تیار

آبادی کا دباؤ ہمارے یہاں چین سے دوگنا ہے۔
ہندوستان میں ایک مربع کلومیٹر رقبے میں ۲۴۰
افراد کی آبادی ہے جبکہ چین میں اسی قدر رقبے میں
۱۱۰ افراد آباد ہیں، ۳۵ برسوں میں ہماری آبادی
دوگنی ہو چکی ہے۔ کسی بھی ملک کے لیے اتنی بڑی
آبادی کے لیے خوراک، صحت، تعلیم اور دیگر بنیادی
ضرورتوں کی فراہمی کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔

ناخوشگوار حالات

ہندوستان دنیا کے غریب ترین ملکوں
میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں فی کس اوسط آمدنی
تقریباً ۲۸۰ امریکی ڈالر ہے۔ حکومت کو عوام کی قلیل
آمدنی اور ان کی بہبود کے بارے میں گہری تشویش
ہونی ضروری ہے۔ یہ مسئلہ صرف انہیں کا نہیں جو
غریبی کے خط سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں بلکہ
اُن لاکھوں عوام کا بھی ہے جو اس خط سے کچھ اونچا

بجلی وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے۔ مگر اس پر وہ توجہ نہیں
دی جا سکی جس کا یہ مستحق تھا۔ اس سلسلے میں سیاسی
عزم کی کمی بھی ہے۔ بہت سے پروگرام بہت اچھے ہیں
مگر جس طرح سے ان پروگراموں پر عمل درآمد کرایا جاتا
ہے، اس سے اس کے نتیجے ان تک نہیں پہنچتے
جن کے لیے یہ بنتے ہیں۔ نچلی سطح پر ان پر عمل درآمد کے
سلسلے میں زبردست خامیاں ہیں، اس لیے مقامی
آبادی کو عمل درآمد کے کام میں شریک کرنا ضروری ہے
تاکہ فنڈز کا مناسب اور صحیح استعمال ہو سکے اور
پروگراموں پر موثر عمل درآمد ہو سکے۔

ترقی کے لیے تعلیم

اب میں غریبی کے تجزیے کا مسئلہ لیتا ہوں
افسوس یہ ہے کہ قومی ترقی کے لیے تعلیم کا سرمایہ
کاری کو اہم ترین شعبہ شمار نہیں کیا گیا۔

ے بھارت نے ترقی اور بقا کا ایک اہم ذریعہ
کرا ہے۔ پہلا ... جیسی کی گئی، آئین میں سب
کے لیے تعلیم کی بات مزید کی گئی ہے اور ظاہر ہے
کہ آئین سب سے اہم دستاویز ہے، لیکن یہ مقصد
بہت پہلے پورا ہو جانا چاہیئے تھا، ابھی تک بھی اس
کی تکمیل کے لیے تاریخ کا تعین ہونا باقی ہے، غریبی
دُور کرنے کے لیے تعلیم ایک اہم اور بنیادی
ضرورت ہے۔ کسی بھی ملک کی ترقی تعلیم کے
بغیر ممکن نہیں۔ تاریخ کی یہ ایک ایسی
حقیقت ہے جس کی شہادت دنیا کے
سبھی ترقی یافتہ ملکوں کے حالات سے
ملتی ہے۔ سو سال قبل جاپان نے جس کی
ترقی کا چرچا آج بچّے بچّے کی زبان پر ہے،
سب سے پہلے تعلیم پر ہی زور دیا تھا۔
ہماری نئی قومی تعلیمی پالیسی میں ۱۵ سال
سے ۳۵ سال کی عمر تک ناخواندگی دُور
کرنے کے لیے سال ۱۹۹۵ء کا نشانہ مقرر
کیا گیا ہے، کوٹھاری کمیشن نے تعلیم کے
موضوع پر جو رپورٹ دی تھی، اُس میں بھی
اسی بات پر زور دیا گیا تھا جس کے نتیجے میں
۱۹۶۸ء میں تعلیم سے متعلق قومی پالیسی
تشکیل دی جا سکی، مگر یہ نہیں ہو سکا۔ اس
دستاویز میں بھی تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانے پر زور
دیا گیا تھا۔ اُس وقت طلباء کا ۵ر۲ فیصد حصّہ
پیشہ ورانہ دھارے کے تحت تھا۔ تعلیم کا رُخ بدل
کر دس + دو سسٹم شروع کیا گیا تاکہ تعلیم کو پیشہ
ورانہ تربیت کی طرف موڑا جا سکے، لیکن اس پر
عمل درآمد اُس ڈھنگ سے نہیں ہوا جس طرح کہ ہونا
چاہیئے تھا۔ اور آج بھی ۳ فیصد سے کم طلباء
اس دھارے کے تحت ہیں۔ البتّہ تعلیمی کمیشن کی
دستاویز میں زراعت کے حصّے پر حقیقی طور سے
عمل درآمد ہو سکا۔ اور اس کے نتیجے سامنے آئے

ہیں۔ اگر ہم تعلیم پر سرمایہ کاری کو غریبی دور کرنے
کا ایک حصّہ نہیں سمجھ سکتے تو غریبی کا تجزیہ کیسے
ممکن ہے۔ آج چند کم ترقی یافتہ افریقی ممالک اپنی
مجموعی قومی آمدنی کا ۶ فیصد تعلیم پر خرچ کر رہے
ہیں جبکہ ہم ابھی ۴ فیصد تک کا نشانہ حاصل کر پائے
ہیں۔ بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں تعلیم پر مجموعی
اخراجات، ۹ فیصد کے برابر ہیں۔ کہیں کہیں تو یہ تناسب
مجموعی قومی آمدنی کے دس فیصد کے بقدر ہیں۔ یہ
افسوسناک صورتِ حال ہے لیکن سچ بات یہ ہے کہ
ہم مستقبل کو صحیح تناظر میں نہیں دیکھ پا رہے ہیں۔ تعلیم
پر پورا زور دیئے بغیر غریبی دُور کرنا مشکل ہے۔ ایک
بار تعلیم کو سبھی کے لیے عام کر دیا جائے تو ایک عمدہ
عمارت کے لیے ایک بڑا ڈھانچہ اور بنیاد فراہم ہو
سکے گی۔ تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی کسی بھی ملک کی
ترقی اور خوشحالی سے براہِ راست جڑی ہوئی
ہے اور غریبی دُور کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ
ہے۔ یہ حقیقت سبھی پر واضح ہے کہ تعلیم
اقتصادی ترقی میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ گویا
کہ ۲۵ فیصد تک۔ غریبی دُور کرنے اور آمدنی
کی تقسیم کو بہتر بنانے میں ان کی اہمیت واضح
ہے۔

نفع کی بلند ترین شرح

ابتدائی تعلیم یا پرائمری تعلیم سے
سب سے زیادہ نفع حاصل ہوتا ہے۔
اس کا پیداواری صلاحیت پر پورا اثر
ہوتا ہے۔ اس کا تعلق عوام کی عام
بہبود سے ہے۔ چونکہ ہم نے ایسا نہیں
کیا ہے اس لیے ہم ہر جگہ غریبی کے تجزیے
اور تحلیل کو بے ربط پاتے ہیں۔ ضرورت
اس بات کی ہے کہ سبھی لوگوں کو تعلیم
کے فائدے مل سکیں، مرد ہو یا عورت،
یا کوئی بھی سماجی طبقہ اور کسی بھی خطّے
میں رہنے والے لوگ سبھی کو تعلیم سے
یکساں مستفید ہونا ہے۔ آزادی ملنے
کے ۴۰ سال بعد بھی اگر یہ صورتِ حال
نہیں لائی جا سکی تو اقتصادی نابرابری،
علاقائی عدم توازن اور سماجی ناانصافی
بڑھتی ہی رہے گی اور اس سے تناؤ
بڑھے گا۔

کسی بھی ملک کی ترقی میں سائنس اور
ٹیکنالوجی کی اہمیت پوری طرح واضح ہے، اس
کے سبب ہماری اقتصادی ترقی کو بھی بڑھاوا ملا
ہے۔ ہم مجموعی قومی پیداوار کا تقریباً ایک فیصد
سائنس و ٹیکنالوجی کے لیے خرچ کر رہے ہیں۔ ان
اخراجات میں مستقبل میں مزید اضافے کے امکانات
ہیں جو کہ ایک حوصلہ افزا رجحان ہے۔ ہمارے

> غریب لوگوں کی بڑی تعداد کی
> آرزوئیں اور اُمنگیں سمٹ کر رہ
> گئی ہیں، ان کو صرف بنیادی
> سامان کی فراہمی کا مسئلہ ہے تاکہ
> وہ یہ سامان مناسب قیمتوں پر حاصل
> کر سکیں اور اپنی گزر بسر کے لیے
> حالات کو یقینی بنا سکیں۔ ساتویں
> منصوبے کی دستاویز اور بیس نکاتی
> پروگرام میں زیادہ تر یہی کچھ ہے جن
> کا مقصد ان غریب عوام کی ضرورتوں
> کو پورا کرنا ہے۔

[illegible] ضروری ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں نے [illegible]
[illegible] ہے اور انھوں نے اپنی معاشی ترقی
کے عمل کو کس طرح سے آگے بڑھایا ہے۔ دنیا میں تقریباً
۳۸ لاکھ سائنسداں تحقیق اور
ترقی کے کاموں میں مصروف ہیں ان میں سے ۹۵
فیصد سائنس داں ترقی یافتہ ملکوں میں ہیں جو کہ مجموعی
آبادی کے ۲۵ فیصد سے بھی کم ہیں۔ باقی ۱۰ فیصد
ترقی پذیر ممالک میں ہیں۔ جو کہ آبادی کا ۷۵ فیصد ہیں۔
آج دنیا میں تحقیق و ترقی کی سرگرمیوں پر ۲۱۰ بلین
امریکی ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔ اس میں سے ۹۵ فیصد
ترقی یافتہ ملکوں میں خرچ کیا جاتا ہے۔ اور ۵ فیصد
ترقی پذیر ملکوں میں خرچ کیا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ
ملکوں میں دس لاکھ آبادی پر ۳ ہزار سائنسداں
تحقیق و ترقی کے کاموں میں مصروف ہیں۔ ترقی
پذیر ملکوں میں اس قدر آبادی میں صرف ۱۲۵
سائنس داں اس طرح کی سرگرمیوں میں لگے ہوئے
ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے طلبا کی تعداد بھی مطالعہ
کی مستحق ہے۔ شمالی امریکہ میں ایک لاکھ آبادی
میں ۵ ہزار طلبا اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں۔ جبکہ ترقی یافتہ
ملکوں میں یہ اوسط ۲۵۰۰ ہے۔ ایشیا اور ترقی پذیر

[illegible]

عوامی شرکت کی ضرورت

اگر تعلیم کو ترجیح دی جاتی ہے تو اس کے لیے وسائل
اکٹھا کرنے ہوں گے، بدقسمتی سے ہندوستان میں
ہم ہر کام سرکار کے ذریعے
کرانا چاہتے ہیں۔ آزادی سے قبل انفرادی،
مذہبی تنظیموں وغیرہ کی طرف سے تعلیمی اخراجات
کا ۲۵ فیصد حصہ بطور عطیات اور اوقاف مل جاتا
تھا، آج یہ ۳ فیصد ہے۔ ۱۹۴۷ء تک لڑکوں کی فیس
سے ۴۵ فیصد رقم آجاتی تھی، آج صرف ۲ فیصد
رقم مل جاتی ہے، انجینئرنگ، میڈیسن وغیرہ کے اخراجات
زیادہ ہونے کے سبب سرکار کو زیادہ سبسڈی
دینی پڑتی ہے، اور ان نصابات سے فارغ ہو کر کام
کرنے میں زیادہ نفع کی امید ہوتی ہے۔ تعلیم کی اعلیٰ
سطح پر اور پیشہ ورانہ نصابات کے سلسلے میں فیس
بڑھانے کی بات نئی تعلیمی پالیسی میں کہی گئی ہے۔
غریب کنبوں کے طلبا سے کوئی فیس نہیں لی جاتی۔
متوسط آمدنی والے کنبوں کے لڑکوں کو بنکوں سے
قرض مل جاتا ہے۔ اس لیے تعلیم کے اخراجات میں
عوامی چندوں، عطیات اور امداد کی بڑی اہمیت
ہے۔ ایک چینی کہاوت ہے کہ اگر آپ ایک سال
کے لیے منصوبہ بندی کر رہے ہیں تو چاول بوئیے، اگر
۳۰ سال کی منصوبہ بندی کرنی ہے تو درخت بوئیے۔
اگر سو سال کی منصوبہ بندی کرنی ہے تو تعلیم پر سرمایہ

غریبی دور کرنے کے لیے تعلیم ایک اہم اور بنیادی ضرورت ہے۔ کسی بھی ملک کی ترقی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ تاریخ کی یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی شہادت دنیا کے سبھی ترقی یافتہ ملکوں کے حالات سے ملتی ہے۔ سو سال قبل جاپان نے جس کی ترقی کا چرچا آج بچہ بچہ کی زبان پر ہے، سب سے پہلے تعلیم پر ہی زور دیا تھا۔

سچ بات یہی ہے کہ ہم مستقبل کو صحیح تناظر میں نہیں دیکھ پا رہے ہیں۔ تعلیم پر پورا زور دیے بغیر غریبی دور کرنا مشکل ہے۔ ایک بار تعلیم کو سبھی کے لیے عام کر دیا جائے تو ایک عمدہ عمارت کے لیے ایک بڑا ڈھانچہ اور بنیاد فراہم ہو سکے گی۔ تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی کسی بھی ملک کی ترقی اور خوشحالی سے براہِ راست جڑی ہوئی ہے۔ اور غریبی دور کرنے میں ان کا پوشیدہ ہاتھ ہے۔

[illegible]

بدقسمتی سے تعلیم کو صنعت نہیں سمجھنا چاہیے جو کہ پانچ سال میں اپنا نتیجہ یا پھل دیگی۔ اس کے لیے ۱۵ تا ۲۰ سال کا انتظار کرنا ہے چنانچہ مبنی بر انصاف سماجی نظام اور ایک ایسے نظام

[illegible] انصاف مل سکے تعلیم پر سرمایہ کاری ضروری ہے۔ ہمارے آئین میں سب کو مساوی مواقع اور سماجی انصاف دلانے کی بات کہی گئی ہے، اس لیے تعلیم ترجیح کی مستحق ہے اور اس کام کو جنگی

[illegible] پیمانے پر انجام دیا جانا ہے [illegible] شرح ترقی کی رفتار کو قدرے کم کرنا پڑے گا کیونکہ اب [illegible] ہے۔ ۲۰ سال بعد حقیقی فائدے ظاہر ہو سکیں۔

ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں نے غریبی کیسے دُور کی ہے اور انھوں نے اپنی معاشی ترقی کے عمل کو کس طرح سے آگے بڑھایا ہے۔ دُنیا میں تقریباً ۳۸ لاکھ سائنس داں تحقیق اور ترقی کے کاموں میں مصروف ہیں ان میں سے ۹۰ فیصد سائنسداں ترقی یافتہ ملکوں میں ہیں جو کہ مجموعی آبادی کے ۲۵ فیصد سے بھی کم ہیں۔ باقی ۱۰ فیصد ترقی پذیر ممالک میں ہیں جو کہ آبادی کا ۷۵ فیصد ہیں۔

بدقسمتی سے تعلیم کو صنعت نہیں سمجھنا چاہیئے جو کہ پانچ سال میں اپنا نتیجہ یا پھل دے گی۔ اس کے لیے ۱۵ تا ۲۰ سال کا انتظار کرنا ہے۔ چنانچہ مبنی بر انصاف سماجی نظام اور ایک ایسے نظام کے لیے جہاں سب کو اقتصادی سیاسی، سماجی انصاف مل سکے تعلیم پر سرمایہ کاری ضروری ہے۔ ہمارے آئین میں سب کو مساوی مواقع اور سماجی انصاف دلانے کی بات کہی گئی ہے، اس لیے تعلیم ترجیح کی مستحق ہے اور اس کام کو جنگی پیمانے پر انجام دینے کی ضرورت ہے۔

بقیہ، بھرشٹاچار کیوں اور کیسے؟

اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بھرشٹ لوگ کیوں خوفزدہ رہتے ہیں۔ یہ خوف محض ایک بھرشٹ اقدام کے فوری نتائج کا نہیں ہوتا بلکہ قدرتی یا خدائی انصاف کا خوف ہوتا ہے یہ گہری جڑوں والی روایات ہیں جن میں بھرشٹاچار ابھی تک مکمل طور پر قابل قبول نہیں ہے۔ خواہ وہ بہت زیادہ پھیل چکا ہے۔ تب ہماری اُمید صرف انفرادی شعور کی سطح کو بلند کرنے اور انفرادی عمل اور سماجی عقیدتمندی کے بنیادی تصور کو تقویت دینے میں ہے۔ ہمارے لیے اس حقیقت سے آگاہ ہونا ضروری ہے کہ ایک ایماندار معاشرہ صرف ایماندار افراد پر ہی مشتمل ہو سکتا ہے۔

ایس۔ ایم۔ ایچ برنی

معیارِ زندگی بہتر بنانے کی مساعی میں

پورے سماج کی شمولیت ضروری

سرزمینِ افراط میں افلاس ـــــ بظاہر یہ ایک اُلٹی اور عجیب بات نظر آتی ہے۔ صاحبِ مضمون نے جو ایک تجربہ کار اور کہنہ مشق ایڈمنسٹریٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ عالم بھی ہیں، زیرِ نظر مضمون میں ملک میں غربت و افلاس کی وجوہات بیان کی ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے حکومت وقتاً فوقتاً کیا اقدامات کرتی رہی ہے۔ انہوں نے ان اقدامات کا سلسلہ قابلِ یقین انداز میں ہماری تحریکِ آزادی سے جوڑا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ کچھ انقلابی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ محض "پُلٹس یا مُسکّن ادویہ" سے کام نہیں چلے گا۔ زراعت و صنعت سائنس و ٹیکنالوجی اور دیگر مختلف شعبوں میں نمایاں ترقی کے باوجود محرومی و نامُرادی اور عدم مساوات ابھی تک ہمارا منہ چڑا رہی ہے۔ مصنف کو خطِ غریبی کی موجودہ تشریح سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ ان کی رائے میں اس پر اعتراض کی گنجائش موجود ہے۔ ان کے خیال میں سماجی تبدیلیاں صرف سرکاری ایجنسیوں کے ذریعے ہی نہیں لائی جاسکتیں۔ غریبی کی لعنت کو ختم کرنے کے لیے سارے سماج کو اپنی قوتیں اور اپنے وسائل مجتمع کرنے ہوں گے۔

فیض احمد فیضؔ نے اپنے ایک شعر میں کشاکش زندگی میں مبتلا غریب افراد کی تصویر مؤثر انداز میں یوں کھینچی ہے ؎

زندگی کیا کوئی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

یہ شعر ہماری توجہ غربت و افلاس کے تین بنیادی پہلوؤں کی جانب مبذول کراتا ہے ـــ محرومی بدرجۂ محتاجی، مسلسل تکالیف و مصائب اور ناقابلِ برداشت تنزلی و بدحالی ـــ غریبی ایک نسبتی اصطلاح ہے۔ ہمارے سامنے پہلا سوال تو یہ ہے کہ ہم اسے ایک صحیح معنی دیں۔ غریب کون ہے؟ خطِ غریبی کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ عام اصطلاح میں غریب سے مراد ایک نادار و محروم انسان ہے جسے کم از کم اتنے وسائل بھی حاصل نہیں ہیں جو زندہ رہنے کے لیے ضروری ہیں، جس کے حالات غیر یقینی ہیں اور جسے ہمیشہ روزی روٹی اور جائے رہائش کی تلاش میں سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔ ایک غریب انسان کو اتنے وسائل بھی حاصل نہیں ہوتے کہ وہ سماج کی تسلیم کی ہوئی کم از کم انسانی ضروریات کو بھی پورا کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں غریبی کا مطلب ہے کم خوراک، کم غذا، غیر صحت مند ماحول اور بھوکوں مرنے اور بے گھر ہونے کا خطرہ۔ اقتصادی اصطلاح میں خطِ غریبی کا اشاریہ فی کس

بیس روپے کے ماہانہ اخراجات (۱۹۷۰-۷۱ء کی قیمتوں کی بنیاد پر) کو سمجھا جانے لگا ہے۔ ساتویں منصوبے کے مطابق خط غریبی کا تازہ ترین اشاریہ دیہی علاقوں میں فی کس ۶۴۰۰ روپے اور شہری علاقوں میں فی کس ۷۳۰۰ روپے کی سالانہ آمدنی ہے جو ۱۹۶۰ء کی قیمتوں کے مطابق بیس روپے فی کس بنتا ہے۔ اس حساب سے جو لوگ خط غریبی سے نیچے گزر بسر کر رہے ہیں ان کی غالب اکثریت درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبائل، زرعی مزدوروں، کمتر بن کاشتکاروں اور مختلف زمروں کے بے روزگار اور کم روزگار شہری محنت کشوں پر مشتمل ہے۔

> اصولوں اور نظریات کے مورخین کے لیے بنیادی سوشلسٹ پلاننگ اور جدید مخلوط معیشت کے نظریات جن پر ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۹ء کے دوران وسیع پیمانے پر بحث و تمحیص ہوئی تھی، کا مطالعہ تحقیق کا جوش آفریں موضوع ہوں گے۔

سماج کی تعمیر نو

یہ امر ہماری قومی تحریک کی عظمت میں اضافہ کرتا ہے کہ ہماری تحریک نے صرف ملک کو برطانوی حکومت کی زنجیروں سے آزاد کرانے کا نصب العین ہی اپنے سامنے نہیں رکھا تھا بلکہ ہمارے قومی رہنماؤں نے ہندوستانی معاشرے کی مضبوط اقتصادی بنیادوں پر تعمیر نو کے بارے میں بھی ٹھوس نظریات وضع کیے تھے۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اقتصادی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہوگی۔

برطانوی عہد میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہندوستان ایک امیر ملک ہے جہاں غریب آباد ہیں۔ وسائل تو کثیر تھے لیکن انھیں بروئے کار لانے کی تدابیر نہیں سوچی گئیں۔ نوآبادیاتی حکمرانوں نے آبادی کا ہوا کھڑا کیا۔ قوم پرست حلقوں میں لگانِ اراضی، صنعتوں، محصولوں اور ٹیکسوں کے بارے میں برطانوی اقتصادی پالیسیوں کو اقتصادی جمود کے لیے ذمہ دار سمجھا جاتا تھا۔ دادا بھائی نوروجی نے ہندوستان کی غربت کے سوال پر بیشتر سنجیدہ ماہرین اقتصادیات کو ایک نظریاتی ڈھانچہ فراہم کیا۔ نوروجی نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہندوستان کتنا غریب ہے، سب سے پہلے فی کس ۲۶ روپے کی آمدنی کا تخمینہ مرتب کیا لیکن برطانوی عہد میں غریبی کے حجم کا اندازہ لگانے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔ ہندوستان نے نوآبادیاتی عہد میں اقتصادی جمود کی وجہ سے بہت نقصان اٹھایا اور نوآبادیاتی نظام ہی ملک کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔ مہاتما گاندھی نے ہندوستانی معاشرے کی دیہی تعمیر نو کا ایک جامع منصوبہ بنایا اور جواہر لال نہرو نے ملک کی صنعت کاری کے لیے ایک خاکہ تیار کیا۔ اصولوں اور نظریات کے مورخین کے لیے بنیادی سوشلسٹ پلاننگ اور جدید مخلوط معیشت کے نظریات، جن پر ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۹ء کے دوران وسیع پیمانے پر بحث و تمحیص ہوئی تھی، کا مطالعہ تحقیق کا جوش آفریں موضوع ہوں گے۔ انڈین نیشنل کانگریس نے آج سے بہت پہلے ۱۹۳۸ء میں غریبی کی بیخ کنی اور دولت کے ارتکاز کو روکنے کے لیے ایک نیشنل پلاننگ کمیٹی قائم کی تھی۔ کچھ کانگریسی رہنماؤں نے ہندوستانی معاشرے کے جاگیردارانہ ڈھانچے کی مذمت کی اور زمینداری کے خاتمے پر زور دیا۔

یہاں میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اقتصادی ترقی کی تحریک کا ماخذ ہماری سیاسی آزادی کی جد و جہد تھی۔ ہندوستان کے قوم پرست رہنما نو پیدا شدہ دولت کے ایک تنگ دائرے میں مجتمع ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والی روز افزوں نابرابریوں کے مسئلے سے پوری طرح باخبر تھے۔ چونکہ آمدنی پیدا کرنے والے اثاثہ جات صرف چند ہاتھوں میں مرکوز ہوتے جا رہے تھے اس لیے قومی رہنماؤں نے نمایاں نابرابریوں کو دور کرنے کے لیے چند بنیادی اقدامات تجویز کیے مثلاً خاتمۂ زمینداری، انسداد سود خوری اور صنعتوں کا نیشنلائزیشن وغیرہ۔ اگرچہ کانگریس نے بہت سے صوبوں میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء کے دوران اپنی حکومت بنائی تھی، تاہم ہمارے رہنما ظاہرہ وجوہ کی بنا پر ان اقدامات کو روبہ عمل نہ لا سکے۔ لیکن حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان نے اپنا مستقبل بنانے اور عزم و اعتماد سے پُر ایک خود کفیل معاشرہ تشکیل دینے نیز اقتصادی طور پر آزاد ایک سوشلسٹ جمہوریہ قائم کرنے کا تہیہ کر لیا جس میں کروڑوں

> لیکن حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان نے اپنا مستقبل بنانے اور عزم و اعتماد سے پُر ایک خود کفیل معاشرہ تشکیل دینے نیز اقتصادی طور پر آزاد ایک سوشلسٹ جمہوریہ قائم کرنے کا تہیہ کر لیا جس میں کروڑوں بھوکے عوام کو پنجۂ افلاس سے آزاد کرالیا گیا ہے، جس کی گرفت میں وہ صدیوں سے رہتے ہوئے مفلوج ہو گئے تھے۔

جبکہ عوام کو بہت افلاس سے آزاد کرا لیا گیا ہے، جس کی گرفت میں وہ صدیوں سے رہتے ہوئے مفلوج ہو گئے تھے۔

> بہرحال اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریز نہیں کیا جاسکتا کہ چھ پنجسالہ منصوبوں اور غریبی کے خاتمے کے لیے مزید کوششوں کے باوجود آج ہمارے معاشرے میں ترقی اور غریبی دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں اور ایک نہیں بہت سے ہندوستان معرض وجود میں ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف کارفرما ہیں — جاگیرداری سے پہلے کا ہندوستان، جاگیرداری والا ہندوستان، سرمایہ دارانہ ہندوستان اور بے حد غریب ہندوستان ،

ترقی کا ریکارڈ

جالیس سال کی آزادی کے بعد ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ ہم اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ ہم ۱۹۴۷ء میں کہاں تھے اور آج کہاں ہیں۔ ہماری حصولیابیاں اور ناکامیاں کیا ہیں؟ ۱۹۴۷ء کے بعد سے ہندوستان کی اقتصادی ترقی شاندار رہی ہے۔ غلّہ کی پیداوار ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۵۰ ملین ٹن سے بڑھ کر ۱۹۸۵ء میں ۱۵۰ ملین ٹن ہو گئی ہے۔ یہ اعداد سہ گنا اضافہ ظاہر کرتے ہیں اسی طرح صنعتی پیداوار میں بھی آزادی کے بعد سے چھ فیصد کی مرکب شرح سے پانچ گنا اضافہ ہوا ہے۔ ہندوستانی معیشت کی شرح ترقی ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اوائل میں تین فیصد سے بڑھ کر ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ۴ فیصد سے کچھ زیادہ ہو گئی ہے اور گزشتہ سات برسوں میں یہ اوسطاً پانچ فیصد کے لگ بھگ رہی ہے۔ پیدائش پر اوسط عمر ۱۹۵۰-۱۹۵۱ میں ۲۷ سال سے بڑھ کر ۵۴ سال ہو گئی ہے۔ آج ہندوستان اپنی مشینری کی ۸۵ فیصد ضروریات خود پوری کر سکتا ہے۔ افراطِ زر پر قابو پا لیا گیا ہے اور تجارتی خسارے میں نمایاں کمی لائی جا چکی ہے۔ کوئلے اور بجلی کی پیداوار اور ریلوے کی نقل و حرکت اور کارکردگی میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ حالیہ برسوں میں سرمایہ بازار میں بھی نمایاں اضافہ دیکھنے کو ملا ہے۔ اپریل تا جنوری ۱۹۸۶-۸۸ء کی مدت میں ۷۰۰۵ کروڑ روپے کے نئے سرمائے کے اجراء کی منظوری دیئے جانے کی توقع ہے جبکہ ۱۹۸۴-۸۵ء میں ۲۰۰۳ کروڑ ۱۹۸۵-۸۶ء میں ۴۶۹۵ کروڑ روپے کے نئے سرمائے کے اجراء کی منظوری دی گئی تھی۔

اقتصادی میدان میں اس نمایاں رفتار ترقی کو اس امر کے باوجود برقرار رکھنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان کو چار جنگیں لڑنی پڑی ہیں — تین پاکستان سے اور ایک چین سے۔ اس کے علاوہ نیوکلیائی خطرہ بھی موجود ہے جس کی وجہ سے ملک کو اضافی دفاعی اخراجات کا بوجھ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ بہرحال اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریز نہیں کیا جاسکتا کہ چھ پنجسالہ منصوبوں اور غریبی کے خاتمے کے لیے مزید کوششوں کے باوجود آج ہمارے معاشرے میں ترقی اور غریبی دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں اور ایک نہیں بہت سے ہندوستان معرض وجود میں ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف کارفرما ہیں — جاگیرداری سے پہلے کا ہندوستان، جاگیرداری والا ہندوستان، سرمایہ دارانہ ہندوستان اور بے حد غریب ہندوستان۔ ہندوستانی معیشت ہنوز پسماندہ ہے۔ فی کس آمدنی کم ہے، بیروزگاری کا مسئلہ موجود ہے اور ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے ۲۷.۴ کروڑ عوام کو خط غریبی سے نیچے گزر بسر کرنا پڑ رہی ہے۔ ۱۹۵۴-۵۵ء میں پروفیسر کالڈور نے ملک میں ۶۰۰ کروڑ روپے کی غیر قانونی دولت کی موجودگی کا اندازہ لگایا تھا۔ آج غیر محسوب دولت اور زمین دوز معیشت سے پیدا ہونے والی آمدنی کا تخمینہ ۶۰۰۰ سے ۷۰۰۰ کروڑ روپے کے لگ بھگ ہے جو ملک کی ۱۹۸۳-۸۴ء کی قومی آمدنی کے نصف کے برابر ہے۔ ان حالات میں ملک کی اکثریت کا غریب ہونا یقینی ہے۔ غیر قانونی دولت پانی میں ہیضے کے جراثیم کی طرح بڑھتی ہے۔ آج بھی ۲۱.۴ فیصد زمیندار تھوڑی نہیں ۸.۲۶ فیصد قابل کاشت زمین کے مالک ہیں۔ ایک حالیہ تخمینے کے مطابق سال ۱۹۸۶-۸۷ء میں مجموعی قومی پیداوار کی شرح ترقی کے ۱۹۸۵-۸۶ء کی ۵.۱ کی سطح سے کم تر ہونے کا اندیشہ ہے ۱۹۸۷-۸۸ء میں غلّے کی پیداوار میں بھی گزشتہ سال کے مقابلے میں دس پندرہ ملین ٹن کی کمی واقع ہونے کا امکان ہے۔ ملک کو بدترین خشک سالی کا سامنا ہے اگرچہ یہ بات اطمینان بخش ہے کہ ہمارے پاس نازک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ۲۸ ملین ٹن غلّہ کا ذخیرہ موجود ہے (جو اب گھٹ کر تقریباً ۱۸ ملین ٹن رہ گیا ہے)۔

جرأت مندانہ اقدامات کی ضرورت

ایسا کیوں ہے کہ ہمارے بہترین ارادوں اور بڑے بڑے منصوبوں کے باوجود غریبی کا دیو ہمارا منہ چڑا رہا ہے؟ ہم کہاں ناکام رہے اور کیوں؟ اور صورتِ حال کو درست کرنے کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے؟ شاید اقتصادی اور سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے ہمارے رہنما ضروری بنیادی اقدام نہیں کر سکے۔ ٹیلٹسوں اور مسکّن ادویہ سے کام نہیں چلا اور جن جرأت مندانہ اور دلیرانہ اقدامات کی ضرورت تھی وہ کسی ایک یا دوسری مجبوری کے سبب نہیں کیے جاسکے۔ سرجری یا جراحت کا استعمال نہیں کیا جاسکا۔ اصلاحاتِ اراضی کے نفاذ کو ہی لیجئے۔

جب ہمارے رہنماؤں کو اس بات کا احساس ہوا کہ ملکیت اراضی کی حد مقرر کرنے کے فوری اور مؤثر طور پر قانون نافذ کرنے کی ضرورت ہے اس وقت اتنی زمین ہی نہیں بچی تھی جسے فاضل قرار دے کر اُن بے زمین مزدوروں اور چھوٹے سے چھوٹے کسانوں میں تقسیم کیا جا سکے جن کا اگر تناسب نہیں تو تعداد ہمارے سوشلسٹ دعوؤں کے باوجود برابر بڑھتی رہی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ شہری ملکیت اراضی (بشمول عمارات) کی حد مقرر کرنے کے لیے بھی کوئی اقدام نہیں کیا گیا ہے، عام شہری جائداد اور صنعتی و تجارتی شعبے کے آمدنی دینے والے اثاثہ جات تو درکنار سرکاری سیکٹر کے اداروں میں عظیم سرمایہ کاری کے باوجود، آج ہماری قومی معیشت پر بڑے بڑے نجی کاروباری گھرانوں اور اجارہ داروں کا غلبہ پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سرکاری سیکٹر کے ادارے اہلیت اور عمدگی کے ساتھ نہیں چلائے جا رہے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ حالیہ برسوں میں ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کا شکنجہ اور بھی مضبوط ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں کچھ وقت بعد بے روزگاری میں مزید اضافہ یقینی ہے۔

اگرچہ غریبی کی پیمائش کا سوال طویل بحث و تمحیص کا موضوع بنا رہا ہے۔ تاہم اس بارے میں ابھی تک اتفاق نہیں ہو سکا کہ غریب کون ہے؟ مختلف ماڈل تجویز کیے گئے ہیں، منصوبہ بندی کمیشن کے مطالعاتی گروپوں نے ۶۱-۱۹۶۰ء کی قیمتوں کی بنیاد پر فی کس بیس روپے ماہوار کے کم از کم اخراجات کا جو جادوئی پیمانہ مقرر کیا ہے اس کی بنا پر غریبی کے تعین کے لیے مختلف خطوط کھینچے جا رہے ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ پیمانہ مقرر کرنے کے پیچھے استدلال کیا ہے۔ اگر معلوم بھی ہو تو سوال کیا جا سکتا ہے کہ آج کے ہندوستان میں ایک پچیس برس پرانی بنیاد کو اختیار کرنے کا جواز کیا ہے۔ جبکہ ماہرین شہری اور دیہی ہندوستان میں خطِ غریبی کے اوپر یا نیچے گزر بسر کرنے والے لوگوں کے تناسب پر مسلسل بحث کرتے رہیں گے، یہ بات تسلیم کرنا ہی ہوگی کہ ساتویں منصوبے کے بعد بھی ۲۶ فیصد لوگ خطِ غریبی سے نیچے رہ رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں تقریباً بیس کروڑ افراد کے معیار زندگی کی سطح میں زیادہ بہتری نہیں ہو سکتی اور عوام کی یہ تعداد ریاست ہائے متحدہ امریکہ سوویت روس کی کُل آبادی سے کچھ زیادہ کم نہیں ہے

خطِ غریبی سے اوپر اٹھانے کی تدابیر

> سرکاری سیکٹر کے اداروں میں عظیم سرمایہ کاری کے باوجود آج ہماری قومی معیشت پر بڑے بڑے نجی کاروباری گھرانوں اور اجارہ داروں کا غلبہ پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سرکاری سیکٹر کے ادارے اہلیت اور عمدگی کے ساتھ نہیں چلائے جا رہے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ حالیہ برسوں میں ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کا شکنجہ اور بھی مضبوط ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں کچھ وقت بعد بے روزگاری میں مزید اضافہ یقینی ہے۔

بڑھتی ہوئی غربت کے پیش نظر یہ امر قدرتی ہے کہ اسے کم کرنے کی تدابیر سوچی جائیں۔ غریبی کے جاری رہنے اور مسئلے کے مزید شدت اختیار کرنے کی وجہ روایتی انداز میں کثرت آبادی کو قرار دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ آبادی اس شرح سے بڑھ رہی ہے کہ حکومت کی ترقیاتی کوششیں بے اثر ہو جاتی ہیں۔ گو یہ بات وزن رکھتی ہے تاہم مسئلے کے دوسرے پہلوؤں پر جن کی وجہ سے ہماری کارکردگی غیر تسلی بخش رہی ہے، غور کرنا فائدہ مند ہوگا۔ ایک بار خامیوں کا پتہ چل جائے تو اصلاحی اقدامات کیے جا سکیں گے۔ عوام اور گھرانوں کو خطِ غریبی سے درج ذیل تین طریقوں سے اوپر اٹھایا جا سکتا ہے:

(۱) جو لوگ اپنی مرضی سے بے روزگار نہیں ہیں انھیں روزگار مہیا کیا جائے اور جو کم روزگار ہیں انھیں ہمہ وقتی روزگار فراہم کیا جائے۔

(۲) باروزگار افراد بھی اپنی کم آمدنی کے سبب غریب ہو سکتے ہیں اس لیے ایسے باروزگار افراد کی آمدنی کو، اُن کی مہارت و ہنرمندی کو بہتر بنا کر اور پیداواری اثاثہ جات کی ازسرنو تقسیم کے ذریعے، بڑھایا جائے۔

(۳) اگر نئی ٹیکنالوجی کے سبب کچھ لوگوں کو بے روزگار رہنا پڑتا ہے اور دوسروں کو اپنی آمدنی اس حد تک بڑھانے کے قابل نہیں بنایا جا سکتا جو کھپت کے کم از کم معیار کو قائم رکھنے کے لیے کافی ہو، تو سماج کا فرض ہے کہ مرفع الحال طبقے کشاکش میں مبتلا لوگوں، بے روزگاروں اور ناداروں کو اپنی کچھ آمدنی منتقل کریں یہ بے روزگاروں کو خیرات، عطیات اور فراخدلانہ امدادی رقوم کی شکل میں ہو سکتی ہے۔

لیکن ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ان پہلوؤں کی راہ میں حکمت عملی اور اس کے نفاذ کی دشواریاں آڑے آتی ہیں۔ ملکیت اراضی کو زمینداروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں میں مرکوز ہونے کو روکنے اور فاضل زمین بے مایہ بے زمین مزدوروں اور کمترین کاشتکاروں کو منتقل کرنے کے لیے اب تک جو اقدامات کیے گئے ہیں

[illegible]

[illegible] کوئی موثر اقدامات نہیں کیے گئے ہیں اور یہ ارتکاز بڑھتا جارہا ہے۔ تیسرے منصوبے سے لے کر اب تک روزگار میں اضافے کے لیے کیے گئے اقدامات سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکے ہیں کیونکہ ساتھ ہی ساتھ ترقی کی حکمت عملی کے ایک تسلیم شدہ عنصر کے طور پر ٹیکنالوجیکل ترقی پر بھی زور دیا جاتا رہا ہے۔ گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی دستکاریوں کو جو اہم مقام عطا کیا گیا ہے اس سے محض تھوڑی سی پیداوار دینے والے پیشوں کو ہی بڑھاوا ملا ہے۔ مالی اور دیگر پالیسیوں کے تحت جو ٹرانسفر ادائیگیاں کی گئی ہیں وہ اتنی کم اور معمولی ہیں کہ نہ تو برسر روزگار افراد کی قوت آمدنی کو بڑھایا جا سکا ہے نہ غیر ہنرمند اور نیم ہنرمند محنت کشوں کے لیے کافی زیادہ روزگار پیدا کیا جا سکا ہے۔ تکنیکی تعلیم کی سہولیات میں حسب ضرورت توسیع و اضافہ نہیں ہوا ہے۔ اس کے بجائے ہم نے "انکلیو" طرز کی ترقی کو فروغ دیا ہے جو بعض سماجی و معاشی مفروضات کے تحت مدت طویل میں مواقع روزگار میں اضافہ اور غریبی میں کمی لا سکتی ہے لیکن اس وقت تو اہمیت اس بات کی ہے کہ موجودہ بے روزگاروں اور غریب و نادار لوگوں کو فوری فائدہ پہنچایا جائے۔ اعلیٰ تربیت یافتہ افرادی قوت کے لیے روزگار میں توسیع مسئلے کو محض چھو کر گزرتی ہے۔

مربوط دیہی ترقی کے پروگرام کی کارکردگی شاہد ہے کہ تمام بے زمین زرعی مزدوروں کو اثاثہ جات کی فراہمی ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ایک غیر صحت مند صورت حال پیدا ہو گئی ہے اور اثاثے کی از سر نو تقسیم کے اقدامات سے بڑا فائدہ مرفع الحال طبقات نے اٹھایا ہے۔ ایک غریب ملک میں اثاثوں اور آمدنی کو روایتی مالی اقدامات

[illegible] آتی ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کچھ کیا ہی نہیں گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ غریبی کا مسئلہ اتنا پیچیدہ اور بڑا ہے کہ ان اقدامات سے حل نہیں ہو سکتا اور ہمارے سیاسی ڈھانچے میں سوشلسٹ طرز کے بنیادی اقدامات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل ہماری حالت ویسی ہی ہے جو انگریزی شاعر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنی ان سطور میں بیان کی ہے:

We only live
only Suspire
Consumed by
either fire
or fire

(لٹل گڈنگ)

مربوط دیہی ترقی کے پروگرام کی کارکردگی شاہد ہے کہ تمام بے زمین زرعی مزدوروں کو اثاثہ جات کی فراہمی ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ایک غیر صحت مند صورت حال پیدا ہو گئی ہے اور اثاثے کی از سر نو تقسیم کے اقدامات سے بڑا فائدہ مرفع الحال طبقات نے اٹھایا ہے۔

دیہی معیشت کی تعمیر نو کی ضرورت

گاندھی جی ایک حقیقت پسند رہنما تھے۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کی اقتصادی ترقی کی کلید دیہات میں ہے۔ اسی لیے انھوں نے "گرام سوراج" کا سپنا دیکھا۔ دیہات کی غربت ملک کے سامنے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ کچھ سرکردہ ماہرین معاشیات نے ہندوستان کی سست رفتار اقتصادی ترقی کی اصل وجہ اس کی زرعی معیشت کی نوعیت کو قرار دیا ہے۔ اقتصادی ترقی کے لیے کیے گئے کچھ مثبت اقدامات کے باوجود ہندوستان کی دیہی معیشت پسماندہ ہے۔ دیہات سے غریب افراد تلاش معاش میں تیزی سے شہروں کا رخ کر رہے ہیں جہاں وہ جھگی جھونپڑیوں کے باسی

[illegible] بنتے ہیں۔ دیہی ترقی کے کام [illegible]
نیشنل رورل ایمپلائمنٹ پروگرام (NREP) [illegible] بے زمین دیہی افراد کے لیے روزگار کی گارنٹی کے پروگرام (RLEGP) ـــــــ سے حسب منشاء دیہی غرباء کو فائدہ نہیں پہنچا ہے اور اس کی وجہ ان پروگراموں کی تنظیمی اور عملی کمزوریاں ہیں۔ ان اسکیموں میں اثاثے کی منتقلی کی جو بات کہی گئی ہے اس سے بدعنوانیوں کی گنجائش نکال لی گئی ہے اور غرباء کی قرضداری میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ ان اسکیموں نے مختصر المدت روزگار تو فراہم کیا لیکن وہ دیہی غرباء کے معیار زندگی کو کسی بھی طرح بہتر نہیں بنا تیں۔ اس کے برعکس دیہات کے مرفع الحال طبقے کو اپنے اثاثہ جات کو بڑھانے کا موقع مل گیا جس سے موجودہ نابرابریاں اور بڑھ گئیں۔ وقت آ گیا ہے کہ ان پروگراموں پر تنقیدی انداز میں نظر ثانی کی جائے اور غریب افراد کو، جن کے لیے یہ پروگرام وضع کیے گئے تھے، حقیقتاً فائدہ پہنچانے کے لیے انھیں نئے سرے سے مرتب کیا جائے۔

اس سلسلے میں یہ بات باعث حیرت ہے کہ مربوط دیہی ترقی کے پروگرام (IRDP) کے لیے ساتویں منصوبے میں تقریباً ۵۵۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے جبکہ چھٹے منصوبے میں تقریباً ۱۷۰۰ کروڑ روپے مخصوص کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ۴۰۰۰ کروڑ روپے قرضوں کی صورت میں بینک فراہم کریں گے۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ ساتویں منصوبے میں مختصر المدت روزگار کی کوئی محدود گارنٹی بھی فراہم نہیں کی گئی ہے نہ ہی ہنرمند کاریگروں کی، جنھیں فائدہ مند طریقے سے کام پر لگایا جا سکتا ہے، اُجرت اور غیر ہنرمند جسمانی مزدوروں کی اُجرت میں کوئی تمیز کی گئی ہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ غریبی کو کم کرنے کی حکمت عملی میں تقسیم اشیاء یا اثاثہ کی اسکیموں کے بجائے

[illegible]

فروغ کے لیے تربیت دینے کی ضرورت ہوگی۔ [illegible] کی شناخت اور دیہی غیر زرعی مزدوروں کو [illegible]

غریبی کے خاتمے کے لیے تعلیم

"تعلیم کی چنوتی" (Challenge of Education) نامی دستاویز میں جو حکومت ہند کی جانب سے ۱۹۸۵ء میں شائع کی گئی تھی، تعلیم اور ترقی کے باہمی رشتے کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تعلیم اور روزگار کے درمیان باہمی تعلق ایک دوسرے سے مطابقت رکھتا ہے۔ خیال یہ ہے کہ تعلیم اقتصادی خرابیوں کے تدارک و انسداد کے لیے اہم انسانی سرمایہ ہے۔ ہنرمندیوں کو منتقل کرکے تعلیم دماغی قوت کو بڑھاتی ہے جو پیداوار و نفع بخش روزگار حاصل کرنے کے لیے ذہانت، حوصلہ اور ہمت پیدا کرتی ہے۔

لیکن گزشتہ برسوں میں تعلیم اور صحت پر مصارف میں کمی آتی گئی ہے۔ ہندوستان تعلیم پر تین فیصد سے بھی کم رقم خرچ کر رہا ہے جو اس سے بہت کم ہے جو ترقی یافتہ ممالک خرچ کر رہے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان کی دیہی آبادی کا ۹۴،۲ فیصد حصہ کسی قسم کے ہنر سے یکسر عاری ہے۔ ناخواندگی کی شرح بھی بہت زیادہ ہے صرف بیس فیصد مرد اور دس فیصد عورتیں خواندہ ہیں۔ یہ اندازہ بھی باعث تشویش و حیرت ہے کہ سن ۲۰۰۰ء تک ہندوستان میں پچاس کروڑ افراد ناخواندہ ہوں گے۔ تعلیم کی سماجی و معاشی (آڈیو و ڈیوژول) تکنیکوں کی مدد سے ہنر سکھانے اور جاب پر تربیت دینے کی ایک بہت بڑی مہم شروع کی گئی ہے۔ جب تک ناخواندگی کا خاتمہ نہیں کیا جاتا اس وقت تک دیہی عوام میں معاشی خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔

ایک ماحولیات جو اقتصادی ترقی کے لیے خطرہ

[illegible] کی جو اطلاع ہے کہ ۱۹۸۰ء میں ہر سال [illegible] پر جنگلات کو برقرار رکھا جا سکے گا۔ اس وقت جنگلات کا ایک ملین ہیکٹر اراضی پر دست اندازی کی جا رہی ہے۔ اڑیسہ میں ایک حالیہ سروے سے معلوم ہوا ہے کہ وہاں ۱۹۸۱ء تک تقریباً ۱۱۹۳ مربع کلو میٹر جنگلات ہر سال کاٹے جاتے رہے ہیں۔ اگر اسی رفتار سے جنگلات کی بربادی جاری رہی تو موجودہ صدی کے اختتام تک صرف ۴،۶ فیصد جنگلات ہی باقی رہیں گے۔ آدرش تو یہ ہے کہ تقریباً ۳۳ فیصد رقبۂ اراضی پر جنگلات ہونے چاہئیں۔ سوکھا پڑنے کی ایک بڑی وجہ

> اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان کے دیہی آبادی کا ۹۴،۲۰ فیصد حصہ کسی قسم کے ہنر سے یکسر عاری ہے۔ ناخواندگی کی شرح بھی بہت زیادہ ہے صرف بیس فیصد مرد اور دس فیصد عورتیں خواندہ ہیں۔ یہ اندازہ بھی باعثِ تشویش وحیرت ہے کہ سنہ ۲۰۰۰ء تک ہندوستان میں پچاس کروڑ افراد ناخواندہ ہوں گے۔

بڑے پیمانے پر جنگلات کا کاٹا جانا اور زمین کو ہریالی سے محروم کرنا ہے۔ اس سلسلے کو روکنا ہوگا۔ اس لیے قدرتی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے ایک ماحولیاتی پلان بنایا جانا چاہئے۔ قدرتی توازن کو برقرار رکھ کر ہی زمین کے کٹاؤ اور پہاڑیوں کے، درختوں سے محروم ہونے کو روکا جا سکے گا، بارش کو منضبط کیا جا سکے گا۔ شمسی توانائی کو انسانی استعمال میں لایا جا سکے گا اور معدنی دولت کو محفوظ رکھا جا سکے گا۔

ہندوستان کی اقتصادی پالیسیوں کے ناقدین کا کہنا ہے کہ ان پالیسیوں پر درست انداز میں عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے۔ یہاں بیوروکریسی کا رول

[illegible] میں [illegible] کی جانب سے کہ وہ بھی فریضہ کام کریں گے جیسے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اقتصادی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں سرمایہ دار منتظم کرتے تھے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں وہ یہ رول اہلیت و قابلیت کے ساتھ موثر ڈھنگ سے ادا کر سکیں۔ ان کے اندر آدرش سے عقیدت کا جذبہ ہونا چاہئے، نصب العین ان پر پوری طرح واضح ہونا چاہئے۔ اور انھیں انسداد غربت کے پروگراموں پر صدق دل سے عمل درآمد کرنا چاہئے۔

کچھ دنوں سے اس بارے میں کافی بحث چلی آرہی ہے کہ دورِ حاضر میں مرفع الحال یا اعلیٰ طبقے کی ضروریات کی اشیاء کی تیاری پر زیادہ زور ہے جس سے کہ عام آدمی کے استعمال میں آنے والی اشیاء کی تیاری پر بُرا اثر پڑا ہے اور وہ عدم توجہی کا شکار ہو گئی ہیں۔ ایلیٹ ازم "حصص کے سٹے"، اسکولوں کی اونچی فیسوں، شان و شوکت سے بھری ہوئی زندگی، پانچ ستارہ ثقافت، انتخابات کے لیے مالیات کی فراہمی اور اس طرح کے دوسرے امور کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ نے خبردار کیا ہے کہ ایلیٹ ازم کی وجہ سے ہندوستان میں سماجی کشیدگی بڑھنے کا اندیشہ ہے جس کے نتیجے میں طبقاتی کش مکش پیدا ہو سکتی ہے۔ اور ملک کی یکجہتی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ مانگ کو مدنظر رکھ کر کی جانے والی پیداوار سے بنیادی اشیائے ضروریہ کی سپلائی میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اور حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس صدی کے باقیماندہ تیرہ برسوں میں مجموعی قومی پیداوار میں ۷،۵ فیصد سالانہ کی شرح اضافہ کے باوجود غریبی مزید بڑھ سکتی ہے تاوقتیکہ مجموعی قومی پیداوار کے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی نہ لائی جائے اور اس کا رخ بنیادی نوعیت کی ضروری اشیاء کی تیاری کی طرف موڑ دیا جائے۔

(اقتصادی [illegible])

ایک نامور ماہرِ معاشیات کے قلم سے

غریب آدمی، عام آدمی

> مصنف نے عام آدمی اور غریب آدمی کے درمیان حد بندی کا ایک منطقی خط کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ غریب آدمی کی تشریح قطعی معانی میں حراروں کی کھپت اور فی کس ماہوار آمدنی کی شرح کی بنیاد پر کی گئی ہے تاہم عام آدمی کے بارے میں تصور واضح نہیں ہے جو اجناس کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے پیشِ نظر خود بھی غریب ہو سکتا ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ ٹی۔ وی سیٹ، گیس اسٹوو اور اسکوٹر جیسی متعدد صنعتی اشیاء اُن لوگوں کی رسائی میں نہیں ہیں جن کی آمدنی ۱۸ ہزار روپیہ سالانہ تک ہے اگرچہ وہ تسلیم شدہ خطِ افلاس سے بہت اوپر رہتے ہیں انہوں نے یہ تعجب خیز جانکاری دی ہے کہ ایک نہ سُدھرنے والے بیمار یونٹ میں ایک ملازمت کے تحفظ پر جو رقم خرچ کی جاتی ہے وہ انسدادِ افلاس کے پروگرام کے تحت دس ملازمتیں پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔ انھوں نے یہ بتانے میں صاف بیانی سے کام لیا ہے کہ آمدنی اور اثاثہ جات کے موجودہ تقسیمی نظام کے تحت جن کے پاس (مال و زر) ہے وہ اُس میں اضافہ چاہتے ہیں اور انھیں عموماً مل جاتا ہے۔ لہذا اُن کا بیان ہے کہ جو لوگ خطِ افلاس کے اوپر ہیں اور جو اُس کے نیچے ہیں ہم انھیں امداد اور امدادی اشیاء بہم نہیں پہونچا سکتے۔ ہمیں ان دو میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔
>
> (ایڈیٹر)

افلاس کا انسداد ہمارے منصوبوں کا مرکزی مقصد چلا آرہا ہے۔ اگرچہ افلاس پر براہِ راست وار کرنے والے پروگرام جیسے کہ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام اور قومی دیہی روزگار پروگرام وغیرہ مقابلتہً حال ہی کی پیداوار ہیں تاہم ہمارے ہر منصوبہ میں ان پروگراموں اور پالیسیوں کو کافی اہمیت دی گئی ہے جن کا مقصد آمدنیوں کی تقسیم کو بہتر بنانا اور تفاوتوں کو کم کرنا ہے۔ اگر حقیقی نتائج ہماری توقعات کے مطابق نہیں نکلے تو اس کا یقینی طور پر یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے منصوبہ سازوں میں سوجھ بوجھ یا عزم کی کمی تھی۔

۲۔ اس پیچیدہ مسئلہ کے حل کے لیے ضروری ہے کہ ہماری ترقیاتی حکمتِ عملی اور اُس سیاسی اور سماجی نظام پر اُس کے ردِعمل کا جامع اور تنقیدی جائزہ لیا جائے جس صورت میں کہ حصولِ آزادی کے بعد اُس کا ارتقاء ہوا ہے۔ یہ ماہرینِ اقتصادیات اور دیگر سماجی سائنسدانوں کے نزدیک تحقیق و مطالعہ کا ایک زرخیز شعبہ ہے۔ میں خود کو محض ایک "ناظم"

> کوئی بھی شخص جو شہری علاقوں میں ۱۶۰۰ روپے سالانہ سے زیادہ اور دیہی علاقوں میں ۱۳۰۰ روپے سالانہ سے زیادہ کھپت پر خرچ کرتا ہے اُس کے بارے میں خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ غریب نہیں ہے اور خط افلاس سے اوپر ہے۔ جب ہم افلاس کا انسداد کرنے یا افلاس سے متعلقہ پروگراموں کا ذکر کرتے ہیں تو یہ آبادی کا وہ حصہ ہوتا ہے جو کھپت کی اس سطح کے نیچے ہوتا ہے جسے نشانے کا گروپ تصور کیا جاتا ہے۔

ہوتا ہے کہ آیا مسئلہ افلاس کی حقیقت عملیاں تصویر میں بعض اوقات ہماری توقعات پر پوری کیوں نہیں اُترتیں؟ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ جو کچھ "عام آدمی" یا معیشت کے لیے اچھا ہے وہ "غریب آدمی" کے لیے بھی اچھا ہونا لازمی ہے۔

۳۔ بھارت میں خطِ افلاس کی تشریح قطعی معانی میں کی جاتی ہے۔ اس طرح افلاس کا اندازہ کرنے کے لیے جو خطِ افلاس استعمال کیا جاتا ہے اُس میں دیہی علاقوں میں فی کس روزانہ ۲۴۰۰ حرارون (کیلوری) کی ضرورت کے مطابق ۷۴-۱۹۷۳ء کی قیمتوں کے حساب سے ۴۹٫۰۹ روپے ماہوار کی آمدنی طے کی گئی ہے اور شہری علاقوں میں ۲۰۰۰ حرارون کی ضرورت کے مطابق آمدنی ۵۶٫۶۴ روپے ماہوار طے کی گئی ہے۔ بعد کے برسوں کے لیے "سی ایس او" (پرائیویٹ کھپت کو کم دکھلانے والے اعداد) کا استعمال کر کے دیہی علاقوں میں ۸۶-۱۹۸۵ء میں خطِ افلاس کے اندازے کے مطابق فی کس ماہوار آمدنی تقریباً ۱۱۶ روپے تھی اور اس حساب سے شہری علاقوں میں یہ آمدنی ۱۳۴ روپے ماہوار تھی۔ افلاس کی اس تشریح کے مطابق کوئی بھی شخص جو شہری علاقوں میں ۱۶۰۰ روپے سالانہ سے زیادہ اور دیہی علاقوں میں ۱۳۰۰ روپے سالانہ سے زیادہ کھپت پر خرچ

وہ غریب نہیں ہے اور خطِ افلاس سے اوپر ہے۔ جب ہم افلاس کا انسداد کرنے یا افلاس سے متعلقہ پروگراموں کا ذکر کرتے ہیں تو یہ آبادی کا وہ حصہ ہوتا ہے جو کھپت کی اس سطح کے نیچے ہوتا ہے جسے نشانے کا گروپ تصور کیا جاتا ہے۔ ساتویں پانچ سالہ منصوبے کے آغاز میں تقریباً ۴۰ فیصد آبادی اندازے کے مطابق خطِ افلاس کے نیچے تھی۔ خطِ افلاس کے نیچے رہنے والے افراد کی تعداد تقریباً ۲۷ کروڑ ۱۰ لاکھ تھی، جن میں سے ۲۲ کروڑ ۱۰ لاکھ دیہی علاقوں میں بود و باش رکھتے تھے۔

۴۔ آبادی کا ایک ایسا بڑا حصہ بھی خطِ افلاس سے اوپر ہے جسے نسبتاً غریب تصور کیا

جاتا ہے یا ایک سرکاری ملازم یا شہری کے مقابلے میں بدتر ہے۔ اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ آج ایک سرکاری ملازم کی کم از کم تنخواہ ۱۲ ہزار روپے سالانہ سے زائد ہے اور ایک کارخانے کا مزدور اُس سے بھی زیادہ کماتا ہے۔ ۸۶-۱۹۸۵ء میں پبلک سیکٹر کے ملازموں کی فی کس اوسط آمدنی ۲۶ ہزار روپے سالانہ تھی۔ یہ کسی بھی لحاظ سے شہری علاقوں میں اخراجات زندگی کو پورا کرنے کے لیے خصوصاً اونچے کرایوں اور عام کھپت کی اشیاء کی بڑھی ہوئی قیمتوں کے پیشِ نظر زیادہ نہیں تھی۔ قدرتی طور پر گو وہ ملازمت میں رہیں۔ تاہم انھیں محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ امیروں کی بڑھتی ہوئی خوشحالی اور اُن کی اعلیٰ سطح کی نمایاں کھپت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ امیروں کی تعداد تھوڑی ہو سکتی ہے لیکن اُن کے طرزِ زندگی کا عام انسان کی بہبود کے بارے میں تصور پر اہم اور نمایاں اثر پڑتا ہے۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ملک میں افلاس کی قطعی سطحوں کے مقابلے میں ادنیٰ سرکاری ملازم یا صنعتی مزدور کی آمدنی کی سطح بھی کافی بلند ہے۔

۵۔ ہمارے بیشتر بہبود اور امداد کے پروگرام ہمارے معاشرے میں نسبتاً کم آسودہ حال لوگوں کو امداد بہم پہنچانے کے لیے بنائے گئے ہیں گو وہ بھی قطعی معانی میں حقیقی طور پر غریبوں سے کئی گنا بہتر ہیں۔ مثال کے طور پر ہماری مالی پالیسی ملاحظہ کیجیے۔ انکم ٹیکس سے استثنیٰ کی حد ۱۸ ہزار روپے سالانہ ہے۔ معیاری تخفیف اور بعض دیگر مراعات کو یکجا کیا جائے تو کسی بھی ایسے شخص کی طرف سے انکم ٹیکس دینے کا امکان نہیں رہتا جس کی سالانہ آمدنی

۳ ہزار روپیے ماہوار کے حساب سے عملی استثنائی
حد ملک کی فی کس آمدنی کی تقریباً ۱۳ گنا اور ان افراد
کی آمدنی کی سطح کی ۲۰ گنا سے زیادہ ہے جو خطِ افلاس
کے نیچے رہتے ہیں۔ اس پر بھی استثنائی حد کو بڑھانے
کی بار بار مانگ کی جا رہی ہے۔ اسی طرح ہمارے
ٹیکس کے ڈھانچے میں بچت کے لیے متعدد مراعات
مہیا کی گئی ہیں۔ ان مراعات
سے بڑا فائدہ اٹھانے
والے وہ افراد ہیں جن کی
سالانہ آمدنی ۲۵ ہزار
روپے سے زیادہ ہے۔ یہ
دلیل دی جا سکتی ہے اور شائد
بجا طور پر دی جا سکتی ہے کہ انکم
ٹیکس میں بچتوں کی مراعات دینا
ضروری ہے تاکہ انکم ٹیکس دہندگان کی طرف سے
بچتوں کو فروغ ملے۔ لیکن اس سے حقیقت کو بدلا نہیں
جا سکتا کہ ان مراعات کا فائدہ ہماری آبادی کے بہت
تھوڑے حصے کو پہونچتا ہے جس کی قابلِ ٹیکس آمدنی
خطِ افلاس سے کئی گنا اوپر ہے۔
۶۔ ہم نے ایک خاص حد کے نیچے صنعتوں میں
پیداوار پر پیداواری محاصل (ایکسائز ڈیوٹی) سے
بھی کافی چھوٹ دے رکھی ہے۔ بعض صنعتی پیداواری
اشیاء پر بھی جو عام کھپت کی اشیاء تصور کی جاتی ہیں
نسبتاً کم ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ صنعتی ترقی اور صنعتی
بکھراؤ کو فروغ دینے اور مانگ بڑھانے کی غرض
سے ان مراعات کو بخوبی حق بجانب ٹھہرایا جا سکتا
ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ خطِ افلاس کے
نیچے رہنے والوں کے لیے ان کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔
نیشنل کونسل آف اپلائڈ اکانومک ریسرچ کی طرف
سے حال ہی میں مختلف آمدنی کے طبقوں کی طرف سے
گھریلو کھپت کے بارے میں جو سروے کیا گیا ہے اس
سے بعض دلچسپ باتیں علم میں آئی ہیں۔ اس سروے

سے پتہ چلتا ہے کہ بیشتر اشیاء کی کھپت اُن کنبوں
کی طرف سے نہیں کی جاتی جن کی گھریلو آمدنی ۹ ہزار
روپے سالانہ ہے حتیٰ کہ ۱۸ ہزار روپیے سالانہ
سے بھی کم ہے۔ ان میں تقریباً تمام پائیدار کھپت کی
اشیاء شامل ہیں جن کے زمرہ میں بلیک اینڈ وائٹ
ٹی۔وی، گیس اسٹوو، سلائی کی مشینیں، سوٹ کیس
اسکوٹر، موپیڈ اور گیس اوون آتے ہیں۔ یہ اُن ۱۰۰۰
گھرانوں میں ۲۰ سے بھی کم کی طرف سے خریدی
جاتی ہیں جن کی آمدنی
۱۸ ہزار روپیے سالانہ سے
کم ہے۔ تعجب یہ ہے کہ یہ نہانے
کے صابن، بسکٹوں بناسپتی، اے بی
ٹوکلز اور فلموں وغیرہ جیسی کھپت کی
متعدد اشیاء کے بارے میں بھی صحیح ہے جن
پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔
۷۔ ہم عوامی تقسیمی نظام (پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم)
کے ذریعہ خوراک کی تقسیم میں تقریباً ۲ ہزار کروڑ روپے
کی رقم بطور امداد خرچ کرتے ہیں۔ فرٹیلائزر کی تقسیم
میں بھی مزید ۲۵۰۰ کروڑ روپے کی امداد دی جاتی
ہے۔ شہری علاقوں میں مناسب دام کی قیمتوں کی دکانوں
میں جو توسیع ہوئی ہے وہ بہت اچھی ہے۔
پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم غذائی سلامتی
اور کاشتکاری کے لیے منافع بخش قیمتوں کی یقین

امیروں کی تعداد تھوڑی ہو سکتی ہے لیکن اُن کے طرزِ زندگی کا عام انسان کی بہبود کے بارے میں تصوّر پر اہم اور نمایاں اثر پڑتا ہے تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ملک میں افلاس کی قطعی سطحوں کے مقابلے میں ادنیٰ سرکاری ملازم یا صنعتی مزدور کی آمدنی کی سطح بھی کافی بلند ہے۔

دہانی کے لیے بھی ایک اہم قدم ہے۔ اس کے
باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے دیہی
علاقوں میں جہاں زیادہ تر ہمارے غریب عوام رہتے
ہیں۔ پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم کے وسائل محدود رہے
یہ دیکھنا بھی باعثِ دلچسپی ہے کہ بعض ریاستیں
جہاں افلاس بہت زیادہ ہے وہی ریاستیں ہیں جو
متعدد اسباب سے پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم سے
بہت کم فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اگرچہ خوراکی امداد کے
لیے اہم اقتصادی اسباب
ہیں تاہم افلاس
کا قطعی
انسداد اُن
میں نہیں ہے۔
۸۔ حکومت نے
پرائیویٹ سیکٹر کے بیمار یونٹوں
کو بھاری تعداد میں اپنی تحویل میں
لیا ہے تاکہ ایسے یونٹوں میں روزگار
کا تحفظ کیا جا سکے۔ انھیں زندہ رکھنے
میں سال بہ سال اربوں روپوں کا نقصان
ہو رہا ہے۔ بعض یونٹوں میں تو سال
میں کل جتنی تنخواہ دی جاتی ہے نقصان
اُس سے کہیں زیادہ ہو رہا ہے۔ ایک
نہ سُدھرنے والے بیمار یونٹ میں
ایک ملازمت کے تحفظ پر جتنا روپیہ خرچ کیا جا رہا
ہے۔ وہ انسدادِ افلاس کے پروگراموں کے تحت دس
ملازمتیں پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایک سماجی
نقطۂ نگاہ سے اُن لوگوں کی ملازمتوں کے تحفظ کے
لیے یہ معاملہ درست ہو سکتا ہے جو ان یونٹوں میں
ملازم ہیں لیکن یہ امر خود واضح ہے کہ اس پالیسی سے
اگرچہ کسی دیگر مقصد کا حصول ہوتا ہے تاہم اُن
لوگوں کو فائدہ نہیں پہونچتا جنھیں روزگار کے لیے

کوئی موقع حاصل نہیں اور اس کے نتیجے میں جن کی کھپت کی موجودہ سطح خطِ افلاس سے نیچے ہے۔

۹۔ مندرجہ بالا قسم کی مثالیں ہماری معیشت کے تقریباً تمام سیکٹروں میں سے کئی گنا دی جاسکتی ہیں۔ ان کے ذکر کرنے سے میری مراد ان اہم مقاصد کو نیست و نابود کرنا نہیں جنھیں ان میں سے بیشتر پالیسیاں پورا کر رہی ہیں اور نہ ہی انھیں جاری رکھنے کی تمام تر اقتصادی موزونیت پر حرف گیری کرنا ہے۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کا سامنا ضرور کرنا چاہیئے کہ یہ پالیسیاں لازماً ان غریب لوگوں کے کاز کو پورا نہیں کرتیں جو خطِ افلاس کے نیچے رہتے ہیں۔

۱۰۔ حالیہ برسوں میں چند اہم پروگرام، خصوصاً مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام اور قومی دیہی روزگار پروگرام شروع کیے گئے ہیں جو خاص طور پر ان لوگوں کی آمدنی بڑھانے کے لیے تیار کیے گئے ہیں جو خطِ افلاس کے نیچے رہتے ہیں یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ان پروگراموں کا افلاس کی سطح پر اچھا اثر پڑ چکا ہے۔ گو بیشتر خامیاں موجود ہیں، جنھیں درست کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ان پروگراموں پر ہمارے کل اخراجات ابھی تک کل قومی پیداوار کے ایک فیصد سے بھی کم ہیں۔ دیہی علاقوں میں افلاس کے عظیم مسئلہ کو حل کرنے کے لیے یہ کافی نہیں ہیں۔

بنیادی ضروریات

ساتویں پانچ سالہ منصوبے کی تہہ میں کارفرما طویل المدتی حکمتِ عملی کا مقصد ۲۰۰۰ء تک افلاس کا انسداد کرنا ہے اس مقصد کے حصول کے لیے ایک موزوں پالیسی کے ڈھانچے کی ترتیب میں ماخوذ امور پیچیدہ ہیں اور یہ واضح نہیں ہے کہ آیا پالیسی کا ایسا ڈھانچہ مضبوطی سے اپنی جگہ پر رکھا گیا ہے۔ ہمارا سابقہ تجربہ بتاتا ہے کہ ۱۰ سے ۱۵ برس کے نسبتاً مختصر عرصے میں افلاس کے انسداد کے لیے ایک موثر حکمتِ عملی مرتب کرنے کے لیے تین "بنیادی" ضروریات ہیں۔ یہ کسی بھی طرح اپنے طور پر کافی نہیں ہیں۔ اور متعدد بنیادی امور کی طرف توجہ دینا بھی ضروری ہے جن میں اصلاحاتِ اراضی بھی شامل ہیں۔ لیکن جب تک یہ بنیادی ضروریات پوری نہیں ہوں گی مختصر عرصے میں کچھ بھی کامیابی نہیں ہوسکتی۔

سب سے پہلی اور بڑی بات یہ ہے کہ معیشت میں بچت کی شرح بڑھانا لازمی ہے۔ گو آج کے مسائل پر روائتی معاشیات کے اطلاق کے بارے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ تاہم ترقی کو بڑھاوا دینے میں سرمایہ کے اجتماع کے مرکزی کردار کو چنوتی نہیں دی گئی ہے بھارت میں ۸۰-۱۹۷۹ء کے بعد سے گھریلو بچت کی شرح ۲۳ فیصد کے آس پاس رہی ہے۔ بچت کی اس سطح پر بھی معیشت میں سرمایہ کی تشکیل کی شرح بہت زیادہ بیان کی گئی ہے۔ ڈاکٹر کے این راج کی زیرِ صدارت بچت سے متعلق ورکنگ گروپ کی طرف سے بتایا گیا تھا کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آخری برسوں میں کُل مقررہ سرمایہ کی تشکیل کی جو شرح کُل قومی پیداوار کا تقریباً ۱۸ فیصد تھی وہ ۱۹۶۰ء کے وسط کے برسوں کے مقابلے میں زیادہ نہیں تھی اور ۱۹۵۰ء کے وسطی برسوں کے مقابلے میں محض تقریباً دو تہائی زیادہ تھی۔ جبکہ وہ کُل قومی پیداوار کا تقریباً ۱۱ فیصد تھی۔ حالیہ اعداد و شمار سے اس رجحان میں کسی تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا۔ گھریلو بچت کی شرح میں درحقیقت اضافے کا مطلب ہے کھپت کی افزائش میں کمی۔ یہ انسدادِ افلاس کی حکمتِ عملی کے ضمن میں پالیسی کا ایک اہم معمہ ہے۔ اگرچہ کُل کھپت کی افزائش کی شرح کو کم کرنا ہوگا تاہم غریبوں کی کھپت کی شرح کو تیز رفتاری سے بڑھانا ہوگا۔ اس کو صرف اس صورت میں حل کیا جاسکتا ہے جس صورت میں ان لوگوں کی کھپت کی شرح افزائش کو جو خطِ افلاس سے اوپر ہیں اس شرح پر بڑھایا جائے جو اوسط سے بہت کم ہو۔

ہمارے معاشرے کی تنظیم اور آمدنی اور اثاثہ جات کی موجودہ تقسیم کچھ ایسی ہے کہ جن کے پاس (مال و زر) ہے وہ مزید چاہتے ہیں اور وہ انھیں عموماً مل جاتا ہے۔ یہ استدلال بھی دیا جاسکتا ہے کہ کھپت کو کم کرنے سے متعلق پالیسیوں کا افزائش کی ترغیبات پر اثر پڑے گا۔ ایک ممکن حل یہ ہے کہ پیداوار کے طریقِ کار کو منضبط کیا جائے، تاکہ

> پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم غذائی سلامتی اور کاشت کاروں کے لیے منافع بخش قیمتوں کی یقین دہانی کے لیے بھی ایک اہم قدم ہے۔ اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے دیہی علاقوں میں جہاں زیادہ تر ہمارے غریب عوام رہتے ہیں۔ پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم کی رسائی محدود ہے۔

اُجرتی مالی کے سے لئے کھپت کا مال محض کچھ عرصہ تک دستیاب نہ ہو۔ اس حکمتِ عملی سے بھی کئی مشکلات اور خطرات پیدا ہوسکتے ہیں جن میں اسمگلنگ کا امکان بھی ہوسکتا ہے۔

۱۵۔ انسداد افلاس کی موثر حکمتِ عملی کی دوسری بنیادی ضرورت ہے کہ پبلک سرمایہ کاری میں اضافہ اُس شرح سے بہت زیادہ ہونا چاہیئے جس شرح سے حالیہ برسوں میں ہوا ہے۔ جن سرمایہ کاریوں کا انسداد افلاس سے براہِ راست تعلق ہے وہ ہیں اجتماعی سرمایہ کاریاں (یعنی صحت عامّہ تعلیم، بنیادی ڈھانچہ اور آبپاشی) مارکیٹ یا پرائیویٹ کاروبار ایسی سرمایہ کاریوں کے مؤثر نعم البدل فراہم نہیں کرسکتے۔ پبلک سرمایہ کاری کی اعلیٰ تر سطح کی غیر افراطِ زر والی مالیات سے مراد ہے کہ عوامی بچت میں اضافہ ضروری ہے۔ یہ صرف تب ممکن ہے اگر پبلک سرمایہ کاری کی پیداواریت بڑھے اور معاشرے کی مزید بچت کا پبلک سیکٹر کے ذریعہ شیرازہ بندی ہو لیکن اس سلسلے میں حالیہ بچتوں کے رجحانات پریشان کن ہیں۔ مثال کے طور پر مرکزی بجٹ میں ۸۸–۱۹۸۷ء میں ۵ ہزار کروڑ روپے کی منفی خاص بچت دکھائی گئی ہے (بجٹ تخمینہ جات)۔ ۸۰–۱۹۷۹ء کے بعد سے کھپت کے اخراجات میں ۵ و ۱۸ فیصد کی سالانہ شرح سے اضافہ ہوا ہے جو قومی آمدنی کی افزائش سے بہت زیادہ ہے۔ ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں ٹیکس آمدنی میں بھاری اضافے کے باوجود حکومت اب اپنی نجی کھپت کی ضروریات کو پورا کرنے کے

لیے قرض پر لیے ہوئے فنڈوں پر انحصار کر رہی ہے۔

۱۶۔ ایک تیسری بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ہمارے لیے اُن پروگراموں پر زیادہ خرچ کرنا ضروری ہے جو افلاس کے مسئلہ پر براہِ راست وار کرتے ہیں۔ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام

اور قومی دیہی روزگار پروگرام جیسے پروگراموں نے بیشتر خامیوں کے باوجود نہایت غریب عوام میں روزگار اور آمدنی پیدا کرنے میں اپنی افادیت کا ثبوت دیا ہے۔ دیہی علاقوں خصوصًا قبائلی خشک سالی زدہ پہاڑی علاقوں میں افلاس کا جو ڈھانچہ ہے اُس میں غریبوں کے لیے امدادی خوراک کا پروگرام انسداد افلاس کی حکمتِ عملی کا جزو لاینفک ہونا چاہیئے۔ وسائل کی محدودیت کو دیکھتے ہوئے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اُن پروگراموں میں جن سے خطِ افلاس کے اوپر رہنے والے لوگ مستفید ہوتے ہیں بھاری کٹوتی کئے بغیر افلاس زدگان کی براہِ راست امداد سے متعلق پروگراموں کے لیے

ایک نہ سُدھرنے والے بیمار یونٹ میں ایک ملازمت کے تحفظ پر جتنا روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے وہ انسداد افلاس کے پروگراموں کے تحت دس ملازمتیں پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایک سماجی نقطۂ نگاہ سے اُن لوگوں کی ملازمتوں کے تحفظ کے لیے یہ معاملہ دُرست ہوسکتا ہے جو اُن یونٹوں میں ملازم ہیں۔

گھریلو بچت کی شرح میں درحقیقت اضافے کا مطلب ہے کھپت کی افزائش میں کمی۔ یہ انسداد افلاس کی حکمتِ عملی کے ضمن میں پالیسی کا ایک اہم معمّہ ہے۔ اگرچہ کُل کھپت کی افزائش کی شرح کو کم کرنا ہوگا تاہم غریبوں کی کھپت کی شرح کو تیز رفتاری سے بڑھانا ہوگا۔

کاڈی سرمایہ بہم نہیں پہنچایا جا سکتا۔ اگر امدادی اشیاء دینے کا رُخ دوبارہ غریبوں کی طرف موڑے اور بعض قسم کے سرکاری اخراجات کو کم کرنے سے متعلق پالیسیاں وضع کی جاسکیں اور انھیں مضبوط قومی اتفاق رائے کی پُشت پناہی حاصل ہو تو ملک کو افلاس کے براہِ راست تدارک سے متعلقہ

مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام اور قومی دیہی روزگار پروگرام جیسے پروگراموں نے بیشتر خامیوں کے باوجود نہایت غریب عوام میں روزگار اور آمدنی پیدا کرنے میں اپنی افادیت کا ثبوت دیا ہے۔ دیہی علاقوں، خصوصاً قبائلی، خشک سالی زدہ پہاڑی علاقوں میں افلاس کا جو ڈھانچہ ہے اُس میں غریبوں کے لیے امدادی خوراک کا پروگرام انسدادِ افلاس کی حکمتِ عملی کا جزو لاینفک ہونا چاہیئے۔

پروگراموں پر اپنی کُل ملکی پیداوار کا کم از کم تین فیصد صرف کرنا چاہیئے۔ تاہم جو لوگ خطِ افلاس کے اوپر ہیں اور جو اُس کے نیچے ہیں ہم اِن دونوں کو امداد اور امدادی اشیاء بہم نہیں پہنچا سکتے۔ ہمیں اُن میں سے انتخاب کرنا ہوگا۔

یہ مشکل امور ہیں۔ یہ واضح نہیں ہے کہ کیا ہم اپنی پالیسیوں اور اُمنگوں کو مطلوبہ سمتوں میں لے جانے کے لیے صلاحیت اور عزم رکھتے ہیں شاید بہترین کام جس کی حقیقتاً توقع کی جا سکتی ہے اور جو واقعی کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ کچھ کچھ سب کے لیے کیا جائے جس سے مستقبل کے لیے اچھی اُمید بندھ جاتی ہے۔ لیکن یہ امور بحث طلب ہیں تاکہ اس صدی کے آخر تک افلاس کے انسداد کے امکان کے بارے میں ایک واضح تناظر ظہور میں آسکے۔ ●

بقیہ: پیداواری اضافہ اور انصاف

اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان اسلحہ کی تجارت پر ذرا غور کریں۔ بعض صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں سب سے بڑی برآمد اسلحہ جات کی ہے، اور یہ اربوں کھربوں ڈالر میں ہے۔ اگر اس میں کمی ہو جائے تو کیا ان کی معیشت کو دھکا نہیں پہنچے گا۔ تباہی کے اس سامان کو بیچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی مانگ پیدا ہو اور بڑھتی جائے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ملک الف، ملک ب کے ساتھ لڑائی میں لگاتار مصروف رہے، ملک ج پر ملک د کے حملہ کا خطرہ برابر بنا رہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ تمام ملک جنگی سامان تیار کرنے والے ترقی یافتہ ممالک پر ڈورے ڈالتے رہیں گے تاکہ وہ ان کو تباہی کا جدید ترین ہتھیار عنایت کر دے اور تمام دنیا ایٹمی جنگ کے خطرے سے دم بخود رہے گی۔ اب آپ سوچیے اس کے اثرات ہمارے جیسے غریب ملک کے وسائل پر کیا نہ ہوں گے۔

صاف بات یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں غریبی ختم کرنے کے لیے عالمی امن اور تخفیف اسلحہ ضروری شرائط ہیں مگر محض ان سے بھی تو مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ مگر یہ طے ہے کہ نیوکلیائی میزائل بنتے رہیں گے تو غریبی کے خاتمہ کی کوئی صورت نہ نکلے گی۔

سائنس اور ٹیکنالوجی ترقی کے اوزار ہیں۔ تاریخ کے آئینہ میں نظر آ جائے گا کہ یہ ہمیشہ بڑی طاقتوں کے ہاتھ میں رہے ہیں اور ترقی کی جہت بھی انھوں نے ہی مقرر کی ہے۔ لیکن ہمارے معاملہ میں یہ دیہی آبادی کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے اوزار ہو سکتے ہیں۔ آج ہمارے ساتھ علم کا خزانہ بھی ہے اور لوگ بھی جن میں ذوق و شوق ہے۔ لیکن حالات کچھ ایسے پیدا کرنے ہوں گے کہ وہ عمل کے لیے کمر ہمت باندھیں۔ خاص طور پر اعلیٰ تربیت یافتہ نوجوان۔

جہاں تک آمدنی، اثاثے اور مواقع کی از سرِ نو تقسیم کا کلیدی سوال ہے تو اس کا تعلق منصوبہ بند اقتصادی ترقی سے زیادہ تغیر و تبدل کے سماجی سیاسی عمل سے ہے۔ منصوبہ بند اقتصادی ترقی سے، غریبی ہٹاؤ تو بعد میں ہوگا پہلے "غریبی گھٹاؤ" ہوگا۔ اس ذیل میں چلائے جانے والے براہِ راست پروگرام غریبی کی پستی کو کچھ نہ کچھ ضرور کم کریں گے۔

ہمارے آئین میں صاف اشارے ہیں کہ طاقت کو ایک مرکز پر نہ جمع ہونے دیا جائے اور جمہوری رنگ میں رنگا جائے۔ اس سے ہی ایسی بنیاد بن سکتی ہے کہ جس پر ترقی کے پھلوں کی مساویانہ تقسیم کی جا سکے گی۔ منصوبہ بند ترقی کی رفتار اور ترجیحات یقیناً اس عمل کو تیز بھی بنا سکتے ہیں اور سست بھی کر سکتے ہیں۔ ●

ڈاکٹر جی ایس۔ ستیارام

ٹیکنالوجی
ملک کی ترقّی کا راستہ

دُنیا تیزی کے ساتھ بدل رہی ہے، اقتصادی پسماندگی دُور کرنے اور سماج کا یا پلٹ اور ترقی کے لیے اب ٹیکنالوجی کا سہارا لینا لازمی ضرورت بن چکا ہے، فاضل مصنّف نے پُرزور انداز میں سائنس اور منضبط اندازِ فکر کی ضرورت پر زور دیا ہے تاکہ اس کے ذریعے سے ۲۱ ویں صدی کے چیلنجوں سے نبٹا جا سکے، ہندوستان میں افرادی قوّت کے وسائل بے پناہ ہیں لیکن فاضل مصنّف کی رائے میں انقلابی ترقیوں اور تبدیلیوں کے اس دَور میں معیار کی بلندی درکار ہے نہ کہ تعداد۔ گزشتہ چند برسوں میں ہر فرقہ اپنے آپ کو پسماندہ بنانے کی کوشش میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی تیاری کرتا رہا ہے جس کا مقصد محض یہ ہے کہ ریزرویشن کے اصول سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جائے، اُن کے نزدیک اقتصادی پسماندگی اور پچھڑے پن کا قریبی رشتہ ہے۔ چنانچہ مواصلات اور رابطۂ عام کے نئے وسائل کے بہتر استعمال، اب تک نظرانداز کیے گئے طبقات کی بہتری کے اقدامات نیز ظلمت پسندی اور فرسودہ نظریات سے نجات کے ذریعے ہی غریبی دُور ہو سکتی ہے۔

[...]ارت مستقبل کی تابناکیوں کے [...]ن مثال ہے اور یہ ہمیشہ [...]ے ایک مثال بنا رہے گا۔

(نامعلوم)

ہمارا ملک اب اکیسویں صدی کی [...] قدم بڑھا رہا ہے اور اس موقع پر ایسی ایسی [...]یاں ظہور پذیر ہو رہی ہیں جن کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جدید ٹیکنالوجی ان تمام تبدیلیوں میں کلیدی اہمیت کی حامل ہے۔ ٹیکنالوجی اس قدر ترقی کر چکی ہے جس کا پہلے کبھی اندازہ نہیں کیا گیا تھا، اس ٹیکنالوجی نے تہذیب کے ترقی یافتہ گوشوں کا احاطہ کر لیا ہے۔ چنانچہ مستقبل کا مورخ جب تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو وہ نوعِ انسانی کی پوری تاریخ کو دو حصّوں میں بانٹے گا۔ پہلا دَور وہ ہوگا جو کہ کمپیوٹر کے استعمال سے قبل کا ہے، دوسرا دَور وہ ہے جبکہ کمپیوٹر نے اپنی حیرت انگیز کارگزاریوں سے محیرّ العقول کارنامے انجام دیے ہیں۔ کمپیوٹر کے ارتقا نے انسان کی صلاحیتوں کو بڑھا دیا ہے۔ اب اسے تخلیق و تباہی کی قوتیں اور صلاحیتیں حاصل ہیں اور یہ کام انتہائی تیزی سے انجام پا رہا ہے۔ تیکنیکی تبدیلی کی موجودہ لہر نوعِ انسا[...]

کی تاریخ کا نادر الوجود کارنامہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مستقبل کا مورخ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ انسانی تاریخ کا آغاز دراصل کمپیوٹر کے عہد سے ہی ہوا۔ جدید ترین ٹیکنالوجی کے سبب پوری دنیا کا نقشہ ہی بدل رہا ہے۔

حیاتیاتی اور جین کی سائنس یعنی جنیٹکس نے کلیدی اہمیت حاصل کرلی ہے۔ بائیو ٹیکنالوجی، حیاتیاتی سائنس اور سپر کنڈکٹوٹی کی سائنس نے نمایاں پیش رفت کی ہے۔ آج کل ہر کام روبوٹ کی مدد سے انجام دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خلائی ڈاکنگ ٹیکنالوجی، [illegible]، کمپیوٹر سائنس، میڈیسن وغیرہ کے شعبوں میں حیرت انگیز تبدیلیاں دیکھنے کو ملی ہیں۔ مواصلاتی تکنیک، رابطہ عام کے ذرائع میں زبردست انقلابات آچکے ہیں۔ ان میں فائبر آپٹکس کا استعمال بڑھا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اب دراصل یہی دوڑ ہے کہ کون سا ملک تکنیکی ترقی کے اعتبار سے سب سے آگے ہو۔

جاپان میں پانچویں نسل کے کمپیوٹر کی طرف پیش رفت ہو چکی ہے اور پانچواں اور چھٹا سلسلہ معرض وجود میں آنے والا ہے۔ مستقبل میں مصنوعی ذہانت کا دور دورہ ہوگا۔ ہماری کی ٹیکنالوجی میں زبردست ترقی ہوئی ہے۔ اس وجہ سے پوری دنیا سکڑ کر مختصر ہو گئی ہے۔ پوری دنیا میں آپس میں ایک دوسرے پر انحصار کا تانا بانا بڑھ رہا ہے۔ نوع انسانی کی تاریخ میں پہلی بار عالمی برادری کا تصور فروغ پا رہا ہے۔ مالیات، سامان اور کروڑوں افراد قومی سطح پار کر رہے ہیں۔ محض قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی برادریاں جنم لے رہی ہیں مثلاً یورپ کی اقتصادی برادری۔ اب برادری محدود نہ رہ کر وسیع تر ہوتی جا رہی ہے، فاصلے اب سمٹ گئے ہیں، ڈیجیٹل نظام مواصلات نے لفظ فاصلہ کو بے معنی بنا دیا ہے، الیکٹرانک نظام پر مبنی ڈاک کا نظام بینکنگ، ٹیلی ٹائپ، ٹیلی ٹیکسٹ، ٹیلی کانفرنس وغیرہ ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔ بیرونی خلاء میں کھوج کا کام ترقی پر ہے۔

بے پناہ ترقی کا نظام۔ انسان کی لغت سے 'ناممکن' کا لفظ خارج ہوا جا رہا ہے

مستقبل کی ترقی کا دارومدار اس امر پر ہے کہ بھارت کس حد تک ان جدید ٹیکنالوجیوں سے استفادے کی صلاحیت رکھتا ہے، خاص کر جدید ترین شعبوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت اس میں کس قدر ہے۔

یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا عہد ہے، ٹیکنالوجی کی ترقی تیزی سے عمل میں آنے سے دنیا کا نقشہ بدل رہا ہے۔ ایک انجینیر سے جب یہ پوچھا گیا کہ وہ گزشتہ تین برسوں میں دو ہفتے کی چھٹی پر بھی باہر نہیں گئے۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے یہ ڈر رہا کہ کہیں اس وقفے میں ٹیکنالوجی نہ بدل جائے جس سے کہ وہ چھٹی کے دنوں میں اس سے ناواقف رہ جانے کے سبب بے کار ہو کر رہ جائے۔ ایک زمانے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ انگریزی زبان عالمگیر زبان ہے۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمپیوٹر سافٹ ویر ہی عالمگیر زبان بن سکے گا عالمی سطح پر ٹیکنالوجی کے فروغ سے جو ترقیاں عمل میں آ رہی ہیں، ان کا مرکز کیلی فورنیا کی اسٹین فورڈ یونیورسٹی اور ایم آئی ٹی میسوچوسٹس ہے۔ اس کے ساتھ ہی عالمی سطح پر بڑے شہر ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔ اس ترقی کے سبب آئندہ پندرہ برسوں میں بھارت کے سامنے زبردست چیلنج ہیں، مستقبل کی ترقی کا دارومدار اس امر پر ہے کہ بھارت کس حد تک ان جدید ٹیکنالوجیوں سے استفادے کی صلاحیت رکھتا ہے، خاص کر جدید ترین شعبوں سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت اس میں کس قدر ہے۔ چونکہ ہمارے پڑوس میں چین نے جدید نظام کو اپنانے کا پروگرام اختیار کیا ہے، اس وجہ سے جدید کاری اور بھی ضروری ہوگئی ہے۔ چین کا ترقی کا پروگرام ایسا ہے جس سے آئندہ ۱۵ تا ۲۰ برسوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی میں اس کا شمار ترقی یافتہ ملکوں میں ہونے لگے گا۔ جنوب مشرقی ایشیا اور لاطینی امریکہ کے ممالک بھی جدید کاری کے پروگراموں کو اپنائے ہوئے ہیں، امریکہ، جاپان اور مغربی جرمنی تو اس سلسلے میں پہلے ہی اپنا نام رکھتے ہیں۔

بھارت کا دعویٰ ہے کہ یہاں سائنسی افرادی قوت کی تعداد دنیا کے ملکوں میں تیسرے نمبر پر ہے لیکن حالات تو یہ ہیں کہ نئی ایجادات کا اعشاریہ ایک فیصد حصہ بھی ہمارے نام سے نہیں ہے حالانکہ بھارت کی آبادی دنیا کی آبادی کے ۲۰ فیصد کے برابر ہے۔ ایسا نہیں کہ ذہانت کی کمی کے باعث ہمارے یہاں ایجادات نہیں ہو پاتیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستانی اور یہودی دونوں کو ہی امریکی حلقوں میں سب سے زیادہ ذہین شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ بھارت کے اس ماحول کی دین ہے جس میں معمولی صلاحیت کے لوگوں کو نوازا جاتا ہے اور ذہانت دکھانے پر نقصان

اٹھانا پڑتا ہے۔ تخلیق کاروں کے لیے بھارت ایک خطرناک ملک ہے۔ یہاں کے سماجی طور طریق اور رویّے گھٹن والے ہیں، چنانچہ جستجو اور تلاش سے دلچسپی رکھنے والے افراد امریکہ جانا پسند کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ ہماری ثقافت روایتوں کی مختلف اشکال پر زور دیتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے اُس کے مغز پر اُس کی نظر نہیں رہتی اور یہ اصل رُوح سے دور ہو جاتے ہیں۔ اس سے بلاوجہ دہشت اور خوف پیدا ہوتا ہے۔ اور اس سے خود اعتمادی کو دھکا پہونچتا ہے۔ متوسط طبقے کے زیادہ تر لوگ اپنے نقطۂ نظر کو پُرزور انداز میں پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور ان کی شخصیت میں وہ اُبھار نہیں آتا جو آنا چاہیئے تھا۔ ہندوستانیوں کی زندگی میں ہمّت اور سالمیت نایاب صفات ہیں۔ اس کے بغیر ان کی شخصیت اُبھرنے نہیں پاتی۔ اور پیشقدمی کرنے کی جرأت پیدا نہیں ہوتی۔ تحقیق و ترقی کے ہندوستانی ادارے جن میں کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کی لیبارٹریاں بھی شامل ہیں، خاطر خواہ کام نہیں کر پاتیں اور وہ بیمار نظر آتی ہیں۔

ہم گروپ بنا کر کام کرنے میں قطعی ناکام ہیں، ہم ایک دوسرے کی کوششوں کو اس طرح نہیں سراہتے جس سے اس کی ہمّت افزائی ہو بلکہ ہماری کوشش اس کو دل شکستہ کرنے کی ہوتی ہے۔ ہندوستانی سائنسدانوں کے رویّے "مارو گولی" کے تصوّر کے تحت ظاہر ہوتے ہیں۔ پی ایچ ڈی کے مقالہ کو عالمی ادب میں پہلے قدم کے طور پر سمجھنے کی بجائے، علم کا آخری کڑی سمجھ لیا جاتا ہے، وہ زندگی بھر اسی ڈگری کے بھروسے اپنی زندگی گزار کر اس کی قیمت

وصول کرنا چاہتے ہیں۔ نئے سوالات کی دریافت ہندوستانی مزاج میں شامل نہیں ہے، لہٰذا ہم نئے سوالات نہ تو اٹھاتے ہیں اور چنانچہ ان کے جوابات حاصل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لہٰذا جب تک ثقافتی کایا پلٹ پیدا نہیں ہوتی اور تعلیم یافتہ حضرات اس تبدیلی کے عادی نہیں ہو جاتے، اس وقت تک عالمی سطح کی تیکنیکی ترقی کے ہم پلّہ ہونا دُشوار ہے۔ اس ملک کے باشندوں میں مطالعہ کا شوق بالکل چھوٹ گیا ہے۔ یہ ایک رنجدہ اور افسوسناک صورتِ حال ہے۔ بہت سے ہندوستانی سکالر، ہر سوال کا جواب ویدوں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اس طرح سے خیالات محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ زیادہ تعلیم یافتہ اشخاص علم مابعدالطبیعات پر ضرورت سے زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ جو بالآخر فلسفیانہ انداز نظر بن جاتا ہے اور اس کے عملی پہلو دب کر رہ جاتے ہیں۔ ہر سطح پر

قیادت کی صلاحیت کی کمی ہے، آج کے دور میں ہندوستانی عوام جواہر لال نہرو کی طرح سے نئے راستے کی کھوج کی کوشش نہیں کرتے، وہ ہومی بھابھا، جے آر۔ ڈی ٹاٹا وغیرہ کا انداز فکر نہیں اپناتے۔ جب تک ہم سماجی کایا پلٹ کے لیے ماحول کو موزوں نہیں بناتے اور ہم اپنی نسلی کمزوریوں پر قابو نہیں پاتے اور انسانی نقطۂ نظر سے مسائل کو حل نہیں کرتے، اس وقت تک تیکنیکی انقلاب سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے جو کہ اس وقت دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ ہم پسماندگی کا ایک ڈھیر یا گندی بستی بن جائیں گے۔ اس خطرے کو فرضی نہیں بلکہ حقیقی سمجھنا چاہیئے۔

انسانی وسائل کا چیلنج

انسانی وسائل کے چیلنج کو بھی کم نہ سمجھنا چاہیئے، یہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے تیکنیکی چیلنجوں سے کم نہیں۔ قدیم زمانے میں زمین ہی لوگوں کا اصل اثاثہ تھا۔ گذشتہ برسوں میں قدرتی وسائل اور صنعت کارانہ نیز مہم جویانہ صلاحیتیں اپنا رنگ لائیں اور انھوں نے اپنی اہمیت تسلیم کرائی، لیکن اب انسانی وسائل کے استعمال کی صلاحیت پر ہی ملک کی ترقی یا تنزّلی کا انحصار ہے، یہ دور تعداد کا نہیں بلکہ معیار کا ہے۔ ہمارے دفاتر اور فیکٹریوں میں انسانی وسائل زیادہ تر ترقی کے عمل میں رکاوٹ ہیں اور وہ ہمارے وسائل پر بوجھ ہیں۔ اب ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جو ذہین ہوں، صحت مند ہوں، محنتی ہوں، اور ذہنِ رسا کے مالک ہوں۔ اس سلسلے میں جاپان کے تجربات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، سوئٹزرلینڈ اور جنوب مشرقی ایشیا کے کمتر وسائل کے مالک ملکوں کے تجربوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ آبادی کی پیداواری

ہم گروپ بنا کر کام کرنے میں قطعی ناکام ہیں، ہم ایک دوسرے کی کوششوں کو اس طرح نہیں سراہتے جس سے اس کی ہمّت افزائی ہو بلکہ ہماری کوشش اس کو دل شکستہ کرنے کی ہوتی ہے۔ ہندوستانی سائنس دانوں کے رویّے "مارو گولی" کے تصوّر کے تحت ظاہر ہوتے ہیں

صلاحیت کم ہونے سے روس، چین اور بھارت مقابلہ میں اس رفتار سے آگے نہیں بڑھے جس حساب سے کہ انھیں اپنی افرادی قوت کے وسائل کے پیش نظر بڑھنا تھا، انسانی ذہانت اور تخلیقی صلاحیت تکنیکی تبدیلی لانے میں موثر کردار ادا کرتی ہے۔ اس لیے ہماری سماجی اور تعلیمی پالیسیاں ڈسپلن پیدا کرنے، عوام کو محنتی بنانے، اُن کی ذہانت سے کام لینے میں موثر کردار نبھا سکتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہماری سماجی پالیسیاں۔ ترقی پسندانہ نہیں ہیں، اس لیے کہ پسماندہ ہونے کی صورت میں بہت سی رعائتیں ہیں اور ترقی پسند ہونے کی صورت میں بہت سے نقصانات ہیں، اگر کسی ملک میں میرٹ، لیاقت، صلاحیت، وسائل سے کام لینے کی صلاحیت اور صنعت کارانہ لیاقتوں کے لیے بہت کچھ نقصان اٹھانا پڑے تو وہ ترقی کی راہ پر بہت آگے بڑھ سکتا ہے۔

اس نظام کی وجہ سے ہندوستان میں گذشتہ چند برسوں میں ہر برادری اور فرقہ خود کو 'پسماندہ' ظاہر کرنے پر تلا ہوا ہے تاکہ ریزرویشن کے فائدے اٹھا سکے۔ ایک ایسے سماج میں جہاں ہر مرد یا ہر عورت اپنے آپ کو اُس سے زیادہ بے وقوف ظاہر کرنے کی کوشش کرے جتنا کہ وہ ہے، اس کی ترجیحات میں کہیں نہ کہیں غلطی ضرور ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس صدی کے آخر تک ہماری آبادی ۱۰۰ کروڑ ہو جائے گی اور ان میں سے ۴۵ کروڑ افراد ان طبقوں سے تعلق رکھتے ہوں گے جو حالات کے تحت یا ظلمت پسندی کے سبب رضاکارانہ طور پر جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے نابلد ہوں گے۔ ان طبقوں کو جدید بنانے اور جدید راستہ پر لانے کے لیے عظیم قیادت درکار ہے۔ جو کہ جرأت سے پوری طرح لیس ہو۔

بدقسمتی سے رجعت پسندی اور قدامت پرستی سے ہندوستان کے دیگر

ہندوستان میں گذشتہ چند برسوں میں ہر برادری اور فرقہ خود کو "پسماندہ" ظاہر کرنے پر تلا ہوا ہے تاکہ ریزرویشن کے فائدے اٹھا سکے۔ ایک ایسے سماج میں جہاں ہر مرد یا ہر عورت اپنے آپ کو اُس سے زیادہ بیوقوف ظاہر کرنے کی کوشش کرے جتنا کہ وہ ہے اس کی ترجیحات میں کہیں نہ کہیں غلطی ضرور ہے۔

طبقے بھی اثر لے رہے ہیں۔ اور ان میں سے بہت سے وہ ہیں جو کہ انتہائی سوجھ بوجھ والے ہیں۔ ان رجحانات کے خلاف نبرد آزما ہونا ہے۔ اس کے لیے تعلیمی نظام کو نئی سمتیں دینی ہوں گی جن سے طلبا میں کھوج کرنے کا مادہ پیدا ہو اور ان کی تخلیقی قوتوں کو جلا مل سکے۔ اقداری نظام کو بھی بدلنا ہے اور اس میں محنت کی عادت اور محنت کے وقار کو جگہ دینی ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کی بھی ہمت افزائی کی جانی ہے، اس سلسلے میں اعداد و شمار یہ ثابت کرتے ہیں کہ چھوٹے کنبوں کے بچے بالعموم ان کنبوں کے بچوں کے مقابلے زیادہ کامیاب رہتے ہیں جہاں بچے بہت تعداد میں ہیں۔ پہلے بچے کی کارگزاری بعد کے آنے والے بچوں کے مقابلے زیادہ اچھی رہتی ہے۔ انسانی وسائل کو فروغ دینے کے لیے انسان کے معیار کو بلند کرنے پر زور دینا ہے تاکہ وہ اکیسویں صدی کے تقاضے پورے کر سکے، بھارت نوجوانوں کا دیش ہے لیکن بدقسمتی سے مقابلتہً کم عمر لوگوں کا ۸۰ فیصد حصہ کسی نہ کسی شکل میں غذا کی کمی کا شکار ہے۔ ہندوستان میں ہر تیسرا بچہ مطلوبہ وزن سے کم پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح سے نسلی اعتبار سے کمزوری بڑھ رہی ہے، اس کو روکنا ضروری ہے، اس کے لیے بلا تاخیر فوری کارروائی درکار ہے۔

مواصلاتی چیلنج اور رابطۂ عام کا چیلنج بھی اس سے ملتا جلتا ایک چیلنج ہے، اس صدی کے آخر تک ملک میں ٹی۔ وی سیٹوں کی تعداد ۳ تا ۴ کروڑ ہو گی۔ وی۔ سی۔ آر کا رواج بھی تیزی سے فروغ پا رہا ہے، دیگر مواصلاتی ذرائع بھی فروغ پا رہے ہیں۔ اس نئے طریقے کو اس طرح سے کام میں لانا ہے جس سے ہمارے رویّوں میں مطلوبہ انداز کی تبدیلی عمل میں آسکے۔

بھارت اکیسویں صدی میں کس حالت میں قدم رکھے گا، اس کا انحصار ملک کی قیادت پر ہے۔ ایک ایسی قیادت پر جو نڈر اور بیباک ہو کر عارضی ناکامیوں سے نہ گھبرائے اور جسے اپنی عدم مقبولیت کا ڈر نہ ہو اور جو ایسی حالت میں تکنیکی اعتبار سے ترقی یافتہ ہندوستان کی قیادت کی باگ ڈور سنبھالے۔ ●

پروفیسر سی۔ جے۔ داسوانی

بھرشٹاچار کیوں اور کیسے؟

حرص، خود غرضی، ذاتی مفاد اور اس کے ساتھ ہی سماجی وعدوں کی پابندی کا قطعی فقدان اُس بھرشٹاچار کے بڑے اسباب ہیں جو سماج میں تمام سطحوں پر پھیلا ہوا ہے اور جو بڑی حد تک اُس افسوسناک صورتِ حال کے لیے ذمہ دار ہے جس کا سامنا ہمیں کرنا پڑ رہا ہے۔ اعلیٰ ماہرِ تعلیم پروفیسر داسوانی نے جو سرِدست "این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی" میں کام کر رہے ہیں۔ بھرشٹاچار کے مسئلہ کے تانے بانے پر بڑی قابلیت سے بحث کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بہت بڑے پیمانے پر اس بدعت کی قبولیت نے موجودہ نازک صورتِ حال پیدا کی ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ بھرشٹاچار کے لیے عموماً مغرب کی تقلید، جدید کاری اور صنعت کاری کو قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے مگر وہ پُرزور دلائل سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ موقف دُرست نہیں ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اس وقت اُمید صرف فرد پر لگی ہوئی ہے جو سماجی ڈھانچے کو ٹوٹنے سے بچا سکتا ہے۔ اُن کی رائے میں "یُگ" کے تصور کا انحصار فرد کے اعمال کے نتائج پر ہے۔ چونکہ سماج افراد پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے جتنے زیادہ سماجی عقیدتمندی اور زیادہ سماجی شعور رکھنے والے لوگ ہمارے مابین ہوں گے بھرشٹاچار کا خطرہ اُتنا ہی کم ہو جائے گا۔ شاید ایسے سماج میں دولتمندوں کو زیادہ دولتمند بننے کی ہوس نہیں ہوگی اور وہ خوشی خوشی اپنی خوشحالی میں غریبوں کو شریک کریں گے۔ (ایڈیٹر)

معلوم ہوتا ہے کہ آج بھارت کے عوام نے بھرشٹاچار کو ایک طرزِ زندگی کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ ہر شخص کو خواہ وہ کتنا بڑا یا چھوٹا ہو یہ یقین ہو گیا ہے کہ بھرشٹاچار بھارتی معاشرے کے رگ و خون میں سما گیا ہے۔ بلاشبہ کوئی بھی اس امر کے متعدد اسباب کے بارے میں سُنتا ہے کہ حالات اس قدر کیوں خراب ہو گئے ہیں۔ اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے بھی سُنا جاتا ہے کہ حالات بد سے بدتر ہو گئے ہیں اور کہ صورتِ حال کبھی بھی اس قدر مایوس کُن نہیں تھی۔ یہ بھی سُنا جاتا ہے کہ چالیس برس قبل بھی جب ہمیں آزادی ملی تھی حالات اس قدر خراب نہیں تھے جس قدر اب ہیں۔ کچھ لوگ یہ بھی سناتے ہیں کہ ہمیں بھرشٹاچار کے بارے میں زیادہ تشویش نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ یہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ بھرشٹاچار دنیا بھر میں طرزِ زندگی بن گیا ہے۔ یا پھر کئی لوگ کہتے ہیں کہ بھرشٹاچار کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ دُنیا کے دوسرے مُلکوں کی مانند بھارت میں بھرشٹاچار

ہمیشہ موجود رہا ہے۔

سوال درحقیقت یہ نہیں کہ بھرشٹاچار کیا قدیمی یا عالمی مسئلہ ہے۔ کوئی بھی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ انسانی دنیا میں سچ اور جھوٹ کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور یہ کہ ایمانداری اور بھرشٹاچار ہمارے ساتھ بھارت اور دیگر ملکوں میں ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ سوال دراصل یہ ہے کہ بھرشٹاچار کس حد تک پھیل گیا ہے۔

بھرشٹاچار کا جائزہ دو جاری رہنے والے عملوں سے لیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک میں زندگی کے حصے کے طور پر بھرشٹاچار کی قبولیت کا جائزہ لیا جاسکتا ہے جس میں بھرشٹاچار قطعاً ناقابلِ قبول سے "مکمل طور پر قابلِ قبول" حدتک پہونچ جاتا ہے اور دوسرے جاری رہنے والے عمل میں ایسے بھرشٹاچار کے پھیلاؤ کا جائزہ لیا جاتا ہے جس میں وہ "محدود" سے "وسیع پھیلاؤ" یا "کنٹرول شدہ" سے "بے قابو" حدتک پہونچ جاتا ہے۔

اس کے بعد ان دونوں عملوں سے بھرشٹاچار کی چار صورتیں وجود میں آتی ہیں۔

۱۔ بھرشٹاچار جو "قابل قبول اور محدود" ہے۔

۲۔ بھرشٹاچار جو "قابل قبول" اور "وسیع طور پر پھیلا" ہے۔

۳۔ بھرشٹاچار جو "ناقابل قبول" ہے تاہم وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا ہے۔

۴۔ بھرشٹاچار جو "قابلِ قبول" لیکن "محدود" ہے۔

ان چار انتہائی پوزیشنوں کے درمیان غیر یقینی طور پر بیشتر پوزیشنیں ایسی ہیں جہاں بھرشٹاچار "کم یا زیادہ" قابل قبول ہے۔

متعدد اسباب

بھرشٹاچار ایک معاشرے میں کس قدر قابل قبول ہے اور کس وسیع حد تک پھیلا ہوا ہے اس کا انحصار بیشتر اسباب پر ہے۔ روایات، ثقافت، اخلاقی اقدار کا نظام، سماجی ڈھانچہ اور شائد اقتصادی خوشحالی بھی مل کر اس امر کا تعین کرتے ہیں کہ کیا بھرشٹاچار معاشرے میں ایک قابلِ قبول طرزِ زندگی ہے یا وہ وسیع حد تک پھیلا ہوا یا محدود ہے۔ بھرشٹاچار ایک معاشرے میں کبھی بھی جم کر نہیں رہتا اور نہ یہ ایک بار ہی پیدا ہونے والا مسئلہ ہے۔ معاشرے کے ڈھانچے میں پیچیدہ تبدیلیوں کے نتیجے میں بھرشٹاچار زیادہ تر ایک طرزِ زندگی بن جاتا ہے یا معاشرہ ایک زیادہ بھرشٹ سے کم بھرشٹ یا زیادہ ایماندارانہ طرزِ زندگی کی جانب بڑھتا ہے۔

اس نشو و نمائی عمل کے اندر تاویل کرتے ہوئے کوئی بھی یہ استدلال کرسکتا ہے کہ بھارت کے زیادہ تر عوام ایک "ناقابل قبول اور محدود صورت" کے بھرشٹاچار سے ایک "زیادہ" قابل قبول اور زیادہ وسیع' صورت کے بھرشٹاچار کی جانب بڑھے ہیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ پہلے بھی بھرشٹاچار موجود تھا تاہم اسے کبھی بھی ایک طرز زندگی کے طور پر قبول نہیں کیا گیا اور یہ چند اشخاص تک محدود تھا۔ بھرشٹاچار کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اس کی تمام کارروائیاں چھپ کر انجام دی جاتی تھیں۔ ایک بھرشٹ شخص کو کبھی بھی معاشرے کے ایک معزز فرد کے طور پر نہیں دیکھا جاتا تھا اور نہ ہی اس کی قدر کی جاتی تھی۔ آج یہ دکھائی دیتا ہے کہ بھرشٹاچار نہ صرف وسیع پیمانے پر پھیل گیا ہے بلکہ یہ ایک طرز زندگی کے طور پر زیادہ قابل قبول ہوگیا ہے۔ بھرشٹاچار کی کارروائیاں کھلے بندوں انجام دی جاتی ہیں اور بھرشٹ لوگوں کو اب سرِ شرم سے نہیں جھکانا پڑتا اور نہ ہی

> آج یہ دکھائی دیتا ہے کہ بھرشٹاچار نہ صرف وسیع پیمانے پر پھیل گیا ہے بلکہ یہ ایک طرزِ زندگی کے طور پر زیادہ قابلِ قبول ہوگیا ہے۔ بھرشٹاچار کی کارروائیاں کھلے بندوں انجام دی جاتی ہیں اور بھرشٹ لوگوں کو اب سرِ شرم سے نہیں جھکانا پڑتا، اور نہ ہی انھیں سماجی بائیکاٹ کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔

> کوئی بھی اکثر ایسے سرکاری ملازموں کے بارے میں سنتا ہے جو رشوت لے کر کام کرتے ہیں اور ایسے ہی بعض لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بار رشوت لے لیں تو اُن پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے کہ اُن کا کام "ایمانداری" سے کر دیں گے۔

انھیں سماجی بائیکاٹ کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔

تب ہمیں یہ سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے کہ لوگ کیوں محسوس کرتے ہیں کہ آج ہمارے معاشرے میں بہت حد تک بھرشٹاچار پھیلا ہوا ہے۔ کوئی بھی شخص یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ بھارتی معاشرے میں ماضی میں بھرشٹاچار بہت کم تھا کیونکہ بھرشٹاچار عام طور پر کبھی بھی قابلِ قبول نہیں تھا اور نہ ہی وسیع پیمانے پر پھیلا تھا۔ اگر ایسی بات تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم میں کیوں بھرشٹاچار زیادہ بڑھ گیا ہے۔؟

> **ایک بھرشٹ معاشرہ زیادہ تر ایسے افراد پر مشتمل ہوتا ہے جن کی کارکردگیوں میں خود غرضی کو اوّل ترین مقام حاصل ہوتا ہے اور ایک ایماندار معاشرہ زیادہ تر ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنی کارکردگیوں کے لیے محض خود غرضی سے تحریک حاصل نہیں کرتے۔**

لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس سوال کی طرف توجہ دیں بھرشٹاچار کا ایک اور پہلو ہے جس پر غور کیا جانا چاہیئے۔ لفظ بھرشٹاچار صرف منفی معانی کا حامل ہے۔ یہ "ایمانداری" کے برعکس ہے۔ خواہ ایک معاشرہ کتنا بھرشٹ ہو جائے، بھرشٹاچار کو کبھی بھی ایک وصف کے طور پر نہیں دیکھا جاتا۔ علاوہ ازیں بھرشٹاچار خواہ کتنا بھی پھیلا ہوا ہو، ایمانداری کو ہمیشہ ایک وصف کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایک بھرشٹ سماج بھی ایمانداری کی تعریف کرتا ہے اور کسی کو بھی یہ بتایا جاتا ہے کہ کم ایک بھرشٹ شخص کس قدر "ایماندار" یا "معتبر" ہے۔ کوئی بھی اکثر اپنے سرکاری ملازموں کے بارے میں سنتا ہے جو رشوت لے کر کام کرتے ہیں اور ایسے ہی بعض لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک بار رشوت لے لیں تو اُن پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اُن کا کام "ایمانداری" سے کر دیں گے۔

ہمارے لیے واضح طور پر یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ چونکہ بھرشٹاچار سے مراد ایک غیر اخلاقی فعل ہے اس لیے ایک نہایت بھرشٹ شخص بھی اپنے بھرشٹاچار سے انکار کرتا ہے۔ مثالی طور پر ایک بھرشٹ معاشرے میں کوئی شخص اکثر وعدے کرتا ہے کہ صرف وہ ایماندار ہے اور اُس کے گرد دیگر لوگ بے ایمان اور بھرشٹ ہیں۔ صرف جب بھرشٹاچار نہایت وسیع پیمانے پر پھیل جائے اور وہ زیادہ تر ایک طرزِ زندگی کے طور پر قابلِ قبول ہو جائے تو کوئی بھی سُننے گا کہ لوگ اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر ایک بھرشٹ ہے۔

آج بھارت کی صورتِ حال کے بارے میں جو چونکا دینے والی بات ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے یہ تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے کہ ہم سب بھرشٹ ہیں۔ گویا ہمیں مایوس ہو کر بیٹھ جانا چاہیئے اور اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ بھرشٹاچار نے تمام معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور کہ اب کوئی اُمید نہیں رہ گئی۔ تاہم چونکہ ہم اس مرض کی سنجیدگی کو تسلیم کرنے کو تیار ہیں اس لیے نجات کی کچھ اُمید ضرور رہ جاتی ہے۔

اخلاقی اقدار میں تبدیلی

آؤ! ہم اسی سوال کی طرف لوٹ جائیں کہ ہم ایک قوم کے طور پر کیوں بھرشٹ ہو گئے ہیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ بھرشٹاچار معاشرے کے اخلاقی اقدار کے نظام میں تبدیلی کا نتیجہ ہے اور اس کا سبب نہیں ہے۔ یہ بات خود آشکارا یا حتی کہ جانی مانی دکھائی دے سکتی ہے کہ ہم زیادہ بھرشٹ ہو گئے ہیں کیونکہ ہم ایک قوم کے طور پر اُس سے کم ایماندار ہو گئے ہیں جتنے ایماندار پہلے تھے۔ لیکن آؤ ہم اس سوال پر قدرے زیادہ گہرائی سے غور کریں۔ اگر ہم اس الزام کو سچا مان لیں کہ بھارتی معاشرہ آج زیادہ بھرشٹ ہو گیا ہے تو ہمیں اس کا یہ مطلب لینا چاہیئے کہ کسی سبب سے بھرشٹاچار آج اُس سے زیادہ قابلِ قبول ہو گیا ہے یا (اور) وہ زیادہ پھیل گیا ہے جتنا کہ وہ ماضی میں تھا۔ تب سوال یہ ہے کہ اس امر کی وجہ تلاش کی جائے کہ بھرشٹاچار کیوں زیادہ قابلِ قبول ہو گیا ہے اور وہ کیوں وسیع پیمانے پر پھیل گیا ہے۔ ہمارے اخلاقی نظام میں یہ تبدیلی کیوں آئی ہے؟۔ اگرچہ آج ایک بھرشٹ سماج کی موجودگی کا پرچار کیا جاتا ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ بھرشٹاچار افراد کی طرف سے لایا جاتا ہے۔ بلاشبہ افراد کی طرف سے ایمانداری بھی عمل میں لائی جاتی ہے گو ہم ایماندارانہ معاشروں کا ذکر کرتے ہیں تاہم اُن میں بنیادی فرق ہے۔ ایک بھرشٹ اقدام ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں نقصان دہ ہوتا ہے جب کہ ایماندارانہ اقدام ایسا نہیں ہوتا۔ ایک بھرشٹ اقدام قابلِ نفرین ہے اور اُس کا مقصد دوسروں کو نقصان پہونچانا ہے جبکہ اُس سے بھرشٹ لوگوں کو فائدہ پہونچتا ہے ایک ایماندارانہ اقدام سے اگر کسی کو نادانستہ طور پر نقصان پہونچ بھی جائے تو کبھی یہ مراد نہیں ہوتی کہ کسی دوسرے کی قیمت پر فائدہ اُٹھایا جائے۔ ایک بھرشٹ اقدام اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہی خود غرضانہ اور ذلت آمیز ہوتا ہے۔ جبکہ ایک ایماندارانہ اقدام بے غرضانہ اور رحم دلانہ

ہوتا ہے۔ ایک بھرشٹ معاشرہ زیادہ تر ایسے افراد پر مشتمل ہوتا ہے جن کی کارکردگیوں میں خود غرضی کو اولین مقام حاصل ہوتا ہے اور ایک ایماندار معاشرہ زیادہ تر ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اپنی کارکردگیوں کے لیے محض خود غرضی سے تحریک حاصل نہیں کرتے۔ ایک بھرشٹ سماج میں سماجی وعدوں کے تئیں پابندی کو بہت کم اہمیت دی جاتی ہے جبکہ ایک ایماندار معاشرے میں عوام اپنے سماجی کردار اور فرائض سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔

سماجی وعدوں کی پابندی کی حد

یہاں جس بات پر بحث کی جا رہی ہے وہ یہ کہ ایمانداری اور بدعنوانی یا بھرشٹاچار دونوں ہی اس بات پر منحصر ہیں کہ عوام کس حد تک احساس ذمہ داری رکھتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی عام سماجی احساس ذمہ داری ہی سماج کو ایماندار بناتی ہے۔ ایک بھرشٹ معاشرہ سماجی عقیدتمندی کے تنزلی احساس کا نتیجہ ہوتا ہے جس سے طمع، لالچ، خودغرضی اور بے ایمانی پیدا ہوتی ہے۔ ایمانداری سماجی عقیدتمندی سے براہ راست تعلق رکھتی ہے اور بھرشٹاچار اس کے برعکس غیر اخلاقی عمل ہے۔ آج بھارتی معاشرہ پہلے سے زیادہ بھرشٹ ہے کیونکہ بھارتی عوام اس سے کم سماجی عقیدتمندی رکھتے ہیں جتنی وہ ماضی میں رکھتے تھے۔

دوسروں کے مفاد میں دلچسپی کا احساس

دوسرے الفاظ میں ہم نے کم از کم گذشتہ [illegible] برس میں عوام کے مابین سماجی یا قومی عقیدتمندی کی سطح میں عام اور تیز رفتار تنزل دیکھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ عوام کو ذاتی مفاد سے دلچسپی ہو گئی ہے۔ دوسروں کے تئیں دلچسپی کے احساس میں بھاری کمی آ گئی ہے۔ احساس ذمہ داری کے اس فقدان کا اظہار کئی طریقوں سے ہوتا ہے۔ مال اور سروس تیار کرنے والے کوالٹی کے تئیں عقیدتمندی نہیں رکھتے۔ تاجر ایمانداری کے تئیں عقیدتمند نہیں، پیشہ ور لوگ ایمانداری کے تئیں عقیدتمند نہیں، نوعمر نظم و ضبط کے تئیں عقیدتمند نہیں، اسکول تعلیم کے تئیں عقیدتمند نہیں، انتظامیہ قانون کی حکومت کے تئیں عقیدتمند نہیں اور سیاستداں عوامی بہبود کے تئیں عقیدتمند نہیں۔

> مال اور سروس تیار کرنے والے کوالٹی کے تئیں عقیدتمند نہیں — تاجر ایمانداری کے تئیں عقیدتمند نہیں، پیشہ ور لوگ ایمانداری کے تئیں عقیدتمند نہیں، نوعمر نظم و ضبط کے تئیں عقیدتمند نہیں، اسکول تعلیم کے تئیں عقیدتمند نہیں، انتظامیہ قانون کی حکومت کے تئیں عقیدتمند نہیں اور سیاستداں عوامی بہبود کے تئیں عقیدتمند نہیں۔

کوئی بھی جلدی سے کہہ دے گا کہ یہ طے شدہ امر نہیں ہے کہ احساس ذمہ داری کا یہ فقدان تمام تر صورت حال کے لیے ذمہ دار ہے۔ جو بات سچ دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ جو بھی اسکیمیں بنائی جاتی ہیں ان میں سماجی یا قومی عقیدتمندی کو کم ترین اولیت دی جاتی ہے۔ "اپنا پن" پہلے آتا ہے اس کے بعد کنبہ، پھر اس کے بعد سماجی گروپ یا تنظیم کی باری آتی ہے اور قوم اور قومی مفاد آخر میں آتے ہیں۔

خودغرضی — بڑا سبب

ہم خود کو اس افسوسناک حالت میں کیوں پاتے ہیں؟ ہم اس حالت زار میں کیونکر پہونچے؟ اسے اقتصادی طور پر حق بجانب ٹھہرانے کے لیے وجوہات کی تلاش کی جا سکتی یا اس کے لیے مغربی نظام کی تقلید یا جدید کاری یا حتیٰ کہ صنعت کاری کو قصوروار ٹھہرایا جائے گا۔ شائد ان تمام امور نے مل کر یہ صورت حال پیدا کی ہے، لیکن ہم اس بنیادی حقیقت سے منہ نہیں موڑ سکتے کہ حرص و طمع بھارتی معاشرے میں اخلاقی اقدار کی گراوٹ کے بڑے اسباب ہیں۔ آج امیر ترین سے لے کر غریب ترین ہر بھارتی کو صرف اپنے لیے، اپنے کنبے اور اپنے قریبی رشتہ داروں کے لیے "چیزیں" حاصل کرنے میں دلچسپی ہے۔ اس میں میرے لیے کیا ہے؟ یہ آج ہر بھارتی کا مقصد اور فلسفہ بن گیا ہے۔ اس ہمہ گیر خودغرضی سے اخلاقی اصولوں میں عام گراوٹ آئی ہے جو سب طرف پھیلے ہوئے بھرشٹاچار کا باعث ہے۔

تو کیا سب کچھ کھو گیا ہے؟ صورت حال کا کوئی مداوا نہیں؟ کیا ہم اپنے عوام میں عقیدتمندی کی سطح بلند کر سکتے ہیں؟ ہم کس کی طرف مڑ کر دیکھیں؟ ہم طاقت کے کون سے وسائل کا استفادہ کر کے عظیم تر عقیدتمندی اور عوامی ایمانداری کے دنوں کو واپس لا سکتے ہیں؟

دوسروں کو راستے سے ہٹانے کا کھیل

جب ہم چاروں طرف دیکھتے ہیں ہمیں کوئی

راحت نظر نہیں آتی اور اُمید تو بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ اگر خود غرضی عقیدتمندی کو نیست و نابود کرے اور اس سے بھرشٹاچار پیدا ہو تو اس سے ہماری حالت مایوس کُن ہوتی ہوئی دکھائی دے گی۔ قومی اور عوامی ادارے افراد کے نجی مفاد کا اسی طرح شکار ہو گئے ہیں جس طرح پرائیویٹ ادارے اور تنظیمیں۔ تعلیمی نظام بہت کم اُمید جگاتا ہے۔ ایک خود غرض معاشرے میں نظام عوام کو محض مقابلہ اور دوسروں کو راستے سے ہٹانے کی تربیت دیتا ہے۔ یہ ایک دائرہ نما کھیل ہے۔ جب آپ اُن کو راستے سے ہٹائیں گے جو آپ سے "کمزور تر" ہیں تو آپ کا راستہ ایسا روکے گا جو آپ سے مضبوط تر ہوگا۔ لیکن کمزور، طاقتور کی مخالفت اُس حد کے اندر نہیں رہتی جس کے اندر بڑے، چھوٹے، یا لازماً "امیر غریب" کی مخالفت رہتی ہے۔ شکار کرنے والا خود شکار ہو جاتا ہے اور کوئی بھی ہمیشہ کمزور یا طاقتور نہیں رہتا۔ یہ ایک پُر جوش کھیل ہے۔ صرف بقاء کی فطری خواہش اور جنگل کا قانون حاوی رہتا ہے۔ ماہرین تعلیم ناظموں، منتظموں یا ملازموں کی ماسد افراد کے کھیل میں شریک رہتے ہیں۔

حتیٰ کہ جب اعلیٰ تر عقیدتمندی کا کچھ ثبوت ملتا بھی ہے تو وہ قومی مفاد کے بجائے گروہی مفاد سے تحریک پاتی ہوئی جان پڑتی ہے۔ قومی عقیدتمندی کا عارضی جوش کھیلوں اور جنگوں کی مانند عارضی ہوتا ہے جو انھیں پیدا کرتی ہیں۔ بچے اور نوعمر جو فطرتاً رومان پرست ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے اپنی تربیت کا تباہ کن انجام دیکھ سکنے سے بہت پہلے ہی اشیاء کے حصول میں بھرشٹاچار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ صورتِ حال واقعی خطرناک ہے۔

یہ کافی عجیب بات ہے کہ ایک بھرشٹ معاشرہ شاذ ہی ایک شکی معاشرہ ہوتا ہے۔ ایک بھرشٹ معاشرے میں ہر ایک پر خوف چھایا رہتا ہے۔ حوصلے اور بےخوفی سے ایک ایماندار اور عقیدتمند معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے۔ آج واحد جذبہ جو بھارتی نفسیات پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے وہ ہے خوف۔ ہر ایک خوفزدہ ہے۔ شکاری اُسی طرح خوفزدہ ہے جس طرح شکار ہونے والا۔ اگر کوئی دریافت کرے کہ لوگ کیوں خوفزدہ ہیں تو اس کا کوئی واحد جواب نہیں ہوگا۔ لیکن خوف ہر جگہ چھایا ہوا ہے۔ اور بھرشٹاچار کی مانند خوف اپنی ذات پر ہی پرورش پاتا ہے

تب اُمید کہاں پائی جاتی ہے؟ کیا ہم عقیدتمندی اور ایمانداری کا احساس دوبارہ پیدا کرنے کے لیے اپنے اخلاقی اقدار کے نظام میں تبدیلی لا سکتے ہیں اور اس طرح اپنے معاشرے سے بھرشٹاچار کو جلا وطن کر سکتے ہیں؟

بدعنوانیوں کے مرض کا مرکز انسان ہے مگر اُمید بھی ایک حد تک اسی سے وابستہ ہے۔ یہ اُمید اسی انسان سے وابستہ کی جاتی ہے جو کہ مادی فوائد کے لالچ میں خودغرضی کا ارتکاب کرتا ہے اور اپنی سماجی ذمہ داریوں سے روگردانی کرتا ہے اور اُمید کا دوسرا جُز و ہماری روایات میں پایا جاتا ہے۔ وہ بھی فرد کو تمام اعمال میں مرکزی مقام عطا کرتی ہیں۔ بھارتی روایات نے ہمیشہ فرد کے اعمال پر زور دیا ہے۔ ترقی کے تصور کا انحصار بھی فرد کے اعمال کے نتائج پر ہے۔ یہ تعجب خیز نہیں ہے کہ ہماری روایات ہر فرد کو بالمیکی کی مانند اُس کے اعمال کے لیے ذمہ دار قرار دیتی ہیں۔ فرد کے لیے لازمی ہے کہ وہ ایمانداری، سماجی عقیدتمندی اور اخلاقی عمل کے ذریعہ اپنی نجات کا حصول کرے

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

> آج امیر ترین سے لے کر غریب ترین ہر بھارتی کو صرف اپنے لیے اپنے کُنبے اور اپنے نزدیکی رشتہ داروں کے لیے 'چیزیں' حاصل کرنے میں دلچسپی ہے۔ اس میں میرے لیے کیا ہے؟ یہ آج ہر بھارتی کا مقصد اور فلسفہ بن گیا ہے۔

> یہ ایک دائرہ نما کھیل ہے۔ جب آپ اُن کو راستے سے ہٹائیں گے جو آپ سے "کمزور تر" ہیں تو آپ کا راستہ ایسا روکے گا جو آپ سے مضبوط تر ہوگا لیکن کمزور، طاقتور کی مخالفت اُس حد کے اندر نہیں رہتی جس حد کے اندر بڑے، چھوٹے، یا لازماً امیر، غریب کی مخالفت رہتی ہے۔ شکار کرنے والا خود شکار ہو جاتا ہے اور کوئی بھی کمزور یا طاقتور نہیں رہتا۔ یہ ایک پرجوش کھیل ہے۔

پروفیسر کاملتا پرشاد

انسدادِ افلاس

مسائل اور مختلف حل

اب یہ امر متنازعہ نہیں رہا کہ افلاس کے انسداد کے لیے جو اقدامات کئے گئے ہیں اُن کے حسبِ توقع نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ فاضل مصنف نے جو ایک اقتصادی مفکر اور دیہی ترقی سے متعلق مشیر ہیں، اُن مختلف اقدامات کا صدقدلانہ تجزیہ کیا ہے جو ہمارے منصوبہ سازوں نے افلاس کا انسداد کرنے کے لیے کئے ہیں اور اس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ مطلوبہ نتائج پیدا کرنے میں کیوں قاصر رہے ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ گو یہ اقدامات قابلِ تعریف تھے تاہم ایک خاص لائحۂ عمل کے پورے مفہوم پر غور کئے بغیر وہ عمل میں لائے گئے۔ کوئی بھی شاید اُس دن کا انتظار کرسکتا ہے جب ہمارا سماج نظریاتی طور پر نظام میں انقلابی تبدیلی کے لیے تیار ہو جائے لیکن غریبوں کی نت بڑھتی ہوئی تعداد کا معیارِ زندگی بلند کرنے کا کام اتنی فوری اہمیت کا حامل ہے کہ اسے التوا میں نہیں رکھا جا سکتا۔ فاضل مصنف نے اسکیموں کو نئی سمت دینے کے لیے ٹھوس تجاویز پیش کی ہیں جو اُن کے خیال میں محرومی کی سطح کو کم کرسکتی ہیں۔ اُن کی رائے میں زراعت، اور دیہی صنعتوں کے فروغ سے منفی موزوں ٹیکنالوجی کی حمایت حاصل ہو، ایسے حالات پیدا کرنے میں مدد ملے گی جو ناداری کی جڑوں کو کمزور کر دیں گے۔ (ایڈیٹر)

دنیا میں کسی ایسے دوسرے ملک کی نشاندہی کرنا آسان نہیں ہے جس نے بھارت کی مانند لیے افلاس کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اتنے زیادہ اور اتنے طویل اور گوناگوں تجربے کئے ہوں جس میں انسانی بقا کے لیے ضروری بنیادی مادّی اشیاء بھی میسّر نہ ہوں۔ انسدادِ افلاس سے متعلق کوئی بھی دستورکار یا حکمتِ عملی بمشکل ایسی ہوگی جسے اس مسئلہ کے حل کی طویل تلاش میں بھارت نے کسی ایک یا دوسرے وقت آزمایا نہ ہو۔

تاہم یہ مسئلہ اس قدر بڑا ہے کہ تمام حل اس پر قابو پانے میں ناکام رہے ہیں اور اس میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں آرہی۔ یہ سچ ہے کہ حکومت کی طرف سے ۱۹۸۳ء میں افلاس سے متعلق جاری کردہ اعداد کی رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ پچھلے چھ برس کے دوران ان اعداد میں ۱۱ فیصد تک نمایاں کمی ہوئی ہے لیکن ۱۹۸۳ء بھارتی زراعت کے لیے ایک غیر معمولی طور پر اچھا سال تھا۔ اُس کے بعد سے اُس برس کی زرعی پیداوار پر ابھی تک سبقت حاصل نہیں

کی گئی۔ لہٰذا اُس برس کے افلاس کے اعداد کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مجموعی طور پر اس عرصے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

انسداد افلاس سے متعلق دستورکار

سوال یہ ہے کہ افلاس، گندگی، امراض، گندی بستیوں، ضرورت سے زیادہ بھیڑ بھاڑ اور بچوں کی اموات جیسے اپنے مختلف مظاہر کے ساتھ ابھی تک کیوں موجود ہے گو ۵۰ کی دہائی اور خصوصاً ۷۰ کی دہائی کے بعد سے ایک یا دوسری صورت میں افلاس کا انسداد کرنا ہمیشہ منصوبہ بندی کا ایک مقصد رہا ہے کیا اس مرض کا قطعی علاج کیا جا سکتا ہے جیسا کہ حکومت کی طرف سے کرنے کا اعلان کیا جاتا ہے؟ کیا حکام اس سے وابستہ مسائل سے آگاہ ہیں؟ کیا انھوں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ مسئلہ کس قدر زبردست ہے اور کیا انھوں نے محسوس کر لیا ہے کہ اسے حل کرنے کے لیے کیسے بڑے بڑے اور مشکل کام انجام دینے ہوں گے؟ یا کیا ہم محض شیخی بگھار رہے ہیں؟ آئیے ہم قدرے گہرائی کے ساتھ ان پہلوؤں پر غور کریں۔

اب تک انسداد افلاس کے لیے جو حکمت عملی اختیار کی گئی ہے اُس کے بڑے اجزا ہیں (۱) رفتہ رفتہ غریبوں کو فائدے پہنچانے کی پالیسی کے ذریعے کل شرح ترقی پر انحصار رکھنا۔ (ب) دیہی علاقوں میں بے زمینوں کو زمین بانٹنا (ج) تعلیم و تربیت کے ذریعے انسانی قوت کی سرمایہ کاری (د) کمزور طبقوں کے لیے آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی" "ایس ایف ڈی اے" "این۔ آر۔ ای۔ پی"۔ "آر۔ ایل۔ ای۔ جی۔ پی"۔ "ای جی ایس" وغیرہ خاص اسکیموں کے ذریعے ملازمت کے مزید مواقع پیدا کرنا۔ یہ سب مل کر تمام مواقع کو ختم کر دیتے ہیں کیونکہ وہ افلاس کے بنیادی اسباب یعنی غریبوں کے اثاثوں، ہنروں یا سود مند دھندوں کی کمی کو بڑھاتے ہیں۔ بعض دستورکار تو سماجی و اقتصادی ہیں اور دوسرے ٹیکنالوجی سے متعلق ہیں۔ یہ تمام گزشتہ دس برس سے زیر عمل ہیں مگر بدستور مسئلہ برقرار ہے۔ یہ تمام دستورکار قابل تعریف ہوتے ہوئے بھی مطلوبہ نتائج کیوں پیدا نہیں کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی پوری طاقت اور شدت کے ساتھ نہیں آزمایا گیا۔ انھیں ایک خاص حد تک عمل میں لایا جاتا ہے۔ لیکن انھیں انجام تک پہنچانے کے بجائے آدھے راستے سے بہت پہلے ہی اُسی لمحہ چھوڑ دیا جاتا ہے جب کوئی بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ مجوزہ لائحہ عمل کے پورے مفہوم پر کافی غور کیے بغیر اقدامات شوقیہ انداز میں کیے جاتے ہیں۔ یہ منصوبہ سازوں اور ناظموں کے غور و فکر کی مفلسی ہے جو کروڑوں افراد کے افلاس کے لیے زیادہ تر ذمہ دار ہے۔

سُست روی کی پالیسی

مثال کے طور پر نام نہاد سُست روی کی پالیسی کو لیجیے جو کسی وقت منظر پر چھائی ہوئی تھی جیسا کہ ہر ایک کو علم ہے ابتدائی پانچ سالہ منصوبوں خصوصاً پہلے تین منصوبوں سے توقع کی گئی تھی کہ افلاس کا مسئلہ زیادہ تر مجموعی ترقی کے پروگراموں کے ذریعہ حل کر لیا جائے گا لیکن ان سوالوں کے بارے میں مشکل سنجیدگی کے ساتھ غور کیا گیا کہ اس کے لیے کتنی بڑی شرح ترقی کی ضرورت ہے اور کیا یہ ممکن ہے پھر اس کے لیے کتنا وقت درکار ہے۔ ۱۹۶۲ء میں پلاننگ ڈویژن کی ایک تناظری دستاویز میں کچھ تحقیقی مطالعہ کیا گیا تھا اس سے یہ پتہ لگایا گیا تھا کہ ۷۶-۱۹۷۵ء تک آبادی کے تیسرے ادنیٰ ترین گروپ کو خط افلاس سے اوپر اٹھانے کے لیے ۷ فیصد کی شرح ترقی سے آمدنی بڑھانی ضروری ہوگی، یہ اضافہ اس مفروضے کے ساتھ ہوگا کہ اس غریب ترین طبقے کا حصہ مجموعی آمدنی میں وہی رہے گا اس میں یہ بھی اندازہ کیا گیا کہ آبادی کے ۲۰ فیصد غریب ترین لوگوں کی اوسط کھپت دُگنی سے زیادہ ہو جائے گی جبکہ ۲۰ فیصد امیر ترین لوگوں کی کھپت میں محض ۲۰ فیصد اضافہ ہوگا۔ لیکن ایسا کیونکر کیا جائے گا؟ اس دستاویز میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ یہ محض اعداد و شمار کا کھیل تھا۔ لیکن ہمارے پانچ سالہ منصوبوں میں اس کے لیے بھی کوشش نہیں کی گئی۔ اس امر کے بارے میں سوال کبھی نہیں اٹھایا گیا کہ کیا تین سے پانچ فیصد شرح ترقی سے جو ممکنات کی حد کے اندر ہیں، افلاس دور کر سکتی ہے اور اگر وہ ایسا کر سکتی ہے تو وہ اس کام کے لیے کتنے برس لے گی؟ اگر بیروزگاری اور نیم روزگاری بڑھتی گئی تو افلاس میں کیوں کر کمی ہو

یہ تمام دستورکار قابلِ تعریف ہونے پر بھی مطلوبہ نتائج کیوں پیدا نہیں کر سکے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی پوری طاقت اور شدت کے ساتھ نہیں آزمایا گیا۔ انھیں ایک خاص حد تک عمل میں لایا جاتا ہے۔ لیکن انھیں انجام تک پہنچانے کے بجائے آدھے راستے سے بہت پہلے ہی اُسی لمحہ چھوڑ دیا جاتا ہے جب کوئی بڑی مشکل پیش آتی ہے۔

سکتی ہے؟ اس نے تکنیک کے انتخاب اور وسائل کی بین العلاقائی تخصیص کے بارے میں جو سبق دیا تھا اُس پر مشکل غور کیا گیا۔ اقتصادی نظام کی غیر مکمل یکجہتی کے باعث ترقی کے نام نہاد "توسیعی اثرات" کا پھیلاؤ نہیں ہوا۔ لہٰذا یہ ردِّ عمل کے اثرات تھے جو افلاس زدہ علاقوں میں زیادہ نمایاں ہوئے۔ اس قسم کے حل سے استفادہ کرنے کے بارے میں کسی بھی کوشش کے لیے اُن امور پر سیر حاصل بحث کرنا ضروری ہے۔ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

انتقالِ اراضی

انسدادِ اراضی سے متعلق سماجی، اقتصادی دستور کار کا زیادہ تر مقصد غریبوں کو انتقالِ اراضی کرانا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک نہایت مؤثر دستور کار ہے۔ دیہی غریبوں کی آمدنی کم کیوں ہے اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کے پاس قابلِ کاشت اراضی نہیں ہے یا اگر ہے تو بہت کم ہے۔ چین کے تجربے سے ظاہر ہوتا ہے کہ افلاس کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اس دستورِ کار پر انحصار کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس پالیسی کو ۵ کی دہائی کے اواخر اور ۶۰ کی دہائی کے آغاز سے اور زیادہ خاص طور پر جولائی ۱۹۷۲ء سے آزمایا گیا ہے تاہم افلاس کے خلاف جنگ میں اسے کبھی بھی غالب مقام نہیں دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسے ایسا مؤثر بنایا جا سکتا ہے جیسا کہ اس کے حامی اس کی زوردار وکالت کرتے ہیں۔

اس مرحلے پر یہ کہنا بے محل نہیں ہو سکتا کہ اس وقت جس سیلنگ فاضل زمین کی نشاندہی کی گئی ہے وہ ملک میں قابلِ کاشت رقبے کی محض ۱.۸ فیصد ہے اور انتقالِ اراضی سے مستفید ہونے والوں کی تعداد زرعی مزدوروں کے ۶ فیصد تک کم ہے۔ موجودہ سیلنگ قانون کے ذریعے دستیاب زمین افسوسناک طور پر اتنی کم ہے کہ اس سے انسدادِ افلاس کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔ سیلنگ کی حد میں بھاری کمی کر کے ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کمی کس قدر کی جائے اس کا کسی کو علم نہیں۔ ظاہراً اس کا انحصار زمین کی اُس مقدار پر ہوگا جو انسدادِ افلاس کے لیے ضروری ہے۔ اس سے ایک مزید سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہر

> اس امر کے بارے میں سوال کبھی نہیں اُٹھایا گیا کہ کیا تین سے پانچ فیصد کم شرح ترقی جو ممکنات کی حد کے اندر ہے۔ افلاس دور کر سکتی ہے اور اگر وہ ایسا کر سکتی ہے تو وہ اس کام کیلئے کتنے برس لے گی؟ اگر بیروزگاری اور نیم روزگاری بڑھتی گئی تو افلاس میں کیوں کر کمی ہو سکتی ہے؟

کنبے کو زراعت، آب و ہوا اور آبپاشی کے مختلف حالات میں کس قدر زمین کی ضرورت ہے جس سے وہ خطِ افلاس کو پار کر سکے۔ اتنی زمین حاصل کرنا کس حد تک ممکن ہے؟ اس کے لیے سیلنگ کی کتنی حد ہونا ضروری ہے؟ کیا اس کا اثر صرف بڑے زمینداروں پر پڑے گا یا اس سے متوسط اور چھوٹے کسان بھی متاثر ہوں گے؟ اگر موخرالذکر بھی متاثر ہوں گے تو کیا موجودہ سماجی، اقتصادی حالات اور طاقت کے ڈھانچے کے تحت یہ ممکن ہوگا؟ اور ہمارے سماجی، اقتصادی نظام کی مخصوص نوعیت کو دیکھتے ہوئے ان تمام امور کا زمینی ملکیت کی ضمنی تقسیم اور سود مند کاشت کے امکانات پر کیا اثر پڑے گا؟ کیا بے زمینوں میں اُس قسم کی برادری کی ملکیت یا کوآپریٹو کاشت کاری کو جو چین میں رائج ہوئی تھی انتقالِ اراضی کی پہلی لازمی شرط قرار دیا جانا چاہیئے؟ تب کیا غریب اُسے قبول کرنے کو آمادہ ہو جائیں گے؟ کیا انسدادِ افلاس کے لیے محض زمین پر انحصار رکھنا ہی کافی ہوگا؟ یا اس کے ساتھ ہی دیہی صنعتکاری کا ایک وسیع پروگرام شروع کیا جانا چاہیئے جس میں مزدوروں کی فاضل تعداد کو کھپایا جائے جس طرح چین میں اصلاحاتِ اراضی کے بعد کیا گیا تھا؟ اُس صورت میں کیا اصلاحات کے ڈھانچے کے معانی کو وسیع نہیں کیا جانا چاہیئے جس میں اقتصادی سرگرمیوں کی تشکیل میں تبدیلیوں کو شامل کیا جائے اور تبدیل شدہ ڈھانچے میں غریبوں کے لیے یقینی پوزیشن کا اہتمام کیا جائے؟ کیا بڑے پیمانے پر انتقالِ اراضی کیے بغیر ایسا کرنا ممکن ہے جس کے ساتھ بہت بڑے سیاسی خطرات وابستہ ہوں جنہیں کم از کم موجودہ وقت میں کوئی بھی حکومت اٹھانے کو تیار نہیں ہے؟ بلاشبہ کوئی بھی اُس دن کا انتظار کر سکتا ہے۔ جب سماج نظریاتی طور پر نظام میں انقلابی تبدیلی کے لیے تیار ہو جائے گا۔ لیکن کب تک؟ کیا انسدادِ افلاس ایک فوری کام نہیں ہے؟ اور کیا اضافہ آبادی اور اس کے نتیجے میں بڑی بڑی زمینوں کی تقسیم سے فاضل زمین کے رقبے میں کمی نہیں ہو جائے گی۔ جنہیں حاصل کیا جا سکتا ہے جب کہ اضافے کی وجہ سے زیادہ زمین کی ضرورت بڑھتی رہے گی؟ یہ وقت ہے کہ نام نہاد ماہرین سماجیات عام سطح سے اوپر اٹھیں اور اوپر اٹھائے گئے مسائل کی روشنی میں ایک عملی ایکشن پلان مرتب کریں۔

خصوصی پروگرام

اب ہم خالصتہً ٹیکنوکریٹک دستور کار پر بحث

کرتے ہیں جس کا اظہار "آئی آر ڈی پی"۔ "این آر ای پی"۔ "آر ایل ای جی پی" جیسے غریبوں کے لیے متعدد خصوصی پروگراموں سے ہوتا ہے جن پر حکام زیادہ سے زیادہ انحصار رکھنے لگے ہیں۔ ایک طرح سے یہ اس امر کے پیشِ نظر زیادہ حقیقت پسندانہ ہے کہ وہ ایک طرف سماجی دستورِ کار کو اپنانے

اور دوسری طرف شرحِ ترقی کو بہت بلند سطح تک لے جانے کے ناقابل ہیں۔ عملی نقطۂ نگاہ سے اس دستورِ کار کو اس لحاظ سے سماجی دستورِ کار پر فوقیت حاصل ہے کہ اس کا لازماً مطلب ہے مال مویشی، پمپ سیٹوں، نئے ماڈل کے چرخوں جیسے بھاری سامان کا استعمال جن کی مجموعی سپلائی استعمالِ اراضی کے برعکس لچکدار ہے اور جس کی سپلائی مقررہ اور مستقل ہے۔ لہٰذا یہ دستورِ کار محض مزید وسائل کی تحقیق کے لیے ایک موزوں حکمتِ عملی وضع کرکے اپنا مقصد پورا کرسکتا ہے۔ اس متبادل میں بھی افلاس دُور کرنے کا امکان موجود ہے اور وہ بھی مختصر وقت میں۔ بشرطیکہ اس کے تمام تر مفہوم کا احساس کرنے اور اس کی کامیابی کے لیے ضروری شرائط پوری کرنے کے بعد اسے باقاعدہ طور پر عمل میں لایا جائے۔

اس حکمتِ عملی کی کامیابی کا دارومدار ظاہراً اُن وسائل کی مقدار پر ہے جو اس مقصد کے لیے مخصوص کیے جائیں گے۔ اب تک جو وسائل مخصوص کیے گئے ہیں وہ نہایت محدود ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان پروگراموں کو ابھی مطلوبہ اثر پیدا کرنا ہے۔ اب تک انھوں نے محض ترقیاتی عمل کے ایک ضمیمے کے طور پر کام کیا ہے۔ لہٰذا سرمایہ اور پیداوار کے تناسبوں کے حقیقت پسندانہ تخمینوں کی بناء پر فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس کا نتیجہ مجموعی طور پر پلان کی از سرِ نو ترتیب کی صورت میں نکلے گا۔ محض وسائل کی تخصیص نہ بڑھا کر اور اس کے نتیجے میں پلان کی از سرِ نو ترتیب نہ کرکے محض پلان کی تعمیل میں کمی پر زور دینا جیسا کہ اب تک ہوا ہے، اصل مسئلہ سے توجہ ہٹانے کے مترادف ہے۔ اب تک جس صورت میں پالیسی کو عمل میں لایا گیا ہے اس سے ایک دہائی میں بھی افلاس دُور نہیں ہو سکے گا خواہ اسے کسی نقص کے بغیر عمل میں لایا جائے لیکن اگر اسے اس قدر طویل وقت لینا ہے تو کیا پہلے سماجی، اقتصادی تبدیلی لانے کے لیے جو سماجی اصلاح کے لیے ضروری ہے اقدامات کرنا بہتر نہیں ہوگا، لہٰذا اس کے لیے بھاری فنڈوں کی ضرورت ہوگی۔ لیکن فنڈ کہاں سے آئیں گے، وسائل کی مجموعی قلت دیکھتے ہوئے غریبوں کے لیے پروگراموں کے حق میں وسائل کی تخصیص میں بھاری اضافہ صرف اُس صورت میں ممکن ہے جب وسائل کو دوسرے شعبوں اور سیکٹروں میں جانے سے روکا جائے۔ پھر یہ کام آسان نہیں ہے اگر ہر سیکٹر اور گروپ کی طرف سے اپنی نجی ترقی کے لیے وسائل کو ہتھیانے کی مجنونانہ دوڑ

کو دیکھا جائے یہ کام صرف اُس صورت میں ممکن ہے جب حکومت کی طرف سے غریبوں کے حق میں ترجیحات کو نئی سمت دی جائے اور اُن مفاداتِ خصوصی کی ناواجب افزائش پر پابندی عائد کی جائے جو خود حکومت کے مختلف محکموں اور اداروں میں جم کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر حکومت ایسا نہیں کر سکتی تو اُس کے لیے بہتر یہی ہو سکتا ہے کہ وہ انسدادِ افلاس کے بارے میں سب کچھ بھول جائے۔

اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ نظام کو تقویت دینے اور اسکیموں کی کوالٹی کو بہتر بنا کر وسائل کے موزوں استعمال کو یقینی بنایا جائے۔ ایک حد تک اس پہلو کا تعلق وسائل سے ہے جس پر بحث کی جا چکی ہے۔ ریاستی حکومتیں ایک مضبوط تعمیلی مشینری کا قیام کیونکر کر سکتی ہیں اگر اُس مشینری کی طرف سے لیے جانے والے کام کی مقدار کم اخراجات کے باعث کم سطح پر ہو؟۔

اسکیموں کی کوالٹی سے متعلقہ پہلو کئی سوالات اُٹھاتا ہے۔ ایک خاص علاقہ میں سرگرمیوں کا امتزاج اور پروگراموں کا امتزاج کس قدر ہونا چاہیئے؟ ظاہراً ان کا تعین علاقے کے تیکنیکی اقتصادی اور سماجی حالات کے پیشِ نظر کیا جانا چاہیئے اور اُنھیں تمام ملک یا ریاست کے لیے یکساں نہیں رکھا جانا چاہیئے کیونکہ اُن میں مختلف حالات پائے جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں انتظامیہ کے ادنٰے ترین یونٹوں یعنی بلاکوں کو اسکیموں کی مقررہ فہرست نہیں دی جانی چاہیئے بلکہ دستیاب قومی یا ریاستی اسکیموں میں سے اُن کے انتخاب کی فہرست دی جانی چاہیئے۔ لیکن بلاک صرف اُس وقت آزادانہ انتخاب کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے اگر اُن کے پاس ایک بخوبی تربیت یافتہ پلاننگ مشینری

> **موجودہ سیلنگ قانون کے ذریعہ دستیاب زمین افسوسناک طور پر اتنی کم ہے کہ اُس سے انسدادِ افلاس کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔ سیلنگ کی حد میں بھاری کمی کرکے ہی کچھ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کمی کس قدر کی جائے اس کا کسی کو علم نہیں۔**

ہوگی۔ اس طرح منصوبہ بندی کے عمل کی لامرکزیت اس حکمتِ عملی کی کامیابی کی بنیادی شرط ہے۔ یہ بھی ایک مختلف کام ہے۔ اسکیموں کی پیداواری صلاحیت میں مزید اضافہ ہوگا اگر انھیں علاقائی ترقی کے دستور کار کا لازمی حصہ بنایا جائے۔ علاقے کی ترقی غریبوں کی ترقی کے لیے ایک ڈھانچہ اور ایک موقع فراہم کرتی ہے۔ پہلے ایک علاقے کی ترقیاتی سرگرمیوں کی فہرست مرتب کی جاسکتی ہے اور اُن کے باہمی تعلق کی کھوج کی جاسکتی ہے۔ تب یہ موزوں پالیسی اقدامات کے ذریعہ غریبوں کے لیے مخصوص کی جاسکتی ہے۔

آخر میں پروگرام کے مشمولات کے بارے میں چند الفاظ۔ زراعت دیہی علاقوں کی سب سے بڑی سرگرمی ہے۔ اس لیے دیہی افلاس کے انسداد کی کسی بھی اسکیم میں اسے اولیت دی جانی چاہیے۔ لیکن زراعت خود تمام دیہی غریبوں کو سودمند دھندے فراہم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ یہ خصوصاً پسماندہ علاقوں میں زراعت کے بارے میں سچ ہے جو غریبوں کے گڑھ ہیں۔ لہٰذا دیہی صنعتوں کو اولیت دینا ہوگی۔ اس کے لیے بدلے میں مختلف اقسام کی صنعتوں کے لیے موزوں ٹیکنالوجی کے انتخاب، روزگار دینے والی دیہی صنعتوں سے ترجیحی سلوک اور غالباً بعض بڑے پیمانے کی صنعتوں کی نشوونما پر پابندی سے متعلق ایک جامع پالیسی کی ضرورت ہوگی۔ یہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے جیسا کہ حصولِ آزادی کے بعد گذشتہ چار دہائیوں کے تجربے سے واضح ہوتا ہے۔

چنانچہ مختصر عرصے میں افلاس کا انسداد کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے خواہ کسی بھی پالیسی کا ہم انتخاب کریں۔ لیکن آخری حکمتِ عملی کے معاملے میں مشکلات کم معلوم ہوتی ہیں کیوں کہ اسے سرکاری ڈھانچے کے اندر لازماً ایک نئی سمت کی ضرورت ہے۔ ایسی حکمت عملیاں اور بھی زیادہ مشکل ہوں گی، جنھیں پہلے سماج کی از سر نو تنظیم کی ضرورت ہے۔

●

> محض وسائل کی تخصیص نہ بڑھا کر اور اس کے نتیجے میں پلان کی از سر نو ترتیب کرکے محض پلان کی تعمیل میں کمی پر زور دینا جیسا کہ اب تک ہوا ہے، اصل مسئلے سے توجہ ہٹانے کے مترادف ہے۔

> ریاستی حکومتیں ایک مضبوط تعمیلی مشینری کا قیام کیونکر کرسکتی ہیں اگر اس مشینری کی طرف سے لیے جانے والے کام کی مقدار کم اخراجات کے باعث کم سطح پر ہو؟

جشنِ جمہوریہ

دلؔ کھولاپوری : کھولاپور ۴۴۴۸۰۲
ضلع امراؤتی (مہاراشٹر)

بے خطر جمہوریت ہو شورشِ جذبات سے
باخبر ہو جائے ہر اک گردشِ حالات سے

سازِ دل پر اب ہمارے ایکتا کا راج ہو
ملک سارا گونج اُٹھے پیار کے نغمات سے

پیشِ مقصد ہو سدا دل جیتنے کی آرزو
جیت راس آتی نہیں لوگو! دلوں کی مات سے

حوصلے اپنے اٹل ہوں اور ارادے ہوں جواں
کب نہ جانے سامنا کرنا پڑے آفات سے

دیکھ کر ہم کو مخالف خوش نہ ہو جائے کہیں
توڑیئے مت پیار کے بندھن ذرا سی بات سے

سالِ نو پھر ساتھ لایا ہے بہاروں کا ہجوم
لطف پھولوں سے اٹھائیں ہم کبھی باغات سے

ذرہ ذرہ کہہ چکا اے دلؔ جشن خوش آمدید
شانتی ہندوستاں میں ہے انہی لمحات سے

●

ڈاکٹر آر جیسوال

عوام — عظیم ترین سرمایہ

اس مقالے کے مصنف ڈاکٹر جیسوال مشہور و معروف ماہر عمرانیات ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ترقی پذیر ممالک کو، جن میں بھارت بھی شامل ہے، جس طرح کی دشواریوں اور رکاوٹوں کا سامنا ہے، وہ ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک ایسے عالمی نظام کے سبب ہیں جو مفاد پرستانہ حکمت عملی کے تحت کام کر رہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ سب نوآبادیاتی نظام کے اثرات ہیں جو ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔ چنانچہ ترقی پذیر ممالک کی اقتصادی ترقی، ترقیاتی حکمت عملیاں اور تکنیکی ترقیات مختلف طرح کے جوڑ توڑ کا شکار رہی ہیں، یہ جوڑ توڑ کہیں آئیڈیالوجی کے زیر اثر ہیں اور کہیں ذرائع پیداوار پر کنٹرول کے سبب ہیں، جن میں غیر ملکی طاقتیں لگی رہتی ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ غریبی، بدستور غریبی ہی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ سرکاری سرمایہ کاری کے فائدے بنیادی طور پر سماج کے نچلے طبقے تک نہیں پہنچ پاتے۔ بچولیے ان رقومات کا کافی حصّہ اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں یا پھر یہ رقومات سماج کے بالائی طبقات کے مفاد کے لیے استعمال کی جاتی ہیں، بچا کھچا ہی غریبوں تک پہنچ پاتا ہے۔ مصنف کی رائے میں ایک ایسے سرگرم سماج کی ضرورت ہے۔ جہاں علم اور ہنرمندی کے سہارے سماج کی حالت میں سدھار آسکے۔ سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سماج وادی نظام ہر دو جگہ سماج کی زندگی کا معیار نقصانات میں رہا ہے اور محض ظلم و استحصال کا دور دورہ رہا ہے۔

غریبی ترقی کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے، خاص کر تیسری دنیا کے ملکوں میں۔ یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں اور یہ صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ البتہ اس صدی میں اس سے نبٹنے کے لیے شعور بیدار ہوا ہے جس کا سبب تکنیکی اور اقتصادی ترقی ہے، صارفین کی سوسائٹیاں جن پر منڈی کی معیشت غالب رہی ہے، اس تکنیکی ترقی اور شعور کی بیداری کے نتیجے میں عمل میں آئی ہیں۔ اس شعور کا ہی نتیجہ ہے کہ دنیا دو حصوں میں بٹ چکی ہے، ایک امیر ممالک اور دوسرے غریب ممالک۔ ترقیاتی حکمت عملی کے انتخاب میں محرومی کے بڑھتے ہوئے احساس نے رہنمائی کی ہے۔ شخصی آمدنی کی تقسیم پر مبنی غریبی کے اشاریوں، صارفین کی کھپت، اخراجات غذائی طریقوں وغیرہ کے پیمانوں کو سامنے رکھ کر ہی ترقیاتی عمل کو نئی نئی سمتیں دینے کی کوشش کی جاسکی ہے، اب ان تمام عناصر پر انحصار اسقدر بڑھ چکا ہے کہ اگر اپنے لیے کوئی دیگر راستہ کوئی اپنانا بھی چاہے تو متبادل راستہ کے لیے امکانات تنگ دکھائی پڑتے ہیں۔

نوآبادیاتی نظام سے ورثے میں ملنے والے اثرات

اگرچہ ترقی پذیر ممالک کے حالات ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کے حالات سے بالکل مختلف ہیں تاہم ترقیاتی نظریات کا اصل دھارا روایتی انداز کے معاشی نظام سے ہوکر گزرتا ہے جو جدید ہونے کی کوشش کے باوجود پرانی بندشوں میں الجھا ہوا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں ترقیاتی حکمت عملی کو بدلنے اور اس پر نظر ثانی کی جو کوشش کی گئی تھی وہ مفادات کی عالمی ہم آہنگی کے پابند اور آزاد نظریے کے امتزاج سے متاثر تھی۔ اس نظام سے غیر مرئی طور پر استحصالی نظام کو تقویت ملی، اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں بڑی کٹھنائی ملکی یا گھریلو طور پر پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ

وہ مالی نظام کے روایتی طریقوں کے نتیجے میں سامنے آتی ہے۔ مرڈل نے اپنے نظریے کے مطابق اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ غیر ملکی اثرات خوشحالی پھیلانے کے سلسلے کی کوششوں کو بے اثر کر دیتے ہیں اور یہ وہ اثرات ہیں جو امیر ملکوں سے غریب ملکوں کو منتقل ہوتے ہیں۔ سیاسی اور عملی میدانوں میں ترقیات کے نظریات کی برتری نوآبادیاتی نظام کی دین ہے اور تیسری دنیا کے ملکوں میں رائج نظام تعلیم بھی اسی نوآبادیاتی نظام کی دین ہے۔ اس کے ذریعے ترقی کے مغربی نظریات کو موجودہ نظام کی بقا کا ذریعہ سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ غریبی کا نظریہ بنیادی طور پر آفاقی ہے اور اُسے مقابلہ جاتی تناظر میں دیکھنا چاہیے اس کی جڑیں ثقافتی محسوسات اور داخلی عناصر میں پیوست ہیں۔

زیادہ تر ترقی پذیر ملکوں میں غریبی بے معنی ہو کر رہ گئی ہے اور یہ نوعِ انسانی کے لیے ایک توہین آمیز صورت حال ہے، خاص کر اس لیے کہ اگر اس کا مقابلہ چند ترقی یافتہ ملکوں کی چندھیا دینے والی خوشحالی سے کیا جائے تو ترقی پذیر ممالک کی غریبی نوعِ انسانی کے ماتھے پر ایک کلنک ہے۔ محرومی کا احساس بڑھتا جا رہا ہے اور نوآبادیاتی نظام کے استحصال کے اقتصادی اثرات شدت سے محسوس کیے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی رائج الوقت ترقیاتی نظام کی تکالیف کا احساس بھی بڑھ رہا ہے جہاں کہ ترقی یافتہ ملکوں پر انحصار تقریباً لازمی ہے۔ یہ انحصار ترقی کے لیے بھی ضروری ہے اور بقا کے لیے بھی۔

اثاثہ جات اور اشیاء کی تقسیم میں انصاف کو یقینی بنانا

اس صورت حال میں زیادہ تر ترقی پذیر ممالک یہ شکار محسوس کر رہے ہیں کہ وہ اپنے لیے ترقی کا کون سا راستہ اپنائیں جس سے کہ ان کے شہریوں کو سارے مواقع دستیاب ہو سکیں اور اشیاء کی تقسیم میں انصاف برتا جا سکے۔ ان ملکوں میں تکنیکی ترقی کا معاملہ ہو، اقتصادی ترقی کا سوال ہو یا ترقیاتی حکمت عملی اپنانے کی بات ہو۔ ان سب کو کسی نہ کسی پابندی کا سامنا ہے، خواہ یہ پابندی نظریاتی ہو یا غیر ملکی طاقتوں کی طرف سے ذرائع پیداوار پر کنٹرول کی صورت میں ہو — اس لیے ترقی پذیر ملکوں کے سامنے

> سماج کو سرگرم بنانے کے لیے اس کے راستے کی دشواریوں کو دور کرنا ضروری ہے۔ اس طرح سے سماج کی کایا پلٹ میں سماجی ادارے اپنی اجتماعی ضرورتوں اور مقاصد کو سمجھیں گے۔ اس کے لیے رائے عامہ بدلنی ضروری ہوگی۔ علم کا پھیلاؤ اور ہنرمندیوں کی تشہیر سماج کو سرگرم عمل بنانے میں بے حد معاون ہوگی۔ سماج کو ایسے حالات سے دور رہنا ہوگا جن میں عوام یا طبقات کام سے جی چرائیں۔

چند ایک سوالات ہیں جو ذیل میں درج ہیں :-

(۱) ترقی اور تقسیم کا جھگڑا :- غریب لوگوں کے معیار زندگی میں اصلاح و بہتری اور اشیاء کی تقسیم کے نظام کو سامنے رکھے بغیر فی کس اوسط آمدنی یا مجموعی قومی دولت کی اصطلاح کے ساتھ اقتصادی ترقی ناپنے کے سلسلے میں اختلاف رائے ہے۔

(۲) زراعتی اور صنعتی ترقی کا مقابلہ :- یہاں سوال یہ ہے کہ ان میں سے کون زیادہ ترجیح چاہتا ہے اور کس سیکٹر اور شعبے میں زیادہ سرمایہ کاری کی جائے۔

(۳) منصوبہ بندی میں شہری اور دیہی پس منظر :- یعنی یہ جھگڑا ہے کہ دیہی علاقوں کو چھوڑ کر شہری علاقوں پر زیادہ توجہ ہے۔ شہروں میں وسائل اور سہولتیں زیادہ دی جا رہی ہیں اور آمدنیوں کا ارتکاز شہروں میں ہے۔

(۴) ٹکنالوجی کا جھگڑا :- سوال یہ ہے کہ ٹکنالوجی ایسی ہو جس سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کھپایا جا سکے یا ایسی ہو جس پر زیادہ سرمایہ کاری درکار ہے۔ یعنی انتہائی جدید طریقے اپنائے جائیں یا محض مناسب ٹکنالوجی سے کام لیا جائے۔

(۵) فیصلہ سازی میں مرکزیت یا لامرکزیت :- سیاسی نظام ہو یا اقتصادی نظام دونوں ہی جگہ یہ مسئلہ درپیش ہے۔ ایچ مادھوسنگر جیسے ماہر اقتصادیات کا عرصہ دراز سے یہ نظریہ رہا ہے کہ زیادہ آمدنی والا سماج سماجی اعتبار سے کم ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ اس نے رائج الوقت اقتصادی ترقی کے نظریے پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا ہے اسی طرح ماہر اقتصادیات پیٹر ایف۔ ڈریکر نے ۱۹۷۳ء میں یہ تسلیم کر لیا تھا کہ جہاں کہیں صرف پیداوار کے اقتصادی عناصر میں مدد دی گئی ہے اور سرمایہ فراہم کیا گیا ہے، وہاں ترقی کے محاذ پر کوئی خاص کامیابی دیکھنے کو نہیں ملتی ... ترقی دوسرے لفظوں میں انسانی قوتوں سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ اقتصادی دولت سے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں مینیجمنٹ بنیادی وسیلہ بن رہا ہے اور ترقی پذیر ملکوں میں بنیادی ضرورت بن کر سامنے آ رہا ہے۔

ترقی کے فائدے کہاں جاتے ہیں :-

ترقی کے محاذ پر کمی کا سبب غریبی میں دکھائی پڑتا ہے۔ اگر معیار زندگی کمزور ہے اور اقتصادی سطح کم ہے تو اس کا واحد نتیجہ یہ ہے فی کس اوسط آمدنی کم ہوگی، صارفین کے اخراجات کم ہوں گے اور تغذیہ بخش غذا کی کمی ہوگی۔ غریبی کا اثر کبھی کبھی اتنا بدیہی ہوتا ہے کہ یہ اپنا کلچر پیدا کرنے اور بنانے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ سے ضعیف الاعتقادی، تقدیر پر شاکر رہنا اور اسی طرح کے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ترقی کی کمی کے بیشتر مسائل ضروری نہیں غریبی سے پیدا ہوں جیسا کہ اکثر کہا جاتا ہے۔

یہ کم وبیش سماجی رہن سہن اور سماجی ڈھانچے کی وجہ سے بھی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ کسی خاص ترقیاتی عمل کے غیر مطلوبہ اور ان چاہے نتیجے ہوتے ہیں۔ ترقی پذیر سماج میں جو نظام رائج ہے اس کے تحت ترقیاتی سرمایہ کاری کے فائدے بنیادی طور پر سماج کے کمزور ترین طبقات تک نہیں پہنچ پاتے۔ ترقیاتی سرمایہ کاری مقابلتاً مختصر بالائی طبقے کے ہاتھوں میں محدود ہے۔ متوسط سطح کے دلالوں کی طرف سے سرمایہ کاری کے فائدے سمیٹ لیے جانے کے بعد مشکل ہی سے کوئی حصہ نچلے طبقے اور غریبوں کے لیے باقی بچتا ہے۔ یہ دلال ایک طرف اپنے مفادات سے دلچسپی رکھتے ہیں اور دوسری طرف بالائی طبقوں کے مفادات میں معاون ہوتے ہیں اور انھیں سے جڑے رہتے ہیں۔ اس طرح سے اکثریت غریبوں کی ہے جن کی سرمایہ کاری پر براہ راست کوئی دسترس نہیں ہے اور صرف بچے کھچے پر ہی زندگی گزارتے ہیں۔ سرمایہ کاری میں اضافے سے ان نچلے اور غریب افراد کو راحت نہیں ملتی البتہ دولت اور وسائل کے ارتکاز میں مدد ملتی ہے۔ انفرادی کوششوں کی جگہ ادارہ جاتی ذرائع راہ پاتے ہیں اور ان کے توسط سے اجارہ داری کو تقویت ملتی ہے۔ اس لیے رضاکار اداروں کے ذریعے عوامی شرکت کا تصور بھی بے معنی ہوتا جا رہا ہے۔ اکثر تحقیقی مطالعے یہ واضح کرتے ہیں کہ یہ تنظیمیں ابھرتے ہوئے چیدہ طبقے کے افراد کی نگرانی میں ہیں۔ غریب ان کے خلاف منظم طور پر آواز اٹھانے کے قابل نہیں۔ اس لئے یہ ادارے مالکانہ حیثیت رکھنے والے طبقات کے مفادات کی خدمت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک وہ ترقیاتی نظام ہے جو سرمایہ داری پر منحصر ہے۔ اس کا جھکاؤ شہری اور صنعتی ترقی پر ہے، اس لیے دیہات کے غریب اور قبائلی آبادی اس کا سب سے بڑا شکار ہوتے ہیں، شہری یا صنعتی علاقے کی ترقی ہو،

باندھ بنانے کا سوال ہو، بجلی پیدا کرنے کا معاملہ ہو، پراجیکٹ کی تعمیر ہو، سڑکوں کی تعمیر ہو، ان تمام کاموں میں اراضی کا حصول اور آبادی کو بے گھر کرنا ہوتا ہے جن سے تناؤ بڑھتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کی زندگی اتنی تلخ ہو جاتی ہے جس قدر کہ غریبی سے نہیں ہوتی۔ غریبوں کے استحصال کے ذریعے جو نقصانات انھیں پہنچتے ہیں، ان کا ازالہ ریاستی خیرات یا بہبودی پروگرام نہیں کر سکتے اور

> ترقیاتی عمل کسی بھی مرحلے میں مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو ذہنی کیفیت کا نام ہے، یہ ایک رجحان ہے یا یہ ایک سمت ہے، مقصد نہیں۔ اس طرح سے یہ تصور ترقی کے رائج الوقت تصورات اور نظریات سے جدا ہے

یہ تو صرف اقتصادی نقصانات کو پورا کرنے تک ہی محدود ہے، دیگر نقصانات کا تو ذکر ہی کیا، غریب کی پیداواری صلاحیت بڑھا کر اور ترقیاتی عمل کے لیے متبادل راستہ کی کھوج کر کے، جس سے کہ آمدنی، وسائل اور مواقع کی تقسیم کو مبنی بر انصاف بنایا جا سکے، مسئلہ کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے، اس طرح ترقی کا مسئلہ صرف غریبی دور کرنے تک ہی محدود نہیں رہ جاتا بلکہ یہ تو وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں کہ غریبی ختم ہوتی ہے ــــ غریبی ختم ہونے سے مراد یہ ہے کہ جہاں وسائل کی کمی، مواقع کی کمی اور مایوسی ختم ہوتی ہے۔ چنانچہ ترقی پذیر ملکوں کے حالات کی مناسبت سے انتظامی طریق کار وضع کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

سماجی ذمہ داریاں اور بنیادی ضرورتیں

جب ہم مذکورہ نوعیت کے ترقیاتی انتظامیہ کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب ایسے نظام کی ضرورت سے ہوتا ہے جہاں اقتصادی ترقی اور سماجی انصاف دونوں کو ساتھ لے کر چلا جا سکے، اس کے لیے ایسے انداز نظر اپنانے کی ضرورت ہے جس سے غریب عوام میں ایسی لیاقت

پیدا ہو سکے جس سے کہ اپنا مقدر خود سنوار سکیں۔ اس کا تعلق بنیادی طور پر انسانی وسائل کے فروغ سے ہے۔ عوام سب سے عزیز اور قیمتی سرمایہ ہیں۔ اس میں عوام کو ترغیب و تحریک کے ذریعے ایسے راستے پر ڈالنا ہے جہاں وہ اپنے لیے خود کام کر سکیں اور سرکاری اقدامات کو سماجی انصاف کی راہ پر ڈالنے کے لیے سرکار کو مجبور کر سکیں۔ اس کے تحت ہندوستان کے اقداری نظام پر مبنی طرز زندگی اپنانا ہوگا۔ اس طرح کے اقداری نظام سے زندگی کی قدر و قیمت بڑھتی ہے اور محض مادی خوشحالی اور آرام و آسائش کی کبھی نہ ختم ہونے والی خواہش نہیں رہتی بلکہ زندگی کی اہمیت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ سماجی ترقی اور خوشحالی کیلئے ایک ماحول بنتا ہے اور اس کے لیے آپسی تعاون کو فروغ ملتا ہے۔ زندگی کے سبھی شعبوں میں اقداری نظام کے ذریعے ذمہ داریوں کو بخوبی نبھایا جا سکتا ہے۔ اس کے تحت وسیع تر مفادات کو قابل ترجیح سمجھا جاتا ہے اور انفرادی مفادات سے دست کش ہوا جا سکتا ہے۔ یہ سب کام اخلاقی بنیادوں پر انجام دیا جا سکتا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے بھی اخلاقی ضابطے ہیں۔ اس کا دعویٰ یہ نہیں کہ جو چیز پرانی ہو، وہ سونا ہے یا ہر نئی چیز اپنی طرف دامنِ دل کھینچتی ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ قدیم میں جو اچھی چیز ہو، اسے رکھ لو، اور اسی طرح جدید میں جو فضول ہو، اسے رد کر دو، علم حاصل کرنا اور دوررس نگاہ ڈالنا برا نہیں، لیکن اندھی تقلید یقیناً غیر پسندیدہ ہے۔

مذکورہ بالا انداز نظر سماج کو سرگرم عمل بنانے کے لیے قرینہ کا ہے، اس طرح سے سماج میں برابر تبدیلی کا عمل جاری وساری رہے گا اور وہ عصری تقاضوں کا ساتھ دے سکے گا۔ اس طرح کے سماج کی تعمیر کے لیے کچھ بنیادی شرطیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ تبدیلی کی خواہش خود سماجی ارکان کے اندر پیدا ہو اور وہ ایکٹر کی طرح سے اپنے کام سے واقف ہوں،

یہ کام مل جل کر اس طرح انجام دیا جائے کہ سماجی منظر نامہ خراب نہ ہونے پائے۔ اس کے ساتھ ہی اقتدار پر وسائل پر گرفت ہو جس سے کہ عام سماجی اور اقتصادی نظام میں شریک ہو سکیں۔ ترقیاتی نظام باضابطہ ہو جس سے کہ غریبی میں پھنسا سماج اپنی حالت بدل سکے اور وہ ترقیاتی کاموں میں سرگرم ہو سکے۔

سرگرم سماج :- سماج کو سرگرم بنانے کے لیے

> سرمایہ دارانہ اور سماج وادی منصوبہ بندی کے طریقے اور ترقیاتی عمل کا نظم و نسق تبدیلی کے ایک لامتناہی سلسلے سے دوچار ہے۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام نے ایک کمزور سماج کو جنم دیا ہے تو سماج وادی نظام نے ایک گروہی سماج کی تخلیق کی ہے۔ دونوں جگہ ظلم و تعدی اور استحصال کا دور دورہ رہا ہے اور سماجی زندگی میں جان پیدا نہیں ہو سکی ہے۔

اس کے راستے کی دشواریوں کو دور کرنا ضروری ہے۔ اس طرح سے سماج کی کایا پلٹ میں سماجی ادارے اپنی اجتماعی ضرورتوں اور مقاصد کو سمجھیں گے۔ اس کے لیے رائے عامہ بدلنی ضروری ہوگی۔ علم کا پھیلاؤ اور ہنرمندیوں کی تشہیر سماج کو سرگرم عمل بنانے میں بے حد معاون ہوگی۔ سماج کو ایسے حالات سے دور رہنا ہوگا جن میں عوام یا طبقات کام سے جی چرائیں۔ انتظامیہ کا انداز نظر بنیادی طور پر ترقیاتی عمل کی ناپائیداری کو ختم کرنا ہے۔ عوام کو ترقیاتی عمل میں شریک کرنے کے بہانے پیش کیا جاتا ہے مگر اس طرح کے کام سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اس لیے اصل کام یہ ہے کہ سماجی کایا پلٹ اور ترقی کے پروگراموں میں انھیں پوری طرح اور عملی انداز میں شریک کیا جائے۔ ایسا کرنے سے عوام اپنے طور پر اپنے مسائل کو حل کر سکیں گے۔

ترقیاتی عمل کسی بھی مرحلے میں مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو ذہنی کیفیت کا نام ہے، یہ ایک رجحان ہے یا یہ ایک سمت ہے، مقصد نہیں۔ اس طرح سے یہ تصور ترقی کے رائج الوقت تصورات اور نظریات سے جدا ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ انتظامیہ کی ترقی اور ترقی کے لیے انتظامیہ۔

اس طرح سے پبلک ایڈمنسٹریشن ترقیاتی عمل کا جزو لازم ہے۔ منیجر سماج کا ایجنٹ ہے — ایک ایسے سماج کا جس پر مبنی بر انصاف سماج کے تقاضے عائد کیے گئے ہیں۔ عوام کی تنظیم اور ان کا نظم و نسق کچھ اس طرح کا ہونا چاہیے جس سے وہ از خود سماجی انصاف حاصل کر سکیں۔

مختصر یہ کہ ترقیاتی انداز فکر اپنے طویل راستے میں ایک نازک مقام پر پہنچ چکا ہے — ایک ایسے مقام پر جہاں مداخلت ضروری ہو گئی ہے۔ سرمایہ دارانہ اور سماج وادی منصوبہ بندی کے طریقے اور ترقیاتی عمل کا نظم و نسق تبدیلی کے ایک لامتناہی سلسلے سے دوچار ہے۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام نے ایک کمزور سماج کو جنم دیا ہے تو سماج وادی نظام نے ایک گروہی سماج کی تخلیق کی ہے۔ دونوں جگہ ظلم و تعدی اور استحصال کا دور دورہ رہا ہے اور سماجی زندگی میں جان پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ لہٰذا غریبوں کی ترقی اور غریبی دور کرنے کے لیے ہمیشہ مردانہ جسارت کے حامل انتظامیہ کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ملا جلا انداز نظر اپنانے کی ضرورت ہے۔

بقیہ: پورے سماج کی شمولیت ضروری

سوال یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرے کی تشکیل نو کیسے کرنے جا رہے ہیں۔ جب بسمارک کو جرمنی کے چانسلر کا عہدہ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا، اس سے ایک سال پہلے کی بات ہے کہ ایک انگریز ملاقاتی نے اس سے پوچھا: "آپ نے جرمنی کو عظیم کیسے بنایا؟" بسمارک نے کہا: "تنہا تنہا۔ تنہا۔"

علیحدگی خواہ کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہو، یہ ہمارے حالات میں نہ تو ممکن ہے نہ ہی مناسب۔ اگرچہ ترقی باہر سے درآمد نہیں کی جا سکتی پھر بھی یہ بین الاقوامی صورت حال سے جڑی ہوتی ہے اور عالمی انحصار باہم لازمی ہے۔ دراصل بین الاقوامی حالات کے دائرے میں رہتے ہوئے قومی مفادات کو عظیم ترین اہمیت دی جانی چاہیے۔ کیا ہمارے اندر سچی لگن ہے؟ کیا ہمارا ذہن اپنے منصوبوں اور ترجیحات اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے سیاسی عزم کے بارے میں صاف ہے؟ یہ یہاں وہاں پیوند لگانے کا سوال نہیں ہے۔ نہ معاملات کو تھوڑا تھوڑا کر کے سدھارنے کا یا خود کو چند مخصوص اسکیموں تک محدود کرنے کا سوال ہے۔ اس کے برخلاف ہمیں تمام سماجی، اقتصادی اور تعلیمی سرگرمیوں کا احاطہ کرتے ہوئے ایک مکمل اور جامع انداز نظر اختیار کرنا چاہیے۔ سماجی تبدیلیاں محض معقولیت پسندانہ منصوبوں یا دانشوروں کی مساعی سے ہی نہیں لائی جا سکتیں بلکہ یہ سارے سماج، سارے معاشرے کی بھرپور شمولیت کے ذریعے ہی لائی جا سکتی ہیں۔ اس کے لیے سماج میں مادی اور ثقافتی معیاروں کو بلند کرنے کا جذبہ بیدار کرنا ہوگا۔ اور عوام کے دلوں کو سماجی تشکیل نو کی شدید خواہش سے معمور کرنا ہوگا۔

حوالہ جات

۱۔ ایل۔ کے۔ جھا کا مضمون "اکنامک پروگریس"۔ یوجنا ۱۶۔۳۱ مئی ۱۹۸۵ء

۲۔ ڈاکٹر منموہن سنگھ کا الوداعی خطبہ۔ آٹھویں عالمی اکنامک کانگریس۔ ۵ دسمبر ۱۹۸۶ء صفحہ ۵۔

۳۔ "چیلنج آف ایجوکیشن" نئی دہلی ۱۹۸۵ء صفحہ ۲۷ اور ۲۸۔

۴۔ ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ کا خطبۂ افتتاحیہ۔ آٹھویں عالمی اکنامک کانگریس، یکم دسمبر ۱۹۸۶ء، نئی دہلی۔ صفحہ ۱۹۔ ایلیٹ ازم پر نقد و تبصرہ کے لیے پروفیسر او۔ پی۔ مہاجن کا مضمون "انڈین پلاننگ: ان ریٹرو سپیکٹ اینڈ پراسپیکٹ" اور "ڈیولپمنٹل پراسیس آف انڈین اکونومی" مرتبہ پی۔ آر۔ برہمانند اور وی۔ آر۔ پنچ مکھی میں ملاحظہ فرمائیے صفحہ ۷۳۴۔۷۵۱ ●

کامیشور چودھری

غربت کے سماجی اور ثقافتی پہلو

اس مضمون میں مصنف نے، جوکہ جواہرلال نہرو یونیورسٹی میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ریسرچ اسکالر ہیں، ویدک عہد سے آج کے جدید دور تک غربت کے اسباب و عوامل کی نشاندہی ان کے تاریخی پس منظر کے ساتھ کی ہے۔ مصنف نے مستند حوالوں کے ذریعے حتمی طور پر یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ ماضی میں سنہرے دور نام کا کوئی دور کبھی نہیں گزرا ہے۔ نوآبادیاتی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی، جوکہ خود بھی غربت میں اضافے کا ایک اہم سبب رہی تھی، یہاں کا پرانا سماجی نظام بھی رفتہ رفتہ نابود ہوتا چلا گیا۔ آزادی کی تحریک میں عوام نے جس طرح حصہ لیا اس سے ان میں اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے عوام بھی قومی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ مصنف کے خیال میں آزادی کے بعد کیے جانے والے منصوبہ بند اقتصادی اقدامات اس لیے زیادہ حوصلہ افزا ثابت نہیں ہو سکے کہ دولت حاصل کرنے کے وسائل سماج کے ایک محدود طبقے تک ہی سمٹ کر رہ گئے۔ مصنف نے اس مضمون میں یہ نشاندہی بھی کی ہے کہ جہاں ملک کے دستور اساسی میں، جائداد بنانے کے حق اور پیداوار کے وسائل کی ملکیت کو بھی بنیادی حقوق کے ہی ضمن میں رکھا گیا ہے، کام کرنے کے حق، اور تعلیم حاصل کرنے کے حق کو مملکت کے ہدایتی اصولوں میں شامل کیا گیا ہے۔ مصنف کا خیال یہ ہے کہ ایسے حالات میں ملک کے سماجی ڈھانچے میں انقلابی تبدیلی بلکہ اس کی ازسرنو تشکیل بہت ضروری ہے۔

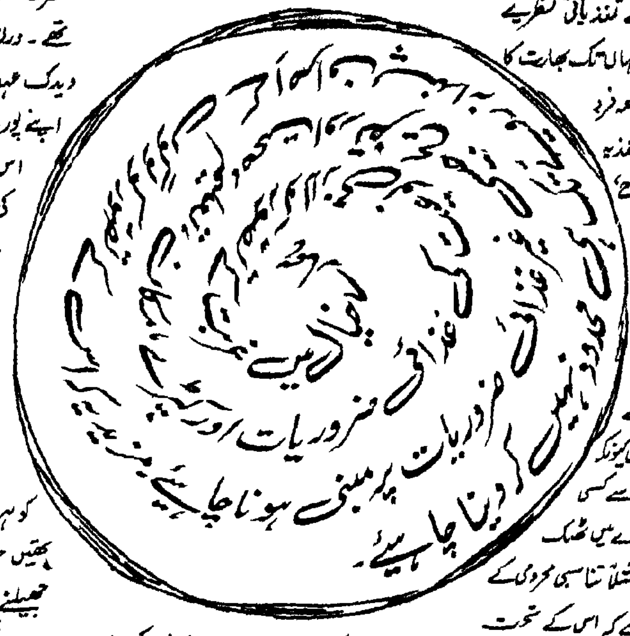
غربت کی تعریف مختلف معاشروں میں انکے اپنے حالات کے لحاظ سے کی جاتی رہی ہے تاہم اس کی تعریف کے سلسلے میں دو عام طریقہ کار یا نظریے اپنائے جاتے رہے ہیں۔ یعنی تناسبی محرومی کا نظریہ اور تغذیاتی نظریہ۔ تناسبی محرومی کے نظریے کے لحاظ سے کسی بھی آبادی کے افراد، کنبے یا گروہ، کو اس صورت میں غریب یا نادار کہا جاتا ہے جبکہ انھیں دولت، آمدنی، تعلیم اور سیاسی طاقت کے فقدان کی وجہ سے اسی معاشرے کی متوسط درجے کی بود و باش، رسم و رواج کی ادائیگی اور دوسری سرگرمیوں سے الگ کر دیا گیا ہو، آخرالذکر یعنی تغذیاتی نظریے کے لحاظ سے غربت کی حدبندی

بھی فراہم کیجیے یا کم از کم اتنی تغذیہ کی دستیابی کی بنیاد پر کی جاتی ہے جو کہ اسے اچھی صحت اور کام کرنے کی صلاحیت کو برقرار رکھنے کے لیے درکار ہوتی ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں غربت کی سطح کا پتہ لگانے کے لیے تناسبی محرومی کے نظریے سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ بہرحال ترقی پذیر ملکوں میں اس طرح کے مطالعات کے لیے تغذیاتی نظریے کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے تو کسی بھی زیر مطالعہ فرد کے لیے ۲۲۵۰ کلوری یومیہ تغذیہ کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ اناج، دالوں، پھلوں، گوشت، انڈے وغیرہ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

مگر مشکل یہ ہے کہ یہ دونوں ہی نظریے غربت کے حقیقی فلسفے سے عاری ہیں کیونکہ ان دونوں نظریوں کی مدد سے کسی بہتر انسانی وجود کے بارے میں ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چل پاتا۔ مثلاً تناسبی محرومی کے نظریے میں یہ قباحت ہے کہ اس کے تحت مختلف وسائل کی حصولیابی کے لیے کسی فرد کی خواہشات کی حد بندی ہی نہیں کی جا سکتی۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے معاشرہ زوال پذیر بھی ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ، کم سے کم غذائی ضرورت کی تکمیل تو ضروری ہوتی ہی ہے، مگر اس تکمیل کو ہی انسان کی بہترین بقا کے لیے کافی قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ کم سے کم، غیر غذائی ضروریات بھی برابر کی ہی اہمیت رکھتی ہیں جن کا اس نظریے میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں غربت کے تصور کو لازمی نوعیت کی غذائی ضروریات اور کپڑے، مکان، تعلیم، صحت اور تفریح جیسی غیر غذائی ضروریات پر مبنی ہونا چاہیے۔ مزید یہ کہ لوگوں کے اصراف پسندانہ رویے کو محدود نہیں کر دینا چاہیے۔

بھارت میں غربت کے متوازن تجزیے کے لیے اس مسئلے کے انفرادی اور سماجی، نیز معروضی اور موضوعی پہلوؤں کا تسلسل کرنا اور تاریخی تناظر



کے ساتھ ان کی باہمی عمل پذیری کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔

تاریخی پس منظر

ماضی میں کسی سنہرے دور کا تصور بالکل غلط ہے۔ بھارت میں غربت کا مسئلہ ہمیشہ موجود رہا ہے۔ ابتدائی عہد کی کتابوں میں بھی اس سلسلے کے چند ہی حوالے ملتے ہیں۔ رگ وید کے تیسرے باب کے آٹھویں بھجن میں خدا سے غربت اور قحط ہٹا لینے کی دعا کی گئی ہے۔ عام غربت کا مسئلہ دراصل سماج کی بناوٹ کا ہی ایک حصہ ہے۔ رگ وید کے عہد (۱۵۰۰ ق م) کا معاشرہ، بحیثیت مجموعی ایک قبائلی نیم خانہ بدوش معاشرہ تھا جس کا عام پیشہ گلہ بانی تھا۔ اس کے بعد کے ویدک عہد (۱۰۰۰—۶۰۰ ق م) میں اس معاشرے نے زراعتی معاشرے کی حیثیت حاصل کر لی مگر زراعت کے ابتدائی زمانے میں پیداوار زیادہ نہیں ہو پاتی تھی اور اس کی وجہ سے اس وقت کے حکمران کسانوں سے زیادہ وصول نہیں کر پاتے تھے۔ ورن آشرم یعنی ذات پات میں بٹا ہوا معاشرہ ویدک عہد کے بعد کے زمانے (۶۰۰ ق م) میں اپنے پورے عروج پر تھا۔ براہمن اور چھتری، جو کہ اس وقت حکمران تھے، ویشیوں اور شودروں کی فاضل پیداوار پر ہی جیتے تھے، ویدک عہد کی عام غربت کے حالات کے برعکس اس عہد میں غربت دراصل سماجی وسائل کی نابرابر تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی نابرابری کا ایک لازمی حصہ بن گئی تھی۔

قدیم اور متوسط عہد میں حکمران طبقے کو ہر طرح کی مراعات اور سہولیات حاصل تھیں جبکہ عام لوگوں کو غربت کے شدید مصائب جھیلنے پڑتے تھے، Kalhana کے رجت رنگینی نے ۹۱۷ عیسوی کے قحط کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

اب جہلم ندی میں بھی پانی نظر نہیں آتا۔ بادشاہ کے وزیر اور محافظ چاول کو اونچے داموں پر فروخت کر کے بہت مالدار ہو گئے ہیں"۔ اس طرح شاہجہاں کے نام نہاد سنہرے دور کے کچھ خراب برسوں کے دوران بھی حالات اس حد تک خراب ہو گئے کہ لوگ ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے لگے اور اپنے بیٹے کا گوشت بھی اپنی محبوبہ کو پیش کیا جانے لگا تھا"۔

(عبدالحمید کی تصنیف بادشاہ نامہ سے ماخوذ)

نوآبادیاتی دَور حکومت میں ہندوستانی معیشت برطانوی تجارت و صنعت کی تابع محض بناکر رکھدی گئی تھی جس کا نتیجہ شدید قسم کی غربت کی شکل میں سامنے آیا۔ ولیم ڈگ بائی کے بیان کے مطابق ۱۸۵۴ اور ۱۹۰۱ کے دوران مختلف قحطوں میں ۲،۸۸،۲۵،۰۰۰ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ بار بار کی قحط سالی اور ان میں اتنی بڑی تعداد میں قوموں کی ہلاکتوں سے پتہ چلتا ہے کہ بھارت میں غربت اور بھوک مری کی جڑیں کتنی گہری ہیں۔

قدیم اور ازمنۂ وسطیٰ میں غربت کو ایک قدرتی آفت سمجھا جاتا تھا اور اسے کرم اور کام کے فلسفے سے جوڑ دیا گیا تھا اور اُس وقت کے حکمران، زمیندار یا دولتمند شخص، غریب لوگوں کو دان دینا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا تھا۔ ایسی صورت میں ایک غیر مساوی سماجی ڈھانچے کو استحکام حاصل ہوتا چلا گیا۔

زندگی کے معیار کو بہتر بنانے کی سماجی ذمہ داری

لیکن قومی تحریک میں عوام نے جس طرح حصہ لیا اس کی وجہ سے وہ قومی زندگی کی اگلی صفوں میں آتے چلے گئے۔ ملک کے نئے جمہوری ڈھانچے میں عوام کو ایک باوقار حیثیت حاصل ہوئی۔ غریب اور نادار عوام کی زندگی کو بہتر بنانے کی سماجی ذمہ داری حکومت نے اپنے اوپر لی۔ تمام شہریوں کو کافی تعداد میں روزگار کے وسائل کی فراہمی، مادّی وسائل کی منصفانہ اور مساوی تقسیم، اور دولت کے ارتکاز کو روکنا بھارت کے دستور کا مقصد قرار دیا گیا۔ حکومت نے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبوں کے ذریعے غربت کی لعنت کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینے کے لیے جامع اقدامات کیے۔ لیکن اگر مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس سلسلے میں سرکاری پالیسی کے اثرات زیادہ حوصلہ افزا ثابت نہیں ہوسکے ہیں۔ معیشت کی نشو ونما کی رفتار بہت دھیمی رہی ہے۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ حصولِ آزادی کی چار دہائیوں کے بعد بھی آبادی کا چالیس فیصد حصہ غربت کے خط سے نیچے کی زندگی گزار رہا ہے۔ اور اگر غربت کی ناقص تعریف کے مطابق صحت اور تعلیم کے سلسلے کو بھی شامل کرلیا جائے تو آبادی کا مزید ۳۰ فیصد حصہ بھی اسی زمرے میں آجائے گا۔ مزید کہ، ترقیات کے جو تھوڑے بہت ثمرات سامنے آئے بھی ہیں تو وہ بھی اعلیٰ متوسط طبقے اور مالدار طبقے کے لوگوں تک ہی محدود رہے ہیں جس کی وجہ سے دولت کے ارتکاز کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ بے روزگار لوگوں کی بڑی تعداد، غیر نفع بخش سامان کے مالکوں کی اکثریت، غریب کسان اور مزدور اور نادار طبقے کے دوسرے لوگ، سرکاری اقدامات کے فوائد سے محروم ہی رہے ہیں۔ پھر یہ کہ، غربت کے خاتمے کے پروگراموں میں اُن غریبوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے جو شہروں میں رہتے ہیں اور دیہاتوں سے شہروں کی طرف آبادی کا بھاری منتقلی کی وجہ سے ان کی تعداد مسلسل بڑھتی ہی جارہی ہے۔

اسباب و عوامل

غربت کے انسداد کے لیے حکومت کی کوششیں کامیاب نہ ہونے کی وجہ، آبادی میں زبردست اضافہ، قدرتی آفات اور لوگوں کی انفرادی نا اہلی بتائی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بھارت میں غربت سماجی ڈھانچے کی پیدا کردہ ہے نہ کہ قدرتی حالات کی۔ یہ سماجی حالات کے تحت ہی جنم لیتی ہے اور پروان چڑھتی رہتی ہے۔ بلکہ اسے معاشی، سیاسی اور سماجی اختیارات کی غیر مساوی تقسیم کا ایک لازمی نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ غربت کی جڑیں معاشرے کی سماجی، اقتصادی اور ثقافتی تنظیم میں ہی پیوست ہوتی ہیں۔ اس کے سماجی، اقتصادی اور قدرتی عوامل تو اس کے محض مظاہر ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ مظاہر بھی غربت کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔

بھارت والوں کو غربت کے مسئلہ کا ہمیشہ سے ہی سامنا رہا ہے۔ مگر اسے اب تک نوآبادیاتی نظام حکومت کا ہی نتیجہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ برطانوی اقتدار نے دیہی، سماجی اور اقتصادی ڈھانچے کو ختم کردیا تھا۔ شہری دستکاریوں کے اچانک خاتمہ کے نتیجے میں شہری اور دیہی علاقے کے دستکار محتاج ہوتے چلے گئے۔ زمینداری، مہاجنوں اور انگریزوں کے ذریعے کسانوں کے شدید استحصال کا نتیجہ افلاس اور ناداری کی شکل میں سامنے آیا۔ انگریزوں کے ہاتھوں ملک کے اقتصادی استحصال،

بے روزگار لوگوں کی بڑی تعداد، غیر نفع بخش سامان کے مالکوں کی اکثریت، غریب کسان اور مزدور اور نادار طبقے کے دوسرے لوگ، سرکاری اقدامات کے فوائد سے محروم ہی رہے ہیں۔

کئی بہانے بنائے کہ غربت کی بد انگیزی
پیداوار کا ایک خاص حالت پر رکے رہنا، صنعت
کاناکا نہ ہونا۔ کچھ ایسے حالات تھے جس کی وجہ
سے یہاں کے لوگ زیادہ سے زیادہ غربت کا شکار
ہوتے گئے۔ اس کے علاوہ یہ کہ سرمایہ پر مبنی معیشت
اور زراعت کی
تجارت کاری سے بھی
ملک کے
نظام کو سخت دھکا
پہونچا۔ اب تک
اس نظام کی وجہ
سے ہی یہاں کے
لوگ صدیوں سے
اقتصادی، سماجی اور ثقافتی اعتبار سے
ایک دوسرے سے جڑتے چلے آئے تھے، ہوتا یہ تھا
کہ ہر پیشے کے لوگ اجتماعی طور پر ایک دوسرے کی
ضروریات پوری کرتے تھے۔ برطانوی عہد میں اس
نظام کے زوال کی وجہ سے پورا دیہی ڈھانچہ ہی
اتھل پتھل ہو کر رہ گیا اور غریب طبقے کے لوگ
امیروں کی عنایات سے محروم ہو گئے اور اس طرح
غربت کا شکار ہو کر موت کی گود میں جاتے رہے۔

حصولِ آزادی کے بعد غربت کا اتنے بڑے
پیمانے پر پلنے جانے کی سب سے بڑی وجہ حکمران
طبقے کا رجعت پسندانہ اور سامراجی کردار رہا ہے۔
حقیقت تو یہ ہے کہ انگریزوں نے اقتدار عوام کی
بجائے ملک کے مخصوص اور چیدہ طبقے کے حوالے
کیا تھا۔ بھارت کو آئینی طور پر ایک سوشلسٹ، سیکولر
اور عوامی جمہوریہ قرار دئے جانے کے باوجود، یہ چیدہ
مخصوص سیاسی طبقہ اپنے ہی استحکام کی پالیسی پر
عمل پیرا رہا ہے۔ جائداد بنانے کا حق اور پیداوار
کے وسائل کی ملکیت کا حق، جو کہ تمام سرمایہ دارانہ
نظام کی بنیاد ہے، دستور اساسی میں بنیادی حقوق

کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔ لیکن کام کرنے
کے حق، تعلیم حاصل کرنے کے حق جیسے سوشلسٹ
نظریات کو ملک کے لیے ہدایتی اصولوں کی پالیسی
میں شامل کیا گیا ہے جنھیں قانونی اعتبار سے
نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

ملک کے چیدہ طبقے کے کردار سے ہی
غربت کے تئیں اُس کے رویے کی وضاحت ہو
جاتی ہے۔ سرسری
طور پر یہ کہا جا سکتا ہے
کہ یہ طبقہ دیہی کم، شہری زیادہ،
بے زمین کم، زمیندار زیادہ، بے جائداد کم،
صاحبِ جائداد زیادہ، غیر تعلیم یافتہ کم اور
تعلیم یافتہ زیادہ ہے۔ غریبوں کی حق تلفی اور
امیروں کی رعایت کی بات خود ترقیاتی حکمت
عملی میں شامل ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد
سے زیادہ سے زیادہ توجہ، وسائل کی منصفانہ
تقسیم کی بجائے اقتصادی نشو و نما پر دی گئی
ہے۔ چنانچہ اس مخصوص طبقے نے ایک ایسی
صورت حال پیدا کر لی ہے جس میں صرف اُن کا
ہی بھلا ہو سکتا ہے جب کہ آبادی کا تین چوتھائی
حصہ غربت کے خط سے نیچے کی زندگی گزار رہا ہے۔

غربت کا ایک دوسرا سب سے بڑا سبب
اقتصادی ڈھانچے اور معاشرے کی روح میں مضمر
ہے۔ ملک کا سارا زرعی سیکٹر نجی ملکیت میں ہے۔

حالانکہ معیشت کے دعوے کے باوجود،
معیشت کے ایک بہت ہی تھوڑے سے حصے کو
سرکاری یا عوامی سیکٹر میں شامل کیا گیا ہے اور
یہ بھی محض نجی سیکٹر کے مفاد کے لیے ہی کیا گیا
ہے۔ کیونکہ اس طرح سرمایہ دارانہ زراعت، بڑے
کاشت کاروں کی بھاری نفع اندازی اور چھوٹے
کسانوں کی بدحالی کو بھی بڑھاوا مل رہا ہے۔
ان تمام باتوں سے بڑھ کر یہ کہ اصل مشکل،
ہمارے معاشرے کی عملی اقدار کی
بناوٹ میں ہی مضمر ہے۔ وجہ
یہ ہے کہ ہم لوگ
اپنے سماجی،
نفسیاتی اور
معاشی رویّوں کے
لیے، ذاتی مفادات
کی تکمیل اور نجی منافع
میں اضافے کو ہی اخلاقی
ہدایت تصور کرتے ہیں۔
ہم میں سماجی امور کے
لیے ذرا بھی تشویش نہیں پائی جاتی۔ اس کا نتیجہ ہے
کہ اب انسانی اقدار کی جگہ مادّی اقدار نے لے لی
ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ملک کے چیدہ طبقے،
بدعنوانی، اسمگلنگ وغیرہ جیسے تمام غلط طریقوں
کو بروئے کار لا کر اپنی سماجی حیثیت بڑھانے کی
دوڑ میں سب سے آگے نکل جانے کے لیے کوشاں
رہنے لگے ہیں۔ مانا کہ روایتی ہندوستانیوں نے،
آرٹ، مذہب اور ثقافت کے توسط سے، خود
کو آج کے دور سے ہم آہنگ کر لیا ہے مگر ایک
دوسرے کو جوڑنے والے نئے رشتے تلاش نہیں
کیے گئے ہیں۔ ہماری اخلاقی اور مادّی غربت کا
ہی یہ نتیجہ ہے کہ ہر شخص، خود کو دوسروں سے
الگ تھلگ محسوس کرنے لگا ہے، غیر انسانی

> واقعہ یہ ہے کہ بھارت میں غربت سماجی حالات کی پیدا کردہ ہے نہ کہ
> قدرتی حالات کی۔ یہ سماجی حالات کے تحت جنم لیتی ہے اور
> پروان چڑھتی رہتی ہے۔ بلکہ اسے معاشی اور سماجی
> اختیارات کی غیر مساوی تقسیم کا ایک لازمی نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

رہنے کے میدان چھوٹے گئے ہیں اور ہر فرد کی ذات ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔

غربت کا سماج ہوتا ہی ایسا ہے کہ وہ غربت کو باقی رکھنے میں بھی اہم رول ادا کرتا رہتا ہے۔ اس میں غریب لوگوں کے طرز معاشرت کی بات کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔ غریب طبقے کے لوگ، اپنے غربت، بے چارگی، محتاجی، احساس کمتری اور نامرادی کے احساسات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ نفسیاتی گتھیاں نسل بعد نسل مضبوط اور پیچیدہ تر ہوتی جاتی ہیں کیوں کہ اس طرح کے حالات سے ان کے بچوں کے ذہن متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ اور وہ بدلتے ہوئے حالات سے فائدہ اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں آپاتے۔ اس طرح غربت کا مسئلہ ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔

اپنایا تھا۔ وہ ترقی یافتہ ملکوں کی ہی طرح بھارت جیسے ترقی پذیر ملک میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے ہمیں معاشرے میں انقلابی تبدیلی کے لیے کوشش کرنی ہوگی۔ اس طرح تمام سماجی اقدار کو بھی بدلنا ہوگا۔ سماجی نابرابری کے خاتمے کے لیے جنگی پیمانے پر کام کرنا ہوگا۔ غربت کا مسئلہ اس طرح اپنے آپ ہی حل ہو جائیگا

زمین جوت داروں کو دینی ہوگی اور عوامی سیکٹر کے میدان کو وسیع تر کرنا ہوگا۔ آبپاشی، مکان کی تعمیر اور مواصلات جیسے میدانوں میں ترقی کے لیے ایسی ٹیکنالوجی اختیار کرنا ہوگی جو محض مزدوروں کی بھلائی پر ہی مبنی ہو۔ تاکہ بے روزگاری یا کم روزگاری کے مسئلے بھی حل کئے جا سکیں۔

تعلیم اور صحت جیسی لازمی خدمات تک سب کی پہونچ کو آسان بنانا ہوگا۔ اور تنخواہوں میں بھاری فرق کو کم کرنا ہوگا۔ مزید یہ کہ ہمیں اسراف پسند معاشرے کی حوصلہ شکنی کرنی ہوگی۔ انصاف، مساوات، اور آزادی جیسے مثالی تصورات کو عملی جامہ پہنانا ہوگا۔ ہم اس طرح اپنی اخلاقی اور مادی غربت کو ختم کر سکیں گے۔

حصول آزادی کے بعد اقتصادی نشو و نما پر دی گئی توجہ، وسائل کی منصفانہ تقسیم کی بجائے مخصوص طبقے نے ایک ایسی صورت حال پیدا کی ہے جس میں صرف آبادی کا تین چوتھائی حصہ غربت کے خط...

انسداد

بھارت میں مستقبل قریب میں غربت کے مکمل خاتمے کے امکانات زیادہ روشن نظر نہیں آتے۔ غربت کے خاتمے کے لیے حکومت کی کوشش کی ناکامی واضح ہو چکی ہے۔ کیوں کہ

ہماری منصوبہ بند ترقیات میں سماجی انصاف اور منصفانہ تقسیم کو، ترجیحی اہمیت دینی ہوگی۔ دولت کے جماؤ پر دار کرنا ہوگا۔

ہم جب موجودہ سیاسی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انقلابی نوعیت کی سماجی تشکیلِ نو کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوگا۔ فی الوقت پورے ملک میں قومی، ریاستی اور علاقائی سطح پر اقتدار کے لیے ایک جنگ جاری ہے۔ فی الحال یہ جنگ چیدہ طبقے کے برسر اقتدار اور اقتدار سے محروم گروہوں تک ہی محدود ہے۔ لیکن اگر تمام سیاسی

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

ہم لوگ اپنے سماجی، نفسیاتی اور معاشی ... تکمیل اور نجی منافع میں اضافے کو سماجی امور کے لیے ذرا بھی تشویش ... انسانی اقدار کی جگہ مادی اقدار نے لے لی ...

اس نے اس کے لیے پہلے تو ہلکی سی چوٹ اور پھر براہِ راست حملے کا جو نظریہ

بھرت ڈوگرہ

غریبی کے چیلنج اور اسکے حل کچھ سوالات

مصنف نے اس مضمون میں محرومیوں کی مختلف سمتوں کی مؤثر ڈھنگ سے نقاب کشائی کی ہے خاص کر دیہی اور قبائلی علاقوں میں بسنے والوں کی زندگی کی محرومیوں کا نقشہ کھینچا ہے چونکہ انھوں نے خود دیہی عوام میں رہ کر کام کیا ہے، اس لیے اس کا تجربہ ان کو براہِ راست ہے، انھوں نے ان کے مختلف مسائل کا مطالعہ کیا ہے، اس لیے یہ حقائق مستند ہونے کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ زمین کا فذات میں قبائلی آبادی میں بانٹ دی گئی ہے۔ تاہم عملاً ان کو معتدبہ حصہ نہیں مل سکا ہے۔ بلاشبہ سرکار نے قانون بنائے، پروگرام تیار کئے اور غریبی دور کرنے کے لیے پراجیکٹ بنائے تاکہ سماج کے کمزور طبقات کو زیادہ سے زیادہ فائدے مل سکیں۔ لیکن بدقسمتی سے ان مفید پروگراموں پر عمل درآمد اکثر حالتوں میں لفظی صورت میں ہے، حقیقی صورت میں نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ استحصال کرنے والوں اور پروگرام پر عمل درآمد کرنے والے اداروں کے درمیان کچھ گٹھ جوڑ ہے۔ جہاں یہ صورت حال نہیں ہے، وہاں بہتری کی صورت بلاشبہ پیدا ہوئی ہے۔

آزادی ملنے کے وقت ہمارے ملک کے سامنے غریبی کا مسئلہ سب سے مہیب اور بڑا مسئلہ تھا، ۴۰ سال بعد آج بھی غریبی بدستور جوں کا توں ایک بڑا اور مہیب مسئلہ ہے۔ آج بھی غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے لوگ موجود ہیں۔ یہ وہ بنیادی نقطہ ہے جسے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ صورت حال پہلے سے بہتر نہیں بلکہ بدتر ہے، غریبی کے تئیں روایتی اندازِ نظر کے برعکس حقیقتِ حال یہ ہے کہ زندگی میں محرومیوں کی نشاندہی کرکے اسے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے خاص کر تغذیہ بخش خوراک اور بنیادی ضرورتوں سے محرومی غریبی کی نشانی ہے جس میں مکان وغیرہ شامل ہیں جبکہ روایتی انداز غریبی کے سمجھنے کا یہ ہے کہ بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کس قدر نقدی کی صورت میں کمائی ہے۔ دورِ حاضر میں یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ نقد رقم کیسے کمائی جا رہی ہے اور یہ کیسے خرچ کی جا رہی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نقد رقم کمانے کے لیے یا بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے سخت سے سخت محنت کرنی پڑتی ہو۔ بلکہ خطرناک قسم کے کام کرنے پڑتے ہوں اور ایسے کام

کرنے پڑتے ہیں جن سے صحت پر مضر اثرات پڑتے ہوں۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کیا محنت کش کو کام کے لیے اتنے دور دراز مقامات پر جانا پڑتا ہے جس سے کہ اس کے کنبے کی زندگی پارہ پارہ ہو گئی ہو۔ خرچ کرنے کے ڈھانچے پر دورِ حاضر میں اس طرح نظر ڈالی جاتی ہے جس سے یہ پتہ لگایا جائے کہ تمباکو نوشی، الکحل، دواؤں اور نمائش کاری

غریبی کے کئی چہرے

یہ باتیں زیادہ تر روایتی بنیادی ضرورتوں کے ضمن میں کہی گئی ہیں، حالانکہ اس کا دائرہ وسیع کر کے ان کو بیان کیا گیا ہے۔ غریبی سے متعلق کچھ اور باتیں بھی ہیں۔ دیہات میں اور شہری آبادی میں بہت سے لوگ ڈاکوؤں، سماج دشمن عناصر اور فرقہ وارانہ عناصر کے زیرِ اثر ہیں، اسی طرح پولیس کے بہت سے غیر ذمہ دار افسران بھی ہیں۔

ہے، وہ یہ کہ کیا بھائی چارہ اور اچھے پڑوسیوں کے سے تعلقات یا وسیع تر سماجی اور قومی شناخت پہلے کے مقابلے زیادہ مستحکم ہے یا کمزور۔ میں بحیثیت ایک صحافی ان تمام امور کو غریبی کے پس منظر میں ہی دیکھتا ہوں۔ میں نے متعدد علاقوں کا دورہ کیا اور بہت سے لوگوں سے بات چیت کی اور ان کے مسائل کی نوعیت کو سمجھنا چاہا ہے۔ مختلف پالیسیوں، پروگراموں اور حکمتِ عملی کے تئیں عوام کا ردِ عمل جاننا چاہا۔ یہ کام کچھ علاقوں میں میں نے دس سال تک کیا،

> سبز انقلاب سے کسانوں پر قرض کا بوجھ بڑھا ہے۔ دیہات کے مختلف طبقات میں نابرابری بڑھی ہے، تعلیم یافتہ بے روزگاری کے مسئلے نے زندگی کو اور فکرمند بنا دیا ہے، البتہ اب لوگوں کو پہلے سے زیادہ قرض مل رہا ہے۔

پر کتنا خرچ کیا جاتا ہے۔ اُن میں اُن نمائشی اخراجات اور اُن بچتوں کا مطالعہ نہیں کیا جاتا جو کہ جہیز جیسی سماجی برائیوں کو جنم دیتی ہیں اور جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری ہونے سے رہ جاتی ہیں۔

اس سے ملا جلا ایک سوال یہ ہے کہ عورتوں کے ضمن میں بنیادی ضرورتیں کیا ہیں۔ متعدد کنبے نقد آمدنی کے لحاظ سے اتنا رکھتے ہیں جو اُن کی ضرورتوں کے لیے کافی ہوتا ہے لیکن عورتوں کی ضرورتوں کو بالعموم نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور گھر میں بہو کے ساتھ بُرا سلوک ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ مردوں کو شراب کی لت ہوتی ہے۔ اس لیے عورتوں کی بنیادی ضرورتیں رُک جاتی ہیں۔ بوڑھوں کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل بھی اس سے ملتا جلتا ایک سوال ہے۔ بھارت کی اس سلسلے میں روایت بہت شاندار ہے لیکن اب یہ تیزی سے بدلتی نظر آ رہی ہے۔

روزمرہ کی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہریجنوں اور سماجی پسماندہ عوام کو وقار حاصل نہیں ہے۔ کچھ فرق اور امتیاز تو ذات پات کی بنیاد پر ہے۔ خاص کر عورتیں اس کا خاص طور پر شکار ہیں۔ اس لیے روزانہ کی زندگی میں تحفظ اور وقار بہت ضروری ہے۔ اب جبکہ غیر ملکی حکومت بھی نہیں ہے، اس وقار کی بحالی کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ کیا یہ تصورِ غریبی کے مطالعے کے لیے ضروری ہے، یہ معرضِ بحث ہے۔ اس سلسلے میں عوام کا مقروض ہونا، بے روزگاری اور نابرابری پر بھی بحث ہونی چاہیئے۔ سبز انقلاب سے کسانوں پر قرض کا بوجھ بڑھا ہے۔ دیہات کے مختلف طبقات میں نابرابری بڑھی ہے، تعلیم یافتہ بے روزگاری کے مسئلے نے زندگی کو اور فکرمند بنا دیا ہے۔ البتہ اب لوگوں کو پہلے سے زیادہ قرض مل رہا ہے۔ زندگی پر ایک اور نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالنی

اس لیے میں کچھ خیالات اس بارے میں پیش کر رہا ہوں۔

اتر پردیش میں ضلع باندہ کا پرتھا نامی علاقہ ہے جہاں شدید نوعیت کی غربت ہے۔ کول قبائلی آبادی بے حد غریب ہے۔ ان کے پاس زمین بہت کم۔ آبرسانی تقریباً مفقود، پینے کا پانی کم، ڈاکوؤں، زمینداروں اور پولیس کی زیادتیوں سے زندگی بے حد خراب۔ ان تمام مسائل پر قابو پانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ان کے نتائج کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ کاغذ پر زمین کی تقسیم دکھائی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ کول قبائلی آبادی میں زمین تقسیم کی گئی ہے کاغذ پر ایسی زمین ہے جو زمین کی بالائی حدود کے قوانین کی زد میں آتی ہو، اس لیے نابرابری بھی کاغذ پر نہیں ہے۔ عمل یہ ہے کہ کول قبائل کو زمین کا شاید ہی کوئی حصہ ملا ہو

اراضی پر قابض ہیں اور زمین کی بالائی حد سے کہیں زیادہ ان کے پاس زمین ہے۔
کیا بڑے زمینداروں کے ساتھ کوئی ایسا خطرناک ربط ہے کہ انھیں کا قدرت کا سرمائی پر ہی اکتفا کرنی ہوگی۔ کیا اس کے پیچھے وہ افسروں کو رشوت دے کر زمین کی بالائی حد کے قوانین سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ کیا قانون ہی اتنا ناقص ہے کہ ایماندار افسر کو کچھ کرنے کا موقع نہیں مل پاتا۔ کیا طاقتور سیاستداں ان کو ایسا کرنے سے روکتے ہیں۔ یا کیا نچلی سطح کے افسر بڑے زمینداروں کے زیر اثر ہوتے ہیں اور وہ بڑے افسروں کو بہکا دیتے ہیں۔ شاید اس کا جواب مختلف عناصر پر منحصر ہوگا اور ان سب وجوہات کا ملا جلا جواب ہوگا۔ مگر یہ صورتِ حال پھر بھی باقی ہے کہ قبائلی آبادی کو زمین نہیں دی گئی ہے اور یہ سلسلہ ماضی کی ایک یا دو نسلوں سے چلا آ رہا ہے اور زمین کی بالائی حد کا قانون اس سلسلے میں کوئی اثر نہیں دکھا سکا۔

آبرسانی کے معاملے میں بڑے ڈیموں مثلاً باردھا، مارو وغیرہ کی افادیت زیرِ بحث آتی ہے، ان سے ہونے والے آبرسانی کے فائدوں کو اہم نہیں کہا جا سکتا۔ چھوٹے چیک ڈیم زیادہ مفید ہیں لیکن ٹھیکیدار جو کہ زیادہ تر مقامی بڑے مالکان اراضی میں سے ہوتے ہیں، کول کسانوں کے مفادات کو سامنے نہیں رکھتے۔ پینے کے پانی کی مہنگی اسکیمیں جو کہ ملٹی پل لفٹ اور پائپ لائنوں کے بچھانے سے تعلق رکھتی ہیں، زیرِ عمل آئی ہیں لیکن خرچ کے مقابلے ان سے ہونے والے فائدے کتنے زیادہ اور کتنے

> آبرسانی کے معاملے میں بڑے ڈیموں مثلاً باردھا، مارو وغیرہ کی افادیت زیرِ بحث آتی ہے، اُن سے ہونیوالے آبرسانی کے فائدوں کو اہم نہیں کہا جاسکتا۔ چھوٹے چیک ڈیم زیادہ مفید ہیں لیکن ٹھیکیدار جو کہ زیادہ تر مقامی بڑے مالکان اراضی میں سے ہوتے ہیں، کول کسانوں کے مفادات کو سامنے نہیں رکھتے۔ پینے کے پانی کی مہنگی اسکیمیں جو کہ ملٹی پل لفٹ اور پائپ لائنوں کے بچھانے سے تعلق رکھتی ہیں، زیرِ عمل آئی ہیں لیکن خرچ کے مقابلے اُن سے ہونیوالے فائدے کتنے زیادہ اور کتنے موثر ہیں، یہ بات بھی معرضِ بحث ہے۔ اس کے مقابلے کم خرچ کی چھوٹی اور مفادِ عامہ سے تعلق رکھنے والی اسکیموں سے مطلوبہ نتائج اخذ نہیں کئے جا سکے۔

موثر ہیں یہ بات بھی معرضِ بحث ہے اس کے مقابلے کم خرچ کی چھوٹی اور مفادِ عامہ سے تعلق رکھنے والی اسکیموں سے مطلوبہ نتائج اخذ نہیں کئے جا سکے۔

جنگلاتی پیداوار کا معاملہ

جنگلاتی دولت سے ٹھیکیداروں نے بڑے پیمانے پر ناجائز فائدہ اٹھایا ہے، ان کے مقابلے جو کوآپریٹو ادارے کھولے گئے، ان کو مقامی با اثر ٹھیکیداروں کی زیادتیوں کے سبب تناؤ کا شکار ہونا پڑا۔ اس تبدیلی سے سماج کے کمزور طبقوں کو جن فائدوں کا یقین دلایا گیا تھا، وہ نہ ہو سکا۔ اس کے نظم و نسق سے متعلق ارکان اس بات پر متفق ہیں کہ کوآپریٹو ادارے کی طرف سے دی گئی شرحیں ٹھیکیداروں کی شرحوں کے مقابلے زیادہ ہیں۔ دوسرے کوآپریٹو اداروں کی طرف سے کی جانے والی ادائیگیوں میں دیر ہوتی ہے اور اس طرح سے ان اداروں کا فائدہ کم ہو جاتا ہے۔ ایک سب سے بڑے ٹھیکیدار نے نجی بات چیت میں ایک سماجی کارکن سے کہا کہ کوآپریٹو اداروں سے اُسے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میرے تعلقات اُن سے بہت اچھے ہیں، اس لیے میں ان کے خلاف کچھ کہنا نہیں چاہوں گا۔ غالباً اسی تعلق سے جنگلاتی دولت اور پیداوار کی قیمت نیلامی میں خاطر خواہ نہیں ملتی، اس لیے بڑے ٹھیکیداروں میں بارسوخ اور با اثر افراد خوش ہیں۔ بانس کی دستکاری کرنے والے فنکار بے حد ناخوش ہیں۔

خصوصی شمارہ یوجنا، نئی دہلی

ان کو کوآپریٹو اداروں سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کارپوریشن کی طرف سے انھیں بانس تھوڑی مقدار میں نہیں مل پاتا جو ان کی ضرورت کے مطابق ہوتا ہے۔ محکمہ جنگلات کے لوگ کول قبائل کی کاشت سے پھلنے پھولنے والے بڑے قطعات اراضی پر اپنا دعویٰ جتاتے ہیں۔

ڈاکوؤں، بڑے زمینداروں اور غیر ذمہ دار پولیس افسروں کے ڈر اور خوف کا جہاں تک سوال ہے، یہ سلسلہ مسلسل پچھلے آٹھ دس سال سے جاری ہے، جب سے کہ میں وہاں کام کر رہا ہوں میں نے اس میں کوئی کمی نہیں پائی۔ حال ہی میں ڈاکوؤں کے خلاف مہم شروع کی گئی تھی، جو ناکام ہوگئی اور پولیس کی دہشت گردی اور ڈرانے دھمکانے کے واقعات میں اور اضافہ ہوگیا۔

ترجیحات کا غلط تعین

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کی حقیقی ضرورتوں کے تئیں سرکاری ردعمل کم ہی ظاہر ہو سکا ہے۔ البتہ غریبوں کی آمدنی بڑھانے کے کچھ ایسے پروگرام شروع کئے گئے جن کے تحت بہت سے قرضے اور سبسڈی بانٹنے کا کام تھا۔ اگر بنیادی مسائل کو موثر طور پر حل کر لیا گیا ہوتا تو پروگراموں پر موثر عمل درآمد کے لیے راہ ہموار ہوگئی ہوتی۔ لیکن اس طرح کی کامیابی کی عدم موجودگی میں، اس طرح کے پروگراموں پر زور دینا ترجیحات کے غلط تعین کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس پروگرام پر عمل درآمد کے دوران بے ضابطگیاں متضاد ہیں۔ اسی طرح سے غلط ترجیحات کی مظہر کچھ اور کوششیں بھی ہیں جن کے تحت غریبی دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر گاؤں میں سماج کے کمزور طبقات پر یہ بات روشن ہونی چاہیئے کہ ان کی اقتصادی بدحالی کا حل اراضی کی از سرِ نو تقسیم پر منحصر ہے اور یہ پانی اور دیگر وسائل کی نئے سرے سے تقسیم چاہتی ہے اس صورت میں سرکاری حکام صرف بھینس خریدنے کے لیے قرض دینے پر زور دیتے ہیں۔ چنانچہ عوام کو اس بات کے لیے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ وہ غریبی دور کرنے کے لیے پُرجوش اندازِ نظر نہیں رکھتے۔

کاغذی کارروائی

غریبی کے مسئلے کو ایک اور طرح سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ گڑھوال کے خطے میں طویل عرصے سے جنگلات صاف کرنے کا رُجحان کارفرما ہے۔ اس سے مٹی کے کٹاؤ اور چارے وغیرہ کے مسائل اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔ زراعتی سرگرمیوں اور مویشی پروری کے پروگراموں کو نقصان پہونچا ہے۔ اس سے پانی اور ایندھن کی کمی کے مسائل بھی سامنے آئے ہیں۔ چنانچہ نوجوان کام کی تلاش میں وہاں سے باہر نکلے، اس سے نقد کی صورت میں زیادہ آمدنی ہوئی، لیکن عورتوں کو ایندھن اکٹھا کرنے میں کتنی محنت اور دشواری کا سامنا ہے۔ چارے اور پانی کی کمی کا کس قدر سامنا ہے یا کنبہ کی زندگی میں کتنی دوریاں پڑی ہیں، ان تمام باتوں کو ساتھ رکھنے سے حقیقت یہ سامنے آئی ہے کہ غریبی بڑھی ہے۔ اب سے کچھ عرصہ قبل سرکار کو درخت کاٹنے سے ہونے والے نقصانات کا پتہ چل سکا۔ اس نے ایک حد تک درختوں کے کاٹنے پر پابندی لگا دی، یہ قدم اپنی جگہ خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس پر عمل درآمد ہو سکا۔ اس پابندی کے بعد بھی رال حاصل کرنے کے لیے چیڑ کے پیڑوں کو بے دردی سے کاٹا گیا۔ درختوں سے کہیں کہیں رال نکالی لیے جانے سے وہ اتنے کمزور ہو گئے کہ ہلکی سی آندھی میں وہ گر پڑے۔ ان قوانین کا غلط استعمال ہوا اور اگر کہیں راستہ میں ایک یا دو درخت آگئے تو اہم سڑکوں اور اسکولی عمارتوں کی تعمیر رُکوا دی گئی، جو کہ قانون کا منشا نہیں ہے۔

چھتیس گڑھ کی کانوں کے مزدوروں کی انجمن نے دالی۔ راجہرہ خام لوہے کی کانوں میں کام کرنے والوں کو منظم کیا۔ انھوں نے کانوں میں کام کرنے والوں کے لیے ٹھیکیداری نظام کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔

(باقی صفحہ پر)

گاؤں میں سماج کے کمزور طبقات پر یہ بات روشن ہونی چاہیئے کہ ان کی اقتصادی بدحالی کا حل اراضی کی از سرِ نو تقسیم پر منحصر ہے اور یہ پانی اور دیگر وسائل کی نئے سرے سے تقسیم چاہتی ہے اس صورت میں سرکاری حکام صرف بھینس خریدنے کے لیے قرض دینے پر زور دیتے ہیں۔ چنانچہ عوام کو اس بات کے لیے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ وہ غریبی دور کرنے کے لیے پُرجوش اندازِ نظر نہیں رکھتے۔

غزلیں

ملتمس ظفیر الحسن : ۳-۴۳ ٹیگور ہوسٹل
ٹیگور روڈ، نئی دہلی۔

دیوار و در میں سمٹا اک لمس کانپتا ہے
دستک سی کوئی دے کر شاید چلا گیا ہے
گم گشتگی! چلیں اب کوہِ ندا کی جانب
دہشت فزا ہے موسم، سحر آفریں فضا ہے
اپنی ہی حدتوں میں جل بجھ کے خاک تھے ہم
سمٹی جو راکھ، بن کر پیکر سا اٹھا ہے
اک زخم زخم چہرا، ٹکڑوں میں ہاتھ آیا
ہم مطمئن تھے ٹوٹا آئینہ جڑ گیا ہے
صحرائے نیم شب میں بے آس ریتیوں پر
دن بھر کے کشتِ وخوں کا لاشہ تڑپ رہا ہے
مل جائے آبلوں کو داد مسافرت اب
اس دردِ بینوائی کچھ حد سے بھی سوا ہے
ہم پر تو کھل چکا تھا در بستہ ہر بلا کا
کیا جانئے اجل کو اب انتظار کیا ہے
گلچینیوں کا ہم سے ملتمس حال پوچھو
انگشتِ آرزو میں کانٹا اتر چکا ہے
●

ڈاکٹر ہلال فرید : ۵۔۸، میڈیکل کالونی
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

یہ بھید ہے کہ فقط عزمِ سفر رکھتا ہوں
اپنے قدموں کے تلے راہگذر رکھتا ہوں
لبِ خنداں تو کبھی دیدۂ تر رکھتا ہوں
زندگانی کے سبھی عیب و ہنر رکھتا ہوں
مجھ سے دشمن کو پشیماں نہیں دیکھا جاتا
تیغ گردن پہ کبھی دار پہ سر رکھتا ہوں
حسرتِ راہ روی مجھ سے لپٹ پڑتی ہے
گر کسی موڑ پہ سامانِ سفر رکھتا ہوں
اُس کو شکوہ کہ کبھی بات نہ مانی میں نے
میری مشکل الگ اندازِ نظر رکھتا ہوں
سرد موسم کی ہوا پھر سے چلی ہے تو ہلالؔ
اب بھی سینے میں وہی برق و شرر رکھتا ہوں ●

خلیل انجم ۔ اسٹور سیکشن
آرڈی ننس فیکٹری بھنڈارہ ۴۴۱۹۰۶ (مہاراشٹرا)

ہمارا گھر سے نکلنا بہت ضروری تھا
دل و دماغ بدلنا بہت ضروری تھا
زمانہ سخت مخالف تھا آسماں کی طرح
تمہارے ساتھ بھی چلنا بہت ضروری تھا
سرِ درِ عہدِ محبت ارے خدا کی پناہ
قدم قدم پہ سنبھلنا بہت ضروری تھا
وفا کی راہ میں کانٹے بچھے تھے پتھر بھی
وفا کی راہ میں چلنا بہت ضروری تھا
یہ ایک فرض تھا اس کا صلہ ملے نہ ملے
پرائی آگ میں جلنا بہت ضروری تھا
چراغ گھی کے جلاتے یہ امن کے دشمن
بلائے جنگ کا ٹلنا بہت ضروری تھا
تم آفتاب سہی اپنے گھر کے اے انجمؔ
مزاجِ یار میں ڈھلنا بہت ضروری تھا ●

ریاض احمد عباسی ساغر اعظمی
محلہ مولانا، قصبہ و ڈاکخانہ مئو آئمہ
ضلع الہ آباد۔ (یو۔پی) ۲۱۲۵۰۱

کس طرح بدل جاتے ہیں حالات لکھیں گے
کیوں ملک میں ہوتے ہیں فسادات لکھیں گے
اے میرے وطن تیری محبت کے جنوں میں
ہم نے جو اٹھائے ہیں وہ صدمات لکھیں گے
چہرے کی اداسی سے پتا ملتا ہے دل کا
افلاس کی آنکھوں کے سوالات لکھیں گے
اشفاق، حمید اور وہ عثمان کی خدمات
آزاد کے الفاظ و بیانات لکھیں گے
تاریخ کے لفظوں کو مٹانا نہیں ممکن
حیدر سے ظفر تک کی حکایات لکھیں گے
بخشی ہے عمارات مغلیہ نے جو عظمت
ہم صفحۂ دل پر وہ نشانات لکھیں گے
ٹوٹے ہوئے ساغر سے بھی آتی ہیں صدائیں
آؤ کہ محبت کے پیامات لکھیں گے
●

منظر نیاز صدیقی منظر اعظمی :
پریس انفارمیشن بیورو (اردو یونٹ)، شاستری بھون،
نئی دہلی ۔ ۱

ہے سفر جاری کوئی منزل نہیں
کوئی محفل ہو تیری محفل نہیں
دھوپ لگتی ہے تو بیٹھو چھاؤں میں
چلنے والوں کو کوئی مشکل نہیں
آنسو بہتے ہیں بہیں کچھ کرتا چل
بیٹھے رہنے سے تو کچھ حاصل نہیں
زندگی خود بڑھ کے دیتی ہے صدا
کون کہتا ہے ترا ساحل نہیں
ہر گھڑی منظرؔ یہی احساس ہے
جذبۂ باہم کا کوئی حاصل نہیں ●

دوہے

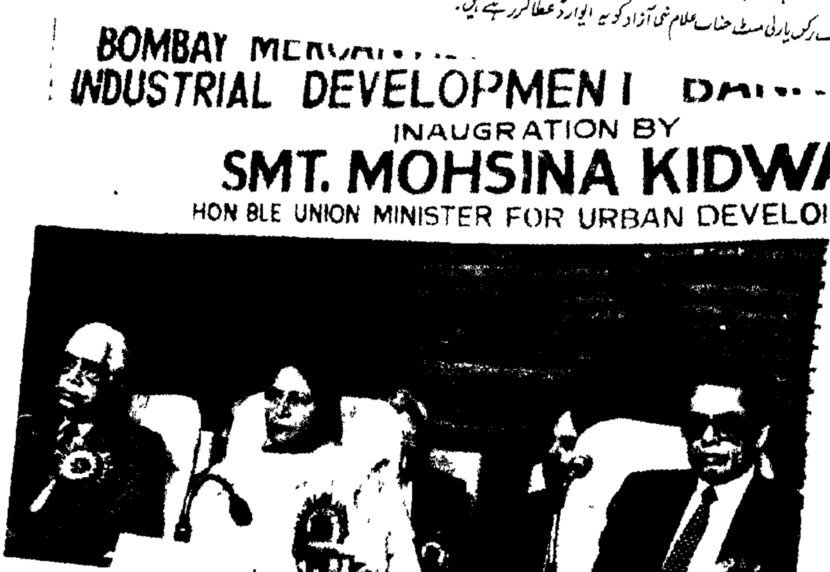
بھگوانداس اعجاز : ۵/۸ ویسٹ پٹیل نگر،
نئی دہلی، ۸

منزل کتنی دور ہے، کہاں پڑے گی رات
کانپے مرے سوال پر کوچوان کے ہات
ایک بد دعا بزدلی، لا علاج یہ روگ
ہاتھ اٹھا کر رک گئے' پرشن چنہ پر لوگ
ساری دنیا سے جدا، داتا تیری ذات
سب کچھ دے کر بھی رکھا، سب کچھ اپنے ہاتھ ●

خصوصی شمارہ یوجنا، نئی دہلی



نائب صدر جمہوریہ ہند جناب شنکر دیال شرما نے ۳۰ دسمبر ۱۹۸۷ء کو فکی ہال میں ۱۹۸۷ء کے شرومنی ایوارڈز تقسیم کئے۔ زیر نظر تصویر میں
موصوف رکن پارلیمنٹ جناب غلام نبی آزاد کو یہ ایوارڈ عطا کر رہے ہیں۔ (تصویر۔ سید فدا علی)



ممبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک کی جانب سے وگیان بھون، نئی دہلی میں ۲۱ دسمبر سے ۲ جنوری ۱۹۸۸ء تک ہونے والے ٹریننگ ورکشاپ
برائے ایکس سروس مین، سیمینار کا افتتاح مرکزی وزیر محترمہ محسنہ قدوائی نے کیا۔ تصویر میں (دائیں سے) سید حسیم ناظم جنرل منیجر ممبئی مرکنٹائل
بینک، مرکزی وزیر محترمہ محسنہ قدوائی اور پدم شری زین جی رنگون والا، منیجنگ ڈائرکٹر، ممبئی مرکنٹائل بینک۔ (تصویر: سید فدا علی)۔

Regd. No.D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without pre-payment at NDPSO, New Delhi.

Vol. 7 No. 19-20 YOJANA (URDU) Special Issue January 1988

مُفلسی

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مُفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مُفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مُفلسی
بھوکا تمام رات سُلاتی ہے مُفلسی
یہ دُکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مُفلسی

یہ مُفلسی وہ شئے ہے کہ جس گھر میں بھر گئی
پھر جتنے گھر میں ست تھے اسی گھر کے در گئے
زن بچے روتے ہیں گویا نانی گذر گئی
ہمسائے پوچھتے ہیں کہ کیا دادی مر گئی
بن مُردے گھر میں شور مچاتی ہے مُفلسی

(نظیر اکبر آبادی)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by A.J. Printers, 5 Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110002.

یوجنا

یکم تا ۲۹ فروری ۱۹۸۸ء

دو روپے

اترپردیش کی اقلیتوں اور غریبوں کی ترقی

دیہات کی مربوط ترقی
(ڈاکٹر اسلم [illegible])

ڈاکٹر بشیر بدر سے ایک انٹرویو
(ذکی طارق)

وطن میں اجنبی — ایک جائزہ
(خلیل الرحمٰن قاسمی)

غزلیں، کہانی، تبصرے اور
بہت سا دلچسپ مواد



محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ۶۸۳ ویں سالانہ عرس میں نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما، یو پی کے گورنر محمد عثمان عارف نقشبندی، ہندوستان میں ایران کے سفیر ڈاکٹر ابراہیم سہام اور سفارتخانہ پاکستان کے فرسٹ سیکریٹری اور ممبران پارلیمنٹ نے شرکت کی۔ اس موقع پر مختلف درگاہوں کے سجادگان بھی موجود تھے۔ حضرت پیر ضامن نظامی نے سب کی دستار بندی کی اور تبرکات پیش کئے۔ تصویر میں دستار بندی کے بعد گروپ کا منظر۔ (تصویر سید فدا علی)



پاکستان کے مشہور افسانہ نگار جناب محمد منشا یاد کے استقبال میں ایک جلسہ اردو اکیڈمی میں دہلی اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ زیر نظر تصویر میں (دائیں سے بائیں) پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر گوپی چند نارنگ، جناب دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی، پاکستانی افسانہ نگار جناب منشا یاد، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ڈاکٹر خلیق انجم، جناب رام لعل، جناب حسین علی جعفری اور اردو اکیڈمی کے سکریٹری جناب شریف الحسن نقوی۔ (تصویر: سید فدا علی

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : سید ظفر الحسن
ایڈیٹر : جگندر سنگھ
اسسٹنٹ ایڈیٹر : محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر : وسیم حیدر
عبد الحمید

چندہ
سالانہ ۲۰ روپے، دو سالہ ۳۶ روپے
سہ سالہ ۴۸ روپے، فی کاپی دو روپے
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے
کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت۔

جلد، ۷ | شمارہ، ۲۱، ۲۲ | یکم تا ۲۹ فروری ۱۹۸۸ء | ۱۲ ماگھ تا ۱۰ پھاگن، شک ۱۹۰۹ | قیمت : ۲ روپے ٭ ٹیلیفون ۶۰۱۸۱۸

اس شمارے میں

اداریہ		۲
اترپردیش		
اترپردیش کی اقلیتوں اور غریبوں کی ترقی	نرسیدر جوشی	۳
کوآپریٹو سوسائٹیاں	سائرہ بانو	۶
دیہات کی ترقی		
دیہات کی مربوط ترقی	ڈاکٹر اسلم پرویز	۷
صنعت		
ہلکی پھلکی انجنیئرنگ کی صنعت	ستار صدیقی	۹
تعلیم		
تعلیمی پالیسی ایک بنیادی مسئلہ	م۔ فرقان خاں	۱۰
تخلیق پسند خواتین کے مسائل	گوپال اروڑہ	۱۵
آندھرا پردیش میں تعلیمی ترغیبات	ڈاکٹر مسعود علی خاں	۱۷
صحت		
برگ گل	م۔ ک۔ مہتاب	۱۹
ذیابیطس کے مرض سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں	جگدیش لال	۲۳
ادب		
ڈاکٹر بشیر بدر سے ایک انٹرویو	ذکی طارق	۲۵
ادا شناس عظم فانی بدایونی	شمیم یزدانی	۲۹
وطن میں اجنبی — ایک جائزہ	خلیل الرحمٰن قاسمی	۳۳
غزلیں	سید غلام سمنانی، تعظیم احمد گوہر، مخمور اصدی	۳۶
قطعات	واحد پریمی	۳۷
نظمیں	جرار چھولسی، جمال ہاشمی، ناہید آفر	۳۸
گھاس کا لمس (کہانی)	لونجی پراند ملو / سلمان قریشی	۳۹
چینار	موتی لال ساقی	۴۲
تبصرے / پندرہ روزہ "مستقبل"۔ "اوراق شرف"	محمد کمال انور / کمال جعفری	۴۵
منصوبہ بندی کی ایک جھلک	ادارہ	۴۶
آپ سب کے لیے	ادارہ	۴۷
قارئین کی آراء اور مشورے	عبد اللطیف اعظمی، جگدیش لال	۴۸

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر یوجنا اردو، پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (منیٹ)
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲
بزنس منیجر —— آر۔ ایس۔ منہاس
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا فروغ

ھبھارت سے ملک میں ۱۹۵۶ء میں صنعتی پالیسی کی قرارداد میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کے پروگرام پر زور دیا گیا تھا تاکہ یہ شعبہ اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہو سکے۔ اس لیے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں پیداوار کی تکنیکوں پر برابر نظر رکھی جا رہی ہے۔ جدید کاری کے ذریعے اس صنعتی شعبے کی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو مالیات کی دشواریوں سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حکومت نے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے فروغ کے لیے کچھ ایسے آئٹموں کی نشاندہی کر رکھی ہے جو صرف اسی سیکٹر میں تیار کئے جاتے ہیں۔ ان آئٹموں کی تیاری بڑی اور متوسط پیمانے کی صنعتوں کے شعبے میں ممنوع ہے۔ ۱۳ر فروری ۱۹۸۷ء کو چھوٹے پیمانے کے صنعتی سیکٹر کے لیے ۸۵ آئٹم مخصوص کر دئے گئے تھے۔ اس پالیسی کے نتیجے میں چھوٹے پیمانے کے صنعتی سیکٹر کے لیے مخصوص آئٹموں کی تیاری میں ۱۹۸۱ء میں ایک لاکھ ۴۴ ہزار کارخانے مصروف تھے۔ اس سلسلے میں ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ آئٹموں کی تخصیص کی پالیسی بروئے کار لانے کے بعد اس شعبے میں ایسے ۹٫ آئٹم تیار کئے جانے لگے جن کے لیے ماضی میں کوئی کارخانہ نہ تھا۔ مثال کے طور پر دھاں کوٹنا، سوتی اور اونی کپڑوں کی بُنائی، لکڑی کا فرنیچر، کتابیں، کاپیاں، رنگا ہوا چمڑا۔ نیم مصنوعہ چمڑے کے جوتے، لانڈری سوپ، گھڑیاں، اینٹیں، اسٹیل کا فرنیچر اور زرعی آلات وغیرہ۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں نے پچھڑے اور پسماندہ علاقوں کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۸۱ء کے دوران ۶۸ ہزار صنعتی کارخانوں کا رجسٹریشن عمل میں آیا۔ اس میں سے ۴۰ فیصد کارخانے پسماندہ اضلاع میں تھے۔ ان کے علاوہ ۷ ہزار کارخانے ایسے اضلاع میں لگائے گئے جہاں پہلے سے کوئی صنعت نہ تھی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی ضروری ہے کہ اکثر ایسے معاملات سامنے آئے ہیں جہاں ریزرویشن پالیسی کی خلاف ورزی دکھائی پڑتی ہے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ حکومت نے ایک کمیٹی تشکیل کر رکھی ہے جس سے کہ بڑے اور متوسط پیمانے کے صنعتی کارخانے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے مخصوص آئٹموں کی تیاری میں داخل نہ ہو سکیں۔

(باقی صلا پر)

وفیات

مشہور ماہر اقتصادیات ایل۔ کے۔ جھا کی وفات : مشہور و معروف ماہرِ اقتصادیات ڈاکٹر ایل۔ کے۔ جھا حرکت قلب بند ہونے سے پونا کے ایک ہسپتال میں وفات پا گئے۔ آپ ۷۴ برس کے تھے۔ ۰ر جنوری کو جبکہ وہ این ایم واڈیہ انسٹی ٹیوٹ میں زیر علاج تھے، وزیراعظم شری راجیو گاندھی اُن کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ وزیراعظم اُس روز انڈین سائنس کانگریس کی پلاٹینم جوبلی کا افتتاح کرنے آئے ہوئے تھے۔ صدر جمہوریہ ہند مسٹر آر۔ وینکٹ رمن نے مسٹر جھا کے انتقال پر گہرے دُکھ کا اظہار فرمایا ہے اور انھیں ایک قابل ایڈمنسٹریٹر، ماہرِ اقتصادیات اور ذہین اور باصلاحیت فرد سے تعبیر کیا ہے۔ صدر نے فرمایا کہ وہ ایک قریبی اور خوش مزاج دوست سے محروم ہو گئے۔ وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے اپنے پیغام میں انھیں غیر معمولی صلاحیت کے مالک بے لوث خادم بتایا اور کہا کہ ان کی بیش بہا خدمات کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ یوجنا میں آپ کے مضامین ہمیشہ ہی ہمارے قارئین کے لیے مشعلِ راہ ہوتے تھے، ادارہ آپ کے غم میں سوگوار ہے اور آپ کے پسماندگان سے اظہارِ تعزیت کرتا ہے۔

خوشتر گرامی : اُردو کے مشہور جریدے بیسویں صدی کے مالک اور مدیر جناب رام رکھا مل عرف خوشتر گرامی کا انتقال ۱۵ر جنوری کو دل کا دورہ پڑنے سے ہوا۔ ان کی وفات سے اردو صحافت کو سخت دھکا پہونچا ہے۔ بیسویں صدی اُردو دنیا کے معتبر اور مقبول رسالوں میں سے ایک ہے۔ خوشتر صاحب کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کے توسط سے بہت سے ادیبوں کا تعارف کرایا اور ان کی تربیت کی۔ خوشتر گرامی نے ادبی اور صحافتی زندگی کا آغاز لکھنؤ سے کیا تھا۔ لاہور سے اپنا مشہور جریدہ بیسویں صدی نکالنا شروع کیا، خوشتر گرامی نے تقسیمِ وطن کے مصیبتوں اور اذیتوں کو دیکھا، لاہور سے دلی آکر بیسویں صدی کا آغاز کیا اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرایا۔ تیر و نشتر کے ذریعے وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بھرپور طنز کرتے تھے، یہ اسٹائل ان کا اپنا تھا۔ آپ کی وفات سے ایک عہد کا خاتمہ ہوا ہے۔ ادارہ آپ کی وفات پر اظہارِ افسوس اور اظہارِ تعزیت کرتا ہے اور آپ کے پسماندگان سے اظہارِ ہمدردی کرتا ہے۔ ●

نریندر جوشی

اُتّر پردیش کی اقلیتوں اور غریبوں کی ترقّی

حکومت اُتر پردیش دیہی مفلسوں اور اقلیتوں کی ترقی کی جانب خاص توجہ دے رہی ہے۔ اُس کے تمام ترقیاتی پروگراموں کا مقصد جہاں بالخصوص دیہات میں افلاس کا انسداد کرنا ہے وہاں اقلیتوں کی سماجی و اقتصادی حالت کو بھی بہتر بنانا ہے۔ چنانچہ اُس کی طرف سے اقلیتوں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لیے بیشتر اسکیمیں شروع کی گئی ہیں تاکہ اقلیتوں اور دوسرے لوگوں کے درمیان عدم توازن کو حتی الوسع کم کیا جا سکے۔

اقلیتی طبقے کے ہونہار اور ضرورتمند طلباء کے لیے جو مالی کمزوری کے باعث اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے، ایک اسکالرشپ اسکیم شروع کی گئی ہے جس کے تحت ایسے طلبا کو پیشہ ورانہ اور تکنیکی نصاب جاری رکھنے کے لیے بلا سود اسکالر شپ دیئے جاتے ہیں۔ اس کے لیے ۸۷–۱۹۸۶ء کے دوران ایسے ۱۰۰ طلبا کے لیے ۵ لاکھ روپے کے اسکالرشپ منظور کرنے کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ تکنیکی مہارت حاصل کرنے کے بعد یہ طلبا ایک نیا ماحول پیدا کرنے اور قوم سازی کے عمل کو فروغ دینے میں مدد دیں گے۔

جن علاقوں میں اقلیتی فرقہ کے لوگ بھاری تعداد میں آباد ہیں وہاں سرکاری اور غیر سرکاری ایجنسیاں، صنعتی، تربیتی ادارے (آئی ٹی آئی)، متعدد مقصدی پالی ٹیکنک ادارے کھولنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ سردست ۲۳ پالی ٹیکنک اور ۵ سرکاری انٹر میڈیٹ تکنیکی اسکول ایسے علاقوں میں کام کر رہے ہیں۔ ۸۷–۱۹۸۶ء کے پہلے برس میں ۲۳۶ طلبا نے ڈپلومہ سطح کے ۲۳، اداروں میں داخلہ لیا۔ مراد آباد کے گورنمنٹ پالی ٹیکنک اور لکھنؤ کے لکھنؤ پالی ٹیکنک کو کمیونٹی پالی ٹیکنکوں کے طور پر فروغ دیا گیا ہے جہاں بالخصوص اقلیتی فرقے کے لڑکوں کو تکنیکی تربیت دی جا رہی ہے۔ اب تک لکھنؤ پالی ٹیکنک میں ۶۷ اور مراد آباد کے سرکاری پالی ٹیکنک میں ۱۱۴ طلبا کو مختلف ہنروں کی تربیت دی جا چکی ہے۔ مراد آباد کے سرکاری پالی ٹیکنک میں ٹرانزسٹر، موٹر وائنڈنگ، ہاؤس وائرنگ اور ٹولز کے ہنروں کی تربیت دینے کی منظوری دی گئی ہے۔

قرضے

زراعت، تجارت، اور دوسرے پیشوں میں اقلیتی فرقہ کی مدد کرنے کی غرض سے ایک مالیاتی اور ترقیاتی کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ یہ انھیں مالی، تکنیکی اور مارکیٹنگ امداد بہم پہنچاتا ہے۔ کارپوریشن کی طرف سے اقلیتی غلبے والے اضلاع میں شعوری نصابوں کا پروگرام شروع کیا گیا ہے جس کے ساتھ اقلیتی فرقہ کے ذمہ دار اشخاص اور مالیاتی اداروں کے اہلکاروں کو وابستہ کیا گیا ہے۔ ۸۷–۱۹۸۶ء کے دوران ۲۳ اقلیتی غلبے والے علاقوں میں ایسے نصاب عمل میں لائے گئے۔

کریڈٹ کیمپ اسکیم کے تحت مالی امداد کی منظوری اور تقسیم بینکوں کی امداد سے موقعہ پر صنعت کاروں اور مستفیدگان میں کی جاتی ہے۔ گذشتہ برس لکھنؤ، اعظم گڑھ، مراد آباد اور شاہجہانپور میں کریڈٹ کیمپوں کا انعقاد کیا گیا۔ کل ۱۵۱۴، افراد کو ۵ کروڑ ۲۱ لاکھ روپے کے قرضے دیئے گئے۔ ۸۸–۱۹۸۷ء کے دوران ۱۰ ایسے کیمپ لگانے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

خیر سگالی اور ہم آہنگی کی فضا کو برقرار رکھنے کے لیے مختلف سطحوں پر یکجہتی کمیٹیاں اور کونسلیں

قائم کی گئی ہیں۔ ریاستی سطح کی کونسل کے سربراہ خود وزیر اعلیٰ ہیں۔ مشترکہ کمیٹیاں بلاک سطحوں پر کام کر رہی ہیں۔ حکومت کی طرف سے اتحاد برقرار رکھنے کی ذمہ داری خاص طور پر سیول ڈیفنس اسکیم اور ہوم گارڈوں کو سونپی گئی ہے۔ حکومت کی یہ کوشش بھی ہے کہ اس پروگرام میں نوجوانوں کو شامل کیا جائے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے نوجوانوں کی تنظیموں کی حوصلہ افزائی کریں۔

قومی یکجہتی کو تقویت دینے کی غرض سے مرحومہ اندرا گاندھی کا یوم شہادت قومی اتحاد کے سنکلپ دیوس (یوم عہد) کے طور پر منایا گیا اور "قومی ایکتا" کا ہفتہ اُن کی موت کی تاریخ کے ساتھ شروع کیا گیا۔ عوام نے حلف لیا کہ وہ مذہب، زبان اور علاقے کے نام پر کبھی لڑائی جھگڑے نہیں کریں گے اور پُرامن اور آئینی طریقوں سے اپنی شکایات اور جھگڑوں کو نبٹائیں گے۔

حکومت نے اُن لوگوں کے تئیں کڑا رُخ اختیار کیا ہے جو فرقہ وارانہ تناؤ اور تشدد کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ریاستی حکومت کی طرف سے ۱۹۸۶ء میں اُن لوگوں کی امداد کے لیے امداد کے طور پر ۲۷ لاکھ روپے بانٹے گئے تھے جو فسادات میں ہلاک و زخمی ہوئے تھے۔

ملازمتوں میں اقلیتی فرقوں کے افراد کی بھرتی کے لیے خاص احتیاط سے کام لیا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے انتخابی کمیٹیوں کا قیام کیا گیا ہے تاکہ اقلیتوں کے نمائندوں کو اُن میں شامل کیا جا سکے۔ اقلیتوں میں سلامتی کا احساس پیدا کرنے کے لیے مسلح پولیس کی پانچ نئی بٹالین قائم کی گئی ہیں اور اُن کے کارکنوں کو خاص طور پر تربیت دی گئی ہے کہ وہ اقلیتوں کے مذہبی جذبات کو سمجھ سکیں اور اُن کا احترام کر سکیں۔

ملازمتیں

ایمپلائمنٹ ایکسچینجوں میں اقلیتوں کے اُمیدواروں کے اندراج میں امتیاز نہ برتا جائے اس کے لیے موزوں اقدامات کئے گئے ہیں جبکہ جاتی افسروں کی طرف سے ان اُمیدواروں کی رہنمائی بھی کی جاتی ہے۔ ۱۹۸۶ء کی آخری سہ ماہی میں اقلیتوں کے ۲۴۲۰ اُمیدواروں کو ملازمت دی گئی۔ آگرہ، گورکھپور اور الہ آباد یونیورسٹیوں اور فیض عام کالج، شاہجہاں پور میں اقلیتی فرقوں کے طلبا کو خصوصی تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ مقابلے کے امتحانات میں کامیابی حاصل کر سکیں۔ ایسی کوچنگ کلاسیں مراد آباد، میرٹھ، وارانسی اور اعظم گڑھ میں بھی لگائی جائیں گی۔

یہ معلوم کرنے کے لیے نمونہ جاتی سروے کئے جا رہے ہیں کہ کیا اقلیتوں کو ۲۰ نکاتی پروگرام سے مطلوبہ فوائد پہنچ رہے ہیں۔ انھیں صنعتی سطح کی تعمیلی کمیٹیوں میں موزوں نمائندگی دی گئی ہے۔ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے تحت جو سروے کئے گئے ہیں اُن سے انکشاف ہوا ہے کہ اس سے شاہجہاں پور میں ۲۳۷۵۸، مراد آباد میں ۱۴۳۷۰، بریلی میں ۱۹۳۴۷ اور اعظم گڑھ میں ۴۳۴۴ مستفید ہونے والے افراد اقلیتی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

اُردو کو فروغ

ریاست میں ۲۱۴۲ ایسے اسکول کام کر رہے ہیں جن میں ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔ ان اسکولوں میں ۳ لاکھ ۷۵ ہزار طلبا زیر تعلیم ہیں۔ اُردو کی تعلیم کے لیے اُردو ٹیچروں کی ۵ ہزار نئی آسامیوں کی منظوری دی گئی ہے اور اُن پر تقرری عمل میں لائی گئی ہے۔

ریاست میں اقلیتوں کے مفادات کا تحفظ اور اُن کے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے اقلیتی کمیشن کام کر رہا ہے۔ اُردو اکادمی بھی اُردو کی توسیع و ترقی میں بڑا حصہ ادا کر رہی ہے۔ ریاستی حکومت کی طرف سے اُسے تقریباً ۲۷ لاکھ روپے کا عطیہ دیا گیا ہے۔ مولانا آزاد میموریل سوسائٹی کو ایک لاکھ روپیہ کا سالانہ عطیہ دیا جا رہا ہے۔ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کو اُردو میں خصوصی کتابوں کی اشاعت کے لیے ۵ لاکھ روپے کا عطیہ دیا گیا ہے۔ کمیٹی کی طرف سے مصنفوں کو ۵۹۷ مسودوں کی اشاعت کے لیے مالی امداد دی گئی ہے۔

حکومت اس امر کی پابند ہے کہ اقلیتوں کی حالت کو بہتر بنایا جائے، اُن میں اعتماد کا احساس پیدا کیا جائے، اُنھیں تعمیر و ترقی کے قومی دھارے میں لایا جائے اور اُنھیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ آگے بڑھ کر قومی تعمیر کی ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر لیں۔

دیہی مفلسی

ان خصوصی پروگراموں کے علاوہ دیہات میں افلاس کے انسداد کے لیے جو پروگرام عمل میں لائے جا رہے ہیں اُن کا مقصد اقلیتوں سمیت تمام لوگوں کی حالت کو بہتر بنانا ہے۔ اتر پردیش کی تقریباً تین چوتھائی آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ حکومت کو اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ اگر دیہات میں رہنے والے غریب کسانوں، زرعی مزدوروں اور سماج کے دیگر کمزور طبقوں کی اقتصادی و سماجی حالت بہتر ہو جائے تو یوپی کی تاریخ میں خود بخود ایک نئے باب کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اتر پردیش سرکار کی طرف سے متعدد ترقیاتی پروگراموں کو عمل میں لا کر دیہی علاقوں کی ترقی کے لیے متواتر کوششیں کی جا رہی ہیں۔

اس وقت مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام ریاست کے تمام ۸۹۵ بلاکوں میں عمل میں لایا جا رہا ہے تاکہ

دیہات میں غریب کنبوں کو روزگار مہیا کیا جائے اور اُن کی آمدنی میں اضافہ کیا جائے۔ جن کسانوں کے پاس پانچ ایکڑ تک ایسی زمین ہے جس پر سینچائی نہیں ہوتی اُنھیں چھوٹے کسانوں کے زمرے اور جو ڈھائی ایکڑ ایسی زمینوں کے مالک ہیں اُنھیں حاشیائی کسانوں کے زمرے میں بانٹا گیا ہے۔ ان چھوٹے اور حاشیائی کسانوں، زرعی مزدوروں، دستکاروں اور کاریگروں وغیرہ کو جن کی سالانہ آمدنی ۳۵۰۰ روپے سے کم ہے سطح افلاس کے نیچے رکھا گیا ہے۔ گذشتہ برس افلاس کی سطح ۶۴۰۰ روپے تک بڑھا دی گئی۔ لیکن اس پروگرام کے تحت مستفید ہونے والوں کو کم آمدنی والے گروپ میں شامل کر لیا گیا۔ درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے ۵۰ فیصد افراد کو فائدہ پہنچانے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

گذشتہ مالی برس کے دوران اس پروگرام کے ذریعے ۶ لاکھ ۳۲ ہزار کنبوں کو فائدہ پہنچانے کا نشانہ مقرر کیا گیا جس میں ۳ لاکھ ۹۹ ہزار پرانے اور ۲ لاکھ ۳۳ ہزار نئے کنبے شامل تھے۔ اس نشانے کے مقابلے میں ۸۷–۱۹۸۶ء کے دوران ۴ لاکھ ۹ ہزار پرانے اور ۲ لاکھ ۵۸ ہزار نئے کنبوں کو امداد دی گئی۔ ان مستفید ہونے والے کنبوں میں ۳ لاکھ ۳۱ ہزار کنبے درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے تھے اور ۸۷ ہزار خواتین بھی تھیں۔ ایک ارب ۲۹ لاکھ ۶۶ ہزار روپے کے اخراجات کے مقابلے میں ایک ارب ۱۱ کروڑ ۳۸ لاکھ روپے خرچ کئے گئے۔ علاوہ ازیں ایک ارب ۸۵ کروڑ ۳۵ لاکھ روپے کے قرضے تقسیم کئے گئے۔

رواں مالی سال کے دوران مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے لیے ایک ارب ۱۶ کروڑ ۱۵ لاکھ ۵۸ ہزار روپے کے اخراجات مخصوص کئے گئے ہیں اور ۷ لاکھ ۶۶ ہزار کنبوں کو مستفید کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ ان میں چھ لاکھ پرانے اور ایک لاکھ ۶۶ ہزار نئے کنبے شامل ہیں۔

اس پروگرام کے تحت رواں مالی سال کے دوران ۶۶ ہزار پرانے اور ۳۱ ہزار نئے کنبوں کو جولائی تک فائدہ پہنچایا گیا۔ ان ۹۷ ہزار کنبوں کو ۷ کروڑ ۱۶ لاکھ روپے کی امداد دی گئی۔ علاوہ ازیں اُنھیں ۲۵ کروڑ ۳۶ لاکھ روپے کا قرضہ دیا گیا۔ ان میں سے ۵۸ ہزار کنبوں نے صنعتی لائن اور پیشہ ورانہ پروگرام اختیار کیا ہے اور ۳۸۳۴۰ کنبوں کو زرعی اور متعلقہ پیشوں میں امداد دی گئی ہے اس پروگرام کو زیادہ موثر بنانے کے لیے ریاستی حکومت نے متعدد نئے اقدامات کئے ہیں۔

نئے اقدامات

تمام پراجیکٹوں میں نئی اور پرانی اسکیموں میں سلسلہ جوڑنے پر زور دیا گیا ہے۔ خام مال کی دستیابی، اثاثہ جات کی خرید اور پیداوار کی مارکیٹنگ کو افزائش مویشیاں کے محکمہ جاتی میڈیا، کھادی اور گرام اُدیوگ بورڈ، محکمہ باغبانی، محکمہ ماہی گیری اور محکمہ صنعت کی طرف سے یقینی بنایا گیا ہے۔ بینکوں کے ساتھ مؤثر رابطہ بھی برقرار رکھا جا رہا ہے ضابطے کو مزید فراخدلانہ بنایا گیا ہے۔ پروگرام کے تحت پمپ سیٹوں کے لیے مفت کھدائی کی سہولت دی گئی ہے اور امدادی رقم میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اب چھوٹے کسانوں کو ۳۳ فیصد اور حاشیائی کسانوں کو ۵۰ فیصد امدادی رقم دی جا رہی ہے۔

ٹرائسم اسکیم کو جو دیہی نوجوانوں کے لیے شروع کی گئی تھی تاکہ وہ اپنا روزگار خود پیدا کر سکیں مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس اسکیم کے تحت ۱۸ سے ۳۵ عمر کے گروپ کے دیہی نوجوانوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ جو ادارے ایسی تربیت دیتے ہیں وہ ہیں۔ انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، پالی ٹیکنک، کسانوں کے تربیتی مرکز، توسیعی تربیتی ادارے اور ماسٹر کرافٹس مین مرکز۔ جن ہنروں کی تربیت دی جاتی ہے وہ ہیں۔ بیکری، ویلڈنگ، ٹیلرنگ، ایمبرائڈری، ریڈیو اور ٹی۔ وی کی مرمت اور فوٹو گرافی وغیرہ۔ رواں مالی سال میں ۲۵۴۸۰۰، افراد کو تربیت دینے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کا ایک اور معاون ہے "دیہی خواتین اور بچوں کی ترقی کا پروگرام"۔ ۸۷–۱۹۸۶ء کے دوران اسے سات اضلاع کے ۷۰ ترقیاتی بلاکوں میں عمل میں لایا گیا۔ امسال مزید چھ اضلاع کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اس اسکیم کے تحت خواتین کے گروپ بنائے جاتے ہیں اور ہر گروپ کو ۱۵ ہزار روپے تک بنیادی امداد دی جاتی ہے۔ ان گروپوں کو اچار مربے تیار کرنا، مسالے پیسنا، اور پاپڑ وغیرہ بنانے کے ہنر سکھائے جاتے ہیں۔

دیہی ترقی کی دیگر اسکیموں میں "دیہات کے بے زمین لوگوں کے لیے روزگار کی گارنٹی کا پروگرام" شامل ہے۔ اس کے تحت ۱۹۸۶ء کے دوران ۵ کروڑ ۲۷ لاکھ ۶۱ ہزار انسانی دنوں کا روزگار پیدا کیا گیا اور اس کے لیے ایک ارب ۷ کروڑ ۹۴ لاکھ ۸۲ ہزار روپے خرچ کئے گئے۔

اسی طرح نیشنل رورل ایمپلائمنٹ پروگرام" کے تحت گذشتہ برس ۴ کروڑ ۶۵ لاکھ ۲۴ ہزار انسانی دنوں کا روزگار پیدا کیا گیا۔ حکومت کی طرف سے دیہی عوام کی ترقی کے لیے متعدد پروگرام عمل میں لائے جا رہے ہیں جن کا زیادہ تر مقصد دیہات کو خود کفیل بنانا اور گاندھی جی کے گرام راج کے خواب کی تعبیر کرنا ہے۔ ●

سائرہ بانو ⁵

اترپردیش ترقی کی شاہراہ پر

کوآپریٹو سوسائٹیاں

کوآپریٹو سوسائٹیاں کسانوں کے سماجی اور معاشی حالات سدھارنے میں اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ ایک طرف انھوں نے قرض کی ضرورتوں کو پورا کیا ہے، دوسری طرف اُن سے ملک میں اناج کی پیداوار بڑھانے میں مدد ملی ہے۔ اس لیے ان کوآپریٹو سوسائٹیوں کو بڑھاوا دینے کے لیے حکومت انھیں دفتر اور گودام کی سہولتیں مہیا کرنے پر غور کر رہی ہے اور دیگر قومی اور ریاستی بنک ان کی مدد کر رہے ہیں تاکہ یہ اپنے کاز کو مزید بڑھا سکیں۔ اس وقت اترپردیش میں کوآپریٹو سوسائٹیوں کی ۱۱۹۲۴، اکائیاں کام کر رہی ہیں۔

اُترپردیش اگر ترقی کی راہ پر تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے تو اس ترقی میں ان کوآپریٹو سوسائٹیوں کا بہت بڑا رول ہے۔ یہ سوسائٹیاں نہ صرف چھوٹے کسانوں اور کھیت مزدوروں کو قرض مہیا کرتی ہیں بلکہ ان کی پیداوار پر مناسب دام دلوانے کے انتظامات بھی کرتی ہیں۔ یہی نہیں ان سوسائٹیوں کی کوششوں سے کسانوں کی فاضل پیداوار مال گوداموں میں محفوظ کرانے کا بندوبست بھی کیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ سوسائٹیاں دھان، سویابین، دال، گنّا اور آلو جیسی اشیاء کو صارفین تک پہنچانے کا کام بھی کر رہی ہیں۔

اترپردیش میں دھان بہت زیادہ پیدا ہوتا ہے اس لیے صرف گھریلو طریقے سے چاول نکالنا ممکن نہیں۔ نجی ادارے اس کام کے لیے زیادہ منافع چاہتے ہیں۔ چنانچہ غریب کسانوں کی مدد کے لیے کوآپریٹو سوسائٹیوں نے دھان کی ۲۳ ملیں قائم کی ہیں۔ ان ملوں کی پیداواری صلاحیت ۱۷۵۶۴۰ کوئنٹل سالانہ ہے۔ ریاستی حکومت نے کوآپریٹو بنیادوں پر دھان کی ۵ ملیں قائم کرنے کے لیے ۳۶ء۱۱ لاکھ روپے کا قرض دیا ہے۔

دھان کی ملوں کے علاوہ دال کی ۱۲ ملیں بھی کام کر رہی ہیں اور ان کی پیداواری صلاحیت فی مِل ۱۶۲ء۱ لاکھ کیلوگرام سالانہ ہے۔ ان ملوں سے سال ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران ۳۶۷۵۴ کوئنٹل دالیں مل سکی تھیں۔ حکومت نے دال کی مزید ملیں قائم کرنے کے لیے ۴۸ء۱۱ لاکھ روپے کے قرض کی منظوری دی ہے۔ اترپردیش کے باندا ضلع میں کوآپریٹو سوسائٹی نے ایک ایسا مِل لگایا ہے جو ہر گھنٹہ ایک ٹن دال تیار کرتا ہے۔ ۷ ویں پانچ سالہ منصوبے کے دوران دال کی مزید ۱۰ ملیں لگانے کا منصوبہ ہے۔

ریاست میں ان کوآپریٹو سوسائٹیوں کی تیل کی ۱۵ ملیں، مونگ پھلی کا تیل نکالنے والی ۲ ملیں اور ہردوئی میں سامیتی گھی بنانے والی ایک مل قائم ہے۔ ان کا ایک کارخانہ سالونٹ ایکسٹنکشن پلانٹ کے نام سے ہے جس میں اپریل ۱۹۸۵ء تک تیل کی پیداوار ۲۰۲۴۰ کوئنٹل تک پہنچ جانے کی وجہ سے ۲۶۹۵۵ روپیوں کا منافع حاصل کیا ہے۔

کسانوں کو آلو کی ذخیرہ بندی کی سہولت بہم پہونچانے کی غرض سے ریاستی حکومت نے سب سے پہلے ایک کولڈ اسٹوریج قائم کیا تھا اس کے بعد مزید کولڈ اسٹوریج کوآپریٹو سوسائٹیوں کی مدد سے تعمیر کرائے گئے۔ ان کی تعداد ۵۸ تک پہونچ گئی ہے جس میں ۱۶۹۴۰۰ میٹرک ٹن آلو رکھا جا سکتا ہے۔ مزید کولڈ اسٹوریج تعمیر کئے جا رہے ہیں۔ اچانک بجلی کی سپلائی بند ہو جانے کی وجہ سے ہونے والے نقصانات سے بچنے کے لیے ۵۰ کولڈ اسٹوریجوں میں جنریٹر لگانے کا منصوبہ تھا جن

(باقی ص ۳۶ پر)

ـــــــــــــــــــــــــــــ

⁵ معرفت محمد حنیف، ۱۳، میور سچیج روڈ۔ کلکتہ ۲۳۔
یوجنا، نئی دہلی

ڈاکٹر اسلم پرویز٭



دیہات کی مربوط ترقی

مربوط دیہی ترقیات پروگرام پر حالیہ ترین سروے رپورٹ اس اہم سیکٹر میں کی گئی ترقی کی اچھی عکاسی کرتی ہے، یہ اُن معروضی اعداد و شمار کے پورے سلسلے کو پیش کرتی ہے جس سے بغیر کسی شک کے یہ ثابت کرنے والا ایک کُلّی تجزیہ سہل ہو جاتا ہے کہ دیہی ترقیات پروگرام زور پکڑتا جا رہا ہے۔

چوتھے پلان میں اس امر کو تسلیم کر لیا گیا تھا کہ غالباً نئی ٹکنالوجی چھوٹے اور معمولی کسانوں کو نظر انداز کر دے گی اور بین ذاتی تفاوتوں میں اضافہ کرنے پر منتج ہوگی۔ لہٰذا چھوٹے کسانوں کے لیے ترقیاتی ایجنسیاں اور معمولی کسانوں اور کھیت مزدوروں کے لیے ترقیاتی ایجنسیاں جیسے خصوصی پروگرام شروع کئے گئے تھے۔ بعد میں قومی کمیشن برائے زراعت کی سفارش پر چھوٹے کسانوں کے لیے ترقیاتی ایجنسیوں نیز معمولی کسانوں اور کھیت مزدوروں کے لیے ترقیاتی ایجنسیوں کو آپس میں مدغم کر کے۔ ایک واحد اسمال فارمرز ڈویلپمنٹ ایجنسیز پروگرام تشکیل کیا گیا، جو چھوٹے اور معمولی کسانوں اور کھیت مزدوروں پر بھی محیط تھا۔ یہ خصوصی پروگرام چھوٹے اور معمولی کسانوں کے پیداواری اثاثے کی بُنیاد کو وُسعت دینے کی غرض سے وضع کئے گئے تھے۔ روزگار اور آمدنی پیدا کرنے والی موجودہ سرگرمیوں کو زیادہ نفع بخش سا دیا گیا تھا، نیز ڈیری فارمنگ اور مُرغی، سوّر، بھیڑ و بکری پالن جیسی امدادی سرگرمیوں کے ذریعے نئے مواقع فراہم کئے گئے تھے۔

مربوط دیہی ترقیات پروگرام کا آغاز ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۲۳۰۰ ترقیاتی بلاکوں میں کیا گیا تھا۔ ۲؍اکتوبر ۱۹۸۰ء سے اسے ملک کے سبھی ترقیاتی بلاکوں میں پھیلا دیا گیا، آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی کی غرض و غایت افلاس کی سطح سے نیچے کے کنبوں کو امداد دینا ہے تاکہ وہ اپنی آمدنی کی سطح کو بڑھا کر بالآخر غریبی کی سطح کو پار کر سکیں، اس مقصد کا حصول شناخت کردہ کنبوں کو پیداواری اثاثے مہیا کر کے کیا جاتا ہے۔ ان اثاثوں کے لاگتی سرمائے میں چھوٹے کسانوں کے ضمن میں ۲۵ فیصد، معمولی کسانوں، کھیت مزدوروں اور دیہی کاریگروں کے بارے میں ۳۳ و ۳ فیصد اور درج فہرست قبائل کے تعلق سے ۵۰ فیصد کی سرکاری امداد دی جاتی ہے۔ چوں کہ درج فہرست ذاتیں اور قبائل دیہی علاقوں میں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والی آبادی کا نمایاں حصہ ہیں اس لیے یہ قرار دیا گیا ہے کہ آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی کے ذریعے امداد پانے والے کنبوں میں سے کم از کم ۳۰ فیصد کنبے ایسے ہونے چاہئیں جن کا تعلق درج فہرست ذاتوں اور قبائل سے ہو۔ مزید اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ سرکاری امداد اور قرضہ جات کی شکل میں وسائل کا کم از کم ۳۰ فیصد دیہی سماج کے ان کمزور طبقوں کو دیا جانا چاہیئے۔

خود روزگار کے لیے دیہی نوجوانوں کو تربیت دینے کی اسکیم اگست ۱۹۷۹ء میں شروع کی گئی تھی۔ اس کا مقصد ۳۵-۱۸ سال کی عمر کے زمرے میں آنے والے دیہی نوجوانوں کو خود روزگاری پیشوں کے لیے درکار ضروری ہُنرمندیوں اور ٹکنالوجی سے لیس کرنا تھا۔ اس اسکیم کے تحت مقررہ نشانہ ۴۰ نوجوان فی بلاک کی شرح سے ہر سال تقریباً ۲,۰۰,۰۰۰ کو تربیت دینا ہے۔ یہ اسکیم آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ اس سے مستفید ہونے والے کنبوں کا انتخاب آمدنی کی

٭ شعبۂ نباتات، ذاکر حسین کالج، اجمیری گیٹ، دہلی۔

بنا پر کیا جاتا ہے۔ مثلاً فی سال ۳۵۰۰ روپے سے کم آمدنی والے کنبے پر انتخاب کے لیے غور کیا جاتا ہے، اولین ترجیح غربا میں سے غریب ترین کنبے کو دی جاتی ہے اور منتخب کنبے میں سے فقط ایک شخص کو لیا جاتا ہے۔

قومی دیہی روزگار پروگرام اکتوبر ۱۹۸۰ء میں کام کے بدلے خوراک، پروگرام کے بدلے میں شروع کیا گیا تھا۔ یکم اپریل ۱۹۸۱ء سے یہ چھٹے پنجسالہ پلان کا ایک باقاعدہ جزو بن گیا اور اُس کے بعد اسے مرکزی سرپرستی والے پروگرام کے طور پر نافذ کیا جا رہا ہے، جس میں مرکز اور ریاستیں ۵۰-۵۰ حصّہ ادا کرتی ہیں۔ اس کا مقصد سال کے کام سے خالی دنوں میں روزگار کے متلاشیوں کو روزگار کے اضافی مواقع فراہم کرنا ہے۔ نیز پائیدار اجتماعی اثاثے پیدا کرنا اور دیہی غربا کے غذائی معیار کو اونچا اُٹھانا ہے۔

چھٹے پنجسالہ منصوبے کے دوران یہ بات پہلی بار محسوس کی گئی کہ بھارتی معاشرے کے بڑے گوشوں میں عورتوں کے کمتر مرتبے کو، اُنھیں جداگانہ روزگار کے مواقع فراہم کیے بغیر بڑھایا نہیں جا سکتا۔ متعدد غریب کنبوں کی عورتوں کو کنبے کی آمدنی میں اضافہ کرنے کی خاطر کام کرنا پڑتا ہے۔ مربوط دیہی ترقیات پروگرام بھی الگ الگ اسکیموں کے تحت ایسے کنبوں کی عورتوں کی مدد کرتا ہے تاکہ وہ اپنے کنبے کی آمدنی بڑھا پائیں۔ ایسا اس اسکیم کے تحت اُنھیں قرضے اور دیگر فائدے حاصل کرنے میں سہولیات بہم پہنچا کر کیا جاتا ہے۔ خود روزگار کے لیے دیہی جوانوں کی تربیت کی اسکیم کے تحت یہ پروگرام نوجوان عورتوں کو زیادہ سے زیادہ ممکن فائدے پہنچاتا ہے، نیز انھیں قرضہ جات اور امدادی رقوم کی ادائیگی میں ترجیح دیتا ہے، دیہی علاقوں میں عورتوں اور بچوں کی فلاح کے لیے ستمبر ۱۹۸۲ء میں ایک نسبتاً نئی اسکیم شروع کی گئی ہے۔ اسے آئی۔آر۔ڈی۔پی کے ایک جزو کے طور پر الگ الگ صوبوں کے ۱۵ منتخب پسماندہ اضلاع میں رہبرانہ اساس پر نافذ کیا جا رہا ہے۔ خصوصی مساعی اور ضروری لاگتی سامان کی فراہمی کے ذریعے، اس اسکیم کا مقصد غریب دیہی عورتوں میں سے غریب ترین کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ دیہی ترقیاتی پروگراموں میں بالعموم اور آئی۔آر۔ڈی۔پی۔ میں بالخصوص کارگر ڈھنگ سے حصّہ لے سکیں۔

تازہ ترین سروے رپورٹ جس کے بموجب اس اسکیم سے مستفید ہونے والی عورتوں میں سے ۶۶ فیصد اقل ترین آمدنی والے زمرے سے تعلق رکھتی تھیں، مذکورہ امر کی تصدیق کرتی ہے۔

مدد پانے والے کنبوں کی بہ لحاظ آمدنی تفصیلات سے مزید منکشف ہوتا ہے کہ اگرچہ بے آسرا اور نہایت غریب زمرے سے آنے والے کنبے، آئی۔آر۔ڈی۔پی کی طرف سے دی جانے والی مدد کے لیے نشانے کے طور پر مقررہ زمرے کا صرف لگ بھگ ۲۹ فیصد ہی محیط ہے، اُن کا اصل احاطہ اس سے زیادہ تھا جتنا کہ ۸۰ فیصد۔ درجِ فہرست ذاتوں اور قبائل کو امداد کی فراہمی میں ترجیح کا دیا جانا بھی مذکورہ سروے سے واضح ہے۔ ۶۴۰۰ روپے سالانہ آمدنی کی نظرثانی شدہ غریبی کی سطح کی بنا پر پرانے فائدہ اُٹھانے والوں کی، جو اب غریبی کی سطح کو پار کر چکے ہیں، از سرِ نو تقسیم، اہم اشاروں کا پتہ دیتی ہے۔ قومی سطح پر لگ بھگ ۱۲ فیصد پرانے فائدہ اُٹھانے والے نئی غریبی کی سطح کو پار کر چکے ہیں۔ آسام کے تعلق سے تقریباً ۳۳ فیصد پرانے فائدہ اٹھانے والے نظرثانی شدہ غریبی کی سطح سے اُوپر اُٹھ چکے ہیں، پنجاب اور راجستھان میں ایسے معاملات کا فیصد ۲۶ تا ۲۸ ہے اور آندھرا پردیش، بہار، ہریانہ، کیرالا، مہاراشٹر، میگھالیہ، تامل ناڈو، تریپورہ، اُتر پردیش اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں یہ فیصد ۱۰ تا ۲۰ ہے۔ باقیماندہ صوبوں میں یہ فیصد ۱۰ سے بھی کم ہے جبکہ منی پور میں کسی بھی پرانے فائدہ اٹھانے والے نے نظرثانی شدہ غریبی کی سطح کو پار نہیں کیا۔ آمدنی کے لحاظ سے گوشوارے، اثاثوں کی بدولت مرتبے نیز اثاثوں سے آمدنی کے ساتھ ساتھ ان اعداد و شمار کا تقابلی مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ جب تک مجموعی سرمایہ کاری نمایاں طور پر بڑے پیمانے پر نہیں ہوگی، بے آسرا اور نہایت غریب لوگ غریبی کی سطح کو پار نہیں کر پائیں گے۔

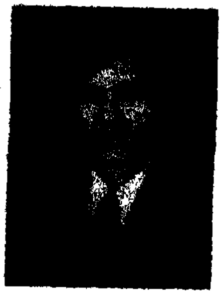
صوبائی بنچ پر، بنیادی ڈھانچے سے متعلق موجودہ سہولیات کی صورتِ حال، بشمول لاگتی سامان نیز مارکیٹنگ، مرمت اور رکھ رکھاؤ خدمات کی فراہمی، ظاہر کرتی ہے کہ یہ جملہ سہولیات جموں و کشمیر میں مفقود ہیں۔

اس پروگرام کی گیرائی اور آسودگی کی حیثیت کے بارے میں، مذکورہ سروے سے پتہ چلتا ہے کہ قومی سطح پر ۸۰ فیصد فائدہ برداروں نے ملنے والی مدد کو اثاثوں کے حصول کے لیے کافی پایا ہے۔ سکم میں سبھی معاملات میں، اور ہماچل پردیش، اڑیسہ اور اُتر پردیش میں ۹۰ فیصد سے زیادہ حالتوں میں فائدہ برداروں نے ایسی امداد کو کافی پایا ہے، ایسے کیس آسام، بہار، کرناٹک، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، میگھالیہ، تریپورہ اور مغربی بنگال میں بھی قومی اوسط سے زیادہ اوپر ہیں، قرضہ دینے والے مختلف اداروں کے رول کا مقابلہ کرنے پر یہ واضح ہوتا ہے کہ علاقائی دیہی بینکوں اور امدادِ باہمی بینکوں کی نسبت کمرشیل بینک قرضوں کی فراہمی میں زیادہ سرگرمی سے کام کر رہے

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

نثار صدیقی*

ہلکی پھلکی انجینئرنگ کی صنعت



انجینئرنگ ـــــــ تمام دوسری صنعتوں کی بنیادی ضرورت ہے۔ ہر صنعت میں استعمال ہونے والی مشینیں، آلات، اوزار، کل پرزے اور نٹ بولٹ، واشر، اسکریو، کیلیں، جیسی معمولی لیکن اہم اشیاء کی فراہمی اسی صنعت کے ذریعے ہوتی ہے۔ آپ کو یہ اندازہ بھی ہوا ہوگا کہ زرعی ملک ہونے کی وجہ سے زراعت کے بیشتر شعبوں میں انجینئرنگ کی صنعت اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ اور دوسری طرف اسٹیل پلانٹ کی تکمیل کے بعد ملک میں ایک نئے اور خوش آئند صنعتی دور کا آغاز ہو گیا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف اندرونِ ملک انجینئرنگ کی مصنوعات کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ بلکہ اگر معیار اور موزوں قیمت کا خیال رکھتے ہوئے کام کیا جائے تو انجینئرنگ کی مصنوعات کی برآمد میں بھی کئی گنا اضافہ ہو سکتا ہے۔

ذیل میں چند منصوبوں کی تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں ان میں تمام منصوبوں کی بنیادی معلومات اور لاگت کے تخمینے بھی درج کئے جا رہے ہیں۔

نٹ بولٹ اور اسکریو بنانے کا کارخانہ

نٹ بولٹ اور اسکریو انجینئرنگ کی تمام صنعتوں اور سبھی پیداواری شعبوں کی ایسی ضرورتیں ہیں، جن کے بغیر نہ تو کوئی مشین کھڑی ہو سکتی ہے نہ کوئی عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے اور نہ کوئی گاڑی چل سکتی ہے یہ بہت چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں لیکن ہر اوزار، مشین، گاڑی اور کل پرزوں کے لیے وہی اہمیت رکھتی ہیں جو جانداروں کے لیے ہوا کی ہے۔

ملک میں انجینئرنگ کی صنعت کے فروغ کے ساتھ ساتھ ان کی مانگ مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تعمیراتی سرگرمیاں بڑھنے سے بھی ان کے استعمال میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ آٹو موبائل اور زرعی مشینوں و آلات کی صنعت کے فروغ سے ان کی طلب اچانک بڑھ گئی ہے۔ اس وقت ملک میں تقریباً ڈیڑھ دو سو کارخانے نٹ بولٹ اور اسکریو بنا رہے ہیں۔

پہلے اس صنعت کے لیے خام مال کی فراہمی ایک بڑا مسئلہ تھا۔ لیکن اب ملک میں اسٹیل ملز کے قیام کے بعد یہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔

نٹ، بولٹ اور اسکریو کے کارخانے کے قیام پر تقریباً ۵ اسولاکھ روپیہ لاگت آئے گی مشینوں کی قیمت کا اندازہ چھ لاکھ روپیے، متفرق اخراجات کے لیے ۵۰ ہزار روپیے اور جاری اخراجات کے لیے ۴۰ ـ ۵۰ ہزار روپیے کی ضرورت ہوگی کارخانے کے لیے مندرجہ ذیل مشینوں کی ضرورت ہوگی:۔

۱۔ خراد مشین ۲۔ ڈرلنگ مشین ۳۔ ملنگ مشین ۴۔ شیپر ۵۔ بورنگ مشین ۶۔ ویلڈنگ پلانٹ ۷۔ فرنیس مع بھٹی ۸۔ مختلف اوزار۔

کارخانے کی پیداوار پر منافع کی شرح کا اندازہ ایک سے سوا لاکھ روپیے سالانہ ہے۔

دستی اوزار بنانے کا کارخانہ

ورکشاپ، فیکٹری، کارخانوں، سروس اسٹیشن اور گھروں، دفتروں میں استعمال ہونے والے دستی اوزار و آلات کی مارکیٹ کافی وسیع ہے۔ یہ اوزار مکینک، فٹر، پلمبر، الیکٹریشین، کارپینٹر، مستری اور دیگر ہنرمند و نیم ہنرمند افراد استعمال کرتے ہیں۔ لوگ گھروں میں مرمت کے کام کے لیے بھی چند اوزار رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں ہینڈ ٹولز چھوٹی اور بڑی سطح پر تیار ہوتے ہیں۔ کاٹیج انڈسٹری کے طور پر بنائے جانے والے اوزاروں کا معیار عام طور پر اچھا نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے صارفین

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

* معرفت جمال بک ڈپو، بارہ کا روڈ، گیا (بہار)۔

م۔ فرقان خان



تعلیمی پالیسی
ایک بُنیادی مسئلہ

تعلیم اور طریقۂ تعلیم دونوں کسی بھی ملک کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں! لیکن ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کا المیہ یہ رہا ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد اس پالیسی کو ہماری ضروریات اور تہذیب کے مطابق ڈھالنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی اور جو کچھ کوشش وقتاً فوقتاً کی گئیں وہ نہ صرف ناکافی تھیں بلکہ ان کو عملی جامہ جس بے دلی سے پہنایا گیا اس کے نتائج آج ہم سب کے سامنے ہیں۔

موجودہ تعلیمی پالیسی کے متعلق یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ یہ وراثت میں ملی ہوئی وہ پالیسی ہے جس کا مقصد میکالے نے کلرک پیدا کرنا ٹھہرایا تھا۔ آج یہ پالیسی اپنے اس مقصد میں نہ صرف کامیاب ہی ہے بلکہ اس نے ملک کی بہت بڑی آبادی (جس میں نئی نسل شامل ہے) میں ایسا میٹھا زہر گھول دیا جس سے کہ یہ نسل نہ صرف ذہنی اعتبار سے ملک کے تہذیبی ورثہ سے دُور ہوگئی بلکہ نفسیاتی طور پر مجہول بھی بن گئی۔

اس تعلیمی پالیسی میں نہ تو ہماری برسوں کی پروردہ تہذیب کی جھلک ہے اور نہ اخلاقی اقدار کی گنجائش۔ نتیجتاً کچھ بُرائیاں ظاہری اور کچھ پوشیدہ طور پر ہمارے معاشرے میں رچ بس گئی ہیں۔ ملکی سطح پر اس پالیسی کے اثرات کا تجزیہ کیا جائے تو کچھ باتیں ہمارے سامنے آئیں گی۔ جیسے تعلیم کی ہمہ گیریت میں کمی، بامقصد تعلیم کا فقدان، قومی یکجہتی جیسے اہم پہلو کی نظرانداز ی۔ فرداً فرداً ان پہلوؤں کو یوں پیش کیا جاسکتا ہے :

۱۔ تعلیم کی ہمہ گیریت :-

ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کی سب سے بڑی ناکامی یہ رہی ہے کہ آزادی کے ۴۰ سال گزرنے پر بھی ہم عوام کے نصف حصّے کو بھی بنیادی تعلیم مُہیا نہیں کرا سکے۔ سرکاری اعداد کے مطابق ۱۹۸۱ء میں ۳۶ فیصد لوگ تعلیم یافتہ تھے (یہ ذہن میں رہے کہ سرکاری حساب سے تعلیم یافتہ اُن کو مانا جاتا ہے۔ جنھیں حروف تہجی کا علم ہو)۔ ایسے میں تعلیم کی صورت حال کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر ہمارے ملک میں اب بھی ۶۴ فیصد ایسے افراد ہیں جنھیں تعلیم کے دوسرے مقاصد تو دُور، زبان کے حروف تہجی کا بھی علم نہیں ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں کی بات نہ کریں تو بھی ترقی پذیر ممالک سے بھی ہم بہت پیچھے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق غیر تعلیم یافتہ افراد کی تعداد کوریا میں ۱۲٫۴ فیصد، فلپائن میں ۱۷٫۴ فیصد اور تھائی لینڈ میں ۲۱٫۴ فیصد ہے۔ یہ وہ ترقی پذیر ممالک ہیں جو کم و بیش آزاد ہندوستان کے ساتھ ہی وجود میں آئے تھے۔ لیکن تعلیم کے میدان میں یہ ممالک کتنا آگے نکل چکے ہیں اس کے شاہد یہ اعداد ہیں۔ اس سے ہم ہندوستان میں تعلیم کی حالت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

۲۔ مقصدیت کا فقدان

ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کا دوسرا بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ جو بھی تعلیم آزادی کے بعد ہم نے اسکولوں اور کالجوں میں دی اس کا کوئی مقصد ہم طے نہیں کر پائے۔ مقصد کے فقدان کی وجہ سے دو بہت بڑی خرابیاں تعلیمی نظام میں گھر کر گئیں۔ ایک تو یہ کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایسے طلباء کی کثیر بھیڑ جمع ہوگئی جن کا مقصد حصولِ تعلیم نہ ہو کر وقت گزارنا رہا، دوسری یہ کہ کالج کی تعلیم کے اختتام پر طالب علم خود کو

۴۲۹۶ ۔ ۸ نمبر بڑلی کا راستہ، چوکری رام چندر جی، جے پور۔

ایسی سڑک پر کھڑا محسوس کرتا ہے جہاں نہ تو کوئی راہبر ہے اور نہ ہی کوئی منزل۔ اس طرح تعلیم نے نہ تو اُسے اس قابل رکھا کہ اپنے آباؤ اجداد کے کھیت پر جا کر کام کر سکے اور نہ ہی وہ تعلیم کے میدان میں کوئی ایسا اہم کارنامہ انجام دے سکا جس سے اس کی معاش کا انتظام ہو سکے اور وہ سماج میں اپنا کوئی رول ادا کر سکے۔ طالب علم کے کالج کے زمانے کا سحر جب ٹوٹتا ہے تو وہ خود کو فریب خوردہ محسوس کرتا ہے اور نوجوان طبقے میں ایک طرح کا غم و غصہ پرورش پانے لگتا ہے۔ سماج، سرکار اور ملک سے بیزاری اس میں گھر کر جاتی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے کی اتنی بڑی تعداد ملک اور سماج سے بیزار ہو جائے تو کیا ہم اپنی پالیسی کو بامقصد تعلیم دینے والی پالیسی کہہ سکیں گے۔

۳۔ تعلیمی معیار میں فرق

ایک طرف تو ہم ملک کی پوری آبادی کو تعلیم کی سہولیات مُہیا نہیں کرا سکے دوسری طرف جتنی سی بھی تعلیم ہم مُہیا کرا سکے، اس کا معیار بھی بہت گرا ہوا رہا۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ معیار کی اس گراوٹ کو ہم نے محسوس تو کیا لیکن اس کا حل بڑا ہی مضحکہ خیز نکالا — پبلک اسکولوں کی شکل میں، انگریزوں نے جو روایت شروع کی تھی کہ ایک خاص طبقے کے لیے اچھی تعلیم اور باقی عوام کے لیے عوامی تعلیم، اس ہی روایت کو نہ صرف ہم نے قائم رکھا بلکہ اس کو پھلنے پھولنے کا موقع بھی دیا۔ سرکاری امداد اور تحفظ کی شکل میں۔ نتیجے میں تعلیم کے دو مختلف معیار قائم ہو گئے جس نے نہ صرف ہماری سماجی زندگی پر اثر ڈالا بلکہ امیر اور غریب کی خلیج کو اور بڑھا دیا۔ یہ ہماری تعلیمی پالیسی کا تیسرا المیہ تھا۔

۴۔ قومی یکجہتی اور ملکی سالمیت

ہماری تعلیمی پالیسی کا چوتھا المیہ ہے نصاب میں پڑھائی جانے والی کتابیں۔ یہ کتابیں معیار کے حساب سے تو پست ہیں ہی، ساتھ ہی ان میں قومی یکجہتی اور سالمیت کے پہلو کو بھی یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آج کا طالب علم جو کہ شمالی ہندوستان میں تعلیم حاصل کر رہا ہے، جنوبی ہندوستان کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتا ہے کہ جنوب میں لنکا ہے جہاں سیتا جی کو قید کر کے رکھا گیا تھا یا پھر یہ کہ وہاں کے رہنے والے سبھی مدراسی ہیں۔ اسی طرح مشرقی ہندوستان کے بارے میں ان کی معلومات کلکتہ تک ہی محدود ہے وہ اس بات سے بالکل لاعلم ہے کہ کلکتے کے آگے بھی ہندوستان کا پرچم لہراتا ہے۔ کم و بیش یہی حال جنوبی ہندوستان میں پڑھائی جانے والی کتابوں کا ہے۔ ان کتابوں میں اگر کہیں ملک کے دوسرے حصوں کا ذکر آ بھی جاتا ہے تو صرف ضمناً یا پھر سیاحت کی اہمیت کے اعتبار سے۔ ان میں ملک کے دوسرے خطوں کی تہذیبی ورثہ اور مذہبی عقائد کے بارے میں معلومات کا یکسر فقدان رہتا ہے۔ ایسے میں ہم کیسے سوچ سکتے ہیں کہ ان کتابوں کے پڑھنے والے طالب علم ذہنی طور پر ہندوستان کے تمام علاقوں سے خود کو منسلک کر پائے ہیں۔

قومی یکجہتی کا ہی دوسرا پہلو ہے ایک دوسرے کے مذہب اور ان کے عقائد کے بارے میں معلومات۔ ہماری تہذیب گنگا جمنی تہذیب ہے اور جنگ آزادی میں ہمارے قائدین نے جس اعلیٰ اقدار کے لیے لڑائی لڑی ان ہی اقدار کے تحفظ کے لیے ہم نے سیکولرزم کو اپنایا۔ لیکن یہاں ہم ایک بڑی بھول کر بیٹھے۔ ہم نے سیکولرزم کو غیر مذہبیت سے وابستہ کر دیا جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے مذاہب کی معلومات کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ نتیجے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مذہب کے ماننے والے بجائے دوسرے مذہب کے بارے میں جاننے کی بات تو دور گئی بے بنیاد غلط فہمیوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سیکولرزم کو سیکولرزم کے آئینے میں ہی دیکھا جائے نہ کہ غیر مذہبیت کی روشنی میں۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں غیر مذہبیت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے کیوں کہ مذہبی عقائد یہاں کے لوگوں کی زندگی ہے اور ان عقائد ہی سے انھیں روحانی طاقت ملتی ہے۔ ایسے ماحول میں ضرورت غیر مذہبیت کی نہیں بلکہ مذہب کے درس کی ہے۔ نصاب کی کتابوں میں ملک کے تمام مذاہب کی اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی شمولیت اور درس اس لیے ہی ضروری ہو جاتا ہے۔

اسی پہلو سے پیوستہ دوسرا پہلو ہے تاریخ کی تشریح کا غلط انداز۔ ہماری درسی کتابوں میں ایسے واقعات کی بھرمار ملتی ہے۔ جن کا تاریخی وجود مشکوک ہے اور جو ہماری گنگا جمنی تہذیب میں بھی خلیج پیدا کرتے ہیں ہماری کتابوں میں اُن عناصر کا ذکر تو خوب مل جاتا ہے جو قومی یکجہتی پر بُرا اثر ڈالتے ہیں لیکن اُن عناصر کا ذکر نہیں ملتا جو ہماری صدیوں سال کی پروردہ گنگا جمنی تہذیب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر علاؤالدین خلجی اور پدمنی کا ذکر تو جگہ جگہ مل جائے گا (حالاں کہ اس قصے کو تاریخ داں مشکوک ٹھہرا چکے ہیں) لیکن ہمایوں اور کرموتی کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ یہی نہیں ہندوستان کی تاریخ میں سینکڑوں ایسے واقعات مل جائیں گے جن کا محرک سیاست تھی لیکن جن

کو درسی کتابوں میں مذہبی جھگڑوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ غور کیجیے کہ اس فضا میں پروردہ تعلیم یافتہ طالب علم کیا ذہنی اور جذباتی طور پر ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی سچائی کو تسلیم کر پائے گا؟

۱۹۶۸ء کی پالیسی

نظام تعلیم میں بنیادی تبدیلی لانے کی ایک کوشش ۱۹۶۸ء کی تعلیمی پالیسی کے ذریعے کی گئی تھی جس کی بنیاد کوٹھاری کمیٹی کی رپورٹ تھی۔ اس کے ذریعے تعلیم کو بامقصد بنانے کے ساتھ ساتھ نظام تعلیم میں کئی ایسی تبدیلیاں جو انقلابی اہمیت کی حامل تھیں، لانے کی سعی بھی کی گئی۔ ۱۹۶۸ء کی تعلیمی پالیسی کی خاص باتیں تھیں۔

۱۔ ۱۴ سال کی عمر تک سب کو مفت اور لازمی تعلیم۔

۲۔ اساتذہ کی بہتر حیثیت اور بہتر تنخواہ۔

۳۔ سہ زبانی فارمولے کو تسلیم کیا جانا اور علاقائی زبانوں کی ترقی۔

۴۔ تعلیم کے سبھی مدارج میں سائنس اور ریسرچ پر زور۔

۵۔ زراعت اور صنعت کی ترقی کے لیے تعلیم۔

۶۔ کم قیمت پر اعلیٰ معیار کی نصابی کتابیں مہیا کرانا۔

۷۔ ملکی آمدنی کا ۶ فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کرنا۔

اس کے ساتھ ہی تعلیمی نظام کا نیا طریقہ ۱۰+۲+۳ رائج کیا گیا۔ جس میں تعلیم کے پیشہ ورانہ (Vocational) یا ہنرمندانہ ہونے پر زور دیا گیا تھا لیکن اس پالیسی کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔

حال ہی میں جو نئی تعلیمی پالیسی ملک گیر بحث کے لیے جاری کی گئی ہے، اس کی بنیاد ۱۹۶۸ء کی پالیسی پر ہی رکھی گئی ہے۔ خود سرکاری اپیروچ پیپر میں اس بات کو کھلے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ آج کی نئی تعلیمی پالیسی کی بنیادی باتوں پر غور کرنے سے پہلے بہتر رہے گا کہ ہم یہ دیکھیں کہ وہ کونسی وجوہات تھیں جس کی وجہ سے ۱۹۶۸ء کی تعلیمی پالیسی کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ اگر ہم معروضی طور پر غور کریں تو دو خاص باتوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔

۱۔ تعلیم پر کم خرچ

کوٹھاری کمیٹی نے یہ سفارش کی تھی کہ تعلیم پر ہماری ملکی آمدنی کا کم سے کم ۶ فیصد خرچ کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ تو ہم تعلیم کو ہمہ گیر بنا سکتے ہیں اور نہ تعلیم کا اچھا معیار پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم یہ نہیں کر سکے اور تعلیم پر ہونے والا خرچ ملک کی آمدنی کا کم و بیش ۳،۶ فیصد ہی رہا جو کہ نہ صرف کوٹھاری کمیٹی کی سفارشوں کے خلاف ہی تھا بلکہ دوسرے ممالک کے مقابلے میں بہت ہی کم۔ دوسرے ممالک تعلیم پر کتنا خرچ کر رہے ہیں۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد سے کیا جا سکتا ہے۔

سوئیڈن	۹،۵ فیصد	ایران	۸،۵ فیصد
کناڈا	۷،۷ فیصد	ڈنمارک	۷ فیصد
روس	۷ فیصد	امریکہ	۶،۹ فیصد
جاپان	۵،۸ فیصد	سعودی عرب	۶،۴ فیصد
فرانس	۵ فیصد	نیوزی لینڈ	۵،۴ فیصد

ان اعداد کے پیش نظر ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں جہاں کہ آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے، تعلیم پر صرف ۳،۶ فیصد خرچ کرنا کیا نتائج برآمد کرے گا۔ یہ بعید از قیاس نہیں۔

۲۔ پیشہ ورانہ (VOCATIONAL) یا ہنرمندانہ اسکول اور مراکز کی کمی!

۱۹۶۸ء کی تعلیمی پالیسی میں پہلی بار تعلیم کو ہنرمندانہ رُخ دے کر مقصدیت عطا کی تھی جس کے لیے ملک بھر میں بڑے پیمانے پر پیشہ ورانہ ٹکنیکل اسکول اور ٹریننگ مراکز کھلنے چاہیے تھے۔ اس وقت ان اسکولوں اور مراکز کے لیے انفرا اسٹرکچر (INFRA STRUCTURE) موجود نہیں تھا۔ جسے دھیرے دھیرے پیدا کرنا تھا۔ لیکن اس سمت میں خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہو سکی۔ اس کا نتیجہ نکلا تھا ۱۹۶۸ء کی پالیسی کی ناکامی۔ اب یہ بات بلا تردد تسلیم کر لینا چاہیے کہ ۱۰+۲+۳ والا نظام بنا پیشہ ورانہ اسکول اور ٹریننگ مراکز کے بالکل بیکار رہے۔ کیونکہ جب ۱۰+۲ والی سطح کو طالب علم عبور کرتا ہے تو اس کے سامنے پھر وہی کھلی سڑک ہوتی ہے جو پرانی اسکیم میں بھی تھی۔ ایسے میں ۱۰+۲+۱ والے نظام کی کوئی اہمیت و افادیت نہیں رہ جاتی۔

صاف ظاہر ہے کہ ۱۹۶۸ء کی پالیسی کی ناکامی کے دو اہم اسباب تھے۔ تعلیم پر کم خرچ کیا جانا اور پیشہ ورانہ تنظیموں کا نہ ہونا۔ نئی پالیسی پر غور کرتے ہوئے انہی دو بنیادی باتوں کو ذہن میں رکھا گیا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی

نئی تعلیمی پالیسی کی بنیاد اگرچہ ۱۹۶۸ء کی پالیسی پر ہی رکھی گئی ہے لیکن چند خاص باتوں کے لیے یہ پالیسی ایک منفرد مقام رکھتی

ہے۔ ایسے ورچ پیپر کا مطالعہ کرنے پر ایک بات تو کم از کم صاف ہو جاتی ہے کہ اب سرکار کچھ اہم تبدیلیاں لانی چاہتی ہے! ایسا کچھ کرنا چاہتی ہے۔ جس سے تعلیم کے شعبے میں انقلاب رونما ہو جائے۔ چونکہ ملک کی بہت ساری پریشانیوں کا رشتہ بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلیم سے ہی آکر ملتا ہے۔ اس لیے سرکار کی کچھ کرنے کی تمنّا بلکہ عزم بجائے خود ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کی وہ اہم باتیں جس کی وجہ سے یہ پالیسی منفرد حیثیت کی مالک بنتی ہے، کا تجزیہ کرنا مضمون کے اس حصّے میں مقصود ہے۔

(۲ الف) ماڈل اسکول

ماڈل اسکولوں کا تصور نئی تعلیمی پالیسی کا ایک اہم نکتہ ہے اس اسکیم کے تحت ملک کے ہر ضلع میں ایک ماڈل اسکول کھولا جا رہا ہے جس میں تعلیم کا معیار مقابلتاً بہتر ہوگا اور طلبا کے تمام اخراجات جس میں ہوسٹل میں رہنے کا خرچ بھی شامل ہے، سرکار کے ذمّے ہوگا۔ ان اسکولوں میں داخلہ مقابلے کے امتحانوں کے ذریعے ہوگا اور ان میں ۶۰ فیصد جگہیں دیہاتی علاقوں کے طلبا کے لیے محفوظ رکھی جائیں گی۔ داخلے کے بعد طالب علموں کا علاقائی تبادلہ بھی ہوگا جس سے ان کے اذہان میں قومی یکجہتی کی اصلی تصویر اُبھر سکے گی۔ ان اسکولوں کا مقصد ہونہار غریب طلبا کو اچھی تعلیم مہیّا کرانا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ماڈل اسکولوں کے روپ میں "سرکاری پبلک اسکول" قائم کیے جائیں گے۔

اس اسکیم کے سلسلے میں تین باتیں غور کرنے کے لائق ہیں۔

۱۔ صرف پالیسی میں یہ طے کر دینا کہ تعلیم کا معیار اچھا (بالفاظ دیگر اچھے پبلک اسکولوں کی طرح) رکھا جائے گا کوئی اہمیت نہیں رکھتا جب تک کہ یہ طے نہ کیا جائے کہ اچھے اساتذہ کہاں سے آئیں گے اور ان کا میلان ماڈل اسکولوں کی طرف کرنے کے لیے کون کون سے طریقے استعمال میں لائے جائیں گے۔ ساتھ ہی اچھی تعلیم کے لیے ضروری ساز و سامان کہاں سے مُہیّا ہوگا۔ یہ بھی طے کیا جانا ضروری ہے۔ اس کے لیے مستقل تفصیل کا سبق کیا جانا ضروری ہے ورنہ ماڈل اسکولوں میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔

۲۔ ماڈل اسکولوں میں داخلہ مقابلے کے امتحانوں کے ذریعے ہوگا۔ اس کے لیے اہم بات یہ ہے کہ یہ امتحان ایماندارانہ طور پر منعقد کرائے جائیں اور امتحان میں پرچے اس طرح تیار کیے جائیں کہ طالب علم میں پوشیدہ صلاحیتیں اُبھر کر سامنے آسکیں۔ صرف رٹی رٹائی معلومات کا امتحان اس کا مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ اس امتحان کا مقصد صرف پاس یا فیل کرنا نہ ہو کر ایسے طلبا کو چھانٹنا ہو جو آگے چل کر ملک کا اہم سرمایہ بننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ دیہاتی علاقوں کے چند با اثر لوگ ہی اس کا فائدہ نہ اُٹھائیں ورنہ اس اسکیم کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

۳۔ تیسری اور بہت اہم بات یہ ہے کہ ماڈل اسکول کی اسکیم ایک عبوری دور کا انتظام تو مانی جا سکتی ہے لیکن ایک مستقل حل نہیں ہمارا آخری مقصد تو یہی ہونا چاہیے کہ ملک کے تمام اسکول ماڈل اسکولوں میں تبدیل ہو جائیں انصاف کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ صرف چند لوگوں کو معیاری تعلیم مُہیّا کرانے کے لیے ملک کی بڑی آبادی کو اچھی تعلیم اور بہتر سہولیات سے زیادہ دن تک محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ اس سے منسلک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ہم تعلیم کا معیار اونچا اٹھانے کے لیے اعلیٰ تعلیم میں بھیڑ روکنے کے لیے قانون تو بنا سکتے ہیں لیکن ایک ہی طرح کی تعلیم پانے والے لوگوں کے تعلیمی معیار میں فرق نہیں کر سکتے اور خاص طور پر تب جبکہ یہ فرق خود سرکار کی طرف سے پیدا کیا جا رہا ہو۔

(ب) نصاب کا ملک گیر انتخاب

نئی تعلیمی پالیسی کا ایک اہم نکتہ اس کا نصاب ہے۔ یہ نصاب ملک اور صوبائی نصاب کا ایک مرکب ہوگا جس میں ملکی نصاب کا حصّہ ۷۰ فیصد ہوگا۔ یہ پورے ملک میں ایک جیسا ہوگا اور باقی کا ۳۰ فیصد صوبائی نصاب ہوگا۔ اس اسکیم کے تحت پورے ملک کے طلبا کو ایک ہی ذہنی اور دماغی سطح پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح کی کوشش ہندوستانی تعلیم کے پس منظر میں انقلاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نصاب نہ صرف علاقائی اور صوبائی تعصبات سے پاک ہوگا بلکہ اچھے اساتذہ کا تیار کردہ ہونے کی وجہ سے اس کا معیار بھی یقیناً اچھا ہی ہوگا۔

لیکن اس سلسلے میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ نصاب کا ۳۰ فیصد حصّہ ملکی نصاب کے علاوہ مقرر کیا گیا ہے اس کے لیے اکائی (Unit) صوبے کو بنایا گیا ہے جو موجودہ حالات میں شاید صحیح نہیں ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ ہماری ریاستوں کی تنظیم علاقائی زبانوں کے مطابق کی گئی تھی۔ یہ تنظیم کامیاب رہی یا ناکام اس سوال میں نہ جا کر اگر ہم صرف یہ دیکھیں کہ موجودہ صورتِ حال کیا ہے تو یہ پائیں گے کہ یہ تنظیم جو کہ صرف حکومت کی گرفت یا انتظام کی سہولیت کے لیے کی گئی تھی اب اسٹیٹ شاونزم (State CHAUVANISM) کی صورت اختیار

گیا ہے۔ ایک صوبہ یا ریاست اپنے آپ میں ایک ایسی مکمل تہذیبی اکائی بنتی جا رہی ہے جس کا رشتہ دوسری اکائی سے نہیں کے برابر ہے۔ اس صورت حال کا اثر لوگوں کے اذہان پر بھی اسی طرح کا ہو رہا ہے۔

ان حالات کے پیش نظر بہتر صورت یہ ہے کہ ۳۰ فیصد نصاب کے لیے اکائی (UNIT) اگر ریاست کو بنا کر زون (ZONE) کو بنایا جائے تو قومی یکجہتی کے لیے طلبا کے ذہن کا کینوس بڑا ہو جائے گا۔ ایک ریاست کا طالب علم اپنے آس پاس کی کم سے کم تین یا چار ریاستوں کے بارے میں معلومات رکھے گا جو اس کو پورے ملک سے جذباتی طور پر ہم آہنگ کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ اس کا ایک طریقۂ عمل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ۱۵ فیصد نصاب ریاست کے لیے مقرر کر دیا جائے اور باقی ۱۵ فیصد اس زون میں آنے والی دیگر ریاستوں کے لیے۔

(ب) ہنرمندانہ تعلیم

ہنرمندانہ تعلیم یا با مقصد تعلیم نئی تعلیمی پالیسی کا ایک اہم پہلو ہے۔ ایپروچ پیپر میں کہا گیا ہے کہ اس تعلیم کو میٹرک کے بعد شروع کیا جائے گا اور ضرورت پڑنے پر کچھ حلقوں میں تعلیم آٹھویں کلاس کے بعد سے بھی شروع کی جا سکتی ہے۔ ہنرمندانہ یا پیشہ ورانہ تعلیم دینے کے لیے مختلف تنظیموں کے قیام کی ذمہ داری سرکاری اور پبلک سیکٹر دونوں کی رکھی گئی ہے، لیکن سرکار عورتوں اور دیہی علاقوں کے طلبا پر توجہ کو اپنی مخصوص ذمہ داری شمار کرے گی۔

ایپروچ پیپر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ۱۹۹۰ء تک ۱۰ فیصد اور ۱۹۹۵ء تک ۲۵ فیصد طلبا کو اس اسکیم کے تحت شامل کر لیا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں ۱۹۹۵ء تک اتنے تکنیکی ادارے قائم کر دیے جائیں گے کہ وہ کل طالب علموں کے ۲۵ فیصد کو اپنے یہاں جگہ دے سکیں۔

اس اسکیم میں غور کرنے لائق امر یہ ہے کہ ہم ۱۹۹۵ء تک صرف ۲۵ فیصد لوگوں کو ہی تیکنیکی تعلیم یا ٹریننگ کے لیے سہولیات مہیا کرا پائیں گے۔ ایسے میں سوال کیا جا سکتا ہے کہ باقی ۷۵ فیصد لوگوں کا کیا ہوگا۔ ایک طرف تو ہماری اسکیم یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کو کچھ ہی ہونہار طلبا تک محدود رکھا جائے اور باقی لوگوں کو پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف موڑ دیا جائے۔ دوسری طرف ہم ۱۹۹۵ء تک کی طویل مدت میں صرف ۲۵ فیصد لوگوں کو ہی تیکنیکی تعلیم مہیا کرا پائیں گے۔ یوں اس اسکیم کے تحت ۱۰ سال میں ایسے لوگوں کی بھیڑ جمع ہو جائے گی جو دماغی طور پر تو پیشہ ورانہ تعلیم کے خواہاں ہیں، لیکن مجبوراً انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ لینا پڑے گا اور اس طرح ہماری تعلیم میں مقصدیت کا پہلو باقی نہیں رہ پائے گا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اصولاً تو ہم نے پیشہ ورانہ یا ہنرمندانہ تعلیم کو فروغ دینے کی بات تسلیم کی ہے لیکن اس پوری اسکیم کا طریقہ عمل کیا ہوگا اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اس مضمون کے دوسرے حصے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی تھی کہ ۳ + ۲ + ۱۰ والی اسکیم کی ناکامی کا اہم سبب تھا پیشہ ورانہ اور ہنرمندانہ تعلیم کے انتظام کی کمی۔ کوئی بھی اصول بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا جب تک کہ اس پر عمل نہ کیا جائے۔ ہمارے یہاں ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۵ء تک کس کس فیلڈ میں کتنے کتنے ٹیکنیشین (TECHNICIAN) اور کتنے ماہرین (EXPERTS) کی ضرورت پیش آئے گی اس کا بھی کوئی تخمینہ نہیں لگایا گیا ہے۔ ساتھ ہی ایپروچ پیپر اس امر پر بھی خاموش ہے کہ تربیت یافتہ لوگوں کو روزگار کس طرح مہیا کرایا جائے گا۔ ایپروچ پیپر میں سیلف روزگار کی بات ضرور کہی گئی ہے لیکن اس کے لیے قرضہ، مالیہ اور دیگر سہولیات مہیا کرانے کے لیے کیا صورت ہوگی اس پر ایپروچ پیپر خاموش ہے۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی میں انقلابی تبدیلیاں لانے کے امکانات موجود ہیں۔ بشرطیکہ اس میں کچھ معمولی تبدیلیاں و اصلاح کے ذریعے لائی جائیں اور بڑے ایماندارانہ انداز میں ان پر عمل کیا جائے۔ کُل ملا کر بات وہیں آتی ہے کہ اصول اپنے آپ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے ان پر عمل ہی نتائج برآمد کرتا ہے۔ اس پالیسی پر مکمل طور پر عمل ہو اس کے لیے ملک کے حکمرانوں میں سیاسی قوت ارادی کا ہونا اشد ضروری ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ جن حلقوں میں ہم تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں اُن کی حکمت عملی طے کرنے کے لیے مختلف ورکنگ گروپ بنائے جائیں جن میں ربط (COORDINATION) بٹھانے کے لیے وزارتی سطح پر احکامات جاری کیے جائیں تاکہ عمل درآمد میں تاخیر نہ ہو۔ ●

گوپال اروڑہ

تخلیق پسند خواتین کے مسائل

یوں تو لڑکیوں کی بھاری تعداد اسکولوں اور کالجوں میں تحصیلِ علم میں لڑکوں کو مات دیتی ہے۔ کیوں کہ اُن کی غیر نصابی سرگرمیاں لڑکوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہیں تاہم اسکول اور کالج چھوڑنے کے بعد اُن کی پوزیشن دگرگوں ہو جاتی ہے۔ وہ جلد ہی شادی کے بندھن میں بندھ جاتی ہیں جس سے انھیں اپنی صلاحیتوں کو پورے طور پر فروغ دینے کا موقع نہیں ملتا۔ در اصل انھیں تعلیم ہی اس مقصد سے دی جاتی ہے کہ انھیں ازدواجی زندگی کے لیے تیار کیا جائے جن لڑکیوں کو حصولِ تعلیم کے بعد ملازمت مل جاتی ہے۔ "شادی کی منڈی" میں اُن کی قدر نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ اُن کی حالت میں عموماً زیادہ جہیز دینے کی ضرورت نہیں رہتی۔ شادی کے بعد تمام تر لڑکیوں کی خواہ وہ زیادہ تعلیم یافتہ ہوں یا کم تعلیم یافتہ، اُن کی زندگی گھر گرہستی کی دیکھ بھال میں کٹ جاتی ہے۔ جو لڑکیاں ملازمت کرتی ہیں انھیں دونوں جگہ ــــ دفتر اور گھر میں کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ گرہستی کی چکی میں اس قدر پستی ہیں کہ اگر اُن میں فنونِ لطیفہ کا رجحان ہو یا شعر و شاعری، افسانہ نگاری، ڈراما نویسی، رقص و موسیقی یا اداکاری اپنانے کی اُمنگ ہو تو وہ گرہستی کے بوجھ تلے کچلی جاتی ہیں دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ ایسی عورتوں کی طرف سے گھر گرہستی کی طرف تمام تر توجہ دینے سے اُن کی شخصیت میں نکھار نہیں آتا جس سے ادب و فن کی دنیا ایسی امکانی ہستیوں سے محروم ہو جاتی ہے جو بصورتِ دیگر درخشندہ ستارے بن سکتی تھیں۔ اس طرح ملک ہونہار مصنفوں، شاعروں، مصوروں، سنگیت کاروں اور اداکاراؤں سے محروم ہو جاتا ہے کیوں کہ ایسے افراد کی تخلیقات سے ہی کسی ملک کی ثقافت مالا مال ہوتی ہے۔ ایک باصلاحیت' نوعمر عورت کو ملازمت سے اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ شادی کو حتمی مقصد تصور نہیں کرتی گو وہ اُس صورت میں شادی کر سکتی ہے جس صورت میں اُسے دُرست قسم کا رفیقِ حیات مل جائے لہٰذا بیشتر باصلاحیت لڑکیاں کشمکش اور عصبیت کا شکار ہو جاتی ہیں کیوں کہ بہت کم لوگ اُن کی حالتِ زار کو صحیح طور پر سمجھتے ہیں مشہور امریکی ماہرِ نفسیات اور تعلیم ای پی ٹورنس کا بیان ہے کہ "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تخلیق پسندی کی سرکوبی اطمینان کی زندگی کی جڑوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور انجام کار فرد سنگین ذہنی تناؤ کا شکار ہو جاتا ہے اور خود کو ٹوٹا ٹوٹا سا محسوس کرنے لگتا ہے۔"

خامیاں

معاملہ اس امر سے بھی بگڑ جاتا ہے کہ بھارت میں تخلیق پسند مصنفوں اور فنکاروں کی تخلیقات کی قدر روپے پیسے کے لحاظ سے بہت کم ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے بیشتر والدین اپنی لڑکیوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں کہ وہ تخلیق پسندانہ سرگرمیوں میں دلچسپی لیں۔ اس میں کوئی تعجب نہیں کہ بہت سی باصلاحیت لڑکیاں اس لیے ناخوش رہتی ہیں کہ وہ اپنی تخلیق پسند سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکتیں کیونکہ وہ جرأت اور مالی امداد سے عاری ہوتی ہیں کم ہی والدین ایسے ہیں جو اس بات کو ذہن میں رکھتے ہیں کہ کیا ان کے رویے سے ان کے بچوں کی صلاحیتیں کس طرح متاثر ہو رہی ہیں، کیا اُس سے مثبت اثرات پڑ رہے ہیں یا منفی؟ اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ گھروں میں بچوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے جس سے ان کی شخصیت نکھر سکے اور اُن کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہو سکیں۔

والدین کی جانکاری

بھارت جیسے ایک ترقی پذیر ملک میں جہاں

زیادہ تعداد میں ماہرین نفسیات نہیں ہیں۔ جہاں لڑکوں کی بھاری تعداد ناخواندہ ہے اور جو تھوڑے سے لوگ پڑھے لکھے ہیں انھیں اپنے باصلاحیت بچوں کے بارے میں زیادہ خیال نہیں ہے اور جہاں ادھوری تعلیم چھوڑنے والی لڑکیوں کا تناسب بہت زیادہ ہے اور اسکولوں میں ٹیچروں کو بہت کم تنخواہ دی جاتی ہے، تخلیق پسند لڑکیوں کی تعلیم دوگونہ چنوتی پیش کرتی ہے۔ ریڈیو، ٹی وی پروگراموں اور ماہرین نفسیات و تعلیم کے لیکچروں کے ذریعے والدین کو جانکاری دی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی باصلاحیت لڑکیوں کی کیئرکرنت اندیہی اور پرورش کریں۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو اپنی باصلاحیت لڑکیوں کا پتہ لگانے کے لیے کوشش کرنی چاہیئے۔ والدین کو باصلاحیت بچوں کی نفسیات سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ خواندگی و دیالیہ اسکیم اس خلا کو پُر کر سکتی ہے۔

ہوسٹل

حکومت کی طرف سے ساتویں پنجسالہ منصوبے کے باقیماندہ عرصے میں کارکن خواتین کے لیے مزید ۲۰۰ ہوسٹل قائم کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے جس سے تخلیق پسند خواتین اپنے گھروں کے ناسازگار ماحول سے نکل کر دوسرے قصبوں میں جا سکیں گی اور وہاں ملازمت پاکر اپنے ہوسٹل کے کمروں کی پُرسکون فضا میں اپنی پسند کا تخلیقی کام انجام دے سکیں گی۔

خواتین، نوعمر بیواؤں اور غیر شادی شدہ ماؤں کو روزگار کے مواقع مہیا کرنے کی غرض سے انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت کے "خواتین اور بچوں کی ترقی کے محکمے" کی طرف سے ہر ریاست میں خواتین کی ترقی سے متعلق کارپوریشن قائم کیے جا رہے ہیں۔ اگرچہ یہ ایک ترقی پسندانہ اسکیم ہے تاہم یہ دیکھنا باقی ہے کہ اس سے تخلیق پسند خواتین کو کس حد تک فائدہ پہونچ سکے گا۔ حالیہ ماضی میں بھارت کے بیشتر شہروں اور قصبوں میں ہوسٹل نہ ہونے کے باعث کارکن خواتین اپنے گھروں سے باہر نہیں جا سکیں جس سے انھیں سازگار ماحول دستیاب نہیں ہو سکا۔

تخلیق پسند خواتین کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ہیں، اول، سرمایہ کی کمی اور دوئم جو لوگ اُن کی تخلیقات کی قدر کر سکتے ہیں اُن سے سرپرستی اور حوصلہ افزائی نہ پانا۔ بدقسمتی سے فطرت کا کھیل کچھ نیارا ہے۔ علم و ادب، فنون لطیفہ، سنگیت، رقص اور ناٹک وغیرہ میں کمال حاصل کرنے والے لوگ زیادہ تر سماج کے متوسط طبقوں اور پسماندہ گروپوں میں سے آتے ہیں۔ اگر تخلیق پسند خواتین کو موزوں سہولیات دی جائیں اور اُن کی حوصلہ افزائی کی جائے تو اُن کی اقتصادی حالت بہتر ہو سکتی ہے اور وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکتی ہیں۔

مقبولیت

حصول آزادی کے بعد بھارت کے دیہی اور شہری علاقوں میں خواتین اپنے گھروں کی چار دیواری سے باہر نکل کر اپنے کمال فن کا پبلک طور پر مظاہرہ کر رہی ہیں۔ ان میں سے بیشتر نے آل انڈیا ریڈیو اور ثقافتی انجمنوں کے موسیقی کے کُل ہند مقابلوں میں حصہ لیا ہے۔ بعض نے تو تخلیقی ادب و مصوری وغیرہ میں کمال فن کا مظاہرہ کرکے قومی اعزاز حاصل کیے ہیں۔ ان میں سے بعض باصلاحیت خواتین نے ثقافتی وفدوں کے ممبروں کے طور پر غیر ممالک کے دورے کیے ہیں جن کا اہتمام بھارت سرکار اور غیر سرکاری تنظیموں کی طرف سے کیا گیا تھا۔

یہ امر قابل تعریف ہے کہ حالیہ ماضی میں نئی دلی کے متعدد اداروں جیسے "نیشنل گیلری آف آرٹ" ساہتیہ کلا پریشد، اور "اے آئی ایف اے سی ایس" کی طرف سے خواتین فنکاروں کی خصوصی نمائشوں کا اہتمام کیا گیا۔ خواتین سنگتراشوں کی ایک نمائش کا انعقاد حال میں نیشنل گیلری آف آرٹ میں کیا گیا تھا۔ اس صدی کے وسط تک بھارت میں کوئی نامور سنگتراش نہیں تھی۔ آج اس شعبے میں نامور خواتین سنگتراش پائی جاتی ہیں۔

انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت کا خواتین و بچوں کی ترقی سے متعلق محکمہ مالی امداد اور دیگر ترغیبات جیسے ریفریشر نصابوں، خصوصی جماعتوں، تخلیقات کے لیے منڈیوں، بہتر معاوضوں، نمائشوں اور قومی مقابلوں کا اہتمام کرکے اس سلسلے میں ایسی باصلاحیت خواتین کی مدد کر سکتا ہے اور اُن خواتین کو اس شعبے میں واپس لا سکتا ہے جن کی تخلیقات میں شادی، بیوگی یا مالی کمزوری کی وجہ سے رکاوٹ پڑ گئی تھی۔ ●

بقیہ، اداریہ

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے تحت تیار کردہ مال کی فروخت ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں چھوٹے پیمانے کی صنعتی ترقی کی تنظیم جسے مختصراً SIDO کہتے ہیں بالواسطہ مدد دے رہی ہے۔ ان کارخانوں کو علاقہ وار سروے رپورٹ اور صنعتی امکانات پر مبنی دستاویزات مہیا کر دی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں مرکزی حکومت نے ان کارخانوں سے مال خریدنے کا جو پروگرام چلا رکھا ہے، وہ بیحد کارآمد ثابت ہوا ہے۔ حکومت ان کارخانوں سے نکلنے والے مال کو سب سے زیادہ خریدتی ہے۔ اس شعبے سے خریدے جانے والے آئٹم ۵۷-۱۹۵۶ء میں صرف ۶ تھے جو بڑھ کر ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۴۰۹ تک پہونچ چکے ہیں۔ تجارتی بینکوں کو ہدایت ہے کہ وہ ۴۰ فیصد قرضہ ترجیحی زمرے میں آنے والی چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو دیں، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو جگہ جگہ پھیلانے اور ان کی موثر ترقی کو ہمارے معاشی نظام میں اولیت حاصل ہے۔ اسی لیے مئی ۱۹۸۶ء میں ۲۵۰۰ کروڑ روپے کی مدد سے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کے لیے ایک فنڈ قائم کیا گیا۔ ●

ڈاکٹر مسعود علی خان*

آندھرا پردیش میں تعلیمی ترغیبات

ہندوستان نے آزادی کے بعد اپنے عوام کی تعلیمی ترقی کے لئے کافی توجہ دی اور پنج سالہ منصوبہ بندی کے ذریعہ ناخواندگی کے خاتمہ کے لیے خاطر خواہ مالیہ بھی فراہم کیا۔ ہر ریاست میں متعدد پرائمری، سیکنڈری اور اعلیٰ تعلیم کے مدارس کھولے گئے۔ ہندوستان کی جنوبی ریاستوں نے خاص طور پر دیہی تعلیمی ترقی کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ تامل ناڈو نے دیہی مدارس کے طلباء کے لیے دوپہر کے کھانے کی اسکیم شروع کی تاکہ ان مدارس میں طلبا کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اسی طریقے سے ریاست کرناٹک نے بھی طلبا کے لیے مفت درسی کتابیں اور فری بس پاس کی سہولتیں مہیا کی گئیں۔ ریاست آندھرا پردیش میں جس کی خواندگی ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۳۰ فیصد ہے، دیہی تعلیمی ترقی کے لیے مختلف اسکیمیں شروع کیں۔ اس ریاست نے ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران تامل ناڈو کی طرح مدارس میں دوپہر کے کھانے کی شروعات کی تھی لیکن کچھ انتظامی امور کی مشکلات کی وجہ سے اس اسکیم پر زیادہ عرصے تک عمل نہیں ہو سکا۔

ریاست آندھرا پردیش سے طلباء اور طالبات کے لیے ۱۵ اگست ۱۹۸۷ء سے فری اسکول یونیفارم مہیا کرنے کی اسکیم شروع کی جس کے ذریعے پہلی دوسری اور تیسری جماعت میں زیر تعلیم تقریباً ۲۲ لاکھ طلباء کو مفت اسکول یونیفارم دیئے جائیں گے اور اس یونیفارم کے مستحق وہ طلباء ہوں گے جو سرکاری یا نیم سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے ہوں۔ اس اسکیم کے تحت صرف تیسری جماعت کے تقریباً ۴ لاکھ طلباء کو فائدہ پہنچے گا۔ اس یونیفارم کی نوعیت اس طرح ہو گی۔ نیلے رنگ کا شرٹ، اور ہرے رنگ کی ہاف پینٹ لڑکوں کے لیے اور نیلے رنگ کا بلاؤز اور ہرے رنگ کا اسکرٹ لڑکیوں کے لیے۔ اس قسم کی اسکیم کا مقصد خاص طور سے دیہی طلباء میں تعلیم کے تعلق سے دلچسپی پیدا کرنا ہے کیونکہ عام تاثر یہ ہے کہ دیہی طلبا میں ترک تعلیم کا رجحان بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔

مختلف ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کی خواندگی کا فیصد

ریاست	آبادی (لاکھ میں)	خواندگی فیصد	سرکاری زبان
آندھرا پردیش	۵۳۹٫۹	۳۰٫۰	تلگو
آسام	۱۹۸٫۹	۲۸٫۱	آسامی
بہار	۶۹۸٫۲	۲۶٫۰	ہندی
گجرات	۳۴۰٫۰	۴۳٫۸	گجراتی
ہریانہ	۱۲۹٫۲	۳۵٫۰	ہندی

* ڈپٹی ڈائرکٹر (انچارج)، انڈین کونسل آف سوشل سائنس ریسرچ۔ ریجنل سینٹر، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد۔

ہماچل پردیش	۴۲ر۴	۴۲ر۰	ہندی، پہاڑی
جموں کشمیر	۳۹ر۸	۲۰ر۰	کشمیری
کرناٹک	۳۷۰ر۴	۳۸ر۴	کنڑا
کیرالہ	۲۵۴ر۵	۶۹ر۲	ملیالم
مدھیہ پردیش	۵۲۱ر۴	۲۷ر۸	ہندی
مہاراشٹر	۶۲۷ر۱	۴۸ر۸	مراٹھی
منی پور	۱۴ر۲	۴۲ر۰	منی پوری
میگھالیہ	۱۳ر۳	۳۳ر۰	قبائلی
ناگالینڈ	۰ر۷۷	۴۲ر۰	انگامی
اُڑیسہ	۲۶۳ر۷	۳۴ر۱	اُڑیہ
پنجاب	۱۶۶ر۷	۴ر۷	پنجابی
راجستھان	۳۴۱ر۰	۲۴ر۱	ہندی
سکم	۰ر۳۱	۳۳ر۸	بھوٹیہ
تامل ناڈو	۴۸۳ر۰	۴۵ر۸	تامل
تریپورہ	۲ر۰	۴۱ر۶	تریپوری
اُترپردیش	۱۱۰۸ر۸	۲۷ر۴	ہندی
مغربی بنگال	۵۴۴ر۸	۴ر۹	بنگالی
اروناچل پردیش	۰ر۶۳	۶۴ر۷	قبائلی
گوا	۱۰ر۸	۵۵ر۹	کوکنی مراٹھی
میزورم	۰ر۴۹	۵۹ر۵	میزو
مرکز کے زیرِ انتظام علاقے			
انڈومان نکوبار	ر۱۹	۴۳ر۶	قبائلی
چنڈی گڑھ	ر۱۰	۲۶ر۷	پنجابی، ہندی
دہلی	۶۲ر۰	۶۱ر۱	ہندی
لکش دیپ	۰ر۴۰	۵۴ر۷	ملیالم
پانڈیچری	۰ر۶۰	۵۴ر۲	تامل

آندھرا پردیش میں خواندگی

	۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق	۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق
مرد	۲ر۳۰ فیصد	۰ر۳۹ فیصد
خواتین	۱۲ر۲ "	۲۰ر۲ "
درج فہرست اقوام مرد	۱۶ر۲ "	۲۴ر۸ "
درج فہرست اقوام خواتین	۵ر۳ "	۱۰ر۳ "
درج فہرست قبائل مرد	۸ر۵ "	۱۲ر۰۰ "
درج فہرست قبائلی خواتین	۲ر۱ "	۳ر۵ "

تعلیم کی نئی پالیسی کے تحت بہت سے اضافے کیے اور تعلیم کے نظام میں سہولتیں لانے کے لیے از سر نو کوششیں شروع کی گئی ہیں ہر نئے تعلیمی سال سے ایک نئی کلاس کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ساتویں منصوبے کی تکمیل تک وہ طلبا جو پہلی سے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کریں گے اُن طلبا کو اس اسکیم سے فائدہ پہنچے گا۔ یونیفارم کا پہلا جوڑا ۱۵ر اگست ۱۹۸۷ء یعنی یومِ آزادی کے دن طلباء میں تقسیم کیا گیا اور دوسرا جوڑا ۳۰ر ستمبر ۱۹۸۷ء کو اس اسکیم کی عمل آوری میں تقریباً ۱۸ کروڑ روپیہ (۱۹۸۷ء - ۸۸) کے بجٹ سے سرکاری خزانہ سے خرچ ہوں گے اور اس اسکیم کا فائدہ اُن طلبا تک ہی محدود رہے گا جن کے سرپرستوں کی سالانہ آمدنی ۶ ہزار روپیوں سے کم ہے۔ اور جن کے پاس گرین راشن کارڈ ہے، اور اس اسکیم کی تکمیل کے لیے محکمہ سماجی بھلائی سے لائسنس حاصل کیا جا رہا ہے محکمہ تعلیم کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مستحق طلبا کی شناخت کرے، تاکہ اسکیم کا فائدہ صحیح طور پر عوام تک پہنچ سکے۔

یونیفارم کی سلائی کا کام آندھرا پردیش ٹکسٹائل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے سپرد کیا گیا ہے، جس کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ طلبا کے لیے سلے ہوئے یونیفارم مہیا کرے۔ چنانچہ یہ یونیفارم کی سلائی کا کام محکمہ سماجی بھلائی کے تحت جو سلائی مرکز چلتے ہیں اُن کے ذریعے کیا جا رہا ہے اور اُن مراکز کو بھی سلائی کا کام دیا گیا جو خود کار روزگار کے تحت قائم کیے گئے ہیں۔ اس میں Co-operative Federation کا بھی تعاون حاصل کیا گیا۔ وہ سلائی کے مراکز جنہیں ٹکسٹائل کارپوریشن خود چلاتی ہے اُن کو بھی یہ کام سپرد کیا گیا ہے۔ یہ یونیفارم اضلاع کے مراکز پر سلوائے جا رہے ہیں اور وہیں سے مختلف مدارس

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

یکم تا ۲۹ فروری ۱۹۸۸ء

م.ک. مہتاب

آزادی کے چالیس برس

برگِ گُل

پھول کی مجموعی خوبصورتی کا راز اُس کی ہر پتّی کی خوبصورتی میں مضمر ہے اور کسی قوم کے پھولوں کی یہ پتّیاں اُس کے بچّے ہوتے ہیں جو نرم و نازک ہوتے ہوئے بھی اُس قوم کی بنیاد اور مستقبل کہے جاتے ہیں۔ اس لیے ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند بچّوں کو کسی معاشرے میں انسانی وسیلوں کے فروغ کے لیے بہترین سرمایہ کہا جا سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کوئی ملک جسے مستقبل کی فکر ہے بچّوں کی صحیح نشوونما سے غافل نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا ملک کے منصوبہ سازوں پر یہ فرض لازم ہو جاتا ہے کہ وہ قوم کی اس بنیاد پر خصوصی توجہ دیں جو برگِ گُل پر کھڑی ہوتی ہے۔ اگر بنیاد میں نقص رہ جائے گا تو اُس پر کبھی مضبوط عمارت تعمیر نہیں ہو سکے گی۔

ہندوستان میں آزادی سے قبل بچّوں کی صحیح نشوونما پر بہت کم توجہ دی گئی اُن کی صحت اور تعلیم پر بہت کم توجہ دی گئی۔ بچّوں کی شرحِ اموات خاص طور پر آبادی کے معاشی طور پر کمزور بچّوں میں اتنی زیادہ تھی کہ کسی کسی بچّے کا سنِ بلوغ تک پہنچنا یقینی خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ اموات کو مقدّر کا حصّہ مان لیا جاتا تھا۔ بیمار اور کمزور بچّوں پر ایک مضبوط قوم کی تعمیر کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا آزادی کے فوراً بعد ملک کی ترقی کے پیشِ نظر بچّوں کی منظّم پیمانے پر نشوونما، تعلیم، صحت، غذا اور سماجی تحفظ کے پروگرام مختلف وزارتوں کے تحت شروع کیے گئے چونکہ بچّوں کی بہت بڑی تعداد کا تعلق معاشی طور پر کمزور طبقوں سے تھا اس لیے یہ پروگرام سرکار کی مالی امداد کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ بیشک شرحِ اموات کم ہوئی، شرحِ تعلیم بڑھی لیکن یہ مقرّرہ نشانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ ان پروگراموں کا اثر زیادہ تر شہروں اور قدرے خوشحال طبقوں تک محدود تھا۔ بچّوں کی غالب اکثریت ان پروگراموں سے فیضیاب نہیں ہو سکتی تھی۔

لہٰذا اگست ۱۹۷۴ء میں حکومت نے بچّوں کے بارے میں ایک قومی پالیسی منظور کی جس کے تحت بچّوں کو ایک نہایت اہم قومی سرمایہ قرار دیا گیا۔ پالیسی کے تحت بچّوں کی بہبود اور تحفظ کی ذمّہ داری ریاستی سرکاروں پر عائد کی گئی اُن پر لازم قرار دیا گیا کہ وہ بچّوں اور بالخصوص غریب بچّوں کی فلاح و بہبود کی جانب خصوصی توجہ دیں۔

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک کی کُل ۶۸ کروڑ ۵ لاکھ کی آبادی میں سے ۲۷ کروڑ ۲۰ لاکھ کی آبادی ۱۴ برس تک کے بچّوں کی تھی۔ اِن میں سے ایک تہائی بچّے اقتصادی طور پر کمزور آبادی سے تعلق رکھتے تھے۔ اب ملک کی آبادی قریب دس کروڑ بڑھ گئی ہے لیکن بچّوں کے مقابلتاً تناسب میں زیادہ اضافہ ہوا ہے کیونکہ زچّہ و بچّہ کی دیکھ بھال، بچّوں کو وبائی امراض سے بچانے اور ایامِ طفولیت میں لگنے والے روگوں کی روک تھام کے وسیع پیمانے پر جو اقدامات کیے گئے ہیں اُن سے بچّوں کی شرحِ اموات بہت کم ہو گئی ہے۔

بچّوں کے بارے میں قومی پالیسی کے تحت ایک قومی بورڈ قائم کیا گیا ہے جو مختلف وزارتوں میں بچّوں سے متعلق خدمتوں اور انتظامات میں تال میل پیدا کرتا ہے اور اُن کی کارکردگی کا جائزہ لیتا ہے۔ یہ بورڈ ان خدمتوں کی منصوبہ بندی کے مرکز کے طور پر بھی کام کرتا ہے۔ یہ بورڈ جس کے صدر وزیرِ اعظم ہیں ۱۹۷۴ء میں قائم کیا گیا تھا اور ۱۹۸۶ء میں اس کی پھر سے تشکیل کی گئی۔

سرمائے کے لیے قومی فنڈ

کروڑوں بچّوں کی صحت، تعلیم اور نشوونما کی

۵ اے ہلز، پچھم وہار، نئی دہلی - ۶۳ -

ضروریات پوری کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر سرگرمی کی ضرورت تھی جسے پورا کرنے کے لیے بچوں کے سال ۱۹۷۹ء میں بچوں کا قومی فنڈ قائم کیا گیا۔ اس فنڈ میں دسمبر ۱۹۸۶ء تک ۲۳ کروڑ ۴۳ لاکھ روپیہ جمع ہو چکا تھا۔ یہ فنڈ قومی ریاستی اور اضلاع کی سطح پر رضاکار اداروں کو بچوں کی فلاح کے پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مالی مدد دیتا ہے۔ ۱۹۸۶ء کے آخر تک فنڈ میں سے ان اداروں کو ۱۹ کروڑ روپے کی رقم دی جا چکی تھی۔

بچوں کی مجموعی اور مربوط دیکھ بھال کا منصوبہ

چھ برس سے کم عمر کے بچوں کی دیکھ بھال کا مجموعی اور مربوط منصوبہ مرتب کرنے کی تجویز اس وقت کے وزیر منصوبہ بندی نے ۱۹۷۲ء میں پیش کی جس کے تحت ۱۹۷۵ء سے چھ برس سے کم عمر کے بچوں کے حفظان صحت، حاملہ عورتوں اور بچوں کو دودھ پلانے والی عورتوں کو اضافی غذا دینے، صحت کی جانچ اور امراض سے بچاؤ کے ٹیکے لگانے، تین سے چھ برس کے بچوں کو قبل از اسکول کی تعلیم نیز خواتین کو غذا اور صحت کے بارے میں تعلیم دینے کے لیے ایک اسکیم ۱۹۷۵ء سے معمولی پیمانے پر شروع کی گئی۔ ابتدا میں یہ پروگرام ۳۳ پراجیکٹوں کے ذریعہ شروع کیا گیا لیکن خاص طور پر دیہی علاقوں میں یہ پروگرام اتنا مقبول ہوا کہ ۸۰-۱۹۷۹ء میں پراجیکٹوں کی تعداد بڑھ کر ۱۵۰ ہو گئی۔ چھٹے پانچسالہ منصوبے میں پراجیکٹوں کی تعداد بڑھ کر ۸۶۹ ہو گئی۔ لیکن ۸۶-۱۹۸۵ء اور ۸۷-۱۹۸۶ء میں مزید ۴۶۰ پراجیکٹ منظور کئے گئے جس سے کل پراجیکٹوں کی تعداد ۱۴۷۹ ہو گئی۔ ریاستی سرکاروں نے بھی اپنے طور پر ۱۳۶ پراجیکٹ شروع کر رکھے ہیں۔

اس پروگرام کا مقصد چھ برس تک کی عمر کے بچوں کی غذا اور صحت کا معیار بلند کرنا، اُن کی نفسیاتی، جسمانی اور سماجی ترقی کے لیے معقول بنیاد فراہم کرنا، ایامِ طفولیت میں شرح اموات، بیماری، غذا کی کمی اور اسکول چھوڑ دینے والے بچوں کی شرح کو کم کرنا، بچوں کی ترقی کے لیے مختلف محکموں کی طرف سے کی جانے والی خدمتوں میں موثر تال میل پیدا کرنا اور بچے کی صحت و غذائی ضروریات پوری کرنے کے سلسلے میں ماں کی اہلیت اور صلاحیت میں اضافہ کرنا ہے۔

پروگرام کے تحت یہ خدمتیں ہر گاؤں، قصبوں اور شہروں کی گندی بستیوں میں آنگن واڑیوں کے ذریعے کی جاتی ہیں۔ عام طور پر ایک ہزار کی دیہی آبادی اور گندی بستیوں کی آبادی پر ایک آنگن واڑی قائم کی جاتی ہے۔ قبائلی علاقوں میں سات سو کی آبادی پر ایک آنگن واڑی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کے اداروں اور غیر ممالک کی طرف سے بھی ان آنگن واڑیوں کے لیے امداد موصول ہوتی رہتی ہے۔ دسمبر ۱۹۸۶ء کی رپورٹ سے ظاہر ہے کہ ۱۲۵۶ پراجیکٹوں میں ۳۰،۲۹۰ سماجی کارکن ان آنگن واڑیوں میں کام کر رہے تھے۔ ۱،۲۱،۱۶۲ آنگن واڑیوں میں ۹۳ لاکھ ۱۴ ہزار بچوں، حاملہ عورتوں اور دودھ پلانے والی عورتوں کو اضافی خوراک دی جا رہی ہے۔ اس طرح ۱،۲۵،۳۸۱ آنگن واڑیاں ۴۳ لاکھ ۲۴ ہزار بچوں کو قبل از اسکول جانے کی تعلیم دے رہی تھیں۔

بچوں کی مربوط فلاح کے کام میں کتنا اضافہ ہوا ہے اُس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جہاں ۸۱-۱۹۸۰ء میں اس پروگرام پر ۵ کروڑ ۹۲ لاکھ روپے خرچ کیا گیا وہاں ۱۹۸۷ء میں یہ رقم بڑھا کر ۷۰ کروڑ روپے کر دی گئی ہے۔ اس پروگرام میں مقامی آبادی کے سرگرم تعاون پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ طبیہ کالج اور طبی تحقیق کے ادارے بھی اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے میں مدد دیتے ہیں۔

اسکول جانے سے کم عمر بچوں کی فلاح کے لیے ۷۱-۱۹۷۰ء سے ایک بال سیوکا پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ ان میں عورتوں کو بچوں کی ضروریات کے بارے میں تربیت دی جاتی ہے۔ وہ بچوں کو ضروری خدمات مہیا کر کے مربوط ترقی کے پروگرام میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔

بچوں کی دیکھ بھال کی خدمتوں میں مصروف رضاکار اداروں کی عزت افزائی کے لیے ۱۹۷۹ء سے قومی اعزازات کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ ان اعزازات کے تحت بہترین ادارے کو دو لاکھ روپیہ اور توصیفی سند اور تین بہترین کارکنوں کو تیس تیس ہزار روپے کے انعامات اور سند دی جاتی ہے۔

اقوام متحدہ کا بچوں کا فنڈ

ہندوستان آزادی کے فوراً بعد یعنی ۱۹۴۹ء سے اقوام متحدہ کے بچوں کے ہنگامی فنڈ سے وابستہ ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء سے ہندوستان بچوں کی فلاح کے لیے کام کرنے والے اس ادارے کے سرمائے میں ہر سال دو کروڑ ۸۰ لاکھ روپیہ دے رہا ہے۔ اقوام متحدہ کا یہ ادارہ ہندوستان میں بچوں کی بہبود کے مختلف پروگراموں کے لیے ۸۹-۱۹۸۵ء کے پانچ برسوں کے لیے ۲۲ کروڑ ۷۰ لاکھ ڈالر کی مدد دے گا۔

سارک تنظیم کے تحت بھی جنوبی ایشیا کے بچوں کی فلاح کے پروگرام مرتب کئے جا رہے ہیں۔

چھ برس سے کم عمر بچوں کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے ۷۱-۱۹۷۰ء سے ایک خصوصی غذائی پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ اس کے تحت حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کو بھی غذا مہیا کی جاتی ہے۔ پہلے برس اس پروگرام سے ۶ لاکھ بچوں اور عورتوں کو فائدہ پہنچا لیکن ۱۹۷۴ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۳۸ لاکھ اور ستمبر ۱۹۸۶ء میں ایک کروڑ ۱۵ لاکھ ہو گئی۔ بال واڑیوں میں غذا مہیا کرنے کا ایک پروگرام بھی ۷۱-۱۹۷۰ء سے شروع کیا گیا ہے جس کے تحت ۸۷-۱۹۸۶ء میں دو لاکھ ۲۹ ہزار بچوں کو اضافی خوراک مہیا کی جا رہی تھی۔

اس طرح طبی خدمتوں کے تحت سب بچوں کو ابتدائی ٹیکے لگانے کا لازمی پروگرام شروع کیا گیا جس سے شرح اموات میں نمایاں کمی ہوئی ہے۔ بیس نکاتی پروگرام کے تحت دو بچوں کے کنبے کے نظریہ کو مقبول کیا گیا ہے۔ جس سے بچوں کی صحت اور طوالت عمر میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ والدین بچوں کو بہتر تعلیم اور خوراک مہیا کر سکتے ہیں اور آج پھولوں کی یہ نازک پتیاں آزادی سے قبل کے دور کی وہ پتیاں نہیں رہیں جو پھوٹنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی تھیں یا داغدار ہو کر پورے پھول کی خوبصورتی کو داغدار کر دیتی تھیں۔ آج ملک اُن کے مستقبل پر بھروسہ کر سکتا ہے اور قوم اُن سے امیدیں وابستہ کر سکتی ہے۔

قوانین کے فلاح

اگر بچے قوم کی بنیاد ہیں تو قوانین وہ سانچہ ہیں جس میں یہ بنیاد ڈھلتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں آج بھی دیوریا کے ستی جیسے واقعات ہوتے ہیں جو اس بات کی یاد دلاتے ہیں کہ اس معاشرے میں مرد کو ہمیشہ بالادستی حاصل رہی ہے اور وہ عورت کو ہمیشہ کسی نہ کسی لحاظ سے اپنے تسلط میں رکھنے کی سوچتا آیا ہے۔ ہمارے قدیم ادب میں عورت کو مرد کے مساوی درجہ دیا گیا لیکن حقیقی زندگی میں ملک کے بیشتر حصوں میں ؂

ڈھور گنوار شودر اور ناری

چاروں تاڑن کے ادھکاری

یعنی چاروں کے ہانکنے کے قابل کہا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب مہاتما گاندھی نے تحریکِ آزادی کے ساتھ ساتھ سماجی اصلاحات کا علم بلند کیا تو انھوں نے کہا۔

" عورت مرد کی قابلِ اعتماد ساتھی ہے قدرت نے اُسے مرد جیسی ہی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ اُسے مرد کی ہر سرگرمی میں حصّہ لینے کا حق حاصل ہے۔ اُسے اپنے دائرہ کار میں ویسا ہی بلند مقام حاصل ہے جیسے کہ مرد کو اپنے دائرہ کار میں دونوں ایک دوسرے کے معاون اور ساتھی ہیں۔ لہٰذا کوئی بھی عمل جو ایک کے لیے مضر ہے دوسرے کے لیے بھی نقصان دہ ہوگا "۔ اسی لیے مہاتما گاندھی نے خواتین کی بیداری کو اپنا نصب العین بنایا اور آزادی کی تحریک میں خواتین کو مردوں کے شانہ بشانہ لے کر آگے بڑھے۔

جب آزادی کے بعد جواہر لال نہرو کی زیر قیادت آزاد ملک کی حکومت قائم ہوئی تو وزیر اعظم نے خواتین کا مقام اور مرتبہ بلند کرنے کی اولین ترجیحات میں شامل کیا۔ اُن کی قیادت میں قومی منصوبہ بندی کی کمیٹی نے خواتین کے بارے میں اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ہم عورت کو مرد کا گھٹیا نعم البدل، ماں بننے کا ذریعہ اور قومی تعمیر کے عمل کے لیے بے کار چیز نہیں بنانا چاہتے بلکہ اُس کے لیے برابر کے مواقع کا مطالبہ کرتے ہوئے تعلیم و روزگار کے موافق ماحول کے تحت اُس کی ترقی کا اہتمام کرنا چاہتے ہیں۔ ہم عورت کی جس تصویر کے بارے میں سوچ رہے ہیں کہ عورت بچہ اُٹھائے مرد کے پیچھے پیچھے نہیں چل رہی بلکہ وہ مرد کے شانہ بشانہ آگے بڑھ رہی ہے۔

رپورٹ کے اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ منصوبہ بندی میں خواتین کی اہمیت کو شروع سے ہی تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ہندوستان کے آئین میں مردوں اور عورتوں کو ایک جیسے حقوق اور مراعات دی گئی ہیں اور سماج میں خواتین کا مرتبہ بلند کرنے کے لیے خصوصی اہتمام کیا گیا۔ عورتوں کی ترقی کی راہ میں حائل دشواریوں کو دُور کرنے کے لیے کئی قوانین بنائے گئے۔

ان سب قوانین کے باوجود عورتیں بہت سے شعبوں بالخصوص تعلیم کے میدان میں مردوں سے بہت پیچھے ہیں۔ خواتین کی ۷۰ فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ اُن میں تعلیم کی شرح ۱۸ فیصد ہے۔ جب کہ شہروں میں خواتین کی تعلیم کا تناسب ۴۸ فیصد ہے۔

خواتین کی صحت ایک اور اہم مسئلہ ہے جس پر مناسب توجہ نہیں دی جا سکی۔ اُن کی غذائیت کا معیار مردوں کے مقابلے میں کم ہے۔ زچگی کے دوران اموات کا تناسب اب بھی بہت اونچا ہے۔ دیہات کی ساٹھ سے اسّی فیصد عورتوں میں خون کی کمی ہے جس سے اُن کے بچے کمزور پیدا ہوتے ہیں۔ جہاں تک روزگار کا سوال ہے صرف ۱۴ فیصد عورتیں کارکن ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر زراعتی اور مویشی پالن کے کاموں سے وابستہ ہیں۔ زیادہ تر عورتیں خانہ داری کا کام کرتی ہیں۔ بہت سی عورتیں باغیچوں میں بھی کام کرتی ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ دیہات کی ۴۵ فیصد اور شہروں کی ۲۶ فیصد عورتیں چھوٹے موٹے کام کر کے کنبوں کی آمدنی میں اضافہ کرتی ہیں۔ عورتوں کی بہبود کے بارے میں جو نئے پروگرام بنائے گئے ہیں اُن کے بارے میں بھی عام لوگوں میں بیداری نہیں ہے۔

ان تمام رکاوٹوں کو دُور کرنے کے لیے گذشتہ ۳۵ برسوں میں کروڑوں روپے کے مصارف سے نئے پروگرام اور اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔

چھٹے منصوبے میں عورتوں کے لیے روزگار مہیا کرنے کے لیے ایک خصوصی شعبہ قائم کیا گیا ہے جو اُن کے ملازمت اور روزگار کے حقوق کی نگہداشت کرتا ہے۔ روزگار اور تربیت کے ڈائریکٹوریٹ جنرل نے بنگلور، بمبئی اور ترویندرم میں پیشہ ورانہ تربیت کے علاقائی اور دہلی میں ایک قومی انسٹی ٹیوٹ قائم کیا ہے۔ جہاں ہر برس چھ سو خواتین کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں صرف خواتین کی پیشہ ورانہ تربیت کے لیے ۱۴۴ صنعتی تربیت کے مراکز قائم کئے گئے ہیں، جن میں ہر سال قریب ۱۲ ہزار خواتین کو تربیت

دی جاتی ہے۔

دیہات کی ترقی کے شعبے میں مربوط دیہی ترقی کے پروگرام کے تحت ہر کنبے کی سربراہ خاتون کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں دیہات کی عورتوں کی فلاح کا ایک خصوصی پروگرام شروع کیا گیا۔ اس پروگرام کے تحت ایسی عورتوں کو جو روزگار کی بڑی اسکیموں کا فائدہ نہیں اٹھا سکتیں، دس دس بارہ بارہ کی ٹولیاں بنائی گئیں جنہیں سلائی، بنائی ٹوکریاں بنانے، اچار مربّے، پاپڑ وغیرہ تیار کرنے کی تربیت دے کر کام دلایا گیا۔ اس قسم کے ایک ہزار ۹ سو گروپ ملک بھر میں بنائے گئے۔ دو برس میں ان گروپوں کی ۳۰ ہزار خواتین کو کام دلایا گیا۔

خواتین کا سماجی مرتبہ بلند کرنے کے لیے انھیں جدّی جائداد میں حصہ دلانے اور انتقال جائداد، مکانات اور قطعات زمین کی ملکیت میں مساوی حقوق دلانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم میں لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے غیر رسمی تعلیم کے مراکز کھولنے کی غرض سے مالی مدد دینے کی ایک اسکیم شروع کی گئی ہے۔ تعلیم بالغان کی اسکیم کے تحت عورتوں کے لیے خاص پروگرام شروع کیے گئے ہیں جہاں عورتوں کو غذائیت، صحت، بچوں کی دیکھ بھال اور خاندانی بہبود کی تعلیم دی جاتی ہے۔ دسمبر ۱۹۸۵ء میں ۲۹ لاکھ عورتیں اس اسکیم کے تحت تعلیم پا رہی تھیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے پروگرام کے تحت خواتین کو دھواں نہ دینے والے چولھے، سورج کی گرمی سے چلنے والے کوکر، گوبر گیس پلانٹ اور پانی صاف کرنے کے آلات مہیا کیے جا رہے ہیں۔ خواتین کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنے میں سہولت کے لیے اُن کے واسطے حدِ عمر میں دس برس تک کی چھوٹ دی گئی ہے۔

انھیں صحت کی نگہداشت کے لیے جو سہولیات دی گئی ہیں اُن کی بدولت شیر خوار بچیوں کی شرح اموات جو ۱۹۴۲ء میں ایک ہزار پر ۱۴۸ تھی گھٹ کر ۱۹۸۰ء میں ۱۱۲ رہ گئی۔ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جگہ جگہ ہوسٹل تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان سہولیات کا نتیجہ یہ ہے کہ پینتیس برس بعد منظر بالکل بدلتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ تعلیم ہو یا تربیت، روزگار ہو یا ملازمت عورتیں ہر جگہ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہی ہیں اور آگے بڑھتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔

ساتویں پنجسالہ منصوبے کا نصب العین بھی مرد اور عورت کے سماجی فرق کو کم کرنا اور اُنھیں معاشی عمل میں برابر کا شریک بنانا ہے۔ ۱۴ برس تک کی لڑکیوں کے لیے مفت تعلیمی سہولیات مہیا کر دی گئی ہیں۔ انھیں فنّی و ٹیکنیکی تعلیم دینے کے لیے خاص پولی ٹیکنیک اسکول کھولے جا رہے ہیں۔ پسماندہ جماعتوں اور درج فہرست ذاتوں کی لڑکیوں کو تعلیم کی خصوصی سہولیات مہیا کی جا رہی ہیں۔

مُلک کی مختلف وزارتیں اور محکمے خواتین کی ترقی کے لیے جن اسکیموں پر عمل کر رہے ہیں اُن میں تال میل کے لیے ایک مرکزی بیورو قائم کیا گیا ہے۔

۱۹۷۲ء سے کارکن عورتوں کی رہائش کے لیے ہوسٹل اور کام کے دوران اُن کے بچوں کی دیکھ بھال کے مراکز قائم کرنے کی ایک اسکیم زیر عمل ہے۔ ساتویں منصوبے کے دوران ایسے مزید تین سو ہوسٹل تعمیر کیے جا رہے ہیں جن پر ۴ کروڑ روپیہ صرف ہوگا۔ گذشتہ دس برس میں ۱۲۶ ایسے آشرم تعمیر کیے گئے ہیں جہاں سماجی اور گھریلو پریشانیوں کا شکار خواتین کو ٹھہرنے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی سہولت دی جاتی ہے۔

تمام ریاستوں میں خواتین کی ترقی کے کام کی دیکھ بھال کے لیے ریاستی کارپوریشنیں قائم کی گئی ہیں جنھیں مرکز سے مالی و ہدایتی امداد حاصل ہوتی ہے۔

سماجی تحفظ کے قوانین کے تحت لڑکیوں کی شادی کی کم از کم عمر بڑھا کر ۱۸ برس کر دی گئی ہے۔ جہیز لینا دینا جرم قرار دیا گیا ہے۔ خواتین کی تجارت کو روکنے کے قانون مجریہ ۱۹۸۴ء کو مزید سخت کر دیا گیا ہے۔ اشتہار بازی میں خواتین کے غیر اخلاقی مظاہرے پر بھی پابندی لگا دی گئی ہے۔

حکومت کی ان تمام کوششوں کے حقیقی اثرات اُسی وقت ظاہر ہوں گے جب مرد یہ سمجھے گا کہ وہ خدا کی کوئی مختلف مخلوق نہیں ہے۔ عورت کو بھی زندہ رہنے اور خدا کی نعمتوں سے فیضیاب ہونے کا اتنا ہی حق ہے جتنا مرد کو ہے۔

●

بقیہ قارئین کی آرا اور مشورے

میں شکر گذار ہوں کہ آپ نے میرے مضمون کو لائق توجہ سمجھا۔ البتہ جن دو تاریخوں سے آپ نے اختلاف کیا یعنی یکم اگست ۱۹۲۰ء اور دوسری ۱۶ اگست ۱۹۳۲ء (صفحہ ۴، کالم اول) سے میری گذارش ہے کہ میری تاریخیں اس لیے صحیح معلوم ہوتی ہیں کیوں کہ سرکاری سطح پر شائع شدہ کتاب (انگریزی) بلڈرز آف ماڈرن انڈیا۔ ایس ایس ستیہ مورتی مصنف آر پارتھا سارتھی نے بھی یہی تاریخیں دی ہیں۔ چوں کہ یہ کتاب ایک ذمہ دار شخصیت کی تحریر کردہ ہے جو اُن سے براہِ راست متعلق رہا ہے۔ اس لیے اس کی صحت پر شبہ کرنے کی گنجائش کم ہے۔ ۳۰ اگست کے ساتھ سن اگرچہ درج نہیں ہے تاہم یہ واقعہ ۳۰ اگست ۱۹۲۳ء سے تعلق رکھتا ہے۔ مقدمے کی پیروی کے لیے گاندھی جی جنوبی افریقہ میں ۱۸۹۳ء میں پہنچ گئے تھے۔

جگدیش لال: ۵۵۱۷، شورا کوٹھی پہاڑ گنج، نئی دہلی ۵۵۔

●

جگدیش لال

ذیابیطس کے مرض سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں

اگر پیشاب بار بار آئے، نیند پوری نہ ہو، پیاس زیادہ لگے، بھوک یکایک کم ہونے لگے، وزن میں کمی آنے لگے اور تھوڑی سی مشقت سے بھی تھکاوٹ محسوس ہو تو یہ مرض ذیابیطس ہو سکتا ہے جس کی جانچ کرانا ضروری ہے۔ ذیابیطس جس میں پیشاب میں شکر آنے لگتی ہے، ایک ایسا روگ ہے جو گھن کی طرح انسان کو کھاتا ہے اور اندر ہی اندر اُسے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اس کی ایک اور نمایاں علامت یہ ہے کہ جو شخص ذیابیطس کا مریض ہوتا ہے اگر اُس کے جسم پر کوئی زخم ہو جائے تو اُسے مندمل ہونے میں بہت زیادہ وقت لگتا ہے۔ بلکہ مرض کے شدید ہونے کی صورت میں وہ مندمل ہی نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں رات کو پاؤں اور پنڈلیوں میں اینٹھن ہونے لگتی ہے چونکہ ذیابیطس کے مریض کو کوئی درد یا تکلیف نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی قسم کا بخار چڑھتا ہے اس لیے کافی عرصے تک اس مرض کی موجودگی کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ دراصل آجکل ہم نے جو جدید طرزِ زندگی اختیار کیا ہے اُس کے نتیجے میں جو امراض لاحق ہوتے ہیں اُن میں ایک سنگین مرض ذیابیطس بھی ہے۔

یہ مرض عموماً اُن اشخاص کو ہوتا ہے جو زیادہ آرام طلب رندگی بسر کرتے ہیں۔ جسمانی مشقت نہیں کرتے۔ دفتروں میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں ضرورت سے زیادہ سوتے ہیں۔ دودھ، دہی اور اُس سے سنی اشیار اور گوشت وغیرہ کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ چینی اور مٹھائی زیادہ کھاتے ہیں۔ یہ مرض خاندانی بھی ہو سکتا ہے جو والدین ذیابیطس کے مریض ہوتے ہیں اُن کے بچوں میں بھی اس مرض کا امکان ہو سکتا ہے۔

مرض کی وُسعت

یہ مرض اپنے ملک میں کس قدر پھیلا ہوا ہے اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ حال ہی میں ملک میں جو سروے کیے گئے ہیں اُن کے مطابق شہری علاقوں میں تین سے چھ فیصد لوگ اس مرض کے شکار ہیں۔ بمبئی میں ۵۰ ہزار افراد کے خون کے معائنے سے معلوم ہوا کہ اُن میں ۱۵۰۵ لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں۔ چنڈی گڑھ میں ۳۸۴۶ افراد کے معائنے سے پتہ چلا کہ کوئی ۳ فیصد لوگ اس کی زد میں آ چکے ہیں جب کہ کٹک میں ۶ اشخاص میں سے ۴ء۴ فیصد لوگ اس مرض میں مبتلا پائے گئے۔ ڈایابیٹک ایسوسی ایشن آف انڈیا کے ایک سروے کے مطابق دفتروں میں کام کرنے والے لوگوں میں عموماً ۷ فیصد اس مرض کا شکار ہیں اور اُن میں سے بیشتر کو اپنی بیماری کا علم ہی نہیں۔

اگر نہار مُنہ خون کا معائنہ کرانے سے خون میں ۸۰ سے ۱۰۰ ملی گرام تک اور کھانا کھانے کے دو گھنٹے کے بعد معائنہ کرانے سے ۱۲۰ سے ۱۵۰ ملی گرام تک شکر پائی جائے تو یہ نارمل ہے۔ اگر یہ اس حد سے تجاوز کر جائے تو یہ یقیناً مرض ذیابیطس ہے۔ جب خون میں شکر (کھانا کھانے کے بعد) ۱۸۰ سے بڑھ جائے تو شکر پیشاب میں آنے لگتی ہے۔ لہذا پیشاب کا معائنہ کرانا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ گھر پر پیشاب کے معائنے کے لیے کیمسٹوں (دوا فروشوں) سے "کلینی سٹکس (CLINISTIX)" کی کاغذی پٹیاں لی جا سکتی ہیں۔ ان پٹیوں پر ایک کیمیاوی مادے کا لیپ ہوتا ہے انھیں پیشاب میں ڈبویا جاتا ہے اگر اس میں شکر ہو تو اس پٹی کا رنگ بدل کر نیلا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ گلوکوز آکسی ڈیس (GLUCOSE OXIDASE) کی گولیاں بھی معائنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں

جہاں تک اس کے علاج کا تعلق ہے یہ اب زیادہ خوفناک مرض نہیں رہا بشرطیکہ ضروری احتیاط سے کام لیا جائے۔ اگر مریض مناسب دیکھ بھال کرے تو وہ طویل عمر پا سکتا ہے۔ لیکن لاپروائی کرنے سے متعدد امراض پیدا ہو سکتے ہیں جو موت کا باعث بن سکتے ہیں۔ جیسے گُردوں کی خرابی، عارضہ دل، اعصاب اور پھیپھڑوں کا ناکارہ ہو جانا۔ اگر مرض شدید صورت اختیار کر لے اور ٹانگ پر کوئی زخم ہو جائے تو وہ مندمل نہیں ہوتا بلکہ اس سے چھوت کا خطرہ بڑھتا ہے اور بعض حالات میں ٹانگ بھی کٹوانا پڑتی ہے۔

غذا پر کنٹرول

ذیابیطس کے مریض کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ خود اپنی دیکھ بھال کرے اور اپنی غذا پر سختی سے کنٹرول کرے۔ بیشتر مریضوں کا یہ غلط خیال ہے کہ اس کا مقصد "خراب" غذاؤں سے احتراز ہے۔ دراصل خوراک میں کُل حراروں (کیلوریز) کی موجودگی، پروٹین، چکنائی اور نشاستے (کاربو ہائیڈریٹ) کے صحیح تناسب سے زیادہ اہم ہے۔ ذیابیطس کے مریض کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اُس کا وزن جسم کے مثالی وزن سے ۵ فیصد کم رہے۔

جہاں تک موٹاپے کے باعث ہونے والے ذیابیطس کا تعلق ہے اُس کی غذا میں اس قدر حرارے ہونے چاہئیں جن سے اُس کا وزن جسم کے مثالی وزن سے ۵ فیصد کم ہو جائے اور وہ اس سطح پر برقرار رہے۔

نارمل ذیابیطس والے مریض کو اس قدر حرارے ملنے چاہئیں جس سے اُس کا وزن برقرار رہے۔

کم وزن والے مریض کی غذا میں حرارے بڑھائے جانے چاہئیں جس سے اُس کا وزن بڑھے لیکن وہ مثالی جسمانی وزن سے ۵ فیصد کم ہی رہے۔ ذیابیطس کے مریض کو اپنی غذا میں ۵۰ فیصد حرارے (کاربوہائیڈریٹ)، ۳۰ فیصد چکنائی اور ۲۰ فیصد پروٹین سے حاصل کرنے چاہئیں۔ غذائی پلاننگ کو اس ڈھنگ سے ترتیب دیا جائے کہ مریض کو احساس نہ ہو کہ اُسے کوئی سزا دی جا رہی ہے۔ اُسے اپنی غذا میں پھل، سلاد اور سوپ وغیرہ شامل کر کے اُسے خوشگوار اور خوش ذائقہ بنانا چاہیئے۔ آج کل بہت سی مصنوعی شیرینی حور و نوش استعمال (؟) دستیاب ہیں۔ اُن کا بھی استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن زیادہ فراخدلی کے ساتھ نہیں کیونکہ وہ کینسر کا باعث بن سکتی ہیں۔ ذیابیطس کا مریض حسبِ ذیل سبزیاں اور پھل فراخدلی سے استعمال کر سکتا ہے۔

ہرے پتّے والی سبزیاں، ٹماٹر، مولی، کھیرا، گھیا، بینگن، گوبھی کا پھول، کریلے، میتھی، پرول، گوار کی پھلی، سبزیوں کا سوپ، دہی، دودھ، پنیر، تیل سے مبرّا اچار، سنگترے، موسمی، امرود، جامن، خربوزہ، تربوز، ناشپاتی، آڑو اور لیموں وغیرہ۔

اُس کے لیے حسبِ ذیل اشیا ممنوع ہیں:۔

چینی، گُڑ، مربّے، مٹھائیاں، شہد، زیادہ چکنائی دار اور تلی ہوئی اشیاء، پیسٹری، آئس کریم، بادام، اخروٹ وغیرہ۔ ملک شیک، شراب، سوڈا واٹر، آلو، شکر قندی اور چاول وغیرہ۔

مریضوں کو گھی کے بجائے ریفائنڈ تیل کا استعمال کرنا چاہیئے۔ انھیں لمبے عرصے تک بھوکا بھی نہیں رہنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں انھیں رات کے وقت گرم دودھ میں کوئی ایسی شے ملانی چاہیئے جس سے وہ پروٹین حاصل کر سکیں۔ اس سے انھیں توانائی حاصل ہوگی۔ اگر ذیابیطس خاندانی ہو تو ماؤں کو گھر میں چینی کا استعمال کم از کم کر دینا چاہیئے۔ غذائی پابندیاں عمر بھر جاری رکھنی ہوں گی اس مرض کا کوئی ایسا علاج نہیں ہے جو اسے جڑ سے اُکھاڑ دے مریض کو ساری عمر اس کے ساتھ کاٹنی ہوتی ہے۔

نئی تحقیق

حال ہی میں نیوزی لینڈ کے ڈاکٹر بیونڈ نے انتباہ کیا ہے کہ جو بچّے ذیابیطس کے مریض ہیں اُنھیں دن میں ایک بار بھی بھوکا نہیں رہنا چاہیئے اور کسی حالت میں ایک بار کا کھانا بھی ترک نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے اُن کے خون میں شکر کی سطح بہت کم ہو جاتی ہے جو ان بچّوں کی حالت میں اُن کے دماغ کے لیے خطرناک ہے۔

انھوں نے بتایا کہ اس کے برعکس جوں میں شکر کی سطح چھوت، خون اور تناؤ سے بڑھتی ہے۔

ڈاکٹر موصوف نئی دلی کے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں ذیابیطس کے مریض بچّوں اور ماہرین کی میٹنگ سے خطاب کر رہے تھے جس کا اہتمام اقوامِ متحدہ کے بہبودیِ اطفال فنڈ کی طرف سے کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر بیون نے بچّوں کو مشورہ دیا کہ اگر وہ بہت زیادہ کمزوری کا احساس کریں اور انھیں چکر آنے لگیں یا اُن کا سانس پھولنے لگے تو وہ فوراً ہسپتال کے ایمرجنسی روم میں پہنچیں۔

ایک بچّے کے سوال کے جواب میں ڈاکٹر موصوف نے بتایا کہ ذیابیطس کے مریضوں کو آیوڈین آمیز نمک کا استعمال کرنا چاہیئے ورنہ اُن کا تھائی رائیڈ غدود ناقص ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک دوسرے لڑکے کے سوال کے جواب میں کہ کیا اُسے سویابین کی چپاتیاں کھاتے رہنا چاہیئے؟ انھوں نے بتایا کہ "اگر تم مضبوط اور طاقتور بننا چاہتے ہو تو تمھیں پروٹین سے بھرپور غذا کا استعمال جاری رکھنا چاہیئے۔

ایک اور سوال کے جواب میں کہ کیا ایکوپنکچر (جسم کو چھید کر علاج کرنا) سے کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ موصوف نے بتایا کہ "معمّر لوگوں کے مرض دُور کرنے کے لیے میں ایکوپنکچر کیا جا سکتا ہے جس سے اُن کے شست

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

Sayed Hasmi

بشیر بدر



ذکی طارق



ڈاکٹر بشیر بدر سے ایک انٹرویو

جدید اُردو غزل کے نمائندہ شاعر ڈاکٹر بشیر بدر کو ساہتیہ اکیڈمی دلّی کا پانچ سال کے لیے ممبر نامزد کیا گیا ہے۔ اس موقع پر مشہور سماجی کارکن اور اتر پردیش اردو اکیڈمی کے رکن جناب ذکی طارق نے اُن سے ایک انٹرویو لیا، جو قارئین کی دلچسپی کے لیے پیشِ خدمت ہے۔

س : ڈاکٹر صاحب آجکل پورے ملک میں خاص کر اُردو بولنے اور لکھنے والوں کی طرف سے جن میں ہمارے اُردو رسائل اور اخبارات بھی شامل ہیں، یہ نعرہ دیا جا رہا ہے کہ اُردو زبان ختم ہو رہی ہے۔ اب اُس کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ مگر دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ آپ اور اُردو کے دوسرے بہت سے شعراء امریکہ۔ ٹورنٹو۔ پاکستان اور مڈل ایسٹ۔ لندن جیسے مقامات میں مشاعروں میں حصّہ لے رہے ہیں۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں اُردو سمجھنے والے تو کجا اُردو بولنے والے بھی ایک زمانے میں نہیں تھے۔ دوسرے آپ کی شاعری پر "شاعر" جیسے ادبی ماہنامے نے ایک خصوصی گوشہ نکالا "لمحے لمحے" نے بھی آپ کی شاعری پر ایک شمارہ وقف کیا اور اب پتہ چلا ہے کہ "فکر و آگہی" تو ایک ضخیم نمبر آپ کے فن اور شخصیت پر آجکل ترتیب دے رہا ہے۔ آپ کی شاعری کے کیسٹ مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔ "سوسائٹی" جیسے انگریزی زبان کے پرچے نے حال ہی میں آپ کا انٹرویو شائع کیا ہے اس کے ذریعہ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ایچ۔ ایم۔ وی کمپنی نے آپ کو دس ہزار روپیہ ایڈوانس بھی آپ کے فسادیں جلے مکاں کی مرمت کے لیے دئے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر تو لگتا ہے کہ آپ ایک فلم اسٹار کی زندگی جی رہے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ یا اُردو کے اخبار و رسائل اور دوسرے ادیب، اُردو زبان ختم ہو رہی ہے یا اُردو کا رسم الخط بدل دینا چاہیئے، کس برتے پر کہہ رہے ہیں اور اگر یہ سب غلط ہے تو لگتا ہے کہ آپ کا P.R.O یقیناً ذہین اور دنیادار ہے؟

ج : قبل اس کے کہ میں یہ بتاؤں کہ میرا P.R.O کون ہے یہ عرض کر دوں کہ انگریزی اور فرانسیسی زبان کے علاوہ ہندوستان کی تقریباً تمام علاقائی زبانوں میں مجھ ناچیز کی غزلوں کے ترجمے ہو چکے ہیں اور اُن پر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر رضیہ حامد جو فکر و آگہی کا بشیر بدر نمبر نکال رہی ہیں وہ ابھی زیرِ طباعت ہے۔ طارق صاحب میرا P.R.O میرا "آنسو" ہے جو خدا کے حضور میں سال دو سال میں کبھی چھلکتا ہے۔ میری زندگی میں کامیابیوں اور ناکامیوں کی ہزاروں راتیں ہیں لیکن مجھے وہ چند راتیں ہمیشہ یاد رہتی ہیں جب میری کامیابی کسی داستان کی طرح ناقابلِ یقین تھی یا کوئی غیر متوقع ناکامی دل ہلا دینے والی تھی۔ دونوں حالتوں میں اپنی پہلی فرصت میں تنہائی میں سجدے میں گر کر بھیگی آنکھوں سے میں نے اُس کا شکر ادا کیا ہے۔ واقعی آپ یقین کریں یا نہ کریں میں نے کبھی نہ تو رسم الخط بدلنے کے لیے کہا اور نہ ہی اُردو کے مستقبل کی نشاندہی کی۔ اُردو ایک زندہ زبان ہے۔ اس کا مستقبل بھی تابناک ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کے قارئین اور سامعین کا مرکز بدلتا جا رہا ہے آپ یہ بھی یقین کریں کہ نہ تو اردو کے نقادوں سے میرا یارانہ ہے اور نہ مدیروں سے رشتہ داری ہے۔ میں تو کام کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ شاید یہ دو تین شعر میری ترجمانی کر سکیں ؎

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

٭

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

میں نے سمجھا یا کہ سورج بھی چھپے گا در پہ
ورنہ کانٹوں کی طرف منہ کیے دروازے تھے

٭

س : یہ بات تو ٹھیک ہے کہ خدا سب سے بڑا وسیلہ ہے اور وہی سب کچھ عطا کرتا ہے مگر اُس کی عطا کے بھی تو سلسلے ہیں آپ کن وسیلوں سے یہاں تک پہونچے ہیں۔

ج : میں نے اُردو ادب اور خاص طور پر شاعری ۱۹۵۰ء سے پہلے سے پڑھنا شروع کی اور خاص کر غزل میں یہ جاننے کی کوشش کی کہ کیا ہوگیا ہے اور کیا باقی ہے یہی وجہ ہے کہ دس بارہ برس کے بعد جب میں نے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں ایم۔ اے۔ اُردو میں داخلہ لیا تو نہ صرف یہ کہ میری فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن تھی بلکہ تمام مضامین کے ٹاپرس میں بھی میں ہی ٹاپر تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ تادمِ تحریر ایم۔ اے میں سب سے زیادہ نمبر لانے کا میرا ریکارڈ ہے۔ اس سلسلے میں مجھے بہت سے وظیفوں اور اسکالرشپس کے علاوہ ڈاکٹر ذاکر حسین گولڈ میڈل اور ٹاپرس پرائز بھی دیا گیا تھا۔ دوسری طرف ۵۶-۱۹۵۵ء سے میں نے اُردو کے اُن اعلیٰ ترین جرائد مثلاً "سویرا" لاہور، "نگار" لکھنؤ، "نقوش" لاہور اور "نیا دور" کراچی میں اس انداز سے لکھنا شروع کر دیا تھا کہ اُن کے اکثر شماروں میں میرا تفصیلی مطالعہ شائع ہوتا تھا یعنی میری آٹھ دس غزلیں بیک وقت شائع ہوتی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جلد ہی اُردو غزل کے نقادوں نے مجھے محسوس کرنا شروع کر دیا اور اپنے مضامین میں میرا ذکر ضروری سمجھا جانے لگا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اُردو دنیا کے سب سے خوبصورت رسالے "رابطہ" میں حال ہی میں میری پچیس غزلیں اور منتخب اشعار شائع ہوئے ہیں اور رسالے "فاصلہ" نے بھی اتنا ہی طویل مطالعہ شائع کیا ہے۔ طارق صاحب دوسری بات یہ ہے کہ تقریباً ۱۹۷۰ء تک (ایک سال اِدھر یا اُدھر) میں کسی چھوٹے بڑے مشاعروں میں نہیں گیا اس لیے عام طور پر میرا پڑوسی بھی نہیں جانتا تھا کہ میں شاعر ہوں میں صرف اعلیٰ ترین جرائد میں لکھتا تھا اور وہ رسائل ہندوستان میں نایاب تھے۔

س : یہ تو آپ نے بڑی حیرت کی بات بتائی جہاں تک مجھے یاد ہے ۱۹۷۲ء میں میں نے پہلی مرتبہ آپ کو ڈی۔ سی۔ ایم اور لال قلعہ کے مشاعروں میں سنا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ دونوں مشاعرے آپ نے لوٹے تھے۔ میں آپ کی بات کی تردید نہیں کر رہا ہوں بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جس اعتماد اور یقین کے ساتھ آپ نے ان مشاعروں میں پڑھا تھا وہ اتنے کم عرصے میں کیسے آگیا جبکہ ہم دوسرے شعراء کو دیکھتے ہیں کہ آج بیس پچیس برس گزر جانے کے بعد بھی اعتماد ہونا تو بڑی بات ہے مشاعرے کے آداب سے بھی ناواقف ہیں۔

ج : طارق صاحب پہلی بات تو یہ ہے کہ مشاعرے کا اسٹیج ڈرامے کا اسٹیج نہیں ہے گائکی کا اسٹیج نہیں ہے بلکہ یہ شاعری کا اسٹیج ہے۔ میں مانتا ہوں کہ یہ شاعری کا اسٹیج ہے لیکن یہاں ۹۵ فیصدی شاعری اور ۵ فی صد اسٹیج کے مطالبات اگر اکائی بن جائیں تو شاعری بغیر نقصان کے مقبول ہو سکتی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہمارے مشاعرے میں وہ قابلِ عزت لوگ جو نوٹنکی اور ڈرامے اور میوزک کانفرنس کی اعلیٰ صلاحیتیں رکھتے ہیں وہ بھی دو چار غزلیں جمع کر کے اپنی خوبصورت شکل اور پیشہ ورانہ آواز سے مشاعروں کو لوٹتے ہیں۔ اس کے برخلاف واقعی اچھے شاعر مشاعرے کے اسٹیج کی ضروریات سے محروم رہ کر اچھی شاعری کو بری طرح پیش کرتے ہیں۔ شائد اللہ تعالیٰ کا مجھ پر یہ کرم رہا ہے کہ اپنے Schooling کے زمانے میں میں نے کرکٹ بھی کھیلی ہے اور تقریریں بھی کی ہیں۔ اور ان دونوں کے تجربوں کو میں اپنے لاشعور سے آج تک نہیں مٹا سکا ہوں۔ میرے پاس جو اچھے سے اچھا کلام ہوتا ہے اُس کا وہ حصہ جو سنایا جا سکتا ہے اُسے میں مشاعرے کے اسٹیج کے مہذب مطالبات کا لحاظ رکھتے ہوئے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ ہم سے پہلے لوگ مشاعروں میں پیتے کم اور چھلکاتے زیادہ تھے۔ میں خدا کے ڈر سے بھی نہیں پیوں گا اور مشاعرے کے ڈر سے بھی نہیں پیؤنگا مشاعرہ میرے لیے ایک تہذیبی مرکزِ نگاہ جہاں آپ کا اچھا کلام آپ کی ذہانت، حاضر دماغی شریفانہ خوش لباسی اور آواز کا اعتبار اور وقار اکائی بن جاتا ہے۔ شروع سے میرے لیے مشاعرہ کلیتہً حرفِ آخر نہیں ہے۔ ہر وہ شعر جو مشاعرے میں نہ چلے خراب شعر نہیں ہوتا۔ ہر وہ شعر جو مشاعرے میں چل جائے ضروری نہیں کہ وہ اچھا شعر ہو۔ میں مانتا ہوں کہ مجموعی طور پر بہت بڑے شاعر بھی کامیاب ہوتے ہیں مگر میں یہ بھی عرض کرنا چاہونگا کہ رسائل میں بھی بہت سے بڑے شاعر صدیوں سے چھپتے چلے آرہے ہیں۔ میرے نزدیک اعلیٰ شاعری وہ ہے جو سُننے میں اچھی لگے اور پڑھنے میں بہت زیادہ اچھی لگے۔

س : ڈاکٹر صاحب بات مشاعرے کی آئی تو یہ بتائیں کہ اُردو زبان اور ادب کو مشاعروں سے کیا فائدہ پہونچا ہے۔

ج : اُردو زبان کے وجود کا بار بار احساس دلانے میں، سیاسی لیڈروں سے اُردو کو اُس کا جائز

حق دلانے کے لیے جھوٹا سچا وعدہ لینے میں اور بلاشبہ اتنے بڑے ملک میں ان گنت ہندو اور مسلمان نوجوانوں کو اردو زبان میں دلچسپی لینے میں مشاعروں کا زبردست رول رہا ہے۔ لیکن میں یہاں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ کروڑوں روپے جو مشاعروں پر خرچ کئے جاتے ہیں اور اُردو کی ترقی کے لیے جو اکادمی اور انجمنیں بنائی جاتی ہیں ان سب سے ضروری کام یہ تھا کہ محلے محلے اُردو زبان پڑھانے والے شبینہ اسکول کھولے جاتے اور ان شبینہ اسکولوں کے اساتذہ میں وہ ہندو اور مسلمان ممتاز شخصیتیں تدریس کا کام کرتیں جن کی شخصیت سے یہ اعزازی کام پُروقار طور پر آگے بڑھتا۔ ہم جانتے ہیں کہ اس زمانے میں خوبصورت تصویر کا فریم اُس سے زیادہ خوبصورت ہونا چاہیئے۔ اگر ہم چھوٹے چھوٹے اسکول کھول کر اُن لوگوں کے سپرد کر دیں گے جو زندگی کے ذاتی مسائل میں اُلجھیں ہیں اور اس نمود و نمائش کے سماج میں ابھی وہ بے نام و نشان ہیں تو یہ عمل بڑی سُست رفتاری سے آگے بڑھے گا۔

س : ڈاکٹر صاحب دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ گذشتہ ۲۰، ۲۲ برس سے مشاعرے میں چند چہرے ہی نظر آرہے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ ان چند شعراءِ کرام نے کوئی گروہ یا یونین قسم کی کوئی چیز بنا رکھی ہو۔

ج : یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے کہ دس پندرہ شاعروں کا کوئی ایسا گروہ ہے جو ایک دوسرے کے بغیر مشاعروں میں شریک نہیں ہوتا۔ ہاں یہ تو ضرور ہے کہ مشاعرے کے دو تین کامیاب شاعر ایک دوسرے کے اچھے دوست ہو سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ سفر کی صعوبتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بانٹ کر چلیں۔

دراصل جو بات آپ پوچھنا چاہتے ہیں اُس کے دو سبب ہیں۔ کم از کم دس پندرہ شاعر ایسے ضرور ہیں جن کے نام سے پبلک جمع ہوتی ہے اور کنوینر کی مجبوری بن جاتی ہے کہ اُن میں سے چند شعراء کو ضرور بلائے، دوسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ مشاعرہ شاعری کا اسٹیج ہے اور شاعری برسوں علم و فن کے اکتساب کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس لیے وہ چند لڑکے لڑکیاں جو اپنے قبول صورتی اور مترنم آواز کے سہارے دو چار ٹوٹی پھوٹی غزلیں لے کر آجاتی ہیں وہ ایک آدھ برس میں ایکس پوز expose ہو جاتے ہیں۔ اس لیے نئے شاعر کم آرہے ہیں کیوں کہ وہ بنیادی مطالعہ اور ریاضت جو شاعری کے لیے درکار ہے اُس کا موقعہ ان لوگوں کو نہیں ملتا۔ لیکن بہت سے نوجوان ایسے ہیں جن کا مطالعہ بھی ہے ان کا کلام بھی رسائل میں شائع ہوتا ہے اور وہ مشاعرے کے آداب سے بھی واقفیت رکھتے ہیں مگر وہ ناموسِ فن کو رُسوا کرنا نہیں چاہتے۔ وہ نہیں چاہتے کہ گائکی یا ڈرامہ بازی کے سامنے شاعری کی بے حرمتی ہو۔

س : حال ہی میں آپ امریکہ کے سفر سے لوٹے ہیں کیا وہاں کے باشندے بھی مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں اور کیا اُردو زبان کی طرح انگریزی زبان میں بھی مشاعروں کی روایت ہے۔

ج : میں گذشتہ تین چار سال میں ۳ مرتبہ امریکہ اور کناڈا گیا ہوں وہاں ٹیلی ویژن پر بے شمار چینل ہیں یہ تو میں نے دیکھا ہے کہ ہفتہ میں ایک دن ہندوستانی اور پاکستانی چینل پر مشاعرہ یا کوی سمیلن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں مگر انگریزی شاعری سے متعلق مشاعرہ نما کوئی چیز مجھے وہاں دیکھنے کو نہیں ملی۔ اس بار واشنگٹن میں جس جگہ میں ٹھہرا ہوا تھا وہیں قریب میں انگریزی کا ایک ادیب بھی ٹھہرا ہوا تھا اور میری ملاقات سے قبل اتفاق سے وہ مجھے ہندوستانی اور پاکستانی چینل پر دیکھ چکا تھا جیسا کہ ملاقات پر اُس نے مجھے بتایا کہ شاید تم فلم میں کام کرتے ہو میں نے تمھیں ٹی۔ وی پر دیکھا ہے۔ تب میں نے اُسے تفصیل سے اپنا مکمل تعارف کرایا تو اُس نے بتایا کہ ہمارے یہاں ٹی۔ وی پر یا عوام کے جلسوں میں شاعری پڑھنے اور سننے کا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ " لاس اینجلز" کے ایک مشاعرے میں ایک امریکی جوڑا میرے پاس آیا غالباً وہ لوگ ہندوستانی زبان کے طالب علم تھے انھوں نے بتایا کہ وہ ابتدا سے آخر تک مشاعرے میں بڑی دلچسپی کے ساتھ بیٹھے رہے ہیں۔ امریکن کسی کی تعریف میں ایک آدھ منفرد جملہ کہنا خوش اخلاقی سمجھتے ہیں شاید اسی لیے اُس امریکن خاتون نے مجھ سے کہا تھا۔

Yours sexy voice is Divine

مجھے یاد آیا اُردو کے مشہور شاعر ساقی فاروقی کی بیگم نے جو جرمن ہیں، ایک بار مجھے لکھا تھا کہ تمھاری آواز میں مدر انڈیا کی گونج ہے۔ بہرحال انگریزی یا دوسری مغربی زبانوں میں مشاعروں کی طرح کی کوئی روایت نہیں ہے لیکن جس طرح ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی تعداد وہاں بڑھ رہی ہے اور مشاعروں کا چلن عام ہو رہا ہے۔ اُس سے یہ اُمید ضرور کی جاسکتی ہے کہ مغرب کے لوگ بھی جلد ہی خراب ہو جائیں گے۔ مشاعرے وہاں نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے شعروں میں جن لب و رخسار، دست و بازو اور سراپے کا تذکرہ کرتے ہیں اس کو دیکھنے چھونے

اور برتنے کی سعادت انھیں سرِراہ نصیب ہے۔

س : ہندوستان اور پاکستان کی غزل میں کیا واضح فرق ہے کیا وہ فرق دونوں ملکوں کے سیاسی حالات پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔

ج : غزل کی تین چار سو سالہ تاریخ میں کبھی بھی کتابی زبان میں کوئی ایسا لازوال شعر نہیں ہوا جو عظیم بھی ہو اور مقبول بھی۔ ہر دور کا اچھا شاعر یہ جانتا ہے کہ اپنے عہد کی بولی جانے والی زبان کو نظم کر دینا ایک بہت معمولی شاعرانہ عمل ہے لیکن اس بولی جانے والی زبان کی عمومیت کے سینے سے کسی دھڑکن کا تغزل بنانا غزل کا فن ہے جب میرؔ نے کہا تھا کہ اُن کی شاعری کی زبان جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جانے والی زبان ہے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنے عہد کے عوام اور خواص کے رابطے کی زبان کو وہ اس طرح چھوتے ہیں کہ وہ ان کا انفرادی تغزل بن جاتا ہے ۔

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے سدھا ہوا
وہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ شما ہوا نہ کہا ہوا

میرؔ کے زمانے میں بھی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نہ سہی مینا بازار میں ربن جیسی کوئی چیز ضرور بکتی ہوگی جس کا نام ربن نہیں تھا۔ یا یہ شعر دیکھئے ۔

لان میں ایک بھی بیل ایسی نہیں جو دیہاتی پرندے کے پر باندھ لے
جنگلی آم کی جان لیوا مہک جب بلائے گی اُڑ کر چلا جائے گا

ــ ٭ ــ

لان بھی اپنے دوسرے نام کے ساتھ اُس زمانے میں موجود تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ جو نئے لفظ آتے رہیں وہ نیا تہذیبی کردار ہوتے ہیں اس لیے جب غزل اپنا رابطہ بازار کی زبان سے رکھے گی اور اُس کی بازاریت سے بچ نکلے گی بلکہ اس کی شعری تطہیر کرے گی تو اچھی غزل پیدا ہوگی۔ کبھی کبھی غزل بے زبان کی بھی زبان بن جاتی ہے۔ ہندوستان جیسا وسیع اور بڑا ملک اردو غزل کا میدانی کارزار ہے لوگ اُردو زبان جانتے ہیں اور اُردو غزل ان کے دل کی دھڑکن ہے۔ اس مشکل تضاد میں گرے پڑے لفظوں کو تغزل کا وقار اور اعتبار ملتا ہے۔ پاکستان میں اُردو داخل نصاب ہے اس لیے وہاں کا شاعر غیر غزلیہ لفظ کو نبھانے کی قیامت سے نہیں گزرتا۔ مثال کے طور پر اگر وہ کوئی ایسی غزل کہہ رہا ہے جس کے قافیہ محبت، عبادت، وغیرہ ہیں تو وہ طہارت، وضاحت، علالت وغیرہ قافیوں کو کبھی بالکل بول چال کی زبان سمجھ کر بغیر کسی تکلف کے استعمال کرے گا۔ جبکہ یہاں ایسا نہیں ہے۔ اس لیے یہاں غزل کے وسیلے سے اُردو زبان نمو پذیر ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے کمزور شعروں میں ہندوستان اور پاکستان نظر آئے گا لیکن جو غزل کے لازوال شعر ہوں گے اُن کی زبان ماضی حال اور مستقبل کی زندہ زبان ہوگی اور احساس و تجربات ہزاروں سال کے انسان کے دُکھ سُکھ کا شعری پیکر ہوں گے۔

بقیہ، ذیابیطس کے مرض سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں

"پینکریاس" (PANCREAS) وہ غدود جو انسولین بناتا ہے۔) کو سرگرم کیا جا سکتا ہے۔

احتیاطی تدابیر

ذیابیطس کے مریضوں کے لیے چند احتیاطی تدابیر کا سختی سے عمل میں لایا جانا ضروری ہے جو درج ذیل ہیں۔

اگر پاؤں میں معمولی بے حسی بھی پیدا ہو جائے تو فوراً ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیئے کیوں کہ اگر بے حسی بڑھ گئی تو آپ کو معمولی زخم کا بھی احساس نہیں ہوگا۔ ایسا معمولی زخم پاؤں میں چھوت پھیلا سکتا ہے جس سے آپ کا پاؤں اور پنجہ ماؤف ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ زخم نہ بھرے سے بعد میں پاؤں کاٹنا پڑے۔

سخت جُوتے نہیں پہننے چاہئیں۔ چوڑے پنجے والے جُوتے پہننے چاہئیں۔

سخت پٹیاں بھی نہیں باندھی چاہئیں۔

یہ دیکھنا چاہیئے کہ جسم کے کسی عضو کو زخم نہ لگے۔

ناخنوں کو بڑی احتیاط سے کاٹنا چاہیئے۔

پاؤں کو روزانہ پانی سے صاف کرنا چاہیئے۔ اور اُن پر ٹیلکم پاؤڈر لگانا چاہیئے۔

روزانہ باقاعدگی کے ساتھ سیر کرنی چاہیئے۔ اس سے خون کی گردش صحیح حالت میں رہتی ہے۔

روزانہ چند منٹ تک ایسے انداز سے لیٹئے کہ ٹانگیں فرش سے چند فٹ اوپر اٹھی رہیں۔ اس کے لیے میز کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔

لمبے عرصے تک ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر نہ بیٹھئے۔

تنگ الاسٹک والی جرابیں نہ پہنئے

تمبو ہاٹ احتیاط کے ساتھ بنائیں۔

جہاں تک آیور ویدک دواؤں کا تعلق ہے اس میں "بسنت کسماکر رس" "بسنت تلک رس"

"مدھومیہ انتک بٹی" شلاجیت اور تری ونگ بھسم نہایت مفید ہے۔ ایسی دواؤں کا استعمال بھی نہایت مفید ثابت ہوتا ہے جس میں گُڑ مار بوٹی، جامن کی گٹھلی، نیم کی پتیاں اور بیل وغیرہ ڈالے جاتے ہیں۔

●

شمیم یزدانی٥

اداشناسِ غم
فانی بدایونی

کہتے ہیں کہ غم دراصل نشاطِ معکوس کا دوسرا نام ہے۔ جو لوگ غم کی اس فلسفیانہ تعریف سے اتفاق نہیں کرتے وہ بھی بہر حال یہ مانتے ہیں کہ غم ایک پائدار جذبہ ہے جو ہر انسان کے حصہ میں بقدرِ ظرف آیا ہے۔ ہماری اُردو شاعری کا ایک معتد بہ حصہ تشریحِ غم پر مبنی ہے۔ ہر شاعر نے غم کی شرح اپنے اپنے تجربہ کی گہرائی و گیرائی کے مطابق کی ہے۔ کسی کا غم روایتی ہے تو کسی کا ذاتی۔ لیکن چند شعراء ایسے بھی ہیں جنھوں نے ذاتی غم کو وسعت دے کر کائناتی بنا دیا ہے۔ ایسے شعرا میں جو بہت زیادہ جانے پہچانے ہیں وہ ہیں جناب میرؔ و حضرت فانیؔ بدایونی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان شعراء نے اپنی شاعری میں غم کو اتنی زیادہ اہمیت کیوں دی۔ اس کا جواب حاصل کرنے کے لیے ہم کو شاعر کی شخصیت کی گہرائیوں میں اُترنا پڑے گا۔ دراصل انسان ایک حساس ترین ذی حیات ہے۔ وہ اپنے قول و عمل میں ان ہی باتوں کو دہراتا ہے جو سماج سے اس کے حصہ میں آتی ہیں۔ لیکن شاعر عام آدمیوں کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتا ہے اسی لیے وہ اپنے ہر جذبہ کو — جس میں جذبۂ غم بھی شامل ہے — ذات سے بلند کر کے کائنات تک لے جانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی محسوس کرتا ہے اس کو اپنے اشعار میں اسی شدت سے سمو دیتا ہے کہ اس کے تجربات کی صداقتیں من و عن قاری کے دل میں اُتر جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ قاری خود بھی یہ کہہ اُٹھتا ہے کہ ؎

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہمارا موضوعِ سخن اس وقت صرف فانیؔ بدایونی کی شاعری ہے اس لیے اس نظریہ کے تحت ہم صرف اُن کی ہی شاعری کا جائزہ لیں گے۔

فانیؔ کی زندگی مسلسل تگ و دو، تلاشِ فکر معاش، دوستوں کی بے اعتنائی اور عشق کی دردمندیوں و مایوسیوں سے عبارت تھی۔ ان سب باتوں میں ان کی فطری خودداری اور شدتِ احساس نے اور بھی تندی پیدا کر دی تھی۔ نتیجتاً ان کے دماغ میں غم کا ایک مخصوص فلسفہ پیدا ہو گیا تھا جس کے سیلاب اُن کی شاعری میں جگہ جگہ جھلکتے نظر آتے ہیں۔

جو لوگ فانیؔ کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت صرف دماغ کی رہبری پر بھروسہ کرتے ہیں اور دل کو ساتھ نہیں لیتے وہ ان کی شاعری پر قنوطیت کا الزام لگا کر مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن کچھ دردمند دل ایسے ضرور ہیں جو اس الزام پر تڑپ بھی اُٹھتے ہیں۔ قنوطیت کا الزام لگانے والے دراصل وہ لوگ ہیں جو شاعری کو شاعر کی ذات سے الگ کوئی چیز سمجھتے ہیں۔ حالیؔ بھی اگر تلخیٔ حیات کے ماوصف طربیہ شاعری کرتے تو گو کہ وہ اپنی شاعری کی اصل رُوح سے انصاف نہ کر پاتے لیکن اُن لوگوں کو ضرور مطمئن کر جاتے جو اُن پر قنوطیت کا الزام رکھتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ فانیؔ نے اس الزام سے برأت کی اتنی بھاری قیمت ادا نہیں کی ورنہ، یہ اُردو ادب کی بہت بڑی بدقسمتی ہوتی۔

اچھے ادب کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس میں زندگی کے ہر جذبے کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے اُردو ادب بھی اس معاملے میں کسی بھی زبان کے ترقی یافتہ ادب سے پیچھے نہیں ہے۔ غم جیسے سنجیدہ اور بھرپور جذبے کی ترجمانی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ فانیؔ کا کرم ہے کہ انھوں نے اس شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھنے کا حوصلہ کیا جس کو دوسرے ادبی فرشتے

٥ معرفت دستگیر میڈیکل اسٹور، میاں بازار، گورکھپور ۲۷۳۰۰۱۔

ہاتھ لگاتے ہوئے کانپ جاتے تھے ہرچند کہ اس جرم کی پاداش میں چند نقادانِ ادب نے ان کو قبولِ عام کی جنت سے بزعم خود باہر نکال دیا لیکن وہ اقلیم ادب کو ایک ایسا اچھوتا نظام دے گئے جس پر ہم ہی نہیں، آئندہ اُردو داں نسلیں بھی فخر محسوس کرتی رہیں گی۔

غم کی سب سے بھیانک شکل موت ہے لیکن فانیؔ اس کے اتنے "محرم راز" ہو گئے تھے کہ انھوں نے موت کے تصور سے نہ صرف خوفناکی کے عنصر کو ہی جدا کر دیا بلکہ موت کو محبوبیت کے درجہ تک پہنچا دیا۔ دیکھئے وہ موت کو کیسی کیسی دلبرانہ شکل میں پیش کرتے ہیں۔

ادا سے آڑ میں خنجر کی منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے

٭

تو کہاں ہے اے اجل اے نامرادوں کی مُراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

٭

آج روزِ وصال ہے فانیؔ
موت سے ہو رہے ہیں رازونیاز

ایسی رنگارنگ مثالیں فانیؔ کے کلام میں جابجا ملتی ہیں۔ ضرورت صرف ایک دلِ دردمند کی ہے جو ان سے پورا پورا لطف اٹھانے کا اہل ہو۔ فانیؔ کی مظلومیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے، جب مجنوں گورکھپوری جیسا متوازن نقادِ فن بھی یہ شکایت کرتا ہے کہ مسلسل نالہ و شیون سے ناخوشگوار اثر پیدا ہوتا ہے اور فانیؔ کی شاعری میں ایک تھکا دینے والی یکسانیت پیدا ہو گئی ہے ذرا اس ناانصافی پر غور فرمایئے کہ موت اور غم جیسی بھیانک اور کریہہ سرزمین پر شاعر خونِ دل سے سینچ سینچ کر ہزاروں رنگ برنگے پھول کھلائے لیکن اس پر توصیف کے موتی نثار کرنے کے بدلے "تھکا دینے والی یکسانیت" جیسے الزام کے پتھر پھینکے جائیں۔ اگر کوئی اُگتے ہوئے سورج یا کھلتے ہوئے پھولوں کا حسن تو محسوس کرے لیکن ڈوبتے ہوئے سورج یا مُرجھائے ہوئے پھولوں کے حسن سے حظ اٹھانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اس میں نہ ڈوبتے ہوئے سورج کا کوئی قصور ہے نہ اور نہ مُرجھائے ہوئے پھولوں کی خطا۔ کمی دراصل اس کے "دلِ دردنا آشنا" میں ہے۔ اکتسابِ مسرت جتنا آسان ہے غم سے وجداں پانا اتنا ہی دشوار ہے۔ ایسا صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو شاعرانہ ذوقِ سلیم بدرجۂ اتم رکھتے ہوں۔" اس لیے فانیؔ کے کلام سے حظ اُٹھانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس سلسلے میں کیا خوب کہا تھا کہ "فانیؔ یاسیات کے تخلیقی فلسفہ میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں" اس ضمن میں فانیؔ کے کچھ اشعار پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔

اچھا، یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ
اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم، خدا بھی ہے

٭

زندگی خود کیا ہے فانیؔ یہ تو کیا کہیے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

٭

موت ان کا منھ ہی تکتی رہ گئی
جو تری فرقت کے صدمے سہہ گئے

اس موضوع پر زیادہ لکھنا خود ایک علیحدہ مضمون کا طلبگار ہے۔

پروفیسر احتشام حسین مرحوم کا خیال تھا کہ فانیؔ ایسی موت سے پہلے ہی مر چکے تھے۔ یہ فانیؔ کا بہت سطحی جائزہ ہے۔ کلام فانیؔ میں جگہ جگہ خواہشِ مرگ کی تکرار نے غالباً ان کو ایسا سوچنے پر مجبور کیا ہوگا۔ لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو فانیؔ کی خواہشِ مرگ کہیں بھی زندگی کے حوصلوں کی حریف بن کر نہیں کھڑی ہوتی بلکہ زندگی کو ایک خاص گداز، روحانی بصیرت اور احساسِ دردمندی عطا کر کے ایک سچے انسان کی طرح خود جینے اور دوسروں کو جینے دینے کا سلیقہ عطا کرتی ہے۔ اُن کے حوصلے ایک عام آدمی کے حوصلوں سے بہت بلند ہیں، سوچئے کیا ایسا آدمی اپنی موت سے پہلے مر سکتا ہے جو یہ کہنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

یارب تری رحمت سے مایوس نہیں فانیؔ
لیکن تری رحمت کی تاخیر کو کیا کہیے

٭

اپنے کمالِ شوق پر حشر کا دن ہے منحصر
وعدۂ دید چاہیئے زحمتِ انتظار کیا

"کمالِ شوق" کی منزل حاصل کرنے کے لیے "حشر کے دن" تک انتظار کرنے کے پیچھے جو مجبوری ہے وہ "زحمتِ انتظار کیا" کے سامنے کتنی حقیر بن جاتی ہے۔ یہی فانیؔ کا کمالِ فن ہے۔ اسی لیے پروفیسر آل احمد سرور نے اپنی کتاب "نظر اور نظریے" میں "اُردو میں ادبی تنقید کی صورتِ حال" کے تحت فانیؔ کے تئیں بڑا منصفانہ تجزیہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں "فانیؔ کی عظمت سے سرے سے انکار کسی دور میں ممکن نہ تھا۔ مگر انکی یاسیت آج سے ۲۵-۲۰ برس پہلے اچھی نظر سے نہ دیکھی جاتی تھی۔ حیات کا جو عرفان فانیؔ کے یہاں ملتا ہے، اس کے ساتھ اب زیادہ انصاف ہو رہا ہے۔ وہ صرف خواہشِ مرگ کے شاعر نہیں بلکہ اس بے پایاں درد و کرب کے شاعر سمجھے جاتے ہیں جس کا ایک نام زندگی ہے اور دوسرا موت۔"

فانیؔ کو یاسیات کا امام کہنا دراصل ان کی شاعرانہ عظمت کے احترام کا صرف ایک پہلو ہے چند لوگوں نے ان کے اس لقب کو ان کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان کے نزدیک

فانی کی شاعری یاس کے اندھیروں سے بوجھل ہے۔ انھوں نے شاید غور نہیں کیا کہ موت، حزن و ملال، رنج و غم، اور یاس و ناکامی جیسے بوجھل موضوعات پر فانی سے پہلے اردو کا تقریباً ہر شاعر طبع آزمائی کرچکا تھا۔ لیکن ان میں بیشتر روایتی انداز سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ فانی نے ان موضوعات کو اپنی شاعری کا دین و ایمان بناکر اپنی روح کی گہرائیوں سے بیان کیا اور اس میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ ان موضوعات کی تکرار تو اُن کی شاعری میں ضرور رہی لیکن اندازِ بیان ہمیشہ جداگانہ رہا۔ کبھی بہت شگفتہ و دلنشیں تو کبھی قدرے کم لیکن لہجے کا وقار اور اسلوب کا ٹھہراؤ کبھی کم نہیں ہوا۔ دیکھئے موت کا ایک نادر تصور یہ کیا پیش کرتے ہیں۔

نہیں ضرور کہ مرجائیں جاں نثار ترے
یہی ہے موت کہ جینا حرام ہو جائے

ایسے کریہہ موضوعات پر اس طرح مسلسل طبع آزمائی کرنا کہ اُن میں فرسودگی نہ محسوس ہو صرف اسی وقت ممکن ہے جب شاعر میں انفرادیت ہو فانی کی پوری شاعری اس انفرادیت کو بڑی آب و تاب کے ساتھ قائم رکھنے میں کامیاب ہے۔ دو اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

اپنے دیوانے بہ اتمام کرم کر یارب
در و دیوار دیے اب انھیں ویرانی دے

⁂

جیئے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

جہاں کہیں انھوں نے فلسفیانہ اور حکیمانہ نکات بیان کئے ہیں وہاں بھی اس انفرادیت اور اپنے مخصوص فلسفۂ غم سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ہستی انسانی کے انسانی فہم سے بالاتر ہونے کے بارے میں ان کا اندازِ بیان کیسا منفرد اور کتنا واضح ہے۔

ہوں، مگر کیا، یہ کچھ نہیں معلوم
میری ہستی ہے غیب کی آواز

ہستی کو "غیب کی آواز" کہہ کر "کچھ نہیں معلوم" کے لیے کتنا حسین جواز پیش کیا ہے۔ یہ صرف فانی کا ہی حصہ ہے۔ اُن کا ایک بڑا مشہور مطلع ہے۔

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

فانی سے پہلے اور بعد میں بھی زندگی کو خواب کہنے والے شعراء کی کمی نہیں لیکن فانی کی انفرادیت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے ان کی نگاہ میں زندگی خواب تو ضرور ہے لیکن وہ خواب دیوانے کا خواب ہے۔ زندگی کی مختصر ترین الفاظ میں اتنی جامع و بسیط تعریف پر جتنی بھی داد دی جائے وہ کم ہے اور لطف یہ کہ اس میں بھی وہ اپنے مخصوص فلسفۂ غم کا دامن نہیں چھوڑتے۔

کسی شاعر کا، اسی رنگ کے کسی دوسرے شاعر سے، ایک ہی موضوع پر کہے گئے اشعار کے ذریعہ تقابل اگر محاسنِ کلام کو اُجاگر کرنے کے لیے کیا جائے تو یہ غیر مستحسن نہیں۔ اسی نظریہ کے تحت ذیل میں کچھ شعراء کے اشعار سے فانی کے اشعار کا موازنہ پیش کیا جاتا ہے اس میں کسی دوسرے شاعر کو اس کے شاعرانہ منصب سے نیچے گرانا مقصود نہیں۔ اردو غزل کے ایک اہم ستون مرزا غالب کا ایک مشہور شعر ہے۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چونکہ فانی اس رنگ کے امام ہیں اس لیے اسی موضوع پر ان کا بھی ایک شعر نذرِ قارئین کرکے فیصلہ اُن ہی کے حسنِ نظر پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

شعر یہ ہے: بہلانہ دل نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

غالب ہی کا ایک مقطع ہے۔

اگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

فانی اس کو اپنے ڈھنگ سے یوں کہتے ہیں۔

یاں میرے قدم سے ہے ویرانے کی آبادی
واں گھر میں خدا رکھے آباد ہے ویرانی

"خدا رکھے" کے اضافے سے "گھر میں آباد ہے ویرانی" کے تصور نے شعر کو جو بے پناہ حسن بخشا ہے وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ غالب ہی کا ایک اور شعر جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرچکا ہے یہ ہے۔

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اب ذرا فانی کو بھی سُنئے اور فیصلہ کیجئے کہ بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔

طبیعت رفتہ رفتہ غم کی خوگر ہوتی جاتی ہے
جفا کم کر جفا اب روح پرور ہوتی جاتی ہے

جفاؤں کا عطا کردہ غم اگر روح پرور ہونے لگے تو یہ غم کی معراج ہے۔ ایک اور شعر حالی کے کلام سے پیش ہے۔

غم مٹا دیا، غم کا لذت آشنا کرکے
کیا کیا ستمگر نے خوگرِ جفا کرکے

غالب نے جو بات اپنے پورے شعر میں کہی ہے اس کو فانی نے اپنے مصرعہ اولیٰ میں ہی ادا کردیا ہے لیکن اتنا ہی کہہ کر مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ اپنے مخصوص فلسفۂ غم کی دھڑی دوسرے مصرعے کے اضافہ سے جما کر بات میں ایک اور نزاکت پیدا کردیتے ہیں۔ فانی جیسا لذت شناسِ غم "رنج کا خوگر" ہوکر اپنی مشکلات کو آسان کرنے کی بدذوقی بھلا کس طرح گوارا کرسکتا تھا۔ وہ تو اس بات کا شاکی رہا کہ "ستمگر" نے یہ بہت بُرا کیا کہ اس کو غم سے محروم کردیا۔

اسی طرح فانی کے پیشرو اور میدانِ غم کے

ایک اور مشہور میرؔ کا ایک شعر :-

کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہنے ... وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا

فانیؔ کہتے ہیں :-

یا کہتے تھے "کچھ کہتے" جب اس نے کہا کہیے
تو چپ ہیں کہ کیا کہیے کھلتی ہے زباں کوئی؟

میرؔ کے شعر کے کیف اور اندازِ بیان سے انکار نہیں لیکن ان کے شعر کا نتیجہ قیاسی ہے جبکہ فانیؔ کے یہاں نتیجہ عمل اور تجربہ کی کسوٹی پر کس کر اترتا ہے اُن کا محبوب ان کو عرضِ حال کی دعوت دیتا ہے لیکن رعبِ حسن ان کی زبان روک لیتا ہے "کھلتی ہے زباں کوئی" کی برجستگی اور اس کے اندر پوشیدہ مجبوری و یاس انگیزی کا ذائقہ محسوس کیجئے، شعر اپنی داد آپ کے ذوقِ سلیم سے خود بخود وصول کر لے گا۔

جناب شادؔ عظیم آبادی کا شعر ہے۔

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اصغرؔ گونڈوی نے کہا ہے۔

سُنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

مرزا غالبؔ فرماتے ہیں :

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

اب فانیؔ کا شعر ملاحظہ فرمائیں۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

شادؔ حکایتِ ہستی کے درمیانی حصہ کی شہادت دینے کو تیار ہیں۔ بقول فانیؔ "ہم ہیں" پر ان کو یقین ہے۔ اصغرؔ گونڈوی "کچھ اصل" تک تسلیم کرنے کے بعد بقیہ کو خواب اور اندازِ بیاں سمجھ کر رد کر دیتے ہیں۔ غالبؔ کا خطیبانہ انداز ذوقِ شعری کو مجروح کر دیتا ہے اس کے علاوہ "ہے" پر "نہیں ہے" کی تردید نے مفہوم کی ادائگی پر بڑا ظلم کیا ہے۔ لیکن فانیؔ اپنے مخصوص نظریۂ یاس کے سبب ہستی کے متعلق نہ صرف ابتدا و انتہا سے بے خبر ہیں بلکہ "ہم ہیں" (یعنی بقول شاد حکایتِ ہستی کے درمیانی حصہ) کو بھی وہم سمجھتے ہیں اور جب اس پر بھی مطمئن نہیں ہوتے تو "کیا معلوم" کا اضافہ بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ہستی کی تعریف کی قریب ترین منزل اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

اپنی ساری زندگی فانی اپنے غموں سے لذت کشید کرتے رہے خود بھی اس کے کیف و سُرور میں ڈوبے رہے اور اپنے اشعار کے پیالوں میں اسے دوسروں کے لیے بھی محفوظ کر گئے تاکہ بلا کشانِ غم اپنا اپنا حصہ اس میں سے بقدرِ ظرف حاصل کرتے رہیں اور دنیا درد مندوں سے یکسر خالی نہ ہونے پائے۔

●

بقیہ، دیہات کی مربوط ترقی

ہیں، ان کے علاوہ اور بھی کتنے پیمانے ہیں جنھیں محقق نے استعمال کیا وہ سب یہ پتہ دیتے ہیں کہ آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی کی جڑیں دیہی عوام میں اور خاص کر غربا میں پیوست ہو چکی ہیں تاہم تشویش پیدا کرنے والے کچھ ایسے شعبے بھی ہیں جن پر ساتویں پلان کے دوران زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مثلاً قرضہ جات کی ادائیگی کی مدت میں موزوں ڈھیل دی جانی چاہیئے یا کم از کم اُس کو جائز حدود سے زیادہ کسنا نہیں چاہیئے۔ جیسا کہ سروے رپورٹ میں ظاہر کیا گیا ہے، اس کے سدِ راہ ثابت ہونے کا خدشہ ہے۔ علاوہ ازیں مناسب بنیادی ڈھانچے، بیمے اور تربیت کی سہولیات، زچگی کے بعد کی دیکھ بھال اور کام چلانے کے لیے زیادہ سرمایہ ضرورتمند صوبوں اور مستفید ہونے والوں کو دستیاب کرائی جائیں، چونکہ ساتویں پلان میں اختیار کی گئی ترقیاتی حکمتِ عملی کا مقصد غربت، بے روزگاری اور علاقائی عدمِ توازن کے مسائل پر براہِ راست حملہ کرنا ہے، اس امر کی اُمید کی جا سکتی ہے کہ آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی ان منزلوں کو سَر کرنے میں اہم رول ادا کرے گا۔

●

بقیہ، تبصرہ

اُردو ترجمہ نہایت سلیس اور دل نشیں انداز میں کر کے اس رسالے کو عام فہم بنا دیا۔ تصوف کے متوالوں کے لیے یہ ایک ایسی روحانی غذا ہے جس کی افادیت علمی اور روحانی اعتبار سے اور عملی نقطۂ نظر سے مسلم ہے۔ اس رسالے کی جلد سازی بھی ہوتی تو اچھا ہوتا کیونکہ غیر مجلّد کتابیں آج کے جدید دَور میں کم توجہ کا باعث بنتی ہیں۔ مجموعی اعتبار سے اس کی کتابت اور طباعت عمدہ ہے اور سرِورق جاذبِ نظر ہے۔

(کمال جعفری)

خلیل الرحمٰن قاسمی٭

وطن میں اجنبی

ایک جائزہ

دورِ حاضر کے اُردو شعراء میں جگن ناتھ آزاد ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت کے حامل ہیں۔ ایک عظیم شاعر، مفکر اور ماہر علم و ادب کا درجہ رکھتے ہیں۔ حیات کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں جو ان کی نظر سے اوجھل ہو۔ تمام موضوعات کو اپنی جودتِ فکر اور شاعرانہ بصیرت سے شعری پیکر عطا کرنے کی مخلصانہ کاوش کی ہے۔ آزاد نے تقریباً تمام اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی ہے، نہ صرف شاعری ہی میں اپنے جوہر دکھائے بلکہ تحقیق، تنقید، خاکہ، صحافت اور دیگر اصناف نثر میں بھی خامہ فرسائی کی ہے اور برِصغیر ہند و پاک کے مشہور ماہرینِ اقبالیات میں امتیازی شان کے حامل ہیں جنہوں نے اقبال کا شناسائی کی حد تک نہیں بلکہ آشنائی کی حد تک مطالعہ کیا ہے۔ آزاد نے اقبال اور ان کی شاعری کو جس انداز میں پیش کیا۔ بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی و علامہ نیاز فتح پوری۔

"اقبالیات میں ایک گراں بہا اضافہ ہے"

جگن ناتھ آزاد دسمبر ۱۹۱۸ء میں پاکستان کے ایک چھوٹے سے شہر عیسیٰ خیل میں پیدا ہوئے۔ آزاد کو ذوقِ شاعری وراثت میں ملا۔ آزاد کے والد حساب تلوک چند محروم کا شمار اپنے وقت کے مشہور و معروف شاعروں میں ہوتا تھا۔ آزاد کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے والد کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے دوران لاہور میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، مولانا تاجور نجیب آبادی، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم اور سید عابد علی سے اکتسابِ فیض کیا۔ نیز پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے آنرز کیا۔ ان دنوں جموں یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو سے وابستہ ہیں۔

ایک دردمند اور حساس طبع فنکار اپنے اطراف و اکناف اور داخل و خارج میں رونما ہونے والے واقعات اور برپا ہونے والی ہلچل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اپنے محسوسات اور جذبات کو فنی پیکر عطا کر دیتا ہے۔ آزاد بھی ایک حساس، دردمند اور وسیع المشرب انسان واقع ہوئے ہیں۔ آزاد بھی اپنے داخل و خارج اور اطراف و اکناف میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات سے نہ صرف دوچار ہوئے بلکہ انھوں نے اسکی اذیتیں بھی جھیلی ہیں۔ آزاد کے کلام کے غائر مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کو تقسیمِ ملک کا شدید رنج و غم ہے نیز ہجرت کا کرب بھی۔ ظاہر ہے کہ اپنے علاقے سے جذباتی وابستگی قانونِ فطرت کے عین مطابق ہے۔ یہی عارضۂ وطن ہے۔

جگن ناتھ آزاد کے وافر مجموعہ کلام منظرِ عام پر آ چکے ہیں لیکن "وطن میں اجنبی" ایک ایسے دَور کا اعلانیہ ہے جہاں شرافت و مروّت، خلوص و محبت انسانی دردمندی کی بجائے قتل و غارت گری اور نفرت و حقارت غالب تھی" وطن میں اجنبی" کے سبھی کلام جذبۂ فراقِ وطن سے مملو ہیں۔ ان کی تمام تر نظمیں، غزلیں، قطعات، رباعیات اور مراثی میں ہجرت کا کرب محسوس ہوتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد بھی ہجرت کر کے پنجاب سے دہلی آئے لیکن آزاد نے جن حالات میں اپنے وطنِ عزیز سے ہجرت کی وہ بڑا ہی پُرآشوب خلفشار اور کرب و اضطراب کا دَور تھا۔ دونوں طرف سرحدوں پر خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔

٭ جمیل روڈ، مظفرپور (بہار)

انسانیت کی جگہ وحشت و درندگی نے لے لی تھی۔ انھیں حالات میں آزاد دہلی ہجرت کرکے آئے اور اسی اثناء میں ہندوستان دو ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا۔ وطن کی مٹی اور وطن میں گذارے ہوئے اوقات اور پیار و محبت بھری یادیں اس امر کا شدید احساس دلاتی رہیں اور ہر ساعت ذہن و دل میں نقش بن کر اُبھرتی رہیں کہ وطن آخر وطن ہے اور آباء اجداد کی مٹی سے منسلک ہے۔ یہی جذبۂ فراق اور کربِ وطن آزاد کی پوری شاعری میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح کوئی چڑیا مختلف مقامات سے تنکے اکٹھا کرکے گھونسلہ تعمیر کرتی ہے لیکن جب کوئی شریر اور چلبلا لڑکا اپنی ناعقلی یا شرارت سے گھونسلہ گرا دیتا ہے یا پھر یہ کہ ہوا کے زبردست جھونکے سے گھونسلہ بکھر جاتا ہے اور وہ چڑیا اپنے آشیانے سے جدا ہو کر بے سروسامانی کے عالم میں مضطرب و بیقرار منڈلاتی رہتی ہے اور اسے کہیں بھی امان کی صورت نظر نہیں آتی ہے تو عموماً تھک ہار کر وہ کسی درخت کی شاخ کو جائے پناہ بنا تی ہے اسی طرح آزاد بھی مختلف مقامات سے تنکے اکٹھا کرکے بڑی مشکل سے نشیمن تعمیر کرپائے تھے کہ اپنے ہی لوگوں نے نشیمن جلا ڈالا، اور آزاد اپنے آشیانے سے جدا ہو کر کہیں اور جا بسے۔ بقول میر انیس ؎

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے
جانے وہی بلبل جو بچھڑ جائے چمن سے

جگن ناتھ آزاد بھی وطن سے بچھڑے اور وطن سے والہانہ عقیدت اور جذبہ و خلوص ہی ہے کہ آزاد کو جب ہجرت کا کرب ستاتا ہے اور اپنے وطن عزیز (پاکستان) سے دعوت نامہ آنے پر وطن پہنچ کر اجنبیت کا احساس شدید ہوتا ہے تو وہ ماضی کی طرف مراجعت کرتے ہیں وہ ماضی جو ان کے لیے حسین و دلکش بھی ہے اور بھیانک خواب بھی۔

یہی وجہ ہے کہ آزاد اپنی شاعری میں وطن عزیز اور احباب علم دوست کی پیار و محبت بھری یادوں کے گن گاتے ہیں اور حال کی زبوں حالی اور اجنبی پن پر آنسو بہاتے ہیں۔ وطن عزیز میں داخل ہو کر آزاد ایک طرف پنجاب کو دلکش نغموں اور روحانی شاعری کی زمین کہتے ہیں ؎

فردوس کا عالم مرے پنجاب کی دُنیا
تسکین کے، آرام کے اسباب کی دُنیا

پھر وہیں پنجاب کی بربادی کا خوفناک منظر پیش کرتے نظر آتے ہیں (جہاں تمام مذاہب کے ماننے والے انسانی تہذیب کے پیشوا اور علمبردار تھے اور ایک دوسرے کے گلے کا ہار بنے ہوئے تھے وہاں بھائی کا بھائی قاتل ہوا۔ انسانیت، اخلاص اور محبت کی جگہ نفرت و حقارت اور بے وفائی نے لے لی اور قتل و غارت گری اور عصمت دری کا بازار گرم ہو گیا۔ اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہر پھول کے دامن میں شرارے نظر آئے
ہر شاخِ چمن زار میں کانٹے نظر آئے
خوشبو کے عوض موجِ صبا میں شرر آئے
بکھرے ہوئے انوارِ طلوعِ سحر آئے
پھولوں سے ہوئی دم میں فضا باغ کی خالی
خود باغ کے درپے جو ہوئے باغ کے مالی
جس طرح چلے لعلِ یمن ملکِ یمن سے
یا جیسے چلے درِ عدن کانِ عدن سے
آہوئے ختن یا ہو رواں دشتِ ختن سے
آزاد! ہم اس طرح چلے اپنے وطن سے
جس گھر کی فضاؤں میں جیئے اور پلے ہم
اس گھر کو لگی آگ تو اس گھر سے چلے ہم

آزاد حساس ہوتے ہوئے بھی ثابت قدم رہے لیکن صبر و ضبط کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا۔ جشنِ آزادی کے عنوان سے آزاد نے ہندوستان کی آزادی کا منظر پیش کیا ہے جو برسوں کی غلامانہ زندگی کے حصار سے آزاد انسان کے لیے خوشی و مسرت کا پیغام لے کر آئی، لیکن ذاتی مفاد کی خاطر کچھ شرپسند لوگوں کی نظروں کے عتاب کا شکار ہو گئی اور بھائی ہی بھائی کا قاتل بن بیٹھا، شرافت و مروت اور پیار و محبت کی جگہ نفرت و حقارت غالب ہوئی اور ہر سمت تاریکیوں کے سیاہ بادل منڈلانے لگے اور وطن کی ہر ایک چیز گم ہوئی نظر آئی ؎

اسی ہندوستان میں دھرم کی مذہب کی دُنیا میں
تمدن کو جنوں کی لہر میں بہتا ہوا دیکھا

نظامِ زندگانی میں کچھ ایسا انقلاب آیا
مکانوں کے مکیں بدلے مکینوں کے مکان بدلے
اِدھر صیاد پھرتے تھے اُدھر صیاد پھرتے تھے
کچھ اس انداز سے میرے گلستاں میں بہار آئی
مجھے کیا پھر نویدِ جشنِ آزادی سُناتے ہو
ابھی تک میں وہ پہلا جشنِ آزادی نہیں بھولا
چمن اہلِ چمن کے ہاتھ میں تم دیکھ کر خوش ہو
مگر میں اختتامِ دورِ صیادی نہیں بھولا

شاعر ایک طرف وطن (پاکستان) کو نزہت و نور اور دائمی آب و تاب کہتا ہے وہیں کس خلوص و محبت، عاجزی و انکساری اور پُر درد لہجے میں منت و سماجت بھی کرتا ہے کہ اے وطن میں بادِ سحر کی طرح اپنے وطن آیا ہوں تجھے قسم ہے عہدِ رفتہ کی کہ مجھے وہ تمام خوشیاں اور وہ لمحات لوٹا دے جو کبھی میرے لیے خوشی و مسرت کا سامان تھیں میں قلیل وقت کے ساتھ تیری طرف تیز گام ہوں ؎

نور کا جوہر ہے تیری خاک میں
کشتی رقصاں ہے تیری ادراک میں
دشتِ غربت چھوڑ کر آیا ہوں میں
صورتِ بادِ سحر آیا ہوں میں

تو مجھے میری امانت سونپ دے
پھر مجھے میری محبت سونپ دے

دوسری طرف واگہ کی سرحد پر شاعر کس کرب و اضطراب اور رنج و غم کا شکار ہوتا ہے (وطن میں خود کو پرایا کہنا اور اپنوں کی جستجو کوئی معنی نہیں رکھتی، اس کا تصور آزاد کے وسیع خیالات کی غمازی ہے پھر وہیں آزاد اپنی غلط فہمی کو کچھ اس انداز سے دور کرتا ہے کہ اے آزاد تو اپنے وطن کی حسین و دلفریب وادیوں کو بھول بیٹھا سمجھے کیا خبر کہ یہاں کی مٹی اور اس مٹی سے وابستہ یہاں کی ہر ایک چیز تیرے فراق میں گریہ کناں ہی نہیں بلکہ تجھے اپنے سینے سے لگانے کے لیے مضطرب و بیقرار بھی ہے، تجھے قسم ہے عہد رفتہ کی تو اپنے دیارِ وطن کو واپس آجا، تجھے چھوڑ کر وطن سبز و شاداب نہیں ہے

مری زمیں پہ ترا جب کہیں نشاں نہ ملا
تڑپ تڑپ کے ستاروں نے تجھ کو یاد کیا
ترے فراق میں گریاں ہے چشمِ راوی و سندھ
اسی فضا اسی بزمِ کہن کو واپس آ

یہاں شاعر کی وسیع النظری اور حسنِ ظن کا قائل ہونا پڑتا ہے جو حقیقت نگاری کی اچھی مثال ہے۔

آزاد لاہور کو علم و ادب کا گہوارہ مانتے ہیں، ان کو پورا لاہور علم کی خوشبو سے معطر نظر آتا ہے۔ وہ اس حالت میں ایک خاص قسم کا کیف و سرور محسوس کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :۔

خطۂ لاہور منزل گاہِ تہذیب و ادب
علم کے انوار سے روشن ہیں جسکے روز و شب

لاہور کی شان میں قصیدہ کہنے کے بعد آزاد لاہور سے کس سوز و گداز اور کرب سے دوچار ہوتا ہے جو وطن سے رفاقت اور وفاشعاری کی نادر مثال ہے آزاد وطن عزیز سے گلہ و شکوہ کرتا ہے لیکن اس میں بھی خلوص و محبت کا جذبہ نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے ؎

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں
تری محفل سے جو ارمان و حسرت لے کے نکلا تھا
وہ حسرت لے کے آیا ہوں وہ ارماں لیکے آیا ہوں

آزاد کے کلام پر اقبال کا بھی گہرا اثر ہے جس کا اعتراف جا بجا اپنے اشعار میں کیا ہے۔ آزاد نے اقبال کے مزار پر خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد اقبال سے بہت ساری دعائیں اور نصیحتیں لیں اس طرح اقبال کے ایک شعر میں رد و بدل کر کے اقبال سے ابدی و دائمی رشتہ جوڑ لیا ؎

اقبال: اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

آزاد: اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہوں میں
مرے لیے ہے ترا شعلۂ نوا قندیل

روحِ تاجور کی آواز کے عنوان سے آزاد نے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر انسانیت کے جذبے کو دل میں جگانے کی مخلصانہ کاوش کی ہے مسلمانوں کی وفا اور عظمت کا دم بھرتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہند میں کوئی غیر نہ کہنے پائے اس کے لیے خود کو پند و نصیحت کرتے ہیں کہ اے آزاد تو نے اگر مسلمانوں کی حفاظت کی اور مسلمانوں سے ہمدردی کی تو دیکھ لینا یہ مردِ مجاہد (مسلمان)، وطن اور وطن کے لوگوں کے لیے اپنی جان لٹا دے گا ؎

اس طرح مسلم رہے ہندوستاں کی گود میں
جس طرح رہتا ہے بچہ اپنی ماں کی گود میں
جاں لٹا دیگا یہ خود ہندوستاں کے واسطے
جس طرح مٹتا ہے بلبل گلستاں کے واسطے

اقبال اور تاجور نجیب آبادی کے مزار پر خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد آزاد مختلف اوقات میں اصحاب علم دوست سے ملاقات کی وہ اپنے احساسات اور جذبات اور دوستوں کے تاثرات کو شعر کے قالب میں ڈھال کر ذہنی سکون محسوس کرتے ہیں۔

آزاد کی غزلوں میں بھی وطن کی جدائی کا کرب پایا جاتا ہے جو آزاد نے زندگی سے دوچار ہو کر کہی ہیں وطن سے انسیت اور وطن کی ہر ایک شئے سے لگاؤ اور محبت فطری عمل ہے۔ تمام واقعات و حادثات آزاد کے دلی جذبہ و احساس کا پتہ دیتے ہیں جو بے جا طوالت اور بھرتی کے الفاظ سے پاک ہیں۔ وسعت خیال، زبان و بیان میں سلاست و روانی، تشبیہات و استعارات اور سادگی و لطافت، شگفتہ اسلوب سے عبارت ہے۔ بقول عبدالمجید سالک ؎

"کس قدر سادہ، کس قدر سلیس اور سہل ممتنع غزل ہے جس کو پاکستانیوں نے جتنی دفعہ بھی آزاد کے پُر درد لہجے میں سُنا، ان کے دلوں سے ہُوکیں اُٹھی ہیں۔"

اس ضمن میں شعر ملاحظہ کریں ؎

اے دستِ بُردِ گردشِ ایام کچھ تو کہہ
پنہاں دلوں میں تھے جو خزانے کہاں گئے
غنچۂ و گُل کی نہ کہہ شاخِ نشیمن کی نہ پوچھ
یوں بہار آئی کہ سارا گلستاں گُم ہو گیا
جادۂ منزل اگر گم ہے تو اس کا غم نہیں
غم یہ ہے سالارِ دلستاں کا رواں گم ہو گیا

آزاد کو بعض دعاوت کے طوفاں میں منزل کا پتہ گم ہونے کا غم نہیں بلکہ آزاد کو اپنے کارواں یعنی زندگی سے وابستہ کائنات کی ہر ایک شئے کے مفقود ہونے کی فکر ہے۔ اس سے ان کا خلوص ٹپکتا ہے۔ آزاد کی نظموں اور غزلوں کی طرح رباعیات اور قطعات بھی پُر مغز اور جاں سوز ہیں۔ آزاد نے رباعیات کی تمام بحور اور اوزان کا بھی خاص خیال رکھا ہے یہ رباعیات

پاکستان کے احساسات و جذبات کی آئینہ دار ہیں۔
رباعی ملاحظہ کریں :-

جب یادِ وطن کے صبح و شام آتے ہیں
میٹھے دردِ نہاں کا دل پہ برساتے ہیں
لمحاتِ گذشتہ بن کے شمشیر و سناں
بے ساختہ روح میں اُتر جاتے ہیں

جگن ناتھ آزادؔ نے "پاکستان" کے عنوان سے پاکستان کو آخری سلام کرتے ہیں اور پاکستان کی بعض کمیوں کی طرف خلوص و محبت کے ساتھ نشاندہی کرتے ہیں :-

اے مری ارضِ وطن! اے ارضِ پاکستاں سلام
بھیجتا ہے آج تجھ پر تیرا اک مہماں سلام
کارخانوں کی کمی محسوس کرتا ہوں یہاں
چھیڑ اب شہروں کی دنیا میں مشینی داستاں
علم کہتا ہے کہ سرحد کی زمیں میں تیل ہے
آج کی ساری سیاست تیل ہی کا کھیل ہے
یہ فقط رنگینیٔ گفتار کی باتیں نہیں
یہ حقیقت ہے فقط اشعار کی باتیں نہیں
تجھ سے رہ کر دُور میں تجھ کو بھلا سکتا نہیں
نقشِ اُلفت اپنے سینے سے مٹا سکتا نہیں

حاصلِ کلام یہ ہے کہ "وطن میں اجنبی" شاعر کے جذبۂ فراقِ وطن اور کربِ وطن سے مملو ہے اس میں وطنِ عزیز سے والہانہ عقیدت کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔ آزادؔ کے اشعار میں میرؔ کا لب و لہجہ، سوز و گداز اور کرب و اضطراب بھی ہے اور اقبالؔ کے وسیع خیالات اور اسلوب و ادا کی جلوہ گری بھی ہے۔ آزادؔ کی شاعری زبان و بیان کی برجستگی، سادگی و لطافت، شگفتہ اسلوب، پاکیزگیٔ حسن و خیال اور اور موضوع و مواد کے اعتبار سے تنوع رکھتی ہے جو آزادؔ کے حساس طبع اور سنجیدہ ہونے کی غماز ہے، انھیں اوصاف کی بناء پر آزادؔ عصرِ حاضر کے اُردو شعراء میں امتیازی شان کے حامل ہیں۔ بقول عبدالمجید سالکؔ۔

"جگن ناتھ آزادؔ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت درد و اثر ہے، جو خلوصِ احساس کے بغیر ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ زبان کی گھلاوٹ، بیان کی سلاست اور حقیقت بینی نے اس کو برِّصغیر ہند و پاک کی صفِ اوّل میں جگہ دے دی ہے"

●

بقیہ: کوآپریٹو سوسائٹیاں

میں سے ابھی تک ۲۹ میں لگائے جا چکے ہیں۔

کوآپریٹو سوسائٹیاں فاضل اناج کو جمع کرنے کے لیے مال گودام منظور کراتی ہیں۔ ۱۹۸۴ء تک ان کے پاس منظور شدہ ۳۵۶۸۰ گودام تھے جن میں ۴۰۰ ۸۴۸ ء۳ ٹن اناج جمع رکھا جا سکتا ہے۔ مگر یہ پوری ریاست کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر پاتا ہے اس لیے حکومت نے مزید ۱۱۱ گودام قائم کرنے کی منظوری دے دی ہے۔

حکومت ان کوآپریٹو سوسائٹیوں کو ایسا آفس قائم کرنے کے لیے بھی سہولت دینے کا ارادہ رکھتی ہے جہاں سے کھیتی میں کام آنے والی ضروری اشیاء جیسے بیج، کھیتی میں کام آنے والے اوزار اور کھاد دستیاب ہو سکیں۔ اگر یہ تمام چیزیں کسانوں کو آسانی سے مل سکیں گی تو انھیں کھیتی باڑی کرنے میں آسانی ہوگی۔

پہاڑی علاقے کے لوگ پہاڑوں اور جنگلوں سے جڑی بوٹی حاصل کیا کرتے ہیں۔ یہ کوآپریٹو سوسائٹی ان لوگوں کو بھی مدد پہونچاتی ہے تاکہ یہ سائنسی طریقے پر جڑی بوٹی جمع کر سکیں اور دُور دراز علاقوں میں اسے آسانی سے بھیج سکیں اس سلسلے میں ہلدوانی کے ادویاتی ادارے کی کوششیں قابلِ تحسین ہیں۔

یہ ادارہ پھل پیدا کرنے والوں کی معاشی حالت سدھارنے میں بھی معاون ثابت ہو رہا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اترپردیش میں کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ذریعے دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔

ذیل میں درج گوشوارے سے اترپردیش میں کوآپریٹو اداروں کی ترقی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جا سکتی ہے :-

گوشوارہ : اُترپردیش میں کوآپریٹو سوسائٹیاں

سبھی طرح کی کوآپریٹو سوسائٹیاں	۲۰۵۰۴
قرض دینے والی دیہی کوآپریٹو سوسائٹیاں	۸۶۰۲
ممبران	۴ء۱۱۰ لاکھ
کُل پونجی	۵۱ء۶۹۷۷۵ لاکھ روپیہ
قرض دیا گیا	۰۰ء۱۱۰۵۳ لاکھ روپیہ

●

بقیہ: آندھرا پردیش میں تعلیمی ترغیبات

کو تقسیم کر دئے جائیں گے۔ اور تقسیم کا کام ضلع کے ایجوکیشنل آفیسرس کے تفویض کیا گیا ہے۔

۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران تقریباً ۲۳ء۱۰ لاکھ طلبا اور ۲۸ء۷ لاکھ طالبات کو جو پہلی اور دوسری جماعتوں میں زیرِ تعلیم ہیں اس اسکیم کا فائدہ پہونچے گا۔ اس تعلیمی اسکیم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دیہی مدارس میں طلباء کی تعداد میں اضافہ ہو اور آنے والی نسل میں ناخواندگی باقی نہ رہے۔

●

[redacted]

غزلیں

سیّد غلام سمنانی
شعبۂ انگریزی، ذاکر حسین کالج (ایوننگ)
اجمیری گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

جمتیں، پابندیاں، دشواریاں
کیا یہی ہیں آپ کی غم خواریاں
یاد ہیں وہ ہجر کی شب، تا سحر
کروٹیں، بے چینیاں، بیداریاں
ں کی محفل میں تھیں کتنی بامزہ
عزشیں، سرمستیاں، سرشاریاں
کھو کے سب کچھ عشق میں ہاتھ آئی ہیں
ذلتیں، رسوائیاں، اور خواریاں
شتِ غم میں ہوگئیں حاصل مجھے
بعتیں، سرداریاں، سالاریاں
ہوگئیں کافور پیشِ حسن یار
نخوتیں، خود بینیاں، خود داریاں
ہوگئیں کن غفلتوں میں آپ کی
نتیں، دل سوزیاں، دلداریاں
ہیں ہمیں عصیاں شعاروں کے لیے
رحمتیں، ستاریاں، غفاریاں
وقت مرہم کام آخر آگئیں
میرے زخمِ دل کی دامن داریاں

●



تعظیم احمد گوہر: معرفت محمد ایوب
محلّہ بکی سرائے۔ نزد مسلم کلب، مظفر پور (بہار)

بس حرفِ خدا حرفِ مکرر نہیں ہوتا
جو ساری کتابوں کو میسّر نہیں ہوتا
وہ چشمۂ حیواں ہو کہ ہو قلزمِ ہستی
بے موج اگر ہے تو سمندر نہیں ہوتا
کس قطرے میں دریا کی روانی نہیں ہوتی
کس ذرّے میں خورشید منور نہیں ہوتا
وہ کون رگِ حس ہے جو زخمی نہیں ہوتی
وہ کون سا لمحہ ہے جو خنجر نہیں ہوتا
ہر ٹوٹنے والا یہاں شیشہ ہی نہیں ہے
ہر توڑنے والا یہاں پتھر نہیں ہوتا
یا چشمۂ حیواں میں صدف ہی نہیں باقی
یا قطرۂ نیساں ہے کہ گوہر نہیں ہوتا

●



سحر واحدی، قنوجی، ویٹ ہوسپٹل
شمس آباد، فیض باغ، فرخ آباد (یو۔ پی)

الف اتفاقاً جو کوئی ہمارا ہوا
مصلحت پر محبت کا دھوکہ ہوا
شامِ غم وہ بھی لمحات آئے کہ جب
نالہ دل سے جو نکلا تو شعلہ ہوا
کوئی پیمانۂ صبر چھلکا اگر
ہم نے دیکھا زمانے کو ہنستا ہوا
جو کہ دیکھیں کسی سے گلہ کیوں کریں
پہلے ہم کیا تھے اور اب ہمیں کیا ہوا
کس شہیدِ محبت کا ماتم ہے یہ
چہرۂ حسن بے آج اترا ہوا
جب بھی محنت کشوں کا پسینہ بہا
مثلِ گلزار ہر ایک صحرا ہوا
کس طرح اُن سے شکوہ کریں اے سحر جب
دل ہمارا ہی ہے ہم سے روٹھا ہوا

●

قطعات

واحد پریمی: نزد گنوری اسکول بھوپال ۴۶۲۰۰۱

(۱)

مرے شعور کی کرنیں ہیں اس طرح ضو ریز
کہ جیسے غم کے اندھیروں میں ماہتاب ہوں میں
مرا وجود غنیمت ہے میری قدر کرو
فضائے جنگ میں اک نغمۂ رباب ہوں میں

(۲)

جب چہرۂ گیتی پہ ملے شام کے سائے
ہم وقت کے ماتھے کی کرن بن کے رہے ہیں
ہر عہد میں ظلمت کے نشاں ہم نے مٹائے
ہر عہد میں تنویرِ وطن بن کے رہے ہیں!

●

نظمیں



ہمارا کارواں بڑھتا رہے گا

جرّار چھولسی ، جی ۔ ۲۸ ، طبیہ کالج ، قرول باغ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۵

شعورِ دوستاں بڑھتا رہے گا سکونِ جسم و جاں بڑھتا رہے گا
ترقی کا نشاں بڑھتا رہے گا یوں ہی عزمِ جواں بڑھتا رہے گا
ہمارا کارواں بڑھتا رہے گا
وقارِ پاسباں بڑھتا رہے گا

نہیں مشکل کبھی اب تو کوئی مشکل نظر آنے لگا طوفاں بھی ساحل
چلے ہیں لے کے ہم وہ عزم کامل قدم چومے گی خوشحالی کی منزل
ہمارا کارواں بڑھتا رہے گا
وقارِ پاسباں بڑھتا رہے گا

بہاریں خیمہ زن ہوں گی چمن میں خوشی پھیلی ہوئی ہوگی وطن میں
رہیں گے وادیٔ گنگ و جمن میں نظر آئیں گے ہم ہر انجمن میں
ہمارا کارواں بڑھتا رہے گا
وقارِ پاسباں بڑھتا رہے گا

بہت ہی کیف پرور ہے نظارا بہت روشن ہے مستقبل ہمارا
کبھی جہدِ مسلسل نے پکارا کبھی ہمت نے یہ کہہ کر ابھارا
ہمارا کارواں بڑھتا رہے گا
وقارِ پاسباں بڑھتا رہے گا

جھٹک کر گرد اپنے دامنوں سے بڑھیں گے جنگلوں سے گلشنوں سے
نہیں ہم ڈرنے والے دشمنوں سے نہیں گھبرانے والے اُلجھنوں سے
ہمارا کارواں بڑھتا رہے گا
وقارِ پاسباں بڑھتا رہے گا

محبت کی جہانبانی ملے گی مسرت کی فراوانی ملے گی
بہر منزل تن آسانی ملے گی یقیناً شوق سامانی ملے گی
ہمارا کارواں بڑھتا رہے گا
وقارِ پاسباں بڑھتا رہے گا

حیات افروز علم و فن رہیں گے نہ ہوں گے ہم مگر مدفن رہیں گے
ترقی یافتہ مسکن رہیں گے مہکتے رات دن گلشن رہیں گے
ہمارا کارواں بڑھتا رہے گا
وقارِ پاسباں بڑھتا رہے گا

جمال ہاشمی : ۵۶۲ وویکانند نگر ، غازی آباد۔

آدم کی اولاد یہ سارے
تن کے اُجلے ، کالے ۔ کالے
موٹے ، چھوٹے ، بوڑھے بچے
اِس حصے کے ، اُس خطے کے
روحوں کا کشکول اٹھائے
آنکھیں سب کی بول رہی ہیں
روٹی مت دو
روزی مت دو
دوا ، پانی ، کپڑے مت دو
سورج کی بارش ہونے دو
سایہ مت دو
دے سکتے ہو . . . .
ابنِ آدم ، میرے بھائی
تم آدم کو . . . .
امن سکوں کی بھیک ہی دے دو
موت کی منزل سے پہلے
جی لینے کی مہلت دے دو !!

زاہد اختر : ۵/لے ، اقبال پورلین ، خضر پور ، کلکتہ ۲۳

تم نہ کہتے تھے ؟
آتے ہی گھر میں میرے
اب یہ کمرے کی بتی بجھا دیجئے
کیونکہ ، میرے لیے
آپ ہی روشنی ہیں !
مگر
آج دن کے اُجالے میں
بتی جلانے کے بھی باوجود
ایسا لگتا ہے
جیسے اندھیرے میں تھے
ہم اندھیرے میں ہیں

لوئیجی پرانڈیلو
مترجم: سلمان قریشی

گھاس کا لمس!

وہ لوگ برابر کے کمرے میں داخل ہوئے، جہاں وہ ایک بڑی کرسی پر سو رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ تابوت کو بند کرنے سے پہلے کیا وہ آخری بار اُس کی شکل دیکھنا چاہے گا۔

"اندھیرا ہو گیا، کیا وقت ہوگا" اُس نے پوچھا۔

حالانکہ ابھی دن کے ساڑھے نو بجے تھے، مگر بادل چھائے ہوئے تھے اور روشنی بہت مدھم تھی۔ دفن دس بجے مقرر تھا۔

پادری نے تھکی تھکی نظروں سے اُن لوگوں کو دیکھا۔ اس کو یقین نہیں آیا کہ وہ ساری رات اتنی دیر تک اتنی اچھی طرح سویا۔ نیند اور پچھلے کچھ دنوں کے غم سے اس کے احساسات اب بھی سُن ہو رہے تھے۔ دل تو چاہا کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کر لے۔ بند کر دے اُس مدھم سی روشنی کو بھی جس میں پڑوس کے لوگ اُس کی کرسی کے گرد کھڑے نظر آ رہے تھے۔ مگر نیند جیسے ایک بھاری پتھر کی گرانی لیے ہوئے اُس کے بدن کو دبائے ہوئے تھی، ایک ہلکی سی جنبش، جو اس کے پیروں کو کھڑا ہونے پر اُکسانے لگی تھی، اچانک ہی غائب بھی ہو گئی۔ کیا

وہ اس وقت بھی اپنے رنج کو اپنے اوپر غالب ہونے دے؟ غیر ارادی طور پر اُس نے ذرا اُونچی آواز میں کہا "ہمیشہ" مگر کچھ اس انداز سے جیسے کوئی سونے کی تیاری کرتے ہوئے بستر میں گھستے ہوئے بولے۔

وہاں جمع لوگوں نے اُسے سوالی نظروں سے دیکھا، جیسے پوچھ رہے ہوں، ہمیشہ کیا؟ ہمیشہ اندھیرا، دن کے وقت بھی، وہ کہنا چاہتا تھا، مگر پھر اسے یہ بے معنی سا لگا۔ آج... اُس کی موت کے ایک دن بعد، اُس کے دفن کے دن... یہ مدھم سی روشنی، اپنی گہری نیند... اور وہ برابر کے کمرے میں مردہ پڑی ہوئی... یہ سب اُسے یاد رہے گا۔

شاید کھڑکیاں۔

"کھڑکیاں۔"

کھڑکیاں ابھی تک بند تھیں۔ رات بھر بند رہیں۔ اُن بڑی بڑی پگھلتی ہوئی موم بتیوں کی اک گرم سی آنچ اندر بسی ہوئی تھی۔ پلنگ باہر نکال دیا گیا تھا، اور وہ اپنے سجے ہوئے تابوت میں پڑی تھی، ملائم اطلس کے درمیان اکڑی ہوئی، زرد سی۔

نہیں... بس۔ بہت دیکھ چکا۔

اُس نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا جو پچھلے کچھ دنوں سے رونے کی وجہ سے جلنے لگی تھیں۔ بس۔ وہ سو لیا تھا اور اُس کی نیند جیسے سب کچھ بہا کر لے گئی تھی۔ اب اسے کچھ اطمینان محسوس ہوا اور ایک اندوہناک خلاء کا احساس۔ بند کر دیں لوگ تابوت کو اور لے جائیں اُس کے ساتھ وہ گزشتہ زندگی کی وابستگی بھی۔ مگر پھر... بہرحال وہ اب بھی وہاں تھی۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور لڑکھڑایا۔ لوگوں نے سہارا دیا۔ آنکھیں بدستور بند رہیں اور لوگ اُس کو کھینچے ہوئے تابوت کی طرف لے چلے۔ آنکھیں کھولیں، اُس کو دیکھا، اور اُس کا نام لے کر پکارا۔ وہ نام جو اب تک صرف اُس کے لیے زندہ تھا۔ اُن کی مشترکہ، اور بھرپور زندگی میں جس نام سے اُسے دیکھا اور جانا۔ اُس نے اُن لوگوں کو خفگی سے گھورا جو اُسے موت کی گود میں ساکت پڑا دیکھ رہے تھے۔ یہ لوگ کیا جانیں وہ کیا تھی؟ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اُس کی موت سے وہ کتنا محروم ہو گیا تھا۔ دل چاہا کہ وہ چلّائے، اور شاید اُس کی یہ حالت واضح بھی ہو گئی کیونکہ اُس کا لڑکا جلدی سے آگے بڑھ کر اسے الگ لے گیا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ اس کا مطلب کیا

یہ بات اسے پھر کھٹکی، جیسے آپ سے جرم ہو گیا ہو۔ شرم کی بات تھی! رات بھر سونے کے باوجود آخری وقت تک یہ احمقانہ خیالات! اب ان کو جلدی کرنا چاہیے۔ تاکہ اُن دوست احباب کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے جو تابوت کو چرچ لے جانے کے لیے آئے تھے۔

"پاپا، اب آپ کو ذرا سنبھلنا چاہیے۔"

آنکھوں میں غصّہ اور ملال بھرے ہوئے وہ واپس اپنی کرسی پر آ گیا۔ سنبھلنا چاہیے! ہاں کیا فائدہ اُس کرب کو یوں چلّا کر ظاہر کرنے سے جو اُس کے دل میں بھرا ہوا تھا اور جو کسی بھی آواز یا حرکت کی شکل میں نہیں ڈھل سکتا تھا۔ یہ محرومی کتنی مختلف تھی دونوں کے لیے۔ ایک مرد کے لیے ایسی عمر میں رنڈوا ہو جانا، جس کے دل میں اپنی بیوی کے لیے اب بھی خواہشات ہوں، اور ایک بیٹے کے لیے جس کا اس عمر میں یتیم ہونا تقریباً بروقت ہو۔ بروقت اس لیے کہ وہ شادی کرنے ہی جا رہا تھا، اور سوگ کے تین مہینہ کی مدت کے فوراً بعد کر بھی لے گا۔ اب تو وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ گھر کی دیکھ بھال کے لیے ایک عورت کا ہونا بہتر ہی ہوگا۔ ڈیوڑھی سے لوگوں نے آواز دی،

"پادری، پادری۔"

اُس کا رنج کچھ اور گہرا ہوا جب یہ بات پہلی مرتبہ اُس پر واضح ہو گئی کہ اس نام سے اس کو نہیں، اس کے بیٹے کو پکارا جا رہا تھا۔ اب یہ خاندانی نام اُس سے زیادہ اُس کے بیٹے کا ہو گیا۔

اب جو چیز اُسے زندہ رکھنے کے لیے سب سے اہم تھی وہ یہ جاننے کی خواہش تھی کہ گھر کا نیا نظام کیا ہوگا۔ مثلاً اس کے سونے کا انتظام کہاں کیا جائے گا؟ بڑے ڈبل بیڈ کو ہٹا دیا گیا تھا۔ کیا چھوٹے پلنگ پر؟ اس نے سوچا۔ شاید بیٹے کے چھوٹے پلنگ پر۔ تو اب اسے چھوٹا پلنگ ملے گا اور اُس کا بیٹا ڈبل بیڈ پر سوئے گا اپنی بیوی کے ساتھ، اُس کے پہلو میں۔ اور وہ، اکیلا چھوٹے پلنگ پر لیٹا ہوا، خلاؤں میں اپنی باہیں پھیلائے گا۔ اسے عجیب قسم کی بے حسی اور اُلجھن سی محسوس ہوئی اور ایک خالی پن، اپنے اندر اور باہر بھی۔ اتنی دیر بیٹھے رہنے سے اُس کا بدن سُن ہو چکا تھا۔ اُسے لگا کہ اگر اُس نے اب اُٹھنے کی کوشش کی تو وہ ایک ہلکے سے پَر کی طرح اُڑ جائے گا۔ کچھ بھی تو نہیں رہا تھا اب اُس کی زندگی میں۔ اپنے آپ اور اُس پڑی کرسی میں کوئی خاص فرق نہ نظر آیا۔ کرسی تو پھر بھی اپنی چار ٹانگوں پر کھڑی تھی جبکہ اُس کو اپنے ہاتھ پیروں کا کوئی مصرف نہ نظر آیا۔ کیا فکر تھی اسے اب اپنی زندگی کی۔ یا دوسروں کی زندگی کی۔ مگر بہر حال زندگی ہے تو بسر کرنی ہی ہوگی۔ ایک نئی زندگی، جس کا اُس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ اور جس کے بارے میں اب اس کی زندگی کے حادثات نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یوں دفعتاً معزول، نہ وہ بوڑھا ہی تھا اور نہ جوان۔

وہ مسکرایا اور بے پروائی سے اپنے کندھوں کو جھٹکا دیا۔ اپنے بیٹے کے لیے وہ اچانک پھر ایک بچّہ ہو گیا تھا۔ مگر بہر حال، جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ ہر باپ اپنے اُن بیٹوں کے سامنے بچّے ہوتے ہیں جن کے دل میں زندگی کی اُمنگ ہوتی ہے اور جو دنیا میں کامیاب ہو کر رُتبے میں اُن سے اونچے ہو جاتے ہیں۔ باپ پھر کم عمر ہو جاتے ہیں اور اُن کو کوئی کام نہیں کرنے دیا جاتا، تاکہ لڑکے اپنے وہ احسان چُکا دیں جو اُن پر بچپن میں ہوئے تھے۔

چھوٹا پلنگ ......

مگر اُس کو تو وہ چھوٹا کمرہ بھی نہ ملا جہاں اس کا بیٹا سوتا تھا۔ دالان کے باہر والا کمرہ یہ کہہ کر دے دیا گیا کہ وہاں وہ زیادہ آزادی محسوس کرے گا اور بغیر کسی پابندی کے رہ سکے گا۔ اس کمرہ کو اتنی اچھی طرح سجا دیا گیا کہ کسی کو یہ اندازہ نہ ہو کہ پہلے یہ نوکروں کا کوارٹر تھا۔ شادی کے بعد سامنے کے کمرے نئے سامان سے آراستہ، سجا بنا دیے گئے تھے۔ قالین تک بچھ گئے تھے۔ گھر کی شکل و صورت اب بالکل بدل چکی تھی۔ اس چھوٹے سے تاریک کمرے میں اس کا سارا فرنیچر آ گیا تھا، نوجوانوں کی زندگی کی تگ و دو سے وہ الگ ہو چکا تھا، لیکن گھر اپنا گھر نہیں لگ رہا تھا۔ مگر عجیب بات تھی کہ اس کو وہ غیریت گراں نہ گزری جو اُس کے اور پُرانے فرنیچر کے ساتھ برتی جا رہی تھی، کیونکہ وہ نئے کمروں اور اپنے بیٹے کی کامیابی سے خوش تھا۔

مگر کوئی اور گہرا سبب تھا جو ابھی پوری طرح واضح نہ ہوا تھا، ایک آبدار اور خوش رنگ نئی زندگی کی اُمید، جو پرانی یادوں کو مٹاتی جا رہی تھی۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا کہ شاید اُس کی زندگی بھی ایک نیا روپ لے۔ غیر شعوری طور پر اُسے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اُس کے پیچھے ایک روشن در کھلا ہوا ہے، جس میں سے اُسے وقتِ ضرورت باہر جانے میں آسانی ہوگی، کیوں کہ اب اُسے اس چھوٹے کمرے کی تنہائی میں چھوڑ کر سب اس کی طرف سے بے فکر تھے کہ وہ "جو جی چاہے کرے" اس کو بہت اطمینان ہوا۔ آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی جو ہر چیز کو ایک انوکھی رنگت میں رنگتی چلی گئی، جیسے اُسے پھر سے بچپن مل گیا ہو۔ اُس کی آنکھیں بھی بچّوں کی طرح ہو گئیں۔ بشاش اور ہر لمحہ نئی دنیا پر محوِ حیرت۔

اس نے اپنی اس باقی زندگی کی فرصت گزارنے کے لیے صبح کو ٹہلنا اپنا معمول بنا لیا۔ ساری

ذمہ داریوں سے بری، اُس نے اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے اپنی پنشن میں سے کچھ رقم اپنے بیٹے کو دینے کا انتظام کر دیا۔ یہ رقم کچھ زیادہ نہ تھی۔ حالانکہ اُسے کچھ چاہیئے نہ تھا لیکن اُس کے بیٹے کا کہنا تھا کہ اُسے کچھ رقم اپنے پاس اپنی ضرورت کے لیے بھی رکھنی چاہیئے۔ مگر کیسی ضرورت؟ وہ تو بس دنیا کا ایک تماشائی بن کر رہنے میں ہی مطمئن تھا۔

اُس نے اپنی گزشتہ زندگی کے تجربوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور اس کی گزر اب عمر رسیدہ لوگوں کے ساتھ نہ ہوتی تھی۔ وہ اُن سے کتراتا تھا۔ نوجوان اُس کو بوڑھا سمجھتے، لہٰذا وہ پارک چلا گیا جہاں بچے کھیلتے تھے۔

اس طرح اُس نے اپنی نئی زندگی کا آغاز ایک سبزہ زار میں کیا جہاں بچے گھاس میں کھیل رہے تھے۔ کتنی فرحت بخش خوشبو تھی۔ لمبی، گھنی اور تازہ گھاس کی۔ بچے وہاں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ کہیں سے آتی جھرنے کی آواز نے پتیوں کی سرسراہٹ کو دبا دیا تھا۔ بچوں نے کھیل کود چھوڑ اپنے جُوتے موزے اُتار دئے۔ کیسا مزہ آ رہا تھا اُس تر و تازہ، نرم گھاس کے اندر ننگے پاؤں دھنس جانے میں! اس نے اپنا ایک جُوتا اُتارا اور چپکے چپکے دوسرا بھی اُتار رہا تھا کہ ایک کم عمر لڑکی سامنے نظر آئی۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ "سُور" وہ چلّائی، اُسکی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

لڑکی کے کپڑے سامنے کی طرف سے ایک جھاڑی میں اُلجھے ہوئے تھے اور کیونکہ وہ نیچے بیٹھا اوپر اُس کی طرف دیکھ رہا تھا، لڑکی نے فوراً کپڑوں کو چھڑا کر اپنی ٹانگوں کو ڈھک لیا۔

وہ مبہوت سا ہو گیا۔ کیا سوچ رہی تھی وہ؟ لڑکی جا بھی چُکی تھی۔ وہ تو بچوں کے معصومانہ کھیلوں سے لُطف اندوز ہونے آیا تھا۔ اُس نے جھک کر ہاتھوں سے اپنے سخت ننگے پاؤں کو چھوا۔ اُس لڑکی کو کیا بات ناگوار ہوئی؟ کیا وہ ایسا بوڑھا ہو گیا تھا کہ بچوں کو ننگے پاؤں گھاس میں دوڑتے دیکھ کر اُن کی خوشی میں بھی شریک نہ ہو سکتا تھا؟ وہ بوڑھا تھا تو کیا اس کے یہ معنی تھے کہ اُس کی نیت خراب تھی؟ آہ، یہ تو وہ جانتا تھا کہ اگر ضرورت ہوئی تو پل بھر میں وہ ایک بچے سے ایک مرد بن سکتا تھا۔ تھا تو وہ بہرحال مرد ہی، مگر اس بارے میں کچھ سوچنا نہ چاہتا تھا۔ بالکل کچھ سوچنے پر آمادہ ہی نہ تھا۔ وہ سچ مچ اپنے جُوتے اُتارتے وقت ایک بچہ سا بن گیا تھا۔ اُس لڑکی نے اس طرح اُس کی توہین کر کے کتنی زیادتی کی تھی! وہ گھاس پر اوندھے مُنہ گر گیا۔ اب اُس کے غم، محرومی اور ہر روز کی تنہائی کے پیدا کئے ہوئے اس جذبہ کو ایک کمینی حرکت سمجھا جا رہا تھا۔ نفرت اور غصّہ سے اُس کا حلق خشک ہو گیا۔ بیوقوف لڑکی! اگر اُس کے دل میں وہ ہوتا، (جیسا کہ اُس کے بیٹے کا کہنا تھا، کہ اس کی کچھ تو "خواہشات" ہونگی) تو اسے پورا کرنے کے لیے اُس کے پاس کافی پیسہ تھا۔ وہ غصّہ میں بھرا اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجبوب حجبوب کانپتے ہاتھوں سے اُس نے پھر سے جوتے پہنے۔ سارا خون جیسے اُس کے سر میں کھنچ آیا تھا، اُس کی آنکھوں کے پیچھے نبض تیز چل رہی تھی۔ اسے معلوم تھا اُس کام کے لیے اُسے کہاں جانا چاہیئے۔ خوب معلوم تھا۔

قدرے مطمئن، وہ اُٹھا اور واپس گھر لوٹ آیا۔ یہاں فرنیچر کچھ اس طرح بکھرا پڑا تھا جیسے محض اسے طیش دلانے کو یُوں رکھا گیا تھا۔ وہ اپنے بستر پہ لیٹ گیا اور دیوار کی طرف کروٹ لے لی۔ ●

بقیہ ہلکی پھلکی انجنیرنگ کی صنعت

کو دشواری بھی ہوتی ہے اور شکایت بھی، معیار کو برقرار رکھتے ہوئے اعلیٰ قسم کے ہینڈ ٹولز چھوٹے پیمانے پر ہی بنائے جائیں تو ان کی خاصی کھپت ہوگی اور یہ منافع بخش کام ہوگا۔

یہ بات دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ ورکشاپ اور کارخانوں میں چاہے جتنی بھی خود کار مشینیں کیوں نہ لگائی جائیں۔ ہینڈ ٹولز کے بغیر گذارہ کرنا ناممکن ہے۔ چھوٹے سے کارخانے سے گاڑیاں اسمبل کرنے کے خود کار ریلانٹ تک انجینئرنگ کے ہر کام میں ہینڈ ٹولز بنیادی ضرورت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مستقبل میں ان کی طلب میں اضافہ ہی ہوگا۔ اس طرح چھوٹے دستی اوزار کا کارخانہ نہایت فائدہ بخش ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک جائزے کے مطابق اس قسم کی فیکٹری پر نو ساڑھے نو لاکھ روپیے کی لاگت آئے گی، جس میں زمین اور عمارت کی لاگت تقریباً دو لاکھ روپے اور مشینوں و دیگر ضروریات کے لیے چھ لاکھ روپیے کافی ہوں گے، منافع کی شرح کا اندازہ ڈیڑھ لاکھ سے پونے دو لاکھ روپیے سالانہ ہے۔

تالے سازی کا کارخانہ

تالہ سازی کی صنعت لائٹ انجنیرنگ کی صنعت کا ایک بہت قدیم اور مقبول شعبہ ہے۔ ہندوستان میں روایتی طور پر جو تالے بنائے جاتے ہیں ان کے بیشتر پُرزوں میں مائلڈ اسٹیل کی سلاخوں کے ٹکڑے اور تانبے کی چادریں استعمال ہوتی ہیں۔

ملک کے اندر تعمیراتی سرگرمیوں میں گزشتہ دس سال میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔

دکانوں، کارخانوں اور دفاتر کی بڑھتی ہوئی تعداد فرنیچر کے استعمال میں اضافے کی وجہ سے بھی تالہ سازی کی صنعت کی ترقی کے واضح امکانات موجود ہیں۔ ●

یہ بات بھر چھری کی طرح اُس کے سینے میں اتر گئی تھی۔ شرم کی بات تھی اور رات بھر سوچنے کے باوجود آخری وقت تک یہ احمقانہ خیال آیا: اب ان کو جلدی ہی کرنا چاہیے۔ "تاکہ اُن دوست احباب کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے جو تابوت کو چرچ لے جانے کے لیے آئے تھے۔

"پاپا، اب آپ کو ذرا سنبھلنا چاہیے۔"

آنکھوں میں غصہ اور ملال بھرے ہوئے وہ واپس اپنی کرسی پر آگیا۔ سنبھلنا چاہیے اماں۔ کیا فائدہ اُس کرب کو یوں چلّا کر ظاہر کرنے سے جو اُس کے دل میں بھرا ہوا تھا اور جو کسی بھی آواز یا حرکت کی شکل میں نہیں ڈھل سکتا تھا۔ یہ محرومی کتنی مختلف تھی دونوں کے لیے۔ ایک مرد کے لیے ایسی عمر میں رنڈوا ہو جانا، جس کے دل میں اپنی بیوی کے لیے اب بھی خواہشات ہوں، اور ایک بیٹے کے لیے جس کا اس عمر میں یتیم ہونا تقریباً بروقت ہو۔ بروقت اس لیے کہ وہ شادی کرنے بھی جا رہا تھا، اور سوگ کے تین مہینہ کی مدت کے فوراً بعد کر بھی لے گا۔ اب تو وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ گھر کی دیکھ بھال کے لیے ایک عورت کا ہونا بہتر ہی ہوگا۔ ڈیوڑھی سے لوگوں نے آواز دی، "پادری، پادری۔"

اُس کا رنج کچھ اور گہرا ہوا جب یہ بات پہلی مرتبہ اُس پر واضح ہوگئی کہ اُس نام سے اس کو نہیں، اس کے بیٹے کو بلایا جا رہا تھا۔ اب یہ خاندانی نام اُس سے زیادہ اُس کے بیٹے کا ہوگیا۔

اب جو چیز اُسے زندہ رکھنے کے لیے سب سے اہم تھی وہ یہ جاننے کی خواہش تھی کہ گھر کا نیا نظام کیا ہوگا۔ مثلاً اس کے سونے کا انتظام کہاں کیا جائے گا؟ بڑے ڈبل بیڈ کو ہٹا دیا گیا تھا۔ کیا چھوٹے پلنگ پر؟ اس نے سوچا شاید بیٹے کے چھوٹے پلنگ پر۔ تو اب اسے چھوٹا پلنگ ملے گا اور اُس کا بیٹا ڈبل بیڈ پر سوئے گا اپنی بیوی کے ساتھ، اُس کے پہلو میں۔ اور وہ، اکیلا چھوٹے پلنگ پر لیٹا ہوا، خلاؤں میں اپنی بانہیں پھیلائے گا۔ اسے عجیب قسم کی بے حسی اور اُلجھن سی محسوس ہوئی اور ایک خالی پن، اپنے اندر اور باہر بھی۔ اتنی دیر بیٹھے رہنے سے اُس کا بدن سُن ہو چکا تھا۔ اُسے لگا کہ اگر اُس نے اب اُٹھنے کی کوشش کی تو وہ ایک ہلکے سے پَر کی طرح اُڑ جائے گا۔ کچھ بھی تو نہیں رہا تھا اب اُس کی زندگی میں۔ اپنے آپ اور اُس بڑی کرسی میں کوئی خاص فرق نہ نظر آیا۔ کرسی تو پھر بھی اپنی چار ٹانگوں پر کھڑی تھی جبکہ اُس کو اپنے ہاتھ پیروں کا کوئی مصرف نہ نظر آیا، کیا فکر تھی اسے اب اپنی زندگی کی۔ یا دوسروں کی زندگی کی۔ مگر بہرحال زندگی ہے تو بسر کرنی ہی ہوگی۔ ایک نئی زندگی، جس کا اُس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ اور جس کے بارے میں اب اس کی زندگی کے حادثات نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یوں دفعتاً معزول، نہ وہ بوڑھا ہی تھا اور نہ جوان۔

وہ مسکرایا اور بے پروائی سے اپنے کندھوں کو جھٹکا دیا۔ اپنے بیٹے کے لیے وہ اچانک پھر ایک بچّہ ہوگیا تھا۔ مگر بہرحال، جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ ہر باپ اپنے اُن بیٹوں کے سامنے بچّے ہوتے ہیں جن کے دل میں زندگی کی اُمنگ ہوتی ہے اور جو دنیا میں کامیاب ہو کر رُتبے میں اُن سے اونچے ہو جاتے ہیں۔ باپ پھر کم عمر ہو جاتے ہیں اور اُن کو کوئی کام نہیں کرنے دیا جاتا، تاکہ لڑکے اپنے وہ احسان چُکا دیں جو اُن پر بچپن میں ہوئے تھے۔

چھوٹا پلنگ ....

مگر اُس کو تو وہ چھوٹا کمرہ بھی نہ ملا جہاں اس کا بیٹا سوتا تھا۔ دالان کے باہر والا کمرہ کہہ کر دے دیا گیا کہ وہاں وہ زیادہ آزادی محسوس کرے گا اور بغیر کسی پابندی کے رہ سکے گا۔ اس کمرہ کو اتنی اچھی طرح سجا دیا گیا کہ کسی کو یہ اندازہ نہ ہو کہ پہلے یہ نوکروں کا کوارٹر تھا۔ شادی کے بعد سامنے کے کمرے نئے سامان سے آراستہ، سجا بنا دیے گئے تھے۔ قالین تک بچھ گئے تھے۔ گھر کی شکل و صورت اب بالکل بدل چکی تھی۔ اس چھوٹے سے تاریک کمرے میں اس کا سارا فرنیچر آ گیا تھا، نوجوانوں کی زندگی کی تگ و دو سے وہ الگ ہو چکا تھا، لیکن گھر اپنا گھر نہیں لگ رہا تھا۔ مگر عجیب بات تھی کہ اس کو وہ غیریت گراں نہ گزری جو اُس کے اور پرانے فرنیچر کے ساتھ برتی جا رہی تھی، کیونکہ وہ نئے کمروں اور اپنے بیٹے کی کامیابی سے خوش تھا۔

مگر کوئی اور گہرا سبب تھا جو ابھی پوری طرح واضح نہ ہوا تھا، ایک آبدار اور خوش رنگ نئی زندگی کی اُمید، جو پرانی یادوں کو مٹاتی جا رہی تھی۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا کہ شاید اُس کی زندگی بھی ایک نیا روپ لے۔ غیر شعوری طور پر اُسے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اُس کے پیچھے ایک روشن در کھلا ہوا ہے، جس میں سے اُسے وقتِ ضرورت باہر جانے میں آسانی ہوگی، کیوں کہ اب اُسے اس چھوٹے کمرے کی تنہائی میں چھوڑ کر سب اس کی طرف سے بے فکر تھے کہ وہ "جو جی چاہے کرے" اس کو بہت اطمینان ہوا۔ آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی جو ہر چیز کو ایک انوکھی رنگت میں رنگتی چلی گئی، جیسے اُسے پھر سے بچپن مل گیا ہو۔ اُس کی آنکھیں بھی بچّوں کی طرح ہوگئیں۔ بشاشت اور ہر لمحہ نئی دنیا پر محوِ حیرت۔

اُس نے اپنی اس باقی زندگی کی فرصت گزارنے کے لیے صبح کو ٹہلنا اپنا معمول بنا لیا۔ ساری

۔ راجدھانی دہلی

ذمہ داریوں سے بری، اُس نے اپنی ضروریاتِ زندگی کے لیے اپنی پنشن میں سے کچھ رقم اپنے بیٹے کو دینے کا انتظام کر دیا۔ یہ رقم کچھ زیادہ نہ تھی۔ حالانکہ اُسے کچھ چاہیئے نہ تھا لیکن اُس کے بیٹے کا کہنا تھا کہ اُسے کچھ رقم اپنے پاس اپنی ضرورت کے لیے بھی رکھنی چاہیئے۔ مگر کیسی ضرورت؟ وہ تو بس دنیا کا ایک تماشائی بن کر رہنے میں ہی مطمئن تھا۔

اُس نے اپنی گزشتہ زندگی کے تجربوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور اس کی گزر اب عمر رسیدہ لوگوں کے ساتھ نہ ہوتی تھی۔ وہ اُن سے کتراتا تھا۔ نوجوان اُس کو بوڑھا سمجھتے، لہٰذا وہ پارک چلا گیا جہاں بچے کھیلتے تھے۔

اس طرح اُس نے اپنی نئی زندگی کا آغاز ایک سبزہ زار میں کیا جہاں بچے گھاس میں کھیل رہے تھے۔ کتنی فرحت بخش خوشبو تھی۔ لمبی، گھنی اور تازہ گھاس کی۔ بچے وہاں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ کہیں سے آتی جھرنے کی آواز نے پتیوں کی سرسراہٹ کو دبا رکھا تھا۔ بچوں نے کھیل کود چھوڑ اپنے جُوتے موزے اُتار دئے۔ کتنا مزہ آرہا تھا اُس تر و تازہ، نرم گھاس کے اندر ننگے پاؤں دھنس جانے میں! اس نے اپنا ایک جُوتا اُتارا اور چپکے چپکے دوسرا بھی اُتار رہا تھا کہ ایک کم عمر لڑکی سامنے نظر آئی۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ "شوز" وہ چلّائی، اُسکی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

لڑکی کے کپڑے سامنے کی طرف سے ایک جھاڑی میں اُلجھے ہوئے تھے اور کیونکہ وہ نیچے بیٹھا اوپر اُس کی طرف دیکھ رہا تھا، لڑکی نے فوراً کپڑوں کو چھڑا کر اپنی ٹانگوں کو ڈھک لیا۔

وہ مبہوت سا ہو گیا۔ کیا سوچ رہی تھی وہ؟ لڑکی جا بھی چکی تھی۔ وہ تو بچوں کے معصومانہ کھیلوں سے لطف اندوز ہونے آیا تھا۔ اُس نے جھک کر ہاتھوں سے اپنے سخت ننگے پاؤں کو چھوا۔ اُس لڑکی کو کیا بات ناگوار ہوئی؟ کیا وہ اتنا بوڑھا ہو گیا تھا کہ بچوں کو ننگے پاؤں گھاس میں دوڑتے دیکھ کر اُن کی خوشی میں بھی شریک نہ ہو سکتا تھا؟ وہ بوڑھا تھا تو کیا اس کے یہ معنی تھے کہ اُس کی نیت خراب تھی؟ آہ، یہ تو وہ جانتا تھا کہ اگر ضرورت ہوئی تو پل بھر میں وہ ایک بچے سے ایک مرد بن سکتا تھا۔ تھا تو وہ بہرحال مرد ہی، مگر اس بارے میں کچھ سوچنا نہ چاہتا تھا۔ بالکل کچھ سوچنے پر آمادہ ہی نہ تھا۔ وہ سچ مچ اپنے جُوتے اُتارتے وقت ایک بچہ سا بن گیا تھا۔ اُس لڑکی نے اس طرح اُس کی توہین کر کے کتنی زیادتی کی تھی، وہ گھاس پر اوندھے مُنہ گر گیا۔ اب اُس کے غم، محرومی اور ہر روز کی تنہائی کے پیدا کئے ہوئے اس جذبہ کو ایک کمینی حرکت سمجھا جا رہا تھا۔ نفرت اور غصّہ سے اُس کا حلق خشک ہو گیا۔ بیوقوف لڑکی، اگر اُس کے دل میں وہ ہوتا، (جیسا کہ اُس کے بیٹے کا کہنا تھا، کہ اس کی کچھ تو "خواہشات" ہونگی) تو اسے پورا کرنے کے لیے اُس کے پاس کافی پیسہ تھا۔ وہ غصّہ میں بھرا اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجوُب مجوُب کانپتے ہاتھوں سے اُس نے پھر سے جوتے پہنے۔ سارا خون جیسے اُس کے سر میں کھینچ آیا تھا، اُس کی آنکھوں کے پیچھے نبض تیز چل رہی تھی۔ اسے معلوم تھا اُس کام کے لیے اُسے کہاں جانا چاہیئے۔ خوب معلوم تھا۔

قدرے مطمئن، وہ اُٹھا اور واپس گھر لوٹ آیا۔ یہاں فرنیچر کچھ اس طرح بکھرا پڑا تھا جیسے محض اسے طیش دلانے کو یوں رکھا گیا تھا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا اور دیوار کی طرف کروٹ لے لی۔

●

بقیہ، ہلکی پھلکی انجنیرنگ کی صنعت

کو دشواری بھی ہوتی ہے اور شکایت بھی، معیار کو برقرار رکھتے ہوئے اعلیٰ قسم کے ہینڈ ٹولز چھوٹے پیمانے پر ہی بنائے جائیں تو ان کی خاصی کھپت ہوگی اور یہ منافع بخش کام ہوگا۔

یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ورکشاپ اور کارخانوں میں چاہے جتنی بھی خودکار مشینیں کیوں نہ لگائی جائیں۔ ہینڈ ٹولز کے بغیر گذارہ کرنا ناممکن ہے۔ چھوٹے سے کارخانے سے گاڑیاں اسمبل کرنے کے خودکار پلانٹ تک انجنیرنگ کے ہر کام میں ہینڈ ٹولز بنیادی ضرورت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مستقبل میں ان کی طلب میں اضافہ ہی ہوگا۔ اس طرح چھوٹے دستی اوزار کا کارخانہ نہایت فائدہ بخش ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک جائزے کے مطابق اس قسم کی فیکٹری پر نو ساڑھے نو لاکھ روپے کی لاگت آئے گی، جس میں زمین اور عمارت کی لاگت تقریباً دو لاکھ روپے اور مشینوں و دیگر ضروریات کے لیے چھ لاکھ روپے کافی ہوں گے، منافع کی شرح کا اندازہ ڈیڑھ لاکھ سے پونے دو لاکھ روپے سالانہ ہے

تالے بنانے کا کارخانہ

تالہ سازی کی صنعت لائٹ انجنیرنگ کی صنعت کا ایک بہت قدیم اور مقبول شعبہ ہے۔ ہندوستان میں روایتی طور پر جو تالے بنائے جاتے ہیں ان کے بیشتر پرزوں میں مائلڈ اسٹیل کی سلاخوں کے ٹکڑے اور تانبے کی چادریں استعمال ہوتی ہیں۔

ملک کے اندر تعمیراتی سرگرمیوں میں گزشتہ دس سال میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔

دکانوں، کارخانوں اور دفاتر کی بڑھتی ہوئی تعداد فرنیچر کے استعمال میں اضافے کی وجہ سے بھی تالہ سازی کی صنعت کی ترقی کے واضح امکانات موجود ہیں۔

●

موتی لال ساقی

چنار

پھولوں کی وادی کشمیر کو سنوارنے میں دستِ قدرت نے جس فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے، اُس کی ایک حسین ترین علامت چنار ہے۔ چناروں کی چھتر چھایا نے کشمیر کے حسن میں ٹھنڈک اور ملائمت پیدا کی ہے۔ مادرِ کشمیر کے ماتھے کا جھومر چنار ایک درخت، ایک پیڑ ہی نہیں بلکہ ہماری مخلوط تہذیب کی من کو لبھا دینے والی علامت، ایک ایسی علامت جو جلال اور جمال کا ایک لطیف سنگم ہے۔ ہماری دست کاریوں کو ایک مخصوص مزاج عطا کرنے میں چنار کا ایک الگ مقام ہے۔ شال یا لکڑی کی سطح پر جب ہمارے ہنرمند کاریگر چنار یا چنار کے پتوں کو اُبھارتے ہیں تو لگتا ہے کہ وادیٔ کشمیر کا سارا حسن و جمال شال یا لکڑی پر سمٹ کر یکجا ہو گیا ہے۔ چنار کا پتّہ جب کشمیری شال پر سوزن کاری کے سہارے اُبھر آتا ہے تو کپڑے کی بے جان سطح پر زندگی مسکرانے لگتی ہے۔ سچ مانیے تو ہماری فنی وراثت کو ایک الگ سمت اور ایک رنگ عطا کرنے میں چنار نے اپنا بھرپور حصہ ادا کیا ہے۔ سراپا ٹھنڈک اور چھاؤں کا سرچشمہ چنار خزاں میں ایک اور ہی منظر پیش کرتا ہے۔ چنار کے خزاں زدہ پتّے شعلہ بار لگتے ہیں اور چنار دُور سے ایک ایسا لپکتا ہوا شعلہ لگتا ہے، جو آسمان کو اپنی لپیٹ میں لینا چاہتا ہو۔ بادو باراں میں چنار کا کھوکھلا تنا راہگیروں کی پناہ گاہ بن جاتا ہے۔ آج بھی راہ چلتے مسافر اور خانہ بدوش چنار کے کھوکھلے تنے کے اندر بیٹھ کر رین بسیرا کرتے ہیں۔

ہماری حسین و جمیل دھرتی پر چنار کا وجود رُوح پرور اور روح افزا ہے۔ ٹھنڈک اور چھاؤں کی بارش کرنے والے اس پیڑ کی چھاؤں میں ہمارے آبا و اجداد نے کب سے سکھ اور چین کے مزے لیے اُس کے بارے میں ہماری قدیم تاریخ خاموش ہے۔ اس مسحور کن اور مہمان نواز پیڑ کا ذکر راج ترنگنی میں کسی بھی جگہ نہیں ہوا ہے۔ مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جس وقت کلہن نے راج ترنگنی لکھی اُس وقت ہمارے یہاں چنار کا وجود نہیں تھا۔ کلہن جہاں ابھنو گپت، گن ورمن، سوم آنند اور دوسری درجنوں کشمیری شخصیات کا ذکر کرنا بھول گیا ہے وہاں اگر اُس نے چنار کا ذکر نہیں کیا ہے تو کوئی بڑی بات نہیں۔ یہاں پر مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ سنسکرت کی مشہور ڈکشنری، "امر کوش" کو مصنف امر سنگھ نے ایک پیڑ کے سائے میں تیار کیا۔ اُس کی یہ ڈکشنری ایک نادر دستاویز ہے۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ جس پیڑ کے سائے میں اُس نے "امر کوش" کو ترتیب دیا اُس پیڑ کا ذکر اُس کی ڈکشنری میں آنے سے رہ گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کلہن بھی اسی غفلت شعاری کا شکار ہوا ہو۔ کیوں کہ مانوسیت ہر چیز کی قدر و قیمت کو کم کر دیتی ہے۔ چنار ہم کشمیریوں کی زندگی میں اس قدر رس اور بس گیا ہے کہ ہمیں اُس کے حُسن، اُس کی چھاؤں، اہمیت اور افادیت کا ذرّہ بھر بھی احساس نہیں رہا ہے۔ چنار کی قدر و قیمت تپتے ریگستان کے باسیوں سے پوچھیے، جو دُور سے ہی اس پیڑ کو دیکھ کر ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں۔ چنار کے کوئلوں سے بھری "کانگڑی" ہمارے جسم کو خوش کن آنچ سے گرم رکھتی اور کیف و سرور سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ اس کی سُرخی مائل لکڑی کو پلے ووڈ بنانے کے کام بھی لایا جا سکتا ہے۔ جس کا کامیابی

کے ساتھ تجربہ کیا گیا ہے۔

چنار کشمیر کا اپنا پیڑ ہے۔ یہ عالیشان درخت اسی دھرتی کی گود میں پیدا ہو کر پروان چڑھا ہے۔ "چنار" کے کشمیری الاصل ہونے کے کئی ایک ثبوت ہیں۔

ﻻ۔ اس پیڑ کا کشمیری میں اپنا الگ نام "بُوئن" ہے اگر یہ پیڑ یہاں باہر سے آیا ہوتا تو اس کا نام بھی ساتھ ہی آ جاتا اور کسی نہ کسی صورت میں مروّج ہوتا۔ میرے خیال میں کشمیری لفظ "بُوئن" جو بنیاد، مضبوطی اور پائیداری کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے یہ بھی اس پیڑ کی نسبت سے وجود میں آیا ہے۔ کیونکہ چنار ایک مضبوط درخت ہے اور زور دار ہوا بھی اس کو جڑ سے اکھاڑ نہیں سکتی۔ چنار کا کشمیری نام "بوئن" سنسکرت "بھوانی" سے ماخوذ مانا جا سکتا ہے سنسکرت میں "بھوانی" ماتا دیوی" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ماں جو کہ محبت اور سکون کی علامت ہے چنار بھی سکھ اور سکون بہم پہنچانے میں ماں سے کچھ کم نہیں۔ کشمیری میں کچھ دل کش اور بامعنی محاورات اور مرکبات اسی پیڑ کی نسبت سے وجود میں آ گئے ہیں مثلاً "چھتر بُوئن" (سایہ دار چنار) بونہِ ژُہل تارُن "(چنار میں چھید کرنا معنی کوئی مشکل کام کرنا)" بونہ گُہتُل (چناروں کی گھنی چھاؤں) وغیرہ۔ یہ محاورات مرکبات اس بات کا ثبوت ہیں کہ جس وقت کشمیری زبان اپنا وجود سنوار رہی تھی اُس وقت چنار کشمیر میں موجود تھا۔

ب:۔ وادیٔ کشمیر میں جس تیزی کے ساتھ چنار کے پیڑ کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اتنی تیزی سے دنیا کے کسی اور حصّے میں یہ درخت پروان نہیں چڑھتا۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ کوئی چیز اپنی اصلی دھرتی اور اپنے اصلی وطن میں ہی سرعت کے ساتھ عروج پاتی ہے۔ کشمیر میں چناروں کی کثرت چنار کے اصلی وطن کی نشاندہی کرتی ہے۔ پیڑوں کے بارے میں دیکھا گیا ہے کہ اگر وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کئے جائیں تو اُن کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً جو چنار کشمیر سے باہر لے جائے گئے ہیں اُن کی چھاؤں پھیلتی نہیں اور ساتھ ہی یہ تناور بھی نہیں ہو پاتے۔ کشمیر میں چنار بیج سے بھی پیدا ہوتا ہے اور ٹہنیاں بھی اگر نصب کی جائیں تو اُگ آتی ہیں۔ یہ چیزیں کشمیر سے باہر کے علاقوں میں نہیں ہوتیں۔

ج:۔ ماہرینِ نباتات نے کشمیر، فرغانہ (وسط ایشا) ایران اور یونان کو چنار کا اصلی وطن بتایا ہے۔ کشمیر سے لے کر شمالی افغانستان اور سمرقند کے سارے علاقے میں چنار پایا جاتا ہے۔ مگر جس کثرت سے چنار کے درخت کشمیر میں نظر آتے ہیں اتنی کثرت سے یہ پیڑ اور کسی علاقے میں کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ یہاں پر اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چنار کے سب سے تناور درخت یا تو ایران میں پائے جاتے ہیں ورنہ کشمیر میں۔ دنیا میں سب سے تناور چنار ایران کے شہر طہران کے مضافات میں کوہ البرز کے پاس ہے۔ اس چنار کا تنا چھیاسٹھ فٹ ہے۔ اس کے بعد اس وقت سب سے موٹا چنار بجبہاڑہ کے باغ داراشکوہ میں ہے جس کا تنا ۵۴ فٹ ہے۔ لارنس ۱۸۹۰-۹۵ء کے زمانے میں لولاب وادی میں ایک ایسا چنار موجود تھا جس کا تنا ساڑھے ترلیسٹھ فٹ تھا۔ یورپی سیاحوں کے اس بیان میں کوئی صداقت نہیں کہ کشمیر کو چنار مغلوں کی دین ہے۔ اُن کے اُس دعویٰ کو خود مغل مورخین اور شہنشاہ جہانگیر کے بیانات رد کرتے ہیں۔ طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ کشمیر میں ایک ایسا چنار موجود ہے جس کے سائے میں دو سو سوار بیک وقت ٹھہر سکتے ہیں۔ شہنشاہ جہانگیر ترک جہانگیری میں لکھتا ہے۔

"میں حیدر ملک کے آباد گاؤں چاڈورہ میں چکوروں کا شکار کرنے گیا۔ یہ جگہ بہت ہی دلکش ہے۔ یہاں ترل ترل بہتی ندیاں اور بلند قامت چنار ہیں۔ شہر سے ڈھائی کوس دور راول پورہ میں ایک چنار کا درخت ہے جس کے تنے کو اندر سے آگ نے کھوکھلا کر دیا ہے۔ پچیس سال پہلے جب میں گھوڑے پر سوار ہو کر یہاں سے گزرا، اُس وقت میرے ساتھ پانچ گھوڑے اور دو آدمی تھے۔ ہم سبھی لوگ گھوڑوں سمیت چنار کے کھوکھلے تنے کے اندر سما گئے۔ اس کے بعد جب بھی میں نے اس واقعہ کا ذکر کیا تو لوگ حیران رہ گئے۔ اب کی بار میں نے پھر کچھ لوگوں کو اس چنار کے کھوکھلے تنے کے اندر جانے کا حکم دیا۔ آخر وہی کچھ ہوا جس کا مجھے پہلے ہی علم تھا۔ اکبرنامہ میں لکھا ہے کہ میرے والد نے چونتیس افراد کو اس کھوکھلے تنے کے اندر کھڑا رکھا جب کہ اقبال نامہ میں لکھا ہے کہ کھوکھلے تنے میں ستر آدمی سما گئے۔"

چنار کا کشمیر میں موجود ہونا للہ دید (چودھویں صدی) کے کلام سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ ایسے ایک واکھیہ میں اُس نے "بُوئن" لفظ کا استعمال یوں کیا ہے۔

کیٛنَن رنی چھےٚ ستھیچ بُوئن
پیرو نیبر تہ ستہل کر

ترجمہ:۔ کچھ لوگوں کے لیے بیوی ٹھنڈک پہنچانے والا چنار ہے۔ باہر آ اور اس کی چھایا سے اپنے آپ کو ٹھنڈک پہنچا۔ ہمارے لوک گیتوں میں بھی چنار کی خوبیوں کی خوب سراہنا ملتی ہے ؎

یُہ لگےٚ ناوس تہ کڈِ یو غوصہ
وَتھرے تو سہ بونیَن تل

ترجمہ:۔ میں تمہاری رنجیدگی کو دور کرنے کے لیے اپنی جان قربان کر دوں گی اور چناروں کے

سائے میں شاہ توس کا بچھونا بچھاؤں گی)۔

جہانگیر اور دوسرے مغل تذکرہ نویسوں کے بیانات اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ قد آور اور تناور چنار کشمیر میں مغلوں سے سینکڑوں سال پہلے موجود تھے۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حُسن شناس، حُسن نواز اور حُسن پرست مغلوں نے کشمیر میں چناروں کے باغ لگوائے۔ چنار کے پودوں کو دودھ سے سینچا اور اُن کے سائے میں بیٹھ کر زندگی کی لطافتوں سے ہمکنار ہوئے۔ مغل گورنر علی مردان خاں (۱۶۴۲-۵۷ء) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس نے کشمیر میں کافی تعداد میں چنار کے باغ لگوائے۔

چنار جس کو کشمیر میں "بُونی" یونان میں "دُب" اور انگریزی میں پلین (Plane) کا نام دیا گیا ہے، کو علم نباتات کی زبان میں پلاٹینیس اورینٹلیس PLANTAIUS ORIENTLIS کہا جاتا ہے۔ جو اس امر کی نشاندہی ہے کہ یہ پیڑ مغرب کو مشرق کی دین ہے۔

چنار یونان اور رومیوں کا سب سے پسندیدہ سایہ دار پیڑ رہا ہے۔ آج بھی جب ہم فرانس کے شہر مارسیلز پہنچ جاتے ہیں تو سرسبز اور شاداب چنار ہمارا سواگت کرتے ہیں۔ جنوب مغربی یورپ میں چنار یونانیوں کی وساطت سے پہونچا۔

امریکہ میں چنار کی جو قسم اُگتی ہے اُس کو پلاٹینیس اوکسی ڈنٹل کا نام دیا گیا ہے۔ مگر ماہرینِ نباتات کا خیال ہے کہ چنار کی یہ قسم بھی مشرقی چنار کا ہی پیوندی روپ ہے اور اس کا الگ سے کوئی وجود نہیں۔ امریکہ میں جو چنار اُگتا ہے وہ آب و ہوا اور زمین کی خصوصیت کی وجہ سے تھوڑا سا مختلف ہے مگر ہے چنار ہی۔ وہاں جو چنار اوہیو اور مسیسی پی کے علاقے میں پایا جاتا ہے وہ قدرے بڑا ہوتا ہے۔ جب کہ کیلی فورنیا اور اری زونا میں یہ پیڑ مشرق کے مقابلے میں چھوٹا ہوتا ہے۔ امریکہ میں اس پیڑ کو سائیکامور اور بٹن ووڈ کہا جاتا ہے۔ شمالی امریکہ میں اس کا درخت باقی تمام درختوں سے بڑا اور تناور ہوتا ہے۔ وہاں پر اس خاندان کے درختوں کا تنا دس سے چودہ فٹ کے درمیان موٹا دیکھا گیا ہے۔ مگر پچاس سے ستر فٹ کی بلندی تک وہاں یہ پیڑ ٹنڈ منڈ ہوتا ہے۔

یورپ میں چنار کی کئی ایک قسمیں نظر آتی ہیں۔ یونانیوں اور رومیوں کی طرح وہاں اب بھی یہ پیڑ سجاوٹ کے مقصد سے اُگایا اور لگایا جاتا ہے۔ یورپ میں چناروں کی نشوونما اور ان کے تحفظ کے لیے خاص کام ہو رہا ہے۔ قسطنطنیہ، روم، دی آنا، برلن، لندن اور پیرس میں چنار کے پیڑ مناظر کو بیحد دلکش بناتے ہیں۔ لندن کا چنار امریکہ اور مشرق کے چنار کو پیوندی طریقے سے ملا کر تیار کیا گیا ہے۔ امریکہ کی سڑکوں کو سایہ دار بنانے کے لیے وہاں چنار کثرت سے لگائے جاتے ہیں۔

صنعتی طور پر ترقی یافتہ شہروں میں چنار ماحول کی آلودگی کو کم کرنے میں کافی مدد گار ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے ہموار پتوں کو بارش کا پانی آسانی سے دھو لیتا ہے۔ اس کے پتوں کی یہ بھی خاصیت ہے کہ یہ برسوں تک سڑ نہیں پاتے یہی وجہ ہے کہ چند سال پہلے تک مکان بناتے وقت لکڑی کے فرش پر چنار کے پتوں کی ایک موٹی تہہ بچھائی جاتی تھی اور اس تہہ پر مٹی ڈال کر لپائی کی جاتی تھی۔ دور دراز دیہات میں یہ سلسلہ اب بھی قائم ہے۔

چنار کشمیر کے حسن و جمال کی علامت بھی ہے اور ہمارے تمدنی مزاج کا نقیب بھی۔ آج جب کہ ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لیے عالمی سطح پر سرگرم مہم چل رہی ہے۔ چنار ایک مسیحا کی طرح آلودگی کے اثرات کو جذب کر کے جنّت نظیر کشمیر میں آبِ حیات کی بارش کر رہا ہے۔

اس کی چھال خود بخود اُکھڑ جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں پیڑ کے تنے پر کسی قسم کی غلاظت جمنے نہیں پاتی۔ کشمیر میں بہت دنوں سے چنار کو شاہی پیڑوں کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ مگر گزشتہ کئی سالوں سے جس بے دردی اور بے حسی سے چناروں کو کاٹا، اُکھاڑا اور سُکھایا جا رہا ہے۔ اُس کی نظیر شاید ہی تاریخ میں مل سکتی ہے۔ ہمارے بزرگوں نے چنار کے پیڑ لگا کر کشمیر کے لاہوتی حُسن کی پرورش کی ہے۔ ہم ہیں کہ چناروں کو کاٹ کر نہ صرف ماحول کا توازن بگاڑ رہے ہیں بلکہ مستقبل کو بھی تاریک بنا رہے ہیں۔ ماہرینِ ارضیات نے کشمیر کے ترال علاقے سے چنار کا ایک فوسل (Fussil) دریافت کیا ہے جس کی عمر اندازاً ۱۵ لاکھ سال بتائی جاتی ہے۔ ●

تبصرے

پندرہ روزہ مستقبل

یڈیٹر و پبلشر : ایس۔ ایم۔ شاہ نواز
۱۵ سے ۳۰ جون ۱۹۸۷ء
قیمت : ۲۵ روپے

پندرہ روزہ "مستقبل" نے اسٹینڈنگ کانفرنس آف پبلک انٹرپرائزز (اسکوپ) کی مدد سے اپنا ۱۵ تا ۳۰ جون ۱۹۸۷ء کا شمارہ صوصی پبلک سیکٹر ایڈیشن کے طور پر نکالا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہندوستانی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے پبلک سیکٹر کا رول کتنا اہم ہے ۱۹۸۰ء تک اس میں ۲۸۱۱۴ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی گئی تھی اور امید ہے کہ ۱۹۹۰ء تک بڑھ کر ۸۲ ہزار کروڑ روپے تک پہونچ جائیگی۔ ان کارخانوں میں تقریباً ۲۱ لاکھ افراد کو روزگار ملا ہے اس طرح یہ ایک طرف معیشت کو سدھار رہا ہے تو دوسری طرف بے کاری دور کرنے میں بھی معاون ہے۔ اُردو والوں کو پبلک سیکٹر کے رخانوں کی اہمیت اور افادیت سے روشناس نے کے لیے "مستقبل" کا یہ بڑا دانشمندانہ فیصلہ جا سکتا ہے۔ ایک مخصوص شمارے کے محدود ات میں دوسو سے زائد صنعتوں کا جائزہ ممکن ہے پھر بھی ان کارخانوں کی افادیت اور نزانکا سے اُردو داں طبقے کے سے واقف نے کی کوشش کی گئی ہے کہ ملک نے کتنی حیرت ترقی کی ہے۔ "مستقبل" نے اپنے اجرا کے بعد کوشش شروع کردی تھی کہ ان اداروں کو عوام سے روشناس کرایا جائے اور اس غرض ک مستقل کالم شروع کیا ہے، جس کا عنوان ہے" پبلک سیکٹر۔ شاہراہِ ترقی پر" اور یہ کالم بہت پسند کیا گیا ہے۔

اس شمارے میں پبلک سیکٹر کا بھرپور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور اس میں جو مضامین شامل کئے گئے ہیں، وہ ان اداروں کے چیرمین اور منیجنگ ڈائرکٹروں سے لکھائے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس شمارے میں شامل مضامین مستند کہے جا سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ چیرمین اور ڈائرکٹر جس قدر اداروں کے بارے میں بتا سکتے ہیں دوسروں سے ممکن نہیں ہے۔

اس میں مختلف عنوانات جیسے سائنس ٹیکنالوجی، بھاری و چھوٹی صنعتیں، اسپات و فولاد، تیل و قدرتی گیس اور توانائی، کیمیکلز و فرٹی لائزرز، غیر ملکوں کے ساتھ تجارت، شہری ہوابازی، ریلویز، مواصلات، خوراک و رسد، بحث و بیمہ، پروجیکٹ و تعمیرات، تعمیرات و مکانات، فوٹوگرافی اور سیر و سیاحت کے تحت مختلف اداروں کی کارگزاری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جو ہمارے لیے معلومات کا خزانہ فراہم کرتا ہے۔ طباعت بھی عمدہ ہے اور سلیقہ سے شائع کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ۱۹۸۲ء میں اپنے اجراء سے اب تک ترقیاتی سرگرمیوں، فیملی پلاننگ، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، سماجی انصاف اور سیکولر نظریات کے بارے میں اُردو پڑھنے والوں کو حکومت کی سرگرمیوں اور کوششوں سے باخبر کرا رہا ہے اور "مستقبل" سے مستقبل میں بھی ایسی ہی امید کی جا رہی ہے۔ اس کے عام شمارے کی قیمت فی کاپی ۲ روپیہ، سالانہ ۵۰ روپے اور لائف ممبر شپ ایک ہزار روپے ہے۔

(محمد کمال الدین)

نام کتاب : اورادِ شرفی
مصنف : حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ
مترجم : حافظ محمد شفیع فردوسی رحمۃ اللہ علیہ
تصیحح و ترتیب نو : ڈاکٹر محمد علی ارشد شرفی
ہدیہ : دس روپے
ناشر : مکتبۂ شرف، بیت الشرف خانقاہ معظم بہار شریف (نالندہ)

اورادِ شرفی ایک مختصر سا فارسی رسالہ ہے جو فردوسیہ سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ یہ رسالہ ان کے وظائف کا مجموعہ ہے جس میں نماز کے فضائل اور دعاؤں کی اہمیت پر اس روح پرور انداز میں اصول و آداب بتائے گئے ہیں کہ ان پر عمل کرکے بندہ معبود کی سچی عبادت سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ مذکورہ فارسی رسالے کا اُردو ترجمہ اوّل اوّل حافظ محمد شفیع فردوسی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا۔ اس رسالے کے مختلف ایڈیشن شائع ہوتے رہے۔ اس کا نیا اُردو ایڈیشن بیت الشرف خانقاہِ معظم کے موجودہ سجادہ نشین حضرت سید امجد فردوسی مدظلہ، کے حکم پر اسی خانوادے کے ذی علم نوجوان ڈاکٹر محمد علی ارشد شرفی نے نئے انداز سے اورادِ شرفی کی تصیحح و ترتیبِ نو کا فریضہ انجام دیا کہ پڑھنے والا ایک نظر میں اس علمی اور روحانی رسالے کی خوبیوں کا اعتراف کرنے لگتا ہے۔

راقم الحروف نے ایک ہی نشست میں اس رسالے کو پڑھ ڈالا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ایمان و یقین کی کرنیں کوثر و تسنیم کے ساتھ چھن چھن کر قلب و نگاہ کو سیراب کر رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن و حدیث پر مشتمل یہ وظائف ایمان کو مستحکم کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔

قابلِ مبارکباد ڈاکٹر محمد علی ارشد شرفی ہیں جنھوں نے

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

منصوبہ بندی کی ایک جھلک

اعداد و شمار کے ماہرین کی آٹھویں کانفرنس

اعداد و شمار کی مرکزی اور ریاستی تنظیموں کے ماہرین کے آٹھویں کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے منصوبہ بندی کے وزیر مملکت شری سکھ رام نے کہا ہے کہ منصوبہ بندی کے شعبے میں اعداد و شمار کا بہت ہی اہم کردار ہوتا ہے انھوں نے کہا کہ قابل بھروسہ اعداد و شمار ہمارے منصوبوں کی تیاری، ان کی ترقی کی نگرانی اور ان کے نتائج کا جائزہ لینے کے لیے لازمی ہوتا ہے۔ ہندوستانی معیشت میں بڑھتی ہوئی جدیدیت اور معاشی انتظامیہ نیز منصوبہ بندی کی تکنیکوں میں مسلسل بہتری کے ساتھ ہی مختلف نئے شعبوں میں اعداد و شمار کے مختلف اقسام کی مانگیں بھی بڑھ رہی ہیں، جس میں اعلیٰ سطح کی مہارت درکار ہوتی ہے۔ وزیر موصوف نے کہا کہ انھیں ماہرین کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی قابلیت پر یقین ہے۔

جموں و کشمیر کے سالانہ منصوبے کے لیے ۴۵۰ کروڑ روپے

منصوبہ بندی کمیشن نے جموں و کشمیر کے ۸۹-۱۹۸۸ء کے سالانہ منصوبے کے لیے ۴۵۰ کروڑ روپے مختص کرنے کی منظوری دی ہے۔ یہ اعلان حال ہی میں نئی دلی میں جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ شری فاروق عبداللہ اور منصوبہ بندی کمیشن کے نائب چیئرمین اور وزیر منصوبہ بندی شری پی۔ شیو شنکر کے درمیان ملاقات کے بعد کیا گیا۔ ریاست کے رواں برس کے منصوبے کے لیے ۳۰۵ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔

اس جلسے میں منصوبہ بندی کمیشن کے اراکین پروفیسر ایم جی کے مینن، سری عابد حسین، ڈاکٹر راجا چالیہ، شری ہیتن بھایا اور پروفیسر پی۔ این سریواستو، منصوبہ بندی کمیشن کے سکریٹری شری جے ایس بیجل، جموں و کشمیر کے چیف سکریٹری شری ایم۔ پی۔ کھوسلہ اور منصوبہ بندی کمیشن و ریاستی سرکار کے سینیئر حکام نے شرکت کی۔

آٹھویں منصوبے کی تیاری

وزیر اعظم نے عصری مسائل کے حل پر زور دیا

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ۱۱ جنوری ۱۹۸۸ء کو نئی دلی میں عصری مسائل پر ماہرین سے تبادلۂ خیال کے اپنے سلسلے کی دوسری میٹنگ آج یہاں منعقد کی۔ وزیر اعظم نے آٹھویں منصوبے اور اس کے بعد کے اقتصادی تناظر پر ممتاز اقتصادی عالموں، اقتصادی منتظمین سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے افسران اور اقتصادی ماہرین سے گفت و شنید کی۔

شری گاندھی نے کہا کہ منصوبہ بندی کمیشن جلد ہی آٹھویں منصوبے کو وضع کرنے کا کام شروع کر دے گا۔

وزیر اعظم نے اس حقیقت کی جانب ماہرین کی توجہ مبذول کرائی کہ اگرچہ صنعت اور بنیادی ڈھانچے کی کارکردگی قابلِ اطمینان رہی ہے تاہم ساتویں منصوبے کے ابتدائی تین برسوں میں زراعت کے شعبے کی کارکردگی توقع کے مطابق نہیں رہی ہے۔ اس کی بڑی وجہ ناسازگار موسم ہے لیکن انھوں نے اشارہ کیا کہ زراعت کو ساتویں منصوبے کے بقیہ برسوں میں سب سے زیادہ ترجیح دی جانی چاہیئے تاکہ اسکی پیش رفت کو یقینی بنایا جاسکے۔ انھوں نے اس سلسلے میں ماہرین کو ٹھوس تجاویز پیش کرنے کے لیے کہا۔

شری گاندھی نے کہا کہ ملک کے دستیاب مالی وسائل کی مناسبت سے میکانیکی انداز سے نشانے مقرر کرنے کے بجائے ماہر اقتصادیات اور منصوبہ سازوں کو چاہیئے کہ وہ ملک کی ترقی کے لیے بنیادی ضرورتوں کی نشاندہی کریں۔

اس میٹنگ میں پروفیسر سکھ مے چکرورتی، ڈاکٹر منیال رتن چودھری، پروفیسر بی سی جوشی، پروفیسر اے ایم خسرو، شری وی کرشنا مورتی، شری کے۔ بی لال، ڈاکٹر کریت پاریکھ، شری منوشروف، شری ایم وی۔ شبیا، اور شری کیول ورما شامل ہوئے۔

اشیائے ضروریہ کی معقول فراہمی

اترپردیش حکومت کو مرکز کی یقین دہانی

مرکزی حکومت نے اترپردیش حکومت کے وزراء کے ایک وفد کو یقین دہانی کرائی ہے کہ وہ عوامی تقسیم کے نظام کے تحت ریاست کو گیہوں، چاول اور درآمد شدہ خوردنی تیل کی معقول سپلائی کرے گی۔ ●

یوجنا، نئی دہلی

آپ سب کے لیے

ہم بجلی کا خرچ کیسے کم کریں: توانائی آج کی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے اس کا استعمال ہمارے زندگی کے ہر شعبہ میں روزانہ ہی بڑھ رہا ہے۔ توانائی کی پیداوار، کوئلہ اور پانی کی مدد سے کی جاتی ہے۔ جہاں تک کوئلہ کا سوال ہے، ایک نہ ایک روز اس کا ذخیرہ ختم ہو جائے گا لیکن پانی کے ساتھ ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اس سال ہندوستان میں بارش بہت کم ہوئی ہے اور بہت سی جگہوں پر خشک سالی کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس لیے پانی سے بجلی پیدا کرنے میں کمی آئی ہے۔ اب ہمارا اس سلسلے میں کیا کام ہونا چاہیے۔ ہمیں یہ چاہیئے کہ ہم توانائی کے خرچ میں کمی برتیں۔ یہ کام اپنے گھروں سے شروع کریں اور اس کے ساتھ ہی آفس میں بھی اس کا خیال رکھیں۔

اس سلسلے میں سرکاری سطح پر کام شروع ہو چکا ہے، شہری ترقیات کی وزارت نے تمام شعبوں سے احتیاط کے ساتھ بجلی خرچ کرنے کی درخواست کی ہے اور چند سیدھے سادھے مشورے دئے ہیں۔ اس سے بجلی کی کھپت میں ۱۰ فیصد سے زیادہ کی کمی ہوگی۔ ہمیں اس سلسلے میں کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ بتی، پنکھا، ایرکنڈیشنڈ، اور بجلی کے تمام دیگر سامان کو جس میں ہیٹر بھی شامل ہے، کمرے سے نکلتے وقت بند کردیں۔ تمام ٹیوبوں اور بلبوں پر گرد و غبار نہ جمنے دیں، جہاں ایرکنڈیشنڈ چل رہا ہو وہاں کے تمام دروازوں اور کھڑکیوں کو بند رکھیں یہاں تک کہ نل کی ٹونٹی بھی ضرورت کے اعتبار سے ہی کھولیں اور بند کریں۔ اندازہ یہ ہے کہ بتیوں اور بجلی کے دیگر سامان کے استعمال میں ایک گھنٹہ کی کمی سے ۱۰ فیصد توانائی کی بچت ہو سکتی ہے۔ سرکاری دفتروں میں یہ پروگرام بنایا گیا ہے کہ ایک ماسٹر سوئچ لگایا جائے جس کی مدد سے بیک وقت دفتر کے اوقات سے قبل توانائی کی سپلائی بحال کی جا سکے اور دفتر کے اوقات کے فوراً بعد اس کی بحالی بند کی جا سکے۔ اگر ہم اس طرح کے اقدامات کریں تو یہ ہمارے لیے خوشیوں کا پیغام لا سکتی ہے۔

بے گھروں کے لیے گھر: حکومت نے ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں گاؤں میں بسنے والے لوگوں کے لیے گھر بنا کر دینے کا ایک پروگرام بنایا ہے۔ یہ کام چھٹے منصوبے سے چلا آرہا ہے۔ لیکن اس بار اس پر مزید زور ڈالا جا رہا ہے تاکہ بے گھر لوگوں کو سر چھپانے کے لیے ایک جگہ دی جا سکے۔ اس منصوبے کے تحت ۷۲ ہزار بے زمین خاندانوں کو گھر بنوانے کی سہولت مہیا کی جائے گی جس پر ۳۶ کروڑ روپیوں کے خرچ آئیں گے۔ اس کے علاوہ ۲ لاکھ ۱۷ ہزار خاندانوں کو گھر بنوانے کے لیے مدد بھی دی جائیگی۔ جس کا تخمینہ تقریباً ۵۱۴ کروڑ روپیہ ہے۔ پہلے کے مقابلے میں مدد کی رقم بھی بڑھا دی گئی ہے۔ جنرل انشورنس کارپوریشن بھی ۲۰۰ کروڑ روپے کی امداد مکان بنانے کے لیے دے گی۔ ●

قارئین کی آراء اور مشورے

یوجنا بابت یکم تا ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۷ء ملا۔ اس عنایت کے لیے شکرگزار ہوں۔ پہلی فرصت میں تمام مضامین ایک نظر دیکھ ڈالے۔ ہندوستان میں کیمیاوی کھاد کی صنعت، دلہن کی پیداوار میں ترقی، انڈین فارمنگ فرٹی لائزر کوآپریٹو کا عملی پروگرام اور زعفران کی کاشت جیسے مضامین یقیناً اردو زبان و ادب کی ترقی اور اردو داں طبقے کی واقفیت اور معلومات کے لیے بہت مفید اور از بس ضروری ہیں۔ اس طرح کے مضامین میں انگریزی کے بعض الفاظ اور اصطلاحوں کا ترجمہ یقیناً دقت طلب ہے، لیکن اگر اس طرح کے مضامین اور کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا تو جلد یا بدیر یہ مشکل بھی دور ہو جائے گی۔

اکتوبر مہاتما گاندھی اور سرسید احمد خاں کی پیدائش کا مہینہ ہے، اس مناسبت سے "پسماندہ طبقوں کے مسیحا گاندھی جی" اور "سرسید اور سیکولرازم" خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ مجھے تاریخوں سے خصوصی دلچسپی ہے، اس لیے اول الذکر مضمون کو پڑھتے وقت تاریخوں پر میں نے خصوصی نظر رکھی تھی۔ گاندھی جی کی سولہ جنیتی کے موقع پر میں نے ماہنامہ جامعہ کا گاندھی نمبر نکالا تھا اور بعد میں انھیں مضامین کو "گاندھی جی اور ان کے خیالات" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں گاندھی جی کی زندگی کی اہم تاریخیں بھی مرتب کرکے شائع کی ہیں۔ جگدیش لال صاحب کے اس مضمون کو پڑھتے وقت میں نے اس کی تاریخوں پر خاص طور پر نگاہ رکھی تھی۔ غالباً اس پورے مضمون میں کل پانچ جگہوں پر تاریخیں درج ہیں چار میں سے دو تاریخوں میں مری مرتبہ تاریخوں اور اس مضمون کی تاریخوں میں معمولی سا فرق ہے اور پانچویں تاریخ (۳۰ اگست) کے ساتھ سنہ درج نہیں ہے، اس لیے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جن تاریخوں میں اختلاف ہے ان میں سے پہلی یکم اگست ۱۹۲۰ء اور دوسری ۱۲ اگست ۱۹۳۲ء ہے۔ (صفحہ ۴ کالم اول) اور میرے یہاں یہ تاریخیں علی الترتیب ۳۱ جولائی اور ۱۷ اگست ہیں۔ تیسری ۲۰ ستمبر اور چوتھی ۲۶ ستمبر ۱۹۳۲ء، دونوں میں یکسانیت ہے۔ اس مضمون میں تاریخیں اور بھی ہونی چاہیئے تھیں، مثلاً گاندھی جی تعلیم کے لیے انگلستان اور مقدمے کی پیروی کے لیے جنوبی افریقہ کب تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے مستقل طور پر کب واپس آئے۔ وغیرہ۔ میں اسی کمی کو ضرور پورا کرتا، مگر یہ خط طویل ہو جائے گا۔

دوسرے مضمون: "سرسید اور سیکولرازم" از محمد صالح صاحب کے بارے میں مجھے کئی باتیں عرض کرنی ہیں۔ اتفاق سے سرسید کے بارے میں بھی میں نے ماہنامہ جامعہ کا خصوصی نمبر نکالا تھا اور اس کے مضامین بھی کتابی صورت میں: "سرسید احمد خاں اور ان کی معنویت موجودہ دور میں" جون ۱۹۷۲ء میں شائع کیے تھے اور اسی میں بھی حیات سرسید کی اہم تاریخیں شامل ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سرسید کے دور میں (۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء — ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء) سیکولرازم کا لفظ اس طرح رائج نہیں تھا، جس طرح آزادی کے بعد ہوا ہے، اس لیے اس لفظ کے وسیع معنی اور مفہوم کو ان کی ذات اور زندگی سے وابستہ کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ ویسے یہ بات صحیح ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے شدید حامی تھے اور اس معاملے میں اپنے معاصرین سے بہت آگے اور ممتاز تھے۔ فاضل مضمون نگار نے ایک جگہ لکھا ہے کہ: سرسید کے کردار و عمل اور تحریر و تقریر سے ان کے سیکولر خیالات کی سیکڑوں شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔" (صفحہ ۸ کالم دوم) اگر موصوف نے چند ہی مثالیں پیش کر دی ہوتیں تو مجھ جیسے لوگوں کو غور کرنے کا موقع مل جاتا۔

ایک اور جگہ موصوف نے لکھا ہے کہ: "برسوں کی جدوجہد کے بعد مدرستہ العلوم یا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا اور حکومت سے اردو یونیورسٹی کی بھی مانگ کی۔" (صفحہ ۹ کالم اول) اس سلسلے میں مجھے پہلی بات یہ عرض کرنی ہے کہ انھوں نے مدرستہ العلوم کے قیام سے کم از کم دس برس پہلے اگست ۱۸۶۷ء میں اردو یونیورسٹی کا مطالبہ کیا تھا اور حکومت اس کے لیے تیار بھی تھی، مگر بعد میں جو مشکلات پیش آئیں اور جو تلخ تجربات ہوئے، ان کی وجہ سے وہ اس خیال سے دست بردار ہو گئے۔ چنانچہ اس کے اسباب اور وجوہ پر تفصیل سے بحث کرنے کے بعد مولانا حالی نے لکھا ہے "سرسید اور ان کے ساتھ جتنے آمین کہنے والے تھے، سب ورنیکلر یونیورسٹی کے خیال سے دست بردار ہو گئے۔" (حیات جاوید، ترقی اردو بورڈ ایڈیشن، ۱۹۷۹ء، صفحہ ۱۳۵)

یہی وجہ ہے کہ ۱۸۷۷ء میں جب سرسید مرحوم نے مدرستہ العلوم قائم کیا تو اس کا ذریعۂ تعلیم انگریزی رکھا اور یہ روایت اس وقت بھی برقرار رکھی گئی جب ۱۹۲۰ء میں اس کالج نے ترقی کرکے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر لیا اور اب جبکہ حالات بہت کافی بدل گئے ہیں، اس کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہی ہے۔ حالانکہ اسے اردو یونیورسٹی میں تبدیل کر دینا، نہ صرف یہ کہ بہت آسان ہے، بلکہ اردو زبان و ادب کے لیے بہت مفید ہوگا۔

عبداللطیف اعظمی، ۴۹۳، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

(● محترمی جناب عبداللطیف اعظمی صاحب نے جن تاریخوں کی صحت کی طرف توجہ دلائی تھی، ہم نے اُن کے بارے میں مضمون نگار کو مطلع کیا، مضمون نگار نے جو جواب دیا وہ بھی پیش خدمت ہے۔ ایڈیٹر)

جناب عبداللطیف اعظمی صاحب نے اپنے مکتوب میں میرے مضمون "پسماندہ طبقوں کے مسیحا، گاندھی جی" میں مذکورہ دو تاریخوں سے اختلاف کا اظہار کیا ہے۔

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

بیگم صالحہ عابد حسین کو خراجِ عقیدت



۱۹ر جنوری کو اُردو اکیڈمی، دہلی کی طرف سے بیگم صالحہ عابد حسین کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت کرنل بشیر حسین زیدی نے کی اور متعدد حضرات نے جن میں جناب مالک رام، پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، متعدد دیگر دانشور اور عمائدینِ علم و ادب شامل تھے، مرحومہ کی علمی، ادبی نیز سماجی خدمات کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ بیگم صالحہ عابد حسین اُردو کے عہد ساز ادیب اور شاعر مولانا الطاف حسین حالیؔ کے خاندان سے تھیں اور برصغیر کے ممتاز دانشور ڈاکٹر سید عابد حسین سے ان کی شادی ہوئی تھی۔ انھوں نے تقریباً پچاس کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جو مختلف النوع موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔

(تصویر سید فدا علی)



۲۷ر دسمبر کو اراکین غالب اکیڈمی کی جانب سے مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی ۱۹۰ ویں یومِ ولادت کی تقریب کے موقع پر غالبؔ اکیڈمی، نظام الدین، دہلی میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں اُردو کے نامور ادیبوں نے شرکت کی۔ مرزا غالبؔ کے مزار پر گُل پوشی کرتے ہوئے۔

(دائیں سے) جناب ضامنؔ مراد آبادی، جناب شمس الرب صدیقی، جنرل مینیجر ہمدرد دواخانہ، جناب زرخ ہلال، خصوصی مقالہ نگار اور جناب حکیم عبدالحمید۔

(تصویر: سید فدا علی)

Regd. No. D (DN) 204
R.N. 37032/81

Licensed U (DN) 65 to post without prepayment
at NDPSO , New Delhi

Vol. 7 No. 21-22 YOJANA(URDU) 1-29 February, 198



مرکزی وزیر برائے پارلیمانی امور مسز ممتی ستیلا رکنس نے ۱۶ جنوری کو پیارے لال بھون نئی دلی میں اردو کے ساعر جناب ست پرکاش گنگوہی کے مجموعہ کلام "موج سحر" کا اجراء فرمایا۔ زیر نظر تصویر میں دائیں طرف مسز ممتی ستیلا دکشت کتاب کا اجراء فرماتے ہوئے بیٹھے والوں میں (دائیں سے) جناب میکش اکبرآبادی، جناب مخمور سعیدی، پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر شرافت حالت اور جناب کمال احمد صدیقی (تصویر: سید عبدالعلی)



مرکز علم و دانش، نئی دلی کے زیر اہتمام رسالہ "افکار ملکہ" کے مدیر اعلیٰ جناب عمر حیات خان غوری کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی گئی جس میں ادیب، شاعر اور صحافی حضرات نے شرکت کی۔

(تصویر میں دائیں سے) ڈاکٹر اسعد خان، جناب ابرار کرتپوری، جناب ذکی طارق، جناب عمر حیات خان، جناب رضی نقوی، جناب عادل صدیقی، جناب محبوب ظفر (سفارت خانہ پاکستان)، جناب شوکت حسین اور جناب شمیم حیدر نقوی نظر آرہے ہیں۔

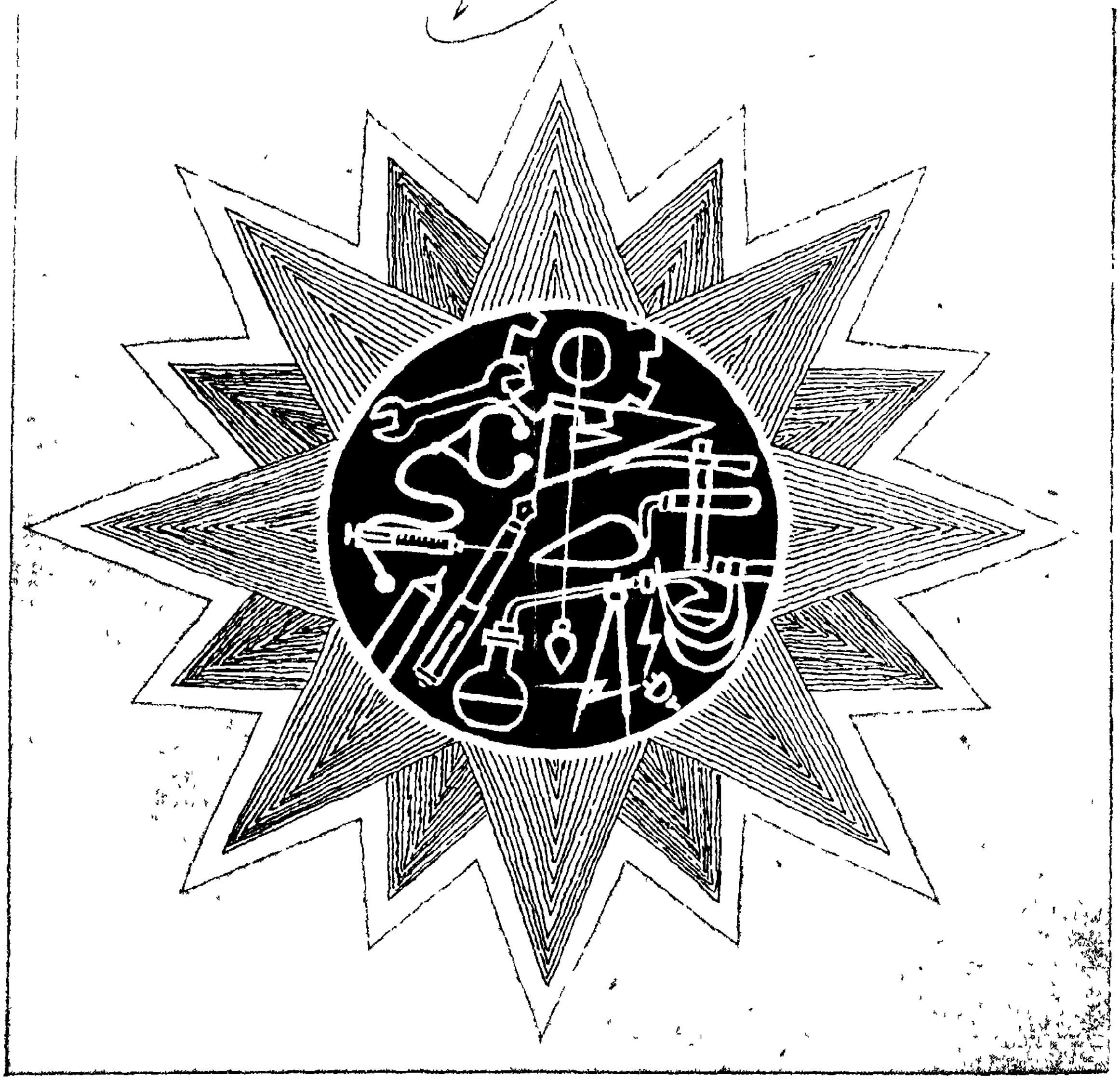
(تصویر: سید عبدالعلی)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110 001
Printed by A.J. Printers, 5-Bahadurshah Zafar Marg, New Delhi-110 002

یوجنا

یکم تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۸ء

دو روپے



اداریہ

بھارتی بحریہ خودکفیلی کی جانب

وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ۳ فروری ۱۹۸۸ء کو وشاکھاپٹنم میں جدید جنگی پن ڈبی بھارتی بحریہ کے حوالے کی۔ اس کا نام ہے آئی این ایس چکرا۔ یہ نیوکلیر ایندھن پر مبنی ہے۔ اس طرح بھارت کا شمار اُن جدید ملکوں میں ہونے لگا ہے جو نیوکلیر نظام سے لیس بحری دفاعی نظام کے مالک ہیں۔ اس سے ملک کی سلامتی کو مزید مستحکم بنانے میں مدد ملے گی۔

۱۹۴۷ء میں حصول آزادی کے فوراً بعد حکومت نے سمندروں کے کردار اور ان سمندروں کی حفاظت کی ضرورت کو محسوس کیا اور بحریہ کی موجودہ سطحوں کو بڑھانے اور مضبوط کرنے کے لیے کئی ایک قدم اُٹھائے گئے۔ بھارت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک مضبوط بحریہ کی ضرورت کو پہچانا۔ لہذا بحریہ کے پہلے علمبردار جہاز آئی این ایس دلی کا خیر مقدم کرنے کے موقع پر وہ ذاتی طور پر وہاں موجود تھے۔ انھوں نے اس جہاز کو ہمارے بحریہ کی بتدریج ترقی کی علامت قرار دیا اور یہ الفاظ آنے والی دہائیوں میں الہامی ثابت ہوئے۔

اس کے بعد بحریہ میں سب سے بڑی پیش رفت ۱۹۶۱ء میں طیارہ بردار جہاز آئی این ایس وکرانت کا حصول تھا۔ بھارتی بحریہ ہم عصر اور ہم مرتبہ ممالک کے بحریوں میں پہلا بحریہ تھا جس نے بحریہ ہوابازی میں یہ صلاحیت حاصل کی تھی اور اس طیارہ بردار جہاز نے ۱۹۷۱ء کی لڑائی میں اپنے جوہر کا مظاہرہ کیا۔ ملک کی یکجہتی اور وقار داؤ پر تھے ایسے وقت میں بحریہ نے توجہ کی دوسری خدمتوں کے ساتھ شاندار بہادری کا مظاہرہ کیا۔ سورگیہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے "خاموش خدمت" کے اس کے کردار کے لیے تعریف کرتے ہوئے کہا کہ بحریہ نے اس چودہ دن کی لڑائی میں جو کامیابی حاصل کی وہ بہت دیر تک یاد رہے گی۔ بحریہ کی کامیابیوں نے قوم میں جوش کی ایک لہر پیدا کر دی ہے۔ آہستہ آہستہ بحریہ نے ایک متوازن طاقت کی سطح حاصل کر لی اور ۱۹۶۷ء میں پہلی آبدوز کشتی کی آمد سے ترقی پذیر بحریہ کی سہ گونہ تصویر مکمل ہو گئی۔

بحریوں کی تشکیل میں طویل مدت صرف ہوتی ہے اور بھارت کے بحریہ نے تو بخوبی مربوط اور کثیر گونہ خدمت کے طور پر ترقی کرنے کے ساتھ ساتھ آزادی کے بعد کے ابتدائی دہوں میں خودکفالت اور خود انحصاری حاصل کرنے کی بنیاد رکھی ہے۔ سرکاری جہاز ساز کارخانے کی بنیادی سہولیات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارتی بحریہ نے پہلے چھوٹے جہاز اور کشتیاں تعمیر کرنے کے پروگرام پر عمل شروع کیا۔ آہستہ آہستہ بحریہ اور جہاز سازی گودی میں ضروری مہارت حاصل ہوتی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بحریہ نے بڑے جنگی جہازوں کا ڈیزائن تیار کرنا اور ان کی تعمیر شروع کر دی۔ جولائی ۱۹۷۱ء میں لینڈر درجے کے پہلے جنگی جہاز آئی این ایس نیلگری کی تعمیر خودکفالت کے حصول کی جانب پہلا بڑا قدم تھا۔ سرکاری ملکیت کے جہاز ساز کارخانے مزگاؤں گودی میں تیار بحریہ کے نمونے پر اس قسم کے چھ جہازوں کی تعمیر سے وہ ضروری مہارت حاصل ہو گئی جس کی مدد سے بھارت میں ڈیزائن کیا گیا پہلا جنگی جہاز آئی این ایس گوداوری یہاں تعمیر کیا گیا جو کہ بھارت کی نمونہ سازی اور جہاز تعمیر کرنے کی صلاحیت کو ایک خراج عقیدت ہے۔

بحریہ کی ایک اور پیش رفت بھارت میں ایک آبدوز کشتی کا نمونہ تیار کیا جانا اور اس کی تعمیر ہے۔ اپنی پرانی آب دوز کشتیوں کے سکویڈرن میں اضافہ کرنے کے لیے بھارتی بحریہ مغربی جرمنی سے ڈیزل سے چلنے والی جدید قسم کی آبدوز کشتیاں حاصل کر رہا ہے۔ اور ان میں سے پہلی دو کشتیاں اگرچہ غیر ممالک میں تعمیر کی جائیں گی تاہم تیسری اور چوتھی کشتیاں مزگاؤں گودی بمبئی میں تعمیر ہوں گی۔ جب بعد ازاں یہ آبدوز کشتیاں سمندری خدمت میں شامل ہو جائیں گی تو بھارت ترقی پذیر ملکوں میں سے پہلا ملک ہوگا جس نے اپنی آبدوز کشتیاں تعمیر کی ہوں گی۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ عورتوں کی طرح سمندری جہازوں پر بھی بہت توجہ اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ مذاق سے کہیں زیادہ یہ بات درست ہے کہ یہ بحریہ کا اصول ہوتا ہے کہ جہازوں کے رکھ رکھاؤ پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے تاکہ ان کی عمر طویل ہو اور وہ ضرورت کے وقت کارروائی کے لیے تیار ملیں۔ دیکھ بھال کے لحاظ سے بھارتی بحریہ کسی دوسرے بحریہ سے پیچھے نہیں ہے جس کا سہرا بحریہ کے ہزارہا بہادروں اور بے وردی عملے کے سر ہے جو خشکی اور سمندر میں بحریہ کی دیکھ بھال کرنے والی جماعتوں کے رکن ہیں۔ بمبئی اور وشاکھاپٹنم کی بحریہ کی گودیوں نے جس طرح مختلف ٹیکنالوجیوں پر عبور حاصل کیا ہے اور وہ جس طرح ہر وقت جہازوں کو لڑائی کے لیے مستعد رکھتی ہیں اس کے لیے ان کی بہت تعریف ہوئی ہے۔ اس

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

یومِ جمہوریہ کے اعزازات

منصوبہ بندی کمیشن کے رُکن شری عابد حسین کو پدم بھوشن



شری عابد حسین، ممبر پلاننگ کمیشن

اس سال یومِ جمہوریہ کے موقع پر صدر جمہوریہ ہند شری آر۔ وینکٹ رمن نے تمل ناڈو کے سابق وزیرِ اعلیٰ سورگیہ شری ایم۔جی۔ رامچندرن کو (پس از مرگ) بھارت رتن کے اعزاز سے نوازا۔ ہندی کی مشہور شاعرہ سورگیہ مہادیوی ورما کو بھی پس از مرگ پدم وبھوشن کا ایوارڈ ملا۔ ان کے علاوہ جسٹس مرزا حمیداللہ بیگ کو بھی ان کی قانون کے شعبے کی خدمات کے عوض پدم وبھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ پدم بھوشن کا اعزاز تیرہ شخصیتوں کو ملا۔ ان میں رُکن منصوبہ بندی کمیشن شری عابد حسین بھی شامل ہیں۔ ۲۷ شخصیتوں کو پدم شری ملا جن میں فلمی اداکارہ شبانہ اعظمی اور کرکٹ کے مشہور کھلاڑی محمد اظہرالدین شامل ہیں۔

●

منصوبہ بندی کی ایک جھلک

۸۹-۱۹۸۸ء میں دلّی کے لیے ۵۱۰ کروڑ روپے کا منصوبہ

منصوبہ بندی کمیشن نے مرکز کے زیرِ انتظام علاقہ دہلی کے لیے ۸۹-۱۹۸۸ء کے ترقیاتی پلان کی رقم ۵۱۰ کروڑ روپے مخصوص کی ہے رواں سال کے دوران یہ رقم ۴۷۰ کروڑ روپے ہے۔ اس کے علاوہ آئندہ سال کے پلان میں ۴۸ کروڑ روپے کی رقم راجگھاٹ بجلی پلانٹ اور گیس ٹربائن پراجیکٹ کے لیے علاحدہ مخصوص کی گئی ہے تاکہ دہلی میں بجلی کی فراہمی بہتر بنائی جائے۔ موجودہ پلان میں گیس ٹربائن پراجیکٹ کے لیے ۴۳۱۱٫۷ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی تھی۔

دہلی کے پلان سے متعلق رقم مخصوص کرنے کا فیصلہ چیف ایگزیکٹیو کونسلر دہلی، مسٹر جگ پرویش چندر اور پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیرمین مسٹر پی شیوشنکر نے ایک میٹنگ میں کیا۔ اس میٹنگ میں منصوبہ بندی کے وزیر مملکت مسٹر سکھ رام اور کمیشن کے ممبران پروفیسر ایم۔جی کے مینن اور دیگر افراد نے شرکت کی۔

اُتّر پردیش کے لیے ۸۹-۱۹۸۸ء کا منصوبہ

اُتّر پردیش کے ۸۹-۱۹۸۸ء کے مجوزہ منصوبے میں ریاست کے پہاڑی علاقوں کی ترقی کے لیے ۴۱ کروڑ روپے مخصوص کئے گئے ہیں۔ جب کہ پورے منصوبے کی مجموعی رقم ۲۶۸۰ کروڑ روپے ہے یہ رقم گذشتہ سال کے مقابلے ۱۸۰ کروڑ روپے زیادہ ہے۔

منصوبے کے بارے میں یہ فیصلہ پلاننگ کمیشن کے نائب صدر مسٹر پی شیوشنکر اور اُتّر پردیش کے وزیرِ اعلیٰ مسٹر ویر بہادر سنگھ کے درمیان میٹنگ میں کیا گیا۔ اس میٹنگ میں وزیرِ مملکت برائے منصوبہ سازی مسٹر رام، اُتّر پردیش کے وزیرِ مملکت برائے مالیات و منصوبہ سازی مسٹر اوپی ریچھاریا اور پلاننگ کمیشن کے متعدد ممبر شریک ہوئے۔

ناگالینڈ کے سالانہ منصوبہ کے لیے ایک ارب دس کروڑ کی رقم مختص

پلاننگ کمیشن نے ناگالینڈ کے ۸۹-۱۹۸۸ء کے منصوبہ کے لیے ۹۴ کروڑ روپے کے مقابلہ میں ایک ارب دس کروڑ روپے کی رقم مختص کرنے کی اپنی منظوری دے دی ہے۔

رقم میں اضافہ کرنے کا فیصلہ وزیرِ اعلیٰ ناگالینڈ ہوکشے سیما اور پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیرمین پی شیوشنکر کے درمیان ہوئی ملاقات کے بعد کیا گیا۔

سیاحت کے فروغ کے لیے ۴۷ کروڑ روپے کا منصوبہ

منصوبہ بندی کمیشن نے ۸۹-۱۹۸۸ء میں سیاحت کی مد میں آنے والے اخراجات میں اضافے کی بات مان لی ہے۔ ۸۹-۱۹۸۸ء میں سیاحت پر ۴۷ کروڑ روپے کے اخراجات کی منظوری دی گئی جبکہ رواں سال میں اس کے لیے ۲۹٫۸۰ کروڑ روپے ہی رکھے گئے تھے۔ اس رقم سے اندرونِ ملک سیاحت کو فروغ دینے اور باہر ملکوں میں سرگرمیوں کو بڑھانے میں مدد مل سکے گی۔ ۱۹۸۷ء میں ہندوستان کی سیر کے لیے ۷،۴۴،۱۶۳ سیّاح آئے جو پچھلے سال کے مقابلے ۰٫۸ فیصد زیادہ ہیں۔ سارناتھ، بودھ گیا اور راجگیر میں سیاحت کے فروغ کے لیے خصوصی اقدامات کئے جارہے ہیں۔

●

ہندوستان میں چائے کی کاشت

چائے غیرالکحلی مشروبات کی عالمی فصلوں میں سب سے اہم پیداوار ہے۔ چائے بہت ہی مقبول مشروب ہے اس کا استعمال اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اب یہ کم و بیش ضروریاتِ زندگی میں سے ایک ضرورت بن گئی ہے۔ دنیا کی تقریباً نصف آبادی چائے کے بطور مشروب روزانہ استعمال کرتی ہے۔ ہندوستان، برطانیہ، سوویت روس، چین، جاپان، پاکستان وغیرہ ممالک میں چائے بطور مشروب بہت زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ برطانیہ میں چائے کا فی کس استعمال دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ سری لنکا اور کینیا میں چائے نوشی کی عادت کم پائی جاتی ہے، جبکہ وہاں چائے کافی مقدار میں پیدا کی جاتی ہے۔ ہندوستان کو صرف یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں دنیا کی سب سے زیادہ چائے پیدا ہوتی ہے، استعمال کی جاتی ہے اور غیر ممالک کو برآمد بھی کی جاتی ہے۔ ہندوستان واحد ملک ہے جہاں چائے کی مختلف اقسام پیدا کی جاتی ہیں یہاں دارجلنگ اور نیلگری پہاڑیوں سے مخصوص فلیور (Flavour) اور خوشبودار (Aromatic) چائے حاصل ہوتی ہے جبکہ آسام میں لذیذ، مزہ دار (Flavour Some) اور تیز چائے پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی چائے دنیا کے مختلف ملکوں میں بہت پسند کی جاتی ہے۔

چائے قوت بخش مشروب ہے۔ اس میں حیاتین کی مقدار ۵ء۱۷ فیصد، ٹینن (Tanin) ۱۳ سے ۱۸ فیصد، کیفین ۴ء۲ فیصد سے ۵ فیصد، پالی فینول ۵ء۲۲ فیصد، چینی ۵ء۳ فیصد اور راکھ کی مقدار ۲ فیصد تک ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ چائے میں کئی دوسرے مادّے بھی تھوڑی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ چائے میں ایک خاص قسم کا تیل بھی موجود ہوتا ہے۔ جو اس میں ایک مخصوص فلیور اور خوشبو (Aroma) پیدا کرتا ہے۔ کچھ چائے میں فلورائڈ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ اُبلتے ہوئے پانی میں چائے کی پتیوں میں موجود فلورائڈ بھی گھل جاتا ہے۔ فلورائڈ دانتوں کی حفاظت کرتا ہے۔ چائے سے ہماری روزمرہ کی ضرورت کا ۵۰ فیصد پوٹیشیم، ۲۵ فیصد المونیم، ۵ فیصد میگنیشیم اور ایک فیصد سوڈیم حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں دودھ، شکر اور ادرک والی چائے کا چلن ہے ایسی چائے سے ہمیں ۴۰ کیلوری توانائی آسانی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ چائے میں موجود ٹینن اور کیفین کی وجہ سے ہمیں فرحت و تازگی حاصل ہوتی ہے۔ اور تھکان دور ہوتی ہے۔ چائے کا بہت زیادہ استعمال نقصان دہ ثابت ہوتا ہے اور جسم میں ایسیڈیٹی (Acidity) میں اضافہ ہوتا ہے۔

چائے کی جائے پیدائش شمال مشرقی ہندوستان یا چین مانی جاتی ہے۔ چین میں ابتداءً چائے کا استعمال دواؤں کے طور پر شروع ہوا تھا۔ بعد میں چائے نوشی کا رواج ہو گیا۔ چین میں چائے نوشی کا رواج پانچویں صدی عیسوی میں بھی موجود تھا۔ چینیوں نے ہی چائے نوشی کے رواج کو جاپان، فلپائن، ملیشیا اور تھائی لینڈ وغیرہ ممالک میں عام کیا تھا۔ ایک ہزار سال پہلے جاپان میں چائے نوشی کا رواج عام ہو گیا تھا۔ سولہویں صدی عیسوی میں یوروپین چائے کی خوبیوں سے آشنا ہوئے۔ ۱۶۶۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاہ چارلس کو چائے کا ایک پیکٹ تحفتاً پیش کیا تھا۔ اس طرح سترہویں صدی میں چائے کی

٭ لیکچرار شعبۂ جغرافیہ، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج کوٹ دوار، گڑھوال، یو۔ پی۔

اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۸۳۳ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کو چین میں چائے کی تجارت سے ہاتھ دھونا پڑا تو ۱۸۳۴ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ نے ہندوستان میں چائے کی کاشت کے امکانات کا پتہ لگایا۔ اُس زمانے میں آسام میں چائے جنگلی شکل میں اُگتی تھی لیکن اس کی منظم کاشتکاری نہیں ہوتی تھی۔ ۱۸۳۴-۳۵ء کے درمیان چین سے لائے گئے بیج کی مدد سے آسام میں چائے کی آزمائشی کاشت شروع کی گئی۔ چائے کی آزمائشی کاشت کے بہت حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے۔ منظم کاشت کاری کے ذریعہ اُگائی جانے والی چائے جنگلی چائے سے کہیں زیادہ بہتر ثابت ہوئی۔ پھر کیا تھا، شمال مشرقی ہندوستان کے ایک بڑے رقبے میں چائے کے باغات لگائے گئے اور چائے پیدا ہونے لگی۔ چائے کی تجارت سے کمپنی کو بہت فائدہ ہوا۔ جلد ہی انگلستان کے بازاروں میں ہندوستانی چائے نے اپنا سکہ جما لیا۔

نشوونما کے طبعی عوامل :-

(Physical Factors of Growth.)

چائے کا پودا جھاڑی نما ہوتا ہے جس کی قدرتی نشوونما ۲۰ فٹ سے ۳۰ فٹ تک ہوتی ہے لیکن اس کے پودوں کو ۴ یا ۵ فیٹ تک بڑھنے دیا جاتا ہے۔ تاکہ چائے کی پتیاں چننے میں مشکل نہ ہو۔ چائے سدا بہار پودا ہوتا ہے اس کی پتیاں سال میں کئی بار چنی جاتی ہیں۔ ایک سال میں عام طور پر تین یا چار بار پتیوں کو چنا جاتا ہے۔ چائے کا پودا چالیس یا پچاس سال تک اچھی پتیاں دے سکتا ہے۔ چائے کی کامیاب کاشت کے لیے بلند درجۂ حرارت اور زیادہ بارش درکار ہوتی ہے۔ چائے کی کاشت ان مقامات پر بہت اچھی ہوتی ہے جہاں سالانہ درجۂ حرارت ۲۵ سے ۳۰ ڈگری سینٹی گریڈ کے بیچ ہو۔ آسام میں اس کی کاشت ۳۵ ڈگری سینٹی گریڈ درجۂ حرارت میں بھی کامیابی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ گرم موسم چائے کی کاشت کے لیے مثالی صورت ہے۔ ۱۸ ڈگری سینٹی گریڈ سے کم درجۂ حرارت میں اس کی اچھی کاشت نہیں ہوتی ہے۔ چائے کا پودا سایہ میں پنپتا ہے اور ہلکے سائے میں تیز رفتار سے بڑھتا ہے۔ اس لیے چائے کے باغات میں ایسے درخت لگائے جاتے ہیں جو زیادہ سایہ دار ہوں اور چائے کے نازک پودوں کو براہِ راست سورج کی تیز شعاعوں سے بچا سکیں۔ زیادہ ٹھنڈک اور پالے سے چائے کے پودے اپنی نزاکت اور حساس ہونے کی بناء پر جل جاتے ہیں۔

بلند درجۂ حرارت کے ساتھ ساتھ مرطوب ہوا میں چائے کے پودوں کی نشوونما اچھی ہوتی ہے۔ عام طور پر اس کے لیے بارش کا سالانہ اوسط ۱۵۰ سینٹی میٹر تک ہونا چاہیئے۔ چائے کے پودے ۲۵۰ سینٹی میٹر تک بارش برداشت کر لیتے ہیں۔ ۱۰۰ سینٹی میٹر سے کم بارش ہونے پر سینچائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ بوچھاروں کی شکل میں بارش بہت مفید ہوتی ہے۔ زیادہ رطوبت یا نمی، صبح کا کہرا اور بھاری شبنم نئی پتیوں کی نشوونما میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔

چائے کی کاشت کے لیے گہری اور زرخیز مٹی جس میں نباتاتی اجزاء کی زیادتی ہو، فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ اس کے لیے ہلکی دومٹ مٹی اور چکنی مٹی بھی مفید ہوتی ہے۔ چائے کی اچھی کاشت کے لیے امونیم سلفیٹ، فاسفیٹ، ہڈی کی کھاد، کھلی کی کھاد اور ہری کھاد کا استعمال نہایت ضروری ہے۔ ایسی مٹی جس میں پانی زیادہ دیر تک نہ رُکتا ہو بہت ہی اچھی ہوتی ہے کیوں کہ مٹی میں زیادہ دیر تک پانی رُکنے سے چائے کے پودے خراب ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چائے کی کامیاب کاشت پہاڑوں کے ڈھلوانوں Foot Hills پر کی جاتی ہے۔ جہاں پانی آسانی سے بہہ جاتا ہے۔ شمالی ہندوستان میں چائے کے باغات سطح سمندر سے ۱۰۶۰ میٹر اور جنوبی ہندوستان میں ۱۴۶۰ میٹر سے ۱۷۰۰ میٹر اونچائی تک پائے جاتے ہیں۔ آسام میں اعلیٰ قسم کی چائے کے باغات سطح سمندر سے ۱۵ میٹر سے ۱۲۰ میٹر کی اونچائی تک واقع ہیں۔

معاشی عوامل

چائے کے باغات کی تیاری ایک محنت طلب کام ہے جو صرف انسانی ہاتھوں سے ہی ممکن ہے کیوں کہ پہاڑوں کے ڈھلوانوں پر مشینوں کا استعمال بہت مشکل ہے۔ چائے کے باغات کی دیکھ بھال چائے کی پتیوں کو چننے، سکھانے، رول کرنے، درجہ بندی کرنے اور ڈبوں میں پیک کرنے کے لیے بہت زیادہ محنت کاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے چائے کی اچھی کاشت کے لیے ارزاں محنت کا حصول ایک اہم معاشی عوامل ہے۔

چائے کی کاشت :-

(Tea culture)

چائے کے بیجوں کو اکتوبر سے فروری تک کیاریوں میں بویا جاتا ہے۔ جب پودے تقریباً ۶ مہینے کے ہو جاتے ہیں تو انھیں پہلے سے تیار کھیتوں میں لگایا جاتا ہے۔ چائے کی شجرکاری بارش کے مہینوں میں کی جاتی ہے خشک موسموں میں پودوں کو لگانے پر سینچائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تین سال میں پودے پتیاں چننے لائق ہو جاتے ہیں۔ پتیاں توڑنے کا موسم اپریل سے شروع ہو جاتا ہے اور اکتوبر تک رہتا ہے۔ عام طور پر ایک پودے سے ایک موسم میں تین بار پتیاں چنی جاتی ہیں، پہلی بار اپریل سے جون تک، دوسری بار جولائی سے اگست تک اور تیسری بار ستمبر سے اکتوبر تک پتیاں چنی جاتی ہیں۔ اگر موسم سرما اور موسم بہار میں بارش ہو جائے تو پتیاں پانچ بار تک توڑی جا سکتی ہیں۔

پودوں کی چھنٹائی (Pruning) بھی چائے کی کاشت کا ایک اہم جز ہے شاخوں کو تراشنے کا کام ایسے موسم میں کیا جاتا ہے جب

پودوں کا بڑھنا رک جاتا ہے۔ پودوں کی چھنٹائی سے نئی پتیاں اور نئی شاخیں نکلتی ہیں نئی پتیاں بہت ہی ملائم ہوتی ہیں جن سے اعلیٰ قسم کی چائے بنتی ہے۔ پرُوننگ سے دوسرا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ چائے کی جھاڑی نیچی رہتی ہے جس سے پتیوں کو توڑنے میں آسانی ہوتی ہے۔ چائے کی پتیوں کو عام طور سے ہاتھ سے ہی چنا جاتا ہے یا پھر قینچیوں کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ عام حالات میں ایک آدمی دن بھر میں ۱۵ کلوگرام سے ۳۵ کلوگرام تک چائے کی پتیاں توڑ سکتا ہے۔ پتیوں کو توڑنے کا کام زیادہ تر عورتیں اور بچے ہی کرتے ہیں۔ اب پتیوں کو توڑنے کا کام ڈائنمو سے چلنے والی مشینوں سے بھی لیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں چائے کے باغات کے نزدیک ہی چائے تیار کرنے کی فیکٹریاں واقع ہیں۔ پودوں سے پتیوں کو توڑ کر ان فیکٹریوں میں بھیجی جاتا ہے۔ جہاں چائے کی پتیوں کو دھوپ میں یا مصنوعی طریقے سے مشینوں پر سکھا لیا جاتا ہے۔ مختلف طریقوں سے سبز چائے یا کالی چائے تیار کی جاتی ہے۔ چائے کو پیک کرنے سے قبل کاٹ اور رول کر لیا جاتا ہے۔ چائے کی مختلف قسموں میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ پتیوں کو تیار کرنے کے طریقۂ کار کے اختلاف کی بنا پر ہوتا ہے۔ چائے تیار کرنے کا کام بہتر ہنرمند افراد کے ذریعہ فیکٹریوں میں ہی کیا جاتا ہے ہمارے ملک میں چائے تیار کرنے والی ۵۰۰ کمپنیاں ہیں۔ یہاں چائے کی صنعت میں تقریباً ۸۰۰ لاکھ افراد کام کر رہے ہیں۔ جن میں پانچ لاکھ سے زائد افراد صرف آسام میں چائے کے باغات اور فیکٹریوں میں لگے ہوئے ہیں۔

اہم ترین علاقے

چائے پیدا کرنے والا زیادہ تر علاقہ ہندوستان کے شمال مشرقی حصہ میں واقع ہے جو ملک کے تمام زیر کاشت رقبہ کے ۸۰ فیصد پر محیط ہے۔ ملک میں چائے کی کل پیداوار کا ۷۵ فیصد آسام اور مغربی بنگال سے، ۵ فیصد اتر پردیش، بہار اور ہماچل پردیش سے حاصل ہوتا ہے جبکہ ۲۰ فیصد چائے جنوبی ہندوستان سے حاصل ہوتی ہے۔ آسام میں چائے کے باغات برہمپترا اور سُرما ندی گھاٹیوں میں واقع ہیں۔ آسام سے ملک کی تقریباً ۵۰ فیصد چائے حاصل ہوتی ہے۔ مغربی بنگال میں چائے کے باغات دارجلنگ، کوچ بہار اور جلپائی گوڑی اضلاع میں واقع ہیں۔ دارجلنگ میں پہاڑی ڈھلوانوں پر چائے کے باغات کو مرکزیت حاصل ہے۔ یہاں اچھے قسم کی خوشبودار چائے پیدا کی جاتی ہے۔ یہاں کی تیار چائے دُنیا بھر میں مشہور ہے۔ مغربی بنگال میں ملک کی تقریباً ۲۰ سے ۲۵ فیصد چائے پیدا ہوتی ہے۔ اتر پردیش میں چائے کے باغات کمایوں اور گڑھوال پہاڑیوں پر واقع ہیں۔ زیادہ تر چائے دون گھاٹی میں پیدا ہوتی ہے۔ ہماچل پردیش میں چائے کی پیداوار کے لیے کانگڑا اور منڈی اضلاع مشہور ہیں۔ یہاں سے ملک کی نصف سے زیادہ سبز چائے حاصل ہوتی ہے۔ بہار میں پیدا ہونے والی چائے کا معیار پست ہوتا ہے۔ پورنیا، رانچی، ہزاری باغ اور چھوٹا ناگپور وغیرہ خاص علاقے ہیں تری پورہ، منی پور اور اروناچل پردیش میں بھی کچھ چائے پیدا ہوتی ہے۔ جنوبی ہندوستان میں چائے کی پیداوار تامل ناڈو کے اناملائی، نیلگری، دانناد، تیرونلویلی اور کوئمبٹور اضلاع، کیرل میں وائناد، وسطی ٹراونکور اور مالابار ساحلی علاقے اہم ہیں۔ کرناٹک میں شموگا اور سکاڈر ضلع، مہاراشٹر میں رتناگری اور ستارا اہم اضلاع ہیں۔ پورے ملک میں تقریباً ۱۳ ہزار ۱۰۰ چائے کے باغات ہیں جو ۳۲،۰۰ لاکھ ہیکٹیرز زمین پر پھیلے ہوئے ہیں۔

چائے کی پیداوار اور تجارت

ہندوستان کو چائے کی پیداوار میں عالمی سطح پر پہلا مقام حاصل ہے۔ یہاں پوری دنیا کی تقریباً ۳۱ فیصد چائے پیدا کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں چائے کی پیداوار ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۲۸۵ ملین کلوگرام تھی جو چائے کی عالمی پیداوار کی ۳۴ فیصد تھی۔ ۷۱-۱۹۷۰ء میں چائے کی پیداوار ۴۱۸ ملین کلوگرام اور ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۵۱۹ ملین کلوگرام تھی۔ ۱۹۸۴ء کا سال ہندوستانی چائے کی صنعت کی تاریخ میں بہت اہم سال تھا کیوں کہ اس سال ملک میں چائے کی ۶۴۵ ملین کلوگرام ریکارڈ پیداوار ہوئی اور چائے کی برآمدات سے ۷۷۴ کروڑ روپے کا زرِ مبادلہ حاصل ہوا۔ ۱۹۸۴ء کے درمیان ہمارے ملک سے تقریباً ۲۲۰ ملین کلوگرام چائے برآمد کی گئی جبکہ اندرونِ ملک ۴۲۵ ملین کلوگرام چائے کی کھپت ہوئی۔ ۱۹۸۵ء میں چائے کی برآمدات سے حاصل ہونے والے زرِ مبادلہ میں کمی واقع ہوئی۔ اُس سال ملک میں ۷۰۹ کروڑ روپے کی ہی چائے برآمد کی جا سکی۔ یہ کمی غیر متوقع طور پر عالمی بازار میں چائے کی قیمتوں میں گراوٹ کی وجہ سے ہوئی۔ پچھلے دو سالوں میں چائے کی برآمدات میں کافی اضافہ ہوا ہے لیکن عالمی بازار میں چائے کی قیمت گر جانے سے زرِ مبادلہ میں کمی ہوئی ہے۔ اس وقت ہندوستان کا عالمی چائے کی برآمدات میں ۲۸ فیصد حصہ ہے۔ اگر ہمارے ملک میں معیاری چائے کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے اور اس کے اعلیٰ معیار پر دھیان دیا جائے تو ۲۰۰۱ء تک ملک کی برآمدات میں چائے کا حصہ ۱۵ فیصد سے بڑھا کر ۳۰ فیصد آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان سے چائے کی برآمدات برطانیہ، مغربی جرمنی، سوویت روس، مصر، ریاستہائے متحدہ امریکہ، کویت اور نیوزی لینڈ وغیرہ ممالک کو ہوتی

ہے۔ برطانیہ، ہندوستانی چائے درآمد کرنے والا اہم ملک ہے۔

ہندوستان میں چائے کی صنعت کو وقتی طور پر کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جس کو جلد از جلد حل کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر ان مشکلات پر قابو نہ پایا گیا تو ہندوستانی چائے کو عالمی بازار میں سخت نقصان پہنچنے کا خطرہ لاحق ہے کیونکہ کچھ سالوں سے کینیا، یوگنڈا، زائرے اور برونڈی وغیرہ ممالک میں پیدا ہونے والی چائے بھی عالمی بازار میں اپنا قدم جما رہی ہے۔ ان ملکوں میں اعلیٰ قسم کی چائے پیدا ہو رہی ہے۔ اس لیے ہمارے ملک میں عمدہ قسم کی چائے کی پیداوار میں مزید اضافہ کرنا بہت ضروری ہے تاکہ یہاں سے برآمد ہونے والی چائے میں معیاری چائے کا حصّہ زیادہ ہو۔ اعلیٰ قسم کی چائے کے لیے ابھی تک ہمارا ملک مشہور ہے۔ "دارجلنگ چائے" جو کہ عالمی شہرت رکھتی ہے اور جس کی پیداوار صرف ۱۰ ہزار ٹن سے ۱۲ ہزار ٹن تک ہے' کی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے۔ بلنڈیڈ (Blen-ded) چائے کی شکل میں بھی چائے کی برآمدات میں حصہ لیا جائے۔ پچھلے دو سالوں میں پیکیٹ چائے (Packets and Tea Bags) کی برآمدات میں ۱۰ ہزار ٹن سے ۳۰ ہزار ٹن تک اضافہ ہوا ہے تاہم اس میدان میں ابھی کافی گنجائش موجود ہے۔

ہماری حکومت نے چائے کی کاشت کو فروغ دینے کے لیے کئی کامیاب قدم اٹھائے ہیں۔ "چائے کی صنعت" کے بہتر نظام کے لیے چائے بورڈ (Tea Board) قائم کیا گیا ہے۔ اس بورڈ کی کوششوں کے نتیجے میں "چائے کی صنعت" میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ طریقہ ہائے کاشت میں بہتری کی بنا پر پیداوار میں پچھلے ۳۵ سالوں میں تین گنا اضافہ ہوا ہے۔ چائے کی بہتر کاشت اور بہتر انتظام، فی ہیکٹیر پیداوار میں اضافہ، قیمتوں کا تعین اور برآمدات کے لیے "ہندوستانی چائے بورڈ" ہی ذمہ دار ہے۔ چائے کی کاشت کرنے والے کسانوں کو جدید معلومات فراہم کرانا بھی اسی بورڈ کی اہم ذمہ داری ہے۔

●

بقیہ: ہندوستان میں کمپنی قانون کا ارتقاء و موجودہ صورتِ حال

کمپنی ایکٹ ۱۹۵۶ء کا اطلاق ہوگا۔

موجودہ ایکٹ میں کمپنیوں کا ایک قانونی ڈھانچہ تیار کرنے سے متعلق تمام ضروری احکامات ہیں، یہ ایکٹ کُل ۱۳ حصّوں پر مشتمل ہے۔ حصّہ اوّل میں ضروری الفاظ کی تعریف و تشریح کی گئی ہے، حصّہ دوم تا چہارم کمپنیوں کے قیام سے متعلق ضروری معلومات فراہم کرتا ہے، حصہ پنجم کمپنیوں کے قرض کے لین دین سے متعلق قانونی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے، حصّہ ششم میں کمپنی کے انتظامی امور و کمپنی کے مختلف افسران کے حقوق و فرائض پر بحث کی گئی ہے' حصّہ ہفتم کمپنیوں کو بند کرنے سے متعلق دفعات پر مشتمل ہے جبکہ حصّہ ہشتم تا سیزدہم میں متفرق امور سے متعلق دفعات ہیں۔ اس طرح تیرہ حصوں پر مشتمل اس ایکٹ میں ۶۱۲ دفعات ہیں، اس طرح یہ ایکٹ دنیا کے کسی بھی کمپنی قانون کے ہم پلّہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

●

بقیہ: قطب مشتری رموز و علائم کی روشنی میں

مجازی عشقِ حقیقی کا زینہ ہے"۔ قطب مشتری کی عمارت اسی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے۔ اس مثنوی کی غرض و غایت یہ ہے کہ جس طرح مختلف کرّوں، بُرجوں، اور آسمانوں میں رہنے والے سیّارے آپسی تال میل سے کائنات کو حیات بخشتے ہوئے ہیں۔ اسی طرح مختلف خطّوں اور علاقوں میں رہنے والے انسان مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے کے باوجود عشقِ انسانی میں مبتلا ہو کر زمین کو جِلا اور احیاء بخش سکتے ہیں۔

●

بقیہ: قارئین کی آراء اور مشورے

کئی پرچے ہیں لیکن ٹکنیکل موضوعات یوجنا کے علاوہ اُردو میں اور کوں چھاپے گا۔

بلجیت سنگھ مطیر۔ سیکٹر نمبر ۱،
کوارٹر ۲۳۱، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی ۲۲-۱۱۰۰

● "یوجنا" کا تازہ شمارہ نومبر ۱۹۸۷ء موصول ہوا۔ یہ شمارہ جتنا دلچسپ ہے اتنا ہی معلوماتی بھی ہے۔

اس شمارہ میں سید احمد شمیم کا مضمون "نئی غزل۔ ایک جائزہ" بے حد پسند آیا۔ شاہین پردیپ جالوی کا مضمون "کرکٹ کی دنیا کی عہد آفریں شخصیت سنیل گواسکر" کافی معلوماتی ہے اور واقعی تعریف کے قابل ہے۔

غزلوں میں عزیز نکھودری اور حسرت رسالپوری کامیاب رہے ہیں۔ نظمیں بھی قابلِ تعریف ہیں۔

آپ 'یوجنا' پابندی سے شائع کر رہے ہیں اس کے لیے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

نوتن مظفر پوری: بسہول، اورائی،
مظفر پور (بہار)۔

●

ڈاکٹر محمد ـــ

مُلک کی تعمیر و ترقی میں سبز انقلاب کی اہمیت

ہماری مبادی ضروریات کا تعلق کافی حد تک معیشت کے شعبۂ زراعت سے وابستہ ہے۔ ہم ترقی کی کسی بھی منزل پر پہونچ جائیں لیکن اس ابتدائی شعبہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتے ہیں۔ گیہوں اور چاول جیسی اشیاء کی پیداوار کے لیے دھرتی ہی کو انسانی محنت کا مرکز بنانا ہوگا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہماری بہت سی صنعتیں اپنے خام مال کے لیے زراعت ہی پر منحصر ہیں۔ علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ایک بنیادی عقدہ کے حل کا آئینہ دار ہے کہ زراعت کی بہتری کے باعث کھیت پر کام کرنے والے مزدوروں، کسانوں اور زمینداروں کی قوتِ خرید میں اضافہ ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں صنعتی اشیاء کی طلب بڑھتی ہے، جو موجودہ صنعتوں کے فروغ نئی صنعتوں و صنعتی وحدتوں کے قیام اور تجارتی کاموں کی بڑھتی ہوئی چہل پہل کا محرک بنتی ہے۔ زراعت کی اہمیت کی اس مختصر تشریح کے بعد ہمارا دھیان زرعی پیدا آوری (Agricultural Productivity) کی طرف جاتا ہے۔

زرعی پیدا آوری کا مطالعہ اصلاً دو نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ اولاً، فی ہیکٹیر پیدا آوری (Productivity per hectare) اور ثانیاً فی کس پیدا آوری (Productivity per capita) لیکن دونوں ہی اعتبار سے قومی سطح پر ہماری حالت کچھ اطمینان بخش نہیں رہی ہے جس کا صحیح اندازہ دوسرے ممالک مثلاً روس امریکہ، چین، جاپان اور فرانس وغیرہ کے ساتھ تقابلی مطالعے سے ہوتا ہے۔ تاہم زرعی پیدا آوری سے متعلق تفصیل یہاں موضوعِ بحث سے خارج ہے۔

قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی غذائی ضرورتوں کے پیشِ نظر من چاہے انداز میں کاشت کی زمین کے رقبے میں خاطر خواہ اضافہ آسان نہیں ہے۔ قدرتی تحدید اس قسم کے اضافے کو لامتناہی سلسلے کا روپ نہیں دھارن کرنے دیگی۔ اب دوسرا پہلو ہمارے سامنے قومی سطح پر فی ہیکٹیر پیدا آوری میں بھرپور اضافہ کرنے سے متعلق ہے۔ اس طرح کھیتی باڑی کے میدان میں دو اہم کاموں کی طرف رُخ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ روز افزوں بڑھتی ہوئی اشیائے خورد و نوش کی ضرورت کے تکفل کے اسباب مُہیا کئے جاسکیں۔

۱۔ دستیاب قابلِ کاشت زرعی زمین کی فی ہیکٹیر اوسط پیدا آوری میں ممکن حد تک اضافہ کرنا اور (۲) زرعی کاموں کے لیے بقدرِ گنجائش بنجر زمین کو زرخیز بنا کر قابلِ کاشت زمین کے رقبہ میں اضافہ کرنا۔

مندرجہ بالا دو معیاروں کو سامنے رکھ کر گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں عالمی زراعت کے خدو خال میں نئے سرے سے تبدیلی آئی ہے۔ اس ضمن میں گیہوں اور چاول کی فصلیں قابلِ ذکر ہیں نئے قسم کے کثیر پیدا آوری بیج کی دریافت، آبپاشی کی بہتر سہولت، کمپوسٹ اور کیمیاوی کھاد کا بڑھتا ہوا چلن اور فصلوں کو کیڑوں نیز بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے دواؤں کی فراہمی نے زرعی شعبے میں غیر معمولی تبدیلی کر دیا ہے ـــ یہی وہ تبدیلی ہے جس کو بین الاقوامی تنظیموں اور زرعی معاشیات کے ماہرین نے سبز انقلاب (Green Revolution) کا نام دیا۔

٭ شعبۂ کامرس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ہندوستان میں بھی اختلاف رائے کے باوجود یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان کھیتی باڑی کے روایتی طریقوں کی جگہ جدید تکنیک اور طریقۂ کار کا دور شروع ہوا جس کے باعث سبز انقلاب رونما ہوا۔

ہمارے سبز انقلاب کی ابتدا ۱۹۶۰ء میں پائلٹ پروجیکٹ کے روپ میں سات اضلاع میں عمیق زرعی ضلعی پروگرام (Intensive Agricultural Distrior Programme- IADP) کے نام سے ہوئی۔ بعد میں کثیر پیداآور پروگرام (High Yielding Verities Programme HYVP) کو (IRDP) کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ پھر اس کا دائرہ وسیع کرکے پورے ملک میں اسی حکمتِ عملی کے ساتھ شعبۂ زراعت کو بھرپور فروغ دینے کی کوششیں جاری کر دی گئیں۔ یہاں ان عوامل کا شمار ضروری ہے جن کی بنیاد پر ہمارے کسانوں اور کھیتوں کو نئی سمت ملی۔

۱۔ نئے قسم کے کثیر پیداآور بیج کی دریافت اور استعمال۔

۲۔ ہری کھاد، کمپوسٹ کھاد اور کیمیاوی کھاد کا استعمال نیز دیگر کیمیاوی اشیاء (جن کا تعلق فصلوں کی حفاظت سے ہے) کی فراہمی اور استعمال۔

۳۔ تعددِ فصل (Multicrop- ping) کے پروگرام کو رواج دینا۔

۴۔ کاشتکاری کے جدید طریقے اور آلات کا عام کیا جانا۔

۵۔ قیمتوں کے تعین کے ذریعے حوصلہ افزائی۔

۶۔ دیہی علاقوں میں بجلی کی سہولت فراہم کرکے آبپاشی کے مسئلہ کو حل کرنا۔

۷۔ گوداموں، ذرائع نقل و حمل اور مارکٹنگ کے حالات کو بہتر بنانا۔

۸۔ زرعی کاموں کے لیے قرض کی سہولتوں کو بڑھانا اور آسان بنانا۔

۹۔ گذشتہ ۲۵ برسوں میں ایک دو سال کے علاوہ زیادہ تر مدت میں قدرتی طور پر مانسونی موافقت کا حاصل ہونا۔

عواملی جائزہ

انڈین کونسل آف اگریکلچرل ریسرچ (ICAR) اور دیگر زرعی یونیورسٹیوں کا کردار تحقیقی کاموں کے لیے قابلِ ذکر ہے، جس کی وجہ سے شعبۂ زراعت میں معیاری انقلاب ممکن ہو سکا ہے۔ نئے قسم کے کثیر پیداآور بیج ایسے ہی اداروں کی علمی اور عملی کاوش کا نتیجہ ہیں جس کی بنا پر کھیتی باڑی کے حالات حیرت انگیز حد تک بہتر ہوئے ہیں۔

ایک سال میں ایک سے زیادہ فصلوں کو حاصل کرنے کا تجربہ اس راہ میں کافی مفید ثابت ہوا ہے۔ زمین کا ایک ٹکڑا ایک سال میں تین فصلوں کے لیے استعمال کیا جائے۔ یہ تصور خاص طور پر ہریانہ اور پنجاب میں عملی شکل میں عام ہوا اور گرین ٹرینگل (Grain Traingle) کے نام سے معروف ہوا۔

کھیتی کے کاموں میں مشینوں کے بڑھتے ہوئے استعمال نے ہمارے گاؤں کے رنگ و روپ کو تو بدل ہی ڈالا ہے۔ اب ٹریکٹر، ہارویسٹر، تھریشر، پمپنگ سیٹ، ونوور، کراپر وغیرہ ہمارے دیہاتوں کی زینت بنتے جا رہے ہیں۔

دیسی اور کیمیاوی کھاد کے بڑھتے ہوئے استعمال کے ساتھ نہروں کے جال، دیہی بجلی پروگرام نیز ضروری قرض کی رقم کی بڑھتی سہولت اور آسان فراہمی نے ہم کو ترقی کے نئے باب سے آشنا کرا دیا ہے۔

اس ضمن میں ہماری ریلوں نے نقل و حمل کی سہولتوں میں اضافہ کرکے زرعی انقلاباتی پروگرام میں کافی تعاون کیا ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ سڑکوں کی تعمیر اور نظام کی بہتری نے ہمارے منصوبے کو مستحکم بنا دیا ہے۔

چھوٹے چھوٹے قصبات اور گاؤں میں سرکاری بنکوں کی شاخوں کے قیام نے بچے بچے کو نظام بنک کاری سے واقف کرا دیا ہے۔ کوآپریٹو سوسائٹیوں پر بھی زور دیا گیا ہے۔ یہاں ریجنل رورل بنک (Regional Rural Bank) کا قیام اس سمت میں ایک مخصوص قدم ہے۔

ان سب کے ساتھ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے غلّہ کی کم سے کم خرید قیمت طے کرکے کسانوں سے براہِ راست غلّہ خریدنے کے نئے باب کا آغاز کیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دیسی ساہوکار، مہاجن اور ایسے ہی دوسرے کاروباری لوگ بازار میں منافع خوری کے غلط ہتھکنڈوں کو استعمال کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔

اس طرح ہمارے زرعی شعبے میں خصوصاً ۱۹۶۰ء۔۷۰ کے درمیان جن مختلف النوع تبدیلیوں نے جنم لیا۔ ان کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور اُن میں روزانہ ہی پیش رفت دیکھنے کو مل رہی ہے۔ یہ سب بہت تھوڑے سے وقت میں انجام پا سکا جس کے لیے ہمارے زرعی سائنس داں مُبارکباد کے مستحق ہیں۔ یہی سبز انقلاب ہے۔

●

پریم پال اشک

دُودھ کی پیداوار میں بھارت کا تیسرا مقام

تندرستی اور صحت کے لیے دودھ ہماری زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ درحقیقت دودھ کے بغیر ہماری زندگی ادھوری ہے۔ تمام ڈاکٹروں کی رائے میں دودھ میں تمام غذائی عناصر موجود ہیں۔ اگر کسی کو کھانے کے لیے اناج نہ ملے تو بھی وہ دُودھ کے سہارے زندہ رہ سکتا ہے، کیونکہ اس میں ہڈیوں کو مضبوط رکھنے کے لیے کیلشیم کے علاوہ کاربن، پروٹین، چربی، کاربوہائیڈریٹ اور وٹامن اے۔ بی۔ سی اور ڈی جیسے قوت بخش اجزا ہوتے ہیں۔ یوں تو ہمارے یہاں گائے اور بھینس کے علاوہ بھیڑ، بکری اور اونٹنی کا دودھ بھی ملتا ہے لیکن افضلیت گائے اور بھینس کے دودھ کو ہی حاصل ہے، یوں تو ہر فرد کے لیے تندرستی اور توانائی برقرار رکھنے میں دودھ کو فوقیت حاصل ہے لیکن بچوں، بوڑھوں، حاملہ خواتین اور مریضوں کے لیے اس کی افادیت مسلّم ہے۔ دودھ یوں تو پینے کے کام آتا ہی ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس سے تیار کی جانے والی دیگر اشیاء مثلاً دہی، لسی، مکھن، گھی اور پنیر وغیرہ بھی صحت اور تندرستی کے لیے اتنی ہی مفید ہیں جتنا کہ دودھ!

آج دنیا میں بھارت نے چاول کے بعد دودھ جیسی زرعی پیداوار میں دوسرا اہم ترین مقام حاصل کر لیا ہے۔ ۸۷-۱۹۸۶ء میں ہمارے ملک میں چار کروڑ ۳۰ لاکھ ۹۰ ہزار لیٹر دودھ پیدا ہوا اور اس طرح دودھ کی پیداوار میں بھارت کو روس اور امریکہ کے بعد تیسرا مقام حاصل ہو گیا ہے اور آئندہ تین برسوں میں بھارت میں دودھ کی پیداوار ۵ کروڑ ٹن سالانہ تک بڑھ جانے کی توقع ہے اور اس صدی کے اختتام تک یہ نشانہ ساڑھے چھ کروڑ ٹن تک پہونچ جائے گا۔

ہمارے دیہی علاقوں میں تقریباً ۸ کروڑ ڈیری فارم ہیں اور اُن میں ہر ایک سے ۲۸۰۰ روپے سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ دودھ کی مجموعی پیداوار کا ۹۰ فیصد ہمارے ملک کی ۲۳ ریاستوں میں سے صرف ۱۲ سے فراہم ہوتا ہے جبکہ پچھلے دو دہوں میں دودھ کی پیداوار میں دوگنے سے بھی زائد اضافہ ہوا ہے۔ جن ۱۲ ریاستوں سے ۹۰ فیصد دودھ فراہم ہوتا ہے۔ اُن میں اترپردیش، آندھرا پردیش، بہار، پنجاب، تامل ناڈو، راجستھان، کرناٹک، گجرات، مدھیہ پردیش، مغربی بنگال، مہاراشٹرا اور ہریانہ شامل ہیں۔

یہ امر بھی باعثِ توجہ ہے کہ حالیہ برسوں میں ہمارے یہاں دودھ کی فی کس فراہمی ۱۰۸ گرام یومیہ سے بڑھ کر ۱۵۷ گرام یومیہ ہو گئی ہے۔ جبکہ ترقی پذیر ممالک میں ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران دودھ کی فی کس فراہمی ۱۰۰ گرام یومیہ تھی۔ اور پوری دُنیا میں یہ مقدار ۳۲۰ گرام یومیہ تھی۔ آپریشن فلڈ کے پہلے دو مراحل کے دوران دودھ کی فروخت کے اقدام کیے گئے جبکہ موجودہ ساتویں منصوبے کے دوران دودھ کے وسیع پیمانے پر حصول پر توجہ دی جا رہی ہے۔ فی الحال آپریشن فلڈ میں ہمارے ملک کے ۲۵۰'۱ اضلاع شامل ہیں اور ہماری ۲۳ ریاستوں اور مرکز کے تحت علاقوں میں ۱۶۸ ملک شیڈ ہیں اور ۴۹ ہزار دودھ کی دیہی کوآپریٹو سوسائٹیاں ہیں۔ جن میں ۵۰ لاکھ سے زائد کسان کنبے شامل ہیں۔ وہ اوسطاً ۸۰ لاکھ لیٹر دودھ یومیہ فروخت کرتے ہیں اور اس سے انھیں تقریباً تین کروڑ روپے یومیہ کی آمدنی ہوتی ہے اور اس طرح یہ رقم ۱۰ ارب روپے سالانہ تک جا پہونچتی ہے۔

(باقی صفحہ پر)

۵-۶۳، ایم بنگلہ صاحب روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱۔
یوجنا، نئی دہلی

ریحانہ بانو*

راجستھان میں ہریالی کے لیے شجرکاری

ریاست راجستھان کو فضائی آلودگی سے بچانے، پیداوار اور پالتو جانوروں کو بڑھانے میں جنگلات نے اہم رول ادا کئے ہیں۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جس قدر تیزی سے جنگلوں کا صفایا کیا گیا ہے اس سے نہ صرف ان کا رقبہ کم ہوا ہے بلکہ ان کی پیداواری صلاحیت بھی گھٹ گئی ہے۔ اس وقت راجستھان کا رقبہ ۳ر۴۲ لاکھ مربع کیلو میٹر ہے۔ اس کے ۳۱۱۵۰ کیلو میٹر علاقوں پر جنگلات پھیلے ہوئے ہیں جو کل رقبہ کا ۹ فیصد ہے۔ یہ بھی رو بہ زوال ہے اور اس کے صرف ایک تہائی حصّہ کو ہی ہم جنگل کہہ سکتے ہیں، حتیٰ کہ پہاڑوں کی وادیاں بھی اُجڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور پہاڑوں کا جو حصّہ سرسبز ہے، وہ آبادی سے دُور اراولی اور وندھیاچل کی پہاڑیوں تک ہی محدود ہے۔

اس لیے راجستھان کی مٹتی ہوئی ہریالی کو دوبارہ لوٹانے کے لیے وہاں سماجی جنگل بانی پروگرام کی شروعات کی گئی ہے اس سے نہ صرف راجستھان ہرا بھرا ہو جائے گا بلکہ لوگوں کی ضرورت میں آنے والے درخت بھی لگائے جائیں گے۔ اس پروگرام کے کچھ فائدے یہ ہیں :-

۱۔ دیہی علاقوں میں ایندھن کی لکڑی کی ضرورت کو پورا کرنا اور گوبر کو جلانے سے بچا کر بطور کھاد استعمال کرنا۔

۲۔ عمارتی لکڑی کی ضرورت کو پورا کرنا۔

۳۔ کاشت کی زمینوں کو ہوا کے کٹاؤ سے بچانا۔

۴۔ ماحول کو خوبصورت بنانا۔

اس پروگرام میں چار طرح سے جنگلات اُگائے جائیں گے، وہ ہیں :-

۱۔ فارم کی بنیاد پر۔

۲۔ جنگلوں میں دوبارہ درخت لگانا۔

۳۔ وادیوں میں دوبارہ درخت لگانا۔

۴۔ دیدہ زیب درخت لگانا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس شجرکاری سے ایک طرف تو مویشیوں کو گھاس اور چارہ ملنے لگے گی وہیں دوسری طرف کھیتی کے لائق زمینوں کو ہوا سے بچایا جا سکتا ہے اگر درخت ہوں تو بارش ہو سکتی ہے، جلانے کی لکڑی اور عمارتی لکڑی کی پیداوار بھی بڑھائی جا سکتی ہے۔

اس منصوبے کی شروعات یہاں پانچویں پنجسالہ منصوبے کے آخر میں ہوئی جو ابھی تک کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے اور اب ایک نیا منصوبہ شجرکاری کے لیے ۱۹۸۵-۸۶ء میں شروع کیا گیا ہے جس کی تکمیل ۱۹۸۹-۹۰ء تک ہو جائے گی۔ اُمید ہے کہ اس دوران راجستھان میں ہریالی لوٹ آئے گی۔

اس نئے منصوبے کا مقصد صرف شجرکاری ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعے پچھڑی ذاتوں، غریبوں اور بے زمین لوگوں کو فائدہ پہنچانا بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس سے کچھ بے روزگاری بھی کم کی جائیگی، اس کے کئی حصّے ہیں۔

پہلے حصّے میں پچھڑے علاقوں میں آباد آدی واسیوں کو دو ہیکٹیئر زمین دی جائے گی تاکہ وہ وہاں شجرکاری کر سکے۔ ان کو محنتانہ کے طور پر ایک خاندان کو ایک سال میں تین ہزار روپیہ دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خاندان اس زمین پر اُگنے والی گھاس اور دیگر اشیا بھی اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ یہ ان کی فاضل آمدنی ہے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ انھیں شروع ہی سے فائدہ ملنے لگے گا۔

دوسرے حصّے کے طور پر غریب اور پچھڑی ذات

---

* معرفت محمد حنیف، ۱۳ میور جنج روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۲۳ -

کسانوں کو ان کے کھیتوں پر پودگھر قائم کرنے کا
م دیا جاتا ہے۔ اس کے لیے تمام ضروری سامان
رجا نکاری محکمۂ جنگلات فراہم کرتا ہے۔ کسانوں
محنت کرکے صرف پودے لگانے ہوں گے۔
ب پودے بڑے ہو جائیں گے تو حکومت اُن
ے فی پودا ۲۰ پیسے کی در سے خریدے گی۔
جلانے کی لکڑی پر کنٹرول کرنے کے لیے بھی
ائین بنائے گئے ہیں۔ اور فیصلہ کیا گیا ہے کہ دیہی
لاقوں میں رہنے والے لوگوں کو فی روز فی شخص
۵ء. کیلوگرام لکڑی اور شہر میں رہنے والے
دں کو فی روز فی شخص ۴۲ء. کیلوگرام لکڑی
ں جائے گی۔ اس حساب سے ۱۹۸۱ء اور ۲۰۰۱ء
ں راجستھان میں جلانے کی لکڑیوں کی ضرورت
ارٹ نمبرا میں دئے گئے اعداد کے مطابق ہوگی۔

چارٹ نمبرا

اقسے	۱۹۸۱	۲۰۰۱
	جلانے والی لکڑیوں کی ضرورت (لاکھ ٹنوں میں)	
دیہی علاقے	۵۷	۶۵
شہری علاقے	۹	۸

پچھلے برسوں میں ریاست کے جنگلوں سے ہر
ل ۷ لاکھ ٹن لکڑیاں نکالی جاتی رہی ہیں جو کُل
مَگ کا دسواں حصہ ہے۔ باقی ضرورتوں کو پورا
نے کے لیے کھیتوں، چراگاہوں، بنجر زمین پر
گنے والے خود رَو جھاڑیوں، فصل کے بیکار حصوں
رگوبر سے مدد لی جاتی ہے۔ اس لیے محکمۂ جنگلات
۔یہی علاقوں میں جلانے کے لیے لکڑی اور چارہ کی

پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر سماجی جنگلاتی پروگرام شروع کرنے کی سفارش کی ہے۔

سماجی جنگل بانی ادارہ محکمۂ جنگلات راجستھان کے مطابق اس پروگرام کے خاص مقاصد یہ ہیں:-

۱۔ ماحول کو فضائی آلودگی سے بچاکر ہوا کو صاف ستھرا رکھنا۔

۲۔ راجستھان میں مٹتی ہوئی ہریالی کو دوبارہ واپس لانا۔

۳۔ دیہی عوام کے لیے جلانے کی لکڑی، جانوروں کے لیے چارہ اور انسانوں کے لیے پھلوں کی پیداوار کو بڑھانا۔

۴۔ ریاست میں سڑکوں، نہروں، باندھوں اور ریلوے لائنوں کے نزدیک واقع بیکار زمینوں سے لکڑی، چارہ اور پھلوں کا پیدا کرنا۔

۵۔ گوبر کو جلانے سے بچانا تاکہ اسے کھیتی کے کام میں لایا جا سکے۔

۶۔ دیہی و شہری لوگوں کے لیے تیوہار کی ضرورتوں کے لیے پودے لگانا۔

۷۔ دیہی علاقوں میں روزگار کے مواقع فراہم کرنا۔

۸۔ چھوٹے کسانوں کی آمدنی بڑھانے کے لیے دیگر بہت سے طریقوں کی تلاش۔

۹۔ لکڑی کو کم سے کم جلانے کے کام میں لانا اور کھاد کو دیہی علاقوں میں مقبول بنانا۔

اس پروگرام میں راجستھان کے ۲۷ اضلاع میں سے ۱۶ اضلاع کو شامل کیا گیا ہے۔ ان کے نام ہیں اور، اجمیر، ٹونک، کوٹا، جھالاواڑ، چتوڑ، سروہی، ڈونگر پور، بھرت پور، جے پور، سوائی مادھو پور، بندی، بھیل واڑہ، اودے پور، بانس واڑہ اور دھول پور۔ باقی کے ۱۱ اضلاع میں بنجر علاقوں کی ترقی کے پروگرام کے تحت کام شروع کر دیا گیا ہے۔ یہ اضلاع ہیں۔ چارو، جھن جھنو، بیکانیر، شری گنگا پور، باڑھ میر، جالور، جیسلمیر، سیکر، ناگور، جودھ پور اور پالی۔

منصوبے کا خاص کام

(الف) باغات کو پھیلانا

ایسا محسوس کیا جاتا ہے کہ اس پروگرام کی کامیابی سے باغات زیادہ پھیل جائیں گے۔ یہ پروگرام خاص طور پر کسانوں اور طالب علموں کے لیے ہے۔ کھیتوں اور اسکولوں میں پودگھر قائم کرنے سے کسانوں کو آسانی سے پودے شجرکاری کے لیے مل جایا کرتے ہیں۔ ایسے پودگھروں کے علاوہ مزید ۵۰ پودگھر ہمیشہ کے لیے قائم کئے جائیں گے جن میں ۲۵، ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران اور باقی ۸۷-۱۹۸۶ء کے دوران قائم کئے جائیں گے۔

(ب) ارضی جنگلات

اس منصوبے کے تحت کسان اپنی زمینوں پر پودے لگائیں گے۔ اس کی تکمیل کے لیے ۱۲ لاکھ پودے تقسیم کئے جائیں گے۔ اس کا سالانہ چارٹ اس طرح ہے:- (چارٹ ۲ اگلے صفحہ پر)

چارٹ نمبر ۲

جنگلات		بیر کے باغات کا تخمینہ
سال	رقم (کروڑ روپیوں میں)	پیڑ کروڑوں میں
۸۶-۱۹۸۵ء	۰٫۲۵	
۸۷-۱۹۸۶ء	۲٫۵۰	۸۰٫۰۰۰
۸۸-۱۹۸۷ء	۳٫۰۰	۹۰۰۰۰
۸۹-۱۹۸۸ء	۳٫۰	۱۰۰۰۰۰
۹۰-۱۹۸۹ء	۳٫۲۵	۱۳۰۰۰۰
کل	۱۲٫۰۰	۴۰۰۰۰۰

کسانوں کو ضروری معلومات کارکنانِ دیہی ترقی اور سماجی جنگلات کے ذریعے دی جائے گی۔

(گ) بیر کے باغات کا پھیلاؤ :-

۴۰ ہزار کسانوں کے فائدے کے لیے شروع کئے جانے والے اس منصوبے کے تحت کسانوں کے کھیتوں پر پائی جانے والی چھوٹے قسم کے بیر کے درخت کو اکھاڑ کر اس پر اچھے قسم کے بیر کی پیوند کاری کی جائے گی۔ اس کا سالانہ منصوبہ چارٹ نمبر ۲ میں دیا گیا ہے۔ ۴ ہزار ہیکٹیئر زمین میں فی ہیکٹیئر ۱۰۰ درخت لگائے جائیں گے۔ پود گھروں میں پیوند کاری کر کے کلی بھی پیدا کی جائے گی۔

۲۔ غریب اور بے زمین افراد کے ذریعے شجر کاری

اس منصوبے کے تحت غریب اور بے زمین اشخاص کا انتخاب کر کے انہیں ۲٫۵ ہیکٹیئر بنجر زمین دی جائے گی تاکہ وہ وہاں شجر کاری کر سکیں۔ اس بنجر زمین سے ہر سال آدھا ہیکٹیئر بنجر زمین پر وہ پودے لگائیں گے۔ اس طرح پانچ سال کے دوران ایک شخص ڈھائی ہیکٹیئر پودوں والی زمین کا مالک ہو جائے گا۔ ان افراد کو شجر کاری کے لیے پودے اور بیج مفت ملا کریں گے اور ہر سال ان کو ۴۰۰ روپیہ بطور امداد ملا کرے گا۔ اس زمین سے انھیں گھاس اور چارہ ابتدا ہی سے ملنے لگے گا۔ اس پروگرام کے تحت ایک ہیکٹیئر زمین پر ۱۶۰۵ پودے اور اچھے بیر کے ۲۰ پودے لگائے جائیں گے۔

۳۔ پنچایتوں کے ذریعے شجر کاری

اس منصوبے کے تحت پنچایتوں کو ان کی زمین پر دیہی جنگلات لگانے پر اکسایا جائے گا۔ وہ لوگ باغات قائم کرنے کے لیے پودے، بیج، کام آنے والی ضروری اشیاء اور تکنیکی جانکاری محکمہ جنگلات سے حاصل کر سکیں گے۔ جہاں پنچایت یہ کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگی لیکن وہ زمین دینے کو تیار ہوگی۔ وہاں یہ کام محکمہ جنگلات کے ذریعے کیا جائے گا۔ پانچ برس بعد ان ہرے بھرے باغات کو پنچایتوں کو سونپ دیا جائے گا تاکہ وہ اس کی دیکھ بھال کارکنانِ سماجی جنگلات کی منشا کے مطابق انجام دے سکیں۔

۴۔ بنجر زمینوں پر عوام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شجر کاری:-

اس پروگرام کے مزید ۵ ذیلی مقاصد ہیں۔

(الف) زوال پذیر جنگلوں میں دوبارہ شجر کاری کرنا تاکہ دیہی علاقوں کے لوگوں کی ایندھن اور چارے کی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔ اس منصوبے کے تحت بلو بلوپرا، ببول، ریڑھ، بانس وغیرہ کے پودے لگائے جائیں گے جیسے جانور زیادہ نقصان بھی نہ پہنچا سکیں اور دیہی عوام بھی ہمیشہ استعمال میں لائیں۔ اس منصوبے میں ایک ہیکٹیئر زمین پر ۱۲۰۰ پودے لگائے جائیں گے جس میں ۴۰۰ پودے چھوٹے پودے کے ذریعے اور ۸۰۰ بیجوں کے ذریعے لگائے جائیں گے۔

(ب) راستوں کے کنارے شجر کاری

ایک سال کے دوران سڑکوں کے کنارے کانٹے دار جھاڑیاں لگائی جائیں گی۔

(ج) نہروں کے کنارے شجر کاری۔

(د) ریل لائنوں کے نزدیک شجر کاری۔

(ہ) باندھوں کے کنارے شجر کاری۔

۵۔ روزگار کی فراہمی :-

آج کل جنگلوں میں کام اتنے بڑھ گئے ہیں کہ یہاں کام کرنے والے لوگوں کو آبادی میں شروع کئے گئے شجر کاری منصوبے کو کامیاب بنانے پر دھیان صرف نہیں کر سکتے اس لیے اس کام کے لیے مزید لوگوں کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں تاکہ اس پروگرام کو کامیاب بنایا جا سکے۔ اس کے علاوہ ایسے افسروں کی تقرری بھی کی جائے گی جو ان پودوں کو کیڑے سے بچانے کے طریقے اور کھاد کے فوائد بھی لوگوں کو بتا سکیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان افسروں کو معلومات بہم پہنچانے کے لیے بھی الور اور جے پور میں جنگلاتی جانچ پڑتال محکمہ قائم کیا گیا ہے۔ ●

جنگلات کا تحفظ

آزادی کے وقت جنگلات کا رقبہ تقریباً ایک ہزار لاکھ ہیکٹیئر تھا مگر آزادی کے فوراً بعد بہت سے ترقیاتی پروگرام بنائے گئے جن میں بڑے بڑے دریاؤں پر بلند باندھ، تیل کی تلاش، کان کنی، سڑکیں، بجلی کے کھمبے، لوگوں کی آبادکاری اور فولاد کے کارخانے بھی شامل تھے۔ ان کی وجہ سے ان کے گرد و نواح کا ماحول متاثر ہوا۔ لہٰذا کافی درخت یا تو خود خشک ہو گئے یا اس علاقوں کی نئی آبادی درختوں کو کاٹ کاٹ کر اپنی ضرورت پوری کرنے لگی۔ آزادی کے بعد خوشحالی میں اضافہ ہونے کی بنا پر آبادی تیزی سے بڑھی اور ان کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے زراعتی پیداوار کو بڑھانا پڑا۔ جو زرعی رقبہ کا اضافہ کرنے ہی سے پورا ہو سکتا تھا، لہٰذا جنگلات کاٹ کر زرعی رقبہ کی کمی کو پورا کیا جانے لگا۔ بارش کا پانی جسے درخت تیزی سے بہہ کر نکل جانے سے روکتے تھے اور پانی کی کافی مقدار زمین کے اندر جذب ہونے کا موقع فراہم کرتے تھے جنگلات کے کاٹنے کی وجہ سے پانی تیزی سے بہنے لگا اور اس تیزی میں زمین کی تراشش و خراش کرنے لگا جس کی وجہ سے دریاؤں کی گہرائی کم ہونے لگی اور پہلے پانی کی جو مقدار دریاؤں کے اندر ہی بہتی تھی وہ اب دریاؤں کے باہر بہنے لگی اور چہار طرف سیلاب آنے لگے۔ ان تمام خامیوں پر قابو پانے کے لیے جنگلات کا تحفظ از حد ضروری ہو گیا، لہٰذا حسب ذیل اقدام اٹھائے گئے۔

قبل اس کے کہ میں جنگلات کے تحفظ کے بارے میں کچھ کہوں یہ بتا دینا بہتر ہوگا کہ جنگلات متوازی لسٹ (Concurrent list) میں شامل ہیں۔ لہٰذا اس کا کچھ حصہ مرکزی حکومت دیکھتی ہے اور کچھ صوبائی حکومتیں۔ مرکز میں انسپکٹر جنرل آف فارسٹس ذمہ دار ہوتا ہے اور صوبے کا ذمہ دار کنزرویٹر آف فارسٹس کہلاتا ہے۔

۱۸۹۴ء میں برٹش حکومت نے ایک ایسی پالیسی بنائی تھی جس سے حکومت کو جنگلات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو لہٰذا جنگلات کاٹنے کے لیے ٹھیکیداروں کو ٹھیکہ دیا جاتا تھا جو بے دردی سے درختوں کو کاٹ کر جنگلاتی علاقوں کو چٹیل میدان بنا دیتے تھے اور اس طرح یہ عمل برسہا برس تک ہونے کی بنا پر جنگلات کا بہت بڑا علاقہ درختوں سے خالی ہو گیا۔ یہاں تک کہ چیراپونجی جو ہندوستان کا سب سے زیادہ بارش کا علاقہ مانا جاتا تھا اور جہاں گھنے جنگلات تھے، بھی درختوں سے بالکل خالی ہو کر بنجر پہاڑی علاقے میں تبدیل ہو گیا۔ اس پالیسی میں تبدیلی کرنے کے لیے ۱۹۵۲ء میں ایک نئی پالیسی بنائی گئی جس کا اہم جز یہ تھا کہ ملک کا ایک تہائی حصہ جنگلات سے ڈھکا ہونا چاہیے اور جنگلات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ محفوظ اور دیہاتی تاکہ ایک طرف دیہاتی جنگلات سے جلانے اور زرعی اوزار بنانے کے لیے لکڑی اور جانوروں کے لیے چارہ حاصل کیا جا سکے اور دوسری طرف بنجر زمین استعمال میں آ سکے، محفوظ جنگلات جو جنگلی جانوروں کے تحفظ کا وسیلہ بن سکے اور شہری آبادی کی لکڑی کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

۱۹۸۰ء میں جنگلاتی تحفظ ایکٹ پاس ہوا جس کے تحت یہ ہدایت کی گئی کہ جنگلاتی

پتہ ۱۶۵، ذاکر باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔
یوجنا، نئی دہلی

رقبہ کسی دوسرے مقصد کے لیے کم سے کم استعمال کیا جائے علاوہ ازیں کچھ مزید ہدایات دی گئیں جو حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ روزانہ جنگلاتی کاروبار میں جنگلات کا تحفظ مدِ نظر رہے۔

۲۔ جنگلات کے پروگرام تمام نقطۂ نظر کا لحاظ رکھ کر بنائے جائیں۔

۳۔ جنگل میں بسنے والے قبائل کے حقوق کی ادائیگی میں جنگلات کا تحفظ نظر سے اوجھل نہ ہونا چاہیئے۔

۴۔ جنگلات میں چراگاہ کا تفصیلی مطالعہ ہونا چاہیئے اور کچھ جنگلاتی رقبہ چارہ کے لیے مخصوص کر دینا چاہیئے۔

۵۔ جنگلات میں زراعت کا علاقہ مخصوص ہونا چاہیئے اور اس کو بار بار بدلنے سے روکا جائے اور دوسرے ناجائز جنگلاتی نقصانات پر کڑی نظر رکھی جائے۔

۶۔ جنگلات میں درختوں کی کٹائی پہاڑی علاقوں میں بیک وقت دس ہزار ہیکٹیر سے زائد نہ ہونی چاہیئے۔ لیکن میدانی علاقوں میں یہ پچیس ہزار ہیکٹیر تک ہو سکتا ہے۔ ایک ہزار سے بلند پہاڑی علاقوں میں جنگلات کا کاٹنا چند سال کے لیے روک دیا جائے۔ ایسے پہاڑی علاقوں میں جہاں تراش خراش زیادہ ہوتی ہے یا پہاڑ کے بڑے حصّوں کے گرنے کا امکان ہے وہاں پر فوری درخت لگانے کا انتظام کیا جائے۔

مندرجہ بالا پالیسی کی بنا پر ۱۹۸۱ء میں مرکزی حکومت نے جنگلات کے سروے کا محکمہ کھولا جو ہر دس سال کے بعد جنگلات کا نقشہ پیش کرے گا اس وقت اس کی پوزیشن یہ ہے کہ سالانہ درختوں کا اندراج تقریباً ۳۵ لاکھ ہیکٹیر رقبہ اراضی پر ہوتا ہے چند برسوں میں یہ شعبہ اس لائق ہو جائے گا کہ ہر تین سال بعد جنگلات کا نقشہ پیش کر سکے گا جس سے یہ ممکن ہو سکے گا کہ حکومت ہر تین سال کے بعد جنگلات کے تحفظ کا نیا پروگرام بنا سکے۔

پروگرام میں یہ بھی شامل ہے کہ تمام بنجر علاقوں پر درخت لگایا جائے اور ملک کا چار فیصد علاقہ قومی پارک، جنگلی جانوروں کی پناہ گاہ اور محفوظ پلاٹ وغیرہ کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔

چھٹے پانچ سالہ پلان میں مرکزی حکومت نے ہمالیہ میں مٹی، پانی اور جنگلات کے تحفظ کا ایک ہمہ جہتی پروگرام پاس کیا تھا۔ جس میں ۲۹ کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ اس پروگرام میں پہاڑی ڈھلانوں پر گھاس، جھاڑیاں اور درخت لگائے گئے اور جو پہاڑی علاقے گرنے والے تھے ان کو مضبوط باندھ بنا کر روکا گیا۔

۱۸۸۱ء میں برٹش حکومت نے دہرہ دون میں جنگلات کے لیے تعلیمی اور تحقیقی کالج کھولا تھا مگر آزادی کے بعد حکومتِ ہند نے اس کالج کی وُسعت کے لیے کثیر رقم فراہم کی جس کی وجہ سے عالمی زرعی ادارہ نے اس کو جنوبی مشرقی ایشیا میں جنگلاتی تعلیم کے لیے عالمی مرکز کی حیثیت دے دی۔ کئی صوبوں میں بھی اس طرح کالج کھولے گئے ہیں۔ مزید برآں پانچ رینجر کالج بھی کھولے گئے ہیں۔ اب کئی زرعی یونیورسٹیاں بھی B.Sc. تک جنگلات کی تعلیم دینے لگی ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں بھوپال میں جنگلات کا انتظامیہ ادارہ کھولا گیا۔

جنگلات کی تعلیم اور تحقیق کی کونسل تمام ملک میں ہونے والی جنگلاتی تعلیم اور تحقیق کی نگرانی کرتی ہے اور مالی امداد بھی دیتی ہے۔
قبائل مختلف پہاڑی جنگلات میں آباد ہیں اور ان کی آبادی تقریباً ۱۵ کروڑ ہے اور یہ تقریباً ۲۵۰ قبائل پر مشتمل ہیں۔ اندازہ ہے کہ ان کی آمدنی کا تہائی حصّہ جنگلات سے حاصل ہوتا ہے مگر ان میں تعلیم کی از حد کمی ہے۔

حکومت نے ان کی بھلائی کے لیے مختلف اقدام اُٹھائے ہیں اس کے علاوہ ان کو جنگلات کے متعلق جو آسانیاں ان کو دی گئی ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ ٹھیکیداروں کو جنگلاتی کاروبار سے روک دیا جائے اور اب تک سات صوبوں نے اس پر عمل کیا ہے

۲۔ قبائل کی جنگلاتی پیداوار کو انفرادی طور پر نہ خریدا جائے بلکہ کوآپریٹو اداروں کے ذریعہ خریدا جائے تاکہ قبائل کے افراد کو مناسب قیمت مل سکے۔

۳۔ قبائل کے گھریلو کاروبار میں مدد کی جائے تاکہ وہ اپنے اوقات کو پیداواری کام میں لگا سکیں۔

۴۔ قبائل کو حکومت کی زمین درخت لگانے کے لیے دی جائے اور جب تک درخت کاٹنے کے لائق نہ ہو جائیں ان کے افراد کو نگرانی کے لیے ماہانہ وظیفہ دیا جائے اور درخت کے کٹنے پر ان کو مناسب حصہ دیا جائے۔

●

نرمل گنگولی٭

برآمدات کے فروغ میں صنعتی پالیسی کا کردار

صنعتی پالیسی کا تجارت برآمد کے فروغ پر اہم اثر پڑتا ہے۔ جبکہ برآمدات صنعتی ترقی کے لیے ضروری زرِ مبادلہ فراہم کرتی ہیں، صنعتی ترقی برآمدات کو فروغ دیتی ہے۔ خود ۱۹۴۸ء کی صنعتی پالیسی کی قرارداد میں ایسی اشیاء کی پیداوار بڑھانے پر زور دیا گیا تھا جن کی برآمد سے ملک کے زرِ مبادلہ میں اضافہ ہو۔ ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی کی قرارداد میں بھی اقتصادی ترقی کی شرح بڑھانے اور صنعت کاری کی رفتار کو بھی تیز کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ لیکن اشیاء سے متعلق لائسنسوں کے لیے رہبرانہ خطوط جولائی ۱۹۷۰ء میں جاری کیئے گئے تاکہ برآمدات کے فروغ کے لیے صنعتی پالیسی کا کردار واضح کیا جائے۔

صنعتی پالیسی کے ایک حصّے کے طور پر تسلیم کیا گیا کہ اُن اشیاء کی بالخصوص برآمد کے بارے میں پیداوار کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے صنعتی صلاحیت کو شعوری اور خصوصی طور پر بڑھانا ہوگا جن میں بھارت کو تقابلی فائدہ ہے اور جن کے لیے بین الاقوامی منڈیوں میں موافقانہ رُجحانات اُبھر رہے ہیں۔ صنعتی لائسنسوں کی درخواستوں پر غور کرنے اور انھیں نپٹانے کے لیے پیداواری صلاحیتوں کی تخلیق کی جانب اس ڈھنگ سے توجہ دینا ہوگی جس سے برآمدی اشیاء تیار کی جا سکیں۔ درمیانے اور چھوٹے پیمانے کے سیکٹروں کے صنعت کاروں کے اداروں کے برآمدی امکانات کو زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک فروغ دینا ہوگا۔ چھوٹے پیمانے کے سیکٹر کے یونٹوں کی اُن اشیاء کے سلسلے میں برآمدی پیداوار کو فروغ دینے کے لیے خاص توجہ دی جانے کو کہا گیا ہے جو اُن کے لیے مخصوص کی گئی تھیں۔ بڑے بڑے صنعتی گھرانوں اور غیر ملکی فرموں کے ملکیتی یا اُن کے زیرِ کنٹرول اُن اداروں کو جنھیں نئی لائسنسنگ پالیسی کے مطابق زیادہ تر بنیادی اور بھاری سرمایہ کاری کے سیکٹروں میں حصّہ لینا تھا اُن سیکٹروں کے باہر ادارے قائم کرنے یا پیداوار بڑھانے کی اجازت دی گئی بشرطیکہ وہ برآمدات بڑھانے کی ذمہ داری لیں۔ ایسے معاملوں میں اُن پر ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ نئی یا زائد پیداوار جسے انھیں تین برسوں میں حاصل کرنا ہوگا، کا ۶۰ فیصد یا زیادہ حصّہ برآمد کریں۔

رہبرانہ خطوط میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ اسمال اسکیل سیکٹر کے لیے جو اشیاء مخصوص کی گئی ہیں اُن کے بارے میں اسمال اسکیل یونٹوں کے علاوہ دیگر یونٹوں کی توسیع یا نئی صلاحیتوں کی تخلیق سے متعلق درخواستوں پر برآمدات بڑھانے کے مفاد میں غور کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ نئی یا زائد پیداوار جو کم از کم تین برس میں حاصل کرنا ہوگی کے کم از کم ۷۵ فیصد حصّے کو برآمد کرنے کی ذمہ داری لیں۔

۱۹۷۳ء میں غیر ملکی کمپنیوں اور اُن کے امدادی اداروں اور غیر ملکی کمپنیوں کی شاخوں کو اپنڈکس ۱ APPENDIX-1 میں واضح کی گئی صنعتوں میں شرکت کرنے کا مستحق بنا دیا گیا جبکہ اس کے ساتھ ہی اُنھیں اُن صنعتوں میں سرمایہ کاری کے لیے متواتر مستحق رہنے دیا گیا جہاں پیداوار غالب طور پر برآمدات کے لیے ہوتی تھی۔ اُن کی سرمایہ کاریوں کا خاص طور پر ٹیکنالوجیکل پہلوؤں، برآمدی امکانات اور ادائیگیوں کے توازن پر مجموعی اثر کے سلسلے میں معائنہ کرنے کو کہا گیا تھا۔

۲۳ جولائی ۱۹۸۰ء کی صنعتی پالیسی کی دستاویز جو ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی کی قرارداد پر مبنی ہے۔

٭ اے۔ ۴۴/۱۸ ڈی ڈی اے ایس ایف ایس، کالکاجی ایکسٹنشن، نئی دہلی۔

زیادہ تر برآمد کرنے والی صنعتوں کے "تیز رفتار فروغ" کو واضح طور پر ایک سماجی، اقتصادی مقصد قرار دیتی ہے۔ اس میں اس امر پر بھی زور دیا گیا ہے کہ صنعت کے لیے لازمی ہے کہ وہ بڑھتی ہوئی غیر ملکی منڈیوں کی ضرورت پوری کر کے تجارتی توازن کو زیادہ موافقانہ بنانے میں اپنا حصہ ادا کریں اور یہ بھی واضح کیا گیا کہ حکومت ۱۰۰ فیصد برآمد کرنے والے یونٹوں کے قیام سے متعلق درخواستوں اور صرف برآمد کے مقاصد کے لیے موجودہ یونٹوں کی توسیع اور ابھرتے ہوئے برآمدی مواقع کا مکمل طور پر فائدہ اٹھانے کی غرض سے پیداوار بڑھانے سے متعلق درخواستوں پر ہمدردانہ طور پر غور کرے گی۔ اس امر کا احساس کرتے ہوئے کہ بھارتی معیشت سمندر پار کی منڈیوں میں مقابلہ کرنے کے ناقابل رہی ہے کیونکہ اُس کا پیداوار کا پیمانہ جو گھریلو مانگ کی سطح سے تعلق رکھتا ہے اس قدر چھوٹا ہے کہ اُس سے جدید ٹیکنالوجی کے فوائد اور اُس پیمانے کی معاشیات حاصل نہیں ہو سکتیں اور کہ پیداوار کی بنیاد بڑھانے سے سمندر پار کی منڈیوں میں بھارت کی مقابلہ کرنے کی طاقت بڑھ جائے گی۔ پالیسی کے بیان میں اعلان کیا گیا کہ حکومت ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کی درآمد پر موافقانہ طور پر غور کرے گی اور پیداواری صلاحیت کو کافی حد تک فروغ دے گی، جس سے وہ عالمی منڈیوں میں مقابلہ کر سکے بشرطیکہ برآمدات کا بھاری امکان پایا جائے۔

برآمدات کے فروغ میں حصہ لینے والی پالیسی کی دفعات

صنعتی پالیسی کی بعض حالیہ واضح دفعات جن کا مقصد برآمدات کو فروغ دینا ہے۔ درج ذیل ہیں۔

۱۔ ایم آر ٹی پی/فیرا کمپنیوں کو جنھیں عموماً اپنڈیکس ۱ کے باہر کی اشیاء تیار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایسا کرنے کی اجازت دی جاتی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی ۶۰ فیصد مصنوعات برآمد کرنے کی ذمہ داری لیں اگر وہ اشیاء اسمال اسکیل کے لیے محفوظ نہیں ہیں اور وہ اپنی ۷۵ فیصد اشیاء برآمد کرنے کی ذمہ داری لیں اگر وہ محفوظ ہیں۔ لیکن زمرہ "بی" اور "سی" کے پسماندہ اضلاع تک یہ ذمہ داری ۲۵ فیصد تک ہے۔

۲۔ جہاں تک ایم آر ٹی پی کمپنیوں کا تعلق ہے برآمدی پیداوار کی تیاری کے لیے انھیں غالب مقام حاصل ہوگا۔

۳۔ جہاں کہیں اصل شے سے مختلف ہونے پر کسی نئی شے کی تیاری کی اجازت دی جاتی ہے۔ کسی بھی صنعتی یونٹ کو اُس کی تیاری کے لیے لائسنس جاری کیا جاتا ہے۔

۴۔ اگر پیداوار برآمد کے لیے ہو تو ایم آر ٹی پی قانون کی دفعہ ۲۲ (توسیع کے لیے) کو دفعہ ۲۱ سے اور (نئے ادارہ کے قیام کے لیے) دفعہ ۲۲ سے مستثنیٰ قرار دیتی ہے۔

۵۔ ۱۰۰ فیصد برآمد والے یونٹوں کے قیام کے لیے ایک نئی اسکیم رائج کی گئی ہے جس میں مشینوں، خام مال اور پرزوں کی درآمد کے لیے ڈیوٹی محاصل نہیں لی جاتی اور اُس کے لیے کسی غیر ملکی اثاثے کی منتقلی پر اصرار نہیں کیا جاتا تیار مال کو مرکزی ایکسائز (پیداواری ٹیکس) سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اس اسکیم کے تحت ایک واحد مقام پر تجاویز کی منظوری دینے کے لیے ایک خصوصی بورڈ قائم کیا گیا ہے۔ درخواست موصول ہونے کے ۳۰ روز کے اندر منظوری دی جاتی ہے۔

۶۔ بڑے بڑے شہروں میں نئے صنعتی اداروں پر عائد پابندیوں کو اُن یونٹوں کی حالت میں چنیدہ طور پر نرم کیا جاتا ہے جو برآمدات کے لیے مال تیار کرتے ہیں۔

۷۔ لائسنس یافتہ صنعتی اداروں کو کا حصہ توسیع کے لائسنسوں کے حصول سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا ہے۔ اگر لائسنس یافتہ پیداواری صلاحیت سے زیادہ تیار کیے جانے والا تمام مال برآمدات کے لیے مخصوص کیا جائے۔

۸۔ اپنڈیکس۔ ۱ کی فہرست کو جس میں "ایم آر ٹی پی" اور "فیرا کمپنیوں" کو شرکت کی اجازت دی گئی ہے۔ وسیع کر دیا گیا ہے۔ اس میں ۳۱ اہم صنعتی گروپوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس فہرست میں ملکی معیشت کے لیے اہمیت رکھنے والی بعض بنیادی صنعتوں اور ایسی بنیادی صنعتوں اور طویل المدتی برآمدی امکانات والی صنعتوں سے براہِ راست تعلق رکھنے والی صنعتوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

۹۔ چیدہ علاقوں میں صنعتی لائسنسنگ پالیسی کو اس غرض سے نرم کر دیا گیا ہے کہ وہ پیداوار اور ٹیکنالوجی کے پیمانوں کے بارے میں صنعت کو بین الاقوامی طور پر مقابلے پر لے آئے۔ فراخدلانہ پالیسی کا اطلاق، خصوصاً ایسے شعبوں کی بیشتر اشیاء پر کیا گیا ہے جن کی ترقی کے امکان کے لیے نشاندہی کی جائے گی تاکہ پیداواری یونٹ اپنی پیداوار کی موجودہ بین الاقوامی مانگ سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے ضروری لچکداری سے کام لے سکیں۔

صنعتی پالیسی رکاوٹ نہیں

بعض حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ صنعتی لائسنسنگ پالیسی بعض اوقات برآمدات کے فروغ کی راہ میں حارج ہوتی ہے۔ لیکن گزشتہ اڑھائی برس میں صنعتی پالیسی سے متعلق جو وسیع سلسلے کی پہل کاریاں کی گئی ہیں اُن سے یہ نکتہ چینی بے بنیاد معلوم ہوتی ہے۔ ۲۸ بڑے صنعتی گروپوں پر سے لائسنس کی قید ہٹا لینا، ۸۲ صنعتوں کے بارے میں پالیسی نرم کرنا، ۴۷ صنعتوں کے بارے میں پیداوار کے کم از کم اقتصادی پیمانوں کی اجازت دینا، اپنڈیکس - ۱ کی صنعتوں کی فہرست کی توسیع کرنا، ایم آر ٹی پی

قانون کی دفعہ ۲۲ (ڈ) کے تحت ۹ صنعتوں کو چھوٹ دینا، ٹیلی کمیونیکیشن کے سازوسامان اور پرزوں کی تیاری میں پرائیویٹ سیکٹر کو شرکت کی اجازت دینا اور پیداواری صلاحیت کی از سر نو توثیق کی اسکیم کا زیادہ دلکش صورت میں دوبارہ اجراء کرنا۔ یہ تمام امور اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ صنعتوں پر کوئی بھی جبر نہیں ہے۔ اگر وہ ترقی کا رُخ اختیار کرتے ہیں۔

برآمدات کے فروغ پر جبر

شاید برآمدات کے فروغ میں رکاوٹیں اس لیے پیدا ہو رہی ہیں کیونکہ ہماری معیشت بھاری لاگت والی ہے۔ ہمارے مال کی کوالٹی صارفین کی متواتر بدلتی ہوئی ترجیحات سے مطابقت نہیں رکھ رہی اور ہم برآمدات کے آرڈروں کا مال مقررہ وقت پر نہیں بھیجتے۔ ہماری لاگت اس لیے زیادہ بیٹھتی ہے کیونکہ لائسنس یافتہ پیداواری صلاحیت دراصل نصب نہیں کی جاتی اور جو صلاحیت نصب کی جاتی ہے اُس کے نتیجے میں ہمیشہ پوری پیداوار حاصل نہیں ہوتی۔ زیادہ لاگت آنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ بھاری مشینری، خام مال اور پرزوں وغیرہ کی درآمد پر بھاری محاصل عائد ہیں۔ فرسودہ ٹیکنالوجی اور جدید کاری اور تحقیقی و ترقیاتی (آر اینڈ ڈی) مساعی کے فقدان سے بھی پیداواری لاگت میں اضافہ ہوتا ہے۔ لاگت بڑھنے کا ایک اور سبب ہے متعدد مرحلوں پر پیداواری ٹیکس لگایا جانا۔

وقت پر مال کی سپلائی کو جزوی طور پر یقینی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وقت پر مال سپلائی کرنے والوں کو بعض فوائد مہیا کیے جائیں۔

برآمدات ترقی کے لیے ضروری

بین الاقوامی تجارت سے کسی ملک کی مخصوص مصنوعات، خصوصاً صنعتی اشیاء کے لیے منڈیاں کھلتی ہیں۔ اس سے روزگار میں اضافہ ہوتا ہے۔ منافع بڑھتے ہیں، بچتوں اور سرمایہ کاری کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ معاشیات کی حد اور جدت پسندی کو بڑھاوا ملتا ہے اور مشینوں اور خام مال کی درآمد ہوتی ہے جو ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔ جیسا کہ سر ڈی ایچ رابرٹسن نے کہا ہے۔ "تجارت ترقی کے ایک انجن کے طور پر کام کرتی ہے" اس امر کے باوجود کہ ترقی یافتہ ملکوں کی طرف سے تجارت کو محدود کرنے کے طور طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔ مقابلے کی ناقابل کنٹرول قوتیں بین الاقوامی تجارت کے میدان میں اپنا کام کرکے رہتی ہیں۔ لہٰذا جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ترقی پذیر ملکوں کو تقابلی قیمتوں پر مناسب کوالٹی کا مال سپلائی کرنا چاہیئے۔ یہ دستور کار یعنی صنعتی مصنوعات کی برآمدات، نہ کہ ابتدائی اور نیم تیار شدہ (نیم فنش والی) مصنوعات کی برآمدات" باہر کی جانب دیکھنے والی صنعت کاری" کے نام سے موسوم ہوا ہے۔ اس دستور کار کے مطابق صنعت کاری محض درآمدات کے متبادل سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ جو بات زیادہ اہم ہے وہ ہے مخصوص طور پر صنعتی مصنوعات کی برآمدات کا فروغ۔ جنوبی کوریا اور تائیوان صنعتی مصنوعات کی برآمد کے ذریعہ صنعت کاری کی نمایاں مثالیں ہیں۔ بھارتی معیشت جس کے صنعتی ڈھانچے میں بہت حد تک گوناگونی آئی ہے۔ بہت بڑے ڈھنگ سے اپنی صنعتی مصنوعات کے لیے برآمدی منڈیوں کی جانب دیکھ سکتی ہے۔

ہماری معیشت میں صنعتی مصنوعات کی برآمد کو فروغ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قوت خرید کی کمی کے باعث بعض مصنوعات کی مانگ گھریلو منڈی میں کافی نہیں ہے۔ اس لیے صنعتی ترقی کو بڑھاوا دینے کے لیے بین الاقوامی منڈیوں کا پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ملک کی بڑھتی ہوئی درآمد کے بل اور مشینوں اور دیگر اہم سازوسامان کی درآمد کے لیے برآمدات کو بڑھا کر سرمایہ موثر طور پر فراہم کیا جاسکتا ہے۔ برآمدی منڈیوں سے زرمبادلہ کما کر کل ملکی پیداوار (جی این پی) کی شرح نمو بھی بڑھائی جا سکتی ہے۔ اس سے ملک میں بچت اور سرمایہ کاری کی شرح کو بھی بڑھاوا ملے گا۔ غیر ممالک میں ہمارے صنعتی مال کے لیے موثر منڈیاں پیدا کرنے سے ہماری مصنوعات بین الاقوامی مقابلے پر بھی پورا اُترنے لگیں گی اور ان کی کوالٹی بھی بہتر ہو جائے گی۔ لہٰذا برآمدات کے فروغ سے ملک کی مجموعی صنعتی و اقتصادی ترقی کو بھی بڑھاوا ملے گا۔

ترقی کا امکان رکھنے والی صنعتیں

تجارتی منظر ترقی پذیر ممالک میں ہماری متعدد روایاتی منڈیوں میں ادائیگیوں کے توازن کے مسائل اور ترقی یافتہ ممالک میں تحفظات کے رُجحانات کے باعث کٹھن ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی متعدد ملکی مالیاتی اداروں سے مالی وسائل کی دستیابی بھی قدرے محدود ہوتی جا رہی ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ جدید کاری کے عمل اور صنعت کے ٹیکنالوجیکل درجے کو بڑھانے سے ملک کی درآمدی ضروریات میں اضافہ ہوگا اور اس سے ہماری ادائیگیوں کے توازن کی پوزیشن پر دباؤ پڑے گا۔ اس سلسلے میں انجینئرنگ برآمدات کو گزشتہ چند برسوں میں جو زوال اور جمود پیش آیا ہے، اُس کی روک تھام کی ضرورت ہے۔ انجینئرنگ سیکٹر کے لیے برآمد کی حکمت عملی کو فروغ دینے کی غرض سے شری ڈی وی کپور کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تاکہ انجینئرنگ اور مشینوں وغیرہ کی برآمد کے لیے ایک "تناظری پلان" مرتب کیا جا سکے۔ کمیٹی نے محسوس کیا کہ ہمارے قدرتی وسائل اور ہنرمند افرادی قوت اور گوناگوں صنعتی ڈھانچے کی بدولت انجینئرنگ برآمدات میں زبردست ترقی کے لیے شاندار بنیاد موجود ہے۔

کمیٹی کی سفارشات پر مبنی ایسی ۲۵ صنعتوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جن میں موجودہ صنعتی ڈھانچہ کافی ترقی یافتہ ہے اور جن میں تقابلی فائدے کا بڑا امکان موجود ہے۔ ان میں تجارتی موٹر گاڑیاں، دو اور تین پہیوں والے اسکوٹر، زرعی ٹریکٹر، مشینی اوزار، کیمیکل اور پراسیس پلانٹ، کپڑا مشینری، کاغذ کی مشینری، ریفریجریٹر اور اس کے پرزے، ڈی جی سیٹ، ڈیزل ریلوے انجن، ریلوے ویگن، شمسی اور قابلِ تجدید توانائی کا سازوسامان، الیکٹرانکس اور کمپیوٹر سافٹ ویئر وغیرہ شامل ہیں

برآمدی امکانات میں چھوٹی صنعتوں کا کردار

پردھان منتری کی طرف سے حال ہی میں خصوصاً برآمدات کے بارے میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے سیکٹر کی کارکردگی کی تعریف کی گئی ہے۔ اس سیکٹر کی برآمدات جو ۷۶-۱۹۷۵ء میں ۵ ارب ۳۲ کروڑ روپے کی تھیں وہ ۸۵-۱۹۸۴ء میں بڑھ کر ۲۵ ارب ۸۰ کروڑ روپے کی ہوگئیں۔ کل برآمدات میں اسمال اسکیل سیکٹر کا حصہ اس کے مطابق ۱۳ فی صد سے بڑھ کر ۲۲٫۵ فیصد ہوگیا۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اسمال سیکٹر کی کل برآمدات میں ۹۱٫۲ فیصد غیر روایتی اشیاء شامل تھیں۔ درحقیقت کل برآمدات میں اسمال اسکیل سیکٹر کا حصہ اس سے بھی زیادہ ہوجاتا ہے۔ اگر بالواسطہ برآمدات کی صورت میں اس کے حصے کو بھی حساب میں شامل کیا جائے کیونکہ چھوٹے چھوٹے یونٹ ایسے حصے پرزے بھاری مقدار میں سپلائی کرتے ہیں جو درمیانہ اور بڑے پیمانے کے سیکٹروں کی تیارشدہ مصنوعات میں جوڑے جاتے ہیں۔ ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران کھیلوں کے سامان، تیار تمباکو، نسوار، لاکھ اور پلاسٹک کی بیشتر اشیاء کی برآمدات خاص طور پر اسمال اسکیل سیکٹر میں سے کی گئیں۔ اس کے علاوہ ملک سے جو برآمدات کی گئیں ان میں سے اس سیکٹر کا مچھلیوں وغیرہ میں ۹۲ فیصد، سِلے سِلائے کپڑوں میں ۹۰ فیصد، اونی مال میں ۸۴ فیصد، چمڑے اور چمڑے کی مصنوعات میں ۷۶ فیصد اور انجینئرنگ کے سامان میں ۴۴ فیصد حصہ تھا۔

اس سیکٹر میں ترقی کا بڑا امکان پایا جاتا ہے۔ جس سے ابھی فائدہ اٹھایا جانا ہے۔ ملک کی زرمبادلہ سے متعلق بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس سیکٹر سے برآمدات میں مزید اضافہ کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کی جائے۔

حتمی تجزیہ میں برآمدات کے فروغ کا تعلق صرف صنعتی پالیسی سے ہی نہیں بلکہ دیگر کئی امور سے ہے۔ نئی منڈیوں اور نئی مصنوعات کی نشاندہی، برآمدات کے لیے قرضے کی آسانی سے دستیابی، اعلیٰ کوالٹی کے مال کی تیاری اور وقت پر مال کی سپلائی وغیرہ مساوی طور پر ضروری ہیں۔ اس طرح ترقی کا امکان رکھنے والی مصنوعات اور علاقوں کی نشاندہی کرنا ہوگی سازگار مالی پالیسی، تجارت اور ترقی یافتہ ٹیکنالوجیکل پالیسی کے ساتھ مل کر صنعتی پالیسی صنعتی سیکٹر میں ترقی کا امکان رکھنے والی اشیاء کی بڑے پیمانے پر تیاری میں بڑی مدد دے گی جو بدلے میں برآمدات کی رفتار ترقی میں نئی تیزی لاکر رہے گی۔ ●

بقیہ: دودھ کی پیداوار میں بھارت کا تیسرا مقام

فلڈ آپریشن کے تیسرے مرحلے کے دوران دودھ کی موجودہ پیداوار ایک کروڑ لیٹر یومیہ سے بڑھ کر ایک کروڑ ۸۰ لاکھ ۳۰ ہزار لیٹر ہوجانے کی توقع ہے اور اس کے ساتھ ہی سائنٹفک انداز سے دودھ کی پیکنگ کا اعلیٰ سسٹم بھی شروع ہوگیا ہے۔ اس سے دودھ کے صارفین میں مزید اضافہ ہوگا۔ اور ہمارے یہاں دودھ کی نہریں بہنے کا قدیم تصور حقیقت بن جائے گا۔ ●

بقیہ اداریہ

برس فروری میں ممبئی میں بحریہ کی جہاز ساز گودی کے لیے وہ لمحہ فخر کا تھا جب اس نے اپنی ۲۵۰ ویں سالگرہ منائی۔ یہ بھارت کی جہازرانی کی قدیم روایات کی یاد دلاتا ہے۔

قبل ازیں اس سال سرکار نے برطانیہ کے شاہی بحریہ کے طیارہ بردار جہاز ہرمز کو بھارتی بحریہ کے لیے حاصل کرنے کے فیصلہ کا اعلان کیا۔ اگلے برس دوسرے طیارہ بردار جہاز کے خدمت میں شامل ہوجانے سے ہندوستانی بحریہ خاکنائے ہند کے گرد سمندروں میں بھارت کے قانونی ذمہ داریوں کو نبھانے کی ضروری صلاحیت حاصل کرے گا۔ اس کے علاوہ غیر ممالک سے حاصل کئے جانے والے اور ملک میں تیار ہونے والے جہازوں میں ایک معقول توازن برقرار رکھنے کی غرض سے طویل المدت منصوبہ بنایا گیا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد ملک نے ناوابستگی اور پُرامن بقائے باہم کی پالیسی اختیار کی ہے اور اسے اس تحریک کا رہنما تسلیم کیا جاتا ہے۔ تاہم ناوابستگی صرف خودکفالت اور خودمنحصری سے ہی حاصل ہوسکتی ہے اور اس کا اطلاق دفاع سے زیادہ کسی شعبے پر نہیں ہوتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اقوام عالم کی صف میں بھارت کا مرتبہ ہمیشہ اس ملک کی حاصل کردہ سمندری طاقت سے قریبی طور پر وابستہ رہا ہے، ستواہن، چولا اور شری وجے سلطنتوں کے مختصر دور میں بھارت کی سمندروں میں جہاز رانی اور مقامی طور پر جہاز تیار کرنے کی قابلیت بہت اعلیٰ تھی جس کا تمام ممالک احترام کرتے تھے۔ اس کے بعد آنے والے بھارتی حکمرانوں کی کمزور ہوتی ہوئی سمندری طاقت اور غیرملکی سرکار کی آمد کا باہم تعلق اتنا واضح ہے کہ اسے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔

جوں جوں برس گذریں گے اضافہ اور بھی زوردار ہوگا اور سفید وردی والے یہ لوگ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے اور قوم نے ان پر جو اعتماد کیا ہے اس پر پورے اُترنے میں کسی سے بھی پیچھے نہیں رہیں گے۔ ●

عرفان عمر

ہندوستان میں کمپنی قانون کا ارتقا و موجودہ صورتِ حال

کمپنی (Company) سے مراد تجارتی و صنعتی اداروں کی ایک مخصوص قسم سے ہے۔ ایسے ادارے اپنے حقِ ملکیت کے حصص (Share) فروخت کر کے ضروری سرمایہ حاصل کرتے ہیں۔ حصص کے خریدار مجموعی طور پر کمپنی کے مالک (Owner) ہوتے ہیں اور انھیں میں سے چند لوگ انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے منتخب کر دئے جاتے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں ہندوستان میں اپنا آئین نافذ ہوا۔ آزاد ہندوستان کی ضروریات غلام ہندوستان سے قدرے مختلف تھیں پھر ملک کے بٹوارہ میں چند بہترین صنعتوں سے ملک محروم ہو گیا تھا اس لیے ضرورت اس بات کی محسوس کی گئی کہ صنعتی و تجارتی ترقی کے لیے خوشگوار ماحول و فضا پیدا کی جائے۔ ترقیاتی کاوشوں کی اس منزل میں انگریزوں کا بنایا ہوا کمپنی قانون معاون ثابت نہیں ہوا اور ایک ترقی یافتہ کمپنی قانون تیار کرنے کے لیے حکومت ہند نے پچیس ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو بارہ افراد پر مشتمل سرایچ' سی' بھابھا (H.C. Bhabha) کی قیادت میں ایک کمیٹی تشکیل کر دی جس کے ذمہ درجِ ذیل حالات کے پیشِ نظر ایک جامع رپورٹ تیار کرنے کا کام دیا گیا۔

(۱) ہندوستانی حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے مشترک سرمایہ والی کمپنیوں کا قیام اُن کی اہمیت و ضرورت پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ کیا ۱۹۱۳ء کا کمپنی قانون کمپنیوں کی ترویج و ترقی کے لیے موزوں و مناسب ہے؟ (۲) ہندوستان میں صنعت و تجارت کی پسماندگی کے لیے کون کون سے عوامل ذمہ دار ہیں اور نئے کمپنی قانون کے ذریعے تجارت و صنعت کی بہتر رفتار ترقی کیوں کر ممکن ہے؟۔ بھابھا کمیٹی نے اپریل ۱۹۵۲ء میں ایک جامع رپورٹ پیش کی جس کے نتیجہ میں ۱۹۵٦ء میں ایک نیا کمپنی قانون پاس کیا گیا۔ گو بھابھا کمپنی کی تشکیل کی بنا یہ تھی کہ آزاد ہندوستان کے لیے مناسب ترین قانون کا نفاذ عمل میں آئے۔ مگر بغور مطالعہ کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۵٦ء کا قانون بہت بڑی حد تک انگلینڈ میں ۱۹۴۸ء میں پاس ہونے والے کمپنی قانون سے متاثر ہے۔ انگلینڈ کا کمپنی قانون ۱۹۴۸ء کوہن کمیٹی (COHEN COMMITTEE) کے سفارشات کے نتیجہ میں عمل میں آیا تھا اور ایسا لگتا ہے کہ بھابھا کمپنی نے اپنی رپورٹ تیار کرنے و نتائج اخذ کرنے میں کوہن کمیٹی کی رپورٹ پر کافی بھروسہ کیا۔

کمپنی ایکٹ ۱۹۵٦ء ایک جامع و مکمل قانون ہے جس میں کمپنی کے قائم کرنے سے لے کر کمپنی کے بند کئے جانے تک تمام امور سے متعلق ضروری قواعد و ضوابط شامل ہیں اس قانون کے پس پشت درج ذیل مقاصد کارفرما تھے۔

(۱) کمپنی کے لین داروں (Creditors) کے حقوق کا تحفظ۔

(۲) کمپنی کے سرمایہ کاروں مثلاً حصص کے خریداروں کے حقوق کا تحفظ۔

(۳) حکومت کو کچھ اس قسم کے اختیارات فراہم کرنا کہ بوقت ضرورت وہ کمپنیوں کے معاملات

پتہ: ڈی ٦٣، جامعہ کالج کیمپس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ ۔

میں دخل انداز ہوسکیں تاکہ کمپنی کے انتظامیہ مثلاً ڈالمیا جین اور آر۔ ٹی ۔ آئی ۔ کی بدعنوانیوں پر کڑی نظر رکھی جاسکے۔

(۴) ملک کے اندر کمپنیوں کی صحت بخش ترویج و ترقی۔

مندرجہ بالا مقاصد کے تکمیل کے لیے کمپنی قانون میں ضروری دفعات شامل کی گئی ہیں۔ موجودہ کمپنی ایکٹ کے تحت تجارت وصنعت سے متعلق تمام ضروری قواعد وضوابط واصول وضع کردئے گئے ہیں تاکہ کمپنی کا قیام، انتظام و اختتام ممکن حد تک بدعنوانیوں سے پاک رہے، چونکہ انسان بذات خود مکمل ترین نہیں لہذا اس کا تخلیق شدہ علم بھی نامکمل وخلیق ہوتا ہے پھر کمپنی قانون ۱۹۵۶ء کیونکر داغ وقلع ثابت ہوسکتا ہے،

لہٰذا چند ہی سال بعد اس ایکٹ کی خامیاں سامنے آنے لگیں اور ۱۹۵۷ء میں شاستری کمیٹی تشکیل ہوئی جس کے نتیجہ میں کمپنی (ترمیم) ایکٹ ۱۹۶۰ء پاس ہوا جو دوسو اٹھارہ [۲۱۸] دفعات پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد تو جیسے ترمیمات کا دروازہ کھل گیا اور تقریباً ہر دوسرے تیسرے سال کمپنی ایکٹ ۱۹۵۶ء میں ترمیمات ہونے لگیں جن کا ایک مختصر خاکہ درج ذیل ہے :-

(۱) کمپنی (ترمیم) ایکٹ ۱۹۶۲ء جس کی رُو سے دفعہ ۲۹۳ بی شامل کی گئی۔

(۲) کمپنی (ترمیم) ایکٹ ۱۹۶۳ء جس کی رُو سے کمپنی کے انتظامیہ کو مزید فعال بنانے کے لیے ضروری دفعات شامل کی گئیں۔

(۳) کمپنی (ترمیم) ایکٹ ۱۹۶۴ء جس نے کمپنیوں میں کام کرنے والے ملازمین کے حقوق کے تحفظ کی جانب مثبت قدم اٹھایا تاکہ ملازمین کو غیرضروری بندشوں سے آزاد رکھا جائے۔

(۴) کمپنی (ترمیم) ایکٹ ۱۹۶۵ء جس کے ذریعہ لوسس کمیٹی و دفتری ۔شاستری کمیٹی کی چند بنیادی سفارشات کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ ڈالمیا۔ جین کمپنی کے قضیہ کو نمونہ بناکر اس ترمیم ایکٹ میں کمپنی کی جانچ پڑتال کے متعلق ضروری دفعات داخل کی گئیں اور کچھ ایسی دفعات جو غیرضروری تھیں انھیں خارج کردیا گیا تاکہ کمپنی قائم کرنے وچلانے میں غیرضروری رخنہ اندازی کو محدود کیا جاسکے۔

(۵) کمپنی (ترمیم) ایکٹ ۱۹۶۶ء

(۶) کمپنی (ترمیم) ایکٹ ۱۹۶۷ء

(۷) کمپنی (ترمیم) ایکٹ ۱۹۶۹ء اس ترمیم کے ذریعہ مینیجنگ ایجنسی سسٹم کو باقاعدہ طور پر ختم کرنے کا اعلان کیا گیا۔

(۸) کمپنی (ترمیمات) ایکٹ ۱۹۷۴ء اس ایکٹ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ کمپنی سے متعلق تمام قسم کی بدعنوانیوں کا خاتمہ کیا جائے۔

(۹) کمپنی (ترمیمات) ایکٹ ۱۹۷۹ء اس ایکٹ کے تحت کمپنیوں کے ذریعہ حاصل کئے جانے والی ڈپازٹ سے متعلق ضروری قاعدے قانون وضع کئے گئے، اس کے علاوہ کمپنیوں کو خیرانہ مقاصد کے لیے چندہ دینے پر پابندی دور کی گئی۔

(۱۰) کمپنی (ترمیمات) ایکٹ ۱۹۸۵ء اس ایکٹ کے تحت کمپنیوں کے انتظام سے متعلق چند ضروری دفعات شامل کی گئیں۔ اس ایکٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کمپنیوں پر سیاسی پارٹیوں کو چندہ دینے کی جو پابندی عائد تھی وہ اٹھالی گئی۔ اب کوئی بھی کمپنی جو تین سال سے زائد عرصہ قبل قائم ہوئی وہ اپنے نفع کا پانچ فیصد تک سیاسی جماعتوں کو یا سیاسی مقاصد کے لیے صرف کرنے کی مجاز قرار پائی۔

مندرجہ بالا حقائق سے ظاہر ہے کہ حکومت نے کمپنی ایکٹ ۱۹۵۶ء کو جامع ترین بنانے کے تمام تر کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود مختلف مسائل کے سلسلہ میں اس ایکٹ کی خامیاں ابھی بھی ظاہر ہوتی ہیں اس بات کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۷۸ء میں جسٹس راجندر سچر نے کمپنیوں سے متعلق اپنی رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش کی آٹھ سو تیس صفحات پر مشتمل یہ رپورٹ مشترک سرمایہ کمپنی کے متعلق تمام ضروری وبنیادی پہلو پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے مزید ترمیمات کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔

اپنی خامیوں سے قطع نظر کمپنی ایکٹ ۱۹۵۶ء بہرحال ہندوستان میں نافذ کمپنی قانون ہے جس کا احترام لازم ہے موجودہ ایکٹ کا دائرہ کار تمام ہندوستان تک پھیلا ہوا ہے لیکن ناگالینڈ، دمن اور دیو، اور جموں وکشمیر میں اس ایکٹ کا اطلاق تھوڑی بہت تخفیف وترمیم کے ساتھ ہوتا ہے۔

چونکہ کمپنیوں کی بھی مختلف اقسام ہوتی ہیں۔ اس لیے اس ایکٹ میں واضح طور پر یہ بتادیا گیا ہے کہ اس کے مختلف دفعات کا اطلاق محض درج ذیل کمپنیوں پر ہی ہوگا۔

(۱) کمپنی ایکٹ ۱۹۵۶ء کے تحت قائم ورجسٹرڈ ہونے والی کمپنی۔

(۲) کمپنی ایکٹ ۱۹۵۶ء سے قبل کسی دوسرے ایکٹ کے تحت قائم ہونے والی کمپنی۔

(۳) غیرملکی کمپنی۔

(۴) بیما وبینکنگ کمپنیاں۔

(۵) سرکاری کمپنیاں۔

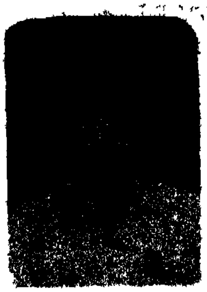
(۶) غیرمحدود کمپنیاں جن کا رجسٹریشن کسی دوسری کمپنی قانون کے تحت محدود کمپنیوں کے طور پہ ہوا ہو۔

(۷) کمپنی کو بند کرنے سے متعلق تمام دفعات کا اطلاق غیر رجسٹری شدہ کمپنیوں پر بھی ہوگا۔

(۸) کوئی بھی دوسرا کمپنی جیسا ادارہ جس کے لیے سرکار گزٹ کے ذریعہ اعلان کرے کہ اس پہ کمپنی

(باقی صفحہ پر)

سید علی٭



ضلع صنعتی مرکز پروگرام اور دیہی صنعتی ترقی

ہندوستان کی ۷۰ فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ اس لیے غربت اور بے روزگاری کا خاتمہ اسی وقت ممکن ہے جب صنعتی ترقی دیہات میں بھی ہو۔ ہمارے پنج سالہ منصوبوں کا یہ ایک اہم مقصد بھی ہے۔

دیہی صنعتوں میں عام طور پر مشنری اور آلات سے کام نہیں لیا جاتا اس لیے زیادہ مزدوروں کو روزگار کے مواقع فراہم ہوتے ہیں جن سے معاشی قوت کے ارتکاز اور اجارہ کے رجحانات کو دور کیا جا سکتا ہے۔ زرعی شعبہ میں ضرورت سے زیادہ مزدور کام کر رہے ہیں جس کی وجہ مزدور کی اوسط پیداوار میں کمی ہے۔ دیہی صنعتوں کے قیام سے زراعت کے شعبہ میں پوشیدہ بے روزگاری (Disguised un-employment) کا مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے اور جس کے نتیجہ میں گاؤں والوں کا معیارِ زندگی بھی بلند ہوگا۔

غربت اور بے روزگاری کے خاتمہ کے لیے حکومت نے کئی اقدامات کئے ہیں۔ مثلاً مربوط دیہی ترقی پروگرام (IRDP) اور قومی دیہی روزگار پروگرام (NREP) وغیرہ۔ اس کے علاوہ دیہی علاقوں میں صنعتوں کے قیام کے ذریعہ روزگار فراہم کرنے کے لیے مرکزی حکومت نے یکم مئی ۱۹۷۸ء سے ضلع صنعتی مرکز پروگرام (ڈسٹرکٹ انڈسٹریز سنٹر) شروع کیا ہے۔ اس سے قبل مرکزی اور ریاستی ادارے ہی انفرادی طور پر دیہی صنعتی ترقی کے لیے اپنی خدمات انجام دیتے تھے۔ جدید پروگرام کے تحت ایسے تمام اداروں کو ایک پلیٹ فارم پر لایا گیا ہے تاکہ ہر ضلع میں صنعتی ترقی کو یقینی بنایا جا سکے۔ اس پروگرام کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتیں بڑے شہروں سے دیہی اور پسماندہ علاقوں کو منتقل کی جائیں۔

طریقۂ کار

ضلع صنعتی مراکز حسب ذیل فرائض انجام دیتے ہیں:۔

۱۔ مختلف اسکیموں کی نشاندہی کرتے اور مستقبل میں اشیاء کی مارکٹ کا تخمینہ لگاتے ہیں اور صنعت کاروں کو سرمایہ کاری کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں اور موجودہ صنعتوں میں خام مال اور انسانی وسائل کے بارے میں سروے کرتے ہیں۔

۲۔ گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے مشنری اور دیگر ضرورتوں کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کی فراہمی کے بارے میں صنعت کاروں کو معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ قسطوں پر خریداری (ہائر پرچیز) کی بنیاد پر مشنری کی سپلائی کا انتظام کرتے ہیں۔

۳۔ چھوٹے صنعت کاروں کی تربیت کا اہتمام کرتے ہیں۔ منتخب اشیاء کی پیداوار اور اس کے معیار کے بارے میں تحقیقی معلومات چھوٹی مصنوعات کی ترقی کے اداروں اور دیگر اداروں (Small Industries Service Corporation) کو فراہم کرتے ہیں۔

۴۔ صنعت کاروں کو خام مال کی ضرورت، اس کی قیمت اور دستیابی کے ذرائع معلوم کرنے کے علاوہ بڑے پیمانے پر ان کی خرید اور تقسیم کا انتظام بھی کرتے ہیں۔

۵۔ لیڈ بنکس اور دیگر مالی اداروں سے ربط پیدا کر کے صنعت کاروں کو مالی امداد دیتے ہیں۔

٭ لیکچرر، شعبہ معاشیات، گورنمنٹ جونیر کالج (بوائز) نلگونڈہ — ۵۰۸۰۰۱ (اے۔پی)۔

۶۔ گورنمنٹ پروکیورمنٹ اداروں سے تعلق قائم کرکے صنعت کاروں کو مارکٹ کے بارے میں معلومات مُہیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مارکٹ سروے اور مارکٹ کی ترقی کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔

۷۔ کھادی اور دیہی صنعتوں کے علاوہ دیگر گھریلو صنعتوں کی ترقی کی طرف خاص توجہ دیتے ہیں۔ علاقائی کھادی بورڈ سے ربط پیدا کرکے دیہی آجرین کی تربیت کا انتظام کرتے ہیں۔

تنظیم :۔

ابتدا میں ضلع صنعتی مرکز کے قیام اور دیگر اخراجات کا ۱۰۰ فیصد مرکزی حکومت برداشت کرتی تھی لیکن ۸۰۔۱۹۷۹ء سے مرکزی اور ریاستی حکومتیں نصف نصف برداشت کررہی ہیں۔

ابتدا میں ہر ضلع صنعتی مرکز میں ایک جنرل منیجر اور سات فنکشنل منیجر کے ساتھ معاون عملہ ہوتا تھا۔ ہر ایک فنکشنل منیجر ایک کام کا ذمّہ دار گردانا گیا تھا یعنی :۔

۱۔ معاشی تحقیق ۲۔ مشینری و آلات۔
۳۔ ریسرچ اور ٹریننگ۔ ۴۔ خام مال۔
۵۔ قرض۔ ۶۔ مارکٹنگ اور ۷۔ گھریلو صنعتیں۔

لیکن یکم اپریل ۱۹۸۱ء کو تنظیم جدید کی گئی۔ جس کے مطابق ہر ایک ضلع صنعتی مرکز میں ایک جنرل منیجر اور چار فنکشنل منیجر ہوں گے۔ ان میں سے تین معاشی کھوج، قرض اور چھوٹی صنعتی ترقی کے ذمہ دار ہوں گے اور چوتھا منیجر خام مال، مارکٹنگ، ٹریننگ، اور انفارمیشن (ضلع کے مرکز کے مطابق) کا ذمہ دار بنایا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ حسب ضرورت مزید تین پراجکٹ منیجر کا تقرر ریاستی حکومت چھوٹی صنعتوں کے کمشنر کے مشورے سے کرتی ہے۔

اس اسکیم کی جانچ کے لیے ریاستی سطح پر ایک کوآرڈی نیشن کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ جس کا چیرمین ریاستی وزیر ہوتا ہے اور متعلقہ امور کے محکموں کے نمایندے بھی شامل رہتے ہیں ــــ مرکزی سطح پر بھی ایسی کمیٹی قائم کی گئی ہے جس کا چیرمین وزیر برائے ریاستی صنعتیں ہوتا ہے اور وزارت کامرس و دیہی تنظیم کے نمائندے بھی شامل رہتے ہیں۔

وزارت صنعت کی جانب سے چھوٹی صنعتوں کی ترقی کا کمشنر اس پروگرام کا جائزہ لے گا اور ہر تین ماہ بعد مرکز کی کارکردگی کے بارے میں وزارت صنعت اور پلاننگ کمیشن کو رپورٹ بھیجی جاتی ہے۔

کام کی رفتار

۷۹۔۱۹۷۸ء کے دوران سارے ملک میں اوسطاً ہر ایک ضلع صنعتی مرکز کے تحت ۴۲۱ آجرین کی نشاندہی کی گئی اور دیہی وسائل کی بنیاد پر صنعتوں کے قیام کے لیے ۱۵۷ پراجکٹس تیار کیے گئے جس کے مطابق ۳۸۶ صنعتی یونٹس قائم کیے گئے اور (۱۲۰۲) افراد کو روزگار کے مواقع فراہم ہوئے۔

۸۰۔۱۹۷۹ء کے دوران اوسطاً ۵۶ نئے صنعتی یونٹس قائم کیے گئے جس کے نتیجے میں (۱۴۴۴) افراد کو روزگار ملا۔ اسی مدت میں ۲۶ نئے مراکز قائم کیے گئے۔ ۸۱۔۱۹۸۰ء کے دوران مزید دس نئے مراکز قائم ہوئے۔ ۸۲۔۱۹۸۱ء میں ان کی کل تعداد ۴۰۶ ہوگئی۔ اس طرح تقریباً تمام اضلاع میں ان مراکز کا قیام عمل میں آیا۔

ضلع صنعتی مرکز کو روزگار کے مواقع فراہم کرنے، پیداوار میں اضافہ کرنے اور آمدنی بڑھانے یعنی معیارِ زندگی کی سطح بلند کرنے میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان مقاصد کے خاطر خواہ حصول کے لیے حسب ذیل اقدامات غور و فکر کے لیے تجویز کیے جاتے ہیں :۔

۱۔ ضلع صنعتی مرکز کو چاہیئے کہ وہ نئی صنعتوں کے قیام کی جانب توجہ دینے کے ساتھ ساتھ موجودہ چھوٹی صنعتوں کی کارکردگی کو بڑھائیں کیونکہ اکثر صنعتی یونٹس غیر معاشی (Un-economic) بنیاد پر کام کررہی ہیں۔

۲۔ یہ مراکز نئی نئی اسکیم تیار کرتے ہیں، تو آجرین کو چاہیے کہ وہ آگے بڑھ کر ان کو اپنائیں اور ان سے خود فائدہ اُٹھائیں اور دوسروں کو فائدہ پہنچائیں۔

۳۔ مارکٹ میں چھوٹی صنعتوں کا بڑے پیمانے کی صنعتوں سے سخت مقابلہ ہے اس لیے چھوٹے صنعتوں میں جو اشیاء تیار کی جاتی ہیں بڑی صنعتوں میں ان کی پیداوار کی اجازت نہیں دی جانی چاہیئے۔

۴۔ گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کا اہم مسئلہ مارکٹنگ کا ہے اس لیے ضلع صنعتی مراکز کو چاہیئے کہ وہ اشیاء کا فروخت کا بھرپور انتظام کرے۔

۵۔ صنعت کاروں کو مالی امداد کے لیے بنکس اور دیگر اداروں سے ربط پیدا کروانے کی بجائے صنعتی مراکز خود ہی مالیہ حاصل کرکے ان صنعت کاروں کو فراہم کریں تاکہ وہ بے چارے تاخیر کا شکار نہ ہوں۔

۶۔ صنعت کاروں کو مشینری اور الکٹریسٹی وغیرہ بروقت مُہیا کی جانی چاہیئے۔

۷۔ متوازن علاقائی ترقی کے لیے پسماندہ علاقوں میں زیادہ سے زیادہ صنعتیں قائم کرنا چاہیئے۔

ڈاکٹر شروتی کمار سنگھ

نئی اقتصادی پالیسی

بیشتر اقتصادی مسائل خالصتاً اقتصادی نہیں ہوتے بلکہ ان پر اقتصادی امور کے علاوہ سیاسی وسماجی امور بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ جمہوری نظام میں اقتصادی پالیسیاں عام اتفاق رائے سے طے کی جاتی ہیں اور انھیں اکثریت کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا اقتصادی پالیسی کو عوام کی بڑی بڑی اُمنگوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ عوام کی اُمنگیں ہی آنے والے وقت میں قومی اقتصادی پالیسی کو بامعنی اور موثر بنا سکتی ہیں۔

۱۹۸۴ء میں حکومت نے تیزی سے کام کرنے اور ہر شعبے میں صلاحیت بڑھانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس سے ایک نئی امید طلوع ہوئی تھی۔ حکومت نے اپنے مقاصد کے بارے میں کہا تھا کہ وہ بھارت کو ۲۱ویں صدی میں لے جانا چاہتی ہے۔ بھارت بھی تبدیلی کا آرزومند ہے۔ نئی حکومت کی تشکیل کے وقت اس امر کی زیادہ آرزو تھی کہ اس خواہش کے برعکس کہ تیزی سے اقتصادی ترقی ہو جس سے افلاس پر اثر پڑے، ایک صاف ستھری حکومت وجود میں آئے۔ کم دخل اندازی پر مبنی اقتصادی پالیسیوں کی بڑھتی ہوئی تائید اس امر پر مبنی ہے کہ ملک میں پھیلے ہوئے بھرشٹاچار اور حقوق کے مطلق العنانہ استعمال کے درمیان واضح تعلق ہے۔

اقتصادی پالیسیوں کے فروغ میں ہمیشہ ایک حد تک تسلسل رہا ہے۔ ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۶ء میں کیئے گئے متعدد اقدامات کی داغ بیل ۱۹۸۰ء میں ہی ڈالی جا چکی تھی۔ اور بعض اقدام تو ایسے بھی ہیں جو جنتا سرکار کے دنوں میں اٹھائے گئے تھے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۶ء میں جو نئے اقدام کیے گئے ہیں وہ ایک نئی رفتار کے مظہر ہیں خواہ وہ نئی سمت نہ کئے گئے ہوں اور جو نئی بات کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وسیع پیمانے پر جو کارروائی ہو رہی ہے اس کی بنیاد بیشتر کمیشنوں، کمیٹیوں، تحقیقی اداروں اور ماہرین کی رپورٹوں کا نتیجہ ہے۔ ان میں مختلف شعبوں میں پالیسی کی سمت کے بارے میں واضح ذکر ملتا ہے۔

بھارت کے اقتصادی نظام میں کچھ عرصے سے متعدد نقائص اور خامیاں بھی دیکھنے میں آئی ہیں، کل ملا کر مانگ کے تناسب میں تمام پیداواری صلاحیت کے ناکافی استعمال کے باعث پیداوار میں کمی ہوئی ہے۔ اور بازار میں فروخت کنندگان کا غلبہ رہا ہے۔ صنعتی یونٹوں کی صلاحیت کا پورا استعمال نہیں کیا جا رہا۔ یہ شکایات سننے میں آتی ہیں کہ ضرورت سے زیادہ قواعد بندی اور کنٹرول کے باعث پہل کاری اور صنعت پر ناموافق اثر پڑتا ہے جس کی وجہ سے لاگت پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ غیر مقابلہ جاتی ماحول میں نہ تو ملکی صارفین کو فائدہ پہنچا ہے اور نہ ہی برآمدات میں فروغ کو بڑھاوا ملا ہے۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں مختلف پالیسیوں کو اپناتے ہوئے یہ محسوس نہیں کیا گیا تھا کہ کنٹرول کے طویل المدتی اثرات اچھے ہونے کے بجائے تباہ کن ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو صحیح طرز پر بھی نہیں سمجھا گیا ہے کہ ایک طرف تو سیاسی لیڈروں اور انتظامیہ کے اہل کاروں میں گٹھ جوڑ ہے اور دوسری طرف صنعتوں کے کپتان وہ بڑے کسان تھے جن کا دوسروں پر ضرورت سے زیادہ اثر تھا۔ متعدد ماہرین کی یہ رائے ہے کہ بھارتی صنعتوں کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر مقابلے کا سامنا کرنا چاہیئے اگر وہ اپنی کارکردگی کو بڑھانا چاہتی ہیں۔ اس پر ہی اکتفا نہیں۔ صنعتوں کی صحتمندانہ ترقی کے لیے انھیں جلد از جلد متعدد غیر ضروری پابندیوں

سے آزاد کرنا ہوگا جیسے صنعتی لائسنسنگ، درآمدات پر کنٹرول، قیمتوں پر کنٹرول یا ایسے کنٹرول جو علاقائی عدم توازن کو روکنے یا اجارہ داری اور محدود تجارتی طور طریقوں کو روکنے یا زیادہ اقتصادی طاقت کے مرکز کو روکنے جیسے طریقے۔

اقتصادی اصلاحات پر زور

لہٰذا اس رائے کو وسیع حمایت حاصل ہوئی ہے کہ جہاں کہیں بھی کنٹرول یا پابندیوں کی ضرورت ہے انھیں واضح طور پر عمل میں لایا جائے اور ان پر آزادانہ بحث ہونی چاہیے۔ اقتصادی اقدامات کے ذریعہ دخل اندازی بھی کم از کم ہونی چاہیے۔ ان کا استعمال بھی متواتر سوچ سمجھ کر کیا جانا چاہیے بلکہ قرضوں اور اقتصادی امداد کا اہتمام ایک آسان اور بالواسطہ تنظیم کے ذریعے ہونا چاہیے جو ایک مناسب وقت تک کام کرے تاکہ بچت اور سرمایہ کاری سے متعلق فیصلوں کو ایک قابل بھروسہ بنیاد حاصل ہو سکے۔ اس سے قیمتوں کو بھی اپنی موزوں کارکردگی کا موقعہ ملے گا جس سے طویل عرصے تک مانگ کے مقابلے میں سپلائی کو بڑھایا جا سکے اور اس دوران مانگ کو محدود کر دیا جائے۔

نئی اقتصادی پالیسی کا مقصد اقتصادی اصلاح ہے۔ کچھ عرصے سے ملک میں یہ عام خیال پایا جا رہا ہے کہ کم از کم دو معاملوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ پہلا یہ ہے کہ کام میں کنٹرول کے بڑھتے ہوئے اثر کو کم کیا جائے تاکہ متعدد شعبوں میں مستعدی سے کام ہو۔ اور دوسرا یہ ہے کہ انسداد افلاس کے پروگراموں کو زیادہ موثر بنایا جائے۔ ہمارے معاشی نظام کا مسئلہ اقتصادی اصلاح کا ہے۔ ڈاکٹر آئی جی پٹیل کے مطابق اقتصادی اصلاح کا مطلب ہے دخل اندازی کی اُن پالیسیوں کا صفایا کرنا جن کے باعث سائنسدانوں اور انتظامیہ کے اہل کاروں کو بہت زیادہ مطلق العنان اختیارات حاصل نہ ہوں، ورنہ یہ خدشہ ہے کہ معیشت ایک طرف اور کام چلاؤ قواعد بندی سے وابستہ ہو جائے گی جس سے کسی بھی قسم کے بہت زیادہ مطلق العنانہ اور بدعنوان پالیسی سازی کے عمل کا بول بالا ہوگا۔

پالیسی میں نرمی کی ضرورت

بھارتی معیشت میں قواعد اور کنٹرول کا جو ڈھانچہ ہے اس نے متعدد دہائیوں کی اقتصادی پالیسی اور منصوبہ جاتی امیدوں اور بعض دیگر امور کے دباؤ کے نتیجہ میں فروغ پایا ہے۔ پالیسی کے شعبے میں مثال کے طور پر پبلک سیکٹر کے لیے مخصوص ان خاص صنعتوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے جن سے یہ توقع تھی کہ وہ تقویت پا کر معیشت میں رہنمایانہ کردار ادا کریں گی اور درآمد کی جانے والی اشیا ملک میں تیار کر کے معیشت کو خود انحصار بنائیں گی۔ دباؤ کے امور میں سرمایہ کی کمی اور غیر ملکی زرمبادلہ کی تنگی کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ متعدد پابندیاں اور کنٹرول دوسری عالمی جنگ کے دوران عمل میں لائے گئے تھے۔

گزشتہ ساڑھے تین دہائیوں میں بھارت نے اپنی معیشت میں گوناگونی لانے میں کافی کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن اس ترقی کے باوجود یہ متواتر محسوس کیا جاتا رہا ہے کہ حقیقی اقتصادی حالات اور تبدیلیوں کی رفتار کے موافق بنے رہنے کے لیے قواعد کے ڈھانچے میں بتدریج چھوٹ دینا ضروری ہے۔ آج بھارتی معیشت اس قدر گوناگوں اور پیچیدہ ہو گئی ہے کہ اسے وسیع انتظامیہ قواعد اور کنٹرول کے ذریعے خوش اسلوبی سے چلانا ناممکن ہے۔ پھر درآمدی پالیسی کچھ اس طرح بنائی گئی ہے جس سے ملک جہاں کافی حد تک خود کفیل ہوا ہے وہاں اس سے صنعتوں کو تحفظ ملا ہے جس سے بازار فروخت کنندگان کا ہے اور قیمتوں میں مقابلہ بہت کم ہے۔ اس کی وجہ سے ملک کی برآمدی اضافے کی صلاحیت پر بھی برا اثر ہوا ہے۔ پسماندہ ٹیکنالوجی سے بھی برا اثر پڑا ہے۔ ان خامیوں کے احساس کی وجہ سے کچھ وقت سے چھوٹ اور فراخدلی کی پالیسی اختیار کی گئی ہے۔ بعض امور کے دباؤ کے ہلکے ہو جانے سے ہی ان کی بحالی میں کافی مدد ملی ہے۔ اس مقصد کے حصول سے صارفین کو بھی فائدہ پہنچے گا اور برآمد میں بھی تیزی سے اضافہ ہو سکتا ہے۔ گو ان مقاصد کے لیے کیے گئے اقدامات کے بارے میں کوئی نتیجہ نکالنا جلد بازی ہوگا

۱۹۸۵ اور ۱۹۸۶ء کے دوران اقتصادی طور طریقوں میں تبدیلی لانے کی سمت میں جو کچھ کیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ انھیں نئی اقتصادی پالیسی کا نام دیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ ابھی تک سرکاری طور پر اس قسم کی کوئی تجویز نہیں کی گئی اور نہ ہی کوئی بیان دیا گیا ہے جس سے ظاہر ہو کہ ان پالیسیوں کی بنا پر کیونکر کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ تاہم آج ہم جن امور کو نئی اقتصادی پالیسی سے معنون کرتے ہیں، وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ معیشت کے مختلف شعبوں میں عائد پابندیوں اور کنٹرولوں میں ڈھیل دینا۔ اسے عام طور پر فراخدلی کی پالیسی کہا گیا ہے۔

۲۔ مقابلے کے ماحول کو فروغ دینا۔

۳۔ مختلف شعبوں میں جدید کاری کے لیے ٹیکنالوجی کی درآمد کے سلسلے میں عملی نظریے کو اختیار کرنا۔

۴۔ سرکاری مالی اور اقتصادی پالیسیوں میں تبدیلی۔

۵۔ پرائیویٹ سیکٹر کے لیے بھاری ذمہ داری۔

۶۔ پہلے کے مقابلے میں پالیسیوں میں زیادہ استحکام پر زور اور طویل المدتی نظریے کا اختیار کیا جانا۔

اقتدار میں آنے کے بعد سرکار نے اقتصادی پالیسیوں اور کام کاج کے طریقے بدلنے کی جانب قدم بڑھانا شروع کر دیے۔ اب تمام تر اقتصادی پروگراموں کو مختلف نظریوں اور آرا کے گرداب سے نکالنے کی کوششیں ہو رہی ہیں اور وہ تمام

کا سلسلہ جاری تھا جن سے بڑھتے ہوئے کے باعث ترقیات کی گاڑی تیزی سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔ لائسنس کا بندھن کافی حد تک ڈھیلا کیا جا چکا ہے۔ غیر ضروری کنٹرول ہٹائے جا رہے ہیں۔ پرمٹ راج کو مسمار کیا جا رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ پیداوار میں رکاوٹ ڈالنے والے تمام سسٹموں کو ختم کر دیا جائے۔

پیداواریت کو بڑھاوا دینے کی غرض سے موجودہ یونٹوں کی طرف سے اُن کی لائسنس کی صلاحیت سے زیادہ پیداوار کئے جانے کی صورت میں اُسے منضبط کر دیا گیا ہے۔ ملک میں مقابلے کو بڑھاوا دینے کی غرض سے صلاحیت بڑھانے کے لیے لائسنس دینے میں فراخدلی کا رُخ اختیار کیا جا رہا ہے کئی صنعتوں میں سے حال ہی میں لائسنس اُٹھایا گیا ہے جن میں صنعت دواسازی بھی ہے۔ لائسنس سسٹم کے دائرے میں آنے والی متعدد صنعتوں کو اپنی پیداوار میں تھوڑی بہت تبدیلی کی سہولت دی گئی ہے۔

پسماندہ اضلاع میں خاص مراعات

ایم۔آر۔ٹی۔پی (اجارہ داری اور محدود تجارت کے طور طریقے) قانون کے تحت بڑی کمپنیوں کی طرف سے منظور شدہ سرمایہ کی کم از کم حد ۲۰ کروڑ روپے سے بڑھا کر ایک ارب روپے کر دی گئی ہے۔ ایم آر ٹی پی کمپنیوں کو ۲۷ صنعتوں کے سلسلے میں اس امر کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ کسی نئے پراجیکٹ یا بڑے پیمانے پر توسیع کرنے کے لیے کمپنی امور کے محکمے کی پہلے در الگ اجازت حاصل کئے بغیر ہی صنعت (ترقی اور ریگولیشن) قانون کے تحت براہِ راست لائسنس حاصل کر سکتی ہیں۔ پسماندہ اضلاع اور علاقوں میں ایم آر ٹی پی اور فیرا کمپنیوں کو فروغ دینے کے لیے اُن شرائط نرم کر دیا گیا ہے جن کے ذریعے ان کمپنیوں کو پسماندہ اضلاع میں صنعتیں لگانے کے لیے اجازت دی جاتی ہے۔

غیر ملکی تجارت کے شعبے میں درآمدی پالیسی میں کی گئی تبدیلیوں کے نتیجے میں صنعتوں کے لیے خام مال اور دیگر ضروری اشیاء کو درآمد کرنا آسان ہو گیا یہ طریق کار آسان ہو گیا اور تاخیر میں کمی ہو گئی۔ کھلے عام لائسنس (او جی ایل) کے تحت آنے والی اشیاء کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا۔ بدلتے ہوئے حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان طریقوں میں سال بہ سال اصلاحات کی گئیں۔ ۱۹۸۵ء میں جس درآمدی پالیسی کا اعلان کیا گیا تھا وہ مارچ ۱۹۸۸ء تک جاری رہے گی تاکہ پالیسی کے شعبے میں تسلسل اور استحکام بنا رہے۔ جدید کاری اور برآمدی پیداوار کے لیے مشینوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے صنعتی مشینوں کی ۱۲۱ مدوں کو اُن بھاری مشینوں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے جن کی درآمد کی اجازت کھلے عام لائسنس کے تحت دی گئی ہے۔

معیشت کے سرکاری ریونیو کے نظم و نسق کے لیے طویل المدتی سرمایہ کاری کی پالیسی ایک نیا نظریہ پیش کرتی ہے۔ اس طویل المدتی تناظر سے ریونیو کی عام پالیسی کے تعین سے اہم فوائد حاصل ہونے کی توقع ہے۔ اس سے سالانہ بجٹوں کے سلسلے کو ایک مقررہ سمت ملے گی اور اُن میں زیادہ سے زیادہ ربط ہوگا سرکاری ریونیو پالیسی میں کافی تبدیلی ہوئی ہے۔ بالواسطہ اور بلاواسطہ ٹیکسوں کی شرح میں کمی کی گئی ہے۔ سرکار یہ تسلیم کر کے کام کر رہی ہے کہ اونچی شرح سے ٹیکس چوری کا رُجحان بڑھتا ہے۔ گذشتہ بجٹوں میں نجی اور کمپنی ٹیکسوں میں کمی کی گئی۔ اس پر بھی ٹیکسوں کی فراہمی میں اضافہ ہوا ہے۔

پیداوار کو بڑھاوا

قیمتوں کے سسٹم کو مزید لچکدار بنانے کے بھی اقدامات کئے ہیں۔ مثال کے طور پر سیمنٹ اور فولاد کی قیمتوں میں کمی کی گئی تبدیلی کا اچھا نتیجہ نکلا ہے۔ اس سے پیداوار میں اضافہ اور پیداواری صلاحیت کی توسیع ہوئی ہے۔ اسی طرح زرعی اشیاء کی قیمتوں کے تعین پر ایک دوسری پالیسی دستاویز پر غور کیا گیا ہے۔ زرعی قیمتوں سے متعلق طویل المدتی پالیسی سے کسانوں کو مزید فائدہ حاصل ہوگا اور اس طرح مطلوبہ سمتوں میں پیداوار کو بڑھاوا ملے گا بعض ماہرینِ اقتصادیات نئی اقتصادی پالیسی کے بارے میں شبہات کا اظہار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر آئی جی پٹیل کی رائے ہے کہ نئی اقتصادی پالیسی کی وکالت عموماً کارکردگی کی اقتصادی سطح پر کی جاتی ہے۔ لیکن جب تک بھرشٹاچار کو کم کرنے کے لیے مؤثر اقدامات نہیں کئے جائیں گے تب تک ترقیات کے فوائد کی منصفانہ تقسیم نہیں ہو گی۔

ڈاکٹر کے۔ این راج نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ نئی اقتصادی پالیسی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ پرائیویٹ صنعتوں کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی جائے یہ یقین کیا جا رہا ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر کے پاس لامحدود وسائل ہیں۔

نئی پالیسی پائیدار سامان صارفین بنانے والی صنعتوں پر زور دیتی ہے۔ جہاں یہ سوچا جا رہا ہے کہ غیر ممالک سے تکنیک کی درآمد کر کے گھریلو منڈی میں کھپت ہونے والا سامان تیار کیا جائے گا۔ وہاں ملک میں بین الاقوامی معیار کا سامان دستیاب ہوگا۔ اس سے شہری بازاروں میں پائیدار سامان صارفین کی فراوانی ہو جائے گی۔ دورِ جدید کی زندگی کو آسان بنانے والی چھوٹی چھوٹی اشیاء کے لیے غیر ممالک کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اپنے ہاں کے بازاروں میں سب قسم کی برقیائی اور انجینئرنگ مشینیں مل جائیں گی۔ ملک کے عوام کے کچھ حصے کے لیے طرزِ جدید کی زندگی بسر کرنا ممکن ہو جائے گا۔ اُسے چھوٹے سے حصے کے لیے ملک جدید ہو جائے گا۔

اس طرح معیشت خوشحال طبقے کی ضرورتوں کے اردگرد گھومے گی۔ غریب عوام کا اس پالیسی میں

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

ظفر پیامی

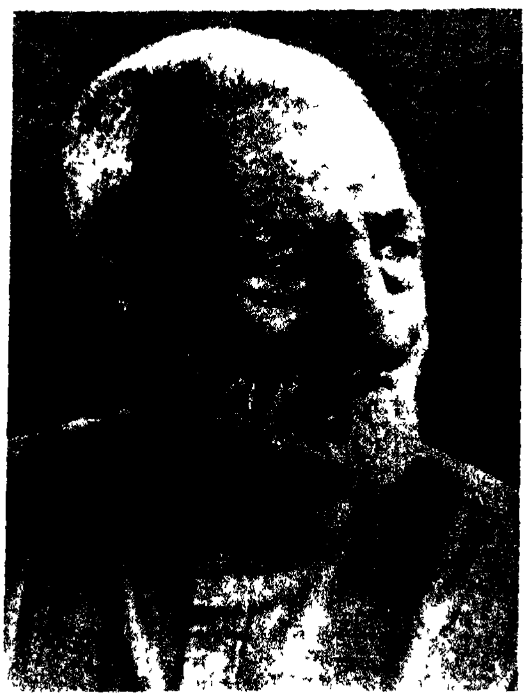
بادشاہ خان

جو اکیلا ہی چلا جانبِ منزل



آزادی کے چالیسویں سال
ور مہاتما گاندھی کے یومِ شہادت کی
الیسویں برسی کے دس روز پہلے برِ صغیر
کے مجاہدینِ آزادی کا سب سے آخری
راغ خان عبدالغفار خاں کی شکل میں
جھ گیا۔ اس پر ہندوستان میں سرکاری
در پر پانچ روزہ ماتم کیا گیا۔ افغانستان
ں بھی تین روزہ قومی ماتم رہا۔ بنگلہ
یش میں ایک روز کے لیے قومی پرچم
سرنگوں کیا گیا۔ پاکستان میں بھی تمام اختلافا
کے باوجود صدر ضیاء الحق اور وزیر اعظم
محمد خاں جونیجو نے نہ صرف نمازِ جنازہ میں
شرکت کی بلکہ انھیں "ایک عظیم انسان" کہا
و" آخری وقت تک اپنے نقطۂ نظر سے
تعمیرِ پاکستان میں معروف رہے"!

گویا بادشاہ خان" سرحدی گاندھی"
"فخرِ افاغنہ" اور باچا خان اور خان بابا
کے نام سے جس شخص کو یاد کیا جاتا تھا اس
کے انتقال نے کابل سے لے کر ڈھاکہ تک
سارے جنوبی ایشیا کو رنج و غم کی تاریکی
کی چادر میں لپیٹ لیا۔ مگر کیوں؟ کیا اس لیے کہ اس مردِ بے حال
نے کوئی بہت بڑی سلطنت یا حکومت قائم کی؟ یا اس
لیے کہ اس نے کوئی قابلِ ذکر سیاسی یا فوجی فتح حاصل کی یا مادی



اور اقتصادی اعتبار سے اپنے عوام کو کوئی
دیرپا تحفہ عطا کیا۔ یا سائنس، فنونِ لطیفہ،
علم و دانش یا روحانیت کے میدان میں
کوئی دائمی نقش چھوڑا؟۔

بادشاہ خاں کی ۹۸ سالہ زندگی
پر نگاہ ڈالیے تو ان کی ذات کے ساتھ
ایسی کوئی کامیابی وابستہ نظر نہیں آتی۔
حقیقت تو یہ ہے کہ دنیاوی کامیابی
کے کسی بھی پیمانے سے انھیں ناپیے وہ
"ناکامی کا شاہکار" ہی معلوم ہوں گے۔
آزادیٔ وطن کے لیے ۵۸ سال تک
لڑتے رہے۔ مگر اس جدوجہد کے خاتمے
تک انھوں نے وطن کو تقسیم ہوتے ہوئے دیکھا،
وہ اپنے ملک میں سیکولر قوم پرستی کی
بنیادوں پر جو سیاسی مسلک لے کر اٹھے
وہ بھی کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کرسکا۔
بدقسمتی سے ہندوستان میں بھی ہمارے
بگڑے ہوئے قومی مزاج سے وہ آخری عمر
تک دکھی رہے گویا بادشاہ خان کی کہانی
کسی میدانِ جنگ سے تختِ شاہی تک

٭ پریس ایشیا انٹرنیشنل، اے-۱۹، گل مہر پارک، نئی دہلی۔

[illegible] ... انسان اپنی کامیابیوں سے پہچانے جاتے ہیں اور عظیم تر انسان اپنی ناکامیوں سے۔ یہی "عظیم تر" لوگ اپنی تمام جدوجہد کی شکل میں آنے والی انسانیت کو ایک "قابل میات" میراث عطا کر جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے خان عبدالغفار خاں اس صف میں شامل ہیں جو تاریخ نے سقراط، جون آف آرک اور مہاتما گاندھی جیسی تاریخ ساز شخصیتوں کے لیے مخصوص کر رکھی ہے۔

"کرم یوگیوں" یعنی خدائی خدمت گاروں کی یہ نسل اب پورے برصغیر سے ختم ہو چکی ہے۔ بادشاہ خاں ہی اب اس وقت کی یادگار تھے جب لوگ اپنا سب کچھ قربان کر صرف اس لیے میدان میں نکل آتے تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ آج نہیں تو کل ان کے ملک سے غلامی کا سیاہ اور خوفناک سایہ اُڑ جائے۔

خود بادشاہ خاں نے آج سے ۵۰ برس پہلے جولائی ۱۹۳۷ء میں اپنے گاؤں چارسدا میں (صوبہ سرحد) خدائی خدمت گاروں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا تھا "ہم خدا کے نام پر اس کے بندوں کی خدمت میں اس لیے لگے ہوئے ہیں کہ خدا کو عبادت کے لیے تو انسانوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کے فرشتے ہی کافی تھے جو یہ کام کر سکتے تھے۔ خدا کے خدمت گار کا ایک ہی کام ہے کہ وہ جہاں تک ہو سکے خدا کے بندوں کی خدمت کرے۔ ان کا ہر ایک دُکھ دُور کرنے کی کوشش کرے اور ہر وقت اس کوشش میں لگا رہے کہ کسی غمزدہ کی آنکھوں میں دُکھ کا ایک بھی آنسو نہ رہے یہی اللہ کی سب سے بڑی عبادت ہے اور اسی لیے اللہ نے ہر دور میں اپنے سب سے پیارے اور سب سے نیک بندوں کو پیغمبر بنا کر بھیجا تاکہ وہ اپنی خدمت سے انسانیت کو صحیح راستہ دکھا سکے۔

آج کے زمانے میں ہندوستانی انسان کا سب سے بڑا غم یہ ہے کہ اس پر غلامی کا جوا تھوپ دیا گیا ہے۔ اس ملک کے کروڑوں انسانوں کا سب سے بڑا دُکھ یہ ہے کہ ہم صرف اللہ کے غلام ہونے چاہئیں۔ آج ایک ظالم غیر ملکی حکومت کے غلام ہیں۔ جب تک یہ غلامی دُور نہیں ہوتی۔ پورے ہندوستان کا کوئی بھی آدمی کسی بھی پریشانی سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ وہ پریشانی من کی ہو یا تن کی۔ مجھے اے بہادر پٹھانو! یہ یقین ہے کہ اگر اس طرح اللہ، بھگوان کی خدمت میں لگے رہے تو ایک دن ہم جو آزاد پیدا تو نہیں ہوئے آزاد شہری کی حیثیت سے مر ضرور سکیں گے۔ یہی میری دُعا ہے۔ اپنے رب سے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا خالق ہماری اس دُعا کو رحمتِ ایزدی کے ساتھ قبول کرے گا۔"

میرے لیے یہ سب کچھ تہائی ڈرامائی ٹریجڈی کا آخری منظر لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے خالق نے اس ٹریجڈی کو بہت بڑے ڈرامے کی شکل میں لکھا جس کا اختتام عین اس طرح ہوا جیسے دُنیا کے بڑے بڑے المناک ڈراموں کے ہیرو اور مذہبی رہنما اپنے اختتام کو پہونچے۔ اس سے زیادہ خوفناک اور ڈرامائی خاتمہ صرف مہاتما گاندھی کا ہوا جنھیں اس بدقسمت قوم کے ایک شخص نے گولی مار دی جس کی آزادی کا سہرا ان کے سر تھا۔

یہی حال پندرہ صدیوں پہلے فرانس کے جون آف آرک کا ہوا تھا جو ملک کی آزادی کے لیے لڑتے لڑتے جب کامیاب ہوئی تو اسے اسی کے احسان فراموش ملک کے باشندوں نے جادوگرنی کہہ کر اسے صلیب پر لٹکا دیا۔ عیسیٰ مسیح پہلے ہی "خدا کے بیٹے" سمجھے جاتے رہے ہوں یا اس کے پیغمبر، شاید اسی طرح اور وہ اعد ہستی ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ خدا کے کنبے، انسانیت کے سچے خدمت گاروں کا خاتمہ صلیب پر ہی ہوتا ہے۔ پہلے ہی وہ صلیب یروشلم کی چٹانوں پر ... [illegible] ... ان کے سینے میں گاڑ دی گئی ہو یا فرانس کی زمین پر کسی کمزور سی عورت (جون آف آرک) کو جادوگرنی اور بھوتنی کہہ کر جھنڈا جلانے کی شکل میں ہو یا گاندھی کو تین گولیوں کی شکل میں ہو یا پٹھان قوم کے پچھلے سو برسوں کے سب سے عظیم شخص بادشاہ خان، سرحدی گاندھی، خدائی خدمت گارِ اعلیٰ خان عبدالغفار خاں کی شہادت نما موت ہو۔

آج بادشاہ خان کی بات کرتے ہوئے جو چیز میرے ذہن میں سب سے زیادہ اُبھرتی ہے وہ یہ ہے کہ اُنھوں نے وہی کیا جو دل میں سوچا اور وہی سوچا جو انسانیت کے علمبردار کی حیثیت سے انھیں سوچنا چاہیئے تھا۔ بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ جس سیدھے سادے کھدر پوش پٹھان کو پچھلے ۷۰ ـ ۶۰ برسوں میں وہ برصغیر کے سب سے قدآور لیڈر کے طور پر دیکھتے رہے ہیں وہ کبھی صوبہ سرحد کا بہت بڑا جاگیردار تھا۔ ان کے والد کا شمار اس وقت شمال مغربی صوبے کے بڑے بڑے نوابوں میں ہوتا تھا۔ بادشاہ خان خود شان و شوکت میں پلے۔ بڑے رئیسی طریقے سے پہلے پشاور اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پڑھے وہ جب تک خدائی خدمت گار نہیں بنے، ایک شہزادے کی حیثیت سے رہے۔ راج پاٹ چھوڑ کر خالقِ باری کی مخلوق کی خدمت میں نکلنے والے شہزادوں کی یہ روایت گوتم بدھ سے چلی آ رہی ہے۔ بادشاہ خان شاید اس کے آخری نمائندے کہے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے ایک ایسے جنگجو کنبے میں جنم لیا جہاں بچے کو بڑوں کی اُنگلی پکڑ کر نہیں بلکہ بندوق پکڑ کر اُٹھنا اور چلنا سکھایا جاتا ہے، لیکن جب انھوں نے قیادت سنبھالی تو عدم تشدد کا ایسا سبق دیا کہ وہ پٹھان جو کسی کو اُنگلی اٹھانے پر گولی مارنے کا عادی تھا اب انگریزوں کی پالتو پولیس اور فوج کے سپاہیوں کے گھنٹوں تک ڈنڈے کھا کر بھی اُف تک نہ کرتا۔ خود گاندھی جی نے کہا کہ گجرات اور بہار کے لوگوں کی قسمتی

میں عدم تشدد ... [illegible] ... منظر بھی دیکھ سکے ... [illegible] ... ہندوستان نے اہنسا کو اپنایا تو یہ ... [illegible] ... نہیں تھا۔ مہان کام تو ہمارے بھائی عبدالغفار خاں کا ہے جنھوں نے جنگ کے بہادر شیروں کو بھیڑ کی طرح ڈکھ اور ظلم برداشت کرنے کی کامیاب تعلیم دی۔"

اسی سرحدی صوبے میں بادشاہ خان سے پہلے انگریزوں نے یہ دستور بنا رکھا تھا کہ کچھ قبائلی سرداروں کو اکسا کر وہاں کے ہندوؤں اور سکھوں کی لوٹ مار کروائی جاتی تاکہ ایک طرف تو قبائلیوں کے سرداروں کے منہ لوٹ کے مال سے بھرے رہیں اور وہ انگریز حکومت کی طرف نہ دیکھیں اور دوسری طرف فرقہ وارانہ نفرت کا زہر بھی پھیلتا رہے۔ آج کی نسل کو شاید یہ پتہ نہیں کہ اسی صوبہ سرحد کے آسمان پر جب خان عبدالغفار خاں سورج کی طرح چمکے تو لوگوں نے ان قبائلی سرداروں کا حقہ پانی بند کردیا جو ایسی لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ بادشاہ خان نے خود یہ کہا کہ "میں تشدد کے بالکل خلاف ہوں لیکن جو لوگ نہتے انسانوں کو مارتے اور لوٹتے ہیں ان کا مقابلہ اگر خدائی خدمت گار روں کو تشدد سے بھی کرنا پڑے تو وہ کریں گے۔" اس چیلنج کا یہ اثر ہوا کہ ۱۹۳۰ - ۳۵ کے بعد جب کہ پٹھانوں میں کانگریس کا زور ہوا، تو بنوں، کوہاٹ، جیسے اخیل اور پیشاور وغیرہ کے تمام سرحدی علاقوں میں قبائلی لوٹ مار ختم ہوکر رہ گئی۔ بادشاہ خان نے نہ صرف تشدد کا سبق سکھایا بلکہ فرقہ وارانہ بھائی چارے کی جڑیں بھی اس طرح مضبوط کیں کہ سرحد میں تقسیم کے وقت بھی شاید ہی کوئی فساد ہوا ہو۔ ہندوؤں سکھوں پہ پیشاور اور کچھ دوسرے شہروں میں جو حملے ہوئے بھی وہ ان علاقوں میں ہوئے جہاں ہمیشہ سے مسلم لیگ کا زور تھا اور باہر والوں کے مقابلے میں پٹھانوں کا شمار بہت کم تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ہم کچھ طالب علم ان سے ستمبر ۱۹۴۵ء میں سری نگر کشمیر میں ملے تھے۔ وہ ان دنوں پنڈت نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور "بلوچی گاندھی" خان عبدالصمد خان کے ساتھ شیخ عبداللہ کے مہمان کے طور پر وہاں کی نیشنل کانفرنس کے اجلاس میں شامل ہونے کے لیے آئے تھے۔ ہم کچھ لڑکوں نے ان سے رہنمائی کے لیے درخواست کی۔ ان کا جواب تھا،

"تمہاری راہ وہ نہیں ہے جس کا مظاہرہ تم احتجاجی مظاہروں، جلسوں اور ہے کار کے نعروں کے ذریعے پچھلے دو روز سے کرتے آئے ہو۔ یہ راہ تم لوگوں کو شاید سیاست کی گندی گلیوں میں تو لے جائے لیکن زندگی کی صحیح شاہراہ پر تم کبھی نہیں چل سکو گے۔ تمہارا راستہ یہ ہے کہ اپنی عمر کے اعتبار سے پڑھو سمجھو اور سوچو کر سماج کا اچھا شخص بننے کے لیے ابھی تمہیں کیا کرنا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کی واہ واہ کرنے کے بجائے اپنے آپ کو سدھارنے کی کوشش کرو۔"

یہ بات آج کہنے یا لکھنے میں آسان معلوم ہوتی ہے۔ لیکن بھلا سوچئے کہ کس لیڈر میں یہ ہمت ہے کہ اپنے مداحوں بلکہ عقیدت میں اندھے پرستاروں کو اس طرح کا شدید ترین ذہنی جھٹکا دے سکے۔

ان کا یہی انداز اُس انٹرویو میں نمایاں تھا جو میں نے ۱۹۸۱ء میں اُن سے آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے بستر علالت پر دُور درشن کے لیے کیا تھا اُس انٹرویو کے دوران میں نے اُن سے پوچھا تھا کہ اب ۷۰ - ۸۰ سال کے تجربات کی روشنی میں وہ اپنے نظریات کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ اُن کا جواب تھا۔

"مجھے اب اور بھی اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ نفرت کی بنیاد بناکر جو تقسیم کی گئی تھی اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا ہے بلکہ معاملات اور زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں آج کی سچائی کو جھٹلانا چاہتا ہوں یا سب ہی ملکوں کا سیاسی اتحاد چاہتا ہوں یا ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کی علاحدہ اور آزاد حیثیت ختم کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ بات صاف ہے کہ مذہب کو سیاست کے لیے استعمال کرنے سے مسائل بگڑتے ہی جائیں گے۔ سدھریں گے بالکل نہیں۔ میرے بھائی اگر مذہب کی بنیاد پر سیاسی مسئلوں کا حل ہوسکتا تو پاکستان میں لسانی انتشار کا یہ تکراؤ نہ ہوتا جو آج ہے۔ پٹھانوں کو ان کا حق ملتا، مہاجر خوشی سے رہتے اور سندھیوں کو بھی پریشان ہونے کی نوبت نہ آتی۔

آگے چل کر بادشاہ خان نے کہا تھا "بنگلہ دیش میں بھی حالات اچھے نہیں ہیں اور خود ہندوستان میں بھی ایسی کوئی شکل دکھائی نہیں دے رہی جسے مہاتما گاندھی کے سپنوں کا بھارت کہا جاسکے۔ یہاں پر بھی مذہب کی بنیاد پر نفرت کا بازار گرم ہے۔ حالانکہ نفرت تو میرے بھائی خود بیماری ہے وہ کسی بیماری کا علاج کیا کرے گی۔"

مجھے اسی وقت یہ لگا جیسے بادشاہ خان اپنی زندگی کا سفر ایک بہت ہی المناک موڑ پر آکر ختم کرنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان میں بادشاہ خان کے عزیز ترین رفیق محمد یونس کا بیان ہے کہ پچھلے سال جب دہلی میں بادشاہ خان پر بے ہوشی کا دورہ پڑا تو اس دوران بھی جب کوئی مالش وغیرہ کرنے کے لیے اُن کا ہاتھ دباتا تو ہاتھ اگر ان کے ہاتھ میں آجاتا تو وہ اسے انتہائی گرمجوشی سے دبا لیتے ان کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ ہاتھ چھڑانا مشکل ہو جاتا۔" زندگی پر ان کی گرفت عین آخری وقت تک مضبوط رہی اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی کا یہ سفر ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ ایک نئی منزل کا آغاز ہوگیا ہے۔ ان کا یہ سفر اور ان کی یہ جدوجہد ساری انسانیت اور خصوصاً برصغیر کی عظیم میراث ہے کہ ان کی زندگی کو جسمانی موت ختم نہیں کرسکی۔ وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے اس وقت تک جب تک کہ برصغیر پر ایک بھی آدمی میں انسان ہونے کی لگن باقی ہے۔ ●



قومی یکجہتی کے نقیب
مرزا عبدالرحیم خانخاناں

اگر راز داری، قدر، ضبط، ہمدردی، شجاعت، سخاوت، فیاضی، منکسر المزاجی، ملنساری، خوش کلامی، سخن گوئی اور سخن شناسی کو یکجا کر دیا جائے تو اس سے ایک ایسی شخصیت کا ظہور ہوگا جسے بے ساختہ عبدالرحیم کہا جا سکتا ہے جو تاریخ ہند میں مرزا عبدالرحیم خان خاناں اور ہندی شاعری کی دنیا میں رحیم کے نام سے مشہور ہے۔ رحیم دربار اکبری کے نورتنوں میں ایک ایسا رتن تھا جو چار صدیوں سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اپنی آب و تاب برقرار رکھے ہوئے ہے۔ یہ ایک ایسا نادر ہیرا ہے جس کے سامنے کوہ نور کی چمک دمک بھی ماند ہے۔

رحیم متعدد اوصاف کے حامل تھے۔ وہ ایک بہادر سپاہی، ایک اعلیٰ کمانڈر، ایک کامیاب ناظم، ایک بلند پایہ ڈپلومیٹ اور متعدد زبانوں کے عالم اور بے مثل شاعر تھے۔ وہ تاتاری النسل تھے لیکن ہندوستان سے والہانہ پیار کرتے تھے وہ ایک پکے مسلمان تھے لیکن ہندوؤں سے ہندوؤں سے بھی بڑھ کر پیار کرتے تھے۔ وہ نماز روزہ وغیرہ کے پابند تھے لیکن ہندو کلچر اور تہذیب تمدن کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے نہ صرف ہندوستان کی عظمت کے گیت گائے بلکہ ہندو اوتاروں اور دیوی دیوتاؤں کے تئیں اپنی گہری عقیدت کا بھی اظہار کیا انھوں نے جہاں حج پر جانے والے مسلمانوں کے لیے اپنے خرچ پر تین جہاز مہیا کئے وہاں انھوں نے ہندوؤں کے دھارمک استھانوں اور ہندو سنتوں، برہمنوں اور شاعروں پر اپنے خزانے کے در کھول دئے۔ دراصل انھوں نے ایسے وقت میں ہندوستان میں قومی یکجہتی کی شمع روشن کی جب ملک پر مذہبی جنون اور تنگ نظری کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ آج ضرورت ہے کہ ایسی ہمہ صفت موصوف ہستی کا از سر نو جائزہ لیا جائے۔

شاعروں کے سرپرست

رحیم جہاں عربی اور فارسی کے علماء اور شعراء کی سرپرستی کرتے تھے وہاں وہ ہندی اور سنسکرت کے شاعروں کو بھی اپنی بخششوں سے نوازتے تھے۔ عربی اور فارسی کے بلند پایہ شعراء جیسے نظیری، عرفی، ظہوری، شکیبی، انیسی، ناصری اور مظہری ان کے دربار کی زینت تھے۔ ایران جیسے ممالک سے بھی کئی شعراء اُن کی فیاضی کے چرچے سن کر ہندوستان آ گئے تھے اور اُن کے انعام و اکرام سے فیضیاب ہوئے تھے۔ لیکن ہندی کے شعراء پر تو وہ اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار رہتے تھے، ان کے دربار میں فارسی سے بھی زیادہ ہندی کو قدر و منزلت حاصل تھی۔ ہندی شعراء کی تعداد فارسی شعراء سے کہیں زیادہ تھی۔ فارسی کے شعراء کو تو انعامات میں دو چار یا دس پندرہ لاکھ روپے ملے ہوں گے لیکن ہندی (اور سنسکرت) کے شاعر گنگ کو ایک نظم پر ہی ۳۶ لاکھ روپے کی بیش بہا رقم دینا رحیم جیسے بے نظیر سخی کا ہی کام تھا۔ یہ ایک ریکارڈ ہے۔ اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ تذکرہ حسینی میں ذکر ہے کہ ایک شاعر نے اُن سے اشعار میں کہا کہ "میری ماہ وش محبوبہ اگر جان مانگے تو کوئی حرج نہیں لیکن افسوس ہے کہ وہ مجھ سے ایک لاکھ روپے مانگتی ہے۔ لیکن اے سخی خان خاناں! آپ میری محبّت کا تحفظ کریں" درد محبّت کا احساس رکھنے والے خان خاناں نے اُسے ایک لاکھ چھ ہزار روپے دیدئے۔ ایک لاکھ روپے محبوب کے لیے اور چھ ہزار سیر و تفریح کے لیے۔

اسی طرح ہندی کے ایک اور شاعر آس کرن جڈا نے رحیم کی بہادری کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اے نواب خان خاناں! تیری تلوار کی آگ عجیب ہے اُس میں پانی والے یا اپنی تلوار کے پانی پر بھروسہ کرنے والے یعنی اپنے کو بہادر سمجھنے والے تو

پتہ: ۱۲۰ ملک بلڈنگ، چونا منڈی، پہاڑ گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۵۵۔

جل مرتے ہیں لیکن جو خود کو گھاس کی طرح نرم سمجھتے ہیں وہ محفوظ رہتے ہیں۔

رحیم نے اس نظم کے ایک دوہے پر ایک لاکھ روپے شاعر کو انعام دینا چاہا جسے شاعر نے ٹھکرا دیا اور مانگا کہ شہنشاہ اکبر سے مہارانا پرتاپ کے بھائی کے لیے جہاز پور پرگنہ دلوا دیا جائے۔ رحیم نے کوشش کی اور وہ کامیاب ہوگئے۔ لیکن پٹّا کے دو دوہوں سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے دوہے میں زمین آسمان اور حتّیٰ کہ اللہ تک کو جٹّا کہہ ڈالا۔

"گھر جٹّی امبر جٹّا، جٹّا ہندو جوئے
جٹّا نام اللہ دا اور جٹّا نہ کوئے"

رحیم کے در سے کوئی سوالی خالی نہیں آتا تھا۔ وہ حاجتمندوں غریبوں اور سادھو سنتوں کو دل کھول کر دان دیتے تھے۔ اُن کا لنگر ہر ایک کے لیے کھلا رہتا تھا۔ جب خان خاناں کھانا کھاتے تھے تو رُتبے اور قاعدے کے مطابق ہر ایک کو کھانا ملتا تھا۔ وہ کھانے کی رکابیوں میں کہیں کچھ روپے اور کہیں کچھ اشرفیاں رکھ دیتے تھے جو جس کے کھانے میں آتا وہی اُس کا مقدر ہوتا۔ چنانچہ آج تک کہاوت مشہور ہے۔

رحیم خان خانخانہ
جس کے کھانے میں بھی خزانہ

انکسار کا مجسّمہ

لاکھوں روپے کی خیرات دیتے پر بھی وہ انکسار اور حلیمی کا مجسمہ تھے۔ تکبّر اُن کے دماغ کو چھو تک نہیں گیا تھا۔ جب وہ خیرات کرنے بیٹھتے تو مال و دولت کا ڈھیر لگا لیتے اور حاجتمند کو مٹھی بھر کر دیدیتے تھے۔ خیرات دیتے وقت آنکھ اُٹھا کر دیکھنا رحیم کے فیاضانہ مزاج کے خلاف تھا۔ انھوں نے یہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ کون لے جا رہا ہے اور کتنا لے جا رہا ہے اُن کے اس وصف سے متاثر ہو کر ہندی کے مشہور شاعر گنگ نے دریافت کیا

"سیکھے کہاں نواب جو ایسی دینی دین
جیوں جیوں کرا ونچو کرو، تیوں تیوں نیچے نین"

"اے رحیم! تو نے یہ عادت کہاں سے سیکھی ہے کہ خیرات کرتے وقت جوں جوں تمھارا ہاتھ اوپر اُٹھتا ہے، تمھاری نگاہ نیچے چلی جاتی ہے۔"

اس کے جواب میں رحیم نے شاعری میں ہی جواب دیا۔

" دین ہار کو ؤ اور ہے، بھیجت سو دن رین
لوگ بھرم ہم پر دھریں، یاتے نیچے نین"

"دینے والا کوئی اور یعنی خدا ہے جو دن رات دولت بھیجتا رہتا ہے، لوگوں کو خواہ مخواہ میرے بارے میں وہم ہے کہ میں اُنھیں دے رہا ہوں اسی لیے مارے شرم کے میری آنکھیں نیچے ہو جاتی ہیں۔

رحیم یوں بھی اپنے دور کے "پارس" سمجھے جاتے تھے۔ ہندو دیو مالا کے مطابق پارس ایک ایسا پتھر ہے جس سے لوہا چھو جائے تو وہ سونے میں منتقل ہو جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ ایک بار ایک سوالی نے توپ کا گولہ نکال کر رحیم کے گھٹنے کے ساتھ لگا دیا۔ محافظوں نے اُسے فوراً دبوچ لیا۔ جب اُس سے دریافت کیا گیا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا تو اُس نے جواب دیا کہ اُس نے سُنا ہے کہ رحیم ایک پارس پتھر ہے اس کے جسم کو جو لوہا چھوتا ہے وہ سونا بن جاتا ہے۔ رحیم نے اُسے گولے کے وزن کے برابر سونا دینے کا حکم دیا۔

سیکولرازم کے نقیب

رحیم ایک اعلیٰ سپہ سالار اور ماہر فن حرب تھے۔ انھوں نے اکبر کی سلطنت کی حدود کو دُور دُور تک لے جانے میں اہم رول ادا کیا۔ علاوہ ازیں جہاں کہیں بغاوت ہوتی تھی اُسے فرو کرنے کے لیے انھیں اکثر بھیجا جاتا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہزاروں سپہ سالار اور فوجی جرنیل آئے اور وہ اپنا کردار ادا کر کے چلے گئے۔ زمانے کے ساتھ وہ سبھی مٹ گئے۔ لیکن رحیم کو جو امر لافانی بناتا ہے وہ ہے اُن کا بلند پایہ کلام، اُن کی بے دریغ سخاوت، اُن کی عدیم المثال رواداری، اور تمام مذاہب کا احترام۔ انھوں نے ہندو دیوتاؤں کی مدح سرائی کی۔ تلسی داس اور کبیر کی مانند "رام نام" کی اہمیت پر زور دیا۔ اور سور داس کی مانند بھگوان کرشن کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ انھوں نے گنگا کی عظمت کے گیت گائے اور گائے کُشی کو ممنوع قرار دیا۔ لیکن اس سب کے باوجود انھوں نے اسلام سے انحراف نہیں کیا۔ انھوں نے زائرین مکّہ کے لیے تین جہاز "رحیمی"، "کریمی" اور "سلاری" مہیا کیے اور اُن کے اخراجات کا تمام بار اُٹھایا۔ جہاز سورت بندرگاہ سے زائرین کو مکّہ لے جاتے تھے اور وہاں سے واپس لاتے تھے انھوں نے مسجدوں کے لیے متعدد سہولیات فراہم کیں۔

انھوں نے بُرہان پور سے چار میل کی دُوری پر واقع لال باغ سے جامع مسجد تک ایک نہر کی تعمیر کی جہاں انھوں نے نمازیوں کے لیے ایک فوارہ بھی بنوایا۔ وہ علمائے اسلام سے بسا اوقات مشورہ کرتے تھے۔ اور انھوں نے مُلّاؤں سے ایسے فتوے بھی حاصل کیے تھے جن میں اُن کی ایمان پرستی کی توثیق کی گئی تھی۔

مقدس گنگا کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے اپنی سنسکرت شاعری میں کہا ہے۔

"میں وشنو پر شیو کو ترجیح دیتا ہوں۔ کیوں کہ (ہندو دیو مالا کے مطابق) گنگا وشنو کے قدموں سے نکلی ہے جبکہ شیو نے اُسے اپنے سر پہ رکھا ہے (دھارن کیا ہے)۔

رحیم نے شری رام اور شری کرشن کے تئیں جو ہندوؤں کے نزدیک ایشور اوتار کا درجہ رکھتے ہیں۔ اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ایک بار تلسی داس نے دوہے کا ایک حصّہ لکھ کر رحیم کو بھیجا اور اُسے مکمل کرنے کی فرمائش کی تلسی داس نے دریافت کیا۔

"دھور دھرت نج سیس پہ، کہو رحیم کیہی کاج"

اپنے سر پر لیتی رہتا ہے؟

رحیم نے اس دوہے کو مکمل کرکے لکھ بھیجا۔

"جیہی رج منی پتنی تری، سو ڈھونڈت گج دھار"

یعنی (ہندو دیومالا کے مطابق) ہی جی ہوئی گوتم رشی کی بیوی اہلیا نے بھگوان رام کے قدموں کی جس دھول سے دوبارہ انسانی جامہ پاکر نجات حاصل کی ہاتھی اُس دھول کو ڈھونڈ رہا ہے۔

کرشن جی کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے لکھا۔

"رحمن کو کو کا کرے، جواری، چور، لبار
جو پت راکھن ہار ہے، ماکھن چاکھن ہار"

یعنی "اگر کرشن جی مہاراج رحیم کے محافظ ہیں تو کوئی جواری، چور اور لفنگا بھی اُس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

سدا دن کسی کے ایک سے رہتے ہیں۔ رحیم کی زندگی پر بھی سیاہ بادل آئے۔ وہ چند درباریوں کی سازش کا شکار ہو گئے۔ انھیں دو برس تک ذلت کی زندگی گذارنا پڑی۔ لیکن وہ خیرات دینے سے پھر بھی باز نہ آئے۔ اُن کے پاس دینے کو کچھ نہیں رہا اور سوالی انھیں برابر گھیرے رہتے۔ ایک سوالی کو انھوں نے ریوا کے راجہ کے پاس یہ رُقعہ لکھ کر بھیجا۔

"چتر کوٹ میں رمی رہے، رحمن اودھ نریس
جا پر بپدا پڑت ہے، سو آوت ایہی دیس"

یعنی اودھ کے راجہ رام (بھگوان کے اوتار) چتر کوٹ میں قیام پذیر ہیں۔ جس شخص پر بھی مصیبت آتی ہے وہ وہاں جاکر پناہ لیتا ہے۔

بتانے کی ضرورت نہیں کہ راجہ اس قدر خوش ہوا کہ اُس نے مذکورہ سوالی کو ایک لاکھ روپیے دے کر رخصت کیا۔

ہندو دیوی دیوتاؤں میں اُن کی عقیدت کو دیکھ کر ہی ہندی کے مشہور شاعر بھارتیندو ہریش چندر نے کہا تھا۔

"ان مسلمان ہریجنن پہ کوٹک ہندن واریئے

ہندوؤں کو نچھاور کیا جانا چاہیئے۔

ماہر لسانیات

رحیم اپنے عہد کی متعدد زبانوں کے عالم تھے۔ انھیں ترکی، عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور دیگر کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انھوں نے اکبر کی خواہش پر تزک بابری کا جسے بابر نے ترکی میں لکھا تھا، فارسی میں مستند ترجمہ کیا۔ یہ کام آسان نہیں تھا کیونکہ بابر ایک اعلیٰ فوجی سالار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ ادیب بھی تھا۔

بابر کی سوانح عمری کے دو ترجمے شیخ زین خوافی اور پائندہ حسن غزنوی نے کئے۔ لیکن رحیم کا ترجمہ دونوں پر سبقت لے گیا اور آجکل وہی دستیاب ہے۔

اسی طرح انھیں عربی میں بھی کمال حاصل تھا۔ نہاوندی نے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیا ہے جس سے جان پڑتا ہے کہ رحیم کو عربی پر عبور حاصل تھا۔ اُس نے لکھا ہے کہ ایک بار اکبر کو تین مراسلات موصول ہوئے۔ وہ اس قدر اہم تھے کہ وہ اُن کے مسودوں کو فوراً معلوم کرنا چاہتا تھا لیکن وہ حجازی رسم الخط میں لکھے ہوئے تھے۔ اور رات کا پہر تھا۔ اُس نے رات میں ہی عربی زبان کے تینوں عالموں — ابوالفضل، عبدالفتح اور رحیم کو بُلا بھیجا۔ ان میں سے پہلے دو مولاناؤں نے عربی کا محدود علم ہونے کے باعث رات بھر کا وقت مانگا لیکن اکبر کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ اُس نے مایوس ہوکر رحیم کی طرف دیکھا۔ رحیم ان مراسلات کو لے کر قریب ہی جلتے ہوئے چراغ کی طرف بڑھے اور ان کا خلاصہ بیان کرکے سب کو حیران و ششدر کر دیا۔

مہارانا پرتاپ سے ٹکراؤ

رحیم اگرچہ مان سنگھ کی کمان کے تحت ہلدی گھاٹی کی تاریخی لڑائی میں مہارانا پرتاپ کے ساتھ لڑے تھے تاہم وہ مہارانا کی شجاعت کے مدّاح تھے۔ مہارانا بھی رحیم کا احترام کرتے تھے۔ اس لڑائی میں مہارانا نے پسپائی اختیار کی اور انھوں نے جنگلوں اور پہاڑوں میں جاکر اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔ مغل فوج چھ ماہ تک اُن کے تعاقب میں رہی لیکن بے سود۔ مہارانا نے اپنا بیشتر علاقہ واپس لے لیا۔ اسی جدوجہد میں جب مہارانا کی فوج کی طرف سے مغلوں پر جوابی حملے کئے جارہے تھے تو ایک بار رحیم کا حرم مہارانا کے بیٹے امر سنگھ کے ہاتھ آگیا۔ مہارانا نے اُن خواتین سے اپنی بیٹیوں کی مانند سلوک کیا اور عزت کے ساتھ واپس بھجوا دیا۔

اسی طرح ایک شاعر کی استدعا پر رحیم نے مہارانا کے بھائی کو اُس کا جہاز پور کا علاقہ اکبر سے واپس دلایا۔

بذلہ سنجی

مزاح و ظرافت کسی بھی شخصیت کو چار چاند لگاتی ہیں۔ یہ فطرت کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔ رحیم میں بھی مزاح کا عنصر بدرجہ اُتم پایا جاتا تھا۔ ایک بار اکبر کے بڑے راجپوت سپہ سالار مان سنگھ اور رحیم میں شطرنج کا کھیل ہو رہا تھا۔ شرط یہ تھی کہ جو شکست کھائے گا اُسے بلّی کی بولی بولنی ہوگی۔ رحیم نے جب اپنا پلڑا کمزور دیکھا تو وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور کسی ضروری کام کا بہانہ کرکے جانے لگے۔ مان سنگھ نے اُن کا دامن تھام لیا اور اصرار کیا کہ وہ جانے سے پہلے بلّی کی بولی بولیں۔ اس پر رحیم اپنا دامن چھڑاتے ہوئے بولے "شما دامنم بگذارید می آیم" کہ تھم! یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ رحیم اپنے جملے کے آخر میں "می آیم می آیم" کو "میاؤں میاؤں" کی مانند بول چکے تھے۔

غرضیکہ رحیم ہمہ صفت موصوف تھے۔ وہ ایک مکمل انسان اور ایک آدرش ہندوستانی تھے۔ انھوں نے سارے جہاں کو جس جذبہ کو لازم کا راہ دکھائی تھی اُس پر چل کر ہی بھارت خوشحالی، استحکام اور یکجہتی کی منزل مقصود پر پہنچ سکتا ہے۔

●

بلجیت سنگھ مطیر

قطب مشتری

رموز و علائم کی روشنی میں

قطب مشتری دکنی زبان کے معروف شاعر و ادیب مُلّا وجہی کی مثنوی ہے جو ۱۰۱۸ ہجری مطابق ۱۶۰۹ـ۱۰ عیسوی میں تخلیق کی گئی تھی۔ مثنوی کے آخری شعر میں وجہی بتاتا ہے کہ یہ عشقیہ تمثیل بارہ دن کے قلیل عرصہ میں مکمل ہوئی تھی۔

تمام اِس کیا دیس بارا منے
سَن یک ہزار ہور اٹھارا منے

اس مثنوی کو مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمے کے ساتھ ۱۹۳۸ء میں شائع کیا تھا۔ اگرچہ اس کے بعد سے یہ مثنوی دوبارہ شائع نہیں ہوئی تاہم دکنی ادب کی وساطت سے اسے اُردو میں بھی معتبر مقام حاصل ہو چکا ہے۔

قطب مشتری کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک عشقیہ داستان ہے جس میں دکنی زبان کے اولین صاحبِ کلیات شاعر اور سلطنتِ حیدرآباد کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ بن ابراہیم قلی قطب شاہ کے ذاتی عشق کو پیش کیا گیا ہے اور شاہِ وقت سلطان محمد قلی قطب شاہ کے درون خانہ معاملات کو عوام کے سامنے پیش کرنے کے لیے مُلّا وجہی کے جرأت مندانہ اقدام کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اِس مثنوی میں محمد قلی قطب شاہ اور اس کے پیش رو ابراہیم قلی قطب شاہ کے ناموں کے علاوہ پورے قصے میں ان کی زندگی کے متعلق ایک بھی واقعہ درج نہیں ہے اور یہ نام بھی زیبِ داستان کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔

برِصغیر ہند کی دوسری سیکڑوں مثنویوں اور پریم گاتھاؤں کی طرح قطب مشتری کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ کرنے والے حضرات قصے کی تہہ تک پہنچنے میں مکمل طور پر ناکام رہے ہیں۔ سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے ادبی و علمی لغزش کھائی اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس داستان میں وجہی نے محمد قلی قطب شاہ اور اس کی ہندو رقاصہ بھاگ متی کا عشق بیان کیا ہے۔ مولوی صاحب نے خیال ظاہر کیا ہے کہ قطب مشتری میں جس مشتری کا احوال بیان کیا گیا ہے وہ دراصل بھاگ متی ہے جو مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد حیدر محل کے لقب سے سرفراز کی گئی تھی اور جس کے نام پر بھاگ نگر تعمیر کیا گیا تھا جو بعد میں حیدر نگر اور حیدرآباد میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب جس تحقیقی کوڑی کو نکال کر لائے تھے اس کو ڈاکٹر زور، ڈاکٹر سروری، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر سیدہ جعفر نے حرفِ آخر کی طرح قبول کر لیا۔ ڈاکٹر زور تو مولوی صاحب کی تحقیق سے اس قدر مرعوب و متاثر ہوئے کہ انھوں نے چھلیم کی رقاصہ (معروف بھاگ متی) کے نام سے ایک مستری کتاب ہی تحریر کر ڈالی۔ کچھ ایک تیز گام محققین چھلیم یا بھاگ متی عرف حیدر محل کے مقبرے یا قبر کی دریافت میں مصروف ہو گئے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا یا ہو رہا ہے کہ تحقیق نگار حضرات قطب مشتری کے مفہوم، مقاصد اور اغراض کو سمجھنے میں قاصر رہے ہیں۔ یہ بدمعاملگی قطب مشتری تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ برِصغیر ہند کی سبھی مثنویاں اور پریم گاتھاؤں کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا گیا ہے۔ انگریز مورخ ٹوڈ نے تو ان مثنویوں، پریم گاتھاؤں اور راجستھان کی رزمیہ منظومات (راسو ادب) کی بنیاد پر راجستھان کی مفروضہ تاریخ ہی مرتب کر ڈالی اور آج تک ہم اس کی کھینچی ہوئی لکیر کو پیٹنے میں فخر محسوس کر رہے ہیں۔

پیشتر اس کے کہ قطب مشتری کے رموز و علائم کا تجزیہ کیا جائے۔ راقم الحروف مکرر اعادہ کرنا چاہے گا کہ حالیہ آندھرا پردیش کا دارالخلافہ حیدرآباد کا نام مسلمان محمد قلی قطب شاہ کی مبینہ محبوبہ بھاگ متی یا حیدر محل کی رعایت

---

* سیکٹر ۱/۲۳۱، آر کے پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲ ـ یوجنا، نئی دہلی

رعایت سے رکھا گیا تھا اور اسی رعایت سے برصغیر ہند کے کئی مقامات کے نام جیسے حیدرآباد، حیدرنگر، حیدرپورم اور حیدرپیٹم وغیرہ وغیرہ، رکھے گئے ہیں۔

قطب مشتری، یوسف زلیخا، ابراہیم نامہ، علی نامہ، گل بکاؤلی، سحرالبیان وغیرہ مثنویوں، پدماوت مصنفہ ملک محمد جائسی، ہیر، سسّی پنوں، مرزا صاحباں وغیرہ پریم گاتھاؤں اور ہمیر راسو مصنفہ مہیش وغیرہ راسو منظومات، گل و مینق اور قصہ چہار درویش وغیرہ نثری داستانوں کی بنیاد صوفیا کرام کی اسی بنیادی تعلیم پر قائم ہے کہ جسے ہم "عشق مجازی عشق حقیقی کے زینے" کے نام سے جانتے ہیں یعنی انسان انسان سے پیار کرے تو خدا تک اپنے آپ رسائی ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ تمام مثنویاں اور پریم گاتھائیں عشقیہ تمثیلیں ہیں۔ ان کی مدد سے ان کے زمانوں اور جغرافیائی علاقوں میں مروج رسم و رواج، کھانے پینے اور ملبوسات و زیورات کی قابل اعتبار فہرستیں تو تیار کی جا سکتی ہیں لیکن ان کو بنیاد بنا کر عصری تواریخ مرتب کرنا فریب کاری کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

جملہ عشقیہ تمثیلیوں کا اگر ہم تقابلی مطالعہ کریں تو اس نتیجہ پر پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ ان کے بنیادی کرداروں کا تعلق شاہی خاندانوں سے ہوتا ہے کیوں کہ عشق ہی کائنات کا اصل شاہ ہے جس کے اشارے ہی سے ارض و سما متوازن حرکت میں آتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان دیکھے گوہرِ مراد کا انکشاف یا تو خواب کے ذریعے ہوتا ہے اور یا پھر کسی توتے کی زبان سے۔ اور اس انکشاف کے ساتھ ہی ہیرو اضطرابِ عشق ظاہر کرنے کے بعد رختِ سفر باندھ لیتا ہے۔ یہاں خواب سے مراد ...۔ یعنی اور قصے سے مراد جہاں دیدہ اور یا پیر ہوتا ہے۔ یہ بھگتوں اور صوفیوں کے علائم ہیں اسی طرح ان قصوں کے سبھی کردار کسی نہ کسی رمز یا علامت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ برصغیر ہند میں لکھی جانے والی پریم گاتھاؤں میں تو قصے کے آخر میں کرداروں کے رموز و علائم کی وضاحت کر دی جاتی تھی لیکن مثنویوں میں رمزیہ توضیح کا چلن نہیں ہوا جس کی وجہ سے نہ صرف عوام بلکہ خواص بھی قصے کی روح تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

قطب مشتری کا قصہ اس طرح ہے :۔

ابراہیم قلی قطب شاہ بادشاہ وقت ہے۔ وہ بہت ہی زیرک و دانشمند ہے لیکن اس کو اولاد نہ ہونے کا بہت دکھ ہے۔ بہت منت و مراد کے بعد محمد قلی قطب پیدا ہوا جس کی بڑے ناز و نعم سے پرورش کی گئی۔ جب شہزادہ جوان ہوا تو اس نے خواب میں ایک حسینہ کو دیکھا اور جب آنکھ کھلی تو اس کا سودا سر پر سوار ہو گیا۔ لیکن اُسے حسینہ کا نام معلوم نہیں تھا۔ آخر کار ایک معتبر خاص عطارد کے ذریعے اسے معلوم ہوا کہ جس شہزادی کو اس نے خواب میں دیکھا تھا وہ بنگالہ نگر کی شہزادی مشتری ہے۔ یہ سن کر قطب اپنے رفیقوں کے ہمراہ منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک زبردست اژدہے اور ایک خطرناک دیو سے معرکے ہوئے۔ مریخ خان نام کا ایک آدمی جو کہ دیو کی قید میں تھا آزاد ہو کر شہزادے کا ہم نشیں ہو گیا کیوں کہ وہ مشتری کی بہن زہرا کا طالب تھا۔ راستے میں اُس نے مہتاب پری کے یہاں قیام کیا لیکن عطارد نے وہاں زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں سمجھا اور اکیلا ہی بنگالہ نگر کی جانب چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر عطارد نے اپنی مصوری کی دھاک جما دی۔ اس کی فنکاری کا شہرہ سن کر شہزادی مشتری نے اپنا خاص محل سنوارنے اور سجانے کے لیے اسے ملازم رکھ لیا۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عطارد نے دونوں کی ملاقات کا انتظام کر دیا۔ قطب نے مشتری کو دکن دیش چلنے کے لیے آمادہ کر دیا۔ اپنی روانگی سے پہلے دونوں نے مریخ اور زُہرا کا عقد پڑھوا دیا اور بنگالہ نگر کی سلطنت ان کے سپرد کر کے دکن دیش کو چلے گئے۔

قطب مشتری کے قصے کا اجمالی خاکہ جاننے کے بعد اس مثنوی کے بنیادی کرداروں پر نظر ڈالتے ہیں۔

قصے کا ہیرو قطب شاہ ہے اور ہیروئن کا نام مشتری ہے۔ قطب دکن یعنی جنوب کا رہنے والا ہے اور مشتری بنگالہ نگر کی یعنی شمالی ہندوستان سے متعلق ہے۔ گویا قطب اور مشتری کا وہی رشتہ ہے جو قطب جنوبی اور قطب شمالی کا ہے یعنی یہ زمین کی دُھری ہے۔ یاد رہے کہ علم نجوم میں قطب کو فلک کا مدار بھی کہا جاتا ہے۔ قطب اور مشتری کے بعد اس مثنوی کا سب سے اہم کردار عطارد ہے وجہی کے الفاظ میں عطارد :

عجب ایک اس وقت پر مرد تھا
ہُنروند (مند)، عاقل، جہاں گرد تھا
کدھیں روم میں تھا کدھیں شام میں
کہ وُستاد (اُستاد) تھا وہ ہر ایک کام میں
عطارد سو نقاش کا نام تھا
بھلا ہور بُرا سب اسے فام (فہم) تھا
ہر یک ملک اوپر گزر تھا اُسے
ہر یک شہر کا سب خبر تھا اُسے
ہر یک ٹھار اوپر اسے ٹھار تھا
کہ خوش طبع، مسکیں، ادب دار تھا
ہر یک شہر پھرنے ہوس تھا اُسے
ہر یک کام کرنے توجس (تجسس) تھا اُسے

عطارد کو ہندوستانی علم نجوم میں بدھ سیارہ

کہا جاتا ہے۔ اس کا مقام دوسرے آسمان پر ہے۔ چونکہ بدھ سیارہ زمین کے نزدیک ترین ہے۔ اس لیے اہلِ ہند، اہلِ عرب اور اہلِ ایران اسے انسان دوست سیارہ مانتے ہیں۔ بدھ کو اہلِ ایران مصورِ فلک کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ تیز بین بھی کہا جاتا ہے۔ اہلِ نجوم بدھ کو علم و عقل کا سیارہ بھی مانتے ہیں۔ عطارد یعنی بُدھ چونکہ سورج کے ارد گرد ۹۷ دن میں چکر لگاتا ہے۔ اس لیے اس کو تیز گام اور تیز رفتار بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ باقی سیاروں کے مقابلے میں یہ مدت بہت ہی کم ہے۔ وجہی نے بھی اپنی مثنوی میں عطارد کے یہی اوصاف بیان کئے ہیں۔

قصے کا دوسرا جوڑا مشتری کی چھوٹی بہن زُہرا اور مریخ پر مشتمل ہے۔ اہلِ ہند اس کو شُکر سیارہ کہتے ہیں۔ اس کا مقام پانچویں آسمان پر ہے۔ جبکہ مشتری کا مقام چھٹے آسمان پر ہے۔ مشتری کو اہلِ عرب اور اہلِ ایران سعد اکبر اور ہندوستانی جیوتشی اُتم سوبھاگیہ کا سیارہ مانتے ہیں۔ مشتری کی سگی بہن زُہرا بھی خوش بختی اور خوش طالعی کا مظہر سیارہ ہے۔ زہرا کا عاشق مریخ ہندوستانی علمِ نجوم کے مطابق منگل سیارہ ہے۔ یہ ایک آتش مزاج سیارہ مانا جاتا ہے۔ اہلِ ایران و اہلِ عرب اسے جلادِ فلک کے نام سے پکارتے ہیں۔ ہندوستانی جیوتش کے لحاظ سے بھی یہ غضبناک سیارہ ہے لیکن اس کا یہ وصف بھی ہے کہ جس پر یہ مہربان ہو جاتا ہے اس کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ مریخ کے والد کا نام اسد ہے جو حلب کا شاہ سرطان مانا جاتا ہے۔ اس کا مقام چوتھے آسمان پر ہے جب کہ مریخ یعنی منگل سیارے کا مقام ساتویں آسمان پر ہے۔

قصے کا ایک اور کردار مہتاب پری ہے جس کے ہاں قطب نے خوفناک اژدہے اور غضبناک دیو پر فتح حاصل کرنے کے بعد قیام کیا تھا۔ مہتاب جیسا کہ ہم کو معلوم ہی ہے چاند کو کہتے ہیں۔ چاند کا اہلِ زمین کے ساتھ بہت ہی قریبی تعلق ہے۔ انسانی سماج کے وسائل کا انحصار بھی چاند کی گردش پر ہے۔

لیکن مہتاب پری کی قیام گاہ تک پہنچنے سے پہلے قطب کو پہلے تو ایک اژدھا اور مابعد ایک دیو کو زیر کرنا پڑا تھا۔ وجہی کے الفاظ میں اژدھا جس مقام پر ہے وہاں :

بی آدم اس ٹھار نئیں ٹھارتا
پنکھی پنک اس ٹھار سیئں مارتا
اُبھرتے بی (بھی) اُونچا ہے اُونچائی میں
دھرتے تے بھی چوڑا ہے چوڑائی میں
یکٹ پیڑ اس پہاڑ کا نانو ہے
یو اسماں اس اس پیڑ کا چھاؤ ہے
دو رنگ تھے اسے رنگ سیہ ہور سفید
کدھیں ہوئے پرگٹ کدھیں ہوئے نہ پید

⁂

جدید سائنسی دَور میں اس مقام کو جاننا مشکل نہیں رہا کہ جہاں آدمی قیام نہیں کر سکتا یا پرند پر نہیں مار سکتا۔ وجہی نے اس کی لمبائی چوڑائی اور گاہ ظاہر ہونے اور گاہ ناپید ہو جانے والے سفید و سیاہ رنگ کے دھوئیں کی وجہ سے اسے پہاڑ (یعنی پہاڑ) کے نام سے منسوب کیا ہے۔ دراصل یہ پہاڑ سنسکرت کا شونیہ، لاطینی کا ایتھر اور فارسی کا ایتر ہے جو کرۂ ہوائی کے اوپر اور اوزون سے نیچے واقع ہے۔ چونکہ ایتھر زمین اور افلاک کے درمیان ناعبور رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ اس لیے وجہی نے اسے اژدھا کا نام دیا ہے کیوں کہ یہ مساعی کو نگل لیتا ہے۔

مثنوی میں جس دیو کو زیر کرنے کا بیان ملتا ہے اس کا نام سنیچر سیارہ ہے جو اپنی نحوست اور بدطالعی کے لیے بدنام ہے۔ دراصل یہ قصے کا ویلین یعنی بدکردار ہے۔ اہلِ عرب اسے زُحل سیارہ کہتے ہیں۔ وجہی نے اس کا نام اس طرح ظاہر کیا ہے:

سو پتیارے کے لے سات بارہ نفر
چلے تا اس سنیچر سے کوٹ ادھر

یعنی پت (عزت) رکھنے والے حضرت محمد صاحب کے بارہ اماموں کا آشیرباد ساتھ لے کر قطب شاہ سنیچر کے قلعہ میں چلے گئے۔

سنیچر سے مقابلہ کے دوران قطب نے قوس و قزح نام کی فتح بخش کمان، ستاروں کے تیروں، آسمان نامی ترکش، کہکشاں نامی نیزے، ہلال نامی خنجر وغیرہ ہتھیاروں کا ہنرمندی سے استعمال کیا تھا۔ وجہی کے الفاظ میں :

عطارد سوں بات کرتا جواں
منگا تیر، ترکش، ترنگ ہور کمان
کہ قوس و قزح فتح بخش ہے کمان
شہاباں نیزاں ہور ترکش آسمان
کہ نیزا ہے کہکشاں کہ خنجر ہلال
ہنر بات مارے اچھے جیوں اچھال

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قطب مشتری کے سبھی کرداروں کے نام علم نجوم کی مناسبت سے رکھے گئے ہیں۔ قصے کا ہیرو قطب ہے جو جنوبی قطب اور مدارِ فلک کا دُہرا رول ادا کر رہا ہے۔ قصے کی ہیروئن مشتری بھی دُہرا رول ادا کر رہی ہے وہ قطب شمالی بھی ہے اور برہسپت سیارہ بھی ہے۔ زُہرا شکر سیارہ ہے۔ مریخ منگل سیارہ ہے۔ عطارد بدھ سیارہ ہے۔ اسد شاہ سرطان ہے۔ دیو سنیچر سیارہ ہے۔ اژدھا ایتھر ہے اور پری مہتاب ہے۔ اتنا ہی نہیں اس میں قوس قزح ہے، شہاب ہیں، ہلال ہے اور آسمان بھی ہے۔

ان کرداروں کی واضح روشنی میں اس بات کا دعویٰ کرنا کہ یہ مثنوی سلطان محمد قلی قطب شاہ کی شخصی زندگی یا تواریخی زندگی کی مظہر ہے۔ اپنی لاعلمی کو مشتہر کرنے کے مترادف ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اہلِ تصوف اور ہندوستانی بھگتوں کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ "عشق

(باقی صــ پر)



بہار میں

اُردو افسانہ نگاری کا ارتقاء

بہار میں اُردو افسانہ نگاری کی روایت کو چار دَور میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا دَور ۱۹۰۴ء سے ۱۹۲۹ء تک، دوسرا دَور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۷ء تک، تیسرا دَور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء تک، اور چوتھا دَور ۱۹۶۱ء سے تا حال۔

بہار میں اُردو افسانہ نگاری کی ابتداء کا سہرا علی محمود کے سر ہے۔ انھوں نے ۱۹۰۴ء کے جنوری اور اپریل میں مخزن نام کے رسالے میں "چھاؤں" اور "ایک پرانی دیوار" نام کے افسانے شائع کرائے انھوں نے بہت کم افسانے لکھے ہیں اور فنی اعتبار سے ان کے افسانے غیر معیاری رہے۔

اولین افسانہ نگاروں میں پروفیسر مسلم عظیم آبادی کا نام اہم ہے۔ انھوں نے "محبت اور جاہ و ثروت کی کشمکش" نام کا افسانہ ۱۹۱۶ء میں ظفر الملک علوی کے الناظر میں شائع کرایا۔ ان کے بعد نور الہدیٰ ندوی، علی اکبر کاظمی، آفتاب حسن، اور فائز عظیم آبادی کے نام آتے ہیں۔ اس دَور کے افسانہ نگار فن پر پوری طرح عبور نہیں رکھتے، البتہ زبان و بیان سے شاعری کا رنگ جھلکتا ہے ان افسانہ نگاروں میں امتیازی شان کے حامل ہیں۔

دوسرے دَور کے افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، شکیلہ اختر، ڈاکٹر سید محسن، ڈاکٹر نصیر الدین، شبلی ابراہیمی اور الیاس اسلام پوری وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ اس دور کا آغاز اختر اورینوی سے ہوتا ہے۔ ان کا سب سے پہلا افسانہ "بدگمانی" ہے۔ اور دوسرے معیاری افسانے "جونیئر وکیل"۔ "ٹائپسٹ"۔ "بوڑھی ماں"۔ "سینی ٹوریم کا فقیر"۔ "سیمنٹ"۔ "۱۵ منٹ" اور "ایک درخت کا قتل" وغیرہ ہیں۔ ان کے چھ افسانوی مجموعے "منظر و پس منظر" "سیمنٹ اور لوری"۔ "کلیاں اور کانٹے"۔ "انار کلی اور بھول بھلیاں"۔ "سپنوں کے دیس میں" اور "کینچلیاں اور بال جبریل" منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کے افسانے فنی اعتبار سے مکمل ہیں۔ ان میں عصری تقاضوں کی حسین مصوری کی گئی ہے اور سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ انشاء پردازی کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اختر اورینوی نے متوسط طبقہ سے اپنی ہمدردی دکھائی ہے۔

سہیل عظیم آبادی نے افسانہ نگاری میں فنی حسن کا اظہار کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں دیہات اور کسانوں سے متعلق روزمرہ کی زندگیاں ملتی ہیں۔ اور مقامی رنگ کا غلبہ نظر آتا ہے اس سلسلے میں وہ پریم چند کے مقلد ہیں۔ انھیں بھی متوسط طبقہ کے لوگوں سے ہمدردی ہے، اور سرمایہ داروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے تین افسانوی مجموعے "الاؤ"، "نئے اور پرانے" اور "چار چہرے" شائع ہو چکے ہیں۔

شکیلہ اختر بہار کی پہلی مسلم خاتون افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں بہار کے متوسط مسلم گھرانوں کی تصویر ملتی ہیں۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعے "درپن"۔ "آنکھ مچولی"۔ "ڈائن"۔ "آگ اور پتھر" اور "لہو کے دل" منظر عام پر آ چکے ہیں۔

ڈاکٹر محسن نے اپنے افسانوں میں تحت الشعور اور لاشعور کی کشمکش کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈرامائی انداز نے ان کے افسانوں میں جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ "انوکھی مسکراہٹ"۔ "لذت آزار" اور "مزدور کا بیٹا" تحلیل نفسی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "انوکھی مسکراہٹ" شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر نصیر الدین، پروفیسر شبلی اور الیاس اسلام پوری اپنے وقت کے اچھے افسانہ نگاروں

: ملکی ٹولہ، سعد پورہ، مظفر پور (بہار)۔

میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جا بجا فنی نقوش ملتے ہیں۔

بہار کے افسانہ نگاروں میں انجستم مانپوری ایک اہم شخصیت کے مالک ہیں ان کے افسانوں میں سنجیدہ طنز و مزاح حسین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ "میر کلو کی گواہی" اور "کرائے کی خیمہ"۔ ان کے مزاحیہ افسانے ہیں۔ یہ واقعات سے زیادہ کردار پر روشنی ڈالتے ہیں۔ زبان و بیان میں مقامی رنگ ملتا ہے۔ انگریزی کے الفاظ کا استعمال نہایت ہی برجستہ اور برمحل کرتے ہیں۔

بہار کی افسانہ نگاری کے تیسرے دور میں افسانہ نگاروں کا کارواں در کارواں نظر آتا ہے۔ ان میں شین مظفر پوری، ذکی انور، گربچن سنگھ، غیاث احمد گدی، انور عظیم، بدر اورنگ آبادی، کلام حیدری، ڈاکٹر شکیل الرحمن، قمر توحیدی، ڈاکٹر وہاب اشرفی، احمد یوسف، شفیع جاوید، شفیع مشہدی، شین اختر، الیاس احمد گدی اور شمس ندیم وغیرہ مشہور و معروف افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ شین مظفر پوری بسیار نویس ہیں۔ ان کی کہانیوں میں اخلاقی زوال و گھریلو زندگی کی ناہمواری، معاشی ناآسودگی، سماجی نابرابری، ہندو مسلم فسادات اور جنسی مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کے افسانے سادگی و پرکاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کے افسانوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعے "دکھتی رگیں" "کڑوے گھونٹ"، "لڑکی جوان ہو گئی"، "آوارہ گرد کے خطوط"۔ اور "حلالہ" منظرِ عام پر آچکے ہیں انھوں نے ۱۹۳۷ء سے لکھنا شروع کیا۔

ذکی انور نے بھی کافی افسانے لکھے۔ ان کی پہلی کہانی "کندن" ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ "رودان" اور "نیک نامی کی واپسی" ان کی عمدہ معیاری کہانیاں ہیں۔

وہاب اشرفی کے افسانوں میں رومانیت اور جمالیات کا نمایاں اثر ہے۔ ان کے مشہور افسانے "گردش میں ہے آسماں"۔ "آخری لاش" "مسیحا کہیں جسے" اور "مٹی کا مادھو" وغیرہ ہیں۔

غیاث احمد گدی کا نام علامتی افسانہ نگاری کو نقطۂ عروج پر پہنچانے والوں میں بیحد نمایاں ہے۔ ان کا پہلا افسانہ "دیوتا" ستمبر ۱۹۴۷ء کے "ہمایوں" (لاہور) میں شائع ہوا۔ غیاث احمد گدی ۲۵ جنوری ۱۹۸۶ء کی صبح ۵ بجے وفات پا گئے۔

چوتھے دَور نے افسانہ کو ایک عظیم انقلاب سے روشناس کیا۔ افسانوں میں نئی نئی تکنیکیں، مسائل اور تجربے پیش ہونے لگے۔ انٹی اسٹوری (Anti Story) اور انٹی پلاٹ (Anti Plot) علامتی اور تجریدی کہانیاں عام ہونے لگیں۔ مؤرخہ علائم کی عام روش نے ترسیل و ابلاغ میں پیچیدگی پیدا کردی۔ ذہنی کرب و انتشار، زندگی کی بے یقینی اور انسان کی بے چارگی کا شدت سے اظہار ہونے لگا، اس دَور کے افسانہ نگاروں میں ظفر اوگانوی، نزہت نوری، نسیم محمد جان، نورالہدیٰ، نشاط قیصر، شبیر احمد، منظر کاظمی، شوکت حیات، اختر یوسف، مشرف عالم ذوقی، رضوان احمد، علی امام، ذکیہ مشہدی، عشرت ظہیر، نعیم کوثر، سعادت شمیم اور عظیم اقبال وغیرہ کے نام ممتاز افسانہ نگاروں میں آتے ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد افسانہ لکھنے والوں میں ظفر اوگانوی کی شخصیت از حد نمایاں ہے۔ ان کے ذاتی طرزِ بیان نے دوسرے افسانہ نگاروں کو بھی متاثر کیا۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں نئے نئے موضوعات اور نئے نئے اسالیب پیش کئے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "بیچ کا ورق" منظرِ عام پر آکر مقبول ہو چکا ہے۔

بہار کے افسانہ نگاروں میں خواتین کے نام بھی آتے ہیں۔ مثلاً: آنسہ نسیمہ سوز، رضیہ رعنا، اعجاز شاہین، عصمت آرا، نصرت آرا، شاہدہ یوسف، روشن آرا، فوزیہ فرحت، شہناز بانو، ثریا جبیں، امروز جہاں، امتیاز فاطمہ، عفت فاطمہ اور عنبریں رحمان وغیرہ وغیرہ۔

روز بروز بہار کے افسانہ نگاروں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور افسانہ نگاری میں نئے نئے رجحانات پیش ہو رہے ہیں۔ اس سے ایک تابناک مستقبل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ حال ہی میں چند نئے نام اُبھر کر سامنے آئے ہیں۔ جن میں مصدر امام قادری، مصطفیٰ کمال، رفیع حیدر انجم، تسنیم بلخی اور ایم اے شمسی سے بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ بہت سے اچھے افسانہ نگاروں کا ذکر مضمون کی طوالت کے خوف سے نہ کیا جا سکا۔ ●

بقیہ، نئی اقتصادی پالیسی

کوئی مقام نہیں ہوگا کہا نہیں جا سکتا کہ اس پالیسی کے دُور رس اثرات کیا ہوں گے؟ کچھ عرصے کے لیے تو معیشت لازماً پھولتی پھلتی نظر آئے گی۔ سڑکوں پر زیادہ موٹر گاڑیاں ہوں گی۔ بازار پائدار سامان صارفین سے بھر جائیں گے۔ لیکن اس چھوٹے سے حصے کے آگے بھی بہت کچھ بڑھنا ہوگا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ نئی اقتصادی پالیسی ایک قسم کا جُوا ہے، یہ اس عقیدے پر مبنی ہے کہ اعلیٰ سطح کے اقتصادی عمل کے فوائد غریب طبقوں تک پہنچ جائیں گے ●

انشائیہ

عذرا رضوی

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس

ہماری زندگی اسی ڈگر پر خراماں خراماں چلی جا رہی تھی۔ راہ میں کوئی سنگ ریزے تھے نہ پیچیدگیاں۔ ہم دونوں میاں بیوی نہایت پُرسکون زندگی گزار رہے تھے کہ ہماری قسمت نے دھکا مارا اور عورتوں کی حریت کی علمبردار بلکہ یوں کہیں کہ عورتوں کی مظلومیت کی آئینہ دار ہماری ایک کرم فرما سے ملاقات ہو گئی۔ اور انھوں نے ہمیں سمجھایا کہ عورت بیچاری کتنی بے بس، کتنی بے کس اور کتنی دُکھیا ہوتی ہے۔ وہ گھر پر رہے یا نوکری کرے حشر سب کا ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی وہ زندگی کی چکّی میں پستی رہتی ہے اور میاں صاحب گلچھرے اُڑاتے پھرتے ہیں۔ ہم نے بیچارے شوہروں کو ان الزامات سے بری کرنے کی خاطر کہا۔ بھئی سب ہی لوگ ایسے نہیں ہوتے ہیں۔ وہ بیچارے بھی تو زندگی کی دوڑ میں برابر کا حصہ لیتے ہیں۔ انھوں نے کہا ارے تم کیا جانو ان مردوں کو، یہ بیچارے ویچارے نہیں ہوتے، یہ بڑے حضرت ہوتے ہیں۔ ہمارا ہلکا پھلکا دماغ اُن کے پُرزور دلائل کو زیادہ دیر تک نہ جھیل سکا۔ ہم نے اپنا آخری ہتھیار یہ کہہ کر کیا کہ بھئی ہمارے میاں تو ایسے نہیں ہیں۔ . . . اور وہ صرف طنزاً مسکرا کر رہ گئیں۔

یہ وار بہت کاری تھا اور ہم تلملا کر رہ گئے۔

میں ان دنوں دفتر سے چھٹی پر تھی۔ اور قسمت سے ایک اچھی کام کرنے والی بھی مل گئی تھی اس لیے ہر طرف سے چین تھا۔ مگر ہماری دوست ہمیں بے چین کر کے چلی گئیں اور اب چھان بین یہ شروع ہوئی کہ ہماری بہن یعنی عورتوں کی حریت کی علمبردار اس عورت کے قول میں کہاں تک صداقت ہے۔ شک اصل میں جاسوسی کی راہ ہموار کرتا ہے اور جاسوسی کے لیے فرصت درکار ہوتی ہے، جہاں شک نے سر اُٹھایا، وہیں جاسوسی کا میدان بھی کھلا پایا۔ آجکل فرصت ہی فرصت تھی۔ اب میں شاعرہ تو تھی نہیں کہ تصورِ جاناں کے لیے فرصت کے رات و دن ڈھونڈتی یہاں تو فرصت کے دنوں میں جاسوسیٔ جاناں کرنا تھی۔ شک دل میں گھر کر چکا تھا۔ اب شوہر کا دیر سے آنا کھلنے لگا۔ ان کا گم صم بیٹھنا بھی ایک آنکھ نہ بھاتا۔ بار بار اپنی کرم فرما کا جملہ دماغ میں گونج جاتا۔ یہ مرد بڑے بے اعتبار ہوتے ہیں، یہ مرد بہت بُرے ہوتے ہیں۔ اگر بغیر نہائے دھوئے، گندے سندے کپڑوں میں شوہر صاحب نظر آتے تو گمان ہوتا کہ کسی پری رُو کے غم میں یہ حال بنا رکھا ہے۔ اگر بنے سنورے گھر سے نکلنے لگتے تو ہم جل کر راکھ ہو جاتے، ضرور کسی سے ملنے جا رہے ہوں گے، تب ہی تو ہنسی پھوٹی پڑ رہی ہے۔ غرضیکہ ہمیں کسی کل چین نہیں تھا۔ دل شک کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا اور کوئی سہارا نظر نہیں آتا تھا۔

ہم اسی اُدھیڑ بُن میں لگے ہوئے تھے کہ ایک دن ہماری کرم فرما پھر آن دھمکیں۔ ہم سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے وہ اپنے محبوب موضوع پر آ گئیں۔ دل سے تو ہم بھی یہی چاہتے تھے۔ آج ہم نے ہتھیار ڈال دیئے اور صاف صاف اپنے دل کی بات کہہ دی۔ بس پھر کیا تھا آن کی آن میں وہ ہماری گائیڈ بن گئیں اور سیکڑوں جاسوسی کے نسخے بتا دیئے۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔

ہم نے سوچا وقتاً فوقتاً فون کر کے شوہر کی مزاج پرسی کر لی جایا کرے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے ایک یہ کہ شوہر صاحب سمجھیں گے کہ ہم ان کا کتنا خیال رکھنے لگے ہیں اور دوسرے یہ پتہ لگتا رہے گا کہ دفتر کے بہانے وہ کہیں اِدھر اُدھر رنگ رلیاں تو نہیں مناتے پھر رہے ہیں۔ پھر ہم نے سوچا کہ کہیں مجرم اس چال کو بھانپ نہ جائے اور جھانسا دینے کی کوئی ترکیب نہ نکال لے، اس لیے اس نسخے کو آزمانے کا ارادہ چھوڑ دیا لیکن "مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی"۔ خیر ہم نے

پتہ: ۲۲۰ ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ ۱۱۰۰ ۔

دوا تو کوئی نہیں کی تھی صرف دوا ڈھونڈنے کے گورکھ دھندے میں پھنسے ہوئے تھے۔ پھر بھی ہمارا مرض یعنی ہمارا اشک راکٹ کی رفتار سے بڑھ رہا تھا۔

ہم نے اس نسخے کی تلاش میں سارا جاسوسی ادب پڑھ ڈالا لیکن کوئی کارگر نسخہ ہاتھ نہیں لگا۔ ان کے یہاں مجرم تھے۔ خطرناک مجرم۔ وہ کھلے عام جرم کرتے تھے۔ شوہر اپنے جرم کو خفیہ رکھتا ہے۔ ان کی پستولیں گولیاں اگلتی ہیں اور شوہر بیوی کو گولیاں دیتا ہے۔ اس لیے جاسوسی ادب ہمارے مطلب کا نہیں نکلا۔ لیکن ایک بات ہمیں شرلاک ہومز کے مطالعے سے ضرور ہاتھ لگی۔ ہومز کے مشاہدے کی طاقت نے ہمیں بے حد متاثر کیا۔ اس لیے ہم نے طے کیا کہ مشاہدے کے ذریعے شوہر کی جاسوسی کی جائے۔ بس ہم نے اسی نسخے کا استعمال فوراً شروع کر دیا۔ سب سے پہلے ہم نے ان کے کپڑے سونگھنے شروع کئے۔ اُمید تھی کہ کسی نہ کسی دن فرانسیسی سینٹ کی خوشبو ضرور ناک میں آئے گی۔ لیکن ان میں پسینے کی بو کے علاوہ کسی خوشبو کا پتہ نہ چلا۔ اب باتوں کے دوران ہماری نگاہیں شوہر کے کاندھوں پر لپ اسٹک کے نشان اور سنہرے بال تلاش کرنے لگیں پھر ہم نے جیبوں کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ ایک جیب میں کاغذ ملے۔ دل نے کہا اب میاں صاحب ضرور پکڑے جائیں گے۔ ایک ایک پرزے کو کئی کئی بار پڑھا۔ نہ کسی پر کوئی پتہ درج تھا نہ کسی خوبرو کا نام۔ ہم نے سوچا یہ مرد بھی ایسی کچی گولیاں تھوڑے ہی کھیلتے ہیں۔ آخر کار ایک دن ایک خط ہاتھ آیا۔ کانپتے ہاتھوں سے خط کھولا گھبراہٹ کے عالم میں جلدی جلدی پڑھنا شروع کیا۔ دل تھا کہ اُمڈا چلا آرہا تھا۔ قریب تھا کہ ہم غشی کھا کر گر پڑتے کہ دماغ نے کہا بی بی ہوش کے ناخن لو۔ پیسوں کی تنگی، بچوں کی پریشانی کے دکھڑے تو ہم نے ہی لکھ کر بھیجے تھے، جب ہمارے میاں کچھ دنوں کے لیے آفس کے کسی کام کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے تھے۔ تو یہ شک بھی کیسی بیماری ہے۔ ہم دل میں بہت شرمندہ ہوئے اور اب ہم نے طے کر لیا کہ کبھی اپنے میاں پر شک نہیں کریں گے۔ چند دن چین سے گزارے مگر پھر وہی مصیبت۔ دیکھا ٹیلی فون پر خوب ہنس ہنس کر باتیں ہو رہی ہیں۔ ضرور کوئی حسینہ ہوگی۔ ہم بھی کام بھول بھال گئے اس کمرے میں اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔ میاں صاحب نے ڈائری نکالی اور فون نمبر نوٹ کیا گیا۔ تو اب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ گھر پر بھی بات چیت ہوگئی اور فون نمبر رکھے جائیں گے۔ ہم بھی موقع کی تلاش میں رہے۔ بس جیسے ہی میاں صاحب دفتر سدھارے ہم نے جیبوں کی تلاشی لے ڈالی، ڈائری تو ملی نہیں ہاں ایک کاغذ کے کونے پر ایک فون نمبر لکھا ملا۔ جی دھک دھک کرنے لگا۔ پھر بھی فون نمبر ملایا۔ ابھی ہم نے اپنا فون نمبر بتایا ہی تھا کہ اُدھر سے آواز آئی۔ جی آپ فکر نہ کریں آجائے گی۔ ہم نے غصہ میں کہا کیسے آجائے گی۔ اس کی اتنی ہمت اب ہمارے گھر بھی آئے گی۔ ادھر سے کچھ پریشان سی آواز آئی۔ میڈم آپ بالکل فکر نہ کریں ہم خود بھیجیں گے۔ آپ خود بھیجیں گے؟ ہم نے تقریباً چیخ کر کہا۔ جی ہاں میڈم جلد سے جلد بھیجنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے ٹیلی فون پر تقریباً دہاڑتے ہوئے کہا۔ ہم بھیجنے والے کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔ اُدھر سے فون پر نہایت مظلوم آواز آئی۔ میڈم ابھی آپ کے صاحب نے ہی تو بھیجنے کو کہا تھا اور آپ اتنی ناراض ہو رہی ہیں۔ بس ہمارا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور ہم ٹیلی فون ہاتھوں میں پکڑے ہی پکڑے سسکنے لگے۔ مڑ کر دیکھا تو ہمارے ہی پاس ہمارے شوہر صاحب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ آگ ہی تو لگ گئی۔ ابھی ہم کچھ کہتے کہ انھوں نے کہا۔ یہ تو پوچھو کیا بھیجیں گے؟ شاید ہم میں اب غصہ کرنے کی سکت باقی نہیں تھی۔ اپنے کو سنبھال کر کمزور سی آواز میں ہم نے ٹیلی فون پر پوچھا آپ کیا بھیجیں گے۔ اُدھر سے آواز آئی۔ میڈم گیس بھیجیں گے۔ اور ہم نڈھال ہو کر وہیں بیٹھ گئے اور میاں صاحب شرارت سے مسکراتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

بقیہ: کیا آپ جانتے ہیں؟

- ٹیسٹ کرکٹ میں کپل دیو کا ایک اننگ میں سب سے زیادہ ۱۶۳ رن اور ایک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میچ میں ۱۷۵ رن ہے۔
- ویسٹ انڈیز کے مشہور بلے باز لارینس رو نے ۱۹۷۲ء میں نیوزی لینڈ کے خلاف اپنا پہلا ٹیسٹ میچ کھیلا تھا۔ اس میچ کی دونوں اننگ میں لارینس رو نے سینچری بنائی۔
- کرکٹ کی تاریخ کا سب سے پہلا ٹیسٹ میچ ۱۸۷۶-۷۷ء میں آسٹریلیا اور انگلینڈ کے بیچ ملبورن میں کھیلا گیا تھا، آسٹریلیا کے سلامی (اوپننگ) بلے باز چارلس بینرمین نے الفریڈ شا کی پہلی گیند کو کھیلا تھا۔ بینرمین نے نہ صرف ٹیسٹ کرکٹ کا سب سے پہلا رن بنایا بلکہ سینچری بھی بنائی۔
- انگلینڈ کے آف اسپنر بالر ڈبلیو۔ای ہولیز نے بریڈمین کو ان کی آخری ٹیسٹ سیریز میں صفر پر آؤٹ کیا تھا۔
- اگر امپائر بلے باز کو آؤٹ دے دیتا ہے تو مخالف ٹیم کا کپتان اپیل کرسکتا ہے اور بلے باز کو دوبارہ بیٹنگ کرنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ اس کی مثال ۱۹۷۹-۸۰ء کے بھارت اور انگلینڈ ٹیسٹ کے دوران دیکھنے کو ملی۔ جب بھارت کے کپتان وشوناتھ نے باب ٹیلر کو امپائر کے آؤٹ کے فیصلے کے باوجود بلے بازی کے لیے واپس بلالیا۔

م۔ ق۔ خان

خود آگہی

زاہدہ! زاہدہ! مجھے ایک آواز نے چونکا دیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میں بازار سے سبزی خرید کر لوٹ رہی تھی۔ میں نے دیکھا نشاط میرے پیچھے آرہی ہے۔ میں نے رُک کر اس سے دریافت کیا "تم، یہاں کب آئیں؟" نشاط کئی سال قبل اس شہر سے اپنے شوہر کے ساتھ جمشید پور چلی گئی تھی۔ نشاط کے شوہر ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔

"میں اس شہر میں دو مہینوں سے ہوں میں یہاں کھادی ایمپوریم میں سیلز ایکزیکٹیو کی جگہ پر کام کر رہی ہوں۔" نشاط نے جواب دیا۔ یہ میرے لیے ایک نیا انکشاف تھا جو بہت حد تک حیران کن بھی تھا۔ میں اب بالکل اپنے مکان کے سامنے آگئی تھی۔ میں اُسے اپنے ساتھ مکان پر لے آئی۔ بیٹھتے بیٹھتے وہ کمرے کی ہر چیز پر طائرانہ نظریں ڈالنے لگی۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی پھر بھی میں مطمئن تھی کہ کمرے سے جاہ و حشمت نہیں ٹپکتی تھی تو کمرہ کچھ ایسا بھی نہیں تھا کہ غربت یا بدسلیقگی کا آئینہ دار ہو۔ عورتوں کی تو فطرت ہی ہوتی ہے کہ ہر چیز کو ایک ماہر جاسوس کی نظر سے دیکھتی ہیں۔

مجھے تعجب اس بات پر تھا کہ نشاط نہایت روایت پسند خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ کالج بھی بغیر برقع چڑھائے نہیں آتی تھی اور تمام اُن لڑکیوں اور لکچرار کو بُرا کہتی تھی جو پردہ نہیں کرتی تھیں۔ جس خاندان میں شادی ہوئی تھی وہ بھی ان معاملوں میں کٹر قسم کے لوگ تھے۔ اس لیے مجھے یہ خواہش اُکسانے لگی کہ آخر وہ کون سے حالات یا مجبوریاں تھیں کہ وہ گھر کی چہار دیواریوں سے باہر نکل کر کسی دفتر میں کام کرنے پر مجبور ہوگئی۔ میں نے چائے پیش کی اور ہم دونوں چائے پینے لگے۔ میں نے دریافت کیا "تم نے نوکری کرنے کا فیصلہ کب کیا، تم تو......"

"کیوں، نوکری کرنا کوئی عیب کی بات ہے؟" نشاط نے بھی سوال کر دیا۔

"میں یہ نہیں کہتی لیکن تم پردے کی اس قدر پابند و قائل تھیں کہ......"

"ان دنوں کی بات اور تھی۔ ماں باپ کا دیا کھاتی اور پہنتی تھی۔ اس وقت یہ احساس کہاں تھا کہ پیسے کہاں سے آتے ہیں؟"

"تمہارے شوہر تو ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں۔ اچھی خاصی تنخواہ ملتی ہوگی، پھر تمہیں......"

"تنخواہ اچھی خاصی کیا ملتی ہے؟ آج کی ہوشربا گرانی میں ایک کی تنخواہ کی آمدنی سے کیا ہوتا تھا۔ ماشاءاللہ تین بچے ہیں۔ ان کے خورد و نوش، علاج معالجہ، اسکول کے یونیفارم، اسکول کی فیس، مکان کا کرایہ، بچوں کے اسکول جانے کے اخراجات وغیرہ مُہیا کرنا پڑتا ہے۔ میں تعلیم یافتہ تھی اس لیے میں نے جگہیں خالی دیکھیں اور درخواست دیدی۔ چھ ماہ تک وظیفہ دیا گیا اور سیلز کی تربیت اور اب سیلز ایکزیکٹیو کے عہدہ پر میری تقرری ہوگئی ہے اب تم ہی بتاؤ کہ آئی روزی کو کون لات مارتا؟ یہ کہاں کی دانشمندی ہوتی؟"

"نہیں، نہیں۔ تم نے ٹھیک ہی کیا۔ انسان کو ضرورت کے مطابق ہر تبدیلی کے لیے تیار رہنا ہی چاہیئے۔"

"اور تم کیا کر رہی ہو؟" تم نے تو انگریزی میں آنرز بھی کیا تھا اور شروع سے ہی کیریئر شاندار

پتہ: حکیم عنایت کالونی، گیا (بہار)۔

تھا" نشاط نے سوال کیا۔

"تعلیم یا ڈگری حاصل کرنے کا مطلب یہ تھوڑے ہی ہوتا ہے کہ بس نوکری ہی کی جائے میں گھر سنبھالتی ہوں۔ ہمارے دو بچے ہیں۔ میں ان کی نگہداشت کرتی ہوں اور بھی دوسری ذمہ داریاں ہیں۔"

"تم کیا سمجھتی ہو کہ میرے ذمے یہ سارے کام نہیں ہیں؟ یہ اور بات ہے کہ تمھارے شوہر کی آمدنی کافی ہے اور تمھارے سامنے معاشی مسائل نہیں ہیں۔ پھر گھر میں رہ کر زندگی کا لطف اٹھاؤ۔ دن بھر کسی دفتر میں کام کرنا کسے بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن مرتا کیا نہیں کرتا؟ یہ میرا شوق یا تفریح نہیں۔ نوکری — میری ضرورت تھی اگر میں نوکری نہیں کرتی تو اخراجات کیسے پورے ہوتے؟ لیکن یہ بھی نہیں کہ کسی نے مجھ پر نوکری لاد دی ہے۔ میں نے خود ہی ضرورت محسوس کی اور ان سے نوکری کرنے کی اجازت چاہی۔ شروع میں تو انھیں یہ بات اچھی نہیں لگی لیکن دھیرے دھیرے حالات نے انھیں مجبور کر دیا۔ آخر آدمی کب تک فرضی احساسِ برتری کا شکار رہتا۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ کبھی میری رہائش گاہ پر آؤ۔ یہ رہا پتہ۔ بائی بائی"

نشاط ہاتھ ہلاتی میرے گھر کے گیٹ سے باہر چلی گئی۔

نشاط کی گفتگو نے جیسے پرسکون سطحِ آب پر کئی پتھر پھینک دئے۔ میں نے اپنے گھر کا جائزہ لیا۔ اللہ کے فضل سے گھر میں ضرورت کی ساری چیزیں میسر تھیں۔ ٹی وی، فرج، اچھے قسم کے فرنیچر، پنکھے، گیس کا چولہا، جمیل کے لیے اسکوٹر۔ ہمارا اپنا چھوٹا سا گھر بھی تھا۔ گو اس گھر کو بنانے میں جمیل نے آبائی جائداد کو فروخت کر دیا تھا۔ ہمارے سامنے بظاہر کوئی ایسا مسئلہ نہیں درپیش آیا تھا کہ معاشی بدحالی کا احساس ہوتا۔ وہ مجھے مہینہ بھر کے اخراجات کے لیے پیسے دیدیتے تھے اور پسماندہ رقم وہ بینک میں جمع کر دیتے تھے۔ اور مجھے کبھی یہ فکر ہی نہیں ہوتی کہ بینک میں کتنی رقم جمع ہوتی ہے یا کتنی رقم جمع ہے۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ چیزوں کی قیمت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی اور بازار میں خریدتے وقت مجھے ہمیشہ کوتاہئ داماں کا احساس ہوتا۔ میں ہر ممکن کوشش کرتی کہ اسی متعینہ رقم میں پورے مہینہ کے اخراجات پورا کر لوں۔ یہی کچھ حال ہمارے پڑوسیوں کا بھی تھا۔ دوپہر کے وقت ہماری گفتگو میں بڑھتی قیمتوں کا ذکر ضرور آتا۔ ان حالات کے پیشِ نظر میرے ذہن میں بھی ایک سوال اٹھا کہ میں اپنے شوہر کی آمدنی کا صحیح صحیح اندازہ لگاؤں اور ممکن ہو تو حسبِ ضرورت ان کا ہاتھ بٹاؤں۔

اس رات جب بچے سو چکے تو میں نے اپنے شوہر کے سامنے یہ مسئلہ اٹھانا چاہا۔ مجھے سنجیدہ اور فکرمند دیکھ کر انھوں نے دریافت کیا "کیا بات ہے؟ مزاج عالی متفکر نظر آ رہا ہے"؟

"بھلا میں متفکر کیوں ہونے لگی؟" میں نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور نشاط کا ذکر کیا اور یہ بھی بتلایا کہ وہ آجکل اسی شہر میں نوکری کر رہی ہے۔ اور میں نے ان کی معاشی پریشانیوں کا بھی ذکر کیا۔

"افسوس ہے اس کا شوہر ڈپٹی مجسٹریٹ ہے اور اس کے باوجود انھیں معاشی پریشانی ہے۔"

میں خاموشی سے جمیل کا منھ دیکھتی رہی۔

انھوں نے کہا "کیوں تم گم سم کیوں ہو؟ کیا تمھارا بھی خیال نوکری کرنے اور آمدنی بڑھانے کا ہے؟"

"دن بدن چیزیں مہنگی ہوتی جا رہی ہیں اور تمام اخراجات کا بوجھ آپ کے کندھوں پر ہے۔ اگر میں اس میں ہاتھ بٹاتی تو اس میں کیا حرج ہے؟..." میں نے نہایت دبی زبان سے کہا۔

"آخر تمھیں کس چیز کی کمی نظر آتی ہے! ہمیں خواہ مخواہ دوسروں کی نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں جمیل سے بحث کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اپنی گفتگو اسی جگہ ختم کر دی۔ جمیل نے کھانا کھایا اور سو گئے۔ میں بھی کام سے فرصت پاکر سو گئی۔ لیکن یہ رات میرے لیے بڑی بے چینی کی رات تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ بغیر سمجھے بوجھے میں اکثر و بیشتر گھر میں کسی نہ کسی چیز کی فرمائش کر دیتی تھی اور جمیل بغیر چون و چرا اسے لانے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ اس لیے ممکن ہے میری باتوں کا انھیں برا لگا ہو۔

جہاں تک میرا قیاس تھا کہ جمیل کو بھی نیند نہیں آئی تھی۔ وہ کروٹیں بدلتے رہے۔ خلافِ معمول انھوں نے کوئی بات کی نہ چھیڑ چھاڑ۔ صبح میں وہ خوش نظر آئے۔ دفتر جانے سے پہلے وہ میرے پاس آئے۔ بڑے پیار سے انھوں نے میری کمر میں ہاتھ ڈالا اور مجھے سینے سے لگاتے ہوئے کہا "کوئی فرمائش؟"

"نہیں، گھر میں سب کچھ ہے۔" میں نے فوراً جواب دیا۔

پتہ نہیں کیوں جمیل کی ہر بات اور ہر حرکت میں مجھے تصنع کا احساس ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا، وہ کچھ ہم سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں اور بظاہر خوش رہنے کا سوانگ رچا رہے ہیں۔

شام کے وقت جمیل دیر سے آئے۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتی انھوں نے کہا کہ دفتر میں کام کی زیادتی سے دیر ہو گئی۔ حسبِ معمول وہ بچوں کے ساتھ کھیلتے رہے۔ کھاتے وقت روحی نے کہا کہ اس کے اسکول سے لڑکیاں بہار کے اہم تفریحی، تاریخی اور صنعتی مقامات پر سیر کرنے جا رہی ہیں۔ اس کے لیے ہر لڑکی کو دو سو روپیے

تنگ کرنے ہوں گے۔ روحی کی باتیں سُن کر جمیل کے چہرے پر شکن سی اُبھری۔ انھوں نے دُزدیدہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ میری چوری پکڑتے یا دونوں کی آنکھیں چار ہوتیں۔ میں نے دوسری جانب دیکھنا شروع کر دیا۔ انھوں نے روحی سے کہا" تم اس ٹور پر ضرور جاؤگی۔ دو تین دنوں میں پیسے دوں گا"۔

دوسرے دن پنٹو نے ٹھنکتے ہوئے کہا ممی میرے اسکول میں ایک نئے پی۔ ٹی۔ ٹیچر آئے ہیں۔ وہ اب ہر سنیچر کو پی۔ ٹی کروائیں گے۔ ہر لڑکے کو اب پی۔ ٹی ڈریس میں جانا ہوگا۔ اس کے لیے کیڑے کے جوتے، سفید پینٹ اور شرٹ ہونا ضروری ہے"۔

پچھلی رات کا منظر مجھے یاد تھا۔ یہ مہینہ کا آخری ہفتہ تھا۔ میں نے پنٹو کو ایک ہفتہ صبر کرنے کی تلقین کی۔" اگلے ہفتہ تمھاری ساری چیزیں آجائیں گی"۔ میں نے پنٹو کو تشفی تو دیدی لیکن سوچنے لگی۔ اس مقررہ رقم سے تو مہینے بھر کا خرچ کس طرح پورا ہوتا ہے۔ میں پنٹو کی فرمائش کہاں سے پوری کروں گی؟ مجھے یہ احساس ہوا کہ مجھے اُسی مقررہ رقم سے کچھ بچا کر رکھنا چاہیئے تھا لیکن کبھی مہمان آتے، کبھی کسی کے یہاں شادی میں جانا پڑتا یا کسی بچے کا برتھ ڈے ہوتا۔ غرض دامن تو پہلے ہی تنگ تھا۔ گھوم پھر کر میں اسی نتیجہ پر پہنچی کہ ایک آدمی پر اس طرح منحصر کرنا کوئی دانشمندی ہے نہ دُور اندیشی۔ لیکن میرے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ جمیل کسی بات کو حقیقت میں نظروں سے دیکھنے کو راضی نہیں تھے۔ ادھر میں دیکھ رہی تھی کہ وہ روزانہ کافی دیر کرکے لوٹ رہے تھے۔ میں وجہ پوچھتی تو وہ ٹال جاتے۔ آخر میں نے پتہ لگا لیا۔ وہ ایک پرائیویٹ فرم میں پارٹ ٹائم کام کرنے لگے تھے۔ روز کی طرح آج رات بھی جمیل کافی دیر سے آئے تھے۔ بچے کھا پی کر سو چکے تھے۔ ان کے چہرے بشرے سے تھکان صاف ظاہر تھی۔ میں نے آج ارادہ کر لیا تھا کہ ایک بار پھر اُن سے بات کروں گی۔ کھانے کے بعد جب انھوں نے مصنوعی مسکراہٹ سے مجھے ایک بار پھر فریب دینا چاہا تو میں نے کہا" آپ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی مجھ سے پیار کرتے ہیں اور پورے گھر کا خیال کرتے ہیں لیکن میرا بھی کچھ فرض ہے۔ میں جو کچھ دیکھ رہی ہوں وہ میری برداشت سے باہر ہے۔

" خیر تو ہے، بندہ سر تسلیم خم کئے دست بستہ کھڑا ہے۔ حکم صادر ہو، ابھی تعمیل کروں گا" جمیل نے لفاظی سے میرا منھ بند کرنا چاہا۔

" آپ مجھے میرے حق سے محروم نہیں کرسکتے۔ آخر میری بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ ۔ ۔"

" آپ کے سارے حقوق محفوظ ہیں اور آپ نے ساری ذمہ داریاں بہ حُسن و خوبی نبھائی ہیں"۔ جمیل نے مجھے اپنے حلقۂ بازو میں سمیٹ لیا اور ہونٹوں پر مُہرِ محبت ثبت کرکے اُس نے خاموش کرنا چاہا۔ لیکن میں اس بار کسی قیمت پر اپنی بات کہنے سے باز آنے والی نہیں تھی۔

" میں آپ کی شریک حیات ہوں یا نہیں"۔ میں نے سوال کیا۔

" بالکل، بلا شرکت غیرے۔ کیا اس میں شک و شبہ ہے؟"۔

" تو پھر سنئے کہ اگر آپ کی مُہیا کردہ خوشی سے فیضیاب ہونے کا حق ہے تو مجھے شریکِ غم ہونے کا بھی حق ہے۔ آپ نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ آپ کی آمدنی کیا ہے؟ اس کے ذرائع کیا ہیں۔ میں نے اندھا دھند فرمائشیں کیں اور آپ نے خندہ پیشانی کے ساتھ سب کچھ لاکر دے دیا۔ میں نے اس وقت کچھ نہیں سوچا۔ اب میں بچی ہوں نہ شبِ عروس کی دُلہن! اور مجھے اب ساری باتیں معلوم ہو چکی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ کی مردانہ غیرت نے کبھی یہ قبول نہیں کیا کہ صورت حال سے مجھے روشناس کریں۔ لیکن آپ کب تک ضرورتوں کو روزانہ بڑھتی ہوئی قربان گاہ پر اپنے کو قربان کرتے رہیں گے؟ آپ کا اندازِ فکر نہیں بدلا اور اسی طرح فکر و تردد اور کام کی زیادتی کے بوجھ کے نیچے دبتے رہے تو اس کا نتیجہ بڑا بھیانک ہوگا اور تب پانی سر سے اونچا اُٹھ چکا ہوگا۔ اس لیے اب میں آپ کو مجبور کروں گی کہ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں بھی کچھ حاصل کروں اور آپ نے مجھے اجازت نہیں دی تو آج سے ۔۔"

" آج تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ لگتا ہے کوہِ آتش فشاں پھٹ پڑا ہے۔ لو آج جو تم کہوگی وہ میں مان لوں گا۔ اب تم خوش ہوگئیں"۔ جمیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" میں کل سے سینٹ فرانسس انگلش میڈیم اسکول میں پڑھانے جاؤں گی۔ وہاں کی پرنسپل سے سب کچھ طے ہو گیا ہے۔ مجھے گیارہ بجے دن سے تین بجے دن تک کام کرنا ہوگا۔ فی الحال مجھے ایک ہزار روپے تنخواہ ملے گی۔ مجھے آپ کی اجازت چاہیئے فوراً فیصلہ کیجئے کہ میں اگلا قدم اُٹھاؤں"۔

" بھلا اس ناچیز کی کیا مجال کہ حضور کے فیصلہ کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالے۔ آپ بخوشی جائیں"۔

میں خوشی سے جھوم اُٹھی۔ میں نے دریافت کیا " کہیں آپ یہ فیصلہ جبراً قہراً تو نہیں کر رہے؟"

انھوں نے مجھے اپنی باہوں میں لے لیا اور یوں ناچنے لگے جیسے ہم بہت دنوں کی جدائی کے بعد پہلی بار پھر سے مل رہے ہوں۔

غزلیں



خسرو متین : ۲۴۹، کلیان واس، دہلی ۹۱۔

تو بتا، درد کا افسانہ سناؤں کیسے
بجھ گیا ہے جو دیا، اُس کو جلاؤں کیسے

ایک خوشبو سی فضاؤں میں گھُلی جاتی ہے
میں تیرا نام زمانے سے چھپاؤں کیسے

خواب کی طرح نگاہوں میں بسا ہے لیکن
دل کے کاغذ پہ تیرا عکس اُٹھاؤں کیسے

تو نگاہوں کی تمازت سے پگھل جاتا ہے
دل تو صحرا ہے، تجھے دل سے لگاؤں کیسے

جو بھی تصویر بناتا ہوں، بگڑ جاتی ہے
بہتے پانی پہ کوئی خواب سجاؤں کیسے

میں گنہگار ہوں، یہ سب کو خبر ہے لیکن
کتنا معصوم ہوں، یہ راز بتاؤں کیسے

تو کہ خوشبو کا بدن، خواب کا نازک پیکر
اور میں ہوں کہ تجھے ہاتھ لگاؤں کیسے

●

ثاقب گنگوہی : قریشاں، گنگوہ، سہارنپور (یو۔پی)۔

بلندی پر بہت میرا بھی سر تھا
کبھی میں بھی یہاں پر معتبر تھا

جھکاتا میں بھلا کس کس کے آگے
خدا تھے اَن گنت اور ایک سر تھا

وضاحت کے لیے درکار صدیاں
مرا قصہ بظاہر مختصر تھا

چلو ثاقب یہاں رکھا ہی کیا ہے
وہ کب کا گر چکا جو اپنا گھر تھا

●

ایم۔ اے۔ شمسی ، دوگھرا، جالہ، دربھنگہ (بہار)

لوگ کہتے ہیں کہ ہے اِک کارواں یہ زندگی
درحقیقت ہے کوئی دردِ نہاں یہ زندگی

یہ خوشی اور غم کی مشترکہ کہانی ہے کوئی
یا کہ ہے رنج و الم کی داستاں یہ زندگی

کیا خبر تھی چھین لے گی مجھ سے میری ہر خوشی
میں سمجھتا تھا کہ ہے اِک پاسباں یہ زندگی

گھومتا پھرتا ہوں میں ہر کوچہ و بازار میں
دیکھئے لے جاتی ہے مجھ کو کہاں یہ زندگی

آج شمسی بے وفا کے نام سے مشہور ہے
کل دیکھئے دیتی ہے مجھ کو کیا نشاں یہ زندگی

●



واجد سحری : بی۔۲۸، طبیہ کالج، قرول باغ، نیو دہلی ۵۔

جام اوروں کے لیے میں نے جو ساقی سے لیا
میرے آئینہ احساس پہ پتھر سا لگا

اپنا خوں آج نہ ساقی کو اگر پیش کیا
کل کوئی قطرۂ مئے ہاتھ نہیں آئے گا

ایک دریا ہے ہزاروں ہیں نہانے والے
خشک دامن کوئی رہ جائے تو حیرانی کیا

اُن کی فطرت پہ تعجب بھی ہے افسوس بھی ہے
حُسن کی تعریف کریں اُس کو ہی کہتے ہیں بُرا

آؤ روشن کریں ہم اپنے لہو کی شمعیں
خیر مقدم کو خود آئے گا ہوا کا جھونکا

کھیل قدرت کے عجب ہوتے ہیں واجد سحری
اُٹھے صحرا سے سمندر پہ برس جائے گھٹا ●

کفیل الرحمٰن نشاط ، مکان نمبر ۳۸۲، محلہ ابوالمعالی، دیوبند (یو۔پی)۔

رشتوں کی ڈھتی ہوئی دیوار کی طرح
اکثر ملے ہیں آپ بھی اغیار کی طرح

اب کے برس نہ آئے بہاروں کے قافلے
اشجار چپ کھڑے ہیں گنہگار کی طرح

غم بھی بقدرِ وسعتِ داماں نہ مل سکا
دامن جھٹک دیا کسی نادار کی طرح

دل وحشتوں کے شہر سے مانوس ہوگیا
صحرا بھی اب لگے ہے سمن زار کی طرح

ہر گل کی زندگی ہے حصارِ ممات میں
دستِ صبا نشاط ہے تلوار کی طرح ●



شیدا بلھونوی : پوسٹ شاہ پور بگھونی، سمستی پور (بہار)

یکجہتی کا ترانہ

ہندو مسلم سکھ عیسائی　　باہم سب ہیں بھائی بھائی
بھارت ماتا سب کی مائی　　پھر کیوں ہے یہ ہاتھا پائی
یکجہتی کا باغ لگاؤ!
گلدستہ الفت کا سجاؤ!
بنگالی ہو یا ہو بہاری　　مسلم ہو یا پنڈت کا پجاری
راجہ پرجہ یا ہو بھکاری　　کوئی نہ ہلکا کوئی نہ بھاری
ہم ہیں ہندی بھائی بھائی
پھر کیوں ہے آپس میں لڑائی
گوتم کا دلدادہ کوئی　　چشتی کا متوالہ کوئی
چھتری کوئی لالا کوئی　　گورا کوئی کالا کوئی
سب ہیں ہندی بھائی بھائی
شیخ ہو کوئی یا ہو سائیں
بن جاؤ گلدستۂ الفت　　ہو جس میں خوشبوئے محبت
برگ و گل کی کچھ ہو رنگت　　ہو کوئی بھی مذہب و ملت
ایک بنو تم ایک رہو تم
اک دھارے کے ساتھ بہو تم
قومی یکجہتی کا چمن ہو　　بہتی جس میں گنگ و جمن ہو
گاندھی اور نہرو کا چلن ہو　　ایک زباں ہو ایک سخن ہو
شیدا ایسی بزم سجاؤ
گانے یکجہتی کے سناؤ

●

ڈاکٹر بیتاب علی پوری : رام بازار، سونی پت ۔ (ہریانہ)

جس طرح اعدادِ جمنا۹۴ اور زمزم۹۴ ایک ہیں

ہندو و مسلم سبھی ابنائے آدم ایک ہیں
جس طرح اعدادِ جمنا۹۴ اور زمزم۹۴ ایک ہیں
امن کے پیغامبر گاندھی و گوتم ایک ہیں　　مختلف طبقات کے انسان باہم ایک ہیں
ماننے والے کسی بھی دھرم کے ہوں خواہ وہ　　امنِ عالم کے امیں سب اہلِ عالم ایک ہیں
ہمکنارِ نور ہے یا کوئی تاریکی میں ہے　　غور سے جب دیکھتے ہیں دونوں ہمدم ایک ہیں
جس طرح صحنِ چمن میں محوِ گلگشتِ چمن　　کوچۂ صیاد میں بھی ہر قدم ہم ایک ہیں
یوں سمجھنے کے لیے غم اور خوشی سمجھیں الگ　　مشترک ہیں ساری خوشیاں اور سب غم ایک ہیں
گو جدا ہیں آب و آتش، خاک و باد و آسماں　　زندگی چاہیں تو یہ اجزائے برہم ایک ہیں
ہم نفس کی آمد و شد سے پریشاں کیوں ہوئے؟　　ذکر کرنے کے لیے تیرا، دمادم ایک ہیں
ایک دنیا کا ہے نصب العین "گٹ نر پیکھتا"　　اور بھارت کے نواسی ہیں، بہت کم ایک ہیں
کر دیا ہے ساز کے پردوں نے ہر سُر کو الگ
ورنہ اے بیتاب سارے سُر و سرگم ایک ہیں

غزل

رفعت شاہین : ۲/۴، گورنمنٹ پریس کالونی،
علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ (یو۔پی)۔

پوچھ کر حالِ پریشاں مجھے چھیڑا مت کر　　تو مری روح کے زخموں کو کریدا مت کر
خواب زاروں کے جھروکوں سے دکھا کر چہرہ　　میرے ماضی کا میرے حال سے رشتہ مت کر
بر سرِ راہ کبھی میں جو تجھے مل جاؤں　　بر سرِ عام مجھے دیکھ کے چونکا مت کر
کوئی سویا ہوا طوفان مچل اٹھے گا　　شام، آنکھوں کے دیئے در پہ جلایا مت کر
چوٹ کھائی ہے محبت میں تو روتا کیوں ہے　　میں نہ کہتا تھا کہ اپنوں کا بھروسہ مت کر
کیا مرا عکس نہیں ہے ترے آئینے میں　　اجنبی بن کے حقیقت کو چھپایا مت کر
دستِ کم ظرف میں شاہین کھلونا بن کر
اپنی خودداری و توقیر کا سودا مت کر

●

معیز الدین شیخ

کرکٹ کی دُنیا

کیا آپ جانتے ہیں؟

• مختلف ملکوں کے ۱۸ کھلاڑیوں نے اب تک کرکٹ ٹیسٹ میچوں میں ۶۰۰۰ رن سے زیادہ بنائے ہیں۔ جن میں ہندوستان کے سُنیل گواسکر، گنڈپّا وشوناتھ اور دلیپ ونگسارکر شامل ہیں۔ پاکستان کے جاوید میاں داد نے بھی ۶۰۰۰ رن سے زیادہ بنائے ہیں۔

• کرکٹ کے ۲۰ ٹیسٹ میچ ایسے رہے ہیں جن میں دونوں ٹیموں کے کپتانوں نے سینچری بنائی ہیں۔ ۷۹-۱۹۷۸ء میں سُنیل گواسکر اور ویسٹ انڈیز کے کالی چرن نے بمبئی میں کھیلے گئے میچ میں ۲۰۵ اور ۱۸۷ رن بنائے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء میں کھیلے گئے ویسٹ انڈیز اور ہندوستان کے ٹیسٹ سیریز میں دلّی میں کھیلے گئے میچ میں ونگسارکر نے ۱۰۲ رن اور ووین رچرڈس نے ۱۰۹ رن بنائے۔

• کرکٹ ٹیسٹ میچوں میں ایک اننگ میں سب سے کم رنز بنانے والے ملکوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔۔

(۱) ۵۵-۱۹۵۴ء سیریز میں نیوزی لینڈ نے انگلینڈ کے خلاف کھیلتے ہوئے ایک اننگ میں صرف ۲۶ رنز بنائے اور پوری ٹیم آؤٹ ہوگئی۔ ٹیسٹ سیریز میں یہ سب سے کم رن تھے۔

(۲) ۹۶-۱۸۹۵ء میں پورٹ الزبتھ میں انگلینڈ کے خلاف میچ کھیلتے ہوئے ساؤتھ افریقہ نے اپنی ایک اننگ میں صرف ۳۰ رن بنائے۔

(۳) ۱۹۰۲ء میں برمنگھم میں کھیلے گئے میچ میں آسٹریلیا نے انگلینڈ کے خلاف صرف ۳۶ رن بنائے۔

(۴) ۸۲-۱۹۸۱ء سیریز میں پرتھ میں کھیلے گئے میچ میں پاکستان نے آسٹریلیا کے خلاف ایک اننگ میں صرف ۶۲ رن بنائے۔

(۵) ۱۹۷۴ء میں لارڈس کے میدان میں کھیلے گئے میچ میں بھارت نے انگلینڈ کے خلاف صرف ۴۲ رن بنائے اور پوری ٹیم آؤٹ ہو گئی۔

(۶) ۸۷-۱۹۸۶ء میں سڈنی میں انگلینڈ نے آسٹریلیا کے خلاف صرف ۴۵ رن بنائے۔

(۷) ۸۷-۱۹۸۶ء میں ویسٹ انڈیز نے پاکستان کے خلاف اپنی ایک اننگ میں صرف ۵۳ رن بنائے۔ یہ میچ فیصل آباد میں کھیلا گیا۔

(۸) ۵۹-۱۹۵۸ء میں ویسٹ انڈیز نے ڈھاکہ میں پاکستان کے خلاف کھیلتے ہوئے صرف ۷۶ رن بنائے اور پوری ٹیم آؤٹ ہو گئی۔

• انگلینڈ کی ملکہ الزبتھ دوم، انگلینڈ کے اوول گراؤنڈ کی پیٹرن (Patron) ہیں۔

• ایک روزہ کرکٹ میں صرف دو کھلاڑیوں نے اپنے پہلے ہی میچ میں سینچری بنائی۔ انگلینڈ کے ڈینس ایمس نے ۱۹۷۲ء میں مانچسٹر میں آسٹریلیا کے خلاف ۱۰۳ رن بنائے۔ دوسرے کھلاڑی ویسٹ انڈیز کے ڈیسمنڈ ہینس ہیں جنھوں نے سینٹ جونس میں ۷۸-۱۹۷۷ء میں آسٹریلیا کے خلاف پہلے ہی میچ میں ۱۴۸ رن بنائے۔

• بھارت کے خلاف ۷۹-۱۹۷۸ء میں ظہیر عباس نے لاہور ٹیسٹ میں گنڈپّا وشوناتھ کے گیند پر چھکّا لگا کر پاکستان کو اس میچ میں فتح دلائی۔

• ایک روزہ کرکٹ میچ میں سب سے زیادہ میڈن (Maiden) اوور ہندوستان کے بشن سنگھ بیدی نے پھینکے ہیں۔ (مشرقی افریقہ کے خلاف، وکٹ ۱، رنز ۶، میڈن ۸، اوور ۱۲)۔

• کرکٹ کے پچ (Pitch) کی لمبائی ۲۲ گز ہوتی ہے اور اس کی چوڑائی دس فٹ ہوتی ہے۔

• اگر بلّے باز اعتراض نہ کرے تو گیند باز ٹوپی پہن کر گیند پھینک سکتا ہے۔

• پاکستان کے عمران خان نے ریلائنس کپ کے پہلے میچ (۸ اکتوبر ۱۹۸۷ء) کو اپنا ۱۰۰واں ون ڈے وکٹ سری لنکا کے اروِند ڈی سلوا کو لے کر پورا کیا۔

• ہندوستانی کرکٹ کنٹرول بورڈ کے صدر ستری ایس۔ ستری رمن ہیں

• رنجی ٹرافی کا پورا آفیشیل نام نیشنل رنجی ٹرافی چیمپیئن شپ ہے۔

• کرکٹ میچ کے دوران دونوں ٹیموں کے کپتان کی مرضی سے امپائر کو بدلا جا سکتا ہے۔

• بشن سنگھ بیدی کا ٹیسٹ میچوں میں سب سے زیادہ رن ۵۰ ہے۔

• بشن سنگھ بیدی نے فرسٹ کلاس میچ میں صرف ایک بار ہیٹ ٹرک (Hat Trick) بنائی ہے۔

• ایک روزہ بین الاقوامی کرکٹ میچ میں سب سے پہلے ہیٹ ٹرک پاکستان کے گیند باز جلال الدین نے آسٹریلیا کے خلاف حیدرآباد میچ میں بنائی۔ انھوں نے اپنے ساتویں اوور کی چوتھی، پانچویں اور چھٹی گیند پر روڈ نی مارش، بروس یارڈلے اور جیوف لاسن کو آؤٹ کیا۔

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

٭ بھلیا گولہ، تاج پور، سمستی پور (بہار)۔

تبصرے

نام کتاب : شعری ادب
مرتب ، ساحل احمد
ضخامت : ۱۵۹ صفحات
قیمت ، ۱۵ روپے
ناشر : اُردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد۔

ساحل احمد کا مرتبہ "شعری ادب" زیر نظر ہے جو دلکش و دیدہ زیب ہے۔ مرتب نے اس کتاب میں ۱۹۷۷ء کا شعری ادب شامل کیا ہے۔ اس میں نظمیں، غزلیں، رباعیوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے (جنوری تا دسمبر) ہر ماہ کے اعتبار سے کتاب کو صفحات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں موجودہ دور کے اُردو کے نامور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کا شاعری کے ضمن پر مختصر سا تاثر ہے۔ ۱۱ صفحات کی فوٹو البم ہے جس میں چند شعرا کی تصاویر ہیں ہر صفحے پر چار تصاویر شامل کی گئی ہیں۔ فوٹو البم کے بعد بعنوان "نقطہ" ساحل احمد نے ادب پر مفصل اظہار کیا ہے۔ کتاب کے سپید صفحات کو نیلے حاشیوں سے آراستہ کیا گیا ہے جس سے کتاب کی خوبصورتی میں مزید چار چاند لگا دئے ہیں۔ موصوف نے ہندوستان کے ممتاز مشہور و معروف شعرا کی شعری تخلیقات شامل کی ہیں۔ انتخاب دیکھ کر مرتب کے باشعور اور سلیقہ مند ہونے کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں جن شعرا کی شعری تخلیقات شامل ہیں وہ اُردو ادب میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔

ہمارے ادب و نقاد اگر گروہی عصبیت سے بالاتر ہو کر سوچتے ہیں تو ذاتی مفاد پیش نظر ضرور رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے نوجوان ادیبوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو پاتا ہے۔ جس کے نیا احساس، نئی فکر اور گہری سوچ ہمارے نئی نسل کے شاعروں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کے باوجود بھی دانستہ طور پر انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اگر مرتب، نوجوان نسل کے چند ایسے شعرا کی تخلیقات بھی شامل کرتے تو یہ قدم دوسرے لوگوں کے لیے قابلِ تقلید ہوتا اور ادبی حلقے میں سراہا جاتا۔ مندرجہ بالا بحث سے ہٹ کر کتاب مجموعی طور پر بہت عمدہ ہے۔ قیمت واجبی ہے۔

٭ ٭ ٭

نام کتاب : اے دل تو ہی بتا
شاعر ، مجید امجد
ضخامت ، ۱۱۲ صفحات
قیمت : ۱۲ روپے
ناشر : اُردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد۔

"اے دل تو ہی بتا" مجید امجد کی غزلیات کا مجموعہ ہے جو ۶۳ غزلوں پر مشتمل ہے۔ مجید امجد کا نام اُردو شاعری میں غیر معروف نہیں ہے انھوں نے بیک وقت غزل اور نظم پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ غزل سے پہلے نظم میں انھوں نے اپنی پہچان بہت جلد قائم کر لی ہے۔ نظم نگاری میں موصوف کو ان کی غزلیہ شاعری کی بہ نسبت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

پاکستان کا اُردو ادب ہندوستان کے اُردو ادب سے بہت مختلف ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے مجھے ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ وہاں پر بہت سے ایسے اہم نام ہیں جن سے بلاشبہ اُردو ادب کو فائدہ پہنچا ہے۔ مجید امجد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ مجید امجد کے کلام میں پختگی ہے۔ موصوف بھی دوسرے شعرا کی طرح آج کے عہد کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں۔ انھوں نے بھی وہی جوہر دکھائے ہیں جو دوسرے شعرا دکھا رہے ہیں۔ اس کے باوجود بھی خود کو روایت سے الگ نہیں رکھا۔ ان کی شاعری فیشن اور فارمولے کی شاعری نہیں بلکہ ان کے جذبات کی ترجمانی باشعور طریقے سے کرتی ہے۔ ان کے کلام میں جدت ہے لیکن وہ کلاسیکی ادب سے قطعی طور پر دامن نہیں بچاتے ہیں، وسیع النظر ہیں اور گہری فکر رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں کلاسیکیت کی ہلکی سی چھاپ ضرور نظر آتی ہے۔ دبے لفظوں میں موصوف زندگی اور اس کے حقائق سے قارئین کو آگاہ کرتے ہیں اور اپنے مشاہدات سے قارئین کو فیض یاب ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

امجد نشاطِ زیست اسی کشمکش میں ہے
مرنے کا قصد، جینے کا عزم ایک ساتھ کر

جنونِ عشق کی رسمِ عجیب کیا کہنا
میں اُن سے دور وہ میرے قریب کیا کہنا

انھیں حقیقتِ دریا کی کیا خبر امجد
جو اپنی رُوح کے منجدھار میں نہیں اُترے

مجید امجد نئی جستجو میں رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں کچھ نئے مشاہدات بھی کیے ہیں مشہور بحروں کے ارکان کو حذف کر کے یا اضافہ کر کے تجرباتی شعر بھی کہے ہیں۔ مندرجہ ذیل شعر اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

وار دُنیا نے کئے مجھ پر تو امجد میں اس گھمسان میں
کس طرح جی ہار کر رکھ دی نیامِ حرف میں شمشیرِ دل

پاکستانی ادب میں نئی علامتیں اور نئے استعارے ہمیں کثرت سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہاں کا ادب ہر اعتبار لائقِ ستائش ہے اور زندگی کے ہر شعبے کے ہم رکاب ہے۔ نیز زندگی کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ادب ہمارے دل کی گہرائیوں کو چھوتا ہے۔

آغاز کے دو صفحات پر جناب ساحل احمد کا پیش لفظ ہے۔ ۱۷ صفحات پر انور سدید صاحب نے اپنی بھرپور رائے کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کی قیمت مناسب ہے۔

عمران عظیم :

آپ سب کے لیے

شری اجیت کمار پانجہ کا زمبابوے کا دورہ

مرکزی وزیر ریاست برائے اطلاعات و نشریات شری اجیت کمار پانجہ کی قیادت میں اعلیٰ اختیارات کے حامل ایک پارلیمانی وفد نے ۱۳ جنوری سے ۱۹ جنوری ۱۹۸۸ء تک زمبابوے کا دورہ کیا۔ یہ ایک بیحد مفید اور کارآمد دورہ تھا۔ شری پانجہ اور وفد کے دوسرے ارکان نے زمبابوے کے بہت سے سماجی لیڈروں اور سرکار کے اہم ذمہ داروں سے بات چیت کی۔ اس بات چیت میں نئی ٹکنالوجی کے عوام پر اثرات کا جائزہ لیا گیا اور عوام کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے میں نئی ٹکنالوجی کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

چائے کی پیداوار بڑھانے کیلئے ۱۰ کروڑ روپے کا فنڈ

ہندوستان میں چائے کی پیداوار اور اس کی پیداواری صلاحیت بڑھانے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے تاکہ اس صدی کے آخر تک ملک میں ۱۲۰ کروڑ کلو گرام چائے کی پیداوار ہو سکے۔ اس کے لیے تحقیق کے کاموں کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔ سرکار نے دس کروڑ روپے کے فنڈ سے قومی سطح پر ایک ایسا ادارہ قائم کیا ہے جو چائے کی صنعت کو آگے بڑھانے میں مدد دے گا۔ اس فنڈ کے انتظام کے لیے ٹی بورڈ ایک کمیٹی قائم کرے گا۔

بنجر زمینوں کا استعمال

بنجر زمینوں کو بہتر بنانے کے کام میں عام لوگوں کو شریک کیا جا رہا ہے۔ اس کام میں رضاکار اداروں کی مدد بھی حاصل کی جا رہی ہے۔ اس کو کامیاب بنانے کے لیے ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں ۲۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔

پچھلے سال اس اسکیم کے تحت غیر سرکاری ایجنسیوں کے ۷۵ پراجیکٹوں کو ۴۸۰،۱۴۳ لاکھ روپے دیے گئے لیکن موجودہ مالی سال کے آخر تک یہ رقم ۵۰۰ لاکھ روپے تک پہنچ جائے گی۔ ۸۷-۱۹۸۶ء میں غیر سرکاری ایجنسیوں کے ۷۹ پراجیکٹوں کے لیے ۴۷،۳ لاکھ روپے کی رقم دی گئی تھی جبکہ ۸۶-۱۹۸۵ء میں یہ رقم ۵،۱۲۲ لاکھ روپے تھی۔

برآمدات میں اضافہ

اپریل سے ستمبر ۱۹۸۷ء کے دوران ہندسے جن خاص اشیاء کی برآمدات میں اضافہ ہوا ہے ان میں ہیرے جواہرات (۹۱۱،۰۷،۳ کروڑ روپے کا اضافہ)، سلے سلائے کپڑے (۲۹،۳۶۸ کروڑ روپے کا اضافہ)، پیٹرولیم کی مصنوعات (۵۹،۱۹۱ کروڑ روپے کا اضافہ)، سوتی کپڑے دھاگے وغیرہ (۴۷،۸۰ کروڑ روپے کا اضافہ)، شامل ہیں۔

اس کے علاوہ انجنیئرنگ کے سازوسامان، کیمیاوی اشیاء اور متعلقہ مصنوعات، دستکاریوں (قالین سمیت) چمڑا اور چمڑے کی مصنوعات، چائے، چاول، خام لوہا، کاجو، معدنیات، پھلوں اور سبزیوں، گوشت اور گوشت کی مصنوعات، کھیل کے سازوسامان کی برآمدات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

●

قارئین کی آراء اور مشورے

● یوجنا کا تازہ شمارہ (بابت ماہ دسمبر ۱۹۸۷ء) نظر سے گزرا۔ پسند آیا۔ رسالہ کافی دنوں بعد میرے مطالعے میں آیا ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس عرصہ میں یوجنا کے معیار و وقار میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔

ویسے تو اس شمارے کے سبھی مضامین مفید معلوماتی اور معیاری ہیں۔ لیکن میرے خیال میں تین مضامین ایسے ہیں جو اپنی جداگانہ نوعیت کے باعث خاص طور پر قابلِ تعریف ہیں۔ پہلا مضمون جس میں شریمتی اندرا گاندھی کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر نہایت خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے، پرہلاد سنگھ کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا مضمون "ایک نئے طرزِ فکر کی ضرورت" جو شہباز حسین کے قلم کا مرہونِ منت ہے، اقلیتی مسائل سے متعلق ہے اور قارئین کو دعوتِ فکر و عمل دیتا ہے۔ اس مضمون کی اہمیت کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:۔

"۔ اس وقت مسلمان تعلیمی لحاظ سے بہت پسماندہ ہیں، معاشی لحاظ سے کمزور ہیں، اور انھیں مختلف سطحوں پر طرح طرح کے اداروں کی ضرورت ہے جو انھیں صحیح مشورہ، رہنمائی، تربیت اور سرمایہ فراہم کریں تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ لہٰذا قومی سطح پر یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ قوم کے پاس جو زائد سرمایہ ہے اس کو مصرف میں لانے کے لیے قومی ترجیحات کیا ہوں؟ وہ کون سے کام ہیں جو ضروری اور اہم ہیں اور جنھیں سب سے پہلے کرنا چاہیئے۔"

تیسرا مضمون "جوہری جنگ کے اثرات" اس لحاظ سے بیحد اہم ہے کہ اس کے مطالعہ سے ایٹمی اسلحے کی تباہ کاریوں کے بارے میں بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

دیگر نگارشات بھی لائقِ ستائش ہیں کہ وہ جدید تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ شوکت فارغ کا افسانہ "گرم موں" بہت عمدہ ہے۔ شعری حصہ میں وقار طاہری، دھرم پال عاقل، فردوس گیاوی اور سیدہ نسرین نقاش کی تخلیقات پسند آئیں۔

(جنید حزیں لاری) وارانسی۔

● دسمبر کا "یوجنا" نظر نواز ہوا۔

ماشاء اللہ رسالہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ گذشتہ کئی ماہ سے خوشگوار تبدیلیاں دیکھنے کو مل رہی ہیں جس کے لیے مدیر واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

نثری حصہ میں ڈاکٹر شفیق اعظمی کا مضمون "اردو ناول کے ارتقاء میں خواتین کا حصہ"، محمد علی خاں کا "سماج اور انسان" شہباز حسین کا "ایک نئے طرزِ فکر کی ضرورت"، عبدالستار انصاری کا "الشائبہ" اچھے کی چیزیں ہیں۔

شعری حصے میں نیّر قریشی صاحب کی غزل دامنِ دل کھینچتی ہے۔

تصویر میاں : محلّہ مدرسہ کہنہ، جیل روڈ، رام پور (یو۔ پی)

● یوں تو چند ماہ ہی سے "یوجنا اُردو" کا قاری بننے کا شرف حاصل ہوا ہے لیکن اس میں ہر ماہ ایک نئی چمک دمک یقیناً آپ کی انتھک کاوشوں کا نتیجہ ہے لہٰذا اس نتیجہ پر میں آپ کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

یکم تا ۳۱ دسمبر ۱۹۸۷ء کا شمارہ بہت پسند [illegible] حامد علی خاں صاحبان کے مضامین نے دل جیت لیے۔

محمد عالمگیر : موضع ویشالی، پوسٹ و ضلع، ویشالی۔ بہار۔

● یوجنا (اُردو) کی عمر سات برس کے قریب ہے۔ لیکن اس کی ترقی کے منازل دیکھ کر گمان گزرتا ہے کہ یہ اپنے سنِ بلوغ کو پہنچ گیا ہے جس کے لیے آپ اور آپ کے رفقا تحسین و ستائش کے مستحق ہیں۔ اپنے مساعی جاری رکھیے۔

آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں طباعت کی تکنیک سے بھی روشناس ہوں۔ اس لیے جب تکنیکی عینک سے پرچے کو دیکھتا ہوں تو مزید خوشی حاصل ہوتی ہے۔ کتابت کی گولائیاں، دائرے اور کرسی و نشست خوشنویسی کی تکنیک کے مطابق ہوتی ہیں۔ پروف ریڈنگ جو طباعت میں ریڑھ کی ہڈی گردانی جاتی ہے پوری طرح ایستادہ، طباعت دیدہ زیب۔ سرورق سادہ مگر پرکار۔ اس کے لیے مبارکباد۔ مگر میرے بھائی! شاید گرانی کی وجہ سے آپ نے جو گردپوش کے چوتھے حصے پر مضامین شائع کرنا شروع کر دئے ہیں ان سے ممکنہ احتراز کیا جائے تو میں مناسب ہوگا۔ ان مضامین کی موجودگی سے جمالیاتی حس کو ٹھیس لگتی ہے۔ فنِ طباعت میں جمالیات بھی ضروری اور مناسب مقام رکھتی ہیں۔ کوشش کیجئے کہ یہ مجروح نہ ہو۔

آخر میں متن کے سلسلہ میں عرض کرنا چاہوں گا۔ ہم اس امر سے واقف ہیں کہ یوجنا کا آغاز تکنیکی موضوعات کو عام کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ اُردو میں تو اس کی خاص ضرورت ہے۔ سائنسی ترقی کی بدولت آج ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ جہاں لسانیاتی ترقی اب کورے ادب کی نہیں بلکہ افادی علوم کے تابع ہو گئی ہے۔ اس لیے تکنیکی و سائنسی موضوعات کو ترجیح دیجئے۔ ایسے موضوعات پر لکھنے والوں کو دعوت دیجئے یا پھر دوسری زبانوں سے ترجمہ کروائیے۔ ادبی چٹخاروں کے لیے

(باقی صفحہ ... پر)



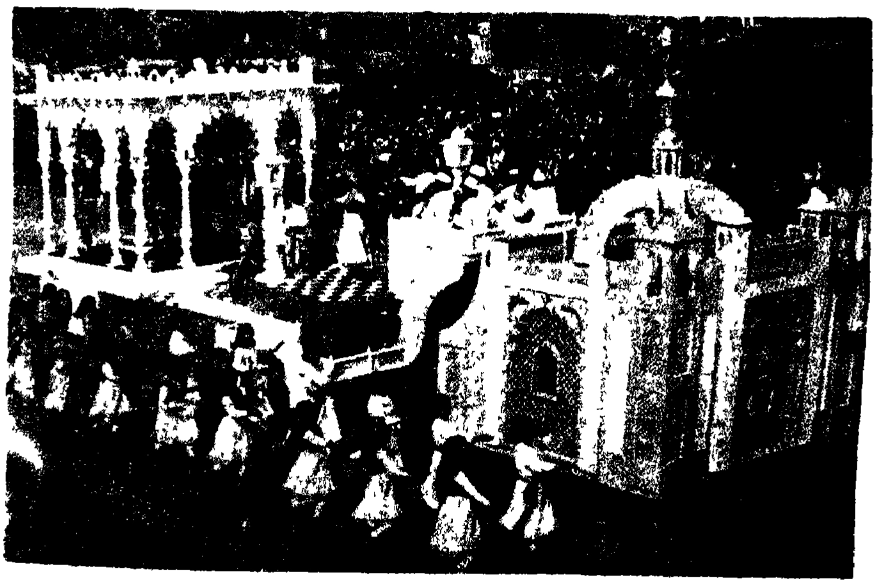
وزیراعظم شری راجیو گاندھی نے ۲۵ جنوری ۱۹۸۸ء کو نئی دہلی میں بچّوں کو بہادری دکھانے
کے صلے میں قومی انعامات برائے سال ۱۹۸۷ء عطا کئے۔
انعامات دینے کے بعد وزیراعظم بچّوں کے ہمراہ۔



۴ فروری ۱۹۸۸ء کو آل انڈیا
قومی ایکتا کمیٹی کی جانب سے پریس
کلب نئی دہلی میں قومی یک جہتی
پر ایک سیمینار ہوا۔ اس موقع
پر راجستھان کے نئے وزیر اعلےٰ
جناب سوچرن ماتھر کا استقبال
کیا گیا۔ تصویر میں (بائیں سے)
مرکزی وزیر محترمہ راجندر کماری
باجپئی، جناب مولانا اسرارالحق
اور راجستھان کے وزیراعلیٰ صاحب
سوچرن ماتھر کو دیکھا جا سکتا
ہے۔



ہر سال ۲۶ جنوری کے موقع پر پریڈ کے ساتھ جھانکیاں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ زیر نظر تصویر میں راج پتھ پر چلتی ہوئی ایک جھانکی میں الیکٹرونکس کے محکمے کی ترقی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔



۲۶ جنوری ۱۹۸۸ء کو یوم جمہوریہ کے موقع پر راج پتھ سلامی منچ کے سامنے گذرتی ہوئی لکھنؤ (اتر پردیش) کی جھانکی کا ایک منظر۔ یہ جھانکی شمسی صاحب کی تیار کردہ تھی جس میں بارہ دری و لکھی گیٹ کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے۔

(تصویر: سید مداعلی)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110 001

Printed by A.J. Printers, 5-Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110 002